قصص القرآن

تألیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

رفیق ندوۃ المصنفین

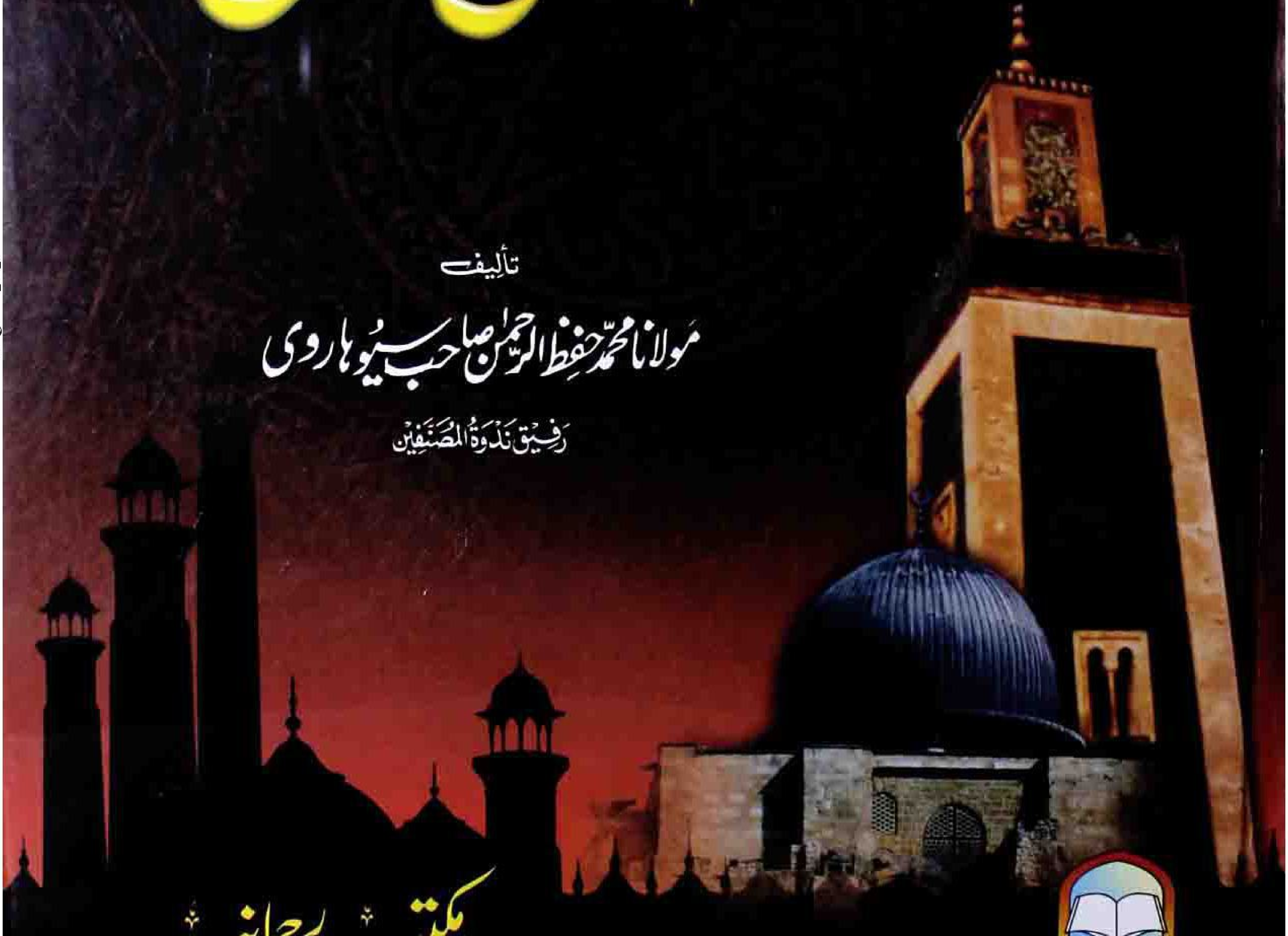

مکتبہ رحمانیہ

MAKTABA-E-REHMANIA

Marfat.com

قصص القرآن

جلد اوّل

قصص قرآنی اور انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات اور اُن کی دعوتِ حق کی مستند ترین
تاریخ جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام کے
واقعات تک نہایت مفصل اور محققانہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

تخریج وتصحیح

مولانا محمد عرفان فاضل جامعہ مدنیہ، لاہور

مکتبہ رحمانیہ

اقرا سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

مکتبہ رحمانیہ
اقرا سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار لاہور

جملہ حقوق ملکیت بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب .... قصص القرآن
تالیف .... مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی
رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی
تخریج و تصحیح .... مولانا محمد عرفان فاضل جامعہ مدنیہ، لاہور
ناشر .... مکتبہ رحمانیہ
اقرا سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار لاہور
مطبع .... خضر جاوید پرنٹرز

ضروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لیے پھر بھی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما دیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

Marfat.com

فہرست مضامین (جلد اوّل)

پیش لفظ ۱۱
چند باتیں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ۱۳
پیش لفظ ۱۷
دیباچہ طبع ثانی ۱۹
دیباچہ طبع ثالث ۱۹

حضرت آدم علیہ السلام

انسان اوّل ۲۱
ذکر آدم علیہ السلام سے متعلق آیات قرآنی ۲۳
پیدائش آدم، فرشتوں کو سجدہ کا حکم، شیطان کا انکار ۲۵
سجدہ سے انکار کرنے پر ابلیس کا مناظرہ ۲۶
ابلیس نے جواب دیا ۲۷
ابلیس کی طلب مہلت ۲۷
خلافت آدم علیہ السلام ۳۰
تعلیم آدم علیہ السلام اور فرشتوں کا اقرار عجز ۳۱
حضرت آدم علیہ السلام کا قیام جنت اور حوّاء کی زوجیت ۳۲
آدم علیہ السلام کا خلد سے نکلنا ۳۲
قصہ سے متعلق چند اہم مسائل ۳۵
خلق آدم علیہ السلام ۳۵
فلسفیانہ نقطہ ۴۰
جنت ارضی علماء طبقات الارض کی نظر میں ۴۰
عصمت نبی کے معنی ۴۱
حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت ۴۳
فرشتہ ۴۵
جن ۴۷
قصہ آدم علیہ السلام میں چند اہم عبرتیں ۴۹
قابیل و ہابیل ۵۱
مقام عبرت ۵۳

حضرت نوح علیہ السلام

حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں ۵۴
نسب نامہ ۵۴
نقشہ نمبر ۱ .... ۵۵
نقشہ نمبر ۲ .... ۵۵
قرآن عزیز میں حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ ۵۵
قوم نوح علیہ السلام ۵۶
دعوت وتبلیغ اور قوم کی نافرمانی ۵۶
بناء سفینہ ۶۰
پسر نوح علیہ السلام ۶۱
کوہ جودی ۶۳
طوفان نوح علیہ السلام عام تھا یا خاص ۶۳

پسر نوح علیہ السلام کی نسبی بحث ۶۴
ایک اخلاقی مسئلہ ۶۴
چند ضمنی مسائل ۶۶
اہم نتائج ۶۹

حضرت ادریس علیہ السلام

حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر قرآن میں ۷۰
نام ونسب اور زمانہ ۷۱
حضرت ادریس علیہ السلام حکماء اور فلاسفہ کی نظر میں ۷۳
حضرت ادریس علیہ السلام کی تعلیم کا خلاصہ ۷۵
نذر الٰہی کے طریقے ۷۶
بعد میں آنے والے نبیوں کے متعلق بشارت ۷۶
حضرت ادریس علیہ السلام کی خلافت ارضی ۷۶
حضرت ادریس علیہ السلام کا حلیہ ۷۷
محاکمہ ۷۸

حضرت ہود علیہ السلام

قرآن عزیز میں ہود علیہ السلام کا ذکر ۷۹
قرآن عزیز میں عاد کا ذکر ۷۹
قوم عاد ۷۹
عاد کا زمانہ ۸۰
عاد کا مسکن ۸۰
عاد کا مذہب ۸۰
حضرت ہود علیہ السلام ۸۱
تبلیغ اسلام ۸۱
حضرت ہود علیہ السلام کی وفات ۹۰
چند عبرتیں ۹۱

حضرت صالح علیہ السلام

حضرت صالح علیہ السلام اور ثمود کا ذکر قرآن عزیز میں ۹۳
حضرت صالح علیہ السلام اور ثمود کا نسب نامہ ۹۳
ثمود کی بستیاں ۹۴
اہل ثمود کا مذہب ۹۶
قرآن عزیز میں قصص کا مطلب ۹۷
معجزہ کی حقیقت ۹۷
نَاقَةُ اللهِ ۱۰۰
قوم کی ہلاکت اور صالح علیہ السلام کا قیام ۱۰۵
چند عبرتیں ۱۱۱

حضرت ابراہیم علیہ السلام

نسب نامہ ۱۱۳
آزر کی تحقیق ۱۱۳
شجرۂ نسب حضرت ابراہیم تا حضرت نوح علیہما السلام ۱۱۵
مستشرقین یورپ کی ہرزہ سرائی ۱۱۶
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر قرآن میں ۱۲۳
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت ۱۲۵
بعثت ۱۲۵
باپ کو دعوت اسلام اور باپ بیٹے کا مناظرہ ۱۲۶
قوم کو دعوت اسلام اور اس سے مناظرہ ۱۲۸
آیات کی تفسیر میں قول فیصل ۱۳۲
بادشاہ کو دعوت اسلام اور اس سے مناظرہ ۱۳۹
آگ کا سرد ہو جانا ۱۴۲
حدیث بخاری ۱۴۴

Marfat.com

زیر بحث مسئلہ ۱۴۷
مؤلف کی رائے ۱۴۸
ہدایت قوم کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا
اضطراب ۱۵۱
اور کلدانیین کی جانب ہجرت ۱۵۱
ہجرت فلسطین ۱۵۲
ہجرت مصر اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام ۱۵۳
حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دو اہم مقام ۱۵۴
مقام اوّل ۱۵۵
مقام ثانی ۱۵۷

حضرت اسماعیل علیہ السلام

اسماعیل علیہ السلام کی ولادت ۱۶۲
وادی غیر ذی زرع اور ہاجرہ و اسماعیل علیہما السلام ۱۶۳
ختنہ ۱۶۹
تاریخ عظیم ۱۶۹
بناء کعبہ ۱۷۳
اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ۱۷۷
قرآن عزیز میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا تذکرہ ۱۷۸
حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وفات ۱۷۸

حضرت اسحاق علیہ السلام

ختنہ ۱۸۰
اسحاق علیہ السلام کی شادی ۱۸۰
حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد ۱۸۱
حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حق الیقین کی طلب ۱۸۲
بنی قطورہ ۱۸۳

حضرت لوط علیہ السلام

لوط اور ابراہیم علیہما السلام ۱۸۵
سدوم ۱۸۵
قوم لوط ۱۸۶
حضرت لوط علیہ السلام اور تبلیغ حق ۱۸۷
حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ملائکۃ اللہ ۱۸۸
مسائل ۱۹۳
حضرت ابراہیم علیہ السلام مجدد انبیاء علیہم السلام ۱۹۵
واقعات زیر بحث سے متعلق چند عبرتیں ۱۹۷

حضرت یعقوب علیہ السلام

نسب نامہ ۲۰۰
ذکر یعقوب علیہ السلام قرآن مجید میں ۲۰۱
اسرائیل ۲۰۱
اولاد یعقوب علیہ السلام ۲۰۱
پیغمبری ۲۰۱

حضرت یوسف علیہ السلام

نسب نامہ ۲۰۲
قرآن عزیز میں حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر ۲۰۲
سورۂ یوسف ۲۰۳
یوسف علیہ السلام کا خواب اور برادران یوسف علیہ السلام ۲۰۳
چاہ کنعان ۲۰۶
یوسف علیہ السلام اور غلامی ۲۰۶

Marfat.com

یوسف علیہ السلام مصر میں ۲۰۷
عزیز مصر کی بیوی اور یوسف علیہ السلام ۲۰۸
وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا کی تفسیر ۲۰۹
یوسف علیہ السلام زندان میں ۲۱۵
دعوت وتبلیغ ۲۱۶
فرعون کا خواب ۲۱۸
لطیفہ ۲۲۲
خاندان یعقوب علیہ السلام مصر میں ۲۳۶
وفات ۲۳۸
اہم اخلاقی مسائل ۲۳۹

حضرت شعیب علیہ السلام

حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر قرآن میں ۲۴۴
قوم شعیب علیہ السلام ۲۴۴
مدین یا اصحاب ایکہ ۲۴۵
زمانہ بعثت اور ایک غلطی کا ازالہ ۲۴۶
دعوت حق ۲۴۶
نوع عذاب ۲۴۹
قبر شعیب علیہ السلام ۲۵۱
بصائر وعبرت ۲۵۲

حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام

بنی اسرائیل مصر میں ۲۵۴
فرعون موسیٰ ۲۵۶
فرعون کا خواب ۲۶۰
حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا ذکر قرآن میں ۲۶۱
نسب وولادت ۲۶۴
فرعون کے گھر میں تربیت ۲۶۵
موسیٰ علیہ السلام کا مصر سے نکلنا ۲۶۸
موسیٰ علیہ السلام اور ارض مدین ۲۷۱
ماء مدین ۲۷۱
شیخ سے رشتۂ مصاہرت ۲۷۴
موسیٰ علیہ السلام کے خسر کون ہیں؟ ۲۷۵
ایفائے مدت ۲۷۸
وادی مقدس ۲۷۹
بعثت ۲۸۰
آیات اللہ ۲۸۱
داخلہ مصر ۲۸۳
وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ۲۸۴
فرعون کے دربار میں دعوت حق ۲۹۱
ربوبیت الٰہی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام وفرعون کا مذاکرہ ... ۲۹۴
ہامان ۲۹۸
فرعون کے دربار میں "آیات اللہ" کا مظاہرہ ۲۹۹
ساحرین مصر ۳۰۱
سحر ۳۰۲
سحر اور مذہب ۳۰۴
معجزہ اور سحر میں فرق ۳۰۵
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساحروں کا مقابلہ ۳۰۷
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل ۳۱۲
فرعون کا دعوائے ربوبیت والوہیت ۳۱۷
مصریوں پر قہر خدا ۳۱۸
آیات اللہ کی تفصیل ۳۱۹
بنی اسرائیل کا خروج اور فرعون کا تعاقب ۳۲۵
غرق فرعون ۳۲۶

Marfat.com

فلق بحر ۳۲۷
فرعون، قوم فرعون اور عذاب قیامت ۳۳۶
عبور قلزم کے بعد بنی اسرائیل کا پہلا مطالبہ ۳۳۸
قومی پستی کا مظاہرہ ۳۳۸
بنی اسرائیل کے دیگر مطالبات اور آیات بینات
کا ظہور ۳۳۹
طور پر اعتکاف ۳۴۲
تجلی ذات؟ ۳۴۳
نزول تورات ۳۴۴
گئو سالہ پرستی کا واقعہ ۳۴۷
سامری کون تھا؟ ۳۵۴
ستر سرداروں کا انتخاب ۳۵۷
حیات بعد الموت ۳۵۹
رحمت عام کا اعلان ۳۶۰
بنی اسرائیل اور جبل طور ۳۶۰
کثرت معجزات ۳۶۲
ارض مقدس کا وعدہ اور بنی اسرائیل ۳۶۳
ذبح بقرہ کا واقعہ ۳۶۶
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قارون ۳۷۲
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ایذاء بنی اسرائیل ۳۷۶
محاکمہ ۳۷۸
حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات ۳۷۸
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر ۳۷۹
قول فیصل ۳۸۳
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ۳۸۶
بنی اسرائیل کا قومی مزاج اور خدا کی جانب سے تذکیر
نعمت ۳۸۸
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ثناء و منقبت قرآن میں ۳۹۰
ایک لطیف تاریخی نکتہ ۳۹۳
بصیرتیں اور عبرتیں ۳۹۵

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحيم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کائنات میں بسنے والوں کے لئے ایک ایسی نعمت ہے جس کا شکر ادا کرنے سے انسانیت قاصر ہے، یہ کلام الٰہی ہے، ضابطۂ حیات ہے، یہ نصیحت وموعظت ہے۔ آج تک جتنے انسانوں نے اس پر ایمان لانے کے ساتھ اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھا اس کے اوامر کو پورا کیا اور اس کے منہیات سے اپنے کو روکا اس کی نصائح اور مواعظ کو گوش حق نیوش سے سنا اور عبرت حاصل کر کے سابقہ معتوب امتوں کی روش سے اپنے آپ کو بچایا تو ایسے لوگ دنیا و آخرت کی کامیابی کا پروانہ حاصل کرنے میں کامیاب و بامراد ہوئے۔

قرآن پاک میں مذکور انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے حالات و واقعات کو نصیحت حاصل کرنے کی غرض سے لکھنے کا قدیم زمانہ سے رواج ہے۔ بہت سے علماء و مؤرخین نے اس میدان میں قدم رکھا اور اپنی اپنی معلومات کے مطابق بہت سے انبیاء علیہم السلام سے متعلق بڑی گراں قدر معلومات جمع کر کے اپنی سعادت کا سامان کیا لیکن بعض مؤرخین نے واقعات کو نقل کرنے میں اچھے خاصے تساہل کو روا رکھا اور توریت وانجیل سے بہت سا رطب و یابس جمع کر کے حقائق واقعیہ کے ساتھ شامل کر دیا جو کہ کسی طرح بھی لائق قبول نہ تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی بندۂ خدا قرآن وسنت کو بنیاد بنا کر انبیاء علیہم السلام کے حالات و واقعات کو ضبطِ تحریر میں لائے اور اس سلسلہ میں ملحدین و مستشرقین کے اٹھائے گئے بے بنیاد اعتراضات کو طشت از بام کر دے لاکھوں مسلمانوں کی اپنی زبان اردو میں تذکرۃ الانبیاء علیہم السلام سے متعلق دسیوں کتب منظر عام پر آ چکی تھیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اس ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر تھی۔ لکھوکھا مسلمانوں کی جانب سے اللہ تعالیٰ ڈھیروں جزائے خیر عطا فرمائے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کو کہ انہوں نے آج سے دسیوں سال قبل وقت کی اس اہم ضرورت کو محسوس فرمایا اور اپنی دینی، ملی، سیاسی اور دعوتی مصروفیات کے باوجود سینکڑوں صفحات پر مشتمل کتاب قصص القرآن تحریر فرما کر امت مسلمہ کے تمام حلقوں پر احسان عظیم فرمایا۔

مولانائے مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف عطا فرمائے تھے جن کا آپ کی تحریرات خصوصاً پیش نظر کتاب قصص القرآن سے اندازہ ہوتا ہے اس کتاب سے جہاں آپ کی قرآن فہمی کا پتہ چلتا ہے وہیں دیگر کتب ساویہ کے انتہائی عمیق مطالعہ کا بھی احساس ہوتا ہے بہت سے مقامات پر مولانا کے ادبی ذوق کے سبب انشاء وادب کے جواہر پارے بھی نوک قلم پر آ گئے ہیں جن سے اہل فن اپنے ذوق کے مطابق بہت سا حصہ پا لیتے ہیں۔ اس کتاب کی افادیت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ مولانا نے جب

Marfat.com

سے یہ کتاب تصنیف فرمائی ہے اس وقت سے اب تک بلا مبالغہ دسیوں، سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں نسخے چھپ کر عوام وخواص کو انبیاء علیہم السلام کی زندگی سے روشناس کرا چکے ہیں۔ لیکن اسے بخت واتفاق کی عدم موافقت کہہ لیجئے یا کچھ اور کہ یہ کتاب ہر لحاظ سے جتنی قیمتی تھی اتنی ہی کتابت وطباعت میں ادائیگی حق سے محروم رہی۔ دسیوں مقامات پر کتابت کی ایسی اغلاط موجود تھیں کہ جن کے سبب بات کو سمجھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا، کئی مقامات پر آیات قرآنی غلط چھپی ہوئی تھیں اور بہت سے مقامات پر مس پرنٹنگ کے سبب پڑھنا بھی دشوار ہوتا تھا۔ کئی مرتبہ اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر خیال ہوا کہ اس کو نئے سرے سے کتابت کرا کر چھاپ دیا جائے تا کہ ایک مفید چیز بہتر سے بہتر صورت میں قارئین تک پہنچائی جا سکے اور تقریباً دو سال سے اس خیال کو بہت سے مخلص دوستوں کے مشوروں نے خاصی تقویت پہنچائی حتیٰ کہ یہ خیال عزم مصمم کی صورت اختیار کر گیا بالآخر بنام خدا کتاب قصص القرآن کے چاروں حصے کمپیوٹر پر کمپوز کرنے کے لیے دے دیئے تا کہ جدید تقاضوں کے عین مطابق قارئین کے سامنے اس کو پیش کیا جا سکے۔ الحمدللہ، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کمپیوٹر پر کتابت کے بعد اس کی دو مرتبہ تصحیح کرائی تا کہ اپنی حد تک کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے تصحیح کا کام بھی بحسن وخوبی انجام کو پہنچا۔ کتاب قصص القرآن کی سابقہ تمام طباعتوں میں اکثر آیات قرآنیہ کے نمبر نہیں دیئے گئے یہ درست ہے کہ اہل علم خاص کر حفاظ کرام کو اس کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی مگر غیر حافظ قارئین کو آیات کی تلاش وجستجو میں خاصی دقت کا سامنا تھا، الحمدللہ ہم نے کتاب میں آنے والی تمام آیات مبارکہ کو مکمل حوالہ کے ساتھ پیش کر دیا ہے جس کے سبب کتاب ہٰذا کا ہر قاری تھوڑے سے وقت میں بڑی سہولت کے ساتھ ہر ہر آیت کو قرآن پاک سے تلاش کر سکتا ہے۔ ہمارے پروگرام کے مطابق تو بہت پہلے اس کتاب کو اپنی موجودہ مفید ترین شکل میں منظر عام پر آ جانا چاہیے تھا مگر جدید کتابت، معیاری طباعت اور خوبصورت جلد بندی ہر کام نے ہمارے وہم وخیال کے علی الرغم وقت سے خاصہ حصہ لیا اور اب کتاب قصص القرآن اپنی تمام تر ظاہری ومعنوی خوبیوں کے ساتھ آپ کے ہاتھوں میں ہے اللہ تعالیٰ سے دُعاء ہے کہ اس کو قبول فرما کر مصنف کتاب، تصحیح کنندہ اور ناشر وقارئین سب کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین

مقبول الرحمٰن

چند باتیں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ۱۰ جنوری ۱۹۰۱ء (۱۳۱۸ھ) کو سیوہارہ ضلع بجنور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے محلے کا نام "محلہ مولویاں" تھا۔ والد کا اسم گرامی مولوی حاجی شمس الدین صدیقی تھا جو اپنے علاقے کے اچھے خاصے زمیندار، نہایت نیک، خوش عقیدہ اور علمائے حق کے گرویدہ تھے۔ ریاست بھوپال اور ریاست بیکانیر میں اسسٹنٹ انجینئر کے عہدے پر مامور رہے۔ ان کے چار بیٹے تھے۔

ایک مولوی فخر الدین جو ڈپٹی کلکٹر کے منصب تک پہنچے۔

دوسرے مولوی بدرالدین جنہوں نے وکالت پاس کی اور اپنے علاقے اور عہد کے بہت اچھے وکیل ہوئے۔

تیسرے مولوی صلاح الدین جنہیں علم طب پڑھایا گیا اور انہوں نے مولوی حکیم صلاح الدین کے نام سے شہرت پائی۔

چوتھے معزالدین تھے جن کو اللہ نے بڑی عزت وتکریم سے نوازا۔ ان کا تاریخی نام "حفظ الرحمٰن" تھا اور یہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔

دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی کا نام بتول فاطمہ اور چھوٹی کا عظم النساء تھا۔ بڑی بیٹی کی شادی مولوی انوار الحسن نائب صوبے دار ریاست گوالیار سے اور چھوٹی بیٹی کی حافظ محمد ابراہیم سے ہوئی تھی۔ یہ وہی حافظ محمد ابراہیم ہیں جو آزادی کے بعد ہندوستان کے وزیر آب پاشی وبرقیات بنائے گئے تھے، اور صدر ایوب کے زمانہ میں جب ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے پاکستان کا دورہ کیا تھا تو نہری پانی کے سلسلے میں حکومت پاکستان سے گفتگو کرنے کی غرض سے حافظ محمد ابراہیم بھی ان کے ساتھ پاکستان آئے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کے والد مکرم نے تین بیٹوں کو دنیوی تعلیم دلائی اور وہ اس میں کامیاب رہے، لیکن چوتھے بیٹے (حفظ الرحمٰن) کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کا فیصلہ کیا، اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں دلائی پھر مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد میں داخل کرا دیئے گئے، چند کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد مدرسہ فیض عام سیوہارہ میں چلے گئے اور اس زمانے کے درس نظامی کی تکمیل وہیں کی۔ یہ مرحلہ طے ہو چکا تو دارالعلوم دیوبند کا عزم کیا اور وہاں حضرت مولانا محمد انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اساتذہ سے استفادے کے مواقع میسر آئے۔ دیوبند سے فراغت کے بعد وہیں تدریسی خدمات سرانجام دینے لگے۔

ان کے وعظ وتقریر کی اثر انگیزیوں کی شہرت عالم جوانی ہی میں دور دراز علاقوں میں پہنچ گئی تھی اور لوگ نہایت شوق سے ان کے تبلیغی جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

۱۹۱۸ء یعنی اٹھتی جوانی میں انہوں نے سیاسیات کے میدان میں قدم رکھا اور اپنی بے پناہ سرگرمیوں کی بناء پر بہت جلد ملک کے معروف وممتاز رہنماؤں میں ان کا شمار ہونے لگا۔

اس زمانے کے لوگوں میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کا جذبہ بڑا تیز تھا۔ مدراس کے رؤساء وامراء کی اس باب میں دلچسپیاں

خاص طور سے بہت مشہور تھیں۔ وہاں ایک بزرگ سیٹھ یعقوب سکونت پذیر تھے۔ انہوں نے مولانا ممدوح سے بدراس تشریف لے جانے اور وہاں اسلام کی تبلیغ کرنے کی درخواست کی، چنانچہ اپنے اساتذہ کے مشورے سے ۱۹۲۶ء میں وہ یہ خدمت سرانجام دینے کے لیے مدراس گئے اور کچھ مدت وہاں فریضہ تبلیغ ادا کرتے رہے۔

۱۹۲۸ء میں دارالعلوم (دیوبند) کے انتظامی معاملات میں شدید کشمکش کا سلسلہ شروع ہوا، جس کے نتیجے میں حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے وہاں کی سکونت ترک کرکے ڈابھیل جانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ان بزرگان گرامی قدر کے ساتھ جن لوگوں نے رخت سفر باندھا ان میں مولانا بدر عالم میرٹھی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان حضرات کی یہ نوجوانی کا زمانہ تھا اور یہ مولانا انور شاہ کے لائق و ذہین شاگرد تھے جو اس وقت مدرسین کی جماعت میں شامل ہو چکے تھے۔ ڈابھیل وہ گوشۂ عزلت تھا جس میں مولانا حفظ الرحمٰن اور ان کے رفقائے کرام کی صلاحیتوں میں بڑا اضافہ ہوا اور انہوں نے وہاں خوب تن دہی سے کام کیا۔

۱۹۳۴ء میں مولانا حفظ الرحمٰن کلکتے چلے گئے اور دو سال وہاں اقامت گزیں رہے، وہاں انہوں نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع کر دیا، جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس سے متاثر ہو کر انہوں نے ایک مستقل تصنیفی ادارے کے قیام کا فیصلہ کیا۔

۱۹۳۸ء میں انہوں نے دہلی میں "ندوۃ المصنفین" کے نام سے تصنیفی ادارہ قائم کیا، جس کا دفتر فیض روڈ (قرول باغ) کی ایک بہت بڑی کوٹھی میں تھا۔ ندوۃ المصنفین کے قیام کے ساتھ ہی انہوں نے ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا جس کا نام "برہان" رکھا گیا ندوۃ المصنفین کا قیام مندرجہ ذیل حضرات کی رفاقت سے عمل میں آیا تھا۔

① مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (رفیق اعلیٰ) ② مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (ناظم ندوۃ المصنفین)
③ مولانا بدر عالم میرٹھی (رفیق) ④ مولانا سعید احمد اکبر آبادی (رفیق و ایڈیٹر ماہنامہ "برہان")
⑤ مولانا حامد الانصاری غازی (رفیق) ⑥ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی (رفیق)

یہ اصحاب ستہ یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور ان میں سب سے بعد میں سفر آخرت اختیار کرنے والے قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی تھے، جنہوں نے تصنیفی خدمات بھی انجام دیں، میرٹھ کی شاہی مسجد کا منصب خطابت بھی سنبھالے رکھا اور جامعہ ملیہ دہلی میں مسند تدریس پر بھی فائز رہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے تصنیفی ادارے میں بڑی محنت اور انہماک و توجہ سے کام کا آغاز کیا اور محققانہ کتابیں تصنیف کیں، جن کا مختصر الفاظ میں یہاں تعارف کرایا جاتا ہے۔

① **قصص القرآن:** یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے اور کم و بیش دو ہزار صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ہر جلد کے مشمولات اس قسم کے ہیں۔

جلد اول: اس میں حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت موسیٰ علیہ السلام تک کے انبیائے کرام کے واقعات و حالات معرض تحریر میں لائے گئے ہیں۔

جلد دوم: حضرت یوشع سے حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے سوانح حیات اور ان کی دعوت و تبلیغ کی مکمل تفصیل اس جلد میں

Marfat.com

بیان کر دی گئی ہے۔

جلد سوم: اس جلد میں بعض انبیائے کرام علیہم السلام کے سوانح زندگی کے علاوہ متعدد دیگر واقعات قرآنی بیان کیے گئے ہیں، مثلاً اصحاب کہف ورقیم، اصحاب القریہ، اصحاب السبت، اصحاب الرس، بیت المقدس اور قوم یہود، اصحاب الاخدود، اصحاب الفیل، اصحاب الجنہ، ذوالقرنین اور سد سکندری۔ علاوہ ازیں سباء اور سیل عرم وغیرہ کا محققانہ اور مؤرخانہ اسلوب میں ذکر کیا گیا ہے۔

جلد چہارم: یہ جلد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سیرتوں کے بیان پر محیط ہے جو قرآن مجید کی روشنی میں ضبط تحریر میں لائی گئی ہیں۔ اس جلد میں بعض دیگر مباحث بھی آ گئے ہیں۔

قصص القرآن جو اس وقت قارئین کرام کے زیر مطالعہ ہے اپنے موضوع کی نہایت اہم تصنیف ہے۔ اس کی بہت بڑی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ ہر مقام پر اسلاف کے نقطۂ نظر کو پیش نگاہ رکھا گیا ہے اور قرآن کے بعض قصص و واقعات پر جن لوگوں نے کوئی اعتراض کیا یا غلط تاویل سے کام لیا ہے، اس کا دلائل سے جواب دیا گیا ہے۔ اُردو زبان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے جو کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔

اس کتاب کی ایک نمایاں صفت یہ ہے کہ بیک وقت یہ قرآن کی تفسیر بھی ہے، امم سابقہ کی تاریخ بھی ہے، ان کے اعمال و کردار کے جو نتائج نکلے، اس کی پوری تفصیل بھی اس میں بیان کر دی گئی ہے۔ پھر قرآن نے جس خوبصورت پیرائے میں اظہار واقعہ کیا ہے۔ اُردو زبان میں نہایت حسن و خوبی سے اس کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ آیات کے ترجمے میں گرامر کے نقطۂ نگاہ کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب اس درجہ گوناگوں خصائص کی حامل ہے کہ اس کے مطالعہ سے قرآن کے تمام اہم مقامات نظر و بصر کے زاویوں میں آ جاتے ہیں۔

۲ **اسلام کا اقتصادی نظام:** محنت اور سرمایہ کی یا مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش کسی نہ کسی صورت میں یوں تو ہمیشہ جاری رہی ہے، مگر چند سالوں سے اس میں زیادہ ہی شدت پیدا ہو گئی ہے اور اس سلسلے میں سیاسی اور اقتصادی خطوط پر بہت سے مسائل ابھر آئے ہیں، جنہوں نے ساری دنیا کو ایک قسم کے میدان جنگ میں لا کھڑا کیا ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے اس موضوع پر بہت ہی احتیاط اور توازن کے ساتھ اظہار خیال فرمایا ہے۔ انہوں نے اس بنیادی مسئلے میں اسلامی احکام کی بھی وضاحت کی ہے اور موجودہ نظاموں کو بھی پیش نگاہ رکھا ہے۔ اُردو میں اس موضوع کی یہ ایک جامع اور مدلل کتاب ہے۔

۳ **اخلاق اور فلسفہ اخلاق:** اخلاقیات کو اسلام کے جامع اور ہمہ گیر نظام زندگی میں ایک اہم باب کی حیثیت حاصل ہے۔ مولانا سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ضخیم کتاب میں اس موضوع پر بسط و تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس میں سابق انبیائے کرام علیہم السلام کے اقوال وارشادات اور عمل و کردار کا تذکرہ بھی کیا ہے، اسلام کے احکام بھی بیان کیے ہیں اور حکمائے اسلام نے اخلاقیات کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس کی تفصیل بھی درج کی ہے، مثلاً امام رازی، امام غزالی، مولانا رومی، حافظ ابن قیم، شیخ سعدی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم نے جس نہج سے اس مسئلے کو ہدف نظر ٹھہرایا ہے، اس کی صاف ستھرے انداز میں وضاحت کی ہے۔

۴ **البلاغ المبین فی مکاتیب سید المرسلین:** اس کتاب میں فاضل مصنف نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ خطوط و مکاتیب جمع کر

Marfat.com

دیے ہیں جو آپ ﷺ نے اپنے عہد کے امرا و سلاطین کے نام تحریر فرمائے۔ مولانا سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ نے ان خطوط کا پس منظر اور ضروری تشریحات اس طرح پیش کی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا طریق دعوت و تبلیغ کھل کر قارئین کے سامنے آجائے اور علماء و مبلغین اسے اپنے لیے اسوہ اور نمونہ بنا سکیں۔

۵ **نور البصر فی سیرۃ خیر البشر:** اس کتاب کا دوسرا نام "سیرت رسول کریم ﷺ" ہے اور یہ اسی نام سے مشہور ہے۔ اس میں نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب انہوں نے قیام ڈابھیل کے زمانے میں لکھی تھی۔

بلاشبہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ جلیل القدر عالم بہت بڑے مقرر اور ممتاز مصنف تھے۔

آزادی برصغیر کے بعد وہ کئی سال ہندوستان کی پارلیمنٹ کے رکن رہے اور انہوں نے وہاں کے مسلمانوں کی بے حد خدمت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سے اوصاف سے مالا مال کیا تھا۔ ان کی خدمات اور مسلمانوں کے لیے مسلسل مساعی کی بنا پر انہیں "مجاہد ملت" کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔

زندگی کے آخری دور میں انہیں پھیپھڑے کا سرطان ہو گیا تھا۔ وہ دہلی اور بمبئی کے ماہر معالجوں کے زیر علاج رہے احباب اور مخلصین کے اصرار سے علاج کے لیے امریکہ بھی گئے، لیکن صحت یاب نہ ہوئے۔ آخر ۲ اگست ۱۹۶۲ء (۳۰ صفر ۱۳۸۲ھ) کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

محمد اسحاق بھٹی

لاہور

Marfat.com

پیش لفظ

(طبع اوّل)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمد للہ الذی ھدانا بالکتاب المبین، و انزل علینا القراٰن بلسانٍ عربیّ مبین، وقص فیه احسن القصص موعظة و ذکرٰی للمؤمنین، والصلوٰۃ والسّلام علی النبیّ الصادق الامین۔ محمد رسول اللہ و خاتم النبیّین۔ وعلٰی اٰلہٖ و اصحابه الذین ھم ھداۃٌ للمتّقین۔

امابعد! قرآن عزیز میں حق تعالیٰ نے دنیا انسانی کی ہدایت کے لیے جو مختلف معجزانہ اسلوب بیان اختیار فرمائے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ گزشتہ قوموں کے واقعات وقصص کے ذریعہ ان کے نیک و بداعمال اور ان اعمال کے ثمرات ونتائج کو یاد دلائے اور عبرت وبصیرت کا سامان مہیا کرے، اسی لئے وہ تاریخی اسلوب بیان کے درپے نہیں ہوتا بلکہ ابلاغ حق اور دعوت الی اللہ کے اہم مقصد کے پیش نظر صرف انہی وقائع کو سامنے لاتا ہے جو اس غرض وغایت کو پورا کرتے ہوں اور اسی لئے قرآن عزیز میں ان کی تکرار پائی جاتی ہے تاکہ سامعین کے دل میں وہ گھر کرسکیں اور فطری اور طبعی رجحانات کو ان حقائق کی جانب متوجہ کیا جاسکے، اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ ایک بات کو مختلف پیرایہ بیان اور مناسب حال اسلوب نگارش سے بار بار دہرایا جائے اور خوابیدہ قوائے فکریہ کو پے بہ پے بیدار کیا جائے۔

قرآن مجید کے قصص وواقعات کا سلسلہ بیشتر گذشتہ اقوام اور ان کی جانب بھیجے ہوئے پیغمبروں سے وابستہ ہے اور جستہ جستہ بعض اور واقعات بھی اس ضمن میں آگئے ہیں، اور یہ تمام تر حق و باطل کے مجادلوں، اور اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان کے معرکوں کا ایک عبرت آموز اور بصیرت خیز بے مثل ذخیرہ ہے۔

لیکن دوسروں کا کیا ذکر ہم مسلمانوں میں بھی بہت کم ہیں جو خدائے تعالیٰ کے اس مکمل ترین اور آخری قانون (قرآن عزیز) سے استفادہ کرتے اور اپنے مردہ دلوں میں ایمان ویقین کی زندگی پیدا کرتے ہوں اس لئے کہ یہ خدا کا قانون ہے اور ہم اس کے امتثال پر مامور ہیں اور معانی ومطالب پر غور کرتے ہوں یہ سمجھ کر کہ یہ رہتی دنیا تک حیات ابدی وسرمدی اور دارین کی فلاح وسعادت کا مکمل دستور ہے۔

نزول قرآن کے وقت پیغمبر خدا ﷺ نے مشرکوں کی معاندانہ روش سے تنگ آکر یہ شکایت کی تھی۔

﴿وَقَالَ الرَّسُوۡلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِى اتَّخَذُوۡا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَهۡجُوۡرًا۝﴾ (الفرقان:٣٠)

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ نے کہا: "اے میرے پروردگار! بے شبہ میری قوم نے قرآن کو مہجور (جھک جھک) بنالیا ہے۔"

لیکن اس چودھویں صدی میں اگر ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں تو دعوائے اسلام اور قرآن کو خدا کا کلام یقین کرنے کے باوجود کتنے ہیں جو اس کلام الٰہی کو اپنی زندگی کے لئے بہترین نظام عمل بناتے اور اس نظر سے اس کی تلاوت کرتے ہوں۔

اپنی اور اپنی قوم کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے جی چاہا کہ اس سرمایہ عبرت وبصیرت کو اُردو میں منتقل کیا جائے تاکہ نقل سے محظوظ ہونے کے بعد خود بخود اصل کی جانب رغبت پیدا ہو اور اس طرح سعادت دارین کا سراغ ملے۔

اپنی سادہ طرز نگارش کے باوجود اس مجموعے میں چند خصوصیات کا خاص طور پر لحاظ کیا گیا۔

① کتاب میں تمام واقعات کی اساس و بنیاد قرآن عزیز کو بنایا گیا ہے اور احادیث صحیحہ اور واقعات تاریخی سے اس کی توضیح وتشریح کی گئی ہے۔

② تاریخ اور کتب عہد قدیم کے درمیان اور قرآن عزیز کے "یقین محکم" کے درمیان اگر کہیں تعارض آپڑا ہے تو اس کی روشن دلائل و براہین کے ذریعہ یا تطبیق دی گئی ہے اور یا پھر صداقت قرآن کو وضاحت سے ثابت کیا گیا ہے۔

③ اسرائیلی خرافات اور معاندین کے اعتراضات کی خرافت کو حقائق کی روشنی میں ظاہر کیا گیا ہے۔

④ خاص خاص مقامات پر تفسیری، حدیثی اور تاریخی اشکالات پر بحث وتمحیص کے بعد سلف صالحین کے مسلک کے مطابق ان کا حل پیش کیا گیا ہے۔

⑤ ہر پیغمبر کے حالات قرآن عزیز کی کن کن سورتوں میں بیان ہوئے ہیں ان کو نقشہ کی شکل میں ایک جگہ دکھایا گیا ہے۔

⑥ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ "نتائج وعبر" یا "عبر و بصائر" کے عنوان سے اصل مقصد اور حقیقی غرض وغایت یعنی عبرت وبصیرت کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔

خادم ملت

محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی

مرقومہ ۲۲ رجب المرجب ۱۳۶۰ھ

Marfat.com

دیباچہ طبع ثانی

قصص القرآن حصہ اول و دوم عرصہ ہوا کہ ختم ہو گئے تھے مگر کاغذ کی قلت، کنٹرول کی پابندیوں اور طباعت کی گونا گوں مشکلات نے موقع نہ دیا کہ دوسرا ایڈیشن جلد طبع ہو سکتا، تاہم سعی بلیغ کے بعد طبع دوم کی نوبت آ ہی گئی اور اب اصحاب کے ہاتھوں میں حصہ اول کا دوسرا ایڈیشن پہنچ رہا ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

ارادہ تھا کہ اس مرتبہ نظر ثانی کر کے کتاب کو نئے اسلوب پر ترتیب دیا جائے، لیکن حصہ اول کی کتابت اس وقت ہوئی جبکہ میں مراد آباد اور بریلی کی جیلوں میں اسارت سے لطف اندوز ہو رہا تھا اس لئے یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ پھر بھی یہ ترمیم ضروری خیال کی گئی کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا پورا واقعہ پہلے ہی حصہ میں آ جائے اور پہلے ایڈیشن کی طرح نصف دوسرے حصہ کے لئے باقی نہ رہے، چنانچہ اس ایڈیشن میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کے مکمل حالات و واقعات یکجا ہو گئے ہیں۔

دیباچہ طبع ثالث

دلی مرحوم کے "مرحوم" ہونے کے بعد کسے گمان تھا کہ قرول باغ میں برباد شدہ ادارہ "ندوۃ المصنفین" دوبارہ زندگی کے سانس لے سکے گا، لیکن مشیت ایزدی نے اس کو روح تازہ بخشی اور سابق کی طرح علمی و دینی خدمت کے لئے اس کو ایک مرتبہ پھر شاہراہ افادیت پر گامزن کیا۔ تاہم ناسازگار حالات اور نامساعد ساعات نے مسلمانان ہند کی جن نت نئی خدمات سے دوچار کیا، ان کی وجہ سے وہ منصوبہ آج بھی پورا نہ ہو سکا کہ قصص القرآن جلد اوّل کو نئے اسلوب پر ترتیب دیا جائے۔

حق تعالیٰ نے توفیق بخشی تو بعد کے ایڈیشن میں اس عزم کو پورا کیا جا سکے گا۔

محمد حفظ الرحمٰن

۱۵ شعبان ۱۳۶۹ھ

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

"قصص القرآن" کا شمار "ندوۃ المصنفین" کی مقبول ترین کتابوں میں ہوتا ہے، علمی اور تحقیقی اعتبار سے بھی اس کا پایہ نہایت بلند ہے، اسی لئے اس کو اب تک بہتر سے بہتر طریقے پر شائع کرنے کی کوشش کی گئی، پھر بھی یہ خلش باقی تھی کہ سعی بلیغ کے باوجود کتاب اپنی حیثیت اور درجے کے مطابق طبع نہیں ہو سکی، شکر ہے اس دفعہ یہ خلش مٹ گئی، اور اب یہ دل آویز اور دیدہ زیب ایڈیشن آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے جس کی کتابت بھی نفیس اور دل کش ہے اور طباعت بھی صاف، سبک اور خوبصورت ہے۔

ظاہری خوبیوں سے قطع نظر اس ایڈیشن کی سب سے اہم خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کو مصنف مرحوم کی مکمل نظر ثانی کے بعد شائع کیا جا رہا ہے۔

مرحوم برسوں سے کتاب کی جلد اوّل اور جلد ثانی پر وسیع اور عمیق نظر ثانی کے خیال میں تھے، مگر ۴۷ء کے انقلاب کے بعد کی غیر معمولی مشغولیات نے ان کو اس کا موقع نہیں دیا تھا، یہاں تک کہ سفر آخرت سے دو سال قبل اس خدمت کے لئے کچھ اس طرح مستعد ہوئے کہ سفر و حضر میں جب بھی موقع ملتا کام کرتے، کبھی کبھی تو صبح سے شام تک اسی کام میں منہمک رہتے تھے۔ نظر ثانی کے وقت اسلوب اور طرز ادا میں ردو بدل کے علاوہ بعض نہایت اہم اور مفید اضافے بھی کئے گئے ہیں، ان اضافوں کے بعد قدرتی طور پر کتاب کا پایہ تحقیق اور بھی بلند ہو گیا ہے۔

صد افسوس کہ مرحوم کی زندگی میں یہ ایڈیشن جلوہ افروز نہ ہو سکا، دیکھتے تو کس قدر مسرور ہوتے لیکن

مَا كُلُّ مَا يَتَمَنَّى الْمَرْءُ يُدْرِكُهُ

تَجْرِي الرِّيَاحُ بِمَا لَا تَشْتَهِي السُّفُنُ

اس وقت کی یہ سطریں زیر قلم ہیں مرحوم کی یاد تیز اور اونچی آواز سے دل پر دستک دے رہی ہے اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔

اُمید ہے قارئین کرام کتاب کے مطالعہ کے وقت مرحوم کے لئے ایصال ثواب کا خاص خیال رکھیں گے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۲۰ نومبر ۱۹۶۴ء

حضرت آدم علیہ السلام

① انسان اوّل ② قرآن عزیز میں ذکر آدم (علیہ السلام) ③ پیدائش آدم علیہ السلام ④ مسئلہ سجود ملائکہ ⑤ انکار ابلیس ⑥ رب العالمین سے ابلیس کا مکالمہ ⑦ ملعونیت ابلیس اور تا قیام قیامت زندگی کی مہلت ⑧ خلافت آدم علیہ السلام ⑨ خلافت آدم پر فرشتوں کا اظہار تعجب ⑩ بارگاہ ربوبیت سے حضرت آدم علیہ السلام کو تعلیم اور فرشتوں کو تنبیہ ⑪ حوا کی پیدائش اور آدم وحوا کی جنت میں رہائش ⑫ آدم وحوا، وسوسہ ابلیس اور شجر ممنوعہ کا واقعہ ⑬ عتاب الٰہی اور آدم وحوا کا جنت سے زمین کی جانب اخراج ⑭ قصہ آدم سے متعلق بعض اہم مسائل

انسان اوّل:

حضرت آدم (علیہ السلام) کے متعلق قرآن عزیز نے جو حقائق بیان کیے ہیں ان کے تفصیلی تذکرہ سے پہلے یہ واضح ہو جانا ضروری ہے کہ انسان کے عالم وجود میں آنے کا مسئلہ آج علمی نقطہ نگاہ سے بحث کا ایک نیا دروازہ کھولتا ہے یعنی ارتقاء (Evolution) کا یہ دعویٰ ہے کہ موجودہ انسان اپنی ابتدائی تخلیق وتکوین ہی سے انسان پیدا نہیں ہوا بلکہ کائنات ہست و بود میں اس نے بہت سے مدارج طے کر کے موجودہ انسانی شکل حاصل کی ہے، اس لیے کہ مبدأ حیات نے جمادات و نباتات کی مختلف شکلیں اختیار کر کے ہزاروں لاکھوں برس بعد درجہ بدرجہ ترقی کر کے اوّل "لبونہ" (پانی کی جونک) کا لباس پہنا اور پھر ایسی ہی طویل مدت کے بعد حیوانات کے مختلف چھوٹے بڑے طبقات سے گزر کر موجودہ انسان کی شکل میں وجود پذیر ہوا۔

اور مذہب یہ کہتا ہے کہ خالق کائنات نے انسان اول کو آدم (علیہ السلام) کی شکل میں ہی پیدا کیا اور پھر اس کی طرح ایک ہم جنس مخلوق حوا کو وجود دے کر کائنات ارض پر نسل انسان کا سلسلہ قائم کیا، اور یہی وہ انسان ہے جس کو خالق کائنات نے عالم مخلوق پر برتری اور بزرگی عطا فرمائی اور امانت الٰہی کا بار گراں اس کے سپرد فرمایا اور کل کائنات کو اس کے ہاتھ میں مسخر کر کے خلافت و نیابت الٰہی کا شرف اس ہی کو بخشا۔

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ﴾ (التین: ۴)

"بلاشبہ ہم نے انسانوں کو بہترین اندازہ سے بنایا ہے۔"

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ﴾ (بنی اسرائیل: ۷۰)

"بے شبہ ہم نے نسل آدم کو تمام کائنات پر بزرگی اور برتری بخشی۔"

﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (البقرہ:۳۰)

"میں زمین پر (آدم کو) اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں"۔

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ﴾ (الاحزاب:۷۲)

"ہم نے بارِ امانت کو آسمانوں اور زمین پر پیش کیا تو انہوں نے (کل کائنات) امانت الٰہی کے بار کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس بارِ گراں کو اٹھالیا"۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ نظریہ ارتقاء (Evolution) اور مذہب کے درمیان اس خاص مسئلہ میں علمی تضاد ہے یا تطبیق کی گنجائش نکل سکتی ہے خصوصاً جبکہ علم اور تجربہ نے یہ حقیقت واشگاف کر دی ہے کہ دینی اور مذہبی حقائق اور علم کے درمیان کسی بھی مؤقف پر تضاد نہیں ہے اور اگر ظاہر سطح میں کہیں ایسا نظر بھی آتا ہے تو وہ علم کے بعض حقائق مستور ہونے کی وجہ سے نظر آتا ہے کیونکہ بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ جب بھی علم کے مستور حقائق سے پردہ اٹھا تو اسی وقت تضاد بھی جاتا رہا اور وہی حقیقت نکھر کر سامنے آگئی جس کا اظہار وحی الٰہی کے ذریعہ ہو چکا تھا۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیجئے کہ علم اور مذہب کے درمیان اگر کسی وقت بھی تضاد نظر آیا تو نتیجہ میں علم کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑی اور وحی الٰہی کا فیصلہ اپنی جگہ اٹل رہا۔

اس بناء پر اس جگہ بھی قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آجاتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں حقیقت حال کیا ہے اور کس طرح ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس مؤقف پر بھی علم (ارتقاء) اور مذہب کے درمیان تضاد نہیں ہے البتہ یہ مسئلہ چونکہ دقیق نکتہ سنجیوں کا حامل ہے اس لئے یہ مقام اس کے تفصیلی مباحث کا متحمل نہیں ہو سکتا اور اسی کتاب کے کسی دوسرے مقام پر زیر بحث آسکے گا۔

تاہم اس جگہ یہ حقیقت ضرور پیش نظر رہنی چاہیے کہ انسان اوّل (جو کہ موجودہ نسل آدم کا باوا آدم ہے) خواہ ارتقائی (Evolution) نظریہ کے مطابق درجہ بدرجہ انسانی شکل تک پہنچا ہو یا ابتداء تخلیق ہی کے وقت سے انسانی صورت میں وجود پذیر ہوا ہو علم اور مذہب دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ موجودہ انسان ہی اس کائنات کی سب سے بہتر مخلوق ہے اور عقل و دانش کا یہ پیکر ہی اپنے اعمال و کردار کے لیے جوابدہ ہے اور دستور قانون کا مکلف!

یا اس طرح تعبیر کر لیجئے کہ انسانی کردار اور اس کے علمی و عملی نیز اخلاقی عوامل و محرکات کے پیش نظر اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ اس کی تخلیق و تکوین اور عالم وجود میں آنے کی تفصیلات کیا ہیں بلکہ اہمیت کا مؤقف یہ ہے کہ اس عالم کون و مکان میں اس کا وجود یونہی بے معنی اور بے مقصد وجود میں آیا ہے یا اس کی ہستی اپنے اندر عظیم مقصد لے کر وجود پذیر ہوئی ہے؟ کیا اس کے افعال و اقوال اور کردار و گفتار کے اثرات لایعنی ہیں؟ کیا اس کی مادی اور روحانی قدریں سب کی سب مہمل اور بے نتیجہ ہیں یا بیش بہا ثمرات کی حامل اور پُر از حکمت ہیں؟ اور کیا اس کی زندگی اپنے اندر کوئی روشن و تابناک حقیقت رکھتی ہے یا تیرہ و تاریک مستقبل کا پتہ دیتی

Marfat.com

ہے اور اس کا ماضی اور حال اپنے مستقبل سے بے بہرہ ہے؟۔

پس اگر ان حقائق کا جواب نفی میں نہیں بلکہ اثبات میں ہے تو پھر قدرتی طور پر یہ تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ اس کی کیفیت پیدائش پر بحث کی بجائے اس کے وجود کے مقصد پر پوری نگاہ رکھی جائے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ اس اشرف المخلوقات ہستی کا وجود بلاشبہ مقصد عظیم کا پتہ دیتا ہے اور اس لیے اس کی اخلاقی قدروں کا ضرور کوئی "مثل اعلیٰ" اور اس کی تخلیق کی کوئی غایت ہے۔

قرآن عزیز نے اسی لیے حضرت انسان سے متعلق مثبت اور منفی ہر دو پہلو کو واضح کر کے انسانی ہستی کی عظمت کا اعلان کیا ہے اور بتلایا ہے کہ خالق کائنات کی قدرت تخلیق وتکوین میں انسان کی تخلیق "احسن تقویم" کا درجہ رکھتی ہے اور اسی وجہ سے وہ تمام کائنات کے مقابلہ میں "تکریم وتعظیم" کا مستحق ہے اور اپنے حسن تقویم اور لائق تکریم ہونے کی بناء پر بلاشبہ وہی امانت الٰہی کا علمبردار ہوکر (خلیفۃ اللہ) کے منصب پر فائز ہونے کا حق رکھتا ہے اور جب یہ سب کچھ اس میں ودیعت ہے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی ہستی کو یونہی بے مقصد اور بے نتیجہ چھوڑ دیا جاتا۔

﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝﴾ (القيامة: ٣٦)

"کیا خیال رکھتا ہے انسان کہ چھوٹا رہے گا بے قید"۔

اور ضروری ہے کہ عقل وشعور کے اس پیکر کو تمام کائنات سے ممتاز بنا کر نیک وبد کی تمیز عطا کی جائے اور برائی سے پرہیز اور بھلائی کے اختیار کا مکلف بنایا جائے۔

﴿خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾ (طٰه: ٥٠)

"(اللہ تعالیٰ نے) انسان کو پیدا کیا اور پھر (نیک وبد کی) راہ دکھائی"۔

﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝﴾ (البلد: ١٠)

"پھر ہم نے انسان کو دونوں راستے (نیک وبد کے) دکھلائے"۔

غرض قرآن عزیز کی تذکیر ودعوت، اوامر ونواہی، اور رشد وہدایت کا مخاطب اور مبدأ ومعاد کا محور ومرکز صرف یہی ہستی ہے جس کو "انسان" کہتے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز نے انسانِ اوّل کے تخلیقی کوائف وتفصیلات کو نظر انداز کر کے اس کے "مبدء ومعاد" کے مسائل ہی کو اہمیت دی ہے۔

ذکر آدم علیہ السلام سے متعلق آیات قرآنی:

قرآن عزیز میں حضرت آدم علیہ السلام کا نام پچیس مرتبہ پچیس آیات میں آیا ہے جو ذیل کے جدول سے ظاہر ہوتا ہے۔

نمبر سورۃ	نام سورۃ	آیات	شمار
۲	البقرۃ	۳۱-۳۳-۳۴-۳۵-۳۷	۵

Marfat.com

۳	آل عمران	۳۳_۵۹	۲
۵	المائدۃ	۲۷	۱
۷	الاعراف	۱۱_۱۹_۲۶_۲۷_۳۱_۳۵_۱۷۲	۷
۱۷	الاسراء	۶۱_۷۰	۲
۱۸	الکھف	۵۰	۱
۱۹	مریم	۵۸	۱
۲۰	طٰہٰ	۱۱۵_۱۱۶_۱۱۷_۱۲۰_۱۲۱	۵
۳۶	یٰسین	۶۰	۱

قرآن عزیز میں انبیاء علیہم السلام کے تذکروں میں سب سے پہلا تذکرہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کا ہے اور حسب ذیل سورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

سورۂ بقرہ، اعراف، اسراء، کہف اور طٰہٰ میں نام اور صفات دونوں کے ساتھ اور سورۂ حجر و صٓ میں فقط ذکر صفات کے ساتھ اور آل عمران، مائدہ، مریم اور یٰسین میں صرف ضمنی طور پر نام لیا گیا ہے۔

یہ واقعہ اوپر کی تمام سورتوں اور آیتوں میں اگرچہ اسلوب بیان، طرز ادا، لطیف تعبیر کے اعتبار سے مختلف نظر آتا ہے لیکن مقصد اور واقعہ کے اعتبار سے ایک ہی حقیقت ہے جو مختلف تعبیرات میں موعظت و عبرت کے پیش نظر حسب موقعہ بیان کی گئی ہے۔

قرآن عزیز ان تاریخی واقعات کو محض اس لیے نہیں بیان کرتا کہ وہ واقعات ہیں جن کا ایک تاریخ میں درج ہونا ضروری ہے بلکہ اس کا مقصد وحید یہ ہے کہ وہ ان واقعات سے پیدا شدہ نتائج کو انسانی رشد و ہدایت کے لیے موعظت و عبرت بنائے اور انسانی عقل و جذبات سے اپیل کرے کہ وہ نوامیس و قوانین فطرت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ان تاریخی نتائج سے سبق حاصل کریں اور ایمان لائیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور اس کا ید قدرت ہی اس تمام ہست و بود پر کارفرما ہے، اور اسی مذہب کے احکام کی پیروی میں فلاح و نجات اور ہر قسم کی ترقی کا راز مضمر ہے جس کا نام مذہب فطرت یا اسلام ہے۔

قرآن عزیز کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ وہ ایک ہی واقعہ کو مختلف سورتوں میں ان سورتوں کے مضامین کے مناسب نئے اور اچھوتے انداز میں بیان کرنے کے باوجود واقعہ کی اصل حقیقت اور اس کی متانت و سنجیدگی میں ادنیٰ سا فرق بھی نہیں آنے دیتا کہیں واقعہ کی تفصیل ہے کہیں اجمال، کسی مقام پر اس کا ایک پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے تو دوسرے مقام پر اسی کو سب سے زیادہ نمایاں حقیقت دی گئی ہے، ایک جگہ اسی واقعہ سے مسرت و انبساط اور لذت و سرور پیدا کرنے والے نتائج نکالے گئے ہیں تو دوسری جگہ واقعہ میں معمولی سا تغیر لیے بغیر خوف و دہشت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے، بلکہ بعض مرتبہ ایک ہی مقام پر لذت و الم دونوں کا مظاہرہ نظر آتا ہے، مگر موعظت و عبرت کے اس تمام ذخیرہ میں ناممکن ہے کہ نفس واقعہ کی حقیقت اور متانت میں معمولی سا بھی تغیر پیدا ہو جائے۔

بلاشبہ یہ کلام الٰہی کے ہی شایان شان ہے اور اعجاز قرآن کے عنوان سے معنون، اور متضاد صفات کے حامل (حضرت انسان)

Marfat.com

کی فصاحت و بلاغت کے مدارج علیا کی دسترس سے باہر!

﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ ﴾ (النساء: ۸۲)

"کیا وہ قرآن کے متعلق غور و فکر سے کام نہیں لیتے؟ اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کا کلام ہوتا تو بلاشبہ وہ اس میں (قسم قسم کے) تضاد و اختلاف کو پاتے۔"

پیدائش آدم، فرشتوں کو سجدہ کا حکم، شیطان کا انکار:

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا، اور ان کا خمیر تیار ہونے سے قبل ہی اس نے فرشتوں کو یہ اطلاع دی کہ عنقریب وہ مٹی سے ایک مخلوق پیدا کرنے والا ہے جو بشر کہلائے گی، اور زمین میں ہماری خلافت کا شرف حاصل کرے گی۔

آدم علیہ السلام کا خمیر مٹی سے گوندھا گیا اور ایسی مٹی سے گوندھا گیا جو نت نئی تبدیلی قبول کر لینے والی تھی، جب یہ مٹی پختہ ٹھیکری کی طرح آواز دینے اور کھنکھنانے لگی تو اللہ تعالیٰ نے اس جسد خاکی میں روح پھونکی اور وہ یک بیک گوشت پوست، ہڈی، پٹھے کا زندہ انسان بن گیا اور ارادہ، شعور، حس، عقل اور وجدانی جذبات و کیفیات کا حامل نظر آنے لگا۔

تب فرشتوں کو حکم ہوا کہ تم اس کے سامنے سربسجود ہو جاؤ، فوراً تمام فرشتوں نے تعمیل ارشاد کی مگر ابلیس (شیطان) نے غرور و تمکنت کے ساتھ صاف انکار کر دیا۔ قرآن عزیز کی ان آیات میں واقعہ کے اسی حصہ کو بیان کیا گیا ہے۔

﴿ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ ٭ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَ قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ (البقرہ: ۳۴-۳۵)

"اور پھر (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ آدم علیہ السلام کے آگے سربسجود ہو جاؤ، وہ جھک گئے، مگر ابلیس کی گردن نہیں جھکی، اس نے نہ مانا، اور گھمنڈ کیا، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ کافروں میں سے تھا پھر (ایسا ہوا کہ) ہم نے آدم سے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو، جس طرح چاہو، کھاؤ پیو، امن چین کی زندگی بسر کرو، مگر دیکھو وہ جو ایک درخت ہے، تو کبھی اس کے پاس نہ پھٹکنا، اگر تم اس کے قریب گئے تو (نتیجہ یہ نکلے گا کہ) حد سے تجاوز کر بیٹھو گے، اور ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو زیادتی کرنے والے ہیں۔"

﴿ وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ٭ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ ﴾ (الاعراف: ۱۱)

"اور (دیکھو یہ ہماری ہی کارفرمائی ہے کہ) ہم نے تمہیں پیدا کیا (یعنی تمہارا وجود پیدا کیا) پھر تمہاری (یعنی نوع انسانی کی) شکل و صورت بنا دی، پھر (وہ وقت آیا کہ) فرشتوں کو حکم دیا (آدم کے آگے جھک جاؤ) اس پر سب جھک گئے، مگر ابلیس کہ جھکنے والوں میں سے نہ تھا۔"

Marfat.com

﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۚ﴿۲۶﴾ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ
السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ
وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۙ﴿۳۰﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰٓى
اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾ ﴾ (الحجر: ۲۶-۳۱)

"اور بلاشبہ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا، جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے اور ہم "جن" کو اس سے پہلے جلتی ہوئی ہوا کی گرمی سے پیدا کر چکے تھے، اور (اے پیغمبر) جب ایسا ہوا تھا کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا "میں خمیر اٹھے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں (یعنی نوع انسانی پیدا کرنے والا ہوں) تو جب ایسا ہو کہ میں اسے درست کر دوں (یعنی وہ وجود تکمیل کو پہنچ جائے) اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو چاہیے کہ تم سب اس کے آگے سربسجود ہو جاؤ چنانچہ جتنے فرشتے تھے سب اس کے آگے سربسجود ہو گئے، مگر ایک ابلیس، اس نے انکار کیا کہ سجدہ کرنے والوں میں سے ہو۔"

﴿ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ
اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِیْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾ ﴾ (الکہف: ۵۰)

"اور جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا" آدم کے آگے جھک جاؤ" اور سب جھک گئے تھے مگر ابلیس نہیں جھکا تھا، وہ جن میں سے تھا۔ پس اپنے پروردگار کے حکم سے باہر ہو گیا پھر کیا تم مجھے چھوڑ کر (کہ تمہارا پروردگار ہوں) اسے اور اس کی نسل کو کارساز بناتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ (دیکھو) ظلم کرنے والوں کے لیے کیا ہی بری تبدیلی ہوئی!"۔

﴿ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ﴿۷۱﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ
سٰجِدِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۙ﴿۷۳﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾ ﴾

(ص: ۷۱-۷۴)

"اور وہ وقت یاد کرو جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا میں مٹی سے بشر کو پیدا کرنے والا ہوں، بس جب میں اس کو بنا سنوار لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو سب فرشتے اس کے لیے سربسجود ہو جاؤ پس سب ہی نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہ مانا، گھمنڈ کیا اور وہ (علم الٰہی میں پہلے ہی) کافروں میں سے تھا۔"

سجدہ سے انکار کرنے پر ابلیس کا مناظرہ:

اللہ تعالیٰ اگرچہ عالم الغیب اور دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے اور ماضی، حال اور استقبال سب اس کے لیے یکساں ہیں مگر اس نے امتحان و آزمائش کے لیے ابلیس (شیطان) سے سوال کیا:

Marfat.com

﴿مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ﴾ (الاعراف:۱۲)

"کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا؟"

ابلیس نے جواب دیا:

﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ (الاعراف:۱۲)

"اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے"۔

شیطان کا مقصد یہ تھا کہ میں آدم سے افضل ہوں، اس لیے کہ تو نے مجھ کو آگ سے بنایا اور آگ بلندی و رفعت چاہتی ہے اور آدم مخلوق خاکی، بھلا خاک کو آگ سے کیا نسبت؟ اے خدا! پھر یہ تیرا حکم کہ ناری، خاکی کو سجدہ کرے کیا انصاف پر مبنی ہے؟ میں ہر حالت میں آدم سے بہتر ہوں، لہٰذا وہ مجھے سجدہ کرے نہ کہ میں اس کے سامنے سربسجود ہوں، مگر بدبخت شیطان اپنے غرور و تکبر میں یہ بھول گیا کہ جب تو اور آدم علیہ السلام دونوں خدا کی مخلوق ہو، تو مخلوق کی حقیقت خالق سے بہتر خود وہ مخلوق بھی نہیں جان سکتی، وہ اپنی تمکنت اور گھمنڈ میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ مرتبہ کی بلندی و پستی اس مادہ کی بناء پر نہیں ہے جس سے کسی مخلوق کا خمیر تیار کیا گیا ہے بلکہ اس کی ان صفات پر ہے جو خالق کائنات نے اس کے اندر ودیعت کی ہیں۔

بہر حال شیطان کا جواب چونکہ غرور و تکبر کی جہالت پر مبنی تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس پر واضح کر دیا کہ جہالت سے پیدا شدہ کبر و نخوت نے تجھ کو اس قدر اندھا کر دیا ہے کہ تو اپنے خالق کے حقوق اور احترام خالقیت سے بھی منکر ہو گیا، اس لیے مجھ کو ظالم قرار دیا اور یہ نہ سمجھا کہ تیری جہالت نے تجھ کو حقیقت کے سمجھنے سے درماندہ و عاجز بنا دیا ہے پس تو اب اس سرکشی کی وجہ سے ابدی ہلاکت کا مستحق ہے اور یہی تیرے عمل کی قدرتی پاداش ہے۔

ابلیس کی طلب مہلت:

ابلیس نے جب دیکھا کہ خالق کائنات کے حکم کی خلاف ورزی، تکبر و رعونت اور خدائے تعالیٰ پر ظلم کے الزام نے ہمیشہ کے لیے مجھ کو رب العالمین کی آغوش رحمت سے مردود اور جنت سے محروم کر دیا، تو توبہ اور ندامت کی جگہ اللہ تعالیٰ سے یہ استدعاء کی کہ تا قیام قیامت مجھ کو مہلت عطا کر اور اس طویل مدت کے لیے میری زندگی کی رسی کو دراز کر دے۔

حکمت الٰہی کا تقاضا بھی یہی تھا، لہٰذا اس کی درخواست منظور کر لی گئی، یہ سن کر اب اس نے پھر ایک مرتبہ اپنی شیطنت کا مظاہرہ کیا، کہنے لگا! جب تو نے مجھ کو راندۂ درگاہ کر ہی دیا تو جس آدم کی بدولت مجھے یہ رسوائی نصیب ہوئی میں بھی آدم کی اولاد کی راہ ماروں گا اور ان کے پس و پیش، اردگرد اور چہار جانب سے ہو کر ان کو گمراہ کروں گا، اور ان کی اکثریت کو تیرا ناسپاس اور ناشکرگزار بنا چھوڑوں گا، البتہ تیرے "مخلص بندے" میرے اغوا کے تیر سے گھائل نہ ہو سکیں گے اور ہر طرح محفوظ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم کو اس کی کیا پرواہ، ہماری فطرت کا قانون "مکافات عمل پاداش عمل" اٹل قانون ہے، پس جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا اور جو بنی آدم مجھ سے روگردانی کر کے تیری پیروی کرے گا وہ تیرے ہی ساتھ عذاب الٰہی (جہنم) کا سزاوار

Marfat.com

ہو گا جا اپنی ذلت و رسوائی اور شومیِ قسمت کے ساتھ یہاں سے دور ہو اور اپنی اور اپنے پیرووں کی ابدی لعنت (جہنم) کا منتظر رہو۔

قرآن عزیز کی حسب ذیل آیات ان ہی تفصیلات پر روشنی ڈالتی ہیں:

﴿قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ
طِيْنٍ ۝۱۲ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝۱۳ قَالَ
اَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝۱۴ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝۱۵ قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ
صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۱۶ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ
شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝۱۷ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ
مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۱۸﴾ (اعراف: ۱۲-۱۸)

"کہا کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا؟ کہا "اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اسے مٹی سے" فرمایا جنت سے نکل جا: تیری یہ ہستی نہیں کہ یہاں رہ کر سرکشی کرے۔ یہاں سے نکل دور ہو یقیناً تو ان میں سے ہوا جو ذلیل و خوار ہیں) ابلیس نے کہا "مجھے اس وقت تک کے لیے مہلت دے جب لوگ (مرنے کے بعد) اٹھائے جائیں گے"۔ "تجھے مہلت ہے" اس پر ابلیس نے کہا چونکہ تو نے مجھ پر راہ بند کر دی، تو اب میں بھی ایسا ضرور کروں گا تیری سیدھی راہ سے بھٹکانے کے لیے بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں گا، پھر سامنے سے پیچھے سے، داہنے سے، بائیں سے (غرضیکہ ہر طرف سے) ان پر آؤں گا اور تو ان میں سے اکثروں کو شکر گزار نہ پائے گا، خدا نے فرمایا "یہاں سے نکل جا، ذلیل اور ٹھکرایا ہوا، بنی آدم میں سے جو کوئی تیری پیروی کرے گا تو (وہ) تیرا ساتھی ہوگا۔ اور میں البتہ ایسا کروں گا کہ (پاداش عمل میں) تم سب سے جہنم بھر دوں"۔

﴿قَالَ يٰۤاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝۳۲ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ
صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝۳۳ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝۳۴ وَّ اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ
الدِّيْنِ ۝۳۵ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝۳۶ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝۳۷ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ
الْمَعْلُوْمِ ۝۳۸ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۳۹ اِلَّا عِبَادَكَ
مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝۴۰ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ۝۴۱ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا
مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝۴۲ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۴۳﴾ (الحجر ۳۲-۴۳)

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے ابلیس تجھے کیا ہوا کہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا؟ کہا "مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایسے بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا ہے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے" حکم ہوا "اگر ایسا ہے تو یہاں سے نکل۔

Marfat.com

جاء کہ تو راندہ ہوا اور جزاء کے دن تک تجھ پر لعنت ہوئی" اس نے کہا" خدایا! مجھے اس دن تک مہلت دے جب انسان (دوبارہ) اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا:" اس مقررہ وقت کے دن تک تجھے مہلت دی گئی" اس نے کہا" خدایا! چونکہ تو نے مجھ پر (نجات وسعادت) کی راہ بندی کر دی، تو اب میں ضرور ایسا کروں گا کہ زمین میں ان کے لیے جھوٹی خوشنمائیاں بنا دوں اور (راہ حق سے) گمراہ کر دوں، ہاں ان میں جو تیرے مخلص بندے ہوں گے (میں جانتا ہوں) میرے بہکانے میں آنے والے نہیں" فرمایا بس یہی سیدھی راہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والی ہے۔ جو میرے (مخلص) بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں چلے گا تیرا زور صرف انہی پر چلے گا جو (بندگی) کی راہ سے بھٹک گئے اور ان سب کے لیے جہنم کے عذاب کا وعدہ ہے" (جو کبھی ٹلنے والا نہیں)۔

﴿وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِیْنًا ۚ﴿۶۱﴾ قَالَ
اَرَءَیْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ ٘ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّیَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۶۲﴾ قَالَ
اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾ وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ
بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَ عِدْهُمْ ؕ وَ مَا یَعِدُهُمُ
الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِیْلًا ﴿۶۵﴾﴾

(بنی اسرائیل: ۶۱۔۶۵)

"اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو (حکم دیا) " آدم علیہ السلام کے آگے جھک جاؤ" اس پر سب جھک گئے مگر ایک ابلیس نہ جھکا۔ اس نے کہا" کیا میں ایسی ہستی کے آگے جھکوں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے؟" نیز اس نے کہا" کیا تیرا یہی فیصلہ ہے کہ تو نے اس (حقیر) ہستی کو مجھ پر بڑائی دی؟" اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے دے تو میں ضرور اس کی نسل کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ کے رہوں، تھوڑے آدمی اس ہلاکت سے بچیں، اور کوئی نہ بچے" اللہ تعالیٰ نے فرمایا:" جا اپنی راہ لے، جو کوئی بھی ان میں سے تیرے پیچھے چلے گا، تو اس کے لیے اور تیرے لیے جہنم کی سزا ہوگی پوری پوری سزا، ان میں سے جس کسی کو تو اپنی صدائیں سنا کر بہکا سکتا ہے بہکانے کی کوشش کر لے، اپنے لشکر کے سواروں اور پیادوں سے حملہ کر، ان کے مال اور اولاد میں شریک ہو جا، ان سے (طرح طرح کی باتوں کے) وعدے کر، اور شیطان کے وعدے تو اس کے سواء کچھ نہیں ہیں کہ سراسر دھوکا" جو میرے (سچے) بندے ہیں ان پر تو قابو پانے والا نہیں تیرا پروردگار کارسازی کے لیے بس کرتا ہے۔"

﴿قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ
اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ﴿۷۶﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ ۚۖ﴿۷۷﴾ وَّ اِنَّ
عَلَیْكَ لَعْنَتِیْۤ اِلٰى یَوْمِ الدِّیْنِ ﴿۷۸﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْۤ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۷۹﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ

الْمُنْظَرِيْنَ ﴿٨٠﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿٨١﴾ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٨٢﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٨٣﴾ قَالَ فَالْحَقُّ وَ الْحَقَّ اَقُوْلُ ﴿٨٤﴾ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَ مِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٨٥﴾ (ص: ۷۵-۸۵)

"فرمایا اے ابلیس! کس چیز نے روک دیا تجھ کو کہ سجدہ کرے اس کو جس کو میں نے بنایا اپنے (قدرت کے) ہاتھوں سے، یہ تو نے غرور کیا یا تو بڑا تھا درجہ میں، بولا میں بہتر ہوں اس سے مجھ کو بنایا آگ سے اور اس کو بنایا مٹی سے، فرمایا تو نکل یہاں سے کہ تو مردود ہوا اور تجھ پر میری پھٹکار ہے اس جزاء کے دن تک، بولا، اے رب! مجھ کو ڈھیل دے جس دن تک مردے جی اٹھیں۔ فرمایا تجھ کو ڈھیل ہے۔ اسی وقت کے دن تک جو معلوم ہے۔ بولا تو قسم ہے تیری عزت کی میں گمراہ کروں گا ان سب کو، مگر جو بندے ہیں تیرے ان میں چنے ہوئے، فرمایا، تو ٹھیک بات یہ ہے اور میں ٹھیک ہی کہتا ہوں۔ مجھ کو بھرنا ہے دوزخ تجھ سے اور جو ان میں تیری راہ چلیں ان سب سے۔"

خلافت آدم علیہ السلام:

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں کو اطلاع دی کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں، جو اختیار و ارادہ کا مالک ہوگا، اور میری زمین پر جس قسم کا تصرف کرنا چاہے گا کر سکے گا، اور اپنی ضروریات کے لیے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکے گا، گویا وہ میری قدرت اور میرے تصرف و اختیار کا "مظہر" ہوگا۔

فرشتوں نے یہ سنا تو حیرت میں رہ گئے، اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا اگر اس ہستی کی پیدائش کی حکمت یہ ہے کہ وہ دن رات تیری تسبیح و تہلیل میں مصروف رہے اور تیری تقدیس و بزرگی کے گن گائے، تو اس کے لیے ہم حاضر ہیں، جو ہر لحہ تیری حمد و ثناء کرتے اور بے چوں و چرا تیرا حکم بجالاتے ہیں، ہم کو تو اس "خاکی" سے فتنہ و فساد کی بو آتی ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ تیری زمین میں خرابی اور خون ریزی بپا کر دے؟ بارالٰہا! تیرا یہ فیصلہ آخر کس حکمت پر مبنی ہے؟

بارگاہِ الٰہی سے اوّل ان کو یہ ادب سکھایا گیا کہ مخلوق کو خالق کے معاملات میں جلد بازی سے کام نہ لینا چاہیے، اور اس کی جانب سے حقیقتِ حال کے اظہار سے قبل ہی شک وشبہ کو سامنے نہ لانا چاہیے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اس میں اپنی برتری اور بڑائی کا پہلو نکلتا ہو، خالق کائنات ان حقائق کو جانتا ہے جس سے تم بے بہرہ ہو، اور اس کے علم میں وہ سب کچھ ہے جو تم نہیں جانتے۔

﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٣٠﴾﴾ (البقرہ: ۳۰)

"اور جب ایسا ہوا تھا کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا۔ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، فرشتوں نے کہا: کیا ایسی ہستی کو خلیفہ بنایا جا رہا ہے جو زمین میں خرابی پھیلائے گی اور خونریزی کرے گی، حالانکہ ہم تیری حمد و ثناء کرتے ہوئے تیری پاکی و قدوسی کا اقرار کرتے ہیں (کہ تیری مشیت برائی سے پاک اور تیرا کام نقصان سے منزہ ہے!) اللہ نے

Marfat.com

کہا، میری نظر جس حقیقت پر ہے، تمہیں اس کی خبر نہیں"۔

تعلیم آدم علیہ السلام اور فرشتوں کا اقرار عجز:

یہ سمجھنا سخت غلطی ہے کہ اس مقام پر فرشتوں کا سوال اس لیے تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مناظرہ یا اس کے فیصلہ کے متعلق موشگافی کریں بلکہ وہ آدم کی تخلیق کا سبب معلوم کرنا چاہتے تھے اور یہ کہ اس کے خلیفہ بنانے میں کیا حکمت ہے ان کی خواہش تھی کہ اس حکمت کا راز ان پر بھی کھل جائے، اس لیے ان کے طرز ادا اور تعبیر مقصد میں کوتاہی پر تنبیہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ ان کے اس سوال کا جواب جو بظاہر حضرت آدم علیہ السلام کی تحقیر پر مبنی ہے۔ عمل وفعل کے ذریعہ اس طرح دیا جائے کہ ان کو خود بخود آدم علیہ السلام کی برتری اور حکمت الٰہی کی بلندی و رفعت کا نہ صرف اعتراف کرنا پڑے بلکہ اپنی درماندگی اور عجز کا بھی بدیہی طور پر مشاہدہ ہو جائے، لہٰذا حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی سب سے عظیم المرتبت صفت "علم" سے نوازا اور ان کو علم اشیاء عطا فرمایا۔ اور پھر فرشتوں کے سامنے پیش کر کے ارشاد فرمایا کہ تم ان اشیاء کے متعلق کیا علم رکھتے ہو؟ وہ لاعلم تھے کیا جواب دیتے۔ مگر چونکہ بارگاہ صمدیت سے قرب رکھتے تھے سمجھ گئے کہ ہمارا امتحان مقصود نہیں ہے کیونکہ اس سے قبل ہم کو ان کا علم ہی کب دیا گیا ہے کہ آزمائش کی جاتی بلکہ یہ تنبیہ مقصود ہے کہ "خلافت الٰہیہ" کا مدار کثرت تسبیح و تہلیل اور تقدیس و تمجید پر نہیں بلکہ صفت "علم" پر ہے، اس لیے کہ ارادہ و اختیار، قدرت تصرف اور قدرت اختیار یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ حکومت ارضی صفت "علم" کے بغیر ناممکن ہے، پس جبکہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت علم کا مظہر اتم بنایا ہے تو بلاشبہ وہی خلافت ارضی کا مستحق ہے نہ کہ ہم، اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ملائکۃ اللہ چونکہ اپنی خدمات مفوضہ کے علاوہ ہر قسم کی دنیوی خواہشوں اور ضرورتوں سے بے نیاز ہیں، اس لیے وہ ان کے علم سے بھی ناآشنا تھے اور آدم علیہ السلام کو چونکہ ان سب سے واسطہ پڑنا تھا اس لیے ان کا علم اس کے لیے ایک فطری امر تھا جو رب العالمین کی ربوبیت کاملہ کی بخشش و عطا سے عطا ہوا اور اس کو وہ سب کچھ بتا دیا گیا جو اس کے لیے ضروری تھا۔

﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۳۱ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝۳۲ قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۙ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝۳۳﴾ (البقرہ: ۳۱-۳۳)

"(پھر جب ایسا ہوا کہ مشیت الٰہی نے جو کچھ چاہا تھا، ظہور میں آگیا) اور آدم علیہ السلام نے (یہاں تک معنوی ترقی کی کہ) تعلیم الٰہی سے تمام چیزوں کے نام معلوم کر لیے، تو فرشتوں کے سامنے وہ (تمام حقائق) پیش کر دیے اور فرمایا، اگر تم (اپنے شبہ میں) درستی پر ہو تو بتلاؤ، ان (حقائق) کے نام کیا ہیں؟ فرشتوں نے عرض کیا۔ خدایا ساری پاکیاں اور بڑائیاں تیرے ہی لیے ہیں ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں سکھلا دیا ہے، علم تیرا علم ہے اور حکمت تیری حکمت جب فرشتوں نے اس طرح اپنے عجز کا اعتراف کر لیا تو حکم الٰہی ہوا "اے آدم تم (اب) فرشتوں کو ان (حقائق) کے نام بتلا دو۔ جب

Marfat.com

آدم علیہ السلام نے بتلا دیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان و زمین کے تمام غیب مجھ پر روشن ہیں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی میرے علم میں ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ بھی مجھ سے مخفی نہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے اس شرف علم کے متعلق مفسرین کی دو رائے ہیں ایک یہ کہ کائنات کی وہ تمام اشیاء جو ماضی سے مستقبل تک وجود میں آنے والی تھیں ان سب کے نام اور ان کی حقیقت کا علم حضرت آدم علیہ السلام کو دے دیا گیا، دوسری رائے یہ ہے کہ اس وقت جس قدر اشیاء بھی عالم کائنات میں موجود تھیں اور حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے ان کا مظاہرہ کیا گیا تھا ان سب کا علم عطا کیا گیا، اور ﴿الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ "تمام چیزوں کے نام" کا اطلاق جس طرح کائنات کی ماضی و مستقبل کی تمام اشیاء پر ہوتا ہے اسی طرح اس وقت کی تمام موجودہ اشیاء پر بھی بغیر کسی تاویل کے ہو سکتا ہے، اور یہ کہ ﴿اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ﴾ سے اکثر موجود و محسوس یعنی حاضر ہی کی جانب اشارہ مقصود ہوا کرتا ہے۔ اور اگر یہ کہہ دیا جائے کہ آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اشیاء کی تمام جزئیات و تفصیلات کا علم بخشا گیا تھا بلکہ اشیاء کی بنیاد و نہاد اور اصول و اساس کا علم عطا کیا گیا تب بھی ﴿الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ کے منافی نہیں ہے۔

بہر حال حضرت آدم علیہ السلام کو صفت "علم" سے اس طرح نوازا گیا کہ فرشتوں کے لیے بھی ان کی برتری اور استحقاق خلافت کے اقرار کے علاوہ چارۂ کار نہ رہا، اور یہ ماننا پڑا کہ اگر ہم زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ بنائے جاتے تو کائنات کے تمام بھیدوں سے نا آشنا رہتے اور قدرت نے جو خواص اور علوم ودیعت کیے ہیں ان سے یکسر ناواقف ہوتے اس لیے کہ نہ ہم خورد و نوش کے محتاج ہیں کہ زمین میں ودیعت شدہ رزق اور خزانوں کی جستجو کرتے نہ ہمیں غرق کا اندیشہ کہ کشتیوں اور جہازوں کی ایجاد کرتے، نہ مرض کا خوف کہ قسم قسم کے معالجات، اشیاء کے خواص، کیمیائی مرکبات، فوائد طبیعات و فلکیات، طبی ایجادات علوم نفسیات وجدانیات اور اسی طرح کے بیش بہاء اور بیشمار علوم و فنون کے اسرار اور ان کی حکمتوں سے واقف ہو سکتے، بلاشبہ یہ صرف حضرت انسان ہی کے لیے موزوں تھا کہ وہ زمین پر خدا کا خلیفہ بنے اور ان تمام حقائق و معارف اور علوم و فنون سے واقف ہو کر نیابت الٰہی کا صحیح حق ادا کرے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا قیام جنت اور حواء کی زوجیت:

حضرت آدم علیہ السلام ایک عرصہ تک تنہا زندگی بسر کرتے رہے مگر اپنی زندگی اور راحت و سکون میں ایک وحشت اور خلاء محسوس کرتے تھے اور ان کی طبیعت اور فطرت کسی مونس و ہمدم کی جویا نظر آتی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حواء کو پیدا کیا اور حضرت آدم علیہ السلام اپنا ہمدم و رفیق پا کر بے حد مسرور ہوئے اور اطمینان قلب محسوس کیا۔ حضرت آدم و حواء علیہما السلام کو اجازت تھی کہ وہ جنت میں رہیں اور اس کی ہر چیز سے فائدہ اٹھائیں، مگر ایک درخت کو معین کر کے بتایا گیا کہ اس کو نہ کھائیں بلکہ اس کے پاس تک نہ جائیں۔

آدم علیہ السلام کا خلد سے نکلنا:

اب ابلیس کو ایک موقعہ ہاتھ آیا اور اس نے حضرت آدم و حواء علیہما السلام کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ شجر "شجر خلد" ہے، اس کا پھل کھانا جنت میں سرمدی آرام و سکونت اور قرب الٰہی کا ضامن ہے اور قسمیں کھا کر ان کو باور کرایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، دشمن نہیں ہوں یہ سن کر حضرت آدم علیہ السلام کے انسانی اور بشری خواص میں سب سے پہلے نسیان (بھول چوک) نے ظہور کیا اور وہ یہ فراموش کر بیٹھے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم، حکم امتناعی تھا، نہ کہ مربیانہ مشورہ، اور آخر کار جنت کے دائمی قیام اور قربت الٰہی کے عزم میں لغزش پیدا کر

Marfat.com

دی اور انہوں نے اس درخت کا پھل کھالیا، اس کا کھانا تھا کہ بشری لوازم ابھرنے لگے، دیکھا تو ننگے ہیں اور لباس سے محروم، جلدی جلدی (آدم و حوا علیہما السلام) دونوں پتوں سے ستر ڈھانکنے لگے گویا انسانی تمدن کا یہ آغاز تھا، کہ اس نے تن ڈھانکنے کے لیے سب سے پہلے پتوں کو استعمال کیا۔

ادھر یہ ہو رہا تھا کہ خدائے تعالیٰ کا عتاب نازل ہوا اور آدم علیہ السلام سے باز پرس ہوئی کہ ممانعت کے باوجود یہ عدول حکمی کیسی؟ آدم آخر آدم تھے، مقبول بارگاہ الٰہی تھے، اس لیے شیطان کی طرح مناظرہ نہیں کیا اور اپنی غلطی کو تاویلات کے پردے میں چھپانے کی سعی نامشکور سے باز رہے ندامت و شرمساری کے ساتھ اقرار کیا کہ غلطی ضرور ہوئی لیکن اس کا سبب تمرد و سرکشی نہیں ہے بلکہ بربنائے بشریت بھول چوک اس کا باعث ہے، تاہم غلطی ہے، اس لیے توبہ و استغفار کرتے ہوئے عفو و درگذر کا خواستگار ہوں۔

حضرت حق نے ان کے اس عذر کو قبول فرمالیا اور معاف کر دیا، مگر وقت آ گیا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام خدا کی زمین پر "حق خلافت" ادا کریں، اس لیے بہ تقاضائے حکمت ساتھ ہی یہ فیصلہ سنایا کہ تم کو اور تمہاری اولاد کو ایک معین وقت تک زمین پر قیام کرنا ہوگا، اور تمہارا دشمن ابلیس بھی اپنے تمام سامان عداوت کے ساتھ وہاں موجود رہے گا اور تم کو اس طرح ملکوتی اور طاغوتی دو متضاد طاقتوں کے درمیان زندگی بسر کرنی ہوگی اس کے باوجود اگر تم اور تمہاری اولاد مخلص بندے اور سچے نائب ثابت ہوئے تو تمہارا اصلی وطن "جنت" ہمیشہ کے لیے تمہاری ملکیت میں دے دیا جائے گا، لہٰذا تم اور حواء دونوں یہاں سے جاؤ اور میری زمین پر جا کر بسو اور اپنی مقررہ زندگی تک حق عبودیت ادا کرتے رہو۔ اور اس طرح انسانوں کے باپ اور خدائے تعالیٰ کے خلیفہ آدم علیہ السلام نے اپنی رفیقہ حیات حواء علیہا السلام کے ساتھ خدا کی زمین پر قدم رکھا۔

﴿وَ قُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا ۪ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِیْهِ ۪ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ۝ فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝﴾ (البقرہ: ۳۵-۳۸)

"پھر (ایسا ہوا کہ) ہم نے آدم سے کہا، اے آدم! تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو، جس طرح چاہو کھاؤ پیو، امن چین کی زندگی بسر کرو، مگر دیکھو، وہ جو ایک درخت ہے، تو کبھی اس کے پاس نہ پھٹکنا، اگر تم اس کے پاس گئے تو (نتیجہ یہ نکلے گا کہ) حد سے تجاوز کر بیٹھو گے اور ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو زیادتی کرنے والے ہیں پھر (ایسا ہوا کہ) شیطان کی وسوسہ اندازی نے ان دونوں کے قدم ڈگمگا دیئے اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جیسی کچھ (راحت و سکون کی) زندگی بسر کر رہے تھے اس سے نکلنا پڑا، خدا کا حکم ہوا کہ یہاں سے نکل جاؤ تم میں سے ہر وجود دوسرے کا دشمن ہے، اب تمہیں (جنت کی جگہ) زمین میں رہنا ہے، اور ایک خاص وقت تک کے لیے (جو علم الٰہی میں مقرر ہو چکا ہے) اس سے فائدہ اٹھانا ہے پھر ایسا ہوا کہ آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کے القاء سے چند کلمات معلوم کر لیے (جن کے لیے اس کے حضور قبولیت تھی) پس اللہ

تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کر لی اور بلاشبہ وہی ہے جو رحمت سے درگزر کرنے والا ہے۔ اور اس کے درگزر کی کوئی انتہا نہیں (آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوگئی لیکن جس زندگی سے وہ نکل چکا تھا وہ دوبارہ نہیں مل سکتی تھی) پس ہمارا حکم ہوا، اب تم سب یہاں سے نکل جاؤ (اور جس نئی زندگی کا دروازہ تم پر کھولا جا رہا ہے اسے اختیار کر لو، لیکن (یاد رکھو) جب کبھی ایسا ہوگا کہ ہماری جانب سے تم پر راہ (حق) کھولی جائے گی، تو تمہارے لیے دو ہی راہیں ہوں گی، جو کوئی ہدایت کی پیروی کرے گا اس کے لیے (کامیابی و سعادت ہوگی) کسی طرح کا کھٹکا نہیں، کسی طرح کی غمگینی نہیں۔"

﴿ وَ یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَیْثُ شِئْتُمَا وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۹﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّیْطٰنُ لِیُبْدِیَ لَهُمَا مَاوٗرِیَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَ قَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَیْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِیْنَ ﴿۲۰﴾ وَ قَاسَمَهُمَاۤ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿۲۱﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَ نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَ اَقُلْ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٚ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ فِیْهَا تَحْیَوْنَ وَ فِیْهَا تَمُوْتُوْنَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾ ﴾ (الاعراف: ۱۹-۲۵)

"اے آدم! تو اور تیری بیوی، دونوں جنت میں رہو سہو اور جس جگہ سے جو چیز پسند آئے شوق سے کھاؤ، مگر دیکھو وہ جو ایک درخت ہے، تو اس درخت کے قریب بھی نہ جانا، اگر گئے تو یاد رکھو، تم زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے، لیکن پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کے ستر جو ان سے چھپے تھے ان پر کھول دے، اس نے کہا تمہارے پروردگار نے اس درخت سے جو تمہیں روکا ہے تو صرف اس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو، تم فرشتے بن جاؤ یا دائمی زندگی تمہیں حاصل ہو جائے، اس نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ میں تم دونوں کو خیر خواہی سے نیک بات سمجھانے والا ہوں۔ غرضیکہ (شیطان اس طرح کی باتیں سنا سنا کر بالآخر) انہیں فریب میں لے آیا۔ پھر جوں ہی ایسا ہوا کہ انہوں نے درخت کا پھل چکھا۔ ان کے ستر ان پر کھل گئے (اور جب انہیں اپنی برہنگی دیکھ کر شرم محسوس ہوئی تو) باغ کے پتے اوپر تلے رکھ کر اپنے جسم پر چپکانے لگے، اس وقت ان کے پروردگار نے پکارا: "کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہیں روک دیا تھا، اور کیا میں نے نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟" انہوں نے عرض کیا" پروردگار ہم نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا، اگر تو نے ہمارا قصور نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا، تو ہمارے لیے بربادی کے سوا کچھ نہیں! فرمایا: "یہاں سے نکل جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اب تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور یہ کہ ایک خاص وقت تک وہاں سروسامان زندگی سے فائدہ اٹھاؤ گے اور فرمایا: تم اسی میں جیو گے اسی میں مرو گے پھر اسی سے (مرنے کے بعد) نکالے جاؤ گے۔"

﴿ وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا یُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَ لَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَ لَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ فَوَسْوَسَ اِلَیْهِ الشَّیْطٰنُ قَالَ یٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا یَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ٘ وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ وَ هَدٰى ﴿۱۲۲﴾ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِیْعًۢا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى ۙ۬ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَ لَا یَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ ﴾ (طٰہٰ: ۱۱۵-۱۲۳)

"اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے آدم کو پہلے سے جتا کر عہد لے لیا تھا پھر وہ بھول گیا، اور ہم نے (نافرمانی کا) قصد اس میں نہیں پایا تھا اور پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا" آدم کے آگے جھک جاؤ" سب جھک گئے تھے مگر ابلیس نہیں جھکا، اس نے انکار کیا اس پر ہم نے کہا اے آدم (دیکھ لے) یہ "ابلیس" تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے ایسا نہ ہو یہ تمہیں جنت سے نکال کے رہے اور تم محنت میں پڑ جاؤ۔ تمہارے لیے اب ایسی زندگی ہے کہ نہ تو اس میں بھوکے رہتے ہو نہ برہنہ، نہ تمہارے لیے پیاس کی جلن ہے نہ سورج کی تپش (اگر اس سے نکلے تو سر تا سر محنت میں مبتلا ہو جاؤ گے) لیکن پھر شیطان نے آدم علیہ السلام کو وسوسہ میں ڈالا اس نے کہا "اے آدم" میں تجھے ہمیشگی کے درخت کا نشان دے دوں؟ اور ایسی بادشاہی جو کبھی زائل نہ ہو؟ چنانچہ دونوں نے (یعنی آدم اور اس کی بیوی نے) اس درخت کا پھل کھا لیا، اور دونوں کے ستر ان پر کھل گئے تب ان کی حالت ایسی ہوگئی کہ باغ کے پتے توڑنے لگے اور ان سے اپنا جسم ڈھانکنے لگے غرضیکہ آدم اپنے پروردگار کے کہنے پر نہ چلا۔ پس وہ (جنت کی زندگی سے) بے راہ ہو گیا۔ (لیکن) پھر اس کے پروردگار نے اسے برگزیدہ کیا۔ اس پر (اپنی رحمتوں سے) لوٹ آیا۔ اس پر (زندگی وعمل کی) راہ کھول دی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا "تم دونوں اکٹھے یہاں سے نکل چلو تم میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہوا (اب تم پر ایک دوسری زندگی کی راہ کھلے گی) پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس (یعنی تمہاری نسل کے پاس) کوئی پیام ہدایت آیا تو (اس بارے میں میرا قانون یاد رکھو) جو کوئی میری ہدایت پر چلے گا، وہ نہ تو راہ سے بے راہ ہوگا نہ دکھ میں پڑے گا۔"

واقعہ سے متعلق چند اہم مسائل:

واقعہ کی اس تفصیل کے بعد چند ایسے اہم مسائل پر بھی روشنی ڈالنا ضروری ہے جو واقعہ کی تفصیلات میں بڑی حد تک معین و مددگار ثابت ہوں۔

تخلیق آدم علیہ السلام:

① یہ مسئلہ بھی لائق فکر و نظر ہے کہ انسان اوّل حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کب ہوئی، کیا کائنات ارضی وسماوی کے ساتھ ساتھ یا

Marfat.com

غیر معین مدت کے بعد اس کی ہستی عالم وجود میں آئی؟

علماء یہود و نصاریٰ اور بعض علماء اسلام کا قول ہے کہ حق تعالیٰ نے تخلیق و تکوین کائنات کے بارے جو ﴿سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ (چھ دن) کی تعبیر اختیار فرمائی ہے ان ہی ایام میں سے ایک دن حضرت آدم علیہ السلام نے بھی لباس وجود پہنا اور وہ جمعہ کا دن ہے۔

﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ (الاعراف:۵۴)

"کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار خدا ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر چھا گیا۔"

لیکن یہ مسلک درست نہیں ہے نہ علمی و تاریخی اعتبار سے اور نہ دینی و مذہبی روایات کے لحاظ سے، یہود و نصاریٰ کے متعلق تو معلوم نہیں کہ انہوں نے کس بنیاد پر یہ کہا، اور اس کے لیے ان کے پاس کیا دلیل ہے مگر علامہ سبکیؒ سے ضرور یہ تعجب ہے کہ انہوں نے اس بے دلیل بات کو کس طرح قبول فرمایا اور یہ مسلک کیوں اختیار کیا۔

کافی غور و فکر کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ مغالطہ غالباً صحیح مسلم کی اس حدیث سے ہوا ہے جو فضائل جمعہ میں مذکور ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش جمعہ کے دن ہوئی۔ اس روایت میں صرف اسی قدر مذکور ہے مگر سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جانب سے اضافہ کر لیا کہ یہ جمعہ ﴿سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ میں شامل جمعہ کا دن ہے اور یہی مغالطہ ہے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ قرآن عزیز نے متعدد جگہ خلق کائنات کا ذکر کیا ہے لیکن کسی ایک جگہ بھی خلق آدم علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ارض و سماوات سے زیادہ حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر ضروری تھا جو قرآن ہی کی زبان میں اشرف المخلوقات، اور ﴿خَلِيْفَةُ اللّٰهِ فِى الْاَرْضِ﴾ ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس قدر اہم شخصیت کو ﴿سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ ہی میں سے کسی دن (یوم) وجود بخشا جائے اور اس کا ذکر تک نہ کیا جائے کیونکہ ان آیات میں صرف دو ہی باتیں ذکر کی گئی ہیں ایک ارض و سماوات کی پیدائش کا معاملہ اور دوسرا ﴿اسْتِوَاء عَلَى الْعَرْشِ﴾ کا، مگر حضرت آدم علیہ السلام کی ولادت سے متعلق صراحت تو کجا اشارہ تک موجود نہیں ہے پھر مستزاد یہ کہ قرآن عزیز نے جس جس موقعہ پر حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر کسی بھی نہج سے کیا ہے ان میں سے کسی ایک مقام پر بھی یوم پیدائش کا ذکر نہیں ہے تب بات واضح ہے کہ اصل حقیقت یہی ہے کہ خلق سماوات و ارض سے ہزاروں، لاکھوں بلکہ غیر معین مدت کے بعد (جس کا علم صرف عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ہی کو ہے) حضرت آدم علیہ السلام کو کسی جمعہ میں خلعت وجود عطا کیا گیا اور ﴿سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ کے جمعہ کے دن کسی کی بھی تخلیق و تکوین نہیں ہوئی بلکہ ﴿اسْتِوَاء عَلَى الْعَرْشِ﴾ [1] کا مظاہرہ ہوا اور اس لیے جمعہ کا دن، جشن یا تعطیل کا دن قرار پایا۔

۲ آدم و حوا (علیہما السلام) عربی نام ہیں یا عجمی؟ اور یہ نام کسی مناسبت سے رکھے گئے ہیں یا صرف نام ہی کی حیثیت میں ہیں۔؟

پہلے سوال کے متعلق مشہور محدث حافظ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ "سریانی" نام ہے اور بائبل میں الف کے مد اور دال کے طول کے ساتھ پڑھا جاتا ہے یعنی آدام اور علامہ جوہریؒ اور جوالیقیؒ یہ کہتے ہیں کہ یہ عربی نام ہیں اور دوسرے سوال کے متعلق ثعلبی کا قول ہے کہ عبرانی زبان میں آدام مٹی کو کہتے ہیں، چونکہ ان کی تخلیق مٹی سے ہوئی، اس لیے آدم یا آدام نام رکھا گیا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ ادمتہ سے ماخوذ ہے اس لیے کہ وہ "ادیم الارض" یعنی صفحہ زمین سے پیدا کیے گئے ہیں، اور بعض علماء کہتے ہیں کہ

---

[1] استواء علی العرش اور ستۃ کی تعبیر کے لئے قصص القرآن کی دوسری جلد ملاحظہ فرمائیں۔

Marfat.com

"ادمت" بمعنی خلطت سے ماخوذ ہے اور چونکہ ان کا خمیر پانی اور مٹی کو ملا کر اور خلط ملط کر کے بنایا گیا ہے اس لیے اس مناسبت سے ان کو آدم کہا گیا۔ اسی طرح حواء اس لیے نام پڑا کہ وہ ہر "انسان حی" (زندہ انسان) کی ماں ہیں اور مبالغہ کا صیغہ بنا کر ان کا نام رکھ دیا گیا۔[1]

③ بہر حال نام اور معنی میں مناسبت کا یہ سوال نکتہ اور لطیفہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے بیان کردہ تمام وجوہ بیک وقت بھی صحیح ہو سکتی ہیں اور کسی ایک وجہ کو دوسری پر ترجیح بھی دی جا سکتی ہے، کیونکہ یہ بات بہت وسیع ہے۔

④ اللہ تعالیٰ نے سجدہ کا جو حکم دیا تھا وہ فرشتوں کو دیا تھا اور ابلیس فرشتوں کی جنس میں داخل نہیں تو پھر اس پر عتاب الٰہی کیوں ہوا اور وہ نافرمانی کا مرتکب کس لیے قرار دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ ابلیس ملائکہ کی جنس سے نہ تھا۔ قرآن عزیز میں تصریح ہے۔

﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ﴾ (الکہف: ۵۰)

وہ "جن" سے تھا پس اس نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی۔"

مگر جب اللہ تعالیٰ نے سجدہ کا حکم فرمایا تو اس وقت وہ اس مجلس میں موجود تھا اور غیر معلوم مدت تک فرشتوں کے ساتھ تسبیح و تہلیل میں مشغول رہنے کی وجہ سے وہ بھی اس حکم کا مخاطب تھا اور وہ بھی خود کو مخاطب سمجھتا تھا اسی لے جب خدائے تعالیٰ نے اس سے دریافت کیا تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا تو اس نے یہ جواب نہیں دیا کہ میں فرشتہ نہیں ہوں اس لیے اس حکم کا مخاطب ہی نہ تھا کہ سجدہ کرتا، بلکہ از راہ غرور کہا تو یہ کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں اس لیے سجدہ سے باز رہا۔

یہی جواب صحیح اور درست ہے۔ ورنہ تو ایک ضعیف اور کمزور رائے یہ بھی ہے کہ ملائکۃ اللہ میں سے ایک قسم کو "جن" بھی کہا جاتا ہے اور یہ انہیں میں سے ایک تھا۔ مگر اس رائے کی تائید نہ قرآن عزیز سے ملتی ہے اور نہ صحیح احادیث سے۔

⑤ ابلیس جب جنت سے مردود ہو کر نکال دیا گیا تو پھر وہ حضرت آدم و حواء (علیہما السلام) کو کس طرح بہکا سکا؟

علماء اسلام سے اس کے دو جواب منقول ہیں اور دونوں کسی تاویل کے بغیر چسپاں ہیں۔

اگرچہ ابلیس جنت سے نکال دیا گیا لیکن پھر بھی اس کا ایک گنہگار اور نابکار مخلوق کی حیثیت میں جنت کے اندر داخل ہونا اس کے مردود ہونے کے منافی نہیں ہے۔ اس لیے اس نے اسی حیثیت سے اندر جا کر حضرت آدم و حواء (علیہما السلام) سے یہ گفتگو کی اور ان کو لغزش میں ڈال دیا آیت ﴿اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا﴾ اسی کی تائید کرتی ہے کہ عاصی کی حیثیت سے ابھی تک اس کا داخلہ ممنوع نہیں تھا۔

⑥ جس طرح ایک آواز ٹیلی فون اور ریڈیو کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ دور جا سکتی ہے یا جس طرح لاسلکی (وائرلیس) میں صرف شعاعوں اور آواز کی لہروں کے ذریعہ سے ایک پیغام ہزاروں میل دور پہنچایا جا سکتا ہے اسی طرح یہ بھی کیوں ممکن نہیں کہ قربت یا بالمشافہ مخاطبت کے بغیر ہی شیطان کا وسوسہ نفس انسانی تک پہنچ جائے اور اس پر اثر انداز ہو تب واقعہ کی صورت یہ ہوئی کہ شیطان نے جنت سے باہر ہی رہ کر حضرت آدم و حوا (علیہما السلام) کے قلوب میں یہ وسوسہ ڈالا اور ان کے بہکانے کی کوشش کی، آیت

---

[1] فتح الباری ج ۲ کتاب حدیث الانبیاء چونکہ یہ تمام اقوال تخمینی ہیں اس لیے سب کو نقل کر دیا گیا ہے اور کسی ایک قول کو ترجیح دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

Marfat.com

﴿ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ ﴾ سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔
⑦ حواء علیہا السلام کی پیدائش کس طرح ہوئی؟ قرآن عزیز میں اس کے متعلق صرف اسی قدر مذکور ہے۔

﴿ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا ﴾ (النساء:۱)

"اور اس (نفس) سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا"۔

یہ نظم قرآنی حواء کی پیدائش کی حقیقت کی تفصیل نہیں بتاتی، اس لیے دونوں احتمال ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ حواء علیہا السلام حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہوئی ہوں جیسا کہ مشہور ہے اور بائبل میں بھی اسی طرح مذکور ہے، دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کو اس طرح پیدا کیا کہ مرد کے ساتھ اس کی جنس سے ایک دوسری مخلوق بھی بنائی جس کو عورت کہا جاتا ہے اور جو مرد کی رفیقۂ حیات بنتی ہے۔

آیت کی تفسیر میں محققین کی رائے اس دوسری تفسیر کی جانب مائل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن عزیز صرف حضرت حواء علیہا السلام کی تخلیق کا ذکر نہیں کر رہا بلکہ "عورت کی تخلیق کے متعلق" اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ بھی مرد ہی کی جنس سے ہے اور اسی طرح مخلوق ہوئی ہے، البتہ بخاری و مسلم کی روایتوں میں یہ ضرور آتا ہے کہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

((استوصوا بالنساء فان المرأة خلقت من ضلع)). (الحدیث)

"عورتوں کے ساتھ نرمی اور خیرخواہی سے پیش آؤ اس لیے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔"

اس کا مطلب ابن اسحاق نے تو یہ بیان کیا ہے کہ حواء علیہا السلام آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئیں، مگر ابن اسحاق سے زیادہ محقق اور نقاد علامہ قرطبی نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ دراصل عورت کو پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے اور بتایا ہے کہ عورت کی خلقت کی ابتداء پسلی سے کی گئی ہے اس کا حال پسلی ہی کی طرح ہے، اگر اس کی کجی کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی تو جس طرح پسلی کے ترچھے پن کے باوجود اس سے کام لیا جاتا ہے اور اس کے خم کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی اسی طرح عورتوں کے ساتھ نرمی اور رفق کا معاملہ کرنا چاہیے ورنہ سختی کے برتاؤ سے خوشگواری کی جگہ تعلق کی شکست و ریخت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔[1]

⑧ حضرت آدم (علیہ السلام) جس جنت میں مقیم تھے اور جہاں سے انہیں زمین پر اترنے کا حکم دیا گیا وہ جنت کون سی جنت ہے "جنت الماویٰ؟" جو بعد قیامت اہل ایمان کا مستقر ہے یا "جنت ارضی" جو اسی سرزمین میں کسی بلند پُرفضا مقام پر آدم علیہ السلام کی حکومت کے لیے بنائی گئی تھی، جمہور علماء اسلام کا مسلک یہ ہے کہ یہ "جنت الماویٰ" ہے جس کا وعدہ آخرت میں مسلمانوں کے لیے کیا گیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ آیات و احادیث کا ظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً:

﴿ وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ ﴾ (البقرہ:۳۵)

"ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی (حواء) جنت میں رہو۔"

اس جگہ جنت کو عربی قاعدہ سے (الجنۃ) الف لام کے ساتھ ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اسی مشہور جنت کا ذکر ہے جس

---

[1] فتح الباری ج ٦ ص ٢٨٣۔

Marfat.com

کو جگہ جگہ قرآن عزیز میں قیام قیامت کے بعد مومنوں کا وطن بتایا گیا ہے ورنہ اگر کسی نئے مقام کا تذکرہ ہوتا تو پہلے اس کی حقیقت کا اظہار ہوتا پھر اس کو جانی پہچانی چیز کی طرح ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا جاتا۔

﴿اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا﴾ (البقرہ: ۳۸)

"تم وہاں سے ایک ساتھ اترو۔"

ہبوط: (اترنا) بلندی سے پستی کی طرف ہوتا ہے، اس لیے یہ جنت ارضی نہیں ہو سکتی بلکہ "جنت الماویٰ" ہی ہو سکتی ہے۔

⑨ مسلم شریف میں ایک طویل حدیث ہے جس میں یہ جملہ موجود ہے۔

((یجمع اللہ الناس فیقوم المؤمنون حین تزدلف لھم الجنة فیأتون ادم فیقولون یاابانا استفتح لنا الجنة فیقول: وھل اخرجکم من الجنة الا خطیئة ابیکم)). (الحدیث)

"اللہ تعالیٰ لوگوں کو جمع کرے گا، پس اہل ایمان کھڑے ہوں گے جب جنت ان کے قریب ہوگی۔ پھر وہ آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے، اے ہمارے باپ ہمارے لیے اس جنت کو کھولیے اس پر حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے کیا تم کو جنت سے تمہارے باپ کی خطا کاری ہی نے نہیں نکالا تھا۔"

اس کے برعکس علماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ (جنت) دنیا ہی کے مقامات میں سے کسی مقام پر تھی "جنت الماویٰ" نہ تھی، اور اپنے قول کی تائید میں یہ کہتے ہیں کہ آیاتِ قرآنی ظاہر کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم وحواء علیہما السلام کو وہاں کھانے پینے کا مکلف بنایا اور ایک درخت کے نہ کھانے کی تکلیف دی، پھر وہاں آدم خواب راحت میں بھی رہتے تھے اور وہاں ابلیس بھی آتا جاتا رہتا تھا، اور اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکا بھی دیا۔ اور پھر آدم وحواء علیہما السلام اور ابلیس وہاں سے نکالے بھی گئے، تو یہ تمام وہ امور ہیں جو دنیا کے ساتھ مخصوص ہیں اور "جنت الماویٰ" میں ان کا وجود نہیں ہے، نہ وہ عالم تکلیف ہے اور نہ اس میں داخلہ کے بعد اخراج ہے، یہ قول بھی بڑے بڑے علماء اسلام کی طرف منسوب ہے، اور ان دو رایوں کے علاوہ اس سلسلہ میں دو رائیں اور بھی ہیں اور اس طرح اس مسئلہ میں چار اقوال جاتے ہیں۔

❶ یہ جنت الماویٰ ہے۔

❷ یہ جنت ارضی ہے۔

❸ یہ جنت الماویٰ اور جنت ارضی کے علاوہ ایک اور جنت ہے جو صرف اسی غرض سے تیار کی گئی تھی۔

❹ اس معاملہ میں توقف اور سکوت کرنا چاہیے، اور اسے خدا کے حوالہ کر دینا چاہیے یہ بحث بہت طویل ہے اور حافظ عماد الدین بن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ میں اس کو بڑے شرح وبسط سے بیان کیا ہے اور تمام اقوال کے مفصل دلائل اور نظائر کو بھی نقل کیا ہے۔ [1] تفصیل دیکھنے کے لیے اس کی مراجعت کرنی چاہیے۔

بہر حال حقیقت حال کا عالم تو اللہ ہی ہے لیکن تمام دلائل وبراہین کے دیکھنے کے بعد ہماری رائے تو یہی ہے کہ یہ معاملہ بلاشبہ

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج۱ص ۷۵ تا ۸۱

Marfat.com

"جنت الماویٰ" ہی میں پیش آیا ہے اور کھانے، سونے اور شیطان کے وسوسہ ڈالنے کے لیے تمام معاملات "جنت الماویٰ" میں اس وقت پیش آئے ہیں جبکہ انسان ابھی تک عالم تکلیف میں نہیں آیا تھا۔ پس یہ جو کچھ ہوا مشیت الٰہی کی حکمت بالغہ کے زیر اثر اس لیے ہوا کہ یہ تمام تکوینی امور انسان کے زمین پر آباد ہونے اور "خلافت الٰہیہ" کے حقدار بننے کے لیے ضروری تھے۔ پس اگر یہی راجح قول ہے کہ اس جگہ جنت سے مراد "جنت الماویٰ" ہی ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام زمین کے کس حصے پر اتارے گئے تو بعض ضعیف رایتوں میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان کی سرزمین پر اور حضرت حواء علیہا السلام جدہ کی سرزمین پر اتارے گئے اور پھر چل کر دونوں عرفات (حجاز) کے میدان میں ایک دوسرے سے جا ملے اسی لیے اس میدان حج کا نام عرفات ہوا کیونکہ دونوں نے اسی مقام پر ایک دوسرے کو پہچانا۔

لیکن قرآن عزیز نے اس حصہ کو نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ اس کا اظہار رشد و ہدایت سے غیر متعلق تھا، البتہ قلبی رجحان اور نفسیاتی برہان اس جانب توجہ دلاتے ہیں کہ آدم وحواء علیہما السلام ایک ہی جگہ اتارے گئے ہوں گے تا کہ حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے زیر اثر جلد ہی نسل انسانی کی افزائش اپنا کام کر سکے اور اس عالم خاکی کے وارث وکمین خدا کی زمین کو آباد کر کے انسانیت کے سب سے بڑے شرف "خلافت ارضی" کا پورا پورا حق ادا کر سکے۔

ظریفانہ نقطہ:

جو علماء اس کے قائل ہیں کہ یہ "جنت الماویٰ" ہے ان پر دوسرے علماء کا یہ اعتراض ہے کہ اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے (اور یہ ظاہر ہے کہ اسی کا دوسرا نام جنت الخلد ہے) تو حضرت آدم علیہ السلام سے ابلیس کا یہ کہنا کہ میں تمہیں شجر خلد کا پتہ بتاؤں کیا معنی رکھتا ہے؟

لیکن اول الذکر علماء ان حضرات سے جو جنت ارضی کے قائل ہیں پلٹ کر یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر یہ جنت ارضی تھی تو اس دار فانی میں ابلیس حضرت آدم علیہ السلام سے ایسی بحث ہی کیسے کر سکتا تھا کہ دنیا اور اس کی تمام اشیاء تو فانی ہیں مگر اس میں ایک شجر خلد بھی ہے۔ دار فانی میں خلود کہاں اس کو تو معمولی عقل کا انسان بھی تسلیم نہیں کر سکتا چہ جائیکہ حضرت آدم علیہ السلام۔

جنت ارضی علماء طبقات الارض کی نظر میں

جو علماء اس جنت کو "جنت ارضی" بتاتے ہیں ان میں سے علماء طبقات الارض کا یہ دعویٰ ہے کہ ربع مسکون میں سے جس خطہ پر جنت قائم تھی وہ آج کائنات ارضی پر موجود نہیں ہے۔ یہ حصہ "قارۂ مو" کے نام سے اس دنیا میں آباد تھا مگر مختلف حوادث اور پیہم زلزلوں کے باعث بحر ہند میں ہزاروں سال ہوئے کہ غرق ہو گیا، اور یہ کہ جب یہ حادثہ پیش آیا تھا تو اس خطہ پر بسنے والی انسانی آبادی تقریباً ساٹھ ملین (چھ کروڑ) کی تعداد میں ہلاک ہو گئی۔

اور بائبل کے سفر تکوین اصحاح میں اس کا مقام وقوع وہ بتایا گیا ہے جہاں سے دجلہ اور فرات نکلتے ہیں۔

⑩ کیا حضرت آدم علیہ السلام نبی اور رسول ہیں؟

شریعت اسلامی میں "نبی" اس ہستی کو کہتے ہیں جس کو حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے چن لیا ہو اور وہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوتی ہو اور "رسول" اس نبی کو کہا جاتا ہے جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے نئی شریعت اور نئی کتاب بھیجی گئی ہو۔

چونکہ حضرت آدم علیہ السلام دنیائے انسانی کے باپ ہیں تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ جس طرح اپنی نسل کی دنیوی سعادت وفلاح کے لیے رہنما اور ہادی تھے اسی طرح اخروی سعادت وفلاح کے لیے پیغمبر تھے یا نہیں؟

اس کا جواب ایک ہی ہوسکتا ہے کہ وہ بلاشبہ خدا کے سچے پیغمبر اور نبی برحق تھے اور اس مسئلہ میں امت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں اور اسی لیے کبھی یہ مسئلہ موضوع بحث نہیں بنا مگر اس مسئلہ میں اس وقت سے اہمیت پیدا ہوئی جبکہ مصر کے قریہ ومنہور کے ایک شخص نے حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا اور اپنے دعوے کی دلیل میں یہ پیش کیا کہ قرآن عزیز میں کسی مقام پر بھی حضرت آدم علیہ السلام کو دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح "نبی" نہیں کہا گیا۔ [1]

اس شخص کا یہ کہنا کہ قرآن عزیز نے حضرت آدم علیہ السلام کو کسی جگہ لفظ "نبی" سے مخاطب نہیں کیا، لفظی اعتبار سے اگرچہ صحیح ہے لیکن حقیقت نبوت کے اعتبار سے بالکل غلط ہے اس لیے کہ نبوت کے جو معنی اسلامی اصطلاح میں بیان کئے گئے ہیں بغیر کسی تاویل کے اس کا اطلاق حضرت آدم علیہ السلام پر نظم قرآنی میں بہت سے مقامات میں موجود ہے، جگہ جگہ یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی واسطہ کے حضرت آدم علیہ السلام سے ہمکلام ہوتا رہا ہے اور اس تمام مخاطبت اور بات چیت میں امر ونہی اور حلال وحرام کے احکام دیتا رہا ہے اور ان احکام کے لیے آدم کے پاس کسی کو نبی ورسول بنا کر نہیں بھیجا بلکہ براہ راست انہی سے خطاب فرمایا گیا، پس جبکہ نبوت کی حقیقت بھی یہی ہے تو حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت کا انکار قطعاً باطل اور بے معنی ہے، نیز ان کے رسول ہونے نہ ہونے کی بحث بھی کچھ زیادہ اہم نہیں ہے اس لیے کہ جب وہ پہلے انسان ہیں تو انسانی آبادی کے لیے خدا کی وحی کے ذریعہ جو پیغامات بھی انہوں نے سنائے وہی ان کی شریعت سمجھی جائے گی اور اس لیے وہ رسول بھی ہیں، بہرحال ان کی نبوت پر یقین رکھنے اور قلب میں اطمینان پیدا کرنے کے لیے نظم قرآنی کی وہ تمام آیات کافی وشافی دلیل ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کے درمیان براہ راست گفتگو اور مکالمت و مخاطبت کی شکل میں نظر آتی ہیں۔

(۸) حضرت آدم علیہ السلام جبکہ نبی ہیں تو ان سے خدا کے حکم کی خلاف ورزی کے کیا معنی، نبی تو معصوم ہوتا ہے اور "عصمت" نافرمانی اور گناہ کے متضاد ہے؟

حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت پر بحث کرنے سے قبل مختصر الفاظ میں "عصمت" کے معنی اور اس کا مفہوم معلوم ہو جانا ضروری ہے تاکہ آئندہ بھی ایسے مقامات میں گنجلک اور ریب وشک کی گنجائش باقی نہ رہے۔

عصمت نبی کے معنی:

خالق کائنات نے انسان کی تخلیق متضاد قوتوں کے ساتھ فرمائی ہے یعنی اس کو نیک و بد دونوں قسم کی قوتیں عطا کی گئی ہیں، وہ گناہ بھی کرسکتا ہے اور نیکی بھی، وہ ارادۂ بد کا بھی حامل ہے اور ارادۂ خیر کا بھی، اور یہی اس کے انسانی شرف کا طغرائے امتیاز ہے۔

---

[1] حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے بتایئے کیا آدم علیہ السلام نبی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں وہ نبی تھے اور رسول بھی، انہیں اللہ رب العالمین سے شرف تخاطب وتکلم حاصل ہوا ہے" روایت کے الفاظ یہ ہیں:
((عن ابی ذر قال: قلت یا رسول اللہ ﷺ ارای ادم انبیاء کان قال نعم نبینا رسولا یکلم اللہ قبیلا)) (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۴ قدیم)

ان متضاد قوتوں کے حامل "انسان" میں سے حضرت حق، انسانی رشد و ہدایت، اور وصول الی اللہ کے لیے کبھی کبھی کسی شخص کو چن لیتے اور اس کو اپنا رسول، نبی اور پیغمبر بنا لیتے ہیں اور اس سلسلہ کی آخری کڑی ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اور جب یہ ہستی "نبوت" کے لیے چن لی جاتی ہے تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عمل و ارادہ کی زندگی میں ہر قسم کے گناہ سے پاک اور ہمہ قسم کی نافرمانیوں سے منزہ ہو، تاکہ پیغامِ الٰہی کے منصب میں خدا کی صحیح نیابت ادا کر سکے۔ اور:

"او خویشتن گم است کرا رہبری کند"

کا مصداق نہ ثابت ہو، اس طرح وہ ایک انسان اور بشر بھی ہے کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے اور اہل و عیال کی زندگی سے بھی وابستہ ہے اور وہ ہر قسم کے عملی اور ارادی گناہوں سے پاک بھی ہے کیونکہ وہ ہر قسم کی نیکی کے لیے ہادی و مرشد اور خدا کا نائب ہے، اور اگرچہ وہ دوسرے انسانوں کی طرح متضاد قوتوں کا حامل ضرور ہے لیکن عمل اور ارادہ میں اس سے ہر قسم کی بدی کے ظہور کو ناممکن اور محال کر دیا گیا ہے تاکہ اس کا ہر ایک ارادہ اور ہر ایک عمل اور ہر ایک قول، غرض ہر ایک حرکت و سکون، کائنات کے لیے اسوہ اور نمونہ بن سکے، البتہ بشریت و انسانیت سے متصف ہونے کی بنا پر سہو، نسیان، اور لغزش کا امکان باقی رہتا اور کبھی کبھی عمل شکل بھی اختیار کر لیتا ہے مگر فوراً ہی اس پر متنبہ کر دیا جاتا ہے اور وہ اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔

سہو اور نسیان تو اپنے مفہوم میں ظاہر ہیں مگر زلتہ (لغزش) کیا ہے؟ تو اس کا اطلاق ایسی حقیقت پر ہوتا ہے کہ جہاں نہ عمل اور کردار میں تمرد اور سرکشی کا دخل ہو اور نہ قصد و ارادہ کے ساتھ حکم کی خلاف ورزی کا اور ساتھ ہی وہ عمل اپنی حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے قبیح، بد اور شر بھی نہ ہو بلکہ ان تمام امور کے پیش نظر وہ اپنی ذات میں اگرچہ اباحت اور جواز کا درجہ رکھتا ہو مگر کرنے والے کی ہستی کے شایان شان نہ ہو بلکہ اس کے عظیم رتبہ کے سامنے سبک اور ہلکا نظر آتا ہو، با ایں ہمہ اس لیے عمل میں آ گیا کہ عمل کرنے والے کی نگاہ میں اس کا اس طرح کرنا خدائے تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہ تھا لیکن نبی پر چونکہ خدائے تعالیٰ کی مستقل حفاظت و نگرانی رہتی ہے اس لیے فوراً ہی اس کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ عمل تمہاری جلالت قدر اور عظمت و مرتبہ کے شایان شان نہیں ہے اور قطعی غیر مناسب ہے، اسی فرق مراتب کو عربی کی اس مثل میں ظاہر کیا گیا ہے۔

"نیکوکار انسانوں کی عام خوبیاں مقربین بارگاہِ الٰہی کے حق میں برائیاں ہوتی ہیں۔"

مگر اس لیے کہ ایک مقرب بارگاہِ الٰہی کو خدا کی مرضی کے سمجھنے میں بھی یہ لغزش کیوں پیش آئی سنۃ اللہ یہ جاری ہے کہ وہ انبیاء و مرسلین (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی اس قسم کی لغزشوں پر جب ان کو متنبہ کرتا ہے تو اول نہایت سخت اور مجرمانہ عمل کی حیثیت میں اس لغزش کا ذکر کرتا ہے مگر پھر کسی دوسرے مقام پر اس معاملہ کی اصل حقیقت کو ظاہر کر کے "نبی و رسول" کے عمل کو لغزش ہی کی حد میں لے آتا، اور ان کی جانب سے خود ہی معذرت کر دیتا ہے تاکہ کسی ملحد اور زندیق کو کسی بھی نبی و رسول کی جانب گناہ کے الزام لگانے کی بے جا جرأت نہ ہو سکے۔

اسی مجموعہ حقیقت کا نام "عصمت انبیاء" ہے اور یہی اسلامی عقائد میں سے ایک بنیادی عقیدہ ہے، یہ مسئلہ اگرچہ بحث و کاوش کے اعتبار سے بہت اہم اور معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، مگر دلائل و براہین اور بحث و نظر کے بعد مسئلہ کی حقیقت اور اس کا خلاصہ یہی ہے جو یہاں سپرد قلم کیا گیا اور اس مقام پر اسی قدر کافی و شافی ہے۔

Marfat.com

حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت:

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اب حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ پر غور کیجئے اور نظر ڈالیے کہ قرآن عزیز "سورۂ بقرہ" میں جب یہ واقعہ بیان کیا گیا تو صاف طور پر واضح کر دیا گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی یہ غلطی نہ گناہ تھی اور نہ نافرمانی بلکہ معمولی قسم کی لغزش تھی۔

﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ (البقرہ: ۳۶)

"شیطان نے ان دونوں سے لغزش کرا دی۔"

اور اس کے بعد سورۂ "اعراف" اور "طٰہٰ" میں دو جگہ اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے "وسوسہ" سے تعبیر کیا:

﴿فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ (الاعراف: ۲۰)

"شیطان نے ان کو پھسلا دیا۔"

اور "طٰہٰ" میں تیسری جگہ اس لغزش اور وسوسہ کا خود ہی سبب بیان کر کے حضرت آدم علیہ السلام کو ہر قسم کے ارادی اور عملی گناہ سے پاک ظاہر کیا اور ان کی عصمت کے مسئلہ کو زیادہ سے زیادہ محکم اور مضبوط بنا دیا۔

﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾ (طٰہٰ: ۱۱۵)

"اور بلاشبہ ہم نے آدم سے ایک اقرار لیا تھا پس وہ اس کو بھول گیا اور ہم نے اس کو پختہ ارادہ کا نہیں پایا (یا ہم نے اس کو اقرار کے پورا نہ کرنے میں اس کے ارادہ اور قصد کا دخل نہیں پایا)۔"

یہ آیات صاف طور پر واضح کرتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں کیا جس حد تک معاملہ پیش آیا اس میں بھی ان کے قصد و ارادہ سے خلاف ورزی کا مطلق کوئی دخل نہیں ہے بلکہ وہ ایک وسوسہ تھا جو لغزش کی شکل میں ان سے صادر ہو گیا اور وہ بھی نسیان اور بھول چوک کے ساتھ۔ ان تمام تصریحات کے بعد اب سورۂ طٰہٰ کی مسطورہ ذیل آیت کا مقصد خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔

﴿وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى﴾ (طٰہٰ: ۱۲۱)

"اور آدم نے اپنے پروردگار کا حکم پورا نہ کیا اور وہ بہک گیا۔"

ہم نے اس جگہ عصیان اور غوایت کے وہ معنی نہیں لیے جو عام بول چال میں بولے جاتے ہیں یعنی "گناہ" اور "گمراہی" اور ایسا تاویل بعید یا دور از کار توجیہ کے لیے نہیں کیا گیا بلکہ لغت اور علم معانی کے عام اصول کے زیر نظر ہی کیا گیا ہے اس لیے کہ لغت عربی کی مشہور کتاب "لسان العرب" اور "اقرب الموارد" وغیرہ میں "المعصية، مصدر و قد تطلق على الزلة مجازا" (معصیۃ مصدر ہے اور کبھی مجاز کے طور پر لغزش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) اسی طرح "غوی" کے معنی یہاں ضل یا خاب کے ہیں، پس اگر یہاں ضل مراد ہیں تو اس کا اردو ترجمہ "بہک گیا" کیا جائے گا اور خاب مراد ہیں تو نقصان میں پڑ گیا فصیح ترجمہ ہے۔

Marfat.com

بہر حال واقعہ سے متعلق ان تمام آیات کو اور ان آیات کو جو حضرت آدم کی جلالت قدر، صفوت و برگزیدگی اور خلعت خلافت سے سرفرازی کو ظاہر کرتی ہیں، جدا جدا کر کے نہ دیکھا جائے "جیسا کہ معترضین کا عام قاعدہ ہے اور جو اکثر قرآن فہمی میں گمراہی کا سبب بنتا ہے" اور سب کو یکجا کر کے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت کا مسئلہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور اس میں قطعی کسی شائبہ ریب و شک کی گنجائش نہیں ہے۔

اور بالفرض اگر ﴿عَصٰی﴾ اور ﴿غَوٰی﴾ کو عام معنی میں لیا جائے تب بھی وہ اصول پیش نظر رکھنا ضروری ہے جو مسئلہ "عصمت" کی حقیقت کے سلسلہ میں ابھی بیان ہو چکا ہے کہ جب نصوص قرآن حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت، صفوت اور خلافت جیسے عظیم الشان مراتب کا اظہار کرتی ہیں تو اس آیت میں ان کی اس لغزش کو ان سخت الفاظ کے ساتھ اس لیے یاد کیا گیا کہ آدم علیہ السلام مقرب بارگاہ الٰہی کے لیے کہ جس کو خود اللہ تعالیٰ کی براہ راست ہم کلامی کا شرف حاصل ہے، یہ لغزش اور نسیان بھی اس کے مرتبہ سے نازل اور غیر موزوں ہے لہٰذا زیادہ سے زیادہ قابل گرفت ہے اگرچہ ابرار و نیکوکار انسانوں کے حق میں اس قسم کی غلطی ایک معمولی بات ہی کیوں نہ ہو۔

⑫ حضرت آدم علیہ السلام دنیائے انسانی میں پہلے انسان اور کائنات بشری کے پہلے ابوالبشر ہیں یا اس سے بھی پہلے اس قسم کی دنیائے انسانی کا وجود اس کائنات میں رہا ہے اور اس کے لیے بھی اسی طرح ایک آدم ابوالبشر کی ہستی رہی ہے؟

اس مسئلہ کے متعلق اگرچہ بعض علماء طبقات الارض نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ انسانی دنیا سے قبل بھی ربع مسکون پر عالم انسانی کا وجود رہا ہے اور آج سے تیس ہزار سال قبل کی اس جنس بشری کا نام "تیاندرتال" تھا اور اس کا موجودہ نسل انسانی سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا بلکہ وہ مستقل نسل تھی جو ہلاک ہوگئی اور اس کے بعد موجودہ نسل انسانی نے جنم لیا مگر ان کی یہ تحقیق تخمینی اور قیاسی ہے جو انسانی ڈھانچوں اور ان کی ہڈیوں کی تحقیق (ریسرچ) پر مبنی ہے اور کسی یقین اور علم حقیقی پر مبنی نہیں ہے اور قرآن عزیز نے ہم کو اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی، نہ کسی موقع پر اس کے بارہ میں کوئی اشارہ کیا اور نہ نبی کریم ﷺ سے اس مسئلہ میں کوئی تصریح موجود ہے لہٰذا ہمارے یقین اور اعتقاد کے لیے اسی قدر کافی ہے جو ہم کو قرآن کے یقینی علم اور وحی الٰہی کی صاف اور صریح اطلاع سے حاصل ہوا ہے۔

دراصل اس قسم کے مباحث علمیہ کے لیے اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو مسائل علم یقین اور مشاہدہ کی حد تک پہنچ چکے ہیں اور قرآنی علوم اور وحی الٰہی ان حقائق کا انکار نہیں کرتے "کیونکہ قرآن عزیز مشاہدہ اور بداہت کا کبھی بھی انکار نہیں کرتا" تو ان کو بلاشبہ تسلیم کیا جائے اس لیے کہ ایسے حقائق کا انکار بیجا تعصب اور تنگ نظری کے سواء اور کچھ نہیں، اور جو مسائل ابھی تک یقین اور جزم کی اس حد تک نہیں پہنچے جن کو مشاہدہ اور بداہت کہا جا سکے جیسا کہ مسئلہ "زیر بحث" تو ان کے متعلق قرآن عزیز کے مطالب میں تاویلات نہیں کرنی چاہئیں اور خواہ مخواہ ان کو جدید تحقیقات کے سانچہ میں ڈھالنے کی سعی ہرگز جائز نہیں، بلکہ وقت کا انتظار کرنا چاہیے کہ وہ مسائل اپنی حقیقت کو اس طرح آشکارا کر دیں کہ ان کے انکار سے مشاہدہ اور بداہت کا انکار لازم آجائے، اس لیے کہ یہ حقیقت ہے کہ مباحث علمیہ کو تو بارہا اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا ہے، مگر علوم قرآنی کو کبھی ایک مرتبہ بھی اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور جب کبھی مسائل علمیہ بحث و نظر کے بعد یقینیات اور مشاہدات کی حد تک پہنچے ہیں وہ ایک نقطہ بھی اس سے آگے نہیں گئے جس کو قرآن

Marfat.com

نے پہلے سے واضح کر دیا ہے۔

البتہ اگر کسی مفسر نے ایک آیت کی ایسی تفسیر کر دی ہے جو اس مسئلہ کی اصل حقیقت کے خلاف پڑتی ہے تو بلا شبہ اس کے بیان کردہ معانی کو نظر انداز کر دینا اور آیت قرآن کو اصل حقیقت کے مطابق ظاہر کرنا قرآن عزیز کا اپنا مطالبہ ہے، جو تعقل، تفکر اور تدبر کی بار بار دعوت سے ظاہر ہوتا ہے: ﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ ○ اَفَلَا یَتَفَکَّرُوْنَ﴾

لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ یہ بحث صرف ان ہی مسائل سے متعلق ہے جو تاریخی، جغرافیائی اور طبعی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں اور قرآن عزیز نے اس حد تک ان کی طرف توجہ کی ہے جس سے اس کے مقصد ارشاد و ہدایت کو مدد مل سکے، باقی وہ تمام مسائل جس کا تعلق ایک مسلمان کے "مسلم" ہونے اور عقائد و اعمال کے اعتبار سے اس کے "مومن" کہلانے سے ہے۔ سو ان کو قرآن عزیز نے جس یقین اور علم حقیقی (وحی الٰہی) کے ذریعہ بیان کر دیا ہے ان میں مطلق کسی قسم کے تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں ہے، اور نہ وہ کسی تحقیق اور ریسرچ کے محتاج، مثلاً خدا کی ہستی آخرت کے وجود، ملائکۃ اللہ، تقدیر اور انبیاء و رسل سے متعلق ایمان واعتقاد یا نماز روزہ کی اصل حقیقت، حج و زکوٰۃ کے معنی و مفہوم وغیرہ یہ تمام مسائل ایک مسلمان کے لیے مطلق کسی جدید تحقیق کے محتاج نہیں ہیں بلکہ ان کے حقائق کے متعلق نصوص نے ہم کو دوسروں سے قطعی بے نیاز کر دیا ہے اور اس کا دیا ہوا علم، علم یقین (وحی الٰہی) پر مبنی ہے جو اپنی ابدیت کے ساتھ اصل اور غیر متبدل ہے۔

⑬ توراۃ و انجیل (بائبل) میں اس قصہ سے متعلق جو واقعات مذکور ہیں مثلاً سانپ اور طاؤس کا قصہ یا اسی قسم کی اور باتیں جو قرآن عزیز اور صحیح روایات حدیث میں نہیں پائی جاتیں ان کے متعلق کیا حکم ہے؟

یہ سب اسرائیلیات کہلاتی ہیں اور بے اصل ہیں، ان کی پشت پر نہ علم یقین اور علم صحیح (وحی الٰہی) کی سند ہے اور نہ عقل و تاریخ کی شہادت، اس لیے من گھڑت اور بے سر و پا باتیں ہیں، بعض مفسرین بھی ایسی روایات کے نقل میں سہل انگاری برتتے ہیں، جس سے بہت بڑا نقصان یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام نہیں بلکہ خواص بھی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان روایات کو اسلامی روایات میں دخل ہے اور یہ بھی صحیح روایات کی طرح صحیح اور قابل قبول ہیں، اس لیے ازبس ضروری ہے کہ تردید کے ارادہ سے علاوہ تفسیر قرآن میں ہرگز ان کو جگہ نہ دی جائے اور نہ صرف کتب تفسیر و حدیث بلکہ کتب سیرت کو بھی ان سے پاک رکھا جائے۔

⑭ حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں "ملک" "فرشتہ" اور "جن" کا ذکر بھی آیا ہے، یہ دونوں خدائے تعالیٰ کی مستقل مخلوق ہیں یا صرف دو قوتوں کا نام ہے جو قوت ملکوتی اور قوت شیطانی سے موسوم ہیں؟

فرشتہ:

قرآن عزیز اور احادیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو کچھ ہم کو بتایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم "فرشتہ" کی نہ حقیقت تخلیقی سے واقف کئے گئے ہیں اور نہ وہ ہم کو نظر آتے ہیں، البتہ ہمارے لیے یہ یقین واعتقاد ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ہم ان کے وجود کو تسلیم کریں اور ان کو مستقل مخلوق یقین کریں، اس لیے کہ قرآن عزیز اور احادیث صحیح نے ان میں سے بعض کے ناموں کی تصریح تک کی ہے اور جنس ملائکہ کی جن صفات کا تذکرہ فرمایا ہے وہ ان کے ایک مستقل مخلوق ہونے کی صراحت کرتی ہیں، ذیل کی آیات ان ہی حقائق کو واضح کرتی ہیں۔

Marfat.com

﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾(البقرہ: ۹۷)

"تو کہہ دے، جو کوئی دشمن ہو جبریل کا سو اس نے تو اتارا ہے یہ کلام تیرے دل پر اللہ کے حکم سے۔"

﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝﴾(البقرہ: ۹۸)

"جو کوئی دشمن ہو اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبریل اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے ان کافروں کا۔"

﴿يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ﴾(النحل: ۲)

"وہ اتارتا ہے فرشتوں کو بھید دے کر اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے۔"

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾(فاطر: ۱)

"سب خوبی اللہ کو ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین، جس نے ٹھہرایا فرشتوں کو پیغام لانے والا جن کے پر ہیں دو دو اور تین تین اور چار چار، بڑھا دیتا ہے وہ پیدائش میں جو چاہے بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے۔"

﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَيْهِ﴾(المعارج: ٤)

"چڑھیں گے فرشتے اور روحیں اس کی طرف۔"

﴿وَّ الْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۭ وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۝﴾(الحاقۃ: ۱۷)

"اور فرشتے ہوں گے (قیامت کے دن) اس (آسمان) کے کناروں پر اور اٹھائیں گے عرش تیرے رب کا اپنے اوپر اس دن آٹھ (فرشتے)۔"

﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا﴾

(البقرہ: ۳۰)

"اور جب کہا تیرے پروردگار نے فرشتوں سے میں بنانے والا ہوں زمین میں خلیفہ تو انہوں نے کہا کیا تو اس میں ایسے کو بنائے گا جو اس زمین میں فساد پھیلائے گا۔"

ان آیات کو غور سے پڑھنے کے بعد خود انصاف کیجئے کہ جن ملحدوں نے فرشتوں کے مستقل مخلوق ہونے سے انکار کیا ہے ان کی باطل تاویلات اور قرآن عزیز میں معنوی تحریفات کس حد تک قابل قبول بلکہ لائق ذکر ہیں۔

قرآن عزیز میں ملک اور ملائکہ کا ذکر ۸۶ آیات میں ۸۸ مرتبہ آیا ہے جو ذیل کے جدول سے ظاہر ہے:

Marfat.com

نمبرسورہ	نام سورہ	تعداد آیات
۲	البقرہ	۳۰_۳۱_۳۴_۹۸_۱۰۲_۳ ۱۶۱_۱۷۷_۲۱۰_۲۴۸_۲۸۵
۴	النساء	۹۷_۱۳۶_۱۶۶_۱۷۲_۶
۷	الاعراف	۱۱_۲۰
۱۱	ھود	۱۲_۳۱
۱۳	الرعد	۱۳_۲۳
۱۶	النحل	۲_۲۸_۳۲_۳۳_۴۹
۱۸	الکہف	۵۰
۲۱	الانبیاء	۱۰۳
۲۳	المؤمنون	۲۴
۳۲	السجدہ	۱۱
۳۴	سباء	۴۰
۳۷	الصافات	۱۵۰
۳۹	الزمر	۷۵
۴۲	الشوریٰ	۵
۴۷	محمد	۲۷
۶۶	التحریم	۴_۶
۷۰	المعارج	۴
۷۸	النباء	۳۸
۹۷	القدر	۴

نمبرسورہ	نام سورہ	تعداد آیات
۳	آل عمران	۱۸_۳۹_۴۲_۴۵_۸۰_۸۷_ ۱۲۴_۱۲۵
۶	الانعام	۸_۹_۵۰_۹۳_۱۱۱_۱۵۸
۸	الانفال	۹_۱۲_۵۰
۱۲	یوسف	۳۱
۱۵	الحجر	۷_۸_۲۸_۳۰
۱۷	الاسراء	۴۰_۶۱_۹۲_۹۵
۲۰	طٰہٰ	۱۱۶
۲۲	الحج	۷۵
۲۵	الفرقان	۷_۲۱_۲۲_۲۵
۳۳	الاحزاب	۴۳_۵۶
۳۵	فاطر	۱
۳۸	صٓ	۷۱_۷۳
۴۱	فصلت	۱۴
۴۳	الزخرف	۱۹_۵۳_۶۰
۵۳	النجم	۲۶_۲۷
۶۹	الحاقہ	۱۷
۷۴	المدثر	۳۱
۸۹	الفجر	۲۲

نیز احادیث صحیحہ اور قدیم آسمانی کتابوں توراۃ، زبور، انجیل وغیرہ میں بھی فرشتوں کا تذکرہ موجود ہے اور ان کو مستقل مخلوق بھی بتایا گیا ہے، خصوصاً بخاری اور مسلم کی روایات میں بکثرت اس کی شہادتیں موجود ہیں۔

جن:

اسی طرح "جن" بھی خدائے تعالیٰ کی مستقل مخلوق ہے جس کی حقیقت تخلیق سے ہم پوری طرح آگاہ نہیں ہیں اور نہ عام

انسانی آبادی کی طرح وہ ہم کو نظر آتے ہیں لیکن قرآن عزیز نے جو تصریحات اس مخلوق کے متعلق کی ہیں وہ ہمارے لیے ضروری قرار دیتی ہیں کہ ہم یہ اعتقاد اور یقین رکھیں کہ وہ بھی انسان کی طرح مستقل مخلوق ہیں اور اسی کی طرح شریعت کے مکلف بھی، ان میں توالد وتناسل کا بھی سلسلہ ہے اور ان میں نیک و بد بھی ہیں۔

قرآن عزیز کی یہ آیات ان ہی حقائق کو واضح اور ظاہر کرتی ہیں۔

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝﴾ (الذاریات: ۵۶)

"اور نہیں پیدا کیا ہم نے جن اور انسان کو مگر تا کہ وہ عبادت گزار ہوں۔"

﴿قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۝ يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ ۖ وَلَن نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا ۝﴾ (الجن: ۱۔۲)

"اور اے پیغمبر سب لوگوں کو بتا دو کہ میرے پاس خدا کی طرف سے اس بات کی وحی آئی ہے کہ جنات میں سے چند شخصوں نے مجھے قرآن پڑھتے سنا اور اس نے پیچھے اپنے لوگوں سے جا کر کہا کہ ہم نے عجیب طرح کا قرآن سنا جو نیک راہ دکھاتا ہے سو ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم تو کسی کو اپنے پروردگار کا شریک ٹھہرائیں گے نہیں۔"

﴿وَأَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُونَ وَمِنَّا الْقَاسِطُونَ ۖ﴾ (الجن: ۱۴)

"اور بلاشبہ کچھ ہم میں سے فرماں بردار ہیں اور کچھ بے انصاف۔"

﴿إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۗ﴾ (الاعراف: ۲۷)

"بیشک وہ (شیطان) اور اس کی ذریات تم کو ادھر سے دیکھتے رہتے ہیں جدھر سے تم ان کو نہیں دیکھتے۔"

﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ ۗ﴾ (الکہف: ۵۰)

"اور تھا (ابلیس) جنات میں سے پس نافرمانی کی اس نے اپنے رب کی۔"

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان بھی "جن" ہی کی نسل میں سے ہے، اور ابلیس (شیطان) نے خدائے تعالیٰ کے سامنے خود یہ اقرار کیا کہ اس کی تخلیق نار (آگ) سے ہوئی ہے۔

مسطورۂ بالا آیات کے علاوہ لفظ جن، جان اور جنۃ بتیس (۳۲) مرتبہ قرآن حکیم کی اکتیس (۳۱) آیات میں مذکور ہوئے ہیں، جو ذیل کے جدول سے ظاہر ہیں۔

نمبر سورہ	نام سورہ	تعداد آیات
۶	الانعام	۱۰۰۔۱۱۲۔۱۲۸۔۱۳۰
۱۱	ھود	۱۱۹

نمبر سورہ	نام سورہ	تعداد آیات
۷	الاعراف	۳۸۔۱۷۹
۱۵	الحجر	۲۷

Marfat.com

۱۷	الاسراء	۸۸	۱۸	الکہف	۵۰
۲۷	النمل	۱۷_۳۹	۳۲	السجدہ	۱۳
۳۴	السباء	۱۲_۱۴_۴۱	۳۷	الصافات	۱۵۸
۴۱	فصلت	۲۵_۲۹	۴۶	الاحقاف	۱۸_۲۹
۵۱	الذاریات	۵۶	۵۵	الرحمٰن	۱۵_۳۳_۳۹_۵۶_۷۴
۷۲	الجن	۱_۵_۶	۱۱۴	الناس	۶

حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن عزیز اور نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہ اطلاع دی ہے کہ "ملائکہ" اور "جن" اگرچہ ہماری ان نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، لیکن بلاشبہ وہ مستقل مخلوق ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ مشاہدہ میں تو غلطی کا امکان بھی ہے اور بارہا ہوتا رہتا ہے لیکن "وحی الٰہی" اور "نبی معصوم" کی اطلاع میں غلطی کی مطلق گنجائش نہیں لہٰذا ہمارا ایمان ہے کہ وہ خدا کی مستقل مخلوق ہیں، اس کے علاوہ عقلی اعتبار سے بھی ان کا مستقل مخلوق ہونا ناممکن نہیں ہے بلکہ امکان عقلی کے دائرہ میں ہے۔

پس جو چیز عقل کے نزدیک ناممکن نہ ہو اور نقل یعنی "وحی الٰہی" اس کا یقین دلاتی ہو تو اس کا انکار "علم" اور "حقیقت" کا انکار ہے، اور تنگ نظری اور ہٹ دھرمی کی زندہ مثال۔

رہا یہ امر کہ وہ ہمارے مشاہدات و محسوسات سے باہر ہیں اور ہم ان کو نہیں دیکھتے تو یہ بھی انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی اس لیے کہ آج کی دوربینوں اور سائنس کے آلات سے پہلے ہزاروں برس تک ہم کو وہ بہت سی اشیاء محسوس نہیں ہوتی تھیں اور نہ آنکھیں ان کو دیکھ سکتی تھیں جن کا وجود اس وقت بھی موجود تھا مگر آج وہ نظر بھی آتی ہیں اور محسوس بھی ہوتی ہیں تو کیا ہزاروں سال پہلے جن لوگوں نے ان کے وجود کا انکار کیا وہ حقیقی علم پر مبنی تھا یا کوتاہی علم اور ذرائع معلومات و تحقیقات سے ناواقفیت کا نتیجہ، اسی طرح ہم آج بھی بجلی، مقناطیس اور روشنی کی صحیح حقیقت سے ناآشنا ہیں اور ان کو صرف ان کے آثار و علامات ہی سے پہچانتے ہیں۔

اسی طرح مادیین اور ملاحدہ کا انکار کسی علم اور یقین پر مبنی نہیں ہے بلکہ محسوسات و مشاہدات میں نہ آنے کی بنا پر "عدم علم" کی وجہ سے ہے جو کسی طرح عدم وجود کی دلیل نہیں بن سکتا، نیز علم دو ہی طرح حاصل ہو سکتا ہے، ایک علوم و فنون کے ذریعہ جو کسب و اکتساب کا محتاج ہے اور دوسرے موہبت اور عطیہ الٰہی کی راہ سے اور اس کا سب سے بلند درجہ وحی الٰہی ہے، پس اگر کوئی شئے علوم و فنون کی راہ سے ہم نہ معلوم کر سکیں گے مگر عقل اس کے وجود کو ناممکن نہ سمجھتی ہو اور "وحی الٰہی" اس کے وجود کا اعلان کرتی ہے تو ہر ذی ہوش اور ذی عقل کا فرض ہے کہ وہ علوم و فنون کی درماندگی کے اعتراف کے ساتھ اس کو تسلیم کرے، البتہ اگر اس کو اس اطلاع کے وحی الٰہی ہونے ہی میں انکار ہو یا وہ سرتاسر وحی الٰہی کا ہی منکر ہو تو اب اس کے لیے اس اطلاع پر ایمان لانے سے قبل ان دلائل کا مطالعہ ضروری ہے جو اس سلسلہ میں قرآن عزیز نے بیان کیے ہیں، اور جن میں بتایا گیا ہے کہ وہ بلاشبہ "کلام اللہ" اور "وحی الٰہی" ہے۔

قصہ آدم علیہ السلام میں چند اہم عبرتیں:

یوں تو حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں بے شمار پند و نصائح اور مسائل کا ذخیرہ موجود ہے اور ان کا احاطہ اس مقام پر ناممکن

Marfat.com

ہے تاہم چند اہم عبرتوں کی جانب اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

① اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے بھید بے شمار اور ان گنت ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی ہستی بھی خواہ وہ کتنی ہی مقربین بارگاہِ الٰہی میں سے کیوں نہ ہو، ان تمام بھیدوں پر واقف ہو جائے اسی لیے ملائکۃ اللہ انتہائی مقرب ہونے کے باوجود خلافت آدم کی حکمت سے آشنا نہ ہو سکے اور جب تک معاملہ کی پوری حقیقت سامنے نہ آ گئی وہ حیرت ہی میں غرق رہے۔

② اللہ تعالیٰ کی عنایت و توجہ اگر کسی حقیر شئے کی جانب بھی ہو جائے تو وہ بڑے سے بڑے مرتبہ اور جلیل القدر منصب پر فائز ہو سکتی اور خلعت شرف و مجد سے نوازی جا سکتی ہے۔

ایک مشت خاک کو دیکھیے اور پھر "خلیفۃ اللہ" کے منصب پر نظر ڈالیے اور پھر اس کے منصب نبوت و رسالت کو ملاحظہ فرمائیے، مگر اس کی توجہ کا فیضان بخت و اتفاق کی بدولت یا خالی از حکمت نہیں ہوتا بلکہ اس شئے کی استعداد کے مناسب بے نظیر حکمتوں اور مصلحتوں کے نظام سے منظم ہوتا ہے۔

③ انسان کو اگرچہ ہمہ قسم کا شرف عطا ہوا اور ہر طرح کی جلالت و بزرگی نصیب ہوئی، تاہم اس کی خلقی اور طبعی کمزوری اپنی جگہ اسی طرح قائم رہی اور بشریت و انسانیت کا وہ نقص پھر بھی باقی رہا یہی وہ چیز تھی جس نے حضرت آدم علیہ السلام پر بایں جلالت قدر و منصب عظیم پر نسیان طاری کر دیا اور وہ ابلیس کے وسوسہ سے متاثر ہو گئے۔

④ خطا کار ہونے کے باوجود اگر انسان کا دل ندامت و توبہ کی طرف مائل ہو تو اس کے لیے باب رحمت بند نہیں ہے اور اس درگاہ تک رسائی میں نا اُمیدی کی تاریک گھاٹی نہیں پڑتی، البتہ خلوص اور صداقت شرط ہے اور جس طرح حضرت آدم علیہ السلام کے نسیان ولغزش کا عفو اسی دامن سے وابستہ ہے، اسی طرح ان کی تمام نسل کے لیے بھی عفو و رحمت عالم کا دامن وسیع ہے۔

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ (الزمر ۵۳)

"کہہ دے، اے میرے وہ بندو جو اپنے نفسوں کے بارے میں حد سے گزر گئے ہو (گناہ کر کے نفسوں پر ظلم کیا ہے) تم اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو، بے شک اللہ سب گناہوں کو بخش دینے والا رحم کرنے والا ہے۔"

⑤ بارگاہِ الٰہی میں گستاخی یا بغاوت بڑی سے بڑی نیکی اور بھلائی کو بھی تباہ کر دیتی، اور ابدی ذلت و خسران کا باعث بن جاتی ہے، ابلیس کا واقعہ عبرتناک واقعہ ہے اور اس کی ہزاروں سال کی عبادت گزاری کا جو حشر بارگاہِ الٰہی میں گستاخی اور بغاوت کی وجہ سے ہوا وہ بلاشبہ سرمایہ صد ہزار عبرت ہے۔

پس عبرت حاصل کرو اے چشم عبرت رکھنے والو

Marfat.com

قابیل وہابیل

ان دونوں کا واقعہ بھی چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کا ایک حصہ ہے، اس لیے یہاں قابل ذکر ہے۔

قرآن عزیز نے حضرت آدم علیہ السلام کے ان دونوں صاحبزادوں کا نام ذکر نہیں کیا صرف ﴿ابنی ادم﴾ (آدم کے دو بیٹے) کہہ کر مجمل چھوڑ دیا ہے، البتہ توراۃ میں ان کے یہی نام بیان کیے گئے ہیں جو عنوان میں درج ہیں، ان کے واقعہ کے متعلق حافظ حدیث عماذ الدین بن کثیر نے اپنی تاریخ میں سدی سے سند کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے اس کا مضمون یہ ہے، دنیائے انسانی میں اضافہ کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کا یہ دستور تھا کہ حواء علیہا السلام سے توام (جڑواں) پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کا عقد دوسرے پیٹ سے پیدا ہونے والے توام بچوں کے ساتھ کر دیا کرتے تھے، اسی دستور کے مطابق قابیل اور ہابیل کی شادی کا معاملہ پیش تھا، قابیل عمر میں بڑا تھا اور اس کی ہمشیر ہابیل کی ہمشیر سے زیادہ حسین وخوبرو تھی، اس لیے قابیل کو یہ انتہائی ناگوار تھا کہ دستور کے مطابق ہابیل کی ہمشیر سے اس کی شادی ہو اور ہابیل کی اس کی ہمشیر سے، معاملہ کو ختم کرنے کے لیے حضرت آدم علیہ السلام نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دونوں اپنی اپنی قربانی حق تعالیٰ کی جناب میں پیش کریں جس کی قربانی منظور ہو جائے وہی اپنے ارادہ کے پورا کر لینے کا مستحق ہے۔

جیسا کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں قربانی (نذر) کی قبولیت کا یہ الہامی دستور تھا کہ نذر و قربانی کی چیز کسی بلند جگہ پر رکھ دی جاتی اور آسمان سے آگ نمودار ہو کر اس کو جلا دیتی تھی، اس قانون کے مطابق ہابیل نے اپنے ریوڑ میں سے ایک بہترین دنبہ خدا کی نذر کیا اور قابیل نے اپنی کھیتی کے غلہ میں سے ردی قسم کا غلہ قربانی کے لیے پیش کیا، دونوں کی حسن نیت اور نیت بد کا اندازہ اسی عمل سے ہو گیا، لہٰذا حسب دستور آگ نے آ کر ہابیل کی نذر کو جلا دیا اور اس طرح قبولیت کا شرف اس کے حصہ میں آیا۔

قابیل اپنی اس توہین کو کسی طرح برداشت نہ کر سکا اور اس نے غیظ وغضب میں آ کر ہابیل سے کہا کہ میں تجھ کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑوں گا تاکہ تو اپنی مراد کو نہ پہنچ سکے۔ ہابیل نے جواب دیا، میں تو کسی طرح تجھ پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا، باقی تیری جو مرضی آئے وہ کر، رہا قربانی کا معاملہ سو خدا کے ہاں تو نیک نیت ہی کی نذر قبول ہو سکتی ہے وہاں بدنیت کی نہ دھمکی کام آ سکتی ہے اور نہ بے وجہ کا غم وغصہ، قابیل پر اس نصیحت کا الٹا اثر پڑا اور اس نے غصہ سے مشتعل ہو کر اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا۔ [1]

مگر قرآن عزیز میں شادی کا قصہ مذکور نہیں ہے، صرف قربانی (نذر) کا ذکر ہے، اور اس روایت سے زائد ہابیل کی نعش کے دفن کے متعلق یہ اضافہ ہے۔

قتل کے بعد قابیل حیران تھا کہ اس نعش کا کیا کرے، ابھی تک نسل آدم موت سے دو چار نہیں ہوئی تھی اور اسی لیے حضرت آدم علیہ السلام نے مردے کے بارہ میں کوئی حکم الٰہی نہیں سنایا تھا، یکایک اس نے دیکھا کہ ایک کوے نے زمین کرید کرید کر گڑھا کھودا،

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۹۳

Marfat.com

قابیل کو تنبہ ہوا کہ مجھے بھی اپنے بھائی کے لیے اسی طرح گڑھا کھودنا چاہیے اور بعض روایات میں ہے کہ کوّے نے دوسرے مردہ کوّے کو اس گڑھے میں چھپا دیا۔

قابیل نے یہ دیکھا تو اپنی ناکارہ زندگی پر بے حد افسوس کیا اور کہنے لگا کہ میں اس حیوان سے بھی گیا گزرا ہوں کہ اپنے اس جرم کو چھپانے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا، ندامت سے سر جھکا لیا اور پھر اسی طرح اپنے بھائی کی نعش کو سپرد خاک کر دیا۔

﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۝ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ﴾ (المائدہ: ۲۷-۳۲)

"اور سنا ان کو حال واقعی آدم کے دو بیٹوں کا جب نذر کی دونوں نے کچھ نذر اور مقبول ہوئی ایک کی اور نہ مقبول ہوئی دوسرے کی، کہا: میں تجھ کو مار ڈالوں گا، وہ بولا اللہ قبول کرتا ہے پرہیزگاروں سے، اگر تو ہاتھ چلائے گا مجھ پر مارنے کو میں نہ ہاتھ چلاؤں گا تجھ پر مارنے کو، میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو پروردگار ہے سب جہان کا، میں چاہتا ہوں کہ (اس اقدام پر) تو میرا گناہ بھی حاصل کر لے، اور اپنا گناہ بھی، پھر ہو جائے تو دوزخ والوں میں سے اور یہی سزا ہے ظالموں کی، پس اس کو راضی کیا اس کے نفس نے خون پر اپنے بھائی کے پھر اس کو مار ڈالا۔ سو ہو گیا نقصان اٹھانے والوں میں، پھر بھیجا اللہ نے ایک کوا جو کریدتا تھا زمین کو تا کہ اس کو دکھلا دے کس طرح چھپاتا ہے لاش اپنے بھائی کی، بولا ہائے افسوس مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اس کوے جیسا ہی ہوتا کہ چھپا لیتا لاش اپنے بھائی کی، پھر لگا پچھتانے۔"

اسی سبب سے لکھا ہم نے، بنی اسرائیل پر کہ جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بلا غرض فساد کرنے کے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا ان سب لوگوں کو اور جس نے زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا سب لوگوں کو۔"

امام احمد نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت کی ہے:

((قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم لا تقتل نفس ظلما الا كان على ابن ادم الاول كفل من دمها لانه كان اول من سن القتل)) (مسند احمد)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا میں جب بھی کوئی ظلم سے قتل ہوتا ہے تو اس کا گناہ حضرت آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے

Marfat.com

(قابیل) کی گردن پر ضرور ہوتا ہے اس لیے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ظالمانہ قتل کی ابتداء کی اور یہ ناپاک سنت جاری کی۔"

دمشق کے شمال میں جبل قاسیون پر ایک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے جو مقتل ہابیل کے نام سے مشہور ہے، اور اس کے متعلق ابن عساکر نے احمد بن کثیر کے تذکرہ میں ان کا ایک خواب نقل کیا ہے جس میں مذکور ہے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا اور آپ ﷺ کے ساتھ ہابیل بھی تھے، ہابیل نے بقسم کہا کہ میرا مقتل یہی ہے اور آپ نے ان کے قول کی تصدیق فرمائی، بہرحال یہ خواب ہی کی باتیں ہیں اور خواب کے سچے ہونے کے باوجود بھی اس سے کوئی شرعی یا تاریخی حکم ثابت نہیں ہوسکتا۔

مقامِ عبرت:

سورۂ مائدہ کی بیان کردہ آخری آیت اور مسطورہ بالا حدیث ہم پر یہ حقیقت آشکارا کرتی ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں ہرگز کسی گناہ کی ایجاد نہ کرنی چاہیے تاکہ وہ کل کو بدکاروں اور ظالموں کے لیے ایک نئے حربہ کا کام نہ دے، ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ کائنات میں جو شخص بھی آئندہ اس "بدعت" کا اقدام کرے گا تو بانی بدعت بھی برابر اس گناہ کا حصہ دار بنتا رہے گا اور موجد ہونے کی وجہ سے ابدی ذلت وخسران کا مستحق ٹھہرے گا، گناہ بہرحال گناہ ہے لیکن گناہ کی ایجاد موجد کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کا وبال سر سے باندھ دیتی ہے۔ (نعوذ باللہ من ذلک)

۴ ہابیل خدائے تعالیٰ کا مقبول بندہ تھا اور قابیل بارگاہ الٰہی کا راندہ ہوا، اس لیے ضرورت تھی کہ ہابیل کے پاک جسم کی توہین نہ ہو، اور نسل آدم کی کرامت و بزرگی قائم رکھنے کے لیے بعد مردن "تدفین" کی سنت قائم ہوجائے اور تقاضائے انصاف تھا کہ قابیل کی اس کمینہ حرکت پر اس کو دنیا میں بھی ذلیل کیا جائے، اور اس قابل بنا دیا جائے کہ خود اس کو اپنی بے مائیگی عقل و دانش اور کمینگی کا احساس ہوجائے اس لیے نہ اس کو الہام بخشا گیا اور نہ اس کمینہ حرکت کو چھپانے کے لیے عقل کی روشنی عطا کی گئی بلکہ ایک ایسے حیوان کو اس کا رہنما بنایا گیا جو عیاری و مکاری میں طاق اور دنائت طبع میں ضرب المثل ہے، اور آخر کار قابیل کو یہ کہتے ہی بنا۔

﴿يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ﴾ (المائدہ:۳۱)

"ہائے افسوس! کیا میں ایسا گیا گزرا ہوگیا کہ اس کوّے جیسا بھی نہ بن سکا۔"

نوٹ: ارباب سیر وتاریخ کی عام روش یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر کرتے ہیں، اور حضرت نوح علیہ السلام کا اس کے بعد، مگر ہم نے ان اختلافات کے پیش نظر جو حضرت ادریس علیہ السلام سے متعلق عنقریب ذکر ہونے والے ہیں عام روش کے خلاف ان کا تذکرہ حضرت نوح علیہ السلام کے تذکرہ کے بعد کیا ہے، تاہم جن ارباب ذوق کو یہ گراں گزرے وہ حضرت آدم علیہ السلام کے تذکرہ کے بعد حضرت ادریس علیہ السلام کے تذکرہ کا مطالعہ کریں اور پھر حضرت نوح علیہ السلام کا۔

حضرت نوح علیہ السلام

○ قرآن عزیز میں حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ ○ حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں ○ نسب نامہ
○ حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں ○ نسب نامہ ○ قرآن عزیز میں حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ
○ قوم نوح علیہ السلام ○ دعوت وتبلیغ اور قوم کی نافرمانی ○ بناء سفینہ ○ پسر نوح ○ کوہ جودی
○ طوفان نوح عام تھا یا خاص ○ پسر نوح کی نسبی بحث ○ ایک اخلاقی مسئلہ ○ چند ضمنی مسائل

حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں:

حضرت آدم علیہ السلام کے بعد یہ پہلے نبی ہیں جن کو "رسالت" [1] سے نوازا گیا۔صحیح مسلم باب شفاعت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت ہے، اس میں یہ تصریح ہے:

یا نوح انت اوّل الرسل الی الارض.

"اے نوح تو زمین پر سب سے پہلا رسول بنایا گیا۔"

نسب نامہ:

علم الانساب کے ماہرین نے حضرت نوح علیہ السلام کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے۔نوح بن لامک بن متوشالح بن اخنوخ یا خنوح بن یارد بن مہلمیل بن قینان بن انوش بن شیث (علیہ السلام) بن آدم (علیہ السلام)۔

اگرچہ مؤرخین اور تورات (سفر تکوین) نے اسی کو صحیح مانا ہے لیکن ہم کو اس کی صحت میں شک اور تردد ہے، بلکہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان ان بیان کردہ سلسلوں سے زیادہ سلسلے ہیں، تورات میں خلق آدم علیہ السلام اور ولادت حضرت نوح علیہ السلام نیز وفات آدم اور ولادت نوح علیہ السلام کی درمیانی مدت کا جو تذکرہ ہے ہم اس کو بھی نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں، البتہ یہ بات پیش نظر رہے کہ تورات کے عبرانی، سامی اور یونانی زبان کے نسخوں میں بہت زیادہ اختلاف ہے اور اس مبحث پر علامہ شیخ مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی ہندی قدس سرہ (کیرانہ ضلع مظفر نگر) کی مشہور کتاب "اظہار حق" قابل مطالعہ ہے، بہرحال تورات سے منقول نقشہ حسب ذیل ہے:

---

[1] جس انسان پر خدا کی "وحی" نازل ہوتی ہے وہ "نبی" ہے اور جس کو جدید شریعت بھی عطا کی گئی ہو وہ "رسول" ہے۔

Marfat.com

نقشہ نمبر ۱

سال	عمر بوقت ولادت پسر
۱۳۰	آدم علیہ السلام بوقت ولادت شیث علیہ السلام
۱۵۰	شیث علیہ السلام بوقت ولادت انوش
۹۰	انوش بوقت ولادت قینان
۷۰	قینان بوقت ولادت مہللیل
۶۵	مہللیل بوقت ولادت یارد
۱۶۲	یارد بوقت ولادت اخنوخ
۶۵	اخنوخ بوقت ولادت متوشالح
۱۸۷	متوشالح بوقت ولادت لامک
۱۸۲	لامک بوقت ولادت نوح علیہ السلام

نقشہ نمبر ۲

مدت درمیان خلق آدم علیہ السلام و ولادت نوح علیہ السلام	۱۰۵۶
عمر آدم علیہ السلام ولادت نوح علیہ السلام	۹۳۰
مدت درمیان وفات آدم علیہ السلام و ولادت نوح علیہ السلام	۱۰۲۶

آپ اگر ان دونوں نقشوں کے درمیان حسابی مطابقت کرنا چاہیں تو کامیاب نہ ہوسکیں گے اس لیے کہ سطور بالا سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ یہ سب تخمین وظن پر مبنی ہے اور اسی وجہ سے اس مسئلہ میں تورات کے مختلف نسخوں میں بھی کافی اختلاف و انتشار پایا جاتا ہے۔

قرآن عزیز میں حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ:

قرآن عزیز کے معجز نما نظم کلام کی یہ سنت ہے کہ وہ تاریخی واقعات میں سے جب کسی واقعہ کو بیان کرتا ہے تو اپنے "مقصد" وعظ و تذکیر" کے پیش نظر واقعہ کی ان ہی جزئیات کو نقل کرتا ہے جو مقصد کے لیے ضروری ہیں اور اجمال و تفصیل اور تکرار واقعہ میں بھی صرف ایک ہی مقصد اس کے سامنے ہوتا ہے اور وہ یہی "موعظت و عبرت" کا مقصد ہے، چنانچہ اسی اسلوب بیان کے مطابق قرآن نے حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کا اجمالی و تفصیلی ذکر تینتالیس (۴۳) جگہ کیا ہے، جس کا ثبوت مسطورۂ ذیل جدول سے ہوتا ہے۔

Marfat.com

نام سورت	آیات	نام سورت	آیات	نام سورت	آیات
آل عمران	۳۳	مریم	۵۸	غافر	۵_۳۱
النساء	۱۶۳	الانبیاء	۷۶	الشوریٰ	۱۳
انعام	۸۴	الحج	۴۲	قٓ	۱۲
اعراف	۵۹_۶۹	المؤمنون	۲۳	الذاریات	۴۶
التوبہ	۷۰	الفرقان	۳۷	النجم	۵۲
یونس	۷۱	الشعراء	۱۰۵_۱۰۶_۱۱۶	القمر	۹
ھود	۲۵_۳۲_۳۶_۴۲	العنکبوت	۱۴	الحدید	۲۶
	۴۵_۴۶_۴۸_۸۹	الاحزاب	۱۰	التحریم	۹
ابراہیم	۷	الصافات	۱_۲۱_۲۶	نوح	۳_۱۷
الاسراء	۷۵_۷۹	صٓ	۱۲		

لیکن اس واقعہ کی اہم تفصیلات صرف سورۂ اعراف، ہود، مومنون، شعراء، قمر، اور سورۂ نوح ہی میں بیان ہوئی ہیں، ان سے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے متعلق جس قسم کی تاریخ بنتی ہے وہی ہمارا موضوع بیان ہے۔

قوم نوح علیہ السلام:

حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے تمام قوم خدا کی توحید اور صحیح مذہبی روشنی سے یکسر ناآشنا ہو چکی تھی اور حقیقی خدا کی جگہ خود ساختہ بتوں نے لے لی تھی، غیر اللہ کی پرستش اور اصنام پرستی ان کا شعار تھا۔

دعوت و تبلیغ اور قوم کی نافرمانی:

آخر سنت اللہ کے مطابق ان کے رشد و ہدایت کے لیے بھی ان ہی میں سے ایک ہادی اور خدا کے سچے رسول نوح علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو راہ حق کی طرف پکارا اور سچے مذہب کی دعوت دی، لیکن قوم نے نہ مانا اور نفرت و حقارت کے ساتھ انکار پر اصرار کیا، امراء اور رؤساء قوم نے ان کی تکذیب و تحقیر کا کوئی پہلو نہ چھوڑا اور ان کے پیرووں نے ان ہی کی تقلید و پیروی کے ثبوت میں ہر قسم کی تذلیل و توہین کے طریقوں کو حضرت نوح علیہ السلام پر آزمایا، انہوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ جس کو نہ ہم پر دولت و ثروت میں برتری حاصل ہے اور نہ وہ انسانیت کے رتبہ سے بلند "فرشتہ ہیکل" ہے، اس کو کیا حق ہے کہ وہ ہمارا پیشوا بنے، اور ہم اس کے احکام کی تعمیل کریں؟

وہ غریب اور کمزور افراد قوم کو جب حضرت نوح علیہ السلام کا تابع اور پیرو دیکھتے تو مغرورانہ انداز میں حقارت سے کہتے "ہم ان کی طرح نہیں ہیں کہ تیرے تابع فرمان بن جائیں اور تجھ کو اپنا مقتدا مان لیں" وہ سمجھتے تھے کہ یہ کمزور اور پست لوگ نوح کے اندر

Marfat.com

مقلد ہیں، نہ یہ ذی رائے ہیں کہ ہماری طرح اپنی جانچی پرکھی رائے سے کام لیتے اور نہ ذی شعور ہیں کہ حقیقت حال کو سمجھ لیتے، اور اگر وہ حضرت نوح علیہ السلام کی بات کی طرف کبھی توجہ بھی دیتے تو ان سے اصرار کرتے کہ پہلے ان پست اور غریب افراد قوم کو اپنے پاس سے نکال دے تب ہم تیری بات سنیں گے کیونکہ ہم کو ان سے گھن آتی ہے اور ہم اور یہ ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتے۔

حضرت نوح علیہ السلام اس کا ایک ہی جواب دیتے کہ ایسا کبھی نہ ہوگا کیونکہ یہ خدا کے مخلص بندے ہیں۔ اگر میں ان کے ساتھ ایسا معاملہ کروں جس کے تم خواہش مند ہو تو خدا کے عذاب سے میرے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ میں اس کے دردناک عذاب سے ڈرتا ہوں، اس کے یہاں اخلاص کی قدر ہے، امیر وغریب کا وہاں کوئی سوال نہیں ہے۔ نیز ارشاد فرماتے کہ میں تمہارے پاس خدا کی ہدایت کا پیغام لے کر آیا ہوں، نہ میں نے غیب دانی کا دعویٰ کیا ہے اور نہ فرشتہ ہونے کا، خدا کا برگزیدہ پیغمبر اور رسول ہوں اور دعوت وارشاد میرا مقصد ونصب العین ہے، اس کو سرمایہ دارانہ بلندی، غیب دانی، یا فرشتہ ہیکل ہونے سے کیا واسطہ؟ یہ کمزور و نادار افراد قوم جو خدا پر سچے دل سے ایمان لائے ہیں تمہاری نگاہ میں اس لیے حقیر وذلیل ہیں کہ وہ تمہاری طرح صاحب دولت و مال نہیں ہیں اور اسی لیے تمہارے خیال میں یہ نہ خیر حاصل کر سکتے ہیں اور نہ سعادت، کیونکہ یہ دونوں چیزیں دولت وحشمت کے ساتھ ہیں نہ کہ نکبت وافلاس کے ساتھ۔

سو واضح رہے کہ خدا کی سعادت و خیر کا قانون ظاہری دولت وحشمت کے تابع نہیں ہے اور نہ اس کے یہاں سعادت و ہدایت کا حصول وادراک سرمایہ کی رونق کے زیر اثر ہے بلکہ اس کے برعکس طمانیت نفس، رضاء الٰہی، غناء قلب اور اخلاص نیت وعمل پر موقوف ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے یہ بھی بارہا تنبیہ کی کہ مجھ کو اپنی اس ابلاغ دعوت وارسال ہدایت میں نہ تمہارے مال کی خواہش ہے نہ جاہ ومنصب کی، میں اجرت کا طلبگار نہیں ہوں، اس خدمت کا حقیقی اجر وثواب تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، اور وہی بہترین قدردان ہے۔ غرض سورۂ ہود حق وتبلیغ کے ان تمام مکالموں، مناظروں اور پیغامات حق کے ان ہی ارشادات عالیہ کا ایک غیر فانی ذخیرہ ہے۔

﴿فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ
هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝٢٧ قَالَ يٰقَوْمِ
اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ
اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝٢٨ وَ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ لٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝٢٩ وَ يٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ
طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝٣٠ وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ اِنِّيْ
مَلَكٌ وَّ لَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۚ

اِنِّیْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۱﴾ ﴾ (ہود: ۲۷۔۳۱)

"اس پر قوم کے ان سرداروں نے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی کہا: "ہم تو تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں ان میں بھی ان لوگوں کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا جو ہم میں ذلیل وحقیر ہیں اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لیے ہیں ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے، بلکہ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو" نوح علیہ السلام نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن پر ہوں، اور اس نے اپنے حضور سے ایک رحمت بھی مجھے بخش دی ہو (یعنی راہ حق دکھا دی ہو) مگر وہ تمہیں دکھائی نہ دے (تو میں اس کے سوا کیا کرسکتا ہوں جو کر رہا ہوں؟) کیا ہم جبراً تمہیں راہ دکھا دیں، حالانکہ تم اس سے بیزار ہو، لوگو! یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں تو اس پر مال و دولت کا تم سے طالب نہیں، میری خدمت کی مزدوری جو کچھ ہے، صرف اللہ پر ہے، اور یہ بھی سمجھ لو کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں (وہ تمہاری نظروں میں کتنے ہی ذلیل ہوں مگر) میں ایسا کرنے والا نہیں کہ اپنے پاس سے انہیں ہنکا دوں انہیں بھی اپنے پروردگار سے (ایک دن) ملنا ہے (اور وہ ہم سب کے اعمال کا حساب لینے والا ہے) لیکن (میں تمہیں سمجھاؤں تو کس طرح سمجھاؤں) میں دیکھتا ہوں کہ تم ایک جماعت ہو (حقیقت سے) جاہل اے میری قوم کے لوگو! مجھے بتاؤ، اگر میں ان لوگوں کو اپنے پاس سے نکال باہر کروں (اور اللہ کی طرف سے مواخذہ ہو جس کے نزدیک معیار قبولیت ایمان وعمل ہے، نہ تمہاری گھڑی ہوئی شرافت ورذالت تو اللہ کے مقابلہ میں کون ہے جو میری مدد کرے گا؟ (افسوس تم پر) کیا تم غور نہیں کرتے؟ اور دیکھو، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں، نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں، میں یہ بھی نہیں کہتا کہ جن لوگوں کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو، اللہ انہیں بھلائی نہیں دے گا (جیسا کہ تمہارا اعتقاد ہے) اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں ہے، اگر میں تمہاری خواہش کے مطابق ایسا کہوں، تو جونہی ایسی بات کہی، میں ظالموں میں سے ہو گیا!"

بہر حال حضرت نوح علیہ السلام نے انتہائی کوشش کی کہ بد بخت قوم سمجھ جائے اور رحمت الٰہی کی آغوش میں آجائے مگر قوم نے نہ مانا اور جس قدر اس جانب سے تبلیغ حق میں جدوجہد ہوئی اسی قدر قوم کی جانب سے بغض وعناد میں سرگرمی کا اظہار ہوا، اور ایذا رسانی اور تکلیف دہی کے تمام وسائل کا استعمال کیا گیا اور ان کے بڑوں نے عوام سے صاف صاف کہہ دیا کہ تم کسی طرح ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر جیسے بتوں کی پرستش کو نہ چھوڑو۔ یہی وہ مباحث ہیں جن کو سورۂ نوح میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور جو بلاشبہ ہدایت و ضلالت کے مہم مسائل کو آشکارا کرتے ہیں۔

﴿ اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲﴾ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۳﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَاۗءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ

Marfat.com

لَيْلًا وَّنَهَارًا ۝ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝ وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ
فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّيْٓ
اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ ﴾ (نوح: ۱۔۱۰)

"ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف کہ ڈرا اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ پہنچے ان پر عذاب دردناک، بولا اے قوم میری میں تم کو ڈر سناتا ہوں کھول کر کہ بندگی کرو اللہ کی اور اس سے ڈرو اور میرا کہا مانو تا کہ بخشے وہ تم کو کچھ گناہ تمہارے اور ڈھیل دے تم کو ایک مقررہ وعدہ تک، وہ جو وعدہ کیا ہے اللہ نے، جب آ پہنچے گا اس کو ڈھیل نہ ہوگی اگر تم کو سمجھ ہے، بولا اے رب میں بلاتا رہا اپنی قوم کو رات اور دن، پھر میرے بلانے سے اور زیادہ بھاگنے لگے، اور میں نے جب کبھی ان کو بلایا تا کہ تو ان کو بخشے، ڈالنے لگے انگلیاں اپنے کانوں میں اور لپیٹنے لگے اپنے اوپر کپڑے، اور ضد کی اور غرور کیا بڑا غرور، پھر میں نے ان کو بلایا برملا، پھر میں نے ان کو کھول کر کہا اور چھپ کر کہا چپکے سے تو میں نے کہا گناہ بخشواؤ اپنے رب سے بیشک وہ ہے بخشنے والا۔"

﴿ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ڏ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۝ ﴾ (نوح: ۲۳)

"اور انہوں نے (اپنے عوام سے) کہا ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑو اور ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو نہ چھوڑو۔"

اور آخر میں زچ ہو کر کہنے لگے: "اے نوح علیہ السلام! اب ہم سے جنگ و جدل نہ کر اور ہمارے اس انکار پر اپنے خدا کا جو عذاب لا سکتا ہے لے آ۔"

﴿ قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ (ہود: ۳۲)

"وہ کہنے لگے: "اے نوح (علیہ السلام) تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑا کیا" اب اس کو ختم کر" اور جو تو نے ہم سے (عذاب الٰہی کا) وعدہ کیا ہے وہ لے آ"۔

حضرت نوح علیہ السلام نے یہ سن کر ان کو جواب دیا کہ عذاب الٰہی میرے قبضہ میں نہیں ہے وہ تو اس کے قبضہ میں ہے جس نے مجھ کو رسول بنا کر بھیجا ہے، وہ چاہے گا تو یہ سب کچھ بھی ہو جائے گا۔

﴿ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ ﴾ (ہود: ۳۳)

"نوح نے کہا ضرور اگر اللہ چاہے گا تو اس عذاب کو بھی لے آئے گا اور تم اس کو تھکا دینے والے نہیں ہو"۔

بہرحال جب قوم کی ہدایت سے حضرت نوح علیہ السلام بالکل مایوس ہو گئے اور اس کی باطل کوشی اور عناد اور ہٹ دھرمی ان پر واضح ہو گئی اور قرآنی تصریح کے مطابق ساڑھے نوسو سال کی پیہم دعوت و تبلیغ کا ان پر کوئی اثر نہ دیکھا تو سخت ملول اور پریشان خاطر ہوئے تب خدائے تعالیٰ نے ان کی تسلی کے لیے فرمایا:

﴿ وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا
يَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾ (ہود: ۳۶)

"اور نوح (علیہ السلام) پر وحی کی گئی کہ جو ایمان لے آئے وہ لے آئے اب ان میں سے کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے پس ان کی حرکات پر غم نہ کر۔"

جب حضرت نوح علیہ السلام کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے ابلاغ حق میں کوتاہی نہیں ہے بلکہ خود نہ ماننے والوں کی استعداد کا قصور ہے، اور ان کی اپنی سرکشی کا نتیجہ، تب ان کے اعمال اور کمینہ حرکات سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں یہ دعا فرمائی۔

﴿وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝﴾ (نوح: ۲۶-۲۷)

"کہا نوح علیہ السلام نے: "اے پروردگار تو کافروں میں سے کسی کو بھی زمین پر باقی نہ چھوڑ اگر تو ان کو یونہی چھوڑ دے گا تو یہ تیرے بندوں کو بھی گمراہ کریں گے اور ان کی نسل بھی انہی کی طرح نافرمان پیدا ہوگی۔"

بناءِ سفینہ:

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی، اور اپنے قانون جزاء اعمال کے مطابق سرکشوں کی سرکشی اور متمردوں کے تمرد کی سزا کا اعلان کر دیا، اور حفظ ماتقدم کے لیے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو ہدایت فرمائی کہ وہ ایک کشتی تیار کریں، تاکہ اسباب ظاہری کے اعتبار سے وہ اور مومنین قانتین اس عذاب سے محفوظ رہیں، جو خدا کے نافرمانوں پر نازل ہونے والا ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے جب حکم رب میں کشتی بنانی شروع کی تو کفار نے ہنسی اڑانا اور مذاق بنانا شروع کر دیا۔ اور جب کبھی ان کا ادھر سے گزر ہوتا تو کہتے کہ "خوب! جب ہم غرق ہونے لگیں گے تب تو اور تیرے پیرو اس کشتی میں محفوظ رہ کر نجات پا جائیں گے، کیسا احمقانہ خیال ہے" حضرت نوح علیہ السلام بھی ان کو انجام کار سے غفلت اور خدا کی نافرمانی پر جرأت دیکھ کر ان ہی کے طرز پر جواب دیتے اور اپنے کام میں مشغول رہتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

﴿وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ۝﴾ (ھود: ۳۷)

"اے نوح تو ہماری حفاظت میں ہماری وحی کے مطابق سفینہ تیار کیے جا اور اب مجھ سے ان کے متعلق کچھ نہ کہو، یہ بلاشبہ غرق ہونے والے ہیں۔"

آخر سفینہ نوح (علیہ السلام) بن کر تیار ہو گیا۔ اب خدا کے وعدۂ عذاب کا وقت قریب آیا اور حضرت نوح علیہ السلام نے اس پہلی علامت کو دیکھا جس کا ذکر ان سے کیا گیا تھا، یعنی زمین کی تہہ میں سے پانی کا چشمہ ابلنا شروع ہو گیا۔ تب وحی الٰہی نے ان کو حکم سنایا کہ کشتی میں اپنے خاندان کو بیٹھنے کا حکم دو اور تمام جانداروں میں سے ہر ایک کا جوڑا بھی کشتی میں پناہ گیر ہو، اور وہ مختصر جماعت (تقریباً چالیس نفر) بھی جو تجھ پر ایمان لا چکی ہے کشتی میں سوار ہو جائے۔

جب وحی الٰہی کی تعمیل پوری ہو گئی تو اب آسمان کو حکم ہوا کہ پانی برسنا شروع ہو، اور زمین کے چشموں کو امر کیا گیا کہ وہ پوری طرح اُبل پڑیں۔ خدا کے حکم سے جب یہ سب کچھ ہوتا رہا تو کشتی بھی اس کی حفاظت میں پانی پر ایک مدت تک محفوظ تیرتی رہی

Marfat.com

تا آنکہ تمام منکرین و معاندین غرق آب ہو گئے اور خدائے تعالیٰ کے قانون "جزاء اعمال" کے مطابق اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے۔

پسر نوح علیہ السلام:

اس مقام پر ایک مسئلہ خاص طور پر قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے طوفانی عذاب کے وقت خدائے تعالیٰ سے اپنے بیٹے کی نجات کے متعلق سفارش کی اور خدائے تعالیٰ نے ان کو اس سفارش سے روک دیا، اس مسئلہ کی اہمیت قرآن عزیز کی حسب ذیل آیات سے پیدا ہوتی ہے۔

﴿وَ نَادٰی نُوۡحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَهۡلِیۡ وَ اِنَّ وَعۡدَكَ الۡحَقُّ وَ اَنۡتَ اَحۡكَمُ الۡحٰكِمِیۡنَ ۝ قَالَ یٰنُوۡحُ اِنَّهٗ لَیۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیۡرُ صَالِحٍ ٭ۚ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَیۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ اِنِّیۡۤ اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِیۡنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَسۡـَٔلَكَ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ وَ اِلَّا تَغۡفِرۡ لِیۡ وَ تَرۡحَمۡنِیۡۤ اَكُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ۝ قِیۡلَ یٰنُوۡحُ اهۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَیۡكَ وَ عَلٰۤی اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ ؕ﴾ (ہود: ۴۵۔۴۸)

"اور نوح (علیہ السلام) نے اپنے رب کو پکارا اور کہا اے پروردگار میرا بیٹا میرے اہل ہی میں سے ہے، اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو بہترین حاکموں میں سے ہے، اللہ تعالیٰ نے کہا اے نوح! یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے، یہ بدکردار ہے، پس تجھ کو ایسا سوال نہ کرنا چاہیے جس کے بارہ میں تجھ کو علم نہ ہو، میں بلاشبہ تجھ کو نصیحت کرتا ہوں کہ تو نادانوں میں سے نہ بن، نوح نے کہا: "اے رب میں بلاتردد" اس بارہ میں کہ جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو تجھ سے سوال کروں تیری پناہ چاہتا ہوں اور اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ کیا تو میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوں گا۔ نوح علیہ السلام سے کہہ دیا گیا: "اے نوح (علیہ السلام)! ہماری جانب سے تو اور تیرے ہمراہی ہماری سلامتی اور برکتوں کے ساتھ زمین پر اترو"۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے خدا کا وعدہ تھا کہ وہ ان کے اہل کو نجات دے گا، اس لیے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے (کنعان) کے لیے دعا مانگی جس پر رب العالمین کی جانب سے عتاب ہوا کہ تم کو جس شئے کا علم نہ ہو اس کے متعلق اس طرز سے سوال کرنے کا حق نہیں ہے اس پر حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور خدائے تعالیٰ سے مغفرت و رحمت طلب کی اور اس کی جانب سے بھی خواہش کے مطابق جواب ملا۔

تو اب غور طلب بات یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا سوال کس وعدہ پر مبنی تھا؟ اور آیا وہ وعدہ پورا ہوا یا نہیں اور حضرت نوح علیہ السلام کو اس وعدہ کے سمجھنے میں کس قسم کی غلط فہمی ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی تنبیہ پر انہوں نے کس طرح اصل حقیقت کو سمجھ لیا؟

اس سوال کے جواب میں حسب ذیل آیت قابل توجہ ہے۔

﴿حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوۡرُ ۙ قُلۡنَا احۡمِلۡ فِیۡهَا مِنۡ كُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ وَ اَهۡلَكَ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡهِ الۡقَوۡلُ وَ مَنۡ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیۡلٌ ۝﴾ (ہود: ۴۰)

Marfat.com

"تا آنکہ جب ہمارا حکم (عذاب) آ پہنچا اور تنور سے پانی اُبل پڑا تو ہم نے (نوح سے) کہا کہ "ہر جاندار میں سے ایک ایک جوڑا کشتی میں اٹھا لو اور اس کے علاوہ جس پر خدا کا فرمان ناطق ہو چکا ہے" اپنے اہل کو بھی اور جو تجھ پر ایمان لائے ہیں ان کو بھی اور وہ بہت تھوڑے ہیں"۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے حق تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ تم اپنی اس کشتی میں جو اہل نجات کے لیے تیار کی گئی ہے اپنے اہل کو بٹھاؤ لیکن تمہارا پورا کنبہ نجات یافتہ نہیں ہے بلکہ بعض ایسے بھی ہیں جن پر خدا کے عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے" الا من سبق علیہ القول"۔

چونکہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی بیوی کے سابقہ کافرانہ عقائد و اعمال کی بنا پر اس بات سے مایوس ہو چکے تھے کہ وہ خدائے برحق پر ایمان لائے اور توحید کی آواز پر لبیک کہے! اس لیے اس استثناء کا مصداق صرف اسی کو سمجھے اور بیٹے کی محبت میں یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ نوعمر ہے شاید کشتی میں مومنین کی صحبت سے فائدہ اٹھا کر ایمان لے آئے اور کافروں کی مجالس کے اثرات کو محو کر دے، خدائے تعالیٰ کے ارشاد ﴿وَ اَهْلَكَ﴾ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے درگاہِ الٰہی میں کنعان کی نجات کی دعا کی، مگر اللہ تعالیٰ کو اپنے جلیل القدر پیغمبر کا یہ "قیاس" پسند نہ آیا اور ان کو تنبیہ کی کہ جو ہستی خدا کی "وحی" سے ہر وقت مستفیض ہوتی رہتی ہو اس کو جذبہ محبت پدری میں اس قدر سرشار نہ ہونا چاہیے کہ وحی الٰہی کا انتظار کئے بغیر خود ہی قیاس آرائی کر کے انجام تک کا فیصلہ کر بیٹھے؟ حالانکہ وعدہ نجات صرف مومنین کے لیے مخصوص ہے اور کنعان کافروں کے ساتھ کافر ہی رہے گا، بلاشبہ تمہارا اس قسم کا سوال منصب رسالت و نبوت کے شایان شان نہیں ہے۔

گویا حضرت نوح علیہ السلام سے خدائے تعالیٰ کا یہ خطاب دراصل عتاب نہیں تھا بلکہ مشاہدۂ حقیقت کے لیے ایک پکار تھی جس کو انہوں نے سنا اور اپنی بشریت و عبدیت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ مغفرت کے طالب ہوئے اور خدا کی سلامتی اور برکت حاصل کر کے شاد کام و بامراد بنے، پس یہ سوال نہ معصیت کا سوال تھا اور نہ عصمت انبیاء کے منافی، اس لیے خطاب الٰہی نے اس کو "نادانی" سے تعبیر کیا نہ کہ گناہ اور نافرمانی سے۔

بہرحال حضرت نوح علیہ السلام کے سامنے یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ وعدہ نجات کا منشاء نسل و خاندان نہیں ہے بلکہ "ایمان باللہ" ہے، اس لیے انہوں نے اپنا رخ بدل کر کنعان کو مخاطب کیا اور اپنا منصب دعوت ادا کرتے ہوئے چاہا کہ وہ بھی "مومن" بن کر "نجات الٰہی" سے بہرہ ور ہو، مگر اس بدبخت نے جواب دیا:

﴿قَالَ سَاٰوِیْۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ ؕ﴾ (ھود: ۴۳)

"میں بہت جلد کسی پہاڑ کی پناہ لیتا ہوں کہ وہ مجھ کو غرقابی سے بچا لے گا"۔

حضرت نوح علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا:

﴿قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَیْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ ۝۴۳﴾ (ھود: ۴۳)

Marfat.com

"آج کوئی خدا کے حکم سے بچانے والا نہیں ہے صرف وہی بچے گا جس پر خدا کا رحم ہو جائے اس دوران میں ان دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی اور وہ غرق ہونے والوں میں سے ایک ہو گیا"۔

کوہ جودی:

غرض جب حکم الٰہی سے عذاب ختم ہوا تو سفینہ نوح "جودی" پر جا کر ٹھہر گیا۔

﴿وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴾ (ھود: ۴۴)

"اور حکم پورا ہوا اور کشتی جودی پر جا ٹھہری اور اعلان کر دیا گیا کہ قوم ظالمین کے لیے ہلاکت ہے"۔

توراۃ میں جودی کو اراراط کے پہاڑوں میں سے بتایا گیا ہے، اراراط درحقیقت جزیرہ کا نام ہے یعنی اس علاقہ کا نام جو فرات و دجلہ کے درمیان دیار بکر سے بغداد تک مسلسل چلا گیا ہے۔

پانی آہستہ آہستہ خشک ہونا شروع ہو گیا اور ساکنان کشتی نے دوسری بار امن و سلامتی کے ساتھ خدا کی سرزمین پر قدم رکھا، اسی بناء پر حضرت نوح علیہ السلام کا لقب "ابوالبشر ثانی" یا "آدم ثانی" (یعنی انسانوں کا دوسرا باپ) مشہور ہوا، اور غالباً اسی اعتبار سے حدیث میں ان کو "اول الرسل" کہا گیا۔

اگرچہ یہاں پہنچ کر واقعہ کی تفصیلات ختم ہو جاتی ہیں تاہم اس اہم واقعہ میں جو علمی اور تاریخی سوالات پیدا ہوتے ہیں یا پیدا کیے گئے ہیں وہ بھی قابل ذکر و مذاکرہ ہیں جو ترتیب وار درج ذیل ہیں۔

طوفان نوح علیہ السلام عام تھا یا خاص:

کیا طوفان نوح تمام کرۂ ارضی پر آیا تھا یا کسی خاص خطہ پر؟ اس کے متعلق علماء قدیم و جدید میں ہمیشہ سے دو رائیں رہی ہیں علمائے اسلام میں سے ایک جماعت علماء یہود و نصاریٰ، اور بعض ماہرین علوم فلکیات، طبقات الارض اور تاریخ طبیعات کی یہ رائے ہے کہ یہ طوفان تمام کرۂ ارضی پر نہیں آیا تھا بلکہ صرف اسی خطہ میں محدود تھا جہاں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم آباد تھی اور یہ علاقہ مساحت کے اعتبار سے ایک لاکھ چالیس ہزار کلومیٹر مربع ہوتا ہے۔

ان کے نزدیک طوفان نوح کے خاص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ طوفان عام تھا تو اس کے آثار کرۂ ارضی کے مختلف گوشوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر ملنے چاہئیں تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، نیز اس زمانہ میں انسانی آبادی بہت ہی محدود تھی اور وہی خطہ تھا جہاں حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم آباد تھی ابھی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کا سلسلہ اس سے زیادہ وسیع نہ ہوا تھا جو کہ اس علاقہ میں آباد تھا، لہٰذا وہی مستحق عذاب تھے اور ان ہی پر طوفان کا یہ عذاب بھیجا گیا، باقی کرۂ زمین کو اس سے کوئی علاقہ نہ تھا۔

اور بعض علماء اسلام اور ماہرین طبقات الارض اور علماء طبیعات کے نزدیک یہ طوفان تمام کرۂ ارضی پر حاوی تھا اور ایک یہی نہیں بلکہ ان کے خیال میں اس زمین پر متعدد ایسے طوفان آئے ہیں، ان ہی میں سے ایک یہ بھی تھا اور وہ پہلی رائے کے تسلیم کرنے والوں کو "آثار" سے متعلق سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ "جزیرہ" یا عراق عرب کی اس سرزمین کے علاوہ بلند پہاڑوں پر بھی ایسے حیوانات کے ڈھانچے اور ہڈیاں بکثرت پائی گئی ہیں جن کے متعلق ماہرین علم طبقات الارض کی یہ رائے ہے کہ یہ حیوانات مائی ہی ہیں

Marfat.com

اور صرف پانی ہی میں زندہ رہ سکتے ہیں، پانی سے باہر ایک لحہ بھی ان کی زندگی دشوار ہے، اس لیے کرۂ ارض کے مختلف پہاڑوں کی ان بلند چوٹیوں پر ان کا ثبوت اس کی دلیل ہے کہ کسی زمانہ میں پانی کا ایک ہیبت ناک طوفان آیا جس نے پہاڑوں کی ان چوٹیوں کو بھی اپنی غرقابی سے نہ چھوڑا۔

ان ہر دو خیالات و آراء کی ان تمام تفصیلات کے بعد جن کا مختصر خاکہ مضمون زیر بحث میں درج ہے اہل تحقیق کی یہ رائے ہے کہ صحیح مسلک یہی ہے کہ طوفان خاص تھا عام نہ تھا۔ اور یہ مسئلہ بھی محل نظر ہے کہ تمام کائنات انسانی صرف حضرت نوح علیہ السلام کی نسل سے ہے، اور آیت ﴿اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ﴾ (نوح: ۲۷) بھی کچھ اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

البتہ قرآن عزیز نے "سنت اللہ" کے مطابق صرف ان ہی تفصیلات پر توجہ کی ہے جو موعظت و عبرت کے لیے ضروری تھے اور باقی مباحث سے قطعاً کوئی تعرض نہیں کیا اور ان کو انسانی علوم کی ترقی کے حوالہ کر دیا، وہ تو صرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ تاریخ کا یہ واقعہ اہل عقل و شعور کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ آج سے ہزاروں سال قبل ایک قوم نے خدا کی نافرمانی پر اصرار کیا اور اس کے بھیجے ہوئے ہادی حضرت نوح علیہ السلام کے رشد و ہدایت کے پیغام کو جھٹلایا، ٹھکرایا، اور قبول کرنے سے انکار کر دیا تو خدائے تعالیٰ نے اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا اور ایسے سرکشوں اور متمردوں کو طوفان باد و باراں میں غرق کر کے تباہ و برباد کر دیا، اور اسی حالت میں حضرت نوح اور مختصر سی ایمان دار جماعت کو محفوظ رکھ کر نجات دی۔ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾

پسر نوح (علیہ السلام) کی نسبی بحث:

بعض علماء نے حضرت نوح علیہ السلام کے اس بیٹے کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ حقیقی بیٹا نہ تھا اور پھر اس بارہ میں دو جدا جدا دعوے کئے ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ "ربیب" تھا یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کے پہلے شوہر کا لڑکا تھا جو حضرت نوح علیہ السلام سے نکاح کے بعد ان کی آغوش میں پلا بڑھا، اور دوسری جماعت حضرت نوح علیہ السلام کی اس کافرہ بیوی پر خیانت عصمت کا الزام لگاتی ہے۔

ان علماء کو ان غیر مستند اور دور از صواب تاویلوں کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ ان کے خیال میں پیغمبر کا بیٹا کافر ہو، یہ بہت مستبعد اور عجیب معلوم ہوتا ہے؟

مگر تعجب ہے کہ وہ اس نص قرآنی کو کیوں فراموش کر جاتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ "آزر" بت تراش و بت پرست کافر تھے، پس اگر ایک جلیل القدر پیغمبر کے باپ کے کفر سے رسول خدا کی جلالت و عظمت اور منصب رسالت و نبوت میں مطلق فرق نہیں آتا تو پھر عظیم المرتبت رسول و نبی کے بیٹے کے کفر سے اس پیغمبر کی عظمت و جلالت قدر میں کیا نقص آسکتا ہے بلکہ ایک حقیقت بیں نگاہ اور حقیقت شناس کے نزدیک تو یہ رب العالمین اور خالق کائنات کی قدرت کاملہ کا مظہر اتم ہے کہ وہ بنجر زمین میں گلاب اُگا دیتا، اور گلاب کے مہکتے ہوئے پھولوں کے ساتھ خار پیدا کر دیتا ہے۔ ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾

پس جبکہ قرآن عزیز نے یہ تصریح کی ہے کہ کنعان حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا تھا تو بلاوجہ ان رکیک اور بے سند تاویلات کی کیا حاجت؟

ایک اخلاقی مسئلہ:

اس مقام پر اگرچہ علامہ عبدالوہاب نجار نے قرآن عزیز کی تصریح ہی کو تسلیم کیا ہے، تاہم ان کے نزدیک حضرت نوح علیہ السلام

Marfat.com

کی بیوی بصراحت قرآن اگر کافر ہو سکتی ہے تو اس پر خیانت عصمت کا الزام عائد کرنا بھی کوئی ناواجب بات نہیں ہے۔

مگر مجھ کو ان جیسے تمام مقامات میں ان بزرگوں سے ہمیشہ اختلاف رہتا ہے اور میں ورطۂ حیرت و تعجب میں پڑ جاتا ہوں کہ ان علماء کے پیش نظر "نبی و رسول" کے معاملہ میں ان تمام نزاکتوں کا لحاظ کیوں نہیں، جو اخلاق، معاشرت، اور تہذیب و تمدن کی زندگی سے وابستہ ہیں۔

مثلاً اسی مقام کو لیجئے کہ صاحب قصص الانبیاء اور بعض دوسرے علماء کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی جب کافر ہو سکتی ہے تو خائن عصمت کیوں نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ دوسرا عمل پہلے سے کم درجہ رکھتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس کو تسلیم کر لینے کے باوجود کہ کفر زنا سے بہت زیادہ برا اور قبیح عمل ہے، مجھے اس سے سخت اختلاف ہے کہ کسی پیغمبر و نبی کی بیوی ان کے حبالۂ عقد میں رہتے ہوئے خائن عصمت ہو اور نبی و رسول اس کی اس حرکت سے غافل رہے، اس لیے کہ اگر کسی نیک اور صالح انسان کی بیوی شوہر سے چھپ کر اس قسم کی بدعملی میں مبتلاء ہو جائے تو یہ ممکن ہے کیونکہ وہ ناواقف رہ سکتا ہے اور جب تک اس کے علم میں یہ بدعملی نہ آئے اس کی ثقاہت و تقویٰ پر کوئی حرف نہیں آتا، مگر ایک نبی و رسول کا معاملہ اس سے جدا ہے، اس کے پاس صبح و شام خدائے برتر کی وحی آتی ہے اور وہ خدائے برتر کی ہمکلامی سے مشرف ہوتا ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی کے گھر میں ایک فاحشہ و زانیہ اس کی رفیق حیات بھی رہے اور خدا کی وحی اس سے قطعاً خاموش ہو۔

خدا کے برگزیدہ پیغمبر جب اصلاح و ہدایت کے لیے بھیجے جاتے ہیں تو ظاہری و باطنی ہر قسم کے عیوب سے معصوم اور پاک رکھے جاتے ہیں تاکہ کوئی ایک شخص بھی ان کے حسب و نسب اور اخلاق و معاشرت پر نکتہ چینی نہ کر سکے۔ لہٰذا یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وحی الٰہی اور رب اکبر کی ہمکلامی کے مدعی کے گھر میں بداخلاقی کا جریمہ مستقل ہو رہا ہو اور اس کو بے خبر اور غافل چھوڑ دیا جائے۔

ہمارے سامنے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ دلیل راہ ہے، ان ہوئی کو ہوئی کرنے والوں اور بے پر کی اڑانے والوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سمع مبارک نے بھی سنا۔ چند روز بدبخت و خوش بخت بننے والوں کے لیے آزمائش کے بھی ملے۔ مگر آخر کار وحی الٰہی نے معاملہ کو اس طرح صاف کر دیا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر رہ گیا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ (العیاذ باللہ) پیغمبر اور نبی کی بیوی سے زنا سرزد ہو جائے کیونکہ وہ نبی کی طرح معصوم نہیں ہے لیکن یہ محال اور ناممکن ہے کہ اس ارتکاب کے بعد وہ نبی کی بیوی رہے اور وحی الٰہی نبی اور پیغمبر کو اس کی بداخلاقی سے غافل رکھے۔

کفر، بلاشبہ سب سے بڑا جریمہ اور گناہ ہے لیکن وہ معاشرتی اور اخلاقی بول چال میں بداخلاقی اور فحش نہیں ہے بلکہ ایک عقیدہ ہے جو عقیدۂ بد کہلانے کا مستحق ہے، اس لیے بعض اسلامی مصالح کی بناء پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کی شریعتوں اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں کافر سے مناکحت کو ممنوع قرار نہیں دیا گیا البتہ مدنی زندگی کے دور میں قرآن عزیز کی نص نے مشرک و مسلم کے درمیان رشتۂ مناکحت کو ہمیشہ کے لیے ممنوع قرار دے دیا، لیکن زنا کسی حال اور کسی وقت میں بھی جائز نہیں رکھا گیا۔

پس اس معاملہ میں کفر و زنا کے تقابل کا سوال صحیح نہیں ہو سکتا بلکہ معاشرتی بدکرداری و نیک کرداری کی بقاء و قیام کا سوال پیدا ہوتا ہے لہٰذا میرے نزدیک حضرت نوح علیہ السلام کی زندگی پاک کے ساتھ زانیہ رفیقہ کا تعلق ناممکن تھا۔ اگر امراۃ نوح ایک مرتبہ بھی ایسا اقدام کرتی تو وحی الٰہی فوراً نبی کو مطلع کر کے تفریق کرا دیتی، یا کم از کم ﴿تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾ پر جا کر معاملہ ٹھہرتا۔ میں اس سے آگے بڑھ

کر یہ جرأت کرتا ہوں کہ اگر خدا نہ کردہ کسی روایت میں بھی اس قسم کے معاملات کا اشارہ پایا جاتا تو بھی ہمارا فرض تھا کہ اس کی صحیح توجیہ تلاش کر کے اصل حقیقت کو سامنے لاتے، چہ جائیکہ نہ قرآن عزیز اس کے متعلق کچھ کہتا ہے اور نہ صحیح وضعیف روایات میں سے کوئی روایت حدیث وسیرت اس کا ذکر کرتی ہے تو پھر خواہ مخواہ اس قسم کی دور از کار تاویلات سے عوام ومتوسطین موافقین ومخالفین کے دل ودماغ پر غلط نقوش نقش کرنے سے بجز مضرت ونقصان کے اور کیا حاصل ہے۔

بہرحال صحیح یہی ہے کہ کنعان حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا تھا مگر اس پر حضرت نوح علیہ السلام کی ہدایت ورشد کی جگہ اپنی کافر والدہ کی آغوش تربیت اور خاندان وقوم کے ماحول نے برا اثر ڈالا، اور وہ نبی کا بیٹا ہونے کے باوجود کافر ہی رہا۔

پسر نوح بابداں بہ نشست   خاندان نبوتش گم شد

نبی وپیغمبر کا کام فقط رشد وہدایت کا پیغام پہنچانا ہے۔ اولاد، بیوی، خاندان، قبیلہ اور قوم پر اس کو زبردستی عائد کرنا اور ان کے قلوب کو پلٹ دینا نہیں ہے۔

﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴾ (غاشیہ: ۲۲)

"تو ان (کافروں پر) مسلط نہیں کیا گیا۔"

﴿وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ﴾ (ق: ۴۵)

"اور تو ان کو (قبول حق کے لیے) مجبور نہیں کر سکتا۔"

ارباب تاریخ نے حضرت نوح علیہ السلام کے اس بیٹے کا نام کنعان بتایا، یہ تورات کی روایت کے مطابق ہے، قرآن عزیز اس کے نام کی صراحت سے ساکت ہے جو نفس واقعہ کے لیے غیر ضروری تھا۔

چند ضمنی مسائل:

① طوفان نوح علیہ السلام خاص حصہ زمین سے وابستہ رہا ہو یا تمام کرۂ زمین سے، مذاہب عالم کی تاریخ اور علم آثار ارض سے یہ قطعی ثابت ہو چکا ہے کہ یہ واقعہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے، اور اس کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ تورات کے علاوہ قدیم ہندو مذہب کی کتابوں میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے اور اگرچہ قرآن عزیز کے بیان کیے ہوئے سادہ اور صاف واقعات کے مقابلہ میں ان میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم نفس واقعہ کے اظہار میں یہ سب متفق نظر آتی ہیں۔

مولانا سید ابو نصر احمد حسین بھوپالی نے اپنی کتاب "تاریخ الادب الہندی" میں تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو نقل کیا ہے، جس کا عنوان ہے "برہمانا داو بانیشاء" اس میں حضرت نوح علیہ السلام کو مانو کہا گیا ہے، جس کے معنی "خدا کا بیٹا" یا "نسل انسانی کا جد اعلیٰ" بتائے جاتے ہیں۔

② قرآن عزیز نے صراحت کی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم میں ساڑھے نو سو (۹۵۰) سال تبلیغ ودعوت کا فرض انجام دیا۔

Marfat.com

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا﴾ (عنکبوت: ۱۴)

"اور بلاشبہ ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اس کی قوم کی جانب رسول بنا کر بھیجا، پس وہ رہا ان میں پچاس کم ایک ہزار سال۔"

یہ عمر، موجودہ عمر طبعی کے اعتبار سے بعید از عقل معلوم ہوتی ہے لیکن محال اور ناممکن نہیں ہے اس لیے کہ کائنات کی ابتداء میں ہموم وافکار اور امراض کی یہ فراوانی نہیں تھی جو چند ہزار برسوں میں انسانی تمدن کے مصنوعی سامانوں نے پیدا کر دی ہے، اور تاریخ قدیم بھی یہ اقرار کرتی ہے کہ چند ہزار سال قبل کی طبعی عمر کا تناسب موجودہ تناسب سے بہت زیادہ تھا۔ نیز حضرت نوح علیہ السلام کی عمر طبعی کا معاملہ اسی قسم کی مستثنیات میں سے ہے جو انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں موہبت الٰہی اور آیت اللہ کی فہرست میں شمار ہوتی ہیں، اور جن کی حکمت وغایت کا معاملہ خود خدائے تعالیٰ کے سپرد ہے۔

قرآن عزیز نے کسی نبی اور پیغمبر کی دعوت وتبلیغ کی مدت کا صراحت کے ساتھ اس طرح تذکرہ نہیں فرمایا جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ میں مذکور ہے، لہٰذا آج تقریباً سات ہزار سال قبل کی طویل عمر کے تاریخی شواہد کے اعتبار سے اگر اس کو صحیح تسلیم کیا جائے، تو اس کی پوری گنجائش ہے اور اگر تاریخ کی ان شہادتوں کو غیر وقیع مان کر انکار کر دیا جائے تب بھی اس واقعہ کو مخصوص حالات کے زیر اثر ایک عطیہ الٰہی سمجھنا چاہیے جو رسول اور پیغمبر کی دعوت وتبلیغ کی حکمتوں سے وابستہ ہے، حق اور صحیح مسلک یہی ہے اور اس مدت کو گھٹانے کے لیے دور از کار تاویلات کی قطعاً ضرورت نہیں۔

مشہور شاعر ابو العلاء معری اپنے چند اشعار میں یہ بیان کرتا ہے کہ قدیم زمانہ میں یہ دستور تھا کہ لوگ سنہ، عام (سال) بول کر شہر (مہینہ) مراد لیا کرتے تھے، اس قول کے پیش نظر بعض مؤرخین کا یہ خیال ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغی خدمات کی عمر اسی سال ہوتی ہے اور ان کی کل عمر ڈیڑھ سو سال سے آگے نہیں بڑھتی۔

لیکن یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اگر ابو العلاء کا یہ قول تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ عرب کے کسی غیر معروف حساب کا تذکرہ سمجھا جائے گا کیونکہ قرآن عزیز کے نزول کے وقت عرب کے کسی قبیلہ کے متعلق یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ (سنہ) یا عام بول کر (شہر مہینہ) مراد لیا کرتے تھے لہٰذا قرآن عزیز کی بیان کردہ تعبیر پر اس قول کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔

نیز سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ قرآن عزیز نے جس انداز میں اس مدت کا ذکر کیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نوح علیہ السلام کی غیر معمولی تبلیغی مدت کے اظہار کو خاص اہمیت دیتا رہتا ہے، ورنہ قرآن عزیز کی عام سنت یہ ہے کہ وہ سخت اہم ضرورت کے بغیر واقعات وحالات کی اس قسم کی جزئیات سے بہت ہی کم تعرض کرتا ہے۔

③ بعض مفسرین نے اسرائیلیات (تورات و یہود کی روایات) سے یہ نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طوفان نوح علیہ السلام سے چالیس سال قبل قوم نوح کی عورتوں کو بانجھ کر دیا تھا کہ جدید نسل عالم وجود میں نہ آئے۔ مگر یہ روایت "غپ شپ" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور غالباً اسے اس لیے گھڑا گیا ہے کہ یہ اعتراض پیدا نہ ہو کہ طوفان نوح کی صورت میں بچوں نے کیا قصور کیا تھا کہ وہ لقمہ اجل ہو گئے۔

ان احتیاط پسند حضرات کو شاید یہ بات فراموش ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کا قانون جس کا نام (سنۃ اللہ) ہے اس بارہ میں کیا ہے؟ ورنہ ان کو ایسی لایعنی روایت کے بیان کی ضرورت پیش نہ آتی جو اکثر یہود کے غلط افکار وعقائد کی مخلوق ہوتی ہیں۔

Marfat.com

کائنات ہست و بود میں (عادۃ اللہ) یہ جاری ہے کہ امراء، وباء، طوفان اور زلزلے جیسے امور جب بھی کسی سبب سے نمودار ہوتے ہیں "خواہ وہ عذاب کے لیے ہوں یا عام حالات زندگی کے اعتبار سے کسی خارجی سبب کے ذریعہ ظاہر ہوئے ہوں" تو جس مقام پر وہ نازل ہوتے ہیں، وہاں کی آبادی میں نیک و بد، ولی و شیطان، زاہد و عابد، اور فاسق و فاجر کے مابین کوئی تمیز نہیں کرتے بلکہ اسباب عادیہ کے زیر اثر مسببات کو وجود میں لانے کے لیے منجانب اللہ مامور ہیں، اور دنیوی زندگی کے اعتبار سے ان کی لپیٹ میں ہر وہ انسان آ جاتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے ان اسباب کا مسبب بن گیا ہے۔

البتہ عالم آخرت کے اعتبار سے یہ امتیاز نمایاں رہتا ہے کہ فاسق و فاجر اور خدا کے دشمن کے لیے یہ اسباب عذاب الٰہی بن جاتے ہیں اور مطیع و فرماں بردار اور نیک کردار انسان کے لیے موجب سعادت اور درجات عالیہ کا مستوجب ہوتے ہیں۔

کیا ہماری نگاہیں روزمرہ یہ مشاہدہ نہیں کرتیں کہ جب زلزلہ آتا ہے تو نیک و بد دونوں پر یکساں اثر کرتا ہے، وباء پھیلتی ہے تو نیک کردار و بدکردار دونوں ہی اس کی زد میں آ جاتے ہیں اور دونوں کے رشتہ حیات کے لیے وہ یکساں مہلک ثابت ہوتی ہے۔

البتہ یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ جب کبھی اس قسم کا عذاب نبی اور پیغمبر کی پیہم نافرمانی کی وجہ سے کسی قوم پر نازل ہوتا ہے تو پیغمبر کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع دے دی جاتی ہے اور یہ حکم ہو جاتا ہے کہ وہ مع اپنے پیروؤں کے جو اسلام کے دامن سے وابستہ ہو گئے ہیں عذاب کی اس بستی سے باہر چلا جائے، اور بانگ دہل یہ کہہ کر جائے کہ یا قوم اس کے لائے ہوئے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دے ورنہ خدا کے عذاب کو قبول کرے، اور اس طرح مومنین اس عذاب کی زد سے محفوظ رہتے ہیں۔

بہرحال مفسرین نے جس احتیاط کی خاطر اسرائیلیات کے اس ذخیرہ سے مدد لینی چاہی ہے وہ قطعاً بے ضرورت ہے۔

پس طوفان نوح علیہ السلام کے مرد و عورت بوڑھے جوان، بچے اور بچیاں سب ہی طوفان کی ہلاکت خیزی کا شکار ہوئے اور دنیائے کفر کا وہ حصہ سب ہی برباد کر دیا گیا، اب یہ معاملہ خدا کے سپرد ہے کہ جن عاقل و بالغ انسانوں نے نافرمانی کی تھی ان کے حق میں یہ دائمی اور سرمدی عذاب بنے اور جو معصوم اور غیر عاقل تھے وہ آخرت کے عذاب سے مامون و محفوظ قرار پائیں۔

④ سفینہ نوح علیہ السلام کے بعد کس مقام پر ٹھہرا؟ توراۃ نے اس کا نام ارارات بتایا ہے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ اس سرزمین سے وابستہ تھی جو دجلہ اور فرات کے درمیان واقع ہے اور یہ دونوں دریا آرمینیا کے پہاڑوں سے نکلے ہیں، اور جدا جدا بہہ کر عراق کے حصہ زیریں میں آ کر مل گئے ہیں، پھر خلیج فارس میں سمندر میں جا گرے ہیں، آرمینیا کے یہ پہاڑ ارارات کے علاقہ میں واقع ہیں، اسی لیے توراۃ میں ان کو ارارات کا پہاڑ کہا ہے، مگر قرآن عزیز نے اس پورے علاقہ کی بجائے صرف اس خاص مقام کا تذکرہ کیا ہے جہاں کشتی جا کر ٹھہری تھی یعنی جودی کا، توراۃ کے شارحین کا یہ خیال ہے کہ جودی اس سلسلہ کوہ کا نام ہے جو ارارات اور جارجیا کے پہاڑی سلسلہ کو باہم ملاتا ہے اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سکندر اعظم کے زمانہ کی یونانی تحریرات بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں، اور اس تاریخی واقعہ کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آٹھویں صدی مسیحی تک اس جگہ ایک معبد اور ہیکل موجود تھا جو "کشتی کا معبد" کہا جاتا تھا۔

⑤ ایک مفسر نے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کنعان کے نجات نہ پانے کے متعلق لطیف اشارہ کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر اور مستجاب الدعوات تھے، انہوں نے دعاء اور بددعاء دونوں حالتوں میں خود اپنے بیٹے کو فراموش کر

Marfat.com

دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ کافر بیٹے کی سرکشی، پاداش عمل کی صورت میں نمودار ہوئی اور وہ بھی ہالکین کے ساتھ غرق دریا ہو کر رہ گیا۔

حضرت نوح علیہ السلام نے جبکہ وہ قوم کو راہ راست پر لانے سے عاجز آ گئے تھے سب سے پہلے یہ دعاء کی:

﴿وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِينَ دَيَّارًا ۝ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوٓا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝﴾ (نوح: ۲۶۔۲۷)

"اور کہا نوح علیہ السلام نے اے پروردگار! تو اس زمین پر کسی بسنے والے کافر کو زندہ نہ چھوڑ اس لیے کہ اگر تو ان کو زندہ چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کرتے رہیں گے اور ان کی اولاد کا سلسلہ بھی گمراہی اور کفر ہی پر قائم رہے گا۔"

اور یہ قطعاً فراموش کر دیا کہ اس موقع پر کنعان کو مستثنیٰ کر کے اس کے لیے قبول ہدایت کی دُعاء مانگنا چاہیے یا اس وقت ان کو بیٹے کے کفر کا علم ہی نہ تھا۔ دوسری مرتبہ جناب باری تعالیٰ میں یہ دُعاء کی:

﴿رَّبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَن دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ﴾ (نوح: ۲۸)

"اے پروردگار مجھ کو اور میرے ماں باپ کو بخش دے اور اس شخص کو بھی بخشش سے نواز جو مومن ہو کر میرے گھر میں داخل ہوا اور مومنین و مومنات کو بھی بخش دے۔"

اس موقعہ پر بھی انہوں نے کنعان کا استثناء نہیں کیا اور اس کے مومن ہو کر گھر میں داخل ہونے کی دعاء نہیں فرمائی۔

تیسری مرتبہ پھر یہ دعاء کی:

﴿وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِينَ إِلَّا تَبَارًا ۝﴾ (نوح: ۲۸)

"اور ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کچھ اضافہ نہ کر۔"

کنعان ظالم تھا اس لیے کہ کافر تھا، موقعہ تھا کہ استثناء کر کے اس کے لیے ظالم نہ رہنے کی دعاء بھی فرما لیتے اور اگر معلوم نہ تھا تو یہ بدقسمت بیٹے کی بدقسمتی پر ازلی مہر تھی جو ثابت ہو کر رہی۔

پس جب وقت قبولیت دعاء آ پہنچا اور کنعان کی سرکشی بدستور رہی تو اب محبت پدری کا جوش خدا کے عادلانہ فیصلہ کے سامنے نہ ٹھہر سکا، اور اس کی نجات کی دعاء پر اپنی نادانی کے اعتراف کے ساتھ عذر خواہی کرنی پڑی، اور بایں ہمہ جلالت قدر خدا کے سامنے اپنی بندگی کے اظہار ہی کو بہتر سمجھ کر عبد کامل ہونے کا ثبوت پیش فرمایا، اور درگاہِ الٰہی سے شرف مغفرت اور قربت الٰہی کو حاصل کیا۔

اہم نتائج:

① ہر ایک انسان اپنے کردار و عمل کا خود ہی جواب دہ ہے، اس لیے باپ کی بزرگی بیٹے کی نافرمانی کا مداوا اور علاج نہیں بن سکتی ورنہ بیٹے کی سعادت باپ کی سرکشی کا بدل ہو سکتی ہے، حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت و پیغمبری کنعان کے کفر کی پاداش کے آڑے نہ آ سکی اور حضرت ابراہیم کی پیغمبرانہ جلالت قدر شرک آزر کے لیے نجات کا باعث نہ ہو سکی۔

﴿كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهِ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۴) "ہر شخص اپنے اپنے ڈھنگ پر کام کرتا ہے۔"

② بُری صحبت زہر ہلاہل سے بھی زیادہ قاتل ہے اور اس کا ثمرہ ونتیجہ ذلت وخسران اور تباہی کے علاوہ کچھ نہیں ہے، انسان کے لیے جس طرح نیکی ضروری شئے ہے اس سے زیادہ صحبت نیکاں ضروری ہے، اور جس طرح بدی سے بچنا اس کی زندگی کا نمایاں امتیاز ہے اس سے کہیں زیادہ بروں کی صحبت سے خود کو بچانا ضروری ہے۔

پسر نوح بابداں بہ نشست خاندان نبوتش گم شد
سگ اصحاب کہف روزے چند پئے نیکاں گرفت مردم شد
صحبت صالح ترا صالح کند صحبت طالح ترا طالح کند

③ خدائے تعالیٰ پر صحیح اعتماد اور بھروسہ کے ساتھ ظاہری اسباب کا استعمال توکل کے منافی نہیں ہے بلکہ توکل علی اللہ کے لیے صحیح طریق کار ہے، تب ہی تو طوفان نوح سے بچنے کے لیے کشتی نوح ضروری ٹھہری۔

④ انبیاء علیہم السلام سے "پیغمبر خدا اور معصوم ہونے کے باوجود" بہ تقاضائے بشریت لغزش ہو سکتی ہے مگر وہ اس پر قائم نہیں رہتے بلکہ منجانب اللہ ان کو تنبیہ کر دی جاتی ہے اور اس سے ہٹا لیا جاتا ہے، حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات اس کے لیے شاہد عدل ہیں، نیز وہ عالم الغیب بھی نہیں ہوتے جیسا کہ اسی واقعہ میں ﴿فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ﴾ سے واضح ہے۔

⑤ اگرچہ پاداش علم کا خدائی قانون کائنات کے ہر گوشہ میں اپنا کام کر رہا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر جرم اور ہر طاعت کی سزا یا جزاء اسی عالم میں مل جائے، کیونکہ یہ کائنات عمل کی کشت زار ہے اور پاداش کردار کے لیے معاد اور عالم آخرت کو مخصوص کیا گیا ہے تاہم ظلم اور غرور ان دو بدعملیوں کی سزا کسی نہ کسی نہج سے یہاں دنیا میں بھی ضرور ملتی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ظالم اور متکبر اپنی موت سے قبل ہی اپنے ظلم و کبر کی کچھ نہ کچھ سزا ضرور پاتا اور ذلت و نامرادی کا منہ دیکھتا ہے، چنانچہ خدا کے سچے پیغمبروں سے اُلجھنے والی قوموں اور تاریخ کی ظالم ومغرور ہستیوں کی عبرت ناک ہلاکت و بربادی کی داستانیں اس دعوے کی بہترین دلیل ہیں۔

Marfat.com

حضرت ادریس علیہ السلام

○ قرآن عزیز میں ذکر مبارک ○ نام ونسب ○ اختلاف روایات ○ نبوت
○ تبلیغ وتعلیم ○ فلاسفہ کی بے سند باتیں ○ محاکمہ۔

حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر قرآن میں:

قرآن عزیز میں حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر صرف دو جگہ آیا ہے، سورۂ مریم میں اور سورۂ انبیاء میں۔

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۙ وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ (مریم: ۵۶۔۵۷)

"اور یاد کر قرآن میں ادریس (علیہ السلام) کو بلاشبہ وہ تھے سچے نبی اور بلند کیا ہم نے ان کا مقام۔"

﴿وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (الانبیاء: ۸۵)

"اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل ان میں سے ہر ایک تھا صبر کرنے والا۔"

نام ونسب اور زمانہ:

حضرت ادریس علیہ السلام کے نام، نسب اور زمانہ کے متعلق مؤرخین کو سخت اختلاف ہے اور تمام اختلافی وجوہ کو سامنے رکھنے کے بعد بھی کوئی فیصلہ کن یا کم از کم راجح رائے نہیں قائم کی جاسکتی، وجہ یہ ہے کہ قرآن عزیز نے تو اپنے مقصد رشد و ہدایت کے پیش نظر تاریخی بحث سے جدا ہو کر صرف ان کی نبوت، رفعت مرتبت اور ان کی صفات عالیہ کا ذکر کیا ہے اور اسی طرح حدیثی روایات بھی اس سے آگے نہیں جاتیں، اس لیے اس سلسلہ میں جو کچھ بھی ہے وہ اسرائیلی روایات ہیں اور وہ بھی تضاد و اختلاف سے معمور، ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ نوح علیہ السلام کے جد امجد ہیں، اور ان کا نام اخنوخ ہے اور ادریس لقب ہے یا عربی زبان میں ادریس اور عبرانی یا سریانی میں ان کا نام اخنوخ ہے اور ان کا نسب نامہ یہ ہے۔

خنوخ یا اخنوخ (ادریس) بن یارد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم علیہ السلام، ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان اسی جانب ہے اور دوسری جماعت کا خیال ہے کہ وہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہیں اور الیاس و ادریس ایک ہی ہستی کے نام اور لقب ہیں اور ان دونوں روایات کے پیش نظر بعض علماء نے یہ تطبیق دینے کی سعی کی ہے کہ جد نوح علیہ السلام کا نام اخنوخ ہے اور ادریس لقب اور بنی اسرائیل کے پیغمبر کا نام ادریس ہے اور الیاس لقب، مگر یہ رائے بے سند اور بے دلیل ہے، بلکہ قرآن عزیز کا الیاس اور ادریس کو جدا

Marfat.com

جدا بیان کرنا شاید اس کو متحمل نہ ہو سکے۔ ❶

صحیح ابن حبان میں روایت ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم کو استعمال کیا، ایک حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے کسی نے رمل کے خطوط کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ علم ایک نبی کو دیا گیا تھا، پس اگر کسی شخص کے نقوش اس کے مطابق آجاتے ہیں تو نشانہ صحیح بیٹھ جاتا ہے ورنہ نہیں۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر ان روایات کے ساتھ یہ بھی نقل فرماتے ہیں کہ بہت سے علماء تفسیر و احکام کا یہ خیال ہے کہ حضرت ادریس ہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے رمل کے کلمات ادا کئے ❷ اور وہ ان کو "ہرمس ❸ الہرامسہ" کا لقب دیتے ہیں اور ان کی جانب بہت سی غلط باتیں اسی طرح منسوب کرتے ہیں جس طرح ان کے علاوہ بہت سے انبیاء، علماء حکماء اور اولیاء اللہ کے متعلق منسوب کی گئی ہیں۔

معراج کی صحیحین ❹ والی حدیث میں صرف اسی قدر ذکر ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ادریس علیہ السلام سے چوتھے آسمان پر ملاقات کی۔ مگر مشہور مفسر ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں ہلال بن یساف کی سند سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کعب احبار سے دریافت کیا کہ حضرت ادریس علیہ السلام سے متعلق اس آیت ﴿وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ کا کیا مطلب ہے؟ تو کعب نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریس علیہ السلام پر ایک مرتبہ یہ وحی نازل فرمائی۔ اے ادریس (علیہ السلام) تمام اہل دنیا جس قدر روزانہ نیک عمل کریں گے ان سب کے برابر میں تجھ کو ہر دن اجر عطا کروں گا۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے یہ سنا تو ان کی یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرے اعمال میں روز افزوں اضافہ ہو اور اس لیے عمر کا حصہ طویل ہو جائے تو اچھا ہے، انہوں نے وحی الٰہی اور اپنے اس خیال کو ایک رفیق فرشتہ پر ظاہر کر کے کہا کہ اس معاملہ میں فرشتہ موت سے گفتگو کرو تا کہ مجھ کو نیک اعمال کے اضافہ کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے، اس فرشتہ نے جب یہ سنا تو حضرت ادریس علیہ السلام کو اپنے بازوؤں پر بٹھا کر لے اُڑا، جب یہ چوتھے آسمان سے گزر رہے تھے تو فرشتہ موت زمین کے لیے اتر رہا تھا وہیں دونوں کی ملاقات ہوئی، دوست فرشتہ نے فرشتہ موت سے حضرت ادریس علیہ السلام کے معاملہ کے متعلق گفتگو کی، فرشتہ موت نے دریافت کیا۔ ادریس ہیں کہاں؟ اس نے کہا میری پشت پر سوار ہیں، فرشتہ موت کہنے لگا درگاہِ الٰہی سے یہ حکم ہوا ہے کہ ادریس علیہ السلام کی روح چوتھے آسمان پر قبض کروں، اس لیے میں سخت حیرت و تعجب میں تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے جبکہ ادریس علیہ السلام زمین میں ہیں، اسی وقت فرشتہ موت نے حضرت ادریس علیہ السلام کی روح قبض کر لی۔

یہ واقعہ نقل کر کے کعب احبار نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ﴿وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ کی یہی تفسیر ہے، ابن جریر رحمہ اللہ کی طرح ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

ان ہر دو نقول کو روایت کرنے کے بعد حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ سب اسرائیلی خرافات ہیں اور ان میں

---

❶ ان اختلافات کے مطالعہ کے بعد غالباً آپ اس نوٹ سے اتفاق فرمائیں گے جو صفحہ ۵۸ پر درج ہے، حضرت ادریس سے متعلق مزید اختلافی بحث کے لئے فتح الباری جلد ۶ ص ۲۸۸ اور البدایہ والنہایہ ابن کثیر ص ۳۶۔۳۷ قابل مطالعہ ہے۔

❷ البدایہ والنہایہ ابن کثیر جلد اول ص ۹۹۔

❸ ہرمس علم نجوم کے ماہر عالم کو کہتے ہیں، اس لئے ہرمس الہرامسہ کے معنی یہ ہیں کہ ماہرین علم نجوم کا استاذ اول، ہرمیس یونان کا ایک مشہور منجم گذرا ہے۔

❹ صحیح بخاری باب الاسراء، مسلم جلد اول باب الاسراء۔

Marfat.com

روایتی اعتبار سے بھی "نکارت" یعنی نا قابل اعتبار اچنبھا ہے، اس لیے صحیح تفسیر وہی ہے جو آیت کے ترجمہ میں بیان کی گئی۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ الیاس علیہ السلام نبی کا نام ہی ادریس علیہ السلام ہے اور ان کے اس قول کی وجہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جو زہری رحمۃ اللہ علیہ نے معراج کے سلسلہ میں بیان کی ہے اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء علیہم السلام کی آسمان پر ملاقات کا جو ذکر ہے اس میں کہا گیا ہے کہ جب آپ کی ملاقات حضرت ادریس علیہ السلام سے ہوئی تو انہوں نے فرمایا: "مرحبا بالاخ الصالح" (برادر نیک تمہارا آنا مبارک) پس اگر حضرت ادریس، اخنوخ ہوتے تو حضرت آدم علیہ السلام و حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح "بالابن الصالح" کہتے یعنی نیک بھائی کی جگہ "نیک بیٹے" کے ساتھ خطاب کرتے۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ دلیل کمزور ہے اس لیے کہ اوّل تو یہ امکان ہے کہ اس طویل حدیث میں راوی الفاظ کی پوری حفاظت نہ کر سکا ہو، دوم ہو سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت قدر اور رفعت مرتبت کے پیش نظر انہوں نے پدری انتساب کو نمایاں نہ کیا ہو اور از راہ تواضع برادرانہ حیثیت کو ہی ظاہر کرنا مناسب سمجھا ہو۔

رہا حضرت آدم علیہ السلام و حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاملہ سو ایک ابوالبشر ہیں اور دوسرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ جلیل القدر اور رفیع الشان پیغمبر جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے: ﴿فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا﴾ (آل عمران: ۹۵)۔ لہٰذا ان کا "ابن" کے ساتھ خطاب کرنا ہر طرح موزوں اور برمحل ہے۔

ابن کثیر نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام سے قبل کے نبی نہیں ہیں بلکہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے ایک نبی ہیں، اور الیاس ہی ادریس علیہ السلام ہیں۔

تورات میں ان مقدس نبی کے متعلق صرف اسی قدر لکھا ہے:

"اور حنوک (اخنوخ) پینسٹھ برس کا ہوا کہ اس سے متوشلح پیدا ہوا اور متوشلح کی پیدائش کے بعد حنوک تین سو برس خدا کے ساتھ چلتا تھا، اور اس سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں اور حنوک کی ساری عمر تین سو پینسٹھ برس کی ہوئی اور حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا، اور غائب ہو گیا، اس لیے کہ خدا نے اسے لے لیا"۔ [1]

حضرت ادریس علیہ السلام حکماء اور فلاسفہ کی نظر میں:

علامہ جمال الدین قفطی نے تاریخ الحکماء [2] میں حضرت ادریس علیہ السلام کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے، حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق علماء تفسیر اور ارباب تاریخ و قصص نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ بہت مشہور ہے، اس لیے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں، البتہ حکماء اور فلاسفہ نے خصوصیت کے ساتھ ان کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت ادریس علیہ السلام کا مولد و منشاء (جائے ولادت و پرورش) کہا ہے، اور انہوں نے نبوت سے پہلے کس سے علم حاصل

[1] باب پیدائش آیت ۲۱-۲۴

[2] اس تاریخ کا پورا نام "المنتخبات الملتقطات من کتاب اخبار العلماء اخبار الحکماء" ہے اور علامہ جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف قفطی کی تصنیف ہے اور مختصر زوزنی کے نام سے مشہور ہے۔

Marfat.com

کیا؟ حکماء اور فلاسفہ کے اقوال ان مسائل میں مختلف ہیں۔

ایک فرقہ کی رائے ہے کہ ان کا نام ہرمس الہرامسہ ہے اور مصر کے قریہ منف میں پیدا ہوئے، یونانی ہرمس کو ارمیس کہتے ہیں، ارمیس کے معنی عطارد ہیں۔ [1]

اور دوسری جماعت کا خیال ہے کہ ان کا نام یونانی میں طرمیس، عبرانی میں خنوخ اور عربی میں اخنوخ ہے، اور قرآن عزیز میں ان کو اللہ تعالیٰ نے ادریس کہا ہے یہی جماعت کہتی ہے کہ ان کے استاد کا نام غوثاذیمون یا اغوثاذیمون (مصری) ہے، وہ غوثاذیمون کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتاتے کہ وہ یونان یا مصر کے انبیاء میں سے ایک نبی ہیں، اور یہ جماعت ان کو ادرین دوم اور حضرت ادریس علیہ السلام کو ادرین سوم کا لقب دیتی ہے، اور غوثاذیمون کے معنی "سعد اور بہت نیک بخت" ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہرمس نے مصر سے نکل کر اقطاع عالم کی سیر کی اور تمام دنیا کو چھان ڈالا اور جب مصر واپس ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بیاسی سال کی عمر میں اپنی جانب اٹھالیا۔

ایک تیسری جماعت یہ کہتی ہے کہ ادریس علیہ السلام بابل میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی، اور اوائل عمر میں انہوں نے حضرت شیث بن آدم علیہ السلام سے علم حاصل کیا، علم کلام کے مشہور عالم علامہ شہرستانی کہتے ہیں کہ اغثاذیمون حضرت شیث علیہ السلام ہی کا نام ہے۔

بہر حال حضرت ادریس علیہ السلام سن شعور کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت سے سرفراز فرمایا، تب انہوں نے شریر اور مفسدوں کو راہ ہدایت کی تبلیغ شروع کی مگر مفسدوں نے ان کی ایک نہ سنی اور حضرت آدم و شیث علیہما السلام کی شریعت کے مخالف ہی رہے، البتہ ایک چھوٹی سی جماعت مشرف بہ اسلام ہوگئی۔

حضرت ادریس علیہ السلام نے جب یہ رنگ دیکھا تو وہاں سے ہجرت کا ارادہ کیا اور اپنے پیروؤں کو بھی ہجرت کی تلقین فرمائی، پیروان ادریس نے جب یہ سنا تو ان کو ترک وطن بہت شاق گزرا اور کہنے لگے کہ بابل جیسا وطن ہم کو کہاں نصیب ہوسکتا ہے۔ [2] حضرت ادریس علیہ السلام نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم یہ تکلیف اللہ کی راہ میں اٹھاتے ہو تو اس کی رحمت وسیع ہے وہ اس کا نعم البدل ضرور عطا کرے گی، پس ہمت نہ ہارو اور خدا کے حکم کے سامنے سر نیاز جھکا دو۔

مسلمانوں کی رضامندی کے بعد حضرت ادریس علیہ السلام اور ان کی جماعت مصر کی جانب ہجرت کر گئی۔ جماعت نے جب نیل کی روانی اور اس کی سرزمین کی شادابی دیکھی تو بہت خوش ہوئی، اور حضرت ادریس علیہ السلام نے یہ دیکھ کر اپنی جماعت سے فرمایا، بابلیون [3] (تمہارے بابل کی طرح شاداب مقام) اور ایک بہترین جگہ منتخب کر کے نیل کے کنارے بس گئے حضرت ادریس علیہ السلام کے اس جملہ "بابلیون" نے ایسی شہرت پائی کہ عرب کے علاوہ قدیم اقوام بھی اس سرزمین کو بابلیون ہی کہنے لگیں، البتہ عرب نے اس کا نام مصر بتایا

---

[1] ارمیس یا ہرمیس یونان کا ایک مشہور منجم اور ماہر فلکیات حکیم تھا اسی لئے اس کو ارمیس (عطارد کہتے تھے، یونانی غلطی سے ادریس اور ارمیس کو ایک ہی شخص تسلیم کرتے ہیں حالانکہ ایسی فاش غلطی ہے جس کے لئے کوئی دلیل نہیں)۔

[2] بابل کے معنی نہر کے ہیں اور چونکہ بابل دجلہ و فرات کی نہروں سے سرسبز و شاداب تھا اس لئے اس نام سے موسوم ہوا، یہ عراق کا مشہور شہر تھا جو فنا ہوگیا۔

[3] بابلیون کے معنی میں مختلف اقوال ہیں، مثلاً تمہاری طرح کی نہر، مبارک نہر، مگر سب سے بہتر قول یہ ہے کہ "یون" سریانی میں تفضیل کی علامت ہے اور معنی ہیں "بڑی نہر"۔

Marfat.com

اور اس کی وجہ تسمیہ یہ سنائی کہ طوفان نوح علیہ السلام کے بعد یہ مصر بن حام کی نسل کا مسکن و موطن بنا ہے۔

حضرت ادریس علیہ السلام اور ان کی پیرو جماعت نے جب مصر میں سکونت اختیار کر لی تو یہاں بھی انہوں نے پیغام الٰہی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دینا شروع کر دیا کہا جاتا ہے کہ ان کے زمانہ میں بہتر (۷۲) زبانیں بولی جاتی تھیں، اور اللہ تعالیٰ کی عطاء و بخشش سے یہ وقت کی تمام زبانوں کے زبان دان تھے، اور ہر ایک جماعت کو اسی کی زبان میں تبلیغ فرمایا کرتے تھے۔

حضرت ادریس علیہ السلام نے دین الٰہی کے پیغام کے علاوہ سیاست مدن، شہری زندگی اور بود و ماند کے متمدن طریقوں کی بھی تعلیم و تلقین کی اور اس کے لیے انہوں نے ہر ایک فرقہ جماعت سے طلبہ جمع کئے اور ان کو مدنی سیاست اور اس کے اصول و قواعد سکھائے جب یہ طلبہ کامل و ماہر بن کر اپنے قبائل کی طرف لوٹے تو انہوں نے شہر اور بستیاں آباد کیں جن کو مدنی اصول پر بسایا، ان شہروں کی تعداد کم و بیش دو صد کے قریب تھی، جن میں سب سے چھوٹا شہر [1] "رہا" تھا، حضرت ادریس علیہ السلام نے ان طلبہ کو دوسرے علوم کی بھی تعلیم دی جس میں علم حکمت اور علم نجوم جیسے علوم بھی شامل ہیں۔

حضرت ادریس علیہ السلام پہلی ہستی ہیں جنہوں نے علم حکمت و نجوم کی ابتداء کی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو افلاک اور ان کی ترکیب، کواکب اور ان کے اجتماع و افتراق کے نقاط اور ان کے باہم کشش کے رموز و اسرار کی تعلیم دی، اور ان کو علم عدد و حساب کا عالم بنایا، اور اگر اس پیغمبر خدا کے ذریعہ ان علوم کا انکشاف نہ ہوتا تو انسانی طبائع کی وہاں تک رسائی مشکل تھی، انہوں نے مختلف گروہوں اور امتوں کے لیے ان کے مناسب حال قوانین و قواعد مقرر فرمائے اور اقطاع عالم کو چار حصوں میں منقسم کر کے ہر ربع کے لیے ایک حاکم مقرر کیا جو اس حصہ زمین کی سیاست و ملوکیت کا ذمہ دار قرار پایا، اور ان چاروں کے لیے ضروری قرار دیا کہ تمام قوانین سے مقدم شریعت کا وہ قانون رہے گا جس کی تعلیم وحی الٰہی کے ذریعے میں نے تم کو دی ہے، اس سلسلہ کے سب سے پہلے چار بادشاہوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

① ایلاوس (بمعنی رحیم) ② زوس ③ اسقلبیوس ④ زوس امون یا ایلاوس امون یا بسیلوس۔

حضرت ادریس علیہ السلام کی تعلیم کا خلاصہ:

خدا کی ہستی اور اس کی توحید پر ایمان لانا، صرف خالق کائنات کی پرستش کرنا، آخرت کے عذاب سے رستگاری کے لیے اعمالِ صالحہ کو ڈھال بنانا، دنیا سے بے التفاتی اور تمام امور میں عدل و انصاف کو پیش نظر رکھنا، اور مقررہ طریقہ پر عبادت الٰہی ادا کرنا، اور ایام بیض [2] کے روزے رکھنا، دشمنانِ اسلام سے جہاد کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، طہارت و نظافت سے رہنا، خصوصیت کے ساتھ جنائت، کتے اور سور سے اجتناب کرنا، ہر نشہ آور شئے سے پرہیز کرنا ان کی تعلیم کا لب لباب ہے۔

انہوں نے اپنے پیروؤں کے لیے بحکم الٰہی سال میں چند دن عید کے مقرر فرمائے اور چند مخصوص اوقات میں نذر اور قربانی دینا فرض قرار دیا، ان میں سے بعض رویت ہلال پر ادا کی جاتی تھیں اور بعض اس وقت جبکہ سورج کسی برج میں داخل ہونے لگا ہو، اور بعض جبکہ سیارے اپنے بیوت و برج شرف میں داخل ہوں اور بعض سیارے بعض سیاروں کے مقابل آ جائیں۔

---

[1] یہ شہر صفحہ عالم سے مٹ گیا مگر اس کے کھنڈرات باقی ہیں۔ [2] ہر ماہ قمری کی ۱۴، ۱۵، ۱۶ تاریخ۔

نذر الٰہی کے طریقے:

اللہ تعالیٰ کے سامنے نذر و قربانی پیش کرنے کے لیے ان کے یہاں تین چیزیں اہمیت رکھتی تھیں، خوشبوؤں کی دھونی، جانوروں کی قربانی اور شراب [1] اور ان کے علاوہ میووں، پھلوں اور پھولوں وغیرہ میں سے موسم کی پہلی چیز کی نذر ضروری تھی، اور میووں میں سے سیب کو، اناج میں سے گیہوں کو، اور پھولوں میں سے گلاب کو ترجیح حاصل تھی۔

بعد میں آنے والے نبیوں کے متعلق بشارت:

حضرت ادریس علیہ السلام نے اپنی امت کو یہ بھی بتایا کہ میری طرح اس عالم کی دینی و دنیوی اصلاح کے لیے بہت سے انبیاء علیہم السلام تشریف لائیں گے اور ان کی نمایاں خصوصیات یہ ہوں گی۔ ① وہ ہر ایک بری بات سے بری اور پاک ہوں گے۔ ② قابل ستائش اور فضائل میں کامل ہوں گے، زمین و آسمان کے احوال سے اور ان امور سے کہ جن میں کائنات کے لیے شفاء ہے یا مرض، وحی الٰہی کے ذریعہ اس طرح واقف ہوں گے کہ کوئی سائل تشنہ کام نہ رہے گا، وہ مستجاب الدعوات ہوں گے اور ان کے مذہب کی دعوت کا خلاصہ اصلاح کائنات ہوگا۔

حضرت ادریس علیہ السلام کی خلافت ارضی:

جب حضرت ادریس علیہ السلام خدا کی زمین کے مالک بنا دیئے گئے تو انہوں نے علم و عمل کے اعتبار سے خدا کی مخلوق کو تین طبقات میں تقسیم کر دیا۔ کاہن، بادشاہ اور رعیت، اور حسب ترتیب ان کے مراتب مقرر فرمائے، کاہن سب سے پہلا اور بلند درجہ قرار پایا اس لیے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے سامنے اپنے نفس کے علاوہ بادشاہ اور رعیت کے معاملات میں بھی جوابدہ ہے اور بادشاہ کا دوسرا درجہ رکھا گیا، اس لیے کہ وہ اپنے نفس اور امور مملکت کے متعلق جواب دہ ہے اور رعیت صرف اپنے نفس ہی کے لیے جواب دہ ہے، اس لیے وہ تیسرے طبقہ میں شامل ہے، لیکن یہ طبقات فرائض کے اعتبار سے تھے نہ کہ نسل و خاندان کے امتیازات کے لحاظ سے، بہر حال حضرت ادریس علیہ السلام "رفع الی اللہ" تک انہی قوانین شریعت و سیاست کی تبلیغ فرماتے رہے۔

مذکورہ بالا چار بادشاہوں میں سے اسقلیبوس بہت پختہ عزم و ارادہ کا بادشاہ تھا، اس نے حضرت ادریس علیہ السلام کے کلمات کی حفاظت اور قوانین شریعت کی نگہداشت خوب کی اور حضرت ادریس علیہ السلام کے اٹھا لیے جانے پر بے حد حزن و ملال کا اظہار کیا اور ہیکلوں میں ان کی اور ان کے رفع کی حالت کی تصاویر بنوائیں۔

اسقلیبوس اس خطہ پر حکومت کرتا تھا جو طوفان نوح کے بعد خطہ یونان کہلایا۔ یونانیوں نے طوفان کی تباہ کاریوں سے بچے ہوئے ٹوٹے پھوٹے ہیکلوں میں جب حضرت ادریس علیہ السلام کے مجسمہ اور ان کے رفع کی تصویر کو دیکھا اور ساتھ ہی اسقلیبوس کی عظمت اور ہیکلوں میں حکمت و فلسفہ کی تدوین کا شہرہ سنا تو ان کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ اسقلیبوس ہی وہ ہستی ہے جس کا رفع ہوا، حالانکہ یہ صریح غلطی ہے جو محض انکل و تخمین سے انہوں نے اختیار کی۔

---

[1] حکماء کا یہ تضاد بیان حیرت میں ڈالتا ہے کہ ایک جانب تو وہ شریعت ادریسی میں شراب کو حرام بتاتے ہیں اور دوسری جانب خدا کی جناب میں شراب کی قربانی و نذر کو قبول کہتے ہیں۔ (ان ھذا لشئ عجاب)

Marfat.com

حضرت ادریس علیہ السلام کا حلیہ:

حضرت ادریس علیہ السلام کا حلیہ یہ ہے، گندم گوں رنگ، پورا قد و قامت، سر پر بال کم، خوبصورت و خوبرو، گھنی داڑھی، رنگ و روپ اور چہرہ کے خطوط میں ملاحت مضبوط بازو، چوڑے منڈھے، مضبوط ہڈی، دبلے پتلے، سرگیں چمکدار آنکھیں، گفتگو باوقار، خاموشی پسند سنجیدہ اور متین، چلتے ہوئے نیچی نظر، انتہائی فکر و خوض کے عادی، غصہ کے وقت سخت غضبناک باتیں کرنے میں شہادت کی انگلی سے بار بار اشارہ کے عادی، حضرت ادریس علیہ السلام نے بیاسی سال کی عمر پائی۔

ان کی انگوٹھی پر یہ عبارت کندہ تھی۔

الصبر مع الایمان باللہ یورث الظفر.

"اللہ پر ایمان کے ساتھ صبر، فتح مندی کا باعث ہے"۔

اور کمر سے باندھنے والے پٹکہ پر یہ تحریر تھا:

الاعیاد فی حفظ الفروض والشریعة من تمام الدین و تمام الدین کمال المروۃ.

"حقیقی عیدیں اللہ تعالیٰ کے فرائض کی حفاظت میں پوشیدہ ہیں اور دین کا کمال شریعت سے وابستہ ہے اور مروت میں کمال دین کی تکمیل ہے۔"

اور نماز جنازہ کے وقت جو پٹکہ باندھتے اس پر حسب ذیل جملے ثبت ہوتے:

السعید من نظر لنفسه و شفاعته عند ربه اعماله الصالحة.

"سعادت مند وہ ہے جو اپنے نفس کی نگرانی کرے اور پروردگار کے سامنے انسان کے شفیع اس کے اپنے نیک اعمال ہیں۔"

حضرت ادریس علیہ السلام کے بہت سے پند و نصائح اور آداب و اخلاق کے جملے مشہور ہیں جو مختلف زبانوں میں ضرب المثل اور رموز و اسرار کی طرح مستعمل ہیں، ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

① خدا کی بیکراں نعمتوں کا شکریہ انسانی طاقت سے باہر ہے۔

② جو علم میں کمال اور عمل صالح کا خواہش مند ہو اس کو جہالت کے اسباب اور بدکرداری کے قریب بھی نہ جانا چاہیے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہر فن مولا کاریگر اگر سینے کا ارادہ کرتا ہے تو سوئی ہاتھ میں لیتا ہے نہ کہ برما، پس ہر وقت یہ پیش نظر رہے۔

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں		ایں خیال است و محال است و جنوں

③ دنیا کی بھلائی "حسرت" ہے اور برائی "ندامت"۔

④ خدا کی یاد، اور عمل صالح کے لیے خلوص نیت شرط ہے۔

⑤ نہ جھوٹی قسمیں کھاؤ، نہ اللہ تعالیٰ کے نام کو قسموں کے لیے تختہ مشق بناؤ اور نہ جھوٹوں کو قسمیں کھانے پر آمادہ کرو، کیونکہ ایسا کرنے سے تم بھی شریک گناہ ہو جاؤ گے۔

⑥ ذلیل پیشوں کو اختیار نہ کرو (جیسے سینگی لگانا، جانوروں کے جفتی کرانے پر اجرت لینا وغیرہ)۔

⑦ اپنے بادشاہوں کی (جو کہ پیغمبر کی جانب سے احکام شریعت کے نفاذ کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں) اطاعت کرو اور اپنے بڑوں،

کے سامنے پست رہو، اور ہر وقت حمد الٰہی میں اپنی زبان کو تر رکھو۔
⑧ حکمت روح کی زندگی ہے۔
⑨ دوسروں کی خوش عیشی پر حسد نہ کرو اس لیے کہ ان کی یہ مسرور زندگی چند روزہ ہے۔
⑩ جو ضروریات زندگی سے زیادہ طالب ہوا وہ کبھی قانع نہ رہا۔

تاریخ الحکماء کے ج ا ص ۳۴۸ پر ہرمس ثالث کے تذکرہ میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ علماء کی ایک جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ طوفان نوح علیہ السلام سے قبل دنیا میں جس قدر علوم شائع ہوئے ان سب کے معلم اوّل یہی ہرمس اوّل ہیں جو مصر کے حصہ اعلیٰ کے باشندہ تھے اور عبرانی حضرات ان کو خنوخ نبی مانتے ہیں اور جو اپنے نسب میں حضرت آدم علیہ السلام کے پر پوتے ہیں۔

یعنی خنوخ (ادریس) بن یارد بن مہلائیل بن قینان، بن انوش، بن شیث، بن آدم (علیہم السلام)۔

ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ فلسفہ کی کتابوں میں جن علمی جواہر اور حرکات نجوم کا تذکرہ آتا ہے سب سے پہلے ان کا ذکر ان ہی کی زبان سے ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ہیکلوں کی تعمیر، علم طب کی ایجاد، ارضی و سماوی اشیاء کے متعلق موزوں قصائد کے ذریعہ اظہار خیال بھی ان ہی کی اولیات میں سے ہیں، اور انہوں نے ہی سب سے پہلے طوفان کی اطلاع دے کر بندگان خدا کو ڈرایا اور بتایا کہ ان کو دکھایا گیا ہے کہ ایک آسمانی آفت سے جو زمین کو پانی اور آگ میں لپیٹ رہی ہے، انہیں یہ دیکھ کر علوم کی بربادی اور صنعت و حرفت کی تباہی کا خوف ہوا اور اس لیے انہوں نے مصر میں اہرام اور برابی ❶ بنائے اور ان میں تمام صنائع اور نو ایجاد آلات کی تصاویر بنوائیں اور تمام علوم کے حقائق و اوصاف کو منقش کیا تا کہ یہ علوم و صناعات تا ابد باقی رہیں اور فنا کا ہاتھ ان کو گزند نہ پہنچا سکے۔ ❷

محاکمہ:

فلاسفہ اور حکمت و فلسفہ کی قدیم کتابوں کی (بعض باتوں سے قطع نظر) ان یاوہ گویوں اور بے سروپا باتوں کا یہ خلاصہ ہے جو حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق افسانوی حیثیت میں گھڑا گیا ہے کہ جس کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ نقل اس کی تائید میں ہے بلکہ تحقیق اور صحیح علم تاریخ کے حقائق ان میں سے اکثر باتوں کی خرافات کو آج اس طرح ظاہر کر رہے ہیں کہ جس کا انکار حقیقت کے انکار کے مترادف ہے مثلاً اہرام و برابی کی تاریخ آج جدید اکتشافات کی بدولت ہمارے سامنے بے نقاب ہے اور اہرام اور ان مقابر کی کھدائی نے علوم و نقوش، اور صنائع کی تصویر کے بنانے والوں، اور ان کے مختلف زمانوں میں مختلف مدارج کے ترقی دینے والوں کے نام ان کے اجسام اور ان کے زور جواہر کے خزانوں اور مختلف زمانوں کی تحریروں، اور رسم الخط کی ترکیبوں کو سامنے لا کر روز روشن کی طرح آشکارا کر دیا ہے، کہاں وہ حقیقتیں اور کہاں یہ دور از کار باتیں، آج مینا، خوفو، منقرع اور طوطامن خامن وغیرہ بادشاہوں کے حالات سے کون آشنا نہیں ہے۔

تاہم ان بے سروپا باتوں کو بھی نقل کر دینا اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ یہ آگاہی رہے کہ ان پیغمبر کے متعلق حکماء کی کتابوں میں بھی کس قسم کی دور از کار باتیں درج ہیں۔

اس سلسلہ میں بس اسی قدر سچ اور حق ہے جس کو ہم قرآن عزیز اور احادیث صحیحہ سے نقل کر آئے ہیں یا توقف کے درجہ میں وہ چند جملے جو تورات سے نقل کیے گئے ہیں، یا وہ اقوال جو پیغمبرانہ تعلیمات کے شایان شان ہیں۔

❶ برابی ایسے ہیکل جو چلہ کشی کے لئے چہار جانب سے بند ہوں۔ ❷ تاریخ الحکماء جلد ا

Marfat.com

حضرت ہود علیہ السلام

○ قرآن عزیز میں ہود علیہ السلام کا ذکر ○ ہود علیہ السلام کا نسب ○ عاد کی بستیاں اور ان کا طریق عبادت
○ عاد کی ہلاکت ○ ہود علیہ السلام اور قوم ہود کے واقعات سے حصول عبرت۔

قرآن عزیز میں ہود علیہ السلام کا ذکر:

قرآن عزیز میں حضرت ہود علیہ السلام کا سات جگہ ذکر آیا ہے جو ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے:

نمبر شمار	نام سورہ	تعداد آیات
۱	اعراف	۶۵
۲	ہود	۵۰۔۵۳۔۵۸۔۶۰۔۸۹
۳	شعراء	۱۲۴

قرآن عزیز میں عاد کا ذکر:

اور عاد کا ذکر نو سورتوں میں ہوا ہے، یعنی اعراف، ہود، مومنون، شعراء، فصلت، احقاف، الذاریات، القمر اور الحاقہ میں۔

قوم عاد:

اس سے قبل کہ ہم عاد کے متعلق تفصیلی بحث کریں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قرآن عزیز کے علاوہ کوئی تاریخ کی کتاب یا توراۃ عاد کے متعلق روشنی نہیں ڈالتی، اس لیے اس قوم کے حالات کا نقشہ یا قرآن عزیز کے ذریعہ بن سکتا ہے اور یا پھر ان اثریات کے ذریعہ جو محققین علم الآثار نے اس بارہ میں حاصل کی ہیں۔

پہلا ذریعہ چونکہ قطعی اور یقینی ہے اس لیے اس کے بیان کردہ حقائق کو بھی بلاشبہ قطعیت حاصل ہے اور دوسرا ذریعہ تخمینی اور قیاسی، اس لیے اس کے بیان کردہ واقعات کی حیثیت ظن و تخمین سے آگے نہیں جاتی۔

عاد، عرب کے قدیم قبیلہ یا امم سامیہ کے صاحب قوت و اقتدار افراد جماعت کا نام ہے، تاریخ قدیم کے بعض یورپی مصنفین عاد کو ایک فرضی کہانی (میتھالوجی) یقین کرتے ہیں، مگر ان کا یہ یقین بالکل غلط اور سراسر وہم ہے، اس لیے کہ جدید تحقیقات کا مسلم فیصلہ ہے کہ عرب کے قدیم باشندے کثرت افراد و قبائل کے اعتبار سے ایک باعظمت و سطوت جماعت کی حیثیت میں تھے جو عرب سے نکل کر شام، مصر اور بابل کی طرف بڑھے اور وہاں زبردست حکومتوں کی بنیادیں قائم کیں، اب فرق صرف اس قدر ہے کہ

Marfat.com

عرب ان باشندوں کو امم بائدہ (ہلاک ہو جانے والی قومیں) یا عرب عاربہ (خالص عرب) اور ان کی مختلف جماعتوں کے افراد کو عاد، ثمود، طسم اور جدیس کہتے ہیں [1] اور مستشرقین یورپ (امم سامیہ) نام رکھتے ہیں، پس اصطلاحات و تعبیرات کے فرق سے حقیقت واقعہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہو جاتی، اس لیے قرآن عزیز نے ان کو عاد اولیٰ کہا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ عرب کی قدیم قوم بنو سام اور عاد اولیٰ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔

اہل جغرافیہ کا قول ہے کہ لفظ عرب دراصل عربہ تھا جس کے معنی صحراء اور بادیہ کے ہیں، خود عربی زبان میں اعراب اہل بادیہ کو کہتے ہیں اور عرابہ کے معنی بدویت کے آتے ہیں۔

اور بعض اہل تحقیق کی رائے یہ ہے کہ عرب اصل میں غرب (غین معجمہ کے ساتھ) تھا اور چونکہ اس کا جائے وقوع فرات کے غرب میں ہے اس لیے وہ آرامی قومیں (امم سامیہ) جو کہ فرات غربی پر آباد تھیں، اوّل غرب اور پھر غین کے نقطہ کے سقوط کے بعد عرب کہلائیں۔

ان میں سے عرب کی وجہ تسمیہ جو بھی صحیح ہو یہ حقیقت ہے کہ یہ مقام قدیم امم سامیہ یا بدوی جماعتوں یا عاد کا مسکن تھا۔ اس لیے عاد بغیر کسی اختلاف کے عرب نژاد تھے، اور لفظ عاد عربی ہے نہ کہ عجمی جس کے معنی عبرانی میں "بلند و مشہور" کے ہیں، قرآن عزیز میں عاد کے ساتھ ارم کا لفظ لگا ہوا ہے اور ارم (سام) کے معنی بھی "بلند و مشہور" ہی کے ہیں، انہی عاد کو تورات کی غلط پیروی میں کہیں کہیں عمالقہ بھی کہا گیا ہے۔

عاد کا زمانہ:

عاد کا زمانہ تقریباً دو ہزار قبل حضرت مسیح علیہ السلام مانا جاتا ہے، اور قرآن عزیز میں عاد کو "من بعد قوم نوح" کہہ کر قوم نوح کے خلفاء میں سے شمار کیا ہے، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شام کی دوبارہ آبادی کے بعد امم سامیہ کی ترقی عاد ہی سے شروع ہوتی ہے۔

عاد کا مسکن:

عاد کا مرکزی مقام ارض احقاف ہے، یہ حضر موت کے شمال [2] میں اس طرح واقع ہے کہ اس کے شرق میں عمان ہے اور شمال میں ربع الخالی، مگر آج یہاں ریت کے ٹیلوں کے سواء کچھ نہیں ہے، اور بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ ان کی آبادی عرب کے سب سے بہترین حصہ حضر موت اور یمن میں خلیج فارس کے سواحل سے حدود عراق تک وسیع تھی اور یمن ان کا دارالحکومت تھا۔

عاد کا مذہب:

عاد بت پرست تھے اور اپنے پیشرو قوم نوح کی طرح صنم پرستی اور صنم تراشی میں ماہر تھے، تاریخ قدیم کے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ ان کے معبودانِ باطل بھی قوم نوح کی طرح ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر ہی تھے، اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے

---

[1] معجم البلدان ص ١٢٩ جلد ٦

[2] عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ مجھ سے سید عبداللہ بن احمد بن عمر بن یحییٰ علوی نے (جو حضر موت کے باشندہ ہیں) بیان کیا کہ وہ ایک جماعت کے ساتھ ان ہلاک شدہ قوموں کے قدیم مساکن کے کھوج میں حضر موت کے شمالی میدان میں مقیم تھے، طویل جدوجہد کے بعد ہم نے سنگ مرمر کے بعض ظروف کو ریت کے ٹیلوں کی کھدائی میں حاصل کیا جس پر خط مسماری میں تحریر تھا، مگر افسوس کہ مالیہ کی کمی نے اس عظیم الشان مہم کو پورا نہ ہونے دیا۔

Marfat.com

ایک اثر منقول ہے، اس میں ہے کہ ان کے ایک صنم کا نام صمود اور ایک کا نام ہتار تھا۔ (۱)

حضرت ہود علیہ السلام:

عاد اپنی مملکت کی سطوت و جبروت، جسمانی قوت وصولت کے غرور میں ایسے چمکے کہ انہوں نے خدائے واحد کو بالکل بھلا دیا اور اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کو اپنا معبود مان کر ہر قسم کے شیطانی اعمال بے خوف وخطر کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ایک پیغمبر حضرت ہود (علیہ السلام) کو مبعوث فرمایا، حضرت ہود علیہ السلام عاد کی سب سے زیادہ معزز شاخ خلود کے ایک فرد تھے، سرخ سفید رنگ اور وجیہ تھے، ان کی داڑھی بڑی تھی۔ (۲)

تبلیغ اسلام:

انہوں نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عبادت کی طرف دعوت دی اور لوگوں پر ظلم و جور کرنے سے منع فرمایا، مگر عاد نے ایک نہ مانی اور ان کو سختی کے ساتھ جھٹلایا اور غرور و تکبر کے ساتھ کہنے لگے ﴿مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ (السجدہ:۱۵) آج دنیا میں ہم سے زیادہ شوکت و جبروت کا کون مالک ہے؟ مگر حضرت ہود علیہ السلام مسلسل اسلام کی تبلیغ میں لگے رہے، وہ اپنی قوم کو عذاب الٰہی سے ڈراتے اور غرور و سرکشی کے نتائج بتا کر قوم نوح کے واقعات یاد دلاتے اور کبھی ارشاد فرماتے:

"اے قوم! اپنی جسمانی طاقت اور حکومت کے جبروت پر گھمنڈ نہ کر بلکہ خدا کا شکر ادا کر کہ اس نے تجھ کو یہ دولت بخشی، قوم نوح کی تباہی کے بعد تجھ کو زمین کا مالک بنایا، خوش عیشی، فارغ البالی اور خوش حالی عطاء کی لہٰذا اس کی نعمتوں کو نہ بھول اور خود ساختہ بتوں کی پرستش سے باز آ جو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ دکھ دے سکتے ہیں، موت و زیست، نفع و ضرر سب ایک خدا ہی کے ہاتھ میں ہے، اے افراد قوم! مانا کہ تم عرصہ تک سرکشی اور اس کی نافرمانی میں مبتلاء رہے ہو مگر آج بھی اگر توبہ کر لو، اور باز آ جاؤ تو اس کی رحمت وسیع ہے اور دروازۂ توبہ بند نہیں ہوا، اس سے مغفرت چاہو وہ بخش دے گا، اس کی طرف رجوع ہو جاؤ وہ معاف کر دے گا، تقویٰ و طہارت کی زندگی اختیار کر لو، وہ تم کو دن دونی، رات چوگنی ترقی عطا کرے گا، بیش از بیش عزت دے گا، اور مال و عزت میں سرفرازی بخشے گا۔"

حضرت ہود علیہ السلام اپنی تبلیغ کے اور پیغام حق کے ساتھ ساتھ بار بار یہ بھی دہراتے کہ میں تم سے کسی اجر و عوض کا خواہاں نہیں، میرا اجر تو خدا ہی کے پاس ہے، اور یہ نبی کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے، ان کو کوئی یہ تہمت نہیں لگا سکتا کہ وہ مال کی طلب میں ایسا کرتے ہیں، یا عزت و جاہ اور ریاست کے طالب ہیں، وہ نہ قوم سے اپنی ریاست و عزت کے طالب ہوتے ہیں اور نہ مال و منال کے، ان کے سامنے تو صرف ایک ہی نقطہ ہوتا ہے اور وہ ادائے فرض اور اپنے مالک حقیقی کے احکام کی پیغمبری ہے۔

عاد میں ایمان دار تو چند ہی تھے باقی تمام سرکش اور متمرد انسانوں کا گروہ تھا، ان کو حضرت ہود علیہ السلام کی یہ نصائح سخت شاق گزرتی تھیں، اور وہ یہ نہیں برداشت کر سکتے تھے کہ ان کے خیالات، ان کے عقائد و اعمال، غرض ان کے کسی ارادہ میں بھی کوئی شخص حائل ہو ان کے لیے ناصح مشفق بنے، اس لیے اب انہوں نے یہ روش اختیار کی کہ حضرت ہود علیہ السلام کا مذاق اڑایا، ان کو بے وقوف

---

(۱) صدا بھی ان کا مشہور بت تھا، البدایہ والنہایہ جلد ۱۔ (۲) عینی جلد ۷ کتاب الانبیاء

Marfat.com

گردانا اور ان کی معصومانہ حقانیتوں اور صداقتوں کے تمام یقینی دلائل و براہین کو جھٹلانا شروع کر دیا اور حضرت ہود علیہ السلام سے کہنے لگے:

﴿قَالُوا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (هود: ۵۳)

"کہا اے ہود (علیہ السلام)! تو ہمارے پاس ایک دلیل بھی نہ لایا، اور تیرے کہنے سے ہم اپنے خداؤں کو چھوڑنے والے نہیں، اور نہ ہم تجھ پر ایمان لانے والے ہیں۔"

ہم اس ڈھونگ میں آنے والے نہیں کہ تجھ کو خدا کا رسول مان لیں اور اپنے خداؤں کی عبادت چھوڑ کر یہ یقین کر لیں کہ وہ خدائے اکبر کے سامنے ہمارے سفارشی نہیں ہوں گے۔"

حضرت ہود علیہ السلام نے ان سے کہا کہ "نہ میں بے وقوف ہوں اور نہ پاگل، بلاشبہ خدا کا رسول اور پیغمبر ہوں" اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے بیوقوف کو منتخب نہیں کیا کرتا کہ اس کا نقصان اس کے نفع سے بڑھ جائے اور ہدایت کی جگہ گمراہی آ جائے، وہ اس عظیم الشان خدمت کے لیے اپنے بندوں میں سے ایسے شخص کو چنتا ہے جو ہر طرح اس کا اہل ہو اور اس خدمت حق کو بخوبی انجام دے سکے۔

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ (الانعام: ۱۲٤)

"اور اللہ خوب جاننے والا ہے کہ اپنے منصب رسالت کو کس جگہ رکھے۔"

مگر قوم کی سرکشی اور مخالفت بڑھتی ہی رہی اور ان پر آفتاب سے زیادہ روشن دلائل و نصائح کا مطلق اثر نہ ہوا، اور وہ حضرت ہود علیہ السلام کی تکذیب و تذلیل کے اور زیادہ درپے ہو گئے اور (العیاذ باللہ) مجنون اور خبطی کہہ کر اور زیادہ مذاق اڑانے لگے، اور کہنے لگے اے ہود! جب سے تو نے ہمارے معبودوں کو برا کہنا اور ہم کو ان کی عبادت سے باز رہنے کے لیے تلقین کرنا شروع کیا ہے ہم دیکھتے ہیں اس وقت سے تیرا حال خراب ہو گیا ہے اور ہمارے خداؤں کی بددعا سے تو پاگل و مجنون ہو گیا ہے تو اب ہم اس کے علاوہ تجھ کو اور کیا سمجھیں؟

ان کو اپنی اسی گستاخانہ جرأت و تہمت سے یہ خیال ہو چلا تھا کہ اب کوئی شخص حضرت ہود علیہ السلام کی طرف دھیان نہ دے گا، اور ان کی باتوں کو توجہ سے نہ سنے گا۔ حضرت ہود علیہ السلام نے یہ سب کچھ نہایت ضبط و صبر سے سنا اور پھر ان سے یوں مخاطب ہوئے:

"میں خدا کو اور تم سب کو گواہ بنا کر سب سے پہلے یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں اس اعتقاد سے قطعاً بری ہوں کہ ان بتوں میں یہ قدرت ہے کہ مجھ کو یا کسی کو کسی قسم کی بھی کوئی برائی پہنچا سکتے ہیں اس کے بعد تم کو اور تمہارے ان معبودانِ باطلہ کو تحدی (چیلنج) کرتا ہوں کہ اگر ان میں ایسی قدرت ہے تو وہ مجھ کو نقصان پہنچانے میں جلدی سے اقدام کریں، میں اپنے خدا کے فضل و کرم سے صاحب عقل و خرد ہوں، فراست و کیاست کا مالک ہوں اور حکمت و دانائی کا حامل۔ میں تو صرف اپنے اس خدا ہی پر بھروسہ کرتا ہوں اور اسی پر وثوق رکھتا ہوں جس کے قبضہ و قدرت میں کائنات کے تمام جانداروں کی پیشانیاں ہیں اور حیات و ممات کا مالک ہے، وہ ضرور میری مدد کرے گا اور ہر نقصان پہنچانے والے کے نقصان سے محفوظ رکھے گا۔"

آخر حضرت ہود علیہ السلام نے ان کی مسلسل بغاوت و سرکشی کے خلاف یہ اعلان کر دیا کہ اگر عاد کا رویہ یہی رہا اور حق سے

اعراض وروگردانی کی روش میں انہوں نے کوئی تبدیلی نہ کی، اور میری پند ونصائح کو گوش دل سے نہ سنا تو میں اگرچہ اپنی مفوضہ خدمت کے لیے ہر وقت چست کمر اور باہمت ہوں مگر ان کے لیے ہلاکت یقینی ہے، اللہ تعالیٰ عنقریب ان کو ہلاک کر دے گا، اور ایک دوسری قوم کو زمین کا مالک بنا کر ان کی جگہ قائم کر دے گا، اور بلاشبہ وہ اللہ تعالیٰ کو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، وہ تو ہر شئے پر قادر و مسلط اور ہر شئے کا حافظ ونگہبان ہے، اور تمام کائنات اس کے ید قدرت میں مسخر ہے۔

اے قوم! اب بھی سمجھ اور عقل و ہوش سے کام لے، قوم نوح کے حالات سے عبرت حاصل کر اور خدا کے پیغام کے سامنے سر نیاز جھکا دے، ورنہ قضاء وقدر کا ہاتھ ظاہر ہو چکا ہے اور بہت قریب ہے وہ زمانہ کہ تیرا یہ سارا غرور و گھمنڈ خاک میں مل جائے گا، اور اس وقت ندامت سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

حضرت ہود علیہ السلام نے بار بار ان کو یہ بھی باور کرایا کہ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں دوست ہوں، تم سے زر وسیم اور ریاست کا طالب نہیں ہوں بلکہ تمہاری فلاح ونجاح چاہتا ہوں، میں اللہ تعالیٰ کے پیغام کے بارہ میں خائن نہیں بلکہ امین ہوں، وہی کہتا ہوں جو مجھ سے کہا جاتا ہے۔ جو کچھ کہتا ہوں قوم کی سعادت اور حسن حال و مال کے لیے کہتا ہوں، بلکہ دائمی وسرمدی نجات کے لیے کہتا ہوں۔
تم کو اپنی ہی قوم کے ایک انسان پر خدا کے پیغام نازل ہونے سے تعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ قدیم سے خدا کی سنت جاریہ ہے کہ انسانوں کی ہدایت وسعادت کے لیے ان ہی میں سے ایک شخص کو چن لیتا اور اپنا رسول بنا کر اس کو خطاب کرتا ہے اور اپنی مرضیات و نامرضیات سے اس کی معرفت اپنے بندوں کو مطلع کرتا رہتا ہے، اور فطرت کا تقاضا بھی تو یہی ہے کہ کسی قوم کے رشد وہدایت کے لیے ایسے شخص کا ہی انتخاب کیا جائے جو بول چال میں ان ہی کی طرح ہو، ان کے اخلاق و عادات کا واقف و دانا ہو، ان کے خصوصی امتیازات سے آشنا، اور ان ہی کے ساتھ زندگی گزارتا رہا ہو کہ اسی سے قوم مانوس ہو سکتی ہے اور وہی ان کا صحیح ہادی مشفق بن سکتا ہے۔
عاد نے جب یہ سنا تو وہ عجیب حیرت میں پڑ گئے، ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایک خدا کی پرستش کے کیا معنی؟ وہ غم وغصہ میں آ گئے کہ کس طرح ہم باپ دادا کی ریت "اصنام پرستی" کو چھوڑ دیں؟ یہ تو ہماری اور ہمارے باپ دادا کی سخت توہین ہے، ان کا غیظ وغضب بھڑک اٹھا کہ ان کو کافر اور مشرک کیوں کہا جاتا ہے جبکہ وہ بتوں کو خدا کے سامنے اپنا شفیع مانتے ہیں؟ ان کے نزدیک ہود علیہ السلام کی بات مان لینے میں ان کے معبودوں اور بزرگوں کی توہین وتحقیر تھی جن کو وہ خدائے اکبر کی بارگاہ میں اپنا وسیلہ اور شفیع مانتے تھے اور اسی کے لیے ان تصویروں اور مجسموں کو پوجتے تھے کہ وہ خوش ہو کر ہماری سفارش کریں گے اور عذاب الٰہی سے نجات دلائیں گے۔
آخر وہ شعلہ کی طرح بھڑک اٹھے اور حضرت ہود علیہ السلام سے بگڑ کر کہنے لگے تو نے "ہم کو اپنے خدا کے عذاب کی دھمکی دی اور ہم کو اس سے یہ کہہ کر ڈرایا"۔

﴿إِنِّىٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٣٥﴾﴾ (الشعراء: ۱۳۵)

"میں تمہارے اوپر بڑے دن کے عذاب آنے سے ڈرتا ہوں (کہ کہیں تم اس کے مستحق نہ ٹھہر جاؤ)۔"

تو اے ہود (علیہ السلام)! اب ہم سے تیری روز روز کی نصیحتیں نہیں سنی جاتیں، ہم ایسے ناصح مشفق سے باز آئے، اگر تو واقعی اپنے قول میں سچا ہے تو وہ عذاب جلد لے آ کہ ہمارا تیرا قصہ پاک ہو۔

Marfat.com

﴿ فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ (الاعراف: ۷۰)

"پس لا تو ہمارے پاس اس شئے کو جس کا تو ہم سے وعدہ کرتا ہے اگر تو واقعی سچوں میں سے ہے"۔

حضرت ہود علیہ السلام نے جواب دیا کہ اگر میری مخلصانہ اور صادقانہ نصائح کا یہی جواب ہے تو بسم اللہ اور تم کو عذاب کا اگر اتنا ہی شوق ہے تو وہ بھی کچھ دور نہیں۔

﴿ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ۭ ﴾ (الاعراف: ۷۱)

"بلاشبہ تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر عذاب وغضب آ پہنچا"۔

تم کو شرم نہیں آتی کہ تم چند خود ساختہ بتوں کو ان کے نام گھڑ کر پکارتے ہو اور تم اور تمہارے آباؤ اجداد ان کو خدا کی دی ہوئی دلیل کے بغیر من گھڑت طریقہ پر ان کو اپنا شفیع اور سفارشی مانتے ہو، اور میرے روشن دلائل سے انحراف اور سرکشی کر کے عذاب کے طالب ہوتے ہو، اگر ایسا ہی شوق ہے تو اب تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں کہ وقت قریب آ پہنچا۔

﴿ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝ ﴾ (الاعراف: ۷۱)

"کیا تم مجھ سے ان من گھڑت ناموں (بتوں) کے بارہ میں جھگڑتے ہو جس کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے گھڑ لیا ہے کہ جس کے متعلق تمہارے پاس خدا کی کوئی حجت نہیں آئی پس اب تم (عذاب الٰہی کا) انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"۔

الحاصل قوم ہود (عاد) کی انتہائی شرارت و بغاوت اور اپنے پیغمبر کی تعلیم سے بے پناہ بغض وعناد کی پاداش عمل اور قانون جزاء کا وقت آ پہنچا اور غیرت حق حرکت میں آئی اور عذاب الٰہی نے سب سے پہلے خشک سالی کی شکل اختیار کی، عاد سخت گھبرائے پریشان ہوئے اور عاجز و درماندہ نظر آنے لگے تو حضرت ہود علیہ السلام کو جوش ہمدردی نے اُکسایا اور مایوسی کے بعد پھر ایک مرتبہ ان کو سمجھایا کہ راہ حق اختیار کرلو، میری نصائح پر ایمان لے آؤ کہ یہی نجات کی راہ ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ورنہ پچھتاؤ گے۔ لیکن بد بخت و بد نصیب قوم پر کوئی اثر نہ ہوا، بلکہ بغض وعناد اور دوبالا ہو گیا۔ ہولناک عذاب نے ان کو آ گھیرا، آٹھ دن اور سات راتیں پیہم تیز و تند ہوا کے طوفان اُٹھے اور ان کو اور ان کی آبادی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا، تنومند اور قوی ہیکل انسان جو اپنی جسمانی قوتوں کے گھمنڈ میں سرمست سرکشی تھے اس طرح بے حس و حرکت پڑے نظر آتے تھے جس طرح آندھی سے تناور درخت بے جان ہو کر گر جاتا ہے، غرض ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا تاکہ آنے والی نسلوں کے لیے عبرت بنیں اور دنیا و آخرت کی لعنت اور عذاب ان پر مسلط کر دیا گیا کہ وہ اس کے مستحق [1] تھے اور حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے مخلص پیروان اسلام خدا کی رحمت و نعمت میں عذاب الٰہی

---

[1] ان ہلاک شدگان کی تعداد مفسرین نے تین سے چار ہزار تک بتائی ہے جیسا کہ روح المعانی وغیرہ میں مذکور ہے لیکن قرآن عزیز نے جس طرح ان کی شوکت و حکومت کا تذکرہ کیا ہے اور بنو سام کی قدیم تاریخ سے جیسا پتہ چلتا ہے اس اعتبار سے یہ تعداد بہت زیادہ ہونی چاہئے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

Marfat.com

سے محفوظ رہے اور سرکش قوم کی سرکشی و بغاوت سے مامون ہو گئے۔

یہ ہے عاد اولیٰ کی وہ داستان عبرت جو اپنے اندر چشم عبرت بیں کے لیے بیشمار پند و نصائح رکھتی اور خدائے برتر کے احکام کی تعمیل اور تقویٰ و طہارت کی زندگی کی جانب دعوت دیتی ہے شرارت، سرکشی اور خدا کے احکام سے بغاوت کے انجام بد سے آگاہ کرتی اور وقتی خوش عیشی پر گھمنڈ کر کے نتیجہ کی بدبختی پر مذاق اڑانے سے ڈراتی اور باز رکھتی ہے۔

غرض ہود علیہ السلام کے اس واقعہ کا تفصیلی ذکر قرآن عزیز نے جس عبرت آموز طریقہ پر کیا ہے اس کو پڑھیے اور موعظت و عبرت، اور گراں مایہ پند و نصائح کا سامان فراہم کیجیے کہ دنیا و آخرت کی سعادت و فلاح کا یہی بہترین ذخیرہ ہے۔

﴿وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۶﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿۶۸﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰی رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۗ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ۗ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۗ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾﴾ (الاعراف: ۶۵-۷۲)

"اور اسی طرح ہم نے قوم عاد میں اس کے بھائی بندوں میں سے ہود (علیہ السلام) کو بھیجا، اس نے کہا: "اے قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا معبود نہیں، کیا تم (انکار و بدعملی کے نتائج سے) نہیں ڈرتے؟ اس پر قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا تھا، کہا: "ہمیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تم حماقت میں پڑ گئے ہو اور ہمارا خیال یہ ہے کہ تم جھوٹ بولنے والوں میں سے ہو، ہود نے کہا بھائیو! میں احمق نہیں ہوں میں تو اس کی طرف سے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے فرستادہ ہوں میں اس کا پیام تمہیں پہنچاتا ہوں اور یقین کرو کہ تمہیں دیانت داری کے ساتھ نصیحت کرنے والا ہوں کیا تمہیں اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ ایک ایسے آدمی کے ذریعہ تمہارے پروردگار کی نصیحت تم تک پہنچی جو خود تم ہی میں سے ہے خدا یہ احسان یاد کرو کہ قوم نوح کے بعد تمہیں اس کا جانشین اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت توانائی بخشی، پس چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی یاد سے غافل نہ ہو تا کہ ہر طرح کامیاب ہو، انہوں نے کہا: "کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے کہ ہم صرف ایک ہی خدا کے پجاری ہو جائیں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں" اگر تم سچے

ہو تو وہ بات لا دکھاؤ جس کا ہمیں خوف دلا رہے ہو" ہود علیہ السلام نے کہا: "یقین کرو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب واقع ہو گیا ہے (کہ عقلیں ماری گئی ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے کو تباہی کے حوالے کر رہے ہو) کیا ہے جس کی بناء پر تم مجھ سے جھگڑ رہے ہو؟ محض چند نام جو تم نے اور تمہارے بزرگوں نے اپنے جی سے گھڑ لیے ہیں اور جن کے لیے خدا نے کوئی سند نہیں اتاری، اچھا (آنے والے وقت کا) انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کروں گا۔ پھر ایسا ہوا کہ ہم نے ہود کو اور اس کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے بچا لیا اور جنہوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائی تھیں ان کی بیخ و بنیاد تک اکھاڑ دی حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی ایمان لانے والے نہ تھے۔"

﴿وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا
مُفْتَرُوْنَ ۝۵۰ یٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۵۱
وَ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ یَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰی قُوَّتِكُمْ
وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ۝۵۲ قَالُوْا یٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ وَّ مَا نَحْنُ بِتَارِكِیْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَ مَا
نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝۵۳ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْۤا
اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝۵۴ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝۵۵ اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَی اللّٰهِ رَبِّیْ
وَ رَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝۵۶ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ
اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَیْكُمْ ؕ وَ یَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۚ وَ لَا تَضُرُّوْنَهٗ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی
كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ ۝۵۷ وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا هُوْدًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَ نَجَّیْنٰهُمْ مِّنْ
عَذَابٍ غَلِیْظٍ ۝۵۸ وَ تِلْكَ عَادٌ ۛ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ۝۵۹
وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ
هُوْدٍ ۝۶۰﴾ (ہود: ۵۰-۶۰)

"اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے ہود (علیہ السلام) کو بھیجا ہود علیہ السلام نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سواء تمہارا کوئی معبود نہیں یقین کرو تم اس کے سواء کچھ نہیں ہو کہ (حقیقت کے خلاف) افتراء پردازیاں کر رہے ہو اے میری قوم کے لوگو! میں اس بات کے لیے تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا، میرا بدلہ تو اسی پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ پھر کیا تم (اتنی صاف بات بھی) نہیں سمجھتے؟ اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے پروردگار سے (اپنے قصوروں کی) مغفرت مانگو اور (آئندہ کے لیے) اس کی جناب میں توبہ کرو، وہ تم پر برستے ہوئے بادل بھیجتا ہے (جس سے تمہارے کھیت اور باغ شاداب ہو جاتے ہیں) اور تمہاری قوتوں پر نئی نئی قوتیں بڑھاتا ہے (کہ روز بروز گھٹنے کی جگہ

Marfat.com

بڑھتے جاتے ہو) اور (دیکھو) جرم کرتے ہوئے اس سے منہ نہ موڑو" (ان لوگوں نے کہا: "اے ہود تو ہمارے پاس کوئی دلیل لے کر تو آیا نہیں (جسے ہم دلیل سمجھیں) اور ہم ایسا کرنے والے نہیں کہ تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں، ہم تجھ پر ایمان لانے والے نہیں، ہم جو کچھ کہہ سکتے ہیں، وہ تو یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی معبود کی تجھ پر مار پڑ گئی ہے (اسی لیے اس طرح کی باتیں کرنے لگا ہے) ہود علیہ السلام نے کہا: "میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ جن ہستیوں کو تم نے اس کا شریک بنا رکھا ہے، مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں تم سب مل کر میرے خلاف جو کچھ تدبیریں کر سکتے ہو ضرور کرو، اور مجھے (ذرا بھی مہلت نہ دو، پھر دیکھ لو، نتیجہ کیا نکلتا ہے؟) میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی، کوئی چلنے والا وجود نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی پیشانی کے بالوں سے پکڑ رکھا ہے (یعنی کوئی حرکت کرنے والی ہستی نہیں کہ اس کے قبضہ سے باہر ہو) میرا پروردگار (حق وعدل کی سیدھی راہ پر ہے) یعنی اس کی راہ ظلم کی راہ نہیں ہو سکتی، پھر اگر (اس پر بھی) تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لیے میں بھیجا گیا تھا وہ میں نے پہنچا دی (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے اور مجھے تو نظر آ رہا ہے) کہ میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دے دے گا، اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے، یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگران حال ہے۔ اور (دیکھو) جب ہماری ٹھہرائی ہوئی بات کا وقت آ پہنچا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہود کو بچا لیا جو اس کے ساتھ (سچائی پر) ایمان لائے تھے، اور ایسے عذاب سے بچایا کہ بڑا ہی سخت عذاب تھا، یہ ہے سرگذشت عاد کی۔ انہوں نے اپنے پروردگار کی نشانیاں (ہٹ دھرمی اور سرکشی کرتے ہوئے) جھٹلائیں اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی، اور ہر متکبر و سرکش کے حکم کی پیروی کی! اور ایسا ہوا کہ دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت پڑی (یعنی رحمت الٰہی کی برکتوں سے محرومی ہوئی) اور قیامت کے دن بھی۔ تو سن رکھو کہ قوم عاد کے لیے محرومی کا اعلان ہوا جو ہود کی قوم تھی"۔

﴿ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۚ﴿۳۱﴾ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ
مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ الْاٰخِرَةِ
وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا
تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَىِٕنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ
تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ
وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُۨ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ
رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۳۹﴾ قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ
فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَاۗءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾﴾ (المومنون: ۳۱-۴۱)

"پھر ہم نے قوم نوح (علیہ السلام) کے بعد قوموں کا ایک دوسرا دور پیدا کر دیا۔ ان میں بھی اپنا رسول بھیجا جو خود انہی میں سے تھا

Marfat.com

(اس کی پکار بھی یہی تھی) کہ "اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، کیا تم (انکار و فساد کے نتائج بد سے) ڈرتے نہیں؟" اس کی قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی اور آخرت کے پیش آنے سے منکر تھے اور جنہیں دنیا کی زندگی میں ہم نے آسودگی دے رکھی تھی کہنے لگے: "اس سے زیادہ اس کی کیا حیثیت ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے جو تم کھاتے ہو یہ بھی کھاتا ہے جو کچھ تم پیتے ہو یہ بھی پیتا ہے، اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی اطاعت کر لی تو بس سمجھ لو تم تباہ ہوئے، تم سنتے ہو یہ کیا کہتا ہے؟ یہ تمہیں اُمید دلاتا ہے کہ جب مرنے کے بعد محض مٹی اور ہڈیوں کا چورا ہو جاؤ گے تو پھر تمہیں موت سے نکالا جائے گا کیسی ان ہونی بات ہے جس کی تمہیں توقع باقی ہے، زندگی تو بس یہی زندگی ہے جو دنیا میں بسر کرتے ہیں یہیں مرنا ہے اور یہیں جینا ہے، ایسا کبھی ہونے والا نہیں کہ مر کر پھر جی اُٹھیں گے، کچھ نہیں یہ ایک مفتری آدمی ہے جس نے اللہ کے نام سے جھوٹ موٹ بات بنا دی، ہم کبھی اس پر یقین لانے والے نہیں، اس پر اس رسول نے دعا مانگی: "خدایا! انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے، پس تو میری مدد کر" حکم ہوا "عنقریب ایسا ہونے والا ہے کہ یہ اپنے کیے پر شرمسار ہوں گے" چنانچہ فی الحقیقت ایک ہولناک آواز نے انہیں آ پکڑا اور ہم نے خس و خاشاک کی طرح انہیں پامال کر دیا، تو محرومی ہو اس گروہ کے لیے کہ ظلم کرنے والا ہے"۔

﴿ كَذَّبَتْ عَادُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٢٣﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٢٤﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٢٥﴾
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿١٢٦﴾ وَ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٢٧﴾ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ
رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿١٢٨﴾ وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿١٢٩﴾ وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿١٣٠﴾ فَاتَّقُوا
اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿١٣١﴾ وَ اتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٣٢﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ بَنِيْنَ ﴿١٣٣﴾ وَ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿١٣٤﴾
اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٣٥﴾ قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿١٣٦﴾ اِنْ
هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٣٧﴾ وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿١٣٨﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَ مَا كَانَ
اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٩﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٤٠﴾ ﴾ (الشعراء: ۱۲۳۔۱۴۰)

"عاد نے (اللہ کے) پیغام لانے والوں کو جھٹلایا جب ان کے بھائی ہود علیہ السلام نے ان کو کہا: "کیا تم کو (خدا کا ڈر نہیں؟) میں تمہارے پاس پیغام لانے والا معتبر ہوں، سو ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میرا کہا مانو، اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر بدلہ میرا بدلہ اس جہان کے مالک پر ہے، کیا بناتے ہو تم ہر اونچی زمین پر ایک نشان کھیلنے کو، اور بناتے ہو کاریگریاں شاید تم ہمیشہ رہو گے اور جب ہاتھ ڈالتے ہو تو ظلم کا پنجہ ہی مارتے ہو، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو، اور ڈرو اس سے جس نے تم کو پہنچائیں وہ چیزیں جو تم جانتے ہو، پہنچائے تم کو چوپائے اور بیٹے، اور باغ اور چشمے، میں ڈرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کی آفت سے"۔ وہ بولے "ہم کو برابر ہے تو نصیحت کرے یا نہ کرے اور کچھ نہیں ہیں یہ باتیں مگر عادت ہے اگلے لوگوں کی، اور ہم پر آفت آنے والی نہیں، پھر اس کو جھٹلانے لگے، تب ہم نے ان کو غارت کر دیا۔ اس بات میں البتہ نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ

Marfat.com

ماننے والے نہیں، اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا"۔

﴿فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۶﴾﴾ (حٰم السجدہ: ۱۵۔۱۶)

"سو وہ عاد تھے وہ تو غرور کرنے لگے ملک میں ناحق، اور کہنے لگے "کون ہے ہم سے زیادہ زور وقوت میں، کیا دیکھتے نہیں کہ اللہ جس نے ان کو بنایا وہ زیادہ ہے ان سے زور میں؟ اور تھے ہماری نشانیوں کے منکر، پھر بھیجی ہم نے ان پر ہوا بڑے زور کی کئی دن جو مصیبت کے تھے، تاکہ چکھائیں ان کی رسوائی کا عذاب دنیا کی زندگانی میں، اور آخرت کے عذاب میں تو پوری رسوائی ہے"۔

﴿وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ۭ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖٓ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۲۱﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ڮ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۴﴾ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۵﴾ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ڮ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۲۶﴾﴾

(الاحقاف: ۲۱۔۲۶)

"اور یاد کر عاد کے بھائی کو جب ڈرایا اس نے اپنی قوم کو احقاف میں اور گزر چکے تھے ڈرانے والے اس کے سامنے سے اور پیچھے سے (یہ کہتے ہوئے) کہ بندگی نہ کرو کسی کی اللہ کے سوائے میں ڈرتا ہوں تم پر آفت سے ایک بڑے دن کی، بولے! کیا تو آیا ہمارے پاس کہ پھیر دے ہم کو ہمارے معبودوں سے، سو لے آ ہم پر جو وعدہ کرتا ہے اگر ہے تو سچا"۔ کہا یہ خبر تو اللہ ہی کو ہے اور میں تو پہنچا دیتا ہوں جو کچھ بھیج دیا ہے میرے ہاتھ، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ نافرمانی کرتے ہو، پھر جب دیکھا اس (عذاب کو) ابر سامنے آیا ہوا اپنی وادیوں کے، بولے! یہ ابر ہے ہمارے اوپر برسے گا" کوئی نہیں" یہ تو وہ چیز ہے جس کی تم جلدی کرتے تھے ہوا ہے جس میں عذاب ہے، دردناک، اکھاڑ پھینکے ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے،

Marfat.com

پھر کل کے دن رہ گئے کہ کوئی نظر نہیں آتا تھا سوائے ان کے گھروں کے، یوں ہم سزا دیتے ہیں گنہگار لوگوں کو اور ہم نے مقدور دیا تھا ان کو ان چیزوں کا جن کا تم کو مقدور نہیں دیا اور ہم نے ان کو دیے تھے کان اور آنکھیں اور دل، پھر کام نہ آئے کان ان کے اور نہ آنکھیں ان کی اور نہ دل ان کے کسی چیز میں، اس لیے کہ منکر ہوتے تھے اللہ کی باتوں سے اور اُلٹ پڑی ان پر جس بات سے کہ وہ ٹھٹھا کرتے تھے۔"

﴿وَ فِیْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ ۟ۚ مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِیْمِ ۟ؕ﴾ (الذاریات: ۴۱۔۴۲)

اور قوم عاد (کے ہلاک ہونے میں بھی قدرت خدا کی بڑی نشانیاں ہیں) جب ہم نے ان پر ایک منحوس آندھی چلائی جس چیز سے ہوکر گزرتی اس کو بوسیدہ ہڈی کی طرح (چورا) کیے بدون نہ چھوڑتی۔"

﴿كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَیْفَ كَانَ عَذَابِیْ وَ نُذُرِ ۟ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ۟ۙ تَنْزِعُ النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ۟ فَكَیْفَ كَانَ عَذَابِیْ وَ نُذُرِ ۟﴾ (القمر: ۱۸۔۲۱)

"جھٹلایا عاد نے پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا۔ ہم نے بھیجی ان پر ہوا تند، ایک نحوست کے دن جو ٹلنے والی نہ تھی اکھاڑ پھینکا لوگوں کو گویا وہ جڑیں ہیں کھجور کی اکھڑی پڑی، پھر کیسا رہا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا۔"

﴿وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَةٍ ۟ۙ سَخَّرَهَا عَلَیْهِمْ سَبْعَ لَیَالٍ وَّ ثَمٰنِیَةَ اَیَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَی الْقَوْمَ فِیْهَا صَرْعٰی ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَةٍ ۟ۚ فَهَلْ تَرٰی لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِیَةٍ ۟﴾ (الحاقۃ: ۶۔۸)

"اور وہ جو عاد تھے سو برباد ہوئے ٹھنڈی سناٹے کی ہوا سے کہ نکلی جائے ہاتھوں سے، مقرر کر دیا اس کو ان پر سات رات اور آٹھ دن لگا تار، پھر تو دیکھے کہ وہ لوگ اس میں بچھڑ گئے گویا وہ جڑیں ہیں کھجور کی، پھر تو دیکھتا ہے کوئی ان میں اُن کا بچا؟"

﴿اَلَمْ تَرَ كَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۟ۙ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۟ۙ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ ۟ۙ﴾ (الفجر: ۶۔۸)

"تو نے دیکھا، کیسا کیا تیرے رب نے عاد ارم کے ساتھ جو تھے بڑے ستونوں والے کہ ان جیسی (چیز) سارے شہروں میں نہیں بنائی گئیں۔"

حضرت ہود علیہ السلام کی وفات:

اہل عرب حضرت ہود علیہ السلام کی وفات اور ان کی قبر مبارک کے متعلق مختلف دعوے کرتے ہیں، مثلاً اہل حضرموت کا دعویٰ ہے کہ عاد کی ہلاکت کے بعد وہ حضرموت کے شہروں میں ہجرت کر آئے تھے، وہیں ان کی وفات ہوئی اور وادی برہوت کے قریب حضرموت کے مشرقی حصہ میں شہر تریم سے قریباً دو مرحلے پر دفن ہوئے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک اثر منقول ہے کہ ان کی قبر حضرموت میں کثیب احمر (سرخ ٹیلہ) پر ہے اور ان کے سرہانے

Marfat.com

جھاؤ کا درخت کھڑا ہے۔

اور اہل فلسطین کا دعویٰ ہے کہ وہ فلسطین میں دفن ہیں، اور انہوں نے وہاں ان کی قبر بھی بنا رکھی ہے اور اس کا سالانہ عرس بھی کرتے ہیں۔ [1]

مگر ان تمام روایات میں سے حضر موت کی روایت صحیح اور معقول معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ عاد کی بستیاں حضر موت ہی کے قریب تھیں، لہٰذا قرینہ یہی چاہتا ہے کہ ان کی تباہی کے بعد قریب ہی کی آبادیوں میں حضرت ہود (علیہ السلام) نے قیام فرمایا ہوگا اور وہیں پیغام اجل کو لبیک کہا اور وہ یہی حضر موت کا مقام ہے۔

چند عبرتیں:

علاوہ اس خاص عبرت کے جس کا ذکر اس طویل واقعہ میں ہو چکا ہے، یہ چند عبرتیں بھی قابل توجہ اور نظر التفات کے لائق ہیں۔

① جو شخص قوم عاد کے واقعہ کو پڑھتا ہے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسی ہستی کا تصور آ جاتا ہے جو وقار اور متانت کا مکمل مجسمہ ہے اور شرافت و نجابت چہرہ سے عیاں، جو کچھ کہتا ہے پہلے اس کو وزن کر لیتا ہے کہ اس کا انجام نیک ہے یا بد، قوم کی درشتی، تمسخر و استہزاء کا جواب ضبط و صبر سے دیتا اور پھر بھی ان کی بھلائی کا جویاں نظر آتا ہے، اخلاص اور حسن نیت اس کی پیشانی سے عیاں ہے، اس کی قوم کہتی ہے:

﴿اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝﴾ (الاعراف: ٦٦)

"بے شک ہم تجھ کو بے وقوف پاتے ہیں اور بیشک ہم تجھ کو جھوٹوں میں شمار کرتے ہیں"۔

مگر وہ اس کا جواب دیتا ہے:

﴿يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۝﴾ (الاعراف: ٦٧۔٦٨)

"اے قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں، البتہ میں جہانوں کے پروردگار کی جانب سے رسول ہوں تم تک اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور میں تمہارے لیے امانت دار خیر خواہ ہوں"۔

یہ سوال و جواب ہم کو توجہ دلاتے ہیں کہ خدا کے برگزیدہ انسان جب کسی کی نیک خواہی کرتے اور کجرووں کی کجی کو سیدھا کرنے کے لیے نصیحت فرماتے ہیں تو کور چشموں اور بد باطنوں کی ہرزہ سرائی تمسخر و تحقیر کی پرواہ نہیں کرتے، دل گیر و رنجیدہ ہو کر امر حق سے منہ نہیں موڑتے ناراض ہو کر خیر خواہی اور نصیحت کوشی کو نہیں چھوڑتے، اور بلندی اخلاق اور نرمی و مہربانی کے ساتھ روحانی مریضوں کے علاج میں مشغول رہتے ہیں اور ان کی ان تمام خصوصیات میں نمایاں امتیاز یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس نصیحت و نیک خواہی کے لیے قوم سے مطلق کسی قسم کے نفع کے خواہش مند نہیں ہوتے اور ان کی زندگی بدلہ اور عوض سے یکسر بلند اور برتر ہوتی ہے۔

[1] قصص الانبیاء ص ۹۷

Marfat.com

﴿لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ﴾ (ہود: ۲۹)

"اور میں تم سے اس نصیحت پر اجرت نہیں مانگتا میرا اجر تو صرف اللہ کے ذمہ ہے اور بس"۔

۲ حضرت ہود علیہ السلام نے لطف و مہربانی کے ساتھ اپنی قوم کو خدا کی وحدانیت پر ایمان لانے کی ترغیب دی، اس کی لازوال نعمتوں کو یاد دلایا اور آئندہ کے لیے وعدہ کیا مگر بد بخت قوم نے کسی طرح مان کر نہ دیا۔ اس کا سب سے بڑا سبب وہ جاہلانہ عقیدہ تھا کہ باپ دادا کی ریت و رسم اور ان کے خود ساختہ اصنام کی قہرمانیت کے خلاف جو شخص بھی آواز اٹھائے گا وہ ان بتوں کی پھٹکار میں آجائے گا، یہ مہلک عقیدہ جن قوموں کے اندر اپنے جراثیم پیدا کر دیتا ہے ان قوموں کا اپنے مصلح اور اپنے نبی و پیغمبر کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو قوم ہود اور قوم نوح کے تذکروں میں نظر آتا ہے، اپنے مصلحین اور انبیاء صادقین کے خلاف قوموں کا بغض و عناد اسی ایک عقیدہ پر مبنی رہا ہے کہ ہمارے باپ دادا کی ریت و رسم اور ان کے خود ساختہ اصنام کی قہرمانیت کے خلاف کیوں کچھ کہا جاتا ہے، یونان کے مشہور حکیم سقراط کو زہر کا پیالہ اسی لیے پینا پڑا کہ وہ اپنی قوم کے معبودانِ باطل کی قہرمانیت کا کیوں انکار کرتا اور ان کو کس لیے ان کے غلبہ و اقتدار کا مخالف بناتا ہے۔ پس یہ جرثومہ اقوام کی روحانی زندگی کے لیے ہمیشہ تباہ کن اور ان کی فلاح و سعادت ابدی کے لیے ہلاکت آفریں رہا ہے۔

۳ حضرت ہود علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی یہ سنت بہترین اسوہ ہے کہ تبلیغ و پیغامِ حق کی راہ میں بدی کا بدلہ نیکی سے دیا جائے اور تلخی کا جواب شیریں کلامی سے پورا کیا جائے، البتہ مبلغ ان کی بدکرداری اور مسلسل سرکشی پر اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون "جزائے عمل یا پاداشِ عمل" کو ضرور یاد دلائے اور آنے والے انجام بد پر یقیناً ان کو تنبیہ کرے اور یہ حقیقت بار بار سامنے لائے کہ جب کوئی قوم اجتماعی سرکشی، ظلم اور بغاوت پر آمادہ ہو جاتی اور اس پر پیہم اصرار کرتی رہتی ہے تو پھر خدائے تعالیٰ کا قہر و غضب اس کو صفحۂ عالم سے مٹا دیا کرتا ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے چنانچہ قوم نوح اور قوم ہود اس کی عبرت آموز مثالیں ہیں۔

Marfat.com

حضرت صالح علیہ السلام

○ حضرت صالح (علیہ السلام) کا ذکر قرآن عزیز میں، ○ حضرت صالح اور ثمود کا نسب نامہ ○ ثمود کی آبادیاں ○ اہل ثمود کا دین ○ قرآن عزیز میں قصص کا مطلب معجزہ کی حقیقت ○ ناقہ کا واقعہ ○ ناقہ ثمود کے لیے خدا ایک نشان تھی ○ ثمود کے ہاتھوں ناقہ کی ہلاکت ○ واقعہ سے متعلق چند عبرتیں۔

حضرت صالح علیہ السلام اور ثمود کا ذکر قرآن عزیز میں:

قرآن عزیز میں صالح علیہ السلام کا نام آٹھ جگہ آیا ہے، حسب ذیل اعداد اس کی تصدیق کرتے ہیں:

نام سورہ	آیات	میزان
اعراف	۷۳، ۷۵، ۷۷	۳
ہود	۶۱، ۶۲، ۶۶، ۸۹	۴
شعراء	۱۴۲	۱
		کل = ۸

حضرت صالح علیہ السلام جس قوم میں پیدا ہوئے اس کو ثمود کہتے ہیں اور ثمود کا ذکر نو سورتوں میں کیا گیا ہے ذیل کا نقشہ اس کو واضح کرتا ہے۔

اعراف	ہود	حجر	نمل	فصلت	النجم	القمر	الحاقہ	الشمس

حضرت صالح علیہ السلام اور ثمود کا نسب نامہ:

علماء انساب قوم ثمود کے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کے نسب نامہ میں مختلف نظر آتے ہیں۔ مشہور حافظ حدیث امام بغوی نے آپ کا نسب اس طرح بیان کیا ہے۔ "صالح بن عبید بن آسف بن ماشخ بن عبید بن حادر بن ثمود" اور وہب بن منبہ مشہور تابعی اس طرح نقل کرتے ہیں۔ "صالح بن عبید بن جابر بن ثمود"۔ [1]

اگرچہ بغوی زمانہ کے اعتبار سے وہب سے بہت بعد میں ہیں اور وہب تورات کے بہت بڑے عالم بھی ہیں تاہم حضرت

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ اعراف۔

Marfat.com

صالح علیہ السلام سے ثمود تک نسب کی جو کڑیاں بغوی نے جوڑی ہیں علماء انساب کے نزدیک وہی تاریخی حیثیت سے راجح اور قرین صواب ہیں۔

اس نسب نامہ سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس قوم کو (جس کے ایک فرد حضرت صالح علیہ السلام بھی ہیں) ثمود اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے نسب نامہ کا جد اعلیٰ ثمود ہے، اور اسی کی جانب یہ قبیلہ یا قوم منسوب ہے۔

ثمود سے حضرت نوح علیہ السلام تک بھی دو قول ہیں۔ اوّل: ثمود بن عامر بن ارم بن سام۔ دوم: ثمود بن عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام۔

سید محمود آلوسی صاحب تفسیر روح المعانی فرماتے ہیں کہ امام ثعلبی دوسرے قول کو راجح سمجھتے ہیں۔ ❶

بہر حال ان دونوں روایتوں سے یہ باتفاق ثابت ہوتا ہے کہ قوم ثمود بھی سامی اقوام ہی کی ایک شاخ ہے اور غالباً بلکہ یقیناً یہی وہ افراد قوم ہیں جو عاد اولیٰ کی ہلاکت کے وقت حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ بچ گئے تھے اور یہی نسل عاد ثانیہ کہلائی، اور بلاشبہ یہ قوم بھی عرب بائدہ (ہلاکت شدہ عربی نسل) میں سے ہے۔

ثمود کی بستیاں:

ثمود کہاں آباد تھے اور کس خطہ میں پھیلے ہوئے تھے؟ اس کے متعلق یہ طے شدہ امر ہے کہ ان کی آبادیاں حجر میں تھیں، حجاز اور شام کے درمیان وادی قریٰ تک جو میدان نظر آتا ہے یہ سب ان کا مقام سکونت ہے، اور آج کل "فج الناقہ" کے نام سے مشہور ہے۔

ثمود کی بستیوں کے کھنڈرات اور آثار آج تک موجود ہیں، اور اس زمانہ میں بھی بعض مصری اہل تحقیق نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ان کا بیان ہے کہ وہ ایک ایسے مکان میں داخل ہوئے جو "شاہی حویلی" کہی جاتی ہے، اس میں متعدد کمرے ہیں اور اس حویلی کے ساتھ ایک بہت بڑا حوض ہے اور یہ پورا مکان پہاڑ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔

عرب کا مشہور مؤرخ مسعودی لکھتا ہے:

ورسمهم باقية و اثارهم بادية في طريق من ورد من الشام. (ج ۳ ص ۱۳۹)

"جو شخص شام سے حجاز کو آتا ہے اس کی راہ میں ان کے مٹے نشان اور بوسیدہ کھنڈرات پڑتے ہیں"۔

حجر کا یہ مقام جو حجر ثمود کہلاتا ہے شہر مدین سے جنوب مشرق میں اس طرح واقع ہے کہ خلیج عقبہ اس کے سامنے پڑتی ہے اور جس طرح عاد کو عاد ارم کہا گیا ہے (حتیٰ کہ قرآن عزیز نے ارم کو ان کی مستقل صفت ہی بنا دیا) اسی طرح ان کی ہلاکت کے بعد ان کو ثمود ارم یا عاد ثانیہ کہا جاتا ہے۔

مشرق خصوصاً عرب کے بارہ میں یورپ کے مستشرقین ❷ جس طرح اپنی حذاقت و مہارت تاریخ کا ثبوت دیا کرتے ہیں اور تحقیق کے نام سے غلط دعاوی کرنے کے عادی ہیں اسی طرح انہوں نے ثمود کو بھی اپنی تحقیق کا تختہ مشق بنایا ہے، وہ سوال کرتے ہیں

---

❶ جلد اوّل ص ۱۴۲

❷ یورپ میں جو علماء مشرق کی تاریخ اور مشرقی علوم سے شغف رکھتے اور ان کے متعلق مباحث و نظریات قائم کرتے ہیں ان کو مستشرق کہتے ہیں، ان میں سے بعض اگرچہ حقیقتہً حذاقت و مہارت رکھتے ہیں، مگر اکثر محض ظنی اور تخمینی بلکہ من گھڑت نظریے قائم کر کے مشرق سے یا تعصب کا ثبوت دیتے ہیں یا اپنی کم مائیگی علم کا۔

Marfat.com

کہ ثمود کی اصل کیا ہے اور ان کا وجود کب ہوا اور کس زمانہ میں؟ اس سوال کے جواب میں ان کے دو گروہ ہیں۔ ایک فریق کہتا ہے کہ یہ یہود کا ایک گروہ تھا جو فلسطین میں داخل نہیں ہوا تھا اور یہیں بس گیا تھا، مگر یہ قول نہ صرف پایہ تحقیق سے گرا ہوا ہے بلکہ قطعاً غلط اور مہمل ہے، اس لیے کہ تمام مؤرخین باتفاق آراء یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ابھی وہ زمانہ قریب بھی نہ آیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلتے کہ ثمود کی آبادیاں ہلاک و تباہ ہو چکی تھیں اور ان کا قلع قمع ہو چکا تھا، نیز قرآن عزیز تصریح کرتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قوم فرعون نے جھٹلایا تو آل فرعون ہی میں سے ایک مردِ مومن نے یہ کہہ کر اپنی قوم کو ڈرایا کہ تمہاری اس تکذیب کا نتیجہ کہیں وہی نہ ہو جو تم سے پہلے قوم نوح، عاد اور ثمود اور ان کے بعد کی قوموں کا اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی وجہ سے ہوا تھا۔

مستشرقین کی دوسری جماعت کہتی ہے کہ یہ عمالقہ میں سے تھے اور فرات کے مغربی ساحل سے اُٹھ کر یہاں آباد ہو گئے تھے۔

ان میں سے بعض کا یہ خیال ہے کہ یہ عمالقہ میں سے تھے جن کو مصر کے بادشاہ احمس نے خارج البلد کر دیا تھا اور چونکہ مصر کے زمانہ میں فن سنگ تراشی میں انہوں نے کمال حاصل کر لیا تھا اس لیے حجر جا کر پہاڑوں اور پتھروں کو تراش کر بے نظیر عمارات تعمیر کیں اور عام رائج طریقہ پر بھی عالی شان محل بنائے۔

مگر ہم عاد کے واقعہ میں یہ ثابت کر آئے ہیں کہ عاد و ثمود سامی اقوام میں سے ہیں اور یہ کہ اہل عرب ان کو محض یہود کی غلط تقلید میں عمالقہ میں سے کہہ دیتے ہیں، حالانکہ عملیق بن ادکا اس نسل سے کوئی رشتہ نہیں ملتا۔ اس لیے یہ قول بھی صحیح نہیں ہے۔

ان تمام آراء کے خلاف محققین کی رائے یہ ہے کہ یہ عاد کا بقیہ ہیں اور یہی صحیح اور راجح قول ہے، اور اہل حضرموت کا یہ دعویٰ کہ ثمود کی آبادیاں اور محلات عاد کی صناعی کا نتیجہ ہیں، اس قول کا مخالف نہیں ہے کہ ثمود فن تعمیر میں یدطولیٰ رکھتے تھے اور یہ عمارات ان کی اپنی تعمیر ہیں، اس لیے کہ عاد اولیٰ اور عاد ثانیہ بہرحال عاد ہیں۔ حضرت صالح کا اپنی قوم سے یہ خطاب بھی اسی کا مؤید ہے۔

﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا﴾ (الاعراف: ۷۴)

"اور تم اس وقت کو یاد کرو کہ تم کو خدا نے عاد کے بعد ان کا قائم مقام بنایا اور تم کو زمین پر جگہ دی کہ تم اس کی سطح اور نرم حصوں پر محلات بناتے ہو اور سنگ تراشی کر کے پہاڑوں میں مکان تراشتے ہو۔"

رہا ثمود کے زمانہ کا مسئلہ سو اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن منضبط وقت نہیں بتایا جا سکتا، اس لیے کہ تاریخ اس بارہ میں غیر مطمئن ہے، البتہ یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کا زمانہ ہے اور وہ اس جلیل القدر پیغمبر کی بعثت سے بہت پہلے ہلاک ہو چکے تھے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ثمود کی آبادیوں کے قریب بعض ایسی قبریں پائی جاتی ہیں کہ جن پر آرامی زبان کے کتبے لگے ہوئے ہیں اور ان کتبوں پر جو تاریخ کندہ ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے کی ہے، تو اس سے یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ یہ قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد وجود میں آئی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

یہ دراصل ان لوگوں کی قبریں ہیں جو اس قوم کی ہلاکت کے ہزاروں برس کے بعد اتفاقاً یہاں آ کر بس گئے ہیں اور انہوں

Marfat.com

نے اپنے بزرگوں کے آثار کی قدامت ظاہر کرنے کے لیے آرامی خط میں (جو کہ قدیم خط ہے) اپنے کتبے لکھ کر لگا دیئے تا کہ یادگار رہیں ورنہ وہ قبریں نہ ثمود کی ہیں اور نہ ان کا یہ زمانہ ہے۔

مصر کا مشہور عیسائی مؤرخ جورجی زیدان اپنی کتاب "العرب قبل الاسلام" میں اسی کے قریب قریب لکھتا ہے، کہتا ہے:

"آثار و کتبات کے پڑھنے سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ صالح (علیہ السلام) کی قوم کی بستیاں ولادت مسیح سے کچھ پہلے نبطیوں کے اقتدار میں آ گئی تھیں، یہ لوگ بطرہ کے ساکنین میں سے تھے، (جن کا ذکر عنقریب کتاب میں آنے والا ہے) اور ان کے آثار اور ٹیلوں کو بہت سے مستشرقین نے خود دیکھا ہے اور مقدمہ کتاب میں اس کا ذکر تفصیل سے کر چکا ہوں، ان ہی کے آثار کو انہوں نے پڑھا ہے جو پتھروں پر کندہ ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم وہ کھنڈر ہیں جو قصر بنت، قبر باشا، قلعہ اور برج کے ناموں سے موسوم ہیں۔ ان پر جو کچھ تحریر ہے وہ نبطی تحریر میں ہے اور ان میں سے بعض یا سب کی سب وہی تحریریں ہیں جو قبروں پر کندہ ہیں۔"

مستشرقین نے یہاں جو کچھ پایا ان میں سے حسب ذیل ایک کتبہ بھی ہے جو پتھر پر نبطی حروف میں کندہ ہے اور ولادت مسیح علیہ السلام سے قریب زمانہ کا مکتوب ہے (کندہ عبارت کا مضمون یہ ہے) "مقبرہ کمکم بنت وائلہ بنت حرم نے اور کمکم کی بیٹی کلیبہ نے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے بنوایا ہے۔ اس کی بناء بہت اچھے مہینوں میں شروع کی گئی ہے، یہ نبطیوں کے بادشاہ حارث کی تخت نشینی کا نواں سال ہے، وہ حارث جو اپنے قبیلے کا عاشق صادق ہے۔

پس "عمی ذوالشری ✿ وعرشہ"؟ لات، عمند، منوت اور قیس کی ان پر لعنت ہو جو ان قبروں کو فروخت کرے یا رہن رکھے، یا ان سے کسی جسم کو یا عضو کو نکالے، یا کمکم، اس کی بیٹی اور اس کی اولاد کے علاوہ کسی کو دفن کرے۔

اور جو شخص بھی اس پر لکھے ہوئے کی مخالفت کرے اس پر ذوالشری ہبل، منوت کی پانچ لعنتیں ہوں، اور جو ساحر اس کے خلاف کرے اس پر ایک ہزار درہم حارثی کا تاوان واجب ہے مگر یہ کہ اس کے ہاتھ میں کمکم کلیبہ یا اس کی اولاد میں سے کسی کے ہاتھ کی تحریر ہو جس میں اس اجنبی قبر کے لیے صاف اور صریح الفاظ میں اجازت موجود ہو، اور وہ اصلی ہو جعلی نہ ہو۔

اس مقبرہ کو وہب اللاۃ بن عبادہ نے بنایا۔ ✿

اہل ثمود کا مذہب:

ثمود اپنے بت پرست پیشروؤں کی طرح بت پرست تھے، وہ خدائے واحد کے علاوہ بہت سے معبودانِ باطل کے پرستار اور شرک میں مبتلا تھے، اس لیے ان کی اصلاح اور احقاق حق کے لیے ان ہی کے قبیلہ میں سے حضرت صالح علیہ السلام کو ناصح پیغمبر اور رسول بنا کر بھیجا گیا تا کہ وہ ان کو راہ راست پر لائیں، ان کو خدا کی نعمتیں یاد دلائیں جن سے صبح و شام وہ محظوظ ہوتے رہتے ہیں اور ان پر واضح کریں کہ کائنات کی ہر شے خدا کی توحید اور یکتائی پر شاہد ہے اور یقینی دلائل اور مسکت براہین کے ساتھ ان کی گمراہی ظاہر کریں اور بتائیں کہ پرستش و عبادت کے لائق ذات اَحد کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں ہے۔

✿ سوالیہ نشان زدہ عربی عبارت کتبہ پر صاف نہیں پڑھی جا سکی اس لیے اصل الفاظ نقل کر دیئے گئے۔ ✿ ص ۸۰

قرآن عزیز میں قصص کا مطلب:

قرآن عزیز کی یہ سنت ہے کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لیے گذشتہ اقوام اوران کے ہادیوں کے واقعات وحالات بیان کر کے نصیحت وموعظت کا سامان مہیا کرتا ہے، اس کا موضوع حکایات وقصص بیان کرنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ خدائے تعالیٰ نے جبکہ انسان کو عقل کی روشنی عطا فرمائی ہے تو اس کی ہدایت ونجات اخروی کا کیا سامان مہیا کیا ہے تا کہ وہ ان اسباب کی مدد سے اپنی عقل سے کام لے اور خدا کی مرضیات ونامرضیات کو پہچانے؟ اس نے بتایا کہ خدائے تعالیٰ کی یہ سنت جاریہ ہے کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لیے ان ہی میں سے پیغمبر اور رسول بھیجتا ہے، وہ ان کو حق کی راہ بتاتے اور ہر قسم کی گمراہی سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں اور تائید میں اقوام امم کے واقعات بیان کرتا اور تاریخ ماضی کو دہراتا ہے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ جن اقوام نے اپنے رسولوں کی ہدایات کو تسلیم کیا انہوں نے دنیا وآخرت کی فلاح پائی اور جن امتوں نے ان کی تلقین کا انکار کیا، ان کا مذاق اڑایا اور ان کو جھٹلایا تو خدائے تعالیٰ نے اپنے سچے رسول کی تصدیق کے لیے کبھی بطور خود اور کبھی قوم کے مطالبہ پر ایسی نشانیاں نازل فرمائیں جو نبیوں اور رسولوں کی تصدیق کا باعث بنیں اور "معجزہ" کہلائیں۔

لیکن اگر قوم نے اس نشانی "معجزہ" کے بعد بھی تکذیب کو نہ چھوڑا اور بغض وعناد سے وہ انکار پر اڑے رہے تو پھر "عذاب الٰہی" نے آکر ان کو تباہ وہلاک کر دیا اور ان کے واقعات کو آنے والی اقوام کے لیے عبرت وموعظت کا سامان بنا دیا۔

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۝﴾ (قصص:۵۹)

"اور تیرا رب بستیوں کو اس وقت تک ہلاک کرنے والا نہیں جب تک نہ بھیج دے ان کے صدر مقام میں اپنا رسول جو پڑھ کر سنائے ان کو ہماری آیات اور ہم (اس وقت تک) بستیوں کو ہلاک نہیں کرتے جب تک ان کے بسنے والے خود ہی ظلم پر نہ اتر آئیں۔"

معجزہ کی حقیقت:

"معجزہ" لغت میں عاجز کر دینے اور تھکا دینے والی چیز کو کہتے ہیں اور اسلامی اصطلاح میں ایسے عمل کا نام ہے جو سلسلہ اسباب کے بغیر عالم وجود میں آجائے، اس کو عام بول چال میں "خرق عادت" بھی کہتے ہیں، اور اسی بنا پر اس جگہ یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا "عادت اللہ" (کہ جس کو ناموس فطرت بھی کہا جاتا ہے) کا ٹوٹنا ممکن ہے؟

دوسرے الفاظ میں اس سوال کی تعبیر اس طرح کی جا سکتی ہے کہ کیا قانون قدرت میں تبدیلی ممکن ہے؟

اس سوال کا حل یہ ہے کہ معجزہ کی یہ تعبیر کہ وہ خارق عادت شئے کا نام ہے، غلط تعبیر ہے اس لیے کہ خدائے تعالیٰ کے قوانین قدرت یا نوامیس فطرت دراصل دو قسموں میں تقسیم ہیں، عادت عام اور عادت خاص۔ عادت عام سے قدرت کے وہ قوانین مراد ہیں جو عام اسباب ومسببات کے سلسلہ میں جکڑے ہوئے ہیں مثلاً: آگ جلاتی ہے اور پانی خنکی پہنچاتا ہے، اور عادت خاص کا مطلب یہ ہے کہ اسباب ومسببات میں علاقہ پیدا کرنے والے ید قدرت نے کسی خاص مقصد کے لیے سبب اور مسبب کے درمیانی رشتہ کو کسی

Marfat.com

شئے سے الگ کر دیا یا بغیر سبب کے مسبب کو وجود بخش دیا، جیسا کہ جلنے کے اسباب موجود ہونے کے باوجود کسی جسم کا آگ سے نہ جلنا، یا دو تین انسانوں کے قابل خوراک سے سو دو سو انسانوں کا شکم سیر ہو جانا اور اپنی اصل مقدار کی حد تک پھر بھی باقی بچ جانا۔

یہ دونوں باتیں چونکہ عام نگاہوں میں قانون قدرت کے خلاف ہیں اس لیے جب یہ اور اسی طرح کی کوئی شئے رونما ہوتی یا اس کے وجود پذیر ہو جانے کی اطلاع دی جاتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قدرت کے قانون یا عادت اللہ کے خلاف ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ قوانین فطرت کی پہلی قسم یعنی عام عادت کے خلاف تو ہوتا ہے مگر عادت خاص کے خلاف نہیں ہوتا اور وہ بھی قانون قدرت ہی کی ایک کڑی ہوتی ہے جو عام حالات سے الگ کسی خاص مقصد کے پورا کرنے کے لیے ظاہر کی جاتی ہے، اور اس جگہ وہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس طرح خدائے تعالیٰ اپنے سچے رسول اور پیغمبر کی صداقت وحقانیت کی تصدیق کرتا اور جھٹلانے والوں کو یہ باور کراتا ہے کہ اگر یہ مدعی رسالت اپنے دعوے میں صادق نہ ہوتا تو خدا کی تائید کبھی اس کے ساتھ نہ ہوتی، پس عام قانون قدرت سے جدا رسول و پیغمبر کا یہ عمل ظاہر کرتا ہے کہ درحقیقت یہ اس کا اپنا فعل نہیں ہے بلکہ یہ خدا کا فعل ہے جو عادت خاص کی صورت میں نبی کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا تاکہ اس کی صداقت کی دلیل بن سکے۔

اور اس میں شک نہیں کہ اگر کسی نبی اور پیغمبر کو معجزہ نہ بھی دیا جاتا تب بھی پیغمبر کی پیغمبرانہ زندگی، کتاب ہدایت کی موجودگی، اور عقلی دلائل و براہین کی روشنی میں اس کی صداقت پر ایمان لانا ازبس ضروری ہوتا اور اس کا انکار مذہب کی اصطلاح میں کفر و جمود مانا جاتا تاہم یہ بھی ایک حقیقت تامہ ہے کہ آفتاب صبح سے زیادہ روشن عقلی و نقلی دلائل کے باوجود عوام کی فطرت اکثر و بیشتر حق وصداقت کے قبول کے لیے بھی دلائل سے زیادہ ایسے امور سے جلد متاثر ہوتی ہے جو عقل کو حیران اور دماغ کو مرعوب کر کے ان پر یہ ظاہر کر دے کہ دعوائے نبوت کے ساتھ نبی کا یہ عمل بلاشبہ خدا کی دی ہوئی ایسی طاقت رکھتا ہے جس کا مقابلہ انسانی طاقت سے بالاتر ہے اور اس کے مظاہرہ کے سامنے عاجز و درماندہ، اور وہ یقین کر لیتے ہیں کہ بے شک وشبہ اس ہستی کو خدا کی تائید حاصل ہے اور اس لیے یہ جو کچھ بھی کہتا ہے خدا کی جانب سے کہتا ہے۔

تب اس مرحلہ پر پہنچ کر "عقلیین" کا یہ کہنا کہ معجزہ دلیل نبوت نہیں ہے سراسر باطل اور حق تعالیٰ کی صداقت کو جھٹلانا ہے جو کسی طرح بھی ایمان کی علامت نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب تک نبی اور رسول، معجزہ نہ دکھلائے نبی کی صداقت اس پر موقوف نہیں ہے لیکن اگر منکرین کے مطالبہ پر یا از خود پیغمبر خدا معجزہ کا مظاہرہ کرے تو یقیناً معجزہ دلیل نبوت ٹھہرے گا اور اس کا انکار صداقت وحقانیت کا انکار اور کفر و جمود کہلائے گا۔

پس ہر خاص و عام کے لیے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ انبیاء و رسل سے جو معجزات ثبوت اور دلالت کے اعتبار سے قطعی اور یقینی ثابت ہو چکے ہیں ان پر ایمان لائے اور ان کے وجود اور ان کی حقیقت کا اعتراف کرے۔ اس لیے کہ ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار درحقیقت اسلام سے انکار ہے۔

البتہ یہ حقیقت کبھی فراموش نہ ہونی چاہیے کہ کسی شخص سے صرف اس قسم کے خارق عادت عمل صادر ہونے کا نام معجزہ نہیں ہے اور محض اس عمل کے بروئے کار لانے سے وہ نبی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ نبی اور رسول کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کی تمام زندگی اس طرح آزمائش و امتحان کی کسوٹی پر اتر چکی ہو کہ اس کا کوئی شعبہ زندگی ناقص اور قابل اعتراض نہ ہو بلکہ اس کی تمام

Marfat.com

زندگی میں اخلاق کی بلندی، گناہوں سے معصومیت اور صداقت گفتار و کردار کا کمال ہی پایا جاتا ہو، پھر اگر ایسا شخص دعوائے نبوت کرتا اور اپنے دعوے کی صداقت میں علمی دلائل و براہین کے علاوہ خدا کے نشانات (معجزات) بھی پیش کرتا ہے تو بلاشبہ وہ نبی ہے اور بلاریب اس کا یہ فعل "معجزہ" ہے۔

ہم نے ابھی کہا کہ "معجزہ" درحقیقت نبی کا اپنا عمل نہیں ہوتا بلکہ وہ خدائے تعالیٰ کا فعل ہے جو نبی کے ہاتھوں سے ظاہر ہوتا اور معجزہ کہلاتا ہے، یہ اس لیے کہ نبی و رسول بھی ایک انسان اور بشر ہی ہوتا ہے اور کسی انسان کی قدرت میں یہ نہیں ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے قوانین عام و خاص میں دخل اندازی یا دراندازی کر سکے، یہ تو خدا ہی کی مرضی پر ہے کہ اگر وہ چاہے اور مناسب حال اور اقتضاء وقت سمجھے تو نبی اور رسول کے ہاتھ پر ایسے فعل کا ظہور کرا دے جو اس کے قوانین فطرت کی عادت خاص کی قسم میں داخل ہوں، اور اگر نہ چاہے تو نبی و رسول کے لیے بھی اس کا اظہار ناممکن اور محال ہے۔

غزوۂ بدر میں جبکہ تین سو تیرہ کے مقابلہ میں ساز و سامان سے مسلح ایک ہزار دشمنوں کا لشکر مسلمانوں پر یلغار کر کے آیا تھا تو آپ ﷺ نے ان کی جانب مٹھی بھر خاک پھینک دی جس کی وجہ سے ہر لشکری کی آنکھ میں خاک کے ریزے پہنچے اور وہ بے چین ہو کر آنکھیں ملنے لگا اور اس طرح مسلمانوں کو حملہ کر کے فتح حاصل ہو گئی، اس واقعہ کا مختصر اور معجزانہ انداز میں قرآن عزیز نے جس طرح تذکرہ کیا ہے وہ ہمارے اس دعویٰ کی قوی اور یقینی دلیل ہے۔

﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۚ﴾ (الانفال: ۱۷)

"اور تم نے (اے محمد ﷺ) وہ مٹھی بھر خاک نہیں پھینکی تھی جو تم نے (اپنے ہاتھ سے) پھینکی، لیکن وہ تو (حقیقت میں) اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی۔"

غور فرمائیے کہ اس مقام پر نبی کے اس عمل کا (جو ان کے ہاتھوں انجام پایا تھا) کس عجیب و غریب انداز سے معجزہ ہونا ثابت کیا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ اے پیغمبر! مٹھی بھر خاک بے شک تمہارے ہاتھ سے پھینکی گئی اس لیے کہ تمہارے ہاتھ میں تھی لیکن مٹھی بھر خاک کا یہ اثر کہ دشمن کے محاذ کی دوری اور دشمن کے اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود ان سب کی آنکھوں میں جھونک دی جائے تمہارے ہاتھ سے ناممکن تھا، یہ درحقیقت خدا کا فعل تھا کہ اس کے ید قدرت نے ان تمام دشواریوں کو ایک لخت ختم کر کے اس مٹھی بھر خاک کو اس حالت تک پہنچا دیا کہ دشمنوں کا پورا لشکر ہزیمت کھا کر فرار کر گیا۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو آپ کے سامنے اس طرح واضح کیا گیا کہ معجزہ نبی کا اپنا فعل نہیں ہوتا بلکہ وہ براہ راست خدا کا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھوں سے اس کی تائید میں کیا جاتا ہے۔

﴿وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُونَ ﴿٧٨﴾﴾ (الزمر: ۷۸)

"اور کسی رسول کو طاقت میں نہیں کہ وہ کوئی نشانی (معجزہ) لا سکے خدا کی اجازت بغیر، پس جب خدا کا حکم آ پہنچتا ہے تو حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اس موقع پر جھٹلانے والے خسارہ میں پڑ جاتے ہیں۔"

Marfat.com

﴿وَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ لَئِنۡ جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ لَّيُؤۡمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلۡ اِنَّمَا الۡاٰيٰتُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَمَا يُشۡعِرُكُمۡ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝۱۰۹﴾ (الانعام:۱۰۹)

"اور وہ اللہ کی سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آ جائے تو اس پر ضرور ایمان لے آئیں گے (اے محمد ﷺ!) آپ کہہ دیجئے کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے قبضے میں ہیں۔ اور (اے مسلمانو! تم کو خبر نہیں کہ ان کے پاس اگر یہ نشانیاں آ بھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔"

معجزہ سے متعلق ہماری یہ بحث اسی شخص کے لیے باعث تسکین ہے جو مذہب کے اس بنیادی عقیدہ کا قائل ہو کہ تمام اشیاء کے خواص ان کے اپنے ذاتی خواص نہیں ہیں بلکہ کسی پیدا کرنے والے نے ان کو عطا کیے ہیں۔ پس جو شخص اس عقیدہ کا حامی ہے وہ بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ آگ میں جلانے کی خاصیت پیدا کرنے والے نے عام قانون قدرت اس کے لیے یہی رکھا ہے کہ جو شئے اس سے چھو جائے وہ جل جائے لیکن یہ عقلاً ناممکن نہیں ہے کہ وہ کسی اہم مقصد کی تکمیل کے لیے آگ کی اس خاصیت کو کسی خاص حالت میں سلب کر لے اور وہ اس کے قانون قدرت کی خاص حالت یا خاص عادت شمار ہو۔

لیکن جو شخص اس بنیاد ہی کو تسلیم نہیں کرتا اور ہر شئے کے خواص کو اس طرح اس کے ذاتی خواص مانتا ہے کہ کسی حالت اور کسی وقت میں بھی اس خاصیت کا اس شئے سے جدا ہونا ممکن نہیں ہے تو اس شخص سے اول یہ طے کرنا چاہیے کہ کیا عقل یہ باور کر سکتی ہے کہ جو شئے خود اپنے وجود میں دوسرے کی محتاج ہو اس کا کوئی خاصہ بھی ذاتی اور غیر منفک ہو سکتا ہے؟ "گذشتہ سال لندن اور امریکہ میں خدا بخش کشمیری نے دہکتی ہوئی آگ پر چلنے کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ خود بھی چلا اور دوسرے اشخاص کو بھی اپنے ساتھ آگ پر سے گزارا اور اس کے بعد تمام سائنس دانوں نے اس کے جسم کا طرح طرح سے تجربہ کر کے یہ معلوم کرنا چاہا کہ شاید وہ فائر پروف ہو مگر ناکام رہے اور ان کو اقرار کرنا پڑا کہ اس کا جسم اور آگ پر گزرنے والے دوسرے اشخاص کا جسم عام انسانوں کے جسم سے زیادہ کوئی خاص کیفیت نہیں رکھتا اور انتہائے حیرت و استعجاب کے ساتھ اس کا اعتراف کیا کہ وہ اس حقیقت کے سمجھنے سے عاجز ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ آگ موجود ہے اور نہیں جلاتی"۔ [1] تو اس کا اس کے پاس کیا جواب ہے۔

پس علم کی فراوانی کے باوجود جبکہ ہمارے عجز کا یہ عالم ہے تو ہم کو کیا زیبا ہے کہ علم یقین (وحی) کی بیان کردہ حقیقت (معجزہ) کا اس لیے انکار کر دیں کہ ہماری عقل عام حالات میں سبب کے بغیر کسی مسبب کو دیکھنے کی عادی نہیں ہے۔

بہر حال ایسے شخص کو خدا اور اس کی صفات خصوصاً صفت قدرت پر پہلے بحث کرنی چاہیے، اس کے بعد اس مسئلہ کی نوبت آ سکتی ہے مگر اس کا اصل مقام یہ نہیں بلکہ "علم کلام" ہے۔

نَاقَةُ اللّٰهِ:

غرض حضرت صالح علیہ السلام قوم (ثمود) کو بار بار سمجھاتے اور نصیحت فرماتے رہے، مگر قوم پر مطلق اثر نہیں ہوا بلکہ اس کا بغض و عناد ترقی پاتا رہا اور ان کی مخالفت بڑھتی ہی رہی اور وہ کسی طرح بت پرستی سے باز نہ آئی، اگرچہ ایک مختصر اور کمزور جماعت نے

[1] لندن ٹائمز

ایمان قبول کرلیا اور وہ مسلمان ہوگئی، مگر قوم کے سردار اور بڑے بڑے سرمایہ دار اسی طرح باطل پرستی پر قائم رہے اور انہوں نے خدا کی دی ہوئی ہر قسم کی خوش عیشی اور رفاہیت کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے کفرانِ نعمت کو شعار بنالیا، وہ حضرت صالح علیہ السلام کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کرتے کہ صالح! اگر ہم باطل پرست ہوتے، خدا کے صحیح مذہب کے منکر ہوتے اور اس کے پسندیدہ طریقہ پر قائم نہ ہوتے تو آج ہم کو یہ دھن دولت، سرسبز و شاداب باغات کی فراوانی، سیم و زر کی بہتات، بلند و عالی شان محلات کی رہائش، میوہ جات اور پھلوں کی کثرت، شیریں نہروں اور عمدہ مرغزاروں کی افزائش حاصل نہ ہوتی، تو خود کو اور اپنے پیرووں کو دیکھ اور پھر ان کی تنگ حالی اور غربت پر نظر کر اور بتلا کہ خدا کے پیارے اور مقبول کون ہیں۔ ہم یا تم؟

حضرت صالح علیہ السلام فرماتے کہ تم اپنی اس رفاہیت اور عیش سامانی پر شیخی نہ مارو اور خدا کے سچے رسول اور اس کے دین برحق کا مذاق نہ اڑاؤ، اس لیے کہ اگر تمہارے کبر و غرور اور عناد کا یہی حال رہا تو پل بھر میں یہ سب کچھ فنا ہو جائے گا اور پھر نہ تم رہو گے اور نہ تمہارا یہ ساز و سامان، بیشک یہ سب کچھ خدا کی نعمتیں ہیں بشرطیکہ ان کو حاصل کرنے والے اس کا شکر ادا کریں اور اس کے سامنے سر نیاز جھکائیں اور بلاشبہ یہی سامان عذاب و لعنت ہیں اگر ان کا استقبال شیخی اور غرور کے ساتھ کیا جائے اس لیے یہ سمجھنا سخت غلطی ہے کہ ہر سامان عیش خوشنودی الٰہی کا ثمرہ ہے۔

ثمود کو یہ بھی حیرانی تھی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ہی میں کا ایک انسان خدا کا پیغمبر بن جائے اور وہ خدا کے احکام سنانے لگے، وہ سخت تعجب سے کہتے:

﴿ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا﴾ (ص: ۸)

"کیا ہماری موجودگی میں اس پر (خدا کی) نصیحت اترتی ہے۔"

یعنی اگر ایسا ہونا ہی تھا تو اس کے اہل ہم تھے نہ کہ صالح، اور کبھی اپنی قوم کے کمزور افراد کو (جو کہ مسلمان ہو گئے تھے) خطاب کر کے کہتے:

﴿اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ (الاعراف: ۷۵)

"کیا تم کو یقین ہے کہ بلاشبہ صالح اپنے پروردگار کا رسول ہے؟"

مسلمان جواب دیتے:

﴿قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ﴾ (الاعراف: ۷۵)

"انہوں نے کہا بیشک ہم تو اس کے لائے ہوئے پیغام پر ایمان رکھتے ہیں۔"

یہ متکبرین غصہ میں کہتے:

﴿اِنَّا بِالَّذِيْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ﴾ (الاعراف: ۷۶)

"بلاشبہ ہم تو اس شئے کا جس پر تمہارا ایمان ہے انکار کرتے ہیں۔"

Marfat.com

بہر حال حضرت صالح علیہ السلام کی مغرور اور سرکش قوم نے ان کی پیغمبرانہ دعوت و نصیحت کو یوں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور خدا کے نشان (معجزہ) کا مطالبہ کیا۔ تب صالح علیہ السلام نے درگاہِ الٰہی میں دعا کی اور قبولیت کے بعد اپنی قوم سے فرمایا کہ تمہارا مطلوبہ نشان اونٹنی کی شکل میں یہ موجود ہے۔ دیکھو! اگر تم نے اس کو ایذاء پہنچائی تو پھر یہی تمہاری ہلاکت کا نشان ثابت ہوگی، اور خدائے تعالیٰ نے تمہارے اور اس کے درمیان پانی کے لیے باری مقرر فرما دی ہے ایک دن تمہارا ہے اور ایک دن اس کا لہٰذا اس میں فرق نہ آئے۔

قرآن عزیز نے اس کو "ناقۃ اللہ" کا لقب دلایا ۞ اور نیز اس کو ﴿لکم ایۃ﴾ کہہ یہ بھی بتایا کہ یہ نشانی اپنے اندر خاص اہمیت رکھتی ہے لیکن بدقسمت قوم ثمود زیادہ دیر تک اس کو برداشت نہ کر سکی اور ایک روز سازش کر کے قدار بن سالف کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس کے قتل میں پہل کرے اور باقی اعانت کریں۔ اور اس طرح ناقہ کو ہلاک کر ڈالا۔ حضرت صالح علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا تو آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے:

"بدبخت قوم! آخر تجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ اب خدا کے عذاب کا انتظار کر، تین روز کے بعد وہ نہ ٹلنے والا عذاب آئے گا اور تم سب کو ہمیشہ کے لیے تہس نہس کر جائے گا۔"

سید آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی ج ۱ ص ۱۴۵، ۱۴۶ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ثمود پر عذاب آنے کی علامات اگلی صبح ہی سے شروع ہو گئیں یعنی پہلے روز ان سب کے چہرے اس طرح زرد پڑ گئے جیسا کہ خوف کی ابتدائی حالت میں ہو جایا کرتا ہے اور دوسرے روز سب کے چہرے سرخ تھے گویا خوف و دہشت کا یہ دوسرا درجہ تھا، اور تیسرے روز ان سب کے چہرے سیاہ تھے اور تاریکی چھائی ہوئی تھی، یہ خوف و دہشت کا وہ تیسرا مقام ہے جس کے بعد موت ہی کا درجہ باقی رہ جاتا ہے، تین دن کی ان علامات عذاب نے اگرچہ ان کے چہروں کو واقعی زرد، سرخ اور تاریک بنا دیا تھا، لیکن ان رنگوں کی ترتیبی خصوصیت یہ صاف بتا رہی ہے کہ ان کے دلوں کو صالح علیہ السلام کے سچے ہونے کا یقین تھا اور صرف حسد و بغض سے انکار کرتے تھے، اب جبکہ خدا کے حکم کے خلاف "جرم" کر چکے اور اس کی پاداش میں صالح علیہ السلام سے عذاب کی ہولناک خبر سنی تو ان پر خوف و دہشت کے وہ فطری رنگ اور نقوش نمایاں ہونے لگے جو موت کے یقین کے وقت خوف و دہشت سے مجرموں کے اندر پیدا ہوا کرتے ہیں۔

۞ قرآن عزیز سے اس سلسلہ میں صرف دو باتیں ثابت ہیں، ایک یہ کہ ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے نشان (معجزہ) طلب کیا اور حضرت صالح علیہ السلام نے "ناقہ" کو بطور نشانی پیش کیا، دوسرے یہ کہ حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہ اس کو ضرر نہ پہنچائے اور پانی کی باری مقرر کر لے کہ ایک روز ناقہ کا اور دوسرا قوم کا، اور اگر اس کو نقصان پہنچایا تو یہی قوم کی ہلاکت کا نشان ہوگا، چنانچہ انہوں نے "ناقہ" کو ہلاک کر دیا اور خدا کے عذاب سے خود بھی ہلاک ہو گئے۔

اس سے زائد جو کچھ ہے اس کا مدار یا ان روایات حدیثی پر ہے جو اخبار آحاد کے درجہ میں شمار ہیں اور یا بائبل اور تاریخ قدیم کی روایات پر، جہاں تک اخبار آحاد کا تعلق ہے محدثین کے نزدیک ان میں سے بعض صحیح روایات ہیں اور بعض ضعیف، اس لئے حافظ عماد الدین بن کثیر نے سورۂ اعراف کی تفسیر میں "ناقۃ اللہ" کے وجود میں آنے کی روایات کو سند روایات کے اصول پر نقل نہیں فرمایا بلکہ ایک تاریخی واقعہ کی طرح تحریر فرمایا ہے۔

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ قوم ثمود جب حضرت صالح علیہ السلام کی تبلیغ حق سے اُکتا گئی تو اس کے سرخیل اور سرگروہ افراد نے قوم کی موجودگی میں مطالبہ کیا کہ اے صالح (علیہ السلام)! اگر تو واقعی خدا کا فرستادہ ہے تو کوئی نشانی دکھا تاکہ ہم تیری صداقت پر ایمان لے آئیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ نشان آنے کے بعد بھی انکار پر مصر اور سرکشی پر قائم رہو، قوم کے ان سرداروں نے بتاکید وعدہ کیا کہ ہم فوراً ایمان لے آئیں گے۔ تب

= حضرت صالح علیہ السلام نے انہی سے دریافت کیا کہ وہ کس قسم کا نشان چاہتے ہیں، انہوں نے مطالبہ کیا کہ سامنے والے پہاڑ میں سے یا بستی کے اس پتھر میں سے جو کنارہ پر نصب ہے ایک ایسی اونٹنی ظاہر کرکہ جو گابھن ہو اور فوراً بچہ دے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے درگاہِ الٰہی میں دعاء کی اور اسی وقت ان سب کے سامنے پہاڑ یا پتھر میں سے حاملہ اونٹنی ظاہر ہوئی اور اس نے بچہ دیا۔ یہ دیکھ کر ان سرداروں میں سے جندع بن عمرو تو اسی وقت مشرف باسلام ہو گیا اور دوسرے سرداروں نے بھی جب ان کی پیروی میں اسلام لانے کا ارادہ کیا تو ان کے ہیکلوں اور مندروں کے مہنتوں ذؤاب بن عمرو اور جناب اور ان کے کاہن رباب بن صمعر نے اس کو اس سے باز رکھا اور اسی طرح باقی دوسروں کو بھی اسلام لانے سے روکا۔

اب حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کے تمام افراد کو تنبیہ کی کہ دیکھو یہ نشانی تمہاری طلب پر بھیجی گئی ہے، خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ پانی کی باری مقرر ہو، ایک دن اس ناقہ کا ہوگا اور ایک دن ساری قوم اور اس کے سارے چوپاؤں کا۔ اور خبردار اس کو کوئی اذیت نہ پہنچے، اگر اس کو آزار پہنچا تو پھر تمہاری بھی خیر نہیں۔

قوم نے اگرچہ اس حیرت ناک معجزہ کو دیکھ کر ایمان قبول نہ کیا لیکن دلوں کے اقرار نے اس کو آزار پہنچانے سے باز رکھا، اور یہ دستور جاری رہا کہ پانی کی باری ایک روز ناقہ کی رہتی اور تمام قوم اس کے دودھ سے فائدہ اٹھاتی اور دوسرے روز قوم کی باری ہوتی، اور ناقہ اور اس کا بچہ بغیر روک ٹوک چراگاہوں میں چرتے اور آسودہ رہتے، مگر آہستہ آہستہ یہ بات بھی ان کو کھٹکنے لگی اور آپس میں صلاح و مشورے ہونے لگے کہ اس ناقہ کا خاتمہ کر دیا جائے تو اس باری والے قصے سے نجات ملے، کیونکہ ہمارے چوپاؤں کے لئے اور خود ہمارے اپنے لئے یہ قید ناقابل برداشت ہے۔ یہ باتیں اگرچہ ہوتی رہتی تھیں لیکن کسی کو اس کے قتل کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، پھر ایک حسین و جمیل مالدار عورت صدوق نے خود کو ایک شخص مصدع کے سامنے اور ایک مالدار عورت عنیزہ نے اپنی ایک خوبصورت لڑکی کو قدار کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا کہ اگر وہ دونوں ناقہ کو ہلاک کر دیں تو یہ تمہاری ملک ہیں، تم ان کو بیوی بنا کر عیش کرو۔ آخر قدار بن سالف اور مصدع کو اس کے لئے آمادہ کر لیا گیا۔ اور طے پایا کہ وہ راہ میں چھپ کر بیٹھ جائیں گے اور ناقہ جب چراگاہ جانے لگے تو اس پر حملہ کر دیں گے اور چند دوسرے آدمیوں نے بھی مدد کا وعدہ کیا۔

غرض ایسا ہی کیا گیا اور ناقہ کو اس طرح سازش کر کے قتل کر ڈالا اور پھر آپس میں حلف کیا کہ رات ہوتے ہی ہم سب صالح علیہ السلام اور اس کے اہل و عیال کو بھی قتل کر دیں گے اور پھر اس کے اولیاء کو قسمیں کھا کر یقین دلائیں گے کہ یہ کام ہمارا نہیں ہے۔

اور بچہ یہ دیکھ کر بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا اور چیختا اور بولتا ہوا پہاڑی میں غائب ہو گیا۔ صالح علیہ السلام کو جب یہ خبر ہوئی تو حسرت و افسوس کے ساتھ قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آخر وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا، اب خدا کے عذاب کا انتظار کرو جو تین دن کے بعد تم کو تباہ کر دے گا، اور پھر بجلی کی چمک اور کڑک کا عذاب آیا اور اس نے رات میں سب کو تباہ کر دیا، اور آنے والے انسانوں کے لئے تاریخی عبرت کا سبق دے گیا۔

اس واقعہ کے ساتھ ساتھ محدث ابن کثیر نے چند روایات حدیثی بھی بیان فرمائی ہیں مثلاً:

غزوۂ تبوک کے موقعہ پر جب آپ کا گذر حجر پر ہوا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے ثمود کے کنوئیں سے پانی بھرا اور آٹا گوندھ کر روٹیاں تیار کرنے لگے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو پانی گرا دینے اور ہانڈیاں اوندھی کر دینے اور آٹا بیکار کر دینے کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یہ وہ بستی ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا، یہاں نہ قیام کرو اور نہ یہاں کی اشیاء سے فائدہ اٹھاؤ، آگے بڑھ کر پڑاؤ ڈالو ایسا نہ ہو کہ تم بھی کسی بلا میں مبتلا ہو جاؤ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تم ان حجر کی بستیوں میں خدا سے ڈرتے عجز و زاری کرتے اور روتے ہوئے داخل ہوا کرو، ورنہ ان میں داخل ہی نہ ہوا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی ان کی غفلت کی وجہ سے عذاب کی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حجر میں داخل ہوئے تو فرمایا کہ اللہ سے نشانیاں طلب نہ کیا کرو دیکھو صالح علیہ السلام کی قوم نے نشان طلب کیا تھا اور وہ ناقہ پہاڑ کی کھو سے نکلتی اور اپنی باری میں کھا پی کر وہیں واپس چلی جاتی اور جو اس کی باری کا دن تھا اس میں قوم ثمود کو اپنے دودھ سے سیراب کرتی تھی، مگر ثمود نے آخر کار سرکشی اور ناقہ کی کونچیں کاٹ کر اس کو ہلاک کر دیا اور یہ نکلا کہ خدا نے ان پر "چیخ کا عذاب" مسلط کر دیا، اور وہ اس عذاب سے گھروں کے اندر ہی مردہ ہو کر رہ گئے، صرف ایک شخص ابورغال نامی باقی بچا جو حرم میں گیا ہوا تھا لیکن جب وہ حدودِ حرم سے باہر آیا تو فوراً اسی عذاب کا شکار ہو گیا۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تینوں روایات سند کے ساتھ مسند احمد سے نقل کر کے ان کی توثیق کی ہے۔ =

Marfat.com

بہرحال ان تین دن کے بعد وقت موعود آ پہنچا اور رات کے وقت "ایک ہیبت ناک آواز" نے ہر شخص کو اسی حالت میں ہلاک کر دیا جس حالت میں وہ تھا، قرآن عزیز نے اس ہلاکت آفرین آواز کو کسی مقام پر صاعقہ (کڑک دار بجلی) اور کسی جگہ رجفہ (زلزلہ ڈال دینے والے شئے) اور بعض جگہ طاغیہ (دہشت ناک) اور بعض جگہ صیحہ (چیخ) فرمایا۔ اس لیے کہ یہ تمام تعبیرات ایک ہی حقیقت کے مختلف اوصاف کے اعتبار سے کی گئی ہیں تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ خدائے تعالیٰ کے اس عذاب کی ہولناکیاں کیسی گوناگوں تھیں، تم ایک ایسی کوندنے والی بجلی کا تصور کرو جو بار بار اضطراب کے ساتھ چمکتی، کڑکتی اور گرجتی ہو اور اس طرح کوندرہی ہو کہ کبھی مشرق میں ہے کبھی مغرب میں اور جب ان تمام صفات کے ساتھ چمکتی کوندتی، گرجتی، لرزتی، لرزاتی ہوئی کسی مقام پر ایک ہولناک چیخ کے ساتھ گرے تو اس مقام اور اس کے نواح کا کیا حال ہوگا؟ یہ ایک معمولی اندازہ ہے اس عذاب کا جو ثمود پر نازل ہوا اور ان کو اور ان کی بستیوں کو تباہ و برباد کر کے سرکشوں کی سرکشی اور مغروروں کے غرور کا انجام ظاہر کرنے کے لیے آنے والی نسلوں کے سامنے عبرت پیش کر گیا۔

ایک طرف ثمود پر یہ عذاب نازل ہوا اور دوسری جانب صالح علیہ السلام اور ان کے پیرو مسلمانوں کو خدا نے اپنی حفاظت میں لے لیا اور ان کو اس عذاب سے محفوظ رکھا۔ حضرت صالح علیہ السلام حزن و ملال کے ساتھ ہلاک شدگان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمانے لگے:

﴿يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۝﴾ (الاعراف:۷۹)

"اے قوم! بلاشبہ میں نے اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچایا اور تم کو نصیحت کی لیکن تم نصیحت کرنے والوں کو دوست ہی نہ رکھتے تھے۔"

ہلاک شدہ قوم کی جانب حضرت صالح علیہ السلام کا یہ خطاب اسی طرح کا خطاب تھا جس طرح بدر میں مشرکین مکہ کے سرداروں کی ہلاکت کے بعد مردہ نعشوں کے گڑھے پر کھڑے ہو کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((یا فلان بن فلان و فلان بن فلان ایسرکم انکم اطعتم اللہ و رسولہ فانا قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقًا فھل وجدتم ما وعد ربکم حقًا)). (بخاری جلد ٦)

= اس پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ قرآن عزیز سے یہ تو یقین کے ساتھ ثابت ہے کہ "ناقۃ اللہ" خدا کا ایک نشان تھی اور اپنے اندر ضرور کوئی ایسی خصوصیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے وہ ایسی نشانیاں رکھ سکے جس کا ذکر قرآن عزیز اس اہمیت کے ساتھ کر رہا ہے ﴿هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً﴾ یہ ناقۃ اللہ تمہارے لئے ہے اور پھر پانی کی باری جس طرح ناقہ اور قوم ثمود کے درمیان تقسیم فرمائی وہ خود ایک مستقل دلیل ہے کہ یہ "ناقہ" ضرور اپنے اندر ایسی حیثیت رکھتی تھی جو نشان الٰہی کہلا سکے لیکن یہ بات کہ "ناقہ" کا وجود کس طرح ہوا اور کن وجوہ سے "نشان الٰہی" یا "معجزہ نبی" قرآن عزیز اس سے ساکت ہے۔ البتہ مختلف صحیح اخبار آحاد سے اس واقعہ پر ضرور روشنی پڑتی ہے جس کی تفصیل ابن کثیر سے ابھی نقل ہو چکی مگر واقعہ کی تفصیلی صراحت و وضاحت وہاں بھی موجود نہیں ہے بلکہ کتب تفسیر میں اسرائیلیات سے منقول ہے یا ضعیف روایات سے اخذ کی گئی ہے، لہٰذا مناسب یہی ہے کہ واقعہ کے اجمال و تفصیل میں فرق مراتب کا ضرور خیال رکھا جائے، جس قدر قرآن عزیز نے تصریح کی ہے وہ بغیر کسی تاویل کے واجب الاعتقاد ہے اور جس قدر صحیح روایات (اگرچہ وہ آحاد ہی کے درجہ کی ہیں) اس اجمال کی تفصیل کا پتہ ملتا ہے وہ اجمال کی تفصیل باقی تفصیلات کی حیثیت وہی ہے جو عام تاریخی وقائع اور اسرائیلیات کی حیثیت ہے۔

Marfat.com

"اے فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں کیا تم کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پسند آئی؟ بلاشبہ ہم نے وہ سب کچھ پالیا جو ہمارے رب نے ہم سے وعدہ کیا تھا، پس کیا تم نے بھی وہ پایا جو تمہارے رب نے تم سے وعدہ کیا تھا؟"

اس قسم کے خطاب کے بارہ میں علماء کی چند رائیں ہیں:

① اس قسم کا خطاب انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات میں سے ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس کلام کو بلاشبہ مردوں کو سنوا دیتا ہے اگرچہ وہ جواب دینے سے قاصر ہیں، اس لیے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی لاشوں کو اس طرح مخاطب کیا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے تعجب سے پوچھا، کیا یہ سن رہے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں تم سے زیادہ مگر جواب سے عاجز ہیں۔"

② یہ طریق خطاب حزن و ملال کے اظہار کے لیے ہوتا ہے، مثلاً تم نے کسی شخص کو متنبہ کیا کہ اس باغ میں نہ جانا، سانپ بڑی کثرت سے ہیں، ڈسے جانے کا خطرہ ہے، مگر وہ شخص باغ میں گیا اور ڈسا گیا تو جب یہ تنبیہ کرنے والا اس کی نعش پر پہنچتا ہے تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے افسوس کیا میں نے تجھ سے نہ کہا تھا کہ باغ میں نہ جانا ورنہ ڈسا جائے گا آخر وہی ہوا۔

③ اس قسم کے خطاب کے اصل مخاطب وہ زندہ انسان ہوتے ہیں جو ان مردہ نعشوں کو دیکھ رہے ہیں تاکہ ان کی عبرت حاصل ہو اور وہ اس قسم کی سرکشی کی جرأت نہ کر سکیں۔

قوم کی ہلاکت اور صالح علیہ السلام کا قیام:

یہ ایک تاریخی سوال ہے کہ جب ثمود ہلاک و برباد ہو گئے تو صالح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے مسلمانوں نے کہاں سکونت اختیار کی؟

اس سوال کا جواب یقینی اور حتمی طور پر دینا تو قریب قریب ناممکن ہے البتہ غالب گمان یہ ہے کہ وہ قوم کی ہلاکت کے بعد علاقہ فلسطین میں آکر آباد ہوئے اس لیے کہ حجر کے قریب یہی مقام ایسا تھا جو سرسبز و شاداب اور مویشیوں کے پانی اور چارہ کے لیے بہترین تھا اور فلسطین کے علاقہ میں یہ جگہ نواحی رملہ ہوگی یا کوئی دوسرا مقام۔ علماء تفسیر اس کے جواب میں متعدد اقوال پیش فرماتے ہیں:

① وہ فلسطین کے علاقہ میں رملہ کے قریب آباد ہوئے، خازن نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

② وہ حضرموت میں آکر آباد ہوئے اس لیے کہ ان کا اصل وطن یہی تھا یا اس لیے کہ یہ احقاف ہی کا ایک حصہ ہے، یہاں ایک قبر ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ صالح علیہ السلام کی قبر ہے۔

③ وہ ثمود کی ہلاکت کے بعد ان ہی بستیوں میں آباد رہے، یہ عام مؤرخین کی رائے ہے۔

④ وہ قوم کی ہلاکت کے بعد مکہ معظمہ تشریف لے آئے اور وہیں مقیم ہو گئے اور وہیں انتقال فرمایا، اور ان کی قبر مبارک کعبہ سے غربی جانب حرم ہی میں ہے، سید آلوسی اسی کو راجح سمجھتے ہیں۔

سید آلوسی نے اپنی تفسیر میں ایک قول نقل کیا ہے جس میں بتایا ہے کہ صالح علیہ السلام پر ایمان لانے والے جو مسلمان ان کے ساتھ عذاب سے محفوظ اور نجات یافتہ رہے ان کی تعداد تقریباً ایک سو بیس (۱۲۰) تھی اور ہلاک شدہ قریباً ڈیڑھ ہزار گھرانے تھے۔

اب اس تمام ایں و آں کے بعد اس کلام بلاغت نظام "قرآن عزیز" کی آیات کا مطالعہ فرمایئے جو ان واقعات کا حقیقی

Marfat.com

سرچشمہ ہیں اور عبرت و موعظت کا بے نظیر سامان مہیا کرتی ہیں۔

﴿وَ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَ اذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَ عَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَ قَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۷۳-۷۹)

"اور (اسی طرح) ہم نے قوم ثمود کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے صالح علیہ السلام کو بھیجا، اس نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں دیکھو تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل تمہارے سامنے آ چکی ہے، یہ خدا کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی تمہارے لیے ایک (فیصلہ کن) نشانی ہے، پس اسے کھلا چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں جہاں چاہے چرے، اسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ کہ (اس کی پاداش میں) عذاب جانکاہ تمہیں آ پکڑے اور وہ وقت یاد کرو کہ خدا نے تمہیں قوم عاد کے بعد اس کا جانشین بنایا اور اس سرزمین میں اس طرح بسا دیا کہ میدانوں سے محل بنانے کا کام لیتے ہو اور پہاڑوں کو بھی تراش کر اپنا گھر بنا لیتے ہو (یہ اس کا تم پر احسان ہے) پس اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد کرو، اور ملک میں سرکشی کرتے ہوئے خرابی نہ پھیلاؤ" قوم کے جن سربرآوردہ لوگوں کو (اپنی دولت و طاقت کا) گھمنڈ تھا انہوں نے مومنوں سے کہا، اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں (افلاس و بیچارگی کی وجہ سے) کمزور و حقیر سمجھتے تھے" کیا تم نے سچ مچ کو معلوم کر لیا ہے کہ صالح خدا کا بھیجا ہوا ہے؟ (یعنی ہمیں تو ایسی کوئی بات اس میں دکھائی دیتی نہیں) انہوں نے کہا، ہاں! بیشک جس پیام حق کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے، ہم اس پر پورا یقین رکھتے ہیں" اس پر گھمنڈ کرنے والوں نے کہا: "تمہیں جس بات کا یقین ہے ہمیں اس سے انکار ہے" غرض کہ انہوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی۔ انہوں نے کہا: "اے صالح (علیہ السلام)! اگر تم واقعی پیغمبروں میں سے ہو، تو اب وہ بات ہم پر لا دکھاؤ جس کا تم نے ہمیں خوف دلایا تھا" پس ایسا ہوا کہ لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آ لیا۔ اور جب ان پر صبح ہوئی تو گھروں میں اوندھے منہ پڑے تھے۔ پھر صالح علیہ السلام ان سے کنارہ کش ہو گئے، اس نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! میں نے اپنے پروردگار کا پیام تمہیں پہنچایا اور نصیحت کی، مگر افسوس تم پر! تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔"

Marfat.com

﴿ وَ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ
الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ۝۶۱ قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ
كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ
مُرِيْبٍ ۝۶۲ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ
اِنْ عَصَيْتُهٗ ۫ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۝۶۳ وَ يٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ
اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ۝۶۴ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ
اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۝۶۵ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا
وَ مِنْ خِزْيِ يَوْمِىِٕذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝۶۶ وَ اَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ
جٰثِمِيْنَ ۝۶۷ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ۝۶۸ ﴾ (هود: ۶۱-۶۸)

"اور ہم نے قوم ثمود کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے صالح علیہ السلام کو بھیجا اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سواء تمہارا کوئی معبود نہیں، وہی ہے جس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور پھر اسی میں تمہیں بسا دیا، پس چاہیے کہ اس سے بخشش مانگو اور اس کی طرف رجوع ہو کر رہو۔ یقین کرو میرا پروردگار (ہر ایک کے) پاس ہے۔ اور (ہر ایک کی) دعاؤں کا جواب دینے والا ہے۔ لوگوں نے کہا: "اے صالح! پہلے تُو تو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی اُمیدیں تجھ سے وابستہ تھیں، پھر کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ ان معبودوں کی پوجا نہ کریں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں؟ (یہ کیسی بات ہے؟) ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو کہ ہمارے دل میں اترتی نہیں" صالح نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن پر ہوں اور اس نے اپنی رحمت مجھے عطا فرمائی ہو تو پھر کون ہے جو اللہ کے مقابلہ میں میری مدد کرے گا اگر میں اس کے حکم سے سرتابی کروں؟ تم (اپنی توقع کے مطابق دعوت کار دے کر) مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے تباہی کی طرف لے جانا چاہتے ہو اور اے میری قوم کے لوگو! دیکھو یہ اللہ کی اونٹنی (یعنی اس کا نشان) تمہارے لیے ایک (فیصلہ کن) نشانی ہے پس اسے چھوڑ دو، اللہ کی زمین میں چرتی رہے، اسے کسی طرح کی اذیت نہ پہنچانا، ورنہ فوراً عذاب تمہیں آ پکڑے گا۔" لیکن لوگوں نے (اور زیادہ ضد میں آ کر) اسے ہلاک کر ڈالا۔ تب صالح علیہ السلام نے کہا: (اب تمہیں صرف) تین دن کی مہلت ہے، اپنے گھروں میں کھا پی لو یہ وعدہ ہے جھوٹا نہ نکلے گا" پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آ پہنچا تو ہم نے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت سے بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے نجات دے دی (اے پیغمبر!) بلاشبہ تیرا پروردگار ہی ہے جو قوت والا اور سب پر غالب ہے! اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کا یہ حال ہوا کہ ایک زور کی کڑک نے آ لیا۔ جب صبح ہوئی تو سب اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے (وہ اس طرح اچانک مر گئے)

گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے! تو سن رکھو کہ ثمود نے اپنے پروردگار کی ناشکری کی، اور ہاں سن رکھو کہ ثمود کے لیے محرومی ہوئی۔"

﴿وَ لَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَ اٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۝ وَ كَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ۝ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ۝ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝﴾ (الحجر: ۸۰-۸۴)

"اور دیکھو حجر کے لوگوں نے بھی رسولوں کی بات جھٹلائی، ہم نے اپنی نشانیاں انہیں دکھائیں، مگر وہ روگردانی ہی کرتے رہے، وہ پہاڑ تراش کر گھر بناتے تھے کہ محفوظ رہیں لیکن (یہ حفاظتیں کچھ بھی کام نہ آئیں) ایک دن صبح کو اٹھے تو ایک ہولناک آواز نے آ پکڑا تھا، اور جو کچھ انہوں نے اپنی سعی و عمل سے کمایا تھا وہ کچھ بھی ان کے کام نہ آیا۔"

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِيْنَ ۝ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۝ وَّ زُرُوْعٍ وَّ نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ۝ وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ وَ لَا تُطِيْعُوْۤا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ۝ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ مَاۤ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّ لَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ۝ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ (الشعراء: ۱۴۱-۱۵۹)

"جھٹلایا ثمود نے پیغام لانے والوں کو جب کہا ان کو ان کے بھائی صالح علیہ السلام نے کیا تم ڈرتے نہیں میں تمہارے پاس پیغام لانے والا ہوں معتبر، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ بدلہ، میرا بدلہ ہے اسی جہان کے پالنے والے پر، کیا چھوڑے رکھیں گے تم کو یہاں کی چیزوں میں بے خوف، باغوں اور چشموں میں اور کھیتوں میں اور کھجوروں میں جن کا خوشہ نرم ہے اور تراشتے ہو پہاڑوں میں گھر تکلف کے، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو، اور نہ مانو حکم بیباک لوگوں کا جو خرابی کرتے ہیں ملک میں اور اصلاح نہیں کرتے، بولے تجھ پر تو کسی نے جادو کیا ہے۔ تو بھی ایک آدمی ہے جیسے ہم، سو لے آ کچھ نشانی اگر تو سچا ہے، کہا یہ اونٹنی ہے اس کے لیے پانی پینے کی ایک باری اور تمہارے لیے باری ایک دن مقرر، اور مت چھیڑیو اس کو بری طرح سے پھر پکڑ لے تم کو آفت ایک بڑے دن کی، پھر کونچیں کاٹیں اس اونٹنی کی پھر کل کو رہ گئے پچھتاتے پھر آ پکڑا ان کو عذاب نے البتہ اس بات میں نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے

Marfat.com

اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم کرنے والا۔"

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْ لَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَ بِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ۝ وَ كَانَ فِى الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ۝ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ وَ مَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا مَكْرًا وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَ قَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝﴾

(النمل: ۴۵-۵۳)

"اور ہم نے بھیجا تھا ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو کہ بندگی کرو اللہ کی پھر وہ تو دو فرقے ہو کر لگے جھگڑنے کہا اے میری قوم کیوں جلدی مانگتے ہو برائی کو پہلے بھلائی سے۔ کیوں نہیں گناہ بخشواتے اللہ سے شاید تم پر رحم ہو جائے، بولے ہم نے منحوس قدم دیکھا تجھ کو اور تیرے ساتھ والوں کو، کہا تمہاری بری قسمت اللہ کے پاس ہے تمہارا کہنا صحیح نہیں بلکہ تم جانچے جاتے ہو اور تھے اس شہر میں نو (۹) شخص کہ خرابی کرتے ملک میں اور اصلاح نہ کرتے بولے کہ آپس میں قسم کھاؤ اللہ کی کہ البتہ رات کو جا پڑیں ہم اس پر اور اس کے گھر پر پھر کہہ دیں گے اس کے دعویٰ کرنے والے کو ہم نے نہیں دیکھا جب تباہ ہوا اس کا گھر اور ہم بیشک سچ کہتے ہیں، اور انہوں نے بنائی ایک خفیہ تدبیر اور ہم نے بنائی ایک پوشیدہ تدبیر اور ان کو خبر نہ ہوئی پھر دیکھ لے کیسا ہوا انجام ان کے فریب کا کہ ہلاک کر ڈالا ہم نے ان کو اور ان کی قوم کو سب کو، سو یہ پڑے ہیں ان کے گھر ڈھئے ہوئے بسبب ان کے انکار کے، البتہ اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں، اور بچا دیا ہم نے ان کو جو یقین لائے تھے اور بچتے رہے تھے۔"

﴿وَ اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ وَ نَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝﴾ (حٰمٓ السجدہ: ۱۷-۱۸)

"اور جو ثمود تھے سو ہم نے ان کو راہ بتائی پھر ان کو پسند آیا اندھا رہنا راہ سوجھنے سے، پھر پکڑا ان کو کڑک نے ذلت کے عذاب کی، بدلہ اس کا جو کماتے تھے اور بچا دیا ہم نے ان لوگوں کو جو یقین لائے تھے اور بچ کر چلتے تھے (برائی سے)۔"

﴿وَ فِىْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ۝ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّ مَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ۝﴾ (الذاريات: ۴۳-۴۵)

Marfat.com

"اور نشانی ہے ثمود میں جب کہا ان کو فائدہ اٹھا لو ایک وقت تک۔ پھر شرارت کرنے لگے اپنے رب کے حکم سے، پھر پکڑا ان کو کڑک نے اور وہ دیکھتے تھے پھر نہ ہو سکا ان سے کہ اٹھیں اور نہ ہوئے کہ بدلہ لیں۔"

﴿وَ اَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا لِۨالْاُوْلٰى ۙ﴿۵۰﴾ وَ ثَمُوْدَاۡ فَمَاۤ اَبْقٰى ۙ﴿۵۱﴾﴾ (النجم: ۵۰-۵۱)

"اور یہ کہ اس نے غارت کیا عاد اول کو، اور ثمود کو پھر کسی کو باقی نہ چھوڑا۔"

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ﴿۲۳﴾ فَقَالُوْۤا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ﴿۲۴﴾ ءَاُلْقِیَ
الذِّكْرُ عَلَیْهِ مِنْۢ بَیْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿۲۵﴾ سَیَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿۲۶﴾ اِنَّا مُرْسِلُوا
النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَ اصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾ وَ نَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَیْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾
فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾ فَكَیْفَ كَانَ عَذَابِیْ وَ نُذُرِ ﴿۳۰﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ صَیْحَةً وَّاحِدَةً
فَكَانُوْا كَهَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿۳۱﴾ وَ لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۳۲﴾﴾ (القمر: ۲۳-۳۲)

"جھٹلایا ثمود نے ڈر سنانے والوں کو، پھر کہنے لگے کیا ایک آدمی ہم میں سے اکیلا ہم اس کے کہے پر چلیں گے تو، تو ہم غلطی میں پڑے اور آگ میں جھکے کیا اُتری اسی پر نصیحت ہم سب میں سے کوئی نہیں یہ جھوٹا ہے بڑائی مارتا ہے، اب جان لیں گے کہ کل کو کون ہے جھوٹا بڑائی مارنے والا، ہم بھیجتے ہیں اونٹنی ان کے جانچنے کے واسطے سو انتظار کر ان کا اور سہتا رہ، اور سنا دے ان کو کہ پانی کی تقسیم ہے ان میں ہر ایک (فریق) اپنی باری پر پہنچے پھر پکارا انہوں نے اپنے رفیق کو پھر ہاتھ چلایا اور کاٹ ڈالا، پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ ہم نے بھیجی ان پر ایک (خوفناک) چیخ، پھر رہ گئے جیسے روندی ہوئی باڑ کانٹوں کی، اور ہم نے آسان کر دیا قرآن کو سمجھنے کے لیے، پھر ہے کوئی سوچنے والا۔"

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَ عَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ﴿۴﴾ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِیَةِ ﴿۵﴾﴾ (الحاقة: ۴-۵)

"جھٹلایا ثمود اور عاد نے اس کھڑکھڑانے والی (بات) کو سو جو ثمود تھے سو غارت کر دیے گئے اچھال کر (سخت بھونچال سے)۔"

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَاۤ ﴿۱۱﴾ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ﴿۱۲﴾ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْیٰهَا ﴿۱۳﴾
فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۪ۙ فَدَمْدَمَ عَلَیْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿۱۴﴾ وَ لَا یَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿۱۵﴾﴾

(الشمس: ۱۱-۱۵)

"جھٹلایا ثمود نے اپنی شرارت سے جب اُٹھ کھڑا ہوا ان میں کا بدبخت، پھر کہا ان کو اللہ کے رسول نے خبردار رہو اللہ کی اونٹنی سے اور اس کے پانی پینے کی باری سے پھر انہوں نے اس کو جھٹلایا پھر پاؤں کاٹ ڈالے اس کے پھر اُلٹ مارا ان کے رب نے بسبب ان کے گناہوں کے پھر برابر کر دیا سب کو اور اللہ نہیں ڈرتا پیچھا کرنے سے۔"

Marfat.com

چند عبرتیں

① "ناقۃ اللہ" اگرچہ صالح علیہ السلام کی صداقت و رسالت کا ایک نشان تھی، تاہم قرآن عزیز کی تصریح ہے کہ وہ ثمود کے لیے آزمائش اور ابتلاء اور نتیجہ و ثمرہ میں ان کی ہلاکت کا نشان ثابت ہوئی۔

﴿اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ﴾ (القمر: ۲۷)

"بیشک ہم بھیجنے والے ہیں ناقہ کو ان کی آزمائش اور امتحان کے لیے پس تو ان کے انتظار میں رہ اور صبر اختیار کر۔"

② سنت اللہ یہ رہی ہے کہ اگر وہ اپنے پیغمبر کو کسی قوم کی ہدایت کے لیے بھیجے اور قوم اس کی ہدایت پر کان نہ دھرے تو ضروری نہیں کہ وہ قوم ہلاک ہی کر دی جائے لیکن جو قوم اپنے نبی سے اس وعدہ پر نشان طلب کرے کہ اگر ان کا مطلوبہ نشان ظاہر ہو گیا تو وہ ضرور ایمان لے آئیں گے اور پھر وہ ایمان نہ لائے تو اس قوم کی ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے اور خدائے تعالیٰ اس کو معاف نہیں کرتا تا آنکہ وہ تائب ہو جائے اور خدا کے دین کو قبول کر لے اور یا عذاب الٰہی سے صفحۂ ہستی سے مٹ کر دوسروں کے لیے عبرت کا سبب بن جائے۔

③ مگر اس سنت اللہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام رسالت مستثنیٰ ہے اس لیے کہ آپ نے تصریح فرمائی ہے کہ میں نے خدائے تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ میری امت (امت دعوت ہو یا امت اجابت) میں عذاب عام مسلط نہ فرمائے اور اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمالی۔ اور قرآن عزیز میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس تصریح کی یہ کہہ کر تصدیق بھی فرما دی۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ﴾ (الانفال: ۳۳)

"اے رسول اس حال میں کہ تو ان میں موجود ہے خدائے تعالیٰ (ان کافروں) پر عام عذاب مسلط نہ کرے گا۔"

④ یہ مہلک غلطی اور نفس کا دھوکا ہے کہ انسان، خوش عیشی، رفاہیت اور دنیوی جاہ و جلال کو دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ جس قوم یا جس فرد کے پاس یہ سب کچھ موجود ہے وہ ضرور خدائے تعالیٰ کے سایہ میں ہے اور یہ کہ ان کی یہ خوش عیشی اس کی علامت ہے کہ خدائے تعالیٰ کی خوشنودی ان کے ساتھ ہے۔

یہ دھوکا اور غلطی اس لیے ہے کہ اس واقعہ میں جگہ جگہ یہ تصریح موجود ہے کہ بعض مرتبہ زیادہ سے زیادہ رفاہیت اور خوش عیشی زیادہ سے زیادہ عذاب و ہلاکت کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے، اگرچہ قوموں کے لیے اس کی مدت چند ماہ یا چند سال نہیں بلکہ گھبرا دینے والی مدت ہی کیوں نہ ہو مگر ہر قسم کی دنیوی کامرانیوں اور خوش عیشیوں کے ساتھ ساتھ جب ظلم، سرکشی، اور غرور کسی قوم کا مستقل شعار بن جائے تو سمجھو کہ اس کی تباہی و ہلاکت کا وقت قریب آ پہنچا۔

﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ﴾ (البروج: ۱۲)

"تیرے رب کی پکڑ بہت شدید ہے۔"

البتہ ان تمام رفاہیتوں کے ساتھ اگر قوم کے اکثر افراد خدا کے شکر گزار ہوں، اس کے بندوں کے ساتھ انصاف کرنے

Marfat.com

والے اور باہم حسن نیت اور خیر خواہی پر عامل ہوں تو بلاشبہ وہ مقبول بارگاہِ الٰہی ہیں اور ان ہی کو دنیا و آخرت کی کامرانیوں کی بشارت ہے، اور ان ہی کے لیے یہ دنیوی عیش خدا کی بے غایت نعمتوں کی علامت ہے۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔـا ۭ﴾ (النور: ۵۵)

"اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کر لیا جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں یہ کہ ان کو زمین کی خلافت دے گا جیسا کہ ان سے اگلوں کو خلیفہ بنایا تھا اور ان کے لیے ان کا دین مضبوط کر دے گا جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ان کے لیے خوف کو امن سے بدل دے گا (جن کی شان یہ ہوگی کہ) وہ میری بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو (کسی حیثیت سے بھی) شریک نہ کریں گے۔"

﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۱۰۵)

"اور بلاشبہ ہم نے نصیحت کے بعد زبور میں لکھ دیا کہ زمین کی وراثت میرے نیک بندوں کو حاصل ہوگی۔"

یہ آیات صراحت کر رہی ہیں کہ حکومت و دولت کا وعدہ "وراثت" کی حیثیت سے صرف انہی کا حصہ ہے جو مومن بھی ہیں اور خدا کے احکام پر عامل بن کر صالحین (نیکوکاروں) کی صف میں بھی شامل ہیں یعنی جن کی اجتماعی زندگی کا قالب ایک ساتھ ان دونوں صفات سے متصف ہے ان کے لیے بلاشبہ یہ حکومت و دولت خدا کا انعام و اکرام ہے۔

اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر "حکومت و دولت" کے لیے مومن و کافر کی کوئی تخصیص نہیں، خدا کی حکمتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر یہ دنیوی اسباب کی شکل میں چلتی پھرتی چھاؤں ہے اور ایسی "حکومت و دولت" کے لیے ہرگز یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے ساتھ خدا کی خوشنودی اور اس کا فضل و کرم بھی شامل حال ہو۔

Marfat.com

حضرت ابراہیم علیہ السلام

○ نسب ابراہیم علیہ السلام ○ آزر کی تحقیق ○ مستشرقین کی ہرزہ سرائی کا جواب ○ قرآن عزیز میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ ○ ابراہیم علیہ السلام کا بتوں کے ساتھ معاملہ ○ اسلام کے متعلق باپ سے مناظرہ ○ قوم سے مناظرہ اور محاکمہ ○ بادشاہ وقت سے مناظرہ ○ سکونت و قیام ○ قوم کی ہدایت کے لیے اضطراب ○ مصر کی جانب سفر ○ ابراہیم و ہاجرہ علیہما السلام ○ ولادت اسماعیل علیہ السلام ○ سارہ و ہاجرہ علیہما السلام ○ سنت ختنہ ○ ارض حجاز و ہاجرہ علیہا السلام ○ اسحاق علیہ السلام ○ بناء کعبہ ○ چند اہم نتائج

نسب نامہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نسب نامہ توراۃ میں اس طرح مذکور ہے: "ابراہیم (خلیل اللہ علیہ السلام) بن تارخ بن ناحور بن سروج بن رعو بن فالج بن عابر بن شالح بن ارفکشاذ بن سام بن نوح علیہ السلام۔

یہ تصریح تورات اور تاریخ کے مطابق ہے مگر قرآن عزیز نے ان کے والد کا نام آزر بتایا ہے۔

﴿ وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً ﴾ (الانعام: ۷۴)

"اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ آزر سے کہا" کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے"۔

آزر کی تحقیق:

چونکہ تاریخ اور تورات دونوں ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ بتاتے ہیں اور قرآنِ عزیز آزر کہتا ہے، اس لیے علماء اور مفسرین نے اس مسئلہ کی تحقیق میں دو راہیں اختیار کی ہیں۔

① ایسی صورت کی جائے کہ دونوں ناموں کے درمیان مطابقت ہو جائے اور یہ اختلاف جاتا رہے۔

② تحقیق کے بعد فیصلہ کن بات کہی جائے کہ ان دونوں میں کون صحیح ہے اور کون غلط یا دونوں صحیح ہیں مگر دو جدا جدا ہستیوں کے نام ہیں۔

پہلے خیال کے علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخصیت سے وابستہ ہیں اور تارخ علم (اسمی نام) ہے اور آزر علم وصفی (وصفی نام)۔

ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ آزر عبری زبان میں "محب صنم" کو کہتے ہیں اور چونکہ تارخ میں بت تراشی و بت پرستی دونوں

Marfat.com

وصف موجود تھے اس لیے آزر کے لقب سے مشہور ہوا، اور بعض کا گمان ہے کہ آزر کے معنی اعوج (کم فہم) یا بے وقوف اور پیر فرتوت [1] کے ہیں، اور چونکہ تارخ میں یہ باتیں موجود تھیں اس لیے اس وصف سے موصوف کیا گیا۔ قرآن عزیز نے اسی مشہور وصفی علم کو بیان کیا ہے۔

سہیلی نے روض الانف [2] میں اسی کو اختیار کیا۔

اور دوسرے خیال کے علماء کی تحقیق یہ ہے کہ آزر اس بت کا نام ہے، تارخ جس کا پجاری اور مہنت تھا، چنانچہ مجاہد (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ قرآن عزیز کی مسطورہ بالا آیت کا مطلب یہ ہے:

اَتَتَّخِذُ اٰزَرَ اٰلِهَا ای تتخذ اصناما الهة.

"کیا تو آزر کو خدا مانتا ہے یعنی بتوں کو خدا مانتا ہے"۔

اور صنعانی کی رائے بھی اس کے قریب قریب ہے، صرف نحوی اعتبار سے تقدیر کلام میں وہ ایک دوسری راہ اختیار کرتے ہیں، غرض ان دونوں کے نزدیک آزر "ابیہ" کا بدل نہیں ہے بلکہ بت کا نام ہے اور اس طرح قرآن عزیز میں ان کے والد کا نام مذکور نہیں۔

ایک مشہور قول یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ تھا اور چچا کا آزر، اور چونکہ آزر ہی نے ان کی تربیت کی تھی اور بمنزلہ اولاد کے پالا تھا اس لیے قرآنِ عزیز میں آزر کو باپ کہہ کر پکارا گیا جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے "العم صنوابیه" چچا باپ ہی کی طرح ہے۔

علامہ عبدالوہاب نجار کی رائے یہ ہے کہ ان اقوال میں سے مجاہد کا قول قرینِ قیاس اور قابل قبول ہے اس لیے کہ مصریوں کے قدیم دیوتاؤں میں ایک نام ازوریس بھی آتا ہے جس کے معنی "خدائے قوی و معین" ہیں، اور اصنام پرست اقوام کا شروع سے یہ دستور رہا ہے کہ قدیم دیوتاؤں کے نام ہی پر جدید دیوتاؤں کے نام رکھ لیا کرتے تھے، اس لیے اس بت کا نام بھی قدیم مصری دیوتا کے نام پر آزر رکھا گیا ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ تھا۔

ہمارے نزدیک یہ تمام تکلفات باردہ ہیں، اس لیے کہ قرآن عزیز نے جب صراحت کے ساتھ آزر کو اب ابراہیم (ابراہیم کا باپ) کہا ہے تو پھر محض علماء انساب اور بائیبل کے تخمینی قیاسات سے متاثر ہو کر قرآن عزیز کی یقینی تعبیر کو مجاز کہنے یا اس سے بھی آگے بڑھ کر خواہ مخواہ قرآن عزیز میں نحوی مقدرات ماننے پر کون سی شرعی اور حقیقی ضرورت مجبور کرتی ہے۔

بر سبیل تسلیم اگر آزر عاشق صنم کو کہتے ہیں، یا بت کا نام ہے تب بھی بغیر تقدیر کلام اور بغیر کسی تاویل کے یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ ان ہر دو وجہ سے آزر کا نام آزر رکھا گیا جیسا کہ اصنام پرست اقوام کا قدیم سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ کبھی اپنی اولاد کا نام بتوں کا غلام ظاہر کر کے رکھتے تھے اور کبھی خود بت ہی کے نام پر نام رکھ دیا کرتے تھے۔

اصل یہ بات ہے کہ "آدار" کالدی زبان میں بڑے پجاری کو کہتے ہیں اور عربی میں یہی "آزر" کہلایا۔ تارخ چونکہ تراش اور سب سے بڑا پجاری تھا اس لیے "آزر" ہی کے نام سے مشہور ہو گیا، حالانکہ یہ نام نہ تھا بلکہ لقب تھا اور جبکہ لقب نے نام کی جگہ لے لی تو قرآن عزیز نے بھی اسی نام سے پکارا۔

---

[1] تاج العروس ج ۳ ص ۱۲۔ [2] جلد ۱

[1] تاج العروس ج ۳ ص ۱۲ [2] قصص الانبیاء ص ۹۶

Marfat.com

نیز جس مقدس انسان (ابراہیم علیہ السلام) کی اخلاقی بلندی کا یہ عالم ہو کہ جب بت پرستی کی مذمت کے سلسلہ میں آزر سے مناظرہ ہو گیا اور آزر نے زچ ہو کر یہ کہا:

﴿ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝﴾ (مریم: ۴۶)

"اے ابراہیم (علیہ السلام) کیا تو میرے خداؤں سے بیزار ہے تو اگر اس حرکت سے باز نہ آیا میں ضرور تجھ کو سنگسار کر دوں گا اور جا میرے سامنے سے دور ہو جا۔"

تو اس سخت گیر اور دل آزار گفتگو کے موقع پر بھی اس نے پدری رشتہ کی بزرگی کا احترام کیا، اور جواب میں صرف یہ فرمایا:

﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝﴾ (مریم: ۴۷)

"تجھ پر سلامی ہو، میں عنقریب تیرے لیے اپنے پروردگار سے بخشش چاہوں گا بلاشبہ وہ میرے ساتھ بہت مہربان ہے۔"

اس ہستی سے یہ کیسے توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے باپ آزر کو بے وقوف، پیر فرتوت اور اسی قسم کے تحقیر الفاظ کے ساتھ خطاب کرے؟

پس بلاشبہ تارخ کا تارخ، آزر ہی ہے اور وہ علم اسی ہے نہ کہ علم وصفی اور تارخ یا غلط نام ہے اور یا آزر کا ترجمہ ہے جو تورات کے دوسرے اعلام کی طرح ترجمہ نہ رہا بلکہ اصل بن گیا۔

مراتشی سترھویں صدی کا ایک عیسائی عالم ہے، اس نے قرآن عزیز کا ترجمہ کیا ہے اور قرآن عزیز پر نہایت رکیک اور متعصبانہ حملے کیے ہیں، اس نے اس موقعہ پر بھی عادت کے مطابق ایک مہمل اور لچر اعتراض کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یوزبیوس کی تاریخ کنیسہ کی ایک عبارت میں یہ لفظ آیا ہے جس کو غلط صیغہ کے ساتھ محمد ﷺ نے قرآن عزیز میں درج کر دیا۔

لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ مراتشی اپنے اس دعوے کے ثبوت میں نہ تاریخ کنیسہ کی وہ عبارت پیش کرتا ہے جس سے یہ لفظ ماخوذ بتایا گیا ہے اور نہ اس اصل لفظ ہی کا پتہ دیتا ہے کہ جس سے یہ غلط لفظ بنا لیا گیا اور نہ یہ بتلاتا ہے کہ آخر محمد ﷺ کو اس نقل کی کیا ضرورت پیش آئی؟ اس لیے یہ قطعاً بے دلیل اور بے سروپا بات ہے جو محض تعصب اور جہالت کی وجہ سے کہی گئی اور حق وہی ہے جو ہم نے ابھی واضح کیا۔

شجرۂ نسب حضرت ابراہیم تا حضرت نوح علیہما السلام:

تورات اور تاریخ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک نسب کی جو کڑیاں شمار کرائی ہیں وہ درج ذیل ہیں، ان شجرۂ نسب کی صحت و عدم صحت کا معاملہ قیاسی اور تخمینی رائے سے زیادہ نہیں ہے اس لیے کہ جب نبی اکرم ﷺ کے سلسلہ نسب کے متعلق، اس یقین کے باوجود کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں، عدنان سے اوپر کی کڑیوں کے متعلق خود ذات اقدس کا یہ مقولہ ہے کہ "کذب النسابون" علماء نسب نے ناموں کی تعیین میں غلط بیانی سے کام لیا ہے" تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک کا سلسلہ کس طرح کذب بیانی اور وضع سے پاک رہ سکتا ہے۔؟

Marfat.com

نام	باپ کا نام	بیٹے کی پیدائش کے وقت باپ کی عمر
سام	نوح علیہ السلام	۵۰۰
ارفکشاذ	سام	۱۰۰
شالح	ارفکشاذ	۳۵
عابر	شالح	۳۰
فالج	عابر	۳۴
رعو	فالج	۳۰
سروج	رعو	۳۲
ناجور	سروج	۳۰
آذر (تارخ)	ناجور	۲۹
ابراہیم علیہ السلام	آذر (تارخ)	۷۰
		۸۹۰ مجموعی مدت

ان اعداد و شمار کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت سے حضرت نوح علیہ السلام تک آٹھ سو نوے سال ہوتے ہیں اور جبکہ حضرت نوح علیہ السلام کی کل عمر نو سو پچاس سال بتائی جاتی ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت نوح علیہ السلام کی عمر کے ساٹھ سال پائے اور وہ دونوں اس مدت کے اندر معاصر رہے ہیں اور یہ بلاشبہ بے سروپا بات اور قطعاً غلط اور مہمل ہے اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ تورات کے یہ اعداد و شمار محض خود تراشیدہ کہانیوں اور حکایتوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قدیم زمانہ میں یہود کے یہاں تاریخ کا باب اسی قسم کی حکایات و روایات پر قائم رہا ہے اور اس میں تاریخی حقائق اور زمانوں کے تضاد و اختلاف کا مطلق لحاظ و پاس نہیں رکھا گیا۔

مستشرقین یورپ کی ہرزہ سرائی:

مستشرقین یورپ کی ایک جماعت اسلام دشمنی میں ید طولیٰ رکھتی ہے اور بغض و عناد کی مشتعل آگ میں حقائق و واقعات تک کے انکار پر آمادہ ہو جاتی ہے، چنانچہ اس قسم کے مواقع میں سے کہ جہاں قرآن عزیز کے خلاف بے دلیل ان کی تنقید کی تلوار چلتی رہتی ہے ایک موقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کا بھی ہے۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ [1] نے ونسنک [2] کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے اسپرنگر [3] نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن میں ایک عرصہ تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کعبہ کے بانی اور دین حنیف کے ہادی کی حیثیت سے روشنی میں نہیں آئی البتہ عرصہ دراز کے بعد ان کی شخصیت کو ان صفات کے ساتھ متصف ظاہر کیا گیا ہے، اور ان کی ذات کی خاص اہمیت نظر آتی ہے، چونکہ یہ دعویٰ

[1] جلد ۱ ص ۲۷۔۲۸ [2] Wensinck [3] Sprenger

Marfat.com

اپنی اجمالی تعبیر کے لحاظ سے ابھی تشنہ تکمیل تھا اس لیے ایک طویل زمانہ کے بعد اسپر نگر کے اس دعوے کو سنوگ ہیکر ونیہ نے بڑے شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا اور اپنے مزعومہ دلائل کے ذریعہ اس کو خاص آب ورنگ سے رنگین بنایا۔ اس نے کہا:

"قرآن پاک میں جس قدر مکی آیات اور سورتیں ہیں ان میں کسی ایک مقام پر بھی اسماعیل (علیہ السلام) کا ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ رشتہ نظر نہیں آتا اور نہ ان کو اوّل مسلمین بتایا گیا ہے بلکہ وہ صرف ایک نبی اور پیغمبر کی حیثیت میں نظر آتے ہیں، ان کے تذکرہ کی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملتی جو اس کو مؤسس کعبہ، اسماعیل علیہ السلام کا باپ، عرب کا پیغمبر و ہادی، اور ملت حنیفی کا داعی، ظاہر کرتی ہو، سورۃ الذاریات، الحجر، الصافات، الانعام، ہود، مریم، انبیاء اور عنکبوت جو سب مکی سورتیں ہیں ہمارے اس دعوے کی شاہد ہیں۔ اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے سرزمین عرب میں کوئی نبی نہیں آیا اور یہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔"

البتہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدنی زندگی شروع ہوتی ہے تو مدنی سورتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر کے وقت یہ تمام خصوصیات نمایاں کی جاتی اور اہمیت کے ساتھ روشنی میں لائی جاتی ہیں۔

ایسا کیوں ہوا؟ اور یہ اختلاف کیوں موجود ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکی زندگی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام امور میں یہود پر اعتماد رکھتے اور انہیں کے طریقوں کو پسند فرماتے تھے، لہٰذا اس وقت تک ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو بھی انہوں نے اسی نظر سے دیکھا جس نظر سے یہود دیکھتے تھے لیکن جب مدینہ پہنچ کر انہوں نے یہود کو اپنے مشن "اسلام" کی دعوت دی تو انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور وہ آپ کے دشمن ہو گئے۔ اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فکر و تامل کیا اور خوب سوچا، آخر ان کی ذکاوت اور جودت طبع نے رہنمائی کی اور انہوں نے عرب کے لیے یہود کی یہودیت سے جدا ایک ایسے دین کی بنیاد ڈالی جس کو یہودیت ابراہیمی کہنا چاہئے، لہٰذا اس سلسلہ کی تکمیل کے لیے قرآن کی مدنی سورتوں میں ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت کو اس طرح پیش کیا گیا کہ وہ ملت حنیفی کے داعی، عرب کے پیغمبر، اسماعیلؑ کے والد، کعبہ کے مؤسس نظر آتے ہیں۔ انتہیٰ

یہ ہے وہ دعویٰ اور اس کی دلیل جو اسپرنگر، سنوک اور وینسنک جیسے اسلام دشمن مستشرقین کی جانب محض اس لیے اختراع کیے گئے ہیں کہ اس قسم کی لچر بنیادوں پر مسیحیت کی برتری اور اسلام کی تحقیر کی عمارت تیار ہو سکے اور نیز یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ ان کا عرب کے ساتھ نہ نسلی تعلق ہے اور نہ دینی، لیکن جب ایک مؤرخ اور ایک نقاد مستشرقین کے اس دعوے اور دعوے کے دلائل کو صرف تاریخی اور تنقیدی حیثیت سے دیکھتا ہے تب بھی اس کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے حقائق اور واقعات سے قصداً چشم پوشی کر کے محض عداوت اور بغض و عناد کی راہ سے بے دلیل کہا گیا ہے، اس لیے کہ اس سلسلہ میں سب سے بڑی دلیل پیش کی گئی ہے کہ مکی سورتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق وہ اوصاف نظر نہیں آتے جو مدنی آیات میں پائے جاتے ہیں، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سراسر غلط بلکہ قصد و ارادہ کے ساتھ علمی بددیانتی ہے کہ مکی سورتوں میں سے صرف انہی کا حوالہ دیا گیا جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فقط ایک پیغمبر کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے، لیکن وہ مکی سورت جو ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو ہمہ حیثیت سے نمایاں کرنے کے لیے ان کے نام ہی سے معنون کر کے نازل کی گئی یعنی (سورۂ ابراہیم) اس کو نظر انداز کر دیا گیا تا کہ قرآن عزیز سے براہ راست فائدہ نہ اٹھا سکنے والے حضرات کے سامنے جہالت کا پردہ پڑا رہے اور ان کی کورانہ تقلید میں وہ ان کے دعوے کو صحیح سمجھتے رہیں۔

Marfat.com

سورۂ ابراہیم مکی ہے، اس کی آیات کا نزول ہجرت سے قبل مکہ ہی میں ہوا ہے اور وہ حسب ذیل حقائق کا اعلان کرتی ہے۔

① حضرت ابراہیم علیہ السلام عرب (حجاز) کے اندر قیام پذیر ہیں اور خدا کے رسول کی حیثیت سے خود کو اور اپنی اولاد کو بت پرستی سے بچنے اور اس مقام کو امن عالم کا مرکز بنانے کی دعا کر رہے ہیں:

﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴾(ابراھیم: ۳۵)

"اے پروردگار اس شہر (مکہ) کو تو امن کا مرکز بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے دور رکھ۔"

﴿رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾(ابراھیم: ۳۶)

"اے پروردگار بلاشبہ ان (بتوں) نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا پس جو شخص میری پیروی کرے وہ میری جماعت میں سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے پس بلاشبہ تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔"

② حضرت ابراہیم علیہ السلام اقرار کرتے ہیں کہ سرزمین حجاز (جو عرب کا قلب ہے) ان ہی کی اولاد سے آباد ہوئی اور انہوں نے ہی اس کو بسایا ہے اور وہی اس چٹیل میدان میں بیت الحرام (کعبہ) کے مؤسس ہیں۔

﴿رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴾(ابراھیم: ۳۷)

"اے ہمارے پروردگار بیشک میں نے اپنی بعض ذریت کو اس بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے گھر (کعبہ) کے نزدیک آباد کیا ہے، اے ہمارے پروردگار یہ اس لیے تاکہ وہ نماز قائم کریں پس تو لوگوں میں سے کچھ کے دل اس طرف پھیر دے کہ وہ (اس کعبہ کی بدولت) ان کی جانب مائل ہوں اور ان کو پھلوں سے رزق عطا کرتا کہ یہ شکرگزار بنیں۔"

③ حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت اسحاق علیہ السلام کے والد ہیں اور یہی اسماعیل علیہ السلام اہل عرب کے باپ ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اور اپنی اولاد کے لیے ملت حنیفی کے شعار "صلوٰۃ" کی اقامت کی دعا کر رہے ہیں:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ۝ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ڰ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاۗءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴾(ابراھیم: ۳۹-۴۱)

"سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق بخشے بلاشبہ میرا پروردگار ضرور دُعا کا سننے والا ہے، اے پروردگار مجھ کو اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا دے، اے ہمارے پروردگار ہماری دعا سن، اے ہمارے پروردگار تو مجھ کو اور میرے والدین کو اور کل مومنوں کو قیام حساب (قیامت) کے روز بخش دے۔"

Marfat.com

ان آیات کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا ایک لمحہ کے لیے بھی کسی شخص کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ ان لغو اور بے سروپا دعووں کی تصدیق کرے جن کو مستشرقین یورپ نے اپنی جہالت یا ارادی جھوٹ کے ساتھ علمی تنقید کا عنوان دیا ہے، کیا یہ آیات مکی نہیں ہیں، اور کیا ان سے وہ سب کچھ ثابت نہیں ہوتا جو مدنی آیات میں مذکور ہے؟

④ اسی طرح سورۂ ابراہیم کے علاوہ سورۂ انعام اور سورۂ النحل بھی مکی سورتیں ہیں ان میں بصراحت موجود ہے کہ حضرت ابراہیم شرک کے مقابلہ میں ملت حنیفی کے داعی ہیں اور ان کی شخصیت اس دعوت میں بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔

﴿إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا ۖ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝٧٩﴾ (الانعام: ۷۹)

"بلاشبہ میں اپنے چہرہ کو اسی ذات کی طرف جھکاتا ہوں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور شرک کرنے والوں میں سے ہرگز نہیں۔"

﴿قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝١٦١﴾ (الانعام: ۱۶۱)

"(اے محمد ﷺ) کہہ دو بلاشبہ مجھ کو میرے رب نے سیدھی راہ کی ہدایت کی ہے جو کج راہ سے الگ صاف اور سیدھا دین ہے ملت ہے ابراہیم کی جو تھے ایک خدا کی طرف جھکنے والے اور نہ تھے وہ مشرکوں میں سے۔"

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝١٢٠﴾ (النحل: ۱۲۰)

"بیشک ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا حکم بردار صرف ایک خدا کی طرف جھکنے والا اور نہ تھا وہ شرک کرنے والوں میں سے۔"

﴿ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝١٢٣﴾ (النحل: ۱۲۳)

"پھر وحی کی ہم نے تیری جانب (اے محمد ﷺ) اس بات کی کہ تو پیروی کر اس ابراہیم کی ملت کی جو صرف خدائے واحد کی جانب جھکنے والا ہے اور نہیں ہے مشرکوں میں سے۔"

تو کیا ان واضح آیات کے بعد بھی ان دلائل کو دلائل کہنا کوئی حقیقت رکھتا ہے جو اس سلسلہ میں سنوک اور اس کے ہمنواؤں نے بیان کیے ہیں؟ مکی سورتیں ہوں یا مدنی دونوں جگہ ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت ایک ہی طرح نمایاں نظر آتی ہے، وہ دونوں حالتوں میں ملت حنیفی کے داعی حضرت اسماعیل علیہ السلام اور عرب کے باپ، کعبہ کے مؤسس و بانی اور عرب کے ہادی ہیں، اور اس لیے مستشرقین یورپ کا یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت قرآن عزیز کی مکی اور مدنی آیات میں دو جدا جدا صورتوں میں نظر آتی ہے کذب اور صریح بہتان ہے نیز یہ بھی خلاف واقعہ ہے کہ عرب میں رسول اکرم ﷺ کے دعوائے نبوت سے قبل کوئی بھی پیغمبر نہیں گزرا اس لیے کہ ابراہیم و اسماعیل اور ہود و صالح علیہم السلام اسی سرزمین کے ہادی و پیغمبر ہیں۔

ان مدعیان علم کو تعصب نے ایسا نادان بنا دیا کہ قرآن اور محمد رسول اللہ ﷺ پر اعتراض کرتے وقت یہ بھی خیال نہ رہا کہ اس قسم کے دعوے سے ہم صرف قرآن ہی کی نہیں بلکہ بائبل (تورات) کی بھی تکذیب کر رہے ہیں، اس لیے کہ تورات میں تصریح

Marfat.com

ہے کہ اسماعیل، ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں اور اسماعیل علیہ السلام ہی عرب کے باپ ہیں اور ابراہیم علیہ السلام کی اسی اولاد سے حجاز کی سرزمین آباد ہوئی اور یہ دونوں باپ بیٹے عرب کی نمایاں شخصیتیں ہیں۔

نیز یہ الزام بھی قطعاً بے بنیاد اور لغو ہے کہ "مکہ کی زندگی میں رسول اکرم ﷺ نے یہود اور ان کے مذہبی امور کی تقلید کی اور جب مدینہ میں پہنچ کر یہود کے انکار اور ان کے مخالفانہ جذبہ کو دیکھا تو یہود سے الگ ایک نئی یہودیت کی بنیاد ڈالی اور اس کو ملت ابراہیمی کا لقب دیا اس لیے کہ مکہ کی زندگی میں تو یہود سے آپ کا سابقہ ہی نہیں پڑا تو پھر مخالفت و موافقت یا اتباع کا سوال ہی کیا، البتہ مدینہ میں آ کر آپ نے مشرکین کے مقابلہ میں یہود کی جانب زیادہ توجہ فرمائی اور یہ اس لیے کہ وہ اسلام کے عقیدہ کے مطابق دین موسوی کے پیرو تھے اگرچہ اس میں تحریف ہو چکی تھی مگر وہ مشرکین کے خلاف توحید کے قائل تھے اور ان کی محرف کتابوں میں تحریف کے بعد بھی بہت سے جملے ایسے موجود تھے جو نبی اکرم ﷺ کی بعثت اور رسالت کے شاہد اور گواہ ہیں اور ان سے آپ کے حق میں بشارات نکلتی ہیں، نیز بہت سے وہ احکام بھی موجود تھے جو صحیح معنی میں وحی الٰہی کی حیثیت رکھتے ہیں اور دین موسوی کی اساس و بنیاد رہے ہیں اس لیے آپ کو خیال تھا کہ یہ مشرکین کے مقابلہ میں جلد ہی ملت ابراہیمی یعنی اسلام قبول کر لیں گے لیکن جب آپ نے ان کے انکار، بغض و حسد کا تجربہ کر لیا تو پھر ان کے ساتھ بھی آپ کا معاملہ وہی ہو گیا جو مشرکین کے ساتھ تھا اور بمصداق ((الکفر ملة واحدة))۔ "کفر سب ایک ملت ہے" آپ نے ان سب کو ایک ہی حیثیت میں رکھا۔

اسپرنگر، سنوک اور ان کے ہمنوا اتنی صاف بات سمجھنے سے بھی قاصر ہیں یا عمداً سمجھنا نہیں چاہتے کہ جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) کے دادا تھے اور یہود اپنے دین کی نسبت حضرت اسرائیل علیہ السلام کی جانب کرتے اور بنی اسرائیل ہونے کی حیثیت سے اس پر فخر کرتے تھے تو ان کا یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام بھی یہودی تھے کس قدر مضحکہ خیز تھا، کیا پوتے کے دین کے متعلق کسی طرح یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ عرصہ دراز کے گزرے ہوئے دادا کا دین پوتے کے دین کے تابع تھا۔ پس اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے قرآن عزیز نے یہ اعلان کیا:

﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا﴾ (آل عمران: ٦٧)

"ابراہیم نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی، البتہ وہ تھے ایک خدا کی جانب جھکنے والے مسلمان"۔

مگر ان کور چشموں نے اس کے معنی یہ لیے کہ نبی اکرم ﷺ مکہ میں تو یہود کے دین پر تھے لیکن مدینہ جا کر جب یہود نے ان کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا تو یہود کے دین کے مقابلہ میں ذکاوت طبع سے یہودیت ابراہیمی ایجاد کر لی۔ سبحانك هذا بهتان عظيم۔

سنوک اور اس کے ہمنواؤں نے اس دعوے کی دلیل میں کہ نبی اکرم ﷺ سے پہلے عرب میں کوئی پیغمبر نہیں گزرا، قرآن عزیز کی اس آیت کو بھی پیش کیا ہے:

﴿لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ﴾ (السجدہ: ٣)

"تاکہ تو (اے محمد ﷺ) ڈرائے ایسی قوم کو کہ نہیں آیا ان کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا"۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام عرب کے پیغمبر ہوتے تو قرآن عزیز امت عربیہ کے متعلق اس طرح محمد ﷺ

Marfat.com

خطاب نہ کرتا۔

مگر یہ بھی ایک سخت مغالطہ ہے جو قرآن عزیز کے طرز خطابت، اسلوب بیان، اور باطل پرستوں کی باطل پرستی، کے خلاف دلائل کی ترتیب سے ناواقفیت کی بناء پر پیدا ہوا ہے یا گذشتہ اعتراضات کی طرح محض بغض وعناد کی خاطر اختیار کیا گیا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ عرب کا بہت بڑا حصہ بت پرستی میں مبتلاء تھا، اس سلسلہ میں انہوں نے عقائد اور دین کے نام سے کچھ احکام مرتب کر رکھے تھے، مثلاً دیوتاؤں کی نذر اور قربانی کے لیے سائبہ، بحیرہ اور وصیلہ کی ایجاد، اور مختلف بتوں کی پرستش کے مختلف قواعد وضوابط وغیرہ، اس لیے جب نبی اکرم ﷺ نے ان کو توحید اور اسلام کی دعوت دی اور شرک اور بت پرستی سے روکا تو وہ کہنے لگے کہ تمہارا یہ کہنا کہ ہم بددین ہیں اور ہمارا کوئی الہامی دین نہیں ہے، غلط ہے ہم تو خود مستقل دین رکھتے ہیں اور وہ ہمارے باپ دادا کا قدیمی دین ہے۔

﴿ قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ﴾ (الاعراف: ۲۸)

"مشرکین نے کہا۔ ہم نے اسی (بت پرستی) پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے۔"

تب قرآن عزیز نے ان کے باطل عقائد کی حقیقت کو ان پر واضح کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کو بتایا جائے کہ کسی دین کے خدائی دین ہونے کے لیے دو ہی قسم کے دلائل ہو سکتے ہیں، یا حسی اور عقلی راہ سے یہ واضح ہو جائے کہ یہ خدا کا دین اور اس کا مرغوب مذہب ہے، اور یا نقلی روایات اس کا قطعی، یقینی اور نا قابل انکار ثبوت پیش کرتی ہوں کہ یہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعت ہے اور اگر یہ دونوں راہیں کسی دعوے کے لیے بند ہیں تو وہ دعویٰ باطل اور اس کا مدعی کاذب ہے۔

لہٰذا قرآن عزیز نے مشرکین کے اس دعوے کی تردید کے لیے آیات قرآنی کے تین حصے کر دیئے، ایک حصہ میں ان کے اس دعوے کا انکار اور دعوے کی غیر معقولیت کا اظہار کیا اور بتایا کہ مشرکین کا یہ کہنا کہ ﴿ وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ﴾ "(ہم کو خدا نے ایسا (شرک) کرنے ہی کا حکم دیا ہے) بالکل غلط اور سراسر باطل ہے اس لیے کہ:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (الاعراف: ۲۸)

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ بے ہودہ خرافات کا حکم نہیں دیا کرتا (اے مشرکین) کیا تم اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے۔"

اور دوسرا حصہ ان کے باطل دعوے پر حسی اور عقلی سند کے مطالبہ سے متعلق کیا اور بتایا کہ وہ عقل سے یہ فتویٰ صادر کریں کہ جو کچھ خدا کے ساتھ انہوں نے غلط نسبتیں قائم کر رکھی ہیں اور جن پر ان کے مزعومہ دین کی بنیاد قائم ہے، وہ کس طرح صحیح اور اہل عقل کے نزدیک قابل تسلیم ہیں؟ وہ کہتا ہے:

﴿ فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَ لَهُمُ الْبَنُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّ هُمْ شٰهِدُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ۝ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ ﴾ (الصافات: ۱۴۹-۱۵۵)

Marfat.com

"پس (اے محمد ﷺ) تم ان سے دریافت کرو کیا تمہارے پروردگار کے لیے لڑکیاں ہیں اور ان کے لیے لڑکے، کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں بنایا اور وہ اس وقت موجود تھے، خبردار بلاشبہ یہ سب ان کی بہتان طرازی ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے اولاد ہے، بلاشبہ یہ قطعاً جھوٹے ہیں (یہ کہتے ہیں کہ خدا نے) اپنے لیے بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیوں کو پسند کرلیا ہے (اے مشرکین) تم کو کیا ہوا یہ تم کیسا (جھوٹا) حکم کرتے ہو، پس کیا تم نصیحت نہ حاصل کرو گے؟"

اور تیسرا حصہ ان کے باطل عقیدوں کے متعلق نقلی سند کے مطالبہ سے وابستہ کیا، قرآن عزیز ان سے سوال کرتا ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اور اس کو خدا کا دین بتا رہے ہو تو کیا تمہارے پاس اس کے لیے خدا کی جانب سے کوئی حجت، اور دلیل نازل ہوئی ہے یا اس کے پاس سے ان عقائد کی صداقت کے لیے کوئی کتاب بھیجی گئی ہے اگر ایسا ہے تو پیش کرو؟

﴿ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ (الصافات : ۱۵۶۔۱۵۷)

"کیا تمہارے پاس کوئی ظاہر حجت اور صاف دلیل ہے پس تم اپنی (خدا کی جانب سے نازل شدہ) وہ کتاب لاؤ اگر تم سچے ہو؟"

اب اگر ان کے اپنے دعوے کی صداقت کے لیے ان کے پاس نہ کوئی حسی و عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی سند کے طور پر کوئی حجت و کتاب، تو پھر ان کا یہ دعویٰ کہ ان کے پاس محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے سے خدا کا دین موجود ہے اور اس کی منضبط شریعت بھی! بالکل غلط اور باطل دعویٰ ہے۔

اسی طرح مشرکین پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ تمہارے پاس اپنے دعوائے باطل کے سلسلہ میں نہ عقلی سند ہے اور نہ نقلی اور ان کو لاجواب بنانے کے لیے سورۂ احقاف میں بھی یہی طریق استدلال اختیار کیا گیا ہے۔

﴿ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ؕ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ ﴾ (الاحقاف : ۴)

"تم مجھے بتاؤ کہ اللہ کے ماسواء جن کو تم پوجتے ہو مجھے دکھلاؤ کہ انہوں نے زمین سے کیا بنایا، یا کیا ان کی آسمانوں میں (اللہ کے ساتھ) کوئی شرکت ہے، اس سے پہلی کوئی کتاب اگر تمہارے پاس ہے (جو اس دعوے کی تصدیق کرتی ہو) تو وہ لے آؤ، یا علم (اولین میں سے کوئی بقیہ علم) تمہارے پاس ہو تو وہ پیش کرو۔"

یہی وہ حقیقت ہے جس کو ایک دوسرے پیرایہ میں قرآن عزیز کی ان آیات میں بیان کیا گیا ہے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشرکین عرب کے پاس محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں آیا، ان آیات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سرزمین عرب (حجاز) ہمیشہ سے خدا کے نبی اور پیغمبر کے وجود سے محروم ہے اور اس ملک میں نبی اکرم ﷺ کی آواز سب سے پہلی آواز ہے، قرآن عزیز ایسی خلاف حقیقت بات کس طرح کہہ سکتا تھا جبکہ سورۂ ابراہیم، الانعام اور النمل کی آیات میں حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے عربی نبی ہونے کی صاف اور صریح شہادتیں موجود ہیں جو ابھی نقل کی جاچکی ہیں بلاشبہ قرآن عزیز اس قسم کے تضاد اور اختلاف سے قطعاً بری ہے، کہ ایک جگہ وہ ایک بات کا انکار کرے اور دوسری جگہ اسی بات کا اقرار، اس لیے کہ وہ خدائے عالم الغیب والشہادۃ کا

Marfat.com

کلام ہے نہ کہ بھول چوک کرنے والے انسان کا کلام۔

﴿ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ۝ ﴾ (النساء: ۸۲)

"کیا انہوں نے قرآن پر غور نہیں کیا اور اگر وہ ہوتا اللہ کے سواء کسی اور کا کلام تو ضرور پاتے اس میں بہت سا اختلاف۔"

لہٰذا قرآن عزیز کے خلاف سنوک، اسپرنگر اور وینسنگ کے یہ تمام دعاوی اور ان کے دلائل تاریخی حقائق اور واقعات کی روشنی میں قطعاً باطل اور افتراء ہیں اور ان کے طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کے دوسرے ناقدین قرآن عزیز پر علمی دیانت کے ساتھ تنقید نہیں کرتے اور نہ ان کی فہم اور سمجھ کا قصور ہے بلکہ اس کے برعکس وہ علمی بددیانتی سے کام لے کر قرآن کے خلاف زہر اگلتے، غلط الزام قائم کرتے، اور صریح اور واضح مسائل میں اپنے پیش نظر مقاصد کے مطابق گنجلک پیدا کر کے ناواقف دنیا کو گمراہ کرتے ہیں، بلکہ اس قسم کے الزامات سے ان کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے جس کو قرآن عزیز نے اس قسم کے معاندین کے لیے ایک مستقل قانون کی طرح واضح کر دیا ہے:

﴿ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً ﴾ (النساء: ۸۹)

"یہ (منکرین قرآن و اسلام) یہ خواہش رکھتے ہیں کہ کاش تم بھی ان کی طرح منکر بن جاؤ تا کہ وہ اور تم سب یکساں ہو جائیں۔"

اس لیے ان منکرین (کافروں) کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ہمیشہ ایک ہی جواب رہا ہے۔

﴿ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا ﴾ (آل عمران: ۸)

"اے پروردگار ہمارے دلوں کو ہدایت یافتہ اور راہ یاب کرنے کے بعد کجی کی جانب مت مائل کرنا۔"

بہر حال قرآن حکیم کی مسطورہ بالا زیر بحث آیت کا مطلب صاف اور واضح ہے اور اس کے درمیان اور الانعام، النحل اور ابراہیم جیسی سورتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے پیغمبر عرب ہونے کے درمیان قطعاً کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔

اس پیش کردہ تفصیل و تشریح کے علاوہ عام مفسرین نے اس قسم کی آیات کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہ خطاب صرف ان ہی لوگوں سے متعلق ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک میں موجود تھے۔ ان کے گزشتہ آباؤ اجداد اور گزشتہ تاریخ عرب سے اس خطاب کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر قرآن میں:

قرآن عزیز کے رشد و ہدایت کا پیغام چونکہ ملت ابراہیمی کا پیغام ہے اس لیے اس نے جگہ جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا ہے اور جیسا کہ گزشتہ سطور میں کہا جا چکا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر مکی اور مدنی دونوں قسم کی سورتوں میں موجود ہے، مندرجہ ذیل جدول ان تمام سورتوں اور آیتوں کو ظاہر کرتی ہے۔

Marfat.com

نام سورہ	نمبر سورہ	تعداد آیات
البقرہ	۲	۱۲۴،۱۲۵،۱۲۶،۱۲۷،۱۳۰،۱۳۲،۱۳۳،۱۳۵،۱۳۶،۱۴۰،۲۵۸،۲۶۰
آل عمران	۳	۳۳،۶۵،۶۷،۶۸،۸۴،۹۵،۹۷
النساء	۴	۵۴،۱۲۵،۱۶۳
الانعام	۶	۷۴،۷۵،۸۳،۱۶۱
التوبہ	۹	۷۰،۱۱۴
ہود	۱۱	۶۹،۷۴،۷۵،۷۶
ابراہیم	۱۴	۳۵
النحل	۱۶	۱۲۰،۱۲۳
الانبیاء	۲۱	۵۱،۶۰،۶۲،۶۹
الشعراء	۲۶	۶۹
الاحزاب	۳۳	۷
صٓ	۳۸	۴۵
الزخرف	۴۳	۲۶
النجم	۵۳	۳۷
الممتحنہ	۶۰	۴
یوسف	۱۲	۶،۳۸
الحجر	۱۵	۵۱
مریم	۱۹	۴۱،۴۶،۵۸
الحج	۲۲	۲۶،۴۳،۷۸
العنکبوت	۲۹	۱۶،۳۱
الصافات	۳۷	۸۳،۱۰۴،۱۰۹
الشوریٰ	۴۲	۱۳
الذاریات	۵۱	۲۴
الحدید	۵۷	۲۶
الاعلیٰ	۸۷	۱۹
مجموعہ	۲۵ سورتیں	۶۳ آیات

Marfat.com

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے ساتھ دوسرے چند انبیاء علیہم السلام کے واقعات بھی وابستہ ہیں مثلاً حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ اس لیے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے بھی ہیں، اور ان کے پیرو بھی۔ اسی طرح ان کے صاحبزادوں حضرت اسماعیل و حضرت اسحاق علیہما السلام کے واقعات، اس لیے کہ اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ستاسی سال تھی اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کے وقت ان کی عمر پورے سو سال تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کل عمر ایک سو پچھتر (۱۷۵) سال ہوئی۔ لیکن ان تینوں پیغمبروں کے تفصیلی واقعات مستقل عنوان میں درج کیے جائیں گے اور یہاں صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے ضمن میں کہیں کہیں ذکر آئے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس عظمت شان کے پیش نظر جو انبیاء و رسل کے درمیان ان کو حاصل ہے قرآن عزیز نے ان کے واقعات کو مختلف اسلوب کے ساتھ جگہ جگہ بیان کیا ہے، ایک مقام پر اگر اختصار کے ساتھ ذکر ہے تو دوسری جگہ تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے اور بعض جگہ مختلف شؤن و اوصاف کے پیش نظر ان کی شخصیت کو نمایاں کیا ہے اس لیے مناسب ترتیب کے ساتھ ان کو پیش کیا جاتا ہے۔

تورات یہ بتاتی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام عراق کے قصبہ اور اس کے باشندے اور اہل فدان میں سے تھے اور ان کی قوم بت پرست تھی اور انجیل برنابا میں تصریح ہے کہ ان کے والد نجاری (ترکھان) کا پیشہ کرتے اور اپنی قوم کے مختلف قبائل کے لیے لکڑی کے بت بناتے اور فروخت کیا کرتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شروع ہی سے حق کی بصیرت اور رشد و ہدایت عطا فرمائی تھی اور وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ بت نہ سن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کسی کی پکار کا جواب دے سکتے ہیں، اور نہ نفع و نقصان کا ان سے کوئی واسطہ، اور نہ لکڑی کے کھلونوں اور دوسری بنی ہوئی چیزوں کے اور ان کے درمیان کوئی فرق و امتیاز ہے، وہ صبح و شام آنکھ سے دیکھتے تھے کہ ان بے جان مورتیوں کو میرا باپ اپنے ہاتھوں سے بناتا اور گھڑتا رہتا ہے اور جس طرح اس کا جی چاہتا ہے، ناک، کان، آنکھیں اور جسم تراش لیتا اور پھر خریدنے والوں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے تو کیا یہ خدا ہو سکتے ہیں یا خدا کے مثل و ہمسر کہے جا سکتے ہیں؟ حاشا و کلا پس بعثت سے سرفراز ہو کر سب سے پہلے انہوں نے اسی طرف توجہ فرمائی۔

بعثت:

قرآن عزیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس حقیقت بین اور بصیرت افروز رشد و ہدایت کا اس طرح ذکر کرتا ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ۝ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَ اَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۵۱ - ۵۶)

Marfat.com

"اور بلاشبہ ہم نے ابراہیم کو اول ہی سے رشد و ہدایت عطاء کی تھی، اور ہم اس کے (معاملہ کے) جاننے والے تھے جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: "یہ مجسمے کیا ہیں جن کو تم لیے بیٹھے ہو" کہنے لگے "ہم نے اپنے باپ دادا کو ان ہی کی پوجا کرتے پایا ہے" ابراہیم نے کہا "بلاشبہ تم اور تمہارے باپ دادا کھلی گمراہی میں ہیں" انہوں نے جواب دیا کیا تو ہمارے لیے کوئی حق لایا ہے یا یوں ہی مذاق کرنے والوں کی طرح کہتا ہے، ابراہیم علیہ السلام نے کہا (یہ بت تمہارے رب نہیں ہیں) بلکہ تمہارا پروردگار زمینوں اور آسمانوں کا پروردگار ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے اور میں اسی بات کا قائل ہوں۔"

اور جب کہ اس جلیل القدر ہستی پر اللہ تعالیٰ کے جود و کرم اور عطاء و نوال کا فیضان بے غایت و بے نہایت سرعت رفتار کے ساتھ ہو رہا تھا تو اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس نے انبیاء علیہم السلام کی صف میں نمایاں جگہ پائی اور اس کی دعوت و تبلیغ کا محور و مرکز "دین حنیف" قرار پایا۔

اس نے جب یہ دیکھا کہ قوم بت پرستی، ستارہ پرستی اور مظاہر پرستی میں اس قدر منہمک ہے کہ خدائے برتر کی قدرت مطلقہ اور اس کی احدیت و صمدیت کا تصور بھی ان کے قلوب میں باقی نہیں رہا اور ان کے لیے خدا کی وحدانیت کے عقیدہ سے زیادہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں رہی، تب اس نے کمر ہمت چست کی اور ذات واحد کے بھروسہ پر ان کے سامنے دین حق کا پیغام رکھا اور اعلان کیا۔

اے قوم! یہ کیا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بتوں کی پرستش میں مشغول ہو، کیا تم اس قدر خواب غفلت میں ہو کہ جس بے جان لکڑی کو اپنے آلات سے گھڑ کر مجسمے تیار کرتے ہو اور اگر وہ مرضی کے مطابق نہ بنے تو ان کو توڑ کر دوسرے بنا لیتے ہو، بنا لینے کے بعد پھر ان ہی کو پوجنے اور نفع و ضرر کا مالک سمجھنے لگتے ہو، تم اس خرافات سے باز آؤ، خدا کی توحید کے نغمے گاؤ، اور اسی ایک مالک حقیقی کے سامنے سر نیاز جھکاؤ جو میرا، تمہارا اور کل کائنات کا خالق و مالک ہے۔

مگر قوم نے اس کی آواز پر مطلق کان نہ دھرا اور چونکہ گوش حق نیوش اور نگاہ حق بین سے محروم تھی اس لیے اس نے جلیل القدر پیغمبر کی دعوت حق کا مذاق اڑایا۔ اور زیادہ سے زیادہ تمرد و سرکشی کا مظاہرہ کیا۔

باپ کو دعوت اسلام اور باپ بیٹے کا مناظرہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام دیکھ رہے تھے کہ شرک کا سب سے بڑا مرکز خود ان کے اپنے گھر میں قائم ہے اور آزر کی بت سازی و بت پرستی پوری قوم کے لیے مرجع و محور بنی ہوئی ہے اس لیے فطرت کا تقاضا ہے کہ دعوت حق اور پیغام صداقت کے اداء فرض کی ابتداء گھر ہی سے ہونی چاہیے۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے والد "آزر" ہی کو مخاطب کیا اور فرمایا: اے باپ! خدا پرستی اور معرفت الٰہی کے لیے جو راستہ تو نے اختیار کیا ہے اور جس کو آباؤ اجداد کا قدیم راستہ بتلایا ہے یہ گمراہی اور باطل پرستی کی راہ ہے۔ اور صراط مستقیم اور راہ حق صرف وہی ہے جس کی دعوت میں دے رہا ہوں، اے باپ! توحید ہی سرچشمۂ نجات ہے نہ کہ تیرے ہاتھ کے بنائے ہوئے ان بتوں کی پرستش و عبادت، اس راہ کو چھوڑ اور توحید حق کی راہ کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کرتا کہ تجھ کو خدا کی رضا اور دنیا و آخرت کی سعادت حاصل ہو۔

مگر افسوس کہ آزر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس پند و نصیحت کا مطلق کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ قبول حق کے بجائے آزر نے بیٹے

Marfat.com

کو دھمکانا شروع کیا، کہنے لگا کہ ابراہیم! اگر تو بتوں کی برائی سے باز نہ آئے گا تو میں تجھ کو سنگسار کر دوں گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ معاملہ اب حد سے آگے بڑھ گیا اور ایک جانب اگر باپ کے احترام کا مسئلہ ہے تو دوسری جانب ادائے فرض، حمایت حق اور اطاعت امر الٰہی کا سوال، تو انہوں نے سوچا اور آخر وہی کیا جو ایسے برگزیدہ انسان اور اللہ کے جلیل المرتبت پیغمبر کے شایان شان تھا، انہوں نے باپ کی سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا، تحقیر و تذلیل کا رویہ نہیں برتا بلکہ نرمی، ملاطفت، اور اخلاق کریمانہ کے ساتھ یہ جواب دیا، اے باپ! اگر میری بات کا یہی جواب ہے تو آج سے میرا تیرا اسلام ہے میں خدا کے سچے دین اور اس کے پیغام حق کو نہیں چھوڑ سکتا، اور کسی حال بتوں کی پرستش نہیں کر سکتا، میں آج سے تجھ سے جدا ہوتا ہوں، مگر غائبانہ تیرے لیے درگاہِ الٰہی میں بخشش طلب کرتا رہوں گا تا کہ تجھ کو ہدایت نصیب ہو اور تو خدا کے عذاب سے نجات پائے۔

سورۃ مریم میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَ اهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ وَ اَعْتَزِلُكُمْ وَ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ اَدْعُوْا رَبِّيْ ۫ۖ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝﴾ (مریم: ۴۱-۴۸)

"اور (اے پیغمبر!) الکتاب میں ابراہیم کا ذکر کر، یقیناً وہ مجسم سچائی تھا اور اللہ کا نبی تھا۔ اس وقت کا ذکر جب اس نے اپنے باپ سے کہا، اے میرے باپ! تو کیوں ایک ایسی چیز کی پوجا کرتا ہے جو نہ تو سنتی ہے نہ دیکھتی ہے، نہ تیرے کسی کام آ سکتی ہے؟ اے میرے باپ! میں سچ کہتا ہوں علم کی ایک روشنی مجھے مل گئی ہے جو تجھے نہیں ملی، پس میرے پیچھے چل، میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں گا، اے میرے باپ! شیطان کی بندگی نہ کر، شیطان تو خدائے رحمٰن سے نافرمان ہو چکا، اے میرے باپ! میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو، خدائے رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب تجھے گھیرے، اور شیطان کا ساتھی ہو جائے۔ باپ نے (یہ باتیں سن کر) کہا: "ابراہیم (علیہ السلام) کیا تو میرے معبود سے پھر گیا ہے؟ یاد رکھ اگر تو ایسی باتوں سے باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر کے چھوڑوں گا، اپنی خیر چاہتا ہے تو جان سلامت لے کر مجھ سے الگ ہو جا" ابراہیم علیہ السلام نے کہا: "اچھا میرا سلام قبول ہو (میں الگ ہو جاتا ہوں) اب میں اپنے پروردگار سے تیری بخشش کی دعا کروں گا۔ وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں نے تم سب کو چھوڑا اور انہیں بھی جنہیں تم اللہ کے سوا پکارا کرتے ہو، میں اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں، اُمید ہے اپنے پروردگار کو پکار کے میں محروم ثابت نہیں ہوں گا۔"

Marfat.com

سورہ انعام میں آزر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نصیحت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً ۖ إِنِّي أَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ﴾

(الانعام: ۷٤)

"اور (وہ وقت یاد کر) جب ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ آزر سے کہا: "کیا ٹھہراتا ہے تو بتوں کو خدا، میں تجھ کو اور تیری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتا ہوں"۔

قوم کو دعوت اسلام اور اس سے مناظرہ:

باپ اور بیٹے کے درمیان جب اتفاق کی کوئی صورت نہ بنی اور آزر نے کسی طرح ابراہیم علیہ السلام کی رشد وہدایت کو قبول نہ کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آزر سے جدائی اختیار کر لی اور اپنی دعوت حق اور پیغام رسالت کو وسیع کر دیا اور اب صرف آزر ہی مخاطب نہ رہا بلکہ پوری قوم کو مخاطب بنا لیا۔ مگر قوم اپنے باپ دادا کے دین کو کب چھوڑنے والی تھی۔ اس نے ابراہیم علیہ السلام کی ایک نہ سنی اور دعوت حق کے سامنے اپنے باطل معبودوں کی طرح گونگے، اندھے اور بہرے بن گئے۔

ان کے کان موجود تھے مگر حق کی آواز کے لیے بہرے تھے، پتلیاں آنکھوں کے حلقوں میں زندہ انسان کی آنکھوں کی طرح حرکت ضرور کرتی تھیں مگر حق کی بصارت سے محروم تھیں، زبان گویا ضرور تھی لیکن کلمہ حق کے اعتبار سے گنگ تھی۔

﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولٰئِكَ هُمُ الْغٰفِلُونَ﴾ (الاعراف: ۱۷۹)

"ان کے دل ہیں پر سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں پر دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں، یہ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں، یہی ہیں جو غفلت میں سرشار ہیں۔"

اور جب ابراہیم علیہ السلام نے زیادہ زور دے کر پوچھا کہ یہ تو بتاؤ کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو یہ تم کو کسی قسم کا بھی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ تو کہنے لگے کہ ان باتوں کے جھگڑے میں ہم پڑنا نہیں چاہتے، ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا ہی کرتے چلے آئے ہیں لہٰذا ہم بھی وہی کر رہے ہیں۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک خاص انداز سے خدائے واحد کی ہستی کی جانب توجہ دلائی، فرمانے لگے، میں تو تمہارے ان سب بتوں کو اپنا دشمن جانتا ہوں یعنی میں ان سے بے خوف وخطر ہو کر ان سے اعلان جنگ کرتا ہوں، کہ اگر یہ میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں تو اپنی حسرت نکال لیں۔

البتہ میں صرف اس ہستی کو اپنا مالک سمجھتا ہوں جو تمام جہانوں کی پروردگار ہے، جس نے مجھ کو پیدا کیا اور راہ راست دکھائی، جو مجھ کو کھلاتا پلاتا یعنی رزق دیتا ہے، اور جب میں مریض ہو جاتا ہوں تو جو مجھ کو شفاء بخشتا ہے، اور جو میری زیست وموت دونوں کا مالک ہے، اور اپنی خطاء کاری کے وقت جس سے یہ طمع کرتا ہوں کہ وہ قیامت کے روز مجھ کو بخش دے اور میں اس کے حضور میں یہ دعا کرتا رہتا ہوں، اے میرے پروردگار! تو مجھ کو صحیح فیصلہ کی قوت عطاء کر اور مجھ کو نیکوکاروں کی فہرست میں داخل کر اور مجھ کو

زبان کی سچائی عطا کر اور جنت نعیم کے وارثوں میں شامل کر۔

نصیحت و موعظت کے اس مؤثر انداز خطابت کو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد اور قوم کے سامنے پیش کیا، سورۃ الشعراء میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ
لَهَا عٰكِفِيْنَ ۝ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۝ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ۝ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَاۤ
اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝ قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۝
فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۝ وَ الَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَ يَسْقِيْنِ ۝
وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝ وَ الَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۝ وَ الَّذِيْۤ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ
يَوْمَ الدِّيْنِ ۝ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ وَ اجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي
الْاٰخِرِيْنَ ۝ وَ اجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ۝ وَ اغْفِرْ لِاَبِيْۤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ وَ لَا تُخْزِنِيْ
يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝ ﴾

(الشعراء: ۶۹-۸۹)

"اور سنا دے ان کو خبر ابراہیم (علیہ السلام) کی جب کہا اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو تم کس کو پوجتے ہو، وہ بولے ہم پوجتے ہیں مورتیوں کو پھر سارے دن انہی کے پاس لگے بیٹھے رہتے ہیں، کہا، کچھ سنتے ہیں تمہارا کہا جب تم پکارتے ہو یا کچھ بھلا کرتے ہیں تمہارا یا برا، بولے نہیں، پر ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو یہی کام کرتے، کہا: بھلا دیکھتے ہو جن کو پوجتے رہے ہو، تم اور تمہارے باپ دادے اگلے، سو وہ میرے دشمن ہیں مگر جہان کا رب جس نے مجھ کو بنایا سو وہی مجھ کو راہ دکھلاتا ہے اور وہ جو مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی شفاء دیتا ہے، اور وہ جو مجھ کو مارے گا اور پھر جلائے گا، اور جس سے مجھ کو توقع ہے کہ بخشے میری تقصیر انصاف کے دن، اے میرے رب! دے مجھ کو حکم اور ملا مجھ کو نیکوں میں، اور رکھ میرا بول سچا پچھلوں میں، اور کر مجھ کو وارثوں میں نعمت کے باغ کے اور معاف کر میرے باپ کو وہ ہے راہ بھولے ہوؤں میں، اور رسوا نہ کر مجھ کو جس دن سب جی کر اٹھیں۔ جس دن نہ کام آوے کوئی مال اور نہ بیٹے، مگر جو کوئی آیا اللہ کے پاس لے کر بے روگ دل۔"

مگر آذر اور قوم آزر کے دل کسی طرح قبول حق کے لیے نرم نہ ہوئے اور ان کا انکار اور جحود حد سے گزرتا ہی رہا۔

گزشتہ سطور میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم، بت پرستی کے ساتھ ساتھ کواکب پرستی بھی کرتی تھی، اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ انسانوں کی موت وحیات، ان کا رزق ان کا نفع وضرر، خشک سالی اور قحط سالی، فتح وظفر اور شکست وہزیمت، غرض نظام کارخانہ عالم کا نظم ونسق کواکب اور ان کی حرکات کی تاثیر پر چل رہا ہے، اور یہ تاثیر ان کے ذاتی اوصاف میں سے ہے اس لیے

ان کی خوشنودی ضروری ہے اور یہ ان کی پرستش کے بغیر ممکن نہیں۔

اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس طرح ان کو ان کے سفلی معبودان باطل کی حقیقت واشگاف کر کے راہ حق کی طرف دعوت دی اسی طرح ضروری سمجھا کہ ان کے علوی معبودان باطل کی بے ثباتی اور فنا کے منظر کو پیش کر کے اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیں کہ تمہارا یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ ان چمکتے ہوئے ستاروں، چاند اور سورج کو خدائی طاقت حاصل ہے، ہرگز نہیں، یہ خیال خام اور باطل عقیدہ ہے، مگر یہ باطل پرست جبکہ اپنے خود ساختہ اصنام سے اس قدر خائف تھے کہ ان کو برا کہنے والے کے لیے ہر آن یہ تصور کرتے تھے کہ وہ ان کے غضب میں آ کر برباد و تباہ ہو جائے گا تو ایسے اوہام پرستوں کے دلوں میں بلند ستاروں کی پرستش کے خلاف جذبہ پیدا کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس لیے (مجدد انبیاء ابراہیم علیہ السلام) نے ان کے دماغوں کے مناسب ایک عجیب اور دلچسپ پیرایۂ بیان اختیار فرمایا۔

تاروں بھری رات تھی، ایک ستارہ خوب روشن تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو دیکھ کر فرمایا "میرا رب یہ ہے؟" اس لیے کہ اگر ستارے ربوبیت کر سکتے ہیں تو یہ ان سب میں ممتاز اور روشن ہے لیکن جب وہ اپنے وقت مقررہ پر نظر سے اوجھل ہو گیا، اور اس کو یہ مجال نہ ہوئی کہ اپنے پرستاروں کے لیے ایک گھڑی اور رونمائی کرا سکتا اور نظام کائنات سے منحرف ہو کر اپنے پوجنے والوں کے لیے زیارت گاہ بنا رہتا۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: "میں چھپ جانے والے کو پسند نہیں کرتا" یعنی جس شئے پر مجھ سے بھی زیادہ تغیرات کا اثر پڑتا ہو، اور جو جلد جلد ان اثرات کو قبول کر لیتا ہو وہ میرا معبود کیونکر ہو سکتا ہے، پھر نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ چاند آب و تاب کے ساتھ سامنے موجود ہے، اس کو دیکھ کر فرمایا: "یہ میرا رب ہے؟" اس لیے کہ یہ خوب روشن ہے اور اپنی خنک روشنی سے سارے عالم کو بقعۂ نور بنائے ہوئے ہے پس اگر کواکب کو رب بنانا ہی ہے تو اسی کو کیوں نہ بنایا جائے کیونکہ یہی اس کا زیادہ مستحق نظر آتا ہے۔

اب سحر کا وقت ہونے لگا تو قمر کے بھی ماند پڑ جانے اور روپوش ہو جانے کا وقت آ پہنچا اور جس قدر طلوع آفتاب کا وقت قریب ہوتا گیا چاند کا جسم دیکھنے والوں کی آنکھوں سے اوجھل ہونے لگا، تو یہ دیکھ کر ابراہیم علیہ السلام نے ایک ایسا جملہ فرمایا۔ جس سے چاند کے رب ہونے کی نفی کے ساتھ ساتھ خدائے واحد کی ہستی کی جانب قوم کی توجہ اس خاموشی کے ساتھ پھیر دی جائے کہ قوم اس کا احساس بھی نہ کر سکے اور اس گفتگو کا جو مقصد وحید ہے "یعنی صرف خدائے واحد پر ایمان" وہ ان کے دلوں میں بغیر قصد و ارادے کے پیوست ہو جائے فرمایا: "اگر میرا حقیقی پروردگار میری رہنمائی نہ کرتا تو میں بھی ضرور گمراہ قوم ہی میں سے ایک ہوتا"۔

پس اس قدر فرمایا اور خاموش ہو گئے اس لیے کہ ابھی اس سلسلہ کی ایک کڑی اور باقی ہے اور قوم کے پاس ابھی مقابلہ کے لیے ایک ہتھیار موجود ہے اس لیے اس سے زیادہ کہنا مناسب نہیں تھا۔

تاروں بھری رات ختم ہوئی چمکتے ہوئے ستارے اور چاند سب نظر سے اوجھل ہو گئے، کیوں؟ اس لیے کہ اب آفتاب عالمتاب کا رخ روشن سامنے آ رہا ہے، دن نکل آیا اور وہ پوری آب و تاب سے چمکنے دمکنے لگا۔

ابراہیم علیہ السلام نے اس کو دیکھ کر فرمایا: "یہ ہے میرا رب کیونکہ یہ کواکب میں سب سے بڑا ہے اور نظام فلکی میں اس سے بڑا ستارہ ہمارے سامنے دوسرا نہیں ہے؟" لیکن دن بھر چمکنے اور روشن رہنے اور تمام عالم کو روشن کرنے کے بعد وقت مقررہ پر اس نے بھی عراق کی سرزمین سے پہلو بچانا شروع کر دیا اور شب دیجور آہستہ آہستہ سامنے آنے لگی اور آخر کار وہ نظروں سے غائب ہو گیا، تو اب

Marfat.com

وقت آ پہنچا کہ ابراہیم علیہ السلام اصل حقیقت کا اعلان کر دیں اور قوم کو لاجواب بنا دیں کہ ان کے عقیدہ کے مطابق اگر ان کواکب کو ربوبیت اور معبودیت حاصل ہے تو اس کی کیا وجہ کہ ہم سے بھی زیادہ ان میں تغیرات نمایاں ہیں اور یہ جلد جلد ان کے اثرات سے متاثر ہوتے ہیں اور اگر معبود ہیں تو ان میں "افول" کیوں ہے جس طرح چمکتے نظر آتے تھے اسی طرح کیوں چمکتے نہ رہے، چھوٹے ستاروں کی روشنی کو ماہتاب نے کیوں ماند کر دیا اور ماہتاب کے رخ روشن کو آفتاب کے نور نے کس لیے بے نور بنا دیا۔

پس اے قوم! میں ان مشرکانہ عقائد سے "بری ہوں اور شرک کی زندگی سے بیزار، بلاشبہ میں نے اپنا رخ صرف اسی ایک خدا کی جانب کر لیا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے میں "حنیف" ہوں اور "مشرک" نہیں ہوں۔

اب قوم سمجھی کہ یہ کیا ہوا، ابراہیم علیہ السلام نے ہمارے تمام ہتھیار بیکار اور ہمارے تمام دلائل پامال کر دیئے، اب ہم ابراہیم علیہ السلام کے اس مضبوط و محکم برہان کا کس طرح رَد کریں اور اس کی روشن دلیل کا کیا جواب دیں؟ وہ اس کے لیے بالکل عاجز و درماندہ تھے اور جب کوئی بس نہ چلا تو قائل ہونے اور صدائے حق کو قبول کر لینے کے بجائے ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑنے اور اپنے معبودانِ باطلہ سے ڈرانے لگے کہ وہ تیری توہین کا تجھ سے ضرور انتقام لیں گے اور تجھ کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کیا تم مجھ سے جھگڑتے اور اپنے بتوں سے مجھ کو ڈراتے ہو حالانکہ خدائے تعالیٰ نے مجھ کو صحیح راہ دکھا دی ہے اور تمہارے پاس گمراہی کے سواء کچھ نہیں، مجھے تمہارے بتوں کی مطلق کوئی پرواہ نہیں، جو کچھ میرا رب چاہے گا وہی ہوگا۔ تمہارے بت کچھ بھی نہیں کر سکتے، کیا تم کو ان باتوں سے کوئی نصیحت حاصل نہیں ہوتی؟ تم کو تو خدا کی نافرمانی کرنے اور اس کے ساتھ بتوں کو شریک ٹھہرانے میں بھی کوئی خوف نہیں آتا جس کے لیے تمہارے پاس ایک دلیل بھی نہیں ہے اور مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ خدائے واحد کا ماننے والا اور امن عالم کا ذمہ دار ہو کر میں تمہارے بتوں سے ڈر جاؤں گا، کاش کہ تم سمجھتے کہ کون مفسد ہے اور کون مصلح و امن پسند؟

صحیح امن کی زندگی اسی شخص کو حاصل ہے جو خدائے واحد پر ایمان رکھتا اور شرک سے بیزار رہتا ہے، اور وہی راہ یاب ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کی یہ وہ عظیم الشان حجت تھی جو اس نے ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے بت پرستی کے خلاف ہدایت و تبلیغ کے بعد کواکب پرستی کے رَد میں ظاہر فرمائی اور ان کی قوم کے مقابلہ میں ان کو روشن دلائل و براہین کے ساتھ سربلندی عطاء فرمائی۔

اس سلسلہ میں سورۂ انعام کی یہ آیات شاہد عدل ہیں:

﴿وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ وَ حَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ۭ قَالَ

Marfat.com

أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ ۚ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَن يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا ۗ وَسِعَ رَبِّي كُلَّ
شَيْءٍ عِلْمًا ۗ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ﴿٨٠﴾ وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُم بِاللَّهِ مَا
لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا ۚ فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٨١﴾ الَّذِينَ آمَنُوا
وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ ﴿٨٢﴾ وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ
عَلَىٰ قَوْمِهِ ۚ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن نَّشَاءُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿٨٣﴾ (الانعام: ۷۵-۸۳)

"اور اسی طرح ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت کے جلوے دکھائے، تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائے پھر (دیکھو) جب ایسا ہوا کہ اس پر رات کی تاریکی چھا گئی تو اس نے (آسمان پر) ایک ستارہ (چمکتا ہوا) دیکھا۔ اس نے کہا "یہ میرا پروردگار ہے" (کہ سب لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں) لیکن جب وہ ڈوب گیا تو کہا "نہیں میں انہیں پسند نہیں کرتا جو ڈوب جانے والے ہیں (یعنی طلوع و غروب ہوتے رہتے ہیں) پھر جب ایسا ہوا کہ چاند چمکتا ہوا نکل آیا، تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا "یہ میرا پروردگار ہے" لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا "اگر میرے پروردگار نے مجھے راہ نہ دکھائی ہوتی تو میں ضرور اسی گروہ میں سے ہو جاتا جو راہ راست سے بھٹک گیا ہے"! پھر جب صبح ہوئی اور سورج چمکتا ہوا طلوع ہوا تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا، یہ میرا پروردگار ہے کہ یہ سب سے بڑا ہے" لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا، تو اس نے کہا اے میری قوم! تم جو کچھ خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو، میں اس سے بیزار ہوں، میں نے تو ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف اسی ہستی کی طرف اپنا رخ کر لیا ہے جو (کسی کی بنائی ہوئی نہیں، بلکہ) آسمان و زمین کی بنانے والی ہے (اور جس کے حکم و قانون پر تمام آسمانی اور ارضی مخلوقات چل رہی ہیں) اور میں ان میں سے نہیں جو اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے ہیں!" اور (پھر) ابراہیم سے اس کی قوم نے رد و کد کی، ابراہیم نے کہا: "کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں رد و کد کرتے ہو، حالانکہ اس نے مجھے راہ حق دکھا دی ہے جنہیں تم نے خدا کا شریک ٹھہرا لیا ہے، میں ان سے نہیں ڈرتا۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، مگر یہ کہ میرا پروردگار ہی مجھے نقصان پہنچانا چاہے، میرا پروردگار اپنے علم سے تمام چیزوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ پھر کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے" اور (دیکھو) میں ان ہستیوں سے کیونکر ڈر سکتا ہوں جنہیں تم نے خدا کا شریک ٹھہرا لیا ہے جبکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراؤ جن کے لیے اس نے کوئی سند و دلیل تم پر نہیں اتاری؟ بتلاؤ ہم دونوں فریقوں میں سے کس کی راہ امن کی راہ ہوئی، اگر علم و بصیرت رکھتے ہو جن لوگوں نے خدا کو مانا اور اپنے ماننے کو ظلم سے (یعنی شرک سے) آلودہ نہیں کیا تو انہی کے لیے امن ہے اور وہی ٹھیک راستہ پر ہیں اور (دیکھو) یہ ہماری حجت ہے ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر دی تھی، ہم جس کے مرتبے بلند کرنا چاہتے ہیں اسے علم و دلیل کا عرفان دے کر بلند کر دیتے ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار حکمت والا علم رکھنے والا ہے۔"

آیات کی تفسیر میں قول فیصل:

اس بارہ میں کلی اتفاق کے باوجود کہ ابراہیم علیہ السلام نے کبھی کواکب پرستی نہیں کی اور ان کی تمام زندگی شرک کی تلویثات سے

Marfat.com

پاک ہے سورۂ انعام کی مسطورہ بالا آیات کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، ان آیات کی تمہید میں جو کچھ لکھا گیا وہ ان اقوال میں سے ایک قول کے مطابق ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ گفتگو قوم کی کواکب پرستی کے رَد میں اس کو لاجواب کرنے کے لیے تھی، اس لیے کہ جب دو فریق کسی مسئلہ میں اختلاف کر بیٹھتے ہیں تو احقاقِ حق کے لیے مناظرانہ دلائل میں سے دلیل کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں صرف نظریوں، تھیوریوں (Thorees) سے کام نہ لیا جائے بلکہ مشاہدہ اور معائنہ کی ایسی راہ اختیار کی جائے کہ مخالف اس کے دعوے کے مقابلہ میں لاجواب ہو جائے اور اس کی دلیل کے رَد کرنے کی تمام راہیں اس کے سامنے بند ہو جائیں، اب اگر اس میں سلامت روی باقی ہے اور اس کے قلب میں قبولِ حق کی گنجائش ہے تو وہ اس کو قبول کر لیتا ہے ورنہ بے دلیل لڑنے اور جھگڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے تب اس طرح حق و باطل میں امتیاز ہو جاتا ہے اور اصلی اور حقیقی بات نکھر کر صاف ہو جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر ہیں اس لیے ان کی تبلیغ کا مشن منطقی صغریٰ کبریٰ پر قائم نہ تھا بلکہ حقیقت کو فطری دلائل کی سادگی کے ساتھ واضح کرنا ہی ان کا طغرائے امتیاز تھا، اس لیے انہوں نے یہی راستہ اختیار کیا اور قوم پر واضح کر دیا کہ ستارے خواہ شمس و قمر ہی کیوں نہ ہوں رب کہلانے کے قابل نہیں ہیں بلکہ ربوبیت صرف اسی کو زیبا ہے جو رب العالمین ہے اور ارضی و سماوی، سفلی و علوی کل کائنات کا خالق و مالک ہے اور چونکہ قوم کے پاس اس بہترین دلیل کا کوئی جواب نہ تھا اس لیے وہ زچ ہوئی اور امرِ حق کو قبول کرنے کی بجائے لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہوگئی، مگر اس کے ضمیر کو ماننا پڑا کہ یہ جو کچھ کہا گیا حق ہے اور ہمارے پاس اس کا کوئی صحیح جواب نہیں ہے یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد تھا اور ان کے ادائے فرض کی حد یہیں تک تھی، کیونکہ دل چیر کر حق کو اس میں اتار دینا ان کی طاقت سے باہر تھا۔

اس تفسیر کے مطابق قرآن عزیز کی ان آیات میں نہ تاویل کی ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ مقدرات ماننے کی، نیز مشاہدہ کواکب سے متعلق آیات کا سیاق و سباق بھی بے تکلف اسی کی تائید کرتا ہے، مثلاً اس سلسلہ کی پہلی دو آیات ہیں:

﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَ كَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝﴾ (الانعام: ۷۴-۷۵)

"جب کہا ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ آزر سے، کیا تو بناتا ہے بتوں کو خدا، میں تجھ کو اور تیری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتا ہوں، اور اسی طرح ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت کا مشاہدہ کرا دیا اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔"

ان ہر دو آیات سے حسب ذیل نتائج ظاہر ہوتے ہیں:

① رؤیتِ کواکب کا یہ معاملہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ایسے زمانہ میں پیش آیا ہے جبکہ وہ اپنے والد اور قوم کے ساتھ تبلیغ حق کے مناظرہ میں مصروف تھے، اس لیے کہ پہلی آیت کے بعد دوسری آیت ﴿وَ كَذٰلِكَ﴾ کہہ کر شروع کرنا یہی معنی رکھتا ہے، پھر تیسری آیت کے شروع میں ﴿فَلَمَّا﴾ کی ﴿فَ﴾ یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ دوسری آیت سے وابستہ ہے، اور اس طرح ان تینوں

Marfat.com

آیات کا سلسلہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جس طرح اصنام پرستی کے مقابلہ میں روشن دلائل عطاء فرمائے تھے تاکہ وہ آزر اور قوم کو لاجواب کر سکیں اور راہ ہدایت دکھائیں۔ اسی طرح کواکب پرستی کے مقابلہ میں بھی اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت کا مشاہدہ کرا دیا تاکہ وہ ان سب مخلوق کی حقیقت سے آگاہ ہو جائیں اور ان کو حق الیقین کا درجہ حاصل ہو جائے، اور پھر وہ کواکب پرستی کے رَد میں بھی بہترین دلائل دے سکیں اور اس سلسلہ میں بھی قوم کو حق کی راہ دکھلا کر ان کی غلط روش کے متعلق لاجواب بنا سکیں۔ یہ تو آیات رؤیت کا سباق تھا اور اب سیاق قابل توجہ ہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آخر میں آفتاب پر نظر فرمائی اور پھر وہ بھی نظروں سے غائب ہونے لگا تو اسی آیت میں یہ جملہ موجود نظر آتا ہے:

﴿قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝﴾ (الانعام: ۷۸)۔

"ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا: "اے قوم میں شرک کرنے والوں سے بری ہوں"۔

اور ساتھ ہی یہ آیت مذکور ہے:

﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝﴾ (الانعام: ۷۹)

"بلاشبہ میں نے اپنا رخ صرف اس خدا کی جانب پھیر دیا ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، اس حالت میں کہ میں حنیف ہوں اور مشرک نہیں ہوں۔"

اور پھر اسی کے متصل آیت میں ہے:

﴿وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ﴾ (الانعام: ۸۰)

"اور ابراہیم (علیہ السلام) کی قوم نے اس سے جھگڑنا شروع کیا ابراہیم علیہ السلام نے کہا، کیا تو مجھ سے اللہ کے بارہ میں جھگڑتی ہے۔"

اور سب سے آخر آیت میں کہا گیا ہے:

﴿وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَیْنٰهَآ اِبْرٰهِیْمَ عَلٰی قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ۝﴾ (الانعام: ۸۳)

"اور یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطاء کی، ہم جس کا درجہ بلند کرنا چاہتے ہیں کر دیا کرتے ہیں، بیشک تیرا رب دانا ہے جاننے والا۔"

ان آیات سے یہ نتائج اخذ ہوتے ہیں:

(۱) رؤیت کواکب کا یہ معاملہ قوم سے ضرور وابستہ تھا تب ہی تیسری مرتبہ میں ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذات سے خطاب کرنے کے بجائے فوراً قوم سے خطاب شروع کر دیا۔

(۲) اور قوم نے بھی یہ سب کچھ سن کر دلیل کا جواب دلیل سے دینے کی جگہ ابراہیم علیہ السلام سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔

Marfat.com

(۴) اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اس گفتگو کو قوم کے مقابلہ میں اپنی جانب سے حجت قرار دیا اور بتایا کہ ابراہیم علیہ السلام کا رتبہ رسالت بہت بلند اور ارفع ہے، اور اس لیے قوم ان کی رہنمائی کی سخت محتاج ہے، اور ان امور کے سوا یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۵۱)

"اور بلاشبہ ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو پہلے ہی سے ہدایت عطا کر دی تھی اور ہم ہی اس کے واقف کار ہیں۔"

لٰہذا یہ معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نہ لڑکپن کا ہو سکتا ہے اور نہ ان کے اپنے عقیدہ اور ایمان کا اس تفصیل سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری بیان کردہ تفسیر ہی آیات کی صحیح تفسیر ہے اور بلاشبہ ابراہیم علیہ السلام کی جانب سے قوم پر یہ زبردست حجت تھی کہ افراد قوم کا کواکب کی پرستش کرنا، ان کے لیے ہیکل بنانا، اپنے سفلی معبودوں کے نام ان کے نام پر رکھنا، غرض ان کو معبود، رب اور خدا سمجھنا قطعاً باطل اور گمراہی ہے، اس لیے کہ یہ سب ایک خاص نظام میں جکڑے ہوئے اور دن اور رات کے تغیر کے ساتھ تغیرات کو قبول کرنے والے ہیں، اور اس پورے نظام کی مالک و خالق صرف وہی ہستی ہے جس کے ید قدرت میں ان سب کی تسخیر ہے، اور وہ "اللہ" ہے۔

﴿لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ﴾ (یٰس: ۴۰)

"نہ سورج کی یہ مجال ہے کہ وہ قمر کو پا سکے اور نہ رات میں یہ قدرت کہ وہ دن کو پیچھے ہٹا کر اس کی جگہ خود لے لے۔"

غرض ان تمام روشن دلائل و براہین کے بعد بھی جب قوم نے دعوت اسلام کو قبول نہ کیا اور اصنام پرستی و کواکب پرستی میں اسی طرح مبتلا رہی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک دن جمہور کے سامنے اعلانِ جنگ کر دیا کہ میں تمہارے ان بتوں کے متعلق ایک ایسی چال چلوں گا جو تم کو زچ کر کے ہی چھوڑے گی۔

﴿وَ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۵۷)

"اور اللہ کی قسم میں تمہاری عدم موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کے ساتھ خفیہ چال چلوں گا۔"

اس معاملہ سے متعلق اصل صورت حال یہ ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے آزر اور قوم کے جمہور کو ہر طرح بت پرستی کے معائب ظاہر کر کے اس سے باز رکھنے کی سعی کر لی، اور ہر قسم کے پند و نصائح کے ذریعہ ان کو یہ باور کرانے میں قوت صرف کر دی کہ یہ بت نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان اور یہ کہ تمہارے کاہنوں اور پیشواؤں نے ان کے متعلق تمہارے دلوں میں غلط خوف بٹھا دیا ہے کہ اگر ان سے منکر ہو جاؤ گے تو یہ غضبناک ہو کر تم کو تباہ کر ڈالیں گے، یہ تو اپنی آئی ہوئی مصیبت کو بھی نہیں ٹال سکتے مگر آزر اور قوم کے دلوں پر مطلق اثر نہ ہوا اور وہ اپنے دیوتاؤں کی خدائی قوت کے عقیدہ سے کسی طرح باز نہ آئے بلکہ کاہنوں اور سرداروں نے ان کو زیادہ پختہ کر دیا اور ابراہیم علیہ السلام کی نصیحت پر کان دھرنے سے سختی کے ساتھ روک دیا تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ اب رشد و ہدایت کا ایسا پہلو اختیار کرنا چاہیے جس سے جمہور کو یہ مشاہدہ ہو جائے کہ واقعی ہمارے دیوتا صرف لکڑیوں اور پتھروں کی

Marfat.com

مورتیاں ہیں جو گونگی بھی ہیں، بہری بھی ہیں اور اندھی بھی، اور دلوں میں یہ یقین راسخ ہو جائے کہ اب تک ان کے متعلق ہمارے کاہنوں اور سرداروں نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل غلط اور بے سروپا بات تھی اور ابراہیم ہی کی بات سچی ہے، اگر ایسی کوئی صورت بن آئی تو پھر میرے لیے تبلیغ حق کے لیے آسان راہ نکل آئے گی، یہ سوچ کر انہوں نے ایک نظام عمل تیار کیا۔ جس کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا، اور اس کی ابتداء اس طرح کی کہ باتوں باتوں میں اپنی قوم کے افراد سے یہ کہہ گزرے کہ "میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک خفیہ چال چلوں گا" گویا اس طرح ان کو متنبہ کرنا تھا کہ اگر تمہارے دیوتاؤں میں کچھ قدرت ہے جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو تو وہ میری چال کو باطل اور مجھ کو مجبور کر دیں کہ میں ایسا نہ کر سکوں مگر چونکہ بات صاف نہ تھی اس لیے قوم نے اس جانب کچھ توجہ نہ کی، حسن اتفاق کہ قریب ہی زمانہ میں قوم کا ایک مذہبی میلہ پیش آ گیا، جب سب اس کے لیے چلنے لگے تو کچھ لوگوں نے ابراہیم علیہ السلام سے بھی اصرار کیا کہ وہ بھی ساتھ چلیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اول انکار فرمایا اور جب اس جانب سے اصرار بڑھنے لگا تو ستاروں کی جانب نگاہ اٹھائی اور فرمانے لگے ﴿اِنِّیْ سَقِیْمٌ﴾ "میں آج کچھ علیل سا ہوں" چونکہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم کو کواکب پرستی کی وجہ سے نجوم میں کمال بھی اور اعتقاد بھی تھا اس لیے اپنے عقیدہ کے لحاظ سے وہ یہ سمجھے کہ ابراہیم علیہ السلام کسی نحس ستارہ کے اثر بد میں مبتلاء ہیں اور یہ سوچ کر بغیر کسی تشریح حال کے ابراہیم علیہ السلام کو چھوڑ کر میلہ میں چلے گئے:

﴿فَنَظَرَ نَظْرَةً فِی النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِیْنَ ﴿۹۰﴾﴾ (الصافات: ۸۸-۹۰)

"پس (ابراہیم علیہ السلام) نے ایک نگاہ اٹھا کر ستاروں کی جانب دیکھا اور کہنے لگا میں کچھ علیل ہوں، پس وہ اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔"

اب جبکہ ساری قوم، بادشاہ، کاہن اور مذہبی پیشواء میلہ میں مصروف اور شراب و کباب میں مشغول تھے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ وقت آ گیا ہے کہ اپنے نظام عمل کی تکمیل کروں اور مشاہدہ کی صورت میں جمہور پر واضح کر دوں کہ ان کے دیوتاؤں کی حقیقت کیا ہے؟ وہ اٹھے اور سب سے بڑے دیوتا کے ہیکل (مندر) میں پہنچے، دیکھا تو وہاں دیوتاؤں کے سامنے قسم قسم کے حلووں، پھلوں، میووں اور مٹھائیوں کے چڑھاوے رکھے تھے، ابراہیم علیہ السلام نے طنزیہ لہجہ میں چپکے چپکے ان مورتیوں سے خطاب کر کے کہا کہ یہ سب کچھ موجود ہے ان کو کھاتے کیوں نہیں؟ اور پھر کہنے لگے، میں بات کر رہا ہوں کیا بات ہے کہ تم جواب نہیں دیتے؟ اور پھر ان سب کو توڑ پھوڑ ڈالا اور سب سے بڑے بت کے کاندھے پر تبر رکھ کر واپس چلے گئے۔

﴿فَرَاغَ اِلٰۤی اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾﴾ (الصافات: ۹۱-۹۲)

"پس چپکے سے جا گھسا ان کے بتوں میں کہنے لگا (ابراہیم علیہ السلام) ان کے دیوتاؤں سے کیوں نہیں کھاتے، تم کو کیا ہو گیا کیوں نہیں بولتے؟ پھر اپنے داہنے ہاتھ سے ان سب کو توڑ ڈالا۔"

﴿فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِیْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَیْهِ یَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾﴾ (الانبیاء: ۵۸)

"پس کر دیا ان کو ٹکڑے ٹکڑے مگر ان میں سے بڑے دیوتا کو چھوڑ دیا تاکہ (اپنے عقیدہ کے مطابق) وہ اس کی طرف

Marfat.com

رجوع کریں (کہ یہ کیا ہو گیا)۔"

جب لوگ میلے سے واپس آئے تو ہیکل (مندر) میں بتوں کا یہ حال پایا، سخت برہم ہوئے اور ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے کہ یہ کیا ہوا اور کس نے کیا؟ ان میں وہ بھی تھے جن کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام ﴿وَ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ﴾ (تفسیر ابن کثیر جلد ۳ سورہ انبیاء) کہہ چکے تھے انہوں نے فوراً کہا کہ یہ اس شخص کا کام ہے جس کا نام ابراہیم (علیہ السلام) ہے، وہی ہمارے دیوتاؤں کا دشمن ہے۔

﴿ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَاۤ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِيْمُ ۝﴾ (الانبیاء: ۵۹۔۶۰)

"وہ کہنے لگے یہ معاملہ ہمارے خداؤں کے ساتھ کس نے کیا ہے بلاشبہ وہ ضرور ظالم ہے (ان میں سے بعض) کہنے لگے ہم نے ایک جوان کی زبان سے ان بتوں کا (برائی کے ساتھ) ذکر سنا ہے اس کو ابراہیم کہا جاتا ہے (یعنی یہ اس کا کام ہے)۔"

کاہنوں اور سرداروں نے جب یہ سنا تو غم وغصہ سے سرخ ہو گئے اور کہنے لگے اس کو مجمع کے سامنے پکڑ کر لاؤ تا کہ سب دیکھیں کہ مجرم کون شخص ہے۔

ابراہیم علیہ السلام سامنے لائے گئے تو بڑے رعب داب سے انہوں نے پوچھا، کیوں ابراہیم (علیہ السلام) تو نے ہمارے دیوتاؤں کے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہے؟

﴿قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰۤى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ۝ قَالُوْۤا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۝﴾ (الانبیاء: ۶۱۔۶۲)

"انہوں نے کہا ابراہیم علیہ السلام کو لوگوں کے سامنے لاؤ تا کہ وہ دیکھیں، وہ کہنے لگے، کیا ابراہیم تو نے ہمارے دیوتاؤں کے ساتھ یہ کیا ہے؟"

ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ اب وہ بہترین موقعہ آ گیا ہے جس کے لیے میں نے یہ تدبیر اختیار کی، مجمع موجود ہے جمہور دیکھ رہے ہیں کہ ان کے دیوتاؤں کا کیا حشر ہو گیا، اس لیے اب کاہنوں اور مذہبی پیشواؤں کو جمہور کی موجودگی میں ان کے باطل عقیدہ پر نادم کر دینے کا وقت ہے تا کہ عوام کو آنکھوں دیکھتے معلوم ہو جائے کہ آج تک ان دیوتاؤں کے متعلق جو کچھ ہم سے کاہنوں اور پجاریوں نے کہا تھا یہ سب ان کا مکروفریب تھا، مجھے ان سے کہنا چاہیے کہ یہ سب اس بڑے بت کی کاروائی ہے، اس سے دریافت کرو؟ لامحالہ وہ یہی جواب دیں گے کہ کہیں بت بھی بولتے اور بات کرتے ہیں، تب میرا مطلب حاصل ہے اور پھر میں ان کے عقیدے کا پول جمہور کے سامنے کھول کر صحیح عقیدہ کی تلقین کر سکوں گا اور بتاؤں گا کہ کس طرح وہ باطل اور گمراہی میں مبتلاء ہیں، اس وقت ان کاہنوں اور پجاریوں کے پاس ندامت کے سوائے کیا ہو گا، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۶۳)

Marfat.com

"ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا بلکہ ان میں سے اس بڑے بت نے یہ کیا ہے، پس اگر یہ (تمہارے دیوتا) بولتے ہوں تو ان سے دریافت کرلو۔"

ابراہیم (علیہ السلام) کی اس یقینی حجت اور دلیل کا کاہنوں اور پجاریوں کے پاس کیا جواب ہوسکتا تھا، وہ ندامت میں غرق تھے۔ دلوں میں ذلیل ورسوا تھے، اور سوچتے تھے کہ کیا جواب دیں، جمہور بھی آج سب کچھ سمجھ گئے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھ لیا جس کے لیے وہ تیار نہ تھے اور بالآخر چھوٹے اور بڑے سب ہی کو دل میں اقرار کرنا پڑا کہ ابراہیم علیہ السلام ظالم نہیں ہے بلکہ ظالم ہم خود ہیں کہ ایسے بے دلیل اور باطل عقیدہ پر یقین رکھتے ہیں، تب نہایت شرمساری کے ساتھ سرنگوں ہوکر کہنے لگے ابراہیم علیہ السلام تو خوب جانتا ہے کہ ان دیوتاؤں میں بولنے کی سکت نہیں ہے، یہ تو بے جان مورتیاں ہیں۔

﴿فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ٦٤-٦٥)

"پس انہوں نے اپنے جی میں سوچا پھر کہنے لگے بیشک تم ہی ظالم ہو بعدازاں اپنے سروں کو نیچے جھکا کر کہنے لگے (اے ابراہیم علیہ السلام) تو خوب جانتا ہے کہ یہ بولنے والے نہیں ہیں۔"

اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حجت ودلیل کامیاب ہوئی اور دشمنوں نے اعتراف کرلیا کہ ظالم ہم ہی ہیں اور ان کو جمہور کے سامنے زبان سے اقرار کرنا پڑا کہ ہمارے یہ دیوتا جواب دینے اور بولنے کی طاقت نہیں رکھتے، چہ جائیکہ نفع ونقصان کے مالک ہوں۔

تو اب ابراہیم علیہ السلام نے مختصر مگر جامع الفاظ میں ان کو نصیحت کی اور ملامت بھی، اور بتایا کہ جب یہ دیوتا نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان تو پھر یہ خدا اور معبود کیسے ہوسکتے ہیں، افسوس تم اتنا بھی نہیں سمجھتے یا عقل سے کام نہیں لیتے؟ فرمانے لگے:

﴿اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ۝ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ٦٦-٦٧)

"کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی پوجا کرتے ہو جو تم کو نہ کچھ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان دے سکتے ہیں، تم پر افسوس ہے اور تمہارے ان معبودان باطل پر بھی جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔"

﴿فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ۝ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

(الصافات: ٩٤-٩٦)

"پس وہ سب ہلہ کرکے ابراہیم (علیہ السلام) کے گرد جمع ہوگئے، ابراہیم نے کہا کیا جن بتوں کو ہاتھ سے گھڑتے ہو انہی کو پھر پوجتے ہو، اور اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے تم کو پیدا کیا ہے اور ان کو بھی جن کاموں کو تم کرتے ہو۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس نصیحت وموعظت کا اثر یہ ہونا چاہیے تھا کہ تمام قوم اپنے باطل عقیدہ سے تائب ہوکر ملت حنفی

Marfat.com

کو اختیار کر لیتی اور کج روی چھوڑ کر راہ مستقیم پر گامزن ہو جاتی لیکن دلوں کی کجی، نفوس کی سرکشی، متمردانہ ذہنیت اور باطنی خباثت و نائت نے اس جانب نہ آنے دیا، اور اس کے برعکس ان سب نے ابراہیم (علیہ السلام) کی عداوت و دشمنی کا نعرہ بلند کر دیا اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ اگر دیوتاؤں کی خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو اس گستاخی اور مجرمانہ حرکت پر سخت سزا دو اور دہکتی ہوئی آگ میں جلا ڈالو تاکہ اس کی تبلیغ و دعوت کا قصہ ہی پاک ہو جائے۔

بادشاہ کو دعوت اسلام اور اس سے مناظرہ:

ابھی یہ مشورے ہو ہی رہے تھے کہ شدہ شدہ بادشاہ وقت تک یہ باتیں پہنچ گئیں، اس زمانہ میں عراق کے بادشاہ کا لقب نمرود ہوتا تھا اور یہ رعایا کے صرف بادشاہ ہی نہیں تھے بلکہ خود کو ان کا رب اور مالک مانتے تھے اور رعایا بھی دوسرے دیوتاؤں کی طرح اس کو اپنا خدا اور معبود مانتی اور اس کی بھی اسی طرح پرستش کرتی تھی، جس طرح دیوتاؤں کی، بلکہ ان سے بھی زیادہ پاس وادب کے ساتھ پیش آتی تھی، اس لیے کہ وہ صاحب عقل و شعور بھی ہوتا تھا اور مالک تخت و تاج بھی۔

نمرود کو جب یہ معلوم ہوا تو آپے سے باہر ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اس شخص کی پیغمبرانہ تبلیغ و دعوت کی سرگرمیاں اگر اسی طرح جاری رہیں تو یہ میری ربوبیت، ملوکیت اور الوہیت سے بھی سب رعایا کو برگشتہ کر دے گا اور اس طرح باپ دادا کے مذہب کے ساتھ ساتھ میری یہ سلطنت بھی زوال میں آ جائے گی، اس لیے اس قصہ کا ابتداء ہی میں خاتمہ کر دینا بہتر ہے، یہ سوچ کر اس نے حکم دیا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کو ہمارے دربار میں حاضر کرو، ابراہیم (علیہ السلام) جب نمرود کے دربار میں پہنچے تو نمرود نے گفتگو شروع کی اور ابراہیم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ تو باپ دادا کے دین کی مخالفت کس لیے کرتا ہے اور مجھ کو رب ماننے سے تجھے کیوں انکار ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں خدائے واحد کا پرستار ہوں، اس کے علاوہ کسی کو اس کا شریک نہیں مانتا ساری کائنات اور تمام عالم اسی کی مخلوق ہے اور وہی ان سب کا خالق و مالک ہے، تو بھی اسی طرح ایک انسان ہے جس طرح ہم سب انسان میں پھر تو کس طرح رب یا خدا ہو سکتا ہے، اور کس طرح یہ گونگے بہرے لکڑی کے بت خدا ہو سکتے ہیں؟ میں صحیح راہ پر ہوں اور تم سب غلط راہ پر ہو، اس لیے میں تبلیغ حق کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں اور تمہارے باپ دادا کے خود ساختہ دین کو کیسے اختیار کر سکتا ہوں؟

نمرود نے ابراہیم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اگر میرے علاوہ تیرا کوئی رب ہے تو اس کا ایسا وصف بیان کر کہ جس کی قدرت مجھ میں نہ ہو، تب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میرا رب وہ ہے جس کے قبضہ میں موت و حیات ہے، وہی موت دیتا ہے اور وہی زندگی بخشتا ہے، کج فہم نمرود، موت و حیات کی حقیقت سے ناآشنا نمرود کہنے لگا۔ اس طرح موت و حیات تو میرے قبضہ میں بھی ہے اور یہ کہہ کر اسی وقت ایک بے قصور شخص کے متعلق جلاد کو حکم دیا کہ اس کی گردن مار دو اور موت کے گھاٹ اتار دو، جلاد نے فوراً حکم کی تعمیل کر دی اور ایک قتل کے سزا یافتہ مجرم کو جیل سے بلا کر حکم دیا کہ جاؤ ہم نے تمہاری جان بخشی کی اور پھر ابراہیم علیہ السلام کی جانب متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ دیکھا میں بھی کس طرح زندگی بخشتا اور موت دیتا ہوں، پھر تیرے خدا کی خصوصیت کیا رہی؟

ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ نمرود یا تو موت و حیات کی اصل حقیقت سے ناآشنا ہے اور یا جمہور اور رعایا کو مغالطہ دینا چاہتا ہے کہ وہ اس فرق کو نہ سمجھ سکیں کہ زندگی بخشنا اس کا نام نہیں ہے بلکہ نیست سے ہست کرنے کا نام زندگی بخشنا ہے اور اسی طرح کسی کو قتل پھانسی سے بچا لینا موت کا مالک ہونا نہیں ہے۔ موت کا مالک وہی ہے جو روح انسانی کو اس کے جسم سے نکال کر اپنے قبضہ میں کر لیتا

Marfat.com

ہے، اس لیے بہت سے دار رسیدہ اور شمشیر چشیدہ انسان زندگی پا جاتے ہیں اور بہت سے قتل و دار سے بچائے ہوئے انسان لقمہ اجل بن جاتے ہیں اور کوئی طاقت ان کو نہیں روک سکتی اور اگر ایسا ہو سکتا تو ابراہیم علیہ السلام سے گفتگو کرنے والا نمرود سریر آرائے سلطنت نہ ہوتا بلکہ اس کے خاندان کا پہلا شخص ہی آج بھی اس تاج و تخت کا مالک نظر آتا، مگر نہ معلوم کہ عراق کی اس سلطنت کے کتنے مدعی زیر زمین دفن ہو چکے اور ابھی کتنوں کی باری ہے۔

تاہم ابراہیم (علیہ السلام) نے سوچا کہ اگر میں نے اس موقع پر موت و حیات کے دقیق فلسفہ پر بحث شروع کر دی تو نمرود کا مقصد پورا ہو جائے گا اور وہ جمہور کو مغالطہ میں ڈال کر اصل معاملہ کو الجھا دے گا اور اس طرح میرا نیک مقصد پورا نہ ہو سکے گا اور تبلیغ حق کے سلسلہ میں سر محفل نمرود کو لا جواب کرنے کا موقع ہاتھ سے جاتا رہے گا، کیونکہ بحث و مباحثہ اور جدل و مناظرہ میرا اصل مقصد نہیں ہے بلکہ لوگوں کے دماغ و قلب میں خدائے واحد کا یقین پیدا کرنا میرا مقصد واحد ہے اس لیے انہوں نے اس دلیل کو نظر انداز کر کے سمجھانے کا ایک دوسرا پیرایہ اختیار کیا اور ایسی دلیل پیش کی جس کا صبح و شام ہر شخص آنکھوں سے مشاہدہ کرتا اور بغیر کسی منطقی دلیل کے روز و شب کی زندگی میں اس سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔

ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا میں اس ہستی کو "اللہ" کہتا ہوں جو روزانہ سورج کو مشرق سے لاتا اور مغرب کی جانب لے جاتا ہے، پس اگر تو بھی اسی طرح خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کے خلاف سورج کو مغرب سے نکال اور مشرق میں چھپا۔ یہ سن کر نمرود مبہوت اور لا جواب ہو کر رہ گیا اور اس طرح ابراہیم (علیہ السلام) کی زبان سے نمرود پر خدا کی حجت پوری ہوئی۔

نمرود اس دلیل سے مبہوت کیوں ہوا اور اس کے پاس اس کے مقابلہ میں مغالطہ کی گنجائش کیوں نہ رہی؟ یہ اس لیے کہ ابراہیم (علیہ السلام) کی دلیل کا حاصل یہ تھا کہ میں ایک ایسی ہستی کو اللہ مانتا ہوں جس کے متعلق میرا یہ عقیدہ ہے کہ یہ ساری کائنات اور اس کا سارا نظام اس ہی نے بنایا ہے اور اس نے اس پورے نظام کو اپنی حکمت کے قانون سے ایسا مسخر کر دیا ہے کہ اس کی کوئی شئے نہ وقت مقررہ سے پہلے اپنی جگہ سے ہٹ سکتی اور نہ اِدھر اُدھر ہو سکتی ہے، تم اس پورے نظام میں سے آفتاب ہی کو دیکھو کہ عالم ارضی اس سے کس قدر فائدے حاصل کرتا ہے۔ بایں ہمہ اللہ تعالیٰ نے اس کے طلوع و غروب کا بھی ایک نظام مقرر کر دیا ہے۔ بس اگر آفتاب لاکھ بار بھی چاہے کہ وہ اس نظام سے باہر ہو جائے تو وہ اس پر قادر نہیں ہے، کیونکہ اس کی باگ خدائے واحد کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اس کو بیشک یہ قدرت ہے کہ جو چاہے کر گزرے لیکن وہ کرتا وہی ہے جو اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔

لہٰذا اب نمرود کے لیے تین ہی صورتیں جواب دینے کی ہو سکتی تھیں یا وہ یہ کہے کہ مجھے آفتاب پر پوری قدرت حاصل ہے اور میں نے ہی یہ سارا نظام بنایا ہے، مگر اس نے یہ جواب اس لیے نہیں دیا کہ وہ خود اس کا قائل نہیں تھا کہ یہ ساری کائنات اس نے بنائی ہے اور آفتاب کی حرکت اس کے قبضہ قدرت میں ہے بلکہ وہ تو خود اپنی رعایا کا رب اور دیوتا کہلاتا تھا اور بس۔

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ کہتا "میں اس عالم کو کسی کی مخلوق نہیں مانتا اور آفتاب تو خود مستقل دیوتا ہے اس کے اختیارات میں خود بہت کچھ ہے" مگر اس نے یہ بھی اس لیے نہ کہا کہ اگر وہ ایسا کہتا تو ابراہیم علیہ السلام کا وہی اعتراض سامنے آ جاتا، جو انہوں نے جمہور کے سامنے آفتاب کی ربوبیت کے خلاف اٹھایا تھا کہ اگر یہ "رب" ہے تو عابدوں اور پجاریوں سے زیادہ اس معبود اور دیوتا میں تغیرات اور فنا کے اثرات کیوں موجود ہیں "رب" کو فنا اور تغیر سے کیا علاقہ، اور کیا اس کی قدرت میں یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو وقت مقررہ

Marfat.com

پہلے یا بعد طلوع یا غروب ہو جائے۔

تیسری صورت یہ تھی کہ ابراہیم علیہ السلام کی تحدی (چیلنج) کو قبول کر لیتا اور مغرب سے نکال کر دکھا دیتا، مگر نمرود چونکہ ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت میں بھی جواب پر قادر نہ تھا اس لیے مبہوت اور لاجواب ہو جانے کے علاوہ اس کے پاس دوسرا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا۔ [1]

قرآن عزیز نے (سورۂ البقرہ) میں اس واقعہ کو مختصر مگر لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۚ﴾ (البقرہ: ۲۵۸)

"کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کا واقعہ، جس کو اللہ نے بادشاہت بخشی تھی اس نے کس طرح ابراہیم سے اس کے پروردگار کے بارے میں مناظرہ کیا؟ جب کہا ابراہیم نے میرا پروردگار تو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے، بادشاہ نے کہا میں بھی زندگی بخشتا ہوں اور موت دیتا ہوں، ابراہیم نے کہا بلاشبہ اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے پس تو اس کو مغرب سے نکال کر دکھلا، پس وہ کافر (بادشاہ) مبہوت اور لاجواب ہو کر رہ گیا اور اللہ ظلم کرنے والوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔"

غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے والد آزر کو اسلام کی تلقین کی، پیغام حق سنایا اور راہ مستقیم دکھائی، اس کے بعد عوام اور جمہور کے سامنے اس دعوت کو عام کیا اور سب کو امر حق تسلیم کرانے کے لیے فطرت کے بہترین اصول دلائل کو پیش فرمایا، اور نرمی، شیریں کلامی مگر مضبوط و محکم اور روشن حجت و دلیل کے ساتھ ان پر حق کو واضح کیا اور سب سے آخر میں بادشاہ نمرود سے مناظرہ کیا اور اس پر روشن کر دیا کہ ربوبیت و الوہیت کا حق صرف خدائے واحد ہی کے لیے سزاوار ہے اور بڑے سے بڑے شہنشاہ

---

[1] عیسائی پادریوں اور ان کی اندھی تقلید میں آریہ سماجیوں نے ابراہیم علیہ السلام کے اس ذکر کردہ مناظرہ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر نمرود یہ کہہ بیٹھتا کہ ابراہیم تو ہی اپنے خدا سے آفتاب کو مغرب سے طلوع کرا دے تو ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس کیا جواب تھا؟ یہ اعتراض بہت ہی لچر اور سطحی ہے اس لئے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے مناظرہ کی جو تشریح بیان کی ہے اور جو حقیقت واقعہ ہے اس کے بعد یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ نمرود جانتا تھا کہ وہ ایسا اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ پہلے وہ خود اپنی عاجزی و درماندگی کا اقرار کرے اور ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرے کہ آفتاب ہمارا دیوتا بھی نہیں ہے اور نہ اس میں یہ قدرت کہ وہ ہماری اس استدعاء کو ابراہیم علیہ السلام کے مقابلہ میں منظور کر لے، بدیں وجہ اس نے خاموشی کو ترجیح دی، اور اگر وہ ایسا سوال کر ہی بیٹھتا تو ابراہیم علیہ السلام کو یہ یقین تھا کہ ایسے تحدی (چیلنج) کے وقت اللہ تعالیٰ اپنے سچے پیغمبر کو ذلیل نہیں کرے گا اور ابراہیم علیہ السلام کی دُعا پر وہ بلاشبہ آفتاب کو مغرب سے طلوع کر کے ابراہیم کی صداقت کو واضح کر دے گا۔ البتہ یہ مسئلہ مادیین اور خدا کی قدرت پر کنٹرول کرنے والوں کے لئے ضرور تعجب خیز ہو سکتا ہے لیکن جن کا عقیدہ یہ ہے کہ "کائنات کا یہ سارا نظام اگرچہ خاص قوانین کے شکنجہ میں جکڑا ہوا ہے لیکن اس کا یہ شکنجہ ان اشیاء کے ذاتی خواص کی بناء پر نہیں ہے بلکہ اس شکنجہ میں کسنے والی ہستی اور ہے جو سب سے بالاتر ہے اور تمام اشیاء کی تاثیر اور اس کے خواص اسی کے ید قدرت میں ہیں لہٰذا وہ چاہے تو ان کے خواص و تاثیرات کو بدل بھی سکتا ہے اور فنا بھی کر سکتا ہے اور اسی قادر مطلق اور بے قید مالک و متصرف کا نام "اللہ" ہے، تو ان کی نگاہ میں یہ تعجب انگیز بات نہیں ہے۔

Marfat.com

کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس کی ہمسری کا دعویٰ کرے، کیونکہ وہ اور کل دنیا اسی کی مخلوق ہے اور وجود و عدم کی قید و بند میں گرفتار، مگر اس کے باوجود کہ بادشاہ، آزر اور جمہور، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے دلائل سے لاجواب تھے اور دلوں میں قائل، بلکہ بتوں کے واقعہ میں تو زبان سے بھی اقرار کرنا پڑا کہ ابراہیم جو کچھ کہتا ہے وہی حق ہے اور صحیح و درست، تاہم ان میں سے کسی نے راہ مستقیم کو اختیار نہ کیا اور قبول حق سے منحرف ہی رہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے برعکس اپنی ندامت و ذلت سے متاثر ہو کر بہت زیادہ غیظ و غضب میں آ گئے اور بادشاہ سے رعایا تک سب نے متفقہ فیصلہ کر لیا کہ دیوتاؤں کی توہین اور باپ دادا کے دین کی مخالفت میں ابراہیم علیہ السلام کو دہکتی آگ میں جلا دینا چاہیے کیونکہ ایسے سخت مجرم کی سزا یہی ہو سکتی ہے اور دیوتاؤں کی تحقیر کا انتقام اسی طرح لیا جا سکتا ہے۔

آگ کا سرد ہو جانا:

اس مرحلہ پر پہنچ کر ابراہیم علیہ السلام کی جدوجہد کا معاملہ ختم ہو گیا اور اب دلائل و براہین کی قوت کے مقابلہ میں مادی طاقت و سطوت نے مظاہرہ شروع کر دیا، باپ اس کا دشمن، جمہور اس کے مخالف، اور بادشاہ وقت اس کے درپے آزار، ایک ہستی اور چہار جانب سے مخالفت کی آواز دشمنی کے نعرے، اور نفرت و حقارت کے ساتھ سخت انتقام اور خوفناک سزا کے ارادے، ایسے وقت میں اس کی مدد کون کرے، اور اس کی حمایت کا سامان کس طرح مہیا ہو؟

مگر ابراہیم علیہ السلام کو نہ اس کی پرواہ تھی اور نہ اس کا خوف، وہ اسی طرح بے خوف و خطر اور ملامت کرنے والوں کی ملامت سے بے نیاز اعلان حق میں سرشار، اور دعوت رشد و ہدایت میں مشغول تھے، البتہ ایسے نازک وقت میں جب تمام مادی سہارے ختم، دنیوی اسباب ناپید، اور حمایت و نصرت کے ظاہری اسباب مفقود ہو چکے تھے، ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت بھی ایک ایسا بڑا زبردست سہارا حاصل تھا جو تمام سہاروں کا سہارا اور تمام نصرتوں کا ناصر کہا جاتا ہے اور وہ خدائے واحد کا سہارا تھا۔ اس نے اپنے جلیل القدر پیغمبر، قوم کے عظیم المرتبت ہادی اور رہنما کو بے یار و مددگار نہ رہنے دیا اور دشمنوں کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ ہوا یہ کہ نمرود اور قوم نے ابراہیم علیہ السلام کی سزا کے لیے ایک مخصوص جگہ بنوائی اور اس میں کئی روز مسلسل آگ دہکائی گئی، حتیٰ کہ اس کے شعلوں سے قرب و جوار کی اشیاء تک جھلسنے لگیں، جب اس طرح بادشاہ اور قوم کو کامل اطمینان ہو گیا کہ اب ابراہیم علیہ السلام کے اس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تب ایک گوپھن میں ابراہیم علیہ السلام کو بٹھا کر دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا گیا۔

اس وقت آگ میں جلانے کی تاثیر بخشنے والے نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ابراہیم علیہ السلام پر اپنی سوزش کا اثر نہ کرے اور ناری عناصر کا مجموعہ ہوتے ہوئے بھی اس کے حق میں سلامتی کے ساتھ سرد پڑ جائے۔

آگ اسی وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں "برد و سلام" بن گئی اور دشمن ان کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا سکے اور ابراہیم علیہ السلام دہکتی ہوئی آگ سے سالم و محفوظ دشمنوں کے نرغہ سے نکل گئے۔

"دشمن اگر قویست نگہبان قوی ترست"

اس مقام پر ایک مذہبی انسان کی طمانیت قلب اور سکون خاطر کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ آگ کے برد و سلام ہو جانے کو اس لیے صحیح اور مبنی بر حقیقت سمجھے کہ اس نے اپنی عقل اور اپنے شعور سے اول اس امر کا امتحان کر لیا ہے کہ قرآن عزیز کی تعلیم وحی الٰہی کی تعلیم ہے اور اس کی لانے والی ہستی کی زندگی کا ہر پہلو پیغمبرانہ معصومیت کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ کہ وہ جن معجزانہ حقائق کی اطلاعات

Marfat.com

بہم پہنچاتا اور وحی الٰہی کے ذریعہ ہم کو سناتا ہے وہ عقل کے لیے اگرچہ حیران کن ہیں لیکن عقل کی نگاہ میں محال اور ناممکن نہیں، اس لیے ایک مخبر صادق (کہ جس کی زندگی کی صداقت کا ہر پہلو سے امتحان کر کے اطمینان کر لیا گیا ہے) کی اس قسم کی خبریں بلاشبہ صحیح اور حق ہیں اور بقول قیصر روم ہرقل اعظم (ہرکلیوس) کہ جو شخص انسانوں کے ساتھ جھوٹ نہیں بولتا اور ان سے دغا و فریب نہیں کرتا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی خدا کی جانب کسی غلط بات کو منسوب نہیں کر سکتا اور کبھی اس پر جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا" اور مذہبی زندگی میں صاف اور سیدھی راہ بھی یہی ہے کہ جس مذہب کی مکمل تعلیم کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر ہر طرح قابل اطمینان پا لیا جائے اس کے بتائے ہوئے چند ایسے امور پر جو عقل کے لیے صرف حیران کن ہوں مگر اس کے نزدیک محال ذاتی اور ناممکن کے مرادف نہ ہوں فلسفیانہ موشگافیوں کے بغیر ایمان لے آیا جائے اور صاحب وحی (ﷺ) کی اس یقینی اور غیر مشکوک اطلاع کو آفتاب کی روشنی سے زیادہ روشن سمجھا جائے اور یقین رکھا جائے کہ تمام اشیاء میں خواص و تاثیرات پیدا کرنے والے خدا میں یہ بھی قدرت ہے کہ جب چاہے ان کو دی ہوئی تاثیر اور خاصہ کو سلب کر لے اور جب چاہے دوسری کیفیت کے ساتھ بدل ڈالے لیکن مادیین کے لیے اگر یہ راہ باعث اطمینان نہ ہو اور فلسفہ کے شیدائی مذہب کے اس مسئلہ کو بھی فلسفیانہ موشگافیوں سے پاک نہ رہنے دینا چاہتے ہوں تو ان کے لیے بھی اس معجزہ سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لیے کہ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ آگ کا طبعی خاصہ جلا دینا ہے اور جو شئے بھی اس میں پڑے گی جل جائے گی لیکن اس کی کیا وجہ کہ بعض وہ کپڑے اور وہ اشیاء جن کو "فائر پروف" کہا جاتا ہے، آگ کے شعلوں کے اندر کیوں محفوظ رہتی ہیں اور ان کو آگ جلا کر کیوں خاکستر نہیں کر دیتی۔

تم کہو گے کہ آگ بدستور جلانے کا خاصہ رکھتی ہے مگر کپڑے یا چیز پر ایک ایسا مسالہ لگا دیا گیا ہے جس پر آگ اپنا اثر نہیں کر سکتی، یہ نہیں ہے کہ آگ نے جلانے کا خاصہ ترک کر دیا ہے۔

تو ایک مذہبی انسان کے لیے اسی طرح آپ کے فلسفیانہ رنگ میں یہ جواب دینے کا کیوں حق نہیں ہے کہ نمرود اور اس کی قوم کی دہکتی آگ میں جلانے کا خاصہ بدستور اسی طرح باقی تھا جس طرح آگ کے عناصر میں موجود ہے، مگر وہ ابراہیم کے جسم کے لیے بے اثر ثابت ہوا، فرق صرف اس قدر ہے کہ تمہارے "فائر پروف" میں انسانوں کی سوچی ہوئی تدابیر کا دخل ہے اور اس لیے ہر سیکھنے والے کو ایک فن کی طرح سیکھ لینے کا موقع حاصل ہے اور ابراہیم علیہ السلام کے جسم کا آگ سے محفوظ ہو جانا بلا واسطہ خدائے برتر کی تدبیر کے زیر اثر تھا اور اس قسم کا عمل پیغمبر کی صداقت اور دشمنوں کے مقابلہ میں اس کی برتری کے لیے کبھی کبھی بہ تقاضائے حکمت اس کی جانب سے سامنے آ جاتا اور شریعت کی اصطلاح میں "معجزہ" شمار ہوتا ہے بیشک وہ نہ فن ہوتا ہے اور نہ وسائل و اسباب سے پیدا کردہ تدابیر کا محتاج، پس خدا کی مخلوق "انسان" کو اگر یہ قدرت حاصل ہے کہ کسی شئے کے طبعی خاصہ کو بعض اشیاء پر مؤثر نہ ہونے دے تو اشیاء کے خواص کے خالق کو کیوں یہ قدرت حاصل نہیں کہ وہ کسی خاص موقع پر شئے کی تاثیر کو عمل سے روک دے۔

اور اگر آج سائنس کی دریافت پر فضا میں ایسی گیسیں موجود ہیں جن کے بدن پر اثر کرنے سے آگ کی سوزش سے محفوظ رہا جا سکتا ہے تو گیسوں کے پیدا کرنے والے خالق کے لیے کون مانع ہے کہ نمرود کی دہکتی آگ میں ان کو ابراہیم علیہ السلام تک نہ پہنچا دے، اور اس طرح آگ کو بحق ابراہیم علیہ السلام بردو سلام نہ بنا دے۔

قرآن عزیز میں ابراہیم علیہ السلام کے اس پر اعجاز واقعہ کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

Marfat.com

﴿ قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ ۝ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۝
وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ۝ ﴾ (الانبیاء: ۶۸۔۷۰)

"وہ سب کہنے لگے اس (ابراہیم علیہ السلام) کو جلا ڈالو اور اپنے دیوتاؤں کی مدد کرو اگر تم کرنا چاہتے ہو، ہم نے حکم دیا، اے آگ! تو ابراہیم کے حق میں سرد اور سلامتی بن جا، اور انہوں نے ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا پس ہم نے ان کو ان کے ارادہ میں ناکام بنا دیا۔"

﴿ قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ۝ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ۝ وَقَالَ إِنِّي
ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ۝ ﴾ (الصافات: ۹۷۔۹۹)

"انہوں نے کہا اس کے لیے ایک جگہ بناؤ اور اس کو دہکتی آگ میں ڈالو، پس انہوں نے اس کے ساتھ ارادہ بد کیا تو کر دیا ہم نے ان کو (اس کے مقابلہ میں) پست و ذلیل اور کہا ابراہیم (علیہ السلام) نے میں جانے والا ہوں اپنے پروردگار کے پاس قریب ہے وہ مجھے راہ یاب کرے گا۔"

حدیث بخاری:

ابراہیم علیہ السلام کے واقعات میں قرآن عزیز نے اس موقعہ پر جبکہ ابراہیم علیہ السلام اور قوم کے بعض افراد کے درمیان میلے کی شرکت کے لیے گفتگو ہو رہی تھی ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا ہے ﴿ إِنِّي سَقِيمٌ ﴾ (ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میں بیمار ہوں) اور جب بتوں کی شکست و ریخت کے سلسلہ میں ان سے دریافت کیا گیا تو ان کا جواب اس طرح منقول ہے۔

﴿ قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَٰذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِن كَانُوا يَنطِقُونَ ۝ ﴾ (الانبیاء: ۶۳)

"ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا بلکہ ان میں سے سب سے بڑے بت نے یہ کیا ہے پس ان سے پوچھو اگر یہ بول سکتے ہیں؟"

ان دونوں جملوں کے متعلق ایک خالی الذہن انسان ایک لحہ کے لیے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ان میں جھوٹ کا بھی کوئی شائبہ ہو سکتا ہے؟ "إِنِّي سَقِيمٌ" میں علالت طبع کا ذکر ہے۔ جس کو ابراہیم علیہ السلام ہی خوب جان سکتے ہیں کہ وہ کیا بیمار ہیں اس میں دوسرے کو خواہ مخواہ شک اور تردد کا کونسا موقع ہے، حتیٰ کہ اگر ایک شخص ظاہر میں نگاہوں میں تندرست نظر آتا ہو تب بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ واقعی تندرست ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کا مزاج کسی وجہ سے حد اعتدال پر نہ ہو اور ایسی تکلیف میں مبتلاء ہو جس کا اظہار کئے بغیر دوسرا اس کو نہ سمجھ سکے۔ اسی طرح دوسری آیت کا معاملہ ہے اس لیے کہ دو مختلف الخیال انسانوں کے درمیان اگر مناظرہ اور تبادلہ خیالات کی نوبت آ جاتی ہے تو معمولی حرف شناس بھی اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اپنے حریف کو اس کی غلطی پر متنبہ کرنے اور لاجواب کر دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے مسلمات میں سے کسی مسلمہ عقیدہ کو صحیح فرض کر کے اس طرح اس کا استعمال کرے کہ اس کا ثمرہ اور نتیجہ حریف کے خلاف اور اپنے موافق ظاہر ہو۔

ابراہیم علیہ السلام نے یہی کیا، ان کی قوم کا یہ عقیدہ تھا کہ ان کے دیوتا سب کچھ سنتے اور ہماری مرادوں کو پورا کرتے ہیں، وہ

Marfat.com

اپنے پجاریوں اور معتقدوں سے خوش اور اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے سخت انتقام لیتے ہیں، ابراہیم علیہ السلام نے جب ان دیوتاؤں کو توڑ پھوڑ ڈالا تو بڑے بت کو چھوڑ دیا، آخر جب پوچھ گچھ کی نوبت آئی تو انہوں نے مناظرہ کا وہی بہترین اسلوب اختیار کیا جس کا تفصیلی ذکر گزشتہ صفحات میں آ چکا ہے اور نتیجہ یہ نکلا کہ کاہنوں، پجاریوں اور ساری قوم کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ہم ہی غلطی پر ہیں اور تو خود حقیقت شناس ہے کہ ان میں گویائی کی طاقت نہیں ہے۔

لہٰذا ان دونوں جملوں میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جس کو حقیقتاً "یا صورۃً" جھوٹ کہا جا سکے، یہ دو باتیں تو قرآن عزیز میں مذکور ہیں لیکن صحیح بخاری، صحیح مسلم اور بعض دوسری حدیث کی کتابوں میں مسطورہ بالا دونوں باتوں کے علاوہ ایک تیسری بات کا بھی ذکر ہے۔

یہ حدیث ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے:

لم یکذب ابراھیم النبی علیه السلام قط الاثلث کذبات...الخ. (بخاری ج ۶ ص ۳۰۱)

"نہیں جھوٹ بولا کبھی ہرگز ابراہیم نبی علیہ السلام نے مگر تین جھوٹ۔"

اور پھر تفصیل کے ساتھ ان تینوں کو شمار کیا ہے، ان میں سے دو کا ذکر ابھی ہو چکا اور تیسری بات یہ مذکور ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا جب مصر سے گزر ہوا تو انہوں نے مصر پہنچنے سے پہلے اپنی زوجہ مطہرہ حضرت سارہ علیہا السلام سے یہ فرمایا کہ یہاں کا بادشاہ جابر و ظالم ہے اگر کسی حسین عورت کو دیکھتا ہے تو اس کو زبردستی چھین لیتا ہے اور اس کے ساتھی مرد کو اگر وہ اس عورت کا شوہر ہے تو قتل کر ڈالتا ہے اور اگر کوئی دوسرا عزیز ہے تو اس سے کوئی تعرض نہیں کرتا، تم چونکہ میری دینی بہن ہو اور اس سرزمین میں میرے اور تمہارے علاوہ دوسرا کوئی مسلمان نہیں ہے اس لیے تم اس سے کہہ دینا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور جب شب میں اس نے ارادۂ بد کیا تو اس کا ہاتھ شل ہو کر رہ گیا اور وہ کسی طرح حضرت سارہ علیہا السلام کو ہاتھ نہ لگا سکا، یہ دیکھ کر اس نے سارہ علیہا السلام سے کہا اپنے خدا سے دعا کر کہ میرا ہاتھ درست ہو جائے تو میں تجھ کو رہا کر دوں گا، سارہ علیہا السلام نے دعا کی مگر اس نے پھر ارادۂ بد کیا، دوبارہ اس کا ہاتھ شل ہو گیا، تیسری مرتبہ پھر یہی تمام قصہ پیش آیا تب اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے یہ "جن" ہے انسان نہیں ہے، اس کو میرے پاس سے جلد لے جاؤ اور ساتھ ہی ہاجرہ علیہا السلام کو حوالہ کر کے کہا کہ اس کو بھی اپنے ساتھ لے جا میں نے تیرے حوالہ کیا۔ جب سارہ علیہا السلام ہاجرہ علیہا السلام کو ساتھ لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچیں تو انہوں نے حال دریافت کیا اور سارہ علیہا السلام نے مبارک باد دی اور کہا، شکر ہے خدائے عزوجل کا کہ اس نے ہم کو اس فاسق و فاجر سے نجات دی اور آپ کے لیے ایک خادمہ اور ساتھ کر دی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث نقل کر کے فرمایا: "اے شریف النسب اہل عرب یہ ہیں وہ ہاجرہ علیہا السلام جو تم سب کی ماں ہیں۔"

یہ حدیث مختلف طریقوں سے کتب احادیث میں منقول ہے، اس کے علاوہ بخاری میں ایک اور طویل حدیث ہے جو حدیث شفاعت کے نام سے موسوم ہے اور متعدد ابواب بخاری مثلاً سورۂ بقرہ کی تفسیر کے باب میں کتاب الاسترقاق میں، اور کتاب التوحید میں مذکور ہے، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو تذکرہ ہے اس کا حاصل یہ ہے:

میدان حشر میں جب سب مخلوق آدم، نوح علیہما السلام اور دوسرے انبیاء علیہم السلام سے شفاعت کے لیے کہہ چکی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچی اور ان سے کہا کہ آپ خلیل الرحمٰن ہیں، آپ ہماری سفارش بارگاہ الٰہی میں کیجیے کہ جلد فیصلہ ہو، تو انہوں

Marfat.com

نے فرمایا کہ مجھ کو شرم آتی ہے اس لیے کہ میں نے دنیا میں تین جھوٹ باتیں کہی تھیں ﴿اِنِّیْ سَقِیْمٌ . بَلْ فَعَلَهٗ كَبِیْرُهُمْ﴾ اور اپنی بیوی سے کہا تھا کہ ﴿اِنِّیْ اَخُوْكَ﴾۔

بخاری کے علاوہ یہ روایت مسلم، مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ، مستدرک حاکم، معجم طبرانی، مصنف ابن ابی شیبہ، ترمذی، اور مسند ابی عوانہ میں مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔

یہ روایت کتب حدیث میں اجمال وتفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے روایت کی گئی ہے۔ بعض میں صرف اجمالی طور پر اسی قدر تذکرہ ہے کہ ہر نبی اس وقت اپنی لغزش کو بیان کر کے معذرت کریں گے کہ وہ شفاعت نہیں کر سکتے اور بعض میں ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں فقط "ثلث کذبات" ہی کا ذکر ہے اور بعض روایات میں ان تینوں کی تفصیل ہے اور ان ہی میں سے بعض روایات میں یہ تصریح بھی موجود ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابراہیم علیہ السلام کے ان تینوں جھوٹ میں سے ہر ایک صرف اللہ تعالیٰ کے دین کی مدافعت و حمایت ہی کے لیے بولا گیا ہے۔

بہرحال یہ دونوں روایات صحیحین (بخاری ومسلم) کی روایات ہیں جو ہر قسم کے سقم روایت سے پاک اور صاف ہیں، یہ روایات ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر اور مجدد انبیاء کی جانب "کذب" کی نسبت کر رہی ہیں اگرچہ انہی روایات کے بعض طریق روایت نے یہ صاف کر دیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر "کذب" سے مراد وہ عام معنی نہیں لیے جو اخلاقی بول چال میں نہایت شنیع اور گناہ کبیرہ میں شمار ہیں، بلکہ اس کے برعکس یہ واضح کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ تینوں باتیں نہ ذاتی غرض کے لیے کہی ہیں اور نہ دنیوی مصلحت کے پیش نظر بلکہ معاندین حق کے مقابلہ میں خالص اللہ تعالیٰ کے دین کی حمایت میں کہی ہیں، اس کے باوجود جو بات دل میں کھٹکتی اور قلب پر ایک بھاری بوجھ محسوس ہوتی ہے وہ حدیث کی یہ تعبیر ہے۔

یہ تسلیم کہ روایت کی بعض تصریحات نے اس کو "کذب" کے عام معنی سے جدا کر دیا تاہم اول تو یہ "زیادت" صحیحین میں مذکور نہیں اگرچہ صحیح روایت میں موجود ہے، دوسرے جبکہ "صدق لسانی" انبیاء علیہم السلام کی غیر منفک اور عصمت نبی کے لیے ایک ضروری صفت ہے نیز جبکہ خصوصیت کے ساتھ قرآن عزیز نے ابراہیم علیہ السلام کے متعلق حسب ذیل امتیازات کا صراحت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے تو پھر ان کے ساتھ صورۃً بھی کذب کی نسبت کیسی؟

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝﴾ (مریم: ۴۱)

"اور یاد کر کتاب میں ابراہیم کا ذکر بے شک تھا وہ صدیق (صادق النفس) نبی۔"

"صدیق" مبالغہ کا صیغہ ہے اور اسی ہستی پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے "صدق" جس کی ذاتی اور نفسیاتی صفت ہو۔

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۭ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ۭ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾ (النحل: ۱۲۰-۱۲۱)

"بیشک ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا حکم بردار، خالص اللہ کی طرف جھکنے والا اور نہ تھا وہ مشرکوں میں سے، خدا کی نعمتوں کا شکر

Marfat.com

گزار تھا، خدا نے اس کو چن لیا تھا، اور سیدھی راہ کی اس کو ہدایت دی۔"
مجتبیٰ اور مہدی ایسی صفات ہیں کہ جن کے ساتھ کذب نہ حقیقتاً جمع ہو سکتا ہے اور نہ صورۃً۔

﴿ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا﴾ (النحل: ۱۲۳)

"(اے محمد ﷺ) پھر ہم نے تیری طرف وحی بھیجی کہ تو ملت ابراہیم کی پیروی کر جو ابراہیم کہ خالص خدا کی جانب جھکنے والا ہے۔"

یہ وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں جن کی ملت کی اقتداء اور پیروی کا حکم محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کی امت مرحومہ کو دیا جا رہا ہے۔

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ﴾ (الانبیاء: ۵۱)

"اور بلاشبہ ہم نے ابراہیم کو رشد وہدایت شروع ہی سے بخش دی تھی اور ہم ہی اس کو جاننے والے ہیں۔"

یہ اور اسی قسم کی بہت سی آیات حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ان خصوصی صفات کا ذکر کرتی اور نصوص قطعیہ پیش کرتی ہیں کہ جن کے بعد ایک لمحہ کے لیے بھی اس جیسی مقدس اور جلیل القدر ہستی کے متعلق "کذب" کا تصور نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ وقوع اور عمل" خواہ وہ کذب حقیقی معنی میں ہو یا محض کذب کی صورت میں۔"

زیر بحث مسئلہ:

اس مقام پر پہنچ کر ایک مرتبہ پھر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مسئلہ زیر بحث یہ نہیں ہے کہ "العیاذ باللہ" ابراہیم علیہ السلام نے واقعی جھوٹ بولا۔ کیونکہ قرآن عزیز کی قطعی نصوص اور زیر بحث روایات کے علاوہ احادیث نصوص ابراہیم علیہ السلام کو نبی، پیغمبر اور رسول بتاتی اور ان کی امتیازی صفات صدیق، مجتبیٰ، مہدی، نبی، حنیف اور رسول ثابت کرتی ہیں، نیز زیر بحث روایت میں بھی یہ واضح ہے کہ ان کے یہ کلمات خدا کے دین کی حمایت و مدافعت کے لیے تھے نہ کہ کسی دنیوی غرض و مصلحت سے۔ لہٰذا ایک لمحہ کے لیے بھی اس میں تردد کی گنجائش نہیں ہے کہ "کذب" ان سے اسی طرح دور ہے جس طرح دن سے رات اور روشنی سے تاریکی، اور بلاشبہ وہ ایک نبی معصوم ہیں اور ہر قسم کی معصیت گناہ سے پاک۔

البتہ زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ ان دو صحیح روایات میں ان تینوں باتوں کے متعلق رسول اکرم ﷺ نے ایسے جلیل القدر پیغمبر کے بارہ میں "کذب" کی تعبیر کیوں فرمائی جبکہ آپ کی ذات اقدس ضروریات دین اور عقائد اسلامی کے بارہ میں ابہام اور گنجلک کو دور کرنے کا باعث ہے نہ کہ ابہام والتباس پیدا کرنے کا؟ خصوصاً جبکہ یہ تینوں باتیں خود اپنی جگہ کسی حال میں نہ صورت میں کذب ہیں اور نہ حقیقی معنی ہیں۔

- بلاشبہ حضرت سارہ علیہا السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دینی بہن تھیں اور بیوی کے رشتہ سے اسلامی اخوت کا رشتہ منقطع نہیں ہو جاتا، نیز ابن کثیر اور دوسرے مؤرخین کی تحقیق میں وہ ان کے چچا حاران کی بیٹی تھیں، اس لیے چچا زاد بہن بھی تھیں، اور بلاشبہ ان کا مزاج ناساز تھا گو سخت بیماری نہ سہی اس لیے "اِنِّیْ سَقِیْمٌ" ہر حیثیت سے صحیح ہے اور بلاشبہ انہوں نے مناظرانہ طرز خطابت میں دشمن کو

Marfat.com

لاجواب کرنے کے لیے فرمایا ﴿بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ﴾ اور یہ علمی دنیا میں کسی حیثیت سے بھی جھوٹ نہیں تھا، تو پھر ان ہر دو احادیث میں اس طرح کی تعبیر کیوں اختیار کی گئی؟

اس اشکال کے جواب میں علماء اسلام نے دو راہیں اختیار فرمائی ہیں:

① یہ اخبار آحاد ہیں اس لیے جرأت کے ساتھ یہ کہہ دینا چاہیے کہ اگرچہ یہ روایتیں صحیحین کی ہیں اور اس لیے مشہور کی حد تک پہنچ گئی ہیں مگر راوی کو ان روایات میں سخت مغالطہ ہوا ہے لہٰذا ہرگز قابل قبول نہیں ہیں اس لیے کہ ایک نبی کی جانب کذب کی نسبت کے مقابلہ میں راویوں کی غلطی کا اعتراف بدرجہا بہتر اور صحیح طریق کار ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان اسی جانب ہے اور انہوں نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

(۲) یہ قطعی اور یقینی عقیدہ ہے کہ نبی اور رسول کی جانب "کذب" کی نسبت کسی حال میں درست نہیں ہے ایسی صورت میں اگر مستند اور صحیح روایات میں جو کہ حد شہرت و تواتر کو پہنچ چکی ہوں اس قسم کی کوئی نسبت موجود ہو جو نبی کی نبوت کے شان کے منافی ہو تو ان روایات کو صحیح مانتے ہوئے ان خصوصی جملوں کی ایسی توجیہ کرنی چاہیے جس سے اصل مسئلہ پر بھی زد نہ پڑے اور صحیح روایات کا انکار بھی لازم نہ آئے پس چونکہ صحیحین کی یہ روایات "تلقی بالقبول" کی وجہ سے صحت اور شہرت کے اس درجہ اور مرتبہ کو پہنچ چکی ہیں جو اخبار آحاد میں شمار نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے ان روایات کو مردود قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ "ثلث کذبات" کے جملہ کی یہ توجیہ کرنی چاہیے کہ اس مقام پر "کذب" سے مراد یہ ہے کہ "ایسا کلام جو صحیح اور پاک مقصد کے لیے بولا گیا ہو لیکن مخاطب اس کا وہ مطلب نہ سمجھے جو متکلم کی مراد ہے بلکہ ان الفاظ کو اپنی ذہنی مراد کے مطابق سمجھے" اور یہ معنی صرف ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے لیے ہی نہیں تراشے گئے بلکہ علم بدیع کی اصطلاح میں اس کو "معاریض" کی اقسام میں شمار کیا گیا ہے اور فصحاء و بلغاء کے کلام میں اکثر رائج ہے۔

اس طرح روایات کا انکار بھی لازم نہیں آئے گا اور صداقت نبی کا مسئلہ بھی اپنی جگہ بغیر کسی غل و غش کے صحیح رہے گا، چنانچہ حدیث شفاعت کے وہ الفاظ "ما منها كذبة الا ماحل به عن دين الله" ہماری اس توجیہ کی تائید کرتے ہیں، جمہور علماء اسلام کی یہی رائے ہے اور وہ امام رازی اور ان کے ہمنوا علماء کی پہلی رائے کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔

مشہور مصری عالم عبدالوہاب نجار نے قصص الانبیاء میں امام رازی کی رائے کے ساتھ موافقت کی ہے اور مصری علماء عصر کی رائے کے خلاف (جو دراصل جمہور کی تائید میں نجار کی رائے پر تنقید کی شکل میں ظاہر کی گئی ہے) کافی شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام و سارہ علیہا السلام کے اس واقعہ سے انکار کیا ہے۔

مؤلف کی رائے:

مگر ان ہر دو آراء سے الگ سادہ اور صاف راہ یہ ہے کہ صحیح حدیث کے انکار اور اس کے الفاظ کی رکیک تاویل کیے بغیر ہی مسئلہ کو اس طرح حل کر دیا جائے کہ اصل مسئلہ "عصمت پیغمبر" پر بھی حرف نہ آنے پائے اور اس قسم کے مواقع سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں، اور احادیث نبوی کے ساتھ تمسخر اور مذاق کرنے والوں کو بھی الحاد کی جرأت نہ ہو سکے۔

Marfat.com

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ "عصمت پیغمبر" کا مسئلہ بلاشبہ اصول دین اور مہمات عقائد میں سے ہے بلکہ دین و مذہب کی صداقت کی اساس و بنیاد صرف اسی ایک مسئلہ پر قائم ہے کیونکہ یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ بعض حالات میں نبی اور پیغمبر بھی "کذب" کی کوئی نہ کوئی شکل وصورت اختیار کر سکتا ہے خواہ وہ حمایت حق ہی کے لیے کیوں نہ ہو اس کی لائی ہوئی تمام تعلیم سے یہ امتیاز اٹھ جائے گا کہ اس میں سے کون سا جز اپنی حقیقی مراد کے ساتھ وابستہ ہے اور کون سا "کذب" کے رنگ میں رنگا ہوا، اور اگر یہ مان لیا جائے تو پھر دین، دین نہیں رہ سکتا اور نہ مذہب، مذہب۔

اس لیے قرآن عزیز کا یہ منصوص عقیدہ "عصمت پیغمبر" اپنی جگہ غیر متزلزل اور غیر متبدل عقیدہ ہے اور اس لیے بلاشبہ جو اس عقیدہ کی صداقت پر حرف گیری کا باعث بنے وہ خود اپنی جگہ یا قابل ردو انکار ہے اور یا اپنی صحت تعبیر کے لیے جوابدہ، پس اس محکم عقیدہ کو اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی بلکہ اس سے معارض شئے کو یا اس کے مطابق ہونا پڑے گا ورنہ تو مٹ جانا ہوگا۔

اسی طرح یہ امر بھی مسلم ہے کہ قرآن عزیز کی تفسیر وتشریح صرف لغت عرب سے ہی نہیں کی جا سکتی بلکہ جس طرح اس کے مفہوم سمجھنے کے لیے "لغت کی معرفت" ضروری ہے اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ پیغمبر خدا ﷺ کے اقوال، اعمال اور احوال کی معرفت کی ضرورت ہے جو کلام اللہ کی صحیح توجیہ، تفسیر اور تشریح کے حامل ہیں۔

بلاشبہ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ قرآنی احکام مثلاً: ﴿ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ، اٰتُوا الزَّكٰوةَ ، اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ ، فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ میں نماز، زکوٰۃ حج اور روزہ کے مفہوم اور معنی کو ہم کسی طرح بھی "لغت عربی" کے ذریعہ متعین نہیں کر سکتے اور تنہا یہ لغوی معنی ومفہوم قرآنی احکام کا مصداق نہیں بن سکتے بلکہ ان کی معرفت کے لیے ہم مجبور ہیں کہ پیغمبر خدا ﷺ کے ان اقوال واعمال کی طرف رجوع کریں جو ان فرائض کی تفسیر وتشریح میں کہے گئے یا کیے گئے ہیں، اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ صرف تعامل کے ذریعہ ہم ان فرائض کی حقیقت سے آگاہ ہو سکیں اس لیے کہ اگر دقت نظر سے کام لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تعامل کا مبدأ بھی آخر کار قول وعمل رسول پر ہی جا کر منتہی ہوتا ہے، لہٰذا پیغمبر خدا ﷺ کے اس قول وعمل کو بھی جزو دین سمجھنا ضروری ہو جاتا ہے اور بغیر اس تسلیم ورضا کے آیت۔

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ ﴾ (الاحزاب: ۲۱)

"بلاشبہ خدا کے پیغمبر (ﷺ) میں اس شخص کے لیے عمدہ نمونہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر اُمید لگاتا ہو۔"

کے کوئی معنی نہیں بنتے، کیونکہ یہ "اسوۂ حسنہ" خود قرآن عزیز اور اس کی آیات نہیں ہیں بلکہ اس پیغمبر کا قول، عمل اور حال ہی اسوۂ حسنہ ہے اور جبکہ پیغمبر خدا ﷺ کے یہ اقوال، اعمال اور احوال جزء دین ہیں تو ضروری تھا کہ ان کی حفاظت کا ایسا سامان مہیا ہو جو "خاتم النبیین" کی امت کے لیے رہتی دنیا تک محفوظ طریقے سے پہنچ سکے اور اس جوہر خالص میں جب بھی کھوٹ کی ملاوٹ کی جائے تو اس کے محافظین اور فن کے ماہرین فوراً دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے کھرے کھوٹے کو الگ کر سکیں، پس اسی طریقہ حفاظت کا نام "روایت حدیث اور نقد حدیث ہے" اور اسی فن کو "فن حدیث" کہتے ہیں، اور یہی وہ شریف اور مقدس خدمت ہے جس نے اپنوں سے

Marfat.com

نہیں بلکہ غیروں سے بھی خراج تحسین حاصل کیا ہے اور اس خدمت کو اسلام کا امتیازی نشان تسلیم کرایا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ان اقوال و اعمال کی روایت کی حفاظت کے سلسلہ میں کھرے اور کھوٹے کے امتیاز کے لیے زمانہ نبوت سے اب تک جو خدمت ہوتی آ رہی ہے اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہو سکتی ہے کہ "روایت حدیث" کا فن تقریباً چودہ فنون اور شاخوں میں منقسم ہے۔

لہٰذا ازبس ضروری ہے کہ ہم کسی ایک ایسی روایت یا روایت کے جملہ کو" جو اپنی لفظی اور ظاہری تعبیر میں مسلمہ عقیدہ کے بارہ میں ابہام پیدا کرتا ہو" صحیح اور مقبول، مشہور اور متواتر روایات حدیثی کے انکار پر حجت و دلیل قائم نہ کر لیں اور اس کو انکار حدیث کا ذریعہ بنا کر قرآن عزیز کو ایک ایسی اجنبی کتاب نہ بنا دیں جس کی تعبیر کے لیے نہ کسی پیغمبر کے تفسیری اقوال ہیں اور نہ تشریحی اعمال بلکہ وہ کسی ویرانہ یا پہاڑ پر نازل ہوئی ہے اور صرف اپنی زبان کی لغت اور ڈکشنری سے حل کی جا سکتی ہے۔ البتہ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ تمام احادیث رسول روایت باللفظ نہیں ہیں بلکہ بعض روایات بالمعنیٰ ہیں یعنی یہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو بھی الفاظ زبان مبارک سے فرمائے ہوں راوی نے ایک ایک لفظ اسی طرح نقل کر دیا ہو، بلکہ معنی اور مفہوم کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اس روایت کے الفاظ راوی کی اپنی تفسیر ہوتے ہیں۔

پس ان اہم اور بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھنے کے بعد اب مسئلہ زیر بحث کو اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ بخاری کی احادیث کو بلاشبہ "تلقی بالقبول" حاصل ہے اور یہ بھی تسلیم کہ یہ کتاب جرح و نقد پ۔۔ ۔نے اور پرکھے جانے کے بعد امت میں شہرت و قبولیت کا وہ درجہ رکھتی ہے کہ کتاب اللہ کے بعد اس کو اصح الکتب کہا جاتا ہ۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ روایت بالمعنیٰ ہونے کی وجہ سے اس کی کسی روایت میں راوی سے لفظی تعبیر میں سقم پیدا ہو گیا ہو اور روایت اگرچہ اپنے سلسلہ سند اور مجموعہ متن کے اعتبار سے اصولاً قابل تسلیم ہو مگر اس جملہ کی تعبیر کو سقیم سمجھا جائے اور اصل روایت کو رد کرنے کی بجائے صرف اس کے سقم کو ظاہر کر دیا جائے چنانچہ اس کی بہترین مثال بخاری کی حدیث معراج ہے۔

محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ مسلم کی حدیث اسریٰ عن انس رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں بخاری کی حدیث عن عبداللہ بن ابی نمرہ میں سقم ہے اور اس کی ترتیب میں غلطیاں ہیں اور مسلم کی روایت ان اسقام و اغلاط سے پاک صاف ہے، حالانکہ یہ دونوں روایتیں روایت و درایت کے اعتبار سے صحیح اور قابل تسلیم ہیں۔

تب بغیر کسی شک اور تردد کے یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق یہ دونوں طویل روایات "روایت بالمعنیٰ" کی قسم میں داخل ہیں، اور یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ الفاظ اور جملوں کی یہ پوری نشست نبی اکرم ﷺ کی زبان حق ترجمان کے نکلے ہوئے الفاظ اور جملوں کی نشست ہے بلکہ آپ کے مفہوم اور معنی کو ادا کرتی ہیں لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ہر دو روایات میں بیان کردہ واقعات کی صحت کے باوجود زیر بحث الفاظ سلسلہ سند کے کسی راوی کے اختلال لفظی کا نتیجہ ہوں اور اس سے یہ تعبیری سقم پیدا ہو گیا ہو۔

خصوصاً جبکہ اس کے لیے یہ قرینہ بھی موجود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام و سارہ علیہا السلام اور شاہ مصر کا یہ واقعہ توراۃ میں بھی مذکور ہے اور وہاں اس قسم کے غیر محتاط جملے بکثرت موجود ہیں لہٰذا یہ ممکن ہے کہ راوی سے اس اسرائیلی روایت اور صحیح روایت کے درمیان تعبیر میں خلط ہو گیا ہو اور اس لیے اس نے معاملہ کی تعبیر زیر بحث الفاظ سے کر دی ہو۔

Marfat.com

ہدایت قوم کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اضطراب:

گذشتہ سطور سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کی ہدایت کے لیے کس درجہ مضطرب اور بے چین تھے اور دلائل و براہین کی وہ کون سی صورت ہو سکتی ہے جو انہوں نے حق کے آشکارا کرنے میں صرف نہ کر دی ہو؟ سب سے پہلے اپنے باپ آزر کو سمجھایا پھر "جمہور" کے سامنے حق کی روشنی کو پیش کیا، اور آخر میں نمرود سے مناظرہ کر کے اس کے سامنے بھی احقاق حق کو بہتر سے بہتر اسلوب کے ساتھ ادا کیا اور ہر لحہ یہی سب کو تلقین کی کہ خدائے واحد کے علاوہ کسی کی پرستش جائز نہیں اور اصنام پرستی اور کواکب پرستی کا نتیجہ خسران اور ذلت کے سوائے دوسرا نہیں ہے اس لیے شرک سے باز آنا چاہیے اور "ملت حنیفیہ" ہی کو صراط مستقیم سمجھنا چاہیے جس کی اساس و بنیاد صرف "توحید الٰہی" پر قائم ہے۔

مگر بدبخت قوم نے کچھ نہ سنا، اور کسی طرح رشد و ہدایت کو قبول نہ کیا اور ابراہیم علیہ السلام کی بیوی حضرت سارہ علیہا السلام اور ان کے برادر زادہ حضرت لوط علیہ السلام کے علاوہ کوئی ایک بھی ایمان نہیں لایا۔ اور تمام قوم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلا دینے کا فیصلہ کر لیا اور دہکتی آگ میں ڈال دیا۔

اور جب خدائے تعالیٰ نے دشمنوں کے ارادوں کو ذلیل و رسوا کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں آگ کو "بردو سلام" بنا دیا تو اب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ کسی دوسری جگہ جا کر پیغام الٰہی سنائیں اور دعوت حق پہنچائیں اور یہ سوچ کر "فدان آرام"[1] سے ہجرت کا ارادہ کر لیا۔

﴿وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ۝﴾ (الصافات: ۹۹)

اور ابراہیم نے کہا "میں جانے والا ہوں اپنے پروردگار کی طرف قریب ہی وہ میری رہنمائی کرے گا۔"

یعنی اب مجھے کسی ایسی آبادی میں ہجرت کر کے چلا جانا چاہیے جہاں خدا کی آواز گوش حق نیوش سے سنی جائے، خدا کی زمین تنگ نہیں ہے، یہ نہیں اور سہی، میرا کام پہنچانا ہے، خدا اپنے دین کی اشاعت کا سامان خود پیدا کر دے گا۔

اور کلدانیین کی جانب ہجرت:

بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد آزر اور قوم سے جدا ہو کر فرات کے غربی کنارہ کے قریب ایک بستی میں چلے گئے جو اور کلدانیین کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کیا، اور حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت سارہ علیہا السلام ہم سفر ہیں اور کچھ دنوں کے بعد یہاں سے "حران یا حاران" کی جانب روانہ ہو گئے اور وہاں "دین حنیف" کی تبلیغ شروع کر دی مگر اس عرصہ میں برابر اپنے والد آزر کے لیے بارگاہ الٰہی میں استغفار کرتے، اور اس کی ہدایت کے لیے دعا مانگتے رہے اور یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ وہ نہایت رقیق القلب رحیم اور بہت ہی نرم دل و بردبار تھے اس لیے آزر کی جانب سے ہر قسم کی عداوت کے مظاہروں کے باوجود انہوں نے آزر سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگرچہ میں تجھ سے جدا ہو رہا ہوں اور افسوس کہ تو نے خدا کی رشد و ہدایت پر توجہ نہ کی تاہم میں برابر تیرے حق

---

[1] بابل کی حکومت شکر دہ میں ایک مشہور شہر تھا، یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مولد ہے۔

Marfat.com

میں خدا سے مغفرت کی دعا کرتا رہوں گا آخر کار حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وحی الٰہی نے مطلع کیا کہ آزر ایمان لانے والا نہیں ہے اور یہ انہی اشخاص میں سے ہے جنہوں نے اپنی نیک استعداد کو فنا کر کے خود کو اس کا مصداق بنا لیا۔

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ (البقرہ: ۷)

"اللہ نے مہر لگا دی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہو گیا تو آپ نے آزر سے اپنی برات کا صاف صاف اعلان کر دیا کہ جو اُمید موہوم میں نے لگا رکھی تھی وہ اب ختم ہو گئی اس لیے اب استغفار کا سلسلہ بے محل ہے، قرآن عزیز کی سورۂ توبہ میں اس واقعہ کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

﴿وَ مَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝﴾ (التوبہ: ۱۱۴)

"اور نہ تھا ابراہیم (علیہ السلام) کا استغفار اپنے باپ کے لیے مگر اس وعدہ کے مطابق جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا، پھر جب اس پر یہ ظاہر ہو گیا کہ یہ خدا کا دشمن ہے (یعنی اس کا آخری انجام یہی ہو گا) تو اس سے بیزاری کا اظہار کر دیا، بے شک ابراہیم (علیہ السلام) ہے ضرور رقیق القلب بردبار۔"

ہجرت فلسطین:

ابراہیم علیہ السلام اس طرح تبلیغ کرتے کرتے فلسطین پہنچے، اس سفر میں بھی ان کے ہمراہ حضرت سارہ علیہا السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیوی تھیں۔ سورۂ عنکبوت میں ہے:

﴿فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَ قَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ (العنکبوت: ۲۶)

"پس لوط علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور کہنے لگے میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں بیشک وہ غالب ہے، حکمت والا ہے۔"

روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ اپنی زوجہ مطہرہ حضرت رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کر گئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ان عثمان اوّل مهاجر باهله بعد لوط)).

"بلاشبہ لوط علیہ السلام کے بعد عثمان پہلے مہاجر ہیں جنہوں نے اپنی بیوی سمیت ہجرت کی۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فلسطین کے غربی اطراف میں سکونت اختیار کی، اس زمانہ میں یہ علاقہ کنعانیوں کے زیر اقتدار تھا، پھر قریب ہی شکم (نابلس) میں چلے گئے اور وہاں کچھ عرصہ قیام کیا، اس کے بعد یہاں بھی زیادہ مدت قیام نہیں فرمایا اور غرب ہی کی جانب بڑھتے چلے گئے حتیٰ کہ مصر تک جا پہنچے۔

ہجرت مصر اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام:

جب نابلس سے چل کر مصر پہنچے تو بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق ملک جبار کا وہ واقعہ پیش آیا جو گذشتہ سطور میں سپرد قلم ہو چکا ہے اور تورات میں اس قصہ کو اس طرح نقل کیا گیا ہے:

"سو جب ابرام مصر پہنچا۔ مصریوں نے اس عورت کو دیکھا کہ وہ نہایت خوبصورت ہے اور فرعون کے امیروں نے بھی اسے دیکھا اور فرعون کے حضور میں اس کی تعریف کی اور اس عورت کو فرعون کے گھر میں لے گئے اور اس نے اس کے سبب ابرام پر احسان کیا کہ اس کو بھیڑ بکری اور گائے بیل اور گدھے اور غلام اور لونڈیاں اور گدھیاں اور اونٹ ملے، پھر خداوند نے فرعون، اور اس کے خاندان کو ابرام کی جورو سری کے سبب بڑی مار ماری، تب فرعون نے ابرام کو بلا کر اس سے کہا کہ تو نے مجھ سے یہ کیا کیا؟ کیوں نہ جتایا کہ یہ میری جورو ہے، تو نے کیوں کہا کہ وہ میری بہن ہے؟ یہاں تک کہ میں نے اسے اپنی جورو بنانے کو لیا، دیکھ یہ تیری جورو حاضر ہے اس کو لے اور چلا جا، اور فرعون نے اس کے حق میں لوگوں کو حکم کیا تب انہوں نے اسے اور اس کی جورو کو اور جو کچھ اس کا تھا روانہ کیا۔" [1]

صحیحین (بخاری و مسلم) کی روایت اور تورات کی اس روایت کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ صحیحین کی روایت میں حضرت سارہ علیہا السلام کے بددعا والے واقعہ میں ملک جبار "فرعون" نے شیطانی (جنی) اثر سمجھ کر سارہ علیہا السلام سے جان چھڑائی اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو ان کے حوالہ کر کے ابراہیم علیہ السلام کو مع ان کے رفقاء اور ساز و سامان کے مصر سے چلے جانے کی اجازت دی، فتح الباری میں ہے کہ مصری "جن" کی عظمت کے قائل تھے، اس لیے شیطان سے مراد یہاں جن ہے۔

اور تورات کی روایت یہ کہتی ہے کہ فرعون مصر نے سارہ علیہا السلام کے واقعہ کو کرامت سمجھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ عتاب کیا کہ انہوں نے شروع ہی سے یہ کیوں نہ بتا دیا کہ سارہ علیہا السلام ان کی بہن نہیں ہے۔ بلکہ بیوی ہے اور پھر بڑے انعام و اکرام اور عزت کے ساتھ ان کو مصر سے رخصت کیا۔ تورات کی روایت کے مطابق اس وقت حضرت سارہ علیہا السلام کی عمر ستر سال کی تھی۔

بہرحال صحیحین کی روایت ہو یا تورات کی، معنی اور مفہوم کے اعتبار سے دونوں روایات قریب قریب ہیں اور دونوں کے درمیان کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔

البتہ ان تمام روایات سے اس قدر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی سارہ علیہا السلام اور اپنے برادر زادہ حضرت لوط علیہ السلام کے ساتھ مصر تشریف لے گئے اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مصر کی حکومت ایسے خاندان کے ہاتھ میں ہے جو سامی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبی سلسلہ میں وابستہ تھا، یہاں پہنچ کر ابراہیم علیہ السلام اور فرعون مصر کے درمیان ضرور کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جس سے اس کو یقین ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام اور اس کا خاندان خدا کا مقبول اور برگزیدہ خاندان ہے، یہ دیکھ کر اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی حضرت سارہ علیہا السلام کا بہت اعزاز کیا اور ان کو ہر قسم کے مال و منال سے نوازا، اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے قدیم خاندانی رشتہ کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے اپنی بیٹی ہاجرہ علیہا السلام کو بھی ان کی زوجیت میں دے دیا،

---

[1] پیدائش باب ۱۲ آیت ۱۴۔۲۰ تورات

Marfat.com

جو اس زمانہ کے رسم و رواج کے اعتبار سے پہلی اور بڑی بی بی کی خدمت گذار قرار پائیں، چنانچہ اس تاریخی قیاس کی سب سے بڑی شہادت خود یہود کے یہاں بھی موجود ہے۔

سفر الیشیاء میں (جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے) مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ حضرت کا ہم وطن تھا۔ [1]

اور اسی طرح یہود کی معتبر روایات سے یہ مسئلہ بھی صاف اور روشن ہو جاتا ہے کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام "شاہ مصر فرعون" کی بیٹی تھیں، لونڈی اور باندی نہیں تھیں، توراۃ کا ایک معتبر مفسر ربی شلوملو اسحقکتاب پیدائش باب ۱۶ آیت ا کی تفسیر میں لکھتا ہے ابث بر عه هاینا کشر انسیم شنعسو اساره امر تاب شتهابتی شفحه بیت زه و لو کبیره بیت اخیر۔ جب اس نے (رقیوں شاہ مصر نے) سارہ کی وجہ سے کرامات کو دیکھا تو کہا: میری بیٹی کا اس کے گھر میں لونڈی ہو کر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ ہو کر رہنے سے بہتر ہے۔ [2]

اس تفسیر اور تورات کی آیت کو جمع کرنے سے یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جاتی ہے کہ تورات میں ہاجرہ علیہا السلام کو صرف اسی لیے لونڈی کہا گیا کہ شاہ مصر نے ان کو سارہ اور ابراہیم علیہ السلام کے سپرد کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ وہ سارہ کی خدمت گزار رہے گی، یہ مطلب [3] نہ تھا کہ وہ لونڈی بمعنی "جاریہ" ہیں اس لیے کہ ربی شلوملو تصریح کرتا ہے کہ ہاجرہ فرعون مصر کی بیٹی تھیں۔

بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملک جبار کی جو روایت مذکور ہے اس میں بھی یہ جملہ موجود ہے اور ربی شلوملو کی تفسیر کی تائید کرتا ہے۔

واخدمها هاجره [4] اور ہاجرہ علیہا السلام کو سارہ علیہا السلام کے حوالہ کر دیا کہ ان کی خدمت گذار رہے اور اس لیے بنی اسرائیل کا یہ طعن کہ بنی اسماعیل ہم سے اس لیے کمتر ہیں کہ وہ لونڈی سے ہیں اور ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ علیہا السلام سے، صحیح نہیں ہے اور واقعہ اور تاریخ دونوں کے خلاف ہے اور جس طرح تورات کے دوسرے مضامین میں تحریف کی گئی ہے اسی طرح اس واقعہ میں بھی تحریف کی گئی ہے، اور واقعہ کی تمام تفصیلات کو حذف کر کے صرف "لونڈی" کا لفظ باقی رہنے دیا گیا ہے۔

ہاجرہ دراصل عبرانی لفظ "ہاغار" ہے جس کے معنی بیگانہ اور اجنبی [5] کے ہیں، ان کا وطن چونکہ مصر تھا اس لیے یہ نام پڑ گیا، لیکن اسی اصول کے پیش نظر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ "ہاغار" کے معنی "جدا ہونے والے" کے ہیں اور عربی میں "ہاجر" کے معنی بھی یہی ہیں، چونکہ اپنے وطن مصر سے جدا ہو کر یا ہجرت کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریک حیات اور حضرت سارہ علیہا السلام کی خدمت گذار بنیں اس لیے ہاجرہ کہلائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دو اہم مقام:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زیر عنوان بحث ختم کرنے سے قبل دو ایسے اہم مقامات کا ذکر کر دینا از بس ضروری ہے جن کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بہت گہرا تعلق ہے اور جو پیروان ملت ابراہیمی کے لیے "مقام بصیرت" کی حیثیت رکھتے اور مجد انبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیغمبرانہ عظمت و جلال کو تابندہ تر بناتے ہیں۔

---

[1] ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۱ [2] ایضاً [3] براهين باهره في حرية هاجره از مولانا غلام رسول چڑیا کوٹی
[4] بخاری، باب الانبیاء جلد ۶ ص ۳۰۱ [5] ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۰

Marfat.com

مقام اوّل:

سورۂ ممتحنہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک خاص دُعا کا تذکرہ ہو رہا ہے، وہ بارگاہ الٰہی میں دست طلب دراز کیے عجز و نیاز کے ساتھ یہ عرض کر رہے ہیں۔

﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (الممتحنہ: ۵)

"اے ہمارے پروردگار! ہم کو ان لوگوں کے لیے "فتنہ" نہ بنا جو کافر ہیں۔"

فتنہ "فتن" سے ماخوذ ہے، جب سونے کو اس لیے آگ میں تپاتے ہیں کہ کھوٹ اور میل جل کر خالص سونا باقی رہ جائے تو اس کے لیے "فتن الذہب" بولتے ہیں، اب اصطلاح میں امتحان اور آزمائش اور پرکھ کو کہتے ہیں اور اس لیے حضرت انسان پر جو شدائد و مصائب آتے ہیں وہ اس مناسبت سے "فتنہ" کہلاتے ہیں، قرآن حکیم نے بھی مال، اولاد اور منصب و جاہ کو اسی معنی کے پیش نظر "فتنہ" کہا ہے اور صاف صاف اعلان کیا ہے کہ صادق کاذب کی جانچ کے لیے "مومن" کو اس کسوٹی پر ضرور پرکھا جاتا ہے۔

﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝۲﴾ (العنکبوت: ۲)

"کیا لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ جو لوگ دعویٰ ایمان کرتے ہیں وہ یوں ہی چھوڑ دیئے جائیں گے اور آزمائے نہ جائیں گے۔"

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال: ۳۹)

"اور ان مشرکوں سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ مٹ جائے اور دین سب کا سب خالص اللہ کے لیے رہ جائے۔"

تو اب قابل توجہ ہے یہ بات کہ اس دُعا ابراہیمی کی مراد کیا ہے؟ اور وہ کافروں کے لیے فتنہ نہ بننے سے متعلق کیا خواہش رکھتے ہیں؟

اختلاف ذوق کے پیش نظر علماء حق نے اس سوال کو تین طرح سے حل کیا ہے لیکن ان تینوں حقیقتوں پر غائر نظر ڈالنے کے بعد بآسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ دُعا اپنی وسعت اور دقیق تعبیر کے لحاظ سے بیک وقت تینوں باتوں پر حاوی ہے۔

① حضرت ابراہیم علیہ السلام درگاہ رب العزت میں یہ دعا کر رہے ہیں "پروردگار عالم! مجھ کو وہ زندگی بخش کہ میرا قول و عمل اور میری رفتار و گفتار "اسوۂ حسنہ" کی تعبیر ہو، میں اگر ہادی بنوں تو اسوۂ حسنہ کا اور مجھ کو قیادت نصیب ہو تو رشد و ہدایت کی اور پھر اس پر استقامت عطا فرما، ایسا نہ ہو کہ میں اسوۂ سیئہ کا رہنما اور قائد بن جاؤں اور فردائے قیامت میں امت کے گمراہ کافر تیرے حضور مجھ کو یہ کہہ کر شرمندہ کریں۔

﴿رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝۶۷﴾ (الاحزاب: ۶۷)

"اے ہمارے پروردگار! اس میں ذرا شک نہیں ہے کہ ہم نے اپنے قائدین اور اپنے بڑوں کی پیروی اختیار کر لی تھی پس انہوں نے ہی ہم کو راہ سے بے راہ کیا۔"

Marfat.com

یعنی وہ خواہش رکھتے ہیں کہ اگر راہنمائی اور قیادت ان کا نصیب ہے تو پھر وہ اسوہ اور قدوہ چھوڑ کر جائیں کہ کل کے دن "اولیاء الرحمٰن" کے زمرہ میں جگہ ملے اور ان کی زندگی کا راز "اولیاء الشیطان" کے ساتھ عداوت بن جائے، آیت کا سیاق و سباق اس معنی کی پوری تائید کرتا ہے اس لیے کہ آیت سے قبل مشرکین کے مقابلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی پاکباز امت کے اس اعلان کا تذکرہ ہے۔

﴿ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ ﴾ (الممتحنة: ٤)

"اور ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت و بغض کا آغاز ہوگیا ہے تا آنکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔"

اور زیر بحث آیت کے بعد پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے پیرو "مومنین قانتین" کے اسوۂ حسنہ کا ذکر خیر ہے اور شروع سورۃ میں بھی ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کا ذکر موجود ہے۔

(۲) ابراہیم علیہ السلام اپنے ان جامع کلمات میں بارگاہ حق سے اس کے طالب ہیں کہ خدایا! تو ہم کو کافروں کے ہاتھوں آزمائش کے لیے نہ چھوڑ دینا کہ وہ ہم کو ایمان سے برگشتہ اور کفر کے قبول کرنے کے لیے طرح طرح کے مصائب و آلام کا شکار بنائیں اور جبر و ظلم کے ذریعہ راہ سے بے راہ بنانے پر آمادہ و دلیر ہو جائیں۔

اس معنی کا قرینہ یہ ہے کہ آیت زیر عنوان سے قبل یہ ذکر آ چکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی امت اجابت نے ذی اقتدار اور با اختیار کافر و مشرک جماعت کے سامنے جرأت حق کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ ہم تمہارے معتقدات کے قطعاً منکر ہیں "کفرنا بکم" اور ہمارے اور تمہارے درمیان اسلام کے انکار و اقرار اور قبول و عدم قبول کے لیے کھلا چیلنج ہے، تو اس صورت حال میں از بس ضروری تھا کہ ایک باخدا انسان، جلیل القدر پیغمبر، عظیم المرتبہ ہادی، اپنی انسانی کمزوریوں پر نظر رکھتے ہوئے درگاہ الٰہی میں دست بدعا ہو کر اے لازوال قدرت کے مالک! تو کسی طرح اور کسی حالت میں بھی کافروں کو ہم پر غلبہ عطا نہ فرما اور کافر کسی شکل میں بھی ہم پر ایسے قابو یافتہ نہ ہو سکیں کہ ایمان و کفر سے متعلق ہمارا یہ اعلان جنگ ہمارے لیے باعث امتحان و فتنہ بن جائے اور مشرک کو کفر کی جانب واپس لانے کی جرأت بے جا کر سکیں۔

(۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام اس مقام پر فتنہ کہہ کر "عذاب" مراد لیتے ہیں اس لیے کہ فتنہ کی مختلف شکلوں میں سے ایک بھیانک شکل یہ بھی ہے، اور عرض کرتے ہیں، پروردگار ہم کو ایسی حالت پر کبھی نہ پہنچانا کہ ہم کافروں اور مشرکوں کے ہاتھوں طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہو جائیں اور نتیجہ یہ نکلے کہ اپنی پستی، نکبت، ذلت و غلامی اور دشمنوں کی دنیوی عزت و جاہ عروج و ترقی، اور حاکمانہ اقتدار کو دیکھ دیکھ کر یہ کہہ اٹھیں کہ اگر ہم حق پر ہوتے تو اس ذلت و خسران میں نہ ہوتے اور اگر شرک و کفر خدا کی نگاہ میں مبغوض ہوتا تو ان کافر اور مشرک جماعتوں کو یہ عزت و جاہ اور یہ فروغ حاصل نہ ہوتا یعنی ہم سے حق و باطل کا امتیاز ہی اٹھ جائے پس ایسے فتنہ سے ہمیشہ ہمیشہ محفوظ رکھ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا یہ پہلو ہمارے لیے صد ہزار سامان عبرت و بصیرت رکھتا ہے اس لیے کہ گذشتہ ڈیڑھ صدی سے خصوصیت کے ساتھ اسلامی دنیا اپنی خود ساختہ غیر اسلامی روش کی بدولت جس طرح غیر اسلامی اقتدار، حاکمانہ جبر اور پنجہ استبداد

Marfat.com

کے نیچے دبی ہوئی ہے اور ہر طرح بیچارہ و مجبور نظر آتی ہے اس نے ہم کو اس درجہ حقیر و ذلیل بنا دیا ہے کہ ہم سے ہمارے قوائے فکر و عمل بھی مفقود ہو چکے ہیں اور احساس کمتری میں مبتلا ہو کر ہم بے خوف و خطر یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اسلام نہ خدا پرستی کا نام ہے اور نہ عقائد و اعمال صالحہ کی زندگی کا بلکہ صرف مادی قوت و شوکت (حکومت) اور اس کے ذریعہ حصول عیش و عشرت کا دوسرا نام "مذہب" یا "اسلام" ہے اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اس مادی قوت کے حصول کے لیے ڈسپلن اور ضبط و نظم کے لیے صرف ایک طریق کار ہیں نہ کہ مقصد حیات ملی، اور صرف یہی حقیقت ہے اس "جنت" کی جس کا وعدہ ارباب حق کے لیے قرآن میں کیا گیا ہے۔ پس اگر یہ حاصل نہیں تو پھر اس کا دوسرا نام "جہنم" ہے اور وعدہ آخرت، بعثت و حشر اور جنت و جہنم سب محض فرضی تخیلات ہیں جو کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوں گے۔ (العیاذ باللہ)

اور یہ کہ جن قوموں کو دنیا میں اقتدار اور طاقت اور اس کے ذریعہ عیش و عشرت حاصل ہے قرآن میں مذکور حقیقی مومن وہی ہیں اور وہی اس طغرائے امتیاز کے مستحق، نہ کہ وہ خدا پرست مسلمان جو اس دولت سے محروم اور مجبور ہیں، چنانچہ کتاب "تذکرہ" [1] اسی خیال کی صدائے بازگشت ہے اور دین حق (اسلام) کی تعلیم سے نا آشنا اور مادیت سے مرعوب اکثر نوجوانان قوم کے بیباک خیالات اور ملحدانہ جذبات اسی پست اور شکست خوردہ ذہنیت کے آئینہ دار ہیں، یہی وہ خوفناک حقیقت ہے جس کے تصور نے مرکز وحدت، کعبہ کے مؤسس، ملت ابراہیمی کے داعی، دین حق کے مبلغ اور خدا کے مقدس رسول، ابراہیم علیہ السلام کو لرزہ براندام کر دیا اور انہوں نے عجز و زاری کے ساتھ اس ناپاک زندگی سے محفوظ رہنے کے لیے حضرت حق کے سامنے دست طلب دراز کیا کہ ہم پر وہ وقت کبھی نہ آئے کہ کفر کی شوکت و طاقت اس طرح کچل ڈالے کہ پرستاران توحید اس سخت اور کڑی آزمائش میں مبتلاء ہو کر حق و باطل کے درمیان امتیاز بھی کھو بیٹھیں۔

﴿ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَ اِلَيْكَ اَنَبْنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ اغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ﴾ (الممتحنة: ٤-٥)

"اے ہمارے رب تجھ ہی پر ہمارا بھروسہ ہے، اور تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں، اور تیرے ہی حضور میں (ہمیں) لوٹ جانا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم کو کافروں کے ہاتھ سے عذاب نہ دلانا، اور اے پروردگار ہمارے ہمیں معاف فرما بیشک تو غالب حکمت والا ہے۔"

مقام ثانی:

سورہ شعراء میں بہ سلسلہ عبرت و بصیرت، انبیاء علیہم السلام کی دعوت رشد و ہدایت کا جو ذکر ہو رہا ہے، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی تذکرہ ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کو توحید الٰہی کی تلقین اور شرک و کفر سے بیزاری و نفرت کی ترغیب دلا رہے ہیں، اسی حالت میں وہ توحید ذات و صفات کا ذکر خیر کرتے ہوئے یک بیک خدائے واحد کی جانب دست بدعا ہو جاتے ہیں، گویا ایک دوسرے رنگ میں قوم کو اللہ رب العالمین کا پرستار بنانے کی سعی فرما رہے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام دعا کرتے کرتے درگاہ

[1] مصنفہ علامہ مشرقی

Marfat.com

ایزدی میں عرض کرتے ہیں ﴿وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ﴾ "پروردگار! اور جس روز لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے تو اس دن مجھ کو رسوا نہ کرنا۔

اس آیت کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی الجامع الصحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث نقل فرمائی ہے کتاب التفسیر میں مختصر اور کتاب الانبیاء میں تفصیل کے ساتھ منقول ہے۔ کتاب التفسیر میں منقول حدیث کا ترجمہ یہ ہے:

"حضرت ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن اپنے والد کو پراگندہ حال اور روسیاہ دیکھیں گے تو فرمائیں گے: "پروردگار! دنیا میں تو نے میری اس دعا کو قبول فرمالیا تھا ﴿وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ﴾ (یعنی پھر یہ رسوائی کیسی کہ میدان حشر میں اپنے باپ کو اس حال میں دیکھ رہا ہوں) اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا ابراہیم! میں نے کافروں پر جنت کو حرام کر دیا ہے"۔

اور کتاب الانبیاء میں یہ روایت ان اضافات کے ساتھ مذکور ہے۔

"جب قیامت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کو پراگندہ حال اور روسیاہ دیکھیں گے تو باپ سے مخاطب ہو کر فرمائیں گے: "کیا میں نے بارہا تجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ میری راہ ہدایت کی مخالفت نہ کر" آزر کہے گا! "جو ہوا سو ہوا آج کے دن سے میں تیری مخالفت نہیں کروں گا" تب حضرت ابراہیم علیہ السلام درگاہِ الٰہی میں عرض رسا ہوں گے: "پروردگار! تو نے میری اس دعا کو قبول فرمالیا تھا ﴿وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ﴾ مگر اس سے زیادہ رسوائی اور کیا ہوگی کہ میرا باپ (آزر) تیری رحمت سے انتہائی دور ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا "میں نے بلاشبہ کافروں پر جنت کو حرام کر دیا ہے" پھر ہاتف غیبی آواز دے گا (اور بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی پکارے گا) ابراہیم! قدموں کے نیچے دیکھ کیا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام دیکھیں گے کہ گندگی میں لتھڑا ہوا ایک بجو پیروں میں پڑا لوٹ رہا ہے، تب فرشتے ٹانگوں سے پکڑ کر جہنم میں اس کو پھینک دیں گے۔"

مختصر حدیث میں قیامت کے دن آزر کی ہیئت کذائی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ تو ٹھیک قرآن عزیز سورۂ عبس کی اس آیت کی تفسیر ہے جس میں قیامت کے دن کافروں کی یہ حالت بیان کی گئی ہے:

﴿وَوُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝﴾ (عبس: ۴۰-۴۲)

"اور کتنے (لوگوں کے) منہ اس دن (ایسے) ہوں گے کہ ان پر گرد پڑی ہوگی اور ان پر کلونس چھا رہی ہوگی، یہی وہ (لوگ) ہیں جو (دنیا میں) کافر اور بدکار ہیں۔

اور سورۂ یونس میں مومنوں اور اصحاب جنت کے لیے اسی حالت کی نفی کی گئی ہے۔

﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ۭ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ۭ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ (یونس: ۲۶)

"جن لوگوں نے دنیا میں بھلائی کی ان کے لیے (آخرت میں بھی) بھلائی ہے اور کچھ بڑھ کر بھی اور گنہگاروں کی طرح ان کے منہ پر نہ کلونس چھائی ہوئی ہوگی اور نہ ذلت، یہی ہیں جنتی کہ وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔"

طویل حدیث میں دو نئی باتیں کہی گئی ہیں ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آزر کی یہ حالت دیکھ کر درگاہِ الٰہی میں مسطورہ بالا دعا کا ذکر کریں گے جو انبیاء علیہم السلام کی دعاؤں کی طرح شرف قبول حاصل کر چکی ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ باپ کی یہ رسوائی دراصل میری رسوائی ہے، دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آزر کو بجو کی شکل میں مسخ کر دیا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے اجزاء پر بحث کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آزر کو اس لیے مسخ کر دے گا تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ حزن وملال جاتا رہے جو آزر کے بشکل انسان رہنے کی صورت میں ناری اور جہنمی ہونے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا اور وہ اس کی اس ہیئت کذائی کو دیکھ کر متنفر ہو جائیں اور فطرت ابراہیمی اس سے بیزار ہو جائے۔

اور بجو کی شکل میں مسخ ہو جانے کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ ماہرین علم الحیوانات کے نزدیک بجو گندہ بھی ہے اور درندوں میں احمق بھی تو چونکہ آزر بھی بت پرست ہونے کی وجہ سے نجاست میں ملوث تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیش کردہ آیات بینات اور توحید الٰہی کے روشن دلائل و براہین کے نہ قبول کرنے کی بناء پر احمق بھی تھا اس لیے قانون الٰہی "پاداش عمل از جنس عمل" کے پیش نظر اسی کا مستحق تھا کہ ایک احمق اور نجس درندہ کی شکل میں مسخ کر دیا جائے۔

مگر مشہور محدث اسمٰعیلی اس روایت ہی کو مجروح اور لائق طعن سمجھتے اور صحت سند کے اعتراف کے باوجود "سقم درایت" کی بناء پر اس کو قبول نہیں کرتے، وہ فرماتے ہیں:

> "اس حدیث میں یہ "سقم" ہے کہ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ وہ العیاذ باللہ خدائے برتر کے متعلق "خلف وعدہ" کا شک کرتے تھے، تب ہی تو یہ سوال کیا؟ حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اولوالعزم انبیاء میں سے ہیں اور وہ بلاشبہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی ہرگز نہیں کرتا ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ﴾ لہٰذا ابراہیم علیہ السلام کی جانب ایسی بات کی نسبت کرنا قطعاً درست نہیں، وہ کسی طرح بھی آزر کی مشرکانہ زندگی و موت کے علم ہوتے ہوئے ایسا سوال نہیں کر سکتے۔"

اسماعیلی کے علاوہ بعض دوسرے محدثین نے بھی اس تفصیلی روایت پر جرح کی ہے، وہ کہتے ہیں:

یہ روایت بظاہر قرآن کے خلاف ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَمَا كَانَ اسۡتِغۡفَارُ اِبۡرٰهِيۡمَ لِاَبِيۡهِ اِلَّا عَنۡ مَّوۡعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ‌ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنۡهُ‌ ؕ اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيۡمٌ ۝﴾ (التوبہ: ۱۱۴)

> "اور (وہ جو) ابراہیم نے اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا مانگی تھی سو (وہ) ایک وعدہ (کی وجہ) سے مانگی تھی جو ابراہیم نے اپنے باپ سے کر لیا تھا، پھر ان کو جب معلوم ہو گیا کہ یہ دشمن خدا ہے تو باپ سے (مطلقاً) دست بردار ہو گئے، بیشک ابراہیم علیہ السلام البتہ بڑے نرم دل اور بردبار تھے۔"

یہ آیت ناطق ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو دنیا ہی میں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا باپ آزر حیات کے آخری لمحہ تک خدا کا دشمن ہی رہا اور اسی پر اس کی موت ہوئی اس لیے انہوں نے دنیا ہی میں اس سے اپنی بیزاری اور بے تعلقی کا اعلان کر دیا تھا اور بتلا دیا تھا کہ

خلیل الرحمٰن کو عدو الرحمٰن کے ساتھ کسی قسم کا واسطہ نہیں ہوسکتا۔
پس اس صورت حال کے بعد روایت کا یہ مضمون کس طرح صحیح ہوسکتا ہے؟
حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ مسطورہ بالا دونوں جرح کو نقل کرنے کے بعد ان کا جواب اس طرح دیتے ہیں:

"حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ آزر سے اظہار بیزاری کس وقت پیش آیا؟ اس سلسلہ میں دو روایات منقول ہیں، ایک حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن جریر نے بسند صحیح اس طرح روایت کی ہے کہ جب آزر کا بحالت شرک و کفر انتقال ہوگیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یقین ہوگیا کہ وہ دشمن خدا ہو کر مرا لہٰذا انہوں نے آزر سے جو وعدۂ استغفار کیا تھا اب اس کو ترک کر دیا اور اس سے اظہار بیزاری کر دیا۔"

اور دوسری روایت کہ وہ بھی ابن جریر ہی نے روایت کی ہے، یہ ہے:

"ابراہیم علیہ السلام کی "تبریٰ" (آزر سے اظہار بیزاری) کا یہ معاملہ دنیا میں نہیں قیامت کے دن پیش آئے گا اور اسی طرح پیش آئے گا جیسا کہ مسطورۂ بالا تفصیلی روایت میں مذکور ہے یعنی جب آزر مسخ کر دیا گیا تو ابراہیم علیہ السلام نے یقین کر لیا کہ اب استغفار کی قطعاً گنجائش باقی نہیں رہی۔

نقد و جرح کے اصول کو پیش نظر رکھ کر دونوں روایات کے درمیان تطبیق کی شکل یہ ہے کہ اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دنیا ہی میں آزر کی مشرکانہ موت کے پیش نظر اس سے اظہار بیزاری کر دیا تھا لیکن جب میدان حشر میں باپ کی زبوں حالت کو دیکھا تو صفت رافت و رحمت جوش میں آ گئی اور بہ تقاضائے فطرت انہوں نے پھر طلب مغفرت پر اقدام کیا مگر جب اللہ تعالیٰ نے آزر کو مسخ کر دیا تب ابراہیم اس کے انجام سے مایوس ہوگئے اور سمجھ گئے کہ اس کی مغفرت کی قطعاً کوئی صورت نہیں ہے لہٰذا دوسری مرتبہ اس دار و گیر کے دن بھی "تبریٰ" کا اعلان فرمایا۔ ✽ (انتہٰی)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ قرآن عزیز نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نمایاں خصوصیات میں سے اس صفت کا بھی اعلان کیا ہے ﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝﴾ چنانچہ اس کے مختلف مظاہر میں سے ایک مظہر یہ بھی ہے کہ آزر کی شرک پر موت اور ابراہیم علیہ السلام کے دنیا ہی میں اس سے اظہار تبریٰ کے باوجود کہ جس کا ذکر قرآن عزیز کی سورۂ توبہ میں موجود ہے جب وہ فردائے قیامت میں آزر کو اس زبوں حال میں دیکھیں گے۔ ﴿غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝﴾ تو ان کی رافت و رحمت جوش میں آ جائے گی اور اولوالعزم پیغمبر کی طرح حقیقت حال سے باخبر رہتے ہوئے بھی ان کی صفات کریمانہ کا اس درجہ فطری غلبہ برسرکار آ جائے گا کہ وہ آزر کے لیے طلب مغفرت پر آمادہ ہو جائیں گے اور یہ دیکھ کر کہ آزر کی مشرکانہ زندگی کا کوئی پہلو بھی ایسا نہیں ہے کہ اس کو حیلہ شفاعت بنایا جا سکے ابراہیم علیہ السلام اپنی اس دعا کی پناہ لیں گے جو دنیا ہی میں قبولیت کا شرف دوام حاصل کر چکی تھی اور باپ کی رسوائی کو اپنی رسوائی ظاہر کر کے درگاہ حق میں اس وعدہ کا ذکر کریں گے، لیکن اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں یہ فرما کر کہ "کافر پر میں نے جنت کو حرام کر دیا ہے" ابراہیم علیہ السلام کو اس جانب توجہ دلائے گا کہ اپنی اس فطری رافت و رحمت کے باوجود تم کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ دنیائے عمل نہیں بلکہ روز جزاء ہے اور آج "میزان عدل قائم ہے جس کے لیے ہمارا یہ غیر متبدل قانون ابدیت کا

✽ جلد ۸ کتاب التفسیر

Marfat.com

شرف حاصل کر چکا ہے کہ کافر و مشرک کے لیے جنت میں کوئی جگہ نہیں اور یہ کہ "مشرک کی رسوائی" ہرگز "مومن کی رسوائی" کا باعث نہیں ہو سکتی خواہ ان دونوں کے درمیان علاقہ دنیوی کے مضبوط رشتے ہی کیوں نہ قائم رہے ہوں، اور ساتھ ہی حکمت الٰہی ایسی صورت حال پیدا کر دے گی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حزن و ملال کا وہ اثر ہی باقی نہ رہے گا جس کی وجہ سے ان کے فطری ملکات نے طلب مغفرت پر آمادہ کیا تھا چنانچہ آزر کو درندہ کی شکل میں مسخ کر دیا جائے گا جس کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پاک اور سلیم فطرت اس کو دیکھ کر نفرت و کراہت کرنے لگے گی۔

غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ سوال اس لیے نہ تھا کہ وہ العیاذ باللہ اس صورت حال کو "خلف وعد" سمجھ رہے تھے بلکہ ایک فطری تقاضے کے پیش نظر تھا جو اگرچہ نتائج و ثمرات کو تو نہیں بدل سکتا مگر اس شخصیت کے ملکات حسنہ اور اوصاف کریمانہ کے نمایاں کرنے کا باعث ضرور بن جاتا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ جواب اگرچہ اسمٰعیلی اور بعض دوسرے محدثین کے طعن و جرح کو بلاشبہ بڑی حد تک ہلکا کر دیتا ہے تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول بخاری کی مختصر حدیث کے علاوہ طویل حدیث کے بعض اجزاء ضرور محل نظر ہیں تب ہی تو غالباً حافظ حدیث عماد الدین ابن کثیر نے ان روایات کو اپنی تفسیر میں نقل کرنے کے بعد مختصر حدیث کو قبول کرتے ہوئے بخاری کی کتاب الانبیاء والی طویل حدیث پر "تفرد" کا اور نسائی کی حدیث پر "غرابت" و "نکارت" کا حکم لگایا ہے، مشہور محدث کرمانی نے بھی اس مسئلہ کو سوال و جواب کی شکل میں پیش کر کے اس کے حل کرنے کی سعی فرمائی ہے جو اپنی جگہ قابل مراجعت ہے۔ [1]

[1] فتح الباری جلد ۸ کتاب الانبیاء۔

Marfat.com

حضرت اسماعیل علیہ السلام

اسماعیل علیہ السلام کی ولادت:

حضرت ابراہیم علیہ السلام ابھی تک اولاد سے محروم تھے اور ان کے گھر کا مالک ایک خانہ زاد الیعزر دمشقی تھا، ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں فرزند کے لیے دُعا کی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمالیا اور ان کو تسلی دی۔

"ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے خداوند خدا تو مجھ کو کیا دے گا میں تو بے اولاد ہوا جاتا ہوں اور میرے گھر کا مختار الیعزر ہے پھر ابرام نے کہا کہ تو نے مجھے فرزند نہ دیا، اور دیکھ میرا خانہ زاد میرا وارث ہوگا، ❶ تب خداوند کا کلام اس پر اترا اور اس نے کہا کہ یہ تیرا وارث نہیں ہونے کا بلکہ جو تیری صلب سے پیدا ہو وہی تیرا وارث ہوگا"۔

اور یہ دعا اس طرح قبول ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چھوٹی بی بی حضرت ہاجرہ علیہا السلام حاملہ ہوئیں۔

"اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی"۔ ❷

جب حضرت سارہ علیہا السلام کو یہ پتہ چلا تو انہیں بہ تقاضائے بشریت ہاجرہ علیہا السلام سے رشک پیدا ہو گیا اور انہوں نے حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو تنگ کرنا شروع کر دیا، حضرت ہاجرہ علیہا السلام مجبور ہو کر ان کے پاس سے چلی گئیں۔

اور خداوند کے فرشتے نے اسے میدان میں پانی کے ایک چشمہ کے پاس پایا یعنی اس چشمہ کے پاس جو صور کی راہ پر ہے اور اس نے کہا کہ اے سری کی لونڈی ہاجرہ تو کہاں سے آئی؟ اور کدھر جاتی ہے؟ وہ بولی کہ میں اپنی بی بی سری کے سامنے سے بھاگی ہوں، اور خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ تو اپنی بی بی کے پاس پھر جا اور اس کے تابع رہ، پھر خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے اور خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ تو حاملہ ہے، اور ایک بیٹا جنے گی، اس کا نام اسماعیل رکھنا کہ خداوند نے تیرا دکھ سن لیا اور وہ وحشی (بدوی) آدمی ہوگا اور اس کا ہاتھ سب کے ہاتھ اور سب کا ہاتھ اس کے برخلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بود و باش کرے گا۔ ❸

حضرت ہاجرہ علیہا السلام جس مقام پر فرشتہ سے ہمکلام ہوئیں اس جگہ ایک کنواں تھا، ہاجرہ علیہا السلام نے یادگار کے طور پر اس کا نام "زندہ نظر آنے والے کا کنواں" رکھا، تھوڑے عرصہ کے بعد ہاجرہ علیہا السلام کا بیٹا پیدا ہوا اور فرشتہ کی بشارت کے مطابق اس کا نام اسمٰعیل رکھا گیا۔

"اور ہاجرہ (علیہا السلام) ابرام کے لیے بیٹا جنی اور ابرام نے اپنے اس بیٹے کا نام جو ہاجرہ جنی اسمٰعیل رکھا اور جب ابرام کے لیے

---

❶ تورات پیدائش باب ۱۵ آیت ۲۔۴ ❷ ایضاً باب ۱۶ آیت ۴ ❸ تورات پیدائش باب ۱۶ آیت ۷۔۱۲

Marfat.com

ہاجرہ سے اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا۔"

اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کے بعد ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام کی بشارت دی جیسا کہ ابھی مفصل ذکر آئے گا، مگر ابراہیم علیہ السلام نے اس بشارت پر چنداں مسرت کا اظہار نہیں کیا اور اس کی جگہ یہ دعا مانگی۔

"اور ابرام نے خدا سے کہا کہ کاش اسماعیل تیرے حضور جیتا رہے" اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کا یہ جواب دیا۔

"اسماعیل علیہ السلام کے حق میں میں نے تیری سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا، اور اسے برومند کروں گا، اور اس کو بہت بڑھاؤں گا، اور اس کے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔" اسماعیل "اسمع" اور "ایل" دو لفظوں سے مرکب ہے، عبرانی میں "ایل" اللہ کے مرادف ہے اور عربی کے اسمع اور عبرانی کے شماع کے معنی ہیں "سن" چونکہ اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سن لی اور ہاجرہ کو فرشتہ سے بشارت ملی اس لیے ان کا یہ نام رکھا گیا، عبرانی میں اس کا تلفظ "شماع ایل" ہے۔

وادی غیر ذی زرع اور ہاجرہ و اسماعیل علیہما السلام:

حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے بطن سے اسماعیل کا پیدا ہو جانا حضرت سارہ علیہا السلام پر بے حد شاق گذرا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اور بڑی بیوی، قدیم سے گھر کی مالکہ ہاجرہ چھوٹی بیوی اور ان کی خدمت گذار، یہ سب باتیں تھیں جنہوں نے بشری تقاضے کے پیش نظر اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کو حضرت سارہ علیہا السلام کے لیے سوہان روح بنا دیا تھا، اس لیے سارہ علیہا السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اصرار کیا کہ ہاجرہ علیہا السلام اور اس کا بچہ اسماعیل علیہ السلام میری نگاہ کے سامنے نہ رہیں، ان کو علیحدہ کسی جگہ لے جاؤ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ اصرار بے حد ناگوار گزرا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو مطلع کیا کہ ہاجرہ، اسماعیل تیرے لیے مصلحت اسی میں ہے کہ سارہ جو کچھ کہتی ہے اس کو مان لے۔

اور سرہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو وہ ابراہیم علیہ السلام سے جنی تھی ٹھٹھے مارتا ہے تب اس نے ابراہام سے کہا کہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اسحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا، پھر اپنے بیٹے کی خاطر یہ بات ابراہیم علیہ السلام کی نظر میں نہایت بری معلوم ہوئی خدا نے ابراہام سے کہا کہ وہ بات اس لڑکے اور تیری لونڈی کی بابت تیری نظر میں بری نہ معلوم ہو، ہر ایک بات کے حق میں جو سرہ نے تجھے کہی اس کی آواز پر کان رکھ، کیونکہ تیری نسل اضحاق سے کہلائے گی، اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی ایک قوم پیدا کروں گا، اس لیے کہ وہ تیری نسل ہے۔

تورات کی اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہو چکے تھے، اس لحاظ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام سن رشد کو پہنچ چکے ہوں گے کیونکہ تورات کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام سے تیرہ سال بڑے ہیں۔

ایضاً باب ۱۶ آیت ۱۵، ۱۶ ✿ ایضاً باب ۱۷ آیت ۱۸ ✿ ایضاً باب ۱۷ آیت ۲۰
✿ تورات پیدائش ۲۱ آیت ۹، ۱۳

Marfat.com

لیکن اسی واقعہ میں تورات کی دوسری آیات مسطورۂ بالا آیات کے خلاف یہ کہتی ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ابھی شیر خوار بچہ تھے۔

”تب ابراہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ کو اس کے کاندھے پر دھر کر دی اور اس کے لڑکے کو بھی اور اسے رخصت کیا، وہ روانہ ہوئی اور بیر سبع کے بیابان میں بھٹکتی پھرتی تھی، اور جب مشک کا پانی چک گیا تب اس نے اس لڑکے کو ایک پہاڑی کے نیچے ڈال دیا اور آپ اس کے سامنے ایک پتھر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی کیونکہ اس نے کہا کہ میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں۔“ ❶

اس لیے تورات کے ان مخالف و متضاد بیانات کے مقابلہ میں صحیح قول یہ ہے کہ ہاجرہ و اسماعیل علیہما السلام کے خروج کے وقت اسماعیل علیہ السلام شیر خوار بچہ تھے اور اسحاق علیہ السلام ابھی تک پیدا نہیں ہوئے تھے۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت منقول ہے وہ بھی اسی قول کی تائید کرتی ہے، اس روایت کا مضمون یہ ہے:

”ابراہیم، ہاجرہ اور اس کے شیر خوار بچہ اسماعیل علیہ السلام کو لے کر چلے اور جہاں آج کعبہ ہے اس جگہ ایک بڑے درخت کے نیچے زمزم کے موجودہ مقام سے بالائی حصہ پر ان کو چھوڑ گئے، وہ جگہ ویران اور غیر آباد تھی اور پانی کا بھی نام ونشان نہ تھا، اس لیے ابراہیم علیہ السلام نے ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلی کھجور بھی ان کے پاس چھوڑ دیں اور پھر منہ پھیر کر روانہ ہو گئے، ہاجرہ علیہا السلام ان کے پیچھے پیچھے یہ کہتی ہوئی چلیں اے ابراہیم! تم ہم کو ایسی وادی میں کہاں چھوڑ کر چل دیئے جہاں نہ آدمی ہے نہ آدم زاد اور نہ کوئی مونس و غمخوار، ہاجرہ برابر یہ کہتی جاتی تھیں مگر ابراہیم علیہ السلام خاموش چلے جا رہے تھے آخر ہاجرہ علیہا السلام نے دریافت کیا، کیا تیرے خدا نے تجھ کو یہ حکم دیا ہے؟ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ”ہاں، یہ خدا کے حکم سے ہے“ ہاجرہ علیہا السلام نے جب یہ سنا تو کہنے لگیں، اگر یہ خدا کا حکم ہے تو بلاشبہ وہ ہم کو ضائع اور برباد نہیں کرے گا، اور پھر واپس لوٹ آئیں، ابراہیم علیہ السلام چلتے چلتے جب ایک ٹیلہ پر ایسی جگہ پہنچے کہ ان کے اہل وعیال نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو اس جانب جہاں کعبہ ہے رخ کیا اور ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی:

﴿رَبَّنَآ اِنِّیْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ ۝﴾ (ابراھیم: ۳۷)

”اے ہم سب کے پروردگار! (تو دیکھ رہا ہے کہ) ایک ایسے میدان میں جہاں کھیتی کا نام ونشان نہیں، میں نے اپنی بعض اولاد تیرے محترم گھر کے پاس لا کر بسائی ہے کہ نماز قائم رکھیں (تاکہ یہ محترم گھر عبادت گزارانِ توحید سے خالی نہ رہے) پس تو (اپنے فضل وکرم سے) ایسا کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں اور ان کے لیے زمین کی پیداوار سے سامان رزق مہیا کر دے تاکہ تیرے شکر گزار ہوں۔“

ہاجرہ چند روز تک مشکیزہ سے پانی اور خورجی سے کھجوریں کھاتی اور اسماعیل علیہ السلام کو دودھ پلاتی رہیں، لیکن وہ وقت بھی آ گیا کہ پانی رہا نہ کھجوریں تب وہ سخت پریشان ہوئیں، چونکہ وہ بھوکی پیاسی تھیں اس لیے دودھ بھی نہ اترتا تھا اور بچہ بھی بھوکا پیاسا رہا،

❶ ایضاً پیدائش ۲۱ آیت ۱۴، ۱۶

Marfat.com

جب حالت دگرگوں ہونے لگی اور بچہ بیتاب ہونے لگا تو ہاجرہ، اسماعیل علیہ السلام کو چھوڑ کر دور جا بیٹھیں تا کہ اس حالت زار میں اس کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں، کچھ سوچ کر قریب کی پہاڑی صفا پر چڑھیں کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ نظر آ جائے یا پانی نظر آ جائے مگر کچھ نظر نہ آیا، پھر بچہ کی محبت میں دوڑ کر وادی میں آ گئیں، اس کے بعد دوسری جانب کی پہاڑی مروہ پر چڑھ گئیں، اور وہاں بھی جب کچھ نظر نہ آیا تو پھر تیزی سے لوٹ کر وادی میں بچہ کے پاس آ گئیں، اور اس طرح سات مرتبہ کیا نبی اکرم ﷺ نے اس مقام پر پہنچ کر فرمایا کہ یہی وہ "سعی بین الصفا والمروۃ" ہے جو حج میں لوگ کرتے ہیں، آخر میں جب وہ مروہ پر تھیں تو کانوں میں ایک آواز آئی، چونکیں اور دل میں کہنے لگیں کہ کوئی پکارتا ہے کان لگایا تو پھر آواز آئی، ہاجرہ کہنے لگیں اگر تم مدد کر سکتے ہو تو سامنے آؤ تمہاری آواز سنی گئی، دیکھا تو خدا کا فرشتہ (جبریل علیہ السلام) ہے، فرشتہ نے اپنا پیر (یا ایڑی) اس جگہ مارا جہاں زمزم ہے، اس جگہ سے پانی اُبلنے لگا، ہاجرہ علیہا السلام نے یہ دیکھا تو پانی کے چاروں طرف باڑ بنانے لگیں مگر پانی برابر اُبلتا رہا، اس جگہ پہنچ کر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ اُم اسماعیل پر رحم کرے، اگر وہ زمزم کو اس طرح نہ روکتیں اور اس کے چار جانب باڑھ نہ لگاتیں تو آج وہ زبردست چشمہ ہوتا۔

ہاجرہ علیہا السلام نے پانی پیا اور پھر اسماعیل علیہ السلام کو دودھ پلایا، فرشتہ نے ہاجرہ سے کہا خوف اور غم نہ کر، اللہ تعالیٰ تجھ کو اور اس بچہ کو ضائع نہ کرے گا۔ یہ مقام "بیت اللہ" ہے جس کی تعمیر اس بچہ (اسماعیل علیہ السلام) اور اس کے باپ ابراہیم علیہ السلام کی قسمت میں مقدر ہو چکی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اس خاندان کو ہلاک نہیں کرے گا، بیت اللہ کی یہ جگہ قریب کی زمین سے نمایاں تھی مگر پانی کا سیلاب داہنے بائیں اس حصہ کو برابر کرتا جا رہا تھا، اسی دوران میں ہی بنی جرہم کا ایک قبیلہ اس وادی کے قریب آ کر ٹھہرا، دیکھا تو تھوڑے سے فاصلہ پر پرندا اُڑ رہے ہیں، جرہم نے کہا یہ پانی کی علامت ہے، وہاں ضرور پانی موجود ہے، جرہم نے بھی قیام کی اجازت مانگی، ہاجرہ علیہا السلام نے فرمایا قیام کر سکتے ہو، لیکن پانی میں ملکیت کے حصہ دار نہیں ہو سکتے، جرہم نے یہ بات بخوشی منظور کر لی اور وہیں مقیم ہو گئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہاجرہ علیہا السلام خود بھی باہمی انس و رفاقت کے لیے یہ چاہتی تھیں کہ کوئی یہاں آ کر مقیم ہو، اس لیے انہوں نے مسرت کے ساتھ بنی جرہم کو قیام کی اجازت دے دی۔ جرہم نے آدمی بھیج کر اپنے باقی ماندہ اہل خاندان کو بھی بلا لیا اور یہاں مکانات بنا کر رہنے سہنے لگے، ان ہی میں اسماعیل علیہ السلام بھی رہتے اور کھیلتے اور ان سے ان کی زبان سیکھتے، جب اسماعیل علیہ السلام بڑے ہو گئے تو ان کا طرز و انداز اور ان کی خوبصورتی بنی جرہم کو بہت بھائی اور انہوں نے اپنے خاندان کی لڑکی سے ان کی شادی کر دی، اس کے کچھ عرصہ کے بعد ہاجرہ علیہا السلام کا انتقال ہو گیا، ابراہیم علیہ السلام برابر اپنے اہل و عیال کو دیکھنے آتے رہتے تھے، ایک مرتبہ تشریف لائے تو اسماعیل علیہ السلام گھر پر نہ تھے ان کی اہلیہ سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ روزی کی تلاش میں باہر گئے ہیں ابراہیم علیہ السلام نے دریافت کیا، گذران کی کیا حالت ہے؟ وہ کہنے لگی، سخت مصیبت و پریشانی میں ہیں اور سخت دکھ و تکلیف میں، ابراہیم علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا اسماعیل سے میرا سلام کہہ دینا اور کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ تبدیل کر دو، اسماعیل علیہ السلام واپس آئے تو ابراہیم علیہ السلام کے نور نبوت کے اثرات پائے، پوچھا کہ کوئی شخص یہاں آیا تھا، بی بی نے سارا قصہ سنایا اور پیغام بھی، اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کا یہ مشورہ ہے کہ میں تجھ کو طلاق دے دوں، لہٰذا میں تجھ کو جدا کرتا ہوں۔

اسماعیل علیہ السلام نے پھر دوسری شادی کر لی، ایک مرتبہ ابراہیم علیہ السلام پھر اسماعیل علیہ السلام کی غیبت میں آئے اور اسی طرح ان کی بی بی سے سوالات کیے، بی بی نے کہا خدا کا شکر و احسان ہے، اچھی طرح گذر رہی ہے، دریافت کیا کھانے کو کیا ملتا ہے؟ اسماعیل علیہ السلام

Marfat.com

کی بی بی نے جواب دیا، گوشت، ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا اور پینے کو؟ اس نے جواب دیا، پانی، تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی:

"اللہ تعالیٰ ان کے گوشت اور پانی میں برکت عطا فرما"۔

اور چلتے ہوئے پیغام دے گئے کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ کو محفوظ رکھنا، حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو ان کی بی بی نے تمام واقعہ دہرایا اور پیغام بھی سنایا، اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کا پیغام یہ ہے کہ تو میری زندگی بھر رفیقۂ حیات رہے۔ (الخ)

یہ طویل روایت بخاری کتاب الرویاء اور کتاب الانبیاء میں دو جگہ منقول ہے اور دونوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی سرزمین) یعنی مکہ میں بحالت شیر خوارگی پہنچے تھے۔

مگر سید سلیمان ندوی، ارض القرآن میں تورات کی روایت کی تردید یا تصحیح کرتے ہوئے یہ تحریر فرماتے ہیں کہ اسماعیل علیہ السلام اس وقت سن رشد کو پہنچ چکے تھے، اور قرآن کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں:

﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝۱۰۱ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ۚ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝۱۰۴ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۰۵ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ۖ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝۱۰۹ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۱۰ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۱۱ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ؕ﴾ (الصافات: ۱۰۰۔۱۱۳)

"اے پروردگار! عطا کر مجھ کو نیک لڑکا پس بشارت دی ہم نے اس کو بردبار لڑکے کی پھر جب پہنچا وہ اس سن کو کہ باپ کے ساتھ دوڑے، تو باپ نے کہا، میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ دیکھو تم کیا سمجھتے ہو بیٹے نے کہا، میرے باپ جو حکم کیا گیا ہے کر گزرو، مجھے صابر پاؤ گے۔ اور ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اسحاق (علیہ السلام) کی بشارت دی جو نبی ہوگا، اور نیکو کاروں میں سے ہوگا اور اس پر اور اسحاق (علیہ السلام) پر برکت نازل کی۔"

﴿رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ﴾ (ابراھیم: ۳۷)

"اے ہمارے پروردگار! میں نے بسا دیا ہے اپنی اولاد میں سے بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے محترم گھر کے پاس۔"

(اور آخر میں ہے)

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ﴾ (ابراھیم: ۳۹)

"سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے بخشا مجھ کو بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق (علیہما السلام) کو۔"

وجہ استدلال یہ ہے کہ صافات کی پہلی آیت میں ﴿ بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ ﴾ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام سن رشد تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ رہے اور آخر کی آیت بتاتی ہے کہ اسحاق علیہ السلام اس وقت پیدا ہو چکے تھے اور اسماعیل علیہ السلام اسحاق علیہ السلام سے تیرہ سال بڑے تھے۔

اور سورۂ ابراہیم کی آیتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام جب مکہ میں لائے گئے ہیں تو وہ سن رشد کو پہنچ چکے تھے تب ہی تو ابراہیم علیہ السلام نے دعا میں دونوں کا ذکر فرمایا ہے۔

اس استدلال کے بعد سید صاحب بخاری کی روایت کو ابن عباس رضی اللہ عنہما پر موقوف اور اسرائیلیات سے قرار دیتے ہیں، مگر سید صاحب کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، اور نہ ان کی پیش کردہ آیات سے اس کی تائید نکلتی ہے۔

اول: اس لیے کہ صافات میں ﴿ بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ ﴾ کا یہ مطلب لینا کہ اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زیر سایہ فلسطین ہی میں پرورش پاتے رہے، تب صحیح ہو سکتا تھا کہ اس جملہ کے بعد آیت میں کوئی دوسرا جملہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مکے پہنچنے کے متعلق مذکور ہوتا تاکہ ذبح اسماعیل علیہ السلام کے واقعہ کے ساتھ صحیح جوڑ لگ سکتا، کیونکہ اس پر تمام علماء اسلام کا اتفاق ہے اور سید صاحب بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ذبح اسماعیل علیہ السلام کا واقعہ مکہ کی زندگی سے وابستہ ہے، اور آیت یہ کہتی ہے کہ "جب اسماعیل علیہ السلام سن رشد کو پہنچے تو ان کے باپ نے ان سے اپنا خواب بیان کیا" پس سید صاحب کی توجیہ کے مطابق اس آیت میں سخت ابہام ہے، حالانکہ قرآن عزیز کے طرز خطابت اور اصول بیان کے یہ قطعاً خلاف ہے کہ ایک آیت کے اندر اس طرح کا ابہام پیدا کر دے جس سے دو اہم زندگیوں کے درمیان کوئی ربط قائم نہ رہ سکے۔

دوم: اس لیے کہ صافات میں اسماعیل علیہ السلام سے متعلق جس واقعہ کا ذکر ہے، وہ "ذبح عظیم" کا تذکرہ ہے نہ کہ مکہ پہنچنے کا اور وہ بلاشبہ اسماعیل علیہ السلام کے سن رشد کا زمانہ ہے اور اسحاق علیہ السلام اس وقت پیدا ہو چکے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اگرچہ ہاجرہ اور اسماعیل علیہما السلام کو مکہ کے بیابان و صحراء میں چھوڑ آئے تھے لیکن باپ تھے، نبی و پیغمبر تھے، اہلیہ اور بیٹے کو کیسے بھول سکتے، اور ان کی نگہداشت سے کیسے بے پرواہ ہو سکتے تھے، وہ برابر اس بے آب و گیاہ صحراء میں آتے رہتے اور اپنے خاندان کی نگرانی کرتے رہتے تھے اور آیت ﴿ بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ ﴾ سے یہی مراد ہے۔ لہٰذا اسحاق علیہ السلام کی بشارت کا ذکر بالکل برمحل ہے، خود سید صاحب تورات کے ایک فقرہ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تورات میں یہ مذکور نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ساتھ آئے تھے لیکن کون شقی ہوگا جو اپنے نرینہ بچہ کو جس کی پیدائش کی اس نے خود دعا کی ہو، جس کے لیے زندگی اس نے خدا سے مانگی ہو، اس کو تنہا بے آب و گیاہ مقام میں ہمیشہ کے لیے جانے دے۔"[1]

اسی طرح سورہ ابراہیم کی آیت میں ﴿ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ﴾ کے بعد یہ جملہ ہے۔

﴿ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ ﴾ (ابراھیم: ۳۷)

---

[1] ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۷

"اے ہمارے پروردگار! (میں نے کعبہ کے پاس ان کو اس لیے بسایا) تا کہ یہ نماز کو قائم کریں پس تو لوگوں کو ان کی طرف پھیر دے۔"

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا بیت اللہ کی تعمیر کے بعد سے متعلق ہے اور آیت کا سیاق وسباق صاف صاف اسی پر دلالت کرتا ہے، اس میں قیام صلوٰۃ کا ذکر ہے، اس میں حج کی طرف اشارہ ہے اور اس میں یہاں کے بسنے والوں کے لیے رزق کی وسعت کی تمنا جھلکتی ہے اور یہ سب باتیں جب ہی موزوں ہوسکتی ہیں کہ بیت اللہ اپنی تعمیر کے ساتھ موجود ہو، البتہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی اس دُعا کا ذکر آتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاندان کو یہاں چھوڑتے وقت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا مانگی تھی وہ اسی کے قریب قریب تھی، اس لیے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس آیت کو بطور استشہاد نقل کر دیا گیا ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ بعینہٖ یہی وہ دعا ہے جو اس وقت انہوں نے مانگی تھی اور اس میں اسحاق علیہ السلام کا بھی ذکر تھا، جب ابن عباس رضی اللہ عنہ خود روایت کر رہے ہیں کہ یہ واقعہ اسماعیل علیہ السلام کی شیر خوارگی کا ہے تو وہ کس طرح کہہ سکتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت ایسی دعا مانگی کہ جس کے آخر میں اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ اسحاق علیہ السلام کی ولادت کا بھی ذکر تھا۔

سوم: اس بن کھیتی کی سرزمین (مکہ) کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ میں شور پانی کے سوائے شیریں پانی کا نام ونشان نہیں ہے اور آج بھی آلات جدیدہ کی اعانت کے باوجود اس زمین سے شیریں پانی کا اخراج ناممکن بنا ہوا ہے تو "زمزم" کا وجود یہاں کیسے ہوا؟ یہ مذہبی اور تاریخی دونوں حیثیت سے اہم سوال ہے، سو اس کے متعلق اگرچہ آیات قرآنی کوئی تصریح نہیں کرتیں، مگر بخاری کی یہی ابن عباس رضی اللہ عنہ والی ہر دو روایات اس کے وجود کی تاریخ بیان کرتی ہیں۔ جس میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو شیر خوار ظاہر کیا گیا ہے، اور تورات میں بھی جس طرح اس کا ذکر ہے وہ ان ہی آیات میں ہے جو اسماعیل علیہ السلام کو شیر خوار ظاہر کرتی ہیں۔

بہر حال اگرچہ قرآن عزیز کی کسی آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسماعیل علیہ السلام اس سرزمین (مکہ) میں کس سن میں پہنچائے گئے اگر بخاری کی روایات کہتی ہیں کہ یہ زمانہ اسماعیل علیہ السلام کی شیر خوارگی کا تھا۔ اور یہی صحیح ہے، پس ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت اسرائیلیات میں سے نہیں ہے بلکہ زبان وحی ترجمان کے بیان کردہ تفصیلات کی صحیح ترجمانی ہے۔

قرآن عزیز نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے متعلق ان کا نام لے کر صاف صاف کوئی ذکر نہیں کیا، البتہ بغیر نام لیے ہوئے ان کی ولادت کی بشارت کا تذکرہ موجود ہے۔

ابراہیم علیہ السلام ابھی تک اولاد سے محروم ہیں اس لیے درگاہِ الٰہی میں ایک نیک اور صالح فرزند کے لیے دعا مانگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشتا، اور ولادت فرزند کی بشارت دیتا ہے۔

﴿رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۞ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۞﴾ (الصافات: ۱۰۰۔۱۰۱)

"اے پروردگار مجھ کو ایک نیکوکار لڑکا عطا کر، پس ہم نے اس کو ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی۔"

یہ "غلام حلیم" کون ہے؟ وہی اسماعیل علیہ السلام جو ہاجرہ علیہا السلام کے بطن سے پیدا ہوا، اس لیے کہ قرآن عزیز کی اس آیت سے دوسری آیت کے بعد حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت کا ذکر ہے۔

﴿وَ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١١٢﴾ وَ بٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَ عَلٰٓى اِسْحٰقَ ﴾ (الصافات: ۱۱۲-۱۱۳)

"اور بشارت دی ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اسحاق (علیہ السلام) کی جو نیکو کاروں میں سے ہوگا نبی ہوگا، اور برکت دی ہم نے اس پر اور اسحاق (علیہ السلام) پر۔"

پس جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ابھی دو بیٹے تھے اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام اور تورات و تاریخ کی متفقہ نقول کے پیش نظر اسماعیل علیہ السلام بڑے ہیں اور اسحاق علیہ السلام چھوٹے تو صاف ظاہر ہے کہ صافات کی پہلی آیت میں جس لڑکے کی بشارت مذکور ہے اس سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے علاوہ دوسرا کون مراد ہوسکتا ہے؟

اور جب ابراہیم علیہ السلام نے ہاجرہ و اسماعیل علیہما السلام کو مکہ میں آباد کیا تھا تو ان کے لیے دعا کرتے ہوئے اس طرح اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ ﴾ (ابراھیم: ۳۹)

"تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق (علیہما السلام) عطاء کیے۔"

یہ آیت بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ الصافات کی آیت میں جس بشارت کا ذکر ہے اس سے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی مراد ہیں۔

ختنہ:

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ننانوے سال ہوئی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تیرہ سال تو اللہ تعالیٰ کا حکم آیا کہ ختنہ کرو، ابراہیم علیہ السلام نے تعمیل حکم میں پہلے اپنی ختنہ کیں۔ اور اس کے بعد اسماعیل علیہ السلام اور تمام خانہ زادوں اور غلاموں کی ختنہ کرائیں۔

"تب ابراہام نے اپنے بیٹے اسماعیل اور سب خانہ زادوں اور اپنے سب زر خریدوں کو یعنی ابراہام کے گھر کے لوگوں میں جتنے مرد تھے سب کو لیا، اور اسی روز ان کا ختنہ کیا جس طرح خدا نے اس کو فرمایا تھا جس وقت ابراہام کا ختنہ ہوا وہ ننانوے برس کا تھا اور جس اس کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کا ختنہ ہوا وہ تیرہ برس کا تھا۔" [1]

یہی رسم ختنہ آج بھی "ملت ابراہیمی" کا شعار ہے اور سنت ابراہیمی کے نام سے مشہور ہے۔

تاریخ عظیم:

مقربین بارگاہِ الٰہی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ وہ نہیں ہوتا جو عام انسانوں کے ساتھ ہے، ان کو امتحان و آزمائش کی سخت سے سخت منزلوں سے گزرنا پڑتا، اور قدم قدم پر جاں سپاری اور تسلیم و رضا کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہم گروہ انبیاء اپنے اپنے مراتب کے اعتبار سے امتحان کی صعوبتوں میں ڈالے جاتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام بھی چونکہ جلیل القدر نبی اور پیغمبر تھے اس لیے ان کو بھی مختلف آزمائشوں سے دو چار ہونا پڑا، اور اپنی جلالت

---

[1] پیدائش باب ۱۷ آیات ۲۳-۲۵

قدر کے لحاظ سے ہر دفعہ امتحان میں کامل و مکمل ثابت ہوئے۔

جب ان کو آگ میں ڈالا گیا تو اس وقت جس صبر اور رضاء بہ قضاء الٰہی کا انہوں نے ثبوت دیا۔ اور جس عزم و استقامت کو پیش کیا وہ انہی کا حصہ تھا، اس کے بعد جب اسماعیل اور ہاجرہ علیہما السلام کو فاران کے بیابان میں چھوڑ آنے کا حکم ملا تو وہ بھی معمولی امتحان نہ تھا، آزمائش اور سخت آزمائش کا وقت تھا۔ بڑھاپے اور پیری کی تمناؤں کے مرکز، راتوں اور دنوں کی دعاؤں کے ثمر اور گھر کے چشم و چراغ اسماعیل علیہ السلام کو صرف حکم الٰہی کی تعمیل و امتثال میں ایک بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑتے ہیں اور پیچھے پھر کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شفقت پدری جوش میں آجائے اور امتثال امر الٰہی میں کوئی لغزش ہو جائے۔

ان دونوں کٹھن منزلوں کو عبور کرنے کے بعد اب ایک تیسرے امتحان کی تیاری ہے، جو پہلے دونوں سے بھی زیادہ زہرہ گداز اور جاں گسل امتحان ہے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام تین شب مسلسل خواب دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے ابراہیم! تو ہماری راہ میں اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دے۔

انبیاء (علیہم السلام) کا خواب "رویاء صادقہ" اور وحی الٰہی ہوتا ہے اس لیے ابراہیم علیہ السلام رضاء و تسلیم کا پیکر بن کر تیار ہو گئے کہ خدا کے حکم کی جلد سے جلد تعمیل کریں، مگر چونکہ یہ معاملہ تنہا اپنی ذات سے وابستہ نہ تھا بلکہ اس آزمائش کا دوسرا جزو وہ "بیٹا" تھا جس کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا، اس لیے باپ نے بیٹے کو اپنا خواب اور خدا کا حکم سنایا، بیٹا ابراہیم علیہ السلام جیسے مجدد انبیاء و رسل کا بیٹا تھا فوراً سر تسلیم خم کر دیا اور کہنے لگا کہ اگر خدا کی یہی مرضی ہے تو انشاء اللہ آپ مجھ کو صابر پائیں گے، اس گفتگو کے بعد باپ بیٹے اپنی قربانی پیش کرنے کے لیے جنگل روانہ ہو گئے باپ نے بیٹے کی مرضی پا کر مذبوح جانور کی طرح ہاتھ پیر باندھے، چھری کو تیز کیا اور بیٹے کو پیشانی کے بل بچھاڑ کر ذبح کرنے لگے، فوراً خدا کی وحی ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئی، اے ابراہیم (علیہ السلام)! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھلایا، بیشک یہ بہت سخت اور کٹھن آزمائش تھی، اب لڑکے کو چھوڑ اور تیرے پاس جو یہ مینڈھا کھڑا ہے اس کو بیٹے کے بدلے میں ذبح کر، ہم نیکوکاروں کو اسی طرح نوازا کرتے ہیں، ابراہیم علیہ السلام نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جھاڑی کے قریب ایک مینڈھا کھڑا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اس مینڈھے کو ذبح کیا۔

یہی وہ "قربانی" ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسی مقبول ہوئی کہ بطور یادگار کے ہمیشہ کے لیے ملت ابراہیمی کا شعار قرار پائی اور آج بھی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو تمام دنیائے اسلام میں یہ "شعار" اسی طرح منایا جاتا ہے۔

مگر اس پورے واقعہ سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے "ذبیح" کون ہے۔ اسماعیل علیہ السلام یا اسحاق علیہ السلام؟

قرآن عزیز نے اگرچہ "ذبیح" کا نام نہیں لیا مگر جس طرح اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے اس سے بغیر کسی کنج وکاؤ کے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نص قرآنی اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح بتاتی ہے اور یہی واقعہ اور حقیقت ہے۔ سورہ الصافات میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ

Marfat.com

مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۰۲ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝۱۰۳ وَ نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۝۱۰۴ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا
كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۰۵ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝۱۰۶ وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝۱۰۷ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ
فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝۱۰۸ سَلٰمٌ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ ۝۱۰۹ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۱۰ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۱۱
وَ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۱۲ وَ بٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَ عَلٰۤى اِسْحٰقَ ﴾ (الصافات: ۱۰۰۔۱۱۳)

"اے پروردگار! مجھ کو ایک نیکوکار لڑکا عطا کر، پس بشارت دی ہم نے ان کو بردبار لڑکے کی، پھر جب وہ اس سن کو پہنچا کہ باپ کے ساتھ دوڑنے لگے، ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا اے میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں پس تو دیکھ کیا سمجھتا ہے؟ کہا "اے میرے باپ! جس بات کا تجھے حکم کیا گیا ہے وہ کر، اگر اللہ نے چاہا تو مجھ کو صبر کرنے والوں میں سے پائے گا۔ پس جب ان دونوں نے رضاء وتسلیم کو اختیار کر لیا اور پیشانی کے بل اس (بیٹے) کو پچھاڑ دیا، ہم نے اس کو پکارا، اے ابراہیم! تو نے خواب سچ کر دکھایا، بیشک ہم اسی طرح نیکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں، بلاشبہ یہ کھلی ہوئی آزمائش ہے، اور بدلہ دیا ہم نے اس کو بڑے ذبح (مینڈھے) کے ساتھ، اور ہم نے آنے والی نسلوں میں اس کے متعلق یہ باقی چھوڑا کہ ابراہیم پر سلام ہو، اس طرح ہم نیکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں، بیشک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے ہے۔ اور بشارت دی ہم نے اس کو اسحاق (علیہ السلام) کی جو نبی ہوگا اور نیکوکاروں میں سے ہوگا، اور برکت دی ہم نے اس پر اور اسحاق پر۔"

ان آیات میں ابراہیم علیہ السلام کے دو صاحبزادوں کی بشارت کا ذکر ہے پہلے لڑکے کا نام نہیں لیا اور "غلام حلیم" کہہ کر اس کے ذبح عظیم کے واقعہ کا تذکرہ کیا اور اس کے بعد دوسرے لڑکے کی بشارت کا ذکر نام لے کر کیا ﴿ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ ﴾ اور یہ طے شدہ امر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دونوں صاحبزادوں اسماعیل و اسحاق علیہما السلام میں سے اسماعیل علیہ السلام کے علاوہ کس کا ذکر ہو سکتا ہے؟ بلاشبہ وہ اسماعیل علیہ السلام ہی ہیں جنہوں نے ﴿ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ کہہ کر اور ﴿ وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۚ ﴾ کا مظاہرہ کر کے ﴿ وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴾ کا اعزاز حاصل کیا، علاوہ ازیں صرف قرآن عزیز ہی اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح نہیں کہتا بلکہ تورات کی عبارت کو اگر غور سے مطالعہ کیجیے تو وہ بھی یہی بتاتی ہے کہ اسماعیل علیہ السلام اور صرف اسماعیل علیہ السلام ہی ذبیح ہیں۔

"ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابراہام کو آزمایا اور اسے کہا کہ تو اپنے بیٹے ہاں اپنے اکلوتے بیٹے جس کو تو پیار کرتا ہے "اضحٰق کو لے" اور زمین موریا میں جا اور اسے وہاں پہاڑوں میں سے ایک جو میں تجھے بتاؤں گا، سوختنی قربانی کے لیے چڑھا۔" [1]

"تب خداوند کے فرشتے نے دوبارہ آسمان پر سے ابراہام کو پکارا اور کہا کہ ...... خداوند فرماتا ہے اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا "اپنا اکلوتا ہی بیٹا" دریغ نہ رکھا، میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا۔" [2]

---

[1] تورات پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۔۲

[2] ایضاً باب ۲۲ آیت ۱۵۔۱۶

Marfat.com

تورات کی ان ہر دو عبارات کے نشان زدہ فقروں "اپنے اکلوتے بیٹے" اور "اپنا اکلوتا ہی بیٹا" کو دیکھئے اور پھر تورات کی ان گذشتہ آیات کو پڑھئے کہ جس میں اسماعیل علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اکلوتا بیٹا بتایا گیا ہے کیونکہ اسماعیل علیہ السلام جب چودہ برس کے ہو چکے ہیں تب اسحاق علیہ السلام کی ولادت ہوئی ہے، کیا ان سے یہ صاف طور پر واضح نہیں ہوتا کہ "ذبیح" جیسے اعزاز کو بنی اسرائیل کے ساتھ وابستہ کرنے کی یہ غلط حرص تھی جس نے یہود کو اس تحریف پر آمادہ کیا کہ انہوں نے اس عبارت میں "اکلوتے بیٹے" کے فقرے کے ساتھ "اسحاق" علیہ السلام کا نام بے محل جوڑ دیا؟ پس یہ اضافہ تورات کی تصریحات کے بھی خلاف ہے اور نص قرآنی کے بھی اور واقعہ و حقیقت کے بھی قطعاً خلاف ہے۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ "ذبیح اللہ" کا عظیم الشان شرف اسماعیل علیہ السلام ہی کے لیے مقسوم تھا۔

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝﴾ (الجمعة: ٤)

"یہ اللہ کا فضل ہے جس کو وہ چاہے اس کو دے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔"

سخت تعجب ہے کہ چند علمائے اسلام بھی اس غلطی میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ "ذبیح" اسماعیل علیہ السلام نہ تھے، اسحاق علیہ السلام تھے اور جو دلائل انہوں نے اس سلسلہ میں بیان کیے ہیں افسوس کہ ہم ان سے متفق نہیں ہو سکتے، کیوں کہ ان کی بنیاد و اساس محض وہم و ظن پر قائم ہے نہ کہ یقین کی روشنی پر۔ مثلاً ان کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ "والصافات" کی مسطورۂ بالا آیات میں سے پہلی آیت ﴿فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ﴾ میں کوئی نام مذکور نہیں ہے اور اس کے بعد کی آیات میں اس کے ذبح سے متعلق ذکر کرتے ہوئے فرمایا ﴿بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ﴾ تو کیا "غلام حلیم" بھی یہی اسحاق نہیں ہیں؟ مگر آپ خود اندازہ کیجئے کہ یہ کس قدر غلط استدلال ہے، اول ان آیات کے سیاق و سباق کا مطالعہ کیجئے اور پھر غور کیجئے کہ ﴿فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ﴾ کے بعد ﴿بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ﴾ کو عطف کے ذریعہ جس طرح جدا کیا گیا ہے عربی اصول نحو کے مطابق کون سی گنجائش ہے کہ ان دونوں کو ایک ہی شخصیت قرار دیا جائے خصوصاً جب کہ دونوں کی بشارت کے ذکر کے ساتھ ساتھ جدا جدا ان کے اوصاف بھی بیان کیے گئے ہیں۔

صاحب قصص الانبیاء عبدالوہاب نجار نے اس موقعہ پر آیت ﴿وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ﴾ میں علیہ کی ضمیر "ہٖ" کی جانب راجع کی ہے اور یہ ترجمہ کیا ہے "ہم نے برکت نازل کی اس "ذبیح" پر اور اسحاق علیہ السلام پر اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ پورا قصہ بیان کرنے کے بعد اسحاق علیہ السلام کی بشارت کا ذکر اس بات کے لیے "نص" ہے کہ صاحب قصہ لڑکا اسحاق کے علاوہ ہے اور وہ صرف اسماعیل علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ واقعہ مکہ کے قریب منیٰ میں پیش آیا ہے اور تورات کا جملہ "اکلوتا بیٹا" اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ ابھی تک حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت بھی نہیں ہوئی لہٰذا تورات کا اس واقعہ کو موریا کے قریب بتانا اسی قسم کی تحریف ہے جس سے تورات کا کوئی باب خالی نہیں اور جس کا انکار بداہت کا انکار ہے۔[1]

یہ مسئلہ اگرچہ بہت زیادہ تفصیل طلب ہے لیکن ہم نے صرف ضروری امور کے بیان کر دینے پر اکتفاء کیا ہے۔[2]

---

[1] تحریف کے لئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کی کتاب "اظہار الحق" قابل مطالعہ ہے۔

[2] اس مسئلہ پر مولانا عبدالحمید صاحب فراہی مرحوم کا رسالہ "الرائے الصحیح فی من هو الذبیح" بہترین معلومات کا حامل ہے۔

Marfat.com

بناء کعبہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام اگرچہ فلسطین میں مقیم تھے مگر برابر مکہ میں ہاجرہ و اسماعیل علیہ السلام کو دیکھنے آتے رہتے تھے، اسی اثناء میں ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ "کعبۃ اللہ" کی تعمیر کرو، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے تذکرہ کیا اور دونوں باپ بیٹوں نے "بیت اللہ" کی تعمیر شروع کر دی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری[1] میں ایک روایت نقل کی ہے، جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ بیت اللہ کی سب سے پہلی اساس حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں رکھی گئی اور ملائکۃ اللہ نے ان کو وہ مقام بتا دیا تھا جہاں کعبہ کی تعمیر ہوئی تھی، مگر ہزاروں سال کے حوادث نے عرصہ ہوا اس کو بے نشان کر دیا، البتہ اب بھی وہ ایک ٹیلہ یا ابھری ہوئی زمین کی شکل میں موجود تھا، یہی وہ مقام ہے جس کو وحی الٰہی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتایا اور انہوں نے اسماعیل علیہ السلام کی مدد سے اس کو کھودنا شروع کیا تو سابق تعمیر کی بنیادیں نظر آنے لگیں، انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی تعمیر کی گئی، مگر قرآن عزیز نے بیت اللہ کی تعمیر کا معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے شروع کیا ہے اور اس سے پہلی حالت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

حاصل یہ کہ اس واقعہ سے قبل تمام کائنات اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں بتوں اور ستاروں کی پرستش کے لیے ہیکل اور مندر موجود تھے اور ان ہی کے ناموں پر بڑی بڑی تعمیرات کی جاتی تھیں۔

مصریوں کے یہاں سورج دیوتا، ازوریس، ایزیس، حوریس اور بعل دیوتا سب ہی کے نام پر ہیکل اور مندر تھے، اشوریوں نے بعل دیوتا کا ہیکل بنایا اور ابوالہول کا مجسمہ بنا کر اس کی جسمانی عظمت کا مظاہرہ کرایا۔ کنعانیوں نے مشہور قلعہ بعلبک میں اسی بعل کا مشہور ہیکل بنایا تھا جو آج تک یادگار چلا آتا ہے غرہ کے باشندے "داجون" مچھلی دیبی کے مندر پر چڑھاوے چڑھاتے تھے، جس کی شکل انسان کی اور جسم مچھلی کا بنایا گیا تھا، عمونیوں نے سورج دیوتا کے ساتھ عشتارون (قمر) کو دیبی بنا کر پوجا اور اس کے عظیم الشان ہیکل تیار کیے، فارس نے آگ کی تقدیس کا اعلان کر کے آتشکدے تیار کیے، رومیوں نے مسیح اور کنواری مریم کے بت بنا کر کلیساؤں کو زینت دی اور ہندیوں نے مہاتما بدھ، شری رامچندر، شری مہادیر اور مہادیو کو دیوتا اور اوتار مان کر اور کالیدیوی، سیتلا دیوی، سیتا دیوی اور پاربتی دیوی ناموں سے ہزاروں بتوں کی پرستش کے لیے کیسے کیسے عظیم الشان منادر تیار کیے ہردوار پریاگ، کاشی پوری، ٹیکسلا، سانچی اور بودہ گیا جیسے مذہبی مقامات اس کی زندہ شہادتیں ہیں۔

مگر ان سب کے برعکس صرف خدائے واحد کی پرستش اور اس کی یکتائی کے اقرار میں سرنیاز جھکانے کے لیے یا یوں کہیے کہ توحید الٰہی کی سربلندی کے اظہار کے لیے دنیا کے بت کدوں میں پہلا گھر جو خدا کا گھر کہلایا وہ یہی "بیت اللہ" ہے۔

خلیل ایک معمار تھا جس بناء کا ۔ وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۶﴾﴾ (ال عمران: ۹۶)

"بیشک سب سے پہلا وہ گھر جو لوگوں کے لیے (خدا کی یاد کے لیے) بنایا گیا البتہ وہ ہے جو مکہ میں ہے، وہ سرتا پا برکت

---

[1] جلد ۸ ص ۱۳۸

ہے اور جہاں والوں کے لیے ہدایات (کا سرچشمہ)۔"

اسی تعمیر کو یہ شرف حاصل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جیسا جلیل القدر پیغمبر اس کا معمار ہے اور اسماعیل علیہ السلام جیسا نبی و ذبیح اس کا مزدور، باپ بیٹے برابر اس کی تعمیر میں مصروف ہیں اور جب اس کی دیواریں اوپر اٹھتی ہیں اور بزرگ باپ کا ہاتھ اوپر تعمیر سے معذور ہو جاتا ہے تو قدرت کی ہدایت کے مطابق ایک پتھر کو باڑ بنایا جاتا ہے جس کو اسماعیل علیہ السلام اپنے ہاتھ سے سہارا دیتے، اور ابراہیم علیہ السلام اس پر چڑھ کر تعمیر کرتے جاتے ہیں، یہی وہ یادگار ہے جو آج مقام ابراہیم کے نام سے موسوم ہے، جب تعمیر اس حد پر پہنچی جہاں آج حجر اسود نصب ہے تو جبریل امین علیہ السلام نے ان کی راہنمائی کی اور حجر اسود کو ان کے سامنے ایک پہاڑی سے محفوظ نکال کر دیا جس کو جنت کا لایا ہوا پتھر کہا جاتا ہے تاکہ وہ نصب کر دیا جائے۔

بیت اللہ تعمیر ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو بتایا کہ یہ ملت ابراہیمی کے لیے (قبلہ) اور ہمارے سامنے جھکنے کا نشان ہے، اس لیے یہ توحید کا مرکز قرار دیا جاتا ہے تب ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے دعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کی ذریت کو اقامت صلوٰۃ و زکوٰۃ کی ہدایت دے اور استقامت بخشے اور ان کے لیے پھلوں، میووں اور رزق میں برکت عطا فرمائے اور تمام اقطاع عالم کے بسنے والوں میں سے ہدایت یافتہ گروہ کو اس طرف متوجہ کرے کہ وہ دور دور سے آئیں اور مناسک حج ادا کریں اور ہدایت و رشد کے اس مرکز میں جمع ہو کر اپنی زندگی کی سعادتوں سے دامن بھریں۔

قرآن عزیز نے بیت اللہ کی تعمیر، تعمیر کے وقت ابراہیم علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام کی مناجات، اقامت صلوٰۃ اور مناسک حج کی ادا کے لیے شوق و تمنا کے اظہار اور بیت اللہ کے مرکز توحید ہونے کے اعلان کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے اور نئے نئے اسلوب و طرز ادا سے اس کی عظمت اور جلالت و جبروت کو ان آیات میں واضح فرمایا ہے:

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (آل عمران: ۹۶-۹۷)

"بلاشبہ پہلا گھر جو انسانوں کے لیے (خدا پرستی کا معبد و مرکز) بنایا گیا ہے وہ یہی (عبادت گاہ) ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا، اور تمام انسانوں کے لیے سرچشمہ ہدایت، اس میں (دین حق کی) روشن نشانیاں ہیں، ازانجملہ مقام ابراہیم ہے (یعنی ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑے ہونے اور عبادت کرنے کی جگہ) جو اس وقت سے لے کر آج تک بغیر کسی شک و شبہ کے مشہور و معین رہی ہے اور (ازانجملہ یہ بات ہے کہ) جو کوئی اس کی حدود میں داخل ہوا، وہ امن و حفاظت میں آ گیا اور (ازانجملہ یہ کہ) اللہ کی طرف سے لوگوں کے لیے یہ بات ضروری ہو گئی کہ اگر اس تک پہنچنے کی استطاعت پائیں تو اس گھر کا حج کریں، بایں ہمہ جو کوئی (اس حقیقت سے) انکار کرے (اور اس مقام کی پاکی و فضیلت کا اعتراف نہ کرے) تو یاد رکھو اللہ کی ذات تمام دنیا سے بے نیاز ہے (وہ اپنے کاموں کے لیے کسی فرد اور قوم کا محتاج نہیں!)۔"

﴿وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ

وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ
هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ
فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾ وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ
الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ
ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ
فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ (البقرہ: ۱۲۵۔۱۲۹)

”اور (پھر دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے (مکہ کے) اس گھر کو (یعنی خانہ کعبہ) کو انسانوں کی گرد آوری کا مرکز اور امن وحرکت کا مقام ٹھہرادیا اور حکم دیا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑے ہونے کی جگہ (ہمیشہ کے لیے) نماز کی جگہ بنائی جائے، اور ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) اور اسماعیل (علیہ السلام) کو حکم دیا تھا کہ ہمارے نام پر جو گھر بنایا گیا ہے اسے طواف کرنے والوں، عبادت کے لیے ٹھہرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے (ہمیشہ) پاک رکھنا (اور ظلم ومعصیت کی گندگیوں سے آلودہ نہ کرنا!) اور پھر جب ایسا ہوا تھا کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے خدا کے حضور دعا مانگی تھی (اے پروردگار! اس جگہ کو (جو دنیا کی آباد سرزمینوں سے دور اور سرسبزی اور شادابی سے یک قلم محروم ہے) امن وامان کا ایک آباد شہر بنادے، اور اپنے فضل وکرم سے ایسا کر کہ یہاں کے بسنے والوں میں جو لوگ تجھ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہوں ان کے رزق کے لیے ہر طرح کی پیداوار مہیا ہو جائے! اس پر ارشاد الٰہی ہوا تھا کہ (تمہاری دعا قبول کی گئی اور یہاں کے باشندوں میں سے) جو کوئی کفر کا شیوہ اختیار کرے گا، سو اسے بھی ہم (سروسامان رزق سے) فائدہ اٹھانے دیں گے البتہ یہ فائدہ اٹھانا بہت تھوڑا ہوگا، کیونکہ بالآخر اسے (پاداش عمل میں) چارو ناچار دوزخ میں جانا ہے، اور (جو بدبخت نعمت کی راہ چھوڑ کر عذاب کی راہ اختیار کرلے تو کیا ہی بری اس کی راہ ہے اور) کیا ہی برا اس کا ٹھکانا ہے! اور (پھر دیکھو، وہ کیسا عظیم الشان اور انقلاب انگیز وقت تھا) جب ابراہیم خانہ کعبہ کی بنیاد چن رہا تھا، اور اسماعیل بھی اس کے ساتھ شریک تھا (ان کے ہاتھ تو پتھر چن رہے تھے، اور دل وزبان پر یہ دعا طاری تھی!) اے ”پروردگار! (ہم تیرے دو عاجز بندے تیرے مقدس نام پر اس گھر کی بنیاد رکھ رہے ہیں) ہمارا یہ عمل تیرے حضور قبول ہو! بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کا سننے والا اور (مصالح عالم کا) جاننے والا ہے۔ اے پروردگار! (اپنے فضل وکرم سے) ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم (یعنی تیرے حکموں کے فرمانبردار) ہو جائیں اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی امت پیدا کردے جو تیرے حکموں کی فرمانبردار ہو! خدایا ہماری عبادت کے (سچے) طور طریقے بتادے، اور ہمارے قصوروں سے درگزر کر، بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو رحمت سے درگزر کرنے والی ہے اور جس کی رحیمانہ درگزر کی کوئی انتہا نہیں! اور خدایا (اپنے فضل وکرم

Marfat.com

سے) ایسا کیجئے کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول مبعوث ہو جو انہی میں سے ہو، وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے، کتاب اور حکمت کی انہیں تعلیم دے، اور (اپنی پیغمبرانہ تربیت سے) ان کے دلوں کو مانجھ دے، اے پروردگار! بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو حکمت والی اور سب پر غالب ہے۔"

﴿وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآىِٕفِيْنَ وَ الْقَآىِٕمِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝۲۶ وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝۲۷ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْۤ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآىِٕسَ الْفَقِيْرَ ۝۲۸ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَ لْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَ لْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝۲۹ ذٰلِكَ ۗ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝۳۰ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝۳۱ ذٰلِكَ ۗ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝۳۲ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝۳۳﴾ (الحج: ۲۶-۳۳)

"اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے خانہ کعبہ کی جگہ مقرر کر دی، (اور حکم دیا) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کر، اور میرا یہ گھر ان لوگوں کے لیے پاک رکھ جو طواف کرنے والے ہوں، عبادت میں سرگرم رہنے والے ہوں، رکوع و سجود میں جھکنے والے ہوں! اور (حکم دیا کہ) "لوگوں میں حج کا اعلان پکار دے، لوگ تیرے پاس دنیا کی تمام دور دراز راہوں سے آیا کریں گے پاپیادہ، اور ہر طرح کی سواریوں پر جو (مشقت سفر سے) جھکی ہوئی ہوں گی، وہ اس لیے آئیں گے کہ اپنے فائدہ پانے کی جگہ میں حاضر ہو جائیں اور ہم نے جو پالتو جانور پائے ان کے لیے مہیا کر دیئے ہیں ان کی قربانی کرتے ہوئے مقررہ دنوں میں اللہ کا نام لیں، پس قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ اور بھوکے فقیروں کو بھی کھلاؤ، پھر قربانی کے بعد وہ اپنے جسم و لباس کا میل کچیل دور کر دیں (یعنی احرام اتار دیں) نیز اپنی نذریں پوری کریں اور اس خانہ قدیم (یعنی خانہ کعبہ) کے گرد پھیرے پھر لیں" ۔ تو دیکھو (حج کی) بات یوں ہوئی اور جو کوئی اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حرمتوں کی عظمت مانے، تو اس کے لیے اس کے پروردگار کے حضور بڑی ہی بہتری ہے، اور (یہ بات بھی یاد رکھو کہ) ان جانوروں کو چھوڑ کر جن کا حکم قرآن میں سنا دیا گیا ہے تمام چار پائے تمہارے لیے حلال کیے گئے ہیں، پس چاہیے کہ بتوں کی ناپاکی سے بچتے رہو، نیز جھوٹ بولنے سے، صرف اللہ ہی کے ہو کر رہو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، جس کسی نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا، تو اس کا حال ایسا سمجھو، جیسے بلندی سے اچانک نیچے گر پڑا، جو چیز اس طرح گرے گی، اسے یا تو کوئی پرندا اچک لے گا یا ہوا کا جھونکا کسی دور دراز گوشہ میں لے جا کر پھینک دے گا! (حقیقت حال) یہ ہے، پس (یاد

Marfat.com

رکھو) جس کسی نے اللہ کی نشانیوں کی عظمت مانی، تو اس نے ایسی بات مانی جو فی الحقیقت دلوں کی پرہیزگاری کی باتوں میں سے ہے، ان (چارپایوں) میں ایک مقررہ وقت تک تمہارے لیے (طرح طرح کے) فائدے ہیں۔ پھر اس خانہ قدیم تک پہنچا کر ان کی قربانی کرنی ہے۔"

﴿وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۗ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۞ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۗ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۗ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ۞﴾ (الحج: ٣٦-٣٧)

"اور (دیکھو) قربانی کے یہ اونٹ (جنہیں دور دور سے حج کے موقع پر لایا جاتا ہے، تو ہم نے اسے ان چیزوں میں سے ٹھہرادیا ہے، جو تمہارے لیے اللہ کی (عبادت) کی نشانیوں میں سے ہیں، اس میں تمہارے لیے بہتری کی بات ہے، پس چاہیے کہ انہیں قطار در قطار ذبح کرتے ہوئے اللہ کا نام یاد کرو، پھر جب وہ کسی پہلو پر گر پڑیں (یعنی ذبح ہو جائیں) تو ان کے گوشت میں سے خود بھی کھاؤ اور فقیروں اور زائروں کو بھی کھلاؤ، اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا تاکہ (احسان الٰہی کے) شکر گزار رہو! یاد رکھو اللہ تک ان قربانیوں کا نہ گوشت پہنچتا ہے نہ خون، اس کے حضور جو کچھ پہنچ سکتا ہے وہ تو صرف تمہارا تقویٰ ہے (یعنی تمہارے دل کی نیکی ہے) ان جانوروں کو اس طرح تمہارے لیے مسخر کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی پر اس کے شکر گزار ہو۔ اور اس کے نام کی بڑائی کا آوازہ بلند کرو، اور نیک کرداروں کے لیے (قبولیت حق کی) خوش خبری ہے۔"

اسماعیل علیہ السلام کی اولاد:

اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کا ذکر قرآن عزیز یا احادیث نبوی ﷺ میں تفصیل کے ساتھ نہیں آتا، البتہ تورات نے ان کے ناموں کا علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے تورات کے قول کے مطابق اسماعیل علیہ السلام کے بارہ لڑکے تھے جو بارہ سردار کہلائے اور عرب کے مستقل قبائل کے جد قبیلہ بنے اور ایک لڑکی تھی جس کا نام بشامہ یا محلاۃ تھا۔

اور ابراہام کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کا جسے سری کی لونڈی مصری ہاجرہ ابراہیم کے لیے جنی تھی یہ نسب نامہ ہے اور یہ اسماعیل کے بیٹوں کے نام ہیں مطابق ان کے ناموں اور نسبوں کی فہرست کے اسماعیل علیہ السلام کا پہلوٹھا نبایوت، قیدار، ادبئیل، مبسام، مشماع، دومہ، مسا، حدار، تیما، یطور، نافیش، قیدمایہ اسماعیل علیہ السلام کے بیٹے ہیں، اور ان کے نام ان کی بستیوں اور قلعوں میں یہ ہیں اور یہ اپنی امتوں کے بارہ رئیس تھے۔ [1]

ان میں دو بڑے بیٹے نابت یا نبایوت اور قیدار بہت مشہور ہیں اور ان کا ذکر تورات میں بھی کثرت سے پایا جاتا ہے اور

---

[1] ۲۵ آیت ۱۲-۱۶ پیدائش

Marfat.com

عرب مؤرخین بھی ان کی تفصیلات پر روشنی ڈالتے ہیں یہی وہ نابت ہیں جن کی نسل اصحاب الحجر کہلائی اور قیدار کی نسل اصحاب الرس کے نام سے مشہور ہوئی ان کے علاوہ دوسرے بھائیوں اور ان کے خاندانوں کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔

قرآن عزیز میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا تذکرہ:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں متعدد بار ہوا ہے، ان میں سے ایک جگہ صرف اوصاف مذکور نہیں ہیں، یہ "ذبح عظیم" والی آیت ہے اور دو مقام پر اس بشارت کے موقع پر ذکر آیا ہے جس میں ابراہیم علیہ السلام کی پسری اولاد کی بشارت دی گئی ہے اور سورۂ مریم میں ان کا نام لے کر ان کے اوصاف جمیلہ کا ذکر کیا گیا ہے:

﴿وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۚ﴿۵۴﴾ وَ كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ ۪ وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾﴾ (مریم: ۵۴-۵۵)

"اور یاد کر کتاب میں اسماعیل (علیہ السلام) کا ذکر تھا وہ وعدہ کا سچا اور تھا رسول نبی اور حکم کرتا تھا اپنے اہل کو نماز کا اور زکوٰۃ کا اور تھا وہ اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ۔"

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وفات:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر جب ایک سو چھتیس (۱۳۶) سال کی ہوئی تو ان کا انتقال ہو گیا، اس وقت ان کے سامنے ان کی اولاد اور نسل کا سلسلہ بہت پھیل گیا تھا جو حجاز، شام، عراق، فلسطین، اور مصر تک پھیلی۔

تورات ایک موقع پر اشارہ کرتی ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر فلسطین ہی میں [1] ہے اور یہیں ان کی وفات ہوئی اور عرب مؤرخین کہتے ہیں کہ وہ اور ان کی والدہ ہاجرہ بیت اللہ کے قریب حرم کے اندر مدفون ہیں۔ [2]

---

[1] پیدائش باب ۲۵ [2] تاریخ طبری جلد ۱

Marfat.com

حضرت اسحاق علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر سو سال کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بشارت سنائی کہ سارہ کے بطن سے بھی تیرے ایک بیٹا ہوگا اس کا نام اسحاق رکھنا۔

"اور خدا نے ابراہام سے کہا کہ تیری جورو سری جو ہے اس کو سری مت کہا کر بلکہ اس کا نام سرہ ہے اور میں اسے برکت دوں گا، اور اس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا یقیناً میں اسے برکت دوں گا کہ وہ قوموں کی ماں ہوگی، اور ملکوں کے بادشاہ اس سے پیدا ہوں گے، تب ابراہام منہ کے بل گرا اور ہنس کے دل میں کہا کہ کیا سو برس کے مرد کو بیٹا پیدا ہوگا اور کیا سارہ جو نوے برس کی ہے بیٹا جنے گی؟ اور ابراہیم نے خدا سے کہا کہ کاش کہ اسماعیل تیرے حضور جیتا رہے تب خدا نے کہا کہ بیشک تیری جورو سرہ تیرے لیے بیٹا جنے گی تو اس کا نام اضحاق رکھنا"۔ ❶

اور قرآن عزیز میں ہے:

﴿وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰی قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ ۝ فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ ۝ وَ امْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ ۝ قَالَتْ یٰوَیْلَتٰۤی ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ ۝ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝﴾ (ھود: ۶۹-۷۳)

"اور بلاشبہ ہمارے ایلچی (فرشتے) ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے، انہوں نے ابراہیم (علیہ السلام) کو سلام کیا اور ابراہیم (علیہ السلام) نے سلام کہا، تھوڑی دیر کے بعد ابراہیم بچھڑے کا بھنا گوشت لایا اور جب اس نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھتے تو ان کو اجنبی محسوس کیا اور ان سے خوف کھایا، وہ کہنے لگے خوف نہ کرو، ہم لوط کی قوم پر (عذاب کے لیے) بھیجے گئے ہیں، اور ابراہیم (علیہ السلام) کی بیوی (سارہ) کھڑی ہوئی ہنس رہی تھی، پس ہم نے اس کو اسحاق کی اور اس کے بعد (اس کے بیٹے) یعقوب کی بشارت دی، سارہ کہنے لگی، کیا میں نگوڑی بڑھیا جنوں گی اور جب کہ یہ ابراہیم میرا شوہر بھی بوڑھا ہے، واقعی یہ تو بہت عجیب بات ہے، فرشتوں نے کہا، کیا تو خدا کے حکم پر تعجب کرتی ہے، اے اہل بیت تم پر خدا کی رحمت و برکت ہو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر طرح قابل حمد ہے اور بہت بزرگ"۔

❶ باب ۱۷ آیت ۱۵ تا ۱۹

Marfat.com

﴿فَاَوۡجَسَ مِنۡهُمۡ خِيۡفَةً ؕ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ ؕ وَ بَشَّرُوۡهُ بِغُلٰمٍ عَلِيۡمٍ ۞ فَاَقۡبَلَتِ امۡرَاَتُهٗ فِىۡ صَرَّةٍ فَصَكَّتۡ وَجۡهَهَا وَ قَالَتۡ عَجُوۡزٌ عَقِيۡمٌ ۞ قَالُوۡا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡحَكِيۡمُ الۡعَلِيۡمُ ۞﴾

(الذاریات: ۲۸۔۳۰)

"پس محسوس کیا (ابراہیم علیہ السلام نے) ان سے خوف، وہ (فرشتے) کہنے لگے خوف نہ کھا اور بشارت دی اس کو ایک سمجھ دار لڑکے کی، پس آئی بی بی (سارہ) ابراہیم کی سخت بے چینی کا اظہار کرتی ہوئی پھر پیٹ لیا اس نے اپنا منہ اور کہنے لگی بانجھ بڑھیا (اور بچہ) فرشتوں نے کہا تیرے پروردگار نے یہی کہا ہے، ایسا ہی ہوگا وہ دانا ہے، حکمت والا۔"

﴿قَالَ اِنَّا مِنۡكُمۡ وَجِلُوۡنَ ۞ قَالُوۡا لَا تَوۡجَلۡ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيۡمٍ ۞ قَالَ اَبَشَّرۡتُمُوۡنِىۡ عَلٰٓى اَنۡ مَّسَّنِىَ الۡكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوۡنَ ۞ قَالُوۡا بَشَّرۡنٰكَ بِالۡحَـقِّ فَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡقٰنِطِيۡنَ ۞ قَالَ وَمَنۡ يَّقۡنَطُ مِنۡ رَّحۡمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوۡنَ ۞﴾ (الحجر: ۵۲۔۵۶)

"ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا بیشک مجھ کو تم سے خوف معلوم ہوتا ہے، فرشتوں نے کہا ہم سے نہ ڈر بلا شبہ ہم تجھ کو ایک سمجھ دار لڑکے کی بشارت دینے آئے ہیں، ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کیا تم مجھ کو اس بڑھاپا آ جانے پر بھی بشارت دیتے ہو، یہ کیسی بشارت دے رہے ہو؟ فرشتوں نے کہا ہم تجھ کو حق بات کی بشارت دے رہے ہیں پس تو ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہو ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا اور نہیں ناامید ہوتے اپنے پروردگار کی رحمت سے مگر گمراہ۔"

ختنہ:

جب حضرت اسحاق علیہ السلام آٹھ دن کے ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی ختنہ کرا دیں۔ اور ابراہام نے جیسا کہ خدا نے اسے حکم دیا تھا، اپنے بیٹے اضحاق کا جب وہ آٹھ دن کا ہوا ختنہ کیا۔ [1] اسحٰق اصل لفظ کے اعتبار سے "یصحق" ہے، یہ عبرانی لفظ ہے جس کا عربی ترجمہ "یضحك" (ہنستا ہے) ہوتا ہے۔

خدا کے فرشتوں نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سو برس اور حضرت سارہ علیہا السلام کو نوے سال کے سن میں بیٹا ہونے کی بشارت دی تھی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اچنبھا سمجھا تھا اور حضرت سارہ کو بھی یہ سن کر ہنسی آ گئی تھی اس لیے ان کا یہ نام تجویز ہوا، یا اس لیے یہ نام رکھا گیا کہ ان کی پیدائش حضرت سارہ علیہا السلام کی مسرت و شادمانی کا باعث ہوئی۔

عربی قاعدہ سے "یضحق" مضارع کا صیغہ ہے، اہل عرب کا ہمیشہ سے ہی یہ دستور رہا ہے کہ وہ مضارع کے صیغوں کو بھی بطور نام کے استعمال کرتے ہیں، چنانچہ یعرب، یملک جیسے نام عرب میں معروف و مشہور ہیں۔

اسحاق علیہ السلام کی شادی:

قرآن عزیز میں اس کے متعلق کوئی ذکر نہیں ہے، البتہ تورات میں اس سلسلہ میں ایک طویل قصہ مذکور ہے جس کا خلاصہ یہ

[1] تورات باب ۲۱ آیت ۴

Marfat.com

ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے خانہ زاد الیعرز دمشقی سے فرمایا کہ میں یہ طے کر چکا ہوں کہ اسحاق کی شادی فلسطین کے ان کنعانی خاندانوں میں ہرگز نہ کروں گا بلکہ میری یہ خواہش ہے کہ اپنے خاندان اور باپ دادا کی نسل میں اس کا رشتہ کروں اس لیے تو سازوسامان لے کر جا اور فدان آرام میں میرے بھتیجے بتوئیل بن ناحور کو یہ پیغام دے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اسحاق سے کر دے، اگر وہ راضی ہو جائے تو اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ میں اسحاق کو اپنے پاس سے جدا کرنا نہیں چاہتا لہٰذا لڑکی کو تیرے ساتھ رخصت کر دے، الیعرز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حکم کے مطابق فوراً آرام کو روانہ ہو گیا جب آبادی کے قریب پہنچا تو اپنے اونٹ کو بٹھایا تاکہ حالات معلوم کرے، الیعرز نے جس جگہ اونٹ بٹھایا تھا، اسی کے قریب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی بتوئیل کا خاندان آباد تھا، ابھی یہ اس میں مشغول تھا کہ سامنے ایک حسین لڑکی نظر آئی جو پانی کا گھڑا بھر کر مکان کو لیے جا رہی تھی۔ الیعرز نے اس سے پانی مانگا، لڑکی نے اس کو بھی پانی پلایا اور اس کے اونٹ کو بھی اور پھر حال دریافت کیا، الیعرز نے بتوئیل کا پتہ دریافت کیا، لڑکی نے کہا کہ وہ میرے باپ ہیں اور الیعرز کو مہمان بنا کر لے گئی، مکان پر پہنچ کر اپنے بھائی لابان کو اطلاع دی، لابان نے الیعرز کی بیحد مدارات کی اور آمد کی وجہ دریافت کی، الیعرز نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیغام سنایا۔ لابان کو اس پیغام سے بے حد مسرت ہوئی اور اس نے بہت سا سازوسامان دے کر اپنی بہن رفقہ کو الیعرز کے ہمراہ رخصت کر دیا۔

حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد:

رفقہ سے حضرت اسحاق علیہ السلام کے توام دو لڑکے علی الترتیب عیسو اور یعقوب پیدا ہوئے، اس وقت حضرت اسحاق علیہ السلام کی عمر ساٹھ سال کی تھی، اسحاق علیہ السلام عیسو کو زیادہ چاہتے تھے اور رفقہ یعقوب سے زیادہ پیار رکھتی تھیں، عیسو شکاری تھا اور بوڑھے ماں باپ کو شکار کا گوشت لا کر دیتا تھا اور یعقوب خیمہ ہی میں رہتا تھا۔

ایک روز عیسو تھکا ماندہ آیا اور یعقوب سے کہنے لگا میں ماندہ ہوں اور آج شکار بھی ہاتھ نہ آیا تو اپنے کھانے مسور اور لپسی میں سے مجھے بھی کچھ دے، یعقوب نے کہا کہ فلسطینیوں کا یہ دستور ہے کہ میراث بڑے لڑکے کو ملتی ہے اس لیے باپ کا وارث تو ہوگا اگر تو اس حق سے دست بردار ہو جائے تو میں تجھ کو کھانا کھلاؤں گا، عیسو نے کہا مجھے اس میراث کی کوئی پرواہ نہیں تو ہی وارث ہو جانا، تب یعقوب نے عیسو کو کھانا کھلایا۔

ایک مرتبہ حضرت اسحاق علیہ السلام نے (جبکہ بہت بوڑھے اور ضعیف البصر ہو گئے تھے) یہ چاہا کہ عیسو کو برکت دیں، اور اس سے کہا کہ جا شکار کر کے لا اور عمدہ کھانا پکا کر میرے سامنے پیش کر، رفقہ نے یہ سنا تو دل سے چاہا کہ یہ برکت یعقوب کو ملے۔ فوراً یعقوب کو بلا کر کہا کہ جلدی عمدہ کھانا تیار کر کے باپ کے سامنے لے جا اور دُعا برکت کا طالب ہو، یعقوب نے نام بتائے بغیر ایسا ہی کیا اور اسحاق علیہ السلام سے دُعا برکت حاصل کر لی، جب عیسو آیا اور اس نے سب قصہ سنا تو انتہائی ناگواری محسوس کی اور یعقوب سے کینہ رکھنے لگا۔ تب رفقہ نے یعقوب کو رائے دی کہ وہ یہاں سے اپنے ماموں لابان کے پاس کچھ دنوں کے لیے چلا جائے۔ یعقوب ماموں کے یہاں پہنچا اور وہیں کچھ مدت گذاری اور یکے بعد دیگرے لابان کی دونوں لڑکیوں لئیہ اور راحیل سے شادی کر لی۔ [1]

---

[1] پیدائش باب ۲۴ آیت ۱-۶۵

Marfat.com

یہ روایت اگرچہ اپنے مضامین کے اعتبار سے بہت زیادہ ناقابل اعتماد ہے اور اس میں جو اخلاقی زندگی پیش کی گئی ہے وہ تورات کی دوسری محرف روایات کی طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے خاندان کے شایان شان بھی نہیں ہے، مگر اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی شادی ان کے ماموں کے یہاں ہوئی اور وہ ایک عرصہ تک ان کے پاس رہے۔

اور عیسو بھاگ کر اپنے چچا اسماعیل علیہ السلام کے پاس چلے گئے اور وہاں ان کی صاحبزادی بشامہ یا باسمہ یا محلاۃ (جو بھی نام صحیح ہو) سے شادی کر لی، اور ان کے علاوہ بھی شادیاں کیں، اور اپنے خاندان کو لے کر سعیر (یا ساعیر) کو اپنا وطن بنا لیا، اور یہاں ادوم کے نام سے مشہور ہوئے اور اس لیے ان کی نسل بنی ادوم کے نام سے مشہور ہوئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حق الیقین کی طلب:

گزشتہ سطور میں چونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کا ذکر آ گیا تھا اس لیے ان سے متعلق واقعات کو تفصیل سے بیان کر دینا مناسب سمجھا گیا تاکہ واقعات کے تسلسل میں انتشار پیدا نہ ہو، نیز یہ واقعات بھی درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی زندگی سے متعلق ہیں اس لیے ان کا تذکرہ بے محل نہیں ہے، اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باقی حالات قابل توجہ ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حقائق اشیاء کی جستجو اور طلب کا طبعی ذوق تھا، اور وہ ہر شئے کی حقیقت تک پہنچنے کی سعی کو اپنی زندگی کا خاص مقصد سمجھتے تھے تاکہ ان کے ذریعہ ذات واحد (اللہ جل جلالہ) کی ہستی، اس کی وحدانیت، اور اس کی قدرت کاملہ کے متعلق علم الیقین کے بعد حق الیقین حاصل کر سکیں۔

آزر، جمہور اور نمرود کے ساتھ مناظروں میں ان کے اس طبعی ذوق کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "حیات بعد الممات" یعنی مر جانے کے بعد جی اٹھنے کے متعلق خدائے تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ وہ کس طرح ایسا کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا، اے ابراہیم! کیا تم اس مسئلہ پر یقین و ایمان نہیں رکھتے؟ ابراہیم علیہ السلام نے فوراً جواب دیا، کیوں نہیں! میں بلا توقف اس پر ایمان رکھتا ہوں، لیکن میرا یہ سوال ایمان و یقین کے خلاف اس لیے نہیں ہے کہ میں علم الیقین کے ساتھ ساتھ عین الیقین اور حق الیقین [1] کا خواستگار ہوں، میری تمنا یہ ہے کہ تو مجھ کو آنکھوں سے مشاہدہ کرا دے

---

[1] یقین: مضبوط اعتقاد اور اذعان محکم کو کہتے ہیں جو کسی بھی حالت میں شک و شبہ کی راہ سے متزلزل نہ ہو سکے، اس لئے یہ (یقین) ایمان بالحق کے لئے اساس و بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، البتہ اعتقاد جازم کے باوجود مراتب و درجات کے لحاظ سے اس میں تفاوت بھی پایا جاتا ہے جس کو علمی اصطلاح میں علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کہا جاتا ہے، اگر کسی مسئلہ میں جہل و نادانی کے خلاف دلیل و برہان کے ذریعہ علم و دانش اس حد تک حاصل ہو جائے کہ تردد اور تذبذب کی راہیں مسدود ہو کر رہ جائیں تو اس کا نام علم الیقین ہے، اور اگر یہ علم، علیل و برہان سے آگے مشاہدہ محسوس کی حد میں داخل ہو جائے اور دلیل کے ساتھ پوری پوری مطابقت نظر آ جائے تو پھر اس حاصل شدہ یقین کو عین الیقین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علم الیقین اور عین الیقین تک رسائی کے باوجود فطرت انسانی ابھی مزید یقین کی طالب ہوتی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ جس شئے کو محکم دلیل کی روشنی میں سمجھا اور جانا نیز مشاہدہ و حس کے ذریعہ اس کی مزید تقویت بھی مل کیا اچھا ہو کہ اس کا کیف و کم سب ہی سامنے آ جائے اور حقیقت حال تک پہنچنے کی راہ نکل آئے پس جب فطرت انسانی یقین کے اس درجہ پر قابو پا لیتی ہے تو اس کو حق الیقین کہا جاتا ہے۔ مثلاً سیب ایک بہترین پھل ہے اس کے جاننے اور معلوم کرنے کا پہلا درجہ یہ ہے کہ عوام و خواص اور ثقہ اور غیر ثقہ سے تواتر اور شہرت کی اس حد تک اس کے وجود اور اس کی تعریف کو سنا کہ جس کے انکار کے لئے کوئی تردد، تذبذب اور شک و شبہ باقی نہیں رہا تو سیب کے متعلق اس یقین کا نام علم الیقین ہے، اور حسن اتفاق سے کشمیر جا کر آنکھوں سے اس کو

Marfat.com

کہ "حیات بعد الممات" کی شکل کیا ہوگی، تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا اگر تم کو اس کے مشاہدہ کی طلب ہے تو چند پرندلو، اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سامنے والے پہاڑ پر ڈال دو، اور پھر فاصلہ پر کھڑے ہو کر ان کو پکارو، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے ان کو آواز دی تو ان سب کے اجزاء علیحدہ علیحدہ ہو کر فوراً اپنی اپنی شکل پر آ گئے اور زندہ ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس اُڑتے ہوئے چلے آئے۔

سورۂ بقرہ میں اس واقعہ کو اس معجزانہ بلاغت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۶۰﴾ (البقرہ: ۲۶۰)

"(یاد کر) جب ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا، اے میرے پروردگار! مجھے دکھلا تو کس طرح مردوں کو زندہ کر دے گا، کہا، کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟ کیوں نہیں لیکن دلی اطمینان چاہتا ہوں، کہا پس چار پرندے لے پھر ان کو اپنے ساتھ مانوس کر پھر رکھ دے ہر ہر پہاڑ پر ان کے جزء جزء ڈال کر، پھر ان کو بلا وہ آئیں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور تو جان بیشک اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا۔"

سلف صالحین سے ان آیات کی تفسیر یہی ثابت ہے اور بعض روایات حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہیں، اس لیے حضرات [illegible] نے اس مسئلہ کی غرابت کے پیش نظر ان آیات میں طرح طرح کی تاویلات کر کے دور از کار باتیں بیان کی ہیں وہ نا قابل التفات [illegible]، ہم اس سے قبل واضح کر چکے ہیں کہ جس طرح یہ راہ غلط ہے کہ ہر موقعہ پر اچنبھوں اور عجوبہ کاریوں کی داستان سرائی ہو اور رطب و [illegible]بس روایات کے اعتماد پر بے اصل باتوں پر یقین کیا جائے اسی طرح یہ بھی گمراہی کی راہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے متعلق جن خوارق [illegible]ادات (معجزات) کا ذکر نصوص قرآنی اور صحیح روایات سے معلوم ہو جائے ان کا بھی اس لیے انکار کیا جائے یا باطل تاویلات گھڑی [illegible] کہ مدعیان عقل و فلسفہ (مادیین) ہمارے اس یقین و علم پر ٹھٹھا کریں گے اور اس کا مذاق اڑائیں گے۔

قطورہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ علیہا السلام اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے علاوہ ایک اور شادی کی تھی اس بی بی کا نام قطورہ تھا، ان [illegible] سے ابراہیم علیہ السلام کے چھ بیٹے پیدا ہوئے۔

[illegible] دیکھ لیا تو یقین کا یہ درجہ عین الیقین کے نام سے موسوم ہے، اور اگر آنکھ سے رنگ و روپ کا مشاہدہ کیا، ناک سے اس کی خوشبو کو پہچانا اور زبان پر رکھ [illegible] کی مدد سے اس کی لطافت، خشکی، شیرینی غرض اس کی حقیقت کے تمام اوصاف کو حاصل کر لیا تو یہ حق الیقین ہے، اور یقین کا یہ وہ آخری درجہ ہے جو [illegible] انسانی کے تقاضائے تشنگی کی سیرابی کے لیے کافی ووافی ہوتا اور حضرت انسان کی دسترس کی معراج سمجھا جاتا ہے۔

البتہ یہ الگ بات ہے کہ مختلف انسانوں کی صلاحیت و استعداد اور خود شئے مطلوب کی حقیقت و کنہ کے پیش نظر حق الیقین کے بھی مختلف مراتب و [illegible] ہیں جن کی تشریح و توضیح کا یہ مقام نہیں ہے۔

Marfat.com

"اور ابراہیم علیہ السلام نے ایک اور جورو کی جس کا نام قطورہ تھا، اور اس سے زمران، یقسان مدان، مدیان، یشباق، شوحا پیدا ہوئے اور یقسان سے صبا اور ددان پیدا ہوئے، اور ان کے فرزند اسوری اور لطوسی اور لومی تھے اور مدیان کے فرزند عیفہ، غفر، خیوک، ابیداع، اور دعا تھے یہ سب بنی قطورہ تھے۔"[1]

"مدین یا مدیان" کی نسل نے اپنی آبادی اپنے باپ کے نام پر مدین کے نام سے بسائی اور یہ اصحاب مدین کہلائے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ددان کی نسل اصحاب الایکہ کے نام سے مشہور ہوئی یہی اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ دو قومیں ہیں جن میں ہدایت وسعادت کی پیغامبری کے لیے حضرت شعیب علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ یہ قتادہ کی روایت اور بعض مؤرخین حاضر کی تحقیق ہے، اس کے خلاف حافظ ابن کثیر اصحاب مدین وایکہ کو ایک ہی تسلیم کرتے ہیں اور یہی تحقیق راجح ہے، تفصیل حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعہ میں آئے گی۔

---

[1] پیدائش ۲۵۔ آیت ۱۔ ۴

Marfat.com

حضرت لوط علیہ السلام

لوط اور ابراہیم علیہما السلام:

صفحات گذشتہ میں ذکر آ چکا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے برادرزادہ ہیں، ان کے والد کا نام ہاران تھا، حضرت لوط علیہ السلام کا بچپن حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے زیر سایہ گذرا اور ان کی نشوونما حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہی آغوش تربیت کی رہین منت تھی۔ اسی لیے وہ اور حضرت سارہ "ملت ابراہیمی" کے پہلے مسلم اور ﴿السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ﴾ میں داخل ہیں:

﴿فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ؕ﴾ (العنکبوت: ۲۶)

"پس ایمان لایا لوط ابراہیم (کے دین) پر اور کہا میں ہجرت کرنے والا ہوں اپنے رب کی جانب۔" [1]

یہ اور ان کی بی بی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرتوں میں ہمیشہ ساتھ رہے ہیں اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام مصر میں تھے تو اس وقت بھی یہ ہم سفر تھے۔

تورات میں ہے کہ مصر کے قیام میں چونکہ دونوں کے پاس کافی سازوسامان تھا اور مویشیوں کے بڑے بڑے ریوڑ تھے اس لیے ان کے چرواہوں اور محافظوں کے درمیان بہت زیادہ کشمکش رہتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چرواہے چاہتے تھے کہ اس چراگاہ اور سبزہ زار سے پہلے ہمارے ریوڑ فائدہ اٹھائیں اور حضرت لوط علیہ السلام کے چرواہوں کی خواہش ہوتی کہ اول ہمارا حق سمجھا جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس صورت حال کا اندازہ کر کے حضرت لوط علیہ السلام سے مشورہ کیا، اور دونوں کی صلاح سے یہ طے پایا کہ باہمی تعلقات کی خوشگواری اور دائمی محبت و الفت کی بقاء کے لیے ضروری ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام مصر سے ہجرت کر کے شرق اردن کے علاقہ سدوم اور عامورہ چلے جائیں اور وہاں رہ کر دین حنیف کی تبلیغ کرتے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی رسالت کا پیغام حق سناتے رہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پھر واپس فلسطین چلے جائیں اور وہاں رہ کر اسلام کی تعلیم و تبلیغ کو سربلند کریں۔

سدوم:

اردن کی وہ جانب جہاں آج بحر میت یا بحر لوط واقع ہے یہی وہ جگہ ہے جس میں سدوم اور عامورہ کی بستیاں آباد تھیں، اس کے قریب بسنے والوں کا یہ اعتقاد ہے کہ پہلے یہ تمام حصہ جو اب سمندر نظر آتا ہے کسی زمانہ میں خشک زمین تھی اور اس پر شہر آباد تھے، سدوم و عامورہ کی آبادیاں اسی مقام پر تھیں۔ یہ مقام شروع سے سمندر نہیں تھا بلکہ جب قوم لوط پر عذاب آیا اور اس سرزمین کا تختہ

---

[1] آیت ﴿مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ﴾ میں وطنی اور روحانی دونوں قسم کی ہجرتیں مراد ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ خدا کے دین کی خاطر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا وطنی ہجرت ہے اور باپ دادا کے قدیم مذہب (مظاہر پرستی) کو چھوڑ کر ملت حنیفی کو اختیار کر لینا روحانی ہجرت ہے۔

اُلٹ دیا گیا اور سخت زلزلے اور بھونچال آئے تب یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی بھر آیا، اسی لیے اس کا نام بحر میت اور بحر لوط ہے۔ [1]

یہ صحیح ہو یا غلط بہر حال یہ مسئلہ حقیقت رکھتا ہے کہ اسی بحر میت کے ساحل پر وہ حادثہ رونما ہوا جو قوم لوط کے عذاب سے موسوم ہے اور جو گذشتہ دو سو سال کی اثری تحقیق نے بحر میت کے ساحل پر لوط کی بستیوں کے بعض تباہ شدہ آثار ہویدا کر کے اس علم و یقین کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے جس کا اعلان ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن عزیز نے کر دیا تھا۔

قوم لوط:

لوط علیہ السلام نے جب سدوم میں آ کر قیام کیا تو دیکھا کہ یہاں کے باشندے فواحش اور معصیتوں میں اس قدر مبتلاء ہیں کہ الامان، الحفیظ، دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں تھی جو ان میں موجود نہ ہو اور کوئی خوبی ایسی نہ تھی جو ان میں پائی جاتی ہو، دنیا کی سرکش، متمرد، اور بد اخلاق و بد اطوار اقوام کے دوسرے عیوب و فواحش کے علاوہ یہ قوم ایک خبیث عمل کی موجد تھی یعنی اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے وہ عورتوں کی بجائے امرد لڑکوں سے اختلاط رکھتے تھے، دنیا کی قوموں میں اس عمل کا اس وقت تک قطعاً کوئی رواج نہ تھا، یہی بد بخت قوم ہے جس نے اس ناپاک عمل کی ایجاد کی، اس عمل کا نام "لواطت" مشہور ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ شرارت، خباثت اور بے حیائی یہ تھی کہ وہ اپنی اس بدکرداری کو عیب نہیں سمجھتے تھے، اور علی الاعلان فخر و مباہات کے ساتھ اس کو کرتے رہتے تھے۔

﴿وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۸۰۔۸۱)

"اور (یاد کرو) لوط کا واقعہ، جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسے فحش کام میں مشغول ہو، جس کو دنیا میں تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا، یہ کہ بلاشبہ تم عورتوں کی بجائے اپنی شہوت کو مردوں سے پوری کرتے ہو، یقیناً تم حد سے گزرنے والے ہو۔"

عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ میں نے عبرانی ادب کی ایک کتاب میں ان کی بعض بداعمالیوں کا حال پڑھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل سدوم کی یہ بھی عادت تھی کہ وہ باہر سے آنے والے تاجروں اور سوداگروں کے مال کو ایک نئے اور اچھوتے انداز سے لوٹ لیا کرتے تھے، چنانچہ ان کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی سوداگر باہر سے آ کر سدوم میں مقیم ہوتا تو اس کے مال کو دیکھنے کے بہانے سے ہر شخص تھوڑی تھوڑی چیزیں اٹھاتا اور لے کر چل دیتا اور تاجر بیچارہ حیران و پریشان ہو کر رہ جاتا، اب اگر اس نے اپنے ضیاع مال کا شکوہ کیا اور رونے دھونے لگا تو ان لٹیروں میں سے ایک آتا اور لوٹی ہوئی دو ایک چیزیں دکھلا کر کہنے لگتا کہ بھائی میں تو یہ لے گیا تھا، لو تمہاری یہ چیز موجود ہے، وہ رنجیدہ آواز میں کہتا کہ میں اس کو لے کر کیا کروں گا، جہاں میرا سارا مال لٹ گیا وہاں یہ بھی سہی، جا تو ہی اپنے پاس رکھ، جب یہ معاملہ ختم ہو جاتا تو اب دوسرا آتا اور وہ بھی اسی طرح کوئی معمولی سی چیز دکھا کر وہی کہتا جو پہلے نے کہا تھا اور سوداگر رنج و غم اور غصہ میں اس سے بھی پہلی بات لوٹا کر کہہ دیتا۔ اسی طرح سب اس کا مال ہضم کر جاتے اور سوداگر کو لوٹ کھسوٹ

---

[1] بستانی جلد ۹ ص ۵۳۷

Marfat.com

کر بھگا دیتے۔

اسی کتاب میں یہ عجیب قصہ بھی نقل کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور سارہ علیہا السلام نے ایک مرتبہ حضرت لوط علیہ السلام کی عافیت وخیر معلوم کرنے کے لیے اپنے خانہ زاد الیعزر دمشقی کو سدوم بھیجا، یہ جب بستی کے قریب پہنچا تو اجنبی سمجھ کر ایک سدومی نے اس کے سر پر پتھر کھینچ مارا، الیعزر کے سر سے خون جاری ہو گیا، تب آگے بڑھ کر سدومی کہنے لگا کہ میرے پتھر کی وجہ سے یہ تیرا سر سرخ ہوا ہے لہٰذا مجھے اس کا معاوضہ ادا کر، اور اس مطالبہ کے لیے کھینچتا ہوا سدوم کی عدالت میں لے گیا، حاکم سدوم نے مدعی کا بیان سن کر کہا کہ بیشک الیعزر کو سدومی کے پتھر مارنے کی اجرت دینی چاہیے، الیعزر یہ سن کر غصہ میں آ گیا اور ایک پتھر اٹھا کر حاکم کے سر پر دے مارا اور کہنے لگا کہ میرے پتھر مارنے کی جو اجرت ہے وہ تو اس سدومی کو دے دینا اور یہ کہہ کر وہاں سے بھاگ گیا۔

یہ واقعات صحیح ہوں یا غلط لیکن ان سے یہ روشنی ضرور پڑتی ہے کہ اہل سدوم اس قدر ظلم، فحش، بے حیائی، بداخلاقی اور فسق و فجور میں مبتلا تھے کہ اس زمانہ کی قوموں میں ان کی جانب اس قسم کے واقعات عام طور پر منسوب کیے جاتے تھے۔

حضرت لوط علیہ السلام اور تبلیغ حق:

ان حالات میں حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو ان کی بے حیائیوں اور خباثتوں پر ملامت کی اور شرافت وطہارت کی زندگی کی رغبت دلائی، اور حسن خطابت، لطافت اور نرمی کے ساتھ جو ممکن طریقے سمجھانے کے ہو سکتے تھے ان کو سمجھایا اور موعظت ونصیحت کی اور گزشتہ اقوام کی بداعمالیوں کے نتائج وثمرات بتا کر عبرت دلائی، مگر ان بدبختوں پر مطلق اثر نہ پڑا، بلکہ اس کا یہ اُلٹا اثر ہوا کہ کہنے لگے:

﴿وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝﴾

(الاعراف: ۸۲)

"لوط (علیہ السلام) کی قوم کا جواب اس کے سوائے کچھ نہ تھا کہ کہنے لگے ان/لوط اور اس کے خاندان) کو اپنے شہر سے نکال دو، یہ بیشک بہت ہی پاک لوگ ہیں۔"

"بیشک یہ پاک لوگ ہیں" قوم لوط کا یہ مذاقیہ فقرہ تھا، گویا حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے خاندان پر طنز کرتے اور ان کا ٹھٹھا اڑاتے تھے کہ بڑے پاکباز ہیں ان کا ہماری بستی میں کیا کام، یا ناصح مشفق کی مربیانہ نصیحت سے غیظ وغضب میں آ کر کہتے تھے کہ اگر ہم ناپاک اور بے حیا ہیں اور وہ بڑے پاکباز ہیں تو ان کا ہماری بستی سے کیا واسطہ ان کو یہاں سے نکالو۔

حضرت لوط علیہ السلام نے پھر ایک مرتبہ بھری محفل میں ان کو نصیحت کی اور فرمایا: تم کو اتنا بھی احساس نہیں رہا ہے کہ یہ سمجھ سکو کہ مردوں کے ساتھ بے حیائی کا تعلق، لوٹ مار، اور اسی قسم کی بداخلاقیاں بہت برے اعمال ہیں، تم یہ سب کچھ کرتے ہو اور بھری محفلوں اور مجلسوں میں کرتے ہو اور شرمندہ ہونے کے بجائے بعد میں ان کا ذکر اس طرح سناتے ہو کہ گویا یہ کارنامے ہیں جو تم نے انجام دیے ہیں۔

﴿اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ۬ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ﴾ (العنکبوت: ۲۹)

"کیا تم ہی وہ نہیں ہو کہ تم مردوں سے بدعملی کرتے اور لوگوں کو راہ مارتے ہو اور اپنی مجلسوں میں اور اہل وعیال کے روبرو

فواحش کرتے ہو۔"

قوم نے اس نصیحت کو سنا تو غم و غصہ سے تلملا اٹھی اور کہنے لگی: لوط (علیہ السلام)! بس یہ نصیحتیں اور عبرتیں ختم کر، اور اگر ہمارے ان اعمال سے تیرا خدا ناراض ہے تو وہ عذاب لا کر دکھا جس کا ذکر کر کے بار بار ہم کو ڈراتا ہے اور اگر تو واقعی اپنے قول میں سچا ہے تو ہمارا تیرا فیصلہ ہو جانا ہی اب ضروری ہے۔

﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝﴾ (العنکبوت: ۲۹)

"پس اس (لوط علیہ السلام) کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ کہنے لگے تو ہمارے پاس اللہ کا عذاب لے آ، اگر تو سچا ہے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ملائکۃ اللہ:

ادھر یہ ہو رہا تھا اور دوسری جانب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جنگل میں سیر کر رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ تین اشخاص سامنے کھڑے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت متواضع اور مہمان نواز تھے اور ہمیشہ ان کا دسترخوان مہمانوں کے لیے وسیع تھا، اس لیے ان تینوں کو دیکھ کر وہ بے حد مسرور ہوئے اور ان کو اپنے گھر لے گئے اور بچھڑا ذبح کر کے تکے بنائے اور بھون کر مہمانوں کے سامنے پیش کیے، مگر انہوں نے کھانے سے انکار کیا، یہ دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سمجھا کہ یہ کوئی دشمن ہیں جو حسب دستور کھانے سے انکار کر رہے ہیں اور کچھ خائف ہوئے کہ آخر یہ کون ہیں؟

مہمانوں نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اضطراب دیکھا تو ان سے ہنس کر کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں! ہم خدا کے فرشتے ہیں اور قوم لوط کی تباہی کے لیے بھیجے گئے ہیں، اس لیے سدوم جا رہے ہیں۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان ہو گیا کہ یہ دشمن نہیں ہیں بلکہ ملائکۃ اللہ ہیں تو اب ان کی رقت قلب، جذبہ ہمدردی اور محبت و شفقت کی فراوانی غالب آئی اور انہوں نے قوم لوط کی جانب سے جھگڑنا شروع کر دیا اور فرمانے لگے کہ تم اس قوم کو کیسے برباد کرنے جا رہے ہو جس میں لوط جیسا خدا کا برگزیدہ نبی موجود ہے، اور وہ میرا برادر زادہ بھی ہے، اور ملت حنیف کا پیرو بھی، فرشتوں نے کہا: ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں مگر خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ قوم لوط اپنی سرکشی، بدعملی، بے حیائی اور فواحش پر اصرار کی وجہ سے ضرور ہلاک کی جائے گی، اور لوط اور اس کا خاندان اس عذاب سے محفوظ رہے گا البتہ لوط کی بیوی قوم کی حمایت اور ان کی بداعمالیوں اور بدعقیدگیوں میں شرکت کی وجہ سے قوم لوط کے ساتھ عذاب پائے گی۔

﴿فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَ جَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ۝ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَ اِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ۝﴾ (هود: ۷۴-۷۶)

"پھر جب ابراہیم (علیہ السلام) سے خوف جاتا رہا اور اس کو ہماری بشارت (ولادت اسحاق) پہنچ گئی تو وہ ہم سے قوم لوط کے متعلق جھگڑنے لگا، بیشک ابراہیم بردبار، غمخوار، رحیم ہے، اے ابراہیم! اس معاملہ میں نہ پڑ، بلاشبہ تیرے رب کا حکم آ چکا

Marfat.com

ہے اور بلاشبہ ان پر عذاب آنے والا ہے جو کسی طرح ٹل نہیں سکتا۔"

﴿قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝﴾ (الذاریات: ۳۱ـ۳۴)

"ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا: "اے خدا کے بھیجے ہوئے فرشتو! تم کس لیے آئے ہو" انہوں نے کہا: "ہم مجرم قوم کی جانب بھیجے گئے ہیں تاکہ ہم ان پر پتھروں کی بارش کریں، یہ نشان کر دیا گیا ہے تیرے رب کی جانب سے حد سے گذرنے والوں کے لیے"۔

﴿وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ڭ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۤ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝﴾ (العنکبوت: ۳۱ـ۳۲)

"اور جب ہمارے فرشتے، ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے کہنے لگے بیشک ہم ہلاک کرنے والے ہیں اس (سدوم) قریہ کے بسنے والوں کو بلاشبہ اس کے باشندے ظالم ہیں، ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ اس بستی میں تو لوط ہے فرشتوں نے کہا ہمیں خوب معلوم ہے جو اس بستی میں آباد ہیں، ہم البتہ لوط کو اور اس کے خاندان کو نجات دیں گے مگر اس کی بی بی کو نہیں کہ وہ بھی بستی میں رہ جانے والوں کے ساتھ ہے۔"

غرض حضرت لوط علیہ السلام کے ابلاغ حق، امر بالمعروف، اور نہی عن المنکر کا قوم پر مطلق کچھ اثر نہ ہوا اور وہ اپنی بداخلاقیوں پر اسی طرح قائم رہی، حضرت لوط علیہ السلام نے یہاں تک غیرت دلائی کہ تم اس بات کو نہیں سوچتے کہ میں رات دن جو اسلام اور صراط مستقیم کی دعوت و پیغام کے لیے تمہارے ساتھ حیران و سرگرداں ہوں کیا کبھی میں نے تم سے اس سعی و کوشش کا کوئی ثمرہ طلب کیا، کیا کوئی اجرت مانگی، کسی نذر و نیاز کا طالب ہوا؟ میرے پیش نظر تو تمہاری دینی و دنیوی سعادت و فلاح کے سوائے اور کچھ بھی نہیں ہے، مگر تم ہو کہ مطلق توجہ نہیں کرتے۔

﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ وَ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (الشعراء: ۱۶۰ـ۱۶۴)

"جھٹلایا قوم لوط (علیہ السلام) نے پیغمبروں کو جب کہ کہا ان کے بھائی لوط نے کیا تم نہیں ڈرتے، بیشک میں تمہارے لیے پیغمبر ہوں امانت والا، پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو، اور میں تم سے (اس نصیحت پر) اجرت نہیں مانگتا، میرا اجر اللہ رب العالمین کے سوائے کسی کے پاس نہیں۔"

مگر ان کے تاریک دلوں پر اس کہنے کا بھی مطلق کچھ اثر نہ ہوا۔ اور وہ حضرت لوط علیہ السلام کو "اخراج" اور سنگساری کی

Marfat.com

دھمکیاں دیتے رہے، جب نوبت یہاں تک پہنچی اور ان کی سیہ بختی نے کسی طرح اخلاقی زندگی پر آمادہ نہ ہونے دیا، تب ان کو بھی وہی پیش آیا جو خدا کے بنائے ہوئے قانون جزا کا یقینی اور حتمی فیصلہ ہے یعنی بدکرداریوں پر اصرار کی سزا بربادی و ہلاکت، غرض ملائکۃ اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے روانہ ہو کر سدوم پہنچے اور لوط علیہ السلام کے یہاں مہمان ہوئے، یہ اپنی شکل وصورت میں حسین و خوبصورت اور عمر میں نوجوان لڑکوں کی شکل وصورت میں تھے، حضرت لوط علیہ السلام نے ان مہمانوں کو دیکھا تو گھبرا گئے اور ڈرے کہ بدبخت قوم میرے ان مہمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرے گی، کیونکہ ابھی تک ان کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ خدا کے پاک فرشتے ہیں۔

ابھی حضرت لوط علیہ السلام اسی حیص وبیص میں تھے کہ قوم کو خبر لگ گئی اور لوط علیہ السلام کے مکان پر چڑھ آئے اور مطالبہ کرنے لگے کہ تم ان کو ہمارے حوالہ کرو، حضرت لوط علیہ السلام نے بہت سمجھایا، اور کہا کیا تم میں کوئی بھی سلیم فطرت انسان "رجل رشید" نہیں ہے کہ وہ انسانیت کو برتے اور حق کو سمجھے؟ تم کیوں اس لعنت میں گرفتار ہو، اور خواہشات نفس کے ایفاء کے لیے فطری طریق عمل کو چھوڑ کر اور حلال طریقہ سے عورتوں کو رفیقۂ حیات بنانے کی جگہ اس ملعون بے حیائی کے درپے ہو، اے کاش میں "رکن شدید" کی زبردست حمایت حاصل کر سکتا۔

حضرت لوط علیہ السلام کی اس پریشانی کو دیکھ کر فرشتوں نے کہا، آپ ہماری ظاہری صورتوں کو دیکھ کر گھبرائیے نہیں، ہم ملائکہ عذاب ہیں اور خدا کے قانون "جزائے اعمال" کا فیصلہ ان کے حق میں اٹل ہے، وہ اب ان کے سر سے ٹلنے والا نہیں، آپ اور آپ کا خاندان عذاب سے محفوظ رہے گا، مگر آپ کی بیوی ان ہی بے حیاؤں کی رفاقت میں رہے گی اور تمہارا ساتھ نہ دے گی۔

آخر عذاب الٰہی کا وقت آ پہنچا، ابتداء شب ہوئی تو ملائکہ کے اشارہ پر حضرت لوط علیہ السلام اپنے خاندان سمیت دوسری جانب سے نکل کر سدوم سے رخصت ہو گئے اور ان کی بیوی نے ان کی رفاقت سے انکار کر دیا اور راستہ ہی سے لوٹ کر سدوم واپس آ گئی، آخر شب ہوئی تو اول ایک ہیبت ناک چیخ نے اہل سدوم کو تہ و بالا کر دیا اور پھر آبادی کا تختہ اوپر اٹھا کر الٹ دیا گیا اور اوپر سے پتھروں کی بارش نے ان کا نام ونشان تک مٹا دیا اور وہی ہوا جو گذشتہ قوم کی نافرمانی اور سرکشی کا انجام ہو چکا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿٦٢﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ
يَمْتَرُوْنَ ﴿٦٣﴾ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٦٤﴾ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ
وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٥﴾ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَاۗءِ
مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿٦٦﴾ وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿٦٧﴾ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ ضَيْفِيْ فَلَا
تَفْضَحُوْنِ ﴿٦٨﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿٦٩﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ هٰٓؤُلَاۗءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ
كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٧١﴾ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿٧٢﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿٧٣﴾
فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿٧٤﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿٧٥﴾

(الحجر: ٦١-٧٥)

Marfat.com

"اور پھر جب ایسا ہوا کہ بھیجے ہوئے (فرشتے) خاندان لوط کے پاس پہنچے، تو انہوں نے کہا "تم لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہو" انہوں نے کہا نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ ہم تمہارے پاس وہ بات لے کر آئے ہیں، جس میں لوگ شک کیا کرتے تھے (یعنی ہلاکت کے ظہور کی خبر جس کا لوگوں کو یقین نہ تھا) ہمارا آنا ایک امر حق کے لیے ہے، اور ہم اپنے بیان میں سچے ہیں، پس چاہیے کہ کچھ رات رہے اپنے گھروں کے لوگوں کو لے کر نکل جاؤ اور ان کے پیچھے قدم اٹھاؤ، اور اس بات کا خیال رکھو کہ کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے، جہاں جانے کا حکم دیا گیا ہے (اسی طرح رخ کیے چلے جائیں) غرضیکہ ہم نے لوط پر حقیقت حال واضح کر دی کہ ہلاکت کا ظہور ہونے والا ہے اور باشندگان شہر کی بیخ و بنیاد صبح ہوتے ہوتے اکھڑ جانے والی ہے اور اس (اثناء میں ایسا ہوا کہ) شہر کے لوگ خوشیاں مناتے ہوئے آ پہنچے، لوط علیہ السلام نے کہا دیکھو یہ (نئے آدمی) میرے مہمان ہیں تم میری فضیحت نہ کرو، اللہ سے ڈرو تم میری رسوائی کے کیوں درپے ہو گئے ہو؟" انہوں نے کہا: "کیا ہم نے تجھے اس بات سے نہیں روک دیا تھا کہ کسی قوم کا آدمی ہو، لیکن اپنے یہاں نہ ٹھہراؤ" لوط (علیہ السلام) نے کہا اگر ایسا ہی ہے تو "دیکھو یہ میری بیٹیاں (کھڑی) ہیں (یعنی باشندگان شہر کی بیویاں جن کی طرف وہ ملتفت نہیں ہوتے تھے) ان کی طرف ملتفت ہو" (تب فرشتوں نے لوط سے کہا) تمہاری زندگی کی قسم، یہ لوگ تو اپنی بدمستیوں میں کھوئے گئے ہیں (تمہاری باتیں ماننے والے نہیں) غرضیکہ سورج نکلتے نکلتے ایک ہولناک آواز نے انہیں آ لیا، پس ہم نے وہ بستی زیروزبر کر ڈالی اور پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی ان پر بارش کی بلاشبہ اس واقعہ میں ان لوگوں کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو (حقیقت کی) پہچان رکھنے والے ہیں۔"

﴿وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَ ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّ قَالَ هٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ۝ وَ جَآءَهٗ
قَوْمُهٗ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ ؕ وَ مِنْ قَبْلُ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ قَالَ یٰقَوْمِ هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ ؕ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ۝ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ
مِنْ حَقٍّ ۚ وَ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ۝ قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ۝ قَالُوْا
یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ یَّصِلُوْۤا اِلَیْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ وَ لَا یَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا
امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِیْبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ۝ فَلَمَّا جَآءَ
اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ۙ۬ مَّنْضُوْدٍ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ
وَ مَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ۝﴾ (هود: ۷۷_۸۳)

"اور پھر جب ایسا ہوا کہ ہمارے فرستادے لوط کے پاس پہنچے، تو وہ ان کے آنے سے خوش نہ ہوا اور ان کی موجودگی نے اسے پریشان کر دیا، وہ بولا "آج کا دن تو بڑی مصیبت کا دن ہے!" اور اس کی قوم کے لوگ (اجنبیوں کے آنے کی خبر سن کر) دوڑتے ہوئے آئے وہ پہلے سے برے کاموں کے عادی ہو رہے تھے، لوط نے ان سے کہا "لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں

Marfat.com

(یعنی بستی کی عورتیں جنہیں وہ اپنی بیٹیوں کی جگہ سمجھتا تھا، اور جنہیں لوگوں نے چھوڑ رکھا تھا) یہ تمہارے لیے جائز اور پاک ہیں، پس (ان کی طرف ملتفت ہو، دوسری بات کا قصد نہ کرو اور) اللہ سے ڈرو، میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسواء نہ کرو، کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں؟" ان لوگوں نے کہا تجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تیری ان بیٹیوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں اور تو اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں لوط (علیہ السلام) نے کہا: "کاش تمہارے مقابلہ کی مجھے طاقت ہوتی یا کوئی اور سہارا ہوتا جس کا آسرا پکڑ سکتا" (تب) مہمانوں نے کہا: اے لوط! "ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں (گھبرانے کی کوئی بات نہیں) یہ لوگ کبھی تجھ پر قابو نہ پاسکیں گے تو یوں کر کہ جب رات کا ایک حصہ گزر جائے تو اپنے گھر کے آدمیوں کو ساتھ لے کر نکل چل، اور تم میں سے کوئی اِدھر اُدھر نہ دیکھے (یعنی کسی بات کی فکر نہ کرے) مگر ہاں تیری بیوی (ساتھ دینے والی نہیں، وہ پیچھے رہ جائے گی، اور) جو کچھ ان لوگوں پر گذرتا ہے وہ اس پر بھی گذرے گا، ان لوگوں کے لیے عذاب کا مقررہ وقت صبح کا ہے، اور صبح کے آنے میں کچھ دیر نہیں" پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آ پہنچا تو (اے پیغمبر!) ہم نے اس (بستی) کی تمام بلندیاں پستی میں بدل دیں (یعنی بستی کو اُلٹ دیا) اور زمین کے برابر کر دیا) اور اس پر آگ میں پکے ہوئے پتھر لگا تار برسائے تیرے پروردگار کے حضور (اس غرض) سے نشانی کیے ہوئے تھے، یہ (بستی) ان ظالموں سے (یعنی اشرار مکہ سے) کچھ دور نہیں ہے (یہ اپنی سیر و سیاحت میں وہاں سے گذرتے رہتے ہیں، اور اگر چاہیں، تو اس سے عبرت پکڑ سکتے ہیں)۔"

﴿فَنَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ۙ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ۚ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۚ وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ (الشعراء: ۱۷۰۔۱۷۵)

"پھر بچا دیا ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو سب کو مگر ایک بڑھیا رہ گئی رہنے والوں میں، پھر اٹھا مارا ہم نے ان دوسروں کو اور برسایا ان پر ایک برساؤ، سو کیا بُرا برساؤ تھا ان ڈرائے ہوؤں کا، البتہ اس بات میں نشانی ہے، اور ان میں بہت لوگ نہیں تھے ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا۔"

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّ قِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝﴾

(التحریم: ۱۰)

"اللہ نے بتلائی ایک مثال منکروں کے واسطے عورت نوح کی اور عورت لوط کی، گھر میں تھیں دونوں دو نیک بندوں کے ہمارے نیک بندوں میں سے، پھر انہوں نے ان سے خیانت کی پھر وہ کام نہ آئے ان کے اللہ کے ہاتھ سے کچھ بھی اور حکم ہوا کہ چلی جاؤ دوزخ میں جانے والوں کے ساتھ۔"

Marfat.com

مسائل:

① مسطورۂ بالا آیات میں حضرت لوط علیہ السلام کے یہ مقولے مذکور ہیں: ﴿هٰؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ هٰؤُلَآءِ بَنَاتِیْۤ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ﴾ یعنی حضرت لوط علیہ السلام نے قوم کی مزاحمت اور مہمانوں سے متعلق مطالبہ سے تنگ آ کر یہ فرمایا کہ "تم ان مہمانوں سے تعرض نہ کرو، اگر نفس کی فطری خواہش پوری کرنا چاہتے ہو تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، یہ تمہارے لیے پاک ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟ ایک باعصمت و باعزت انسان اور پھر وہ بھی نبی معصوم، کس طرح یہ گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اپنی باعصمت لڑکیوں کو ایسے بے حیا اور خبیث انسانوں کے سامنے پیش کرے؟ اس سوال کے حل میں علماء محققین نے مختلف جواب دیئے ہیں۔

(ا) حضرت لوط علیہ السلام نبی ہیں اور ہر ایک نبی اپنی قوم کا روحانی باپ ہوتا ہے، قوم مسلمان ہو کر اس کی اطاعت گذار ثابت ہو، یا انکار کر کے متمرد و منحرف، دونوں صورتوں میں وہ اس کی "امت" میں داخل ہے، اگرچہ پہلی امت "امت اجابت" ہے اور دوسری "امت دعوت" اور اس لیے تمام امت اس کی اولاد ہوتی ہے اور نبی اور رسول اس کا روحانی باپ۔

لہٰذا حضرت لوط علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ بدبختو! تمہارے گھروں میں یہ سب میری بیٹیاں تمہاری رفیقۂ حیات ہیں اور تمہارے لیے حلال، پھر تم ان کو چھوڑ کر اس ملعون اور خبیث کام پر اصرار کرتے ہوا ایسا نہ کرو (العیاذ باللہ) یہ مقصد نہ تھا کہ وہ اپنی صلبی لڑکیاں ان کو پیش فرما رہے تھے۔

(ب) تورات اور دیگر روایات سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو "اسحاق علیہ السلام" کی بشارت دے کر قوم لوط کو ہلاک کرنے آئے تھے تین تھے، اس لیے یہ ناممکن تھا کہ تین افراد کے لیے پوری بستی خواہش مند ہو جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، بلکہ اصل بات یہ تھی کہ اس قوم میں دو سردار تھے اور انہوں نے ہی لوط علیہ السلام کے مہمانوں کا مطالبہ کیا تھا، باقی قوم اپنی اس عام بدکرداری کی وجہ سے ان کی حمایت میں جمع ہو گئی تھی اور چونکہ حضرت لوط علیہ السلام کی دو بیٹیاں کنواری موجود تھیں اس لیے انہوں نے ان دونوں سرداروں کو سمجھایا کہ تم اپنے اس خبیث و شنیع مطالبہ سے باز آ جاؤ، اور میں اس کے لیے تیار ہوں کہ اپنی دونوں لڑکیوں کا نکاح تم سے کر دوں مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا، اور کہنے لگے، لوط! تجھے معلوم ہے کہ ہم عورتوں کی جانب رغبت نہیں رکھتے۔

(ج) حضرت لوط علیہ السلام نے بیشک اپنی بیٹیوں ہی کے متعلق یہ جملہ فرمایا تھا مگر اس کی حیثیت اس بزرگ کے مقولہ کی طرح ہے جو کسی کو ناحق پٹتا ہوا دیکھ کر ظالم مارنے والے سے یہ کہے کہ اس کو نہ مار اس کے عوض مجھ کو مار لے، حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کبھی ایسی جرأت نہیں کر سکے گا کیوں کہ وہ اس کا چھوٹا ہے یا ماتحت۔

پس جس طرح اس شخص کا مقصد مارنے والے کو عار اور شرم دلانا ہوتا ہے، اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو شرم اور عار دلانے اور اس قبیح فعل پر ذلیل اور نادم کرنے کے لیے یہ جملہ فرمایا اور ان کو یہ یقین تھا کہ نہ یہ بدبخت اس طرف راغب ہوں گے اور نہ وہ عملاً ایسا کریں گے۔

امام رازی، اصفہانی اور ابوالسعود اسی توجیہ کو پسند فرماتے ہیں اور عبدالوہاب نجار مصری کی بھی یہی رائے ہے، مگر میرے

Marfat.com

نزدیک پہلی توجیہ زیادہ صحیح اور قابل قبول ہے اور علامہ عبدالوہاب کا اس کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ "یہ قول اس لیے کمزور ہے کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام ان کافر عورتوں کے باپ تسلیم کئے جائیں" اس لیے کہ ہم شروع جواب ہی میں تصریح کر چکے ہیں کہ "نبی معصوم" اپنی اس تمام امت کا روحانی باپ ہوتا ہے جس کی جانب اس کو مبعوث کیا گیا ہے، یہ جدا بات ہے کہ امت اجابت اس کی عطاء کردہ سعادت و فلاح سے مستفید ہوتی ہے اور امت دعوت اس سے محروم رہتی ہے، نیز آج بھی یہ دستور ہے کہ کافر و مسلم کے امتیاز کے بغیر بڑے بوڑھے بستی کی لڑکیوں کو اپنی بیٹیاں کہا کرتے ہیں۔

② حضرت لوط علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ قوم ان کے مہمانوں کے ساتھ بداخلاقی پر تلی ہوئی ہے اور کسی طرح ان پر عار دلانے کا اثر ہوتا ہے نہ حیاء و مروت اور اخلاق و انسانیت کے نام پر اپیل کا، تب پریشان خاطر ہو کر فرمایا:

﴿لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ ۝۸۰﴾ (ھود: ۸۰)

"کاش میرے لیے تم سے (مقابلہ کی) طاقت ہوتی یا پناہ ملتی کسی زبردست قوت پناہ کے ساتھ۔"

اس "رکن شدید" سے کیا مراد ہے، کیا حضرت لوط علیہ السلام "العیاذ باللہ" خدا کی قدرت پر بھروسہ نہیں رکھتے تھے جو کسی "رکن شدید" کی پناہ کے طالب تھے؟

اس مشکل کا حل بخاری کی روایت نے بخوبی کر دیا ہے، اس روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

یغفر اللہ للوط ان کان لیاوی الی رکن شدید، وھو ربہ وخالقہ۔ [1]

"اللہ تعالیٰ لوط علیہ السلام کی بخشش کرے (کہ وہ اس درجہ پریشان کیے گئے) کہ رکن شدید کی پناہ کے طالب ہوئے اور ان کے لیے رکن شدید ان کا پروردگار اور ان کا خالق ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام خدا کو بھول کر کسی اور قوت کی پناہ کے طالب نہ تھے بلکہ وہ اس درجہ قابل رحم حالت میں تھے کہ اس وقت ان کی یہ تمنا ہوئی، کاش کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی قوت عطا کرتا کہ میں اسی وقت ان سب بدبختوں کو ان کی خباثت کا مزہ چکھا سکتا، اور "رکن شدید" یعنی اس کے پروردگار نے آخر ان کی مدد کی اور ان پر فرشتوں نے اپنا راز ظاہر کر دیا اور ان کو تسلی اور اطمینان بخشا کہ آپ پریشان نہ ہوں تھوڑا ہی وقت گذرتا ہے کہ یہ اپنی بدکرداری کے عبرتناک انجام کو پہنچ جائیں گے۔

③ بعض مفسرین نے ﴿بِکُمْ قُوَّةً﴾ میں ﴿کُمْ﴾ کا مخاطب فرشتوں کو سمجھا ہے، اور مراد یہ لیتے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا کاش تم اس کثرت سے ہوتے کہ ان کے مقابلہ میں مجھ کو تم سے قوت پہنچتی یا خدا کوئی ایسی صورت پیدا کر دیتا کہ میں ان کو سزا دے سکتا، اسی لیے حضرت لوط علیہ السلام کے اس قول کو سن کر فرشتوں نے کہا:

---

[1] تفسیر کی بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ "رکن شدید" میں رکن سے مراد خاندان ہے، حضرت لوط علیہ السلام نے سدوم کے باشندوں کی بے مروتی اور وحشت کو محسوس کیا تو بہ تقاضائے بشریت فرمایا، کاش کہ میں خاندان والوں سے وابستہ ہوتا تو یہ پریشانی نہ ہوتی، چنانچہ اس کے بعد حق تعالیٰ نے انبیاء ورسل کو ان کے اپنے خاندان اور برادری ہی میں مبعوث کیا، مگر یہ توجیہ مضبوط نہیں ہے اور اپنے اندر کافی سقم رکھتی ہے اس لئے صحیح توجیہ وہی ہے جو صحیح بخاری میں خود ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔

﴿قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ یَّصِلُوْۤا اِلَیْكَ﴾ (ھود:۸۱)

"فرشتوں نے کہا، اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں (مجبور انسان نہیں ہیں) یہ تجھ کو ہرگز نہیں پہنچا سکتے۔"

توارات میں ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام مع اپنے خاندان کے سدوم سے ہجرت کر کے ضوغر یا ضغر کی بستی میں چلے گئے جو سدوم سے قریب ہی آباد تھی۔ [1] آفتاب نکلنے کے بعد جب انہوں نے سدوم کی جانب دیکھا تو وہاں ہلاکت و بربادی کے نشانات کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام نے پھر ضغر کو بھی چھوڑ دیا، اور اس کے قریب ایک پہاڑی پر جا کر آباد ہوئے، اور امن و امان سے رہنے سہنے لگے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام مجدد انبیاء علیہم السلام:

ان مسلسل واقعات سے بہت سے بصائر و عبر وغیرہ حاصل ہونے کے علاوہ ایک سب سے اہم بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت منصب نبوت و رسالت میں بھی خاص امتیازی شان رکھتی ہے، یوں تو خدا کا ہر ایک پیغمبر توحید کا داعی اور شرک کا دشمن ہے اور اس لیے تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں یہ دو باتیں قدرے مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں، بلکہ روحانی دعوت و ارشاد کی اساس و بنیاد صرف انہی دو مسئلوں پر قائم ہے مگر یہ خصوصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے حصہ میں آئی تھی کہ اس دنیا میں وہ پہلی ہستی ہیں جنہیں اس راہ عزیمت میں سخت سے سخت آزمائشوں اور کڑی سے کڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اور وہ ان مصائب کے مقابلے میں کامران و کامیاب ثابت ہوئے۔

غور کیجئے بڑھاپے اور یاس کی عمر میں ہزاروں تمناؤں اور لاکھوں آرزوؤں کے بعد ایک بچہ پیدا ہوا تھا اور ابھی بچہ شیر خوار ہے کہ خدائے تعالیٰ کا حکم آتا ہے "ابراہیم (علیہ السلام)! اس کو اور اس کی والدہ کو اپنے گھر سے جدا کرو، اور ایک لق و دق بیابان اور بن کھیتی کی زمین میں "جہاں نہ پانی ہے نہ سبزہ" ان دونوں کو چھوڑ آؤ پھر کیا ہوا؟ کیا ابراہیم علیہ السلام نے ایک لمحہ بھی تامل کیا؟ اور تعمیل ارشاد میں کسی قسم کا کوئی عذر سامنے آیا؟ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ بے چون و چرا ان دونوں کو مکہ کی سرزمین پر چھوڑ آئے۔

اور اس کے بعد جب وہ سن رشد کو پہنچتا اور ماں باپ کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنتا ہے تو اب پھر ابراہیم (علیہ السلام) کو خدا کا حکم ملتا ہے کہ اس کو ہمارے نام پر قربان کرو اور اپنی فداکاری و اطاعت شعاری کا ثبوت دو۔

اس نازک وقت میں ایک مطیع سے مطیع اور فرمانبردار سے فرمانبردار ہستی کے ایمان و یقین کی کشتی کس طرح بھنور میں آجاتی ہے اس کا اندازہ خود کرو، اور پھر ابراہیم علیہ السلام کی جانب دیکھو کہ نہ خدا کی وحی کی جو "خواب اور رؤیا کی شکل میں" دکھائی گئی تھی، انہوں نے کوئی تاویل کی، نہ اس کے لیے حیلہ بہانہ سوچا، اور نہ اس کو ٹالنے کے لیے کوئی فکر و تردد کیا، صبح اٹھے اور اپنے لخت جگر کو لیا اور تعمیل ارشاد الٰہی میں وہ سب کچھ کیا جو ان کے انسانی ہاتھ کر سکتے تھے اور اس طرح اپنی محیر العقول وفاکیشی کا ثبوت دیا۔

اور تیسری سخت آزمائش کا وہ وقت تھا کہ جب باپ، قوم اور بادشاہ وقت سب نے متفق ہو کر یہ فیصلہ کر لیا کہ ابراہیم علیہ السلام یا پیغام حق سے باز آ جائے ورنہ تو اس کو دہکتی آگ میں ڈال کر خاکستر کر دیا جائے، تب ظالموں کا یہ فیصلہ اور اتحاد کیا ابراہیم علیہ السلام

---

[1] پیدائش باب ۱۹ آیت ۲۲

Marfat.com

کو ڈگمگا سکا؟ نہیں! بلکہ وہ ایک عزم کا پہاڑ بن کر اسی طرح اپنی جگہ کھڑا رہا، اور پیغام حق اور خدا کی رشد و ہدایت کو اسی عزم و ثبات کے ساتھ سناتا رہا جس طرح شروع سے کرتا رہا، پھر دشمنوں نے جو کچھ کہا تھا آخر کر دکھایا اور اس کو دہکتی آگ میں جھونک دیا، مگر ابراہیم علیہ السلام کے سکون و اطمینان میں مطلق کوئی فرق نہیں آیا، البتہ دشمنوں کی دشمنی اور ان کے تمام مکر و فریب کو ابراہیم علیہ السلام کے خدا نے پادر ہوا کر دیا اور خاک میں ملا دیا، اور آگ کے شعلے اس کے لیے "برد و سلام" بن گئے، اور اس طرح ابراہیم علیہ السلام اپنے قوی تر نگہبان کے زیر سایہ سعادت و ہدایت کے فیضان سے بندگان خدا کو برابر منور و روشن کرتا رہا اور اس کی جرأت حق اور دعوت الی اللہ تیز تر ہوگئی۔

ان تمام سخت امتحانوں اور آزمائشوں اور پھر ان میں ثبات قدمی اور استقامت کے علاوہ ابراہیم علیہ السلام کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے شرک اور توحید کی متضاد زندگی کے لیے ایک ایسا امتیاز قائم کر دیا جو انہی جیسے جلیل القدر پیغمبر کے شایان شان تھا۔

﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۟ۚ﴾ (الانعام: ۷۹)

"بلاشبہ میں نے اپنا رخ اسی ذات کی طرف جھکا دیا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے، خالص اس کا ہو کر اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

ابراہیم علیہ السلام کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے تصور کی دو راہیں ہیں ایک صحیح اور دوسری غلط، غلط راہ یہ ہے کہ یہ عقیدہ قائم کر لیا جائے کہ خدا کو راضی کرنے، اس کو خوش رکھنے اور اس کی عبادت و پرستش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بتوں اور ستاروں کی پوجا کی جائے کیونکہ جب یہ ارواح ہم سے خوش ہو جائیں گی یہ تو خدا کو ہم سے راضی کر دیں گی، اس عقیدہ کا نام "شرک اور صابیت ہے" کیونکہ اس عقیدہ کے مطابق عبودیت و پرستش کے تمام وہ خصوصی امتیازات جو صرف "ذات واحد" کے لیے مخصوص رہنے چاہیے تھے دوسروں کے لیے بھی مشترک ہو جاتے ہیں، اور یہی شرک کی حقیقت ہے۔

اس کے مقابلہ میں صحیح راہ یہ ہے کہ اس علم و یقین کو عقیدہ بنایا جائے کہ خدائے تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کا طریقہ اس کے علاوہ دوسرا نہیں ہے کہ خود اسی کی پرستش کی جائے اسی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے، نفع و ضرر، صحت و مرض، افلاس و تمول، رزق کا قبض و بسط اور موت و زیست غرض تمام امور میں اسی کو اور صرف اسی کو مالک و مختار مطلق تسلیم کیا جائے اور اس کی رضا و عدم رضاء کی معرفت کے لیے اس کے بھیجے ہوئے سچے پیغمبروں اور رسولوں کی ہی ہدایت و رشد پر عمل کیا جائے، گویا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیا جائے کہ خدا کو راضی رکھنے اور اس سے قربت حاصل کرنے کے لیے دیوی دیوتاؤں کو ذریعہ بنانے کی حاجت نہیں بلکہ صرف اس ذات احدیت کی عبودیت و بندگی کو سرمایہ حیات بنایا جائے، اسی عقیدہ کا نام "اسلام" اور "حنیفیت" ہے۔

اس لیے یہ پہلا دن تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلی راہ کو شرک و صابیت اور دوسری راہ کو اسلام و حنیفیت کا نام دے کر دونوں راہوں کے درمیان مستقل امتیاز قائم کر دیا اور یہ امتیاز ایسا مقبول ہوا کہ آنے والی تمام پیغمبرانہ تعلیم و دعوت کی بنیاد و اساس انہی نام سے موسوم کی گئیں حتیٰ کہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری پیغام کا نام بھی "ملت حنیف" اور اس کے پیرو کا نام "مسلم" قرار پایا۔

Marfat.com

﴿ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ ﴾ (النحل : ۱۲۳)

"اور پیروی کر وملت ابراہیم کی جو حنیف تھا۔"

﴿ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَ فِیْ هٰذَا ﴾ (الحج : ۷۸)

"اس ابراہیم (علیہ السلام) نے تمہارا نام پہلے ہی سے مسلمان رکھا ہے اور اس قرآن میں بھی (یہی نام پسند رہا)"۔

یہی وجہ ہے کہ "سورۂ ابراہیم" کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں انبیاء علیہم السلام کے ظہور اور ان کے حالات وتشخصات اور نتائج کو مجموعی طور پر پیش کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ پیغمبروں کی دعوت رشد وہدایت کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان کیا فرق ہے؟ اور یہ کہ خیر وشر، طاعت وبغاوت اور تسلیم وانکار میں کیا غیر اللہ کی خوشنودی کو بھی کوئی مقام حاصل ہے یا صرف رضاء وعدم رضاء الٰہی ہی اصل ایمان ہے؟

پس ان مجموعی خصوصیات ابراہیمی کے پیش نظر بلاشبہ یہ کہنا صحیح ہے کہ نبیوں اور رسولوں کی مقدس زندگی میں ابراہیم (علیہ السلام) کا مقام "مجد دانبیاء ورسل" کا مقام ہے۔

واقعات زیر بحث سے متعلق چند عبرتیں:

① جب انسان کسی عقیدہ کو علم ویقین کی روشنی میں قائم کر لیتا ہے، اور وہ اس کے قلب میں جاگزیں، اس کی روح میں پیوست، اور اس کے سینہ میں نقش کالحجر ہو جاتا ہے تو اس کا فکر وخیال، اس کا سوچ بچار، اور اس کا استغراق اس بارہ میں اس درجہ زبردست ثابت وراسخ ہو جاتا ہے کہ کائنات کا کوئی حادثہ اور دنیا کی کوئی سخت سے سخت مصیبت بھی اس کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی، وہ اس کے لیے آگ میں بے خطر کود پڑتا، سمندر میں بے جھجک چھلانگ مار دیتا اور سولی کے تختہ پر بے خوف جان دے دیتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عزم وثبات کی مثال اس کے لیے ایک زندہ اور روشن مثال ہے۔

② حمایت حق کے لیے ایسے دلائل وبراہین پیش کرنے چاہئیں جو دشمن اور باطل پرست کے تہ قلب میں اتر جائیں اور وہ زبان سے خواہ اقرار حق نہ کرے لیکن اس کا ضمیر اور اس کا قلب حق کے اقرار پر مجبور ہو جائے بلکہ بعض مرتبہ زبان بھی بے اختیار اعلان حق سے باز نہ رہ سکے، آیت قرآن ﴿وجادلهم بالتي هي احسن﴾ اسی حقیقت کا اعلان کرتی ہے۔

③ پیغمبروں اور رسولوں کی راہ یہی ہے، وہ جدل ومخاصمت کی منطقیانہ راہوں پر نہیں چلتے، ان کے دلائل وبراہین کی بنیاد محسوسات ومشاہدات پر ہوتی ہے یا سادہ وجدانیات وعقلیات پر، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصنام پرستی وکواکب پرستی کے متعلق جمہور سے مناظرہ اور مناظرۂ نمرود، اس کی واضح اور روشن مثال ہے۔

④ کسی امر حق کو ثابت کرنے کے لیے دلیل میں مخالف کے باطل عقیدہ کو فرضی طور پر تسلیم کر لینا جھوٹ یا اس باطل عقیدہ کا اقرار نہیں ہے بلکہ اس کو ﴿فرض الباطل مع الخصم﴾ یا ﴿معاریض﴾ کہا جاتا ہے اور یہ طریقہ استدلال مخالف کو اپنی غلطی کے اعتراف پر مجبور کر دیتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جمہور کے ساتھ مناظرہ میں دلیل کا یہی پہلو اختیار کیا تھا جس نے صنم پرستوں کو مجبور کر دیا کہ وہ

Marfat.com

اقرار کرلیں کہ بیشک بت کسی حال میں بھی نہ سنتے ہیں اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔

⑤ اگر ایک مسلم کے والدین مشرک ہوں اور کسی طرح شرک سے باز نہ آتے ہوں تو ان کی مشرکانہ زندگی سے بیزار اور علیحدہ رہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ دنیوی معاملات اور آخرت کی پندونصائح میں عزت وحرمت کا معاملہ کرنا چاہیے اور سختی اور درشتی کو کام میں نہ لانا چاہیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طرز عمل آزر کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کا طریق عمل ابوطالب کے ساتھ اس مسئلہ کے لیے قطعی اور یقینی شہادت ہے۔

⑥ اگر قلب مومن صحیح عقائد پر اطمینانِ قلب اور زبان وقلب کی مطابقت کے ساتھ ایمان رکھتا ہے، مگر عینی اور حقیقی مشاہدہ ومحسوس کے لیے یا اس کو حق الیقین کے درجہ تک حاصل کرنے کے لیے کسی ایمانی یا اعتقادی مسئلہ میں بھی سوال وجستجو کی راہ اختیار کرتا اور طمانیت قلب کا طالب ہوتا ہے تو یہ جستجو ریب وکفر نہیں ہے بلکہ عین ایمان ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب ﴿ولکن لیطمئن قلبی﴾ سے اسی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

⑦ دسترخوان کی وسعت اگر ریاء ونمود سے پاک ہو اور فطری تقاضے کے پیش نظر مہمان نوازی میں وسعت قلب اور فراخ حوصلگی پائی جاتی ہو تو اخلاق کریمانہ میں بہت فضیلت شمار ہوتی ہے اور "سخاء نفس" اور "کرم" کے نام سے موسوم ہے۔

یہ وصف گرامی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حقیقت نفس بن چکا تھا اور فطری تھا۔ مہمان نوازی، دسترخوان کی وسعت، آنے والوں کا احترام، ایسے اوصاف تھے جو ابراہیم علیہ السلام میں "مثل اعلیٰ" کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔

بعض کتابوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی کے سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ منقول ہے، کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حسب دستور حضرت ابراہیم علیہ السلام کسی مہمان کے انتظار میں جنگل میں کھڑے تھے، کیوں کہ بغیر مہمان کے نہ ان کا دسترخوان بچھتا تھا اور نہ وہ کھانا کھاتے تھے، سامنے سے ایک بہت بوڑھا آدمی نظر پڑا جس کی کمر بھی کج ہوگئی تھی اور لکڑی کے سہارے بمشکل چل رہا تھا، ابراہیم علیہ السلام آگے بڑھے اور مسرت کے ساتھ اس کو سہارا دیتے ہوئے گھر لائے، دسترخوان بچھا، اور کھانا چنا گیا، جب سب فارغ ہوگئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا، اس خدائے یکتا کا شکر ادا کر جس نے ہم سب کو یہ نعمتیں عطا فرمائیں، بوڑھے نے غضبناک ہوکر کہا میں نہیں جانتا کہ تیرا خدائے واحد کون ہے، میں تو اپنے معبود (بت) کا شکر ادا کرتا ہوں جو میرے گھر میں رکھا ہے، یہ جواب ابراہیم علیہ السلام کو بہت شاق گذرا، اور اس کو فوراً گھر سے رخصت کردیا، لیکن کچھ وقفہ نہ گذرا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے دل اپنے اس طرز عمل سے تکدر ہوا، انہوں نے سوچا کہ جس خدائے واحد کا شکر میں اس سے کرانا چاہتا تھا اس کی شان تو یہ ہے کہ اس بوڑھے کی اس طویل عمر میں وہ برابر اپنی نعمتوں سے اس کو نوازتا رہا اور اس کی بت پرستی، کفر، اور شرک سے ناراض ہوکر ایک وقت بھی اس پر رزق کا دروازہ بند نہیں کیا پھر تجھ کو کیا حق تھا کہ اگر اس نے تیری بات نہ مانی اور حق کے کلمہ کو قبول نہ کیا تو خفا ہوکر اس کو گھر سے نکال دیا۔

یہ واقعہ اپنی تاریخی حیثیت میں قابل قبول ہو یا ناقابل قبول لیکن اس حقیقت کا ضرور اعلان کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اخلاق کریمانہ کی وہ بلندی جو "حقیقی مثل اعلیٰ" تک پہنچی ہوئی تھی ضرب المثل اور زبان زد خلائق تھی، اور بلاشبہ ان کا یہ فکر، پیغام اور دعوت اسلام کے لیے بہترین اسوہ ہے۔

Marfat.com

⑧ اللہ تعالیٰ جن ہستیوں کو اپنے ابلاغ حق کے لیے چن لیتا ہے ان کے قلب و دماغ کو اپنے نور سے اس درجہ روشن کر دیتا ہے کہ ان کے سامنے عشق حق و صداقت کے سوائے دوسری کوئی چیز باقی ہی نہیں رہتی اور اس لیے ان میں شروع ہی سے یہ استعداد ودیعت ہوتی ہے کہ وہ عہد طفولیت ہی سے اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور نمایاں نظر آنے لگتے اور راہ حق میں ابتلاء و امتحان کو خوشی سے سہتے اور صبر و رضاء کا اسوۂ حسنہ پیش کرتے رہتے ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا واقعہ اس کی شہادت کے لیے شاہد عدل اور باعث صد ہزار عبرت و عظمت ہے۔

⑨ حضرت لوط علیہ السلام اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے برادر زادہ اور ان کے پیرو تھے مگر شرف نبوت سے بھی سرفراز ہو چکے تھے اور خدا کے ایلچی بنا دیئے گئے تھے اس لیے سدوم اور عامورہ میں ہمہ قسم کے مصائب اور وطن سے دور دشمنوں کے نرغہ کی تکالیف کے باوجود انہوں نے صبر و استقامت سے کام لیا اور اپنے بزرگ چچا اور خاندان کی مدد کی طلب کی بجائے صرف خدائے عزوجل ہی پر بھروسہ رکھتے ہوئے اس کے احکام کے سامنے رضا و تسلیم کا ثبوت دیا۔ یہ مقام "مقربین و انبیاء" کا مقام ہے۔

Marfat.com

حضرت یعقوب علیہ السلام

○ نسب نامہ ○ قرآن عزیز میں ذکر یعقوب علیہ السلام ○ اولاد یعقوب علیہ السلام ○ ولادت یوسف علیہ السلام

نسب نامہ:

حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ہیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے بتوئیل کے نواسہ، ان کی والدہ کا نام رفقہ یا ربقہ تھا، یہ اپنی والدہ کے چہیتے اور پیارے تھے اور ان کا حقیقی بھائی عیسو والد کا محبوب اور پیارا اور دونوں حقیقی بھائی تھے۔

تورات سے ان دونوں بھائیوں کی باہم ناراضی کا واقعہ گذشتہ سطور میں نقل کیا جا چکا ہے حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی والدہ کے اشارہ پر جب فدان آرام چلے گئے تو ان کے ماموں لابان نے ان سے یہ عہد لیا کہ وہ دس سال ان کے یہاں رہ کر ان کی بکریاں چرائیں تو وہ اس مدت کو مہر قرار دے کر اپنی لڑکی سے شادی کر دیں گے۔ جب یعقوب علیہ السلام نے اس مدت کو پورا کر دیا تو لابان نے اپنی لڑکی لیاہ سے ان کا نکاح کرنا چاہا مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنا رجحان طبع چھوٹی لڑکی راحیل کی جانب ظاہر کیا، لابان نے یہ عذر کیا کہ یہاں کے دستور کے مطابق بڑی لڑکی کے نکاح سے قبل چھوٹی لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا، اس لیے تم اس رشتہ کو منظور کرو، اور اپنے قیام کو دس سال اور طویل کرو اور میری خدمت میں رہو تو راحیل بھی تمہارے نکاح میں دی جا سکے گی (کیونکہ اس زمانہ میں دو بہنوں کا ایک نکاح میں جمع ہونا شرعاً ممنوع نہ تھا) چنانچہ یعقوب علیہ السلام نے اس مدت کو بھی پورا کر دیا، اور راحیل سے شادی کر لی، ان دونوں کے علاوہ لیاہ کی خانہ زاد زلفا اور راحیل کی خانہ زاد بلہا بھی ان کی زوجیت کے رشتہ میں منسلک ہو گئیں اور ان سب سے اولاد بھی ہوئی۔ اور بنیامین کے علاوہ یعقوب علیہ السلام کی تمام اولاد اپنے ماموں کے ہی یہاں پیدا ہوئی اور جب یعقوب علیہ السلام وطن واپس آ گئے تو یہاں بنیامین پیدا ہوئے لابان نے یعقوب علیہ السلام کو بیس سال اپنے پاس رکھنے کے بعد بہت سا مال و متاع اور ریوڑ دے کر رخصت کیا اور یہ پھر اپنے دادا کے دار الہجرت فلسطین میں آ کر مقیم ہو گئے۔

یعقوب علیہ السلام جس زمانہ میں فدان آرام چلے گئے تھے، اس زمانہ میں عیسو ناراض ہو کر اپنے چچا اسماعیل علیہ السلام کے پاس آ بسے تھے اور ان کی بیٹی سے شادی کر کے قریب ہی آباد ہو گئے تھے، یہ تاریخ میں ادوم کے نام سے مشہور ہیں، اس عرصہ میں دونوں بھائیوں کے درمیان جو چپقلش تھی وہ بھی دور ہو گئی اور دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ پھر استوار ہو گیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو تحائف بھیجنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

یہ تمام واقعات تورات کی کہانی اور داستان ہے، قرآن عزیز ان تفصیلات کے حق میں قطعاً خاموش ہے اور صرف حضرت

Marfat.com

یعقوب علیہ السلام کے جلیل القدر نبی، صاحب صبر و عزیمت اور یوسف علیہ السلام کے برگزیدہ باپ ہونے کا ذکر کرتا ہے اور اسی ضمن میں نام لیے بغیر یوسف علیہ السلام کے دوسرے بھائیوں کا بھی ذکر آ جاتا ہے۔

ذکر یعقوب علیہ السلام قرآن مجید میں:

قرآن عزیز میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام دس جگہ آتا ہے اور اگرچہ سورۂ یوسف میں جگہ جگہ ضمائر اور اوصاف کے لحاظ سے اور بعض دوسری سورتوں مثلاً "مومنون" میں اوصاف کے اعتبار سے ان کا تذکرہ موجود ہے، مگر نام کے ساتھ صرف دو ہی جگہ ان کا ذکر کیا گیا ہے، مسطورۂ ذیل جدول اس کی وضاحت کرتی ہے۔

نام سورہ	آیت	شمار
بقرہ	۱۴۰، ۱۳۳، ۱۳۶	۴
انعام	۸۴	۱
مریم	۴۹، ۶	۲
صٓ	۴۵	۱

نام سورہ	آیت	شمار
الانبیاء	۷۲	۱
نساء	۱۶۳	۱
یوسف	۶۸، ۳۸، ۶	۳

اسرائیل:

حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام عبرانی میں اسرائیل ہے، یہ اسرا (عبد) اور ایل (اللہ) دو لفظوں سے مرکب ہے، اور عربی میں اس کا ترجمہ "عبداللہ" کیا جاتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ اسحاقی خاندان جو ان کی نسل سے ہے اسی لیے "بنی اسرائیل" کہلاتا ہے اور آج بھی یہود و نصاریٰ کے قدیم خاندان اسی نسبت کے ساتھ منسوب ہیں۔

اولاد یعقوب علیہ السلام:

یعقوب علیہ السلام کے بارہ لڑکے تھے اور گذشتہ سطور میں واضح ہو چکا ہے کہ بنیامین کے علاوہ ان کی تمام اولاد فدان آرام ہی میں پیدا ہو چکی تھی، صرف بنیامین فلسطین (ارض کنعان) میں پیدا ہوئے، حضرت یعقوب کی یہ اولاد چونکہ چند بیبیوں سے ہے اس لیے ان کی تفصیل یہ ہے۔

لیہ یا لیا بنت لابان سے ① راوبین ② شمعون ③ لاوی ④ یہودا ⑤ ویساکر ⑥ زلوبون پیدا ہوئے۔

راخیل بنت لابان سے ⑦ یوسف ⑧ بنیامین پیدا ہوئے۔

بلہا جاریہ راخیل سے ⑨ دان ⑩ نفتالی۔

اور زلفا جاریہ لیعہ سے ⑪ جاد اور ⑫ اشیر پیدا ہوئے۔ [1]

پیغمبری:

حضرت یعقوب علیہ السلام خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے اور کنعانیوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے انہوں نے برسوں اس خدمت حق کو انجام دیا، قرآن عزیز میں چونکہ ان کا ذکر بیشتر حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا گیا ہے، اس لیے وہیں قابل مراجعت ہے۔

[1] تورات پیدائش باب ۳۵ آیات ۲۱-۲۶

Marfat.com

حضرت یوسف علیہ السلام

○ یوسف علیہ السلام کا نسب نامہ ○ یوسف علیہ السلام کا ذکر قرآن حکیم میں ○ سورہ یوسف کا نزول ○ برادران یوسف علیہ السلام ○ یوسف علیہ السلام کا خواب ○ برادران یوسف علیہ السلام کی سازش ○ یوسف علیہ السلام آزمائشوں میں ○ چاہ کنعان ○ یوسف علیہ السلام بحالت غلامی ○ عزیز مصر اور یوسف علیہ السلام ○ عزیز مصر کی بی بی اور یوسف علیہ السلام ○ یوسف علیہ السلام اور آیت ﴿وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ﴾ ○ شاہی خاندان کی عورتیں اور یوسف علیہ السلام ○ قید خانہ ○ قید خانہ میں دعوت و تبلیغ ○ تعبیر خواب ○ شاہ مصر اور یوسف علیہ السلام ○ یوسف علیہ السلام تخت شاہی پر ○ برادران یوسف کا قافلہ ○ حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن سلوک ○ عذر خواہی اور معافی ○ حضرت یعقوب علیہ السلام کی مصر میں آمد اور لخت جگر سے ملاقات ○ یوسف علیہ السلام کی وفات ○ آخری وصیت ○ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں وصیت پر عمل۔

نسب نامہ:

یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پڑپوتے ہیں اور ان کی والدہ کا نام راحیل بنت لابان ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کو ان کے ساتھ بے حد محبت تھی بلکہ عشق تھا، اور اس لیے کسی وقت بھی ان کی جدائی گوارا نہ کرتے تھے۔

یہ بھی اپنے والد، دادا، اور پردادا کی طرح سن رشد کو پہنچ کر خدائے برتر کے جلیل القدر پیغمبر بنے اور ملت ابراہیمی کی دعوت و تبلیغ کی خدمت سرانجام دی یہی وجہ ہے کہ ابتدائے زندگی ہی سے ان کی دماغی اور فطری استعداد دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں بالکل جدا اور نمایاں تھی، یعقوب علیہ السلام کے عشق و محبت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ یوسف علیہ السلام کی پیشانی کا چمکتا ہوا نور نبوت پہچانتے، اور وحی الٰہی کے ذریعہ اس کی اطلاع پا چکے تھے۔

قرآن عزیز میں حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر:

حضرت یوسف علیہ السلام کا نام قرآن عزیز نے چھبیس مرتبہ ذکر کیا ہے جن میں سے چوبیس جگہ صرف سورۂ یوسف میں اور ایک جگہ سورۂ انعام میں اور ایک جگہ سورۂ غافر میں ذکر آیا ہے، اور ان کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ پردادا ابراہیم علیہ السلام کی طرح ان کے نام پر بھی قرآن عزیز کی ایک سورت (سورۂ یوسف) نازل ہوئی ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات سے متعلق عبرت و موعظت کا بے نظیر ذخیرہ ہے۔

نام سورہ	آیت	شمار
انعام	۸۴	۱
غافر	۳۴	۱

نام سورہ	آیت	شمار
یوسف	۴، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۷، ۲۱، ۲۹، ۴۶، ۵۱، ۵۶، ۶۹، ۷۶	۲۴
	۷۷، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۷، ۸۹، ۹۰، ۹۴، ۹۹	

Marfat.com

سورۂ یوسف:

قرآن عزیز نے یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو "احسن قصص" کہا ہے اس لیے کہ اس ایک واقعہ میں جس قدر عبرتیں، حکمتیں اور مواعظ ونصائح ودیعت ہیں دوسرے کسی واقعہ میں یکجا میسر نہیں ہیں، درحقیقت یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب دل کش اور زمانہ کے عروج وزوال کی زندہ یادگار ہے، یہ ایک فرد کے ذریعہ قوموں کے بننے اور بگڑنے، گرنے اور اُبھرنے کی ایسی بولتی تصویر ہے جو کسی تشریح وتوضیح کی محتاج نہیں رہتی، یہ بدوی اور خانہ بدوش قبیلہ کے ایک ایسے فرد یگانہ اور انمول موتی کی حیرت زدہ تاریخ ہے جس کو خدائے تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے اعجاز نے اس زمانہ کی بڑی سے بڑی متمدن قوم کی رہنمائی اور ان پر حاکمانہ اقتدار کے لیے چن لیا تھا اور شرف نبوت سے نوازا تھا۔

قرآن عزیز تورات کی طرح داستان گوئی یا محض اشخاص واقوام کے تاریخی حالات کا مرقع نہیں ہے بلکہ وہ جن واقعات تاریخی کو بیان کرتا ہے اس کے سامنے صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ عبرت وموعظت اور تذکیر وپند کا مقصد وحید ہے۔

پس جبکہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں بے نظیر عبرتیں اور بصیرتیں پنہاں تھیں مثلاً رشد وہدایت کی اہمیت، ابتلاء اور آزمائشوں پر صبر واستقامت، رضاء وتسلیم کے مظاہرے، افراد واقوام کے عروج واقبال کے وقائع، خدائے تعالیٰ کے عدل ورحم کی کرشمہ سازیاں، انسانی اور بشری لغزشیں اور ان کے انجام ومال، عصمت اور ضبط نفس کی عجوبہ کاریاں، تو بلاشبہ وہ "احسن قصص" ہے، اور کتاب ماضی کا وہ حسین ورق جو اپنی شان زیبائی میں یکتا اور فرد کہلانے کا مستحق ہے۔

﴿الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۞ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۞﴾

(یوسف:۱۔۳)

"الر ○ یہ روشن کتاب کی آیتیں ہیں، ہم نے اس قرآن کو عربی میں نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھ سکو، اے پیغمبر! ہم اس قرآن کے ذریعہ سے جو ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے ایک نہایت اچھا قصہ (واقعہ) سناتے ہیں اور تم اس سے پہلے بے خبر تھے۔"

سورۂ یوسف کے شان نزول کے بارہ میں حدیثی روایات اور مفسرین کے اقوال کا حاصل یہ ہے کہ کفار مکہ نے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق "یہود" سے گفتگو کی اور اپنی درماندگی اور پریشانی کا اظہار کیا، اس پر یہود نے ان سے کہا کہ اس مدعی نبوت کو زچ کرنے اور جھوٹا بنانے کے لیے تم ان سے یہ سوال کرو کہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد شام سے مصر کیوں منتقل ہوئی اور یوسف علیہ السلام سے متعلق جو واقعات ہیں ان کی تفصیل کیا ہے؟ اگر یہ نبی نہیں ہے تو ہرگز نہ بتا سکے گا۔

کفار مکہ نے یہود کی ہدایت کے مطابق ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دونوں سوال کیے اور آپ نے وحی الٰہی کے ذریعہ وہ سب کچھ ان کو سنا دیا جو سورۂ یوسف میں موجود ہے۔

یوسف علیہ السلام کا خواب اور برادران یوسف علیہ السلام:

ان واقعات کا حاصل یہ ہے کہ جبکہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی تمام اولاد میں حضرت یوسف علیہ السلام سے بے حد محبت رکھتے

Marfat.com

تھے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کا حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ والہانہ عشق و محبت برادرانِ یوسف علیہ السلام کے لیے بے حد شاق اور ناقابل برداشت تھا، اور وہ ہر وقت اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ یا حضرت یعقوب علیہ السلام کے قلب سے اس محبت کو نکال ڈالیں اور یا پھر یوسف علیہ السلام ہی کو اپنے راستہ سے ہٹا دیں تاکہ قصہ پاک ہو جائے۔

ان بھائیوں کے حاسدانہ تخیل پر مزید تازیانہ یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام نے ایک خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے اور شمس و قمر اُن کے سامنے سجدہ ریز ہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام نے چہیتے بیٹے کا خواب سنا تو سختی کے ساتھ ان کو منع کر دیا کہ اپنا یہ خواب کسی کے سامنے نہ دہرانا، ایسا نہ ہو کہ اس کو سن کر تیرے بھائی برے پیش آئیں، کیوں کہ شیطان انسان کے پیچھے لگا ہے اور تیرا خواب اپنی تعبیر میں بہت صاف اور واضح ہے۔

﴿اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ عَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ (یوسف : ۴۔۶)

”جب یوسف (علیہ السلام) نے اپنے باپ سے کہا: اے باپ! میں نے خواب میں گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے، دیکھتا کیا ہوں کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں، انہوں نے کہا: اے میرے بیٹے! تو اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں کو نہ سنانا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تیرے ساتھ کوئی چال چل جائیں، بلاشبہ شیطان انسان کے لیے کھلا دشمن ہے اور اس طرح تیرا پروردگار تجھ کو برگزیدہ کرے گا، اور سکھائے گا تاویل احادیث، اور اپنی نعمت کو تجھ پر اور اولاد یعقوب پر تمام کرے گا، جس طرح کہ اس نعمت (نبوت) کو پورا کیا تیرے اجداد پر پہلے سے (یعنی) ابراہیم و اسحاق پر، بیشک تیرا پروردگار جاننے والا حکمت والا ہے۔“

اس مقام پر تورات اور قرآن عزیز کے بیانات میں تفاوت و اختلاف پایا جاتا ہے۔

① قرآن عزیز بیان کرتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جب اپنا خواب حضرت یعقوب علیہ السلام کو سنایا تو دوسرے بھائی وہاں موجود نہ تھے، اور تورات کہتی ہے کہ یہ معاملہ بھائیوں کی موجودگی میں پیش آیا۔

② قرآن عزیز سناتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اس خواب سے بحق یوسف علیہ السلام بے حد مسرور ہوئے اور ان کو نبوت و علومہ الٰہیہ کی بشارت سنائی مگر تورات کہتی ہے کہ یعقوب علیہ السلام خواب سن کر بہت خفا ہوئے اور فرمانے لگے کہ شاید اس سے تیرا منشاء یہ ہے کہ میں، تیری والدہ، اور تیرے سب بھائی تیرے سامنے سجدہ ریز ہوں گے؟۔

واقعات کی اس ترتیب کے اعتبار سے جو آگے چل کر قرآن عزیز اور تورات میں مشترک ہے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عزیز ہی کا بیان صحیح اور درست ہے، نیز تقاضائے فطرت اسی کا داعی ہے کہ یوسف علیہ السلام اپنے اس خواب کو بھائیوں سے الگ ہو کر بیان کریں اور یعقوب علیہ السلام بیٹے کے اس خواب کو سن کر مسرور ہوں کہ ہر ایک باپ اپنی اولاد کی ترقی درجات اور بلندی مناصب

کا خواہش مند ہوتا ہے۔ خصوصاً جبکہ یعقوب علیہ السلام نبی ہونے کی وجہ سے خواب کی تعبیر میں یوسف علیہ السلام کے لیے جو بلندی دیکھ رہے تھے وہ موجب صد ہزار مسرت تھی نہ کہ باعث رنج والم۔

آخر کار حسد کی بھڑکتی ہوئی آگ نے ایک روز برادرانِ یوسف کو یوسف علیہ السلام کے خلاف سازش کرنے پر مجبور کر ہی دیا۔

﴿اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۚۖ ۝ اِقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ۝ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝﴾ (یوسف: ۸۔۱۰)

"جبکہ وہ کہنے لگے البتہ یوسف اور اس کا بھائی (بنیامین) ہمارے باپ کو زیادہ پیارا ہے اور ہم ان سے زیادہ قوت والے ہیں، بلاشبہ ہمارا باپ صریح خطاء پر ہے یوسف کو مار ڈالو یا کسی ملک میں پھینک دو تاکہ تمہارے باپ کی توجہ تمہاری طرف سمٹ آئے اور ہو رہنا بعد میں نیک قوم، ان میں سے ایک نے کہا یوسف کو قتل نہ کرو اور اس کو گمنام کنوئیں میں ڈال دو کہ اٹھا لے جائے اس کو کوئی مسافر اگر تم کو کرنا ہی ہے۔"

اس مشورہ کے بعد سب جمع ہو کر حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ یوسف کو ہمارے ساتھ سیر کرنے کس لیے نہیں بھیجتے، کیا آپ کو ہم پر اعتماد نہیں ہے، ہم سے زیادہ اس کا محافظ دوسرا کون ہو سکتا ہے؟

﴿قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۱۱۔۱۲)

"(اے باپ) کیا بات ہے کہ تجھ کو یوسف کے بارہ میں ہم پر اعتماد نہیں ہے حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں، کل اس کو ہمارے ساتھ بھیج کہ وہ کھائے پیئے اور کھیلے کودے اور بلاشبہ ہم اس کے نگہبان ہیں۔"

حضرت یعقوب علیہ السلام سمجھ گئے کہ ان کے دلوں میں کھوٹ ہے اور یہ یوسف علیہ السلام کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں، مگر صاف لفظوں میں اس بات کو ظاہر نہیں فرمایا تاکہ بگڑ کر وہ اعلانیہ دشمنی پر آمادہ نہ ہو جائیں اور یہ بھی خیال کیا کہ اشارہ کنایہ سے ممکن ہے وہ اپنی ظالمانہ سازش سے باز رہیں اس لیے اشارہ اشارہ میں ان پر حقیقت حال واضح کر دی کہ واقعی مجھ کو یوسف علیہ السلام کے بارہ میں تم سے اندیشہ ہے۔

﴿قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۱۳)

"یعقوب (علیہ السلام) نے کہا مجھے اس سے رنج اور دکھ پہنچتا ہے کہ تم اس کو (اپنے ساتھ) لے جاؤ، اور مجھے یہ خوف ہے کہ اس کو بھیڑیا کھا جائے اور تم غافل رہو۔"

Marfat.com

برادرانِ یوسف علیہ السلام نے یہ سن کر بہ یک زبان کہا:

﴿قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝﴾ (یوسف:۱۴)

"اگر کھا گیا اس کو بھیڑیا جبکہ ہم سب طاقتور ہیں تو بلاشبہ ایسی صورت میں تو ہم نے سب کچھ گنوا دیا۔"

ایک جگہ توارت کا بیان یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے خود اپنے حکم سے یوسف علیہ السلام کو اس کے بھائیوں کے ساتھ جنگل میں کھیلنے کودنے کے لیے بھیجا تھا۔ [1] مگر آگے کے واقعات خود توارت کے بیان کی تغلیط کرتے ہیں۔

چاہ کنعان:

غرض برادرانِ یوسف، یوسف علیہ السلام کو جنگل کی سیر کرانے کے بہانے لے گئے اور مشورہ کے مطابق ایک ایسے کنوئیں میں اس کو ڈال دیا جس میں پانی نہ تھا، اور عرصہ سے خشک پڑا تھا، اور واپسی میں اس کے قمیص کو کسی جانور کے خون میں تر کر کے روتے ہوئے حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس آئے اور کہنے لگے: اے باپ! اگرچہ ہم اپنی صداقت کا کتنا ہی یقین دلائیں مگر تجھ کو ہرگز یقین نہ آئے گا کہ ہم دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں مشغول تھے کہ اچانک یوسف کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے پیراہن یوسف کو دیکھا تو خون آلود تھا مگر کسی ایک جگہ سے بھی پھٹا ہوا نہ تھا اور نہ چاک داماں تھا، فوراً حقیقت حال سمجھ گئے، مگر جھڑکنے، طعن و تشنیع کرنے اور نفرت و حقارت کا طرز عمل اختیار کرنے کی بجائے پیغمبرانہ حلم و فراست اور علم و سماحت کے ساتھ یہ بتا دیا کہ باوجود حقیقت حال کو چھپانے کی سعی کے تم اسے چھپا نہ سکے۔

﴿قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ۝﴾ (یوسف:۱۸)

"(حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا) یہ ہرگز نہیں بلکہ بنا دی ہے تمہارے نفسوں نے تمہارے لیے ایک بات، اب صبر ہی بہتر ہے اور جو بات تم ظاہر کرتے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔"

یوسف علیہ السلام اور غلامی:

یہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی اور یوسف علیہ السلام کے ساتھ یہ قصہ پیش آیا کہ حجازی اسماعیلیوں (مدیانیوں) کا ایک قافلہ شام سے مصر کو بخورات، بلساں اور مسالہ لاد کر لیے جا رہا تھا، کنواں دیکھ کر انہوں نے پانی کے لیے ڈول ڈالا، یوسف علیہ السلام سمجھے کہ شاید بھائیوں کو رحم آ گیا ڈول پکڑ کر لٹک گئے، تاجر نے ڈول نکالا تو یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر جوش سے شور مچایا۔

﴿يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ﴾ (یوسف:۱۹)

"بشارت ہو ایک غلام ہاتھ آیا۔"

توارت میں ہے کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے جب اسماعیلی قافلہ کو دیکھا تو آپس میں کہنے لگے کہ یوسف کو کنوئیں سے نکال کر اس قافلہ کے ہاتھ فروخت کر دو مگر اس سے پہلے ہی مدیانیوں (اسماعیلیوں) نے ان کو نکال کر غلام بنا لیا اور سب سے بڑا بھائی

---

[1] پیدائش باب ۳۷ آیات ۱۳۔۱۴

Marfat.com

راوبین جب کنوئیں پر پہنچا اور دیکھا کہ یوسف علیہ السلام وہاں نہیں ہے تو روتا ہوا واپس آ گیا، راوبین کو یہ رائے یہودا نے دی تھی اور راوبین شروع ہی سے اس فکر میں تھا کہ یوسف علیہ السلام کو کنوئیں سے نکال کر خاموشی سے باپ کے سپرد کر آئے اسی لیے اس نے قتل یوسف علیہ السلام کی سخت مخالفت کی تھی۔

اس مقام پر بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو خود برادران یوسف نے ہی کنوئیں سے نکال کر اسماعیلیوں کے قافلہ میں فروخت کر دیا تھا، مگر مفسرین کے اس قول کی نہ تورات موافقت کرتی ہے اور نہ قرآن عزیز، بلکہ دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ والوں نے ہی یوسف علیہ السلام کو کنوئیں سے نکالا اور اپنا غلام بنالیا۔

اسی طرح صاحب قصص الانبیاء کو تورات کے بیان سے قافلہ کے متعلق غلط فہمی ہوگئی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اسماعیلی اور مدیانی کو دو جدا جدا قافلے سمجھا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ شام سے مصر جانے والا یہ قافلہ ایک ہی قافلہ تھا جو نسلی اعتبار سے اسماعیلی اور ملکی اعتبار سے مدیانی [1] (حجازی) تھا۔ غرض اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو اسماعیلی تاجروں کے قافلہ نے اپنا غلام بنالیا اور مال تجارت کے ساتھ ان کو بھی مصر لے گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا یہ پہلو اپنے اندر کیسی عظمتیں پنہاں رکھتا ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو چشم بصیرت رکھتا ہو، چھوٹی سی عمر ہے، والدہ کا انتقال ہو چکا ہے، باپ کی آغوش محبت تھی وہ بھی چھوٹی، وطن چھوٹا، بھائیوں نے بے وفائی کی، آزادی کی جگہ غلامی نصیب ہوئی مگر ان تمام باتوں کے باوجود نہ شور وشیون ہے، نہ واویلا، نہ جزع وفزع ہے اور نہ الحاح وزاری قسمت پر شاکر، مصائب پر صابر اور خدا کے فیصلہ پر راضی بہ رضاء، سر نیاز خم کیے، مصر کے بازار میں فروخت ہونے جا رہے ہیں، سچ ہے۔ نزدیکاں را بیش بود حیرانی۔

یوسف علیہ السلام مصر میں:

تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح "مصر" تمدن وتہذیب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا، یہاں کے حکمران عمالقہ (ہیکسوس) تھے جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کنعان سے ایک بدوی غلام کی حیثیت میں مصر میں داخل ہوئے، مصر کا دار السلطنت اس زمانہ میں رعمسیس تھا، یہ غالباً اس مقام پر واقع تھا جہاں آج صان کی بستی آباد ہے۔ جغرافی حیثیت سے اس کا جائے وقوع مشرق کی جانب دریائے نیل کے قریب بتایا جاتا ہے، مصری افواج کا افسر، شاہی خاندان کا ایک رئیس فوطیفار تھا، یہ سیر کے لیے مصر کے بازار سے گذر رہا تھا کہ یوسف پر نظر پڑی اور اس نے معمولی قیمت دے کر ان کو خرید لیا۔

ابھی ذکر ہو چکا ہے کہ اس زمانہ میں مصری خود کو دنیا کی بہترین مہذب اور متمدن قوم سمجھتے تھے اور بدوی اور صحرائی قبائل کو نہایت ذلت وحقارت سے دیکھتے اور اپنے شہروں میں ان کے ساتھ اچھوت کی طرح معاملہ کرتے تھے، انہی قبائل میں سے ایک قبیلہ

---

[1] جدید نسلی وجغرافی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جس مقام کو تورات میں مدین یا مدیان کہا ہے اس سے وہ علاقہ مراد ہے جو ساعیر (سراۃ) سے بحر احمر کے کنارے شام سے یمن تک چلا گیا ہے، اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے بنی اسرائیل مدین اور اسماعیلی شروع سے ہی حجاز کہتے تھے، اس لیے ایک ہی مقام کے یہ دو نام ہیں۔ (ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۷، ۴۹)

نسل ابراہیمی کی یادگار کنعان میں آباد تھا، یہاں مدنیت وحضارت کا نام ونشان تک نہ تھا، شکار پر ان کے رزق کا مدار تھا اور خس پوش جھونپڑیوں اور بکریوں کے گلے ان کا دھن دولت تھے۔

ان حالات میں یوسف علیہ السلام کے متعلق خدائے تعالیٰ کی کارسازی اور معجز نمائی دیکھئے کہ ایک بدوی اور وہ بھی غلام، ایک متمدن اور صاحب شوکت وحشمت رئیس کے یہاں جب پہنچتا ہے تو اپنی عصمت ماب زندگی، حلم ووقار اور امانت وسلیقہ مندی کے پاک اوصاف کی بدولت اس کی آنکھوں کا تارا اور دل کا مالک بن جاتا ہے اور وہ اپنی بیوی سے کہتا ہے:

﴿ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ ﴾(یوسف:۲۱)

"(دیکھو) اس کو عزت سے رکھو کچھ عجب نہیں کہ یہ ہم کو فائدہ بخشے یا ہم اس کو اپنا بیٹا بنالیں۔"

اور یہ کس لیے ہوا، اور یوسف علیہ السلام میں یہ پسندیدہ اطوار واخلاق کہاں سے پیدا ہو گئے، ایک بدوی نے کس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی، اور ایک غلام نے کس مربی سے اس پاک طینت کو پایا؟ اس کے متعلق قرآن عزیز جواب دیتا ہے:

﴿ وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝۲۲ ﴾(یوسف:۲۲)

"اور جب وہ سن رشد کو پہنچ گیا تو ہم نے اس کو فیصلہ کی قوت اور علم عطاء کیے اور ہم اسی طرح نیکوکاروں کو جزا دیا کرتے ہیں۔"

بہر حال فوطیفار نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ غلاموں کا سا معاملہ نہیں کیا، بلکہ اپنی اولاد کی طرح عزت واحترام کے ساتھ رکھا اور اپنی ریاست، دولت وثروت اور گھریلو زندگی کی تمام ذمہ داریاں ان کے سپرد کر دیں اور ان سب کا امین بنا دیا، گویا کنعان کے گلہ بان کو عنقریب جو جہانداری وجہاں بانی سپرد ہونے والی تھی یہ اس کی تمہید تھی، اسی لیے ارشاد ہوا:

﴿ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ٘ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۲۱ ﴾(یوسف:۲۱)

"اور اسی طرح جگہ دی ہم نے یوسف (علیہ السلام) کو اس ملک میں اور اس واسطے کہ اس کو سکھائیں باتوں کا نتیجہ اور مطلب نکالنا، اور اللہ طاقتور رہتا ہے اپنے کام میں، لیکن اکثر آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔"

عزیز مصر کی بیوی اور یوسف علیہ السلام:

ایک مشہور صوفی ابن عطاء اللہ السکندری کا قول ہے "ربما کنت المنن فی المحن"[1] (خدا کے اکثر احسانات وکرم مصائب کے اندر مستور ہوتے ہیں) حضرت یوسف علیہ السلام کی ساری زندگی اسی مقولہ کا ہو بہو مصداق ہے۔

بچپن کی پہلی مصیبت یا آزمائش نے کنعان کی بدوی زندگی سے نکال کر تہذیب وتمدن کے گہوارہ "مصر" کے ایک بہت بڑے گھرانے کا مالک بنا دیا، غلامی میں آقائی اسی کو کہتے ہیں۔

اب وقت کی دوسری اور کٹھن آزمائش شروع ہوئی، وہ یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا جوانی کا عالم تھا، حسن وخوبروئی کا کوئی

---

[1] قصص الانبیاء للنجار

پہلو ایسا نہ تھا جو ان کے اندر موجود نہ ہو، جمال اور رعنائی کا پیکر مجسم، رخ روشن شمس وقمر کی طرح منور، عصمت وحیاء کی فراوانی سونے پر سہاگہ اور پھر ہر وقت کا ساتھ، عزیز مصر کی بیوی دل پر قابو نہ پا سکی اور یوسف علیہ السلام پر پروانہ وار نثار ہونے لگی، مگر ابراہیم علیہ السلام کا پوتا، اسحاق و یعقوب علیہما السلام کا نور دیدہ، خانوادہ نبوت کا چشم و چراغ اور منصب نبوت کے لیے منتخب، بھلا اس سے یہ کس طرح ممکن تھا کہ ناپاکی اور فحش میں مبتلا ہو اور عزیز کی بیوی کے ناپاک عزائم کو پورا کرے۔

لیکن مصر کی اس آزاد عورت نے جب اس طرح جادو چلتے نہ دیکھا تو ایک روز بے قابو ہو کر مکان کا دروازہ بند کر دیا اور اصرار کرنے لگی کہ مجھے شاد کام کر، حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے یہ وقت سخت آزمائش کا وقت تھا، شاہی خاندان کی نوجوان عورت، شعلہ حسن سے لالہ رو، محبوب نہیں بلکہ عاشق، آرائش حسن وزینت کی بے پناہ نمائش، عشوہ طرازیوں کی بارش، ادھر یوسف علیہ السلام خود نوجوان حسین اور حسن کی خوبی سے آشنا، دروازے بند، رقیب کا خوف نہ ڈر، مالکہ خود ذمہ دار، مگر ان تمام سازگار حالات نے کیا یوسف علیہ السلام کے دل میں ایک لمحہ کے لیے بھی عزیز مصر کی بیوی کی حوصلہ افزائی کی، کیا اس کے دل نے قرار چھوڑ کر بے قراری اختیار کی کیا نفس نے جہان قلب کو ایک لمحہ کے لیے بھی متزلزل کیا؟ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ اس کے برعکس اس پیکر عصمت، امین نبوت، مہبط وحی الٰہی نے دو ایسے دلکش اور محکم دلائل سے "مصری عورت" کو سمجھایا جو ایک ایسی ہستی سے ہی ممکن تھے جس کی تربیت براہ راست آغوش الٰہی میں ہوئی ہو۔ فرمایا: "یہ ناممکن ہے، پناہ بخدا" میں اور اس کی نافرمانی کروں جس کا اسم جلالت "اللہ" ہے، اور وہ تمام کائنات کا مالک، اور کیا میں اپنے اس مربی "عزیز مصر" کی امانت میں خیانت کروں جس نے غلام رہنے کی بجائے یہ حرمت وعزت عطاء کی؟ اگر میں ایسا کروں تو ظالم ٹھہروں گا اور ظالموں کے لیے انجام ومال کے اعتبار سے کبھی فلاح نہیں ہے۔

مگر عزیز مصر کی بیوی پر اس نصیحت کا مطلق اثر نہ ہوا اور اس نے اپنے ارادہ کو عملی شکل دینے پر اصرار کیا تب یوسف علیہ السلام نے اپنے اس برہان رب کے پیش نظر جس کا ذکر وہ کر چکا تھا صاف انکار کر دیا۔

﴿وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ قَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۳ وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝۲۴﴾ (یوسف: ۲۳۔۲۴)

"اور پھسلایا یوسف کو اس عورت نے جس کے گھر میں وہ رہتے تھے اس کے نفس کے معاملہ میں اور دروازے بند کر دیے اور کہنے لگی آ میرے پاس آ، یوسف (علیہ السلام) نے کہا، پناہ بخدا! بلاشبہ وہ (عزیز مصر) میرا مربی ہے جس نے مجھ کو عزت سے رکھا، بلاشبہ ظالم فلاح نہیں پاتے، اور البتہ اس عورت نے یوسف سے ارادہ بد کیا اور وہ بھی ارادہ کرتے اگر اپنے پروردگار کے برہان کو نہ دیکھ لیتے، اسی طرح ہوا تاکہ ہٹائیں ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو، بیشک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے۔"

وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا کی تفسیر:

مفسرین نے آیت وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا کی مختلف تفسیریں کی ہیں لیکن ہم نے جو معنی بیان کیے ہیں وہی زیادہ

موزوں اور مناسب مقام ہیں قرآن عزیز نے اول سے آخر تک اس واقعہ میں عزیز مصر کی بیوی کی شناعت کار اور حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت و جلالت قدر کا تذکرہ فرمایا ہے، اس لیے یوسف کے ﴿مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ فرمانے کے بعد یہی معنی برمحل ہو سکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کی زبان سے برہان رب کو سن لینے کے بعد بھی جب عورت اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئی اور اپنے ارادہ پر مصر رہی تو یوسف علیہ السلام نے اس کے ارادہ کو قطعاً رد کر دیا اور برہان رب کے سامنے اس کے ﴿هَمَّ﴾ کی مطلق پروانہ کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ یوسف علیہ السلام اس سے بچنے کے لیے دروازہ کی طرف بھاگے اور عزیز مصر کی بیوی نے ان کا پیچھا کیا۔

بعض مفسرین نے اس تفسیر پر یہ اعتراض کیا ہے کہ عربی گرامر کا تقاضا ہے کہ ﴿لَوْلَآ﴾ کلام کے شروع میں استعمال ہو اس لیے کہ وسط کلام میں اس کا استعمال نحوی قاعدہ کے خلاف ہے مگر اس تفسیر کے مطابق "لولا" وسط کلام میں استعمال ہوگا اور تعبیر یہ ہوگی۔

﴿وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ﴾ (یوسف: ۲۴)

"اور یوسف بھی گناہ کا قصد کر لیتا اگر اپنے رب کے برہان کو نہ دیکھ لیتا"۔

مگر یہ اعتراض اس لیے درست نہیں کہ اس مقام پر بھی ﴿لَوْلَآ﴾ کا استعمال شروع کلام ہی میں ہوا ہے اور نحوی قاعدہ کے مطابق دال علی الجواب مقدم ہے اور ﴿لَوْلَآ﴾ کا جواب جو بعد میں مذکور ہوتا اس دال علی الجواب کی وجہ سے مقدر و محذوف ہے۔ اور یہ اس لیے صحیح ہے کہ فصاحت و بلاغت کا تقاضا ہے کہ ایک جانب مناسبت کلام کو قائم رکھا جائے یعنی دونوں کے ارادہ و عدم ارادہ کا ایک ہی جگہ ذکر ہو اور دوسری جانب نحوی قاعدہ کے پیش نظر ﴿لَوْلَآ﴾ کا جواب اس کے بعد میں آئے اور یہ دونوں باتیں جب ہی ہو سکتی ہیں کہ ﴿هَمَّ بِهَا﴾ کو دال علی الجواب بنا کر ﴿هَمَّتْ بِهٖ﴾ کے ساتھ ذکر کیا جائے اور ﴿لَوْلَآ﴾ کا جواب ﴿فَهَمَّ بِهَا﴾ کو مقدر تسلیم کیا جائے۔

لہٰذا مسطورہ بالا تفسیر ہی شک و شبہ سے بالاتر حقیقت حال کو واضح اور ظاہر کرتی ہے۔ کلام مجید میں اس کی نظیر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے تذکرہ سے متعلق یہ آیت ہے:

﴿اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰي قَلْبِهَا﴾ (القصص: ۱۰)

"قریب تھا کہ وہ (والدۂ موسیٰ علیہ السلام) اس کو ظاہر کر دے اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ بنا دیتے"۔

یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل کو مضبوط کر دیا تو وہ موسیٰ علیہ السلام کے راز کو ظاہر نہ کر سکیں اور اگر ہم ایسا نہ کرتے تو وہ ظاہر کر دیتیں۔

دیکھیے یہاں بھی ﴿لَوْلَآ﴾ سے دال علی الجواب مقدم ہے اور ﴿لَوْلَآ﴾ کا جواب ﴿لَتُبْدِيْ بِهٖ﴾ مقدر و محذوف ہے، اسی طرح اس مقام پر یہ معنی ہیں کہ اگر یوسف کو برہان رب حاصل نہ ہوتا تو وہ بھی ارادۂ بد کر لیتے لیکن انہوں نے ارادہ بد نہیں کیا کیونکہ وہ برہان رب دیکھ چکے تھے۔

اس جگہ یہ بھی ایک سوال ہے کہ وہ "برہان رب" کیا تھا جس کا قرآن عزیز یہاں ذکر کر رہا ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن عزیز نے اپنی بلیغانہ اور معجزانہ خطابت میں خود ہی اس کو اس طرح ادا کر دیا ہے کہ سوال کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، دروازہ

بند ہو جانے پر عزیز کی بیوی کو حضرت یوسف علیہ السلام نے جو جواب دیا ایسے مقام کے لحاظ سے اس سے بہتر جواب کیا ہو سکتا تھا سو یہی وہ "برہان رب" تھا جو یوسف علیہ السلام کو عطا ہوا اور جس نے عصمت یوسف کو بے داغ رکھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز نے بڑے شد و مد سے اس کے بعد یہ بیان کیا ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ (یونہی ہوا) ﴿ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ﴾ تا کہ ہٹائیں ہم اس سے برائی اور بے حیائی ﴿ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ ﴾ (بیشک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے) یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کا دامن اس قسم کے ﴿ هَمّ ﴾ سے اس لیے پاک رہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عصمت و پاکی کا فیصلہ شروع ہی سے کر دیا تھا، پھر کیسے ممکن تھا کہ اس کی عصمت و حفاظت کے بعد اس کے خلاف کوئی شائبہ بھی ان میں پایا جاتا؟

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت نظر آنا اور ان کا اشارہ سے منع کرنا یا فرشتہ کا ظاہر ہو کر ان کو اس سے روکنا، یا عزیز مصر کا گھر میں رکھے ہوئے صنم پر اس کی بیوی کا پردہ ڈالنا اور حضرت یوسف علیہ السلام کا اس سے عبرت حاصل کرنا، یہ اور اس قسم کے تمام اقوال کے مقابلہ میں "برہان رب" کی تفسیر وہی بہتر تفسیر ہے جو خود قرآن عزیز کی نظم و ترتیب سے ثابت ہے یعنی ① ایمان باللہ کا حقیقی تصور ② اور مربی مجازی کے احسان کی احسان شناسی اور وصف امانت، عزیز مصر نے یوسف علیہ السلام کے متعلق اپنی بیوی سے کہا تھا ﴿ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ ﴾ (اس یوسف علیہ السلام) کو عزت سے رکھنا یوسف علیہ السلام نے اسی کو پیش نظر رکھ کر فرمایا ﴿ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ﴾ (اس (عزیز مصر) نے مجھ کو عزت دی) تب یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں خیانت کر کے اس کو بے عزت کروں۔

بہرحال حضرت یوسف علیہ السلام جب دروازہ کی جانب بھاگے تو عزیز کی بیوی نے پیچھا کیا، اور دروازہ کسی طرح کھل گیا، سامنے عزیز مصر اور عورت کا چچا زاد بھائی کھڑے نظر آئے، عورت کا عشق ابھی خام تھا اس لیے وہ صحیح حال کہنے پر قادر نہ ہوئی اور اصل حقیقت کو چھپانے کے لیے غیظ و غضب میں آ کر کہنے لگی کہ ایسے شخص کی سزا قید خانہ یا دردناک عذاب کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے جو تیرے اہل کے ساتھ ارادۂ بد رکھتا ہو؟ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے مکر و فریب کو سنا تو فرمایا کہ یہ اس کا بہتان ہے؟ اصل حقیقت یہ ہے کہ خود اس نے میرے ساتھ ارادہ بد کیا تھا مگر میں نے کسی طرح نہ مانا اور بھاگ کر باہر نکل جانا چاہتا تھا کہ اس نے پیچھا کیا اور سامنے آپ نظر آ گئے تو اس نے یہ جھوٹ گھڑ لیا۔

عزیز کی بیوی کا چچا زاد بھائی ذکی، فطین اور بہت ہوشیار تھا اس نے کہا کہ یوسف کا پیراہن دیکھنا چاہیے اگر وہ سامنے سے چاک ہے تو عورت راست باز ہے، اور اگر پیچھے سے چاک ہے تو یوسف صادق القول ہے اور عورت جھوٹی ہے، دیکھا تو پیراہن یوسف علیہ السلام پیچھے سے چاک تھا، عزیز مصر نے اصل حالت کو بھانپ لیا مگر اپنی عزت و ناموس کی خاطر معاملہ کو ختم کرتے ہوئے کہا، یوسف سچے تم ہی ہو، اور اس عورت کے معاملہ سے درگزر کرو، اور اس کو یہیں ختم کر دو، اور پھر بیوی سے کہا، یہ سب تیرا مکر و فریب ہے اور تم عورتوں کا مکر و فریب بہت ہی بڑا ہوتا ہے، بلاشبہ تو ہی خطاء کار ہے لہٰذا اپنی اس حرکت بد کے لیے استغفار کر اور معافی مانگ۔

﴿ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّاۤ اَنْ یُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ قَالَ هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ هُوَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ۝ وَ اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَ هُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝ فَلَمَّا رَاٰ قَمِیْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ

Marfat.com

مِنْ كَيْدِكُنَّ ۭ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ۝ يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ښ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـــِٕيْنَ ۝﴾ (یوسف: ۲۵-۲۹)

" کہنے لگی، اس شخص کی کیا سزا ہے جو تیرے اہل کے ساتھ برائی کا ارادہ رکھتا ہو مگر یہ کہ قید کر دیا جائے یا دردناک عذاب میں مبتلاء کیا جائے، یوسف علیہ السلام نے کہا، اسی نے مجھ کو میرے نفس کے بارہ میں پھسلایا تھا، اور فیصلہ کیا عورت ہی کے گھرانے کے ایک شخص نے کہ اگر پیراہن یوسف سامنے سے چاک ہے تو عورت سچی ہے اور یوسف جھوٹا، اور اگر پیچھے سے چاک ہے تو عورت کاذب ہے، اور یوسف صادق، پس جب اس کی قمیص کو دیکھا تو پیچھے سے چاک تھا، کہا بیشک اے عورت یہ تیرے مکر وفریب سے ہے، بلاشبہ تمہارا مکر بہت بڑا ہے، یوسف تو اس معاملہ سے درگزر اور اے عورت تو اپنے گناہ کی معافی مانگ! تو بلاشبہ خطاء کار ہے۔"

عزیز مصر نے اگرچہ فضیحت و رسوائی سے بچنے کے لیے اس معاملہ کو یہیں پر ختم کر دیا مگر بات پوشیدہ نہ رہ سکی اور شدہ شدہ شاہی خاندان کی عورتوں میں یہ چرچا ہونے لگا کہ عزیز مصر کی بیوی کس قدر بے حیاء ہے کہ اپنے غلام پر ریجھ گئی، اتنے بڑے مرتبہ کی عورت اور غلام سے اختلاط کا ارادہ؟ آہستہ آہستہ یہ خبر عزیز کی بیوی تک بھی پہنچ گئی، اس کو یہ طعن بیحد شاق گذرا اور اس نے چاہا کہ اس کا انتقام لے، اور ایسا انتقام لے کہ جس بات پر وہ مجھ پر طعن کرتی ہیں اسی میں ان کو بھی مبتلا کیا جائے، یہ سوچ کر ایک روز اس نے شاہی خاندان اور عمائدین شہر کی عورتوں کو دعوت دی، جب سب دسترخوان پر بیٹھ گئیں اور سب نے کھانا کھانے کے لیے چھریاں ہاتھ میں لے لیں تاکہ اس سے گوشت یا ترنج جیسی چیزوں کو کاٹیں، تب عزیز کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ باہر آئیں، حضرت یوسف علیہ السلام مالکہ کے حکم سے باہر نکلے تو تمام عورتیں جمال یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر حیران رہ گئیں، اور رخ انور کی تجلی و تابانی سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ چیزیں کاٹنے کی بجائے چھریوں سے ہاتھ کاٹ لیے، اور بے ساختہ کہنے لگیں کہ کون کہتا ہے یہ انسان ہے، بخدا یہ تو نور کا پتلا اور بزرگ فرشتہ ہے، یہ دیکھ کر عزیز کی بیوی بیحد محظوظ ہوئی اور اپنی کامیابی اور ان کی شکست پر فخر کرتے ہوئے کہنے لگی یہی تو وہ غلام ہے جس کے عشق و محبت کے بارہ میں تم نے مجھ کو مطعون کر رکھا ہے اور تیر ملامت کا نشانہ بنایا ہوا ہے، اب اس کو دیکھ کر یہ تمہارا حال کیا ہے؟ بتاؤ میرا یہ عشق بیجا ہے یا بجا، اور تمہاری ملامت بے محل ہے یا برمحل؟

﴿وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ﴾ (یوسف: ۳۰-۳۲)

"اور (جب اس معاملہ کا چرچا پھیلا) تو شہر کی بعض عورتیں کہنے لگیں دیکھو عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے لگی کہ اسے رجھالے، وہ اس کی چاہت میں دل ہار گئی، ہمارے خیال میں تو وہ صریح بدچلنی میں پڑ گئی، پس جب عزیز کی بیوی نے

Marfat.com

ان عورتوں کے مکر کو سنا تو ان کو بلا بھیجا اور ان کے لیے مسندیں آراستہ کیں اور (دستور کے موافق) ہر ایک کو ایک ایک چھری پیش کر دی، پھر یوسف (علیہ السلام) سے کہا ان سب کے سامنے نکل آؤ، جب یوسف (علیہ السلام) کو ان عورتوں نے دیکھا تو اس کی بڑائی کی قائل ہو گئیں، انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور (بے اختیار) پکار اٹھیں یہ تو انسان نہیں ہے ضرور ایک فرشتہ ہے بڑے مرتبہ والا فرشتہ (عزیز کی بیوی) بولی تم نے دیکھا، یہ ہے وہ آدمی جس کے بارہ میں تم نے مجھے طعنے دیئے۔"

عزیز کی بیوی نے یہ بھی کہا کہ بیشک میں نے اس کا دل اپنے قابو میں لینا چاہا تھا مگر وہ بے قابو نہ ہوا، مگر میں یہ کہے دیتی ہوں کہ اگر اس نے میرا کہا نہ مانا تو یہ ہو کر رہے گا کہ وہ قید کیا جائے اور بے عزتی میں پڑے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ سنا اور پھر عزیز کی بیوی کے علاوہ اور سب عورتوں کے چلتر اپنے بارے میں دیکھے تو اللہ تعالیٰ کے حضور میں دست بدعا ہوئے اور کہنے لگے، خدایا! جس بات کی جانب یہ عورتیں بلا رہی ہیں اس کے مقابلہ میں مجھے قید میں رہنا کہیں زیادہ پسند ہے، اگر تو نے میری مدد نہ کی اور مجھ کو ان مکاریوں سے نہ بچایا تو عجب نہیں کہ میں ان کی جانب مائل ہو جاؤں اور نادانوں میں سے بن جاؤں، یوسف کی دعا درگاہِ الٰہی میں قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے سب مکر و فریب رفع کر دیئے، اور کامیابی کا سہرا یوسف علیہ السلام ہی کے سر رہا۔

﴿قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝٣٣ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝٣٤﴾

(یوسف: ۳۳-۳۴)

"یوسف (علیہ السلام) نے کہا اے میرے پروردگار! جس بات کی طرف یہ مجھ کو بلاتی ہیں مجھے اس کے مقابلہ میں قید خانہ زیادہ پسند ہے اور اگر تو نے ان کے مکر کو مجھ سے نہ ہٹا دیا اور میری مدد نہ کی تو میں کہیں ان کی جانب جھک نہ جاؤں اور نادانوں سے نہ ہو جاؤں، پس اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور اس سے ان کا مکر ہٹا دیا بیشک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔"

اس واقعہ میں مذکور ہے ﴿قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ﴾ (ان عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے) عام طور پر مفسرین اس کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ جمال یوسف علیہ السلام سے مدہوش ہو کر واقعی یہ حالت ہو گئی تھی کہ ان کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا اور کاٹنے والی چیز کی بجائے ہاتھوں کو کاٹ لیا۔

مگر بعض مفسرین عصر [1] نے اس تفسیر کو صحیح نہیں سمجھا، ان کے نزدیک مصری عورتوں کا یہ بھی تریا چرتر تھا اور وہ یوسف علیہ السلام کو اپنی جانب مائل کرنے کے لیے یہ بتانا چاہتی تھیں "کہ ہم تیرے حسن کے اس قدر متوالے ہیں کہ تیری صورت دیکھ کر ہوش و حواس بھی جاتے رہے اور ہاتھوں کو زخمی کر لیا" اور اپنی اس تفسیر کی تائید میں اس آیت سے استدلال کیا ہے ﴿اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ﴾ یعنی یوسف علیہ السلام نے ان کی اس حالت کو ﴿كَیْدَ﴾ (مکر) سے تعبیر کیا ہے اگر یہ اضطراری حالت ہوتی تو پھر وہ بے قصور تھیں، ایسی حالت میں ان کے اس طرز عمل کو ﴿كَیْدَ﴾ کہنے کے کیا معنی؟ نیز جب یوسف علیہ السلام کو شاہ مصر نے زندان سے نکالنے کا

[1] مولانا آزاد ترجمان القرآن سورۂ یوسف

Marfat.com

حکم دیا ہے تو اس وقت بھی حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا کہ:

﴿ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ ۝ ﴾ (یوسف: ۵۰)

"پس تو بادشاہ سے جا کر دریافت کر کہ ان عورتوں کا معاملہ کیا تھا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، بلاشبہ میرا رب ان کے مکر سے خوب واقف ہے۔"

بہر حال عزیز پر چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کی صداقت ظاہر ہو چکی تھی اس لیے اس نے نہ چاہا کہ یوسف علیہ السلام کو کسی قسم کی گزند پہنچائے لیکن اس کی بیوی پر عشق کا بھوت بری طرح سوار تھا سو جب اس نے خوشامد، چاپلوسی، مکر و حیلہ، کسی طرح سے مطلب براری نہ دیکھی تو دھمکیوں سے کام لینا شروع کیا اور جب کوہ استقامت کو اس کے باوجود بھی مطلق حرکت نہ ہوئی تو اب عزیز نے یوسف علیہ السلام کی صداقتوں کی تمام نشانیاں دیکھنے اور سمجھ لینے کے باوجود اپنی بیوی کی فضیحت و رسوائی ہوتی دیکھ کر یہ طے کر ہی لیا کہ یوسف علیہ السلام کو ایک مدت کے لیے زندان میں بند کر دیا جائے تا کہ یہ معاملہ لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائے اور یہ چرچے بند ہو جائیں، اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو زندان جانا پڑا۔

اس موقعہ پر حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر [1] فرمایا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنی دُعا کے ساتھ چونکہ یہ بھی کہہ دیا کہ مجھے ان کی بے حیائی کی دعوت کے مقابلہ میں زندان زیادہ پسند ہے تو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے مکر سے تو ان کو بچا لیا مگر قید ان کی قسمت میں مقدر کر دی، ان کو چاہیے تھا کہ وہ یہ جملہ نہ کہتے اور بلاء و امتحان کو دعوت نہ دیتے، اور حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے اس لطیفہ کو قوی بنانے کے لیے ایک دوسرے محقق مفسر نے ایک حدیث کا حوالہ بھی دے دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص خدا سے دُعا مانگا کرتا تھا:

"اللّٰھم انی اسئلك الصبر". "اے اللہ میں تجھ سے صبر مانگتا ہوں"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا تو بلاء و مصیبت کیوں مانگتا ہے، اس سے عافیت کا طالب کیوں نہیں ہوتا۔

ہمیں ان دونوں بزرگوں کی جلالت قدر کے پیش نظر اگر چہ جرأت گویائی نہیں ہے لیکن یوسف علیہ السلام جیسے عظیم المرتبت پیغمبر کی زندگی کے اس عدیم النظیر کارنامہ کو ایک لطیفہ کی نذر ہوتے دیکھ کر رہا نہیں جاتا، اور بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ جملہ ﴿ اَلسِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ﴾ ان کے علوشان، تقرب الی اللہ، استقامت فی الدین، عزیمت فی الحق اور رضاء و تسلیم کا بے نظیر مظاہرہ ہے جو ان جیسے اولوالعزم پیغمبروں کا ہی حصہ ہے۔

غور کیجئے عزیز کی بیوی اور گھر کی مالکہ نے خوشامد و چاپلوسی کی کون سی راہ اختیار نہیں کی جس سے یوسف علیہ السلام کو رام کیا جا سکے، پھر اس میں ناکامی کے بعد دوسری عورتوں کی مدد حاصل کی اور انہوں نے اپنے ممکن داؤں گھات یوسف علیہ السلام پر استعمال کیے مگر پھر بھی ناکامی رہی، اب آخری درجہ یہ تھا کہ اس نے دھمکی دی کہ یا یوسف اس کو شاد کام کرے ورنہ قید خانہ میں ڈالا جائے گا۔ ایسی حالت میں ایک باخدا انسان، صاحب عزیمت و استقامت ہستی، اور خوف خدا کو تمام کائنات کے غیظ و غضب پر غالب رکھنے والا

---

[1] موضح القرآن

Marfat.com

انسان، اس سے بہتر اور کیا جواب دے سکتا تھا کہ خدایا میں اس عمل بد کے مقابلہ میں زندان کو ترجیح دیتا ہوں، مجھے قید و بند سب کچھ منظور ہے مگر تیری نافرمانی منظور نہیں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قید کی طلب ہے، زندان کے شوق کا اظہار ہے، بلاؤ مصیبت کو دعوت ہے، ہرگز نہیں بلکہ یہاں تو لطیف پیرایہ میں وہ کہا جا رہا ہے جو اعلان حق اور خدارسی کا صحیح درجہ ہے، یوسف علیہ السلام نے یہ بھی گوارہ نہیں کیا کہ عزیز کی بیوی کو مخاطب کرے یا مہمان عورتوں کو اپنی گفتگو میں تخاطب کا موقع دے بلکہ اس نے اپنے خدا کو پکارا، مگر ان گمراہ اور بدقماش عورتوں پر یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھا کہ جس طرح ان کے تمام مکروفریب، خوشامد اور چاپلوسی ناکام رہیں، اسی طرح ان کی دھمکی اور ان کا عذاب بھی میرے ارادہ حق، اور خدارسی کو باطل نہیں کر سکتا، یہ کہتی ہے کہ "یوسف یا مجھ کو شادکام کرے ورنہ جیل خانہ جائے" تو میں جیل خانہ کو اس کے ارادہ بد کے مقابلہ میں لاکھ بار ترجیح دوں گا۔ ﴿السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ﴾۔

اب فرمایئے کہ اس اعلان حق اور اظہار استقامت کا اس دُعا سے کیا تعلق جو ایک شخص خواہ مخواہ اپنے لیے "صبر" مانگ کر خود کو آزمائش میں پڑنے کی دعوت دے رہا تھا، وہاں نہ آزمائش تھی نہ امتحان، بلکہ مفت میں بلاؤ مصیبت کا داعی بن رہا تھا اور یہاں امتحان سر پر ہے، آزمائش موجود ہے، مصیبت کی دھمکی دی جا رہی ہے، بلا نازل کرنے کا خوف دلایا جا رہا ہے کیا ایسے نازک موقع پر صرف یہ جواب کافی ہوتا کہ یوسف علیہ السلام گڑگڑا کر جناب باری میں امراۃ عزیز سے چھٹکارا پالینے کی دُعا کرتے اور بس، اگر ایسا ہوتا، تو امتحان، آزمائش اور بلاؤ مصیبت کے وقت استقامت، اعلان حق، بے خوفی اور تمام دنیوی رعونتوں کے مقابلہ میں اعلائے کلمۃ اللہ کا سبق کون سکھاتا اور عزیمت کی زندگی کون بتاتا باطل سے بے خوفی کی تعلیم کس سے ملتی اور حق و باطل میں امتیاز کی شان کون پیدا کرتا؟

یوسف علیہ السلام زندان میں:

بہرحال یوسف علیہ السلام کو قیدخانہ بھیج دیا گیا اور ایک بے خطاء کو خطاء کار اور معصوم کو مجرم بنا دیا گیا تاکہ عزیز کی بیوی فضیحت سے بچ جائے اور مجرم کو کوئی مجرم نہ کہہ سکے۔

تورات میں ہے کہ یوسف علیہ السلام کے علمی اور عملی جوہر قیدخانہ میں بھی نہ چھپ سکے اور قیدخانہ کا داروغہ اس کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گیا اور جیل کا تمام انتظام و انصرام اس کے سپرد کر دیا، وہ قیدخانہ بالکل مختار ہو گیا اور خداوند نے وہاں بھی اسے اس کے تمام کاموں میں اقبال مند کیا۔ (۱)

قرآن عزیز سے بھی اس کی تائید نکلتی ہے اس لیے کہ اس زمانے کے قیدخانوں کے حالات کے پیش نظر یوسف علیہ السلام کے پاس قیدیوں کا اس طرح آنا جانا اور پھر ان کی عظمت و نیک نفسی کا اعتراف، اس کو واضح کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے پاک اوصاف کی قیدخانہ میں کافی شہرت تھی۔

---

(۱) پیدائش باب ۳۹ آیت ۲۳۔

Marfat.com

دعوت و تبلیغ:

حسن اتفاق کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو نو جوان اور قید خانہ میں داخل ہوئے، ان میں سے ایک شاہی ساقی تھا اور دوسرا شاہی باورچی خانہ کا داروغہ، [1] ایک روز دونوں خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور ان میں سے ساقی کہنے لگا، میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ میں شراب بنانے کے لیے انگور نچوڑ رہا ہوں، اور دوسرے نے کہا، میں نے یہ دیکھا ہے کہ میرے سر پر روٹیوں کا خوان ہے اور پرند اس سے کھا رہے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نبی زادہ تھے، اسلام کی تبلیغ کا ذوق ان کے ریشہ ریشہ میں پیوست تھا، پھر خدا نے ان کو بھی نبوت کے لیے چن لیا تھا اس لیے دین حق کی اشاعت ان کی زندگی کا نصب العین تھا، گو قید میں تھے مگر مقصد حیات کو کیسے بھول جاتے اور اگرچہ مصیبت و محن میں تھے لیکن اعلاء کلمۃ اللہ کو فراموش کر دیں یہ کیسے ممکن تھا، موقعہ کو غنیمت جانا اور ان سے نرمی اور محبت سے فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے جو باتیں مجھے تعلیم فرمائی ہیں منجملہ ان کے یہ علم بھی اس نے عطا فرمایا ہے، میں اس سے پہلے کہ تمہارا مقررہ کھانا تم تک پہنچے تمہارے خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا مگر میں تم سے ایک بات کہتا ہوں، ذرا اس پر بھی غور کرو اور سمجھو بوجھو۔

"میں نے ان لوگوں کی ملت کو اختیار نہیں کیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی منکر ہیں، میں نے اپنے باپ دادوں یعنی ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کی ملت کی پیروی کی ہے، ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک ٹھہرائیں، یہ اللہ تعالیٰ کا ایک فضل ہے جو اس نے ہم پر اور لوگوں پر کیا ہے لیکن اکثر لوگ اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے۔"

"اے دوستو! تم نے اس پر بھی غور کیا، جدا جدا معبودوں کا ہونا بہتر ہے یا اللہ کا جو یکتا اور سب پر غالب ہے؟ تم اس کے علاوہ جن کی عبادت بھی کرتے ہو ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جن کو تمہارے باپ دادا نے گھڑ لیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ہرگز کوئی سند نہیں اتاری، حکومت تو صرف اللہ کے ہی لیے ہے، اس نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو، یہی سیدھا دین ہے، مگر اکثر آدمی نہیں جانتے۔"

﴿يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۳۹-۴۰)

"اے یاران مجلس! (تم نے اس پر بھی غور کیا کہ) جدا جدا معبودوں کا ہونا بہتر ہے یا اللہ کا جو یگانہ اور سب پر غالب ہے تم اس کے سواء جن ہستیوں کی بندگی کرتے ہو ان کی حقیقت اس سے زیادہ کیا ہے کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کوئی سند نہیں اتاری، حکومت تو اللہ ہی کے لیے ہے، اس کا فرمان یہ ہے کہ صرف اس کی بندگی کرو اور کسی کی نہ کرو، یہی سیدھا دین ہے، مگر اکثر آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔"

[1] پیدائش باب ۴۰ آیت ا

Marfat.com

رشد و ہدایت، کے اس پیغام کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام ان کے خوابوں کی تعبیر کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے:

"دوستو! جس نے یہ دیکھا ہے کہ وہ انگور نچوڑ رہا ہے وہ پھر آزاد ہو کر بادشاہ کے ساقی کی خدمت انجام دے گا اور جس نے روٹیوں والا خواب دیکھا ہے اس کو سولی دی جائے گی، اور پرند اس کے سر کو نوچ نوچ کھائیں گے، جن باتوں کے بارہ میں تم نے سوال کیا تھا وہ فیصل ہو چکی، اور فیصلہ یہی ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ ساقی اور داروغہ، باورچی خانہ پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے بادشاہ کے کھانے پینے کی چیزوں میں زہر ملایا، جب تحقیقات ختم ہو گئیں تو داروغہ پر یہ جرم ثابت ہو گیا اور ساقی کو بری کر دیا گیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام جب تعبیر خواب سے فارغ ہو گئے تو ساقی سے یہ سمجھ کر کہ وہ نجات پا جائے گا، فرمانے لگے ﴿اذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ﴾ اپنے بادشاہ سے میرا ذکر کرنا، ساقی جب رہا ہو گیا تو اس کو اپنی مشغولیات میں کچھ بھی یاد نہیں رہا کہ زندان میں کیا وعدہ کر آیا تھا، اور شیطان نے اس کے دماغ سے یہ سب بھلا دیا اور اس طرح چند سال تک یوسف علیہ السلام کو قید خانہ میں ہی رہنا پڑا۔

اس مقام پر اکثر مفسرین کی تفسیر کا ماحصل یہ ہے کہ ﴿اذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ﴾ سے یوسف علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ بادشاہ سے کہنا کہ ایک بے قصور اور بے گناہ انسان اس طرح مجرم بنا کر زندان میں ڈال دیا گیا ہے اور اس تفسیر کے بعد وہ یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ اگرچہ مصائب اور ضرورت کے موقعہ پر انسان کا انسانوں سے مدد لینا اور استعانت طلب کرنا حق گوشی اور خدا پرستی کے خلاف نہیں ہے تاہم بمصداق ﴿حسنات الابرار سیئات المقربین﴾ "نیکوں کی بعض بھلائیاں مقربین بارگاہِ الٰہی کے شایان شان نہیں ہوتیں" حضرت یوسف علیہ السلام جیسی ہستی کے لیے یہ موزوں نہ تھا کہ وہ خدا پر بھروسہ کے ساتھ ساتھ دنیوی اسباب پر بھروسہ کریں، اور بادشاہ سے اپنی مظلومیت کے دفاع کے طالب ہوں، اس لیے خدا کا فیصلہ یہ ٹھہرا کہ ان کو ابھی چند سال اور قید خانہ میں رکھے اور ساقی کو شیطان نے ایسا بھلایا کہ وہ یوسف کا کچھ بھی ذکر نہ کر سکا۔ اور ابن جریر اور بغوی نے بعض سلف سے نقل کیا ہے کہ وہ ﴿فانساہ﴾ کی ضمیر کو یوسف علیہ السلام کی جانب پھیرتے اور یہ معنی کرتے ہیں کہ شیطان نے یوسف علیہ السلام کو بھلا دیا کہ ان کا بادشاہ کی مدد کے لیے ساقی سے کہنا ناموزوں ہے، مگر ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کو سختی کے ساتھ رد کر دیا اور اس تفسیر کو غلط ثابت کیا ہے، [1] آئندہ سطور میں توراۃ سے اس سلسلہ میں جو نقل کیا گیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہے۔

اس تفسیر کے برعکس بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ "بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا کہ ایسا ایک شخص ہم کو اس طرح دین حق کی تلقین کرتا ہے، اور وہ اپنی ملت کو ہماری ملت سے جدا بتاتا، اور اس پر بہترین دلائل دیتا ہے"۔

اور اس تفسیر کی صحت کے لیے قرینہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر قرآن عزیز میں یوسف علیہ السلام اور ان دو [2] شخصوں کے درمیان صرف دو ہی باتوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے، ایک دعوت و تبلیغ اسلام کا اور دوسرے خواب اور اس کی تعبیر کا، تیسری کسی بات کا اشارہ تک نہیں، یعنی کسی اشارہ اور کنایہ سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان ہر دو اشخاص کے سامنے اپنا قصہ بیان

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ یوسف [2] پیدائش باب ۴۰ آیت ۱۲-۱۵

Marfat.com

کیا ہو، اور ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہو، پھر بغیر ذکر سابق کے اس طرح ﴿اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ﴾ میں اجمال کے کیا معنی؟ علاوہ ازیں اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے زندان سے باہر آنے کی طلب وجستجو کا یہ حال تھا تو جب ساقی کے یاد آنے اور بادشاہ کے خواب کی تعبیر دینے کے بعد بادشاہ نے ان کی رہائی کا حکم دے دیا تو کیوں فوراً باہر نہ نکل آئے اور تفتیش حال کا مطالبہ کیوں کیا، یہ تو رہائی کے بعد بھی ہوسکتی تھی، اور عصمت، اور بے گناہی کا فیصلہ باہر آ کر بھی کیا جاسکتا تھا۔

آیات کی ترتیب وانسجام کے پیش نظر یہی تفسیر قابل ترجیح ہے۔ تورات میں اس واقعہ کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

"تب یوسف بولا اس کی تعبیر یہ ہے کہ یہ تین ڈالیاں تین دن ہیں اور فرعون اب سے تین دن میں تیری روبکاری کرے گا، اور تجھے تیرا منصب پھیر دے گا اور آگے کی طرح جب تو فرعون کا ساقی تھا اس کے ہاتھ میں پھر جام دے گا، لیکن جب تو خوش حال ہو تو مجھے یاد کیجیو اور مجھے اس گھر سے مخلصی دلوائیو کہ وہ عبرانیوں کی ولایت سے مجھے چرا لائے، اور یہاں بھی میں نے ایسا کام نہیں کیا کہ وہ مجھے اس قید میں رکھیں۔" ❶

فرعون کا خواب:

حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ واقعہ "فراعنہ مصر" کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے، یہ خاندان شاہی نسلی اعتبار سے "عمالقہ" میں سے تھا، مصر کی تاریخ میں ان کو "ہکسوس" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان کی اصلیت کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ چرواہوں کی ایک قوم تھی، جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قوم عرب سے آئی تھی اور دراصل یہ "عرب عاربہ" ہی کی ایک شاخ تھی، نیز قدیم قبطی اور عربی زبانوں کی باہمی مشابہت ان کے عرب ہونے کی مزید دلیل ہے۔ ❷

اور مصر کے مذہبی تخیل کی بنا پر ان کا لقب "فاراع" ❸ (فرعون) تھا، اس لیے کہ مصری دیوتاؤں میں سے بڑا اور مقدس دیوتا آمن راع (سورج دیوتا) تھا اور بادشاہ وقت اس کا اوتار اور "فاراع" کہلاتا تھا، یہی فاراع عبرانی میں فارعن اور عربی میں فرعون کہلایا اور اس زمانہ کے فرعون کا نام عرب مؤرخوں نے ریان بتایا ہے اور مصری آثار میں آپوفی کے نام سے موسوم ہے۔

بہرحال حضرت یوسف علیہ السلام ابھی زندان ہی میں تھے کہ وقت کے فرعون نے ایک خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات دُبلی، اور دُبلی گائیں موٹی کو نگل گئیں، اور سات سرسبز وشاداب بالیں ہیں اور سات خشک اور خشک بالوں نے سرسبز کو کھالیا، بادشاہ صبح اُٹھا تو پریشان خاطر تھا اور اس عجیب وغریب خواب سے حیران، فوراً دربار کے مشیروں سے اپنا خواب کہا اور خواب کی تعبیر چاہی درباری بھی اس کو سن کر فکر وتردد میں پڑ گئے اور جب حل نہ کر سکے تو اپنی درماندگی وبے چارگی کو چھپانے کے لیے کہنے لگے، بادشاہ! یہ خواب نہیں ہے بلکہ پریشان خیالات ہیں جن کا کوئی خاص مطلب نہیں ہے، ہم سچے خواب کی تعبیر تو دے سکتے ہیں لیکن پریشان خیالات حل نہیں کر سکتے۔

---

❶ پیدائش باب ۴۰ آیت ۱۲۔۱۵ ❷ ترجمان القرآن ج ۲ ص ۳۶۶

❸ مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے اور ان سب سے بلند تر "آمن راع" تھا، یعنی سورج دیوتا نیز مصریوں میں الوہیت آمیز شاہی کا تصور بھی پوری طرح نشوونما پاچکا تھا اور تاجدارن مصر نے نیم خدا کی حیثیت اختیار کر لی تھی، ان کا لقب فاراع اسی لیے ہوا کہ وہ راع یعنی سورج دیوتا کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ (ترجمان القرآن ج ۲ ص ۳۶۲) پھر بھی یہی فارع عربی میں جا کر فرعون بن گیا۔

Marfat.com

بادشاہ کو دربار یوں کے اس جواب سے اطمینان نہ ہوا، کہ اس اثناء میں ساقی کو اپنا خواب اور یوسف کی تعبیر کا واقعہ یاد آ گیا، اس نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کی کہ اگر کچھ مہلت دیجئے تو میں اس کی تعبیر لا سکتا ہوں، مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دیجئے۔ بادشاہ کی اجازت سے وہ اسی وقت قید خانہ پہنچا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو بادشاہ کا خواب سنایا اور کہا کہ آپ اس کو حل کیجئے کیونکہ آپ سچائی اور تقدس کے پیکر ہیں، آپ ہی اس کو حل کر سکتے ہیں، اور کیا عجب ہے کہ جن لوگوں نے مجھے بھیجا ہے جب میں صحیح تعبیر لے کر ان کے پاس واپس جاؤں تو وہ آپ کی حقیقی قدر و منزلت معلوم کر لیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا کمال صبر و استقلال، اور جلالت قدر کا اندازہ کیجئے، ساقی کو نہ ملامت کی اور نہ برسوں تک بھولے رہنے پر جھڑکا، اور نہ عطاء علم میں بخل سے کام لیا اور نہ یہ سوچا کہ جن ظالموں نے مجھ کو بے قصور زندان میں ڈالا ہے وہ اگر تباہ ہو جائیں اور اس خواب کا حل نہ پا کر برباد ہو جائیں تو اچھا ہے، ان کی یہی سزا ہے، نہیں ایسا کچھ بھی نہیں کیا بلکہ اسی وقت خواب کی تعبیر دی اور اپنی جانب سے اس سلسلہ میں صحیح تدبیر بھی بتلا دی، اور ساقی کو پوری طرح مطمئن کر دیا۔ فرمایا:

اس خواب کی تعبیر، اور اس کی بنا پر جو کچھ تم کو کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ تم سات برس تک لگاتار کھیتی کرتے رہو گے اور یہ تمہاری خوش حالی کے سال ہوں گے، جب کھیتی کے کٹنے کا وقت آئے تو جس قدر مقدار تمہارے سال بھر کھانے کے لیے ضروری ہو اس کو الگ کر لو اور باقی غلہ کو ان کی بالوں میں ہی رہنے دو تا کہ محفوظ رہے اور گلے سڑے نہیں۔ اس کے بعد سات برس بہت سخت مصیبت کے آئیں گے وہ تمہارا جمع کیا ہوا تمام ذخیرہ ختم کر دیں گے، اس کے بعد پھر ایک برس ایسا آئے گا کہ خوب پانی برسے گا، کھیتیاں ہری بھری ہوں گی اور لوگ پھلوں اور دانوں سے عرق اور تیل بہتات کے ساتھ نکالیں گے، یعنی موٹی گائیں اور بالیں خوش حالی کے سال ہیں اور دبلی گائیں اور بالیں خشک سالی کے برس جو خوش حالی کی پیداوار کو کھا جائیں گے۔

﴿قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۝ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۴۷-۴۹)

"کہا تم کھیتی کرو گے سات برس جم کر سو جو کاٹو اس کو چھوڑ دو اس کی بال میں مگر تھوڑا سا جو تم کھاؤ، پھر آئیں گے اس کے بعد سات برس سختی کے کھا جائیں گے جو رکھا تم نے ان کے واسطے مگر تھوڑا سا جو روک رکھو گے بیج کے واسطے، پھر آئے گا، ایک برس اس کے پیچھے اس میں مینہ برسے گا لوگوں پر اور اس میں رس نچوڑیں گے۔"

یہ قرآن عزیز کی بلاغت کلام کا اعجاز ہے کہ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر خواب اور اس سے متعلق تدبیر کو ایک ہی جملہ میں ساتھ ساتھ بیان کر دیا ہے تا کہ کلام میں تکرار اور دہرانے کی ضرورت باقی نہ رہے۔

ساقی نے یہ سب معاملہ بادشاہ کے سامنے جا سنایا، بادشاہ نے ساقی کی زبان سے پہلے کچھ جملے یوسف علیہ السلام کی تعریف میں سنے تھے، تعبیر خواب کا معاملہ دیکھ کر ان کے علم و دانش، اور جلالت قدر کا قائل ہو گیا اور نادیدہ مشتاق بن کر کہنے لگا کہ ایسے شخص کو میرے پاس لاؤ۔

Marfat.com

جب بادشاہ کا پیامبر یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا اور بادشاہ کے طلب و اشتیاق کا حال سنایا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانے سے باہر آنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ اس طرح تو میں جانے کو تیار نہیں ہوں، تم اپنے آقا کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ یہ تحقیق کرے کہ ان عورتوں کا معاملہ کیا تھا، جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ پہلے یہ بات صاف ہو جائے کہ انہوں نے کیسی کچھ مکاریاں کی تھیں اور میرا پروردگار تو ان کی مکاریوں سے خوب واقف ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام بے قصور اور بے خطاء برسوں سے قید خانہ میں بند تھے اور بلا وجہ ان کو زندانی بنایا ہوا تھا۔ اب جب کہ بادشاہ نے مہربان ہو کر رہائی کا مژدہ سنایا تو چاہیے تھا کہ وہ مسرت وخوشی کے ساتھ زندان سے باہر نکل آتے، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور گذشتہ معاملہ کی تحقیق کا مطالبہ شروع کر دیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام خانوادۂ نبوت سے ہیں اور خود بھی برگزیدہ نبی و پیغمبر ہیں، اس لیے غیرت وحمیت اور عزت نفس کے بدرجہ اتم مالک ہیں، انہوں نے سوچا کہ اگر بادشاہ کی اس مہربانی پر میں رہا ہو گیا تو یہ بادشاہ کا رحم و کرم سمجھا جائے گا اور میرا بے قصور اور صاحب عصمت ہونا پردۂ خفا میں رہ جائے گا، اس طرح صرف عزت نفس ہی کو ٹھیس نہیں لگے گی بلکہ دعوت وتبلیغ کے اس اہم مقصد کو بھی نقصان پہنچے گا جو میری زندگی کا نصب العین ہے پس اب بہترین وقت ہے کہ معاملہ کی اصل صورت سامنے آ جائے اور حق ظاہر و واضح ہو جائے۔

صحیحین (بخاری ومسلم) کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کا ذکر فرماتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کے ضبط و صبر کو بہت سراہا اور تواضع و کسر نفسی کی حد تک اس کو بڑھا کر یہ ارشاد فرمایا:

((لَوْ لَبِثْتُ فِی السجنِ مَا لَبِثَ یُوسُفُ لَاَجَبْتُ الدَّاعِیَ)). (الحدیث) [1]

"اگر میں اس قدر دراز مدت تک قید میں رہتا۔ جس قدر کہ یوسف علیہ السلام رہے تو بلانے والے کی دعوت فوراً قبول کر لیتا۔"

اس جگہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگرچہ یوسف علیہ السلام کا معاملہ براہ راست عزیز کی بیوی کے ساتھ پیش آیا تھا مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کا ذکر نہیں کیا بلکہ ان مصری عورتوں کا حوالہ دیا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسا کیوں کیا، اس کی دو وجہیں تھیں، ایک یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اگرچہ عزیز کی بیوی سے زیادہ تکلیف پہنچی تھی مگر قید کے اس معاملہ میں ان عورتوں کی بھی سازش تھی اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک یوسف علیہ السلام کی عاشق اور ان کو اپنی جانب مائل کرنے کی آرزومند تھی، اور ناکامی کی صورت میں سب نے مل کر عزیز کی بیوی کو اس کے قید والے فیصلہ میں شہ دی اور عملی جامہ پہنا کر چھوڑا یہی وجہ ہے کہ زندان کا معاملہ ان عورتوں کے قضیہ کے بعد پیش آیا، دوسری وجہ یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام سمجھتے تھے کہ عزیز نے میرے ساتھ ممکن حسن سلوک برتا ہے، میری عزت اور میرا احترام کیا ہے اس لیے موزوں نہیں ہے کہ میں اس کی بیوی کا نام لے کر اس کی رسوائی کا باعث بنوں۔

غرض بادشاہ نے جب یہ سنا تو ان عورتوں کو بلوایا اور ان سے کہا کہ صاف صاف اور صحیح صحیح بتاؤ کہ اس معاملہ کی اصل حقیقت کیا ہے جب کہ تم نے یوسف علیہ السلام پر ڈورے ڈالے تھے تا کہ تم اس کو اپنی طرف مائل کر لو؟ وہ ایک زبان ہو کر بولیں:

---

[1] بخاری کتاب الانبیاء

Marfat.com

﴿ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ﴾(یوسف: ۵۱)

"بولیں، حاشاءللہ ہم نے اس میں برائی کی کوئی بات نہیں پائی۔"

مجمع میں عزیز کی بیوی بھی موجود تھی اور اب وہ عشق و محبت کی بھٹی میں خام نہ تھی کندن تھی، اور ذلت و رسوائی کے خوف سے آگے نکل چکی تھی اس نے جب یہ دیکھا کہ یوسف علیہ السلام کی خواہش ہے کہ حقیقت حال سامنے آ جائے تو بے اختیار بول اٹھی:

﴿اَلْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝﴾(یوسف: ۵۱)

"جو حقیقت تھی وہ اب ظاہر ہوگئی، ہاں وہ میں ہی تھی جس نے یوسف (علیہ السلام) پر ڈورے ڈالے کہ اپنا دل ہار بیٹھے، بلاشبہ وہ (اپنے بیان میں) بالکل سچا ہے۔"

اور یہ بھی کہا:

﴿ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۝ وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾(یوسف: ۵۲-۵۳)

"یہ میں نے اس لیے کہا کہ اس (یوسف علیہ السلام) کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پیٹھ پیچھے اس کے معاملہ میں خیانت نہیں کی۔ نیز اس لیے کہ (واضح ہو جائے) اللہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی (کامیابی) کی راہ نہیں کھولتا، میں اپنے نفس کی پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی، آدمی کا نفس تو برائی کے لیے بڑا ہی اُبھارنے والا ہے مگر ہاں اسی حال میں کہ میرا پروردگار رحم کرے، بلاشبہ میرا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا، بڑا ہی رحم کرنے والا ہے۔"

ہم نے اس آیت کا ترجمہ مشہور مفسر ابن حیان اندلسی کی تفسیر کے مطابق کیا ہے، دوسرے مفسرین اس کے علاوہ تفسیر کرتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے شاگرد رشید حافظ عماد الدین بن کثیر اپنی تفسیر میں اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

"یہ میں نے اس لیے کہا کہ اس (عزیز) کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس کی (اس سے زیادہ اور کوئی) خیانت نہیں کی (جس کا حال اسے معلوم ہے) اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے مکر کو کامیاب نہیں کرتا (سو اگر میں نے اس سے زیادہ خیانت کی ہوتی تو اس کا بھی پردہ فاش ہو کر رہتا) اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتی، بیشک نفس البتہ برائی کے لیے اُبھارنے والا ہے مگر جس پر میرا پروردگار رحم کر دے، بیشک میرا پروردگار بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔"

یعنی انہوں نے اس مقولہ کو عزیز کی بیوی کا مقولہ قرار دے کر ﴿لَمْ اَخُنْهُ﴾ کی ضمیر کا مرجع عزیز کو قرار دیا ہے۔

اور عام مفسرین اس پورے مقولے کو حضرت یوسف علیہ السلام کا مقولہ قرار دیتے ہیں اور ﴿لَمْ اَخُنْهُ﴾ کی ضمیر کو اسی طرح عزیز کی بیوی کی جانب پھیرتے ہیں جس طرح حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے ہے اور آیت کا اس طرح ترجمہ کرتے ہیں:

"یوسف علیہ السلام نے کہا یہ اس واسطے کہ عزیز کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی اور اللہ تعالیٰ دغابازوں کا فریب کامیاب نہیں کرتا، اور میں اپنے نفس کو پاک نہیں کہتا، بیشک نفس سکھلاتا ہے برائی مگر یہ کہ رحم کرے میرا پروردگار بیشک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔"

Marfat.com

اور ﴿مَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ﴾ کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے چونکہ اپنی عصمت نفس کا اس موقعہ پر زبردست مظاہرہ کیا تھا تو ایک جلیل القدر نبی اور مقرب بارگاہِ الٰہی ہونے کی وجہ سے یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری تھا کہ میری پاکبازی اور عصمت کا یہ معاملہ میرے اپنے نفس کی بدولت نہیں ہے کیونکہ نفس انسانی تو اکثر برائی پر اُبھارتا ہے بلکہ یہ محض خدا کی رحمت و عنایت کا صدقہ ہے اور یہی رحمت، عصمت انبیاء کی کفیل ہے۔

بہرحال وقت آ پہنچا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت و پاکبازی اور صداقت وطہارت کا معاملہ تہمت لگانے والوں کی زبان ہی سے واضح ہو جائے چنانچہ واضح اور ظاہر ہو گیا اور شاہی دربار میں مجرموں نے اعتراف جرم کر کے بتا دیا کہ یوسف (علیہ السلام) کا دامن ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک اور منزہ ہے۔

لطیفہ:

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام خدا کے سچے پیغمبر اور نبی معصوم تھے اس لیے ان کا دامن ہر قسم کی آلائش سے پاک صاف تھا، اور ان کی مقدس زندگی کا ایک لمحہ بھی کسی آلودگی سے ملوث نہیں ہوا تھا، اس لیے خدائے تعالیٰ کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق جس قدر بھی شخصیتیں تھیں ان سب کی زبانی ان کی طہارت نفس اور عصمت کا اعتراف کرایا۔

اَلفضلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ

اچھا یوسف علیہ السلام کے علاوہ اس واقعہ کی شخصیتیں کون ہیں؟ عزیز مصر کی بیوی، شہری عورتیں، اور عزیز کی بیوی کا رشتہ دار، یہی افراد ہیں جو کسی نہ کسی طرح تحقیق طلب معاملہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں سب سے پہلے عزیز کی بیوی کا رشتہ دار سامنے آتا ہے اور پیراہن کے چاک ہونے کا عاقلانہ فیصلہ دے کر یوسف علیہ السلام کی پاکی کا اظہار کرتا، اور عورت کو مجرم ٹھہراتا ہے، اس کے بعد حقیقت حال واضح ہو جانے پر عزیز بھی اقرار کرتا ہے کہ یوسف بے گناہ، بے خطا اور معصوم ہے اور ﴿یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا﴾ کہہ کر یوسف علیہ السلام سے معذرت کرتا اور اپنی ناموس کی حفاظت کی خاطر معاملہ کو ختم کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ تیسرا نمبر شہری عورتوں کا ہے، جب بادشاہ نے بھرے دربار میں یوسف علیہ السلام کے معاملہ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بے تامل کہہ دیا ﴿حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَیْهِ مِنْ سُوْٓءٍ﴾ اور اس طرح یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی پر مہر لگا دی، یہ سب شہادتیں اگرچہ یوسف علیہ السلام کے عزیزوں، رشتہ داروں اور حامیوں کی جانب سے نہ تھیں بلکہ ایک اجنبی ملک عزیز کی بیوی کے ہم قوم اور اہل خاندان کی شہادتیں تھیں، تاہم وہم وگمان ہو سکتا تھا کہ کچھ عجب نہیں کہ اس معاملہ میں کسی حد تک "اگرچہ بہت تھوڑا ہی سہی" یوسف کا بھی ضرور قصور ہو گا، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم الشان فضل وکرم تھا کہ اس نے اپنے پاک اور مقدس بندہ کی عصمت کے اعلان اور اس کے بارہ میں شائبۂ سوءِ ظن کے انہدام کے لیے علی روس الاشہاد خود مجرم سے اقرار جرم کرایا، اور اس ہی کی زبان سے یوسف علیہ السلام کی عصمت وصداقت کی شہادت لا کر حقیقت حال آشکارا کر دی اور شاہی دربار میں عزیز کی بیوی کو یہ کہنا پڑا کہ:

﴿اَلْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝۵۱﴾ (یوسف: ۵۱)

"اب حق ظاہر ہو گیا میں نے ہی اس کو اپنے نفس کے لیے پھسلایا تھا اور بلاشبہ وہ سچا ہے۔"

﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ (المائدہ:۵۴)

"اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطاء کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والے ہیں۔"

فرعون پر جب حقیقت حال منکشف ہوگئی تو اس کے قلب میں حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت و جلالت قدر کا سکہ بیٹھ گیا، ساقی کا حسن عقیدت کے ساتھ یوسف علیہ السلام کی عقل و دانش کا ذکر اپنی خواب کی بہترین اور دل لگتی تعبیر اور عصمت نفس کا یہ انکشاف، یہ سب امور تھے جنہوں نے مل کر بادشاہ کو اس بزرگ اور پر عظمت ہستی کی دید اور اس سے استفادہ کا عاشق بنا دیا، وہ کہنے لگا:

﴿ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ﴾ (یوسف:۵۴)

"اس کو (جلد) میرے پاس لاؤ کہ میں اس کو خاص اپنے کاموں کے لیے متقرر کروں۔"

یوسف علیہ السلام اب بایں رعنائیں و دلبری، بایں عصمت و پاکبازی، اور بایں عقل و دانش زندان سے نکل کر بادشاہ کے دربار میں تشریف لائے، بات چیت ہوئی تو بادشاہ حیران رہ گیا کہ اب تک جس کی راست بازی، امانت داری اور وفاء عہد کا یہ تجربہ کیا تھا وہ عقل و دانش اور حکمت و فطانت میں بھی آپ اپنی نظیر ہے اور مسرت کے ساتھ کہنے لگا:

﴿ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴾ (یوسف:۵۴)

"بلاشبہ آج کے دن تو ہماری نگاہوں میں بڑا صاحب اقتدار اور امانت دار ہے۔"

پھر ان سے دریافت کیا کہ میرے خواب میں جس قحط سالی کا ذکر ہے اس کے متعلق مجھ کو کیا کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب دیا۔

﴿ قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰي خَزَاۗىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّىْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴾ (یوسف:۵۵)

یوسف علیہ السلام نے کہا: "اپنی مملکت کے خزانوں پر آپ مجھے مختار کیجیے میں حفاظت کر سکتا ہوں، اور میں اس کام کا جاننے والا ہوں۔"

چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی تمام مملکت کا امین و کفیل بنا دیا، اور شاہی خزانوں کی کنجیاں ان کے حوالہ کر کے مختار عام کر دیا، تورات میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"یہ تعبیر فرعون کی نگاہ میں اور اس کے سب نوکروں کی نظر میں اچھی معلوم ہوئی، فرعون نے اپنے نوکروں کو کہا کیا ہم ایسا جیسا کہ جس میں خدا کی روح ہے پا سکتے ہیں؟ اور فرعون نے یوسف علیہ السلام سے کہا از بس کہ خدا نے تجھے اس سب میں بینائی دی ہے سو تجھ سا عاقل و دانشور نہیں ہے تو میرے گھر کا مختار ہوا اور اپنا حکم میری سب رعیت پر جاری کر، فقط تخت نشینی میں میں تجھ سے برتر رہوں گا، پھر فرعون نے یوسف علیہ السلام سے کہا دیکھ میں نے تجھے ساری زمین مصر پر حکومت بخشی اور فرعون نے اپنی انگشتری ہاتھ سے نکال کر یوسف کے ہاتھ میں پہنا دی اور اس کو کتان کا لباس پہنایا اور سونے کا طوق اس کے گلے میں ڈالا اور اس نے اسے مصر کی ساری مملکت پر حاکم کیا، اور فرعون نے یوسف کو کہا میں فرعون ہوں اور بغیر تیرے مصر کی ساری زمین میں کوئی انسان اپنا ہاتھ یا پاؤں نہ اٹھائے گا۔" [1]

---

[1] پیدائش باب ۴۱ آیات ۳۷-۴۴

اللہ اللہ! خدائے تعالیٰ کی قدرت اور اس کے عطاء وکرم کی یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ کل جس ہستی کو مصر کی متمدن قوم، بدوی اور صحرائی سمجھتی تھی، جو بدوی تھا اور غلام بھی اس کو پہلے ایک سردار کے گھر کا مختار، اس کی نگاہوں میں محترم ومعزز اور امین وفطین بنایا، اور پھر قید خانہ کی زندگی سے نکالا تو مملکت مصر، اور قوم مصر کا مالک ومختار بنا دیا، اور اس مرتبہ پر پہنچا دیا کہ اسباب دنیوی کے ماتحت جس کا تصور بھی ممکن نہ تھا، یہ قادر مطلق کی کارفرمائی کا معجزانہ مظاہرہ نہیں تو اور کیا ہے کہ کل جو کنعان میں گلہ بانی کر رہا تھا وہ آج وقت کی سب سے بڑی متمدن قوم کا مختار ومالک بن کر جہاں بانی کر رہا ہے، سچ ہے جس کو وہاں قبولیت کا شرف حاصل ہو گیا اس کے لیے راہ کی تمام دشواریاں ہیچ ہیں اور حالات کی نامساعدت پرکاہ کی وقعت بھی نہیں رکھتی۔

اسی لیے حق تعالیٰ نے "عزیز" کے کاروبار کا مختار بنا کر یوسف علیہ السلام کے لیے یہ فرمایا تھا کہ ہم نے اس کو "تمکین فی الارض" عطا کر دی اور اب جبکہ اس آغاز کی یہ انتہا نمود میں آ گئی تو پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ؕ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۵۶-۵۷)

"اور اس طرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف (علیہ السلام) کے قدم جما دیئے جس جگہ سے چاہے حسب مرضی رہنے سہنے کا کام لے، ہم جسے چاہتے ہیں (اسی طرح) اپنی رحمت سے فیض یاب کر دیتے ہیں، اور نیک عملوں کا اجر بھی ضائع نہیں کرتے، اور جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور بدعملیوں سے بچتے رہے ان کے لیے تو آخرت کا اجر اس سے کہیں بہتر ہے۔"

سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے دو جگہ ﴿تمکین فی الارض﴾ (زمین کا مالک بنا دینا) کی بشارت سنائی گئی ہے اور دونوں مقام پر تعبیر کا نیا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، اس کے متعلق مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں کیا خوب کہا ہے:

حضرت یوسف علیہ السلام کی مصری زندگی کے دو انقلاب انگیز نقطے تھے، ایک وہ جب غلام ہو کر بکے اور پھر عزیز کی نظروں میں ایسے معزز ہوئے کہ اس کے علاقے کے مختار ہو گئے، دوسرا یہ کہ قید خانہ سے نکلے اور نکلتے ہی وہاں پہنچ گئے کہ حکمرانی کی مسند جلال پر جلوہ آرا نظر آئے پس جب پہلے انقلاب تک سرگذشت پہنچی تھی تو آیت (۲۱) میں حکمت الٰہی کی کرشمہ سنجیوں پر توجہ دلائی تھی کہ ﴿كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ﴾ اور اب کہ دوسرا انقلاب پیش آیا تو اسی آیت (۵۶) میں فرمایا ﴿كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ﴾ وہاں چونکہ معاملہ مصر کی ابتداء ہوئی تھی اور ابھی حضرت یوسف علیہ السلام کو حکمرانی کی دانش سیکھنی باقی تھی اس لیے فرمایا تھا ﴿وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ﴾ (یوسف: ۲۱) یہاں چونکہ تکمیل کار کے بعد اس کا نتیجہ ظاہر ہو گیا تھا اس لیے فرمایا ﴿لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (یوسف: ۵۶) یہ اس لیے ہوا کہ ہمارا قانون ہے نیک عمل کا بیج کبھی ضائع نہیں ہوتا ضروری ہے کہ پھل لائے۔ [1]

شروع واقعہ میں یہ کہا گیا ہے کہ سورۂ یوسف کا نزول یہودیوں کے اس سوال پر ہوا جو انہوں نے مشرکین مکہ کے ذریعہ نبی اکرم ﷺ سے کیا تھا: وہ یہ کہ "ابراہیم علیہ السلام کی نسل مصر میں کیسے آئی؟"

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۲۳۵ (نوٹ)

Marfat.com

اس لیے آیت زیر بحث کی تفسیر میں شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ جواب ہوا ان کے سوال کا کہ "اولاد ابراہیم اس طرح شام سے آئی مصر میں" اور بیان ہوا کہ بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گھر سے دور پھینکا تا کہ ذلیل ہو، اور اللہ نے زیادہ عزت دی اور ملک پر اختیار دیا" ویسا ہی ہوا ہمارے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ [1]

غرض حضرت یوسف علیہ السلام نے سلطنت مصر کے مختار کل ہونے کے بعد خواب سے متعلق وہ تمام تدابیر شروع کر دیں جو چودہ سال کے اندر مفید کار ہو سکیں اور رعایا قحط سالی کے ایام میں بھی بھوک اور پریشان حالی سے محفوظ رہ سکے، چونکہ یہ تفصیل، خواب اور اس کی تعبیر کے ضمن میں خود بخود ذہن میں آ جاتی ہے، اس لیے قرآن عزیز نے واقعہ کے ان غیر ضروری حصوں کو بیان نہیں کیا۔ البتہ تورات نے ان تفصیلات کو بھی دہرایا ہے۔

"اور یوسف علیہ السلام جس وقت مصر کے بادشاہ فرعون کے حضور کھڑا ہوا تیس (۳۰) برس کا تھا، اور یوسف علیہ السلام فرعون کے حضور سے نکل کر مصر کی ساری زمین میں پھرا، اور بڑھتی کے سات برس میں زمین مالا مال ہوئی تب اس نے ان سات برسوں کی ساری چیزیں کھانے کی جو سرزمین مصر میں تھیں جمع کیں اور اس نے ان کھانے کی چیزوں کو بستیوں میں ذخیرہ کیا اور ان کھیتوں کی جو ہر بستی کے آس پاس تھے کھانے کی چیزیں اسی بستی میں رکھیں، اور یوسف علیہ السلام نے غلہ بہت کثرت سے جیسے دریا کی ریت ایسا کہ وہ حساب کرنے سے باز رہا جمع کیا کیونکہ وہ بے حساب تھا، اور سات برس سستی کے جو زمین مصر میں تھے آخر ہوئے اور گرانی کے سات برس جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے کہا تھا آنے شروع ہوئے اور سب زمین میں گرانی ہوئی، پر ہنوز مصر کی ساری زمین میں روٹی تھی پھر جب ساری زمین مصر بھوک سے ہلاک ہونے لگی تو خلق روٹی کے لیے فرعون کے آگے چلائی، فرعون نے سب مصریوں کو کہا کہ یوسف علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ جو تمہیں کہے سو کرو، اور تمام روئے زمین پر کال تھا، اور یوسف علیہ السلام نے ذخیرے کے کھتے کھول کے مصریوں کے ہاتھ بیچے اور مصر کی زمین میں کال بہت بڑھا، اور سارے ملک مصر میں مول لینے آئے، کیونکہ سب ملکوں میں سخت کال تھا۔

جب یعقوب علیہ السلام نے دیکھا کہ مصر میں غلہ ہے تب یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم کیوں ایک دوسرے کو تاکتے ہو، دیکھو، میں نے سنا ہے کہ مصر میں غلہ ہے تم وہاں جاؤ اور وہاں سے ہمارے لیے مول لو، تا کہ ہم جئیں اور مریں نہیں۔ [2]

غرض جب قحط سالی کا زمانہ شروع ہوا تو مصر اور اس کے قرب و جوار کے علاقہ میں بھی سخت کال پڑا اور کنعان میں خاندان یعقوب علیہ السلام بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا، جب حالت نزاکت اختیار کر گئی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاحبزادوں سے کہا کہ مصر میں عزیز مصر نے اعلان کیا ہے کہ اس کے پاس غلہ محفوظ ہے تم سب جاؤ اور غلہ خرید کر لاؤ چنانچہ باپ کے حکم کے مطابق یہ کنعانی قافلہ عزیز مصر سے غلہ لینے کے لیے مصر روانہ ہوا، خدا کی قدرت دیکھئے کہ برادران یوسف علیہ السلام کا یہ قافلہ اسی بھائی سے غلہ لینے چلا ہے جس کو اپنے خیال میں وہ کسی مصری گھرانے کا معمولی اور گمنام غلام بنا چکے تھے، مگر اس یوسف فروش قافلہ کو کیا معلوم کہ وہ کل کا غلام آج مصر کے تاج و تخت کا مالک و مختار کل ہے اور اس کو اسی کے سامنے عرض حال کرنا ہے بہر حال کنعان سے چلے اور مصر جا پہنچے اور

---

[1] موضح القرآن سورۂ یوسف

[2] پیدائش باب ۴۱ آیات ۴۶، ۴۹، ۵۳، ۵۷ و باب ۴۲ آیات ۱۔۲

Marfat.com

اور جب دربار یوسفی میں پیش ہوئے تو یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا۔ اور کیوں نہ پہچانتے، رنگ ڈھنگ بول چال، لب ولہجہ نقشہ و صورت اور ساری ادائیں یوسف علیہ السلام کی جانی پہچانی تھیں، البتہ وہ یوسف کو نہ پہچان سکے، اور کس طرح پہچانتے؟ کل جو چھوٹا سا بچہ تھا آج وہ تقریباً چالیس (۴۰) سالہ تجربہ کار انسان ہے نقشہ و رنگ اور بول چال سے کچھ شبہ بھی کرتے تو کس طرح؟ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ یوسف علیہ السلام اور تخت شاہی مگر یہ واقعہ تھا، حقیقت تھی اور اپنے برگزیدہ بندہ کے ساتھ رب العالمین کا وہ معاملہ تھا جو صفحہ دنیا پر ثبت ہو کر رہا۔

﴿وَجَآءَ اِخْوَةُ یُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَیْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۵۸)

"اور (پھر ایسا ہوا کہ قحط سالی کے زمانہ میں) یوسف علیہ السلام کے بھائی (غلہ خریدنے مصر سے) آئے، وہ جب یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو اس نے فوراً ان کو پہچان لیا اور وہ یوسف (علیہ السلام) کو نہ پہچان سکے۔"

توراۃ کا بیان ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام پر جاسوسی کا الزام لگایا گیا اور اس طرح ان کو یوسف علیہ السلام کے سامنے حاضر ہو کر بالمشافہ گفتگو کرنے کا موقعہ ملا۔

غرض حضرت یوسف علیہ السلام نے والد، حقیقی بھائی، اور گھر کے حالات کو خوب کرید کرید کر پوچھا اور آہستہ آہستہ سب کچھ معلوم کر لیا، اور پھر ان کو حسب مرضی غلہ بھر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ قحط اس قدر سخت ہے کہ تم کو دوبارہ یہاں آنا پڑے گا اس لیے یاد رکھو کہ اب کی مرتبہ اگر تم اپنے چھوٹے بھائی بنیامین کو ساتھ نہ لائے جس کے متعلق تم نے مجھ سے کہا ہے کہ اس کا بھائی یوسف گم ہو گیا ہے اور اس لیے تمہارا باپ اس کو کسی طرح جدا نہیں کرتا، تو تم کو ہرگز غلہ نہیں ملے گا۔

﴿وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِیْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِیْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْۤ اُوْفِی الْكَیْلَ وَاَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا كَیْلَ لَكُمْ عِنْدِیْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ۝﴾ (یوسف: ۵۹-۶۰)

"اور جب یوسف (علیہ السلام) نے ان کا سامان مہیا کر دیا تو کہا اب کے آنا تو اپنے سوتیلے بھائی بنیامین کو بھی ساتھ لانا، تم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ میں تمہیں (غلہ) پورا تول دیتا ہوں اور باہر سے آنے والوں کے لیے بہتر مہمان نواز ہوں لیکن اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے تو پھر یاد رکھو نہ تمہارے لیے میرے پاس خرید و فروخت ہو گی نہ تم میرے پاس جگہ پاؤ گے۔"

برادران یوسف علیہ السلام نے کہا کہ ہم اپنے والد سے کہیں گے اور ہر طرح ترغیب دیں گے کہ وہ بنیامین کو ہمارے ساتھ یہاں بھیجنے پر راضی ہو جائے پھر جب وہ چلنے لگے اور یوسف علیہ السلام سے رخصت ہونے آئے تو انہوں نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ خاموشی کے ساتھ ان کے کجاووں میں ان کی وہ پونجی بھی رکھ دو جو انہوں نے غلہ کی قیمت کے نام سے دی ہے تاکہ جب گھر جا کر اس کو دیکھیں تو عجب نہیں کہ پھر دوبارہ واپس آئیں، جب یہ قافلہ کنعان واپس پہنچا تو انہوں نے اپنی تمام سرگذشت اپنے باپ یعقوب علیہ السلام کو سنائی اور ان سے کہا کہ مصر کے والی نے صاف صاف ہم سے کہہ دیا ہے کہ اس وقت تک یہاں نہ آنا اور نہ غلہ کی خرید کا دھیان کرنا، جب تک کہ اپنے سوتیلے بھائی بنیامین کو ساتھ نہ لاؤ، لہٰذا تم کو چاہیے کہ اس کو ہمارے ساتھ کر دو، ہم اس کے ہر طرح نگہبان اور محافظ ہیں۔

Marfat.com

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کیا تم پر اسی طرح اعتماد کروں جس طرح اس کے بھائی یوسف کے معاملہ میں کر چکا ہوں، اور تمہاری حفاظت ہی کیا؟ خدا ہی سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی رحم کرنے والا نہیں ہے۔

﴿قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝۶۴﴾ (یوسف: ٦٤)

"(یعقوب علیہ السلام نے) کہا کیا میں تم پر اس (بنیامین) کے بارہ میں ایسا ہی اعتماد کروں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی یوسف کے بارہ میں کر چکا ہوں سو اللہ ہی بہترین حفاظت کرنے والا ہے اور وہی سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔"

اس گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد اب انہوں نے اپنا سامان کھولنا شروع کیا، دیکھا تو ان کی پونجی ان ہی کو واپس کر دی گئی ہے، یہ دیکھ کر وہ کہنے لگے اے باپ! اس سے زیادہ اور کیا ہم کو چاہیے؟ دیکھیے غلہ بھی ملا اور ہماری پونجی بھی جوں کی توں لوٹا دی گئی اس نے تو ہم سے قیمت بھی نہ لی اب ہمیں اجازت دے کہ ہم دوبارہ اس کے پاس جائیں اور گھر والوں کے لیے رسد لائیں اور بنیامین کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دے ہم اس کی پوری حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ کا بوجھ اور زیادہ لائیں گے کیونکہ یہ غلہ جو پہلے ہم لائے تھے تھوڑا ہے۔

اور تورات [1] میں ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام پونجی کو دیکھ کر ڈر گئے تھے کہ نہ معلوم اب کیا نئی آفت آئے مگر واقعات کی ترتیب اور حضرت یوسف علیہ السلام کے طرز عمل کے پیش نظر جس کا ذکر قرآن اور تورات دونوں میں یکساں طور پر کیا گیا ہے یہی صحیح ہے جو قرآن عزیز نے بیان کیا ہے، برادران یوسف علیہ السلام خود اپنے ہاتھ سے غلہ کی قیمت ادا کر چکے تھے، لیکن اس کے بعد ہی قافلہ کو روانگی کی اجازت ملی تھی پھر ہر ایک بھائی کے کجاوہ میں سے علیحدہ علیحدہ اسی طرح قیمت کی واپسی، ہر عقلمند کے لیے یہی راہنمائی کرتی ہے کہ جس طرح والی مصر نے دوران قیام میں ہمارا اعزاز کیا اسی طرح یہ پونجی بھی اس نے واپس کر دی اور منت احسان سے بچانے کے لیے اس کا اظہار بھی مناسب نہ سمجھا۔

بہر حال یعقوب علیہ السلام نے فرمایا میں بنیامین کو ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک تم اللہ کے نام پر مجھ سے عہد نہ کرو اور وہ یہ کہ جب تک ہم خود نہ گھیر لیے جائیں اور ہر طرح مجبور نہ کر دیے جائیں ہم ضرور ضرور اس کو تیرے پاس صحیح و سلامت لوٹائیں گے، جب ان سب نے متفق ہو کر باپ کے سامنے اس کا پختہ عہد کیا اور ہر طرح اطمینان دلایا تب حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ کچھ ہوا محض اسباب ظاہری کی بنا پر ہے ورنہ کیا تم اور کیا تمہاری حفاظت، اور کیا ہم اور کیا ہمارا عہد، ہم سب کو اپنے اس معاملہ کو خدا کی نگہبانی میں دینا چاہیے۔

﴿قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۝۶۶﴾ (یوسف: ٦٦)

"یعقوب (علیہ السلام) نے کہا ہم نے جو قول و قرار کیا ہے اس پر اللہ نگہبان ہے۔"

---

[1] پیدائش باب ۴۳۔ آیت ۳۵

Marfat.com

عہد و پیمان کے بعد برادران یوسف علیہ السلام کا قافلہ دوبارہ کنعان سے مصر کو روانہ ہو رہا ہے اور اس مرتبہ بنیامین بھی ہمراہ ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے رخصت کرتے وقت نصیحت فرمائی کہ دیکھو سب ایک ہی دروازہ سے مصر میں داخل نہ ہونا بلکہ متفرق دروازوں سے شہر میں داخل ہونا اور یہ بھی فرمایا کہ اس نصیحت کا مقصد یہ نہیں کہ تم اپنی تدابیر پر مغرور ہو بیٹھو کیونکہ میں تمہیں کسی ایسی بات سے ہرگز نہیں بچا سکتا جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہونے والی ہو، فرماں روائی تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور تمام بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے، اس لیے میں نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف احتیاطی تدابیر کے طور پر ہے اور خدا پر بھروسہ اور یقین کے ساتھ اسباب ظاہری کو احتیاطی تدبیر کے لیے استعمال کرنا خدا پرستی کے خلاف نہیں ہے۔

علماء تفسیر عام طور پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی اس نصیحت کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ عزیز مصر (حضرت یوسف علیہ السلام) نے چونکہ پہلی مرتبہ ان کا کافی اعزاز کیا تھا اور یہ قافلہ خاص شان کے ساتھ یوسف علیہ السلام کی دعوت پر مصر میں داخل ہو رہا ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ مصری ان سے حسد کرنے لگیں اور یہ ان کی تکلیف کا باعث بن جائے۔

لیکن بعض مفسرین اور مؤرخین اس کی وجہ دوسری بتلاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ تورات سے اس قدر ثابت ہو چکا ہے کہ پہلی مرتبہ برادران یوسف علیہ السلام پر جاسوسی کا گمان کیا جا چکا تھا اور اگرچہ یوسف علیہ السلام نے یہ الزام نہ لگایا ہو لیکن مصریوں نے ضرور ان پر شبہ کیا تھا، اور حضرت یعقوب علیہ السلام بیٹوں کی زبانی پوری تفصیل سن چکے تھے لہٰذا انہوں نے سوچا کہ اگر گیارہ نوجوان اس کروفر سے ایک ساتھ شہر میں داخل ہوں گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ عزیز مصر کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر لیے جائیں، اس لیے نصیحت فرما دی کہ ایک جتھ بنا کر شہر میں داخل نہ ہونا جدا جدا دروازوں سے ایک مسافر کی طرح داخل ہونا۔

اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کی جانب بھی توجہ دلائی ہے کہ یعقوب علیہ السلام چونکہ صاحب علم و بصیرت تھے اور یہ دولت علم ہم نے ہی اس کو بخشی تھی اس لیے اس نے بیٹوں سے یہ نصیحت کی بات کہہ دی جو اس کے خیال میں آ گئی تھی ورنہ تو باپ کے حکم کی تعمیل کرنے کے باوجود خدائے تعالیٰ کی مشیت نے جو کچھ مقرر کر دیا تھا اس کے مقابلہ میں ان کی یہ احتیاط کچھ بھی کام نہ آ سکی۔

﴿وَ لَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَ اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۶۸﴾ (یوسف: ۶۸)

"پھر جب یہ مصر میں اسی طرح داخل ہوئے جس طرح ان کے باپ نے ان کو حکم کیا تھا تو یہ (احتیاط) ان کو اللہ تعالیٰ (کی مشیت) کے مقابلہ میں کچھ کام نہ آئی مگر یہ ایک خیال تھا یعقوب کے جی میں جو اس نے پورا کر لیا اور بلاشبہ وہ صاحب علم تھا اور ہم نے ہی اس کو یہ علم سکھایا تھا لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔"

مطلب یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے جو کچھ کیا اس کو بمقتضائے علم یہی کرنا چاہیے تھا کیونکہ علم کی یہ دولت ہم نے ہی اس کو بخشی تھی مگر یہ ضروری نہیں کہ احتیاطی تدابیر ہر جگہ راست ہی آ جائیں اگر خدائے تعالیٰ کی مشیت اس کے برعکس مصلحت دیکھتی ہے تو پھر وہی ہو کر رہتا ہے اور سب تدبیریں بیکار ہو جاتی ہیں جیسا کہ آنے والے واقعہ میں بنیامین کے ساتھ پیش آیا کہ وہ روک لیے گئے اور ایسی مصلحت کے زیر اثر روک لیے گئے کہ اس کا انجام تمام خاندان یعقوب علیہ السلام کے حق میں بہتر ثابت ہوا۔

Marfat.com

صورت یہ پیش آئی کہ جب برادران یوسف علیہ السلام کنعان سے روانہ ہوئے تو راستہ میں بنیامین کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ کبھی اس کو باپ کی محبت وعشق کا طعنہ دیتے اور کبھی اس بات پر حسد کرتے کہ عزیز مصر نے خصوصیت کے ساتھ اس کو کیوں بلایا ہے، بنیامین یہ سب کچھ سنتا اور خاموش رہتا، جب یہ سب منزل مقصود پر پہنچے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اپنا تمام حال سنایا اور بتایا کہ میں تیرا حقیقی بھائی یوسف ہوں اور پھر تسلی وتشفی کی کہ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں، ان کی بدسلوکیوں کا دور ختم ہو گیا، اب یہ تجھ کو کسی قسم کی ایذاء نہیں پہنچا سکیں گے۔

﴿وَ لَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّیْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىٕسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۶۹﴾

(یوسف: ۶۹)

"اور جب یہ سب یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی (بنیامین) کو اپنے پاس بٹھا لیا اور اس سے (آہستہ سے) کہا میں تیرا بھائی (یوسف) ہوں، بس جو بدسلوکی یہ تیرے ساتھ کرتے آئے ہیں، تو اس پر غمگین نہ ہو۔"

توراۃ میں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی بڑی مدارات کی اور نوکروں کو حکم دیا کہ ان کو شاہی مہمان خانہ میں اتاریں، اور ان کے لیے پرتکلف دعوت کا سامان کیا، چند روز کے قیام کے بعد جب یہ رخصت ہونے لگے تو یوسف علیہ السلام نے حکم دیا کہ ان کے اونٹوں کو اس قدر لاد دو جتنا کہ یہ لے جا سکیں، حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح اپنے عزیز بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک لیں مگر انتہائی اضطراب اور بے قراری کے باوجود اس کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا اس لیے کہ حکومت مصر کے قانون میں کسی غیر مصری کو بغیر کسی معقول وجہ کے روک لینا سخت ممنوع تھا، اور حضرت یوسف علیہ السلام یہ کسی طرح نہیں چاہتے تھے کہ اس وقت لوگوں پر یا ان کے بھائیوں پر اصل حقیقت منکشف ہو، بدیں وجہ خاموش رہے اور جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو کسی کو اطلاع کیے بغیر نشانی کے طور پر اپنا چاندی کا پیالہ بنیامین کے کجاوہ میں رکھ دیا۔

کنعان کے اس قافلہ نے ابھی تھوڑی ہی مسافت طے کی ہوگی کہ یوسف علیہ السلام کے کارندوں نے شاہی برتنوں کی دیکھ بھال کی تو اس میں پیالہ ندارد پایا سمجھے کہ شاہی محل میں کنعانیوں کے سوا دوسرا کوئی نہیں آیا اس لیے انہوں نے ہی یہ چوری کی ہے، فوراً دوڑے اور چلائے قافلہ والو ٹھہرو تم چور ہو، برادران یوسف علیہ السلام کارندوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے ہم کو خواہ مخواہ کیوں الزام دیتے ہو آخر معلوم تو ہو کہ تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے کارندے کہنے لگے کہ بادشاہ کا پیمانہ (پیالہ) گم ہو گیا ہے اور ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا کہ جو شخص اس چوری کا پتہ لگا دے گا اس کو ایک اونٹ غلہ انعام میں ملے گا اور میں اس بات کا ضامن ہوں، برادران یوسف علیہ السلام نے کہا: "خدا علیم ہے کہ ہم مصر میں فساد اور شرارت کی غرض سے نہیں آئے اور تم جانتے ہو کہ ہم اس سے پہلے بھی غلہ لینے آ چکے ہیں، ہم میں چوری کی قطعاً عادت نہیں ہے" کارندوں نے کہا اچھا جس کے پاس سے یہ چوری نکلے اس کی سزا کیا ہونی چاہیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ خود آپ اپنی سزا ہے یعنی وہ تمہارے حوالے کر دیا جائے گا تا کہ وہ اپنے جرم کی پاداش میں پکڑا جائے، اور ہم اپنے یہاں ایسی زیادتی کرنے والوں کو یہی سزا دیا کرتے ہیں۔

کارندوں نے یہ جواب سنا تو پہلے دوسرے بھائیوں کے بوروں کی تلاشی لی اور جب ان میں پیالہ نہ نکلا تو آخر میں بنیامین کے خورجی کی تلاشی لی تو اس میں پیالہ موجود تھا انہوں نے وہ پیالہ نکال لیا اور قافلہ کو واپس لوٹا کر عزیز مصر "یوسف علیہ السلام" کی خدمت

میں معاملہ کو پیش کیا، حضرت یوسف علیہ السلام نے معاملہ کی نوعیت کو سنا تو دل میں بے حد مسرور ہوئے اور خدائے تعالیٰ کی کارسازی پر شکر ادا کیا کہ جس بات کے لیے میں بیقرار تھا کہ کسی طرح بنیامین میرے پاس رک جائے اور وہ میرے ہاتھوں کسی طرح نہ بن پڑی اس وقت حق تعالیٰ نے اس حکمت کے ساتھ پورا کر دیا اور یہ سوچ کر قطعاً خاموش رہے اور یہ ظاہر نہیں فرمایا کہ یہ پیالہ میں نے خود بنیامین کی خورجی میں اپنی نشانی کے طور پر رکھ دیا تھا، ادھر بنیامین بھی جو کہ قبل ہی اپنے برادر بزرگ یوسف علیہ السلام سے واقف ہو چکا تھا اس واقعہ کو مرضی کے مطابق پا کر خاموش رہا۔

برادران یوسف علیہ السلام نے جب یہ دیکھا تو ان کی حاسدانہ رگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے یہ جھوٹ بولنے کی جرأت کی کہ اگر بنیامین نے یہ چوری کی ہے تو تعجب کا مقام نہیں ہے اس سے پہلے اس کا بڑا بھائی یوسف (علیہ السلام) بھی چوری کر چکا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ دیکھ کر بھی کہ میرے منہ پر ہی جھوٹ بول رہے ہیں ضبط سے کام لیا اور راز فاش نہ کیا اور دل میں کہنے لگے "تمہارے لیے سب سے بری جگہ ہے کہ تم ایسا جھوٹا الزام لگا رہے ہو اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت کا خوب جاننے والا ہے" یا خود ان ہی سے مخاطب ہو کر فرمایا جیسا کہ بعض مفسرین کی تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے، یعنی ان کو شرمندہ کرتے ہوئے کہا کہ ابھی تو یہ کہتے تھے کہ ہم چوری کے قریب تک نہیں ہیں اور یا اب غیر حاضر بھائی پر بھی چوری کا الزام لگا رہے ہو جس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا خاندان ہی چوری پیشہ ہے، یہ کیسا برا مقام ہے جو تم نے اختیار کیا ہے۔

برادران یوسف علیہ السلام نے جب یہ رنگ دیکھا تو بہت گھبرائے اور باپ کا عہد و پیمان یاد آ گیا آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ کس طرح بنیامین کو حاصل کریں؟ ہم تو پہلے ہی قول ہار چکے، صرف ایک ہی پہلو باقی تھا کہ التجائیں اور خوشامدانہ عرض معروض کر کے عزیز مصر کو بنیامین کی واپسی کی ترغیب دلائیں، کہنے لگے: "عزیز مصر! ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے اس کو اس کے پہلے بھائی کا بھی بے حد غم ہے اور اسی لیے اس کا عاشق و متوالا ہے، اس پر رحم کیجئے اور اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو سزا کے لیے روک لیجئے، آپ ہم پر مہربان رہے ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جو احسان کرنے والے ہیں" عزیز مصر یوسف علیہ السلام نے کہا: "پناہ بخدا یہ کیسے ممکن ہے ہم اگر ایسا کریں تو ظالم ہوں گے"۔

جب اس جانب سے مایوس ہو گئے تو اب الگ خلوت میں بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے، ان میں سے بڑے نے کہا: "بھائی تم کو معلوم ہے کہ والد نے بنیامین کے متعلق کس قدر سخت اور پختہ عہد و پیمان ہم سے لیا ہے اور اس سے پہلے تم یوسف علیہ السلام کے ساتھ جو ظلم و زیادتی کر چکے ہو وہ بھی سامنے ہے اس لیے میں تو اب اس جگہ سے اس وقت تک ٹلنے والا نہیں کہ یا والد مجھ کو کنعان آنے کی اجازت دیں اور یا خدا میرے لیے کوئی دوسرا فیصلہ کر دے، جاؤ تم سب ان کے پاس جاؤ اور عرض کرو کہ تمہارے بیٹے بنیامین نے چوری کی اور جو بات ہمارے جاننے میں آئی وہی سچ سچ آپ کے سامنے کہہ دی ہم کو کچھ غیب کا علم تو تھا نہیں کہ پہلے سے جان لیتے کہ اس سے ایسی حرکت سرزد ہونے والی ہے، اور یہ بھی کہنا کہ آپ مصر کے لوگوں سے اس کی تصدیق کر لیں نیز اس قافلہ سے بھی کہ جس کے ساتھ ہم مصر سے یہاں آئے ہیں کہ ہم اس معاملہ میں بالکل سچے ہیں۔

اس مشورہ کے مطابق وہ کنعان واپس آئے اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے بے کم و کاست سارا واقعہ کہہ سنایا، قرآن عزیز نے یوسف علیہ السلام کے سوتیلے بھائیوں کی اس گفتگو کو جو اس سلسلہ میں انہوں نے یعقوب علیہ السلام سے کی اس طرح نقل کیا ہے:-

Marfat.com

﴿ فَقُوْلُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ ﴾ (یوسف: ۸۱)

"پس (باپ کے پاس جاکر) کہنا اے باپ تیرے بیٹے نے چوری کر لی۔"

اور اس سے وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے ان سوتیلے بھائیوں کی شقاوت کا اندازہ کیجئے کہ ایسے سخت وقت میں بھی بوڑھے باپ کو طعن وتشنیع اور ملامت سے نہ چھوڑا اور یہ نہ کہا کہ ہمارے بھائی سے یہ غلطی ہوگئی بلکہ ان کی طرف نسبت کر کے یہ کہا کہ تیرے بیٹے ہاں چہیتے اور پیارے بیٹے نے چوری کر کے ہم سب کو ذلیل کیا ہم کو کیا معلوم تھا کہ اس کے ایسے گن ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں ان کی صداقت کا تجربہ کر چکے تھے اس لیے فرمایا: "نہیں تمہارے جی نے ایک بات بنالی ہے واقعہ یوں نہیں ہے "بنیامین اور چوری؟" یہ نہیں ہوسکتا۔ خیر اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں" ایسا صبر کہ بہتر سے بہتر ہو" خدائے تعالیٰ سے کیا بعید ہے کہ وہ ایک دن ہم ان گم گشتگان کو پھر جمع کر دے اور ایک ساتھ ان دونوں کو مجھ سے ملا دے بلاشبہ وہ دانا حکمت والا ہے، اور ان کی جانب سے رخ پھیر لیا اور فرمانے لگے: "آہ فراق یوسف کی غم انگیزی" حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں شدت غم میں روتے روتے سپید پڑ گئی تھیں اور سینہ غم کی سوزش سے جل رہا تھا، مگر صبر کے ساتھ اللہ پر تکیہ کیے بیٹھے تھے۔

بیٹے یہ حال دیکھ کر کہنے لگے: "بخدا تم ہمیشہ اسی طرح یوسف علیہ السلام کی یاد میں گھلتے رہو گے یا اسی غم میں جان دے دو گے" حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا: "میں کچھ تمہارا تو شکوہ نہیں کرتا اور نہ تم کو ستاتا ہوں۔"

﴿ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (یوسف: ۸۶)

"(بلکہ) میں تو اپنی حاجت اور اپنا غم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا ہوں میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

ہم نے شاہی پیالہ کے واقعہ کی تفسیر میں عام تفاسیر سے جدا، مفسرین کے اس قول کو اختیار کیا ہے جس کو متاخرین کے یہاں "قول شاذ کا درجہ" حاصل ہے، مگر اس مقام پر سب سے بہتر اور بے غل وغش تفسیر ہے، کتب تفاسیر میں عام طور پر آیت ﴿ جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ ﴾ (یوسف: ۷۰) "رکھ دیا یوسف نے پیالہ کو بھائی (بنیامین) کے کجاوہ میں) میں حضرت یوسف علیہ السلام کے اس عمل کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ وہ چونکہ بنیامین کو روکنا چاہتے تھے اور مصر کا قانون اس کی اجازت نہ دیتا تھا اس لیے انہوں نے یہی سمجھ کر یہ پیالہ رکھ دیا تھا کہ اس طرح بنیامین چور بن جائے گا اور میں اس کو روک سکوں گا اور پھر آیت ﴿ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ ﴾ میں پکارنے والی شخصیت بھی یوسف علیہ السلام ہی کو بتاتے ہیں، اور اس طرح جب ان پر جھوٹ کا الزام عائد ہونے لگتا ہے تو اس کو "توریہ" سے تعبیر کر کے ان کی معصوم شخصیت کو اس الزام سے بری کرتے ہیں، حالانکہ قرآن عزیز کے اسلوب بیان میں کوئی ایسا اشارہ تک موجود نہیں ہے جس سے حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت پر جھوٹ کا شبہ بھی ہوسکتا ہو یا توریہ کہنے کی ضرورت پیش آتی ہو۔

یہ مانا کہ کسی محمود اور نیک مقصود کی خاطر "توریہ" بری اور معیوب بات نہیں ہے، بلکہ اچھی بات ہے لیکن یہ کہنے والے اس کو بھول جاتے ہیں کہ معاملہ ہمارا تمہارا یا صالحین اور ابرار کا نہیں ہے بلکہ خدا کے پیغمبر اور رسول کا معاملہ ہے، ان کی اخلاقی زندگی کا معیار اس قسم کی اصطلاحی تعبیروں سے بہت بلند اور برتر ہے، وہ اپنی نیک خواہشات میں بھی عزیمت کی بلندی کو ہاتھ سے نہیں جانے

دیتے، پھر کیا ضرورت کہ ایسے موقعہ پر جہاں قرآن عزیز کا اسلوب بیان مجبور نہ کرتا ہو اور احادیث صحیحہ اس کی تائید نہ کرتی ہوں خواہ مخواہ ان کی جانب ایسی بات منسوب کی جائے جس کے درست کرنے اور پیغمبرانہ معصومیت کو محفوظ رکھنے کے لیے "توریہ" کی پناہ لینی پڑے۔

اس مقام پر قرآن عزیز میں حضرت یوسف علیہ السلام کا صرف یہ عمل مذکور ہے کہ انہوں نے شاہی پیمانہ (چاندی کے کٹورے) کو بنیامین کی خورجی میں رکھ دیا (تاکہ بھائی کے پاس ایک نشانی رہے)۔

﴿جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ﴾ (یوسف: ۷۰)

"اس (یوسف علیہ السلام) نے اپنے بھائی (بنیامین) کے کجاوہ میں کٹورہ رکھ دیا۔"

اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کا کوئی ذکر نہیں بلکہ تمام گفتگو کا معاملہ بھائیوں اور کارندوں کے درمیان دائر نظر آتا ہے۔

﴿ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ۝ قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِم مَّاذَا تَفْقِدُونَ ۝ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَن جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ۝ قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ عَلِمْتُم مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ ۝ قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِن كُنتُمْ كَاذِبِينَ ۝ قَالُوا جَزَاؤُهُ مَن وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ۝﴾ (یوسف: ۷۰۔۷۵)

"پھر پکارا پکارنے والے نے اے قافلہ والو! تم تو البتہ چور ہو، وہ کہنے لگے ان کی جانب منہ کر کے تمہاری کیا چیز گم ہوگئی، وہ (کارندے) بولے ہم نہیں پاتے بادشاہ (یوسف علیہ السلام) کا پیمانہ (کٹورا) اور جو کوئی اس کو لائے اس کو ملے ایک اونٹ کا بوجھ (غلہ) اور میں ہوں اس کا ضامن۔ وہ بولے خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ ہم شرارت کرنے کو نہیں آئے ملک (مصر) میں اور نہ ہم کبھی چور تھے، وہ کارندے بولے پھر کیا سزا ہے اس کی اگر تم نکلے جھوٹے۔ کہنے لگے اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں سے ہاتھ آئے وہی اس کے بدلے میں جائے ہم یہی سزا دیتے ہیں ظالموں کو۔"

اس تمام مرحلے کے بعد یہ معاملہ قانونی طور پر عزیز مصر (یوسف علیہ السلام) کے سامنے پیش ہوا اور ان کی تلاشی لی گئی تو بنیامین کے کجاوہ میں چاندی کا وہ پیمانہ موجود تھا۔

﴿فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِن وِعَاءِ أَخِيهِ﴾ (یوسف: ۷۶)

"پھر یوسف (علیہ السلام) نے ان کی خورجیاں دیکھنی شروع کیں اپنے بھائی کی خورجی سے پہلے، آخر میں وہ برتن نکالا اپنے بھائی کی خورجی سے۔"

اس تفصیل کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے احسان و انعام کا ذکر کرتا اور بتاتا ہے کہ یوسف علیہ السلام جس بات کے لیے بے قرار تھے اور مصری قانون کے تحت اس کو نہیں کر سکتے تھے ہم نے اپنی خفیہ تدبیر سے اس کا سامان بہم پہنچایا۔

Marfat.com

ذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ۭ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾ (یوسف: ۷۶)

"یوں خفیہ تدبیر کردی ہم نے یوسف کے لیے، وہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی بنیامین کو اس بادشاہ (مصر) کے طریقے کے مطابق مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی چاہے ہم درجے بلند کرتے ہیں جس کے چاہیں، اور ہر جاننے والے سے اوپر جاننے والا ہے۔"

پس اس قدر صاف اور واضح بات کی ایسی تشریح کس لیے کی جائے کہ جس میں یوسف علیہ السلام کے کلام کو توریہ پر محمول کرنے کی ضرورت پڑے اور کیوں نہ وہ معنی لیے جائیں کہ جس سے نہ کوئی شبہ پیدا ہو اور نہ اس کے لیے تاویلات کی ضرورت پیش آئے۔

بہرحال حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے فرمایا: "دیکھو ایک مرتبہ پھر مصر جاؤ اور یوسف علیہ السلام اور اس کے بھائی کی تلاش و جستجو کرو اور خدا کی رحمت سے نا اُمید و مایوس نہ ہو، اس لیے کہ خدا کی رحمت سے نا اُمیدی کافروں کا شیوہ ہے۔"

﴿يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾﴾ (یوسف: ۸۷)

"اے میرے بیٹو! (مصر) جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو، بلاشبہ اللہ کی رحمت سے کافروں کے سوا کوئی نا اُمید نہیں ہوتا۔"

حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کے ساتھ یوسف علیہ السلام کا بھی نام لیا حالانکہ بظاہر اس مقام پر ان کے سراغ کا کوئی جوڑ نہیں لگتا، معلوم ہوتا ہے کہ اب حضرت حق نے یعقوب علیہ السلام کے غم اور دکھ کی زندگی ختم کرنے کا ارادہ کر لیا اور یعقوب علیہ السلام کو یہ اشارہ کر دیا کہ بنیامین کے اس قصہ میں یوسف علیہ السلام کی ملاقات کا راز بھی محفوظ ہے اور تب ہی تو یوسف علیہ السلام کے پیغام بشارت آنے پر (جس کی تفصیل آنے والی ہے) انہوں نے یہ ارشاد فرمایا:

﴿اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾﴾ (یوسف: ۹۶)

"کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

غرض برادران یوسف علیہ السلام نے کچھ تو باپ کے اصرار پر اور کچھ اس لیے کہ واقعی قحط کی شدت انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی تھی اور غلہ کا آس پاس نام و نشان نہ تھا تیسری بار پھر مصر کا ارادہ کیا، اور جب دربار شاہی میں پہنچے تو کہنے لگے اے عزیز! ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو قحط نے سخت پریشانی میں ڈال دیا ہے اور اس مرتبہ ہم پونجی بھی بہت تھوڑی لائے ہیں، یہ حاضر ہے اب معاملہ خرید و فروخت اور لین دین کا نہیں ہے ہم سے قیمت ادا نہیں ہو سکتی، اس لیے تیری خدمت میں ہماری یہ درخواست ہے کہ ازراہ کرم ہم کو غلہ کی پوری تول دیجیے اور ہمیں ضرورت مند سمجھ کر اپنی جانب سے احسان فرمائیے اللہ تعالیٰ صدقہ و خیرات کرنے والے کو نیک بدلہ دیتا ہے۔"

حضرت یوسف علیہ السلام نے والدین اور بھائیوں کی اس پریشانی کا حال سنا اور ان کی اس عاجزانہ درخواست اور نیاز مندانہ

طلب کی مجبور کن حالت پر غور کیا تو دل بھر آیا اور اب ضبط نہ ہو سکا کہ خود کو چھپائیں اور راز ظاہر نہ ہونے دیں، آخر فرمانے لگے:

﴿هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۸۹)

"کیوں جی تم جانتے ہو کہ تم نے یوسف (علیہ السلام) اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا معاملہ کیا جبکہ تم جہالت میں سرشار تھے۔"

بھائیوں نے اس موقع پر غیر متوقع گفتگو سنی تو چونکے اور لب ولہجہ پر غور کر کے ایک دم ان کو کچھ خیال آیا اور کہنے لگے:

﴿قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ﴾ (یوسف: ۹۰)

"(انہوں نے کہا) کیا تو واقعی یوسف (علیہ السلام) ہی ہے۔"

یعنی اس حیرانی اور پریشانی میں تھے کہ ہم "عزیز مصر" کے دربار میں کھڑے ہیں، اس سے باتیں کر رہے ہیں یہ بے محل یوسف علیہ السلام کا ذکر کیسا؟ صورت شکل اور گفتگو کے طرز و انداز کو اب دوسری نیت سے دیکھا تو یوسف علیہ السلام کی شکل نگاہ کے سامنے پھر گئی اور سمجھ گئے کہ بیشک یہ یوسف ہے مگر حالت موجودہ کے پیش نظر قدرتی طور پر یہ جرأت نہیں کی کہ یہ کہہ اٹھیں کہ تو یوسف علیہ السلام ہے بلکہ ایسے موقعہ کے مناسب لب ولہجہ سے کہنے لگے کیا آپ واقعی یوسف علیہ السلام ہی ہیں؟ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ اَنَا يُوْسُفُ وَ هٰذَآ اَخِيْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ (یوسف: ۹۰)

"ہاں میں یوسف ہوں اور یہ (بنیامین) میرا ماں جایا بھائی ہے اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان کیا، اور جو شخص بھی برائیوں سے بچے اور (مصیبتوں میں) ثابت قدم رہے تو اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔"

اب برادرانِ یوسف علیہ السلام کے پاس ندامت، شرمساری، خفت اور اعتراف خطا و جرم کے سوا کیا تھا معاً یوسف علیہ السلام کی تباہی و بربادی کے لیے اپنی تمام بیہودگیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور جب ان پر یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ جس کو کل کنعان کے کنوئیں میں پھینک کر آئے تھے وہ آج "عزیز مصر" بلکہ مصر کے تاج و تخت کا مالک ہے، تو سر جھکا کر کہنے لگے:

﴿قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ۝﴾ (یوسف: ۹۱)

"(انہوں نے کہا) بخدا اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو ہم پر برتری و بلندی بخشی اور بلاشبہ ہم سراسر قصور وار تھے۔"

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے سوتیلے بھائیوں کی اس خستہ حالی اور پشیمانی کو دیکھا تو ان کی اخلاقی برتری اور پیغمبرانہ رحمت ورافت اس کو برداشت نہ کر سکی اور عفو و درگذر اور حلم و کرم کے ساتھ فوراً یہ ارشاد فرمایا:

"آج کے دن میری جانب سے تم پر کوئی سرزنش نہیں، اللہ تعالیٰ تمہارا قصور بخش دے اور وہ تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔"

یعنی جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اب ہم سب کو یہ تمام داستان فراموش کر دینی چاہیے میں درگاہِ الٰہی میں دُعا کرتا ہوں کہ وہ تمہاری اس غلطی کو معاف فرما دے کیونکہ وہی سب سے بڑھ کر رحیم و کریم ہے۔

اب تم کنعان واپس جاؤ اور میرا پیراہن لیتے جاؤ، یہ والد کی آنکھوں پر ڈال دینا۔ ان شاء اللہ شمیم یوسف ان کی آنکھوں کو روشن کر دے گی اور تمام خاندان کو مصر لے آؤ۔

برادران یوسف علیہ السلام کے لیے بھی اس سے بڑھ کر سعادت اور کیا ہوسکتی تھی؟ یوسف علیہ السلام کو چاہ کنعان میں ڈال کر یعقوب علیہ السلام کے پاس خون آلود پیراہن لے کر آئے تھے اور جھوٹ اور فریب کے ساتھ ان کے دل و جگر کو زخمی کیا تھا، آج بھی انہی کو پیراہن یوسف علیہ السلام لے جانا چاہیے تاکہ اس زخم کا مرہم بنے اور رنج و غم مسرت و شادمانی سے بدل جائے۔

یہاں یہ باتیں ختم ہو کر برادران یوسف علیہ السلام کا کارواں کنعان کو پیراہن یوسف علیہ السلام لے کر چلا تو ادھر خدا کے برگزیدہ پیغمبر یعقوب علیہ السلام کو وحی الٰہی نے شمیم یوسف سے مہکا دیا، فرمانے لگے اے خاندان یعقوب علیہ السلام! اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے میں اس کی عقل ماری گئی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھ کو یوسف علیہ السلام کی مہک آ رہی ہے، وہ سب کہنے لگے: "بخدا تم تو اپنے اسی پرانے خبط میں پڑے ہو" یعنی اس قدر عرصہ گذر جانے کے بعد بھی جبکہ یوسف علیہ السلام کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا تمہیں یوسف علیہ السلام ہی کی رٹ لگی ہوئی ہے۔

کنعان کا قافلہ بخیریت تمام پہنچ گیا اور برادرانِ یوسف علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ان کا پیراہن یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر ڈال دیا اور یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں فوراً روشن ہو گئیں، اور وہ فرمانے لگے: "دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ "اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔

﴿فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۹۶)

"پھر جب بشارت دینے والا آ پہنچا تو اس نے پیراہن یوسف کو یعقوب کے چہرہ پر ڈال دیا، پس اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں (بینائی لوٹ آئی) یعقوب نے کہا کیا میں تم سے نہ کہتا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

برادرانِ یوسف علیہ السلام کے لیے یہ وقت بہت کٹھن تھا، شرم و ندامت میں غرق سر جھکائے ہوئے بولے، اے باپ! آپ خدا کی جناب میں ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لیے دُعا فرمائیے، کیوں کہ اب یہ تو ظاہر ہی ہو چکا کہ بلاشبہ ہم سخت خطا کار اور قصور وار ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا:

﴿سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ (یوسف: ۹۸)

"عنقریب میں اپنے رب سے تمہارے لیے مغفرت کی دُعا کروں گا، بلاشبہ وہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔"

مفسرین کہتے ہیں کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے مصر میں اپنی خطا کا اعتراف کرتے ہوئے یوسف علیہ السلام سے بھی مغفرت کی دُعا کی استدعاء کی تھی اور کنعان میں اپنے والد یعقوب علیہ السلام سے بھی یہی درخواست کی، مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے تو اسی وقت ان کی بات منظور کر لی، اور ﴿يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ کہہ دیا، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ نہیں کیا بلکہ ﴿سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ﴾ کہہ کر صرف توقع ہی دلائی، اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ اور پھر حسب ذیل دو جواب دیتے ہیں۔

Marfat.com

① برادرانِ یوسف علیہ السلام کی ان تمام خطا کاریوں کا معاملہ براہ راست حضرت یوسف علیہ السلام سے تعلق رکھتا تھا اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے بالواسطہ اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے اخلاق کریمانہ کی راہ سے اسی وقت ان کا اطمینان کر دیا۔ مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ سمجھ کر کہ چونکہ اس معاملہ کا تعلق یوسف علیہ السلام سے ہے اس لیے اس کی مرضی بھی معلوم کر لینا ضروری ہے، اس طرح جواب دیا کہ توقع اور اُمید تک بات رہے اور ساتھ ہی اپنی طبیعت کا رجحان بھی ظاہر کر دیا کہ ان کی خواہش یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ان خطا کاریوں کو معاف کر دے۔

② حضرت یوسف علیہ السلام نوجوان تھے اس لیے ان کے کریمانہ وصف میں حزم و احتیاط کا پہلو نہ تھا انہوں نے فوراً معاف کر دیا، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام تجربہ کار، محتاط اور پھر باپ تھے اس لیے چاہتے تھے کہ بیٹوں کا امتحان کریں کہ ان کا یہ انفعال اور ندامت کا اظہار محض وقتی اور ہنگامی ہے اور صرف دفع الوقتی کے لیے یا اب ان کی طبیعت میں حقیقی ندامت و شرمساری کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے اور یہ واقعی اپنی خطا پر صداقت سے نادم ہیں، اس لیے ان کو بالکل مایوس بھی نہیں کیا اور رجحان طبیعت کا اظہار کرتے ہوئے صرف توقع اور اُمید تک ہی معاملہ کو چھوڑ دیا۔

خاندان یعقوب علیہ السلام مصر میں:

غرض حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے سب خاندان کو لے کر مصر روانہ ہو گئے، تورات میں اس واقعہ کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

اور یہی ذکر فرعون کے گھر میں سنا گیا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی آئے اور اس سے فرعون اور اس کے چاکر بہت خوش ہوئے اور فرعون نے یوسف علیہ السلام کو کہا کہ اپنے بھائیوں کو کہہ تم یہ کام کرو، اپنے جانور لادو اور جاؤ اور کنعان کی سرزمین میں جا پہنچو اور اپنے باپ اور اپنے گھرانے کو لو اور میرے پاس آؤ اور میں تم کو مصر کی سرزمین کی اچھی چیزیں دوں گا اور تم اس سرزمین کے تحائف کھاؤ گے اب تجھے حکم ملا تو ان کو کہہ تم یہ کرو کہ اپنے لڑکوں اور اپنی جوروؤں کے لیے مصر کی زمین سے گاڑیاں لے جاؤ اور اپنے باپ کو لے آؤ اور اپنے اسباب کا کچھ افسوس نہ کرو کیونکہ مصر کی ساری زمین کی خوشی تمہارے لیے ہے اور اسرائیل کے فرزندوں نے یہی کیا اور یعقوب علیہ السلام اپنی سب نسل سمیت مصر میں آئے، وہ اپنے بیٹوں اور اپنے بیٹوں کے بیٹوں کو جو اس کے ساتھ تھے اور اپنی بیٹیوں اور اپنے بیٹوں کی بیٹیوں کو اور اپنی سب نسل کو اپنے ساتھ مصر میں لائے، سو وہ سب جو یعقوب علیہ السلام کے گھرانے کے تھے اور مصر میں آئے ستر (۷۰) جانیں تھیں۔ ❶

جب حضرت یوسف علیہ السلام کو اطلاع ہوئی کہ ان کے والد خاندان سمیت شہر کے قریب پہنچ گئے تو وہ فوراً استقبال کے لیے باہر نکلے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب مدت دراز کے بچھڑے ہوئے لخت جگر کو دیکھا تو سینہ سے چمٹا لیا اور جب یہ مسرت افزا اور رقت آمیز ملاقات ہو چکی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے والد سے عرض کیا کہ اب آپ عزت و احترام اور امن و حفاظت کے ساتھ شہر میں تشریف لے چلیں۔

---

❶ پیدائش باب ۴۵ آیات ۱۶، ۲۰ و باب ۴۶ آیات ۷، ۲۷

Marfat.com

اس وقت مصر کا دارالسلطنت رعمسیس تھا اور وہ "جشن کا شہر" کہلاتا تھا، حضرت یوسف علیہ السلام والد ماجد اور تمام خاندان کو بڑے کروفر کے ساتھ شاہی سواریوں میں بٹھا کر شہر میں لائے اور شاہی محل میں اتارا۔

جب ان تمام باتوں سے فراغت پائی تو اب ارادہ کیا کہ دربار منعقد کریں تاکہ مصریوں کا بھی بزرگ باپ اور خاندان سے تعارف ہو جائے اور تمام درباری ان کے عزت و احترام سے آگاہ ہو جائیں، دربار منعقد ہوا، تمام درباری اپنی مقررہ نشستوں پر بیٹھ گئے، یوسف علیہ السلام کے حکم سے ان کے والدین [1] کو تخت شاہی پر ہی جگہ دی گئی اور باقی تمام خاندان نے حسب مراتب نیچے جگہ پائی، جب یہ سب انتظامات مکمل ہو گئے تب حضرت یوسف علیہ السلام شاہی محل سے نکل کر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوئے، اسی وقت تمام درباری "حکومت کے دستور کے مطابق" تخت کے سامنے تعظیم کے لیے سجدہ میں گر پڑے، موجودہ صورت کو دیکھ کر تمام خاندان یوسف علیہ السلام نے بھی یہی عمل کیا۔ [2] یہ دیکھ کر یوسف علیہ السلام کو فوراً اپنے بچپنے کا خواب یاد آ گیا، اور اپنے والد سے کہنے لگے:

﴿ وَ قَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ١٘ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا١ؕ وَ قَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ١ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ١ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ۝ ﴾ (یوسف: ۱۰۰)

"اور یوسف (علیہ السلام) نے کہا اے باپ! یہ ہے تعبیر اس خواب کی جو مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا، میرے پروردگار نے اسے سچا ثابت کر دیا، یہ اسی کا احسان ہے کہ مجھے قید سے رہائی دی تم سب کو صحرا سے نکال کر میرے پاس پہنچا دیا اور یہ سب کچھ اس کے بعد ہوا کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف ڈال دیا تھا، بلاشبہ میرا پروردگار ان باتوں کے لیے جو وہ کرنی چاہے بہتر تدبیر کرنے والا ہے کہ وہ سب کچھ جاننے والا اور (اپنے کاموں میں) حکمت والا ہے۔"

اور جبکہ یہ تمام واقعات ایک عجیب و غریب ترتیب سے وقوع میں آئے اور قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سنجیوں اور چارہ سازیوں کے بے نظیر مظاہرے پیش آتے رہے تو ان تمام آغاز و انجام کے اس حسن خاتمہ کو دیکھ کر یوسف (علیہ السلام) بے اختیار ہو گئے اور خدا کی جناب میں شکر و دعا کا اس طرح اظہار فرمانے لگے:

﴿ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ١ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ١۫ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ١ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ۝ ﴾ (یوسف: ۱۰۱)

"اے پروردگار! تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا، اے آسمان اور زمین کے

---

[1] حضرت یوسف علیہ السلام کی حقیقی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔

[2] تعظیم کا یہ طریقہ انبیاء سابقین میں شاید جائز رہا ہو، اگرچہ مجھے اس میں بھی شک ہے اور میرے نزدیک اس آیت کی دوسری تفسیر ہے جس کو میں نے اس جگہ قصداً ذکر نہیں کیا، تاہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی تعظیم کو اپنی امت کے لیے حرام قرار دیا ہے اور اس کو صرف ذات الٰہی کے لیے ہی مخصوص بتایا (ترمذی، ابوداؤد، باب النکاح)

Marfat.com

بنانے والے تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، تو یہ بھی کیجیو کہ دُنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں۔"

تورات میں ہے کہ اس واقعہ کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کا تمام خاندان مصر ہی میں آباد ہو گیا، کیونکہ فرعون نے حضرت یوسف علیہ السلام سے اصرار کے ساتھ یہ کہا کہ تم اپنے خاندان کو مصر ہی میں آباد کرو، میں ان کو بہت عمدہ زمین دوں گا اور ہر طرح ان کی عزت کروں گا۔

یہ دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد بزرگوار اور خاندان کے دوسرے افراد کو یہ سمجھا دیا کہ فرعون جب ان سے مصر میں رہنے کی درخواست کرتے ہوئے زمین اور مقام کے انتخاب کے لیے کہے تو تم فلاں حصہ زمین طلب کرنا اور کہنا کہ چونکہ ہم قبائلی زندگی کے عادی اور مویشی چرانے کا شوق رکھتے ہیں اس لیے ہم عام شہری زندگی سے علیحدگی پسند کرتے ہیں چنانچہ فرعون نے خاندان یوسف علیہ السلام کو وہ سرزمین بطور جاگیر بخش دی اور اس طرح بنی اسرائیل سرزمین مصر میں آباد ہو گئے۔

اور فرعون نے یوسف علیہ السلام کو کہا کہ اپنے بھائیوں کو کہہ تم یہ کام کرو، اپنے جانور لادو اور جاؤ اور کنعان کی سرزمین میں جا پہنچو اور اپنے باپ اور اپنے گھرانے کو لو اور میرے پاس آؤ اور میں تم کو مصر کی سرزمین کی اچھی چیزیں دوں گا اور تم اس زمین کے تحائف کھاؤ گے، اب تجھے حکم ملا کہ تو ان کو کہے کہ تم یہ کرو کہ اپنے لڑکوں اور اپنی جوروؤں کے لیے مصر کی زمین سے گاڑیاں لے جاؤ اور اپنے باپ کو لے آؤ اور اپنے اسباب کا کچھ فکر نہ کرو کیونکہ مصر کی ساری زمین کی خوشی تمہارے لیے ہے اور اسرائیل کے فرزندوں نے یہی کیا۔" [1]

اور یوں ہو گا کہ جب فرعون تم کو بلائے اور کہے کہ تمہارا پیشہ کیا ہے؟ تو تم کہیو کہ تیرے غلام جوانی سے لے کر اب تک چوپانی کرتے رہے ہیں، کیا ہم اور کیا ہمارے آباء، تاکہ تم جشن کی زمین میں رہو اس لیے کہ مصریوں کو ہر ایک چوپان سے نفرت ہے۔" [2]

حضرت یوسف علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ اس طرح مصریوں سے الگ رہنے سے بنی اسرائیل اپنی مذہبی زندگی پر قائم، مصری بت پرستی سے متنفر اور مصری بداخلاقی اور مبتذل شہری عادات وخصائل سے محفوظ رہیں گے، اور اپنی شجاعانہ بدویانہ زندگی کو کبھی نہ بھولیں گے۔

وفات:

بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی زندگی کے طویل حصہ عمر کو مصر ہی میں گزارا اور جب ان کی عمر ایک سو دس سال کو پہنچی تو ان کی وفات ہو گئی، حضرت یوسف علیہ السلام نے وفات سے پہلے اپنے خاندان والوں سے یہ عہد لیا کہ وہ مجھ کو مصر کی زمین میں نہ دفن کریں گے، بلکہ جب خدا کا یہ وعدہ پورا ہو کہ بنی اسرائیل دوبارہ فلسطین یعنی آباؤ اجداد کی سرزمین میں واپس ہوں تو میری ہڈیاں وہیں لے جا کر سپرد خاک کرنا، چنانچہ انہوں نے وعدہ کیا اور جب حضرت یوسف علیہ السلام کا انتقال ہو گیا تو ان کو حنوط (ممی) کر کے تابوت میں محفوظ رکھ دیا اور جب موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو اس تابوت کو بھی ساتھ لیتے گئے اور آباؤ اجداد کی سرزمین ہی میں لے جا کر سپرد خاک کر دیا۔ حموی کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کی قبر بلاطہ میں ہے جو فلسطین کے علاقہ نابلس کا ایک گاؤں ہے، یہ قبر ایک درخت کے نیچے ہے، اور تورات میں ہے:

---

[1] پیدائش باب ۴۶ آیات ۱۶-۱۹ [2] پیدائش باب ۴۶ آیات ۳۳-۳۴

"اور یوسف (علیہ السلام) اور اس کے باپ کے گھرانے نے مصر میں سکونت کی اور یوسفؑ ایک سو دس برس جیا اور یوسفؑ نے افرائیم کے لڑکے جو تیری پشت تھے دیکھے اور منسی کے بیٹے مکیر کے بیٹے بھی یوسف کے گھٹنوں پر پالے گئے اور یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا میں مرتا ہوں اور خدا یقیناً تم کو اس سرزمین میں جس کی بابت اس نے ابراہام اور اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) سے قسم کی ہے لے جائے گا اور یوسف علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے قسم لے کے کہا خدا یقیناً تم کو یاد کرے گا، اور تم میری ہڈیوں کو یہاں سے لیجائیو سو یوسف علیہ السلام ایک سو دس (۱۱۰) برس کا بوڑھا ہو کے مرگیا اور انہوں نے اس میں خوشبو بھری اور اسے مصر میں صندوق میں رکھا..... ❶

"اور موسیٰ علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کی ہڈیاں ساتھ لیں کیونکہ اس نے بنی اسرائیل کو تاکیداً قسم دے کر کہا تھا کہ خدا یقیناً تمہاری خبر گیری کرے گا تم یہاں سے میری ہڈیاں اپنے ساتھ لے جائیو۔" ❷

اہم اخلاقی مسائل:

حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ عجیب وغریب قصہ ارباب بصیرت کے لیے اپنی آغوش میں نہایت اہم اخلاقی مسائل رکھتا ہے، دراصل یہ قصہ ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ فضائل اخلاق کی ایسی زریں داستان ہے جس کا ہر پہلو موعظت وبصیرت کے جواہر سے لبریز ہے۔

قوت ایمانی، استقامت، ضبط نفس، صبر، شکر، صفت، دیانت وامانت، عفو ودرگذر، جذبہ تبلیغ واعلاء کلمۃ اللہ کا عشق اور اصلاح وتقویٰ جیسے اخلاق فاضلہ اور صفات کاملہ کا ایک نادر سلسلۃ الذہب ہے جو اس قصہ کے ہر نقش میں منقش نظر آتا ہے مگر ان میں سے یہ چند امور خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

① اگر کسی شخص کی ذاتی سرشت عمدہ ہو اور اس کا ماحول بھی پاک، مقدس اور لطیف ہو تو اس شخص کی زندگی اخلاق کریمانہ میں نمایاں اور صفات عالیہ میں ممتاز ہوگی اور وہ ہر قسم کے شرف ومجد کا حامل ہوگا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی مقدس زندگی اس کی بہترین مثال ہے، وہ یعقوب، اسحاق اور ابراہیم علیہم السلام جیسے جلیل القدر نبیوں اور پیغمبروں کی اولاد تھے اس لیے نبوت ورسالت کے گہوارہ میں نشوونما پائی اور خانوادۂ نبوت کے ماحول میں تربیت حاصل کی، ذاتی نیک نہادی اور فطری پاکی نے جب ایسے لطیف ماحول کو دیکھا تو تمام فضائل واوصاف حمیدہ چمک اٹھے اور بچپن جوانی اور کہولت کی زندگی کے تمام گوشے تقویٰ، عفت، صبر واستقامت، دیانت اور عشق الٰہی کے ایسے روشن مظہر بن گئے کہ عقل انسانی اس مجموعہ کمالات ہستی کو دیکھ کر محوحیرت ہو جاتی ہے۔

② اگر کسی شخص میں ایمان باللہ مستقیم ومستحکم ہو اور اس پر اس کا یقین راسخ اور مضبوط ہو تو پھر اس راہ کی تمام صعوبتیں اور مشکلات اس پر آسان بلکہ آسان تر ہو جاتی ہیں اور رؤیت حق کے بعد تمام خطرات اور مصائب ہیچ ہو کر رہ جاتے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام کی تمام زندگی میں یہ بات نمایاں نظر آتی ہے۔

③ ابتلاء وآزمائش، مصیبت وہلاکت کی شکل میں ہو یا دولت وثروت اور خواہشات نفسانی کے خوبصورت اسباب کی صورت میں،

---

❶ پیدائش باب ۵۰ آیات ۲۲۔۲۶ ❷ خروج باب ۱۳ آیت ۱۹۔

Marfat.com

ہر حالت میں انسان کو خدائے تعالیٰ کی جانب ہی رجوع کرنا چاہیے اور اسی سے التجا کرنی چاہیے کہ وہ امر حق پر ثابت قدم رکھے اور استقامت بخشے۔

عزیز کی بیوی اور حسین مصری عورتوں کی ترغیبات اور ان کی مرضیات پوری نہ کرنے پر قید کی دھمکیاں اور پھر قید و بند کے مصائب، ان تمام حالات میں حضرت یوسف علیہ السلام کا اعتماد اور ان کی دعاؤں اور التجاؤں کا مرکز صرف ایک ہی ہستی سے وابستہ نظر آتا ہے، وہ نہ عزیز مصر کے سامنے عرض رساں نظر آتے ہیں نہ فرعون کے سامنے ملتجی، وہ نہ ان خوبرویان مصر اور عشوہ طراز ان حسن و جمال سے جی لگاتے ہیں اور نہ اپنے مربی کی خوبرو بیوی سے، بلکہ ہر موقعہ پر خدائے تعالیٰ ہی سے مدد کے طالب نظر آتے ہیں۔

﴿رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ﴾ (یوسف: ۳۳)

﴿مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ﴾ (یوسف: ۲۳)

④ جب خدائے تعالیٰ کی محبت اور اس کا عشق، قلب کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے تو پھر انسان کی زندگی کا تمام تر مقصد وہی بن جاتا ہے اور اس کے دین کی دعوت و تبلیغ کا عشق ہر وقت رگ و پے میں دوڑتا رہتا ہے، چنانچہ قید خانہ کی سخت مصیبت کے وقت اپنے رفیقوں سے سب سے پہلا کلام یوسف علیہ السلام کا یہی تھا:

﴿یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝﴾ (یوسف: ۳۹)

⑤ دیانت و امانت ایک ایسی نعمت ہے کہ اس کو انسان کی دینی و دنیوی سعادتوں کی کلید کہنا چاہیے، عزیز مصر کے یہاں یوسف علیہ السلام جس طرح داخل ہوئے تھے واقعہ کی تفصیلات سے معلوم ہو چکا ہے، یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی دیانت و امانت ہی کا نتیجہ تھا کہ پہلے وہ عزیز مصر کی نظروں میں بلند و باوقار اور محبوب بنے پھر مصر کی حکومت کے مالک ہو گئے۔

⑥ خود اعتمادی انسان کے بلند اوصاف میں سے ایک بڑا وصف ہے، خدائے تعالیٰ نے جس شخص کو یہ دولت بخش دی ہے وہی دنیا کے مصائب و آلام سے گذر کر دنیوی و دینی رفعت و بلندی حاصل کر سکتا ہے۔

خود اعتمادی کی مختلف اقسام میں سے ایک قسم "عزت نفس" بھی ہے، جو شخص خودداری اور عزت نفس سے محروم ہے، وہ انسان نہیں، ایک مضغہ گوشت ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کی عزت نفس کے تحفظ کا یہ عالم ہے کہ برسوں کے بعد جب قید خانہ سے رہائی کا حکم ملتا، اور بادشاہ وقت کا پیغام سربلندی حاصل ہوتا ہے تو مسرت و شادمانی کے ساتھ فوراً اس کو لبیک نہیں کہتے بلکہ صاف انکار کر دیتے ہیں کہ میں اس وقت تک قید خانہ سے باہر نہیں آؤں گا تاوقتیکہ یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ مصری عورتوں نے مکر و فریب سے جس قسم کا معاملہ میرے ساتھ کیا تھا اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟

﴿فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ﴾ (یوسف: ۵۰)

⑦ صبر ایک عظیم الشان "خلق" ہے اور بہت سی برائیوں کے لیے سپر اور ڈھال کا کام دیتا ہے، قرآن حکیم میں ستر سے زیادہ مقامات پر اس کی فضیلت کا اعلان کیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے بہت سے مراتب علیا اور درجات رفیعہ کا مدار اسی فضیلت پر رکھا ہے۔

Marfat.com

﴿ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ﴾(السجدہ: ۲۴)

"اور ہم نے ان میں سے مقتدا بنائے جو ہمارے احکام کے ہادی بنے جبکہ وہ فضیلت صبر سے مزین ثابت ہوئے۔"

﴿ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا ﴾(الاعراف: ۱۳۷)

"اور پورا ہوا تیرے رب کا نیک کلمہ بنی اسرائیل پر اس وجہ سے کہ وہ صابر رہے۔"

﴿ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾

(البقرہ: ۱۵۵۔۱۵۶)

"اور بشارت دے دو ان صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو کہہ اٹھتے ہیں "بیشک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور بیشک ہم اسی جانب لوٹ جانے والے ہیں۔"

﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ﴾(الاحقاف: ۳۵)

"(اے محمد ﷺ) تم اسی طرح صبر کرو جس طرح بلند عزیمت والے پیغمبروں نے کیا۔"

﴿ وَ اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ﴾(البقرہ: ۴۵)

"اور (اللہ) سے مدد چاہو صبر اور نماز کے ذریعہ۔"

((وَقَالَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اَلصَّبْرُ نُصفُ الایمانِ)). (بیہقی فی شعب الایمان)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "صبر نصف ایمان ہے۔"

((وَسُئِلَ عنِ الایمانِ فقالَ الصبرُ وَالسَّماحةُ)). (بیہقی)

نبی کریم ﷺ سے ایک مرتبہ ایمان کی تعریف پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا: "صبر اور دریا دلی۔"

حقیقت میں "صبر" ایک ایسی صفت کا نام ہے جس کے ذریعہ انسان برائیوں سے باز رہ سکے اور نفس ان کی طرف اقدام سے رک جائے، اس لیے یہ صرف انسان ہی کا خاصہ ہے اور تمام حیوانات سے اس کو امتیاز بخشتا ہے۔

صبر کی مختلف اقسام ہیں یا یوں کہیے کہ ان اشیاء کی نسبت کے لحاظ سے جن کی جانب "صبر" کو منسوب کیا جاتا ہے وہ مختلف ناموں سے موسوم ہے۔

پس اگر پیٹ اور شرمگاہ کی خواہشات کے مقابلہ میں صبر ہے تو اس کا نام "عفت" ہے اور اگر مصائب پر صبر ہے تو اس کو "صبر" ہی کہتے ہیں اور اس کی ضد کا نام "جزع وفزع" ہے اور اگر ثروت و دولت کی بہتات کی حالت میں صبر ہے تو اس کا نام "ضبط نفس" ہے اور اس کی ضد کو "بطر" (چھچھورپن) کہتے ہیں، اور اگر میدان جنگ اور اسی قسم کے مہلک حالات پر صبر ہے تو وہ "شجاعت" کہلاتا ہے اور اس کی ضد کا نام "جبن" (بزدلی) ہے، اور اگر غیظ وغضب کے حالات پر صبر ہے تو اس کو "حلم" کہتے ہیں اور اس کی ضد کو "تذمر" (بے قابو ہونا) کہا جاتا ہے، اور اگر حوادثات زمانہ پر صبر ہے تو اس کا نام "وسعتِ صدر" (کشادہ دلی اور حوصلہ مندی) ہے اس کی

Marfat.com

مخالف صفت کو "ضجر" (تنگ دلی اور بے صبری) کہتے ہیں، اور اگر دوسروں کے پوشیدہ رازوں پر صبر ہے تو اس کا نام "کتمان سر" (پردہ پوشی) ہے اور بقدر کفاف معیشت پر صبر ہے تو اس کو "قناعت" کہتے ہیں اور اگر ہر قسم کی عیش پسندی کے مقابلہ میں صبر ہے تو اس کا نام "زہد" ہے۔

صبر کی ان تمام اقسام کا بیان جامع ایجاز و اعجاز کے ساتھ قرآن عزیز کی اس آیت میں کیا گیا ہے:

﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾

"اور ہر قسم کی مصیبتوں اور مضرتوں اور میدان جنگ کی ہولناکیوں میں صبر کرنے والے یہی دراصل صادق ہیں اور یہی متقی و پرہیزگار ہیں۔" (البقرہ: ۱۷۷)

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو صبر و رضا کے ان تمام مراحل میں وہ کمال عطا فرمایا تھا جس کو "مثل اعلیٰ" کہا جاتا ہے، مثلاً:

① برادران یوسف علیہ السلام کی ایذا رسانیوں پر صبر۔
② آزاد ہونے کے باوجود غلام بن جانے اور ایسے ملک اور ایسی قوم کے ہاتھوں میں فروخت ہو جانے پر صبر جو معاشرت و معیشت میں بھی مخالف اور دین و ایمان میں بھی دشمن تھی۔
③ عزیز مصر کی بیوی اور مصری عورتوں کی پرفریب ترغیبات پر صبر۔
④ قید خانہ کے مصائب پر صبر۔
⑤ عزیز مصر کی تمام دولت و ثروت کے وکیل بن جانے پر صبر یعنی خدا کی شکر گذاری کا اظہار اور شیخی سے پرہیز۔
⑥ مملکت مصر کے حاکم مطلق ہونے پر صبر یعنی ظلم، کبر، شیخی سے پرہیز۔
⑦ ہر دو حالتوں میں قناعت و زہد کی زندگی کو ترجیح۔
⑧ ایذا رسا بھائیوں کی ندامت کے وقت اختیار صبر یعنی وسعت قلب کا ثبوت ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ﴾۔
⑨ اخلاق حسنہ میں "شکر" بھی بہترین خلق ہے اس لیے کہ یہ اخلاق الٰہیہ میں سے بہت بلند خلق ہے، قرآن عزیز میں ہے ﴿وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾ انسانی اوصاف میں "شکر" ایسی صفت کا نام ہے جس کے ذریعہ منعم حقیقی کی نعمت کا اعتراف کیا جائے، اور اس پر مسرت و شادمانی کا اظہار ہو اور اس کو محسن و منعم کے مرغوب اور پسندیدہ طریقہ پر استعمال کیا جائے، قرآن عزیز میں ہے۔

﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ﴾ (البقرہ: ۱۵۲)

"پس تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا اور تم میرا شکر کرو اور ناشکری نہ کرو۔"

﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ﴾ (النساء: ۱۴۷)

"اللہ تم پر عذاب نہ لائے گا، اگر تم اس کے شکر گذار اور اس پر ایمان والے رہے۔"

﴿لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ (ابراھیم: ۷)

Marfat.com

"اگر تم شکر گذار ہو تو ہم (تمہاری) نعمتوں میں اضافہ کرتے رہیں گے۔"
مگر افسوس یہ ہے کہ انسانی دنیا میں حقیقی شکر گذار اور سپاس گذار بہت ہی کم ہیں۔

﴿وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝﴾(سبا: ۱۳)

"اور میرے بندوں میں حقیقی شکر گذار بہت کم ہیں۔"

لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ صفت بھی بدرجہ کمال عطا فرمائی تھی ان کی زندگی کے حالات پڑھو اور اندازہ کرو کہ کس طرح جگہ جگہ شکر اور سپاس گذاری کا مظاہرہ نمایاں نظر آتا ہے خصوصاً ختم قصہ پر ان کی جو دُعا مذکور ہے وہ ان کے اس وصف کو اور زیادہ نمایاں کرتی ہے۔

﴿رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۟ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝﴾(یوسف: ۱۰۱)

"اے پروردگار! بلاشبہ تو نے مجھ کو حکومت بخشی اور باتوں کے فیصلہ کی سمجھ بوجھ عطا فرمائی اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا مددگار ہے تو مجھ کو اپنی اطاعت پر موت دینا اور صالحین کے زمرہ میں شامل کر لینا۔"

⑩ حسد اور بغض کا انجام حاسد اور بغض کرنے والے کے حق میں ہی مضر ہوتا ہے اور اگر چہ کبھی محسود و مبغوض کو بھی دنیوی نقصان پہنچ جانا ممکن ہے لیکن حاسد کسی حال میں بھی فلاح نہیں پاتا، اور خسر الدنيا والاخرة کا مصداق ہی رہتا ہے، الا یہ کہ تائب ہو جائے اور حاسدانہ زندگی کو ترک کر دے۔

برادران یوسف علیہ السلام کے واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور ان کا انجام بھی مگر چشم بصیرت شرط ہے۔

⑪ صداقت، دیانت، امانت، صبر اور شکر جیسے صفات عالیہ سے متصف زندگی ہی حقیقی اور کامیاب زندگی ہے، اور اگر انسان میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے تو پھر وہ انسان نہیں بلکہ حیوان ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر۔

﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ﴾(الاعراف: ۱۷۹)

"(یہ متمرد و سرکش انسان) چوپاؤں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گذرے۔"

⑫ حضرت یوسف علیہ السلام کے اخلاق کریمانہ اور صفات عالیہ کی مدحت و منقبت میں سب سے اہم وہ جملہ ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں فرمایا: "الكريم بن الكريم بن الكريم بن الكريم" یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم، یعنی وہ سلسلہ نسب جو چار پشتوں سے کرامت نبوت سے مستفیض ہے، یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم کا سلسلہ ہے، اور ایک روایت میں ہے:

((اكرم الناس يوسف نبي الله بن نبي الله بن نبي الله بن خليل الله)). (بخاری کتاب التفسیر)

Marfat.com

حضرت شعیب علیہ السلام

○ حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں ○ قوم شعیب علیہ السلام ○ مدین واصحاب ایکہ
○ زمانہ بعثت ○ دعوت حق ○ قوم کی سرکشی ○ سرکشی کا انجام ○ بصائر وعبر

حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر قرآن میں:

قرآن حکیم میں حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا تذکرہ اعراف، ہود اور شعراء میں قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے اور حجر اور عنکبوت میں مختصر ہے، ان سورتوں میں حجر کے علاوہ حضرت شعیب علیہ السلام کا نام دس جگہ مذکور ہے، ذیل کا نقشہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔

نام سورۃ	آیات	شمار
اعراف	۸۵۔۸۸۔۹۰۔۹۲	۴
ہود	۸۴۔۸۷۔۹۰۔۹۱۔۹۵	۵
شعراء	۱۷۷	۱
عنکبوت	۳۶	۱
	میزان	۱۱

قوم شعیب علیہ السلام:

حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت مدین یا مدیان میں ہوئی تھی، مدین کسی مقام کا نام نہیں ہے بلکہ "قبیلہ" [1] کا نام ہے، یہ قبیلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے مدین کی نسل سے تھا جو ان کی تیسری بیوی قطورا سے پیدا ہوا، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خاندان بنی قطورا کہلاتا ہے۔

"مدین" اپنے اہل وعیال کے ساتھ اپنے سوتیلے بھائی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پہلو ہی میں حجاز میں آباد ہو گیا تھا، یہی خاندان آگے چل کر ایک بڑا قبیلہ بن گیا اور شعیب علیہ السلام بھی چونکہ اسی نسل اور اسی قبیلہ سے تھے اس لیے ان کو بعثت کے بعد یہ "قوم شعیب" کہلایا ہے۔

[1] اسی قبیلہ کے نام پر بستی کا نام مدین مشہور ہوا۔

Marfat.com

مدین یا اصحاب ایکہ:

یہ قبیلہ کس مقام پر آباد تھا؟ اس کے متعلق عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ یہ حجاز میں شام کے متصل ایسی جگہ آباد تھا کہ جس کا عرض البلد افریقہ کے جنوبی صحرا کے عرض البلد کے مطابق پڑتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ شام کے متصل معان کے حصہ زمین پر آباد تھا۔ قرآن عزیز نے اس قبیلہ کی آبادی کے متعلق ہم کو دو باتوں سے تعارف کرایا ہے۔ ایک یہ کہ وہ "امام مبین" پر آباد تھا۔

﴿وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ (الحجر: ۷۹)

"اور لوط (علیہ السلام) کی قوم اور مدین دونوں بڑی شاہراہ پر آباد تھے۔"

عرب کے جغرافیہ میں جو شاہراہ حجاز کے تاجر قافلوں کو شام، فلسطین، یمن بلکہ مصر تک لے جاتی اور بحر قلزم کے مشرقی کنارے سے ہو کر گذرتی تھی قرآن اسی کو "امام مبین" (کھلی اور صاف شاہراہ) کہتا ہے، کیونکہ صیف (گرمی) اور شتاء (سردی) دونوں زمانوں میں قریشی قافلوں کے لیے یہ متعارف اور بڑی تجارتی سڑک تھی جس کا سلسلہ بری مسافت کے ساتھ بحری کو بھی ڈانڈے ملا دیتا تھا۔

دوسرے یہ کہ "وہ اصحاب ایکہ" (جھنڈ والے) تھے، عربی میں "ایکہ" ان سرسبز و شاداب جھاڑیوں کو کہتے ہیں جو ہرے بھرے درختوں کی کثرت کی وجہ سے جنگلوں اور بنوں میں اُگی رہتی ہیں، اور جھاندے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

ان دونوں باتوں کے جان لینے کے بعد مدین کی آبادی کا پتہ آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے وہ یہ کہ مدین کا قبیلہ بحر قلزم کے مشرقی کنارہ اور عرب کے مغرب شمال میں ایسی جگہ آباد تھا جو شام کے متصل حجاز کا آخری حصہ کہا جا سکتا ہے اور حجاز والوں کو شام، فلسطین بلکہ مصر تک جانے میں اس کے کھنڈر راہ میں پڑتے تھے اور جو تبوک کے بالمقابل واقع تھا۔ [1]

مفسرین اس بارہ میں مختلف ہیں کہ مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قبیلہ کے دو نام ہیں یا دو جدا جدا قبیلے ہیں، بعض کا خیال ہے کہ دونوں جدا جدا قبیلے ہیں، مدین متمدن اور شہری قبیلہ تھا اور "اصحاب ایکہ" دیہاتی اور بدوی قبیلہ جو جنگل اور بن میں آباد تھا، اس لیے اس کو "بن والا" یا "جنگل والا" کہا گیا، اور آیت ﴿وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ﴾ میں ﴿هُمَا﴾ ضمیر تثنیہ سے یہی دونوں مراد ہیں نہ کہ مدین اور قوم لوط۔

اور دوسرے مفسرین دونوں کو ایک ہی قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آب و ہوا کی لطافت نہروں اور آبشاروں کی کثرت نے اس مقام کو اس قدر شاداب و پُر فضا بنا دیا تھا اور یہاں میووں، پھلوں اور خوشبودار پھولوں کے اس قدر باغات اور چمن تھے کہ اگر شخص آبادی سے باہر کھڑے ہو کر نظارہ کرتا تھا تو اس کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ نہایت خوبصورت اور شاداب گھنے درختوں کا ایک جھنڈ ہے اسی وجہ سے قرآن عزیز نے اس کو "ایکہ" کہہ کر تعارف کرایا ہے۔

ان مفسرین میں سے حافظ عماد الدین ابن کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہاں "ایکہ" نام ایک درخت تھا، اہل قبیلہ چونکہ اس کی پرستش کرتے تھے لہٰذا اس کی نسبت سے "مدین" کو "اصحاب ایکہ" کہا گیا، نیز چونکہ یہ نسبت نسبی نہ تھی بلکہ مذہبی تھی اس لیے جن آیات

[1] معجم البلدان ج ۵ ص ۴۱۸

Marfat.com

میں ان کو اس لقب سے یاد کیا گیا ہے ان میں حضرت شعیب علیہ السلام کو ﴿ اَخُوْهُمْ ﴾ ان کا بھائی، یا اسی قسم کے نسبی علاقہ سے یاد نہیں کیا، البتہ جن آیات میں، قوم شعیب علیہ السلام کو مدین کہہ کر یاد کیا ہے، ان میں حضرت شعیب علیہ السلام کو بھی ان کے نسبی رشتہ میں منسلک ظاہر کیا ہے۔

بہر حال راجح یہی ہے کہ مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قبیلہ ہے جو باپ کی نسبت سے مدین کہلایا اور زمین کی طبعی اور جغرافی حیثیت سے "اصحاب ایکہ" کے لقب سے مشہور ہوا۔

زمانہ بعثت اور ایک غلطی کا ازالہ:

عبدالوہاب نجار اپنی کتاب "قصص الانبیاء" میں تحریر فرماتے ہیں کہ ابوالعباس احمد قلقشندی نے "صبح الاعشیٰ" جلد ۴ ص ۱۶ میں یہ تحریر کیا ہے:

ثم ملك بعده. يعني يوثام، ابنه احاز ست عشرة سنة ايضا و كانت الحرب بينه و بين ملك دمشق و فى زمنه كان شعيب عليه السلام.

"پھر یوثام کے بعد آحاز نے بھی سولہ سال تک حکومت کی اور اس کے اور دمشق کے بادشاہ کے درمیان جنگ رہی اور اسی زمانہ میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔"

قلقشندی کی عبارت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صدیوں بعد پیدا ہوئے، یعنی سات سو برس بعد آٹھویں صدی کے اوائل میں، کیونکہ آحاز کی حکومت کا یہی زمانہ تھا، حالانکہ بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے، اس لیے کہ حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام کا زمانہ پایا ہے یا نہیں یہ بات البتہ اختلافی ہے۔

اسی بنا پر قرآن عزیز نے سورۂ اعراف میں حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب (علیہم السلام) کے ذکر کے بعد فرمایا ﴿ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى ﴾ اور اسی طرح سورۂ یونس، سورۂ حج، سورۂ ہود اور سورۂ عنکبوت میں بیان کیا گیا۔

تو قلقشندی سے اس جگہ لغزش ہوگئی ہے کہ اس نے شعیاء علیہ السلام کی جگہ شعیب علیہ السلام تحریر کر دیا، بلاشبہ آحاز کی حکومت کا زمانہ شعیاء نبی کا زمانہ ہے۔ [1]

دعوت حق:

بہر حال شعیب علیہ السلام جب اپنی قوم میں مبعوث ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ خدا کی نافرمانی اور معصیت کا ارتکاب صرف افراد و آحاد میں ہی نہیں پایا جاتا بلکہ ساری قوم گرداب ہلاکت میں مبتلا ہے اور اپنی بداعمالیوں میں اس قدر سرمست و سرشار ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی ان کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے معصیت اور گناہ ہے بلکہ وہ اپنے ان اعمال کو باعث فخر سمجھتے ہیں۔

[1] قصص الانبیاء للنجار ص ۱۸۵

Marfat.com

ان کی بہت سی بداخلاقیوں اور نافرمانیوں سے قطع نظر جن قبیح امور نے خصوصیت کے ساتھ ان میں رواج پالیا تھا، وہ یہ تھے:

① بت پرستی اور مشرکانہ رسوم وعوائد ② خرید وفروخت میں پورا لینا اور کم تولنا یعنی دوسرے کو اس کے حق سے کم دینا اور اپنے لیے حق کے مطابق لینا بلکہ اس سے زیادہ ③ تمام معاملات میں کھوٹ اور ڈاکہ زنی۔

قوموں کے عام رواج کے مطابق دراصل ان کی رفاہیت، خوش عیشی، دولت وثروت کی فراوانی، زمین اور باغوں کی زرخیزی اور شادابی نے ان کو اس قدر مغرور بنا دیا تھا کہ وہ ان تمام امور کو اپنی ذاتی میراث اور اپنا خاندانی ہنر سمجھ بیٹھے تھے، اور ایک ساعت کے لیے بھی ان کے دل میں یہ خطرہ نہیں گذرتا تھا کہ یہ سب کچھ خدائے تعالیٰ کی عطا وبخشش ہے کہ شکرگذار ہوتے اور سرکشی سے باز رہتے، غرض ان کی فارغ البالی نے ان میں طرح طرح کی بداخلاقیاں اور قسم قسم کے عیوب پیدا کر دیئے تھے۔

آخر غیرت حق حرکت میں آئی اور سنت اللہ کے مطابق ان کو راہ حق دکھانے، فسق وفجور سے بچانے اور امین ومتقی اور بااخلاق بنانے کے لیے ان ہی میں سے ایک ہستی کو چن لیا اور شرف نبوت ورسالت سے نواز کر اس کو دعوت اسلام اور پیغام حق کا امام بنایا یہ ہستی حضرت شعیب علیہ السلام کی ذات گرامی تھی۔

خدا کی توحید اور شرک سے بیزاری کا اعتقاد تو تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کی مشترک بنیاد اور اصل ہے جو حضرت شعیب علیہ السلام کے حصہ میں بھی آئی تھی مگر قوم کی مخصوص بداخلاقیوں پر توجہ دلانے اور ان کو راہ راست پر لانے کے لیے انہوں نے اس قانون کو بھی اہمیت دی کہ خرید وفروخت کے معاملہ میں یہ ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ جو جس کا حق ہے وہ پورا پورا اس کو ملے کہ دنیوی معاملات میں یہ ایک ایسی بنیاد ہے جو متزلزل ہو جانے کے بعد ہر قسم کے ظلم، فسق وفجور اور مہلک خرابیوں اور بداخلاقیوں کا باعث بنتی ہے۔

الحاصل حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کی بداعمالیوں کو دیکھ کر سخت دکھ محسوس کیا اور رشد وہدایت کی تعلیم دیتے ہوئے قوم کو انہی اصول کی طرف بلایا جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت وارشاد کا خلاصہ ہے۔

انہوں نے فرمایا: "اے قوم! ایک خدا کی عبادت کر! اس کے علاوہ کوئی پرستش کے قابل نہیں ہے، اور خرید وفروخت میں ناپ تول کو پورا رکھ، اور لوگوں کے ساتھ معاملات میں کھوٹ نہ کر، کل تک ممکن ہے کہ تجھ کو ان بداخلاقیوں کی برائیوں کا حال معلوم نہ تھا، مگر آج تیرے پاس خدا کی حجت، نشانی، اور برہان آچکا، اب جہل ونادانی، عفو ودرگذر کے قابل نہیں ہے، حق کو قبول کر اور ظلم سے باز آ، کہ یہی کامرانی اور کامیابی کی راہ ہے، اور خدا کی زمین میں فتنہ وفساد نہ کر، جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی صلاح، خیر کے تمام سامان مہیا کر دیئے، اگر تجھ میں ایمان ویقین کی صداقت موجود ہے تو سمجھ کہ یہی فلاں وبہبودی کی راہ ہے اور دیکھ ایسا نہ کر کہ دعوت حق کی راہ کو روکنے اور لوگوں کو لوٹنے کے لیے ہر راہ پر جا بیٹھے اور جو آدمی بھی ایمان لائے اس کو خدا کی راہ اختیار کرنے پر دھمکیاں دینے اور اس میں کج روی پیدا کرنے کے درپے ہو جائے، اے افراد قوم اس وقت کو یاد کرو، اور خدا کا احسان مانو کہ تم بہت تھوڑے تھے پھر اس نے امن وعافیت دے کر تمہاری تعداد کو بیش از بیش بڑھا دیا۔

اے میری قوم! ذرا اس پر بھی غور کر کہ جن لوگوں نے خدا کی زمین پر فساد پھیلانے کا شیوہ اختیار کیا تھا ان کا انجام کس قدر عبرت ناک ہوا، اور اگر تم میں سے ایک جماعت مجھ پر ایمان لے آئی اور ایک جماعت ایمان نہیں لائی تو صرف اتنی ہی بات پر معاملہ ختم ہو جانے والا نہیں، بلکہ صبر کے ساتھ انتظار کر، تا آنکہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان آخری فیصلہ کر دے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا

Marfat.com

ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے، شیریں کلامی، حسن خطابت، طرز بیان اور طلاقت لسانی میں بہت نمایاں امتیاز رکھتے تھے، اسی لیے مفسرین ان کو خطیب الانبیاء کے لقب سے یاد کرتے ہیں، پس انہوں نے نرم و گرم ہر طریقہ سے قوم کو رشد و ہدایت کے یہ کلمات ارشاد فرمائے مگر اس بدبخت قوم پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا، اور چند ضعیف اور کمزور ہستیوں کے علاوہ کسی نے پیغام حق پر کان نہ دھرا، وہ خود بھی اسی طرح بداعمال رہے اور دوسروں کی راہ بھی مارتے رہے، وہ راستوں میں بیٹھ جاتے اور حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس آنے جانے والوں کو قبول حق سے روکتے اور اگر موقعہ لگ جاتا تو لوگوں کو لوٹ لیتے اور اگر اس پر بھی کوئی خوش قسمت حق پر لبیک کہہ دیتا تو اس کو ڈراتے، دھمکاتے اور طرح طرح سے کج روی پر آمادہ کرتے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت حق کا سلسلہ برابر جاری رہا تو ان میں سے سر برآوردہ اشخاص نے کہ جن کو اپنی شوکت و طاقت پر غرور تھا، حضرت شعیب علیہ السلام سے کہا: "اے شعیب (علیہ السلام)! دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہو کر رہے گی، یا ہم تجھ کو اور تجھ پر ایمان لانے والوں کو اپنی بستی میں سے نکال دیں گے اور تیرا دیس نکالا کریں گے یا تم کو مجبور کریں گے کہ پھر ہمارے دین میں واپس آ جاؤ۔"

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا: "اگر ہم تمہارے دین کو غلط اور باطل سمجھتے ہوں تب بھی زبردستی مان لیں یہ تو بڑا ظلم ہے؟ اور جبکہ ہم کو خدائے تعالیٰ نے تمہارے اس دین سے نجات دے دی تو پھر ہم اس کی طرف لوٹ جائیں تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم نے جھوٹ بول کر خدائے تعالیٰ پر بہتان باندھا، یہ ناممکن ہے، ہاں اگر اللہ کی (جو کہ ہمارا پروردگار ہے) یہی مرضی ہو تو وہ جو چاہے گا کرے گا، ہمارے رب کا علم تمام اشیاء پر چھایا ہوا ہے، ہمارا تو صرف اسی پر بھروسہ ہے، اے پروردگار! تو ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق اور سچائی کے ساتھ فیصلہ کر دے تو ہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے، قوم کے سرداروں نے جب حضرت شعیب علیہ السلام کا یہ عزم و استقلال دیکھا تو اب ان سے روئے سخن پھیر کر اپنی قوم کے لوگوں سے کہنے لگے: "خبردار! اگر تم نے شعیب علیہ السلام کا کہنا مانا تو تم ہلاک و برباد ہو جاؤ گے۔"

حضرت شعیب علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا: "دیکھو خدائے تعالیٰ نے مجھ کو اس لیے بھیجا ہے کہ میں اپنے مقدور بھر تمہاری اصلاح کی سعی کروں اور میں جو کچھ کہتا ہوں اس کی صداقت اور سچائی کے لیے خدا کی حجت اور دلیل اور نشانی بھی پیش کر رہا ہوں، مگر افسوس کہ تم اس واضح حجت کو دیکھ کر بھی سرکشی و نافرمانی پر قائم ہو اور مخالفت کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو تم سے چھوٹا ہوا ہو پھر میں تم سے اپنی اس رشد و ہدایت کے بدلہ میں کوئی اجرت بھی نہیں مانگتا اور نہ کوئی دنیوی نفع کا طالب ہوں، میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے، اور اگر تم اب بھی نہ مانو گے تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں خدا کا عذاب تم کو ہلاک و برباد نہ کر ڈالے، اس کا فیصلہ اٹل ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کو رد کر دے۔

قوم کے سردار تیوری چڑھا کر بولے۔ شعیب (علیہ السلام)! کیا تیری نماز ہم سے یہ چاہتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے دیوتاؤں کو پوجنا چھوڑ دیں اور ہم کو اپنے مال و دولت میں یہ اختیار نہ رہے کہ جس طرح چاہیں معاملہ کریں، اگر ہم کم تولنا چھوڑ دیں، لوگوں کے کاروبار میں کھوٹ نہ کریں تو مفلس و قلاش ہو کر رہ جائیں۔ پس کیا ایسی تعلیم دینے میں تجھ کو کوئی متین اور سچا رہبر کہہ سکتا ہے۔؟

حضرت شعیب علیہ السلام نے نہایت دل سوزی اور محبت کے ساتھ فرمایا: "اے قوم! مجھے یہ خوف لگ رہا ہے کہ تیری بے باکیاں اور خدا کے مقابلہ میں نافرمانیاں کہیں تیرا بھی وہی انجام نہ کریں، جو تجھ سے پہلے قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح اور قوم لوط کا ہوا، اب بھی

Marfat.com

کچھ نہیں گیا، خدا کے سامنے جھک جا، اور اپنی بدکرداریوں کے لیے بخشش کی طلب گار بن اور ہمیشہ کے لیے ان سے تائب ہو جا، بلاشبہ میرا پروردگار رحم کرنے والا بہت ہی مہربان ہے، وہ تیری تمام خطائیں بخش دے گا۔

قوم کے سرداروں نے یہ سن کر جواب دیا "شعیب (علیہ السلام)! ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ تو کیا کہتا ہے؟ تو ہم سب سے کمزور اور غریب ہے، اگر تیری باتیں سچی ہوتیں تو تیری زندگی ہم سے زیادہ اچھی ہوتی، اور ہم کو صرف تیرے خاندان کا خوف ہے ورنہ تجھ کو سنگسار کر چھوڑتے، تو ہرگز ہم غالب نہیں آ سکتا۔"

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا: "افسوس ہے تم پر! کیا تمہارے لیے خدا کے مقابلہ میں میرا خاندان زیادہ ڈر کا باعث بن رہا ہے حالانکہ میرا رب تمہارے تمام اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔

خیر اگر تم نہیں مانتے تو تم جانو، تم وہ سب کچھ کرتے رہو جو کر رہے ہو عنقریب خدا کا فیصلہ بتا دے گا کہ عذاب کا مستحق کون ہے اور کون جھوٹا اور کاذب ہے تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں؟"

آخر وہی ہوا جو قانون الٰہی کا ابدی و سرمدی فیصلہ ہے "یعنی حجت و برہان کی روشنی آنے کے بعد بھی جب باطل پر اصرار ہو اور اس کی صداقت کا مذاق اڑایا جائے اور اس کی اشاعت میں رکاوٹیں ڈالی جائیں تو پھر خدا کا عذاب اس مجرمانہ زندگی کا خاتمہ کر دیتا، اور آنے والی قوموں کے لیے اس کو عبرت و موعظت بنا دیا کرتا ہے۔"

نوعِ عذاب:

قرآن عزیز کہتا ہے کہ نافرمانی اور سرکشی کی پاداش میں قوم شعیب علیہ السلام کو دو قسم کے عذاب نے آ گھیرا، ایک زلزلہ کا عذاب، اور دوسرا آگ کی بارش کا عذاب، یعنی جب وہ اپنے گھروں میں آرام کر رہے تھے تو یک بیک ایک ہولناک زلزلہ آیا اور ابھی یہ ہولناکی ختم نہ ہوئی تھی کہ اوپر سے آگ برسنے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ صبح کو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ کل کے سرکش اور مغرور آج گھٹنوں کے بل اوندھے جھلسے ہوئے پڑے ہیں۔

﴿فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۷۸)

"پھر آ پکڑا ان کو زلزلے نے پس صبح کو رہ گئے اپنے اپنے گھروں کے اندر اوندھے پڑے۔"

﴿فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝﴾ (الشعراء: ۱۸۹)

"پھر انہوں نے شعیب (علیہ السلام) کو جھٹلایا پس آ پکڑا ان کو بادل والے عذاب نے (جس میں آگ تھی) بیشک وہ بڑے ہولناک دن کا عذاب تھا۔"

﴿وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْیَالَ وَ الْمِیْزَانَ اِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ بِخَیْرٍ وَّ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ ۝ وَ یٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْیَالَ وَ الْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۝

بَقِیَّتُ اللّٰهِ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۚ۬ وَ مَاۤ اَنَا عَلَیْکُمْ بِحَفِیْظٍ ۝۸۶ قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ
تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّکَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ
الرَّشِیْدُ ۝۸۷ قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ رَزَقَنِیْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ مَاۤ اُرِیْدُ
اَنْ اُخَالِفَکُمْ اِلٰی مَاۤ اَنْهٰىکُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَ مَا تَوْفِیْقِیْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ
عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ وَ اِلَیْهِ اُنِیْبُ ۝۸۸ وَ یٰقَوْمِ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شِقَاقِیْۤ اَنْ یُّصِیْبَکُمْ مِّثْلُ مَاۤ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ
اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَ مَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْکُمْ بِبَعِیْدٍ ۝۸۹ وَ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ ؕ
اِنَّ رَبِّیْ رَحِیْمٌ وَّدُوْدٌ ۝۹۰ قَالُوْا یٰشُعَیْبُ مَا نَفْقَهُ کَثِیْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىکَ فِیْنَا ضَعِیْفًا ۚ وَ لَوْ
لَا رَهْطُکَ لَرَجَمْنٰکَ ۫ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَیْنَا بِعَزِیْزٍ ۝۹۱ قَالَ یٰقَوْمِ اَرَهْطِیْۤ اَعَزُّ عَلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ
وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَکُمْ ظِهْرِیًّا ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ۝۹۲ وَ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ
عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَ مَنْ هُوَ کَاذِبٌ ؕ وَ ارْتَقِبُوْۤا اِنِّیْ مَعَکُمْ
رَقِیْبٌ ۝۹۳ وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا شُعَیْبًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ اَخَذَتِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا
الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۝۹۴ کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْیَنَ کَمَا بَعِدَتْ
ثَمُوْدُ ۝۹۵ ﴾ (هود: ۸۴-۹۵)

"اور ہم نے (قبیلہ) مدین کی طرف سے اس کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو بھیجا اس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم خوشحال ہو (یعنی خدا نے تمہیں بہت کچھ دے رکھا ہے، پس کفرانِ نعمت سے بچو) میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایسا دن نہ آ جائے جو سب پر چھا جائے گا"۔ اور اے میری قوم کے لوگو! ناپ تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو، لوگوں کو ان کی چیزیں (ان کے حق سے) کم نہ دو، ملک میں فساد پھیلاتے نہ پھرو، اگر تم میرا کہا مانو تو جو کچھ اللہ کا دیا (کاروبار میں) بچ رہے، اسی میں تمہارے لیے بہتری ہے اور دیکھو (میرا کام تو صرف نصیحت کر دینا ہے) میں کچھ تم پر نگہبان نہیں" (کہ جبراً اپنی راہ پر چلا دوں) لوگوں نے کہا: اے شعیب (علیہ السلام)! کیا تیری یہ نمازیں (جو تو اپنے خدا کے لیے پڑھتا ہے) تجھے یہ حکم دیتی ہیں کہ ہمیں آ کر کہے: ان معبودوں کو چھوڑ دو جنہیں ہمارے باپ دادے پوجتے رہے ہیں، یا یہ کہ ہمیں اختیار نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہیں کریں۔ بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو، شعیب علیہ السلام نے کہا" اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن رکھتا ہوں اور اس کے فضل و کرم کا یہ حال ہو کہ اچھی (سے اچھی) روزی عطا فرما رہا ہو (تو پھر بھی میں چپ رہوں اور تمہیں راہ حق کی

طرف نہ بلاؤں) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جس بات سے تمہیں روکتا ہوں اس سے تمہیں تو روکوں اور خود اس کے خلاف چلوں میں تمہیں جو کچھ کہتا ہوں اسی پر عمل بھی کرتا ہوں میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ جہاں تک میرے بس میں ہے اصلاح حال کی کوشش کروں، میرا کام بنتا ہے تو اللہ ہی کی مدد سے بنتا ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع ہوں" اور اے میری قوم کے لوگو! میری ضد میں آ کر کہیں ایسی بات نہ کر بیٹھنا کہ تمہیں بھی ویسا ہی معاملہ پیش آ جائے جیسا قوم نوح کو یا قوم ہود کو یا قوم صالح کو پیش آ چکا ہے، اور قوم لوط (کا معاملہ) تم سے کچھ دور نہیں، اور دیکھو اللہ سے (اپنے گناہوں کی) معافی مانگو۔ اور اس کی طرف لوٹ جاؤ۔ میرا پروردگار بڑا ہی رحمت والا۔ بڑا ہی محبت والا ہے" لوگوں نے کہا: "اے شعیب (علیہ السلام)! تم جو کچھ کہتے ہو اس میں سے اکثر باتیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہم لوگوں میں ایک کمزور آدمی ہو، اگر (تمہارے ساتھ) تمہاری برادری کے آدمی نہ ہوتے تو ہم ضرور تمہیں سنگسار کر دیتے" تمہاری ہمارے سامنے کوئی ہستی نہیں، شعیب (علیہ السلام) نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! کیا اللہ سے بڑھ کر تم پر میری برادری کا دباؤ ہوا؟ اور اللہ تمہارے لیے کچھ نہ ہوا کہ اسے پیچھے ڈال دیا؟ (اچھا) جو تم کرتے ہو میرے پروردگار کے احاطہ (علم) سے باہر نہیں، اے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ، میں بھی اپنی جگہ، سرگرم عمل ہوں، بہت جلد معلوم کر لو گے کہ کس پر عذاب آتا ہے، جو اسے رسوا کرے گا اور کون فی الحقیقت جھوٹا ہے، انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں اور پھر جب ہماری ٹھہرائی ہوئی بات کا وقت آ پہنچا تو ایسا ہوا کہ ہم نے شعیب (علیہ السلام) کو اور ان کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا اور جو لوگ ظالم تھے انہیں ایک سخت آواز نے آ پکڑا، پس جب صبح ہوئی تو اپنے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے۔ وہ اس طرح اچانک ہلاک ہو گئے، گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے، تو سن رکھو کہ قبیلہ مدین کے لیے بھی محرومی ہوئی جس طرح ثمود کے لیے محرومی ہوئی تھی۔"

قبر شعیب علیہ السلام:

حضر موت میں ایک قبر ہے جو زیارت گاہ عوام و خواص ہے، وہاں کے باشندوں کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ شعیب (علیہ السلام) کی قبر ہے، حضرت شعیب علیہ السلام مدین کی ہلاکت کے بعد یہاں بس گئے تھے اور یہیں ان کی وفات ہوئی، حضر موت کے مشہور شہر "شیون" کے مغربی جانب میں ایک مقام ہے جس کو "شبام" کہتے ہیں، اس جگہ اگر کوئی مسافر وادی ابن علی کی راہ ہوتا ہوا، شمال کی جانب چلے تو وادی کے بعد وہ جگہ آتی ہے جہاں یہ "قبر" ہے، یہاں مطلق کوئی آبادی نہیں ہے اور جو شخص بھی یہاں آتا ہے صرف زیارت ہی کے لیے آتا ہے۔ [1]

عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ مجھ کو اس قبر کے متعلق شک ہے کہ یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر ہے، لیکن انہوں نے اس شک کے لیے کوئی وجہ نہیں بیان فرمائی۔

---

[1] قصص الانبیاء

Marfat.com

بصائر و عبرت:

پچھلی امتوں اور قوموں کے یہ واقعات کہانیاں نہیں ہیں بلکہ عبرت بیں نگاہوں کے لیے سرمایہ صد ہزار عبرت ہیں، اگر زیادہ غور و فکر سے بھی کام نہ لیا جائے تب بھی بآسانی مسطورۂ بالا واقعات سے ہم حسب ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

① سورۂ اعراف میں مذکور ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی حجت و بینہ آ چکی ﴿ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ مگر قرآن عزیز نے دیگر انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت شعیب علیہ السلام کے کسی معجزہ ﴿آیۃ اللہ﴾ کا ذکر نہیں کیا، علماء نے اس سے دو نتیجے نکالے ہیں، ایک یہ کہ اگر نبی اور پیغمبر کسی قسم کا معجزہ نہ بھی لائے اور صرف خدا کے پیغام کے لیے روشن دلائل و براہین کی حجت ہی پیش کرے تو یہ روشن برہان ہی اس کا سب سے بڑا اور عظیم الشان معجزہ ہے، دوسرے یہ کہ اس مقام پر "بینہ" کی تفصیلات کو خدا کے سپرد کرنا چاہیے، اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ شریعت کے روشن دلائل کے علاوہ حضرت شعیب علیہ السلام کو بھی خدا کی جانب سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح کوئی نشان ﴿آیۃ اللہ﴾ بطور معجزہ عطا کیا گیا ہو اور اگرچہ قرآن نے اس جگہ اس کی تصریح نہیں کی مگر شعیب علیہ السلام کے اس خطاب میں اسی جانب اشارہ ہو۔

② ہماری غلطیوں میں سب سے بڑی مہلک غلطی عرصہ سے یہ رہی ہے کہ ہم قرآن عزیز کی تعلیم سے یکسر غافل ہونے کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ اسلامی زندگی کے ارکان میں صرف "عبادات" ہی اہم رکن ہیں اور معاملات میں درست کاری اور اصلاح معاشرت کو اسلام میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں فساق امت کا تو ذکر ہی کیا اکثر اتقیاء اور پرہیزگار بھی حقوق العباد اور معاملات میں بے پروا نظر آتے ہیں، مگر حقوق العباد کی حفاظت معاشرتی درستکاری اور معاملات میں دیانت و امانت کو اسلام میں کس درجہ اہم شمار کیا گیا ہے وہ اس سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جلیل القدر پیغمبر کی بعثت کا مقصد اسی کو قرار دیا اور ان کو انہی امور کی اصلاح حال کے لیے رسول بنا کر بھیجا۔

③ خرید و فروخت میں دوسروں کے حق کو پورا نہ کر دینا انسانی زندگی میں ایسا روگ لگا دیتا ہے کہ یہ بداخلاقی بڑھتے بڑھتے تمام حقوق العباد کے بارے میں حق تلفی کی خصلت پیدا کر دیتی، اور اس طرح انسانی شرافت اور باہمی اخوت و مودت کے رشتہ کو منقطع کر کے لالچ، حرص، خود غرضی اور خست و نائت جیسے رذائل کا حامل بنا دیا کرتی ہے اسی لیے خدائے برتر کا ارشاد ہے:

﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ ﴾ (مطففین: ۱۔۳)

"ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو دوسروں سے جب لیتے ہیں تو پورے پیمانے سے لیتے ہیں اور جب خود اپنی چیز دیتے ہیں تو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں اور کم تولتے ہیں۔"

پس ﴿ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ﴾ (ھود: ۸۵) کہہ کر اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ ناپ تول میں انصاف صرف اشیاء کی خرید و فروخت ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ انسانی کردار کا یہ کمال ہونا چاہیے کہ خدا اور اس کے بندوں کے تمام حقوق و فرائض میں ایک اصل کو بنیاد کار بنائے اور کسی موقع اور کسی حالت میں بھی عدل و انصاف کی ترازو کو ہاتھ سے نہ دے اور خرید و

Marfat.com

فروخت کے درمیان ناپ تول میں کمی نہ کرنا اور انصاف کو برقرار رکھنا گویا ایک کسوٹی ہے کہ جو انسانی زندگی کے معمولی لین دین میں عدل وانصاف نہیں برتتا اس سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اہم معاملات دینی و دنیوی میں عدل و قسط کو کام میں لائے گا؟

④ اصلاح حال کے بعد خدا کی زمین میں فساد پیدا کرنے سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں ہے۔ اس لیے کہ ظلم، کبر، قتل اور عصمت ریزی جیسے بڑے بڑے جرائم کی بنیاد اور اصل یہی رذیلہ ہے۔

⑤ باطل کی ایک بڑی شناخت یہ ہے کہ نہ وہ اپنے لیے دلائل کی روشنی رکھتا ہے اور نہ روشن دلائل کو برداشت کرتا ہے بلکہ جب اس کے سامنے روشنی آتی ہے تو وہ منہ پھیر لیتا ہے، اور آنکھیں بند کر لیتا ہے اور اس کی موجودگی کو برداشت نہ کرتے ہوئے دلائل کا جواب غصہ، دھمکی اور قتل سے دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے، تم انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیروان حق کی زندگی اور پھر ان کے مقابل اور مخالف باطل پرستوں کی زندگی کا موازنہ کرو اور تاریخ کے اوراق سے واضح شہادت لو تو تم کو قدم قدم پر یہ حقیقت آشکارا اور روشن نظر آئے گی کہ انبیاء علیہم السلام روشن دلائل دے رہے ہیں، آیات اللہ اور خدا کی نشانیاں دکھا رہے ہیں، محبت اور رحم کے جذبات کا اظہار کر رہے ہیں اور اپنی دعوت و تبلیغ پر مخاطبین پر مالی دباؤ نہ ڈالنے کا اطمینان دلا رہے ہیں مگر ان تمام باتوں کے باوجود دوسری جانب سے ان کو کہا جا رہا ہے کہ ہم تمہارا دیس نکالا کر دیں گے، ہم تم کو سنگسار کر دیں گے، ہم تم کو قتل کر دیں گے، اور اگر خدا کے پیغمبر آخری طور پر یہ کہتے ہیں کہ اگر تم ہماری آواز پر لبیک نہیں کہتے تو کم از کم ہمارے وجود کو برداشت کرو اور اتنا تو صبر کرو کہ خدا تمہارے اور ہمارے درمیان حق و باطل کا خود ہی فیصلہ کر دے تو دوسری جانب سے اس کے جواب میں بھی انکار، تمسخر اور یہ مطالبہ پیش ہوتا ہے کہ بس اب اپنی نصیحت ختم کرو اور اگر سچے ہو تو جس عذاب سے ڈراتے ہو وہ ابھی لے آؤ، ورنہ تو ہم ہمیشہ کے لیے تمہارا اور تمہارے مشن کا خاتمہ کر دیں گے۔

⑥ حق و باطل کا یہی وہ آخری مرحلہ ہے جس کے بعد خدائے تعالیٰ کا وہ قانون جس کو "قانون پاداش عمل" کہا جاتا ہے، ایسی سرکش اور متکبر قوموں کے لیے دنیا ہی میں نافذ ہو جاتا ہے اور ان کو ہلاک و تباہ کر کے آنے والی نسلوں اور قوموں کے لیے سامان عبرت و موعظت مہیا کر دیتا ہے۔

Marfat.com

حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام

○ بنی اسرائیل مصر میں ○ موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا ذکر قرآن میں ○ نسب و ولادت موسیٰ علیہ السلام ○ ارض مدین اور موسیٰ علیہ السلام کا مصر سے خروج ○ وادی مقدس و بعثت موسیٰ علیہ السلام ○ واپسی مصر اور فرعون کو دعوت اسلام ○ آیات اللہ اور فرعون کا انکار ○ قتل موسیٰ علیہ السلام کا مشورہ ○ بنی اسرائیل کی ہجرت اور فرعون کی مزاحمت ○ نجات بنی اسرائیل و غرق فرعون ○ عبور قلزم کے بعد بنی اسرائیل کا پہلا مطالبہ ○ قومی پستی کا مظاہرہ ○ دیگر مطالبات اور آیات بینات کا ظہور ○ موسیٰ علیہ السلام کا طور پر اعتکاف ○ نزول تورات ○ گوسالہ پرستی کا واقعہ ○ سامری؟ ستر سرداروں کا انتخاب ○ حیات بعد الموت ○ بنی اسرائیل اور جبل طور ○ ارض مقدس اور بنی اسرائیل ○ ذبح بقرہ کا واقعہ ○ موسیٰ علیہ السلام اور قارون ○ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ایذاء بنی اسرائیل ○ حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات ○ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام ○ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ○ بنی اسرائیل کا قومی مزاج اور خدا کی جانب سے تذکیر نعمت ○ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ثناء و منقبت قرآن میں ○ ایک لطیف تاریخی نکتہ ○ بصیرتیں اور عبرتیں۔

بنی اسرائیل مصر میں:

قرآن عزیز نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں بنی اسرائیل کا ذکر صرف اسی قدر کیا تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کا خاندان حضرت یوسف علیہ السلام سے ملنے مصر میں آئے مگر اس کے بعد صدیوں بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں پھر ایک مرتبہ قرآن حکیم، بنی اسرائیل کے واقعات تفصیل کے ساتھ سناتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر میں بس گئے تھے اور ان تمام پچھلی صدیوں میں ان کی تاریخ مصر ہی سے وابستہ رہی ہے، تورات کی یہ تفصیلات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں:

> ”تب فرعون یوسف علیہ السلام سے متکلم ہوا اور کہا کہ تیرے باپ اور تیرا بھائی تیرے پاس آئے ہیں، مصر کی زمین تیرے آگے ہے، اپنے باپ اور اپنے بھائیوں کو اس سرزمین کے ایک مقام میں جو سب سے بہتر ہے بسا، جشن کی زمین میں انہیں رہنے دے، اور اگر تو جانتا ہے کہ بعضے ان کے درمیان چالاک ہیں تو ان کو میری مواشی پر مختار کر[1] اور یوسف (علیہ السلام) نے اپنے باپ اور بھائیوں کو ملک مصر کی ایک بہتر زمین میں جو رعمسیس کی زمین ہے جیسا فرعون نے فرمایا تھا بٹھایا اور انہیں اس کا مالک کیا اور یوسف نے اپنے باپ اور اپنے بھائیوں اور اپنے باپ کے سب گھرانے کی، ان کے لڑکے بالوں کے موافق

[1] پیدائش باب ۴۷ آیات ۵-۶

Marfat.com

روٹی سے پرورش کی۔ ❶

اور اسرائیل نے مصر کی زمین میں جشن کے ملک میں سکونت کی اور وہ وہاں ملکیتیں رکھتے اور وہ بڑھے اور بہت زیادہ ہوئے اور یعقوب علیہ السلام مصر کی زمین میں ستر (۷۰) برس جیا، سو یعقوب علیہ السلام کی ساری عمر ایک سو سینتالیس (۱۴۷) برس کی ہوئی۔ ❷

تورات میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے فرعون سے اپنے باپ اور اہل خاندان کے لیے "ارض جاشان" طلب کی جو فرعون نے بخوشی ان کے سپرد کر دی۔ ❸

مصر کے نقشہ میں یہ جگہ بلبیس کے شمال میں واقع ہے، اس علاقہ کا ایک موجودہ شہر فلوسہ (سفط الحنہ) ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں ہم بتا چکے ہیں کہ شہری آبادی سے دور حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے خاندان کے لیے یہ جگہ غالباً اس لیے منتخب کی تھی کہ یہاں رہ کر ان کے خاندان کی بدویانہ زندگی بحالہٖ باقی رہے گی اور اس کی وجہ سے مصری بت پرست ان کے ساتھ اختلاط نہ کر سکیں گے، اور ان کی مشرکانہ رسوم اور بداخلاقیاں بنی اسرائیل میں سرایت نہ کر سکیں گی کیونکہ مصری لوگ چرواہوں، کاشتکاروں اور بدوی لوگوں کو کمتر اور نجس سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ اختلاط کو معیوب جانتے تھے۔

تورات میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلا کر وصیت کی کہ مجھ کو سرزمین مصر میں دفن نہ کیا جائے بلکہ باپ دادا کے وطن فلسطین میں میری قبر بنائی جائے، حضرت یوسف علیہ السلام نے باپ کو پورا اطمینان دلایا اور انتقال کے بعد ان کے جسد اطہر کو حنوط (ممی) کر کے تابوت میں رکھا اور فسلطین لے جا کر سپرد خاک کیا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے وفات سے پہلے ساری اولاد کو جمع کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے صاحبزادوں افرائیم اور منسی کو بھی بلایا اور ان سب کو اول دعاء برکت دی اور محبت و شفقت کے ساتھ ان کو نوازا اس کے بعد ان کو نصیحت کی کہ "دیکھو میرے بعد اپنے ایمانیات و اعتقادات کو کہیں خراب نہ کر لینا اور خدا کے اس پاک رشتہ کو جو میں نے اور میرے باپ دادا نے ہمیشہ مضبوط رکھا مشرکانہ رسوم و عوائد سے شکست و ریخت نہ کر دینا۔ ❹

قرآن عزیز نے بھی یعقوب علیہ السلام کی اس مقدس وصیت کا ان معجزانہ جملوں میں ذکر کیا ہے:

﴿أَمْ كُنتُمْ شُهَدَآءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنۢ بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٣﴾﴾

(البقرہ: ۱۳۳)

"(اے محمد ﷺ) کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت تھا، جبکہ اس نے اپنی اولاد سے کہا "میرے بعد کس کی پرستش کرو گے (یعنی کون سا دین اختیار کرو گے) تو انہوں نے جواب دیا "ہم اسی ایک خدا کی پرستش کریں گے

---

❶ پیدائش باب ۴۷ آیات ۱۱-۱۲ ❷ پیدائش باب ۴۷ آیات ۲۷-۲۸
❸ پیدائش باب ۴۷ آیات ۳۰-۳۱ ❹ پیدائش باب ۴۷ آیات ۳۰-۳۱

Marfat.com

جو تیرا اور تیرے باپ دادا ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق (علیہم السلام) کا خدا ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں اور ہم تو اسی کے فرمانبردار ہیں۔"

تورات نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کی وفات کے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ان کی عمر اور ان کی نسل کا بھی ذکر حسب ذیل عبارت میں کیا ہے:

"اور یوسف (علیہ السلام) اور اس کے باپ کے گھرانے نے مصر میں سکونت کی اور یوسف (علیہ السلام) ایک سو دس (۱۱۰) برس جیا، اور یوسف (علیہ السلام) نے افرائیم کے لڑکے جو تیسری پشت میں تھے دیکھے اور منسی کے بیٹے مکیر کے بیٹے بھی یوسف (علیہ السلام) کے گھٹنوں پر پالے گئے، اور یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا میں مرتا ہوں اور خدا یقیناً تم کو یاد کرے گا اور تم کو اس زمین سے باہر اس زمین میں جس کی بابت اس نے ابراہام، اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) سے قسم کی ہے لے جائے گا اور یوسف نے بنی اسرائیل سے قسم لے کر کہا خدا یقیناً تم کو یاد کرے گا اور تم میری ہڈیوں کو یہاں سے لے جائیو، سو یوسف (علیہ السلام) ایک سو دس برس (۱۱۰) برس کا بوڑھا ہو کے مر گیا اور انہوں نے اس میں خوشبو بھری اور اسے مصر میں صندوق میں رکھا۔" [1]

اور موسیٰ (علیہ السلام) نے یوسف کی ہڈیاں ساتھ لیں کیونکہ اس نے بنی اسرائیل کو تاکیداً قسم دے کے کہا تھا کہ خدا یقیناً تمہاری خبر گیری کرے گا، تم یہاں سے میری ہڈیاں ساتھ لے جائیو۔ [2]

چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کی وصیت کے مطابق ان کی اولاد نے ان کے جسم مبارک کو بھی حنوط (ممی) کر کے تابوت میں محفوظ کر دیا، اور جب موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل مصر سے ہجرت کر کے چلے ہیں تو یوسف (علیہ السلام) کی وصیت کو پورا کرنے کے لیے ان کا تابوت بھی ساتھ لے گئے اور نبیوں کی سرزمین میں لا کر دفن کر دیا، یہ مقام کونسا ہے؟ اس کے متعلق اہل جبرون یہ کہتے ہیں کہ وہ جبرون میں مدفون ہیں اور حرم خلیلی میں مکفیلہ کے قریب ایک محفوظ تابوت کے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہی تابوت یوسف علیہ السلام ہے۔ لیکن عبدالوہاب مصری اس کو وہم بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت فاضل محمد نمر حسن نابلسی اور نابلس کے سرکردہ عالم حضرت فاضل امین بک عبدالہادی نے بیان کیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی ضریح مبارک نابلس میں ہے اور یہی صحیح ہے، اس لیے کہ توریت کہتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ارض فرائیم میں دفن ہوئے اور نابلس ارض فرائیم ہی میں ہے اور اس کو قدیم زمانہ میں شکیم کہتے تھے۔ [3]

بہر حال ان تفصیلات سے یہ واضح ہو گیا کہ بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیانی صدیوں میں مصر میں آباد رہے۔

فرعون موسیٰ:

گذشتہ واقعات میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ "فرعون" شاہان مصر کا لقب ہے، کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں ہے، تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہو کر عہد سکندر تک فراعنہ کے اکتیس خاندان مصر پر حکمران رہے ہیں، سب سے آخری خاندان فارس کی شہنشاہی

---

[1] پیدائش باب ۵۰ آیات ۲۲۔۲۶ [2] خروج باب ۱۳ آیت ۱۹ [3] قصص الانبیاء ص ۱۸۷

Marfat.com

جو ۳۳۲ قبل از مسیح سکندر کے ہاتھوں مفتوح ہو گیا، ان میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کا فرعون (ہیکسوس) (عمالقہ) کے خاندان سے تھا جو دراصل عرب خاندانوں ہی کی ایک شاخ تھی تو اب سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد کا فرعون کون ہے اور کس خاندان سے متعلق ہے؟

عام مؤرخین عرب اور مفسرین اس کو بھی "عمالقہ" ہی کے خاندان کا فرد بتاتے ہیں، اور کوئی اس کا نام ولید بن مصعب بن ریان بتاتا اور کوئی مصعب بن ریان کہتا ہے اور ان میں سے ارباب تحقیق کی رائے یہ ہے کہ اس کا نام ریان یا ریان ابا تھا، ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کی کنیت ابومرہ تھی۔

یہ سب اقوال قدیم مؤرخین کی تحقیقی روایات پر مبنی تھے مگر اب جدید مصری اثری تحقیقات اور حجری کتبات کے پیش نظر اس سلسلہ میں دوسری رائے سامنے آئی ہے، وہ یہ کہ موسیٰ کے زمانہ کا فرعون رعمسیس ثانی کا بیٹا منفتاح ہے جس کا دور حکومت ۱۲۹۲ ق م سے شروع ہو کر ۱۲۲۵ ق م پر ختم ہوتا ہے۔

اس تحقیقی روایت کے متعلق احمد یوسف آفندی نے ایک مستقل مضمون لکھا ہے، یہ مصری دار الآثار کے مصور ہیں اور اثری وحجری تحقیق کے بہت بڑے عالم ہیں، ان کے اس مضمون کا خلاصہ نجار نے قصص الانبیاء میں نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے۔

"یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ یوسف علیہ السلام جب مصر میں داخل ہوئے ہیں تو یہ فراعنہ کے سولہویں خاندان کا زمانہ تھا اور اس فرعون کا نام "ابابی الاول" تھا، میں نے اس کی شہادت اس حجری کتبہ سے حاصل کی جو عزیز مصر "فوتی فارع" (فوطیفار) کے مقبرہ میں پایا گیا، اور سترھویں خاندان کے بعض آثار سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اس خاندان سے قبل مگر قریب ہی زمانہ میں مصر میں ہولناک قحط پڑ چکا تھا، لہٰذا ان تعینات کے بعد آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا داخلہ مصر "ابابی الاول" کے زمانے میں تقریباً ۱۶۰۰ ق م ہوا ہے، اور حضرت یوسف علیہ السلام کا عزیز مصر کے یہاں رہنا اور پھر قید خانہ کی زندگی بسر کرنا ان دونوں کی مدت کا اندازہ کر کے کہا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام سے تقریباً ستائیس سال بعد مصر میں اس نشان سے داخل ہوئے جس کا ذکر قرآن حکیم اور تورات میں کیا گیا ہم اگرچہ فراعنہ مصر کی حکومت اور شاہی خاندانوں کے متعلق اچھی طرح آگاہی پا چکے ہیں اور مصری آثار نے اس میں ہم کو کافی مدد دی ہے مگر ابھی تک ان اثریات میں وہ تفصیلی تصریحات دستیاب نہیں ہوئیں جو فرعون اور بنی اسرائیل کی عداوت، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور غرق فرعون ونجات بنی اسرائیل سے متعلق ہیں، تورات میں مذکور ہے کہ جس فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ عداوت کا معاملہ کیا اور ان کو سخت مصائب میں مبتلا رکھا، اس نے بنی اسرائیل سے دو شہروں رعمسیس اور فیثوم کی تعمیر کی خدمت بھی لی اور ان کو مزدور بنایا، تو اثری حضریات (پرانے آثار کی کھدائی) میں ان دو شہروں کا پتہ تو لگ چکا ہے، ایک کے کتبہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس کا نام "بر۔توم" یا "فیثوم" ہے اس کا ترجمہ ہے "خدائے توم کا گھر" اور دوسرے کا نام "برر عمسیس" ہے جس کا ترجمہ "قصر رعمسیس" ہوتا ہے۔

اور شرقی جانب میں جو مقام اب "تل مسخوطہ" کے نام سے مشہور ہے یہیں "فیثوم" کی آبادی تھی، اور جس جگہ اب قنتیر یا مصری زبان کے اعتبار سے خعت نفر واقع ہے اس مقام پر رعمسیس آباد تھا، اس کو رعمسیس ثانی نے اس لیے آباد کیا تھا کہ یہ مصر کی

Marfat.com

بحری جانب کے سینٹر میں بہترین قلعہ کا کام دے اور فیثوم کی آبادی کا بھی یہی مقصد تھا، اس شہر کی چہار دیواری کے جو کھنڈر معلوم ہوئے ہیں وہ بلاشبہ اس کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ دونوں شہر مصر کے بہترین حفاظتی قلعے تھے نہ کہ تورات کے بیان کے مطابق غلوں کے گودام۔

اس تمام قیل وقال کا مطلب یہ ہے کہ جس فرعون نے بنی اسرائیل کو مصائب میں مبتلا کیا وہ یہی "ریمسیس دوم" ہو سکتا ہے، یہ مصر کے حکمرانوں کا انیسواں خاندان تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور اسی کی آغوش میں پرورش پائی، تاریخ اثریات سے پتہ چلتا ہے کہ "اسیویہ" قبائل جو مصر کے قریب آباد تھے ان کے اور فراعنہ کے اس خاندان کے درمیان پیہم نو سال تک سخت جنگ و پیکار رہی، بدیں وجہ یہ قرین قیاس ہے کہ ریمسیس دوم نے اس خوف سے کہ کہیں بنی اسرائیل کا یہ عظیم الشان قبیلہ جو لاکھوں نفوس پر مشتمل تھا اندرونی بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائے بنی اسرائیل کو ان مصائب میں مبتلا کرنا ضروری سمجھا جن کا ذکر توراۃ اور قرآن حکیم میں کیا گیا ہے۔ ✿

ریمسیس دوم اس زمانہ میں بہت مسن اور معمر ہو چکا تھا، اس لیے اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹے منفتاح کو شریک حکومت کر لیا ریمسیس کی ڈیڑھ سو اولاد میں سے یہ تیرھواں لڑکا تھا، لہٰذا منفتاح ہی وہ فرعون ہے جس کو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے اسلام کی دعوت دی اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کیا، اور اسی کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر سے نکلے اور یہی غرق دریا ہوا، چونکہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے گھر میں پرورش پاتے دیکھا تھا اس لیے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو اسلام کا پیغام سنایا تو قرآن عزیز کے ارشاد کے مطابق اس نے یہ طعنہ دیا:

﴿ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّ لَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۝ ﴾ (الشعراء: ۱۸)

"کیا ہم نے اپنے یہاں تیرے بچپن میں تیری پرورش نہیں کی؟ اور تو اپنی عمر کے چند سال ہم میں بسر کر چکا ہے۔"

تورات میں ہے کہ خروج سے پہلے مصر کے بادشاہ کا انتقال ہو گیا، اس سے مراد وہی ریمسیس دوم ہے جو منفتاح کا باپ تھا۔

علامہ فلانڈرس نے ایک حجری کتبہ دریافت کیا ہے جس پر سیاہ حروف کندہ ہیں اور وہ ۵۹۹ مصری میں لکھا گیا ہے، یہ دراصل ایک بہت بڑی چٹان ہے جس کی بلندی ۳ میٹر ✿ اور ۱۴ سم ✿ ہے، یہ "کتبہ" دو وجہ سے معرض تحریر میں آیا تھا، ایک یہ کہ ان تمام تفصیلات کو بیان کیا جائے جو اٹھارھویں خاندان کے بادشاہ امنحتب نے "معبد امون" کی خدمات کے متعلق انجام دی تھیں، اور دوسرے یہ کہ انیسویں خاندان کے بادشاہ "منفتاح" بن ریمسیس دوم کی تعریف میں کچھ لکھا جائے، اس لیے اس کتبہ کی عبارت شاعرانہ اسلوب پر لکھی گئی ہے اور منفتاح نے یوسین پر جو فتح حاصل کی تھی اس کا بڑے فخر و مباہات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اور عسقلان جیرز، یانوعیم جو فلسطین کے علاقہ کے مشہور شہر تھے ان کے سقوط کی جانب اشارات کیے گئے ہیں، اسی کے ضمن میں بنی

✿ تورات سے بھی اس قیاس کی تائید ہوتی ہے، اس سے کہا گیا ہے "اور اس نے اپنے لوگوں سے کہا دیکھو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں، آؤ ہم ان سے دانشمندانہ معاہدہ کریں تاکہ یہ نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہوں اور جنگ پڑے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل جائیں اور ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں۔ (خروج باب ۱ آیت ۱۰-۱۱)

✿ ا میٹر = ۱۰۹۳ء ا گز ✿ سم (سینٹی میٹر) میٹر ۱۱۰ / ا حصہ

Marfat.com

اسرائیل کے متعلق بھی مختصر عبارت میں اظہار خیال کیا گیا اور یہ سب سے پہلا اثری نقش اور حضریات مصری کا پہلا کتبہ ہے جس میں بنی اسرائیل کا صراحت کے ساتھ ذکر موجود ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

لقد سحق بنو اسرائیل ولم یبق لھم بذر.

بنی اسرائیل تمام ہلاک ہو گئے اور اب ان کی نسل کا خاتمہ ہو گیا۔"

ایک باریک بین اس عبارت کو دیکھ کر بآسانی یہ علم حاصل کر سکتا ہے کہ یہ تحریر منفتاح کے زمانے میں نہیں لکھی گئی ورنہ تو مصری دستور کے مطابق بنی اسرائیل جیسے عظیم الشان قبیلہ کی ہلاکت کے واقعہ کو اس معمولی اور مختصر الفاظ میں درج نہ کیا جاتا، بلکہ منفتاح کی شان میں بڑے زبردست قصیدہ کے ساتھ اس دشمن پر کامیابی کا اظہار کیا جاتا، اور جن واقعات پر اس کتبہ میں اشارہ کیا گیا ہے ان کی اہمیت اور عظمت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ یونہی ضمنی طور پر اور وہ بھی سابق بادشاہ کے حالات سے متعلق کتبہ پر درج نہ کر دیئے جاتے بلکہ ان اہم واقعات کے لیے منفتاح کے زمانہ میں مستقل الگ ایک کتبہ اسی غرض سے تحریر کیا جاتا۔

مگر ایسا کیوں نہ ہوا؟ سو بات بہت واضح ہے وہ یہ کہ مصری کاہنوں کو اس واقعہ ہائلہ کی ہرگز توقع نہ تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں غرض فرعون کی شکل میں ظاہر ہوا اور وہ منفتاح کی موت کے لیے ایک عجلت کے متوقع نہ تھے، اس زمانہ کی عمر طبعی کے لحاظ سے ابھی کافی زمانہ تھا کہ منفتاح کے کاہن، مصری دستور کے مطابق اس انیسویں خاندان کے بادشاہ کے ان حالات کو مرتب کر کے لوح پر محفوظ کر دیں تاکہ وہ بادشاہ کے مقبرہ پر کندہ ہو سکے، اب جبکہ یہ واقعہ ہائلہ پیش آ گیا تو اصل حقیقت کو چھپانے کی سعی کی گئی تاکہ آئندہ قبطی نسلیں اس ذلت و رسوائی کو معلوم نہ کر سکیں جو ان کے واجب الاحترام دینی عقائد پر خدا کی طرف سے سخت ضرب کا باعث بن چکی تھی۔ پس انہوں نے بیجا جسارت اور تاریخی بددیانتی کے ساتھ حالات کو منقلب کر کے معاملہ کو بالکل مخالف شکل میں ظاہر کر دیا اور بنی اسرائیل کی کامیاب واپسی وطن کو ان مسطورہ بالا الفاظ میں ظاہر کیا تاکہ غرق فرعون کا قصہ آئندہ مصریوں کے سامنے باقی ہی نہ رہے۔

اس نتیجہ کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مصری دستور کے مطابق ہر ایک بادشاہ کا مقبرہ جدا ہوتا تھا اور اس کے تمام حالات اور خصوصی نمایاں امتیازات کی تاریخ اور اس کے زمانہ کی بعض شاہی اشیاء اور جواہرات اس کی قبر کے ساتھ ہی محفوظ کر کے رکھے جاتے تھے لیکن منفتاح کی اس شان کے باوجود جس کا مذکورہ بالا کتبہ میں اشارہ کیا گیا ہے نہ اس کا علیحدہ مقبرہ بنایا گیا اور نہ وہ تمام رسوم انجام پا سکیں جو ہمیشہ بادشاہوں کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھیں، بلکہ اس کو عجلت کے ساتھ امنحتب کے مقبرہ ہی میں دفن کر دیا گیا اور اٹھارویں خاندان کے بادشاہ اور انیسویں خاندان کے بادشاہ کی نعشیں ایک ہی جگہ جمع کر دی گئیں۔ [1]

مصری عجائب خانہ میں یہ نعش آج بھی محفوظ ہے اور قرآن عزیز کے اس کلام بلاغت نظام کی تصدیق کر رہی ہے۔

﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً﴾ (یونس: ۹۲)

"پس آج کے دن ہم تیرے جسم کو (دریا سے) نجات دیں گے تاکہ وہ تیرے بعد آنے والوں کے لیے (خدا کا) نشان رہے۔"

---

[1] قصص الانبیاء نجار، ص ۲۳۹، ۲۴۱

Marfat.com

اور محمد احمد عدوی کتاب "دعوۃ الرسل الی اللہ" میں لکھتے ہیں کہ اس نعش کی ناک کے سامنے کا حصہ ندارد ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی حیوان کا کھایا ہوا ہے غالباً دریائی مچھلی نے خراب کیا ہے اور پھر اس کی نعش خدائی فیصلہ کے مطابق کنارہ پر پھینک دی گئی۔ ❶

ان نقول کے لیے کسی شرح کی ضرورت نہیں ہے، البتہ یہ یورپ کے ان مقلدین کے لیے ضرور سرمایہ صد عبرت ہیں جو جلد بازی کے ساتھ مستشرقین کی ہر ایک تحقیق پر بغیر کسی پس وپیش کے ﴿اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا﴾ کہہ دینے کے عادی ہیں، جو قرآن اور خدا کے نبی کے احکام پر شک کر سکتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں مگر یورپین مؤرخین اور مستشرقین کی تحقیقات علمی کو وحی الٰہی سے زیادہ سمجھتے ہیں، جو اپنے علماء اسلام کی تقلید کو حرام جانتے مگر علماء یورپ کے ہر نوشتہ کو نوشتہ الٰہی یقین کرتے ہیں۔

چنانچہ یورپ کے مؤرخین جدید نے یہ دعویٰ کیا کہ حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ علیہما السلام اور فراعنہ مصر کے درمیان جو واقعات، تورات وقرآن عزیز سے ثابت ہوتے ہیں وہ تاریخی معیار پر اس لیے غلط اور بے اصل ہیں کہ مصری حضریات واثریات میں ان اہم اور عظیم الشان حالات وواقعات کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا، حالانکہ یہ مسلم ہے کہ مصری اپنی تاریخ کی تدوین میں بہت زیادہ چست و چالاک اور سب سے پیش پیش ثابت ہوئے ہیں اور آج ان کے اس طرز عمل کی بدولت تین ہزار سال قبل مسیح کے حالات کی صحیح تاریخ مرتب ہو سکی ہے۔

تو اس دعویٰ کی کورانہ تقلید میں ہندوستان کے بعض یورپ زدہ مسلمانوں نے بھی ان واقعات کی صحت سے انکار کر دیا اور خدا کی سچی وحی سے اعراض کرتے ہوئے ان تخمینی قیاسات کو یقینی اور الہامی نوشتہ کی حیثیت دی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

لیکن آج جبکہ مصری حضریات واثریات میں صراحت کے ساتھ اس زمانہ کے فرعون اور بنی اسرائیل کی عداوت کا حال روشنی میں آ چکا ہے اور مسطورۂ بالا ترتیبی واقعات خود بخود ان حقائق کو سامنے لے آتے ہیں جن کا ذکر قرآن عزیز میں موجود ہے، تو اب نہ معلوم جلد بازی سے انکار کرنے والے ان مدعیان علم کی علمی روش کیا صورت اختیار کرے گی؟ اپنی نادانی اور کورانہ تقلید کی پردہ دری کے خوف سے انکار پر اصرار یا حقیقت کے اقرار کے ساتھ ساتھ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی راہ یقین (وحی الٰہی) کے سامنے اظہار ندامت وتاسف؟

بہر حال وہ اپنا معاملہ جو کچھ بھی رکھیں یہ نا قابل انکار حقیقت ہے کہ اذعان اور یقین کی جو راہ وحی الٰہی یعنی قرآن عزیز کے ذریعہ حاصل ہو چکی ہے اس کو ذرہ برابر اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور استقراء وقیاس سے حاصل شدہ علم اس وقت تک برابر گردش میں رہے گا جب تک قرآنی صداقت پر آ کر نہ ٹھہر جائے۔

فرعون کا خواب:

تورات اور مؤرخین کہتے ہیں کہ فرعون کو بنی اسرائیل کے ساتھ اس لیے عداوت ہو گئی تھی کہ اس زمانہ کے کاہنوں، نجومیوں اور قیافہ شناسوں نے اس کو بتایا تھا کہ تیری حکومت کا زوال ایک اسرائیلی لڑکے کے ہاتھ سے ہوگا اور بعض تاریخی روایات میں ہے کہ فرعون نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر دربار کے منجموں اور کاہنوں نے وہی دی تھی جس کا ذکر ابھی گذر چکا ہے، مفسرین

---

❶ دعوۃ الرسل الی اللہ ص ۱۸۱

Marfat.com

نے بھی انہی روایات کو کتب تفسیر میں نقل فرمایا ہے، تورات میں یہ اور اضافہ ہے کہ فرعون نے "دایہ" مقرر کر دی تھیں کہ قلمرو مصر میں جس اسرائیلی کے یہاں لڑکا پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے مگر ان عورتوں کے دلوں میں ایسی ہمدردی پیدا ہوئی کہ انہوں نے اس عمل کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا اور جب فرعون نے باز پرس کی تو یہ معذرت پیش کی کہ اسرائیلی عورتیں شہری عورتوں کی طرح نازک اندام نہیں ہیں، وہ خود ہی بچہ جن لیتی ہیں اور ہم کو مطلق خبر نہیں دیتیں، اس پر فرعون نے ایک جماعت کو اس لیے مقرر کیا کہ وہ تفتیش اور تلاش کے ساتھ اسرائیلی لڑکوں کو قتل کر دیں اور لڑکیوں کو چھوڑ دیا کریں۔ [1]

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا ذکر قرآن میں:

قرآن عزیز میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر بے شمار مقامات میں آیا ہے، چونکہ ان کے بیشتر حالات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک حالات سے بہت زیادہ مطابقت رکھتے ہیں، اور ان واقعات میں غلامی اور آزادی کے باہم معرکہ آرائی اور حق و باطل کے مقابلہ کی بے نظیر داستان ودیعت ہے، نیز ان کے اندر بصائر و مواعظ کا نادر ذخیرہ جمع ہے، اس لیے قرآن عزیز نے حسب ضرورت اور حسب موقع و محل جگہ جگہ اس قصہ کے اجزاء کو مجمل اور مفصل طریقہ پر بیان کیا ہے۔

مندرجہ ذیل نقشہ سے "اعداد و شمار کے ساتھ ساتھ" اس واقعہ کی اہمیت کا بھی صحیح اندازہ ہو سکے گا اور اس اولوالعزم پیغمبر کی عظمت و شان کا بھی۔

اس نقشہ کے دو (۲) حصے ہیں پہلے حصے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام یا بنی اسرائیل اور فرعون کے واقعات کن کن سورتوں اور کتنی آیات میں مذکور ہیں، اور دوسرا حصہ یہ واضح کرتا ہے کہ قرآن عزیز میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے نامہائے مبارک کتنی جگہ مذکور ہیں اور ان کی مجموعی تعداد کیا ہے؟

نقشہ (۱)

نام سورۃ	آیات	شمار
بقرہ	۴۷ تا ۶۱، ۶۳ تا ۷۵، ۸۳ تا ۸۷، ۹۲ تا ۹۳، ۱۰۸ تا ۱۲۶، ۲۴۳ تا ۲۵۱	۶۵
نساء	۱۵۳ تا ۱۵۶، ۱۶۴	۱۲
مائدہ	۱۲، ۱۳، ۲۰ تا ۲۵، ۳۲، ۴۵، ۷۰، ۷۱، ۷۸، ۷۹	۳۷
انعام	۸۴ تا ۹۰، ۱۴۶، ۱۵۴، ۱۸۹	۲۱
اعراف	۱۰۳ تا ۱۵۷، ۱۵۹ تا ۱۷۱	۶۸
انفال	۵۴	۱
یونس	۷۴ تا ۹۳	۲۰
ھود	۹۶ تا ۹۹، ۱۱۰	۵

[1] خروج باب ۱ آیات ۱۵-۲۲

Marfat.com

نام سورة	آیات	شمار
ابراہیم	۵،۶،۸	۳
نحل	۱۲۴	۱
بنی اسرائیل	۲ تا ۸، ۱۰۱ تا ۱۰۴	۱۱
کہف	۶۰	۲۳
مریم	۵۱ تا ۵۳	۳
طٰہٰ	۹۰ تا ۹۸	۹
انبیاء	۴۸،۴۹	۲
مومنون	۴۵ تا ۴۹	۵
فرقان	۳۵ تا ۳۶	۲
شعراء	۱۰ تا ۶۶	۵۷
نمل	۷ تا ۱۴	۸
قصص	۳ تا ۴۸	۴۶
عنکبوت	۳۹،۴۰	۲
سجدہ	۲۳،۲۴	۲
احزاب	۲۹	۱
الصافات	۱۱۴ تا ۱۲۲	۹
مومن	۲۳ تا ۴۵	۲۳
زخرف	۳۶ تا ۵۶	۲۱
دخان	۱۷ تا ۳۳	۱۷
جاثیہ	۱۶،۱۷	۲
الذاریات	۳۸،۴۰	۳
قمر	۴۱ تا ۵۵	۱۵
صف	۵	۱
جمعہ	۵،۶	۲
تحریم	۱۱	۱

Marfat.com

الحاقہ	۹، ۱۰	۲
مزمل	۱۵، ۱۶	۲
النازعات	۱۵ تا ۲۵	۱۱
فجر	۱۰ تا ۱۳	۴
	میزان	۵۱۴

نقشہ (۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام

نام سورۃ	شمار
بقرہ	۱۳
نساء	۳
مائدہ	۳
انعام	۳
اعراف	۲۱
یونس	۸
ھود	۳
ابراہیم	۳
بنی اسرائیل	۳
کہف	۲
مریم	۱
طٰہٰ	۱۷
انبیاء	۱
مومنون	۲
فرقان	۱
شعراء	۸
نمل	۳
قصص	۱۸

حضرت ہارون علیہ السلام

نام سورۃ	شمار
بقرہ	۱
نساء	۱
انعام	۱
اعراف	۲
یونس	۱
یونس	۱
یونس	۱
یونس	۱
یونس	۱
یونس	۲
طٰہٰ	۴
انبیاء	۱
مومنون	۱
فرقان	۱
شعراء	۲
شعراء	۲
قصص	۱

Marfat.com

سجدہ	۱
احزاب	۲
الصافات	۲
مومن	۴
زخرف	۱
الذاریات	۱
صافات	۱
النازعات	۱
میزان	۱۲۶

قصص	۱
قصص	۱
قصص	۲
قصص	۲
قصص	۲
قصص	۲
قصص	۲
قصص	۲
میزان	۲۰

نسب وولادت:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب چند واسطوں سے حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچتا ہے، ان کے والد کا نام عمران اور والدہ کا نا[م] یوکابد تھا، باپ کا سلسلہ نسب یہ ہے: عمران بن قامت بن الاوی بن یعقوب (علیہ السلام) اور حضرت ہارون (علیہ السلام) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے حقیقی اور بڑے بھائی تھے۔

عمران کے گھر میں موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ایسے زمانہ میں ہوئی جبکہ فرعون اسرائیلی لڑکوں کے قتل کا فیصلہ کر چکا تھا اس لیے ان کی والدہ اور اہل خاندان ان کی ولادت کے وقت سخت پریشان تھے کہ کس طرح بچہ کو قاتلوں کی نگاہ سے محفوظ رکھیں؟ بہرحال جوں توں کر کے تین مہینہ تک ان کو ہر ایک کی نگاہ سے اوجھل رکھا اور ان کی پیدائش کی مطلق کسی کو خبر نہ ہونے دی، لیکن جاسوسوں کی دیکھ بھال اور حالات کی نزاکت کی وجہ سے زیادہ دیر تک اس واقعہ کے پوشیدہ رہنے کی توقع نہ ہوسکی اور اس لیے ان کی والدہ سخت پریشان رہنے لگی۔

اس سخت اور نازک وقت میں آخر خدائے قدوس نے مدد کی اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں یہ القاء کیا کہ ایک تابوت کی طرح کا صندوق بناؤ جس پر رال اور روغن کی پالش کروتا کہ پانی اندر اثر نہ کر سکے اور اس میں اس بچہ کو محفوظ رکھ دو اور پھر اس صندوق کو نیل کے بہاؤ پر چھوڑ دو۔ ❶

موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ایسا ہی کیا، اور ساتھ ہی اپنی بڑی لڑکی اور موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیر کو مامور کیا کہ وہ اس صندوق کے بہاؤ کے ساتھ کنارے کنارے چل کر صندوق کو نگاہ میں رکھے اور دیکھے کہ خدا اس کی حفاظت کا وعدہ کس طرح پورا کرتا ہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو خدائے تعالیٰ نے یہ بشارت پہلے ہی سنا دی تھی کہ ہم اس بچہ کو تیری ہی جانب واپس کر دیں گے اور یہ ہمارا پیغمبر اور رسول ہوگا۔

---

❶ خروج ۲ آیت ۲۰

Marfat.com

فرعون کے گھر میں تربیت:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیر برابر صندوق کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ کنارے کنارے نگہداشت کرتی جا رہی تھیں کہ انہوں نے دیکھا کہ صندوق تیرتے ہوئے شاہی محل کے کنارے آ لگا اور فرعون کے گھرانے میں سے ایک عورت نے اپنے خادموں کے ذریعے اس کو اٹھوا لیا اور شاہی محل میں لے گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیر یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور حالات کی صحیح تفصیل معلوم کرنے کے لیے شاہی محل کی خادماؤں میں شامل ہو گئی۔

قرآن عزیز نے اس شاہی خاندان کی عورت کو فرعون کی بیوی بتایا ہے اور تورات کے حصہ "خروج" میں اس کو فرعون کی بیٹی کہا ہے مگر مؤرخین اس اختلاف کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے، اور کہتے ہیں کہ یہ ہو سکتا ہے کہ پانی میں بہتے ہوئے صندوق کو فرعون کی بیٹی نے اٹھایا ہو اور پھر بیٹا بنانے کی آرزو، اور فرعون سے اس بچہ کے قتل نہ کرنے اور خود پالنے کی خواہش کا اظہار اور فرعون سے سفارش فرعون کی بیوی (آسیہ) نے کی ہو۔

قرآن کریم کے اسلوب بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو دریا سے نکالنے والے کے متعلق کہا ہے:

﴿فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ﴾ (القصص: ۸)

"اس کو اٹھایا فرعون کے گھر والوں نے"

اور بیٹا بنانے کی آرزو اور اس کے قتل نہ کرنے کی سفارش کرنے والے کے متعلق فرمایا:

﴿وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ﴾ (القصص: ۸)

"اور فرعون کی بیوی نے کہا"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی منقول ہے۔

بہرحال فرعون کے گھر والوں نے جب صندوق کھولا تو دیکھا کہ ایک حسین اور تندرست بچہ آرام سے لیٹا ہوا انگوٹھا چوس رہا ہے، فرعون کی بیٹی فوراً اس کو محل میں لے گئی، فرعون کی بیوی نے بچہ کو دیکھا تو باغ باغ ہو گئی اور انتہائی محبت سے اس کو پیار کیا، محل کے شاگرد پیشہ میں سے کسی نے کہا کہ یہ تو اسرائیلی معلوم ہوتا ہے اور ہمارے دشمنوں کے خاندان کا بچہ ہے اس کا قتل کر دینا ضروری ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی ہمارے خواب کی تعبیر ثابت ہو؟ اس بات کو سن کر فرعون کو بھی خیال پیدا ہوا، فرعون کی بیوی نے شوہر کے تیور دیکھے تو کہنے لگی کہ ایسے پیارے بچہ کو قتل نہ کرو، کیا عجب کہ یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بنے، یا ہم اس کو اپنا بیٹا ہی بنا لیں اور ہمارے لیے اس کا وجود نفع بخش ثابت ہو، یعنی اگر یہ وہی اسرائیلی بچہ ثابت ہو جو تیرے خواب کی تعبیر بننے والا ہے تو ہماری محبت اور آغوش تربیت شاید اس کو مضر ہونے کے بجائے مفید ثابت کر دے، مگر فرعون اور اس کے خاندان کو یہ کیا معلوم کہ خدا کی تقدیر ان پر ہنس رہی ہے کہ رب العالمین کی کرشمہ سازی دیکھو کہ تم اپنی نادانی اور بے خبری میں اپنے دشمن کی پرورش پر نگران مقرر کیے گئے ہو۔

غرض اب یہ سوال پیدا ہوا کہ بچہ کے لیے دودھ پلائی مقرر کی جائے مگر خدائے تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے کیے گئے

Marfat.com

وعدہ کو پورا کرنے کے لیے بچہ کی طبیعت میں یہ بات پیدا کر دی کہ وہ کسی عورت کے پستان کو منہ ہی نہیں لگاتا، شاہی دایہ تھک کر بیٹھ گئی مگر موسیٰ علیہ السلام نے کسی ایک پستان سے بھی دودھ نہ پیا، یہ سارا حال موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیر مریم دیکھ رہی تھیں، کہنے لگیں اگر اجازت ہو تو میں ایک ایسی دایہ کا پتہ بتاؤں جو نہایت نیک اور اس خدمت کے لیے بہت موزوں ہے بلکہ حکم ہو تو میں خود اس کو ساتھ لے کر آؤں؟ فرعون کی بیوی نے دایہ کو لانے کا حکم دے دیا، اور موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیر خوش خوش گھر کو روانہ ہوئیں کہ والدہ کو لے کر آئیں۔

شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ موضح القرآن میں فرماتے ہیں...... فرعون کی عورت تھی بنی اسرائیل میں سے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چچا کی بیٹی اس لفظ سے وہ پہچان گئی کہ لڑکا ان کا ہے۔ ❶

یہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا ادھر برا حال تھا، ایک الہامی خیال سے بچہ کو سپرد دریا تو کر آئیں مگر ماں کی مامتا نے زور کیا اور بے چین ہو کر اس پر آمادہ ہو گئیں کہ اپنے اس راز کو افشاء کر دیں، اسی اضطراب و بے چینی کی حالت میں خدائے تعالیٰ نے ان پر اپنے فضل و کرم کی بارش کی اور ان کے قلب میں اطمینان و سکون نازل کیا، اب لطیفہ غیبی کے انتظار میں چشم براہ تھیں کہ لڑکی نے آ کر پوری داستان کہہ سنائی اور بتایا کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے کسی دایہ کا بھی دودھ نہ پیا تو میں نے کہا اسرائیلی قبیلہ میں ایک نہایت شریف اور نیک عورت ہے وہ اس بچہ کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کر سکتی ہے، فرعون کی بیوی نے یہ سن کر مجھ کو حکم دیا ہے کہ فوراً آپ کو لے کر آؤں، یہ ہم پر خدا کا بڑا احسان اور فضل و کرم ہوا، اب تم چل کر اپنے بچہ کو سینے سے لگاؤ اور آنکھیں ٹھنڈی کرو اور اس کا شکر ادا کرو کہ اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

﴿وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَ لَا تَخَافِىْ وَ لَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ ۝ وَ قَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّىْ وَ لَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِىْ بِهٖ لَوْ لَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَ قَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۫ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَ حَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَ هُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ۝ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ كَىْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ وَ لِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (القصص: ۷۔۱۳)

"اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ (علیہ السلام) کی ماں کو کہ اس کو دودھ پلاتی رہ پھر جب تجھ کو ڈر ہو اس کا تو ڈال دے اس کو دریا میں اور نہ خطرہ کر اور نہ غمگین ہو، ہم پھر پہنچا دیں گے اس کو تیری طرف اور کریں گے اس کو رسولوں سے، پھر اٹھا لیا اس کو فرعون

---

❶ مفسرین نے فرعون کی اس بیوی کا نام "آسیہ" بتایا ہے اور قرآن عزیز امراۃ فرعون کو مومنہ قرار دیتا ہے، بایں ہمہ یہ قول کہ وہ اسرائیلی تھیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چچازاد بہن ضعیف ہے، صحیح یہ ہے کہ وہ فرعون ہی کے خاندان سے تھیں۔ (روح المعانی جلد ۲۰ ص ۱)۔

Marfat.com

کے گھر والوں نے کہ ہو ان کا دشمن اور غم میں ڈالنے والا، بیشک فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر تھے چوکنے والے، اور بولی فرعون کی عورت یہ تو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے میرے لیے اور تیرے لیے اس کو مت مارو کچھ بعید نہیں جو ہمارے کام آئے یا ہم اس کو بنالیں بیٹا، اور ان کو کچھ خبر نہ تھی اور صبح کو موسیٰ (علیہ السلام) کی ماں کے دل میں قرار نہ رہا۔ قریب تھی کہ ظاہر کر دے بے قراری کو اگر ہم نہ مضبوط کر دیتے اس کے دل کو تا کہ رہے یقین کرنے والوں میں اور کہہ دیا اس کی بہن کو پیچھے چلی جا، پھر دیکھتی رہی اس کو اجنبی ہو کر اور ان کو خبر نہ ہوئی اور روک رکھا تھا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے دائیوں کو پہلے سے، پھر بولی میں بتاؤں تم کو ایک گھر والے کہ اس کو پال دیں تمہارے لیے اور وہ اس کا بھلا چاہنے والے ہیں، پھر ہم نے پہنچا دیا اس کو اس کی ماں کی طرف کہ ٹھنڈی رہے اس کی آنکھ اور غمگین نہ ہو اور جانے کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے پر بہت لوگ نہیں جانتے۔"

﴿ وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰۤى ۝ اِذْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّكَ مَا يُوْحٰۤى ۝ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَ عَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ۬ وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ۝ اِذْ تَمْشِيْۤ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰۤى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ ؕ﴾ (طٰہٰ: ۳۷۔۴۰)

"اور (تجھے معلوم ہے) ہم تجھ پر پہلے بھی ایک مرتبہ کیسا احسان کر چکے ہیں؟ ہم تجھے بتاتے ہیں، اس وقت کیا ہوا تھا جب ہم نے تیری ماں کے دل میں بات ڈال دی تھی، ہم نے اسے سمجھایا تھا کہ بچہ کو ایک صندوق میں ڈال دے اور صندوق میں ڈال دے اور صندوق کو دریا میں چھوڑ دے، دریا اسے کنارے پر دھکیل دے گا، پھر اسے وہ اٹھا لے گا جو میرا (یعنی میری مسلم قوم کا) دشمن ہے، نیز اس بچہ کا بھی دشمن، اور (اے موسیٰ علیہ السلام) ہم نے اپنے فضل خاص سے تجھ پر محبت کا سایہ ڈال دیا تھا (کہ اجنبی بھی تجھ سے محبت کرنے لگے) اور یہ اس لیے تھا کہ ہم چاہتے تھے تو ہماری نگرانی میں پرورش پائے، تیری بہن جب وہاں سے گذری، تو (یہ ہماری ہی کارفرمائی تھی کہ) اس نے (فرعون کی لڑکی سے) کہا میں تمہیں ایسی عورت بتلا دوں جو اسے پالے پوسے؟ اور اس طرح ہم نے تجھے پھر تیری ماں کی گود میں لوٹا دیا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور (بچہ کی جدائی سے) غمگین نہ ہو۔"

تورات میں ہے کہ جب موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ نے موسیٰ علیہ السلام کا دودھ چھڑایا تو انہوں نے ان کو فرعون کی بیٹی کے سپرد کر دیا، اور اس کے بعد عرصہ تک وہ شاہی محل میں زیر تربیت رہے اور وہیں نشوونما پائی، مگر تورات کا یہ کہنا واقعہ کے بالکل خلاف ہے کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون کی لڑکی کے بیٹے بنے۔

جب لڑکا بڑھا وہ اسے فرعون کی بیٹی پاس لائی اور وہ اس کا بیٹا ٹھہرا اور اس نے اس کا نام موسیٰ (عبرانی موشی) رکھا اور کہا اس سبب سے کہ میں نے اسے پانی سے نکالا۔ [1]

---

[1] خروج باب ۲ آیت ۱۰

Marfat.com

موسیٰ علیہ السلام کا مصر سے نکلنا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک عرصہ تک شاہی تربیت میں بسر کرتے کرتے شباب کے دور میں داخل ہوئے تو نہایت قوی الجثہ اور بہادر جوان نکلے، چہرہ سے رعب ٹپکتا اور گفتگو سے ایک خاص وقار اور شان عظمت ظاہر ہوتی تھی، ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اسرائیلی ہیں اور مصری خاندان سے ان کا کوئی رشتہ قرابت نہیں ہے، انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ بنی اسرائیل پر سخت مظالم ہو رہے ہیں اور وہ مصر میں نہایت ذلت اور غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، یہ دیکھ کر ان کا خون کھولنے لگتا اور موقعہ بہ موقعہ عبرانیوں کی حمایت و نصرت میں پیش پیش ہو جاتے۔

طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام جوان ہو گئے اور قوی ہیکل جوان ثابت ہوئے تو عبرانیوں کے معاملات میں ان کی نصرت وحمایت کا یہ اثر ہوا کہ مصری گماشتوں کے مظالم عبرانیوں پر کم ہونے لگے۔ (طبری)

اور اس میں شک نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کی ذلت و غلامی پر غم وغصہ اور ان کی حمایت ونصرت کا عمیق اور بے پناہ جذبہ ایک فطری اور قدرتی جذبہ تھا۔

اب اللہ تعالیٰ کے عطاء ونوال کا ہاتھ اور آگے بڑھا اور جسمانی طاقت وقوت کے ساتھ اس نے ان کو زیور علم وحکمت سے بھی نوازا اور سن رُشد کو پہنچ کر ان کی قوت فیصلہ اور دقت علم ونظر بھی عروج تک پہنچ گئے اور اس طرح ان کو جسمانی و روحانی تربیت کا کمال حاصل ہو گیا۔

﴿وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝﴾ (القصص: ۲۲)

”اور جب (موسیٰ علیہ السلام) پہنچا اپنے زور پر اور سنبھالا تو بخشا ہم نے اس کو (قوت) فیصلہ اور علم اور اس طرح ہم نیکو کاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔“

غرض موسیٰ علیہ السلام شہر میں گشت کرتے ہوئے اکثر ان حالات کا مشاہدہ کرتے رہتے اور گاہے گاہے بنی اسرائیل کی مدد کرتے۔

ایک مرتبہ شہری آبادی سے ایک کنارہ جا رہے تھے کہ دیکھا ایک مصری ایک اسرائیلی کو بیگار کے لیے گھسیٹ رہا ہے، اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تو لگا فریاد کرنے اور مدد چاہنے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصری کی اس جابرانہ حرکت پر سخت غصہ آیا اور اس کو باز رکھنے کی کوشش کی، مگر مصری نہ مانا، موسیٰ علیہ السلام نے غصہ میں آ کر ایک طمانچہ رسید کر دیا، مصری اس ضرب کو برداشت نہ کر سکا اور اسی وقت مر گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا تو بہت افسوس کیا کیونکہ ان کا ارادہ ہرگز اس کے قتل کا نہ تھا، اور ندامت و شرمندگی کے ساتھ دل میں کہنے لگے کہ بلاشبہ یہ کار شیطان ہے، وہی انسان کو ایسی غلط راہ پر لگاتا ہے، اور خدائے تعالیٰ کی درگاہ میں عرض کرنے لگے کہ یہ جو کچھ ہوا نادانستگی میں ہوا، میں تجھ سے مغفرت کا خواستگار ہوں، خدا نے بھی ان کی غلطی کو معاف کر دیا اور مغفرت کی بشارت سے نوازا۔ ادھر شہر میں مصری کے قتل کی خبر شائع ہو گئی مگر قاتل کا کچھ پتہ نہ چلا، آخر مصریوں نے فرعون کے پاس استغاثہ کیا کہ یہ کام کسی اسرائیلی کا ہے لہٰذا آپ دادرسی فرمائیے، فرعون نے کہا کہ اس طرح ساری قوم سے تو بدلہ نہیں لیا جا سکتا تم قاتل کا پتہ لگاؤ، میں ضرور اس کو کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔

سوء اتفاق کہئے یا حسن اتفاق کہ دوسرے دن بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر کے آخری کنارہ پر سیر فرما رہے تھے کہ دیکھا وہی اسرائیلی ایک قبطی سے جھگڑ رہا ہے اور قبطی غالب ہے، موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر کل کی طرح آج بھی اس نے فریاد کی اور دادرسی کا خواستگار ہوا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوہری ناگواری محسوس کی، ایک جانب قبطی کا ظلم تھا اور دوسری جانب اسرائیلی کا شور و غوغا اور گذشتہ واقعہ کی یاد تھی، اس جھنجھلاہٹ میں ایک طرف انہوں نے مصری کو باز رکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور ساتھ ہی اسرائیلی کو بھی جھڑکتے ہوئے فرمایا ﴿اِنَّکَ لَغَوِیٌّ مُّبِیۡنٌ﴾ تو بھی بلاشبہ کھلا ہوا گمراہ ہے، یعنی خواہ مخواہ جھگڑا مول لے کر دادفریاد کرتا رہتا ہے۔

اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہاتھ بڑھاتے، اور پھر اپنے متعلق ناگوار اور تلخ الفاظ کہتے سنا تو یہ سمجھا کہ یہ مجھ کو مارنے کے لیے ہاتھ بڑھا رہے ہیں اور مجھ کو گرفت میں لینا چاہتے ہیں، اس لیے شرارت آمیز انداز سے کہنے لگا:

﴿ اَتُرِيۡدُ اَنۡ تَقۡتُلَنِىۡ كَمَا قَتَلۡتَ نَفۡسًۢا بِالۡاَمۡسِ ۖ ﴾ (القصص: ۱۹)

"جس طرح تو نے کل ایک جان (قبطی) کو ہلاک کر دیا تھا اسی طرح آج مجھ کو قتل کر دینا چاہتا ہے۔"

مصری نے جب یہ سنا تو اسی وقت فرعونیوں سے جا کر ساری داستان کہہ سنائی انہوں نے فرعون کو اطلاع دی کہ مصری کا قاتل موسیٰ ہے، فرعون نے یہ سنا تو جلاد کو حکم دیا کہ موسیٰ (علیہ السلام) کو گرفتار کر کے حاضر کرے، مصریوں کے اس مجمع میں ایک معزز مصری وہ بھی تھا جو دل و جان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محبت رکھتا اور اسرائیلی مذہب کو حق جانتا تھا، یہ فرعون ہی کے خاندان کا فرد تھا اور دربار کا حاضر باش، اس نے فرعون کا یہ حکم سنا تو فرعونی جلادوں سے پہلے ہی دربار سے نکل کر دوڑتا ہوا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان سے سارا قصہ بیان کیا، اور ان کو مشورہ دیا کہ اس وقت مصلحت یہی ہے کہ خود کو مصریوں سے نجات دلایئے اور کسی ایسے مقام میں ہجرت کر جایئے جہاں ان کی دسترس نہ ہو سکے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے مشورہ کو قبول فرمایا اور ارض مدین کی جانب خاموشی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اس مقام پر یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن عزیز نے اس شخص کے متعلق اس قدر کہا ہے:

﴿ وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنۡ اَقۡصَا الۡمَدِيۡنَةِ يَسۡعٰى ﴾ (القصص: ۲۰)

"اور شہر کے آخری کنارہ سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔"

مگر ہم نے اس کے اوصاف میں "شریف" اور "معزز" کا اضافہ کر دیا تو بقول نجار اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس آنے والے شخص کے متعلق دو صفات بیان کی ہیں۔

① وہ شہر کے آخری کنارے سے آیا تھا، اور عرب میں یہ مثل مشہور ہے کہ:

الاطراف سکنی الاشراف۔ "شہر کے کنارے شرفاء کے رہنے کی جگہ ہیں"۔

② اس نے آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا:

﴿ اِنَّ الۡمَلَاَ يَاۡتَمِرُوۡنَ بِكَ لِيَقۡتُلُوۡكَ ﴾ "بھری جماعت تیرے قتل کا مشورہ کر رہی ہے۔"

اور یہ ظاہر ہے کہ یہ علم اسی شخص کو ہو سکتا ہے جو فرعون اور اس کے ارکان کے درمیان نمایاں حیثیت رکھتا ہو۔ ❶

---

❶ قصص الانبیاء ص ۱۹۷

Marfat.com

﴿ وَ دَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۗ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَ هٰذَا
مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۗ قَالَ هٰذَا
مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ
هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶﴾ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۷﴾ فَاَصْبَحَ فِي
الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤى اِنَّكَ لَغَوِيٌّ
مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾ فَلَمَّاۤ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا
قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۗ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَ مَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ
الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾ وَ جَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۫ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ
لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۰﴾ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۫ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ
الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۱﴾ ﴾ (القصص: ۱۵۔۲۱)

"اور آیا شہر کے اندر جس وقت بے خبر ہوئے تھے وہاں کے لوگ، پھر پائے اس میں دو مرد لڑتے ہوئے یہ ایک اس کے رفیقوں میں اور یہ دوسرا اس کے دشمنوں میں، پھر فریاد کی اس سے اس نے جو تھا اس کے رفیقوں میں اس کے مقابلہ میں جو تھا اس کے دشمنوں میں پھر مکا مارا اس کو موسیٰ (علیہ السلام) نے پھر، اس کو تمام کر دیا، بولا یہ ہوا شیطان کے کام سے، بیشک وہ دشمن ہے بہکانے والا صریح موسیٰ (علیہ السلام) بولا! اے میرے رب میں نے برا کیا اپنا سو بخش مجھ کو، پھر اس کو بخش دیا بیشک وہی ہے بخشنے والا مہربان، بولا اے رب جیسا تو نے فضل کر دیا مجھ پر پھر میں کبھی نہ ہوں گا مددگار گنہگاروں کا پھر صبح کو اٹھا اس شہر میں ڈرتا ہوا انتظار کرتا ہوں پھر ناگہاں دیکھا جس نے کل مدد مانگی تھی وہ آج پھر فریاد کرتا ہے، اس سے کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے بیشک بے راہ ہے صریح پھر جب چاہا کہ ہاتھ ڈالے اس پر جو دشمن تھا ان دونوں کا، بول اٹھا فریاد کرنے والا "اے موسیٰ (علیہ السلام) کیا تو چاہتا ہے کہ خون کرے میرا جیسے خون کر چکا ہے کل ایک جان کا، تیرا یہی جی چاہتا ہے کہ زبردستی کرتا پھرے ملک میں اور نہیں چاہتا کہ ہو صلح کرا دینے والا، اور آیا شہر کے پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا، کہا اے موسیٰ (علیہ السلام)! دربار والے مشورہ کرتے ہیں تیرے متعلق کہ تجھ کو مار ڈالیں سو نکل جا، میں تیرا بھلا چاہنے والا ہوں، پھر نکلا وہاں سے ڈرتا ہوا راہ دیکھتا، بولا! اے رب بچا لے مجھ کو اس قوم بے انصاف سے۔"

﴿ وَ قَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۫ ﴾ (طٰہٰ: ۴۰)

"اور تو نے ایک شخص کو مار ڈالا پھر ہم نے تجھ کو غم سے نجات دی اور جانچا تجھ کو معمولی جانچنا۔"

اس مقام پر قرآن عظیم اور تورات کے بیانات میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے:

Marfat.com

① قرآن حکیم نے دوسرے دن کے جھگڑا کرنے والوں میں سے ایک کو عبرانی بتایا ہے، اور دوسرے کو مصری (فرعونی) اور تورات دونوں کا عبرانی ہونا ظاہر کرتی ہے۔

② تورات میں اس شخص کا کوئی ذکر نہیں ہے جس نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعونیوں کے مشورہ کی اطلاع دی تھی۔

مگر ان دونوں باتوں کے متعلق (بلالحاظ جانبداری) عقل اور فطرت اسی جانب رہنمائی کرتی ہے کہ قرآن عزیز کی تفصیلات صحیح ہیں، اور اسی پر یقین رکھنا ضروری ہے، اس لیے کہ فرعون اور فرعونیوں کے نزدیک تو اسرائیلیوں کی جان کی کوئی وقعت ہی نہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام جیسے شاہی خاندان میں رہنے والے شخص کے مقابلہ میں قصاص کے طالب ہوتے اور دوسری بات تورات کے بیان پر ایک فطری اضافہ ہے جو علم و یقین کے ساتھ کیا گیا۔

موسیٰ علیہ السلام اور ارض مدین:

حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعات میں "مدین" کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب مصر سے روانہ ہونے کا ارادہ کیا تو اسی جگہ کو منتخب فرمایا، مدین کی آبادی مصر سے آٹھ منزل پر واقع تھی۔ ❶ غالباً یہ انتخاب اس لیے کیا گیا کہ یہ قبیلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نزدیک کی قرابت رکھتا تھا اس لیے کہ حضرت موسیٰ، حضرت اسحاق بن ابراہیم (علیہما السلام) کی نسل سے ہیں اور یہ قبیلہ اسحاق علیہ السلام کے بھائی مدین بن ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ فرعون کے خوف سے بھاگے تھے اس لیے ان کے ہمراہ نہ کوئی رفیق اور رہنما تھا اور نہ زادِ راہ، اور تیز روی کی وجہ سے برہنہ پاؤں تھے، طبری بروایت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں کہ اس تمام سفر میں موسیٰ علیہ السلام کی خوراک درختوں کے پتوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھی، اور برہنہ پاؤں ہونے کی وجہ سے سفر کی طوالت نے پاؤں کے تلووں کی کھال تک اڑا دی تھی، اس پریشان حالی میں موسیٰ علیہ السلام ارض مدین میں داخل ہوئے۔ ❷

آبِ مدین:

جب مدین کی سرزمین میں قدم رکھا تو دیکھا کہ کنوئیں کے سامنے پانی کے حوض (پیاؤ) پر بھیڑ لگی ہوئی ہے اور جانوروں کو پانی پلایا جا رہا ہے مگر اس جماعت سے ذرا فاصلہ پر دو لڑکیاں کھڑی ہیں اور اپنے جانوروں کو پانی پر جانے سے روک رہی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہاں بھی وہی سب ہو رہا ہے جو دنیا کی ظالم طاقتوں نے اختیار کر رکھا ہے اور خدائے برتر کے بہترین قانون کو توڑ کر قوموں کا سارا نظام ظلم کی بنیادوں پر قائم کر دیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیاں کمزور اور ضعیف گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں تب ہی تو اس انتظار میں ہیں کہ قوی اور سرکش جب اپنے جانوروں کو سیراب کر چکیں اور ہر وارد و صادر پانی پر سے چلا جائے تو بچا کھچا پانی ان کے جانوروں کا حصہ بنے، ہر قوی نے ضعیف کے لیے یہی قانون تجویز کر دیا ہے کہ ہر فائدے میں وہ مقدم ہے اور ضعیف مؤخر، اور قوی کا "اولش خور" عرب کا مشہور شاعر عمرو بن کلثوم کہتا ہے:

ونشرب ان وردنا الماء صفوا و یشرب غیرنا کدرا وطینا

---

❶ طبری عن سعید بن جبیرؓ ج ۱ ص ۲۰۵ ❷ تاریخ طبری ج ۱ ص ۲۰۵

Marfat.com

"اور ہم جب کسی پانی پر آتے ہیں تو عمدہ اور صاف پانی ہمارے حصہ میں آتا ہے اور ہمارے غیروں کے (جو ہم سے کمزور ہیں) حصہ میں گدلا پانی اور مٹی ہے۔"

درحقیقت یہ شعر تنہا عمرو بن کلثوم اور اس کے قبیلے کی حالت کا نقشہ نہیں ہے بلکہ ساری دنیا کے ظالمانہ نظام کا ٹھیک آئینہ دار ہے۔

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ حالت نہ دیکھی گئی اور آگے بڑھ کر لڑکیوں سے دریافت کیا "تم کیوں پانی نہیں پلاتیں، پیچھے کس لیے کھڑی ہو؟" دونوں نے جواب دیا ہم مجبور ہیں اگر جانوروں کو آگے لے کر بڑھتے ہیں تو یہ طاقتور زبردستی ہم کو پیچھے ہٹا دیتے ہیں، اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں ان میں اب یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ ان کی مزاحمت کو دور کر سکیں پس جب یہ سب پانی پلا کر واپس ہو جائیں گے تب بچا ہوا پانی ہم پلا کر لوٹیں گے یہی ہمارا روز کا دستور ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوش آ گیا اور آگے بڑھ کر تمام بھیڑ کو چیرتے ہوئے کنوئیں پر جا پہنچے اور کنوئیں کا بڑا ڈول اٹھایا اور تنہا کھینچ کر لڑکیوں کے مویشیوں کو پانی پلا دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مجمع کو چیرتے ہوئے درانہ گھسنے لگے تو اگرچہ لوگوں کو ناگوار گذرا مگر ان کی پر جلال صورت اور جسمانی طاقت سے مرعوب ہو گئے اور ڈول کو تنہاء کھینچتے دیکھ کر اسی قوت سے ہار مان گئے جس کے بل بوتے پر کمزوروں اور ناتوانوں کو پیچھے ہٹا دیا کرتے اور ان کی حاجات کو پامال کرتے رہتے تھے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ کنوئیں کے منہ پر بہت بڑا پتھر ڈھکا ہوا ہے جو ایک جماعت کے متفقہ زور لگانے سے اپنی جگہ سے ہٹتا ہے، مگر وہ آگے بڑھے اور تنہا اس کو ہٹا کر لڑکیوں کے مویشیوں کے لیے پانی بھر دیا، عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ یہ قول قرآن حکیم کی تصریح کے خلاف ہے، قرآن کہتا ہے:

﴿ وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ﴾ (القصص: ۲۳)

"اور جب وہ مدین کے پانی پر پہنچے تو اس پر ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ پانی پلا رہی ہے۔"

تو پھر یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ کنوئیں کا منہ پتھر سے ڈھکا ہوا ہو اور جس طرح یہ قول صحیح نہیں اسی طرح یہ تاویل بھی درست نہیں ہے کہ اس مقام پر دو کنوئیں تھے ایک سے مدین کے لوگ پانی پلا رہے تھے اور دوسرے کا منہ پتھر سے ڈھکا ہوا تھا اور یہ کہ اس زمانہ میں بھی اس مقام پر دو کنوئیں موجود پائے گئے ہیں۔

اس تاویل کے درست نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اول تو قرآن حکیم نے دوسرے کنوئیں کا قطعی کوئی ذکر نہیں کیا اور جو کچھ بیان کیا ہے ایک ہی سے متعلق بیان کیا ہے، دوسرے بعد میں اس جگہ دو کنوئیں ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس وقت بھی وہاں اسی طرح دو کنوئیں موجود تھے، ہو سکتا ہے کہ عرصہ دراز کے بعد یا اسلامی عہد میں ضرورت کے لحاظ سے یہاں دوسرا کنواں تیار کیا گیا ہو، پس قرآن حکیم کے صاف اور سادہ بیان کو محض ایک غیر مستند روایت کی خاطر پیچیدہ بنانا قطعی بے محل اور غیر مناسب ہے۔

غرض جب ان لڑکیوں کے گلے نے پانی پی لیا تو وہ گھر کو واپس چلیں، گھر پہنچیں تو خلاف عادت جلد واپسی پر ان کے والد کو سخت تعجب ہوا، دریافت کرنے پر لڑکیوں نے گذرا ہوا ماجرا کہہ سنایا کہ کس طرح ایک "مصری" نے ان کی مدد کی، باپ نے کہا عجلت

Marfat.com

سے جاؤ اور اس کو میرے پاس لے کر آؤ۔

یہاں تو باپ بیٹی کے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی اور ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام پانی پلانے کے بعد قریب ہی ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کر ستانے لگے، مسافرت وغربت اور پھر بھوک پیاس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی "پروردگار! اس وقت جو بھی بہتر سامان میرے لیے تو اپنی قدرت سے نازل کرے میں اس کا محتاج ہوں"۔

لڑکی تیزی سے وہاں پہنچی تو دیکھا کہ کنوئیں کے قریب ہی وہ بیٹھے ہوئے ہیں شرم وحیاء کے ساتھ نیچی نظریں کیے لڑکی نے کہا: "آپ ہمارے گھر چلیے والد بلاتے ہیں، وہ آپ کے اس احسان کا بدلہ دیں گے" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوچا کہ شاید اس سلسلہ میں کوئی بہتر صورت نکل آئے اس لیے چلنا ہی بہتر ہے اور اس کی دعوت کو رد کرنا مناسب نہیں، خدا نے میری دعاء سن لی اور یہ اسی کا پیش خیمہ ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اٹھ کھڑے ہوئے اور لڑکی کو ہدایت کی کہ وہ آگے نہ چلے بلکہ میرے پیچھے پیچھے چلے اور ٹھیکری یا اشارے کے ساتھ راہ کی رہنمائی کرے۔

موسیٰ علیہ السلام چل تو پڑے لیکن طبعی اور فطری غیرت اور عزت نفس کے پیش نظر بار بار اس جملہ سے متاثر ہو رہے تھے: "میرا باپ تم کو اس محنت کا عوض دینا چاہتا ہے" مگر مسافرت اور حالات کی نزاکت نے آخر یہی مشورہ دیا کہ اس وقت اس گرانی کو بھی انگیز کر لو تا کہ اس غربت میں ایک غم خوار اور مونس وہمدم کی مستقل ہمدردی کو حاصل کیا جا سکے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام چلتے چلتے منزل مقصود پر پہنچے اور اس بزرگ صورت وسیرت انسان کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف ملاقات سے بہرہ اندوز ہوئے بزرگ نے پہلے کھانا کھلایا اور پھر اطمینان کے ساتھ بٹھا کر ان کے حالات سنے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عین وعن اپنی ولادت اور فرعون کے بنی اسرائیل پر مظالم سے شروع کر کے آخر تک ساری داستان کہہ سنائی، سب کچھ سننے کے بعد بزرگ نے موسیٰ علیہ السلام کو تسلی دی اور فرمایا کہ خدا کا شکر کرو کہ اب تم کو ظالموں کے پنجہ سے نجات مل گئی، اب کوئی خوف کا مقام نہیں ہے۔

یہاں قوم ظالمین کے ظلم سے بنی اسرائیل کے بچوں کا قتل اور ان کی غلامی وتباہ حالی کے واقعات ہی مراد ہو سکتے ہیں، نیز ان کا کفر اور فساد فی الارض، ورنہ تو قبطی کے قتل میں تو خود موسیٰ علیہ السلام بھی اپنے فعل پر نادم تھے اور خود کو قصور وار سمجھتے تھے۔

﴿وَ لَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝ وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۫ وَ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٜ وَ اَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ۝ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ۝ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۫ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَ قَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ٙ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ (القصص: ۲۲۔۲۵)

"اور جب منہ کیا مدین کی سیدھ پر، بولا امید ہے کہ میرا رب لے جائے مجھ کو سیدھی راہ پر اور جب پہنچا مدین کے پانی پر

پایا وہاں ایک جماعت کو لوگوں کی پلاتی پلاتے ہوئے اور پایا ان سے ورے دو عورتوں کو کہ روکے ہوئے کھڑی تھیں اپنی بکریاں، بولا تمہارا کیا حال ہے، بولیں ہم نہیں پلاتیں پانی چرواہوں کے پھیر لے جانے تک اور ہمارا باپ بوڑھا ہے بڑی عمر کا پھر اس نے پانی پلا دیا اس کے جانوروں کو، پھر ہٹ کر آیا چھاؤں کی طرف، بولا اے رب! تو جو چیز اتارے میری طرف اچھی میں اس کا محتاج ہوں، پھر آئی اس کے پاس ان دونوں میں سے ایک چلتی تھی شرم سے بولی میرا باپ تجھ کو بلاتا ہے کہ بدلے میں دے حق اس کا کہ تو نے پانی پلا دیا ہمارے جانوروں کو، پھر جب پہنچا اس کے پاس اور بیان کیا اس سے احوال، کہا مت ڈر بچ آیا تو اس قوم بے انصاف سے۔"

تورات میں اس موقعہ پر بھی دو جگہ اختلاف موجود ہے:

① وہ لڑکیوں کی تعداد دو کی جگہ سات بتاتی ہے۔

② اس کا بیان ہے کہ لڑکیوں نے حوض کو پانی سے بھر لیا تھا مگر دوسرے لوگوں نے زبردستی ان کو ہٹا کر اپنے جانوروں کو پانی پلانا شروع کر دیا، یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غصہ آیا۔

ہم کو اس موقع پر بھی قرآن عزیز کے بیان پر ہی بھروسہ کرنا چاہئے اول اس لئے کہ سابق اختلافات میں قرآن عزیز کے بیانات کی روش عقل اور فطرت کے مطابق رہی ہے، دوسرے اس لئے کہ اس جگہ بھی تعداد کے معاملہ سے قطع نظر تورات کی دوسری بات اس لئے صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ لڑکیاں مدین ہی کے قبیلہ اور ان ہی کی بستی کی ساکن تھیں اور پانی کا معاملہ روزانہ ہی ان کے ساتھ پیش آتا رہتا تھا، لہٰذا ان کو یہ معلوم تھا کہ یہ قوی گروہ کسی حالت میں بھی ہم کو پیش قدمی نہیں کرنے دے گا، اور عرب کے شعرا کے کلام سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ پانی کے معاملہ میں خصوصیت کے ساتھ ان کے یہاں قوی کو ضعیف پر ترجیح حاصل تھی، اور عرب کے ماسواء دنیا کے ہر گوشہ میں یہی حال تھا، تو وہ کیسے اس اقدام کی جرأت کر سکتی تھیں، صحیح بات یہی ہے کہ وہ ضعیف گھرانے کی فرد ہونے اور پھر عورت ہونے کی وجہ سے اسی پر اکتفاء کرتی تھیں کہ جب سب پانی پلا کر واپس ہو جائیں تو بچے ہوئے پانی سے یہ فائدہ اٹھا لیں اور بس۔

رہا لڑکیوں کی تعداد کا معاملہ سو ابن کثیر رحمہ اللہ نے ہر دو اقوال کی مطابقت کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ مدین کے اس بزرگ کے سات لڑکیاں ہوں جیسا کہ تورات میں مذکور ہے مگر مدین کے پانی پر جو واقعہ پیش آیا اس میں صرف دو لڑکیاں ہی موجود تھیں جیسا کہ قرآن حکیم کی تصریح سے ظاہر ہوتا ہے۔

شیخ سے رشتۂ مصاہرت:

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قبیلہ مدین کے بزرگ میزبان کے درمیان یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اس لڑکی نے جو موسیٰ علیہ السلام کو بلانے گئی تھی اپنے باپ سے کہا: "اے باپ! آپ اس مہمان کو اپنے مویشیوں کے چرانے اور پانی مہیا کرنے کے لیے اجیر رکھ لیجئے اجیر وہی بہتر ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی"۔

مفسرین کہتے ہیں کہ باپ کو لڑکی کی یہ گفتگو عجیب سی معلوم ہوئی اور اس نے دریافت کیا، "تجھ کو اس مہمان کی قوت و امانت کا حال کیا معلوم؟" لڑکی نے جواب دیا: "میں نے مہمان کی قوت کا اندازہ تو اس سے کیا کہ کنوئیں کا بڑا ڈول (چرس) اس نے تنہا بھر

Marfat.com

کھینچ لیا، اور امانت کی آزمائش اس طرح کی کہ جب میں اس کو بلانے گئی تو اس نے مجھے دیکھ کر نیچی نظریں کر لیں، اور گفتگو کے دوران میں ایک مرتبہ بھی میری طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا، اور جب یہاں آنے لگا تو مجھ کو پیچھے چلنے کو کہا اور خود آگے آگے چلا، اور صرف اشاروں سے میں اس کی رہنمائی کرتی رہی۔ [1]

بزرگ باپ نے بیٹی کی ان باتوں کو سنا تو بہت مسرور ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اگر تم آٹھ سال تک میرے پاس رہو اور میری بکریاں چراؤ تو میں اپنی اس بیٹی کی تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں اور اگر تم اس مدت کو دو سال بڑھا کر دس سال کر دو تو اور بھی بہتر ہے، یہی اس لڑکی کا مہر ہوگا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس شرط کو منظور کر لیا اور فرمایا کہ یہ میری خوشی پر چھوڑیے کہ میں ان دونوں مدتوں میں سے جس کو چاہوں پورا کر دوں، آپ کی جانب سے مجھ پر اس بارہ میں کوئی جبر نہ ہوگا۔ طرفین کی اس باہمی رضامندی کے بعد بزرگ میزبان نے اس بیان کردہ مدت کو مہر قرار دے کر موسیٰ علیہ السلام سے اپنی اس بیٹی کی شادی کر دی۔

اور بعض مفسرین کا خیال ہے کہ مدت ختم ہونے پر "عقد" عمل میں آیا، اور عقد کے فوراً بعد ہی موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی کو لے کر روانہ ہو گئے، مفسرین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیوی کا نام "صفورہ" بتایا ہے۔

﴿قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۫ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۝ قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ؕ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ؕ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۝﴾ (القصص: ۲۶-۲۸)

"بولی ان دونوں میں سے ایک، اے باپ اس کو نوکر رکھ لے، البتہ بہتر نوکر جس کو تو نوکر رکھنا چاہے وہ ہے جو زور آور ہو امانت دار، کہا میں چاہتا ہوں کہ بیاہ دوں تجھ کو ایک بیٹی اپنی ان دونوں میں سے اس شرط پر کہ تو میری نوکری کرے آٹھ برس، پھر اگر تو پورے کر دے دس برس تو وہ تیری طرف سے ہے، اور میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر تکلیف ڈالوں تو پائے گا مجھ کو اگر اللہ نے چاہا نیک بختوں سے بولا یہ وعدہ ہو چکا میرے اور تیرے بیچ جونسی مدت ان دونوں میں پوری کر دوں سو زیادتی نہ ہو مجھ پر اور اللہ پر بھروسہ ہے اس چیز کا جو ہم کہتے ہیں"۔

﴿فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ ۬ۙ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۝ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۝﴾ (طٰه: ۴۰-۴۱)

"پھر تو نے مدین میں چند سال قیام کیا، پھر تو اے موسیٰ مقررہ اندازہ پر پورا اتر آیا اور میں نے تجھ کو اپنے لیے (اپنے خاص کام کے لیے) بنایا ہے"۔

موسیٰ علیہ السلام کے خسر کون ہیں؟:

قرآن عزیز نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور مدین کے شیخ کے متعلق جو واقعات بیان کیے ہیں ان میں کسی ایک جگہ بھی اس شیخ

[1] تفسیر ابن جریر سورۂ قصص

Marfat.com

نام نہیں بتایا، اس لیے تاریخی حیثیت سے شیخ مدین کے نام میں مؤرخین و مفسرین کے مختلف اقوال پائے جاتے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

① مفسرین اصحاب سیر اور ادباءِ عرب کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال ہے کہ یہ حضرت شعیب علیہ السلام ہیں، یہ قول بہت مشہور اور شائع ذائع ہے۔

مشہور مفسر امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے حسن بصری رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"لوگ کہتے ہیں کہ صاحب موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام ہیں"۔ ❶

اور حافظ عماد الدین کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حسن بصری رحمہ اللہ اسی طرف مائل ہیں کہ مدین کے شیخ حضرت شعیب علیہ السلام ہیں اور فرماتے ہیں کہ ابن ابی حاتم نے سلسلہ سند کے ساتھ مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے "کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ صاحب موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام ہیں۔" ❷

② ایک جماعت کہتی ہے کہ شیخ کا نام "یثرون" تھا اور یہ حضرت شعیب علیہ السلام کے بھتیجے تھے، طبری نے سند کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے کہ ابو عبیدہ فرماتے تھے کہ جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اجیر بنایا وہ شعیب علیہ السلام کا برادر زادہ یثرون تھا۔ ❸

③ بعض کہتے ہیں کہ صاحب موسیٰ علیہ السلام کا نام "یثری" تھا طبری نے سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اجیر رکھنے والا مدین کا شیخ "یثری" نامی تھا، اور اسی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں "عورت کے والد کا نام "یثری" تھا مگر یثری والی روایت میں یہ نہیں کہا گیا کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام کا برادر زادہ تھا۔ ❹ اور تورات نے اسی سے ملتا جلتا نام "یثرو" بتایا ہے۔ ❺

④ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ "شیخ" حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا ایک "مرد مومن" تھا۔

⑤ ایک جماعت کا گمان ہے کہ یہ "شیخ" نہ شعیب علیہ السلام ہو سکتے ہیں اور نہ ان کے بھتیجے اس لیے کہ قرآن عزیز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے کا زمانہ ہے جس کے درمیان صدیاں ہیں، قرآن حکیم کہتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو نصیحت فرماتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنكُم بِبَعِيدٍ﴾ (ھود:۸۹)

"اور قوم لوط (کا معاملہ) تم سے کچھ دور نہیں ہے۔"

یہ ظاہر ہے کہ قوم لوط کی ہلاکت کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ ہے اور ان کے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کی درمیانی مدت چار سو سال سے بھی زیادہ ہے، اور جن لوگوں نے اس مدت کو قریب کر دینے کے لیے یہ کہا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی عمر غیر معمولی طور پر طویل ہوئی، تو یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ ❻

---

❶ تفسیر سورۂ قصص۔ ❷ تفسیر ابن کثیر ج ۷ ص ۲۴۸۔ ❸ ابن جریر ج ۱ ص ۲۰۶۔

❹ تفسیر ابن کثیر ج ۷ ص ۲۴۸۔ ❺ تفسیر ابن کثیر ج ۷ ص ۲۴۸۔

❻ ان حوالہ جات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سید سلیمان صاحب کا یہ فرمانا صحیح نہیں ہے کہ "مسلمان مفسرین بھی علی العموم یثرو، حوباب اور شعیب کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔"

Marfat.com

اس قول کی تائید کے لیے یہ دلیل بھی قوت رکھتی ہے کہ اگر "صاحب موسیٰ علیہ السلام شعیب علیہ السلام ہوتے تو قرآن عزیز ضرور ان کے نام کی تصریح کرتا، اور اس طرح مجمل و مبہم نہ چھوڑتا۔

ان مختلف پانچ اقوال کی نقل کے بعد ہمارے نزدیک راجح اور صحیح مسلک وہی معلوم ہوتا ہے جو ابن جریر اور ابن کثیر جیسے جلیل القدر محدثین و مفسرین نے اختیار کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نام کی تصریح کے بارہ میں کوئی روایت صحت کو نہیں پہنچتی اور جو روایات نقل کی گئی ہیں، وہ قابل احتجاج نہیں ہیں، اس لیے جس طرح تصریح کیے بغیر قرآن عزیز نے ان کا ذکر کیا ہے، اسی طرح بھی ان کے نام کی تصریح کو خدا کے علم کے حوالہ کر دیں، ابن کثیر کی عبارت یہ ہے:

قال ابوجعفر (الطبری) و هذا مما لا يدرك علمه الا بخبر و لا خبر بذالك تجب حجة فلا قول في ذلك اولى بالصواب مما قاله الله جل ثناءه.... الخ ❶

"ابوجعفر طبری نے کہا ہے کہ نام کی تصریح کا یہ معاملہ خبر اور اطلاع کے بغیر طے نہیں ہو سکتا اور اس سلسلہ میں کوئی خبر (روایت) ایسی موجود نہیں ہے جو حجت اور دلیل بن سکے پس سب سے بہتر قول اس سلسلہ میں وہی ہے جو قرآن میں اللہ جل شانہٗ نے اختیار فرمایا (یعنی سکوت)۔"

ابن جریر کا اشارہ قرآن عزیز کے اس جملہ کی جانب ہے ﴿وَ اَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ۝﴾ عبدالوہاب نجار فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک بڑے فاضل عالم نے یہ بحث کی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جلیل القدر نبی تھے اس لیے ان کو کوئی معمولی شخص اپنا اجیر رکھنے کا حوصلہ نہیں کر سکتا اور نہ وہ اس کو منظور فرماتے بلکہ ان کا مستاجر نبی اور پیغمبر ہی ہو سکتا ہے اس لیے مدین کے "شیخ کبیر" حضرت شعیب علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ آپ کا یہ ارشاد نہ عقلی حجت و برہان کی حیثیت رکھتا ہے نہ نقلی دلیل و حجت کی، زیادہ سے زیادہ استحسان کے درجہ کا قیاس ہے اور اس سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا بلکہ یہ یقین اور قطعیت کو چاہتا ہے، علاوہ ازیں اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی تھے نبوت سے بعد کو سرفراز کیے گئے۔ ❷

بہرحال یہ طے شدہ امر ہے کہ "شیخ کبیر" کے نام کی تصریح میں کوئی قابل حجت روایت موجود نہیں اور ابن جریر اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے "وفاء مدت" کے سلسلہ میں بھی جس قدر روایات نقل کی ہیں ان میں بھی بزار اور ابن ابی حاتم کی طویل روایات کے علاوہ کسی میں نام کا ذکر موجود نہیں ہے اور ان دونوں روایات کی اس "زیادت" کے بارہ میں ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مدار هذا الحديث على عبد الله بن لهيعة المصري و في حفظه سوء و اخشى ان تكون رفعه خطاءً. ❸

"اس "نام کی تصریح والی" حدیث کا مدار ابن لہیعہ مصری پر ہے اور اس کا حافظہ خراب تھا اور مجھے خوف ہے کہ اس حدیث کو مرفوع کہنے میں غلطی ہوئی ہے۔

ابن جریر فرماتے ہیں: ❹

---

❶ تفسیر ابن کثیر ج ۷ ص ۲۴۸۔ ❷ قصص الانبیاء ص ۲۰۴۔
❸ تفسیر ابن کثیر ج ۷ ص ۲۵۷۔ ❹ تفسیر ابن کثیر جلد ۷

Marfat.com

نیز اسی طرح عتبہ بن المنذر سے روایت کی گئی ہے (مگر) ایک یقینی نادر اور غیر معروف زیادت کے ساتھ (وہ زیادت یہی
... ن ... احت ہے)۔

ایفائے مدت:

غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے خسر کے یہاں مدت اجارہ پوری کرنے یعنی بکریاں چرانے کے لیے مقیم رہے، مفسرین مستند روایات کے پیش نظر فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے کامل مدت یعنی دس سالہ مدت کو پورا کیا۔

قرآن عزیز نے یہ نہیں بتایا کہ مدت پوری ہونے کے کس قدر بعد تک موسیٰ علیہ السلام نے "شیخ" کے پاس قیام کیا؟ البتہ مفسرین یہ کہتے ہیں کہ مدت ختم ہونے کے فوراً بعد ہی موسیٰ علیہ السلام مصر کو روانہ ہو گئے اور ان کے خسر نے روانگی کے سال میں بکریوں نے جس قدر بچے دیئے تھے ان کے حوالے کر دیئے اور اپنی بیوی اور اس ریوڑ کو لے کر چل پڑے۔ [1] شاید ان کا یہ قول اس آیت کے پیش نظر ہو۔

﴿فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا﴾ (القصص: ۲۹)

"پس جب موسیٰ (علیہ السلام) نے مدت پوری کر دی اور اپنے اہل کو لے کر چل دیا تو محسوس ... طور کی جانب آگ کو۔"

ان حضرات نے مدت کے ایفاء اور روانگی کے بیان میں جو قربت ہے اس سے یہ اندازہ کر لیا کہ وہ فوراً ہی روانہ ہو گئے حالانکہ جب تک خاص قرینہ موجود نہ ہو اس وقت تک "واؤ" نہ تعقیب پر دلالت کرتی ہے اور نہ ترتیب پر۔

اور معالم التنزیل میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وفاء مدت کے بعد دس سال مزید اپنے خسر کے یہاں مقیم رہے۔ [2]

تورات اسی قول کی تائید کرتی ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) مدت ختم ہونے پر فوراً ہی مصر روانہ نہیں ہو گئے تھے بلکہ بکریاں چراتے ہوئے بھولے بھٹکے جب "وادی مقدس" میں پہنچ کر خدا کا حکم ملا کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے رہا کراؤ اور مصر جا کر فرعون کے ظلم سے ان کو نجات دلاؤ تب وہ مصر روانہ ہوئے۔

اور موسیٰ اپنے سسر یترو کے جو مدیان کا کاہن تھا گلے کی نگہبانی کرتا تھا، تب اس نے گلے کو بیابان کی طرف ہانک دیا اور خدا کے پہاڑ حورب کے نزدیک آیا، اس وقت خدا کا فرشتہ ایک بوٹے میں سے آگ کے شعلہ میں اس پر ظاہر ہوا، اس نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوٹا آگ کا روشن ہے اور وہ جل نہیں جاتا..... اب دیکھ بنی اسرائیل کی فریاد تجھ تک آئی اور میں نے وہ ظلم جو مصری ان پر کرتے ہیں دیکھا ہے، پس اب تو جا میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں میرے لوگوں کو جو بنی اسرائیل ہیں مصر سے نکال۔" [3]

تب موسیٰ (علیہ السلام) روانہ ہوا اور اپنے سسر یترو کے پاس گیا اور اسے کہا کہ میں تیری منت کرتا ہوں کہ مجھے رخصت دے کہ اپنے بھائیوں کے پاس جو مصر میں ہیں جاؤں۔ [4]

بہتر یہی ہے کہ حقیقت حال کو علم الٰہی کے ہی سپرد کر دیا جائے "واللہ اعلم بحقیقۃ الحال" تاہم قرآن حکیم کا اسلوب بیان یہ ضرور رہنمائی کرتا ہے کہ عام کتب تفسیر میں جو یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ روانگی جو "طٰہٰ" اور "قصص" میں مذکور ہے:

---

[1] معالم جلد ۵ ص ۱۴۳ [2] حاشیہ خازن ج ۵ ص ۱۴۳ [3] خروج باب ۳ آیات ۱۔۱۰ [4] خروج باب ۴ آیات

Marfat.com

﴿فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖٓ﴾

مصر کے لیے تھی غالباً صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام گھر کے ارادہ سے چلے تھے تو جب وادی مقدس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو کہا گیا کہ ظالم فرعون اور اس کی قوم کی طرف جاؤ اور ان کو سمجھاؤ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جواب میں یہ نہ فرماتے:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ۝۳۳﴾ (القصص: ۳۳)

"موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے پروردگار میں نے ان (فرعونیوں) کے ایک آدمی کو مار ڈالا تھا پس مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں وہ مجھ کو نہ مار ڈالیں (اگر میں مصر گیا)۔"

﴿وَ لَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ۝۱۴﴾ (الشعراء: ۱۴)

"اور ان (مصریوں) کا میں نے ایک گناہ کیا ہے پس میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھ کو قتل کر دیں گے۔"

یہ جواب خود بول رہا ہے کہ اس گفتگو کے وقت تک قتل والے معاملہ کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر جانے کا حوصلہ نہیں تھا البتہ جب خدائے تعالیٰ کی عطاء و بخشش نے ان کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا اور اس وقت مصر جانے کا حکم ملا تو موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے اپنا اطمینان کر کے یہیں سے مصر روانہ ہو گئے اور حکم الٰہی کے سامنے خسر کے پاس جا کر اجازت لینے کی بھی پرواہ نہ کی۔

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین میں ایک عرصہ قیام کیا، اور اس پوری مدت میں اپنے خسر کے مویشیوں کی گلہ بانی کرتے رہے، تورات میں مذکور ہے کہ اس قیام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام جیرسون رکھا، مدیانی عبرانی میں اس کے معنی غربت و مسافرت کے ہیں، گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بیٹے کے نام میں اپنی "مسافرت" کو بطور یادگار قائم رکھا، تاکہ خاندان والوں کو یاد رہے کہ اس بچہ کی ولادت "غربت و مسافرت" میں ہوئی تھی، تورات کی عبارت یہ ہے:

"اور اس نے اپنی بیٹی صفورہ موسیٰ (علیہ السلام) کو دی، وہ بیٹا جنی، اس نے اس کا نام "جیرسون" رکھا کیونکہ اس نے کہا، میں اجنبی ملک میں مسافر ہوں۔" *

وادیٔ مقدس:

ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے اہل و عیال سمیت بکریاں چراتے چراتے مدین سے بہت دور نکل گئے، گلہ بان قبائل کے لیے یہ بات کوئی قابل تعجب نہ تھی مگر رات ٹھنڈی تھی اس لیے سردی آگ کی جستجو پر مجبور کر رہی تھی، سامنے کوہ سینا کا سلسلہ نظر آ رہا تھا، یہ اس کا مشرقی گوشہ تھا اور مدین سے ایک روز کے فاصلہ پر بحر قلزم کے دو شاخے کے درمیان مصر کو جاتے ہوئے واقع تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چقماق استعمال کیا مگر سخت خنکی تھی اس نے کام نہ دیا۔

سامنے کی وادی (وادی ایمن) میں نگاہ دوڑائی تو ایک شعلہ چمکتا ہوا نظر پڑا، بیوی سے کہا کہ تم یہیں ٹھہرو میں آگ لے

* خروج باب ۲ آیات ۲۱-۲۲

Marfat.com

آ وَں تاپنے کا بھی انتظام ہو جائے گا اور اگر وہاں کوئی رہبر مل گیا تو بھٹکی ہوئی راہ کا بھی کھوج لگ جائے گا۔

﴿ فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّيْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْۤ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝ ﴾ (طٰہٰ: ۱۰)

"پھر موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی بیوی سے کہا تم یہاں ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے شاید اس میں سے کوئی چنگاری تمہارے لیے لاسکوں یا وہاں الاؤ پر کسی رہبر کو پا سکوں۔"

بعثت:

خدا کے فضل کا موسیٰ علیہ السلام سے پوچھیے احوال: کہ آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ عجیب آگ ہے درخت پر روشنی نظر آتی ہے مگر نہ درخت کو جلاتی ہے اور نہ گل ہی ہو جاتی ہے، یہ سوچتے ہوئے آگے بڑھے لیکن جوں جوں آگے بڑھتے جاتے تھے آگ اور دور ہوتی جاتی تھی، یہ دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام کو خوف سا پیدا ہوا اور انہوں نے ارادہ کیا کہ واپس ہو جائیں، جوں ہی وہ پلٹنے لگے آگ قریب آگئی اور قریب ہوئے تو سنا کہ یہ آواز آ رہی ہے:

﴿ يٰمُوْسٰۤى اِنِّيْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (القصص: ۳۰)

"اے موسیٰ (علیہ السلام)! میں ہوں میں اللہ پروردگار جہانوں کا۔"

﴿ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝ اِنِّيْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝ ﴾ (طٰہٰ: ۱۱۔۱۳)

"پس جب موسیٰ (علیہ السلام) اس (آگ) کے قریب آئے تو پکارے گئے اے موسیٰ (علیہ السلام)! میں ہوں تیرا پروردگار پس اپنی جوتی اتار دے تو طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے اور دیکھ! میں نے تجھ کو اپنی رسالت کے لیے چن لیا ہے پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سن۔"

قرآن عزیز کی سابق آیت اور ان آیات کے پیش نظر دو باتیں کتب تفسیر میں زیر بحث لائی جاتی ہیں:

① موسیٰ علیہ السلام نے جس روشنی کو آگ سمجھا تھا وہ آگ نہ تھی بلکہ تجلی الٰہی کا نور تھا، لیکن جو آواز اس پردۂ نور سے سنی گئی وہ فرشتے کی آواز تھی اور اس کے واسطہ سے خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو شرف ہم کلامی بخشا، یا خود اللہ تعالیٰ کی نداء تھی؟ بعض مفسرین کہتے ہیں یہ فرشتے کی آواز تھی اور اس کے واسطہ سے موسیٰ علیہ السلام کو خدا کی ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا، یہ خدا کی آواز نہ تھی اس لیے کہ

قول اور الحن نے آواز نے

اور ارباب تحقیق کی رائے یہ ہے کہ یہ براہ راست ندائے الٰہی تھی اور موسیٰ علیہ السلام نے اس کو کسی واسطہ سے بھی نہیں سنا بلکہ اسی طرح سنا جس طرح پیغمبران خدا وحی الٰہی کو سنتے اور "من وراء حجاب" اس سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

② وادی مقدس میں موسیٰ علیہ السلام کو جوتی اتارنے کا حکم دیا گیا، حالانکہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مساجد میں جوتیوں سمیت نماز ادا کیا کرتے تھے اور آج امت کے لیے بھی یہی اسلامی مسئلہ ہے کہ اگر جوتیاں پاک ہوں تو ان

Marfat.com

سے بے تامل نماز پڑھنا درست ہے تو پھر اس جگہ موسیٰ علیہ السلام سے یہ کیوں کہا گیا کہ "یہ وادی مقدس ہے لہٰذا جوتی اتارو" تو اس کا جواب صحیح حدیث میں موجود ہے اور رسول اکرم ﷺ نے خود اس کی وجہ بیان فرمائی ہے۔

((كَانَتَا مِنْ جِلْدِ حِمَارٍ مَيِّتٍ)).

"(موسیٰ علیہ السلام) کی جوتیاں مردہ گدھے کی کھال سے بنائی گئی تھیں (یعنی غیر مدبوغ تھیں اسی لیے طاہر نہ تھیں)۔"

بہرحال اب حضرت موسیٰ علیہ السلام خدائے تعالیٰ کے پیغمبر اور جلیل القدر رسول ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو انبیاء کے سچے دین کی تلقین اور فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کی رہائی کی اہم خدمات کے لیے چن لیا ہے وہ اب وادی مقدس میں حق تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کر رہے ہیں، وہ موسیٰ علیہ السلام جو مدین کی راہ سے بھٹکے ہوئے تھے آج مصر جیسے متمدن و مہذب ملک اور اس کے سرکش و مغرور بادشاہ کی رہنمائی کرنے کے لیے منتخب کیے گئے ہیں اور جو کل تک اونٹوں اور بکریوں کی گلہ بانی کر رہے تھے آج انسانوں کی قیادت کے فرض کو انجام دینے کے لیے چنے گئے ہیں اور جو نصاب زندگی کل بکریوں کے گلہ کی چرائی سے شروع ہوا تھا وہ آج وادی مقدس میں خدا کی بہترین مخلوق "حضرت انسان" کی گلہ بانی پر تکمیل کو پہنچ رہا ہے، اور کل کا گلہ بان آج جہاں بان بن رہا ہے۔

خدائے تعالیٰ کے ید قدرت کی یہی کرشمہ سازیاں ہیں جو زبان سے انکار کرنے والوں کے دلوں میں بھی اقرار کا کانٹا چبھوئے رکھتی ہیں، کجا خانہ بدوش چرواہا اور کجا متمدن حکومتوں کے لیے خدا کی صداقت کی پیغامبری۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب خدا کی اس آواز کو سنا اور ان کو یہ معلوم ہوا کہ آج ان کے نصیب میں وہ دولت آ گئی ہے جو انسانی شرافت کا طغرائے امتیاز اور خدا کی موہبت کا آخری نشان ہے تو پھولے نہ سمائے اور والہانہ فریفتگی میں مثل مورت حیران کھڑے رہ گئے، آخر پھر اسی جانب سے ابتداء ہوئی اور پوچھا گیا:

﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۱۷)

"موسیٰ (علیہ السلام)! تیرے داہنے ہاتھ میں یہ کیا ہے؟"

پس پھر کیا تھا محبوب حقیقی کا سوال عاشق صادق سے "یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے" وارفتگی عشق میں یہ بھی خیال نہ رہا کہ سوال کے پیمانہ ہی پر جواب کو تولا جائے اور جو کچھ پوچھا گیا ہے صرف اسی قدر جواب دیا جائے بولے:

﴿هِيَ عَصَايَ ۚ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِي﴾ (طٰہٰ: ۱۸)

"یہ میری لاٹھی ہے، اس پر (بکریاں چراتے وقت) سہارا لیا کرتا ہوں اور اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑ لیتا ہوں۔"

جواب میں صرف یہ کہنا چاہیے تھا "عصا" مگر محبت کے اس ولولہ کو کیسے روکیں جو محبوب کے ساتھ ہمکلامی کے شرف کو طول دے کر سوختہ جانی کے سامان مہیا کرنا چاہتا ہے کہتے ہیں کہ میری لاٹھی ہے اور اس کے فوائد بیان کرنے لگتے ہیں مگر یکایک جذبہ شوق کی جگہ محبوب حقیقی کا پاس ادب دل میں چٹکی لیتا ہے، موسیٰ! خبردار کس دربار میں کھڑے ہو، کہیں یہ طول بیانی گستاخی اور بے ادبی میں شمار ہو جائے موسیٰ علیہ السلام نے یہ سوچ کر فوراً پہلو بدلا اور جناب باری میں عرض کی:

﴿وَلِيَ فِيهَا مَاٰرِبُ أُخْرٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۱۸)

Marfat.com

"اور میرے لیے اس سے متعلق اور ضروریات بھی ہیں۔"

خدایا! دل کے ولولے اور روح کی بیتابیاں تو چاہتی ہیں کہ کہے جاؤں اور اس لطف بے پایاں کی لذت کو حاصل کیے جاؤں لیکن پاس ادب مانع اور چشم حقیقت بیں کا حکم ہے کہ خاموش ہو جاؤں اس لیے قصہ کو تاہ کرتا ہوں ورنہ داستان عشق تو بہت طویل ہے۔

عشق کہتا ہے جنوں کا جوش رہنا چاہیے
ضبط کی تاکید ہے خاموش رہنا چاہیے
قصہ موسیٰ علیہ السلام! سبق ہے ہوش والوں کے لیے
کس طرح عشاق کو خاموش رہنا چاہیے

آیات اللہ:

اب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴾ (طٰه : ۱۹)

"موسیٰ! اس لاٹھی کو زمین پر ڈال دو۔"

اور موسیٰ علیہ السلام نے اس ارشاد عالی کی تکمیل کی۔

﴿ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴾ (طٰه : ۲۰)

"موسیٰ (علیہ السلام) نے لاٹھی کو زمین پر ڈال دیا، پس ناگاہ وہ اژدھا بن کر دوڑنے لگا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ حیرت زدا واقعہ دیکھا تو گھبرا گئے، اور بشریت کے تقاضا سے متاثر ہو کر بھاگنے لگے، پیٹھ پھیر کر بھاگے ہی تھے کہ آواز آئی:

﴿ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴾ (طٰه : ۲۱)

"(اللہ تعالیٰ نے فرمایا) موسیٰ! اس کو پکڑ لو اور خوف نہ کھاؤ ہم اس کو اس کی اصل حالت پر لوٹا دیں گے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لکڑی دوشاخہ تھی، اب وہی دوشاخہ اژدھے کا منہ نظر آ رہا تھا، سخت پریشان تھے مگر قربت الٰہی نے طمانیت وسکون کی حالت پیدا کر دی اور انہوں نے بے خوف ہو کر اس کے منہ پر ہاتھ ڈال دیا، اس عمل کے ساتھ ہی فوراً وہ دوشاخہ پھر لاٹھی بن گیا۔

اب موسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ پکارا گیا اور حکم ہوا کہ اپنے ہاتھ کو گریبان کے اندر لے جا کر بغل سے مس کیجئے اور پھر دیکھئے وہ مرض سے پاک اور بے داغ چمکتا ہوا نکلے گا۔

﴿ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴾ (طٰه : ۲۲)

"اور ملا دے اپنے ہاتھ کو اپنی بغل کے ساتھ، نکل آئے گا وہ روشن بغیر کسی مرض کے (یعنی برص سے پاک) یہ دوسری نشانی ہے۔"

Marfat.com

موسیٰ (علیہ السلام)! یہ ہماری جانب سے تمہاری نبوت و رسالت کے دو بڑے نشان ہیں، یہ تمہارے پیغام صداقت اور دلائل و براہینِ حق کی زبردست تائید کریں گے، پس جس طرح ہم نے تم کو نبوت و رسالت سے نوازا اسی طرح تم کو یہ دو عظیم الشان نشان (معجزے) بھی عطاء کئے۔

﴿لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى﴾ (طٰہٰ : ۲۳)

"تاکہ ہم تجھ کو اپنی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کرا دیں۔"

﴿فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ﴾ (القصص : ۳۲)

"پس تیرے پروردگار کی جانب سے فرعون اور اس کی جماعت کے مقابلہ میں تیرے لیے یہ دو "برہان" ہیں، بلاشبہ وہ فرعون اور اس کی جماعت نافرماں قوم ہیں۔"

اب جاؤ اور فرعون اور اس کی قوم کو راہ ہدایت دکھاؤ، انہوں نے بہت سرکشی اور نافرمانی اختیار کر رکھی ہے اور اپنے غرور و تکبر اور انتہاءِ ظلم کے ساتھ انہوں نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے سو ان کو غلامی سے رستگاری دلاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جناب باری میں عرض کیا: "پروردگار! میرے ہاتھ سے ایک مصری قتل ہو گیا تھا اس لیے یہ خوف ہے کہ کہیں وہ مجھ کو قتل نہ کر دیں، مجھے یہ بھی خیال ہے کہ وہ میری بڑی زور سے تکذیب کریں گے اور مجھ کو جھٹلائیں گے، یہ منصب عالی جب تو نے عطاء فرمایا ہے تو میرے سینہ کو فراخ اور نور سے معمور کر دے اور اس اہم خدمت کو میرے لیے آسان بنا دے اور زبان میں پڑی ہوئی گرہ کو کھول دے تاکہ لوگوں کو میری بات سمجھنے میں آسانی ہو، اور چونکہ میری گفتگو میں روانی نہیں ہے اور میری بہ نسبت میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح بیان ہے اس لیے اس کو بھی اپنی اس نعمت (نبوت) سے نواز کر میرا شریک کار بنا دے۔"

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اطمینان دلایا کہ تم ہمارا پیغام لے کر ضرور جاؤ اور ان کو حق کی راہ دکھاؤ، وہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، ہماری مدد تمہارے ساتھ ہے، اور جو نشانات ہم نے تم کو بخشے ہیں وہ تمہاری کامیابی کا باعث ہوں گے اور انجام کار تم ہی غالب رہو گے، ہم تمہاری درخواست منظور کرتے ہیں اور تمہارے بھائی ہارون کو بھی تمہارا شریک کار بناتے ہیں، دیکھو تم دونوں، فرعون اور اس کی قوم کو جب ہماری صحیح راہ کی جانب بلاؤ تو اس پیغام حق میں نرمی اور شیریں کلامی سے پیش آنا کیا عجب ہے کہ وہ نصیحت قبول کر لیں، اور خوف خدا کرتے ہوئے ظلم سے باز آ جائیں۔

داخلہ مصر:

سدی کہتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام منصب نبوت سے سرفراز ہو کر کلام ربانی سے فیض یاب بن کر اور دعوت و تبلیغ حق میں کامیابی و کامرانی کا مژدہ پا کر، وادی مقدس سے اترے تو اپنی بیوی کے پاس پہنچے جو وادی کے سامنے جنگل میں ان کی منتظر اور چشم براہ تھیں ان کو ساتھ لیا اور یہیں سے تعمیل حکم الٰہی کے لیے مصر روانہ ہو گئے، منزلیں طے کرتے ہوئے جب مصر پہنچے تو رات ہو گئی تھی، خاموشی کے ساتھ مصر میں داخل ہو کر اپنے مکان میں پہنچے مگر اندر داخل نہ ہوئے اور والدہ کے سامنے ایک مسافر کی حیثیت سے ظاہر ہوئے، یہ بنی اسرائیل میں مہمان نواز گھر تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خوب خاطر و مدارات کی گئی، اسی دوران میں ان کے بڑے بھائی

Marfat.com

ہارون علیہ السلام آ پہنچے، یہاں پہنچنے سے قبل ہی ہارون علیہ السلام کو خدا کی طرف سے منصب رسالت عطاء ہو چکا تھا، اس لیے ان کو بذریعہ وحی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سارا قصہ بتا دیا گیا تھا، وہ بھائی سے آ کر لپٹ گئے اور پھر ان کے اہل وعیال کو گھر کے اندر لے گئے اور والدہ کو سارا حال سنایا، تب سب خاندان آپس میں گلے ملا اور بچھڑے ہوئے بھائیوں نے ایک دوسرے کی گذشتہ زندگی سے تعارف پیدا کیا اور والدہ کی دونوں آنکھوں نے ٹھنڈک حاصل کی۔ [1] تورات میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: "اور خداوند نے ہارون علیہ السلام کو کہا کہ بیابان میں جا کے ملاقات کر، وہ گیا اور خدا کے پہاڑ پر اسے ملا اور اسے بوسہ دیا اور موسیٰ علیہ السلام نے خدا کی جس نے اسے بھیجا ساری باتیں اور معجزے کو جن کا اس نے حکم دیا تھا ہارون علیہ السلام سے بیان کئے۔" [2]

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿۲۷﴾

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وادی مقدس میں خدائے تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا تھا کہ میری زبان میں جو گرہ ہے اس کو کھول دے اور یہ کہ میرا بھائی ہارون علیہ السلام مجھ سے زیادہ فصیح ہے تو مفسرین نے اس "عقدۃ" کے متعلق ایک حکایت نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام زمانہ طفولیت میں ایک روز فرعون کی آغوش میں بیٹھے ہوئے تھے، اور فرعون کی ڈاڑھی جواہرات اور موتیوں سے مرصع تھی بچوں کی عادت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ڈاڑھی پر ہاتھ چلا دیا اور چمکتے ہوئے موتیوں کے ساتھ فرعون کی ڈاڑھی کے چند بال بھی اکھڑ آئے، فرعون کو سخت غصہ آیا اور چاہا کہ ان کو قتل کرا دے، آسیہ زوجہ فرعون نے شوہر کا یہ رنگ دیکھا تو عاجزی کے ساتھ عرض کیا کہ بچہ ہے اس کو نہ مارو، یہ ان احترامات سے کیا واقف ہے، اس کے نزدیک تو تمرہ (کھجور) اور جمرہ (چنگاری) دونوں برابر ہیں "راج ہٹ" پرانی مثل ہے، بادشاہ نے کہا کہ میں ابھی اس کا امتحان کرتا ہوں، اگر اس نے انگارہ کو دیکھ کر ہاتھ کھینچا تو ضرور قتل کرا دوں گا، خدائے تعالیٰ کو موسیٰ علیہ السلام سے کام لینا تھا اس لیے ان کی حفاظت کی ذمہ داری کا وعدہ کر لیا تھا، لہٰذا جب فرعون نے چند کھجور کے دانے اور چند دہکتی آگ کے سرخ انگارے منگا کر موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رکھے تو موسیٰ علیہ السلام نے جلد ہاتھ بڑھا کر ایک سرخ انگارے کو اٹھا کر منہ میں رکھ لیا، سیکنڈ بھر کا کام تھا ہو گذرا مگر زبان پر داغ پڑ گیا اور زبان موٹی ہو گئی، اس وقت سے موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت آ گئی، اور مسلسل گفتگو میں رکاوٹ ہونے لگی، پس وادی مقدس میں خدائے تعالیٰ کے سامنے موسیٰ علیہ السلام نے اسی "عقدۃ" (گرہ) کا ذکر کیا۔ [3] لیکن عام مفسرین کی اس نقل حکایت سے جدا نجار مصری نے اس سلسلہ میں اپنی ایک قیاسی رائے بیان کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"میں اس قصہ کو صحیح نہیں سمجھتا، میرے خیال میں تو صرف موسیٰ علیہ السلام کی غیر فصیح بیانی اور گفتگو میں رکاوٹ کی دو وجوہات میں سے ایک ہو سکتی ہے۔

① قرآن عزیز میں مذکور ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو دریائے نیل میں سے نکال کر شاہی محل پہنچایا گیا تو دودھ پلانے کے لیے دایہ کی فکر ہوئی، شہر کی بیسیوں دایہ آئیں مگر انہوں نے کسی کا دودھ منہ سے نہ لگایا، تو اس واقعہ میں ضرور عرصہ لگا ہو گا اور موسیٰ علیہ السلام ایک عرصہ دودھ سے محروم رہے ہوں گے، ایسی حالت میں یہ تجربہ کیا گیا ہے کہ بچہ کی زبان موٹی ہو جاتی ہے اور بات کرنے میں

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۱ ص ۲۵۲ [2] خروج باب ۴ آیت ۲۷-۲۸ [3] تاریخ ابن کثیر ج ۱ ص ۲۴۹

رکاوٹ کا مرض پیدا ہو جاتا ہے لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی یہی صورت پیش آئی ہوگی۔

② حضرت موسیٰ علیہ السلام ابتداء جوانی ہی میں مصر سے مدین چلے گئے اور وہاں ایک طویل عرصہ رہے، اگر "صاحب معالم التنزیل" یا تورات کی روایات کو صحیح مان لیا جائے تو بیس سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ ہوتا ہے، ایسی صورت میں یہ قدرتی بات ہے کہ وہ مصری زبان سے ایک حد تک ناآشنا اور اس کے محاورات اور اس زبان میں تقریر کے ملکہ سے محروم ہو چکے ہوں گے، اسی کو انہوں نے "عقدۂ لسانی" فرمایا اور ہارون علیہ السلام کے متعلق فرمایا ﴿هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي﴾ اس دوسری وجہ میں البتہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کو صحیح مان لیا جائے تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کس طرح حضرت ہارون علیہ السلام سے بے تکلف بات چیت کرنے پر قادر رہے ہوں گے جبکہ حضرت ہارون علیہ السلام کبھی مصر سے باہر ہی نہیں گئے اور صرف مصری زبان ہی میں بات چیت کر سکتے تھے، سو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام مصری اور عبرانی دونوں زبانوں کے خوب واقف اور ماہر تھے، مصری زبان ان کی ملکی زبان تھی، اور عبرانی زبان ان کی مادری زبان تھی جس کو صدیاں گذرنے کے باوجود بھی بنی اسرائیل نے محفوظ رکھا تھا اور باہمی بات چیت اور نوشت وخواند میں اسی کو استعمال کرتے تھے اور مدیانی اور عبرانی میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا اس لیے کہ دونوں زبانیں ایک ہی جد اعلیٰ (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کی نسل سے متعلق تھیں۔

اور ان ہر دو وجوہ کو نقل کرنے کے بعد نجار کہتے ہیں کہ میری طبیعت کا میلان پہلی وجہ کی جانب ہے اور میں اسی کو راجح سمجھتا ہوں۔ [1]

مگر ہمارے نزدیک پہلی وجہ تو کسی طرح بھی قرین قیاس نظر نہیں آتی، اس لیے کہ "دایہ کی تفتیش کا معاملہ قرآن عزیز اور صحیح احادیث میں تو بہت ہی مختصر ہے اور اس کی تفصیل جو توراۃ اور تاریخی روایات سے نقل کی گئی ہے ان سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ صرف چند گھنٹوں کے اندر طے ہو گیا، موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ان کو دودھ پلانے کے لیے لے گئیں، اور شاہی احکام کے بعد ایک بچہ کے دودھ پلانے کے معاملہ میں دنوں کی تاخیر ہو بھی کیسے سکتی تھی نیز دوسری وجہ بھی کچھ زیادہ قابل قبول نہیں ہے اس لیے کہ اس توجیہ کے مطابق حضرت ہارون علیہ السلام کے متعلق ﴿هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي﴾ کا فقرہ تو سمجھ میں آ سکتا ہے لیکن مصری زبان کی فراموشی کو ﴿عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي﴾ کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے، علاوہ ازیں اگر یہ صحیح ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء تو قبول کر لی گئی پھر اس فراموشی کے کیا معنی؟

بلکہ صاف اور بے غل وغش بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسی حالت میں مولود ہوئے کہ ان کی زبان میں لکنت تھی اور بات کرنے میں رکاوٹ واقع ہو جاتی تھی اور حضرت ہارون علیہ السلام لسان اور فصیح البیان تھے، پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے متعلق صرف اسی قدر دعا مانگی کہ زبان کا یہ حصر اور اس کی لکنت اس درجہ شدید نہ رہے کہ گفتگو میں عاجز ہو جانا پڑے، اگر فطری رکاوٹ دور نہیں ہوتی نہ ہو صرف اس قدر خواہش ہے کہ مخاطبین گفتگو کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور فصاحت وطلاقت لسانی کے لیے میری خواہش یہ ہے کہ میرے بھائی ہارون کو میرا قوت بازو بنا دیجئے کہ وہ میرا ویسے بھی دست وبازو ہے، چنانچہ دربار الٰہی میں دونوں باتیں قبول اور منظور ہو گئیں۔

بعض علماء تفسیر نے ﴿يَفْقَهُوا قَوْلِي﴾ میں ایک اور نکتہ پیدا کیا اور فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف یہ دعا مانگی کہ ان

---

[1] قصص الانبیاء عربی ص ۲۰۸، ۲۰۹

کی زبان کی گرہ اس حد تک کھل جائے کہ جس قوم کو تبلیغ کرنے جارہے ہیں وہ ان کی گفتگو سمجھ سکے لہٰذا اسی درجہ دعا قبول ہوئی اور ان کی زبان میں قدرے لکنت اور رکاوٹ پھر بھی باقی رہی، موسیٰ علیہ السلام نے شرط لگا کر دعاء کا دائرہ خود ہی تنگ کر دیا، ورنہ وہ بھی فصاحت اور طلاقت لسانی میں فرد ہو جاتے۔

میرے خیال میں اس نکتہ سنجی کی بھی یہاں مطلق ضرورت نظر نہیں آتی اس لیے کہ جس مقام پر اور جس وقت میں موسیٰ علیہ السلام نے درگاہ الٰہی میں یہ دعا فرمائی ہے اس کی برکت اور عظمت کو ان نکتہ سنجوں نے بالکل فراموش کر دیا اور یہ غور نہیں فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام منصب نبوت سے سرفراز کیے جارہے ہیں، خدا کا انتہائی فضل و کرم بارش کی طرح ان پر برس رہا ہے، آغوش رحمت وا ہے، اس حالت میں موسیٰ علیہ السلام معاملہ اور ذمہ داری کی اہمیت کو محسوس فرماتے ہوئے آسانی کار کے لیے دعائیں اور استدعائیں کر رہے ہیں اور خدائے تعالیٰ خود موسیٰ علیہ السلام کی مشکلات اور مہم کی نزاکت کا عالم و دانا ہیں تو پھر کیا ایسے وقت میں خدائے تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا یہ تقاضا ہو سکتا تھا کہ وہ عطاء و نوال کی بیکراں نوازش کی جگہ مول تول اور سودے کی طرح لین دین کا سا معاملہ کرتی یا حقیقت حال کے پیش نظر موسیٰ علیہ السلام کے دعائیہ الفاظ کی لفظی گرفت سے درگذر فرما کر وہ سب کچھ عطاء کرتی جو ان کی مشکلات کو ختم کرنے کے لیے معاون و مددگار ثابت ہو سکے، بیشک اس نے ایسا ہی کیا البتہ موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد میں ایک راز تھا جس کو وہ اور ان کا پروردگار دونوں سمجھتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ ان کی اس اہم خدمت میں ان کے بھائی ہارون علیہ السلام ضرور شریک کار بنیں اس لیے کہ وہ بھائی بھی ہیں اور فطری فصاحت و طلاقت لسانی کے مالک بھی، لہٰذا وہ اس سے زیادہ کے خواہش مند ہی نہ تھے کہ ان کو حصر کی دشواری سے نجات مل جائے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح ہارون کو بھی یہ دولت نبوت عطا ہو پس ان کی سفارش کے لیے اسی وصف "فصاحت بیانی" کو خدا کی درگاہ میں پیش کیا، یہ نہ تھا کہ انہوں نے الفاظ دعاء میں تنگی کی تھی، تو خدا نے بھی کم دینے کی خاطر ان کے الفاظ کو پکڑ لیا اور اسی قدر دیا جو ان کی دعاء کے الفاظ میں محدود تھا۔

﴿وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝۹ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا
بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝۱۰ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝۱۱ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ
بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝۱۲ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝۱۳ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ
اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝۱۴ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ۝۱۵ فَلَا
يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۝۱۶﴾ (طٰہٰ: ۹-۱۶)

"اور اے پیغمبر! موسیٰ کی حکایت تو نے سنی؟ جب اس نے (دور سے) آگ دیکھی تو اپنے گھر کے لوگوں سے کہا: "ٹھہرو مجھے آگ دکھائی دی ہے میں جاتا ہوں ممکن ہے تمہارے لیے ایک انگارہ لیتا آؤں یا (کم از کم) الاؤ پر کوئی راہ دکھانے والا ہی مل جائے، پھر جب وہ وہاں پہنچا تو اس وقت پکارا گیا (ایک آواز اٹھی کہ) اے موسیٰ میں ہوں تیرا پروردگار! پس اپنی جوتی اتار دے۔ تو طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے، اور دیکھ میں نے تجھے (اپنی رسالت کے لیے) چن لیا ہے پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اسے کان لگا کر سن، میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی بندگی کر اور میری ہی

Marfat.com

یاد کے لیے نماز قائم کر، بلاشبہ (مقررہ) وقت آنے والا ہے، میں اسے پوشیدہ رکھنے کو ہوں تا کہ (لوگوں کے یقین وعمل کی آزمائش ہو جائے اور) جس شخص کی جیسی کچھ کوشش ہو اسی کے مطابق بدلہ پائے پس دیکھ ایسا نہ ہو کہ جو لوگ اس وقت کے ظہور پر یقین نہ رکھتے ہوں اور اپنی خواہش کے بندے ہوں وہ تجھے بھی (قدم بڑھانے سے) روک دیں اور نتیجہ یہ نکلے تو تباہ ہو جائے۔"

﴿اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِاَهْلِهٖۤ اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝۷ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۸ یٰمُوْسٰۤی اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۹﴾ (النمل: ۷۔۹)

"جب کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے گھر والوں کو میں نے دیکھی ہے ایک آگ اب لاتا ہوں تمہارے پاس وہاں سے کچھ خبر، یا لاتا ہوں انگارہ سلگا کر تا کہ تم تاپو، پھر جب پہنچا اس کے پاس آواز ہوئی کہ برکت ہے اس پر جو کوئی آگ میں ہے اور جو اس کے آس پاس ہے، اور پاک ہے ذات اللہ کی جو رب ہے سارے جہاں کا، اے موسیٰ وہ میں اللہ ہوں زبردست حکمتوں والا۔"

﴿وَ مَا تِلْكَ بِیَمِیْنِكَ یٰمُوْسٰی ۝۱۷ قَالَ هِیَ عَصَایَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَیْهَا وَ اَهُشُّ بِهَا عَلٰی غَنَمِیْ وَ لِیَ فِیْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی ۝۱۸ قَالَ اَلْقِهَا یٰمُوْسٰی ۝۱۹ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰی ۝۲۰ قَالَ خُذْهَا وَ لَا تَخَفْ ٚ سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰی ۝۲۱ وَ اضْمُمْ یَدَكَ اِلٰی جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ اٰیَةً اُخْرٰی ۝۲۲ لِنُرِیَكَ مِنْ اٰیٰتِنَا الْكُبْرٰی ۝۲۳﴾ (طٰہٰ: ۱۷۔۲۳)

"اور صدائے غیبی نے پوچھا: اے موسیٰ! تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟ عرض کیا: "میری لاٹھی ہے، چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں اسی سے اپنی بکریوں کے لیے درختوں کے پتے جھاڑ لیتا ہوں، میرے لیے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں حکم ہوا: "اے موسیٰ! اسے ڈال دے" موسیٰ نے ڈال دیا، اور کیا دیکھتا ہے ایک سانپ ہے، جو دوڑ رہا ہے حکم ہوا" اسے اب پکڑ لے، خوف نہ کھا، ہم اسے پھر اس کی اصل حالت پر کیے دیتے ہیں" اور نیز حکم ہوا" اپنا ہاتھ اپنے پہلو میں رکھ اور پھر نکال بغیر اس کے کہ کسی طرح کا عیب ہو چمکتا ہوا نکلے گا، یہ (تیرے لیے) دوسری نشانی ہوئی (اور یہ دونوں (نشانیاں) اس لیے (دی گئی ہیں) کہ آئندہ تجھے اپنی قدرت سے بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔"

﴿وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِیِّ اِذْ قَضَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسَی الْاَمْرَ وَ مَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِیْنَ ۝۴۴ وَ لٰكِنَّاۤ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَیْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَ مَا كُنْتَ ثَاوِیًا فِیْۤ اَهْلِ مَدْیَنَ تَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِنَا ۙ وَ لٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِیْنَ ۝۴۵ وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَیْنَا وَ لٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴۶﴾ (القصص: ۴۴۔۴۶)

Marfat.com

"اور تو نہ تھا غرب کی طرف جب ہم نے بھیجا موسیٰ کو حکم اور نہ تھا تو دیکھنے والا لیکن ہم نے پیدا کیں کئی جماعتیں پھر دراز ہوئی ان پر مدت، اور تو نہ رہتا تھا مدین والوں میں کہ ان کو سناتا ہماری آیتیں، پر ہم رہے رسول بھیجتے، اور تو نہ تھا طور کے کنارے جب ہم نے آواز دی، لیکن یہ انعام ہے تیرے رب کا کہ ڈر سنا دے ان لوگوں کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی ڈر سنانے والا تجھ سے پہلے تا کہ وہ یاد رکھیں۔"

﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝۱۵ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝۱۶ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝۱۷ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝۱۸ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝۱۹﴾ (النازعات: ۱۵-۱۹)

"کچھ پہنچی ہے تجھ کو بات موسیٰ کی، جب پکارا اس کو اس کے رب نے پاک میدان میں جس کا نام طویٰ ہے۔ جا فرعون کے پاس اس نے سر اٹھایا، پھر کہہ تیرا جی چاہتا ہے کہ تو سنور جائے اور راہ بتاؤں تجھ کو تیرے رب کی طرف پھر تجھ کو ڈر ہو؟"۔

﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝۲۴ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۝۲۵ وَ يَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ۝۲۶ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۝۲۷ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۝۲۸ وَ اجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝۲۹ هٰرُوْنَ اَخِي ۝۳۰ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۝۳۱ وَ اَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۝۳۲ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝۳۳ وَّ نَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۝۳۴ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۝۳۵ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ۝۳۶﴾ (طٰہٰ: ۲۴-۳۶)

"(حکم ہوا) اے موسیٰ! فرعون (یعنی بادشاہ مصر) کی طرف جا وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے" موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا: "اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے (کہ بڑے سے بڑا بوجھ اٹھانے کے لیے مستعد ہو جاؤں) میرا کام میرے لیے آسان کر دے (کہ راہ کی کوئی دشواری بھی غالب نہ آ سکے) میری زبان کی گرہ کھول دے کہ (خطاب و کلام میں پوری طرح رواں ہو جائے اور) میری بات لوگوں کے دلوں میں اُتر جائے، نیز میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو میرا وزیر بنا دے اس کی وجہ سے میری قوت مضبوط ہو جائے، وہ میرے کام میں میرا شریک ہو، ہم دونوں ایک دل ہو کر تیری پاکی اور بڑائی کا بکثرت اعلان کریں، تیری یاد میں زیادہ سے زیادہ لگے رہیں، اور بلاشبہ تو ہمارا حال دیکھ رہا ہے (ہم سے کسی حال میں غافل نہیں) ارشاد ہوا، اے موسیٰ! تیری درخواست منظور ہوئی۔"

﴿اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَ لَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۝۴۲ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝۴۳ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝۴۴ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۝۴۵ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى ۝۴۶ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَ لَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَ السَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝۴۷﴾ (طٰہٰ: ۴۲-۴۷)

"اب تو اور تیرا بھائی، دونوں میری نشانیاں لے کر جاؤ اور میری یاد میں کوتاہی نہ کرو، ہاں تم دونوں (یعنی موسیٰ اور ہارون

Marfat.com

کیونکہ اب دونوں اکٹھے ہو گئے تھے اور مصر کے قریب وحی الٰہی نے انہیں دوبارہ مخاطب کیا تھا) فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکشی میں بہت بڑھ چلا ہے، پھر جب اس کے پاس پہنچو تو سختی کے ساتھ پیش نہ آنا۔ نرمی سے بات کرنا (تمہیں کیا معلوم؟) ہوسکتا ہے کہ نصیحت پکڑے یا (عواقب سے) ڈر جائے دونوں نے عرض کیا "پروردگار! ہمیں اندیشہ ہے فرعون ہماری مخالفت میں جلدی نہ کرے یا سرکشی سے پیش آئے ارشاد ہوا کچھ اندیشہ نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں، میں سب کچھ سنتا ہوں، سب کچھ دیکھتا ہوں! تم اس کے پاس (بے دھڑک) جاؤ اور کہو ہم تیرے پروردگار کی نشانی لے کر تیرے سامنے آ گئے، اس پر سلامتی ہو جو سیدھی راہ اختیار کرے۔"

﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ۝۳۵ فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ۝۳۶﴾ (الفرقان: ۳۵۔۳۶)

"اور ہم نے دی موسیٰ کو کتاب اور کر دیا ہم نے اس کے ساتھ اس کا بھائی ہارون کام بٹانے والا، پھر کہا ہم نے دونوں جاؤ ان لوگوں کے پاس جنھوں نے جھٹلایا ہماری باتوں کو پھر دے مارا ہم نے ان کو اکھاڑ کر۔"

﴿وَ اِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰۤى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۰ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا يَتَّقُوْنَ ۝۱۱ قَالَ رَبِّ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ؕ ۝۱۲ وَ يَضِيْقُ صَدْرِيْ وَ لَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ۝۱۳ وَ لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۝۱۴ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ۝۱۵ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۶﴾ (الشعراء: ۱۰۔۱۶)

"اور جب پکارا تیرے رب نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کہ جا اس قوم گنہگار کے پاس، قوم فرعون کے پاس، کیا وہ ڈرتے نہیں، بولا اے رب میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھٹلائیں، اور رک جاتا ہے میرا جی اور نہیں چلتی ہے میری زبان، سو پیغام دے ہارون کو اور ان کو مجھ پر ہے ایک گناہ کا دعویٰ، سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں، فرمایا کبھی نہیں، تم دونوں جاؤ لے کر ہماری نشانیاں، ہم ساتھ تمہارے سنتے ہیں، سو جاؤ فرعون کے پاس اور کہو ہم پیغام لے کر آئے ہیں پروردگار عالم کا۔"

﴿وَ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝۱۰ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۱ وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝۱۲﴾ (النمل: ۱۰۔۱۲)

"اور ڈال دے لاٹھی اپنی، پھر جب دیکھا اس کو پھن ہلاتے جیسے سفید پتلا سانپ، لوٹا پیٹھ پھیر کر اور مڑ کر نہ دیکھا۔ اے موسیٰ! مت ڈر میں جو ہوں میرے پاس نہیں ڈرتے رسول مگر جس نے زیادتی کی، پھر بدلے نیکی کی برائی کے پیچھے تو میں

Marfat.com

بخشنے والا ہوں اور ڈال دے ہاتھ اپنا اپنے گریبان میں کہ نکلے سفید ہو کر بغیر کسی عیب کے یہ دونوں مل کر نو نشانیاں لے کر جا، فرعون اور اس کی قوم کی طرف بے شک وہ تھے لوگ، نافرمان۔"

﴿فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤی اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۰﴾ وَ اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰۤی اَقْبِلْ وَ لَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ ﴿۳۱﴾ اُسْلُكْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ٘ وَّ اضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡىِٕهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾ وَ اَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ ٘ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا ۚۛ بِاٰیٰتِنَاۤ ۚۛ اَنْتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾﴾ (القصص ۲۹۔۳۵)

"پھر جب پوری کر چکا موسیٰ (علیہ السلام) وہ مدت اور لے کر چلا اپنے گھر والوں کو دیکھی کوہ طور کی طرف سے ایک آگ، کہا اپنے گھر والوں کو ٹھہرو میں نے دیکھی ہے آگ شاید لے آؤں تمہارے پاس وہاں کی کچھ خبر یا انگارہ آگ کا تاکہ تم تاپو، پھر جب پہنچا اس کے پاس آواز ہوئی میدان کے داہنے کنارے سے، برکت والے تختہ میں ایک درخت سے کہ اے موسیٰ میں ہوں میں اللہ جہان کا رب، اور یہ کہ ڈال دے تو اپنی لاٹھی، پھر جب دیکھا اس کو پھن ہلاتے جیسے پتلا سانپ الٹا پھرا منہ موڑ کر اور نہ دیکھا پیچھے پھر کر، اے موسیٰ! آگے آ اور مت ڈر تجھ کو کچھ خطرہ نہیں، ڈال اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں نکل آئے سفید ہو کر نہ کہ کسی برائی سے، اور لائے اپنی طرف اپنا بازو ڈر سے، سو یہ دو سندیں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے سرداروں پر، بیشک وہ تھے لوگ نافرمان، بولا اے رب میں نے خون کیا ہے ان میں ایک جان کا سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں گے، اور میرا بھائی ہارون (علیہ السلام) اس کی زبان چلتی ہے مجھ سے زیادہ سو اس کو بھیج میرے ساتھ مدد کو میری تصدیق کرے میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھوٹا کریں، فرمایا ہم مضبوط کر دیں گے تیرے بازو کو تیرے بھائی سے اور دیں گے تم کو غلبہ پھر وہ نہ پہنچ سکیں گے تم تک ہماری نشانیوں سے، تم اور جو تمہارے ساتھ ہو غالب رہو گے۔"

﴿وَ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًا ؕ﴿۲﴾ ذُرِّیَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ﴿۳﴾﴾ (بنی اسرائیل: ۲۔۳)

"اور دی ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب اور کیا اس کو ہدایت بنی اسرائیل کے واسطے کہ نہ ٹھہراؤ میرے سواء کسی کو کارساز تم جو

Marfat.com

اولاد ہوان لوگوں کی جن کو چڑھایا ہم نے نوح کے ساتھ، بیشک وہ تھا بندہ حق ماننے والا۔"

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَآىِٕهٖ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۲۳﴾ وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۲۵﴾﴾ (السجدہ: ۲۳۔۲۵)

"اور ہم نے دی ہے موسیٰ کو کتاب سو تو مت رہ دھوکے میں اس کے ملنے سے اور کیا ہم نے اس کو ہدایت بنی اسرائیل کے واسطے اور کیے ہم نے ان میں پیشواء جو راہ چلاتے تھے ہمارے حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے اور رہے ہماری باتوں پر یقین کرتے تیرا رب جو ہے وہی فیصلہ کرے گا ان میں دن قیامت کے جس بات میں کہ وہ اختلاف کرتے تھے۔"

ان آیات میں "عصاء موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ یا آیۃ اللہ ہونے کو" مختلف تعبیرات سے ادا کیا گیا ہے سورۂ طٰہٰ میں ﴿حیۃ تسعی﴾ فرمایا اور سورۂ نمل اور قصص میں ﴿جان﴾ کہا گیا، اور شعراء میں ﴿ثعبان مبین﴾ ظاہر کیا، مفسرین فرماتے ہیں کہ "عصاء موسیٰ (علیہ السلام)" کی اگرچہ یہ تعبیرات لفظی اعتبار سے مختلف ہیں لیکن حقیقت اور معنی کے لحاظ سے مختلف نہیں ہیں، بلکہ ایک حقیقت کے مختلف اوصاف کو ادا کیا گیا ہے یعنی جنس کے اعتبار سے وہ "حیہ" سانپ تھا، اور تیز روی کے اعتبار سے "جان" (تیز رو سانپ تھا) اور ضخامت کے پیش نظر وہ "ثعبان" (اژدھا) تھا۔

اور سورۂ قصص میں موسیٰ علیہ السلام کے دونوں معجزوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَّ اضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ﴾ (القصص: ۳۲)

"اور اپنی جانب اپنے بازو لے خوف کی حالت میں"۔

اس آیت میں کس قسم کے خوف کا ذکر ہے؟ اس کے متعلق حضرت شاہ صاحب دہلوی نور اللہ مرقدہٗ ارشاد فرماتے ہیں:

"بازو ملا ڈر سے یعنی سانپ کا ڈر جاتا رہے۔" [1]

اور بعض علماء کہتے ہیں کہ اس خوف سے فرعون کے دربار کا خوف مراد تھا یعنی اگر فرعون کے سامنے کسی وقت خوف محسوس ہونے لگے تو اے موسیٰ علیہ السلام! تو اپنے بازو کو بدن کے ساتھ ملا لینا فوراً ڈر جاتا رہے گا، اور دل میں سکون و اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ یہ دو نشانیوں کے علاوہ تیسری نشانی نہیں تھی بلکہ خوف اور ڈر دور کرنے کا ایک فطری علاج بتلایا گیا تھا جو ایسے موقع پر عموماً فائدہ مند ثابت ہوتا ہے، اور اب جبکہ خدائے تعالیٰ کا فرمودہ تھا تو اس کے راست آنے میں موسیٰ علیہ السلام کو شک کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ [2] ہمارے نزدیک آیت کا سیاق حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی تائید کرتا ہے اور نجار کی توجیہ ایک دور کی بات معلوم ہوتی ہے۔

فرعون کے دربار میں دعوت حق:

بہرحال حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کے درمیان جب ملاقات اور گفتگو کا سلسلہ ختم ہوا تو اب دونوں نے طے کیا کہ

---

[1] موضح القرآن [2] قصص الانبیاء للنجار ص ۲۱۲

Marfat.com

خدائے تعالیٰ کے امتثال حکم کے لیے فرعون کے پاس چلنا اور اس کو پیغام الٰہی سنانا چاہیے۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ جب دونوں بھائی فرعون کے دربار میں جانے لگے تو والدہ نے غایت شفقت کی بنا پر روکنا چاہا کہ تم ایسے شخص کے پاس جانا چاہتے ہو جو صاحب تخت و تاج بھی ہے اور ظالم و مغرور بھی، وہاں نہ جاؤ وہاں جانا بے سود ہوگا، مگر دونوں نے والدہ کو سمجھایا کہ خدائے تعالیٰ کا حکم ٹالا نہیں جاسکتا، اور اس کا وعدہ ہے کہ ہم کامیاب ہوں گے۔

غرض دونوں بھائی اور خدا کے سچے پیغمبر و نبی فرعون کے دربار میں پہنچے اور بغیر خوف و خطر اندر داخل ہو گئے، جب فرعون کے تخت کے قریب پہنچے تو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی اور گفتگو شروع ہوئی اور انہوں نے فرمایا:

"فرعون! ہم کو خدا نے اپنا پیغمبر اور رسول بنا کر تیرے پاس بھیجا ہے، ہم تجھ سے دو اہم باتیں چاہتے ہیں، ایک یہ کہ خدا پر یقین لا، اور کسی کو اس کا ساجھی اور سہیم نہ بنا، دوسرے یہ کہ ظلم سے باز آ، اور بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے نجات دے، ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یقین رکھ کہ یہ بناوٹ اور تصنع نہیں ہے اور نہ ہم کو یہ جرأت ہوسکتی ہے کہ خدائے تعالیٰ کے ذمہ غلط بات لگائیں، ہماری صداقت کے لیے جس طرح ہماری یہ تعلیم خود شاہد ہے اسی طرح خدائے تعالیٰ نے ہم کو اپنی دو زبردست نشانیاں (معجزات) بھی عطاء فرمائی ہیں۔ لہٰذا تیرے لیے مناسب یہی ہے کہ صداقت و حق کے اس پیغام کو قبول کر اور بنی اسرائیل کو رستگاری دے کر میرے ساتھ کر دے تاکہ میں انہیں پیغمبروں کی اس سرزمین میں لے جاؤں جہاں بجز ذات واحد کے یہ اور کسی کی پرستش نہ کریں کہ یہی راہ حق ہے اور ان کے باپ دادوں کا ابدی شعار۔"

﴿وَ قَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ حَقِيْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۰۴-۱۰۵)

"اور موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے فرعون! میں جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا ایلچی ہوں، میرے لیے کسی طرح زیبا نہیں کہ اللہ پر حق اور سچ کے علاوہ کچھ اور کہوں، بلاشبہ میں تمہارے لیے تمہارے پروردگار کے پاس سے دلیل اور نشان لایا ہوں پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔"

فرعون نے جب یہ سنا تو کہنے لگا کہ "موسیٰ (علیہ السلام)! آج تو پیغمبر بن کر میرے سامنے بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کرتا ہے، وہ دن بھول گیا تو نے میرے ہی گھر میں پرورش پائی اور بچپن کی زندگی گذاری اور کیا تو یہ بھی بھول گیا کہ تو نے ایک مصری کو قتل کیا اور یہاں سے بھاگ گیا" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "فرعون! صحیح ہے کہ میں نے تیرے گھر میں پرورش پائی اور ایک مدت تک شاہی محل میں رہا۔ اور مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ غلطی کی بناء پر مجھ سے نادانستہ ایک شخص قتل ہو گیا اور میں اس خوف سے چلا گیا تھا، لیکن یہ خدائے تعالیٰ کی رحمت کا کرشمہ ہے کہ اس نے تمام بیکسانہ مجبوریوں کی حالت میں تیرے ہی گھرانے میں میری پرورش کرائی اور مجھ کو اپنی سب سے بڑی نعمت "نبوت و رسالت" سے سرفراز کیا۔

اے فرعون! کیا یہ طریقہ عدل و انصاف کا طریقہ ہوگا کہ مجھ ایک اسرائیلی کی پرورش کا بدل یہ ٹھہرے کہ بنی اسرائیل کی تمام قوم کو تو غلام بنائے رکھے؟"

Marfat.com

﴿ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۶ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝۱۷ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ
فِيْنَا وَلِيْدًا وَّ لَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۝۱۸ وَ فَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَ اَنْتَ مِنَ
الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۹ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝۲۰ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّ
جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۲۱ وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝۲۲ ﴾ (الشعراء : ۱۶۔۲۲)

"پھر وہ دونوں فرعون کے پاس آئے پس انہوں نے کہا: "ہم بلاشبہ جہانوں کے پروردگار کے پیغمبر اور ایلچی ہیں، یہ پیغام لے کر آئے ہیں کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے" فرعون نے کہا: "کیا ہم نے تجھ کو اپنے یہاں لڑکا سا نہیں پالا اور تو ہمارے یہاں ایک مدت نہیں رہا اور تو نے جو کچھ اس زمانے میں کام کیا وہ تجھے خود بھی معلوم ہے اور تو ناشکر گزار ہے" موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "میں نے وہ کام (مصری کا قتل) ضرور کیا اور میں اس میں چوک جانے والوں میں سے ہوں پھر یہاں سے تمہارے خوف سے بھاگ گیا، پھر میرے رب نے مجھ کو صحیح فیصلہ کی سمجھ دی اور مجھ کو اپنے پیغمبروں میں سے بنا لیا (یہ اس کی حکمت کی کرشمہ سازیاں ہیں) اور میری (پرورش) کا یہ احسان جس کو تو مجھ سے جتا رہا ہے کیا ایسا احسان ہے کہ تو بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھے۔"

سورۂ شعراء کی اس آیت ﴿وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ .... الخ﴾ کا ترجمہ عام مفسرین کی تفسیر کے مطابق کیا گیا ہے لیکن اس کے [...]س عبدالوہاب نجار اس آیت کے یہ معنی کرتے ہیں: "اور تیرا یہ انعام ہوگا اور تو مجھ پر احسان کرے گا کہ تو بنی اسرائیل کو عزت بخشے [...]نی ان کو میرے ساتھ بھیج دے کہ وہ اپنے خدا کی عبادت میں آزاد ہو جائیں۔"

اور اس معنی کے جواز میں فرماتے ہیں کہ "عبدت" بمعنی "کرمت" لغت عرب سے ثابت ہے، چنانچہ لسان العرب ص ۲۶۳ [...]د ۴ میں ہے "المعبد، المکرم" اور یہاں یہ معنی لینے اس لیے ضروری ہیں کہ قرآن عزیز میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ [...]لام کو یہ تلقین کر دی تھی کہ فرعون کے سمجھانے میں نرمی اور لطف و مہربانی کو پیش نظر رکھنا، غصہ یا سخت کلامی کا اظہار نہ کرنا لہٰذا حضرت [...]ٰ علیہ السلام سے یہ بعید ہے کہ وہ اس ہدایت الٰہی کے خلاف طعن و تشنیع یا معاریض و مجازات سے کام لیں جو رفق و تلطف کے قطعاً [...]ف ہے اور جو معنی عام مفسرین نے لیے ان میں طعن و معاریض کا پہلو نکلتا ہے۔ [۱]

مگر نجار نے اس موقعہ پر جو کچھ کہا ہے وہ خود تکلف بارد اور رکیک تاویل کی حیثیت سے زیادہ نہیں ہے، اس لیے کہ عام [...]رین کے معنی کے مطابق یہاں نہ طعن و تشنیع ہے اور نہ معاریض و مجازات بلکہ روشن دلیل اور واضح حجت کے ذریعہ فرعون کو اس کی [...]روی اور متمردانہ سرکشی پر توجہ دلانا ہے جو ایک پیغمبر اور خدا کے سچے رسول کا فرض منصبی ہے۔

فرعون نے اپنی مغرورانہ سرشت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیغمبر خدا ہونے کا استخفاف کیا اور مذاق و تحقیر کرتے [...]ئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت سے بحث شروع کر دی، اپنے گھرانے کے احسان جتائے اور مصری کے قتل والا معاملہ یاد دلا کر [...]زدہ کرنے کی سعی کی مگر موسیٰ علیہ السلام چونکہ ان سب مراحل کے متعلق خدائے برحق سے ہر قسم کا اطمینان کر چکے تھے، اس لیے ان پر

---

[۱] [...]ص الانبیاء عربی ۲۱۶

Marfat.com

مطلق نہ خوف کا اثر ہوا اور نہ ان کو غصہ آیا، بلکہ انہوں نے فرعون کے گھرانے کی تربیت کا اعتراف بھی کیا اور مصری کے قتل کی غلطی کو بھی تسلیم کیا مگر ساتھ ہی ایک ایسا مسکت برہان اور خاموش کن دلیل بھی پش کر دی کہ فرعون واقعی لاجواب ہو گیا اور اس نے ناراضی اور غصے کے اظہار کی بجائے گفتگو کا پہلو فوراً بدل دیا اور موسیٰ علیہ السلام سے رب العالمین کے متعلق بات چیت شروع کر دی، اور وہ دلیل و حجت یہی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ”تو نے جو کچھ کہا میری شخصیت اور ذات سے متعلق ہے لیکن کیا یہ باتیں اس کے لیے جواز کا سبب بن سکتی ہیں کہ بنی اسرائیل کی پوری قوم کو تو غلام بنائے رہے، یہ تو صریح ظلم ہے۔“

لہٰذا مفسرین کی تفسیر اور ترجمہ ہی صحیح ہے اور نجار کے ترجمہ کو تسلیم کر لینے کے بعد کلام کی تمام لطافت اور خوبی فنا ہو جاتی ہے اور سیاق وسباق کے ساتھ بھی بے تکلف اس کا جوڑ نہیں لگتا۔

ربوبیت الٰہی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام و فرعون کا مذاکرہ:

فرعون نے دوران گفتگو میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو یہ طعن کیا تھا کہ تو نے ہمارے یہاں تربیت پائی ہے اور میں تیرا مربی ہوں تو اس کے معنی صرف اسی قدر نہیں تھے بلکہ اس کی تہہ میں وہ عقیدہ کام کر رہا تھا جس کی شکست و ریخت کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث کیے گئے تھے یعنی سلطنت مصر کا بادشاہ صرف بادشاہ ہی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ”راع“ [1] (سورج) کا اوتار مانا جاتا تھا اور اسی لیے فرعون کے لقب سے ملقب تھا، مصریوں کے عقیدہ میں تربیت کائنات کا معاملہ ”راع“ دیوتا کے سپرد تھا اور دنیا میں اس کا صحیح مظہر شاہ مصر (فرعون) تھا، اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب خدائے واحد کی پرستش اور دیوتاؤں کی پوجا کے خلاف آواز بلند کی اور فرمایا ﴿ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴾ تو اول اس نے اپنی اور اپنے باپ دادا کی ربوبیت کو اس طرح ثابت کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت پر اس کا بوجھ پڑے، اور جب اس طرح اصل مسئلہ کو حل ہوتے نہ دیکھا تو اب مسئلہ کو زیادہ عریاں کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مناظرہ پر آمادہ ہو گیا اور کہنے لگا موسیٰ (علیہ السلام)! یہ تو نئی بات کیا سناتا ہے، کیا میرے علاوہ بھی کوئی رب ہے کہ جس کو تو رب العالمین کہتا ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو اس کی حقیقت بیان کر، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اگر تجھ میں یقین اور ایمان صحیح کی گنجائش ہے تو تجھ کو سمجھنا چاہیے کہ میں جس ہستی کو رب العالمین کہتا ہوں وہ ذات اقدس ہے جس کے قبضۂ قدرت میں آسمان، زمین اور ان دونوں کے درمیان کی کل مخلوقات کی ربوبیت ہے، فرعون! کیا تو دعویٰ کر سکتا ہے کہ ان آسمانوں، زمینوں اور ان کے تمام مخلوقات کو تو نے پیدا کیا ہے یا ان کی ربوبیت کا کارخانہ تیرے ید قدرت میں ہے؟ اگر نہیں اور بلاشبہ نہیں! تو پھر رب العالمین کی ربوبیت عام سے انکار کیوں؟ فرعون نے یہ سنا تو درباریوں کی جانب مخاطب ہو کر تعجب اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا ﴿ أَلَا تَسْتَمِعُونَ ﴾ کیا تم سنتے

[1] مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے جن میں سے بعض تو خاص خاص قبیلوں اور علاقوں کے تھے، جیسے نیفات فتاہ اور مات اور بعض عالمگیر قوتوں کے الگ مظاہر تھے، جیسے ازیریں عالم آخرت کا خدا، میہ ادرت آسمان کا خدا، کینمو، جسم بنانے والا، ایزیر روح بخشنے والی دیوی۔ طوطا عمر کی مقدار مقرر کرنے والا، ہوراس درد وغم دور کرنے والا، حاثو (گائے) رزق بخشنے والی دیوی، اور ان سب سے بلند تر آمن راع تھا یعنی سورج دیوتا۔

نیز مصریوں میں الوہیت آمیز شاہی کا تصور بھی پوری طرح نشوونما پا چکا تھا اور تاجداران مصر نے نیم خدا کی حیثیت اختیار کر لی تھی، ان کا لقب ”فاراع“ اس لئے ہوا کہ وہ ”راع“ یعنی سورج دیوتا کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ (ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۴۶۲) و دائرۃ المعارف للبستانی جلد ۵ مادہ ”راع“۔

Marfat.com

ہو؟ یہ کیسی عجیب بات کہہ رہا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے درباریوں کے اس تعجب اور حیرانی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اور اپنے سلسلہ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: "رب العالمین" وہ ہستی ہے جس کی ربوبیت کے اثر سے تیرا اور تیرے باپ کا وجود بھی خالی نہیں ہے، یعنی جس وقت تو عالم وجود میں نہ آیا تھا تو تجھ کو پیدا کیا اور تیری تربیت کی اور اسی طرح وہ تجھ سے پہلے تیرے آباء واجداد کو عالم وجود میں لایا اور ان کو اپنی ربوبیت سے نوازا، فرعون نے جب اس مسکت اور زبردست دلیل کو سنا اور کوئی جواب نہ بن پڑا تو درباریوں سے کہنے لگا: "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو خود کو تمہارا پیغمبر اور رسول کہتا ہے مجنون اور پاگل ہے" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ اس سے اب کوئی جواب نہیں بن پڑتا تو سوچا یہ بہتر ہے کہ اور زیادہ دل نشین پیرایہ بیان میں خدا کی ربوبیت کو واضح کیا جائے اس لیے فرمایا: یہ جو مشرق و مغرب اور اس کے درمیان ساری کائنات نظر آتی ہے اس کی ربوبیت جس کے ید قدرت میں ہے اسی کو میں "رب العالمین" کہتا ہوں، تم اگر ذرا بھی عقل و سمجھ سے کام لو تو بآسانی اس حقیقت کو پا سکتے ہو۔

غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ رب العالمین کے حکم کے مطابق برابر شیریں کلامی، نرم گفتاری اور رفق و لطف کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کو راہ حق دکھاتے اور رسالت کا فرض ادا فرماتے رہے اور فرعون کی تحقیر و توہین اور مجنون جیسے سخت الفاظ کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے اس کی رشد و ہدایت کے لیے بہترین دلائل اور مسکت جوابات دیتے رہے۔

﴿قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ۝ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۝ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝﴾

(الشعراء: ۲۳۔۲۸)

"بولا فرعون کیا معنی ہیں پروردگار عالم کے؟ کہا پروردگار آسمان اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے، اگر تم یقین کرو، بولا اپنے گرد والوں سے کیا تم نہیں سنتے ہو؟ کہا پروردگار تمہارا اور پروردگار تمہارے اگلے باپ دادوں کا، بولا تمہارا پیغام لانے والا جو تمہاری طرف بھیجا گیا ضرور باؤلا ہے، کہا پروردگار مشرق کا اور مغرب کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں موجود ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔"

ایک مرتبہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو یاد دلایا کہ جو راستہ تو نے اختیار کیا ہے یہ صحیح نہیں ہے بلکہ رب العالمین ہی وہ ذات ہے جو لائق پرستش ہے اور اس کے مقابلہ میں کسی انسان کا دعوائے ربوبیت کھلا ہوا شرک ہے، اے فرعون! تو اس سے باز آ کیونکہ اس ہستی نے جس کو میں رب العالمین کہہ رہا ہوں ہم پر یہ وحی نازل کی ہے کہ جو شخص اس قول حق کی خلاف ورزی اور تکذیب کرے گا اور اس سے منہ موڑے گا وہ خدا کے عذاب کا مستحق ٹھہرے گا۔

﴿اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۴۸)

"جو کوئی اور سرتابی کرے تو ہم پر وحی اتر چکی کہ اس کے لیے عذاب کا پیام ہے۔"

فرعون نے پھر وہی سوال دہرا دیا "اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں ایسی لاجواب بات کہی کہ فرعون حیران رہ گیا اور پہلو بدل کر بات کا رخ دوسری جانب پھیرنے کی اس طرح سعی کرنے لگا جس طرح باطل گوش مناظرین کا قاعدہ ہے کہ جب صحیح جواب نہ بن پڑے اور حقیقت حال صاف سامنے آجائے تو پھر اس کو دبانے کے لیے کجروی کے ساتھ بات کا رخ دوسری جانب پھیر دیا کرتے ہیں۔

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "ہمارا پروردگار تو وہ ایک ہی پروردگار ہے جس نے دنیا کی ہر چیز کو اس کا وجود بخشا اور پھر ہر طرح کی ضروری قوتیں (حواس وعقل وغیرہ) دے کر اس پر زندگی وعمل کی راہ کھول دی، جس نے ہر شئے کو نعمت جسم و وجود عطاء کی اور پھر سب کو منزل کمال کی طرف چلنے کی راہ دکھائی" تب فرعون نے لاجواب ہو کر بات کا رخ یوں بدلا کہنے لگا:

﴿قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۝﴾ (طٰہٰ:۵۱)

"تو پھر پہلے لوگوں کا حال کیا ہوا"۔

مطلب یہ تھا کہ اگر تیری یہ بات صحیح ہے تو پھر ہم سے پہلے لوگ اور ہمارے باپ دادا جن کا عقیدہ تیرے عقیدے کی تائید میں نہ تھا کہا وہ سب عذاب میں گرفتار ہیں اور سب جھوٹے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی کج بحثی کو سمجھ گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ یہ اصل مقصد کو الجھانا چاہتا ہے اس لیے فوراً جواب دیا:

﴿قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَ لَا یَنْسَی ۝﴾ (طٰہٰ:۵۲)

"ان پر کیا گذری اور ان کے ساتھ خدا کا کیا معاملہ رہا اس کی ذمہ داری نہ مجھ پر ہے اور نہ تجھ پر، ان کا علم میرے پروردگار کے پاس محفوظ ہے۔ ہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میرا پروردگار بھول چوک اور خطاء سے پاک ہے جس نے جو کچھ کیا ہے اس کے معاملہ میں کوئی بھول یا ظلم نہ ہوگا"

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر گفتگو کو اصل مسئلہ کی طرف پھیر دیا اور رب العالمین کے اوصاف کا ذکر کر کے مسئلہ کی حقیقت کو اچھی طرح واضح اور مستحکم بنایا۔

﴿قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا یٰمُوْسٰى ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۝ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَ لَا یَنْسَی ۝ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ سَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝ كُلُوْا وَ ارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ۝ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِیْهَا نُعِیْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝﴾ (طٰہٰ:۴۹-۵۵)

"فرعون نے پوچھا "اگر ایسا ہی ہے تو بتلاؤ تمہارا پروردگار کون ہے اے موسیٰ؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر اس پر (زندگی وعمل کی) راہ کھول دی" فرعون نے کہا، پھر ان کا کیا حال ہونا ہے جو

پچھلے زمانوں میں گذر چکے ہیں؟ موسیٰ نے کہا، اس بات کا علم میرے پروردگار کے پاس نوشتہ میں ہے میرا پروردگار ایسا نہیں کہ کھویا جائے یا بھول میں پڑ جائے، وہ پروردگار جس نے تمہارے لیے زمین بچھونے کی طرح بچھا دی، نقل وحرکت کے لیے اس میں راہیں نکال دیں، آسمان سے پانی برسایا، اس کی آبپاشی سے ہر طرح کی نباتات کے جوڑے پیدا کر دیئے، خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشی بھی چراؤ، اس بات میں عقل والوں کے لیے کیسی کھلی نشانیاں ہیں؟ اس نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا، اسی میں لوٹتا ہے اور پھر اسی سے دوسری مرتبہ اٹھائے جاؤ گے۔"

ہندوستان کے ایک مشہور معاصر عالم نے سورہ طٰہٰ کی آیت ﴿كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾ میں "ہدایت" کے معنی رہنمائی حواس وعقل تسلیم کرتے ہوئے مفسرین کو بے محل مورد طعن بنایا ہے کہ انہوں نے قرآن عزیز کی آیت زیر بحث کی روح کو نہ پاتے ہوئے غلطی سے یہاں بھی "ہدیٰ" کے معنی ہدایت دین مذہب کے لیے ہیں، اور گویا صرف انہوں نے ہی سب سے پہلی مرتبہ اس روح کو پہچانا اور اس حقیقت پر آگاہی حاصل کی ہے، حالانکہ چند مفسرین کے علاوہ قدیم اور جدید عام مفسرین اور محققین نے بھی اس مقام پر "ہدیٰ" کے وہی معنی بیان کیے ہیں جن کو اچھوتا اور طبع زاد بتایا گیا ہے۔ ❶

علماء تفسیر کہتے ہیں کہ فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کے ان مکالمات میں حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کے درمیان ترجمان ہوتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دلائل وبراہین کو نہایت فصاحت وبلاغت کے ساتھ ادا فرماتے تھے۔

بہرحال مختلف مجالس میں مکالمات کا یہ سلسلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان جاری رہا، فرعون، حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کے روشن اور پرازصداقت دلائل سن سن کر اگرچہ پیچ وتاب کھاتا مگر لاجواب ہو جانے کی وجہ سے کوئی صورت نہیں بنتی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام سے رستگاری حاصل کرے، وہ خوب جانتا تھا کہ میری ربوبیت اور الوہیت کی بنیاد اس قدر کمزور ہے کہ دلائل موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کے سامنے تارعنکبوت کی طرح تار تار ہو جاتی ہے اور درباری بھی اس کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لیے فرعون کے لیے یہ بات سخت ناقابل برداشت تھی، اور جس قلمرو میں اس کے رعب شاہی اور دبدبۂ حکومت کے ساتھ ساتھ اس کی ربوبیت و الوہیت کا جاہ وجلال بھی مانا جاتا ہو وہاں موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی جرأت حق اندر ہی اندر اس کو سخت خائف اور پریشان کر رہی تھی، اس لیے فرعون نے اب سلسلہ بحث کو ختم کرنے کے لیے دوسرے طریقے اختیار کیے جن میں اپنی طاقت وقہرمانیت کا مظاہرہ، مصری قوم کو موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے خلاف مشتعل کرنا اور "رب العالمین" سے جنگ کا اعلان کر کے اس بحث کا خاتمہ کر دینا شامل تھا، چنانچہ اس نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ﴾ (القصص: ۳۸)

"اور فرعون نے کہا اے جماعت میں تمہارے لیے اپنے سوائے کوئی خدا نہیں جانتا۔"

اور پھر (اپنے مشیر یا وزیر) ہامان کو حکم دیا:

---

❶ ثم هدى الى طريق الانتفاع والارتفاق بما اعطاه و عرفه كيف يتوصل الى بقائه كماله اما اختيار اكما في الحيوانات او طبعًا كمه في الجماد... الخ (روح المعانی جلد ۱۶ ص ۱۸۳)

Marfat.com

﴿فَاَوْقِدْ لِیْ یٰهَامٰنُ عَلَی الطِّیْنِ فَاجْعَلْ لِّیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤی اِلٰهِ مُوْسٰی ۙ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ۝﴾ (القصص: ۳۸)

"اے ہامان! اینٹیں پکا اور ایک بہت بلند عمارت بنا شاید اس پر چڑھ کر میں موسیٰ (علیہ السلام) کے خدا کا پتہ لگا سکوں اور میں تو بلا شبہ اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔"

﴿وَ قَالَ فِرْعَوْنُ یٰهَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤی اِلٰهِ مُوْسٰی وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَ كَذٰلِكَ زُیِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ صُدَّ عَنِ السَّبِیْلِ ؕ وَ مَا كَیْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِیْ تَبَابٍ ۝﴾ (المومن: ۳۶-۳۷)

"فرعون نے کہا! اے ہامان! میرے لیے ایک بلند عمارت تیار کرتا کہ میں آسمانوں کی بلندیوں اور ان کے ذرائع تک دسترس حاصل کر سکوں اور اس طرح موسیٰ (علیہ السلام) کے خدا کا حال معلوم کر سکوں اور میں تو اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں، اسی طرح فرعون کے لیے اس کی بدعملی کو خوبصورت کر دیا گیا اور وہ راہ حق سے (بدعملی پر اصرار کی وجہ سے) روک دیا گیا۔ اور فرعون کے مکر کا آخری انجام ہلاکت ہے۔"

حضرت شاہ عبدالقادر نوراللہ مرقدہٗ موضح القرآن میں ارشاد فرماتے ہیں کہ آیت ﴿مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ﴾ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون دہری (ناسک) تھا اور کتب تفسیر و تاریخ میں جو مصر قدیم کے تاریخی حوالہ جات نقل کیے گئے ہیں ان سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ مصری دیوتاؤں کے پرستار تھے اور ان کا سب سے بڑا دیوتا "آمن راع" (سورج دیوتا) تھا اور وہ خدائے واحد کے کسی معنی میں بھی قائل نہ تھے بلکہ تمام کائنات کی تخلیق اور ان کے ہر قسم کے معاملات و حادثات کا تعلق کواکب و سیارات اور ان دیوتاؤں ہی سے متعلق سمجھتے تھے، غالباً فرعون اور اس کی قوم کا عقیدہ ہندوستان کے جین مت کے قریب قریب تھا کیونکہ جینی بھی خدا کے منکر مگر دیوتاؤں کے پرستار ہیں۔

ہامان:

ہامان کے متعلق قرآن عزیز نے کوئی تصریح نہیں کی کہ یہ کسی شخصیت کا نام ہے یا عہدہ اور منصب کا اور اس کا منصب وعدہ فرعون کے دربار میں کیا تھا، اور نہ اس نے اس پر روشنی ڈالی کہ ہامان نے عمارت تیار کرائی یا نہیں اور فرعون نے پھر اس پر چڑھ کر کیا کیا؟ کیونکہ یہ اس کے مقصد کے لیے غیر ضروری تھا، تورات نے بھی اس کے متعلق کوئی اشارہ نہیں کیا بلکہ اس نے فرعون کے عمارت بنانے کے حکم کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا، البتہ مفسرین نے یہ قصہ ضرور نقل کیا ہے کہ جب ہامان نے ایک بہت اونچا مینارہ تیار کرا کے فرعون کو اطلاع دی تو فرعون اس پر چڑھا اور تیر کمان ہاتھ میں لے کر آسمان کی طرف تیر پھینکا، قدرت الٰہی کے فیصلہ کے مطابق وہ تیر خون آلود ہو کر واپس ہوا فرعون نے یہ دیکھ کر غرور اور شیخی کے ساتھ مصریوں سے کہا کہ لو اب میں نے موسیٰ (علیہ السلام) کے خدا کا قصہ تمام کر دیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

Marfat.com

فرعون نے درباریوں، عام قبطیوں اور ہامان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنی شکست کو چھپانے کے لیے اگرچہ مسطورہ بالا طریقہ اختیار کیا مگر وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ یہ ایک دھوکا ہے اور بس، اس سے دلوں کی تسلی نہیں ہو سکتی، اور بہت ممکن ہے کہ بہت سے مصری بھی اس کو سمجھتے ہوں تاہم درباریوں اور خواص و عوام میں ایک بھی ایسا "رجل رشید" نہ تھا جو جرأت و حق گوئی کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کر دیتا اور رشد و ہدایت کی قبولیت کا دروازہ وا کرتا۔

فرعون کے دربار میں "آیات اللہ" کا مظاہرہ:

غرض فرعون کا خدشہ بڑھتا ہی رہا، اس کو حق و باطل کی اس کشمکش میں اپنے لیے سخت خطرہ نظر آ رہا تھا اس لیے اس نے معاملہ کو صرف یہیں ختم نہیں کر دیا بلکہ ضروری سمجھا کہ اپنی سطوت و جبروت اور قہرمانیت، کا اثر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام پر بھی ڈالے اور اس طرح ان کو مرعوب کر کے پیغام حق کے فرض سے ان کو باز رکھے، چنانچہ کہنے لگا "موسیٰ (علیہ السلام)! اگر تو نے میرے سوائے اور کسی کو معبود قرار دیا تو میں تجھ کو قید میں ڈال دوں گا" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "اگرچہ میں تیرے پاس خدائے واحد کی جانب سے واضح نشان لے کر آیا ہوں تب بھی تیرے غلط راستے کو اختیار کر لوں؟" فرعون نے کہا: "اگر واقعی تو اس بارہ میں سچا ہے تو کوئی "نشان" دکھا۔"

﴿قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِىْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ۝ قَالَ اَوَ لَوْ جِئْتُكَ بِشَىْءٍ مُّبِيْنٍ ۝ قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝﴾ (الشعراء: ۲۹-۳۱)

"فرعون نے کہا اگر تو نے میرے سوائے کسی کو معبود بنایا تو میں تجھے ضرور قید کر دوں گا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا، اگرچہ میں تیرے پاس ظاہر نشان لایا ہوں تب بھی؟ فرعون نے کہا اگر تو سچا ہے تو وہ نشان دکھا۔"

﴿قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۰۶)

"فرعون نے کہا اگر تو اپنے خدا کے پاس کوئی نشانی لایا ہے تو اس بارے میں سچا ہے تو لا وہ نشان دکھا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے اور بھرے دربار میں فرعون کے سامنے اپنی لاٹھی کو زمین پر ڈالا، اسی وقت اس نے اژدہا کی شکل اختیار کر لی اور یہ حقیقت تھی، نظر کا دھوکا نہ تھا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ہاتھ کو گریبان کے اندر لے جا کر باہر نکالا تو وہ ایک روشن ستارہ کی طرح چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا، یہ دوسری نشانی اور دوسرا معجزہ تھا۔

فرعون کے درباریوں نے جب اس طرح ایک اسرائیلی کے ہاتھوں اپنی قوم اور اپنے بادشاہ کی شکست کو دیکھا تو تلملا اٹھے اور کہنے لگے: بلاشبہ یہ بہت بڑا ماہر جادوگر ہے اور اس نے یہ سب ڈھونگ اس لیے رچایا ہے کہ تم پر غالب آ کر تم کو تمہاری سرزمین (مصر) سے باہر نکال دے، لہٰذا اب ہم کو سوچنا ہے کہ اس کے متعلق کیا ہونا چاہیے، آخر فرعون اور فرعونیوں کے باہمی مشورہ سے یہ طے پایا کہ فی الحال تو اس کو اور ہارون علیہ السلام کو مہلت دو اور اس دوران میں تمام قلمرو سے ماہر جادوگروں کو دارالسلطنت میں جمع کرو اور پھر موسیٰ (علیہ السلام) کا مقابلہ کراؤ، بلاشبہ یہ شکست کھا جائے گا اور اس کے تمام ارادے خاک میں مل جائیں گے، تب فرعون نے حضرت

Marfat.com

موسیٰ علیہ السلام سے کہا: موسیٰ (علیہ السلام)! ہم خوب سمجھ گئے کہ تو اس حیلہ سے ہم کو سرزمین مصر سے بے دخل کرنا چاہتا ہے، لہٰذا اب تیرا علاج ہمارے درمیان مقابلہ کے دن کا معاہدہ ہونا چاہیے، اور پھر نہ ہم اس سے ٹلیں گے اور نہ تو وعدہ خلافی کرنا" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کام کے لیے سب سے بہتر وقت "یوم الزینۃ" (جشن کا روز) ہے، اس دن سورج بلند ہونے پر ہم سب کو میدان میں موجود ہونا چاہیے۔

﴿ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ۝ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۝ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ وَ اَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۝ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝ ﴾ (الاعراف: ۱۰۷۔۱۱۲)

"پس موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی لاٹھی کو ڈالا پھر اچانک وہ "اژدہا" تھی صاف اور ظاہر اور اس نے ہاتھ کو گریبان سے نکالا تو دیکھنے والوں کے لیے چمکتا ہوا روشن تھا، فرعونیوں کی ایک جماعت نے کہا بلاشبہ یہ ماہر جادوگر ہے، اس کا ارادہ ہے کہ تم کو تمہاری سرزمین (مصر) سے نکال دے پس تمہارا کیا مشورہ ہے، انہوں نے کہا اس کو اور اس کے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو مہلت دو اور شہروں میں ایک جماعت کو بھیجو جو ماہر جادوگروں کو اکٹھا کر کے لائے۔"

﴿ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَ هٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَ مَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝ ﴾ (یونس: ۷۵۔۷۹)

"پھر ہم نے ان رسولوں کے بعد موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو بھیجا، فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف، وہ ہماری نشانیاں اپنے ساتھ رکھتے تھے، مگر فرعون اور اس کے درباریوں نے گھمنڈ کیا، ان کا گروہ مجرموں کا گروہ تھا، پھر جب ہماری جانب سے سچائی ان میں نمودار ہو گئی تو کہنے لگے "یہ اس کے سواء کچھ نہیں ہے کہ جادو ہے۔ صریح جادو" موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: "تم سچائی کے حق میں جب وہ نمودار ہو گئی ایسی بات کہتے ہو؟ کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر تو کبھی کامیابی نہیں پا سکتے، انہوں نے جواب میں کہا کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا اس سے ہمیں ہٹا دو اور ملک میں تم دونوں بھائیوں کے لیے سرداری ہو جائے؟ ہم تو تمہیں ماننے والے نہیں اور فرعون نے کہا لاؤ میرے پاس ہر قسم کے ماہر ساحر۔"

﴿ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ۝ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَ

Marfat.com

بَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَ لَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ۝ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَ اَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ۝﴾ (طٰه : ۵۷۔۵۹)

"اس نے کہا اے موسیٰ (علیہ السلام)! کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہمیں ہمارے ملک سے نکال باہر کرے؟ اچھا ہم بھی اسی طرح کے جادو کا کرتب لا دکھائیں گے، ہمارے اور اپنے درمیان ایک دن (مقابلہ کا) مقرر کر دے، نہ تو ہم اس سے پھریں نہ تو، دونوں کی جگہ برابر ہوئی، موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا "جشن کا دن تمہارے لیے مقرر ہوا، دن چڑھے لوگ اکٹھے ہو جائیں۔"

غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان "یوم الزینۃ" طے پا گیا، اور فرعون نے اسی وقت اپنے اعیان و ارکان کے نام احکام جاری کر دیئے کہ تمام قلمرو میں جو مشہور اور ماہر جادوگر ہوں ان کو جلد از جلد دار الحکومت روانہ کر دو۔

نجار مصری کہتے ہیں کہ غالباً یوم الزینۃ سے مصریوں کی عید کا وہ دن مراد ہے جو وفاء النیل کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ ان کے یہاں تمام عیدوں میں سب سے بڑی عید کا دن یہی تھا۔ [1]

ساحرین مصر:

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی بعثت کا زمانہ مصری تمدن کی جو تاریخ پیش کرتا ہے اس میں یہ بات بہت نمایاں نظر آتی ہے کہ مصری علوم و فنون میں "سحر" کو ایک مستقل علم و فن کی حیثیت حاصل تھی اور اسی بنا پر ساحرین کا رتبہ مصریوں میں بہت بڑا سمجھا جاتا تھا، حتیٰ کہ ان کو شاہی دربار میں بھی بڑا رسوخ حاصل تھا اور جنگ و صلح، پیدائش و وفات کی زائچہ کشی اور اہم سرکاری معاملات میں بھی انہیں کی جانب رجوع کیا جاتا تھا اور ان کے ساحرانہ نتائج کو بڑی وقعت دی جاتی تھی، حتیٰ کہ مذہبی معاملات میں بھی ان کو اہم جگہ دی جاتی تھی، قدیم شاہی مقبروں میں ممی (حنوط شدہ نعشوں) کے ساتھ جو کاغذات و دستاویزات برآمد ہوئی ہیں اور ان حجروں میں جو تصاویر و نقوش پائے جاتے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

قدیم قوموں کی عام گمراہیوں میں سے ایک گمراہی یہ بھی رہی ہے کہ وہ جادو پر مذہبی حیثیت سے اعتقاد رکھتے اور اس کو اپنی مذہبی زندگی میں اثر انداز یقین کرتے تھے، اور اسی اعتقاد کے پیش نظر وہ اس کو سیکھتے اور سکھاتے بھی تھے اور اس میں طرح طرح کی ایجادات و اختراعات کرتے رہتے تھے، چنانچہ بابل (عراق) مصر چین اور ہندوستان کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔

یہی وجہ تھی کہ مصری قوم پر فرعون اور اس کے اعیان و ارکان حکومت کا یہ جادو چل گیا، کہ موسیٰ جادوگر ہے، اور یہ اپنے جادو کی مہارت کے اثر و رسوخ کو کام میں لا کر مصری حکومت پر قابض ہونا اور تم کو اس سے خارج کر دینا چاہتا ہے اور اب اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اپنے قلمرو کے ماہر جادوگروں کو جمع کر کے موسیٰ (علیہ السلام) کو شکست دے دی جائے اور اس کی چال کو پادر ہوا بنا دیا جائے، موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس بات کو اس لیے غنیمت جانا کہ وہ خدائے تعالیٰ کے جس قدر نشانات (معجزات) فرعون اور قوم فرعون کو دکھا چکے تھے انہوں نے ان کو یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ یہ تو جادو اور سحر ہے، لہٰذا اب جبکہ ساحروں اور جادوگروں سے مقابلہ کے بعد بھی خدا کا معجزہ

---

[1] قصص الانبیاء

غالب رہے گا تو ناچار ان کو صداقت اور حق کے سامنے جھکنا پڑے گا، اور اقرار کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہے گا، نیز یہ سوچا کہ اگرچہ "وحی الٰہی" کے یقین اور روشن حجت و برہان کے ذریعہ "آیات اللہ" (معجزات) کی صداقت کا کافی یقین دلایا جا چکا ہے تاہم فرعون اور اعیان سلطنت ہمیشہ ان واقعات کو سحر اور جادو کہہ کر عوام کو اصل حقیقت سے بے خبر رکھنے کی کوشش کرتے رہے یا شدید حسد اور تعصب نے خود ان کو بھی حقیقی روشنی سے محروم رکھا، پس اگر جشن کے روز خواص و عوام کے مجمع میں ساحر اور جادوگر عاجز ہو کر میری صداقت کا اقرار کریں تو پھر کسی کو بھی لب کشائی کا موقع نہ رہے گا اور برسرِ عام حق کا مظاہرہ منصب تبلیغ کے لیے بہترین ذریعہ ثابت ہوگا۔

سحر:

لغت میں "سحر" کے معنی امر خفی اور پوشیدہ چیز کے ہیں، چنانچہ صبح کے اول وقت کو "سحر" اس لیے کہتے ہیں کہ ابھی دن کی روشنی پوری طرح نمودار نہیں ہوئی اور قدرے تاریکی ہے، اور علمی اصطلاح میں ایسے عجیب و غریب امور کا نام ہے جن کے وجود پذیر ہونے کے اسباب نظر سے اوجھل ہوں اور بادی النظر میں محسوس نہ ہوتے ہوں

اعلم ان لفظ السحر فی عرف الشرع مختص بکل امر یخفی سببه و یتخیل علی غیر حقیقة.... الخ [۱]

"واضح رہے کہ لفظ "سحر" شریعت کی اصطلاح میں ایسے امر کے لیے مخصوص ہے جس کا سبب پوشیدہ ہو اور وہ اصل حقیقت کے خلاف خیال میں آنے لگے۔

"سحر" کی حقیقت کچھ ہے یا وہ محض نظر کا دھوکا اور بے حقیقت شئے ہے؟ اس کے متعلق جمہور علماء اہل سنت کی یہ رائے ہے کہ سحر واقعی ایک حقیقت ہے اور مضرت رساں اثرات رکھتا ہے، حق تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ اور مصلحت کاملہ کے پیش نظر اس میں اسی طرح مضر اثرات رکھ دیئے ہیں جس طرح زہر میں یا دوسری نقصان رساں ادویہ میں، یہ نہیں ہے کہ "سحر" قدرت الٰہی سے بے نیاز ہو کر "العیاذ باللہ" خود مؤثر الذات ہے کیونکہ یہ عقیدہ تو کفر خالص ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ صاحب احکام القرآن، ابواسحاق رحمۃ اللہ علیہ اسفرائنی شافعی علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ ظاہری اور معتزلہ کہتے ہیں کہ "سحر" کی حقیقت شعبدہ نظر بندی، اور فریب خیال کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے بلاشبہ وہ ایک باطل اور بے حقیقت شئے ہے، چنانچہ ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ رازی فرماتے ہیں۔

"اور جب "سحر" کو کسی قید کے بغیر استعمال کیا جائے تو وہ ایک ایسے امر کا نام ہے جو محض دھوکا اور باطل ہو کہ جس کی اس سے زیادہ نہ کوئی حقیقت ہو اور نہ اس کو ثبات حاصل ہو۔" [۲]

اور حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

و قد ذکر الوزیر ابوالمظفر یحییٰ بن محمد بن هبیرة فی کتابه "الاشراف فی مذهب الاشراف" بابًا فی السحر فقال اجمعوا علی ان السحر له حقیقة الا ابا حنیفة رحمة الله علیه فانه قال لا حقیقة له عنده. [۳]

"اور وزیر ابوالمظفر یحییٰ بن محمد بن ہبیرہ نے اپنی کتاب "الاشراف فی مذہب الاشراف" میں ایک باب سحر کے متعلق بھی

---

[۱] تفسیر کبیر ج ۱ ص ۴۳۰ [۲] احکام القرآن ج ۱ ص ۴۸ [۳] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۴۷

Marfat.com

رکھا ہے، اس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ سحر کی بھی حقائق کی طرح ایک حقیقت ہے مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ قطعاً بے حقیقت شئے ہے۔"

قال ابوعبدالله القرطبی و عندنا ان السحر حق و له حقیقة و یخلق الله عنده ما یشاء خلافًا للمعتزلة و ابی اسحٰق الاسفرائینی من الشافعیة حیث قالوا انه تمویه او تخییل.... الخ. [1]

"ابوعبداللہ قرطبی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سحر حقیقت ہے اور ایک واقعی شئے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے، مگر معتزلہ اور شوافع میں سے ابواسحاق اسفرائنی اس قول کے مخالف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ سحر محض فریب نظر اور خیال بندی کا نام ہے۔"

اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

واختلف فی السحر فقیل هو تخییل فقط ولا حقیقة له و هذا اختیار ابی جعفر الاستراٰبادی من الشافعیة ابی بکر الرازی من الحنفیة و ابن حزم الظاهری و طائفة قال النووی و الصحیح ان له حقیقة و به قطع الجمهور و علیه عامة العلماء. [2]

"اور سحر کے متعلق اختلاف ہے، بعض نے یہ کہا ہے کہ وہ فقط تخییل کا نام ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور یہ ابوجعفر شافعی، ابوبکر رازی حنفی اور ابن حزم ظاہری اور ایک چھوٹی جماعت کا خیال ہے، اور نووی فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ "سحر" حقائق میں سے ایک حقیقت ثابتہ ہے اور جمہور اسی پر یقین رکھتے ہیں اور عام علماء کا یہی مسلک ہے۔"

اور جو علماء سحر کو "حقیقت" تسلیم کرتے ہیں ان کے درمیان پھر یہ اختلاف رائے ہے کہ کیا خدائے تعالیٰ نے "سحر" میں یہ تاثیر بخشی ہے کہ وہ حقائق اور ماہیات میں بھی انقلاب کر دے یا مضرت رساں اشیاء کی طرح صرف نقصان دہ ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اس کے اثر سے انسان کی حقیقت گھوڑے میں تبدیل ہو جائے یا گدھا مثلاً انسان ہو جائے، پس ایک چھوٹے سے گروہ کا خیال یہ ہے کہ اس کے اندر انقلاب ماہیت کی تاثیر بھی ودیعت ہے اور جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس میں یہ تاثیر قطعاً ودیعت نہیں اور سحر کے ذریعہ کسی بھی ماہیت کا انقلاب نہیں ہوتا بلکہ اس مرحلہ پر وہ محض نظر بندی اور قوت متخیلہ کی شعبدہ بازی کے سواء اور کچھ نہیں ہوتا، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لکن محل النزاع هل یقع بالسحر انقلاب عین اولا فمن قال انه تخییل فقط منع ذلك و من قال ان له حقیقة اختلفوا هل له تاثیر فقط بحیث یغیر المزاج فیکون نوعًا من الامراض او ینتهی الی الاحالة بحیث یصیر الجماد حیوانًا مثلًا وعکسه فالذی علیه الجمهور هو الاول و ذهبت طائفة قلیلة الی الثانی.... الخ [3]

"لیکن محل نزاع یہ امر ہے کہ سحر سے ذات کا انقلاب ہو جاتا ہے یا نہیں پس جس شخص نے یہ کہا ہے کہ محض تخییل کا نام ہے وہ تو انقلاب کے منکر ہیں اور جو سحر کو حقیقت مانتے ہیں وہ اس بارہ میں مختلف الرائے ہیں آیا سحر کی تاثیر اسی حد تک ہے کہ مزاج میں اس قسم کے تغیرات پیدا کر دے جس طرح امراض میں ہوا کرتا ہے اور وہ بھی ایک مرض شمار ہو یا اس کی تاثیر اس

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۴۷ [2] فتح الباری ج ۱۰ ص ۱۸۲ [3] فتح الباری ج ۱ ص ۱۸۴، احکام القرآن ج ۱ ص ۵۰

Marfat.com

سے زیادہ ہے کہ ایک شۓ کی حقیقت کو بدل ڈالے مثلاً جماد کو حیوان بنادے یا اس کا عکس کردے پس جمہور پہلی بات کے قائل ہیں اور ایک چھوٹی سی جماعت دوسری بات کی۔"

اور اس تمام ایں وآں کے بعد ساحرین فرعون کے اس ساحرانہ مظاہرہ کے متعلق جو جشن کے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں کیا گیا، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ تصریح کرتے ہیں کہ تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ محض تخییل اور تمویہ کی حد تک تھا اور ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ اور ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ دونوں یہ تفصیل دیتے ہیں کہ ساحرین فرعون کی لاٹھیاں اور چمڑے کی رسیاں سانپ نہیں بن گئی تھیں بلکہ ان کے اندر پارہ بھر دیا گیا تھا اور جس زمین میں یہ مظاہرہ کیا گیا تھا اس کو کھوکھلا کر کے اس کے اندر آگ بھر دی گئی تھی، چنانچہ وقت معین پر نیچے کی گرمی سے پارہ میں حرکت پیدا ہوگئی اور وہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ کی طرح دوڑتی نظر آنے لگیں۔ [1]

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر میں "سحر" پر بحث کرتے ہوئے لغوی معنی کے پیش نظر ان تمام اشیاء کو بھی اقسام سحر میں شمار کرایا ہے جو عام نگاہوں میں تعجب خیز اور حیرت انگیز سمجھی جاتی ہیں، مثلاً مسمریزم، ہپناٹزم، تعویذات، حیرت انگیز نقاشی اور سائنس کی ایجادات اور دنیا کے مختلف عجائبات حتیٰ کہ مقرر کی جادو بیانی کو بھی اس عمومیت میں شامل کرلیا ہے، ایک موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا: ((اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا))۔ [2] "بلاشبہ بعض بیان جادو ہوتے ہیں۔"

پس یہ واضح رہے کہ ان اقسام کا اس "سحر" سے کوئی دور کا بھی علاقہ نہیں ہے جو مذہب اور اخلاق کی نگاہ میں مذموم، گمراہی یا کفر سمجھا جاتا ہے۔

سحر اور مذہب:

فقہائے اسلام نے "سحر" کے متعلق تصریح کی ہے کہ جن اعمال سحر میں شیاطین ارواح خبیثہ، اور غیر اللہ، سے استعانت کی جائے اور ان کو حاجت روا قرار دے کر منتروں کے ذریعہ ان کی تسخیر سے کام لیا جائے تو وہ شرک کے مترادف ہے، اور اس کا عامل کافر ہے۔ اور جن اعمال میں ان کے علاوہ دوسرے طریقے استعمال کیے جائیں اور ان سے دوسروں کو نقصان پہنچایا جائے ان کا مرتکب حرام اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے۔ قرآن عزیز میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں مذکور ہے۔

﴿ وَمَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ﴾ (البقرہ: ۱۰۲)

"اور سلیمان (علیہ السلام) نے کفر نہیں کیا لیکن شیاطین نے کفر کیا سکھاتے تھے وہ لوگوں کو سحر۔"

اور حدیث میں ہے:

((ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اِجْتَنِبُوا الْمُوْبِقَاتِ الشِّرْكُ بِاللّٰهِ وَالسِّحْرُ))۔ [3]

---

[1] یہ تفصیل ہے ان اقوال کی جو سحر کے متعلق علماء سلف وخلف میں دائر رہے ہیں، ہم نے فریقین کے دلائل اور ان سے متعلق معرکۃ الآراء مباحث کو اس مقام پر قصداً ترک کردیا ہے اس لئے کہ اس حیثیت سے اس مسئلہ کو چھیڑنا ایسی طوالت کا باعث ہے جو ہم کو کتاب کے مقصد سے دور لے جاتا ہے اور اختصار کے ساتھ بیان کرنا بجائے فائدہ کے نقصان دہ نظر آتا ہے۔

[2] بخاری جلد ۲ باب السحر [3] فتح الباری ج ۱۰ ص ۱۸۳

Marfat.com

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مہلک باتوں سے بچوں یعنی شرک سے اور جادو سے۔"

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ "حدیث سحر" پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قال النووی عمل السحر حرام و هو من الکبائر بالاجماع و قد عدّہ النبی ﷺ من السبع الموبقات و منه ما یکون کفرًا و منه لا یکون کفرًا بل معصیة کبیرة فان کان فیه قول او فعل یقتضی الکفر فهو کفر و الا فلا و اما تعلمه و تعلیمه فحرام.... الخ [1]

"نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں عمل سحر حرام ہے اور وہ بالاجماع کبائر میں سے ہے اور نبی اکرم ﷺ نے اس کو سات مہلک چیزوں میں سے شمار کیا ہے اور سحر کی بعض صورتیں کفر ہیں اور بعض کفر تو نہیں ہیں مگر سخت معصیت ہیں پس اگر سحر کا کوئی منتر یا کوئی عمل کفر کا مقتضی ہے تو وہ کفر ہے ورنہ نہیں، بہرحال سحر کا سیکھنا اور سکھانا قطعاً حرام ہے۔"

معجزہ اور سحر میں فرق:

علماء اسلام میں یہ بحث ہمیشہ سے معرکۃ الآراء رہی ہے کہ سحر اور معجزہ میں کیا فرق ہے؟ ایک شخص یہ کیسے اندازہ لگائے کہ یہ نبی و پیغمبر کا معجزہ ہے یا ساحر اور جادوگر کا سحر اور جادو؟ اس سلسلہ میں جو اہم علمی دلائل و براہین پیش کئے گئے ہیں اس کے لیے "علم کلام" کی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے، خصوصاً شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب النبوات اور شیخ محمد سفارینی کی شرح عقیدہ سفارینی قابل مطالعہ ہیں، البتہ اس مقام پر ایک سہل الوصول اور آسان دلیل پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نبی اور رسول کا اصل معجزہ اس کی وہ تعلیم ہوتی ہے جو وہ گم کشتگان راہ حق اور بھٹکی ہوئی قوموں کی ہدایت کے لیے نسخۂ کیمیاء اور دینی و دنیوی فلاح و کامرانی کے لیے بے نظیر قانون کی شکل میں پیش کرتا ہے یعنی "کتاب اللہ" لیکن جس طرح ارباب علم و حکمت اس کے لائے ہوئے علوم و حکم اور بتائی ہوئی رشد و ہدایت کی صداقت و کمال کو پرکھتے ہیں اسی طرح عام انسانی دنیا کی سرشت و نہاد اس پر قائم ہے کہ وہ سچائی اور صداقت کے لیے بھی بعض ایسی چیزوں کے خواہش مند ہوتے ہیں جو لانے والے کے روحانی کرشموں سے تعلق رکھتی ہوں اور جن کے مقابلہ سے تمام دنیوی طاقتیں عاجز ہو جاتی ہوں کیونکہ ان کا مبلغ علم کسی صداقت کے لیے اسی کو معیار قرار دیتا ہے۔

اس لیے "سنت اللہ" یہ جاری رہی ہے کہ وہ انبیاء و رسل کو دین حق کی تعلیم و پیغام کے ساتھ ایک یا چند "نشانات" (معجزات) بھی عطاء کرتا ہے، اور جب وہ دعوائے نبوت کے ساتھ بغیر اسباب کے ایسا "نشان" دکھاتا ہے جس کا کوئی دنیوی طاقت مقابلہ نہیں کر سکتی تو اس کا نام "معجزہ" ہوتا ہے۔

اور اسی لیے یہ بھی "سنت اللہ" ہے کہ کسی نبی و رسول کو جو معجزہ یا نشان دیا جاتا ہے وہ اسی نوع میں سے ہوتا ہے جس میں اس قوم کو جس کو کہ سب سے پہلے اس پیغمبر نے خطاب کیا ہے "درجہ کمال" حاصل ہو۔ اور وہ اس کے تمام دقائق سے بخوبی آگاہ ہوتا کہ اس کو یہ سمجھنے میں آسانی ہو سکے کہ پیغمبر کا یہ نشان انسانی اور بشری طاقت سے بالاتر قوت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اگر تعصب اور ہٹ دھرمی

---

[1] فتح الباری ج ۱۰ ص ۱۸۳

Marfat.com

حائل نہ ہو تو وہ بے ساختہ یہ اقرار کر لے کہ:

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اسی طرح ہر فرد بشر پر خدا کی حجت تمام ہو جائے۔

پس معجزہ دراصل براہ راست خدائے تعالیٰ کا فعل ہے جو بغیر اسباب کے ایک صادق کی صداقت کے لیے وجود میں آتا ہے، اور وہ کسی اصول وقوانین پر مبنی نہیں ہوتا کہ ایک فن کی طرح سیکھا جا سکے اور نبی ہر وقت اس کے کر دکھانے پر قادر ہو، تاوقتیکہ مخالفین صداقت کے سامنے بطور تحدی (چیلنج) اس کو دکھانے کی ضرورت پیش نہ آ جائے، سو جب وہ اہم وقت آتا ہے اور "نبی" خدا سے رجوع کرتا ہے تو خدائے تعالیٰ کی جانب سے اس کو کر دکھانے کی قوت عطاء ہو جاتی ہے، بخلاف سحر اور جادو کے کہ وہ ایک "فن" ہے کہ جس کو اس کے اصول وقوانین کی پابندی کے ساتھ ہر فن دان ساحر ہر وقت کام میں لا سکتا ہے، اس کے اسباب اگرچہ عام نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ لیکن اس فن کے تمام واقف کار اس سے واقف ہوتے ہیں اسی لیے وہ دوسرے علوم وفنون کی طرح مدون و مرتب فن ہے جس کو مصریوں، چینیوں اور ہندیوں نے بہت فروغ دیا اور حد کمال کو پہنچایا۔

یہ مسئلہ کی علمی حیثیت ہے کہ جس سے معجزہ اور سحر کی حدود قطعاً جدا اور متمائز ہو جاتی ہیں، رہا حس اور مشاہدہ کا معاملہ تو "معجزہ" اور "سحر" میں یہ فرق ہے کہ ساحر کی عام زندگی خوف و دہشت ایذاء رسانی اور بد عملی سے وابستہ ہوتی ہے اور لوگ اس نظر سے ساحر سے خوف کھاتے ہیں یا اس کے سامنے مرعوب ہو جاتے ہیں، بخلاف نبی اور رسول کے کہ اس کی تمام زندگی صداقت خلوص، مخلوق خدا کی ہمدردی و غمگساری اور تقویٰ وطہارت سے وابستہ ہوتی ہے اور اس کا کردار بے داغ اور صاف اور روشن ہوتا ہے، اور وہ معجزہ کو پیشہ نہیں بناتا بلکہ خاص اہم موقع پر صداقت اور حق کی حمایت میں اس کا مظاہرہ کرتا ہے اور وہ ایسے وقت معجزہ دکھاتا ہے جبکہ دشمن بھی اس کی عصمت وصداقت اور کردار کی پاکیزگی کے پہلے سے معترف ہوتے ہیں مگر اس کی دعوت کو یا شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یا جحود وانکار کے نقطہ نظر سے، اور پھر اس سے معجزہ کے طالب ہوتے ہیں، نیز اگر سحر اور معجزہ کا مقابلہ آن پڑے تو معجزہ غالب رہے گا اور اعلیٰ سے اعلیٰ سحر بھی مغلوب و عاجز، اور اس کا عکس محال اور ناممکن ہے، چنانچہ ساحرین اور انبیاء ورسل کے مقابلہ کی تاریخ اس کی شاہد عدل ہے۔

الحاصل موسیٰ علیہ السلام کو عصاء اور ید بیضاء کے نشانات (معجزہ) اس لیے عطا کیے گئے کہ ان کے زمانے میں مصر سحر اور جادو کا مرکز تھا اور فن سحر شباب پر، اور مصریوں نے تمام دنیا کے مقابلہ میں اس کو اوج کمال تک پہنچا دیا تھا۔

لہٰذا "سنت اللہ" کا تقاضا تھا کہ ایسے زمانہ میں موسیٰ علیہ السلام کو ایسے نشانات (معجزات) عطاء کیے جائیں جو اسی نوع سے متعلق ہوں تا کہ جب انکار پر اصرار حد سے بڑھ جائے اور معاندین ومخالفین اپنے محیر العقول سحر اور جادو کے ذریعہ ان کے مقابلہ پر آ جائیں تو خدا کے نشان (معجزات و آیات اللہ) مخالفوں کو یہ باور کرا دیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس جو قوت وطاقت ہے وہ انسانی صنعتوں اور عجوبہ کاریوں سے بلند اور بشری دسترس سے باہر ہے، اور اس طرح عوام وخواص کو ان کی صداقت اور ان کے "مِنَ اللهِ" ہونے کا یقین آ جائے اور خواہ زبان اقرار کرے یا نہ کرے لیکن ان کا عجز اور ان کی درماندگی علی رؤس الاشہاد ان کے دلوں کے اقرار کی شہادت دینے لگے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساحروں کا مقابلہ:

بہر حال یوم جشن آ پہنچا، میدان جشن میں تمام شاہانہ کروفر کے ساتھ فرعون تخت نشین ہے اور درباری بھی حسب مراتب قرینے سے بیٹھے ہیں اور لاکھوں انسان حق و باطل کے معرکہ کا نظارہ کرنے کو جمع ہیں، ایک جانب مصر کے مشہور جادوگروں کا گروہ اپنے ساز و سامان سحر سے لیس کھڑا ہے اور دوسری جانب خدا کے رسول حق کے پیغامبر، سچائی اور راستی کے پیکر حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کھڑے ہیں، فرعون بہت مسرور ہے اور اس یقین پر کہ ساحرین مصر ان دونوں کو جلد ہی شکست دے دیں گے ساحروں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے، اگر تم نے موسیٰ علیہ السلام کو شکست دے دی تو نہ صرف انعام و اکرام سے مالا مال کیے جاؤ گے بلکہ میرے دربار میں خاص جگہ پاؤ گے، ساحر بھی اپنی کامیابی کے یقین پر فرعون سے اپنے اعزاز و اکرام کا وعدہ لے رہے ہیں، اور مستقبل کے تصور سے بہت شاداں اور مسرور ہیں۔

﴿وَ جَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۱۳-۱۱۴)

"اور جادوگر فرعون کے پاس آئے اور کہنے لگے کیا اگر ہم موسیٰ (علیہ السلام) پر غالب آ جائیں تو ہمارے لیے انعام و اکرام ہے؟ فرعون نے کہا ہاں ضرور، اور یہی نہیں بلکہ تم مقربین بارگاہ شاہی بنو گے۔"

﴿فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ وَّ قِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ۝ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝﴾ (الشعراء: ۳۸-۴۲)

"پھر وعدہ کے دن جادوگر جمع ہو گئے، اور لوگوں سے کہا گیا کہ تم (اس میدان میں جمع ہو گے، شاید ہم جادوگروں کی پیروی کریں اگر وہ غالب رہیں، سو جب جادوگر آ گئے تو انہوں نے فرعون سے کہا کیا ہمارے لیے انعام ہے اگر ہم غالب رہیں؟ فرعون نے کہا ہاں، اور تم اس صورت میں (ہمارے) مقربین میں سے ہو گے۔"

جادوگروں نے جب اس طرف سے اطمینان کر لیا تو اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے مگر قبل اس کے کہ ایک دوسرے کو چیلنج کریں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تبلیغ ادا فرماتے ہوئے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا: تمہاری حالت پر سخت افسوس ہے، تم کیا کر رہے ہو؟ تم ہم کو جادوگر کہہ کر خدا پر جھوٹا الزام نہ لگاؤ، مجھ کو ڈر ہے کہ کہیں وہ تم کو اس بہتان طرازی کی سزا میں عذاب دے کر جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکے، کیونکہ جس کسی نے بھی بہتان باندھا وہ نامراد ہی رہا، لوگوں نے یہ سنا تو آپس میں رد و کد شروع کر دی اور سرگوشیاں کرنے لگے اور درباریوں نے یہ حال دیکھا تو جادوگروں کو مخاطب کر کے کہنے لگے یہ دونوں بھائی بلاشبہ جادوگر ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ جادو کے زور سے تم کو تمہارے وطن سے نکال دیں اور تم پر غلبہ کر لیں، تم اپنا کام شروع کرو اور پرے باندھ کر موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ڈٹ جاؤ آج جو بھی غالب آ جائے گا وہی کامیاب ثابت ہو گا۔

﴿ قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُم بِعَذَابٍ ۖ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرَىٰ ﴿٦١﴾
فَتَنَازَعُوا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ وَأَسَرُّوا النَّجْوَىٰ ﴿٦٢﴾ قَالُوا إِنْ هَٰذَانِ لَسَاحِرَانِ يُرِيدَانِ أَن يُخْرِجَاكُم مِّنْ
أَرْضِكُم بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ ﴿٦٣﴾ فَأَجْمِعُوا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوا صَفًّا ۚ وَقَدْ أَفْلَحَ
الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلَىٰ ﴿٦٤﴾ ﴾ (طه: ٦١-٦٤)

"موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا افسوس تم پر، دیکھو اللہ پر جھوٹی تہمت نہ لگاؤ، ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی عذاب بھیج کر تمہاری جڑ اکھاڑ دے جس کسی نے جھوٹ بات بنائی وہ ضرور نامراد ہوا بس لوگ آپس میں رد و کد کرنے لگے اور پوشیدہ سرگوشیاں شروع ہوگئیں، پھر (درباری) بولے یہ دونوں بھائی ضرور جادوگر ہیں، یہ چاہتے ہیں اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال باہر کریں اور پھر تمہارے شرف اور تمہاری عظمت کے مالک ہو جائیں، پس اپنے سارے داؤں جمع کرو اور پرا باندھ کر ڈٹ جاؤ، جو آج بازی لے گیا وہی کامیاب ہوگا۔"

جادوگروں نے آگے بڑھ کر موسیٰ علیہ السلام سے کہا، موسیٰ علیہ السلام! اس قصہ کو چھوڑ اور یہ بتا کہ ابتداء تیری جانب سے ہوگی یا ہماری جانب سے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ ان پر اس تنبیہ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تو فرمایا کہ ابتداء تم ہی کرو، اور اپنے کمال فن کی پوری حسرت نکال لو، چنانچہ ساحروں نے اپنی رسیاں، بان اور لاٹھیاں زمین پر ڈالیں جو سانپ اور اژدھے کی شکل میں دوڑتی نظر آنے لگیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا تو دل میں خوف و ہراس محسوس کیا کہ کہیں لوگ اس مظاہرہ سے متاثر نہ ہو جائیں اور ساحروں کے سحر کو حقیقت نہ سمجھ لیں، کیونکہ اگر ایسا ہوا تو یہ تاثر اور رعب قبول حق کے لیے سد راہ بن جائے گا، تب خدائے تعالیٰ نے ان کو مطمئن فرمایا اور وحی کے ذریعہ مطلع کیا کہ موسیٰ خوف نہ کھاؤ ہمارا وعدہ ہے کہ تم ہی غالب رہو گے، اپنی لاٹھی کو زمین پر ڈالو، موسیٰ علیہ السلام نے جب لاٹھی کو ڈالا تو اژدھا بن کر اس نے ساحروں کے تمام شعبدوں کو نگل لیا اور تھوڑی سی دیر میں سارا میدان صاف ہوگیا، اور اس طرح ساحر اپنے سحر میں ناکامیاب رہے۔

﴿ قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِمَّا أَن تُلْقِيَ وَإِمَّا أَن نَّكُونَ أَوَّلَ مَنْ أَلْقَىٰ ﴿٦٥﴾ قَالَ بَلْ أَلْقُوا ۖ فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَ
عِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِن سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ ﴿٦٦﴾ فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ ﴿٦٧﴾ قُلْنَا لَا
تَخَفْ إِنَّكَ أَنتَ الْأَعْلَىٰ ﴿٦٨﴾ وَأَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوا ۖ إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سَاحِرٍ ۖ وَلَا
يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ ﴿٦٩﴾ ﴾ (طه: ٦٥-٦٩)

"جادوگروں نے کہا "اے موسیٰ (علیہ السلام)! تم پہلے اپنی لاٹھی پھینکو یا پھر ہماری طرف سے پہل ہو" موسیٰ نے کہا نہیں تم ہی پہلے پھینکو، چنانچہ انہوں نے اپنا کرتب دکھایا اور اچانک موسیٰ (علیہ السلام) کو ان کے جادو کی وجہ سے ایسا دکھائی دیا کہ ان کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ کی طرح دوڑ رہی ہیں، موسیٰ (علیہ السلام) نے دل میں ہراس محسوس کیا (کہ اس منظر سے لوگ متاثر نہ ہو جائیں) ہم نے کہا "اندیشہ نہ کر تو ہی غالب ہوگا، تیرے داہنے ہاتھ میں جو لاٹھی ہے فوراً پھینک دے جادوگروں کی تمام بناوٹیں نگل جائے گی، انہوں نے جو کچھ کیا ہے محض جادوگروں کا فریب ہے، اور جادوگر کسی راہ سے آئے کبھی کامیابی نہیں پا سکتا۔"

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ۝ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ۝ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ۝ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَ انْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ۝﴾ (الاعراف : ۱۱۵۔۱۱۹)

"جادوگروں نے کہا اے موسیٰ (علیہ السلام)! یا تم اپنی لاٹھی پھینکو یا پھر ہم پھینکیں، موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا تم ہی پہلے پھینکو، پھر جب جادوگروں نے جادو کی بنائی ہوئی لاٹھیاں اور رسیاں پھینکیں تو لوگوں کی نگاہیں جادو سے ماردیں اور اپنے کرتبوں سے ان میں دہشت پھیلادی اور بہت بڑا جادو بنا لائے اور اس وقت ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) پر وحی کی کہ تم بھی اپنی لاٹھی ڈال دو، جونہی اس نے لاٹھی پھینکی تو اچانک کیا ہوا کہ جو کچھ جھوٹی نمائش جادوگروں کی تھی سب اس نے نگل کر نابود کر دی، پس حق قائم ہو گیا اور وہ جو عمل کر رہے تھے باطل ہو کر رہ گیا پس اس موقعہ پر وہ مغلوب ہو گئے اور ذلیل ہو کر بولے۔"

﴿فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ وَ يُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝﴾ (یونس : ۸۰۔۸۲)

"جب جادوگر آموجود ہوئے تو موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا "تمہیں جو کچھ میدان میں ڈالنا ہے ڈال دو" جب انہوں نے جادو کی رسیاں اور لاٹھیاں ڈال دیں تو موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا تم جو کچھ بنا کر لائے ہو یہ جادو ہے یقیناً اسے اللہ ملیا میٹ کر دے گا، اللہ کا یہ قانون ہے کہ وہ مفسدوں کا کام نہیں سنوارتا، وہ حق کو اپنے احکام کے مطابق ضرور ثابت کر دکھائے گا، اگرچہ مجرموں کو ایسا ہونا پسند نہ آئے۔"

جادوگروں نے "جو کہ اپنے فن کے ماہر وکامل تھے" جب عصاء موسیٰ علیہ السلام کا یہ کرشمہ دیکھا تو وہ حقیقت حال سمجھ گئے اور جس کو اس وقت تک فرعون اور اس کے درباری لوگ پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے رہے تھے وہ اس کو نہ چھپا سکے اور انہوں نے برسر مجلس اقرار کر لیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ عمل جادو سے بالاتر خدا کا معجزہ ہے، اس کا سحر سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور پھر فوراً سجدہ میں گر پڑے اور اعلان کر دیا کہ ہم موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے پروردگار پر ایمان لے آئے کیونکہ وہی "رب العالمین" ہے۔

﴿فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى ۝﴾ (طٰہٰ : ۷۰)

"پس سب جادوگر سجدہ میں گر گئے اور کہنے لگے ہم ہارون اور موسیٰ (علیہما السلام) کے رب پر ایمان لے آئے۔"

﴿وَ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ۝﴾ (الاعراف : ۱۲۰۔۱۲۲)

"اور سب جادوگر سجدہ میں گر پڑے، کہنے لگے ہم تو جہانوں کے پروردگار پر ایمان لے آئے جو موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کا پروردگار ہے۔"

فرعون نے جب یہ دیکھا کہ میرا تمام دام فریب تار تار ہو گیا، اور موسیٰ علیہ السلام کو شکست دینے کی جو آخری پناہ تھی وہ بھی منہدم ہو گئی، اب کہیں ایسا نہ ہو کہ مصری عوام بھی ہاتھ سے جائیں اور موسیٰ علیہ السلام اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے تو اس نے مکر وفریب کا دوسرا

Marfat.com

طریقہ اختیار کیا اور ساحروں سے کہنے لگا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام تم سب کا استاذ ہے اور تم سب نے آپس میں سازش کر رکھی تھی تب ہی تو میری رعایا ہوتے ہوئے میری اجازت کے بغیر تم نے موسیٰ علیہ السلام کے خدا پر ایمان لانے کا اعلان کر دیا، اچھا! میں تم کو عبرتناک سزا دوں گا تاکہ آئندہ کسی کو ایسی غداری کی جرأت نہ ہو، پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں الٹے سیدھے کٹواؤں گا اور پھر سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔

﴿قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۷۱)

فرعون نے کہا: "تم بغیر میرے حکم کے موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لے آئے؟ ضرور یہ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے، اچھا دیکھو میں کیا کرتا ہوں، میں تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤں گا اور کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا، پھر تمہیں پتہ چلے گا ہم دونوں میں کون سخت عذاب دینے والا ہے، اور کس کا عذاب دیر پا ہے۔"

﴿قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۲۳)

"فرعون نے کہا: "مجھ سے اجازت لیے بغیر تم موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لے آئے؟! ضرور یہ ایک پوشیدہ تدبیر ہے جو تم نے مل جل کر شہر میں کی ہے تاکہ اس کے باشندوں کو اس سے نکال باہر کرو، اچھا تھوڑی دیر میں تمہیں اس کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔

مگر سچا ایمان جب کسی کو نصیب ہو جاتا ہے خواہ وہ ایک لمحہ کا ہی کیوں نہ ہو وہ ایسی بے پناہ روحانی قوت پیدا کر دیتا ہے کہ کائنات کی کوئی زبردست سے زبردست طاقت بھی اس کو مرعوب نہیں کر سکتی، دیکھیے، وہی جادوگر جو فرعون سے تھوڑی دیر پہلے انعام و اکرام اور عزت و جاہ کی آرزوئیں اور التجائیں کر رہے تھے، ایمان لانے کے بعد ایسے نڈر اور بے خوف ہو گئے کہ ان کے سامنے سخت سے سخت مصیبت اور دردناک سے دردناک عذاب بھی ہیچ ہو کر رہ گیا اور کوئی دہشت بھی ان کے ایمان کو متزلزل نہ کر سکی اور انہوں نے فرعون کی موجودگی ہی میں بے دھڑک اسلام کا اعلان کر دیا، اور جب انہوں نے فرعون کی ان جابرانہ دھمکیوں کو سنا تو کہنے لگے:

﴿قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰي مَا جَاۗءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ۭ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۷۲۔۷۳)

"انہوں نے کہا ہم یہ کبھی نہ کر سکتے کہ سچائی کے جو روشن دلائل ہمارے سامنے آ گئے ہیں اور جس خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اس سے منہ موڑ کر تیرا حکم مان لیں، تُو جو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر گزر تُو زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ دُنیا کی اس زندگی کا فیصلہ کر دے، ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لا چکے کہ ہماری خطائیں بخش دے خصوصاً جادوگری کی خطاء کہ جس پر تُو نے ہمیں مجبور کیا تھا، ہمارے لیے اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔"

﴿قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۡ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ

Marfat.com

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۱﴾ (الشعراء: ۵۰۔۵۱)

"جادوگروں نے کہا (تیرا یہ عذاب ہمارے لیے) کوئی نقصان کی بات نہیں بلاشبہ ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جانے والے ہیں، بیشک ہم اس کے حریص ہیں کہ وہ ہماری خطاؤں کو بخش دے کیونکہ ہم ہو گئے مومنوں میں اول۔"

غرض حق و باطل کی اس کشمکش میں فرعون اور اس کے اعیان و ارکان کو سخت شکست اٹھانی پڑی اور وہ سر عام ذلیل و رسواء ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر خدا کا وعدہ پورا ہوا اور کامیابی کا سہرا انہی کے سر رہا۔

اس صورت حال کو دیکھ کر جادوگروں کے علاوہ اسرائیلی نوجوانوں میں سے بھی ایک مختصر جماعت مسلمان ہو گئی مگر وہ فرعون کے ظلم و ستم کی وجہ سے اعلان نہ کر سکی کیونکہ مسلمانوں کے ساتھ اس کی عام قاہرانہ ستم کیشیوں اور ظلم پرستیوں کے علاوہ اس وقت کی ذلت نے اس کو زیادہ غضبناک بنا دیا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تلقین فرمائی کہ اب مومن ہونے کے بعد تمہارا سہارا صرف خدا پر ہونا چاہیے، جماعت مومنین نے اس پر لبیک کہا اور وہ خدا کے سامنے گڑگڑا کر رحمت و مغفرت کی دعائیں اور ظالموں کے عذاب و معصیت سے محفوظ رہنے کی التجائیں کرنے لگے۔

﴿فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَ قَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَ نَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾﴾ (یونس: ۸۳۔۸۶)

"پھر موسیٰ (علیہ السلام) پر کوئی ایمان نہیں لایا، مگر صرف ایک گروہ جو اس قوم کے نوجوانوں کا گروہ تھا وہ بھی فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتا ہوا کہ کہیں کسی مصیبت میں نہ ڈال دے اور اس میں شک نہیں کہ فرعون سرزمین مصر پر متمردانہ قابض اور ظلم و استبداد میں بالکل چھوٹ تھا اور موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا: لوگو! اگر تم فی الحقیقت اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس کی فرمانبرداری کرنا چاہتے ہو تو چاہیے کہ صرف اسی پر بھروسہ کرو اور فرعون کی طاقت سے نہ ڈرو پس انہوں نے کہا: "ہم صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم کو ظالم قوم کی آزمائش میں نہ ڈال اور ہم کو اپنی رحمت سے منکروں سے نجات دے۔"

الحاصل فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی روحانی قوت کا یہ مظاہرہ دیکھ کر بے حد مرعوب ہو گیا اور اگرچہ وہ جادوگروں پر اپنے انتہائی غیظ و غضب کا اظہار کرتا رہا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس وقت کچھ کہنے کی مطلق ہمت نہ پڑی اور درباریوں اور ارکان سلطنت نے جب یہ احتجاج کیا کہ تو موسیٰ علیہ السلام کو قتل کیوں نہیں کرا دیتا، کیا اس کو اور اس کی قوم کو یہ موقع دیا جا رہا ہے کہ وہ مصر میں فساد پھیلائیں اور تجھ کو اور تیرے دیوتاؤں کو ٹھکراتے رہیں؟ تو کہنے لگا کہ تم گھبراتے کیوں ہو؟ میں اسرائیلیوں کی طاقت کو بڑھنے نہ دوں گا اور مقابلہ کے قابل ہی نہ رکھوں گا، ابھی یہ حکم جاری کرتا ہوں کہ ان کی اولاد نرینہ کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا کرو اور صرف لڑکیوں کو چاکری کے لئے زندہ رہنے دو۔

Marfat.com

﴿وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَ قَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَ يَذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۲۷)

"اور فرعون کی قوم میں سے ایک جماعت نے فرعون سے کہا، کیا تو موسیٰ (علیہ السلام) اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا کہ وہ زمین (مصر) میں فساد کرتے پھریں اور تجھ کو اور تیرے دیوتاؤں کو ٹھکرائیں، فرعون نے کہا، ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی لڑکیوں کو (باندیاں بنانے کے لئے) زندہ رکھیں گے اور ہم ان پر ہر طرح غالب ہیں اور وہ ہمارے ہاتھوں میں بے بس ہیں۔"

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ قَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْۤا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَ اسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ وَ مَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝﴾ (المؤمن: ۲۳-۲۵)

"اور بلاشبہ ہم نے فرعون ہامان اور قارون کی طرف موسیٰ (علیہ السلام) کو رسول بنا کر اور واضح نشان دے کر بھیجا، پس انہوں نے کہا کہ یہ تو جادوگر ہے جھوٹا، پھر جب وہ ہمارے پاس سے ان کے پاس حق لے کر آیا تو کہنے لگے کہ جو لوگ اس (موسیٰ علیہ السلام) پر ایمان لے آئے ہیں، ان کے لڑکوں کو مار ڈالو اور ان کی لڑکیوں کو باقی رہنے دو، اور (انجام کار) کافروں کا مکر وفریب باطل و برباد ہو کر رہا۔"

گویا فرعون کا یہ دوسرا اعلان تھا جو بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل سے متعلق کیا گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل:

تاریخ کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ جب کسی قوم پر غلامی کی حالت میں صدیاں گذر جاتی ہیں تو اس کی زبوں حالی اور پستی کے حدود یہیں ختم نہیں ہو جاتے کہ وہ مفلس و بدحال ہوں اور کاہل و پریشان بال، بلکہ ان کے قوائے عملی کی خرابی سے زیادہ ان کے قوائے دماغی بیکار، مضمحل، اور ناکارہ ہو جاتے ہیں، ان میں سے ہمت و شجاعت مفقود ہو جاتی ہے اور وہ پستی پر ہی قناعت کر لیتے ہیں، ناامیدی ان کا شیوہ ہو جاتا ہے اور ذلت و نکبت کو وہ صبر و قناعت سمجھنے لگتے ہیں، اس لئے جب کوئی مصلح یا پیغمبر و رسول اس دماغی و عملی پستی سے نکالنے کے لئے ان کو پکارتا اور ہمت و شجاعت پر آمادہ کرتا ہے تو یہ ان کے لئے سب سے مشکل اور ناممکن العمل پیغام نظر آتا ہے اور کبھی وہ اس راہ کی سختیوں سے گھبرا کر آپس میں دست بگریباں ہونے لگتے، اور کبھی اپنے نجات دہندہ پر شک و شبہ کی نگاہ ڈالنے لگتے ہیں اور اگر اس جدوجہد میں ان کو کوئی فائدہ حاصل ہو جاتا ہے تو وقار اور سنجیدگی سے بھی گذر کر اظہار مسرت کرنے لگتے ہیں، اور اگر اس راہ میں کوئی آزمائش اور مصیبت کا سوال آ پڑتا ہے تو مصلح یا پیغمبر کو الزام دینے لگتے ہیں، کہ ہم کو خواہ مخواہ تو نے اس مصیبت میں پھنسایا، ہم تو اپنی حالت پر ہی صابر و شاکر تھے۔

یہی حال بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تبلیغ حق سے لے کر مصر سے خروج کے

Marfat.com

وقت تک جو حالات پیش آئے وہ اس امر کی زندہ شہادت ہیں۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعون اور اس کے درباریوں کی گفتگو کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے بنی اسرائیل کو جمع کر کے صبر اور توکل علی اللہ کی تلقین کی بنی اسرائیل نے سن کر جواب دیا کہ موسیٰ علیہ السلام! ہم پہلے ہی سے مصیبتوں میں گرفتار تھے اب تیرے آنے پر کچھ امید بندھی تھی مگر تیرے آنے کے بعد بھی وہی مصیبت باقی رہی، یہ تو سخت آفت کا سامنا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دی کہ خدا کا وعدہ سچا ہے، گھبراؤ نہیں تم ہی کامیاب ہو گے اور تمہارے دشمن کو ہلاکت کا منہ دیکھنا پڑے گا، زمین کا مالک فرعون، یا اس کی قوم نہیں ہے بلکہ رب العالمین اور مختار مطلق خدا ہے، پس وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کا مالک بنادے، اور انجام کار یہ انعام متقیوں کا ہی حصہ ہے۔

﴿قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ قَالُوْۤا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۲۸۔۱۲۹)

"موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا: "اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو، بلاشبہ زمین اللہ کی ملک ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وارث بنا دیتا ہے اور انجام (کی کامیابی) متقیوں کے لیے ہی ہے" انہوں نے جواب دیا: "تیرے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبت میں تھے اور تیرے پیغام لانے کے بعد بھی مصیبت ہی میں گرفتار ہیں" موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "وہ وقت قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو برباد کر دے گا اور تم کو اس زمین کا خلیفہ بنا دے گا اور پھر دیکھے گا کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو۔"

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مسلمانوں سے کہا کہ فرعون کے مظالم کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا، اور بنی اسرائیل اور قبطی مومنوں کو آزادی کے ساتھ مصر سے چلے جانے پر راضی نہیں ہے اس لئے خدا کے فیصلہ تک تم سرزمین مصر ہی میں اپنے گھروں کو مساجد بنالو اور ان کو قبلہ رخ کر کے خدائے واحد کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ کہ خدا کی وحی کا یہی فیصلہ ہے، اور ساتھ ہی خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں دعاء کی، بارالہا! فرعون اور فرعونیوں کو تو نے جو دولت وسطوت عطاء فرمائی ہے اس پر شکریہ ادا کرنے کی بجائے وہ تیرے بندوں پر جبر اور ظلم وستم کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور تیری راہ حق کو نہ یہ خود قبول کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو قبول کرنے دیتے ہیں بلکہ جبر وتشدد سے کام لے کر ان کے آڑے آتے ہیں لہٰذا اب تو ان کے مظالم کا ذائقہ چکھا، اور ان کی اس دولت وثروت کو تباہ و ہلاک کر دے جس پر یہ نازاں ہیں، اور جس طرح یہ ایمان کی سچائی کو ٹھکرا رہے ہیں تو بھی ان کو ایمان کی دولت کے بجائے اب ایسا دردناک عذاب دے کہ ان کی داستان دوسروں کے لئے عبرت بن جائے۔

﴿وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَ اَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّ اجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا

Marfat.com

يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ
سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾ (یونس: ۸۷-۸۹)

"اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) اور اس کے بھائی ہارون (علیہ السلام) پر وحی کی کہ اپنی قوم کے لئے مصری مکان بناؤ اور ان کو قبلہ رخ تعمیر کرو اور ان میں نماز قائم کرو، اور جو ایمان لائے ہیں انہیں کامیابی کی بشارت دو، اور موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا مانگی "خدایا تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو اس دنیا کی زندگی میں زیب وزینت کی چیزیں اور مال ودولت کی شوکتیں بخشی ہیں، تو خدایا! کیا یہ اس لیے ہے کہ تیری راہ سے یہ لوگوں کو بھٹکائیں، خدایا ان کی دولت زائل کردے اور ان کے دلوں پر مہر لگادے کہ اس وقت تک یقین نہ کریں کہ جب تک عذاب دردناک اپنے سامنے نہ دیکھ لیں، اللہ نے فرمایا! "میں نے تم دونوں کی دعاء قبول کی تو اب تم اپنی راہ میں جم کر کھڑے ہو جاؤ اور ان لوگوں کی پیروی نہ کرو جو میرا طریق کار نہیں جانتے۔"

فرعون نے اپنے سرداروں سے اگرچہ اطمینان کا اظہار کر دیا تھا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے روحانی غلبہ کا خیال اس کو اندر ہی اندر گھلائے ڈالتا تھا اور بنی اسرائیل کی اولاد نرینہ کے قتل کے حکم سے بھی اس کو سکون قلب نصیب نہ تھا، آخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو قتل کیے بغیر یہ معاملہ ختم نہیں ہوگا۔ لہٰذا سرداروں اور ندیموں سے ایک روز کہنے لگا کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے یوں ہی چھوڑے رکھا تو مجھے یہ خوف ہے کہ یہ تمہارے دین کو بھی آہستہ آہستہ بدل ڈالے گا اور تمام مصر میں فساد مچادے گا، اب یہی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ موسیٰ کو قتل کر دیا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ میں ایسے متکبر ومغرور سے کیا ڈرتا ہوں، جو خدا کے یوم حساب سے نہیں ڈرتا، میرا پشت پناہ تو وہ ہے جو میرا بھی پروردگار ہے اور تم سب کا بھی، میں صرف اسی کی پناہ چاہتا ہوں۔

﴿وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَ لْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾ وَ قَالَ مُوْسٰٓى اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَ رَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾﴾

(المؤمن: ۲۶-۲۷)

"اور فرعون نے کہا! مجھے موسیٰ (علیہ السلام) کو قتل ہی کر لینے دو اور اس کو چاہیے کہ اپنے رب کو پکارے، میں ڈرتا ہوں کہ وہ تمہارے دین کو بدل ڈالے یا زمین میں فساد برپا کردے، اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں اپنے اور تمہارے رب کی پناہ چاہتا ہوں ہر اس متکبر سے جو حساب کے دن پر ایمان نہیں لاتا۔"

فرعون اور اس کے سردار جب اس گفتگو میں مصروف تھے تو اس مجلس میں ایک مصری "مردمومن" بھی تھا، جس نے ابھی تک اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا تھا، اس نے جب یہ سنا تو اپنی قوم کے ان افراد کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے مدافعت کی کوشش شروع کی، اور ان کو سمجھایا کہ تم ایسے شخص کو قتل کرنے چلے ہو جو یہ سچی بات کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے اور جو تمہارے سامنے اپنی صداقت پر بہترین دلائل ونشانات لایا ہے، اور بالفرض اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ سے تم کو کچھ نقصان نہیں پہنچ رہا ہے اور اگر وہ سچا ہے تو پھر اس کی وعیدوں سے ڈرو جو وہ تم کو خدا کی جانب سے سناتا ہے۔

Marfat.com

فرعون نے مردِ مومن کا کلام قطع کرتے ہوئے کہا کہ میں تم کو وہی مشورہ دے رہا ہوں جس کو اپنے خیال میں درست سمجھتا ہوں اور تمہاری بھلائی کی بات کہہ رہا ہوں۔

مردِ مومن نے آخری نصیحت کے طور پر پھر کہا: "اے میری قوم! مجھے یہ خوف ہے کہ ہمارا حال کہیں ان پچھلی قوموں کا سا نہ ہو جائے جو قومِ نوح، عاد اور ثمود کے نام سے مشہور ہیں، یا ان کے بعد جو قومیں آئیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا، بلکہ ان قوموں کی ہلاکت خود اپنے اسی قسم کے اعمال کی بدولت پیش آئی تھی، جو آج تم موسیٰ علیہ السلام کے خلاف سوچ رہے ہو، تم تو آج دنیا کی وجاہت کی سوچ میں پڑے ہو اور میں تمہارے لئے اس دن سے ڈر رہا ہوں جب قیامت کا دن ہوگا اور سب ایک دوسرے کو پکاریں گے مگر اس وقت تمہیں کوئی خدا کے عذاب سے بچانے والا نہ ہوگا۔

اے قوم کے سردارو! تمہارا حال تو یہ ہے کہ اس سرزمین میں جب حضرت یوسف علیہ السلام نے خدا کا پیغام سنایا تھا تب بھی تم یعنی تمہارے باپ دادا اسی شک و تردد میں پڑے رہے اور ان پر ایمان نہ لائے اور جب ان کی وفات ہوگئی تو کہنے لگے کہ اب خدا اپنا کوئی رسول نہیں بھیجے گا، اب یہی معاملہ تم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کر رہے ہو، خدارا سمجھو اور سیدھی راہ اختیار کرو۔

﴿وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَ قَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَ اِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾ يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ؕ قَالَ فِرْعَوْنُ مَاۤ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰى وَ مَاۤ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾ وَ قَالَ الَّذِيْۤ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ۙ﴿۳۰﴾ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ وَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ وَ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾ وَ يٰقَوْمِ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۙ﴿۳۲﴾ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾ وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۚ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾﴾ (المؤمن: ۲۸-۳۵)

"اور بولا ایک مرد ایماندار فرعون کے لوگوں میں سے جو چھپاتا تھا اپنا ایمان، کیا مارے ڈالتے ہو ایک مرد کو اس بات پر کہ کہتا ہے "میرا رب اللہ ہے اور لایا ہمارے پاس کھلی نشانیاں تمہارے رب کی، اور اگر وہ جھوٹا ہوگا تو اس پر پڑے گا اس کا جھوٹ، اور اگر وہ سچا ہوگا تو تم پر پڑے گا کوئی نہ کوئی وعدہ جو تم سے کرتا ہے، بے شک اللہ راہ نہیں دیتا جو ہو بے لحاظ جھوٹا، اے میری قوم! آج تمہارا راج ہے، غالب ہو رہے ہو ملک میں، پھر کون مدد کرے گا ہماری اللہ کی آفت سے اگر آ گئی ہم

پر! بولا فرعون، میں تو وہی بات سمجھاتا ہوں تم کو جو سوجھی مجھ کو، اور وہی راہ بتاتا ہوں جس میں بھلائی ہے، اور کہا اس ایمان دار نے، اے میری قوم! میں ڈرتا ہوں کہ آئے تم پر دن اگلے فرقوں کا سا، جیسے حال ہوا قوم نوح کا اور عاد اور ثمود کا، اور جو لوگ ان کے پیچھے ہوئے، اور اللہ بے انصافی نہیں چاہتا بندوں پر، اور اے میری قوم! میں ڈرتا ہوں کہ تم پر آئے دن چیخ و پکار کا، جس دن بھاگو گے پیٹھ پھیر کر، کوئی نہیں تم کو اللہ سے بچانے والا، اور جس کو غلطی میں ڈالے اللہ، تو کوئی نہیں اس کو سمجھانے والا، اور تمہارے پاس آ چکا ہے یوسف (علیہ السلام) اس سے پہلے کھلی باتیں لے کر پھر تم رہے دھوکے ہی میں ان چیزوں سے جو وہ تمہارے پاس لے کر آیا، یہاں تک کہ جب مر گیا، لگے کہنے ہرگز نہ بھیجے گا اللہ اس کے بعد کوئی رسول، اسی طرح بھٹکاتا ہے اللہ اس کو جو ہو بے باک شک کرنے والا، وہ جو کہ جھگڑتے ہیں اللہ کی باتوں میں بغیر کسی سند کے جو پہنچی ہو ان کو بڑی بیزاری ہے (اس جھگڑے سے) اللہ کے یہاں اور ایمان داروں کے یہاں، اسی طرح مہر لگا دیتا ہے اللہ ہر دل پر غرور والے سرکش کے۔"

﴿وَ قَالَ الَّذِیْۤ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ ۚ﴿۳۸﴾ یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ ۫
وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾ مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا یُجْزٰۤی اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ
ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ یُرْزَقُوْنَ فِیْهَا بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۴۰﴾ وَ یٰقَوْمِ مَا لِیْۤ
اَدْعُوْكُمْ اِلَی النَّجٰوةِ وَ تَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَی النَّارِ ؕ﴿۴۱﴾ تَدْعُوْنَنِیْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ اُشْرِكَ بِهٖ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ
عِلْمٌ ؗ وَّ اَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَی الْعَزِیْزِ الْغَفَّارِ ﴿۴۲﴾ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ لَیْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِی الدُّنْیَا
وَ لَا فِی الْاٰخِرَةِ وَ اَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَی اللّٰهِ وَ اَنَّ الْمُسْرِفِیْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاۤ اَقُوْلُ
لَكُمْ ؕ وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۴۴﴾﴾ (المؤمن: ۳۸۔۴۴)

"اور کہا اس ایماندار نے اے قوم! راہ چلو میری، پہنچا دوں تم کو نیکی کی راہ پر اے میری قوم! یہ جو زندگی ہے دنیا کی سو کچھ فائدہ اٹھا لینا ہے اور وہ گھر جو پچھلا ہے وہی ہے جم کر رہنے کا گھر، جس نے کی ہے برائی تو وہی بدلا پائے گا اس کے برابر اور جس نے کی ہے بھلائی مرد ہو یا عورت اور وہ یقین رکھتا ہو سو وہ لوگ جائیں گے بہشت میں روزی پائیں گے وہاں بیشمار، اور اے قوم! مجھ کو کیا ہوا ہے بلاتا ہوں تم کو نجات کی طرف، اور تم بلاتے ہو مجھ کو آگ کی طرف، تم چاہتے ہو مجھ کو کہ منکر ہو جاؤں اللہ سے اور شریک ٹھہراؤں اس کا، اس کو جس کی مجھ کو خبر نہیں، اور میں بلاتا ہوں تم کو اس زبردست گناہ بخشنے والے کی طرف، آپ ہی ظاہر ہے کہ جس کی طرف تم مجھ کو بلاتے ہو اس کا بلاوا کہیں نہیں دنیا میں اور نہ آخرت میں اور یہ کہ ہم کو پھر جانا ہے اللہ کے پاس اور یہ کہ زیادتی والے وہی ہیں دوزخ کے لوگ سو آگے یاد کرو گے جو میں کہتا ہوں تم کو اور میں سونپتا ہوں اپنا معاملہ اللہ کو، بیشک اللہ کی نگاہ میں ہیں سب بندے۔"

جب فرعون اور اس کے سرداروں نے اس مرد مومن کی یہ باتیں سنیں تو ان کا رخ موسیٰ علیہ السلام سے ہٹ کر اس کی طرف ہو گیا

Marfat.com

اور فرعونیوں نے چاہا کہ پہلے اس کی خبر لیں، اور اس کو قتل کر دیں، مگر اللہ تعالیٰ نے اس ناپاک ارادہ میں ان کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

﴿فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾﴾ (المؤمن: ۴۵-۴۶)

"سو اللہ تعالیٰ نے اس کو ان کی تدبیروں کے شر سے بچا لیا اور فرعون کے لوگوں کو برے عذاب نے آ لیا۔ نار جہنم ہے جس پر وہ صبح شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت آ جائے گی، (تو کہا جائے گا) فرعونیوں کو سخت عذاب میں داخل کرو۔"

تورات میں اگرچہ گذشتہ واقعات کا اکثر حصہ مذکور ہے مگر دو باتوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا ایک فرعون کے اس دوسرے حکم کا ذکر نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کی اولاد نرینہ کو قتل کیا جائے اور دوسرے اس واقعہ کا کہ فرعون کی قوم میں سے بھی بعض آدمی ایمان لائے تھے اور ان میں سے ایک مرد مومن نے فرعون اور اپنی قوم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے باز رکھنے کی کوشش کی، ان کو دین کی تبلیغ کی اور سچائی کو قبول کر لینے کی دعوت دی۔

بظاہر اس دوسرے واقعہ کے ترک کر دینے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بنی اسرائیل کو فرعون اور فرعونیوں کے مظالم کی وجہ سے انتہائی رنج و غصہ تھا اور اس نے بغض و کینہ کی شکل اختیار کر لی تھی، لہٰذا اس نے اجازت نہ دی کہ اس قوم کے کسی فرد کے لئے بھی یہ ثابت کریں کہ اس میں سعادت اور حمایت حق کی روح موجود تھی۔

فرعون کا دعوائے ربوبیت والوہیت:

فرعون اور اس کے سرداروں کا موسیٰ علیہ السلام کو شکست دینے میں جب کوئی مکر و فریب اور غیظ و غضب کام نہ آیا اور ارادۂ قتل کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی بھی ہمت نہ پڑی تو اب فرعون نے دل کا بخار نکالنے کا یہ طریقہ نکالا کہ ایک جانب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توہین کے درپے رہتا اور دوسری جانب یہ اعلان کرتا کہ تمہارا "رب اعلیٰ اور معبود" میرے علاوہ کوئی نہیں ہے، موسیٰ علیہ السلام بن دیکھے خدا کو رب بتا رہا ہے اور میں بایں صد ہزار شوکت و سطوت تمہارے سامنے موجود ہوں، چنانچہ مصری قوم پر جو اثر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے "آیات بینات" دیکھ کر ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا اور دنیوی شوکت و سطوت کی مرعوبیت اور عزت و جاہ کی حرص میں دب کر رہ گیا، اور اس طرح وہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی مخالفت میں فرعون کے ہم نوا ہو گئے۔

﴿وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴿۵۲﴾ فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۴﴾﴾ (الزخرف: ۵۱-۵۴)

"اور فرعون نے اپنی قوم میں اعلان کیا "اے قوم! کیا میں مصر کے تاج و تخت کا مالک نہیں ہوں، اور میری حکومت کے قدموں کے نیچے یہ نہریں بہہ رہی ہیں، کیا تم (میرے اس جاہ و جلال کو) نہیں دیکھتے (اب بتاؤ) کیا میں بلند و بالا ہوں یا

Marfat.com

یہ جس کو نہ عزت نصیب اور جو بات بھی صاف نہ کرسکتا ہو (اگر یہ اپنے خدا کے یہاں عزت والا ہے) تو کیوں اس پر (آسمان سے) سونے کے کنگن نہیں گرتے یا فرشتے ہی اس کے سامنے پرے باندھ کر کھڑے نہیں ہوتے، پس عقل کھو دی فرعون نے اپنی قوم کی سوانہوں نے اسی کی اطاعت کی اور تھے وہ نافرمان بندے۔"

فرعون نے اس جگہ بلند و بالا ہونے کا معیار دو باتوں پر رکھا اور عام طور پر دنیا کو مقصد زندگی سمجھنے والوں کی یہی شان رہی ہے، ایک دولت و ثروت، دوسرے دنیوی جاہ و حشم، اور یہ دونوں فرعون کے پاس موجود تھے، موسیٰ علیہ السلام کے پاس نہ تھے۔

حضرت شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہٗ نے ان دونوں باتوں کو موضح القرآن میں ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

"وہ آپ کنگن پہنتا تھا جواہر کے مکلف، اور جس امیر پر مہربان ہوتا سونے کے کنگن پہناتا تھا اور اس کے سامنے فوج کھڑی ہوتی تھی پرا باندھ کر۔"

اس لئے اس نے انہی باتوں کا ذکر کیا کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کا خدا مجھ سے الگ کوئی اور ہستی ہے، تو وہ موسیٰ علیہ السلام کو سونے کے کنگن آسمان سے کیوں نہیں برساتا اور فرشتے اس کے جلو میں پرا باندھ کر کیوں کھڑے نہیں ہوتے اور چونکہ قوم کی نگاہ میں دینی و دنیوی عزت کا معیار یہی تھا، اس لئے فرعون کا داؤ ان پر چل گیا اور انہوں نے یک زبان ہو کر فرعون کی اطاعت کا دوبارہ اعلان کر دیا، یہ بدبخت یہ نہ سمجھے کہ خدائے تعالیٰ کے یہاں عزت کا معیار "صدق و خلوص" اور خدا کی "وفادارانہ عبودیت" ہے نہ کہ دنیوی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت، البتہ جو شخص اصل عزت کو حاصل کر لیتا ہے تو خدائے تعالیٰ یہ چیزیں بھی اس کے قدموں پر نثار کر دیتا ہے اور صرف دنیوی عظمت پر اترانے والوں کو ابدی ذلت و رسوائی کے سواء کچھ حاصل نہیں ہوتا، چنانچہ آخر میں یہی صورت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم بنی اسرائیل اور فرعون اور اس کی قوم کے ساتھ پیش آئی۔

﴿فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ۝﴾ (الزخرف: ۵۵-۵۶)

"پھر جب ہم کو غصہ آیا تو ہم نے (ان کی بدکرداریوں کا) بدلہ لیا پس ڈبو دیا ان سب کو اور کر دیا گئے گزرے اور آنے والی نسلوں کے واسطے ان کو کہاوت بنا دیا۔"

﴿ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۝ فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰى ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝﴾ (النازعات: ۲۲-۲۶)

"پس پیٹھ پھیر کر چل دیا، پھر (قوم کو) جمع کیا، پھر پکارا اور کہنے لگا! "میں ہی تمہارا سب سے بڑا رب ہوں" پس اس کو پچھلے (آخرت کے) اور پہلے (دنیا کے) عذاب نے آ پکڑا بلاشبہ اس واقعہ میں اس شخص کے لئے عبرت ہے جو خوف خدا رکھتا ہو۔"

مصریوں پر قہر خدا:

غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رشد و ہدایت کا فرعون اور اس کے سرداروں پر مطلق اثر نہیں ہوا اور معدودے چند کے سوائے عام مصریوں نے بھی ان ہی کی پیروی کی اور صرف یہی نہیں بلکہ فرعون کے حکم سے بنی اسرائیل کی نرینہ اولاد قتل کی جانے لگی،

Marfat.com

موسیٰ علیہ السلام کی توہین وتذلیل ہونے لگی، اور فرعون نے اپنی ربوبیت اور معبودیت کی زور شور سے تبلیغ شروع کر دی تب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ فرعون کو مطلع کر دو کہ اگر تمہارا یہی طور طریق رہا تو عنقریب تم پر خدا کا عذاب نازل ہونے والا ہے، چنانچہ جب انہوں نے اس پر بھی دھیان نہ دیا تو اب یکے بعد دیگرے عذاب الٰہی آنے لگے، یہ دیکھ کر فرعون اور اس کی قوم نے اب یہ وطیرہ اختیار کیا کہ جب عذاب الٰہی کسی ایک شکل میں ظاہر ہوتا تو فرعون اور قوم فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کرنے لگتی کہ اچھا ہم ایمان لے آئیں گے تو اپنے خدا سے دعا کر کہ یہ عذاب جاتا رہے اور جب وہ عذاب جاتا رہتا تو پھر سرکشی و نافرمانی پر اتر آتے، پھر عذاب جب دوسری شکل میں آتا تو کہتے کہ اچھا ہم بنی اسرائیل کو آزاد کر کے تیرے ساتھ روانہ کر دیں گے، دعاء کر کہ یہ عذاب دفع ہو جائے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے ان کو پھر مہلت مل جاتی، اور عذاب دفع ہو جاتا تو پھر اسی طرح مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے، اس طرح خدا کی جانب سے مختلف قسم کے نشانات ظاہر ہوئے اور فرعون اور قوم فرعون کو بار بار مہلت عطا ہوتی رہی لیکن جب انہوں نے اس کو بھی ایک مذاق بنا لیا تب خدا کا آخری عذاب آیا اور فرعون اور اس کے سرکش سردار سب ہی غرق کر دیئے گئے۔

آیات اللہ کی تفصیل:

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہت سے نشانات (معجزات) عطا فرمائے تھے جن کا ذکر بقرہ، اعراف، نمل، قصص، اسراء، طٰہٰ، زخرف، مومن، قمر اور النازعات میں مختلف طریقوں سے کیا گیا ہے، چنانچہ اسراء میں ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا ۝ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل: ۱۰۱۔۱۰۲)

”اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو نو نشانات واضح عطاء کیے پس تو بنی اسرائیل سے دریافت کر کہ جب یہ نشانات ان کے پاس آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعون نے یہ کہا! اے موسیٰ! بلاشبہ میں تجھ کو جادو کا مارا ہوا سمجھتا ہوں موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا، تو خوب جانتا ہے کہ ان کو بصیرتیں بنا کر آسمانوں اور زمین کے پروردگار کے سوائے اور کسی نے نہیں اتارا اور (اس لیے) بلاشبہ اے فرعون میں تجھ کو ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔“

اور طٰہٰ، نمل، زخرف اور النازعات میں شمار بتائے بغیر صرف ”آیات“ کہہ کر ذکر کیا گیا ہے، پھر کسی جگہ ”آیات بینات“ اور کہیں ”آیات مفصلات“ اور کسی موقعہ پر ”الایۃ الکبریٰ“ اور کہیں صرف ”ایاتنا“ سے تعبیر کیا ہے اور ان تفصیلی اور اجمالی تعبیرات کے علاوہ مسطورۂ بالا تمام سورتوں میں علیحدہ علیحدہ نشانات (معجزات) کا بھی ذکر موجود ہے، اور اگر ان سب کو یکجا جمع کیا جائے تو حسب ذیل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے۔

عصاء، ید بیضا، سنین (قحط) نقص ثمرات (پھلوں کا نقصان) طوفان، جراد (ٹڈی دل) قمل (جوں) ضفادع (مینڈک) دم (خون) فلق بحر (قلزم کا پھٹ کر دو حصہ ہو جانا) من وسلویٰ (حلوا و بٹیر) غمام (بادلوں کا سایہ) انفجار عیون (پتھر سے چشموں کا پھوٹنا) نتق جبل (پہاڑ کا اکھڑ کر سروں پر آ جانا) اور نزول تورات۔

Marfat.com

پس مسطورۂ بالا مختلف تعبیرات و تفصیلات کی بناء پر مفسرین [1] کو حیرانی ہے کہ کونسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے "تسع آیات" کی تعیین بھی ہو جائے اور باقی آیات اللہ کی تفصیل بھی صحیح اسلوب پر باقی رہ جائے، چنانچہ قاضی بیضاوی اور بعض دوسرے مفسرین نے یہ تشریح فرمائی کہ سورۂ اسراء میں جن "تسع آیات" کا تذکرہ ہے ان سے وہ نشان (معجزات) مراد نہیں ہیں جو فرعون اور قوم فرعون کے مقابلہ میں بطور سرزنش، عذاب و عبرت کے لئے بھیجے گئے بلکہ اس سے وہ احکام مراد ہیں، جو بنی اسرائیل کو قلزم عبور کر لینے کے بعد دیئے گئے تھے اور اپنی اس تشریح کی تائید میں حضرت صفوان رضی اللہ عنہ بن عسال کی حدیث پیش کی جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مرتبہ دو یہودیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت کا امتحان لیا جائے اور مشورہ کے بعد آپ سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو جو "تسع آیات" دیئے تھے ان کی تشریح کیجئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ احکام یہ ہیں:

"شرک نہ کرنا، زنا نہ کرنا، ناحق کسی کو قتل نہ کرنا، چوری نہ کرنا، جادو نہ کرنا، حکام رسی کے ذریعے جرم سے پاک انسان کو قتل نہ کرانا، سود نہ کھانا، پاک دامن کو تہمت نہ لگانا، میدان جنگ سے نہ بھاگنا، (شعبہ کو شک ہو گیا کہ نواں حکم یہی فرمایا یا کوئی اور) اور اے یہود! تمہارے لئے خصوصیت کے ساتھ یہ کہ سبت کی خلاف ورزی نہ کرنا۔" [2]

مگر ان مفسرین کی یہ تشریح اس لئے صحیح نہیں کہ اسراء میں "تسع آیات" کے ذکر کے ساتھ فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ بھی درج ہے، فرعون ان آیات کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اے موسیٰ (علیہ السلام)! یہ سب جادو کا دھندا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں، اے فرعون! یہ اللہ تعالیٰ کے نشانات ہیں اور تو انکار کر کے ہلاکت میں پڑ رہا ہے پس اس جگہ "احکام" مراد لینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے، کیونکہ ان کا نزول خود ان مفسرین کے نزدیک بھی غرق فرعون کے بعد ہوا ہے، چنانچہ یہی اشکال ترمذی کی حدیث پر بھی وارد ہوتا ہے، نیز یہ بات بھی خدشہ سے خالی نہیں کہ قرآن عزیز کی آیات زیر بحث میں تو "نو آیات" کا ذکر ہے اور صفوان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں دس [3] احکام شمار کرائے ہیں تو یہ گنتی کا تعارض ہے اور پھر احکام عشر کو "تسع آیات" کی تشریح بتانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

ان ہر دو اہم خدشات کے علاوہ اس قول اور حدیث صفوان رضی اللہ عنہ کی تشریح پر جو سخت اشکال لازم آتا ہے وہ یہ ہے کہ سورۂ نمل میں تسع آیات کا ذکر کرتے ہوئے ید بیضاء کو نو میں کا ایک بتایا گیا اور یہ بھی صراحت کی گئی ہے کہ یہ آیات (نشانات) فرعون اور قوم فرعون کی عبرت و بصیرت کے لئے بھیجے گئے تھے۔

﴿وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهٖ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝﴾ (النمل: ۱۲)

"اور داخل کر تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں وہ نکلے گا روشن بغیر کسی مرض کے (یہ ان) نو آیات میں سے (ہے) جو فرعون

---

[1] مفسرین کہتے ہیں کہ جوں اور مینڈک کے عذاب کی صورت یہ تھی کہ برتنے، کھانے، پینے اور رہنے سہنے کی کوئی شئے اور کوئی جگہ ایسی نہ تھی جس کو ان دونوں نے فاسد اور خراب نہ کر دیا ہو، اور زندگی تلخ نہ کر دی ہو اور خون کے عذاب کی شکل یہ تھی کہ قلزم اور کنوؤں کا تمام پانی خون آلود ہو گیا تھا، جس کو کسی حالت میں پیا نہ جا سکتا تھا۔

[2] ترمذی کتاب التفسیر ج ۲ ص ۱۵۹

[3] تورات میں بھی ان احکام کا ذکر موجود ہے "اور اس نے ان لوحوں پر ان عہد کی باتوں کو یعنی موجودہ احکام کو لکھ کر" (خروج باب ۳۴ آیت ۲۸)

Marfat.com

اور اس کی قوم کے لئے (بھیجی گئیں) بلاشبہ تھے وہ نافرمان گروہ۔"

پس قرآن عزیز کی اس صراحت کے بعد نہ حدیث نکارت سے خالی رہتی ہے اور نہ مفسرین کا یہ قول صحیح ہو سکتا ہے، اس لئے حافظ حدیث ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس حدیث کے متعلق یہ فرمایا ہے:

فهذا الحديث رواه هكذا الترمذی والنسائی و ابن ماجة و ابن جرير فی تفسيره من طرق عن شعبة بن الحجاج به و قال الترمذی حسن صحيح و هو حديث مشكل و عبدالله بن سلمة فی حفظه شئ و قد تكلموا فيه و لعله اشتبه عليه التسع الأيات بالعشر الكلمات وصايا فی التوراة لا تعلق لها لقيام الحجة على فرعون الله اعلم و لهذا قال موسٰى لفرعون لقد علمت ما انزل هٰؤلاء الا رب السمٰوٰت والارض بصائر ای حجة و ادلة على صدق ما جئتك به وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا. (تفسیر ابن کثیر جلد ٦ ص ١١٢)

"پس اس حدیث کو اس طرح ترمذی، نسائی، ابن ماجہ نے اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں مختلف طریقوں سے شعبہ بن الحجاج سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ حسن صحیح ہے، مگر اس حدیث میں اشکال ہے اور عبداللہ بن سلمہ راوی کے حفظ میں کچھ خرابی ہے اور محدثین نے اس کے بارے میں کلام کیا ہے اور شاید اس کو اشتباہ ہو گیا کہ اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ دس احکام کو تسع آیات سمجھ کر ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا، حالانکہ وہ دس وصیتیں ہیں جو توراۃ میں بیان کی گئی ہیں، ان کا فرعون پر قیام حجت و دلیل سے مطلق کوئی تعلق نہیں، (واللہ اعلم) اور تسع آیات میں قیام حجت مقصود ہے اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے یہ فرمایا: "تو خوب جانتا ہے کہ ان آیات (معجزات) کو آسمان اور زمین کے پروردگار نے نہیں اتارا مگر عبرت و بصیرت کے لئے یعنی جو حق کا پیغام لے کر آیا ہوں اس کی تصدیق کے لئے حجت و دلیل بنا کر بھیجا ہے، اور میں بلاشبہ اے فرعون! تجھ کو ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔"

بہرحال یہ تشریح قطعاً مخدوش و مجروح ہے، اور بعض مفسرین نے اس کے خلاف تسع آیات کی تعیین میں ان ہی آیات (معجزات) کو شمار کرایا ہے جو عبرت و بصیرت اور مخالفین کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کے لئے عطاء کیے گئے تھے، لیکن یہ اقوال بھی مختلف ہیں اور ان میں کافی انتشار موجود ہے، اس لئے کہ ان میں قبل عبور اور بعد عبور نشانات کو خلط کر دیا گیا ہے، البتہ ان سب اقوال میں قابل ترجیح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول ہے کہ تسع آیات سے مراد حسب ذیل "آیات اللہ" مراد ہیں:

عصاء، ید بیضاء، سنین، نقص ثمرات، طوفان، جراد، قمل، ضفادع، دم، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے علاوہ مجاہد، عکرمہ، شعبی اور قتادہ رضی اللہ عنہم بھی اسی کی تائید فرماتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اس تشریح کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس قدر بھی آیات (معجزات) عطاء کیے گئے، ایک حصہ بحر قلزم کے عبور سے قبل، اور دوسرا حصہ عبور کے بعد سے متعلق ہے، اور پہلے حصہ کا تعلق ان تمام واقعات سے ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان پیش آئے اور معرکہ حق و باطل کا باعث بنے اور یہ نو ہیں ان میں سے عصاء اور ید بیضاء آیات کبریٰ ہیں۔

﴿فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴾ (النازعات: ۲۰)

"پس دکھایا اس (فرعون) کو ایک بڑا نشان (یعنی عصاء کا نشان)"

﴿وَ اَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ﴾ (النمل: ۱۲)

"اور داخل کر تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں نکلے گا وہ روشن بغیر کسی مرض کے نو نشانات (معجزات) میں سے۔"

رباقی سات "آیات عذاب" ہیں جس نے فرعون اور اہل مصر (قبطیوں) کی زندگی تنگ کر دی تھی۔

﴿وَ لَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ۝ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰی وَ مَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ وَ قَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰیَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ﴾

(الاعراف: ۱۳۰۔۱۳۳)

"اور ہم نے پکڑ لیا فرعون والوں کو قحطوں میں اور میووں کے نقصان میں تاکہ وہ نصیحت مانیں۔ پھر جب پہنچی ان کو بھلائی کہنے لگی یہ ہے ہمارے لائق، اور اگر پہنچی برائی تو نحوست بتلاتے موسیٰ (علیہ السلام) کی اور اس کے ساتھ والوں کی سن لو، ان کی شومی تو اللہ کے پاس ہے، پر اکثر لوگ نہیں جانتے، اور کہنے لگے جو کچھ تو لائے گا، ہمارے پاس نشانی کہ ہم پر اس کی وجہ سے جادو کرے سو ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ لائیں گے، پھر ہم نے بھیجا ان پر طوفان اور ٹڈی اور چیچڑی اور مینڈک اور خون، بہت سی نشانیاں جدا جدا دیں۔"

اور "آیات بینات" کے دوسرے حصہ کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل سے متعلق واقعات سے ہے جن میں سے بعض (معجزات) ان کو ہلاکت سے محفوظ رکھنے اور صداقت موسیٰ علیہ السلام کو قوت دینے کے لیے ہیں، مثلاً من و سلویٰ کا نزول، غمام (بادلوں کا سایہ) اور انفجار عیون (پتھر سے بارہ چشموں کا پھوٹ نکلنا) اور بعض بنی اسرائیل کی سرکشی پر تہدید و تخویف کے لئے ہیں مثلاً نتق جبل (طور کے ایک حصہ کا اپنی جگہ سے اُکھڑ کر بنی اسرائیل کے سر پر آ جانا)۔

﴿وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰی ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ﴾ (البقرہ: ۵۷)

"اور اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر من (حلواء شیریں) اور سلویٰ (بٹیریں) نازل کیا، پس تم ان پاک چیزوں کو کھاؤ جو ہم نے تم کو رزق بنا کر دی ہیں، اور اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر بادل کا سایہ قائم کر دیا اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تو ہم نے کہا (اے موسیٰ علیہ السلام) تو پتھر پر اپنی لاٹھی مار، پس بہہ پڑے اس سے بارہ چشمے۔"

اور دونوں قسم کے نشانات کے لئے حد فاصل وہ عظیم الشان نشان ہے جو فلق بحر (قلزم کے دو ٹکڑے ہو کر راہ نکل آنا) کے عنوان سے معنون ہے، اور دراصل ظلم و قہر کی ہلاکت اور مظلومانہ زندگی کی نصرت و حمایت کے لیے ایک فیصلہ کن نشان تھا، یا یوں کہ دیجیے کہ واقعات قبل از عبور کے انجام اور بعد از عبور روشن آغاز کے لئے نمایاں حد فاصل کی حیثیت رکھتا تھا، چنانچہ اعراف، اسرا

Marfat.com

طٰہٰ، شعراء، قصص، زخرف، دخان اور الذاریات میں اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور یہ تمام نشانات (معجزات) درحقیقت شرطیہ اور تمہید تھے ایک ایسے عظیم الشان اور جلیل المرتبت نشان کے جو اس پوری تاریخ کا حقیقی مقصد اور بنیاد واساس تھا، اور وہ نزول تورات کا نشان اعظم ہے۔

﴿ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ﴾ (المائدہ: ۴۴)

"ہم نے اتاری تورات جس میں ہدایت اور نور (کا ذخیرہ) ہے۔"

الحاصل حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ اثر زیر بحث مسئلہ کے لئے قول فیصل ہے اسی لئے حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے:

"اور یہ قول صاف ہے، واضح ہے، عمدہ ہے اور قوی ہے۔" [1]

بہرحال فرعون اور اس کی پیہم اور مسلسل سرکشی، ظلم، حق کے ساتھ استہزاء، تمول، اور نافرمانی کے باعث خدائے تعالیٰ کی جانب سے مصریوں پر مختلف ہلاکتیں اور عذاب آتے رہے اور وقفہ کے ساتھ ان "نشانات" کا ظہور ہوتا رہا، جب ایک عذاب آتا تو سب واویلا کرنے لگتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہتے کہ اگر اس مرتبہ تو نے اپنے خدا سے کہہ کر اس عذاب کو ٹال دیا تو ہم سب ایمان لے آئیں گے اور جب وہ ٹل جاتا تو پھر سرکشی شروع کر دیتے، آخر پھر دوسرا عذاب آ پکڑتا اور پھر وہی صورت پیش آ جاتی۔

اس تفصیلی واقعہ کا ذکر ابھی سورۂ اعراف کی آیات میں گزر چکا ہے۔ ان آیات میں بیان کردہ نشانیوں میں سے قمل [2] (جوں) اور ضفادع (مینڈک) کے متعلق علماء سیر نے لکھا ہے کہ ان دونوں چیزوں کی یہ حالت تھی کہ بنی اسرائیل کے کھانے پینے، پہننے اور برتنے کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جن میں یہ موجود نظر نہ آتے ہوں حتیٰ کہ قوم فرعون کی عافیت تنگ ہوگئی اور وہ عاجز ہوگئے، اور خون کے متعلق لکھا ہے کہ دریائے نیل کا پانی لہو کی رنگت کا ہو گیا تھا، اور اس کے ذائقہ نے اس کا پینا دشوار کر دیا تھا اور پانی میں مچھلیاں تک مر گئی تھیں، تورات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۱۱۔ اس بحث کے لئے روح المعانی، ابن کثیر، تفسیر کبیر اور البحر المحیط خصوصیت کے ساتھ قابل مراجعت ہیں، ان کے مطالعہ کے بعد مؤلف کے قول فیصل کی اہمیت ولطافت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ﴿ وَ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾۔

[2] قمل سے یہاں کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے کہ وہ کیڑا مراد ہے جو اناج میں پیدا ہو کر اس کو خراب کر دیتا ہے (اردو میں اس کو سرسری کہتے ہیں، اور انہی سے ایک روایت ہے کہ اس سے وہ چھوٹی ٹڈی مراد ہے جس کے پر نہیں ہوتے اور وہ بھی غلہ کو گھن لگا دیتی ہے، مجاہد، عکرمہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے ہے اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جوں کی طرح کا ایک کیڑا ہوتا ہے جو اونٹوں میں ہلاکت پیدا کرتا ہے اور راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ چھوٹی مکھی ہے جو انسانی صحت کے لئے بے حد مضرت رساں ہے۔ قمل عربی میں عام طور پر جوں کو کہتے ہیں، تورات میں اس جگہ جوں اور مکھی دونوں کا ذکر ہے لیکن ابن عباس، مجاہد، قتادہ، عکرمہ، ابن جریر رحمۃ اللہ علیہم اور راغب رحمۃ اللہ علیہ جیسے ائمہ لغت اس لفظ کا اطلاق مسطورہ بالا مختلف کیڑوں پر کر رہے ہیں، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قمل اپنے معنی میں ان مصادیق کے لئے وسیع ہے، اس لئے ان تمام اطلاقات کی تطبیق کے لئے یہ کیوں نہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں پر یہ عذاب نازل فرمایا کہ انسان پر جوئیں مسلط کر دیں، ان کے کھانے پینے کی چیزوں میں چھوٹی مکھیوں کو پھیلا دیا۔ ان کے جانوروں میں ہلاک کرنے والا کیڑا پیدا کر دیا۔ اور ان کے اناج اور غلہ میں گھن لگا کر خراب کر دینے والی سرسری کی تباہی پھیلا دی، اور ان سب مہلک کیڑوں کو قرآن کے اعجاز نے قمل کی وسیع تعبیر میں بیان فرما دیا ہے۔ (مؤلف)

Marfat.com

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ
یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا ۝ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ
یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل: ۱۰۱-۱۰۲)

"اور بیشک ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو نو ظاہر نشانات دیئے پس (اے محمد ﷺ!) تو بنی اسرائیل سے دریافت کر کہ جب وہ ان کے پاس آیا تو فرعون نے موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا: "اے موسیٰ (علیہ السلام)! میں تجھ کو جادو کا مارا ہوا گمان کرتا ہوں" موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: "تو خوب جانتا ہے کہ آسمان و زمین کے پروردگار نے ان نشانات کو عبرتیں بنا کر اتارا ہے اور اے فرعون میں سمجھتا ہوں کہ تو نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔"

﴿وَ لَقَدْ اَرَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَ اَبٰی ۝﴾ (طٰہٰ: ۵۶)

"اور بیشک ہم نے فرعون کو اپنے سب نشانات (معجزے) دکھائے پھر بھی اس نے جھٹلایا اور انکار ہی کیا۔"

﴿فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ
ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ۝﴾ (النمل: ۱۳-۱۴)

"پھر جب ان کے پاس ہمارے نشانات بصیرت کے لئے آ پہنچے تو وہ کہنے لگے "یہ تو صریح جادو ہے" اور انہوں نے اپنے جی میں یہ یقین رکھتے ہوئے کہ یہ "صحیح ہیں" ظلم اور غرور کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا۔ پس دیکھ (اے مخاطب) مفسدوں کا انجام کیسا ہوا؟"

﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًی وَّ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْۤ اٰبَآىِٕنَا
الْاَوَّلِیْنَ ۝ وَ قَالَ مُوْسٰی رَبِّیْۤ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰی مِنْ عِنْدِهٖ وَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ
اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾ (القصص: ۳۶-۳۷)

"پھر جب ان کے پاس ہماری صریح نشانیاں پہنچیں کہنے لگے یہ کچھ نہیں ہیں مگر گھڑا ہوا جادو اور ہم نے اپنے پہلے باپ دادوں میں یہ باتیں نہیں سنیں، اور موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: "میرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون شخص لایا ہے اس کے پاس سے ہدایت کو اور کون ہے جس کے لئے آخرت کا انجام مقرر ہے، بلاشبہ وہ بے انصافوں کو فلاح نہیں دیتا۔"

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡىِٕهٖ فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰیٰتِنَاۤ
اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَضْحَكُوْنَ ۝ وَ مَا نُرِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ اِلَّا هِیَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ؗ وَ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ
یَرْجِعُوْنَ ۝ وَ قَالُوْا یٰۤاَیُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا

Marfat.com

عَنۡهُمُ الۡعَذَابَ اِذَا هُمۡ يَنۡكُثُوۡنَ ﴿۵۰﴾ (الزخرف: ۴۶-۵۰)

"اور بیشک ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف اپنی نشانیاں دے کر بھیجا، پس موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا میں جہانوں کے پروردگار کا رسول ہوں پھر جب وہ ہماری نشانیاں لایا۔ اچانک وہ اس کا مذاق اڑانے لگے، اور ہم نے جو نشان ان کو دکھایا ان میں سے ایک دوسرے سے بڑا ہی تھا اور ہم نے ان کو (دنیوی) عذاب میں گرفتار کیا تاکہ وہ باز آ جائیں اور وہ کہنے لگے، اے جادوگر! تو اپنے پروردگار سے اپنے اس عہد (نبوت) کی بنا پر ہمارے لئے دعاء کر (کہ یہ مصیبت جاتی رہے) تو ہم بلاشبہ ہدایت قبول کر لیں گے، پھر جب ہم نے ان سے عذاب کو دور کر دیا تو پھر وہ بد عہد ہو گئے۔"

﴿وَلَقَدۡ جَآءَ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذۡنٰهُمۡ اَخۡذَ عَزِيۡزٍ مُّقۡتَدِرٍ ﴿۴۲﴾﴾ (القمر: ۴۱-۴۲)

"بلاشبہ آل فرعون کے پاس (بدکرداریوں) کے انجام سے ڈرانے والے آئے انہوں نے ہماری سب نشانیوں کو جھٹلایا، پس ہم نے ان کو (اپنے عذاب میں) پکڑ لیا، ایک غالب اور قدرت والے کی پکڑ کی طرح۔"

﴿فَاَرٰىهُ الۡاٰيَةَ الۡكُبۡرٰى ﴿۲۰﴾ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿۲۱﴾﴾ (النازعات: ۲۰-۲۱)

"پھر دکھلائی (موسیٰ علیہ السلام نے) اس کو بڑی نشانی، پس اس (فرعون) نے جھٹلایا اور نافرمانی کی۔"

بنی اسرائیل کا خروج اور فرعون کا تعاقب:

جب معاملہ اس حد کو پہنچ گیا تو خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ تم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر باپ دادا کی سرزمین کی جانب لے جاؤ۔

مصر سے فلسطین یا ارض کنعان جانے کے دو راستے ہیں، ایک خشکی کا راستہ ہے اور وہ قریب ہے اور دوسرا بحر احمر (قلزم) کا راستہ یعنی اس کو عبور کر کے بیابان سور اور سینا (تیہ) کی راہ ہے اور یہ دور کی راہ ہے، مگر خدائے تعالیٰ کی مصلحت کا تقاضا یہی ہوا کہ خشکی کی راہ چھوڑ کر دور کی راہ اختیار کریں اور قلزم کو پار کر کے جائیں۔

واقعات رونما ہو جانے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ اس راہ حق کو حق تعالیٰ نے اس لئے ترجیح دی کہ خشکی کی راہ سے گزرنے میں فرعون اور اس کی فوج سے جنگ ضروری ہو جاتی، کیونکہ انہوں نے بنی اسرائیل کو قریب ہی آ لیا تھا اور اگر دریا کا معجزہ پیش نہ آتا تو فرعون بنی اسرائیل کو واپس مصر لے جانے میں کامیاب ہو جاتا اور چونکہ صدیوں کی غلامی نے بنی اسرائیل کو بزدل اور پست ہمت بنا دیا تھا اس لئے وہ خوف اور رعب کی وجہ سے کسی طرح فرعون کے ساتھ جنگ پر آمادہ نہ ہوتے، تورات سے بھی اس توجیہ کی تائید نکلتی ہے، اس میں مذکور ہے:

"اور جب فرعون نے ان لوگوں کو جانے کی اجازت دے دی تو خدا ان کو فلستیوں کے ملک کے راستہ سے نہیں لے گیا اگرچہ ادھر سے نزدیک پڑتا کیونکہ خدا نے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ لڑائی بھڑائی دیکھ کر پچھتانے لگیں اور مصر کو لوٹ جائیں بلکہ خداوند ان کو چکر کھلا کر بحر قلزم کے بیابان کے راستے سے لے گیا۔" (خروج باب ۱۳ آیت ۱۷ و ۱۸)

علاوہ ازیں فرعون اور قوم فرعون کو ان کی نافرمانی اور سرکشی کی پاداش اور عظیم الشان اعجاز کے ذریعہ ظالم و قاہر اقتدار سے مظلوم قوم کی نجات کا عدیم النظیر مظاہرہ کرنا بھی مقصود تھا، اسی لئے یہ راستہ موزوں سمجھا گیا۔

غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات بحر احمر کی راہ ہو لئے اور روانہ ہونے سے پہلے مصری عورتوں کے زیورات اور قیمتی پارچہ جات جو ایک تہوار میں مستعار لئے تھے وہ بھی واپس نہ کر سکے کہ کہیں مصریوں پر اصل حال نہ کھل جائے۔

ادھر پرچہ نویسوں نے فرعون کو اطلاع کی کہ بنی اسرائیل مصر سے فرار ہونے کے لئے شہروں سے نکل گئے، فرعون نے اسی وقت ایک زبردست فوج کو ساتھ لیا اور رعمسیس سے نکل کر ان کا تعاقب کیا، اور صبح ہونے سے پہلے پہلے ان کے سر پر جا پہنچا۔

بنی اسرائیل کی تعداد بقول تورات علاوہ بچوں اور چوپایوں کے چھ لاکھ تھی، مگر پو پھٹنے کے وقت جب انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو فرعون کو سر پر پایا، گھبرا کر کہنے لگے:

"کیا مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہم کو مرنے کے لئے بیابان میں لے آیا ہے؟ تو نے ہم سے یہ کیا کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا ہم تجھ سے مصر میں یہ بات نہ کہتے تھے کہ ہم کو رہنے دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں؟ کیونکہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہوتا۔" (خروج باب ۱۴ آیات ۱۱،۱۲)

غرق فرعون:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تسلی دی اور فرمایا خوف نہ کرو، خدا کا وعدہ سچا ہے وہ تم کو نجات دے گا اور تم ہی کامیاب ہو گے، اور پھر درگاہِ الٰہی میں دست بدعاء ہوئے، وحی الٰہی نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی لاٹھی کو پانی پر مارو تا کہ پانی پھٹ کر بیچ میں راستہ نکل آئے، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی کیا، جب انہوں نے قلزم پر اپنا عصا مارا تو پانی پھٹ کر دونوں جانب دو پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا اور بیچ میں راستہ نکل آیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم سے تمام بنی اسرائیل اس میں اتر گئے، اور خشک زمین کی طرح اس سے پار ہو گئے فرعون نے یہ دیکھا تو اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: یہ میری کرشمہ سازی ہے کہ بنی اسرائیل کو تم جا پکڑو لہٰذا بڑھے چلو، چنانچہ فرعون اور اس کا تمام لشکر بنی اسرائیل کے پیچھے اسی راستے پر اتر لئے لیکن اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ جب بنی اسرائیل کا ہر فرد دوسرے کنارہ پر سلامتی کے ساتھ پہنچ گیا تو پانی بحکم الٰہی پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا اور فرعون اور اس کا تمام لشکر جو ابھی درمیان ہی میں تھا غرق ہو گیا۔

جب فرعون غرق ہونے لگا اور ملائکہ عذاب سامنے نظر آنے لگے تو پکار کر کہنے لگا: "میں اسی ایک وحدہٗ لاشریک لہٗ ہستی پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں" مگر یہ ایمان چونکہ حقیقی ایمان نہ تھا بلکہ گذشتہ فریب کاریوں کی طرح نجات حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ایک مضطربانہ بات تھی اس لئے خدا کی طرف سے یہ جواب ملا:

﴿ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۹۱ ﴾ (یونس: ۹۱)

"اب یہ کہہ رہا ہے حالانکہ اس سے پہلے جو اقرار کا وقت تھا اس میں انکار اور خلاف ہی کرتا رہا اور درحقیقت تو مفسدوں میں

Marfat.com

سے تھا۔"

یعنی خدا کو خوب معلوم ہے کہ تو "مسلمین" میں سے نہیں بلکہ "مفسدین" میں سے ہے۔

درحقیقت فرعون کی یہ پکار ایسی پکار تھی جو ایمان لانے اور یقین حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ عذاب الٰہی کا مشاہدہ کرنے کے بعد اضطراری اور بے اختیاری کی حالت میں نکلتی ہے، اور مشاہدۂ عذاب کے وقت اس کی یہ صدائے "ایمان ویقین" حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعاء کا نتیجہ تھی جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔

﴿فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا﴾ (یونس: ۸۸-۸۹)

"پس یہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک اپنی ہلاکت اور عذاب کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "بلاشبہ تم دونوں کی دعاء قبول کر لی گئی۔"

اس موقعہ پر فرعون کی پکار پر درگاہ الٰہی کی جانب سے یہ بھی جواب دیا گیا:

﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً﴾ (یونس: ۹۲)

"آج کے دن ہم تیرے جسم کو ان لوگوں کے لئے جو تیرے پیچھے آنے والے ہیں نجات دیں گے کہ وہ (عبرت) کا نشان بنے۔"

پس اگر گذشتہ "مصری مقالہ" کا مضمون صحیح ہے کہ منفتاح (ریمسس ثانی) ہی فرعون موسیٰ علیہ السلام تھا تب تو بے شبہ اس کی لاش آج تک محفوظ ہے اور سمندر میں تھوڑی دیر غرق رہنے کی وجہ سے اس کی ناک کو مچھلی نے کھا لیا ہے اور آج وہ مصریات (اجپٹالوجی) کے مصری عجائب خانہ میں تماشا گاہ خاص وعام ہے۔

اور بالفرض یہ وہ فرعون نہیں ہے تب بھی آیت کا مطلب اپنی جگہ صحیح ہے، اس لئے کہ توراۃ میں تصریح ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنی آنکھوں سے غرق شدہ مصریوں کی نعشوں کو کنارے پر پڑے ہوئے دیکھا تھا:

"اور اسرائیلیوں نے مصریوں کو سمندر کے کنارے مرے ہوئے پڑے دیکھا۔" (خروج باب ۱۴، آیت ۳۱)

بصائر:

قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کی روانگی اور فرعون کے غرق اور بنی اسرائیل کی نجات کے واقعہ کو بہت مختصر بیان کیا ہے اور صرف ضروری اجزاء ہی کا تذکرہ کیا ہے البتہ اس سے متعلق عبرت وبصیرت اور موعظت کے معاملہ کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ۝ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۷۷-۷۹)

"اور (پھر دیکھو) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) پر وحی بھیجی تھی کہ (اب) میرے بندوں کو راتوں رات (مصر سے) نکال لے جا پھر

Marfat.com

سمندر میں ان کے گذرنے کے لئے خشکی کی راہ نکال لے، تجھے نہ تو تعاقب کرنے والوں سے اندیشہ ہوگا، نہ اور کسی طرح کا خطرہ پھر (جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر نکل گیا، تو) فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ اس کا پیچھا کیا، پس پانی کا ریلا (جیسا کچھ) ان پر چھانے والا تھا چھا گیا یعنی جو کچھ ان پر گذرنی تھی گذر گئی اور فرعون نے اپنی قوم پر راہ (نجات) گم کر دی انہیں سیدھی راہ نہیں دکھائی۔"

﴿وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۵۳﴾
اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَ اِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَ اِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ
جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ ۚ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾
فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۶۲﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى
مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۚ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿۶۳﴾ وَ اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَ
اَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۶۵﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۚ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۶۷﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۶۸﴾﴾ (الشعراء: ۵۲-۶۸)

"اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کہ رات کو لے نکل میرے بندوں کو، البتہ تمہارا پیچھا کریں گے، پھر بھیجے فرعون نے شہروں میں نقیب، یہ لوگ جو ہیں سو ایک جماعت ہے تھوڑی سی، اور وہ مقرر ہم سے دل جلے ہوئے ہیں، اور ہم سارے ان سے خطرہ رکھتے ہیں، پھر نکال باہر کیا ہم نے ان کو باغوں اور چشموں سے اور خزانوں اور مکانوں سے اسی طرح اور ہاتھ لگا دیں ہم نے یہ چیزیں بنی اسرائیل کے پھر پیچھے پڑے ان کے سورج نکلنے کے وقت پھر جب مقابل ہوئیں دونوں فوجیں کہنے لگے موسیٰ (علیہ السلام) کے لوگ ہم تو پکڑے گئے، کہا ہرگز نہیں میرے ساتھ ہے میرا رب، وہ مجھ کو راہ بتائے گا، پھر حکم بھیجا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کہ مار اپنے عصاء سے دریا کو پھر دریا پھٹ گیا تو ہو گئی، ہر ایک پھانک جیسے بڑا پہاڑ اور پاس پہنچا دیا ہم نے اسی جگہ دوسروں کو اور بچا دیا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اور جو لوگ تھے اس کے ساتھ سب کو، پھر ڈبو دیا ہم نے ان دوسروں کو، اس چیز میں ایک نشانی ہے، اور نہیں تھے بہت لوگ ان میں ماننے والے، اور تیرا رب ہی ہے زبردست رحم والا۔"

﴿فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَ اَوْرَثْنَا
الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۚ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ
الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ۚ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾﴾
(الاعراف: ۱۳۶-۱۳۷)

"بالآخر ہم نے (ان کی بدعملیوں پر) انہیں سزا دی یعنی اس جرم کی پاداش میں کہ ہماری نشانیاں جھٹلائیں اور ان کی طرف سے

Marfat.com

غافل رہے، انہیں سمندر میں غرق کر دیا، اور جس قوم کو کمزور و حقیر خیال کرتے تھے اسی کو ملک کے تمام پورب کا اور اس کے مغربی حصوں کا کہ ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالا مال ہے وارث کر دیا، اور اس طرح (اے پیغمبرؐ) تیرے پروردگار کا فرمان پسندیدہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا کہ (ہمت و ثبات کے ساتھ) جمے رہے تھے اور فرعون اور اس کا گروہ (اپنی طاقت و شوکت کے لئے) جو کچھ بنا تا رہا تھا اور جو کچھ (عمارتوں کی) بلندیاں اٹھائی تھیں، وہ سب درہم برہم کر دیں۔"

﴿وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَ جُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّ عَدْوًا ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝۹۰ آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝۹۱ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً ؕ وَ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝۹۲﴾ (یونس: ۹۰۔۹۲)

"اور پھر ایسا ہوا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا، یہ دیکھ کر فرعون اور اس کے لشکر نے پیچھا کیا۔ مقصود یہ تھا کہ ظلم و شرارت کریں لیکن جب حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ فرعون سمندر میں غرق ہونے لگا، تو اس وقت پکارا اٹھا "میں یقین کرتا ہوں کہ اس ہستی کے سواء کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں، اور میں بھی اسی کے فرماں برداروں میں ہوں!" (ہم نے کہا) "ہاں، اب تو ایمان لایا، حالانکہ پہلے برابر نافرمانی کرتا رہا، اور تو دنیا کے مفسد انسانوں میں سے ایک (بڑا ہی) مفسد تھا" پس آج ہم ایسا کریں گے کہ تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے) بچالیں گے، تاکہ ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں، (قدرت حق کی) ایک نشانی ہو اور اکثر انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں کی طرف سے یک قلم غافل رہتے ہیں۔"

﴿وَ اسْتَكْبَرَ هُوَ وَ جُنُوْدُهٗ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اِلَیْنَا لَا یُرْجَعُوْنَ ۝۳۹ فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ ۝۴۰﴾ (القصص: ۳۹۔۴۰)

"اور برائی کرنے لگے وہ اور اس کے لشکر ملک میں ناحق اور سمجھے کہ ہماری طرف پھر کر نہ آئیں گے، پھر پکڑا ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو پھر پھینک دیا ہم نے ان کو دریا میں سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام گنہگاروں کا۔"

﴿وَ لَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِیْمٌ ۝۱۷ اَنْ اَدُّوْۤا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۝۱۸ وَّ اَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّیْۤ اٰتِیْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝۱۹ وَ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ۝۲۰ وَ اِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ ۝۲۱ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ۝۲۲ فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝۲۳ وَ اتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ۝۲۴ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ۝۲۵ وَّ زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِیْمٍ ۝۲۶ وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِیْهَا فٰكِهِیْنَ ۝۲۷ كَذٰلِكَ ۫ وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا

Marfat.com

اٰخَرِيْنَ ۝ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۝ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۝ مِنْ فِرْعَوْنَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝﴾ (الدخان: ۱۷۔۳۱)

"اور جانچ چکے ہم ان سے پہلے فرعون کی قوم کو اور آیا ان کے پاس رسول عزت والا کہ حوالہ کرو میرے بندے خدا کے تمہارے پاس آیا ہوں بھیجا ہوا معتبر، اور یہ کہ سرکشی نہ کرو اللہ کے مقابل، میں لایا ہوں تمہارے پاس سند کھلی ہوئی اور میں پناہ لے چکا ہوں اپنے رب اور تمہارے رب کی اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار کرو، اور اگر تم نہیں یقین کرتے مجھ پر تو مجھ سے پرے ہو جاؤ، پھر دعاء کی اپنے رب سے کہ یہ لوگ گنہگار ہیں، پھر لے نکل رات میں میرے بندوں کو، البتہ تمہارا پیچھا کریں گے اور چھوڑ جا دریا کو تھما ہوا، البتہ وہ لشکر ڈوبنے والے ہیں، بہت سے چھوڑ گئے باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور گھر عمدہ، اور آرام کا سامان جس میں باتیں بنایا کرتے تھے، یونہی ہوا اور وہ سب ہاتھ لگا دیا ہم نے ایک دوسری قوم کے پھر نہ رویا ان پر آسمان اور زمین اور نہ ملی ان کو ڈھیل اور ہم نے بچا نکالا بنی اسرائیل کو ذلت کی مصیبت سے جو فرعون کی طرف سے تھی، بیشک وہ تھا چڑھ رہا حد سے بڑھ جانے والا۔"

﴿فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ۝ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ۝﴾ (بنی اسرائیل: ۱۰۳۔۱۰۴)

"پھر چاہا، بنی اسرائیل کو چین نہ دے اس زمین میں پھر ڈبو دیا ہم نے اس کو اور اس کے ساتھ والوں کو سب کو اور کہا ہم نے اس کے پیچھے آباد رہو تم زمین میں پھر جب آئے گا وعدہ آخرت کا لے آئیں گے ہم تم کو سمیٹ کر۔"

﴿وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيْمٌ ۝﴾ (الذاریات: ۳۸۔۴۰)

"اور نشانی ہے موسیٰ (علیہ السلام) کے حال میں، جب بھیجا ہم نے اس کو فرعون کے پاس دے کر کھلی سند، پھر اس نے منہ موڑ لیا اپنے زور پر، اور بولا یہ جادوگر ہے یا دیوانہ، پھر پکڑا ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو پھر پھینک دیا ان کو دریا میں اور اس پر لگا الزام۔"

البتہ تورات نے بیان کردہ واقعات کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تفصیلات بیان کی ہیں اور بنی اسرائیل کے کوچ اور پڑاؤ کے اکثر مقامات کے نام بھی بتائے ہیں جو دنیا کے لیے نامعلوم ہیں۔

تورات کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ فرعون اور اس کی قوم پر جب خدا کی بھیجی ہوئی آفات کا سلسلہ جاری ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق یکے بعد دیگرے "نشانات" کا ظہور ہونے لگا تو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بلا کر کہا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لے جا مگر ان کے چوپائے اور پالتو جانور یہیں چھوڑنے ہوں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس شرط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ایک جانور بھی تو روکنے کا حق نہیں رکھتا، تب فرعون غضبناک ہو کر کہنے لگا کہ اب بنی اسرائیل نہ جا سکیں گے اور تو اب میرے سامنے کبھی نہ آنا ورنہ میرے ہاتھ سے مارا جائے گا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تو نے ٹھیک کہا اب میں کبھی تیرے

Marfat.com

سامنے نہ آؤں گا، میرے خدا کا یہی فیصلہ ہے اور اس نے مجھ کو بتا دیا ہے کہ تجھ پر اور تیری قوم پر ایسی سخت آفت آئے گی کہ تیرا اور کسی مصری کا پہلوٹھا زندہ نہیں رہے گا۔

موسیٰ علیہ السلام فرعون سے یہ گفتگو کر کے دربار سے باہر نکل آئے اور پھر بنی اسرائیل سے یہ فرمایا کہ خداوند کا ارشاد ہے کہ فرعون کا دل سخت ہو گیا ہے، وہ اب تم کو یہاں سے اس وقت تک نہ جانے دے گا جب تک مزید نشان نہ دیکھ لے کہ جس سے تمام مصریوں میں کہرام مچ جائے مگر تم کو تیاری کر لینی چاہیے کہ مصر سے نکلنے کا وقت آ پہنچا اور خدائے تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ بنی اسرائیل کو نکلنے سے پہلے قربانی اور عید فسح کا بھی حکم دیا اور اس کا طریقہ اور شرائط بھی بتا دیں، موسیٰ علیہ السلام نے ان سے یہ بھی کہا کہ اپنی عورتوں سے کہو کہ وہ مصری عورتوں کے پاس جائیں اور ان سے عید کے لیے سونے اور چاندی کے زیور اور قیمتی پارچہ جات مستعار مانگ لائیں اور مصری عورتوں نے آخر ان کو زیورات دے دیئے پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک رات فرعون سے لے کر معمولی مصری کا پہلوٹھا مر گیا اور تمام گھرانوں میں کہرام مچ گیا یہ دیکھ کر مصری فرعون کے پاس دوڑے آئے اور اس کو مجبور کیا کہ اسی وقت تمام بنی اسرائیل کو مصر سے نکال دے تاکہ یہ نحوست یہاں سے دور ہو، ہم پر یہ سب آفتیں انہی کی بدولت آتی رہتی ہیں۔

تب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اسی وقت تم سب یہاں سے نکل جاؤ اور اپنے جانوروں اور مویشیوں اور سب سامان کو ساتھ لے جاؤ، جب بنی اسرائیل رعمسیس (جشن کے شہر) سے نکلے تو بچوں اور جانوروں کے علاوہ وہ سب چھ لاکھ تھے اور جب وہ نکلے تو مصریوں کے زیورات کو بھی واپس نہ کر سکے اور مصریوں نے بھی مطالبہ نہ کیا۔

جب بنی اسرائیل نے جنگل کی راہ لی تو اب فرعون اور اس کے سرداروں کو اپنے فیصلہ پر سخت افسوس ہوا، اور انہوں نے آپس میں کہا کہ ہم نے مفت میں ایسے اچھے چاکر اور غلام ہاتھ سے کھو دیئے اور فرعون نے حکم دیا کہ فوراً سرداروں، مصری نوجوانوں اور فوج کو تیاری کا حکم دو اور وہ کروفر کے ساتھ رتھوں میں سوار ہو کر نکل کھڑے ہوئے اور بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔

بنی اسرائیل رعمسیس سے سکات اور وہاں سے ایتام اور پھر مڑ کر مجدال اور بحر احمر کے درمیان فی ہجزوت کے پاس بعل صفون کے سامنے خیمہ زن ہو چکے تھے، بنی اسرائیل کے اس پورے سفر میں خدا ان کے ساتھ رہا اور وہ نورانی ستون کی تجلی کے ساتھ رات میں بھی ان کی راہنمائی کرتا اور دن میں بھی آگے آگے چلتا، غرض صبح کی پو پھٹ رہی تھی کہ فرعون نے سمندر کے کنارے بنی اسرائیل کو آ لیا، انہوں نے پیچھے پھر کر دیکھا اور فرعون کو لاؤ لشکر کے ساتھ اپنے قریب پایا تو بد دل اور خائف ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جھگڑا کرنے لگے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو بہت کچھ تسلی و تشفی دی اور بتایا کہ تمہارے دشمن ہلاک ہوں گے اور تم سلامتی و عافیت کے ساتھ نجات پاؤ گے، اور پھر دربار خداوندی میں مناجات کرنے لگے:

"اور خداوند نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تو کیوں مجھ سے فریاد کر رہا ہے، بنی اسرائیل سے کہو کہ وہ آگے بڑھیں اور تو اپنی لاٹھی اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اسے دو حصے کر، اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے..... پھر موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ خشک زمین پر چل کر نکل گئے۔

......اور خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہ و بالا کر دیا اور پانی پلٹ کر آیا اور اس نے رتھوں اور سواروں اور

Marfat.com

فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا غرق کر دیا، اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوڑا، پھر بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور پانی ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ دیواروں کی طرح رہا۔

......اور اسرائیلیوں نے وہ بڑی قدرت جو خداوند نے مصریوں پر ظاہر کی دیکھی، اور وہ لوگ خداوند سے ڈرے اور خداوند پر اور اس کے بندے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔ ❶

تورات کی ان تفصیلات میں اگرچہ بہت زیادہ رطب و یابس اور دور از کار باتیں بھی ضمناً آ گئی ہیں، مگر وہ اور قرآن عزیز دونوں اس بارہ میں ہم آہنگ ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قہرمانیت کے مظالم سے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو ایک عظیم الشان نشان (معجزہ) کے ذریعہ نجات دی، قرآن عزیز کہتا ہے کہ یہ معجزہ اس طرح ظاہر ہوا کہ خدا کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام نے قلزم پر لاٹھی ماری اور دریا کا پانی، بیچ میں خشکی دے کر دونوں جانب پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا۔

﴿فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۝﴾ (الشعراء: ٦٣)

"بس (دریا) پھٹ گیا ہر ایک جانب ایک بڑے پہاڑ کی مانند ہو گئی۔"

﴿وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝﴾ (البقرہ: ٥٠)

"اور جب ہم نے ٹکڑے کر دیا تمہارے لیے سمندر پس نجات دی ہم نے تم کو اور غرق کر دیا فرعون کے لوگوں کو اور تم دیکھ رہے تھے۔"

اور تورات بھی اسی کی تائید کرتی ہے، چنانچہ اس میں مذکور ہے:

"تو اپنی لاٹھی اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اسے دو حصے کر........

اور پانی ان کے دائیں بائیں دیوار کی طرح رہا"۔

البتہ تورات میں یہ اضافہ اور ہے کہ "رات بھر تند پوربی ہوا چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا" سو اول تو تورات کی تحریف اور مختلف سنین کے مختلف تراجم کے پیش نظر تاریخی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے قرآن عزیز کے بیان ہی کو قابل اعتماد سمجھا جائے گا، کیونکہ وہ باتفاق دوست و دشمن ہر قسم کی تحریف و تبدیلی اور اضافہ و ترمیم سے محفوظ ہے۔

﴿لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝﴾ (حٰم السجدہ: ٤٢)

"اس پر باطل کا کسی جانب سے گذر نہیں نہ سامنے سے اور نہ پیچھے سے وہ اتارا ہوا ہے ایسی ہستی کی جانب سے جو حکمت والا خوبیوں والا ہے۔"

علاوہ ازیں اس اضافہ کی تطبیق کی بہترین صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ بڑھا کر عصاء چلانے سے اوّل دریا کے دو حصے ہو گئے اور دونوں جانب پانی کھڑا ہو گیا اور پھر لاکھوں انسانوں نے جب اس کے درمیان سے گذرنا شروع کیا تو زمین کی نمی اور تری کو خشک کرنے کے لیے برابر پوربی تند ہوا چلتی رہی تاکہ بچہ سے بوڑھے تک اور انسان سے حیوان تک کسی کو بھی گذرنے میں زحمت و تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔

---

❶ خروج باب ١٤ آیت ١٥-٣١

Marfat.com

بدقسمتی سے مسلمانوں میں بعض ایسے افراد بھی ہیں جو "علم" کے نام سے مذہب کے ہر مسئلہ کو "مادیات" ہی تک محدود دیکھنا چاہتے ہیں اور اس لیے وہ خدا کے دیئے ہوئے ان نشانات (معجزات) کا بھی انکار کرتے ہیں جو انبیاء و رسل علیہم السلام کی صداقت کی تائید اور دلیل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں ان کے انکار کے وہی معنی ہیں جو گذشتہ صفحات پر معجزہ کی بحث میں زیر بحث آ چکے ہیں یعنی وہ خدا کے کسی فعل کو بھی کسی حالت میں اس محسوس اور مادی دنیا کے اسباب و علل سے مستثنیٰ مان لینے کو آمادہ نہیں ہیں کیونکہ ان کے الحاد و زندقہ کی بنیاد دراصل مغربی الحاد و زندقہ پر قائم ہے، اور ان کا دل و دماغ اس ہی سے مرعوب اور متاثر ہے جس کا لازمی نتیجہ میٹریلزم (Materlalism) پر اعتقاد و اعتماد کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

پس منجملہ دوسرے مقامات کے انہوں نے اس مقام پر بھی یہ کوشش کی ہے کہ کسی طرح "غرق فرعون" کا یہ واقعہ روحانی معجزہ سے نکل کر مادی اسباب و علل کے تحت میں آ جائے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے لیے سرگرم عمل ہستی سید احمد خان (سرسید) (مرحوم) بھی علوم عربیہ اور علوم دینیہ سے ناواقفیت کے باوجود مسطورہ بالا عقیدہ کی ترویج میں پیش پیش ہیں، غالباً اس طرح وہ یورپ کی موجودہ زندگی کے ساتھ اسلام کو مطابق کرنا چاہتے تھے مگر مادیت کا یہ چولا چونکہ اس کے قد پر راست نہ آیا اس لیے انہوں نے چولے کی ترمیم کے بجائے اسلام کے نقشہ اور قد و قامت میں ترمیم شروع کر دی مگر اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

بے شبہ اسلام ایک ایسا روحانی مذہب ہے جو روحانیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ دنیوی زندگی میں بھی انسان کے عروج اور فلاح و بہبود کا کفیل ہے اور اس لیے ہر زمانے کے علوم و فنون کی ترقی اس کی آغوش میں پلتی اور اس میں جذب ہوتی رہی ہے اور علم و حکمت ہمیشہ اس کے سایہ عاطفت میں نشوونما پاتے رہے لیکن "مادی علوم" کی حدود مادیات و مشاہدات اور محسوسات سے آگے کسی حال میں متجاوز نہیں ہو سکتیں اور آج کی سائنس اور کل کا فلسفہ دونوں اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ہماری حدود محسوسات سے پرے نہیں ہیں، یعنی محسوسات و مادیات کی دیوار کے پیچھے کیا ہے؟ وہ اس سے لاعلمی تو ظاہر کرتے ہیں، مگر ان کا انکار نہیں کرتے۔

اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ گذشتہ اور موجودہ زمانہ میں جب کبھی علوم "نظریوں" اور "تھیوریز" سے آگے بڑھ کر محسوس اور مشاہدہ کی حد تک پہنچے ہیں تو ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ وہ اسلام کے اصول سے ٹکراتا ہو، یا اسلام میں اس کا انکار پایا جاتا ہو تب ایسی صورت میں جب تک علمی نظریوں اور تھیوریوں میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی اور علمی تحقیقات ایک جگہ چھوڑتی اور دوسری جگہ بناتی رہتی ہیں تو اسلام کو ان کے مطابق کرنے کی سعی عبث ہے کیونکہ مشاہدہ کی حد پر پہنچنے کے بعد بے شبہ ان کا فیصلہ قرآن کے فیصلہ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

البتہ اسلام یا مذہب حق چند ایسے امور کا بھی اقرار کرتا ہے جو ان مادیات کی دنیا سے پرے کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں: مثلاً آخرت، حشر و نشر، جنت، جہنم، ملائکہ، وحی، نبوت اور معجزہ، مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان میں سے کوئی امر بھی خلاف عقل یعنی عقل کی نگاہ میں ناممکن اور محال نہیں ہے، تاہم عقل کے لیے اب کی کنہ و حقیقت کا ادراک صرف اسی قدر ہو سکتا ہے جس قدر کہ مذہب نے اپنے علم یقین (وحی الٰہی) کے ذریعے اس کو بتا دیا ہے اور ان باتوں کے سمجھنے کے لیے وحی کے سوائے عقل کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

بہر حال سید احمد خان صاحب نے تفسیر احمدی میں اس مقام کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ غرق فرعون اور نجات بنی اسرائیل کا یہ

Marfat.com

واقعہ معجزہ نہ تھا بلکہ عام دنیوی سلسلہ اسباب وعلل کے ماتحت بحر کے "مدوجزر" (جوار بھاٹا) سے تعلق رکھتا ہے، یعنی صورت حال یہ پیش آئی کہ جس وقت بنی اسرائیل نے قلزم کو عبور کیا تھا اس وقت اس کا پانی سمٹا ہوا تھا اور پیچھے کو ہٹ کر اس نے "جزر" اختیار کر رکھا تھا، فرعون نے جب بنی اسرائیل کو اس آسانی سے پار ہوتے دیکھا تو اس نے بھی اپنے لشکر کو داخل ہو جانے کا حکم دے دیا، مگر بنی اسرائیل پار ہو چکے تھے اور فرعونی لشکر ابھی دریا کی خشکی پر چل ہی رہا تھا کہ اس کے "مد" اور آگے بڑھنے کا وقت آ پہنچا اور فرعون اور اس کے لشکر کو اتنی بھی مہلت نہ ملی کہ وہ آگے بڑھ سکے یا پیچھے ہٹ سکے، اور سب غرق ہو گئے۔

سید صاحب نے اپنے اس مزعومہ خیال کے مطابق بنی اسرائیل کے عبور کے متعلق ایک نقشہ بھی دیا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنی اسرائیل نے قلزم کے شمالی دہانہ پر جا کر اس کو عبور کیا ہے۔

مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قرآن عزیز کی تصریحات اس کا قطعی انکار کرتی ہیں، اور سید صاحب کی بات کسی طرح بنائے نہیں بنتی۔ اس بات کا فیصلہ تو قطعی ناممکن ہے کہ خاص وہ مقام متعین کیا جا سکے جس سے بنی اسرائیل گذرے اور دریا کو عبور کر گئے کیونکہ اس سلسلے میں گزشتہ تاریخ کا پرانا ذخیرہ تورات ہے مگر اس کے بیان کردہ مقامات موجودہ نسل کے لیے نامعلوم اسماء کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔

البتہ قرآن اور تورات کی مشترک تصریحات ونصوص سے یہ قطعی متعین کیا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل نے "بحر قلزم" کے کسی کنارے اور دہانے سے عبور کیا یا درمیانی کسی حصہ سے؟

اس کے لیے ایک مرتبہ نقشہ میں اس حصہ پر نظر ڈالیے جہاں بحر احمر (قلزم یا ریڈ سی) Red Sea واقع ہے، دراصل یہ بحر عرب کی ایک شاخ ہے جس کے مشرق میں سرزمین عرب واقع ہے، اور مغرب میں مصر، شمال میں اس کی دو شاخیں ہو گئی ہیں، ایک شاخ (خلیج عقبہ) جزیرہ نمائے سینا کے مشرق میں اور دوسری (خلیج سویز) اس کے مغرب میں واقع ہے، یہ دوسری شاخ پہلی سے بڑی ہے اور شمال میں بڑی دور تک چلی گئی ہے بنی اسرائیل اسی کے درمیان سے گذرے ہیں۔ اس شاخ کے شمالی دہانہ کے سامنے ایک اور سمندر واقع ہے جس کا نام بحر روم (Mediterranean Sea) ہے۔

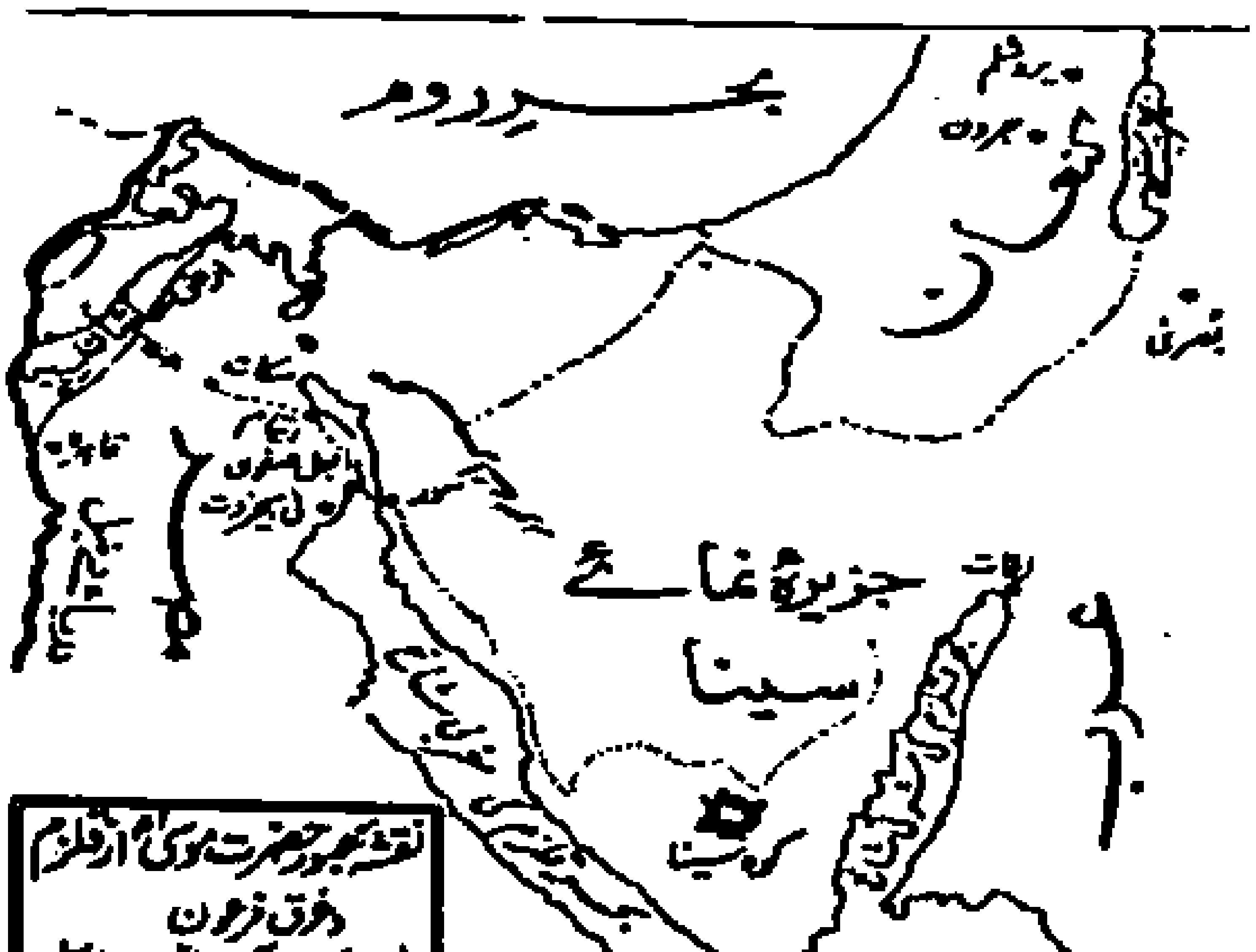

اور بحر روم اور بحر احمر کے اس شمالی دہانہ کے درمیان تھوڑا سا خشکی کا حصہ ہے، یہی وہ راستہ تھا جہاں سے مصر سے فلسطین اور کنعان جانے والے کو "بحر احمر" عبور کرنا نہیں پڑتا تھا، اور اس زمانہ میں یہ راہ قریب کی راہ سمجھی جاتی تھی اور بنی اسرائیل نے بحکم الٰہی یہ راہ اختیار نہیں کی تھی، اب اسی خشک زمین کو کھود کر بحر احمر (ریڈ سی) کو بحر روم سے ملا دیا گیا ہے اور اس ٹکڑے کا نام نہر سوئیز ہے اور "ریڈ سی" کے شمالی دہانہ پر سوئیز کے نام سے ایک شہر آباد ہے، جو مصر کی بندرگاہ شمار ہوتا ہے۔

اب اس کے بعد قرآن عزیز کی سورۂ بقرہ اور سورۂ شعراء کی ان آیات پر پھر ایک مرتبہ غور کرنا چاہیے جو اس سلسلہ کی تصریحات پیش کرتی ہیں، ان آیات میں دو باتوں کا صاف صاف تذکرہ موجود ہے، ایک "فلق یا فرق بحر" یعنی دریا کا پھٹنا یا اس کو پھاڑ دینا، اور دوسرے دونوں جانب پانی کا پہاڑ کی طرح کھڑا ہو جانا اور درمیان میں راستہ پیدا ہو جانا ﴿فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۝﴾۔

عربی لغت میں "فرق" کے معنی دو ٹکڑے کر کے جدا کر دینے کے آتے ہیں خصوصاً "بحر" کی نسبت کے ساتھ چنانچہ کتب لغت میں ہے "فرق البحر ای فلقه" سر کی مانگ کو بھی "فرق" اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ سر کے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے بیچ میں نکالی جاتی ہے، اور "فلق" کے متعلق اس طرح مذکور ہے "فلق الشی، شقه والفلق، انشق یعنی اس نے فلاں شئے کو ٹکڑے کر دیا اور وہ ٹکڑے ہو گئی" اسی لیے "فالق" اس دراڑ کو کہتے ہیں جو پتھر کے درمیان ہو جاتی ہے، اسی طرح "طود" کے معنی بڑے پہاڑ کے ہیں "الطود۔ الجبل العظیم" پس ان لغوی تصریحات کے بعد ان ہر دو آیات کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہوا کہ دریا کا پانی یقیناً دو ٹکڑے ہو گیا اور وہ دونوں جانب دو کھڑے ہوئے پہاڑ کی طرح بن گیا، اور درمیان میں راستہ پیدا ہو گیا، اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ بنی اسرائیل نے دریا کے ایسے حصہ سے عبور کیا ہو جو دہانہ اور کنارہ کے سامنے کا حصہ نہ ہو بلکہ پانی کا ایسا حصہ جو درمیان سے پھٹ کر دو حصے بن سکتا ہو، دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیجئے کہ قرآن عزیز صاف صاف اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ بنی اسرائیل خشکی کی راہ سے قلزم کے دہانہ یا کنارے سے نہیں گزرے تھے بلکہ دریا کے کسی درمیانی حصہ کو عبور کر کے میدان سینا میں پہنچے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ "مدوجزر" (جوار بھاٹا) طولانی حصہ میں دہانہ کی جانب ہوا کرتا ہے، عرض میں اس طرح کبھی بھی نہیں ہوتا کہ پانی دونوں جانب سمٹ جائے اور بیچ میں خشکی کی راہ پیدا ہو جائے، لہٰذا خدائے تعالیٰ کے اس عظیم الشان "نشان" (معجزہ) کا انکار کرتے ہوئے اس کو روزمرہ کے مادی اسباب کے نیچے لانے کی سعی کرنا قرآنی تصریحات کے بالکل خلاف اور اس کی تحریف کے مترادف ہے۔

نیز تورات نے بنی اسرائیل کے اس عبور کے واقعہ میں "بحر احمر" کے جن مشرقی اور مغربی کنارہ کے مقامات کا ذکر کیا ہے اور اس عبور کے متعلق جو تصریحات بیان کی ہیں ان سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ عبور دہانہ پر سے نہیں تھا بلکہ شمال مغرب کے درمیانی حصہ سے ہوا تھا جیسا کہ نقشہ سے واضح ہوتا ہے۔

بعض مغرب زدہ "ملحدوں" نے اس مقام پر جب کسی طرح انکار معجزہ کی بات بنتی نہ دیکھی تو تورات کے فقرہ کا سہارا لیا:

"اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا، اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے۔"

وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ خشک زمین دریا کے بیچ میں نکل آئی تھی تو بھی یہ معجزہ نہ تھا بلکہ رات بھر خشک

Marfat.com

ہوا کے چلنے سے دونوں جانب پانی بستہ برف کی طرح ہوگیا تھا اور بیچ میں خشک راستہ بن گیا تھا مگر جب فرعون کی باری آئی تو آفتاب کی تمازت نے بستہ برف کو پگھلا دیا اور پانی اصل حالت پر آ گیا اور مصری غرق ہوگئے۔

تو اس کے متعلق نجار مصری نے خوب کہا ہے کہ اگر بالفرض ان کی اس باطل تاویل کو تسلیم بھی کرلیا جائے تب بھی یہ "معجزہ" ہوا، اس لیے کہ سمندروں کے وجود سے لے کر آج تک کسی جگہ یہ ثابت نہیں ہے کہ اس طرح ہوا چل کر ان کے درمیان میں خشک راہ بنا دیتی ہو، علم تاریخ اور طبیعات دونوں اس قسم کے واقعہ سے یکسر خالی ہے۔

پس "عام مادی علل واسباب سے جدا، اگر ہوا کا یہ عمل صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی نجات اور فرعون اور اس کے لشکر کے غرق ہی کے لیے مخصوص تھا اور مخصوص رہا تو پھر یہ "معجزہ" نہیں تو اور کیا ہے؟"

بہر حال قرآن عزیز صراحت کرتا ہے کہ بحر قلزم میں غرق فرعون اور نجات موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کی تائید میں ایک عظیم الشان معجزہ تھا اور اگر کائنات کی کوئی شہادت بھی اس واقعہ کے اعجاز میں موجود نہ ہوتی تب بھی ہمارے لیے "وحی الٰہی" کا یہ فیصلہ ایک ناطق فیصلہ ہے اور مومن کا ایمان دور از کار تاویلات سے جدا اصل حقیقت ہی کے ساتھ وابستہ ہے، اور ہمارا یقین ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کے لیے یہ ایسا عظیم "معجزہ" تھا جس نے تمام مادی قہرمانیت اور سامان استبدادیت کو ایک لمحہ میں شکست دے کر مظلوم قوم کو ظالم قوم کے پنجہ سے رستگاری دلائی۔ [1] وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ.

﴿وَ اَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ (الشعراء: ۶۵-۶۸)

"اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) اور اس کے تمام ساتھیوں کو نجات دی، پھر دوسروں کو (یعنی ان کے دشمنوں کو) غرق کر دیا، بلاشبہ اس واقعہ میں (خدا کا زبردست) نشان (معجزہ) ہے اور اکثر ان کے ایمان نہیں لاتے اور اقرار نہیں کرتے اور بلاشبہ تیرا رب ہی (سب پر) غالب رحمت والا ہے۔"

فرعون، قوم فرعون اور عذاب قیامت:

فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ حق و باطل کے معرکوں میں ایک عظیم الشان معرکہ ہے، اور ایک جانب غرور و نخوت، جبر و ظلم اور قہرمانیت و انانیت کی ذلت و رسوائی ہے تو دوسری جانب مظلومیت، خدا پرستی اور صبر و استقامت

---

[1] نجار کہتے ہیں کہ غرق فرعون اور عبور بنی اسرائیل کی جگہ آج متعین و منضبط نہیں ہے کہ ٹھیک ٹھیک اس جگہ کو بتایا جا سکے، البتہ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ یہ جگہ وہ ہے جو آج "برکہ فرعون" (فرعون کے پانی میں بیٹھ جانے کی جگہ) کے نام سے مشہور ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ یہ بحر احمر کی بندرگاہ سویز سے بہت دور ہے، مثلاً اگر جہاز شام کے وقت سویز سے روانہ ہو تو آدھی رات کے بعد اس مقام پر پہنچے گا، لہٰذا یہ مقام وہ جگہ ہرگز نہیں ہے بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ اس زمانہ میں "قلزم" کی خلیج جو خلیج سویز کے نام سے مشہور ہے بحر روم کے قریب تک پھیلتی چلی گئی تھی اور اب سے بہت نزدیک تھی، لہٰذا بنی اسرائیل کے عبور کی جگہ وہ ہو سکتی ہے جو آج "عیون موسیٰ" کے نام سے مشہور ہے اور جو شمال مشرق میں واقع ہے، اس وقت میرے پاس محمد رفعت کا اطلس (اٹلس) موجود ہے، اس میں عبور بنی اسرائیل کے لئے جو خط کھینچ کر دکھلائے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ یہ عبور سویز اور بحیرہ مرہ کے درمیان ہوا ہے، اور عیون موسیٰ بھی یہیں شمال مشرق میں واقع ہے۔ (قصص الانبیاء ص ۳۴۱-۳۴۲)

کی فتح و کامرانی کا عجیب و غریب مرقع، اس لیے خدائے تعالیٰ نے فرعون اور قوم فرعون کی ہلاکت دنیوی کے بعد عبرت و بصیرت کے لیے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اس قسم کے لوگوں کے لیے آخرت اور سرمدی و ابدی زندگی میں کس قدر سخت عذاب اور خدا کی پھٹکار کے کیسے عبرتناک سامان مہیا ہیں تاکہ سلیم اور صالح طبائع اور نیک نہاد و نیک سرشت ہستیاں ان کا مطالعہ کریں اور ان اعمال زشت سے خود کو بھی بچائیں اور دوسروں کو بھی بچنے کی ترغیب دیں۔

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِہٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ﴿۹۷﴾ یَقْدُمُ قَوْمَہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَاَوْرَدَہُمُ النَّارَ ؕ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ وَ اُتْبِعُوْا فِیْ ہٰذِہٖ لَعْنَۃً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾﴾ (ھود: ۹۶۔۹۹)

"اور (یہ بھی ہو چکا ہے کہ) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیوں اور واضح سند کے ساتھ بھیجا تھا، فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف، مگر وہ فرعون کی بات پر چلے، اور فرعون کی بات راست بازی کی بات نہ تھی، قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا (جس طرح دنیا میں گمراہی کے لیے ہوا) اور انہیں دوزخ میں پہنچائے گا تو دیکھو کیا ہی پہنچنے کی بری جگہ ہے جہاں وہ پہنچ کر رہے! اور اس دنیا میں بھی لعنت ان کے پیچھے لگی (کہ ان کا ذکر کبھی پسندیدگی کے ساتھ نہیں کیا جاتا) اور قیامت میں بھی (کہ عذاب آخرت کے مستحق ہوئے) تو دیکھو کیا ہی برا صلہ ہے جو ان کے حصہ میں آیا۔"

﴿وَ جَعَلْنٰہُمْ اَئِمَّۃً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ ۚ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ لَا یُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَ اَتْبَعْنٰہُمْ فِیْ ہٰذِہِ الدُّنْیَا لَعْنَۃً ۚ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ہُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ ﴿۴۲﴾﴾ (القصص: ۴۱۔۴۲)

"اور کیا ہم نے ان کو پیشوا کہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور قیامت کے دن ان کو مدد نہ ملے گی، اور پیچھے رکھ دی ہم نے ان پر اس دنیا میں پھٹکار اور قیامت کے دن ان پر برائی ہے۔"

﴿وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْہَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا ۚ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَۃُ ۟ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾﴾ (المؤمن: ۴۵۔۴۶)

"اور الٹ پڑا فرعون والوں پر بری طرح کا عذاب، وہ آگ ہے کہ دکھلا دیتے ہیں ان کو صبح اور شام، اور جس دن قائم ہوگی قیامت، حکم ہوگا داخل کرو فرعون والوں کو سخت سے سخت عذاب میں۔"

﴿اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿۴۳﴾ طَعَامُ الْاَثِیْمِ ﴿۴۴﴾ کَالْمُہْلِ ۚ یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ ﴿۴۵﴾ کَغَلْیِ الْحَمِیْمِ ﴿۴۶﴾ خُذُوْہُ فَاعْتِلُوْہُ اِلٰی سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِہٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِیْمِ ﴿۴۸﴾ ذُقْ ۚ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ ﴿۴۹﴾ اِنَّ ہٰذَا مَا کُنْتُمْ بِہٖ تَمْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾﴾ (الدخان: ۴۳۔۵۰)

"بلاشبہ سیہنڈ کا درخت خوراک ہے گنہگار کی جیسے پگھلا ہوا تانبا کھولتا ہے پیٹوں میں، جیسے کھولتا پانی، پکڑو اس کو اور دھکیل کر

Marfat.com

لے جاؤ دوزخ میں، پھر ڈالو اس کے سر پر پانی کا عذاب، اس کو چکھ! تو ہی ہے بڑا عزت والا سردار، یہ وہی ہے جس کے متعلق تم دھوکے میں پڑے تھے۔"

عبورِ قلزم کے بعد بنی اسرائیل کا پہلا مطالبہ:

تورات میں ہے کہ جب بنی اسرائیل سلامتی کے ساتھ بحرِ قلزم کو پار کر گئے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے فرعون اور اس کی فوج کو غرق ہوتے اور پھر ان کی نعشوں کو ساحل پر تیرتے دیکھ لیا تو بتقاضائے فطرت بے حد مسرت اور خوشی کا اظہار کیا، اور عورتوں نے خصوصیت کے ساتھ دف پر خوشی کے گیت گائے اور شادمانی و خوش کامی کا ثبوت دیا، جب یہ سب کچھ ہو چکا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو جمع کر کے فرمایا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنی قوم سے کہو کہ "وہ میں ہوں جس نے تم کو اس زبردست فتنہ سے نجات دی سو میرا شکر ادا کرو اور میری ہی بندگی کرو۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اب اپنی قوم کو ساتھ لے کر بیابان شور سے ہوتے ہوئے سین یا سینا کی راہ لی، سینا کے بت کدوں میں پرستاران صنم بتوں کی پوجا میں مشغول تھے بنی اسرائیل نے یہ منظر دیکھا تو کہنے لگے: "موسیٰ! ہم کو بھی ایسے ہی معبود بنا دے تاکہ ہم بھی اسی طرح ان کی پرستش کریں۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کی زبانی یہ مشرکانہ مطالبہ سنا تو بہت زیادہ ناراض ہوئے اور بنی اسرائیل کو ڈانٹا، عار دلائی اور ملامت کی کہ بدبختو! خدائے واحد کی پرستش چھوڑ کر بتوں کی پوجا پر مائل ہوا اور خدا کی ان تمام نعمتوں کو فراموش کر بیٹھے جن کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر چکے ہو۔

قومی پستی کا مظاہرہ:

دنیا کی تاریخ میں ہمارے سامنے ایک قوم کا نقشہ حیات اس طرح نظر آتا ہے کہ وہ تقریباً ساڑھے چار سو برس سے مصر کے قاہر و جابر بادشاہوں اور مصری قوم کے ہاتھوں میں غلام اور مظلوم چلی آتی ہے اور غالب قوم کے سخت سے سخت مصائب و مظالم کا شکار بن رہی ہے کہ اچانک اسی مردہ قوم میں سے بجلی کی کڑک اور آفتاب کی چمک کی طرح ایک برگزیدہ ہستی سامنے آتی ہے اور اس کی صدائے حق اور اعلانِ ہدایت سے تمام قلمرو باطل لرزہ براندام ہو جاتی، اور ایوانِ ظلم و کفر میں بھونچال آ جاتا ہے، وہ دنیا کی ایک زبردست متمدن طاقت کے مقابلہ میں یہ اعلان کرتی ہے کہ میں خدائے واحد کا رسول اور ایلچی ہوں اور تجھ کو ہدایت کی پیروی اور مظلوم قوم کی آزادی کا پیغام سنانے آیا ہوں، فرعونی طاقت اپنے تمام مادی اسباب کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتی ہے، مگر ہر مرتبہ شکست کا منہ دیکھتی ہے اور آخری بازی میں حق کی کامیابی اور باطل کی ہلاکت کا ایسا حیرت زدہ نقشہ سامنے آتا ہے کہ مادی طاقت قلزم میں غرق ہو جاتی اور غلام و مظلوم قوم اور دنیوی اسباب و وسائل سے محروم قوم آزادی کے گیت گاتی نظر آتی ہے۔

یہ ہے وہ عجیب و غریب فطرت اور حیران کن طبیعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی قوم "بنی اسرائیل" جو ان تمام معرکہ ہائے حق و باطل کو آنکھوں سے دیکھنے اور حق کی کامیابی کے ساتھ اپنی نجات پا جانے کے شکریہ میں آج موسیٰ علیہ السلام سے پہلا مطالبہ یہ کرتی ہے کہ ہم کو بھی ایسے ہی معبود (بت) بنا دے جیسا کہ یہ پجاری بت خانہ میں بیٹھے پوج رہے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اگرچہ بنی اسرائیل نبیوں کی اولاد تھے اور ابھی تک ان میں وہ اثرات ایک حد تک باقی بھی تھے جو ان کو

Marfat.com

باپ دادا سے ورثہ میں ملے تھے، تاہم صدیوں سے مصری بت پرستوں میں بود و باند کرنے اور ان کے حاکمانہ اقتدار میں غلام رہنے کی وجہ سے ان میں صنم پرستی کا جذبہ کافی سرایت کر چکا تھا، اور وہی جذبہ تھا جو آج پجاریوں کو دیکھ کر ان میں اُبھر آیا اور وہ موسیٰ علیہ السلام سے ایسا ناپاک مطالبہ کر بیٹھے۔

﴿وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا کَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْکُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۴۰﴾﴾ (الاعراف : ۱۳۸۔۱۴۰)

"اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار کر دیا پھر ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے بتوں کے سامنے دھ لگائے بیٹھی تھی تو کہنے لگے: (موسیٰ! جیسے ان کے معبود بت) ہیں ایسے ہی ہمارے لیے بھی بنا دے" موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "افسوس تم پر بلاشبہ تم جاہل قوم ہو، لاریب ان لوگوں کا طریقہ تو ہلاکت کا طریقہ ہے اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں باطل ہے (اور یہ بھی) کہا کہ باوجود اس کے کہ تم کو خدا نے تمام کائنات پر فضیلت دی ہے، پھر بھی میں تمہارے لیے خدائے واحد کے سوا اور معبود تلاش کروں۔"

بنی اسرائیل کے دیگر مطالبات اور آیات بینات کا ظہور:

بنی اسرائیل نے بحر قلزم کو پار کر کے جس سرزمین پر قدم رکھا یہ عرب کی سرزمین تھی جو قلزم کے مشرق میں واقع ہے، یہ لق و دق بے آب و گیاہ میدان سے شروع ہوتی ہے جو تورات کی زبان میں بیابان شور، سین، وادی سینا (تیہ) کے نام سے مشہور ہے اور طور تک اس کا دامن وسیع ہے، یہاں شدید گرمی پڑتی ہے۔ دور دور تک سبزہ اور پانی کا پتہ نہیں، اس لیے بنی اسرائیل گھبرا اٹھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کرنے لگے کہ ہم پانی کہاں سے پئیں، ہم تو پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے، یہاں تو پینے کے لیے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درگاہِ الٰہی میں التجاء کی اور وحی الٰہی نے ان کو حکم دیا کہ اپنا عصاء زمین پر مارو، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تعمیل ارشاد کی تو فوراً بارہ سوت اُبل پڑے اور بنی اسرائیل کے بارہ اسباط (قبائل) کے لیے جدا جدا چشمے جاری ہو گئے، بنی اسرائیل کو جب اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو اب کہنے لگے کہ پانی کا تو انتظام ہو گیا، لیکن زندگی کے لیے صرف یہی تو کافی نہیں ہے، ہم کو بھوک لگی ہے اب کھائیں کہاں سے؟ یہاں تو کوئی صورت نظر نہیں آتی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر رب العالمین کی بارگاہ میں دعاء کی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ موسیٰ (علیہ السلام)! تمہاری دعاء قبول ہوئی پریشان نہ ہو، ہم غیب سے سب انتظام کیے دیتے ہیں، اور پھر ایسا ہوا کہ جب رات بیت گئی اور صبح ہوئی تو بنی اسرائیل نے دیکھا کہ زمین اور درختوں پر جگہ جگہ سفید اولے کے دانے کی طرح شبنم کی صورت میں آسمان سے کوئی چیز برس کر گری ہوئی ہے، کھایا تو نہایت شیریں حلوے کی مانند تھی، یہ "من" تھا اور دن میں تیز ہوا چلی اور تھوڑی دیر میں بٹیروں کے غول کے غول آ کر زمین پر اترے اور پھیل گئے، بنی اسرائیل نے بآسانی ان کو ہاتھوں سے پکڑ لیا اور بھون کر کھانے لگے، یہ "سلویٰ" تھا اس طرح روزانہ بغیر زحمت و تکلیف کے ان کو یہ دونوں نعمتیں مہیا ہو جاتیں، لیکن خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت بنی اسرائیل کو یہ تنبیہ کر دی تھی کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق "من و سلویٰ" کو کام میں لائیں

Marfat.com

اور دوسرے دن کے لئے ذخیرہ نہ کریں ہم ان کو روزانہ یہ نعمت عطا کرتے رہیں گے۔ ❶

کھانے اور پینے کی ضروریات کی فراہمی سے جب اطمینان ہو گیا تو اب بنی اسرائیل نے تیسرا مطالبہ یہ کیا کہ گرمی کی شدت اور سایہ دار درختوں اور مکانوں کی راحت میسر نہ ہونے کی وجہ سے ہم بہت پریشان ہیں، ایسا نہ ہو کہ یہ تپش اور تمازت ہماری زندگی کا خاتمہ ہی کر دے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تشفی دی اور بارگاہِ قدس میں عرض کیا کہ جب تو نے ان پر بڑے بڑے انعامات اور فضل و کرم کی بارش کی ہے تو اس سخت تکلیف سے بھی ان کو نجات عطاء فرما، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سنی گئی اور آسمان پر بادلوں کے پرے کے پرے بنی اسرائیل پر سایہ فگن ہو گئے اور بنی اسرائیل جہاں بھی سفر کرتے ہوئے جاتے بادلوں کا یہ سائبان ان کے سروں پر سایہ فگن رہتا۔

سدی کی ایک روایت میں ان ہر سہ "آیات اللہ" کا تذکرہ یکجا اس طرح مذکور ہے: "جب بنی اسرائیل "تیہ" کے میدان میں پہنچے تو کہنے لگے "موسیٰ (علیہ السلام)! اس لق و دق میدان میں ہمارا کیا حشر ہوگا، کہاں سے کھائیں گے، کہاں سے پئیں گے اور کہاں سے سایہ حاصل کریں گے تب اللہ تعالیٰ نے ان کے کھانے کے لیے "من وسلویٰ" اتارا پینے کے لیے "بارہ چشمے" جاری کر دیئے، اور سایہ کے لیے بادل سایہ فگن ہو گئے۔ ❷

﴿ وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۝ ﴾ (البقرہ: ۶۰)

"اور پھر "وہ واقعہ بھی یاد کرو، جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا تھا اور ہم نے حکم دیا تھا، اپنی لاٹھی سے پہاڑ کی چٹان پر ضرب لگاؤ، (تم دیکھو گے کہ پانی تمہارے لیے موجود ہے، موسیٰ علیہ السلام نے اس حکم کی تعمیل کی) چنانچہ بارہ چشمے پھوٹ نکلے، اور تمام لوگوں نے اپنے اپنے پانی لینے کی جگہ معلوم کر لی (اس وقت تم سے کہا گیا تھا، اس بے آب و گیاہ بیابان میں تمہارے لیے زندگی کی تمام ضرورتیں مہیا ہو گئی ہیں پس) کھاؤ پیو، خدا کی بخشائش سے فائدہ اٹھاؤ اور ایسا نہ کرو کہ ملک میں فتنہ و فساد پھیلاؤ (یعنی ضروریات معیشت کے لیے لڑائی جھگڑا کرو، یا ہر طرف لوٹ مار مچاتے پھرو)۔"

﴿ وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝ ﴾ (البقرہ: ۵۷)

"اور (پھر جب ایسا ہوا تھا کہ صحراءِ سینا کی بے آب و گیاہ سرزمین میں دھوپ کی شدت اور غذا کے نہ ملنے سے تم ہلاک ہو جانے والے تھے) تو ہم نے تمہارے سروں پر ابر کا سایہ پھیلا دیا، اور من وسلویٰ کی غذا فراہم کر دی (تم سے کہا گیا) خدا نے تمہاری غذا کے لیے جو اچھی چیزیں مہیا کر دی ہیں، انہیں بفراغت کھاؤ اور کسی طرح کی تنگی و قلت محسوس نہ کرو (لیکن اس پر بھی تم اپنی بدعملیوں سے باز نہ آئے غور کرو) تم نے اپنی ناشکریوں سے ہمارا کیا بگاڑا؟ خود اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔"

---

❶ تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۹۵۔۹۶ ❷ تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۹۷

Marfat.com

﴿وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ ۝ وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْهِمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْهِمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۵۹۔۱۶۰)

"اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک گروہ (ضرور) ایسا ہے جو لوگوں کو سچائی کی راہ چلاتا اور سچائی کے ساتھ (ان کے معاملات میں انصاف بھی کرتا ہے) اور ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ خاندانوں کے بارہ گروہوں میں منقسم کر دیا، اور جب لوگوں نے موسیٰ (علیہ السلام) سے پینے کے لیے پانی مانگا تو ہم نے وحی کی کہ اپنی لاٹھی (ایک خاص) چٹان پر مارو، چنانچہ بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنی اپنی جگہ پانی کی معلوم کر لی اور ہم نے بنی اسرائیل پر ابر کا سایہ کر دیا تھا، اور ان کی غذا کے لیے من وسلویٰ اتارا تھا ہم نے کہا تھا یہ پسندیدہ غذا کھاؤ جو ہم نے عطا کی ہے اور فتنہ وفساد میں نہ پڑو انہوں نے نافرمانی کر کے ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑا خود اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کرتے رہے۔"

﴿یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ قَدْ اَنْجَیْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَ وٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَیْمَنَ وَ نَزَّلْنَا عَلَیْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ۝ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ لَا تَطْغَوْا فِیْهِ فَیَحِلَّ عَلَیْكُمْ غَضَبِیْ ۚ وَ مَنْ یَّحْلِلْ عَلَیْهِ غَضَبِیْ فَقَدْ هَوٰى ۝ وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۸۰۔۸۲)

"اے بنی اسرائیل! میں نے تمہارے دشمن سے تمہیں نجات بخشی، تم سے (برکتوں اور کامرانیوں کا) وعدہ کیا جو کوہ طور کے داہنی جانب ظہور میں آیا تھا، تمہارے لیے (صحرائے سینا میں) من وسلویٰ مہیا کر دیا تمہیں کہا گیا یہ پاک غذا مہیا کر دی گئی ہے شوق سے کھاؤ (مگر اس بارہ میں سرکشی نہ کرو) کرو گے تو میرا غضب نازل ہو جائے گا اور جس پر میرا غضب نازل ہوا تو بس وہ (ہلاکت میں گرا) اور میں نے کہا جو کوئی توبہ کرے، ایمان لائے، نیک عمل ہو تو میں یقیناً اس کے لیے بڑا ہی بخشش والا ہوں۔"

عبدالوہاب نجار نے قصص الانبیاء میں لکھا ہے کہ پانی کے وہ چشمے جن کا ذکر بنی اسرائیل کے واقعات میں آیا ہے بحر احمر کے مشرقی بیابان میں سوئیز سے زیادہ دور نہیں ہیں اور اب بھی "عیون موسیٰ" (موسیٰ علیہ السلام کے چشمے) کے نام سے مشہور ہیں، ان چشموں کا پانی اب بہت کچھ سوکھ گیا ہے اور بعض کے تو آثار بھی قریب قریب معدوم ہو گئے ہیں اور کہیں کہیں ان چشموں پر اب کھجور کے باغات نظر آتے ہیں۔

قرآن عزیز کے ذکر کردہ واقعات سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عصاء مار کر پانی کے حاصل کرنے کا واقعہ صرف ایک ہی مرتبہ پیش نہیں آیا بلکہ "تیہ کے میدان میں" مختلف مقامات پر متعدد مرتبہ پیش آیا ہے۔

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طفیل بنی اسرائیل پر خدائے تعالیٰ کے احسانات کی مسلسل بارش ہوتی رہی اور سینکڑوں برس

Marfat.com

کی غلامی سے ان کے عزائم کی پستی، اخلاقی کمزوری اور ہمت و شجاعت کے فقدان نے ان پر جو ایک مستقل مایوسی اور نا امیدی طاری کر دی تھی ان "خدائی نشانات" نے بڑی حد تک ان کی ڈھارس بندھائے رکھی، مگر عجیب الفطرت قوم پر اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور انہوں نے اپنی "بوالعجبی" کا ایک نیا مظاہرہ پیش کر دیا ایک دن سب جمع ہو کر کہنے لگے موسیٰ (علیہ السلام)! ہم روز روز ایک غذا کھاتے رہنے سے گھبرا گئے ہیں، ہم کو اس "من وسلویٰ" کی ضرورت نہیں ہے، اپنے خدا سے دعا کر کے وہ ہمارے لیے زمین سے باقلاء، کھیرا، ککڑی، مسور، لہسن، پیاز جیسی چیزیں اُگائے تاکہ ہم خوب کھائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا، اور فرمانے لگے "تم بھی کس قدر احمق ہو کہ ایک عمدہ اور بہترین غذا کو چھوڑ کر معمولی اور گھٹیا قسم کی چیزوں کے طلبگار بنے ہو اور اس طرح خدا کی نعمتوں کی ناسپاسی اور اس کے احسانات کی ناشکری کر کے کفرانِ نعمت کرتے ہو؟ پس اگر واقعی تم کو یہ نعمتیں نہیں بھاتیں اور جن چیزوں کا تم نام لے رہے ہو ان ہی کے لیے اصرار کرتے ہو تو درگاہِ الٰہی سے ان کو نشانات کی طرح طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے جاؤ کسی بستی اور شہر میں چلے جاؤ وہاں ہر جگہ تم کو یہ چیزیں وافر مل جائیں گی۔

﴿وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَکُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ﴾ (البقرہ: ۶۱)

"اور جب تم نے کہا موسیٰ (علیہ السلام)! ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے پس اپنے پروردگار سے ہمارے لیے دعاء کر کہ وہ زمین سے ہمارے لیے باقلا، ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز جیسی چیزیں اُگائے، موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: "کیا تم بہتر اور عمدہ چیز کے بدلے گھٹیا چیز کے خواہش مند ہو، کسی شہر میں جا کر قیام کرو، بلاشبہ وہاں یہ سب کچھ مل جائے گا جس کے تم طلب گار ہو۔"

طور پر اعتکاف:

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خدا کا وعدہ تھا کہ جب بنی اسرائیل مصری حکومت کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے تو تم کو "شریعت" دی جائے گی، اب وہ وقت آ گیا کہ خدا کا وعدہ پورا ہو، اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام وحی الٰہی کے اشارہ سے طور پر پہنچے اور وہاں عبادت الٰہی کے لیے اعتکاف کیا، اس اعتکاف کی مدت ایک مہینہ تھی مگر بعد میں دس دن اور بڑھا کر چلہ پورا کر دیا۔

دیلمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک ماہ کا اعتکاف ختم ہو گیا تو انہوں نے خدائے تعالیٰ سے ہم کلامی کی تیاری شروع کی، چونکہ مسلسل ایک ماہ روزہ ہی میں بسر کیے تھے اس لیے منہ میں بو محسوس کرتے تھے، لہٰذا انہوں نے یہ پسند نہیں کیا کہ رب العالمین سے اس حالت میں ہم کلام ہوں اور انہوں نے ایک خوشبودار بوٹی کو چبایا اور کھا لیا، فوراً وحی الٰہی نے ٹوکا موسیٰ! تم نے ہمکلامی سے پہلے روزہ کیوں افطار کر لیا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی وجہ بیان کر دی، تب حکم ہوا کہ موسیٰ (علیہ السلام) اس مدت کو دس دن بڑھا کر چالیس دن کر دو، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارے یہاں

Marfat.com

ایک روزہ دار کے منہ کی بو بھی مشک کی خوشبو سے زیادہ محبوب ہے، اور اس طرح پر "چلہ" پورا ہوا۔ ❶

مگر قرآن کریم نے صرف اسی قدر ذکر کیا ہے کہ یہ مدت اوّل تیس دن تھی اور پھر بڑھا کر چالیس دن کردی گئی، وجہ بیان نہیں کی۔ ❷

﴿وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً﴾ (الاعراف: ۱۴۲)

"اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا پھر دس راتیں بڑھا کر اسے پورا (چلہ) کردیا، اس طرح پروردگار کے حضور آنے کی مقررہ میعاد چالیس راتوں کی پوری میعاد ہوگئی۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور پر چلہ کشی کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین بنا گئے کہ وہ بنی اسرائیل کو راہ حق پر قائم رکھیں اور ہر معاملہ میں ان کی نگرانی کریں۔

﴿وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۴۲)

"اور موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے بھائی ہارون (علیہ السلام) سے کہا! تو میرے پیچھے میری قوم میں میرا نائب رہنا اور ان کی اصلاح کا خیال رکھنا اور مفسدوں کی راہ پر نہ چلنا۔"

تجلی ذات؟:

جب "چلہ" پورا ہوگیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ہم کلامی کا شرف بخشا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غایت کیف و انبساط میں عرض کیا: "خدایا! جب تو نے مجھ کو لذت وکیف سماع سے نوازا ہے تو پھر لذت مشاہدہ و دیدار سے کیوں محروم رہوں؟ اس سے بھی سرفراز فرما وہاں سے جواب ملا موسیٰ (علیہ السلام)! تم مشاہدۂ ذات کی تاب نہ لاسکو گے، اچھا دیکھو ہم اپنی ذات کی تجلی کا ظہور اس پہاڑ پر کریں گے، اگر یہ اس تجلی کو برداشت کرلے تو پھر تم یہ سوال کرنا اس کے بعد طور پر حضرت حق کی تجلی نے ظہور کیا تو پہاڑ کا وہ حصہ ریزہ ریزہ ہوگیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس نظارہ کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہوگئے اور گر پڑے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہوش آیا تو انہوں نے خدائے برتر کی حمد وثناء کی اور اپنے سوال سے رجوع کیا اور کہا کہ میں اقرار کرتا ہوں اور ایمان لاتا ہوں کہ تیرے جمال کی تجلی و عرفان اور نمود حق میں کوئی کمی نہیں، نقصان صرف میری اپنی ہستی کے کم وبیچارگی کا ہے۔

﴿وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۴۳)

---

❶ روح المعانی جلد ۹ ص ۳۸۔ لیکن دیلمی، محققین اسماء الرجال کی نظر میں قابل اعتماد نہیں ہے۔ (مؤلف)

❷ روحانی ریاضیات کے لئے صوفیائے کرام کی "چلہ کشی" غالباً اسی واقعہ سے اخذ کی گئی ہے تجربہ بتاتا ہے کہ کسی کام پر استقامت حاصل کرنے کے لئے عموماً یہ مدت مفید ثابت ہوتی ہے۔

Marfat.com

"اور جب موسیٰ (علیہ السلام) آئے تا کہ ہمارے مقررہ وقت میں حاضری دے اور اس کے پروردگار نے اس سے کلام کیا تو پکار اٹھا" پروردگار! مجھے اپنا جمال دکھا کہ تیری طرف نظر کر سکوں" حکم ہوا تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا، مگر ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھ! اگر یہ (تجلی حق کی تاب لے آیا اور) اپنی جگہ ٹکا رہا تو تو بھی مجھے دیکھ سکے گا پھر جب اس کے پروردگار نے تجلی کی تو اس تجلی نے پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ (علیہ السلام) غش کھا کر گر پڑا جب موسیٰ ہوش میں آیا تو بولا" خدایا! تیرے لیے ہر طرح کی تقدیس ہو، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلے یقین کرنے والوں میں ہوں"۔

نزول تورات:

اس راز و نیاز کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی گئی، اور حضرت حق نے ان کو حکم کیا کہ اس پر مضبوطی سے قائم رہو اور اپنی قوم سے کہنا کہ وہ بھی ان احکام پر اس طرح عمل کریں کہ جو عمل نیک جس قدر زیادہ قرب الٰہی کا سبب بنے اس کو دوسرے اعمال پر ترجیح دیں، میں نے اس کتاب میں تمہارے دینی و دنیوی فلاح کی تمام تفصیلات بیان کر دی ہیں، اور حلال و حرام، اور محاسن معائب غرض تمام اوامر و نواہی کو کھول کر بیان کر دیا ہے اور یہی میری شریعت ہے۔

﴿ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّـكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ ﴾ (الاعراف: ۱۴۴۔۱۴۵)

"(اللہ تعالیٰ نے) کہا اے موسیٰ (علیہ السلام)! بیشک میں نے لوگوں پر تجھ کو اپنی پیغمبری اور ہمکلامی سے برتری دی ہے اور چن لیا ہے، پس جو میں نے تجھ کو (تورات کو) دیا ہے اس کو لے اور شکر گزار بن اور ہم نے اس کے لیے (تورات کی) تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور (احکام میں سے) ہر شے کی تفصیل لکھ دی ہے، پس اس کو قوت کے ساتھ پکڑ اور اپنی قوم کو حکم کر کہ وہ ان میں سے اچھی کو اختیار کریں، عنقریب میں تم کو نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا۔"

اس مقام پر دو باتیں قابل توجہ ہیں:

① علماء اسلام کہتے ہیں کہ طور کے اس واقعہ میں جن احکام کا نزول ہوا وہ تورات ہے اور علماء نصاریٰ کی موجودہ جماعت کہتی ہے کہ اس سے مراد وہ دس احکام ہیں جو مذہب موسوی میں "شریعت یا احکام عہد" کے نام سے موسوم ہیں، یعنی خدا کے سوا کسی کو پوجو، زنا نہ کرو، چوری نہ کرو وغیرہ۔ ✿ اور بعض معاصر مفسرین نے بھی اس آیت کا مصداق "احکام عہد" ہی کو ٹھہرایا ہے لیکن دوسرا قول قرآن عزیز اور تورات دونوں کی شہادت سے غلط ہے، اور قول اول ہی صحیح اور درست ہے، اس لیے کہ قرآن عزیز نے سورۂ بقرہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چلہ کا ذکر کرتے ہوئے جب نزول احکام کا تذکرہ کیا ہے تو اس کو کتاب اور فرقان کہا ہے اور یہ دونوں صفات قرآن عزیز میں تورات کے لیے بولی گئی ہیں نہ کہ "احکام عہد" کے لیے۔

✿ خروج باب ۳۴ آیت ۲۸

Marfat.com

﴿وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَ اِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝﴾

(البقرہ: ۵۱-۵۳)

"اور جب عہد کیا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے چالیس راتوں کا پھر بنالیا تم نے اس کے پیچھے گوسالہ، اور تم اس بارہ میں ظالم تھے، پھر ہم نے اس کے بعد تم کو معاف کر دیا تا کہ تم شکر گزار بنو اور جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب اور حق و باطل میں فرق کرنے والی (فرقان) چیز عطاء کی تا کہ تم راہ پاؤ۔"

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ۝﴾ (القصص: ۴۳)

"اور بیشک ہم نے پہلی قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی جو لوگوں کے لیے بصیرتیں مہیا کرنے والی اور ہدایت اور رحمت ہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔"

اور اگرچہ تورات (موجودہ بائیبل) کے سفر خروج، استثناء اور کتاب یسوع میں موسیٰ علیہ السلام کے "چلہ" کے بعد احکام عہد یا "شریعت" کا لفظ پایا جاتا ہے لیکن مولانا رحمت اللہ کیرانوی نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب اظہار الحق میں فارسی، عربی اور اُردو قدیم تراجم کے حوالہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ تورات کے ان نسخوں میں ان ہر دو الفاظ کی جگہ "تورات" لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحق رحمہ اللہ نے بھی تفسیر حقانی میں اُردو و فارسی بائبل مطبوعہ ۱۸۴۵ء و ۱۸۳۹ء سے حسب ذیل حوالے نقل کیے ہیں۔

(۱) و بر آں سنگہا تمامی کلمات ایں تورات را بخط روشن بنویس۔ (استثناء باب ۲۷ آیت ۲۸)

(۲) بنی اسرائیل نے بموجب حکم موسیٰ علیہ السلام کے ایک مذبح بنایا اور اس کے پتھروں پر توریت کو لکھ دیا۔ (یسوع۔ باب ۸ آیت ۱۵-۱۸۴۵ء)

ان حوالوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جو الواح چلہ کے بعد دی گئیں وہ تورات تھیں "احکام عہد" کی الواح نہیں تھیں، اور انگریزی نسخہ کے ترجمہ لا (Law) اور عربی و اُردو نسخوں میں "شریعت" کو بھی صحیح مان لیا جائے تو یہ لفظ بھی اپنے معنی کی وسعت میں تورات پر صادق آتا ہے، اور تورات، شریعت اور قانون سب کا مصداق ایک ہی چیز ہے اور قدیم عیسائی دنیا میں یہی معنی سمجھے جاتے رہے ہیں۔ اور "احکام عہد" اسی کا ایک جز ہیں، اور اس کو مستقل قرار دینا بہت بعد کی پیداوار ہے۔

④ مسطورہ بالا آیات میں مذکور ہے:

﴿سَاُورِیْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِیْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۴۵)

"عنقریب میں تم کو نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا۔"

تو اس "دار" سے مراد کون سا مقام ہے؟ کہنے والوں نے قیاس اور تخمین سے مختلف جوابات دیئے ہیں: (۱) اس "دار" سے عاد و ثمود کے

Marfat.com

کھنڈر مراد ہیں (ب) مصر مراد ہے کہ بنی اسرائیل دوبارہ اس میں داخل ہوں گے۔ (ج) قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس سے شام کی مقدس سرزمین مراد ہے جہاں اس زمانہ عمالقہ کے جابر بادشاہوں کی حکومت تھی اور جہاں بنی اسرائیل کو داخل ہونا تھا۔ نجار [1] نے اسی کو ترجیح دی ہے اور میرے نزدیک یہی صحیح ہے، رہا یہ امر کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے بوڑھے ان بستیوں میں داخل نہیں ہو سکے۔ اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتقال ارض مقدس میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہو گیا تھا اور اسی طرح بنی اسرائیل کے بوڑھوں پر بھی آنے والی تفصیل کے مطابق اس کا داخلہ حرام کر دیا گیا تھا، تو آیت کی یا تو یہ مراد ہے کہ بنی اسرائیل کے نوجوانوں کا داخلہ جن کی اکثریت تھی سب کا داخلہ ہے اور اس طرح کا استعمال شائع ذائع ہے اور یا یہ مراد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوشع بن نون اور کالب بن یوفنہ اور چند بنی اسرائیل کے بہادروں کو ارض مقدس میں اس لیے بھیجا تھا کہ وہ وہاں کے مفصل حالات معلوم کر کے آئیں کہ ہم کس طرح دشمن کو شکست دے کر پاک سرزمین میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اور انہوں نے آ کر تمام حالات بنی اسرائیل اور موسیٰ علیہ السلام کے سامنے بیان کیے تھے تو گویا ان معدودے چند افراد کا ارض مقدس میں داخل ہو کر اس کو دیکھ آنا اور پھر سب کو وہاں کے حالات سے آگاہ کرنا، آیت میں اسی معاملہ کی جانب اشارہ ہے قتادہ کے قول کے مقابلہ میں پہلا قول اس لیے مرجوح ہے کہ اس واقعہ کے بعد بنی اسرائیل کبھی قومی اور جماعتی حیثیت سے مصر میں داخل نہیں ہوئے اور دوسرا قول اس لیے قابل اعتبار نہیں ہے کہ اگرچہ ثمود کے آثار وادی سینا کے قریب ضرور تھے مگر عاد کے آثار و کھنڈرات تو عرب کے مغربی حصہ میں واقع تھے جو وادی سینا سے مہینوں کی راہ تھی تو ایسی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بنی اسرائیل کو صرف ان محو شدہ آثار و کھنڈرات کو دکھانے کے لیے بھیجا جاتا اور اس کے لیے خدا کا وعدہ اس شان کے ساتھ بیان ہوتا؟ مگر ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے جہنم مراد ہے اور کافروں کی تہدید کے لیے کہا گیا ہے۔ [2]

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی گئی اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا کہ "ہمارا قانون" یہ ہے کہ جب کوئی قوم ہدایت پہنچنے اور اس کی صداقت پر دلائل اور روشن حجت آ جانے کے باوجود بھی سمجھ سے کام نہیں لیتی اور گمراہی اور باپ دادا کی بری ریت رسم ہی پر قائم رہتی اور اس پر اصرار کرتی ہے تو پھر ہم بھی اس کو اس گمراہی میں چھوڑ دیتے ہیں اور ہمارے پیغام حق میں ان کے لیے کوئی حصہ باقی نہیں رہتا اس لیے کہ انہوں نے قبول حق کی استعداد اپنی متمردانہ سرکشی کی بدولت زائل کر دی، قرآن عزیز نے اسی حقیقت کو اس انداز میں بیان کیا ہے:

﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ لِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۴۶۔۱۴۷)

"جو لوگ ناحق خدا کی زمین میں سرکشی کرتے ہیں، ہم اپنی نشانیوں سے ان کی نگاہیں پھرا دیں گے، وہ دنیا بھر کی نشانیاں

[1] روح المعانی ج ۵ ص ۵۳ [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ سورۂ اعراف

دیکھ لیں، پھر بھی ایمان نہ لائیں، اگر وہ دیکھیں ہدایت کی سیدھی راہ سامنے ہے تو کبھی اس پر نہ چلیں، اگر دیکھیں گمراہی کی ٹیڑھی راہ سامنے ہے تو فوراً چل پڑیں، ان کی ایسی حالت اس لیے ہو جاتی ہے کہ ہماری نشانیاں جھٹلاتے ہیں اور ان کی طرف سے غافل رہتے ہیں اور جن لوگوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائیں اور آخرت کے پیش آنے سے منکر ہوئے تو ان کے سارے کام اکارت ہو گئے، وہ جو کچھ بدلہ پائیں گے وہ اس کے سواء کچھ نہ ہوگا کہ ان ہی کے کرتوتوں کا پھل ہوگا جو دنیا میں کرتے رہے۔"

گئوسالہ پرستی کا واقعہ:

اسی اثناء میں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا جس کو حیرت زا بھی کہہ سکتے ہیں اور افسوسناک بھی، اور جس سے بنی اسرائیل کی ذہنیت اور اخلاقی پستی بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے یعنی جبل طور یا حورب کے پہاڑ پر تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پروردگار عالم سے راز و نیاز میں مصروف، اور بنی اسرائیل کے لیے آئین الٰہی (تورات) حاصل کرنے میں مشغول تھے، اور نیچے وادی سینا میں بنی اسرائیل نے سامری کی قیادت، میں خود ہی اپنا معبود (گئوسالہ) منتخب کر کے اس کی سمادھ لگالی اور پرستش شروع کر دی۔

جمہور مفسرین کی تفسیر کے مطابق واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور پر تورات لینے کے لیے تشریف لے جانے لگے تو بنی اسرائیل سے یہ فرمایا کہ میرے اعتکاف کی مدت ایک ماہ ہے، مدت پوری ہونے پر فوراً تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ ہارون علیہ السلام تمہارے پاس موجود ہیں یہ تمہارے احوال کے نگران رہیں گے، مگر طور پر جا کر وہ مدت تیس کی بجائے چالیس دن ہو گئی، اس تاخیر سے ایک شخص (سامری) نے فائدہ اٹھایا اس نے جب یہ دیکھا کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاخیر سے مضطرب ہو رہے ہیں تو اس نے کہا اگر تم اپنے وہ تمام زیورات میرے پاس لے آؤ جو تم نے مصریوں سے مستعار لیے تھے اور پھر واپس نہ کر سکے تو میں تمہارے فائدہ کی ایک بات کر دوں۔

سامری گو ظاہر میں مسلمان تھا مگر اس کے دل میں کفر و شرک کی نجاست بھری ہوئی تھی، پس جب بنی اسرائیل نے تمام زیورات لا کر اس کے حوالے کر دیے تو اس نے ان کو بھٹی میں ڈال کر گلا دیا اور اس سے گئوسالہ (بچھڑا) کا جسم تیار کیا اور پھر اپنے پاس سے ایک مشت خاک اس کے اندر ڈال دی، اس ترکیب سے گئوسالہ میں آثار حیات پیدا ہو گئے اور وہ بچھڑے کی آواز "بھائیں بھائیں" بولنے لگا۔ اب سامری نے بنی اسرائیل سے کہا کہ موسیٰ (علیہ السلام) سے غلطی اور بھول ہو گئی کہ وہ خدا کی تلاش میں طور پر گیا، تمہارا معبود تو یہ موجود ہے۔

صفحات گذشتہ میں یہ اچھی طرح واضح ہو چکا ہے کہ صدیوں تک مصر کی غلامی نے بنی اسرائیل میں مشرکانہ رسوم وعقائد کو پھیلا دیا تھا اور وہ اس رنگ میں کافی حد تک رنگے جا چکے تھے، اور گئوسالہ پرستی مصر کا قدیم عقیدہ تھا، اور ان کے مذہب میں اس کو بہت اہمیت حاصل تھی، اسی لیے ان کے ایک بڑے دیوتا (حورس) کا منہ گائے کی شکل کا تھا، اور وہ عقیدہ رکھتے تھے کہ کرۂ زمین گائے کے سر پر قائم ہے۔ [1]

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ تمام بت پرست اقوام میں گائے کی تقدیس اور گوسالہ پرستی مشترک عقیدہ کی حیثیت رکھتی ہے، اسی لئے ہندوستان، عراق، ایران، چین اور جاپان کے بت پرستوں میں اس کی اہمیت یکساں نظر آتی ہے۔

Marfat.com

سامری نے جب بنی اسرائیل کو ترغیب دی کہ وہ اس کے بنائے ہوئے گئو سالہ کو اپنا معبود سمجھیں اور اس کی پوجا کریں تو انہوں نے بآسانی اس کو قبول کر لیا۔

حضرت ہارون علیہ السلام نے یہ دیکھا تو بنی اسرائیل کو سمجھایا کہ ایسا نہ کرو یہ تو گمراہی کا راستہ ہے۔ مگر انہوں نے ہارون علیہ السلام کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہنے لگے کہ جب تک موسیٰ علیہ السلام نہ آ جائیں ہم اس سے باز آنے والے نہیں۔

یہاں جب یہ نوبت پہنچی تو اللہ تعالیٰ کی مصلحت کا تقاضا ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس واقعہ سے مطلع کر دے اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا موسیٰ علیہ السلام تم نے قوم کو چھوڑ کر یہاں آنے میں اس قدر جلدی کیوں کی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: "خدایا! اس لیے کہ تیرے پاس جلد حاضر ہو کر قوم کے لیے ہدایت حاصل کروں" اللہ تعالیٰ نے اس وقت ان کو بتایا کہ جس کی ہدایت کے لیے تم اس قدر مضطرب ہو وہ اس گمراہی میں مبتلا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سنا تو ان کو سخت رنج ہوا اور غصہ و ندامت کے ساتھ قوم کی طرف واپس ہوئے اور قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا یہ تم نے کیا کیا؟ مجھ سے ایسی کونسی تاخیر ہو گئی تھی جو تم نے یہ آفت برپا کی؟ یہ فرماتے جاتے تھے اور غیظ و غضب میں کانپ رہے تھے حتیٰ کہ ہاتھ سے تورات کی الواح بھی گر گئیں۔

بنی اسرائیل نے کہا کہ ہمارا کوئی قصور نہیں، مصریوں کے زیورات کا جو بوجھ ہم ساتھ لیے پھر رہے تھے وہ سامری نے ہم سے مانگ کر یہ سوانگ بنا لیا اور ہم کو گمراہ کر دیا۔

"شرک" منصب نبوت کے لیے ایک ناقابل برداشت شئے ہے اس لیے اور نیز اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت گرم مزاج تھے، انہوں نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کی گردن پکڑ لی، اور ڈاڑھی کی جانب ہاتھ بڑھایا تو حضرت ہارون علیہ السلام نے فرمایا "برادر! میری مطلق خطا نہیں ہے؟ میں نے ان کو ہر چند سمجھایا مگر انہوں نے کسی طرح نہیں مانا اور کہنے لگے کہ جب تک موسیٰ علیہ السلام نہ آ جائے ہم تیری بات سننے والے نہیں بلکہ انہوں نے مجھ کو کمزور پا کر میرے قتل کا ارادہ کر لیا تھا، جب میں نے یہ حالت دیکھی تو خیال کیا کہ اب اگر ان سے لڑائی کی جائے اور مؤمنین کاملین اور ان کے درمیان جنگ برپا ہو تو کہیں مجھ پر یہ الزام نہ لگایا جائے کہ میرے پیچھے قوم میں تفرقہ ڈال دیا، اس لیے میں خاموشی کے ساتھ تیرا منتظر رہا۔ پیارے بھائی! تو میرے سر کے بال نہ نوچ اور نہ ڈاڑھی پر ہاتھ چلا اور اس طرح دوسروں کو ہنسنے کا موقعہ نہ دے۔

ہارون علیہ السلام کی یہ معقول دلیل سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ ان کی جانب سے فرو ہو گیا اور اب سامری کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا: سامری! تو نے یہ کیا سوانگ بنایا ہے؟ سامری نے جواب دیا کہ میں نے ایسی بات دیکھی جو ان اسرائیلیوں میں سے کسی نے نہیں دیکھی تھی یعنی غرق فرعون کے وقت جبرئیل علیہ السلام گھوڑے پر سوار اسرائیلیوں اور فرعونیوں کے درمیان حائل تھے، میں نے دیکھا کہ ان کے گھوڑے کے سم کی خاک میں اثر حیات پیدا ہو جاتا ہے، اور خشک زمین پر سبزہ اُگ آتا ہے تو میں نے جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدموں کی خاک سے ایک مٹھی بھر لی اور اس خاک کو اس بچھڑے میں ڈال دیا اور اس میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے اور یہ "بھاں بھاں" کرنے لگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اچھا اب تیرے لئے دنیا میں یہ سزا تجویز کی گئی ہے کہ تو پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرے اور جب کوئی انسان تیرے قریب آئے تو اس سے بھاگتے ہوئے یہ کہے کہ دیکھنا مجھ کو ہاتھ نہ لگانا، یہ تو دنیوی عذاب ہے اور قیامت میں

Marfat.com

ایسے نافرمانوں اور گمراہوں کے لئے جو عذاب مقرر ہے وہ تیرے لئے وعدۂ الٰہی کی صورت میں پورا ہونے والا ہے۔

اے سامری! یہ بھی دیکھ کہ تو نے جس گؤ سالہ کو معبود بنایا تھا اور اس کی سمادھ لگا کر بیٹھا تھا ہم ابھی اس کو آگ میں ڈال کر خاک کیے دیتے ہیں اور اس خاک کو دریا میں پھینکے دیتے ہیں کہ تجھ کو اور تیرے ان بے وقوف مقتدیوں کو معلوم ہو جائے کہ تمہارے معبود کی قدر و قیمت اور طاقت و قوت کا یہ حال ہے کہ وہ دوسروں پر عنایت و کرم تو کیا کرتا، خود اپنی ذات کو ہلاکت و تباہی سے نہ بچا سکا۔ بدبختو! یہ معمولی بات بھی نہ سمجھ سکے کہ تمہارا معبود صرف وہی ایک خدا ہے جس کا نہ کوئی ساجھی ہے نہ شریک اور وہ ہر شئے کا عالم و دانا ہے۔

﴿وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَیِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا ۗ وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝﴾

(البقرہ: ۹۲۔۹۳)

"اور پھر دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) سچائی کی روشن دلیلوں کے ساتھ تمہارے پاس آیا، لیکن جب چالیس دن کے لئے تم سے الگ ہو گیا تو تم بچھڑے کے پیچھے پڑ گئے اور ایسا کرتے ہوئے یقیناً تم (شیوۂ ایمان میں ثابت قدم نہ تھے) ایمان سے منحرف ہو گئے تھے، اور پھر جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے (دین الٰہی پر قائم رہنے کا) تم سے عہد لیا تھا، اور کوہ طور کی چوٹیاں تم پر بلند کر دی تھیں (تو تم نے اس کے بعد کیا کیا؟ تمہیں حکم دیا گیا کہ) جو کتاب تمہیں دی گئی ہے، اس پر مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ اور اس کے حکموں پر کاربند رہو، تم نے (زبان سے) کہا، سنا اور دل سے کہا نہیں مانتے، اور پھر ایسا ہوا کہ تمہارے کفر کی وجہ سے تمہارے دلوں میں گؤ سالہ پرستی رچ گئی، اے پیغمبر! ان سے کہو (دعوت حق سے بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے) تم اپنے جس ایمان کا دعویٰ کرتے ہو، اگر وہ یہی ایمان ہے تو افسوس اس ایمان پر! کیا ہی بری راہ ہے جس پر تمہارا ایمان تمہیں لے جا رہا ہے۔"

﴿وَ اتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِیِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ یَرَوْا اَنَّهٗ لَا یُكَلِّمُهُمْ وَ لَا یَهْدِیْهِمْ سَبِیْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَ كَانُوْا ظٰلِمِیْنَ ۝ وَ لَمَّا سُقِطَ فِیْۤ اَیْدِیْهِمْ وَ رَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ یَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَ یَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ وَ لَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْۢ بَعْدِیْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗۤ اِلَیْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَ كَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ ۖؗ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ وَ لَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ لِاَخِیْ وَ اَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ ۖؗ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ ذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ

Marfat.com

الدُّنْيَا ۖ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ۡ اِنَّ رَبَّكَ
مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵۳﴾ وَ لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۚۖ وَ فِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّ
رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ (الاعراف : ۱۴۸۔۱۵۴)

"پھر ایسا ہوا کہ موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم نے اس کے (پہاڑ پر) چلے جانے کے بعد اپنے زیور کی چیزوں سے (یعنی زیور کی چیزیں گلا کر) ایک بچھڑے کا دھڑ بنایا جس سے گائے کی سی آواز نکلتی تھی اور اسے (پرستش کے لئے) اختیار کر لیا (افسوس ان کی عقلوں پر) کیا انہوں نے اتنی موٹی سی بات بھی نہ سمجھی کہ نہ تو وہ ان سے بات کرتا ہے، نہ کسی طرح کی رہنمائی کر سکتا ہے؟ وہ اسے لے بیٹھے اور وہ (اپنے اوپر) ظلم کرنے والے تھے، پھر جب ایسا ہوا کہ (افسوس وندامت سے) ہاتھ ملنے لگے، اور انہوں نے دیکھ لیا کہ (راہ حق سے) قطعاً بھٹک گئے ہیں تو کہنے لگے" اگر ہمارے پروردگار نے ہم پر رحم نہیں کیا اور نہ بخشا تو ہمارے لئے تباہی کے سواء کچھ نہیں ہے" اور جب موسیٰ (علیہ السلام) خشمناک اور افسوس کرتا ہوا اپنی قوم میں لوٹا تو اس نے کہا" افسوس تم پر! کس برے طریقہ پر تم نے میرے پیچھے میری جانشینی کی تم اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں ذرا بھی صبر نہ کر سکے" اس نے (جوش میں آ کر) تختیاں پھینک دیں اور ہارون (علیہ السلام) کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا؛ ہارون (علیہ السلام) نے کہا" اے میرے ماں جائے بھائی! (میں کیا کروں) لوگوں نے مجھے بے حقیقت سمجھا، اور قریب تھا کہ قتل کر ڈالیں، پس میرے ساتھ ایسا نہ کر کہ دشمن ہنسیں، اور نہ مجھے (ان) ظالموں کے ساتھ شمار کر، موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا " پروردگار! میرا قصور بخش دے (کہ جوش میں آ گیا) اور میرے بھائی کا بھی (کہ گمراہوں کو سختی کے ساتھ نہ روک سکا) اور ہمیں اپنی رحمت کے سایہ میں داخل کر! تجھ سے بڑھ کر کون ہے جو رحم کرنے والا ہو۔ خدا نے فرمایا" جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی، ان کے حصے میں ان کے پروردگار کا غضب آئے گا، اور دنیا کی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی پائیں گے، ہم افتراء پردازوں کو (ان کی بد عملی کا) اسی طرح بدلہ دیتے ہیں، ہاں! جن لوگوں نے برائیوں کے ارتکاب کے بعد (متنبہ ہو کر) توبہ کر لی، اور ایمان لے آئے تو بلاشبہ تمہارا پروردگار توبہ کے بعد بخش دینے والا، رحمت والا ہے۔ اور جب موسیٰ (علیہ السلام) کی خشمناکی فرو ہوئی، تو اس نے تختیاں اٹھالیں، ان کی کتابت میں (یعنی ان حکموں میں جو ان پر لکھے ہوئے تھے) ان لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے جو اپنے پروردگار کا ڈر رکھتے ہیں۔"

﴿ وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۳﴾ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۴﴾
قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ
اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ
عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ
اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿۸۷﴾ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ

Marfat.com

خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى ۬ فَنَسِیَ ۸۸ اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا ۬ وَّ لَا یَمْلِكُ لَهُمْ
ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ۸۹ وَ لَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ
فَاتَّبِعُوْنِیْ وَ اَطِیْعُوْۤا اَمْرِیْ ۹۰ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْهِ عٰكِفِیْنَ حَتّٰى یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوْسٰى ۹۱ قَالَ یٰهٰرُوْنُ
مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَیْتَهُمْ ضَلُّوْۤا ۹۲ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ ۹۳ قَالَ یَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ وَ لَا
بِرَاْسِیْ ۚ اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ لَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ ۹۴ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ
یٰسَامِرِیُّ ۹۵ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ یَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ
سَوَّلَتْ لِیْ نَفْسِیْ ۹۶ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِی الْحَیٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَ اِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ
تُخْلَفَهٗ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِیْ ظَلْتَ عَلَیْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا ۹۷ اِنَّمَاۤ
اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ۹۸ (طٰہٰ: ۸۳-۹۸)

"اور (جب موسیٰ علیہ السلام طور پر حاضر ہوا تو ہم نے پوچھا) "اے موسیٰ! کس بات نے تجھے جلدی پر اُبھارا اور تو قوم کو پیچھے چھوڑ کر چلا آیا" موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا: "وہ مجھ سے دور نہیں، میرے نقش قدم پر ہیں، اور اے پروردگار! میں نے تیرے حضور آنے میں جلدی کی کہ تو خوش ہو" فرمایا، مگر ہم نے تیرے پیچھے تیری قوم کی (استقامت کی) آزمائش کی اور سامری نے اسے گمراہ کر دیا، پس موسیٰ (علیہ السلام) خشمناک اور افسوس کرتا ہوا قوم کی طرف لوٹا، اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! (یہ تم نے کیا کیا؟) کیا تم سے تمہارے پروردگار نے ایک بڑی بھلائی کا وعدہ نہیں کیا تھا؟ پھر کیا ایسا ہوا کہ تم پر بڑی مدت گزر گئی (اور تم اسے یاد نہ رکھ سکے؟) یا یہ بات ہے کہ تم نے چاہا، تمہارے پروردگار کا غضب تم پر نازل ہو، اس لئے تم نے مجھ سے ٹھہرائی ہوئی بات توڑ ڈالی؟" انہوں نے کہا: "ہم نے خود اپنی خواہش سے عہد شکنی نہیں کی، بلکہ (ایک دوسرا ہی معاملہ پیش آیا، مصری) قوم کی زیب و زینت کی چیزوں کا ہم پر بوجھ پڑا تھا (یعنی بھاری بھاری زیوروں کا جو مصر میں پہنے جاتے تھے ہم اس بوجھ کے رکھنے کے خواہش مند نہ تھے) وہ ہم نے پھینک دیا" (بس ہمارا اتنا ہی قصور ہے) چنانچہ اس طرح (جب سونا فراہم ہو گیا تو) سامری نے اسے آگ میں ڈالا، اور ان کے لئے ایک (سنہرا بچھڑا بنا کر) نکال لایا، محض ایک دھڑ جس سے گائے کی سی آواز نکلتی تھی، لوگ یہ دیکھ کر بول اٹھے، یہ ہے ہمارا معبود اور موسیٰ (علیہ السلام) کا بھی، مگر وہ بھول میں پڑ گیا (افسوس ان کی سمجھ پر) کیا انہیں یہ (موٹی سی) بات بھی دکھائی نہ دی کہ بچھڑا (آواز تو نکالتا ہے مگر) ان کی بات کا جواب نہیں دے سکتا اور نہ انہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان؟ اور ہارون (علیہ السلام) نے اس سے پہلے انہیں (صاف صاف) جتا دیا تھا "بھائیو! یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمہاری (استقامت کی) آزمائش ہو رہی ہے، تمہارا پروردگار تو خدائے رحمٰن ہے، دیکھو! میری پیروی کرو اور میرے کہے سے باہر نہ ہو" مگر انہوں نے جواب دیا تھا، جب تک موسیٰ (علیہ السلام) ہمارے پاس واپس نہ آ جائے ہم اس کی پرستش پر جمے ہی رہیں گے، بہر حال موسیٰ (علیہ السلام) نے (اب

Marfat.com

ہارون علیہ السلام سے) کہا: "اے ہارون! جب تو نے دیکھا یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں تو کیا بات ہوئی کہ انہیں روکا نہیں؟ کیا تو نے پسند کیا کہ میرے حکم سے باہر ہو جائے؟" ہارون بولا "اے میرے عزیز بھائی! میری ڈاڑھی اور سر کے بال نہ نوچ (میں نے اگر سختی میں کمی کی، تو صرف اس خیال سے کہ) میں ڈرا، کہیں تم یہ نہ کہو، تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میرے حکم کی راہ نہ دیکھی" تب موسیٰ (علیہ السلام) نے (سامری سے کہا) کہا "سامری! یہ تیرا کیا حال ہوا؟" کہا "میں نے وہ بات دیکھ لی تھی جو اوروں نے نہیں دیکھی تو میں نے فرشتہ کے نقش قدم (کی مٹی) سے ایک مٹھی بھر لی پھر اس کو (ڈھلے ہوئے بچھڑے میں) ڈال دیا، میرے جی نے ایسی ہی بات مجھے سمجھائی" موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اگر ایسا ہے تو پھر جا، زندگی میں تیرے لئے یہ ہونا ہے کہ کہے میں اچھوت ہوں، اور (آخرت میں عذاب کا) ایک وعدہ ہے جو کبھی ٹلنے والا نہیں اور دیکھ تیرے (گھڑے ہوئے) معبود کا اب کیا حال ہوتا ہے جس کی پوجا پر جم کر بیٹھ رہا تھا، ہم اسے جلا کر راکھ کر دیں گے اور راکھ سمندر میں اڑا کر بہا دیں گے، معبود تو تمہارا بس اللہ ہی ہے اس کے سواء کوئی نہیں وہی ہے جو ہر چیز پر اپنے علم سے چھایا ہوا ہے۔"

آیات مسطورۂ بالا میں حسب ذیل آیت کی تفسیر کے متعلق مفسرین کے درمیان کلام ہے:

﴿قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ۝ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ۝﴾ (طٰہٰ: ۹۵-۹۶)

"موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: "پس اے سامری! تیرا یہ کیا معاملہ ہے" سامری نے کہا "میں نے اس چیز کو دیکھا جس چیز کو انہوں نے نہیں دیکھا، پس میں نے "رسول" کے نشان سے ایک مٹھی بھر لی پھر اس کو ڈال دیا اور میرے جی نے یہی سمجھا دیا۔"

دراصل اس آیت میں چند باتیں زیر بحث ہیں اور ان ہی کے فیصلہ پر کل واقعہ کی تفسیر کا مدار ہے۔

① سامری نے وہ کیا شے دیکھی جو دوسروں نے یعنی بنی اسرائیل نے نہیں دیکھی؟

② ﴿فَقَبَضْتُ قَبْضَةً﴾ سے کیا مراد ہے؟۔

③ ﴿اَثَرِ الرَّسُوْلِ﴾ میں "رسول" سے مراد "حضرت موسیٰ علیہ السلام" ہیں یا جبریل علیہ السلام فرشتہ؟

④ ﴿فَنَبَذْتُهَا﴾ سے کیا مراد ہے؟

واقعہ کی گذشتہ تفصیلات سے اگرچہ "جمہور" کی رائے معلوم ہو چکی ہے، تاہم مختصر طور پر اس کو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی پھر سن لیجئے۔

"جس وقت بنی اسرائیل پھٹے دریا میں پیٹھے (گھسے) پیچھے فرعون ساتھ فوج کے پیٹھا (داخل ہوا) جبرئیل بیچ میں ہو گئے کہ ان کو ان تک نہ پہنچنے دیں، سامری نے پہچانا کہ یہ جبرئیل ہیں، ان کے پاؤں کے نیچے سے مٹھی بھر مٹی اٹھالی وہی اب اس سونے کے بچھڑے میں ڈال دی، سونا تھا کافروں کا مال لیا ہوا فریب سے اس میں مٹی پڑی برکت کی، حق و باطل مل کر ایک "کرشمہ" پیدا ہوا کہ رونق جاندار کی اور آواز اس میں ہو گئی، ایسی چیزوں سے بچنا چاہیے اسی سے بت پرستی بڑھتی ہے۔

اس تفسیر کے متعلق صاحب روح المعانی ارشاد فرماتے ہیں:

آیت کی یہ تفسیر وہ ہے جو صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور جلیل القدر مفسرین سے منقول ہے۔ ❶

اس تفسیر کے خلاف دوسری تفسیر مشہور معتزلی ابومسلم اصفہانی کی ہے: وہ کہتے ہیں آیت کا مطلب یہ ہے کہ سامری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ جواب دیا کہ مجھ کو بنی اسرائیل کے خلاف یہ بات سوجھی کہ آپ حق پر نہیں ہیں اور ساتھ ہی میں نے آپ کا کچھ اتباع کر لیا تھا، اور پیروی اختیار کر لی تھی، مگر دل اس پر نہ جما اور آخر کار میں نے اس اتباع اور پیروی کو بھی ترک کر دیا اور اسی طریق کار کو میرے نفس نے بہتر جانا، گویا ابومسلم کے نزدیک آیت ﴿بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهٖ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ سامری بنی اسرائیل کے عقیدے کے خلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حق پر نہیں سمجھتا تھا اور ﴿فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ﴾ میں رسول سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور ﴿اَثَرِ الرَّسُوْلِ﴾ سے مراد پیروی اور اتباع ہے، اور ﴿قَبْضَةً﴾ سے تھوڑی سی پیروی اور ﴿فَنَبَذْتُهَا﴾ سے ترک اتباع مراد ہے، ابومسلم نے اپنی اس تفسیر کے ثبوت میں لغت عرب سے کچھ استشہادات بھی پیش کیے ہیں اور جمہور کی تفصیل پر کچھ اشکالات بھی وارد کیے ہیں، جس کا جواب سید محمود آلوسی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ دیا ہے۔

بایں ہمہ ابومسلم کی اس تفسیر کو امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں قوی، راجح اور صحیح تسلیم کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"یہ واضح رہے کہ ابومسلم نے جو تفسیر بیان کی ہے اس میں مفسرین کی مخالفت تو ضرور پائی جاتی ہے لیکن حسب ذیل چند وجوہ کے پیش نظر تحقیق سے قریب تر اسی کی تفسیر ہے۔ ❷

چنانچہ علماء عصر میں سے مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ترجمان القرآن میں اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔

زیر بحث آیت سے متعلق قرآن عزیز کے سیاق و سباق کے مطالعہ اور اس سلسلہ میں صحیح احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تفتیش و تحقیق کے بعد حق اور راجح بات یہ ہے کہ اس مسئلہ میں نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی تصریح منقول نہیں ہے کہ جس کے بعد ایک جانب کو قطعیت حاصل ہو جائے اور دوسری جانب باطل قرار پائے اور غالباً اسی وجہ سے مشہور محدث و مفسر حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس سلسلہ کی تمام روایات کو سامنے رکھنے کے بعد اگرچہ جمہور کی تائید کی ہے، اور ابومسلم کی تائید نہیں کی بلکہ اس کی تفسیر کو نقل بھی نہیں کیا تاہم جمہور کی تفسیر کو وہ حیثیت نہیں دی جو صاحب روح المعانی نے ذکر فرمائی ہے یعنی یہ کہ جمہور کی تفسیر نصوص حدیثی سے ثابت ہے اور اس لئے دوسرا احتمال بے شبہ الحاد و زندقہ ہے، چنانچہ انہوں نے آیت کی تفسیر کرنے کے بعد صرف یہ فرمایا:

هٰذا هو المشهور عند كثير من المفسرين او اكثرهم. (جلد ۳ سورہ طٰہٰ)

"یہ وہ تفسیر ہے جو بہت سے مفسرین بلکہ اکثر مفسرین کی نسبت سے مشہور ہے۔"

اور اسی طرح ان کے مشہور معاصر مفسر ابن حیان اندلسی نے البحر المحیط میں ابومسلم کی تفسیر کو اگرچہ قیل ❸ کہہ کر نقل کیا ہے مگر اس کے خلاف ایک جملہ بھی نہیں لکھا اور سکوت فرمایا:

پس ان جلیل القدر مفسرین کے اس طرز تحریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اگرچہ جمہور کی تفسیر ہی کو صحیح یا راجح سمجھتے ہیں، مگر دوسرے احتمال کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ نصوص قطعیہ کے خلاف ہے اور ایسا احتمال ہے جس کی پشت پر الحاد و زندقہ کی کارفرمائی ہے۔

---

❶ روح المعانی ج ۱۶ ص ۲۲۹ ❷ تفسیر کبیر ج ۶ ص ۷۰

❸ کوئی قول کمزور سمجھا جاتا ہے تو اس کو قیل کہہ کر بیان کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

البتہ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس آیت کا سیاق وسباق اور قبول عدم قبول حق کے متعلق اس سلسلہ کی تمام آیات قرآن کا اسلوب بیان دونوں ابومسلم کی تفسیر کا قطعاً انکار کرتے اور اس کو تاویل محض ظاہر کرتے ہیں، اس لئے آیت زیر بحث کے جملہ ﴿بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ﴾ میں بصارت سے بصارت عینی کی جگہ بصیرت قلبی مراد لینا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخاطب ہوتے ہوئے بھی ﴿الرَّسُوْلِ﴾ کہہ کر ان کو غائب کے قائم مقام بنانا اور ﴿قَبَضْتُ قَبْضَةً﴾ کے معنی مٹھی بھر لینا کی بجائے "تھوڑا سا اتباع کر لینا" بیان کرنا اور جملہ ﴿نَبَذْتُهَا﴾ سے ترک اتباع مراد لینا، یہ سب علیحدہ علیحدہ جملہ کے اعتبار سے اگرچہ محاورات عرب میں قابل تسلیم ہیں لیکن پورے نظم کلام کے پیش نظر ابومسلم کی تفسیر لچر تاویل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، اور سیاق وسباق شہادت دے رہے ہیں کہ اس جگہ وہی معنی راجح ہیں جو جمہور کا مختار ہیں۔

کیا یہاں یہ اصولی سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اگر سامری کو صرف یہ بتانا تھا کہ میں دل سے آپ کا معتقد نہیں تھا، مگر مصلحتاً کچھ دنوں کے لئے آپ کی پیروی کر رہا تھا اور اب اس کو بھی ترک کر دیا تو اس صاف اور سادہ بات کے لئے قرآن عزیز کو ایسے "ذومعنی اور مبہم اظہار بیان کی کس لئے ضرورت پیش آئی کہ بقول مولانا آزاد مفسرین کو یہ موقع مل گیا کہ انہوں نے یہودیوں میں مشہور روایت کو ٹھیک ٹھیک آیت زیر بحث پر چسپاں کر دیا پس جمہور کی تفسیر یہود کی روایت نہیں ہے بلکہ خود قرآن کا بولتا ہوا بیان ہے اور صاف اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال پر سامری کا جواب ضرور کسی ایسے واقعہ سے تعلق رکھتا ہے جو حیرت انگیز بھی تھا اور کج فطرت انسانوں کی گمراہی کے لئے اس کو آلہ کار بھی بنایا جا سکتا تھا۔

رہا یہ سوال کہ یہ عجیب وغریب معاملہ ایک باطل پرست کے ہاتھ سے کس طرح ظہور پذیر ہوا تو اس کے متعلق سب سے بہتر جواب شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی وہ تعبیر ہے جو موضح القرآن سے گذشتہ سطور میں نقل کی گئی یعنی جب ایک باطل کو کسی دوسرے حق کے ساتھ ملایا جائے تو اس کے امتزاج سے ایک کرشمہ پیدا ہو جاتا ہے جو اس ترکیب کا خاصہ اور اس کا حقیقی مزاج کہلاتا ہے مثلاً آپ گلاب کے عطر کو چرکین کے کچھ اجزاء کے ساتھ مخلوط کیجئے تو گلاب کی نفیس اور لطیف خوشبو چرکین کی قابل نفرت بدبو کے ساتھ مل کر ایک ایسی کیفیت پیدا کر دے گی جس سے بے شبہ نفس چرکین کی بو سے بھی زیادہ دل ودماغ پر برا اثر پڑے گا اور یہ حالت ہو جائے گی کہ ایک سلیم المزاج انسان چرکین کے ڈھیر پر کھڑا ہونا منظور کر سکتا ہے لیکن اس مخلوط بو کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتا، اسی لئے اسلام نے حق وباطل کے ایسے امتزاج کو حرام قرار دیا ہے کہ اس سے سخت گمراہی پھیلتی ہے۔

بہرحال جمہور کی تفسیر ہی صحیح اور قرآن عزیز کے اسلوب بیان کے مطابق ہے۔

سامری کون تھا؟

سامری کے اس انوکھے فریب نے ایک محقق کے لئے یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ یہ شخص اسرائیلی تھا یا کون؟ اور یہ کہ سامری اس کا نام ہے یا لقب؟

نجار کہتے ہیں، اس موقعہ پر جرائد میں عیسائیوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ سامری "سامرہ" کی جانب منسوب ہے اور سامرہ شہر اس وقت تک آباد نہیں ہوا تھا، لہٰذا قرآن کے اس واقعہ میں سامری کے ذکر کے کیا معنی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ "سامری" سامرہ شہر کی جانب منسوب نہیں ہے اور نہ منسوب ہو سکتا ہے اس لئے کہ یہ شہر موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں موجود نہ تھا۔ بلکہ بہت زمانہ کے بعد

Marfat.com

عالم وجود میں آیا ہے بلکہ یہ "شامر" کی جانب منسوب ہے اور یہ عبرانی لفظ ہے یہ جب عربی میں منتقل ہوا تو "ش" "س" کے ساتھ تبدیل ہو گیا۔ خود عبرانی بولنے والی دو شاخیں سبط افرائیم اور سبط یہوذا میں سے افرائیمی "س" بولتے ہیں اور یہوذا "ش" چنانچہ یہ لفظ عبرانی میں "شومیر" بولا جاتا ہے اور شمر کے معنی حرس (حفاظت) کے ہیں لہٰذا "شومیر" یا شامر یا سامر کے معنی "حارس" (محافظ) کے ہیں اور اسی کی نسبت سے "سامری" بولا جاتا ہے۔

نجار نے عبرانی تورات سے (اس معنی کی استشہاد میں ایک حوالہ بھی دیا ہے کہ جب خدا نے قابیل سے پوچھا کہ تیرا بھائی ہابیل کہاں ہے؟ سومیر احی الوخی ✿ (کیا میں اپنے بھائی کا محافظ ہوں)۔ ✿

اور علامہ آزاد فرماتے ہیں:

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سامری کون تھا؟ یہ اس کا نام تھا یا قومیت؟ قیاس کہتا ہے کہ یہاں سامری سے مقصود سمیری قوم کا فرد ہے، کیونکہ جس قوم کو ہم نے سمیری کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے، عربی میں اس کا نام قدیم سے سامری آ رہا ہے اور اب بھی عراق میں ان کا بقایا اسی نام سے پکارا جاتا ہے، یہاں قرآن کا "سامری" کہہ کے اسے پکارنا صاف کہہ رہا ہے کہ یہ نام نہیں ہے، اس کی قومیت کی طرف اشارہ ہے، یعنی وہ شخص اسرائیلی نہ تھا، سامری تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ساڑھے تین ہزار برس پہلے دجلہ وفرات کے دوآبے میں دو مختلف قومیں آباد ہو رہی تھیں اور ایک عظیم الشان تمدن کی بنیادیں اٹھا رہی تھیں، ان میں سے ایک قوم جو جنوب سے آئی تھی، عرب تھی، دوسری جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ شمال سے اتری، سمیری تھی، اسی قوم کے نام سے تاریخ قدیم کا شہر سامرہ آباد ہوا تھا جس کا محل اب "تل العبید" میں دریافت ہوا ہے اور وہاں سے پانچ ہزار برس پیشتر کے بنے ہوئے زیور اور سنہری ظروف برآمد ہوئے ہیں۔

سمیری قوم کی اصل کیا تھی؟ اس بارہ میں اس وقت تک کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ہے لیکن نینوا میں اشوری پال (متوفی ۶۶۶ قبل مسیح) جو کتب خانہ نکلا ہے اس میں تختیوں کا ایک مجموعہ لغت کی کتاب کا بھی ہے جس میں اکادی اور سمیری زبان کے ہم معنی الفاظ جمع کیے گئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سمیری زبان کے اصوات، صامی حروف کے اصوات سے چنداں مختلف نہیں تھے، یہ بہت ممکن ہے کہ وہ بھی دراصل ان ہی قبائل کے مجموعہ سے کوئی بعید کی تعلق رکھتے ہوں جن کے لئے ہم نے تورات کی اصطلاح سامی اختیار کر لی ہے...... بہرحال سمیری قبائل کا اصلی وطن عراق تھا، مگر یہ دور دور تک پھیل گئے تھے، مصر کے ان سے تعلقات کا سراغ ایک ہزار سال قبل مسیح تک روشنی میں آ چکا ہے، پس معلوم ہوتا ہے اسی قوم کا ایک فرد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی معتقد ہو گیا اور جب بنی اسرائیل نکلے، تو یہ بھی ان کے ساتھ نکل آیا، اسی کو قرآن نے "السامری" کے لفظ سے یاد کیا ہے، گائے، بیل اور بچھڑے کی تقدیس کا خیال سمیریوں میں بھی تھا اور مصریوں میں بھی... الخ۔ ✿ ان ہر دو بیانات کے مطالعہ کے بعد یہ بآسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا آزاد کی تشریح نجار کی تشریح کے مقابلہ میں زیادہ قرین صواب اور راجح ہے اور نجار کی تشریح تاویل بعید کی حیثیت رکھتی ہے سامری کے معنی اگر نگہبان کے آتے ہیں تو اس کا نام بھی سامری کیوں ہوا؟ اس کا جواب اس تاویل میں نہیں ملتا اور عیسائیوں کے سوال کا جواب جس تاریخی تحقیق کے ساتھ آزاد صاحب کے مضمون میں ملتا ہے وہی صحیح ہے۔

✿ تکوین اصحاح ۴ آیت ۹ ✿ قصص الانبیاء ۲۶۶ ✿ ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۶۴۔۴۶۵

Marfat.com

الحاصل حضرت موسیٰ علیہ السلام جب ان معاملات سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے خدائے تعالیٰ کی جناب میں رجوع کیا کہ اب ان کے اس ارتداد اور بے دینی کی سزا تیرے نزدیک کیا ہے؟ وہاں سے جواب ملا کہ جن لوگوں نے یہ شرک کیا ان کو اپنی جان سے ہاتھ دھولینا پڑے گا۔ نسائی میں روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تمہاری توبہ کی صرف ایک صورت مقرر کی گئی ہے، وہ یہ کہ مجرموں کو اپنی جان کو اس طرح ختم کرانا چاہیے کہ جو شخص رشتہ میں جس سے زیادہ قریب ہے وہ اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے یعنی باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو اور بھائی بھائی کو، آخر بنی اسرائیل کو اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ تورات میں ہے کہ اس طرح تین ہزار بنی اسرائیل قتل ہوئے اور بعض اسلامی روایات میں اس سے بھی زیادہ تعداد مذکور ہے، جب نوبت یہاں تک پہنچی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام درگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوئے اور عرض کیا یا بارِ الٰہا! اب ان پر رحم فرما اور ان کی خطاؤں کو بخش دے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے قاتل اور مقتول دونوں کو بخش دیا اور جو زندہ ہیں قصوروار ہیں ان کی بھی خطا معاف کر دی، تم ان کو سمجھا دو کہ آئندہ شرک کے قریب بھی نہ جائیں۔

﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ (البقرہ: ۵۴)

"اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا: "اے قوم! بلاشبہ تم نے گوسالہ بنانے میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا ہے پس اپنے خالق کی طرف رجوع کرو اور اپنی جانوں کو قربان کرو، تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے حق میں یہی بہتر ہے، پھر وہ تم پر رجوع بہ رحمت ہوگا بلاشبہ وہ بڑا رجوع برحمت ہونے والا، رحم کرنے والا ہے۔"

اس واقعہ کے متعلق قرآن عزیز اور تورات میں بہت سخت اختلاف ہے، تورات کا بیان ہے کہ گوسالہ ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا۔ اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی، تو وہ ہارون علیہ السلام کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اُٹھ ہمارے لئے دیوتا بنا دے جو ہمارے آگے آگے چلے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰ علیہ السلام کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا، کیا ہو گیا، ہارون علیہ السلام نے ان سے کہا تمہاری بیویوں اور لڑکوں لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں ہیں ان کو اُتار کر میرے پاس لے آؤ، چنانچہ سب لوگ ان کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار اتار کر ان کو ہارون علیہ السلام کے پاس لے آئے اور اس نے ان کو ان کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی، تب وہ کہنے لگے اے اسرائیل! یہی وہ تیرا دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا۔ یہ دیکھ کر ہارون علیہ السلام نے اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور اس نے اعلان کر دیا کہ کل خداوند کے لئے عید ہے۔ [1]

تورات کی تحریف و مسخ کی شہادت اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ جو کتاب اسی باب خروج میں ہارون علیہ السلام کو خدا کا پیغمبر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وزیر ظاہر کرتی ہے وہی تورات اس جگہ ہارون علیہ السلام کو "العیاذ باللہ" نہ صرف مشرک اور بت پرست ثابت کر رہی ہے بلکہ شرک کا معلم اور بت پرستی کا راہنما بتا رہی ہے۔

---

[1] خروج باب ۳۲۔ آیت ۹۔۵

تورات کے مطالعہ سے بآسانی آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اہل کتاب کی بوالعجبیوں اور کتاب اللہ میں تحریفات کی داستانوں میں سب سے زیادہ قابل نفرت داستان یہ ہے کہ وہ خدا کے جن برگزیدہ انسانوں کو نبی اور پیغمبر کہتے جاتے ہیں ان ہی پر شرک وکفر اور بداخلاقیوں کی تہمت لگانے میں بھی نہیں جھجکتے، چنانچہ اس مقام پر بھی سامری کے مشرکانہ عمل کو حضرت ہارون علیہ السلام کے سر لگا دیا قرآن عزیز اس خرافات کی پُرزور تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کا دامن اس قسم کی ناپاکی سے قطعاً پاک ہے، گئوسالہ بنانا اور گئوسالہ پرستی کی ترغیب دینا سامری کا کام تھا نہ کہ حضرت ہارون علیہ السلام جیسے برگزیدہ نبی کا، انہوں نے تو سختی کے ساتھ بنی اسرائیل کو اس ناپاک حرکت سے باز رکھنے کی سعی کی مگر وہ بدبخت کسی طرح نہ مانے۔

﴿وَ لَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَ اَطِيْعُوْۤا اَمْرِيْ ۝ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۹۰-۹۱)

”اور بیشک ہارون (علیہ السلام) نے پہلے ہی ان (بنی اسرائیل) سے کہا ”اے قوم! بلاشبہ تم فتنہ میں ڈال دیئے گئے (اس بچھڑے کے بنانے سے) اور بیشک تمہارا پروردگار بڑا رحم والا ہے پس (اب بھی سمجھو اور) میری پیروی کرو اور میرے حکم کو مانو انہوں نے (بنی اسرائیل نے) کہا ہم اس کو سادھ ہرگز نہ چھوڑیں گے تا آنکہ موسیٰ (علیہ السلام) لوٹ کر ہمارے پاس نہ آ جائے۔“

ستر سرداروں کا انتخاب:

جب بنی اسرائیل کا یہ جرم معاف کر دیا گیا تو اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ میرے پاس جو یہ الواح (تختیاں) ہیں، یہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت اور دینی و دنیوی زندگی کی فلاح کے لئے مجھ کو عطا فرمائی ہے، یہ تورات ہے، اب تمہارا فرض ہے کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام کی تعمیل کرو۔

بنی اسرائیل بہرحال بنی اسرائیل تھے، کہنے لگے موسیٰ علیہ السلام! ہم کیسے یقین کریں کہ یہ خدا کی کتاب ہے؟ صرف تیرے کہنے سے تو ہم نہیں مانیں گے، ہم تو جب اس پر ایمان لائیں گے کہ خدا کو بے حجاب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، اور وہ ہم سے یہ کہے کہ یہ تورات میری کتاب ہے، تم اس پر ایمان لاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سمجھایا یہ بے وقوفی کا سوال ہے، آنکھوں سے خدا کو کس نے دیکھا ہے جو تم دیکھو گے، یہ نہیں ہو سکتا، مگر بنی اسرائیل کا اصرار بدستور قائم رہا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دیکھا تو کچھ سوچ کر ارشاد فرمایا کہ یہ تو ناممکن ہے کہ تم لاکھوں کی تعداد میں میرے ساتھ حوریب (طور) پر اس کی تصدیق کے لئے جاؤ مناسب یہ ہے کہ تم میں سے چند سردار چن کر ساتھ لئے جاتا ہوں، وہ اگر واپس آ کر تصدیق کر دیں تو پھر تم بھی تسلیم کر لینا، اور چونکہ تم ابھی گئوسالہ پرستی کا ایک بہت بڑا گناہ کر چکے ہو اس لئے اظہار ندامت اور خدا سے آئندہ نیکی کے عہد کے لئے بھی یہ موقع مناسب ہے۔ قوم اس پر راضی ہو گئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تمام اسباط سے ستر سرداروں کو چن کر ساتھ لیا اور طور پر جا پہنچے، طور پر ایک سپید بادل کی طرح (نور) نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گھیر لیا اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی شروع ہو گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ تو بنی اسرائیل کے حالات کا دانا بینا ہے، میں ان کی ضد پر ستر آدمی انتخاب کر لایا ہوں، کیا اچھا ہو کہ وہ بھی اس ”حجاب نور“ سے میری اور

Marfat.com

تیری ہمکلامی کو سن لیں اور قوم کے پاس جا کر تصدیق کرنے کے قابل ہو جائیں؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء منظور فرمالی اور ان کو "حجاب نور" میں لے لیا گیا اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اللہ رب العالمین کی ہمکلامی کو سنا۔ پھر جب پردۂ نور ہٹ گیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان سرداروں کے درمیان مواجہہ ہوا تو سرداروں نے وہی اپنا پہلا اصرار قائم رکھا کہ جب تک بے حجاب خدا کو نہ دیکھ لیں ہم ایمان لانے والے نہیں، اس احمقانہ اصرار اور ضد پر غیرتِ الٰہی نے ان کو یہ سزا دی کہ ایک ہیبت ناک چمک، کڑک اور زلزلہ، نے ان کو آ لیا اور جلا کر خاک کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دیکھا تو درگاہِ الٰہی میں عاجزی کے ساتھ دعاء مانگی، الٰہی! یہ بے وقوف اگر بے وقوفی کر بیٹھے تو کیا تو ہم سب کو ہلاک کر دے گا، اے خدا اپنی رحمت سے تو ان کو معاف کر دے، حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء کو سنا اور ان سب کو دوبارہ حیات تازہ بخشی اور پھر جب وہ زندگی کا لباس پہن رہے تھے تو ایک دوسرے کی تازہ زندگی کو آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

﴿وَ اخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا لِّمِیْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِیَّایَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَ تَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَ ۝ وَ اكْتُبْ لَنَا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَیْكَ ؕ قَالَ عَذَابِیْۤ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ ؗ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۵۵-۱۵۷)

"اور اس غرض سے کہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے وقت میں حاضر ہوں موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی چنے، پھر جب لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آ لیا تو موسیٰ (علیہ السلام) نے ہماری جناب میں عرض کیا "پروردگار!" اگر تو چاہتا تو ان سب کو اب سے پہلے ہی ہلاک کر ڈالتا، اور خود میری زندگی بھی ختم کر دیتا (مگر تو نے اپنے فضل و رحمت سے ہمیں مہلت دی) پھر کیا ایک ایسی بات کے لئے جو ہم میں سے چند بے وقوف آدمی کر بیٹھے ہیں تو ہم سب کو ہلاک کر دے گا؟ یہ اس کے سواء کیا ہے کہ تیری طرف سے ایک آزمائش ہے تو جسے چاہے اس میں بھٹکا دے، جسے چاہے راہ دکھا دے، خدایا! تو ہمارا والی ہے، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر، تجھ سے بہتر بخشنے والا کوئی نہیں! اور (خدایا) اس دنیا کی زندگی میں بھی ہمارے لئے اچھائی لکھ دے، اور آخرت کی زندگی میں بھی ہمارے لئے اچھائی کر، ہم تیری طرف لوٹ آئے! خدا نے فرمایا میرے عذاب کا حال یہ ہے کہ جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں، اور رحمت کا حال یہ ہے کہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، پس

میں ان کے لئے رحمت لکھ دوں گا جو برائیوں سے بچیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور ان کے لئے، جو میری نشانیوں پر ایمان لائیں گے، جو الرسول کی پیروی کریں گے کہ نبی یا امی ہوگا اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے وہ انہیں نیکی کا حکم دے گا، برائی سے روکے گا، پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا، گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا، اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دبے ہوں گے، ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے تو جو لوگ اس پر ایمان لائے اس کے مخالفوں کے لئے روک ہوئے (راہ حق میں) اس کی مدد کی، اور اس روشنی کے پیچھے ہو لیے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے، سو وہی ہیں جو کامیابی پانے والے ہیں۔"

﴿وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾﴾ (البقرہ: ۵۵-۵۶)

"اور جب تم نے کہا اے موسیٰ (علیہ السلام)! ہم تجھ پر اس وقت تک ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو بے حجاب اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، پس آنکھوں دیکھتے تم کو بجلی کی کڑک نے آ پکڑا، پھر ہم نے تم کو موت کے بعد زندہ کیا تا کہ تم شکر گزار رہو۔"

حیات بعد الموت:

قرآن عزیز نے حیات بعد الممات کا عام قانون تو یہ بتایا ہے کہ اس دنیوی موت کے بعد پھر عالم آخرت ہی کے لئے دوبارہ زندگی ملے گی لیکن قانون خاص یہ ہے کہ کبھی کبھی حکمت و مصلحت کے پیش نظر خدائے تعالیٰ اس دنیا ہی میں مردہ کو زندگی بخش دیا کرتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی معجزانہ زندگی میں خود قرآنی شہادت کے مطابق اس حقیقت کا متعدد مرتبہ ظہور ہو چکا ہے۔

قرآن عزیز جب حیات بعد الممات کا ذکر کرتا ہے تو اس کا قرینہ یہ ہے کہ وہ اس زندگی کو "بعث" سے تعبیر کرتا ہے جس کو اُردو میں جی اٹھنا کہتے ہیں۔

سورۂ بقرہ کی اس آیت میں بھی قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے نمائندوں کی موت و ہلاکت اور اس کے بعد ان کے "بعث" اٹھنے کا ذکر کیا ہے اور ﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ کہہ کر اس واقعہ کی اصلی حقیقت کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے کہ بے شبہ صورت یہ پیش آئی کہ ان کے نامعقول اور گستاخانہ اصرار پر "رجفہ" کے عذاب نے ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عاجزانہ دعاء پر خدا کی وسعت رحمت نے ترس کھایا اور ان سوختہ جان انسانوں کو دوبارہ زندگی بخش دی گئی تا کہ یہ شکر گذار ہوں اور آئندہ اس قسم کی بے جا ضد کو کام میں نہ لائیں اور خدا کے سچے فرمانبردار بن جائیں۔

اس تفصیل کے بعد یہ بآسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ جن معاصر مفسرین نے آیت کی تفسیر اس حیات بعد الممات سے بچنے کے لئے رکیک تاویلات کے ساتھ کی ہے وہ صحیح نہیں ہے اور انہوں نے بغیر کسی سند اور دلیل کے قرآن عزیز کے صاف اور صریح اسلوب کو تفسیر بالرائے پر قربان کر دیا ہے۔

Marfat.com

رحمت عام کا اعلان:

سورۂ اعراف کی یہ آیت ﴿قَالَ عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ رَحْمَتِیْ وَ سِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ﴾ مہمات قرآنی میں سے ہے، اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ خدا کی جانب سے جو عذاب آتا ہے وہ خاص حالات کے ماتحت ہوتا ہے ورنہ عذاب خدائے تعالیٰ کی صفت نہیں ہے بلکہ "رحمت" اس کی ازلی ابدی صفت ہے اس لئے اس کی صفت رحمت ہر شئے کے لئے عام ہے اور کائنات میں ایک شئے بھی ایسی نہیں ہے جو اس کی صفت رحمت سے خالی ہو بلکہ یوں کہئے کہ جس کو تم "عذاب" کہہ رہے ہو وہ تمہارے اعمال و کردار کی نسبت سے "عذاب" ہے، ورنہ کارخانۂ ہستی کے پورے نقشہ کے لحاظ سے اگر تم غور کرو گے تو اس کو بھی رحمت ہی پاؤ گے، چنانچہ سورۂ انعام میں اسی لئے فرمایا:

﴿ كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ "اللہ نے رحمت کو اپنی ذات پر مقرر کرلیا۔"

اور اسی رحمت عام کا مظہر اتم اور پرتو اکمل وہ ذات گرامی ہے جس کا ذکر مبارک سورۂ اعراف کی اس آیت میں اس طرح کیا جا رہا ہے کہ اس کی آمد سے قبل ہی کتب سابقہ میں اس کی آمد کی بشارت دے دی گئی تھی اور اس کی صفات اور اس کے اخلاق کا بھی تذکرہ کردیا گیا تھا اور اسی لئے دوسری جگہ اس کو رحمت العالمین کے لقب سے پکارا گیا۔ [1]

بنی اسرائیل اور جبل طور:

بہر حال جب یہ ستر سردار دوبارہ زندگی پا کر قوم کی جانب واپس ہوئے تو انہوں نے قوم سے تمام قصہ کہہ سنایا اور بتایا کہ موسیٰ علیہ السلام جو کچھ کہتے ہیں وہ حق ہے اور بے شبہ وہ خدا کے فرستادہ ہیں۔

اب فطرت سلیم کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ سب خدائے تعالیٰ کا شکر بجالاتے اور اس کے فضل و کرم کی فراوانی کے پیش نظر فرمانبرداری اور عبودیت کے ساتھ اس کے سامنے سر تسلیم خم کردیتے مگر ہوا یہ کہ انہوں نے اپنی کجروی کو باقی رکھا اور اپنے نمائندوں کی تصدیق کے باوجود تورات کو قبول کرنے میں معاندانہ پس وپیش شروع کردی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ارشادات پر کان نہ دھرا۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا تو بارگاہ الٰہی میں رجوع کرتے ہوئے قوم کی بے راہ روی کا گلہ کیا۔ درگاہ الٰہی سے حکم ہوا کہ ان نافرمانوں کے لئے میں تجھ کو ایک حجت (معجزہ) اور عطا کرتا ہوں اور وہ یہ کہ جس پہاڑ (طور) پر تو مجھ سے ہمکلام ہوتا رہتا ہے اور جس پر تیری قوم کے منتخب سرداروں نے حق کا مشاہدہ کیا ہے اسی پہاڑ کو حکم دیتا ہوں کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کرے اور سائبان کی طرح بنی اسرائیل کے سروں پر چھا جائے اور زبان حال سے یہ اعلان کرے کہ موسیٰ علیہ السلام خدا کا سچا پیغمبر ہے اور تورات بے شبہ خدا کی سچی کتاب ہے اور اگر یہ دونوں حق وصداقت کا مظہر نہ ہوتے تو یہ عظیم الشان "نشان" تم نہ دیکھتے جس کا ظہور قدرت الٰہی کے سواء اور کسی طرح ناممکن ہے۔

چنانچہ جوں ہی خدائے تعالیٰ کا یہ تکوینی فیصلہ ہوا طور ان کے سروں پر مثل سائبان نظر آنے لگا، اور زبان حال سے کہنے لگا کہ اے بنی اسرائیل! اگر تم میں عقل و ہوش باقی ہے اور حق و باطل کی تمیز موجود ہے تو گوش حق نیوش سے سنو کہ میں خدا کا نشان بن کر تم

---

[1] اس آیت کی مفصل تفسیر ذکر رسول ﷺ کے موقع پر کی جائے گی۔ (مؤلف)

کو یقین دلاتا ہوں اور شہادت دیتا ہوں کہ موسیٰ علیہ السلام نے بارہا میری پیٹھ پر خدائے تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل کیا ہے اور تمہارے رشد و ہدایت کا قانون (تورات) بھی اسی کو میری پیٹھ ہی پر عطاء ہوا ہے اور اے سرمستان بادۂ غفلت و سرکشی! میری یہ ہیبت جو تمہارے لئے حیران کن بن رہی ہے، اس امر کی شہادت ہے کہ جب انسان کے سینہ میں دل کی نرمی، سختی سے بدل جاتی ہے تو پھر وہ پتھر کا ٹکڑا بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت بن جاتا ہے اور رشد و ہدایت اس میں کسی جانب سے بھی سرایت نہیں کر پاتی، دیکھو! میں پتھر کے ٹکڑوں کا مجموعہ (پہاڑ) ہوں لیکن خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیے کس طرح عبودیت کا مظاہرہ کر رہا ہوں مگر تم ہو کہ انانیت اور خودی کے گھمنڈ میں کسی حالت میں بھی "نہیں" کو "ہاں" سے بدل دینے کے لئے تیار نہیں، سچ ہے۔

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ (البقرہ: ۷۴)

"پھر تمہارے دل سخت ہو گئے سو وہ ہو گئے جیسے پتھر یا ان سے بھی سخت۔"

بنی اسرائیل نے جب یہ "نشان" دیکھا تو اب اسے وقتی خوف و دہشت کا ثمرہ سمجھئے یا علی رؤس الاشہاد خدا کے عظیم الشان "نشان" کے مشاہدہ کا نتیجہ یقین کیجئے کہ بنی اسرائیل تورات کی جانب متوجہ ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اس کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا تب خدائے تعالیٰ کا فرمان ذی شان ہوا کہ اے بنی اسرائیل! ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس کو مضبوطی کے ساتھ لو اور جو احکام اس (تورات) میں درج ہیں ان کی تعمیل کرو تا کہ تم پرہیزگار اور متقی بن سکو۔

مگر افسوس کہ بنی اسرائیل کا یہ عہد و میثاق ہنگامی ثابت ہوا اور زیادہ عرصہ تک وہ اس پر کاربند نہ رہ سکے اور حسب عادت پھر خلاف ورزی شروع کر دی، قرآن عزیز نے ان واقعات کو نہایت مختصر مگر صاف اور واضح نظم الفاظ کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝﴾

(البقرہ: ۶۳-۶۴)

"اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے سر پر طور کو اونچا کیا (اور کہا) جو ہم نے تم کو دیا ہے اس کو قوت سے پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد کرو تا کہ تم پرہیزگار بنو، پھر اس کے بعد تم نے (اس تورات سے) پیٹھ پھیر لی، پس اگر تم پر خدا کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بلاشبہ تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاتے۔"

﴿وَ اِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۷۱)

"اور جب ہم نے ان کے (بنی اسرائیل) کے سروں پر پہاڑ بلند کر دیا گویا کہ وہ سائبان ہے اور انہوں نے یقین کر لیا کہ وہ ان پر گرنے والا ہے (تو ہم نے کہا) جو ہم نے تم کو دیا ہے اس کو قوت سے پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد کرو تا کہ تم پرہیزگار بنو۔"

Marfat.com

ان آیات میں تصریح ہے کہ بنی اسرائیل نے جب تورات کو قبول کرنے میں پس وپیش کیا بلکہ انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سروں پر طور کو بلند کر دیا اور اس طرح آیۃ اللہ کا مظاہرہ کر کے ان کو قبول تورات پر آمادہ کیا پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ آیات کے ظاہر کو تاویلات میں گھسیٹا جائے جیسا کہ بعض معاصر مفسرین نے کیا ہے۔

کسی پہاڑ کا جڑ سے اُکھڑ کر فضاء میں معلق ہو جانا، عقلاً محال ہے اور نہ قانون قدرت کے منافی، البتہ انوکھا اور حیرت زدہ واقعہ ضرور ہے اور اس لئے "آیۃ اللہ" کہلانے کا مستحق، مگر تاویل کرنے والے کہتے ہیں کہ "رفع" کے معنی صرف بلندی کے آتے ہیں نہ کہ سر پر بلند ہونے کے، اور اسی طرح "نتق" کے معنی جس طرح "جڑ سے اُکھڑنے کے آتے ہیں" اسی طرح زلزلہ میں آنے اور "خوفناک حرکت کرنے" کے بھی آتے ہیں، لہٰذا سورۂ اعراف کی آیت کے معنی یہ ہوئے۔

"اور جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو زلزلہ میں ڈالا تھا، گویا ایک سائبان ہے جو ہل رہا ہے اور وہ (دہشت کی شدت میں) سمجھے تھے کہ بس ان کے سروں پر آ گرا۔" الخ[1]

مگر ان حضرات نے اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیا کہ "رفع" اور "نتق" کے اگر متعدد معانی آتے ہیں تو عربیت کے قاعدہ سے اس مقام پر جو قرینہ پایا جاتا ہے اسی کے مطابق معنی متعین ہوں گے خصوصاً جب کہ قرآن عزیز کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے تو بے شبہ کسی لفظ کے متعدد معانی میں سے صرف وہی معنی مراد ہوں گے جو دوسری آیت کے ذریعہ متعین ہوتے ہیں۔

پس بقرہ کی آیت ﴿رَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ الطُّوۡرَ﴾ میں "رفع" اور "فوق" کو جب اعراف کی آیت ﴿نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ﴾ میں "نتق" کے ساتھ ملائیں گے تو قرآن عزیز کی ان آیات کا صاف اور سادہ مطلب یہی بنے گا کہ طور کو اس کی جگہ سے اکھاڑ کر بنی اسرائیل کے سروں پر اس طرح کر دیا گیا گویا ایک سائبان ہے جو عنقریب ان پر گرنے والا ہے۔ نیز "فوق" کا رفع کے ساتھ لانا بھی اس تفسیر کی صحت کے لئے موثق شہادت ہے جو جمہور نے بیان فرمائی ہے، اس کے برعکس معاصر مفسرین سے نقل کردہ معنی صاف بول رہے ہیں کہ وہ منطوق قرآنی کے خلاف کھینچ تان بنائے گئے ہیں۔

اس مقام پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ ان ہر دو آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر "تورات" کے قبول کرانے میں جبر و کراہ سے کام لیا گیا ہے، حالانکہ دین میں جبر واکراہ درست نہیں ہے مگر قرآن عزیز کے سیاق وسباق کو پیش نظر رکھ کر واقعہ کی صورت جس طرح ہم نے نقل کی ہے یہ اعتراض اس شکل میں پیدا ہی نہیں ہوتا، البتہ اگر جمہور مفسرین اور جدید مفسرین کی تفسیر سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے تو اس کا بہترین جواب مفتی عبدہ نے اپنی تفسیر میں دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دراصل یہ جبر واکراہ کا معاملہ نہیں تھا بلکہ آیۃ اللہ کا یہ آخری مظاہرہ تھا جو ان کی رشد وہدایت کی تقویت وتائید میں کیا گیا اور اس لئے یہ واقعہ عہد ومیثاق کے بعد پیش آیا جیسا کہ سیاق کلام سے ظاہر ہے۔

کثرت معجزات:

یہاں یہ بات بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ گزشتہ اوراق میں یہ بخوبی روشن ہو چکا ہے کہ صدیوں غلامی کی زندگی بسر کرنے

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۱

Marfat.com

اور پست خدمات میں مشغول رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل کے ملکات فاضلہ کو گھن لگ گیا تھا اور مصریوں میں رہ کر مظاہر پرستی اور اصنام پرستی نے ان کے عقل وحواس کو اس درجہ معطل کر دیا تھا کہ وہ قدم قدم پر توحید الٰہی اور احکام الٰہی میں کسی "کرشمہ" کے منتظر رہتے، اس کے بغیر ان کے دل میں یقین واذعان کے لئے کوئی جگہ نہ بنتی تھی، پس ان کی ہدایت ورشد کے لئے دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں، ایک یہ کہ ان کو فقط افہام وتفہیم کے مختلف طریقوں ہی سے قبول حق پر آمادہ کیا جاتا اور انبیاء سابقین کی امتوں کی طرح صرف کسی خاص اور اہم موقعہ پر "آیۃ اللہ" (معجزہ) کا مظاہرہ پیش آتا اور دوسری صورت یہ تھی کہ ان کی صدیوں کی تباہ شدہ اس حالت کی اصلاح کے لئے روحانی طاقت کا جلد جلد مظاہرہ کیا جائے، اور حق وصداقت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ خدائے تعالیٰ کے تکوینی نشانات "معجزات" ان کی استعداد قبول وتسلیم کو بار بار تقویت پہنچائیں، پس اس قوم کی پست ذہنیت اور تباہ حالی کے پیش نظر مصلحت خداوندی نے ان کی اصلاح وتربیت کے لئے یہی دوسری صورت اختیار فرمائی۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ "اللہ تعالیٰ عالم ودانا حکمت والا ہے"۔

بہرحال اس واقعہ کا ذکر توارات میں بھی موجود ہے، اور اس میں طور کے متعلق وہی کہا گیا ہے جو ہمارے جدید مفسرین نے آیت کی تاویل کی صورت میں بیان کیا ہے۔

جب تیسرا دن آیا تو صبح ہوتے ہی بادل گرجنے اور بجلی چمکنے لگی اور پہاڑ پر کالی گھٹا چھا گئی اور قرنا کی آواز بہت بلند ہوئی اور سب لوگ ڈیروں میں کانپ گئے، اور موسیٰ علیہ السلام لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملائے اور وہ پہاڑ سے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اس پر اترا اور دھواں تنور کے دھوئیں کی طرح اوپر کو اٹھ رہا تھا اور وہ سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا..... چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نیچے اتر کر لوگوں کے پاس گیا اور یہ باتیں ان کو بتائیں۔ [1]

ارض مقدس کا وعدہ اور بنی اسرائیل:

سینا کے جس میدان میں اس وقت بنی اسرائیل موجود تھے یہ سرزمین فلسطین سے قریب تھا، اور ان کے باپ دادا حضرت ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام سے خدا کا وعدہ تھا کہ تمہاری اولاد کو پھر اس سرزمین کا مالک بنائیں گے اور وہ یہاں پھولے پھلے گی، لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت خدا کا حکم ہوا کہ اپنی قوم سے کہو کہ ارض مقدس میں داخل ہوں اور وہاں کے جابر وظالم حکمرانوں کو نکال کر عدل وانصاف کی زندگی بسر کریں، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ فتح تمہاری ہوگی اور تمہارے ظالم دشمن ناکام ہوں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے پہلے کہ بنی اسرائیل کو ارض مقدس میں داخل ہونے کے لئے آمادہ کریں "بارہ آدمیوں کو تفتیش حال کے لئے بھیجا، وہ فلسطین کے قریبی شہر اریحا میں داخل ہوئے اور تمام حالات کو بغور دیکھا، جب واپس آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتایا کہ وہ بہت جسیم اور تن وتوش کے زبردست ہیں اور بہت قوی ہیکل ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جس طرح تم نے مجھ سے ان کے متعلق کہا ہے قوم کے سامنے نہ کہنا۔ اس لئے کہ عرصہ دراز کی غلامی نے ان کے حوصلے پست کر دیئے ہیں، اور ان میں شجاعت، خودداری اور علو ہمت کی جگہ بزدلی، ذلت اور پستی ہمت نے لے لی ہے، مگر آخر یہ بھی اسی قوم کے افراد تھے، نہ مانے اور خاموشی کے ساتھ قوم کے سامنے دشمن کی طاقت کا خوب بڑھا چڑھا کر ذکر کیا،

---

[1] خروج باب ۱۹ آیات ۱۵۔۱۶

Marfat.com

البتہ صرف دو شخص یوشع بن نون اور کالب بن یفنہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی اور انہوں نے بنی اسرائیل سے ایسی کوئی بات نہ کہی کہ جس سے ان کی ہمت پست ہو۔

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم اس بستی (اریحاء) میں داخل ہو اور دشمن کا مقابلہ کر کے اس پر قابض ہو جاؤ خدا تمہارے ساتھ ہے۔

﴿ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ ﴾ (المائدہ: ۲۰-۲۱)

"اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا "اے قوم! تم پر جو خدا کا احسان رہا ہے اس کو یاد کرو کہ اس نے تم میں نبی اور پیغمبر بنائے اور تم کو بادشاہ اور حکمران بنایا اور وہ کچھ دیا جو جہانوں میں کسی کو نہیں دیا۔ اے قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کر دیا ہے اور پشت پھیر کر نہ لوٹو (کہ نتیجہ یہ نکلے) کہ تم خسارہ اور نقصان اٹھانے والے بن کر لوٹو۔"

بنی اسرائیل نے یہ سن کر جواب دیا کہ موسیٰ علیہ السلام! وہاں تو بڑے ظالم لوگ بستے ہیں، ہم تو اس وقت تک اس بستی میں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں، افسوس بدبختوں نے یہ نہ سوچا کہ جب تک ہمت و شجاعت کے ساتھ تم ان کو یہاں سے نہ نکالو گے تو یہ ظالم خود کیسے نکل جائیں گے۔

یوشع اور کالب نے جب یہ دیکھا تو قوم کو ہمت دلائی اور کہا شہر کے پھاٹک سے گذر جانا کچھ مشکل نہیں ہے، چلو اور ان کا مقابلہ کرو ہم کو پورا یقین ہے کہ تم ہی غالب رہو گے۔

﴿ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ۬ وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ (المائدہ: ۲۳)

"ان ڈرنے والوں میں سے دو ایسے آدمیوں نے جن پر خدا نے اپنا فضل و انعام کیا یہ کہا "تم ان جابروں پر دروازہ کی جانب سے داخل ہو جاؤ پس جس وقت تم داخل ہو جاؤ گے تم بلاشبہ غالب رہو گے اور (یہ بھی کہا) اللہ پر ہی بھروسہ رکھو اگر تم ایمان والے ہو۔"

لیکن بنی اسرائیل پر اس بات کا بھی مطلق اثر نہ ہوا اور وہ بدستور اپنے انکار پر قائم رہے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زیادہ زور دیا تو اپنے انکار پر اصرار کرتے ہوئے کہنے لگے:

﴿ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ ﴾ (المائدہ: ۲۴)

Marfat.com

"انہوں نے کہا" اے موسیٰ (علیہ السلام)! ہم کبھی اس شہر میں اس وقت تک داخل نہیں ہوں گے جب تک وہ اس میں موجود ہیں، پس تو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور ان سے لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں (یعنی تماشا دیکھیں گے)۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ ذلیل اور بے ہودہ جواب سنا تو بہت افسردہ خاطر ہوئے اور انتہائی رنج و ملال کے ساتھ درگاہِ الٰہی میں عرض کیا: "بارالہا! میں اپنے اور ہارون علیہ السلام کے سواء کسی پر قابو نہیں رکھتا سو ہم دونوں حاضر ہیں، اب تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان جدائی کر دے، یہ تو سخت نااہل ہیں" اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی موسیٰ! تم غمگین نہ ہو، ان کی نافرمانی کا تم پر کوئی بار نہیں، اب ہم نے ان کے لئے یہ سزا مقرر کر دی ہے کہ یہ چالیس سال اسی میدان میں بھٹکتے پھیریں گے، اور ان کو ارضِ مقدس میں جانا نصیب نہ ہوگا، ہم نے ان پر ارضِ مقدس کو حرام کر دیا ہے۔

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ۝﴾

(المائدہ: ۲۵۔۲۶)

"(موسیٰ علیہ السلام نے) کہا" اے پروردگار! میں اپنے اور اپنے بھائی کے ماسواء کسی کا مالک نہیں ہوں، لہٰذا تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان تفریق کر دے (اللہ تعالیٰ) نے کہا" بلاشبہ ان پر ارضِ مقدس کا داخلہ چالیس سال تک حرام کر دیا گیا، اس مدت میں یہ اسی میدان میں بھٹکتے پھریں گے، پس تو نافرمان قوم پر غم نہ کھا اور افسوس نہ کر۔"

وادی سینا کو "تیہ" اس لئے کہتے ہیں قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے لئے کہا: ﴿یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ﴾ (یہ اس زمین میں بھٹکتے پھریں گے) جب کوئی شخص راہ سے بھٹک جائے تو عربی میں کہتے ہیں" تاہ فلان"۔

تورات میں اس واقعہ کی تفصیلات اگرچہ اس انداز میں مذکور نہیں ہیں تاہم "گنتی باب ۱۴" میں بنی اسرائیل کے ارضِ مقدس میں داخلہ سے انکار، اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ناراضی اور پھر چالیس سال تک ان پر ارضِ مقدس کے داخلہ کا حرام ہو جانا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس مدت کے اندر اندر بنی اسرائیل کے وہ تمام افراد مر جائیں گے جنہوں نے خدا کے حکم کے خلاف ارضِ مقدس کے داخلہ سے انکار کیا ہے اور ان کے بعد نئی نسل کو داخلہ کی اجازت ہوگی جو کالب اور یوشع کی سرکردگی میں دشمنوں کو پامال کر کے پاک زمین میں داخل ہوں گے نیز یہ کہ حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی اس وقت انتقال ہو چکا ہوگا۔

"پھر خداوند نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو خطاب کر کے فرمایا میں کب تک اس خبیث گروہ کے مقابل جو میری شکایت کرتا ہے صبر کروں؟ بنی اسرائیل جو میرے برخلاف شکایتیں کرتے ہیں میں نے ان کی شکایتیں سنیں، ان سے کہہ، خداوند کہتا ہے: مجھے اپنی حیات کی قسم جیسا تم نے مجھے سنا کے کہا ہے میں تم سے ویسا ہی کروں گا، تمہاری لاشیں اور ان سب کی جو تم میں شمار کیے گئے ان کے کل جمع کے مطابق بیس برس والے سے لے کر اوپر والے تک جنہوں نے میری شکایتیں کیں اس بیابان میں گریں گی، تم بیشک اس زمین تک نہ پہنچو گے جس کی بابت میں نے قسم کھائی ہے کہ تمہیں وہاں بساؤں گا سوالفینہ

Marfat.com

کے بیٹے کالب اور نون کے بیٹے یشوع اور تمہارے لڑکوں کو جن کے حق میں تم کہتے ہو کہ وہ لٹ جائیں گے، میں ان کو داخل کروں گا، اس زمین کی قدر کو جسے تم نے ذلیل جانا اور پہچانیں گے، پر تم جو ہو تمہاری لاشیں اس بیابان ہی میں گریں گی اور تمہارے لڑکے اس دشت میں چالیس برس تک بھٹکتے پھریں گے اور تمہاری برگشتگی کے اٹھانے والے ہوں گے جب تک کہ تمہاری لاشیں اس دشت میں نیست و نابود نہ ہوں، ان دنوں کے شمار کے مطابق جن میں تم اس زمین کی جاسوسی کرتے تھے جو چالیس دن ہیں دن پیچھے ایک سال ہوگا سو تم چالیس برس تک اپنے گناہ کو اٹھائے رہو گے، تب تم میری عہد شکنی کو جان لو گے۔“ ❶

اس جگہ یہ شبہ پیدا نہ کرنا چاہیے کہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو بھی اسی میدان میں رہنا پڑا اور وہ بھی ارض مقدس میں نہ داخل ہو سکے اس لئے کہ جب بنی اسرائیل کے اس پورے قافلہ پر ارض مقدس کو حرام کر دیا گیا تو اب ضروری تھا کہ ان کے رشد و ہدایت کے لیے خدا کا پیغمبر ان میں موجود رہے تاکہ کچھ یہ بوڑھے بھی راہ حق پر قائم رہیں اور نئی نسل میں وہ استعداد پیدا ہو جس کے ذریعہ وہ ارض مقدس میں داخل ہو کر خدا کے حکم کو پورا کریں۔

ذبح بقرہ کا واقعہ:

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ بنی اسرائیل میں ایک قتل ہو گیا مگر قاتل کا پتہ نہ لگا، آخر شبہ نے تہمت کی شکل اختیار کر لی اور اختلاف باہمی کی خوفناک صورت پیدا ہو گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب یہ واقعہ پیش ہوا تو انہوں نے خدائے تعالیٰ کی جانب رجوع کیا اور عرض کیا کہ اس واقعہ نے قوم میں سخت اختلاف رونما کر دیا ہے، تو خود علیم و حکیم ہے میری مدد فرما۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ ان سے کہو کہ پہلے ایک گائے ذبح کریں، اور اس کے بعد گائے کے ایک حصہ کو مقتول کے جسم سے مس کریں، پس اگر وہ ایسا کریں گے تو ہم اس کو زندگی بخش دیں گے اور یہ معاملہ واضح ہو جائے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے جب ”ذبح بقرہ“ کے متعلق فرمایا تو انہوں نے اپنی کج بحثی اور حیلہ جوئی کی خصلت کے مطابق بحث شروع کر دی۔

موسیٰ علیہ السلام! کیا تو ہم سے مذاق کرتا ہے ”یعنی مقتول کے واقعہ سے ذبح بقرہ کا کیا تعلق“؟ اچھا اگر واقعی یہ خدا کا حکم ہے تو وہ گائے کیسی ہو؟ اس کا رنگ کیسا ہو؟ اس کی کچھ اور تفصیلی صفات معلوم ہونی چاہئیں، کیونکہ ابھی تک اس کے تعین کے متعلق ہم مشتبہ حالت میں ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب وحی الٰہی کی معرفت ان کے تمام سوالات کے جواب دیے دیے اور حیلہ جوئی کا ان کے لیے کوئی موقعہ باقی نہیں رہا تب وہ تعمیل حکم پر آمادہ ہوئے اور وحی الٰہی کے مطابق معاملہ کا سرانجام کیا، خدا کے حکم سے وہ مقتول زندہ ہو گیا اور اس نے تمام واقعہ من و عن بیان کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب اس حیرت انگیز ”خدائی نشان“ نے حقیقت کو واشگاف کر دیا تو قاتل کو بھی اقرار کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہ رہا اور اس طرح نہ صرف قاتل ہی کا پتہ چل گیا بلکہ مختلف اسباط اور خاندانوں میں اختلاف پیدا ہو کر جو سخت خانہ جنگی اور خون ریزی کی صورت رونما ہو چلی تھی اس کا بھی خوش اسلوبی کے ساتھ خاتمہ ہو گیا۔

---

❶ گنتی باب ۱۴ آیات ۲۶۔ ۲۵

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اس تاریخی واقعہ کو یاد دلا کر دو باتوں کی جانب توجہ دلائی ہے، ایک منکرین معاد کو یہ بتایا ہے کہ جس قوم کے اسلاف میں یہ واقعہ ہو گذرا ہے وہ آج تک اس تاریخی واقعہ کی شاہد ہیں، لہٰذا جس طرح خدا نے اس وقت مردہ کو زندہ کر کے اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا تھا تم سمجھ لو وہ قیامت کے دن بھی اسی طرح مردے کو زندگی عطاء فرمائے گا۔ ﴿ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ﴾[1] دوسرے بنی اسرائیل کو بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو (یعنی تمہارے اسلاف کو) اتنی کثرت کے ساتھ اپنے نشان (معجزات) دکھائے ہیں کہ اگر دوسری قوم کے سامنے یہ مظاہرے کیے جاتے تو وہ ہمیشہ کے لیے خدائے تعالیٰ کی فرماں بردار بن جاتی اور اس کے دل میں ایک لمحہ کے لیے بھی نافرمانی کا خطرہ نہ گزرتا لیکن تم اور تمہارے اسلاف پر یا تو اثر ہی نہ ہوا اور اگر ہوا بھی تو ناپائیدار اور غیر مؤثر ثابت ہوا اور آج بھی اگر تم نبی اکرم ﷺ کا انکار اور ان کی مخالفت کر رہے ہو تو یہ تمہاری جبلت اور قدیم عصبیت و جہالت ہی کا اثر ہے۔

قرآن عزیز نے ہم کو اس واقعہ کے متعلق صرف اسی قدر بتایا ہے اور اس سے زیادہ کوئی تفصیل نہیں دی۔

﴿ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ
اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝۶۷ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا
فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝۶۸ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ
قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۝۶۹ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا
هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَ اِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝۷۰ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ
تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَ مَا
كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۷۱ وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝۷۲ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ
بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۷۳ ﴾ (البقرہ: ۶۷۔۷۳)

"اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا "بلاشبہ تم کو خدا یہ حکم دیتا ہے کہ تم گائے ذبح کرو" وہ کہنے لگے: "کیا تو ہمارے ساتھ مذاق کرتا ہے؟" موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: "میں اللہ سے پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ جاہلوں میں شمار ہوں" (یعنی یہ مذاق نہیں ہے) انہوں نے کہا: "تو اپنے پروردگار سے یہ دریافت کر کہ اس کی حقیقت کیا ہے"؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "اللہ تعالیٰ کہتا ہے وہ ایسی گائے ہو کہ نہ تو بڑھیا ہو اور نہ بچھیا بلکہ درمیانی عمر کی جوان ہو، پس اب جو تم سے کہا گیا ہے اس کی تعمیل کرو" وہ کہنے لگے: "اپنے خدا سے پوچھ کہ اس کا رنگ کیسا ہو"؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ "وہ گہرے زرد رنگ کی ہو کہ دیکھنے والے کو خوش رنگ معلوم ہو" کہنے لگے "ہم پر (ابھی تک) گائے کی کیفیت مشتبہ ہے اگر خدا کو منظور ہے تو ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے" وہ ایسی گائے ہو کہ نہ محنت ماری ہو کہ زمین میں ہل چلاتی ہو اور نہ

---

[1] اور اسی طرح اللہ تعالیٰ مردہ کو زندہ کر دیا کرتا ہے۔

Marfat.com

کھیت کو سیراب کرتی ہو۔ وہ بے داغ ہو جس پر کسی قسم کا دھبہ نہ ہو" کہنے لگے "اب تو صحیح بات لایا" پس انہوں نے اس کو حاصل کر کے ذبح کیا، اور قریب تھا کہ نہ کرتے اور "یہ جب ہوا کہ تم نے ایک جان کو قتل کر دیا۔ پھر آپس میں اختلاف کرنے لگے، اور اللہ ظاہر کرنے والا ہے اس بات کو جس کو تم چھپاتے ہو" پس ہم نے کہا "اس مقتول کو گائے کے بعض حصے کے ساتھ مس کرو (مارو) اللہ تعالیٰ اسی طرح مردوں کو زندہ کر دیتا ہے، اور تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔"

صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرماتے ہی "ذبح بقرہ" کی تعمیل کر دیتے تو ان کے لیے گائے کے معاملہ میں کسی قسم کی مطلق قید و بند نہ ہوتی اور وہ کوئی سی گائے بھی ذبح کر دیتے تو تعمیل پوری ہو جاتی مگر انہوں نے بیہودہ سوالات کر کے اپنے اوپر پابندیاں لگوائیں، چنانچہ پیغمبر خدا کے ساتھ اس قسم کی بیہودہ باتوں اور کج بحثیوں کی قرآن عزیز نے سخت مذمت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس کا آخر نتیجہ کفر اور ترک ایمان پر جا کر ختم ہوتا ہے، لہٰذا امت مسلمہ کو چاہیے کہ وہ اس قسم کی باتوں سے بچے۔

﴿اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝﴾ (البقرہ: ۱۰۸)

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر (ﷺ) سے اس قسم کے سوال کرو جس طرح پہلے زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوالات کیے گئے تھے اور جو شخص ایمان کے عوض کفر اختیار کرتا ہے وہ بلاشبہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔"

اس موقعہ پر یہ سوال ضرور سامنے آ جاتا ہے کہ آخر "ذبح بقرہ" اور مقتول کے زندہ کر دینے کے درمیان کیا مناسبت ہے جو احیاء مقتول کے لیے یہ خاص صورت اختیار کی گئی سو خدا کی حکمتوں اور مصلحتوں تک پہنچنا تو انسانی مقدرت سے باہر ہے تاہم عقل و شعور کی جو روشنی اس نے انسان کو بخشی ہے وہ اس طرف راہنمائی کرتی ہے کہ اگر بنی اسرائیل کی اس تاریخ پر نظر کی جائے جو گذشتہ صفحات میں سپرد قلم ہو چکی ہے تو یہ بات بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ مصر کے بود و ماند نے ان کے اندر بت پرستی خصوصاً گائے کی عظمت و تقدیس اور گوسالہ پرستی کا جذبہ بہت زیادہ پیدا کر دیا تھا جو جگہ جگہ ابھر آتا اور ان پر اثر انداز ہونے لگتا تھا، چنانچہ گوسالہ پرستی کے واقعہ کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے "تورات کی تعمیل" کے لیے فرمایا تو اس وقت بھی انہوں نے کافی حیلہ جوئی سے کام لیا تھا اور اگر "رفع طور" کا نشان ان پر ظاہر نہ ہوتا تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب پر اتر آتے تو کچھ تعجب نہ تھا، خدائے تعالیٰ نے اس موقعہ پر ارشاد فرمایا ہے کہ اس تعنت اور حیلہ سازی کی خصلت کا باعث وہی گئو سالہ پرستی ہے، ابھی تک ان کے دلوں سے بت پرستی اور گئو سالہ کی تقدیس کا عقیدہ دور نہیں ہوا بلکہ ان کی حالت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تقدیس ان کے دلوں میں رچ گئی ہے۔

﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا ۗ وَ اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (البقرہ: ۹۳)

Marfat.com

"اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے سروں پر طور بلند کر دیا (اور کہا) جو ہم نے تم کو دیا ہے اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اس پر کان دھرو۔ انہوں نے کہا "ہم نے سنا (اور عمل سے بتایا کہ) ہم نے نافرمانی کی" اور اصل بات یہ ہے کہ ان کے دلوں میں کفر کی وجہ سے گوسالہ رچ گیا ہے (اے مخاطب) کہہ دے اگر تم اپنے قول کے مطابق مومن ہو تو تمہارے ایمان نے یہ فیصلہ ہی برا کیا ہے۔"

﴿وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝﴾ (البقرہ: ۹۲)

"اور بے شبہ موسیٰ (علیہ السلام) تمہارے پاس واضح دلائل لے کر آئے۔ پھر تم نے اس کے بعد گوسالہ بنالیا اور تم خود اپنے لیے ظالم ہو۔"

پس اس موقع پر خدا کی مصلحت نے یہ فیصلہ کیا کہ بنی اسرائیل کی اس گمراہی کو کسی ایسے عمل سے دور کرے جس کا مشاہدہ خود ان کی آنکھیں کر رہی ہوں لہٰذا ان کو مشاہدہ کرایا کہ جس کی تقدیس تمہارے دل میں اس قدر پیوست ہو گئی ہے کہ بار بار نمایاں ہوتی ہے، اس (گائے) کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کو فنا کے گھاٹ اتار دیا اور وہ تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکی اور کہیں یہ خیال نہ کر بیٹھنا کہ یہ گائے کی تقدیس ہی کا اثر تھا کہ اس کے پارۂ گوشت کے مس کرنے سے مردہ زندہ ہو گیا اس لیے کہ اگر موت و حیات کا یہ معاملہ گائے کی تقدیس سے متعلق تھا، تو جس پارۂ گوشت نے مردہ کو زندہ کر دیا وہ خود زندگی حاصل کر کے کیوں دوبارہ جیتی جاگتی گائے نہ بن گیا، کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ گائے جس کو تم نے ذبح کیا تھا اسی طرح بے جان پڑی ہے اور اس کے پارہائے جسم تمہارے درمیان زینت دسترخوان ہو چکے ہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ موت و حیات کا یہ معاملہ صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور جس "گوسالہ" کی محبت تمہارے دلوں میں رچ گئی ہے وہ تم سے بھی ادنیٰ ایک جان دار ہے جو صرف تمہاری خدمت اور ضرورت کے لیے بنایا گیا ہے نہ کہ تمہارے لیے "دیوتا" اور "دیوی"...... خدائے تعالیٰ ہی کی ذات واحد ہے کہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے حیات بخشے، چنانچہ تم نے ایک ہی واقعہ میں دونوں حقیقتوں کا مشاہدہ کر لیا کہ اس نے گائے کی زندگی کو فنا سے بدل دیا اور انسان کے مردہ جسم کو حیات تازہ بخش دی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

قرآن عزیز نے غالباً اسی حکمت کے پیش نظر "ذبح بقرہ" کے واقعہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، پہلے حصہ میں بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کے واقعہ کی تائید میں بقرہ کا یہ واقعہ بیان کیا گیا کہ جب ایک خاص مقصد کے لیے بنی اسرائیل سے گائے ذبح کرنے کو کہا گیا تھا تو یہی گوسالہ پرستی کی محبت ان کے آڑے آئی تھی اور مصریوں کے عقیدۂ تقدیس بقرہ (گائے کی تقدیس) کے اتباع میں انہوں نے بیسیوں حیلے اور بہانے تراشے اور یہ کوشش کی کہ کسی طرح ان کو گائے ذبح نہ کرنی پڑے، لیکن جب سوالات کی پیچیدگی میں آ کر پھنس گئے تو مجبوراً تعمیل کرنی پڑی۔

قرآن عزیز نے جب اس واقعہ سنایا تو قدرتی طور پر سامعین کو شوق پیدا ہونا چاہیے تھا کہ وہ یہ معلوم کریں کہ ذبح بقرہ کا وہ واقعہ کیوں اور کس طرح پیش آیا جس کے بارے میں بنی اسرائیل اس قدر حیلے تراش رہے تھے تو دوسرے حصہ میں قرآن عزیز نے اس پیدا شدہ فطری سوال کا جواب اس طرح دیا کہ اس واقعہ کے نمایاں پہلو کو بیان کر دیا جس کا بنی اسرائیل کی اس رد و کد کے ساتھ

Marfat.com

حقیقی تعلق تھا، اس لیے اس حصہ بیان کو دوبارہ لفظ "اذ" سے شروع کیا۔

قرآن عزیز کی ان آیات کی یہ وہ تفسیر ہے جو قرآن کے جملوں کے اندر محدود ہو کر کی گئی ہے، اور جس میں ذبح بقرہ کے واقعہ سے متعلق آیات میں تقدیم و تاخیر کی بحثوں میں جانے کی مطلق ضرورت پیش نہیں آتی اور نہ واقعہ کو اچنبھا سمجھ کر باطل اور رکیک تاویلات کی پناہ لینے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

بلاشبہ یہ واقعہ خدائے تعالیٰ کے ان مسلسل نشانوں میں سے ایک "نشان" تھا جو یہود کی سخت اور تند جبلت اور متمردانہ خصلت کے مقابلہ میں تائید حق کے لیے حکمت الٰہی کے پیش نظر ظہور میں آیا اور جو نشان ہونے کے علاوہ اپنے اندر متعدد اہم مصالح رکھتا تھا اور اس حقیقت ثابتہ کے لیے خود قرآن عزیز کا سیاق و سباق تائید کرتا ہے، چنانچہ اس واقعہ کے متصل ہی ارشاد ہے ﴿كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى﴾ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کر دے گا، اور اسی کے سیاق میں ارشاد فرمایا ﴿وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ﴾ تاکہ دکھائے تم کو اپنی قدرت کے "نشان"۔

گویا "ذبح بقرہ" کا واقعہ نقل کرنے سے قبل بنی اسرائیل کو بار بار خدائی نشان مشاہدہ کرانے کا ذکر اور پھر قصہ کے متصل ہی آخرت میں "احیاء موتی" کا اس واقعہ سے استشہاد اور پھر اس واقعہ کو بھی "آیات اللہ" میں سے ایک آیت (نشان) بتانا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ کسی تاویل اور دوراز کار باتوں کی پناہ لیے بغیر ان آیات کی صاف اور سادہ تفسیر وہی ہے جو سطور بالا میں بیان کی گئی۔

لہٰذا ان آیات کی وہ تفاسیر جو جدید معاصرین نے بیان کی ہیں اور جن میں تمام آیات متعلقہ کو کبھی دو جدا واقعات کہہ کر اور کبھی ایک واقعہ تسلیم کر کے مختلف رکیک اور لچر تاویلات سے کام لیا گیا ہے ناقابل تسلیم ہیں" اور قرآن عزیز کے منطوق کے خلاف۔

مثلاً کہا جاتا ہے کہ ذبح بقرہ کا یہ طریقہ دراصل خود بنی اسرائیل کی قدیم رسوم میں سے تھا جس کا ذکر اب تک تورات میں موجود ہے یعنی جب کسی جگہ ایسا مقتول پایا جاتا کہ اس کے قاتل کا پتہ نہ ملتا تو باہمی جنگ و جدال سے بچانے کے لیے یہ طریقہ مروج تھا کہ وہ ایک ایسی گائے کو حاصل کرتے جو نہ کاشت کے کام میں آئی ہو اور نہ سیرابی کی خدمت کر چکی ہو اور اس کو ایسی وادی میں لے جاتے جہاں کاشت کبھی نہ ہوئی ہو اور پانی کا نالہ بہہ رہا ہو، اور جس پر قاتل ہونے کا شبہ ہوتا تو اس کے محلہ، خاندان یا بستی کے لوگوں کو جمع کیا جاتا اور پھر کاہن آگے بڑھتا اور بہتے ہوئے پانی پر گائے کو کھڑا کر کے اس کی گردن مارتا اور جب اس کا خون پانی میں مل جاتا تو فوراً مشتبہ گروہ کے لوگ اٹھ کر اس خون آلود پانی سے ہاتھ دھوتے جاتے اور پکار پکار کر یہ کہتے جاتے کہ "نہ ہمارے ہاتھوں نے اس کو قتل کیا ہے اور نہ ہمیں قاتل کا پتہ معلوم ہے" پھر ان پر کوئی شبہ باقی نہ رہتا اور خانہ جنگی نہ ہونے پاتی، اور اگر مشتبہ گروہ کا ایک سردار بھی ہاتھ دھونے اور اس رسم میں شریک ہونے سے انکار کر دیتا تو پھر مقتول کا خون بہا اس خاندان یا محلہ پر ڈال دیا جاتا تھا جس کا وہ سردار ہے۔ ❶

اس تفسیر میں قرآن عزیز کے سیاق و سباق کے لحاظ سے جو نقائص ہیں وہ معمولی فہم و عقل سے بھی معلوم ہو سکتے ہیں لیکن ان کے علاوہ سب سے زیادہ قابل اعتراض یہ امر ہے کہ اگر بنی اسرائیل میں یہ دستور قدیم سے رائج تھا تو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی رسم کے مطابق خدائے تعالیٰ کا فیصلہ سنایا تو بنی اسرائیل نے اس کو اجنبی نگاہ سے کیوں دیکھا اور یہ کیوں کہا ﴿اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا﴾

---

❶ استثناء باب ۲۱ آیات ۹-۲

Marfat.com

اے موسیٰ علیہ السلام! کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے کہ گائے ذبح کرنے کو کہتا ہے، اور اگر ازراہ تعنت ان کا سوال تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام یہی جواب دیتے کہ اس میں حیرت وتعجب کا کون سا موقعہ ہے جبکہ تم خود جانتے ہو کہ قضیہ کے فیصلہ کا یہ پرانا طریقہ ہے۔

اس سلسلہ میں گائے حاصل کرنے سے متعلق کتب تفاسیر میں عجیب وغریب قصے مذکور ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام قصص "اسرائیلیات" سے منقول ہیں، یعنی یہ وہ قصے ہیں جو یہود کی نقل وروایت سے شہرت پا گئے اور تفسیروں میں بھی درج کر دیئے گئے ہیں مگر محققین نے ان کو چھان کر تفسیر قرآن سے بالکل جدا کر دیا ہے، چنانچہ حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ جیسے جلیل القدر مفسر نے ان قصص کے متعلق یہ فیصلہ دیا ہے:

"اور یہ سلسلہ بیانات جو عبیدہ، ابو العالیہ اور سدی اور دوسروں سے مروی ہے ان سب کے آپس میں اختلاف ہے، اور صاف بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی کتابوں سے ماخوذ ہیں اور اگرچہ ان کا نقل کرنا درجہ جواز میں آ سکتا ہے مگر ہم نہ ان کی تصدیق کرتے ہیں اور نہ تکذیب، اور اسی بنا پر ان روایات پر قطعاً کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا، مگر وہ روایات جو ہمارے نزدیک (قرآن وحدیث کی روشنی میں) حق ہوں۔ واللہ اعلم"

اور خاص اس واقعہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

گائے کا وہ کون سا حصہ تھا جو مردہ جسم پر مس کیا گیا سو وہ کوئی بھی حصہ ہو واقعہ میں جس قدر مذکور ہے معجزہ ہونے کے لیے وہ بھی کافی ہے، اور اگر اس حصہ کا تعین بھی ہمارے دینی دنیوی حالات کے اعتبار سے ضروری ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور واضح فرما دیتے۔ مگر اس نے اس کو مبہم ہی رکھا ہے اگرچہ اصل حقیقت کے لحاظ سے وہ بہرحال متعین ہے اور نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس کے تعین کے متعلق کوئی صحیح روایت ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے بھی یہی مناسب ہے کہ ہم بھی اس کو اسی طرح مبہم رہنے دیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کو مبہم رکھا ہے۔ [1]

علاوہ ازیں مسلم کی حدیث میں صرف اسی قدر مذکور ہے کہ "اگر بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام سے رد وکد نہ کرتے تو گائے کے معاملہ میں ان پر پابندیاں عائد نہ ہوتیں" پس اگر اس معاملہ سے متعلق اور تفاصیل بھی ہوتیں تو نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم ان کا بھی ذکر ضرور فرماتے۔

غرض یہ واقعہ حق تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک "عظیم نشان" ہے، البتہ قرآن عزیز نے جو تفصیل بیان کی ہے صرف اسی قدر قابل تسلیم ہے، باقی سب قصص وحکایات ہیں۔ اور لاطائل داستانیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات سے متعلق ان مباحث کا خطاب ان ہی مفسرین کے ساتھ ہے جو اصولاً معجزات انبیاء کے قائل ہیں مگر ان مقامات میں تاویل کی گنجائش سمجھ کر ایسی تاویلات کرتے ہیں جن کی بدولت یہ واقعات "معجزہ" کی حد سے باہر ہو جائیں، باقی جو ملاحدہ اسلام کے مسلمہ عقیدہ "معجزہ" کے ہی قائل نہیں ہیں اور اس لیے قرآن عزیز کے ایسے تمام واقعات کو باطل تاویلات کی نذر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں تو ان کے لیے سب سے پہلے نفس معجزہ کے امکان پر گفتگو ہونا چاہیے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے کہ ان عظیم الشان "آیات اللہ" کے مشاہدہ اور ان پر خدائے تعالیٰ کے

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۱۲

Marfat.com

بے غایت فضل و کرم کے باوجود ان بدبختوں پر کوئی اثر نہ ہوا اور یہ اسی طرح کج روی اور زیغ پر قائم رہے، قبول حق کے لیے ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے، بلکہ پیہم تمرد و سرکشی نے ان کی نیک استعداد کو فنا کر کے پتھر سے بھی زیادہ سخت بنا دیا، اس لیے کہ پتھر میں سختی ہوتے ہوئے بھی اس سے مخلوق خدا کو بہت سے فائدے ہیں، مگر ان کی زندگی کا تو بجز خسارہ اور نقصان کے اور کچھ حاصل نہیں رہا۔

﴿ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (البقرہ: ۷۴)

"اس (مشاہدہ) کے بعد ان کے دل سخت ہو گئے پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا (دل نہیں) پتھر ہیں یا (یوں سمجھو) کہ پتھر سے بھی زیادہ سخت (یہ بات واضح ہے) کہ بعض پتھروں سے پانی نکل کر نہریں بہتی ہیں اور بعض چیخ کر پھٹتے ہیں تو ان سے سوت جاری ہو جاتے ہیں اور بعض خدا کے خوف سے (بھونچال وغیرہ حالتوں میں) نیچے لڑھک آتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ تمہاری کرتوتوں سے غافل نہیں ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے قلوب کی سختی اور قبول حق میں بے اثری کا یہ عالم ہے کہ اگر محاورہ اور بول چال کے مطابق یوں کہہ دیا جائے کہ ان کا دل پتھر کا ٹکڑا بن گیا ہے تب بھی ان کی شدت و صلابت کی صحیح تصویر سامنے نہیں آ سکتی، اس لیے کہ پتھر اگرچہ سخت ہے مگر ناکارہ نہیں ہے، کیا تم نے پہاڑوں کا مشاہدہ نہیں کیا اور نہیں دیکھا کہ ان ہی سخت پتھروں سے ندیاں اور دریا بہہ رہے ہیں اور کہیں ان ہی سے شیریں اور خنک پانی کے سوت جاری ہیں اور اگر بھونچال آ جائے یا خدا کی مشیت کا کوئی اور فیصلہ ہو جائے تو پہاڑوں کی یہی دیو پیکر چٹانیں روئی کے گالوں کی طرح ٹوٹ کر اور اُڑ کر سرنگوں ہو جاتی اور خدائے تعالیٰ کے خوف و خشیت کا زبان حال سے اقرار کرتی نظر آتی ہیں مگر ان میں بنی اسرائیل پر نہ آیات اللہ کا اثر ہوتا ہے نہ پیغمبر کی شیریں اور دل نشیں پند و نصائح کا اور نہ نافرمانی کرتے وقت خدا کا خوف ان کے دلوں پر طاری ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قارون:

بنی اسرائیل میں ایک بہت بڑا متمول شخص تھا، قرآن عزیز نے اس کا نام قارون بتایا ہے، اس کے خزانے زر و جواہر سے پُر تھے، اور قوی ہیکل مزدوروں کی جماعت بمشکل اس کے خزانوں کی کنجیاں اٹھا سکتی تھی، اس تمول اور سرمایہ داری نے اس کو بے حد مغرور بنا دیا تھا اور وہ دولت کے نشہ میں اس قدر چور تھا کہ اپنے عزیزوں، قرابت داروں اور قوم کے افراد کو حقیر اور ذلیل سمجھتا اور ان سے حقارت کے ساتھ پیش آتا تھا۔

مفسرین کہتے ہیں کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا اور اس کا نسب اس طرح نقل فرماتے ہیں:

قارون بن یصر بن قاہث۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب یہ ہے: موسیٰ بن عمران بن قاہث۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی منقول ہے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ قارون قیام مصر کے زمانہ میں فرعون کا درباری ملازم رہا تھا اور دولت کا یہ بے انتہا انبار اس نے وہیں جمع کیا تھا، اور سامری منافق تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین میں اعتقاد نہیں رکھتا تھا۔ [1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم نے ایک مرتبہ اس کو نصیحت کی کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو بے شمار دولت و ثروت بخشی ہے اور عزت و حشمت عطاء فرمائی ہے لہٰذا اس کا شکر ادا کر اور مالی حقوق "زکوٰۃ و صدقات" دے کر غرباء، فقراء اور مساکین کی مدد کر، خدا کو بھول جانا اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنا اخلاق و شرافت دونوں لحاظ سے سخت ناشکری اور سرکشی ہے، اس کی دی ہوئی عزت کا صلہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ تو کمزوروں اور ضعیفوں کو حقیر و ذلیل سمجھنے لگے اور نخوت و پندار میں غریبوں اور عزیزوں کے ساتھ نفرت سے پیش آئے۔

قارون کے جذبہ انانیت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ نصیحت پسند نہ آئی اور اس نے مغرورانہ انداز میں کہا: موسیٰ علیہ السلام! میری یہ دولت و ثروت تیرے خدا کی عطاء کردہ نہیں ہے، یہ تو میرے عقلی تجربوں اور علمی کاوشوں کا نتیجہ ہے ﴿اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ﴾ میں تیری نصیحت مان کر اپنی دولت کو اس طرح برباد نہیں کر سکتا۔

مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام برابر اپنے فرض تبلیغ کو انجام دیتے اور قارون کو راہ ہدایت دکھاتے رہے، قارون نے جب یہ دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتے تو ان کو زچ کرنے اور اپنی دولت و حشمت کے مظاہرہ سے مرعوب کرنے کے لیے ایک دن بڑے کروفر کے ساتھ نکلا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے مجمع میں پیغام الٰہی سنا رہے تھے کہ قارون ایک بڑی جماعت اور خاص شان و شوکت اور خزانوں کی نمائش کے ساتھ سامنے سے گزرا اشارہ یہ تھا کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا تو میں بھی ایک کثیر جتھ رکھتا ہوں اور زر و جواہر کا بھی مالک ہوں لہٰذا ان دونوں ہتھیاروں کے ذریعہ موسیٰ علیہ السلام کو شکست دے کر رہوں گا۔

بنی اسرائیل نے جب قارون کی اس دنیوی ثروت و عظمت کو دیکھا تو ان میں سے کچھ آدمیوں کے دلوں میں انسانی کمزوری نے یہ جذبہ پیدا کیا کہ وہ بے چین ہو کر یہ دعا کرنے لگے: "اے کاش یہ دولت و ثروت اور عظمت و شوکت ہم کو بھی نصیب ہوتی" مگر بنی اسرائیل کے ارباب بصیرت نے فوراً مداخلت کی اور ان سے کہنے لگے "خبردار! اس دنیوی زیب و زینت پر نہ جانا اور اس کے لالچ میں گرفتار نہ ہو بیٹھنا، تم عنقریب دیکھو گے کہ اس دولت و ثروت کا انجام بد کیسا ہونے والا ہے"؟

آخر کار جب قارون نے کبر و نخوت کے خوب خوب مظاہرے کر لیے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے مسلمانوں کی تحقیر و تذلیل میں کافی سے زیادہ زور صرف کر لیا تو اب غیرت حق حرکت میں آئی اور پاداش عمل کے فطری قانون نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور قارون اور اس کی دولت پر خدا کا یہ اٹل فیصلہ ناطق کر دیا ﴿فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ﴾ "ہم نے قارون اور اس کے سرمایہ کدہ کو زمین کے اندر دھنسا دیا" اور بنی اسرائیل کے آنکھوں دیکھتے نہ غرور باقی رہا اور نہ سامان غرور سب کو زمین نے نگل کر عبرت کا سامان مہیا کر دیا، قرآن عزیز نے متعدد مقامات پر اس واقعہ کو مفصل اور مجمل بیان کیا ہے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۳۰۹

Marfat.com

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍۙ۝۲۳ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ قَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ۝۲۴﴾ (المؤمن: ۲۳۔۲۴)

"اور بے شبہ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں اور ظاہر وزبردست حجت (توراۃ) دے کر فرعون، ہامان اور قارون کے پاس بھیجا تھا پس ان سب نے یہ کہا کہ یہ تو جادوگر ہے بڑا جھوٹا۔"

﴿وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ وَ مَا كَانُوْا سٰبِقِیْنَ۝۳۹ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّیْحَةُ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ۝۴۰﴾
(العنکبوت: ۳۹۔۴۰)

"اور بلاشبہ ان کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) کھلی نشانیاں لے کر آیا پھر انہوں نے زمین میں کبر وغرور اختیار کیا، اور وہ ہم سے جیت جانے والے نہیں تھے، پھر سب کو پکڑا ہم نے اپنے اپنے گناہ پر، پھر کسی پر ہم نے ہوا سے پتھراؤ کیا، اور کسی کو چیخ نے آدبایا، اور کسی کو زمین میں دھنسا دیا، اور کسی کو ہم نے غرق کردیا، اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود آپ اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے۔"

قارون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق صحیح حالات صرف اسی قدر ہیں، باقی روایات "اسرائیلیات" سے ماخوذ ہیں، اس لیے ناقابل اعتماد ہیں، اسی لیے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

وقد ذکر ھٰھنا اسرائیلیات اضربنا عنها صفحًا. (ابن کثیر سورہ القصص)

"اور اس مقام پر بہت سی اسرائیلیات بیان کی گئی ہیں ہم نے ان کو نظر انداز کردیا ہے۔"

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ﴿اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ﴾ میں علم سے مراد علم کیمیاء ہے اور وہ قارون کی دولت کو اس کی کیمیاء دانی کا رہین منت بتاتے ہیں، محققین نے اس کی تردید فرمائی ہے، اور یہ واضح کیا ہے کہ اس کا مقصد "علم" سے اپنی عقل ودانش کے ذریعہ حصول مال ہے اور کیمیا کی باتیں سب دور از کار ہیں۔

علماء تفسیر اس میں متردد ہیں کہ قارون کا واقعہ کب پیش آیا؟۔ مصر میں قبل غرق فرعون یا "تیہ" میں بعد غرق فرعون، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر قبل غرق کا ہے تو آیت میں "دار" اپنے حقیقی معنی میں ہے اور اگر میدان تیہ کا واقعہ ہے تو "دار" سے خیمہ وخرگاہ مراد ہے، ہمارے نزدیک یہ واقعہ میدان تیہ کا ہے اس لیے کہ قرآن عزیز نے اس کو غرق فرعون سے متعلق واقعات کے بعد بیان کیا ہے:

﴿اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰی فَبَغٰی عَلَیْهِمْ ۪ وَ اٰتَیْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ۝۷۶ وَ ابْتَغِ فِیْمَاۤ اٰتٰىكَ

اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا وَاَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ
فِی الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ ؕ اَوَلَمْ یَعْلَمْ اَنَّ
اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا یُسْـَٔلُ عَنْ
ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا
مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ۝ وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ
لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۫ فَمَا كَانَ لَهٗ
مِنْ فِئَةٍ یَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِیْنَ ۝ وَاَصْبَحَ الَّذِیْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ
بِالْاَمْسِ یَقُوْلُوْنَ وَیْكَاَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَیَقْدِرُ ۚ لَوْلَاۤ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ
عَلَیْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَیْكَاَنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ
عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝ ﴾ (القصص : ۷۶۔۸۳)

" بیشک قارون، موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم ہی میں سے تھا، پس اس نے ان پر سرکشی کی اور ہم نے اس کو اس قدر خزانے دیئے تھے کہ اس کی کنجیوں کے بوجھ سے طاقتور آدمی تھک جاتے تھے جب اس کی قوم نے کہا تو شیخی نہ مار اللہ شیخی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے اور جو کچھ تجھ کو خدا نے دیا ہے اس میں آخرت کو تلاش کر، اس کو نہ بھول کہ دنیا میں اس نے تجھ کو کیا کچھ دے رکھا ہے، اور جس طرح خدا نے تیرے ساتھ بھلائی کی ہے تو بھی اسی طرح بھلائی کر، اور فساد کے درپے نہ ہو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ قارون کہنے لگا یہ مال تو مجھ کو میرے ایک ہنر سے ملا ہے جو مجھ کو آتا ہے، کیا وہ اس سے بے خبر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے اس سے کہیں زیادہ مال دار اور طاقتور قوموں کو ہلاک کر دیا۔ اور نہ سوال کیا جائے مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارہ میں (یعنی ان کی عقلیں ماری گئی ہیں تب ہی تو گناہ میں مبتلا ہیں پھر سوال سے کیا فائدہ) پھر نکلا ایک دن قوم کے سامنے بن سنور کر خدم و حشم کے ساتھ تو جو لوگ دنیا کے طالب تھے انہوں نے اس کو دیکھ کر کہا " اے کاش ہمیں بھی یہ سب کچھ ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے بلاشبہ یہ بڑے نصیب والا ہے، اور جن لوگوں کو اللہ نے بصیرت و علم عطاء کیا تھا انہوں نے کہا تمہیں ہلاکی ہو جو اللہ پر ایمان لایا اور نیک عمل کیے اس کے لیے اللہ کا ثواب اس دولت سے بہتر ہے اور اس کو نہیں پاتے مگر صبر کرنے والے، پھر ہم نے قارون اور اس کے محل کو زمین میں دھنسا دیا، پس اس کے لیے کوئی جماعت مددگار ثابت نہیں ہوئی، جو خدا کے عذاب سے اس کو بچائے اور وہ بے یار و مددگار ہی رہ گیا اور جنھوں نے کل اس کی شان و شوکت دیکھ کر اس جیسا ہو جانے کی تمنا کی تھی وہ یہ دیکھ کر آج یہ کہنے لگے ارے خرابی یہ تو اللہ تعالیٰ کھول دیتا ہے روزی جس کو چاہے اپنے بندوں میں اور تنگ کر دیتا ہے، اگر احسان نہ کرتا اللہ ہم پر تو ہم کو بھی دھنسا دیتا ارے خرابی یہ تو چھٹکارا نہیں پاتے منکر یہ آخرت کا گھر ہم نے ان لوگوں کے لیے بنایا ہے جو (خدا کی) زمین میں شیخی نہیں مارتے اور نہ

فساد کے خواہش مند ہوتے ہیں اور انجام کی بھلائی متقیوں کے لیے ہے۔"

تورات نے بھی اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، [1] مگر اس کے بیان اور قرآن عزیز کی تصریحات کو پڑھنے کے بعد ایک انصاف پسند انسان کو یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قرآن عزیز جب کسی تاریخی واقعہ کو نقل کرتا ہے تو اس کے صرف ان ہی اجزاء کو بیان کرتا ہے جو غرض اور مقصد "نصیحت وعبرت" کے لیے ضروری ہوں اور زائد از حاجت تفصیلات کو نظر انداز کرتا جاتا ہے لیکن تورات میں اکثر بے ضرورت تفاصیل بیان ہوتی ہیں اور بعض جگہ تو بے محل طوالت بلکہ تضاد بیان تک پایا جاتا ہے جن کو ہم حسب موقعہ بیان کرتے جاتے ہیں چنانچہ اس مقام پر بھی بعض غیر ضروری حصوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ایذاء بنی اسرائیل:

گذشتہ واقعات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قول اور عمل دونوں طریقوں سے سخت اذیتیں پہنچائیں حتیٰ کہ بہتان طرازی اور تہمت تراشی سے بھی باز نہیں رہے۔

بت پرستی کی فرمائش، گوسالہ پرستی میں انہماک، قبول تورات سے انکار، ارض مقدس میں داخلہ سے انکار، من وسلویٰ پر ناسپاسی، غرض ہر ادائے فرض میں ضد اور ہٹ اور ہر ایک معاملہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جاہلانہ رَدّ وکد کا ایک طویل سلسلہ ہے جو ان کی زندگی کا جز نظر آتا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ضبط وصبر کے ساتھ ایک اولوالعزم رسول کی طرح ان کو برداشت کرتے اور رشد و ہدایت کے پیغام میں منہمک نظر آتے ہیں۔

قرآن عزیز کی تصریحات کے علاوہ تاریخی حیثیت سے اگر بنی اسرائیل کی ان خصوصیات کا مطالعہ مقصود ہو تو تورات کے حسب ذیل ابواب قابل مراجعت ہیں:

خروج باب ۱۲ آیات ۱۲۔۱۱، باب ۱۶ آیات ۳۔۲، گنتی باب ۱۴۔ آیات ۳۔۱، باب ۱۶ آیات ۱۴۔۱۳، باب ۷ آیات ۳۱۔۱۲۔ استثناء باب ۹ آیات ۲۴۔۲۳۔

لیکن قرآن عزیز نے ان واقعات کے علاوہ جن کا ذکر صفحات گذشتہ میں تفصیل سے آچکا ہے، سورۂ احزاب اور سورۂ صف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کی ایذاء رسانی پر مذمت کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ۝﴾ (الاحزاب: ۶۹)

﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝﴾ (الصف: ۵)

"اے ایمان والو! تم ان بنی اسرائیل کی طرح نہ بنو جنہوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو ایذاء پہنچائی، پھر اللہ نے ان کو اس بات

---

[1] تورات گنتی باب ۱۶ آیات ۳۴۔۳۰

Marfat.com

سے بری کر دیا جو وہ اس کے متعلق کہتے تھے اور موسیٰ اللہ کے نزدیک صاحب وجاہت ہے۔ اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا اے قوم! تو کس لیے مجھ کو ایذاء پہنچاتی ہے جبکہ تجھ کو یہ معلوم ہے کہ میں تمہاری جانب خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں، پھر جب وہ کجی پر اڑ بیٹھے تو اللہ نے بھی ان کے دلوں پر کجی کو مسلط کر دیا۔ اور اللہ نافرمان قوم کو راہ یاب نہیں کیا کرتا۔"

اس لیے علماء تفسیر نے ان ہر دو مقام پر بحث کی ہے کہ یہاں جس ایذاء کا تذکرہ کیا گیا ہے کیا اس سے وہی حالات مراد ہیں جو بنی اسرائیل کی سرکشی اور تعنت کے سلسلہ میں بیان ہو چکے ہیں اور جن کا پورا سلسلہ یقیناً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اذیت کا باعث تھا، یا ان کے علاوہ کسی اور خاص واقعہ کی جانب اشارہ ہے، چنانچہ بعض مفسرین نے تو یہ فرمایا کہ اس سے وہی ایذاء مراد ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے تعنت اور ضد کی وجہ سے پہنچتی رہی تھی اور بعض مفسرین نے ان ہر دو آیات کا مصداق گذشتہ واقعات سے جدا واقعہ کو بتایا ہے، اور وہ فرماتے ہیں کہ بعض صحیح احادیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے درمیان ایسے واقعات کا تذکرہ پایا جاتا ہے جن کا تفصیلی ذکر قرآن عزیز میں موجود نہیں ہے لہٰذا ان کے واقعات میں سے کوئی ایک مخصوص واقعہ یا وہ سب واقعات ان آیات کے مصداق ہیں اور وہی ان کے لیے شان نزول کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان واقعات میں سے ایک واقعہ بخاری اور مسلم میں مذکور ہے اور وہ یہ کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر شرم و حیاء کا بہت غلبہ تھا حتیٰ کہ وہ اپنے برہنہ بدن کے کسی حصہ پر بھی نگاہ نہیں پڑنے دیتے تھے۔ اس کے برعکس بنی اسرائیل مجمع عام میں برہنہ ہو کر غسل کرنے کے عادی تھے، اس لیے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تنگ کرتے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے کبھی کہتے کہ ان کے خاص حصہ جسم پر برص کے داغ ہیں کبھی کہتے کہ ان کو ادرۃ (فوطوں کا متورم ہو کر بڑھ جانا) کا مرض ہے یا کوئی اور اسی قسم کا خراب مرض ہے تب ہی تو چھپ کر علیحدہ نہاتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام سنتے اور خاموش رہتے، آخر اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی ہوئی کہ ان کو اس تہمت سے پاک اور بری کرے، چنانچہ ایک روز وہ علیحدہ آڑ میں نہانے کی تیاری کر رہے تھے، کپڑے اتار کر پتھر پر رکھ دیئے، پتھر خدا کے حکم سے اپنی جگہ سے سرکا اور جہاں مجمع میں بنی اسرائیل برہنہ نہا رہے تھے، وہاں چل کر پہنچ گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام گھبراہٹ اور غصہ میں اس کے پیچھے یہ کہتے ہوئے دوڑے "ثوبی حجر، ثوبی حجر" (اے پتھر! میرے کپڑے، اے پتھر! میرے کپڑے) پتھر جب مجمع کے سامنے ٹھہر گیا تو سب نے دیکھ لیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بیان کردہ ہر قسم کے عیب سے پاک و صاف ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اس اچانک واقعہ کا ایسا اثر پڑا کہ غصہ میں جھنجھلا کر پتھر پر لاٹھی کے چند وار کر دیئے جس سے اس پر نشان پڑ گئے۔

بخاری اور مسلم نے اس کو متعدد طریقوں سے روایت کیا ہے، ان میں سے ایک طریقہ میں اس واقعہ کو سورۂ احزاب کی اس آیت کا شان نزول قرار دیا ہے جس میں بنی اسرائیل کی ایذاء اور خدائے تعالیٰ کی جانب سے موسیٰ علیہ السلام کی براءت کا ذکر ہے۔

اور اسی آیت کے شان نزول میں ابن ابی حاتم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت نقل کی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام پہاڑ (ہور) پر گئے مگر حضرت ہارون علیہ السلام کا وہیں انتقال ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام تنہا واپس ہوئے۔ بنی اسرائیل نے یہ دیکھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت رکھی کہ اس نے ہارون علیہ السلام کو قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس تہمت سے بہت دکھ پہنچا تب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ ہارون علیہ السلام کی نعش کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کریں۔

Marfat.com

فرشتوں نے فضاء میں حضرت ہارون علیہ السلام کی نعش بنی اسرائیل کے مجمع میں پیش کی، اور انہوں نے یہ دیکھ کر اطمینان حاصل کیا کہ واقعی ہارون علیہ السلام پر قتل کا کوئی نشان نہیں ہے۔

تیسری روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی سے کتب تفاسیر میں منقول ہے کہ جب قارون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت بہت ناگوار گذرنے لگی تو ایک دن اس نے ایک پیشہ ور عورت کو کچھ روپے دے کر اس پر آمادہ کر لیا کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پند و نصیحت میں مصروف ہوں اس وقت تو ان پر الزام لگانا کہ یہ شخص مجھ سے تعلق رکھتا ہے، چنانچہ دوسرے دن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام وعظ فرما رہے تھے تو اس عورت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر الزام لگایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ سن کر سجدہ میں گر پڑے اور پھر سر اٹھا کر عورت کی جانب مخاطب ہوئے کہ تو نے جو کچھ ابھی کہا تھا کیا خدا کی قسم کھا کر کہہ سکتی ہے کہ یہ سچ ہے؟ یہ سن کر عورت پر رعشہ طاری ہو گیا اور اس نے کہا بخدا سچ بات یہ ہے کہ قارون نے مجھ کو روپیہ دے کر اس الزام پر آمادہ کیا تھا ورنہ تو آپ اس سے بری اور پاک ہیں، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قارون کے لیے بددعا کی اور وہ خدا کے حکم سے مع ساز و سامان زمین میں دھنسا دیا گیا۔

محاکمہ:

اس بحث میں صحیح مسلک یہ ہے کہ جب قرآن عزیز نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متعلق ایذاء کے واقعہ کو مجمل بیان کیا ہے اور اس کی کوئی تعیین نہیں کی تو ہمارے لیے بھی یہی مناسب ہے کہ اس کی تفصیل اور تعیین کے بغیر، نفس واقعہ پر ایمان لائیں اور کسی خاص واقعہ سے متعلق نہ کریں اور جس حکمت و مصلحت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کو مجمل رکھنا مناسب سمجھا، ہم بھی اسی پر اکتفاء کریں۔ اور اگر تفصیل اور تعیین کی جانب توجہ دینا ضروری ہے تو پھر یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ان ہر دو آیات کا مصداق وہ تمام واقعات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایذاء رسانی سے متعلق قرآن عزیز اور صحیح احادیث میں منقول ہیں، اور اس امر کا لحاظ کرتے ہوئے کہ زیر بحث ایذاء کا معاملہ اس نوعیت کا ہے کہ جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وجاہت پر اثر پڑتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے اس کا دفاع کر کے ان کے قولی ہفوات سے ان کو بری اور پاک ثابت کر دیا تو ان ہر دو آیات کے مصداق کی تعیین میں وہ تینوں روایات قابل ترجیح ہیں جو کتب احادیث سے نقل کی جا چکی ہیں، اور وہ سب ان آیات کا مصداق ہیں۔

رہا یہ امر کہ شان نزول کے لیے کسی ایک واقعہ کا مخصوص ہونا ضروری ہے تو بقول حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ یہ درست نہیں ہے بلکہ شان نزول کی اصل حقیقت یہ ہے کہ زمانہ نبوت میں پیش آنے والے وہ تمام واقعات جو کسی آیت کا مصداق بن سکتے ہوں۔ اس آیت کے لیے یکساں طور پر شان نزول کہے جا سکتے ہیں۔

اس مقام کی تفسیر میں نجار نے قصص الانبیاء میں ایک طویل بحث کی ہے اور ان کے درمیان اور مصر کی مجلس علماء کے درمیان جو بحث و تمحیص ہوئی ہے اس کو بھی نقل کیا ہے مگر ہم چونکہ دونوں خیالات کے پوری طرح ہم نوا نہیں ہیں اور مفسرین قدیم میں ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اور ابن حیان کے رجحانات کے مؤید ہیں اس لیے اس بحث کو نظر انداز کرتے ہیں۔

حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات:

گذشتہ واقعات میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے ارض مقدس میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا تو اللہ

Marfat.com

تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ان کو یہ اطلاع کر دی تھی کہ چالیس سال تک اب تم کو اسی سرزمین میں بھٹکنا پڑے گا اور سرزمین مقدس میں ان افراد میں سے کوئی بھی داخل نہ ہو سکے گا، جنہوں نے داخل ہونے سے اس وقت انکار کر دیا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ان کو یہ بھی بتایا کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام بھی تمہارے پاس ہی رہیں گے کیونکہ ان کی اور آنے والی نسل کی رشد و ہدایت کے لیے ان دونوں کا یہاں موجود رہنا ضروری ہے، چنانچہ جب بنی اسرائیل "تیہ" کے میدان میں گھومتے اور پھرتے پھراتے پہاڑ کی اس چوٹی کے قریب پہنچے جو "ہور" کے نام سے مشہور تھی تو حضرت ہارون علیہ السلام کو پیغام اجل آ پہنچا وہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا کے حکم سے "ہور" پر چڑھ گئے اور وہیں کچھ روز عبادت الٰہی میں مصروف رہے اور جب حضرت ہارون علیہ السلام کا وہاں انتقال ہو گیا تب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی تجہیز و تکفین کے بعد نیچے اترے اور بنی اسرائیل کو ہارون علیہ السلام کی وفات سے مطلع کیا۔ تورات میں اس واقعہ کو اس طرح ادا کیا ہے:

"اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت قادس سے روانہ ہو کر کوہ ہور پہنچی اور خداوند نے کوہ ہور پر ادوم کی سرحد سے ملا ہوا تھا، موسیٰ اور ہارون علیہ السلام سے کہا ہارون اپنے لوگوں میں جا ملے گا کیونکہ وہ اس ملک میں جو میں نے بنی اسرائیل کو دیا ہے جانے نہیں پائے گا اس لیے کہ مریبہ کے چشمہ پر تم نے میرے کلام کے خلاف عمل کیا لہٰذا تو ہارون اور اس کے بیٹے الیعزر کو اپنے ساتھ لے کر کوہ ہور کے اوپر آ جا اور ہارون کے لباس کو اتار کر اس کے بیٹے الیعزر کو پہنا دینا کیونکہ ہارون وہیں وفات پا کر اپنے لوگوں میں جا ملے گا۔ اور موسیٰ (علیہ السلام) نے خداوند کے حکم کے مطابق عمل کیا اور ساری جماعت کی آنکھوں کے سامنے کوہ ہور پر چڑھ گئے اور موسیٰ (علیہ السلام) نے ہارون (علیہ السلام) کے لباس کو اتارا اس کے بیٹے الیعزر کو پہنا دیا اور ہارون نے وہیں پہاڑ کی چوٹی پر رحلت کی تب موسیٰ اور الیعزر پہاڑ پر سے اتر آئے جب جماعت نے دیکھا کہ ہارون نے وفات پائی تو اسرائیل کے سارے گھرانے کے لوگ ہارون (علیہ السلام) پر تیس دن تک ماتم کرتے رہے۔" [1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات زندگی میں ایک اہم واقعہ اس ملاقات کا ہے جو ان کے اور ایک صاحب باطن کے درمیان ہوئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے عالم تکوینیات کے بعض رموز و اسرار معلوم کیے۔ اس ملاقات کا ذکر تفصیل کے ساتھ سورۂ کہف میں کیا گیا ہے، اور بخاری میں اس واقعہ سے متعلق بعض مزید تفصیلات مذکور ہیں، بخاری میں سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کیا کہ نوف بکالی کہتا ہے کہ موسیٰ صاحب خضر، موسیٰ صاحب بنی اسرائیل نہیں ہیں، یہ ایک دوسرے موسیٰ ہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "دشمن خدا جھوٹ کہتا ہے" مجھ سے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ ارشاد فرماتے تھے کہ ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو خطاب فرما رہے تھے کہ کسی شخص نے دریافت کیا، اس زمانہ میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مجھے خدا نے سب سے زیادہ علم عطاء فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ بات پسند نہ آئی اور ان پر عتاب ہوا کہ تمہارا منصب تو یہ تھا کہ اس کو علم الٰہی کے سپرد کرتے اور

[1] گنتی باب ۲۰ آیات ۲۲-۲۹

Marfat.com

کہتے "واللہ اعلم" اور پھر وحی نازل فرمائی کہ جہاں دو سمندر ملتے ہیں (مجمع البحرین) وہاں ہمارا ایک بندہ ہے جو بعض امور میں تجھ سے بھی زیادہ عالم و دانا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا "پروردگار! تیرے اس بندے تک رسائی کا کیا طریقہ ہے" اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مچھلی کو اپنے توشہ دان میں رکھ لو، پس جس مقام پر وہ مچھلی گم ہو جائے اسی جگہ وہ شخص ملے گا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مچھلی کو توشہ دان میں رکھا اور اپنے خلیفہ یوشع بن نون کو ساتھ لے کر "مرد صالح" کی تلاش میں روانہ ہو گئے، جب چلتے چلتے ایک مقام پر پہنچے تو دونوں ایک پتھر پر سر رکھ کر سو گئے مچھلی میں زندگی پیدا ہوئی اور وہ زنبیل سے نکل کر سمندر میں چلی گئی مچھلی پانی کے جس حصہ میں بہتی ہوئی گئی اور جہاں تک گئی وہاں تک پانی برف کی طرح جم کر ایک چھوٹی سی پگڈنڈی کی طرح ہو گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمندر میں ایک لکیر یا خط کھنچا ہوا ہے۔

یہ واقعہ یوشع نے دیکھ لیا تھا کیوں کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے بیدار ہو گئے تھے مگر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے تو ان سے ذکر کرنا بھول گئے اور پھر دونوں نے اپنا سفر شروع کر دیا اور اس دن اور رات میں آگے ہی بڑھتے گئے، جب دوسرا دن ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اب تھکان زیادہ محسوس ہونے لگا وہ مچھلی لاؤ تاکہ بھوک رفع کریں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی منزل مقصود تک پہنچنے میں کوئی تھکان نہیں ہوا تھا مگر منزل سے آگے غلطی سے نکل گئے تو اب تھکان بھی محسوس ہونے لگا" یوشع نے کہا، آپ کو معلوم رہے کہ جب ہم (صخرہ) پتھر کی چٹان پر تھے تو وہیں مچھلی کا یہ تعجب خیز واقعہ پیش آیا کہ اس میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ مکتل (زنبیل) میں سے نکل کر سمندر میں چلی گئی اور اس کی رفتار پر سمندر میں راستہ بنتا چلا گیا، میں آپ سے یہ واقعہ کہنا بالکل بھول گیا، یہ بھی شیطان کا ایک چرکا تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سمندر کا وہ خط مچھلی کے لیے "سرب" (راستہ) تھا، اور موسیٰ علیہ السلام و یوشع کے لیے "عجب" (تعجب خیز بات)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جس مقام کی ہم کو تلاش ہے وہ وہی مقام تھا اور یہ کہہ کر دونوں پھر ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہوئے اسی راہ پر لوٹے اور اس "صخرہ" (پتھر کی چٹان) تک جا پہنچے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اس جگہ عمدہ لباس پہنے ہوئے ایک شخص بیٹھا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو سلام کیا، اس شخص نے کہا کہ تمہاری اس سرزمین میں "سلام" کہاں؟ (یعنی اس سرزمین میں تو مسلمان نہیں رہتے) یہ خضر تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ میرا نام موسیٰ ہے۔

خضر علیہ السلام نے کہا: موسیٰ بنی اسرائیل؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہاں! میں تم سے وہ علم حاصل کرنے آیا ہوں جو خدا نے تم ہی کو بخشا ہے خضر علیہ السلام نے کہا: "تم میرے ساتھ رہ کر ان معاملات پر صبر نہ کر سکو گے، موسیٰ! خدائے تعالیٰ نے مجھ کو تکوینی رموز و اسرار کا وہ علم عطاء کیا ہے جو تم کو نہیں دیا گیا اور اس نے تم کو (تشریعی علوم کا) وہ علم عطاء فرمایا ہے جو مجھ کو عطاء نہیں ہوا" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "انشاء اللہ آپ مجھ کو صابر و ضابط پائیں گے اور میں آپ کے ارشاد کی قطعاً خلاف ورزی نہیں کروں گا؟" حضرت خضر نے کہا: "تو پھر شرط یہ ہے کہ جب آپ میرے ساتھ رہیں تو کسی معاملہ کے متعلق بھی جس کو آپ کی نگاہیں دیکھ رہی ہوں مجھ سے کوئی سوال نہ کریں، میں خود آپ کو ان کی حقیقت بتادوں گا" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے منظور کر لیا، اور دونوں ایک جانب کو روانہ ہو گئے، جب سمندر کے کنارے پہنچے تو سامنے سے ایک کشتی نظر آئی حضرت خضر علیہ السلام نے ملاحوں سے کرایہ پوچھا، وہ خضر علیہ السلام کو پہچانتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا اور اصرار کر کے دونوں کو کشتی پر سوار کر لیا اور کشتی روانہ ہو گئی، ابھی چلے ہوئے زیادہ

Marfat.com

عرصہ نہیں ہوا تھا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کے سامنے والے حصہ کا ایک تختہ اکھاڑ کر کشتی میں سوراخ کر دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ضبط نہ ہو سکا، خضر علیہ السلام سے کہنے لگے کہ کشتی والوں نے تو یہ احسان کیا کہ آپ کو اور مجھ کو مفت سوار کر لیا اور آپ نے اس کا یہ بدلہ دیا کہ کشتی میں سوراخ کر دیا کہ سب کشتی والے کشتی سمیت ڈوب جائیں، یہ تو بہت نازیبا بات ہوئی؟ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میری باتوں پر صبر نہ کر سکیں گے؟ آخر وہی ہوا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ "مجھے وہ بات بالکل فراموش ہو گئی، اس لیے آپ بھول چوک پر مؤاخذہ نہ کریں اور میرے معاملہ میں سخت گیری سے کام نہ لیں" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "یہ پہلا سوال واقعی موسیٰ علیہ السلام کی بھول کی وجہ سے تھا" اسی اثناء میں ایک چڑیا کشتی کے کنارے آ کر بیٹھی اور پانی میں چونچ ڈال کر ایک قطرہ پانی پی لیا، حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ بلاشائبہ تشبیہ علم الٰہی کے مقابلہ میں میرا اور تمہارا علم ایسا ہی بے حقیقت ہے جیسا کہ سمندر کے سامنے یہ قطرہ۔

کشتی کنارے لگی اور دونوں اتر کر ایک جانب روانہ ہو گئے، سمندر کے کنارے ہی کنارے جا رہے تھے کہ ایک میدان میں کچھ بچے کھیل رہے تھے، حضرت خضر علیہ السلام آگے بڑھے اور ان میں سے ایک بچہ کو قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پھر یارائے صبر نہ رہا۔ فرمانے لگے "ناحق ایک معصوم جان کو آپ نے مار ڈالا، یہ تو بہت ہی برا کیا؟ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: میں تو شروع ہی میں کہہ چکا تھا کہ آپ میرے ساتھ رہ کر صبر و ضبط سے کام نہ لے سکیں گے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "چونکہ یہ بات پہلی بات سے بھی زیادہ سخت تھی اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر و ضبط نہ کرنے میں معذور تھے" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "خیر اس مرتبہ اور نظر انداز کر دیجیے، اس کے بعد بھی اگر مجھ سے صبر نہ ہو سکا تو پھر عذر کا کوئی موقع نہیں رہے گا، اور اس کے بعد آپ مجھ سے علیحدہ ہو جائیے گا، غرض پھر دونوں روانہ ہو گئے، اور چلتے چلتے ایک ایسی بستی میں پہنچے جہاں کے باشندے خوش عیش اور مہمان داری کے ہر طرح قابل تھے، مگر دونوں کو مسافرانہ درخواست پر بھی ان کو مہمان بنانے سے انکار کر دیا تھا، یہ ابھی بستی ہی میں سے گزر رہے تھے کہ خضر علیہ السلام ایک ایسے مکان کی جانب بڑھے جس کی دیوار کچھ جھکی ہوئی تھی اور اس کے گر جانے کا اندیشہ تھا، حضرت خضر علیہ السلام نے اس کو ہاتھ کا سہارا دیا اور دیوار کو سیدھا کر دیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر خضر علیہ السلام کو ٹوکا اور فرمانے لگے کہ "ہم اس بستی میں مسافرانہ وارد ہوئے، مگر اس کے بسنے والوں نے نہ مہمان داری کی اور نہ ٹکنے کو جگہ دی، آپ نے یہ کیا کیا کہ اس کے ایک باشندے کی دیوار کو بغیر اجرت درست کر دیا، اگر کرنا ہی تھا تو بھوک پیاس کو دور کرنے کے لیے کچھ اُجرت ہی طے کر لیتے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا اب میری اور تمہاری جدائی کا وقت آ گیا ﴿هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَ بَيْنِكَ﴾ اور پھر انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان تینوں معاملات کے حقائق کو سمجھایا اور بتایا کہ یہ سب منجانب اللہ وہ باتیں تھیں جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہمارا جی تو یہ چاہتا تھا کہ موسیٰ تھوڑا صبر اور کرتے اور ہم کو اللہ تعالیٰ کے اسرار اور تکوینی علوم کی مزید معلومات ہو سکتیں۔"

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی مفارقت ہونے لگی تو خضر علیہ السلام نے ان واقعات کی جو حقیقت بیان کی قرآن عزیز نے سورۂ کہف میں اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اس طرح ظاہر کیا ہے:

﴿قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَ بَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝ اَمَّا السَّفِيْنَةُ

Marfat.com

فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾ وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ﴿۸۰﴾ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾ وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ؕ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۸۲﴾

(الکہف: ۷۸۔۸۲)

"پس اب مجھ میں اور تم میں جدائی کا وقت آ گیا، ہاں جن باتوں پر تم سے صبر نہ ہو سکا، ان کی حقیقت تمہیں بتلائے دیتا ہوں۔ سب سے پہلے کشتی کا معاملہ لو، وہ چند مسکینوں کی تھی جو سمندر میں محنت مزدوری کرتے ہیں، وہ جس طرف بڑھ رہے تھے، وہاں ایک بادشاہ ہے (ظالم) جس کسی کی (اچھی) کشتی پاتا ہے زبردستی لے لیتا ہے، میں نے چاہا اس کی کشتی میں عیب نکال دوں (تاکہ عیبی سمجھ کر اس کو چھوڑ دے) رہا لڑکے کا معاملہ، تو اس کے ماں باپ مومن ہیں۔ میں یہ دیکھ کر ڈرا کہ یہ انہیں سرکشی اور کفر کر کے اذیت پہنچائے گا، بس میں نے چاہا کہ ان کا پروردگار اس لڑکے سے بہتر انہیں لڑکا دے گا، دینداری میں بھی اور محبت میں بھی، اور وہ جو دیوار درست کر دی گئی تو وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی ہے جس کے نیچے ان کا خزانہ گڑا ہوا ہے، ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا، پس تمہارے پروردگار نے چاہا دونوں لڑکے اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ محفوظ پا کر نکال لیں، یہ ان لڑکوں کے حال پر پروردگار کی ایک مہربانی تھی جو اس طرح ظہور میں آئی، اور یاد رکھو میں نے جو کچھ کیا اپنے اختیار سے نہیں کیا (اللہ کے حکم سے کیا) یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے۔"

قرآن عزیز نے اس واقعہ کے شروع میں خضر علیہ السلام کے اس "علم" کے متعلق کہا ہے ﴿وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ "اور ہم نے اس کو اپنے پاس سے علم عطا کیا" اور قصہ کے آخر میں خضر علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا ﴿وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ؕ﴾ "میں نے اس سلسلہ واقعات کو اپنی جانب سے نہیں کیا" تو ان دونوں جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خضر علیہ السلام کو بعض اشیاء کے حقائق کا وہ علم عطاء فرمایا تھا جو تکوینی رموز و اسرار اور باطنی حقائق سے متعلق ہے، اور یہ ایک ایسا مظاہرہ تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے اہل حق پر یہ واضح کر دیا کہ اگر عالم ہست و بود کے تمام حقائق سے اسی طرح پردہ اٹھا دیا جائے جس طرح بعض حقائق کو خضر علیہ السلام کے لیے بے نقاب کر دیا گیا تھا تو اس عالم کے تمام احکام ہی بدل جائیں اور عمل کی آزمائشوں کا یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جائے مگر دنیا اعمال کی آزمائش گاہ ہے، اس لیے "تکوینی حقائق" پر پردہ پڑا رہنا ضروری ہے، تاکہ حق و باطل کی پہچان کے لیے جو "ترازو" قدرت الٰہی نے مقرر کر دیا ہے وہ برابر اپنا کام انجام دیتا رہے۔

سورۂ کہف کی ان آیات کے مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ اولو العزم پیغمبر اور جلیل المرتبت رسول تھے اور تشریعی علوم و احکام کی تبلیغ ان کا منصب تھا اس لیے وہ ان تکوینی اسرار کے مظاہرے کو برداشت نہ کر سکے اور باوجود وعدۂ صبر کے تشریعی منکرات کو دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور حضرت خضر علیہ السلام کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مخاطب بناتے رہے

اور آخر کار جدائی کی نوبت آ گئی۔

بخاری کی مسطورۂ بالا حدیث میں سورۂ کہف کے ذکر کردہ واقعات سے چند باتیں زیادہ ہیں جو اصل کی تمہید یا مزید تشریح کے طور پر بیان ہوئی ہیں اور اسی حدیث ہی نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس "عبد صالح" کو خضر کہتے ہیں۔

اس مقام پر چند باتیں قابل بحث ہیں: ① خضر نام ہے یا لقب؟ ② خضر فقط عبد صالح (ولی) ہیں یا نبی یا رسول؟ ③ ان کو حیات ابدی حاصل ہے، یا وفات پا چکے ہیں؟۔

مفسرین کے یہاں ان تینوں سوالات کے جوابات میں بہت سے اقوال منقول ہیں، چنانچہ پہلے سوال کے جواب میں بعض کہتے ہیں کہ خضر نام ہے اور اکثر کا قول ہے کہ یہ لقب ہے، اور پھر نام کے متعلق بھی مختلف اقوال ہیں مثلاً:

① بلیا بن ملکان ② ایلیا بن ملکان ③ خضرون، معمر، الیاس، الیسع وغیرہ۔

دوسرے سوال کے جواب میں بعض کا قول ہے کہ وہ فقط "عبد صالح" تھے اور بعض کہتے ہیں کہ "رسول" تھے، مگر جمہور کا قول یہ ہے کہ نہ وہ رسول تھے اور نہ فقط عبد صالح بلکہ "نبی" تھے۔

اور تیسرے سوال کے جواب میں بعض علماء کا خیال ہے کہ ان کو حیات ابدی حاصل ہے اور وہ اب تک زندہ ہیں اور اس سلسلہ میں کچھ حکایات و روایات بھی بیان کرتے ہیں اور جلیل القدر محققین فرماتے ہیں کہ ان کے لیے حیات ابدی کا ثبوت نہ قرآن سے ثابت ہے، اور نہ احادیث سے لہٰذا وہ بھی انسانی دنیا کی طرح اپنی طبعی موت سے وفات پا چکے ہیں۔

قول فیصل:

ان ہر سہ مسائل میں قول فیصل یہ ہے کہ پہلی بات کے متعلق قرآن عزیز میں کوئی تذکرہ نہیں نہ حضرت خضر علیہ السلام کا نام مذکور ہے اور نہ لقب بلکہ ﴿عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا﴾ کہہ کر ان کا واقعہ نقل کیا ہے، البتہ بخاری و مسلم کی صحیح احادیث میں خضر کہہ کر ان کا ذکر کیا گیا ہے، پس اگر تاریخی روایات سے ہم ان کے نام اور لقب کا پتہ لگا سکتے تو بآسانی یہ کہہ سکتے کہ فلاں نام ہے اور فلاں لقب، مگر اس بارے میں تاریخی اقوال اس درجہ مضطرب ہیں کہ ان سے کسی نتیجہ پر پہنچنا ناممکن ہے، لہٰذا ہمارے سامنے ان کی شخصیت کا تعارف صرف اسی قدر ہوتا ہے کہ ان کو خضر کہا جاتا ہے اور یہ کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاصر ہیں، اس سے زیادہ ان کے نام یا لقب یا نسب کی تمام بحثیں بے دلیل، محض تخمینی اقوال کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اور دوسری بات کے متعلق راجح قول یہ ہے کہ وہ "نبی" تھے اس لیے کہ قرآن عزیز نے جس انداز میں ان کے شرف کا ذکر کیا ہے وہ مقام نبوت ہی پر صادق آتا ہے اور مقام ولایت اس سے بہت فروتر ہے، مثلاً جب خضر علیہ السلام نے لڑکے کے قتل کی وجہ بیان کی تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:

﴿رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ اَمْرِيْ ۭ﴾ (الکہف: ۸۲)

"یہ میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا، تیرے رب کی رحمت کی بدولت ہوا"۔

ظاہر ہے کہ کسی ولی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ الہام کے ذریعے کسی شخص کو قتل کر ڈالے اس لیے کہ "الہام" میں مغالطہ کا امکان ہے

اور اولیاء اللہ کے بہت سے مکاشفات میں اسی لیے کثرت سے تضاد پایا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر وہ شرعی حجت تسلیم نہیں کیا گیا۔

لہٰذا امور تکوینیہ میں سے ایک ایسا تکوینی امر جو ظاہر سطح میں نہایت قبیح اور بہت بڑا جرم ہے صرف وحی الٰہی کے ذریعہ ہی انجام پا سکتا تھا، اس آیت کے علاوہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے درمیان گفتگو کے واقعہ کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ وہ نبی تھے تب ہی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر حضرت خضر علیہ السلام کی معیت اور ان کے علم تکوینی کے مشاہدہ کے لیے اصرار کرتے، اور تب ہی حضرت خضر علیہ السلام جرأت کے ساتھ اپنے علم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان موازنہ کرتے نظر آتے ہیں۔

تاہم مجموعہ کمالات نبوت ورسالت کے اعتبار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقام حضرت خضر علیہ السلام کے مقام سے بہت بلند ہے کیونکہ وہ خدا کے نبی بھی ہیں اور جلیل القدر رسول بھی، صاحب شریعت بھی ہیں اور صاحب کتاب بھی، اور رسولوں میں بھی اولوالعزم رسول ہیں۔ پس حضرت خضر علیہ السلام کا وہ جزئی علم جو علم تکوین کے اسرار سے تعلق رکھتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جامع علم تشریعی پر فائق نہیں ہوسکتا۔

اور تیسری بات کے متعلق صحیح رائے علماء محققین ہی کی ہے جو اس امر کے قائل ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام کو حیات ابدی حاصل نہیں ہے اور وہ اپنی طبعی عمر کے بعد وفات پا چکے، اس لیے کہ قرآن عزیز میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو بھی حیات ابدی عطاء نہیں فرمائی، اور اس کے لیے اس دنیا میں "موت" ایک امر حق ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِن مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ ۞﴾ (الانبیاء: ۳۴)

"اور (اے محمد ﷺ) ہم نے تجھ سے پہلے بھی کسی بشر کو حیات ابدی عطاء نہیں کی۔"

نیز قرآن عزیز میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم نے ہر ایک نبی سے یہ عہد و میثاق لیا ہے کہ جب محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوگی تو تم میں سے جو بھی اس وقت موجود ہو اس کا فرض ہوگا کہ وہ اس رسول پر ایمان بھی لائے اور اس کی مدد بھی کرے، چنانچہ تمام انبیاء ورسل نے اس کا اقرار کیا اور ان کے اور خدا کے درمیان شہادت و میثاق محکم و مضبوط ہوا۔

﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ ۚ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۖ قَالُوا أَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ ۞﴾ (ال عمران: ۸۱)

"اور جب اللہ نے نبیوں سے میثاق و عہد لیا کہ میں نے جو کچھ تم کو کتابیں اور علم دیا ہے پھر آئے تمہارے پاس رسول (محمد ﷺ) کہ سچا بتائے تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے، فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا؟ بولے ہم نے اقرار کیا، فرمایا تم اب گواہ رہو، اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔"

پس اگر حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کا فرض تھا کہ وہ علی الاعلان حاضر خدمت ہو کر آپ ﷺ پر ایمان لاتے تمام غزوات میں آپ کی اعانت و امداد کرتے، مگر کسی صحیح روایت سے ان باتوں میں سے کسی ایک بات کا بھی ثبوت نہیں ملتا، حالانکہ

Marfat.com

غزوۂ بدر وحنین وغیرہ میں جبرئیل امین اور ملائکہ کی اعانت وامداد تک کی تصریحات موجود ہیں۔

قرآن عزیز کی ان آیات کے علاوہ صحیحین (بخاری ومسلم) کی حسب ذیل روایت بھی اس عقیدہ کی تردید کرتی ہے کہ خضر علیہ السلام اب تک زندہ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک شب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ اس رات کو تم نے دیکھا؟ یہ واضح رہے کہ آج جو شخص بھی بقید حیات ہے ایک صدی گزرنے پر ان میں سے ایک بھی زمین پر زندہ باقی نہیں رہے گا۔ [1]

اس صحیح حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق بھی حضرت خضر علیہ السلام کی حیات ابدی کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکلتی، اور نہ ان کا استثناء کسی روایت سے ثابت ہوتا ہے، حالانکہ یہ روایت صحیحین کے علاوہ مختلف طریقوں سے دوسری کتب حدیث میں بھی منقول ہے۔

اسی لیے مشہور محدث حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ایک بھی صحیح روایت ایسی منقول نہیں ہے جس سے حضرت خضر علیہ السلام کے زندہ ہونے کا ثبوت ملتا ہو، بلکہ اس کے برعکس آیات قرآنی اور صحیح روایات ان کی موت کی تائید کرتی ہیں۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن جوزی، امام بخاری، قاضی ابو یعلی حنبلی، ابو طاہر بن الغباری، علی بن موسیٰ الرضاء، ابو الفضل مریسی، ابو طاہر بن العبادی، ابو الفضل بن ناصر، قاضی ابوبکر العربی، ابوبکر محمد بن الحسن رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر محدثین ومفسرین ان کی موت ہی کے قائل ہیں۔

لہٰذا حیات خضر علیہ السلام کے متعلق جن علماء نے اجماع نقل کیا ہے وہ قطعاً بے سند ہے بلکہ مشہور مفسر ابن حیان اندلسی نے دعوائے اجماع کے خلاف یہ دعویٰ کیا ہے کہ جمہور کا مسلک یہی ہے کہ خضر علیہ السلام زندہ نہیں ہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے کرائی جن کا نام خضر علیہ السلام تھا، ان کو بعض اسرار کونیہ کا وہ علم عطاء ہوا تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہیں دیا گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان حضرت خضر علیہ السلام سے کہیں زیادہ ہے، حضرت خضر علیہ السلام کا تذکرہ حسن انداز سے قرآن عزیز نے کیا ہے اس سے یہی راجح نظر آتا ہے کہ وہ نبی تھے، تاہم بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ کو قرآن عزیز نے جس طرح مجمل رکھا ہے ہم صرف اسی پر یقین رکھیں اور اس سے آگے اپنی تحقیق کو دخل نہ دیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے اور چونکہ ان کی حیات ابدی کے لیے کوئی شرعی اور تاریخی دلیل موجود نہیں ہے اس لیے بے شبہ وہ بھی اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر واصل الی اللہ ہوئے۔

حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق اور بھی بہت سی عجیب وغریب روایات تفسیر وتاریخ کی کتابوں میں منقول ہیں، محققین کی نگاہ میں سب موضوع اور بے اصل ہیں، اور اسرائیلیات سے ماخوذ، اس لیے ناقابل اعتماد ہیں۔ [2]

"مجمع البحرین" دو دریاؤں کے سنگم کو کہتے ہیں، یہاں کون سے دو دریا اور ان کا سنگم مراد ہے؟ اس کے متعلق مفسرین اور

---

[1] بخاری ومسلم کتاب الفضائل۔

[2] اس علمی بحث کے لئے البدایہ والنہایہ جلد ۱۔ البحر المحیط جلد ۲۔ روح المعانی جلد ۶۔ عینی شرح بخاری جلد ۷۔ فتح الباری جلد ۶۔ اور اصابہ جلد اوّل قابل مراجعت ہیں۔

ارباب سیرت سے مختلف اقوال منقول ہیں مگر ان میں سے کوئی قول بھی "قول فیصل" کی حیثیت نہیں رکھتا، البتہ جن حضرات نے اس سے بحر روم اور بحر قلزم اور ان دونوں کا سنگم مراد لیا ہے وہ قرین قیاس ہے اور یہ ممکن ہے کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اس وقت ان دونوں میں ایسا خط اتصال موجود ہو جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے درمیان یہ واقعہ پیش آیا ہے، اس لیے کہ خروج مصر اور میدان تیہ کے قیام کے دوران میں بظاہر انہی ہر دو سمندروں سے یہ واقعہ متعلق ہو سکتا ہے، اور حضرت استاذ علامہ سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ یہ مقام وہ ہے جو آج کل عقبہ کے نام سے مشہور ہے۔ ❶

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات:

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان تمام صبر آزما حالات میں جن کا ذکر گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت میں مصروف اور ایک اولوالعزم پیغمبر کی طرح ہر قسم کی ایذاء رسانی و مخالفت کے باوجود صبر کے ساتھ ان کی اصلاح میں مشغول و منہمک تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہنے کا وقت آ پہنچا۔ بخاری و مسلم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا واقعہ اس طرح مذکور ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آیا تو موت کا فرشتہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا "اَجِبْ رَبَّکَ" اپنے پروردگار کی جانب سے پیغام اجل کو قبول فرمایئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے طمانچہ رسید کر دیا جس سے اس کی آنکھ پھوٹ گئی، تب اس نے دربار الٰہی میں جا کر شکایت کی کہ تیرا بندہ موت نہیں چاہتا اور یہ کہ اس نے میرے طمانچہ رسید کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی آنکھ پھر درست ہو گئی، اور اس کو حکم ملا کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس دوبارہ جاؤ اور کہو کہ اللہ کا یہ ارشاد ہے کہ کسی بیل کی کمر پر تم اپنا ہاتھ رکھ دو جس قدر بال تمہاری مٹھی میں آ جائیں گے ہم ہر ایک بال کے عوض تمہاری عمر میں ایک سال کا اضافہ کر دیں گے، فرشتہ نے دوبارہ حاضر ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدائے تعالیٰ کا پیغام سنایا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت کیا کہ بارالٰہا! اس کے بعد کیا انجام ہوگا؟ حضرت حق سے جواب ملا کہ آخر کار پھر "موت" ہے، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اگر طویل سے طویل زندگی کا آخری نتیجہ موت ہی ہے تو پھر وہ شے آج ہی کیوں نہ آ جائے اور دعاء کی کہ الٰہ العالمین اس آخری وقت میں ارض مقدس سے قریب کر دے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں اس جگہ ہوتا تو تم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر کا نشان دکھاتا کہ وہ سرخ ٹیلہ (کثیب احمر) کے قریب اس جگہ دفن ہیں۔

ضیاء مقدسی کہتے ہیں کہ اریحاء میں سرخ ٹیلہ کے قریب ایک قبر ہے جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر بتایا جاتا ہے، دوسرے تاریخی اقوال کے مقابلہ میں یہ قول صحیح ہے، اس لیے کہ میدان تیہ کے سب سے قریب وادی مقدس کا علاقہ اریحاء کی بستی ہے اور اس جگہ وہ کثیب احمر (سرخ ٹیلہ) واقع ہے جس کا ذکر حدیث میں آیا ہے۔ ❷

بخاری و مسلم کی اس روایت میں فرشتہ کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو معاملہ منقول ہے ابن قتیبہ کے نزدیک وہ مادی حقیقت کے ساتھ وابستہ نہیں ہے بلکہ تخیلی و تمثیلی ہے۔ ❸

---

❶ فیض الباری جلد ا۔ ❷ فتح الباری ج ٦ ص ٣٤٣۔ ❸ فتح الباری ج ٦ ص ٣٤٣

ہمارے نزدیک اس واقعہ میں انسانی موت وحیات کے مسئلہ کو ایسے انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ جس سے اس سلسلہ کی تمام ضروری اور اہم کڑیاں نمایاں ہو سکیں یعنی یہ ظاہر ہو جائے کہ انسان اگر نبوت و رسالت جیسے عظیم الشان منصب پر بھی فائز ہو تب بھی بربناء بشریت وہ "موت" کو غیر مرغوب شئے سمجھتا ہے مگر جب خدا اس پر موت کی حقیقت کو منکشف کر دیتا ہے تو اس کے مقرب بندوں کے لیے وہ سب سے زیادہ محبوب شے بن جاتی ہے، نیز یہ واضح ہو جائے کہ موت کسی کے نزدیک محبوب شے ہو یا نامرغوب مگر وہ انجام کار ایک نہ مٹنے والا حکم ہے جس سے کسی حالت میں بھی مفر نہیں، اس لیے تمنا یہ نہ ہونی چاہیے کہ زندگی میں اضافہ ہو بلکہ یہ آرزو رہنی چاہیے کہ زندگی کا جو لمحہ بھی میسر آئے وہ پاکی اور بلندی اخلاق کے ساتھ پورا ہو، تاکہ خدائے تعالیٰ کی آغوش رحمت پا سکے اور "موت" حقیقی اور ابدی زندگی بن جائے۔

تو اب حدیث کے الفاظ کی تعبیر اس طرح کرنی چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں جب موت کا فرشتہ حاضر ہوا تو بشری شکل و صورت میں تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو اس حالت میں اسی طرح نہ پہچان سکے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام عذاب کے فرشتوں کو ابتداءً نہ پہچان سکے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ ناگوار گذرا کہ ایک اجنبی شخص بغیر اجازت کیوں ان کے خلوت کدہ میں گھس آیا اور اس کو موت کا پیغام دینے کا کیا حق ہے اور طیش میں آ کر منہ پر طمانچہ مار دیا، فرشتہ بشکل انسان تھا لہٰذا بشری اثرات نے کام کیا اور آنکھ مجروح ہو گئی، مگر جس طرح عذاب کے فرشتوں نے آہستہ آہستہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کو اپنی اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا، موت کے فرشتہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگاہ نہ کیا اور فوراً غائب ہو گیا اور درگاہِ الٰہی میں جا پہنچا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو پھر ملکوتی ہیئت پر واپس کر دیا، اور اس طرح وہ اس عیب سے بری ہو گیا جو بشری شکل و صورت میں آنکھ مجروح ہو جانے سے پیدا ہو گیا تھا۔

فرشتہ موت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیالات سے آشناء ہوئے بغیر خود ہی یہ سمجھ لیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام موت کے نام سے خفا ہو گئے اور وہ موت نہیں چاہتے اور دربار الٰہی میں جا کر یہ شکایت کر دی کہ تیرا بندہ موت نہیں چاہتا۔ خدائے تعالیٰ نے فرشتہ کی غلط فہمی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جلالت شان دونوں کے اظہار کے لیے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ دوبارہ جاؤ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جا کر ہمارا پیغام سناؤ، اِدھر فرشتہ پیغام حاصل کر رہا تھا اور اُدھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اجنبی شخص کے غائب ہو جانے پر فوراً یہ محسوس کر لیا کہ درحقیقت یہ معاملہ انسانی معاملات سے جدا دوسرے عالم کا ہے، چنانچہ جب فرشتۂ اجل نے دوبارہ حاضر ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغام الٰہی سنایا تو ان کا لہجہ اور طرز گفتگو بالکل دوسرا ہو گیا اور انجام کار وہ رفیق اعلیٰ سے جا ملے اور قربت موت کی جو چند گھڑیاں تھیں موت سے قبل اسی طرح سامان عبرت و موعظت بنیں۔

صحیحین کی حدیث کے مفہوم و مطلب سے متعلق یہ ایسی تعبیر ہے کہ جس سے وہ تمام سوالات و اشکالات حل ہو جاتے ہیں جو اس سلسلہ میں علماء کے درمیان زیر بحث آئے ہیں۔

تورات اور کتب تاریخ میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس سال کی ہوئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے درمیان تقریباً ڈھائی سو سال کا عرصہ ہے۔ [1]

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۱

تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا ذکر متعدد مقامات پر کیا گیا ہے، ان میں سے ایک جگہ مذکور ہے:

"اور موسیٰ موآب کے میدانوں میں سے بنو کے پہاڑوں پر پسگہ چوٹی پر جو یریحو کے مقابل ہے چڑھ گیا اور خداوند نے ساری زمین جلعاد سے لے کر ران تک اس کو دکھلائی اور نفتال کا سارا ملک پچھلے سمندر تک اور جنوب کا ملک اور وادی اریحو (اریحا) جو خزانوں کا شہر ہے اس کی وادی کا میدان صغر تک اس کو دکھایا اور خداوند نے اس سے کہا یہی وہ ملک ہے جس کی بابت میں نے ابراہام اور اضحاق اور یعقوب سے قسم کھا کر کہا تھا کہ اسے میں تمہاری نسل کو دوں گا سو میں نے ایسا کیا کہ تو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے، پھر تو اس پار وہاں جانے نہ پائے گا، پس خداوند کے بندے موسیٰ (علیہ السلام) نے خداوند کے کہے موافق وہیں موآب کے ملک میں وفات پائی اور اس میں اسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغفور کے مقابل دفن کیا، پھر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں، اور موسیٰ اپنی وفات کے وقت ایک سو بیس برس کا تھا، اور نہ تو اس کی آنکھ دھندلانے پائی اور نہ اس کی طبعی قوت کم ہوئی۔" [1]

بنی اسرائیل کا قومی مزاج اور خدا کی جانب سے تذکیر نعمت:

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے تفصیلی واقعات کا مطالعہ کرنے سے جو بات سب سے پہلے نگاہ کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے اندر ایک عجیب طرح کا تلون پایا جاتا ہے، اور سرکشی، احسان فراموشی، فساد انگیزی اور بغض وحسد، ان کے قومی مزاج کا مایہ خمیر معلوم ہوتا ہے، غالباً ان کے قومی مزاج کا یہ فساد صدیوں کی غلامی کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ تمام عیوب میں غلامی ہی ایک ایسا عیب ہے جو اخلاق کی پستی، دناءت اور بغض وعناد جیسے ناپاک رذائل انسان کے اندر پیدا کر دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی قوم کو راہ راست پر لانے یا صراط مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے انبیاء ورسل کو سخت سے سخت نامساعد حالات اور دشوار گذار مراحل پیش آئیں گے، چنانچہ پیش آتے رہے اور چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پہلے پیغمبر ہیں کہ جن کی پیغمبرانہ مساعی کے ذریعہ بنی اسرائیل نے غلامی سے نجات پائی اور آزادی حیات سے بہرہ مند ہونے کا موقع میسر آیا تو سب سے زیادہ انہی کو بنی اسرائیل کے فاسد قومی مزاج سے دو چار ہونا اور اس کی اصلاح کے لیے سخت سے سخت مصائب کو برداشت کرنا پڑا۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھی ایسی قوم کی اصلاح اور رشد وہدایت کے لیے نزول قانون (توراۃ) کے علاوہ بڑی کثرت سے آیات اللہ (معجزات ونشانات) کا مظاہرہ کیا گیا، تاکہ اس طرح ان کے تلون اور آشفتہ مزاجی میں اعتدال پیدا ہو کر قبول حق اور استقامت حق کی استعداد وصلاحیت پیدا ہو سکے۔

یہی وہ آیات اللہ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن عزیز کے اندر سورۂ بقرہ، اعراف اور ابراہیم میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور بتایا ہے کہ معاصر قوموں میں ہمارے فضل وکرم اور عطا واحسان کا مرکز یہی قوم (بنی اسرائیل) رہی ہے مگر افسوس کہ ان تمام انعام واکرام اور عفو ورحمت کی فراوانی کے باوجود ان کی سرکشی اور بغاوت اور تلون رہ رہ کر ابھرتا، اور دب دب کر نمایاں ہوتا رہا اور آخر کار انہوں نے خدا کی "ابدی لعنت وغضب" کو سرمایہ نازش بنا کر ہمیشہ کے لیے دنیا وآخرت کی عزت سے محرومی کا داغ لگا لیا۔

---

[1] استثناء باب ۳۴ آیات ۷۔۱

Marfat.com

چنانچہ آیات

﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ ......الایۃ﴾(البقرہ: ۴۰۔۴۷۔۱۲۲)

﴿وَ اِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ...... الایۃ﴾(البقرہ: ۴۹)

﴿وَ اِذۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَ الۡفُرۡقَانَ لَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ ﴿۵۳﴾﴾(البقرہ: ۵۳)

﴿وَ اِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نَّصۡبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ.........الایۃ﴾(البقرہ: ۶۱)

﴿وَ اِذِ اسۡتَسۡقٰی مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖ ...... الایۃ﴾(البقرہ: ۶۰)

﴿وَ اِذۡ اَنۡجَیۡنٰکُمۡ..... الایۃ﴾(الاعراف: ۱۴۱)

﴿وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہِ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ.......الایۃ﴾ (ابراھیم: ۶)

میں ان ہی واقعات کا تذکرہ ہے اور نگاہ عبرت بیں کے لیے سامان صد ہزار عبرت و موعظت ہے۔

البتہ بنی اسرائیل کی قومی زندگی کا جو نقشہ قرآن عزیز نے پیش کیا ہے اور جس کی زبردست تائید خود تورات سے بھی ہوتی ہے اس کو سامنے رکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے ایسی قوم کو کس لیے ان نعمتوں اور فضیلتوں کے لیے منتخب کر لیا تھا، اور عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ نے کیوں نہ شروع ہی سے ایسی ضدی قوم کو نظر انداز کر دیا، اور کیوں نہ ان افضال و انعامات کا رخ کسی دوسری قوم کی جانب مبذول فرمایا، سو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر آپ اس زمانہ کی تاریخ کا مطالعہ فرمائیں اور علم الاجتماع (Sociology) اور علم الاقوام والامم (Anthro Polohgy) کے اصول پر مطالعہ فرمائیں تو آپ دیکھیں گے جب سے تاریخ انسانی کا کائنات میں وجود ہوا ہے اس وقت سے یہ بات صاف اور واضح ہے کہ اقوام عالم کے تمدن و معاشرت اور ان کی سیاست و مذہب پر سامی (Semetic) اقوام کا تسلط اور غلبہ نظر آتا ہے چنانچہ تاریخی حقائق کی تہہ تک پہنچنے کے بعد دنیا کی کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی جو سامی اقوام کے ان اثرات سے متاثر نہ ہوئی ہو، [1] تو جس دور کی حالت قرآن عزیز بیان کر رہا ہے اس دور میں اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے دور و نزدیک جو سامی اقوام آباد تھیں تاریخ نے ان کو عمالیقی، قبطی، کنعانی، عناقی، سمیری وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے جن کا تمدن شام، فلسطین، شرق اردن، مصر اور عراق میں چمک رہا تھا، مگر ان تمام اقوام میں شرک و کفر، بغاوت و سرکشی اور ظلم و طغیان کا جو ہیبت ناک مظاہرہ بپا تھا اس کے سامنے بنی اسرائیل بسا غنیمت نظر آتے تھے اور ان کی استعداد و صلاحیت معاصر اقوام کے مقابلہ میں قدرے قابل اطمینان تھی، قبطی قوم کا حال فرعون مصر اور مصریوں کے وقائع میں ابھی آپ مطالعہ کر چکے ہیں اور کنعانی و عمالیقی قوم کے حالات عنقریب نظر سے گذریں گے اور سمیری قوم کا اندازہ اس کے ایک سردار "سامری" کے حالات سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

یہ تھے وہ کوائف و حالات جن کی بناء پر رشد و ہدایت کے لیے بنی اسرائیل کو منتخب کیا گیا اور تاریخ اس کا ثبوت بہم پہنچاتی

[1] یہ تاریخی مسئلہ کافی تفصیل کا محتاج ہے اس جگہ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔

Marfat.com

ہے کہ اس قوم کی عام بدبختی کے باوجود اسی کی ایک قلیل جماعت کے ذریعہ خدا کی رشد و ہدایت کا پیغام عرصہ دراز تک کائنات انسانی تک پہنچتا رہا اور ہزاروں برس کے بعد اسرائیلیوں سے یہ نعمت سلب کر کے بنی اسماعیل کے حوالہ کی گئی۔

غرض بنی اسرائیل کا یہ انتخاب ان کے تقدس و طہارت کے پیش نظر نہ تھا بلکہ ان کو ان سے بھی زیادہ فساد و سرکشی پھیلانے والی طاقتوں کی سرکوبی کا ذریعہ بنانا تھا لہٰذا ان کو احکام الٰہی کا مطیع بنانے اور ان کو راہ راست پر لانے کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا اور اس طرح ان کی نوجوان نسل سے خدا نے اپنی یہ خدمت لی۔

تورات نے بھی ایک جگہ اس حقیقت کو ان بہترین الفاظ کے ساتھ آشکارا کیا ہے:

"سن لے اے اسرائیل! آج تجھے یردن پار اس لیے جانا ہے کہ تو ایسی قوموں پر جو تجھ سے بڑی اور زور آور ہیں اور ایسے بڑے شہروں پر جن کی فصیلیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں قبضہ کرے، وہاں عناقیم کی اولاد میں جو بڑے بڑے اور قد آور لوگ ہیں، تجھے ان کا حال معلوم ہے اور تو نے ان کی بابت یہ کہتے سنا ہے کہ بنی عناق کا مقابلہ کون کرسکتا ہے؟ پس آج کے دن جان لے کہ خداوند تیرا خدا تیرے آگے آگے بھسم کرنے والی آگ کی طرح پار جا رہا ہے اور ان کو فنا کر دے گا اور وہ ان کو تیرے آگے پست کرے گا، ایسا کہ تو ان کو نکال کر جلد ہلاک کر دے گا، جیسا خداوند نے تجھ سے کہا ہے۔ اور جب خداوند تیرا خدا ان کو تیرے آگے سے نکال چکے تو تو اپنے دل میں یہ نہ کہنا کہ میری "صداقت" کے سبب سے خداوند مجھے اس ملک پر قبضہ کرنے کو یہاں لایا کیوں کہ فی الواقع ان کی "شرارت" کے سبب سے خداوند ان قوموں کو تیرے آگے سے نکالتا ہے، تو اپنی صداقت یا اپنے دل کی راستی کے سبب سے اس ملک پر قبضہ کرنے کو نہیں جا رہا ہے یہ بلکہ خداوند تیرا خدا ان قوموں کی شرارت کے باعث ان کو تیرے آگے سے خارج کرتا ہے تاکہ یوں وہ اس وعدہ کو جس کی قسم اس نے تیرے باپ دادا ابراہام اور اضحاق اور یعقوب سے کھائی پورا کرے، غرض تو سمجھ لے کہ خداوند تیرا خدا تیری صداقت کے سبب سے یہ اچھا ملک تجھے قبضہ کرنے کے لیے نہیں دے رہا ہے، کیونکہ تو ایک "گردن کش قوم" ہے، اس بات کو یاد رکھ اور کبھی نہ بھول کہ تو نے خداوند اپنے خدا کو بیابان میں کس کس طرح غصہ دلایا بلکہ جب سے تم ملک مصر سے نکلے ہو تب سے اس جگہ پہنچنے تک تم برابر خداوند سے "بغاوت" ہی کرتے رہے۔" [1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ثناء و منقبت قرآن میں:

قرآن عزیز اور احادیث نبوی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مناقب و فضائل اور بنی اسرائیل کے واقعات کے سلسلہ میں ان کی جلالت و عظمت کا جس طرح اظہار کیا گیا ہے اس سے یہ نمایاں ہوتا ہے کہ ختم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مجدد انبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اولوالعزم رسول اور پیغمبر ہیں اور انبیاء و رسل میں عظیم المرتبت اور بڑی قدر و منزلت کے مالک دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دیجئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بچپن کی زندگی سے وفات تک کے حالات ایسے عجیب و غریب طریقے سے گذرے ہیں کہ ان کے مطالعہ سے بے ساختہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جلالت قدر کا اقرار و اعتراف کرنا اور یہ تسلیم کرنا

---

[1] استثناء باب ۹ آیات ۱-۷

Marfat.com

ہے کہ فرعون، قوم فرعون اور بنی اسرائیل کے ہاتھوں جو تکالیف حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اٹھائیں اور ان کی اصلاح حال کے لیے جس قسم کی ایذائیں اور مصیبتیں برداشت کیں، ان کی نظیر (باستثناء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم و حضرت ابراہیم علیہ السلام اور) کسی نبی و رسول کی زندگی مبارک میں نہیں ملتی۔

قرآن عزیز نے جگہ جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات سے اسی لیے استشہاد کیا ہے کہ امتوں اور قوموں کی سہل انگاری، حق سے اغماض بلکہ تمرد و سرکشی، مخالفت و عناد، پیغمبر کی توہین و ایذاء رسانی، اور پیغمبر کا صبر و ضبط اور گمراہ امت و قوم کی اصلاح اور ان کی رشد و ہدایت کے لیے پیہم سعی اور جدوجہد کا اس قدر کثیر مواد موعظت و بصیرت کے لیے کہیں نہیں پایا جاتا، جس قدر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے واقعات میں فراہم ہے۔

پس اگرچہ قرآن عزیز کی ان تمام آیات سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جلالت قدر اور اولوالعزم پیغمبر ہونے کا اظہار ہوتا ہے "جو ان کے واقعات کو بیان کرتی ہیں" مگر حسب ذیل آیات میں خصوصیت کے ساتھ ان کی ثناء و منقبت کا اعلان کیا گیا ہے اور ان کے ضمن میں حضرت ہارون علیہ السلام کا بھی، چنانچہ سورۂ مریم میں ارشاد ہے:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰۤى ۙ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَ نَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝ وَ وَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ۝﴾ (مریم: ۵۱-۵۳)

"اور یاد کر قرآن میں موسیٰ (علیہ السلام) کو بے شبہ وہ تھے مخلص اور تھے رسول، نبی، اور ہم نے ان کو طور ایمن کی جانب سے پکارا اور ان کو قریب کر کے ان سے سرگوشیاں کیں اور ہم نے اپنی رحمت سے ان کے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو نبی بنایا۔"

اور سورۂ اعراف میں ہے:

﴿قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَ بِكَلَامِيْ ۫﴾ (الاعراف: ۱۴۴)

"(اللہ تعالیٰ) نے کہا: اے موسیٰ! بے شبہ میں نے تم کو لوگوں پر بزرگی عطاء کی اور تم کو چن لیا اپنی رسالت دے کر اور ہم کلامی کا شرف بخش کر۔"

بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مجھ کو موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو اس لیے کہ قیامت کے دن لوگوں پر دہشت سے غشی طاری ہو جائے گی تو سب سے پہلا شخص جس کو ہوش آئے گا میں ہوں گا، تو میں یہ دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ پکڑے کھڑے ہیں، اب میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کو مجھ سے پہلے افاقہ ہو گیا یا وہ طور پر بے ہوش کیے جانے کے بدلہ میں آج کی مدہوشی سے بری کر دیئے گئے۔"

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد "کہ مجھ کو موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو، از راہِ تواضع اور انکسار ہے ورنہ تو دوسری جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خود یہ ارشاد مبارک ہے:

((انا سید ولد ادم ولا فخر))

"بغیر فخر و مباہات کے کہتا ہوں کہ میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں۔"

Marfat.com

اور آپ ﷺ کا خاتم النبیین ہونا خود اس کی روشن دلیل ہے، رہا قیامت کا یہ واقعہ سو یہ ایک جزئی فضیلت ہے اور منبع فضل وکمال کے مجمع کمالات کی برتری وتفوق پر اس سے اثر نہیں پڑتا، بہرحال اس روایت کی روح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جلالت قدر اور عظمت کا اظہار ہے اور بس۔ سورۂ نساء میں ہے:

﴿وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ١٦٤ۚ﴾ (النساء: ١٦٤)

"اور کچھ رسول ہیں کہ جن کا ذکر ہم نے تم سے پہلے کر دیا ہے اور کچھ رسول ہیں جن کا ذکر ہم نے تم کو نہیں سنایا اور اسی طرح اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام ہوتا ہے۔"

اور سورۂ صافات میں ہے:

﴿وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰي مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ١١٤ۚ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ١١٥ۚ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ١١٦ۚ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ١١٧ۚ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ١١٨ۚ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ١١٩ۙ سَلٰمٌ عَلٰي مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ١٢٠ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ١٢١ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ١٢٢﴾ (اصفت: ١١٤-١٢٢)

"اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) پر احسان کیا اور ان دونوں کو اور ان کی قوم کو بڑی مصیبت سے نجات دی، اور ہم نے ان کی مدد کی کہ وہ (فرعون) اور قوم (فرعون) پر غالب رہے اور ہم نے ان دونوں کو روشن کتاب دی اور دونوں کو راہ مستقیم کی ہدایت بخشی اور باقی رکھا ان کے متعلق پچھلے لوگوں میں کہ سلام ہو موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) پر، بے شک ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں نیکوکاروں کو، بیشک وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے ہیں۔"

اور سورۂ احزاب میں ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ۭ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ٦٩ۭ﴾ (الاحزاب: ٦٩)

"اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جنہوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو ایذاء پہنچائی، پس اللہ نے ان کو اس بات سے بری کر دیا، جس کو ان کی زبانیں کہہ رہی تھیں، اور موسیٰ اللہ کے نزدیک وجیہہ ہیں۔"

نیز بخاری ومسلم میں اسریٰ اور معراج کی روایات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم ﷺ کے مکالمات منقول ہیں ان سے ان کی عظمت وشان کا نمایاں اظہار ہوتا ہے۔

بخاری ومسلم میں ایک اور روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے کچھ تقسیم فرمایا تو ایک شخص (منافق) کہنے لگا کہ اس تقسیم میں خدا کی خوشنودی کا لحاظ نہیں رکھا گیا، کسی مسلمان نے اس مقولہ کو نبی اکرم ﷺ کے سامنے نقل کر دیا تو آپ کا چہرۂ مبارک غضب وغصہ کی وجہ سے سرخ ہو گیا اور ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر رحم

فرمائے کہ ان کو تو اس سے بھی کہیں زیادہ اذیت پہنچائی گئی اور انہوں نے ان تمام اذیتوں کے مقابلہ میں صبر وضبط ہی سے کام لیا۔ یعنی منافق کے اس ایذاء رساں قول کے مقابلہ میں بھی اولوالعزم رسولوں کی طرح صبر وضبط ہی سے کام لیتا ہوں۔

غرض یہ اور اسی قسم کے بے شمار فضائل ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اولوالعزم رسول ہونے پر دلالت کرتے اور ہمارے لیے ذخیرۂ رشد وہدایت مہیا کرتے ہیں۔

ایک لطیف تاریخی نکتہ:

یہود (بنی اسرائیل) کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا اس حقیقت سے ناآشنا نہیں ہے کہ عرصہ دراز قبل از مسیح علیہ السلام (یہود) حجاز میں آکر بس گئے تھے، اور تیماء، وادی قریٰ، فدک، خیبر اور مدینہ (یثرب) میں انہوں نے مکانوں، مذہبی صومعوں، جائیدادوں، مذہبی درس گاہوں اور فوجی چھاؤنیوں اور قلعوں کے ذریعہ اپنا مستقل تمدن قائم کرلیا تھا اور بقول عرب مؤرخین بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع اور بنی حارث بڑے بڑے یہود قبائل نے ان مقامات کو اپنا مستقل موطن بنالیا تھا اور وہ یہیں رہ پڑے تھے۔

اس حقیقت کے پیش نظر دو اہم تاریخی سوال پیدا ہوتے ہیں جو حل طلب ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کون سا ناگزیر واقعہ پیش آیا کہ جس کی وجہ سے یہود کو وہ سرزمین چھوڑنی پڑی جس کو فلسطین کہتے ہیں اور جس کے متعلق یہود کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ "ارض مقدس" ہے اور وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں؟ دوسرے یہ کہ اگر کسی ناگزیر حالت میں ان کو اپنی یہ محبوب سرزمین چھوڑنی ہی پڑی تھی تو پھر وہ کون سا سبب تھا جس نے ان کو مجبور کیا کہ وہ قریب کے سرسبز وشاداب اور پر کیف علاقوں کو چھوڑ کر ایسے علاقہ میں آکر آباد ہوئے جہاں گھاس پات اور زندگی کے لیے سامان خورد ونوش بھی وسعت کے ساتھ مہیا نہیں تھے، حالانکہ مصر ان کی سرزمین سے قریب تھا، عراق ان کا قدیم دارالہجرۃ اور نزدیک تھا اور شام ان کے شمال میں متصل ہی آباد تھا اور یہ سب مقامات بے حد سرسبز وشاداب اور متمدن ساز وسامان کا مرکز تھے۔

پہلے سوال کا جواب تو تاریخ یہ دیتی ہے کہ فلسطین کی محبوب، مقدس، اور پیاری سرزمین سے یہود کو سنہ ۷۰ قبل عیسوی طیطس رومی (Titus) کے زمانہ میں جبراً نکلنا پڑا، اس بادشاہ نے فلسطین پر فوج کشی کرکے بلاد فلسطین کو تہ وبالا کرڈالا۔ بیت المقدس کو برباد کردیا، اس "ہیکل" کو جس پر یہود کو ناز تھا اور جس کی مضبوطی اور پر شوکت تعمیر کی وہ مثالیں دیا کرتے تھے اور جس کے ساز وسامان اور مکلل ومذہب ظروف پر وہ فخر کیا کرتے تھے "ظالم" نے اس کو کھود کر پھینک دیا تھا اور اس کے تمام بیش قیمت ساز وسامان کو لوٹ لیا تھا۔

اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ "یہود" توراۃ میں پڑھ چکے، اور اپنے پیغمبروں کی زبانی سن چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ ایک زمانہ میں اپنے اس "عہد" کو "بنی اسرائیل" کے بھائیوں "بنی اسمٰعیل" میں پھر تازہ کرے گا، اور ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ "یثرب (مدینہ) میں آئے گا، اور یہ اس کا دارالہجرۃ بنے گا، اور اس کی دعوت الٰہی کا مرکز قرار پائے گا، اور یہ کہ "بت پرستوں" کے مقابلہ میں اس کی مجاہدانہ زندگی کامیاب ہوگی، اور ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب وموسیٰ علیہم السلام کے اعلان حق کو دوبارہ اسی کے ہاتھوں سربلندی نصیب ہوگی اس لیے جب وہ اس "بت پرست بادشاہ" کے ہاتھوں عاجز ودرماندہ ہوئے تو انہوں نے اپنی سربلندی کی آخری پناہ "حجاز" کی اس سرزمین یثرب (مدینہ) ہی کو سمجھا اور اس راہ پر اپنا موطن بنالیا جو اس نبی کے ظہور کے شہر اور فلسطین کے درمیان تھی اور اس طرح وہ نبی منتظر کے انتظار اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کے واپسی کے لیے زندگی بسر کرنے لگے۔

Marfat.com

چنانچہ "یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں" صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ اس نبی کا ظہور سلع پہاڑ کے قریب ہوگا، اور یہ ظاہر ہے کہ "مدینہ" کی آبادی ایسی جگہ واقع ہے، جس کے مشرق میں جبل اُحد ہے اور مغرب میں جبل سلع اور درمیان میں "وادی مدینہ" ہے۔

"اے سمندر پر گزرنے والو اور اس میں بسنے والو! اے جزیرہ اور ان کے باشندو! خداوند کے لیے نیا گیت گاؤ، زمین پر سر تا سر اسی کی ستائش کرو، بیابان اور اس کی بستیاں قیدار کے آباد گاؤں اپنی آواز بلند کریں، سلع کے بسنے والے گیت گائیں، پہاڑوں کی چوٹیوں سے للکاریں، وہ خداوند کا جلال ظاہر کریں، اور جزیروں میں اس کی ثناء خوانی کریں، خداوند بہادروں کی مانند نکلے گا، وہ جنگی مرد کی مانند اپنی غیرت دکھائے گا، وہ نعرہ مارے گا، ہاں وہ للکارے گا، وہ اپنے دشمنوں پر غالب آئے گا۔ میں بہت مدت سے چپ رہا۔ میں خاموش ہو رہا اور ضبط کرتا رہا۔۔۔۔۔ جو کھودی ہوئی مورتوں پر بھروسہ کرتے اور ڈھالے ہوئے بتوں سے کہتے ہیں، تم ہمارے معبود ہو وہ پیچھے ہٹیں گے اور وہ بہت شرمندہ ہوں گے۔" [1]

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا کوئی نبی اور پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے "بت پرستوں" سے جہاد کیا ہو اور انجام کار ان کو نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا ہو، پھر یہ بنی قیدار کون ہیں؟ سلع کس جگہ واقع ہے؟ جزیروں اور پہاڑوں کا بار بار تذکرہ کیوں ہے؟ اور بنی اسرائیل کے گیت کے علاوہ "نیا گیت" کونسا ہے؟ یہ تمام باتیں پکار کر کہہ رہی ہیں کہ یہ ایسی "شریعت" اور ایسے "نبی" کی بشارت کا ذکر ہے جو جزیرۂ عرب میں حجاز کے خطہ سے تعلق رکھتا ہے، تو کیا پھر یہی وہ بات نہیں ہے جس کو قرآن عزیز نے زندہ تاریخی شہادت کے طور پر یہود کو مخاطب کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا ہے:۔

﴿وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝۸۹﴾ (البقرہ: ۸۹)

"اور جب کہ ان کے پاس اللہ کی جانب سے کتاب (قرآن) آئی جو اس کتاب (توراۃ) کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس ہے اور یہ (یہود) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے کافروں کے مقابلہ میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے، پھر جب ان کے پاس جانی پہچانی بات (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آ پہنچی تو اس کا انکار کرنے لگے، سو اللہ کی لعنت ہو انکار کرنے والوں پر۔"

یعنی جب ان اہل کتاب (یہود) کی یثرب کے بت پرستوں سے جنگ ہوا کرتی تھی، اور اہل کتاب کو شکست ہو جاتی تو وہ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ خدا نبی منتظر کو جلد بھیج کہ ہم اس کے ساتھ مل کر بت پرستی کا قلع قمع کریں اور تیرے وعدہ کے مطابق حق کو کامیابی حاصل ہو لیکن جب وہ پیغمبر برحق تشریف لے آئے اور مبعوث ہو گئے تو وہ اس حسد میں اس کا انکار کرنے لگے کہ یہ اسماعیلی کیوں ہے، اسرائیلی کیوں نہیں؟۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بعض علماء یہود اس وسوسہ میں گرفتار تھے کہ اگرچہ اس پیغمبر کی بعثت اور ظہور کا مقام کوہ سلع کے قریب بتایا گیا ہے مگر اس کا ظہور بنی اسرائیل ہی میں سے ہونا چاہیے، اور اسی لیے وہ یہاں آ کر بس گئے تھے کہ خدا کا وہ وعدہ ہم ہی میں سے پورا ہو لیکن انہوں نے یہ فراموش کر دیا تھا کہ اسی توراۃ میں اسی نبی منتظر کے لیے یہ بھی کہا گیا ہے کہ "میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔" [2] اور یہ نہیں کہا کہ ان ہی (بنی اسرائیل) میں سے برپا کروں گا، لیکن ان کے جمہور علماء اور ان کے پیرو عوام اس حقیقت سے آشنا نہ تھے کہ یہ نعمت اب ان کے بھائیوں بنی اسماعیل میں منتقل ہو کر ہم کو مستفیض کرنے والی ہے،

---

[1] یسعیاہ باب ۴۲۔ آیات ۱۰۔۱۷۔ ماخوذ از قصص الانبیاء للنجار [2] استثناء باب ۱۸۔ آیت ۱۷

Marfat.com

اسی جانب قرآن نے اشارہ کیا ہے:

﴿يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ﴾ (البقرہ: ۱٤٦)

"یہ محمد (ﷺ) کو اسی طرح (سچا نبی) جانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کے بیٹا ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔"

الحاصل، یہ وجہ تھی کہ صدیوں پہلے بنی اسرائیل جب جبراً وقہراً فلسطین کی سرزمین سے نکالے گئے تو انہوں نے مصر، شام اور عراق کے سرسبز وشاداب اور متمدن ممالک کو چھوڑ کر حجاز کی سرزمین کو ترجیح دی اور یثرب (مدینہ) اور اطراف یثرب میں آ کر بس گئے اور اسی کو اپنا وطن ومسکن بنالیا، مگر افسوس کہ اس کے ظہور پر حسد وبغض نے ان کو دولت ایمان سے محروم رکھا۔

جدید تاریخی حقائق کے پیش نظر اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ سوال وجواب کی مسطورۂ بالا پوری بحث اس لیے بیکار ہے کہ سرزمین حجاز (مدینہ) میں جو یہود آباد تھے وہ عربی نژاد تھے، یہودی النسل نہیں تھے اس لیے کہ یہود بنی اسرائیل کے خصوصی امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ دنیا کے کسی گوشہ میں بھی جا کر بسے ہوں اپنے اسرائیلی ناموں کو نہیں چھوڑتے بخلاف یہود حجاز کے کہ ان کے اجداد کے نام قریظہ، نضیر، قینقاع عربی نام ہیں اور اسرائیلی ناموں سے بالکل ممتاز ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس جدید نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ سرزمین حجاز میں آباد یہود صرف عرب نژاد ہی تھے اور ان میں یہودی النسل قبائل قطعاً موجود نہ تھے تو یہ قطعاً غلط اور واقعات تاریخی کے خلاف ہے اس لیے کہ ان قبائل میں بعض وہ قبائل بھی ہیں، جن کا ارض فلسطین سے ہجرت کر کے حجاز میں آباد ہو جانا تاریخ کے اوراق میں آج تک محفوظ ہے اور اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ قبائل عرب کے ساتھ ساتھ یہودی النسل قبائل بھی یہاں آباد تھے اور ان ہی کی بدولت قبائل عرب میں یہودیت کا بیج بویا گیا تھا تو مسطورۂ بالا سوال پھر پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا جواب تاریخی حیثیت سے وہی دیا جاسکتا ہے جو گذشتہ سطور میں دیا جاچکا ہے۔

بصیرتیں اور عبرتیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل، فرعون اور قوم فرعون کی یہ طویل تاریخی داستان ایک قصہ اور حکایت نہیں ہے بلکہ حق وباطل کے معرکے، ظلم وعدل کی جنگ، آزادی غلامی کی کشمکش، مجبور وپست کی سربلندی، اور جابر وسربلند کی پستی وہلاکت، حق کی کامرانی اور باطل کی ذلت ورسوائی، صبر وابتلاء اور شکر واحسان کے مظاہر، غرض ناسپاسی وناشکری کے بدنتائج کی ایسی پُر عظمت اور نتائج سے لبریز حقائق کی ایسی پُرمغز داستان ہے جس کی آغوش میں بے شمار عبرتیں اور ان گنت بصیرتیں پنہاں ہیں اور ہر صاحب ذوق کو اس کے مبلغ علم اور دقت نظر کے مطابق دعوت نظر وفکر دیتی ہیں، ان میں سے "مشتے نمونہ از خروارے" یہ چند بصائر خصوصیت کے ساتھ قابل غور اور لائق فکر ہیں۔

① اگر انسان کو کوئی مصیبت اور ابتلاء پیش آ جائے تو ازبس ضروری ہے کہ "صبر ورضاء" کے ساتھ اس کو انگیز کرے۔ اگر ایسا کرے گا تو بلاشبہ اس کو خیر عظیم حاصل ہوگی اور وہ یقیناً فائز المرام اور کامیاب ہوگا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی پوری داستان اس کی زندہ شہادت ہے۔

② جو شخص اپنے معاملات میں خدا پر بھروسہ اور اعتماد رکھتا اور اسی کو خلوص دل کے ساتھ اپنا پشتیبان سمجھتا ہے تو خدائے تعالیٰ ضرور اس کی مشکلات کو آسان کر دیتا اور اس کے مصائب کو نجات اور کامرانی کے ساتھ بدل دیتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قبطی کو قتل کر دینا، مصریوں کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے لیے آپس میں مشورہ کرنا، پھر دشمنوں ہی میں سے ایک ہمدرد شخص کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصریوں کی سازش پر مطلع کرنا، اور اس طرح ان کا مدین جانا، وحی الٰہی سے مشرف ہونا، اور رسالت کے جلیل القدر

منصب سے سرفراز ہونا اس کی روشن شہادتیں ہیں۔

③ جس کا معاملہ حق کے ساتھ عشق تک پہنچ جاتا ہے اس کے لیے باطل کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہیچ اور بے وجود ہو کر رہ جاتی ہے، غور کیجیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان مادی طاقت کے پیش نظر کیا نسبت ہے، ایک بیچارہ اور مجبور اور دوسرا با صد ہزار قہرمانی کبر و غرور سے معمور، مگر جب فرعون نے برسر دربار حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا:

﴿ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ۝ ﴾ "اے موسیٰ! بالیقین میں تجھے جادو مارا سمجھتا ہوں۔"

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی بے دھڑک جواب دیا:

﴿ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝ ﴾ (بنی اسرائیل: ۱۰۲)

"تو بلاشبہ جانتا ہے کہ ان (آیات) کو آسمانوں اور زمینوں کے پروردگار نے صرف بصیرتیں بنا کر نازل کیا ہے، اور اے فرعون! میں تجھ کو بلاشبہ ہلاک شدہ سمجھتا ہوں۔"

یعنی خدائے تعالیٰ کے ان کھلے نشانوں کے باوجود نافرمانی کا انجام ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

④ اگر کوئی خدا کا بندہ حق کی نصرت و حمایت کے لیے سرفروشانہ کھڑا ہو جاتا ہے تو خدا دشمنوں اور باطل پرستوں ہی میں سے اس کے معین و مددگار پیدا کر دیتا ہے۔

تمہارے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی مثال موجود ہے کہ جب فرعون اور اس کے سرداروں نے ان کے قتل کا فیصلہ کر لیا تو ان ہی میں سے ایک مرد حق پیدا ہو گیا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے پوری مدافعت کی، اسی طرح قبطی کے قتل کے بعد جب ان کے قتل کا فیصلہ کیا گیا تو ایک باخدا قبطی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کی اطلاع کی اور ان کو مصر سے نکل جانے کا نیک مشورہ دیا، جو آئندہ چل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عظیم الشان کامرانیوں کا باعث بنا۔

⑤ اگر ایک بار بھی کوئی لذت ایمانی سے لطف اندوز ہو جائے اور صدق دلی کے ساتھ اس کو قبول کر لے تو یہ نشہ اس کو ایسا مست بنا دیتا ہے کہ اس کے ہر ریشہ جان سے وہی صدائے حق نکلنے لگتی ہے، کیا یہ اعجاز نہیں ہے کہ جو "ساحر" چند منٹ پہلے فرعون کی زبردست طاقت سے مرعوب اور اس کے حکم کی تعمیل کو حرز جان بنائے ہوئے تھے، اور جو اپنے کرشموں کی کامیابی پر انعام و اکرام کا معاملہ طے کر رہے تھے وہی چند منٹ کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دست مبارک پر دولت ایمان کے نشہ سے سرشار ہو گئے تو فرعون کی سخت سے سخت دھمکیوں اور جابرانہ عذاب و عقاب کو ایک کھیل سے زیادہ نہ سمجھتے ہوئے بے باکانہ انداز میں یہ کہتے نظر آتے ہیں:

﴿ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الَّذِیْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ؕ ۝ ﴾ (طٰہٰ: ۷۲)

"انہوں نے کہا ہم کبھی یہ نہیں کر سکتے کہ جو روشن دلیلیں ہمارے سامنے آ گئی ہیں، اور جس خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اس

سے منہ موڑ کر تیرا حکم مان لیں، تو جو فیصلہ کر چکا ہے اس کو کر گذر، تو زیادہ سے زیادہ جو ہوسکتا ہے وہ یہی ہے کہ دنیا کی اس زندگی کا فیصلہ کر دے۔"

⑥ صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے خواہ اس پھل کے حاصل ہونے میں کتنی ہی تلخیاں برداشت کرنی پڑیں، مگر جب بھی وہ پھل لگے گا میٹھا ہی ہوگا، بنی اسرائیل مصر میں کتنے عرصہ تک بیچارگی، غلامی اور پریشان حالی میں بسر کرتے اور نرینہ اولاد کے قتل اور لڑکیوں کی باندیاں بننے کی ذلت و رسوائی کو برداشت کرتے رہے مگر آخر وہ وقت آ ہی گیا جبکہ ان کو صبر کا میٹھا پھل حاصل ہوا اور فرعون کی تباہی اور ان کی باعزت رستگاری نے ان کے لیے ہر قسم کی کامرانیوں کی راہیں کھول دیں۔

﴿تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ۭ﴾ (الاعراف: ۱۳۷)

"اور بنی اسرائیل پر تیرے رب کا کلمہ نیک پورا ہو کر رہا بسبب اس بات کے کہ انہوں نے صبر سے کام لیا۔"

⑦ غلامی اور محکومانہ زندگی کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہمت و عزم کی روح پست ہو کر رہ جاتی ہے اور انسان اس ناپاک زندگی کے ذلت آمیز امن و سکون کو نعمت سمجھنے اور حقیر راحتوں کو سب سے بڑی عظمت تصور کرنے لگتا ہے، اور جدوجہد کی زندگی سے پریشان و حیران نظر آتا ہے، اس کی زندہ شہادت بھی ان بنی اسرائیل کی زندگی کا وہ نقشہ ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آیات و بینات دکھانے، عزم و ہمت کی تلقین کرنے اور خدا کے وعدہ کامرانی کو باور کرانے کے باوجود ان میں زندگی اور پامردی کے آثار نظر نہیں آتے اور وہ قدم قدم پر شکووں اور حیرانیوں کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔

ارض مقدس میں داخلہ اور وعدہ نصرت کے باوجود بت پرست دشمنوں کے مقابلہ سے انکار کے وقت جو یہ تاریخی جملے انہوں نے کہے وہ اس حقیقت کے لیے شاہد عدل ہیں:

﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴾

"اے موسیٰ (علیہ السلام)! تو اور تیرا رب دونوں جا کر ان سے لڑو، بلاشبہ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں یعنی تماشا دیکھتے ہیں۔"

⑧ وراثت زمین یا وراثت ملک اسی قوم کا حصہ ہے جو بے سروسامانی سے بے خوف ہو کر اور عزم و ہمت کا ثبوت دے کر ہر قسم کی مشکلات اور موانع کا مقابلہ کرتی اور "صبر" اور "خدا کی مدد پر بھروسہ" کرتے ہوئے میدان جدوجہد میں ثابت قدم رہتی ہے۔

⑨ باطل کی طاقت کتنی ہی زبردست اور پر از شوکت و صولت کیوں نہ ہو انجام کار اس کو نامرادی کا منہ دیکھنا پڑے گا اور آخری انجام میں کامرانی و کامیابی کا سہرا ان ہی کے لیے ہے جو نیکوکار اور باہمت ہیں ﴿وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾۔

⑩ یہ "عادۃ اللہ" ہے کہ جابر و ظالم قومیں جن قوموں کو ذلیل اور حقیر سمجھتی ہیں، ایک دن آتا ہے کہ وہی ضعیف اور کمزور قومیں خدا کی زمین کی وراثت بنتی اور حکومت و اقتدار کی مالک ہو جاتی ہیں اور ظالم قوموں کا اقتدار خاک میں مل جاتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی مکمل داستان اس کے لیے روشن ثبوت ہے۔

﴿وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝﴾ (القصص: ۵-۶)

"اور ہم چاہتے تھے کہ جو لوگ ملک میں کمزور کر دیئے گئے ہیں ان پر احسان کریں اور ان کو پیشواء بنائیں اور انہیں ملک کا

Marfat.com

وارث کریں اور ملک میں ان کو طاقت وقدرت دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر کو وہ چیز دکھادیں جس سے وہ ڈرتے تھے۔"

⑪ طاقت وحکومت اور دولت وثروت میں سرشار جماعتوں کا ہمیشہ سے یہ شعار رہا ہے کہ سب سے پہلے وہی "دعوتِ حق" کے مقابلہ میں نبرد آزما ہوتی ہیں مگر قوموں کی تاریخ یہ بھی بتلاتی ہے کہ ہمیشہ حق کے مقابلہ میں ان کو شکست ہوتی رہی ہے اور انجام کاران کو ناکامی ونامرادی کا منہ دیکھنا پڑا ہے، اس کے لیے نہ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ تنہا شاہد ہے بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوتِ حق اور مخالف طاقتوں کی مخالفت کا انجام تاریخی شہادت بن کر حقیقت بیں انسانوں کے لیے درسِ عبرت دیتا رہا ہے۔

⑫ جو ہستی یا جو جماعت دیدہ دانستہ حق کو حق جانتے ہوئے بھی سرکشی کرے اور خدا کی دی ہوئی نشانیوں کی منکر ونافرمان بنے تو اس کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ ان سے قبولِ حق کی استعداد فنا کر دیتا ہے کیونکہ یہ ان کی پیہم سرکشی کا قدرتی ثمرہ ہے۔

﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ﴾

"عنقریب میں اپنی نشانیوں سے ان کی نگاہیں پھیر دوں گا جو ناحق خدا کی زمین میں سرکشی کرتے ہیں۔"

اس آیت کا اور اس قسم کی دوسری آیات کا یہی مطلب ہے جو سطورِ بالا میں ذکر کیا گیا، یہ مطلب نہیں ہے کہ خدائے تعالیٰ کسی کو بے عقلی اور گمراہی پر مجبور کرتا ہے۔

⑬ یہ بہت بڑی گمراہی ہے کہ انسان کو جب حق کی بدولت کامرانی وکامیابی حاصل ہو جائے تو خدا کے شکر وسپاس اور عبودیت ونیاز کی جگہ مخالفینِ حق کی طرح غفلت وسرکشی میں مبتلاء ہو جائے، افسوس کہ بنی اسرائیل کی داستان کا وہ حصہ "جو فرعون سے نجات پا کر قلزم عبور کرنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے" اسی گمراہی سے معمور ہے۔

⑭ دین کے بارہ میں ایک بہت بڑی گمراہی یہ ہے کہ "انسان صداقت وسچائی کے ساتھ اس پر عمل پیرا نہ ہو اور خواہش نفس کو امام بنا کر احکامِ الٰہی میں مرضی کے مطابق حیلہ سازیاں تراشے اور خود فریبی میں مبتلاء ہو کر یہ سمجھ بیٹھے کہ من مانی بھی ہوگئی اور دین کا اتباع بھی ہو گیا۔ برائی کو برائی سمجھ کر اس میں مبتلاء ہونا اس درجہ شنیع نہیں ہے جتنا کہ برائی کو بھلائی کا رنگ دے کر اور منہیات میں حیلہ سازی کر کے اس کا جواز پیدا کرنا مذموم ومکروہ ہے، حق تعالیٰ کی جانب سے اکثر وبیشتر قوموں پر عذاب اسی قابلِ نفرت عمل کی وجہ سے ہوتا رہا ہے۔

یہود نے بھی "سبت کے متعلق" یہی طریقہ اختیار کیا تھا اور عذابِ الٰہی کے مستحق ٹھہرے تھے، سبت کے دن بنی اسرائیل کو شکار کی ممانعت تھی اور پورا دن عبادت کے لیے مخصوص تھا، انہوں نے کچھ عرصہ تو اس حکم پر صبر کیا لیکن زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے، اور حیلہ یہ اختیار کیا کہ سبت سے پہلی رات میں دریا کے کنارہ پر گڑھے کھود کر پانی کا بہاؤ اس طرف کر دیتے اور صبح ہوتے مچھلیاں خود بخود ان گڑھوں میں آ جاتیں اور بنی اسرائیل شام کو ان کو قبضہ میں کر لیتے، اور جب خدا کے نیک بندے اس حیلہ پر اعتراض کرتے تو بڑے فخر سے کہتے کہ ہم نے سبت کے احترام کو کب شکست کیا ہے جو تم معترض ہوتے ہو، مگر خدا کے عذاب نے جب ان کو آ لیا تب ان کو معلوم ہوا کہ دین میں حیلہ سازی کس قدر خوفناک جرم ہے۔

⑮ کوئی حق کو قبول کرے یا نہ کرے حق کے داعی کا فرض ہے کہ وہ موعظتِ حق سے باز نہ رہے، چنانچہ سبت کی بے حرمتی پر ان ہی میں سے بعض اہلِ حق نے ان کو سمجھایا تو بعض نے یہ بھی کہا کہ یہ ماننے والے نہیں ہیں ان کا سمجھانا بیکار ہے مگر پختہ کار داعیانِ حق نے جواب دیا:

Marfat.com

﴿مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴾

"قیامت میں خدا کے سامنے ہم معذرت تو کر سکیں گے کہ ہم حق تبلیغ برابر ادا کرتے رہے، اور ہم کو غیب کا کیا علم، کیا عجب ہے کہ پرہیزگار بن جائیں؟"

⑯ کسی قوم پر جابر و ظالم حکمران کا مسلط ہونا اس حکمران کی عنداللہ مقبولیت و سرفرازی کی دلیل نہیں ہے بلکہ وہ خدا کا ایک عذاب ہے جو محکوم قوم کی بد عملیوں کے پاداش عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، مگر محکوم قوم کی ذہنیت پر جابر طاقت کا اس قدر غلبہ چھا جاتا ہے کہ وہ اس کی قہرمانیت کو ظالم حکمران پر خدا کی رحمت اور اس کے اعمال کا انعام سمجھنے لگتی ہے، چنانچہ فرعون اور بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ "جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دلانے کے لیے ان کو ابھارا اور انہوں نے قدم قدم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اپنی شکایتوں اور مصر میں غلامانہ خوش حال زندگی بسر کرنے کی دوبارہ تمناؤں کا اظہار کیا ہے" اس کے لیے شاہد عدل ہے، قرآن عزیز نے اس حقیقت کو اس معجزانہ انداز میں بیان کیا ہے:

﴿وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ﴾ (الاعراف: ۱۶۷)

"اور جب ایسا ہوا کہ تیرے پروردگار نے اعلان کر دیا تھا (اگر بنی اسرائیل بد عملی اور سرکشی سے باز نہ آئے تو) وہ قیامت کے دن تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرے گا جو انہیں ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا رکھیں گے۔"

⑰ جب فرعون اور اس کی قوم کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدائے تعالیٰ سے دعا کی، خدایا! اب ان بد کرداروں کو ان کی سرکشی اور بد عملی کی سزا دے کہ یہ کسی طرح راہ راست پر نہیں آتے، مگر جب بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء کی استجابت کا وقت آتا اور خدا کے عذاب کی علامتیں شروع ہوتیں تب فوراً فرعون اور اس کی قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہتی: اگر اس مرتبہ یہ عذاب ہم پر سے دفع ہو گیا تو ہم ضرور تیری بات مان لیں گے اور جب وہ دفع ہو جاتا تو پھر بدستور تمرد اور سرکشی کرنے لگتے، اس طرح ایک عرصہ تک ان کو مہلت ملتی رہی اور جب کسی طرح کج روی سے باز نہ آئے تو آخر کار عذاب الٰہی نے اچانک ان کو آ لیا اور ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیا، اسی طرح سبت کی بے حرمتی کرنے والوں کو مہلت ملتی رہی۔ مگر جب وہ کسی طرح باز نہ آئے تو خدا کے عذاب نے ان کا خاتمہ کر دیا۔

یہ اور امم ماضیہ کے اسی قسم کے دوسرے واقعات اس امر کی دلیل ہیں کہ جب کوئی قوم یا کوئی جماعت بد کرداری اور سرکشی میں مبتلا ہوتی ہے تو خدا کا قانون یہ ہے کہ ان کو فوراً ہی گرفت میں نہیں لیا جاتا بلکہ بتدریج مہلت ملتی رہتی ہے کہ اب باز آ جائے، اب سمجھ جائے اور اصلاح حال کر لے، لیکن جب وہ آمادہ اصلاح نہیں ہوتی اور ان کی سرکشی اور بد عملی ایک خاص حد تک پہنچ جاتی ہے تو خدا کی گرفت کا سخت پنجہ ان کو پکڑ لیتا ہے اور وہ بے یار و مددگار فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔

⑱ کسی ہستی کے لیے بھی "وہ نبی یا رسول ہی کیوں نہ ہو" یہ مناسب نہیں کہ وہ یہ دعویٰ کرے کہ مجھ سے بڑا عالم کائنات میں کوئی نہیں بلکہ اس کو خدا کے علم کے سپرد کر دینا بہتر ہے کیونکہ ﴿وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴾ اس کا ارشاد عالی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جلیل القدر رسول و پیغمبر اور جامع صفات و کمالات نبوت ہونے کے بعد جب یہ فرمایا کہ میں سب سے بڑا عالم ہوں تو خدا نے ان کو تنبیہ کی اور خضر علیہ السلام سے ملاقات کرا کے یہ بتایا کہ ان صفات کمال کے باوجود علم الٰہی اسرار اس قدر بے غایت و بے نہایت ہیں کہ ان میں سے چند امور کو اس نے ایک بزرگ ہستی پر ظاہر کر دیا تو موسیٰ علیہ السلام ان تکوینی اسرار کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

(۱۹) پیروان ملت اسلامیہ کے لیے "غلامی" بہت بڑی لعنت اور خدا کا بہت بڑا غضب ہے اور اس پر قانع ہو جانا گویا عذاب الٰہی اور لعنت خداوندی پر قناعت کر لینے کے مترادف ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت حق دیتے ہوئے پہلا مطالبہ یہ کیا کہ بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے آزاد کر دے تاکہ وہ میرے ساتھ ہو کر آزادانہ توحید الٰہی کے پرستار رہ سکیں اور ان کی مذہبی زندگی کے کسی شعبہ میں بھی جابرانہ اور کافرانہ اقتدار حائل نہ رہ سکے۔

﴿وَ قَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۰۴۔۱۰۵)

"اور موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا! اے فرعون! میں جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا ایلچی ہوں، میرے لیے کسی طرح زیبا نہیں کہ اللہ پر حق اور سچ کے علاوہ کچھ اور کہوں، بلاشبہ میں تمہارے لیے تمہارے پروردگار کے پاس سے دلیل اور اشارہ لایا ہوں، پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔"

﴿فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝﴾ (الشعراء: ۱۶۔۱۷)

"پھر وہ دونوں فرعون کے پاس آئے پس انہوں نے کہا: ہم بلاشبہ جہانوں کے پروردگار کے پیغمبر اور ایلچی ہیں، یہ پیغام لے کر آئے ہیں کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور غلامی سے ان کو چھٹکارا دے۔"

سورۂ شعراء کی یہ آیت تو اس مسئلہ کی اہمیت کو اس درجہ رفیع ظاہر کر رہی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبر کی بعثت کی غرض و غایت ہی یہ تھی کہ انبیاء علیہم السلام کے مشہور خانوادہ بنی اسرائیل کو فرعون کے جابرانہ اور کافرانہ اقتدار کی غلامی سے آزاد کرائیں اور نجات دلائیں۔

نیز سورۂ اعراف کی آیات کو اگر غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی یہی حقیقت نمایاں ہے، اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں اول اپنی رسالت کا اعلان کرتے ہیں اور پھر خدا کی جانب سے رشد و ہدایت کی دعوت دیتے اور آیات بینات کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے اپنی بعثت کا مال اور نتیجہ یہی بیان فرماتے ہیں:

﴿فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝﴾

"پس بنی اسرائیل کو (اپنی غلامی سے نجات دے کر میرے ساتھ کر دے)۔"

پھر یہ بات بھی توجہ کے لائق ہے کہ دعویٰ نبوت و رسالت کے بعد اگرچہ عرصہ دراز تک موسیٰ علیہ السلام کا قیام مصر میں رہا تاہم بنی اسرائیل پر اس وقت تک قانون ہدایت (تورات) نہیں اترا جب تک ان کو فرعون کی غلامی سے نجات نہیں مل گئی اور وہ ظالمانہ اقتدار کے پنجہ استبداد سے نجات پا کر ارض مقدس واپس نہیں آ گئے۔

﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ﴾

Marfat.com

قصص القرآن

جلد دوم

قصص قرآن اور انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات اور اُن کی دعوتِ حق کی مُستند ترین تاریخ جس میں حضرت یُوشع علیہ السلام کے واقعات سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حالات تک، نہایت مُبصّرانہ اور محقّقانہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیُوہاروی رفیقِ اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

تخریج و تصحیح

مولانا محمد عرفان فاضل جامعہ مدنیہ، لاہور

مکتبہ رحمانیہ

اِقرا سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

Marfat.com

فہرست مضامین (جلد دوم)

پیش لفظ ۷
طبع اوّل ۷
دیباچہ طبع دوم ۹
دیباچہ طبع سوم ۹
دیباچہ طبع چہارم ۱۰
دیباچہ طبع پنجم عکسی ۱۰

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام

نیابت حضرت موسیٰ علیہ السلام ۱۱
حضرت یوشع علیہ السلام کا ذکر قرآن میں ۱۱
نسب ۱۲
ارض مقدس میں داخلہ ۱۲
حق ناسپاسی ۱۴
بصیرت وعبرت ۱۶
حضرت حزقیل علیہ السلام ۱۷
تمہید ۱۷
نام ونسب اور بعثت ۱۷
قرآن اور حزقیل علیہ السلام ۱۸
فرار از جہاد ۱۸
آیت جہاد سے روایت کی تائید ۱۹
احیاءِ موتی ۱۹
بصائر ۲۰

حضرت الیاس علیہ السلام

تمہید ۲۲
نام ۲۲
نسب ۲۳
قرآن عزیز اور حضرت الیاس علیہ السلام ۲۳
بعثت ۲۳
قوم الیاس علیہ السلام اور بعل ۲۳
تفسیری نکتہ ۲۴
موعظت ۲۵

حضرت الیسع علیہ السلام

نام ونسب ۲۷
بعثت ۲۷
قرآن اور حضرت الیسع علیہ السلام ۲۷
موعظت ۲۷
قرآن عزیز اور حضرت الیسع علیہ السلام ۲۷

حضرت شمویل علیہ السلام

بنی اسرائیل کی گذشتہ تاریخ پر طائرانہ نظر ۲۸

Marfat.com

نام ونسب ۲۹
تابوت سکینہ ۳۲
طالوت وجالوت کی جنگ اور بنی اسرائیل کا امتحان ۳۴
حضرت داؤد علیہ السلام کی شجاعت ۳۵
ایک اسرائیلی روایت پر محاکمہ ۳۶
بصائر وحکم ۳۸

حضرت داؤد علیہ السلام

نسب نامہ ۴۱
حلیہ مبارک ۴۱
قرآن عزیز میں ذکر مبارک ۴۱
نبوت ورسالت ۴۲
عظمت مملکت ۴۳
زبور ۴۴
حضرت داؤد علیہ السلام اور قرآن وتورات ۴۵
خصائص داؤد علیہ السلام ۴۶
تسخیر وتسبیح جبال وطیور ۴۶
حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں لوہے کا نرم ہو جانا ۵۰
منطق الطیر ۵۲
تلاوت زبور ۵۲
حضرت داؤد علیہ السلام اور دو اہم تفسیری مقام ۵۲
مقام اوّل ۵۲
مقام ثانی ۵۳
بہتان طرازی کی مثال ۵۳
تورات کا تضاد بیان ۵۴
آیات کی باطل تفسیر ۵۷
آیات کی صحیح تفاسیر ۵۹
عمر مبارک ۶۳
مدفن ۶۴
بصائر ۶۴

حضرت سلیمان علیہ السلام

نسب ۶۷
قرآن عزیز اور ذکر سلیمان علیہ السلام ۶۸
بچپن ۶۸
وراثتِ داؤد علیہ السلام ۶۸
نبوت ۶۹
خصائص سلیمان علیہ السلام ۷۰
منطق الطیر ۷۰
تسخیر ریاح ۷۱
تسخیر جن وحیوانات ۷۲
بیت المقدس کی تعمیر ۷۴
تانبے کے چشمے ۷۶
حضرت سلیمان علیہ السلام اور جہاد کے گھوڑوں کا واقعہ ۷۷
محاکمہ ۷۹
حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کا واقعہ ۸۰
محاکمہ ۸۲
لشکر سلیمان علیہ السلام اور وادی نملہ ۸۴
حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سباء ۸۸
چند قابل تحقیق مسائل ۹۳
سباء کی تحقیق ۹۳
ملکہ سباء کا نام ۹۴
ھُدْ ھُدْ ۹۵
ملکہ سباء کا تخت ۹۶

Marfat.com

عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ کی شخصیت ۹۹
ملکہ سباء کا قبولِ اسلام ۱۰۰
تورات میں ملکہ سباء کا ذکر ۱۰۴
ملکہ سباء کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ نکاح ۱۰۵
اسرائیلیات ۱۰۵
حضرت سلیمان علیہ السلام کے مکتوب کا اعجاز ۱۰۶
حضرت سلیمان علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا بہتان ۱۰۷
حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات ۱۱۱
بصائر ۱۱۳

حضرت ایوب علیہ السلام

حضرت ایوب علیہ السلام اور قرآن عزیز ۱۱۷
حضرت ایوب علیہ السلام کی شخصیت ۱۱۷
یوباب اور ایوب علیہ السلام ۱۱۸
عہد ایوب علیہ السلام ۱۲۰
غلط فہمی کا ازالہ ۱۲۱
حضرت ایوب علیہ السلام اور علماء یہود و نصاریٰ ۱۲۱
قرآن عزیز اور واقعہ ایوب علیہ السلام ۱۲۲
چند تفسیری حقائق ۱۲۴
سفر ایوب ۱۲۷
وفات ۱۲۸

حضرت یونس علیہ السلام

حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں ۱۳۱
حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ ۱۳۱
نسب ۱۳۵
زمانہ کا تعین ۱۳۵
مقام دعوت ۱۳۶
چند تفسیری مباحث ۱۳۶
متنبی کاذب کی تلبیس ۱۴۱
صحیفہ یوناہ ۱۴۳
وفات ۱۴۴
فضیلت یونس علیہ السلام ۱۴۴
فضائل انبیاء علیہم السلام ۱۴۵
موعظت ۱۴۸

حضرت ذوالکفل علیہ السلام

قرآن عزیز اور ذوالکفل ۱۵۰
نسب ۱۵۰
آثار و روایات ۱۵۰
تنقید ۱۵۲
ایک غلط فہمی کا ازالہ ۱۵۴
موعظت ۱۵۴

حضرت عزیر علیہ السلام

قرآن عزیز اور حضرت عزیر علیہ السلام ۱۵۶
تاریخی بحث ۱۵۸
واقعہ کی غلط تفسیر ۱۶۰
حضرت عزیر علیہ السلام اور عقیدۂ ابنیت ۱۶۱
ایک شبہ کا جواب ۱۶۲
حضرت عزیر علیہ السلام کی زندگی مبارک ۱۶۲
حضرت عزیر اور منصب نبوت ۱۶۳
نسب ۱۶۳
وفات اور قبر مبارک ۱۶۳

Marfat.com

بصائر ۱۶۴

حضرت زکریا علیہ السلام

قرآن عزیز اور حضرت زکریا علیہ السلام ۱۶۵
نسب ۱۶۵
حالات زندگی ۱۶۶
چند تفسیری حقائق ۱۷۱

حضرت یحییٰ علیہ السلام

قرآن عزیز اور حضرت یحییٰ علیہ السلام ۱۷۴
نام ونسب ۱۷۴
حالاتِ زندگی ۱۷۴
دعوت وتبلیغ ۱۷۷
واقعہ شہادت ۱۷۹
مقتل ۱۸۰
زکریا علیہ السلام کی وفات ۱۸۱
شب معراج اور یحییٰ علیہ السلام ۱۸۲
یحییٰ علیہ السلام اور اہل کتاب ۱۸۲
بصائر ۱۸۳

پیش لفظ

طبع اوّل

الحمدللہ الذی خلق الانسان و علمہ البیان، ولھدایۃ الثقلین نزّل القران تبیانًا لِکُل شیٔ و بُرھان والصلوٰۃ والسلام علی سیّد بنی عدنان، الذی اسمہٗ احمد فی الانجیل والفرقان، خاتم النبیین للانسان والجان وعلی اٰلہٖ و اصحابہ العزیزالکرام، السّابقین الاولین الی الھدایۃ والایمان، والذین اتبعوھم بالخیر والاحسان.

امابعد! جب قصص القرآن جلد اوّل طبع ہو کر شائع ہوئی اس وقت یہ خیال بھی نہیں تھا کہ یہ کتاب اس درجہ مقبول ہوگی اور اس قدر پسند کی جائے گی جس کا مشاہدہ عام پڑھنے والوں کی قدر افزائی کے علاوہ معزز رسائل اور موقر جرائد کے ذریعہ اہل قلم کی آراء اوران کے تبصروں کی شکل میں ہوا۔ فالحمدللہ علی ذالک.

یہ جلد حضرت یوشع علیہ السلام کے واقعات سے شروع ہو کر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حالات طیبہ پر ختم ہوئی ہے۔ واقعات کی ترتیب میں جلد اوّل ہی کے اسلوب کو برقرار رکھا گیا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل کے سلسلہ ترتیب کے درمیان حضرت ایوب علیہ السلام اور حضرت یونس علیہ السلام کا بھی ذکر آ گیا ہے حالانکہ ان ہر دو پیغمبروں کا سلسلہ نسب حضرت اسرائیل سے وابستہ نہیں ہے کیونکہ دونوں متقدم ہیں اور چونکہ حضرت زکریا و حضرت یحییٰ علیہما السلام کا ذکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر پاک کے لیے توطیہ وتمہید ہے اس لیے حضرت ایوب علیہ السلام اور حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر حضرت زکریا علیہ السلام سے قبل آ جانا ہی مناسب سمجھا گیا۔ اصحاب ذوق کتاب کے مطالعہ کے وقت جلد اول کی طرح اس جلد میں بھی حسب ذیل خصوصیات پائیں گے۔

① کتاب میں تمام واقعات کی اساس قرآن عزیز کو بنایا گیا ہے اور صحیح احادیث اور مستند تاریخی واقعات سے ان کی توضیح وتشریح کی گئی ہے۔

② کتب عہد قدیم اور قرآن عزیز کے "یقین محکم" کے درمیان جس جگہ تعارض نظر آتا ہے اس کو یا روشن دلائل کے ذریعہ تطبیق دے دی گئی ہے اور یا پھر قرآن عزیز کی صداقت کو واضح براہین کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔

③ اسرائیلی خرافات اور معاندین کے اعتراضات کی خرافات کو حقائق کی روشنی میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔

④ تفسیری، حدیثی اور تاریخی مسائل اور ان سے متعلقہ اشکالات پر بحث وتمحیص کے بعد سلف صالحین کے مسلک قدیم کے مطابق ان کا حل پیش کیا گیا ہے۔

⑤ کسی پیغمبر کے حالات قرآن عزیز کی کن کن سورتوں میں بیان ہوئے ہیں، ان کو نقشہ کی شکل میں ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔

⑥ ان تمام خصوصیات کے ساتھ "نتائج و عبر"، "مواعظ و بصائر" کے عنوانات سے واقعات و اخبار کے حقیقی مقصد اور اصل غرض و غایت یعنی "عبرت و بصیرت" کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔

مصنف کو ان خصوصیات کے متعلق کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی، اس کا فیصلہ اصحاب ذوق اور اہل نظر کے ہاتھ میں ہے۔

﴿ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۔ وَهُوَ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾

خادم ملت

محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی

شعبان ۱۳۶۱ھ

Marfat.com

دیباچہ طبع دوم

الحمد للہ کہ قرآن عزیز کی یہ خدمت مقبول عام و خاص ہوئی، پہلے حصہ کی طرح دوسرا حصہ بھی بہت جلد ختم ہو گیا اور تقریباً ڈیڑھ سال سے اس کی ایک جلد بھی دفتر میں برائے فروخت موجود نہیں تھی، ارادہ تھا کہ طبع دوم میں کچھ حک و فک کیا جائے اور نقش ثانی کو نقش اوّل سے زیادہ بہتر اور مکمل کرنے کی سعی کی جائے لیکن وقت کی دوسری اور اہم مصروفیتوں اور تصنیف و تالیف کے دیگر ناگزیر مشاغل نے اس کا موقع نہ دیا اور پہلی جلد کی طرح یہ جلد بھی بعینہٖ شائع کر دینی پڑی۔ توفیق الٰہی شامل حال رہی تو طبع سوم میں اس کی تلافی کی جائے گی۔

محمد حفظ الرحمٰن

۲ مارچ ۴۷ء

دیباچہ طبع سوم

۴۷ء کے شروع میں قصص القرآن جلد اوّل کی طرح جلد دوم بھی کئی ہزار کی تعداد میں طبع کرائی گئی تھی اور سمجھ لیا گیا تھا کہ ان دونوں جلدوں کی طباعت سے اب چند سال کے لیے فراغت ہو گئی ہے لیکن قضاء و قدر کے فیصلے ہمارے اندازوں پر مسکرا رہے تھے۔

۸ ستمبر ۴۷ء کی صبح "ندوۃ المصنفین" کے لیے صبح قیامت ثابت ہوئی، چند لمحوں کے اندر ادارے اور اس کے کارکنوں کے نظام حیات کا شیرازہ بکھر کے رہ گیا اور لاکھوں روپے کے ذخیرۂ کتب کے ساتھ اس کتاب کا بھی تمام ذخیرہ ضائع ہو گیا۔ تباہی و بربادی کے اس فیصلہ کے باوجود قدرت کا دوسرا فیصلہ یہ تھا کہ تلخیوں اور ناسازگاریوں کی موجودہ فضاء میں یہ ادارہ پھر زندگی کے میدان میں قدم رکھے گا، چنانچہ جیسے ہی دفتر کا قیام عمل میں آیا، اس متبرک کتاب کی اشاعت کا کام شروع کر دیا گیا۔ پہلے جلد سوم طبع کرائی گئی اور ابھی پچھلے مہینے میں جلد چہارم چھپی، اب جلد دوم حاضر ہے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۱۲ جنوری ۵۰ء

Marfat.com

دیباچہ طبع چہارم

کتاب کے ایڈیشن پر ایڈیشن نکل رہے ہیں لیکن نظر ثانی کی نوبت نہیں آتی، دیکھنا چاہیے کہ طبع پنجم کے وقت بھی نظر ثانی ہو سکے گی۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ کتاب کا یہ حصہ اپنی ترتیب اور مضامین کے لحاظ سے نظر ثانی کا کچھ زیادہ محتاج نہیں ہے اور یوں انسانی جدوجہد کو ہر حیثیت سے مکمل کسی وقت بھی نہیں کیا جا سکتا۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۲۰ رجب المرجب ۷۴ھ مطابق ۱۶ مارچ ۱۹۵۵ء

دیباچہ طبع پنجم عکسی

"قصص القرآن حصہ اوّل" کی عکسی طباعت جو ہر اعتبار سے دل کش اور دیدہ زیب ہے، اپریل ۱۹۶۵ء میں وجود میں آئی تھی، اسی وقت سے ارادہ تھا کہ حصہ دوم بھی جلد سے جلد اعلیٰ طباعت کے زیور سے آراستہ ہو کر سامنے آئے، لیکن اندازے کے خلاف کتابت کے کام میں تعویق ہوتی گئی، ہمارے نامور اور باکمال خطاط منشی محمد خلیق صاحب ٹونکی آنتوں کے مرض میں مبتلاء ہو گئے اور علالت کا تسلسل کئی سال تک قائم رہا، یہ طے کر لیا گیا تھا کہ حصہ دوم کی کتابت بھی حصہ اول ہی کا کاتب کرے گا، ادھر یہ بھی واقعہ ہے کہ خلیق صاحب کی جگہ کوئی دوسرا کاتب لے بھی نہیں سکتا تھا، اس لیے انتظار کے سوا چارہ نہ تھا، شکر ہے، کئی سال کے انتظار کے بعد طباعت کی نوبت آ ہی گئی۔

مصنف رحمۃ اللہ علیہ مرحوم اپنی رحلت سے قبل کتاب کے دونوں حصوں پر مکمل نظر ثانی کر چکے تھے اور مرحلہ صرف طباعت کا باقی رہ گیا تھا، جیسا کہ معلوم ہے "قصص القرآن" کا شمار ہمارے ادارے کی اہم ترین اور مقبول ترین تصنیفات میں ہوتا ہے، جی چاہتا تھا کہ کتاب کے شایانِ شان کتابت و طباعت بھی ہو، الحمد للہ یہ آرزو پوری ہو گئی۔

خیال ہے حصہ سوم اور حصہ چہارم بھی کتابت و طباعت کے اسی معیار کے مطابق شائع ہوں، یہ دونوں حصے پہلے ہی سے نظر ثانی کے کچھ زیادہ محتاج نہیں تھے، لیکن مصنف رحمۃ اللہ علیہ مرحوم دنیا میں ہوتے تو ان حصوں کے بھی نوک پلک اور زیادہ درست کرتے۔

یقین ہے، کتاب کے مطالعہ کے وقت قارئین مرحوم کے لیے ایصالِ ثواب کا خیال رکھیں گے کہ یہ ہم سب پر مرحوم کا حق ہے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۳ شعبان المعظم ۱۳۸۹ھ مطابق ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۹ء

Marfat.com

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام

○ نیابت حضرت موسیٰ علیہ السلام ○ حضرت یوشع علیہ السلام کا ذکر قرآن میں
○ ارض مقدس میں داخلہ ○ حق ناسپاسی جزاءِ عمل

نیابت حضرت موسیٰ علیہ السلام:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی مبارک کے واقعات میں حضرت ہارون علیہ السلام کے بعد تورات میں حضرت یوشع علیہ السلام (یشوع) کا ذکر بہ کثرت آتا ہے ہم نے بھی صفحات گذشتہ میں دو تین جگہ ان کا تذکرہ کیا ہے، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات میں ان کے خادم تھے اور حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ اور جانشین نبوت بنے، کنعان میں جابر اور مشرک قوموں کے حالات معلوم کرنے کے لیے جو وفد گیا تھا اس کے ایک رکن یہ بھی تھے، اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو ان قوموں سے جنگ کرنے کی دعوت و ترغیب دی اور انہوں نے انکار کیا، تب یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے بنی اسرائیل کو جرأت و ہمت دلانے کی کوشش کی اور خدا کا وعدۂ نصرت یاد دلا کر جہاد پر اکسایا اور کہا کہ اگر تم جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ تو یقیناً فتح تمہاری ہے۔

تورات میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہی میں حق تعالیٰ نے ان پر ظاہر کر دیا تھا کہ یوشع میرا خاص بندہ ہے اور بنی اسرائیل کے نوجوان اسی کی سرکردگی میں کنعان اور بیت المقدس کو جابر مشرکین سے پاک کریں گے۔

"خداوند نے موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا کہ نون کے بیٹے یشوع کو لے کر اس پر اپنا ہاتھ رکھ کیونکہ اس شخص میں "روح" ہے اور اسے الیعزر کاہن اور ساری جماعت کے آگے کھڑا کر کے ان کی آنکھوں کے سامنے اسے وصیت کر، اور اپنے رعب داب سے اسے بہرہ ور کر دے تاکہ بنی اسرائیل کی ساری جماعت اس کی فرمانبرداری کرے۔[1] اور نون کا بیٹا یشوع (یوشع) دانائی کی روح سے معمور تھا کیونکہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے ہاتھ اس پر رکھے تھے اور بنی اسرائیل ان کی بات مانتے رہے۔[2]

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان ہی کی قیادت میں چالیس برس کے بعد بنی اسرائیل کی نسل ارض مقدس میں داخل ہوئی اور انہوں نے کنعان، شام، شرق اردن سے تمام جابر و ظالم طاقتوں کو پامال کر دیا۔

حضرت یوشع علیہ السلام کا ذکر قرآن میں:

قرآن عزیز میں حضرت یوشع علیہ السلام کا نام مذکور نہیں ہے، البتہ سورۂ کہف میں دو جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک نوجوان

---

[1] گنتی باب ۲۷ آیات ۱۹-۲۰ [2] استثناء باب ۳۴ آیت ۹

Marfat.com

رفیق سفر کا تذکرہ موجود ہے جبکہ وہ حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے ﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ﴾ ایک صحیح حدیث میں جو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اس نوجوان رفیق کا نام یشوع بتایا گیا ہے۔ اس طرح گویا ان کا ذکر بھی قرآن عزیز میں موجود ہے، اہل کتاب کا ان کے نبی ہونے پر اتفاق ہے اور تورات (عہد قدیم) میں یشوع کی کتاب بھی مستقل صحیفہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

نسب:

حضرت یوشع علیہ السلام بنی اسرائیل کے اسباط (اولاد) میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کے سبط سے تعلق رکھتے ہیں، چنانچہ مؤرخین نے ان کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے: یوشع بن نون بن فراہیم بن یوسف بن یعقوب بن ابراہیم علیہم السلام۔

خدائے تعالیٰ کی کرشمہ سازیوں کا یہ عجب مظاہرہ ہے کہ جس یوسف کی بدولت کنعان کے ستر انسانوں پر مشتمل خاندان عزت وعظمت اور جاہ وجلال کے ساتھ کنعان سے ہجرت کر کے مصر میں آباد ہوا تھا، آج اس کے پوتے یوشع کی قیادت میں لاکھوں کی مردم شماری کا یہ خاندان پھر اپنے آباء و اجداد کے وطن کنعان میں اسی جاہ وجلال اور سطوت و جبروت کے ساتھ داخل ہو رہا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چالیس سال گزر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع علیہ السلام کو حکم دیا کہ تم بنی اسرائیل کے اس قافلہ کو لے کر موعودہ سرزمین کی طرف بڑھو اور وہاں عمالقہ اور دوسری جابر قوموں سے جنگ کر کے ان کو شکست دو، میری مدد تمہارے ساتھ ہے، تورات میں ہے:

"اور خدا کے بندے موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ایسا ہوا کہ خداوند نے اس کے خادم نون کے بیٹے یشوع سے کہا۔ میرا بندہ موسیٰ مر گیا ہے سو اب تو اٹھ اور ان سب لوگوں کو ساتھ لے کر اس یردن کے پار اس ملک میں جا، جسے میں ان کو یعنی بنی اسرائیل کو دیتا ہوں، جس جس جگہ تمہارے پاؤں کا تلوا ٹکے اس کو جیسا میں نے موسیٰ کو کہا، میں نے تم کو دیا ہے، بیابان اور اس لبنان سے لے کر بڑے دریائے فرات تک حتیوں کا سارا ملک اور مغرب کی طرف بڑے سمندر تک تمہاری حد ہوگی، تیری زندگی بھر کوئی شخص تیرے سامنے کھڑا نہ رہ سکے گا، جیسا میں موسیٰ کے ساتھ تھا ویسے ہی تیرے ساتھ رہوں گا، میں نہ تجھ سے دست بردار ہوں گا اور نہ تجھے چھوڑوں گا۔" [1]

ارض مقدس میں داخلہ:

حضرت یوشع علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو خدا کا پیغام سنایا اور وہ سب دشت سینا سے نکل کر ارض کنعان کے سب سے پہلے شہر اریحا (یریحو) کی جانب بڑھے اور دشمنوں کو للکارا، دشمنوں نے بھی باہر نکل کر سخت مقابلہ کیا اور آخر کار شکست کھا کر وہیں کھیت رہے اور بنی اسرائیل کو زبردست فتح ونصرت نصیب ہوئی اور آہستہ آہستہ اسی طرح یشوع اور بنی اسرائیل لڑتے لڑتے تمام ارض مقدس پر قابض ہو گئے اور جابر مشرکوں سے اس کو پاک کر کے ایک مرتبہ پھر اپنے آبائی وطن کے مالک کہلائے۔

تورات میں ہے کہ جب بنی اسرائیل جنگ کے لیے تیار ہوئے تو خدا کے حکم سے عہد کا صندوق (تابوت سکینہ) ان کے

---

[1] یشوع کی کتاب باب ۵-۱

Marfat.com

ساتھ تھا، اس میں عصاء موسیٰ علیہ السلام، پیرہن ہارون علیہ السلام، اور من کا مرتبان بھی تھا اور ان کے علاوہ دوسرے تبرکات بھی تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا تھا کہ تم من کو محفوظ کرلو، تاکہ تمہاری آئندہ نسلیں بھی مشاہدہ کرلیں کہ تم پر خدا کا انعام ہوا تھا۔

ابن اثیر فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی ہی میں ارض مقدس میں جابر طاقتوں سے مقابلہ کے لیے حضرت یوشع علیہ السلام کو امیر جیش نامزد کر کے بنی اسرائیل کے اسباط کی تقسیم اور ان کے سپہ سالاروں کی نامزدگیاں کردی تھیں، اس لیے حضرت یوشع علیہ السلام کا یہ معاملہ ٹھیک حضرت اسامہ کا سا معاملہ تھا کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زندگی مبارک ہی میں شام کی تسخیر کے لیے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو امیر منتخب کیا تھا اور دست مبارک سے ان کے لیے جھنڈا بنایا تھا، مگر لشکر ابھی روانہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی اور پھر خلافت صدیقی میں یہ ہوا کہ جیش اسامہ کو شام کی مہم پر روانہ کیا گیا اور آخر کار یہی مہم روم، ایران، اور عراق کی فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارض مقدس میں جابر طاقتوں کے استیصال کے لیے بحکم الٰہی حضرت یوشع علیہ السلام کو امیر جیش بنایا اور جنگ کے ابتدائی مراحل کو خود انجام دیا، لیکن جیش کی روانگی سے قبل ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوگئی اور اب حضرت یوشع علیہ السلام کو خدائے تعالیٰ نے نبوت سے بھی سرفراز فرما دیا اور ان ہی کے ہاتھوں آخر کار ارض مقدس مشرک اور جبار طاقتوں سے پاک ہوئی اور اریحا کی کامیابی تمام ارض مقدس کی فتح و نصرت کا پیش خیمہ بنی۔

حضرت یوشع علیہ السلام نے سب سے پہلے کس شہر کو فتح کیا قرآن عزیز نے اس کا نام نہیں بتایا بلکہ "قریہ" کہہ کر مبہم چھوڑ دیا ہے، اس لیے کہ اس واقعہ کے بیان کرنے سے اس کا جو مقصد ہے۔ قریہ کی تعیین کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حافظ عماد الدین کہتے ہیں کہ راجح قول یہ ہے کہ یہ بیت المقدس (یروشلم) ہے اور اریحا اس لیے صحیح نہیں ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے اس راستہ میں نہیں پڑتا اور نہ خدا نے بنی اسرائیل سے اس کا وعدہ کیا تھا، بلکہ بیت المقدس کا وعدہ تھا۔

مگر ہمارے نزدیک ان کا یہ فرمانا تو صحیح ہے کہ قریہ سے مراد بیت المقدس ہے لیکن انہوں نے اس سلسلہ میں جو دلائل پیش فرمائے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں، اس لیے کہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اگر بنی اسرائیل بیابان سینا سے براہِ راست بیت المقدس بھی ارادہ کرتے تب بھی خشکی کی راہ سے ارض کنعان پہلے پڑتی اور اریحا اس کا پہلا شہر تھا، نقشہ سامنے رکھیے اور دیکھیے کہ خشکی کی راہ سے جب کوئی اس زمانہ میں بیابان سینا کو عبور کر کے یروشلم جانا چاہے تو اس کو کنعان سے ہی راہ ملے گی۔ نیز بنی اسرائیل سے کا وعدہ یہ تھا کہ وہ ان کو ان کے باپ دادا کی سرزمین میں واپس کرے گا اور یہ ظاہر ہے کہ ان کے باپ دادا کی سرزمین صرف بیت المقدس ہی نہیں ہے، بلکہ ارض کنعان بھی ہے، جہاں سے ہجرت کر کے حضرت یوسف و یعقوب علیہما السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل مصر میں آ کر بسے تھے۔ لہٰذا ابن کثیر رحمہ اللہ کے ہر دو دلائل کمزور بلکہ حقیقت کے خلاف ہیں۔ البتہ قریہ سے مراد بیت المقدس ہونا اس لیے صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے یوشع علیہ السلام اور بنی اسرائیل نے اریحا میں سب سے پہلے عمالقہ کو شکست دی اور اس کے بعد ارض کنعان کو فتح کرتے ہوئے ارض فلسطین جا پہنچے اور بیت المقدس کو بھی فتح کرلیا اور چونکہ یہ مقام ان کی فتوحات کا اور مقصد وحید تھا اس لیے جب وہ بھی فتح ہوگیا تو اب اللہ تعالیٰ نے اس عظیم الشان کامیابی پر وہ حکم دیا جس کا ذکر قرآن عزیز میں ہے۔

Marfat.com

حق ناسپاسی:

قرآن عزیز میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کامیاب کیا اور شہر کے اندر ان کا فاتحانہ داخلہ ہونے لگا تو اس نے حکم دیا کہ مغرور اور متکبر انسانوں کی طرح داخل نہ ہونا بلکہ خدا کا شکر ادا کرنے والوں کی طرح درگاہ الٰہی میں خشوع کے ساتھ جھکتے ہوئے اور توبہ و استغفار کرتے ہوئے داخل ہونا، تاکہ خدا کے شکر گزار بندوں اور مغرور سرکش انسانوں کے درمیان امتیاز رہے مگر فتح و نصرت کے بعد بنی اسرائیل کی سرشت غالب آئی اور خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مغرور اور متکبر انسانوں کی طرح بستی میں داخل ہوئے، وہ اتراتے ہوئے سر کو بلند کرتے ہوئے اور اکڑتے ہوئے جا رہے تھے اور استغفار و نیاز مندی کی بجائے سوقیانہ الفاظ کہتے ہوئے گویا اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے ساتھ ٹھٹھول کرتے ہوئے داخل ہو رہے تھے۔ آخر غیرت حق کو جوش آیا اور جزاء اعمال کے قانون الٰہی نے عذاب کی صورت میں ان کو آ پکڑا۔ قرآن عزیز میں اس کو دو جگہ اختصار اور قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، سورہ بقرہ اور سورہ اعراف میں:

﴿ وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ ﴾ (البقرہ: ۵۸-۵۹)

"اور جب ہم نے کہا! اس بستی میں داخل ہو اور اپنی مرضی کے مطابق جو چاہو کھاؤ اور شہر کے دروازے میں نیاز مندی کے ساتھ جھکتے ہوئے داخل ہونا اور یہ کہتے ہوئے جانا "الٰہی ہماری خطاؤں کو معاف فرما" ہم تمہاری خطاؤں کو بخش دیں گے اور عنقریب نیکوکاروں کو اور زیادہ دیں گے پس ظالموں نے اس قول کو جو ان سے کہا گیا تھا دوسرے قول میں بدل دیا، پس ہم نے ظالموں پر ان کی نافرمانی کی وجہ سے آسمان سے سخت عذاب بھیجا۔"

﴿ وَ اِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَ كُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَ قُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝ ﴾ (اعراف: ۱۶۱-۱۶۲)

"اور پھر ان سے کہا گیا تم اس بستی میں رہو اور جس طرح تمہارا جی چاہے کھاؤ پیو، اور یہ کہتے ہوئے شہر میں جاؤ! "اے خدا! ہماری خطاؤں کو محو کر دے" اور شہر میں نیاز مندی کے ساتھ جھکتے ہوئے اور سجدہ ریز ہو کر داخل ہو تو ہم تمہاری خطاؤں کو بخش دیں گے اور عنقریب نیکوکاروں کو زیادہ دیں گے، پس ظالموں نے اس قول کو جو ان کو بتایا گیا تھا دوسرے قول سے بدل ڈالا، پس ہم نے ان پر آسمان سے عذاب نازل کر دیا ان کے ظالم ہونے کی وجہ سے۔"

ان آیات میں لفظ ﴿حِطَّةٌ﴾ آیا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ نیز بنی اسرائیل نے کیا تبدل قول کر لیا تھا؟ یہ دو سوال ہیں جو تشریح طلب ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ای مغفرۃ استغفروا۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

Marfat.com

"احطط عنا خطایانا"[1] دونوں کا حاصل یہ ہے کہ یہ کہتے ہوئے داخل ہو "خدایا! ہم کو بخش دے اور ہماری خطاؤں کو محو کر دے" گویا ﴿حِطَّةٌ﴾ اس طویل عبارت کا اسی طرح مختصر (شارٹ) ہے جس طرح بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کا "بسملہ" اور لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کا "حوقلہ" اور "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا "ہللہ" مختصر ہے، اور بخاری کی ایک روایت میں ہے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل نے ﴿حِطَّةٌ﴾ کی جگہ ((حبة فی شعرة)) کہنا شروع کر دیا یعنی یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے "ہم کو بالوں میں محفوظ دانوں کی ضرورت ہے" گویا اس حکم خداوندی کے ساتھ ٹھٹھول کرتے تھے، اور سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونے کی بجائے سرینوں کے بل چل رہے تھے "یزحفون علی استاھھم"۔

روایت بخاری کی اس عبارت کا عام طور پر یہ مطلب سمجھا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل سرینوں کے بل زمین پر گھسٹ کر چل رہے تھے، مگر اس صورت میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ مغرورانہ اور متکبرانہ انداز میں چلنے کا یہ طریقہ تو کہیں بھی مروج و معقول نہیں ہے اور اس طرح تو خود کو مذاق اور مضحکہ بنانا ہے نہ کہ دوسروں کے ساتھ ٹھٹھول کرنا۔ لہٰذا حدیث کے اس جملہ کی صحیح تفسیر وہ ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل شہر میں داخل ہوتے وقت سر جھکائے ہوئے چلنے کے بجائے اکڑتے ہوئے سربلند کرتے ہوئے چل رہے تھے یعنی جس طرح ایک مغرور انسان اکڑتے ہوئے اور مٹکتے ہوئے سرینوں کو حرکت دے دے کر ایک عجب انداز سے چلتا ہے اسی طرح بنی اسرائیل بھی سرینوں کو ابھارے ان کے بل پر مٹکتے ہوئے داخل ہو رہے تھے۔

بہر حال خدائے تعالیٰ نے ان آیات میں اپنے سچے اور نیاز مند بندوں اور متکبر انسانوں کے درمیان ایک امتیاز کر دیا ہے کیونکہ اس کے متواضع اور فرمانبردار بندے کسی سے اپنی ذاتی غرض اور ذاتی سربلندی کے لیے نہیں لڑتے بلکہ خدا کے دشمنوں، مفسد اور شریر انسانوں کی شرارت اور ظالم و سرکش قوموں کے ظلم و طغیان کو مٹانے کے لیے صرف اس لیے جنگ کرتے ہیں کہ اس سے عدل و نصفت غلبہ پاتے اور خدا کا حکم بلند ہوتا ہے اور وہ اس یقین کے ساتھ لڑتے ہیں کہ ((اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ)) فتنہ و فساد قتل سے بھی زیادہ سخت بری چیز ہے لہٰذا جب ان کو کافروں پر کامیابی نصیب ہوتی ہے تو وہ اپنی مسرت کا اظہار غرور و تمکنت سے نہیں کرتے بلکہ خدا کی جناب میں خشوع و خضوع کے ساتھ سجدہ ریز ہو کر کرتے ہیں اور جب مفتوحہ علاقہ میں داخل ہوتے ہیں تو شکر گزار اور متواضع انسان کی طرح داخل ہوتے ہیں چنانچہ نبی اکرم ﷺ جب مکہ معظمہ کو مشرکین سے پاک کر کے جانب اعلیٰ سے داخل ہونے لگے تو تواضع اور فروتنی کی یہ کیفیت تھی کہ ناقہ پر بیٹھے بیٹھے اس قدر جھکے جا رہے تھے کہ ریش مبارک کجاوے کے سرے سے مس کرتی جاتی تھی اور جب حرم میں داخل ہوئے ہیں تو فوراً درگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہو گئے اور آٹھ رکعات نماز شکر ادا کی۔

یہی حال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر جب بیت المقدس فتح ہوا اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ایران تو ان عظیم المرتبت فاتحین کا داخلہ متکبر بادشاہوں کی طرح نہیں تھا بلکہ خدا کے متواضع اور منکسر المزاج فرمانبردار بندوں کی طرح تھا اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ حریم قدیم میں اور حضرت سعد ایوان کسریٰ میں داخل ہوئے تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ

[1] تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۹۸

Marfat.com

خدا کی جناب میں سجدہ ریز ہو کر نماز شکر ادا کی اور اپنی بندگی اور عاجزی کا عملی اعتراف کیا۔ وہ لڑتے تھے تو شیر نیستاں کی طرح شجاعت اور بہادری کے ساتھ دشمن پر بھاری ہوتے اور جب کامیاب ہو جاتے تو عجز و نیاز کے ساتھ خدا کا شکر بجالاتے اور مخلوق خدا کے لیے رحیم و کریم ثابت ہوتے۔

غرض بنی اسرائیل نے اپنے کیے کی سزا پائی، اور عذاب الٰہی کے سزاوار بنے وہ عذاب کیا تھا؟ قرآن عزیز نے اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی صرف ﴿رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ کہہ کر مبہم چھوڑ دیا ہے اور عبرت و بصیرت کے لیے اسی قدر کافی ہے۔

سورۂ اعراف کے اس جملہ سے ﴿فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ﴾ "پس ان میں سے جنہوں نے ظلم سے اس قول کو بدل دیا" یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناسپاسی اور نافرمانی کا یہ مذموم فعل بنی اسرائیل کی پوری جماعت سے سرزد نہیں ہوا تھا بلکہ ان میں سے ایک جماعت وہ تھی جو خدا کے حکم کی فرمانبردار رہی اور جس نے تعمیل ارشاد میں حضرت یوشع علیہ السلام کا ساتھ دیا۔

بصیرت و عبرت:

① حضرت یوشع علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے ان واقعات میں سب سے زیادہ جو بات جاذب توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ایک انسان کا انسانی اور اخلاقی فرض ہے کہ جب اس کو کسی مصیبت یا امتحان سے نجات ملے اور وہ کامیاب اور فائز المرام ہو کر اپنی مراد کو پہنچے تو غرور و نخوت کے جال میں پھنس کر یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ یہ میری ذاتی استعداد و قابلیت کا نتیجہ ہے بلکہ خدائے برتر کا شکر گزار بنے اور اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے سامنے سر نیاز جھکا دے تاکہ رحمت الٰہی اس کو اپنے دامن میں چھپا لے اور دنیا کی طرح آخرت میں بھی وہ بامراد اور شاد کام ہو۔

② سخت سے سخت نا امیدی کی حالت میں بھی انسان کو خدا سے نا امید نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اگر وہ مظلوم ہے اور ستم رسیدہ، تو خدا کا فضل اس کو بھی محروم نہیں چھوڑتا۔ البتہ دقیق اور دور رس حکمتوں اور مصلحتوں کی وجہ سے تاخیر ضرور ہو جاتی ہے۔

③ جس قوم پر خدا کا فضل و احسان اور انعام و اکرام کھلی ہوئی نشانیوں کے ذریعہ ہوتا ہے وہ اگر شکر و اطاعت کی بجائے ناسپاسی اور نافرمانی پر اتر آتی ہیں تو پھر وہ جلد ہی خدا کی بطش شدید اور سخت گرفت کا شکار بھی ہو جاتی ہے کیونکہ اس کی سرکشی و بغاوت مشاہدہ اور تجربہ کے بعد ہے اور بے شبہ وہ سخت سزا کی مستوجب ہے۔

Marfat.com

حضرت حزقیل علیہ السلام

○ تمہید ○ نام ونسب اور بعثت ○ قرآن عزیز اور حزقیل علیہ السلام ○ فرار از جہاد
○ آیت جہاد سے روایت کی تائید ○ احیاءِ موتیٰ ○ بصائر

تمہید:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد انبیاء بنی اسرائیل کا طویل سلسلہ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک پہنچتا ہے، صدیوں کے اس دور میں کس قدر انبیاء ورسل مبعوث ہوئے، ان کی صحیح تعداد رب العزت ہی جانتا ہے، قرآن عزیز نے ان میں سے چند پیغمبروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بعض کا ذکر تو تفصیل سے آیا ہے اور بعض کا اجمال کے ساتھ اور بعض کا صرف نام ہی مذکور ہے، تورات میں قرآن عزیز کی بیان کردہ فہرست پر چند اور پیغمبروں کا اضافہ ہے، اور ان کے واقعات وحالات کا بھی۔

ان اسرائیلی پیغمبروں کے درمیان تاریخی ترتیب اختلافی مسئلہ ہے، ہم ابن جریر، طبری اور ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہم کی ترتیب کو راجح سمجھتے ہیں اور اس لیے اسی کے مطابق ان پیغمبروں کے حالات زیر بحث لائیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے بعد باتفاق تورات وتاریخ حضرت یوشع علیہ السلام منصب نبوت پر فائز ہوئے اور ان کے بعد ان کی جانشینی کا حق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دوسرے رفیق کالب بن یوحنا نے ادا کیا یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیر مریم بنت عمران کے شوہر تھے مگر نبی نہیں تھے۔ [1]

طبری کہتے ہیں کہ ان کے بعد سب سے پہلے جس ہستی نے بنی اسرائیل کی روحانی اور دنیوی قیادت وراہنمائی کا فرض انجام دیا وہ حزقیل علیہ السلام ہیں۔

نام ونسب اور بعثت:

تورات میں ہے کہ وہ بوزی کاہن کے بیٹے ہیں اور ان کا نام حزقی ایل ہے۔ [2] عبرانی زبان میں ایل اسم جلالت ہے اور حزقی کے معنی قدرت اور قوت کے ہیں، اس لیے عربی زبان میں اس مرکب نام کا ترجمہ "قدرت اللہ" ہے، کہتے ہیں کہ حضرت حزقیل علیہ السلام کے والد کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا اور جب ان کی بعثت کا زمانہ قریب آیا تو ان کی والدہ بہت ضعیف اور معمر ہو چکی تھیں، اس لیے اسرائیلیوں میں یہ "ابن العجوز" [3] کے لقب سے مشہور تھے۔ [4]

---

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۔ [2] حزقی ایل کی کتاب، بنی اسرائیل کے یہاں کاہن، متبحر عالم وشیخ کامل کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ [3] بڑھیا کا بیٹا۔ [4] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۲

حضرت حزقیل علیہ السلام عرصہ دراز تک بنی اسرائیل میں تبلیغ حق کرتے اور ان میں دین و دنیا کی راہنمائی کا فرض انجام دیتے رہے۔

قرآن اور حزقیل علیہ السلام:

قرآن عزیز میں حزقیل نبی کا نام مذکور نہیں ہے لیکن سورۂ بقرہ میں بیان کردہ ایک واقعہ کے متعلق سلف صالحین سے جو روایات منقول ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق حضرت حزقیل علیہ السلام کے ساتھ ہی ہے۔

کتب تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض دوسرے صحابہ سے یہ روایت منقول ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک بہت بڑی جماعت سے جب ان کے بادشاہ یا ان کے پیغمبر حزقیل علیہ السلام نے یہ کہا کہ فلاں دشمن سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا فرض ادا کرو تو وہ اپنی جانوں کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے اور یہ یقین کر کے کہ اب جہاد سے بچ کر موت سے محفوظ ہو گئے ہیں، اور ایک وادی میں قیام پذیر ہو گئے۔

اب یا تو پیغمبر نے ان کے اس فرار کو خدا کے حکم کی خلاف ورزی یا قضاء و قدر کے فیصلہ سے روگردانی سمجھ کر اظہار ناراضی کرتے ہوئے ان کے لیے بددعاء کی اور یا خود اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ حرکت ناگوار ہوئی، بہرحال اس کے غضب نے ان پر موت طاری کر دی اور وہ سب کے سب آغوش موت میں چلے گئے۔ ایک ہفتہ کے بعد ان پر حضرت حزقیل علیہ السلام کا گزر ہوا تو انہوں نے ان کی اس حالت پر اظہار افسوس کیا اور دعاء مانگی کہ الٰہ العالمین ان کو موت کے عذاب سے نجات دے تاکہ ان کی زندگی خود ان کے لیے اور دوسروں کے لیے عبرت و بصیرت بن جائے۔ پیغمبر کی دعاء قبول ہوئی اور وہ زندہ ہو کر نمونہ عبرت و بصیرت بنے۔ [1]

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ یہ اسرائیلی جماعت داوردان کی باشندہ تھی جو شہر واسط سے چند کوس پر اس زمانہ کی مشہور آبادی تھی، اور یہ فرار ہو کر اسی کی وادی میں چلے گئے تھے، وہیں ان پر موت کا عذاب نازل ہوا۔

قرآن عزیز میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا۔

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾ (البقرہ: ۲۴۳)

"(اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے ہزاروں کی تعداد میں نکلے، پھر اللہ نے فرمایا کہ مر جاؤ پھر ان کو زندہ کر دیا، بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔"

فرار از جہاد:

شریعت محمدیہ میں بھی میدان جہاد سے فرار (شرک باللہ کے بعد) سب سے بڑا گناہ شمار ہوتا ہے اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے بعد جبکہ انسان اپنی جان و مال کو اس کے سپرد کر دیتا ہے اور سپردگی ہی کا نام اسلام ہے تو پھر اس کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ حق نہیں رہتا کہ وہ اس کے حکم کے خلاف جان کو بچانے کی فکر کرے، جبن اور نامردی اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہوتی

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۰۴ قدیم روح المعانی ج ۲ ص ۱۳۰ و تفسیر کبیر ج ۲ ص ۲۸۳ بخاری و مسلم کتاب الایمان و مستدرک ج ۲ ص ۲۵۹۔

Marfat.com

اور راہ حق میں شجاعت ہی اسلام کا طغرائے امتیاز ہے۔

اسی طرح جب انسان کا اذعان واعتقاد اس یقین کو حاصل کر لے کہ یہ خیر وشر اور موت وحیات سب خالق کائنات کے قضاء وقدر کے ہاتھ ہے تو پھر آن واحد کے لیے بھی اس کو خیال نہیں آتا کہ وہ خدا کی مقررہ قدر کے متعلق یہ باور کرے کہ اس کا حیلہ خدا کے فیصلہ کو رَد کر سکتا ہے، اور ایک مقام پر اگر اس کی تقدیر نافذ ہے تو دوسرے مقام پر وہ اس کے اثر سے آزاد رہ سکتا ہے۔

اسلام کی نگاہ میں تقدیر کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان اپنے اندر یہ یقین پیدا کر لے کہ میرا فرض خدا کے احکام کی تعمیل ہے، رہا یہ امر کہ اس اداء تعمیل میں جان کا خوف یا مال کی تباہی کا ڈر ہے تو یہ میرے اپنے اختیار میں نہیں ہے، اگر قدرت کا ہاتھ جان و مال کی ہلاکت کا فوری فیصلہ کر چکا ہے تو دوسرے اسباب پیدا ہو کر عالم تکوین کے اس فیصلہ کو ضرور صادق کر دکھائیں گے، یہی یقین انسان کو شجاع اور بہادر بناتا اور جبن و نامردی سے دور رکھتا ہے، اس کی نظر صرف اداءِ فرض پر جم جاتی ہے اور وہ تکوینی فیصلوں کو اپنی دسترس سے بالاتر سمجھ کر اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اسلام نے تقدیر کے یہ معنی کبھی نہیں بتائے کہ ہاتھ پیر توڑ کر اور جدوجہد اور عمل کی زندگی کو چھوڑ کر غیبی مدد کے منتظر ہو بیٹھو اور اداءِ فرض کو یہ کہہ کر ترک کر دو کہ تکوینی فیصلہ کے مطابق جو کچھ ہونا ہوگا ہو رہے گا۔ دراصل یہ خیال جبن اور نامردی کی پیداوار ہے جو اداءِ فرض سے روکتا اور تن آسانی کی دعوت دے کر ذلت کے حوالہ کر دیا کرتا ہے۔

آیت جہاد سے روایت کی تائید:

ان آیات کے متعلق جو روایت نقل کی گئی ہے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان آیات کے بعد ہی دوسری آیت "آیت جہاد" ہے، جس میں مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کیا گیا ہے ﴿ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ﴾ اور اس کی راہ میں جنگ کرو اور چونکہ "فریضہ جہاد" سخت جانبازی اور فداکاری کی دعوت دیتا اور موت کے ڈر کو دل سے نکالتا ہے اس لیے یہ مناسب سمجھا گیا کہ پہلے بنی اسرائیل کے ایک ایسے واقعہ کا ذکر کر دیا جائے جس میں جہاد کے خوف سے بھاگ جانے والوں پر موت کا عذاب مسلط کیا گیا تاکہ وہ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں اور ان کے قلوب میں شجاعت و بہادری کا جذبہ اور جبن و نامردی کے خلاف نفرت پیدا ہو۔

احیاءِ موتیٰ:

یہ تمام تصریحات وتفصیلات جمہور کے مسلک کے مطابق کی گئی ہیں۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ احیاء موتیٰ کا یہ معاملہ ان لوگوں کی عبرت کے لیے تھا جو قیامت کے دن حشر اجساد کے منکر ہیں کیونکہ بنی اسرائیل میں بھی مشرکین کا ایک ایسا گروہ تھا جو حشر اجساد کا قائل نہ تھا۔

ہم اگرچہ اس مسئلہ پر گذشتہ صفحات میں بحث کر آئے ہیں لیکن اس مقام پر بھی اس قدر واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جب کہ روحانیت (Spiritu Alism) کے ماہرین کے نزدیک یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ "روح" جسم سے الگ ایک مستقل مخلوق ہے، اور جسم کے گل سڑ جانے اور اس کی عنصری ترکیب کے مٹ جانے کے باوجود روح زندہ رہتی ہے۔ نیز یہ بھی امر معقول ہے کہ جس ہستی نے کسی شے کو ترکیب دیا ہے وہ ترکیب کے بکھر جانے کے بعد دوبارہ اس کو ترکیب دے سکتی ہے تو پھر کوئی

وجہ نہیں کہ حیات روح اور بکھرے ہوئے اجزاء کی دوبارہ ترکیب کے معقول ہونے کے بعد احیاءِ موتی کا انکار کیا جائے جو بعض خاص حالات میں نبی اور رسول کی تصدیق اور تائید کے لیے اسی دنیا میں بصورت معجزہ عالم وجود میں آ جاتا ہے۔

اور جن حضرات نے جلد اوّل میں معجزہ کی بحث کا مطالعہ فرمایا ہے وہ اس شبہ کا جواب بھی پا سکتے ہیں کہ عالم دنیا میں عام قانون کے مطابق اگرچہ دوبارہ زندگی نہیں ملتی اور قیامت ہی میں حشر اجساد کا واقعہ پیش آئے گا، لیکن خاص قانون کے پیش نظر کسی حکمت و مصلحت کی بناء پر ایسا ہونا عقلاً نہ صرف ممکن ہے بلکہ واقع ہوتا رہا ہے۔ لیکن جمہور کے خلاف مشہور تابعی مفسر ابن جریج کہتے ہیں کہ ان آیات میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک تمثیل ہے جو جہاد سے ڈر کر بھاگنے والوں کی عبرت و بصیرت کے لیے قرآن نے بیان کی ہے کسی واقعہ کا ذکر نہیں ہے جو بنی اسرائیل کی سابق تاریخ میں پیش آیا ہو۔

ہمارے نزدیک جمہور کا قول صحیح ہے اس لیے کہ قرآن عزیز کے نظم کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات سے پہلے زن و شوہر سے متعلق طلاق کے بعض احکام بیان کیے جا رہے ہیں اور جہاد کا قطعاً کوئی تذکرہ نہیں ہے، البتہ ان آیات کے بعد آیت جہاد مذکور ہے۔ پس اگر یہ آیات "جہاد" کی ترغیب و ترہیب کے لیے بطور تمثیل پیش کی گئی ہیں تو بلاغت کے اعتبار سے پہلے جہاد کا حکم مذکور ہوتا اور پھر جہاد سے جی چرانے والوں کے لیے بطور تمثیل اس حقیقت کا اظہار کیا جاتا کہ جہاد سے بھاگنے والوں کا حشر خراب ہوتا ہے مگر یہاں اس کے برعکس ہے، یعنی پہلے تمثیل بیان ہوئی ہے۔ پھر آیت جہاد ہے۔

اس لیے صحیح تفسیر یہ ہے کہ جب کلام کا رخ حکم جہاد کی جانب ہوا تو اس سے قبل بنی اسرائیل کا ایک واقعہ بیان کیا گیا کہ اگلے وقتوں میں ایک قوم نے جہاد سے روگردانی کر کے خدا کا عذاب مول لیا تھا اور اس کے بعد مخاطبین قرآن کو حکم دیا گیا کہ جہاد کے لیے تیار ہو جاؤ، اس طریق بیان کا نفسیاتی اثر یہ ہوتا ہے کہ اس حکم کی روگردانی مشکل ہو جاتی اور وساوس و شبہات اور ہواجس و خطرات کا ہجوم جان طلبی کے اس اہم موقعہ پر دل پر چھا جاتا ہے وہ مرد سلیم الطبع سے فوراً کافور ہو جاتا ہے اور پھر وہ خود کو حق کی راہ میں جاں نثاری کے لیے ہر طرح آمادہ پاتا ہے۔

بصائر:

حضرت حزقیل علیہ السلام اور بنی اسرائیل سے متعلق ان آیات میں جو بصیرتیں نمایاں طور پر ہم کو دعوت نظر دیتی ہیں وہ یہ ہیں:

① اگر فطرت سلیم اور طبع مستقیم ہو تو انسان کی ہدایت اور بصیرت کے لیے ایک مرتبہ فکر و ذہن کو حقائق کی جانب متوجہ کر دینا کافی ہے پھر اس کی انسانیت خود بخود راہ مستقیم پر گامزن ہو جاتی اور منزل مقصود کا پتہ لگا لیتی ہے۔ لیکن اگر خارجی اسباب کی بناء پر فطرت میں کجی اور طبیعت میں زیغ پیدا ہو چکا ہو تو اس کو ہموار کرنے کے لیے اگرچہ بار بار خدا کی پکار اس کو بیدار کرتی ہے مگر ہر مرتبہ کے بعد اس کی صلاحیتیں اور استعدادی قوتیں خفتہ ہو جاتیں بلکہ اور زیادہ غفلت میں سرشار ہو کر رہ جاتی ہیں حتیٰ کہ قوت و استعداد باطل ہو جاتی ہے اور جب اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے جس کا ذکر قرآن عزیز نے اس طرح کیا ہے:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ٞ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۟﴾ (البقرہ: ۷)

تو پھر اس پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے اس کے غضب اور اس کی پھٹکار کا نشانہ بن جاتی اور اس اعلان کی مستحق ٹھہرتی ہے۔

﴿وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ﴾

چنانچہ بنی اسرائیل کی پیہم سرکشی اور خدا کے فرامین کے مقابلہ میں مسلسل بغاوت نے ان کی کج روی کو اس دوسری راہ پر ڈال دیا تھا اور حضرت حزقیل علیہ السلام کے دور میں بھی وہ اسی راہ بد کی تکمیل میں مصروف تھے مگر ان میں ایک چھوٹی سی جماعت پیغمبروں کی رشد و ہدایت کے سامنے ہمیشہ سر جھکاتی رہی اور لغزشوں اور خطاء کاریوں کے باوجود اس نے راہ مستقیم کو گرتے پڑتے حاصل کر ہی لیا۔

۴ جہاد اگرچہ قوم کے بعض افراد کے لیے پیغام موت بن کر ان کو دنیوی لذائذ سے محروم کر دیتا ہے لیکن وہ امت اور قوم کے لیے اکسیر حیات ہے اور نظام قومی و ملی کے لیے بقاء و دوام کا کفیل اور ساتھ ہی آغوش موت میں جانے والے افراد کے لیے فانی اور ناپائیدار حیات کے عوض حیات سرمدی عطاء کرنے والا ہے، یہی موت کا وہ فلسفہ ہے جس نے مسلمانوں کی زندگی کو دوسری قوموں سے اس طرح ممتاز کر دیا تھا کہ خدا کا کلمہ بلند کرنے والا انسان حیات دنیوی سے اگر شادکام رہا تو غازی اور مجاہد ہے اور اگر موت کا شربت حلق سے اتار لیا تو شہید ہے اسی لیے ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝﴾ (البقرہ: ۱۵٤)

"جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ان کو مردہ نہ کہو بلکہ حقیقی حیات تو ان ہی کو حاصل ہے لیکن تم اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہو۔"

اور اسی لیے اس زندگی سے جان چرانے والے کے لیے یہ وعید ہے:

﴿وَ مَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝﴾ (الانفال: ۱٦)

"اور جو کوئی اس روز (جہاد کے روز) ان (کافروں) کو اپنی پیٹھ دے گا، سوائے اس شخص کے جو لڑائی کی جانب واپس آنے والا ہو یا اپنی جماعت میں پناہ تلاش کرنے والا ہو وہ اللہ کے غضب کی طرف لوٹا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔"

۵ اسلام، شجاعت کو خلق حسن قرار دیتا اور بزدلی کو اخلاق ردیہ شمار کرتا ہے۔ ایک حدیث میں مختلف اعمال بد کو شمار کراتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی لغزش اور خطاء کی راہ سے ان اعمال کا صدور ممکن ہے۔ لیکن اسلام کے ساتھ جبن (بزدلی) کسی حال میں بھی جمع نہیں ہو سکتی، مگر یاد رہے کسی پر بیجا قوت آزمائی کا نام شجاعت نہیں ہے، بلکہ امر حق پر قائم ہو جانا اور باطل سے بے خوف بن جانا شجاعت ہے۔

Marfat.com

حضرت الیاس علیہ السلام

○ تمہید ○ نام ○ نسب ○ قرآن اور حضرت الیاس علیہ السلام ○ بعثت۔ ○ قوم الیاس اور بعل
○ تفسیری نکتہ ○ موعظت

تمہید:

گزشتہ صفحات میں یہ واضح ہو چکا کہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہ السلام کے بعد قرآن عزیز میں ان کے ابتدائی جانشینوں کے نام مذکور نہیں، حضرت یوشع علیہ السلام کا دو جگہ ذکر آیا مگر ایک جگہ "فتی" (جوان) یعنی صاحب موسیٰ کہہ کر تذکرہ کیا اور دوسری جگہ یعنی مائدہ میں حضرت یوشع علیہ السلام اور کالب بن یوفنا کو "رجلان" دو اشخاص کہہ کر تذکرہ کیا اور حضرت حزقیل علیہ السلام کا ذکر جمہور کی روایت کے مطابق صرف قصہ کے ضمن ہی میں آتا ہے ورنہ آیت میں کسی صفت کے ساتھ بھی ان کا تذکرہ موجود نہیں ہے۔ سب سے پہلے جس نبی اور پیغمبر کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے بعد قرآن عزیز میں صراحت کے ساتھ موجود ہے، وہ حضرت الیاس علیہ السلام ہیں، یہ حضرت حزقیل علیہ السلام کے جانشین اور بنی اسرائیل میں ایلیا کے نام سے مشہور ہیں۔

نام:

قرآن عزیز نے ان کا نام الیاس بتایا ہے، اور انجیل یوحنا میں ان کو ایلیاہ نبی کہا گیا ہے، بعض آثار میں ہے کہ الیاس اور ادریس ایک نبی کے دو نام ہیں، مگر یہ صحیح نہیں ہے، اول تو ان آثار کے متعلق محدثین کو کلام ہے اور وہ ان کو ناقابل حجت قرار دیتے ہیں۔ ❶ دوسرے قرآن عزیز کا انداز بیان بھی ان آثار کی تردید کرتا ہے، اس لیے کہ اس نے انعام اور والصافات میں حضرت الیاس کے جو اوصاف و حالات قلم بند کیے ہیں ان میں کسی ایک جگہ بھی یہ اشارہ نہیں ملتا کہ ان کو ادریس بھی کہتے ہیں اور سورۂ انبیاء میں ادریس علیہ السلام کا جس آیت میں تذکرہ ہے اس میں بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں پایا جاتا کہ جس سے ان دونوں پیغمبروں کے اوصاف و حالات کی مشابہت پر بھی استدلال کیا جا سکے چہ جائیکہ ان حالات کو صرف ایک ہی شخصیت سے متعلق سمجھ لیا جائے۔

علاوہ ازیں مؤرخین نے حضرت ادریس علیہ السلام کا جو نسب نامہ بیان کیا ہے وہ اس نسب نامے سے قطعاً جدا ہے جو حضرت الیاس علیہ السلام سے متعلق ہے اور اس لحاظ سے دونوں کے درمیان صدیوں کا بعد ہو جاتا ہے۔ پس اگر یہ دونوں نام ایک ہی پیغمبر کے ہوتے تو قرآن عزیز ضرور اس جانب اشارہ کرتا اور مؤرخین ضرور ہر دو نسب ناموں کی وحدت کسی دلیل سے بیان کر سکتے۔ اس لیے صحیح یہ ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام، حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیانی دور کے پیغمبر ہیں، اور حضرت الیاس علیہ السلام اسرائیلی

❶ البدایہ والنہایہ ج ص ۲۳۷، ۲۳۹

Marfat.com

نبی ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد مبعوث ہوئے ہیں، چنانچہ طبری کہتے ہیں کہ حضرت الیسع علیہ السلام کے چچازاد بھائی تھے اور یہ کہ ان کی بعثت حزقیل علیہ السلام نبی کے بعد ہوئی ہے۔

نسب:

بیشتر مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور ان کا نسب نامہ یہ ہے:

الیاس بن یاسین بن فنحاص بن یعزار بن ہارون یا الیاس بن عازر بن یعزار بن ہارون علیہ السلام۔

قرآن عزیز اور حضرت الیاس علیہ السلام:

قرآن عزیز میں حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر دو جگہ آیا ہے، سورۂ انعام میں اور سورۂ والصافات میں۔ سورۂ انعام میں تو ان کو صرف انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے، اور والصافات میں بعثت اور قوم کی ہدایت سے متعلق حالات کو مختصر طور پر بیان کیا ہے۔

سورہ	آیت	شمار
انعام	۸۵	۱
والصافات	۱۳۱۔۱۴۳	۹۔۱۰

بعثت:

حضرت الیاس علیہ السلام کی بعثت کے متعلق مفسرین اور مؤرخین کا اتفاق ہے کہ وہ شام کے باشندوں کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے اور بعلبک کا مشہور شہر ان کی رسالت و ہدایت کا مرکز تھا۔

حضرت الیاس علیہ السلام کی قوم مشہور بت بعل کی پرستار اور توحید سے بیزار، شرک میں مبتلا تھی خدا کے برگزیدہ پیغمبر نے ان کو سمجھایا اور راہ ہدایت دکھائی۔ صنم پرستی اور کواکب پرستی کے خلاف وعظ و پند کرتے ہوئے توحید خالص کی جانب دعوت دی۔

قوم الیاس اور بعل:

یہ مشرق میں آباد شامی اقوام کا مشہور اور سب سے زیادہ مقبول دیوتا تھا۔ یہ بت مذکر تھا اور زحل یا مشتری کا مثنی سمجھا جاتا تھا۔

فینیقی، کنعانی، موآبی اور مدیانی قبائل خاص طور پر اس کی پرستش کرتے تھے، اس لیے بعل کی پرستش عہد قدیم سے چلی آتی تھی اور موآبی اور مدیانی اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے پوجتے چلے آتے تھے، چنانچہ شام کا مشہور شہر بعلبک بھی اسی کے نام سے منسوب تھا اور حضرت شعیب علیہ السلام کو مدین میں اسی کے پرستاروں سے واسطہ پڑا تھا، بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ حجاز کا مشہور بت ہبل بھی یہی بعل ہے۔

بعل دیوتا کی عظمت کا یہ حال تھا کہ وہ مختلف مربیانہ عطاؤ نوال کی وجہ سے مختلف ناموں کے ساتھ موسوم تھا، چنانچہ تورات میں سامی قوموں کی پرستش بعل کا ذکر کرتے ہوئے بعل کو بعل بریث اور بعل فغور کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے اور عقرونیوں کے یہاں بعل زبوب کا اور اضافہ پایا جاتا ہے، کلدانیوں کے یہاں بعل باء کے زیر کے ساتھ بولا جاتا ہے اور وہ اکثر بیل اور بیلوس یا بیل اور بعلوس بھی کہتے ہیں۔

Marfat.com

سامی اور عبرانی زبانوں میں بعل کے معنی مالک، سردار، حاکم اور رب کے آتے ہیں اسی لیے اہل عرب شوہر کو بھی "بعل" کہتے ہیں، لیکن جب بعل پر الف لام لے آتے ہیں یا کسی شے کی جانب اضافت کر کے بولتے ہیں تو اس وقت فقط دیوتا اور معبود مراد ہوتا ہے۔

یہود یا مشرقی اسرائیلیوں کے یہاں بعل کی پرستش کے لیے مختلف موسموں میں عظیم الشان مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں اور اس کے لیے بڑے ہیکل اور عظیم الشان قربانگاہیں بنائی جاتی تھیں اور کاہن اس کو بخورات کی دھونی دیتے اور اس پر طرح طرح کی خوشبوئیں چڑھاتے تھے اور کبھی کبھی اس کو انسانوں کی بھینٹ بھی دی جاتی تھی۔ [1]

کتب تفسیر میں منقول ہے کہ بعل سونے کا تھا بیس گز کا قد تھا اور اس کے چار منہ تھے اور اس کی خدمت پر چار سو خادم مقرر تھے۔ [2]

حضرت الیاس علیہ السلام کے زمانہ میں بھی یمن و شام کا یہ بت ہی محبوب دیوتا تھا اور حضرت الیاس علیہ السلام کی قوم دوسرے بتوں کے ساتھ خصوصیت سے اس بت کی پرستش کرتی تھی۔ چنانچہ اسی تقریب سے قرآن عزیز میں اس کا ذکر آیا ہے:

﴿وَ اِنَّ اِلْیَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝۱۲۳ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۱۲۴ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّ تَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِیْنَ ۝۱۲۵ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَ رَبَّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِیْنَ ۝۱۲۶ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝۱۲۷ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ ۝۱۲۸ وَ تَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ۝۱۲۹ سَلٰمٌ عَلٰۤى اِلْ یَاسِیْنَ ۝۱۳۰ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝۱۳۱ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۱۳۲﴾ (الصافات: ۱۲۳۔۱۳۲)

"اور بے شبہ الیاس (علیہ السلام) رسولوں میں سے ہیں اور وہ وقت ذکر کے قابل ہے جب اس نے اپنی قوم سے کہا، کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، کیا تم بعل کو پکارتے ہو، اور سب سے بہتر خدا کو چھوڑے ہوئے ہو، اللہ ہی تمہارا اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا پروردگار ہے، پس انہوں نے الیاس (علیہ السلام) کو جھٹلایا تو بے شبہ وہ لائے جائیں گے پکڑے ہوئے بجز ان کے جو چن لیے گئے ہیں اور ہم نے بعد کے لوگوں میں الیاس کا ذکر باقی رکھا، الیاس پر سلام ہو، بے شبہ ہم نیکوکاروں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں، بیشک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے ہے۔"

تفسیری نکتہ:

سورۂ انعام میں حضرت الیاس علیہ السلام کا جن آیات کے اندر ذکر آیا ہے وہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی ذریت اور ان کی نسل کے انبیاء و رسل کی ایک مختصر فہرست ہے۔ ارشاد ہے:

﴿كُلًّا هَدَیْنَا ۚ وَ نُوْحًا هَدَیْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝۸۴ وَ زَكَرِیَّا وَ یَحْیٰى وَ عِیْسٰى وَ اِلْیَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝۸۵ وَ

[1] دائرۃ المعارف للبستانی ج ۵۔ [2] روح المعانی ج ۲۳ ص ۱۴۷

اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٦﴾ (الانعام: ۸۴-۸۶)

"ہم نے (ان میں سے) ہر ایک کو ہدایت عطاء کی اور نوح (علیہ السلام) کو ہدایت بخشی ان سے پہلے اور ابراہیم کی نسل میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی یہی راہ دکھائی اور ہم اس طرح نیک کرداروں کو نیکی کا بدلہ دیتے ہیں، اور زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو بھی یہ سب صالح انسانوں میں سے تھے اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو بھی ان سب کو ہم نے دنیا والوں پر برتری دی تھی۔"

قرآن عزیز نے اس فہرست میں انبیاء علیہم السلام کو تین جدا جدا حلقوں میں بیان کیا ہے، اس کی حکمت کیا ہے؟ اکثر مفسرین اس کے انکشاف پر متوجہ ہوئے ہیں، ان تمام اقوال میں سب سے بہتر توجیہی قول صاحب المنار کا ہے جس کا حاصل یہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر انبیاء و رسل کو تین جدا جدا جماعتوں میں اس لیے بیان فرمایا ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل میں خصوصی امتیازات کے پیش نظر تین قسم کی جماعتیں تھیں، بعض انبیاء علیہم السلام وہ تھے جو صاحب تخت و تاج اور صاحب حکومت تھے یا وزارت و سرداری کے مالک تھے اور بعض انبیاء علیہم السلام کی زندگی اس کے برعکس زاہدانہ اور راہبانہ تھی اور دولت و ثروت سے یکسر نفور فقیرانہ معیشت کے حامل تھے اور بعض نہ تو اپنی قوم میں حاکم اور صاحب تاج و تخت تھے اور نہ خالص راہبانہ زندگی کے حامل، بلکہ ایک طرف قوم کے ہادی و پیغمبر تھے اور دوسری جانب متوسط معیشت سے وابستہ، لہٰذا جب قرآن عزیز نے ان انبیاء و رسل کا ذکر کیا تو ان کے زمانہائے بعثت اور بعض دوسری خصوصیات میں مشابہت سے الگ ہو کر اسی نقطہ نظر سے ان کو تین جماعتوں میں تقسیم کر دیا اور پھر ترتیب درجات کے لحاظ سے ترتیب ذکر کو بھی ضروری سمجھا، یعنی پہلی فہرست میں اوّل حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر کیا جو نبی اور رسول ہونے کے علاوہ صاحب مملکت بھی تھے اور اس کے بعد حضرت ایوب اور حضرت یوسف علیہما السلام کا تذکرہ کیا جو اگرچہ صاحب مملکت نہ تھے مگر اوّل الذکر چھوٹی سی ریاست کے مالک تھے اور ثانی الذکر حکومت مصر کے وزیر اور مختار کل تھے اور اس کے بعد حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا نام آیا جو نہ بڑی حکومت کے مالک تھے اور نہ چھوٹی ریاست کے مالک یا کسی حکومت کے وزیر اور مختار کل بلکہ اپنی قوم کے رسول اور پیغمبر تھے اور ان کے سردار بھی۔

اور دوسری فہرست میں ان انبیاء کرام کا تذکرہ ہے جنہوں نے ساری عمر زہادت میں گزاری، انہوں نے نہ رہنے کو مکان بنایا اور نہ کھانے پینے کا سامان فراہم کیا۔ دن بھر تبلیغ حق میں مصروف رہتے اور شب کو یاد الٰہی کے بعد جہاں جگہ میسر آ جاتی تکیہ سر کے نیچے رکھ کر سو رہتے حضرت یحییٰ، زکریا، عیسیٰ اور الیاس علیہم السلام اس سلسلہ میں بہت مشہور اور ممتاز ہیں۔

اور تیسری فہرست میں ان پیغمبروں کا مذکور ہے جنہوں نے نہ حکومت و سرداری کی اور نہ خالص زہادت اختیار کی بلکہ متوسط زندگی سے وابستہ رہ کر حق تبلیغ و ریاست ادا کیا، چنانچہ حضرت اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط علیہم السلام اسی درمیانی زندگی کے حامل تھے۔

موعظت:

حضرت الیاس علیہ السلام اور ان کی قوم کا واقعہ اگرچہ قرآن میں بہت مختصر مذکور ہے۔ تاہم اس سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ یہود بنی اسرائیل کی ذہنیت اس درجہ مسخ تھی کہ دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں تھی جس کے کرنے پر یہ حریص نہ ہوں اور کوئی خوبی ایسی نہ تھی

Marfat.com

جس کے یہ دلدادہ ہوں، اور انبیاء و رسل کے ایک طویل اور پیہم سلسلہ کے باوجود بت پرستی عناصر پرستی، کواکب پرستی، غرض غیر اللہ کی پرستش کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس کے یہ پرستار نہ بنے ہوں۔

پس قرآن عزیز میں بنی اسرائیل سے متعلق ان واقعات میں جہاں ان کی بدبختی اور کج روی پر روشنی پڑتی ہے وہیں ہم کو یہ موعظت و عبرت بھی حاصل ہوتی ہے کہ اب جبکہ انبیاء و رسل کا سلسلہ منقطع ہو چکا اور خاتم النبیین کی بعثت اور قرآن عزیز کے آخری پیغام نے اس سلسلہ کو ختم کر دیا ہے تو ہمارے لیے از بس ضروری ہے کہ بنی اسرائیل کی مسخ فطرت اور تباہ ذہنیت کے خلاف خدائی احکام کو مضبوطی سے پکڑیں اور ان میں کجروی اور زیغ سے کام لے کر ان کی خلاف ورزی کی جرأت نہ کریں، گویا ہمارا شیوہ سپردو تسلیم ہو، انکار و انحراف نہ ہو کہ "اسلام" کے یہی اور صرف یہی معنی ہیں۔

Marfat.com

حضرت الیسع علیہ السلام

○ نام ونسب ○ بعثت ○ قرآن اور حضرت الیسع علیہ السلام

نام ونسب ○ وہب بن منبہ کی اسرائیلی روایات میں ہے کہ ان کا نام الیسع ہے اور یہ خطوب کے بیٹے ہیں، ابن اسحاق نے اسی کو اختیار کیا ہے، کتب تواریخ میں یہ بھی منقول ہے کہ حضرت الیسع حضرت الیاس علیہ السلام کے چچازاد بھائی ہیں، اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں ان کے نسب کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ حضرت یوسف بن یعقوب علیہما السلام کی اولاد میں سے ہیں اور نسب نامہ اس طرح ہے:

الیسع بن عدی بن شوتم بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام۔ اور اگر تورات کے یسعیاہ نبی اور حضرت الیسع ایک ہی شخصیت ہیں تو تورات نے ان کو عموص کا بیٹا بتایا ہے۔

بعثت ○ حضرت الیسع علیہ السلام حضرت الیاس علیہ السلام کے نائب اور خلیفہ ہیں۔ اوائل عمر میں ان ہی کی رفاقت میں رہتے تھے اور ان کے انتقال کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی رہنمائی کے لیے حضرت الیسع کو نبوت سے سرفراز فرمایا اور انہوں نے حضرت الیاس علیہ السلام ہی کے طریقہ پر بنی اسرائیل کی راہنمائی فرمائی۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ حضرت الیسع کی عمر مبارک کیا ہوئی اور بنی اسرائیل میں کتنے عرصہ تک انہوں نے حق تبلیغ ادا کیا۔

قرآن عزیز اور حضرت الیسع علیہ السلام:

قرآن عزیز نے ان کے خالات پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی اور سورۂ انعام اور سورۂ ص میں صرف ذکر پر اکتفاء کیا ہے:

﴿وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (الانعام: ۸۶)

"اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط اور ان سب کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت عطاء فرمائی۔"

﴿وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ﴾ (ص: ۴۸)

"اور ذکر کرو اسماعیل اور الیسع اور ذوالکفل کا اور ان میں سے ہر ایک نیک انسانوں میں سے تھے۔"

موعظت ○ بنی اسرائیل کے ان نبیوں اور پیغمبروں کے واقعات سے جو جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کے شرف صحبت، مخلصانہ اتباع میں خلافت کے بعد منصب نبوت سے سرفراز ہوئے، یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحبت نیکاں حصول خیر کے لیے اکسیر اعظم ہے۔ رومی نے سچ کہا:

یک زمانہ صحبتے با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریاء

"اگر ریاضات وطاعات کا سلسلہ ہزاروں سال بھی رہے مگر کسی کامل کی صحبت سے محرومی ہو تو بے شبہ یہ ایک بہت بڑی خامی ہے جس کا مداوا صحبت کامل کے علاوہ اور کچھ نہیں۔"

Marfat.com

حضرت شمویل علیہ السلام

○ بنی اسرائیل کی گزشتہ تاریخ پر طائرانہ نظر ○ نام اور نسب ○ قوم میں دعوت وتبلیغ ○ قوم کا مطالبہ
○ حضرت شموئیل کی تنقید ○ بنی اسرائیل کا امیر حکومت ○ قرآن عزیز اور بنی اسرائیل
○ طالوت و جالوت ○ بصائر و حکم

بنی اسرائیل کی گذشتہ تاریخ پر طائرانہ نظر:

حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل جب سرزمین فلسطین میں داخل ہو گئے تو انہوں نے خدا کے حکم سے ان کے درمیان اس علاقہ کو تقسیم کر دیا تاکہ وہ امن واطمینان کے ساتھ زندگی بسر کریں اور دین حق کے لیے سرگرم عمل رہیں۔ تورات یشوع باب ۲۳ میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ منقول ہے۔

حضرت یوشع علیہ السلام آخر عمر تک ان کی نگرانی اور اصلاح حال میں مصروف رہے اور ان کے معاملات اور باہمی مناقشات کے فیصلوں کے لیے قاضیوں کو مقرر کیا تاکہ وہ آئندہ بھی اسی طرح اپنا نظام قائم رکھیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات سے تقریباً ساڑھے تین سو سال تک یہ نظام یوں ہی قائم رہا کہ خاندانوں اور قبیلوں میں "سردار" حکومت کرتے اور ان کے مناقشات ومعاملات کے فیصلے "قاضی" انجام دیتے تھے اور "نبی" ان تمام امور کی نگرانی کے ساتھ ساتھ دین کی دعوت وتبلیغ اور اس کی نشرواشاعت کی خدمت سرانجام دیتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بفضل ایزدی ان ہی میں سے کسی قاضی کو منصب نبوت عطاء ہو جاتا اور اس تمام عرصہ میں بنی اسرائیل کا نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ تمام قوم کا ایک حکمران اور اسی لیے ہمسایہ قومیں اکثر ان پر حملہ آور ہوتی رہتی تھیں اور بنی اسرائیل ان کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔ ❶ کبھی عمالقہ چڑھ آتے اور کبھی فلسطینی، کبھی مدیانی حملہ آور ہوتے تو کبھی آرامی اور ان میں سے اگر کسی حملہ آور کو ہزیمت بھی ہو جاتی تو بھی وہ آئے دن چھاپے مارتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا کہ کبھی یہ فتح پا جاتے اور کبھی وہ غالب آ جاتے۔

چوتھی صدی عیسوی کے آخر میں عیلی کاہن کے زمانہ میں اشدود حوالی غزہ کی فلسطینی قوم نے ان پر زبردست حملہ کیا اور شکست دے کر متبرک صندوق "تابوت سکینہ" بھی چھین کر لے گئے۔ اس متبرک صندوق میں تورات کا اصل نسخہ، حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے عصاء اور پیرہن اور من کا مرتبان محفوظ تھے، فلسطینیوں نے اس کو اپنے مشہور مندر "بیت دجون" میں رکھ دیا۔ یہ مندر ان کے سب سے بڑے دیوتا "دجون" کے نام سے موسوم تھا۔ دجون کا جسم انسانی چہرہ اور مچھلی کے دھڑ سے مرکب بنایا گیا تھا اور اسی مندر

---

❶ قضاۃ باب ۲ آیات ۶۔۷ و قضاۃ باب ۲۱ آیات ۲۵

Marfat.com

میں نصب تھا۔ نجار مصری کہتے ہیں کہ فلسطین کے مشہور رملہ کے قریب آج بھی ایک بستی بیت دجون کے نام سے پائی جاتی ہے، غالب گمان یہ ہے کہ تورات میں دجون کے جس مندر کا ذکر ہے وہ یہیں واقع ہوگا اور اسی نسبت سے بستی کا نام بھی بیت دجون رکھا گیا۔ ❶

نام ونسب:

عیلی کاہن کا زمانہ ختم ہو چکا تھا کہ قضاۃ میں سے ایک قاضی شموئیل کو منجانب اللہ منصب نبوت عطا ہوا اور وہ بنی اسرائیل کی رشد وہدایت کے لیے مامور ہوئے۔

بعض آثار میں مذکور ہے کہ جب حضرت الیسع علیہ السلام کی وفات ہوگئی تو مصر وفلسطین کے درمیان بحر روم پر آباد عمالقہ میں سے جالوت نامی جابر وظالم حکمران نے بنی اسرائیل کو مغلوب کر کے ان کی آبادیوں پر قبضہ کر لیا اور ان کے بہت سے سرداروں اور قبیلہ کے معزز لوگوں کو گرفتار کر کے ساتھ لے گیا اور باقی کو مقہور ومغلوب کر کے ان پر خراج مقرر کر دیا اور تورات کو بھی فنا کر دیا۔ بنی اسرائیل کے لیے یہ ایسا نازک دور تھا کہ نہ کوئی نبی ورسول ان میں موجود تھا اور نہ سردار وامیر اور خاندان نبوت میں ایک حاملہ عورت کے علاوہ کوئی باقی نہ تھا مگر اس نکبت وادبار کی حالت میں خدائے تعالیٰ نے ان پر فضل وکرم فرمایا اور اس عورت کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا اس کا نام شمویل رکھا گیا اور اس کی تربیت کا بار بنی اسرائیل کے ایک بزرگ نے اپنے ذمہ لیا۔ شمویل نے ان سے تورات حفظ کی اور دینی تعلیم کے مدارج طے کیے اور جب سن رشد کو پہنچے تو تمام بنی اسرائیل میں ممتاز اور نمایاں نظر آنے لگے، آخر اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا اور بنی اسرائیل کی رشد وہدایت پر مامور کیا۔ ❷

مؤرخین کہتے ہیں کہ شمویل حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ ❸ اور ان کا نسب نامہ ہے۔ شموئیل بن حنہ بن عاقر۔ ❹ عاقر سے اوپر کی کڑیاں مذکور نہیں ہیں اور مقاتل کی روایت کے مطابق یہ اضافہ ہے اشموئیل بن بالی بن علقمہ بن یرخام بن یہو بن تہو بن صوف بن علقمہ بن ماحث بن عموص بن عزایا۔ ❺ اشمویل عبرانی ہے اور عربی میں اس کا ترجمہ اسماعیل ہوتا ہے۔ اور کثرت استعمال سے اشمویل، شمویل رہ گیا۔

بہر حال جب شمویل علیہ السلام کے زمانہ میں بھی عمالقہ کی دست برد اور ظالمانہ شرارتیں اسی طرح جاری رہیں تو بنی اسرائیل نے ان سے درخواست کی کہ وہ ہم پر ایک بادشاہ (حاکم) مقرر کر دیں جس کی قیادت میں ہم ظالموں کا مقابلہ کریں اور جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ دشمنوں کی لائی ہوئی مصیبت کا خاتمہ کر دیں۔ تورات میں بنی اسرائیل کے اس مطالبہ کی کہ "ہم پر ایک سلطان مقرر کر دیجئے" وجہ یہ بیان کی ہے:

> "اور ایسا ہوا کہ جب شموئیل بوڑھا ہو گیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو مقرر کیا کہ اسرائیل کی عدالت کریں۔ اور اس کے پہلوٹے کا نام یوایل تھا اور اس کے دوسرے بیٹے کا نام ابیاہ۔ وہ دونوں بیرسبع میں قاضی تھے پر اس کے بیٹے اس کی راہ پر نہ چلے بلکہ نفع کی پیروی کرتے اور رشوت لیتے اور عدالت میں طرفداری کرتے تھے۔ تب سارے اسرائیلی بزرگ جمع ہو کے راستہ میں شموئیل کے پاس آئے اور اسے کہا دیکھ تو بوڑھا ہوا اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے، اب کسی کو ہمارا

❶ قصص الانبیاء ❷ روح المعانی ج ۲ ص ۱۴۲ ❸ خازن ج ۲ ❹ روح المعانی ج ۲ ص ۱۴۲ ❺ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۵

Marfat.com

بادشاہ مقرر کر جو ہم پر حکومت کیا کرے، جیسا کہ سب قوموں میں ہے"۔ ❶
اور آگے چل کر لکھا ہے کہ شموئیل کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور انہوں نے فرمایا کہ اگر تم پر بادشاہ مقرر ہوگیا تو وہ سب کو اپنا خادم اور غلام بنالے گا۔ لیکن بنی اسرائیل کا اصرار بڑھتا ہی رہا اور آخر شموئیل نے خدا سے دعا مانگ کر بنیامین کی نسل میں سے ساؤل (طالوت) نامی ایک شخص کو بادشاہ مقرر کر دیا جو نہایت وجیہ وشکیل اور قوی ہیکل تھا۔

ثعلبی نے طالوت کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے: ساؤل بن قیش بن افیل بن صارد بن کورت بن انیح بن انیس بن بنیامین بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم۔ ❷

لیکن قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے اس مطالبہ پر حضرت شموئیل علیہ السلام کا جو جواب نقل کیا ہے وہ اس سے جدا اور بنی اسرائیل کی عادات وخصائل کے عین مطابق ہے۔

قرآن عزیز میں ہے کہ جب بنی اسرائیل نے حضرت شموئیل علیہ السلام سے بادشاہ کے تقرر کا مطالبہ کیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا: مجھے خوف ہے کہ ایسا نہ ہو جب تم پر کوئی بادشاہ مقرر کر دیا جائے تو وہ تم کو دشمنوں کے مقابلہ کے لیے "جہاد" کا حکم دے تو تم بزدل ثابت ہو اور جہاد سے انکار کر جاؤ۔

بنی اسرائیل نے بڑی قوت کے ساتھ جواب دیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جہاد سے انکار کر دیں جبکہ ہم یہ خوب جانتے ہیں کہ ہم کو دشمنوں نے بہت زیادہ ذلیل کر دیا ہے انہوں نے ہم کو ہمارے گھروں سے نکالا اور ہماری اولاد کو قید کیا۔

جب حضرت شموئیل علیہ السلام نے اتمام حجت کر لیا تو اب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع کیا۔ حق تعالیٰ نے ان کو مطلع فرمایا کہ بنی اسرائیل کی درخواست منظور ہوئی اور ہم نے طالوت کو جو علمی اور جسمانی دونوں لحاظ سے تم میں نمایاں ہے، تم پر بادشاہ مقرر کر دیا۔ بنی اسرائیل نے جب یہ سنا تو منہ بنانے لگے اور ناگواری سے کہنے لگے، یہ شخص تو غریب ہے مالدار تک نہیں ہے یہ کس طرح ہمارا بادشاہ ہو سکتا ہے؟ اور دراصل بادشاہت کے لائق تو ہم ہیں، ہم میں سے کسی کو مقرر کیجیے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک عرصہ سے نبوت کا سلسلہ سبط لاوی میں اور حکومت وسرداری کا سلسلہ سبط یہودا میں چلا آتا تھا تو اب جبکہ شموئیل علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق یہ شرف بنیامین کی نسل میں منتقل ہونے لگا تو بنی اسرائیل کے ان سرداروں کو حسد پیدا ہوا، اور وہ اس کو برداشت نہ کر سکے۔

شروع میں کسی بات کے اقرار کر لینے اور وقت پر انکار کر دینے کی یہ ادا بنی اسرائیل کی زندگی کا طغرائے امتیاز بن چکی تھی، اس لیے یہاں بھی کارفرما رہی، کیونکہ وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ شموئیل علیہ السلام کی نظر انتخاب بہر حال ہم ہی میں سے کسی پر پڑے گی۔ اس لیے جب انہوں نے خلاف توقع بنیامین کے گھرانے میں سے ایک غریب مگر قوی اور عالم انسان کو اس منصب پر مامور دیکھا تو حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور رد وکد شروع کر دی۔

حضرت شموئیل علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے معترضین اور نکتہ چین سرداروں کی نکتہ چینی کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

---

❶ سموئیل باب ۸ آیات ۴-۲۲ و باب ۹ ❷ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۶

Marfat.com

میں پہلے ہی جانتا تھا کہ تمہاری پستی اور بزدلی تمہارے وقتی جوش اور ولولہ کو کبھی پائیدار اور مستقل نہیں رہنے دے گی اور وقت آنے پر تمہاری یہ گرم جوشی برف کی طرح سرد ہو کر رہ جائے گی، چنانچہ تم نے اب اسی لیے حیلہ جوئی شروع کر دی، تم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حکمرانی کا جو معیار تم نے سمجھ لیا ہے یعنی وسعت مال اور کثرت دولت تو یہ قطعاً غلط اور سراسر باطل ہے۔

خدائے تعالیٰ کے نزدیک حکمراں کے ذاتی اوصاف میں قوت علم اور طاقت جسم ضروری ہیں، اس لیے کہ یہی ہر دو وصف حسن تدبیر، صحت فکر اور جرأت وشجاعت کے کفیل ہیں اور ان اوصاف میں طالوت (ساؤل) تم سب میں ممتاز اور نمایاں ہے۔

قرآن عزیز کی آیات ذیل اس تفصیل کی شاہد عدل ہیں:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَ اَبْنَآىِٕنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝ وَ قَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى یَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَیْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ لَمْ یُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَیْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ ؕ وَ اللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْكَهٗ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝ ﴾ (البقرہ: ۲۴۶-۲۴۷)

"کیا تم کو بنی اسرائیل کی اس جماعت کا حال معلوم نہیں، جس نے موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد اپنے زمانے کے نبی سے درخواست کی تھی کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے، ہمارے لیے ایک حکمران مقرر کر دیجئے نبی نے کہا! کچھ بعید نہیں ہے کہ اگر تم کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو تم لڑنے سے انکار کر دو! سرداروں نے کہا: ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں جبکہ ہم اپنے گھروں سے جا چکے اور اپنی اولاد سے علیحدہ کیے جا چکے ہیں؟ پھر جب ان کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو تھوڑے سے آدمیوں کے سوا باقی سب نے پیٹھ دکھلا دی، اور اللہ بے انصافوں سے خوب واقف ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ ان کے نبی نے کہا: اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو مقرر کر دیا ہے، جب انہوں نے یہ بات سنی تو (طاعت وفرمانبرداری کی بجائے) کہنے لگے، وہ ہم پر کیسے حکمران بن سکتا ہے جبکہ اس سے کہیں زیادہ ہم حکمران بننے کے حق دار ہیں، علاوہ بریں اس کو مال و دولت کی وسعت بھی حاصل نہیں ہے، نبی نے فرمایا (حکمران کا جو معیار تم نے بنا لیا ہے وہ غلط ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ حکمرانی کی قابلیت واستعداد میں تم پر اس کو برگزیدہ اور فائق کیا ہے اور علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت دونوں میں اس کو وسعت عطا فرمائی ہے (اور حکمرانی وقیادت تمہارے دینے سے نہیں ملتی بلکہ (اللہ جس کو چاہتا ہے) اس کا اہل سمجھ کر) اپنی زمین کی حکمرانی بخش دیتا ہے، اور وہ (اپنے تصرف وقدرت میں) بڑی وسعت رکھنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔"

ان آیات میں جس نبی کا ذکر ہے وہ یہی شموئیل علیہ السلام ہیں۔

Marfat.com

تابوت سکینہ:

بنی اسرائیل کی اس ردوکد نے یہاں تک طویل کھینچا کہ انہوں نے شموئیل علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ اگر طالوت کا تقرر منجانب اللہ ہے، تو اس کے لیے خدا کا کوئی "نشان" دکھایئے۔ حضرت شموئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر تم کو خدا کے اس فیصلہ کی تصدیق مطلوب ہے تو اتمام حجت کے لیے وہ بھی تم کو عطاء کی جا رہی ہے اور وہ یہ کہ جو متبرک صندوق (تابوت سکینہ) تمہارے ہاتھوں سے چھن گیا ہے اور جس میں "تورات" اور حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے تبرکات محفوظ ہیں وہ طالوت کی بدولت تمہارے پاس واپس آ جائے گا اور حکمت الٰہی سے ایسا ہوگا کہ تمہاری دیکھتی آنکھوں فرشتے اسے اٹھا لائیں گے، اور وہ دوبارہ تمہارے قبضہ میں آ جائے گا۔

﴿وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (البقرہ: ۲۴۸)

"اور ان کے نبی نے ان سے کہا: "طالوت کی اہلیت حکومت کی نشانی یہ ہے کہ (جو مقدس) تابوت (تم کھو چکے ہو، اور دشمنوں کے قبضہ میں چلا گیا ہے) تمہارے پاس واپس آ جائے گا اور فرشتے اس کو اٹھا لائیں گے، اس تابوت میں تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے لیے (فتح و نصرت) کی طمانیت ہے، اور موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کے گھرانوں (کی مقدس یادگاروں) کا بقیہ ہے، بے شبہ اس واقعہ میں تمہارے خدا کا بہت بڑا نشان ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو۔"

حضرت شموئیل علیہ السلام کی یہ بشارت آخر بروئے کار آئی اور بنی اسرائیل کے سامنے "ملائکۃ اللہ" نے "تابوت سکینہ" طالوت کو پیش کر دیا اور اس طرح ان پر یہ ظاہر ہو گیا کہ اگر وہ حضرت شموئیل علیہ السلام کے اس الہامی فیصلہ کو قبول کر لیں تو کامیابی و کامرانی یقینی اور حتمی ہے۔

توراۃ میں "تابوت سکینہ" کی واپسی کی داستان جس پیرایہ میں بیان کی گئی ہے وہ بہت دلچسپ ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے:

سفر شموئیل میں ہے کہ جب سے "بیت دجون" میں "تابوت سکینہ" لا کر رکھا گیا اس وقت سے فلسطینیوں نے روزانہ یہ منظر دیکھا کہ جب صبح کو وہ اپنے معبود "دجون" کی عبادت کے لیے جاتے ہیں تو اس کو منہ کے بل اوندھا پڑا پاتے ہیں اور صبح کو جب وہ اس کو دوبارہ اپنی جگہ پر قائم کر دیتے ہیں تو شب گزرنے پر پھر اسی طرح اوندھا گرا ہوا پاتے ہیں پھر ایک نئی بات یہ ہوئی کہ اس شہر میں اتنی کثرت سے چوہے پیدا ہو گئے کہ انہوں نے ان کے تمام حاصلات کو خراب اور تباہ کر دیا۔ اور ایک خاص قسم کی گلٹیوں کی وبا نے وہاں گھر کر لیا۔ جس سے سخت نقصان جان ہونے لگا۔ فلسطینیوں نے جب کسی طرح ان باتوں سے نجات نہ پائی تو غور و فکر کے بعد کہنے لگے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہم پر یہ تمام نحوست اس صندوق کی وجہ سے ہے، لہٰذا اس کو یہاں سے نکالو۔

یہ سوچ کر فلسطینیوں نے اپنے کاہنوں اور نجومیوں کو جمع کیا اور ان سے تمام واقعات بیان کر کے علاج کا مطالبہ کیا۔ کاہنوں اور نجومیوں نے کہا کہ اس کا صرف یہی علاج ہے کہ جس طرح ممکن ہو جلد اس تابوت کو یہاں سے خارج کر دو اور اس کی صورت یہ ہے کہ سونے کے سات چوہے بنائے جائیں اور سات گلٹیاں اور ان کو ایک گاڑی میں تابوت کے ساتھ رکھ دیا جائے، اور گاڑی میں دو ایسی گائیں جوڑی جائیں جو دودھ دے رہی ہوں، اور ان کو بستی کے باہر لے جا کر سڑک پر چھوڑ دیا جائے کہ جس جانب ان کا رخ ہو اس صندوق کو لے جائیں۔

چنانچہ فلسطینیوں نے ایسا ہی کیا۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ وہ گائیں خود بخود ایسے رخ پر چل پڑیں کہ جو بنی اسرائیل کی بستیوں کی جانب تھا اور آخر چلتے چلتے ایک ایسے کھیت پر جا کھڑی ہوئیں جہاں اسرائیلی اپنا کھیت کاٹ رہے تھے، اسرائیلیوں نے جب صندوق کو دیکھا تو مسرت و خوشی سے مدہوش ہو گئے اور دوڑے دوڑے شہر بیت شمس میں جا کر خبر کی اور اس کے بعد بیت یعریم کے یہودی آ کر اس کو بڑے احترام سے لے گئے اور اینداب کے گھر میں جو ٹیلہ پر واقع تھا حفاظت کے ساتھ اس کو رکھا۔ [1]

عبدالوہاب نجار نے اس واقعہ سے یہ استنباط کیا ہے کہ "تابوت سکینہ" کے متعلق قرآن عزیز میں جو یہ کہا گیا ہے کہ ﴿تَحۡمِلُهُ ٱلۡمَلَـٰٓئِكَةُ﴾ "اس کو فرشتے اٹھا لائیں گے" اس سے یہ مراد ہے کہ ملائکۃ اللہ کی راہنمائی میں اس طرح یہ گائیں صندوق کی گاڑی کو بغیر کسی قائد و سائق کے منزل مقصود پر لے آئیں گی۔ لیکن قرآن اور بائبل کے مضامین کی تطبیق میں یہ تاویل اگرچہ بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے تاہم تاویل باطل ہے اور نظم قرآنی اس کا انکار کرتی ہے۔

اس لیے کہ قرآن عزیز کے بیان کا حاصل تو یہ ہے کہ تابوت سکینہ کی واپسی طالوت کی حکمرانی کے لیے خدا کا ایک نشان ہے جو شموئیل علیہ السلام کے ہاتھوں پر اس طرح ظاہر کیا گیا کہ ملائکۃ اللہ نے بنی اسرائیل کی آنکھوں دیکھتے اس کو لا کر طالوت کے سامنے پیش کر دیا۔ مگر توراۃ کی عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گاڑی میں جوتی گئی گائیں بیت شمس کی سڑک پر لے جا کر چھوڑی گئی تھیں، البتہ انہوں نے دائیں بائیں رخ نہ کیا اور سیدھی چلتی رہیں حتیٰ کہ بیت شمس کے سامنے کھیتوں میں جا کھڑی ہوئیں جو فلسطینیوں کے حدود کے بعد پہلی سرحدی اسرائیلی بستی تھی، اور اس میں یہ بھی تصریح ہے کہ فلسطینی اس گاڑی کے پیچھے پیچھے بیت شمس کی سرحد تک گئے اور جب گاڑی بیت شمس کے کھیتوں میں چلی گئی تب واپس ہوئے۔

> سو ان گایوں نے بیت شمس کی سڑک کی سیدھی راہ لی اور اس شاہراہ پر چلیں اور چلتے ہوئے ڈکارتی تھیں اور داہنے یا بائیں ہاتھ نہ مڑیں اور فلسطینی قطب ان کے پیچھے بیت شمس کے سوانے تک گئے اور بیت شمس کے لوگ وادی میں گیہوں کی فصل کاٹ رہے تھے، انہوں نے جو آنکھیں اوپر کو کیں تو صندوق دیکھا۔ [2]

اور "تابوت" کے حاصل ہونے کا یہ طریقہ بے شبہ "معجزہ" یا "نشان" کی حیثیت نہیں رکھتا خصوصاً تورات میں یہ بھی تصریح ہے کہ "بیت دجون" کے کاہن اس کے پیچھے پیچھے اسرائیلی کھیتوں کے قریب تک آئے نیز قرآن عزیز ہرگز اس کے لیے یہ زوردار جملہ نہ کہتا:

﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَأٓيَةً لَّكُمۡ﴾ (البقرہ: ۲۴۸)

"بلاشبہ تمہارے لیے اس میں بہت بڑا نشان ہے۔"

علاوہ ازیں قرآن عزیز کے طرز بیان اور اس کے نظم کلام سمجھنے کا جس کو معمولی سا بھی ذوق ہے وہ بہت آسانی کے ساتھ یہ جان سکتا ہے کہ اگر "تابوت سکینہ" بائبل کے بیان کردہ واقعہ کے مطابق حاصل ہوا تھا تو قرآن عزیز اس کو ﴿تَحۡمِلُهُ ٱلۡمَلَـٰٓئِكَةُ﴾ سے تعبیر نہ کرتا بلکہ ﴿تَهۡدِي بِهِ ٱلۡمَلَـٰٓئِكَةُ﴾ یا اسی قسم کا کوئی ایسا جملہ کہتا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ "تابوت سکینہ" فرشتوں کی راہنمائی میں پہنچ جائے گا۔

---

[1] سموئیل باب ۶، باب ۷ آیات ا۔۲ [2] سموئیل باب ٦ آیت ۱۲

Marfat.com

اور اگر بالفرض توراۃ کی اس تفصیل کو صحیح مان لیا جائے تب بھی اس کا حاصل یہ نکلے گا کہ جبکہ بیت دجون میں صنم دجون تابوت سکینہ کی موجودگی میں روزانہ اوندھے منہ گر جاتا تھا اور اس واقعہ کی بدولت تابوت کو سرزمین دجون سے نکالا گیا تو یہ بھی بہرحال اسی قسم کا "معجزہ" اور "نشان" ہے جو ظاہری اسباب کے بغیر دجون کے مندر میں ظاہر ہوتا رہا۔ لہٰذا جو شخص اس واقعہ کی پوری تفصیل کو صحیح تسلیم کرنے پر آمادہ ہوسکتا ہے اس کو ﴿ تَحۡمِلُهُ الۡمَلٰٓئِكَةُ ؕ ﴾ کے اس صاف اور سادہ معنی کے قبول کر لینے میں کیا اشکال ہوسکتا ہے کہ خدا کے فرشتے آنکھوں دیکھتے اس کو اٹھا کر لے آئیں گے۔

طالوت وجالوت کی جنگ اور بنی اسرائیل کا امتحان:

اس تمام ردّوکد کے بعد بنی اسرائیل کو انکار کرنے کے لیے کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا اور حضرت شمویل کے الہامی فیصلہ پر طالوت کو بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا دیا گیا۔

اب طالوت نے بنی اسرائیل کو نفیر عام دیا کہ وہ دشمنوں (فلسطینیوں) کے مقابلہ کے لیے نکلیں۔ جب بنی اسرائیل طالوت کی سرکردگی میں روانہ ہوئے تو بنی اسرائیل کی آزمائش کا ایک اور مرحلہ پیش آیا، وہ یہ کہ طالوت نے یہ سوچا کہ جنگ کا معاملہ بے حد نازک ہے اور اس میں بعض مرتبہ ایک شخص کی بزدلی یا منافقانہ حرکت پورے لشکر کو تباہ کر دیا کرتی ہے اس لیے ازبس ضروری ہے کہ بنی اسرائیل کے اس گروہ کو جہاد سے پہلے آزما لیا جائے کہ کون شخص تعمیل حکم، ضبط نفس اور صداقت واخلاص کا حامل ہے اور کس میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے اور وہ بزدل اور کمزور ہے تاکہ ادائے فرض سے پہلے ہی ایسے عناصر کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے، کیوں کہ یہاں صبر وثبات قدمی اور اطاعت وانقیاد اصل ہے لہٰذا جو شخص معمولی پیاس میں ضبط وصبر پر قدرت نہیں رکھتا وہ جہاد جیسے نازک معاملہ میں کس طرح ثابت قدم رہ سکتا ہے۔

چنانچہ سب گروہ ایک ندی کے کنارے پہنچا تو طالوت نے اعلان کیا، اللہ تعالیٰ اس نہر کے ذریعہ تمہاری آزمائش کرنا چاہتا ہے وہ یہ کہ کوئی شخص اس سے جی بھر کر پانی نہ پئے لہٰذا جو شخص اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ خدا کی جماعت سے نکال دیا جائے گا اور جو تعمیل ارشاد کرے گا وہ جماعت میں شامل رہے گا۔ البتہ سخت پیاس کی حالت میں گھونٹ بھر پانی پی کر حلق تر کر لینے کی اجازت ہے:

﴿ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوۡتُ بِالۡجُـنُوۡدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبۡتَلِيۡكُمۡ بِنَهَرٍ‌ ۚ فَمَنۡ شَرِبَ مِنۡهُ فَلَيۡسَ مِنِّىۡ ۚ وَمَنۡ لَّمۡ يَطۡعَمۡهُ فَاِنَّهٗ مِنِّىۡٓ اِلَّا مَنِ اغۡتَرَفَ غُرۡفَةً ۢ بِيَدِهٖ ‌ۚ فَشَرِبُوۡا مِنۡهُ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡهُمۡ‌ ؕ ﴾ (البقرہ:۲۴۹)

"جب طالوت لشکریوں کو لے کر روانہ ہوا تو اس نے کہا بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم کو نہر کے پانی کے ذریعہ آزمائے گا پس جو شخص اس سے سیراب ہو کر پئے گا وہ میری جماعت میں نہ رہے گا، اور جو ایک چلو پانی کے سوا اس سے سیراب ہو کر نہیں پئے گا وہ میری جماعت میں رہے گا، پھر تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ سب نے اس نہر سے سیراب ہو کر پی لیا۔"

مفسرین کہتے ہیں کہ یہ واقعہ نہر اردن پر پیش آیا۔[1] بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپس میں بات چیت کیا کرتے تھے کہ اصحاب بدر کی تعداد اصحاب طالوت کے برابر ہے۔[2]

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۸ [2] بخاری باب المغازی

Marfat.com

بہر حال نتیجہ یہ نکلا کہ جب لشکر ندی کے پار ہو گیا تو جن لوگوں نے خلاف ورزی کر کے پانی پی لیا تھا، وہ کہنے لگے کہ ہم میں جالوت جیسے قوی ہیکل اور اس کی جماعت سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے، لیکن جن لوگوں نے ضبط نفس اور اطاعت امیر کا ثبوت دیا تھا انہوں نے بے خوف ہو کر یہ کہا کہ ہم ضرور دشمن کا مقابلہ کریں گے اس لیے کہ خدا کی قدرت کا یہ مظاہرہ اکثر ہوتا رہتا ہے کہ چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آ جاتی ہیں، البتہ ایمان باللہ اور اخلاص و ثبات شرط ہے۔

﴿ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْیَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِیْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝﴾ (البقرہ: ۲۴۹)

" پر جب طالوت اور اس کے ساتھ وہ لوگ جو (حکم الٰہی پر سچا) ایمان رکھتے تھے، ندی کے پار اترے تو ان لوگوں نے (جنہوں نے طالوت کے حکم کی نافرمانی کی تھی) کہا "ہم میں یہ طاقت نہیں کہ آج جالوت سے اور اس کی فوج سے مقابلہ کر سکیں" لیکن وہ لوگ، جو سمجھتے تھے انہیں ایک دن اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے، پکار اٹھے (تم دشمنوں کی کثرت اور اپنی قلت سے ہراساں کیوں ہوئے جاتے ہو؟) کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر حکم الٰہی سے غالب آ گئیں، اور اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔"

مجاہدین کا لشکر اب آگے بڑھا اور دشمن کی فوج کے مقابل صف آراء ہوا، دشمن کی فوج کا سردار جالوت نامی دیو ہیکل شخص تھا اور اس کے لشکر کی تعداد بھی زیادہ تھی، مجاہدین نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اخلاص و تضرع کے ساتھ دعاء کی کہ دشمن کو شکست دے اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور اپنی فتح و نصرت سے شادکام بنا۔

تورات اور کتب سیر میں ہے کہ جالوت کی غیر معمولی شجاعت و بہادری نے بنی اسرائیل کو متاثر کر رکھا تھا اور اس کی مبارز طلبی کے جواب میں جھجک محسوس کرتے تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی شجاعت:

بنی اسرائیل کے اس لشکر میں ایک نوجوان بھی تھا جو بظاہر کوئی نمایاں شخصیت نہیں رکھتا تھا اور نہ شجاعت و بہادری میں کوئی خاص شہرت کا مالک تھا، یہ داؤد علیہ السلام تھے، کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے والد کے سب سے چھوٹے لڑکے تھے، اور شرکت جنگ کے ارادہ سے بھی نہیں آئے تھے بلکہ باپ کی جانب سے بھائیوں اور دوسرے اسرائیلیوں کے حالات کی تحقیق کے لیے بھیجے گئے تھے مگر جب انہوں نے جالوت کی شجاعانہ مبارز طلبی اور اسرائیلیوں کی پس و پیش کو دیکھا تو ان سے نہ رہا گیا اور طالوت سے اجازت چاہی کہ جالوت کا جواب دینے کے لیے ان کو موقع دیا جائے۔ طالوت نے کہا تم ابھی ناتجربہ کار لڑکے ہو اس لیے اس سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے، مگر داؤد علیہ السلام کا اصرار بڑھتا ہی رہا اور آخر کار طالوت کو اجازت دینی پڑی۔

داؤد علیہ السلام آگے بڑھے اور جالوت کو للکارا، جالوت نے ایک نوجوان کو مقابل پایا تو حقیر سمجھ کر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی، مگر

جب دونوں کے درمیان نبرد آزمائی شروع ہوگئی تو اب جالوت کو داؤد علیہ السلام کی بے پناہ شجاعت کا اندازہ ہوا۔ داؤد علیہ السلام نے لڑتے لڑتے اپنی گوپھن سنبھالی اور تاک کر پے در پے تین پتھر اس کے سر پر مارے اور جالوت کا سر پاش پاش کر دیا اور پھر آگے بڑھ کر اس کی گردن کاٹ لی۔ جالوت کے قتل کے بعد جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور بنی اسرائیل کی جنگ مغلوبہ جارحانہ حملہ میں تبدیل ہوگئی اور طاغوتی طاقت کو شکست ہوئی اور بنی اسرائیل کامگار و کامران واپس لوٹے۔ اس واقعہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی شجاعت کا دوست و دشمن دونوں کے قلوب پر سکہ بٹھا دیا اور وہ بے حد ہر دل عزیز ہو گئے اور ان کی شخصیت بہت نمایاں اور ممتاز نظر آنے لگی۔

اگر چہ قرآن عزیز نے ان تفصیلات کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے یا حقیقتاً یہ تفصیلات خود اپنی جگہ پر صحیح نہیں ہیں لیکن اس بات پر قرآن اور تورات دونوں کا اتفاق ہے کہ جالوت کے قاتل حضرت داؤد علیہ السلام ہیں اور جالوت کے قتل سے اسرائیلیوں کو فتح اور دشمن کو شکست نصیب ہوئی۔

﴿وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ۝ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ۫ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا یَشَآءُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ (البقرہ: ۲۵۰۔۲۵۱)

"اور جب وہ (مجاہدین) جالوت اور اس کے لشکر کے مقابل ہوئے تو کہنے لگے" اے پروردگار! ہم کو صبر دے اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور کافر قوم پر ہم کو فتح و نصرت عطاء فرما" بس اللہ کے حکم سے انہوں نے ان (فلسطینیوں) کو شکست دے دی اور داؤد (علیہ السلام) نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے داؤد (علیہ السلام) کو حکومت اور حکمت عطا فرمائی اور جو مناسب جانا وہ سب کچھ سکھایا۔"

بعض اسرائیلی روایات میں یہ بھی ہے کہ جالوت کی زبردست طاقت اور بنی اسرائیل کے اس کے مقابل ہونے میں جھجک کو دیکھ کر طالوت نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص جالوت کو قتل کرے گا میں اس سے اپنی بیٹی کی شادی کروں گا اور اس کو حکومت میں بھی حصہ دار بناؤں گا، چنانچہ جب داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا تو طالوت نے وفائے عہد کے پیش نظر اس کے ساتھ اپنی لڑکی میکال کی شادی کر دی اور حکومت میں بھی حصہ دار بنا لیا۔ [1]

ایک اسرائیلی روایت پر محاکمہ:

تورات کے صحیفہ شموئیل میں طالوت اور داؤد علیہ السلام کے متعلق ایک طویل داستان پائی جاتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر چہ طالوت نے داؤد علیہ السلام کے شجاعانہ کارناموں کی بناء پر حسب وعدہ ان سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی مگر بنی اسرائیل کی ان کے ساتھ والہانہ عقیدت اور ان کی غیر معمولی شجاعت کو اس نے اچھی نظر سے نہ دیکھا اور اس کے دل میں ان کی جانب سے آتش بغض و حسد بھڑک اٹھی مگر اس نے اس کو پوشیدہ رکھا اور اندر ہی اندر ایسی ترکیبیں کرتا رہا کہ جس سے داؤد علیہ السلام کا قصہ پاک ہو جائے۔

[1] شموئیل کی کتاب البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۸۔۹

Marfat.com

باپ کے خلاف طالوت کے لڑکے اور لڑکی داؤد علیہ السلام کے راز دار اور ہمدرد رہے اور اس لیے ہر موقعہ پر طالوت کو ناکام ہونا پڑا۔ آخر زچ ہو کر اس نے علی الاعلان داؤد علیہ السلام کی مخالفت شروع کر دی اور داؤد علیہ السلام یہ دیکھ کر اپنی بیوی اور سالے کو ہمراہ لے کر فرار ہو گئے اور فلسطینیوں کے ایک قصبہ میں طالوت کے دشمن کے یہاں پناہ لی۔ اسرائیلیوں کی اس باہمی آویزش سے دشمنوں نے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے فوج کشی کر کے اسرائیلیوں کو سخت ہزیمت دی۔

اب اس جگہ سے سدی کی روایت اور تورات کی روایت میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے، تورات کہتی ہے کہ طالوت اس جنگ میں مارا گیا اور سدی کہتا ہے کہ شکست کا یہ منظر دیکھ کر ساؤل (طالوت) اپنے کیے پر پچھتایا اور نادم ہوا اور وقت کے بزرگوں اور کاہنوں سے دریافت کیا کہ میری توبہ قبول ہونے کی بھی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ سب نے انکار کیا۔ مگر ایک عابدہ عورت "ہاں" کہہ کر اس کو الیسع نبی کی قبر پر لے گئی اور دعاء کی، حضرت الیسع علیہ السلام قبر سے اٹھے اور اسے کہا کہ تیری توبہ کی صرف یہ ایک صورت ہے کہ تو حکومت داؤد علیہ السلام کے حوالے کر دے اور اپنے خاندان سمیت جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہو کر شہید ہو جا۔ چنانچہ اس نے یہی کیا اور اس طرح حکومت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں میں بلاشرکت غیرآ گئی اور ساؤل (طالوت) نے مع خاندان کے جام شہادت پی لیا۔

یہ پوری داستان شموئیل کے صحیفہ سے ماخوذ ہے مگر سدی کے حوالے سے اصحاب سیر نے بھی اس اسرائیلی داستان کو اسلامی روایات کی طرح بیان کیا ہے حتیٰ کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی جو منقبت سورۂ بقرہ کی آیت میں مذکور ہے اس داستان کو اس کی تفسیر میں بیان کر دیا گیا ہے۔ معلوم نہیں کہ گزشتہ دور میں اسرائیلیات کی نقل کا اس قدر ذوق کیوں پیدا ہو گیا تھا کہ یہود نے جن داستانوں کو اپنی گمراہی اور غلط روی کی تائید کے لیے گھڑا تھا ان کو بھی اسلامیات میں شامل کرنے سے احتیاط نہیں برتی گئی اور تاریخ و سیرت تو کجا تفسیر قرآن جیسے اہم مقام کو بھی اس خرافات سے محفوظ نہ رہنے دیا گیا چنانچہ یہاں بھی یہی صورت حال پیش آئی ہے۔

قرآن عزیز کی زبانی آپ سن چکے ہیں کہ جب شموئیل علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے مطالبہ پر طالوت (ساؤل) کو بادشاہ مقرر کر دیا تو بنی اسرائیل نے اتباع و انقیاد کا وعدہ کرنے کے باوجود اس کو بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور انحراف کی راہ اختیار کی تھی، مگر جب خدائی نشان نے ان کو لاجواب بنا دیا تب مجبور و مقہور ہو کر طالوت کو اپنا اولوالامر تسلیم کیا، چنانچہ علماء یہود اس بات کو محسوس کرتے رہے کہ ہماری مجرمانہ عادات و خصائل کے اعداد و شمار میں یہ ایک مزید اضافہ ہے کہ ہم نے خدا کے مامور انسان طالوت کو نااہل بنا کر شروع میں اس کو بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، لہٰذا ایسی صورت پیدا کرنی چاہیے کہ جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ طالوت (ساؤل) کے بارہ میں "نااہلیت امارت" کا جو دعویٰ ہم نے کیا تھا وہ صحیح اور سچ ظاہر ہو جائے اور ہم کو دنیا کے سامنے یہ کہنے کا موقع ملے کہ یہی وہ امور تھے جن کو ہم نے اپنی فطانت و فراست سے پہلے ہی بھانپ لیا تھا اور آخر کار طالوت (ساؤل) کی نالائقی اور نااہلیت ثابت ہو کر رہی۔ جرم ہلکا کرنے اور اپنی مجرمانہ خصلت پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ وہ اقدام ہے جو شموئیل کی کتاب میں طالوت (ساؤل) اور حضرت داؤد علیہ السلام کی باہمی آویزش سے متعلق داستان میں نظر آ رہا ہے مگر وائے افسوس کہ ہمارے بعض ارباب سیر و راویان تفسیر نے بھی اس حقیقت تک پہنچے بغیر اپنی سادگی سے کتب سیر و تفسیر میں اس کو نقل کر دیا اور یہ توجہ نہ فرمائی کہ جس ہستی (طالوت) کو قرآن عزیز مامور من اللہ قرار دے رہا ہے اور جس کی برکت سے "تابوت سکینہ" بنی اسرائیل کو دوبارہ عطاء ہو رہا ہے اور جس کو ﴿ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ﴾ کہہ کر اس کے علم و شجاعت کو شوکت الفاظ میں سراہ رہا ہے، ہم بغیر کسی دلیل و برہان

Marfat.com

قویم کے کس طرح ایسے شخص کو قابل نفرت حرکات کا حامل قرار دے کر مورد لعن وطعن بنا سکتے ہیں، قرآن عزیز سے یہ قطعاً بعید ہے کہ جس ہستی کی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ معاصی میں گزر رہا ہو اور وہ جرائم کا مرتکب ہو رہا ہو اس کے مناقب ومحامد کا تو ذکر کر دے اور اس کی زندگی کے دوسرے پہلو کو نمایاں نہ کرے پس جبکہ قرآن عزیز نے طالوت کے ثناء ومنقبت کے علاوہ ایک لفظ بھی مذمت کا بیان نہیں کیا، بلکہ اس کی جانب اشارہ تک موجود نہیں ہے تو ایک مسلمان کے لیے کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ وہ تورات کی اس خرافی داستان کو صحیح تسلیم کرے، حاشا وکلا!

یہی وجہ ہے کہ مشہور محقق ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد یہ فرمادیا: وفی بعض ھذا نظرو نکارۃ اور اس قصہ کے بعض حصے اوپری داستان اور قابل اعتراض ہیں۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ ایک عورت نے الیسع نبی کی قبر پر حاضر ہو کر ان کو موت سے جگایا، یہ خود اس موقعہ کے غلط ہونے کا عمدہ ثبوت ہے اس لیے کہ اس قسم کے معجزات کا ظہور انبیاء ورسل سے کبھی کبھی ہوتا ہے نہ کہ ایک زاہدہ وعابدہ عورت سے۔[1] چنانچہ اسی وجہ سے ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس واقعہ کی جانب مطلق توجہ نہیں فرمائی اور بلاشبہ یہ ہرگز توجہ کے قابل نہیں ہے۔ اسی دوران میں حضرت شموئیل علیہ السلام کا انتقال ہو گیا۔

بصائر وحکم:

سموئیل علیہ السلام طالوت اور داؤد علیہ السلام کے ذکر کردہ واقعات میں جو بصیرتیں اور حکمتیں پنہاں ہیں وہ اگرچہ بہت ہیں تاہم مختصر طور پر یہ چند قابل غور ہیں:

① اللہ تعالیٰ نے قوموں اور امتوں کے مزاج میں یہ خاصیت ودیعت فرمائی ہے کہ جب ان کی آزادی خطرہ میں پڑ جائے اور کوئی قوی ان کو غلام بنا لینے کے خیال سے ظلم پر اتر آئے تو وہ اپنے اس حق کی حفاظت اور ظالم کے دفاع کے لیے تشتت وافتراق کو چھوڑ کر وحدت مرکز کی جانب دوڑتی اور اپنے لیے ایک صالح اور قابل زعیم اور رہنما تلاش کرنے لگتی ہیں تاکہ وہ ان کی اس پستی کو بلندی سے بدل ڈالے۔ چنانچہ بنو اسرائیل کا حضرت شموئیل علیہ السلام سے یہ مطالبہ ان کے لیے ایک آمر وسلطان منتخب کریں اس فطری تقاضے کے پیش نظر تھا۔

② آزادی اور حفاظت حقوق کا یہ شعور بدرجہ کمال اقوام وامم کے خواص میں پیدا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ عوام تک پہنچتا ہے اور جس قوم اور جس امت میں ایسے خواص کثرت سے موجود ہوں گے اس قوم اور اس امت میں یہ جذبہ اسی قدر تیزی کے ساتھ پایا جائے گا۔

③ جب کسی قوم کے خواص میں اپنے استقلال اور دشمن کے مقابلہ میں حفاظت ودفاع کا شعور بہت زیادہ ترقی پا جاتا ہے تو وہ عوام اور خام کار افراد ملت وقوم کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارا یہ شعور اور یہ جذبہ قومی عصبیت وحمیت میں خواص کے شعور سے کسی طرح کم نہیں ہے، مگر جب یہ فکر، شعور سے گزر کر عمل وظہور کی وادی میں آتا ہے تو اس وقت ان پر اپنا عجز اور خامکاری ظاہر ہو کر رہتی ہے اور صادقین کاملین کے علاوہ اس وادی پر خار کا کوئی دوسرا رہ رو نظر نہیں آتا چنانچہ یہی وہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۹

Marfat.com

حقیقت ہے جس کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ (البقرہ: ۲۴۶)

"پھر جب ان (بنی اسرائیل) پر جہاد فرض کر دیا گیا تو ان میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سواء سب پیٹھ دکھا گئے اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے خبردار ہے۔"

④ اقوام وامم کے مختلف جاہلی رسوم واعتقادات میں سے ایک مہلک اعتقاد یہ بھی رہا ہے کہ قیادت وحکومت صرف اسی شخص کا حق ہے جو دولت وثروت کا مالک اور سرمایہ داری میں نمایاں حیثیت رکھتا ہو اور حسب ونسب میں بھی بلند مرتبہ ہو، اقوام عالم کا یہ تخیل اس درجہ عام رہا ہے کہ جو قومیں تہذیب وتمدن اور عقل ودانش کی علمبردار رہی ہیں وہ بھی اس فاسد عقیدہ میں جہالت کے دوش بدوش نظر آتی ہیں بلکہ اس کو علمی اور عقلی رنگ دے کر جاہلی دور سے بھی زیادہ اس کی پابند ہیں۔ بنی اسرائیل کے نقوش بھی اس فاسد عقیدہ سے خالی نہ تھے، اسی بناء پر انہوں نے طالوت کی امارت پر اعتراض کرتے ہوئے یہ کہہ دیا:

﴿وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۗ وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ﴾ (البقرہ: ۲۴۷)

"اور اس کو وسعت دولت تو حاصل ہی نہیں اور ہم اس کے مقابلہ میں زیادہ مستحق حکومت ہیں۔"

⑤ مگر اسلام نے اس جاہلانہ عقیدہ کے خلاف یہ واضح کیا کہ خدا کے نزدیک حکومت وقیادت کا تعلق دولت وثروت سے وابستہ نہیں ہے اور نہ حسب ونسب اس کے لیے مدار ہے بلکہ علم اور قوت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سلسلہ کی شرط قرار دیے جائیں اس لیے کہ حق وانصاف، حسن تدبیر واصابت رائے جو حکومت وزعامت کے لیے شرط اولیں ہیں وہ مال ودولت اور حسب ونسب سے پیدا نہیں ہوتیں بلکہ ان کا مبدء صفت "علم" قرار پاتی ہے۔ اسی طرح شجاعت وبسالت اور جرأت حق جو حکومت وقیادت کے لیے از بس ضروری ہیں بیشتر ﴿بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ کی رہین منت ہیں اس لیے کہ ﴿بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ سے یہ مراد نہیں کہ عمدہ غذائیں کھا کر وہ خوب فربہ ہو گیا ہو بلکہ جسم کی وہ طاقت وقوت مراد ہے جو میدان جہاد میں دشمن کے مقابلہ میں ہیبت وسطوت کا باعث اور قوت مدافعت اور جرأت قلب کے ساتھ متصف ہو۔

قرآن عزیز نے یہ بھی بتایا کہ قیادت وحکومت کے استحقاق کا یہ مسئلہ دین حق کے امتیازی مسائل میں سے ہے اور ہمیشہ وقت کے جاہلی دور کے مقابلہ میں انبیاء ورسل کی معرفت اقوام وامم کے سامنے دہرایا جاتا رہا ہے تاکہ جب وہ اسی سلسلہ کی گمراہی میں مبتلاء ہوں تو فوراً کسی نبی یا رسول یا ان کے نائبین کے ذریعہ ان کی گمراہی پر متنبہ کر کے ان کو ہدایت کی راہ دکھا دی جائے چنانچہ جب بنی اسرائیل نے حضرت شمویل علیہ السلام کے سامنے طالوت کے خلاف متذکرہ بالا غلط استدلال پیش کیا تو حضرت شمویل نے فوراً ان کو یہ کہہ کر اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۗ﴾ (البقرہ: ۲۴۷)

"بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو فضیلت دی ہے اس کو علم اور جسمانی قوت کی وسعت عطاء فرمائی ہے۔"

Marfat.com

⑥ جب حق و باطل کا معرکہ پیش آتا ہے اور حق کی جانب سے مخلصین کاملین فدا کارانہ جذبات کے ساتھ حمایت حق کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان میں خود اعتمادی اور توکل علی اللہ کی روح سرایت کر جاتی ہے تو پھر کامرانی و کامیابی کا مدار قلت و کثرت پر نہیں رہتا بلکہ قلت، کثرت پر بھاری ہو جاتی اور کثرت، قلت سے مغلوب ہو کر شکست کھا جاتی ہے یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار قرآن عزیز نے اس طرح کیا ہے:

﴿ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾(البقرہ: ۲۴۹)

"اور بارہا چھوٹی جماعت اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب آ جاتی ہے۔"

Marfat.com

حضرت داوٗد علیہ السلام

○ نسب نامہ ○ حلیہ مبارک ○ قرآن عزیز میں ذکر مبارک ○ نبوت و رسالت ○ عظمت مملکت ○ زبور ○ خصائص داوٗد ○ تسخیر و تسبیح طیور و جبال ○ حضرت داوٗد علیہ السلام کے ہاتھ میں لوہے کا نرم ہو جانا ○ منطق الطیر ○ تلاوت زبور ○ حضرت داوٗد علیہ السلام اور اہم تفسیری مقام ○ مقام اوّل ○ مقام ثانی ○ بہتان طرازی کی مثال ○ تورات کا تضاد بیان ○ آیات کی باطل تفسیر ○ آیات کی صحیح تفاسیر ○ عمر مبارک ○ بصائر

نسب نامہ:

گزشتہ واقعہ میں حضرت داوٗد علیہ السلام کا مختصر ذکر آچکا اور یہ واضح ہو چکا کہ قتل جالوت میں بے نظیر شجاعت کے اظہار نے بنی اسرائیل کے قلوب پر داوٗد علیہ السلام کی محبت وعظمت کا سکہ بٹھا دیا تھا اور ان کی شخصیت ممتاز اور نمایاں ہو چکی تھی چنانچہ یہی داوٗد آگے چل کر خدا کے برگزیدہ رسول اور پیغمبر بنے اور بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے رسول اور ان کے اجتماعی نظم وضبط کے لیے خلیفہ مقرر ہوئے ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں حضرت داوٗد علیہ السلام کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے:

داوٗد بن ایشا (ایشی) بن عوبد بن عابر (یا عابز) بن سلمون بن نحشون بن عونیاذب (یا عمی ناذب) بن ارم (یا رام) بن حصرون بن فارص بن یہوذا بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم (علیہم السلام) خطوط کے اندر جو نام درج ہیں وہ ابن جریر سے منقول ہیں اور ثعلبی نے عرائس البیان میں بعض ناموں کی جگہ دوسرے نام بیان کیے ہیں۔ مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ داوٗد علیہ السلام اسرائیلی اسباط میں یہودا کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۞ تورات میں ہے کہ ایشا یا ایشی کے بہت سے لڑکے تھے اور داوٗد ان سب میں صغیر سن تھے۔ ۞

حلیہ مبارک:

محمد بن اسحاق نے وہب بن منبہ کے واسطہ سے حضرت داوٗد علیہ السلام کا حلیہ مبارک اس طرح نقل کیا ہے: پستہ قد نیلگوں آنکھیں، جسم پر بال بہت کم تھے چہرہ اور بشرے سے طہارت قلب اور نفاست طبع جھلکتی تھی۔ ۞

قرآن عزیز میں ذکر مبارک:

قرآن عزیز میں حضرت داوٗد علیہ السلام کا ذکر سورۂ بقرہ، نساء، مائدہ، انعام، اسراء، انبیاء، نمل، سباء اور صٓ میں آیا ہے ان سورتوں میں سولہ جگہ نام مذکور ہے اور بعض سورتوں میں مختصر اور بعض میں تفصیلی طور پر ان کے حالات و واقعات کا ذکر اور ان کی رشد و

۞ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۹۔ ۞ شموئیل کی کتاب ۞ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۰

ہدایت کا بیان ہے۔ ذیل کا نقشہ اس مطالعہ کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

نام سورہ	آیات	شمار
البقرہ	۱۰۲، ۲۵۱	۲
نساء	۱۶۲	۱
مائدہ	۷۸	۱
انعام	۸۴ تا ۹۰	۷
اسراء	۵۵	۱

نام سورہ	آیات	شمار
الانبیاء	۷۸ تا ۸۲	۵
نمل	۱۵ تا ۴۴	۲۹
سباء	۱۰ تا ۱۴	۳
صٓ	۱۷ تا ۲۶ ـ ۳۰ تا ۴۰	۱۹

نبوت ورسالت:

حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کی بڑھتی ہوئی محبت کا نتیجہ یہ نکلا کہ طالوت کی موجودگی میں ہی یا اس کی موت کے بعد عنان حکومت حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں آگئی اور اس عرصہ میں ان پر خدا کا ایک اور زبردست انعام یہ ہوا کہ وہ منصب نبوت ورسالت سے بھی سرفراز کر دیے گئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام سے قبل بنی اسرائیل میں یہ سلسلہ قائم تھا کہ حکومت ایک سبط (خاندان) سے وابستہ تھی اور نبوت و رسالت دوسرے سبط سے، یہودا کے گھرانے میں نبوت چلی آتی تھی اور افراہیم کے خاندان میں حکومت وسلطنت،[1] داؤد علیہ السلام پہلے شخص ہیں جن کے اندر خدائے تعالیٰ نے یہ دونوں نعمتیں یکجا جمع کر دی تھیں وہ خدا کے پیغمبر اور رسول بھی تھے اور صاحب تاج وتخت بھی، چنانچہ قرآن عزیز نے حضرت داؤد علیہ السلام کے اس شرف کا اس طرح ذکر کیا ہے:

﴿ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ﴾ (البقرہ: ۲۵۱)

"اللہ نے ان کو حکومت بھی عطاء کی اور حکمت (نبوت) بھی اور اپنی مرضی سے جو چاہا سکھایا۔"

﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ ﴾ (ص: ۲۶)

"اے داؤد! بے شک ہم نے تم کو زمین میں اپنا نائب بنایا۔"

﴿ وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ﴾ (الانبیاء: ۷۹)

"اور ہم نے ہر ایک (داؤد وسلیمان) کو حکومت بخشی اور علم عطاء کیا۔"

انبیاء ورسل میں سے حضرت آدم علیہ السلام کے علاوہ صرف حضرت داؤد علیہ السلام ہی وہ پیغمبر ہیں جن کو قرآن عزیز نے "خلیفہ" کے لقب سے پکارا ہے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۰

تحقیق و کاوش کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام کی اس امتیازی خصوصیت کی دو حکمتیں سمجھ میں آتی ہیں، ایک صفحات آئندہ میں اپنے موقعہ پر آئے گی اور دوسری حکمت یہ ہے کہ جبکہ بنی اسرائیل میں صدیوں سے قائم شدہ رسم کے خلاف حضرت داؤد علیہ السلام میں نبوت و رسالت کے ساتھ حکومت و سلطنت بھی جمع کر دی گئی تو ضروری تھا کہ ان کو ایک ایسے لقب سے پکارا جائے جو اللہ تعالیٰ کی صفات علم و قدرت کا مظہر اتم ہونے پر صراحت کرتا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے شریعت حقہ کی اصطلاح میں "خلیفہ" سے بہتر اور کوئی لفظ نہیں ہو سکتا۔

الحاصل حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کی خدمت بھی سرانجام دیتے اور ان کی اجتماعی حیات کی نگرانی کا فرض بھی ادا فرماتے رہے۔

عظمت مملکت:

قرآن عزیز، تورات اور اسرائیلی تاریخ اس کے شاہد ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام شجاعت و بسالت، اصابت رائے اور قوت فکر و تدبیر جیسے اوصاف کے پیش نظر کامل و مکمل انسان تھے اور فتح و نصرت ان کے قدم چومتی تھی اور خدا کا فضل و کرم اس درجہ ان کے شامل حال تھا کہ دشمن کے مقابلہ میں ان کی جماعت کتنی ہی مختصر ہوتی کامیابی ہمیشہ ان ہی کے ہاتھ رہتی اس لیے بہت تھوڑے عرصہ میں شام، عراق، فلسطین اور شرق اردن کے تمام علاقوں پر ان کا حکم نافذ اور ایلہ (خلیج عقبہ) سے لے کر فرات کے تمام علاقوں اور دمشق تک تمام ملک ان کے زیر نگیں تھا، اور اگر حجاز کے بھی ان حصوں کو شامل کر لیا جائے جو ان کے قلمرو حکومت کا حصہ بن چکے تھے، تو یہ کہنا کسی طرح بیجا نہ ہوگا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی مملکت و حکومت بلاشرکت "سامی اقوام" کی واحد سلطنت تھی، جو جدید فلسفہ تاریخ اقوام کے مطابق "وحدت عرب" یا اس سے بھی زیادہ وسیع "وحدت اقوام سامیہ" کی حکومت کہی جا سکتی ہے، اور پھر کثرت لشکر اور وسعت حدود و رقبہ مملکت کے ساتھ ساتھ "وحی الٰہی" کے شرف نے ان کی عظمت و شوکت اور صولت و ہیبت کو اور بھی زیادہ بلند کر دیا تھا اور رعایا کو یہ یقین حاصل تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے کوئی ایسا معاملہ رکھ دیا جائے یا ایسی کوئی مہم پیش کر دی جائے جو انتہائی پیچیدہ ہو یا کذب و افتراء نے اس پر زیادہ سے زیادہ ملمع کر دیا ہو، تب بھی "وحی الٰہی" کے ذریعہ ان پر حقیقت حال منکشف ہو جاتی ہے اس لیے جن و انس کسی کو بھی یہ حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان کے احکام کی خلاف ورزی کریں چنانچہ ابن جریر نے اپنی تاریخ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ دو آدمی ایک بیل کا مناقشہ لے کر داؤد علیہ السلام کی خدمت میں پیش ہوئے۔ ایک یہ کہتا تھا کہ یہ میری ملک ہے اور دوسرا غاصب ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے قضیہ کا فیصلہ دوسرے دن پر مؤخر کر دیا۔ دوسرے دن انہوں نے مدعی سے فرمایا کہ رات میں خدا نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تجھ کو قتل کر دیا جائے لہٰذا تو صحیح صحیح بات بیان کر مدعی نے کہا: اے خدا کے سچے نبی! اس مقدمہ میں تو میرا بیان قطعاً حق اور سچ ہے لیکن اس واقعہ سے قبل میں نے اس (مدعی علیہ) کے باپ کو دھوکا دے کر مار ڈالا تھا، یہ سن کر حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کو قصاص میں قتل کر دینے کا حکم صادر فرمایا۔ [1]

اسی قسم کے واقعات ہوتے تھے جن کی وجہ سے حضرت داؤد علیہ السلام کے حکم اور ان کی عظمت و شوکت کے سامنے سب مطیع اور فرمانبردار تھے۔ قرآن عزیز کی آیت ذیل میں حضرت داؤد علیہ السلام کی اسی عظمت مملکت اور موہبت حکمت و نبوت کا اظہار

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۲

Marfat.com

کیا گیا ہے:

﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ۝﴾ (ص: ۲۰)

"اور ہم نے اسی کی حکومت کو مضبوط کیا اور اس کو حکمت (نبوت) عطاء کی اور صحیح فیصلہ کی قوت بخشی۔"

اس آیت اور گذشتہ آیات میں "حکمت" سے کیا مراد ہے؟ یہ سوال ہے جو مفسرین کے یہاں زیر بحث ہے۔ ہمارے نزدیک اقوال سلف کا خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ حکمت سے دو باتیں مراد ہیں، ایک نبوت اور دوسری عقل و دانش کا وہ مقام جس پر فائز ہو کر کوئی شخص راہ راست کی بجائے کبھی کج روی اختیار نہیں کر سکتا۔ بعض علماء نے حکمت سے زبور مراد لی ہے، اسی طرح "فصلِ خطاب" سے بھی دو امور کی جانب اشارہ ہے:

① وہ تقریر و خطابت کے فن میں کمال رکھتے تھے اور اس طرح بولتے تھے کہ لفظ لفظ اور فقرہ فقرہ جدا جدا فہم و ادراک میں آتا تھا اور اس سے کلام میں فصاحت و لطافت اور شوکت بیان پیدا ہو جاتی تھی۔

② ان کا حکم اور فیصلہ حق و باطل کے درمیان قول فیصل کی حیثیت رکھتا تھا۔

زبور:

بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے "اصل اور اساس" تورات تھی لیکن حالات و واقعات اور زمانہ کے تغیرات کے پیش نظر حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی خدا کی جانب سے زبور عطا ہوئی جو تورات کے قوانین و اصول کے اندر رہ کر اسرائیلی گروہ کی رشد و ہدایت کے لیے بھیجی گئی تھی، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام نے شریعت موسوی کو از سر نو زندہ کیا، اسرائیلیوں کو راہ ہدایت دکھائی اور نور وحی سے مستفیض ہو کر تشنہ کامان معرفت الٰہی کو سیراب فرمایا۔

زبور خدا کی حمد کے نغموں سے معمور تھی اور حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسا لہجہ اور سحر آگیں لحن عطاء فرمایا تھا کہ جب زبور کی تلاوت فرماتے تو جن و انس حتیٰ کہ وحوش و طیور تک وجد میں آ جاتے۔ اس لیے آج تک "لحن داؤدی" ضرب المثل ہے۔

مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے حسن صوت کو سنتے تو ارشاد فرماتے: "ابو موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے لحن داؤد عطاء فرمایا ہے۔" [1]

لغت میں زبور کے معنی پارے اور ٹکڑے کے ہیں چونکہ یہ کتاب درا صل توراۃ کی تکمیل کے لیے نازل ہوئی تھی اسی لیے گویا اسی کا ایک حصہ اور ٹکڑا ہے۔

زبور ایسے قصائد اور مسجع [2] کلمات کا مجموعہ تھا جس میں خدا کی حمد و ثنا اور انسانی عبدیت و عجز کے اعتراف اور پند و نصائح اور بصائر و حکم کے مضامین تھے۔ مسند احمد میں ایک روایت منقول ہے کہ زبور کا نزول رمضان میں ہوا اور وہ مواعظ و حکم کا مجموعہ تھی۔ نیز بعض بشارات اور پیشین گوئیاں بھی منقول تھیں، چنانچہ بعض مفسرین نے یہ تصریح کی ہے کہ آیت مسطورہ ذیل میں زبور کے جس واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ دراصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بشارت سے متعلق ہے اور وہی اس کا مصداق ہیں۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۱ [2] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۲

Marfat.com

﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۱۰۵)

"اور بیشک ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ کہہ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔"

قرآن عزیز نے جگہ جگہ توراۃ، انجیل اور زبور کو خدا کی وحی فرمایا ہے اور منزل من اللہ بتایا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے دیدہ ودانستہ خدا کی ان کتابوں کو بدل ڈالا اور جگہ جگہ اپنی مرضی کے مطابق ان میں تحریف کر دی حتیٰ کہ اب ان کے حقائق پر اس قدر پردہ پڑ گیا ہے کہ اصل اور جعل کے درمیان فرق کرنا سخت مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا ہے۔

﴿مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ (النساء: ۴۶)

"بعض یہود وہ ہیں جو (توراۃ وانجیل زبور) کے کلمات کو ان کی اصل حقیقت سے بدلتے اور پھیرتے ہیں۔"

چنانچہ توراۃ وانجیل کے علاوہ خود زبور اس کی زندہ شہادت موجود ہے۔ موجودہ زبور میں ان مختلف حصوں کی تعداد جن کو اہل کتاب کی اصطلاح میں مزبور کہا جاتا ہے ایک سو پچاس ہے ان حصوں پر جو نام درج ہیں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ سب حصے حضرت داؤد علیہ السلام کے "مزبور" نہیں ہیں، کیونکہ بعض پر اگر حضرت داؤد علیہ السلام کا نام ثبت ہے تو بعض پر مغنیوں کے استاذ قورح کا اور بعض پر شوشنیم کے سروں پر آصف کا اور بعض پر گتیت کا اور بعض پر کسی کا نام نہیں ہے علاوہ ازیں بعض ایسے مزبور بھی ہیں جو حضرت داؤد علیہ السلام سے صدیوں بعد تصنیف کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ مزبور:

اے خدا قوموں میں تیری میراث میں گھس آئی ہیں، انہوں نے تیری مقدس ہیکل کو ناپاک کیا ہے، انہوں نے یروشلم کو کھنڈر بنا دیا ہے۔"[1]

اس مزبور میں اس ہولناک واقعہ کا تذکرہ ہے جو بنوکدرزر (بخت نصر) کے ہاتھوں بنی اسرائیل کو پیش آیا اور ظاہر ہے کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے صدیوں بعد پیش آیا ہے۔

بہرحال خدائے تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر زبور نازل فرمائی، اور ان کے ذریعہ بنی اسرائیل کو رشد وہدایت کا پیغام سنایا۔

﴿وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل: ۵۵)

﴿وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝﴾ (النساء: ۱۶۳)

"اور بے شک ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت عطاء فرمائی اور ہم نے داؤد کو زبور بخشی۔ اور ہم نے داؤد کو زبور عطاء کی۔"

بخاری کتاب الانبیاء میں ایک روایت منقول ہے کہ حضرت داؤد پوری زبور کو اتنے مختصر وقت میں تلاوت کر لیا کرتے کہ وہ گھوڑے پر زین کسنا شروع کرتے تو تلاوت بھی شروع کرتے اور جب کس کر فارغ ہوتے تو پوری زبور ختم کر چکے ہوتے۔

حضرت داؤد علیہ السلام اور قرآن وتورات:

اس مقام پر قرآن عزیز اور تورات کے درمیان سخت اختلاف ہے۔ قرآن عزیز تو حضرت داؤد علیہ السلام کو اگر صاحب شوکت

[1] مزبور ۷۹ تا ۷۴

Marfat.com

وصولت بادشاہ مانتا ہے تو جلیل القدر پیغمبر اور رسول بھی تسلیم کرتا ہے۔ لیکن تورات ان کو صرف "کنگ داؤد" (شاہ داؤد) ہی تسلیم کرتی ہے اور ان کی نبوت و رسالت کا اقرار نہیں کرتی۔ ظاہر ہے کہ تورات کا انکار تحکم اور بے سروپا بات ہے اور اسی قسم کے کذب و افتراء پر مبنی ہے جس کا ثبوت بارہا ان ہی صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔

خصائص داؤد علیہ السلام:

اللہ تعالیٰ نے یوں تو سب ہی پیغمبروں کو خصوصی شرف و امتیاز بخشا ہے اور اپنے نبیوں اور رسولوں کو بے شمار انعام و اکرام سے نوازا ہے تاہم شرف و خصوصیت کے درجات کے اعتبار سے ان کے درمیان بھی فرق مراتب رکھا ہے اور یہی امتیازی درجات و مراتب ان کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں:

﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ ﴾ (البقرہ: ۲۵۳)

"یہ رسول! ہم نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔"

چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق بھی قرآن عزیز نے چند خصائص و امتیازات کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدس رسول کو کس درجہ بزرگی اور عظمت عطاء فرمائی ہے لیکن یہ واضح رہے کہ قرآن عزیز کی بیان کردہ خصائص انبیاء و رسل میں "خاصہ" کے وہ منطقی معنی مراد نہیں ہیں کہ کسی دوسرے شخص میں قطعاً اس کا وجود نہ پایا جائے اور وہ وصف صرف اسی کے اندر محدود ہو بلکہ اس مقام پر خاصہ سے وہ وصف مراد ہے جو اس ذات میں تمام و کمال درجہ پر پایا جاتا ہو اور اس کے ذکر سے ذہن فوراً اس شخصیت کی جانب متوجہ ہو جاتا ہو اگرچہ بعض حالات میں اس وصف خاص کا وجود دوسرے نبیوں میں بھی جلوہ گر نظر آتا ہو۔

تسخیر و تسبیح جبال و طیور:

حضرت داؤد علیہ السلام خدائے تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس میں بہت زیادہ مصروف رہتے تھے اور اس قدر خوش الحان تھے کہ جب زبور پڑھتے یا خدا کی تسبیح و تہلیل میں مشغول ہوتے تو ان کے وجد آفریں نغموں سے نہ صرف انسان بلکہ وحوش و طیور وجد میں آ جاتے اور آپ کے اردگرد جمع ہو کر حمد خدا کے ترانے گاتے اور سریلی اور پرکیف آوازوں سے تقدیس و تسبیح میں حضرت داؤد علیہ السلام کی ہمنوائی کرتے اور صرف یہی نہیں بلکہ پہاڑ بھی خدا کی حمد میں گونج اٹھتے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کی اس فضیلت کا قرآن عزیز نے سورۂ انبیاء، سبا اور صٓ میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے:۔

﴿ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ ﴾ (الانبیاء: ۷۹)

"اور ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو تابع کر دیا ہے کہ وہ داؤد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور ہم ہی میں ایسا کرنے کی قدرت ہے۔"

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۭ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ ﴾ (سباء: ۱۰)

"اور بیشک ہم نے داؤد (علیہ السلام) کو اپنی جانب سے فضیلت بخشی ہے (وہ یہ کہ ہم نے حکم دیا) اے پہاڑو اور پرندو تم داؤد کے ساتھ مل کر تسبیح اور پاکی بیان کرو۔"

Marfat.com

﴿اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ۝ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗ اَوَّابٌ ۝﴾

(صٓ: ۱۸۔۱۹)

"بیشک ہم نے داؤد کے لیے پہاڑوں کو مسخر کر دیا کہ اس کے ساتھ شام اور صبح تسبیح کرتے ہیں اور پرندوں کے پرے کے پرے جمع ہوتے اور سب مل کر حمد خدا کرتے ہیں۔"

بعض مفسرین نے ان آیات کی تفسیر میں کہا ہے کہ چرند و پرند اور پہاڑوں کی تسبیح زبان حال سے تھی گویا کائنات کی ہر شے کا وجود اور اس کی ترکیب بلکہ اس کی حقیقت کا ذرہ ذرہ خدا کی خالقیت کا شاہد ہے اور یہی اس کی تسبیح وتحمید ہے۔

سیب اگرچہ زبان حال نہیں رکھتا اور نطق سے محروم ہے لیکن اس کی خوشبو اور اس کی لطافت، اس کا حسن اور اس کی نزاکت جدا جدا پکار کر کہہ رہے ہیں۔ ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝﴾

امام رازی نے یہی مسلک اختیار کیا ہے مگر بایں جلالت قدر اس مسلک کے ثبوت میں ایسی فلسفیانہ دلیل پیش کی ہے جو عقل ونقل دونوں اعتبار سے رکیک ہے بلکہ اس کو دلیل کہنا بھی غلط ہے۔ [1]

ہم کو یہ حقیقت کبھی بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ قرآن عزیز کا طرز استدلال ان فلسفیانہ موشگافیوں کے تابع نہیں ہے جو محض ظن اور تخمین کی بنیادوں پر قائم ہیں خصوصاً یونانی فلسفہ کے مزعومہ اصول پر ایک بات کہی جائے اور پھر قرآن عزیز کے صاف اور سادہ مطلب کو اس کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے تو قرآن عزیز اس کو برداشت نہیں کرتا۔

اس خیال کے برعکس محققین کی یہ رائے ہے کہ حیوانات، نباتات اور جمادات حقیقتاً تسبیح کرتے ہیں اور ان کی تسبیح کے صرف یہی معنی نہیں ہیں کہ ان کا وجود زبان حال سے صانع حکیم پر دلالت کرتا ہے اور یہی ان کی تسبیح ہے، اس لیے کہ قرآن عزیز نے سورۂ بنی اسرائیل میں بصراحت یہ اعلان کیا ہے:

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ﴾ (بنی اسرائیل: ٤٤)

"آسمان اور زمین خدا کی تسبیح کرتے ہیں اور کائنات کی ہر شے خدا کی تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کا فہم وادراک نہیں رکھتے۔"

اس جگہ دو باتیں صاف صاف نظر آتی ہیں:

① کائنات کی ہر شے تسبیح کرتی ہے۔ ② جن وانس ان کی تسبیح سمجھنے کا ادراک وفہم نہیں رکھتے۔

تو اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین اور کائنات کی ہر شے حیوانات، نباتات اور جمادات کی جانب تسبیح کی نسبت فرمائی ہے تو یہ ضرور ہے کہ ان اشیاء میں تسبیح کا حقیقی وجود موجود ہو اور پھر دوسرے جملہ کا اس پر اطلاق کیا جائے کہ جن وانس ان کی تسبیح کے فہم وادراک سے قاصر ہیں۔ اگر اس جگہ تسبیح کے حقیقی معنی نہ لیے جائیں بلکہ "زبان حال سے تسبیح کرنا" اس معنی کو اختیار کیا جائے تو پھر قرآن عزیز کا یہ ارشاد کیسے صحیح ہوگا:

---

[1] اس بحث کے مطالعہ کے لئے ملاحظہ کیجئے تفسیر کبیر جلد ۵ سورہ بنی اسرائیل

Marfat.com

﴿ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ ﴾ "تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے"۔

اس لیے کہ اگر ایک دہری اس کو نہیں سمجھتا کہ کائنات کا ہر ذرہ خدائے واحد کی ہستی کا پتہ دے رہا ہے تو تمام اہل مذاہب خصوصاً ہر مسلمان تو بے شبہ اس کو سمجھتا ہے اور جب بھی وجود باری پر کچھ سوچتا ہے تو اس کا یقین کر کے سوچتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی ہستی کا اقرار کر رہا ہے اور ہر شے کا وجود ہی خود خالق کائنات کا پتہ دے رہا ہے۔ ابن حزم نے "الفصل" میں اس جگہ یہ شبہ پیش کیا ہے کہ اگر حیوانات، نباتات اور جمادات کی تسبیح کو حقیقتاً تسبیح پر محمول کیا جائے تو یہ اشکال لازم آئے گا کہ ایک دہری انسان بھی "شے" ہے مگر وہ خدا کی تسبیح کسی لحہ بھی نہیں کرتا۔ لہٰذا آیت کا عموم کیسے صحیح باقی رہے گا۔

ابن حزم کا یہ اشکال بہت ہی سطحی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہ کے بیان کرتے وقت ان کی نظر قرآن عزیز کے اس مطلب ومراد سے غافل ہوگئی جو اس مقام پر اس کے پیش نظر ہے اور انہوں نے آیت زیر بحث کے سیاق وسباق پر غور نہیں فرمایا۔

قرآن عزیز اس آیت سے قبل مشرکین کا تذکرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو بتا رہا ہے کہ مشرکین اپنی ناسمجھی اور کج فہمی سے خدا کے ساتھ معبودان باطل کو شریک ٹھہراتے ہیں، لیکن قرآن جب اس مسئلہ کے بطلان کو ان پر واضح کرتا اور طرح طرح سے سمجھاتا ہے تو ان پر نصیحت کا الٹا اثر پڑتا ہے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ نفرت کرنے لگتے ہیں حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور برتر ہے ان تمام باطل نسبتوں سے جو مشرکین اس کی جانب منسوب کرتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ یہ انسان ہی ہے جو اس قسم کی مشرکانہ گمراہی میں مبتلاء ہو رہا ہے ورنہ ساتوں آسمان وزمین اور کائنات کی ہر شے خدا کی پاکی بیان کرتی اور شرک سے بیزاری کا اظہار کرتی ہے۔ مگر انسان ان کی اس تسبیح کے فہم وادراک سے قاصر ہے بیشک اللہ بردبار ہے بخشنے والا۔

اس کے بعد مشرکین کے باطل عقیدہ کا ثمرہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب محمد ﷺ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم ان کے اور مشرکین کے درمیان ایک "حجاب" قائم کر دیتے ہیں، یعنی جب قرآن کو خدا کا کلام نہیں مانتے تو وہ آپ کو رسول بھی تسلیم نہیں کرتے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ آپ کی نصیحت سے منہ موڑ کر آخرت کے انجام سے بے نیاز ہو جاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ۭ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِـهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝ وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝ ﴾ (بنی اسرائیل: ۴۱-۴۵)

"اور ہم نے قرآن میں طرح طرح کی باتیں بیان کی ہیں تاکہ لوگ نصیحت پکڑیں مگر وہ اس سے اور بدک جاتے ہیں۔ کہہ دو کہ اگر خدا کے ساتھ اور معبود ہوتے جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو وہ ضرور (خدائے) مالک عرش کی طرف (لڑنے بھڑنے کے

لیے) رستہ نکالتے وہ پاک ہے اور جو کچھ یہ بکواس کرتے ہیں اس سے (اس کا رتبہ) بہت عالی ہے۔ ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں اسی کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور (مخلوقات میں سے) کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے بیشک وہ بردبار اور غفار ہے۔"

قرآن عزیز کی ان تفصیلات اور سیاق وسباق کی تصریحات کے بعد ابن حزم کے شبہ کے لیے کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، وہ تو صاف صاف یہ کہہ رہا ہے کہ خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانے کی ناپاک جرأت "انسان" کو ہی ہوئی اس لیے کہ وہ متضاد اوصاف کا مجموعہ ہے لیکن اس کے علاوہ کائنات کی ہر شے خدا کے سامنے حقیقت کے سواء اور کچھ کہنے کی جرأت نہیں رکھتی اور اسی لیے وہ صرف پاکی ہی بیان کرتی ہے اور "تسبیح وتحمید" اس کا شیوہ ہے۔

شیخ بدرالدین عینی نے محققین کے اس مسلک کو اس حدیث کے تحت میں مختصر مگر مدلل بیان کیا ہے جس میں دو قبروں میں مردوں پر عذاب ہونے اور نبی اکرم ﷺ کے درخت کی ایک سبز شاخ کو چیر کر دونوں قبروں پر لگاتے ہوئے ارشاد فرمانے کا ذکر ہے کہ جب تک یہ شاخیں خشک نہ ہوں گی یہ دونوں عذاب سے محفوظ رہیں گے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"اہل علم آیت ﴿وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ﴾ کے معنی بیان کرتے ہیں کہ ہر زندہ شے خدا کی حمد کرتی ہے اور ہر شے کو اس کے درجہ کے مناسب زندگی حاصل ہے اور لکڑی (نباتات) میں زندگی اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک وہ سبز رہے اور خشک ہو جانا اس کی موت کا اعلان ہے اور پتھر (جمادات) کی زندگی اس کے سالم رہنے سے وابستہ ہے اور اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا اس کی موت کا پیغام ہے اور محققین کا یہی مسلک ہے کہ آیت (بغیر کسی تاویل کے) اپنے عموم پر ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ اشیاء کیا حقیقتاً تسبیح کرتی ہیں یا اپنے حال سے صانع اور خالق پر دلالت کرنا ہی ان کی تسبیح ہے۔

تو اہل تحقیق کا مذہب یہ ہے کہ یہ اشیاء حقیقتاً تسبیح کرتی ہیں اور جبکہ "عقل" بھی اس کو محال نہیں سمجھتی اور "نص" بھی بصراحت اس کا اظہار کرتی ہے تو ضروری ہے کہ اس کا مطلب وہی لیا جائے جو اہل تحقیق فرماتے ہیں۔" [1]

نص قرآنی کی صراحت تو آپ کے سامنے ہے۔ لیکن عقل کیوں اس کو محال نہیں سمجھتی تو اس کا فتویٰ عقل ہی سے لیجیے۔

عقلاء دہر کا اس پر اتفاق ہے کہ گفتگو اور قول کے لیے "نطق" شرط نہیں ہے، اور اگر کسی شے میں "حیات" اور "صوت" موجود ہیں تو اس کی جانب قول کی نسبت بے تردد صحیح ہے، چنانچہ فلاسفہ یونان حیوانات کے اندر حیات کے ساتھ جزئیات کا حس بھی تسلیم کرتے رہے ہیں اور جدید سائنس کے دور میں تو یہ مشاہدہ ہو رہا ہے کہ نباتات کے اندر بھی "حیات" اور "احساس" دونوں چیزیں موجود ہیں حتیٰ کہ جزئیات کا تمیز بھی تجربہ میں آ چکا ہے۔ چھوئی موئی کا درخت ہاتھ لگانے سے مرجھا جاتا ہے اور ہاتھ الگ ہونے سے پھر شاداب ہو جاتا ہے۔ "مردم خور درخت" انسان یا حیوان کے قریب ہونے پر اس کا احساس کرتا اور فوراً اپنی شاخیں دراز کر کے اس کو دبوچ کر اپنی گرفت میں کر لیتا ہے، یہ اب رات دن کے مشاہدے میں کلکتہ میں مشہور ماہر علم النباتات سائنس دان کا ایک باغیچہ آج بھی موجود ہے جس میں مسٹر بوس خدا کی قدرت کے عجائبات دکھاتا ہے کہ درخت مریض بھی ہوتے ہیں اور صحت یاب بھی اور بعض

[1] عینی شرح بخاری ج ۱ ص ۸۷۴

درختوں کا بعض سے نفرت کرنا مشاہد ہوتا ہے اور بعض کا بعض کی جانب مائل ہونا بھی، حتیٰ کہ بعض سائنس دانوں کا اب یہ دعویٰ ہے کہ ایک نہایت ہی ضعیف اور غیر محسوس قسم کی حیات جمادات کے اندر بھی پائی جاتی ہے اور وہی اس کے نمو کی کفیل ہے۔

غرض نقل اور عقل دونوں اعتبار سے قرآن عزیز کا یہ ارشاد کہ "کائنات کی ہر شے خدا کی حمد وثناء کرتی ہے" اپنے حقیقی معنی کے لحاظ سے ہے اور "دلالت حال" کے ساتھ اس کی تاویل کرنا فضول ہے۔ البتہ ان کی یہ تسبیح وتحمید انسانوں کے عام فہم وادراک سے بالاتر رکھی گئی ہے اور خدا کی مرضی اور مشیت کے ماتحت کبھی کبھی انبیاء ورسل کو اس کا فہم وادراک عطا ہو جاتا ہے جو ان کے لیے بطور نشان (معجزہ) کے ہوتا ہے چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کی خصوصیات میں سے ایک خصوصی شرف وامتیاز یہ تھا کہ جب وہ صبح وشام خدا کی حمد وثناء کرتے اور اس کی پاکی اور تقدیس میں مشغول ہوتے تو وحوش وطیور اور پہاڑ بھی ان کے ساتھ بلند آواز سے خدا کی تسبیح وتحمید میں ان کی ہمنوائی کرتے اور حضرت داؤد علیہ السلام اور وہ سب ایک دوسرے کی تسبیح وتحمید کو سنتے، حضرت داؤد علیہ السلام کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کا قرآن عزیز نے سورۂ انبیاء، سباء اور صؔ میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

یہ واضح رہے کہ علماء حق میں سے جن علماء نے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت میں جن وانس کے علاوہ اشیاء کی تسبیح کو "حال" پر محمول کیا ہے، انہوں نے بھی بلاخوف یہ تسلیم کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا معاملہ اس عام حالت سے جدا معجزات سے تعلق رکھتا ہے اور ان مقامات میں حیوانات و جمادات کی تسبیح وتحمید حقیقی معنی ہی کے لحاظ سے ہے۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان معجزات میں حقیقت ہی مراد ہے جن میں کنکریوں کا کلمہ پڑھنا، استن حنانہ کا گریہ کرنا اور حیوانات کا آپ سے ہم کلام ہونا ثابت ہے۔

Marfat.com

حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں لوہے کا نرم ہوجانا:

شاہی اور شاہنشاہی کے باوجود حضرت داؤد علیہ السلام سلطنت ومملکت کے مالیہ سے ایک حبہ نہیں لیتے اور اپنا اور اہل وعیال کی معاش کا بار بیت المال پر نہیں ڈالتے تھے بلکہ اپنی محنت اور ہاتھ کی کمائی سے حلال روزی حاصل کرتے اور اسی کو ذریعہ معاش بناتے تھے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کے اس وصف کو حدیث صحیح میں ان الفاظ کے ساتھ سراہا گیا ہے۔

((قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما اکل احد طعاماً قط خیرا من ان یاکل من عمل یدہ و ان نبی اللہ داؤد علیہ السلام کان یاکل من عمل یدہ)). (بخاری کتاب التجارۃ)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کسی انسان کا بہترین رزق اس کے اپنے ہاتھ کی محنت سے کمایا ہوا رزق ہے اور بے شبہ اللہ کے پیغمبر داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے محنت سے روزی کماتے تھے۔"

شیخ بدرالدین عینی فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام دعا مانگا کرتے تھے کہ خدایا ایسی صورت پیدا کر دے کہ میرے لیے ہاتھ کی کمائی آسان ہو جائے کیونکہ میں بیت المال پر اپنی معاش کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔[1] دراصل حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ پاک جذبہ اسی پیغمبرانہ امتیازات میں سے تھا جن کا ذکر قرآن عزیز نے تمام اولوالعزم پیغمبروں کی رشد وہدایت کے سلسلہ میں کیا ہے کہ ہر نبی اپنی امت کو جب پیغام الٰہی سناتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا ہے۔

---

[1] عینی ج ۷ ص ۳۲۰

﴿وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾(الشعراء: ۱۰۹)

"اور میں تم سے اس خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں چاہتا میرا معاوضہ تو اللہ کے ذمہ ہے۔"

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث بخاری کا مقصد یہ ہے کہ خلیفہ اسلام کو اگرچہ بیت المال سے بقدر کفاف وظیفہ لینا درست ہے لیکن افضل یہی ہے کہ اس پر بار نہ ڈالے چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت اس تمام رقم کو واپس کر دیا تھا جو انہوں نے زمانہ خلافت میں بیت المال سے وظیفہ کی شکل میں لی تھی اسی طرح دوسری خدمات اسلامی پر معاوضہ لینے کا معاملہ ہے۔ [1] چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کی خواہش کو اللہ تعالیٰ نے اس فضیلت کے ساتھ قبول فرمایا کہ ان کے ہاتھ میں لوہے اور فولاد کو موم کی طرح نرم کر دیا کہ جب وہ زرہ بناتے تو سخت مشقت اور آلات حدادی کے بغیر فولاد کو جس طرح چاہتے کام میں لاتے اور ان کے ہاتھ میں موم کی طرح بآسانی ہر قسم کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔

قرآن عزیز نے اس واقعہ کو سورۂ انبیاء اور سورہ سباء میں اس طرح بیان کیا ہے:

﴿وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۙ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾(سباء: ۱۰۔۱۱)

"اور ہم نے اس (داؤد) کے لیے لوہا نرم کر دیا کہ بنا زرہیں کشادہ اور اندازہ سے جوڑ کڑیاں اور تم جو کچھ کرتے ہو، میں اس کو دیکھتا ہوں۔"

﴿وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴾(الانبیاء: ۸۰)

"اور ہم نے اس (داؤد) کو سکھایا ایک قسم کا لباس بنانا تاکہ تم کو لڑائی کے موقعہ پر اس سے بچاؤ حاصل ہو، پس کیا تم شکر گزار بنتے ہو۔"

تورات اور "لوہے کے استعمال کے زمانہ کی تاریخ" سے پتہ چلتا ہے کہ داؤد علیہ السلام سے پہلے لوہے کی صنعت نے اس حد تک تو ترقی کر لی تھی کہ فولاد کو پگھلا کر اس سے سپاٹ ٹکڑے بناتے اور ان کو جوڑ کر زرہ بنایا کرتے تھے لیکن یہ زرہ بہت بھاری ہوتی تھی اور چند قوی ہیکل انسانوں کے علاوہ عام طریقہ سے ان کا استعمال مشکل اور دشوار سمجھا جاتا تھا اور میدان جنگ میں سبک خرامی دشوار ہو جاتی تھی۔

حضرت داؤد علیہ السلام پہلے شخص ہیں جن کو خدائے تعالیٰ نے یہ فضیلت بخشی کہ انہوں نے تعلیم وحی کے ذریعہ ایسی زرہیں ایجاد کیں جو باریک اور نازک زنجیروں کے حلقوں سے بنائی جاتی تھیں اور ہلکی اور نرم ہونے کی وجہ سے میدان جنگ کا سپاہی اس کو پہن کر بآسانی نقل و حرکت بھی کر سکتا تھا اور دشمن سے محفوظ رہنے کے لیے بھی بہت عمدہ ثابت ہوتی تھیں۔

سید محمود آلوسی نے روح المعانی میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی قسم کی روایت نقل کی ہے۔ [2]

---

[1] فتح الباری ج ۴ ص ۲۴۳۔ [2] روح المعانی ج ۱۷ ص ۷۱

Marfat.com

منطق الطیر:

حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت سلیمان علیہ السلام کو خدائے تعالیٰ کی جانب سے ایک شرف یہ عطاء ہوا تھا کہ دونوں بزرگوں کو پرندوں کی بولیاں سمجھنے کا علم دیا گیا تھا، اور جس طرح ایک انسان دوسرے انسان کی گفتگو سمجھتا ہے اسی طرح وہ پرندوں کی گفتگو سمجھتے تھے۔

نطق طیر کی حقیقت کیا ہے اور حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کو نطق طیر کے متعلق کس قسم کا علم تھا اس کی مفصل بحث حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات میں آئے گی لیکن یہ یقینی بات ہے کہ ان کا یہ علم اس طریقہ کا نہ تھا جو علم الحیوانات کے ماہرین نے تخمینی اور ظنی طور پر ایجاد کیا ہے اور جو علمی اصطلاح میں زولوجی (Zoology) کی ایک شاخ شمار ہوتا ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک موہبت اور بخشش تھی جس سے ان دونوں پیغمبروں کو نوازا گیا تھا۔

تلاوت زبور:

گزشتہ سطور میں ذکر آ چکا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جب گھوڑے پر زین کسنا شروع کرتے تو اس سے فارغ ہونے تک مکمل زبور کی تلاوت کر لیا کرتے تھے تو حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ معجزہ "حرکت زبان" سے تعلق رکھتا ہے گویا خدائے تعالیٰ حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے زمانہ کو اس مدت میں ایسا سمیٹ دیتا تھا کہ عام حالت میں وہ گھنٹوں کی مقدار بن سکتا ہے یا حضرت داؤد کو سرعت اداء الفاظ کی اس درجہ قوت عطاء کر دی گئی تھی کہ دوسرا شخص جس کلام کو گھنٹوں میں ادا کرے، داؤد علیہ السلام اس کو بخاری کی نقل کردہ روایت کے مطابق مختصر وقت میں ادا کرنے پر قدرت رکھتے تھے اور یہ تو آج بھی مسلم ہے کہ سرعت حرکت کے لیے کوئی حد معین نہیں کی جا سکتی۔

حضرت داؤد علیہ السلام اور دو اہم تفسیری مقام:

حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ میں دو اہم مقام ایسے ہیں جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی اور مفسرین کے تفسیری مباحث کے لحاظ سے بھی اہم شمار ہوتے ہیں اور پہلا مقام اگرچہ اختلافی نہیں ہے مگر دوسرا مقام معرکۃ الآراء بن گیا ہے اور اہل علم کی موشگافیوں نے اس کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اصل حقیقت کو آشکارا کیا جائے اور باطل اوہام و مزعومات کو دلائل و براہین کی روشنی میں رد کیا جائے۔

مقام اوّل:

﴿وَ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْكُمٰنِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِیْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ ۚ وَ كُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ۫ وَّ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَ الطَّیْرَ ؕ وَ كُنَّا فٰعِلِیْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۷۸-۷۹)

"اور داؤد اور سلیمان علیہما السلام (کا واقعہ) جب کہ وہ ایک کھیتی کے معاملہ کا فیصلہ کر رہے تھے جس کو ایک فریق کی بکریوں کے

Marfat.com

ریوڑ نے خراب کر ڈالا تھا اور ہم ان کے فیصلہ کے وقت (اپنے علم محیط کے اعتبار سے) موجود تھے پھر ہم نے اس کے (بہترین) فیصلہ کی سمجھ سلیمان کو عطاء کی اور داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کو ہم نے علم و حکمت عطاء کیے۔"

اس آیت کی تفسیر میں جمہور مفسرین نے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعود و حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں دو شخص ایک مقدمہ لے کر حاضر ہوئے، مدعی نے دعوے کی روئیداد یہ سنائی کہ مدعی علیہ کی بکریوں کے گلے نے اس کی تمام کھیتی تباہ و برباد کر ڈالی اور اس کو چر چگ کر روند ڈالا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے علم و حکمت کے پیش نظر یہ فیصلہ دیا کہ مدعی کی کھیتی کا نقصان چونکہ مدعی علیہ کے گلہ کی قیمت کے قریب قریب متوازن ہے لہٰذا یہ پورا گلہ مدعی کو تاوان میں دے دیا جائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی عمر ابھی گیارہ سال کی تھی، وہ والد ماجد کے نزدیک ہی بیٹھے ہوئے تھے، کہنے لگے کہ اگرچہ آپ کا یہ فیصلہ صحیح ہے مگر اس سے بھی زیادہ مناسب شکل یہ ہے کہ مدعی علیہ کا تمام ریوڑ مدعی کے سپرد کر دیا جائے کہ وہ اس کے دودھ اور اس کی اون سے فائدہ اٹھائے اور مدعی علیہ سے کہا جائے کہ اس درمیان میں مدعی کے کھیت کی خدمت انجام دے اور جب کھیت کی پیداوار اپنی اصلی حالت پر واپس آ جائے تو کھیت مدعی کے سپرد کر دے اور اپنا ریوڑ واپس لے لے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو بیٹے کا یہ فیصلہ بہت پسند آیا۔

قرآن عزیز نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اس معاملہ میں سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ زیادہ مناسب رہا اور اس واقعہ خاص میں فہم داؤد پر فہم سلیمان گویا سبقت لے گیا۔ [1] فقہی اصطلاح میں حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلہ کو قیاسی کہیں گے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کو "استحسانی" مگر اس قسم کی جزئی فضیلت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بحیثیت مجموعی فضائل حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے والد حضرت داؤد علیہ السلام پر فضیلت رکھتے تھے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مجموعہ فضائل کے اعتبار سے حضرت داؤد علیہ السلام کی جو منقبت فرمائی ہے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حصہ میں نہیں آئی۔

مقام ثانی:

توراۃ اور "اسرائیلی روایات" کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی ذات قدسی صفات کی جانب ایسی مضحکہ خیز اور بیہودہ حکایات و قصص منسوب کرتی ہیں کہ جن کو پڑھ کر ان مقدس ہستیوں کے متعلق نبی یا رسول ہونے کا تو کیا یقین ہو سکتا ہے یہ بھی باور نہیں ہوتا کہ وہ با اخلاق بزرگ ہستیاں ہیں۔

بہتان طرازی کی مثال:

چنانچہ ان قصص و حکایات میں سے ایک خرافی روایت حضرت داؤد علیہ السلام سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ تورات کے صحیفہ شموئیل (۲) میں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ایک طویل داستان بیان کی گئی ہے جو مختصر الفاظ میں اسی کی زبانی سننے کے قابل ہے:۔

"اور شام کے وقت داؤد علیہ السلام اپنے پلنگ پر سے اٹھ کر بادشاہی محل کی چھت پر ٹہلنے لگے اور چھت پر سے اس نے ایک عورت کو دیکھا جو نہا رہی تھی، اور وہ عورت نہایت خوبصورت تھی۔ تب داؤد علیہ السلام نے لوگ بھیج کر اس عورت کا حال دریافت

---

[1] ابن کثیر سورۂ انبیاء

Marfat.com

کیا، اور کسی نے کہا، کیا وہ العام کی بیٹی بنت سبع نہیں جو حتی اور ریاہ کی بیوی ہے؟ اور داؤد علیہ السلام نے لوگ بھیج کر اسے بلا لیا وہ اس کے پاس آئی اور اس نے اس سے صحبت کی (کیونکہ وہ اپنی ناپاکی سے پاک ہو چکی تھی) پھر اپنے گھر کو چلی گئی، اور وہ عورت حاملہ ہوگئی۔ سو اس نے داؤد کے پاس خبر بھیجی کہ میں حاملہ ہوں..... صبح کو داؤد نے یوآب کے لیے ایک خط لکھا اور اسے اوریاہ کے ہاتھ بھیجا۔ اور اس نے خط میں یہ لکھا کہ اوریاہ کو گھمسان میں سب سے آگے رکھنا اور تم اس کے پاس سے ہٹ جانا تاکہ وہ مارا جائے.... اور اس شہر کے لوگ نکلے اور یوآب سے لڑے اور وہاں داؤد کے خادموں میں سے تھوڑے سے لوگ کام آئے اور حتی اوریاہ بھی مر گیا۔ تب یوآب نے آدمی بھیج کر جنگ کا سب حال داؤد کو بتایا....

جب اوریاہ کی بیوی نے سنا کہ اس کا شوہر اوریاہ مر گیا تو وہ اپنے شوہر کے لیے ماتم کرنے لگی، اور جب سوگ کے دن گزر گئے تو داؤد نے اسے بلوا کر اس کو اپنے محل میں رکھ لیا اور وہ اس کی بیوی ہوگئی اور اس سے اس کے ایک لڑکا ہوا۔ پر اس کام سے جسے داؤد علیہ السلام نے کیا تھا خداوند ناراض ہوا۔" ❶

اس داستان میں حضرت داؤد علیہ السلام کا جو اخلاقی نقشہ پیش کیا گیا ہے اس کے مطالعہ کے بعد ان کو نبی اور پیغمبر تو کجا ایک صحیح اخلاق کا انسان بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ دوسرے کی بیوی پر نظر بد ڈالنا، اس سے ناجائز طور پر ملوث ہونا اور پھر سازش کر کے اس کے شوہر کو ناحق قتل کروا دینا انسانی زندگی کے وہ ناپاک اعمال ہیں جن کے لیے علم اخلاق کی زبان میں "بدکاری" سے کم کوئی دوسرا لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ سُبۡحٰنَكَ هٰذَا بُهۡتَانٌ عَظِيۡمٌ ○

تورات کا تضاد بیان:

لیکن اس سے قبل کہ ہم حضرت داؤد علیہ السلام کی معصوم ہستی پر لگائے ہوئے اس بہتان کی مدلل تردید کریں خود توراۃ ہی کی زبانی یہ سنانا چاہتے ہیں کہ دوسرے مقامات پر اس نے حضرت داؤد علیہ السلام کی نسبت کیا کہا ہے اور ان کی پاک دامنی اور خدارسی کا کس انداز میں ذکر کیا ہے؟ تورات کے صحیفہ شموئیل ۲ میں ہے:

"تب ناتن (نبی) نے بادشاہ (داؤد) سے کہا۔ جا جو کچھ تیرے دل میں ہے کر کیونکہ خداوند تیرے ساتھ ہے۔

اور اسی رات کو ایسا ہوا کہ خداوند کا کلام ناتن کو پہنچا۔ جا اور میرے بندہ داؤد سے کہہ خداوند یوں فرماتا ہے.....

سو اب تو میرے بندے داؤد سے کہہ کہ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ میں نے تجھے بھیڑ سالہ سے جہاں تو بھیڑ بکریوں کے پیچھے پیچھے پھرتا تھا، لیا تاکہ تو میری قوم اسرائیل کا پیشوا ہو...... ❷

اس نے میرے زور آور دشمن اور میرے عداوت رکھنے والوں سے مجھے چھڑا لیا کیونکہ وہ میرے لیے نہایت زبردست تھے، وہ میری مصیبت کے دن مجھ پر آ پڑے پر خداوند میرا سہارا تھا۔ وہ مجھے کشادہ جگہ میں نکال لایا، اس نے مجھے چھڑایا اس لیے کہ وہ مجھ سے خوش تھا۔ خداوند نے میری راستی کے موافق مجھے جزا دی اور میرے ہاتھوں کی پاکیزگی کے مطابق مجھے بدلہ دیا، کیونکہ میں خداوند کی راہوں پر چلتا رہا اور شرارت سے اپنے خداوند سے الگ نہ ہوا، کیونکہ اس کے سارے فیصلے میرے سامنے تھے اور میں اس کے آئین سے برگشتہ نہ ہوا۔ میں اس کے حضور کامل بھی رہا، اور اپنی بدکاری سے باز

❶ شموئیل (۲) باب ۱۱ آیات ۲۔۲۷ ❷ شموئیل (۲) باب ۷ آیات ۳۔۸

رہا، اس لیے خداوند نے مجھے میری راستی کے موافق بلکہ میری اس پاکیزگی کے مطابق جو اس کی نظر کے سامنے تھی بدلہ دیا۔"

داؤد بن یسی کہتا ہے۔ یعنی یہ اس شخص کا کلام ہے جو سرفراز کیا گیا اور یعقوب علیہ السلام کے خدا کا ممسوح اور اسرائیل کا شیریں نغمہ ساز ہے۔ خداوند کی روح نے میری معرفت کلام کیا اور اس کا سخن میری زبان پر تھا ......

سلیمان نے کہا تو نے اپنے خادم میرے باپ داؤد پر بڑا احسان کیا اس لیے کہ وہ تیرے حضور راستی اور صداقت اور تیرے ساتھ سیدھے دل سے چلتا رہا ......

سو اس (سلیمان) نے کہا خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو جس نے اپنے منہ سے میرے باپ داؤد سے کلام کیا.... اور داؤد کو چنا تا کہ وہ میری قوم اسرائیل پر حاکم ہو۔

اب اے خداوند اسرائیل کے خدا اپنے بندے میرے باپ داؤد کے ساتھ اس قول کو بھی پورا کر جو تو نے اس سے کیا تھا کہ تیرے پاس میرے حضور اسرائیل کے تخت پر بیٹھنے کے لیے آدمی کی کمی نہ ہو گی۔ بشرطیکہ تیری اولاد جیسے تو میرے حضور چلتا ہے ویسے ہی میری شریعت پر عمل کرنے کے لیے اپنی راہ کی احتیاط رکھے ......

پھر بھی میں ساری سلطنت کو نہیں چھینوں گا بلکہ اپنے بندے داؤد کی خاطر یروشلم کی خاطر جسے میں نے چن لیا ہے ایک قبیلہ تیرے بیٹے کو دوں گا ......

اور ایسا ہو گا کہ اگر تو ان سب باتوں کو جن کا میں تجھے حکم دوں سنے اور میری راہوں پر چلے اور جو کام میری نظر میں بھلا ہے اس کو کرے اور میرے آئین و احکام کو مانے جیسا میرے بندہ داؤد نے کیا تو میں تیرے ساتھ رہوں گا، اور تیرے لیے ایک پائیدار گھر بناؤں گا۔ جیسا میں نے داؤد علیہ السلام کے لیے بنایا اور اسرائیل کو تجھے دوں گا۔

یہ تمام عبارات بھی توراۃ ہی کی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ داؤد علیہ السلام خدا کے مختار اور پسندیدہ بندے تھے، بلا واسطہ اس سے ہم کلام ہونے کا شرف رکھتے تھے، خدا کی شریعت کے کامل مطیع و فرماں بردار تھے، راستباز، پاکدامن اور باعفت بزرگ تھے، اور خدا کے دیے ہوئے ملک میں بنی اسرائیل کے امیر اور خلیفۃ اللہ تھے، ہر وقت خدا کی حفاظت و صیانت ان کی کفیل تھی، گویا برگزیدہ "پیغمبر" اور صاحب اقتدار "حکمران" تھے۔ پس نہیں کہا جا سکتا کہ اہل کتاب توراۃ کے ان متضاد بیانات میں کس طرح تطبیق دیتے ہیں۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کی شخصیت ان کی نگاہ میں کیا وقعت رکھتی ہے؟ اگر داؤد علیہ السلام "نبی" ہیں یا اخلاق حسنہ سے متصف "کنگ داؤد" ہیں تو حتی اور ریاہ کی عورت سے متعلق داستان کا ان کے پاس کیا جواب ہے اور اگر اوریاہ کی بیوی کا واقعہ صحیح ہے تو اس مسطورہ بالا مدحت و مدحت کا استحقاق کس داؤد کو حاصل ہے؟

اس کے برعکس قرآن عزیز نے حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق تفصیل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے برگزیدہ رسول اور معصوم پیغمبر ہیں، خلیفۃ اللہ اور بنی اسرائیل کے امیر و حکمران ہیں۔ وہ کہتا ہے:

سموئیل باب ۲۲ آیات ۱۸۔۲۵ ✿ ایضاً باب ۲۳ آیات ۱۔۳ ✿ سلاطین (۱) باب ۳ ✿ تاریخ (۲) باب ۶ آیات ۴۔۷
ایضاً باب ۹ آیت ۱۶ ✿ سلاطین (۱) باب ۱۱ آیت ۱۳ ✿ ایضاً باب ۱۱ آیت ۳۸

Marfat.com

﴿ وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝۵۵ ﴾(بنی اسرائیل: ۵۵)

"اور بلاشبہ ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) کو زبور عطا کی۔"

﴿ وَ وَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝۳۰ ﴾(ص: ۳۰)

﴿ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ؕ ﴾(سبا: ۱۰)

﴿ وَ شَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَ اٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَ فَصْلَ الْخِطَابِ ۝۲۰ ﴾(ص: ۲۰)

﴿ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَ قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۵ ﴾(النمل: ۱۵)

"اور ہم نے داؤد کو سلیمان بخشا، داؤد اچھا بندہ ہے بلاشبہ وہ خدا کی رحمت کی جانب رجوع ہونے والا ہے اور بلاشبہ ہم نے داؤد کو اپنی جانب سے فضیلت بخشی اور ہم نے اس (داؤد) کو مضبوط ملک عطاء کیا اور حکمت سے نوازا اور حق و باطل کے فیصلہ کی قوت عطاء فرمائی۔ اور بلاشبہ ہم نے داؤد اور سلیمان کو "علم" سے بہرہ ور کیا اور ان دونوں نے کہا "اس اللہ کے لیے ہر طرح کی حمد جس نے اپنے بہت سے مومن بندوں پر ہم کو فضیلت اور برتری عطا فرمائی۔"

ان تمام آیات میں حسب عادت قرآن عزیز نے کتب سابقہ کے ان خیالات کی تردید اور اصلاح فرمائی ہے جو ان کے پیرودں کی تحریف و تبدیل کی بدولت ان میں بطور معتقدات داخل ہو گئے ہیں۔ اس نے تاریخ کے اس تاریک پردہ کو چاک کر کے بتایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام بنی اسرائیل میں مقدس ہستیاں گزری ہیں۔ وہ خدا کے سچے نبی اور پیغمبر ہیں اور ہر قسم کے گناہ اور نافرمانیوں سے مقدس اور پاک ہیں۔

مگر افسوس اور صد ہزار افسوس کہ قرآن عزیز کے اس مقدس اعلان کے باوجود حتی اور یاہ کی بیوی کی اس خرافی داستان کو توراۃ اور اسرائیلیات سے لے کر بعض مفسرین نے قرآن عزیز کی تفسیر میں نقل کر دیا اور اسرائیلی ہفوات کو بلا دلیل و سند اسلامی روایات کی حیثیت دے دی۔

ان سادہ لوح بزرگوں نے یہ مطلق خیال نہیں فرمایا کہ جن خرافی داستانوں کو آج وہ اسرائیلی روایت کی حیثیت سے قرآن عزیز کی تفسیر میں نقل کر رہے ہیں کل وہ آیات قرآنی کی تفسیر و تشریح سمجھی جا کر امت مرحومہ کے لیے فتنہ سامانی کا باعث بنیں گی اور ان کی گمراہی کا سبب ثابت ہوں گی۔ اور حیرت و صد حیرت ہے بعض ان جدید و قدیم متکلمین پر جنھوں نے اس قسم کی ہزلیات کو حق کے ساتھ رد کر دینے اور ان بہتان طرازیوں کو مردود قرار دینے کی بجائے ان روایات کے نیک محمل تلاش کر کے ان کو قابل قبول بنانے کی سعی نامشکور فرمائی ہے، اور بے محل حسن ظن سے کام لے کر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ یہ تاویلات جو اس خرافی روایت کے بارہ میں کی جا رہی ہیں، ریت کی دیوار اور تار عنکبوت ہیں اور کسی نہ کسی اسلوب کے ساتھ اس کو تسلیم کرنے سے "عصمت انبیاء" جیسے اہم اور بنیادی اسلامی عقیدہ پر ضرب کاری لگتی ہے، اور یہ کہ انبیاء و رسل کی جانب اس قسم کے انتساب سے جبکہ قرآن عزیز دامن پاک اور بے لوث ہے اور وہ اس قسم کی روایات کو بہتان عظیم سمجھتا ہے تو پھر کسی شخص کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کی تفسیر میں ان

قسم کی خرافات کا تذکرہ کرے۔

بہرحال ان مفسرین نے جن آیات کی تفسیر میں اس زہر ہلاہل کو ملایا ہے وہ سورۂ ص میں حضرت داؤد کے اس واقعہ سے متعلق ہے:

﴿وَ هَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ۙ﴿۲۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَ لَا تُشْطِطْ وَ اهْدِنَاۤ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿۲۲﴾ اِنَّ هٰذَاۤ اَخِیْ ۫ لَهٗ تِسْعٌ وَّ تِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۫ فَقَالَ اَكْفِلْنِیْهَا وَ عَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ وَ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَیَبْغِیْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ قَلِیْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَ ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَ خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ ۩ ﴿۲۴﴾ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾ یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾﴾ (ص: ۲۱-۲۶)

"اور کیا تجھ کو ان دعوے والوں کی خبر پہنچی ہے جب وہ دیوار کود کر عبادت خانہ میں گھس آئے داؤد کے پاس تو داؤد ان سے گھبرایا، وہ بولے گھبراؤ نہیں ہم دو جھگڑ رہے ہیں۔ زیادتی کی ہے ایک نے دوسرے پر سو ہمارے درمیان انصاف کے مطابق فیصلہ کر دے اور ٹالنے والی بات نہ کرنا، اور ہم کو سیدھی راہ بتا۔ یہ میرا بھائی ہے، اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے یہاں ایک دنبی ہے، پس یہ کہتا ہے کہ وہ ایک بھی میرے حوالہ کر دے اور مجھ سے گفتگو میں بھی تیز ہے، داؤد نے کہا، وہ اپنی دنبیوں میں تیری ایک دنبی کو ملانے کے لیے جو سوال کرتا ہے ظلم کرتا ہے اور اکثر شریک ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں الا یہ کہ جو ایمان لائے اور عمل کیے انہوں نے نیک اور ایسے بہت کم ہیں اور داؤد کے خیال میں گزرا کہ ہم نے اس کا امتحان لیا پس مغفرت چاہنے لگا وہ اپنے رب سے اور گر پڑا جھک کر اور رجوع ہوا (خدا کے سامنے) پھر ہم نے اس کو وہ کام معاف کر دیا، اور اس کے لیے ہمارے پاس (عزت کا) مرتبہ ہے اور اچھا ٹھکانا۔ اے داؤد ہم نے تجھ کو ملک میں (اپنا) نائب مقرر کیا ہے سو تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ حکومت کر اور نفس کی خواہش پر نہ چل کہ وہ تجھ کو اللہ کی راہ سے بچلا دے جو لوگ اللہ کی راہ سے بچلتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے۔"

آیات کی باطل تفسیر:

اس جگہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک امتحان کا ذکر ہے جو خدائے تعالیٰ کی جانب سے ان کو پیش آیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اوّل اس کو نہیں سمجھا مگر یکایک دل میں یہ خیال آیا کہ یہ منجانب اللہ ایک آزمائش ہے لہٰذا فوراً ہی خدا کے برگزیدہ پیغمبروں کی طرح حق تعالیٰ کی جانب رجوع کیا، استغفار کیا اور درگاہِ الٰہی میں ان کا استغفار قبول ہو کر ان کی عظمت شان اور تقرب الی اللہ کا باعث بنا۔

Marfat.com

معاملہ صرف اسی قدر تھا لیکن بعض مفسرین نے جب یہ دیکھا کہ قرآن عزیز نے اس آزمائش کی کوئی تفصیل نہیں بیان کی اور توراۃ اور ''اسرائیلی روایات'' میں اوریاہ کی بیوی کی ایک داستان موجود ہے جس میں حضرت داؤد علیہ السلام سے خدا کی ناراضی کا بھی ذکر ہے تو بلا تامل اس خرافات کو اس آیت کی تفسیر بنا کر آزمائش، استغفار اور قبول استغفار کو اس کے ساتھ چسپاں کر دیا۔

یہ دیکھ کر جلیل القدر مفسرین اور محققین سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے روشن دلائل و براہین کے ساتھ یہ واضح کیا کہ اس خرافی روایت کا سورۂ ص کی ان آیات کی تفسیر سے دور کا بھی کوئی علاقہ نہیں ہے اور نہ صرف یہ بلکہ یہ پوری داستان از اوّل تا آخر یہودیوں کی من گھڑت اور پر از بہتان روایتیں ہیں جن کے لیے اسلامیات میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

چنانچہ حافظ عماد الدین بن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

قد ذكر المفسرون هٰهنا قصة اكثرها ماخوذ من الاسرائيليات و لم يثبت فيها عن المعصوم حديث يجب اتباعه۔ ❶

''اس جگہ مفسروں نے ایک ایسا قصہ بیان کیا ہے بلاشبہ جس کا اکثر حصہ اسرائیلیات سے لیا گیا ہے اور اس بارے میں رسول اکرم ﷺ سے ایک حدیث بھی موجود نہیں ہے کہ جس کی پیروی ضروری ہو جائے۔''

اور اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ میں اس سے بھی زیادہ زور کے ساتھ فرماتے ہیں:

و قد ذكر كثير من المفسرين من السلف والخلف هٰهنا قصصًا و اخبارًا اكثرها اسرائيليات و منها ما هو مكذوب لا محالة تركنا ايرادها فى كتابنا قصدًا اكتفاء و اقتصارًا على مجرد تلاوة القصة من القران العظيم ﴿وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾ ❷

''اور بہت سے اگلے اور پچھلے مفسرین نے اس مقام پر چند قصے اور حکایتیں نقل کی ہیں، ان میں سے اکثر و بیشتر یہودیوں کی من گھڑت روایتیں ہیں اور بعض ان میں سے یقینی طور پر جھوٹی اور باطل ہیں۔ ہم نے اس لیے اس کو قصداً بیان نہیں کیا، اور قرآن عظیم نے جس قدر واقعہ بیان کیا ہے صرف اسی قدر بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے راہ مستقیم پر چلاتا ہے۔''

اور کتاب الفصل میں حافظ ابو محمد بن حزم ان آیات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

و هٰذا قول صادق صحيح لا يدل على شيء مما قاله المستهزؤن الكاذبون المتعلقون بخرافات ولدها اليهود۔ ❸

''اور قرآن کا یہ قول سچا اور صحیح ہے اور یہ کسی طرح بھی اس روایت پر دلالت نہیں کرتا جس کو ان مسخروں کاذبوں نے بیان کیا ہے جو ایسی خرافات سے لپٹے رہتے ہیں جن کو یہود نے ایجاد کیا ہے۔''

اسی طرح نسیم الریاض میں خفاجی نے شفاء میں قاضی عیاض نے، بحر المحیط میں ابو حیان اندلسی نے تفسیر کبیر میں امام رازی نے اور دیگر محققین نے ان تمام خرافات کو مردود قرار دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ اس سلسلے میں نبی معصوم ﷺ سے کوئی تفصیل منقول

---

❶ تفسیر ابن کثیر سورۂ ص ❷ ایضاً ج ۲ ص ۱۳ ❸ الفصل فی الملل والنحل ج ۴ ص ۱۴

...ں ہے۔

...آیات کی صحیح تفاسیر:

ان تمام خرافات سے الگ ہو کر ان محققین نے آیات کی جو تفسیریں کی ہیں وہ یا صحیح آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہیں اور یا قرآن عزیز کے سیاق و سباق کو پیش نظر رکھ کر ذوق سلیم کے ذریعہ کی گئی ہیں۔ اس لیے یہی صحیح اور قابل توجہ ہیں۔

① علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ واقعہ صرف اس قدر ہے کہ دو شخص اچانک محراب داؤد میں داخل ہو گئے جہاں حضرت داؤد علیہ السلام عبادت الٰہی میں مشغول تھے اور چونکہ ان دونوں کا معاملہ حقیقی اور واقعی تھا اور ان کو اس کے طے کرانے میں عجلت تھی اس لیے وہ دیوار پھاند کر چلے آئے، حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعی کا بیان سن کر تذکیر و وعظ کے پیش نظر اوّل زمانے کے فساد حال کا ذکر کیا اور فرمایا کہ زیردستوں پر ارباب قوت کے مظالم کا ہمیشہ یہی حال رہا ہے کہ وہ ان کی زندگی کو صرف اپنی راحت کا ایک آلہ سمجھتے رہے ہیں اور یہ بہت ہی بری بات ہے۔ البتہ خدا کے مومن بندے جو نیکوکار بھی ہیں ایسے مظالم سے بچتے اور خدا کا خوف کرتے ہیں۔ مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔

اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام نے انصاف پر مبنی فیصلہ کر کے قضیہ کو ختم کر دیا جب فریقین چلے گئے تو حضرت داؤد علیہ السلام کے بلند احساسات نے ان کے قلب و دماغ کو اِدھر متوجہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم الشان حکومت اور بے نظیر سطوت جو ان کو بخشی درحقیقت یہ ان کے لیے بہت بڑی آزمائش ہے اور امتحان ہے اس امر کا کہ ذات واحد نے اپنی اس کثیر مخلوق پر مجھ کو جو عزت و ... عطاء فرمائی ہے، اس سے متعلق عائد شدہ فریضہ کو میں کہاں تک صحیح طور پر انجام دیتا اور خدا کی اس نعمت کا اپنی عملی زندگی سے کس ... شکر ادا کرتا ہوں؟

چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام پر اس وجدانی کیفیت کا اس قدر اثر پڑا کہ وہ فوراً درگاہِ الٰہی میں سربسجود ہو گئے اور طلب مغفرت ...تے ہوئے اعتراف کرنے لگے کہ خدایا! اس عظیم المرتبت ذمہ داری سے سبکدوش ہونا بھی میری اپنی طاقت سے باہر ہے جب تک ...ری اعانت شامل حال نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ عمل پسند آیا اور اس کی مغفرت نے ان کو اپنی آغوش میں ڈھانپ لیا۔

ابن حزم اس تفسیر کے بعد فرماتے ہیں کہ "استغفار" خدا کی بارگاہ میں ایسا محبوب عمل ہے کہ اس کے لیے ہرگز یہ ضروری نہیں ...ں سے پہلے گناہ اور معصیت وجود میں آئے اور پھر اس کے ردعمل کے طور پر طلب مغفرت کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ "استغفار" ...اللہ سے بھی ثابت ہے حالانکہ قرآن عزیز نے تصریح کی ہے کہ ملائکۃ اللہ کی شان یہ ہے:

﴿لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۝۶﴾ (التحریم: ۶)

"وہ خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔"

قرآن عزیز نے فرشتوں کے استغفار کا اس طرح ذکر کیا ہے:

﴿یَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ﴾ (المؤمن: ۷)

Marfat.com

"اور وہ فرشتے استغفار کرتے ہیں مومنوں کے لیے (اور کہتے ہیں) اے ہمارے پروردگار تو ہر شے پر اپنی رحمت اور اپنے علم سے چھایا ہوا ہے تو بخش دے ان کو جو تیری جانب رجوع کرتے ہیں اور تیری راہ کی پیروی کرتے ہیں۔"

ابن حزم کی اس تفسیر کی تائید میں ہم اس قدر اور اضافہ کرتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زیر بحث واقعہ میں قرآن عزیز نے ان کے عصیان اور گناہ کا مطلق کوئی تذکرہ نہیں کیا بلکہ فَتَنّٰہُ کہہ کر صرف یہ بتایا ہے کہ ان کو کسی آزمائش میں ڈال دیا گیا اور آزمائش کے لیے ہرگز یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی گناہ اور خطاء سے ہی متعلق ہو جیسا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے ساتھ امتحان کا معاملہ پیش آیا۔ لہٰذا حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ معاملہ بھی کسی معصیت یا گناہ سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ پیغمبرانہ شان کے مطابق احساس فرض اور خدا کے حضور میں اپنی عبودیت و بیچارگی کا بہترین مظاہرہ تھا۔

قرآن عزیز کی زیر بحث آیات کے معانی و مطالب اگرچہ اس تفسیر کے متحمل ہیں اور اس سے حضرت داؤد علیہ السلام کی پیغمبرانہ جلالت شان اور زیادہ نمایاں ہوتی ہے تاہم یہ تفسیر اجتہادی ہے اس لیے کہ اس میں آزمائش کی جو صورت بیان کی گئی ہے وہ آیت یا کسی حدیث میں مذکور نہیں ہے، صرف اجتہاد سے تعلق رکھتی ہے۔

(۲) ابو مسلم نے ان آیات کی تفسیر میں کہا ہے کہ داؤد علیہ السلام کے سامنے جب دو شخصوں نے بحیثیت مدعی اور مدعا علیہ کے اپنا قضیہ پیش کیا تو حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعا علیہ کو جواب دہی کا موقعہ دیئے بغیر فقط مدعی کا بیان سن کر اپنی نصیحت میں اس قسم کی باتیں فرمائیں کہ جن سے فی الجملہ مدعی کی تائید ہوتی تھی اور چونکہ یہ طریق عام حالات میں انصاف کے خلاف تھا، اس لیے حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ ارشاد اگرچہ صرف ناصحانہ انداز میں تھا اور ابھی قضیہ کے انفصال کی نوبت نہیں آئی تھی تاہم ان جیسے جلیل القدر پیغمبر کے شایان شان نہیں تھا، لہٰذا یہ تھا وہ "فتنہ" جس میں حضرت داؤد علیہ السلام پڑ گئے۔

مگر جب کہ اس قسم کی لغزشوں پر خدائے تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کو فوراً متنبہ کر دیتا ہے تو حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی معاً تنبہ ہوا کہ ان سے قضیہ زیر بحث میں لغزش ہو گئی اور ان کے لیے یہ ابتلا اور آزمائش ہے اس لیے وہ خدا کی درگاہ میں طالب مغفرت ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو شرف قبولیت سے نوازا بلکہ ان کے اس پسندیدہ عمل کی وجہ سے ان کی رفعت شان کو اور زیادہ بلند کر دیا۔ ❶

ہم اس توجیہ پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو نصیحت فرمائی کہ داؤد علیہ السلام کہ تم دنیا کے عام حاکموں اور بادشاہوں کی طرح نہیں ہو جو اکثر و بیشتر حق و انصاف سے بے پروا ہو کر خدا کی مخلوق پر محض ہوائے نفس اور ذاتی غرض کی تکمیل کے لیے حکومت کرتے ہیں، تم خدا کی زمین میں اس کی جانب سے نائب اور "خلیفہ" ہو اور خدمت خلق تمہاری حیات طیبہ کا طغرائے امتیاز، اس لیے تمہارا فرض ہے کہ ہر لحہ حق و انصاف کو پیش نظر رکھو اور اس معاملہ میں کسی قسم کی بھی لغزش نہ ہونے دو اور صراط مستقیم ہی کو اپنی شاہراہ سمجھو، لہٰذا قرآن عزیز نے اسی حقیقت کے اظہار کے لیے آیات زیر بحث کے بعد آیت کو بیان کیا:

---

❶ روح المعانی ج ۲۳ ص ۱۶۸

Marfat.com

﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ﴾ (ص: ۲۶)

ان ہر دو توجیہات میں دونوں مفسروں نے تصریح کی ہے کہ یہ قضیہ فرضی نہ تھا بلکہ حقیقت پر مبنی تھا اور فریقین ملائکۃ اللہ نہیں تھے بلکہ انسان تھے کیونکہ قرآن عزیز کا تبادر یہی ظاہر کرتا ہے۔

آیات زیر بحث کی یہ توجیہ بھی اگرچہ استنباط و اجتہاد نظر سے تعلق رکھتی ہے تاہم آیات کے نظام و ربط کے ساتھ بہت زیادہ مطابق ہے اور اس لیے مفسرین کی نگاہ میں بہت زیادہ مقبول ہے۔

لیکن گذشتہ ہر دو توجیہات میں جدا جدا ایک خلش ہے جو قابل غور ہے، پہلی توجیہ میں ربط آیات کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آیات کی بیان کردہ اس توجیہ کو تسلیم کر لیا جائے جو ابن حزم نے بیان کی ہے تو پھر اگلی آیت ﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ.... الایۃ﴾ کا آیات زیر بحث کے ساتھ کوئی تعلق اور ربط نظر نہیں آتا کہ اس موقعہ پر حضرت داؤد علیہ السلام کی ایسی اہم فضیلت کے ذکر کے کیا معنی ہیں جو قرآن عزیز میں حضرت آدم علیہ السلام کے بعد انبیاء و رسل میں سے صرف ان ہی کے لیے بیان کی گئی۔

اور ابو مسلم کی توجیہ میں یہ خلش پیدا ہوتی ہے کہ جبکہ فصل مقدمات میں دنیوی حکام اور بادشاہوں کے یہاں بھی یہ مسلم ہے کہ ہمیشہ فیصلہ فریقین کے بیانات سننے کے بعد ہونا چاہیے بلکہ یوں کہیے کہ یہ طریق کار جبکہ ایک طے شدہ فطری مسئلہ ہے تو حضرت داؤد علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر کے متعلق یہ کس طرح یقین کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مدعی علیہ کا بیان سنے بغیر ہی مدعی کے حق میں فیصلہ دے دیا یا اپنے رجحان طبع کا اظہار کر دیا۔ یہ کوئی ایسی باریک اور دقیق بات نہیں ہے کہ جو حسب اتفاق حضرت داؤد علیہ السلام کے فہم و ادراک میں نہ آئی اور اس بارہ میں ان سے لغزش ہو گئی۔

لہٰذا ان ہر دو توجیہات سے جدا ہمارے نزدیک آیات کی بہتر توجیہ و تفسیر وہ ہے جو نظم کلام، ربط آیات اور سیاق و سباق میں مطابقت کے لحاظ سے بھی صحیح ہے اور جس کی بنیاد حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے ایک "اثر" پر قائم ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے تقسیم کار کے پیش نظر اپنے معمولات کو چار دنوں پر اس طرح تقسیم کر دیا تھا۔ ایک دن خالص عبادت الٰہی کے لیے۔ ایک دن فصل مقدمات کے لیے ایک دن خالص ذات کے لیے اور ایک دن بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے عام تھا۔ [1]

لیکن تقسیم ایام کی اس تفصیل میں اس حصہ کو زیادہ اہمیت حاصل تھی جو عبادت الٰہی کے لیے مخصوص تھا اس لیے کہ یوں تو حضرت داؤد علیہ السلام کا کوئی دن بھی عبادت الٰہی سے خالی نہ تھا، مگر ایک دن کو انہوں نے صرف اسی کے لیے مخصوص کر لیا تھا اور اس میں کوئی کام انجام نہیں دیتے تھے، چنانچہ قرآن عزیز ان کے اس وصف کو ﴿اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ﴾ کہہ کر نمایاں کرتا ہے۔

نیز قرآن عزیز اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام حجرہ بند کر کے عبادت اور تسبیح و تحمید کیا کرتے تا کہ کوئی خلل انداز نہ ہو سکے۔ گویا تقسیم ایام میں صرف یہی ایک دن ایسا تھا جس میں حضرت داؤد علیہ السلام تک کسی کا پہنچنا سخت تھا اور بنی اسرائیل سے ان کا تعلق منقطع ہو جاتا تھا اور باقی ایام میں اگر کوئی خاص ہنگامی صورت پیش آ جائے تو حضرت داؤد

---

[1] روح المعانی ج ۲۳ ص ۱۶۲

Marfat.com

علیہ السلام کے ساتھ واسطہ باقی رہتا تھا اور وہ اپنے معاملات کو ان کی جانب رجوع کر سکتے تھے۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عبادت الٰہی اور خدا کی تسبیح وتہلیل ایک مسلمان کا مقصد حیات ہے تاہم خدائے تعالیٰ نے جن ہستیوں کو اپنی مخلوق کی رشد و ہدایت اور خدمت خلق کے لیے چن لیا ہے ان کے لیے "کثرت عبادت" کے مقابلہ میں "ادائیگی فرض میں انہماک" عند اللہ زیادہ محبوب اور پسندیدہ عمل ہے۔ بے شبہ ایک صوفی اور مرتاض عابد و زاہد جس قدر بھی گوشہ گیر اور خلوت پذیر ہو کر عبادات میں مشغول رہتا ہے "منصب ولایت" کے درجات کو اسی قدر زیادہ حاصل کرتا رہتا ہے بخلاف "منصب نبوت" و "منصب خلافت" کے کہ خدائے تعالیٰ کی جانب سے اس کی موہبت وعطا کی غرض وغایت مخلوق کی رشد وہدایت اور ان کی خدمت وصیانت ہے، اس لیے اس کا کمال مخلوق کے ساتھ رشتہ وتعلق قائم کر کے احکام الٰہی کو سربلند کرنا ہے نہ کہ خلوت گزیں ہو کر "صوفی" بننا۔

لہٰذا حضرت داؤد علیہ السلام کی یہ تقسیم ایام اگرچہ زندگی کے نظم اور تقسیم عمل کے لحاظ سے ہر طرح قابل ستائش تھی، لیکن اس میں ایک دن کو عبادت الٰہی کے لیے اس طرح خاص کر لینا کہ ان کا تعلق مخلوق خدا سے منقطع ہو جائے "منصب نبوت" اور "منصب خلافت" کے منافی تھا اور حضرت داؤد علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر اور خلیفۃ اللہ کے لیے کسی طرح موزوں نہ تھا، اس لیے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک گوشہ نشین عابد و زاہد اور مرتاض کی حیثیت سے نہیں نوازا تھا بلکہ ان کو نبوت اور خلافت بخش کر مخلوق کی دینی و دنیوی ہر قسم کی خدمت و ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا تھا اور اس طرح ان کی حیات طیبہ کا شاہکار "ہدایت خلق" اور "خدمت خلق" تھا نہ ک "کثرت عبادت" چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کی اس روش کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس طرح آزمائش (فتنہ) میں مبتلا کر دیا کہ دو شخص جن کے درمیان ایک خاص مناقشہ تھا، عبادت کے مخصوص دن میں حجرہ کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اچانک خلاف عادت اس طرح دو انسانوں کو موجود پایا تو بہ تقاضائے بشری گھبرا گئے۔ دونوں نے صورت حال اندازہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ آپ خوف نہ کریں۔ ہمارے اچانک اس طرح داخل ہونے کی وجہ یہ قضیہ ہے اور ہم اس کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ تب حضرت داؤد علیہ السلام نے واقعات کو سنا اور مسطورہ بالا نصیحت فرمائی۔

قرآن عزیز نے اس مقام پر قضیہ کے عام پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ وہ ہر فہم رسا میں خود بخود آ جاتے ہیں کہ دا علیہ السلام کا فیصلہ بلاشبہ حق کے مطابق ہی رہا ہوگا اور اس نے صرف اسی پہلو کو نمایاں کیا جس کا تعلق "رشد و ہدایت" سے تھا، یع زبردستوں کا زیردستوں کے ساتھ ظلم کرنا۔

غرض فریقین کا فیصلہ کرنے کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام کو فوراً تنبہ ہوا کہ مجھ کو خدائے تعالیٰ نے اس آزمائش میں کس ڈالا ہے اور وہ حقیقت حال کو سمجھ کر خدا کی درگاہ میں سربسجود ہوئے اور استغفار کیا، اور اللہ تعالیٰ نے استغفار کو شرف قبولیت عطاء فر ان کی عظمت کو اور دوبالا کر دیا اور پھر یہ نصیحت فرمائی کہ "اے داؤد علیہ السلام! ہم نے تم کو زمین میں اپنا "خلیفہ" بنا کر بھیجا ہے اس لیے تم فرض ہے کہ خدا کی اس نیابت کا پورا حق ادا کرو اور یہ خیال رکھو کہ اس راہ میں عدل و انصاف بنیاد کار رہے اور صراط مستقیم سے ہٹ کبھی بھی افراط وتفریط کی راہ کو اختیار نہ کرو۔

④ قیاس واجتہاد یا آثار صحابہ سے استنباط پر مبنی گزشتہ توجیہات سے جدا مشہور محدث حاکم نے مستدرک میں خود حضرت عبداللہ

Marfat.com

عباس رضی اللہ عنہما سے ان آیات کی تفسیر نقل کی ہے اور محدثین نے اس روایت کو صحیح اور حسن تسلیم کیا ہے لہٰذا بلاشبہ اس کو مسطورۂ بالا توجیہات پر برتری اور تفوق حاصل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ایک مرتبہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں از راہ فخر عرض کیا: بارالہا! دن اور رات میں ایک ساعت بھی ایسی نہیں گزرتی کہ داؤد علیہ السلام یا آل داؤد میں سے کوئی شخص ایک لحہ کے لیے بھی تیری تسبیح وتہلیل میں مشغول نہ رہتا ہو۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے مقرب پیغمبر داؤد علیہ السلام کا یہ فخریہ انداز پسند نہ آیا۔ وحی آئی داؤد! یہ جو کچھ بھی ہے صرف ہماری اعانت اور ہمارے فضل وکرم کی وجہ سے ہے ورنہ تجھ میں اور تیری اولاد میں یہ قدرت کہاں کہ وہ اس نظم پر قائم رہ سکیں اور اب جبکہ تم نے یہ دعویٰ کیا ہے تو میں تم کو آزمائش میں ڈالوں گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا۔ خدایا! جب ایسا ہو تو پہلے سے مجھ کو اطلاع دے دی جائے لیکن آزمائش کے معاملہ میں حضرت داؤد علیہ السلام کی استدعاء قبول نہیں ہوئی اور حضرت داؤد علیہ السلام کو اس طرح فتنہ میں ڈال دیا گیا جو قرآن عزیز میں مذکور ہے"۔ [1]

یعنی حضرت داؤد علیہ السلام اس قضیہ کے فیصلہ دینے میں تسبیح وتحمید سے محروم ہو گئے اور حسب اتفاق آل داؤد میں سے بھی اس وقت کوئی عبادت الٰہی میں مصروف نہ تھا۔

اس تفسیر کا بھی حاصل یہی نکلتا ہے کہ بمصداق "حسنات الابرار سیئات المقربین" نہ یہ کوئی گناہ کا معاملہ تھا اور نہ معصیت کا بلکہ حضرت داؤد علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر کے شایان شان نہیں تھا اس لیے ان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے متنبہ کر دیا گیا۔

غرض قرآن عزیز کی ان آیات کی تفاسیر میں علماء محققین نے جو کچھ کہا ہے یا وہ قابل تسلیم ہے اور یا ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر حقیقی تفسیر ہے مگر یہودیوں کی خرافات اور ہفوات کا ان آیات سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

عمر مبارک:

مشہور محدث حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں ایک روایت نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عالم بالا میں جب حضرت آدم علیہ السلام کی صلب سے ان کی ذریت کو نکال کر ان کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے ایک خوبصورت چمکتی ہوئی پیشانی والے شخص کو دیکھ کر دریافت کیا، پروردگار یہ کون شخص ہے؟ جواب ملا تمہاری ذریت میں سے بہت بعد میں آنے والی ہستی داؤد ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا۔ اس کی عمر کیا مقرر کی گئی ہے؟ ارشاد ہوا کہ ساٹھ سال۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا کہ الٰہی میں اپنی عمر کے چالیس سال اس نوجوان کو بخشتا ہوں، مگر جب حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کا وقت آ پہنچا تو آدم علیہ السلام نے ملک الموت سے کہا کہ ابھی تو میری عمر کے چالیس سال باقی ہیں۔ فرشتہ موت نے کہا آپ بھول گئے آپ نے اس قدر حصہ عمر اپنے ایک بیٹے داؤد علیہ السلام کو بخش دیا ہے۔ [2]

---

[1] مستدرک ج ۲ ص ۴۳۳ [2] مستدرک جلد ۲ کتاب التاریخ

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر سو سال کی ہوئی اور تورات کے باب سلاطین اور تواریخ میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہن سالی میں انتقال فرمایا اور اسرائیلیوں پر چالیس سال حکومت کی۔

"اور داؤد بن ایشی نے سارے اسرائیلیوں پر سلطنت کی اور وہ عرصہ جس میں اس نے اسرائیل پر سلطنت کی چالیس برس کا تھا۔ اس نے حبرون میں سات برس اور یروشلم میں پینتیس برس سلطنت کی اور اس نے بڑھاپے میں خوب عمر رسیدہ ہو کر اور دولت و عزت سے آسودہ ہو کر وفات پائی۔" ❶

جعفر بن محمد کہتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ستر سال حکومت کی۔ ❷ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا انتقال اچانک سبت کے دن ہوا۔ وہ سبت کے روز مقررہ عبادت میں مشغول تھے اور پرندوں کی ٹکڑیاں پرے باندھے ہوئے ان پر سایہ فگن تھیں کہ اچانک اسی حالت میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مدفن:

تورات میں مذکور ہے:

"اور داؤد اپنے باپ دادا کے ساتھ سو گیا، اور "داؤد کے شہر" صیہون میں دفن ہوا۔" ❸

بصائر:

حضرت داؤد علیہ السلام کی مقدس زندگی کے حالات و واقعات نے ہمارے لیے جن بصیرتوں اور عبرتوں کو پیش کیا ہے وہ اگرچہ بہت وسیع دائرہ رکھتی ہیں تاہم چند اہم حقائق اور بیش بہا نتائج خصوصیت کے ساتھ جاذب توجہ ہیں۔

① جب خدائے تعالیٰ کسی ہستی کو اولوالعزم بناتا اور اس کی شخصیت کو خاص فضائل سے سرفراز کرنا چاہتا ہے تو اس کے فطری جوہروں کو شروع ہی سے چمکا دیتا ہے اور اس کو ناصیۂ قسمت ایک چمکتے ہوئے ستارے کی طرح روشن نظر آنے لگتی ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کو جبکہ پیغمبر اور اولوالعزم رسول بنانا تھا تو زندگی کے ابتدائی دور ہی میں جالوت جیسے جابر و قاہر بادشاہ کو ان کے ہاتھ سے قتل کرا کر ان کی ہمت و شجاعت اور ان کے عزم راسخ اور ثبات قدمی کے جوہر اس طرح نمایاں کر دیے کہ تمام بنی اسرائیل ان کو اپنا محبوب قائد اور مقبول رہنما تسلیم کرنے لگے۔

② بسا اوقات ہم ایک چیز کو معمولی سمجھ لیتے ہیں لیکن حالات و واقعات بعد میں ظاہر کرتے ہیں کہ وہ "بے بہا شے" ہے، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کے بچپن کے حالات میں اور مجاہدانہ حمایت حق، اعتصام باللہ کے ساتھ دعوت حق اور سرفرازی نبوت کے حالات کے درمیان جو فرق ہے وہ خود اس دعوے کی شہادت ہے۔

③ ہمیشہ "خلیفۃ اللہ" اور "طاغوتی بادشاہ" کے درمیان یہ فرق نظر آئے گا کہ اول الذکر میں ہمہ قسم کی سطوت و شوکت کے باوجود فروتنی، تواضع اور خدمت خلق نمایاں خدوخال کے ساتھ پائے جائیں گے اور ثانی الذکر میں کبر، انانیت، جبر اور قہرمانیت کا غلبہ ہوگا اور وہ مخلوق خدا کو اپنی راحت اور عیش کا آلہ کار سمجھے گا۔

---

❶ تواریخ باب ۲۹ آیات ۲۶۔۲۸ ❷ مستدرک جلد ۲ کتاب التاریخ ❸ سلاطین (۱) باب ۲ آیات ۱۱

Marfat.com

④ قانون الٰہی ہے کہ جو ہستی عزت اور عروج پر پہنچنے کے بعد جس قدر خدا کا شکر اور اس کے فضل و کرم کا اعتراف کرتی ہے اسی قدر اس کو بیش از بیش انعام و اکرام سے اور زیادہ نوازا جاتا ہے، حضرت داؤد علیہ السلام کی پوری زندگی اس کی شاہد عدل ہے۔

⑤ مذہب اور دین اگرچہ روحانیت سے زیادہ تعلق رکھتا ہے لیکن مادی طاقت (خلافت) اس کی بڑی پشت پناہ ہے یعنی دین و ملت، دینی و دنیوی اصلاح حال کا کفیل ہے اور خلافت و طاقت اس کے بتائے ہوئے نظام عدل کی محافظ، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ قول بہت مشہور ہے:

ان اللہ لیزع بالسلطان ما لا یزع بالقرآن۔ [1]

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ صاحب طاقت (خلیفہ) کے ذریعہ مدافعت کا وہ کام لیتا ہے جو قرآن کریم کے ذریعہ انجام نہیں پاتا۔"

⑥ اللہ تعالیٰ نے عطاء ملک و حکومت کے لیے قرآن عزیز کی مختلف آیات میں جو ارشاد فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ سب سے پہلے انسان کو یہ یقین پیدا کرنا چاہیے کہ ملک اور حکومت کی عطا اور اس کا سلب صرف خدائے تعالیٰ کے ید قدرت میں ہے چنانچہ دنیا کے بڑے بڑے شہنشاہوں اور باجبروت سلاطین کی تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے کہ:

﴿اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ (آل عمران: ۲۶)

"خدایا! شاہی اور جہانداری کے مالک، تو جسے چاہے ملک بخش دے جس سے چاہے ملک لے لے، جسے چاہے عزت دے دے جسے چاہے ذلیل کر دے، تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے۔ بے شبہ تو ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔"

لیکن اس نے اس بخشش و عطاء اور سلب و نزع کا ایک قانون مقرر کر دیا ہے جس کو سنت اللہ سے تعبیر کرنا مناسب ہے۔

قانون یہ ہے کہ اقوام و امم کو حکومت و سلطنت دو طرح حاصل ہوتی ہے، ایک "وراثت الٰہی" کی معرفت اور دوسری "دنیوی اسباب و وسائل" کی معرفت پہلی صورت میں کسی قوم کو جب حکومت عطا ہوتی ہے کہ اس کے عقائد و اعمال میں پوری طرح وراثت الٰہی کارفرما ہو یعنی خدائے تعالیٰ کے ساتھ اس کا رشتہ عقیدت بھی صحیح اور استوار ہو اور وہ انفرادی و اجتماعی اعمال میں بھی صلاح و خیر کے اس درجہ پر فائز ہو کہ قرآن عزیز کی اصطلاح میں اس کو "صالحین" میں شمار کیا جا سکے۔

یہ قوم بلاشبہ اس کی مستحق ہے کہ وہ خدا کے اس انعام سے بہرہ ور ہو جس کا عنوان "خلافت الٰہیہ" ہے، اور جو درحقیقت دنیا میں خدائے تعالیٰ کی نیابت کا مظہر اور انبیاء و رسل کی پاک وراثت ہے۔ خدا کا وعدہ ہے کہ جو قوم بھی عقائد و اعمال میں انبیاء و رسل کی وراثت سے فیض یاب ہے وہ وراثت ارضی کی بھی مالک ہوگی اور اگر دنیوی اسباب و وسائل کے پہاڑ بھی اس کے حصول کے درمیان حائل ہوں گے تو ان سب کو زیر و زبر کر کے خدائے تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۱۰۵)

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۱۰

Marfat.com

"اور ہم نے بلاشبہ زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا کہ خدا کی زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔"

اور آیت

﴿ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۬ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ ﴾ (الاعراف: ۱۲۸)

"بے شک زمین اللہ کی ہی ملکیت ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وارث بنا دیتا ہے۔"

میں اس کی مشیت کا یہی فیصلہ ہے کہ زمین کی وراثت ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو اس کے "صالح بندے" ہیں اور اگر کسی قوم یا امت میں یہ صلاحیت موجود نہیں ہے تو خواہ وہ مدعی اسلام ہی کیوں نہ ہو تو اس کی وراثت ارض نصیب نہیں ہو سکتی اور "خلافت الٰہیہ" اس کا حق نہیں بن سکتی ہے اور نہ اس قوم کی عظمت و عزت کے لیے خدا کے پاس کوئی وعدہ ہے، البتہ خدا کی مشیت اپنی حکمت و مصلحت کے پیش نظر کائنات کے نظم و انصرام کی خاطر جس کو چاہتی ہے حکومت عطاء کر دیتی ہے، اور جس سے چاہتی ہے سلب کر لیتی ہے اور اس عطاء و سلب میں اس کا قانون قدرت اسی طرح کارفرما رہتا ہے جس طرح اسباب کو مسببات کے ساتھ پیوند لگانے میں کارفرما ہے اور اس عطاء و نزع کے لیے اس قدر مختلف اور بیشمار مصالح ہوتے ہیں کہ انسان ان کی حقیقت تک رسائی سے عاجز ہے اور اس سلسلہ کی سب سے بھیانک اور بدبخت صورت یہ ہے کہ مسلمان "غلام و محکوم" ہوں اور کفر و شرک کی حکومت ان پر "ہیئت حاکمہ اور صاحب اقتدار ہو" گویا یہ خدا کا ایسا عقاب و عتاب ہے جو مسلمانوں کے لیے بداعمالیوں اور صلاح و خیر کی استعداد کے فقدان کی وجہ سے منصۂ شہود پر آتا ہے اور اس حالت میں مقام عبرت یہ ہوتا ہے کہ صاحب تاج و تخت کو اس لیے حکومت نہیں دی جاتی کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہے بلکہ اس لیے عطاء کی جاتی ہے کہ زمین کی ملکیت کے حقیقی وارثوں نے اپنی بدکرداریوں کی وجہ سے استحقاق وراثت کو ہاتھ سے کھو دیا اور اب کائنات کے مصالح عامہ کے پیش نظر حکومت کے لیے نہ مسلم کی شرط ہے نہ کافر و مشرک کی۔

﴿ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ ﴾ (البقرہ: ۲۴۷)

"اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنا ملک بخش دیتا ہے۔"

اور اگر مسلمان چشم عبرت وا کریں اور اپنی فاسد زندگی میں انقلاب برپا کر کے "صالحین" کا طغرائے امتیاز حاصل کر لیں تو خدا کا وعدہ بھی ان کو بشارت دینے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ ﴾

(النور: ۵۵)

"وعدہ کر لیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان والے ہیں اور کیے ہیں انہوں نے نیک کام البتہ بعد کو حاکم کر دے گا ان کو ملک میں، جیسا حاکم کیا تھا ان کے اگلوں کو اور جما دے گا ان کے لیے دین جو پسند کر لیا ان کے واسطے اور دے گا ان کو ان کے خون کے بدلے امن۔"

Marfat.com

حضرت سلیمان علیہ السلام

○ نسب ○ قرآن عزیز اور ذکر سلیمان علیہ السلام ○ بچپن ○ وراثت داؤد ○ نبوت ○ خصائص سلیمانؑ ○ منطق الطیر ○ تسخیر ریاح ○ تسخیر جن وحیوانات ○ بیت المقدس کی تعمیر ○ تانبے کے چشمے ○ حضرت سلیمان علیہ السلام اور جہاد کے گھوڑوں کا واقعہ ○ محاکمہ ○ حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کا واقعہ ○ محاکمہ ○ لشکر سلیمان علیہ السلام اور وادی نملہ ○ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سباء ○ چند قابل تحقیق مسائل ○ سباء کی تحقیق ○ ملکہ سباء کا نام ○ ہدہد ○ ملکہ سباء کا تخت ○ عندہ علم من الکتاب کی شخصیت ○ توراۃ میں ملکہ سباء کا ذکر ○ ملکہ سبا کا قبول اسلام ○ ملکہ سبا کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کا نکاح ○ اسرائیلیات ○ حضرت سلیمان علیہ السلام کے مکتوب کا اعجاز ○ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کا معاملہ ○ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات ○ بصائر

نسب:

حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں اس لیے ان کا نسب بھی یہودا کے واسطہ سے حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

ان کی والدہ ماجدہ کا نام معلوم نہیں ہوسکا، تورات نے بنت سبع نام بتایا ہے لیکن اس طرح کہ وہ اول اوریاہ کی بیوی تھی اور پھر داؤد علیہ السلام کی بیوی بنی اور حضرت سلیمان علیہ السلام اس سے پیدا ہوئے۔ مگر اس قصہ کی لغویت گزشتہ صفحات میں واضح ہو چکی ہے اس لیے یہ نام بھی تاریخی حیثیت سے صحیح نہیں ہے۔

ابن ماجہ کی ایک حدیث میں صرف اس قدر منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سلیمان بن داؤد علیہ السلام کی والدہ نے ایک دفعہ سلیمان علیہ السلام کو یہ نصیحت فرمائی کہ بیٹا رات بھر نہ سوتے رہا کرو اس لیے کہ رات کے اکثر حصہ کو نیند میں گزارنا انسان کو قیامت کے دن اعمال خیر سے محتاج بنا دیتا ہے۔

قرآن عزیز نے بھی صرف اسی قدر بتایا ہے کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے واسطہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں:

﴿وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَیْنَا ۚ وَ نُوْحًا هَدَیْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ﴾ (الانعام: ۸۴)

"اور ہم نے اس (ابراہیم) کو بخشے اسحاق و یعقوب، ہم نے ہر ایک کو ہدایت دی اور نوح کو ہدایت دی اس (ابراہیم) سے

Marfat.com

پہلے اور اس ابراہیم کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان کو ہدایت دی۔"

﴿وَ وَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ﴾ (ص: ۳۰)

"اور ہم نے داؤد کو سلیمان دیا۔"

قرآن عزیز اور ذکر سلیمان علیہ السلام:

قرآن عزیز میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر سولہ جگہ آیا ہے ان میں سے چند جگہ کچھ تفصیل کے ساتھ ذکر ہے اور اکثر جگہ مختصر طور پر ان انعامات اور فضل و کرم کا تذکرہ ہے جو خدا کی جانب سے ان پر اور ان کے والد حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوتے رہے۔ ذیل کا نقشہ اس سلسلہ کے مطالعہ کے لیے مفید ہے:

نام سورہ	آیت	شمار	نام سورہ	آیت	شمار
البقرہ	۱۰۲	۱	نمل	۱۵ تا ۱۸۔ ۲۰، ۳۶، ۴۴	۷
نساء	۱۶۳	۱	سباء	۱۲	۱
انعام	۸۵	۱	صٓ	۳۰۔ ۳۴	۲
الانبیاء	۷۸، ۷۹، ۸۱	۳			۱۶

بچپن:

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام میں ذکاوت اور فصل مقدمات میں اصابت رائے کا کمال فطرت ہی سے ودیعت کر دیا تھا چنانچہ ان کے بچپن کا وہ واقعہ اس کے لیے روشن برہان ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعات کے ضمن میں قرآن عزیز سے نقل کیا جا چکا ہے۔ [1]

حضرت داؤد علیہ السلام نے ان کے اس جوہر کو پہچان لیا تھا اس لیے بچپن ہی سے ان کو امور مملکت میں شریک کار رکھتے تھے۔ خصوصاً فصل مقدمات میں ان سے ضرور مشورہ فرما لیا کرتے تھے۔

وراثت داؤد علیہ السلام:

مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سن رشد کو پہنچ چکے تھے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا انتقال ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت اور حکومت دونوں میں داؤد علیہ السلام کا جانشین بنا دیا اور اس طرح فیضان نبوت کے ساتھ ساتھ اسرائیلی حکومت بھی ان کے قبضہ میں آ گئی اور قرآن عزیز نے اسی جانشینی کو وراثت داؤد سے تعبیر کیا ہے:

﴿وَ وَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ﴾ (النمل: ۱۶)

"اور سلیمان داؤد کا وارث ہوا۔"

---

[1] آیت ﴿وَ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ﴾ الآیۃ کی جانب اشارہ ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہاں وراثت سے نبوت و سلطنت کی وراثت مراد ہے، مالی وراثت مراد نہیں ہے ورنہ حضرت داؤد علیہ السلام کی اور بھی بہت سی اولاد تھی وہ کیوں محروم رہتی نیز صحاح ستہ میں متعدد جلیل القدر صحابہ سے یہ روایت منقول ہے:

((ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال نحن معشر الانبياء لا نُورِثُ ما تركنا فهو صدقة)). (الحديث)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہم جماعت انبیاء کی وراثت مالی کا سلسلہ نہیں چلتا اور ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہو جاتا ہے۔"

یہ روایت صراحت کرتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی وفات کے بعد ان کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا بلکہ وہ مساکین اور فقراء کا حق اور خدا کے نام پر صدقہ ہے۔

دراصل نبی کی فطرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ مال جیسی حقیر شے پر ان کی وراثت کا انتساب ہو اس لیے کہ جن ہستیوں کا مقصد حیات تبلیغ و ارشاد اور راہ خدا کی عبادت ہو وہ کب یہ گوارا کر سکتی ہیں کہ علوم و فیوض نبوت کے علاوہ ایک دینی شے ان کی وراثت قرار پائے بلکہ بربنائے بشریت بقاءِ حیات کے لیے وہ جو کچھ مال کی صورت میں رکھتے تھے پس مردن صرف خدا کی ملکیت ہو جانا چاہیے جو فقراء اور مساکین ہی کا حصہ ہو سکتا ہے نہ کہ اس اولوالعزم ہستی کی نسل و خاندان کا۔

نبوت:

جن انبیاء و رسل کی صحیح تاریخ منضبط ہے اس سے اور قرآن عزیز کی بعض آیات کی صراحت سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس ہستی کو شرف نبوت سے سرفراز کرتا ہے اس کو یہ منصب جلیل سن رشد کے بعد عطاء فرماتا ہے تاکہ وہ دنیوی اسباب کے لحاظ سے بھی عمر طبعی کا وہ حصہ طے کر لے جس میں عقل و تجربہ پختگی اختیار کر لیتے ہیں اور اس حد پر پہنچ کر استعداد کے مطابق انسانوں کے قوائے فکری و عملی میں استواری اور استقامت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ یہ سنت اللہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حق میں بھی کارفرما رہی اور سن رشد کے بعد ان کو حکومت و خلافت کے ساتھ ساتھ "منصب نبوت" بھی منجانب اللہ عطا ہوا۔

﴿ اِنَّاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ کَمَاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی نُوۡحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ ۚ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطِ وَ عِیۡسٰی وَ اَیُّوۡبَ وَ یُوۡنُسَ وَ ہٰرُوۡنَ وَ سُلَیۡمٰنَ ۚ ﴾ (النساء: ۱۶۳)

"بیشک ہم نے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تیری طرف وحی بھیجی جس طرح ہم نے نوح کی جانب وحی بھیجی اور اس کے بعد دوسرے پیغمبروں کی طرف وحی بھیجی اور ابراہیم کی جانب اسماعیل کی اسحاق کی یعقوب کی اور اس کی اولاد کی جانب اور عیسیٰ کی اور ایوب کی اور یونس کی اور ہارون کی اور سلیمان کی جانب وحی بھیجی۔"

﴿ وَ کُلًّا اٰتَیۡنَا حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا ۫ ﴾ (الانبیاء: ۷۹)

"اور (داؤد و سلیمان) ہر ایک کو ہم نے حکومت دی اور علم (نبوت) دیا۔"

﴿ وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ عِلۡمًا ۚ ﴾ (النمل: ۱۵)

"اور بیشک ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم (نبوت کا علم) دیا۔"

خصائص سلیمان علیہ السلام:

پھر حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی بعض خصوصیات اور امتیازات سے نوازا اور اپنی نعمتوں میں سے بعض ایسی نعمتیں عطاء فرمائیں جوان کی زندگی مبارک کا طغرائے امتیاز بنیں۔

① منطق الطیر:

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام دونوں کو یہ خصوصیت عطاء فرمائی تھی کہ وہ چرند و پرند کی بولیاں سمجھ لیتے تھے اور دونوں بزرگوں کے لیے ان کی آوازیں ایک ناطق انسان کی گفتگو کی طرح تھیں۔ قرآن عزیز نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس شرف کا اس طرح ذکر کیا ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَ قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی كَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَ وَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ وَ قَالَ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ وَ اُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِیْنُ ۝﴾ (النمل: ۱۵-۱۶)

”اور بے شک ہم نے داؤد اور سلیمان (علیہما السلام) کو ”علم“ دیا، اور ان دونوں نے کہا: حمد اللہ کے لیے ہی زیبا ہے جس نے اپنے بہت سے مومن بندوں پر ہم کو فضیلت عطا فرمائی اور سلیمان داؤد کا وارث ہوا اور اس نے کہا: اے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولیوں کا علم دیا گیا ہے اور ہم کو ہر چیز بخشی گئی ہے، بیشک یہ (خدا کا) کھلا ہوا فضل ہے۔“

اس مقام پر ”منطق الطیر“ کا جس اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اس کو پیش نظر رکھ کر یہ بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے ”کہ وہ اپنے قیاس و تخمین کے ذریعہ ان کی مختلف قسم کی آوازوں سے صرف ان کے مقصد اور مراد کو سمجھ لیتے تھے، اور اس سے زیادہ کچھ نہ تھا“ اس لیے کہ قیاس و تخمین کا یہ درجہ تو بکثرت لوگوں کو حاصل ہے اور وہ پالتو جانوروں کی بھوک پیاس کے وقت کی آواز، خوشی اور مسرت کی آواز، مالک کو قریب دیکھ کر اظہار وفاداری کی آواز اور دشمن کو دیکھ کر خاص طرح سے پکارنے کی آواز کے درمیان بخوبی فرق سمجھتے اور ان کے ان مقاصد کو بآسانی ادراک کر لیتے ہیں۔ نیز ”منطق الطیر“ سے وہ علم بھی مراد نہیں ہو سکتا، جو جدید علمی دور میں ظن و تخمین کی راہ سے بعض جانوروں کی گفتگو کے سلسلہ میں ایجاد ہوا ہے اور جوزولوجی (Zoology) کا ایک شعبہ شمار کیا جاتا ہے اس لیے کہ یہ محض انکل کا تیر ہے جو مسطورۂ بالا تجربہ کے بعد کمان علم سے نکلا ہے اور اس کو علم بمرتبہ یقین کہنا خود واضعین علم الحیوانات کے نزدیک بھی صحیح نہیں ہے علاوہ ازیں وہ ایک اکتسابی فن ہے جو ہر شخص کو تھوڑی سی محنت کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے اس علم کے لیے قرآن عزیز کو اس قدر اہم پیرایہ بیان کی ضرورت نہیں تھی۔

قرآن عزیز نے جس انداز میں اس کا ذکر کیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے شکریہ کے انداز بیان کو نقل کیا ہے اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے لیے یہ ایسی عظیم الشان نعمت تھی جس کو نشان (معجزہ) کہا جاتا ہے اور وہ بلاشبہ پرندوں کی بولیاں انسان ناطق کی گفتگو کی طرح سمجھتے تھے اور یقیناً ان کا یہ علم اسباب دنیوی سے بالاتر خاص قوانین قدرت

فیضان کا نتیجہ تھا۔

لہٰذا عقل اس بارہ میں صرف یہیں تک جا سکتی ہے کہ اس کے نزدیک یہ محال بات نہیں ہے کیونکہ لغت اور عقل دونوں کے لحاظ سے "نطق" کے لیے صرف صوت کا ہونا کافی ہے اور اس کے لیے انسانوں کی طرح کی گویائی ضروری نہیں ہے اور چرند و پرند کی بولیوں میں صوت اور صوت کا نشیب و فراز دونوں موجود ہیں پس منطق الطیر ایسی بخشش اور موہبت تھی جس کو خدا کا نشان کہنا چاہیے اور جو ان ہی جیسی پاک ہستیوں کے لیے مخصوص ہے، بیضاوی کے اور ہمارے درمیان "منطق الطیر" کی تفسیر سے متعلق اس پر تو اتفاق ہے کہ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام حیوانات کی بولیاں جس طریقے سے یقینی طور سمجھ لیا کرتے تھے وہ عام علمی تدوین سے جدا اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو بطور نشان کے عطاء ہوا تھا، البتہ اس کی تفصیل میں یہ فرق ہے کہ قاضی بیضاوی کے نزدیک حیوانات کی بولیاں مختلف کیفیات کی صورت میں تخیل کی مدد سے سمجھی جاتی ہیں اور اس کا یقینی درجہ کسب کے ذریعہ سے نہیں بلکہ موہبت الٰہی سے حاصل ہوتا ہے جو حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کو حاصل تھا اور ہمارے نزدیک دونوں اولوالعزم پیغمبران کی بولیاں اس طرح سنتے تھے جس طرح انسان کی گفتگو خواہ اس لیے کہ یہ صرف معجزہ تھا جو ان کے ہاتھ پر دکھلایا گیا اور عام طور پر ان کی بولیاں محض مختلف کیفیات صوت سے پہچانی جاتی ہیں اور خواہ یہ ہو کہ حقیقتاً ان کی صوت بھی نطق کا ایسا درجہ رکھتی ہے جس سے وہ صاف صاف ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھاتے اور سمجھتے ہیں لیکن وہ انسانی نطق سے بہت کمزور درجہ کا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام اور ہدہد کے مکالمہ کو جس انداز میں قرآن نے بیان کیا ہے وہ میری توجیہ کی تائید کرتا ہے۔

② تسخیر ریاح:

حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت حقہ کے خصوصی امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے "ہوا" کو ان کے حق میں مسخر کر دیا تھا اور وہ ان کے زیر فرمان کر دی گئی تھی، چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام جب چاہتے تو صبح کو ایک مہینہ کی مسافت اور شام کو ایک مہینہ کی مسافت کی مقدار سفر کر لیتے تھے۔

قرآن عزیز نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس شرف کے متعلق تین باتیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ "ہوا" کو سلیمان علیہ السلام کے حق میں مسخر کر دیا گیا۔ دوسری یہ کہ "ہوا" ان کے حکم کے اس طرح تابع تھی کہ شدید اور تیز و تند ہونے کے باوجود ان کے حکم سے "نرم" اور آہستہ روی کے باعث "راحت رساں" ہو جاتی تھی۔ تیسری بات یہ کہ نرم رفتاری کے باوجود اس کی تیز روی کا یہ عالم تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا صبح و شام کا جدا جدا سفر ایک شہسوار کی مسلسل ایک ماہ کی رفتار مسافت کے مساوی ہوتا تھا، گویا تخت سلیمان علیہ السلام انجن اور مشین جیسے اسباب ظاہر سے بالاتر صرف خدائے تعالیٰ کے حکم سے ایک بہت تیز رفتار ہوائی جہاز سے بھی زیادہ تیز مگر سبک روی کے ساتھ ہوا کے کاندھے پر اڑا چلا جاتا تھا۔

ایک فطرت پرست انسان کی نگاہ میں یہ بات بہت کھٹکتی ہے۔ مگر ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جبکہ عقل و فکر کے نزدیک یہ مسلمات میں سے ہے کہ انسان کے قوائے فکری و عملی کے درمیان اس درجہ تفاوت ہے کہ ایک شخص جس شے کو اپنی عقل سے کرتا اور اس کا کرنا آسان سمجھتا ہے دوسرا شخص اسی شے کو ناممکن اور محال یقین کرتا ہے تو اسی اصول پر ان کو یہ تسلیم کرنے میں کیوں انکار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح عام قوانین قدرت کے پیش نظر کائنات کی اشیاء کو اسباب کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اسی طرح اس کے کچھ خاص

Marfat.com

قوانین قدرت اور نوامیس فطرت بھی ہیں جو ایسے امور کے لیے مخصوص ہیں جیسا کہ امر زیر بحث ہے اور نفوس قدسیہ (انبیاء علیہم السلام) کو ان کا اسی طرح یقینی علم حاصل ہوتا ہے جس طرح اسباب کے ذریعہ مسببات کے وجود کا علم عام عقلاء کو حاصل ہے اور موجودہ دنیوی علوم کی دسترس اس علم تک نہیں ہے لہٰذا جب ایسے امور کے وقوع کی اطلاع علم الیقین (وحی الٰہی) کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے تو محض ظن وتخمین اور عقل کے استبعاد کی وجہ سے ایک حقیقت ثابتہ کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے اور اگر ہم کو ایک شے کا علم نہیں ہے تو یہ کیسے لازم آ جاتا ہے کہ وہ شے حقیقتاً بھی موجود نہیں ہے؟

لہٰذا جادۂ مستقیم یہی ہے کہ واقعہ تسخیر ریاح اور مسافت رفتار کو بغیر کسی تاویل کے صحیح تسلیم کیا جائے اس مقام پر تخت سلیمان اور حضرت سلیمان کے صبح وشام سفر کے متعلق جو تفصیلات سیرت کی کتابوں اور تفسیروں میں منقول ہیں وہ سب اسرائیلیات کا ذخیرہ ہیں اور لاطائل تفصیلات ہیں اور تعجب ہے کہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ جیسے محقق سے کہ اس جگہ وہ بھی ان روایات کو اس طرح نقل فرما رہے ہیں گویا ان کے نزدیک وہ مسلمات میں سے ہیں حالانکہ تاریخی اعتبار سے ان پر بہت سے صحیح اشکالات وارد ہوتے ہیں، قرآن عزیز نے تو اس کے متعلق صرف اس قدر بیان کیا ہے:

﴿وَ لِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ عَاصِفَةً تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ؕ وَ كُنَّا بِكُلِّ شَیْءٍ عٰلِمِیْنَ ۝۸۱﴾ (الانبیاء: ۸۱)

"اور مسخر کر دیا سلیمان (علیہ السلام) کے لیے تیز وتند ہوا کو کہ اس کے حکم سے اس زمین پر چلتی تھی جس کو ہم نے برکت دی تھی اور ہم ہر شے کے جاننے والے ہیں۔"

﴿وَ لِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ﴾ (سبا: ۱۲)

"اور سلیمان کے لیے مسخر کر دیا ہوا کو کہ صبح کو ایک مہینہ کی مسافت (طے کرتی) اور شام کو ایک مہینہ کی مسافت۔"

﴿فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّیْحَ تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَیْثُ اَصَابَ ۝۳۶﴾ (ص: ۳۶)

"اور مسخر کر دیا ہم نے اس (سلیمان) کے لیے ہوا کو کہ چلتی ہے وہ اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ جہاں وہ پہنچنا چاہے۔"

تسخیر جن وحیوانات:

حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا ایک بڑا امتیاز جو کائنات میں کسی کو نصیب نہیں ہوا یہ تھا کہ ان کے زیر نگیں صرف انسان ہی نہیں تھے بلکہ جن اور حیوانات بھی تابع فرمان تھے اور یہ سب حضرت سلیمان علیہ السلام کے حاکمانہ اقتدار کے تابع اور زیر حکم تھے۔

بعض ملاحدہ نے "انکار معجزہ" اور "انکار جن" کے شوق میں ان جیسے دیگر مقامات کی طرح یہاں بھی عجیب مضحکہ خیز باتیں کہی ہیں، کہتے ہیں کہ جن سے مراد ایک ایسی قوم ہے جو اس زمانہ میں بہت قوی ہیکل اور دیو پیکر تھی اور سلیمان کے علاوہ کسی کے قابو میں نہ آتی تھی اور تسخیر حیوانات کے متعلق کہتے ہیں کہ قرآن میں اس سلسلہ کا ذکر صرف ہدہد سے متعلق ہے اور یہاں ہدہد پرند مراد نہیں ہے، بلکہ ایک شخص کا نام ہدہد تھا جو پانی کی تفتیش پر مقرر تھا اور زمانہ طویل سے لوگوں میں رسم چلی آتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کے نام ان

Marfat.com

حیوانات کے نام پر رکھتے تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے چنانچہ آج اس کو ایک مستقل علم کی حیثیت دے دی گئی جو ٹوٹیزم (Tootism) کے نام سے موسوم ہے۔

اس قسم کی رکیک تاویل کرنے والے یا تو جذبہ الحاد میں قصداً تحریف کے لیے جرأت بیجا کے مرتکب ہوتے ہیں اور یا قرآن عزیز کی تعلیم سے ناآشنا ہونے کے باوجود دعویٰ بے دلیل پر اصرار کرتے ہیں۔

قرآن عزیز نے "جن" کے متعلق جگہ جگہ بصراحت یہ اعلان کیا ہے کہ وہ بھی انسانوں سے جدا خدا کی ایک مخلوق ہے، چنانچہ ہم تفصیل کے ساتھ قصص القرآن جلد اوّل میں اس پر بحث کر آئے ہیں اور یہاں صرف ایک آیت پر اکتفا کرتے ہیں جو اس بارہ میں قول فیصل کا حکم رکھتی ہے۔

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴾ (الذاریات: ۵۶)

"اور ہم نے جن اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ خدا کے عبادت گذار ثابت ہوں۔"

اس آیت میں جن کو انسان سے جدا مخلوق ظاہر کر کے دونوں کی تخلیق کی حکمت بیان کی گئی ہے، لہٰذا اس آیت کو پیش نظر رکھنے کے بعد یہ کہنا کہ "جن" انسانوں ہی میں سے ایک قوی ہیکل قوم کا نام ہے جہالت ہے، علم نہیں ہے۔

اسی طرح جبکہ ہدہد کے واقعہ میں قرآن عزیز نے صاف صاف اس کو پرند کہا ہے تو کسی کو کیا حق ہے کہ اس کے خلاف لچر تاویل کی پناہ لے۔ قرآن عزیز میں ہے:

﴿وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ ۖ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ ﴾ (النمل: ۲۰)

"اور سلیمان (علیہ السلام) نے پرندوں کا جائزہ لیا تو کہا یہ کیا بات ہے کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھتا، کیا وہ غائب ہے۔"

غرض سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ بے مثل شرف عطاء فرمایا کہ ان کی حکومت انسانوں کے علاوہ جن، حیوانات اور ہوا پر بھی تھی اور یہ سب بحکم خدا ان کے حکم کے تابع اور مطیع تھے اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک مرتبہ درگاہِ الٰہی میں یہ دعاء کی:

﴿رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِنْ بَعْدِي ۖ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ﴾ (ص: ۳۵)

"اے پروردگار مجھ کو بخش دے اور میرے لیے ایسی حکومت عطاء کر جو میرے بعد کسی کے لیے بھی میسر نہ ہو، بے شک تو بہت دینے والا ہے۔"

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاء کو قبول فرمایا اور ایک ایسی عجیب و غریب حکومت عطاء فرمائی کہ نہ ان سے پہلے کسی کو نصیب ہوئی اور نہ ان کے بعد کسی کو میسر آئے گی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ارشاد فرمایا: گزشتہ شب ایک سرکش جن نے اچانک یہ کوشش کی کہ میری نماز میں خلل ڈالے مگر خدائے تعالیٰ نے مجھ کو اس پر قابو دے دیا اور میں نے اس کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد میں نے

Marfat.com

ارادہ کیا کہ اس کو مسجد کے ستون سے باندھ دوں تاکہ تم سب دن میں اس کو دیکھ سکو مگر اس وقت مجھ کو اپنے بھائی سلیمان علیہ السلام کی یہ دعاء یاد آ گئی کہ انہوں نے خدائے تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا:

﴿رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝﴾ (ص: ۳۵)

یہ یاد آتے ہی میں نے اس کو ذلیل کر کے چھوڑ دیا۔ ✿ نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد ((فذکرت دعوة اخی سلیمٰن)) کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ خدائے تعالیٰ نے مجھ میں کل انبیاء ورسل کے خصائص وامتیازات جمع کر دیے ہیں اور اس لیے تسخیر قوم جن پر بھی مجھ کو قدرت حاصل ہے لیکن جبکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس اختصاص کو اپنا طغرائے امتیاز قرار دیا ہے تو میں نے اس سلسلہ کا مظاہرہ مناسب نہیں سمجھا۔

بیت المقدس کی تعمیر:

حق تعالیٰ نے "جن" کو ایسی مخلوق بنایا ہے جو مشکل سے مشکل اور سخت سے سخت کام انجام دے سکتی ہے۔ اس لیے حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ ارادہ فرمایا کہ مسجد (ہیکل) کے چہار جانب ایک عظیم الشان شہر آباد کیا جائے، اور مسجد کی تعمیر بھی از سرنو کی جائے، ان کی خواہش یہ تھی کہ مسجد اور شہر کو بیش قیمت پتھروں سے بنوائیں اور اس کے لیے بعید سے بعید اطراف سے حسین اور بڑے بڑے پتھر منگوائیں۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ کے رسل ورسائل کے محدود اور مختصر وسائل سلیمان علیہ السلام کی خواہش کی تکمیل کے لیے کافی نہیں تھے اور یہ کام صرف "جن" ہی انجام دے سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے "جن" ہی سے یہ خدمت لی، چنانچہ وہ دور دور سے خوبصورت اور بڑے بڑے پتھر جمع کر کے لاتے اور بیت المقدس کی تعمیر کا کام انجام دیتے تھے۔

عام طور سے یہ مشہور ہے کہ مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کی تعمیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں ہوئی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ بخاری اور مسلم کی صحیح مرفوع حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا، یارسول اللہ ﷺ دنیا میں سب سے پہلی مسجد کون سی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا مسجد حرام، ابوذر رضی اللہ عنہ نے پھر دریافت کیا۔ اس کے بعد کون سی مسجد عالم وجود میں آئی آپ ﷺ نے فرمایا مسجد اقصیٰ۔ ابوذر رضی اللہ عنہ نے تیسری مرتبہ سوال کیا کہ ان دونوں کے درمیانی مدت کس قدر ہے، تو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا، دونوں کے درمیان چالیس سال کی مدت ہے۔ ✿ حالانکہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بانی مسجد حرام کے درمیان ایک ہزار سال سے بھی زیادہ مدت کا فاصلہ ہے اس لیے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مسجد حرام کی بنیاد رکھی اور وہ مکہ کی آبادی کا باعث بنی اسی طرح حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السلام نے مسجد بیت المقدس کی بنیاد ڈالی اور اس کی وجہ سے بیت المقدس کی آبادی وجود میں آئی پھر عرصہ دراز کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے مسجد اور شہر کی تعمیر کی تجدید کی گئی اور جنوں کی تسخیر کی وجہ سے بے نظیر اور شاندار تعمیر عالم وجود میں آئی جو آج تک لوگوں کے لیے باعث حیرت ہے کہ ایسے دیو پیکر پتھر کہاں سے لائے گئے، کس طرح لائے گئے اور جرثقیل کے وہ کون سے آلات تھے جن کے ذریعہ ان کو ایسی بلندیوں پر پہنچا کر باہم اتصال پیدا کیا گیا۔

✿ بخاری کتاب الانبیاء وفتح الباری ج ۶ ص ۳۵۶ ✿ بخاری کتاب الانبیاء

Marfat.com

قوم جن نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے بیت المقدس کے علاوہ اور بھی تعمیرات کیں اور بعض ایسی چیزیں بنائیں جو اس زمانہ کے لحاظ سے عجیب وغریب سمجھی جاتی تھیں۔ چنانچہ قرآن عزیز میں ہے:

﴿وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴾ (الانبیاء: ۸۲)

"وہ شیطانوں (سرکش جنوں) میں سے ہم نے مسخر کر دیے وہ جو اس (سلیمان) کے لیے سمندروں میں غوطے مارتے (یعنی بیش قیمت بحری اشیاء نکالتے) اور اس کے علاوہ اور بہت سے کام انجام دیتے اور ہم ان کے لیے نگران اور نگہبان تھے۔"

﴿وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۭ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَاۗءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ۭ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝﴾ (سبا: ۱۲۔۱۳)

"اور جنوں میں سے وہ تھے جو اس کے سامنے خدمت انجام دیتے تھے اس کے پروردگار کے حکم سے اور جو کوئی ان میں سے ہمارے حکم کے خلاف کجروی کرے ہم اس کو دوزخ کا عذاب چکھائیں گے وہ اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا تھا قلعوں کی تعمیر، ہتھیار اور تصاویر اور بڑے بڑے لگن جو حوضوں کی مانند تھے اور بڑی بڑی دیگیں جو اپنی بڑائی کی وجہ سے ایک جگہ جمی رہیں اے آل داؤد! شکر گزاری کے کام کرو اور میرے بندوں میں سے بہت کم شکر گزار ہیں۔"

﴿وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝﴾ (النمل: ۱۷)

"اور اکٹھے کیے گئے سلیمان کے لیے اس کے لشکر جنوں میں سے انسانوں میں سے جانوروں میں سے اور وہ درجہ بدرجہ کھڑے کیے جاتے ہیں۔"

﴿وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّاۗءٍ وَّغَوَّاصٍ ۝ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۝ هٰذَا عَطَاۗؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ (ص: ۳۷۔۳۹)

"اور مسخر کر دیے سلیمان کے لیے شیطان (سرکش جن) ہر قسم کے کام کرنے والے، عمارت بنانے والے، دریا میں غوطہ لگانے والے اور وہ (سرکش سے سرکش) جو جکڑے ہوئے ہیں زنجیروں میں۔ یہ ہماری بخشش وعطاء ہے، چاہے اس کو بخش دو یا روکے رکھو تم سے اس کا کوئی مؤاخذہ نہیں۔"

حضرت شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر ایسے عظیم الشان احسانات کیے اور پھر یہاں تک فرمایا کہ اس بے انتہاء دولت وثروت کے صرف وخرچ، داد ودہش اور روک کر رکھنے میں تم سے کوئی باز پرس بھی نہیں ہے مگر ان تمام باتوں کے باوجود حضرت سلیمان علیہ السلام اس دولت وحکومت کو مخلوق خدا کی خدمت کے لیے "امانت الٰہی" سمجھ کر ایک حبہ

اپنی ذات پر صرف نہیں فرماتے بلکہ اپنی روزی ٹوکریاں بنا کر حاصل کرتے تھے۔

بیضاوی نے اس مقام پر یہ اسرائیلی روایت نقل کی ہے کہ قوم جن نے تخت سلیمان علیہ السلام کو اس کاریگری سے بنایا تھا کہ تخت کے نیچے دوز بردست اور خونخوار شیر کھڑے تھے اور دو گدھ (نسر) معلق تھے اور جب حضرت سلیمان تخت حکومت پر جلوہ افروز ہونے کے لیے تخت کے قریب تشریف لے جاتے تو دونوں شیر اپنے بازو پھیلا کر بیٹھ جاتے اور تخت نیچا ہو جاتا اور وہ بیٹھ جاتے تو شیر پھر کھڑے ہو جاتے اور فوراً ہیبت ناک گدھ اپنے پروں کو پھیلا کر سر مبارک پر سایہ فگن ہو جاتے تھے۔ اسی طرح انہوں نے پتھر سے بڑی اور بھاری دیگیں بنائی تھیں جو چولہوں پر قائم تھیں اور اپنی ضخامت کی وجہ سے حرکت میں نہیں آتی تھیں اور بڑے بڑے حوض پتھر تراش کر بنائے تھے اور شہر بیت المقدس اور ہیکل (مسجد اقصیٰ) اور ان سب اشیاء کی تعمیر اور کاریگری میں صرف سات سال لگے تھے۔ [1]

تورات میں متعدد جگہ ان تعمیری خدمات کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے:

"اور یہی باعث ہے جس سے سلیمان بادشاہ نے لوگوں کی بیگار لی کہ خداوند کا گھر (مسجد اور شہر یروشلم) اور اپنا قصر (قصر سلیمان) اور (شہر) ملو اور یروشلم کی شہر پناہ اور شہر (حاصور اور مجدو اور جاذر) بھی بنائے..... سو سلیمان نے جاذر اور بیت حوران اسفل کو پھر تعمیر کیا، اور بعلات اور دشت تدمر کو مملکت کے درمیان..... اور خزانے کے سارے شہر جو سلیمان کے تھے اور اس کی گاڑی کے شہر اور اس کے سرداروں کے شہر بنائے اور جو کچھ سلیمان کی تمنا تھی سو یروشلم میں اور لبنان میں اور اپنی مملکت میں ساری زمین میں بنائے۔" [2]

اسی طرح توراۃ میں پتھر کے عظیم الشان حوض، بڑی اور بھاری دیگیں اور تصویروں اور ان کے بنانے کے لیے بیش قیمت پتھروں کے متعلق طویل فہرست دی گئی ہے۔ [3]

④ تانبے کے چشمے:

حضرت سلیمان علیہ السلام چونکہ عظیم الشان عمارات، پر شوکت و پر ہیبت قلعوں کی تعمیر کے بہت شائق تھے اور ایسی تعمیرات کے استحکام میں بہت دلچسپی رکھتے تھے اس لیے ضرورت تھی کہ گارے اور چونے کے بجائے پگھلی ہوئی دھات گارے کی طرح استعمال کی جائے لیکن اس قدر کثیر مقدار میں یہ کیسے میسر آئے، یہ سوال تھا جس کا حل حضرت سلیمان علیہ السلام چاہتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی اس مشکل کو اس طرح حل کر دیا کہ ان کو پگھلے ہوئے تانبے کے چشمے مرحمت فرما دیئے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حسب ضرورت سلیمان علیہ السلام کے لیے تانبے کو پگھلا دیتا تھا اور یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ایک "نشان تھا اور اس سے قبل کوئی شخص دھات کو پگھلانا نہیں جانتا تھا۔" اور نجار کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ انعام کیا کہ زمین کے جن حصوں میں ناری مادہ کی وجہ سے تانبا پانی کی طرح پگھل کر بہہ رہا تھا ان چشموں کو حضرت سلیمان علیہ السلام پر آشکارا کر دیا اور ان سے قبل کوئی شخص زمین کے اندر دھات کے چشموں سے آگاہ نہ تھا۔ [4]

---

[1] بیضاوی سورۂ سبا [2] سلاطین ا باب ۹ آیات ۱۵۔۱۵۔۲۰ [3] سلاطین ا باب ۸۔۷ [4] قصص الانبیاء عربی ص ۳۹۳

Marfat.com

چنانچہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ بروایت قتادہ ناقل ہیں کہ پگھلے ہوئے تانبے کے یہ چشمے یمن میں تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر ظاہر کر دیا تھا۔ [1]

قرآن عزیز نے اس حقیقت کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی اور مسطورۂ بالا دونوں توجیہات آیت زیر بحث کا مصداق بن سکتی ہیں، اس لیے ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب صاحب مطالعہ کے اپنے ذوق پر ہے۔ تورات میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس خصوصی امتیاز کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اور جہاد کے گھوڑوں کا واقعہ:

قرآن عزیز نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق ایک مختصر واقعہ کا اس طرح تذکرہ کیا ہے:

﴿وَ وَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۝ فَقَالَ اِنِّيْۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۝ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ؕ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَ الْاَعْنَاقِ ۝﴾ (ص: ۳۰-۳۳)

"اور ہم نے داؤد کو سلیمان (فرزند) عطاء کیا وہ اچھا بندہ تھا، بیشک وہ خدا کی جانب بہت رجوع ہونے والا تھا (اس کا واقعہ قابل ذکر ہے) جب اس کے سامنے شام کے وقت اصیل اور سبک رو گھوڑے پیش کیے گئے تو وہ کہنے لگا بیشک میری محبت مال (جہاد کے گھوڑوں کی محبت) پروردگار کے ذکر ہی میں سے ہے یہاں تک کہ وہ گھوڑے نظر سے اوجھل ہو گئے (حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا) ان کو واپس لاؤ، پھر وہ ان کی پنڈلیاں اور گردنیں چھونے اور تھپتھپانے لگا۔"

ان آیات کی تفسیر میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے تین قول منقول ہیں ایک حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اور دو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان میں سے ایک حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے مذکور ہے اور دوسرا علی ابن ابی طلحہ کی سند سے۔

① حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق واقعہ کی حقیقت اس طرح ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایک مرتبہ جہاد کی مہم پیش آئی اور انہوں نے حکم دیا کہ اصطبل سے گھوڑوں کو لایا جائے گھوڑے پیش ہوئے تو ان کی دیکھ بھال میں عصر کی نماز کا وقت جاتا رہا اور سورج غروب ہو گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب تنبہ ہوا تو فرمایا، مجھے یہ اعتراف ہے کہ مال کی محبت یاد خدا پر غالب آ گئی اور اس غم و غصہ میں گھوڑوں کو واپس منگایا اور یاد خدا کی محبت کے جوش میں ان سب کو ذبح کر ڈالا کہ وہی اس غفلت کا باعث بنے تھے۔

اس تفسیر کے مطابق آیت ﴿اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ﴾ کے معنی یہ ہوئے کہ بیشک میں پروردگار کے ذکر سے غافل ہو کر مال کی محبت میں لگ گیا اور آیت ﴿حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ﴾ میں توارت کی ضمیر آفتاب کی جانب راجع ہے جو عبارت میں محذوف ہے یعنی ﴿تَوَارَتِ الشَّمْسُ بِالْحِجَابِ﴾ اور آیت ﴿فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَ الْاَعْنَاقِ﴾ میں مسح کے معنی "ضرب"

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۲۸

Marfat.com

کے ہیں یعنی ان کی کونچیں اور گردنیں کاٹ ڈالیں۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ اکثر سلف کی بھی یہی رائے ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ عمل قصداً نہیں تھا بلکہ اسی قسم کا معاملہ تھا جیسا کہ غزوۂ خندق کے موقعہ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا کہ عصر کی نماز فوت ہو گئی اور آپ نے مع صحابہ رضی اللہ عنہم غروب آفتاب کے بعد اس کی قضاء کی۔ ❶

اور جب کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خدا کے ذکر کی محبت میں اپنے بہترین گھوڑوں کو ذبح کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ عظیم الشان انعام فرمایا کہ "ہوا" کو ان کے لیے مسخر کر دیا۔" ❷

(۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت کے مطابق جو حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے منقول ہے حقیقت واقعہ یہ ہے کہ جہاد کی مہم کے سلسلہ میں جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے گھوڑوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا اور وہ پیش کیے گئے اور پھر وہ تمام صورت پیش آئی جو پہلی تفسیر میں ذکر ہو چکی تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے واپس منگا کر گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہلکے ہلکے مارا اور فرمایا کہ آئندہ تم ذکر اللہ سے غفلت کا باعث نہ بننا۔ ❸

گویا اس روایت کے پیش نظر "مسح" کے معنی آہستہ آہستہ مارنے کے ہوئے اور مطلب یہ ہوا کہ اگرچہ جہاد کی مصروفیت ہی کی بناء پر غفلت کا یہ معاملہ پیش آیا تاہم حضرت سلیمان علیہ السلام نے بظاہر اسباب گھوڑوں کو اس کا باعث سمجھ کر ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جس سے فی الجملہ رنج کا اظہار بھی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حیوان سمجھ کر ان کو اپنے غیظ و غضب کا شکار نہیں بنانا چاہتے بلکہ فی الجملہ اظہار رنج کرنا چاہتے ہیں۔

(۳) مسطورۂ بالا ہر دو تفاسیر سے جدا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بہ طریق علی بن ابی طلحہ جو تفسیر منقول ہے اس میں نہ نماز فوت ہونے کا ذکر ہے اور نہ سورج غروب ہونے کا مسئلہ ہے اور نہ گھوڑوں کے ذبح کر دینے کا واقعہ زیر بحث آیا ہے بلکہ واقعہ کی صورت اس طرح ذکر کی گئی ہے کہ جہاد کی ایک مہم کے موقعہ پر ایک شام کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے جہاد کے گھوڑوں کو اصطبل سے لانے کا حکم دیا۔ جب وہ پیش کیے گئے تو آپ کو چونکہ گھوڑوں کی نسلوں اور ان کے ذاتی اوصاف کے علم کا کمال حاصل تھا اس لیے آپ نے جب ان سب کو اصیل، سبک رو، خوش رو اور پھر بہت بڑی تعداد میں پایا تو آپ پر مسرت انبساط کی کیفیت طاری ہو گئی اور فرمانے لگے، ان گھوڑوں سے میری یہ محبت ایسی مالی محبت میں شامل ہے جو پروردگار کے ذکر ہی کا ایک شعبہ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس غور و فکر کے درمیان گھوڑے اصطبل کو روانہ ہو گئے۔ چنانچہ جب انہوں نے نظر اوپر اٹھائی تو وہ نگاہ سے اوجھل ہو چکے تھے، آپ نے حکم دیا، ان کو واپس لاؤ۔ جب وہ واپس لائے گئے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے محبت اور آلات جہاد کی حیثیت سے عزت و توقیر کی خاطر ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنا اور تھپتھپانا شروع کر دیا اور ایک ماہر فن کی طرح ان کو مانوس کرنے لگے۔

گویا اس تفسیر کے مطابق آیت ﴿إِنِّيٓ أَحۡبَبۡتُ حُبَّ ٱلۡخَيۡرِ عَن ذِكۡرِ رَبِّي﴾ کا ترجمہ یہ ہوا "بے شبہ میری محبت مال (جہاد

---

❶ تفسیر ابن کثیر جلد ۴ سورۂ ص و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۵۔ ❷ ایضاً ❸ فتح الباری ج ۶ ص ۳۵۶

کے گھوڑوں کی محبت) ذکر خدا ہی میں سے ہے اور ﴿ تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴾ میں توارت کی ضمیر ﴿ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴾ ہی کی طرف ہے، یعنی جب گھوڑے آنکھ سے اوجھل ہو گئے اور اس طرح "شمس" کے محذوف ماننے کی ضرورت نہیں رہتی اور ﴿ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَ الْاَعْنَاقِ ﴾ میں مسح کے "چھونے اور ہاتھ پھیرنے کے" وہی عام معنی ہیں جو لغت میں بہت مشہور ہیں۔ ❶

ابن جریر طبری اور امام رازی اسی تفسیر کو راجح اور قرین صواب سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب گھوڑوں کی تعداد ہزاروں تھی اور وہ بھی جہاد کے لیے تیار کیے گئے تھے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر حضرت سلیمان علیہ السلام کی نماز فوت ہوگئی تھی تو اس میں ان حیوانوں کا کوئی قصور نہ تھا جو ان کو عذاب دیا جائے پس ان امور کے پیش نظر آیات کی وہ تفسیر صحیح نہیں ہوسکتی جس کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب کی جاتی ہے۔

محاکمہ:

روایات اور اقوال مفسرین کے مطالعہ کے بعد ہمارے نزدیک ابن جریر اور امام رازی کا پسندیدہ قول ہی قابل ترجیح اور قرین صواب ہے اس لیے کہ نہ اس میں محذوف ماننے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف ایسے عمل کی نسبت ہوتی ہے جو عقلاً نامناسب معلوم ہوتا ہے اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے ابن جریر کے اعتراض کا جو جواب اس سلسلہ میں دیا ہے وہ بھی تاویل بعید سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ ایک اولوالعزم پیغمبر کے اس واقعہ میں کوئی ایسی وجہ وجیہ نہیں ہے کہ جس کے پیش نظر ❷ دس یا بیس ہزار گھوڑوں کو اس طرح ذبح کر دیا جائے اور یہ کہہ دینا کہ شاید ان کی ملت میں اس قسم کا عمل راجح اور پسندیدہ سمجھا جاتا ہو، بے دلیل بات ہے۔ اسی طرح ابن کثیر رحمہ اللہ کا یہ قول کہ "حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب اپنی غفلت کی مکافات میں ہزاروں بہترین گھوڑوں کو ذبح کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کے عوض میں ہوا کو مسخر کر دیا۔" اگرچہ دلچسپ ضرور ہے لیکن قرآن عزیز کے بیان سے مطابقت نہیں رکھتا اس لیے کہ واقعہ زیر بحث ایک جدا واقعہ ہے جس کے ذیل میں قرآن عزیز نے معمولی سا بھی ایسا اشارہ نہیں کیا جس سے تسخیر ہوا کے معاملہ کا اس سے تعلق ظاہر ہوتا ہو۔ حالانکہ قرآن عزیز کے عام طرز بیان کے مطابق آیات زیر بحث میں ہی یہ ذکر آنا چاہیے تھا کہ چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہماری خوشنودی میں ایسا کیا اس لیے ہم نے اس کے عوض میں اتنا بڑا انعام دیا کہ ہوا کو مسخر کر دیا، مگر اس کے برعکس تسخیر ہوا کے مسئلہ کو ایک دوسرے واقعہ کے ساتھ متعلق کیا ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش سے تعلق رکھتا ہے یعنی جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کی تو ساتھ ہی یہ دعا بھی مانگی کہ ان کو ایسی حکومت عطاء ہو جو ان کے علاوہ پھر کسی کو نصیب نہ ہو اور یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اس طرح قبول فرمائی کہ جن، حیوانات اور ہوا کو ان کے لیے مسخر کر دیا۔ ❸

غرض ﴿ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴾ کے واقعہ کے بعد نہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا گھوڑوں کی سواری کو ترک کر دینا اور میدان جہاد میں ان سے کام نہ لینا ثابت ہے اور نہ تسخیر جن و ہوا کا اس معاملہ سے کوئی تعلق ہے اور نہ آیت میں "شمس" کا کوئی تذکرہ ہے اور نہ اتنی کثیر تعداد میں عمدہ گھوڑوں کا بیک وقت ذبح کر ڈالنا کوئی خاص محبوب عمل ہے، اس لیے ان وجوہ کی بناء پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

---

❶ فاحببت معناه اردت المحبة (البحر المحیط۔ ج ۷، ص ۳۹۲۔ فتح الباری ج ۶ ص ۳۵۲ و تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۵

❷ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں دس ہزار اور بیس ہزار کی تعداد روایت کی ہے۔ ❸ سورۂ ص

Marfat.com

ہی کا یہ قول راجح اور قرین صواب ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کا واقعہ:

سورہ ص میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش اور خدائے تعالیٰ کی جانب سے ابتلاء کا ایک مجمل واقعہ اس طرح مذکور ہے۔ [1]

﴿وَ لَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَ اَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ۝ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ۝﴾ (ص: ۳۴ تا ۳۶)

"اور بیشک ہم نے سلیمان کو آزمایا اور ڈال دیا ہم نے اس کی کرسی پر ایک جسم، پھر وہ اللہ کی جانب رجوع ہوا۔ کہا اے پروردگار! مجھ کو بخش دے اور مجھ کو ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی کو میسر نہ آئے، بے شبہ تو ہی بخشنے والا ہے۔ تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا کہ وہ اس کے حکم سے نرم رفتار سے چلتی تھی جہاں وہ پہنچنا چاہتا۔"

ان آیات میں یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب آزمائش پیش آئی تو وہ کیا تھی صرف اس قدر اشارہ ہے کہ ان کی کرسی پر ایک جسد ڈالا گیا نیز احادیث میں بھی اس سے متعلق کوئی تفصیل مذکور نہیں ہے لہٰذا ان آیات کی تفسیر میں مفسرین نے دو رائیں اختیار کی ہیں:

ایک یہ کہ ہم کو قیاس اور ظن و تخمین سے کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے اور صرف اسی قدر یقین رکھنا چاہیے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس نے کسی آزمائش میں مبتلا کیا، جس کا تعلق تخت سلیمان اور جسد کا تخت سلیمان علیہ السلام پر ڈالا جانا ان دو باتوں سے ہے اور اس کی تفصیلی کیفیت نامعلوم ہے اور یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اولوالعزم پیغمبروں کی طرح خدا کی درگاہ میں رجوع کیا۔ اوّل مغفرت طلب کی اور اس کے بعد ایسی حکومت کے لیے دعا مانگی جو بے نظیر اور بے مثال ہو چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کی مقبولیت اور عظمت شان کو سراہا۔

﴿وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ ۝﴾ (ص: ۲۵)

"اور بے شبہ اس کے لیے ہمارے پاس تقرب ہے اور عمدہ مقام۔"

آیات زیر بحث کی تفسیر میں یہ راہ حافظ عماد الدین بن کثیر اور ابن حزم اور بعض دوسرے جلیل القدر محدثین و مفسرین نے اختیار کی ہے۔

دوسری راہ یہ ہے کہ اس واقعہ کی تفصیل اور آیات کی تشریح کے لیے کوئی صورت پیدا کی جائے اور اس کے اجمال و ابہام کو حل کیا جائے۔

اس سلسلہ میں مفسرین نے جو تفسیریں کی ہیں ان میں سے صرف دو قابل ذکر ہیں ان میں سے ایک امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی جانب

---

[1] اور ہمدانی کے قول کے مطابق اگر آحببت کے معنی اردت المحبۃ لیے جائیں تو پھر عن بمعنی من استعمال ہوسکتا ہے۔

Marfat.com

منسوب ہے اور دوسری بعض محدثین کی جانب۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک مرتبہ سخت علیل ہو گئے اور ان کی حالت اس درجہ نازک ہو گئی کہ جب تخت پر لا کر بٹھائے گئے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جسم ہے بے روح۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو صحت عطاء فرمائی جب وہ تندرست ہو گئے تو خدائے تعالیٰ کا شکر بجالاتے ہوئے اوّل انہوں نے پیغمبرانہ شان کے مطابق مغفرت طلب کی اور اپنی بیچارگی کا اظہار کیا اور پھر دعا مانگی کہ خدایا مجھ کو لاثانی حکومت عطا فرما۔ ❶

رازی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تفسیر ❷ کے مطابق آیت ﴿وَ لَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ﴾ میں "فتنہ" سے مراد "مرض شدید" ہے اور ﴿وَ اَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا﴾ میں "القاء جسد" سے حضرت سلیمان علیہ السلام کا شدت مرض میں جسم بے روح کی طرح تخت پر پڑ جانا مراد ہے اور ﴿ثُمَّ اَنَابَ﴾ سے صحت کی جانب رجوع ہو جانا اور تندرست ہو جانا مراد ہے گویا آزمائش کا مقصد یہ تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام عین الیقین کے درجہ میں سمجھ لیں کہ اس حاکمانہ شان کے باوجود ان کا نہ صرف اقتدار بلکہ جان تک اپنے قبضہ میں نہیں ہے تا کہ ایک اولوالعزم رسول کی طرح خدا کے سامنے جھک جائیں اور اظہار خشوع وخضوع اور طلب مغفرت کے ذریعہ درگاہ الٰہی سے درجہ رفیع اور مزید سربلندی حاصل کریں۔

بعض محدثین نے ان آیات کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ سوچا کہ میں اس شب میں اپنے حرم کے ساتھ ازدواجی فریضہ ادا کروں تو میری ہر ایک بیوی سے لڑکا پیدا ہوگا اور وہ میدان جہاد کا مجاہد بنے گا، مگر اس خیال کے ساتھ "ان شاء اللہ" کہنا بھول گئے۔ خدائے تعالیٰ کو اولوالعزم پیغمبر کا یہ طرز ناپسند ہوا، اور اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس دعوے کو اس طرح غلط ثابت کر دیا کہ تمام ازواج مطہرات میں سے صرف ایک بیوی کے مردہ بچہ پیدا ہوا جس کو کسی خادم نے ان کے سامنے اس وقت پیش کیا جبکہ وہ تخت پر متمکن تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام کو تنبہ ہوا کہ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ خدا کے سپرد کیے اور ان شاء اللہ کہے بغیر میں نے اپنی بات کو زوردار بنایا، چنانچہ فوراً ہی انہوں نے اللہ کی جانب رجوع کیا، مغفرت طلب کی اور وہ دعا مانگی جس کا ذکر قرآن عزیز میں بصراحت موجود ہے۔ ❸

محدثین اپنی اس تفسیر کی دلیل میں بخاری ومسلم کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں اور اسی کو اپنی تفسیر کی سند بناتے ہیں۔ مفسر ابوالسعود رحمۃ اللہ علیہ اور سید محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی توجیہ اختیار کی ہے۔ ❹

> عن ابی هريرة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال قال سليمان بن داؤد لا طوفن الليلة على سبعين امرأة تحمل كل امرأة فارسا يجاهد فی سبيل الله فقال له صاحبه ان شاء الله فلم يقل و لم تحمل شيئا الا واحدا ساقطا احدى شقيه فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو قالها لجاهد وا فی سبيل الله. ❺

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایک مرتبہ سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے فرمایا، آج کی رات میں اپنی ستر بیویوں کے پاس جاؤں گا تا کہ ان میں سے ہر ایک بیوی ایک شہ زور لڑکا جنے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے، حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر نے ان سے کہا "ان شاء اللہ" مگر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس جملہ کو ادا نہ کیا اور

---

❶ تفسیر کبیر سورۂ ص ❷ تفسیر کبیر سورۂ ص ❸ روح المعانی جلد ۲۶ ❹ بخاری کتاب الانبیاء

Marfat.com

نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی بیوی بھی حاملہ نہ ہوئی البتہ ایک بیوی کے ناقص بچہ پیدا ہوا جس کا ایک پہلو ندارد تھا اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر حضرت سلیمان علیہ السلام "ان شاء اللہ" کہہ دیتے تو ہر ایک حرم کے بطن سے مجاہد پیدا ہوتا۔"

محاکمہ:

مگر یہ دونوں تفسیریں محل نظر ہیں۔ پہلی توجیہ جس کو امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے پسند فرمایا ہے صرف قیاسی توجیہ ہے اور آیت کے جملوں کی ایسی تاویل ہے جو تاویل بعید کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تسلیم کہ مقربین بارگاہِ الٰہی کے لیے کبھی مرض بھی آزمائش بن جاتا ہے، لیکن کرسی سلیمان پر "القاء جسد" سے بحالت نقاہت حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت پر بیٹھنا مراد لینا متبادر معنی کے خلاف ہے، آیت سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تخت سلیمان پر کوئی شے ڈالی گئی جس کا سلیمان علیہ السلام کی آزمائش سے تعلق تھا نیز "اناب" (رجوع ہوا) کے معنی بھی قرآن عزیز میں جگہ جگہ طلب مغفرت اور اظہار عبودیت کے لیے رجوع ہونے کے آئے ہیں، لہٰذا یہاں "صحت کی جانب ہونے" کے معنی لینا دل لگتی بات نہیں ہے۔

اسی طرح بعض محدثین نے جو تفسیر بیان فرمائی ہے اور جس کو ابوالسعود اور سید محمود آلوسی رحمہم اللہ نے اختیار کیا ہے وہ بھی آیات زیر بحث کی تفسیر نہیں ہے۔ اس لیے کہ بخاری یا دوسری کتب حدیث میں جہاں جہاں یہ حدیث منقول ہے اس کے کسی ایک طریقہ میں بھی ایسا کوئی لفظ یا جملہ نہیں پایا جاتا جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کو آیات زیر بحث کی تفسیر فرمایا ہو یا اس کی جانب اشارہ تک بھی کیا ہو بلکہ یہ حدیث حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات میں سے ایک مستقل واقعہ کا اسی طرح ذکر کرتی ہے جس طرح بخاری نے اسی باب میں بعض دوسرے واقعات کو بیان کیا ہے مثلاً یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں دو عورتیں ساتھ سفر کر رہی تھیں اور دونوں کے ساتھ ان کے شیر خوار بچے بھی تھے، راہ میں ایک عورت کے بچہ کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا اور جو بچہ باقی رہا دونوں اس کے لیے آپس میں جھگڑا کرنے لگیں، دونوں کا دعویٰ تھا کہ یہ بچہ میرا ہے اور دوسری کا بچہ بھیڑیا لے گیا۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس یہ معاملہ پہنچا تو انہوں نے "فصل قضایا" کے اصول پر مقدمہ کی روئیداد سن کر بڑی کے حق میں فیصلہ دیا اس لیے کہ بظاہر بچہ بڑی کے قبضہ میں تھا اور چھوٹی اس کے قبضہ کے خلاف گواہ نہ پیش کر سکی۔ جب عورتیں واپس ہو کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس سے گزریں تو انہوں نے ان کے قضیہ کی تفصیل دریافت فرمائی اور سن کر حکم دیا ایک چھری لائی جائے اور اس بچہ کے دو ٹکڑے کر کے ایک بڑی کو اور ایک چھوٹی کو دے دیا جائے، بڑی خاموش رہی مگر چھوٹی یہ فیصلہ سن کر شور و غوغا کرنے لگی کہ خدارا اس بچہ کے دو ٹکڑے نہ کیجئے، میں بڑی کے حق میں دستبردار ہوتی ہوں۔ تب سب کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ بچہ چھوٹی کا ہے، اور بڑی جھوٹا دعویٰ کرتی ہے۔ لہٰذا بچہ چھوٹی کے حوالہ کر دیا گیا۔ [1]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح یہ واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دانش و عقل کی برتری کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا، اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام اور ان کی ازواج مطہرات کا واقعہ اس لیے سنایا کہ امت کو یہ موعظت حاصل ہو کہ اپنے کاموں میں اگر خیر و برکت چاہتی ہے تو ارادہ و عزم کے اظہار کے وقت "ان شاء اللہ" کہنا چاہیے، نیز شاید یہ بھی مقصد ہو کہ وہب بن منبہ جب یہ قصہ سنایا

---

[1] کتاب الانبیاء

Marfat.com

کرتے تھے تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی ازواج مطہرات اور باندیوں کی تعداد ایک ہزار بتایا کرتے تھے۔اس لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے اس تعداد کو ساٹھ یا بعض روایات کے پیش نظر سو تک بتایا جن میں بعض ازواج مطہرات تھیں اور باقی جاریات (باندیاں) تھیں۔ [1]

غرض روایت زیر بحث موعظت وعبرت کے سلسلہ میں مستقل حیثیت سے بیان ہوئی ہے۔آیات زیر بحث کی تفسیر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور خلاصہ بحث یہ ہے کہ امام رازیؒ اور بعض محدثین کی اختیار کردہ تفسریں حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش اور کرسی سلیمان علیہ السلام پر "القاء جسد" کے واقعات کو حل نہیں کرتیں اور آیات میں اگرچہ ان دونوں باتوں کا مجمل ذکر ہے، تاہم اس واقعہ سے متعلق موعظت اور عبرت کے پہلو کو بہت صاف اور نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے اور قرآن کا واقعات کے تذکرے سے یہی مقصد ہوتا ہے، لہٰذا ہم کو بھی اس کے موعظت کے پہلو کو سامان عبرت ونصیحت بناتے ہوئے واقعہ کے اجمال پر ہی ایمان رکھنا چاہیے، اور اگر کوئی شخص واقعہ کے اس اجمال پر قلب کو مطمئن نہیں پاتا تو پھر امام رازی رحمہ اللہ کی بیان کردہ تفسیر کو اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے۔

ان آیات کی تفسیر میں بیان کردہ تفاسیر کے علاوہ بہت سی ایسی روایات کتب تفاسیر میں درج ہیں جن کا اسلامی روایات سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور بلاشبہ وہ تمام تر یہودی قصص اور اسرائیلی خرافات کا مجموعہ ہے۔اس لیے ان کو روایات کہنا بھی روایت کی توہین کرنا ہے۔

ان روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت پر شیطان کو قابض کردیا تھا اور اس کے مختلف اسباب میں سے ایک سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک بیوی جس کا نام امینہ تھا بت پرست تھی اور اپنے باپ کا مجسمہ بنا کر اس کی پرستش کیا کرتی تھی۔لہٰذا خدائے تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو سزا دی کہ جس مدت تک امینہ نے ان کے گھر میں بت پرستی کی تھی اس مدت تک کے لیے وہ تخت سلطنت سے محروم کردیے گئے اور ان کی انگشتری جس میں اسم اعظم کندہ تھا وہ ان کی باندی جراوہ کے ذریعہ شیطان کے ہاتھ پڑ گئی اور وہ بصورت سلیمان ان کے تخت پر بیٹھ کر حکومت کرنے لگا اور پھر مدت ختم ہونے کے بعد انگشتری شیطان کے ہاتھ سے دریا میں گر گئی اور مچھلی اس کو نگل گئی اور وہ مچھلی حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس شکار ہو کر آئی اور اس طرح اس کے پیٹ میں سے انگشتری نکال کر انہوں نے اپنا ملک واپس لے لیا۔

تورات سلاطین باب ۱۱ میں بھی اس روایت سے ملتا جلتا ایک قصہ مذکور ہے اور اس میں بیویوں کی خاطر حضرت سلیمان کا بت پرستی کرنا تک موجود ہے۔(العیاذ باللہ)

اس روایت میں ایک اولوالعزم پیغمبر کی جانب جس قدر خرافات اور ذلیل واقعات کی نسبت کی گئی ہے ایک عامی بھی بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسی روایات کا اسلام کی تعلیم سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔اسی لیے محدث ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان روایات کے متعلق یہ فیصلہ دیا ہے:

ذکر ابن جریر و ابن ابی حاتم و غیرھما من المفسرین ھٰھنا اثارًا کثیرۃ عن جماعۃ من السلف و اکثرھا او کلھا

---

[1] نجار نے اس مقام کی تفسیر میں ایک تیسری راہ اختیار کی ہے مگر وہ ہمارے نزدیک اٹکل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اس کے لئے قصص الانبیاء صفحہ ۳۹۲ قابل مراجعت ہے۔

متلقاة من الاسرائیلیات و فی کثیر منها نکارة شدیدة و قد نبهنا علی ذلک فی کتابنا التفسیر و اقتصرنا ھھنا علی مجرد التلاوة. ❶

ولکن الظاھر انه انما تلقاه ابن عباس رضی اللّٰه عنهما ان اصح عنه من اھل الکتاب و فیهم طائفة لا یعتقدون نبوة سلیمان علیه الصلٰوة والسلام فالظاھر انهم یکذبون علیه و ھٰذا کان فی ھذا السیاق منکرات. ❷

و قد رویت ھٰذه القصة مطولة عن جماعة من السلف رضی اللّٰه عنهم کسعید بن المسیب و زید بن اسلم و جماعة اخرین و کلها متلقاة من قصص اھل الکتاب. ❸

"ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور ان دونوں کے علاوہ دوسرے مفسرین نے اس مقام پر جماعت سلف سے بہت سے آثار کا ذکر کیا ہے اور ان میں سے اکثر یا سب کے سب اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں، اور ان میں سے اکثر آثار میں سخت ناروا باتیں مذکور ہیں اور ہم نے اپنی تفسیر میں اس پر تنبیہ کر دی ہے اور اس جگہ صرف قرآن میں بیان کردہ واقعہ کو تلاوت کرنے پر اکتفاء کیا ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ اگر اس روایت کی نسبت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی جانب صحیح بھی ثابت ہو جائے تب بھی یہ اہل کتاب سے انہوں نے لی ہے اور ان میں ایک گروہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو نبی نہیں مانتا تو یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر جھوٹ تراشتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس روایت کے بیان میں ناروا باتیں پائی جاتی ہیں۔ اور یہ طول طویل قصہ سلف کی ایک جماعت کی نسبت کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔ مثلاً سعید بن مسیب اور زید بن اسلم رضی اللہ عنہ اور ان کے علاوہ ایک جماعت سے منقول ہے اور یہ پورا قصہ از اول تا آخر اہل کتاب کی کہانیوں سے لیا گیا ہے۔"

ابن کثیر رحمہ اللہ کے علاوہ امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں، ابن حزم نے الفصل میں، قاضی عیاض رحمہ اللہ نے شفاء میں، شیخ بدرالدین عینی نے شرح بخاری میں، ابن حبان نے اپنی تفسیر میں اور دوسرے جلیل القدر محققین، محدثین، اور مفسرین نے اس قصہ سے متعلق روایات کو خرافات اور اہل کتاب کی ہزلیات ظاہر کر کے اسلامی روایات کے دامن کو اس نجاست سے پاک کیا ہے۔

لشکر سلیمان علیہ السلام اور وادی نملہ:

گزشتہ صفحات میں منطق الطیر کی بحث میں یہ مسئلہ واضح ہو چکا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حیوانات کی بولیاں سمجھنے کا علم عطاء فرمایا تھا۔ چنانچہ اسی سلسلہ کا ایک واقعہ قرآن عزیز میں وادی نملہ (چونٹیوں کی بستی) سے متعلق اس طرح مذکور ہے۔

ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام جن وانس اور حیوانات کے عظیم الشان لشکر کے جلو میں کسی جگہ تشریف لے جا رہے تھے۔ لشکر کی کثرت کے باوجود کسی طبقہ کے افراد کی بھی یہ مجال نہ تھی کہ وہ اپنے درجہ اور رتبہ کے خلاف آگے پیچھے ہونے کی بے ترتیبی کا مرتکب ہو سکے۔ سب فرمانبردار لشکریوں کی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کی ہیبت سے اپنے اپنے قرینہ سے فوج در فوج چل رہے تھے

---

❶ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۲۶ ❷ تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۳۶ ❸ ایضاً ج ۴ ص ۳۶

Marfat.com

کہ لشکر چلتے چلتے ایک ایسی وادی میں پہنچا جہاں چیونٹیاں بیشمار تھیں اور پوری وادی ان کا مسکن بنی ہوئی تھی، چیونٹیوں کے بادشاہ نے لشکر کے اس کثیر انبوہ کو دیکھ کر اپنی امت سے کہا کہ تم فوراً اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ، سلیمان اور سلیمان علیہ السلام کے لشکر کو کیا معلوم کہ تم اس کثرت کے ساتھ وادی کی زمین پر رینگ رہی ہو، نہ معلوم ان کے گھوڑوں اور پیادوں کے نیچے تم میں سے کتنی تعداد بے خبری میں روندی جائے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے چیونٹیوں کے بادشاہ کی یہ باتیں سنیں تو ان کو ہنسی آ گئی اور اس کے عاقلانہ حکم کی داد دینے لگے۔
اب اس واقعہ کو خود قرآن عزیز سے سنئے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَ قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی كَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۵﴾ وَ وَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ وَ قَالَ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ وَ اُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۶﴾ وَ حُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ وَ الطَّیْرِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ یّٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی وَالِدَیَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹﴾﴾ (النمل: ۱۵-۱۹)

"اور بے شک ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم (علم نبوت بخشا اور ان دونوں نے کہا، تعریف ہے اللہ کے لیے جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت دی۔ اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا۔ اس نے کہا: اے لوگو! ہم کو پرندوں (حیوانات) کی بولیوں کا علم دیا گیا ہے اور ہمارے لیے ہر شے مہیا کر دی گئی ہے۔ بے شک یہ (خدا کا) کھلا ہوا فضل ہے اور جمع ہوا لشکر سلیمان کے لیے جن، انسان اور پرندوں (حیوانات) سے اور وہ درجہ بدرجہ قرینہ کے ساتھ آگے پیچھے چل رہے تھے حتیٰ کہ وہ وادی نملہ پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! اپنے گھروں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں سلیمان اور اس کا لشکر تم کو پیس ڈالے، چیونٹی کی یہ بات سن کر سلیمان ہنس پڑا اور کہنے لگا: اے پروردگار! مجھ کو یہ توفیق دے کہ میں تیرا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر انعام کیا ہے اور یہ کہ میں وہ نیک عمل کروں جو تجھ کو پسند آئے اور مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔"

ہم نے حکم دینے والی چیونٹی کو چیونٹیوں کا بادشاہ کہا ہے اور یہ صرف اس لیے کہ قدیم و جدید عقلاء زمانہ کا اس پر اتفاق ہے کہ حیوانات میں شہد کی مکھیوں اور چیونٹیوں کا اس قدر بہترین نظام ہے کہ اس کو "نظام حکومت" کہنا مبالغہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ بعض عقلاء دہر نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ انسان نے بھی اپنا نظام ان ہی دو نظاموں کو دیکھ کر مرتب کیا ہے، یہ دعویٰ اپنی جگہ کتنا ہی محل نظر کیوں نہ ہو مگر اس سے ان دونوں کے نظام کی خوبی بہرحال مسلم ہو جاتی ہے، اور اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ

Marfat.com

حکم دینے والا نملہ وادی نملہ کا بادشاہ یا سردار ہی ہوگا۔

وادی نملہ کس جگہ واقع ہے؟ اس سوال کے جواب میں اگرچہ بہت سے مقامات کا نام لیا گیا ہے مگر مؤرخین کی زیادہ رائے اس طرف ہے کہ عسقلان کے قریب ہے جیسا کہ ابن بطوطہ نے بیان کیا ہے یا بیت جبرون و عسقلان کے درمیان، جیسا کہ یاقوت سے منقول ہے، عام مفسرین شام میں بتلاتے ہیں۔

اس سوال کے علاوہ اس مقام پر اور بھی چند سوالات پیدا کیے گئے ہیں۔ مثلاً حکم دینے والی چیونٹی کا نام کیا تھا؟ وہ چیونٹیوں کے قبائل میں سے کس قبیلہ سے تھی؟ ان کی جسامت کس قدر تھی؟ وغیرہ وغیرہ اور پھر اسرائیلی داستانوں اور یہودی خرافات سے ان کے جوابات دینے کی سعی کی گئی ہے۔ مگر یہ سب بحثیں دور از کار، بے سند بلکہ لا طائل ہیں اور قرآن عزیز اور احادیث رسول ﷺ اس قسم کی لغویات سے مبرا ہیں۔

مثلاً نوف بکالی کہتا ہے کہ ان چیونٹیوں کا قد بھیڑیے کے برابر تھا، [1] حالانکہ قرآن عزیز نے واضح طور پر یہ بیان کیا ہے کہ وہ اس قدر حقیر جسم رکھتی تھیں کہ نملہ کو یہ کہنا پڑا: ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کا لشکر تم کو پیس ڈالے اور ان کو خبر بھی نہ ہو۔ کیونکہ یہ بات جب ہی صحیح ہوسکتی ہے کہ وہ چیونٹیاں اپنی ہم جنسوں کی طرح حقیر جسم رکھتی ہوں کہ پیر سے روندنے والے کو ان کا علم بھی نہ ہوسکے۔

اس واقعہ کے ذکر سے قرآن عزیز کا مقصد یہ ہے کہ جب آیت بالا سے قبل اس نے یہ بیان کیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے "علم منطق الطیر" عطاء فرمایا اور یہ ان کی عظمت و شان کا ایک نشان ہے تو اس نے مناسب سمجھا کہ ایک دو واقعات اس سلسلہ کے ایسے بیان کر دیے جائیں کہ جس سے مخاطب کو اس مسئلہ میں کسی قسم کا تردد اور شک باقی نہ رہے اور اس کو علم الیقین حاصل ہو جائے کہ قرآن عزیز نے جس حیثیت سے اس کا ذکر کیا ہے اس کے پیش نظر یہ علم عام دینوی علوم کی طرح کا علم نہیں تھا بلکہ خدائے تعالیٰ کی جانب سے ان دونوں عظیم المرتبت پیغمبروں کے لیے خاص موہبت (عطاء و بخشش) اور نشان (معجزہ) تھا، چنانچہ اس ہی کے متصل پہلا واقعہ وادی نملہ کا بیان کیا کہ کس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک حقیر جسم کے حیوان کی باتوں کو اس طرح سن لیا جس طرح ایک انسان دوسرے انسان کی گفتگو بے تکلف سن لیتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیا کہ جب اس حیرت زا علم کے متعلق حضرت سلیمان علیہ السلام کو "عین الیقین اور حق الیقین" کا درجہ حاصل ہو گیا تو انہوں نے ایک اولوالعزم پیغمبر کی شان کے مناسب خدا کے اس عطا کردہ نشان پر اظہار تشکر و امتنان کیا۔

اس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جس سورۃ میں اس کا ذکر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام ہی سورۂ نمل رکھا ہے۔

احمد زکی پاشا مصری نے اپنے ایک مقالہ میں آیت زیر بحث کے متعلق یہ کہا ہے کہ اس جگہ نملہ سے انسانوں کا انبوہ کثیر مراد ہے یعنی وہ وادی میں چیونٹیوں کی طرح بیشمار تھے اور خوف تھا کہ کہیں سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر ان کو نہ روند ڈالے، مگر زکی پاشا کی یہ تفسیر آیت کی تفسیر نہیں ہے بلکہ اس کی مراد کی تحریف ہے اس لیے کہ آیت میں جبکہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ان کے لشکر کے متعلق یہ مقولہ منقول ہے ﴿وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ﴾ یعنی ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو پیس ڈالیں اور ان کو یہ خبر بھی نہ ہو کہ تمہاری جانوں پر کیا حادثہ گزر گیا، تو

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۱

Marfat.com

نملہ سے کس طرح انسانوں کا کثیر گروہ مراد لیا جا سکتا ہے۔ نیز قرآن عزیز کا سیاق و سباق اس تاویل کو مردود قرار دیتا ہے کیونکہ اس صوت میں آیت کا تعلق نہ اس "علم" سے رہتا ہے جس کا پہلی آیت میں بڑی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور نہ انسانوں کے اس تحفظ خود اختیاری کے مقولہ میں کوئی ایسی بات نظر آتی ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی متعجبانہ ہنسی کا سبب بن سکے، اور نہ یہ کوئی ایسا اہم واقعہ تھا جس کے متعلق حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس احساس شکر گزاری کی اہمیت کو واضح کیا جاتا جس کو بعد کی آیت میں واضح کیا گیا ہے، اور پھر ان تمام باتوں کے علاوہ اگر یہ معاملہ انسانوں کے انبوہ کثیر سے متعلق ہوتا تو قرآن عزیز کو ایسے صاف اور سادہ معاملہ کو ایسے پیچیدہ کنایہ اور اشارہ میں بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ جس کی مراد سمجھنے میں خواہ مخواہ مغالطہ پیدا ہو اس لیے کہ اگر کہیں بے شمار انسانوں اور حیوانوں کا مثلاً اجتماع ہو تو مختلف زبانوں کے محاورہ میں یہ تو بیشک کہا جاتا ہے کہ چیونٹیوں کی طرح بیشمار تھے مگر جس مقام پر نہ کسی انسانی جماعت کا پہلے سے کوئی ذکر ہو رہا ہو اور نہ ان کی کثرت وقلت کی کوئی بحث ہو رہی ہو اس جگہ کلام کی ابتداء اگر یوں کی جائے کہ "جب لشکر وادی نملہ پر پہنچا تو نملہ نے کہا" تو کسی زبان کے محاورہ میں بھی نہیں کہا جا سکتا اس سے انسانوں کا انبوہ کثیر مراد ہے۔

آج کے علمی دور میں جبکہ "ماہرین علم السنہ حیوانات" کی تحقیق اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ید قدرت نے حیوانات میں بھی نفس ناطقہ اور اس کے لیے لغات مخصوصہ ودیعت کیے ہیں اگرچہ وہ "نفوس" انسان کے نفس ناطقہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ضعیف اور کمزور ہیں اور جبکہ حیوانات کی فہم و فراست پر فلسفیانہ مباحث مہیا کیے جا رہے ہیں اور ان کی بولیوں اور زبانوں کی اقسام اور ان کی جدا جدا ابجد کو حقائق ثابتہ کی طرح نمایاں کیا جا رہا ہے۔ [1] ایسے دور میں اگر "وحی الٰہی" کے ذریعہ یہ یقین دلایا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک خاص بندے (پیغمبر) کو دنیوی اسباب سے بالاتر ہو کر حیوانات کی بول چال کا علم عطا فرمایا تو سخت حیرت ہے کہ اس کو کیوں عقلاً محال سمجھا جاتا اور اس میں رکیک تاویل بلکہ تحریف کی سعی کی جاتی ہے۔

بعض روایات میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں بارش نہیں ہوئی، قحط کی حالت دیکھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی امت کے ساتھ استسقاء کے لیے میدان میں نکلے، راہ میں دیکھا کہ ایک چیونٹی اگلے قدم اٹھائے آسمان کی جانب نظر کیے یہ دعا مانگ رہی ہے۔ "خدایا ہم بھی تیری مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہیں اور تیرے فضل کے محتاج ہم کو بارش سے محروم رکھ کر ہلاک نہ کر" حضرت سلیمان علیہ السلام نے قوم سے فرمایا: واپس چلو ایک حیوان کی دعاء نے ہمارا کام کر دیا، اب تمہاری طلب کے بغیر ہی بارش ہوگی۔

یہ روایت موقوف اور مرفوع دونوں طریقوں سے ابن عساکر اور ابن ابی حاتم نے روایت کی ہے۔ [2]

لیکن محدثین کے نزدیک اس روایت کو نبی اکرم ﷺ کی جانب نسبت کرنا محل نظر ہے۔ البتہ چیونٹی کے بارہ میں صحیح مسلم میں ایک مرفوع حدیث یہ ضرور موجود ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ کسی "نبی" کو ایک چیونٹی نے کاٹ کھایا، پیغمبر نے غصہ میں اس سوراخ کو جلا دینے کا حکم دے دیا جس میں سے اس چیونٹی نے نکل کر ان کے کاٹا تھا۔ فوراً ان پر خدا کی وحی نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایک چیونٹی کے کاٹنے پر گھر کو جلا دینے کا حکم تم نے کیوں دیا، تم کو کیا معلوم کہ اس میں کس قدر بے خطاء چیونٹیاں موجود

[1] دائرۃ المعارف للبستانی ج ۷ ص ۲۸۷، ۲۸۸۔ [2] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۲ و تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۵۹

Marfat.com

تھیں۔صرف اس ایک چیونٹی ہی کو ہلاک کر دینے پر کیوں اکتفا نہیں کیا۔ ❶

آیت زیر بحث میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ مقولہ مذکور ہے ﴿وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ "ہم کو سب کچھ دیا گیا ہے" اس کے معنی صاف اور متبادر یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہم کو ایسا نوازا ہے کہ اپنی نعمتوں کی ہم پر بارش کر دی ہے اور یہ کہ گویا کائنات کی ہر چیز ہم کو میسر ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سباء:

قرآن عزیز نے سورۂ نمل میں حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سباء کا ایک واقعہ قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے، جو اپنے تفصیلی اور جزئی واقعات کے لحاظ سے بہت دلچسپ اور پیدا شدہ نتائج و بصائر کے پیش نظر بہت اہم تاریخی واقعہ ہے۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عظیم الشان اور بے مثال دربار میں انسانوں کے علاوہ جن اور حیوانات بھی درباری خدمات کے لیے فوج در فوج حاضر رہتے تھے اور اپنے اپنے مراتب اور مفوضہ خدمات پر بغیر چون و چرا تابع فرمان۔ ایک مرتبہ دربار سلیمانی اپنے پورے جاہ و حشم کے ساتھ منعقد تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے جائزہ لیا تو ہدہد کو اپنی جگہ پر غیر حاضر پایا۔ ارشاد فرمایا میں ہدہد کو موجود نہیں پاتا، اگر واقعی وہ غیر حاضر ہے تو اس کی یہ بے وجہ غیر حاضری سخت قابل سزا ہے، اس لیے میں اس کو یا تو سخت عذاب دوں گا، یا ذبح کر ڈالوں گا، ورنہ یا پھر وہ اپنی غیر حاضری کی معقول وجہ بتائے۔ ابھی زیادہ وقفہ نہیں ہوا تھا کہ ہدہد حاضر ہو گیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی باز پرس پر کہنے لگا کہ میں ایک ایسی یقینی اطلاع لایا ہوں جس کی خبر آپ کو پہلے سے نہیں ہے، وہ یہ کہ یمن کے علاقہ میں سبا کی ایک ملکہ رہتی ہے اور خدا نے اس کو سب کچھ دے رکھا ہے اور اس کا تخت سلطنت اپنی خاص خوبیوں کے اعتبار سے عظیم الشان ہے۔

ملکہ اور اس کی قوم آفتاب پرست ہے اور شیطان نے ان کو گمراہ کر رکھا ہے اور وہ مالک کائنات، پروردگار عالم، وحدہ لا شریک لہ کی پرستش نہیں کرتے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: اچھا تیرے سچ جھوٹ کا امتحان ابھی ہو جائے گا تو اگر سچا ہے تو میرا یہ خط لے جا اور اس کو ان تک پہنچا دے اور انتظار کر کہ وہ اس کے متعلق کیا گفتگو کرتے ہیں۔

ملکہ کی گود میں جب خط گرا تو اس نے اس کو پڑھا اور پھر اپنے درباریوں سے کہنے لگی کہ ابھی میرے پاس ایک معزز مکتوب آیا ہے جس میں یہ درج ہے:

"یہ خط سلیمان کی جانب سے اور اللہ کے نام سے شروع ہے جو بڑا مہربان رحم والا ہے، تم کو ہم پر سرکشی اور سربلندی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے اور تم میرے پاس خدا کے فرمانبردار (مسلم) ہو کر آؤ"۔

ملکہ سباء نے خط کی عبارت پڑھ کر کہا: اے میرے ارکان دولت! تم جانتے ہو کہ میں اہم معاملات میں تمہارے مشورے کے بغیر کبھی کوئی اقدام نہیں کرتی اس لیے اب تم مشورہ دو کہ مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟ ارکان دولت نے کہا کہ جہاں تک مرعوب ہونے کا

---

❶ مسلم کتاب الانبیاء

Marfat.com

تعلق ہے تو اس کی قطعاً ضرورت نہیں کیونکہ ہم زبردست طاقت اور جنگی قوت کے مالک ہیں رہا مشورہ کا معاملہ تو فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے کہ جو مناسب ہو اس کے لیے حکم کیجئے۔

ملکہ نے کہا: بیشک ہم طاقتور اور صاحب شوکت ہیں، لیکن سلیمان کے معاملہ میں ہم کو عجلت نہیں کرنی چاہیے، پہلے ہم کو اس کی قوت و طاقت کا اندازہ کرنا ضروری ہے کیونکہ جس عجیب طریقہ سے ہم تک یہ پیغام پہنچا ہے وہ اس کا سبق دیتا ہے کہ سلیمان کے معاملہ میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا مناسب ہے۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ چند قاصد روانہ کروں اور وہ سلیمان کے لیے عمدہ اور بیش بہا تحائف لے جائیں، اس بہانہ سے وہ اس کی شوکت وعظمت کا اندازہ لگا سکیں گے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ ہم سے کیا چاہتا ہے، اگر واقعی وہ زبردست قوت وشوکت کا مالک اور شاہنشاہ ہے تو پھر اس سے ہمارا لڑنا فضول ہے اس لیے کہ صاحب طاقت وشوکت بادشاہوں کا یہ دستور ہے کہ جب وہ کسی بستی میں فاتحانہ غلبہ کے ساتھ داخل ہوتے ہیں تو اس شہر کو برباد اور باعزت شہریوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں اس لیے بے وجہ بربادی مول لینی کیا ضرور۔

جب ملکہ سبا کے قاصد تحائف لے کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا: تم نے اور تمہاری ملکہ نے میرے پیغام کا مقصد غلط سمجھا۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ان ہدایا کے ذریعہ "جن کو تم بیش بہا سمجھ کر بہت مسرور ہو" مجھ کو پھسلاؤ، حالانکہ تم دیکھ رہے ہو کہ خدائے تعالیٰ نے مجھ کو جو کچھ مرحمت فرمایا ہے اس کے مقابلہ میں تمہاری یہ بیش بہا دولت قطعاً ہیچ ہے، لہٰذا تم اپنے ہدایا واپس لے جاؤ اور اپنی ملکہ سے کہو کہ اگر اس نے میرے پیغام کی تعمیل نہیں کی تو میں ایسے عظیم الشان لشکر کے ساتھ سبا والوں تک پہنچوں گا کہ تم اس کی مدافعت اور مقابلہ سے عاجز رہو گے اور پھر میں تم کو ذلیل ورسواء کر کے شہر بدر کر دوں گا۔

قاصدوں نے واپس جا کر ملکہ سبا کے سامنے تمام روئداد سنائی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی شوکت وعظمت کا جو کچھ مشاہدہ کیا تھا وہ حرف بحرف کہہ سنایا اور بتایا کہ اس کی حکومت صرف انسانوں ہی پر نہیں ہے بلکہ جن اور حیوانات بھی ان کے تابع فرمان اور مسخر ہیں۔ ملکہ نے جب یہ سنا تو طے کر لیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے لڑنا اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے، بہتر یہی ہے کہ اس کی دعوت پر لبیک کہا جائے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے مکتوب گرامی میں یہ جملہ بھی تھا ﴿وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ﴾ چونکہ ملکہ سباء حضرت سلیمان علیہ السلام کے دین و مذہب سے ناواقف تھی اس لیے اس نے لفظ مسلم کو لغوی معنی پر محمول کرتے ہوئے یہ سمجھا کہ قاہر بادشاہوں کی طرح سلیمان علیہ السلام کا مقصد بھی یہ ہے کہ میں اس کی فرمانبرداری اور شان حکومت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے ماتحت ہو جانا قبول کر لوں۔ لہٰذا اس نے یہ طے کر کے سفر شروع کر دیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں روانہ ہو گئی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو "وحی" کے ذریعہ معلوم ہو گیا کہ ملکہ سباء حاضر خدمت ہو رہی ہے، تب آپ نے اپنے درباریوں کو مخاطب کر کے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ ملکہ سباہ کے یہاں پہنچنے سے پہلے اس کا تخت شاہی اٹھا کر یہاں لے آیا جائے تم میں سے کون اس خدمت کو انجام دے سکتا ہے؟ یہ سن کر ایک دیو پیکر جن نے کہا کہ آپ کے دربار برخاست کرنے سے پہلے میں تخت کو لا سکتا ہوں، مجھ کو یہ طاقت حاصل ہے اور یہ کہ میں اس کے بیش بہاء سامان کے لیے امین ہوں، ہرگز خیانت نہیں کروں گا۔

دیو پیکر جن کا یہ دعویٰ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر نے کہا کہ میں آنکھ جھپکتے اس کو آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا

Marfat.com

ہوں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے رخ پھیر کر دیکھا تو ملکہ سباء کا تخت موجود پایا۔ فرمانے لگے: یہ میرے پروردگار کا فضل و کرم ہے، وہ مجھ کو آزماتا ہے کہ میں اس کا شکر گزار بنتا ہوں یا نافرمان، اور حقیقت تو یہ ہے کہ جو شخص اس کا شکر گزار ہوتا ہے وہ دراصل اپنی ذات ہی کو نفع پہنچاتا ہے اور جو نافرمانی کرتا ہے تو خدا اس کی نافرمانی سے بے پروا اور بزرگ تر ہے اور اس کا وبال خود نافرمانی کرنے والے ہی پر پڑتا ہے۔

خدائے تعالیٰ کے ادائے شکر کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے حکم دیا کہ اس تخت کی ہیئت میں کچھ تبدیلی کر دی جائے، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ملکہ سبا یہ دیکھ کر حقیقت کی طرف راہ یاب ہوتی ہے یا نہیں۔

کچھ عرصے کے بعد ملکہ سباء حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گئی اور جب دربار میں حاضر ہوئی تو اس سے دریافت کیا گیا: کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ عقلمند ملکہ نے جواب دیا: "ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہی ہے" یعنی تخت کی ساخت اور مجموعی حیثیت تو یہ بتا رہی ہے کہ یہ میرا ہی تخت ہے اور قدرے ہیئت کی تبدیلی اس یقین میں تردد پیدا کر رہی ہے اس لیے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ یقیناً میرا ہی تخت ہے۔

ملکہ سباء نے ساتھ ہی یہ بھی کہا: مجھ کو آپ کی بے نظیر اور عدیم المثال قوت و طاقت کا پہلے سے علم ہو چکا ہے اسی لیے میں مطیع اور فرمانبردار بن کر حاضر خدمت ہوئی ہوں اور اب تخت کا یہ محیر العقول معاملہ تو آپ کی لاثانی طاقت کا تازہ مظاہرہ ہے اور ہماری اطاعت و انقیاد کے لیے مزید تازیانہ، اس لیے ہم پھر ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں اظہار وفاداری و فرمانبرداری کرتے ہیں۔

ملکہ نے یقین کر لیا کہ ﴿ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴾ "ہم فرمانبردار ہیں" کہہ کر ہم نے سلیمان علیہ السلام کے پیغام کی تعمیل کر دی اور اس کے مقصد کو پورا کر دیا اور ملکہ کی مشرکانہ زندگی اور آفتاب پرستی مانع آئی کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پیغام کی حقیقت سمجھ سکے اور ہدایت کی جانب راہ یاب ہو سکے، اس لیے اب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اظہار مقصد کے لیے دوسرا لطیف طریقہ اختیار فرمایا اور اس کی ذکاوت و فطانت کو مہمیز کیا وہ یہ کہ انہوں نے جنوں کی مدد سے ایک عالیشان شیش محل تیار کرایا تھا جو آبگینہ کی چمک، قصر کی رفعت اور عجیب و غریب صنعت کاری کے لحاظ سے بے نظیر تھا اور اس میں داخل ہونے کے لیے سامنے جو صحن پڑتا تھا اس میں بہت بڑا حوض کھدوا کر پانی سے لبریز کر دیا تھا اور پھر شفاف آبگینوں اور بلور کے ٹکڑوں سے ایسا نفیس فرش بنایا گیا تھا کہ دیکھنے والے کی نگاہ دھوکا کھا کر یہ یقین کر لیتی تھی کہ صحن میں صاف و شفاف پانی بہہ رہا ہے۔

ملکہ سبا سے کہا گیا کہ قصر شاہی میں قیام کرے، ملکہ محل کے سامنے پہنچی تو شفاف پانی بہتا ہوا پایا، یہ دیکھ کر ملکہ نے پانی میں اترنے کے لیے کپڑوں کو ساق سے اوپر چڑھایا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا، اس کی ضرورت نہیں، یہ پانی نہیں ہے، سارے کا سارا محل اور اس کا خوبصورت صحن چمکتے ہوئے آبگینہ کا ہے۔

ملکہ کی ذکاوت و فطانت پر یہ سخت چوٹ تھی جس نے حقیقت حال سمجھنے کے لیے اس کے قوائے عقلی کو بیدار کر دیا اور اس نے اب سمجھا کہ اس وقت تک یہ جو کچھ ہوتا رہا ہے ایک زبردست بادشاہ کی قاہرانہ طاقتوں کا مظاہرہ نہیں ہے بلکہ مجھ پر یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ سلیمان علیہ السلام کو یہ بے نظیر طاقت اور یہ معجزانہ قدرت کسی ایسی ہستی کی عطاء کردہ ہے جو شمس و قمر بلکہ کل کائنات کا تنہا مالک ہے اور اس لیے سلیمان علیہ السلام مجھ سے اپنی تابعداری اور فرمانبرداری کا طالب نہیں بلکہ اسی "یکتا ذات" کی اطاعت و انقیاد کی

دعوت دینا اس کا مقصد ہے۔

ملکہ کے دماغ میں یہ خیال آنا تھا کہ اس نے فوراً حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے ایک شرمسار اور نادم انسان کی طرح درگاہِ الٰہی میں یہ اقرار کیا "پروردگار! آج تک ماسوی اللہ کی پرستش کر کے میں نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا، مگر اب میں سلیمان کے ساتھ ہو کر صرف ایک خدا ہی پر ایمان لاتی ہوں جو تمام کائنات کا پروردگار ہے" اور اس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے پیغام ﴿وَ اْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ﴾ کی حقیقی مراد تک پہنچ کر اس نے دین اسلام اختیار کر لیا۔

قرآن عزیز نے ملکہ سباء کے اس واقعہ کو ایسے معجزانہ اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے کہ واقعہ کے بیان کرنے سے جو حقیقی مقصد ہے یعنی "تذکیر" وہ بھی نمایاں رہے اور واقعہ کے اہم اور ضروری حصے بھی ذکر میں آ جائیں اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو علم "منطق الطیر" عطا ہونے کا جو پہلی آیات میں ذکر ہے اس کی شہادت کے لیے یہ دوسرا واقعہ ہے جو ہدہد (پرند) اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے مکالمے سے شروع ہوتا ہے:

﴿وَ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَاۤ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ۝۲۰ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا
شَدِيْدًا اَوْ لَاۡاَذْبَحَنَّهٗۤ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۲۱ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ
بِهٖ وَ جِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ۝۲۲ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّ لَهَا عَرْشٌ
عَظِيْمٌ ۝۲۳ وَجَدْتُّهَا وَ قَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ
فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝۲۴ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ
وَ يَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ۝۲۵ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝۲۶ قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ
اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۲۷ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَا ذَا
يَرْجِعُوْنَ ۝۲۸ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ۝۲۹ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ
الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۳۰ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَ اْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝۳۱ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ ۚ مَا
كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ۝۳۲ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّ الْاَمْرُ اِلَيْكِ
فَانْظُرِيْ مَا ذَا تَاْمُرِيْنَ ۝۳۳ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ
اَذِلَّةً ۚ وَ كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝۳۴ وَ اِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ۝۳۵ فَلَمَّا
جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَاۤ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ
تَفْرَحُوْنَ ۝۳۶ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَ لَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَاۤ اَذِلَّةً وَّ هُمْ
صٰغِرُوْنَ ۝۳۷ قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝۳۸ قَالَ عِفْرِيْتٌ

Marfat.com

مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَ اِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ۝ قَالَ الَّذِيْ
عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ
هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۖ۫ لِيَبْلُوَنِيْۤ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَ مَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ
رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْۤ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝ فَلَمَّا
جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ ۝ وَ
صَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۝ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا
رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ۬ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ
ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (النمل: ۲۰-۴۴)

"اور پرندوں کا جائزہ لیا تو کہنے لگا: کیا وجہ میں ہدہد کو نہیں پاتا، کیا واقعی وہ غائب ہے؟ ایسا ہے تو ضرور میں اس کو سخت عذاب میں ڈالوں گا یا ضرور اس کو ذبح کروں گا اور یا میرے پاس غیر حاضری کی معقول وجہ بیان کرے۔ بہت دیر نہیں لگی کہ (ہدہد) نے حاضر ہو کر کہا: میں ایسی خبر لایا ہوں جس کا آپ کو پہلے سے علم نہیں تھا۔ میں سبا کی ایک یقینی خبر لے کر آپ کے پاس حاضر آیا ہوں، میں نے ایک عورت کو ملکہ دیکھا جو اہل سباء پر حکومت کرتی ہے اور اس کے پاس سب کچھ مہیا ہے اور اس کا ایک عظیم الشان تخت ہے۔ میں نے اس کو اس حال میں پایا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کے سوا آفتاب کی پرستش کرتی اور اس کے سامنے سربسجود ہوتی ہے اور شیطان نے ان کے ان کاموں کو بھلا اور اچھا دکھا رکھا اور راہ مستقیم سے ہٹا رکھا ہے، لہٰذا وہ راہ یاب نہیں ہوتے (تعجب ہے) کہ وہ کیوں اس اللہ کو سجدہ نہیں کرتے جو نکالتا ہے آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں، اور جو تم ظاہر کر کے کرتے اور چھپا کر کرتے ہو، ان سب کا جاننے والا ہے۔ اللہ ہے اس کے ماسواء کوئی خدا نہیں، وہ پروردگار ہے عرش عظیم کا۔ سلیمان (علیہ السلام) نے کہا: ہم اب دیکھتے ہیں کہ تو اپنے قول میں سچا ہے یا جھوٹا ہے۔ لے یہ میرا خط لے جا اور ان کی طرف ڈال دے۔ پھر ان کے پاس سے ہٹ کر دیکھ وہ کیا جواب دیتے ہیں (ملکہ) کہنے لگی: اے درباریو! میرے پاس ایک معزز خط ڈالا گیا ہے۔ (اس میں تحریر ہے) "یہ خط ہے سلیمان (علیہ السلام) کی طرف سے اور وہ یہ ہے کہ اس اللہ کے نام سے شروع جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے، تم کو چاہیے کہ مجھ پر برتری کا اظہار نہ کرو اور میرے مقابلہ میں قوت کا مظاہرہ نہ کرو اور چلے آؤ میرے پاس مسلمان ہو کر" کہنے لگی اے میری جماعت! مجھ کو میرے معاملہ میں مشورہ دو (کیونکہ) میں تمہارے بغیر مشورہ کوئی فیصلہ نہیں کرتی۔ انہوں نے جواب دیا: ہم بہت قوت والے اور سخت جنگجو ہیں، آگے تیرے اختیار میں ہے تو غور کر لے کہ تیرا کیا حکم ہے (ملکہ نے) کہا: "بادشاہ جب (فاتحانہ) کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو خراب کرتے اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ سلاطین ایسا ہی کرتے ہیں اور میں ان کی جانب کچھ ہدایا بھیجتی ہوں پھر دیکھتی ہوں کہ قاصد کیا جواب لے کر واپس

Marfat.com

آتے ہیں۔ قاصد جب سلیمان (علیہ السلام) کے پاس پہنچا تو سلیمان نے کہا کیا تم میری مالی اعانت کرنا چاہتے ہو (جو یہ بیش بہا ہدایا لے کر آئے ہو) مجھے نہیں چاہئیں تم ہی اپنے ان تحفوں سے خوش رہو۔ تو واپس جا (اگر میرے پیغام کا یہی جواب ہے) تو ہم ان پر آ پہنچتے ہیں، ایسا لشکر لے کر جن کا مقابلہ ان سے نہ ہو سکے اور ہم ان کو ذلیل کر کے ان بستیوں سے نکال دیں گے (قاصد نے جواب سنایا تو ملکہ نے فوراً ارادہ کر لیا کہ سلیمان تک پہنچے۔ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کو یہ معلوم ہوا تو) سلیمان نے کہا: اے درباریو! تم میں کوئی ایسا ہے جو اس کا تخت لے آئے قبل اس کے کہ وہ فرمانبردار ہو کر آ پہنچے۔ ان میں سے ایک دیو پیکر جن نے کہا: میں اس کو آپ کی مجلس برخاست ہونے سے پہلے لا سکتا ہوں اور مجھ کو یہ قدرت حاصل ہے اور میں اس کے بارے میں امین ہوں اور جس کے پاس کتاب (الٰہی) کا علم تھا، اس نے کہا: میں تیری پلک جھپکتے اس کو حاضر کر سکتا ہوں۔ پھر سلیمان نے (پلک جھپکتے ہی) اس کو اپنے پاس موجود پایا تو کہا: یہ میرے پروردگار کا فضل ہے میری آزمائش کے لیے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری اور جو شکر کرتا ہے وہ اپنے نفس کے لیے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو میرا پروردگار بے پرواہ ہے کرم والا ہے۔ سلیمان (علیہ السلام) نے کہا اس تخت کی ہیئت بدل کر اس کو عورت کے سامنے پیش کرو ہم دیکھیں گے کہ وہ سمجھ پاتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جن کو سمجھ نہیں، جب وہ آ پہنچی تو اس سے کہا گیا: کیا ایسا ہی ہے تیرا تخت؟ اس نے کہا: گویا یہ وہی ہے اور ہم کو (سلیمان (علیہ السلام) کی بےنظیر طاقت کا) پہلے سے علم ہو چکا ہے اور ہم اس کے فرمانبردار ہیں اور اس کو (ایمان لانے سے) روکے اس چیز نے جس کو وہ خدا کے ماسواء پوجتی تھی، بےشبہ وہ قوم کافرین میں سے تھی (اب) اس سے کہا گیا محل میں چلو، اس نے محل (کی ساخت) کو دیکھا تو سمجھی کہ گہرا پانی بہہ رہا ہے اور (سوچ کر پار ہونے کے لیے) اپنی پنڈلیاں کھولیں (کسی نے کہا) یہ تو ایک محل ہے جس میں جڑے گئے ہیں آبگینے کہنے لگی: اے پروردگار! میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور میں اب سلیمان (علیہ السلام) کے ساتھ ایمان لاتی ہوں اس اللہ پر جو پروردگار ہے جہانوں کا۔"

چند قابل تحقیق مسائل:

حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا کے واقعہ سے متعلق چند مسائل قابل تحقیق ہیں، جن کا حل ہونا ازبس ضروری ہے اور وہ ترتیب وار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

سباء کی تحقیق:

سباء کے متعلق مفصل تحقیق تو "سیل عرم" کی بحث میں آئے گی، یہاں صرف اس قدر معلوم ہو جانا کافی ہے کہ قحطانی نسل کی ایک مشہور شاخ سباء ہے، یہ اپنے قبیلہ کا جد اعلیٰ تھا اور اس کا نام عمر یا عبد شمس تھا اور سبا اس کا لقب، یہ عرب مؤرخین اور جدید مؤرخین کی تحقیق ہے اور توراۃ کا بیان ہے کہ اس کا نام ہی سبا تھا۔ یہ شخص بہت جری اور صاحب ہمت تھا اور اس نے زبردست فتوحات کے ذریعہ حکومت سباء کی بنیاد ڈالی۔ سبا کا زمانہ عروج محققین کے نزدیک تقریباً ۱۱۰۰ ق م سمجھا جاتا ہے اس لیے کہ تقریباً ۱۰۰۰ ق م اس کی حکومت و طاقت اور عروج کا ذکر داؤد علیہ السلام کی زبور میں موجود ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اے خدا بادشاہ کو اپنی عدالتیں عطاء کر اور بادشاہ کے بیٹے کو اپنی صداقت دے۔ وہ تیرے لوگوں میں صداقت سے حکم

Marfat.com

کرے گا.......ترسیس اور جزیروں کے سلاطین نذریں دیں گے اور سباء اور سباء کے بادشاہ ہدیے گزاریں گے...... وہ جیتا رہے گا اور سبا کا سونا اسے دیا جائے گا اس کے حق میں سدا دعا ہوگی۔"❶

چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کی یہ دعا قبول ہوئی اور تقریباً ۹۵۰ ق م میں ملکہ سباء نے حاضر ہو کر سباء کا سونا اور جواہرات نذر گزارے بلکہ مسلمان ہو کر حکومت سبا کو ہی حضرت سلیمان علیہ السلام کے زیر فرمان کر دیا۔

سباء کی حکومت کا اصل مرکز عرب کے جنوبی حصہ یمن کے مشرقی علاقہ میں تھا اور دارالحکومت کا نام مارب تھا، اس کو شہر سباء بھی کہتے تھے اور آہستہ آہستہ اس کا دائرہ وسیع ہو کر مغرب میں حضرموت تک وسیع ہو گیا تھا اور دوسری جانب افریقہ تک بھی اس کا اثر پہنچ چکا تھا، چنانچہ حبشہ میں اذینہ کا علاقہ سبا کے ماتحت تھا جس پر معافر ایک سبائی گورنر حکومت کرتا تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ معین کی حکومت زوال پذیر تھی اور سبا نے یمن اور اطراف یمن میں اپنے مشہور قلعے تعمیر کر لیے تھے اور معین کے قلعے کھنڈر کی صورت میں بدلتے جا رہے تھے۔ سبا کی مختلف شاخیں تھیں اور عرصہ دراز کے بعد ان میں سے متعدد شاخوں نے یمن کو مرکز حکومت بنا کر عظیم الشان تمدن اور حکومت کی بنیادیں قائم کر لی تھیں، ان میں سے حمیر اور تبابعہ مشہور حکمران شاخیں ہیں اور ان سے قبل کے سبا کے حکمران ملوک سبا کے لقب سے مشہور ہیں اور ملوک سبا کا آخری دور حکومت ۵۵۰ ق م بتایا جاتا ہے۔❷

ملکہ سباء کا نام:

قرآن عزیز نے حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سباء کے واقعہ میں نہ یہ بتایا کہ اس ملکہ کا نام کیا تھا اور نہ یہ تعیین کی کہ وہ سباء کے دائرہ حکومت کے تین مرکز یمن، حبشہ، شمالی عرب میں سے کس حصہ سے آئی تھی۔ کیونکہ اس کے مقصد کے لیے یہ دونوں باتیں غیر ضروری ہیں مگر عرب یہود کی اسرائیلی داستانوں میں اس کا نام بلقیس مذکور ہے اور "اہل حبشہ جن کو دعویٰ ہے کہ وہ ملکہ سبا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسل سے ہیں" اپنی زبان میں ملکہ کا نام ماکدہ بیان کرتے ہیں۔

جہت کے متعلق ترگوم❸ میں ہے کہ اس کا ملک فلسطین سے مشرق میں ہے اور انجیل❹ میں ہے کہ فلسطین کے جنوب میں ہے۔ یوسیفوس❺ کی تاریخ میں ہے کہ وہ مصر و حبشہ کی ملکہ تھی اور اہل حبش اس کو حبشی نژاد سمجھتے اور شاہان حبش آج تک فخر یہ یہ کہتے ہیں کہ وہ ملکہ سبا (بلقیس) کی نسل سے ہیں۔

ان روایات میں اہل تحقیق یوسیفوس کی روایت کو غلط کہتے ہیں اور باقی دونوں روایتوں کا حاصل ایک ہی ظاہر کرتے ہیں۔ اس لیے یہ دونوں حصے یمن ہی کی حکومت کے حصے تھے اور انجیل کے بیان کو زیادہ صحیح مانتے ہیں۔ ماہرین اثریات (Archaedagists) کہتے ہیں کہ خاص یمن کے علاقہ میں کتبات اور دیگر حضریات سے کسی عورت کا حکمراں ہونا ثابت نہیں ہوتا، البتہ شمالی عرب متصل عراق میں چار قدیم حکمران عورتوں کے نام ضرور ملتے ہیں، لہٰذا زیادہ امکان یہ ہے کہ ملکہ سباء اسی حصہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں پہنچی ہے۔

---

❶ زبور ۷۲ (سلیمان علیہ السلام کا زبور) ❷ معجم البلدان، دائرۃ المعارف ذکر سباء ❸ جیوش انسائیکلو پیڈیا "سباء"
❹ متی باب ۱۲ آیت ۴۲ لوقا باب ۱۱ آیت ۳۱ ❺ ارض القرآن ماخوذ تاریخ یوسیفوس جلد ا ذکر سلیمان علیہ السلام

Marfat.com

هُد هُد:

قرآن عزیز نے بہت صاف اور واضح طور پر یہ بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا قاصد ہد ہد پرندہ تھا، لیکن قانون قدرت اور نیچر کا نام لے کر آج کل کے بعض اہل علم اس قسم کے اعجاز نما واقعات سے بھڑکتے اور ان کو خلاف عقل کہہ کر آیات قرآنی کے انکار پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اگر مذہب پر بہت احسان فرماتے ہیں تو آیات کی معنوی تحریف کر کے رکیک تاویلات اور قرآن کی مراد کے خلاف خود ساختہ توجیہات بیان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس مقام پر بھی یہی پیش آیا کہ اول پرندہ کا بات چیت کرنا خلاف عقل قرار دیا گیا اور پھر واقعہ زیر بحث سے متعلق آیات کے معنی بیان کیے گئے اور کہا گیا کہ پہلے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ مشرکین اکثر اپنی اولاد کے نام دیوتاؤں اور دیویوں کے نام پر رکھ لیا کرتے تھے، جن میں حیوانات کے نام بھی ہوتے تھے۔ لہٰذا اس جگہ بھی ہد ہد سے پرندہ مراد نہیں ہے بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا قاصد "انسان" مراد ہے جس کا نام غالباً ہد ہد ہوگا۔ لیکن جب ان پر یہ اعتراض وارد ہوا کہ قرآن عزیز نے جبکہ صاف الفاظ میں یہ کہا ہے کہ ﴿وَ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ﴾ "پرندوں کا جائزہ لیا" تو ہد ہد کو انسان کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ تب مولوی چراغ علی نے اس کی یہ توجیہ بیان کی کہ اس جگہ طیر کے معنی "فوج" کے ہیں۔ یعنی جب سلیمان علیہ السلام نے فوج کا جائزہ لیا۔ مگر افسوس کہ ان کے یہ معنی بے سند اور عربی لغت کے پیش نظر باطل ہیں اور یہ مسلم ہے کہ لغت میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے بلکہ وہ اہل زبان کے استعمال کے تابع ہے اور اہل عرب حقیقی اور مجازی کسی معنی کے اعتبار سے بھی "طیر" بمعنی "فوج" نہیں استعمال کرتے، نیز "الطیر" اور "طیر" متعلقات و اضافات سے مجرد ہونے کی صورت میں صرف "پرندہ" کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

قرآن عزیز اس زندہ زبان میں نازل کیا گیا ہے جس کو ﴿لِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ﴾ کہا گیا ہے، یہ کسی مردہ زبان میں نہیں اتارا گیا کہ ہر شخص اپنی مرضی کے ماتحت جس لفظ کے جو چاہے معنی بیان کر دے۔ ایک شخص "اصحاب فیل" کے اصل واقعہ کا انکار کرنا چاہے تو ﴿طَيْرًا اَبَابِيْلَ﴾ میں طیر کے معنی بدشگونی کے اختیار کر لے اور دوسرا شخص اگر ہد ہد سلیمان کو پرندہ تسلیم کرنے سے منکر ہو تو وہ ﴿تَفَقَّدَ الطَّيْرَ﴾ میں "طیر" کے معنی "فوج" کے بیان کر دے خواہ دونوں معنی اپنے اپنے مقام پر لغت عربی کے لحاظ سے قطعاً غلط اور محاورۂ عرب کے اعتبار سے باطل ہی کیوں نہ ہوں۔ سخت تعجب ہے مولانا سید سلیمان ندوی سے کہ اس مقام پر مولوی چراغ علی کی تاویل باطل کا رد کرنے کے باوجود اس مسئلہ کو عقلی بنانے کے خیال میں یہ تحریر فرما رہے ہیں:

"اور اگر پرندوں کا بولنا اب بھی کھٹکتا ہے تو فرض کر لو کہ نامہ بر کبوتروں کی طرح تربیت یافتہ نامہ بر ہد ہد ہوگا اور اس کے بولنے سے مقصود اس مضمون کا خط اس کے پاس ہونا سمجھ لو جیسا کہ خود اس موقعہ پر قرآن مجید میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط دے کر اس کو ملکہ سباء کے پاس بھیجا۔ اسی طرح پہلے بھی خط لے کر آیا ہوگا۔" [1]

تعجب اس لیے ہے کہ جب کہ قرآن عزیز "منطق الطیر" کو اور "نملہ" اور "ہدہد" کے واقعات کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے عظیم الشان نعمت اور بے غایت احسان ظاہر کر رہا ہے اور قرآن عزیز کا سیاق اور سباق ان واقعات کو ایسے انداز میں ہونا بیان کرتا ہے جس سے ہد ہد کا پرندہ ہو کر حضرت سلیمان علیہ السلام سے باتیں کرنا صاف اور صریح معلوم ہوتا ہے تو چند فطرت پرستوں کے بے دلیل انکار اور حقائق ثابتہ کو اپنے ناقص علم میں محدود مان کر وحی کے دیے ہوئے علم کے انکار پر اصرار کی خاطر سید صاحب نے کیوں ایسی

[1] ارض القرآن ج ۱، ص ۲۶۸

Marfat.com

تاویل بیان کی جو قرآن عزیز کے بیان کردہ مقصد کے خلاف ہے نیز کسی واقعہ کا تورات یا اسرائیلی روایات میں منقول ہونا اس کے باطل ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ جب قرآن عزیز یا احادیث صحیحہ میں بدلائل اس کے باطل اور لغو ہونے کو واضح کریں یا قرآن و حدیث کے روشن اصول و مسلمات کے خلاف وہ کوئی بات بیان کریں یا ایسی تفصیلات نقل کریں کہ جو قرآن و حدیث میں مذکور نہیں ہیں اور عقل و درایت کی نگاہ میں لغو و فضول ہیں تو بے شبہ اس قسم کی تمام اسرائیلی روایات قابل رد ہیں لیکن ایک واقعہ بصراحت قرآن یا حدیث میں موجود ہے توراۃ یا اسرائیلی ادبیات بھی اسی طرح کا واقعہ نقل کرتی ہیں تو محض اس لیے کہ یہ واقعہ اسرائیلی روایات میں بھی مذکور ہے اس کو غلط قرار دے کر قرآن کے صاف اور صریح مطالب میں بھی تحریف یا رکیک تاویلات کا باب کھول دینا ہرگز جائز نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے برعکس اسرائیلی ادبیات میں منقول شدہ واقعہ کو قرآن اور حدیث کے مصرحہ واقعہ کی تائید میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ہد ہد (پرندہ) حضرت سلیمان علیہ السلام کا پانی کے لیے مہندس تھا۔ زمین کے اندر جس جگہ بھی پانی ہوتا اور لشکر کو ضرورت پیش آتی تو ہد ہد بتا دیتا کہ اس جگہ اس قدر گہرائی پر پانی ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام جنوں سے کھدائی کروا کر پانی کو کام میں لاتے۔ [1]

ملکہ سباء کا تخت:

ملکہ سباء کے تخت کی تعریف ہد ہد کی زبانی ہم سن چکے ہیں اور اس سلسلہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ بھی قرآن میں مذکور ہے کہ ان کے حکم سے نگاہ پلٹتے ہی وہ تخت سباء کے ملک سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں پیش کر دیا گیا۔ اس کے متعلق قرآن عزیز کی چند تصریحات کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

① ملکہ نے اپنے قاصدوں کے ہاتھ جو ہدایا بھیجے تھے حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

﴿ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ۝﴾ (النمل: ۳۶)

② جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ ملکہ سبا (حضرت سلیمان علیہ السلام کے ملک کی جانب) روانہ ہوگئی تو درباریوں سے کہا کہ اس کے یہاں آنے سے قبل کون اس کے تخت کو میرے پاس لاسکتا ہے۔

﴿ قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝﴾ (النمل: ۳۸)

③ اول ایک دیو پیکر جن نے کہا کہ میں آپ کے دربار برخاست ہونے سے پہلے اس کو حاضر کر سکتا ہوں اور اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ کہا کہ میں بہت قوی ہوں اور اس تخت کے بیش قیمت سامان کے لیے امین بھی ہوں۔

﴿ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَ اِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ۝﴾ (النمل: ۳۹)

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۱

④ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر نے کہا کہ میں آپ کی نگاہ پلٹتے ہی اس کو پیش کر سکتا ہوں۔

﴿اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ﴾(النمل: ۴۰)

⑤ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے رخ پھیر کر دیکھا تو تخت کو اپنے نزدیک موجود پایا، یہ دیکھ کر انہوں نے خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا فضل میری اس آزمائش کے لیے ہے کہ میں اس کا شکر گزار بندہ ہوں یا نافرمان۔

﴿ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۖ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ ﴾(النمل: ۴۰)

⑥ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اب حکم دیا کہ اس کی ہیئت تبدیل کردو۔

﴿قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝﴾(النمل: ۴۱)

⑦ جب ملکہ سباء سفر کر کے دربار سلیمان میں پہنچ گئی تو اب اس سے یہ دریافت کیا گیا کہ یہ تخت ایسا ہی ہے جیسا کہ تیرا؟ اور اس نے عاقلانہ جواب دیا، گویا یہ وہی ہے:

﴿فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ﴾(النمل: ۴۲)

تخت سے متعلق اس تفصیل اور پھر اس کی ترتیب کو پیش نظر رکھیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن ایک ایسے تخت کا ذکر کر رہا ہے جس کی خبر ہدہد نے سلسلہ پیغام سے پہلے دی تھی وہ سلیمان علیہ السلام کے لیے بنایا نہیں گیا تھا اس لیے کہ قاصدوں کی معرفت جو ہدایا بھیجے گئے ان میں تخت کا کوئی ذکر نہیں ہے اور وہ واپس بھی گئے، مگر ملکہ کے آنے کی خبر سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام اس کا شاہی تخت اس کے پہنچنے سے قبل اپنے دربار میں منگانا چاہتے ہیں اور اس کا لانا ایسا عجیب و غریب ہے کہ جنوں میں سے بھی ایک بہت بڑا دیو پیکر جن یہ وعدہ کرتا ہے کہ دربار برخاست ہونے سے پہلے اٹھا کر لا سکتا ہوں مگر حضرت سلیمان علیہ السلام کا معتمد کہتا ہے کہ میں پلک جھپکتے حاضر کر دوں گا اور حاضر کر دیتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام خدا کے عطا کردہ اس اعجاز کو دیکھ کر اس کو خدا کا عظیم الشان فضل قرار دیتے ہیں اور اس کے بعد تخت کی ہیئت تبدیل کرنے کا حکم فرماتے ہیں اور ان تمام مراحل کے بعد اب ملکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں پہنچتی ہے اور تخت سے متعلق سوال و جواب ہوتے ہیں اور اس جگہ بھی قرآن ملکہ سباء کے کسی تحفہ کا ذکر نہیں کرتا۔

اس پوری تفصیل میں اپنی جانب سے کوئی تاویل اور توجیہ ہے اور نہ توڑ مروڑ کر اس کو اپنی خواہش کے مطابق کیا گیا ہے لہٰذا اس تخت کا معاملہ بے شک و شبہ اعجاز اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت و رسالت کا "نشان" ہے، اور جن حضرات نے اس کے علاوہ دوسرے معانی یا تفاسیر بیان کی ہیں وہ سب باطل ہیں۔ اس لیے کہ وہ یا تو قرآن کے صاف اور سادہ بعض حصوں کو نظر انداز کر کے بیان کی گئی ہیں جیسا کہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے کیا ہے یا اس کے بعض الفاظ سے غلط فائدہ اٹھا کر باقی پورے واقعہ حقیقت کو مسخ کر دیا گیا ہے۔

علامہ ندوی نے جو تاویل ان آیات کی فرمائی ہے اس کو مطالعہ کرنے کے بعد ارباب نظر خود انصاف فرما سکتے ہیں کہ قرآن عزیز کے زیر بحث واقعہ کا مضمون ان کی تاویل کے ساتھ کس درجہ مطابقت رکھتا ہے؟ فرماتے ہیں:

"ہماری رائے یہ ہے کہ ملکہ سبا نے تحفہ کے طور پر حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اپنے ملک کی صنعت کاری کی ایک چیز تیار کرائی تھی اور چونکہ یہ تحفہ تھا ضرور ہے کہ ملکہ اپنے ساتھ شام لائی ہوگی، تحفہ کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ قرآن نے سباء کی پہلی سفارت میں تحفہ کا ذکر کیا اور تیلیم میں بھی سبا کے تحائف کا ذکر ہے۔

قرآن عزیز میں مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک درباری نے جو کتاب سے واقف تھا عرض کی کہ میں نظر پلٹنے سے پہلے ملکہ کا تخت اٹھا لاتا ہوں۔ نگاہ پلٹنے سے پہلے تخت اٹھالانے سے مقصود جیسا کہ ہماری زبان میں سرعت اور جلدی سمجھا جا سکتا ہے اسی طرح عربی زبان میں ﴿قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ﴾ سے یہی سمجھنا چاہیے۔ بعض تابعین اور مفسرین کبار نے بھی اس لفظ کے یہی معنی لیے ہیں اور یہ کہنا تو درحقیقت محاورات زبان سے نادانی کا ثبوت ہے کہ واقعتاً اس سے نگاہ پلٹنے کے ساتھ کام کا ہو جانا مقصود ہے۔"[1]

کاش کہ سید صاحب ان تابعین اور مفسرین کبار کا نام بھی ظاہر فرما دیتے جنہوں نے سید صاحب کی تاویل کے مطابق معنی بیان کیے ہیں ورنہ اس جملہ ﴿قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ﴾ سے سرعت اور جلدی کے معنی لینے کا تو کسی کو بھی انکار نہیں، فرق یہ ہے کہ سید صاحب اس سرعت کو محاورہ کی حدود میں محدود رکھنا چاہتے ہیں اور قرآن اس مقام پر ان حدود سے بالاتر ہو کر حضرت سلیمان علیہ السلام کا "نشان" ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے اس کو ﴿قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ﴾ کہنے والے کے مقابلہ میں ترجیح دی گئی ورنہ یہ تقابل فضول ہو جاتا ہے کیونکہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا مقصد یہ ٹھہرا کہ وہ توشہ خانے سے دربار میں ملکہ کی آمد سے قبل آ جائے تو ﴿قَوِيٌّ اَمِيْنٌ﴾ کی پیش کش اس کے لیے کافی تھی اور نہ یہ کوئی ایسا اہم معاملہ رہ جاتا جس پر مذاکرہ ہوتا اور قرآن اس کی تفصیل کو اتنی اہمیت دیتا۔

نجار نے اس موقع پر بہت عمدہ بات تحریر فرمائی ہے:

"حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کا تخت اس شخص کے ذریعہ جس کے پاس کتاب کا علم تھا جس خاص طریقہ سے منگایا وہ ایسا طریقہ ہے جس کو موجودہ علوم ابھی تک نہیں پا سکے اور تخت کا یہ واقعہ صریح نص سے ثابت ہے جو یقینی الثبوت والدلالت ہے اور ان مفسرین کی تاویل انتہائی رکیک اور قابل افسوس ہے جنہوں نے ﴿عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ کے یہ معنی بیان کیے کہ اس کے پاس مملکت سلیمان کا خریطہ رہتا تھا لہٰذا اسے معلوم تھا کہ یہ "تخت" سلیمان علیہ السلام کے کس توشہ خانہ میں رکھا ہے، اور خارق عادات معجزات کا جب ثبوت موجود ہو تو انکار اور بے دلیل انکار سے کیا فائدہ اس لیے کہ قوانین قدرت کا جو خالق ہے اس کو یہ بھی اختیار ہے اور وہ قدرت کے کسی عمل کو توڑ پھوڑ دے اور یہ کیوں نہ تسلیم کیا جائے کہ اس قسم کے معجزانہ اعمال کے لیے عام قوانین قدرت کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے خاص قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کار فرما ہیں جن کو ابھی تک "علم" معلوم نہیں کر سکا اور جن پر صرف وہی پاک نفوس مطلع ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں پر وہ نوامیس کے ذریعہ معجزات کا ظہور کراتا ہے۔" واللہ تعالیٰ یخلق ما یشاء و یختار"۔[2]

---

[1] ارض القرآن ج ا ص ۲۶۹۔۲۷۰

[2] قصص الانبیاء ص ۳۹۶

Marfat.com

عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ کی شخصیت:

مفسرین کہتے ہیں کہ جس شخص کے متعلق قرآن عزیز نے یہ کہا ہے کہ اس کے پاس کتاب کا "علم" تھا اس کا نام آصف بن برخیا تھا، اور یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا معتمد خاص اور کاتب (وزیر) تھا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی منقول ہے اور بعض مفسرین نے کچھ اور نام بھی ذکر کیے [2] ہیں مگر زیادہ پہلے قول ہی کو راجح تسلیم کرتے ہیں۔

مفسرین نے اس مسئلہ پر بھی بحث کی ہے کہ یہ شخص انسانوں میں سے تھا یا قوم جن سے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ قتادہ اور مجاہد کہتے ہیں کہ وہ انسانوں میں سے ہی تھا۔ [3]

اس شخص کے متعلق تیسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ آیت کے جملہ ﴿عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ میں علم کتاب سے کیا مراد ہے؟ وہب بن منبہ، مجاہد، محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسم اعظم سے واقف تھا، اور بعض جدید اہل قلم کہتے ہیں کہ اس سے حضرت سلیمان علیہ السلام کا درباری رجسٹر اور سرکاری دفتر مراد ہے یعنی اس کو ہدایا کے رجسٹر کے امین ہونے کی وجہ سے یہ علم تھا کہ وہ "تخت" توشہ خانہ کے کس حصہ میں محفوظ ہے اور سید سلیمان فرماتے ہیں:

"عربی محاورہ میں کتاب اکثر "خط" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے خود اسی جگہ قرآن میں دو جگہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے اس لیے آیت کا مقصود یہ ہے کہ درباریوں میں سے ملکہ سبا کے مضمون خط کا جس کو علم تھا وہ بطور تحفہ اپنے ساتھ ایک تخت لائی ہے۔ اس نے کہا "میں ابھی لاتا ہوں"۔

ہمارے نزدیک آخر کے دونوں قول غلط اور قرآن کی تصریحات کے خلاف ہیں اس لیے کہ زیر بحث تخت کا یہ معاملہ ملکہ سباء کے دربار سلیمان میں پہنچنے سے قبل کا ہے تعجب ہے کہ فطرت پرستوں کی مرعوبیت میں اس صاف اور واضح بات کو کیوں نظر انداز کر دیا گیا اسی طرح رجسٹر اور دفتر سے بھی اس معاملہ کا کوئی تعلق نہیں ہے ابھی تو ملکہ اور اس کے رفقاء یا اس کے ہدایا دربار سلیمانی میں پہنچے ہی نہیں اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملکہ کے آنے کی خبر وحی کے ذریعہ نہیں بلکہ ہدہد یا ملکہ سباء کے کسی قاصد کے ذریعہ ہوئی جو ملکہ کا خط لے کر ملکہ کے آگے روانہ ہوا تب بھی کسی جگہ نہ قرآن میں اور نہ اسرائیلیات میں یہ مذکور ہے کہ ملکہ سے پہلے اس کے تحفہ کا تخت حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں پہنچ چکا تھا، اس لیے انکل کے یہ تیر نشانہ پر ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ اور صحیح اور راجح قول یہ ہے کہ یہ شخص آصف ہو یا کسی اور نام سے موسوم، درحقیقت حضرت سلیمان علیہ السلام کا صحابی اور ان کا بہت مقرب تھا اور جس طرح صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شخصیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں نمایاں تھی اسی طرح یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا رفیق تھا اور ان کے شرف صحبت سے اس کو تورات اور زبور اور اسماء وصفات الٰہی سے متعلق اسرار وحقائق کا زبردست علم حاصل تھا اس لیے جب یہ جنوں میں سے ایک "عفریت" نے تخت سباء کو حاضر کرنے کا دعویٰ کیا تو اگرچہ مقصد کے حاصل ہونے کے لیے یہ مدت بھی کافی تھی مگر حضرت سلیمان علیہ السلام کا گوشہ خاطر یہ رہا کہ یہ عمل ﴿عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ﴾ کے ذریعہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ خدا کے کسی خاص بندہ کے ہاتھ پر ہونا چاہیے تاکہ ان کی پیغمبرانہ توجہ سے وہ "معجزہ" اور "نشان" بن کر ملکہ سباء کے سامنے پیش ہو۔ آصف نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۶۴، وتاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۴۔ [2] ایضاً [3] ایضاً

گوشۂ التفات کو سمجھ کر فوراً خود کو پیش کیا اور "عفریت" کی بیان کردہ مدت سے بھی بہت قلیل مدت میں حاضر کر دینے کا وعدہ کر لیا کیونکہ اس کو یقین تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی مبارک توجہ اس اعجاز کو پورا کر دکھائے گی۔ اور چونکہ معجزہ دراصل خدائے تعالیٰ کا اپنا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر کیا جاتا ہے (جیسا کہ قصص القرآن جلد اول میں گزر چکا) تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی صداقت نبوت اور عظمت رسالت کے اس نشان کو دیکھ کر ان الفاظ میں خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کیا ﴿هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ﴾ یعنی جو کچھ بھی ہوا اس میں آصف کی یا میری سعی اور قوت کا کوئی دخل نہیں بلکہ محض خدا کا فضل ہے جس نے یہ کام کر دکھایا ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝﴾

ملکہ سباء کا قبولِ اسلام:

حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا کا واقعہ اس حد پر جا کر ختم ہو جاتا ہے کہ ملکہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پیغمبرانہ جاہ وجلال کو دیکھ کر اسلام قبول کر لیا ﴿وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ اور اس مکمل واقعہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی یہی ایک غرض تھی جس کا اظہار انہوں نے اپنے پہلے مکتوب ہی میں کر دیا تھا، مگر ملکہ اس وقت اس غرض کو نہ پا سکی تھی۔

عام مفسرین کی نگاہوں میں یہ سوال حل طلب رہا ہے کہ اس مقصد کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام کا ملکہ کو اپنے دربار میں بلانا تو بیشک اپنی جگہ رکھتا ہے لیکن تخت کو اس طرح منگوانا اور آبگینہ کے محل کے سامنے ملکہ کے ساتھ پیش آمدہ معاملہ ہونا اس مقصد سے کیا تعلق رکھتا ہے؟ اور پھر خود ہی یہ جواب دیا ہے کہ اس سے ملکہ سبا پر یہ اثر ڈالنا مقصود تھا کہ وہ یہ یقین کر لے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بلانے کی غرض دنیوی لالچ اور دولت وحکومت میں اضافہ نہیں ہے بلکہ اس سے بلند وبالا دوسرا مقصد ہے نیز وہ یہ سمجھ جائے کہ یہ دونوں واقعات شاہانہ اقتدار اور قاہرانہ قوت وطاقت سے بالاتر اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی پیغمبرانہ صداقت کا نشان ہیں اسی لیے مفسرین نے ملکہ سبا کے قول ﴿كُنَّا مُسْلِمِیْنَ﴾ میں اسلام بمعنی ایمان مراد لیا ہے۔ یعنی ملکہ نے حقیقی معنی میں اسلام قبول کر لیا۔

لیکن مفسرین کی حکمت ومصلحت کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے ان کی اس دلیل پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے کہ ﴿كُنَّا مُسْلِمِیْنَ﴾ کہہ کر ملکہ نے اسلام قبول کر لیا تھا تو اس کے بعد کی آیات کے ان دو جملوں کے کیا معنی ہوں گے

﴿وَ صَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ ۝﴾ (النمل: ۴۳)

"اور اس کو ایمان لانے سے ماسوی اللہ (آفتاب) کی عبادت نے باز رکھا۔ کیونکہ بے شبہ وہ قوم کافرین میں سے تھی"۔

﴿قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ (النمل: ۴۴)

یعنی آبگینہ کے محل کے واقعہ سے متاثر ہو کر ملکہ نے یہ کہا کہ "اب تک میں نے شرک کر کے نفس پر ظلم کیا اور اب میں رب العالمین پر ایمان لاتی ہوں"۔

ان دونوں جملوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ﴿كُنَّا مُسْلِمِیْنَ﴾ کہتے وقت وہ مسلمان نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد دوسرے واقعہ سے متاثر ہو کر پھر دین اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا حالانکہ دونوں باتوں کا مظاہرہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار ہی میں ہو رہا تھا۔ چنانچہ مجاہد، سعید اور ابن جریر نے اس اعتراض کو تسلیم کرتے ہوئے زیر بحث آیات کی یہ تفسیر کی ہے کہ جملہ ﴿وَ اُوْتِیْنَا

﴿الْعِلْمَ﴾ سے ﴿مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ﴾ تک سب حضرت سلیمان علیہ السلام کا مقولہ ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ ہم کو ملکہ سباء کی آمد سے قبل ہی یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ملکہ کافروں میں سے ہے اور ہم بہر حال مسلمان ہیں اور ملکہ کو آفتاب پرستی نے ماسوی اللہ کی پرستش کا عادی بنا کر خدائے واحد کی عبادت سے روگرداں کر دیا ہے۔

اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے مجاہد کی اس تفسیر کو نقل کر کے کہا ہے کہ یہی قول راجح ہے اس لیے کہ ملکہ سباء ابھی تک مسلمان نہیں ہوئی تھیں بلکہ بصراحت قرآن وہ ﴿صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ﴾ (النمل : ٤٤) کے واقعہ کے بعد ایمان لائی ہے لہٰذا ﴿كُنَّا مُسْلِمِيْنَ﴾ اس کا مقولہ نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس تفسیر میں یہ سقم ہے کہ ضمائر کے مرجع میں بے ترتیبی اور خلل واقع ہوتا ہے یعنی جبکہ جملہ ﴿قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ﴾ میں ﴿قَالَتْ﴾ کی قائل ملکہ سبا ہے اور اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کا کوئی ذکر نہیں ہے تو بعد کے جملہ ﴿ وَ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴾ کو جو پہلے جملہ کے متصل ہے کس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کا مقولہ کہا جا سکتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ان دونوں جملوں کے درمیان ﴿قَالَ سُلَيْمٰنُ﴾ یا فقط ﴿قَالَ﴾ مقدر ہے تو یہ دعویٰ بے دلیل ہے اور جبکہ مرجع کے اختلال کے بغیر ہی آیات کی صحیح تفسیر ہو سکتی ہو تو بے وجہ مقدر ماننے کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے۔ چنانچہ آیات زیر بحث کی ایسی تفسیر جس میں یہ دونوں سقم بھی باقی نہ رہیں اور ہر دو واقعات کی حکمت و مصلحت بھی روشن اور نمایاں ہو جائے شیخ الہند[1] سے بواسطہ علامہ سید حسین احمد مدنی منقول ہے، فرماتے ہیں:

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کی معرفت جو پیغام بھیجا تھا اس میں یہ لکھ کر ﴿وَ اْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ﴾ ملکہ سباء کو صریح الفاظ میں دعوت اسلام دی تھی مگر ملکہ سباء چونکہ حقیقت توحید اور دین اسلام سے ناآشنا تھی اس لیے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے مطلب کو نہ سمجھ سکی اور مکتوب گرامی میں ﴿اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ﴾ کے بعد اس نے جب ﴿وَ اْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ﴾ کو پڑھا تو وہ شاہوں کی خط و کتابت کے پیش نظر یہ سمجھی کہ سلیمان علیہ السلام اپنے قاہرانہ اقتدار کے زور میں مجھ کو اور میری حکومت کو اپنا تابع فرمان اور زیر نگیں بنانا چاہتے ہیں اسی لیے اس نے اپنے درباریوں سے مشورہ کے بعد دریافت حال کے لیے وہ طریقہ اختیار کیا جس کا ذکر قرآن کر رہا ہے اور جب اس کو یہ یقین ہو گیا کہ درحقیقت سلیمان علیہ السلام کی شاہانہ عظمت اور قاہرانہ سطوت شہنشاہوں سے بھی زیادہ بلند ہے تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ سلیمان علیہ السلام سے جنگ مناسب نہیں اور ان کی اطاعت و انقیاد ہی میں نجات ہے اس لیے ملکہ شام کی جانب روانہ ہو گئی، حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب یہ اطلاع ملی کہ ملکہ سبا ان کی خدمت میں حاضری کے لیے روانہ ہو چکی ہے تو سوچا کہ ایسا کوئی لطیف طریقہ اختیار کرنا چاہیے جس سے ملکہ سبا خود یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائے کہ آفتاب پرستی یقیناً گمراہی ہے اور سیدھی اور سچی راہ یہ ہے کہ صرف خدائے واحد کی پرستش کی جائے۔

قوم سباء کا مذہب آفتاب پرستی تھا اور وہ اس فلسفہ کی قائل تھی کہ کائنات میں خیر و شر کی قدرت و طاقت کواکب کے ہاتھ میں ہے اور چونکہ آفتاب ان میں سب سے بڑا اور کائنات پر اثر انداز ہے اس لیے وہی اس قابل ہے کہ اس کی پرستش کی جائے اس لیے حضرت سلیمان علیہ السلام ملکہ کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ کائنات کی ان چھوٹی اور بڑی تمام اشیاء پر صرف ایک "حقیقت" کا تسلط ہے اور وہ

[1] حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی نور اللہ مرقدہ

Marfat.com

خدائے کائنات ہے اور آفتاب و ماہتاب، کواکب و سیارگان یہ سب اس کی مخلوق اور اس کی قدرت کے مظاہر ہیں لہٰذا انسان کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ وہ حقیقت کو چھوڑ کر مظاہر کی پرستش کرنے لگتا ہے کیونکہ وہ اس کے سامنے شاہد اور محسوس ہیں حالانکہ مظاہر صرف "حقیقت" کے وجود اور اس کی ہستی کے لیے دلیل ہیں نہ کہ بجائے خود "حقیقت" اسی لیے تغیر و تبدل، وجود و فنا، طلوع و غروب، ناپائیداری و بے ثباتی مظاہر کے رگ و ریشہ میں سرایت کیے ہوئے ہے اور حقیقت (ذات واحد) ان تمام تغیرات سے پاک اور بالاتر ہے یہی سوچ کر انہوں نے ملکہ کے شاہی تخت کو یمن سے اٹھا منگایا تا کہ اس کے نزدیک سے ایک مثال دے کر اس کو بتائیں اور اس پر یہ واضح اور ثابت کریں کہ دیکھ میرے اس دعوے کی دلیل خود تیرا یہ تخت شاہی ہے، غور کر کہ یہ تیری حکومت و سطوت کا مظہر ہے اور اسی لیے "تخت شاہی" کہلاتا ہے، مگر جوں ہی تو اپنے ملک سے غائب ہوئی یہ "مظہر" بے حقیقت ہو کر رہ گیا اور کل جو تیری سطوت کا مظہر تھا آج وہ میرے دربار کی زینت بنا ہوا ہے اور یہاں بھی تبدیل ہیئت و صورت کے ساتھ تجھ کو اپنی بے ثباتی اور ناپائیداری کا درس دے رہا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس ارادہ کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ جب انہوں نے ملکہ کا تخت اپنے دربار میں منگا لیا تو اس میں تغیر کا حکم دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا: ﴿ نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝ ﴾ ہم یہ اس لیے کرنا چاہتے ہیں کہ دیکھیں کہ وہ اس واقعہ سے متاثر ہو کر ہدایت قبول کرتی ہے یا گمراہ ہی رہتی ہے، اس اعتبار سے یہاں "ہدایت" سے خاص اسلام کی ہدایت مراد ہے نہ کہ محض "راہیاب" ہونا جو کہ ہر معاملہ کی حقیقت پر آگاہ ہو جانے کے لیے عام ہے۔

اس اسلوب بیان سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سباء پر یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ان کا جلال اور جبروت صرف شاہانہ اقتدار اور حاکمانہ قوت و سطوت کی وجہ سے ہی نہیں ہے بلکہ اس کی پشت پر خدائے تعالیٰ کی وہ طاقت کارفرما ہے جو شہنشاہوں کی قاہرانہ جبروت کی دسترس سے بھی بالاتر پیغمبرانہ جاہ و جلال کے ساتھ "نشان الٰہی" کے نام سے وابستہ رہتی ہے اور ساتھ ہی تبلیغ و دعوت کے مسطورہ بالا طریقہ خصوصی کے ذریعہ یہ بھی واضح کر دیا کہ سبا کی آفتاب پرستی حقیقت کو چھوڑ کر مظہر کی، باقی سے منہ موڑ کر فانی کی، قدیم سے روگرداں ہو کر حادث کی، صمد سے رخ بدل کر محتاج کی اور خالق سے نگاہ پھیر کر مخلوق کی پرستش ہے اور یہ سخت گمراہی اور ضلالت کی راہ ہے اور صراط مستقیم یہ ہے کہ صرف "حقیقت" (خدائے واحد) ہی کو نفع و ضرر اور خیر و شر کا مالک سمجھا جائے اور فقط اس کی ہی عبادت کی جائے۔

لیکن قوم سبا چونکہ صدیوں سے غیر اللہ کی پرستش میں اعتقاد رکھتی تھی اس لیے ملکہ اس لطیف دلیل کے سمجھنے سے قاصر رہی اور اس کی عقل و خرد حقیقت کی معرفت تک نہ پہنچ سکی اور "تخت" کے اس پورے واقعہ سے اس نے یہی نتیجہ نکالا کہ سلیمان علیہ السلام اس محیر العقول واقعہ سے اپنی بے مثال شان و شوکت کا مظاہرہ کر کے مجھ کو اپنی اطاعت و فرمانبرداری کے لیے متاثر کر رہے ہیں، چنانچہ ملکہ نے یہی سوچ کر یہ جواب دیا "آپ اگر یہ زبردست مظاہرہ نہ بھی کرتے تب بھی ہم کو پہلے سے آپ کے جلال و جبروت کا حال معلوم ہو چکا ہے اور ہم آپ کے تابع اور حکم بردار ہو چکے ہیں" اور ملکہ کے اس جواب کو نقل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے درمیان میں اس کی صدیوں کی گمراہی اور معاملہ کی اصل حقیقت کے متعلق قصور فہم کی وجہ بھی یہ بیان فرما دی کہ آفتاب پرستی کی مداومت نے اب بھی اس کو قبول اسلام سے باز رکھا اور وہ کافر ہی رہی۔

Marfat.com

یہی دو باتیں ہیں جو آیات ذیل میں بغیر کسی تاویل کے صاف اور واضح طور پر بیان کی گئی ہیں:

﴿قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ ۝ وَ صَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۝﴾ (النمل: ۴۲-۴۳)

اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے دوسرا مظاہرہ کیا جو اس بارہ میں پہلے سے زیادہ واضح اور روشن تھا اور یہ آبگینہ کے محل کا واقعہ تھا۔ ملکہ نے جب یہ سمجھ کر کہ صاف شفاف پانی بہہ رہا ہے اپنے کپڑے سمیٹے اور پانی میں اترنے کا ارادہ کیا تو اس کو بتایا گیا کہ جس کو تو پانی سمجھ رہی ہے وہ آبگینہ کا عکس ہے پانی نہیں ہے۔ ملکہ پر جب اس حقیقت کا انکشاف ہوا تو اب اس کا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ان مظاہروں سے کیا مقصد ہے؟ اور اب اس کی عقل و دانش کی اس حقیقت تک رسائی ہوئی کہ جس طرح میں نے یہ غلطی کھائی کہ ایک شے کے پرتو، عکس اور مظہر کو "حقیقت" جان کر اس کے ساتھ حقیقت کا سا معاملہ کرنا چاہا تو اسی طرح بے شبہ میں اور میری قوم اس گمراہی میں مبتلا ہیں کہ آفتاب کی پرستش کر رہے ہیں حالانکہ وہ حقیقت (خدائے واحد) کی قدرت کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے اور اس سے بڑھ کر اور کون سا ظلم ہو سکتا ہے کہ حقیقت کو چھوڑ کر مظہر کی پرستش کی جائے اور اب وہ یہ سمجھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے مکتوب گرامی میں جملہ ﴿وَ اْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ﴾ کا کیا مطلب تھا، چنانچہ ملکہ کے قلب میں یہ خیال آنا تھا کہ وہ فوراً پکار اٹھی

﴿رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (النمل: ۴۴)

شیخ الہند (نور اللہ مرقدہ) کی اس تفسیر سے آیات کے انسجام اور ان کے مرجعوں کی ترتیب میں بھی کوئی خلل واقع نہیں ہوتا اور حذف و تقدیر کلام کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی اور ہر دو واقعات سے متعلق حکمت و مصلحت اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی پیغمبرانہ دعوت و ارشاد اور جاہ و جلال کی عظمت کا اظہار بھی حسن و خوبی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

ملکہ سباء کے پہلے مقولہ ﴿وَ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ﴾ میں "اسلام بمعنی انقیاد و اطاعت کی نظیر سورۂ حجرات کی وہ آیت ہے جو اعراب مدینہ کے دعویٰ ایمان پر نازل ہوئی:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا﴾ (الحجرات: ۱۴)

"اعرابی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ آپ کہہ دیجئے تم ایمان تو نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ ہم تابع دار اور منقاد ہو گئے ہیں۔"

اس جملہ ﴿كُنَّا مُسْلِمِيْنَ﴾ میں "اسلام" بمعنی انقیاد و اطاعت اور جملہ ﴿اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ میں "اسلام" بمعنی دین اسلام کا فرق اور دونوں معانی کا تفاوت خود قرآن عزیز کی ان آیات سے ہی ظاہر ہے کہ پہلے جملہ میں ملکہ سباء نے کوئی ایسی تفصیل بیان نہیں کی جس میں شرک سے بیزاری اور توحید کے قبول کا ذکر ہو اور اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے اس جملہ کے بعد بھی یہی ظاہر فرمایا کہ آفتاب پرستی اس کو اسلام سے باز رکھے ہوئے ہے اور وہ کافروں میں سے ہے لیکن آخری جملہ میں ملکہ نے صراحت کے ساتھ یہ اقرار کیا کہ اب اس کا اسلام لغوی نہیں بلکہ دین اسلام کا اصطلاحی اسلام ہے اور جو سلیمان علیہ السلام کے لیے نہیں بلکہ سلیمان علیہ السلام

Marfat.com

کی رفاقت میں "رب العالمین" کے لیے ہے اور غالباً اسی تفاوت کے پیش نظر پہلے جملہ میں ملکہ نے اپنے ساتھ تمام ارکان سلطنت اور رعایا کو شامل کر کے جمع کی تعبیر اختیار کی کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے شاہانہ اقتدار کی اطاعت کا مسئلہ ملکہ اور ملکہ کے اراکین دولت کے درمیان مشورہ کے بعد باتفاق طے شدہ تھا اور دین اسلام کے قبول کا مسئلہ اس کے اپنے ذاتی یقین پر مبنی تھا، اس لیے اس کے اظہار میں اس نے انفرادیت اختیار کی اگرچہ اس زمانہ کے عام دستور کے مطابق بادشاہ کا مذہب خودبخود رعایا کا مقبول مذہب ہو جاتا تھا اور غالباً اس کی قوم نے بھی دین اسلام قبول کر لیا ہوگا، غرض یہ تفسیر بہت لطیف اور ہر حیثیت سے راجح اور قابل قبول ہے۔

تورات میں ملکہ سباء کا ذکر:

تورات میں بھی ملکہ سباء اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی ملاقات کا ذکر موجود ہے، چنانچہ سلاطین [1] میں ہے۔

"اور جب کہ خداوند کے نام کی بابت سلیمان (علیہ السلام) کی شہرت سباء کی ملکہ تک پہنچی تو وہ مشکل سوالوں سے اسے آزمانے آئی اور وہ بڑے جلو کے ساتھ اور اونٹوں کے ساتھ جن پر خوشبوئیں لدی ہوئی تھیں اور بہت سونا اور انمول جواہرات ساتھ لے کر یروشلم میں آئی اور اس نے سلیمان کے پاس آ کے جو کچھ اس کے دل میں تھا سب کی بابت اس سے گفتگو کی سلیمان (علیہ السلام) نے اس کے سب سوالوں کا جواب دیا۔ بادشاہ سے کوئی بات پوشیدہ نہ تھی جو اس کے کسی سوال کا جواب نہ دیتا اور جبکہ سباء کی ملکہ نے سلیمان (علیہ السلام) کی ساری دانشمندی کا حال اور اس گھر کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دسترخوان کی نعمتوں کو اور اس کے ملازموں کی نشست اور اس کے خادموں کی حاضر باشی اور ان کی پوشاک اور اس کے ساقیوں اور سیڑھی کو کہ جس سے وہ خداوند کے مسکن کو جاتا تھا دیکھا تو اس کے حواس نہ رہے اور اس نے بادشاہ سے کہا یہ تحقیقی خبر تھی جو میں نے تیری کرامتوں اور تیری دانش کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی...... وہ خبر جو میں نے سنی تھی سو آدھی بھی نہ تھی کیونکہ تیری دانش اور اقبال مندی اس شہرت سے جو میں نے سنی تھی کہیں زیادہ ہے۔ نیک بخت ہیں تیرے لوگ اور نیک بخت ہیں تیرے خواص جو تیرے حضور کھڑے رہتے ہیں۔ اور تیری حکمت سنتے ہیں، خداوند تیرا خدا مبارک ہو جو تجھ پر راضی ہے اور تجھے اسرائیل کے تخت پر بٹھایا، اس لیے کہ خداوند نے اسرائیلیوں کو سدا پیار کیا۔" [2]

تورات کے بیان میں اگرچہ ملکہ کے مسلمان ہونے کا ذکر نہیں ہے لیکن آخر کے جملے ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اسرائیلی خدا پر ایمان لے آئی تھی تب ہی تو اس کا ذکر اس عقیدت مندی سے کرتی ہے۔

مگر قرآن اور تورات کے بیان میں یہ فرق نمایاں ہے کہ قرآن عزیز کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بایں جاہ و جلال ملکہ سباء کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ ایک اولوالعزم پیغمبر کی طرح کا تھا اور قرآن کے بیان سے بات بات میں تبلیغ و دعوت اور پیغمبرانہ شان نظر آتی ہے، لیکن تورات کے بیان میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی دانشمندی اور شاہانہ اقتدار کے ماسواء اور کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ بنی اسرائیل کے اس غلط عقیدہ کا نتیجہ ہے جو انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق اختراع کر لیا تھا کہ وہ پیغمبر نہیں ہیں صرف بادشاہ ہیں۔

---

[1] باب ۱۰ آیات ۱۰-۱ [2] باب ۲۰ آیات ۱۰-۱

Marfat.com

اور قرآن عزیز جبکہ اصلاح عقائد و اعمال کے ساتھ ساتھ امم سابقہ اور ان کے انبیاء و رسل سے متعلق واقعات میں بنی اسرائیل کی تحریف و تبدیل اور ان کے غلط اور فضول اختراعات کی اصلاح کا بھی مدعی ہے اس لیے اس نے اس مقام پر بھی واقعہ سے متعلق صحیح حقائق کو بیان اور ان غلطیوں کو واضح کر دیا جو کتب سابقہ میں پائی جاتی ہیں۔

ملکہ سباء کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ نکاح:

کتب تفاسیر میں منقول ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سباء (بلقیس) سے نکاح کر لیا اور اس کو اپنے ملک میں جانے کی اجازت دی اور حضرت سلیمان علیہ السلام گا ہے گا ہے اس سے ملاقات فرماتے رہتے تھے۔ [1] لیکن قرآن عزیز اور احادیث صحیحہ میں نفی یا اثبات دونوں حیثیتوں میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اسرائیلیات:

بلقیس، ملکہ سباء اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس واقعہ سے متعلق بیان کردہ تفصیلات کے علاوہ اور بھی عجیب و غریب اور دور از کار باتیں کتب سیر میں مذکور ہیں جو اول سے آخر تک اسرائیلیات اور یہودی روایات سے ماخوذ ہیں۔ چنانچہ ان کے متعلق ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے:

"اس سلسلہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک عجیب روایت منقول ہے جس کو ابن السائب کی سند سے ابو بکر بن شیبہ نے روایت کیا ہے اور ابن ابی شیبہ نے اس روایت کے متعلق کہا ہے کہ یہ کیسا دل خوش کن واقعہ ہے مگر میں کہتا ہوں کہ ابن ابی شیبہ کو یہ نہیں کہنا چاہیے بلکہ یہ روایت قابل انکار ہے اور بے شبہ اس کے بیان کرنے میں عطاء بن سائب کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ وہ اس روایت کو ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ قرین قیاس یہ ہے کہ اس قسم کا طرز روایت دراصل اہل کتاب کے صحیفوں سے ماخوذ ہے اور واقعہ کی یہ تفصیلات اسی طرح کی ہیں جیسا کہ کعب احبار اور وہب بن منبہ بنی اسرائیل کے قصے ان کی کتابوں سے نقل کر کے اس امت کو سنایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ درگزر کا معاملہ کرے، کہ وہ ان قصوں میں عجیب و غریب اور قابل انکار باتیں اور واقعی و غیر واقعی اور تحریف شدہ و مسخ شدہ ہر قسم کے واقعات نقل کر دیا کرتے تھے حالانکہ اللہ سبحانہ، نے ہم کو ان فضول اور لغو باتوں سے قطعی غنی اور بے پروا کر دیا ہے اور ہم کو ایسا علم (قرآن) عطاء کیا ہے جو واقعات کی صحت، نیک مقصد کی افادیت، مطالب کی وضاحت اور کلام کی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بہت برتر اور بلند ہے۔" [2]

قصص القرآن میں واقعات کی تحقیق کے سلسلہ میں بار بار یہ کہا جاتا رہا ہے کہ فلاں روایت صحیح ہے اور فلاں اسرائیلی روایت ہے تو اسرائیلیات سے کیا مراد ہے یہ بات قابل وضاحت ہے۔

بنی اسرائیل کی روایات کا مدار بیشتر تورات پر ہے، عبرانی زبان میں تورات کے معنی "شریعت" کے ہیں۔ اس لیے اس کا عمومی اطلاق سفر تکوین (پیدائش) سفر خروج سفر احبار سفر عدد سفر استثناء پر ہوتا ہے، تورات کے علاوہ دوسرا سلسلہ تلمود ہے، یہ عبرانی

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۴ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۶۵، ۳۶۶

Marfat.com

قاعدۂ لغت کے اعتبار سے "نبی" کی جمع ہے۔ عبرانی میں "ی" اور "م" اضافہ کر کے جمع بناتے ہیں۔ یہ بنی اسرائیل کے انبیاء کے مواعظ، مراثی اور بنی اسرائیل کے کلام اور مختصر تاریخ کا ذخیرہ ہے جن میں سفر یوشع سفر القضاۃ، سفر شموئیل، سفر ایام، سفر ملوک خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ آج کل نبیم بھی تورات کا ہی حصہ شمار ہوتا ہے۔ تیسرا حصہ ترگوم ہے۔ عربی زبان میں "ترجمہ" کو کہتے ہیں یہودی علماء نے توراۃ اور "نبیم" کی آرامی زبان میں تفسیر کی ہے، جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے یہ تفسیر انبیاء علیہم السلام سے سنی ہے، چوتھا حصہ مدراش ہے اس کی حیثیت یہود کے یہاں وہ ہے جو اسلام میں حدیث کا درجہ ہے، پانچواں حصہ تالمود ہے یہ بنی اسرائیل کا فقہ ہے اور ان سب کے علاوہ بعض وہ قصص و حکایات ہیں جن کو یہود سینہ بہ سینہ اپنی یادداشت سے مذہبی نقول کی طرح نقل اور بیان کرتے چلے آتے ہیں۔

یہود کے سلسلہ روایات کی یہ تمام اقسام وہ ہیں جو اسرائیلیات کہلاتی ہیں اور ان میں سے بعض روایات ان علماء یہود کے ذریعہ جو مشرف باسلام ہو گئے تھے مسلمانوں میں بھی نقل ہو کر مشہور ہو گئیں اور اس لیے ہمیشہ علماء محققین کا مقدس گروہ ان پر تنبیہ کرتا اور ان سے اسلامی روایات کو پاک کرتا چلا آتا ہے اور صرف انہی روایات کے ذکر سے چشم پوشی کرتا ہے جو قرآن عزیز اور صحیح احادیث کے مضامین کی تائید کرتی ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے مکتوب کا اعجاز:

ماہرین ادبیات کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو جو خط دعوت اسلام کے سلسلہ میں بھیجا وہ دنیا کے ان خطوط میں جو آج تک تحریر کیے گئے ہیں یکتا اور بے مثال ہے اور یہ دعویٰ حسن عقیدت کی بناء پر نہیں ہے بلکہ دعوے کی بنیاد اس دلیل پر قائم ہے کہ اس قدر اہم اور نازک مسئلہ پر نہایت مختصر مگر مقصد کے لحاظ سے بہت واضح، فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے نہایت رفیع، اداء بیان اور طرز ادا کے پیش نظر بے حد لطیف و شیریں، پرشوکت اور دلنشین غرض مجموعہ صفات سے متصف کوئی خط کسی بڑے انسان کا کتب تاریخ میں اس کے علاوہ ایسا موجود نہیں ہے جو اس کا مقابلہ کر سکے۔

مضمون خط میں خلل انداز نہ ہونے والے انتہائی اختصار کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی ربوبیت، خالقیت و مالکیت عام کا اظہار پیغمبرانہ پیغام حق کا اعلان، حاکمانہ و قاہرانہ اقتدار کا مظاہرہ اور اپنا ذاتی تعارف، جیسے اہم امور کو جس خوبی سے ادا کیا گیا ہے اس پر یہ مثال صادق آتی ہے، "گویا دریا کوزہ میں بند ہے"۔

خط کی عبارت کو مطالعہ کیجئے پھر مسطورۂ بالا خصوصیات و امتیازات کا اندازہ کیجئے اور بتایئے کہ مجموعہ الفاظ معنی کے لحاظ سے یہ خط "اعجاز" نہیں تو اور کیا ہے۔

﴿ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿٣٠﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَ اْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿٣١﴾ ﴾

(النمل: ۳۰۔۳۱)

"یہ خط ہے سلیمان کی جانب سے اور یہ شروع ہے اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحیم ہے۔ مجھ پر اپنی دھاک نہ بٹھاؤ اور نہ برتری کا مظاہرہ کرو اور خدا کے فرمانبردار بن کر میرے پاس حاضر ہو۔"

Marfat.com

حضرت سلیمان علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا بہتان:

گزشتہ صفحات میں تاریخی نقول سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنی الہامی کتابوں میں تحریف کر دی تھی اور اپنی اغراض دنیوی کی خاطر ان میں ہر قسم کا ردوبدل کر دیا تھا۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے معاملہ میں تو اس درجہ جسارت اختیار کی کہ ان کی نبوت و رسالت سے بھی انکار کر کے ان پر طرح طرح کے الزام اور بے ہودہ بہتان لگائے۔ منجملہ دوسرے الزامات کے ایک الزام حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ بھی لگایا کہ وہ جادو کے حامل اور اس ہی کے زور پر "کنگ سلیمان" تھے، اور جن وانس اور وحوش وطیور کو مسخر کیے ہوئے تھے۔

قرآن عزیز نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے بنی اسرائیل کے لگائے ہوئے اس بہتان کی مدلل تردید کی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی پیغمبرانہ عظمت کو نمایاں اور روشن کیا۔ اس نے بتایا کہ سلیمان علیہ السلام کا دامن جادو کی نجاست سے پاک ہے اور اصل حقیقت یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل کو گمراہ کرنے کے لیے شیاطین (انس و جن) نے سحر کو سکھایا اور اس کو مدون کیا اور بنی اسرائیل نے کتاب اللہ (تورات وزبور) کو پس پشت ڈال کر اس کو الہامی قانون سمجھا اور جادو سیکھنے سکھانے لگے اور جب بنی اسرائیل میں سے مخصوص اہل حق نے ان کو سمجھایا اور بتایا کہ یہ سخت گمراہی اور کفر ہے تم اس سے باز آ جاؤ تو شیطانوں کے بہکانے پر انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ سلیمان علیہ السلام کا سکھایا ہوا علم ہے اور سلیمان علیہ السلام اسی کے ذریعہ سے اتنی بڑی حکومت کے مالک تھے اور یہ کہہ کر اپنی گمراہی پر قائم رہے مگر وہ اس قول میں جھوٹ بولتے اور حضرت سلیمان علیہ السلام پر بہتان طرازی کرتے ہیں۔

سدی کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کی زندگی میں بنی اسرائیل میں یہ گمراہی شروع ہو گئی تھی اور ان میں یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ "جن" علم غیب جانتے ہیں۔ چنانچہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے شیاطین کے ان تمام نوشتوں کو حاصل کر کے اپنے تخت کے نیچے دفن کر دیا تا کہ جن وانس کسی کو وہاں تک پہنچنے کی جرأت نہ ہو سکے، اور ساتھ ہی یہ فرمان جاری کر دیا کہ جو شخص سحر کرے گا یا جنوں کے متعلق علم غیب کا عقیدہ رکھے گا تو اس کو قتل کی سزا دی جائے گی۔ لیکن جب سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہو گیا تو شیاطین نے اس مدفون ذخیرہ کو نکال لیا اور بنی اسرائیل میں یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ جادو کا یہ علم حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم ہے اور وہ اسی قوت سے جن وانس اور وحوش وطیور اور ہوا پر حکومت کرتے تھے اور اس طرح جادو کو پھر بنی اسرائیل میں رائج کر دیا۔ [1]

قرآن عزیز نے اس تاریخی حقیقت کو اس ضمن میں بیان کیا ہے کہ بنی اسرائیل باوجود اس یقین رکھنے کے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور ان کی نبوت کی بشارت کثرت سے کتب عہد قدیم میں موجود ہیں پھر بھی ضد اور ہٹ کی راہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا انکار کرتے ہیں اور کتب الٰہیہ کو پس پشت ڈال کر اسی طرح شیطان کی پیروی کرتے ہیں جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں جادو کے متعلق کر چکے ہیں اور آج تک بیجا جسارت کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کی جانب کفر (جادو) کی نسبت کرتے چلے آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن عزیز کا سیاق وسباق اس حقیقت کو بخوبی واضح کر رہا ہے۔

﴿وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۳۴

Marfat.com

كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ؕ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ؕ وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۟ؕ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ (البقرہ: ۱۰۱۔۱۰۲)

"اور جب ان (اسرائیل) کے پاس اللہ کی جانب سے رسول آیا جو تصدیق کر رہا ہے ان الہامی کتابوں کی جو ان کے پاس ہیں تو جو لوگ (بنی اسرائیل) کتاب (توراۃ) دیئے گئے تھے انہوں نے اللہ کی کتاب (توراۃ) کو پس پشت ڈال دیا، اور (آپ کی صداقت کی بشارات) کے متعلق ایسے ہو گئے گویا وہ جانتے ہی نہیں اور (یہ تو وہ لوگ ہیں کہ) انہوں نے سلیمان (علیہ السلام) کے زمانہ میں اس چیز کی پیروی اختیار کر لی تھی جو شیاطین پڑھتے تھے اور سلیمان (علیہ السلام) نے کفر نہیں کیا تھا لیکن شیاطین نے کفر کیا تھا کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور وہ (علم) جو بابل میں ہاروت و ماروت دو فرشتوں پر نازل کیا گیا اور جس کو کہ وہ دونوں جس کسی کو سکھاتے تھے تو یہ کہہ کر سکھاتے تھے کہ ہم (تمہارے لیے) سخت آزمائش ہیں لہٰذا تم (اب) کفر نہ کرنا مگر وہ (بنی اسرائیل) ان دونوں سے بھی ایسی بات سیکھتے کہ جس کے ذریعہ سے زن و شوہر کے درمیان تفریق پیدا ہو جائے حالانکہ وہ اس کے ذریعہ سے خدا کی مرضی کے بغیر کسی کو بھی نقصان پہنچا نہیں سکتے (البتہ) وہ ایسی شے سیکھتے ہیں جو (انجام کار) ان کو نقصان پہنچانے والی ہے اور ان کو ہرگز نفع نہیں دے گی اور بے شبہ وہ جانتے ہیں کہ جس شخص نے اس شے (جادو) کو خریدا۔ اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور ضرور وہ شے بہت بری ہے جس کے عوض میں انہوں نے اپنی جان فروخت کر ڈالی کاش کہ وہ سمجھتے (یعنی سمجھنے کے بعد اس سے بچتے) اور وہ کام نہ کرتے جس کا نتیجہ برا ہے۔"

مسطورۂ بالا آیات میں جن حقائق کو واضح کیا گیا ہے اس کی تفسیر میں مفسرین مختلف ذوق رکھتے ہیں اس لیے کہ ان تین باتوں کے علاوہ جن کا گزشتہ سطور میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جا چکا ہے واقعہ کی باقی تفصیلات کے بارے میں قرآن عزیز خاموش ہے کیونکہ وہ تفصیلات اس کے مقصد کے لیے ضروری نہیں ہیں، چنانچہ اس سلسلہ کی تفاسیر میں سے ہم نے ترجمہ میں عام تفسیر سے جدا راہ اختیار کی ہے جو آیۃ من آیات اللہ محقق عصر علامہ محمد انور شاہ (نور اللہ مرقدہ) کی تحقیق سے ماخوذ ہے، حضرت استاذ کی تفسیر کا خلاصہ یہ ہے:

"جب بنی اسرائیل کو شیاطین نے سحر سکھا کر گمراہ کر دیا اور وہ شیاطین کو غیب داں یقین کرنے لگے اور یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات ہو چکی تھی اور اس وقت ان کے درمیان خدا کا کوئی نبی موجود نہ تھا تو بنی اسرائیل کو راہ ہدایت دکھانے اور سنبھالنے کے لیے اس معجزانہ طریقہ کے مطابق جو صدیوں سے ان کے لیے حق تعالیٰ کی جانب سے سنت متوارثہ بنا ہوا تھا، ہاروت، ماروت دو فرشتے آسمان سے نازل کیے گئے اور انہوں نے بنی اسرائیل کو تورات سے

ماخوذ اسماء وصفات الٰہی کے اسرار کا ایسا علم سکھایا جو "سحر" کے مقابلہ میں ممتاز، اور سحر کے ناپاک اثرات سے پاک تھا اور اس کی وجہ سے ایک اسرائیلی بآسانی یہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ "سحر" ہے اور یہ "علوی علم الاسرار" ہے اور جب وہ فرشتے بنی اسرائیل کو یہ علم سکھاتے تو پھر ان کو نصیحت کرتے کہ اب جبکہ تم پر اصل حقیقت منکشف ہوگئی اور تم نے حق و باطل کے درمیان چشم دید مشاہدہ کرلیا تو اب کتاب اللہ کے علم کو پس پشت ڈال کر پھر بھی سحر کی طرف رجوع کرو گے تو تم بلاشبہ کافر ہو جاؤ گے، کیونکہ خدا کی حجت تم پر تمام ہوگئی اور اب جو تمہارے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا، گویا ہمارا وجود تمہارے لیے ایک آزمائش ہے کہ تم ہماری تعلیم کے بعد شیاطین کے تابع ہو کر "سحر" ہی کے شیدائی رہتے ہو یا اس سے زیادہ زبردست اور امرحق "کتاب اللہ" کے علم کی پیروی کرتے ہو؟ لیکن بنی اسرائیل کی کج فطرت نے اس موقع پر بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا اور انہوں نے اس پاک "علوی علم" کو بھی ناجائز اور حرام خواہشات کے لیے استعمال کرنا شروع کردیا، مثلاً زن وشوہر کے درمیان ناحق تفریق وغیرہ، اور گویا اس طرح حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کر کے اس کو بھی ایک کرشمہ بنا دیا اور حق کو باطل کے ساتھ خلط کرنے یا کسی پاک جملہ کے خواص و اثرات کو ناجائز اور حرام کاموں میں استعمال کرنے کے متعلق علماء حق کی تصریحات موجود ہیں کہ یہ بھی ساحرانہ اعمال کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور اسی لیے حرام اور کفر ہے۔" [1]

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تفسیر کے مطابق آیت ﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ﴾ میں ﴿مَا نَافِيَه﴾ نہیں ہے بلکہ بمعنی ﴿الَّذِي﴾ [2] ہے اس لیے کہ آیت میں سحر اور ﴿وَمَآ اُنْزِلَ﴾ کے درمیان معطوف علیہ کی نسبت ہے اور عربیت کے قاعدہ سے عطف، مغائرت کلام کے لیے ہوتا ہے لہٰذا آیات زیر بحث میں "سحر" الگ شے ہے جو شیاطین کے ذریعہ سے وجود پذیر ہوتا ہے اور فرشتوں کا لایا ہوا علم دوسری شے ہے جو پاک مقصد کے لیے تعلیم کیا گیا۔ لہٰذا فرشتوں کی جانب سحر کی نسبت صحیح نہیں ہوسکتی۔ یہ تفسیر، معانی کی ترتیب، سیاق وسباق کی مطابقت اور حقائق و وقائع کی وضاحت کے لحاظ سے بہت وقیع ہے اور اس لیے ہم اسی کو راجح سمجھتے ہیں۔

اس تفسیر کے علاوہ دوسری تفسیر مشہور نحوی فراء سے منقول ہے، وہ ﴿وَمَآ اُنْزِلَ﴾ میں ﴿مَآ﴾ کو نافیہ تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آیات کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں سحر کی تعلیم شیاطین کے ذریعہ پھیلی اور ان کا یہ عقیدہ غلط ہے کہ یہ سلیمان علیہ السلام کا علم ہے اور یہ بھی غلط کہ بابل میں ہاروت و ماروت دو فرشتے نازل ہوئے اور وہ بنی اسرائیل کو جادو سکھاتے اور سکھاتے وقت یہ تنبیہ کرتے کہ ہم آزمائش بنا کر تمہارے پاس بھیجے گئے ہیں، تم اگر سیکھو گے تو ہم ضرور سکھا دیں گے، مگر تم کافر ہو جاؤ گے، اس لیے تم کو نصیحت کرتے ہیں کہ کفر اختیار نہ کرو اور جب بنی اسرائیل اصرار کرتے تو وہ زن وشوہر کے درمیان تفریق کا جادو سکھا دیتے۔ یہ سارا قصہ جو ان کے درمیان مشہور ہے سب غلط ہے اور ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

تیسری تفسیر امام قرطبی [3] کی جانب منسوب ہے اور ابن جریر بھی اسی کو راجح تسلیم کرتے ہیں اور وہ یہ کہ آیت ﴿وَمَآ اُنْزِلَ﴾ الایہ میں ﴿مَآ﴾ نافیہ ہے اور ہاروت و ماروت "شیاطین" سے بدل ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ غلط ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے آسمان کے فرشتے "سحر" کا علم لے کر آئے تھے بلکہ شیاطین سحر سکھاتے تھے جن میں سے بابل میں دو مشہور شخصیتیں

---

[1] موضح الفرقان از شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہ زیر آیت ﴿فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ﴾ و کتاب النبوت از شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ
[2] تفسیر ابن کثیر ج ۱ [3] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۳۷۔

ہاروت و ماروت کی تھیں اور وہ جادو سکھاتے تو بنی اسرائیل کی مذہبی زندگی پر طعن کرتے ہوئے یہ کہتے جاتے کہ دیکھو! اگر تم نے ہم سے یہ "سحر" سیکھا تو تم کافر ہو جاؤ گے مگر بنی اسرائیل کی گمراہی کا یہ عالم تھا کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی ان سے زن و شوہر کے درمیان تفریق کا جادو سیکھتے اور کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیتے تھے۔

ہمارے خیال میں یہ دونوں تفسیریں بھی عام تفسیر سے زیادہ بہتر ہیں کیونکہ عام تفسیر کے مطابق ﴿مَآ﴾ کو بمعنی ﴿الذی﴾ تسلیم کر کے یہ مطلب لینا کہ بابل میں ہاروت و ماروت دو فرشتے بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے خدائے تعالیٰ کی جانب سے نازل ہو کر سحر سکھاتے اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کرتے جاتے تھے کہ ہم سے یہ علم نہ سیکھو ورنہ کافر ہو جاؤ گے بے وجہ متعدد اشکالات کو دعوت دینا اور "سحر" اور ﴿مَآ اُنْزِلَ﴾ کو بے دلیل ایک ہی شے تسلیم کرنا ہے۔

ان تفاسیر کے علاوہ آیات زیر بحث کے سلسلہ میں بعض عجیب و غریب آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اور ایک مرفوع روایت کتب تفسیر میں منقول ہیں حالانکہ یہ درحقیقت نہ آثار صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں اور نہ مرفوع حدیث، بلکہ کعب احبار اور دوسرے علماء یہود کے وہ بیان کردہ قصے ہیں جو بنی اسرائیل کا ذخیرہ خرافات کہے جانے کے مستحق ہیں۔ ان قصوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ہاروت و ماروت فرشتوں نے ایک مرتبہ خدائے تعالیٰ کے حضور میں انسانوں کی معصیتوں کا مذاق اڑایا کہ یہ کیسی ذلیل مخلوق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہمہ قسم کے انعامات کے باوجود اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتی رہتی ہے۔ یہ طنز اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا اور ان سے فرمایا کہ اگر تم دنیا کے ماحول میں محصور ہوتے تو یہی کرتے۔ فرشتوں نے اپنی عصمت اور پاکدامنی پر اعتماد کا اظہار کیا تب بطور آزمائش ان دونوں کو زمین پر اتار دیا گیا، یہاں رہتے رہتے ایک مرتبہ ان کی نگاہ ایک بے حد حسین عورت زہرہ پر پڑی اور دونوں اس کے عشق میں گرفتار ہو گئے اور زہرہ سے قربت کے طلبگار ہوئے۔ اس نے کہا جب تک تم شراب نہ پیو گے، قتل نہیں کرو گے اور بت کو سجدہ نہیں کرو گے مجھے حاصل نہیں کر سکتے، چنانچہ زہرہ کے عشق میں انہوں نے یہ تینوں کام کیے۔ زہرہ نے بحالت مقاربت ان سے دریافت کیا کہ وہ آسمان پر کس طرح جاتے ہیں، فرشتوں نے اس کو اسم اعظم سکھا دیا اور زہرہ اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلی گئی اور یہ دونوں فرشتے خدا کے غضب میں مبتلا ہو گئے اور بابل کے کنویں میں قید کر دیے گئے۔ اب جو شخص ان کو آواز دے کر ان سے جادو سیکھنا چاہتا ہے وہ اول تو اس کو منع کرتے اور کافر ہو جانے کا خوف دلاتے ہیں، لیکن جب وہ اصرار کرتا ہے تو اس کو جادو سکھا دیتے ہیں اور اس سے دریافت کرتے ہیں کہ تجھ کو کچھ نظر آیا، وہ شخص کہتا ہے کہ ایک نورانی شکل کا انسان گھوڑے پر جاتا ہوا نظر آتا ہے، فرشتے کہتے ہیں کہ یہ تیرا ایمان تھا جو تجھ سے جدا ہو گیا اور اب تو جادوگر بن گیا۔ یہ فرشتے قیامت تک خدا کے عذاب کی وجہ سے اسی طرح کنویں میں اُلٹے لٹکے رہیں گے۔

اس روایت کا لغو ہونا خود بخود واضح ہے اس لیے محققین نے اس کی لغویت اور خرافت پر متنبہ کر کے اسلامی روایات کے دامن کو اس سے پاک اور محفوظ ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اول مرفوع روایت پر بحث کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیا ہے:

واقرب ما یکون فی هذا انه من روایة عبدالله بن عمر عن کعب الاحبار لا عن النبی صلی الله علیه وسلم فدار الحدیث و رجع الی نقل کعب الاحبار عن کتب بنی اسرائیل۔ [1]

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ا

Marfat.com

اور اس سلسلہ میں قریب تر بات یہ ہے کہ "عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے جو روایت مسند احمد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے منقول ہے" وہ دراصل عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کعب احبار سے اسرائیلی قصہ نقل کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب اس کی نسبت ہرگز صحیح نہیں ہے۔

(بیان کردہ تصریحات کے بعد) نتیجہ یہ نکلا کہ جس حدیث کو مرفوع کہا جاتا تھا وہ آخر کار کعب احبار کی روایت ثابت ہوئی جو انہوں نے بنی اسرائیل کی کتابوں سے نقل کر کے بیان کی ہے۔

اور اس فیصلہ کے بعد ان تمام آثار پر تنقید کرتے ہوئے جو اس سلسلہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین (رحمہم اللہ) کی جانب منسوب کیے جاتے ہیں جو محاکمہ کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے:

"ہاروت و ماروت کا یہ قصہ (زہرہ اور چاہ بابل کا قصہ) تابعین کی ایک اچھی خاصی جماعت نے نقل کیا ہے مثلاً مجاہد، سدی، حسن بصری، قتادہ، ابوالعالیہ، زہری، ربیع بن انس، مقاتل، ابن حیان وغیرہ اور پھر ان سے نقل کر کے متقدمین اور متاخرین نے کثرت سے بیان کیا ہے مگر ان تمام نقول کا حال یہ ہے کہ ان میں جس قدر تفصیلات بھی منقول ہیں وہ سب بنی اسرائیل کے قصوں سے لی گئی ہیں اس لیے کہ صادق مصدوق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے (کہ جن کی شان مبارک یہ ہے کہ وہ اپنے ہوائے نفس سے کچھ بھی نہیں کہتے جو کچھ فرماتے ہیں وحی الٰہی سے فرماتے ہیں) اس بارہ میں کوئی صحیح روایت ذخیرۂ حدیث میں موجود نہیں ہے اور قرآن کا ظاہر سیاق واقعہ کو مجمل رکھتا ہے اور کوئی تفصیل اور تشریح نہیں کرتا اس لیے ہمارا ایمان یہ ہے کہ قرآن عزیز نے جس قدر اس سلسلہ میں بیان کیا ہے وہ حق ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی تفصیل و تشریح کیا ہے وہ اس ہی کے سپرد ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ ❁

یعنی قرآن عزیز نے اس واقعہ کو جس غرض سے بیان کیا ہے وہ تو صرف اس قدر ہے کہ بنی اسرائیل کا حضرت سلیمان علیہ السلام کی جانب جادو (کفر) کی نسبت کرنا بہتان اور افتراء ہے، یہ کام شیاطین کا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا دامن اس سے پاک ہے اور یہ کہ بنی اسرائیل نے شیاطین کی پیروی اختیار کی اور اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور باقی تفصیلات کو اس نے نظر انداز کر کے صرف اجمال پر اکتفاء کیا ہے لہٰذا ہمارے لیے اس کے اجمال پر ایمان لے آنا ہی کافی ہے اور اس کی شرح و بسط کو خدا کے حوالہ کرنا ہی اسلم طریقہ ہے کیونکہ تفصیلات سے دین وملت کا کوئی مسئلہ وابستہ نہیں ہے۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کے اس مسلک کی تائید بعض دوسرے محققین نے بھی کی ہے جس میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابوحیان اندلسی ❁ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات:

قرآن عزیز نے سورہ سباء میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا جو واقعہ بیان کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے جنوں کی ایک بہت بڑی جماعت عظیم الشان عمارات بنانے میں مصروف تھی کہ سلیمان علیہ السلام کو پیغام اجل آ پہنچا مگر

❁ تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۴۱ ❁ البحر المحیط جلد ۱

Marfat.com

جنوں کو ان کی موت کی خبر نہ ہوئی اور وہ اپنی مفوضہ خدمات میں مصروف رہے اور عرصہ کے بعد جب دیمک نے ان کی لاٹھی کو چاٹ کر اس توازن کو خراب کر دیا جس کی وجہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام لاٹھی سے ٹیک لگائے کھڑے نظر آتے تھے اور وہ گر گئے تب جنوں کو علم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا عرصہ ہوا انتقال ہو گیا تھا مگر افسوس کہ ہم نہ معلوم کر سکے کاش کہ ہم علم غیب رکھتے تو عرصہ تک اس مشقت ومحنت میں نہ پڑے رہتے جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے خوف سے مبتلا رہے۔

﴿فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ﴾ (سبا: ۱۴)

"اور جب ہم نے اس (سلیمان) کی موت کا فیصلہ کر دیا تو ان (جنوں) کو اس کی موت کی کسی نے اطلاع نہیں دی مگر دیمک نے کہ جو سلیمان کی لاٹھی چاٹ رہی تھی اور جب سلیمان (لاٹھی کے توازن خراب ہو جانے سے) گر پڑا تو جنوں پر یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ غیب کا علم رکھتے ہوتے تو اس سخت مصیبت میں مبتلا نہ رہتے۔"

کہتے ہیں کہ جنوں پر یہ راز جب کھلا کہ تعمیر مکمل ہو چکی تھی اس لیے جنوں کو افسوس رہا کہ اگر وہ غیب داں ہوتے تو اس سے بہت پہلے آزاد ہو گئے ہوتے۔

اس مقام پر قرآن عزیز کا مقصد جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے واقعہ کا اظہار ہے اسی طرح بنی اسرائیل کو ان کی حماقت پر متنبہ کرنا بھی اس کا مقصد ہے کہ ان کے عقیدہ کے مطابق اگر جن غیب دان ہوتے تو وہ عرصہ تک حضرت سلیمان علیہ السلام کے خوف سے تعمیر بیت المقدس یا کسی دوسرے شہر کی تعمیر کی صعوبتوں میں مبتلا نہ رہتے۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا جس صورت سے ان کو علم ہوا اس کے بعد خود شیاطین (جنوں) کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ہمارا دعویٰ غیب دانی قطعاً غلط ثابت ہوا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے متعلق قرآن عزیز نے اسی قدر بتایا ہے، اس سے زائد تفصیل نہیں بیان کی اور نہ اس کے مقصد تبلیغ کے پیش نظر اس کی کوئی ضرورت تھی لہٰذا ہم کو بھی ان تفصیلات میں کنج وکاؤ کی حاجت نہیں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کتنی مدت لاٹھی کے سہارے کھڑے رہے؟ کس حالت میں کھڑے رہے؟ انس وجن دونوں ہی کو اس کا علم نہیں تھا یا فقط ان جنوں کو ہی علم نہیں ہوا جو بیت المقدس سے بہت فاصلہ پر کسی شہر کی تعمیر میں مشغول تھے وغیرہ وغیرہ۔

البتہ اسرائیلی روایات سے ماخوذ ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں فرشتہ اجل نے حاضر ہو کر یہ پیغام سنایا کہ ان کی موت میں چند ساعتیں باقی ہیں تو انہوں نے یہ سوچ کر کہ کہیں "جن" تعمیر کو ناقص نہ چھوڑ دیں فوراً جنوں سے آبگینہ کا ایک حجرہ بنوایا اور اس میں دروازہ نہیں رکھا اور خود اس کے اندر بند اور لاٹھی کے سہارے کھڑے ہو کر مشغول عبادت ہو گئے اور اسی حالت میں موت کے فرشتے نے اپنا کام پورا کر لیا تقریباً ایک سال تک حضرت سلیمان علیہ السلام اسی طرح کھڑے رہے اور "جن" مشغول تعمیر رہے لیکن جب وہ تعمیر کو مکمل کر کے فارغ ہو گئے تو اب حضرت سلیمان علیہ السلام کی لاٹھی میں دیمک پیدا ہو گئی اور اس نے لاٹھی کو چاٹ کر بے جان کر دیا اور وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا بوجھ برداشت نہ کر سکی اور حضرت سلیمان علیہ السلام زمین پر گر گئے۔ تب

Marfat.com

جن سمجھے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا عرصہ ہوا کہ انتقال ہو گیا اور اپنی نادانی پر افسوس کرنے لگے۔ [1]

غرض یہ اور اسی قسم کی روایات ہیں جو اسرائیلیات سے نقل ہو کر اس سلسلہ میں کتب تفاسیر میں بیان کی گئی ہیں اور نقل کرنے کے بعد محققین نے واضح کر دیا ہے کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔ تورات میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا واقعہ اس طرح ہے۔

"غرض ساری مدت کہ سلیمان (علیہ السلام) نے یروشلم میں سارے اسرائیل پر سلطنت کی، چالیس برس کی تھی اور سلیمان اپنے باپ دادوں کے ساتھ سورہا اور اپنے باپ دادوں کے شہر صیہون میں گاڑ دیا گیا اور اس کا بیٹا رجعام اس کی جگہ بادشاہ ہوا۔" [2]

اور قاضی بیضاوی نے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی عمر ابھی تیرہ سال کی تھی کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا انتقال ہو گیا اور وہ سریر آرائے سلطنت ہوئے اور ترپین سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ [3] بیضاوی کا یہ قول غالباً تورات ہی سے ماخوذ ہے۔

بصائر:

حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات کو جس ترتیب اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے وہ صاحب بصیرت کو خود دعوت بصیرت دیتے، پیغام عبرت سناتے اور ایک حقیقت بیں نگاہ کے سامنے ہم حقائق کے پردے چاک کرتے ہیں تاہم ان میں سے یہ چند امور خصوصیت کے ساتھ قابل مطالعہ ہیں:

① امم سابقہ نے خدا کے سچے دین میں اپنی خواہشات نفس کے زیر اثر جہاں اور بہت سی تحریفات کی ہیں ان میں سے ایک شرمناک تحریف خدا کے سچے پیغمبروں اور اولوالعزم رسولوں پر بہتان طرازی اور ان کی جانب بیہودہ اور فحش انتسابات کے لیے بیجا اقدام بھی ہے۔

اور اس معاملہ میں بنی اسرائیل کا قدم سب سے آگے ہے، وہ ایک جانب خدا کی ایک برگزیدہ ہستی کو نبی اور رسول بھی تسلیم کرتے ہیں اور دوسری جانب بغیر کسی جھجک کے شرمناک اور غیر اخلاقی امور کا انتساب بھی ان کے ساتھ وابستہ رکھتے ہیں مثلاً حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی بیٹیوں کا معاملہ [4] نیز بعض انبیاء و رسل اور خدا کے جلیل القدر پیغمبروں کی رسالت و نبوت سے انکار کر کے ان پر مختلف قسم کے بہتان اور جھوٹے الزامات لگانا قابل فخر بات سمجھتے ہیں یا مثلاً حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا معاملہ۔

قرآن عزیز نے دین کے بارہ میں سچائی اور اعلان حق کا جو بیڑا اٹھایا اور اصلاح ادیان کے ساتھ دین حق (اسلام) کی جو حقیقی روشنی عطا کی۔ اس کے ان احسانات میں سے ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ جن انبیاء و رسل کا اس نے ذکر کیا ہے ان سے متعلق بنی اسرائیل کی خرافات و ہزلیات کو مدلل رد کیا اور ان کے مقدس دامن کو عائد کردہ آلودگیوں سے پاک ظاہر کیا اور اس طرح اصل حقیقت کو آشکارا کر کے رباطنوں کی خباثت نفس کا پردہ چاک کر دیا۔

② صد ہزار قابل عبرت ہے یہ بات کہ جس گمراہی کو بنی اسرائیل نے اختیار کیا اور قرآن عزیز نے جس کو روشن اور واضح دلائل کے

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۵۲۹، ۵۳۰ [2] سلاطین باب ۱۱ آیات ۴۲۔۴۳

[3] تفسیر سورۂ سبا [4] تورات پیدائش باب ۹ آیات ۳۰۔۳۸

ساتھ مردود قرار دیا تھا، اس آلودگی سے ہمارا دامن بھی محفوظ نہ رہ سکا اور قرآن عزیز کی صاف اور روشن راہ کو چھوڑ کر ہم نے تحریف شدہ روایات بنی اسرائیل کو اسلامی روایات میں جگہ دینی شروع کر دی۔

نبی اکرم ﷺ نے ایک جگہ صرف یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اہل کتاب کی جو روایات قرآن اور تعلیم اسلام کے منافی نہ ہوں ان کو نقل کرنا درست ہے لیکن ہم نے اس ارشاد مبارک کی بنیادی شرط" کہ وہ قرآن اور تعلیم اسلام کے خلاف نہ ہو" کو نظر انداز کر کے ہمہ قسم کی اسرائیلی روایات کو نہ صرف نقل کیا بلکہ قرآن عزیز کی تفسیر وتوجیہ کے لیے ان کو دلیل بنالیا اور جگہ جگہ تاویل وتفسیر قرآن میں ان کو پیش کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف تو غیر مسلموں نے ان روایات کو اسلامی روایات ظاہر کیا اور ان میں آب ورنگ پیدا کر کے اسلام کی بے لوث اور پاک تعلیم پر حملے شروع کر دیے اور ان کو اپنے ناپاک مقاصد کے لیے بہانہ اور حیلہ بنالیا اور دوسری جانب خود مسلمانوں میں الحاد وزندقہ کے علم برداروں نے ان روایات کی آڑ لے کر قرآن عزیز اور صحیح احادیث سے ثابت اور علم یقین (وحی الٰہی) سے حاصل حقائق (معجزات) حشر ونشر کے واقعات، جنت وجہنم کی تفصیلات سے انکار کے لیے راہ بنالی اور ہر ایسے مقام پر بے سند یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ تو ہمارے مفسرین نے عادت کے مطابق اسرائیلی اعتقادات سے اخذ کرلیا ہے حالانکہ اس واقعہ کے لیے خود قرآن عزیز یا حدیث رسول کی نص قطعی (یقینی صراحت) موجود ہوتی ہے۔

چنانچہ سرسید، مولوی محمد حسن امروہوی، مولوی چراغ علی، غلام احمد قادیانی، محمد علی لاہوری کی تفاسیر قرآن اور تفسیری مضامین کی اساس اسی الحاد پر قائم ہے۔

غرض یہ دونوں راہیں غلط ہیں۔ اسلام کی تعلیم کے خلاف اسرائیلی روایات کو اسلامیات خصوصاً تفسیر قرآن میں جگہ دینا بھی غلط راہ اور سخت مہلک قدم ہے خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی سے کیوں نہ اٹھایا گیا ہو اور اسی طرح الحاد کی دعوت کے لیے اس نقل روایات کی آڑ لے کر نصوص قرآن وحدیث سے انکار یا تفسیر کے نام سے معنوی تحریف کا اقدام بھی اسلامی تعلیم کو برباد کرنا اور اس کے خدوخال کو مسخ کر دینا ہے۔

صحیح اور صاف راہ (راہ مستقیم) صرف وہ ہے جو علماء محققین نے اختیار کی ہے کہ وہ ایک طرف نصوص قرآن وحدیث کو اپنا ایمان یقین کرتے اور ان میں ملحدانہ تاویلات کو تحریف سمجھتے ہیں اور دوسری جانب قرآن وحدیث کے دامن کو اسرائیلیات سے پاک ثابت کر کے حقیقت کی روشنی کو سامنے لاتے ہیں۔

(۳) صاحب حکومت انبیاء ورسل اور دنیوی بادشاہوں اور حکمرانوں کی زندگی میں ہمیشہ بین اور واضح امتیاز رہا اور رہتا ہے، اوّل الذکر حضرات کی زندگی کے ہر ایک پہلو اور ہر ایک گوشہ میں خدا کا خوف، اس کی خشیت، عدل وانصاف، دعوت وارشاد، خدمت خلق نمایاں نظر آتے ہیں، وہ کسی جائز موقع پر حاکمانہ اقتدار کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں تو اس میں نخوت وتکبر کی جگہ بغض فی اللہ نظر آتا ہے یعنی ان کا غصہ اپنے لیے نہیں، اپنے ذاتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ خدائے برتر کے کلمہ کی بلندی کے لیے ہوتا ہے، چنانچہ حضرت یوسف، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کی حیات طیبہ کا پورا دور اس کا شاہد عدل ہے اور مؤخر الذکر کی زندگی اور حیات کے ہر شعبہ میں ذاتی وقار شخصی یا جماعتی (پارٹی) تفوق وبرتری کا مظاہرہ، زیردستوں پر ظلم، اساس وبنیاد کی طرح کارفرما نظر آتے ہیں۔

Marfat.com

مثال کے طور پر آپ اول فرعون کے اس اعلان پر غور فرمائیے:

﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ (النازعات: ٢٤)

"میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں دوسرا کوئی نہیں"۔

اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس خطاب پر نظر کیجئے:

﴿اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ﴾ (النمل: ٣١)

"مجھ پر بلندی نہ ظاہر کر اور مسلمان ہو کر میرے پاس حاضر ہو۔"

دونوں جملوں میں حاکمانہ اقتدار کا مظاہرہ موجود ہے مگر فرعون کے اعلان میں خدا کے ساتھ سرکشی، مخلوق خدا پر ظالمانہ قہرمانیت اور دعوائے خدائی کے لیے انانیت جیسے امور صاف نظر آ رہے ہیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے خطاب میں مخاطب کے مقابلہ میں سربلندی کا اظہار ذاتی وقار اور شخصی سربلندی کے لیے نہیں بلکہ خدائے واحد کے ارشاد و تبلیغ، اعلاء کلمۃ اللہ اور شرک سے بیزاری کے ساتھ دعوت توحید کے لیے کیا جا رہا ہے اور یہی فرق ہے جو انبیاء علیہم السلام کی وراثت کے ذریعہ ہمیشہ خلافت حقہ اور ملک عضوض (دنیوی حکومت) کے درمیان نمایاں رہنا چاہیے۔

④ جس شخص کی زندگی خالص اللہ کے لیے ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ بھی اپنی کل کائنات کو اس کے لیے تابع اور مسخر کر دیتے ہیں اور اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ اس کا کوئی قدم بھی خدا کی مرضی کے خلاف نہیں اٹھتا۔ اب اگر ایسا شخص بعض ایسے امور کو دکھاتا ہے جو عام دنیوی اسباب و وسائل سے بالاتر ہو کر عمل میں آئے ہیں تو کوتاہ بیں اور مشکوک نگاہیں دیکھنے اور سمجھنے کی تو زحمت گوارا نہیں کرتیں کہ جس ہستی سے یہ اعمال صادر ہوئے ہیں وہ خدا کی مرضی میں خود کو فنا کر چکی ہے اس لیے خدا کی بے قید قدرت کا ہاتھ اس کے سر پر ہے اور اس کے ان اعمال (معجزات) کو بھی عام قوانین قدرت کی ترازو میں تول کر ان کے انکار پر آمادہ ہو جاتی ہیں، یہ راہ بے شبہ غلط اور گمراہی کی راہ ہے اور صاف اور روشن "راہ مستقیم" وہ ہے جس کو ہمیشہ سے مفکرین اسلام قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کرتے چلے آئے ہیں، یعنی:۔

"عام قوانین قدرت کے خلاف امور ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ان کا انکار بداہت کا انکار ہے اس لیے کہ قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے خالق کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بے قید قدرت سے کسی قانون کو توڑ دے بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ غالباً معجزات جیسے امور کے لیے اس کے یہاں شروع ہی سے ایسے جدا نوامیس فطرت اور قوانین قدرت کام کر رہے ہیں جو عام قوانین فطرت سے خاص ہیں چونکہ دنیوی علوم نے ان حدود تک رسائی نہیں کی اور وہ ابھی تک ان کے اکتشافات سے عاجز ہیں، اس لیے ہم اپنی کوتاہ عقل کے پیش نظر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ امور خارق عادت اور قوانین قدرت کو توڑنے والے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ ان اعمال کا تعلق بھی نوامیس فطرت ہی سے وابستہ ہوتا ہے، فرق صرف عام اور خاص کا ہے نہ کہ عام قوانین کے توڑنے کا، اور نوامیس فطرت کی اس تقسیم کا علم خدائے تعالیٰ کی جانب سے ان نفوس قدسیہ کو مشاہدہ کے درجہ میں حاصل ہو جاتا ہے، جن کے ذریعہ سے ایسے امور کو ظاہر کیا جاتا ہے جو خاص نوامیس فطرت کے تحت میں بروئے کار

Marfat.com

آتے ہیں (مثلاً معجزات وکرامات)۔"

⑤ شیطانی اثرات میں سب سے بدترین اثر یا شیطانی وسوسہ یہ ہے کہ زن وشوہر کے خوش گوار تعلقات میں نفرت وعداوت کا ایسا زہر ملا دیا جائے جو ان کے مابین تفرقہ کا باعث ہو۔ یہ اس لیے بدترین ہے کہ عموماً اس کے نتائج کذب و بہتان، بدکلامی و بداخلاقی بدکاری وفحش حتیٰ کہ قتل تک دوررس ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ عمل شیطان کو بہت محبوب ہے، چنانچہ صحیح حدیث میں آتا ہے:

"نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابلیس علی الصباح اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے اور پھر اپنی فوج کو انسانوں کی گمراہی کے لیے اطراف زمین میں منتشر کرتا ہے اور جو ان سے زیادہ فتنہ پرداز ہوتا ہے وہ اس کے یہاں زیادہ تقرب پاتا ہے چنانچہ واپس آ کر ہر ایک شیطان اپنی اپنی کارگزاری بیان کرتا ہے کہ مثلاً میں فلاں شخص کو چمٹا رہا حتیٰ کہ یہ کلمات (بیہودہ کلمات) کہلا کر چھوڑا۔ مگر ابلیس اس قسم کی کارگزاریوں کی داد نہیں دیتا اور ان کے فتنہ کو معمولی قرار دیتا ہے کہ اسی درمیان میں ایک شیطان آ کر کہتا ہے کہ میں نے زن وشوہر کے درمیان آج تفرقہ ڈال دیا اور ان کے خوشگوار تعلقات کو مکدر بنا دیا۔ ابلیس یہ سن کر فوراً اس کو اپنے گلے لگالیتا اور شاباش دیتا ہے کہ بیشک تو نے بہت بڑا کارنامہ کیا ہے۔"

شیاطین جن وانس کا یہ سحر عموماً ایسے وساوس اور اسباب کے ذریعہ عمل میں آتا ہے جو دونوں کے درمیان بدگمانی، بدکلامی اور شکر رنجی پیدا کرتے ہوں اور یہ حالت آہستہ آہستہ نفرت وعداوت اور تفریق بین الزوجین پر منتج ہوتی ہے۔ اعاذنا اللہ من ذالك۔

Marfat.com

حضرت ایوب علیہ السلام

○ حضرت ایوب علیہ السلام اور قرآن عزیز ○ حضرت ایوب علیہ السلام کی شخصیت؟ ○ یوباب اور ایوب علیہ السلام
○ عہد ایوب علیہ السلام ○ حضرت ایوب علیہ السلام اور علماء یہود ونصاریٰ ○ غلط فہمی کا ازالہ
○ قرآن عزیز اور واقعہ ایوب علیہ السلام ○ چند تفسیری حقائق ○ سفر ایوب علیہ السلام ○ وفات ○ بصائر

حضرت ایوب علیہ السلام اور قرآن عزیز:

قرآن عزیز میں حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر چار سورتوں میں آیا ہے، سورہ نساء، انعام، انبیاء اور ص۔ نساء اور انعام میں تو انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں فقط نام مذکور ہے:

﴿وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ﴾ (النساء: ۱۶۳)

"اور عیسیٰ ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان۔"

﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ﴾ (الانعام: ۸۴)

"اور اس کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون۔"

اور سورۂ انبیاء اور ص میں مجمل تذکرہ ہے اور صرف یہ بتایا گیا ہے کہ ان پر آزمائش و امتحان کا ایک سخت وقت آیا اور مصائب اور بلاؤں نے چہار جانب سے ان کو گھیر لیا مگر وہ صبر وشکر کے ماسواء حرف شکایت تک زبان پر نہیں لائے اور آخر کار ان کو خدائے تعالیٰ نے اپنی رحمت میں ڈھانپ لیا اور مصائب کے بادل دور کر کے ان کو فضل وعطاء سے مالا مال کر دیا اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عزیز کے بیان کردہ واقعات سے قبل حضرت ایوب علیہ السلام کی شخصیت پر تاریخ کی روشنی میں بحث کر لی جائے تاکہ ہم اس ہستی کا صحیح تعارف کر سکیں جس کے صبر وشکر کی قرآن عزیز نے مدحت کی ہے اور جس کی زندگی کو مبارک اور اخلاقی بلندی میں ضرب المثل ٹھہرایا ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی شخصیت:

حضرت ایوب علیہ السلام کی شخصیت سے متعلق تحقیق کے لیے صرف دو ماخذ ہو سکتے ہیں۔ ایک تورات اور دوسرے وہ اقتباسات جو تاریخ قدیم سے اخذ کر کے مؤرخین عرب اور مؤرخین اسلام نے نقل کیے ہیں اور اگر ان کے ساتھ چند خارجی قرائن کو بھی

Marfat.com

شامل کرلیا جائے تو اس مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق سب سے قدیم شہادت سفر ایوب کی ہے، یعنی وہ صحیفہ جو مجموعہ تورات میں ایوب علیہ السلام کی جانب منسوب ہے اور جس میں ان کی حیات طیبہ کے متعلق تفصیلی حالات درج ہیں۔

سفر ایوب میں تاریخی حیثیت سے ایوب علیہ السلام کے متعلق دو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ سرزمین عوض کے باشندہ تھے۔

عوض کی سرزمین میں ایوب نامی ایک شخص تھا اور وہ شخص کامل اور صادق تھا اور خدا سے ڈرتا اور بدی سے دور رہتا تھا۔ [1]

دوسری بات یہ کہ ان کے مویشی اور چوپایوں پر سباء اور کسدیوں (بابلیوں) نے حملہ کر کے لوٹ لیا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں قوموں کے زمانہ عروج کے معاصر تھے۔

یوباب اور ایوب علیہ السلام:

سفر ایوب کے ان دو حوالوں کی وضاحت کے علاوہ ایک اور تاریخی مسئلہ بھی ہے جس سے حضرت ایوب علیہ السلام کے زیر تحقیق مسئلہ میں مدد مل سکتی ہے وہ یہ کہ توراۃ اور کتب تاریخ میں ایک نام یوباب آتا ہے محققین کا خیال اس کے متعلق یہ ہے کہ ایوب اور یوباب ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں دراصل عبرانی میں یوباب کو ادب کہا گیا ہے اور یہی ادب عربی میں ایوب ہوگیا۔ لیکن اس تحقیق کے باوجود کہ ایوب، یوباب اور ادب مختلف زبانوں میں ایک ہی شخصیت کے نام ہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی شخصیت سے متعلق مسئلہ پھر بھی حل طلب رہتا اور کچھ تفصیل چاہتا ہے۔

توراۃ کے بیان کے مطابق یوباب دو جدا جدا شخصیتوں کا نام ہے۔ ایک بنی یقطان میں سے ہے اور دوسرا بنی ادوم میں سے، جو یوباب یقطان کی نسل سے ہے اس کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی مقدم ہے کیونکہ اس کا سلسلہ نسب پانچ واسطوں سے حضرت نوح علیہ السلام تک پہنچتا ہے یعنی یوباب بن یقطان بن عیبر بن سلخ بن ارفکسد بن سام بن نوح (علیہ السلام)۔ [2] اور جو بنی ادوم میں سے ہے وہ بھی اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہے لیکن یوباب اول کے زمانہ سے اس کا عہد متاخر ہے، اس لیے حضرت اسحاق علیہ السلام کے صاحبزادہ عیسو (عیص یا عیصو) کا لقب ہے اور یہ کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے بڑے تھے اور کنعان سے ترک وطن کر کے اپنے چچا حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاس حجاز میں آ گئے تھے اور ان کی صاحبزادی محلات [3] یا بشامہ (باسمہ) سے شادی کر کے عرب کے اس حصہ زمین میں آباد ہو گئے تھے جو شام و فلسطین کے جنوب مغرب میں عرب کی آخری حد ہے اور جس جگہ کوہ ساعیر کا سلسلہ طول میں شمال سے جنوب تک چلا گیا ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ وہ مقام جو عمان سے حضر موت تک وسیع ہے۔ [4]

ان عیسو (ادوم) کی نسل میں صدیوں تک حکومت و سطوت کا دور رہا ہے۔ اور مؤرخین کے نزدیک ان کے دور حکومت کی ابتداء تقریباً ۱۷۰۰ ق م بتائی جاتی ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جب بنی اسرائیل مصر سے واپس آئے ہیں تو اس وقت بھی بنی ادوم شعیر (ساعیر) پر حکمران تھے، تورات میں ہے:

"تب موسیٰ (علیہ السلام) نے قادس سے ادوم کے بادشاہ کو ایلچی کے ہاتھ یوں کہلا بھیجا کہ تیرے بھائی اسرائیل نے کہا ہے کہ وہ سب تکلیفیں جو ہم پر آن پڑی ہیں تو جانتا ہے ...... اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت قادس سے روانہ ہو کر کوہ ہور پر آئی اور

[1] باب آیت ۱ [2] پیدائش باب ۱۰ آیت ۲۲ ـ ۲۴ [3] تورات پیدائش باب ۲۸ آیت ۹ [4] دائرۃ المعارف للبستانی فی جلد ۲

خداوند نے کوہ ہور پر جو ادوم کی سرحد سے ملا ہوا تھا موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو کہا۔" [1]

بنی ادوم [2] کے ان حکمرانوں کی جو فہرست تورات میں مذکور ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر ساؤل (طالوت) کی وسیع حکومت سے پہلے کہ جس کی وسعت خطہ ادوم تک پہنچی اور جو ۱۰۰۰ ق م میں قائم ہوئی تھی آٹھ حکمران برسر حکومت رہ چکے تھے اور ان میں سے دوسرے حکمراں کا نام یوباب بن زارح تھا۔

اس حد پر پہنچ کر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت ایوب علیہ السلام اور یوباب دونوں نام ایک ہی شخصیت کے ہیں تو ان دونوں میں سے کس یوباب کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں مورخین کی دو رائیں ہیں۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ یہ بنی یقطان کی نسل سے اور عرب عاربہ میں سے ہے اور اس لیے حضرت ایوب علیہ السلام یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاصر ہیں اور یا کم از کم حضرت اسحاق علیہ السلام و حضرت یعقوب علیہ السلام کے معاصر۔ فرماتے ہیں:

"اولاً محققین تورات میں سے اکثر اس طرف گئے ہیں کہ حضرت ایوب علیہ السلام عرب تھے، عرب میں ظاہر ہوئے تھے اور سفر ایوب اصلاً قدیم عربی میں لکھی گئی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے قدیم عربی سے عبرانی میں منتقل کیا۔ سفر ایوب میں ہے کہ وہ عوض کے ملک میں رہتے تھے اور آگے چل کر تصریح کی ہے کہ ان کے مویشی پر شیبا (سباء) کے لوگوں نے حملہ کیا تھا۔"

ان دونوں تصریحوں سے بھی اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کیونکہ کتاب پیدائش اور تواریخ اول میں عوض کو آرام بن سام بن نوح کا بیٹا کہا ہے، اور آرامی بالاتفاق عرب عاربہ کی ابتدائی جماعتوں میں سے ہیں۔ [3]

عرب مورخ ابن عساکر کا رجحان بھی اسی جانب معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت ایوب علیہ السلام کو قریب بعہد ابراہیمی مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام کے معاصر اور دین ابراہیمی کے پیرو تھے۔ [4]

اور نجار مصری اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت ایوب علیہ السلام کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ایک سو سال پہلے تھا۔ [5]

مولانا سید سلیمان فرماتے ہیں کہ ایوب علیہ السلام بنی ادوم میں سے ہیں اور ان کا زمانہ ۱۰۰۰ ق م اور ۷۰۰ ق م کے درمیان ہے چنانچہ ارض القرآن میں ہے:

"یہ مسئلہ کہ حضرت ایوب علیہ السلام ایک ادومی عرب تھے، خود سفر ایوب سے ثابت ہے: عوض کی سرزمین میں ایک مرد صالح، راست گو، خدا سے ڈرنے والا اور بدی سے دور تھا۔" (۱۰۱)

عوض تورات میں دو آدمیوں کا نام ہے، ایک تو نہایت قدیم عوض بن ارم بن سام بن نوح (تکوین ۳۶۔۲۹) باتفاق اہل کتاب اس سے عوض ثانی مراد ہے، عوض کے بنی ادومی عرب ہونے پر ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ سفر ایوب میں رفقائے ایوب کے جو مسکن بتائے ہیں وہ تیمن، نعمان اور شوحان ہیں (۲۔۱۱) اوّل کے متعلق تو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ مملکت ادوم کا ایک مشہور شہر تھا (تکوین ۳۶۔۳۵) الخ زمانہ کے متعلق بھی فیصلہ اس لیے آسان ہے کہ "کلدان" (ایوب ۱۔۱۷) اور سباء (ایوب ۱۰۔۱۵) کا اس

---

[1] گنتی باب ۲۰ آیات ۲۲۔۲۳ [2] پیدائش باب ۳۶ آیات ۳۳۔۳۹ [3] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۸۶
[4] فتح الباری ج ۶ ص ۳۲۶ [5] قصص الانبیاء ص ۴۱۵

Marfat.com

پر ذکر معاصرت ہے۔ سباء کا عروج ۱۰۰۰ ق م سے ۷۰۰ ق م تک ہے۔ اس لیے ان دونوں زمانوں کے حدود میں کہیں حضرت ایوب علیہ السلام کا عہد قرار دینا چاہیے۔[1]

یہ عجیب بات ہے کہ زمانہ کے تعین میں دونوں حضرات سباء اور کلدانیوں (بابلیوں) کی معاصرت کی سند پیش فرماتے ہیں۔ مگر نتیجہ جدا جدا نکالتے اور ایک دوسرے کے متضاد فیصلہ دیتے ہیں۔

سید سلیمان صاحب کی تائید مشہور مؤرخ یعقوبی کے قول سے ہوتی ہے، وہ لکھتا ہے: یوباب هو ایوب بن زارح الصدیق۔ "یوباب ہی ایوب صدیق بن زارح ہیں"۔

ان تفصیلات کے بعد ہمارا خیال یہ ہے کہ بے شبہ یہ صحیح ہے کہ یوباب ہی ایوب علیہ السلام ہیں اور راجح یہی ہے کہ بنی یقطان میں سے نہیں بلکہ بنی ادوم میں سے ہیں۔

عہد ایوب علیہ السلام:

البتہ زمانہ کے متعلق سید صاحب کی تحقیق صحیح نہیں ہے اور ان کا یہ فرمانا کہ ایوب علیہ السلام کا عہد ۱۰۰۰ ق م سے ۷۰۰ ق م کے درمیان ہے۔ غیر تحقیقی بات یہ ہے کہ ایوب علیہ السلام کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت اسحاق و یعقوب علیہما السلام کے زمانہ کے درمیان ہے اور تقریباً ۱۵۰۰ ق م اور ۱۳۰۰ ق م کے حدود میں تلاش کرنا چاہیے۔

ہماری یہ تحقیق چند اہم قرائن پر مبنی ہے اور جو اس درجہ واضح ہیں کہ اگر ان کو دلائل بھی کہہ دیا جائے تو بے جا نہیں ہے۔

① پہلا قرینہ یہ ہے کہ بالاتفاق محققین توراۃ کے نزدیک صحیفہ ایوب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قبل زمانہ کا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو قدیم عربی سے عبرانی میں منتقل کیا ہے اور یہ کہ مجموعہ تورات میں سب سے قدیم صحیفہ سفر ایوب ہے۔

② جن مؤرخین نے ایوب علیہ السلام کو بنی ادوم میں سے بتایا ہے وہ بھی ادوم (عیسو یا عیص) اور ان کے درمیان دو واسطوں سے زیادہ بیان نہیں کرتے یعنی ایوب بن زارح بن موص (عوض) بن عیصو (عیسو)[2]

③ یہی مؤرخین حضرت ایوب علیہ السلام کا سلسلہ نسب بیان کرتے ہوئے جب مادری سلسلہ پر آتے ہیں تو لوط علیہ السلام کی صاحبزادی سے لے کر صاحبزادگان تک حضرت یوسف علیہ السلام کی صاحبزادیوں کے ذکر کے نیچے نہیں اترتے مثلاً ابن عساکر کہتے ہیں کہ وہ بنت لوط علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں اور قاضی بیضاوی نقل کرتے ہیں کہ وہ لیا بنت یعقوب علیہ السلام یا ماخیر بنت میشا بن یوسف علیہ السلام یا رحمت بن افرائیم بن یوسف علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں۔[3]

④ سید صاحب نے عوض کا جو نسب نامہ نقل کیا ہے اس کے پیش نظر بھی حضرت ایوب علیہ السلام کا نسب نامہ اس طرح بغیر کسی جرح و تنقید کے صحیح ہوسکتا ہے یعنی یوباب (ایوب) بن زارح بن عوض بن دیسان بن عیسو بن اسحاق علیہ السلام کا اس سلسلہ میں اگرچہ عام مؤرخین کے بیان کردہ نسب نامہ سے صرف ایک نام دیسان کا اضافہ ہوتا ہے تاہم اس سے یہ فرق نہیں پڑتا کہ ان کا زمانہ پیچھے ہٹ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے بھی بعد ہو جائے اور ۱۰۰۰ ق م اور ۷۰۰ ق م کے درمیان پہنچ جائے۔

---

[1] ارض القرآن ج ۲ ص ۴۴ [2] فتح الباری ج ۶ ص ۳۲۶ [3] بیضاوی سورۂ ص

Marfat.com

مسطورۂ بالا قرائن یا دلائل میں سے پہلا قرینہ بہت مضبوط اور تاریخی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کہ محققین توراۃ نے تاریخی روشنی ہی میں یہ متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ سفر ایوب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے قبل زمانہ کا ہے اور اس لیے یہ قرینہ نہیں بلکہ زبردست دلیل ہے اور دوسرا اور تیسرا قرینہ اگرچہ ناموں کے تعین کے لحاظ سے قابل بحث ہوسکتا ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ تورات اور تاریخی نقول کا سلسلہ نسب کے متعلق یہ بیان کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے نواسہ یا حضرت لوط علیہ السلام کے نواسہ ہیں محض اتفاقی نہیں ہے بلکہ کسی حقیقت پر مبنی ہے۔ اور چوتھا قرینہ بھی یہ واضح کرتا ہے کہ حضرت ایوب کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل ہونا چاہیے اور وہ ۱۵۰۰ ق م اور ۱۳۰۰ ق م کے درمیان ہوسکتا ہے۔ امام بخاری کی بھی غالباً یہی تحقیق ہے اسی لیے انہوں نے کتاب الانبیاء میں انبیاء علیہم السلام کے متعلق جو ترتیب قائم کی ہے اس میں حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل کیا ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ:

ایوب علیہ السلام کے سلسلہ نسب میں تورات کے ناموں اور مؤرخین عرب کے ناموں میں کچھ اختلاف ہے لیکن بہ نظر تحقیق یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ ناموں کے متعلق اس قسم کا اختلاف ہے جو عموماً مختلف زبانوں میں منتقل ہونے کی وجوہ سے کتابت کی تصحیف وتبدیل کی شکل میں پیش آتا رہتا ہے، یعنی تورات کا عوض، اور عرب مؤرخین کا موص، اور اسی طرح تورات کا زارح اور مؤرخین کا زراح دونوں ایک ہی ہیں البتہ جن بعض مؤرخین نے موص یا اموص کو ایوب اور زراح (زارح) کے درمیان بیان کردیا ہے وہ صحیح نہیں ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ بعض حضرات نے ایوب علیہ السلام کا نسب بیان کرتے ہوئے روم بن عیص کہہ کران کو بنی روم سے بتایا ہے، یہ قطعاً بے اصل ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام اور علماء یہود ونصاریٰ:

حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق صحیح تحقیق کے بعد یہ حقیقت بھی واضح رہنا چاہیے کہ ایوب علیہ السلام کے متعلق علماء یہود ونصاریٰ کے درمیان سخت اختلاف ہے، ان میں سے بعض تو یہ کہتے ہیں کہ یہ فرضی نام ہے اور ایوب کسی شخصیت کا نام نہیں ہے مثلاً ربی حمانی دیز، میکائیلس، سملر، استیان اسی کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ اس شخصیت سے متعلق جس قدر واقعات منسوب ہیں سب باطل اور فرضی ہیں گویا ان کے نزدیک سفر ایوب اگرچہ تاریخی اعتبار سے قدیم صحیفہ ہے مگر فرضی ہے اور کانٹ اور انٹل وغیرہ کہتے ہیں کہ ایوب علیہ السلام ایک حقیقی شخصیت کا نام ہے اور اس سے منسوب "صحیفہ" کو فرضی اور باطل کہنا خود باطل ہے۔ [1]

مگر شخصیت تسلیم کرنے کے باوجود پھر تعین زمانہ کے متعلق ان کے درمیان بھی سخت اختلاف ہے اور مؤرخین عرب کے درمیان بھی اختلاف ہے جو نقشہ ذیل سے معلوم ہوسکتا ہے:

---

[1] قصص الانبیاء للنجار ص ۴۱۵۔۴۱۶

Marfat.com

قول مختار	نام	شمار
سن ۱۰۰ قبل از عہد ابراہیم علیہ السلام	بستانی	(۱)
قریب بعہد ابراہیمی	ابن عساکر	(۲)
معاصر یعقوب علیہ السلام	کانٹ	(۳)
معاصر موسیٰ علیہ السلام	اٹل	(۴)
بعد زمانہ شعیب علیہ السلام	طبری	(۵)
معاصر سلیمان علیہ السلام	x	(۶)
بعد سلیمان علیہ السلام	ابن خیثمہ	(۷)
اسرائیلی مگر زمانہ نامعلوم	ابن اسحٰق	(۸)
معاصر بخت نصر (بنی کدرزر)	x	(۹)
معاصر زمانہ قضاۃ بنی اسرائیل	x	(۱۰)
معاصر اردشیر شاہ ایران	x	(۱۱)

غرض حضرت ایوب علیہ السلام کی شخصیت کو جب تاریخ کی روشنی میں زیر بحث لایا جاتا ہے تو یقینی طور پر حسب ذیل نتائج ظاہر ہوتے ہیں:

① حضرت ایوب علیہ السلام عرب ہیں اور تمام مختلف اقوال میں بھی ان کے عرب ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔
② مجموعہ تورات میں سے صحیفہ ایوب قدیم صحیفہ ہے اور عبرانی میں عربی سے نقل ہو کر آیا ہے۔
③ حضرت ایوب علیہ السلام بنی ادوم میں سے ہیں۔
④ ان کا عہد حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا درمیانی عہد ہے۔

قرآن عزیز اور واقعہ ایوب علیہ السلام:

حضرت ایوب علیہ السلام سے متعلق مسطورہ بالا حقائق روشن ہو جانے کے بعد اب اس مختصر اور مجمل واقعہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے جو سورۂ انبیاء اور سورۂ ص میں مذکور ہے:

﴿وَ اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَیْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰی لِلْعٰبِدِیْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۸۳۔۸۴)

"اور ایوب (کا معاملہ بھی یاد کرو) جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا میں دکھ میں پڑ گیا ہوں، اور خدایا! تجھ سے بڑھ کر

رحم کرنے والا کوئی نہیں، پس ہم نے اس کی دعاء قبول کر لی اور اس کا دکھ دور کر دیا اور اس کو اس کا کنبہ اور اس کی مثل اور اس کے ساتھ اپنی رحمت سے اور اپنے عبادت گزار بندوں کی نصیحت کے لیے عطا کر دیا۔"

﴿وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ ۝ ارْكُضْ بِرِجْلِكَ ۖ هَٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِب بِّهِ وَلَا تَحْنَثْ ۗ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا ۚ نِّعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ ۝﴾

(ص: ۴۱-۴۴)

"اور یاد کر ہمارے بندہ ایوب (کے معاملہ) کو جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا کہ مجھ کو شیطان نے ایذاء اور تکلیف کے ساتھ ہاتھ لگایا ہے (تب ہم نے اس سے کہا) اپنے پاؤں سے ٹھوکر مار (اس نے ایسا ہی کیا، اور چشمہ زمین سے اُبل پڑا تو ہم نے کہا) یہ ہے نہانے کی جگہ ٹھنڈی اور پینے کی اور ہم نے اس کو اس کے اہل وعیال عطاء کیے اور ان کی مانند اور زیادہ اپنی مہربانی سے اور یادگار بننے کے لیے علقمندوں کے لیے، اور اپنے ہاتھ میں سینکوں کا مٹھا لے اور اس سے مار اور اپنی قسم میں جھوٹا نہ ہو، بیشک ہم نے اس کو صبر کرنے والا پایا (اور وہ اچھا بندہ ہے) بے شبہ وہ (خدا کی جانب) بہت رجوع ہونے والا ہے۔"

ان آیات میں حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ کو اگرچہ بہت مختصر اور سادہ طرز میں بیان کیا گیا لیکن بلاغت و معانی کے لحاظ سے واقعات کے جس قدر بھی صحیح اور اہم اجزاء تھے ان کو ایسے اعجاز کے ساتھ ادا کیا گیا ہے کہ سفر ایوب کے ضخیم اور طویل صحیفہ میں بھی وہ بات نظر نہیں آتی۔

ایک پاک اور مقدس انسان ہے جو خدائے تعالیٰ کے یہاں انبیاء ورسل کی جماعت میں شامل ہے اور اس کا نام ایوب ہے ﴿وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ﴾ وہ دولت وثروت اور کثرت اہل وعیال کے لحاظ سے بھی بہت خوش بخت اور فیروز مند تھا۔ مگر یکا یک امتحان و آزمائش میں آ گیا اور متاع و مال، اہل وعیال اور جسم و جان سب کو مصیبت نے آ گھیرا مال ومنال برباد ہوا۔ اہل وعیال ہلاک ہوئے اور جسم و جان کو سخت روگ لگ گیا تب بھی اس نے نہ شکوہ کیا اور نہ شکایت بلکہ صبر وشکر کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی جناب میں صرف عرض حال کر دیا:

﴿إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ ۝﴾ (ص: ۴۱)

پاس ادب کا یہ عالم ہے کہ یہ نہیں کہا: "تو نے مصیبت میں ڈال دیا کیونکہ اس کو علم ہے کہ تکلیف وعذاب گو خدا ہی کی مخلوق ہیں مگر شیطانی اسباب پر ظہور پذیر ہوتے ہیں اس لیے یہ کہا "شیطان نے مجھ کو تکلیف وعذاب کے ساتھ چھو دیا" اور پھر عرض حال کے لیے نہایت عجیب ولطیف اور بلیغ پیرایہ بیان اختیار کیا کہ ﴿أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ﴾ خدایا مجھ کو مصیبت نے آ گھیرا ہے" ﴿وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ۝﴾ "اور تو مہربانوں میں سب سے بڑا مہربان ہے" اور جب اس نے پکارا تو خدا نے سنا اور قبول کیا۔ جو مال ومتاع برباد ہوا اور جو اہل وعیال ہلاک ہوئے خدا نے اس سے چند در چند اور زیادہ اس کو بخش دیے اور صحت وتندرستی کے لیے چشمہ جاری کر دیا

Marfat.com

کہ غسل کر کے چنگا ہو جائے۔

﴿ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ ﴾(ص:۴۲۔۴۳)

﴿ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ ﴾(الانبیاء:۸۴)

اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ "رحمت" اس کا ذاتی وصف ہے

﴿ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ﴾(الاعراف:۱۵۶)

اور تا کہ اہل بصیرت اور فرمانبردار بندے اس سے نصیحت وعبرت حاصل کریں:

﴿ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ۝ ﴾ .... ﴿ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ ﴾

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم نے ایوب کو بڑا ہی صابر پایا وہ بہت ہی اچھا بندہ اور ہماری جانب ہر حال میں رجوع ہونے والا ہے:

﴿ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝ ﴾ (ص:۴۴)

ان چار پانچ آیات میں حضرت ایوب علیہ السلام کے جس واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے اس کے اعجاز کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان ہی واقعات کو بیان کرنے میں سفر ایوب کے طویل بیالیس ابواب اور کئی سو آیات نے جگہ لی ہے۔

چند تفسیری حقائق:

اس مقام پر چند تفسیری حقائق کا بیان کر دینا بھی ضروری ہے جو ایوب علیہ السلام کے واقعہ سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔

① اسرائیلی روایات میں حضرت ایوب علیہ السلام کے مرض کے متعلق مبالغہ آمیز روایات درج ہیں اور ان میں ایسے امراض کا انتساب کیا گیا ہے جو باعث نفرت سمجھے جاتے اور جن کی وجہ سے مریض انسان سے بچنا ضروری سمجھا جاتا ہے، مثلاً جذام یا پھوڑے پھنسیوں کا اس حد تک پہنچ جانا کہ بدن گل سڑ جائے اور بدبو سے نفرت پیدا ہونے لگے۔ ان روایات کو نقل کرنے کے بعد بعض مفسرین نے یہ اشکال پیدا کیا کہ "نبی" کو ایسا مرض لاحق نہیں ہوتا جو انسانوں کی نگاہوں میں باعث نفرت ہو اور اس کی وجہ سے وہ مریض سے دور بھاگتے ہوں اس لیے کہ نبوت کے مقصد تبلیغ وارشاد کے منافی ہے اور رشد وہدایت کے لیے رکاوٹ کا باعث اور پھر اس کے دو جواب دیے۔ ایک یہ کہ شاید حضرت ایوب علیہ السلام کو یہ مرض نبوت سے پہلے لاحق ہوا ہو، اور مصیبت و آزمائش پر صبر وشکر کے بعد جب ان کو شفا عطا ہوئی تب منصب نبوت سے سرفراز کیا گیا ہو اور دوسرا جواب یہ کہ اسرائیلی روایات غیر مستند اور مبالغہ آمیز ہیں اور قرآن عزیز اور احادیث رسول میں اس کے متعلق کوئی تفصیل موجود نہیں ہے لہٰذا نہ اشکال پیدا ہوتا ہے اور نہ اس کے جواب کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

محققین کی رائے یہی ہے اور یہی صحیح اور درست ہے اور جبکہ قرآن عزیز نے مرض کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی اور تمام ذخیرۂ حدیث اس کے ذکر سے خالی ہے تو اسرائیلی روایات پر بحث قائم کرنا فضول اور لغو ہے۔

② ﴿ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ ﴾ سے کیا مراد ہے؟ اسرائیلی روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کو آزمانے کے لیے ان کے مال

ومنال، اہل وعیال حتیٰ کہ ان کے جسم پر بھی شیطان کو قابو دے دیا تھا۔

اور محققین کہتے ہیں کہ ایوب علیہ السلام نے یہ بات پاس ادب کے طور پر فرمائی اس لیے کہ یہ حقیقت ہے کہ خدا کی جانب سے تو "خیر" ہی "خیر" ہے اور جس شے کو ہم "شر" کہتے ہیں وہ ہماری نسبت سے "شر" ہے، ورنہ کائنات کے مجموعی مصالح کے لحاظ سے غور کرو گے تو اس کو بھی خیر ہی ماننا پڑے گا، ہماری زندگی اور ہمارے اعمال کی نسبتیں بعض چیزوں کو "شر" بنا دیتی ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ بھی خیر ہی ہوتی ہیں چنانچہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے متقین کا یہ طریقہ ہے کہ جب ان کو بھلائی پہنچتی ہے تو وہ اس کی نسبت خدائے تعالیٰ کی جانب کرتے ہیں اور جب ان پر کوئی برائی حملہ کرتی ہے تو وہ اس کو اپنے نفس کی جانب منسوب کر لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن عزیز میں ایک جگہ اس مضمون کو اس طرح ادا کیا گیا ہے:

﴿مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ﴾ (النساء: ۷۹)

یہی حضرات کرام دوسری توجیہ یہ کرتے ہیں کہ سورۂ انبیاء میں حضرت ایوب علیہ السلام کا جو مقولہ بیان کیا گیا ہے ﴿اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ﴾ تو اس سے وہ مرض مراد ہے جو ایوب علیہ السلام کو لاحق تھا اور سورۂ ص کی اس آیت میں شیطان کی ایذا (نصب) اور عذاب سے وہ وساوس وہموم مراد ہیں جو اس کی جانب سے ان پر ہجوم کرتے اور آئی ہوئی مصیبت کی وجہ سے خدائے تعالیٰ کی ناشکرگزاری اور جزع وفزع پر آمادہ کرنے کے لیے حملہ آور ہوتے رہتے تھے حضرت ایوب علیہ السلام کے صبر واستقامت اور انابۃ الی اللہ کے پاک جذبات کو ٹھیس لگا کر ان کی روحانی اذیت وتکلیف کا باعث بنتے اور حضرت ایوب علیہ السلام کے جسمانی مرض کے مقابلہ میں بہت زیادہ پریشان کن بنتے رہتے تھے۔

③ آیت ﴿وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ﴾ میں اہل وعیال کی عطاء کا جو ذکر آیا ہے کیا اس سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کی صحت کے بعد ان کے ہلاک شدہ اہل وعیال کی جگہ پہلے سے زیادہ ان کے اہل وعیال میں اضافہ کر دیا اور جو اہل خاندان منتشر ہو گئے تھے ان کو دوبارہ ان کے پاس جمع کر دیا۔ یا یہ مقصد ہے کہ ہلاک شدگان کو بھی حیات تازہ بخش دی اور مزید عطاء کر دیے، ابن کثیر رحمہ اللہ نے حسن اور قتادہ سے یہی دوسرے معنی نقل[1] کیے ہیں اور شاہ عبدالقادر صاحب (نوراللہ مرقدہ) کی بھی یہی رائے[2] ہے، اور امام رازی وابن حبان کا رجحان پہلے معنی کی جانب ہے اور آیت میں دونوں معنی کی گنجائش ہے۔

④ سورۂ ص میں ہے:

﴿وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ؕ﴾ (ص: ٤٤)

"اور اپنے ہاتھ میں سینکوں کا مٹھا لے پھر اس سے مار اور قسم میں جھوٹا نہ ہو۔"

تو یہ کس واقعہ کی جانب اشارہ ہے؟ قرآن عزیز اور احادیث صحیح میں تو اس کی کوئی تفصیل مذکور نہیں، البتہ مفسرین یہ کہتے ہیں کہ ایوب علیہ السلام کی ہر قسم کی بربادی کے بعد جب ان کی بیوی کے علاوہ کوئی ان کا غمگسار باقی نہ رہا تو وہ نیک بی بی ہر وقت ایوب علیہ السلام کی تیمارداری میں مشغول اور دکھ درد کی شریک رہتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے حضرت ایوب علیہ السلام کی انتہائی تکلیف

---

[1] ابن کثیر سورۂ ص [2] موضح القرآن سورۂ ص

Marfat.com

سے بے چین ہو کر کچھ ایسے کلمات کہہ دیے جو صبر ایوبی کو ٹھیس پہنچانے والے اور خدائے تعالیٰ کی جناب میں شکوہ کا پہلو لیے ہوئے تھے، ایوب علیہ السلام اس کو برداشت نہ کر سکے اور قسم کھا کر فرمایا کہ میں تجھ کو سو کوڑے لگاؤں گا۔ جب حضرت ایوب علیہ السلام کی مدت امتحان ختم ہوگئی اور وہ صحت یاب ہوئے تو قسم پوری کرنے کا سوال سامنے آیا۔ ایک جانب رفیقہ حیات کی انتہائی وفاداری، غمخواری اور حسن خدمت کا معاملہ اور دوسری جانب قسم کو سچا اور پورا کرنے کا سوال، ایوب علیہ السلام سخت تردد میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے نیک بی بی کی نیکی اور شوہر کے ساتھ وفاداری کا یہ صلہ دیا کہ ایوب علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ سو (۱۰۰) تنکوں کا ایک مٹھا بنائیں اور اس سے اپنی رفیقہ حیات کو ماریں اس طرح آپ کی قسم پوری ہو جائے گی۔

⑤ سورہ ص میں ہے: ﴿ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ ۝ ﴾ ابن کثیر نے اس کی تفسیر میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے:

"اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایوب اپنی جگہ سے اٹھو اور زمین پر ٹھوکر مارو۔ ایوب علیہ السلام نے ارشاد باری کی تعمیل کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک چشمہ جاری کر دیا جس میں انہوں نے غسل کیا اور جسم کا ظاہری روگ سب جاتا رہا اس کے بعد انہوں نے پھر ٹھوکر ماری اور دوسرا چشمہ اُبل پڑا اور انہوں نے اس کا پانی پیا اور اس سے جسم کے باطنی حصہ میں مرض کا جو اثر تھا اس کا بھی قلع قمع ہو گیا اور اس طرح وہ چنگے ہو کر شکر خدا بجا لائے۔ [1] حافظ ابن حجر نے بہ واسطہ ابن جریر، قتادہ سے بھی اسی قسم کا قول نقل کیا ہے۔" [2]

چشمہ ایک تھا یا دو اس بحث سے قطع نظر اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کے لیے صحت کا جو طریقہ اختیار فرمایا وہ فطری طریقہ ہے۔ آج بھی ایسے معدنی چشمے اس نے کائنات انسانی کے فائدے کی خاطر ظاہر کر رکھے ہیں جن میں غسل کرنے اور ان کا پانی پینے سے بہت سے امراض کم ہو جاتے یا دور ہو جاتے ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ ایسے چشمے کا ظہور ایوب علیہ السلام کے لیے اعجاز کی صورت میں ہوا اور عام حالات میں اسباب کے ماتحت ہوا کرتا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں روایت نقل کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حضرت ایوب علیہ السلام غسل فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے سونے کی چند ٹڈیاں ان پر برسائیں ایوب علیہ السلام نے ان کو دیکھا تو مٹھی بھر کر کپڑے میں رکھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کو پکارا: ایوب! کیا ہم نے تم کو یہ سب کچھ دھن دولت دے کر غنی نہیں بنا دیا، پھر یہ کیا؟ ایوب علیہ السلام نے عرض کیا: پروردگار! یہ صحیح اور درست مگر تیری نعمتوں اور برکتوں سے کب کوئی بے پرواہ ہو سکتا ہے۔ ﴿ولكن لا غنى عن بركتك﴾ [3]

اس روایت کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام بخاری کی اپنی شرط کے مطابق حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق کوئی خبر ثابت نہیں ہو سکی اس لیے صرف مسطورہ بالا روایت ہی پر انہوں نے اکتفاء کیا۔ اس لیے کہ وہ ان کی شرط کے مطابق صحیح ہے، اس کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اپنی جانب سے فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں اگر کوئی روایت صحت کو پہنچ سکی ہے تو وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ایک اثر ہے جس کو ابن ابی حاتم اور ابن جریج نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے اور وہ روایت اس طرح ہے:

---

[1] تفسیر سورہ ص [2] فتح الباری ج ۶ ص ۳۲۶ [3] بخاری کتاب الانبیاء

Marfat.com

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایوب علیہ السلام تیرہ سال تک مصائب کے امتحان میں مبتلاء رہے حتیٰ کہ تمام عزیز و اقارب اور قریب و بعید کے متعارف سب ہی نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ البتہ اعزہ میں سے ان کے دو عزیز ضرور صبح وشام ان کے پاس آتے رہے۔ ایک مرتبہ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ایوب علیہ السلام نے کوئی بہت ہی بڑا گناہ کیا ہے تب ہی تو وہ اس کی پاداش میں ایسی سخت مصیبت کے اندر مبتلا ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو خدا ان پر مہربان نہ ہو جاتا اور ان کو شفاء نہ ہو جاتی؟ یہ بات دوسرے نے حضرت ایوب علیہ السلام سے کہہ سنائی۔ ایوب علیہ السلام یہ سن کر بہت بے چین اور مضطرب ہو گئے اور خدائے تعالیٰ کی درگاہ میں سربسجود ہو کر دعا گو ہوئے اس کے فوراً بعد ہی ایوب علیہ السلام رفع حاجت کے لیے جگہ سے اٹھے اور ان کی بیوی ان کا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں، جب فارغ ہو گئے اور وہاں سے علیحدہ ہوئے تو خدا کی وحی نازل ہوئی کہ زمین پر پاؤں سے ٹھوکر مارو، اور جب انہوں نے ٹھوکر ماری تو پانی کا چشمہ اُبل پڑا اور انہوں نے غسل صحت کیا اور پہلے سے زیادہ صحیح تندرست نظر آنے لگے۔ یہاں بیوی انتظار کر رہی تھیں کہ ایوب علیہ السلام تازگی اور شگفتگی کے ساتھ سامنے نظر آئے وہ قطعاً نہ پہچان سکیں اور ایوب علیہ السلام کے متعلق ان ہی سے دریافت کرنے لگیں۔ تب آپ نے فرمایا، میں ہی ایوب ہوں اور خدا کے فضل و کرم کا واقعہ سنایا۔ روزمرہ کے کھانے کے لیے ایوب علیہ السلام کے پاس ایک گٹھری گیہوں کی اور ایک جو کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دولت میں اضافہ کرنے کے لیے گیہوں کو سونے اور جو کو چاندی سے بدل دیا۔ [1]

قریب قریب اسی قسم کا واقعہ ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی روایت کیا ہے، [2] اور مدت مصیبت کے متعلق وہب بن منبہ تین سال بیان کرتے ہیں، اور حسن سے سات سال منقول ہیں۔ [3]

سفر ایوب:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کی روایات کا ماخذ سفر ایوب سے منقول اسرائیلی روایات ہیں اس لیے کہ اس صحیفہ میں ہی ایوب علیہ السلام کے متعلق یہ دو باتیں خصوصیت سے درج ہیں جن کا ذکر قرآن عزیز میں موجود نہیں ہے، ایک یہ کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے چند دوستوں نے ان سے کہا تھا کہ تو نے کوئی سخت گناہ کیا ہے تب ہی اس مصیبت میں مبتلاء ہوا، دوسری یہ کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور انؔ سے مناظرہ کیا، یہ مناظرہ بہت طویل ہے اور صحیفہ کے اکثر ابواب اسی سے متعلق ہیں اور جب دونوں دوستوں نے کسی طرح یقین نہ کیا تب بے چین و مضطرب ہو کر ایوب علیہ السلام نے خدا کی بارگاہ میں دعا کی کہ ان کی صداقت ظاہر کر اور شفایاب کر دے۔ چنانچہ سفر ایوب میں ہے:

> تب نعمتی الیفر نے جواب دیا اور کہا: اگر ہم تجھ سے ایک بات کہیں تو کیا تو ناراض ہوگا..... یاد کیجیو، کیا کوئی بے گناہ ہوتے ہوئے بھی کبھی ہلاک ہوا اور کہاں صادق مارے گے۔ [4] تب ضوفر نعماتی نے جواب دیا اور کہا: کیا طول کلام کا جواب نہ دیا جائے اور کیا کوئی شخص اپنی زیادہ گوئی سے بے گناہ ٹھہرے؟..... جان رکھ کہ خدا نے تیری بدکاری کا بہت ہی کم بدلہ لیا ہے کیا تو اپنی تلاش سے خدا کا بھید پا سکتا ہے۔" [5]

---

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۳۲۶۔ [2] ایضاً ص ۱۳۲۷۔ [3] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۱۸۸۔
[4] باب ۴ آیات ۷۔۱ [5] باب ۱۱ آیات ۷۔۱

Marfat.com

حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنے ان دوستوں کے اس الزام کو تسلیم نہیں کیا اور مناظرہ میں ان کو بتایا کہ میں بے گناہ ہوں اور یہ مصیبت خدا کی جانب سے ایک امتحان ہے اور ہم اس کی حکمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے، چنانچہ خدائے تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کے کلام کی تصدیق کی اور ان کے دوستوں کو قصوروار ٹھہرایا۔

"اور ایسا ہوا کہ جب خداوند ایوب (علیہ السلام) سے یہ باتیں کہہ چکا تو خداوند نے الیفز تیمی سے کہا کہ میرا غضب تجھ پر اور تیرے دونوں دوستوں پر بھڑکا ہے، کیونکہ تم نے میری بابت حق باتیں نہیں کہیں، جیسی میرے بندے ایوب (علیہ السلام) نے کہی ہیں۔" ❶

سفر ایوب نے حضرت ایوب علیہ السلام کے ان دوستوں کے نام یہ بتائے ہیں: الیفز تیمی، سوخی، بلدو، نعماتی ضوفر۔ اور محققین تورات کا یہ دعویٰ ہے کہ سفر ایوب قدیم عربی زبان کی غیر غنائی شاعری کا بے نظیر شاہکار ہے اور یہ کہ دنیا کی قدیم ترین نظم سفر ایوب ہے، اور تاریخی اعتبار سے صرف رگ ویدا اس کا معارضہ کر سکتا ہے جب کہ اس کی تصنیف کے زمانہ سے متعلق وہ مذہب تسلیم کر لیا جائے جو رگ وید کو ۱۵۰۰ ق م یا اس سے بھی پیچھے لے جانا چاہتا ہے۔ ❷

وفات:

سفر ایوب میں ہے کہ ابتلاء سے نجات پانے کے بعد ایوب علیہ السلام ایک سو چالیس سال زندہ رہ کر انتقال کر گئے۔

بعد اس کے ایوب علیہ السلام ایک سو چالیس برس جیا اور اپنے بیٹے اور اپنے بیٹوں کے بیٹے چار پشت تک دیکھے اور ایوب بوڑھا اور دراز عمر ہو کے مر گیا۔ ❸

بصائر:

حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ میں صبر و ضبط، استقلال و استقامت اور مصائب و بلاء میں شکر و سپاس گزاری کے جو اسرار اور حکمتیں موجود ہیں وہ اہل بصیرت کے لیے درس عبرت ہیں ان میں سے چند مسطورۂ ذیل ہیں:

① بندگانِ خدا میں سے جس کو خدائے تعالیٰ کے ساتھ جس قدر تقرب حاصل ہوتا ہے اسی نسبت سے وہ بلایا و مصائب کی بھٹی میں زیادہ تپایا جاتا ہے اور جب وہ ان کے پیش آنے پر صبر و استقامت سے کام لیتا ہے تو وہی مصائب اس کے درجات تقرب کی رفعت و بلندی کے سبب بن جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مضمون کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا:

((قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اشدُّ الناس بلاءً الانبیاءُ ثم الصالحُون ثم الامثل فالامثل.(الحدیث) ❹

"مصائب میں سب سے زیادہ سخت امتحان انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد صلحاء کا نمبر ہے اور پھر حسب مراتب و درجات۔"

---

❶ باب ۴۲ آیات ۷

❷ تفسیر ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۸۸

❸ باب ۴۲ آیات ۱۶۔۱۷

❹ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۱۸۸ منقول از صحاح

Marfat.com

((قال النبی ﷺ یبتلی الرجل علیٰ قدر دینه فان کانَ فی دینه صلابة زید فی بلائه.[۱] (الحدیث)

"انسان اپنے دین کے درجات کے مناسب آزمایا جاتا ہے پس اگر اس کے دین میں پختگی اور مضبوطی ہے تو وہ مصیبت کی آزمائش میں بھی دوسروں سے زیادہ ہوگا۔"

④ وجاہت وعزت، دولت وثروت اور خوشحالی ورفاہیت کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری اور احسان شناسی کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے اور اگر رعونت وانانیت کارفرما نہیں ہے تو بہت آسان ہے لیکن مصیبت وبلاء، رنج ومحن اور عسرت وتنگ حالی میں رضاء بقضاء رہ کر حرف شکایت تک زبان پر نہ لانا اور صبر واستقامت کا ثبوت دینا بہت مشکل اور کٹھن ہے اس لیے جب کوئی خدا کا نیک بندہ اس زبوں حالت میں ضبط واستقلال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اور صبر وشکر کا مسلسل مظاہرہ کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی صفت "رحمت" بھی جوش میں آجاتی ہے اور ایسے شخص پر اس کے فضل وکرم کی بارش ہونے لگتی ہے اور وہ غیر متوقع طور پر بے غایت افضال واکرام سے نوازا جاتا اور دین ودنیا دونوں کی کامرانی کا حق دار بن جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام کی مثال اس کے لیے روشن شہادت ہے:۔

﴿ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَیْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰی لِلْعٰبِدِیْنَ ۝ ﴾ (الانبیاء: ۸۳-۸۴)

③ انسان کو چاہیے کہ کسی حالت میں بھی خدائے تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اس لیے کہ قنوطیت کفر کا شیوہ ہے اور یہ نہ سمجھے کہ مصیبت وبلا محض گناہوں کی پاداش ہی میں وجود پذیر ہوتی ہیں بلکہ بسا اوقات آزمائش اور امتحان بن کر آتی اور صابر وشاکر کے لیے اللہ تعالیٰ کی آغوش رحمت وا کرتی ہیں۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرماتا ہے:

((انا عندَ ظنِّ عبدی بی)). (الحدیث)

"میں اپنے بندہ کے گمان سے قریب ہوں۔"

یعنی بندہ میرے متعلق جس قسم کا گمان اپنے قلب میں رکھتا ہے میں اس کے گمان کو پورا کر دیتا ہوں۔

④ زن وشوہر کے تعلقات میں وفاداری اور استقامت سب سے زیادہ محبوب شے ہے اور اسی لیے ایک حدیث میں شیطانی وساوس میں سے سب سے زیادہ قبیح وسوسہ جو شیطان کو بہت ہی پیارا ہے زن وشوہر کے درمیان بدگمانی اور بغض وعداوت کا بیج بو دینا ہے اسی لیے صحیح احادیث میں اس عورت کو جنت کی بشارت دی گئی ہے جو اپنے شوہر کے حق میں نیکوکار اور وفادار ثابت ہو اور اس وفا اور محبت کی قدر وقیمت اس وقت بہت زیادہ ہو جاتی ہے جب شوہر مصائب وآلام میں گرفتار ہو اور اس کے اعزہ واقرباء تک اس سے کنارہ کش ہو چکے ہوں چنانچہ ایوب علیہ السلام کی "زوجہ مطہرہ" نے ایوب علیہ السلام کے زمانہ مصیبت میں

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۱۸۸ منقول از صحاح

Marfat.com

جس حسن وفا، اطاعت، ہمدردی اور غم خواری کا ثبوت دیا، اللہ تعالیٰ نے اس کے احترام میں ایوب علیہ السلام کی قسم کو ان کے حق میں پورا کرنے کے لیے عام احکام قسم سے جدا ایک ایسا حکم دیا جس سے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس نیک بی بی کی قدر و منزلت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

⑤ عیش و راحت میں تواضع و شکر اور رنج و مصیبت میں ضبط و صبر دو ایسی بیش بہا نعمتیں ہیں کہ جس شخص کو یہ نصیب ہو جائیں وہ دین و دنیا میں کبھی ناکام نہیں رہ سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضاء اور خوشنودی ہر حالت میں اس کی توفیق رہتی ہے:

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ﴿وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ﴾ (ابراهیم:۷)

وَقَالَ : ﴿وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِیْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓىٕكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۫ وَ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾﴾ (البقرہ:۱۵۵-۱۵۷)

Marfat.com

حضرت یونس علیہ السلام

○ حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں ○ حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ ○ نسب ○ زمانہ کا تعین
○ مقام دعوت ○ چند تفسیری مباحث ○ متنبی کاذب کی تلبیس ○ وفات موعظت

حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں:

قرآن عزیز میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر چھ سورتوں میں کیا گیا ہے: سورۂ نساء، انعام، یونس، الصافات، انبیاء، القلم۔ ان میں سے چار پہلی سورتوں میں نام مذکور ہے اور دو آخری سورتوں میں "ذوالنون" اور "صاحب الحوت" مچھلی والا کہہ کر صفت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ذیل کا نقشہ اس حقیقت کے لیے کاشف ہے:

شمار	سورۃ	آیت	عدد
۱	نساء	۱۶۳	۱
۲	انعام	۸۶	۱
۳	یونس	۹۸	۱
۴	انبیاء	۸۸،۸۷	۲
۵	الصافات	۱۴۸،۱۳۹	۱۰
۶	القلم	۵۰،۴۸	۳

یہ بھی واضح رہے کہ سورۂ نساء اور انعام میں انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں فقط نام مذکور ہے اور باقی سورتوں میں واقعات پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے اور حضرت یونس علیہ السلام کی حیات طیبہ کے صرف اسی پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے جو ان کی پیغمبرانہ زندگی سے وابستہ ہے اور جس میں رشد و ہدایت کے مختلف گوشے دعوت بصیرت دیتے ہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ:

قرآن عزیز کی روشنی میں یونس علیہ السلام کا واقعہ اگرچہ مختصر اور اظہار واقعہ کے لحاظ سے صاف اور واضح ہے مگر بعض تفسیری مباحث نے اس کی جزئیات کو معرکۃ الآراء بنا دیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اول آیات قرآنی کی روشنی میں واقعہ کو مفصل بیان کر دیا جائے اور اس کے بعد تفسیری مباحث پر کلام کیا جائے تا کہ واقعہ کی حقیقت سمجھنے میں مدد ملے۔ [1]

حضرت یونس علیہ السلام کی عمر مبارک اٹھائیس سال کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت پر سرفراز فرمایا اور اہل نینویٰ کی رشد و ہدایت کے لیے مامور کیا، یونس علیہ السلام ایک عرصہ تک ان کو تبلیغ فرماتے اور توحید کی دعوت دیتے رہے مگر انہوں نے اعلان حق پر

[1] روح المعانی سورۂ یونس والصافات۔

Marfat.com

کان نہ دھرا اور تمرد وسرکشی کے ساتھ شرک وکفر پر اصرار کیے رہے اور گزشتہ نافرمان قوموں کی طرح خدا کے سچے پیغمبر کی دعوت حق کا ٹھٹھا کرتے اور مذاق اڑاتے رہے، تب مسلسل اور پیہم مخالفت و معاندت سے متاثر ہو کر یونس علیہ السلام قوم سے خفاء ہو گئے اور ان کو عذاب الٰہی کی بددعا کر کے ان کے درمیان سے غضبناک روانہ ہو گئے۔

فرات [1] کے کنارے پہنچے تو ایک کشتی کو مسافروں سے بھرا ہوا تیار پایا، حضرت یونس علیہ السلام کشتی میں سوار ہوئے۔ اور کشتی نے لنگر اٹھا دیا۔ راہ میں طوفانی ہواؤں نے کشتی کو آ گھیرا، جب کشتی ڈگمگانے لگی اور اہل کشتی کو غرق ہونے کا یقین ہونے لگا تو اپنے عقیدہ کے مطابق کہنے لگے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشتی میں کوئی غلام اپنے آقا سے بھاگا ہوا ہے۔ جب تک اس کو کشتی سے جدا نہ کیا جائے گا نجات مشکل ہے" یونس علیہ السلام نے سنا تو ان کو تنبہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو میرا نینویٰ سے وحی کا انتظار کیے بغیر اس طرح چلا آنا پسند نہیں آیا اور یہ میری آزمائش کے آثار ہیں، یہ سوچ کر انہوں نے اہل کشتی سے فرمایا: وہ غلام میں ہوں جو اپنے آقا سے بھاگا ہوا ہے، مجھ کو کشتی سے باہر پھینک دو مگر ملاح اور اہل کشتی ان کی پاکبازی سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور آپس میں یہ طے کیا کہ قرعہ اندازی کی جائے چنانچہ تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی اور ہر مرتبہ یونس علیہ السلام کے نام پر قرعہ نکلا، تب مجبور ہو کر انہوں نے یونس علیہ السلام کو دریا میں ڈال دیا یا وہ خود دریا میں کود گئے۔ اسی وقت خدائے تعالیٰ کے حکم سے ان کو مچھلی نے نگل لیا مچھلی کو حکم تھا کہ صرف نگل لینے کی اجازت ہے، یونس تیری غذا نہیں ہے اس لیے اس کے جسم کو مطلق گزند نہ پہنچے۔ [2] یونس علیہ السلام نے جب مچھلی کے پیٹ میں خود کو زندہ پایا تو درگاہِ الٰہی میں اپنی اس ندامت کا اظہار کیا کہ کیوں وہ وحی الٰہی کا انتظار کیے اور اللہ تعالیٰ سے اجازت لیے بغیر امت دعوت سے ناراض ہو کر نینویٰ سے نکل آئے اور عفو تقصیر کے لیے اس طرح دعا گو ہوئے:

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۸۷)

"الٰہی تیرے سواء کوئی معبود نہیں تو ہی یکتا ہے۔ میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں بے شبہ میں اپنے نفس پر خود ہی ظلم کرنے والا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کی درد بھری آواز کو سنا اور قبول فرمایا، مچھلی کو حکم ہوا کہ یونس کو "جو تیرے پاس ہماری امانت ہے" اگل دے۔ چنانچہ مچھلی نے ساحل پر یونس علیہ السلام کو اگل دیا، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے ان کا جسم ایسا ہو گیا تھا جیسا کہ پرندہ کا پیدا شدہ بچہ کہ جس کا جسم بے حد نرم ہوتا ہے [3] اور جسم پر بال تک نہیں ہوتے، غرض یونس علیہ السلام بہت نحیف و ناتواں حالت میں خشکی پر ڈال دیے گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک بیل دار درخت اگا دیا۔ [4] جس کے سایہ میں وہ ایک جھونپڑی بنا کر رہنے لگے۔ چند دن کے بعد ایسا ہوا کہ حکم خدا سے اس بیل کی جڑ کو کیڑا لگ گیا اور اس نے جڑ کو کاٹ ڈالا، جب بیل سوکھنے لگی تو یونس علیہ السلام کو بہت غم ہوا، تب اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ ان کو مخاطب کیا اور فرمایا: "یونس! تم کو اس بیل کے سوکھنے کا بہت رنج ہوا جو ایک حقیر سی چیز ہے مگر تم نے یہ نہ سوچا کہ نینویٰ کی ایک لاکھ سے زیادہ آبادی جس میں انسان بس رہے ہیں اور ان کے علاوہ جاندار بھی آباد ہیں اس کو برباد اور ہلاک کر دینے میں ہم کو کوئی ناگواری نہیں ہوگی اور کیا ہم

[1] روح المعانی [2] فتح الباری ج ۶ ص ۳۵۱ [3] تفسیر ابن کثیر الصافات [4] کہتے ہیں کہ یہ کدو کی بیل تھی۔

Marfat.com

ان کے لیے اس سے زیادہ شفیق و مہربان نہیں ہیں جتنا کہ تجھ کو اس بیل کے ساتھ انس ہے جو تم وحی کا انتظار کیے بغیر قوم کو بددعا کر کے ان کے درمیان سے نکل آئے، ایک نبی کی شان کے یہ نامناسب ہے کہ وہ قوم کے حق میں عذاب کی بددعا کرنے اور نفرت کر کے ان سے جدا ہو جانے میں عجلت کرے اور وحی کا بھی انتظار نہ کرے۔"

ہوا یہ کہ ادھر یونس علیہ السلام بددعا کر کے اہل نینویٰ سے جدا ہوئے اور ادھر انہوں نے بددعا کے کچھ آثار محسوس کیے، نیز یونس علیہ السلام کے بستی چھوڑ دینے پر ان کو یقین ہو گیا کہ وہ ضرور خدا کے سچے پیغمبر تھے اور اب ہلاکت یقینی ہے تب ہی تو یونس علیہ السلام ہم سے جدا ہو گئے۔ یہ سوچ کر فوراً بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب کے دل خوف و دہشت سے کانپ اٹھے اور یونس علیہ السلام کو تلاش کرنے لگے کہ ان کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کریں اور ساتھ ہی سب خدائے تعالیٰ کی درگاہ میں توبہ و استغفار کرنے لگے اور ہر قسم کے گناہوں سے کنارہ کش ہو کر آبادی سے باہر میدان میں نکل آئے حتیٰ کہ چوپاؤں کو بھی ساتھ لے آئے اور بچوں کو ماؤں سے جدا کر دیا اور اس طرح دنیوی علائق سے کٹ کر درگاہِ الٰہی میں گریہ وزاری کرتے اور متفقہ آواز سے یہ اقرار کرتے رہے:

﴿ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَا جَآءَ بِهٖ يُوْنُسُ ﴾

"پروردگارا یونس (علیہ السلام) تیرا جو پیغام ہمارے پاس لے کر آئے تھے ہم اس کی تصدیق کرتے اور اس پر ایمان لاتے ہیں۔"

آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، ان کو دولت ایمان سے نوازا اور ان کو عذاب سے محفوظ کر دیا۔

بہر حال حضرت یونس علیہ السلام کو اب دوبارہ حکم [1] ہوا کہ وہ نینویٰ جائیں اور قوم میں رہ کر ان کی راہنمائی فرمائیں تاکہ خدا کی اس قدر کثیر مخلوق ان کے فیض سے محروم نہ رہے۔ چنانچہ یونس علیہ السلام نے اس حکم کا امتثال کیا اور نینویٰ میں واپس تشریف لے آئے۔ قوم نے جب ان کو دیکھا تو بے حد مسرت وخوشی کا اظہار کیا اور ان کی راہنمائی میں دین و دنیا کی کامرانی حاصل کرتی رہی۔

یہ واقعہ کی وہ ترتیب جو آیات قرآنی کی تفسیر میں تاویلات سے پاک اور صحیح مفہوم کی ترجمان ہے اور بے غل وغش مختلف سورتوں کی تمام آیات کے معانی کو کسی تکلف کے بغیر صاف صاف ادا کر دیتی ہے لیکن یہ حقیقت اچھی طرح اس وقت ظاہر ہو گی جبکہ واقعہ سے متعلق اختلافی مباحث کو زیر بحث لایا جائے اور پھر اس تفصیلی ترتیب کا موازنہ کیا جائے مگر اس سے قبل آیات قرآنی کا مطالعہ ضروری ہے:

﴿ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴾ (یونس: ۹۸)

"پھر کیوں ایسا ہوا کہ قوم یونس کی بستی کے سوا اور کوئی بستی نہ نکلی کہ (نزول عذاب سے پہلے) یقین کر لیتی اور ایمان کی برکتوں سے فائدہ اٹھاتی؟ یونس کی قوم جب ایمان لے آئی، تو ہم نے رسوائی کا وہ عذاب ان پر سے ٹال دیا جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والا تھا اور ایک خاص مدت تک سروسامان زندگی سے بہرہ مند ہونے کی مہلت دے دی۔"

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۲۲

Marfat.com

﴿وَ ذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَ كَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۸۷۔۸۸)

"اور ذوالنون (یونس علیہ السلام کا معاملہ یاد کرو) جب ایسا ہوا تھا کہ وہ (راہ حق) میں خشمناک ہو کر چلا گیا۔ پھر اس نے خیال کیا کہ ہم اس کو تنگی (آزمائش) میں نہیں ڈالیں گے پھر (جب اس کو آزمائش کی تنگی نے آگھیرا تو) اس نے (مچھلی کے پیٹ میں اور دریا کی گہرائی کی) تاریکیوں میں پکارا "خدایا تیرے سواء کوئی معبود نہیں! تیرے لیے ہر طرح کی پاکی ہو! حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنے اوپر بڑا ہی ظلم کیا۔ تب ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے غمگینی سے نجات دی اور ہم اسی طرح ایمان والوں کو نجات دیا کرتے ہیں۔"

﴿وَ اِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ۝ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَ هُوَ مُلِيْمٌ ۝ فَلَوْ لَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۝ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَ هُوَ سَقِيْمٌ ۝ وَ اَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ۝ وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۝ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝﴾ (الصّٰفّٰت: ۱۳۹۔۱۴۸)

"اور بیشک یونس پیغمبروں میں سے تھا۔ (اور وہ واقعہ یاد کرو) جبکہ وہ بھری ہوئی کشتی کی جانب بھاگا۔ (اور جب کشتی والوں نے غرق ہونے کے خوف سے) قرعہ ڈالا تو (دریا میں) ڈالے جانے کے لیے اس کا نام نکلا، پھر نگل گئی اس کو مچھلی اور وہ (اللہ کے نزدیک قوم کے پاس سے بھاگ آنے پر) قابل ملامت تھا پس اگر یہ بات نہ ہوتی کہ وہ خدا کی پاکی بیان کرنے والوں میں سے تھا تو مچھلی کے پیٹ میں قیامت تک رہتا، پھر ڈال دیا ہم نے اس کو مچھلی کے پیٹ سے نکال کر) چٹیل زمین میں اور وہ ناتواں اور بے حال تھا اور ہم نے اس پر (سایہ کے لیے) ایک بیل والا درخت اُگا دیا اور ہم نے اس کو ایک لاکھ سے زیادہ انسانوں کی جانب پیغمبر بنا کر بھیجا۔ پس وہ ایمان لے آئے پھر ہم نے ان کو ایک مدت (پیغام موت) تک سامان زندگی سے نفع اٹھانے کا موقع دیا۔"

﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَ هُوَ مَكْظُوْمٌ ۝ لَوْ لَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَ هُوَ مَذْمُوْمٌ ۝ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝﴾ (القلم: ۴۸۔۵۰)

"پس اپنے پروردگار کے حکم کی وجہ سے صبر کو کام میں لاؤ اور مچھلی والے (یونس علیہ السلام) کی طرح (بے صبر) نہ ہو جاؤ جبکہ اس نے (خدا کو) پکارا اور وہ بہت مغموم تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اس کے پروردگار کے فضل نے اس کو (آغوش میں) لے لیا تھا تو وہ ضرور چٹیل میدان میں ملامت شدہ ہو کر پھینک دیا جاتا۔ پس اس کے پروردگار نے اس کو برگزیدہ کیا اور اس کو نیکو کاروں میں رکھا۔"

نسب:

مؤرخین اسلام اور اہل کتاب اس پر متفق ہیں کہ یونس علیہ السلام کے نسب سے متعلق اس سے زیادہ اور کوئی بات ثابت نہیں کہ ان کے والد کا نام متی [1] ہے اور بعض لوگوں نے کہا کہ متی حضرت یونس علیہ السلام کی والدہ کا نام ہے مگر یہ فاحش غلطی ہے اس لیے کہ بخاری کی ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بصراحت مذکور ہے کہ متی والد کا نام ہے [2] اور اہل کتاب یونس علیہ السلام کا نام یوناہ اور ان کے والد کا نام امتی بتاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یونس بن متی اور یوناہ بن امتی میں کوئی نمایاں اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ عربی اور عبری زبانوں کی لفظی تعبیر کا فرق ہے۔

زمانہ کا تعین:

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یونس علیہ السلام کے زمانہ کا تعین تاریخی روشنی میں مشکل ہے۔ البتہ بعض مؤرخین نے یہ کہا ہے کہ جب ایرانی (فارس) میں طوائف الملوکی کا دور تھا اس وقت نینوئی میں حضرت یونس علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ [3]

محققین جدید نے فارس کی حکومت کو تین عہدوں پر تقسیم کیا ہے، ایک حملہ سکندر سے قبل، دوسرا پارتھوی حکومت یعنی طوائف الملوکی، تیسرا ساسانی عہد۔

پہلا عہد، عروج و ارتقاء کا عہد شمار ہوتا ہے اور اس کی ابتداء تقریباً ۵۵۹ ق م سے سمجھی گئی ہے جو تقریباً ۳۷۲ ق م یعنی دو صدی پر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا عہد تقریباً ۳۷۲ ق م سے شروع ہو کر ۱۵۰ء تک پہنچتا ہے اور یہی طوائف الملوکی کا دور کہا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد ساسانی دور حکومت شروع ہو جاتا ہے۔ [4]

اس تحقیق کے پیش نظر حافظ ابن حجر کی نقل کے مطابق یونس علیہ السلام کا عہد ۳۷۲ ق م سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے درمیان ہونا چاہیے۔ مگر یہ قول تاریخی نقطہ نظر سے غلط ہے اس لیے کہ مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ بابلیوں کے ہاتھوں آشوریوں کا یہ مشہور شہر (نینوی) ۶۱۲ ق م میں تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں اہل کتاب کی روایات یہ شہادت دیتی ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام کے عہد کے بعد ۶۹۰ ق م میں جب اہل نینوئی نے دوبارہ کفر و شرک اور ظلم و ستم شروع کر دیا اور ان کی سرکشی بہت بڑھ گئی۔ تب ایک اسرائیلی نبی ناحوم نے دوبارہ ان کو سمجھایا اور ہدایت و رشد کی دعوت دی، اور جب انہوں نے کوئی پروا نہیں کی تو نینوئی کی تباہی کی پیشین گوئی فرمائی اور اس سے ستر برس بعد ۶۱۲ ق م میں نینوئی تباہ و برباد ہو گیا۔ لہٰذا حضرت یونس علیہ السلام کا عہد ۶۹۰ ق م سے بھی قدیم ہونا چاہیے غالباً شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) کا یہ قول صحیح ہے کہ یونس علیہ السلام حزقیل علیہ السلام کے معاصر ہیں، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

> "حزقیل کے یاروں میں تھے یونس علیہ السلام بڑے شوق میں عبادت کی اور دنیا سے الگ حکم ہوا کہ ان کو بھیجو شہر نینوا میں مشرکوں کو منع کریں بت پوجنے سے۔ [5]

---

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۳۵۱ [2] بخاری کتاب الانبیاء [3] فتح الباری ج ۶ ص ۳۵۰
[4] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۸۳، یہ دور اردشیر بن بابکان پر ختم ہو جاتا ہے اور اردشیر پہلا ساسانی بادشاہ ہے۔
[5] موضح القرآن سورۃ انبیاء

لیکن اس جگہ حزقیل کے نام میں عرب مؤرخین کو عام طور پر یہ مغالطہ ہوا کہ وہ اس سے حزقیل "بادشاہ" سمجھے ہیں حالانکہ بنی اسرائیل میں اس نام کا کوئی بادشاہ نہیں گزرا اس لیے دراصل اس سے مراد مشہور پیغمبر حزقیل علیہ السلام ہیں۔

اس تحقیق سے بات واضح ہوگئی کہ یونس علیہ السلام اسرائیلی پیغمبر ہیں۔

امام بخاری نے کتاب الانبیاء میں انبیاء علیہم السلام کے ذکر میں اپنی تحقیق کے مطابق جو ترتیب قائم کی ہے اس میں یونس علیہ السلام کا ذکر حضرت موسیٰ و حضرت شعیب علیہما السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے درمیان کیا ہے۔

مقام دعوت:

عراق کے مشہور و معروف مقام نینویٰ کے باشندوں کی ہدایت کے لیے ان کا ظہور ہوا تھا۔ نینویٰ آشوری حکومت کا پایۂ تخت اور موصل کے علاقہ کا مرکزی شہر تھا۔

جس زمانہ میں یونس علیہ السلام نینویٰ کے باشندوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے وہ زمانہ آشوری حکومت کے عروج کا زمانہ تھا مگر ان کا طرز حکومت قبائلی تھا اور ہر ایک قبیلہ کا جدا جدا حکمران یا بادشاہ ہوتا تھا اور نینویٰ ان قبائلی حکومتوں کے پایۂ تختوں میں مرکز کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے اپنے عروج و اقبال میں مشہور تھا۔

قرآن عزیز میں اس شہر کی مردم شماری ایک لاکھ سے زیادہ بتائی گئی ہے، ترمذی نے بسند غریب ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے اس میں یہ تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بتائی گئی ہے اور مجموعہ تورات میں جو صحیفہ یونس علیہ السلام کے نام سے موسوم ہے اس میں بھی یہی تعداد مذکور ہے مگر ابن عباس رضی اللہ عنہما سعید بن جبیر اور مکحول وغیرہ سے اویزیدون کی تفسیر میں دس ہزار سے لے کر ستر ہزار تک منقول ہے۔ ہمارے نزدیک پہلا قول راجح ہے۔

چند تفسیری مباحث:

سورۂ انبیاء میں ہے: ﴿وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ﴾ اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں بعض مفسرین یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ یونس علیہ السلام اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے اور وحی کا انتظار اور خدا کی مرضی معلوم کیے بغیر چلے گئے۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ "ہم ان کی اس جلد بازی پر ان کو آزمائش اور تنگی میں نہ ڈالیں گے۔" اس تفسیر کے مطابق ﴿مُغَاضِبًا﴾ کا تعلق قوم سے ہے اور ﴿لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ﴾ کے معنی ﴿لَّنْ نُّضِيْقَ عَلَيْهِ﴾ کے ہیں، اور قدر بمعنی ضیق (تنگی) بکثرت مستعمل ہے، جمہور کا یہی قول ہے اور ابن عباس، ضحاک، قتادہ، حسن سے یہی منقول ہے اور ابن کثیر اور ابن جریر کا یہی مختار قول ہے۔

اور بعض مفسری نے ﴿مُغَاضِبًا﴾ کی پہلی تفسیر کے ساتھ اتفاق رکھتے ہوئے ﴿لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ﴾ میں قدر بمعنی "تقدیر قدرت" لیتے ہیں اور یہ معنی کرتے ہیں "یونس نے سمجھا کہ ہم اس کو نہ پکڑ سکیں گے" یہ عطیہ عوفی کا قول ہے مگر اس تفسیر پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ایسا عقیدہ تو کفر ہے، لہٰذا یہ بات جبکہ ایک مسلمان بھی نہیں سمجھ سکتا تو نبی کیسے ایسا گمان کر سکتے ہیں، اس اشکال کا جواب مفسرین یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے ساتھ عوام و خواص سے بالکل جدا ہے اور جو بات خواص اور صالحین

کے حق میں معمولی اور قابل نظر انداز سمجھی جاتی ہے وہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں سخت گرفت کا باعث ہو جاتی ہے اور اس بناء پر ان سے اگر معمولی سی لغزش بھی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے سخت سے سخت تعبیر اور اس کو بہت بڑا جرم ظاہر کرتا ہے تاکہ وہ یہ محسوس کریں کہ ان کی شان اس قدر رفیع اور خدا کے یہاں اس درجہ بلند ہے کہ معمولی سے معمولی لغزش بھی ان کی شان کے نامناسب ہے مگر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ ان کے اس الزامی واقعہ میں ان کے متعلق ایسی بات بھی کہہ دیتا ہے جس سے یہ واضح ہو جائے کہ اگرچہ خدا کے نزدیک ان کا یہ معاملہ حد درجہ قابل گرفت و مواخذہ ہے مگر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی بارگاہ میں ان کی مقبولیت و برگزیدگی میں مطلق فرق نہیں آیا۔ اور چونکہ وہ فوراً ہی خطاء پر متنبہ کر دیے جاتے اور وہ اظہار ندامت کے ساتھ عذر خواہی کر کے شرف قبولیت حاصل کر لیتے ہیں اس لیے ان کا تقرب الی اللہ اسی طرح قائم ہے۔ چنانچہ حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے واقعات مذکورہ قرآن اس کے شاہد ہیں۔

یہاں بھی یہی صورت ہے کہ یونس علیہ السلام نے حقیقتاً یہ گمان نہیں کیا تھا اور نہ کر سکتے تھے لیکن چونکہ وہ نبی تھے اور وحی الٰہی کے مخاطب رہتے تھے اس لیے ان کے چلے جانے کی یہ صورت حال ان کی شان کے نامناسب تھی لہٰذا خدائے تعالیٰ نے ان کی اس حالت کو ایسی سخت تعبیر کے ساتھ ظاہر فرمایا۔ مگر ساتھ ہی ان کے واقعات میں یہ ظاہر کر کے ﴿وَ اِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ اور ﴿فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ ان کی عظمت وشان اور رفعت مرتبہ کو محفوظ رکھا تاکہ کسی کو مغالطہ نہ ہونے پائے اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس خاص معاملہ سے کسی کج فہم کو کجروی کا موقعہ ہاتھ نہ آئے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ﴿مُغَاضِبًا﴾ کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے یعنی جب یونس علیہ السلام نے یہ دیکھا کہ عذاب کی مدت پر عذاب نہیں آیا تو اس بات پر خفاء ہو کر چلے گئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو قوم کے سامنے جھوٹا بنا دیا۔ لیکن یہ معنی ہرگز صحیح نہیں، اس لیے کہ جب یہ بات سب کے نزدیک تسلیم شدہ ہے کہ یونس علیہ السلام اپنی قوم سے ناراض ہو کر اور عذاب کی پیشین گوئی کر کے نینویٰ سے چلے گئے تھے تو پھر اس صاف معنی کو چھوڑ کر ایک بے سند قصہ اس میں اور اس طرح اضافہ کرنا کہ وہ نینویٰ کی بستی سے نکل کر کچھ دن جنگل میں مقیم رہے تاکہ قوم کی ہلاکت کا حال معلوم کریں اور جب شیطان نے پیر ضعیف کی شکل میں آ کر عذاب ٹل جانے کی اطلاع دی تو اللہ تعالیٰ سے خفا ہو کر چل دیے اور پھر کشتی کا واقعہ پیش آیا، قطعاً دور از کار اور بے محل ہے۔

حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع پر موضح القرآن میں جو تحریر فرمایا ہے وہ ان سب تفسیروں سے جدا روش پر مبنی ہے ان کے نزدیک ﴿مُغَاضِبًا﴾ کا تعلق قوم اور اللہ تعالیٰ دونوں سے ہے اور یونس علیہ السلام کی خفگی کا معاملہ تین مرتبہ پیش آیا۔ ایک جب کہ ان کو نینویٰ جانے کا حکم ہوا کہ اہل شہر نے شرک و کفر اور ظلم وستم میں طوفان برپا کر رکھا ہے اور دوسرا جب کہ قوم میں رہ کر سمجھاتے رہے اور انہوں نے کسی طرح مان کر نہ دیا تو عذاب کی پیشین گوئی کر کے اور خفا ہو کر چلے گئے اور تیسرا جب کہ ان کو یہ اطلاع ملی کہ عذاب نہیں آیا اور مجھ کو جھوٹا سمجھا جائے گا۔

مگر مجھ کو اس آخری حصہ کے متعلق سخت حیرت یہ ہے کہ یونس علیہ السلام کو یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ قوم پر عذاب نہیں آیا۔ مگر یہ معلوم نہ ہوا کہ قوم پر اس لیے عذاب نہیں آیا کہ وہ ایمان سے بہرہ یاب ہو چکی اور آپ کے لیے چشم براہ ہے، رہا شیطان کے اطلاع دینے کا معاملہ سو اس کے لیے شرعی حجت کی ضرورت ہے جس کا اس جگہ قطعاً ثبوت نہیں ہے، لہٰذا یہ آخری قول تو کسی بھی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

Marfat.com

حضرت شاہ صاحب نے جملہ ﴿ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ ﴾ کی تفسیر میں بھی عجیب پہلو اختیار فرمایا ہے جو راجح و مرجوح اور صحیح وغیر صحیح سے قطع نظر ان کی ذکاوت طبع پر دلالت کرتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ جو فرمایا: سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے یعنی مہربانی کے معاملہ میں اس کو راضی نہ کر سکیں گے وہ ایسا خفا ہوا۔ اور حکومت کے معاملہ میں ہر چیز آسان ہے۔"

یعنی یونس علیہ السلام نے خدا کے ساتھ ناز و ادا کا ایسا پہلو اختیار کیا کہ گویا وہ اللہ تعالیٰ سے ایسے خفا ہوئے ہیں کہ اب راضی نہ ہوں گے مگر ان کو یہ حقیقت فراموش ہوگئی کہ جب وہ آزمائش کے شکنجہ میں کسے جا کر پھر خدائے تعالیٰ کی مہربانیوں میں ڈھانپ لیے جائیں گے تو ساری خفگی و ناراضی بھول جائیں گے اور توبہ و ندامت کے ساتھ بہت جلد راضی ہو جائیں گے اور پھر شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جہاں حکومت و طاقت ہوتی ہے وہاں مشکل آسان ہو جاتی ہے اور ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔

④ سورۂ الصافات آیت ۱۴۸ میں اہل نینویٰ کے ایمان لے آنے کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

﴿ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴾ (الصافات: ١٤٨)

"پس وہ ایمان لے آئے پھر ہم نے ان کو ایک مدت تک کے لیے فائدہ اٹھانے دیا۔"

اور سورۂ یونس پارہ ۱۱ آیت ۹۸ میں ہے:

﴿ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴾ (یونس: ۹۸)

"جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان پر سے وہ رسوا کن عذاب ٹال دیا جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والا تھا اور ایک خاص مدت تک فائدہ اٹھانے کی مہلت دے دی۔"

ان ہر دو قرآنی آیات میں جملہ ﴿ فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴾ نے مفسرین کے لیے بحث کا دروازہ کھول دیا اور جس قدر بھی احتمالات عقلی ہو سکتے تھے سب ہی بیان کر دیے۔ کسی نے کہا اس سے یہ مراد ہے کہ سنت اللہ یہ جاری رہی ہے کہ جب کسی قوم پر عذاب آتا ہے تو پھر ٹلتا نہیں اور اس وقت کا ایمان معتبر نہیں کیونکہ وہ "ایمان بالغیب" نہیں ہوتا بلکہ مشاہدہ کا ایمان ہوتا ہے جیسا کہ فرعون نے غرق ہوتے وقت عذاب کے فرشتوں کو دیکھ کر کہا تھا: ﴿ اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى ﴾ مگر یونس علیہ السلام کی قوم اس قانون سے مستثنیٰ کر دی گئی اور عذاب دیکھ کر جب انہوں نے توبہ اور انابت الی اللہ کا مظاہرہ کیا تو ان پر سے عذاب ٹال دیا گیا، چنانچہ اس جملہ سے قبل اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے ﴿ فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ﴾ پھر کیوں ایسا ہوا کہ قوم یونس کی بستی کے سوا اور کوئی بستی نہ نکلی کہ ایمان لے آتی اور اس کا ایمان اس کے لیے نفع بخش ہوتا۔

یہ تفسیر جمہور کے نزدیک ساقط الاعتبار ہے اس لیے کہ زیر بحث آیت میں کسی جملہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قوم یونس پر عذاب آ چکا تھا اور جب وہ عذاب میں گھر گئے تو عذاب کے مشاہدہ کے بعد خوف نے ان کو ایمان پر آمادہ کر دیا اور پھر سنت اللہ کے خلاف صرف یونس علیہ السلام کی قوم کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا کہ ان کے ایمان بالمشاہدہ کو قبول کر کے ان پر سے عذاب ہٹا لیا گیا بلکہ آیت میں تو صاف یہ کہا گیا ہے کہ جس طرح یونس کی قوم ایمان لے آئی اسی طرح اور بستیوں نے بھی کیوں ایمان قبول نہیں کر لیا تا کہ جس

Marfat.com

طرح قوم یونس عذاب سے محفوظ رہی اسی طرح وہ سب بھی عذاب سے محفوظ رہتیں۔ اس مقام پر تو اللہ تعالیٰ اس پر ناراضی کا اظہار فرما رہے ہیں کہ ایمان لا کر دوسری بستی کے لوگوں نے بھی قوم یونس کی طرح کیوں خود کو عذاب سے نہ بچا لیا لیکن جمہور کے خلاف تفسیر بالا یہ ظاہر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ قوم یونس کے سوا جس قوم نے بھی عذاب کا مشاہدہ کر کے ایمان قبول کیا ہم نے اس کے ایمان کو رد کر دیا مگر قوم یونس پر یہ مہربانی کی کہ ان کے ایمان بالمشاہدہ کو منظورہ کر لیا۔ ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا!

اور اگر کوئی شخص اس موقع پر یہ سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ کو قوم یونس ہی کے ساتھ ایسی کیا خصوصیت تھی اور دوسری قوموں کے ساتھ کیا عداوت کہ جس قسم کا ایمان قوم یونس کا قبول ہوا؟ اس قسم کا دوسری قوموں کا کیوں نہ ہوا؟ تو نہ معلوم اس تفسیر کے قائلین اس کا کیا جواب دیں گے؟ اور بعض مفسرین کہتے ہیں کہ چونکہ قوم یونس نے عذاب کا مشاہدہ کر کے ایمان قبول کیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے صرف دنیا میں اس کو مقبول قرار دیا اور ان پر سے عذاب ہٹا کر دنیا کی زندگی میں مہلت دے دی مگر آخرت کا عذاب بحالہ ان پر قائم رہا۔

یہ قول بھی پہلے قول کی طرح غلط اور قرآن عزیز کے سیاق و سباق کے قطعاً خلاف ہے اس لیے کہ سورۂ والصافات اور سورۂ یونس میں ﴿فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ﴾ کا یہ مطلب کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ ان کا ایمان صرف دنیوی زندگی تک مفید تھا اور آخرت میں وہ کافر اور مشرک ہی شمار ہوں گے جبکہ سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ قوم یونس کی منقبت اور گزشتہ اقوام کے ایمان نہ لانے کی مذمت ہی میں اس واقعہ کو بیان کر رہا اور شاہد بنا رہا ہے اور اس جگہ سیاق کلام ہی یہ ہے کہ دوسری اقوام کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے تھا جیسا کہ یونس علیہ السلام کی قوم نے کیا اور جبکہ والصافات میں ان کے ایمان کو کسی بھی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا؟ نیز قرآن عزیز جب بھی ﴿اٰمَنُوْا﴾ کہتا ہے تو اس سے وہی ایمان مراد لیتا ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں اس کے نزدیک مقبول ہے وہ ﴿اَسْلَمْنَا﴾ کو تو لغوی معنی میں استعمال کرتا ہے جیسا کہ اعراب مدینہ کے واقعہ میں مذکور ہے لیکن ﴿اٰمَنُوْا، اَسْلَمْنَا﴾ کو کبھی "ایمان معتبر" کے سوا دوسرے معنی میں استعمال نہیں کرتا البتہ اس مقام پر ﴿فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ﴾ یا تو اس معنی میں ہے جو ہم ترجمہ میں ابن کثیر سے نقل کر چکے ہیں اور یا پھر یہ مراد ہے کہ گزشتہ اقوام کی تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ جن قوموں نے اپنے نبی اور پیغمبر کی ہدایت کو تسلیم نہیں کیا اور ان کے ساتھ ٹھٹھا کر کے ظلم و طغیان کو اسوہ بنا لیا، وہ قومیں ان کے نبی کی بددعا سے ہلاک ہو گئیں اور ان کی بستیاں آنے والی قوموں کے لیے سرمایہ عبرت بنیں اس لیے قرآن عزیز جب عاد، ثمود، قوم صالح، قوم لوط علیہ السلام وغیرہ کا ذکر کرتا ہے تو چشم عبرت سے دیکھنے والے آنکھ اٹھا کر ان بستیوں کا انجام دیکھ لیتے اور قرآن کی تصدیق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن یونس علیہ السلام کی قوم کا معاملہ ایک شبہ پیدا کرتا تھا اور وہ یہ کہ اگر باشندگان نینویٰ نے ایمان قبول کر لیا تھا تو پھر خدا کے ان مقبول بندوں کی نسلیں آج بھی پھلتی پھولتی نظر آنی چاہیے تھیں مگر تاریخ بتاتی ہے کہ وہ قوم اور ان کا تمدن دنیا سے اسی طرح فنا ہو گیا جس طرح عذاب الٰہی سے ہلاک شدہ قوموں کا، حتیٰ کہ نینویٰ جیسا عظیم الشان اور تاریخی شہر جو آشوری تمدن کا مرکز تھا اس طرح دنیا سے مٹ گیا کہ ۲۰۰ ق م تک دنیائے تاریخ میں اسی کا صحیح جائے وقوع تک بھی بے نشان اور نامعلوم ہو گیا تھا۔ [1]

---

[1] تفسیر ترجمان القرآن جلد ۲ ماخوذ از یونانی مورخ

Marfat.com

لہٰذا قرآن عزیز نے اس شبہ کا جواب پہلے ہی دے دیا تاکہ شبہ کرنے والے کی نگاہ فوراً ہی تاریخ کے دوسرے ورق پر پڑ جائے وہ یہ کہ یہ درست ہے کہ قوم یونس حضرت یونس علیہ السلام کے زمانہ میں مومن، عادل اور پاکباز ہوگئی تھی لیکن ان کی حیات طیبہ کا یہ دور عرصہ تک قائم نہیں رہا اور عرصہ کے بعد ان میں کفر و شرک اور ظلم و سرکشی کا وہ تمام مواد پھر جمع ہوگیا جس کے لیے یونس علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے اور اس زمانہ کے اسرائیلی نبی ناحوم علیہ السلام نے اگرچہ ان کو بہت سمجھایا اور ہدایت و رشد کی راہ دکھائی مگر اس مرتبہ گزشتہ قوموں کی طرح انہوں نے بھی سرکشی اور بغاوت کو زندگی کا نصیب العین بنائے رکھا تب وحی الٰہی کی روشنی میں ناحوم علیہ السلام نے نینویٰ کی تباہی کی خبر دی اور ان کی پیشین گوئی سے ستر برس کے اندر آشوری قوم کا تمدن اور ان کا مرکز شہر سب بابلیوں کے ہاتھوں اس طرح فنا ہوگئے کہ نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

پس قرآن عزیز نے ایک جانب قوم یونس کے ایمان لے آنے پر ان کی مدحت کی اور ان کو سراہا تو دوسری جانب یہ بھی اشارہ کر دیا کہ جن افراد نے یہ نیکوکاری اختیار کی ان کو ہم نے بھی سروسامان زندگی سے نفع اٹھانے کا موقع دیا یعنی عذاب سے بچا لیا لیکن قوم یونس کی یہ حالت ہمیشہ نہ رہی اور ایک زمانہ وہ آیا کہ انہوں نے پھر ظلم و ستم اور کفر و شرک کو اپنا لیا، اور گزشتہ سرکش قوموں کی طرح سمجھانے کے باوجود بھی نہ سمجھی تب خدائے تعالیٰ نے بھی ان کے ساتھ وہی کیا جو "سنت اللہ" کے مطابق ایسی قوموں کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔

بہرحال جمہور علماء اسلام کی تفسیر کے مطابق صحیح بات یہی ہے کہ قوم یونس علیہ السلام پر عذاب نہیں آیا بلکہ بعض ابتدائی آثار نمودار ہوئے تھے جن میں سب سے بڑا اثر حضرت یونس علیہ السلام کا عذاب کی بددعا کر کے بستی کو چھوڑ دینا تھا جس کو قوم نے فوراً محسوس کیا اور دوسرے آثار و قرائن کو دیکھ کر یقین کر لیا کہ یونس علیہ السلام بیشک خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور ایمان لے آئے اور ﴿عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جب قوموں کی سرکشی اور ستم کشی پر خدا کا عذاب آتا ہے تو عذاب آخرت سے قبل ان کو دنیا ہی میں ذلت و رسوائی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور جبکہ قوم یونس مسلمان ہوگئی اور ایمان لے آئی تو وہ دنیا کی اس ذلت و خواری سے بھی بچ گئے جو ظلم و شرک کی وجہ سے ان کو پیش آنے والی تھی یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ دنیا کے عذاب سے تو بچ گئی مگر آخرت کا عذاب بحالہ قائم رہا۔

حافظ ابن حجر اور ابن کثیر نے حضرت عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، مجاہد، سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم سے یہی نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ سلف صالحین یہی تفسیر کرتے تھے چنانچہ جملہ ﴿فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والغرض انه لم یوجد قریة امنت بکمالها بنبیهم ممن سلف من القریٰ الا قوم یونس وهم اهل نینویٰ وما کان ایمانهم الا خوفًا من وصول العذاب الذی انذرهم به رسولهم بعد ما عاینوا اسبابه وخرج رسولهم من بین اظهرهم فعندها جاروا الی الله واستغاثوا به..... الخ [1]

"اور غرض یہ ہے کہ گزشتہ بستیوں میں سے کوئی بستی ایسی نہ نکلی کہ اس کے باشندے اپنے نبیوں پر اس طرح ایمان کامل لے آتے جس طرح یونس کی قوم یونس علیہ السلام پر ایمان لے آئی اور یہ باشندگان نینویٰ تھے اور ان کے ایمان لانے کا واقعہ یہ ہے

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ یونس

Marfat.com

کہ ان کو اس عذاب کے آ جانے کا ڈر پیدا ہو گیا تھا جس سے ان کے پیغمبر نے ان کو ڈرایا تھا جب کہ انہوں نے عذاب کے آثار محسوس کیے اور انہوں نے دیکھا کہ ان کا پیغمبر ان کے درمیان سے نکل گیا اس وقت وہ اللہ کی طرف پناہ چاہنے لگے اور انہوں نے خدا کی پناہ ڈھونڈھنی شروع کر دی۔"

اور جملہ ﴿مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ﴾ کی تفسیر میں کہتے ہیں:

ای الی وقت اجالهم۔ [1] یعنی اپنی زندگی میں عذاب سے محفوظ ہو گئے۔ رہا موت کا معاملہ تو وہ سب کے لیے ہے۔ اور دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

﴿فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ﴾ (الصافات: ۱۴۸)

واختلف المفسرون هل كشف عنهم العذاب الاخروى مع الدنيوى او انما كشف عنهم فى الدنيا فقط؟ على قولين والايمان منقذ من العذاب الاخروى وهذا هو الظاهر... الخ [2]

"اور آیت ﴿فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ﴾ میں مفسرین کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اخروی اور دنیوی دونوں عذاب ٹل گئے تھے اور دوسرا یہ کہ صرف دنیوی ٹل گیا تھا اور اخروی بحالہ قائم رہا۔ اور حقیقت حال یہ ہے کہ "ایمان" نہ صرف دنیا کے عذاب سے چھٹکارا دلاتا ہے بلکہ آخرت کے عذاب سے بھی نجات دلانے والا ہے۔"

اور حضرت شاہ صاحب نے اس مقام پر بھی اپنے رنگ کی جدا تفسیر کی ہے مگر اس کا مال جمہور کی تائید ہی نکلتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

"یعنی دنیا میں عذاب دیکھ کر ایمان لانا کسی کو کام نہیں آیا۔ مگر قوم یونس کو اس واسطے کہ ان پر (خدا کی جانب سے) حکم عذاب نہ پہنچا تھا۔ حضرت یونس کی شتابی سے صورت عذاب کی نمودار ہوئی تھی وہ ایمان لائے اور پھر بچ گئے۔ اسی طرح مکہ کے لوگ فتح مکہ میں ان پر فوج اسلام پہنچی قتل و غارت کو، لیکن ان کا ایمان قبول ہو گیا اور امان ملی۔" [3]

متنبی کاذب کی تلبیس:

حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ سے متنبی پنجاب (مرزا غلام احمد قادیانی) نے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ کہ جب قادیانی نے اپنے بعض مخالفوں کو یہ چیلنج کیا کہ اگر وہ اسی طرح مخالفت کرتے رہے تو خدا کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ فلاں وقت تک ان پر عذاب الٰہی آ جائے گا لیکن مخالفوں کی جانب سے اس کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہ ملا کہ ان کی مخالفانہ جدوجہد اور تیز ہو گئی مگر اس کے باوجود ان پر عذاب نہیں آیا تب ناکامی کی ذلت سے بچنے کے لیے قادیانی نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ چونکہ مخالف دل میں ڈر گئے ہیں اس لیے ان پر سے عذاب ٹل گیا جس طرح یونس علیہ السلام کی قوم پر سے ٹل گیا تھا۔

لیکن قرآن عزیز کی روشن شہادت قادیانی کے اس حیلہ کو مردود قرار دیتی ہے اس لیے کہ یونس علیہ السلام کی قوم نے تو عذاب آنے سے قبل ہی علی الاعلان ایمان قبول کر لیا۔ یونس علیہ السلام کو پیغمبر صادق مان کر ان کی جستجو شروع کر دی اور ان کے واپس آنے پر ان

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ یونس [2] سورۂ والصافات فتح الباری ج ۶ ص ۳۵۱ [3] سورۂ یونس

Marfat.com

کی پیروی کو دین ایمان بنالیا مگر قادیانی حریفوں نے نہ صرف مخالفت باقی رکھی بلکہ قادیانی مشن کے خلاف جدوجہد کو اور تیز کر دیا۔ لہٰذا قادیانی کا اپنے جھوٹے دعوے کے لیے یونس علیہ السلام کے واقعہ سے دلیل لانا اور اس کی آڑ لے کر کذب بیانی کو چھپانا بے سود کوشش اور قیاس مع الفارق ہے اور اگر بفرض محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قادیانی کے مخالف دل میں ڈر گئے تھے تو کیا جو شخص دل میں کسی کی صداقت کا یقین رکھتا ہو مگر اپنے قول و عمل سے اس کا انکار کرتا رہے مومن کہلایا جا سکتا ہے؟ اگر ایسا ہو سکتا تو جن یہود کے متعلق قرآن عزیز نے اعلان کیا ﴿یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَہُمۡ ۘ﴾ "وہ (یہود) رسول اللہ ﷺ کو یعنی ان کے پیغمبر ہونے کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد ہونے کا "یقین رکھتے ہیں" وہ مومن کیوں نہ کہلائے؟

کیا یونس علیہ السلام کی صداقت اور مرزا قادیانی کی کذب بیانی کے درمیان یہ نمایاں فرق کافی نہیں ہے کہ یونس علیہ السلام جب قوم کی جانب واپس آتے ہیں تو جس قوم کو خدا کا دشمن رسول کا دشمن اور متمرد و سرکش چھوڑ گئے تھے اس کو مومن و صادق، مطیع و فرمانبردار اپنی آمد پر ان کو انتہائی مسرور پایا مگر قادیانی نے یہ دیکھا کہ اس کے چیلنج کے بعد مخالف تحریر و تقریر اور عملی زندگی میں پہلے سے زیادہ مخالف ہو گئے ہیں اور مزید برآں یہ کہ ان میں سے بعض آج تک بصد عزت و احترام زندہ ہیں اور خود مرزا قادیانی ایسے مرض میں مبتلاء ہو کر جو بعض قوموں کے لیے عذاب کی شکل میں نمودار ہو چکا ہے عرصہ ہوا دنیا کو چھوڑ چکا ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا!

(۴) سورۂ الصافات پارہ ۲۳ آیت ۱۴۸ میں ہے:

﴿وَ اَرۡسَلۡنٰہُ اِلٰی مِائَۃِ اَلۡفٍ اَوۡ یَزِیۡدُوۡنَ ﴿۱۴۷﴾ۚ فَاٰمَنُوۡا فَمَتَّعۡنٰہُمۡ اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۱۴۸﴾ؕ﴾

اور اس سے قبل یہ آیت ہے: ﴿فَالۡتَقَمَہُ الۡحُوۡتُ وَ ہُوَ مُلِیۡمٌ ﴿۱۴۲﴾﴾ چنانچہ آیات کی اس ترتیب کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوا کہ یونس علیہ السلام کی بعثت مچھلی کے حادثہ سے قبل ہو چکی تھی یا اس کے بعد ہوئی؟ ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یونس علیہ السلام کی بعثت "مچھلی کے حادثہ کے بعد ہوئی ہے" اور مجاہد کہتے ہیں کہ اس واقعہ سے قبل نبوت عطاء ہو چکی تھی اور وہ نینوئ میں تبلیغ کے لیے جا چکے تھے اور بغوی کہتے ہیں کہ یونس علیہ السلام مچھلی کے حادثہ سے قبل تو نینوئ کے باشندوں کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور مچھلی کے حادثہ کے بعد ایک دوسری امت کی جانب بھیجے گئے اور قرآن عزیز میں ایک لاکھ سے زائد اسی دوسری امت کی تعداد بیان کی گئی ہے، یہ باشندگان نینوئ کی مردم شماری کا ذکر نہیں ہے۔

بغوی کی یہ رائے بے سند ہے اس لیے کہ قرآن عزیز میں اشارہ تک نہیں پایا جاتا کہ یونس علیہ السلام دو جدا جدا قوموں کی جانب مبعوث ہوئے تھے۔ رہا ترتیب آیات کا معاملہ تو وہ فصاحت و بلاغت کے اصول کے عین مطابق ہے اس لیے کہ زیر بحث آیات میں اول یونس علیہ السلام کی رسالت و بعثت کا ذکر ہے اور پھر قوم سے ناراض ہو کر چلے جانے، کشتی میں بیٹھنے، بھنور میں آ جانے کی وجہ سے قرعہ اندازی ہونے، قرعہ میں یونس علیہ السلام کے نام پر نکلنے، دریا میں کودنے کے بعد مچھلی کے پیٹ میں رہنے، بعد میں صحیح سلامت مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکل آنے اور خدا کی مہربانیوں کی آغوش میں آ کر شادکام واپس لوٹنے کا تذکرہ ہے اور اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ جس قوم کی جانب ان کو بھیجا گیا تھا وہ چند افراد نہیں تھے بلکہ بہت بڑی تعداد تھی جن کا انجام یہ نکلا کہ وہ ایمان لے آئے اور آنے والے عذاب سے محفوظ ہو کر اپنی زندگی سے بہرہ مند ہوئے۔

Marfat.com

لہٰذا آیات میں نہ تقدیم و تاخیر ہے اور نہ اس ترتیب سے یہ لازم آتا ہے کہ بقول بغوی وہ ایک دوسری امت تھی جس کا ذکر ﴿وَمِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيدُونَ﴾ میں کیا گیا ہے۔

اسی طرح مچھلی کے حادثہ سے قبل اور بعد بعثت کا مسئلہ بھی صاف ہے اور اس میں دو رائے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے ہر دو اقوال کی تطبیق میں جو کچھ کہا ہے وہی حقیقت ہے یعنی یونس علیہ السلام مچھلی کے واقعہ سے قبل اہل نینویٰ کی جانب نبی بنا کر بھیجے گئے اور جب وہ خفا ہو کر چلے آئے تو مچھلی کا حادثہ پیش آیا۔ اس حادثہ سے متنبہ ہو کر جب انہوں نے خدائے تعالیٰ کی طرف اظہار ندامت کے ساتھ رجوع کیا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے شرف قبولیت عطا ہوا اور ان کو حکم ہوا کہ وہ اپنی قوم کی جانب واپس جائیں وہ ایمان لے آئی ہے اس لیے جا کر اس کی راہنمائی کریں۔

صحیفہ یوناہ:

صحیفہ یوناہ (یونس) میں ان اقوال سے الگ یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو اہل نینویٰ کی ہدایت کے لیے مامور کیا۔ مگر وہ ترسیس کو بھاگ گئے اور اسی سفر میں مچھلی کا واقعہ پیش آیا تب وہ متنبہ ہوئے اور پھر ان کو حکم ہوا کہ نینویٰ جاؤ اور اپنا فرض انجام دو، یونس علیہ السلام نے وہاں جا کر تبلیغ کی اور قوم کے نہ ماننے پر ان کو چالیس دن مقرر کر کے عذاب الٰہی سے ڈرایا اور خود دور جنگل میں چلے آئے مگر قوم فوراً ایمان لے آئی اور بادشاہ سے لے کر رعایا تک نے ٹاٹ کے کپڑے پہن لیے اور انسانوں اور جانوروں کے بچوں کو ماؤں سے علیحدہ کر دیا اور میدان میں نکل کر توبہ و استغفار اور آہ و زاری کرنے اور یونس علیہ السلام کی تلاش میں دوڑنے لگے ادھر یونس علیہ السلام کو یہ معلوم ہوا کہ چالیس دن گزر گئے اور عذاب نہیں آتا تو اللہ تعالیٰ سے رنجیدہ ہو کر دور نکل گئے اور خدا کی درگاہ میں عرض کیا: میں اسی خیال سے ترسیس بھاگ گیا اور نینویٰ نہیں آیا تھا کہ میں جانتا تھا کہ تو بہت مہربان اور عذاب میں دھیما ہے اور تو رحیم و کریم ہے اب میں جھوٹا بنا اور اب مجھ کو موت دے دے کہ میرا مرنا میرے جینے سے بہتر ہے اور چھپر ڈال کر وہیں رہنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے سایہ کے لیے رینڈی کا بیل دار درخت اُگا دیا جس کو دیکھ کر یونس علیہ السلام بہت خوش ہوئے، دو پہر دن کے بعد کیڑے نے اس کی جڑ کو کاٹ دیا اور وہ سوکھ گیا۔ یونس علیہ السلام کو بے حد رنج ہوا۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یونس تم ایک معمولی رینڈی کے درخت کے خشک ہونے پر اس قدر رنجیدہ ہو اور کیا میں اتنے بڑے شہر پر کہ جس کی مردم شماری ایک لاکھ بیس ہزار ہے شفقت و مہربانی نہ کرتا۔

توراۃ میں صحیفہ "یوناہ نبی کی کتاب" کے نام سے موسوم ہے اور چھوٹے چھوٹے چار ابواب پر مشتمل ہے جس میں یہی واقعہ مذکور ہے، اس صحیفہ کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

"اور خداوند کا کلام یوناہ بن امتی کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اٹھ اس بڑے شہر نینوہ کو جا اور اس کی مخالفت میں منادی کر، کیونکہ ان کی شرارت میرے سامنے اوپر آئی۔"

اور صحیفہ کا مضمون اس عبارت پر آ کر ختم ہوتا ہے:

"اور خدا نے یوناہ (یونس) کو کہا کیا تو اس رینڈی کے درخت کے سبب شدت سے رنجیدہ ہے؟ اس نے کہا کہ میں یہاں تک رنجیدہ ہوں۔ کہ مرنا چاہتا ہوں تب خداوند نے فرمایا کہ تجھے اس رینڈی کے درخت پر رحم آیا جس کے لیے تو نے کچھ

Marfat.com

عزت نہ کی اور نہ تو نے اسے اُگایا جو ایک ہی رات میں اُگا اور ایک ہی رات میں سوکھ گیا اور کیا مجھے لازم نہ تھا کہ میں اتنے بڑے شہر نینویٰ پر جس میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمیوں سے زیادہ ہیں جو اپنے دائیں بائیں ہاتھ کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتے اور مواشی بھی بہت ہیں شفقت نہ کروں۔"

قرآن عزیز اور اس صحیفہ کے واقعات میں بہت کچھ تطابق ہے لیکن تفصیلات میں جس جس جگہ اختلاف ہے اس میں قرآن عزیز کا قول ہی درست ہے کیونکہ قرآن کی اطلاع علم الیقین (وحی الٰہی) پر مبنی ہے اور صحیفہ محرف مجموعہ کا ایک جزء ہے اور یونس علیہ السلام کا صحیفہ ہدایت نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے کا مضمون ہے جس میں یونس علیہ السلام کے واقعہ کو معرض تحریر میں لایا گیا ہے۔

⑤ یونس علیہ السلام نے اہل نینویٰ کو جس عذاب سے ڈرایا تھا اس کی تعیین مدت میں مختلف اقوال ہیں یعنی تین، سات اور چالیس۔ ابن کثیر تین کو ترجیح دیتے ہیں اور شاہ عبدالقادر چالیس کو صحیفہ یوناہ میں بھی چالیس یوں ہی مذکور ہیں۔

⑥ شروع میں کہا جا چکا ہے کہ قرآن عزیز میں یونس علیہ السلام کا ذکر جن سورتوں میں مذکور ہے ان میں سے سورۂ انبیاء اور القلم میں نام کی بجائے ان کی صفت کے ذریعہ ان کا تعارف کرایا گیا ہے۔ سورۂ انبیاء میں "ذوالنون" کہا گیا ہے اس لیے کہ قدیم عربی میں "نون" مچھلی کو کہتے اور "القلم" میں "صاحب الحوت" سے یاد کیا گیا اور "حوت" بھی مچھلی کو ہی کہتے ہیں اور چونکہ ان پر مچھلی کا حادثہ گزرا تھا اس لیے "مچھلی والا" ان کا لقب ہو گیا۔

وفات:

شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ یونس علیہ السلام کی وفات اس شہر میں ہوئی جس کی جانب وہ مبعوث ہوئے یعنی نینویٰ میں اور وہیں ان کی قبر تھی۔

اور عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ فلسطین کے علاقہ میں جو مشہور شہر خلیل ہے اس کے قریب ایک بستی حلحول کے نام سے معروف ہے اس میں ایک قبر ہے جس کو یونس علیہ السلام کی قبر بتایا جاتا ہے، اور اسی قبر کے قریب دوسری قبر ہے اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ یونس علیہ السلام کے والد متی کی قبر ہے۔

ہمارے خیال میں شاہ صاحب کا قول صحیح ہے اس لیے کہ حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق جس قدر واقعات بھی ہم پہنچ سکے ہیں وہ سب متفق ہیں کہ یونس علیہ السلام دوبارہ نینویٰ واپس تشریف لے گئے اور انہوں نے اپنی قوم کے اندر ہی زندگی گزار دی۔ لہٰذا قرین صواب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا انتقال نینویٰ ہی میں ہوا اور وہیں ان کی قبر ہوگی جو نینویٰ کی تباہی کے بعد نا معلوم ہوگئی اور بعد میں خوش اعتقادی کے نقطۂ نظر سے حلحول کی غیر معروف دو قبروں کو یونس علیہ السلام اور ان کے والد متی کی قبر بنا دیا گیا، آج بھی بعض مشاہیر اولیاء اللہ کے نام سے ایک بزرگ کی متعدد مقامات پر قبریں موجود ہیں اور ایسا تو کثرت سے ہے کہ غیر معروف بزرگوں کے نام سے بہت سی قبروں کو غلط منسوب کر کے اپنے دنیوی اغراض کو پورا کیا جاتا ہے۔

فضیلت یونس علیہ السلام:

احادیث صحیحہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یونس علیہ السلام کا ذکر خیر کرتے ہوئے ان کی عظمت و فضیلت کا خصوصی اظہار فرمایا ہے:

Marfat.com

چنانچہ بخاری میں منقول ہے:

عن عبداللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لایقولن احد کم انی خیر من یونس بن متّٰی.

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص ہرگز یہ نہ کہے کہ میں (یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) بہتر ہوں یونس بن متی سے۔" [1]

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی سامان فروخت کر رہا تھا۔ کسی شخص نے کچھ خرید کر جو قیمت دینی چاہی وہ اس کی مرضی کے خلاف تھی، وہ کہنے لگا قسم بخدا جس نے موسیٰ علیہ السلام کو افضل بشر بنایا میں اس قیمت پر اپنی چیز کو فروخت نہیں کروں گا ایک انصاری نے یہ سنا تو غصہ میں یہودی کے ایک طمانچہ رسید کر دیا اور کہا تو ایسی بات کہتا ہے درآنحالیکہ ہمارے درمیان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں، یہودی فوراً دربار رسالت میں حاضر ہوا اور فریاد کرنے لگا: ابوالقاسم! جبکہ میں آپ کے عہد اور ذمہ میں ہوں تو اس انصاری نے میرے منہ پر طمانچہ کس لیے مارا؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصاری سے وجہ دریافت فرمائی اور جب انصاری نے واقعہ سنایا تو چہرہ مبارک غصہ سے سرخ ہوگیا اور فرمایا: انبیاء علیہم السلام کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو اس لیے کہ جب اوّل صور پھونکا جائے گا تو زمین و آسمان کے درمیان جو بھی جاندار ہیں وہ سب بے ہوش ہو جائیں گے مگر جن کو خدا مستثنیٰ کر دے اس کے بعد دوسرا صور پھونکا جائے گا تو سب سے پہلے جو شخص ہوش میں آئے گا وہ میں ہوں گا مگر جب میں غشی سے بیدار ہوں گا تو دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش کے سہارے کھڑے ہیں، اب میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا ان کی غشی کا معاملہ طور کے واقعہ میں محسوب ہوگیا کہ وہ غشی سے محفوظ رہے یا وہ مجھ سے بھی پہلے ہوش میں آ گئے، اور میں نہیں کہتا کہ کوئی نبی بھی یونس بن متی سے افضل ہے۔" [2]

ان روایات میں خصوصیت کے ساتھ حضرت یونس علیہ السلام کا جو ذکر آیا ہے تو اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ یہ اس لیے تاکہ جو شخص حضرت یونس علیہ السلام کے واقعات کا مطالعہ کرے اس کے دل میں ان کی ذات اقدس سے متعلق کوئی تنقیص کا پہلو ہرگز پیدا نہ ہونے پائے لہٰذا سد ذرائع کے پیش نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی عظمت شان کو اس طرح نمایاں کرنا ضروری سمجھا۔ [3]

فضائل انبیاء علیہم السلام:

مگر اس مقام پر یہ مسئلہ ضرور حل طلب پیش آ جاتا ہے کہ دوسری حدیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت سے متعلق آپ نے جو تفصیل ارشاد فرمائی اور ((لا تفضلوا بین الانبیاء)) فرما کر انبیاء علیہم السلام کے مسئلہ فضیلت کو عام کر دیا اور پھر انبیاء علیہم السلام کے مابین تفصیل کو منع فرما دیا تو اس کی حقیقت کیا ہے؟

مسئلہ زیر بحث کو زیادہ نمایاں کرنے کے لیے یوں سمجھنا چاہیے کہ ایک جانب قرآن عزیز میں ارشاد ہے ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ﴾ "یعنی اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل میں باہم افضل و مفضول کی نسبت قائم کی ہے اور باہم ایک دگر فضیلت عطاء فرمائی ہے۔ نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ((انا سید ولد ادم ولا فخر)) یعنی بغیر کسی فخر و مباہات کے کہتا ہوں کہ "میں تمام اولاد آدم علیہ السلام کا سردار ہوں" اور دوسری جانب آپ یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ ((لا تفضلوا بین الانبیاء)) اور ((لایقولن احد کم انی خیر من یونس بن متی)) یعنی نہ انبیاء کے درمیان افضل و مفضول کے درجات قائم کرو اور نہ ایک کو دوسرے پر فضیلت دو اور نہ مجھ کو

[1] کتاب الانبیاء [2] بخاری کتاب الانبیاء [3] فتح الباری ج ۶ ص ۳۵۱

Marfat.com

یونس بن متی اور موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت دو۔ تو ان نصوص قرآنی اور حدیثی کے درمیان کس طرح مطابقت ہو سکتی ہے۔

اس مسئلہ کے حل میں محدثین اور شارحین حدیث سے متعدد اقوال منقول ہیں مثلاً ان دونوں مضامین کے درمیان تطبیق کی شکل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا وہ ارشاد گرامی جس میں انبیاء کے باہم یکدگر فضیلت یا ذات اقدس کو کسی نبی پر فضیلت کی ممانعت مذکور ہے اس زمانہ کے ارشادات ہیں جبکہ سورۂ بقرہ کی اس آیت کا نزول نہیں ہوا تھا اور نہ آپ کو فضائل انبیاء خصوصاً تمام انبیاء علیہم السلام پر اپنی فضیلت کا ہنوز علم ہوا تھا۔

لیکن یہ جواب یا مسئلہ کا حل بہت کمزور بلکہ ساقط الاعتبار ہے اس لیے کہ یہودی کا یہ واقعہ یا یونس علیہ السلام کی فضیلت سے متعلق روایات کا سلسلہ اس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جو مدنی زندگی کے آخری سال کہلاتے ہیں اور ان سے قبل انبیاء علیہم السلام کے مابین فضائل کے بہت سے واقعات خود ذات اقدس سے منقول ہو چکے ہیں۔

دوسرا حل یہ پیش کیا گیا کہ اگرچہ ان روایات میں سے بعض طریقہ ہائے سند میں فضیلت انبیاء سے متعلق عام الفاظ منقول ہیں یعنی ((لا تفضلوا بین الانبیاء)) مگر درحقیقت اس ارشادِ گرامی کا مقصد صرف ذات اقدس ہے جیسا کہ یہودی کے واقعہ اور یونس علیہ السلام سے متعلق روایت سے ظاہر ہوتا ہے اور اگرچہ آپ جانتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے آپ کو تمام اولاد آدم پر فضیلت عطاء فرمائی ہے تاہم آپ نے تواضع اور انکسار کے طور پر یہ ارشاد فرمایا ہے۔

مگر یہ جواب بھی قوی نہیں ہے اس لیے کہ آپ نے جب مسطورۂ بالا جملہ میں مسئلہ کو عام ذکر فرمایا ہے تو بے دلیل اس کو فقط ذات اقدس کے ساتھ مخصوص کر دینے کے کوئی معنی نہیں۔

تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جن روایات میں انبیاء علیہم السلام کے باہم ایک دوسرے پر فضیلت کا انکار کیا گیا ہے اس سے نفس نبوت کی فضیلت مراد ہے خصائص وصفات کے لحاظ سے افضل ومفضول ہونے کا انکار نہیں ہے جیسا کہ خود سورۂ بقرہ ہی میں مومن کی شان یہ بیان کی گئی ہے ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ یعنی ہم کسی بھی نبی اور رسول کے درمیان کوئی فرق جائز نہیں سمجھتے اور یہ نہیں کرتے کہ خدا کے سچے نبیوں میں سے ایک کو تسلیم اور دوسرے کا انکار کریں۔

مگر یہ جواب اس وقت دلچسپ ہو سکتا تھا جبکہ آپ کا ارشادِ گرامی ایسے واقعہ سے متعلق ہوتا جس میں کسی سچے پیغمبر کے نبی ماننے نہ ماننے پر قضیہ پیش آتا۔ لیکن یہودی کے واقعہ میں تو نفس نبوت کی بحث نہیں تھی بلکہ نبی اکرم ﷺ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے افضل ومفضول ہونے کی بحث تھی۔

لہٰذا اس مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ بے شبہ انبیاء و رسل علیہم السلام کے درمیان درجات فضائل موجود ہیں اور ان کے مابین افضل ومفضول کی نسبت قائم ہے اور یقیناً نبی اکرم ﷺ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام سے افضل ہیں پھر مسطورۂ بالا روایات میں آپ سے جو انبیاء علیہم السلام کے درمیان فضیلت دینے کی ممانعت مذکور ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نبی کو دوسرے نبی پر اس طرح کی فضیلت دینا سخت ممنوع ہے کہ جس سے مفضول نبی کی تنقیص لازم آتی ہو۔ یعنی یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کسی پیغمبر کی محبت کے جوش میں دوسرے انبیاء کا مقابلہ کرتے ہوئے ایسی مدحت ومنقبت کرے کہ جس سے دوسرے پیغمبر کی شان رفیع کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہو نیز ایسے موقعہ پر فضیلت کی بحث کی ممانعت کی گئی ہے جبکہ یہ مسئلہ مجادلہ اور مناظرہ کی شکل اختیار کر لے کیونکہ ایسی صورت میں احتیاط کے باوجود انسان

Marfat.com

بے قابو ہو کر دوسرے پیغمبر کے متعلق ایسی باتیں کہہ جائے گا جو ان کی توہین یا تنقیص کا باعث ہوتی ہوں اور نتیجہ میں ایمان کی جگہ کفر لازم کرتی ہوں چنانچہ جس واقعہ میں آپ نے یہ ارشاد فرمایا تھا وہ اسی قسم کے مجادلہ کا موقع تھا۔ باقی انبیاء علیہم السلام کے درمیان اللہ تعالیٰ نے بعض خصائص کے اعتبار سے جو فرق مراتب قائم کیا ہے اور جس کے متعلق خود یہ فرمایا ہے ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ﴾ تو یہ امر محبوب ہے نہ کہ ممنوع۔

اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر کہ اس مسئلہ سے متعلق حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے جو بحث نقل فرمائی ہے وہ بھی قابل مطالعہ ہے، ارشاد فرماتے ہیں:

قال العلماء فی نهیه صلی اللہ علیہ وسلم عن التفضیل بین الانبیاء انما نهی عن ذٰلك من یقوله برایه لا من یقوله بدلیل او من یقوله بحیث یودی الی تنقیص المفضول او یؤدی الی خصومة والتنازع او المراد لا تفضلوا بجمیع انواع الفضائل بحیث لا یترك المفضول فضیلة فالامام مثلًا اذا قلنا انه افضل من المؤذن لا یستلزم نقص فضیلة المؤذن بالنسبة الی الاذان و قیل النهی عن التفضیل انما هو فی حق النبوة نفسها كقوله تعالیٰ ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ﴾ و لم ینه عن تفضیل بعض الذواتِ علی بعض لِقوله تعالیٰ: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ﴾ و قال الحلیمی الاخبار الواردة فی النهی عن التخییر انما هی فی مجادلة اهل الکتاب و تفضیل بعض الانبیاء علیٰ بعض بالمخایرة لان المخایرة اذا وقعت بین اهل دینین لا یؤمن ان یخرج احدهما الی الازدراء بالاٰخر فیفضی الی الکفر فاما اذا کان التخییر مستندًا اِلی مقابلة الفضائل لتحصیل الرجحان فلا یدخل فی النهی۔ [1]

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انبیاء کے درمیان فضیلت دینے کی ممانعت فرمائی ہے تو علماء اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ ایسی فضیلت ممنوع ہے جو اپنی رائے سے اختراع کی جائے وہ فضیلت منع نہیں ہے جو دلیل شرعی پر قائم ہو یا وہ منع ہے جو اس طرح ادا کی جائے کہ جس نبی پر فضیلت دی جا رہی ہے اس کی شان میں نقص پیدا کرتی ہو یا خصومت اور جھگڑے کا باعث بنتی ہو یا ایسی فضیلت دینے کی ممانعت ہے جو ایک نبی کے اندر اس طرح تمام فضائل کو جمع کرتی ہو کہ اس سے یہ لازم آ جائے کہ دوسرے نبی کو کوئی فضیلت حاصل ہی نہیں ہے مگر ایسی فضیلت کو مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ "امام کو مؤذن پر فضیلت ہے تو اس سے مؤذن کی شان کا نقص لازم نہیں آتا" جائز ہے، ایک قول ضعیف یہ بھی ہے کہ اس ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ نفس نبوت میں ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ﴾ لیکن بعض ذوات گرامی کو بعض پر ان کی ذاتی خصوصیات کے لحاظ سے فضیلت دینا ممنوع نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ثابت ہے: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ﴾۔"

اور حلیمی کہتے ہیں ا جو احادیث انبیاء علیہم السلام کے درمیان فضیلت دینے کی ممانعت کرتی ہیں وہ ایسے مواقع کے متعلق ہیں جبکہ اہل کتاب سے انبیاء کے متعلق مجادلہ اور جھگڑا ہو رہا ہو یا مسلمان اور عیسائی مثلاً اپنے نبی کو دوسرے پر ترجیح دے

---

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۳۴۶

رہے ہوں، کیونکہ ایسی صورت میں جب دو مذہبوں کے درمیان بحث آ جاتی ہے تو یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ ایسی بات زبان سے نہ نکلے جو دوسرے مذہب کے نبی کی شان میں توہین کا باعث ہو اور کفر کا سبب بنے (اس لیے کہ مسلمان کے لیے تو واجب ہے کہ مذاہب کے تمام سچے نبیوں کو اپنا نبی سمجھے) لیکن اگر مقصد یہ ہو کہ انبیاء کے باہم فضائل کی بحث سے ایک دوسرے کی حقیقی ترجیح کو ثابت کرے تو یہ منع نہیں۔"

موعظت:

حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کا اگر بہ نظر بصیرت و موعظت مطالعہ کیا جائے تو حسب ذیل حقائق واضح طور پر سامنے آ جاتے ہیں:

① قوموں کی رشد و ہدایت کے متعلق یہ "سنت اللہ" ہے کہ جب وہ نبی کی دعوت سے منہ موڑ کر انکار وجحود پر اصرار کرنے لگتیں اور ظلم کشی و ستم شعاری کو اسوہ بنا لیتی ہیں اور نبی مایوس ہو کر ان کو عذاب کی اطلاع دے دیتا ہے تو پھر امت کے لیے صرف دو راہیں باقی رہ جاتی ہیں، یا عذاب آنے سے قبل ایمان لے آئے اور عذاب سے محفوظ ہو جائے اور یا عذاب الٰہی کا شکار ہو جائے اور یہ ناممکن ہے کہ نبی کی اطلاع عذاب کے بعد وہ عذاب سے قبل ایمان بھی نہ لائیں اور عذاب سے محفوظ ہو جائیں۔ قوم نوح، قوم صالح، قوم لوط (علیہم السلام) عا، ثمود وغیرہ ان سب امم ماضیہ اور اقوام سالفہ کا عظیم الشان تمدن، بلند و وقیع تہذیب، قہرمانہ طاقت و قوت اور پھر عذاب الٰہی سے ان کا یک بیک فنا ہو کر بے نام و نشان ہو جانے کی تاریخ اس حقیقت کو آشکارا کرتی ہے۔

② گزشتہ اقوام میں سے قوم یونس کی ایک مثال ایسی ہے جس نے عذاب آنے سے قبل ایمان کو قبول کر لیا اور وہ خدا کی سچی مطیع و فرمانبردار ہو کر عذاب الٰہی سے محفوظ ہو گئی، کاش کہ بعد میں آنے والی نسلیں اور قومیں قوم یونس کے قدم پر چل کر اسی طرح عذاب الٰہی سے محفوظ رہ سکتیں مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔

③ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ عوام اور خواص دونوں سے جدا رہتا ہے اور رہنا بھی چاہیے اس لیے کہ وہ براہِ راست خدا کے ساتھ شرف مخاطبت و مکالمت رکھتے ہیں لہٰذا احکام الٰہی کے امتثال کی وہ ذمہ داری جو ان سے وابستہ ہوتی ہے وہ دوسروں کے ساتھ نہیں ہوتی، پس ان کا فرض ہے کہ جو کام بھی انجام دیں وحی الٰہی کی روشنی میں ہونا چاہیے خصوصاً تبلیغ دین اور پیغام حق سے متعلق تمام معاملات میں وحی الٰہی کے علم الیقین ہی پر ان کا معاملہ معلق رہے، یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی کام میں عجلت کر گزرتے ہیں یا انتظار وحی کے بغیر کسی قول و عمل پر اقدام کر جاتے ہیں تو خواہ وہ بات کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو ان سے اللہ تعالیٰ بہت سخت مؤاخذہ کرتا اور ان کی اس صورت حال کے لیے ایسی سخت تعبیر روا رکھتا ہے کہ سننے والا یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ حقیقتاً انہوں نے کوئی عظیم الشان جرم کیا ہے مگر ساتھ ہی اس کی اعانت بھی ان کے شامل حال رہتی ہے اور وہ فوراً متنبہ ہو کر اعتراف ندامت کے ساتھ عفو تقصیر کے لیے دست بدعاء ہو جاتے اور انابت و توبہ کو وسیلہ کار بنا لیتے ہیں جو بہت جلد خدائے تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو جاتی اور ان کی عزت و احترام کے ازدیاد کا باعث بن جاتی ہے۔

Marfat.com

قرآن عزیز کے اسلوب بیان میں یہ حقیقت بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور جو اس حقیقت سے نا آشنا ہوتا ہے اس کے لیے اس قسم کے مواقع سخت خلجان کا موجب ہوتے ہیں کیونکہ ایک طرف وہ دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہستی کو نبی اور رسول کہہ کر اس کی مدحت کر رہا ہے اور دوسری جانب یہ نظر آتا ہے کہ گویا وہ بہت ہی بڑے جرم کا مرتکب ہے تو وہ حیران و مضطرب ہو کر یا کجروی میں پڑ جاتا ہے اور یا وساوس کے تاریک میدان میں گھر جاتا ہے اس لیے از بس ضروری ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے وقائع و اخبار میں ہمیشہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تا کہ صراط مستقیم سے پاؤں نہ ڈگمگا جائیں۔

④ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے سچے نبی اسلام کے اپنے نبی ہیں خواہ وہ کسی دین سے تعلق رکھتے ہوں اور ان پر اسی طرح ایمان لانا ضروری ہے جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا۔ لہٰذا اس کا یقین رکھتے ہوئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و رسل کے سردار اور افضل البشر ہیں کسی نبی کے مقابلہ میں آپ کی ایسی مدحت و منقبت سخت ممنوع ہے جس سے کسی نبی کی بھی تنقیص ہوتی ہو جیسا کہ عام طور پر میلاد کی مروجہ مجالس میں اس اہم حقیقت سے نا آشنا میلاد خوانوں کے اشعار میں یہ ممنوع طریقہ شائع ذائع ہے۔

Marfat.com

حضرت ذوالکفل علیہ السلام

○ قرآن عزیز اور ذوالکفل ○ نسب ○ آثار وروایات ○ تنقید ○ ایک غلط فہمی کا ازالہ ○ موعظت

قرآن عزیز اور ذوالکفل:

قرآن عزیز میں ذوالکفل علیہ السلام کا ذکر دو سورتوں "سورہ انبیاء" اور "سورہ ص" میں کیا گیا ہے، اور دونوں میں صرف نام مذکور ہے اور مجمل و مفصل کسی قسم کے حالات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

﴿وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَ اَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۸۵-۸۶)

"اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل سب (راہ حق میں) صبر کرنے والے تھے۔ ہم نے انہیں اپنی رحمت کے سایہ میں لے لیا۔ یقیناً وہ نیک بندوں میں سے تھے۔"

﴿وَ اذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ وَ كُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ۝﴾ (ص: ۴۸)

"اور یاد کرو اسماعیل، اور الیسع اور ذوالکفل (کے واقعات) اور یہ سب نیکوکاروں میں سے تھے۔"

نسب:

ابھی کہا جا چکا ہے کہ ذوالکفل علیہ السلام کے متعلق قرآن عزیز نے نام کے سواء کچھ نہیں بیان کیا۔ اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کچھ منقول نہیں ہے لہٰذا قرآن وحدیث کی روشنی میں اس سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا کہ ذوالکفل علیہ السلام خدا کے برگزیدہ نبی اور پیغمبر تھے اور کسی قوم کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے، اس سے زائد سے سکوت ہے، اس کے بعد دوسرا درجہ سیر و تواریخ کا ہے لیکن کافی تفتیش و جستجو کے بعد بھی ہم کو اس سلسلہ میں ایسی معلومات بہم نہیں پہنچ سکیں کہ جن کے ذریعہ سے ذوالکفل علیہ السلام کے حالات و واقعات پر مزید روشنی پڑ سکے، چنانچہ تورات بھی خاموش ہے اور اسلامی تاریخ بھی۔

آثار وروایات:

البتہ ابن جریر نے مشہور مفسر تابعی مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے متعلق ایک قصہ نقل کیا ہے، اور اسی کے قریب قریب ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے بھی بعض آثار نقل کیے ہیں جن کی سند منقطع ہے۔ [1] مجاہد کی

[1] یعنی ان دونوں بزرگوں کے اور ان سے روایت کرنے والے راوی کے درمیان ایک یا چند نام مذکور ہیں کہ جن سے سلسلہ روایت متصل اور مسلسل ہو جاتا۔ ایسی سند کو اصطلاح میں منقطع کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

روایت یہ ہے:

جب اسرائیلی نبی حضرت الیسع علیہ السلام بہت بوڑھے ہو گئے تو ایک دن ارشاد فرمایا: کاش میری زندگی ہی میں کوئی شخص ایسا ہوتا جو میرا قائم مقام ہو سکتا اور مجھ کو یہ اطمینان ہو جاتا کہ وہ میری صحیح نیابت کرنے کا اہل ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بنی اسرائیل کا اجتماع کیا اور فرمایا: میں تم میں سے ایک شخص کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں بشرطیکہ وہ مجھ سے تین باتوں کا عہد کرے۔

① دن بھر روزہ رکھے ② شب کو یاد خدا میں مشغول رہے ③ اور کبھی غصہ نہ لائے۔

یہ سن کر ایک ایسا شخص کھڑا ہوا جو لوگوں کی نگاہ میں بے وقعت نظر آتا تھا اور کہنے لگا "اس خدمت کے لیے میں حاضر ہوں" حضرت الیسع نے اپنی تینوں شرطیں دوبارہ بیان کیں اور دریافت کیا ان کی پابندی کرو گے؟ اس شخص نے جواب دیا "بیشک" دوسرا دن ہوا تو حضرت الیسع علیہ السلام نے پھر اجتماع کیا اور کل کی بات کو دہرایا۔ سب خاموش رہے اور وہی شخص پھر آگے بڑھا اور اس نے خود کو اس خدمت کے لیے پیش کرتے ہوئے تینوں شرطیں پوری کرنے کا عہد کیا تب الیسع علیہ السلام نے اس کو اپنا خلیفہ بنا دیا۔ ابلیس نے دیکھا تو اس سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے اپنی ذریت کو جمع کر کے کہا کہ ایسی صورتیں اختیار کرو کہ جن سے یہ شخص بہک جائے اور اپنی شرطوں پر قائم نہ رہ سکے۔ شیاطین نے بہت کوشش کی مگر سب ناکام رہے۔ تب ابلیس نے کہا کہ میں ہی اس کام کو انجام دے سکوں گا تم عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

الیسع علیہ السلام کے خلیفہ کا یہ دستور تھا کہ وہ دن رات میں صرف دوپہر کو تھوڑی دیر قیلولہ کیا کرتا اور کچھ سو کر تھکان دفع کر لیتا تھا۔ چنانچہ ایک دن ابلیس پراگندہ حال بوڑھے کی شکل میں اسی وقت اس کے دروازہ پر پہنچا اور دروازہ پر ہاتھ مارا۔ وہ شخص آرام چھوڑ کر آیا اور دریافت کیا کون ہے؟ ابلیس نے جواب دیا: "ایک مظلوم اور ناتواں بوڑھا ہے" اس نے دروازہ کھول دیا اور حال دریافت کیا۔ ابلیس نے کہا کہ میرے اور میری قوم کے درمیان خصومت ہے، انہوں نے مجھ پر ظلم کر رکھا ہے اور داستان ظلم کو اتنا طول دیا کہ قیلولہ کا وقت ختم ہو گیا۔ بنی اسرائیل کے اس "امیر" نے فرمایا: اب تم جاؤ شام کو جو مجلس منعقد ہو گی تب تم آنا میں تمہاری دادرسی کروں گا۔ وہ چلا گیا، شام کو جب مجلس منعقد ہوئی تو خلیفہ نے دیکھا کہ وہ شخص موجود نہیں ہے اور مجلس برخاست بھی ہو گئی مگر وہ نہیں آیا۔ صبح کو جب پھر مجلس میں بیٹھا تو چہار جانب غور سے دیکھا کہ شاید اب آیا ہو مگر اس کو نہ پایا۔ مجلس برخاست ہونے پر جب اس نے قیلولہ کے لیے تنہائی اختیار کی تو پھر کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ اس نے دروازہ کھولا تو اسی بوڑھے کو موجود پایا اور اس نے کل کی طرح پھر گفت وشنید کی۔ تب خلیفہ نے کہا: میں نے تم سے کہا تھا کہ شام کو مجلس میں آنا، مگر تم نہ آئے؟ ابلیس نے جواب دیا، میری قوم بہت ہی خبیث ہے، جب آپ کو مجلس میں پاتی ہے تو آہستہ سے مجھ سے اقرار کر لیتی ہے کہ مرافعہ نہ کرو ہم تمہارا حق ضرور دے دیں گے، لیکن آپ کے مجلس برخاست کر دینے کے بعد پھر منکر ہو جاتی ہے خلیفہ نے کہا: آج شام کو ضرور آ جانا میں اپنی موجودگی میں حق رسی کروں گا۔ اس گفت وشنید میں قیلولہ کا وقت پھر جاتا رہا اور خلیفہ کی نیند کی تکلیف نے بہت ستایا۔ مگر شام کی مجلس حسب وعدہ منعقد کی اور دادرسی کے لیے بیٹھا، چاروں طرف نگاہ پھرائی مگر اس بوڑھے کو نہ پایا اور نہ صبح کی مجلس میں وہ حاضر ہوا۔ تب تیسرے دن جب نیند کے غلبہ نے عاجز کر دیا تو خلیفہ نے اہل خانہ کو حکم دیا کہ آج دروازہ پر خواہ کوئی شخص بھی آئے قیلولہ کے وقت دروازہ ہرگز نہ کھولیں۔ خلیفہ ابھی لیٹا ہی تھا کہ فوراً ابلیس بوڑھے کی شکل میں آ موجود ہوا اور دروازہ پر دستک شروع کر دی۔ اندر سے جواب ملا کہ

Marfat.com

آج خلیفہ کا یہ حکم ہے کہ کسی کے لیے دروازہ نہیں کھولا جائے گا۔ ابلیس نے کہا میں دو روز سے اپنے ایک اہم معاملہ میں حاضر ہو رہا ہوں اور خلیفہ نے مجھ کو اس وقت بلایا تھا اس لیے دروازہ کھول دو۔ مگر دروازہ نہ کھلا لیکن اہل خانہ نے دیکھا کہ باہر کا دروازہ بند ہونے کے باوجود وہ شخص اندر موجود ہے اور خلیفہ کے کمرہ کے دروازہ پر دستک دے رہا ہے۔ خلیفہ نے دروازہ کھولا اور گھر والوں سے کہا کہ میں نے تم کو منع کر دیا تھا کہ آج دروازہ نہ کھولنا پھر یہ شخص کیسے اندر داخل ہو گیا ساتھ ہی دروازہ پر نظر کی تو اس کو بند پایا اور بوڑھے کو اپنے قریب دیکھا تب خلیفہ حقیقت حال کو سمجھا، اور اس نے ابلیس کو مخاطب کر کے کہا: خدا کے دشمن کیا تو ابلیس ہے؟ ابلیس نے کہا: ہاں میں ابلیس ہوں تو نے مجھ کو جب ہر طرح تھکا دیا۔ اور میری ذریت کسی طرح تجھ پر قابو نہ پاسکی تب میں نے آخری صورت یہ اختیار کی تھی تاکہ تجھ کو غضبناک کروں اور ایفاء شروط میں ناکام بنادوں، مگر افسوس کہ میں خود ہی ناکام رہا۔ چنانچہ اس واقعہ کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے اس کو ذوالکفل کے نام سے مشہور کر دیا۔ اسی لیے کہ اس نے جن شرائط کا حضرت الیسع علیہ السلام سے تکفل کیا تھا اس کو پورا کر دکھایا۔ [1]

تنقید:

مجاہد کی یہ روایت اپنی سند کے اعتبار سے بھی محل نظر ہے اور درایت کے لحاظ سے بھی ناقابل حجت ہے اور جو اثر ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ منقطع بھی ہیں اور سند کے پیش نظر محل نظر بھی، اس لیے ان کی حیثیت ایک قصہ سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ درایت کے اعتبار سے ہم نے ان کو ناقابل حجت اس لیے کہا کہ قرآن عزیز نے اگرچہ ذوالکفل علیہ السلام کے واقعات و حالات بیان نہیں کیے لیکن ان کو انبیاء و مرسلین کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ اس لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ اور مجاہد جیسے تابعی سے یہ مستبعد ہے کہ وہ ان کے متعلق یہ فرمائیں کہ وہ نبی نہیں تھے بلکہ ایک مرد نیک تھے جیسا کہ ابن کثیر نے ان تینوں بزرگوں سے اسی قصہ میں نقل کیا ہے اور شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ذوالکفل علیہ السلام ایوب علیہ السلام کے بیٹے تھے اور انہوں نے حسبۃً للہ کسی شخص کی ضمانت کر لی تھی جس کی پاداش میں ان کو کئی برس قید کی تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔

> کہتے ہیں ذوالکفل تھے ایوب کے بیٹے۔ ایک شخص کے ضامن ہو کر کئی برس قید رہے اور للہ یہ محنت سہی [2] اور بعض معاصرین کا یہ خیال ہے کہ ذوالکفل حزقیل علیہ السلام کا لقب ہے اور ایک دوسرے معاصر کی عجیب رائے یہ ہے کہ ذوالکفل "گوتم بدھ" کا لقب ہے اس لیے کہ اس کے دارالسلطنت کا نام "کپل" تھا جس کا معرب "کفل" ہے اور عربی میں "ذو" صاحب اور مالک کے لیے آتا ہے چنانچہ صاحب مال کے لیے "ذو مال" اور مالک شہر کے لیے "ذو بلد" بہ کثرت استعمال ہے اس لیے یہاں بھی کپل کے مالک اور بادشاہ کو "ذوالکفل" کہا گیا۔ معاصر موصوف نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ گوتم بدھ کی اصل تعلیم توحید اور حقیقی اسلام کی ہی تعلیم تھی اور موجودہ شکل و صورت دوسرے ادیان و ملل کی طرح مسخ اور محرف شدہ ہے۔ مگر یہ اقوال تخمینی آراء سے زیادہ تاریخی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۱۹۰۔۱۹۱ [2] موضح الفرقان سورۂ انبیاء

Marfat.com

ہم اس تعصب کے قائل نہیں ہیں کہ اگر صحیح تاریخ سے یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن نے جن انبیاء کے صرف نام ذکر کیے ہیں ان کا مصداق فلاں برگزیدہ ہستی ہے تو صرف اس لیے انکار کر دیا جائے کہ اس سے قبل ایسی بات چونکہ کسی نے نہیں کہی اس لیے قابل رد ہے۔ بلاشبہ ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ تاریخی حقائق کی جستجو کا باب بند نہیں ہوا اور ہر دن نئی نئی تحقیقات سامنے آتی اور جدید اکتشافات کو منکشف کرتی جاتی ہیں بلکہ ان کے ذریعہ قرآن عزیز اور احادیث رسول کے بیان کردہ ان واقعات کی تصدیق ہوتی چلی جا رہی ہے جن کا انکار ملاحدہ اس لیے کرتے رہے تھے کہ تاریخ اور فلسفہ تاریخ ان کا ساتھ نہیں دیتے پس اگر قرآن عزیز کی بیان کردہ کسی ہستی کے متعلق مزید اکتشافات روشنی میں آئیں تو ہمارے لیے باعث انکار نہیں بلکہ مخالفین و معاندین پر مزید حجت و دلیل ہیں لیکن اس اقرار حقیقت کے باوجود اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ کسی واقعہ کے متعلق اگر ایک شخص محض اپنے مزعومہ قیاس و تخمین سے بے دلیل کوئی دعویٰ کر دے تو ضرور اس کو مان لیا جائے، چنانچہ ذوالکفل کو "گوتم بدھ" قرار دینا ابھی تک اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

ہمارے لیے دنیا کے مختلف گوشوں میں خدا کے فرستادہ نبیوں پر ایمان لانے کے لیے قرآن کی وہ تینوں دفعات کافی ہیں جو دین حق (اسلام) کا طغرائے امتیاز ہیں یعنی:

① ﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ (سورہ فاطر: ۲۴)

"اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں خدا کی جانب سے کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔"

② ﴿مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾ (سورہ مؤمن: ۷۸)

"بعض نبیوں کا ہم نے تم کو (نام لے کر) ذکر سنا دیا اور بعض کے واقعات تم کو نہیں سنائے۔"

③ ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ (البقرہ: ۲۸۵)

"(اس لیے ایک مومن کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ) ہم خدا کے نبیوں میں سے کسی نبی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے یعنی سب نبیوں پر ایمان لاتے ہیں۔"

اس صاف اور واضح عقیدہ کے بعد اگر ہمارے سامنے کسی ملک اور کسی خطہ کے انبیاء و رسل کے واقعات نہیں بھی آئے تو اس کے وجوہ و اسباب دوسرے ہیں لیکن جہاں تک ان پر ایمان لانے کا تعلق ہے وہ اجمال کے ساتھ بھی کافی ہے اور ان کی تفصیلات ہمارے مقاصد ہدایت و رشد یعنی ایمان باللہ اور عمل صالح کے لیے موقوف علیہ نہیں ہیں خصوصاً جب اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ حقیقت بھی قرآن میں واضح کر دی کہ نبی اکرم ﷺ "خاتم النبیین" ہیں اور تمام سچے ادیان و ملل کی صحیح اور حقیقی تعلیم کی تصدیق کر کے ان کو ارتقائی درجات کے درجہ کمال تک پہنچانے والے ہیں:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدہ: ۳)

الحاصل ہم کو یہ تسلیم ہے کہ ہندوستان میں بھی خدا کے سچے نبی اور پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں بلکہ سیر کی روایات کے مطابق ابوالبشر آدم علیہ السلام اسی ہندوستان جنت نشان کے کسی گوشہ میں اتارے گئے، لیکن جب تک قرآن و حدیث کی صراحت اور یا پھر تاریخ

Marfat.com

کے صحیح دلائل و براہین سے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ذوالکفل "گوتم بدھ" کا لقب ہے، محض ظن وتخمین سے اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جس طرح کسی نبی کو نبی نہ ماننا کفر کی راہ ہے اسی طرح کسی غیر نبی کو نبی تسلیم کرنا بھی باطل ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: بنی اسرائیل میں ایک شخص کفل تھا، انتہاء درجہ کا فاسق و فاجر، ایک مرتبہ اس کے پاس ایک حسین وجمیل عورت آئی۔ کفل نے اس کو ساٹھ دینار دے کر زنا پر راضی کر لیا۔ لیکن جب اس نے عورت کے ساتھ مباشرت کا ارادہ کیا تو وہ کانپنے اور زار و زار رونے لگی۔ کفل نے دریافت کیا کیوں روتی ہے کیا مجھ سے نفرت کرتی ہے؟ عورت نے جواب دیا: یہ بات تو نہیں ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ میں نے ساری عمر کبھی اس بدعمل کو نہیں کیا مگر آج ضرورت اور پیٹ کی خاطر اپنی عصمت کو برباد کر رہی ہوں۔ یہ نشتر ہے جو مجھ کو آہ و زاری کے لیے مجبور کر رہا ہے۔ کفل نے یہ سنا تو فوراً اس سے الگ ہو گیا اور کہنے لگا: جو کار بد تو نے کبھی نہیں کیا، آج وہ محض فقر و فاقہ کی خاطر کرے یہ کبھی نہ ہوگا، جا عصمت وعفت کے ساتھ اپنے گھر واپس جا اور یہ دینار بھی تیری ملک ہیں ان کو اپنے کام میں لا۔ اور پھر کہنے لگا: قسم بخدا آج کی گھڑی سے کفل اب کبھی خدا کی نافرمانی نہیں کرے گا۔ حسن اتفاق کہ اسی شب میں کفل کا انتقال ہو گیا اور صبح کو لوگوں نے دیکھا کہ غیب کے ہاتھ نے اس کے دروازہ پر یہ بشارت لکھ دی ہے "کفل کو بے شبہ خدا نے بخش دیا۔"

اس روایت میں ذوالکفل نہیں بلکہ فقط کفل مذکور ہے اور یہ حضرت ذوالکفل کے سواء دوسرا کوئی شخص ہے اس لیے یہ مغالطہ نہ ہونا چاہیے کہ یہ حضرت ذوالکفل علیہ السلام کا واقعہ ہے۔

موعظت:

① اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے نسل و خاندان، رنگ و روپ، ملک وقوم اور ہر قسم کے تفرقہ سے جدا اور بالا ہو کر یہ اعلان کیا ہے کہ خدا ایک ہے تو بے شبہ اس کی صداقت بھی ایک ہی ہونی چاہیے اور وہ ایک ہی ہے، البتہ اس زمانہ کے نشوو ارتقاء اور امم و اقوام کے ذہنی و عقلی افکار کے درجات تفاوت کے مطابق اپنے وجود اور حقیقت کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے قانون فطرت کے مطابق تفصیلات و جزئیات کے تفاوت مراتب کو تسلیم کیا ہے یہ صداقت اور حقیقت "اسلام" ہے جو اپنی وحدت کے ساتھ ساتھ مختلف اقوام و امم اور مختلف زمانوں میں آغاز سے لے کر انجام تک متفاوت درجات و مراتب میں کائنات کی رشد و ہدایت کا کفیل رہا ہے۔

اور اسی لیے اس کی تعلیم کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ دنیا کے ہر گوشے اور ہر قوم کے اندر خدا کے سچے بشیر و نذیر ہی پیغام صداقت لے کر آئے ہیں اور اس لیے ایک مسلم و مومن کا یہ فرض ہے کہ وہ اس عقیدہ کا اعلان کرے کہ ہم خدا کے کسی بھی نبی کے درمیان فرق کرنا جائز نہیں رکھتے اور جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں اسی طرح خدا کے ہر نبی پر ایمان لاتے ہیں خواہ ہم اس کے نام و مقام اور اس کے حالات و واقعات سے آگاہ ہوں یا نہ ہوں۔

Marfat.com

④ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذوالکفل علیہ السلام انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہیں اور بنی اسرائیل کے ان حالات و واقعات کے سواء جن کی تفصیلات قرآن عزیز میں مختلف انبیاء بنی اسرائیل کے ذکر میں آتی رہی ہیں۔ ان کے زمانہ میں کوئی خاص واقعہ ایسا پیش نہیں آیا جو عام تبلیغ و ہدایت سے زائد اپنے اندر عبرت و بصیرت اور موعظت کا پہلو رکھتا ہو۔ اس لیے قرآن عزیز نے ان کے نام ہی پر اکتفا کیا اور حالات و واقعات سے تعرض نہیں کیا۔ کیونکہ قصص القرآن میں یہ بحث چند جگہ روشنی میں آ چکی ہے کہ امم و اقوام ماضیہ کے وقائع اور اخبار بیان کرنے سے قرآن عزیز کا مقصد صرف رشد و ہدایت کے سلسلہ میں بصیرت و موعظت کی جانب توجہ دلانا ہے ورنہ "تاریخ" نہ اس کا موضوع ہے اور نہ اس کا مقصد، چنانچہ قرآن عزیز میں ارشاد ہے:

﴿كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴾ (طٰہٰ: ۹۹)

﴿لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۭ﴾ (یوسف: ۱۱۱)

﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ (یوسف: ۱۰۹)

﴿وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (ہود: ۱۲۰)

"(اے پیغمبر) اسی طرح ہم گزری ہوئی سرگزشتوں میں سے (خاص واقعات کی) خبریں تجھے سناتے ہیں اور بلاشبہ ہم نے اپنے پاس سے تجھے ایک سرمایہ نصیحت عطاء فرما دیا ہے (یعنی قرآن) بلاشبہ ان (نبیوں) کے واقعات میں اہل عقل و دانش کے لیے سامان عبرت ہے۔ کیا انہوں نے زمین میں چل پھر کر سیر نہیں کی تاکہ وہ دیکھتے کہ ان سے اگلوں کا انجام کیا ہوا اور بلاشبہ مقام آخرت ان لوگوں کے حق میں بہتر ہے جو پرہیزگار ہیں۔ پس کیا وہ سمجھتے نہیں؟
اور (اے پیغمبر) رسولوں کی سرگزشتوں میں سے جو قصے ہم تجھ کو سناتے ہیں تو ان سب میں یہی بات ہے کہ تیرے دل کو تسکین دے دیں اور پھر ان کے اندر تجھے امر حق مل گیا اور نصیحت مل گئی اور یاد دہانی مومنوں کے لیے۔"

Marfat.com

حضرت عزیر علیہ السلام

○ قرآن عزیز اور حضرت عزیر علیہ السلام ○ واقعہ سے متعلق تاریخی بحث ○ واقعہ کی غلط تفسیر ○ حضرت عزیر اور عقیدہ ابنیت ○ ایک شبہ کا جواب ○ حضرت عزیر علیہ السلام کی زندگی ○ حضرت عزیر اور منصب نبوت ○ نسب ○ وفات ○ بصائر

قرآن عزیز اور حضرت عزیر علیہ السلام:

قرآن عزیز میں حضرت عزیر علیہ السلام کا نام صرف ایک جگہ سورہ توبہ میں مذکور ہے اور اس میں بھی صرف یہ کہا گیا ہے کہ یہود عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں جس طرح کہ نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ اس ایک جگہ کے سوا قرآن میں اور کسی مقام پر ان کا نام لے کر ان کے حالات وواقعات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے:

﴿وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ یُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰی یُؤْفَكُوْنَ ۝﴾ (التوبہ: ۳۰)

"اور یہودیوں نے کہا: عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا: مسیح اللہ کا بیٹا ہے، یہ ان کی باتیں ہیں محض ان کی زبانوں سے نکالی ہوئی۔ ان لوگوں نے بھی ان ہی کی سی بات کہی جو اس سے پہلے کفر کی راہ اختیار کر چکے ہیں۔ ان پر اللہ کی لعنت، یہ کدھر بھٹکے جا رہے ہیں۔"

البتہ سورۂ بقرہ میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک برگزیدہ ہستی کا اپنے گدھے پر سوار ایک ایسی بستی سے گذر ہوا جو بالکل تباہ و برباد اور کھنڈر ہو چکی تھی اور وہاں نہ کوئی مکین باقی رہا تھا اور نہ کوئی مکان، مٹے ہوئے چند نقوش باقی تھے جو اس کی بربادی اور تباہی کے مرثیہ خواں تھے، ان بزرگ نے یہ دیکھا تو تعجب اور حیرت سے کہا کہ ایسا کھنڈر اور تباہ حال ویرانہ پھر کیسے آباد ہوگا اور یہ مردہ بستی کس طرح دوبارہ زندگی اختیار کرے گی۔ یہاں تو کوئی بھی ایسا سبب نظر نہیں آتا؟ اللہ تعالیٰ نے اسی جگہ ان کی روح قبض کر لی اور ۱۰۰ برس تک اسی حال میں رکھا۔ یہ مدت گزر جانے کے بعد اب ان کو دوبارہ زندگی بخشی اور تب ان سے کہا، بتاؤ کتنے عرصہ اس حالت میں رہے ہو؟ وہ جب تعجب کرنے پر موت کی آغوش میں سوئے تھے تو دن چڑھے کا وقت تھا اور جب دوبارہ زندگی پائی تو آفتاب غروب ہونے کا وقت قریب تھا اس لیے انہوں نے جواب دیا: ایک دن یا اس سے بھی کم۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسا نہیں ہے بلکہ تم ۱۰۰ برس تک اسی حالت میں رہے ہو اور اب تمہارے تعجب اور حیرت کا یہ جواب ہے کہ تم ایک طرف اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ اس

Marfat.com

میں مطلق کوئی تغیر نہیں آیا، اور دوسرے جانب اپنے گدھے کو دیکھو کہ اس کا جسم گل سڑ کر صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے اور پھر ہماری قدرت کا اندازہ کرو کہ جس چیز کو چاہا محفوظ رہے تو سو برس کے اس طویل عرصہ میں کسی بھی موسمی تغیرات نے اثر نہ کیا اور محفوظ و سالم رہی اور جس چیز کے متعلق ارادہ کیا کہ اس کا جسم گل سڑ جائے تو وہ گل سڑ گیا اور اب تمہاری آنکھوں دیکھتے ہی ہم اس کو دوبارہ زندگی بخشے دیتے ہیں اور یہ سب کچھ اس لیے کیا تا کہ ہم تم کو اور تمہارے واقعہ کو لوگوں کے لیے "نشان" بنا دیں اور تا کہ تم یقین کے ساتھ مشاہدہ کر لو کہ خدائے تعالیٰ اس طرح مردہ کو زندگی بخش دیتا اور تباہ شدہ شے کو دوبارہ آباد کر دیتا ہے چنانچہ جب اس برگزیدہ ہستی نے قدرتِ الٰہی کے یہ "نشانات" دیکھنے کے بعد شہر کی جانب نظر کی تو اس کو پہلے سے زیادہ آباد اور بارونق پایا۔ تب انہوں نے اظہارِ عبودیت کے بعد یہ اقرار کیا کہ بلاشبہ تیری قدرت کاملہ کے لیے یہ سب کچھ آسان ہے اور مجھ کو علم الیقین کے بعد عین الیقین کا درجہ حاصل ہو گیا۔

﴿اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ (البقرہ:۲۵۹)

"اور کیا تم نے اس شخص کا حال نہ دیکھا، جس کا ایک بستی پر گزر ہوا جو اپنی چھتوں سمیت زمین پر ڈھیر تھا تو وہ کہنے لگا۔ اس بستی کی موت (تباہی) کے بعد اللہ تعالیٰ کس طرح اس کو زندگی دے گا (آباد کرے گا) پس اللہ نے اس شخص پر (اسی جگہ) سو برس تک موت طاری کر دی اور پھر زندہ کر دیا۔ اللہ نے دریافت کیا: تم یہاں کتنی مدت پڑے رہے اس نے جواب دیا: ایک دن یا دن کا بعض حصہ۔ اللہ نے کہا: ایسا نہیں ہے بلکہ تم سو برس تک اس حالت میں رہے پس تم اپنے کھانے اور پینے (کی چیزوں) کو دیکھو کہ وہ بگڑی تک نہیں اور پھر اپنے گدھے کو دیکھو (کہ وہ گل سڑ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے) اور (یہ سب کچھ اس لیے ہوا) تا کہ ہم تم کو لوگوں کے لیے "نشان" بنائیں اور اب تم دیکھو کہ کس طرح ہم ہڈیوں کو ایک دوسرے پر چڑھاتے اور آپس میں جوڑتے ہیں اور پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں پس جب اس کو ہماری قدرت کا مشاہدہ ہو گیا تو اس نے کہا: میں یقین کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔"

ان آیات کی تفسیر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص کون تھا جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تو اس کے جواب میں مشہور قول یہ ہے کہ یہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم فرمایا تھا کہ تم یروشلم جاؤ ہم اس کو دوبارہ آباد کریں گے، جب یہ وہاں پہنچے اور شہر کو تباہ اور کھنڈر پایا تو بر بناء بشریت یہ کہہ اٹھے کہ اس مردہ بستی کو دوبارہ کیسے زندگی ملے گی؟ اور ان کا یہ قول بہ شکل انکار نہیں تھا بلکہ تعجب اور حیرت کے ساتھ ان اسباب کے متلاشی تھے جن کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے برگزیدہ بندے اور نبی کی یہ بات بھی پسند نہیں آئی کیونکہ ان کے لیے یہ کافی تھا کہ خدا نے دوبارہ اس بستی کی زندگی کا وعدہ فرما

Marfat.com

لیا ہے، چنانچہ ان کے ساتھ وہ معاملہ پیش آیا جس کا ذکر مسطورۂ بالا آیات میں ہے اور جب وہ زندہ کیے گئے تو یروشلم (بیت المقدس) آباد ہو چکا تھا۔

حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہم اور قتادہ سلیمان، حسن رحمہم اللہ کا رجحان اسی جانب ہے کہ یہ واقعہ حضرت عزیر علیہ السلام سے متعلق ہے۔ [1]

اور وہب بن منبہ اور عبداللہ بن عبید کا اور ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن سلام کا قول یہ ہے کہ یہ شخص حضرت ارمیاہ (یرمیاہ) نبی تھے۔ ابن جریر طبری نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور ہمارے نزدیک بھی یہی قول راجح ہے۔ [2]

تاریخی بحث:

اور یہ اس لیے کہ جبکہ قرآن عزیز نے اس ہستی کا نام ذکر نہیں کیا اور نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس سلسلہ میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے اور صحابہ وتابعین سے جو آثار منقول ہیں ان کا ماخذ بھی وہ روایات واقوال ہیں جو وہب بن منبہ، کعب احبار اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تک پہنچتے ہیں اور انہوں نے جن کو اسرائیلی واقعات سے نقل کر کے بیان کیا ہے تو اب واقعہ سے متعلق شخصیت کی تحقیق کے لیے صرف ایک یہی راہ باقی رہ جاتی ہے کہ توراۃ اور تاریخی مصادر سے اس کو حل کیا جائے تو اس حقیقت کے پیش نظر جب ہم مجموعہ تورات کے صحائف انبیاء علیہم السلام اور تاریخی بیانات پر غور کرتے ہیں تب یہ تفصیلات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ [3]

بنی اسرائیل کی سرکشی اور شرارت حد سے تجاوز کر چکی ہے اور ظلم وفساد کا بازار گرم ہے کہ خدا کی جانب سے اس زمانہ کے پیغمبر یرمیاہ علیہ السلام پر وحی آتی ہے کہ بنی اسرائیل میں منادی کر دو کہ وہ ان حرکات بد سے باز آ جائیں ورنہ گزشتہ قوموں کی طرح ان کو تباہ وبرباد کر دیا جائے گا۔ یرمیاہ علیہ السلام نے خدا کا یہ پیغام جب بنی اسرائیل تک پہنچایا تو انہوں نے کوئی اثر قبول نہ کیا اور ظلم وشرارت میں اور اضافہ اور یرمیاہ علیہ السلام کے ساتھ تخول شروع کر دیا اور ان کو زندان میں ڈال دیا، اس حالت میں بھی یرمیاہ علیہ السلام نے ان کو بتایا کہ وہ بابل کے بادشاہ کے ہاتھوں برباد ہوں گے اور وہ ان کو قید کر کے بابل لے جائے گا اور یروشلم کو مٹایا جائے گا۔ [4]

تقریباً ساتویں صدی قبل مسیح کا وسط تھا کہ بابل میں بنوکدنضر (بخت نصر) کا ظہور ہوا اور اس نے اپنی قاہرانہ اور جابرانہ طاقت سے قرب وجوار کی تمام حکومتوں کو مسخر اور زیر کر لیا اور تھوڑے عرصہ میں اس نے فلسطین پر پے در پے تین حملے کر کے بنی اسرائیل کو شکست فاش دے کر یروشلم اور فلسطین کے تمام علاقہ کو برباد کر ڈالا اور تمام بنی اسرائیل کو قید کر کے بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکاتا ہوا بابل لے گیا اور توراۃ کے تمام نسخوں کو خاکستر کر دیا اور ایک نسخہ بھی اسرائیلیوں کے ہاتھ میں محفوظ باقی نہ رہا۔ جب بخت نصر اسرائیلی گھرانوں کو قید کر کے غلام بنا رہا تھا تو کسی شخص نے اس سے یہ کہا کہ یہاں ایک شخص یرمیاہ زندان میں قید ہے، اس نے تیرے اس حملہ سے پہلے ان سب حالات کے متعلق پیشین گوئی کر کے بنی اسرائیل کو ڈرایا تھا مگر اس کی قوم نے اس کی بات پر کان نہ دھرا اور اس کو زندان میں ڈال دیا۔ بخت نصر نے یہ سنا تو یرمیاہ (علیہ السلام) کو قید خانہ سے باہر نکالا اور ان سے بات چیت کرتا رہا۔ یرمیاہ علیہ السلام کی علم ودانش سے معمور گفتگو سن کر اس نے خواہش کی کہ وہ بھی اس کے ساتھ بابل چلیں وہ ان کو احترام سے رکھے گا۔ مگر حضرت

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۱۴ [2] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۴۳ [3] تفسیر وتاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۴۴ [4] یرمیاہ نبی کا صحیفہ

Marfat.com

یرمیاہ نے یہ کہہ کر اس کی خواہش کو رَدّ کر دیا کہ جبکہ میری قوم اس ذلت کے ساتھ بابل جا رہی ہو۔ میں اس عزت کے مقابلہ میں اپنی موجودہ حالت کو ترجیح دیتا ہوں۔ ❶ چنانچہ انہوں نے یروشلم سے دور کسی جنگل میں بود و ماند اختیار کر لی اور یرمیاہ نبی کے صحیفہ میں ہے کہ انہوں نے وہیں بیٹھ کر بابل میں اسرائیلیوں کو یہ پیشین گوئی تحریر کے ذریعہ پہنچائی تھی کہ بنی اسرائیل ستر سال بابل میں اس ذلت و خواری کے ساتھ غلام رہیں گے اور اس کے بعد وہ پھر اپنے وطن میں آ کر بسیں گے۔ ❷

چنانچہ بخت نصر کی ہلاکت کے عرصہ دراز کے بعد جب تقریباً ۵۳۹ ق م میں فارس کے بادشاہ سائرس (کیخسرو) نے بابل کے بادشاہ بیل شاہ کو شکست دے کر فارس کو اس کے بے پناہ مظالم سے نجات دلائی تو اسی زمانہ میں اس نے بنی اسرائیل کو بھی آزاد کیا اور یروشلم اور ہیکل کی تعمیر کے لیے ان کو اجازت دی۔

شاہ خورس (کیخسرو) فتح بابل کے بعد تقریباً دس برس اور زندہ رہا اور اسی دوران میں بنی اسرائیل آزاد ہو کر بیت المقدس کی تعمیر میں مشغول ہوئے مگر جیسا کہ عزرا کے صحیفہ سے معلوم ہوتا ہے یہ تعمیر اس کی زندگی میں مکمل نہیں ہو سکی اور درمیان میں بعض افسروں نے ایسی دراندازیاں کیں کہ دو مرتبہ اسرائیلیوں کو اس کی تعمیر کچھ مدت کے لیے روک دینی پڑی اور کیخسرو کے بعد دارا اور دارا کے بعد اردشیر کے زمانہ میں جا کر وہ اس کو دوبارہ مکمل کر سکے۔ ❸ اور یروشلم (بیت المقدس) پھر ایک مرتبہ پہلے سے زیادہ بارونق شہر نظر آنے لگا۔

ان تمام تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ بخت نصر کے یروشلم کو تباہ کرنے اور کیخسرو سے لے کر اردشیر کے زمانے تک دوبارہ اس کے مکمل آباد ہو جانے کے درمیان جو ایک طویل مدت ہے وہی وہ وقفہ ہے جس پر یرمیاہ (علیہ السلام) کو وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سورۂ بقرہ کی آیات میں کیا گیا ہے۔

قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جبکہ یرمیاہ (علیہ السلام) نے بخت نصر کے ساتھ بابل جانے سے انکار کر دیا اور وہ بیت المقدس کی اس تباہ حالی سے گھبرا کر دور کسی جنگل میں گوشہ گیر ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بذریعہ وحی یہ حکم دیا ہوگا کہ وہ اس ویرانہ میں جا کر رہیں جو آج اگرچہ بنی اسرائیل کی تباہ کاریوں کی بدولت تباہ حال ہے مگر ہمیشہ سے نبیوں کی مقدس سرزمین ہے اور یہ کہ ہم دوبارہ اس کو آباد کریں گے اور جب حضرت یرمیاہ علیہ السلام خدا کے حکم سے وہاں پہنچے اور ان کی نگاہ میں اس کی بربادی کا پورا نقشہ پھر گیا تو انہوں نے حسرت و افسوس اور تعجب و حیرت کے ساتھ دل میں یا زبان سے کہا ہوگا کہ اب کون سے ایسے اسباب پیدا ہوں گے جن کے ذریعہ خدائے تعالیٰ اس مردہ بستی کو دوبارہ زندگی بخشیں گے اور پھر وہ سب کچھ پیش آیا جو زیر بحث آیات میں مذکور ہے۔ اور اگر ہم اس پر یہ اور اضافہ کر دیں تو بیجا نہ ہوگا کہ خدا کی حکمت و مصلحت کا یہ تقاضا ہوا کہ جبکہ ابھی یروشلم کی دوبارہ زندگی اور آبادی میں طویل مدت باقی ہے اور یرمیاہ (علیہ السلام) قوم سے الگ اس ویرانہ میں رہیں گے تو یہ ان کی زندگی کے لیے ناقابل برداشت سانحہ ہوگا لہٰذا رحمت حق نے ان کے اس متعجبانہ سوال کو بہانہ بنا کر اس عرصہ کے لیے ان کو موت کی آغوش میں سلا دیا اور اس وقت بیدار کیا جب کہ یروشلم پہلے کی طرح خوب آباد اور بارونق ہو چکا تھا۔

---

❶ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۳۸۔۳۹ و تاریخ ابن خلدون انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

❷ صحیفہ یرمیاہ باب ۱۹ آیت ۱۰ ❸ عزرا باب ۷ آیت ۱۱

Marfat.com

واقعات و حادثات کی اس پوری مدت میں حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی عمر کا تخمینہ تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوتا ہے اور یہ مدت اس زمانہ کی عمر طبعی کے لحاظ سے کوئی تعجب خیز نہیں ہے۔

اس تحقیق کی تائید حضرت یسعیاہ (علیہ السلام) کی اس پیشین گوئی سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے سائرس نجات دہندہ بنی اسرائیل کے متعلق ڈیڑھ سو سال قبل کی تھی، [1] اس لیے کہ یسعیاہ (علیہ السلام) نبی کے انتقال سے متصل ہی یرمیاہ (علیہ السلام) کا ظہور ہوا۔ لہٰذا انجات بنی اسرائیل کی درمیانی مدت کا معاملہ ان ہی کے ساتھ پیش آ سکتا ہے۔ اس کے برعکس حضرت عزیر (علیہ السلام) کی حیات طیبہ کے متعلق جو تفصیلات توراۃ اور اسرائیلیات میں منقول ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابل کی اسارت کے زمانہ میں وہ صغیر سن تھے اور اسرائیلیوں کے ساتھ بابل ہی میں رہے اور چالیس سال کی عمر میں "فقیہ" تسلیم کیے گئے اور وہیں منصب نبوت سے سرفراز ہوئے اور یروشلم کی تعمیر میں رکاوٹ ڈالنے والوں کے خلاف دارا اور اردشیر کے درباروں میں جس وفد نے کوششیں کیں ان میں بھی یہی پیش پیش رہے ہیں اور تورات کے ناپید ہو جانے کے بعد یروشلم میں اس کی تجدید ان ہی کے فیضان نبوت کا اثر تھا۔

غرض بنی اسرائیل کی اسیری بابل سے لے کر رہائی اور تعمیر و آبادی بیت المقدس تک کی درمیانی مدت میں حضرت عزیر علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔

یہ ہیں وہ شواہد قرائن جن کی وجہ سے ہم نے مفسرین کے راجح قول کو مرجوح اور مرجوح قول کو راجح کہنے کی جسارت کی ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

مسطورۂ بالا ہر دو اقوال کے علاوہ ان آیات کے مصداق متعین کرنے میں بعض اور بھی اقوال ہیں، مثلاً حزقیل علیہ السلام یا بنی اسرائیل میں سے کوئی غیر معلوم شخص۔ [2]

واقعہ کی غلط تفسیر:

سورۂ کہف کے تفسیری فوائد سپرد قلم کرتے ہوئے مولانا آزاد نے ایک جگہ سورۂ بقرہ کے اس واقعہ کو حضرت حزقیل علیہ السلام کا مکاشفہ قرار دیا ہے جو اس واقعہ سے قریب صحیفہ حزقیل میں مذکور ہے۔ [3]

ہم کو سخت تعجب ہے اور حیرت بھی کہ جب قرآن عزیز نے اس واقعہ کو صاف اور صریح طریقہ پر ایک شخص کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک معین مدت کے لیے موت کی آغوش میں سلا دیا اور پھر زندہ کر کے اس سے موت کی مدت کے بارہ میں سوال کیا جب وہ صحیح جواب نہ دے سکا تو خود اس کی تصحیح فرمائی اور اس سے متعلق شواہد کا مشاہدہ کرایا تو کس طرح مولانا آزاد نے حزقیل کے مکاشفہ کو اس واقعہ کی تفسیر یا تاویل قرار دیا ہے:

غور کیجیے کہ ایک برگزیدہ ہستی کا ایک ایسی کھنڈر اور ویران بستی پر گزر ہوا جو کبھی بہت ہی بارونق آباد بستی تھی اور جہاں لاکھوں انسان بس رہے تھے ﴿أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا﴾ اس نے یہ دیکھا تو دل میں سوچا یا زبان سے کہا کہ نہ معلوم کس طرح یہ مردہ بستی پھر زندہ ہوگی ﴿قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ تب اللہ نے اسی جگہ اس کی روح قبض

---

[1] ایضاً باب ۴۴ آیت ۲۸ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۱۴ [3] ترجمان القرآن جلد ۲

Marfat.com

کر لی اور سو برس تک اسی حالت میں رکھ کر دوبارہ زندہ کر دیا ﴿ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ﴾ اور زندگی بخشنے کے بعد اس ہستی سے دریافت فرمایا: بتاؤ تم یہاں کتنی مدت پڑے رہے؟ برگزیدہ ہستی نے جواب دیا: ایک دن یا دن کا بعض حصہ ﴿ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ ﴾ چونکہ جواب غلط تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح اور حقیقت حال کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: نہیں بلکہ سو برس تک موت کی آغوش میں سوتے رہے ہو ﴿ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ ﴾ اور پھر اپنی قدرت کاملہ کے تصرفات کا مشاہدہ کرایا کہ ایک جانب اس طویل مدت کے باوجود کھانے پینے کی تمام چیزیں تروتازہ اور موسمی اثرات سے محفوظ تھیں اور دوسری جانب ان کی سواری کا گدھا گل سڑ کر بوسیدہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا ﴿ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ ﴾ اور پھر فرمایا کہ ہم نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ تم کو دوسروں کے لیے اپنی قدرت کاملہ کا ایک "نشان" بنا دیں ﴿ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ ﴾ پھر ان تمام باتوں کے بعد اس بزرگ ہستی کو مشاہدہ کرایا کہ کس طرح ہڈیوں نے آپس میں ترتیب پائی۔ پھر ان پر گوشت چڑھا اور پھر چمڑا اور ان کا گدھا زندہ کھڑا ہو گیا۔ ﴿ وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ ﴾ یہ سب کچھ دیکھ لینے اور مشاہدہ کر لینے کے بعد جب علم الیقین نے عین الیقین کا درجہ حاصل کر لیا تو فوراً اس برگزیدہ ہستی نے اعتراف کیا کہ بیشک خدا کی قدرت کاملہ کے لیے اسباب و وسائل کی حاجت نہیں، وہ جس طرح چاہے بے روک ٹوک تصرف کرے کوئی اس کے لیے مانع نہیں ہے ﴿ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ ﴾۔

اب ان صاف اور واضح آیات پر دوبارہ غور کیجیے اور سوچیے کہ قرآن عزیز نے اس واقعہ کو ایک "حقیقی واقعہ" کی حیثیت سے بیان کیا ہے یا مجاز کے طور پر ایک "مکاشفہ" کی شکل میں۔ نیز کیا حزقیل علیہ السلام کے مکاشفہ اور ان آیات میں ذکر کردہ واقعہ کے درمیان مشابہت کی وجہ سے دونوں کو ایک بتانا کسی طرح صحیح ہو سکتا ہے، نہیں ہرگز نہیں۔ پس بلاشبہ مولانا آزاد کی یہ تاویل "تاویل باطل" ہے۔

البتہ یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ اگر حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو یہ واقعہ پیش آیا تو اس کے قریب قریب حضرت حزقیل علیہ السلام کا ایک مکاشفہ بھی ہے جو مجموعہ تورات کے صحیفہ حزقیل میں مذکور ہے۔ اس مکاشفہ میں انہوں نے بنی اسرائیل کی سوکھی ہوئی ہڈیوں کو دوبارہ زندہ ہوتے دیکھا اور خدائے تعالیٰ نے ان کو بتایا کہ اس سے یہ مراد ہے کہ بنی اسرائیل اب ناامید ہو چکے ہیں کہ ہم اس بربادی کے بعد کبھی یروشلم میں دوبارہ آباد ہوں گے۔ مگر ہم تیرے ذریعہ سے ان کو خبردار کرتے ہیں کہ خدا کا فیصلہ ہے کہ ایسا ضرور ہو گا۔ [1]

حضرت عزیر علیہ السلام اور عقیدۂ ابنیت :

گزشتہ سطور میں ذکر آ چکا ہے کہ جب بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ و برباد کر ڈالا اور بنی اسرائیل کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو بھیڑوں کی طرح ہنکا کر لے چلا تو تورات کا کوئی نسخہ باقی بچا تھا اور نہ کوئی حافظ تھا جس کو اول سے آخر تک تورات محفوظ ہو، چنانچہ اسیری کے پورے دور میں وہ تورات سے قطعاً محروم ہو چکے تھے لیکن جب عرصہ دراز کے بعد ان کو بابل کی اسیری سے نجات ملی اور بیت المقدس (یروشلم) میں دوبارہ آباد ہوئے تو اب ان کو یہ فکر ہوئی کہ خدا کی کتاب تورات کو کسی طرح حاصل کریں۔ تب حضرت

---

[1] حزقیل باب ۳۷ آیات ۱۔۱۴

Marfat.com

عزیر (عزراہ) نبی نے سب اسرائیلیوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے توراۃ کو اول سے آخر تک پڑھا اور تحریر کرایا۔

بعض اسرائیلی روایات میں ہے کہ جس وقت انہوں نے بنی اسرائیل کو جمع کیا تو سب کی موجودگی میں آسمان سے دو چمکتے ہوئے "شہاب" اترے اور حضرت عزیر علیہ السلام کے سینہ میں سما گئے تب حضرت عزیر علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو از سرنو توراۃ مرتب کر کے عطا فرمائی۔ چنانچہ جب حضرت عزیر علیہ السلام اس اہم کام سے فارغ ہوئے تو بنی اسرائیل نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا اور ان کے قلوب میں حضرت عزیر کی قدر و منزلت سو گنا بڑھ گئی،[1] اور آہستہ آہستہ اس محبت نے گمراہی کی شکل اختیار کر لی کہ انہوں نے عزیر علیہ السلام کو اسی طرح خدا کا بیٹا مان لیا جس طرح نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ تسلیم کرتے ہیں اور بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے اپنے اس عقیدہ کے لیے یہ دلیل قائم کر لی کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب ہم کو توراۃ لا کر دی تھی تو الواح پر لکھی ہوئی تھی مگر عزیر علیہ السلام نے تو کسی لوح یا قرطاس پر مکتوب لا کر دینے کی بجائے حرف بحرف اپنے سینہ کی لوح سے اس کو ہمارے سامنے نقل کر دیا اور عزیر میں یہ قدرت جب ہی ہوئی کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔[2] (العیاذ باللہ) سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔

ایک شبہ کا جواب:

قرآن عزیز کے اس اعلان پر کہ عزیر کو یہود خدا کا بیٹا کہتے ہیں آج کے بعض یہودی عالم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہم تو عزیر کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے اس لیے قرآن کا یہ دعویٰ غلط ہے مگر ان علماء یہود کا یہ اعتراض بھی اپنے پیشروں کی طرح تلبیس اور کتمان حق پر مبنی ہے ورنہ تو وہ جانتے ہیں اور ان کے علاوہ ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے ممالک اسلامیہ کی سیر و سیاحت کی اور اس کو اقوام عالم کے مذاہب کی تحقیق سے دلچسپی رہی ہو کہ آج بھی نواح فلسطین میں یہود کا وہ فرقہ موجود ہے جو عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتا ہے اور رومن کیتھولک عیسائیوں کی طرح ان کا مجسمہ بنا کر ان کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جو خدا کے ساتھ ہونا چاہیے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کی زندگی مبارک:

حضرت عزیر علیہ السلام کی حیات طیبہ سے متعلق تفصیلی حالات کا کچھ زیادہ مواد کتب سیر و تاریخ میں نہیں پایا جاتا اور مجموعہ توراۃ کے صحیفہ عزراہ میں بھی خود ان کی زندگی پاک پر مفصل روشنی نہیں پڑتی اور اس کا زیادہ حصہ بنی اسرائیل کی اسارت بابل اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہے۔ البتہ تورات اور وہب بن منبہ اور کعب احبار سے منقول روایات سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ بخت نصر کے حملہ بیت المقدس کے زمانہ میں صغیر سن تھے اور چالیس[3] برس کی عمر میں بنی اسرائیل کے منصب "فقیہ" پر فائز ہوئے اور اس کے بعد ان کو منصب نبوت عطا ہوا اور وہ نحمیاہ نبی علیہ السلام بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کا فرض انجام دیتے اور اردشیر کے زمانہ میں وہ بنی اسرائیل کی مشکلات کے متعلق تعمیر بیت المقدس کو دور کرنے کے سلسلہ میں شاہی دربار میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے رہے۔[4]

اور مشہور قول کے مطابق جن بزرگوں نے سورہ بقرہ کے واقعہ کا تعلق ان کے ساتھ بتایا ہے انہوں نے اس سلسلہ میں بعض مزید تفصیلات حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور کعب احبار رضی اللہ عنہ وغیرہ سے نقل فرمائی ہیں جن کا ذکر ابن کثیر نے بھی اپنی تاریخ میں کیا

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۴۵۔ [2] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۵۶

[3] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۴۶ [4] صحیفہ عزرا

Marfat.com

ہے اور بعض مفسرین نے بھی آیات زیر بحث کی تفسیر کے ضمن میں ان کو نقل کیا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات کے ضمن میں ایک صحیح روایت نقل کی گئی تھی کہ کسی "نبی" کے ایک چیونٹی نے کاٹ لیا۔ انہوں نے غصہ میں چیونٹی کے سوراخ میں آگ ڈال کر تمام چیونٹیوں کو جلوا دیا تب اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ان پر عتاب فرمایا کہ تم نے ایک چیونٹی کی خطا پر تمام چیونٹیوں کو جلا دینا کس طرح جائز رکھا؟ تو اس واقعہ کے متعلق ابن کثیر نے اسحاق بن بشیر کی سند سے یہ نقل کیا ہے کہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ نبی "عزیر" علیہ السلام تھے۔ [1] عزیر علیہ السلام کے متعلق بعض اور بھی واقعات نقل کیے جاتے ہیں مگر روایت اور درایت دونوں اعتبار سے ساقط الاعتبار بلکہ لغو اور لا طائل ہیں، چنانچہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بھی ان کو نقل کر کے رَد کر دیا ہے۔ [2]

حضرت عزیر اور منصب نبوت:

مگر یہ واضح رہے کہ جن روایات میں حضرت عزیر علیہ السلام کو آیات مسطورۂ بالا کا مصداق قرار دیا گیا ہے ان میں یہ بھی تصریح ہے کہ عزیر علیہ السلام نبی نہیں تھے بلکہ "مرد صالح" تھے۔ حالانکہ جمہور کا قول یہ ہے کہ حضرت عزیر "نبی" تھے اور قرآن عزیز نے بھی جس انداز اور اسلوب سے ان کا ذکر کیا ہے وہ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ وہ خدا کے پیغمبر ہیں اور گمراہ یہودیوں نے ان کو اسی طرح "ابن اللہ" بنا لیا جس طرح نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔ نیز توراۃ بھی ان کے نبی ہونے کا اقرار کرتی ہے۔

علاوہ ازیں جو حضرات ایک طرف سورۂ بقرہ کی زیر بحث آیات کا مصداق عزیر علیہ السلام کو بتاتے ہیں اور دوسری جانب ان کے نبی ہونے کا انکار کرتے ہیں ان کے لیے یہ بات قابل توجہ ہے کہ بقرہ کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بلاواسطہ خطاب فرمایا ہے اور ان سے ہم کلام ہوا ہے اور یہ ان کے نبی ہونے کا واضح ثبوت ہے۔

بہر حال عزیر علیہ السلام کے نبی ہونے کے متعلق دو قول ہیں اور راجح یہی ہے کہ وہ بلاشبہ خدا کے پیغمبر ہیں:

نسب:

عزیر علیہ السلام کے والد اور سلسلہ نسب کے بعض دوسرے ناموں میں مؤرخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ حضرت ہارون بن عمران علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔

ابن عساکر ان کے والد کا نام جروہ بتاتے ہیں اور بعض سوریق اور بعض سروخا بیان کرتے ہیں اور صحیفہ عزرا میں ہے کہ ان کا نام خلقیاہ تھا۔

وفات اور قبر مبارک:

ابن کثیر نے وہب بن منبہ، کعب احبار اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے عزیر علیہ السلام کے متعلق جو طویل روایت نقل کی ہے اس میں ہے کہ عزیر علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لیے توراۃ کی تجدید عراق کے اندر دیر حزقیل میں کی تھی اور اسی نواح کے ایک قریہ سائر آباد میں ان کی وفات ہوئی۔ [3] اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ بعض آثار میں موجود ہے کہ ان کی قبر دمشق میں ہے۔ [4]

---

[1] البدایہ والنہایہ و تاریخ طبری [2] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۴۷ [3] ایضاً ج ۲ ص ۴۵ [4] ایضاً ص ۴۳

Marfat.com

بصائر:

حضرت عزیر علیہ السلام کے واقعات کو جو حضرات قصہ کہانی کی بجائے تاریخی حقائق سمجھتے ہیں وہ بلاشبہ اس سے بہت اہم نتائج اخذ کر سکتے ہیں اور کیا عجب ہے کہ وہ حسب ذیل بصائر و عبر کو بھی اسی سلسلہ کی کڑی سمجھیں۔

① انسان کتنا ہی معراج ترقی اور بام رفعت پر پہنچ جائے اور خدائے تعالیٰ کے ساتھ اس کو زیادہ سے زیادہ بھی قرب حاصل ہو جائے تب بھی وہ "خدا کا بندہ" ہی رہتا ہے اور کسی بھی مقام بلند پر پہنچ کر وہ خدا یا خدا کا بیٹا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس وحدہٗ لاشریک لہٗ اور باپ اور بیٹے کی نسبتوں سے پاک اور وراء الوراء ہے لہٰذا یہ انسان کی سب سے بڑی گمراہی ہے کہ وہ جب کسی برگزیدہ انسان سے ایسے امور صادر ہوتے دیکھتا ہے جو عام طور پر عقل کے نزدیک حیرت زا اور تعجب خیز ہوں تو وہ رعب یا انتہاءِ عقیدت کی وجہ سے پکار اٹھتا ہے کہ یہ ہستی تو خدا کا اوتار (خدا بشکل انسان) یا اس کا بیٹا ہے اور وہ یہ نہیں سوچتا کہ بلاشبہ ان واقعات کا صدور خدا کی طاقت کے ذریعہ بطور "نشان" اس کے ہاتھوں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود نہ خدا ہے اور نہ خدا کا بیٹا، بلکہ اس کا ایک مقرب بندہ ہے اور یہ امور خدا کے خاص قوانین کے ماتحت محض اس کی تائید اور اس کی صداقت کے لیے ظاہر ہوتے ہیں۔ ورنہ تو یہ بھی خدا کے سامنے اسی طرح مجبور ہے جس طرح دوسری مخلوق۔ چنانچہ قرآن عزیز نے جگہ جگہ اس حقیقت کو واضح کر کے انسان کو اس گمراہ کن عقیدت سے سختی کے ساتھ باز رکھا ہے۔

② اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کے اس واقعہ کو ابراہیم علیہ السلام کے اس واقعہ سے متصل بیان فرمایا ہے جس میں مذکور ہے کہ انہوں نے بھی ایک مرتبہ خدائے تعالیٰ سے یہ دریافت کیا تھا کہ یہ بتا کہ تو کس طرح مردہ میں جان ڈال دیتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ سوال کیا کہ ابراہیم! کیا تم اس مسئلہ پر ایمان نہیں رکھتے؟ تب ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا: خدایا! میں بے شک اس پر ایمان رکھتا ہوں کہ تو مردہ کو زندہ کر دیتا ہے مگر میرے سوال کا مقصد قلبی اطمینان حاصل کرنا ہے تو اللہ تعالیٰ نے پہلے واقعہ کو اس واقعہ کے ساتھ اس غرض سے بیان فرمایا ہے تاکہ یہ مسئلہ واضح اور روشن ہو جائے کہ انبیاء علیہم السلام کی جانب سے ان سوالات کا پیش آنا اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ "احیاءِ موتیٰ" کے بارے میں شک رکھتے اور اس کو دور کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان کے استفسار کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کو اس بارے میں "علم الیقین" حاصل ہے وہ "عین الیقین" اور "حق الیقین" کے درجہ تک پہنچ جائے یعنی وہ جس طرح دل سے اس پر یقین رکھتے ہیں اسی طرح وہ چاہتے ہیں کہ آنکھوں سے بھی مشاہدہ کر لیں کیونکہ وہ مخلوق خدا کی رشد و ہدایت پر مامور ہونے کی وجہ سے جن ذمہ داریوں کے حامل ہیں ان کی تبلیغ و دعوت کو باحسن وجوہ انجام دے سکیں اور یقین کا کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ ایسا باقی نہ رہے جو ان کو حاصل نہ ہو۔

③ دنیا دار العمل ہے اور دار الجزاء ایک دوسرا عالم ہے جس کو "دار آخرت" کہا جاتا ہے لیکن عادت اللہ یہ جاری ہے کہ "ظلم" اور "کبر" دو ایسے عمل ہیں کہ ظالم اور متکبر کو اس دنیا میں بھی ضرور ذلت و رسوائی کا پھل چکھاتے ہیں، خصوصاً جبکہ یہ دونوں اعمال بد افراد کی جگہ قوموں کا مزاج بن جائیں اور ان کی طبیعت کا جزو ہو جائیں۔ ﴿قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ﴾ لیکن یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ قوموں کی اجتماعی حیات کی بقاء و فنا کی عمر انفرادی زندگی سے جدا ہوتی ہے اس لیے ان کے پاداش عمل کی تاخیر سے کبھی بھی باہمت اور صاحب استقلال انسان کو گھبرانا اور مایوس ہونا نہیں چاہیے اس لیے کہ خدا کا بنایا ہوا قانون "پاداش عمل" اپنے معین وقت سے ٹل نہیں سکتا۔

حضرت زکریا علیہ السلام

○ قرآن عزیز اور حضرت زکریا علیہ السلام ○ نسب ○ حالات زندگی ○ چند تفسیری حقائق

قرآن عزیز اور حضرت زکریا علیہ السلام:

قرآن عزیز میں حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر چار سورتوں آل عمران، انعام، مریم اور انبیاء کی حسب ذیل آیات میں آیا ہے:

شمار	سورۃ	آیت	عدد
۱	آل عمران	۳۷_۴۱	۵
۲	انعام	۸۵	۱
۳	مریم	۲_۱۱	۱۰
۴	انبیاء	۸۹_۹۰	۲
			۱۸

ان میں سے سورہ انعام میں تو صرف فہرست انبیاء میں نام ذکر کیا گیا ہے اور باقی تین سورتوں میں مختصر تذکرہ منقول ہے۔

نسب:

قرآن عزیز جن زکریا علیہ السلام کا ذکر کر رہا ہے، یہ وہ نہیں ہیں جن کا ذکر مجموعہ توراۃ کے صحیفہ زکریا میں آیا ہے اس لیے کہ توراۃ میں جن زکریا کا تذکرہ ہے ان کا ظہور داریوس (دارا) کے زمانہ میں ہوا ہے، چنانچہ "زکریا نبی کی کتاب" میں ہے:

"دارا کے دوسرے برس کے آٹھویں مہینے میں خداوند کا کلام زکریا بن برخیا بن عدد کو پہنچا۔" [1]

اور دارا بن گشتاسپ کا زمانہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے پانچ سو سال قبل ہے کیونکہ وہ کیقباد بن کیخسرو کے انتقال کے بعد ۵۱۲ ق م میں تخت نشین ہوا ہے اور قرآن عزیز نے جن زکریا علیہ السلام کا ذکر کیا ہے وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کے مربی اور حضرت مسیح علیہ السلام کے معاصر ہیں اور ان کے اور یحییٰ بن زکریا اور مسیح علیہما السلام کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے اور یہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے والد ماجد ہیں۔ [2]

[1] باب ا آیت ا [2] فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۵

Marfat.com

حضرت زکریا علیہ السلام کے والد کا نام کیا تھا؟ اس میں اصحاب سیر کے مختلف اقوال ہیں اور ان میں سے کوئی قول بھی باوثوق نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر اور تاریخ میں ابن عساکر سے وہ سب اقوال نقل کر دیے ہیں۔ یعنی زکریا بن اون (دان) ابن شبوی یا ابن لدن یا ابن برخیا بن مسلم ❶ بن صدوق بن جشان بن داؤد بن سلیمان بن مسلم بن صدیقہ بن برخیا بن بلعاطہ بن ناخور بن شلوم بن بہفاشاط بن اینامن بن رجعام بن سلیمان بن داؤد علیہما السلام۔

لیکن یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کی ذریت میں سے ہیں۔ ❷

حالات زندگی:

زکریا علیہ السلام کی حیات طیبہ کے حالات تفصیل سے معلوم نہیں ہیں لیکن جس قدر بھی قرآن عزیز اور سیر و تاریخ کی قابل اعتماد روایات سے معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

گزشتہ مباحث میں گزر چکا ہے کہ بنی اسرائیل میں "کاہن" ایک معزز مذہبی عہدہ تھا اور اس کے ذمہ یہ خدمت تھی کہ وہ ہیکل (صخرہ بیت المقدس) کی مقدس رسوم ادا کیا کرے اس کے لیے مختلف قبائل میں سے الگ کاہن منتخب ہوتے اور اپنی اپنی نوبت پر اس خدمت کو انجام دیا کرتے تھے۔

چنانچہ حضرت زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل میں معزز کاہن بھی تھے اور جلیل القدر پیغمبر بھی، چنانچہ قرآن عزیز نے ان کو انبیاء کی فہرست میں شمار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۵﴾﴾ (الانعام: ۸۵)

"اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس یہ سب نیکوکاروں میں سے ہیں۔"

اور لوقا کی انجیل میں ان کو کاہن ❸ کہا گیا ہے:

"یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیاہ کے فریق میں زکریا نام کا ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام الیشبع تھا اور وہ دونوں خدا کے حضور راست باز اور خداوند کے سارے حکموں اور قانون پر بے عیب چلنے والے تھے۔" ❹

مگر انجیل برنابا میں بصراحت مذکور ہے کہ وہ خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے، چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام یہود کو مخاطب کر کے ارشاد فرما رہے ہیں:

"وہ وقت قریب ہے جب تم پر ان انبیاء (علیہم السلام) کا وبال پڑنے والا ہے جن کو تم نے زکریا (علیہ السلام) کے زمانہ تک قتل کیا

---

❶ فتح الباری جلد ۶ و تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۴۷ ❷ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۴۷

❸ اسلام کے دور اول میں عرب کے اندر جو کاہن (جوتشی) ہوتے اور مستقبل کے حالات بتایا کرتے تھے اور جن کی باتوں پر ایمان لانا اسلام کے ساتھ کفر بتایا گیا ہے وہ بنی اسرائیل کے اس منصب سے الگ شے ہے۔

❹ باب ا آیت ۵۔۶

Marfat.com

ہے اور جبکہ زکریا (علیہ السلام) کو ہیکل اور قربانگاہ کے درمیان قتل کیا۔" ✿

زکریا علیہ السلام سلالہ داؤد علیہ السلام سے تھے اور ان کی زوجہ مطہرہ ایشاع یا الیشع حضرت ہارون علیہ السلام کی ذریت میں سے تھیں۔ ✿

گزشتہ مباحث میں یہ بھی ذکر آ چکا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام "خواہ وہ بادشاہ اور صاحب حکومت ہی کیوں نہ ہوں" اپنی روزی ہاتھ کی محنت سے پیدا کرتے تھے اور کسی کے لیے باردوش نہیں ہوتے تھے اسی لیے ہر نبی نے جب اپنی امت کو رشد و ہدایت کی تبلیغ کی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا ہے:

﴿ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (سورہ الشعراء: ۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴، ۱۸۰)

"میں تم سے اس تبلیغ پر کوئی اجرت نہیں مانگتا، میرا اجر تو خدا کے سوا اور کسی کے پاس نہیں ہے۔"

چنانچہ زکریا علیہ السلام بھی اپنی روزی کے لیے نجاری (بڑھئی) کا پیشہ کرتے تھے جیسا کہ مسلم، ابن ماجہ اور مسند احمد میں بصراحت مذکور ہے:

((عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال کان زکریا نجارًا))۔ (الحدیث) ✿

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زکریا علیہ السلام نجاری (بڑھئی کا کام) کرتے تھے۔"

ان ہی کے خاندان یعنی سلیمان بن داؤد علیہما السلام کی نسل میں سے عمران بن ناشی اور اس کی بیوی حنہ بنت فاقود نیک نفس ✿ انسان تھے اور پارسائی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر لاولد تھے اور جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں تفصیل سے آئے گا، حنہ کی دعا سے ان کے گھر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام انہوں نے مریم رکھا اور حنہ نے اپنی منت کے مطابق مریم علیہا السلام کو "ہیکل" کی نذر کر دیا۔

تو اب سوال پیدا ہوا کہ اس کی کفالت، پرورش اور نگہداشت کس کے سپرد ہو، کاہنوں کے درمیان اس "مقبول نذر خدا" کے بارے میں اختلاف ہو کر جب بات قرعہ فال پر آ کر ٹھہری تو قرعہ زکریا علیہ السلام کے نام نکلا اور وہی مریم کے کفیل قرار پائے۔

﴿ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ﴾ (آل عمران: ۳۷)

"اور زکریا (علیہ السلام) نے مریم کی کفالت کا بوجھ اپنے ذمہ رکھا۔"

﴿ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴾ (آل عمران: ۴۴)

"اور تم (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنے اپنے قلم (قرعہ کے لیے) ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون شخص مریم کی کفالت کرے اور نہ تم ان کے پاس تھے جب وہ مریم کی کفالت کے معاملہ میں جھگڑ رہے تھے۔"

✿ مشہور چار انجیلوں سے الگ یہ پانچویں انجیل ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری برنابا کی جانب منسوب ہے، یہ روما کے پوپ سکٹس کے کتب خانہ میں محفوظ تھی اور وہاں سے ایک اسقف نے کسی طرح حاصل کر کے اس کو شائع کر دیا اور وہ مسلمان ہو گیا، کیونکہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی شہادتیں صاف اور واضح پائی جاتی ہیں۔

✿ فتح الباری جلد ۶ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ✿ کتاب الانبیاء ✿ فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۴

Marfat.com

علماء سیر و تاریخ کہتے ہیں کہ زکریا علیہ السلام یوں بھی مریم علیہا السلام کی کفالت کے حق دار تھے اس لیے کہ بشیر بن اسحٰق نے "المبتداء" میں نقل کیا ہے کہ زکریا علیہ السلام کی بیوی ایشاع (الیشع) اور حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ حنہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں [1] اور خالہ بمنزلہ والدہ کے ہوتی ہے جیسا کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمارہ بنت حمزہ (رضی اللہ عنہا) کے متعلق فرمایا تھا کہ ان کی پرورش حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی بیوی کریں کیونکہ وہ عمارہ کی خالہ تھیں۔ ((والخالة بمنزلة الام)) [2]

جب مریم علیہا السلام سمجھ دار ہو گئیں تو زکریا علیہ السلام نے ان کے لئے ہیکل کے قریب ایک حجرہ (خلوہ) مخصوص کر دیا جہاں وہ دن میں عبادت الٰہی میں مشغول رہتی اور رات اپنی خالہ کے پاس گزارتی تھیں۔

جب زکریا علیہ السلام مریم علیہا السلام کے حجرہ (محراب) میں داخل ہوتے تو دیکھتے کہ ان کے پاس غیر موسمی پھل رکھے ہیں۔ ایک مرتبہ تعجب سے زکریا علیہ السلام نے دریافت کیا۔ مریم! تیرے پاس یہ کہاں سے آئے؟ مریم علیہا السلام نے کہا: یہ خدا کی جانب سے ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق عطا کر دیتا ہے۔

﴿ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ ﴾ (آل عمران: ۳۷)

"جب زکریا مریم کے پاس محراب (خلوہ) میں داخل ہوتا تو اس کے پاس کھانے پینے کا سامان رکھا دیکھتا زکریا نے دریافت کیا۔ مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آتا ہے مریم نے کہا یہ اللہ کے پاس سے ہے وہ بلاشبہ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق عطا کر دیتا ہے۔"

مجاہد، عکرمہ سعید بن جبیر، ضحاک، قتادہ، ابراہیم نخعی رحمہم اللہ ﴿رِزْقًا﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ زکریا علیہ السلام مریم علیہا السلام کے پاس غیر موسمی پھل رکھتے پاتے تھے۔ [3]

زکریا علیہ السلام کے کوئی اولاد نہیں تھی اور وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اس بات کے علاوہ کہ میں اولاد کی دولت سے محروم ہوں زیادہ فکر اس امر کا ہے کہ میرے بھائی بند ہرگز اس کے اہل نہیں ہیں کہ میرے بعد بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کی خدمت انجام دے سکیں پس اگر اللہ تعالیٰ میرے کوئی نیک سرشت لڑکا پیدا کر دیتا تو مجھ کو یہ اطمینان ہو جاتا کہ بنی اسرائیل کی راہنمائی کا خدمت گزار میرے بعد موجود ہے۔ [4]

مگر چونکہ ان کی عمر بقول ابن کثیر ۷۷ سال اور بقول ثعلبی ۹۰، ۹۲ یا ۱۲۰ سال ہو چکی تھی [5] اور ان کی بیوی بانجھ تھیں اس لیے بہ اسباب ظاہر وہ مایوس تھے کہ اب اولاد ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

لیکن جب انہوں نے مریم علیہا السلام کے پاس بے موسمی پھل دیکھے اور ان کو یہ معلوم ہوا کہ مریم علیہا السلام پر خدا کا یہ فضل و انعام ہے تو ان کے دل میں فوراً جوش پیدا ہوا کہ جو ذات اقدس اس طرح بے موسم مریم کو پھل بخشتی ہے کیا وہ ہم کو موجودہ نا امیدی کی حالت میں

---

[1] فتح الباری ج ٦ ص ۳٦۴ [2] بخاری باب الحضانہ [3] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳٦۰
[4] فتح الباری ج ٦ ص ۳٦۴ [5] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۴۹

ثمر حیات (بیٹا) نہ بخشے گی۔ پس ہماری مایوسی سراسر غلط ہے، بلاشبہ جس ذات پاک نے مریم علیہا السلام پر اپنا انعام واکرام کیا ہے وہ ضرور ہم پر بھی فضل وکرم کرے گا۔ چنانچہ انہوں نے درگاہِ الٰہی میں دعا کی "خدایا میں تنہا ہوں اور وارث کا محتاج، اور یوں تو حقیقی وارث صرف تیری ہی ذات ہے خدایا مجھ کو پاک اولاد عطا فرما مجھے یقین ہے کہ تو حاجت مند کی دعاء کو ضرور سنتا ہے"۔ نبی کی دعاء اور دعاء بھی صرف ذات کے لیے نہیں بلکہ قوم کی رشد وہدایت کی خاطر فوراً مستجاب ہوئی اور جب زکریا علیہ السلام ہیکل میں مشغول عبادت تھے تو خدا کا فرشتہ ان پر ظاہر ہوا اور اس نے بشارت دی کہ تمہارے بیٹا پیدا ہوگا اور تم اس کا نام یحییٰ رکھنا۔ زکریا علیہ السلام کو یہ سن کر بیحد مسرت ہوئی اور تعجب سے دریافت کرنے لگے یہ بشارت کس طرح پوری ہوگی؟ یعنی مجھ کو جوانی عطاء ہوگی یا میری بیوی کا مرض (بانجھ پن) دور کر دیا جائے گا۔ فرشتہ نے جواب دیا: میں اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ حالات کچھ بھی ہوں تمہارے ضرور بیٹا ہوگا۔ کیونکہ خدا کا فیصلہ اٹل ہے اور تیرا خدا کہتا ہے کہ میرے لیے یہ بہت آسان ہے یعنی جو طریقہ بھی اس کے لیے چاہوں اختیار کروں، کیا تجھ کو میں نے نیست سے ہست نہیں کیا۔

اب زکریا علیہ السلام نے درگاہِ الٰہی میں عرض کیا: خدایا! ایسا کوئی نشان عطاء کر جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ بشارت نے وجود کی شکل اختیار کر لی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: علامت یہ ہے کہ جب تم تین روز تک بات نہ کر سکو اور صرف اشاروں سے ہی اپنا مطلب ادا کر سکو تو سمجھ لینا کہ بشارت نے وجود اختیار کر لیا لیکن ان دنوں میں تم خدا کی تسبیح وتہلیل میں زیادہ مشغول رہنا، چنانچہ جب وہ وقت آ پہنچا تو زکریا علیہ السلام یادِ خدا میں اور زیادہ منہمک ہو گئے اور امت کو بھی اشاروں سے یہ حکم دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ خدا کی یاد میں مشغول رہیں اور یہ اس لیے کہ جس طرح یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کی بشارت حضرت زکریا علیہ السلام کے لیے باعث صد ہزار مسرت تھی، اسی طرح بنی اسرائیل کے لیے بھی کم خوشی کا باعث نہیں تھی کہ زکریا علیہ السلام کا ایک صحیح جانشین اور علم وحکمت ونبوت کا سچا وارث عالم وجود میں آنے والا ہے۔

یہی واقعات ہیں جو قرآن عزیز اور صحیح احادیث کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں اور صرف ان ہی پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ یا اسرائیلی روایات ہیں جو اکثر وبیشتر تو اس مسئلہ میں قرآن وحدیث کے بیان کردہ واقعات کی مطابقت کرتی ہیں اور بعض ساقط الاعتبار ہیں اور یا بعض وہ آثار ہیں جو روایت ودرایت کے اعتبار سے ناقابل حجت اور غیر مستند ہیں، اور سورہ مریم میں ہے:

﴿ كٓهٰيٰعٓصٓ ۝ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨاسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ

Marfat.com

عَشِيًّا ﴿١١﴾﴾ (مریم:۱۔۱۱)

"(اے پیغمبر!) تیرے پروردگار نے اپنے بندے زکریا پر جو مہربانی کی تھی یہ اس کا بیان ہے، جب ایسا ہوا تھا کہ زکریا نے چپکے چپکے اپنے پروردگار کو پکار، اس نے عرض کیا" پروردگار! میرا جسم کمزور پڑ گیا ہے میرے سر کے بال بڑھاپے سے بالکل سفید ہو گئے ہیں۔ خدایا! کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے تیری جناب میں دعا کی ہو اور محروم رہا ہوں مجھے اپنے مرنے کے بعد اپنے بھائی بندوں سے اندیشہ ہے (کہ نہ معلوم وہ کیا خرابی پھیلائیں) اور میری بیوی بانجھ ہے، پس تو اپنے خاص فضل سے مجھے ایک وارث بخش دے ایسا وارث جو میرا بھی وارث ہو اور خاندان یعقوب (کی برکتوں) کا بھی اور پروردگار! اسے ایسا کر دیجیو کہ (تیرے اور تیرے بندوں کی نظر میں) پسندیدہ ہو (اس پر حکم ہوا) اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی پیدائش کی خوشخبری دیتے ہیں، اس کا نام یحییٰ رکھا جائے اس سے پہلے ہم نے کسی کے لیے یہ نام نہیں ٹھہرایا ہے (زکریا نے متعجب ہو کر کہا) پروردگار! میرے یہاں لڑکا کہاں سے ہوگا، میری بیوی بانجھ ہو چکی اور میرا بڑھاپا میں دور تک پہنچ چکا۔ ارشاد ہوا: ایسا ہی ہوگا، تیرا پروردگار فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے مشکل نہیں میں نے اس سے پہلے خود تجھے پیدا کیا۔ حالانکہ تیری ہستی کا نام ونشان نہ تھا، اس پر زکریا نے عرض کیا" خدایا! میرے لیے (اس بارے میں) ایک نشانی ٹھہرا دے" فرمایا" تیری نشانی یہ ہے کہ صحیح وتندرست ہونے کے باوجود تو تین رات لوگوں سے بات نہ کرے گا۔ پھر وہ حجرہ سے نکلا اور اپنے لوگوں میں آیا اور اس نے ان سے اشارہ سے کہا:" صبح شام خدا کی پاکی وجلال کی صدائیں بلند کرتے رہو۔"

﴿وَ زَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿٨٩﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَ وَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿٩٠﴾﴾ (الانبیاء: ۸۹۔۹۰)

"اور اسی طرح زکریا (کا معاملہ یاد کرو) جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا" خدایا مجھے (اس دنیا میں) اکیلا نہ چھوڑ (یعنی بغیر وارث کے نہ چھوڑ) اور ویسے تو) تو ہی (ہم سب کا) بہتر وارث ہے، تو دیکھو ہم نے اس کی پکار سن لی۔ اسے (ایک فرزند) یحییٰ عطاء فرمایا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے تندرست کر دیا۔ یہ تمام لوگ نیکی کی راہوں میں سرگرم تھے (اور ہمارے فضل سے) امید لگائے ہوئے اور (ہمارے جلال سے) ڈرتے ہوئے دعائیں مانگتے تھے اور ہمارے آگے عجز ونیاز سے جھکے ہوئے تھے۔"

اور سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے:

﴿هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿٣٨﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ

Marfat.com

سَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۞ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَ امْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۞ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ ۞ (آل عمران: ۳۸-۴۱)

"اسی وقت زکریا نے اپنے پروردگار سے دعا کی، کہا: اے میرے پروردگار! مجھ کو اپنے فضل سے پاکیزہ اولاد عطاء کر بلاشبہ تو دعا کا سننے والا ہے۔ پھر جب زکریا حجرہ کے اندر نماز میں مشغول تھا تو فرشتوں نے اس کو آواز دی کہ اللہ تجھ کو یحییٰ کی (ولادت کی) خوشخبری دیتا ہے جو شہادت دے گا اللہ کے ایک کلمہ (عیسیٰ (علیہ السلام) کی، اور صاحب مرتبہ ہوگا اور عورت کے پاس تک نہ جائے گا (یا ہر قسم کی چھوٹی بڑی تلویث سے پاک ہوگا) اور نیکوکاروں سے (ہوتے ہوئے) نبی ہوگا (زکریا علیہ السلام) نے کہا: پروردگارا میرے لڑکا کس طرح ہوگا جبکہ میں بہت بوڑھا ہوگیا اور میری بیوی بانجھ ہے، فرمایا: اللہ جو چاہے اسی طرح کرتا ہے۔ زکریا (علیہ السلام) نے کہا پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی مقرر کیجئے۔ فرمایا: یہ نشانی ہے کہ تو تین دن لوگوں سے اشارہ کے سوا (زبان سے) بات نہ کرے گا، اور اپنے رب کی یاد میں (اظہار شکر کے لیے) بہت زیادہ رہ اور صبح وشام تسبیح کر۔"

چند تفسیری حقائق:

سورۂ آل عمران اور مریم میں ہے کہ جب زکریا علیہ السلام کو یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کی بشارت دی گئی تو وہ تعجب کا اظہار کرنے لگے کہ میں ضعیف العمر اور بیوی بانجھ، پھر یہ بشارت کس طرح عالم وجود میں آئے گی۔ شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) اس کے متعلق ایک لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں:

"انوکھی چیز مانگتے تعجب نہیں آیا۔ جب سنا کہ ہوگا تب تعجب کیا۔" [1]

گزشتہ مباحث میں یہ کئی جگہ ذکر ہو چکا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی جانب سے اس قسم کے سوالات کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ خدا کی قدرت کاملہ کے بارے میں شک کرتے ہیں بلکہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان کو یہ بتا دیا جائے تو بہتر ہے کہ قدرت الٰہی کا یہ کرشمہ کس نوعیت کے ساتھ وجود پذیر ہونے والا ہے، مگر چونکہ سوال کی ظاہری سطح ایسی ہوتی ہے کہ گویا وہ اس کے وقوع کے بارہ میں متردد ہیں اس لیے سنت اللہ یہ جاری ہے کہ اول ان کو اسی انداز میں جواب دیا جاتا ہے تاکہ ان کو متنبہ کر دیا جائے کہ اگرچہ بہ تقاضائے بشریت ان کا یہ سوال قابل گرفت نہیں ہے تاہم ان کی شان رفیع سے یہ بہت نازل اور کمتر بات ہے کہ وہ مقرب بارگاہ ہوتے ہوئے اس قسم کے معاملہ میں اظہار تعجب کریں۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب نے اپنے مختصر سے دو جملوں میں اسی جانب اشارہ کیا ہے، لیکن ساتھ ہی سوال کی جو حقیقی روح ہے اس کے پیش نظر اصل جواب بھی ضرور دیا جاتا ہے تاکہ ان کا قلب مطمئن ہو جائے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر اس مقام پر بھی اول زکریا علیہ السلام کے تعجب کے مطابق جواب دیا اور اپنی قدرت کاملہ کے بے روک ٹوک تصرفات کا اظہار فرمایا اور پھر زکریا علیہ السلام کے سوال کی حقیقی روح کے مطابق یہ جواب دیا:

---

[1] موضح القرآن سورۂ مریم

Marfat.com

﴿ وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ﴾ (الانبیاء: ۹۰)

"ہم نے اس کی بیوی کے مرض کو دور کر کے صحیح و تندرست کر دیا۔"

② سورۂ مریم میں ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے اولاد کی دعا مانگتے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں یہ کہا تھا:

﴿ يَّرِثُنِيْ وَ يَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَ اجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝ ﴾ (مریم: ۶)

تو یہاں وراثت سے علم و حکمت اور نبوت کی میراث مراد ہے جیسا کہ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے واقعات میں گذر چکا اور اس مقام پر تو یہ معنی اس لیے بھی زیادہ واضح ہیں کہ زکریا علیہ السلام مال و دولت سے خالی تھے اور نجاری (بڑھی کے کام) کے ذریعہ روزانہ کی قوت لایموت حاصل کر لیا کرتے تھے۔ ان کے پاس وہ دولت ہی کہاں تھی جس کی وراثت کی ان کو تمنا ہوتی، نیز اس لیے بھی وراثت مالی مراد نہیں ہو سکتی کہ اگر یہ مقصد ہوتا تو زکریا علیہ السلام کو فقط یہ کہنا چاہیے تھا کہ ﴿ يَّرِثُنِيْ ﴾ وہ میرا وارث بنے گا ﴿ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ﴾ کہنے کے کیا معنی؟ یحییٰ علیہ السلام تنہا تمام خاندان یعقوب علیہ السلام کے کس طرح مالی وارث ہو سکتے تھے۔

③ سورۂ آل عمران اور مریم میں ہے:

﴿ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝ ﴾

ہم نے اس کی تفسیر جمہور کے مطابق کی ہے، چنانچہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، عکرمہ، قتادہ رحمہم اللہ اور دوسرے علماء اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

اعتقل لسان مِن غیر مرض وَلا علة و قال زید بن اسلم من غیر خرس و لا یستطیع ان یکلم قومه الا اشارة۔ ❶

"ان کی زبان تین دن کے لیے بغیر کسی مرض اور خرابی کے بندھ گئی تھی اور زید بن اسلم کہتے ہیں کہ ان کی زبان گنگ کے مرض سے پاک رہتے ہوئے تین دن کے لیے بند ہو گئی تھی اور ان میں یہ قدرت نہیں رہی تھی کہ قوم سے اشارہ کے سواء بول سکیں۔"

البتہ آیت کے اس جملہ میں ﴿ سَوِيًّا ﴾ کے معنی میں دو قول ہیں ایک سوی بمعنی صحیح و تندرست اور دوسرے بمعنی متتابعات (یعنی مسلسل تین روز) قول اول جمہور کا قول ہے اور عوفی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت دوسرے قول کے مطابق نقل کی ہے، حافظ عمادالدین جمہور کے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ لوقا کی انجیل میں بھی زکریا علیہ السلام کے اس واقعہ کا اسی طرح ذکر ہے جس طرح اس آیت کی تفسیر میں جمہور علماء کا مسلک ہے۔

زکریا علیہ السلام نے فرشتے سے کہا: میں یہ بات کس طرح جانوں کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ فرشتے نے جواب میں اس سے کہا: میں جبرئیل ہوں جو خدا کے حضور کھڑا رہتا ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھ سے کلام کروں اور تجھے ان

❶ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۱۱۲

Marfat.com

باتوں کی خوش خبری دوں، اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقعہ نہ ہولیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا۔ ❶

لیکن مولانا آزاد ترجمان القرآن میں جمہور کی تفسیر سے جدا یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ زکریا علیہ السلام سے کہا گیا کہ تم بنی اسرائیل کے روزوں کی طرح تین دن کھانے پینے وغیرہ سے باز رہنے کے ساتھ ساتھ خاموشی بھی اختیار کیے رہو تو موعودہ بشارت کا وقت شروع ہو جائے گا۔" چنانچہ لوقا کی انجیل کا مسطورۂ بالا حوالہ نقل کر کے فرماتے ہیں:

قرآن نے یہ نہیں کہا ہے کہ حضرت زکریا گونگے ہو گئے۔ یہ یقیناً بعد کی تعبیرات ہیں جو حسب معمول پیدا ہو گئیں۔ صاف بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو روزہ رکھنے اور مشغول عبادت رہنے کا حکم ہوا اور یہودیوں کے یہاں روزہ کے اعمال میں ایک عمل "خاموشی" بھی تھی۔ ﴿اَنْ تُکَلِّمَ النَّاسَ﴾ کی یہ تفسیر اگرچہ عربیت کے قواعد کے بموجب بن سکتی ہے لیکن سلف صالحین سے چونکہ اتفاق اس کے خلاف مذکور ہے اس لیے ہمارے نزدیک قابل قبول نہیں، رہا "گونگا ہو جانا" تو اس کے متعلق گزشتہ سطور میں نقل ہو چکا کہ یہ مسلک کسی کا بھی نہیں کہ وہ ایسے مرض میں گرفتار کر دیئے گئے تھے جس کو خرس (گونگا ہونا) کہتے ہیں، بلکہ زبان میں قوت گویائی کے صحیح و سالم رہنے کے باوجود علامت کے طور پر تین دن کے لیے منجانب اللہ زبان میں (حصر) رکاوٹ واقع ہو گئی تھی۔

④ سورۂ آل عمران میں ﴿وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا﴾ کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ یہاں رزق سے مراد علم و حکمت کے صحیفے ہیں، مگر ہم نے اس قول کو اختیار نہیں کیا اس لیے کہ صاف اور متبادر معنی وہی ہیں جو جمہور سے منقول ہیں۔

❶ لوقا باب ۱ آیت ۱۸-۲۰

Marfat.com

حضرت یحییٰ علیہ السلام

○ قرآن عزیز اور حضرت یحییٰ علیہ السلام ○ نام ونسب ○ حالات زندگی ○ دعوت وتبلیغ ○ واقعہ شہادت
○ مقتل ○ شب معراج اور یحییٰ علیہ السلام ○ زکریا علیہ السلام کی وفات ○ یحییٰ علیہ السلام اور اہل کتاب ○ بصائر

قرآن عزیز اور حضرت یحییٰ علیہ السلام:

حضرت یحییٰ علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں ان ہی سورتوں میں آیا ہے، جن میں زکریا علیہ السلام کا ذکر ہے یعنی آل عمران، انعام، مریم، انبیاء۔

نام ونسب:

یہ زکریا علیہ السلام کے بیٹے اور ان کی پیغمبرانہ دعاؤں کا حاصل تھے۔ ان کا نام بھی اللہ تعالیٰ کا فرمودہ ہے اور ایسا نام ہے کہ اس سے قبل ان کے خاندان میں کسی کا یہ نام نہیں رکھا گیا۔

﴿ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۣ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝ ﴾ (مریم: ۷)

"اے زکریا! ہم بیشک تم کو بشارت دیتے ہیں ایک فرزند کی، اس کا نام یحییٰ ہوگا کہ اس سے قبل ہم نے کسی کے لیے یہ نام نہیں ٹھہرایا۔"

حالات زندگی:

مالک بن انس فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن زکریا اور عیسیٰ بن مریم کا رحم مادر میں استقرار ایک ہی زمانہ میں ہوا اور ثعلبی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چھ ماہ قبل ہوا ہے۔ [1] اور لوقا کی انجیل میں ہے کہ جب زکریا علیہ السلام کی بیوی الیشع کو حاملہ ہوئے چھ ماہ گزر گئے تب جبرئیل علیہ السلام فرشتہ مریم علیہا السلام پر ظاہر ہوا اور اس نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کو بشارت دی:

"اور دیکھ تیری رشتہ دار الیشع کے بھی بڑھاپے میں بیٹا ہونے والا ہے اور اب اس کو جو بانجھ کہلاتی تھی چھٹا مہینہ ہے۔" [2]

ان نقول کا حاصل یہ ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چھ ماہ بڑے تھے۔

یحییٰ علیہ السلام کے لیے جب زکریا علیہ السلام نے دعا کی تھی تو اس میں یہ کہا تھا کہ وہ "ذریت طیبہ" ہو، چنانچہ قرآن عزیز نے بتایا کہ

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۴ [2] باب ۱ آیت ۳۶

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاء منظور فرمائی، چنانچہ یحییٰ علیہ السلام نیکوں کے سردار اور زہد وورع میں بے مثال تھے، نہ انہوں نے شادی کی اور نہ ان کے قلب میں کبھی گناہ کا خطرہ پیدا ہوا اور اپنے والد ماجد کی طرح وہ بھی خدا کے برگزیدہ نبی تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بچپن ہی میں علم وحکمت سے معمور کر دیا تھا اور ان کی زندگی کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کی بشارت دیتے اور ان کی آمد سے قبل رشد وہدایت کے لیے زمین ہموار کرتے تھے، چنانچہ ارشاد مبارک ہے:

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝﴾ (آل عمران: ۳۹)

"پس زکریا جس وقت حجرہ میں نماز ادا کر رہا تھا تو فرشتے نے اس کو پکارا: اے زکریا! اللہ تعالیٰ تجھ کو (ایک فرزند) یحییٰ کی بشارت دیتا ہے جو اللہ کے کلمہ (عیسیٰ) کی بشارت دے گا اور وہ اللہ کے اور اس کے بندوں کی نظر میں برگزیدہ اور گناہوں سے بے لوث ہوگا اور نیکوکاروں میں سے نبی ہوگا۔"

کتب سیر میں اس مقام پر "سید" کے مختلف معنی منقول ہیں مثلاً حلیم، عالم، فقیہ، دین ودنیا کا سردار، شریف وپرہیزگار، اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور برگزیدہ۔ لیکن آخری معنی چونکہ مسطورہ بالا تمام معانی کو حاوی ہیں اس لیے ترجمہ میں ان ہی کو اختیار کیا گیا۔ [1]

اسی طرح "حصور" کے بھی مختلف معنی مذکور ہیں "وہ شخص جو عورت کے قریب تک نہ گیا ہو" "جو ہر قسم کی معصیت سے محفوظ ہو اور اس کے قلب میں معصیت کا خطرہ بھی نہ گزرتا ہو۔ جو شخص اپنے نفس پر پوری طرح قابو رکھتا اور خواہشات نفس کو روکتا ہو۔" [2]

ہمارے خیال میں یہ سب معانی ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں اس لیے کہ لغت میں "حصر" کے معنی رکاوٹ کے آتے ہیں اور "حصور" اسم فاعل مبالغہ کا صیغہ ہے لہٰذا اس جگہ یہ مطلب ہے کہ خدا کے نزدیک جن امور سے رکنا ضروری ہے ان امور سے رکنے والا "حصور" ہے اور اس لحاظ سے چونکہ یحییٰ علیہ السلام موصوف بہمہ صفت ہیں اس لیے مسطورۂ بالا تمام معانی ان پر صادق آتے ہیں۔ ان معانی سے جدا بعض کے نزدیک "حصور" کے معنی قوت مردمی سے محروم کے ہیں، مگر یہ معنی اس جگہ قطعاً باطل ہیں اس لیے کہ یہ معنی مرد کے لیے مدح کے نہیں ہیں بلکہ نقص اور عیب ہیں۔ چنانچہ اس بناء پر محققین نے اپنی تفاسیر میں اس کو مردود قرار دیا ہے اور قاضی عیاض نے شفاء میں اور خفاجی نے اس کی شرح نسیم الریاض میں اس پر سخت نکتہ چینی کر کے جمہور کے نزدیک اس قول کو باطل ٹھہرایا ہے۔

البتہ بقاء قوت کے باوجود اس پر قابو پانے کے لیے خدا کے برگزیدہ انسانوں کے ہمیشہ سے دو طریقے رہے ہیں، ایک یہ کہ تجرد وتبتل کی زندگی اختیار کر کے مجاہدات وریاضات اور نفس کشی کے ذریعہ ہمیشہ کے لیے اس کو دبا دیا جائے۔ گویا اس کو فنا کر دیا گیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی مبارک میں یہی پہلو زیادہ نمایاں ہے اور یحییٰ علیہ السلام میں خدائے تعالیٰ نے یہ وصف بغیر مجاہدہ وریاضت ہی کے بدءِ فطرت میں ودیعت کر دیا تھا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۶۱ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۶۱

Marfat.com

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اس درجہ قابو میں رکھا جائے اور اس پر اس حد تک ضبط قائم کیا جائے کہ وہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی بے محل حرکت میں نہ آنے پائے بلکہ بے محل حرکت میں آنے کا خطرہ تک باقی نہ رہے، لیکن بقاء نسل انسانی کے لیے صحیح طریق کار کے ذریعہ تاہل (ازدواجی) زندگی اختیار کی جائے۔

پہلا طریقہ اگرچہ بعض حالات میں محمود ہوتا ہے مگر فطرت انسانی اور حیات اجتماعی کے لیے غیر مناسب ہے پس جن انبیاء علیہم السلام نے اس طریق کار کو اختیار فرمایا وہ وقت کی اہم ضرورت کے پیش نظر تھا خصوصاً جبکہ ان کی دعوت خاص خاص قوموں میں محدود تھی، لیکن جماعتی حیات کے لیے فطرت کا حقیقی تقاضا صرف دوسرا طریق کار پورا کرتا ہے اور اسی لیے نبی اکرم ﷺ کی تعلیم اور آپ کا ذاتی عمل اسی طریق کار کی تائید کرتے ہیں اور جبکہ آپ کی بعثت ﴿كَآفَّةً لِّلنَّاسِ﴾ تمام عالم کے لیے ہے تو ایسی صورت میں آپ کے لائے ہوئے "دین فطرت" میں اسی کو برتری حاصل ہونی چاہیے تھی، چنانچہ آپ نے متعدد شعبہ ہائے حیات میں اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی ہے کہ دنیا کے معاملات سے جدا ہو کر پہاڑوں کے غاروں اور بیابانوں میں زندگی گزارنے والے شخص کے مقابلہ میں اس شخص کا مرتبہ خدا کے یہاں زیادہ بلند ہے جو دنیوی زندگی کے معاملات میں مقید رہ کر ایک لمحہ کے لیے بھی خدا کی نافرمانی نہ کرے اور قدم قدم پر اس کے احکام کو پیش نظر رکھے۔

اس کے بعد ارشاد مبارک ہے:

﴿يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ۝ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝﴾ (مریم: ۱۲ تا ۱۵)

"اے یحییٰ! (خدا کا حکم ہوا کیونکہ وہ خوشخبری کے مطابق پیدا ہوا اور بڑھا) کتاب الٰہی (توراۃ) کے پیچھے مضبوطی کے ساتھ لگ جا چنانچہ وہ ابھی لڑکا ہی تھا کہ ہم نے اسے علم و فضیلت بخش دی نیز اپنے خاص فضل سے دل کی نرمی اور نفس کی پاکی عطاء فرمائی وہ پرہیز گار اور ماں باپ کا خدمت گزار تھا، سخت گیر اور نافرمان نہ تھا۔ اس پر سلام ہو (یعنی سلامتی ہو) جس دن پیدا ہوا اور جس دن مرا اور جس دن پھر زندہ کیا جائے گا۔"

ولادت باسعادت کی بشارت کے بعد قرآن نے یحییٰ علیہ السلام کے بچپن کے ان واقعات کو نظر انداز کر کے جو اس کے مقصد سے غیر متعلق تھے یہ ذکر کیا ہے کہ خدا نے یحییٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ اس کے قانون "توراۃ" پر مضبوطی سے عمل کریں اور اسی کے مطابق لوگوں کو ہدایت دیں" اس لیے کہ یحییٰ علیہ السلام نبی تھے رسول نہ تھے اور توراۃ ہی کی شریعت کے پابند تھے" اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا کہ ہم نے عام بچوں کی زندگی سے جدا ان کو بچپن ہی میں علم و فضیلت بخش دیئے تھے تاکہ وہ جلد ہی نبوت کے منصب پر فائز ہو سکیں چنانچہ سیر کی کتابوں میں مذکور ہے کہ بچپن میں جب بچے ان سے کھیلنے پر اصرار کرتے تو وہ یہ جواب دے دیتے "خدا نے مجھ کو ہو و لعب کے لیے نہیں پیدا کیا"۔ [1] اور یہ بھی مذکور ہے کہ وہ تیس سال قبل ہی نبی بنا دیئے گئے تھے۔ [2]

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۵۰ [2] قصص الانبیا للنجار ص ۴۲۰

آیات زیر بحث میں ﴿وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾ کے معنی ہیں جیسا کہ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے معمر سے نقل کیا ہے، ❶ اور جس شخص نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ "یحییٰ علیہ السلام بچپن ہی میں نبی بنا دیئے گئے تھے" صحیح نہیں ہے اس لیے کہ منصب نبوت جیسا اعلیٰ واہم منصب کسی کو بھی صغرسنی میں عطاء ہونا نہ عقل کے نزدیک درست ہے اور نہ نقل سے ثابت ہے:

اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ان آیات میں جو سلامتی کی دعاء دی گئی ہے وہ تین اوقات کی تخصیص کے ساتھ ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لیے یہی تین اوقات سب سے زیادہ نازک اور اہم ہیں۔ وقت ولادت "جس میں رحم مادر سے جدا ہو کر عالم دنیا میں آتا ہے" اور وقت موت کہ "جس میں عالم دنیا سے وداع ہو کر عالم برزخ میں پہنچتا ہے" اور وقت حشر ونشر کہ "جس میں عالم قبر (برزخ) سے عالم آخرت میں اعمال کی جزاء وسزا کے لیے پیش ہونا ہے۔" لہٰذا جس شخص کو خدا کی جانب سے ان تین اوقات کے لیے سلامتی کی بشارت مل گئی اس کو سعادت دارین کا کل ذخیرہ مل گیا۔ ﴿طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۝﴾ اور سورۂ انبیاء میں ارشاد ہے:

﴿وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۸۹۔۹۰)

"اور اسی طرح (زکریا کا معاملہ یاد کرو) جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا خدا مجھے (اس دنیا میں) اکیلا نہ چھوڑ (یعنی بغیر وارث کے نہ چھوڑ) اور (ویسے تو) تو ہی (ہم سب کا) بہتر وارث ہے، تو (دیکھو) ہم نے اس کی پکار سن لی اسے (ایک فرزند) یحییٰ عطاء فرمایا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے تندرست کر دیا۔ یہ تمام لوگ نیکی کی راہوں میں سرگرم تھے (ہمارے فضل سے) امید لگائے ہوئے اور ہمارے جلال سے ڈرتے ہوئے دعائیں مانگتے تھے اور ہمارے آگے عجز ونیاز کے ساتھ جھکتے تھے۔"

دعوت وتبلیغ:

مسند احمد، ابن ماجہ (وغیرہ) میں حارث اشعری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو پانچ باتوں کا خصوصیت کے ساتھ حکم فرمایا کہ وہ خود بھی ان پر عامل ہوں اور بنی اسرائیل کو بھی ان کی تلقین فرمائیں۔ مگر یحییٰ علیہ السلام کو ان امور خمسہ کی تلقین میں کچھ تاخیر ہو گئی تب عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میرے بھائی! اگر تم مناسب سمجھو تو میں بنی اسرائیل کو ان کلمات کی تلقین کر دوں جن کے لیے تم کسی وجہ سے تاخیر کر رہے ہو یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا: بھائی! میں اگر تم کو اجازت دے دوں اور خود تعمیل حکم نہ کروں تو مجھے خوف ہے کہ کہیں مجھ پر کوئی عذاب نہ آجائے یا میں زمین میں دھنسا نہ دیا جاؤں اس لیے میں ہی پیش قدمی کرتا ہوں چنانچہ انہوں نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں جمع کیا اور جب مسجد بھر گئی تو وعظ بیان کیا اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے

---

❶ تاریخ ابن کثیر جلد ۲

Marfat.com

مجھ کو پانچ باتوں کا حکم کیا ہے کہ میں خود بھی ان پر عمل کروں اور تم کو بھی عمل کی تلقین کروں اور وہ پانچ احکام یہ ہیں:

① پہلا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو اور نہ کسی کو اس کا شریک و سہیم ٹھہراؤ، کیونکہ مشرک کی مثال اس غلام کی سی ہے جس کو اس کے مالک نے اپنے روپیہ سے خریدا اگر غلام نے یہ وطیرہ اختیار کرلیا کہ جو کچھ کماتا ہے وہ مالک کے سواء ایک دوسرے شخص کو دے دیتا ہے تو اب بتاؤ کہ تم میں سے کوئی شخص یہ پسند کرے گا کہ اس کا غلام ایسا ہو؟ لہٰذا سمجھ لو کہ جب خدا ہی نے تم کو پیدا کیا اور وہی تم کو رزق دیتا ہے تو تم بھی صرف اسی کی پرستش کرو اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

② دوسرا حکم یہ ہے کہ تم خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کرو، کیونکہ جب تک تم نماز میں کسی دوسری جانب متوجہ نہ ہوں گے خدائے تعالیٰ برابر تمہاری جانب رضاء و رحمت کے ساتھ متوجہ رہے گا۔

③ تیسرا حکم یہ ہے کہ روزہ رکھو اس لیے کہ روزہ دار کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک جماعت میں بیٹھا ہو اور اس کے پاس مشک کی تھیلی ہو، چنانچہ مشک اس کو بھی اور اس کے رفقاء کو بھی اپنی خوشبو سے مست کرتا رہے گا اور روزہ دار کے منہ کی بو کا خیال نہ کرو، اس لیے کہ اللہ کے نزدیک روزہ دار کے منہ کی بو (جو خالی معدے سے اٹھتی ہے) مشک کی خوشبو سے زیادہ پاک ہے۔

④ چوتھا حکم یہ ہے کہ مال میں سے صدقہ نکالا کرو کیونکہ صدقہ کرنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جس کو اس کے دشمنوں نے اچانک آ پکڑا ہو اور اس کے ہاتھوں کو گردن سے باندھ کر مقتل کی جانب لے چلے ہوں اور اس ناامیدی کی حالت میں وہ یہ کہے: کیا یہ ممکن ہے کہ میں مال دے کر اپنی جان چھڑالوں؟ اور اثبات میں جواب پا کر اپنی جان کے بدلے سب دھن دولت قربان کر دے۔

⑤ اور پانچواں حکم یہ ہے کہ دن رات میں کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہا کرو کیونکہ ایسے شخص کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دشمن سے بھاگ رہا ہو اور دشمن تیزی کے ساتھ اس کا تعاقب کر رہا ہو اور بھاگ کر وہ کسی مضبوط قلعہ میں پناہ گزیں ہو کر دشمن سے محفوظ ہو جائے بلاشبہ انسان کے دشمن کے مقابلہ میں ذکر اللہ کے اندر مشغول ہو جانا محکم قلعہ میں محفوظ ہو جانا ہے۔

اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی جانب متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا: میں بھی تم کو ایسی پانچ باتوں کا حکم کرتا ہوں جن کا خدا نے مجھ کو حکم کیا ہے یعنی "لزوم جماعت" "سمع" اور "طاعت" "ہجرت" اور "جہاد فی سبیل اللہ" پس جو شخص "جماعت" سے ایک بالشت باہر نکل گیا اس نے بلاشبہ اپنی گردن سے اسلام کی رسی کو نکال دیا مگر یہ کہ جماعت کا لزوم اختیار کرے اور جس شخص نے جاہلیت کے دور کی باتوں کی طرف دعوت دی تو اس نے جہنم کو ٹھکانا بنایا، حارث اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ کہنے والے نے کہا! یارسول اللہ اگرچہ وہ شخص نماز اور روزہ کا پابند ہی ہو، تب بھی جہنم کا سزاوار ہے۔ فرمایا: ہاں، اگرچہ وہ نماز اور روزہ کا پابند بھی ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ میں مسلمان ہوں تب بھی سزاوار جہنم ہے۔ [1]

علماء سیر نے اسرائیلیات سے نقل کیا ہے کہ یحییٰ علیہ السلام کی زندگی کا بہت بڑا حصہ صحرا میں بسر ہوا، وہ جنگلوں میں خلوت نشین رہتے اور درختوں کے پتے اور ٹڈیاں ان کی خوراک تھیں اور وہیں ان پر اللہ کا کلام نازل ہوا تب انہوں نے دریائے یردن کے نواح

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۵۲

Marfat.com

میں دین الٰہی کی منادی شروع کر دی اور عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور کی بشارت دینے لگے۔ لوقا کی انجیل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

اس وقت خدا کا کلام بیابان میں زکریا کے بیٹے یوحنا یحییٰ پر اترا اور وہ یردن کے سارے گرد و نواح میں جا کر گناہوں کی معافی کے لیے توبہ کے بپتسمہ (اصطباغ) کی منادی کرنے لگا۔" ❶

ابن عساکر نے وہب بن منبہ سے چند روایات نقل کی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ یحییٰ علیہ السلام پر خدا کی خشیت اس درجہ تھی کہ وہ اکثر روتے رہتے تھے حتیٰ کہ ان کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان پڑ گئے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان کے والد زکریا علیہ السلام نے جب ان کو جنگل میں تلاش کر کے پا لیا تو ان سے فرمایا: "بیٹا ہم تو تیری یاد میں مضطرب تجھ کو تلاش کر رہے ہیں اور تو یہاں آہ و گریہ میں مشغول ہے؟" تو یحییٰ علیہ السلام نے جواب دیا: اے باپ! تم نے مجھ کو بتایا ہے کہ جنت اور جہنم کے درمیان ایک ایسا لق و دق میدان ہے جو خدا کی خشیت میں آنسو بہائے بغیر طے نہیں ہوتا اور جنت تک رسائی نہیں ہوتی یہ سن کر زکریا علیہ السلام بھی رونے لگے۔ ❷

واقعہ شہادت:

یحییٰ علیہ السلام نے جب خدا کے دین کی منادی شروع کر دی اور لوگوں کو یہ بتانے لگے کہ مجھ سے بڑھ کر ایک اور خدا کا پیغمبر آنے والا ہے تو یہود کو ان کے ساتھ دشمنی اور عداوت پیدا ہوگئی اور ان کی برگزیدگی و مقبولیت اور منادی کو برداشت نہ کر سکے اور ایک دن ان کے پاس جمع ہو کر آئے اور دریافت کیا: کیا تو مسیح ہے؟ اس نے کہا، نہیں۔ تب انہوں نے کہا: کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے کہا، نہیں۔ کیا تو ایلیا نبی ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ تب ان سب نے کہا کہ پھر تو کون ہے جو اس طرح منادی کرتا اور ہم کو دعوت دیتا ہے؟ یحییٰ علیہ السلام نے جواب دیا: میں جنگل میں پکارنے والے کی ایک آواز ہوں جو حق کے لیے بلند کی گئی ہے۔ ❸ یہ سن کر یہودی بھڑک اٹھے اور آخر کار ان کو شہید کر ڈالا۔

اور ابن عساکر نے "المستقصی فی فضائل الاقصی" میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مولیٰ قاسم سے ایک طویل روایت نقل کی ہے جس میں یحییٰ علیہ السلام کی شہادت کا واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ دمشق کے بادشاہ ہداد بن حدار نے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی تھیں، اور پھر چاہتا تھا کہ اس کو واپس کر کے بیوی بنا لے یحییٰ علیہ السلام سے فتویٰ طلب کیا۔ انہوں نے فرمایا: "کہ اب یہ تجھ پر حرام ہے" ملکہ کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور یحییٰ علیہ السلام کے قتل کے درپے ہوگئی اور بادشاہ کو مجبور کر کے قتل کی اجازت حاصل کر لی اور جبکہ وہ مسجد حبرون میں نماز میں مشغول تھے ان کو قتل کرا دیا اور چینی کے طشت میں ان کا سر مبارک سامنے منگوایا۔ مگر سر اس حالت میں بھی یہی کہتا رہا کہ تو بادشاہ کے لیے حلال نہیں تاوقتیکہ دوسرے سے شادی نہ کر لے اور اسی حالت میں خدا کا عذاب آیا اور اس عورت کو مع سر مبارک زمین میں دھنسا دیا۔

اس روایت میں ایک ایسا واقعہ مذکور ہے جس کی وجہ سے تمام روایت ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے وہ یہ کہ یحییٰ علیہ السلام کا خون فوارہ کی طرح جسم مبارک سے برابر نکلتا رہا تا آنکہ بخت نصر نے دمشق کو فتح کر کے اس پر ستر ہزار اسرائیلیوں کا خون بہا نہ دیا۔ تب ارمیاہ علیہ السلام نے آ کر خون کو مخاطب کر کے کہا: "اے خون! کیا اب بھی تو ساکن نہ ہوگا؟ کتنی مخلوق خدا فنا ہو چکی اب ساکن ہو جا۔

---

❶ باب ۱ آیت ۱ ❷ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۵۳ ❸ انجیل یوحنا باب ۱ آیات ۱۹۔۲۸

Marfat.com

چنانچہ اس وقت وہ خون بند ہوگیا۔" [1]

اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس قصہ کو نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اس قصہ کے اصل حاکم کی وہ روایت ہے جو انہوں نے مستدرک میں نقل کی ہے۔

روایت کے اس حصہ کو اگر تاریخ کا مبتدی طالب علم بھی سنے گا تو وہ بلاتردد باطل قرار دے گا۔ اس لیے کہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ بخت نصر کا زمانہ عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے صدیوں پہلے ہے پھر یحییٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بخت نصر کے حملہ دمشق کا جوڑ لگانا کس طرح درست ہوسکتا ہے؟ اس لیے سخت تعجب ہے کہ حافظ ابن عساکر اور حافظ عماد الدین بن کثیر جیسے صاحب نقد بزرگوں نے اس طرح اس روایت کو نقل کر کے سکوت اختیار فرمایا۔ علاوہ ازیں اس روایت میں جس قسم کے عجائب وغرائب بیان کیے گئے ہیں وہ اس وقت تک ہرگز قابل قبول نہیں ہوسکتے۔ جب تک ان کا ثبوت "نص صریح" سے حاصل نہ ہوجائے اور حاکم کی روایت بلحاظ سند بھی محل نظر ہے اور بلحاظ درایت بھی۔

مقتل:

علماء سیر وتاریخ کا اس میں اختلاف ہے کہ یحییٰ علیہ السلام کا واقعہ شہادت کس جگہ پیش آیا، ایک قول ہے کہ بیت المقدس میں ہیکل اور قربان گاہ کے درمیان ہوا اور اس جگہ ستر انبیاء شہید کیے گئے، سفیان ثوری نے شمر بن عطیہ سے یہی قول نقل کیا ہے۔ [2]

اور ابوعبیدہ قاسم بن سلام نے حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ وہ دمشق میں قتل ہوئے اور اسی میں بخت نصر کا واقعہ بھی ذکر کیا ہے اور ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ جب صحیح ہوسکتا ہے کہ جب عطاء اور حسن کے اس قول کو تسلیم کر لیا جائے کہ بخت نصر عیسیٰ علیہ السلام کا معاصر تھا۔ [3]

اور ہم ثابت کر چکے ہیں کہ مستند اور صحیح تاریخی شہادتوں سے یہ قول باطل ہے اس لیے کہ بخت نصر، مسیح علیہ السلام سے صدیوں قبل ہو گزرا ہے جیسا کہ خود ابن کثیر نے بیت المقدس کی تباہی اور عزیر علیہ السلام کے واقعات میں اس کو تسلیم کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس غلط بات کو تسلیم کر لینے کے بعد پھر یہ قول بھی قبول کر لینا ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام انبیاء بنی اسرائیل کے آخری نبی نہیں ہیں اور نبی اکرم ﷺ اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان "فترۃ" کا زمانہ بھی نہیں ہے بلکہ ارمیاہ، حزقیل، عزیر اور دانیال علیہم السلام وغیرہ انبیاء بنی اسرائیل جو مسلمہ طور پر بخت نصر اور اس کے بعد کے زمانہ تک بابل میں قید رہے ان سب کا ظہور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا حالانکہ یہ تمام باتیں باتفاق توراۃ، تاریخی شہادت اور اسلامی روایات، قطعاً غلط اور باطل ہیں۔

البتہ یہ بات کہ یحییٰ علیہ السلام کا مقتل بیت المقدس نہیں بلکہ دمشق تھا تو حافظ ابن عساکر کی اس روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو انہوں نے ولید بن مسلم کی سند سے نقل کی ہے کہ زید بن واقد کہتے ہیں کہ دمشق میں جب عمود سکاسکہ کے نیچے ایک مسجد کو دوبارہ تعمیر کیا جا رہا تھا تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا کہ شرقی جانب محراب کے قریب ایک ستون کی کھدائی میں یحییٰ علیہ السلام کا سر برآمد ہوا اور چہرہ مبارک حتیٰ کہ بالوں تک میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور خون آلود ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ابھی کاٹا گیا ہے۔ [4] لیکن

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۵۵ [2] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۵۵ [3] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۵۵ [4] ایضاً

یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ یحییٰ علیہ السلام کا ہی سر مبارک ہے، کسی اور نبی یا مرد صالح کا نہیں ہے۔

الحاصل اس بارہ میں کوئی فیصلہ کن شہادت مہیا نہیں ہے کہ یحییٰ علیہ السلام کا مقتل کون سا مقام ہے لیکن یہ مسلمات میں سے ہے کہ یہود نے ان کو شہید کر دیا اور جب عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی شہادت کا حال معلوم ہوا تو پھر انہوں نے علی الاعلان اپنی دعوت حق شروع کر دی۔

قرآن عزیز نے متعدد جگہ یہود کی فتنہ پردازیوں اور باطل کوشیوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ انہوں نے اپنے نبیوں اور پیغمبروں کو بھی قتل کئے بغیر نہیں چھوڑا، چنانچہ آل عمران میں ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّ یَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝﴾ (آل عمران: ۲۱)

"جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کے حکموں کا اور ناحق پیغمبروں کو قتل کرتے ہیں اور (نبیوں کے سواء) جو لوگ ان کو انصاف کرنے کا حکم کرتے ہیں ان کو (بھی) قتل کرتے ہیں تو ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔"

اور ابن ابی حاتم نے بسلسلہ سند حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل نے ایک دن میں پینتالیس نبیوں اور ایک سو ستر صلحاء کو قتل کر دیا تھا جو ان کو امر بالمعروف کرتے تھے۔ [1]

زکریا علیہ السلام کی وفات:

یحییٰ علیہ السلام کے واقعہ شہادت کے ضمن میں علماء سیر و تاریخ کے درمیان یہ مسئلہ اختلافی رہا ہے کہ زکریا علیہ السلام کی وفات طبعی موت سے واقع ہوئی یا وہ شہید کیے گئے اور لطف یہ ہے کہ دونوں کی سند وہب بن منبہ ہی پر جا کر پہنچتی ہے چنانچہ وہب کی ایک روایت میں ہے کہ یہود نے جب یحییٰ علیہ السلام کو شہید کر دیا تو پھر زکریا علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے کہ ان کو بھی قتل کریں۔ زکریا علیہ السلام نے جب یہ دیکھا تو وہ بھاگے تاکہ ان کے ہاتھ نہ لگ سکیں۔ سامنے ایک درخت آ گیا اور وہ اس کے شگاف میں گھس گئے یہودی تعاقب کر رہے تھے تو انہوں نے جب یہ دیکھا تو ان کو نکلنے پر مجبور کرنے کی بجائے درخت پر آرا چلا دیا، جب آرا زکریا علیہ السلام پر پہنچا تو خدا کی وحی آئی اور زکریا علیہ السلام سے کہا گیا کہ اگر تم نے کچھ بھی آہ وزاری کی تو ہم یہ سب زمین تہ و بالا کر دیں گے اور اگر تم نے صبر سے کام لیا تو ہم بھی ان یہود پر فوراً اپنا غضب نازل نہیں کریں گے۔ چنانچہ زکریا علیہ السلام نے صبر سے کام لیا اور اُف تک نہیں کی اور یہود نے درخت کے ساتھ ان کے بھی دو ٹکڑے کر دیئے۔ [2] اور ان ہی وہب سے دوسری روایت یہ ہے کہ درخت پر آرا کشی کا جو معاملہ پیش آیا وہ شعیا علیہ السلام سے متعلق ہے اور زکریا علیہ السلام شہید نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے طبعی موت سے وفات پائی۔ [3]

بہر حال مشہور قول یہی ہے کہ ان کو بھی یہود نے شہید کر دیا تھا، رہا یہ معاملہ کہ کس طرح اور کس مقام پر شہید کیا تو اس کے متعلق صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ "واللہ اعلم بحقیقۃ الحال"

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۲۵۵ [2] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۵۲ [3] ایضاً

Marfat.com

شب معراج اور یحییٰ علیہ السلام:

بخاری نے یحییٰ علیہ السلام کے ذکر میں صرف اسراء کی حدیث کے اس ٹکڑے کو بیان کیا ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرے آسمان پر ان کے ساتھ ملاقات کرنا مذکور ہے۔ روایت میں ہے:

((فلمّا خلصتُ فاذا یحیٰی و عیسٰی و هما ابنا خالة قال هٰذا یحیٰی و عیسٰی فسلّم علیهما فسلمت فردا ثم قالا مرحبًا بالاخ الصالح والنبی الصالح)). ❶

"پس جب میں (دوسرے آسمان پر) پہنچا تو دیکھا کہ یحییٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) موجود ہیں اور یہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں جبرئیل نے کہا یہ یحییٰ اور عیسیٰ ہیں، ان کو سلام کیجئے میں نے ان کو سلام کیا تو ان دونوں نے سلام کا جواب دیا اور پھر دونوں نے کہا آپ کا آنا مبارک ہوا اے ہمارے نیک بھائی اور نیک پیغمبر!"

زکریا علیہ السلام کے واقعات میں یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ یحییٰ علیہ السلام کی والدہ ایشاع (الیشع) اور مریم علیہا السلام کی والدہ حنہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں، اس لیے حدیث معراج میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ یحییٰ اور عیسیٰ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں مجاز متعارف کے اصول پر ہے یعنی رشتوں میں اس قسم کا مجاز مشہور اور رائج ہے کہ والدہ کی خالہ کو اولاد بھی خالہ کہا کرتی ہے۔

یحییٰ علیہ السلام اور اہل کتاب:

اس سے قبل لوقا کی انجیل سے ہم یحییٰ علیہ السلام کے متعلق بعض حوالہ جات نقل کر چکے ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ یہود تو اپنی سرشت کے مطابق یحییٰ علیہ السلام کے منکر ہیں مگر نصاریٰ ان کو "یسوع مسیح کا منادی" تسلیم کرتے ہیں اور ان کے والد زکریا علیہ السلام کو صرف "کاہن" مانتے ہیں اور اہل کتاب ان کا نام یوحنا بیان کرتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ عبری میں یوحنا کے معنی وہی ہوں جو یحییٰ کے ہیں اور ممکن ہے کہ عبری کے یوحنا نے عربی میں یحییٰ کا تلفظ اختیار کر لیا ہو۔

انجیل لوقا میں بھی قرآن عزیز کے ارشاد کے مطابق یہ تصریح کی ہے کہ یہ نام ان کے خاندان میں کسی شخص کا ان سے پہلے نہیں تھا۔ اس لیے خاندان والوں نے جب سنا تو تعجب کا اظہار کیا۔

"اور آٹھویں دن ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کا ختنہ کرنے آئے اور اس کا نام اس کے باپ کے نام پر زکریا رکھنے لگے۔ مگر اس کی ماں نے کہا: نہیں بلکہ اس کا نام یوحنا رکھا جائے، انہوں نے اس سے کہا کہ تیرے کنبے میں کسی کا یہ نام نہیں اور انہوں نے اس کے باپ کو اشارہ کیا کہ تو اس کا نام کیا رکھنا چاہتا ہے؟ اس نے تختی منگا کر کے یہ لکھا کہ اس کا نام یوحنا ہے، اور سب نے تعجب کیا۔ اسی دم اس کا منہ اور زبان کھل گئی اور وہ بولنے اور خدا کی حمد کرنے لگا۔" ❷

اور ان کی عام رہائش اور زندگی کے متعلق متی کی انجیل میں ہے:

"یوحنا اونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے اور چمڑے کا پٹکا اپنی کمر سے باندھے رہتا تھا اور اس کی خوراک ٹڈیاں اور جنگلی شہد تھا۔" ❸

اور یوحنا کی انجیل میں ان کی دعوت و تبلیغ کے متعلق یہ لکھا ہے:

"اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے "کاہن" اور لاوی" یہ پوچھنے کو بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے

---

❶ کتاب الانبیاء ❷ لوقا باب ۱ آیت ۵۹۔۶۵ ❸ باب ۳ آیت ۴۔۵

Marfat.com

اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں انہوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیا ہے۔ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے؟ یعنی نبی منتظر (محمد ﷺ) اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انہوں نے اس سے کہا، پھر تو ہے کون؟ تا کہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا میں جیسا یسعیاہ نبی نے کہا

"بیابان ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو۔" ❁

اور لوقا کی انجیل میں اس طرح مذکور ہے:

"اس وقت خدا کا کلام بیابان میں زکریاہ کے بیٹے یوحنا پر اترا اور وہ یردن کے سارے گرد و نواح میں جا کر گناہوں کی معافی کے لیے توبہ کے بپتسمہ کی منادی کرنے لگا جیسا یسعیاہ نبی کے کلام کی کتاب میں لکھا ہے کہ:۔

"بیابان میں پکارنے والی آواز آتی ہے کہ خداوند کی راہ تیار کرو، اس کے راستے سیدھے بناؤ۔" ❁

اور اسی انجیل میں ان کی گرفتاری کے متعلق یہ الفاظ مذکور ہیں:

"پس وہ (یوحنا) اور بہت سی نصیحتیں دے دے کر لوگوں کو خوش خبری سناتا رہا۔ لیکن چوتھائی ملک کے حاکم ہیرودیس نے اپنے بھائی فلپس کی بیوی ہرودیاس کے سبب اور ان ساری برائیوں کے باعث جو ہیرودس نے کی تھیں یوحنا سے ملامت اٹھا کر، ان سب سے بڑھ کر یہ بھی کیا کہ اس کو قید میں ڈالا۔" ❁

اور آگے چل کر اسی انجیل میں ان کی شہادت کے متعلق یہ ذکر ہے:

"اور چوتھائی ملک کے حاکم ہیرودیس سب احوال سن کر گھبرا گیا اس لیے کہ بعض کہتے تھے کہ یوحنا مردوں میں سے جی اٹھا ہے اور بعض یہ کہ ایلیاہ ظاہر ہوا ہے اور بعض یہ کہ قدیم نبیوں میں سے کوئی جی اٹھا ہے۔ مگر ہیرودیس نے کہا کہ یوحنا کا تو میں نے سر کٹوا دیا اب یہ (مسیح) کون ہے جس کی بابت ایسی باتیں سنتا ہوں۔ ❁

بصائر:

حضرت زکریا اور یحییٰ علیہما السلام کے واقعات و حالات سے اگرچہ حقیقت میں نگاہیں خود ہی نتائج و بصائر اخذ کر سکتی ہیں تاہم یہ چند باتیں خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں۔

① دنیا میں اس شخص سے زیادہ شقی اور بدبخت دوسرا کوئی نہیں ہوسکتا جو ایسی مقدس ہستی کو قتل کر دے جو نہ اس کو ستاتی ہے اور نہ اس کے مال و دولت پر ہاتھ ڈالتی ہے بلکہ اس کے برعکس بغیر کسی اجرت و عوض کے اس کی زندگی کی اصلاح کے لیے ہر قسم کی خدمت انجام دیتی اور اخلاق، اعمال اور عقائد کی ایسی تعلیم بخشتی ہے جو اس شخص کی دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح و سعادت کی کفیل ہو۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اسی بناء پر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن الجراح کے اس سوال پر کہ قیامت میں سب سے زیادہ مستحق عذاب کون شخص ہوگا؟ یہ ارشاد فرمایا:

قال: رجل قتل نبیًا او من امر بالمعروف و نھی عن المنکر۔ ❁ (الحدیث)

"وہ شخص جو نبی کو یا ایسے شخص کو قتل کرے جو اس کو بھلائی کا حکم کرتا اور برائی سے باز رکھتا ہے۔"

❁ باب ۱ آیات ۱۹۔۲۳ ❁ لوقا باب ۳ آیت ۵۔۴ ❁ باب ۳ آیت ۱۸۔۱۹ ❁ باب ۹ آیات ۷۔۹
❁ تفسیر ابن کثیر عن ابی حاتم ج ۲ ص ۳۵۵

Marfat.com

اقوام عالم میں "یہود" کو اس شقاوت میں ید طولیٰ حاصل رہا ہے اور انہوں نے اپنے پیغمبروں اور نبیوں کے ساتھ جس قسم کے توہین آمیز سلوک حتیٰ کہ قتل تک کو روا رکھا اس کی نظیر دنیا کی دوسری قوموں میں مفقود ہے۔

② بنی اسرائیل چونکہ مختلف اسباط (قبائل) میں تقسیم تھے اور اس وجہ سے ان کی آبادیاں چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے مراکز جدا جدا تھے اس لیے ان کے درمیان ایک ہی وقت میں متعدد نبی اور پیغمبر مبعوث ہوتے رہے ہیں مگر "تورات" ان سب کی تعلیم کے لیے اساس اور بنیاد رہی ہے اور موسیٰ علیہ السلام کے حق میں ان انبیاء علیہم السلام کی حیثیت اس درجہ کی تھی جو اس امت میں نبی اکرم ﷺ کے صحیح اور حقیقی جانشین "علماء حق" کو حاصل ہے۔ اور اگرچہ حدیث ((علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل)) الفاظ کے لحاظ سے محل نظر ہو لیکن مراد اور مفہوم کے اعتبار سے قطعاً صحیح اور درست ہے اس لیے کہ خاتم الانبیاء کے بعد اب جبکہ سلسلہ نبوت اپنے عروج کمال پر پہنچ کر ختم ہو گیا تو امت مرحومہ کی تاقیام قیامت اصلاح و رشد کے لیے "علماء حق" کے سواء دوسری کوئی جماعت نہیں ہو سکتی اور منصب نبوت کے خصوصی شرف کے علاوہ ان کی حیثیت بلاشبہ وہی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کے نشر و ابلاغ کے لیے انبیاء بنی اسرائیل کی تھی۔

ہم نے "عالم" کے ساتھ حق کی شرط لگائی ہے اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ نے "علماء سوء" کو "شرار الخلق" بدترین مخلوق فرمایا ہے، لیکن یہ واضح رہے کہ جس طرح "علماء سوء" کی پیروی امت کی گمراہی کا باعث ہوتی ہے اس سے زیادہ دین کی بربادی کا سامان اس طرح مہیا ہوتا ہے کہ "علماء سوء" کی آڑ لے کر "علماء حق" کے خلاف امت میں بدگمانی پھیلائی جائے اور ان کا استہزاء و تمسخر کر کے "دین قیم" کو تباہ کرنے کی سعی نامشکور کی جائے اور "حق" اور "سوء" کے امتیاز کے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو حکم بنانے کی جگہ اپنی آراء اور خواہشات کی موافقت و مخالفت کو "معیار" قرار دے لیا جائے۔

نیز مخصوص اشخاص و افراد کی مخالفت کے جذبہ میں عام طریقہ پر "علماء دین" کو ہدف ملامت بنانا اور ان کی توہین و تذلیل کرنا دراصل "دین حق" کی تعلیم کے خلاف "علم بغاوت" بلند کرنا ہے اور اس آیت و حدیث کا مصداق بننا ہے جو گزشتہ صفحات میں یہود کے سلسلہ میں بیان ہو چکی ہیں۔

③ انسان کو خدا کے فضل و کرم سے کبھی ناامید نہیں ہونا چاہیے اور اگر بعض حالات میں خلوص کے ساتھ دعائیں کرنے کے باوجود بھی مقصد حاصل نہ ہو تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس شخص سے خدا کی نگاہ مہر نے رخ پھیر لیا ہے۔ نہیں بلکہ "حکیم مطلق" کی حکمت عام اور مصلحت تام کی نظر میں کبھی انسان کی طلب کردہ شے مال اور انجام کے لحاظ سے اس کے لیے مفید ہونے کی جگہ مضر ہوتی ہے جس کا خود اس کو اس لیے علم نہیں ہوتا کہ اس کا علم محدود ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ مطلوب مصالح شخصیہ سے بالاتر مصالح اجتماعیہ کی فلاح و نجاح کی خاطر "تاخیر" چاہتا ہے یا اس سے بہتر مقصد کے لیے اس کو قربان کر دیا جاتا ہے۔

بہرحال "قنوط" اور "مایوسی" درگاہِ رب العزت میں غیر محمود اور ناپسندیدہ بات ہے:

﴿ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ (سورہ یوسف: ۸۷)

"خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو اس لیے کہ خدا کی رحمت سے صرف وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو منکر ہیں۔"

ہماری چند دیگر

خوبصورت اور معیاری مطبوعات

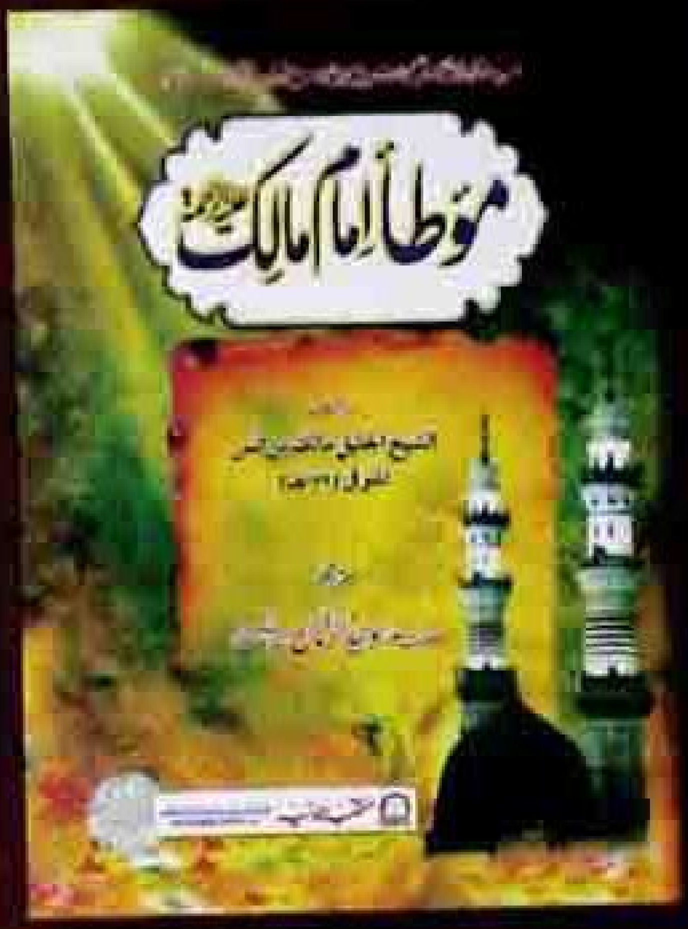

مکتبہ رحمانیہ

اقراء سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور
Tel: +92-42-37224228 , 37355743
E-mail: maktabarehmania@gmail.com

Marfat.com

قصص القرآن

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

رفیق ندوۃ المصنفین

مکتبہ رحمانیہ

Marfat.com

قصص القرآن

جلد سوم

جس میں انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی، اصحاب القریہ، اصحاب الجنہ، حضرت لقمان رضی اللہ عنہ، اصحابِ سبت، اصحاب الرس، بیت المقدس اور یہود، ذوالقرنین، سدِ سکندری، اصحاب الکہف والرقیم، سباء اور سیل عرم، اصحاب الاخدود، اور اصحابُ الفیل وغیرہ کی مکمل اور محققانہ تفسیر وتشریح کی گئی ہے۔

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رفیقِ اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

تخریج وتصحیح

مولانا محمد عرفان فاضل جامعہ مدنیہ، لاہور

مکتبہ رحمانیہ

اقرأ سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

Marfat.com

مکتبہ رحمانیہ

اقرأ سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار، لاہور

جملہ حقوق ملکیت بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب .... قصص القرآن

تالیف .... مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

تخریج و تصحیح .... مولانا محمد عرفان فاضل جامعہ مدنیہ، لاہور

ناشر .... مکتبہ رحمانیہ

اقرأ سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار، لاہور

مطبع .... خضر جاوید پرنٹرز

ضروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لیے پھر بھی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما دیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

Marfat.com

فہرست مضامین (جلد سوم)

پیش لفظ ۹

اصحاب الجنہ

سورۃ القلم اور اصحاب الجنہ ۱۲
واقعہ سے متعلق اقوال ۱۳
تشریح ۱۳
موعظت ۱۴

مومن و کافر

سورۂ کہف اور مومن و کافر کا واقعہ ۱۶
واقعہ کی تشریح ۱۷
بصائر ۱۹

اصحاب القریہ (یا) اصحاب یٰسین

اصحاب قریہ اور قرآن عزیز ۲۲
واقعہ ۲۲
واقعہ سے متعلق اقوال ۲۵
نقد و تبصرہ ۲۵
رحمان ۲۷
موعظت ۲۷

حضرت لقمان

لقمان ۲۹
قرآن عزیز اور حضرت لقمان ۳۱
نبوت یا حکمت ۳۳
چند تفسیری مطالب ۳۳
حسن خلق ۳۴
تواضع ۳۵
کبر و غرور ۳۵
حکمت لقمان ۳۷
مواعظ ۳۸

اصحاب سبت

قرآن عزیز اور اصحاب سبت ۳۹
سبت اور اس کی حرمت ۳۹
واقعہ کی تفصیلات ۴۱
تعیین مقام ۴۵
زمانہ حادثہ ۴۵
چند تفسیری حقائق ۴۶
حقیقت مسخ ۴۷

Marfat.com

حضرت ابن عباس اور عکرمہ کا مکالمہ ۵۲
مسخ شدہ اقوام کا انجام دنیوی ۵۳
بصائر ۵۴

اصحاب الرس

رس ۵۷
قرآن عزیز اور اصحاب الرس ۵۷
اصحاب الرس ۵۷
قول فیصل ۶۱
موعظت ۶۲

بیت المقدس اور یہود

تمہید ۶۳
بیت المقدس ۶۴
شرارت یہود کا پہلا دور ۷۱
غلامی سے نجات ۷۴
شرارت یہود کا دوسرا دور ۷۹
حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل ۸۰
پاداش عمل ۸۰
تیسرا زریں موقعہ اور یہود کی روگردانی ۸۱
ابدی ذلت وخسران ۸۲
بصائر ۸۳

ذوالقرنین

تمہید ۸۴
زیر بحث مسائل اور علماء اسلام ۸۴
ذوالقرنین ۸۷
ذوالقرنین سے متعلق سوال کی نوعیت ۸۷
ذوالقرنین اور سکندر مقدونی ۸۸
کیا ذوالقرنین سکندر مقدونی ہے؟ ۹۰
مسلم؟ ۹۱
یروشلم اور سکندر ۹۲
ذوالقرنین اور ازدایمن ۹۳
سکندر مشرک تھا ۹۶
سکندر کا ظلم وجبر ۹۷
سکندر کا مغرب کی طرف اقدام ۹۷
علماء سلف کی رائے ۱۰۰
متاخرین کی رائے ۱۰۴
یہود وقریش اور انتخاب سوالات ۱۰۵
ذوالقرنین اور انبیاء بنی اسرائیل کی پیشین گوئیاں ۱۰۷
خورس اور تاریخی شواہد ۱۱۰
مغربی مہم ۱۱۱
مشرقی مہم ۱۱۲
تیسری (شمالی) مہم ۱۱۲
فتح بابل ۱۱۳
خورس کا مذہب ۱۱۴
ایران قدیم کا مذہب ۱۱۷
ایران اور مذہب رودشت ۱۱۷
ذوالقرنین اور قرآن عزیز ۱۲۰
یاجوج وماجوج ۱۲۶
سد ۱۳۷
یاجوج وماجوج کا خروج ۱۴۵
کیا ذوالقرنین نبی تھے؟ ۱۶۰
بصائر ۱۶۲

Marfat.com

اصحاب الکہف والرقیم

قرآن عزیز اور اصحاب الکہف والرقیم ۱۶۴
کہف ورقیم ۱۶۷
واقعہ ۱۷۲
واقعہ کی تاریخی حیثیت ۱۷۳
تفسیری حقائق ۱۷۵
نتائج وعبر ۱۸۵

سباء اور سیل عرم

تمہید ۱۸۹
سباء ۱۹۰
نام یا لقب ۱۹۵
زمانہ حکومت ۱۹۵
سباء اور طبقات حکومت ۱۹۶
مکارب سباء وملوک سباء ۱۹۸
وسعت حکومت ۱۹۸
طرز حکومت ۱۹۹
سباء کی عمارات ۱۹۹
سباء کا تمدن ۲۰۰
سد مارب ۲۰۱
جنتان عن یمین وشمال ۲۰۳
اہل سبا اور خدا کی نافرمانی ۲۰۴
سیل عرم ۲۰۴
پہلی سزا ۲۰۴
دوسری سزا ۲۰۸
تاریخی مباحث ۲۱۱
چند تفسیری مباحث ۲۱۳
نتائج وعبر ۲۱۶

اصحاب الاخدود (یا) قوم تُبّع

اخدود؟ ۲۱۸
اصحاب اخدود اور قرآن حکیم ۲۱۸
واقعہ کی تفصیلات ۲۲۰
انتقاد ۲۲۵
تبع ۲۲۸
عرب کی دو حکایتیں ۲۲۹
چند تفسیری نکات ۲۳۰
بصائر وعبر ۲۳۴

اصحاب الفیل

۵۷۱ء وسنہ ولادت باسعادت ﷺ عام الفیل ۲۳۶
حبش ۲۳۶
حکومت ۲۳۶
نجاشی ۲۳۷
مذہب وتمدن ۲۳۷
حبش ویمن کی کشمکش ۲۳۷
ابرہۃ الاشرم ۲۳۸
القلیس ۲۳۹
اصحاب الفیل ۲۳۹
قرآن اور اصحاب فیل ۲۴۲
سورہ فیل اور بعض دیگر تفسیریں ۲۴۵
چند تشریحی مطالب ۲۶۲
بصائر وعبر ۲۶۳

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحيم

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْعَلِیِّ الْاَکْبَرِ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدِ نِ الْمَبْعُوْثِ اِلَی الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ وَ عَلٰی اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهِ الَّذِیْنَ هُمْ هُدَاةُ الدِّیْنِ الْاَزْهَرِ۔

قصص القرآن کی تالیف کے وقت یہ خیال تھا کہ اس موضوع سے عہدہ برآ ہونے کے لیے چند سو صفحات کا ایک جز کافی ہوگا لیکن اس وادی میں قدم رکھنے کے بعد میدان کی وسعت نے اس خیال میں انقلاب برپا کر دیا اور رہوارِ قلم جس قدر آگے بڑھتا گیا میدانِ موضوع وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا، تاہم تیسرے جز پر اس موضوع کو مکمل کر دینے کا حتمی ارادہ تھا مگر سعی بلیغ کے باوجود نا کام رہا اور اس تیسری جلد پر بھی حد تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور چوتھی جلد کے اضافہ پر مجبور ہونا پڑا جو عنقریب انشاء اللہ ہدیہ ناظرین ہوگی۔

قصص القرآن کا یہ تیسرا حصہ ہدیہ ناظرین ہے، پہلے اور دوسرے حصہ کو افادیت اور قدیم و جدید علمی طبقوں میں ان کی مقبولیت، خدائے برتر کا وہ فضل و کرم ہے جس کے اظہار شکر کے لیے میرے قلب و زبان دونوں قاصر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قصص القرآن کی اس جدید ترتیب و تدوین کے ساتھ اہل علم کا شغف مصنف کی محنت و کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ قرآن عزیز کی برکت و عظمت کا ثمرہ ہے، مسلمانوں کا کلام الٰہی کے ساتھ والہانہ ذوق اگر اس محنت کو مفید اور پسندیدہ سمجھتا اور اس کاوش کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے تو فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ وَ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ۔

قصص القرآن کے اس تیسرے جزء میں وہ تمام تاریخی واقعات سپرد قلم ہوئے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی سیرت طیبہ اور ان کی رشد و ہدایت کے سلسلہ میں قرآن عزیز نے عبرت و بصیرت اور پند و موعظت کے لیے بیان کیے ہیں۔

ان میں بعض وہ واقعات ہیں جن کے متعلق حریف اہل قلم خصوصاً متعصب مستشرقین یورپ "اِنْ هُوَ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ" کہہ کر ان کو بے سروپا داستان اور غیر تاریخی قصے ظاہر کرتے ہیں۔

اس لیے ان کے علی الرغم صحیح اور مستند اسلامی و غیر اسلامی تاریخی نقول کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن عزیز کے بیان کردہ یہ وقائع تاریخی حقائق ہیں اور ان کا انکار علمی حقائق کا انکار ہے۔ اس سلسلہ میں ذوالقرنین اصحاب الکہف والرقیم، اصحاب الرس اور

اصحاب الفیل کے واقعات خصوصی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآن عزیز تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ ہدایت ثقلین کے لیے معاد و معاش کا مکمل نظام اور دین و دنیا کی رشد و ہدایت کا قانون کامل ہے اس لیے اس نے قوموں کے عروج و زوال اور مبدا و انجام سے متعلق اسی قدر حصہ بیان کیا ہے جو اس مقصد "تذکیر" و "موعظت" کے لیے مناسب تھا لیکن جب ایک تاریخ عالم کا طالب علم ان قوموں کی تاریخ کا مکمل مطالعہ کرتا یا صفحات عالم پر ان کے آثار و نشانات کو دیکھتا اور پڑھتا ہے تو اس کو بے ساختہ یہ اقرار کرنا ہوتا ہے کہ قرآن نے ان اقوام کے متعلق جو کچھ بھی کہا ہے سر تا سر حقیقت اور ان کی حیات ماضی کا صحیح مرقع ہے۔

اور ان میں بعض واقعات وہ بھی ہیں جو در حقیقت ایک "مثال" کی حیثیت رکھتے ہیں، یعنی قرآن نے ان کو صرف اس لیے بیان کیا ہے کہ موعظت و نصیحت کی جس نوع کا ذکر کیا جا رہا ہے اس کے قبول کرنے اور نہ کرنے والوں کی یہ "مثال" ہے اور ظاہر ہے کہ "مثال" کے لیے واقعہ کا پیش آنا ضروری نہیں ہے۔ اگرچہ وہ واقعہ کی شکل میں ہی کیوں نہ پیش کی جائے اور یہ حقیقت کسی بھی زبان کی فصیح و بلیغ ادیب سے مستور نہیں ہے اور وہ جانتا ہے کہ مثال کا یہ طریقہ موعظت و نصیحت کے لیے کس درجہ مفید اور دل نشین ہوتا ہے؟ مگر بعض مفسرین نے ان واقعات کو بھی ماضی میں ہو گزرے واقعات کے سلسلہ میں منسلک کر دیا ہے۔ لہٰذا ہم نے ایسے مواقع پر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھا کہ اس واقعہ کی حقیقت ایک "مثال" سے زیادہ نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص اس کو واقعات ماضی کی ہی ایک کڑی سمجھتا ہے تب بھی ان واقعات کو واقعات تسلیم کر لینے میں نہ کسی اچھنبی بات کو تسلیم کرنا لازم آتا ہے اور نہ ایسے واقعات کا غیر تاریخی ہونا ان کے لیے "مثال" بننے میں حارج ہو سکتا ہے۔ مثلاً "مومن و کافر" یا اصحاب الجنہ باغ والوں کا واقعہ کہ قرآن کا مقصد ان کے بیان کرنے سے صرف حسب حال ایک "مثال" دینا ہے خواہ وہ ماضی میں گزرا واقعہ ہو یا نہ ہو۔

قصص القرآن کے دوسرے اجزاء کی طرح اس جز میں بھی واقعات کے تاریخی حقائق و مطالب کو روشنی میں لانے کے علاوہ ان سے متعلق "تفسیری و حدیثی مباحث" اور "تحقیقی مباحث" پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی ان سے حاصل شدہ نتائج و ثمرات کو "بصائر و عبر" اور "مواعظ و بصائر" کے مختلف عنوانات سے بیان کیا گیا ہے کہ ان واقعات کے بیان کرنے کا حقیقی مقصد قرآنی "عبرت و بصیرت" ہی ہے۔

موضوع کتاب سے متعلق واقعات کو اس طرح زیر بحث لانے سے آپ کو یہ حقیقت جگہ جگہ ابھری ہوئی نظر آئے گی کہ مستشرقین یورپ نے "کہ جن کی ریسرچ اور فلسفہ تاریخ کی موشگافیوں سے ہم بہت جلد مرعوب ہو جاتے ہیں، کس طرح فلسفہ تاریخ کے نام پر اپنے مخالف واقعات کو غیر تاریخی ظاہر کرنے اور اپنے موافق واقعات کے غیر تاریخی پہلوؤں کو کس طرح تاریخی حیثیت دینے کی سعی کی ہے اور پھر اس زہر ہلاہل کو کس خوبصورتی سے "تریاق" کی شکل میں پیش کیا ہے؟ ان اہم خصوصیات کے علاوہ اپنے دوسرے اجزاء و مجلدات کی طرح یہ جلد بھی حسب ذیل خصوصیات کی حامل ہے۔

① کتاب میں واقعات کی اساس و بنیاد قرآن عزیز کو بنایا گیا ہے اور صحیح احادیث و مستند تاریخی واقعات سے ان کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔

② کتب عہد قدیم اور قرآن عزیز کے "یقین محکم" کے درمیان جس جگہ تعارض نظر آتا ہے، تو یا روشن دلائل و براہین کے ذریعہ دونوں

کے درمیان تطبیق دے دی گئی ہے اور یا پھر قرآن عزیز کی صداقت کو واضح براہین اور مسکت دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔

۳ اسرائیلی روایات کی خرافت و معاندین کے اعتراضات کی بطالت کو حقائق کی روشنی میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔

۴ تفسیری، حدیثی اور تاریخی مسائل اور ان سے متعلق مباحث و اشکالات پر بحث و نظر کے بعد سلف صالحین کے مسلک قویم کے مطابق ان کی تحقیق اور ان کا حل پیش کیا گیا ہے۔

۵ واقعہ کا ذکر قرآن میں کتنی جگہ ہوا ہے اور اس کو دوران بحث میں بیان کر دیا گیا ہے۔

مصنف کو ان خصوصیات کے متعلق کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی اس کا فیصلہ اصحاب نظر اور اہل ذوق کی صوابدید پر ہے۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ وَهُوَ حَسْبِيْ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ

خادم ملت

محمد حفظ الرحمٰن صدیقی سیوہاروی

شعبان ۱۳۶۳ھ

ڈسٹرکٹ جیل، مراد آباد

Marfat.com

اصحاب الجنہ

○ سورۃ القلم اور اصحاب الجنہ ○ واقعہ سے متعلق اقوال ○ تشریح ○ موعظت

سورۃ القلم اور اصحاب الجنہ :

سورۃ القلم میں اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کے حسب حال ایک مثال بیان فرمائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جس طرح باغ والوں نے خدا کی نعمت کو ٹھکرایا اور اس کا حق ادا کرنے کے لیے شکر نعمت نہ کیا اسی طرح مکہ کے مشرکین کا حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین (ﷺ) کو مبعوث فرما کر ان پر اپنی نعمت کاملہ کا اظہار فرمایا اور ان کے ارشاد و ہدایت کے لیے ہادی اعظم بھیج کر عظیم الشان احسان کیا لیکن انہوں نے اس کی کوئی قدر نہ کی اور انکار و مخالفت کے ساتھ اس نعمت کو رد کرنے لگے تو اب ان کا بھی وہی نتیجہ ہونے والا ہے جو باغ والوں کا ہوا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ۝۱۷ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ۝۱۸ فَطَافَ
عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ۝۱۹ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ۝۲۰ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ۝۲۱ اَنِ اغْدُوْا
عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ۝۲۲ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ۝۲۳ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ
مِّسْكِيْنٌ ۝۲۴ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ۝۲۵ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۝۲۶ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝۲۷
قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ۝۲۸ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝۲۹ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ
عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ۝۳۰ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ۝۳۱ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى
رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ۝۳۲ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۳﴾ (القلم:۱۷-۳۳)

"بے شبہ ہم نے ان (کفار مکہ) کو اسی طرح آزمایا ہے جس طرح باغ والوں کو آزمایا جبکہ انہوں نے یہ قسم کھائی کہ ہم صبح ہوتے ان (کے پھلوں) کو کاٹ لیں گے اور وہ انشاء اللہ بھی نہ کہتے تھے پس ابھی وہ سو ہی رہے تھے کہ (ان کے باغ) پر تیرے پروردگار کی جانب سے پھرنے والا پھر گیا (یعنی عذاب الٰہی سے وہ باغ برباد ہو گیا) پس صبح کو ایسا ہو گیا گویا جڑ سے کاٹ کر پھینک دیا گیا ہو۔ (صبح ہوئی) تو انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ اگر کھیتی کاٹنا چاہتے ہو تو سویرے چلے چلو اور چلتے چلتے آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے جاتے تھے (کہ جلدی کرو) ایسا نہ ہو کہ کاٹتے وقت تم کو فقیر آ گھیریں اور

Marfat.com

اپنے بخل کی وجہ سے بہت سویرے (باغ کھیت) پر پہنچے اندازہ لگا کر (کہ اس وقت تک فقیر نہ پہنچ سکیں گے) پس جب اس کو (اس حال میں دیکھا تو کہنے لگے: یقیناً ہم راہ بھول گئے ہیں (یہ وہ مقام نہیں ہے، مگر جب غور سے دیکھا تو کہنے لگے) بلکہ ہم (باغ کے نفع سے) محروم رہ گئے۔ ان میں سے ایک بھلے آدمی نے کہا: کیا میں نے تم سے پہلے ہی نہیں کہا تھا کہ (اسے نعمت الٰہی پر) کیوں خدا کی پاکی بیان نہیں کرتے (اب انجام بد کے بعد) کہنے لگے: ہمارے پروردگار کے لیے پاکی ہے بیشک ہم نے خود ہی اپنے نفس پر ظلم کیا اور آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے (یہ کہ تو نے ہی ہم کو پہلے سے کیوں نہ سمجھایا) اور کہنے لگے ہائے بدقسمتی! بلاشبہ ہم سرکش تھے جلد توقع ہے کہ ہمارا پروردگار ہم کو اس سے بہتر بدل عطاء فرمائے۔ بے شبہ (اب) ہم اپنے پروردگار ہی کی جانب متوجہ ہیں (اے مکہ والو!) خدا کا عذاب اسی طرح (اچانک) آجاتا ہے اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی ہولناک ہے، کاش کہ وہ جان لیتے"۔

واقعہ سے متعلق اقوال:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ کفار مکہ کے حالات کے مناسب قرآن نے ایک مثال دی ہے کوئی واقعہ نہیں ہے [1] اور سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ ہے جو یمن کی ایک بستی ضروان میں پیش آیا جو کہ صنعاء سے چھ میل پر واقع تھی۔ [2] چنانچہ مفسرین نے اس واقعہ کی تفصیل یہ بیان فرمائی ہے۔

اہل کتاب میں سے ایک شخص بہت مالدار، صاحب زمین واملاک اور مرد نیک تھا، اپنی پیداوار میں سے فقراء ومساکین پر کافی خرچ کرتا رہتا تھا، اس کا جب انتقال ہوگیا تو اس نے چند لڑکے وارث چھوڑے، جب پھلوں اور کھیتوں کے کاٹنے کا وقت آیا تو ان لڑکوں نے آپس میں کہا: "ہمارا باپ تو بہت ہی بے وقوف تھا کہ اپنی یہ کثیر دولت فقراء ومساکین میں لٹا دیتا تھا، ہم ایسے پاگل نہیں ہیں کہ اپنی محنت کو اس طرح رائیگاں کردیں اور صلاح یہ ٹھہری کہ پھل اتارنے اور کھیتی کاٹنے کے لیے منہ اندھیرے چلو اور اتنی عجلت کرو کہ فقراء اور مساکین کو معلوم ہی نہ ہوسکے کہ کھیتوں پر آکر ہم کو تنگ کریں۔

یہاں تو یہ خدا ناترس، بخیل، یہ مشورہ کر رہے تھے کہ ساری دولت کو ذخیرہ کر کے "کنز" بنالیں اور اس میں سے نہ خدا کا حق ادا کریں اور نہ خدا کے بندوں کا، اور دوسری جانب خدا کے حکم سے رات ہی میں ان کی تمام سرسبز وشاداب کھیتی اور باغ تیز اور گرم ہوا سے جل کر خاک ہوگئے، اب جو مشورہ کے مطابق یہ منہ اندھیرے وہاں پہنچے تو معاملہ دگرگوں پایا اور کچھ نہ سمجھے اور آگے نکل گئے کہ شاید یہ وہ جگہ ہی نہیں ہے مگر دوسرے نشانات دیکھ کر چونکے اور اب سمجھے کہ یہ ہمارے بخل اور مشورہ کا نتیجہ ہے جو ہم نے شب گزشتہ میں حکم الٰہی کے خلاف غریبوں اور مسکینوں کا حق تلف کرنے کے لیے کیا تھا۔ اب حسرت سے بدقسمتی کا شکوہ کرنے اور خدا کو پکارنے لگے، مگر وقت نکل جانے اور پاداش عمل پالینے کے بعد یہ پکار بے سود ثابت ہوئی۔

تشریح:

یہ مثال ہو یا واقعہ، قرآن عزیز نے اس کے بیان میں تذکیر وتنذیر کا جو پہلو رکھا ہے وہ بہرحال اپنی جگہ ہے، اس لیے کہ ان آیات سے قبل قریش مکہ کی نافرمانیوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے انکار اور کفران کا ذکر کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ان

---

[1] تفسیر ابن کثیر سورۃ القلم [2] ایضاً

Marfat.com

کے ایک سردار ولید بن مغیرہ کی بداعمالیوں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اب ان کو ایک مثال دے کر یا واقعہ سنا کر یہ بتایا جا رہا ہے کہ پیغمبر ﷺ اور خدا کی نعمت (قرآن) کے خلاف باہم سرگوشیاں کرنے، قرآن کی عطاء کردہ تعلیم کے متعلق حقوق اللہ وحقوق العباد سے گریز کر کے اپنی قوت وشوکت پر اتراتے اور گھمنڈ کرتے ہوئے پیغمبر معصوم ﷺ اور مسلمانوں کی تحقیر کرنے کا انجام وہی ہونے والا ہے جو "باغ والوں" کا ہوا اور یہ اس لیے کہ اوّل خدا کی جانب سے قانون امہال (مہلت دینے کا قانون) متکبروں کو ڈھیل دیتا اور اصلاح حال کے لیے موقعہ عطاء کرتا ہے مگر جب کوئی قوم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتی بلکہ خدا کی اس مہلت کو اپنی باطل پرستی کے لیے صداقت کی دلیل ٹھہرا کر صادقین اور ان کی صداقت کی تحقیر وتذلیل پر آمادہ ہو جاتی ہے تو پھر اچانک قانون گرفت اپنا سخت پنجہ ان پر جما دیتا اور ان کو ہلاک و برباد کر کے کائنات کی عبرت وبصیرت کا سامان مہیا کر دیتا ہے، پھر اس وقت نہ حسرت کام آتی ہے نہ ندامت اور اس گھڑی نہ ایمان لانا مفید ہوتا ہے اور نہ خدا کی انقیاد واطاعت کا اعلان:

﴿وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۝﴾ (بنی اسرائیل: ۱۶)

"اور جب ہمیں منظور ہوتا ہے کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو ایسا ہوتا ہے کہ اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں (یعنی وحی کے ذریعہ پیغام حق پہنچا دیتے ہیں) پھر وہ (بجائے اس کے کہ اس کی تعمیل کریں) نافرمانی میں سرگرم ہو جاتے ہیں، پس ان پر عذاب کی بات ثابت ہو جاتی ہے اور (پاداش عمل میں) ہم انہیں برباد وہلاک کر ڈالتے ہیں۔

موعظت:

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات ہست و بود میں انسان کو اجتماعی حیات کے لیے پیدا کیا ہے اور حاجات انسانی کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ یہ کارخانہ باہمی اشتراک واعانت کے بغیر نہیں چل سکتا اور چونکہ اجتماعی زندگی افراد ہی سے بنتی اور سنورتی ہے اس لیے ازبس ضروری ہے کہ ان کی نشوونماء اور بقاء حیات کا ایسا قانون مقرر کیا جائے جس کی بدولت افراد انسانی کے درمیان رشتہ اخوت ومودت قائم ہو سکے اور کسی وقت بھی رقابت اور تنافس پیدا نہ ہونے پائے۔ لہٰذا حق تعالیٰ نے اس نظام کی تکمیل کے لیے معاشی زندگی سے متعلق دو حقوق مقرر فرمائے ایک حق معیشت اور دوسرا درجات معیشت۔

حق معیشت کا قانون یہ ہے کہ اس عالم میں ایک جاندار بھی ایسا نہیں رہنا چاہیے جو حق معیشت سے محروم ہو، یہ ہر شخص کا انفرادی حق ہے کہ وہ زندہ رہے اس لیے حق معیشت میں یہاں سب مساوی ہیں اور کسی کو کسی پر تفوق و برتری حاصل نہیں۔

دوسرا درجات معیشت کا مسئلہ ہے یعنی یہ ضروری ہے کہ معاشی زندگی کے لیے سب کو ملے مگر یہ ضروری نہیں کہ سب کو برابر ملے ﴿وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ﴾ لیکن درجات معیشت کی اس کمی وبیشی اور تفاضل کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے جو کچھ کمایا ہے وہ سب اس کا انفرادی حق ہے، نہیں بلکہ جو جس قدر زیادہ کمائے گا اسی قدر اس کی دولت میں اجتماعی حق زیادہ ہوگا اور پھر یہ اجتماعی حق دو قسم پر تقسیم ہو جاتا ہے، ایک حق اللہ اور دوسرا حق العباد۔ پس جو شخص اپنی دولت وثروت کو صرف انفرادی ملک سمجھتا اور اس میں حق اللہ اور حق العباد دونوں کا انکار کرتے ہوئے اس کے نشہ میں مست ہو کر احکام الٰہی سے بے پروا ہو جاتا ہے اس کا انجام

Marfat.com

کبھی بخیر نہیں ہوتا اور وہ خدا کے غضب کا مستحق قرار پاتا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾

(التوبة: ٣٤)

"اور جو لوگ چاندی سونا اپنے ذخیروں میں ڈھیر کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے تو ایسے لوگوں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو"۔

ولید بن مغیرہ اور قریشی سرداروں کو خدا نے ہمہ قسم کی نعمتیں عطاء فرمائی تھیں اور پھر ان مادی ترقیات کے ساتھ ساتھ خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت فرما کر ان کی روحانی نعمت کو بھی کامل و مکمل کر دیا تھا، لیکن ان بدبختوں نے شکر ادا کرنے کی بجائے کفران نعمت کیا، آخرت نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح باغ والے اپنے باغ کی نعمتوں سے محروم ہو گئے اسی طرح کفار مکہ بھی مادی اور روحانی نعمتوں سے محروم ہو کر ابدی ذلت و خسران کے ماسوا اور کچھ نہ پاسکے۔ فَاعْتَبِرُوْا يٰاُولِي الْاَبْصَارِ۔

Marfat.com

مومن وکافر

○ سورۂ کہف اور مومن وکافر کا مذاکرہ ○ واقعہ کی تشریح ○ بصائر

سورۂ کہف اور مومن وکافر کا واقعہ:

اللہ تعالیٰ نے سورۂ کہف میں اصحاب کہف کے واقعہ کے بعد ایک اور واقعہ کا ذکر فرمایا ہے، یہ واقعہ دو انسانوں کے درمیان مناظرانہ گفتگو کی شکل میں ذکر ہوا ہے اور ساتھ ہی اس کا نتیجہ اور ثمرہ بھی مذکور ہے۔ یعنی ایک کا طریق زندگی مال کے اعتبار سے کامیاب رہا اور دوسرے کو ندامت وحسرت کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس کے متعلق بعض مفسرین کا خیال ہے کہ قرآن عزیز نے اس واقعہ کو مثال کے طور پر کفار مکہ اور مسلمانوں کی جماعت کے حالات کو سامنے رکھ کر تذکیر اور نصیحت کے لیے بیان کیا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس طرح کا واقعہ درحقیقت دو آدمیوں (مومن وکافر) کے درمیان زمانہ ماضی میں پیش آیا تھا۔

اور ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ جس طرح اصحاب کہف کا واقعہ پیش آیا ہے اسی طرح نزول قرآن سے قبل دو انسانوں کے درمیان یہ واقعہ بھی پیش آیا ہے اور قرآن نے ان دونوں واقعات کو مشرکین مکہ کی تذکیر وتنذیر کے لیے بیان کیا ہے۔

قرآن عزیز نے جس انداز میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کتب احادیث وسیر اور تاریخ میں اس سے زیادہ کچھ اور موجود نہیں ہے لہٰذا وہی قابل مراجعت ہے:

﴿وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا
بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۟ؕ ﴿٣٢﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۟ۙ ﴿٣٣﴾ وَّ كَانَ
لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ﴿٣٤﴾ وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَ هُوَ ظَالِمٌ
لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۟ۙ ﴿٣٥﴾ وَّ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىِٕمَةً ۙ وَّ لَىِٕنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ
لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿٣٦﴾ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ
مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ؕ ﴿٣٧﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَ لَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ﴿٣٨﴾ وَ لَوْ لَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ
قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا ۚ﴿٣٩﴾ فَعَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ

Marfat.com

خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَ يُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾ وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾ وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾ (الکہف:۳۲-۴۴)

"اور (اے پیغمبر ﷺ!) لوگوں کو ایک مثال سنا دو۔ دو آدمی تھے، ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگور کے دو باغ مہیا کر دیئے گرداگرد کھجور کے درختوں کا احاطہ تھا، بیچ کی زمین میں کھیتی تھی، پس ایسا ہوا کہ دونوں باغ پھلوں سے لد گئے اور پیداوار میں کسی طرح کی بھی کمی نہ ہوئی ہم نے ان کے درمیان (آب پاشی کے لیے) ایک ندی جاری کر دی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آدمی دولت مند ہو گیا۔ تب ایک دن (گھمنڈ میں آ کر) اپنے دوست سے (جسے خوش حالیاں میسر نہ تھیں) باتیں کرتے کرتے بول اٹھا "دیکھو میں تم سے زیادہ مالدار ہوں اور میرا جتھا بھی بڑا طاقت ور جتھا ہے" پھر وہ (یہ باتیں کرتے ہوئے) اپنے باغ میں گیا اور وہ اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر رہا تھا۔ اس نے کہا "میں نہیں سمجھتا کہ ایسا شاداب باغ کبھی ویران ہو سکتا ہے مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی برپا ہوگی اور اگر ایسا ہوا بھی کہ میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا گیا تو (میرے لیے کیا کھٹکا ہے) مجھے ضرور وہاں بھی اس سے بہتر ٹھکانا ملے گا"۔ یہ سن کر اس کے دوست نے کہا اور باہم گفتگو کا سلسلہ جاری تھا "کیا تم اسی ہستی کا انکار کرتے ہو جس نے تمہیں پہل مٹی سے اور پھر نطفہ سے پیدا کیا اور پھر آدمی بنا کر نمودار کر دیا لیکن یہ تو یقین رکھتا ہوں کہ وہی اللہ میرا پروردگار ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا اور پھر جب تم اپنے باغ میں آئے (اور اس کی شادابیاں دیکھیں) تو کیوں تم نے یہ نہ کہا کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے، اس کی مدد بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا؟ اور یہ جو تمہیں دکھائی دے رہا ہے کہ میں تم سے مال اور اولاد کم تر رکھتا ہوں تو (اس پر مغرور نہ ہو) کیا عجب ہے میرا پروردگار مجھے تمہارے اس باغ سے بھی بہتر باغ (جنت) دے دے اور تمہارے باغ پر آسمان سے ایسی اندازہ کی ہوئی بات اتار دے کہ وہ چٹیل میدان ہو کر رہ جائے یا پھر (بربادی کی کوئی اور صورت نکل آئے مثلاً) اس کی نہر کا پانی بالکل نیچے اتر جائے اور تم کسی طرح بھی اس تک نہ پہنچ سکو اور پھر (دیکھو) ایسا ہی ہوا کہ اس کی دولت (بربادی کے) گھیرے میں آ گئی، وہ ہاتھ مل مل کر افسوس کرنے لگا کہ ان باغوں کی درستگی پر میں نے کیا کچھ خرچ کیا تھا (وہ سب برباد ہو گیا) اور باغوں کا حال ہوا کہ ٹٹیاں گر کے زمین کے برابر ہو گئیں اب وہ کہتا ہے اے کاش میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا اور دیکھو کوئی جتھا نہ ہوا کہ اللہ کے سوا اس کی مدد کرتا اور نہ خود اس نے یہ طاقت پائی کہ بربادی سے جیت سکتا۔ یہاں سے معلوم ہو گیا کہ فی الحقیقت سارا اختیار اللہ ہی کے لیے ہے وہی ہے جو بہتر ثواب دینے والا ہے اور اسی کے ہاتھ بہتر انجام ہے"۔

واقعہ کی تشریح:

ان آیات سے قبل یہ ذکر ہو رہا ہے کہ جو لوگ منکر ہیں ان کے لیے جہنم کی آگ ہے اور جو مومنین ہیں ان کے لیے ہمہ قسم کی

Marfat.com

خوش عیشیاں اور ابدی باغ (جنت) ہے اس کے بعد آیات زیر بحث میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو منکرین ہیں ان کے لیے صرف آخرت ہی کی محرومیاں نہیں ہیں بلکہ وہ اس دنیا میں بھی عنقریب ناکامیوں اور بدبختیوں سے دوچار ہونے والے ہیں ان کا یہ گھمنڈ کہ ان کو ہر قسم کی رفاہت اور خوش عیشی حاصل ہے اور وہ مال و دولت کے مالک ہیں اور ان کا جتھا بھی بہت طاقتور ہے بہت جلد خاک میں مل جانے والا ہے اور مومن اپنی موجودہ تنگ حالی پر دل گیر اور بددل نہ ہوں کہ وقت آ پہنچا ہے کہ ان کی یہ بے چارگی و بے بسی ہمہ قسم کی عزت و طاقت سے بدل جائے گی، نیز یہ کہ دنیا کی خوش عیشی چلتی پھرتی چھاؤں ہے اس پر بھروسہ بے کار ہے وہ جب مٹنے پر آتی ہے تو لمحوں کی بھی دیر نہیں لگتی اور دنیا کی کوئی طاقت بھی اس کو نہیں بچا سکتی۔

چنانچہ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے یہ مثال دی کہ یوں سمجھو کسی جگہ دو آدمی تھے ایک کو خدائے تعالیٰ نے دنیوی عیش و عشرت کے کل سامان دے رکھے تھے اور دوسرا تنگ دست اور پریشان حال تھا، وہ خدا کا منکر اور دولت کے نشہ میں چور اپنے نادار دوست سے غرور و نخوت کے ساتھ یہ کہتا رہتا کہ میری یہ دولت و حشمت پائیدار ہے کوئی طاقت نہیں کہ اس کو مجھ سے چھین لے اور ایک تو ہے کہ افلاس اور تنگی میں بسر کر رہا ہے۔ مفلس دوست اگرچہ تنگ دست تھا مگر خدائے برتر کا سچا پرستار تھا اس نے جواب میں کہا: ”اپنی دولت کے نشہ میں اس درجہ مغرور نہ ہو، کون جانتا ہے کہ لمحوں میں کیا سے کیا ہو جائے اور کس کو خبر ہے کہ وہ مجھ کو ان بخشائشوں سے نواز دے جس پر آج تو غرور کر رہا ہے آخر کار یہی ہوا کہ اس کے وہ تمام باغ جن کی شادابیوں اور عطر بیزیوں پر اس کو گھمنڈ تھا اچانک جل بھن کر خاک ہو گئے اور کل جہاں چمن زار تھا آج وہاں ویرانی کے سواء اور کچھ باقی نہ رہا۔

اس مثال میں حق تعالیٰ نے مشرکین مکہ اور مسلمانوں کی جماعت سے متعلق وہی نقشہ کھینچا ہے جو عرب کے ماحول کے ٹھیک ٹھیک مطابق تھا، کیونکہ ان کے یہاں اس سے بڑھ کر کوئی دولت نہ تھی کہ تاکستان کے بہتر سے بہتر باغ ہوں، ان کے چاروں طرف کھجور کے گنجان درخت لگے ہوں، درمیان میں نہر ہو اور نہر کے اردگرد سرسبز و شاداب کھیتیاں ہوں اور یہ سب کچھ مشرکین مکہ کو میسر تھا اور مسلمان اس وقت ان ظاہری نعمتوں سے محروم تھے۔

بہر حال یہ واقعہ ہو یا مثال، تذکیر و تنذیر کے جس مقصد کی خاطر بیان کی گئی ہے اس کے پیش نظر مشرکین مکہ اور مسلمانوں کے باہمی تقابل کا نہایت ہی جامع اور کامل نقشہ ہے، قریش مکہ کے غرور و نخوت کا یہ حال تھا کہ اول تو پیغام ہدایت پر کان ہی نہ دھرتے تھے اور اگر کبھی سننے پر آمادگی ظاہر بھی کرتے تو یہ شرط لگاتے کہ جب تک ہم محمد ﷺ کے پاس بیٹھیں اس وقت تک ان خستہ حال مسلمانوں میں سے کوئی ہمارے برابر آ کر نہ بیٹھے، کیونکہ ان کے ساتھ بیٹھنا ہماری سخت توہین ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہماری یہ دولت و حشمت غیر فانی اور ہمارا یہ کروفر ابدی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو کمزور اور تنگ دست دیکھ کر ان کا مضحکہ کرتے اور حقیر و ذلیل سمجھتے تھے۔

پس قرآن عزیز نے لطیف اور معجزانہ اسلوب کے ساتھ مسلمانوں کے حق میں ایسے ناسازگار حالات کے وقت ان کی کامرانی اور مشرکین کی ناکامی کے اس انجام کی خبر دی ہے جو کچھ عرصہ بعد ہونے والا تھا، چنانچہ جو سعید روحیں تھیں انہوں نے سمجھا اور حق کی آغوش میں خود کو سپرد کر دیا اور جن کی شقاوت و بدبختی پر مہر لگ چکی تھی ان کا تھوڑے عرصہ بعد ہی وہ حسرت ناک انجام ہوا جس کے لیے یہی کہا جا سکتا ہے۔ اور شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

”پہلے وقت میں ایک شخص مالدار مر گیا، دو بیٹے رہے برابر مال بانٹ لیا، ایک نے زمین خرید کی دو طرف میووں کے باغ لگائے

بیچ میں کھیتی اور ندی کاٹ کر ان پر لا ڈالی کہ مینہ نہ ہو تو بھی نقصان نہ آئے اور عمدہ جگہ بیاہ کیا اولاد ہوئی اور نوکر رکھے، تدبیر دنیا درست کر کے آسودہ گزران کرنے لگا، دوسرے نے سب مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور آپ قناعت سے بیٹھ رہا"۔ ❶

معلوم نہیں کہ حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے واقعہ کی یہ تفصیل کہاں سے اخذ فرمائی ہے کتب سیر و روایات اور تاریخ کے اوراق تو اس بارہ میں خاموش ہیں "اور چھوٹا منہ بڑی بات" حضرت شاہ صاحب نے اس واقعہ میں جس طرح دونوں کا تقابل ظاہر فرمایا ہے قرآن کا ظاہر سیاق اس کی تائید نہیں کرتا، اس لیے کہ مرد مومن نے کافر کے غرور کا جو جواب دیا اور کافر نے جو اس کے افلاس پر طعنہ دیا وہ ہرگز اس صورت حال کے مناسب نہیں ہیں کہ مومن حقیقتاً مالدار تھا مگر اس نے اپنا سارا مال راہ خدا میں خرچ کر دیا تھا، اگر ایسا ہوتا تو مومن و کافر کے سوال و جواب کا اسلوب دوسرا ہی ہوتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بصائر:

① دنیوی نعمتیں دو گھڑی کی دھوپ اور چار دن کی چاندی ہیں، ناپائیدار اور فانی پس عقل مند وہ ہے جو ان پر گھمنڈ نہ کرے اور ان کے بل بوتہ پر خدا کی نافرمانی پر آمادہ نہ ہو جائے اور تاریخ کے ان اوراق کو پیش نظر رکھے جن کی آغوش میں فرعون، نمرود، ثمود اور عاد کی قاہرانہ طاقتوں کا انجام آج تک محفوظ ہے:

﴿سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۶۹﴾ (النمل: ٦٩)

"زمین کی سیر کرو اور پھر دیکھو کہ نافرمانوں کا انجام کیا ہوا؟"

② حقیقی عزت ایمان باللہ اور عمل صالح سے بنتی ہے، دولت و ثروت اور سطوت و حشمت دنیوی سے حاصل نہیں ہوتی، قریش مکہ کو ثروت و سطوت دونوں حاصل تھے، مگر بدر کے میدان میں ان کا انجام بد اور دین و دنیا کی رسوائی کو کوئی روک نہ سکا، مسلمان دنیا کے ہر قسم کے سامان عیش سے محروم تھے مگر ایمان باللہ اور عمل صالح نے جب ان کو دینی و دنیوی عزت و حشمت عطاء کی تو اس میں کوئی حائل نہ ہو سکا۔

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۸﴾ (المنافقون: ٨)

"حقیقی عزت اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کے لیے ہی ہے مگر منافقین اس حقیقت سے نا آشنا ہیں"۔

③ مومن کی شان یہ ہے کہ اگر اس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی نعمتوں سے نوازا ہے تو غرور اور تکبر کی بجائے درگاہ الٰہی میں جبین نیاز جھکا کر اعتراف نعمت کرے اور دل و زبان دونوں سے یہ اقرار کرے کہ خدایا! اگر تو یہ عطاء نہ فرماتا تو ان کا حصول میری اپنی قوت و طاقت سے باہر تھا، یہ سب تیرے ہی عطاء و نوال کا صدقہ ہے: ﴿وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ - صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: ((الکنز من کنوز الجنة لا حول ولا قوة الا باللہ)) "جنت کے پوشیدہ خزانوں میں سے ایک خزانہ یہ ہے کہ بندہ اعتراف کرے کہ بھلائی کرنے کی طاقت اور برائی سے بچنے کی قوت اللہ کی مدد کے بغیر ناممکن

---

❶ موضح القرآن

Marfat.com

ہے"۔ یعنی جس شخص نے زبان سے اس کا اقرار کیا اور دل میں اس حقیقت کو جا گزیں کر لیا اس نے گویا جنت کے مستور خزانوں کی کنجی حاصل کر لی۔

اس کے برعکس کافر کی حالت یہ ہے کہ ان کو جب دولت و ثروت اور جاہ و جلال میسر آ جاتے ہیں تو خودی میں آ کر مغرور ہو جاتا ہے اور جب کوئی خدا کا نیک بندہ اس کو سمجھاتا ہے کہ یہ سب خدا کا فضل ہے اس کا شکر ادا کر تو وہ اکڑ کر کہتا ہے:

﴿اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ مِّنْ عِنْدِيْ﴾

"یہ خدا کا دیا ہوا نہیں ہے بلکہ میری اپنی دانائی اور علم کا نتیجہ ہے"۔

پس مومن اور کافر کے لیے خدا کی جانب سے بھی الگ الگ جواب ملتا ہے، جن کو سورہ مومنون میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝﴾ (المؤمنون:۵۵-۶۱)

"کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم مال اور اولاد سے اس لیے ان کی امداد کر رہے ہیں کہ بھلائی پہنچانے میں سرگرمی دکھائیں؟ نہیں مگر وہ شعور نہیں رکھتے (کہ ان کے بارے میں حقیقت حال دوسری ہے یعنی قانون امہال کام کر رہا ہے) اور جو لوگ اپنے پروردگار کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں جو اپنے پروردگار کی نشانیوں پر یقین رکھتے ہیں جو اپنے پروردگار کے ساتھ کسی ہستی کو شریک نہیں ٹھہراتے جو اس کی راہ میں جتنا کچھ دے سکتے ہیں، بلا تامل دیتے ہیں اور (پھر بھی) ان کے دل ترساں رہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے حضور لوٹنا ہے، تو بلاشبہ یہ لوگ ہیں جو بھلائیوں کے لیے تیز گام ہیں اور یہی ہیں جو اس راہ میں سب سے آگے نکل جانے والے ہیں"۔

(۴) سعید وہ ہے جو انجام سے قبل حقیقت انجام کو سوچ لے اور انجام کار سعادت ابدی و سرمدی پائے اور شقی و بدبخت وہ ہے جو انجام پر غور کیے بغیر اول غرور و نخوت کا اظہار کرے اور اس انجام بد کو دیکھنے کے بعد ندامت و حسرت کا اظہار کرے اور یہ ندامت و حسرت اس وقت کچھ کام نہ آئے۔ چنانچہ اس واقعہ یا مثال میں بھی منکر کو وہی شقاوت پیش آئی:

﴿وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ۝﴾ (الکہف:۴۲)

"اور اس کی دولت (ثمرات) گھیرے میں آ گئی اور جب کہ اس کے باغ کی ٹٹیاں زمین پر گر کے برابر ہو گئیں تو ہاتھ مل مل کر کہتا رہ گیا "افسوس میں نے ان پر کتنی کثیر دولت صرف کی تھی وہ سب برباد ہو گئی" اور حسرت کے ساتھ کہتا تھا "کاش کہ میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا"۔

Marfat.com

اور یہی روز بدفرعون کو دیکھنا پڑا کہ وقت گزرنے پر اس نے وہی کہا کہ اگر عذاب کے مشاہدے سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت مان لیتا تو اس دردناک عذاب کی نذر نہ ہوتا:

﴿حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝۹۰ آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝۹۱﴾ (یونس:۹۰، ۹۱)

"یہاں تک کہ جب وہ غرق ہونے لگا تو اس نے اب کہا: میں اقرار کرتا ہوں کہ کوئی خدا نہیں ہے سواء اس ایک ذات کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمانوں میں سے ہوتا ہوں۔ (اللہ نے جواب دیا) اور اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا اور تو فسادیوں میں سے تھا"۔

اصحاب القریہ (یا) اصحاب یٰسین

○ اصحاب قریہ اور قرآن عزیز ○ واقعہ ○ واقعہ سے متعلق اقوال ○ نقد و تبصرہ ○ موعظت

اصحاب قریہ اور قرآن عزیز:

قرآن عزیز (سورہ یٰسین) میں ایک بہت ہی مختصر واقعہ مذکور ہے جو آیت ﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا أَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ﴾ سے شروع ہو کر ﴿فَإِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ﴾ پر ختم ہوتا ہے اور سورۃ کی نسبت سے اس کو "واقعہ اصحاب یٰسین" اور آیات کے اسلوب بیان کے مطابق "واقعہ اصحاب قریہ" کہتے ہیں۔

واقعہ:

قرآن عزیز نے اس واقعہ کے متعلق صرف اس قدر بتایا ہے کہ گزشتہ زمانہ میں ایک بستی میں کفر و شرک اور فساد کو دور کرنے اور رشد و ہدایت کا سبق دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو پیغمبروں کو مامور کیا، انہوں نے اہل قریہ کو حق کی تلقین کی اور صراط مستقیم کی جانب دعوت دی، لیکن بستی والوں نے ان دونوں کو جھٹلایا، تب ہم نے ایک ہادی کا اور اضافہ کر دیا اور وہ تین مل کر ایک جماعت ہو گئے، اب ان تینوں نے ان کو یقین دلایا کہ بے شبہ ہم خدا کے بھیجے ہوئے ہیں، مگر انہوں نے نہ مانا اور ان کا مذاق اڑایا کہ تم بھی آدمی اور ہم بھی آدمی پھر تمہارے اندر وہ کون سی عجیب بات ہے کہ تم پیغمبر بنا دیئے گئے؟ یہ سب تمہارا جھوٹ اور تمہاری سازش ہے۔ انہوں نے کہا کہ خدا اس کا شاہد ہے کہ ہم جھوٹے نہیں، وہ دانا و بینا اس کو خوب جانتا ہے مگر تم پھر بھی نہیں مانتے تو ہمارا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ خدا کا پیغام تم تک پہنچا دیں اور راہ حق دکھا دیں۔ بستی والے کہنے لگے کہ ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں کہ تم نے خواہ مخواہ ہمارے یہاں آ کر گڑبڑ پیدا کر دی اور اگر تم اس سے باز نہ آئے تو ہم تم تینوں کو مار ڈالیں گے یا سخت قسم کی تکالیف میں مبتلا کر دیں گے۔ انہوں نے جواب دیا خدا کی نافرمانی کر کے نحوست تو تم خود اپنے اوپر لا چکے ہو اس سے زیادہ نحوست اور کیا ہو سکتی ہے کہ تم نصیحت اور خیر خواہی تک کو قبول نہیں کرتے بلکہ اور زیادہ حد سے گزرتے جاتے ہو؟

بستی کے آخری کنارے پر ایک نیک مرد رہتا تھا، اس نے جب سنا کہ بستی والے خدا کے رسولوں کو جھٹلا رہے ہیں اور طرح طرح کی دھمکیاں دے رہے ہیں تو عجلت کے ساتھ وہاں آ پہنچا جس جگہ یہ گفتگو ہو رہی تھی اور کہنے لگا: اے قوم! خدائے تعالیٰ کے پیغمبروں کی پیروی کر، ان مقدس لوگوں کی پیروی سے کیوں منہ موڑتی ہے جو تجھ سے اس خدمت حق کا کوئی معاوضہ تک نہیں طلب کرتے اور جو خدا رسیدہ اور ہدایت مآب انسان ہیں، بتاؤ میں کیوں اس ایک خدا کی ہی پرستش نہ کروں جس نے مجھ کو نیست سے

Marfat.com

ہست کیا ہے اور مرنے کے بعد میں اور تم سب اس کی جانب لوٹ جانے والے ہیں، تم جو ان برگزیدہ انسانوں کی تکذیب کر رہے ہو تو میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا مجھ کو خدائے واحد کے سوائے معبودانِ باطل کو اپنا خدا مان لینا چاہیے کہ اگر وہ ذات واحد جو نہایت ہی مہربان اور رحم والا ہے مجھے کسی قسم کا نقصان پہنچانے کا ارادہ کرلے تو ان معبودانِ باطل کی نہ سفارش کارگر ہو سکے اور نہ وہ اس نقصان سے مجھ کو بچا سکیں، اگر تمہارا مقصد یہ ہے تو ایسی صورت میں بلاشبہ میں تو سخت گمراہی میں پھنس جاؤں گا، لہٰذا کان کھول کر سن لو کہ تم ان مقدس انسانوں کی بات مانو میں تو اس ذات پر ایمان لے آیا جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔

قوم نے اپنی تکذیب اور مقدس رسولوں کی تصدیق میں نیک مرد کی یہ پراز ہدایت گفتگو سنی تو غیظ وغضب میں آ گئی اور اس کو شہید کر ڈالا۔

واقعہ کا اس حد تک ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے جرأت حق کی جزاء میں اس کو جنت عطاء کی اور جب اس نے اپنا پاک مقام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو وجد آفریں انداز میں کہنے لگا: "کاش کہ میری قوم کے لوگ یہ جان سکتے کہ میرے پروردگار نے مجھ کو مغفرت کا کیسا بیش بہا تحفہ عطا فرمایا اور میرا کس درجہ اعزاز واکرام کیا"۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس مرد نیک کی قوم کی بدکرداری پر ان کو ہلاک کرنے اور سزا دینے کے لیے ہمیں آسمان سے کسی لشکر بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی، فقط ایک ہولناک چیخ نے ان سب کا کام تمام کر دیا اور وہ جہاں کے تہاں بجھ کر رہ گئے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شاید ان بدبختوں نے خدا کے رسولوں کو بھی شہید کر ڈالا تھا، جیسا کہ انہوں نے ان کو دھمکی دی تھی اور اگرچہ قرآن عزیز میں یہ مذکور نہیں ہے مگر اس مرد شہید کے ذکر کے بعد چونکہ ان رسولوں کا کوئی مذکور نہیں ہے اس لیے قرینہ یہی شہادت دیتا ہے:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا
فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ
شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ
الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾
قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ
يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَا لِيَ لَآ
اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ
عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾
قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۷﴾ وَمَآ
اَنْزَلْنَا عَلٰي قَوْمِهٖ مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً
فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾﴾ (یٰسین: ۱۳-۲۹)

Marfat.com

"(اے پیغمبر!) ان (مشرکین مکہ) سے بستی والوں کا واقعہ بیان کر جب کہ ان کے پاس خدا کے رسول آئے۔ جب یہ صورت ہوئی کہ ہم نے اوّل ان کے پاس دو بھیجے تھے تو انہوں نے ان کو جھٹلایا تب ہم نے ان دونوں کو تیسرے کے ذریعہ سے قوت و عزت عطاء کی، اب ان تینوں نے بستی والوں سے کہا: "ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہم کو خدا نے تمہارے پاس بھیجا ہے" بستی والوں نے کہا: "بجز اس بات کے کہ تم بھی ہماری طرح ایک انسان ہو کون سی ایسی خوبی ہے کہ تم خدا کے رسول ہو اور رحمٰن نے تم پر کچھ بھی نازل نہیں کیا اس لیے تم صاف جھوٹے ہو"۔ ان تینوں نے کہا: "ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم یقیناً خدا کے فرستادہ ہیں اور ہمارے ذمہ صرف واضح اور صاف طور پر خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے (زبردستی قبول کرا دینا ہمارا کام نہیں ہے)۔ بستی والے کہنے لگے: "ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں پس اگر تم اس (تبلیغ) سے باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے اور سخت قسم کا عذاب چکھائیں گے"۔ انہوں نے کہا: تمہاری نحوست تو خود تمہارے ساتھ وابستہ ہے کہ تم کو جو نصیحت کی جاتی ہے اس کو نحوست کہتے ہو بلکہ تم تو حد سے گزر رہے ہو اور شہر کے آخری کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور اس نے کہا "اے قوم تم خدا کے رسولوں کی پیروی کرو، ان کی پیروی کرو جو تم سے اپنی نیکی ہدایت پر کوئی اجرت طلب نہیں کرتے اور مجھے کیا بات مانع ہے کہ میں صرف اپنے پیدا کرنے والے ہی کی پرستش نہ کرو، اس کی پرستش جس کی جانب ہم تم کو لوٹ جانا ہے، کیا میں اس ذات واحد کے سوائے باطل معبودوں کو خدا بنالوں کہ اگر رحمٰن مجھ کو کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو ان باطل معبودوں کی نہ کچھ سفارش چل سکے اور نہ وہ اس مضرت سے بچا سکیں میں اگر ایسا کروں تو کھلا گمراہ ہوں۔ بیشک میں تو اپنے اور تمہارے پروردگار پر ایمان لے آیا۔ تم خوب کان لگا کر سن لو"۔ تب اس کو (ہماری جانب سے) کہا گیا جنت میں بے خطر داخل ہو جا، اس نے کہا "کاش کہ میری قوم جان لیتی کہ میرے پروردگار نے مجھے مغفرت کا کیسا اچھا تحفہ دیا اور مجھ کو ان لوگوں میں شامل کر لیا جن کو اس نے اعزاز و اکرام سے نوازا ہے اور ہم نے اس کی موت کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی لشکر سزا دینے کے لیے نہیں اتارا اور ہم کو ایسا کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی (ان کی سزا کے لیے) اور کچھ نہیں تھا مگر ایک ہولناک چیخ پس وہ وہیں بجھ کر رہ گئے (یعنی ہلاک ہو گئے)"۔

مفسرین اور ارباب سیرت اس واقعہ کے زمانہ اور تفصیلات میں اس درجہ مشکوک اور متردد نظر آتے ہیں کہ ان کے بیانات اور روایات سے واقعہ کی تعیین ناممکن ہو جاتی ہے اس لیے ہم یہی کہہ سکتے ہیں قرآن عزیز نے اپنے مقصد عظمیٰ "موعظت و عبرت" کے پیش نظر جس قدر بیان کیا ہے وہ ایک صاحب بصیرت کے لیے کافی وشافی ہے۔ خدا کی اس سرزمین پر حق و باطل کے جہاں بہت سے واقعات ہو گزرے ہیں اور اس پیر فلک نے اس سلسلہ میں جتنے ورق بھی الٹے ہیں ان میں ایک یہ واقعہ بھی اسی آسمان کے نیچے اور اسی زمین کے اوپر ہو گزرا ہے، بستی، نیک مرد اور مقدس رسولوں کے نام معلوم ہوئے تب اور نہ ہوئے تب نفس واقعہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ تاریخ کے جن اوراق نے نوح علیہ السلام اور قوم نوح، ہود اور عاد، صالح اور ثمود، ابراہیم، لوط اور قوم لوط، موسیٰ اور فرعون، عیسیٰ اور بنی اسرائیل کے معرکہ حق و باطل کے تفصیلی حالات و واقعات کو اپنے سینہ میں آج تک محفوظ رکھا ہے، اس میں اگر اس واقعہ کا بھی اضافہ ہو جائے جس کا مختصر و مجمل ذکر قرآن عزیز نے کیا ہے تو کون سی حیرت کی بات اور تعجب کا مقام ہے۔

واقعہ کا حاصل یہی تو ہے کہ چند مقدس پیغمبروں نے ایک بے راہ رو مخلوق کو سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کی اور اس نے ازراہ

عناد و گمراہی ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا، حتیٰ کہ خدا رسیدہ ہادیوں کو قتل کر دینے سے بھی باز نہ رہے تو اس قسم کے واقعات کو تاریخ نے صرف بنی اسرائیل ہی میں اتنی بار دہرایا ہے کہ تاریخ اقوام و ملل کا حق آگاہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے متعلق تردد نہیں کر سکتا۔

واقعہ سے متعلق اقوال:

ابن اسحاق بروایت کعب احبار وہب بن منبہ و عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نقل کرتے ہیں کہ یہ واقعہ شہر انطاکیہ (شام) کا ہے، اس شہر کے لوگ بت پرست تھے اور ان کے بادشاہ کا نام انطخیس بن انطخیس تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت کے لیے تین پیغمبروں صادق، صدوق اور شلوم کو بھیجا اور شہر کی آخری سمت سے جو نیک مرد ان کی تائید کے لیے آیا اس کا نام حبیب تھا پھر کوئی کہتا ہے کہ یہ عابد و زاہد اور مرتاض تھا اور شہر کے کنارے عبادت میں مصروف رہتا تھا اور کسی کا قول ہے کہ وہ ریشمی یا سوتی کپڑا بننے کا کام کرتا تھا اور صاحب صدقات و خیرات تھا۔ [1] غرض ان کے نزدیک یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت قدیم زمانہ کا ہے اور قتادہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ کا ہے اور شہر انطاکیہ ہی کا واقعہ ہے، حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے تین حواری شمعون، یوحنا اور پولس کو وہاں بھیجا تھا کہ جا کر ان کو حق کی دعوت دیں اور پیغام الٰہی سنائیں مگر اہل شہر نے قبول نہ کیا اور ان کی ہی بستی کے ایک نیک مرد نے جب ان کو قبول حق کی ترغیب دی تو انہوں نے اس کو قتل کر ڈالا اور پاؤں سے کچل کر اس کی نعش کی توہین کی اس شخص کا نام حبیب تھا اور یہ نجاری (بڑھئی) کا پیشہ کرتا تھا، تب اللہ تعالیٰ نے اس بستی پر چیخ کا عذاب مسلط کر دیا، کہتے ہیں کہ جبرائیل فرشتہ نے ایسی ہولناک چیخ کی کہ اہل بستی اس کو سن کر جس حالت میں بھی تھے اسی حالت میں مر کر رہ گئے۔ [2]

نقد و تبصرہ:

یہ روایات یا اقوال کعب احبار اور وہب بن منبہ کی اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں، حتیٰ کہ ابن اسحٰق کے پاس ان کے لیے مکمل و مسلسل سند بھی نہیں ہے اس لیے "بلغنی" کہہ کر بیان کرتا ہے اور اس قسم کی روایات میں خواہ مخواہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا نام آ جانا اور تفسیری قصص و حکایات کو بغیر سند ان کی جانب منسوب کر دینا تو ایک عام بات ہوگئی ہے۔

یہ ہم نے اس لیے کہا کہ ہر دو واقعات اپنے تفصیلی جزئیات کے لحاظ سے غیر تاریخی ہیں بلکہ بعض تاریخی مسلمات کی تردید کرتے ہیں اور قرآن عزیز کے ظاہر سیاق کے بھی خلاف ہیں۔ چنانچہ مشہور محدث و مؤرخ حافظ عماد الدین بن کثیر تحریر فرماتے ہیں کہ پہلے اور دوسرے واقعہ پر تو یہ مشترک اعتراض واقع ہوتا ہے کہ شہر انطاکیہ ان چار مسیحی شہروں میں سے ہے جن کے متعلق باتفاق علماء سیر و تاریخ یہ ثابت ہے کہ وہ دعوت مسیح کے مرکز شمار کیے جاتے ہیں اس لیے کہ باختلاف زمانہ ان شہروں میں جس وقت دعوت مسیح علیہ السلام پہنچی ہے انہوں نے برضا و رغبت اس پر لبیک کہا ہے اور وہ مسیحی پیغام کے لیے مدد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ مسیحیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ چار مقامات مقدس مقامات ہیں اور بطریق (پاپائے اعظم) کا دار الخلافہ ① القدس (بیت المقدس) ② انطاکیہ، ③ اسکندریہ اور ④ روما (اٹلی) بیت المقدس اس لیے کہ وہ مسیح علیہ السلام کا وطن ہے اور انطاکیہ اس لیے کہ یہ پہلا شہر ہے جس کی کل آبادی ایک ہی وقت میں حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لائی اور اسکندریہ اس لیے کہ یہ پہلا شہر ہے جس کے باشندوں نے صلح و آشتی کے ساتھ یہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ و تاریخ ابن کثیر ج ۱ ص ۲۲۹۔ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۳ و تاریخ ابن کثیر ج ۱ ص ۲۲۹، ۲۳۰۔

Marfat.com

منظور کیا کہ مسیحی مقدسین بطریق (پوپ) مطران، اسقف، قسیس، شماس اور راہب [1] یہاں اپنے اختیارات کے ساتھ قیام کریں گے اور روما اس لیے کہ قسطنطین اعظم کا دارالسلطنت تھا کہ جس نے عیسائی مذہب کو نئے سانچے میں ڈھال کر فروغ دیا اور دعوت مسیح علیہ السلام سے قبل بھی کسی تاریخی شہادت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ انطاکیہ کسی زمانہ میں غضب الٰہی سے برباد و تباہ کر دیا گیا تھا اور بعد میں پھر بارونق شہر بن گیا۔ لہٰذا ہر دو اقوال کے مطابق اس واقعہ کو انطاکیہ سے وابستہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

اور قتادہ کی روایت پر مسطورہ بالا اعتراض کے علاوہ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ قرآن کا ظاہر سیاق یہ بتا رہا ہے کہ معذب بستی کی ہدایت کے لیے جو برگزیدہ انسان بھیجے گئے تھے وہ حضرت مسیح علیہ السلام یا کسی دوسرے نبی کے فرستادہ یعنی رسول خدا کے قاصد و ایلچی نہ تھے بلکہ براہِ راست خدا کے پیغمبر اور نبی تھے اس لیے کہ اگر وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے فرستادہ ہوتے تو قرآن عزیز ضرور اس جانب کوئی اشارہ کرتا مگر ایسا نہیں ہے، بلکہ تمام آیات میں ان کے متعلق لفظ اَرْسَلْنَا (ہم نے ان کو بھیجا) استعمال کیا گیا ہے بلکہ رسولوں اور شہر کے باشندوں کے مکالمے کے جملے تو جب ہی بغیر کسی تاویل کے واضح مطلب ادا کرتے ہیں جب کہ ان کو براہِ راست خدا کا رسول مانا جائے۔

وہ یہ کہ ان برگزیدہ انسانوں نے جب خود کو رسول ظاہر کیا تو اہل شہران پر وہی پرانا اعتراض وارد کرنے لگے جو ہمیشہ منکرین رسول کہتے چلے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا تم تو ہم ہی جیسے انسان ہو پھر رسول کیسے ہو سکتے ہو اور رحمان نے تم پر کچھ بھی نازل نہیں کیا تم جھوٹ کہتے ہو کہ تم پر خدا کا پیغام نازل ہوتا ہے پس اگر وہ خود خدا کے رسول نہیں تھے بلکہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری تھے تو بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جواب میں یہ نہ کہتے "اللہ خوب جانتا ہے کہ ہم تمہاری جانب رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں" بلکہ جواب یہ دیتے کہ "ہم تو خدا کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام کے قاصد ہیں اور تم کو دعوت حق دینے آئے ہیں۔ رہا انسان ہونے کا معاملہ تو اللہ کے پیغمبر انسان ہی ہوتے ہیں، فرشتے یا کسی اور مخلوق میں سے نہیں ہوتے"۔ [2]

ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس موقع پر ایک تیسرا اعتراض بھی کیا ہے مگر وہ چونکہ ہمارے نزدیک خود محل نظر ہے اس لیے نظر انداز کر دیا گیا۔

طبرانی نے معجم میں ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ تین ہستیاں ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی نقیب کہلاتی ہیں ایک موسیٰ علیہ السلام کے نقیب یوشع علیہ السلام دوسرے اصحاب یٰسین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نقیب اور تیسرے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقیب علی رضی اللہ عنہ۔

تو اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں سے ہی وابستہ ہے مگر محدثین کے نزدیک یہ حدیث ضعیف بلکہ نا قابل اعتماد ہے۔ اس لیے کہ اس کی سند میں ایک راوی حسین الاشقر ہے اور یہ کذاب اور متروک الحدیث ہے۔ [3]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اگرچہ اس واقعہ سے متعلق کوئی روایت نہیں بیان فرمائی مگر انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ میں اس واقعہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مقدم رکھا ہے اور آیت کو نقل کر کے صرف حل لغات کر دیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن کثیر اور امام بخاری

---

[1] پادریوں کے مناصب اور عہدے ہیں۔

[2] تفسیر ابن کثیر سورۂ یٰسین ج ۳ و فتح الباری ج ۶۔

[3] فتح الباری ج ۶۔

Marfat.com

کا رجحان یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل [1] کا ہے اور غالباً یہی صحیح ہے۔

الحاصل واقعہ کی جزئی تفصیلات کچھ بھی ہوں قرآن نے اس سلسلہ میں جو حصہ نقل کیا ہے وہ اس مقصد عظمیٰ کو پورا کرتا اور اہل مکہ اور ارباب بصیرت کو عبرت بصیرت کی دعوت دیتا ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں اور خاتم الانبیاء ﷺ کے پیغام رشد و ہدایت سے اصحاب قریہ کی طرح منہ موڑ کر خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ کا سبب نہ بنیں، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَلْبَابِ۔

رحمان:

اصحاب قریہ اگرچہ مشرک اور بت پرست تھے مگر ان میں مذہب حق کی کچھ جھلک موجود تھی اور ان کے یہاں رحمان کا تصور پایا جاتا تھا کیا عجب ہے کہ بمصداق آیت: ﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ (الفاطر: ٢٤) کوئی قوم ایسی نہیں کہ جہاں ہمارا نذیر نہ پہنچا ہو وہ اس دعوت سے قبل عرصہ تک کسی پیغمبر صادق کے پیرو رہے اور آہستہ آہستہ زمانہ دراز کے بعد شرک میں مبتلاء ہو گئے ہوں۔

موعظت:

① ہدایت وضلالت کے معاملہ میں ہمیشہ سے اہل باطل کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ خدا کا پیغمبر انسان نہیں ہونا چاہیے بلکہ کسی مافوق الفطرت ہستی کو "رسول اللہ" ہونا چاہیے اسی لیے قوم نوح علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ کی امت دعوت تک ہر ایک گروہ نے سب سے پہلے اسی پر تعجب یا نفرت کا اظہار کیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہماری ہی طرح کا انسان اور لوازمات بشری کا محتاج انسان خدا کا پیغمبر ہو۔ چنانچہ اصحاب قریہ کی طرح محمد ﷺ سے مشرکین مکہ نے بھی یہی کہا:

﴿مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ (الفرقان: ٧)

"یہ کیسا رسول ہے کہ ہماری طرح کھاتا پیتا اور ہماری ہی طرح بازاروں میں چلتا پھرتا ہے"۔

﴿اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا﴾ (التغابن: ٦)

"کیا انسان ہماری ہدایت کریں گے"۔

﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾

(بنی اسرائیل: ٩٤)

"اور حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی اللہ کی ہدایت (دنیا میں) ظاہر ہوئی تو صرف اسی بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا کہ متعجب ہو کر کہنے لگے کیا اللہ نے (ہماری طرح کا) ایک آدمی پیغمبر بنا کر بھیج دیا ہے"۔

مگر ان کے اس جاہلانہ سوال کا قرآن عزیز نے یہ فیصلہ کن جواب دے کر ہمیشہ کے لیے اس بحث کا خاتمہ کر دیا:

---

[1] فتح الباری ج ٦ وتفسیر ابن کثیر ج ٣۔

Marfat.com

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝﴾

(بنی اسرائیل: ۹۵)

"اے پیغمبر! کہہ دے کہ اگر ایسا ہوتا کہ زمین میں انسانوں کی جگہ فرشتے بسے ہوتے اور اطمینان سے چلتے پھرتے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے ایک فرشتہ پیغمبر بنا کر اتار دیتے"۔

یعنی اس سوال کی بنیاد ہی بے وقوفی پر مبنی ہے اس لیے کہ جب دنیا میں انسان بس رہے ہیں اور فرشتوں کی آبادیاں نہیں ہیں تو پھر ان کی ہدایت کے لیے رسول اور پیغمبر بھی انسان ہی ہونا چاہیے نہ کہ فرشتہ۔

② جہاں شر و فساد اور فتنہ و گمراہی کے جراثیم بہ کثرت موجود ہوتے ہیں وہاں خیر و سعادت کی بھی کوئی روح ضرور نکل آتی ہے اور وہ کلمہ حق کی تائید میں جان کی بازی لگا دینے سے بھی گریز نہیں کرتی چنانچہ جس طرح اصحاب یٰسین کی حمایت میں شہر کے آخری حصہ سے ایک نیک مرد نکل آیا اور اس نے اپنی قوم کو نصیحت کی اور اس صلہ میں جان دی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قیام مصر کے زمانہ میں بھی شہر کے دور دراز سے ایک نیک مرد بھاگ کر آیا تھا اور اس نے موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت جان کے لیے نیک صلاح دے کر اپنا فرض ادا کیا تھا، ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝﴾۔

③ حق و باطل کے معرکہ میں حق کی حقانیت اور باطل کی بطالت کا ایک کھلا ہوا مظاہرہ یہ ہوتا ہے کہ حق جوں جوں دلائل و براہین کی روشنی میں اپنی صداقت کو جلوہ گر کرتا جاتا ہے باطل اسی درجہ زیادہ مشتعل ہو کر اور حق کی روشنی سے خیرہ ہو کر دلائل کی جگہ جنگ و جدل پر آمادہ ہو جاتا ہے مگر حق کے پرستار اس کی مطلق پرواہ نہیں کرتے بلکہ وفور جوش اور والہانہ شوق کے ساتھ حق پر جان قربان کر دیتے ہیں، چنانچہ اصحاب قریہ کا واقعہ اس کی بولتی ہوئی شہادت ہے۔

حضرت لقمان

(۳۰۰۰ ق م)

○ لقمان ○ قرآن عزیز اور حضرت لقمان ○ نبوت یا حکمت چند تفسیری مطالب ○ حکمت لقمان ○ مواعظ

لقمان:

لقمان یا حکیم لقمان، اہل عرب کے یہاں ایک مشہور شخصیت ہے لیکن اس کے باوجود ان کے حالات اور خاندان ونسب سے متعلق مختلف اقوال پائے جاتے ہیں اور اس اتفاق کے علاوہ کہ وہ ایک بہت بڑے دانا (حکیم) تھے اور ان کے حکیمانہ اقوال صحیفہ لقمان کے نام سے ان کے درمیان معروف ومشہور تھے ان سے متعلق باقی امور میں متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔

اور یہ اس لیے کہ تاریخ قدیم میں لقمان نام کی ایک اور شخصیت کا پتہ چلتا ہے جو عاد ثانیہ (قوم ہود علیہ السلام) میں ایک نیک بادشاہ ہو گزرا ہے اور خالص عرب نژاد ہے۔ ابن جریر، ابن کثیر، سہیلی جیسے مؤرخین کی رائے یہ ہے مشہور لقمان حکیم افریقی النسل تھا اور عرب میں ایک غلام کی حیثیت میں آیا تھا، چنانچہ یہ حضرات اس کا نسب نامہ اور حلیہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہو لقمان بن عنقا بن سندون او لقمان بن ثار بن سندون۔ ❶

"وہ لقمان بن عنقا یا ثار بن سندون ہے"۔

اور کہتے ہیں کہ وہ سوڈان کے نوبی قبیلہ سے تھا اور پستہ قد، بھاری بدن، سیاہ رنگ تھا۔ ہونٹ موٹے اور ہاتھ پیر بھدے تھے، مگر نہایت نیک، عابد وزاہد، صاحب حکمت اور دانا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حکمت سے حصہ وافر عطاء فرمایا تھا اور بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں عہدہ قضاء پر مامور ہو گیا تھا۔

عن ابن عباس قال کان عبدًا حبشیًا نجارًا وعن جابر بن عبد اللہ، قال کان لقمان قصیرًا افطش من النوبۃ۔ ❷

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے فرماتے تھے کہ لقمان حبشی غلام تھے اور نجاری کا پیشہ کرتے تھے اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لقمان پستہ قد، موٹے ہونٹ والے نوبہ کے قبیلے سے تھے"۔

وعن سعید بن المسیب کان لقمان من سودان مصر ذو شافر اعطاہ اللہ الحکمۃ ومنعہ النبوۃ۔ ❸

"اور سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لقمان مصری سوڈانی تھے اور ان کے ہونٹ بہت موٹے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اگرچہ نبوت نہیں عطاء کی مگر حکمت ودانائی سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا"۔

---

❶ روض الانف ج ا و ابن کثیر ج ۲ و تفسیر ابن کثیر ج ۳ ❷ ایضا ❸ تاریخ ابن کثیر ج ۲

عن عبد الرحمن بن حرملہ قال جاء اسود الی سعید بن المسیب یسألہ فقال لہ سعید لا تحزن من اجل انک اسود فانہ کان من اخیر الناس ثلثۃ من السودان بلال و مھجع مولیٰ عمر و لقمان الحکیم کان اسود نوبیا ذا شافر۔ ①

"عبد الرحمان بن حرملہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک حبشی سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے پاس آنکلا اور کچھ سوال کیا، انہوں نے فرمایا تو اس بات سے دل گیر نہ ہو کہ کالا حبشی ہے اس لیے کہ سوڈانیوں میں تین آدمی دنیا کے بہترین انسان ہوئے ہیں: بلال رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ کا غلام مجع اور لقمان حکیم جو سوڈانی نوبی تھے اور ان کے لب بہت موٹے اور بھدے تھے۔"

اور مشہور مؤرخ اور صاحب مغازی محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ لقمان حکیم عرب کے مشہور قبیلہ عاد سے یعنی عرب بائدہ کی نسل سے تھے اور غلام نہ تھے بلکہ بادشاہ تھے۔

قال وھب فلما مات شداد بن عاد صار الملک الی اخیہ لقمان بن عاد و کان اعطی اللہ لقمان مالم یعط غیرہ من الناس فی زمانہ اعطاہ حاسۃ مائۃ رجل و کان طویلا لا یقارب اھل زمانہ.

"وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ جب شداد بن عاد کا انتقال ہو گیا تو حکومت اس کے بھائی لقمان بن عاد کو ملی اور اللہ تعالیٰ نے لقمان کو وہ چیز عطاء فرمائی جو اس زمانہ کے انسانوں میں کسی کو نہیں عطا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کو سو انسانوں کے برابر ادراک و حاسہ عطاء فرمایا تھا اور وہ اپنے زمانہ کے لوگوں میں سب سے زیادہ طویل قامت تھے۔"

قال ابن وھب قال ابن عباس کان لقمان بن عاد بن الملطاط بن السلک بن وائل بن حمیر نبیا غیر مرسل. ②

"وہب کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ لقمان بن عاد کا نسب نامہ یہ ہے: ملطاط بن سلک بن وائل بن حمیر اور وہ نبی تھے مگر رسول نہیں تھے۔"

اور لطف یہ ہے کہ ابن جریر اور ابن کثیر بھی اپنی تائید میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہی کا قول نقل کرتے ہیں اور ابن اسحاق بھی ان ہی کے قول کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں اور معاصر مؤرخین میں سے مصنف ارض القرآن یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ لقمان حکیم اور لقمان بادشاہ ایک ہی شخصیت ہے اور وہ بلاشبہ عاد ثانیہ کے نیک بادشاہوں میں اور بہت بڑے حکیم و دانا تھے اور عرب میں لقمان کے نام سے جو "صحیفہ" منسوب تھا وہ ان ہی لقمان عاد کا ہے اور وہ اپنے اس دعوے کے مختلف دلائل میں سے ایک دلیل یہ دیتے ہیں کہ شاعر جاہلی سلمیٰ بن ربیعہ کے یہ اشعار اس حقیقت کو بخوبی واضح کرتے ہیں:

اھلکن ضسما و بعدہ غذی بھم و ذا جدون   واھل جاش و مارب "وحی لقمان" والتقون

"حوادث زمانہ نے قبیلہ طسم کو اور اس کے بعد ذا جدون شاہ یمن کو اہل جاش و مارب کو اور قبیلہ لقمان کو مٹا دیا۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"اس دوسرے شعر سے نہ صرف لقمان کا عرب ہونا ظاہر ہوتا ہے بلکہ ایک قبیلہ کا مالک، یمن کا باشندہ اور عظمت و شوکت میں سبا کا متابل اور یہ تمام باتیں لقمان عاد پر صادق آتی ہیں۔"

---

① کتاب التیجان ص ۰۰ ② ....

Marfat.com

عاد کا ایک کتبہ جو ۱۸ اھ میں ملا تھا، اس میں چند حسب ذیل فقرے ہیں:

"ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے ہیں جو کمینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا دینے والے تھے اور ہود علیہ السلام کی شریعت کے مطابق ہمارے واسطے پیدا ہوتے تھے اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے"۔

"کیا ہم ان آخری الفاظ سے جو کاغذ پر نہیں پتھر پر لکھے پائے گئے ہیں یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے ہیں کہ صحیفہ لقمان، لقمان کے اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے ہوئے تھے"۔ [1]

قرآن عزیز اور حضرت لقمان:

حضرت لقمان کا ذکر قرآن عزیز نے بھی کیا ہے اور قرآن کی ایک سورۃ کا نام اسی تقریب سے سورہ لقمان ہے اور اگرچہ اس نے اپنے پیش نظر مقصد کی خاطر ان کے نسب و خاندان کی بحث میں جانا پسند نہیں کیا تاہم ان کے حکیمانہ مقولات کا جس انداز میں ذکر کیا ہے اس سے لقمان کی شخصیت پر ایک حد تک روشنی ضرور پڑتی ہے، اس لیے مناسب ہے کہ اس کو بیان کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا جائے کہ مسطورہ بالا ہر دو راویوں میں سے کون سی رائے صحیح یا قرین قیاس ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَ مَنْ یَّشْكُرْ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ﴿۱۲﴾ وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ یَعِظُهٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؔؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾ وَ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیْكَ ؕ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ ﴿۱۴﴾ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤی اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا ؗ وَّ اتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾ یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ﴿۱۶﴾ یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَ اْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ انْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اصْبِرْ عَلٰی مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾ وَ لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿۱۸﴾ وَ اقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَ اغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ ﴿۱۹﴾﴾ (لقمان: ۱۲-۱۹)

"اور بلاشبہ ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی (اور کہا کہ) اللہ کا شکر ادا کرو پس جو شخص اس کا شکر ادا کرتا ہے وہ اپنے نفس کے فائدہ کے لیے کرتا ہے اور جو کفر کرتا ہے تو اللہ بے پرواہ ہے مالک حمد ہے اور جس وقت لقمان نے اپنے بیٹے سے نصیحت کرتے ہوئے کہا اے میرے بیٹے اللہ کا شریک نہ ٹھہرا بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے اور ہم نے حکم کیا انسان کو اس کے

[1] ارض القرآن ج ا ص ۱۸۱، ۱۸۲

ماں باپ کے بارے میں "کہ اٹھاتی ہے اس کو اس کی ماں تکلیف در تکلیف جھیل کر اور دو برس کے اندر دودھ پلاتے رہنا" یہ کہ میرا شکر گزار بن اور اپنے والدین کا شکر گزار ہو، آخر میری ہی جانب لوٹنا ہے اور اگر تیرے ماں باپ تجھ پر سختی کریں اس بارہ میں کہ میرا شریک ٹھہرا کہ جس کے متعلق وہ نادانی اور جہالت میں ہیں تو اس میں ان دونوں کی پیروی نہ کر اور دنیوی زندگی میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کر اور پیروی اس شخص کی کر کہ جو صرف میری ہی جانب رجوع کرتا ہے پھر میری ہی جانب تم سب کو لوٹنا ہے۔ پس میں اس وقت تم کو تمہارے کیے کی خبر دوں گا"۔ اے میرے بیٹے! بلاشبہ اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی چیز چھوٹی ہوتی ہے اور وہ پتھر کے اندر یا آسمانوں یا زمینوں میں کہیں بھی ہو اللہ اس کو لے آتا ہے۔ بے شک اللہ دقیق مشاہدہ کرنے والا اخبردار ہے۔ اے میرے بیٹے! قائم کر نماز کو اور حکم کر بھلائی کا اور برائی سے منع کر اور جو تجھ پر پڑے اس پر صبر کر، بلاشبہ یہ عزائم امور میں سے ہے اور تو اپنے رخساروں کو لوگوں سے (ازراہ تکبر) نہ پھیر اور زمین پر اترا کر نہ چل بے شبہ اللہ تعالیٰ کسی تکبر اور شیخی کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر و اور اپنی آواز کو نرم و پست کر۔ بے شبہ گدھے کی آواز بہت ہی ناپسندیدہ آواز ہے"۔

ان آیات میں لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصائح کی ہیں اور حکمت و دانائی کی باتیں بتائی ہیں ان میں ان باتوں پر بھی زور دیا ہے کہ ① لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق کے ساتھ پیش آنا چاہیے یہ نہ ہو کہ از راہ غرور منہ موڑ لیا جائے۔ ② اور نہ خدا کی زمین پر اکڑ کر چلو، یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ خدائے تعالیٰ مغرور اور اکڑنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ ③ ہمیشہ رفتار میں متواضعانہ میانہ روی قائم رہنی چاہیے۔ ④ اور آواز کو گفتگو میں نرم رکھو اس لیے کہ چیخنا چلانا انسانوں کا کام نہیں ہے، اگر کرخت اور بے وجہ بلند آواز پسندیدہ چیز ہوتی تو گدھے کی آواز قابل ستائش سمجھی جاتی حالانکہ اس کی آواز بدترین آواز شمار ہوتی ہے۔

حکیم لقمان اگر غلام ہوتے تو اپنے بیٹے غلام زادہ کو یہ نصائح نہ کرتے اس لیے کہ غرور ونخوت، خود بینی و شیخی، کرختگی و خشونت ایسے اوصاف ہیں جو بادشاہوں، شاہزادوں، متمول و صاحب اقتدار انسانوں کے اندر ہی کثرت سے پائے جاتے ہیں اور یہ ناخدا ترس اور نشہ دولت میں چور دولت مندوں ہی کا شیوہ ہو سکتا ہے اور یہ وہ تمام اوصاف و عادات ہیں جو عموماً متکبرین اور جبابرہ کے لیے مخصوص ہیں، غلام اور غلام زادہ کے لیے نہ ان کا موقع ہے اور نہ فرصت، کیونکہ ان کا وقت عزیز تو دوسروں کی نیاز مندی اور خدمت گزاری ہی کے لیے وقف ہوتا ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی لیے یہ فرمایا ہے:

تواضع زگردن فرازاں نکوست گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

اس تفصیل کے بعد جو کہ قرآن عزیز سے ماخوذ ہے اب ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ لقمان حکیم اور لقمان عاد ایک ہی شخصیت ہے اور وہ عاد ثانیہ کے نیک نفس بادشاہ اور حضرت ہود علیہ السلام کے پیرو تھے اور حبشی الاصل نہیں بلکہ عربی الاصل تھے اور صاحب سیرت محمد بن اسحاق کی نقل اور شاعر جاہلی سلمی بن ربیعہ کی شہادت اس مسئلہ میں صحیح اور راجح ہیں اور عاد ثانیہ کے زمانہ کے حجری کتبہ میں جو کہا گیا ہے اس سے مراد وہی صحیفہ لقمان ہے جو عرب میں مشہور و معروف تھا۔

ممکن ہے کہ اس موقعہ پر ان مرفوعہ روایات کو پیش کر کے ہمارے دعوے کی تردید کی جائے جن میں نبی اکرم ﷺ سے یہ منقول ہے کہ لقمان حکیم حبشی الاصل تھے۔ مگر واضح رہے کہ صاحب جرح و تعدیل محدثین نے ان روایات کے رفع کو صحیح تسلیم نہیں کیا

Marfat.com

اوران میں سے بعض کو ضعیف اور منکر قرار دیا ہے یعنی محدثین کے نزدیک نبی اکرم ﷺ سے یہ منقول نہیں ہے کہ لقمان حبشی غلام تھے۔

نبوت یا حکمت:

اگرچہ محمد بن اسحاق کی روایت "عن ابن عباس رضی اللہ عنہما" میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت لقمان نبی تھے لیکن قرآن عزیز کا اسلوب بیان اس کی موافقت نہیں کرتا۔ اس لیے کہ سورۂ لقمان میں باوجود اس امر کے کہ ان کی بعض حکیمانہ نصائح اور بلیغانہ وصایا کا ذکر بصراحت مذکور ہے لیکن کسی ایک جملہ میں بھی ایسا اشارہ نہیں پایا جاتا کہ جو ان کی "نبوت" پر دلالت کرتا ہو اسی لیے جمہور کی رائے اس کے خلاف ہے بلکہ خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی دوسرا قول اس قول کے خلاف مذکور ہے، چنانچہ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تاریخ میں فرماتے ہیں:

والمشهور عن الجمهور انه كان حكيمًا وليًا و لم يكن نبيًا و قد ذكره الله تعالى في القران فاثنى عليه وحكى من كلامه فيما وعظ به ولده الذى هو احب الخلق اليه۔ [1]

"اور جمہور کا مشہور قول یہ ہے کہ لقمان خدا کے ولی اور حکیم دانا تھے نبی نہیں تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کا قرآن میں ذکر کیا ہے اور ان کی تعریف کی اور ان کے اس کلام کو بیان کیا جس میں انہوں نے اپنے بیٹے کو جو کہ خدا کی مخلوق میں ان کے لیے سب سے زیادہ محبوب تھا نصیحت کی ہے"۔

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ﴾ قال يعني الفقه والاسلام ولم يكن نبيا ولم يوح اليه و هكذا نص على هذا غير واحد من السلف منهم مجاهد و سعيد بن المسيب و ابن عباس. والله اعلم۔ [2]

"﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ﴾ یعنی دانائی اور اسلام اور وہ نبی نہیں تھے اور نہ ان پر وحی نازل ہوئی اور بہت سے سلف سے یہی ثابت ہے مثلاً مجاہد سعید بن مسیب اور ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ"۔

چند تفسیری مطالب:

① حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو سب سے پہلے جو اہم نصیحت کی وہ شرک باللہ سے اجتناب اور توحید کا التزام ہے کیونکہ "دین حق" میں یہی وہ حقیقت ہے جو حنیف کو مشرک سے ممتاز کرتی ہے اور شرک ہی ایسا گناہ ہے جو کسی حالت میں بھی قابل بخشش نہیں مگر یہ کہ اس سے تائب ہو جائے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ (النساء: ۴۸)

"بے شک جو خدا کے ساتھ شریک کرتا ہے اس کو خدائے تعالیٰ نہیں بخشے گا اور کفر و شرک کے علاوہ گناہ جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا"۔

② حضرت لقمان نے شرک کو "ظلم عظیم" فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں بخاری کی ایک روایت ہے، وہ یہ کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

---

[1] ابن کثیر ج ۱ ص ۱۲۵ [2] ایضاً

Marfat.com

﴿ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ﴾ (سورۃ الانعام:۸۲)

"خدا کی مغفرت ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا"۔

تو صحابہ رضی اللہ عنہم پر یہ بات بہت شاق گزری اور انہوں نے خدمت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ایسا تو کوئی شخص بھی نہ ہوگا جس نے خدائے تعالیٰ کے احکام کے پیش نظر کچھ نہ کچھ ظلم نہ کیا ہو، تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انه لیس بذالك الم تسمع الی قول لقمان ﴿ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ۝۱۳ ﴾ [1]

آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کیا تم نے لقمان کا یہ قول نہیں سنا: "اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرا بلاشبہ شرک بہت بڑا ظلم ہے"۔

مطلب یہ ہے کہ آیت ﴿ لَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ﴾ میں ظلم سے مراد "شرک" ہے نہ کہ معصیت صغائر و کبائر۔

③ سورہ لقمان میں ﴿ وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ ﴾ سے ﴿ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴾ تک اور پھر ﴿ یٰبُنَیَّ ﴾ سے ﴿ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ ﴾ تک حضرت لقمان کے مقولات بیان کیے گئے ہیں اور درمیان میں ﴿ وَ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ ﴾ سے ﴿ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ تک بطور جملہ معترضہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے تو اس کے لیے وجہ مناسبت یہ ہے کہ جب قرآن نے ایک ایسے واقعہ کا ذکر کیا جس میں باپ نے بیٹے کو پند و نصائح کیے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے امت مرحومہ کو یہ نصیحت کرنا ضروری سمجھا کہ جب کہ باپ اور ماں کی محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ دنیوی اور اخروی کسی معاملہ میں بھی اولاد کو بے راہ دیکھنا نہیں چاہتے تاکہ انجام کار اولاد کو دکھ جھیلنا نہ پڑے تو اولاد کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ خدا کی صحیح اور حقیقی معرفت کے بعد سب سے زیادہ والدین کی خدمت اور ان کی رضاء جوئی کو مقدم سمجھے حتیٰ کہ اگر والدین کافر و مشرک ہوں تب بھی اس کا فرض ہے کہ ان کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک تواضع اور نیاز مندی کو ہاتھ سے نہ دے۔ البتہ اگر وہ دین حق سے اعراض اور شرک کے اختیار پر اصرار کریں تو اس کو قبول نہ کرے اس لیے کہ خدا کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت بھی درست نہیں ہے، چنانچہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ((لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق)) لیکن اس معاملہ میں بھی اپنے انکار کے وقت نرمی اور حسن خطابت کو نہ چھوڑے اور درشت کلامی اختیار نہ کرے۔

④ سورہ لقمان میں جو نصائح مذکور ہیں ان میں حسن خلق اور تواضع کی ترغیب اور کبر، شیخی اور بد خلقی کی مذمت کی گئی ہے۔ حضرت لقمان نے امر و نہی میں ان باتوں کو خصوصیت کے ساتھ اس لیے انتخاب فرمایا ہے کہ کائنات میں جس قدر بھی بھلائی اور برائی پیش آتی ہے ان سب کی جڑ اور بنیاد یہی امور ہیں، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی امت مرحومہ کو ان امور کی اہمیت پر بہت زیادہ توجہ دلائی ہے۔

حسن خلق:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت لاتمم حسن الاخلاق۔ [2]

---

[1] بخاری کتاب التفسیر [2] موطا امام مالکؒ

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بے شبہ میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ محاسن اخلاق کو درجہ کمال تک پہنچاؤں"۔

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قیل یا رسول اللہ ﷺ ای المؤمن افضل قال احسنھم خلقًا عن انس قال رسول اللہ ﷺ ان العبد لیبلغ بحسن خلقه درجات الآخرة و شرف المنازل و انه لضعیف العبادة و انه لیبلغ بسوء خلقه درك جهنم وهو عابد۔

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ کون سا مسلمان سب سے زیادہ صاحب فضیلت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو ان میں سب سے زیادہ حسن اخلاق رکھتا ہے وہی سب سے زیادہ افضل ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ ایک بندہ باوجود عبادت میں کمزور ہونے کے اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے آخرت کے بلند درجات اور منازل علیا کو حاصل کر لیتا ہے اور عابد ہونے کے باوجود بدخلقی کی وجہ سے جہنم پاتا ہے"۔

وقال میمون بن مهران عن رسول اللہ ﷺ ما من ذنب اعظم عند اللہ من سوء الخلق۔

"میمون بن مہران نبی اکرم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے نزدیک بدخلقی سے زیادہ بڑا کوئی گناہ نہیں ہے"۔

تواضع:

قال رسول اللہ ﷺ طوبی للاتقیاء الاثریاء الذین اذا حضروا لم یعرفوا و اذا غابوا لم یتفقدوا و اولئك مصابیح مجردون من كل فتنة غبرآء مشتته۔

"رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بشارت ہے نیکوکار بےنفس لوگوں کے لیے جن کی حالت یہ ہے کہ مجلس میں موجود ہوں تو کوئی تعارف نہ کرے اور جب غائب ہو جائیں تو کوئی تلاش نہ کرے۔ یہی ہیں روشن چراغ اور ہر تاریک و پراگندہ فتنہ سے محفوظ"۔

کبر وغرور:

عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: ((لا یدخل الجنة من كان فی قلبه مثقال ذرة من كبر))۔

"عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنت میں وہ شخص ہرگز داخل نہ ہوگا جس کے قلب میں ذرہ کی مقدار بھی غرور و کبر ہوگا"۔

عن عبداللہ بن عمرو قال رسول اللہ ﷺ من كان فی قلبه مثقال ذرة من كبر اكبه اللہ علی وجهه

بیہقی ✿ معجم طبرانی مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۵، تفسیر ابن کثیر

تفسیر ابن کثیر ج ۳ ✿ اصحاب السنن

فی النار. ❶

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر ہے اس کو اللہ تعالیٰ جہنم میں اوندھے منہ گرا دے گا"۔

عن بریدة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من جر ثوبه خیلاء لم ینظر اللہ الیه. ❷

"حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص اپنے لباس کو از راہِ غرور زمین پر کھینچتا ہوا چلتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی جانب نظر رحمت سے نہ دیکھے گا"۔

⑤ حضرت لقمان نے درشت اور کرخت آواز سے بات چیت کرنے کو بھی منع فرمایا ہے اور یہ بھی واضح بات ہے اس لیے کہ نرم گفتاری حسن خلق کا شعبہ اور درشت و کرخت لہجہ بد خلقی کا جز ہے، اور اسی بناء پر اس طرز گفتگو کو "صوت حمار" سے مشابہ بتایا گیا اور نہیق حمار کے متعلق یہ حدیث بہت معروف و مشہور ہے:

عن ابی هریرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا سمعتم صیاح الدیکة فاسئلوا اللہ من فضله و اذا سمعتم نهیق الحمیر فتعوذوا باللہ من الشیطان فانها رات شیطانًا. ❸

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم مرغ کی آواز سنو تو اللہ تعالیٰ سے فضل طلب کرو اور گدھے کی آواز سنو تو شیطان سے پناہ مانگو اس لیے کہ وہ شیطان کو دیکھ کر آواز کرتا ہے"۔

یعنی مرغ کی آواز ملائکۃ اللہ کے نزول کی دلیل ہے کیونکہ وہ سحر میں تسبیح کا عادی ہے اور حمار کی آواز نزول شیطان کا پتہ دیتی ہے اس لیے کہ ہر مکروہ اور فطرت سلیم کو ناگوار شے شیطان کے لیے محبوب ہے۔

⑥ حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو جو نصائح کی ہیں ان میں یہ بھی کہا ہے کہ "زمین پر اکڑ کر نہ چلو" اس مضمون کو قرآن عزیز نے دوسری جگہ عجیب انداز سے بیان کیا ہے:

﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ﴾ (بنی اسرائیل:۳۷)

"اور زمین پر اتراتا ہوا نہ چل تو اپنے اس انداز رفتار سے نہ زمین کو پھاڑ سکے گا اور نہ پہاڑوں کی چوٹیوں تک طویل ہو جائے گا"۔

مغرور انسان کے انداز رفتار کو کس معجزانہ بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہے گویا وہ اس طرح چلتا ہے کہ اپنی اکڑی ہوئی بلند گردن کے ذریعہ پہاڑوں کی بلندی سے بھی اونچا ہو جانا چاہتا ہے اور قدم کو اس طرح زمین پر رکھتا ہے کہ گویا اس کو پھاڑ ڈالے گا۔ مگر یہ نہیں سمجھتا کہ وہ ان میں سے کوئی بات بھی نہ کر سکے گا پھر بلا وجہ اکڑ کر چلنے کے کیا معنی؟

اور اس کے برعکس متواضع اور با اخلاق انسانوں کی یہ کیفیت ہے کہ

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا ﴾ (الفرقان:۶۳)

❶ اصحاب السنن ❷ مسلم ❸ تفسیر ابن کثیر ج ۸ ص ۱۱

Marfat.com

"اور جو رحمان کے بندے (یعنی حکم بردار بندے) ہیں وہ زمین پر وقار اور تواضع کے ساتھ چلتے ہیں اور جب ان سے جاہل لوگ مخاطب ہوتے ہیں تو وہ (جہالت سے بچنے کے لیے) السلام کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں"۔

حکمت لقمان:

گزشتہ سطور میں یہ ذکر آچکا ہے کہ عرب میں حکمت لقمان کا کافی چرچا تھا اور وہ اکثر مجالس میں ان کے حکیمانہ اقوال کو نقل کرتے رہتے تھے چنانچہ تابعین صحابہ بلکہ نبی اکرم ﷺ سے بھی اس سلسلہ کے بعض اقوال منقول ہیں اور ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:-

① حکمت و دانائی مفلس کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔ ② جب کسی مجلس میں داخل ہو تو اوّل سلام کرو پھر ایک جانب بیٹھ جاؤ اور جب تک اہل مجلس کی گفتگو نہ سن لو خود گفتگو شروع نہ کرو، پس اگر وہ خدا کے ذکر میں مشغول ہوں تو تم بھی اس میں سے اپنا حصہ لے لو اور اگر وہ فضولیات میں مشغول ہوں تو وہاں سے علیحدہ ہو جاؤ اور دوسری کسی عمدہ مجلس کو حاصل کرو۔ ③ اللہ تعالیٰ جب کسی کو امانت دار بنائے تو امین کا فرض ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرے۔ ④ اے بیٹے! خدا تعالیٰ سے ڈر اور ریاکاری سے خدا کے ڈر کا مظاہرہ نہ کر کہ لوگ اس وجہ سے تیری عزت کریں اور تیرا دل حقیقتاً گنہگار ہے۔ ⑤ اے بیٹے! جاہل سے دوستی نہ کر کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ تجھ کو اس کی جاہلانہ باتیں پسند ہیں اور دانا کے غصہ کو بے پرواہی میں نہ ٹال کہ کہیں وہ تجھ سے جدائی نہ اختیار کر لے۔ ⑥ واضح رہے کہ داناؤں کی زبان میں خدا کی طاقت ہوتی ہے، ان میں سے کوئی کچھ نہیں بولتا مگر یہ کہ اس بات کو اللہ تعالیٰ اسی طرح کرنا چاہتا ہو۔ ⑦ اے بیٹے! خاموشی میں کبھی ندامت اٹھانی نہیں پڑتی اور اگر کلام چاندی ہے تو سکوت سونا ہے۔ ⑧ بیٹا ہمیشہ شر سے دور رہو تو شر تم سے دور رہے گا، اس لیے کہ شر سے ہی شر پیدا ہوتا ہے۔ ⑨ بیٹا غیظ و غضب سے بچو اس لیے کہ شدت غضب دانا کے قلب کو مردہ بنا دیتی ہے۔ ⑩ بیٹا! خوش کلام بنو، طلاقت وجہ اختیار کرو تب تم لوگوں کی نظروں میں اس شخص سے بھی زیادہ محبوب ہو جاؤ گے جو ہر وقت ان کو داد و دہش کرتا رہتا ہے۔ ⑪ نرم خوئی دانائی کی جڑ ہے۔ ⑫ جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔ ⑬ اپنے اور اپنے والد کے دوست کو محبوب رکھو۔ ⑭ کسی نے لقمان سے دریافت کیا سب سے زیادہ صابر کون شخص ہے؟ کہا جس کے صبر کے پیچھے ایذا نہ ہو۔ پھر دریافت کیا سب سے بڑا عالم کون ہے؟ جواب دیا جو دوسروں کے علم کے ذریعہ اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے۔ پھر سوال کیا: سب سے بہتر آدمی کون ہے؟ فرمایا: "غنی"۔ سائل نے پھر کہا: غنی سے مالدار مراد ہے؟ جواب میں کہا: نہیں! بلکہ غنی وہ ہے جو اپنے اندر خیر کو تلاش کرے تو موجود پائے ورنہ خود کو دوسروں سے مستغنی رکھے۔ ⑮ کسی نے دریافت کیا بدترین انسان کون سا ہے؟ فرمایا: جو اس کی پرواہ نہ کرے کہ لوگ اس کو برائی کرتا دیکھ کر برا سمجھیں گے۔ ⑯ بیٹا تیرے دسترخوان پر ہمیشہ نیکوکاروں کا اجتماع رہے تو بہتر ہے اور مشورہ صرف علمائے حق ہی سے لینا۔ *

تفسیر ابن کثیر ج ۳، تاریخ ابن کثیر ج ۳ ماخوذ از امام احمد

Marfat.com

مواعظ:

① انسان اگر نبی معصوم اور پیغمبر بھی نہ ہو مگر حکمت و دانائی سے مشرف ہو تب بھی خدا کے نزدیک اس کا مرتبہ عظیم الشان ہے، اسی لیے حضرت لقمان کو یہ عزت ملی کہ خدائے تعالیٰ نے قرآن عزیز میں ان کی ثناء و توصیف فرمائی اور امت مرحومہ کے لیے ان کی بعض ان نصائح اور وصایا کو نقل فرمایا جو انہوں نے اپنے بیٹے کو کی تھیں حتیٰ کہ قرآن کی ایک سورۃ ان کے نام سے منسوب ہوئی۔

② شرک باللہ تمام بھلائیوں کو مٹا کر انسان کو خدا کے سامنے خالی ہاتھ لے جاتا ہے اس لیے ہمیشہ اس سے پرہیز لازم ہے۔ شرک جلی کی طرح شرک خفی بھی اعمال انسانی کو اس طرح کھا لیتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا لیتی ہے اور شرک خفی میں ریاء، نمائش اور شہرت پسندی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

③ والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی عظمت کو اسلام میں اس درجہ اہمیت حاصل ہے کہ قرآن عزیز نے ان کو رب مجازی کہا ہے اور ان کی خدمت اور ان کے سامنے سر نیاز جھکا دینے کو والدین کے اسلام و کفر دونوں حالتوں میں ضروری قرار دیا ہے اور اسی اہمیت کے پیش نظر جگہ جگہ اپنے حق یعنی توحید باللہ کے ساتھ ساتھ حقوق والدین کا ذکر کیا اور ان کو تمام حقوق پر مقدم رکھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:

﴿وَ قَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِیْمًا ﴿۲۳﴾ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا ﴿۲۴﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾﴾ (بنی اسرائیل: ۲۳-۲۵)

"اور حکم کر چکا تیرا رب کہ اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو، اگر پہنچ جائے تیرے سامنے بڑھاپے کو ان میں سے ایک یا دونوں تو ان کو "اُف" بھی نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے ادب کے ساتھ بات کرو اور ان کے سامنے عاجزی کے ساتھ کاندھے جھکا دو نیاز مندانہ طریقہ پر اور کہو اے ربّ! ان پر رحم کر جس طرح پالا انہوں نے مجھ کو چھوٹا سا۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے جو تمہارے جی میں ہے اگر تم نیک نفس ہو گے تو وہ رجوع ہونے والوں کو بخشتا ہے"۔

اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے متعلق احادیث تو بہت کثرت سے ذخیرۂ حدیث میں پائی جاتی ہیں حتیٰ کہ یہ کہا گیا ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ [1]

---

[1] نسائی شریف

اصحاب سبت

(۱۱۰۰ ق۔م تخمیناً)

○ قرآن عزیز اور اصحاب سبت ○ سبت اور اس کی حرمت ○ واقعہ کی تفصیلات تعین مقام ○ زمانہ حادثہ ○ چند تفسیری حقائق ○ حقیقت مسخ ○ مسخ شدہ اقوام کا انجام دنیوی ○ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عکرمہ کا مکالمہ ○ بصائر

قرآن عزیز اور اصحاب سبت:

قرآن عزیز میں اصحاب سبت کا ذکر سورۂ بقرہ، نساء، مائدہ اور اعراف میں کیا گیا ہے جس کی تفصیل ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہوتی ہے:

شمار	سورہ	آیات	عدد
۱	بقرہ	۶۵،۶۶	۲
۲	نساء	۴۷	۱
۳	مائدہ	۶۰	۱
۴	اعراف	۱۶۳،۱۶۶	۴،۸

سبت اور اس کی حرمت:

قصص القرآن کے گذشتہ مباحث میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے "دین حنیف" یعنی خدا کے سچے دین کی تعلیم کا سلسلہ ان کی دو شاخوں بنو اسمٰعیل اور بنو اسحاق کے ذریعہ قوموں اور ملکوں میں پھیلا ہے اس لیے ان دونوں سلسلوں میں "شعائر اللہ" کے متعلق یکساں اصول پائے جاتے ہیں مگر حضرت اسحاق علیہ السلام کے صاحبزادہ اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام کی اولاد نے جو کہ بنی اسرائیل کہلاتی ہے اپنے زمانہ کے انبیاء علیہم السلام سے اختلاف اور جھگڑے کر کے بعض معاملات میں تشدد اور سختی کے احکام اور بعض معاملات میں ملت ابراہیمی سے جدا احکام کا بار اپنے کاندھوں پر ڈال لیا تھا۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی امت میں عبادت الٰہی کے لیے ہفتہ کے سات دنوں میں سے جمعہ کا دن مقرر فرمایا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یہود، بنی اسرائیل نے اپنی روایتی کج روی کی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ اصرار کیا کہ ان کے لیے ہفتہ (سنیچر) کا دن "عبادت" و برکت کا دن مقرر کر دیا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو ان کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنے غلط اصرار سے باز آجائیں اور ملت ابراہیمی کے اس امتیاز کو جو

Marfat.com

خدائے برتر کے نزدیک پسندیدہ و مقبول ہے" ہاتھ سے ضائع نہ ہونے دیں لیکن جب ان کا اصرار حد سے متجاوز ہو گیا تو وحی الٰہی نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ اطلاع دی کہ خدائے تعالیٰ ان کے اصرار بے جا کے نتیجہ میں جمعہ کی سعادت و برکت کو ان سے واپس لے لیتا اور ان کے مطالبہ کو منظور کرتے ہوئے ان کے لیے ہفتہ (سنیچر) کو جمعہ کا قائم مقام بنائے دیتا ہے۔ لہٰذا اب آپ ان کو مطلع کر دیں کہ وہ اپنے اس مطلوبہ دن کی عظمت کا پاس و لحاظ کریں اور اس کی حرمت کو قائم رکھیں، ہم اس دن میں ان کے لیے خرید و فروخت زراعت و تجارت اور شکار کو حرام کرتے اور اس کو صرف عبادت کے لیے مخصوص کیے دیتے ہیں۔

قرآن عزیز نے بھی مختصر الفاظ میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے ہفتہ میں عبادت کے لیے ایک دن مخصوص کرنے کے متعلق اپنے پیغمبر (موسیٰ علیہ السلام) کے ساتھ کیا تھا:

﴿إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴾ (النحل: ۱۲۴)

"بیشک سبت کا دن ان لوگوں کے لیے (عبادت کا دن) مقرر کیا گیا جو اس کے متعلق جھگڑا کرتے تھے اور یقیناً تیرا رب ضرور قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا کہ جس کے متعلق وہ اختلاف کرتے تھے اس میں حق کیا تھا اور باطل کیا؟"

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے تقرر سبت (سنیچر) کے بعد بنی اسرائیل سے عہد و میثاق لیا کہ وہ اس کی حرمت کو برقرار رکھیں گے اور عبادت الٰہی کے سوا ان باتوں کو اس دن میں اختیار نہیں کریں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے ان پر حرام کر دیا ہے:

﴿وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا ﴾ (النساء: ۱۵۴)

"اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) سے کہا: سبت (ہفتہ) کے بارہ میں حد سے نہ گزرنا (خلاف ورزی نہ کرنا) اور ہم نے ان سے اس کے متعلق بہت سخت قسم کا عہد و پیمان لیا"۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہم دنیا میں سب سے آخر آنے والے آخرت میں سب سے مقدم ہوں گے خصوصاً اہل کتاب سے جو کہ ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں اور یہ (جمعہ کا دن) ہم سب سے پہلے ان اہل کتاب پر فرض کیا گیا تھا مگر انہوں نے اس کے متعلق اختلاف ظاہر کیا اور ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس (جمعہ کے دن) کو قبول کر لینے کی ہدایت و توفیق دی سو دنیا میں بھی وہ اس معاملہ میں ہم سے پیچھے رہ گئے اس لیے کہ یہود کا روز عبادت جمعہ سے ایک دن بعد (سنیچر) ہے اور نصاریٰ کا اس کے بعد (اتوار) کا دن ہے۔ ❶

عن ابی هریرة و حذیفة رضی الله عنهما قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ((اضل الله عن الجمعة من کان قبلنا فکان للیهود یوم السبت و کان للنصاری یوم الاحد فجاء الله بنا فهدانا الله لیوم الجمعة فجعل الجمعة والسبت والاحد و کذلک هم تبع لنا یوم القیٰمة نحن الاخرون من اهل الدنیا والاولون یوم القیٰمة

❶ بخاری۔ شاہ ولی اللہ نے اس حدیث کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ منجانب اللہ تو یہ حکم ہوا تھا کہ ہفتہ میں سے ایک روز عبادت کے لیے مقرر کر لو اور تعیین ایام کی فطرت پر چھوڑ دی گئی تھی چنانچہ تمام امم کے مقابلہ میں صرف ہم نے ہی جمعہ کا انتخاب کیا۔

Marfat.com

والمقضی بینھم قبل الخلائق))۔ ❶

"حضرت ابوہریرہ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو ہم سے پہلے گزر چکے جمعہ کے دن سے محروم کر دیا۔ سو یہود کے لیے سبت (سنیچر) کا دن ٹھہرا اور نصاریٰ کے لیے اتوار کا، پھر اللہ تعالیٰ نے ہم کو دنیا میں بھیجا اور جمعہ کے دن کے متعلق ہماری راہنمائی فرمائی اور اس طرح جمعہ سنیچر اور اتوار علیحدہ علیحدہ امتوں کے لیے مقرر ہو گئے لہٰذا اسی طرح یہ سب امتیں قیامت کے دن ہماری تابع ہوں گی اور ہم جو دنیا میں آخر میں ہیں قیامت میں پاداش عمل کے اعتبار سے مقدم ہوں گے اور تمام مخلوق سے قبل ہمارا ہی فیصلہ ہوگا"۔

سبت کی حرمت کے متعلق موسوی قانون میں بنی اسرائیل کو کیا ہدایات تھیں وہ تورات کے اس بیان سے بھی ظاہر ہوتی ہیں:

"پھر خداوند نے موسیٰ سے ہم کلام ہو کے کہا تو بنی اسرائیل کو فرما اور ان کو کہہ کہ تم میرے سبتوں کو مانو اس لیے کہ یہ میرے اور تمہارے درمیان تمہارے قرنوں میں نشانی ہے تاکہ تم جانو کہ خداوند تمہارا پاک کرنے والا ہوں پس تم سبت کو مانو اس لیے کہ وہ تمہارے لیے مقدس ہے جو کوئی اس کو پاک نہ جانے وہ ضرور مار ڈالا جائے جو اس میں کچھ کام کرے وہ اپنی قوم سے کٹ جائے۔ چھ دن کام کرنا لیکن ساتواں دن آرام کے لیے سبت ہے وہ خداوند کے لیے مقدس ہے۔ پس بنی اسرائیل سبت کو مانیں اور اسے اپنی پشت در پشت عہد ابدی جان کے اس میں آرام کریں میرے اور بنی اسرائیل کے درمیان یہ علامت ابدی ہے"۔ ❷

واقعہ کی تفصیلات:

غرض ایک طویل مدت تک یہود بنی اسرائیل اپنے مطلوبہ روز عبادت (سبت) کی عزت و حرمت میں خدا کے لیے ہوئے عہد و پیمان پر قائم رہے اور جن باتوں کو اس دن میں حرام کر دیا گیا تھا ان سے بچتے رہے، مگر آہستہ آہستہ ان کی کج روی اور متمردانہ سرکشی بروئے کار آتی گئی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ان احکامات کی" جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت سبت سے متعلق ان پر لازم کیے گئے تھے" خلاف ورزی شروع کر دی اور اگرچہ شروع میں یہ خلاف ورزی انفرادی اور خفیہ طریق پر ہوتی رہی مگر شدہ شدہ اس نے علی الاعلان جماعتی حیثیت اختیار کر لی اور بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ اس کو کیا جانے لگا، بلکہ بہانے حیلے تراش کر اپنی اس بدعملی پر فخر کیا جانے لگا، تب خدا کے عذاب نے ان کو آ پکڑا اور وہ ذلت و رسوائی کے ساتھ ہلاک کر دیے گئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد مبارک سے عرصہ دراز کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت بحر قلزم کے کنارے آباد ہو گئی تھی چونکہ یہ لوگ ساحل کے باشندے تھے اس لیے مچھلی ان کا قدرتی شکار تھا اور وہ اس کو بہت محبوب مشغلہ سمجھتے اور اس کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے تھے، یہ لوگ ہفتہ کے چھ دن مچھلی کا شکار کھیلتے اور سبت کا روز عبادت الٰہی میں صرف کرتے۔ اس لیے قدرتی طور پر مچھلیاں چھٹے روز جان بچانے کی خاطر پانی کی تہہ میں پوشیدہ رہتیں اور سبت کے روز پانی کی سطح پر تیرتی نظر آتی تھیں۔ ساتھ ہی خدائے تعالیٰ نے اس طریقہ سے ان کو آزمایا اور ان کی قوت ایمانی کا امتحان لیا حتیٰ کہ سبت کے علاوہ ہفتہ کے

❶ مسلم شریف
❷ خروج باب ۳۱ آیات ۱۲-۱۷

Marfat.com

باقی دنوں میں مچھلیوں کا حاصل ہونا مشکل تر ہو گیا اور چھٹے دن یہ کیفیت رہنے لگی کہ گویا قلزم میں مچھلی کا نام ونشان باقی نہیں رہا مگر سبت کے روز وہ اس کثرت سے پانی پر تیرتی نظر آتیں کہ جال اور کانٹے کے بغیر ہاتھوں سے باآسانی گرفت میں آسکتی تھیں۔

کچھ دنوں تک تو یہود اس حالت کو صبر آزما طریقہ پر دیکھتے رہے، آخر نہ رہ سکے اور ان میں سے بعض نے خفیہ طریقوں سے ایسے حیلے ایجاد کر لیے کہ جس سے یہ بھی ظاہر نہ ہو سکے کہ وہ سبت کے احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور سبت کے دن مچھلیوں کی کثرت آمد سے بھی فائدہ اٹھالیں۔ چنانچہ بعض تو یہ کرتے کہ جمعہ کی شام کو قلزم کے قریب گڑھے کھود لیتے اور دریا سے ان گڑھوں تک نہر کی طرح ایک گول نکال لیتے اور جب سبت کے روز سطح آب پر مچھلیاں تیرنے لگتیں تو وہ دریا کے پانی کو کھول دیتے تاکہ پانی گڑھوں میں چلا جائے اور اس طرح مچھلیاں بھی پانی کے بہاؤ سے ان میں چلی جائیں اور جب سبت کا دن گزر جاتا تو یک شنبہ (اتوار) کی صبح کو ان مچھلیوں کو گڑھوں میں سے نکال کر کام میں لاتے۔

اور بعض یہ کرتے کہ جمعہ کے روز دریا میں جال اور کانٹے لگا آتے تاکہ سبت کے روز ان میں مچھلیاں پھنس جائیں اور اتوار کی صبح کو ان جالوں اور کانٹوں میں گرفتار مچھلیوں کو پکڑ لاتے اور یہ سب اپنی ان ترکیبوں پر بے حد مسرور نظر آتے تھے، چنانچہ جب ان کے علمائے حق اور مخلصین امت نے ان کو اس حرکت سے روکا تو انہوں نے معترضین کو یہ جواب دیا کہ خدا کا حکم یہ ہے کہ سبت کے دن شکار نہ کرو لہٰذا ہم اس کی تعمیل میں سبت کے دن شکار نہیں کرتے بلکہ اتوار کے روز کرتے ہیں، باقی یہ ترکیبیں منع نہیں ہیں اور اگرچہ ان کا دل اور ضمیر ملامت کرتا تھا کج روی یہ جواب دے کر ان کو مطمئن کر دیتی تھی کہ ہمارا یہ حیلہ خدا کے یہاں ضرور چل جائے گا۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ دین کے احکام پر صداقت وسچائی کے ساتھ عمل نہیں کرتے تھے اور اسی لیے شرعی حیلے نکال کر ان کے امتثال سے بچنا چاہتے تھے، گویا خود فریبی میں مبتلا تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے، چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ ان چند حیلہ جو انسانوں کی ان حرکات کا علم دوسرے حیلہ ساز افراد کو بھی ہوا اور انہوں نے بھی ان کی تقلید شروع کر دی اور آخر کار بستی کی ایک بہت بڑی جماعت ببانگ دہل ان حیلوں کی آڑ میں سبت کی حرمت کی خلاف ورزی کرنے لگے۔

اس جماعت کی یہ ذلیل حرکات دیکھ کر بستی ہی میں سے ایک سعادت مند جماعت نے کر ہمت چست کی اور ان کے مقابل آکر ان کو اس بدعملی سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کیا مگر انہوں نے کچھ پرواہ نہیں کی اور اپنی حرکت پر قائم رہے، تب سعادت مند جماعت کے دو حصے ہو گئے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ ان لوگوں کو نصیحت کرنا اور سمجھانا بے کار ہے اور یہ باز آنے والے نہیں، کیونکہ یہ اس کام کو اگر گناہ سمجھ کر کرتے تب تو یہ توقع تھی کہ شاید کسی وقت باز آکر تائب ہو جائیں۔ لیکن جب کہ یہ شرعی حیلے تراش کر اپنی بدعملی پر نیکی کا پردہ ڈالنا چاہتے ہیں تو ہم کو یقین ہوتا جاتا ہے کہ اس جماعت پر بہت جلد خدا کا عذاب آنے والا ہے، یا یہ ہلاک کر دیئے جائیں گے اور یا کسی سخت عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔ لہٰذا اب ان سے کوئی تعرض نہ کرو۔

یہ سن کر سعادت مند جماعت کے دوسرے حصہ نے کہا کہ ہم اس لیے ان کو برابر نصیحت کرتے رہنا چاہتے ہیں کہ فردائے قیامت میں اپنے پروردگار کے سامنے یہ عذر پیش کر سکیں کہ ہم نے آخر وقت تک ان کو سمجھایا اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کیا، لیکن انہوں نے کسی طرح نہیں مانا، ہم مایوس نہیں ہیں بلکہ توقع رکھتے ہیں کہ عجب نہیں کہ ان کو توفیق نصیب ہو جائے اور یہ اپنی بدعملی سے باز آجائیں۔

Marfat.com

بہر حال حیلہ جو جماعت اپنے حیلوں پر قائم رہی اور سبت کی حرمت اور اس دن میں شکار کی ممانعت کے احکام سے قطعاً غافل اور بے پروا ہو کر نڈر اور بے باک ہو گئی، تب اچانک غیرت حق کو حرکت ہوئی اور مہلت کے قانون نے گرفت کی صورت اختیار کر لی، یعنی خدائے تعالیٰ کا حکم ہو گیا کہ جس طرح تم نے میرے قانون کی اصل صورت و شکل کو حیلوں کے ذریعہ مسخ کر دیا قانون پاداش عمل کے مطابق اسی طرح تمہاری صورت و شکل بھی مسخ کر دی جاتی ہے تاکہ "پاداش عمل از جنس عمل" کے مظاہرے سے دوسرے لوگ بھی عبرت و بصیرت حاصل کریں، چنانچہ حق جل مجدہٗ نے "کُنْ" کے اشارہ سے ان کو بندر اور خنزیر کی شکلوں میں مسخ کر دیا اور وہ انسانی شرف سے محروم ہو کر ذلیل و خوار حیوانوں میں تبدیل ہو گئے۔

مفسرین کہتے ہیں کہ سعادت مند جماعت کا جو حصہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتا رہا اس نے جب یہ دیکھا کہ متمرد اور سرکش جماعت کسی طرح حق پر کان نہیں دھرتی تو مجبور ہو کر اس نے ان سے ترک تعاون کر لیا اور کھانا پینا اور خرید و فروخت غرض ہر قسم کا اشتراک عمل ختم کر دیا حتیٰ کہ اپنے مکانوں کے دروازوں تک کو ان پر بند کر دیا تاکہ کسی قسم کا بھی اشتراک باقی نہ رہے چنانچہ جس دن بدکرداروں پر عذاب الٰہی نازل ہوا تو ان کے معاملہ کی اس جماعت کو گھنٹوں خبر نہ ہوئی۔ لیکن جب کافی وقت گزر گیا اور اس جانب سے کسی انسان کی نقل و حرکت محسوس نہ ہوئی تب ان کو خیال ہوا کہ معاملہ دگرگوں ہے، لہٰذا وہاں جا کر دیکھا تو صورت حال اس درجہ عجیب تھی کہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، یعنی وہاں انسانوں کی جگہ بندر اور خنزیر تھے جو اپنے ان عزیزوں کو دیکھ کر قدموں میں لوٹتے اور اپنی حالت زار کا اشاروں سے اظہار کرتے تھے۔ سعادت مند جماعت نے باحسرت و یاس ان سے کہا کہ کیا ہم تم کو بار بار اس خوفناک عذاب سے نہیں ڈراتے تھے۔ انہوں نے یہ سنا تو حیوانوں کے طرح سر ہلا کر اقرار کیا اور آنکھوں سے آنسوں بہاتے ہوئے اپنی ذلت و رسوائی کا دردناک نظارہ پیش کیا:

﴿ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ (البقرہ: ۶۵، ۶۶)

"اور (اے گروہ یہود) تم بلاشبہ (اپنے پیش روؤں میں سے) ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہو جو سبت کے بارہ میں احکام الٰہی کی حدود سے متجاوز ہو گئے تھے اور ہم نے ان کے لیے کہہ دیا تم ذلیل بندر ہو جاؤ پس ہم نے اس بستی کے ان بدبخت لوگوں کو گرد و پیش کے لوگوں کے لیے عبرت اور خدا سے ڈرنے والوں کے لیے نصیحت و موعظت بنا دیا"۔

﴿ وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ ﴾

"اور (اے پیغمبر!) بنی اسرائیل سے اس شہر کے بارہ میں پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھا اور جہاں سبت کے دن لوگ خدا کی ٹھہرائی ہوئی حد سے باہر ہو جاتے تھے سبت کے دن ان کی (مطلوبہ) مچھلیاں پانی پر تیرتی ہوئی ان کے پاس آ جاتیں مگر جس دن سبت نہ مناتے نہ آتیں۔ اس طرح ہم انہیں آزمائش میں ڈالتے تھے بہ سبب اس نافرمانی کے جو وہ کیا

کرتے تھے"۔(الاعراف:۱۶۳)

﴿وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٔيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾﴾ (الاعراف:۱۶۴-۱۶۶)

"اور جب اس شہر کے باشندوں میں سے ایک گروہ نے (ان لوگوں سے جو نافرمانوں کو وعظ ونصیحت کرتے تھے) کہا تم ایسے لوگوں کو (بیکار) نصیحت کیوں کرتے ہو جنہیں (ان کی شقاوت کی وجہ سے) یا تو خدا ہلاک کردے گا یا نہایت سخت عذاب میں مبتلاء کرے گا انہوں نے کہا"اس لیے کرتے ہیں تاکہ تمہارے پروردگار کے حضور معذرت کرسکیں (کہ ہم نے اپنا فرض ادا کردیا) اور اس لیے بھی کہ شاید یہ لوگ باز آجائیں" پھر جب ایسا ہوا کہ ان لوگوں نے وہ تمام نصیحتیں بھلادیں جو انہیں کی گئی تھیں تو ہمارا مواخذہ نمودار ہوگیا ہم نے ان لوگوں کو تو بچالیا جو برائی سے روکتے تھے مگر شرارت کرنے والوں کو ایک ایسے عذاب میں ڈالا کہ محرومی ونامرادی میں مبتلاء کرنے والا عذاب تھا بہ سبب ان نافرمانیوں کے جو وہ کیا کرتے تھے پھر جب وہ اس بات میں حد سے زیادہ سرکش ہوگئے جس سے انہیں روکا گیا تھا تو ہم نے کہا بندر ہوجاؤ ذلت وخواری سے ٹھکرائے ہوئے"۔

﴿قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۶۰﴾﴾ (المائدہ:۶۰)

"(اے پیغمبر!) کہہ دیجئے کیا میں تم کو بتاؤں کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک جزاء کے اعتبار سے کون سب سے بدتر ہوگا، وہ شخص ہوگا جس پر خدا نے لعنت کی اور اس پر غضبناک ہوا اور وہ جس میں سے اس نے بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ کردیئے اور جس نے ان میں سے شیطان (یا بت) کی پوجا کی۔ یہی ہیں بدترین مرتبہ والے اور سیدھے راستہ سے بہت دور بھٹکے ہوئے (یعنی اے بنی اسرائیل ہم بدترین جزاء کے مستحق نہیں ہیں بلکہ تم ہو جن کے یہ کچھ اعمال واطوار ہیں)"۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾﴾ (النساء:۴۷)

"اے اہل کتاب تم اس کتاب پر ایمان لاؤ جو ہم نے تم پر اتاری ہے جو اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمہارے پاس ہے (یعنی توراۃ) اس سے پہلے ایمان لاؤ کہ ہم چہروں کو مٹا ڈالیں اور ان کی پیٹھ پر ان کو لگادیں یا ہم ان پر لعنت کریں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کی اور اللہ کا حکم پورا ہوکر رہنے والا ہے"۔

Marfat.com

تعیین مقام:

جس بستی پر یہ حادثہ گزرا اس کا نام کیا ہے؟ قرآن عزیز، سورۂ اعراف میں صرف یہ بیان کرتا ہے کہ وہ ساحل بحر پر واقع تھی "القریة التی کانت حاضرة البحر" مگر مفسرین نے اس کی تعیین میں متعدد نام لیے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت یہ نقل کی جاتی ہے کہ یہ مدین کا واقعہ ہے اور ابن زید کہتے ہیں کہ اس کا نام مقنا تھا اور یہ مدین اور عینونا کے درمیان واقع تھا۔ [1]

اور عکرمہ، مجاہد، قتادہ، سدی، کبیر اور ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ منقول ہے کہ اس بستی کا نام ایلہ تھا اور یہ بحر قلزم کے ساحل پر واقع تھی، عرب جغرافیہ داں کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص طور سینا سے گزر کر مصر کو روانہ ہو تو طور سینا کی جانب ساحل بحر پر یہ بستی ملتی تھی یا یوں کہہ لیجیے کہ مصر کا باشندہ اگر مکہ کا سفر کرے تو راہ میں یہ شہر پڑتا تھا، یہی قول راجح ہے۔ [2]

زمانہ حادثہ:

شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہٗ) اور ان کے اتباع میں بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا ہے لیکن ابن جریر، ابن کثیر، ابوحیان اور امام رازی (رحمہم اللہ) جیسے جلیل القدر مفسرین کے طرز بیان اور خود قرآن عزیز کے اسلوب سے یہ قول صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے کہ قرآن عزیز نے اس واقعہ کو سورۂ اعراف میں قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے اور وہاں یہ بتایا ہے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تو اہل بستی تین جماعتوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور ان میں سے ایک جماعت سرکش اور حیلہ جو نافرمانوں کو راہ ہدایت پر قائم رکھنے کی سعی کر رہی تھی پس اگر یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا تو یہ بات بعید از قیاس اور بعید از اسلوب قرآن تھی کہ وہ ایسے موقعہ پر جب کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی جماعت پر مسخ کا عذاب مسلط ہونے کا ذکر کر رہا ہو اس زمانہ کے پیغمبر کا اس سلسلہ میں قطعاً کوئی ذکر نہ کرے اور یہ نہ بتائے کہ نافرمان قوم کے اور ان کے درمیان کیا معاملہ پیش آیا نیز سلف صالحین سے بھی کوئی ایسی روایت موجود نہیں ہے کہ جس سے یہ واضح ہوتا ہو کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا اور نہ تاریخ ہی اس کے لیے کوئی مواد بہم پہنچاتی ہے۔ اس لیے مذکورة الصدر جلیل المرتبت مفسرین نے بھی اس واقعہ سے متعلق چاروں مقامات میں سے کسی ایک مقام کی تفسیر میں بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا ہے۔ پھر نہیں معلوم کہ حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے یہ کس جگہ سے اخذ فرمایا کہ یہ واقعہ داؤد علیہ السلام کے زمانہ کا ہے ممکن ہے کہ انہوں نے سورۂ مائدہ کی اس آیت سے یہ اندازہ لگایا ہو:

﴿لُعِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ۝۷۸﴾ (المائدہ: ۷۸)

"داؤد اور عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی زبانی بنی اسرائیل میں سے وہ لوگ لعنت کیے گئے جنہوں نے کفر کیا اس لیے کہ وہ نافرمانی کے خوگر تھے اور حد سے گزرے ہوئے تھے۔"

---

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ اعراف و تاریخ ابن کثیر ج ۲ [2] ایضاً فتح الباری ج ۶

Marfat.com

مگر اس آیت سے استدلال صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اوّل تو اس مقام پر بنی اسرائیل کی عام گمراہی کا تذکرہ ہے۔ خاص سبت کا واقعہ زیر بحث نہیں ہے۔ دوسرے اس میں صرف داؤد علیہ السلام ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی تذکرہ ہے۔ چنانچہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

یخبر تعالٰی انه لعن الکافرین من بنی اسرائیل من دھر طویل فیما انزله علٰی داؤد نبیه علیه السلام و علٰی لسان عیسٰی ابن مریم علیه السلام بسبب عصیانھم لله و اعتدائھم علٰی خلقه قال العوفی عن ابن عباس لعنوا فی التوراة والانجیل و فی الزبور و فی الفرقان.... الخ۔ [1]

"اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے کفر کرنے والوں پر داؤد علیہ السلام کی زبانی زبور میں عرصۂ دراز کے بعد لعنت کی گئی اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی زبانی بھی انجیل میں اس لیے کہ خدا کی نافرمانیوں، مسلسل سرکشیوں اور مخلوق خدا پر ظلم کرنے کی وجہ سے اسی قابل تھے کہ ان پر لعنت ہوتی رہے (تاکہ دوسرے لوگ عبرت پکڑیں)۔ عوفی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے وہ آیت کی تفسیر میں فرمایا کرتے تھے کہ بنی اسرائیل میں سے کفر کرنے والوں پر توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن سب ہی کتابوں میں لعنت کی گئی ہے"۔

الحاصل قرآن کے اسلوب بیان اور جلیل القدر مفسرین کی شرح و تفصیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب سبت کا یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے درمیانی زمانہ میں کسی ایسے وقت پیش آیا جب کہ ایلہ میں کوئی نبی موجود نہیں تھے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ وہاں کے علماء حق ہی کے سپرد تھا اس لیے قرآن عزیز نے صرف ان ہی کا تذکرہ کیا اور کسی نبی یا پیغمبر کا ذکر نہیں کیا۔

چند تفسیری حقائق:

① سورۂ بقرہ میں اصحاب سبت کے تذکرہ میں ہے ﴿نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾ تو ﴿مَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾ سے کیا مراد ہے اس کے جواب میں مفسرین کے متعدد اقوال میں سے بہتر قول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے یعنی اس سے وہ بستیاں مراد ہیں جو ایلہ کے گرد و پیش آباد تھیں اور مشہور تابعی سعید بن جبیر کے قول سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

عن ابن عباس لما بین یدیھا من القرٰی و ما خلفھا من القرٰی۔ [2]

"ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ ایلہ کے سامنے اور پیچھے جو بستیاں ہیں ان کے لیے ہم نے اس کو عبرت بنا دیا"۔

وقال سعید بن جبیر ای من بحضرتھا من الناس یومئذٍ۔ [3]

"اور سعید بن جبیر فرماتے ہیں مراد یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو لوگ تھے ایلہ کو ہم نے ان کے لیے سامان عبرت بنا دیا"۔

② اسی واقعہ سے متعلق سورۂ اعراف میں ہے ﴿كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ یعنی ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ہم نے ان کو امتحان و آزمائش میں مبتلاء کر دیا یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جب بنی اسرائیل نے جمعہ کو یوم عبادت تسلیم کرنے سے انکار کر

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ [2] ایضاً [3] ایضاً

Marfat.com

دیا اور سبت (سنیچر) کے یوم عبادت بنائے جانے پر موسیٰ علیہ السلام سے جھگڑا کیا تو ہم نے اگرچہ ان کی بات مان لی لیکن سبت کے معاملہ میں ہم نے ان کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا اور آزمائش کا یہ معاملہ مچھلی کے شکار سے متعلق تھا جس کی تفاصیل تم سن چکے ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی یہی تفسیر بیان فرمائی:

ان اللہ انما افترض علی بنی اسرائیل الیوم الذی افترض علیکم فی عیدکم الیوم الجمعۃ فخالفوا الی السبت فعظموہ و ترکوا ما امروا بہ کلما ابوا الالزوم السبت ابتلاھم اللہ فیہ۔ ✿

"اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں بنی اسرائیل کی عبادت کے لیے اسی طرح جمعہ کو فرض کیا تھا جس طرح ہم پر فرض کیا ہے مگر انہوں نے مخالفت کر کے اس کو سنیچر کے دن سے بدل لیا اور اس کی عظمت کرنے لگے اور جمعہ کے بارہ میں جو حکم ان کو ملا تھا اس کو نہ مانا پس جب وہ سبت پر اڑ گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سلسلہ میں آزمائش میں ڈال دیا"۔

③ اسی سورہ میں ہے ﴿بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾ اس آیت کی تفسیر میں دو احتمال بیان کیے جاتے ہیں ایک یہ کہ یہ اجمال ہے اس تفصیلی عذاب کا جو اگلی آیت ﴿كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ﴾ میں بیان ہوا ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اوّل اہل بستی پر ایک نوع کا عذاب آیا تا کہ ان کی آنکھیں کھلیں اور وہ یہ سمجھیں کہ وہ ان حیلوں سے خدا کے احکام کی تعمیل نہیں کر رہے بلکہ اس کے حکم کو منسوخ کر رہے ہیں مگر انہوں نے اس عذاب سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی تب ان پر "مسخ" کا عذاب آ گیا۔ جمہور پہلے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔

④ سورہ مائدہ میں ہے ﴿جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ﴾ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ معذب گروہ کے نوجوان "بندر" کی شکل میں مسخ کیے گئے اور بوڑھے "خنزیر" کی صورت میں مسخ ہوئے۔ ✿

حقیقت مسخ:

⑤ سورہ بقرہ، مائدہ اور اعراف میں ہے ﴿كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ﴾، ﴿وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ﴾ تو انسان کے بندر یا خنزیر ہو جانے کے کیا معنی ہیں؟ جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس سے مسخ حقیقی (صوری) مراد ہے اور مشہور تابعی مجاہد کہتے ہیں کہ اس سے مسخ معنوی مراد ہے یعنی وہ حقیقتاً بندر کی شکل میں تبدیل نہیں ہو گئے تھے بلکہ ان کے قلوب مسخ ہو گئے تھے۔

قال مسخت قلوبھم ولم یمسخوا قردۃ و انما ھو مثل ضربہ اللہ ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا﴾ و ھذا سند جید من مجاھد و قول غریب خلاف الظاھر من السیاق فی ھذا المقام و فی غیرہ۔ ✿

مجاہد کہتے ہیں کہ ان کے قلوب مسخ ہو گئے تھے اور وہ واقعی بندر نہیں بن گئے تھے اور دراصل یہ ایک مثل ہے جیسا کہ قرآن [کی] یہ مثل ہے ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا﴾ یعنی اہل کتاب کے تورات و انجیل پڑھنے اور پھر اس کے مطابق عمل نہ [ک]رنے کی مثال ایسی ہے کہ گویا گدھے پر کتابیں لدی ہوئی ہیں مجاہد کا یہ قول ان کی جانب صحیح سند سے ثابت ہے مگر یہ غریب انوکھا اور [نر]الا قول ہے اور قرآن کے ان تمام مقامات کے ظاہر کے خلاف ہے جو مختلف سورتوں میں اس سلسلہ میں بیان کیے گئے ہیں۔

[تف]سیر ابن کثیر ج ۱ ✿ ایضاً ✿ ایضاً سورۂ بقرہ

Marfat.com

جمہور کے خلاف مجاہد اپنے اس قول میں منفرد ہیں اور یہ قول ظاہر قرآن کے بھی خلاف ہے اس لیے کہ سورہ بقرہ میں واقعہ مسخ کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ عذاب جس طرح سرکش اور نافرمان لوگوں کی پاداش عمل کے لیے ضروری تھا اسی طرح اس میں یہ بھی حکمت و مصلحت تھی کہ یہ لرزہ براندام کر دینے والا واقعہ گرد و پیش کے رہنے والوں کے لیے بھی سامان عبرت بن جائے، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾ پس اگر مسخ کا یہ عذاب صرف مسخ قلوب تک محدود تھا تو گرد و پیش کے بسنے والے کے لیے یہ کس طرح سامان عبرت و خوف بن سکتا تھا کیونکہ قلب کے مسخ ہو جانے کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ وہ رشد و ہدایت کے قبول سے محروم ہو جائے اور یہ بات دوسروں کی نگاہ میں مشاہد اور محسوس نہیں ہوا کرتی بلکہ ایک معنوی شے ہے جس کو دوسرا انسان ثمرہ یا نتیجہ اور یا کافی تجربہ کے بعد ہی معلوم کر سکتا ہے۔ نیز عدم قبول ہدایت اور انکار ہدایت کا معاملہ تو کچھ ان ہی لوگوں کے لیے مخصوص نہیں ہے یہ تو ہر پیغمبر کی دعوت و تبلیغ کے وقت پیش آتا رہتا ہے، لہٰذا اگر اصحاب سبت کی پیہم سرکشی کی وجہ سے ان کے قلوب مسخ کر دیے گئے یعنی ان سے قبول ہدایت سلب کر لی گئی تو ان میں وہ کیا خاص بات پیدا ہو گئی تھی کہ جس کی وجہ سے مسخ قلوب کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تعبیر اختیار فرمائی "كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ"۔

علاوہ ازیں اگر اس تعبیر سے صرف مسخ قلوب ہی مراد ہوتا تو بلحاظ بلاغت یہ کہہ دینا کافی تھا کہ "كُوْنُوْا قِرَدَةً" "تم بندر کی طرح ہو جاؤ" یعنی جس طرح "بندر" انسان نما شریر و خبیث حیوان ہے اسی طرح تم بھی ہو کہ صورت انسانوں کی مگر قلب میں شرارت و خباثت بندر کی سی ہے اور قِرَدَةً کی صفت خٰسِئِيْنَ۔ "ذلیل و رسوا بندر" کے اضافہ کی قطعاً ضرورت نہیں تھی اس لیے کہ جب ان کی صورتیں بندر کی شکل میں مسخ ہو کر تبدیل نہیں ہو گئی تھیں تو پھر یہ حکمت صحیح نہیں ہو سکتی کہ اگر فقط قِرَدَةً (بندر) کہا جاتا تو ممکن تھا کہ کسی کے دل میں یہ شبہ باقی رہ جاتا کہ جب کہ بعض پالتو بندر پالنے والوں کی نظروں میں پیارے لگتے ہیں تو کسی انسان کے لیے صرف یہ کہہ دینا کہ وہ بندر سا لگتا ہے مذمت کے موقع پر کافی نہیں ہے اس لیے ضروری ہوا کہ "خٰسِئِيْنَ" کہہ کر یہ بتا دیا جائے کہ وہ محبوب بندر نہیں بلکہ ذلیل و رسوا بندر بنا دیے گئے۔

حکمت تو جب ہی صحیح ہو سکتی ہے کہ ان انسانوں کو حقیقی طور پر بندر کی شکل میں مسخ کر دیا گیا ہو اور چونکہ بعض لوگ بندر کی حرکات سے خوش ہو کر ان کو پالتے اور محبوب رکھتے ہیں لہٰذا ان معذب انسانوں کو بندر کی شکل میں بھی اس طرح مسخ کیا گیا کہ دیکھنے والا ان سے گھن کھائے اور ان کا اپنے قریب آنا بھی گوارا نہ کرے۔

مجاہد کا یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ یہ اسی طرح ایک مثل ہے جس طرح ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ عالم بے عمل کے لیے مثل ہے، یہ قول اس لیے درست نہیں ہے کہ قرآن عزیز نے بعض مواقع میں جو مثالیں بیان کی ہیں یا تو وہ "مثل" کہہ کر ہی بیان ہوئی ہیں مثلاً مسطورہ بالا مثال یا ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ منافقین کی مثال یا ﴿مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ جیسی مثال اور یا وہاں ایسا صاف اور واضح قرینہ موجود ہوتا ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ اس جگہ حقیقت حال کو "مثل" کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً آیت ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ میں بتایا گیا ہے کہ جو شخص ہدایت کو ہدایت سمجھنے کے باوجود قبول نہیں کرتا وہ کانوں سے سنتا ہے مگر اس پر توجہ نہیں کرتا وہ حق کو آنکھوں سے دیکھتا ہے مگر اس سے آنکھیں پھیر لیتا ہے اور اپنی زندگی کو مسلسل ایسی کجروی اور بغاوت پر قائم رکھتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے گویا اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا

Marfat.com

دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے پس یہاں یہ واضح قرینہ موجود ہے کہ مشرکین مکہ کے نہ کانوں پر مہر لگی ہوئی تھی اور نہ دلوں پر اور نہ ان کی آنکھوں پر پردے لٹکے ہوئے تھے لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہے کہ عادت اللہ یہ جاری ہے کہ جو سمجھ رکھنے کے باوجود ناسمجھ بنتا، شنوا ہونے کے باوجود ناشنوا ہو جاتا اور بینا ہونے کے باوجود حق سے نابینا بنتا ہے اور اس حالت پر مصر رہتا ہے تو خدائے تعالیٰ کی پاداش عمل کا قانون اس کے قلب، سمع اور بصر کی اس استعداد کو سلب کر لیتا ہے جو قبول حق کے لیے اس کو خلقت و پیدائش کے وقت عطا ہوئی تھیں۔

لیکن زیر بحث مقام پر ﴿كُوْنُوْا قِرَدَةً﴾ کو نہ صاف الفاظ میں مثل کہا گیا ہے اور نہ یہاں کوئی ایسا قرینہ موجود ہے جو "مسخ معنوی" پر دلالت کرتا ہو۔ بلکہ ﴿خٰسِـِٕيْنَ﴾ کو ﴿قِرَدَةً﴾ کے لیے صفت لانا اس کا قرینہ ہے کہ یہاں بلاشبہ "مسخ حقیقی" مراد ہے۔

نیز یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگر اصحاب سبت کا معاملہ محض مسخ معنوی کی حیثیت رکھتا ہے تو اس سے متعلق مثل بیان کرنے کے لیے قِرَدَةً (بندر) اور خنزیر (خوک) میں سے کسی ایک حیوان کا ذکر کافی تھا اور ان دونوں میں سے شرارت اور خباثت میں جو زیادہ سمجھا جاتا ہو مثال کے طور پر صرف اسی کو بیان کر دینا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ سورۂ مائدہ میں یہ بتایا کہ اصحاب سبت میں سے کچھ تو بندر بنا دیئے گئے اور کچھ خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیئے گئے، ﴿وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ﴾۔

یہ ہیں وہ وجوہ جن کی بناء پر ابن کثیر، ابن جریر، ابن حیان، ابن تیمیہ، رازی، آلوسی (رحمہم اللہ) جیسے متقدمین و متاخرین جلیل القدر مفسرین، مجاہد کے انفرادی قول کو قرآن عزیز کے سیاق و سباق کے خلاف قرار دیتے ہوئے جمہور کے قول کی تائید کرتے اور اصحاب سبت سے متعلق آیات میں مسخ حقیقی مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ ابن کثیر رحمہ اللہ حضرت عبداللہ بن عباس، قتادہ، ربیع بن انس، ابوالعالیہ، ضحاک رضی اللہ عنہم اور جمہور کے اقوال نقل کرنے کے بعد یہ تحریر فرماتے ہیں:

> قلت والغرض من هذا السياق عن هٰؤلاء الائمة بيان خلاف ما ذهب اليه مجاهد رحمه الله من ان مسخهم انما كان معنويا لا صوريا بل الصحيح انه معنوي صوري. والله اعلم.
>
> "میں کہتا ہوں ائمہ تفسیر کے بیانات کو ذکر کرنے سے یہ مقصد ہے کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ یہ تمام بالاتفاق مجاہد کے اس قول کے مخالف ہیں کہ "بنی اسرائیل کی زیر بحث جماعت کا مسخ صرف معنوی تھا حقیقی نہ تھا" کیونکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ مسخ معنوی اور حقیقی دونوں حیثیت سے تھا"۔

مسئلہ کا یہ پہلو نقل سے تعلق رکھتا ہے، رہا عقلی نقطہ نظر سو اس کے پیش نظر بھی باآسانی کہا جا سکتا ہے کہ ایسا ہو جانا عقلاً ناممکن اور محال نہیں ہے اس لیے کہ اس مسئلہ میں اگر عقلی استعجاب ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ ایک حقیقت کس طرح دوسری حقیقت میں تبدیل ہو سکتی ہے، لیکن تبدیلی حقائق کا یہ مسئلہ قدیم و جدید فلسفہ مسلمات میں سے شمار کیا گیا ہے اور جدید فلسفہ کے نظریہ ارتقاء (The Theory of Evolution) کی اساس و بنیاد تو صرف اسی پر موقوف ہے کہ ایک حقیقت کا دوسری حقیقت میں تبدیل ہو جانا صرف ممکن بلکہ کائنات ہست و بود میں واقع اور درجات ارتقاء کے لحاظ سے ایک حقیقت کا دوسری حقیقت اختیار کر لینا ہمیشہ ہوتا رہتا ہے، پس اگر نظریہ ارتقاء کے اصول پر ایک گوریلا شمپانزی قسم کا بندر اپنی حقیقت سے منتقل ہو کر انسانی حقیقت میں بدل سکتا ہے تو انسان کا بندر کی حقیقت میں بدل جانا کیوں محال نظر آتا ہے۔

کیا وہ یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ہر شے کا ردعمل (Reaction) ممکن بھی ہے اور واقع و مشاہد بھی تو اس اصول پر اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ جس طرح ایک ادنیٰ حقیقت اعلیٰ حقیقت میں تبدیل ہو جاتی ہے اسی طرح کبھی خصوصی حالات و ناموافق اثرات کی بناء پر اعلیٰ حقیقت، ادنیٰ حقیقت میں منقلب ہو جاتی ہے۔ تو عقلاء جدید کے پاس اس نظریہ کے انکار کے کون سے دلائل ہیں اور یہاں ردعمل (ری ایکشن) کیوں اپنا اثر نہیں کر سکتا؟

آج کی دنیا میں ایک حقیقت کا دوسری حقیقت میں بدل جانا نہ صرف نظریہ اور تھیوری تک محدود ہے بلکہ روزمرہ لاکھوں کی تعداد میں ہوتا رہتا اور مشاہدہ میں آتا رہتا ہے اور یہ اس طرح کہ یہ مسئلہ صدیوں تک پیچیدہ رہا ہے کہ انسان کی پیدائش کا ابتدائی تخم (نطفہ) کن کن مدارج سے گزر کر انسان کی شکل اختیار کرتا ہے اور قرآن عزیز نے اس سلسلہ میں جن مدارج کا ذکر کیا ہے مفسرین قدیم ان مدارج کے حقائق بیان کرنے میں یا اجمال سے کام لیتے رہے ہیں اور یا وقت کی تحقیقات علمی جہاں تک قرآن کا ساتھ دیتی رہی ہیں اس کے مطابق کچھ تفصیلات دیتے رہے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ سب کچھ نظری اور عملی حدود میں محدود تھا اس لیے قرآن عزیز کے بیان کردہ حقائق کی پوری تشریح سامنے نہیں آئی تھی لیکن اب اس مسئلہ میں نظریات سے آگے بڑھ کر علم تحقیقات نے مشاہدہ تک ترقی کر لی ہے اور رحم مادر میں انسانی تخم پر انسان بننے تک جو تطوارت و تحولات گزرتے ہیں ان کو سائنس اور علم طب کے جدید آلات کے ذریعہ مشاہدہ کر کے صحیح طور پر معلوم کر لیا گیا ہے اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ قرآن عزیز نے اس سلسلہ میں نطفہ، علقہ، مضغہ ﴿فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ﴾ کی جو تعبیرات ایک نبی امی ﷺ کی معرفت سنائی تھیں حرف بحرف وہی صحیح اور حقیقت نفس الامر کے مطابق ہیں گویا علمی تحقیقات کو صدیوں تک اپنی جگہ سے حرکت کرتے کرتے مشاہدہ کی حد میں پہنچ کر آخر اسی جگہ ٹھہرنا پڑا جو قرآن واضح کر چکا تھا اور اس طرح علمی تحقیق کی اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا اور جب تک قرآن کے دیئے ہوئے علم الیقین کے ساتھ مطابقت نہ کر لی اپنی جگہ قائم نہ رہ سکی۔

”پیدائش جنین“ کا یہ مسئلہ نشو و ارتقاء کے جن نظریات پر قائم اور عالم مشاہدہ میں آ چکا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نطفہ جب علقہ، مضغہ اور اسی طرح کے درجات طے کرتا ہے تو یہ اپنے ہر درجہ ادنیٰ میں ایک خاص حقیقت ہوتا ہے اور درجہ عالی میں منتقل ہو کر بالکل دوسری حقیقت بن جاتا ہے اور اسی طرح حقائق کا تحول و انقلاب ہوتا رہتا ہے لیکن یہ تمام انقلابات ایک مہینہ کے اندر اندر اس طرح ہوتے ہیں کہ گویا اس ابتدائی دور میں ایک انسان کا جنین بھی درجات کے لحاظ سے ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ نباتات کا جنین، ایک مچھلی کا، ایک چار پائے کا اور ایک بندر کا اور اسی دور کے آخر میں وہ بندر کی اعلیٰ قسم گوریلا اور شمپازی کے جنین کے بالکل مشابہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد دوسرے مہینے کے شروع میں ان تمام درجات نباتاتی و حیوانی میں ایک ایسا عظیم الشان انقلاب پیدا ہو جاتا ہے کہ کل تک جو جنین حیوانات کی اعلیٰ قسم کے جنین کے مشابہ تھا یک بیک انسانی حقیقت میں تبدیل ہونے لگتا اور ﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ﴾ کا مظاہرہ کر کے اعلان کرتا ہے ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ اور پھر پورے سات مہینے تک اس جنین میں قدرت مختلف قسم کی نقاشیاں کرتی رہتی اور اس انسانی ڈھانچہ کو مکمل انسان بناتی رہتی ہے اور ”جنین انسانی“ میں جو انقلابات حقائق ہوتا رہتا ہے اور وہ ادنیٰ حقیقت چھوڑ کر اعلیٰ حقیقت اختیار کرتا رہتا ہے اگر بعض مرتبہ قدرت الٰہی اپنے مصالح کی بناء پر ﴿خَلْقًا اٰخَرَ﴾ کا پورا مظاہرہ نہیں کرتی

تو آپ سنتے ہیں کہ فلاں شخص کے ایسا بچہ پیدا ہوا ہے جو بیل یا بندر یا بن مانس کی شکل ہے بلکہ بعض مرتبہ بعینہٖ ان حیوانات کی ہی شکل کا بچہ عالم وجود میں آ جاتا ہے تو یہ دلیل ہے اس امر کی قدرت کی صناعی نے اس کو اس لیے ادھورا چھوڑ دیا اور مکمل انسانوں کی شکل میں اس حقیقت کو تبدیل نہیں کیا کہ چشم عبرت اس سے عبرت حاصل کرے اور خدا کا شکر ادا کرے کہ اس نے ہم کو انسان بنایا اور عقل وخرد عطاء فرما کر کائنات سے ممتاز ومشرف فرمایا ورنہ خدا چاہتا تو ہم بھی رحم مادر میں اسی طرح ہو کر رہ جاتے۔ نیز اس حقیقت کی جانب بھی توجہ ہو سکے کہ خود انسان کا جنین بھی کن کن جامہائے حقائق کو ترک کر کے انسانی جامہ پہنتا اور تب "انسان" کہلانے کے قابل بنتا ہے۔

پس اگر تبدیلی حقائق کا یہ مظاہرہ روز وشب کائنات بحر وبر میں ہوتا رہتا ہے تو اگر ایک انسان کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ خاص حالات وتاثرات نے اس میں یہ ردعمل (ری ایکشن) پیدا کر دیا کہ وہ انسانی شکل وصورت کو چھوڑ کر جو کہ اس کی تخلیق کا سب سے بلند اور آخری انقلاب تھا اپنی خلقت کے اس پچھلے درجہ میں منقلب ہو گیا جو کہ حیوانی شکل سے متعلق ہے تو عقل وفلسفہ کا کونسا نظریہ اس کی تردید کر سکتا ہے؟

بہر حال ایک حقیقت کا دوسری حقیقت اختیار کر لینا عقلاً کوئی مستبعد بات نہیں ہے جو مسئلہ مسخ پر وارد ہو سکے۔ البتہ یہ امر کہ یہ واقعہ درحقیقت پیش آیا یا نہیں، سو اس کا تعلق عقل سے نہیں ہے بلکہ علم تاریخ اور نقل صحیح سے متعلق ہے اور جب کہ قرآن کے علم یقین نے اس واقعہ کا بصراحت اظہار کیا اور جمہور سلف وخلف اس واقعہ کی تفسیر میں مسخ حقیقی کا اعتراف کرتے چلے آتے ہیں تو محض اس لیے کہ عام طور پر ہم ایسے واقعات کا مشاہدہ نہیں کرتے اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کسی شے کے مشاہدہ نہ کرنے یا اس کے زیر نظر نہ آنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعہ میں وہ شے موجود نہیں ہے یا نہیں ہو سکتی۔

علاوہ ازیں مشہور طبیب اور ماہر فن زکریا رازی نے جذام (Leprosy) پر بحث کرتے ہوئے اس کی مختلف اقسام میں سے سب سے ردی اور خراب قسم یہ بتائی ہے کہ جسم میں زہر پھیل کر خون اس درجہ فاسد ہو جاتا ہے کہ وہ اعصاب اور شرائین میں تشنج پیدا کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے مریض کا جسم ایک گھناؤنے اور مکروہ صورت بندر کی طرح نظر آنے لگتا ہے اور اس درجہ پر پہنچ کر مرض لا علاج ہو جاتا ہے۔

زکریا نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مرض جذام کے متعلق ان کی یہ تحقیق ذاتی کاوش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اطبائے یونان اور قدیم اہل فن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

لہٰذا کیا عجب ہے کہ بنی اسرائیل کی اس جماعت پر خدائے تعالیٰ کا عذاب اس طرح نازل ہوا کہ ایک جانب تو ان کے قلوب مسخ ہو کر قلوب انسانی کے خواص سے محروم کر دیئے گئے اور دوسری جانب ان کے جسم بدترین جذام کے ذریعہ اسدرجہ خراب کر دیئے گئے کہ وہ بندر اور خنزیر کی شکل میں تبدیل نظر آنے لگے، ﴿ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴾۔

اور غالباً یہی وجہ ہے کہ صحیح احادیث میں یہ آتا ہے کہ جو قومیں حیوانات کی شکل میں مسخ ہوئی ہیں وہ تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہیں۔[1] یعنی مسخ کا عذاب ان کے اندرو ظاہر کو اس درجہ فاسد اور گندہ کر دیتا ہے کہ وہ پھر جانبر نہیں ہو سکتیں اور جلد ہی موت کی

[1] مسند احمد

Marfat.com

آغوش میں چلی جاتی ہیں۔

اس مقام پر یہ شبہ پیدا نہیں کرنا چاہیے کہ اگر مسخ کو معنی اور صورۃ دونوں حیثیت سے تسلیم کرلیا جائے تو اس سے تناسخ (آواگون) لازم آجاتا ہے حالانکہ یہ باطل اور فاسد عقیدہ ہے، یہ شبہ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ تناسخ میں روح (جیو) ایک قالب (کالبد) کو چھوڑ کر دوسرے قالب میں چلی جاتی ہے اور انسانی اعمال نیک و بد کی پاداش میں جون بدلنے کا یہ سلسلہ ازل سے ابد تک یوں ہی قائم ہے اور رہے گا لیکن مسخ کی صورت میں نہ روح بدلتی ہے او نہ قالب بدلتا ہے بلکہ وہی قالب (جسم) ایک خاص ہیئت اور حقیقت سے دوسری حقیقت ہیئت میں تبدیل ہو کر موت کی نذر ہو جاتا اور دوسرے مردہ انسانوں کی طرح مالک حقیقی کے سامنے اپنے اعمال کے جواب دہ ہونے کے لیے عالم برزخ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس اور عکرمہ کا مکالمہ:

عکرمہ رحمہ اللہ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد رشید، ذکی وفہیم اور جلیل القدر تابعی ہیں، فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوا، دیکھا کہ ان کی گود میں قرآن عزیز کھلا ہوا رکھا ہے اور ان پر گریہ طاری ہے، یہ دیکھ کر کچھ دیر تو میں ان کی عظمت کی وجہ سے دور بیٹھا رہا مگر جب اس حالت میں ان پر کافی وقت گزر گیا تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے قریب جا کر بعد سلام عرض کیا: اللہ تعالیٰ مجھ کو آپ پر قربان کرے یہ تو فرمایئے کہ آپ کس لیے اس طرح رو رہے ہیں؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمانے لگے: میرے ہاتھ میں جو یہ ورق ہیں مجھ کو رلا رہے ہیں۔ میں نے دیکھا تو سورۂ اعراف کے ورق تھے، پھر مجھ سے فرمایا: تم ایلہ کو جانتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جانتا ہوں، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ اس بستی میں بنی اسرائیل رہتے تھے ان کے یہاں سبت کے دن مچھلیاں پانی کی سطح پر آجاتی تھیں اور سبت کے بعد پانی کی تہہ میں بیٹھ جاتی تھیں اور بمشکل ایک دو ہاتھ آتی تھیں، کچھ دن گزرنے پر شیطان نے ان میں سے بعض کو یہ سکھایا کہ اللہ تعالیٰ نے سبت میں مچھلی کھانے کو منع فرمایا ہے، مچھلی کے شکار کو نہیں منع فرمایا اس لیے انہوں نے یہ کیا کہ سبت کے دن خاموشی کے ساتھ مچھلیاں پکڑ لیتے اور دوسرے دن کھا لیتے۔ جب یہ حیلہ عام ہو گیا تو اہل حق نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ سبت کے دن مچھلی پکڑنا، شکار کرنا اور کھانا سب منع ہے، لہٰذا تم اس حیلہ جوئی کو چھوڑ دو ورنہ خدا کا عذاب تم کو برباد کر ڈالے گا۔ مگر جب انہوں نے نہ مانا تو اس دوسری جماعت میں سے ایک جماعت اگلے ہفتہ ان سے جدا ہو گئی اور وہ مع اپنے اہل وعیال ان سے دور جا بسے اور ایک اور جماعت نے سبت کی خلاف ورزی کو برا تو جانا مگر مخالفین کے ساتھ ہی رہے سہے اور ان سے ترک تعلق نہیں کیا۔ چنانچہ داہنے بازو (ایمنون) یعنی ترک تعلق کرنے والوں نے جب نافرمانوں کو ڈانٹا اور عذاب الٰہی سے ڈرایا تو بایاں بازو (ایسرون) کہنے لگا: ﴿لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ﴾ تب (ایمنون) نے جواب دیا: ﴿مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾ بالآخر ایک روز امر بالمعروف کرنے والی جماعت نے مخالفین کو مخاطب کر کے کہا کہ یا تو تم باز آجاؤ ورنہ ہم یقین کرتے ہیں کہ کل تم پر ضرور کوئی عذاب نازل ہو کر رہے گا۔

اس کے بعد سرکشوں پر عذاب نازل ہونے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ میں دو جماعتوں کے مال اور انجام کا ذکر فرمایا ہے ایک سرکش اور متمرد انسانوں کی جماعت جو ہلاک اور مسخ کر دی گئی اور دوسری (ایمنون) امر بالمعروف

ونہی عن المنکر کرنے والی جماعت کہ اس نے نجات پائی اور عذاب سے محفوظ رہی۔ لیکن تیسری جماعت یعنی ساکتین (ایسرون) کا کوئی ذکر نہیں فرمایا اور میرے دل میں ان کے متعلق ایسے خیالات آتے ہیں کہ میں ان کو زبان سے کہنا پسند نہیں کرتا (یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے چونکہ باز رہے اگرچہ خود خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہوئے لہٰذا وہ بھی کہیں عذاب کے تو مستحق نہیں قرار دیئے گئے اور سرکشوں کے زمرہ میں تو داخل نہیں کر لیے گئے) تب میں نے عرض کیا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں آپ اس بارہ میں اس قدر پریشان نہ ہوں بلاشبہ یہ تیسری جماعت بھی نجات پانے والوں میں ہی رہی اس لیے کہ خود قرآن عزیز ان کے متعلق یہ کہتا ہے کہ انہوں نے نصیحت کرنے والوں سے کہا" کہ تم ایسی جماعت کو کس لیے نصیحت کرتے ہو جس کی بداعمالیوں کی بناء پر خدائے تعالیٰ یا ان کو ہلاک کرنے والا ہے اور یا کسی سخت عذاب میں ڈالنے والا ہے"۔ تو ان کے متعلق قرآن عزیز کی یہ تعبیر صاف صاف بتا رہی ہے کہ وہ ہلاک نہیں کیے گئے ورنہ تو ان کا ذکر بھی ہلاک ہونے والوں ہی کے ساتھ کیا جاتا نجات پانے والوں کے ساتھ نہ ہوتا نیز یہ جماعت اس عمل بد کے بدکرداروں کی حرکات سے مایوس ہو کر ایسا کہتی تھی اس لیے بھی مستحق عذاب نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ سنا تو بے حد مسرور ہوئے اور آیات کی اس تفسیر پر مجھ کو خلعت بخشا۔

مسخ شدہ اقوام کا انجام دنیوی:

جو قومیں خدائے تعالیٰ کے عذاب سے مسخ کر دی جاتی ہیں وہ زندہ باقی نہیں رکھی جاتیں، بلکہ تین دن کے اندر اندر ان کو فنا کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کی نسل کا سلسلہ جاری نہ ہو اور دنیا میں ان کا وجود خود ان کے لیے بھی عرصہ تک باعث ذلت وخواری نہ رہے، چنانچہ صحیح روایات میں یہ بصراحت موجود ہے:

عن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال سألنا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم عن القردة والخنازير من نسل اليهود فقال لا ان الله لم يلعن قوما قط فيمسخهم فكان لهم نسل و لكن هذا خلق كان فلما غضب الله على اليهود فمسخهم مثلهم۔ [1]

"حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم نے دریافت کیا کہ یہ بندر وخوک مسخ شدہ یہود کی نسل میں سے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں! اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر مسخ کی لعنت مسلط کرتا ہے تو اس کی نسل نہیں چلاتا لیکن یہ جانور خدا کی مستقل مخلوق ہیں لہٰذا جب خدا کا غضب یہود پر نازل ہوا تو ان کو ان جانوروں کی شکل میں مسخ کر دیا گیا"۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

لم يمسخ قومًا فيجعل لهم نسلًا ولا عقبًا وان القردة والخنازير كانت قبل ذلك. [2]

"اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو مسخ کرتا ہے تو نہ ان کو باقی چھوڑتا ہے اور نہ ان کی نسل چلتی ہے اور بندر اور خوک تو مسخ کے واقعہ سے قبل بھی موجود تھے"۔

---

[1] مسند احمد ابوداؤد طیالسی، مسلم۔ [2] ایضاً

عن ابن عباس قال ولم یمش مسخ قط فوق ثلث ایام ولم یاکل ولم یشرب ولم ینسل.

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مسخ شدہ انسان تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے اور نہ انہوں نے اس درمیان میں کھایا پیا اور نہ ان کی نسل کا سلسلہ چلا"۔

بصائر:

① "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" عظیم الشان فریضہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد عظیم بھی اسی فرض کو پورا کرنا ہے اور جب کسی قوم اور امت میں کوئی نبی یا رسول موجود نہ ہو تو پھر علمائے امت کے ذمہ واجب ہے کہ وہ اس فرض کو انجام دیں۔ چنانچہ قرآن عزیز اور صحیح احادیث نے بھی امت مرحومہ کو اس فرض کی جانب بہت زیادہ اہمیت کے ساتھ توجہ دلائی ہے اور تعمیل کرنے والے کے اجر وثواب کی بشارت اور ترک کرنے والے کو مستحق عقاب ووعید قرار دیا ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ (ال عمران:۱۱۰)

"تم دنیا کی بہترین امت ہو جو کائنات انسانی کے لیے پیدا کی گئی ہے تاکہ ان کو بھلی باتوں کا حکم کرو اور بری باتوں سے باز رکھو"۔

﴿لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَن مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝﴾ (المائدہ:۷۹،۷۸)

"بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر اختیار کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبانی لعنت کی گئی اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے اور خدا کی حدود سے تجاوزت کرتے تھے، وہ بری باتوں سے لوگوں کو نہیں روکتے تھے اور ان کے یہ کردار بہت ہی برے تھے"۔

عن عدی بن عمیرہ یقول سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لا یعذب العامة بعمل الخاصة حتی یر والمنکر بین ظہر اینہم وھم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکرونہ فاذا فعلوا ذلک عذب اللہ الخاصة والعامة.

"عدی بن عمیرہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ خاص خاص لوگوں کی بداعمالیوں پر عام لوگوں پر عذاب نازل نہیں کرتا البتہ جب ان لوگوں کے سامنے کہ جو ان برائیوں کے روکنے پر قدرت رکھتے ہیں علی الاعلان معاصی ہونے لگیں اور وہ نہ روکیں تو بے شک اس وقت خدا اپنا عذاب عام وخاص سب پر نازل کر دیتا ہے"۔

عن ابی سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من رائی المنکر فلیغیرہ بیدہ و من لم یستطع فبلسانہ و من لم یستطع فبقلبہ و ذلک اضعف الایمان.

"حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی کو برا عمل کرتا دیکھے تو اس کو چاہیے کہ ہاتھ سے روک دے اور جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ زبان سے روکے اور جو اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو وہ دل ہی میں اس

Marfat.com

کو برا جانے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے"۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث اس جانب بھی توجہ دلاتی ہے کہ مسلمانوں میں اتنی قوت اور حاکمانہ اقتدار ضرور ہونا چاہیے کہ وہ اگر کسی کو برے عمل اور بدکرداری میں مبتلاء دیکھیں تو طاقت وقوت سے اس کو روک دیں اور اگر انہوں نے یہ درجہ اپنی کوتاہیوں کی بدولت کھو دیا ہے تو اس درجہ قوت ایمانی ضروری ہے کہ وہ زبان سے اس عمل بد کے خلاف جہاد کر سکے اور اگر اس درجہ سے بھی محروم ہے تو اس کے بعد سوائے اس کے ایمان کا کوئی اور درجہ نہیں ہے کہ وہ کم از کم اس عمل بد کو برا سمجھے اور اس پر اظہار رضا نہ کرے۔ لہٰذا اس حدیث کے الفاظ سے کسی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ جب ایک شخص کو پہلا یا دوسرا درجہ حاصل ہی نہیں تو پھر دوسرا یا تیسرا جو درجہ بھی حاصل ہے اس کے اختیار کر لینے پر وہ ضعیف یا ضعف الایمان کیوں قرار پاتا ہے۔

(۲) انسان کی مختلف گمراہیوں میں سے بہت بڑی گمراہی یہ بھی ہے کہ احکام الٰہی سے بچنے کے لیے حیلے اور بہانے تراش کر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے کی سعی کرے کیونکہ اس طرح وہ شریعت حقہ کے اوامر و نواہی کو مسخ کرنے کا مرتکب ہوتا ہے، قرآن اور توراۃ دونوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود اس گمراہی میں بھی پیش پیش اور اس اقدام پر بہت جری تھے اور اسی لیے ان پر مسخ کا عذاب نازل ہوا۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے بیان کردہ اس واقعہ کی روشنی میں امت مرحومہ کو سخت تاکید فرمائی ہے کہ وہ ایسی گمراہی پر ہرگز اقدام نہ کریں اور اپنا دامن عمل اس سے بچائے رکھیں:

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا ترتکبوا ما ارتکبت الیھود فتستحلوا محارم اللہ بادنی الحیل۔ [1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسی گمراہی کا ہرگز ارتکاب نہ کرنا جس کا یہود نے ارتکاب کیا کہ اللہ کی حرام کی ہوئی باتوں کو معمولی حیلوں کے ذریعہ حلال کر لیتے تھے (حالانکہ وہ حلال نہیں ہو جاتی تھیں)"۔

مگر افسوس کہ ہم نے آج اس کو بھی اپنا لیا اور یہود کی طرح ہم نے بھی اللہ کے فرائض سے بچنے کے لیے تراش لیے ہیں ایسے تمول اور سرمایہ داری کے باوجود کہ جس پر خدا کا حکم ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ وارد ہوتا صرف زکوٰۃ سے بچنے کے لیے یہ حیلہ نکال لیا کہ اس سرمایہ پر پورا ایک سال اپنی ملکیت نہ ہونے دیا جائے تاکہ "حولان حول" کی شرط پوری نہ ہونے پائے اور چھ ماہ بعد اس کو بیوی کے نام منتقل کر دیا اور اس سلسلہ کو برابر جاری رکھا اور اس طرح ﴿اَلَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ﴾ کا لطف اٹھاتے ہیں۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

البتہ فقہائے امت نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے کی غرض سے نہیں بلکہ امت کو کسی ضیق اور تنگی سے نکالنے کے استنباط اور اجتہاد صحیح کے ذریعے جو بعض آسانیاں ہم پہنچائیں اور جو دراصل صاحب شریعت کے اوامر و نواہی کے مقاصد کو فوت ہونے دیتیں تو وہ اس وعید کا مصداق نہیں ہیں مگر ان مسائل کے لیے "کتاب الحیل" کی تعبیر صحیح نہیں ہے بلکہ ان کا عنوان "باب التسھیل" ہونا چاہیے تھا۔

قرآن عزیز کے مطالعہ سے یہ بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمیشہ "پاداش عمل از جنس عمل" ہو جیسا کہ مسئلہ زیر بحث میں بھی موجود ہے کہ اصحاب سبت نے حیلوں اور بہانوں کے ذریعہ سبت کے قانون کو مسخ اور محرف کر

Marfat.com

دیا تھا لہٰذا ان کے لیے سزا بھی "مسخ" ہی تجویز کی گئی، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس حقیقت کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

فلما فعلوا ذلك مسخهم الله الى صورة القردة وهى اشبه شئ بالاناسى فى الشكل الظاهر و ليست بانسان حقيقة فلذلك اعمال هؤلاء وحيلتهم لما كانت مشابهة للحق فى الظاهر و مخالفة فى الباطن كان جزاء هم من جنس العمل. ❶

"پس جب یہود نے یہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بندروں کی شکل میں مسخ کر دیا اور یہ اس لیے کہ ظاہر شکل میں بندر انسان سے زیادہ مشابہ ہے اگرچہ حقیقت میں وہ انسان نہیں ہے پس جب کہ ان یہود کے یہ اعمال بد اور حیلے ظاہر میں حق کے مشابہ اور باطن میں اس کے مخالف ہیں تو ان کو سزا بھی جنس عمل ہی سے دی گئی ہے"۔

④ اداء فرض میں اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے کہ جن کے مقابلہ میں فریضہ ادا کیا جا رہا ہے وہ اس کو قبول کرتے ہیں یا نہیں اس لیے کہ اس کا اداء فرض کی جزاء میں یہ کیا کم سعادت ہے کہ وہ شخص بہرحال اجر و ثواب اور رضاء الٰہی سے معزز و مفتخر ہوتا ہے۔

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾۔

---

❶ تفسیر ابن کثیر

Marfat.com

اصحاب الرس

(تقریباً ۶۳۰ ق۔م (یا مدت نامعلوم)

○ رس ○ قرآن عزیز اور اصحاب الرس ○ اصحاب الرس ○ قول راجح ○ موعظت

رس:

لغت میں "رس" کے معنی پرانے کنوئیں کے ہیں، اس لیے اصحاب الرس کے معنی ہوئے "کنوئیں والے"۔ قرآن عزیز نے اس نسبت کے ساتھ ایک قوم کی نافرمانی اور سرکشی کی پاداش میں اس کی ہلاکت و بربادی کا ذکر کیا ہے۔

قرآن عزیز اور اصحاب الرس:

قرآن عزیز نے سورۂ فرقان اور "ق" میں ان کا ذکر کیا ہے اور جن قوموں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب و استہزاء کے سبب ہلاکت وتباہی مول لی ان کی فہرست میں صرف ان کا نام بیان کر دیا ہے اور حالات وواقعات سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

﴿وَّ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ اَصْحٰبَ الرَّسِّ وَ قُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ۝۳۸ وَ كُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ؗ وَ كُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ۝۳۹﴾ (الفرقان:۳۸،۳۹)

"اور عاد ثمود اور اصحاب الرس کو اور ان کے درمیانی زمانہ کی بہت سی (قوموں) کو (ہم نے ہلاک کر دیا) اور ہم نے ہر ایک کے واسطے مثالیں بیان کیں اور ہم نے ان سب کو ہلاک کر دیا"۔

﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوْدُ ۝۱۲ وَ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ وَ اِخْوَانُ لُوْطٍ ۝۱۳ وَّ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَ قَوْمُ تُبَّعٍ ؕ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ۝۱۴﴾ (ق:۱۲،۱۴)

"ان سے پہلے بھی نوح کی قوم نے اور کنوئیں والوں نے اور ثمود، عاد، فرعون، برادران لوط، اصحاب ایکہ اور تبع کی قوم کے (رسولوں کو جھٹلایا، ان میں سے) ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا، پس ان پر عذاب لازم ہوا"۔

اصحاب الرس:

ان کو اصحاب الرس کیوں کہتے ہیں؟ اس کے جواب میں علمائے تفسیر کے اقوال اس درجہ مختلف ہیں کہ حقیقت حال بجائے منکشف ہونے کے اور زیادہ مستور ہوگئی ہے۔

Marfat.com

① ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ چونکہ رس کے معنی "غار" کے بھی آتے ہیں اس لیے اصحاب اخدود (گڑھوں والے) ہی کو اصحاب الرس بھی کہتے ہیں۔

لیکن یہ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ سورۂ ق میں اصحاب الرس کا ذکر ان قوموں کے ساتھ کیا گیا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل ہو گزری ہیں، اور سورۂ فرقان میں عاد، ثمود اور اصحاب الرس کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے ﴿وَ قُرُوْنًۢا بَیْنَ ذٰلِكَ كَثِیْرًا﴾ اور ان کے درمیانی زمانہ کی بہت سی قوموں کو ہلاک کر دیا"۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اصحاب الرس کا زمانہ کم از کم حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل ہونا چاہیے اور اصحاب الاخدود کا زمانہ عیسیٰ علیہ السلام سے صدیوں بعد ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کے ان بیانات میں تصریح ہے کہ اصحاب الرس ہلاک شدہ قوموں میں سے ہیں اور اصحاب الاخدود کے متعلق قول صحیح یہ ہے کہ وہ اپنے مشہور ظلم کے بعد فوراً ہلاک نہیں کیے گئے اور ان کو مہلت اور ڈھیل دی گئی کہ وہ باز آ جائیں ورنہ پاداش عمل کے لیے تیار رہیں، جیسا کہ عنقریب واقعہ تفصیل سے ظاہر ہو جائے گا۔

② ابن عساکر نے تاریخ میں اپنا رجحان اس روایت کی جانب ظاہر کیا ہے کہ اصحاب الرس عاد سے بھی صدیوں پہلے ایک قوم کا نام ہے، یہ جس جگہ آباد تھے وہاں اللہ تعالیٰ نے ایک پیغمبر حنظلہ بن صفوان کو مبعوث کیا تھا، انہوں نے ان میں رہ کر تبلیغ اسلام کی مگر اصحاب الرس نے کسی طرح حق کو قبول نہیں کیا اور پیغمبر خدا کو قتل کر دیا، اس پاداش میں وہ سب ہلاک کر دیئے گئے۔ [1] لیکن اس روایت سے یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ ان کو "کنویں والے" کیوں کہا گیا اور یہ "نسبت" واقعہ کے ساتھ کیا تعلق رکھتی ہے؟

③ ابن ابی حاتم بروایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نقل کرتے ہیں کہ آذربیجان کے قریب ایک کنواں تھا یہ قصہ چونکہ اس سے تعلق رکھتا ہے اس لیے وہاں کے بسنے والوں کو اصحاب الرس کہتے ہیں۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ اس کنوئیں کے قریب آباد قوم نے اپنے نبی کو چونکہ مسطورۂ بالا کنوئیں میں ڈال کر زندہ دفن کر دیا تھا اس لیے ان کو "اصحاب الرس" کہا گیا۔ [2]

④ اور قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یمامہ کے علاقہ میں فلج نام کی ایک بستی تھی، اصحاب الرس وہیں آباد تھے اور یہ اور اصحاب یاسین (اصحاب القریہ) ایک ہی ہیں اور یہ مختلف نسبتوں سے پکارے جاتے ہیں۔ [3] ایک روایت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے بھی اس کی تائید میں موجود ہے لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ ابن ابی حاتم اور عکرمہ دونوں کی روایت کا ایک ہی مطلب ہے مگر یہ دونوں رائیں بھی مشکوک ہیں اس لیے کہ قرآن عزیز نے اصحاب القریہ (اصحاب یاسین) اور اصحاب الرس کا تذکرہ جدا جدا کیا ہے اور دونوں تذکروں میں کسی ایک جگہ بھی یہ اشارہ نہیں ہے کہ یہ دونوں ایک ہیں۔ حالانکہ یہ طرز بیان، اصول بلاغت کے خلاف ہے کہ ایک ہی معاملہ کو جدا جدا نسبتوں اور کیفیتوں کے ساتھ بیان کیا جائے اور ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ اشارہ موجود نہ ہو کہ یہ مختلف نسبتیں اور تعبیریں ایک ہی معاملہ سے تعلق رکھتی ہیں اور نہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایسی کوئی تفسیر مذکور ہے جو دونوں کو ایک ظاہر کرتی ہو۔ خصوصاً جب کہ قرائن یہ بتا رہے ہیں کہ اصحاب الرس کا معاملہ قبل مسیح علیہ السلام ہے اور تاریخ اور تحقیق یہ ثابت کر چکی ہے کہ اصحاب القریہ کا معاملہ مسیح علیہ السلام کے بہت بعد کا ہے۔ [4]

---

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ فرقان و تاریخ ابن کثیر ج ۱ [2] تفسیر ابن کثیر سورۂ فرقان و تاریخ ابن کثیر ج ۱

[3] ایضاً [4] یہ بحث عنقریب آنے والی ہے۔

Marfat.com

⑤ ابوبکر عمر بن حسن نقاش، اور سہیلی کہتے ہیں کہ اصحاب الرس کی آبادی میں ایک بہت بڑا کنواں تھا جس کے پانی سے وہ پینے اور کھیتی سیراب کرنے، دونوں کا کام لیتے تھے۔ اس بستی کا بادشاہ بہت عادل تھا اور لوگ اس سے بے حد محبت کرتے تھے، اس کا جب انتقال ہوگیا تو اہل شہر اس کی موت سے سخت غمگین اور حزین تھے کہ ایک دن شیطان بادشاہ عادل کی شکل بنا کر پہنچا اور اہل شہر کو جمع کر کے تقریر کی کہ میں تم سے کچھ دنوں کے لیے جدا ہوگیا تھا مرا نہیں تھا، اب آ گیا ہوں اور ہمیشہ زندہ رہوں گا۔ لوگوں نے انتہاء محبت میں یقین کرلیا اور اس کی آمد پر جشن منایا۔ تب شیطان نے ان کو حکم دیا کہ وہ ہمیشہ مجھ سے پس پردہ باتیں کیا کریں، چنانچہ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی اور وہ پس پردہ بیٹھ کر گمراہی پھیلانے لگا۔ اس وقت بقول سہیلی صاحب "روض الانف" ایک شخص حنظلہ بن صفوان کو خواب میں یہ بتایا گیا کہ ان کو اس آبادی میں راہ ہدایت دکھانے کے لیے پیغمبر بنا دیا گیا۔ صفوان نے ان کے پاس جا کر توحید کی تعلیم اور شرک سے اجتناب کی تلقین کی اور بتایا کہ یہ تمہارا بادشاہ نہیں ہے بلکہ پس پردہ شیطان ہے۔ لوگوں کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور قبول حق کی بجائے پیغمبر خدا پر حملہ کر کے ان کو قتل کر دیا، اس پاداش میں ان کو خدا کے عذاب نے تباہ و برباد کر دیا اور کل جس بستی میں چہل پہل تھی اور باغات اور نہروں سے جنگل میں منگل ہو رہا تھا آج وہ جل بھن کر چٹیل میدان نظر آنے لگا، جس میں کتوں بھیڑیوں اور شیروں کے مسکن کے سواء کچھ باقی نہ رہا۔

یہ روایت اصول روایت و دُرایت دونوں اعتبار سے ساقط الاعتبار ہے اور من گھڑت داستان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ [1]

⑥ محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((ان اول الناس یدخل الجنۃ یوم القیامۃ العبد الاسود)).

"جنت میں سب سے پہلے جو شخص داخل ہوگا وہ ایک سیاہ غلام ہوگا"۔

اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بستی میں اپنا پیغمبر بھیجا مگر اس کالے کلوٹے غلام کے علاوہ کسی نے اس کو قبول نہیں کیا اور کوئی ایمان نہیں لایا، پھر اہل شہر نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ نبی کو ایک کنوئیں میں بند کر دیا اور کنویں کے منہ پر بہت بھاری پتھر رکھ دیا تاکہ کوئی کھول نہ سکے۔ مگر یہ سیاہ فام غلام جنگل سے لکڑیاں لاتا، بازار میں فروخت کرتا اور ان کی قیمت سے کھانا خرید کر روزانہ کنوئیں پر پہنچ کر پتھر کو ہٹاتا اور خدا کے پیغمبر کی خدمت میں کھانا پیش کرتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس پر جنگل میں نیند طاری کر دی اور یہ چودہ سال تک اسی حالت میں پڑا رہا۔ یہاں تک تو یہ ہوا اور ادھر قوم کو اپنی نازیبا حرکت پر افسوس آیا اور انہوں نے پیغمبر خدا کو کنویں سے نکال لیا اور توبہ کے بعد ایمان قبول کرلیا اور اسی مدت کے اندر پیغمبر کا انتقال ہوگیا۔ چودہ سال کے بعد جب غلام کی آنکھ کھلی تو اس نے سمجھا کہ میں چند گھنٹے سویا ہوں، جلدی سے لکڑیاں چن کر شہر پہنچا، دیکھا تو حالات بدلے ہوئے ہیں، دریافت کیا تو سارا واقعہ معلوم ہوا۔ اسی غلام کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں سب سے پہلے ایک سیاہ فام غلام جائے گا۔ [2]

یہ روایت اپنی سند کے لحاظ سے بھی قابل جرح ہے اور درایت کے اعتبار سے بھی۔ چنانچہ محدثین کہتے ہیں کہ یہ طویل

---

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ فرقان البدایہ والنہایہ ج ۱

[2] مروج الذہب ص ۸۶ حاشیہ الکامل ج ۱

داستان خود محمد بن کعب کی جانب سے ہے جس کو انہوں نے اسرائیلیات سے اخذ کر کے بیان کیا ہے۔ نبی معصوم ﷺ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ علاوہ ازیں قرآن عزیز میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ اصحاب الرس بھی ہلاک شدہ قوموں میں سے ہیں اور یہ روایت اس کے خلاف ان کو نجات یافتہ بیان کرتی ہے، اس لیے قطعاً غلط ہے اور روایت کا وہ جملہ جو قوسین میں "عبد اسود" سے متعلق ہے اگر بسند صحیح نبی اکرم ﷺ سے ثابت بھی ہو جائے تو بھی اس کا اصحاب الرس کے واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد اس پر اسی قسم کی جرح وارد کی ہے۔

⑦ مشہور مؤرخ مسعودی کہتا ہے کہ اصحاب الرس حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور یہ دو قبیلے تھے ایک قید ماں (قید ماہ) اور دوسرا یامین یا رعویل اور یہ یمن میں آباد تھے۔

لیکن مسعودی نے صرف اسی قدر تعارف پر اکتفاء کیا ہے اور تاریخی حیثیت سے نہیں بتایا کہ وہ کن وجوہ کی بناء پر قید ماہ اور رعویل کو اصحاب الرس کہتا ہے اور ان کو "رس" کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹوں میں سے ایک کا نام قید ماہ بھی ہے لیکن توراۃ اور تاریخ دونوں اس بات سے خاموش ہیں کہ اس کی اولاد کو اصحاب الرس بھی کہا جاتا ہے، لہٰذا مسعودی کا قول دلیل کا محتاج ہے۔

مگر صاحب ارض القرآن نے صرف اس بناء پر کہ مسعودی نے اپنی رائے تذبذب اور تردد کے ساتھ بیان نہیں کی اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ [1]

⑧ مصر کے ایک مشہور معاصر عالم فرج اللہ زکی کردی کہتے ہیں کہ لفظ رس "ارس" کی تخفیف ہے اور یہ اس مشہور شہر کا نام ہے جو قفقاز کے علاقہ میں واقع ہے۔ اس وادی ارس میں اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کو مبعوث فرمایا جس کا نام ابراہیم زردشت تھا، انہوں نے اپنی قوم کو دین حق کی دعوت دی مگر قوم نے انکار کیا اور ان کی دعوت وارشاد کے مقابلہ میں اور زیادہ سرکشی اور بغاوت اختیار کر لی چنانچہ قوم نے اس کی سزا پائی اور ہلاک کر دی گئی۔ اس کے بعد ان کی دعوت کا میدان عمل اس مخصوص علاقہ قفقاز (آذربائیجان وغیرہ) سے کل ایران تک وسیع ہو گیا، زردشت کا صحیفہ اگرچہ محرف ہو چکا ہے مگر اس کا ایک حصہ اب بھی قدیم فارسی میں مکتوب موجود ہے۔ [2] اور اس صحیفہ میں اب بھی نبی اکرم ﷺ کی بعثت اور دین اسلام کی بشارت کا ذکر پایا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے:

"عنقریب عرب میں ایک "نبی عظیم" مبعوث ہو گا اور جب اس کی شریعت پر ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر جائے گا اور دوسرا ہزار شروع ہو گا تو اس دین میں ایسی باتیں پیدا ہو جائیں گی کہ یہ پہچاننا مشکل ہو جائے گا کہ کیا یہ دین وہی دین ہے جو اپنے قرن اوّل میں تھا (یعنی بدعات واہوا اور رسوم قبیحہ پیدا ہو جائیں گی)"۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زردشت کی اصل اور حقیقی تعلیم "حق" تھی اور اسی لیے انہوں نے بعثت محمد ﷺ کی بشارت دی اور بعض ایسی تفصیلات کا بھی ذکر کیا جو آج حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہی ہیں، مگر دوسرے ادیان وملل کی طرح ان کی تبعین نے

---

[1] ارض القرآن ج ۲ ص ۵۶
[2] اوستا کی جانب اشارہ ہے۔

Marfat.com

بھی اس تعلیم حق کو مسخ ومحرف کر ڈالا، ان کے متبعین مجوس (پارسی) اب بھی ایران وہند میں پائے جاتے ہیں۔ [1]

علامہ زکی رحمہ اللہ کے اس قول کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کتب تفسیر میں ایک قول ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی منقول ہے کہ اصحاب الرس آذربائیجان کے قریب ایک کنوئیں کی نسبت سے مشہور تھے لہٰذا ممکن ہے کہ یہ "نہر ارس" ہی سے مراد ہو اور ابن کثیر میں ہے:

واصحاب الرس قال بیر بآذربائیجان.

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آذربائیجان میں ایک پرانا کنواں "رس" تھا اس وادی میں رہنے والے اسی وجہ سے اصحاب الرس کہلاتے تھے۔

بلکہ خود ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس آیت ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ﴾ (النساء: ۱۵۰) کے تحت میں زردشت کے متعلق یہ تحریر فرمایا ہے:

والمجوس یقال انهم کانوا یؤمنون بنبی لهم یقال له زرادشت ثم کفروا بشرعه فرفع من بین اظهرهم. [2] والله اعلم.

"اور مجوس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر مبعوث پیغمبر زردشت پر اوّل ایمان لے آئے تھے اس کے بعد انہوں نے کفر کی راہ اختیار کرلی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس پیغمبر کو ان کے درمیان سے اٹھالیا"۔ واللہ اعلم

ادیان وملل کی تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم زردشت کی اصل تعلیم انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیم حق ہی کے مطابق تھی اور وہ یرمیاہ علیہ السلام یا دانیال (اکبر) علیہ السلام کے تلمیذ اور فیض یافتہ تھے۔ ذوالقرنین کے واقعہ میں ان شاء اللہ تعالیٰ قدرے تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

قول فیصل:

اس مسئلہ میں قرآن کا ظاہر یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ واقعہ یقیناً حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل ہو گزرا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کے زمانہ کی کسی قوم کا تذکرہ ہے یا کسی قدیم العہد قوم کا تو قرآن نے اس سے تعرض نہیں کیا اور مسطورہ بالا تفسیری روایات سے اس کا قطعی فیصلہ ناممکن ہے، البتہ میرا وجدان آخری قول کو راجح سمجھتا ہے۔

بہرحال قرآن کا جو مقصد موعظت وعبرت ہے وہ اپنی جگہ صاف اور واضح ہے اور یہ تاریخی تعینات ومباحث اس کے لیے موقوف علیہ نہیں ہیں بلکہ ایک عبرت نگاہ اور گوش حق نیوش کے لیے یہ کافی وشافی ہے کہ جو قومیں اس دنیا میں خدائے برتر کے پیغام حق کو ٹھکراتی اور اس کے خلاف بغاوت وسرکشی کا علم بلند کرتی ہیں اور مسلسل مہلت اور ڈھیل دینے کے باوجود وہ اپنی متکبرانہ اور مفسدانہ زندگی کو ترک کر کے صالح اور پاک زندگی بسر کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتیں تو پھر ان پر خدائے تعالیٰ کی سخت گرفت "بطش شدید"

[1] حاشیہ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۴۲، ۴۳ مختصراً
[2] تفسیر ابن کثیر ص ۵۵۲

Marfat.com

آ جاتی ہے اور وہ بے یار و مددگار ہلاک و برباد کردی جاتی ہیں۔

موعظت:

① کائنات انسانی کے پاس جس وقت سے اپنی تاریخ کا ذخیرہ موجود ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے کہ دنیا کی جس قوم نے بھی خدا کے پیغام حق کے ساتھ استہزاء کا معاملہ کیا اور خدا کے پیغمبروں اور ہادیوں کے ساتھ سرکشی اور شرارت کو جائز رکھا ان کو زبردست طاقت و شوکت اور عظیم الشان تمدن کے باوجود قدرت کے ہاتھوں نے ہلاک و برباد کر کے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا اور آسمانی یا زمینی عبرتناک عذاب نے صفحۂ عالم سے ان کو حرف غلط کی طرح محو کر دیا مگر یہ عجیب بات ہے کہ اپنے پیشروؤں کے ہیبت ناک انجام کو دیکھنے اور سننے کے باوجود ان کی وارث قوموں نے پھر تاریخ کو دہرایا اور اسی قسم کی حرکات کو اختیار کیا جن کے انجام میں ان کے پیشروؤں کو روز بد دیکھنا پڑا تھا ﴿اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ﴾۔

② ایک حساس دل و دماغ کے لیے یہ تازیانہ عبرت کافی ہے کہ اس دنیا میں جب کہ کسی شے کو بقاء نہیں ہے اور ہر شے کے لیے فنا لازم ہے تو پھر کبر و نخوت اور انانیت کے کیا معنی؟ اور جو مقدس ہستیاں اپنے اوصاف کریمانہ اور اخلاق حسنہ کے ساتھ خدمت خلق اور ہدایت و رشد کو بغیر کسی دنیوی لالچ و توقع کے انجام دیتی ہیں ان کے ساتھ تحقیر و تضحیک کا برتاؤ عقل کے کس فیصلہ کے مطابق ہے؟

اگر انسان اس زندگی میں ان دو حقیقتوں کی معرفت حاصل کرے تو حیات ابدی و سرمدی میں کبھی ناکام نہیں رہ سکتا اور یہی وہ رموز زندگی ہیں جن پر گامزن ہو کر قومیں "اصحاب الجنۃ" کہلائیں اور ان سے غافل رہ کر "اصحاب النار" کہلانے کی سزاوار ہوئیں۔

Marfat.com

بیت المقدس اور یہود

(۶۰۴ق م تا ۵۶۱ ق م و ۷۰ء تا ۱۸ھ)

○ تمہید ○ بیت المقدس (یروشلم) ○ قرآن عزیز اور شرارت یہود کے دو اہم معاملے ○ شرارت یہود کا پہلا دور ○ غلامی کے بعد نجات ○ شرارت یہود کا دوسرا دور ○ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل ○ پاداش عمل ○ تیسرا زریں موقعہ اور یہود کی روگردانی ○ ابدی ذلت وخسران ○ بصائر

تمہید:

جن اصحاب نے قصص القرآن جلد اوّل و دوم کا مطالعہ فرمایا ہے ان کی نظر سے یہ پوشیدہ نہ رہا ہوگا کہ قرآن عزیز اقوام ماضیہ کے تاریخی واقعات یعنی ان کے رشد و ہدایت کے قبول و انکار اور اس کے نیک و بد نتائج و ثمرات کے حالات پیش نظر لانے اور ان سے عبرت و بصیرت حاصل کرنے کی جگہ جگہ ترغیب دیتا ہے اور خود بھی اسی لیے گزشتہ قوموں کے ان واقعات کو بکثرت بیان کرتا ہے جو اس مقصد عظیم کے لیے مفید اور عبرت آموز ہیں اور اگر ان وقائع میں حقائق کے ساتھ غلط اور دور از کار داستانیں شامل ہو گئی ہیں تو ان کی اصلاح بھی کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ بہت سی وہ پیچیدگیاں جو گزشتہ اقوام و امم، ان کے مواطن و مساکن، اور ان سے متعلق حالات میں صحیح اور غلط واقعات کے خلط ملط سے پیدا ہو چکی تھیں قرآن عزیز نے ان کو اس طرح بیان کیا ہے کہ تمام پیچیدگیاں دور ہو کر حقیقت حال روشن سے روشن تر نظر آنے لگی، چنانچہ ان واقعات سے متعلق اصل حقائق کا اظہار ہو جانے کے صدیوں بعد جب علم الآثار (Archaeology) علم طبقات الارض (Geology) اور تاریخی مشاہدات و تجربات کے ذریعہ ان اقوام و امم کے حالات ناقابل انکار درجہ تک روشنی میں آئے تو دنیا کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ قرآن عزیز نے ان سے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ حرف بحرف صحیح نکلا اور اس کے بیان میں حقیقت سے سرمو تجاوز ثابت نہیں ہوا۔ رقیم (پیٹرا) کی تاریخ ماضی اصحاب الحجر کے واقعات، عاد و ثمود کا تمدن اور مقام تاریخ، موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل اور فرعون مصر کی آویزش کے واقعات اور سدعرم کے حالات، غرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے تاریخی وقائع ہیں جو مسطورہ بالا حقیقت کے لیے زندہ جاوید شہادت ہیں۔

پس کیا یہ قرآن عزیز کے کلام الٰہی ہونے کی ایک ناقابل تردید شہادت نہیں کہ ایک "اُمّی" انسان ایک ایسے ملک میں جہاں ہر قسم کے علمی ذرائع مفقود و معدوم ہیں دنیا کی قوموں کو رشد و ہدایت کے سلسلہ میں اقوام ماضیہ اور امم سابقہ کے ایسے تاریخی واقعات سناتا ہے جن کے ایک حرف کی بھی تردید نہیں ہو سکی اور صدیوں تک علمائے تحقیق نے کروڑوں اور اربوں روپیہ اور اپنے قیمتی وقت اور عمر صرف کر کے جب ان حالات کو جدید "علوم انکشاف" کے ذریعہ مشاہدہ کی حد تک حاصل کیا تو ان کو بالآخر یہ اقرار کرنا پڑا کہ قرآن

نے ان سے متعلق جو کچھ کہا اور جس قدر کہا بلاشبہ علم تحقیق اس کے آگے ایک شوشہ بھی اضافہ نہیں کر سکا، چہ جائیکہ اس کے خلاف ثابت کر سکتا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اپنے پیغمبر ﷺ پر گزشتہ اقوام کے حالات ظاہر کر کے عبرت آموز قلب اور بصیرت افروز نگاہ کے لیے بہت کچھ سامان رشد و ہدایت عطاء فرمایا تا کہ موجودہ امم و اقوام، سرکش اور مفسد قوموں کے نتائج بد اور ہولناک پاداش عمل سے عبرت حاصل کریں اور نیکو کار و خیر اندیش قوموں کے حالات و واقعات اور ان کے ثمرات خیر کو اختیار کر کے دین و دنیا کی فوز و فلاح کو اپنا سرمایہ بنائیں اور چونکہ قرآن عزیز کا مقصد صرف موعظت و تذکیر ہے نہ کہ اقوام و امم کی مکمل تاریخ اس لیے اس نے نہ دنیا کی تمام قوموں کی تاریخ بیان کی ہے اور نہ جن قوموں کی تاریخ سے تعرض کیا ہے ان کی پوری تاریخ کو پیش کیا ہے، کیونکہ یہ اس کے موضوع اور مقصد سے خارج ہے اور رشد و ہدایت اقوام کے لیے بلاشبہ ایک مکمل صحیفہ قانون ہے مگر تاریخ و جغرافیہ یا فلسفہ و سائنس کی کتاب نہیں ہے کہ اس میں وہ سب کچھ بھی موجود ہو جس کا فلسفہ و تاریخ کی کتابوں میں ہونا ضروری ہے۔

الحاصل امم ماضیہ کے ان حالات و واقعات میں سے جو بدکردار اور نیک کردار انسانوں کے درمیان امتیاز پیدا کرتے اور قوموں کی انفرادی و اجتماعی اصلاح و انقلاب کے لیے سرمایہ عبرت و بصیرت ثابت ہوتے ہیں ایک اہم واقعہ وہ بھی ہے جو یہود بنی اسرائیل کی پیہم شرارتوں اور فساد انگیزیوں کی بنا پر دو مرتبہ مقدس ہیکل اور یروشلم (بیت المقدس) کی تباہی و بربادی اور خود ان کی غلامی و رسوائی کی شکل میں ظاہر ہوا اور جس نے ان کی قومی ذلت اور اجتماعی ہلاکت پر ہمیشہ کے لیے مہر لگا دی۔

بیت المقدس:

بیت المقدس کی تعمیر کا واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات کے ضمن میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے، یہ پاک جگہ اپنے ہیکل (مسجد) کی وجہ سے بنی اسرائیل کا قبلہ رہی ہے اور یہ مقدس مقام بے شمار انبیاء بنی اسرائیل کا مہبط و مدفن ہے اور اس کی عظمت نہ صرف یہود و نصاریٰ ہی کی نگاہ میں ہے بلکہ اس کو مسلمان بھی مقام مقدس مانتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے واقعہ اسراء (معراج) نے اس کے تقدس کو اور بھی زیادہ چار چاند لگا دیئے ہیں اور جب بھی کوئی مسلمان سورہ اسراء کو تلاوت کرتا ہے اس کے قلب میں اس مقام کا تقدس و جلال اثر کیے بغیر نہیں رہتا:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝﴾ (بنی اسرائیل:۱)

"پاکی ہے اس ذات کے لیے جس نے اپنے بندہ (محمد ﷺ) کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی وہ مسجد اقصیٰ جس کے اطراف کو ہم نے بڑی برکت دی ہے اور اس لیے سیر کرائی کہ اپنی نشانیاں دکھائے بلاشبہ وہی ذات ہے جو دیکھنے والی سننے والی ہے"۔

بیت المقدس کی اس مسجد کو "مسجد اقصیٰ" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ مکہ (حجاز) سے بہت دور فاصلہ پر واقع ہے۔

معراج کے واقعہ میں جب قرآن نے "بیت المقدس" کا ذکر کیا تو ساتھ ہی اس جانب بھی توجہ دلائی کہ بنی اسرائیل کی

دعوت وتبلیغ کا یہ مقام اور بنی اسرائیل کا قبلہ صلوٰۃ جو تمہارے نزدیک بھی عظمت وتقدیس سے معمور ہے یہود کی مفسدانہ سرگرمیوں اور احکام الٰہی کے خلاف مسلسل بغاوتوں اور شرارتوں کی وجہ سے دو مرتبہ تباہی و بربادی اور اہانت سے دوچار ہو چکا ہے اور نہ صرف یہ مقام بلکہ خود یہ بھی مشرکوں اور عیسائیوں کے ہاتھوں حد درجہ ذلیل ورسواء ہو چکے ہیں، مگر ان کو پھر بھی عبرت وبصیرت حاصل نہیں ہوئی اور آج جب کہ نبی اکرم ﷺ کی دعوت عامہ ان کو رشد وہدایت اور دین ودنیا کی عزت وعظمت کا پیغام سنا رہی ہے یہ اس کے ساتھ نفرت وحقارت ہی کا معاملہ کر رہے ہیں اور پہلے سانحوں کی طرح اب بھی غفلت اور سرکشی اختیار کر کے ابدی ذلت وخسران کو دعوت دے رہے ہیں۔

قرآن عزیز کہتا ہے کہ ہم نے کتاب (صحف انبیاء علیہم السلام) میں پہلے سے بنی اسرائیل کو آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ سخت فتنہ وفساد اور سرکشی وبغاوت کرو گے اور خدا کے اس مقدس مقام میں فتنہ ساماں بنو گے اور اس کی پاداش میں دونوں مرتبہ تم کو ذلت و ہلاکت کا منہ دیکھنا پڑے گا اور جس سرزمین کو تم بہت زیادہ محبوب رکھتے ہو یہ بھی دو مرتبہ ظالموں کے ہاتھوں تباہ وبرباد ہوگی۔

اس کے بعد ہم پھر ایک مرتبہ تم پر رحم کریں گے اور سعادت وفلاح کی طرف دعوت دیں گے۔ پس اگر تم نے گزشتہ واقعات سے عبرت وموعظت حاصل کر کے اس دعوت حق پر لبیک کہا اور اس کو بطیب خاطر قبول کیا تو دنیا کی کوئی طاقت تمہاری اس سعادت کو نہیں سلب کر سکتی اور اگر تمہاری تاریخی کجروی اور سرکشی اور حق کے ساتھ بغاوت اور مخالفت نے تمہارا ساتھ نہ چھوڑا اور گزرے ہوئے واقعات کی طرح اس مرتبہ بھی تم نے فساد وگمراہی کو اپنایا تو ہماری جانب سے بھی پاداش عمل کا قانون اس طرح پھر دہرایا جائے گا اس کے بعد تم پر ابدی ذلت ورسوائی کی مہر لگا دی جائے گی اور یہ سب کچھ تو دنیا کا معاملہ ہے اور ایسے سرکشوں کے لیے آخرت میں بہت برا ٹھکانا "جہنم" ہے۔

﴿وَ قَضَیْنَاۤ اِلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِیْرًا۝ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَیْكُمْ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ وَ كَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَیْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِیْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِیْرًا۝ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَ لِیَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِیُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِیْرًا۝ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا۝﴾ (بنی اسرائیل: ۴ تا ۸)

"اور ہم نے کتاب (صحف انبیاء) میں بنی اسرائیل کو اس فیصلہ کی خبر دے دی تھی کہ تم ضرور ملک میں شر وفساد پھیلاؤ گے اور بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی کرو گے پھر جب دو وقتوں میں سے پہلا وقت آ گیا تو اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر اپنے ایسے بندے بھیج دیے جو بڑے ہی خوفناک تھے۔ پس وہ تمہاری آبادیوں کے اندر پھیل گئے اور اللہ کا وعدہ تو اسی لیے تھا کہ پورا ہو کر رہے۔ پھر (دیکھو) ہم نے زمانہ کی گردش تمہارے دشمنوں کے خلاف اور تمہارے موافق کر دی اور مال و

Marfat.com

دولت اور اولاد کی کثرت سے تمہاری مدد کی اور تمہیں پھر ایسا بنا دیا کہ بڑے جتھے والے ہو گئے اگر تم نے بھلائی کے کام کیے تو اپنے ہی لیے کئے اور اگر برائیاں کیں تو بھی اپنے ہی لیے کیں۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا (تو ہم نے اپنے دوسرے بندوں کو بھیج دیا تھا کہ تمہارے چہروں پر رسوائی کی کالک پھیر دیں اور اسی طرح (ہیکل) مسجد میں داخل ہو جائیں جس طرح پہلی مرتبہ حملہ آور گھسے تھے اور جو کچھ پائیں توڑ پھوڑ کر برباد کر ڈالیں کچھ عجب نہیں کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم فرمائے (اگر اب بھی باز آ جاؤ) لیکن اگر تم پھر سرکشی فساد کی طرف لوٹ آ ؤ گے تو ہماری طرف سے پاداش عمل لوٹ آئے گی اور ہم نے منکرین حق کے لیے جہنم کا قید خانہ تیار کر رکھا ہے"۔

اس مقام پر "الکتاب" سے مراد انبیاء بنی اسرائیل کے وہ صحیفے ہیں جن میں یہود کے دو مرتبہ سخت فساد اور سرکشی کرنے اور اس کی بدولت بیت المقدس کی بربادی اور ان کے ہلاک اور غلام بن کر ذلیل رسواء ہونے کے متعلق وہ پیشین گوئیاں کی گئی تھیں جو بذریعہ الہام و وحی ان کو خدا کی جانب سے معلوم ہوئی تھیں، چنانچہ موجودہ توراۃ میں یسعیاہ، یرمیاہ، حزقیل [1] اور زکریا (علیہم السلام) کے صحیفوں میں وہ اب بھی مذکور ہیں اور ان صحیفوں کا بیشتر حصہ اسی قسم کی پیشین گوئیوں پر مشتمل ہے اور ان تینوں صحیفوں میں دو مرتبہ کے ان فسادات اور فسادات سے متعلق خدائے تعالیٰ کی جانب سے سخت سزا کا جس تفصیل کے ساتھ ذکر ہے اس سے حرف بحرف قرآن عزیز کے ارشاد کی تصدیق ہوتی ہے۔ یسعیاہ کی کتاب میں یہود کی پہلی شرارت و فساد کا ذکر اس طرح شروع ہوتا ہے:

"رویا یسعیاہ بن اموص کی جو اس نے یہوداہ اور یروشلم کی بابت یہوداہ کے بادشاہوں عزیاہ اور یوکان اور آخز اور حزقیا کے دنوں میں دیکھی۔ سنو اے آسمانوں اور کان لگا اے زمین کے خداوند یوں فرماتا ہے کہ لڑکوں کو میں نے پالا اور پوسا پھر انہوں نے مجھ سے سرکشی کی بیل اپنے مالک کو پہچانتا ہے اور گدھا اپنے مالک کی چراگاہ کو مگر بنی اسرائیل نہیں جانتے میرے لوگ کچھ نہیں سوچتے آہ خطا کار گروہ ایک قوم جو گناہوں سے لدی ہوئی ہے بدکاروں کی نسل، خراب اولاد کہ انہوں نے خداوند کو ترک کیا اسرائیل کے قدوس کو ہلاک جانا اور اس سے بالکل پھر گئے تھے"۔ [2]

اور پھر ان کی بدکاروں کی وجہ سے جو سزا ان کو ملنے والی تھی اس کا ذکر اسی مکاشفہ میں اس طرح ہے:

"تمہارا ملک اجاڑ ہے، تمہاری بستیاں جل گئیں، پردیسی لوگ تمہاری زمین کو تمہارے سامنے نگلتے ہیں، وہ ویران ہے گویا کہ اسے اجنبی لوگوں نے اجاڑا ہے اور صیہون کی بیٹی چھوڑی گئی ہے"۔ [3]

اور یرمیاہ کتاب میں یہ پیشین گوئی ان الفاظ سے شروع کی گئی ہے:

"کیونکہ خداوند فرماتا ہے کہ دیکھ میں اتر کے بادشاہوں کے سارے خاندانوں کو بلاؤں گا اور وہ آئیں گے اور ہر ایک اپنا اپنا تخت یروشلم کے پھاٹکوں میں داخل ہونے کی راہ پر اور اس کے سب دیواروں کے گرداگرد اور یہوداہ کے تمام شہروں کے

---

[1] یہ یحییٰ علیہ السلام کے والد ہیں، دوسرے نبی ہیں۔

[2] باب ۱ آیات ۴-۱

[3] صیہون شام کے ملک میں مشہور پہاڑ ہے۔ باب ۱ آیت ۷-۸۔

مقابل قائم کرے گا اور میں ان (یہود) کی ساری شرارت کی بابت کہ انہوں نے مجھے چھوڑا ہے اور بیگانے خداؤں کے سامنے لوبان جلایا اور اپنے ہی ہاتھوں کے کاموں کو سجدہ کیا اپنی عدالت ظاہر کر کے ان پر حکم کروں گا۔ ✿

دیکھو! تم جھوٹی باتوں پر جو سود مند نہیں ہو سکتیں اعتماد کرتے ہو۔ کیا تم چوری کرو گے خون کرو گے زناء کاری کرو گے، جھوٹی قسمیں کھاؤ گے اور بعل (بت) کے آگے لوبان جلاؤ گے اور غیر معبودوں کی جنہیں تم نہیں جانتے پیروی کرو گے؟ اور میرے حضور اس گھر میں جو میرے نام کا کہلاتا ہے آ کے کھڑے ہو گے اور کہو گے کہ ہم نے خلاصی پائی تاکہ نفرت کے کام کرو۔ ✿

اے یروشلم (بیت المقدس) اپنے بال منڈا اور پھینک دے اور اونچی جگہوں پر جا کے نوحہ کر کیونکہ خداوند نے اس نسل کو جس پر اس کا قہر پڑا تھا مردود کیا اور ترک کر دیا ہے کہ بنی یہوداہ نے میری نظروں میں برائی کی خداوند کہتا ہے اس گھر میں جو میرے نام کا کہلاتا ہے انہوں نے اپنی مکروہات رکھیں کہ اسے ناپاک کریں۔ ✿

اس لیے رب الافواج یوں کہتا ہے لہٰذا تم نے میری باتیں نہ سنیں دیکھ میں اتر کے سارے گھرانوں کو اور شاہ بابل بنوکد نذر کو بلا بھیجوں گا"۔

اور حزقیل علیہ السلام کی کتاب میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے:

"خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے: یہی یروشلم ہے میں نے اسے قوموں اور مملکتوں کے درمیان جو اس کے آس پاس ہیں رکھا ہے لیکن اس نے میری عدالتوں کو شرارت کر کے قوموں کی بہ نسبت زیادہ ٹال دیا اور میری شریعتوں کو آس پاس کی مملکتوں کی بہ نسبت زیادہ عدول کیا کہ، ہوں نے میری عدالتوں کو حقیر جانا اور میری شریعتوں پر عمل نہیں کیا سو خداوند یہوداہ یہ کہتا ہے ازبس کہ تم نے ان قوموں کی نسبت سے جو تمہارے گرد و پیش ہیں زیادہ بغاوت کی اور میری شریعتوں پر نہ چلے، سو خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ میں ہاں میں ہی تیرا مخالف ہوں اور تیرے درمیان سب قوموں کی آنکھوں کے سامنے تجھے سزا دوں گا"۔

اور زکریاہ نبی کی کتاب میں یہود کے دوسرے فساد اور بیت المقدس کی دوبارہ تباہی کے متعلق یہ پیشین گوئی درج ہے:

"دیکھو خداوند کا دن آتا ہے اور تیری لوٹ کا مال تیرے درمیان بانٹا جائے گا اور میں ساری قوموں کو فراہم کروں گا کہ یروشلم پر چڑھیں اور لڑیں اور شہر لے لیا جائے گا اور گھر کے گھر لوٹے جائیں گے اور عورتیں بے حرمت کی جائیں گی اور آدھا شہر اسیر ہو کے جائے گا پھر وہ جو باقی رہی جائیں گے شہر میں کاٹے نہ جائیں گے تب خداوند خروج کرے گا اور ان قوموں سے ساتھ جنگ کرے گا جس طرح سابق میں جنگ کے دن لڑا تھا"۔ ✿

یہ ہے خلاصہ ان مکاشفات یا پیشین گوئیوں کا جو انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں میں بڑی تفصیلات کے ساتھ مذکور ہیں اور جن کا اجمال تذکرہ قرآن عزیز (سورہ بنی اسرائیل) میں بھی بصورت تصدیق موجود ہے۔

باب ۱ آیات ۱۵-۱۶ ✿ باب ۷ آیات ۸-۱۱

باب ۲۵ آیات ۸-۹ ✿ باب ۱۴ آیات ۱-۳

Marfat.com

اب سوال یہ ہے کہ ان مکاشفات اور پیشین گوئیوں کا ظہور کس کس زمانہ میں ہوا اور کس طرح ہوا تو مفسرین میں سے ابن کثیر کے طرز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہود کی ان دو شرانگیزیوں میں سے ایک کو بعثت محمد (ﷺ) سے قبل زمانہ سے متعلق سمجھتے ہیں اور دوسری کو زمانہ بعثت ﷺ پر محمول فرماتے ہیں اور پھر پہلے واقعہ کے متعلق اپنی جانب سے فیصلہ دیتے ہوئے مفسرین کے تین قول نقل کرتے ہیں:

① قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہود کی پہلی شرارت کی سزا میں جالوت کا حملہ ہوا جس نے یہود کو بہت مصیبت میں ڈال دیا تھا مگر داؤد علیہ السلام کی بدولت اس کے فتنہ سے ان کو نجات ملی یہ واقعہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔

② سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ پہلا وعدۂ الٰہی جو پاداش عمل میں یہود پر نافذ ہوا موصل و نینویٰ کے مشہور قاہر بادشاہ سنجاریب کے حملہ کی شکل میں ظاہر ہوا جس نے فلسطین کے اکثر شہروں پر قبضہ کر لیا تھا اور بیت المقدس کا محاصرہ کیے ہوئے تھا مگر جب یہود اور شاہ یہود خرقیاہ نے اپنے زمانہ کے نبی یسعیاہ علیہ السلام کے ہاتھ پر توبہ و انابت کی اور وہ سچائی کے ساتھ اپنی بداعمالیوں اور بدکاریوں سے باز آ گئے تب خدائے تعالیٰ نے ان پر سے اس بلا کو ٹال دیا اور محاصرہ ترک کر کے واپس ہوا۔

③ سعید بن جبیر ہی سے دوسری روایت یہ ہے کہ اس سے مراد بخت نصر (بنوکدنذر) شاہ بابل کا وہ مشہور حملہ ہے جس نے نہ صرف فلسطین اور شام کے تمام علاقے کو تاراج کر دیا تھا اور بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی بلکہ یہود کی قومیت و نسل کو بھی برباد کر ڈالا اور ہزاروں بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا تھا مگر یرمیاہ علیہ السلام کی پیشین گوئی کے مطابق ستر برس کے بعد یہود کو خورس شاہ فارس نے بابل کی غلامی سے نجات دلائی اور ان کو دوبارہ آزادی، شادمانی اور خوش عیشی نصیب ہوئی اور خورس کے حکم سے بیت المقدس بھی دوبارہ تعمیر ہوا اور اس نے حضرت دانیال علیہ السلام کو ان کا سردار بنا کر یروشلم واپس کر دیا۔ [1]

اور قاضی بیضاوی اور بعض دوسرے مفسرین نے پہلی مرتبہ کے معاملہ کو سنجاریب یا بخت نصر سے متعلق کیا ہے اور دوسرے واقعہ کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ فارس کے ملوک الطوائف میں سے ہردوس بادشاہ کے زمانہ میں پیش آیا جب کہ اس نے بیت المقدس پر سخت حملہ کیا اور یہود اس کی مقاومت سے عاجز رہے مگر جب انہوں نے اپنے زمانہ کے پیغمبر کے سامنے سچی توبہ کی اور نیک کردارانہ زندگی اختیار کرنے کا پختہ عہد و پیمان کیا تو ان سے یہ مصیبت ٹال دی گئی اور یہود کی شرانگیزیوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان پر یہ تباہیاں اس وقت لائی گئیں جب کہ وہ اپنی شرارت میں اس درجہ بڑھ گئے تھے کہ انبیاء علیہم السلام کے قتل سے بھی باز نہیں رہتے تھے، چنانچہ پہلی مرتبہ میں یسعیاہ یا یرمیاہ [2] کو قتل کیا تھا اور دوسری مرتبہ زکریا یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے قتل پر بھی آمادہ تھے اور ﴿وَاِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا﴾ میں اس تیسرے واقعہ کا تذکرہ ہے جو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ پیش آیا یعنی یہود نے اپنی الہامی کتابوں میں آپ کی نبوت و رسالت کے حالات و علامات جان لینے کے باوجود آپ کا انکار کیا اور بدعہدیاں کر کے آپ کو اور مسلمانوں کو ہر قسم کی ایذائیں پہنچائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس مرتبہ جب ٹھکرائے گئے تو پھر کبھی نہ ابھرے اور نہ قیامت تک کبھی صاحب حکومت ہو سکیں گے۔ [3]

---

[1] تفسیر ابن کثیر ۲ و تاریخ ابن کثیر ج ۲ [2] ان ہر دو انبیاء میں سے کوئی بھی قتل نہیں کیے گئے۔

[3] بیضاوی سورۂ اسراء

Marfat.com

دوسری رائے یہ ہے کہ یہود کی پہلی شرارت اور اس کی پاداش کا معاملہ بخت نصر کے حملہ بیت المقدس سے تعلق رکھتا ہے اور دوسری مرتبہ کا معاملہ طیطوس (ٹیٹس) رومی کے حملہ سے متعلق ہے اور یہی رائے صحیح اور قرآن عزیز کی آیات اور تاریخی نقول کے مطابق ہے اور یہ اس لیے کہ قرآن عزیز نے اس معاملہ کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے حسب ذیل باتیں خصوصیت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں۔

① "الکتاب" میں یہ خبر دے دی گئی تھی کہ یہود دو مرتبہ سخت شر انگیزی اور فساد کریں گے:

﴿وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝﴾

(بنی اسرائیل: ۴)

② جب انہوں نے پہلی مرتبہ شر و فساد کیا تو ہم نے ان پر ایسی قاہر طاقت مسلط کر دی کہ اس نے ان کی بستیوں میں گھس کر ان کو اور ان کے گھروں کو تباہ و برباد کر ڈالا:

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝﴾ (بنی اسرائیل: ۵)

③ اس تباہی کے بعد (ان کی توبہ و انابت پر) ہم نے ان کو سابق کی طرح پھر حکومت و طاقت بخشی اور مال و متاع کی بہتات سے بھی مستفیض کیا:

﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل: ۶)

④ اور اس کو یہ بھی بتا دیا کہ سرکشی اور فساد سے پرہیز اور امن و آشتی اور خدائے تعالیٰ کی فرمانبرداری کے قبول کا باز اثر ہم کو کوئی فائدہ یا نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ اس کی خلاف ورزی میں تمہارا اپنا ہی نقصان ہے اور اس کی اطاعت و انقیاد سے تم ہی کو فائدہ پہنچتا ہے:

﴿اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا﴾ (بنی اسرائیل: ۷)

⑤ مگر انہوں نے دوسری مرتبہ پھر بدعہدی کی اور خدا کی نافرمانی و رفساد فی الارض میں دوبارہ بے باک ہو گئے تو ہم نے بھی پہلے کی طرح ان پر ایک ظالم طاقت کو مسلط کر دیا جس نے سابق ظالم حکمران کی طرح دوبارہ بیت المقدس اور اس کے ہیکل (مسجد) کو بھی برباد کیا اور ان کو بھی ذلیل و رسواء کر کے ان کی سرکشی کا سر کچل دیا:

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل: ۷)

اور اگرچہ یہود کی یہ تباہی بظاہر حال ابدی معلوم ہو لیکن خدا تعالیٰ کی رحمت تیسری مرتبہ اور موقعہ دے گی کہ وہ عزت و سربلندی حاصل کریں اور ان کی مایوسی مبدل بہ کامرانی ہو جائے لیکن اگر انہوں نے اس کو بھی ٹھکرا دیا تو بے شک پھر اس کا قانون "پاداش عمل" بھی ان کو ضرور سزا دے گا اور وہ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے اور پھر یقیناً رہتی دنیا تک ذلیل و خوار ہی رہیں

Marfat.com

گے اور دار آخرت میں تو جہنم ایسے ہی متکبروں کے لیے تیار کی گئی ہے:

﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل: ۸)

ان تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہود کی شر انگیزیوں پر بصورت سزا و عذاب جب جابر و قاہر بادشاہوں کو مسلط کیا گیا انہوں نے دونوں مرتبہ بیت المقدس (یروشلم) کو ضرور تباہ و برباد کیا:

﴿وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل: ۷)

اس لیے جن اقوال میں پہلے واقعہ کا مصداقہ آشوری حکمران "سنجاریب" یا "جالوت" کو بتایا گیا ہے وہ غلط ہے کیونکہ ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی بیت المقدس میں داخل نہیں ہو سکا چہ جائیکہ وہ اس کو تباہ برباد کرتا چنانچہ جالوت کے متعلق تو قرآن کی تصریحات بھی اس کی تائید کرتی ہیں اور سیر و تاریخ کی نقول ھی جیسا کہ ہم حضرت شموئیل علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعات میں بیان کر چکے ہیں اسی طرح سنجاریب کے متعلق "یسعیاہ کی کتاب" میں یہ موجود ہے۔

پس شاہ حزقیاہ کے ملازم یسعیاہ کے پاس آئے۔ تب یسعیاہ نے انہیں فرمایا تم اپنے آقا سے کہو خداوند یوں فرماتا ہے کہ تم ان باتوں سے جنہیں شاہ آشور (سنجاریب) کے جوانوں نے کہہ کے میری تکفیر کی ہراساں مت ہو دیکھ میں اِس میں روح ڈالوں گا اور وہ ایک افواہ سن کے اپنی مملکت کو پھر جائے گا اور میں اِس سے اِس ہی کی سرزمین میں تلوار سے مروا ڈالوں گا۔ سو خداوند شاہ آشور (سنجاریب) حق میں یوں فرماتا ہے کہ وہ اس شہر (یروشلم) میں نہ آئے گا نہ اس کے اندر تیر چلائے گا نہ پھر پکڑ کے اس کے سامنے ظاہر ہوگا اور نہ اس کے مقابل دمدمہ باندھے گا بلکہ جس راہ سے وہ آیا اسی راہ سے پھر جائے گا اور اس شہر میں نہ آ سکے گا۔ تب سنجریب (سنجاریب) شاہ آشور نے کوچ کیا اور چلا گیا اور پھر گیا اور نینوی میں آ رہا۔ ❁

اور قاضی بیضاوی کا یہ قول بھی صحیح نہیں ہے کہ یہود سے متعلق دوسرے حادثہ کا مصداق فارس کے ملوک الطوائف میں سے شاہ ہردوس ہے اس لیے کہ تاریخ و سیر میں ملوک الطوائف کے عہد میں کسی ایسے بادشاہ کا ذکر نہیں پایا جاتا جس نے بیت المقدس پر چڑھائی کر کے اس کو فتح کیا اور اس کو تباہ و برباد کر ڈالا ہے۔

ان اقوال کے برعکس توراۃ (صحائف انبیاء) اور سیر و تاریخ کی نقول سے باتفاق یہ ثابت ہوتا ہے کہ فلسطین اور سرزمین یہوداہ کی تباہی اور ہیکل کی بربادی صرف دو بادشاہوں کے ہاتھوں ہوئی ہے اور نہ صرف شہروں کی بربادی بلکہ یہودی قومیت کی وہ تباہی و بربادی جو دنیا کے انقلابات کی تاریخ میں اہم جگہ رکھتی ہے۔ ایک بابل کے قاہر بادشاہ بنوکدنذر (بخت نصر) کے ہاتھ سے اور یہ تقریباً ۶۰۴ ق م کا واقعہ ہے اور دوسری فیطوس رومی کے ہاتھوں سے اور یہ واقعہ رفع مسیح علیہ السلام سے تقریباً ستر سال بعد پیش آیا اور ان ہی دو حادثوں میں یہود، یہودی قومیت اور یہودی مذہب پر وہ سب کچھ ہو گزرا جس کی اطلاع پہلے سے توراۃ (صحف انبیاء) میں دے دی گئی تھی اور جس کی تصدیق کے لیے قرآن عزیز بھی شہادت دے رہا ہے۔

❁ باب ۳۷ آیات ۵-۷ و آیات ۳۱-۳۳ و آیات ۳۷-۳۸

Marfat.com

اس لیے بلاخوف تردید یہ کہنا صحیح ہے کہ یہود کی بدکرداریوں کے نتیجہ میں جابر و قاہر بادشاہوں کے ہاتھوں ان کی تباہی و بربادی کے جو دو سامنے پیش آئے اور جن کا ذکر سورہ اسراء (بنی اسرائیل) میں ہے وہ بلاشبہ بخت نصر اور طیطوس (ٹیٹس) ہی سے تعلق رکھتے ہیں تو اب ازبس ضروری ہے کہ ان ہر دو واقعات کی تفصیلات بیان کر کے یہ دکھایا جائے کہ اس زمانہ میں یہود کی شرانگیزیاں اور مفسدانہ کارگزاریاں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ ان دونوں تباہ کن حوادث میں ان پر جو کچھ گزرا وہ ان کی بداعمالیوں ہی کا ثمرہ اور نتیجہ تھا اور پاداش عمل ہی نے ان دو طاقتوں کی شکل میں نمود و ظہور کیا تھا۔

شرارت یہود کا پہلا دور:

اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون قدرت کا ہمیشہ سے یہ اٹل فیصلہ رہا ہے کہ جب بداخلاقی، فتنہ و فساد، خون ریزی، جبر و ظلم اور حق کے مقابلہ میں بغض و حسد کسی جماعت کا قومی مزاج بن جاتے ہیں اور چند افراد میں نہیں بلکہ پوری قوم کے اندر یہ امور نشو و نماء پا جاتے ہیں۔ تو پھر قبول حق کی صحیح استعداد ان سے سلب کر لی جاتی ہے اور وہ اس درجہ بے خوف اور بے باک ہو جاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس خدا کے سچے پیغمبر (دعوت حق اور پیغام الٰہی سنانے آتے ہیں تو وہ صرف اس دعوت سے منہ ہی نہیں موڑ لیتے بلکہ ان انبیاء و رسل کو قتل تک کر دینے سے گریز نہیں کرتے اور شرک و طغیان کی راہ عمل بنا کر اولیاء الرحمان کی جگہ اولیاء الشیطان بن جاتے ہیں جب ان کی حالت اس درجہ تک پہنچ جاتی ہے تو اب خدائے برتر کا قانون "پاداش عمل" بروئے کار آتا ہے اور آخرت کے عذاب الیم کے علاوہ دنیا میں ہی ان کو ایسی ہلاکت و بربادی سے دوچار کر دیتا ہے کہ اس قوم کا تمام کبر و غرور اور شر و فساد کی شعلہ سامانیاں ذلت و خواری کے ساتھ خاک کر دی جاتی ہیں اور ان کی قومی زندگی کو قعر مذلت میں پھینک دیا جاتا ہے تاکہ ان کی آنکھیں مشاہدہ کر لیں اور عبرت آموز قلب بھی یہ سمجھ لیں کہ حقیقی عزت و سربلندی کے مالک تم نہیں ہو اور ذلت و عزت تمہارے اپنے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اس قادر مطلق ہستی کے قبضہ میں ہے جو کائنات ہست و بود کا خالق و مالک ہے اور جس کا یہ اعلان ہے کہ بدکاروں کے لیے انجام کار ذلت و رسوائی کے سواء اور کچھ نہیں ہے اور حقیقی عزت نیکوکاروں ہی کے لیے ہے اور وہی اس حقیقت کے پیش نظر جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے:

﴿وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞﴾ (آل عمران: ۲۶)

پس جب ہم اس قانون فطرت کو پیش نظر رکھ کر یہود بنی اسرائیل کے اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں جو زیر بحث واقعات سے متعلق ہے تو یہ بات روز روشن کی طرح نمایاں نظر آتی ہے کہ ان کی قومی زندگی کا قوام مسطورہ بالا بداخلاقیوں سے ہی بنا اور وہ اپنی اس زندگی پر فخر و مباہات کرتے تھے چنانچہ حضرت داؤد اور سلیمان (علیہما السلام) کے بعد ان کی مذہبی اور اخلاقی پستی کا یہ عالم کہ جھوٹ، فریب، ظلم و سرکشی اور فساد و فتنہ انگیزی ان کا شعار بن گئے تھے حتیٰ کہ شرک و بت پرستی تک ان میں رچ گئی تھی لیکن اس کے باوجود عرصہ دراز تک خدائے تعالیٰ کے "قانون مہلت" نے ان کو مہلت دی کہ وہ اپنی حالت کی اصلاح کریں اور اس کی صفت "رحمت" نے ان سے منہ نہیں موڑا بلکہ ان کی رشد و ہدایت اور اصلاح اخلاق و اعمال کے لیے نبیوں اور پیغمبروں کا سلسلہ قائم رکھا جو ان کو نیکوکاری کی ترغیب دیتے اور بدکاری سے اجتناب کی تلقین کرتے رہتے تھے تاکہ ان کو دین و دنیا کی سربلندی حاصل ہو اور

وہ انبیاء ورسل علیہم السلام کی اولاد ہونے کی حیثیت سے دوسروں کے لیے اسوۂ حسنہ بن سکیں مگر یہود پر ان کے ارشاد وتبلیغ کا مطلق کوئی اثر نہیں ہوا اور ان کی سرکشی اور نافرمانی ترقی پذیر ہوتی گئی اور ان کے علماء واحبار نے سیم وزر کی خاطر خدائے برتر کے احکام میں تلبیس شروع کر دی اور حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے میں بے خوف ہو گئے اور عوام نے کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال کر گمراہی کو اپنا امام بنالیا اور بے باکی کے ساتھ ہر قسم کی بداخلاقی کو اپنالیا اور آخر کار ان کے خواص وعوام اس انتہائی شقاوت و بدبختی پر اتر آئے کہ خدا کے معصوم پیغمبروں کو قتل کرنا شروع کر دیا اور ان کی تکذیب کر کے ان کے خون ناحق پر فخر ومباہات کرنے لگے۔ چنانچہ یسعیاہ نبی کی کتاب میں جگہ جگہ ان کی بدکرداریوں اور نافرمانیوں کا اس طرح ذکر موجود ہے:

"بنی اسرائیل نہیں جانتے، میرے لوگ کچھ نہیں سوچتے آہ خطا کار گروہ ایک قوم جو گناہوں سے لدی ہوئی ہے بدکرداروں کی نسل، خراب اولاد کہ انہوں نے خدا کو ترک کیا، اسرائیل کے قدوس کو حقیر جانا اس سے بالکل پھر گئے"۔ ❶

"اے میری امت تیرے پیشواء تجھ کو گمراہ کرتے ہیں اور تیرے راہ گیروں کی راہ مارتے ہیں خداوند کھڑا ہے کہ مقدمہ پیش کرے اور وہ لوگوں کی عدالت کرنے پر مستعد ہے"۔ ❷

"کیونکہ وہ جوان کے پیشواء ہیں ان سے خطا کاری کراتے ہیں اور وہ جوان کی پیروی کرتے ہیں نگلے جائیں گے سو خداوند ان کے جوانوں سے خوشنود نہیں اور وہ ان کے یتیموں اور ان کی بیواؤں پر رحم نہ کرے گا کہ ان میں ہر ایک بے دین ہے اور بدکردار ہے"۔ ❸

اور یرمیاہ نبی کی کتاب میں اس طرح مذکور ہے:

"اور خداوند نے اپنے سارے خدمت گزار نبیوں کو تمہارے پاس بھیجا، صبح سویرے اٹھ کر بھیجا، پر تم نے نہ سنا نہ سننے کو اپنا کان لگایا، انہوں نے کہا کہ ہر ایک اپنی بری راہ سے اور اپنے کاموں کی برائی سے باز آؤ اور اس سرزمین میں جسے خدا نے تم کو اور تمہارے باپ داداؤں کو ہمیشہ کے لیے دیا بستے رہو اور تم بیگانے باطل معبودوں کا پیچھا نہ کرو کہ ان کی بندگی اور ان کو سجدہ کرنے لگو اور اپنے ہاتھوں کے کاموں سے مجھے غصہ نہ دلاؤ اور میں تم پر کچھ ضرر نہ پہنچاؤں گا۔ پھر تم نے میری نہ سنی، خداوند کہتا ہے تاکہ اپنے ہاتھوں کے کاموں سے اپنے زیان کے لیے مجھے غصہ دلاؤ"۔ ❹

اور ایسا ہوا کہ جب یرمیاہ ساری باتیں کہہ چکا جو خداوند نے اسے حکم دیا تھا کہ ساری قوم سے کہے تب کاہنوں اور نبیوں (جھوٹے مدعیان نبوت) اور ساری قوم نے اس کو پکڑا اور کہا کہ تو یقیناً قتل کیا جائے گا۔ تو نے خداوند کا نام لے کر کس لیے نبوت کی ہے اور یہ کہا کہ یہ گھر (یروشلم) سیلا کی مانند ہو جائے گا اور یہ شہر ویران کیا جائے گا۔ ❺

کیونکہ اے یہوداہ جتنے تیرے شہر ہیں اتنے ہی تیرے معبود ہیں تم کاہے کو مجھ سے محبت کرو گے تم سب مجھ سے پھر گئے ہو خداوند کہتا ہے میں نے تمہارے لڑکوں کو عبث مارا پیٹا ہے اور وہ تربیت پذیر نہیں ہوئے، تمہاری ہی تلوار پھاڑنے والے شیر ببر کی مانند تمہارے نبیوں کو کھا گئی ہے (یعنی تم نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے سچے پیغمبروں کو قتل کیا ہے)۔

---

❶ باب ا آیت ۳-۴ ❷ باب ۳ آیات ۱۲-۱۳ ❸ باب ۹ آیات ۱۶-۱۷
❹ باب ۲۵ آیات ۴-۷ ❺ باب ۲۱ آیات

Marfat.com

یہود کی سرکشی اور خدا سے بغاوت کے یہ افسوس ناک حالات تھے جن پر خدا کی جانب سے بار بار ان کو تنبیہ کی جاتی اور مہلت سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی جاتی رہی لیکن ان پر الٹا ہی اثر ہوتا رہا اور ان کی بے حیائی اور بیجا جسارت بڑھتی ہی رہی، تب یکایک غیرت حق نے قہر اور بطش شدید کی شکل اختیار کر لی اور اس کا زبردست ہاتھ ان کی جانب پاداش عمل کے لیے بڑھا۔

ساتویں صدی قبل مسیح کے آخری دور میں بابل (عراق) کی حکومت پر ایک زبردست جری اور ظالم و جابر بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس کا نام بنوکدنذر یا بنوکدزار تھا اور عرب اس کو بخت نصر کہتے تھے اگرچہ اس زمانہ میں بابل کی حکومت بذات خود ایک متمدن اور زبردست حکومت شمار ہوتی تھی مگر اس سے قریب نینوی کی مشہور طاقت کی تباہی کے بعد تو اس کو اور زیادہ قوت و شوکت حاصل ہوگئی اور وہ ایک عظیم الشان شہنشاہیت تسلیم کر لی گئی۔ حتیٰ کہ ایران کی مختلف قبائلی حکومتیں بھی اس کی باج گزار اور ماتحت حکومتیں سمجھی جانے لگیں۔

بنوکدنذر کی شمشیر کشورستان نے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا اور اس کی نظریں شام و فلسطین کے علاقوں پر بھی پڑنے لگیں جو یہودیا کا علاقہ کہلاتا اور بنی اسرائیل کے مذہب اور قومیت کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ وہ اس کی جانب بڑھا، جب یہودیا کی سرزمین کے باشندوں نے یہ سنا تو ان کے ہوش و حواس جاتے رہے اور بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب کو موت کا نقشہ نظر آنے لگا اور اب وہ سمجھے کہ یسعیاہ اور یرمیا (علیہما السلام) نے ہماری بدکاریوں پر متنبہ کرتے ہوئے جس سزا اور عذاب الٰہی کا ذکر کیا تھا اور جس سے ناراض ہو کر ہم نے یرمیاہ (علیہ السلام) کو قید خانہ میں ڈال رکھا ہے وہ وقت آ پہنچا مگر شومی قسمت دیکھیے کہ انہوں نے اس حالت کو دیکھ کر اپنی بداعمالیوں اور بدکرداریوں پر اظہار ندامت اور درگاہ الٰہی میں توبہ و انابت کی جانب پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی مادی طاقت کے اسباب و وسائل پر بھروسہ کیا اور شاہ بابل کی مقاومت کے لیے آمادہ ہوگئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ فلسطین و شام کے شہروں اور آبادیوں کو ویران اور مسمار کرتا ہوا بیت المقدس (یروشلم) کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ اب شاہ یہودا یکونیا [1] بن یویقیم کو بجز اطاعت کوئی چارہ نہ رہا۔ بنوکدنذر، یروشلم میں لشکر سمیت داخل ہوا اور بادشاہ، سردار اور تمام امراء کو قید کر لیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ لشکریوں نے تمام مال و متاع اور ہیکل کی تمام اشیاء کو لوٹ لیا اور توراۃ کے تمام نسخوں کو آگ میں جلا کر خاک کر دیا اور ہزار ہا انسانوں کو قتل اور باختلاف روایت ایک لاکھ سے زائد یہودیوں کو (جن میں بوڑھے، بچے، عورتیں اور مرد سب ہی تھے) بھیڑ بکری کی طرح ہنکاتا ہوا پیادہ بابل لے گیا اور ان سب کو غلام و باندی بنا لیا، علاقہ فلسطین و شام کے لاکھوں انسانوں کی قتل و غارت کرنے کے علاوہ صرف دمشق میں اس نے بے تعداد یہودیوں کو تہ تیغ کیا۔ حتیٰ کہ خود یہودیوں کی زبان پر یہ تھا کہ یہ انبیاء علیہم السلام کے ناحق قتل کرنے کی سزا ہے جو ہم کو شاہ بابل کی شمشیر براں کے ذریعہ دی جا رہی ہے۔

غرض شاہ بابل کے اس حملہ نے یہود کا ملک ہی ویران نہیں کیا بلکہ ان کے مذہب اور قوم کو بھی پارہ پارہ کر دیا، چنانچہ یہود کے ان قیدیوں میں حضرت دانیال (اصغر) حضرت عزیر اور بعض دوسرے وہ بزرگ بھی تھے جن کو خدائے تعالیٰ کی جانب سے قیام بابل کے زمانہ میں یہود کی اصلاح کے لیے نبوت سے سرفراز کیا گیا تا کہ وہ اس بت پرست شہنشاہی کی غلامی میں طاقت و آزادی سے محرومی کے ساتھ ساتھ دین و مذہب سے بھی محروم نہ ہو جائیں۔ [2]

---

[1] باب ۲۴ آیت ۱ [2] تاریخ ابن کثیر ج ۲

Marfat.com

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ جب بنوکدنذر (بخت نصر) بیت المقدس میں داخل ہو کر سب کچھ برباد کر چکا تو اس کو اطلاع دی گئی کہ یہود نے اپنے ایک نبی یرمیاہ علیہ السلام کو اس بنیاد پر قید کر رکھا ہے کہ انہوں نے تیری آمد اور حملہ سے قبل اپنی قوم کو ان تمام باتوں کی خبر دے دی تھی جو آج پیش آئیں، یہ سن کر شاہ بابل نے ان کو زندان سے نکالا اور ان سے بات چیت کر کے بے حد متاثر ہوا اور اصرار کیا کہ اگر وہ بابل چلنے پر آمادہ ہوں تو ان کو حکومت میں منصب جلیل دیا جائے گا اور ان کی کیاست و فراست سے فائدہ اٹھایا جائے گا، مگر حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ تیرے ہاتھوں میری بدقسمت قوم کا جو حال ہوا ہے اس کے بعد میرے لیے بابل جانا میری زندگی کا سب سے بدترین سانحہ ہوگا۔ میں تو اب ان ہی کھنڈرات پر زندگی گزاروں گا۔ پس اے بادشاہ! تو مجھ سے اس بارہ میں اصرار نہ کر۔ شاہ بابل یہ سن کر خاموش رہا اور بابل کو روانہ ہو گیا۔ [1]

غلامی سے نجات:

بابل کی غلامی کا یہ زمانہ یہود کے لیے کس درجہ یاس انگیز حسرت زا اور عبرت ناک رہا ہوگا، اس کا حقیقی اندازہ ہمارے اور آپ کے لیے بہت مشکل ہے بظاہر کوئی سہارا نہیں تھا کہ جس کے بل بوتہ پر وہ اپنی اس حالت میں انقلاب پیدا کر سکتے البتہ جب کہ وہ یسعیاہ اور یرمیاہ علیہما السلام کے مکاشفوں اور پیشینگوئیوں کی ابتدائی صداقت [2] کا تجربہ کر چکے بلکہ اپنی زندگی پر ان کو گزرتا ہوا دیکھ چکے تو ان کے لیے امید کی ایک یہ جھلک ضرور باقی تھی کہ ان مکاشفوں اور پیشین گوئیوں میں ساتھ ہی یہ بھی خبر دی گئی تھی کہ یہود بابل میں ستر برس غلام رہیں گے اور ستر برس گزرنے پر فارس سے ایک بادشاہ کا ظہور ہوگا جو خدا کا مسیح اور اس کا چرواہا کہلائے گا اور وہ یہود اور یروشلم کا نجات دہندہ ہوگا۔

یہ پیشین گوئی حضرت یسعیاہ نے واقعہ سے تقریباً ایک سو ساٹھ برس اور حضرت یرمیاہ نے ساٹھ برس قبل یہوداہ کو ان کی تباہی و بربادی کی پیشین گوئی کے ساتھ ساتھ سنا دی تھی حتیٰ کہ قیام بابل کے دوران میں پیشین گوئی کے ظہور سے تھوڑے زمانہ قبل دانیال علیہ السلام نے اپنے مکاشفہ میں اس شاہ فارس کو ایک ایسے مینڈھے کی شکل میں دیکھا تھا جس کے دو سینگ (قرنین) ہیں اور

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲

[2] شاہ بابل نے یہود اور یروشلم کے ساتھ جو کچھ کیا اس کی خبر یہود کو پہلے سے دے دی گئی تھی اور بتا دیا گیا تھا کہ تمہاری بدکاریوں کا اگر یہی حال رہا تو تم ایک بت پرست بادشاہ بنوکدنزر کے ہاتھوں ذلیل و رسوا کیے جاؤ گے، یہ پیشین گوئی بھی یسعیاہ اور یرمیاہ کے صحیفوں میں آج تک موجود ہے۔

تب یسعیاہ نبی نے حزقیاہ بادشاہوں کے پاس آ کر اس سے کہا کہ ان شخصوں نے کہا اور وہ کہاں سے تیرے پاس آئے؟ حزقیاہ نے جواب دیا کہ ایک وہ (ملک بابل ہی سے میرے پاس آئے تب اس نے کہا انہوں نے تیرے گھر میں کیا کیا دیکھا؟ حزقیاہ نے جواب دیا سب کچھ کہ جو میرے گھر میں ہے انہوں نے دیکھا، تب یسعیاہ نے حزقیاہ کو کہا کہ رب الافواج کا کلام سن۔ دیکھ وہ دن آتے ہیں کہ وہ سب کچھ جو کہ تیرے گھر (یروشلم) میں ہے اور جو کچھ تیرے باپ داداوں نے آج کے دن تک ذخیرہ کر رکھا ہے اٹھا کے بابل کو لے جائیں گے۔ خداوند فرماتا ہے کوئی چیز باقی نہ چھوٹے گی اور وہ تیرے بیٹوں میں سے جو تیری نسل سے ہوں گے اور تجھ سے پیدا ہوں گے لے جائیں گے اور وہ شاہ بابل کے قصر میں خواجہ سرا ہوں گے۔ (باب ۳۹ آیات ۷-۳)

یہ پیشین گوئی حضرت یسعیاہ نے اس وقت کی تھی جب کہ بنوکدنزر سے بہت پہلے بابل کے بادشاہ مردوک نے یہودا کے بادشاہ حزقیاہ کے پاس اپنے ایلچی بھیجے تھے اسی طرح حضرت یرمیاہ کی کتاب میں ہے۔

اس لئے رب الافواج یوں کہتا ہے تم نے میری باتیں نہیں سنیں تو دیکھو میں شمال کے سارے گھرانوں کو اور بنوکدنزر کو جو کہ میرا غلام ہے بلا بھیجوں گا خداوند کہتا ہے اور میں انہیں اس سرزمین اور اس کے باشندوں پر اور ان ساری قوموں پر جو چہار جانب ہیں چڑھائی کرا لاؤں گا۔ (باب ۲۵ آیات ۹-۸)

جبرائیل علیہ السلام نے اس کی یہ تعبیر دی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بادشاہ مادہ (میڈیا) اور فارس دو بادشاہتوں کو ملا کر بادشاہی کرے گا اور اسی مکاشفہ میں انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک اور بکرا ہے جس کی پیشانی پر صرف ایک سینگ ہے اور اس نے دو سینگ والے مینڈھے کو مغلوب کر لیا ہے اور پھر جبرائیل علیہ السلام نے اس کی تعبیر یہ دی کہ یہ ایک ایسا زبردست بادشاہ ہوگا جو ایران کی اس شہنشاہی کا خاتمہ کر کے اس پر قابض ہو جائے گا (یعنی سکندر یونانی)۔ چنانچہ یرمیاہ کی کتاب میں بصراحت یہ مدت مذکور ہے۔

اور یہ ساری سرزمین ویرانہ اور حیرانی کا باعث ہو جائے گی اور یہ قومیں ستر برس تک بابل کے بادشاہ کی غلامی کریں گی۔ ❶

اور ایسا ہوگا "خداوند کہتا ہے" کہ جب ستر برس ہوں گے میں بابل کے بادشاہ کو اور اس کی قوم کو اور کدیوں (بابلیوں) کی زمین کو ان کی بدکرداری کے سبب سزا دوں گا اور میں اسے ایسا اجاڑوں گا کہ ہمیشہ تک ویرانہ رہے۔ ❷

خداوند یوں کہتا ہے کہ جب بابل میں ستر برس گزر چکیں گے تو میں تمہاری خبر لینے آؤں گا اور تمہیں اس مکان میں پھر لانے سے اپنی اچھی بات تم پر قائم کروں گا۔ ❸

اور ان ہی پیشین گوئیوں میں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ یہود کو بابل کی غلامی سے نجات دینے والی ہستی کا ایران سے ظہور ہوگا اور اس کا نام خورس ہوگا اس کی حکومت اور شہنشاہیت کا فروغ خداوند اسرائیل کی کرشمہ سازیوں کا نتیجہ ہوگا اور جو بات ان کے گزشتہ بادشاہوں کو نصیب نہیں ہوئی اس کو نصیب ہوگی کیونکہ وہ خداوند کا چرواہا، مسیح (مبارک) اور بنی اسرائیل کا نجات دہندہ ہوگا۔ چنانچہ یسعیاہ کی کتاب میں اس کے ظہور کی خبر صاف الفاظ میں اس طرح دی گئی ہے۔

(میں خداوند بنی اسرائیل کا خدا) یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ آباد کی جائے گی اور یہوداہ کے شہروں کی بات کہتا ہوں کہ وہ بنائے جائیں گے اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سوکھا ڈالوں گا۔ جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی خداوند اپنے "مسیح" خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں اور دہرائے ہوئے دروازے اس کے لیے کھول دوں اور وہ دروازے بند نہ کیے جائیں گے۔ میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں، میرے سواء کوئی خدا نہیں، میں نے تیری کمر باندھی اگرچہ تو نے مجھے نہ پہچانا تا کہ لوگ سورج نکلنے کی اطراف سے اور سورج کے غروب ہونے کی اطراف تک جانیں کہ میرے سواء کوئی نہیں میں ہی خداوند ہوں۔ میں نے اس کو صداقت کے لیے برپا کیا ہے اور میں اس کی ساری راہیں آراستہ کروں گا وہ میرا شہر بنائے گا اور میرے اسیروں کو بغیر قیمت اور عوض لیے چھڑائے گا۔ اے اسرائیل کے خدا، اے نجات دینے والے وہ سب کے سب پشیمان اور سراسیمہ بھی ہوں گے وہ جو بت تراش (اہل بابل) میں سب کے سب گھبرا جائیں گے پھر اسرائیل خداوند میں ہو کے ابدی نجات کے ساتھ رہائی پائے گا۔ ❹ گزرو آستانہ پر سے گزرو، لوگوں کے لیے راہ راست کرو اور شاہراہ اونچی کرو، پتھر سرکا دو قوموں کے لیے جھنڈا کھڑا کرو، دیکھو خداوند دنیا کی سرحدوں تک منادی کرتا ہے کہ صیہون کی بیٹی کو کہو دیکھو تیرا نجات دینے والا آتا ہے دیکھ اس کا اجر اس کے ساتھ اور اس کا کام اس کے آگے ہیں۔ ❺

---

❶ باب ۲۵ آیات ۱۱ ❷ باب ۲۵ آیات ۱۲-۱۳ ❸ باب ۲۹ آیات ۱۰-۱۱

❹ یسعیاہ باب ۴۰ آیات ۲۶-۲۸ باب ۴۱ آیات ۱-۱۳ ❺ باب ۱۲ آیات ۱۰-۱۱

Marfat.com

بابل کی بابت وہ الہامی بات جسے اموص کے بیٹے یسعیاہ نے رویا میں دیکھا، میں نے اپنے مخصوص کیے ہوؤں کو حکم کیا۔ میں نے اپنے بہادروں کو جو میری خداوندی سے مسرور ہیں کہ وہ میرے قہر کو انجام دیں۔ رب الافواج جنگی لشکر کی موجودات لیتا ہے، وہ دور ملک سے آسمان کی انتہاء کی طرف سے آتے ہیں۔ دیکھو! میں مادیون (میڈیا والوں کو) ان پر چڑھاؤں گا جو کہ روپیہ کو خاطر میں نہیں لاتے اور سونے سے خوش نہیں ہوتے۔ ✿

اور یرمیاہ کی کتاب میں مذکور ہے:

دیکھ! میں اتر کی سرزمین سے بڑی قوموں کے ایک گروہ کو برپا کروں گا اور بابل پر لے آؤں گا۔ کدستان (بابل) لوٹا جائے گا سب جو اسے لوٹیں گے آسودہ ہوں گے۔" خداوند کہتا ہے" اس لئے خداوند یوں کہتا ہے دیکھ میں تیری حجت ثابت کروں گا اور تیرا انتقام لوں اور اس (بابت) کے دریا سکھا دوں گا اور اس کے سوتے خشک کر دوں اا اور بابل کھنڈر ہو جائے گا اور گیدڑوں کا مقام اور حیرانی کا باعث ہوگا اور اس میں کوئی نہ بسے گا۔ کیونکہ حملہ آور اتر سے اس پر چڑھے ہیں۔ بابل سے رونے کی آواز اور بڑی ہلاکت کی صدا کسریوں کی سرزمین سے آتی ہے کیونکہ خداوند بابل کو غارت کرتا ہے۔ بابل کے بھاری شہر کی دیواریں سراسر ڈھائی جائیں گی اور اس کے بلند پھاٹک آگ سے جلا دیئے جائیں گے۔

توراۃ کے ان بیان کردہ واقعات کی تصدیق تاریخ کے روشن صفحات اس طرح کرتے ہیں کہ

تقریباً ۶۳۵ ق م ایران میں قبائلی طرز حکومت رائج تھا اور ایران دو حصوں پر تقسیم تھا جہاں جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں ان میں سے شمال مغربی حصہ میڈیا (مادہ یا مات) کہلاتا تھا اور جنوبی حصہ پارس کے نام سے موسوم تھا مگر اس دور میں چونکہ بابل و نینوئی کی حکومتیں زبردست اور قاہر حکومتیں تھیں اس لیے یہ دونوں ریاستیں نینوئی کی حکومت کے زیر اثر اور ماتحت سمجھی جاتی تھیں، لیکن جب ۶۱۲ ق م نینوئی تباہ ہو گیا اور آشوری حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو اگرچہ میڈیا کو آزادی نصیب ہو گئی اور وہاں قومی حکومت کے جذبات ابھرنے لگے اور ایک حکمران شاہی خاندان بھی پیدا ہو گیا تاہم پارس اور میڈیا دونوں ریاستوں کو آزاد سلطنت قائم کر لینے کی جرات نہ ہو سکی اور بابلی حکومت کو بے حد فروغ ہو گیا گویا نینوئی کی تباہی نے بابل کی طاقت کو بہت بڑی شہنشاہیت میں تبدیل کر دیا جس کے سامنے یہ ریاستیں بے اثر ہی رہیں یہ کیفیت ۵۶۰ تک رہی لیکن ۵۵۹ ق م میں اچانک میڈیا کے رئیس کبوچہ (کیقباد) کے جانشین کے ارش (خورس) نے غیر معمولی حالات کے ساتھ ظہور کیا اور چند ہی روز میں میڈیا اور فارس کی ریاستوں نے برضاء و رغبت اس کو اپنا واحد شہنشاہ تسلیم کر لیا اور وہ بغیر کسی خونریزی کے ایشیاء کوچک کے تمام علاقوں کا زبردست اور خود مختار شہنشاہ بن گیا۔

اہل فارس اس کو کے ارش اور گورش کہتے ہیں لیکن یہ یونانی میں سائرس اور عبرانی میں خورس اور عربی میں کیخسرو کے ناموں سے مشہور ہے۔

کے ارش کے ظہور سے یونانی اور یہودی دو قومیں خصوصیت کے ساتھ متعارف ہیں اس لیے کہ ان دونوں قوموں پر اس کی حکومت کا موافق اور مخالف حیثیت سے نمایاں اثر پڑا اور یہود کے لیے تو اس کا عروج و ظہور، خوش حالی، آزادی اور امن و اطمینان کا بہت بڑا سبب بنا اسی لیے وہ اس کی شخصیت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور ان کے انبیاء کے صحیفوں میں اس کو "خدا کا چرواہا" مسیح اور بنی اسرائیل کا "نجات دہندہ" کہا گیا ہے، مگر اہل عرب قبل از اسلام اس کی شخصیت سے زیادہ متعارف نہیں تھے اور بعد از اسلام جب

Marfat.com

مسلمانوں نے ایران کو فتح کیا تب بھی ان کو اس کی شخصیت کے تعارف سے اس لیے واسطہ نہیں پڑا کہ یہ ایران کے دور اوّل کا ہیرو ہے اور مسلمانوں کی فتوحات کا تعلق تمام تر ایران کے تیسرے دور سے متعلق ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اس کے نام اور شخصیت کے تعین میں بھی اختلاف نظر آتا ہے۔ چنانچہ بعض مؤرخین عرب نے اس کو بہمن بن اسفندیار کہا ہے اور بعض نے ذوالقرنین کی شخصیت پر بحث کرتے ہوئے اس کا نام کیقباد بیان کیا ہے، حالانکہ ایران و یونان کے وہ مؤرخین جو کے ارش کے معاصر ہیں کیقباد (کمبوچیہ) اس کے باپ اور اس کے بیٹے کا نام بتاتے ہیں اور بعض عرب مؤرخین نے اس کو لہراسپ بن کشتاسپ بتایا ہے۔

غرض جب گورش یا خورس میڈیا (ماہات) اور پارس دونوں ریاستوں کو ملا کر ایک زبردست اور خودمختار بادشاہ ہو گیا تو یہ وہ وقت ہے کہ بابل کے تخت سلطنت پر بنوکدنذر (بخت نصر) کا ایک جانشین بیل شازار سریر آرائے سلطنت تھا۔

یہ بادشاہ بخت نصر کی طرح اگرچہ جری اور بہادر نہیں تھا مگر ظلم اور عیاشی میں اس سے بھی آگے تھا، حتیٰ کہ خود اس کی اپنی رعایا اس کے اعمال بد سے پریشان اور اس کے ظلم سے عاجز اور ہر وقت انقلاب کی خواہاں رہتی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت دانیال علیہ السلام اپنی الہامی پیشین گوئیوں، کریمانہ اخلاق، عالی صفات اور غیر معمولی فہم و فراست کی وجہ سے پبلک میں اس درجہ مقبول تھے کہ حکومت کے نظام کار میں دخیل اور مشیر بن گئے تھے۔ انہوں نے بیل شازار کو ہر چند سمجھایا اور بداعمالیوں سے روکا اور ڈرایا مگر اس پر مطلق اثر نہ ہوا، اور ایک دن اس نے یہ نوبت پہنچا دی کہ اپنی محبوبہ کے اصرار پر یروشلم کے مقدس ظروف کو جو "بخت نصر لوٹ کر لایا تھا" مجلس نشاط میں منگوا کر ان میں شراب پی اور ان کی توہین کی مگر ابھی وہ شراب نوشی میں مشغول ہی تھا کہ اس نے شمع کافوری کی روشنی میں یہ منظر اپنی آنکھ سے دیکھا کہ بغیر کسی شکل و صورت کے سامنے آئے ہوئے ایک ہاتھ غیب سے ظاہر ہوا اور اس نے محل کی دیوار پر چند جملے لکھ دیئے یہ دیکھ کر بادشاہ پر بہت ہیبت طاری ہوگئی اور اس نے فوراً نجومیوں، کاہنوں، جوتشیوں اور بڑے بڑے عقلاء و حکماء کو جمع کیا اور ان سے اس واقعہ کو نقل کر کے تحریر کا مفہوم معلوم کرنا چاہا، لیکن کوئی اس عقدہ کو حل نہ کر سکا اور وہ بھی بادشاہ کی طرح حیران رہ گئے، تب ملکہ نے کہا کہ اس برگزیدہ انسان دانیال کو بلائیں جس کی باتیں ہمیشہ سچی ہوتی ہیں اور جو اپنے اعمال و کردار میں بے نظیر انسان ہے وہی اس کو حل کر سکتا ہے۔

حضرت دانیال علیہ السلام دربار میں پہنچے تو بادشاہ نے واقعہ نقل کیا اور کہا کہ اگر تم اس کو حل کر دو تو میں تم کو دولت و ثروت سے مالا مال کر دوں گا۔ دانیال علیہ السلام نے ہنس کر جواب دیا کہ مجھے بادشاہ کی دولت درکار نہیں ہے میں بغیر کسی عوض کے ہی بادشاہ کے اس عقدہ کو حل کر دوں گا۔ اے بادشاہ! گوش ہوش سے سن خدا نے تجھ کو قوت اور دولت دونوں سے حصہ وافر عطا فرمایا اور نبیوں کی اولاد تک تیرے حوالہ کر دی مگر تو نے خدا کا شکر ادا نہ کیا اور جس نیک کرداری کی تجھ سے توقع ہو سکتی تھی وہ تو نے پوری نہ کی اور حد یہ ہے کہ تو نے مجلس نشاط میں یروشلم کے ظروف کی توہین کر کے گویا یروشلم کے خدا کو چیلنج کیا، چنانچہ اس کی جانب سے تجھ کو وہ جواب ملا جو تو نے نوشتہ میں دیکھا، نوشتہ کہتا ہے کہ ہم نے تجھ کو وزن کیا مگر تو پورا نہ اترا اور کم نکلا، ہم نے تیری حکومت کا حساب کیا اور اس کو تمام کر ڈالا اور ہم نے تیری حکومت پارہ پارہ کر کے فارس اور میڈیا کے بادشاہ کو بخش دی۔ [1]

چنانچہ اس واقعہ کو چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ بابل کی رعایا نے چند افسروں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ خورس کے پاس

---

[1] نوشتہ کے الفاظ یہ ہیں: "منی منی تقیل او فیرسین" دانی ایل کی کتاب باب ۵ آیات ۲۵-۲۸۔

جائیں اور اس سے عرض کریں کہ آپ کی ایمان داری، عدل و انصاف اور رعایا پروری کی شہرت نے ہم کو مجبور کیا ہے کہ ہم آپ کو دعوت دیں کہ آپ ہم کو بیل شازار کے مظالم سے نجات دلا کر اپنی رعایا بنا لیجئے۔ خورس کے پاس یہ وفد اس وقت پہنچا جب کہ وہ مشرق کی مہم سر کرنے میں مشغول تھا، اس نے وفد کی درخواست کو سنا اور قبول کیا اور مشرقی مہم سے فارغ ہو کر بابل پہنچا اور اس کی مستحکم اور نہ تسخیر ہونے والی دوہری شہر پناہ کو منہدم کر کے حکومت بابل کا خاتمہ کر دیا اور تمام رعایا کو امن دے کر ان کو بیل شازار کے مظالم سے نجات دلائی جس کا بابل کی رعایا نے بے حد شکر یہ ادا کیا اور بخوشی اس کی اطاعت قبول کر لی۔ ❶

جب خورس بابل کے شہر میں فاتحانہ داخل ہوا تو دانیال علیہ السلام نے اس کو توراۃ (صحف انبیاء) کی وہ پیشین گوئیاں دکھائیں جو حضرت یسعیاہ اور حضرت یرمیاہ علیہما السلام نے یہود کو غلامی سے نجات دلانے والی ہستی کے متعلق کی تھیں، خورس ان کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوا اور اس نے اعلان کر دیا کہ تمام یہود آزاد ہیں کہ وہ ملک شام و فلسطین کو واپس چلے جائیں اور وہاں جا کر خدا کے مقدس گھر یروشلم (بیت المقدس) اور اس کے ہیکل (مسجد) کو دوبارہ تعمیر کریں اور اس سلسلہ کے تمام اخراجات سرکاری خزانہ سے ادا کیے جائیں اور یہ بھی اعلان کیا کہ یہی دین دین حق ہے اور یروشلم کا خدا ہی سچا خدا ہے۔ ❷

"عزرا کی کتاب" میں ہے کہ اگرچہ خورس کی بدولت یہود کو دوبارہ آزادی اور خوش حالی نصیب ہوئی اور ہیکل کی تعمیر بھی شاہی خزانہ سے شروع ہوگئی مگر ابھی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ خورس کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا کیقباد (کمبوچیہ) بھی جلد مر گیا، تب آٹھ سال کے اندر ہی دارا جو خورس کا چچا زاد بھائی تھا اس کا جانشین ہوا، اس درمیان میں بعض مخالف افسروں نے یروشلم کی تعمیر کو حکماً روک دیا۔ تب حجی نبی اور زکریا نبی نے دارا کے دربار میں ایک مراسلہ بھیجا جس میں تعمیر بیت المقدس کے متعلق لکھتے ہوئے اس کو بتایا تھا کہ سرکاری دفتر میں خورس کا وہ حکم نامہ ضرور موجود ہوگا جس میں بیت المقدس کی تعمیر کا حکم اور خزانہ شاہی سے اخراجات کا ذکر کیا گیا ہے، آپ اس کو نکلوائیں اور اپنے افسروں کو حکم دیں کہ جو بھی اس کی تعمیر میں حائل ہو رہے ہیں ان کو روک دیں تاکہ ہم باطمینان اس کی تعمیر کر سکیں، چنانچہ دارا نے جب خورس کا حکم نامہ دفتر سے طلب کیا تو اس میں یہ تحریر تھا:

"خورس بادشاہ کی سلطنت کے پہلے سال مجھ خورس بادشاہ نے خدا کے گھر کی بابت جو یروشلم میں ہے یہ حکم کیا کہ وہ گھر اور وہ مکان جہاں قربانیاں کرتے ہیں بنایا جائے اور اس کی بنیادیں مضبوطی سے ڈالی جائیں اور خرچ بادشاہ کے خزانہ سے دیا جائے اور خدا کے گھر کے سنہرے رو پہلے برتن بھی جنہیں بنوکدنذر (یروشلم) کی ہیکل سے نکال لایا اور بابل میں لا رکھا سو پھیر دیئے جائیں اور یروشلم کی ہیکل میں اپنی اپنی جگہ رکھ دیئے جائیں، یعنی خدا کے گھر میں رکھ دیئے جائیں"۔ ❸

پس اس حکم کے مطابق دارا نے یروشلم کی تکمیل کا حکم دیا اور افسر کو سختی کے ساتھ روک دیا کہ کوئی اس میں ہرگز مزاحم نہ ہو اور یروشلم اور خدائے یروشلم کے ساتھ اپنی اور اپنے پیشرو کی عقیدت کا ان الفاظ میں اظہار کیا:

"میں ایک اور حکم کرتا ہوں کہ جو شخص اس فرمان کو ٹال دے اس کے گھر پر سے کوئی لٹھا کھینچ کر نکالا جائے اور وہ کھڑا کیا

---

❶ تاریخ کے یہ واقعات مع حوالہ جات ذوالقرنین کی بحث میں مفصل بیان ہوں گے۔
❷ یہ زکریا علیہ السلام کے والد نہیں ہیں بلکہ دوسرے نبی ہیں۔
❸ عزرا باب ٦ آیات ١-٥۔

Marfat.com

جائے اور وہ کھڑا کیا جائے اور وہ اس پر پھانسی دیا جائے اس بات کے لیے اس کا گھر کوڑے کا ڈھیر کر دیا جائے پھر وہ خدا جس نے اپنا نام وہاں رکھا ہے سب بادشاہوں اور لوگوں کو جو اس حکم کو بدل کے خدا کا وہ گھر جو یروشلم میں ہے بگاڑنے کو ہاتھ بڑھاتے ہوں غارت کرے میں (دارا) حکم دے چکا اس پر جلد عمل کرنا چاہیے"۔ ❶

چنانچہ جلد ہی حجی اور زکریا علیہما السلام انبیاء (بنی اسرائیل) کی نگرانی میں دارا کے نہر پار کے صوبہ دار تتنی اور شتر بوزنی اور ان کے رفقاء نے اس تعمیر کو مکمل کرا دیا۔ عزرا کی کتاب میں ہے:

"چنانچہ انہوں نے اسرائیل کے خدا کے حکم کے مطابق اور فارس کے بادشاہ خورس اور دارا اور ارتخششتا کے حکم کے مطابق تعمیر کی اور کام کو انجام تک پہنچایا"۔ ❷

یہودی بنی اسرائیل کو اب پھر ایک بار امن واطمینان نصیب ہوا اور انہوں نے ارض یہوداہ میں دوبارہ اپنی حکومت کو استوار کیا اور چونکہ شاہ بابل نے توراۃ کے تمام نسخوں کو بھی جلا کر خاک کر دیا تھا اور ستر برس تک وہ خدا کی اس کتاب سے محروم رہے تھے اس لیے ان کے اصرار پر حضرت عزیر (عزرا علیہ السلام) نے اپنی یادداشت سے ازسرنو اس کو تحریر کیا۔

شرارت یہود کا دوسرا دور:

یہود کی قومی خصائل و عادات سے متعلق کافی معلومات کے بعد آپ کے لیے یہ بات حیرت انگیز نہیں ہوسکتی کہ اتنی سخت ٹھوکر کھانے اور ذلت ورسوائی کی اس عبرت ناک سزا کو برداشت کرنے کے باد..ر جن کی تفصیلات ابھی سپرد قلم ہو چکی ہیں، ان کی چشم عبرت اور گوش حق نیوش میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی اور ان کی حالت اس آیت کا مصداق ثابت ہوئی:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ﴾ (الاعراف:۱۷۹)

یعنی آہستہ آہستہ انہوں نے پھر ظلم وفساد اور بغاوت وسرکشی پر کمر باندھ لی اور گزشتہ بداخلاقیوں اور بدکرداریوں کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

کچھ یہ بھی نہیں تھا کہ کوئی سمجھانے اور تنبیہ کرنے والا نہیں تھا کیونکہ خدائے تعالیٰ کے سچے پیغمبروں کا سلسلہ ان میں جاری تھا اور وہ ان کو سیدھی راہ پر لگانے اور بری راہ سے بچانے کے لیے برابر پند ونصیحت اور موعظت وبصیرت کا حق ادا کرتے رہتے تھے مگر ان کے قومی مزاج کا توازن اس درجہ خراب ہو چکا تھا کہ ان پر کسی اچھی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا اور بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، وہ پیغمبران حق کا مذاق اڑاتے، باطل کوشی کو شیر مادر سمجھتے اور اپنی حرکات بد پر شرمندہ ہونے کے بجائے فخر کرتے رہتے تھے، پھر صورت حال اس حد پر جا کر بھی ختم نہیں ہوئی بلکہ اسی درمیان میں ایک ایسا ہوش ربا حادثہ پیش آیا جس نے یہود کی دناءت اور باطل کوشی کو دوست دشمن دونوں کی نگاہ میں بخوبی روشن کر دیا۔

---

❶ باب ٦ آیات ۱۱-۱۲ ❷ باب ٦ آیات ۱۳-۱۴

حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل:

اس ہوش رُبا حادثہ کی تفصیل یہ ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے یہ عہد حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تبلیغ و دعوت کا عہد تھا اور ارض یہودیہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے مواعظ کا یہ اثر ہو رہا تھا کہ بنی اسرائیل کے قلوب مسخر ہوتے جاتے تھے اور وہ جس جانب بھی نکل جاتے تھے جماعت کثیر ان پر پروانہ وار نثار ہونے لگتی تھی ادھر تو یہ حالت تھی اور دوسری جانب یہودیہ کا بادشاہ ہیرودیس نہایت ہی بدکار اور ظالم تھا وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مقبولیت دیکھ دیکھ کر لرزہ براندام تھا اور خوف کھاتا تھا کہ کہیں یہودیہ کی بادشاہت میرے ہاتھ سے نکل کر اس مرد ہادی کے پاس نہ چلی جائے۔ سوء اتفاق کہ ہیرودیس کے سوتیلے بھائی کا انتقال ہو گیا اس کی بیوی بے حد حسین تھی اور ہیرودیس کی بھاوج ہونے کے علاوہ اس کی علاتی بھتیجی بھی تھی، ہیرودیس اس پر عاشق ہو گیا اور اس سے عقد کر لیا۔ چونکہ یہ عقد اسرائیلی ملت کے خلاف تھا اس لیے حضرت یحییٰ علیہ السلام نے سر دربار اس کو اس حرکت پر ملامت کی اور خدا کے خوف سے ڈرایا۔ ہیرودیس کی محبوبہ نے یہ سنا تو غم و غصہ سے بے تاب ہو گئی اور ہیرودیس کو آمادہ کیا کہ وہ یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر دے۔ ہیرودیس اگرچہ اس نصیحت سے خود بھی بہت برافروختہ تھا مگر اس ارادہ میں متامل تھا لیکن محبوبہ کے اصرار پر اس نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر قلم کر کے اور طشت میں رکھ کر اس کے پاس بھجوا دیا۔ سخت حیرت کا مقام ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی محبوبیت عام کے باوجود کسی اسرائیلی کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ ہیرودیس کی اس ملعون حرکت پر اس کو روکے یا ملامت کرے۔ بلکہ ایک جماعت نے اس کے اس ملعون عمل کو بنظر استحسان دیکھا۔ اب حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شہادت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ کا وقت آ گیا اور انہوں نے علی الاعلان یہود کی بدعات مشرکانہ رسوم ظالمانہ خصائل اور بددینی کے خلاف جہاد لسانی شروع کر دیا۔ یہود میں یہ صلاحیت کہاں تھی کہ وہ امر حق پر لبیک کہتے۔ چنانچہ مختصر سی تعداد کے ماسوا بھاری اکثریت نے ان کی مخالفت شروع کر دی، اسی درمیان میں بادشاہ حارث نے جو ہیرودیس کی پہلی بیوی کے رشتہ سے اس کا خسر تھا اس پر چڑھائی کر دی اور سخت کشت و خون کر کے ہیرودیس کو ہزیمت فاش دی جس نے ہیرودیس کی قوت کا خاتمہ کر دیا تاہم یہودیہ کی ریاست رومیوں کے بل بوتے پر قائم رہی اس وقت اگرچہ عام طور پر یہودیہ کہتے تھے کہ ہیرودیس اور اسرائیلیوں کی یہ ذلت و ہزیمت حضرت یحییٰ علیہ السلام کے خون ناحق کی پاداش میں پیش آئی لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس حادثہ سے کوئی سبق نہیں لیا اور وہ اپنے ظالمانہ مقاصد سے باز نہ آئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں بغض و عناد کے ساتھ سرگرم رہے تا آنکہ شاہ یہودیہ پلاٹس سے ان کے قتل کی اجازت حاصل کر کے ان کا محاصرہ کر لیا مگر خدائے تعالیٰ نے ان کے ارادوں کو ناکام بنا کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ ❁

پاداشِ عمل:

آخر پاداش عمل سامنے آئی اور اب خود یہودیوں کے باہم خانہ جنگی شروع ہو گئی، وجہ یہ پیش آئی کہ اس دور میں یہود کے تین فرقے ہو گئے تھے ایک فقہاء کی جماعت تھی اور ان کو "فریسی" کہتے تھے اور دوسری جماعت اصحاب ظاہر کی تھی جو الہامی الفاظ کے ظاہر پر جمود کرتے تھے ان کو "صدوقی" کہتے تھے اور تیسری جماعت مرتاض راہبوں کی تھی ان میں سے فریسی اور صدوقی

❁ تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۷ تا ۲۵

Marfat.com

اختلاف اس درجہ ترقی کر گیا تھا کہ ان میں سخت خونریزیاں ہونے لگیں، شاہ یہودیہ جس گروہ کا طرف دار ہو جاتا تھا وہ دوسرے گروہ کو بے دریغ قتل کرتا تھا، آخر یہ جنگ اس قدر بڑھی کہ شاہ یہودیہ کو باغیوں کے خلاف رومیوں سے مدد لینی پڑتی تھی اور بت پرستوں کے ہاتھوں یہودیوں کو قتل کرایا جاتا تھا چنانچہ اس کشمکش میں رفع عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً ستر سال بعد یہود کے دو مدعیان حق یوحنان اور شمعون کے درمیان سخت معرکہ جنگ وجدل برپا ہوا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تخت روم پر اس کا ایک بہادر جرنیل اسپانوس قیصری کر رہا تھا اور ارض یہودیہ میں یوحنان کو کامیابی ہوگئی تھی۔ جو نہایت سفاک اور بدکار تھا اور اس کے ظالم ساتھیوں کے ہاتھوں ارض قدس کی تمام گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اس حالت میں یہود نے اسپانوس سے مدد چاہی اور اس نے اپنے بیٹے طیطوس (ٹیٹس) کو ارض مقدس کی فتح پر مامور کیا، وہ آگے بڑھا اور ارض یہودیہ کے قریب جا کر اپنے ایک قاصد نیقانوس کو صلح کے لیے بھیجا۔ یہود کا پارہ ظلم و ستم بہت چڑھا ہوا تھا، انہوں نے اس کو بھی قتل کر دیا، اب طیطوس غضب ناک ہو گیا اور اس نے کہا کہ بلا لحاظ کسی فرقہ کے تمام یہود کا استیصال کر کے جاؤں گا تا کہ ہمیشہ کے لیے اس سرزمین سے یہ جھگڑا پاک ہو جائے۔ چنانچہ بقول مؤرخین اس نے بیت المقدس پر اس قدر سخت حملہ کیا کہ شہر پناہ منہدم ہوگئی، ہیکل کی دیواریں شکستہ ہوگئیں، محاصرہ کی طوالت سے ہزاروں یہود بھوکے مر گئے اور ہزاروں فرار ہو کر بے وطن ہو گئے اور جو بچے تھے وہ تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ رومیوں نے ہیکل کی بے حرمتی کی اور جہاں خدائے واحد کی عبادت ہوتی تھی وہاں بت جا کر رکھ دیئے۔ [1]

غرض یہ وہ شکست تھی کہ پھر یہود کبھی نہ ابھرے اور اپنی کمینہ اور ظالمانہ حرکات، علانیہ فسق و فجور اور نبیوں کے قتل کی پاداش میں ہمیشہ کے لیے ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے۔

تیسرا زریں موقعہ اور یہود کی روگردانی:

کچھ عرصہ بعد رومیوں نے بت پرستی ترک کر کے عیسائیت اختیار کر لی اور اس طرح ان کے عروج و ترقی نے یہودی قومیت اور مذہب دونوں کو مغلوب و مقہور بنا دیا۔

آپ ابھی مطالعہ کر چکے ہیں کہ جب طیطوس رومی نے بیت المقدس کو برباد کر دیا تو یہودیوں کی ایک کافی تعداد وہاں سے بھاگ کر اطراف و جوانب میں جا بسی تھی، ان ہی میں سے بعض وہ قبائل بھی ہیں جو یثرب (حجاز) اور اس کے قرب و جوار میں ساکن ہو گئے تھے، یہ اور ان سے قبل و بعد جو قبائل یہود یہاں آ کر سکونت پذیر ہوئے ان کے اس انتخاب سکونت کے متعلق مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ یہود کی توراۃ اور قدیم صحیفوں سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہ سرزمین نبی آخر الزماں کا دارالہجرۃ بنے گی اور یہود نبی آخر الزماں کے اس درجہ منتظر تھے اور ان کے یہاں ان کی آمد کی اس قدر شہرت تھی کہ جب حضرت یحییٰ علیہ السلام نے تبلیغ و دعوت کے ذریعہ پیغام الٰہی سنانا شروع کیا تو یہود نے جمع ہو کر ان سے صاف کہا کہ ہم تین نبیوں کا انتظار کر رہے ہیں، ایک مسیح کا دوسرے الیاس کا اور تیسرے اس مشہور و معروف نبی آخر الزماں کا جس کی آمد کی شہرت ہمارے درمیان اس قدر ہے کہ ہم اس کے نام لینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے اور صرف اس کی جانب اشارہ کر دینے سے ہر ایک یہودی اس کو پہچان لیتا ہے، چنانچہ انجیل یوحنا میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے:

[1] ابن خلدون ج ۲

Marfat.com

"اور یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن [1] اور لیوی [2] یہ پوچھنے کو بھیجے کہ تو کون ہے تو اس نے اقرار کیا، انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں انہوں نے اس سے پوچھا پھر تو کون ہے؟ کیا تو ایلیا (الیاس علیہ السلام) ہے؟ اس نے کہا: میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ [3] اس نے جواب دیا کہ نہیں، پس انہوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟ تا کہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں؟ [4]

توراۃ، انجیل، صحائف انبیاء اور تاریخ یہود میں اور بھی بہت سے شواہد موجود ہیں کہ جن سے یہ تحقیق ہوتا ہے کہ یہود کو ایسے پیغمبر کا انتظار تھا جو نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوگا اور حجاز میں مبعوث ہوگا، اسی وجہ سے جب بھی وہ اپنے مرکز سے منتشر ہوئے ہیں تو ان کی ایک معقول تعداد اسی کے انتظار میں یثرب میں جا بسی۔ [5]

ابدی ذلت وخسران:

پس کس درجہ بدبخت و بدقسمت ہے وہ جماعت جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے تقریباً پانچ سو ستر سال تو اس انتظار میں گزارے کہ یثرب کی اس زمین میں جب خدائے تعالیٰ کا وہ پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہجرت کر کے آئے گا تو ہم اس کی پیروی کر کے اپنی قومی اور مذہبی عظمت و وقار کو پھر ایک بار حاصل کریں گے حتیٰ کہ یثرب کے قبائل اوس وخزرج کے مقابلہ میں بھی اس کی نصرت و مدد کے منتظر رہتے تھے مگر جب وہ نبی برحق آیا اور اس نے موسیٰ وعیسیٰ (علیہما السلام) اور توراۃ وانجیل کی تصدیق کرتے ہوئے ان کو پیغام حق سنایا تو سب سے پہلے انہوں (یہود) نے ہی ان کے خلاف بغض وعناد کا مظاہرہ کیا اور اس کی آواز پر کان نہ دھرتے ہوئے اس کی مخالفت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا اور نتیجہ میں ابدی ذلت وحرمان نصیبی کو مول لیا۔

اللہ تعالیٰ نے تو شروع ہی میں ان کو متنبہ کر دیا تھا کہ دو مرتبہ کی سرکشی اور اس کے انجام کے بعد ہم تم کو ایک موقعہ اور عنایت کریں گے پس اگر تم اس وقت سنبھل گئے اور تم نے خدا کی فرماں برداری کا ثبوت دیا اور خدا کے پیغمبر کی صداقت کا اقرار کر کے دین حق کو قبول کرلیا تو ہم بھی تمہاری عظمت رفتہ کو واپس لے آئیں گے اور دین ودنیا کی سعادت سے بہرہ اندوز کریں گے لیکن اگر تم نے اس موقعہ کو بھی گنوا دیا اور پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی قدیم شرارتوں کا مظاہرہ کیا تو ہم بھی پاداش عمل کا قانون نافذ کر دیں گے، ﴿وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾۔

غرض جب یہود نے اس مرتبہ بھی اپنی قومی سرشت کو ہاتھ سے نہ دیا تو خدائے تعالیٰ نے بھی ان کے حق میں یہ آخری فیصلہ سنا دیا:

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۚ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۗ﴾ (البقرۃ:۶۱)

اور یہی ہوا بھی کہ قوم یہود کو نہ پھر کبھی عزت نصیب ہوئی اور نہ حکومت اور آج بھی وہ امریکہ اور یورپ میں بڑے بڑے سرمایہ دار ہونے کے باوجود قومی عزت وحکومت سے محروم ہیں اور قیامت تک محروم رہیں گے اور دنیا کی جو حکومت وطاقت بھی اپنے ناپاک مقاصد کی خاطر مسطورہ بالا فیصلہ کو چیلنج کر کے ان کو برسر حکومت واقتدار لانا چاہے گی وہ بھی اپنے اس مذموم مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتی اور بہت ممکن ہے کہ خود بھی قہر الٰہی کا شکار ہو کر یہود ہی کی طرح ذلت وخسران میں مبتلا ہو جائے اور دوسروں کے لیے عبرت و

---

[1]، [2] یہ یہود کے مذہبی مناصب ہیں۔ [3] توراۃ میں اس کا لقب فارقلیط (احمد) ہے۔
[4] باب ۱ آیات ۱۹-۲۱ [5] یہ بحث اپنے موقعہ پر تفصیل سے آئے گی۔

Marfat.com

بصیرت ہے ﴿ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴾۔

بہر حال اہل ذوق ان حقائق کے بعد باآسانی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ قرآن عزیز کی زیر بحث آیات کا مصداق جو کہ بیت المقدس کی تباہی اور یہود کی بربادی سے تعلق رکھتا ہے تاریخی اعتبار سے بخت نصر اور طیطلیس رومی سے ہی متعلق ہے اور باقی اقوال بلحاظ تاریخ آیات کا صحیح مصداق نہیں بنتے ﴿ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴾۔

بصائر:

① اگرچہ دنیا "دار العمل" ہے "دار الجزاء" نہیں ہے تاہم خدائے تعالیٰ کبھی کبھی دنیا میں بھی مجرموں کو ان کی پاداش عمل میں اس طرح کس دیا کرتے ہیں کہ خود ان کو اور ان کے معاصرین کو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ ان کے جرائم کی سزا ہے اور ان کی تاریخی زندگی بعد میں آنے والوں کے لیے سامان عبرت و بصیرت بن جاتی ہے خصوصاً غرور اور ظلم یہ دو ایسے سخت جرائم اور ام الخبائث ہیں کہ مغرور اور ظالم کو آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا میں بھی ضرور اپنی بدعملیوں کا کچھ نہ کچھ خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ انفرادی کبر وظلم کی پاداش شخص وفرد کی زندگی سے متعلق ہوتی ہے اور قومی و اجتماعی کبر وظلم کی پاداش قومی اور اجتماعی زندگی سے وابستہ ہوتی ہے اس لیے اوّل الذکر کی مدت میں زیادہ عرصہ نہیں ہوتا مگر ثانی الذکر کی مدت کبھی ایسی طویل نظر آتی ہے کہ مظلوم قوم اور جماعت مایوسی کی حد تک پہنچ جاتی ہے اور اس کی نظر سے یہ نکتہ اوجھل ہو جاتا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال اور عزت و ذلت اور کامرانی و ناکامی کی عمر افراد واشخاص کی عمر کی طرح نہیں ہوتی بلکہ طویل ہوتی ہے تاہم بعض حالات میں عبرت و بصیرت کے پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے اس مدت کو کبھی مختصر بھی کر دیا جاتا ہے چنانچہ یہود کی زیر بحث تاریخ کے واقعات و حالات اس کی زندۂ جاوید شہادت ہیں اور قابل صد ہزار عبرت و بصیرت۔

② منکرین حق اور باطل پرست قوموں کو اگر عبرت و بصیرت کے پیش نظر دنیا میں کسی قسم کی سزا دی جاتی یا ان کو عذاب الٰہی میں پکڑا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان پر سے آخرت کا عذاب (عذاب جہنم) ٹل جاتا اور معاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ اسی طرح قائم رہتا ہے جو اپنے وقت پر ہو کر رہے گا:

﴿ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝ ﴾ (بنی اسرائیل:۸)

③ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو اس کی بدکرداریوں اور اس کے مظالم و مفاسد کی وجہ سے عذاب میں مبتلاء کرنا اور اپنے پاداش عمل کے قانون کو ان پر نازل کرنا چاہتا ہے تو سنت اللہ یہ جاری ہے کہ وہ بداعمالیوں کے بعد فوراً ہی ایسا نہیں کرتا بلکہ ایک عرصہ تک اس کو مہلت دیتا اور ہادیوں اور پیغمبروں کی معرفت ان کو ترغیب و ترہیب کی راہ سے ہدایت پر لانے کے تمام مواقع بہم پہنچاتا ہے تا کہ خدا کی حجت ہر طرح تمام ہو جائے پس اگر اس کے بعد بھی ان کی سرکشی اور بغاوت اور ظلم و عدوان کا تسلسل اسی طرح قائم رہتا ہے تو اس کی "بطش شدید" اچانک مجرم قوم کو اس طرح دبوچ لیتی ہے کہ پھر کیفر کردار پر پہنچے بغیر رستگاری ناممکن ہو جاتی ہے اور ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مشاہدہ کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے:

﴿ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ ﴾ (الشعراء:۲۲۷)

"عنقریب ظالم جان لیں گے کہ کس طریقہ انقلاب کے ذریعہ وہ الٹ دیئے جائیں گے۔"

ذوالقرنین
(۵۶۱ ق م)

○ تمہید، ذوالقرنین سے متعلق سوال کی نوعیت.... ○ ذوالقرنین اور سکندر مقدونی ○ ذوالقرنین اور ازوار میں علمائے سلف کی رائے متاخرین کی رائے ○ یہود و قریش اور انتخاب سوالات ○ ذوالقرنین اور انبیاء بنی اسرائیل کی پیشین گوئیاں ○ خورس اور تاریخی شواہد ○ مغربی مہم ○ مشرقی مہم ○ مہم شمالی ○ مہم فتح بابل ○ خورس کا مذہب ○ ایران قدیم کا مذہب ○ ذوالقرنین اور قرآن عزیز ○ یاجوج و ماجوج ○ سد ○ یاجوج و ماجوج کا آخری خروج

تمہید:

یہ واقعہ اپنی دلچسپ تاریخی روایت کے لحاظ سے تین اہم حصوں پر منقسم ہے ذوالقرنین کی شخصیت، سد ذوالقرنین، یاجوج و ماجوج۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان ہر سہ مسائل کو جدا جدا بیان کر کے اس واقعہ کی اصل حقیقت کو واضح کیا جائے۔

زیر بحث مسائل اور علماء اسلام:

سلف میں اگرچہ مسائل زیر بحث کے متعلق ایسے اقوال بہ کثرت ملتے ہیں جو ان مسائل کی تفسیر و تفصیل کی غرض سے بیان کیے گئے ہیں لیکن علماء متاخرین نے اس سلسلہ میں دو جدا جدا راہیں اختیار کر لی ہیں، ایک جماعت سلف کے بعض اقوال کو نقل کرنے کے بعد یہ کہہ دینے پر اکتفاء کرتی ہے کہ زیر بحث مسائل سے متعلق منقول اقوال چونکہ قرآن کی بیان کردہ شخصیت ذوالقرنین کے ساتھ پوری طرح مطابقت نہیں کرتے اس لیے ہمارے لیے یہ کافی ہے ہ ایک جانب یہ یقین و اعتقاد رکھیں کہ قرآن عزیز نے جس حد تک ذوالقرنین کی شخصیت، سد اور یاجوج و ماجوج پر روشنی ڈال دی ہے وہ بلاشبہ حق ہے اور باقی تفصیلات یعنی اس کی شخصیت کا تاریخی مصداق، سد کا جائے وقوع اور قوم یاجوج و ماجوج کا تعین، سو ان کے علم کو سپرد بخدا کر دینا چاہیے، کیونکہ "تفویض" کا طریقہ ہی اسلم طریقہ ہے لیکن جب ایک تحقیق طلب طبیعت اس پر قانع نظر نہیں آتی اور وہ اضطراب و تردد میں پڑ جاتی ہے تو یہ جماعت اس کو مطمئن کرنے کے لیے اس طرح سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ جب کہ دنیوی اسباب علم اور وسائل معلومات کے اس حیرت زا دور میں بھی محققین علم الآثار (Archaeology) کو یہ اعتراف ہے کہ ابھی وہ اس دنیا کے مستور تاریخی خزانوں اور نظروں سے اوجھل تاریخی حقائق کو معلوم کرنے میں سمندر میں سے قطرہ کی مقدار حاصل کر پائے ہیں اور جب کہ ہم چند صدی قبل تک دنیا کے چوتھے براعظم امریکہ کی دریافت سے بھی قاصر رہے تھے تو کون سے تعجب کی بات ہے اگر ابھی تک دنیا اور موجودہ علوم تحقیق سد ذوالقرنین کو نہ پا سکے اور یاجوج و ماجوج کے متعلق ان کا علم تحقیق ابھی تک قاصر رہا ہو اور وہ ذوالقرنین کی شخصیت کا تعین نہ کر سکے ہوں اور ہو سکتا ہے

پہلے دو امور وقت موعود تک یعنی قریب بہ قیامت منکشف ہو کر ہمارے سامنے آجائیں اور ان دونوں کے انکشاف سے ذوالقرنین کی شخصیت کا بھی بآسانی تاریخی تعین ہو جائے پھر کون سی وجہ ہے کہ اگر ہم ان امور کی تاریخی تفصیلات کو آج نہ بیان کر سکیں تو اس بناء پر ان امور کو محض افسانوی داستان سمجھ لیا جائے۔ خصوصاً جب کہ قرآن عزیز وحی الٰہی کے علم ویقین کے ذریعہ ان کے وجود کی اطلاع دیتا ہے اور جب کہ اہل علم کا یہ مسلمہ نظریہ ہے کہ ہمارا کسی شے کو نہ جاننا اس کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ شے حقیقتاً بھی وجود نہیں رکھتی۔ پس ایک مسلمان کے لیے تو اسی قدر کافی ہے کہ نفس مسئلہ پر یقین کرتے ہوئے تفصیلات کو سپرد بخدا کر دے اور منکرین وحی الٰہی کے لیے زیادہ سے زیادہ توقف کی گنجائش ہو سکتی ہے نہ کہ انکار پر اصرار کی۔

اس کے برعکس علماء اسلام میں سے دوسری جماعت ان مسائل کی تحقیق کے درپے ہے اور وہ قرآن عزیز کی عطاء کردہ روشنی میں ان کے حقائق کی تفصیلات کو واضح کرنا نہایت ضروری جانتی اور قرآن حکیم کی اہم تفسیری خدمت پر یقین کرتی ہے، اس کا خیال ہے کہ مسائل زیر بحث میں تفویض کے طریقہ کو اختیار کر کے ہم اپنی ذمہ داری سے کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے اور یہ اس لیے کہ قرآن نے ذوالقرنین کے معاملہ کو یہود کے سوال کرنے پر بیان کیا ہے اور اسی بناء پر وہ اسلوب بیان اختیار کیا ہے جس سے سوال کرنے والی جماعت اس اقرار کرنے پر مجبور ہو جائے کہ "نبی امی" نے وحی الٰہی کے ذریعہ ان ہر سہ مسائل کے متعلق جو تفصیلات بیان کی ہیں بلاشبہ وہ صحیح ہیں اور سورہ بنی اسرائیل میں "روح" کے سوال پر قرآن کا جواب اس کے برعکس اسلوب پر مذکور ہے اور دریافت کرنے والوں کو صرف اس قدر بتا کر کہ "روح" خدا کے حکم وامر میں سے ایک ایسی شے ہے جو اس کے حکم سے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ مزید تفصیلات کو ان کی عقول کے لحاظ سے غیر ضروری قرار دے دیا ہے، لہٰذا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عزیز ذوالقرنین سے متعلق تفصیلات کے درپے ہے اور یہود کو یا مشرکین اور یہود دونوں کو ان کی معلومات کے مطابق مطمئن کرنا چاہتا ہے بلکہ اس سلسلہ میں ان کے یہاں بعض تفصیلات نے جو افسانوی شکل اختیار کر لی تھی اس کے خلاف حقائق واقعیہ کو کھول دینا چاہتا ہے۔

نیز اس لیے بھی یہ مسائل محتاج تحقیق ہیں کہ قرآن حکیم کے اسلوب بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہود اس تاریخی حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کی قومی اور مذہبی زندگی کا اس کے ساتھ گہرا تعلق تھا تب بھی انہوں نے اس مسئلہ کو مشرکین کی اعانت کے لیے اس لیے انتخاب کیا کہ اس سے نبی اکرم ﷺ کی صداقت کا بآسانی امتحان ہو جائے گا، پس جو معاملہ آج سے تیرہ چودہ سو سال پہلے تک لوگوں کی معلومات میں تھا اور جس کی تفصیلات وہ قومیں بخوبی جانتی تھیں اس کے متعلق یہ کہہ کر سبکدوش اور قرآن کے بیان کردہ اس اہم واقعہ کی تفسیر سے عہدہ برآ نہیں ہوا جا سکتا کہ جب کہ ہم خدا کی زمین کے بہت سے حصوں سے ابھی تک ناواقف ہیں تو ممکن ہے کہ اس واقعہ سے متعلق شخصیتیں اور مقامات بھی اسی طرح غیر معلوم ہوں اور ہم ابھی تک ان کا پتہ لگانے سے قاصر رہے ہوں، چنانچہ علماء محققین مثلاً حافظ ابن تیمیہ، ابن کثیر، ابوحیان، ابن عبدالبر، امام رازی، حافظ ابن حجر، شیخ بدرالدین عینی، ابن ہشام اور ... ؒ ان مسائل کی تحقیق وتدقیق کے درپے نظر آتے اور اس بارہ میں اپنے رجحان کے مطابق فیصلہ دینا چاہتے ہیں۔

مسائل زیر بحث سے متعلق ہمارا خیال ان ہی علماء تحقیق کی پیروی پر آمادہ ہے بلکہ ہم ان مسائل کے متعلق اس لیے اور بھی تحقیق وتدقیق کے خواہش مند ہیں کہ جن مستشرقین یورپ نے قرآن عزیز کے الہامی کتاب ہونے کے خلاف زہر چکانی کی ہے اپنے مزعومہ دلائل سے جہاں اس کو نبی اکرم ﷺ کا کلام ثابت کیا ہے وہیں یہ بھی ہرزہ سرائی کی ہے کہ قرآن کے بعض بیان کردہ

Marfat.com

واقعات حقائق نہیں ہیں بلکہ اہل عرب کے مشہور افسانوں کو حقیقت کے نام سے بیان کر دیا گیا ہے۔

اسلامی مسائل میں مستشرقین یورپ کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ اکثر تاریخی حقائق کو نظر انداز کر کے اپنے اندازے اور قیاس سے چند ایسے مقدمات وضع کر لیتے ہیں جن سے ان کو اپنے مزعومات اور خیالات میں مدد ملے اور اسلام بلکہ قرآن عزیز کے بیان کردہ حقائق کی تردید کی جا سکے۔ چنانچہ اصحاب رقیم (پیڑا) کے متعلق قرآن عزیز نے جب چند حقائق کا اظہار کیا اور موعظت وعبرت کے لیے وہ ان کے حالات و واقعات کو روشنی میں لایا تو انہوں نے اپنی ناواقف وجہل کو چھپانے یا تعصب کی راہ سے قرآن کو جھٹلانے کے لیے رقیم (پیڑا) کے وجود ہی سے انکار کر دیا اور جسارت بے جا کے ساتھ یہ کہہ دیا کہ محمد ﷺ نے عرب کے سنے سنائے جھوٹے قصے کو وحی الٰہی کہہ کر بیان کر دیا ہے مگر جب قدرت کے ہاتھوں نے قرآن کا اعلان حق کے تیرہ سو سال کے بعد پیڑا کو ٹھیک اسی مقام پر ظاہر کر دیا اور اس کے عظیم الشان کھنڈر اپنے وجود کا اعلان کرنے لگے تو ان کو حقیقت کے سامنے سر جھکانا پڑا اور ندامت و شرمساری کے ساتھ قرآن عزیز کے اعلان حق کو تسلیم کیے بغیر ان کے لیے کوئی چارۂ کار نہ رہا۔

اسی طرح جب قرآن عزیز نے تفصیل کے ساتھ یہ بتایا کہ بنی اسرائیل ایک طویل عرصہ تک مصر میں فراعنہ مصر اور قبطیوں کے غلام رہے ہیں اور موسیٰ علیہ السلام نے صدیوں کے بعد ان کو خدا کے بخشے ہوئے اعجاز کے ذریعہ نجات دلائی اور اس مسئلہ میں توراۃ نے بھی ایک حد تک قرآن اور وحی الٰہی کے علم یقین کا ساتھ دیا تو اس کے باوجود ان مدعیان علم نے ایک عرصہ تک مصر میں بنی اسرائیل کی غلامی کا انکار کیا اور علم حقیقی کی تکذیب کے درپے رہ کر اس کا مذاق اڑایا مگر مصری حضریات نے جب فرعون کے مشہور سنگی کتبہ کا اکتشاف کرایا اور کتبہ کی کندہ عبارت نے بنی اسرائیل کی غلامی پر ایک حد تک روشنی ڈالی تو آہستہ آہستہ جہل نے علم کے سامنے شکست قبول کر لی اور اب ان نظریات میں بھی تبدیلی ہونے لگی جو فلسفہ تاریخ کے نام پر محض ظن وتخمین سے قائم کیے گئے تھے اور جن کو علم کا درجہ دیا جاتا تھا یہاں تک کہ اب انکار اقرار کی شکل میں تبدیل ہونے لگا ہے۔

ٹھیک اسی طرح ذوالقرنین یا جوج و ماجوج اور سد کا معاملہ ہے قرآن عزیز نے سورۂ کہف میں ایک ایسے بادشاہ کا ذکر کیا ہے جس کا لقب ذوالقرنین ہے اور جس نے مشرق و مغرب تک فتوحات کیں اور دوران فتوحات میں ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کے بسنے والوں نے اس سے یہ شکایت کی کہ یاجوج و ماجوج ہم کو ستاتے اور وحشیانہ حملے کر کے فساد مچاتے اور بربادی لاتے ہیں آپ ہم کو ان سے نجات دلائیے۔ ذوالقرنین نے یہ سن کر ان کو تسلی وتشفی دی اور لوہے اور تانبے کو پگھلا کر دو پہاڑوں کے درمیان ایک ایسی سد قائم کر دی کہ شکایت کرنے والے یاجوج و ماجوج کے فتنہ سے محفوظ ہو گئے۔

مستشرقین یورپ نے جب اس واقعہ کا مطالعہ کیا تو حسب عادت اپنے پیشرو مشرکین مکہ اور کفار عرب کی طرح فوراً یہ کہہ دیا:

﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (المؤمنون: ۸۳)

"یہ (قرآن) کچھ نہیں ہے مگر پہلے لوگوں کی من گھڑت کہانیاں"۔

اور بڑے زور وشور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا کہ ذوالقرنین کا یہ قصہ اخبار قرآنی کے اعجاز اور عبرت و موعظت کے لیے حقیقی واقعہ نہیں ہے بلکہ عبرت کی ایک فرسودہ داستان اور بے سروپا کہانی کو وحی الٰہی کی حیثیت دے دی گئی ہے ورنہ تاریخی دنیا میں

Marfat.com

ذوالقرنین اور یاجوج و ماجوج کی شخصیتیں اور سد ذوالقرنین کا وجود کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

پس ایسی صورت میں ایک مسلمان کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ذاتی اعتقاد کی بنا پر بلکہ تاریخی نقطہ نگاہ کے مطابق یہ واضح کرے کہ دوسرے تاریخی مسائل کی طرح قرآن عزیز کا عطاء کیا ہوا علم ویقین اس مسئلہ میں بھی اپنی جگہ اٹل اور علم ویقین کے درجہ کی حقیقت ہے اور معترضین کا انکار بلاشبہ جہل، ظن وتخمین اور باطل مزعومات کا طومار ہے اور ان تاریخی حقائق کا انکار صرف بے جا تعصب پر مبنی ہے نہ کہ اظہار حقیقت کے پیش نظر۔

ذوالقرنین:

ذوالقرنین کی شخصیت پر بحث کرنے سے قبل حل طلب اہم سوال یہ ہے کہ قرآن عزیز نے اس معاملہ کی جانب کس لیے توجہ کی اور اگر ازخود نہیں بلکہ کسی سوال کے جواب پر توجہ مبذول کی تو سائل کون ہیں اور کس بنیاد پر انہوں نے اس سوال کا انتخاب کیا؟ یہی وہ سوال ہے جو دراصل اس معاملہ کی کلید ہے اور اگرچہ بہ سلسلہ شان نزول مفسرین اور ارباب سیر نے اس کی جانب توجہ فرمائی ہے مگر تحقیق شخصیت کے وقت ان حضرات نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ذوالقرنین کی شخصیت سد کا تعین اور یاجوج و ماجوج کی تحقیق اگرچہ تین مستقل مسائل ہیں تاہم یہ تینوں اس طرح باہم مربوط ہیں کہ اگر کسی ایک کے متعلق واضح تحقیق سامنے آجائے تو قرآن عزیز کی تفصیلات کی روشنی میں باقی دو مسائل کے حل میں بہت زیادہ سہولت ہو جاتی ہے۔

ذوالقرنین سے متعلق سوال کی نوعیت:

محمد بن اسحٰق نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کیا ہے کہ قریش مکہ نے نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط کو علماء یہود کے پاس پیغام دے کر بھیجا کہ چونکہ تم خود کو اہل کتاب کہتے ہو اور تمہارا دعویٰ ہے کہ تمہارے پاس زمانہ سابق کے پیغمبروں کا وہ علم ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے، لہٰذا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق ہم کو یہ بتائیں کہ ان کے دعویٰ پیغمبری کی صداقت کے متعلق آپ حضرات کی کتابوں میں کوئی تذکرہ یا علامات موجود ہیں یا نہیں؟ چنانچہ قریش کے وفد نے یثرب پہنچ کر علماء یہود سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ احبار یہود نے ان سے کہا تم اور باتوں کو چھوڑ دو ہم تم کو تین سوالات بتائے دیتے ہیں اگر وہ ان کا صحیح جواب دے دیں تو سمجھ لینا کہ وہ ضرور اپنے دعوے میں سچے ہیں اور نبی مرسل ہیں اور تم پر ان کی پیروی واجب ہے اور اگر وہ صحیح جواب نہ دے سکیں تو وہ کاذب ہیں پھر تم کو اختیار ہے کہ جو معاملہ ان کے ساتھ چاہو کرو، وہ سوالات یہ ہیں:

۱۔ اس شخص کا حال بیان کیجئے جو مشرق و مغرب تک فتوحات کرتا چلا گیا؟

۲۔ ان چند نوجوانوں پر کیا گزرا جو کافر بادشاہ کے خوف سے پہاڑ کی کھوہ میں جا چھپے تھے؟

۳۔ روح کے متعلق بیان کیجئے؟

وفد، مکہ واپس آیا اور اس نے قریش کے یہودی علماء کی گفتگو سنائی، قریش نے سن کر کہا "اب ہمارے لیے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فیصلہ کرنا آسان ہو گیا کہ یہود کے ان سوالات کے جوابات ایک امی انسان جب ہی دے سکتا ہے کہ درحقیقت اس پر خدا کی

جانب سے وحی آتی ہو"۔ چنانچہ قریش مکہ نے خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہو کر تینوں سوالات پیش کیے، ان ہی سوالات کے جوابات کے لیے آپ ﷺ پر سورۂ کہف کا نزول ہوا۔ [1]

محدثین نے اس روایت کے مختلف طریقوں کو بیان کر کے اس کی تحسین فرمائی ہے اور سدی کے طریق روایت میں اس قدر اور اضافہ ہے: [2]

قال قالت الیھود اخبرنا عن نبی لم یذکرہ اللہ فی التوراۃ الا فی مکان واحد قال و من قالوا ذوالقرنین.

"یہود نے کہا: ہم کو اس نبی کا حال بتائیے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں صرف ایک ہی جگہ کیا ہے، نبی اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا وہ "کون؟" یہود نے کہا: ذوالقرنین"۔

یہود کے اس بلاواسطہ سوال کے متعلق محدثین یہ فرماتے ہیں کہ اس جگہ راوی نے اختصار سے کام لیا ہے صحیح تفصیل یہ ہے کہ ان سوالات کا انتخاب یہود نے کیا تھا، مگر قریش کی زبان سے ادا کرائے گئے اور ہو سکتا ہے کہ سوال میں لفظ توراۃ دیکھ کر نیچے کے کسی راوی نے اپنے وہم سے ان سوالات کو بلاواسطہ یہود کی جانب سے سمجھ لیا ہو۔

غرض اس روایت سے تین اہم باتوں پر روشنی پڑتی ہے: (الف) یہ کہ ذوالقرنین سے متعلق سوال اگرچہ قریش کی زبان سے ادا ہوا لیکن اصل میں یہ یہود کی جانب سے تھا۔ (ب) یہ ایسے شخص سے متعلق سوال تھا جس کو توراۃ میں صرف ایک جگہ "ذوالقرنین" کہا گیا ہے۔ (ج) اس شخص کو قرآن نے اپنی جانب سے ذوالقرنین کا لقب نہیں دیا بلکہ سوال کرنے والوں کے سوال کے پیش نظر اس کو دہرایا ہے چنانچہ قرآن کا یہ اسلوب بیان بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ﴾ (الکہف:۸۳)

"وہ تجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ ذوالقرنین کا حال بتاؤ"۔

ذوالقرنین اور سکندر مقدونی:

ذوالقرنین کس شخصیت کا لقب ہے اس بحث سے قبل یہ معلوم رہنا از بس ضروری ہے کہ بعض حضرات کو یہ سخت مغالطہ ہو گیا ہے کہ سکندر مقدونی ہی وہ ذوالقرنین ہے جس کا ذکر قرآن، سورۂ کہف میں کیا گیا ہے، یہ قول باتفاق جمہور علماء سلف و خلف قطعاً باطل اور جہالت پر مبنی ہے اس لیے کہ قرآن کی تصریحات کے مطابق ذوالقرنین صاحب ایمان اور مرد صالح بادشاہ تھا اور سکندر مقدونی مشرک اور جابر بادشاہ گزرا ہے جس کے شرک و ظلم کی صحیح تاریخ خود اس کے بعض امرائے دربار نے بھی مرتب کی ہے اور تمام معاصرانہ شہادتیں بھی اس کے بت پرست اور جابر و ظالم ہونے پر متفق ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب "احادیث الانبیاء" میں ذوالقرنین کے واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ سے قبل نقل کیا ہے اس کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۷۲-۷۱ و در منثور ج ۳ [2] قرطبی قلمی سورۂ کہف

Marfat.com

وفی ایرادہ المصنف ترجمۃ ذی القرنین قبل ابراھیم اشارۃ الی توھین قول من زعم انہ الاسکندر الیونانی. ¹

"مصنف نے ذوالقرنین کے واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ سے قبل اس لیے بیان کیا ہے کہ وہ اس شخص کے قول کی اہانت کرنا چاہتے ہیں جو سکندر یونانی کو ذوالقرنین کہتا ہے"۔

اور پھر اپنی جانب سے تین وجوہ فرق بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ سکندر یونانی کسی طرح بھی قرآن میں مذکور ذوالقرنین نہیں ہو سکتا، انہوں نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ جن حضرات نے سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کہا ہے غالباً ان کو اس روایت سے مغالطہ ہوا ہے جو طبری نے اپنی تفسیر میں اور محمد بن ربیع جیزی نے کتاب الصحابہ میں نقل کی ہے اور جس میں اس کو رومی اور بانی اسکندریہ کہا گیا ہے مگر یہ روایت ضعیف اور ناقابل اعتماد ہے۔ ²

اور حافظ عماد الدین ابن کثیر ذوالقرنین کے نام کی تعیین سے متعلق مختلف اقوال نقل کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

اور اسحاق بن بشر نے بروایت سعید بن بشیر، قتادہ سے نقل کیا ہے کہ ذوالقرنین کا نام سکندر تھا اور یہ سام بن نوح علیہ السلام کی نسل سے تھا لیکن اسکندر بن فیلپس (مقدونی) کو بھی ذوالقرنین کہنے لگے ہیں جو رومی اور بانی اسکندریہ ہے مگر واضح رہے کہ یہ دوسرا ذوالقرنین پہلے سے بہت زمانہ بعد پیدا ہوا ہے کیونکہ سکندر مقدونی حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً تین سو سال قبل ہوا ہے اور مشہور فلسفی ارسطاطالیس اس کا وزیر تھا اور یہ ہی وہ بادشاہ ہے جس نے دارا بن دار کو قتل کیا اور فارس کے بادشاہ کو ذلیل کر کے ان کے ملک پر قبضہ کر لیا، ہم نے یہ تنبیہ اس لیے کر دی کہ بہت سے آدمی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی شخصیت ہیں اور یہ اعتقاد کر بیٹھے ہیں کہ قرآن میں جس ذوالقرنین کا ذکر ہے وہ یہی سکندر مقدونی ہے جس کا وزیر ارسطاطالیس فلسفی تھا اور اس اعتقاد کی بدولت بہت بڑی غلطی اور بہت زیادہ خرابی پیدا ہو جاتی ہے اس لیے کہ ذوالقرنین اوّل مسلمان اور عادل بادشاہ تھا اور اس کے وزیر خضر علیہ السلام تھے جن کے متعلق ہم ثابت کر آئے ہیں کہ وہ نبی تھے اور دوسرا (مقدونی) مشرک تھا اور اس کا وزیر فلسفی تھا اور ان دونوں کے درمیان تقریباً دو ہزار سال سے بھی زیادہ کا فصل ہے پس کہاں یہ (مقدونی) اور کہاں وہ (عربی سامی) اور ان دونوں کے درمیان اس درجہ امتیازات ہیں کہ ماسوا غبی اور حقائق سے ناآشنا شخص کے دوسرا کوئی شخص ان دونوں کو ایک کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ³

اور امام رازی رحمہ اللہ نے اگرچہ سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کا لقب دیا ہے بایں ہمہ ان کو بھی یہ اقرار ہے:

کان ذوالقرنین نبیا و کان الاسکندر کافرا و کان معلمہ ارسطاطالیس و کان یأتمر بامرہ وھو من الکفار بلا شك. ⁴

"ذوالقرنین نبی تھے اور سکندر مقدونی کافر تھا اور اس کا معلم اور وزیر بلاشبہ کافر تھا"۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس مغالطہ کی وجہ یہ نقل کی ہے کہ چونکہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین مقتدا ہے اور وہ وسیع حکومت کا مالک رہا ہے اور سکندر یونانی بھی وسیع حکومت کا حکمران رہا ہے اس لیے اس کو بھی ذوالقرنین کہنے لگے یا اس لیے کہ وہ دو بادشاہوں روم اور فارس کا بادشاہ ہو گیا تھا اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے محمد بن اسحٰق نے اپنی سیرت میں ذوالقرنین کا نام سکندر نقل کر دیا

---

¹ فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۳
² فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۳
³ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۰۵، ۱۰۶
⁴ تفسیر کبیر سورۂ کہف

Marfat.com

ہے اور چونکہ اس کی سیرت بہت مشہور و مقبول ہے اس لیے یہ نام بھی شہرت پا گیا اور حافظ عماد الدین کا خیال یہ ہے کہ چونکہ اسحٰق بن بشر کی روایت میں قرآن میں مذکورہ ذوالقرنین کا نام بھی سکندر بتایا گیا ہے اس لیے غلطی اور نادانی سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے۔

غرض حافظ حدیث شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ابن عبدالبر، زہیر بن بکار، ابن حجر، ابن کثیر، عینی رحمہم اللہ جیسے محققین نے اس مغالطہ کی پوری طرح تردید کردی اور حقیقت بھی یہ ہے کہ قرآن نے ذوالقرنین کے جو محاسن و مناقب بیان کیے ہیں ان کے پیش نظر ایک بت پرست اور جابر و ظالم شخص کو ان کا مصداق بنانا فاش غلطی ہے۔ ❶

---

❶ استدراک

کیا ذوالقرنین سکندر مقدونی ہے؟:

جولائی ۱۹۴۱ء کے برہان میں میرا ایک مضمون "ذوالقرنین اور سد سکندری" کے عنوان سے شائع ہوا تھا یہ مسلسل مضمون کی پہلی قسط تھی اور اگست کے برہان میں بھی، ابھی تک وہ سلسلہ ناتمام ہی تھا کہ محترم مدیر صاحب "صدق" نے پہلی قسط پر ایک "استدراک" لکھ کر برہان کی عزت افزائی فرمائی اور مجھ کو اس سلسلہ میں مزید لکھنے کا موقعہ مرحمت فرمایا جس کے متعلق صاحب موصوف کا ممنون ہوں۔

"یہ استدراک" برہان کی اشاعت سے قبل ہی ۴ اگست کے "صدق" میں قدرے اضافہ کے ساتھ طبع ہوگیا اور اب ۱۸ اگست کے "صدق" میں بھی "سد سکندری" کے عنوان سے اس کا ایک تکملہ یا ذیل شائع ہوا ہے۔

بہرحال اگست کے برہان میں جو "استدراک" شائع ہوا ہے چونکہ وہی اصل ہے اور صاحب استدراک کے دلائل کا حامل اس لیے "تنقید بر استدراک" کی بنیاد بھی اسی پر قائم کی گئی ہے اور "صدق" کے ہر دو مضامین کے اضافات کو ضمنی طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے۔ (محمد حفظ الرحمٰن)

ذوالقرنین کی تحقیق سے متعلق میرا مضمون تحلیل و تجزیہ کے بعد دو حصوں پر تقسیم ہو سکتا ہے ایک مسئلہ کا "اثباتی پہلو" اور دوسرا "منفی پہلو"۔ اثباتی پہلو میں مضبوط دلائل کے ساتھ یہ واضح کیا گیا ہے کہ سائرس (کیخسرو یا خورس) ہی وہ شخصیت ہے جس کو قرآن عزیز نے "ذوالقرنین" کہہ کر یاد کیا ہے اور "منفی پہلو" میں ان اقوال کو مرجوح قرار دے کر جو "سائرس" کے علاوہ "ذوالقرنین" کا مصداق متعین کرتے ہیں اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ مسئلہ چونکہ قرآن عزیز میں منصوص اور مصرح مذکور نہیں ہے اس لیے دوسری ہستیوں کے متعلق بھی مجال گفتن باقی رہتی ہے لیکن ذوالقرنین سے متعلق قرآنی صفات اور تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ امر قطعی ہے کہ "سکندر مقدونی" کسی حالت میں بھی "قرآن کا ذوالقرنین" نہیں کہلا سکتا، اور بعض علماء حق نے اگر اس کو ذوالقرنین بتایا ہے تو سلف صالحین اور خلف صادقین کی اکثریت نے ان کے اس قول کی سختی سے تردید کی ہے اور ناقابل انکار دلائل کے ساتھ تردید کی ہے۔

علماء اسلام نے جن دلائل کی روشنی میں اس انکار پر اصرار کیا ہے اس کو تفصیل کے ساتھ زیر بحث مضمون میں نقل کیا گیا ہے لیکن محترم "صاحب استدراک" نے ان میں سے صرف تین باتوں کو منتخب فرما کر ان پر "استدراک" سپرد قلم فرمایا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان پر ترتیب وار "تنقیدی نظر" ڈالی جائے تاکہ مسئلہ زیر بحث بخوبی منقح ہو سکے۔ صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں:

مقالہ مذکور مندرجہ برہان بابت جولائی ۱۹۴۱ء ذوالقرنین کے سکندر مقدونی ہونے سے انکار دلائل ذیل کی بنا پر کیا گیا ہے:

① سکندر مقدونوی کی تاریخ کا یہ مسلمہ باب ہے کہ وہ یونانیوں کے قدیم مذہب اور دیوتاؤں کی پرستش کا مقلد تھا اور یہ کہ وہ ہرگز مسلمان نہ تھا۔

② سکندر باتفاق اصحاب تاریخ جابر و قاہر تھا نہ کہ نیک سیرت و نیک نفس۔

③ یہ بات بھی مسلمات میں سے ہے کہ اس کی فتوحات اور سیاحت کا سلسلہ مغرب کی جانب نہیں بڑھا۔ (رسالہ مذکورہ نمبر ۱۷-۱۶)

"عرض کرنے دیجئے کہ یہ تینوں دعوے مسلمات نہیں، بجائے خود مخدوش و مجروح ہیں"۔

اس کے بعد صاحب موصوف نے ان تینوں دلائل یا دعاوی کو "مخدوش" اور مجروح ثابت کرنے کے لیے بالترتیب دلائل پیش فرمائے ہیں، چنانچہ مضمون نگار کی

Marfat.com

....

پہلی دلیل کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد ہے:

"نزول قرآن سے قبل والا ذوالقرنین ظاہر ہے کہ اصطلاحی معنی میں تو مسلمان ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس کے مومن ہونے سے مراد صرف یہی ہو سکتی ہے کہ موحد (مسلم) اور اپنے زمانہ کے نبی کا مطیع تھا"۔ (برہان ماہ اگست)

مسلم؟:

مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ "صاحب استدراک" کا سکندر کے مسلمان ہونے کی بحث میں یہ فرمانا کہ "اصطلاحی معنی میں تو وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتا تھا" کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر مراد یہ ہے کہ اصطلاحی معنی میں صرف وہی شخص "مسلمان" کہلایا جا سکتا ہے جو نبی اکرم ﷺ کی امت میں ہو اور دوسرے کسی نبی کی امت کو "مسلم" نہیں کہہ سکتے تو ظاہر ہے کہ یہ اصطلاح "قرآن کی اصطلاح" نہیں ہے کیونکہ وہ صاف یہ اعلان کرتا ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ کے زمانہ تک خدا کے ہر نبی و رسول کا دین اسلام اور اس کی امت اجابت "امت مسلمہ" ہے اور اس کا سچا مطیع "مسلمان"۔

﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ښ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝﴾ (البقرۃ: ۱۳۳)

"کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کی وفات کا وقت آ پہنچا اس نے اپنی اولاد سے کہا میرے بعد تم کس کی پرستش کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا ہم تیرے اور تیرے باپ ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق کے ایک خدا کی پرستش کریں گے اور ہم تو اس کے فرمانبردار ہیں"۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر اس کی تفسیر کرتے ہوئے، تحریر فرماتے ہیں:

وَالْاِسْلَامُ هُوَ ملة الانبياء قاطبه وان تنوعت شرائعهم واختلفت مناهجهم. (تفسیر ج۱ ص ۳۲۴)

"اور "اسلام" یہی تمام انبیاء علیہم السلام کی ملت ہے بلا تخصیص، اگرچہ ان کی شریعتیں اور ان کے طریقے مختلف ہیں"۔

اور اگر صاحب استدراک کی "مراد اصطلاحی معنی یہ ہے کہ سکندر اگرچہ موحد اور مسلم تو تھا مگر چونکہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ سے بہت پہلے تھا اس لیے عرف عام میں "مسلمان" نہیں ہو سکتا تو گستاخی معاف پھر اس کے لیے اصطلاحی معنی" کی تعبیر صحیح نہیں ہے اور نہ اس ارشاد کی یہاں کوئی ضرورت تھی جب کہ متکلم مخاطب دونوں پر یہ عیاں ہے کہ یہ اس سکندر کا ذکر ہے جو تقریباً تین سو سال قبل مسیح تھا۔

آگے چل کر "صاحب استدراک" ارشاد فرماتے ہیں:

"سو روایات یہود میں سکندر کو اسی حیثیت سے (یعنی موحد اور اپنے زمانہ کے نبی کا مطیع تھا) پیش کیا گیا ہے، چنانچہ جوزیفس (یہ حواریان مسیح کا ہم عصر ہے) کی قدیم تاریخ یہود میں یہ صراحت موجود ہے کہ سکندر نے ہیکل یروشلم میں آ کر وہاں عبادت کی۔ وہاں کے پیشواؤں کی تعظیم و تکریم کی اور جب دانیال کی یہ پیشین گوئی اسے دکھائی گئی کہ "ایک رومی فاتح ایران کی شہنشاہیت کو برباد کر دے گا وہ اس پیشین گوئی کا مصداق اپنے ہی کو سمجھا"۔ جیوش انسائیکلو پیڈیا میں تصریح لکھی چلی آتی ہے کہ اس وقت کے یہود اسے مسیح موعود ماننے کو تیار تھے"۔ (ج ۸ ص ۵۰۷)

ظاہر ہے کہ یہ معاملہ کسی مشرک کے ساتھ روا نہیں رکھا جا سکتا تھا اور نہ کوئی مشرک فرمانروا خود یہ معاملہ مرکز توحید کے ساتھ روا رکھتا۔ (برہان ماہ اگست)

"موحد" اور "مسلم" کی غلط تشریح کے علاوہ صاحب استدراک نے سکندر کو اس کا مصداق ثابت کرنے میں جو سند اور دلیل پیش کی ہے، وہ بھی صحیح نہیں ہے اس لیے کہ "صاحب استدراک" کے اس ارشاد میں ایک دعویٰ ہے اور دوسری اس کی دلیل، دعویٰ یہ ہے کہ "روایت یہود" میں سکندر کو موحد اور اسرائیلی نبی کے مطیع کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے اور دلیل یہ ہے کہ قدیم تاریخ یہود کے مصنف جوزیفس (جو کہ حواریان مسیح کا ہم عصر ہے) نے سکندر کے متعلق وہ سب کچھ لکھا ہے جو صاحب استدراک کی عبارت سے ابھی نقل ہو چکا اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ سکندر کے مسلمان (موحد) ہونے کا زبردست شاہد جوزیفس ہے۔ مگر جوزیفس کا یہ حال ہے کہ وہ خود یہود کے نزدیک قابل تسلیم نہیں۔

جوزیفس؟ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جوزیفس "یہود کے نزدیک" غیر معتبر اور ناقابل احتجاج و اعتماد ہے اور اس کی کتاب "قدیم تاریخ یہود" ان میں غیر

Marfat.com

مقبول ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جوزیفس میں دو خرابیاں ہیں جو کسی طرح یہود کی روایات کی صحت باقی نہیں رہنے دیتیں ایک یہ کہ وہ "مؤرخ" نہیں ہے بلکہ داستان سرا اور قصہ گو ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس درجہ جھوٹا ہے کہ واقعات کو طبع زاد گھڑ کر بیان کر دینے اور اصل واقعہ میں اپنی جانب سے من گھڑت اضافے کرنے کا عادی ہے۔

دوسرا عیب یہ ہے کہ اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں کے درمیان جو نفرت قائم تھی اس کو کسی طرح مٹائے اور دونوں قوموں کے درمیان رابطہ اتحاد پیدا کرے اس لیے وہ یونانی و رومی روایات میں خصوصیت کے ساتھ ایسی داستانیں اختراع اور ایجاد کرتا رہتا اور ان کو تاریخی حیثیت میں پیش کرتا تھا جن کے ذریعہ سے وہ اپنے مسطورہ بالا مقصد کو پورا کرے اس لیے یونانیوں سے متعلق جس قدر روایات وہ بیان کرتا ہے خصوصیت کے ساتھ وہ قطعاً ناقابل اعتماد ہیں، اور کسی طرح لائق احتجاج نہیں۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجین اینڈ ایتھکس میں ہے:

"یہ بات یقینی ہے کہ جوزیفس نہ تو اعلیٰ درجہ کا مؤرخ ہے اور نہ ایک ایماندار اور بے تعصب محقق جسے صرف حقیقت کی تلاش ہو بلکہ وہ ایسا مصنف ہے جس کی غرض و غایت صرف ایک مخصوص اثر پیدا کرنا ہے"۔ (ج ۷ ص ۵۷۴)۔

جوزیفس کا مقصد اور منتہائے نظر کیا ہے؟ آگے چل کر اسی کتاب میں اس کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے:

"اس کی منتہائے تمنا یہ ہے کہ یہودیوں کے خلاف جو تعصب پھیلا ہوا ہے اسے دور کرے اور ان پر جو الزامات عائد کیے جاتے ہیں ان سے ان کو بری ثابت کرے اور یہودیوں اور یونانیوں کے درمیان پیدا شدہ دشمنی کو مٹا دے"۔ (ج ۷ ص ۵۷۴)

جوزیفس کا یہ مقصد برا نہیں تھا اگر تاریخی حقائق پر مبنی ہوتا اور صحیح واقعات کی روشنی میں اس کو کامیاب بناتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس یہ کیا:

"اس کا یہ حمایتی مقصد اس امر سے بالکل آشکارا ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے ماخذوں کا انتخاب کرتا ہے اور ایسے ٹکڑوں کا حوالہ دیتا ہے جن میں یہودیوں کے ساتھ قدیم بادشاہوں اور رومیوں کے الطاف و اکرام کا تذکرہ ہے اور صداقت کو اپنے میلان اور رجحان کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھاتا ہے اگرچہ وہ اس بات کا مدعی ہے کہ حقیقت اور مکمل حقیقت کے سوا کچھ نہیں لکھے گا لیکن وہ ایفاء وعدہ نہ کر سکا اس لیے کہ وہ اپنے مسطورہ بالا مقصد کو پورا کرنے کے لیے کہیں تو بعض چیزوں کو قصداً قلم انداز کر جاتا ہے اور کہیں اپنی طرف سے اضافہ کر دیتا ہے اور جگہ جگہ نہایت بے پروائی اور بے ضابطگی کے ساتھ ماخذوں کے حوالے دیتا ہے"۔ (ج ۷ ص ۵۷۴)

جوزیفس کی تاریخ بد دیانتی کا معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ مقصد کی تکمیل کے لیے اپنی مقدس کتاب بائبل کے واقعات کو بھی توڑ مروڑ کے بغیر نہیں چھوڑتا:

"اور یہی وجہ ہے کہ بائبل کے واقعات بھی کبھی کبھی اس کے قلم سے بالکل نئے معنی اور نئے پہلو اختیار کر لیتے ہیں"۔ (انسائیکلو پیڈیا ریلیجین ج ۷ ص ۵۷۴)

جوزیفس کی اس غیر مؤرخانہ روش اور بد دیانتی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنی تاریخی تصانیف کو خود اپنی قوم "یہود" میں بھی مقبول نہ کر سکا اور ان میں بھی اپنا اعتماد کھو بیٹھا:

"اس کی تاریخی تصانیف اس کی قوم میں سب سے کم مقبول ہوئیں اس کی قوم اس کو بے وفا اور غدار سمجھتی ہے"۔ (انسائیکلو پیڈیا ریلیجن ج ۷ ص ۵۷۷)

یروشلم اور سکندر:

اور یہ واضح رہے کہ "جیوش انسائیکلو پیڈیا" کا مضمون بھی اسی کی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ جوزیفس کے متعلق یہ حوالجات تو اس کی عام مؤرخانہ حیثیت اور اس کی تاریخی کتابوں کی قدر و قیمت سے متعلق تھے اب ریلیجین انسائیکلو پیڈیا کی زبانی ان واقعات خصوصی کی حقیقت کو بھی سن لیجیے جن کو صاحب استدراک نے سکندر کے موحد اور (مسلمان) ہونے کی دلیل میں ذکر فرمایا ہے (یعنی اس کا یروشلم میں جانا، جا کر عبادت کرنا اور یہودی پیشواؤں کی تعظیم کرنا وغیرہ):

"ایسر (Esthar) کی کتاب اور عہد ارٹا سرزز (Artazerxes) کے تذکرہ کے بعد جوزیفس جب قصص تورات کے آخری حصہ پر پہنچتا ہے تو اسی جگہ سے اس کی کتاب انٹی کوئیٹس جوڈیکو (Antiqaitetas Judacio) کے دوسرے باب کا آغاز ہوتا ہے اس باب کے شروع ہی میں روایات کا تسلسل جاتا رہتا اور ان میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے جو "مکابیین بغاوت" (Maceabbsn Revolt) کے دور تک برابر قائم رہتا ہے اور تین صدی تک چلا جاتا ہے۔ اور اسی کے اندر سکندر مقدونی، ٹولمی اور سلیولیائڈ (Seleueidat) وغیرہ کے عہد حکومت بھی آ جاتے ہیں ان دور ہائے حکومت کے متعلق جوزیفس صرف بے ربط قصے بیان کرتا ہے جو سکندر کے آخری دور کے ماخذ سے لیے گئے ہیں اس غیر مسلسل اور بے ربط سلسلہ کی سب سے پہلی چیز

Marfat.com

ذوالقرنین اوراذوا یمن:

ایک جویاء حق کو یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ وسعت حکومت اور زبردست سطوت وصولت کے لحاظ سے جس طرح بعض حضرات نے سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کا لقب دے دیا ہے اسی طرح یمن کے بعض تبابعہ کو بھی اہل عرب وسعت حکومت کی بنیاد پر ذوالقرنین کہتے آئے ہیں، مثلاً ابوکرب تبع نے اپنے دادا کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

قد کان ذوالقرنین جدی مسلما ملکا تدین له الملوك و تسجد

"میرا دادا ذوالقرنین مسلمان تھا اور ایسا پرشوکت بادشاہ تھا کہ بہت سے بادشاہ اس کے تابع فرمان اور اس کے سامنے پست تھے۔"

اور عرب کے مشہور شعراء امراء القیس، اوس بن حجر اور طرفہ بن عبدہ وغیرہ کے کلام میں بھی حمیری بادشاہوں کو ذوالقرنین کہا گیا ہے۔ [1]

اسی طرح ایرانی بادشاہوں میں سے اہل عرب کیقباد اور فریدوں کو بھی ان کی قاہرانہ فتوحات کی وجہ سے ذوالقرنین کہتے تھے۔ [2]

مگر یہ سب مسطورہ بالا وجہ کی بنیاد پر ہی ذوالقرنین کہلاتے رہے ہیں اور قرآن میں مذکورہ ذوالقرنین ان میں سے کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت استاذ محقق عصر علامہ سید محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حقیقت کو بخوبی واضح کر دیا ہے، فرماتے ہیں: ذوالقرنین کے

اسکندر کا یروشلم جانا ہے اور اس کے ساتھ وہ تمام واقعات بھی ہیں جو اس کے وہاں جانے سے پہلے اور جانے کے بعد سے وابستہ ہیں، کیونکہ یہ واقعہ جوزیفس نے ایک ایسے ماخذ سے لیا ہے جو غیر معتبر اور غیر موثق ہے اور "دانیال نبی کی کتاب" کے بعد کی کتاب سے ماخوذ ہے"۔ (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس ج ۷ ص ۷۵۴)

یہ حقیقت ہے اس حوالہ کی جو جیوش انسائیکلوپیڈیا سے نقل کر کے "صاحب استدراک" نے ایسے اہم تاریخی مسئلہ کے متعلق تحریر فرمائے ہیں کہاں یہ من گھڑت اور بے دلیل قصہ جس کا ماخذ تک غیر معتبر اور غیر مستند ہے اور کہاں سائرس کے یروشلم بنانے اور خدا کے مسیح ہونے کے وہ ناقابل تردید تاریخی واقعات جو کتاب مقدس اور صحیح تاریخی حوالوں سے ثابت ہیں۔

بہرحال جوزیفس اس کی کتب تاریخ اور اس کے تاریخی ماخذوں کے متعلق مسطورہ بالا محققانہ حوالہ جات کے بعد آپ خود کتاب مقدس کی طرف رجوع کیجئے اور معلوم کیجئے کہ داستان سرا اور قصہ گو جوزیفس کی یروشلم والی داستان اور یہود کا سکندر کو مسیح موعود مان لینے کا قصہ یہ دونوں کیا حقیقت رکھتے ہیں۔

خدا کا مسیح ابھی بابل کے بادشاہ بخت نصر (بنوکدرزار) نے بیت المقدس پر چڑھائی نہیں کی تھی کہ حضرت یسعیاہ نبی علیہ السلام نے وحی الٰہی سے خبر پا کر یہود کو مطلع کیا کہ وقت آنے والا ہے کہ بابل کی حکومت کے ہاتھوں یروشلم کا ہیکل برباد ہوگا اور اس کی توہین کی جائے گی اور اس کے بعد یہ بشارت سنائی کہ وہ پھر خورس (سائرس) کے ہاتھوں بنایا جائے گا اور اس کی عزت وحرمت برقرار کی جائے گی اور یہود بابل کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے، چنانچہ پیشین گوئی کے الفاظ یہ ہیں:

"خداوند تیرا نجات دینے والا جس نے تجھے رحم میں بنا ڈالا یوں فرماتا ہے: یروشلم کی بابت کہتا ہے کہ وہ آباد کی جائے گی اور یہوداہ کے شہروں کی بات کہ وہ بنائے جائیں گے اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سوکھا ڈالوں گا جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا اور یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائی جائے گی اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی"۔ (یسعیاہ باب ۴۴ آیت ۲۳-۲۸)

[1] فتح الباری ج ۶ [2] تاریخ ابن کثیر ج ۲

Marfat.com

معاملہ میں ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو وہ اہل مشرق میں سے تھا جیسا کہ بعض کا خیال فغفور چین کی جانب ہے اس لیے کہ اگر وہ مشرقی ہوتا تو قرآن عزیز اس کے سفر مغرب کے بعد یہ کہتا کہ وہ پھر مشرق کو لوٹ گیا یعنی اپنے وطن کی جانب واپس ہوگیا یہ نہ کہتا اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ اور نہ وہ اہل مغرب میں سے تھا بلکہ مشرق ومغرب کے درمیانی علاقہ کا باشندہ تھا۔

والراجح انه ليس من اذواء اليمن لا كيقاد بن ملوك العجم ولا هو اسكندر بن فيلقوس بل ملك اخر من الصالحين ينتهي نسبه الى العرب الساميين الاولين ذكره صاحب الناسخ. ❶

"اور راجح یہ ہے کہ ذوالقرنین (مذکور فی القرآن) نہ یمن کے بادشاہوں میں سے تھا اور نہ شاہان عجم میں سے کیقباد ذوالقرنین تھا اور نہ سکندر بن فیلفوس (مقدونی) ہی ذوالقرنین تھا بلکہ وہ ان سب سے جدا ایک نیک بادشاہوں میں سے تھا جن کا نسب قدیم سامی عرب تک پہنچتا ہے ناسخ التواریخ نے ایسا ہی کہا ہے"۔

---

❶ عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام ص ۱۹۵۔

﴿اٰيٰتُ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ (نور اللہ مرقدہٗ) نے ذوالقرنین کے مسئلہ کو ضمنی طور پر بیان فرمایا ہے کیونکہ اس مقام پر ان کا مطمح نظر ذوالقرنین کی شخصیت کی تحقیق نہیں ہے بلکہ مرزا غلام احمد قادیانی کی ان ہفوات کی تردید مقصود ہے جو یاجوج وماجوج سد، دجال کے خروج اور مسیح بن مریم علیہ السلام کے نزول سے متعلق ہیں اور جن پر قادیانی نے اپنی نبوت اور یسوع مسیح ہونے کے دعوے کی بنیاد قائم کی ہے۔ اور یہ ثابت کرنا چاہیے کہ یورپ کی موجودہ متمدن اقوام ہی وہ یاجوج وماجوج ہیں جن کا ذکر قرآن عزیز نے کیا ہے اور یہ کہ دجال ان کے پادری ہیں اور میں ہی یسوع مسیح ہوں، احادیث میں جس کے نزول کی خبر دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ قریب قیامت میں آ کر ان سب کا استیصال کرے گا۔

حالانکہ قادیانی مشن کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس نے اقوام یورپ کے الحاد وزندقہ، فساد فی الارض اور دجل ومکر کی زبردست وبا کو روکنے یا ختم کر دینے کی بجائے ممالک اسلامیہ کو یورپ کی بعض حکومتوں کے استعماری عزائم کے حوالہ کرنے اور غلام بنانے جہاد جیسے فریضہ اسلامی کی منسوخی کا اعلان کر کے اپنے مزعومہ یاجوج وماجوج کو خوش کرنے اور اپنے منکرین پر کفر کا عام فتویٰ دے کر کروڑوں پرستارانِ توحید کو کافر اور خارج از اسلام قرار دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا اور نام نہاد تبلیغ اسلام کے پردہ میں بھی اپنے مشن کی کامیابی کے علاوہ اور اسلام کی کوئی خدمت انجام نہیں دی:

"خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں۔ اور میں گاڑے ہوئے خزانے اور پوشیدہ مکانوں کے گنج تجھے دوں گا تاکہ تو جانے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جس نے تیرا نام لے کے بلایا ہے"۔ (باب ۴۴ آیت ۳۱)

حضرت یسعیاہ علیہ السلام نبی کی یہ پیشین گوئی خورس (سائرس) کے فتح بابل سے ایک سو ساٹھ برس پہلے یہود کو سنائی گئی اور فتح بابل کے صرف ساٹھ برس پہلے اس کی تائید میں حضرت یرمیاہ نبی نے یہود کو یہ پیشین گوئی سنائی تھی:

"وہ کلام جو خداوند نے بابل کی بابت اور کسریوں کی سرزمین کی بابت یرمیاہ نبی کی معرفت فرمایا۔ تم قوموں کے درمیان بیان کرو اور اشتہار دو اور جھنڈا کھڑا کرو۔ منادی کرو، مت چھپاؤ۔ لکھو کہ بابل لے لیا گیا بعل رسوا ہوا مردوک سراسیمہ کیا گیا ہے اس کے بت خجل ہوئے اس کی مورتیں پریشان کی گئیں کیونکہ اتر سے قوم اس پر چڑھتی ہے جو اس کی سرزمین کو اجاڑ کرے گی الخ"۔ (یرمیاہ باب ۵ آیت ۱-۳)

اور عزرا نبی کی کتاب میں بصراحت موجود ہے کہ خورس (سائرس) نے یروشلم کی ہیکل کو تعمیر کیا اور اس نے اس کی تعمیر اور عزت وحرمت کا اپنی قوم میں اعلان کرایا اور اس طرح یرمیاہ نبی کی بشارت پوری ہوئی:

"اور شاہ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہوا۔ خداوند نے شاہ فارس خورس کا دل ابھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کرائی اور اسے قلمبند بھی کر کے یوں فرمایا شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری

Marfat.com

مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوداہ میں ہے اس کے لیے ایک مسکن بناؤں پس اس کی ساری قوم میں سے کون کون ہے اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو جو شہر یہوداہ ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے کہ وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے الخ"۔

(عزرا باب ۱ آیت ۱-۳)

یسعیاہ نبی اور یرمیاہ نبی کی پیشین گوئیوں سے اور عزرا نبی کی کتاب میں اس بیان کردہ منادی سے جو خورس (سائرس) کی جانب سے کی گئی تین صاف اور صریح طور پر ظاہر ہوتی ہیں:

① توراۃ کی پیشین گوئیاں خورس کو خدا کا چرواہا اور خدا کا مسیح بتارہی ہیں نہ کہ سکندر کو۔

② یروشلم (بیت المقدس) کے ہیکل کی تعمیر، اس کی عزت وحرمت کا اعلان، اس کے خدا کے گھر ہونے کا اقرار اور یہود کی آزادی، خورس (سائرس) کے ہاتھوں ہوئی نہ سکندر کے۔

③ یرمیاہ نبی کی پیشینگوئی میں اگرچہ نام نہیں ہے لیکن یہ تصریح ہے کہ بابل کا تباہ کرنے والا اور یروشلم کو آباد کرنے والا اتر (شمال) سے اٹھے گا۔ سو یہ فارس ومیڈیا کا بادشاہ خورس ہی ہوسکتا ہے نہ کہ سکندر جو یونان سے (بابل کی جانب مغرب سے) اٹھا اور عزرا نبی کی تصدیق بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

④ یہ تمام پیشین گوئیاں متفق ہیں کہ خورس کی فتوحات جابرانہ وقاہرانہ انداز کی نہیں تھیں بلکہ ایک صالح اور باخدا انسان کی حیثیت سے تھیں اور کتاب مقدس کے ان صاف اور صریح بیانات کے علاوہ تاریخی حقائق بھی ان نتائج کی زبردست تردید کرتے ہیں، چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں سائرس کے متعلق یہ تصریحات موجود ہیں۔

"بابل پر جب سائرس حملہ آور ہوا تو وہاں کے یہودیوں نے ایرانیوں کو نجات دہندگان اور موحدین کہہ کر پکارا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہود کی مدد کے صلہ میں سائرس نے یہودیوں کو یروشلم اور ان کا معبد (ہیکل) واپس کر دیا اور انہیں فلسطین لوٹنے کی اجازت دے دی"۔ (ج ۶ ص ۵۲ ۷ ایڈیشن ۹)

اب کتاب مقدس اور اس کے ان روشن تاریخی حوالوں پر نظر کیجیے اور پھر جوزیفس کی اس بددیانتی کی داد دیجیے کہ اس نے یروشلم کی تعمیر علماء یہود کی تعظیم وتکریم اور خدا کے مسیح کے ہاتھوں یہود کی بابل سے نجات کے تمام ان معاملات کو جو کتاب مقدس نے خورس (سائرس) کے لیے مخصوص کیے تھے کس جرأت کے ساتھ سکندر مقدونی پر اس غرض سے چسپاں کر دیئے کہ کسی طرح اس کا یہ مقصد کہ یہودیوں اور یونانیوں اور رومیوں کے درمیان منافرت کی خلیج کو پاٹ دیا جائے، پورا ہوجائے مگر اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا اور یہودیوں نے ان تحریفات کی بنا پر (جیسا کہ ابھی حوالہ گزر چکا ہے) اس کو خائن اور غدار کہہ کر اس کی تاریخی کتابوں کو بھی غیر مقبول قرار دے دیا اور اگر ہم بالفرض سکندر کے معاملہ زیر بحث میں جوزیفس کی روایت کو صحیح بھی مان لیں تو اس کی حقیقت زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتی ہے (جیسا کہ تاریخ شاہد ہے) کہ سکندر کی یہ عادت تھی کہ جس ملک کو فتح کرتا وہاں کی پبلک کو اپنا بنانے کے لیے ملکی رسم ورواج کے مطابق عبادت کر کے یہ ثابت کرتا کہ مجھ کو بھی ان عقائد وعبادات سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا کہ اس ملک کے رہنے والوں کو پھر کیا عجب ہے کہ یہودیوں کو متاثر کرنے کی خاطر اس نے یروشلم میں بھی یہ ڈھونگ رچایا ہو یا سائرس کی نقل اتار کر یہودیوں میں ذوالقرنین بننے کی کوشش کی ہو اگرچہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا:

"چنانچہ بستانی کی انسائیکلو پیڈیا میں ہے کہ سکندر جب مصر پہنچا تو لیبیا کے کاہنوں اور باشندوں کو خوش کرنے کے لیے ان کے معبود (مشتری) کی پرستش کی"۔ (ملاحظہ ہو ج ۳ ص ۵۴۶)

اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے:

بابل میں سکندر نے وہاں کے مقامی دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھائی جیسا کہ اس نے دوسرے مقامات پر بھی اسی طرح کیا تھا (یعنی دیوتاؤں کی پرستش کی تھی) اور یہ تمام ملکوں کے مذاہب کی آمیزش آگے چل کر یونانی الحاد وبے دینی پر بڑی حد تک اثر انداز ہوئی"۔ (ج ۱۵ ص ۱۴۱ ایڈیشن ۹)

ہاں یہ صحیح ہے کہ کتاب مقدس کی مسطورہ بالا پیش گوئیوں کی صحت پر بعض عیسائی مؤرخوں نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ پیشین گوئیاں جن میں خورس کا نام تک مذکور ہے، واقعات کے وجود پذیر ہونے کے بعد بنائی گئی ہوں لیکن اول تو اپنے اس دعوے یا شبہ پر انہوں نے قیاس وتخمین کے سوائے کوئی دلیل نہیں دی دوسرے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بابل کی غلامی کے دور اور بخت نصر کے توراۃ جلا ڈالنے کے واقعہ ہائلہ کے بعد کے اس قسم کے تمام ذخیرے کے متعلق علماء یہود و

Marfat.com

•••••••••••

نصاریٰ کا اس پر کلی اتفاق ہے کہ یہ اضافات وتحریفات سے محفوظ ہیں اور ان میں ردوبدل کے لیے کوئی سبب وجود پذیر نہیں ہوا یعنی توراۃ کے قدیم حصہ کی طرح اس پر کوئی حادثہ نہیں گزرا مگر علماء یہود ونصاریٰ کے اس جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم یہ تسلیم کیے لیتے ہیں کہ ان کی طرح اس پر کوئی حادثہ نہیں گزرا مگر علماء یہود ونصاریٰ کے اس جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم یہ تسلیم کیے لیتے ہیں کہ ان پیشین گوئیوں میں خورس کے نام کی تصریح بعد کو داخل کردی گئی یا ان پیشین گوئیوں کو واقعات کے مطابق بنالیا گیا تب بھی ہمارا مطلب حاصل ہے اس لیے کہ ان پیشین گوئیوں سے یہ بات تو بغیر کسی خدشہ کے ثابت ہوگئی کہ یہودیوں میں "خورس" کے یروشلم تعمیر کرنے، یہود کو آزاد کرانے اور مذہب یہود کی عظمت کرنے اور یہود کا اس کو خدا کا مسیح سمجھنے کی روایات کو اس درجہ تواتر حاصل تھا کہ "شبہ کرنے والوں کے بقول" یہود نے سائرس کے ساتھ خوش اعتقادی کی وجہ سے ان ثابت شدہ حقائق کو کتاب مقدس میں وحی الٰہی کی بشارت بنا ڈالا لیکن اس کے برعکس سکندر مقدونی کو کسی طرح یہ حیثیت حاصل نہ ہوسکی۔

بہرحال کس قدر حیرت کی بات ہے کہ یروشلم سے متعلق جن واقعات کو صدیوں تک کتاب مقدس اور یہودیوں کی متواتر روایات میں خورس (سائرس) سے وابستہ ظاہر کیا گیا وہ چار سو برس کے بعد یک بیک جوزیفس کی زبانی سکندر کے حق میں ہوجاتے ہیں، ﴿إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيبٌ﴾۔

سکندر مشرک تھا:

سکندر کے مذہب کا ذکر اگرچہ پہلے گزر چکا ہے مگر آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ صرف دیوتاؤں کی پوجا نہیں کرتا تھا بلکہ اس درجہ مغرور ومتکبر تھا کہ یونان اور اسیا یان کے لوگوں کو اپنے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیتا اور اپنے تئیں معبود کہلاتا تھا۔ (دائرۃ المعارف للبستانی ج ۲ ص ۵۴۷)

اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے:

"جب سکندر باختر (Bactra) لوٹ آیا اور اوکریانس کی بیٹی رواکزانا (Roxana) سے شادی کی تو شادی کی دعوت کے موقعہ کو غنیمت جان کر اس نے اپنے یونانی اور مقدونی پیرووں سے اپنی خدائی کا اعتراف کرانا چاہا۔۔۔ الخ"۔ (ج ۱ ص ۴۸۴)

اور مشہور محدث حافظ عماد الدین بن کثیر نے اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ میں بروایت قتادہ رحمہ اللہ سکندر ذوالقرنین اور سکندر بن فیلپس میں فرق کرتے ہوئے سکندر مقدونی کو مشرک کہا ہے۔ (ج ۲ ص ۱۰۶)

اسی طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام رازی رحمہ اللہ کے قول کو بہ طور سند پیش کرتے ہوئے سکندر مقدونی اور اس کے وزیر ارسطاطالیس دونوں کو کافر کہا ہے۔ (ملاحظہ ہو فتح الباری جدید ایڈیشن ج ۶ ص ۲۹۴)

اور اسلام کے ان جلیل القدر ائمہ دین کی مزید تائید انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا سے بھی ہوتی ہے چنانچہ مقالہ نگار لکھتا ہے:

"جب سکندر دریائے ستلج کے کنارہ پہنچا تو اس نے اپنی فوج کو دریا کے عبور کرنے کا حکم دیا لیکن فوج نے عبور کرنے سے انکار کردیا، اس پر سکندر نے اپنے افسروں کے سامنے مزید فتوحات کی اسکیم پیش کی لیکن یہ بے سود ثابت ہوئی۔ تب سکندر نے حسب دستور دریا کے سامنے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھائی اور (اپنے عقیدہ کے مطابق) دیوتاؤں کی اجازت نہ سمجھتے ہوئے پیش قدمی سے باز آیا اور واپس لوٹ گیا"۔ (ج ۱ ص ۴۸۴)

اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجین میں ہے کہ جوزیفس کی زبانی اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید سکندر یروشلم گیا تھا اور اس نے یہود کے ساتھ خصوصی مراعات بھی کیں اور محکمہ خبر رسانی میں ممتاز درجے بھی دیئے اور اس طرح یونانیوں اور یہودیوں میں ایک علاقہ قائم ہوگیا" تاہم یہ محقق ہے کہ یہودیوں نے ان کے کلچر اور ان کے عقائد ورسوم کو اپنے اندر داخل نہ ہونے دیا اور وہ ہمیشہ ان کو اس حیثیت سے نفرت وحقارت ہی سے دیکھتے رہے اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ یہودی قوم سختی کے ساتھ توحید کی قائل تھی اور اپنے مذہبی عقائد میں بہت پختہ" اور یہی وجہ ہے کہ یونانیت اور یہودیت میں کبھی اتصال نہ ہوسکا۔ (ج ۱ ص ۳۰۹)

اور بستانی لکھتا ہے کہ سکندر مقدونی نے وفات کے وقت جو وصیت کی وہ یہ تھی کہ اس کو بتوں کے درمیان دفن کیا جائے:

ثم لما رأى ان لا رجاله بالشفاء وان ساعته دنت نزع خاتمه من اصبعه وسلمه الى الامير برديكاس واوصاه ان ينقل جثته الى هيكل المشترى بواحات سيرة ليدفن هناك بين الاصنام. (ج ۳ ص ۵۴۸)

"پھر جب سکندر نے دیکھا کہ اب زیست کی کوئی امید باقی نہیں رہی اور اس کی موت کا وقت قریب آلگا تو اس نے اپنی انگلی سے شاہی مہر نکال کر اپنے امیر بردیکاس کو دی اور اس کو وصیت کی کہ مجھ کو سیوہ کے اطراف میں مشتری دیوتا کے ہیکل میں بتوں کے درمیان دفن کیا جائے"۔

اب ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھئے اور فیصلہ کیجئے کہ "مضمون نگار" کا یہ کہنا صحیح ہے کہ "سکندر مقدونی" کی تاریخ کا یہ مسلمہ باب ہے کہ وہ یونانیوں کے قدیم مذہب اور دیوتاؤں کی پرستش کا مقلد تھا اور یہ کہ وہ ہرگز مسلمان نہ تھا یا محترم "صاحب استدراک" کا یہ ارشاد کہ دعویٰ (کہ سکندر مشرک تھا) بجائے خود مخدوش و مجروح ہے۔

اور یہ بھی انصاف طلب بات ہے کہ "صاحب استدراک" کے اس حوالہ کی "جو کہ جوزیفس کی قدیم تاریخ یہود سے دیا گیا ہے" محققین بلکہ کتاب مقدس کی نگاہ میں کیا قدر و قیمت ہے؟ کہاں مدلل واقعات و حقائق اور کہاں محض ظن و تخمین بہیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

سکندر کا ظلم و جبر:

محترم صاحب استدراک مضمون نگار کے دوسرے دعوے کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"سکندر کا جابر و قاہر ہونا مسلم نہیں بہت کچھ مختلف فیہ ہے تاریخ میں دونوں قسم کے اقوال ملتے ہیں کم از کم شک کا فائدہ تو اسے ملتا ہی ہے"۔

(برہان ماہ اگست ۱۹۴۱ء)

اس سلسلہ میں عرض کرنے دیجئے کہ قدیم و جدید مسلم اور عیسائی مؤرخین نے سکندر کی جو سیرت پیش کی ہے بحیثیت مجموعی ان سب کا حاصل یہ ہے کہ وہ جابر و قاہر تھا اور اس کو نیک سیرت اور صالح بادشاہ نہیں کہا جا سکتا، لہٰذا کم از کم ایک قول تو ایسا تحریر کیا جاتا جس میں اس کو نیک، عادل اور صالح تسلیم کیا گیا ہو۔

رہی یہ بات کہ اس کی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی عدل یا رحم کا موجود نہیں ہے تو اس کا انکار تو کوئی بھی نہیں کر سکتا مگر ان چند گنتی کے واقعات سے کسی کی سیرت، عادل رحیم اور صالح نہیں کہی جا سکتی ورنہ تو پھر چنگیز خان ہلاکو خان اور حجاج بن یوسف کو بھی یہی مقام دیا جانا چاہیے۔ سکندر کی جابرانہ حیثیت کا اندازہ ان چند حوالوں سے کیا جا سکتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے:

"درحقیقت اس کے دماغ کا توازن شروع ہی سے بگڑ گیا تھا، یہ ظالم اور جابر انسان جو اپنے کو خدا سمجھتا تھا، جو اپنے دوست کے سینہ میں برچھی گھونپ کر مسرور ہوتا تھا جو ایک دوسرے دوست کو سخت ترین جسمانی ایذا پہنچا کر اس کی چیخ پر حقارت آمیز انداز میں متبسم ہوتا تھا وہ ایک عادل دماغ فرمانروا اور مدبر ہونے سے بہت دور تھا"۔ (ج ۱ ص ۴۸۵)

"ہر شخص اس سے حد درجہ خوشامدانہ انداز میں بات کرنے پر مجبور تھا۔ پلوٹارک (Plotarop) لکھتا ہے کہ اس کو اپنی پرانی عادت یعنی انسانوں کا شکار کرنے میں بڑی تسلی و تشفی اور سکون حاصل ہوتا تھا"۔ (ج ۱)

"آخر کار وہ پسرگیڈا (Pasargadae) پہنچا اور سائرس کی قبر کا پتہ لگا کر اسے کھدوایا اور لوٹا اور اس کی توہین کی"۔ (ج ۱ ص ۴۸۴)

"(قابض ہو جانے کے بعد) پسرگیڈا میں اس کو بے شمار دولت مال و اسباب ہاتھ آیا جس کی قیمت کا اندازہ ایک کروڑ تیس لاکھ پونڈ کے قریب کیا جاتا ہے اس دولت کو لوٹنے کے بعد اس نے شہر کے تمام مردوں اور اولاد ذکور کو تہ تیغ کیا اور عورتوں اور اولاد اناث کو باندیاں بنالیا"۔ (ج ۱ ص ۴۸۳)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے علاوہ بستانی اور وہ تمام مسلمان مؤرخین جو اس کو زبردستی "ذوالقرنین" بنانے پر آمادہ نہیں ہیں سکندر سے متعلق اسی قسم کی روایات جبر و قہر بیان کر رہے ہیں پس ضرورت تھی کہ ان روایات کے مقابلہ میں کسی محقق مؤرخ کو ایک روایت ایسی بھی سامنے آ جاتی جو تخمین و قیاس سے جدا تاریخی روشنی میں اس کو نیک، صالح اور عادل بادشاہ ثابت کر سکتی، مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اور تمام ذخیرہ تاریخ اس سے یکسر خالی ہے۔

رہا "شبہ کا فائدہ" تو اول تاریخی حقائق کے بعد شبہ کے فائدہ کا سوال ہی کیا ہے اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کو زیادہ سے زیادہ یہ فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے کہ سکندر کو جابر و قاہر کہنے میں سکوت اختیار کر لیا جائے نہ کہ یہ فائدہ کہ ایسی ہستی کو جس کا نیک، صالح اور عادل ہونا تک مشتبہ ہو قرآن عزیز کا ذوالقرنین بنا دیا جائے کہ جس کی منقبت میں قرآن عزیز رطب اللسان ہے اس کو تو بلا شبہ تاریخی صحائف میں روز روشن کی طرح صالح و عادل ثابت ہونا چاہیے۔

سکندر کا مغرب کی طرف اقدام:

تیسری بات "مضمون نگار" نے یہ کہی تھی کہ سکندر کی تاریخی مہمات کے متعلق یہ مسلمات میں سے ہے کہ وہ مغرب کی جانب نہیں بڑھا" چنانچہ "صاحب استدراک" کو بھی مخدوش و مجروح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

Marfat.com

....

"سکندر کی ابتدائی فتوحات تاریخ کو مسلم ہے کہ شمال و مغرب ہی کی جانب حاصل ہوئی تھیں"۔ (برہان ماہ اگست ۱۹۴۱ء)

اور اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ سکندر کی شمالی جانب میں فتوحات کا انکار تو "مضمون نگار" نے بھی نہیں کیا البتہ مغربی جانب میں سلسلہ فتوحات و سیاحت کے بڑھنے کا ضرور انکار کیا ہے۔ "صاحب استدراک" اس کی تردید میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اور مقدونیہ کے کنارے مغرب میں ہی وہ جھیل ہے جس کا پانی اتنا گندہ ہے کہ سیاہی مائل ہو گیا ہے اور وہیں سورج ڈوبتا نظر آتا ہے ﴿وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾ کا پورا مصداق"۔ (برہان اگست ۱۹۴۱ء)

مگر یہ دلیل "کوہ کندان وکاہ برآوردن" سے زیادہ وقیع نہیں ہے۔ اس لیے کہ "مضمون نگار" کا یہ مقصد تو ہرگز نہ تھا کہ سکندر جس نے شمال اور مشرق میں ہزارہا میل تک زبردست فتوحات حاصل کیں اور ملکوں اور شہروں کو مسخر کیا وہ مغرب کی جانب اپنے دارالسلطنت مقدونیہ کے کنارہ تک بھی نہیں گیا۔

پس اس جھیل تک سکندر کا پہنچنا جو مقدونیہ کے کنارہ ہی پر ہے ایسی کونسی عظیم الشان مہم تھی جس کا ذکر قرآن عزیز نے اس اہمیت کے ساتھ کیا ہے اور جس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی مغربی مہم کا ذکر کیا جا رہا ہے جو ذوالقرنین کے مرکزی دارالسلطنت سے سینکڑوں یا ہزاروں میل دور اس سے حد پر پہنچ گئی تھی جہاں صحراؤں اور پہاڑوں کی مسافت طے کرنے کے بعد پانی کے سواء اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ مقدونیہ کے کنارہ کے جھیل اوکریڈا جس جگہ واقع ہے وہاں تو صبح و شام خدا کی ہزاروں مخلوق کا شب و روز ہی گزر ہوتا رہتا تھا اور وہ مغرب کے کسی آخری حصہ میں بھی واقع نہیں ہے بلکہ اطراف و جوانب کے شہروں اور ملکوں کے درمیان واقع ہے تو یہ کونسی ایسی جگہ تھی جس کا ذکر قرآن اس طرح کرتا ہے ﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾ پس محض جھیل کے پانی کے گندہ اور سیاہی مائل ہونے کی وجہ سے یہ جھیل کسی طرح بھی قرآن عزیز کی اس آیت کا مصداق نہیں بن سکتی۔

چنانچہ مفسرین قرآن بالاتفاق اس آیت کی تفسیر وہی کرتے ہیں جو ہم نے بیان کی ہے یعنی ذوالقرنین مغرب کی جانب دور تک بڑھتا ہوا ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں صحراؤں اور پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہو کر سمندر شروع ہو جاتا ہے البتہ سمندر کا وہ حصہ ایسا تھا جہاں پانی گدلا اور سیاہ ہو گیا تھا اور سورج غروب ہوتے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ سیاہ گدلے چشمہ پانی میں ڈوب رہا ہے۔

چنانچہ سید محمود آلوسی ﴿بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ای منهتی الارض من جهه الغرب.

"یعنی مغرب کی جانب میں زمین کے آخری حصہ تک جب پہنچا"۔

اور محدث ابن کثیر ابن جریر، امام رازی اور قدیم و جدید تمام مفسرین یہی تفسیر بیان فرما رہے ہیں پس صاحب استدراک کی یہ تفسیر نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں بلکہ قرآن عزیز کے بیان کردہ مقصد کے منافی ہے۔

درحقیقت اس آیت کا مصداق یہ ہے کہ ذوالقرنین مغرب کی جانب فتوحات کرتا ہوا جب تمام ایشیا کوچک کو بحر شام سے بحر اسود تک قبضہ میں کر چکا تو وہ آگے بڑھتا ہوا مغربی ساحل تک پہنچ گیا۔ نقشہ میں دیکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایشیا کوچک کے مغربی ساحل میں چھوٹے چھوٹے خلیج پیدا ہو گئے ہیں اور بحر ایجین کے ساحلی مقام پر جا کر یہ گہرے سیاہ رنگ کی صورت میں نظر آتے ہیں اور ساحل پر کھڑے ہونے والے کو سورج اس کے اندر ڈوبتا نظر آتا ہے اور مغربی ساحل کی یہ مہم سائرس ہی کو نصیب ہوئی ہے۔ سکندر کو نصیب نہیں ہوئی۔ اب صاحب استدراک چاہتے ہیں کہ اسے گھر بیٹھے ہی مقدونیہ کے کنارہ اس خوش قسمتی کا مصداق بنا دیں مگر یہ کسی طرح ممکن نظر نہیں آتا۔

نیز "صاحب استدراک" آرکیڈا جھیل کا جاء وقوع مناستر سے پچاس میل مغرب میں (یوگوسلاویہ) میں بتا کر اگرچہ اس کے بعد مسافت ظاہر فرمانا چاہتے ہیں مگر بہر حال ہے وہ سکندر کے دارالسلطنت مقدونیہ کے کنارہ ہے۔

یہ ہیں وہ خدشات اور اسباب جرح جو "صاحب استدراک" نے تکلیف گوارا فرما کر "مضمون نگار" کے تین مسلمات پر عائد فرمائے ہیں۔ اب قارئین کرام بنظر انصاف خود غور فرمائیں کہ تاریخ کی روشنی میں "مضمون نگار" کے "مسلمات ثلثہ" صحیح ہیں یا "صاحب استدراک" کے "خدشات و جرح" درست ہیں۔ ﴿اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ اس کے بعد صاحب استدراک یہ تحریر فرماتے ہیں:

Marfat.com

"جرم کے ساتھ کسی کا بھی تعین کرنا دشوار ہے اس لیے کہ قرآن کی بتائی ہوئی علامات کا مصداق تمام تر اب تک کوئی نہیں ملا ہے"۔ (برہان ماہ اگست)

مضمون نگار نے بھی ذوالقرنین کی تعیین پر بحث کرتے ہوئے یہی لکھا ہے کہ اس سب کچھ لکھنے کے بعد بھی بحث وتحیص کا دروازہ بند نہیں ہے مگر پھر تعجب یہ ہے کہ ایسی صورت میں صاحب استدراک کو مضمون نگار کے مضمون کی فوری تردید کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ شاید صاحب استدراک کے نزدیک وہ اہم ضرورت یہ تھی، فرماتے ہیں: "لیکن جہاں تک ارجحیت کا تعلق ہے، سکندر مقدونی کا نمبر، جس کی طرف ہمارے متقدمین اس کثرت سے گئے ہیں کسی سے پیچھے نہیں"۔

گویا صاحب استدراک اس غلط فہمی میں ہیں کہ علماء متقدمین کی اکثریت اس جانب ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے حالانکہ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے جس کو جلد رفع ہونا چاہیے۔

اہل نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ذوالقرنین کے متعلق مختلف اقوال میں سے علماء سلف (متقدمین) کی اکثریت کا دعویٰ کسی جانب بھی نہیں کیا جا سکتا اور اگر ان کے تمام اقوال کو جمع کر کے خلاصہ نکالا بھی جائے تو دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ انکے نزدیک شاید راجح یہ ہے کہ وہ ایک قدیم بادشاہ تھا اور اس کا نسب سامئین اولی سے ملتا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر تھا۔ دوسری یہ کہ جن بعض علماء نے یہ کہا کہ ذوالقرنین سکندر ہے ان کی مراد سکندر مقدونی سے نہیں ہے بلکہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام سے دو ہزار برس پہلے سکندر رومی کو اس کا مصداق تسلیم کرتے اور رومی اور مقدونی کو دو جدا جدا ہستیاں مانتے ہیں اور ان دونوں باتوں کی تصدیق کے لئے تفسیر ابن کثیر (ج ۲ ص ۱۶۷) فتح الباری (ج ۶ ص ۲۹۴ و ۲۹۵) بخاری کتاب احادیث الانبیاء البدایہ والنہایہ یعنی تاریخ ابن کثیر (ج ۲ ص ۱۰۵ و ۱۰۶) اور کتاب التیجان قابل مراجعت ہیں اور حافظ عماد الدین بن کثیر نے تو البدایہ والنہایہ (ج ۲ ص ۱۰۵ و ۱۰۶) میں متقدمین کی اس دوسری بات کو واضح کرتے ہوئے صاف صاف تحریر فرمایا ہے:

> "حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین سکندر ہی ہے اور اس کا باپ پہلا قیصر گزرا ہے اور وہ سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے تھا۔ لیکن دوسرا ذوالقرنین، پس وہ سکندر بن فلپس مقدونی یونانی مصری ہے جس نے اسکندریہ آباد کیا اور جو روم کی تاریخ بتاتا ہے اور یہ دوسرا اسکندر پہلے سکندر سے بہت طویل زمانہ کے بعد ہوا ہے اور ہم نے اس پر اس لیے تنبیہ کی کہ بہت سے لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہ دونوں سکندر ایک ہی ہیں اور یہ گمان کر بیٹھے کہ قرآن میں جس سکندر کا ذکر ہے وہ اسکندر ہے جس کا وزیر ارسطو ہے اور اس غلط سمجھ کی وجہ سے بہت بڑی خطا اور عریض وطویل فساد برپا ہو جاتا ہے، پس بلاشبہ پہلا سکندر مومن صالح اور عادل بادشاہ تھا اور اس کے وزیر خضر علیہ السلام تھے اور دوسرا اسکندر مشرک تھا اور اس کا وزیر ارسطو فلسفی تھا اور ان کے درمیان دو ہزار سال سے زائد کا زمانہ ہے اور ان دونوں کا فرق صرف غبی پر ہی مشتبہ رہ سکتا ہے جو حقائق امور سے ناواقف ہو"۔

اب صاحب استدراک غور فرمائیں کہ ان کا یہ کہنا "سکندر یونانی کی جانب ہمارے متقدمین اس کثرت سے گئے ہیں" کہاں تک درست ہے؟ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ اس سخت مغالطہ میں کہ "سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے صرف صاحب استدراک ہی تنہا نہیں ہیں بلکہ مؤرخین اسلام میں سے بعض اچھے اچھے مؤرخوں کو یہ دھوکہ ہو گیا اور انہوں نے اسکندر قدیم کو جو در اصل سکندر نہیں بلکہ حمیری سامی بادشاہ تھا سکندر مقدونی سمجھ لیا اور ذوالقرنین والا تمام قصہ اس کے ساتھ چسپاں کر دیا اور جب اس کے نظام حکومت اور شخصیت پر قباء ذوالقرنین راست نہ آسکی تو وہ رازکار تاویلات کے ذریعہ اس پر موزوں کرنے کی سعی ناکام کی اور زیادہ تعجب یہ ہے کہ امام رازی جیسا بزرگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور غالباً اس کی ابتداء مشہور مفسر ومؤرخ ابن جریر سے ہوئی۔

علماء سلف اور متقدمین کی اکثریت کے مسلک کی توضیح کے بعد لائق صاحب استدراک خود غور فرمائیں کہ کیا اس کے بعد بھی اس کا از راہ طعن یہ فرمانا کہ جب سے تحقیق اور روشن خیالی کا معیار ہی یہ قرار پا گیا ہے کہ اگلے ماہرین فن کے ساتھ رشتہ اتحاد وتوافق کا نہیں بلکہ انکار وتردد کا قائم رکھا جائے ذوالقرنین کے اسکندر ہونے سے مسلسل انکار ہونے لگا ہے"۔ (صدق ۴ اگست ۱۹۴۱ء) کسی حد تک بھی درست ہو سکتا ہے ہم اس کے جواب میں انہیں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ((اِیَّاکَ وَالظَّنَّ فَاِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ)) یاد دلانا چاہتے ہیں۔

صاحب استدراک فرماتے ہیں کہ ہم نے ذوالقرنین کے سکندر مقدونی ہونے سے انکار کر کے اکابر سلف کے ساتھ انکار وتردید کا رشتہ قائم کیا ہے حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ سکندر مقدونی کے انکار میں اکابر تفسیر وحدیث حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عبد اللہ بن عباس، مجاہد، شعبی، حافظ ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن حیان، حافظ ابن حجر، شیخ بدر الدین عینی، امام نووی قرطبی وغیرہ سب ہی غریب مضمون نگار کے ہمنوا اور صاحب استدراک کی رائے کے مخالف ہیں البتہ صرف ابن جریر، طبری اور امام رازی ضرور مقدونی کو ذوالقرنین بتا رہے ہیں مگر ساتھ ہی امام صاحب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس قول پر بہت قوی اعتراضات ہوتے ہیں لیکن صاحب استدراک کی نگاہ میں وہ خود تو اکابر سلف کے مؤید ہیں اور غریب مضمون نگار اکابر کا مخالف ہے۔ والی اللہ المشتکی۔

Marfat.com

اور سید محمد آلوسی نے بھی اذوائے یمن میں سے کسی کو ذوالقرنین تسلیم نہیں کیا اور اس قول کو غلط قرار دیا ہے۔

ان تفصیلات کے بعد اب بسہولت یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین کے متعلق یہ سب اقوال نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں اور صرف دو قول ہی قابل توجہ ہیں جن میں سے ایک قول سلف کی جانب منسوب ہے اور دوسرا متاخرین میں سے ایک محقق کی تحقیق ہے۔

علماء سلف کی رائے:

علماء سلف کی رائے یہ ہے کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین عربی الاصل تھا سامیہ اولیٰ میں سے تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر بادشاہ تھا اور حج کے سفر میں دونوں کا ساتھ رہا ہے اور ایک معاملہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی عدالت میں مرافعہ کیا تھا اور اس نے ان کے حق میں فیصلہ دیا اور خضر علیہ السلام اس کے وزیر باتدبیر تھے لیکن علماء سلف کی اس تحقیق میں کئی فروگزاشتیں پائی جاتی ہیں جو اس تحقیق کو ایک متردد اور مضطرب رائے میں تبدیل کر دیتی ہیں مثلاً قرآن نے ذوالقرنین کے اوصاف میں سے ایک وصف یہ بیان کیا ہے کہ اس نے اپنی عمر میں تین تاریخی مہم سر کی ہیں۔ ایک میں وہ مطلع الشمس تک پہنچتا ہے یعنی مشرق کی جانب اس حد تک پہنچا جہاں آبادیوں کا سلسلہ ختم ہو کر سورج سامنے سے طلوع ہوتا نظر آتا تھا اور دوسرے میں وہ مغرب الشمس تک گیا ہے یعنی اس حد تک پہنچا ہے جہاں حصہ زمین ختم ہو کر سمندر کا کوئی ایسا حصہ سامنے تھا جس میں غروب کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا گویا سورج گدلے چشمہ میں ڈوب رہا ہے اور تیسری مہم ایسے سفر سے متعلق تھی جس میں اس کو ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑا جو اس کی زبان سے ناآشنا تھی اور جس نے یاجوج ماجوج قبائل کی تاخت و تاراج کے متعلق اس سے شکایت کی اور اس نے ان کی فرمائش پر دو پہاڑوں کے پھاٹکوں کے درمیان لوہے اور تانبے سے ایک مضبوط "سد" قائم کر کے حملہ آور یاجوج و ماجوج قبائل سے ان کو محفوظ کر دیا لیکن علماء سلف یہ بتانے سے قاصر رہے ہیں کہ جس شخص کو وہ ذوالقرنین فرما رہے ہیں کیا واقعی اس کو یہ تینوں مہم اس تفصیل کے ساتھ پیش آئیں جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے، بلکہ وہ اس کا بھی فیصلہ نہیں فرما سکے کہ اس کا اصل نام کیا ہے؟ اس کا مرکز حکومت کہاں تھا؟ اور اس کو ذوالقرنین کیوں کہتے ہیں؟ غرض سلف رحمہم اللہ کے یہاں ان سوالات کے جواب میں اس درجہ مختلف اور مضطرب اقوال پائے جاتے ہیں کہ قرآن کے بیان کردہ اوصاف و علامات کے پیش نظر ان کے ذریعہ کسی قدیم العہد بادشاہ کی شخصیت کا تعین ناممکن ہو جاتا اور معاملہ اپنی جگہ غیر منفصل ہو کر رہ جاتا ہے مثلاً نام کے متعلق زبیر بن بکار اور ابن مردویہ (عن ابن عباس رضی اللہ عنہما) کہتے ہیں کہ عبداللہ بن ضحاک بن معد بن عدنان ہے مگر اس کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت بہت ضعیف ہے اس لیے کہ اس صورت میں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر نہیں ہو سکتا، جب کہ حضرت ابراہیم اور عدنان کے درمیان چالیس واسطے ہیں۔ ابن ہشام کعب احبار اور جعفر بن حبیب کہتے ہیں کہ اس کا نام مصعب بن عبداللہ یا مصعب حمیری [1] ہے۔ حافظ ابن حجر کا رجحان بھی اسی جانب ہے لیکن ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ مصعب سے قحطان تک چودہ پشت ہوتی ہیں اور ابراہیم علیہ السلام سے فلج تک سات پشت ہیں، حالانکہ فلج اور قحطان دونوں بھائی اور عبر کے بیٹے ہیں۔ [2] لہٰذا اس حساب سے یہ شخص بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر نہیں ہو سکتا اور جعفر بن حبیب کی دوسری

---

[1] مصعب بن صعب بن عبداللہ بن قرین بن منصور بن عبداللہ بن ازد فتح الباری ج ۶ و تاریخ ابن کثیر ج ۱ توراۃ پیدائش باب ۱۱ والانباہ لابن۔

[2] کتاب المعبر

روایت یہ ہے کہ منذر بن ابی القیس (شاہ حیرہ) ذوالقرنین ہے لیکن یہ بادشاہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بھی بعد پیدا ہوا ہے اور ہمدانی نے کتاب الانساب میں اس کا نام ہمیسع (ابوالصعب) بن عمرو بن عرب بن زید بن کہلان بن سبا بن قحطان یا ابن یشجب بن یعرب بن قحطان بتایا ہے اگرچہ اس نام کا بادشاہ سباء کے خاندان سے ضرور ہو گزرا ہے۔ لیکن حمیری (سباء) بادشاہوں کے طبقہ اولیٰ کی تاریخ بھی ۱۲۰۰ ق م سے اوپر نہیں جاتی۔ حالانکہ معاصر ابراہیم (علیہ السلام) کو ۲۲۰۰ ق م ہونا چاہیے اور ابن ہشام نے سیرت میں دوسری روایت یہ نقل کی ہے کہ ذوالقرنین کا نام مرزبان بن مردویہ ہے اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محمد بن اسحق کی روایت کی رو سے اسی کو سکندر اوّل بھی کہتے ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے یہ نام مجہول ہے اور اس نام کا کوئی بادشاہ تاریخوں میں مذکور نہیں ہے۔

علاوہ ازیں علماء سلف یہ صراحت کرتے ہیں کہ ذوالقرنین عربی الاصل ہے اور مرزبان اور مردویہ عربی نام نہیں ہیں بلکہ عجمی نام ہیں اس لیے اگر اس نام کا کوئی بادشاہ ہوگا تو وہ عجمی ہوگا نہ کہ عربی اور وہب بن منبہ سے منقول ہے کہ اس کا نام صعب بن مرائد (تبع اوّل) ہے۔ لیکن یہ اس لیے نہیں کہ اوّل تو کوئی تبع اوّل کا یہ نام ہی نہیں ہے بلکہ اس کا نام حارث الرائش یا زید ہے دوسرے کوئی حمیری) "تبع" حضرت ابراہیم کا معاصر نہیں ہے اور دارقطنی اور ابن ماکولا سے منقول ہے کہ اس کا نام ہرمس یا ہردس بن قیطون بن ... ہے مگر یہ سخت مغالطہ ہے اس لیے کہ یہ سکندر مقدونی کے دادا کا نام ہے اور سکندر کے مغالطہ ہی میں ذکر میں آ گیا ہے۔

اس تفصیل سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس امر پر اتفاق کے باوجود کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر بادشاہ جو نام سلف سے منقول ہے ان میں سے نہ کوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر ہے اور نہ سامیہ اولی میں سے بلکہ یا یمنی حمیری سلاطین کے نام ہیں اور یا عجمی بادشاہوں کے نام اور ان میں اس درجہ اختلاف ہے کہ چند علماء سلف کا کسی ایک پر بھی اتفاق نہیں اسی بناء پر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ صرف یہ فرما کر خاموش ہو گئے کہ چند اشعار عرب اور بعض اقوال سے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کا نام صعب تھا لیکن خود صعب کی شخصیت کے متعلق جو اختلاف اقوال ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاصر نہ ہونے کا جو اشکال ہے اس کا کوئی حل انہوں نے نہیں کیا۔

پھر نام کی طرح اس کے لقب "ذوالقرنین" کے متعلق بھی یہی اضطراب موجود ہے اور اس لقب کی وجہ میں جس قدر بھی احتمالات ہو سکتے تھے وہ سب ہی منقول و مذکور ہیں، فہرست ملاحظہ ہو۔

ذوالقرنین اس لیے کہا گیا کہ وہ روم و فارس دو مملکتوں کا مالک تھا اور "قرن" جس کے معنی "سینگ" کے ہیں بطور استعارہ کے طاقت حکومت کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی دو حکومتوں کا والی و مالک یہ رائے اہل کتاب کی جانب منسوب ہے اور بعض مفسرین کا رجحان بھی اسی جانب ہے۔

وہ فتوحات کرتا ہوا اقصائے مشرق و مغرب تک پہنچا اور دونوں جہات میں بہت سے ممالک پر قابض و مسلط ہوا یہ زہری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

اس کے سر میں دونوں جانب سینگ کے مشابہ تانبے کے سے غدود ابھرے ہوئے تھے یہ وہب بن منبہ کی رائے ہے۔

لابن عبدالبر و تاریخ ابن کثیر ج ۲ ✽ قاشمندی

التیجان لابن ہشام ✽ تاریخ ابن کثیر ج ۲

Marfat.com

④ اس کی زلفیں دراز تھیں اور وہ ہمیشہ اپنے بالوں کو دو حصے کرتا اور ان کی پٹیاں گوندھ کر دونوں کاندھوں پر ڈالے رکھتا تھا ان دونوں کو "قرن" سے تشبیہ دے کر اس کو یہ لقب دیا گیا یہ قول حسن بصری کی جانب منسوب ہے۔

⑤ اس نے ایک جابر بادشاہ کو یا اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی، بادشاہ یا قوم نے غضب ناک ہو کر اس کے سر کے ایک جانب ایسی سخت چوٹ لگائی کہ وہ مرگیا اس کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر پھر تبلیغ کا فرض انجام دیا، اس مرتبہ دوسری جانب چوٹ مار کر قوم نے اس کو شہید کر دیا۔ اس ضرب سے اس کے سر پر جو دو نشان پڑ گئے تھے اس وجہ سے اس کو یہ لقب دیا گیا۔ یہ توجیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب ہے۔

⑥ وہ نجیب الطرفین تھا، اس لیے والدین کی نجابت کو قرنین کے ساتھ تشبیہ دی گئی اور ذوالقرنین لقب ہوا۔

⑦ اس نے اس قدر طویل عمر پائی کہ انسانی دنیا کے دو قرن (صدیوں) تک زندہ رہا۔

⑧ وہ جب جنگ کرتا تھا تو بیک وقت دونوں ہاتھوں سے ہتھیار چلاتا بلکہ دونوں رکابوں سے بھی ٹھوکر لگاتا تھا۔

⑨ اس نے زمین کی تاریکی اور روشنی دونوں حصوں کی سیاحت کی۔

⑩ وہ ظاہر و باطن دونوں علوم کا حامل تھا۔ [1]

لیکن پہلی توجیہ تو اس قیاس پر مبنی ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے اور دوسری توجیہ کی بنیاد ایک ناقابل اعتماد روایت پر ہے جو سفیان ثوری اور مجاہد سے منقول ہے اس میں ہے کہ چار بادشاہ وہ ہیں جنہوں نے تمام عالم پر حکومت کی ہے ان میں سے دو مسلمان ہیں اور دو کافر۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ذوالقرنین اور نمرود و بخت نصر۔ [2] یہ روایت اس لیے معلول ہے کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین دونوں کی حکومت تمام عالم پر رہی ہے اگرچہ تاریخی حیثیت سے یہ ثابت نہیں ہے تب بھی نمرود اور بخت نصر کے جو مفصل حالات کتب تواریخ میں محفوظ ہیں وہ اس روایت کے مضمون کا انکار کرتے ہیں اس لیے کہ ان دونوں بادشاہوں کی حکومت شام، عراق، مصر، حجاز اور فارس کے علاوہ بالواسطہ یا بلا واسطہ دنیا کے کسی حصہ پر بھی ثابت نہیں ہے اور آخر الذکر بادشاہ کا زمانہ تو بلحاظ عہد تاریخ اتنا قریب ہے کہ اس کی حکومت اور رقبہ حکومت کی تفاصیل تو معاصرانہ شہادتوں اور تاریخی روایتوں اور حضریات کے اکتشافات کی بناء پر بہت مشہور اور واضح ہیں اس لیے یہ روایت بھی قابل حجت نہیں ہے اور تیسری توجیہ سے متعلق جو روایت ہے اس کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے منکر اور ابن کثیر نے ضعیف اور ناقابل اعتماد کہا ہے۔ [3] اور چوتھی توجیہ حسن بصری کی جانب منسوب ہے محض قیاسی ہے اور پانچویں توجیہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اس کے متعلق حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کے دو طریق روایت میں سے ایک ضعیف اور ناقابل اعتبار ہے دوسرا طریقہ اگرچہ صحیح ہے لیکن اس کے متن پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ اس میں یہ الفاظ ہیں "لم یکن نبیا ولا ملکا" ذوالقرنین نہ نبی تھے نہ فرشتہ حالانکہ اس روایت کی ابتداء ہے "بعثه الله الی قومه" اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی قوم کی جانب مبعوث کیا تھا، یہ جملہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ نبی تھے، اور حافظ نے اس اشکال کے جواب میں ایک کمزور سا جواب یہ کہہ کر دے دیا "الا ان تحمل البعث علی غیر رسالة النبوة" مگر

[1] فتح الباری ج ۶ تاریخ ابن کثیر ج ۲ دائرۃ المعارف للبستانی ج ۸
[2] فتح الباری ج ۶ [3] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۳ و فتح الباری

Marfat.com

یوں کہہ دیا جائے کہ اس کی بعثت نبوۃ کے طور پر نہیں تھی۔ [1]

ہمارے نزدیک اس پر یہ اہم اشکال بھی وارد ہوتا ہے کہ قرآن عزیز نے ذوالقرنین کے حاکمانہ اقتدار کے متعلق جو تفصیلات دی ہیں یہ روایت ان کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی وہ کہتا ہے کہ ذوالقرنین وسیع مملکت کا مالک اور کامیاب بادشاہ ہوگزرا ہے مگر یہ روایت اس کو صرف ایک مبلغ ثابت کرتی ہے جس کی قوم تک نے اس کو نہیں تسلیم کیا اور اس کے درپے آزار رہی علاوہ ازیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس کے متعلق جو معجزانہ واقعہ مذکور ہے اگر یہ صحیح تھا تو قرآن عزیز کس طرح اس کو فروگزاشت کرسکتا تھا جب کہ یہ ذوالقرنین کی عظمت کو چند در چند بلند کرتا ہے؟ اس لیے یہ توجیہ بھی جرح اور ضعف سے محفوظ نہیں ہے اور ممکن ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول قرآن میں مذکور ذوالقرنین کے سواء کسی دوسری شخصیت سے متعلق ہو اور نیچے کے راویوں نے اپنے فہم سے اس واقعہ کے ساتھ چسپاں کر دیا ہو اور ساتویں اور نویں ہر دو توجیہات کو ابن کثیر رحمہ اللہ نے منکر یعنی نا قابل اعتماد کہا ہے اور چھٹی آٹھویں اور نویں توجیہات محض اٹکل کے تیر اور بے سند ہیں۔ [2]

یہ ہیں وہ اقوال جو یا بلحاظ نقل ضعیف اور منکر ہیں اور یا بے سند محض اٹکل کے تیر ہیں اسی بناء پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تو ان کو فقط نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور ان اقوال میں سے بھی کسی ایک قول کو ترجیح نہیں دیتے جو ان کے نزدیک بلحاظ روایت و نقل سقم سے پاک ہیں البتہ حافظ ابن کثیر نے زہری کے قول کو راجح کہا ہے یعنی وہ چونکہ مشرق اور مغرب دونوں حدوں تک پہنچا اور ان کے درمیان کا مالک رہا ہے اس لیے ذوالقرنین کہلایا یہ بات اگرچہ کسی حد تک صحیح ہوسکتی ہے لیکن مشارق الارض و مغاربها کے مفہوم میں وہی کلام ہے جو ہم ابھی بیان کر آئے ہیں اور آئندہ تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کریں گے۔

علماء سلف سے ذوالقرنین کے نام اور لقب سے متعلق جو اقوال منقول ہیں اور جن سے اس کی شخصیت کے تعین میں مدد لی جاتی ہے ان کا حال تو آپ تفصیل کے ساتھ معلوم کر چکے اب ذوالقرنین کے بعض حالات کا جو تذکرہ اس ضمن میں پایا جاتا ہے وہ بھی تعارض و اضطراب سے خالی نہیں ہے، مثلاً ازرقی کہتے ہیں کہ ذوالقرنین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ پر ایمان قبول کیا اور پھر ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے ہمراہ کعبہ کا طواف کیا۔ [3] اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکہ میں حاضر ہوکر مسلمان ہوا اور علی بن احمد کی روایت میں ہے کہ ذوالقرنین جب حج کے ارادہ سے نکلا تو پیادہ پا روانہ ہوا اس کی اطلاع حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہوئی تو وہ اس کے استقبال کے لیے نکلے [4] اور اس کے لیے دعائے خیر کی یہ روایت ذوالقرنین کو قدیم الاسلام ثابت کرتی ہے۔

اسی طرح تعین شخصیت میں کوئی اس کو سامیہ اولیٰ میں سے بیان کرتا ہے اور کوئی حمیری بادشاہوں میں سے اور کوئی خضر علیہ السلام کا وزیر کہہ کر خضر علیہ السلام کی عمر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد تک دراز ثابت کرتا ہے حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس قسم کی تمام روایات غیر مستند اور اہل کتاب سے ماخوذ ہیں۔

غرض ذوالقرنین کے نام اس کے لقب کی وجہ تسمیہ اور تعین شخصیت کے متعلق علماء سلف کے یہاں اس قدر مختلف اور مضطرب روایات پائی جاتی ہیں وہ ان کو سامنے رکھ کر ذوالقرنین کی تاریخی شخصیت کا پتہ لگانا ناممکن ہو جاتا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے اس ارشاد کے باوجود:

[1] فتح الباری ج ۶ [2] البدایہ والنھایہ ج ۲
[3] فتح الباری ج ۶ البدایہ والنھایہ ج ۶ [4] البدایہ والنھایہ ج ۲

Marfat.com

فهذه الاٰثار یشد بعضه بعضا و یدل علی قدم عهد ذی القرنین.

"پس یہ آثار ایک دوسرے کو مضبوط بناتے اور قوت پہنچاتے ہیں اور ذوالقرنین کے قدیم العہد ہونے پر دلالت کرتے ہیں"۔

یہ اشکال حل نہیں ہوتا کہ جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے عہد کے کافر بادشاہ نمرود کے حالات و واقعات قرآن کے علاوہ سیر و تاریخ کی کتابوں کے ذریعہ بھی بہت زیادہ روشنی میں آچکے ہیں اور بائبل بھی اکثر حالات کو روشنی میں لاتی ہے تو اگر ذوالقرنین عہد ابراہیمی کی ایسی عظیم الشان ہستی تھی تو ان چند مختصر اور منتشر آثار کے علاوہ اس کے حالات و واقعات کیوں تاریخی حیثیت سے اس طرح سامنے نہیں آئے جس سے اس کی شخصیت صاف طور پر نمایاں نظر آتی نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے وابستہ ایسے جلیل القدر انسان کا ذکر قرآن نے کیوں واقعات ابراہیم علیہ السلام کے سلسلہ میں نہیں کیا اور سورۂ کہف میں اس جانب کیوں اشارہ تک نہیں کیا گیا۔ کیا یہ بات قابل تعجب نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مخالف کافر بادشاہ کی مخالفت اور حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی کا تو قرآن شد و مد کے ساتھ ذکر کرے مگر مشارق و مغارب ارض پر حکمراں ایسے بادشاہ کا اس سلسلہ میں کوئی ذکر نہ کیا جائے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ پر ایمان لایا ان کی اطاعت و فرماں برداری کا اظہار کر کے ان کا مؤید ثابت ہوا اس لیے یہ کہنا شاید بیجا نہ ہوگا کہ قرآن، مرفوع احادیث توراۃ اور تاریخ میں عہد ابراہیمی کے اندر یا اس کے قریب کسی ایسے بادشاہ کا ثبوت نہیں ملتا جس کا ذکر سورۂ کہف میں "ذوالقرنین" کہہ کر کیا گیا ہے اور جو اقوال و آثار اس سلسلہ میں مذکور ہیں وہ اس شخصیت کی تاریخی حیثیت ثابت کرنے سے قاصر ہیں۔

متاخرین کی رائے:

علماء متاخرین میں سے بعض علماء نے تو اسی غلط بات کو اختیار کر لیا کہ سکندر مقدونی ہی قرآن میں مذکور ذوالقرنین ہے اور بعض علماء نے فقط علماء سلف کے قول کو نقل کرنے پر اکتفاء کیا ہے اور اس کے خطاء و صواب پر کوئی توجہ نہیں فرمائی اور بعض نے بغیر کسی دلیل کے یمن کے حمیری بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو زیر بحث ذوالقرنین فرما دیا۔

مگر ان سب اقوال سے جدا مولانا ابوالکلام نے اس سلسلہ میں جو تحقیق فرمائی ہے البتہ وہ ضرور قابل توجہ ہے بلکہ دلائل و براہین کی قوت کے لحاظ سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کی تحقیق بلاشبہ صحیح اور قرآن کے بیان کردہ اوصاف اور تاریخی حقائق کے مطابق کے پیش نظر ہر طرح لائق ترجیح ہے۔

تفسیری مطالب کے سلسلہ میں ہم کو موصوف کے ساتھ شدید اختلاف بھی رہتا ہے اور اتفاق بھی لیکن اس خاص مسئلہ میں چونکہ ان کی رائے علماء سلف سے بالکل مختلف تھی اس لیے کڑی تنقیدی نظر کی محتاج تھی چنانچہ کافی غور و خوض اور گہری نظر کے بعد اس کی صحت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اور جب کہ یہ طے شدہ امر ہے کہ علماء سلف کی جلالت قدر اور علمی عظمت و برتری کے باوجود علمی تحقیق کا دروازہ بند نہیں ہے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں علمائے متاخرین نے علمائے متقدمین سے سینکڑوں مسائل علمی میں اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے خصوصاً تاریخی مباحث میں اور جدید ذرائع معلومات نے ایسے اکتشافات کیے ہیں جن کے ذریعہ ہم بہت سے ایسے مسائل کو بآسانی حل کر لیتے ہیں جو علماء سلف کے زمانہ میں لاینحل رہے ہیں تو ہم کو مولانا آزاد کی اس تحقیق کا "خواہ تاریخی حقائق کے

Marfat.com

لحاظ سے وہ کتنی ہی وقیع کیوں نہ ہو' محض اس لیے انکار نہیں کر دینا چاہیے کہ وہ ان کی اپنی تحقیق ہے۔

مولانا آزاد نے اس سلسلہ میں جو تحقیق فرمائی ہے وہ اپنی جگہ قابل مراجعت ہے اور اس طویل مضمون کا یہاں نقل کرنا قطعاً غیر مناسب ہے البتہ ہم اپنی کاوش و تحقیق سے جس حد تک اس کے ساتھ مطابقت کر سکتے ہیں اس ہی کو سپردِ قلم کرنا موزوں خیال کرتے ہیں۔ ❶

یہود وقریش اور انتخاب سوالات:

ایک مرتبہ پھر اس روایت پر غور فرمایئے جو محمد بن اسحاق اور شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہما نے نقل فرمائی ہے اور جس کا حاصل یہ ہے کہ اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق مشرکین مکہ نے جو سوالات نبی اکرم ﷺ سے کیے وہ دراصل یہود مدینہ کی تلقین پر کیے گئے تو اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہود کو ان واقعات سے ایسی کیا دلچسپی تھی کہ جس کی بنیاد پر انہوں نے ان کا انتخاب کیا اور ان کے صحیح جوابات کو پیغمبر خدا ﷺ کے دعویٰ نبوت و رسالت کی صداقت کا معیار ٹھہرایا۔ اصحاب کہف سے متعلق تو تفصیل کے ساتھ گزشتہ صفحات میں بحث آ چکی ہے لیکن ذوالقرنین کے بارے میں کیوں سوال کیا گیا اس کا جواب یہ ہے کہ یہود نے اس سوال میں درحقیقت ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کیا ہے جو ان کی مذہبی زندگی کے سلسلہ میں بہت ہی زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور جس کو وہ اپنی ملی و اجتماعی حیات میں کسی وقت بھی فراموش نہیں کر سکتے کیونکہ اس شخصیت کی بدولت بنی اسرائیل نے بابل کی غلامی سے نجات پائی اور ان کے قومی مرکز قبلہ صلوٰۃ اور مقدس مقام یروشلم و بیت المقدس ہر قسم کی تباہی اور بربادی کے بعد اسی کے ہاتھوں دوبارہ آباد ہوا چنانچہ ان اہم امور کی بنا پر یہود کے نزدیک وہ نجات دہندہ خدا کا مسیح اور خدا کا چرواہا کہلایا کیونکہ ان کے نبیوں کے مقدس صحیفوں میں اس کے متعلق یہی القاب درج تھے اور اس کی عظمت کا اظہار کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ انہوں نے سوالات میں اس شخصیت کے مسئلہ کو بھی منتخب کیا بلکہ اسی کو زیادہ اہمیت دی جیسا کہ قرآن کے اسلوب بیان ﴿وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ﴾ سے واضح ہوتا ہے وہ سمجھتے تھے کہ جب کہ محمد ﷺ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور اس کے تمام سچے پیغمبروں کے دین کو اور اپنے دین کو ایک ہی دین سمجھتے ہیں خصوصاً انبیاء بنی اسرائیل کی عظمت و عزت اور ان کی صداقت و حقانیت کا اظہار فرماتے ہیں پس اگر وہ حقیقتاً خدا کے سچے پیغمبر ہیں تو "امی" ہونے کے باوجود ضرور وحی الٰہی کے ذریعہ اس شخص کے واقعات پر روشنی ڈال سکیں گے جس کی وجہ سے مہبط انبیاء بنی اسرائیل (یروشلم) اور انبیاء بنی اسرائیل اور قوم بنی اسرائیل کو ایک بت پرست بادشاہ کی غلامی اور تباہ کاریوں سے نجات ملی اور جو خدا کے کلمہ کو بلند کرنے میں انبیاء بنی اسرائیل کا معاون و مددگار ثابت ہوا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے ۷۰۰ ق م میں عراق دو عظیم الشان حکومتیں اپنی قاہرانہ و جابرانہ تسلط کے ساتھ قائم تھیں، ایک آشوری حکومت اور اس کا دارالحکومت نینویٰ تھا اور دوسری بابلی حکومت اور اس کا دارالحکومت بابل تھا لیکن ۶۱۲ ق م میں نینویٰ کی حکومت کو زوال آ گیا اور اب بابلی حکومت بلاشرکت غیرے دونوں حکومتوں کے مقبوضات کی مالک اور وقت کی بہت بڑی طاقت بن

---

❶ اس مسئلہ کی پوری تحقیق میں ہم کو مولانا آزاد کے اس حصہ بیان سے سخت اختلاف ہے جو انہوں نے علماء سلف کے خلاف یاجوج و ماجوج کے آخری خروج کے متعلق تحریر فرمایا ہے اس لیے کہ یہ حصہ تحقیق بلاشبہ باطل ہے، یہ بحث عنقریب ذکر میں آئے گی۔

گئی یہی زمانہ تھا جب کہ بابل کے تخت پر بخت نصر (بنوکدنذر)[1] سریر آرائے سلطنت ہوا، یہ بادشاہ ذاتی طور پر بھی بہت بہادر اور صاحب تدبیر تھا مگر ساتھ ہی سخت جابر و ظالم بھی تھا کتب تاریخ میں مشہور ہے کہ یہ صرف ملکوں کو فتح ہی نہیں کرتا تھا بلکہ قوموں کو غلام بنا کر بھیڑوں کی طرح بابل کو لے جاتا اور بڑے بڑے متمدن اور بے نظیر شہروں کو برباد کر کے کھنڈر چھوڑ جاتا تھا۔

ادھر ایک عرصہ سے بنی اسرائیل کی روحانی، اخلاقی اور اجتماعی زندگی کو گھن لگ چکا تھا اور بداعمالیوں اور بدکرداریوں نے اس درجہ ان کو ذلیل و خوار کر دیا تھا کہ جو انبیاء علیہم السلام ان کی رشد و ہدایت کے لیے مبعوث ہوتے اور ان کی بدکرداریوں پر ان کو وعظ و نصیحت اور تنبیہ کرتے تو یہ ان کو قتل کر دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بخت نصر خدا کا عذاب بن کر ان پر چڑھ آیا اور ایک لاکھ سے زیادہ بنی اسرائیل کو غلام بنا کر بکریوں کے گلہ کی طرح ہنکا لے گیا اور بیت المقدس جیسے خوبصورت اور مقدس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، یہ حادثہ بنی اسرائیل کے لیے ایسا ہوش ربا تھا کہ اس نے ان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کو تباہ و برباد کر ڈالا اور وہ انتہائی مایوسی کی حالت میں بابل کے اندر غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔[2]

بنی اسرائیل پر گزرے ہوئے ان واقعات کی خبر اگرچہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے حضرت یسعیاہ (شعیا) اور حضرت یرمیاہ علیہما السلام نے وحی و الہام کے ذریعہ پیش آنے سے قبل ہی سنا دی تھی مگر اس زمانہ میں وہ اپنی نافرمانیوں میں اس درجہ سرشار و سرمست تھے کہ انہوں نے ان پیشین گوئیوں کی مطلق پرواہ نہیں کی اب جب کہ یہ ہولناک واقعات سر پر سے گزرنے لگے تو ان کی آنکھیں کھلیں مگر ایسے وقت کھلیں کہ رنج و افسوس اور حزن و ملال سب بیکار تھا اور کوئی ترکیب نہیں تھی کہ وہ اس عذاب سے نجات پا سکیں۔

لیکن ان تمام مایوسیوں کی سخت اور ہولناک تاریکی میں ان کے لیے اگر کوئی شعاع امید باقی تھی تو وہ ان ہی انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیوں کا وہ حصہ تھا جس میں حضرت یسعیاہ نبی نے تقریباً ایک سو ساٹھ سال قبل اور حضرت یرمیاہ نبی نے ساٹھ سال قبل یہ بشارت بھی دی تھی کہ بیت المقدس کی تباہی سے ستر سال کے بعد بنی اسرائیل دوبارہ اپنے وطن میں آزاد ہو کر واپس آ جائیں گے اور خدا کا ایک مسیح مبارک خدا کا چرواہا (نگہبان) کہ جس کا نام خورس ہوگا وہ بنی اسرائیل کی نجات اور یروشلم کی دوبارہ آبادی کا باعث بنے گا اور اس کے ہاتھوں یہود کی اجتماعی زندگی کا نیا دور شروع ہوگا۔

بخت نصر جب بیت المقدس کے تمام اسرائیلیوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا تو ان میں بعض انبیاء بنی اسرائیل بھی تھے جو بابل جا کر اپنے حکیمانہ اقوال اور کریمانہ اخلاق کی وجہ سے اس درجہ ہر دلعزیز بنے کہ دشمن بھی ان کی عزت کرنے پر مجبور ہوا چنانچہ حضرت دانیال علیہ السلام بابلی حکومت کے آخری دور میں مشیر خاص تھے۔

اب جب کہ وہ وقت قریب آیا کہ بنی اسرائیل غلامی سے نجات پائیں تو ان ہی برگزیدہ نبی دانیال علیہ السلام کو الہام و مکاشفہ کے ذریعہ اس نجات دہندہ کو ایک تمثیل کی شکل میں دکھایا گیا اور ساتھ ہی جبرئیل علیہ السلام (ناموس اکبر) نے دانیال نبی کو اس کی تعبیر بھی بتائی جو اسی خورس کے حق میں تھی جس کا ذکر یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں آ چکا تھا۔

---

[1] اس نام کا املا دو طرح ہے (بنوکدزار، بنوکدنذر)۔

[2] واقعات کی تفصیلات بیت المقدس کے عنوان میں زیر بحث آ چکی ہیں۔

Marfat.com

ذوالقرنین اور انبیاء بنی اسرائیل کی پیشین گوئیاں:

یہود کے نجات دہندہ، خدا کے مسیح اور اس کے چرواہے کے متعلق وہ پیشین گوئیاں کیا ہیں جن کو دیکھ کر یہود بابل کی سرزمین میں انتہائی مایوسیوں کے باوجود اس وقت کے لیے چشم براہ تھے؟ پہلے ان کو نقل کر دیا جائے تا کہ زیر بحث مسئلہ کے لیے تحقیق کی جانب قدم اٹھایا جاسکے سب سے پہلے اس سلسلہ میں حضرت یسعیاہ علیہ السلام کی پیشین گوئی سامنے آتی ہے جو یہودیوں کے یوم نجات سے ایک سو ساٹھ سال قبل سنائی گئی تھی:

"اے اسرائیل! تجھ کو مجھے فراموش نہیں کرنا چاہیے میں نے تیری خطاؤں کو بادل کی مانند اور تیرے گناہوں کی گھٹا کی مانند مٹا ڈالا، میری طرف پھر آ کہ میں نے تیرا فدیہ دیا ہے، ارے اے آسمانو! گاؤ کہ خداوند نے یہ کیا۔ خداوند تیرا نجات دینے والا جس نے تجھے رحم میں بنا ڈالا یوں فرماتا ہے کہ میں خداوند سب کا بنانے والا ہوں میں نے ہی اکیلا آسمانوں کو تانا اور آپ تنہا زمین کو فرش کیا ہے دروغ گوؤں کے نشانوں کو باطل ٹھہراتا اور فال گیروں کو دیوانہ بناتا ہوں اور حکمت والوں کو رد کر دیتا اور ان کی حکمت کو حماقت ٹھہراتا ہوں جو اپنے بندہ کے کلام کو ثابت کرتا اور اپنے رسولوں کی مصلحت کو پورا کرتا ہوں جو یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ آباد کی جائے گی اور یہوداہ کے شہروں کی بابت کہ وہ بنائے جائیں گے اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سکھا ڈالوں گا جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا اور یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائی جائے گی اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی۔

خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑ کر امتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں اور دہرائے ہوئے دروازے اس کے لیے کھول دوں اور وہ دروازے بند نہ کیے جائیں گے میں تیرے آگے چلوں گا اور ٹیڑھی جگہوں کو سیدھا کروں گا میں پیتل کے دروازوں کو جدا جدا پٹھوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا اور لوہے کے بینڈوں کو کاٹ ڈالوں گا اور میں گاڑے ہوئے خزانے اور پوشیدہ مکانوں کے گنج تجھے دوں گا تا کہ تو جانے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جس نے تیرا نام لے کے بلایا ہے میں نے اپنے بندہ یعقوب اور اپنے برگزیدہ اسرائیل کے لیے تجھے تیرا نام صاف صاف لے کے بلایا میں نے تجھے مہربانی سے پکارا گو کہ تو مجھ کو نہیں جانتا۔ [1]

اور دوسری پیشین گوئی حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی ہے جو بشارت کے وقوع سے تقریباً ساٹھ سال پہلے کی گئی تھی:

"وہ کلام جو خداوند نے بابل کی بابت اور کسدیوں کی سرزمین کی بابت یرمیاہ نبی کی معرفت فرمایا تم قوموں کے درمیان بیان کرو اور اشتہار دو اور جھنڈا کھڑا کرو منادی کرو مت چھپاؤ کہو کہ بابل لے لیا گیا، بعل رسوا ہوا، مردوک سراسیمہ کیا گیا، اس کے بت خجل ہوئے اس کی مورتیں پریشان کی گئیں کیونکہ اتر سے ایک قوم اس پر چڑھتی ہے جو اس کی سرزمین کو اجاڑ کرے گی یہاں تک کہ کوئی اس میں نہ رہے گا وہ بھاگے ہیں وہ روانہ ہوئے کیا انسان کیا حیوان ان دونوں میں اور اسی وقت خدا کہتا ہے بنی اسرائیل آئیں گے وہ اور بنی یہوداہ ایک ساتھ وہ روتے ہوئے چلے جائیں گے اور خداوند اپنے خدا کو

---

[1] یسعیاہ نبی کا صحیفہ باب ۴۵ آیت ۱-۴

Marfat.com

ڈھونڈیں گے وہ اس طرف متوجہ ہو کے صیہون کی راہ پوچھیں گے کہ آؤ ہم آپ ہی خداوند سے مل کے اس کے ساتھ ایک ابدی عہد کریں جو کبھی فراموش نہ ہو"۔ ❶

"بابل میں سے بھاگو اور کسدیون ابابلیوں کی سرزمین سے نکلو اور ان بکریوں کی مانند ہو جو گلوں کے آگے آگے جاتی ہیں کہ دیکھو میں اتر (شمال) کی سرزمین سے بڑی قوموں کے ایک گروہ کو برپا کروں گا اور بابل پر لے آؤں گا"۔ ❷

"قوموں کو مادیون (میڈیا) کے بادشاہوں کو اور اس کے عالموں کو اور اس کے حاکموں کو اور اس کی سلطنت کی ساری سرزمین کو مخصوص کرو کہ اس پر چڑھیں"۔ ❸

"رب الافواج یوں کہتا ہے کہ بابل کے بھاری شہر کی دیواریں سراسر ڈھادی جائیں گی اور اس کے بلند پھاٹک آگ سے جلا دیئے جائیں گے"۔ ❹

اور دانیال علیہ السلام کا خواب یا مکاشفہ یہ تھا:

"بیل شازار (بخت نصر کا جانشین) بادشاہ کی سلطنت کے تیسرے سال میں مجھے مجھ دانی ایل کو ایک رویا نظر آئی بعد اس کے جو شروع میں مجھے نظر آئی تھی اور میں نے عالم رویت میں دیکھا اور جس وقت میں نے دیکھا ایسا معلوم ہوا کہ میں سوسن کے قصر میں تھا جو صوبہ عیلام میں ہے پھر میں نے رویت کے عالم میں دیکھا کہ میں اولائی کی ندی کے کنارہ پر ہوں تب میں نے اپنی آنکھیں اٹھا کے نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے آگے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ تھے اور وہ دو سینگ اونچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے کے پیچھے اٹھا ہوا میں نے اس مینڈھے کو دیکھا کہ پچھم اتر دکھن کی طرف سینگ مارتا تھا یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ ہو سکا نہ کوئی اس کے ہاتھ سے چھڑا سکا پھر وہ جو چاہتا تھا کرتا تھا یہاں تک کہ وہ بہت بڑا ہو گیا اور میں اس سوچ میں تھا کہ دیکھا کہ ایک بکرا پچھم کی سمت سے آ کر تمام روئے زمین پر ایسا پھرا کہ زمین کو بھی نہ چھوا اور اس بکرے کے دونوں آنکھوں کے بیچوں بیچ ایک عجیب طرح کا سینگ تھا اور وہ اس دو سینگ والے مینڈھے کے پاس جسے میں نے ندی کے سامنے کھڑا دیکھا آیا اور اپنے زور کے قہر سے اس پر دوڑ گیا اور میں نے اسے دیکھا کہ وہ مینڈھے کے قریب پہنچا اور اس کا غضب اس پر بھڑکا اور مینڈھے کو مارا اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے اور مینڈھے کو قوت نہ تھی کہ اس کا سامنا کرے"۔ ❺

اور دانیال علیہ السلام کے مکاشفہ اور رویا کے تعبیر ہے:

"اور ایسا ہوا کہ جب مجھ دانی ایل نے یہ رویت دیکھی تھی اور اس کی تعبیر کو تلاش کرتا تھا تو دیکھا کہ میرے سامنے کوئی کھڑا تھا جس کی صورت آدمی کی سی تھی اور میں نے ایک آدمی کی آواز سنی کہ اولائی کے درمیان پکار کے کہا کہ اے جبرائیل! اس شخص کو اس رویت کے معنی سمجھا، چنانچہ وہ ادھر جہاں میں کھڑا تھا نزدیک آیا اور جب پہنچا تو میں ڈر گیا اور اوندھے منہ گرا پھر اس نے مجھے کہا اے آدم زاد سمجھ کیونکہ یہ رویت آخری زمانہ میں انجام ہوگی۔ ❻ اور کہا کہ دیکھ میں تجھے سمجھاؤں گا کہ

---

❶ باب ۵۰ آیات ۱۰۶ ❷ باب ۵۰ آیات ۸-۹ ❸ باب ۵۱ آیات ۵۰
❹ دانی ایل باب ۸ آیات ۱-۸ ❺ دانی ایل باب ۸ آیات ۱۵-۲۱ ❻ دانی ایل باب ۸ آیات ۱۵-۲۱

قہر کے آخر میں کیا ہوگا کیونکہ مقررہ وقت پر ہی کام کا انجام ہوگا، وہ مینڈھا جسے تو نے دیکھا کہ اس کے دو سینگ ہیں سو مادہ (میڈیا) اور فارس کا بادشاہ ہے اور بالوں والا بکرا یونان کا بادشاہ اور بڑا سینگ جو اس کی آنکھوں کے درمیان ہے سو اس کا پہلا بادشاہ ہے"۔ ❶

اور یرمیاہ نبی کی کتاب میں ہے:

"کیونکہ خداوند یہ کہتا ہے کہ جب بابل میں ستر برس گزر چکیں گے تو میں تمہاری خبر لینے آؤں گا اور تمہیں اس مکان میں پھر لانے سے اپنی اچھی بات تم پر قائم کروں گا۔

خداوند کہتا ہے اور میں تمہاری اسیری کو موقوف کراؤں گا اور تمہیں ساری قوموں میں سے اور سب جگہوں میں سے جن میں میں نے تم کو ہانک دیا ہے جمع کروں گا۔ خداوند کہتا ہے اور میں تمہیں اس مکان میں جہاں سے میں نے تمہیں اسیر کرا کے بھیجا پھر لے آؤں گا"۔ ❷

اور عزرا کی کتاب میں ہے:

"اور شاہ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہو خداوند نے شاہ فارس خورس کا دل ابھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کرائی اور اسے قلمبند بھی کر کے یوں فرمایا شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوداہ میں ہے اس کے لیے ایک مسکن بناؤں پس اس کی ساری قوم میں سے تمہارے درمیان کون کون ہے اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو کہ شہر یہوداہ ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے کہ وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے۔ ❸

اور خورس بادشاہ ہی خداوند کے گھر کے ان برتنوں کو جنہیں بنوکدنذر یروشلم میں سے لے گیا اور اپنے دیوتاؤں کے گھر میں رکھا تھا نکال لایا اور شاہ فارس خورس نے انہیں خزانچی متردات کے ہاتھ سے نکلوایا اور اس نے انہیں یہوداہ کے امیر شیس بضر کو گن دیا"۔ ❹

اور زکریا نبی کی کتاب میں ہے:

"رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ دیکھ وہ شخص جس کا نام "شاخ" ہے اور وہ اپنی جگہ سے اگے گا اور وہ خداوند کی ہیکل کو بنائے گا ہاں وہاں خداوند کی ہیکل کو بنائے گا اور وہ صاحب شوکت ہوگا"۔ ❺

ان واضح اور صاف پیشین گوئیوں کی اگر تحلیل کی جائے تو ان سے حسب ذیل اہم امور ثابت ہوتے ہیں:

① جن ہستی نے بنی اسرائیل کو بابل کی غلامی سے نجات دی اس کا نام خورس تھا اور وہ فارس اور میڈیا دو ملکوں کا متفقہ بادشاہ تھا۔

② دانیال نبی کے مکاشفہ اور جبرائیل علیہ السلام کی تعبیر نے ان دو حکومتوں کے اتحاد کی بناء پر ہی خورس کو دو سینگوں والا (ذوالقرنین) بادشاہ

❶ دانی ایل باب ۸ آیات ۱۵-۲۱ ❷ یرمیاہ باب ۲۶، آیات ۱۰-۱۴ ❸ عزرا کی کتاب باب ۱ آیات ۱-۴
❹ ایضا باب ۱ آیات ۷-۸ ❺ زکریا نبی کی کتاب باب ۶ آیت ۱۲

Marfat.com

کہا اور اسی تخیل کی بنا پر بنی اسرائیل میں اس القب ذوالقرنین مشہور ہوا۔

③ انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں میں اس بادشاہ کو خدا کا مسیح بنی اسرائیل کا نجات دہندہ اور خدا کا چرواہا کہا گیا ہے۔

④ یہودیوں میں قومی عصبیت اور نسلی تعصب کے شدید سے شدید تر ہونے کے باوجود ان ہی واقعات کی بنیاد پر وہ غیر اسرائیلی شخص کو اپنے اوصاف سے یاد کرتے ہیں جو صرف اپنے انبیاء کے حق میں ہی کہنے کے عادی ہیں۔

⑤ واقعات تاریخی نے یہ ثابت کر دیا کہ انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیوں کے مطابق خورس ہی نے یہودیوں کو بابل کی غلامی سے نجات دلائی اور بیت المقدس کو دوبارہ آباد کیا۔

⑥ یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں اس کو اتر سے آنا بتایا گیا ہے خورس بابل سے اتر (شمال) ہی کی جانب (فارس و میڈیا) سے آیا تھا اس لیے وہی اس پیشین گوئی کا مصداق ہے۔

⑦ زکریا نبی کی پیشین گوئی میں اس کو اگنے والی "شاخ" بتایا گیا ہے اس سے یہ مطلب ہے کہ اس کی نمود اور اس کا ظہور غیر معمولی صورت حالات میں ہوگا جیسا کہ عموماً ایسی شخصیتوں کے متعلق خدائے تعالیٰ کی جانب سے ہوتا رہا ہے کہ جن سے اس کو کوئی خاص کام لینا ہوتا ہے۔

خورس اور تاریخی شواہد:

ان اجزاء پر بحث کرنے سے قبل چند تاریخی شواہد بھی پیش نظر رکھنے ضروری ہیں جن کا اس معاملہ سے خاص تعلق ہے۔

محققین تاریخ نے فارس کی تاریخ کو تین عہدوں میں تقسیم کیا ہے ایک حملہ اسکندر سے پہلے کا عہد، دوسرا طوائف الملوکی کا عہد اور تیسرا ساسانی سلاطین کا عہد اور یہ بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ان تینوں عہدوں میں سے فارس کی عظمت اور اس کے عروج کا عہد خورس (سائرس) کے عہد حکومت سے شروع ہوتا ہے اور اس عہد کے حالات فارس کے رقیب یونان کے مؤرخین کے ذریعہ سے ہی روشنی میں آسکے ہیں جن میں سے بعض سائرس کے معاصر بھی ہیں اس بادشاہ کو یہودی خورس، یونانی سائرس، فارسی گورش اور کے ارش اور عرب "کیخسرو" کہتے ہیں۔

عرب مؤرخین کے یہاں بھی حکومت فارس کے یہ تین عہد جدا جدا نظر آتے ہیں چنانچہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں ان تینوں عہدوں کے متعلق جو اشارات کیے ہیں وہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں کیونکہ وہ طوائف الملوکی سے قبل کے حالات میں کسریٰ فارس کے درباری عظمت و شوکت کا جس طرح ذکر کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاشبہ یہ دور حکومت فارس کے عروج و عظمت کا دور تھا وہ فرماتے ہیں کہ طوائف الملوک کا وسطی عہد فارس کے لیے بہت خراب اور زوال کا عہد تھا۔ لیکن اردشیر بن بابک ساسانی نے اس کو ختم کر کے فارس کو اس عروج پر دوبارہ پہنچا دیا جس عروج پر پہلے عہد (عہد خورس) میں تھا۔

فاستمر الامر كذلك قريبًا من خمسة مئة سنة حتّٰى كان اردشير بن بابك من بنى ساسان فاعاد ملكهم الى ما كان عليه و رجعت الممالك برمتها اليه۔ [1]

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۸۳، ۱۸۴

Marfat.com

"اور ملوک الطوائف کا یہ عہد تقریباً پانچ سو سال تک رہا تا آنکہ اردشیر بن بابک ساسانی نے ظہور کیا تب اس نے کھوئے ہوئے ملکوں کو واپس لیا اور پہلے عہد کی حالت پیدا کر دی اور تمام تقسیم شدہ حصہ ملک پھر ایک مستقل حکومت کا جز ہو گئے"۔

اسی طرح ابن عبدالبر نے القصد والامم میں ان ہر سہ عہدوں کا ذکر کرتے ہوئے افریدوں اور منوچہر کے تذکرہ میں یہ فرمایا ہے:

وهذه الطبقة الاولى الى ان غلب الاسكندر دار اور تب ملوك الطوائف ثم ملكت الاكاسرة اولهم ارد شير بن بابك۔ ❶

"فارس کے بادشاہوں کا یہ پہلا طبقہ ہے جو دارا پر سکندر کے حملہ تک شمار ہوتا ہے درمیان میں ملوک الطوائف کا دور رہا اور اس کے بعد شاہان کسریٰ کا زمانہ ہے جو اردشیر سے شروع ہوتا ہے"۔

۶۲۲ ق م میں بابل و نینوئی کی حکومتیں بہت عروج و اقبال پر تھیں اور خورس سے قبل اسی دور میں ایران کی حکومت دو جدا جدا حصوں پر تقسیم تھی۔ شمال مغربی حصہ کو میڈیا (ماہات) کہتے تھے اور مغربی حصہ کو فارس اور دونوں حصوں میں قبائلی سردار حکومت کرتے تھے اور یہ قبائلی حکومتیں ان کے زیر اثر اور تابع تھیں لیکن ۶۱۲ ق م جب نینوی کی آشوری حکومت تباہ ہو گئی تو اگرچہ میڈیا آزاد ہو گیا اور قبائلی حکومت کی جگہ آہستہ آہستہ شاہی حکمرانی کی داغ بیل پڑنے لگی تھی تاہم بابل کے بادشاہ بخت نصر کے قاہرانہ اقتدار کے سامنے ایران کے ابھرنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا مگر ان ہی حالات کے اندر ۵۵۹ ق م میں قدرت نے ایکے می نیز یا بخانش خاندان کی ایک غیر معمولی ہستی کو نمایاں کیا کہ جو ابتداء میں اگرچہ ایک چھوٹی سی ریاست انشان کا رئیس تھا مگر ۵۵۹ ق م حیرت ذا طور پر اس کے عدل و انصاف، سیاست و تدبر، خدارسی و علم نے فارس اور ماہات دونوں حکومتوں کو بغیر جنگ و جدل کے اس کے قبضہ میں دے دیا اور دونوں حکومتوں کے قبائلی حکمرانوں نے برضاء و رغبت اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا، یہی وہ ہستی ہے جس کو اہل فارس گورش یا کے ارش اور یہود خورس کہتے ہیں۔

مغربی مہم:

خورس نے جب فارس اور میڈیا کی حکومتوں کو متحد کر کے فرماں روائی کا اعلان کیا تو اس سے قریب ہی زمانہ میں اس کو ایک "مغربی مہم" پیش آئی اور اس وجہ سے پیش آئی کہ خورس سے بہت پہلے میڈیا اور ایران کے مغرب میں واقع حکومت لیڈیا "ایشیاء کوچک" کے درمیان رقیبانہ جنگ رہتی تھی۔ مگر خورس کے معاصر لیڈیا کے بادشاہ کرڈیس کے باپ نے خورس (گورش) کے نانا اسٹیاگس کے باپ سے صلح کر لی تھی اور باہم ازدواجی رشتہ قائم کر کے مستقل طور سے جنگ کا خاتمہ کر دیا تھا لیکن اب جب کہ خورس نے فارس اور میڈیا دونوں کو متحد کر کے ایک مضبوط سلطنت قائم کر لی تو ایشیاء کوچک کا بادشاہ کرڈیس اس کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے باپ کے کیے ہوئے تمام عہد و پیمان کو توڑ کر میڈیا پر حملہ کر دیا، تب گورش بھی مجبوراً اپنے دارالحکومت ہمدان سے تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور دو ہی جنگوں کے بعد تمام ایشیاء کوچک پر قبضہ کر لیا چنانچہ مشہور یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ گورش کی یہ مہم ایسی عجیب اور معجزانہ تھی کہ پیٹریا کے معرکہ سے صرف چودہ دن کے اندر اس نے لیڈیا کے مستحکم اور مضبوط دارالحکومت کو مسخر کر لیا اور کرڈیس

---

❶ ص ۳۱

Marfat.com

قید ہو کر مجرم کی حیثیت میں اس کے سامنے کھڑا نظر آیا۔ اب اگرچہ بحر اسود تک تمام ایشیاء کوچک اس کے زیر نگیں تھا مگر پھر بھی وہ آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ مغربی ساحل پر جا پہنچا، یعنی دارالحکومت سے چودہ سو میل فاصلہ طے کر کے مغربی جانب جا کھڑا ہوا۔

اہل جغرافیہ کہتے ہیں کہ لیڈیا کا دارالحکومت سارڈیس مغربی ساحل کے قریب تھا اور ایشیاء کوچک کے مغربی ساحل کی حالت یہ ہے کہ یہاں سمرنا کے قریب چھوٹے چھوٹے جزیرے نکل آنے کی وجہ سے تمام ساحل جھیل کی طرح بن گیا ہے اور بحر ایجین کے اس ساحل کا پانی خلیج کی وجہ سے بہت گدلا رہتا ہے اور شام کے وقت سورج غروب ہوتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک گدلے حوض میں ڈوب رہا ہے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ خورس نے اگرچہ "ایشیاء کوچک" کو مردانہ وار فتح کر لیا لیکن وقت کے دوسرے بادشاہوں کی طرح اس نے ممالک مفتوحہ پر ظلم روا نہیں رکھا اور نہ ان کو وطن سے بے وطن کیا حتیٰ کہ سارڈیس کی پبلک کو یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ یہاں کوئی انقلاب رونما ہو گیا ہے، انقلاب ہوا مگر فقط شخصیت کا یعنی ان کو کرڈیس کی جگہ خورس جیسا عادل بادشاہ مل گیا۔ چنانچہ ہیروڈوٹس لکھتا ہے:

"سائرس (خورس) نے اپنی فوج کو حکم دے دیا کہ دشمن کی فوج کے سوا اور کسی انسان پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے اور دشمن کی فوج میں سے بھی جو کوئی نیزہ جھکا دے اسے ہرگز قتل نہ کیا جائے اور کرڈیس اگر تلوار بھی چلائے تب بھی اس کو کوئی گزند نہ پہنچائی جائے"۔ ❁

نیز حکومت کے متعلق اس کا عقیدہ وہی تھا جو ایک صالح اور نیک بادشاہ کا ہونا چاہیے، چنانچہ یونانی مؤرخ کی سیاز لکھتا ہے:

"اس کا عقیدہ یہ تھا کہ دولت بادشاہوں کی ذاتی عیش و آرام کے لیے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ رفاہِ عام کے کاموں میں صرف کی جائے اور ماتحتوں کو اس سے فائدہ پہنچے"۔ ❁

مشرقی مہم:

یہی مؤرخ ہیروڈوٹس بیان کرتا ہے کہ گورش نے ابھی بابل کو فتح نہیں کیا تھا کہ اس کو ایران کے مشرق میں ایک اہم معرکہ آرائی پیش آئی کیونکہ مشرق بعید کے بعض وحشی اور صحراء نشین قبائل نے سرکشی اور بغاوت کی تھی اور یہ باختر (بکٹیریا) کے قبائل تھے اور بعض تاریخی حوالہ جات سے یہ تصریح بھی ملتی ہے کہ جس مقام کو آج کل مکران کہتے ہیں اس جگہ کے خانہ بدوش قبائل نے یہ سرکشی کی تھی یہ مقام بلاشبہ ایران کے لیے مشرق بعید کا حکم رکھتا ہے اس لیے کہ اس کے بعد پہاڑ ہیں جنہوں نے آگے بڑھنے کے لیے راہ روک دی ہے۔

تیسری (شمالی) مہم:

بابل کی فتح کے علاوہ تاریخ گورش کی ایک اور مہم کا ذکر کرتی ہے اور یہ ایران سے شمال کی جانب پیش آئی اس مہم میں وہ بحر کاسپین (خزر) کو داہنی جانب چھوڑتا ہوا کاکیشیا کے پہاڑی سلسلہ تک پہنچا ہے ان ہی پہاڑوں میں اس کو ایک درہ ملا ہے جو دو پہاڑوں کے درمیان پھاٹک کی طرح نظر آتا ہے اس مقام پر جب وہ پہنچا ہے تو ایک قوم نے اس سے یاجوج و ماجوج قبائل کے

❁ ، ❁ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مضمون "سائرس"

Marfat.com

تاراج کی شکایت کی ہے کہ وہ اس درہ میں سے نکل کر حملہ آور ہوتے اور تاخت وتاراج کر کے ہم کو برباد و تباہ کر ڈالتے ہیں۔ چنانچہ اس نے لوہا اور تانبا استعمال کر کے اس پھاٹک کو بند کر دیا اور دھات کی ایک سد قائم کر دی جس کے آثار ونشان اس وقت بھی موجود ہیں۔ چنانچہ ہیروڈوٹس اور زینوفن دونوں یونانی مؤرخ تصریح کرتے ہیں کہ گورش نے فتح لیڈیا کے بعد سیتھین قوم کے سرحدی حملوں کی روک تھام کے لیے خاص انتظامات کیے۔

اور یہ حقیقت عن قریب واضح ہو جائے گی کہ گورش کے زمانہ میں یاجوج وماجوج قبائل میں سے یہی سیتھین تھے جو حملہ آور ہو کر قریب کی آبادیوں کو تاخت وتاراج کرتے رہتے تھے۔

فتح بابل:

اب جب کہ گورش یا خورس کی فتوحات اس درجہ وسیع ہو چکی تھیں کہ ایران کے مغرب اقصیٰ میں وہ بحر شمال سے لے کر بحیرہ اسود (بحرالجین) کے آخری ساحل تک قابض تھا اور مشرق اقصیٰ میں مکران کے پہاڑوں تک بلکہ دارا کے رقبہ حکومت کی تفاصیل کو مستند مان لیا جائے تو دریائے سندھ تک فتح کر چکا تھا۔ ✿ اور شمال میں کاکیشیا کے پہاڑی سلسلہ تک حکمران تھا تو اس کو عراق کی مشہور اور متمدن مگر قاہر و جابر حکومت بابل کی جانب متوجہ ہونا پڑا، چنانچہ اس کی تفصیل بھی تاریخ ہی کی زبانی سنئے۔

خورس سے تقریباً پچاس برس پہلے بابل کی حکومت پر بنوکدنذر (بخت نصر) نظر آتا ہے اور اس زمانہ کے ضمنی عقائد کے مطابق وہ نہ صرف بادشاہ تھا بلکہ بابلی اصنام میں سے سب سے بڑے صنم کا مظہر اور دیوتا بھی سمجھا جاتا تھا اور اس لیے اس کا حق تھا کہ وہ جس حکومت کو چاہے اپنے قہر وغضب کا شکر بنا کر اس کے باشندوں کو ہولناک اور سخت عذاب میں مبتلاء کرے۔ ان کو ہلاک کرے یا غلام بنا کر ان پر وحشیانہ مظالم کو روا رکھے۔ اس لیے اس بادشاہ کے مظالم بے پناہ اور اس کے تسخیر ممالک کا طریقہ سخت وحشیانہ تھا جیسا کہ گزشتہ سطور میں بیان ہو چکا ہے۔ اس نے اپنے دور حکومت میں یروشلم (بیت المقدس) پر تین حملے کیے اور فلسطین تباہ و برباد کر کے تمام باشندوں کو مویشیوں کی طرح ہنکا کر بابل لے گیا۔ ایک یہودی مؤرخ جوزیفس کہتا ہے کوئی سخت سے سخت بے رحم قصائی بھی اس وحشت وخونخواری کے ساتھ بھیڑوں کو مذبح میں نہیں لے جاتا جس طرح بنوکدنذر بنی اسرائیل کو بابل میں ہنکا کر لے گیا۔ ✿

بابل کی حکومت آشوری حکومت کی تباہی کے بعد اور بھی زیادہ مضبوط اور قاہر سلطنت ہو گئی تھی اور اس زمانہ میں قرب وجوار کی طاقتوں میں سے کسی کو بھی یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ اس جابر حکومت کے قہر وظلم کا استیصال کر سکیں لیکن فتح بیت المقدس کے کچھ عرصہ بعد بخت نصر مر گیا اور اس کا جانشین نابونی دس مقرر ہوا مگر اس نے حکومت کا تمام بوجھ شاہی خاندان کے ایک شخص بیل شازار پر ڈال دیا یہ شخص اگرچہ بہت عیاش اور ظالم تھا مگر بخت نصر کی طرح بہادر اور جری نہیں تھا، اس کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے قیدیوں میں سے حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنی حکیمانہ فراست سے بابلی شازار کو بار بار اس کے مظالم اور عیاشانہ زندگی کے خلاف تہدید وتنبیہ کی مگر اس نے کچھ شنوائی نہیں کی حتیٰ کہ انہوں نے حکومت کے معاملات سے کنارہ کشی کر لی۔

توراۃ کے بیان کے مطابق اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بیل شازار نے اپنی ملکہ کے اکسانے پر ایک شب یہ حکم دیا

✿ دائرۃ المعارف بستانی ج ۴ (ایران) ✿ دائرۃ المعارف للبستانی (بابل)

Marfat.com

کہ یروشلم سے جو ہیکل کے مقدس ظروف بنوکدنذر لوگ کر لایا تھا وہ لائے جائیں اور ان میں شراب پلائی جائے، یہ جشن ہو ہی رہا تھا کہ کسی غیبی ہاتھ نے بادشاہ کے سامنے دیوار پر ایک نوشتہ لکھ دیا۔ توراۃ میں ہے:

"اسی گھڑی میں کسی آدمی کے ہاتھ کی انگلیاں ظاہر ہوئیں اور انہوں نے شمعدان کے مقابل بادشاہی محل کی دیوار کے گچ پر لکھا اور بادشاہ نے ہاتھ کا وہ سرا جو لکھتا تھا دیکھا تب بادشاہ کا چہرہ متغیر ہوا اور اس کے اندیشوں نے اسے گھبرا دیا۔ اور نوشتہ جو لکھا گیا سو یہ ہے: منے منے تقیل او فیدسین"۔ [1]

تب شاہ نے گھبرا کر نجومیوں اور فال گیروں کو بلایا مگر کوئی اس کا مطلب نہ بتا سکا آخر ملکہ کے مشورہ سے دانیال علیہ السلام کو بلایا، انہوں نے اوّل اس کے مظالم اور اس کی عیاشی کے خلاف پند و نصیحت فرمائی پھر بتایا کہ تو نے چونکہ بیت المقدس کے ظروف کی توہین کر کے اس ظلم کی تکمیل کر دی اس لیے نوشتہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے تیری مملکت کا حساب کیا اور اسے تمام کر ڈالا تو ترازو میں تولا گیا اور کم نکلا، تیری مملکت پارہ پارہ ہوئی اور مادیوں اور فارسیوں کو دے دی گئی۔ [2]

ادھر یہ واقعہ پیش آیا کہ اہل بابل عرصہ سے بیل شازار کے مظالم سے چھٹکارا پانے کی تجویزیں سوچ رہے تھے کہ ان کے بعض سرداروں نے یہ مشورہ کیا کہ قریب کی زبردست طاقت ایران سے مدد حاصل کی جائے اور اس کے عادل فرماں رواں سے یہ عرض کیا جائے کہ وہ ہم کو بیل شازار کے مظالم سے نجات دلائے اور اس کو یہ اطمینان دلایا جائے کہ اہل بابل ہر طرح اس کی مدد کرنے کو آمادہ ہیں۔ چنانچہ ۵۴ ق م بابلی سرداروں کا ایک وفد خورس کے پاس اس وقت پہنچا جبکہ وہ اپنی مشرقی مہم میں مصروف تھا، خورس نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کو اطمینان دلایا کہ وہ اپنی اس مہم سے فارغ ہو کر ضرور بابل پر حملہ کرے گا اور ان کو بیل شازار جیسے ظالم و عیاش بادشاہ سے نجات دلائے گا۔ خورس جب اپنی مہم سے فارغ ہو گیا تو حسب وعدہ اس نے بابل پر حملہ کر دیا۔

تمام مؤرخین باتفاق رائے کہتے ہیں کہ اس عہد میں بابل سے زیادہ ناقابل تسخیر کوئی مقام نہیں تھا اس لیے کہ اس کو شہر پناہ اس درجہ تہ در تہ موٹی اور مستحکم تھی کہ کوئی فاتح اس کی تسخیر کی جرأت نہیں کر سکتا تھا لیکن خورس کی عدل گستری اور رحم کے حالات دیکھ کر بابل کی رعایا خود اس درجہ اس کی گرویدہ تھی کہ حکومت بابل کا ایک گورنر گوب ریاس خود اس کے ہمراہ تھا اور بقول ہیروڈوٹس اس ہی نے دریا میں نہر کاٹ کر اس کا بہاؤ دوسری جانب کر دیا اور دریا کی جانب سے فوج شہر میں داخل ہو گئی اور خورس کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی شہر فتح ہو گیا اور بیل شازار مارا گیا۔

خورس کا مذہب:

خورس کے مذہب کے متعلق توراۃ اور تاریخ دونوں متفق ہیں کہ جس طرح اس نے ایران کے منقسم حصوں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو متحد کر کے ایک بڑی شاہنشاہیت قائم کی اور دوسروں کی سطوت و حکومت کے تابع ہونے کی بجائے بابل و نینوئی کی

---

[1] دانیال کا صحیفہ باب ۵ آیات ۵-۲۵

[2] اس مقام پر توراۃ نے دارا کو فاتح بابل کہا ہے یہ سخت التباس ہے جو توراۃ کے بیان میں پیدا ہو گیا ہے اور جگہ جگہ خورس کی جگہ دارا اور دارا کی جگہ خورس کا ذکر کر کے معاملہ کو خلط ملط کر دیا ہے دراصل بابل کو پہلے خورس ہی نے فتح کیا ہے اس کے بعد جب اہل بابل نے بغاوت کر دی تو دارا نے دوبارہ حملہ کر کے اس بغاوت کو فرو کیا۔

Marfat.com

زبردست طاقتوں کو اپنا تابع فرمان بنایا اور جس طرح وقت کے جابر و قاہر شہنشاہوں کے برعکس اس نے عدل و رحم پر اپنی حکومت کو مستحکم اور استوار کیا اسی طرح وہ دین و مذہب کے بارے میں بھی ایران کے مروجہ مذہب کے خلاف دین حق کا تابع اور ایمان باللہ اور توحید الٰہی کا داعی تھا۔

چنانچہ عزرا (عزیر علیہ السلام) کی کتاب میں تعمیر بیت المقدس سے متعلق اس کا یہ واضح اور صاف اعلان مذکور ہے۔

اور شاہ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہو خداوند نے شاہ فارس خورس کا دل ابھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں یہ منادی کرائی اور اسے قلم بند بھی کرایا، فرمایا: "شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوداہ میں ہے اس کے لیے ایک مسکن بناؤں پس اس کی قوم میں سے تمہارے درمیان کون کون ہے؟ اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو جو شہر یہوداہ ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے کہ وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے۔ ❶

مجھ خورس بادشاہ نے خدا کی بابت جو یروشلم میں ہے حکم کیا کہ وہ گھر اور وہ مکان جہاں قربانیاں کرتے ہیں بنایا جائے اور خدا کے گھر کے سنہرے اور روپہلے برتن بھی جنہیں بنوکدنذر یروشلم کی ہیکل میں سے نکال لایا وہ یروشلم کی ہیکل میں اپنی اپنی جگہ میں پہنچائے جائیں اور خدا کے گھر میں رکھے جائیں۔ ❷

خورس کی منادی اور نوشتہ کے نشان زدہ جملوں کو پڑھیئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ ان مضامین میں صرف یہ اعلان نہیں ہے کہ یہود کو نجات دلا کر بیت المقدس کی تعمیر کی بھی اجازت دی جاتی ہے بلکہ اس سے زیادہ یہ بھی ہے کہ خدا نے یہ حکم کیا ہے کہ میں اس کا گھر دوبارہ تعمیر کروں اور یہ کہ خدا اسی ہستی کا نام ہے جو یروشلم کا خدا ہے اور بیت المقدس خدا کا مقدس گھر ہے۔

اب اسی کے ساتھ اس کے جانشین دارائے اوّل کا وہ فرمان بھی ملاحظہ ہو جو یہودیوں کی اس عرضی کے جواب میں دیا گیا ہے جس میں بعض صوبہ داروں کی شکایت کی کہ وہ بیت المقدس کی تعمیر میں آڑے آتے ہیں۔ دارا لکھتا ہے:

"پس نہر پار کے صوبہ دار تتنی اور شتر بوزنی اور ان کے افارسکی رفیق جو نہر پار ہوں تم وہاں سے دور ہو جاؤ، تم اس بیت اللہ کے کام میں دست اندازی مت کرو، یہودیوں کا ناظم اور یہودیوں کے بزرگ لوگ خدا کے گھر کو اس کی جگہ تعمیر کریں۔ پر وہ خدا جس نے اپنا نام وہاں رکھا ہے سب بادشاہوں اور لوگوں کو جو اس حکم کو بدل کے خدا کا وہ گھر جو یروشلم میں ہے بگاڑنے کو ہاتھ بڑھاتے ہیں غارت کرے، میں دارا حکم دے چکا اس پر جلد عمل کرنا چاہیے"۔ ❸

اس فرمان میں دارا نے بلند آہنگی کے ساتھ یہ ظاہر کیا ہے کہ بیت المقدس بلاشبہ بیت اللہ ہے اور وہ بد دعا کرتا ہے کہ بادشاہ ہو یا معمولی شخص، جو بھی اس بیت اللہ کو خراب کرنے کا ارادہ کرے خدا اس کو غارت کر دے۔

توراۃ کی ان صاف اور واضح شہادتوں کے بعد "جو خورس کا مسلمان ہونا ظاہر کرتی ہیں" اب چند تاریخی شہادتیں بھی قابل مطالعہ ہیں۔

---

❶ باب ۱ آیات ۱-۴ ❷ باب ٦ آیات ۱-۵ ❸ عزرا باب ٦

Marfat.com

دارا نے اپنے زمانہ حکومت میں ایک اہم تاریخی کام یہ کیا ہے کہ پہاڑوں کی مضبوط چٹانوں پر کتبے نقش کرا دیئے ہیں جو اس کے اور خورس کے عہد زریں کو روشنی میں لاتے ہیں ان مختلف کتبات میں سے ایک کتبہ ایران کے مشہور شہر اصطخر میں دریافت ہوا ہے یہ کتبہ قدیم تاریخ کا نادر ذخیرہ سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اس میں دارا نے اپنے تمام مفتوحہ ممالک اور صوبوں کے نام تک گنا دیئے ہیں اور ایسی تفصیلات دی ہیں جن سے اس کے مذہب وعقیدہ اور طریق حکومت تک پر روشنی پڑتی ہے، چنانچہ اسی کتبہ میں دارا کا یہ عقیدہ مذکور ہے:

"خدائے برتر اہورموزدہ ہے اسی نے زمین پیدا کی اسی نے آسمان بنایا اسی نے انسان کی سعادت بنائی اور وہی ہے جس نے دارا کو بہتوں کا تنہا حکمران اور آئین ساز بنایا"۔

اہورموزدہ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے بادشاہت دی اور اسی کے فضل سے میں نے زمین میں امن وامان قائم کیا میں اہورموزدہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے میرے خاندان کو اور ان تمام ملکوں کو محفوظ رکھے، اے اہورموزدہ میری دعا قبول کر!

"اے انسان! اہورموزدہ کا تیرے لیے حکم ہے کہ برائی کا دھیان نہ کر، صراطِ مستقیم کو نہ چھوڑ گناہ سے بچتا رہ"۔ ❶

دارا کے کتبات میں اصطخر کے کتبہ سے بھی زیادہ اہمیت اس کے کتبہ بے ستون کو حاصل ہے اس میں اس کے گوماتہ مجوسی کی بغاوت اور اپنے سریر آرائے سلطنت ہونے کا واقعہ تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

دارا نے اس کتبہ میں گوماتہ کو موگوش (مجوسی) اور اس کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہونے کو اہورموزدہ کے فضل کی جانب منسوب کیا ہے اور ہیروڈٹس اور دوسرے یونانی مؤرخ یہ اور اضافہ کرتے ہیں کہ دارا کے خلاف یہ بغاوت میڈیا (ایران) کے قدیم مذہب کے پیروؤں (مجوسیوں) کی جانب سے ہوئی تھی۔ دارا کے زمانہ میں گوماتہ کے علاوہ پر اورتیش اور چترت خمہ اور مجوسیوں (موگوشوں) نے علم بغاوت بلند کیا اور دارا کے ہاتھ سے پہلا ہمدان میں اور دوسرا اردبیل میں قتل ہوا۔ ❷

پھر خورس اور دارا کے "مومن" ہونے اور ایران کے قدیم مذہبی "مجوسی" سے بیزار رہنے پر سب سے بڑی شہادت دارا کا وہ تبلیغی اعلان ہے جو اس نے دانیال علیہ السلام کے دشمنوں کے خلاف اس وقت شائع کیا تھا جب کہ دانیال علیہ السلام نبی کو ان کے دشمنوں نے شیر ببر کے سامنے ڈال دیا تھا اور دانیال علیہ السلام معجزانہ طور پر صحیح وسالم بچ گئے تھے۔

تب دارا بادشاہ نے ساری قوموں اور گروہوں اور اہل لغت کو جو روئے زمین پر بستے تھے نامہ لکھا:

"تمہاری سلامتی ترقی پائے میں یہ حکم کرتا ہوں کہ میری مملکت کے ہر ایک صوبے کے لوگ دانی ایل کے خدا کے آگے ترساں ولرزاں ہوں کیونکہ یہ وہی زندہ خدا ہے جو ہمیشہ قائم ہے اور اس کی سلطنت لازوال ہے اور آخر تک رہے گی وہی چھڑاتا اور بچاتا ہے اور آسمان اور زمین میں وہی نشانیاں دکھلاتا اور عجائب وغرائب کرتا ہے اسی نے دانی ایل کو شیر ببروں کے چنگل سے چھڑایا ہے پس یہ دانی ایل دارا کی سلطنت اور خورس فارسی کی سلطنت میں کامیاب رہا"۔ ❸

---

❶ ترجمان القرآن ماخوذ حجاز البین فانو گریٹ منار یز آف دی اشنٹ ایسٹرن

❷ دائرۃ المعارف بستانی (ایران)

❸ دانیال کی کتاب باب ۶ آیات ۲۵-۲۸

Marfat.com

ان تاریخی مصادر سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ دارا اور اس کے پیشتر وخورس کا مذہب ایران کے قدیم مذہب "موگوش" (مجوسی مذہب) سے جدا اور مخالف تھا اور یہ کہ دارا جس ہستی کو اہور موزدہ کہہ کر پکارتا ہے اور اس کے جو اوصاف بیان کرتا ہے اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور اس کا پیشترو دین حق پر تھے اور عربی کا "اللہ" سریانی کا الوہیم اور عبرانی کا "ایل" اور ایران کا اہور موزدہ ایک ہی مقدس ہستی کے نام ہیں، کیونکہ دارا کہتا ہے کہ وہی یکتا اور بے ہمتا ہے اور وہی خالق کائنات ہے اور خیر و شر تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے نیز وہ توحید خالص پر ایمان کے ساتھ ساتھ آخرت پر ایمان رکھتا اور صراطِ مستقیم کی تلقین اور گناہوں سے اجتناب کی تعلیم کا اظہار کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ عقائد کی یہ تفصیلات مجوسی مذہب کے بالکل خلاف ہیں اور اسی لیے دارا مجوسیوں پر کامیابی حاصل کرنے کو اہور موزدہ کا فضل و کرم قرار دیتا ہے۔

رہا یہ امر کہ خورس اور دارا وقت کے کس مذہب حق کے پیرو تھے تو اس کا جواب مختصر سی تمہید کے بعد با آسانی دیا جا سکتا ہے۔

ایران قدیم کا مذہب:

ادیان و مذاہب کی تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وسط ایشیاء کے آرین قوموں کا مذہبی تخیل بنیادی طور پر ہمیشہ سے مشترک رہا ہے اور یہ سب مظاہر قدرت کے پرستار اور اصنام پرستی کے ذریعہ اس عقیدہ کے علم بردار نظر آتے ہیں پھر آہستہ آہستہ آسمان پر سورج کو اور زمین پر آگ کو تقدیس کا درجہ دیا جاتا ہے کیونکہ اس کی نگاہ میں یہی دونوں روشنی اور حرارت کے مبدأ ہیں اور روشنی اور حرارت ہی عالم کے تمام نظام میں کارفرما ہیں، چنانچہ قدیم یونان اور ہندوستان اور ایران وغیرہ کے مذاہب میں یہ چیز مشترک نظر آتی ہے البتہ جزئیات میں یہ فرق رہا ہے کہ مثلاً یونان اور ہندوستان کے ضمنی عقائد میں دیوتاؤں کو اچھائی اور برائی دونوں پر قدرت حاصل ہے لیکن ایران کے اصنامی عقائد کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ کائنات کا تمام نظام دو مخالف قوتوں کی کارفرمائی میں ہے، ایک خیر اور نیکی کے دیوتا ہیں جو خیر اور تمام بھلائی کے مالک و متصرف ہیں اور دوسرے شر اور بدی کے دیوتا ہیں جن سے صرف بدی اور برائی کا صدور ہوتا ہے یعنی خالق خیر ایک جدا قوت ہے اور خالق شر دوسری قوت اور تمام عالم پر ان ہی دو متضاد قوتوں کی حکومت ہے اور ان ہی کے تصادم پر نظام کائنات میں خیر و شر کا غلبہ ہوتا رہتا ہے اس لیے ان کے یہاں خدائے واحد کا کوئی تصور ہی نہیں ہے اور چونکہ وہ خیر کو روشنی اور شر کو تاریکی خیال کرتے ہیں اس لیے آگ کو روشنی کا مبدأ قرار دے کر یزداں (خیر کا دیوتا) کی قربت حاصل کرنے کے لیے قابل پرستش سمجھا گیا اور آتش پرستی کو مذہب کا جزاعظم بنایا گیا۔

چنانچہ فارس اور میڈیا یعنی ایران کا یہی قدیم مذہب تھا جس کے پیرو موگوش (مجوس) کہے جاتے تھے۔

ایران اور مذہب زردشت:

لیکن تقریباً ۵۵۰ ق م اور ۵۸۳ ق م کے درمیان شمال مغربی ایران یعنی قفقاز اور آذربیجان کے اس نواح میں جو وادی ارس کے نام سے مشہور ہے ایک ملہم من اللہ ہستی کا ظہور ہوا یہ ابراہیم زردشت کی شخصیت تھی انہوں نے ایران کے مجوسیوں میں دین حق کا اعلان کیا اور رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیا۔

انہوں نے بتایا کہ کائنات میں خیر و شر کے دیوتاؤں کا تصور باطل ہے بلکہ سارے عالم پر صرف ایک ہی ہستی بلا شرکت

غیرے مالک اور متصرف ہے وہ یکتا و بے ہمتا ہے، قدیر و حلیم ہے، نور و قدوس ہے اور یہ اہورموزدہ کی پاک ہستی ہے یہی تمام کائنات کی خالق ہے تم جن کو خیر کے دیوتا سمجھتے ہو وہ دیوتا نہیں بلکہ اہورموزدہ کی مخلوق اور اس کے حکم سے امور خیر کے کارپرداز امش اسپند (فرشتے) ہیں اور تم نے جن کو شر کا دیوتا سمجھ لیا ہے وہ سراسر باطل کے سوا کچھ نہیں بلکہ یہاں شر کا مرکز اسی اہورموزدہ کی مخلوق "اہرمن" (شیطان) کی ہستی ہے یہی انسانوں کے دلوں میں شر کو بھڑکا کر تاریکی کی جانب لے جاتی ہے "انسان" ان دو متضاد اثرات میں گھرا ہوا ہے اور اہورموزدہ نے اس کو اپنے سچے نبیوں کے ذریعہ روشنی اور تاریکی دونوں کے اثرات سے بخوبی آگاہ کر دیا ہے پس آگ کی پرستش محض گمراہی ہے اور انسانی شقاوت و سعادت کا معاملہ صرف اسی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ اس عالم کے علاوہ ایک دوسرا عالم (آخرت) ہے اور وہاں دو جدا جدا مقامات ایک نیکوکاروں کے لیے اور دوسرا بدکاروں کے لیے ہے اس لیے ہم کو گناہوں سے پرہیز کرنا اور نیکی کو اختیار کرنا چاہیے اور اپنے اخلاق کو بہتر بنانا چاہیے۔

یہ تھی ابراہیم زردشت کی وہ تعلیم جس کے متعلق آج عرب اور یورپ کے محقق مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اواخر چھٹی صدی قبل مسیح میں یہ آواز زردشت کی زبانی میڈیا اور فارس کے قدیم مذہب کے خلاف ایران میں سنی گئی۔ ❶

یہی مؤرخین یہ بھی کہتے ہیں کہ ابراہیم زردشت دانیال اکبر یا یرمیاہ علیہما السلام کے شاگرد اور فیض یافتہ تھے اور ایران کے قدیم مذہب کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے۔

ابراہیم زردشت کی تعلیم "دین حق کی تعلیم" تھی اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ ان پر نازل شدہ الہامی کتاب "اوستا" کے مضامین کے ابتداء ایسے ہی جملوں سے ہوتی ہے جن کا مفہوم سچی الہامی کتابوں میں مشترک پایا جاتا ہے یعنی شیطانی وساوس سے پناہ اور خدائے رحمان و رحیم کی مدح و ثناء چنانچہ قرآن سے قبل کی الہامی کتابوں کی طرح اگرچہ "اوستا" بھی محرف ہو چکی ہے تاہم اس میں یہ جملے اب بھی محفوظ ہیں جن سے مضامین کی ابتداء ہوتی ہے اور دساتیر آسمانی میں ان کو اس طرح نقل کیا گیا ہے:

① ہوزامیم فہ مزدان ہزہزماس ہرشیور ہردیور "پناہیم بہ یزداں (اہورموزدہ) از نش رشت و خوئے بدگمارہ کنندہ براہ ناخوب برندہ، رنج دہندہ، آزار رسانندہ (یعنی شیطان)"۔

② فہ شید شمتای ہرشندہ ہرشمشگر زمرپان فراہیدور "بنام ایز دبخشایندہ بخشائش گر مہربان، دادگر"۔

اب اگر اسی کے ساتھ خورس (کے خسرو) اور داریوش (دارا) کے ان بیانات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جو توراۃ میں بیت المقدس کی تعمیر سے متعلق ہیں اور ان کتبات کی عبارات کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے جو دارا کی جانب سے منقوش کیے گئے ہیں اور جن میں مجوسی عقائد کے خلاف خدائے واحد کی حمد و ثنا بیان کی گئی ہے تو پھر یہ دعویٰ حقیقت بن کر سامنے آ جاتا ہے کہ خورس اس کے بیٹے کیقباد دوم ❷ (کم بی سیز) اور دارا کا مذہب بلاشبہ ایران کے قدیم مذہب (مجوسی مذہب) کے خلاف دین حق کا مذہب تھا اور جب کہ تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ابراہیم زردشت اور خورس (کے ارش) کا زمانہ ایک رہا ہے اور خورس اور دارا کے عقائد زردشت کی تعلیم کے عین مطابق ہیں تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خورس پہلا بادشاہ ہے جس نے ایران کے قدیم مذہب (مجوسی مذہب) کے خلاف

---

❶ حاشیہ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۸ و یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ مقالہ پروفیسر گرنڈی ج ۲ ص ۱۱۳

❷ کم بی سیز (کیقباد) خورس کے باپ کا نام بھی ہے اور بیٹے کا بھی۔

Marfat.com

اس دین حق کو قبول کیا اور کچھ تعجب نہیں کہ یہود کو خورس کے ساتھ اس درجہ شغف کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ خورس ایسے مذہب کا پیرو تھا جو ان کے نبی دانیال اکبر یا یرمیاہ علیہ السلام کے شاگرد اور فیض یافتہ ہادی (زردشت) کی جانب منسوب ہے۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ زردشت کی تعلیم حق کو ایران زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکا اور دارا پر حملہ اسکندر کے بعد یعنی ایران کے پہلے عہد تاریخی کے ختم پر وہ بھی مسخ اور محرف کر دیا گیا۔ چنانچہ مؤرخین کا بیان ہے کہ ۴۰۰ ق م کے بعد زردشتی مذہب کا انحطاط شروع ہو گیا اور ایک جانب روم و یونان کے خارجی اثرات نے اس کو متاثر کیا اور دوسری جانب ایران کے قدیم مذہب "مجوس" نے دوبارہ سر اٹھایا اور نتیجہ یہ نکلا کہ دارا کے قتل کے بعد ہی اس کے اصل خدوخال بگڑنے لگے اور اس میں تحریف و مسخ کا سلسلہ شروع ہو گیا اور آہستہ آہستہ قدیم مجوسی مذہب کے امتزاج کے ساتھ اس نے ایک نئی شکل اختیار کر لی اور اب یہی مجوسی مذہب کے نام سے موسوم ہے۔

ایرانیوں (پارسیوں) کا اپنا بیان ہے کہ جب سکندر مقدونی نے اصطخر پر حملہ کیا تو اس نے شہر کو آگ لگا دی اور اس میں زردشت کا مقدس صحیفہ "اوستا" جل کر راکھ ہو گیا گویا بیت المقدس پر حملہ کے وقت جو معاملہ بخت نصر نے یہود کی مقدس کتاب توراۃ کے ساتھ کیا وہی سکندر نے اوستا کے ساتھ کیا اور اس طرح دونوں مذاہب کے مقدس صحیفے دنیا سے مفقود ہو گئے۔

پھر تقریباً پانچ سو سال کے بعد ایران کے تیسرے تاریخی عہد میں ساسانی حکومت کے بانی اردشیر بابکانی نے از سرِ نو "اوستا" کو مرتب کرایا پس ظاہر ہے کہ اب یہ صحیفہ اصل "اوستا" نہیں ہے بلکہ قدیم ایرانی مذہبی یونانی مذہب اور زردشتی مذہب کا ایک معجون مرکب ہے بلکہ اس کے نمایاں عقائد و اعمال بیشتر قدیم مجوسیت ہی سے ماخوذ نظر آتے ہیں تاہم اس صحیفہ کا جو ناقص اور محرف حصہ آج پارسیوں کے ہاتھ میں ہے اس میں اصل مذہب کی جھلک اب بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے جس کے بعض حوالہ جات ہم اصحاب الرس کے واقعہ میں نقل کر چکے ہیں۔

مسلمانوں نے جب خیر القرون کو فتح کیا تو ان کو ان ہی پیروان زردشت سے واسطہ پڑا جو صحیح دین زردشتی چھوڑ کر قدیم مجوسی مذہب پر واپس ہو چکے تھے اور ان میں ایک نبی اور اس کی کتاب کے تصور کے علاوہ کوئی بات زردشتی مذہب کی باقی نہیں رہی تھی اور اسی بناء پر قرآن نے بھی ان کو "مجوس" ہی کہہ کر ذکر کیا ہے، اس لیے متقدم عرب مؤرخین نے یہ سمجھ لیا کہ مجوسی مذہب اور زردشتی مذہب ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، اس کے باوجود بعض متقدم محقق اور اصحاب سیرۃ اس قدر پتہ دے سکتے ہیں کہ ایران میں دو مذاہب نے یکے بعد دیگرے اپنا اثر قائم کیا ہے۔* ایران اول صابی مذہب رکھتا تھا اور اس کے بعد اس نے زردشتی مذہب قبول کر لیا لغت عرب میں "صابی" کے معنی "بددین" کے ہیں چنانچہ قریش مکہ اسی بنا پر اپنے خیال میں مسلمانوں کو "صابی" کہا کرتے تھے۔ اس لیے "صابی" سے ان حضرات کی مراد غالباً اسی مذہب قدیم سے ہے جو آتش پرستی بت پرستی اور دیوتا پرستی پر قائم تھا۔

متاخرین علماء میں سے شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہ بھی تردد کے ساتھ المجوس کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں "مجوس آگ پوجتے ہیں اور ایک نبی کا نام بھی لیتے ہیں معلوم نہیں پیچھے بگڑے یا سرے سے غلط ہیں"۔ مگر آج عرب اور یورپ کے محققین اہل تاریخ بغیر کسی تردد کے دلائل و براہین کی روشنی میں اس حقیقت کا اعلان کرتے ہیں کہ زردشت کا مذہب ایران کے قدیم مذہب سے

---

* کیونکہ اس جدید مرکب مذہب میں بھی آتش پرستی مذہب کی بنیاد تھی اور اس کا پجاری اور مہنت اب بھی مغ ہی کہلاتا تھا اور مغ موگوش اور جوش ایک ہی شئے ہے۔

Marfat.com

جدا "دین حق" تھا جس میں مظاہر پرستی اصنام پرستی آتش پرستی سب ممنوع تھی اور خدائے واحد کی پرستش کے سواء کسی کی پرستش جائز نہیں تھی۔

چنانچہ مصر کے مشہور عالم فرج اللہ زکی نے اس قول کی پرزور تردید کی ہے۔❁ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ زردشت نے اوّل یرمیاہ علیہ السلام کی شاگردی کی مگر جب کسی بات پر یرمیاہ نبی اس سے خفا ہو گئے تو وہ ان سے جدا ہو گیا اور آتش پرستی کا ایک نیا مذہب ایجاد کر لیا ابن کثیر نے بھی اس قول کو "قیل" کہہ کر نقل کیا ہے یعنی وہ بھی اس کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے۔

ذوالقرنین اور قرآن عزیز:

ذوالقرنین کی شخصیت کے بارے میں اگرچہ دو اہم مباحث یعنی ذوالقرنین سے متعلق توراۃ کی پیشین گوئیاں اور تاریخی شہادتیں سپرد قلم ہو چکیں لیکن ابھی ایک اہم مسئلہ یہ باقی ہے کہ کیا وہ شخصیت جس کے لیے توراۃ اور تاریخ سے روایات و شہادات پیش کی گئی ہیں درحقیقت قرآن میں مذکور ذوالقرنین ہی کی شخصیت ہے تو اس کے جواب سے قبل قرآن عزیز کی ان آیات کو پیش کر دینا ضروری ہے جو سورۂ کہف میں اس واقعہ سے متعلق بیان کی گئی ہیں تاکہ بعد میں تطبیق کا مسئلہ بخوبی واضح ہو سکے۔

قرآن عزیز (سورۂ کہف) میں ذوالقرنین کا واقعہ اس طرح مذکور ہے:

﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝٨٣ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ
كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝٨٤ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۝٨٥ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّ
وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۝٨٦ قَالَ اَمَّا مَنْ
ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝٨٧ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ
جَزَآءَ ِ الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۝٨٨ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝٨٩ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ
وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝٩٠ كَذٰلِكَ ۖ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝٩١
ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝٩٢ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝٩٣
قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ
بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝٩٤ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝٩٥
اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ۖ حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ۖ حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْٓ
اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۝٩٦ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝٩٧ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ
فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۝٩٨ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ

❁ حاشیہ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۴۸

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾ (الکہف: ۸۳-۹۹)

"اے پیغمبر! تم سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں تم کہہ دو میں اس کا کچھ حال تمہیں (کلام الٰہی میں) پڑھ کر سنا دیتا ہوں ہم نے اسے زمین میں حکمرانی دی تھی نیز اس کے لیے ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا تھا تو (دیکھو) اس نے (پہلے) ایک مہم کے لیے ساز و سامان کیا (اور پچھم کی طرف نکل کھڑا ہوا) یہاں تک کہ (چلتے چلتے) سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہنچ گیا وہاں اسے سورج ایسا دکھائی دیا جیسے ایک سیاہ دلدل کی جھیل میں ڈوب جاتا ہے اور اس کے قریب ایک گروہ کو بھی آباد پایا ہم نے کہا اے ذوالقرنین (اب یہ لوگ تیرے اختیار میں ہیں تو چاہے انہیں عذاب میں ڈالے چاہے اچھا سلوک کر کے اپنا بنا لے)۔ ذوالقرنین نے کہا: "ہم ناانصاف کرنے والے نہیں جو سرکشی کرے گا اسے ضرور سزا دیں گے پھر اسے اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے وہ (بداعمالوں کو) سخت عذاب میں مبتلاء کرے گا اور جو ایمان لائے گا اور اچھے کام کرے گا تو اس کے بدلے اسے بھلائی ملے گی اور ہم اسے ایسی ہی باتوں کا حکم دیں گے جس میں اس کے لیے راحت و آسانی ہو"۔ اس کے بعد اس نے پھر تیاری کی اور (پورب) کی طرف نکلا یہاں تک کہ سورج نکلنے کی آخری حد تک پہنچ گیا اس نے دیکھا سورج ایک گروہ پر نکلتا ہے جس سے ہم نے کوئی آڑ نہیں رکھی ہے۔ معاملہ یونہی تھا اور جو کچھ ذوالقرنین کے پاس تھا اس کی ہمیں پوری خبر ہے۔ اس نے پھر ساز و سامان تیار کیا اور تیسری مہم میں نکلا، یہاں تک کہ دو پہاڑوں کی دیواروں کے درمیان پہنچ گیا، وہاں اس نے دیکھا پہاڑوں کے اس طرف ایک قوم آباد ہے جس سے بات کہی جائے تو کچھ نہیں سمجھتی، اس قوم نے (اپنی زبان میں) کہا اے ذوالقرنین یاجوج اور ماجوج اس ملک میں آ کر لوٹ مار کرتے ہیں، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک روک بنا دیں اور اس غرض سے ہم آپ کے لیے کچھ خراج مقرر کریں۔ ذوالقرنین نے کہا: میرے پروردگار نے جو کچھ میرے قبضہ میں دے رکھا ہے وہی میرے لیے بہتر ہے (تمہارے خراج کا محتاج نہیں) مگر تم اپنی قوت سے (اس کام میں میری مدد کرو میں تمہارے اور یاجوج و ماجوج کے درمیان ایک مضبوط دیوار کھڑی کر دوں گا۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا) لوہے کی سلیں میرے لیے مہیا کر دو۔ پھر جب (تمام سامان مہیا ہو گیا اور دونوں پہاڑوں کے درمیان دیوار اٹھا کر ان کے برابر بلند کر دی تو حکم دیا (بھٹیاں سلگاؤ اور اسے دھونکو پھر جب (اس قدر دھونکا گیا کہ) بالکل آگ کی طرح لال ہو گئی تو کہا گلا ہوا تانبا لاؤ اس پر انڈیل دیں چنانچہ (اس طرح) ایک ایسی سد بن گئی نہ تو (یاجوج و ماجوج) اس پر چڑھ سکتے تھے نہ اس میں سرنگ لگا سکتے تھے۔ ذوالقرنین نے (تکمیل کار کے بعد) کہا یہ جو کچھ ہوا تو (فی الحقیقت) میرے پروردگار کی مہربانی ہے جب میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات ظہور میں آئے گی تو وہ اسے ڈھا کر ریزہ ریزہ کر دے گا اور میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے ٹلنے والی نہیں اور اس دن ہم ایسا کریں گے کہ ان میں سے ایک قوم دوسری قوم پر موجوں کی طرح آ پڑیں گی اور پھونکا جائے گا نرسنگھار (صور) پس اکٹھا کریں گے ہم ان کو"۔

قرآن عزیز کی ان آیات میں ذوالقرنین کا جو واقعہ مذکور ہے اگر اس کو ان واقعات کے ساتھ تطبیق دیجیے جو گزشتہ صفحات

Marfat.com

میں توراۃ اور تاریخ قدیم کے حوالہ جات سے نقل کیے گئے ہیں تو آپ خود یہ فیصلہ دیں گے کہ تاویلات تخمینی قیاس آرائیوں اور غیر معلوم احتمالات سے محفوظ رہ کر ذوالقرنین کا اطلاق خورس کے سواء اور کسی شخصیت پر نہیں ہوتا۔

مگر اس فیصلہ کی حقیقت پر عبور حاصل کرنے کے لیے ازبس ضروری ہے کہ سورۂ کہف کی زیر مطالعہ آیات کے مطابق کا تجزیہ کر کے ان کے ساتھ خورس سے متعلق تاریخی واقعات کی مطابقت کو واضح اور روشن کر دیا جائے۔

پس ذوالقرنین کے متعلق قرآن عزیز نے کن حقائق کا اظہار کیا ہے اور خورس سے متعلق واقعات کس طرح ان حقائق کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں سطور ذیل میں ترتیب وار قابل مطالعہ ہیں۔

① قرآن عزیز کا اسلوب بیان کہتا ہے کہ اس نے ذوالقرنین کا واقعہ دوسروں کے سوال کرنے پر بیان کیا ہے اور سوال کرنے والوں نے اسی لقب کے ساتھ اس کو یاد کیا ہے۔قرآن نے اپنی جانب سے یہ لقب تجویز نہیں کیا:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ﴾ (الکھف:۸۳)

"(اے پیغمبر!) تم سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں، تم کہہ دو میں اس کا کچھ حال تمہیں (کلامِ الٰہی) میں پڑھ کر سناتا ہوں"۔

تطبیق: صحیح روایات سے یہ ثابت ہو چکا کہ یہ سوال یہودیوں کی تلقین سے قریش مکہ نے کیا تھا اور سوال میں یہ مذکور تھا کہ ایسے بادشاہ کا حال بتاؤ جو مشرق و مغرب میں پھر گیا اور جس کو توراۃ میں صرف ایک جگہ اس لقب سے یاد کیا گیا ہے اور توراۃ یہ کہتی ہے کہ دانیال علیہ السلام کے مکاشفہ میں ایران کے ایک بادشاہ کو ایسے مینڈھے کی شکل میں دکھایا گیا جس کے دو سینگ نمایاں تھے اور جبرائیل فرشتہ نے اس دو سینگوں والے مینڈھے (ذوالقرنین) کی تعبیر یہ دی کہ اس سے وہ بادشاہ مراد ہے جو فارس اور میڈیا دو بادشاہتوں کا مالک ہوگا اور یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی اور تاریخ دونوں اس پر متفق ہیں کہ ایران کا یہ بادشاہ خورس تھا جس نے فارس اور میڈیا دونوں کو ملا کر شاہنشاہی کی۔ یہودیوں کو اس سے اس لیے دلچسپی تھی کہ ان کے انبیاء علیہم السلام کے الہامات کے مطابق وہ ان کا نجات دہندہ تھا چنانچہ یہودیوں کا دیا ہوا یہ لقب ذوالقرنین خود ایران کے شاہی خاندان میں اس درجہ مشہور و مقبول ہوا کہ انہوں نے خورس کے مرنے کے بعد اس کا مجسمہ بنایا تو اس میں بھی تاریخی یادگار کے طور پر دانیال علیہ السلام کے خواب کو مصور کر کے دکھایا اور چونکہ یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں ایک جگہ اس کو عقاب بھی کہا گیا ہے:

"میں خدا ہوں اور مجھ سا کوئی نہیں جو ابتدا سے انتہاء تک احوال اور قدیم وقتوں کی باتیں جو اب تک پوری نہیں ہوئیں بتاتا ہوں اور جو کہتا ہوں میری مصلحت قائم رہے گی اور میں اپنی ساری مرضی پوری کروں گا جو عقاب کو پورب سے لاؤں گا اس شخص کو جو میرے ارادوں کو پورا کرے گا"۔ ❁

اس لیے اصطخر کے قریب خورس کا جو سنگی مجسمہ نکلا ہے اس کو اس مجموعی تخیل ہی پر بنایا گیا ہے کہ اس کے سر کے دونوں جانب دو سینگ ہیں اور سر پر ایک عقاب ہے اور خورس کے سواء دنیا کے کسی بادشاہ کے متعلق یہ تخیل موجود نہیں ہے۔

❁ باب ۴۶ آیات ۹-۱۱

Marfat.com

پس یہ دلیل ہے اس امر کی کہ یہود کو اپنے نجات دہندہ خدا کے مسیح اور خدا کے چرواہے کے ساتھ اس درجہ دلچسپی تھی کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی صداقت کا معیار اس بادشاہ کے واقعات کے علم کو قرار دیا اور اسی کے پیش نظر قرآن نے اس بادشاہ (خورس) کا مناسب حال ذکر کیا۔

② قرآن کہتا ہے کہ وہ بہت صاحب شوکت بادشاہ تھا اور خدا نے اس کو ہر قسم کے ساز و سامان حکومت سے نوازا تھا:

﴿اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝﴾ (سورۃ الکھف:۸۴)

"ہم نے اس کو حکمرانی عطاء کی اور اس کے لیے ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا تھا"۔

تطبیق: خورس (گورش) کے متعلق توراۃ اور قدیم و جدید تاریخی حوالوں سے یہ ثابت ہو چکا کہ اس نے نہ صرف ایران کی مختلف قبائلی حکومتوں کو ہی ایک شاہنشاہی میں منسلک کر دیا تھا بلکہ بابل و نینوئی کی عظیم الشان حکومتوں پر بھی قابض ہو کر اپنی جغرافیائی حیثیت میں ایسی وسیع مملکت کا مالک ہو گیا تھا کہ خدائے تعالیٰ نے اس کو تمام ساز و سامان زندگی و حکومت سے مالا مال کر دیا۔

③ قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نے تین قابل ذکر مہم سر کی ہیں۔

تطبیق: معتبر تاریخی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ خورس نے تین قابل ذکر مہم سر کیں۔

④ قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نے پہلے پچھم (مغرب) کی جانب ایک مہم سر کی:

﴿فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾ (الکھف:۸۵،۸۶)

"پس اس نے (ایک مہم کے لیے) ساز و سامان کیا اور پچھم کی جانب نکل کھڑا ہوا۔ یہاں تک کہ چلتے چلتے سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہنچا، وہاں اسے سورج ایسا دکھائی دیا جیسے ایک سیاہ دلدل میں ڈوب جاتا ہے"۔

تطبیق: یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس اور بعض دوسرے مؤرخین کے حوالے سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خورس کو سب سے پہلی اور اہم مہم کی جانب پیش آئی جب کہ لیڈیا (ایشیاء کوچک) کے بادشاہ کرڈیس کے غدارانہ طرز عمل کے خلاف اس کو لیڈیا پر حملہ کرنا پڑا یہ تمام ایران سے جانب مغرب واقع ہے اور اس کا دارالحکومت "سارڈیس" ایشیاء کوچک کے آخری مغربی ساحل کے قریب تھا۔ بقول ہیروڈوٹس خورس کی یہ مہم ایسی معجزانہ انداز میں تھی کہ وہ مغرب کی جانب فتوحات کرتا ہوا چودہ روز کے اندر ایشاء کوچک کے آخری ساحل پر جا کھڑا ہوا اور سارڈیس جیسے محکم و مضبوط شہر کو تسخیر کر لیا۔ اب اس کے سامنے سمندر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ سمرنا کے قریب بحر ایجین (Aegansea) کا یہی وہ ساحل ہے جو اپنے اندر بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے رکھنے کی وجہ سے جھیل بن گیا ہے اور اس کا پانی بہت گدلا رہتا ہے اور شام کے وقت جب سورج ڈوبتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا سیاہ دلدل میں ڈوب رہا ہے، ﴿تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾۔

⑤ قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہاں کی قوم پر ذوالقرنین کو ایسا غلبہ دے دیا تھا کہ وہ جس طرح چاہے ان کے ساتھ معاملہ کرے، چاہے ان کی بغاوت کی پاداش میں ان کو سزا دے اور چاہے تو ان کے ساتھ حسن سلوک کر کے ان کو معاف کر دے:

﴿وَ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ؕ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۝﴾ (سورۃ الکھف:۸۶)

Marfat.com

تطبیق: تاریخ حوالوں اور ہیروڈوٹس اور زینوفن کے تاریخی اقوال سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خورس (کے ارش) نے لیڈیا کو فتح کر کے عام بادشاہوں کی طرح اس کو برباد نہیں کیا بلکہ عادل، نیک اور صالح بادشاہ کی طرح عفو کا اذن عام کر دیا اور ان کو بے وطن نہیں ہونے دیا۔ بلکہ کرڈیس کی گرفتاری کے سوا یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ یہاں کوئی انقلاب حکومت ہوا ہے، البتہ کرڈیس کی جرأت مردانہ کے امتحان کے لیے اوّل اس کو چتا میں جلانے کا حکم دیا مگر جب وہ مردانہ وار چتا کے اندر بیٹھ گیا تو اس کو بھی معاف کر دیا اور اس کے ساتھ اعزاز واکرام کے ساتھ پیش آیا۔

⑥ قرآن نے ذوالقرنین کا جو مقولہ نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "مومن" بھی تھا اور عادل وصالح بھی۔ وہ کہتا ہے:

﴿قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَۨ الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۝﴾ (سورۃ الکھف:۸۷، ۸۸)

"ذوالقرنین نے کہا ہم ناانصافی کرنے والے نہیں ہیں جو سرکشی کرے گا اسے ضرور سزا دیں گے پھر اسے اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے وہ (بداعمالوں کو) سخت عذاب میں مبتلا کرے گا اور جو ایمان لائے گا اور اچھے کام کرے گا تو اس کے بدلہ میں اس کو بھلائی ملے گی اور ہم اسے ایسی ہی باتوں کا حکم دیں گے جس میں اس کے لیے آسانی وراحت ہو"۔

تطبیق: توراۃ میں خورس کا یروشلم سے متعلق فرمان اور دارا کے کتبات واعلانات مذکورہ توراۃ "اوستا" کی اندرونی شہادات اور تاریخی بیانات یہ سب شہادتیں ناقابل انکار حد تک یہ ثابت کرتی ہیں کہ خورس اور دارا مومن تھے اور وقت کے سچے دین کے پیرو بلکہ اس کے مبلغ ومناد تھے۔ وہ ابراہیم زردشت کے متبع، خدائے واحد کے پرستار اور آخرت کے قائل تھے اور ان کا دین انبیاء بنی اسرائیل ہی کی تعلیم کی ایک شاخ کی حیثیت رکھتا تھا جو دارا کے بعد بہت ہی جلد محرف ومسخ ہو کر رہ گیا۔

⑦ قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نے دوسری مہم مشرق (پورب) کی جانب سرکی اور وہ چلتے چلتے جب سورج نکلنے کی آخری حد پر پہنچا تو اس کو وہاں خانہ بدوش قبائل سے واسطہ پڑا:

﴿ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝﴾ (سورۃ الکھف:۸۹، ۹۰)

"اس کے بعد اس نے پھر تیاری کی اور پورب کی طرف نکلا یہاں تک کہ سورج نکلنے کی آخری حد تک پہنچ گیا اس نے دیکھا سورج ایک ایسے گروہ پر نکلتا ہے جس سے ہم نے کوئی آڑ نہیں رکھی ہے"۔

تطبیق: تاریخ کہتی ہے کہ خورس کی دوسری قابل ذکر مہم مشرق (پورب) کی جانب پیش آئی جب کہ مکران کے خانہ بدوش قبائل نے سرکشی کی "جو کہ اس کے دارالحکومت سے اقصائے مشرق میں پہاڑی علاقہ تک آباد تھے اور جن سے متعلق مہم کی تفصیلات گزشتہ صفحات میں بیان کی جاچکیں"۔

اس جگہ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ قرآن عزیز نے ذوالقرنین کی مغربی اور مشرقی قابل ذکر مہمات کے لیے "مغرب الشمس

اور "مطلع الشمس" کی تعبیر اختیار کی ہے اس سے بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ ذوالقرنین ساری دنیا کا بلا شرکت غیرے حکمران بن گیا تھا اور اس نے دنیا کے دونوں جانب کے آخری ربع مسکون تک اپنے قبضہ میں کرلیا تھا حالانکہ یہ تاریخی واقعات کے لحاظ سے کسی بھی بادشاہ کے لیے ثابت نہیں ہے اور نہ قرآن نے اس مقصد کے لیے یہ تعبیر اختیار کی ہے بلکہ اس کی صاف اور واضح مراد یہ ہے کہ ذوالقرنین اپنے مرکز حکومت کے لحاظ سے اقصاء مغرب اور اقصاء مشرق تک پہنچا ہے اور مغرب میں وہ اس حد تک پہنچ گیا تھا جہاں خشکی کا سلسلہ ختم ہو کر سمندر شروع ہو جاتا ہے اور مشرق میں اس حد تک پہنچا کہ وہاں خانہ بدوش قبائل کے سوا کوئی شہری آبادی نہیں تھی یہ مطلب اس درجہ واضح ہے کہ اگر بے دلیل غلط فہمی کی وجہ سے مسطورہ بالا قول منقول نہ ہوتا تو ہر شخص زبان کے محاورہ کے لحاظ سے یہی سمجھتا جو ہم نے سمجھا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہم ہندوستان میں رہتے ہوئے اقصاء مشرق اور اقصاء مغرب سے دور دراز ملک مراد لیتے ہیں جو ہمارے مشرق و مغرب میں واقع ہیں اور ان الفاظ کو اس بات میں منحصر نہیں کر دیتے کہ مشرق و مغرب کے وہ کنارے مراد ہیں جن کے بعد معمورہ عالم کا کوئی حصہ بھی باقی نہ رہا ہو البتہ دلائل یا قرائن کے ذریعہ کبھی کبھی یہ معنی بھی مراد ہو جاتے ہیں۔

اقصائے مغرب و مشرق کی اس اصطلاح کو جو قرآن نے ذوالقرنین کے سلسلہ میں بیان کی ہے اگر اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین (خورس) سے متعلق توراۃ نے چونکہ یہی تعبیر کی تھی اس لیے بہت ممکن ہے کہ قرآن نے سائلین کو اس کا واقعہ سنانے کے وقت اسی اصطلاح کو اختیار کرنا پسند کیا ہو۔ دیکھئے: یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں خورس کے حق میں بعینہ یہی تعبیر موجود ہے۔

خداوند اپنے خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے:

"میں نے اپنے بندے یعقوب اور اپنے برگزیدہ اسرائیل کے لیے تجھے تیرا نام صاف صاف لے کے بلایا۔ میں نے تجھے مہربانی سے پکارا گو کہ تو مجھے نہیں جانتا میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں میرے سواء کوئی خدا نہیں میں نے تیری کمر باندھی اگرچہ تو نے مجھے نہیں پہچانا تا کہ لوگ سورج کے نکلنے (مطلع الشمس) کی اطراف سے سورج غروب ہونے (مغرب الشمس) کی اطراف تک جائیں کہ میرے سوا کوئی نہیں میں ہی خداوند ہوں اور میرے سواء کوئی نہیں"۔ [1]

اور زکریا نبی علیہ السلام کے صحیفہ میں بنی اسرائیل کے متعلق کہا گیا ہے:

"رب الافواج فرماتا ہے کہ دیکھ میں اپنے لوگوں کو سورج کے نکلنے (مطلع الشمس) کے ملک سے سورج کے غروب ہونے (مغرب الشمس) کے ملک سے چھڑا لوں گا اور میں انہیں لاؤں گا اور وہ (بنی اسرائیل) یروشلم کے درمیان سکونت کریں گے"۔ [2]

ظاہر ہے کہ ان دونوں مقامات میں (مطلع الشمس) اور (مغرب الشمس) سے معمورہ عالم کے دونوں جانب کے آخری کنارے مراد نہیں ہیں بلکہ جن کا ذکر ہے ان کی حکومت یا مقام سکونت سے مشرقی اور مغربی جہات مراد ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین کو تیسری قابل ذکر مہم پیش آئی اور جب وہ ایسے مقام پر پہنچا جہاں دو پہاڑوں کی پھانکیں ایک درہ

---

[1] باب ۴۵ آیت ۱۰۶ [2] باب ۸ آیت ۸

بناتی تھیں تو ان کے درے اس کو ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑا جو اس کی زبان اور بولی سے ناواقف تھی، انہوں نے ذوالقرنین پر (کسی طرح) یہ واضح کیا کہ ان پہاڑوں کے درمیان سے نکل کر ہم کو یاجوج و ماجوج ستاتے اور زمین میں فساد انگیزی کرتے ہیں۔ کیا آپ ہماری اتنی مدد کریں گے کہ ہم سے مالی ٹیکس لے کر ان دو پہاڑوں کے درمیان ایک سد بنا دیں تا کہ ان کے اور ہمارے درمیان وہ حد فاصل ہو جائے در روک بن جائے۔ ذوالقرنین نے کہا میرے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے اس کی مجھے اجرت کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس کے بنانے میں میری مدد کرو۔ ان لوگوں نے ذوالقرنین کے حکم سے لوہے کے ٹکڑے جمع کیے اور ان سے ذوالقرنین نے دونوں پہاڑوں کے درمیان "سد" بنا دی اور پھر تانبا پگھلا کر اس آہنی دیوار کو مستحکم کر دیا۔

تطبیق: تاریخ کی ناقابل انکار شہادتوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ خورس کو جانب شمال میں ایک قابل ذکر مہم پیش آئی جس میں کاکیشیا (جبل توقا یا کوہ قاف) کے پہاڑی سلسلے میں ایسے دو پہاڑوں کے قریب ایک قوم ملی جن کی پھانکوں کے درمیان قدرتی درہ تھا اور پہاڑ کی دوسری جانب سے سیتھین قبائل کے جنگلی اور غیر مہذب لٹیرے دَل کے دَل آ کر اس قوم پر حملہ کرتے اور لوٹ مار کر کے درہ کے راستہ واپس ہو جایا کرتے تھے۔ خورس جب اس جگہ پہنچا تو اس آبادی کے لوگوں نے حملہ آور لٹیروں کی شکایت کرتے ہوئے اس سے پہاڑوں کے درمیان "سد" (دیوار) بنا دینے کی درخواست کی۔ خورس نے ان کی درخواست کو منظور کیا اور لوہے اور تانبے سے ملا کر ایک سد قائم کر دی جس کو وقت کے گاگ اور میگاگ غیر مہذب (سیتھین) قبائل اپنی درندگی اور خونخواری کے باوجود نہ توڑ پھوڑ سکے اور نہ اس کے اوپر سے اتر کر حملہ آور ہو سکے اور اس طرح پہاڑوں کے درّے کی آبادی ان کے حملوں سے محفوظ ہو گئی۔

اگرچہ غیر مہذب قبائل کے حملوں کے تحفظ کی خاطر دنیا کے مختلف حصوں میں ایسی متعدد چھوٹی اور بڑی سد (دیواریں) بنائی گئی ہیں لیکن ایسی سد جو لوہے اور تانبے سے مخلوط دو پہاڑوں کی پھانکوں کے درمیان بنائی گئی ہو۔ خورس کی بنائی ہوئی اس سد کے سواء جو کاکیشیا (جبل توقا) میں پائی جاتی ہے کوئی سد دنیا میں اب تک دریافت نہیں ہوئی اس لیے دلائل کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن نے ذوالقرنین کی سد کے متعلق جو تفصیلات دی ہیں اس کے پیش نظر خورس ہی ذوالقرنین ہے اور درہ داریال ہی کی سد قرآن کی تفصیلات کے مطابق ہے۔

یاجوج و ماجوج کون ہیں؟ اور سد کی حقیقت کیا ہے؟ چونکہ یہ دو زیر تحقیق مسائل ابھی بحث میں نہیں آئے اس لیے ذوالقرنین سے متعلق مطابقت قرآن کا یہ پہلو ہنوز تشنہ دلیل ہے لہٰذا سطور ذیل میں ان دونوں مسائل پر سیر حاصل بحث کی جاتی ہے تا کہ اصل حقیقت اپنے تمام پہلوؤں کے اعتبار سے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔

یاجوج و ماجوج:

ذوالقرنین کی شخصیت کو زیر بحث لانے کے بعد دوسرا مسئلہ یاجوج و ماجوج کی تعیین کا ہے۔ مفسرین اور مؤرخین اسلام نے رطب و یابس روایات کا یہ تمام ذخیرہ نقل کر دیا ہے جو اس سلسلہ میں بیان کی گئی ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ چند روایات کے علاوہ اس سلسلہ کی تمام روایات خرافات و ہفوات کا مجموعہ ہیں جو عقلاً و نقلاً کسی طرح لائق اعتماد نہیں ہیں اور اسرائیلیات کا لایعنی طومار ہیں۔

Marfat.com

ان تمام روایات میں قدر مشترک یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج ایک ایسے قبائل کا مجموعہ ہیں جو جسمانی اور معاشرتی اعتبار سے عجیب و غریب زندگی کے حامل ہیں مثلاً وہ بالشت ڈیڑھ بالشت یا زیادہ سے زیادہ ایک ذراع کا قد رکھتے ہیں اور بعض غیر معمولی طویل القامت ہیں اور ان کے دونوں کان اتنے بڑے ہیں کہ ایک اوڑھنے اور دوسرا بچھانے کے کام میں آتا ہے۔ چہرے چوڑے چکلے اور قد کے ساتھ غیر متناسب ہیں۔ ان کی غذا کے لیے قدرت سال بھر میں دو مرتبہ سمندر سے ایسی مچھلیاں نکال کر پھینک دیتی ہے جن کے سر اور دم کا فاصلہ اس قدر طویل ہوتا ہے کہ دس روز و شب اگر کوئی شخص اس پر چلتا رہے تب اس فاصلہ کو قطع کر سکتا ہے یا ایک ایسا سانپ ان کی خوراک ہے جو پہلے قرب و جوار کے تمام بری جانوروں کو ہضم کر جاتا ہے اور پھر قدرت اس کو سمندر میں پھینک دیتی ہے اور وہ وہاں میلوں تک بحری جانوروں کو چٹ کر لیتا ہے اور پھر ایک بادل آتا ہے اور فرشتہ اس عظیم الجثہ اژدھے کو اٹھا کر اس پر رکھ دیتا ہے اور بادل اس کو ان قبائل میں لے جا کر ڈال دیتا ہے اور یہ کہ یاجوج و ماجوج ایک ایسی برزخی مخلوق ہیں جو آدم علیہ السلام کے صلب سے تو ہیں مگر حوا علیہا السلام کے بطن سے نہیں ہیں۔

ان روایات کو نقل کرتے ہوئے یاقوت نے معجم البلدان میں یہ رائے ظاہر کی ہے:

و است اقطع بصحة ما اوردته لاختلاف الروایات فیه والله اعلم بصحته وعلی کل حال فلیس فی صحته امر السد ریب۔ ✽

"اور میں نے جو کچھ روایات نقل کی ہیں ان کے اختلافات کے پیش نظر میں کسی طرح ان کی صحت کو باور نہیں کر سکتا اور اس معاملہ کی اصل حقیقت کا حال خدا ہی خوب جانتا ہے اور بہر حال اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ جہاں تک سد کا معاملہ ہے اس کے صحیح ہونے میں مطلق شک کی گنجائش نہیں ہے"۔

اور حافظ عماد الدین ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں یہ ارشاد فرماتے ہیں:

ومن زعم ان یاجوج و ماجوج خُلِقُوا من نطفة ادم حین احتلم فاختلط بتراب فخلقوا من ذٰلك و انهم لیسوا من حواء فهو قول حکاه الشیخ ابو زکریا النووی فی شرح مسلم وغیره ضعفوه وهو جدیر بذٰلك اذلا دلیل علیه بل هو مخالف لما ذکرناه من ان جمیع الناس الیوم من ذریته نوح بنص القراٰن هٰکذا من زعم انهم علی اشکال مختلفة و اطوال متباینة جدًا فمنهم من هو کالنخلة اسحق و منهم من هو غایة فی القصر و منهم من نقیرش ذنًا من اذنیه یتغطی بالاخرة فکل هذا بلا دلیل و رجم بالغیب برهان والصحیح انهم من بنی ادم وعلی اشکالهم و صفاتهم۔ ✽

"اور جس شخص نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یاجوج اور ماجوج حضرت آدم علیہ السلام کے ایسے نطفہ سے پیدا ہوئے جو احتلام کی حالت میں نکلا اور مٹی میں رل مل گیا اور یہ مخلوق وجود میں آ گئی اور یہ حضرت حوا کے بطن سے نہیں ہیں تو یہ ایک قول ہے جس کو شیخ ابوزکریا نووی نے شرح مسلم میں حکایت کیا ہے اور ان کے علاوہ علماء نے اس کی تغلیظ کی ہے اور بلاشبہ یہ قول اس

✽ ج ۵ ص ۵۳ ✽ ج ۲ ص ۱۱۰

Marfat.com

قابل ہے کہ اس کو صحیح نہ سمجھا جائے اس لیے کہ یہ قطعاً بے دلیل بات ہے بلکہ اس قول کے بالکل خلاف ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ نص قرآن سے یہ ثابت ہے کہ کائنات کی موجودہ انسانی مخلوق کا ہر فرد حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے۔ اس طرح یہ قول بھی غلط اور بے دلیل ہے کہ یاجوج و ماجوج عجیب عجیب مختلف شکلوں اور متضاد قد و قامت کی مخلوق ہیں بعض ان میں سے اتنے لمبے ہیں کہ گویا کھجور کا بہت طویل درخت ہے اور بعض بہت ہی کوتاہ قامت اور بعض کے کان ایسے ہیں کہ ایک کو وہ بچھا لیتے ہیں اور دوسرے کو اوڑھتے ہیں۔ سو یہ تمام اقوال قطعاً بے دلیل اور محض اٹکل کے تیر ہیں اور صحیح بات یہ ہے کہ وہ عام بنی آدم کی طرح ہیں اور ان ہی کی طرح شکل و صورت اور جسمانی اوصاف رکھتے ہیں"۔

اور اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

و هذا قول غريب جدًا لا دليل عليه لا من عقل ولا من نقل ولا يجوز الاعتماد منها على ما يحكيه بعض اهل الكتاب لما عندهم من الاحاديث المفتعله۔ [1]

"اور یہ قول بلاشبہ ایک اچنبھا قول ہے کہ جس کے لیے نہ عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی اور بعض اہل کتاب نے جو اس سلسلہ میں حکایات بیان کی ہیں اس مقام پر کسی طرح ان پر بھروسہ کرنا درست نہیں ہے اس لیے کہ ان کے یہاں تو اس قسم کے من گھڑت قصوں کی کوئی کمی نہیں ہے"۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

وقد ذكر ابن جرير منها عن وهب بن منبه اثرًا طويلًا عجيبًا في سير ذالقرنين و نبائه السد و كيفيتها جرى له و فيه طول و غرابة و نكارة في اشكالهم و صفاتهم و طولهم و قصر بعضهم و اذانهم۔ [2]

"اور ابن جریر نے اس مقام پر وہب بن منبہ سے ذوالقرنین کی سیاحت اور سد کی تعمیر اور اس سے متعلق کیفیات کے بارہ میں ایک طویل و عجیب اثر نقل کیا ہے دراصل وہ ایک طویل اور اچنبھی داستان ہے اور اس میں ان یاجوج و ماجوج کی شکلوں صورتوں ان کے طویل و کوتاہ ہونے اور ان کے کانوں کے متعلق اجنبی اور غیر معقول باتیں ہیں"۔

اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اس عجیب و غریب قول کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

و وقع في فتاوىٰ الشيخ محي الدين ياجوج و ماجوج من اولاد آدم لا من حواء عند جماهير العلماء فيكون اخوانا لاب كذا قال و لم نر هذا عن احد من السلف الا عن كعب الاحبار و يردهٗ الحديث المرفوع انهم من ذريته نوح و نوح من ذريته حواء قطعا۔ [3]

"اور شیخ محی الدین (نووی) کے فتاویٰ میں مذکور ہے کہ یاجوج و ماجوج حضرت آدم علیہ السلام کی نسل سے تو ہیں مگر حضرت حوا علیہا السلام کے بطن سے نہیں ہیں جمہور علماء کا یہی خیال ہے اور اس طرح وہ حوا کے بطن سے بنی آدم کے علاتی بھائی ہیں مگر ہم نے کعب احبار کے علاوہ سلف میں سے کسی ایک شخص کو بھی اس کا قائل نہیں پایا اور اس قول کو وہ حدیث مرفوع قطعاً رد کرتی

---

[1] ج ۶ ص ۱۷۲ الکہف [2] ج ۶ ص ۱۷۲ [3] فتح الباری ج ۱۲ ص ۹۱

ہے جس میں یاجوج اور ماجوج کو نوح علیہ السلام کی نسل سے بتایا گیا ہے اور حضرت نوح علیہ السلام بلاشبہ حضرت حواء علیہا السلام کے بطن سے ہیں"۔

اور دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

وقد ارشاد النووی وغیرہ الی حکایۃ من زعم ان ادم فاحتلم فاختلط منیہ بتراب فتولد منہ ولد یاجوج و ماجوج من نسلہ وھو قول منکر جدا لا اصل لہ الا عن بعض اھل الکتاب۔ ❶

"اور نووی اور بعض دوسروں نے ایک ایسے شخص کی بیان کردہ حکایت کی جانب اشارہ کیا ہے جو یہ کہتا ہے کہ آدم خواب میں تھے کہ ایک مرتبہ ان کو احتلام ہو گیا اور ان کے قطرات منی مٹی میں رل مل گئے بس اس سے یاجوج اور ماجوج کی نسل مخلوق (پیدا) ہوگئی تو یہ قول ہے جو سراسر بے ہودہ اور بے اصل ہے اور بعض اہل کتاب کی حکایت کے سوائے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے"۔

اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تاریخ میں تحریر فرماتے ہیں:

ثم ھم من ذریۃ نوح لان اللہ تعالیٰ اخبر انہ استجاب بعبدہ نوح فی دعائہ علی اھل الارض بقولہ ﴿رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا﴾ وقال تعالیٰ ﴿فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ﴾ وقال ﴿وَ جَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ﴾۔ ❷

"پھر وہ (یاجوج و ماجوج) نوح علیہ السلام کی ذریت میں سے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ اطلاع دی ہے کہ اس نے اہل زمین کے متعلق نوح کی یہ دعا قبول کر لی (اے رب تو زمین پر کسی کافر کو باقی نہ چھوڑ) اور پھر حق تعالیٰ نے فرمایا (پس ہم نے اس کو اور کشتی والوں کو نجات دی) اور پھر فرمایا اور ہم نے اس کی ذریت ہی کو باقی رہنے والوں میں چھوڑا)"۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ جب کہ قرآن عزیز ان آیات میں یہ تصریح کرتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا کے بعد بنی آدم میں سے حضرت نوح علیہ السلام اور اصحاب کشتی یا دوسرے الفاظ میں حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت اور چند مسلمانوں کے علاوہ کسی کو زندہ اور باقی نہیں چھوڑا اور اب دنیاء انسانی حضرت نوح علیہ السلام ہی کی اولاد ہے تو پھر یہ کہنا کہ یاجوج اور ماجوج بنی آدم میں سے ایک مستقل مخلوق ہے اور ذریت نوح میں سے نہیں ہے قطعاً بے بنیاد اور بے اصل ہے اور اس کی تائید میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ حوا کے بطن سے نہ تھے اور اس لیے ذریت نوح میں سے بھی نہیں تھے تو طوفان نوح میں یہ مخلوق کہاں تھی اور نص قرآن کے خلاف یہ کیسے محفوظ رہی؟

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے جو منقول ہے وہ بھی اس قول کو رد کرتا ہے:

ویاجوج و ماجوج قبیلتان من ولد یافث بن نوح۔ (الحدیث) ❸

"اور عبدالرزاق نے کتاب التفسیر میں قتادہ سے نقل کیا ہے کہ یاجوج اور ماجوج دو قبیلے ہیں جو یافث بن نوح کی نسل سے ہیں"۔

❶ فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۵ ❷ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۱۰ ❸ فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۸

Marfat.com

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ یاجوج و ماجوج حضرت نوح علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور اگرچہ اس کی سند میں فی الجملہ ضعف ہے مگر اس کے مطاوع اور مؤید بعض دوسری صحیح روایات ہیں چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری کی اس مرفوع روایت کے متعلق جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے یہ خیال ظاہر کیا ہے:

والغرض منه هنا ذكر ياجوج وماجوج والاشارة الى كثرتهم و ان هذه الامة بالنسبة اليهم نحو عشر عشر العشر و انهم من ذريته ادم ردا على من قال خلاف ذلك. [1]

"امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت بیان کرنے کی غرض یہ ہے کہ یاجوج اور ماجوج کا حال بیان کیا جائے اور ان کی کثرت تعداد کی جانب اشارہ ہے اور یہ کہ امت محمدیہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے مقابلہ میں وہ ہزاروں گناہ زیادہ ہیں اور یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کی طرح نسل آدم میں شامل ہیں اس سے ان لوگوں کا رد کرنا مقصود ہے جو اس کے خلاف ان کو عام انسانی مخلوق سے جدا مانتے ہیں"۔

یہ چند نقول ہیں ان محققین کے ذخیرہ اقوال سے جو حدیث تفسیر اور علم تاریخ کی ماہر ہستیاں ہیں ان اقوال سے یہ بات قطعاً واضح اور صاف ہو جاتی ہے کہ یاجوج و ماجوج عام دنیاء انسانی کی طرح ربع مسکوں کے باشندے اور ان کی نسل بنی آدم کی عام نسل کی طرح ہے اور وہ کوئی عجوبہ روزگار مخلوق نہیں ہیں اور نہ برزخی مخلوق اور اس قسم کی جو روایات پائی جاتی ہیں ان کا اسلامی روایات سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے بلکہ اسرائیلیات کے بے سروپا ذخیرہ کا جزو ہیں اور ان تمام روایات کا سلسلہ کعب احبار پر جا کر ختم ہوتا ہے جو یہودی النسل ہونے کی وجہ سے ان قصوں کے بہت بڑے عالم تھے اور اسلام لانے کے بعد یا تو تفریح کے طور پر ان کو سنایا کرتے تھے اور یا اس لیے کہ اس رطب و یابس میں سے جو دور از کار باتیں ہوں وہ رد کر دی جائیں اور جن سے قرآن اور احادیث نبوی کی تائید ہوتی ہو ان کو ایک تاریخی حیثیت میں لے لیا جائے مگر نقل کرنے والوں نے اس حقیقت پر نظر نہ رکھتے ہوئے اس پورے طومار کو جو غرق مئے ناب اولی کا مصداق تھا اسی طرح نقل کرنا شروع کر دیا جس طرح حدیثی روایات کو نقل کیا جاتا تھا اور اگر سلف صالحین اور متاخرین میں وہ بے نظیر ہستیاں نہ پیدا ہوتیں جنہوں نے روایات و احادیث کے تمام ذخیرے کو نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر پرکھ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا تو نہ معلوم آج اسلام کو کس قدر بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

پس اس وضاحت کے بعد اب یہ دیکھنا چاہیے کہ یاجوج و ماجوج کا مصداق کون سے قبائل ہیں اور ان کی قبائل کا کائنات انسانی کے ساتھ کیا تعلق رہا ہے؟ یہ مسئلہ درحقیقت ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے اور اقوام عالم کی بہت سی قوموں پر اثر انداز ہے نیز سورۂ انبیاء کی آیت ﴿حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾ سے اس کا گہرا تعلق ہے۔

بہر حال اس سے پہلے کہ ہم اس مسئلہ پر کچھ لکھیں مقدمہ اور تمہید کے طور پر یہ معلوم ہونا چاہیے کہ انسانی آبادی کے تمام گوشوں میں جو چہل پہل اور رونق نظر آتی ہے اور ربع مسکوں جس طرح بنی آدم سے آباد ہے اور تمدن و حضارت کی نیرنگیوں سے گلزار بنا ہوا ہے، ان کی ابتداء بدوی اور صحرائی قبائل سے ہوئی ہے اور یہی قبائل صدیوں گزر جانے اور اپنے اصل مرکز سے جدا ہو جانے کے

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۸

Marfat.com

بعد تمدن و حضارت کے بانی بنتے اور متمدن قومیں شمار ہوتے رہے ہیں۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ دنیا کی قوموں کے سب سے بڑے سرچشمے کہ جہاں سے سیلاب کی طرح اُمنڈ اُمنڈ کر انسانی آبادی پھیلی اور پھلی پھولی ہے اور مختلف ملکوں اور زمین کے مختلف خطوں میں جا کر بسی ہے صرف دو ہی ایک حجاز اور دوسرا چینی ترکستان یا کاکیشیا کا وہ علاقہ جو شمال مشرق میں واقع ہے اور سطح زمین کا مرتفع اور بلند حصہ شمار ہوتا ہے۔

حجاز ان تمام اقوال وقبائل کا سرچشمہ ہے جو سامی النسل یا سمیٹک (Semetic) کہلاتی ہیں، یہ قبائل ہزاروں سال سے اس بے آب وگیاہ سرزمین سے طوفان کی طرح اٹھتے اور بگولہ کی طرح دنیا کے مختلف حصوں پر پھیلتے رہے ہیں اور بدوی اور صحرائی زندگی کے گہوارہ سے نکل کر زبردست تمدن اور عظیم الشان حضارت وشہرت کے بانی قرار پائے۔

عاد اولیٰ اور عاد ثانیہ (ثمود) اسی سرزمین سے اٹھے اور اپنی عظیم الشان صناعی اور پرسطوت حکومت وصولت کے ذریعہ صدیوں تک تمدن وحضارت کے علم بردار رہے، جدیس طسم اور اسی قسم کے دوسرے قبائل بھی جو آج امم بائدہ وہلاک شدہ کہلاتے ہیں اسی خاک کے پروردہ تھے ازواء یمن (شاہان حمیر) اور عمالقہ مصر وشام وعراق کے جلال وجبروت اور وسعت سلطنت کا یہ عالم تھا کہ ایک عرصہ تک فارس اور روم بلکہ ہندوستان کے بعض حصے بھی ان کے احکام کے محکوم اور ان کی حکومت کے باج گزار رہ چکے ہیں۔ غرض سامی النسل اقوام وقبائل خواہ بدوی اور صحرائی ہوں یا حضرمی اور متمدن شہری سب اسی خاک حجاز (عرب) کے ذرّات تھے جو اپنی وسعت کے بعد آپس میں اس قدر اجنبی ہو گئے تھے کہ بدوی اور شہری بلکہ فراعنہ مصر (عمالقہ) اور اذواء یمن (سلاطین حمیری) اور عرب مستعربہ اسماعیلی عربوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنی بھی مشکل ہو گئی تھی اور اگر نسلی امتیازات وخصوصیات اور زبان کی بنیادی یک رنگی ان کے باہم پیوند نہ لگاتی تو تاریخ کے کسی گوشہ کی بھی یہ ہمت نہ تھی کہ وہ ابھر کر ان کی اخوت باہمی کا درس دے سکتا۔

اسی طرح قبائل واقوام عام کا دوسرا اسمندر اور بحر ناپیدا کنار چینی ترکستان اور منگولیا کا وہ علاقہ رہا ہے جو شمال مشرق میں واقع ہے اور سطح زمین کا بلند اور مرتفع حصہ ہے۔

اس مقام سے بھی ہزاروں سال کے عرصہ میں سینکڑوں قبائل اٹھے اور دنیا کے مختلف گوشوں تک پہنچے اور وہاں جا کر بس گئے۔ یہیں سے انسانوں کی موجیں اٹھیں اور وسط ایشیاء میں جا گریں۔ یہیں سے یورپ پہنچیں اور یہیں سے ہندوستان اور شمال مغرب تک پھیلتی چلی گئیں۔ ہندوستان میں بس جانے والوں نے اپنا تعارف آرین کے ساتھ کرایا۔ وسط ایشیاء میں بسنے ولوں نے "ایریانہ" کہلا کر اپنے علاقہ کا نام ایران مشہور کیا۔ یورپ میں ہن گاتھ ڈانڈیال وغیرہ ان ہی قبائل کے نام پڑے اور بحر اسود سے دریا ڈینوب تک بسنے والے سیتھین کہلائے اور یورپ وایشیاء کے ایک بڑے حصہ پر چھا جانے والے رشین کے نام سے مشہور ہوئے۔

یہ قبائل جب اپنے مرکز سے چلے تھے تو صحرائی، وحشی اور بدوی تھے لیکن اپنے مرکز سے ہٹ کر جب دوسرے مقامات پر پہنچے اور حضارت وتمدن سے آشنا ہوئے یا ضرورت نے آشنا کرایا تو نئے نئے ناموں سے پکارے گئے۔ حتیٰ کہ اپنے مرکز کی ابتدائی حالت سے اس قدر بعد ہو گیا کہ مرکز میں بسنے والے وحشی قبائل اور ان کے درمیان کوئی یکسانیت باقی نہ رہی بلکہ ایک ہی اصل کی دو شاخیں ایک دوسرے کی حریف بن گئیں اور شہری اقوام کے لیے ان کے ہم نسل وحشی قبائل مستقل خطرہ ثابت ہونے لگے، جو آئے دن شہریوں پر تاخت وتاراج کرتے اور لوٹ مار کر کے پھر اپنے مرکز کی جانب واپس ہو جاتے تھے۔

Marfat.com

بہر حال تاریخ کے اوراق اس کے شاہد ہیں کہ عہد تاریخی کے قبل سے پانچویں صدی مسیح تک اس علاقہ سے جو آج کل منگولیا تاتار کہلاتا ہے اسی قسم کے انسانی طوفان اٹھتے رہے ہیں اور ان سے قریب اور ہمسایہ قوم "چینی" ان کے بڑے دو قبائل کو "موگ" اور یوچی کہتے رہے ہیں پس یہی "موگ" ہے جو تقریباً چھ سو برس قبل مسیح یونان میں میگ اور میگاگ بنا اور عربی میں ماجوج ہوا اور غالباً یہی "یواچی" یونانی میں یوگاگ اور عبرانی اور عربی میں جوج اور یاجوج کہلایا لیکن جب یہ قبائل دنیا کے مختلف حصوں میں جا کر آباد ہوئے اور بہت سے قبائل پہلے کی طرح اپنے مرکز ہی میں وحشی اور صحرائی بنے رہے تو اس اختلاف تمدن و معیشت نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ ان قبائل کے وحشی اور صحرائی جنگجو تو اسی طرح یاجوج (گاگ-Gag) اور ماجوج (میگاگ-Megag) کے نام سے موسوم رہے مگر متمدن اور شہری قبائل نے مقامی خصوصیات و امتیازات کے ساتھ ساتھ اپنے ناموں کو بھی بھلا دیا اور نئے ناموں سے شہرت پائی اور پھر یہ تقسیم اس طرح قائم ہوگئی کہ تاریخ کے عہد میں بھی اس کو باقی رکھا گیا اور وسط ایشیاء کے ایرانی ایشیائی اور یورپین روسی اور دیگر یورپین قومیں اور ہندوستان کے آرین اصل کے اعتبار سے منگولین (یعنی موگ) ماجوج اور یواگ (یاجوج) نسل ہونے کے باوجود تاریخ میں ان ناموں سے یاد نہیں کیے جاتے اور یاجوج و ماجوج کا نام صرف ان ہی قبائل کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے جو اپنی گزشتہ حالت وحشت و بربریت اور غیر متمدن زندگی میں اپنے مرکز کے اندر موجود ہیں اور مختلف صدیوں میں قتل و غارت اور لوٹ مار کرنے کے لیے اپنی ہم نسل متمدن اقوام پر حملے کرتے رہے ہیں اور ان ہی کے وحشیانہ حملوں کی حفاظت کے لیے اور مشرقی تاخت و تاراج سے بچنے کے لیے مختلف اقوام نے مختلف دیواریں اور سد قائم کیں اور ان ہی میں سے ایک وہ سد ہے جو ذوالقرنین نے ایک قوم کے کہنے پر دو پہاڑوں کے درمیان لوہے اور تانبے سے ملا کر تیار کی تاکہ وہ یاجوج اور ماجوج کے مشرقی حملوں سے محفوظ ہو جائے۔

یاجوج و ماجوج کا ذکر توراۃ میں بھی ہے، چنانچہ حزقیل علیہ السلام کے صحیفہ میں یوں کہا گیا ہے:

"اور خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد تو جوج کے مقابل جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور توبال کا سردار ہے اپنا منہ کر اور اس کے برخلاف نبوت کر اور کہہ کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار ہیں تو تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے سزا دوں گا اور تیرے جبڑوں میں بنسیاں دیکھ میں تیرا خالف ہوں اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار اور میں تجھے پلٹ دوں گا۔ ❶

"اور میں یاجوج پر اور ان پر جو جزیروں میں بے پروائی سے سکونت کرتے ہیں ایک آگ بھیجوں گا۔ ❷ اور اس دن یوں ہوگا کہ میں وہاں اسرائیل میں یاجوج کو ایک گورستان دوں گا یعنی راہ گزروں کی وادی جو سمندر کے پورب ہے اور اس کے راہ گزروں کی راہ بند ہوگی اور وہ وہاں جوج کو اور اس کی جماعت کو گاڑ دیں گے اور اسے ہامون جوج کی وادی نام رکھیں گے"۔ ❸

ان حوالوں میں یاجوج ماجوج روش مسک اور توبال کا ذکر ہے اور ان کو خدا کا مخالف بتایا گیا ہے۔ اور مظلوموں کو یہ بشارت

---

❶ حزقیل باب ۳۸ آیت ۱-۳ ❷ حزقیل باب ۳۹ آیت ۱ ❸ حزقیل باب ۳۹ آیت ۶، ایضاً باب ۳۹ آیت ۱۱

کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو پھرا دے گا اور ان کے جبڑوں میں بنسیاں مار دے گا تاکہ وہ پلٹ جائیں اور یہ کہ قیامت کے قریب ان وحشی اور ظالم قبائل کو تباہ و برباد کر دیا جائے گا اور ان کی موت سے عرصہ تک راہ گزروں کے لیے راہیں بند ہو جائیں گی۔

ان ناموں کی تفصیل میں توراۃ کے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ جوج سے مراد گاگ (Gog) ہے اور ماجوج سے میگاگ (Megog) اور روش سے روس (Russia) اور مسک سے مراد ماسکو (Moscow) اور توبال سے بحر اسود کا بالائی علاقہ مراد ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ توراۃ کی شہادت بھی اس سے اتفاق کرتی ہے کہ لفظ یاجوج اور ماجوج ان ہی قبائل کے لیے مخصوص ہو گیا تھا جو منگولیا اور کاکیشیا سے لے کر دور تک مشرق میں پھیلتے چلے گئے تھے اور یہ کہ حزقیل علیہ السلام کے زمانہ تک روس (Russia) کا علاقہ تہذیب و تمدن اور حضارت سے عاری اور وحشی قبائل کا موطن اور مسکن تھا اور قتل و غارت گری کا پیشہ کرتا تھا اور ظلم و ستم ان کا روزمرہ کا مشغلہ تھا، لہٰذا حضرت حزقیل علیہ السلام کی پیشین گوئیوں میں یہ بشارت دی گئی کہ وہ وقت قریب ہے جب کہ ان قبائل کے تاخت و تاراج کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک کے لیے بند ہو جائے گا، اس پیشین گوئی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جوج شمال کی جانب سے آئے گا اور لوٹ مار کرے اور یہ کہ ماجوج پر اور جزیروں میں بسنے والوں پر سخت تباہی آئے گی اور یہ کہ اسرائیلی بھی ماجوج کے مقابلہ میں بدلہ لیں گے۔

اب اگر تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو آپ پر یہ بخوبی واضح ہو جائے گا کہ تقریباً ایک ہزار قبل مسیح سے بحر خزر اور بحر اسود کا علاقہ وحشی اور خونخوار کا مرکز بنا ہوا ہے جو مختلف ناموں کے ساتھ موسوم ہوتے رہے ہیں بالآخر ان میں سے ایک زبردست قبیلہ نمودار ہوتا ہے جو تاریخ میں "سیتھین" کے نام سے مشہور ہے یہ وسط ایشیا سے بحر اسود کے شمالی کناروں تک پھیلا ہوا ہے اور اطراف میں مسلسل حملے کرتا رہتا اور متمدن اقوام پر تباہی لاتا رہتا ہے یہ زمانہ بابل و نینوی کے عروج اور آشوریوں کے تمدن کے آغاز کا زمانہ تھا پھر تقریباً ساڑھے چھ سو قبل مسیح میں ان کے ایک بڑے زبردست گروہ نے اپنی بلندیوں سے اتر کر ایران کا تمام مغربی حصہ تہ و بالا کر ڈالا۔

اب ۵۲۹ قبل مسیح میں سائرس (کیخسرو) کا ظہور ہوتا ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جب کہ اس کے ہاتھوں بابل کی تباہی بنی اسرائیل کی آزادی اور میڈیا و فارس کی دو سلطنتوں کی یکجا طاقت کا نظارہ سامنے آتا ہے اور ٹھیک حزقیل علیہ السلام کی پیشین گوئی کے خصوصی امتیازات اس کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور سیتھین قبائل کے مغربی حملوں سے حفاظت کے لیے اس کے ہاتھوں وہ سد تعمیر ہوتی ہے جس کا ذکر بار بار آ رہا ہے۔

بہر حال ان تمام تاریخی مصادر سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ حزقیل علیہ السلام کی پیشین گوئی کے مطابق وہ یاجوج و ماجوج جن کی حفاظت کے لیے سائرس (ذوالقرنین) نے سد تیار کی، یہی سیتھین قبائل تھے جو ابھی تک اپنی وحشیانہ خصائص و خصائل کی طرح حامل تھے جس طرح ان کے پیشرو اپنے مرکز میں رہتے ہوئے ان امتیازات کے ساتھ یاجوج و ماجوج کہلاتے رہے اور یہ دراصل ایک مزید ثبوت ہے اس دعویٰ کے لیے کہ ذوالقرنین "سائرس" (کیخسرو) ہی تھے۔

یاجوج و ماجوج کے متعلق جس قدر بحث اس وقت تک کی جا چکی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کوئی عجیب الخلقت مخلوق نہیں بلکہ دنیا انسانی کی عام آبادی کی طرح وہ بھی حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت میں سے ہیں اور یہ کہ یاجوج و ماجوج منگولیا (تاتار) کے وحشی قبائل کو کہا جاتا رہا ہے جو یورپ اور روس کی اقوام کے منبع و منشاء ہیں اور چونکہ ان کی ہمسایہ قوم ان قبائل میں سے دو بڑے

Marfat.com

قبیلوں کو موگ اور یوچی کہتی تھی اس لیے یونانیوں نے ان کی تقلید میں ان کو میگ یا میگاگ اور یوگاگ کہا اور عبرانی اور عربی میں تصرف کر کے ان کو یاجوج و ماجوج سے یاد کیا گیا۔

اب ان تاریخی حقائق کی تائید میں عرب مؤرخین اور محقق مفسرین و محدثین کی تحقیق بھی قابل مطالعہ ہے تاکہ گزشتہ سطور میں جو کچھ لکھا گیا اس کی تصویب ہو سکے۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی تاریخ میں تصریح فرماتے ہیں:

و یافث ابوالترک فیاجوج و ماجوج طائفة من الترک وھم مغلول المغلول وھم اشد بأسا و اکثر فسادًا من ھؤلاء۔ [1]

"اور یافث تاتاریوں کا نسلی باپ ہے پس یاجوج و ماجوج تاتاریوں ہی کی ایک شاخ ہیں اور یہ منگولیا کے قبائل کے منگولی ہیں اور دوسرے تاتاریوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ طاقتور اور بہت زیادہ فسادی اور لوٹ مار مچانے والے ہیں"۔

اور اپنی تفسیر میں بھی اس کی تائید فرماتے ہیں یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ قبائل یافث بن نوح کی نسل سے ہیں اور ان کا مولد وطن منگولیا کا وہی علاقہ ہے جہاں سے قوموں کے طوفان اٹھے اور اٹھ کر یورپ وغیرہ میں جا کر بسے ہیں۔

اور ابن اثیر نے کامل میں یہ تحریر فرمایا ہے:

وقد اختلف الاقوال فیھم والصحیح انھم نوع من الترک لھم شوکته و فیھم شروھم کثیرون و کانوا یفسدون فیما یجاورھم من الارض ویخربون ما قدروا علیه من البلاد یوذون من یقرب منھم۔ [2]

"یاجوج و ماجوج کے متعلق مختلف اقوال ہیں اور صحیح قول یہ ہے کہ وہ تاتاریوں ہی میں سے ایک قسم کے تاتاری ہیں اور بہت طاقتور ہیں اور ان میں شر و فساد کا مادہ بہت ہے اور وہ بہت بڑی تعداد رکھتے ہیں اور قرب و جوار کی زمین میں فساد پھیلاتے اور جس بستی پر قابو پا جاتے اس کو برباد کر ڈالتے تھے اور پڑوسیوں کو ایذاء پہنچاتے رہتے تھے"۔

اور سید محمود آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں:

ان یاجوج و ماجوج قبیلتان من ولد یافث بن نوح علیه السلام و بر جزم وھب بن منبه وغیرہ و اعتمدہ کثیر من المتاخرین۔ [3]

"یاجوج و ماجوج یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے دو قبیلے ہیں اور وہب بن منبہ اسی پر یقین رکھتے ہیں اور متاخرین میں سے اکثر کی یہی رائے ہے"۔

اور آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

وفی کلام بعضھم ان الترک منھم لما اخرجه ابن جریر و ابن مردویه من طریق السدی من اثر قوی الترک سریة من سرایا یاجوج و ماجوج۔ [4]

---

[1] البدایہ والنھایہ ج ۲ ص ۱۱۰ [2] ج ا ص ۶۸ [3] ج ۱۶ ص ۳۶ [4] ج ۱۶ ص ۳۶

"اور بعض کہتے ہیں کہ ترک (تاتاری) ان ہی میں سے ہیں جیسا کہ ابن جریر اور ابن مردویہ نے سدی سے ایک قوی اثر نقل کیا ہے کہ ترک (تاتاری) یاجوج وماجوج کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہیں"۔

وفی روایة عن عبدالرزاق عن قتادة ان یاجوج و ماجوج ثنتان وعشرون قبیلة.[1]

"اور عبدالرزاق نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ یاجوج اور ماجوج بائیس قبائل کا مجموعہ ہیں"۔

اس کے علاوہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری میں یاجوج وماجوج سے متعلق جو کچھ نقل فرمایا ہے وہ بھی نقول بالا کی ہی تائید کرتا ہے،[2] اور علامہ طنطاوی اپنی تفسیر جواہر القرآن میں لکھتے ہیں:

"یاجوج وماجوج اپنی اصل کے اعتبار سے یافث بن نوح کی اولاد میں سے ہیں اور یہ نام لفظ "اجیج النار" سے ماخوذ ہیں جس کے معنی آگ کے شعلہ اور شرارہ کے ہیں گویا ان کی شدت اور کثرت کی طرف اشارہ ہے اور بعض اہل تحقیق نے ان کی اصل پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا کہ مغلوں (منگولیوں) اور تاتاریوں کا سلسلہ نسب ایک شخص "ترک" نامی پر پہنچتا ہے اور یہی شخص ہے جس کو ابوالفداء ماجوج کہتا ہے۔

پس اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یاجوج وماجوج سے مراد منگولین اور تاتاری قبائل ہی ہیں ان قبائل کا سلسلہ ایشیاء کے شمالی کنارہ سے شروع ہو کر تبت اور چین سے ہوتا ہوا محیط منجمد شمالی تک چلا گیا ہے اور غربی جانب ترکستان کے علاقہ تک پھیلا ہوا ہے۔ فالیتہ الخلفاء اور ابن مسکویہ کی تہذیب الاخلاق اور رسائل (اخوان الصفا) ان سب نے یہی کہا ہے کہ یہی قبائل یاجوج وماجوج کہلاتے ہیں"۔[3]

اور ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں یاجوج وماجوج کے مستقر اور اس کے جغرافیائی حیثیت کو اس طرح واضح کیا ہے۔

ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں مغرب کی جانب ترکوں کے وہ قبائل آباد ہیں جن کو قفچاق اور چرکس کہا جاتا ہے اور مشرق کی [جانـ]ـب یاجوج کی آبادیاں اور ان دونوں کے درمیان کوہ قاف حد فاصل ہے جس کا ذکر گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے کہ وہ بحر محیط سے [شرو]ع ہوتا ہے جو چوتھی اقلیم کے مشرق میں واقع ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب اقلیم کے آخر تک چلا گیا ہے اور پھر بحر محیط (Atlanti[c]) سے جدا ہو کر شمال مغرب میں ہوتا ہوا یعنی مغرب کی جانب جھکتا ہوا پانچویں اقلیم کے نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے [یہا]ں سے وہ پھر اپنی پہلی سمت کو مڑ جاتا ہے حتیٰ کہ ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے اور یہاں پہنچ کر جنوب سے شمال [کی جانـ]ـب کو ہوتا ہوا گیا ہے اور اسی سلسلہ کوہ کے درمیان "سد سکندری" واقع ہے اور ساتویں اقلیم کے نویں حصہ کے وسط ہی میں وہ "سد [سکند]ری" ہے جس کا ابھی ہم ذکر کر آئے ہیں اور جس کی اطلاع قرآن نے بھی دی ہے۔

اور عبداللہ بن خرداذبہ نے اپنی جغرافیہ کی کتاب میں واثق باللہ (خلیفہ عباسی) کا وہ خواب نقل کیا ہے جس میں اس نے یہ [دیکھا] تھا کہ "سد" کھل گئی ہے چنانچہ وہ گھبرا کر اٹھا اور دریافت حال کے لیے "سلام ترجمان" کو روانہ کیا اور اس نے واپس آ کر اس[ـ]کے حالات (اوصاف) بیان کیے۔

---

[1] ...ص ۳۰۶ [2] ج ۱۳ ص ۹۰ [3] ج ۹ ص ۱۱۹

Marfat.com

اور ساتویں اقلیم کے دسویں حصہ میں ماجوج کی بستیاں ہیں جو مسلسل آخر تک چلی گئی ہیں یہ حصہ بحر محیط کے ساحل پر واقع ہے جو اس کے مشرقی شمالی حصہ کو اس طرح گھیرے ہوئے ہے شمال میں تو طول میں چلا گیا ہے اور بعض مشرقی حصہ میں عرض میں گیا ہے۔ [1]

ابن خلدون نے یاجوج و ماجوج اور سد کے متعلق اسی طرح اقلیم رابع، اقلیم خامس اور اقلیم سابع کی بحث میں بھی ضمناً بیان کیا ہے بلکہ اقلیم رابع میں یہ بھی تصریح ہے۔

وعلی قطعه من البحر المحیط هنالك هو جبل یاجوج ماجوج و هذه الامم کلها من شعوب الترك. [2]

"اور اقلیم رابع کے جزء عاشر کا ایک حصہ بحر محیط کے اوپر واقع ہے اور یہ جبل یاجوج و ماجوج ہے اور یاجوج و ماجوج تمام قبائل ترک ہیں"۔

گزشتہ بحث میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ منگولیا کا کیشیا کے یہ قبائل جب تک اپنے مرکز میں رہتے ہیں یاجوج و ماجوج کہلاتے ہیں اور جب وہاں سے نکل کر کہیں بس جاتے اور صدیوں بعد متمدن ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اس نام کو بھلا دیتے ہیں اور دوسرے بھی ان کو اس وحشیانہ امتیاز سے یاد نہیں کرتے کیونکہ پھر یہ اپنے مرکز سے اس قدر اجنبی ہو جاتے ہیں کہ مرکز کے وحشی قبائل ان کو بھی اپنا حریف بنا لیتے اور ان پر غارگری کرتے رہتے ہیں اور یہ بھی اپنے ہی ہم نسل مرکزی وحشی قبائل سے اسی طرح خوف کھانے لگتے ہیں جس طرح دوسرے قبائل چنانچہ اس مسئلہ کی تائید حافظ عماد الدین ابن کثیر کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے، تحریر فرماتے ہیں:

﴿حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ بَیْنَ السَّدَّیْنِ﴾ وهما جبلان متنا و جان بینهما ثغرة یخرج منها یاجوج و ماجوج علی بلاد الترك فیعثبون فیها فسادًا و یهلکون الحرث والنسل. [3]

"سدین سے مراد وہ دو پہاڑ ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل ہیں اور ان کے درمیان شگاف ہے اسی شگاف سے یاجوج و ماجوج ترکوں کے شہروں پر آ پڑتے اور ان میں فساد مچا دیتے اور کھیتوں اور نسلوں کو ہلاک اور برباد کر ڈالتے تھے"۔

یعنی یاجوج و ماجوج بھی اگرچہ منگولی (تاتاری) ہیں مگر پہاڑوں کے درے جو تاتاری قبائل اپنے مرکز سے ہٹ کر آباد ہو گئے تھے اور متمدن بن گئے تھے ہم نسل ہونے کے باوجود دونوں میں اس قدرت تفاوت ہو گیا کہ ایک دوسرے سے ناآشنا بلکہ حریف بن گئے اور ایک ظالم کہلائے اور دوسرے مظلوم، اور ان ہی قبائل نے ذوالقرنین سے سد بنانے کی فرمائش کی۔

اور بعض عرب مؤرخین نے تو "ترک" کی وجہ تسمیہ ہی یہ بیان کر دی کہ یہ وہ قبائل ہیں جو یاجوج و ماجوج کے ہم نسل ہونے کے باوجود سد سے ورے آباد تھے اور اس لیے جب ذوالقرنین نے سد قائم کی اور ان کو اس میں شامل نہیں کیا تو اس چھوڑ دیے جانے کی وجہ سے وہ "ترک" کہلائے۔

یہ وجہ تسمیہ اگرچہ ایک لطیفہ ہے تاہم اس امر کا ثبوت ضرور بہم پہنچاتی ہے کہ متمدن قبائل تمدن و حضارت کے بعد اپنے ہم نسل مرکزی قبائل سے اجنبی ہو جاتے تھے اور وہ یاجوج و ماجوج نہیں کہلاتے تھے اور لفظ یاجوج و ماجوج صرف ان ہی قبائل کے لیے مخصوص ہو گئے ہیں جو اپنے مرکز میں سابق کی طرح ہنوز وحشت بربریت اور درندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۹۷ بحث الاقلیم السادس یہ واضح رہے کہ جبل قوقایا کوہ قاف اور جبال کا کیشیا ایک ہے۔
[2] ایضاً ص ۱۷ [3] تفسیر ج ۳ ص ۱۰۳ جدید ایڈیشن [4] البدایہ والنہایہ ج ۲

Marfat.com

سد:

یاجوج وماجوج کے اس تعین کے بعد دوسرا مسئلہ "سد" کا سامنے آتا ہے یعنی وہ "سد" کس جگہ واقع ہے جو ذوالقرنین نے یاجوج وماجوج کے فتنہ وفساد کو روکنے کے لیے بنائی اور جس کا ذکر قرآن عزیز میں بھی کیا گیا ہے۔

تعین سد سے پہلے یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ یاجوج وماجوج کی تاخت وتاراج اور شر وفساد کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ ایک طرف کاکیشیا کے نیچے بسنے والے ان کے ظلم وستم سے نالاں تھے تو دوسری جانب تبت اور چین کے باشندے بھی ان کی شمالی دستبرد سے محفوظ نہ تھے۔ اس لیے صرف ایک ہی غرض کے لیے یعنی قبائل یاجوج وماجوج کے شر وفساد اور لوٹ مار سے بچنے کے لیے مختلف تاریخی زمانوں میں متعدد "سد" تعمیر کی گئیں۔ ان میں سے ایک "سد" وہ ہے جو دیوار چین کے نام سے مشہور ہے یہ دیوار تقریباً ایک ہزار میل طویل ہے اس دیوار کو منگولی اتکووہ کہتے ہیں اور ترکی میں اس کا نام بوقورقہ ہے۔

دوسری سد وسط ایشیا میں بخارا اور ترمز کے قریب واقع ہے اور اس کے محل وقوع کا نام دربند ہے یہ سد مشہور مغل بادشاہ تیمور لنگ کے زمانہ میں موجود تھی اور شاہ روم کے ندیم خاص سیلابرجر جرمنی نے بھی اس کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور اندلس کے بادشاہ کسٹیل کے قاصد کلاچو نے بھی اپنے سفرنامہ میں کیا ہے۔ یہ ۱۴۰۳ء میں اپنے بادشاہ کا سفیر ہو کر جب تیمور صاحب قراں کی خدمت میں حاضر ہوا ہے تو اس جگہ سے گزرا ہے وہ لکھتا ہے کہ باب الحدید کی "سد" موصل کے اس راستے پر ہے جو سمرقند اور ہندوستان کے درمیان واقع ہے۔ [1]

تیسری سد روسی علاقہ داغستان میں واقع ہے یہ بھی دربند اور باب الابواب کے نام سے مشہور ہے اور بعض مؤرخین اس کو الباب بھی لکھ دیتے ہیں یاقوت حموی نے معجم البلدان میں ادریسی نے جغرافیہ میں اور بستانی نے دائرۃ المعارف میں اس کے حالات کو بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور ان سب کا خلاصہ یہ ہے:

داغستان میں دربند ایک روسی شہر ہے یہ شہر بحر خزر (کاسپین) غربی کے کنارہ واقع ہے اس کا عرض البلد ۴۳.۳ شمالاً اور طول البلد ۴۸.۱۵ شرقاً ہے اور اس کو دربند انوشیرواں بھی کہتے ہیں اور باب الابواب کے نام سے بہت مشہور ہے اور اس کے اطراف وجوانب کو قدیم زمانہ سے چہار دیوار گھیرے ہوئے ہیں جن کو قدیم مؤرخین ابواب البانیہ کہتے آئے ہیں اور اب یہ خستہ حالت میں ہے اور اس کو باب الحدید اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی سد کی دیواروں میں لوہے کے بڑے بڑے پھاٹک لگے ہوئے تھے۔ [2]

اور جب اسی باب الابواب سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں بڑھتے ہیں تو ایک درہ ملتا ہے جو درہ داریال کے نام سے مشہور ہے اور یہ کاکیشیا کے بہت بلند حصوں سے گزرا ہے یہاں ایک چوتھی سد ہے جو قفقاز یا قوقایا جبل قاف کی سد کہلاتی ہے اور یہ سد دو پہاڑوں کے درمیان بنائی گئی ہے۔ بستانی اس کے متعلق لکھتا ہے:

اور اسی کے قریب ایک اور "سد" ہے جو غربی جانب بڑھتی چلی گئی ہے غالباً اس کو اہل فارس نے شمالی بربروں سے حفاظت کی خاطر بنایا ہوگا کیونکہ اس کے بانی کا صحیح حال نہیں معلوم ہو سکا۔ بعض نے اس کی نسبت سکندر کی جانب کر دی اور بعض نے کسریٰ و

---

[1] جواہر القرآن ج ۹ ص ۱۹۸ [2] دائرۃ المعارف ج ۷ ص ۶۵۱ ومعجم البلدان ج ۸ ص ۹

نوشیرواں کی جانب اور یاقوت کہتا ہے کہ یہ تانبا پگھلا کر اس سے تیار کی گئی ہے۔ ❶

اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں بھی "دربند" کے مقالہ میں اس آہنی دیوار کا حال قریب قریب اس کے بیان کیا گیا ہے۔ ❷

چونکہ یہ سب دیواریں شمال ہی میں بنائی گئی ہیں اور ایک ہی ضرورت کے لیے بنائی گئی ہیں اس لیے ذوالقرنین کی بنائی ہوئی سد کے تعین میں سخت اشکال پیدا ہوگیا ہے اور اسی لیے ہم مؤرخین میں اس مقام پر سخت اختلاف پاتے ہیں اور اس اختلاف نے ایک دلچسپ صورت اختیار کر لی ہے اس لیے کہ دربند کے نام سے دو مقامات کا ذکر آتا ہے اور دونوں مقامات میں سد یا دیوار بھی موجود ہے اور غرض بنا بھی ایک ہی نظر آتی ہے۔

تو اب دیوار چین کو چھوڑ کر باقی تین دیواروں کے متعلق قابل بحث یہ بات ہے کہ ذوالقرنین کی سد ان تینوں میں سے کون سی ہے اور اس سلسلہ میں جس دربند کا ذکر آتا ہے وہ کون سا ہے۔

مؤرخین عرب میں سے مسعودی، قزوینی، اصطخری، حموی سب اسی دربند کا ذکر کر رہے ہیں جو بحر خزر پر واقع ہے وہ کہتے ہیں کہ اس شہر میں داخل ہونے سے پہلے بھی دیوار ملتی ہے اور شہر کے بعد بھی دیوار ہے اگرچہ ایک دیوار چھوٹی ہے اور دوسری بڑی مگر شہر سد یا دیواروں سے گھرا ہوا ہے اور ایران کے لیے یہ مقام خاص اہمیت رکھتا ہے اور دیوار سے پرے بسنے والے قبائل کی زد سے بچاتا ہے البتہ ابوالفداء اور بعض اس سے ناقل مؤرخین کو یہ غلطی ہوگئی کہ انہوں نے بخارا اور ترمذ کے قریب دربند کو اور بحر خزر کی قریب دربند کو ایک سمجھ کر ایک کے حالات کو دوسرے کے ساتھ خلط کر دیا ہے۔؟

مگر ادریسی نے دونوں کی جغرافیائی حلات کو مفصل اور جدا جدا بیان کر کے اس خلط کو دور کیا اور اصل حقیقت کو بخوبی واضح کر دیا ہے۔

اس کے باوجود حال کے بعض اہل قلم کو اس غلطی پر اصرار ہے کہ سد ذوالقرنین یا سد سکندری کے سلسلہ میں جس سد کا ذکر آتا ہے اس سے بحر خزر یا بحر قزوین کا دربند مراد نہیں ہے بلکہ بخارا اور ترمذ کے قریب جو دربند حصار کے علاقہ میں واقع ہے وہ مراد ہے۔ ❸

بہر حال یہ مؤرخین بحر خزر اور کاکیشیا کے علاقہ دربند (باب الابواب) کی دیوار کے متعلق یہ واضح کرتے ہیں کہ قرآن عزیز میں جس سد کا ذکر ہے وہ یہی ہے مگر یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ کوئی اس کو سد سکندری کہتا ہے اور کوئی سد نوشیروانی غرض دربند کے متعلق جب بھی مؤرخین کو خلط ہو جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی محقق اس کو دور کر کے یہ ضرور واضح کر دیتا ہے کہ سد ذوالقرنین کا تعلق اس دربند سے ہے جو کاکیشیا میں بحر خزر کے کنارہ واقع ہے اس دربند سے نہیں ہے جو بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے۔

چنانچہ وہب بن منبہ فرماتے ہیں:

قرآن عزیز میں جو ﴿بَيْنَ السَّدَّيْنِ﴾ آیا ہے تو سدین سے مراد جبلین ہے یعنی دو پہاڑ کہ جن کے درمیان سد قائم کی گئی ہے پہاڑ کی یہ دونوں چوٹیاں بہت بلند ہیں اور ان کے پیچھے بھی آبادیاں ہیں اور ان کے سامنے بھی اور یہ دونوں منگولین سرزمین کے اس آخری کنارہ پر واقع ہیں جو آرمینہ اور آذربیجان کے متصل ہے۔ ❹

---

❶ دائرۃ المعارف ج ۷ ص ۶۵۲ ❷ نیا ایڈیشن ج ۷ لفظ دربند ص ۱۰۶

❸ صدق ۱۸ اگست ۴۱ء مضمون سد سکندری ❹ تفسیر البحر المحیط ابوحیان اندلسی ج ۶ ص ۱۶۳

Marfat.com

اور علامہ ہروی فرماتے ہیں:

"یہ دو پہاڑ کہ جن کے درمیان ذوالقرنین کی سد قائم ہے تاتاری قبائل کے ورے واقع ہیں (یعنی سد ان کو اس جانب آنے سے روکنے کے لیے بنائی گئی ہے)"۔

اور امام رازی تحریر فرماتے ہیں:

"زیادہ صاف بات یہ ہے کہ ان دو پہاڑوں کا جاء وقوع جانب شمال میں ہے اور (تعین میں) بعض نے کہا ہے کہ وہ دو پہاڑ آرمینہ اور آذربیجان کے درمیان واقع ہیں اور بعض نے کہا کہ تاتاری قبائل کی سرزمین کا جو آخری کنارہ ہے وہاں واقع ہیں"۔

اور طبری نے اپنی تاریخ میں بیان کیا کہ

"شاہ آذربیجان نے جب کہ وہ اس کو فتح کر چکا تھا ایک شخص کو خزر (بحر فردین) کے اطراف سے بلایا کہ وہ صاحب آذربیجان کو بالمشافہ سد کے حالات سنائے۔ اس نے بتایا کہ وہ پہاڑوں کے درمیان ایک بلند سد ہے اور اس کے ایک جانب بہت بڑی خندق ہے جو نہایت گہری ہے"۔

اور ابن خرواد نے کتاب المسالک والممالک میں بیان کیا ہے کہ

"واثق باللہ نے ایک خواب دیکھا تھا کہ گویا اس نے اس سد کو کھول ڈالا ہے اس خواب کی بنا پر اس نے اپنے بعض عمال کو اس کی تحقیق کے لیے بھیجا تاکہ وہ اس کا معائنہ کریں سو یہ لوگ باب الابواب سے آگے بڑھے اور ٹھیک سد کے مقام پر پہنچ گئے۔ انہوں نے واثق باللہ سے آکر بیان کیا کہ یہ سد لوہے کے ٹکڑوں سے بنائی گئی ہے جس میں پگھلا ہوا تانبا شامل کیا گیا ہے اور اس کا آہنی دروازہ مقفل ہے پھر جب انسان وہاں سے واپس ہوتا ہے تو راہنما اس کو ایسے چٹیل میدانوں میں پہنچاتے ہیں جو سمرقند کے محاذات میں واقع ہیں۔ ابوریحان بیرونی کہتے ہیں کہ اس تعارف کا مقتضی یہ ہوا کہ وہ زمین کے ربع شمال مغربی میں واقع ہے"۔ [1]

اور سید محمود آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں:

"یہ دو پہاڑ ارض متعین جہت شمالی میں واقع ہیں اور کتاب حزقیل علیہ السلام میں حرج کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ وہ شمال کی جانب سے آخری دنوں میں آئیں گے اس سے بھی یہی مراد ہے اور کاتب چلپی کا میلان بھی اسی جانب ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے آرمینہ اور آذربیجان کے پہاڑ مراد ہیں اور قاضی بیضاوی کی رائے بھی یہی ہے اور بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے اگرچہ اس قول کا تعاقب کیا گیا ہے اور اس کی صحت میں کلام ہے ان اقوال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اس کا مصداق باب الابواب (دربند بحر قزوین) ہے حالانکہ ان ہی مؤرخین کے نزدیک اس کا بانی کسریٰ نوشیرواں ہے"۔ [2]

---

[1] تفسیر کبیر ج ۵ ص ۵۱۳ و طبری ص ۲۵۶ [2] خلاصہ روح المعانی ج ۱۶ ص ۳۵

Marfat.com

اور ابن ہشام "ترک" کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

"ان میں سے ایک جماعت مسلمان ہوگئی تھی اس لیے جب ذوالقرنین نے آرمینیہ میں (یعنی ان پہاڑوں میں جو آرمینیہ سے آگے دور تک چلے گئے ہیں) سد بنانی شروع کی تو ان کو سد کے اس جانب چھوڑ دیا پس اس ترک کرنے پر وہ "ترک" کہلائے، ترکھم فسموا الترك كذلك"۔ ❶

اور حضرت استاد علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری (نور اللہ مرقدہٗ) عقیدۃ الاسلام میں تحریر فرماتے ہیں:

"قرآن عزیز نے ذوالقرنین کے تیسرے سفر کی جہت کا ذکر نہیں کیا اور قرینہ یہ بتاتا ہے کہ وہ شمال کی جانب تھا اور اسی جانب اس کی سد ہے جو قفقاز کے پہاڑوں کے درمیان واقع ہے اور جس غرض کے لیے ذوالقرنین نے سد بنائی تھی اسی غرض کے لیے اور بادشاہوں نے بھی سد تعمیر کی ہیں۔ مثلاً چینیوں نے دیوارِ چین بنائی جس کو منگولین انکورہ اور ترک بوقورقہ کہتے ہیں۔ صاحب ناسخ التواریخ نے اس کا مفصل ذکر کیا ہے اور اسی طرح بعض عجمی بادشاہوں نے دربند (باب الابواب) کی سد کی تعمیر کی اور اسی طرح اور سد بھی ہیں جو شمال ہی کی جانب ہیں"۔ ❷

اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں کاکیشیا کے علاقہ یا بحر قزوین کے کنارہ واقع دربند (باب الابواب) کے متعلق جو مقالہ ہے اس میں تحریر ہے۔

یہاں جو دربند ہے یزدگرد اوّل نے دوبارہ صاف کرایا اور اس کی مرمت کرائی اس دیوار کو سکندر اعظم کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔ ❸

اور دوسری جگہ بحر خزر کے متعلق تحریر ہے:

"رسالہ اخوان الصفا میں جو بحر یاجوج و ماجوج کا ذکر آیا ہے تو اس سے مراد بحر کاسپین یعنی بحر خزر ہے"۔

پس عرب مؤرخین، محدثین، مفسرین اور محققین تاریخ کے ان حوالجات سے چند امور ثابت ہوتے ہیں:

① کوئی ایک مؤرخ بھی یہ صراحت نہیں کرتا کہ دربند ضلع حصار کی سد سد سکندری ہے۔

② ابوالفداء اور بعض مؤرخین کو دربند کے متعلق یہ خلط ہوگیا ہے کہ وہ بحر قزوین والے دربند کا ذکر شروع کرتے ہیں اور پھر ترمذ و بخارا والے دربند (حصار) کے ساتھ اس کو ملا دیتے ہیں۔ اور دونوں کے درمیان امتیاز کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

③ باقی تمام محققین مؤرخین ہوں یا محدثین و مفسرین، امتیاز کے ساتھ یہ تصریح کر رہے ہیں کہ جو سد سکندری کے نام سے مشہور ہے وہ وہی ہے جو بحر قزوین کے قریب دربند (باب الابواب) میں واقع ہے۔

چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور دائرۃ المعارف بستانی میں بھی (جو کہ جدید و قدیم تحقیق کا ذخیرہ ہیں) یہی ہے حتیٰ کہ برٹانیکا جلد ۱۳ ص ۵۲۶ طبع یازدہم میں جو دربند ضلع حصار کا مختصر حال بیان کیا ہے اس میں بھی اس سد کو سد سکندری نہیں بتایا بلکہ اس کے برعکس بحر قزوین والے دربند کی سد کے متعلق یہ کہا ہے کہ اس کی نسبت سکندر کی جانب کی جاتی ہے اور اس لیے سد سکندری کے نام سے مشہور ہے۔

④ وہب بن منبہ ابوحیان اندلسی صاحب ناسخ التواریخ (جو ایران کا درباری مؤرخ ہے) بستانی اور حضرت علامہ سید محمد انور شاہ

❶ کتاب التیجان ❷ ملخص عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام ص ۱۹۸ ❸ ص ۱۱۴۲ بحث یاجوج و ماجوج

Marfat.com

صاحب رحمہ اللہ نے دربند "بحر قزوین" کے متعلق یہ توجہ دلائی ہے کہ سد ذوالقرنین اس دربند بحر قزوین میں نہیں ہے بلکہ اس سے بھی اوپر قفقاز کے آخری کنارہ پر پہاڑوں کے درمیان واقع ہے، چنانچہ مولانا ابوالکلام نے اپنی تفسیر میں اس کا درہ داریال کے نام سے ذکر کیا ہے۔

اب ان چاروں باتوں سے تھوڑی دیر کے لیے قطع نظر کر لیجئے اور اس مسئلہ میں بھی سابق کی طرح قرآن عزیز ہی کو حکم بنائیے تاکہ معاملہ واضح سے واضح تر ہو جائے۔

سد ذوالقرنین کے متعلق قرآن عزیز نے دو باتیں صاف صاف بیان کی ہیں، ایک یہ کہ وہ سد دو پہاڑوں کے درمیان تعمیر کی گئی ہے اور اس نے پہاڑوں کے درمیان اس "درہ" کو بند کر دیا ہے جہاں سے ہو کر یاجوج و ماجوج اس جانب کے بسنے والوں کو تنگ کرتے تھے:

﴿حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ [1] (ای بین الجبلین) وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ﴾ (سورۃ الکھف: ۹۳-۹۴)

"یہاں تک کہ جب ذوالقرنین دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو ان دونوں کے اس طرف ایک ایسی قوم کو پایا جن کی بات وہ پوری طرح نہیں سمجھتا تھا وہ کہنے لگے اے ذوالقرنین بلاشبہ یاجوج و ماجوج اس سرزمین میں فساد مچاتے ہیں"۔

دوسرے یہ کہ وہ سد چونے یا اینٹ گارے سے نہیں بنائی گئی ہے بلکہ لوہے کے ٹکڑوں سے تیار کی گئی ہے جس میں تانبا پگھلا ہوا شامل کیا گیا تھا:

﴿اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝ اٰتُوْنِىْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِىْۤ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۝﴾ (سورۃ الکھف: ۹۵-۹۶)

"میں تمہارے اور ان کے (یاجوج و ماجوج کے) درمیان ایک موٹی دیوار قائم کر دوں گا تم میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لا کر دو یہاں تک کہ پہاڑ کی دونوں پھانکوں (چوٹیوں) کے درمیان جب دیوار کو برابر کر دیا تو اس نے کہا کہ دھونکو یہاں تک کہ جب دھونک کر اس کو آگ کر دیا کہا لاؤ میرے پاس پگھلا ہوا تانبہ کہ اس پر ڈالوں"۔

قرآن عزیز کی بتائی ہوئی ان دونوں صفات کو سامنے رکھ کر اب ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ بغیر کسی تاویل کے ان کا مصداق کونسی سد ہو سکتی ہے اور کس سد پر یہ صفات ٹھیک صادق آتی ہیں۔

سب سے پہلے ہم اس سد پر بحث کرنا چاہتے ہیں جو دربند (حصار) میں واقع ہے۔ اس سد کے حالات ساتویں صدی کے

---

[1] ﴿السَّدَّيْنِ﴾ کی تفسیر میں امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب میں روایت کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے اس میں ہے ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے سد کو دیکھا ہی نہیں ہے جیسے یمنی چادر مثل البحر والمحبر۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو نے ضرور اس کو دیکھا ہے (قال قد رایتہ) یہ روایت بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس شخص نے لوہے تانبے سے مخلوط بنی ہوئی دیوار کو دیکھا کیونکہ "حبرہ" کے معنی اس زردی کے آتے ہیں جو دانتوں پر جمی ہوئی نظر آتی ہے اور یمنی چادریں سیاہ اور زرد یا سیاہ اور سرخ مخلوط دھاری دار ہوتی تھیں اس روایت کے موصول ہونے نہ ہونے میں کلام ہے جو فتح الباری میں قابل مراجعت ہے۔

Marfat.com

ایک چینی سیاح نے ہی نہیں بیان کیے بلکہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں شاہ رخ کے جرمنی مصاحب سیلد برجر اور ہسپانوی سفیر کلاڈچو ن نے بھی پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس کا مشاہدہ کیا ہے اور انہوں نے بھی یہ کہا ہے کہ یہاں آہنی پھاٹک لگے ہوئے ہیں مگر مؤرخین یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ یہ سد (دیوار) پتھر اور اینٹ کی بنی ہوئی ہے اور آہنی دروازوں کے علاوہ دیوار کسی جگہ بھی لوہے اور تانبے سے بنی ہوئی نہیں ہے اور لوہے کے پھاٹکوں کی وجہ سے اس کو بھی اسی طرح درہ آہنی کہتے ہیں جس طرح دربند (بحر قزوین) کو درہ آہنی کہا جاتا ہے۔

نیز یہ دیوار جس طرح پہاڑوں کے درمیان میں چلی گئی ہے اسی طرح اس کا ایک حصہ سطح زمین پر بھی بنایا گیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ وہ صرف دو پہاڑوں کی پھانکوں (چوٹیوں) کے درمیان ہی میں قائم کی گئی ہو۔ پس اِس دیوار کو سد ذوالقرنین کہنا قرآنی تصریحات کے قطعاً خلاف ہے اور غالباً اِسی وجہ سے کسی ایک مؤرخ نے بھی (جو کہ دربند) حصار اور دربند (بحر قزوین) کے درمیان امتیاز کر سکے ہیں۔ اس دیوار (سد) کو سد ذوالقرنین یا سد سکندری نہیں کہا۔

مگر تعجب ہے محترم مدیر صاحب "صدق" سے کہ انہوں نے قرآنی تصریحات کو سامنے رکھے بغیر تمام مؤرخین کے خلاف یہ دعویٰ کر دیا کہ دربند (حصار) کی دیوار (سد) ہی "سد سکندری" یعنی سد ذوالقرنین ہے۔ شاید وہ اس جدت کے لیے اس لیے مجبور ہوئے ہیں کہ ایک تو ان کا مسلک یہ ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے اور دوسرے اس جانب میں سکندر کی فتوحات کی آخری حد اسی علاقہ تک ہے جیسا کہ ۱۸ اگست ۱۹۴۱ء کے "صدق" کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے:

"سکندر اعظم اپنی تیسری فوج کشی میں اسی علاقہ تک گیا تھا"۔

ظاہر ہے کہ ان دو باتوں کی صراحت کے بعد وہ مجبور ہیں کہ دربند (حصار) کی سد ہی سد ذوالقرنین تسلیم کریں، مگر اس سے زیادہ یہ ظاہر ہے کہ اس سد پر نہ قرآن عزیز کی بیان کردہ صفات ہی کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ کوئی مؤرخ ہی اس کو سد سکندری یا سد ذوالقرنین کہتا ہے اور بالفرض اگر اس کو سکندر کی تعمیر تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی وہ سد ذوالقرنین کسی طرح نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ قرآن صفات کے مطابق نہیں ہے۔ اس کے بعد دوسرا نمبر دربند (بحر قزوین) کی دیوار (سد) کو زیر بحث لانے کا ہے، اس کے متعلق یہ تو معلوم ہو چکا کہ اس کو عرب باب الابواب الباب کہتے ہیں اور اہل فارس دربند اور درہ آہنی نام رکھتے ہیں اور اِس میں شک نہیں کہ بڑی کثرت سے مؤرخین اس دربند کی دیوار (سد) کو "سد سکندری" کہتے چلے آئے ہیں مگر محققین یہ بھی کہتے چلے آئے ہیں کہ بانی کا صحیح حال معلوم نہیں ہے، البتہ اس کو سد سکندری بھی کہہ دیتے ہیں اور کاکیشین وال (کاکیشیا کی دیوار) اور دیوار نوشیرواں بھی۔

لیکن ہم اس بحث کو مؤخر کرتے ہوئے کہ اس کے متعلق یہ اضطراب بیانی کیوں ہے اس سد کو سد ذوالقرنین جب ہی مان سکتے ہیں کہ یہ قرآن عزیز کے بیان کردہ ہر دو صفات کے مطابق پوری اترے مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اس لیے کہ اس دیوار کے عرض وطول اور اس کے حجم کی تفصیلات دیتے ہوئے تمام مؤرخین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس دیوار کا بھی بہت بڑا حصہ سطح زمین پر تعمیر کیا گیا ہے اور آگے بڑھ کر پہاڑ پر بھی بنایا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی مانتے ہیں کہ اگرچہ یہ دیوار بعض جگہ دوہری بھی ہے اور اس میں متعدد لوہے کے پھاٹک بھی ہیں جن میں سے بعض بعض پہاڑوں کے درمیان قائم ہیں اور پہاڑوں پر اس کے استحکامات بھی بہت ہیں تاہم یہ دیوار لوہے کے ٹکڑوں اور تانبے سے نہیں بنائی گئی بلکہ عام دیواروں کی طرح پتھر اور چونہ ہی سے بنائی گئی ہے۔ پس اس کا بانی کوئی

Marfat.com

شخص بھی ہو اس دیوار کو سد ذوالقرنین کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اب اس کو "سد سکندری" کہنا سو ہمیں اس سے انکار کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اگر تاریخی حقائق اس دعوے کا ساتھ دیتے مگر حیرت اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہی مؤرخین جب سکندر مقدونی کا ذکر کرتے اور اس کی وسعت فتوحات کو زیر بحث لاتے ہیں تو ان میں سے کوئی ایک بھی یہ نہیں کہتا کہ سکندر اعظم کاکیشیا تک پہنچا ہے اور بقول مولانا ابوالکلام:

"لیکن جب سکندر کے تمام فوجی اعمال خود اس کے عہد میں اور خود اس کے ساتھیوں نے قلم بند کر دیے ہیں اور ان میں کہیں بھی کاکیشیا کے استحکامات کی تعمیر کا اشارہ نہیں ملتا تو پھر کیوں کر ممکن ہے کہ اس طرح کی توجیہات قابل اطمینان تسلیم کر لی جائیں"۔ [1]

یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ سکندر اعظم کی جانب یہ انتساب صحیح ہے۔

امریکہ کے ایک مشہور جغرافیہ دان کریم (Cram) نے اپنے جغرافیہ کریمس یونیورسل ایٹلس (CramesUniversal Atlas) میں سکندر اعظم کی سلطنت ۳۸۱-۳۳۱ قیام کا جو مکمل نقشہ تیار کیا ہے اس میں بھی کاکیشیا کا علاقہ اس کی فتوحات سے سینکڑوں میل دور نظر آتا ہے۔

بہر حال اکثر مؤرخین تو اس کا بانی نوشیرواں کو بتاتے ہیں اور جوزیفس سکندر کو اس کا بانی قرار دیتے ہیں مگر بیان کردہ تاریخی حقائق کے پیش نظر نہ نوشیرواں کی نسبت صحیح ہے اور نہ سکندر اعظم کی اور اگر ان دونوں میں سے کسی کی نسبت کو بالفرض صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی اس کو سد ذوالقرنین کہنا حقائق قرآنی سے آنکھیں بند کر لینا ہوگا پس دربند (حصار ہو یا دربند بحر خزر) دونوں کی سد سد ذوالقرنین نہیں ہے۔

تیسری قابل ذکر وہ سد ہے جو دربند (قزوین) یا کاسپین وال کے مغرب جانب میں ایک درہ کو بند کرتی ہے یہ درہ بند سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں آگے بڑھتے ہوئے ملتا ہے اور درہ داریال کے نام سے مشہور ہے اور قفقاز اور تفلس کے درمیان واقع ہے، یہ درہ کاکیشیا کے بہت بلند حصوں سے ہو کر گزرا ہے اور قدرتی طور پر پہاڑ کی دو بلند چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے اس کو فارسی میں درہ آہنی اور ترکی میں دامر کپو کہتے ہیں۔

اس درہ کے متعلق گزشتہ صفحات میں امام رازی رحمہ اللہ کی تفسیر سے اس تشریح کے بعد یہ دو پہاڑ جن کے درمیان سد واقع ہے قفقاز میں ہے ہم ابن خرداد کی کتاب المسالک کا یہ حوالہ نقل کر چکے ہیں کہ واثق باللہ نے جب اپنے خواب کی تعبیر کے پیش نظر سد ذوالقرنین کی تحقیق کے لیے تحقیقاتی وفد (ریسرچ کمیشن) مقرر کیا اور اس نے باب الابواب (دربند) سے آگے چل کر جب اس کا مشاہدہ کیا ہے تو یہ تصریح کی ہے کہ یہ دیوار تمام کی تمام لوہے اور پگھلے ہوئے تانبے سے بنائی گئی ہے، اصل الفاظ یہ ہیں:

ان الواثق باللہ رأی فی المنام کانہ فتح ھٰذا الروم فبعث بعض الخدم الیہ لیعانیوہ فخرجوا من باب الابواب حتی وصلوا الیہ و شاھدوہ فوصفوا انہ بناء من لبن من حدید مشدود بالنحاس المذاب و علیہ

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۴۸

Marfat.com

باب مقفل۔ ❶

پس کہ آج کے مشاہدے سے بھی یہ ثابت ہے کہ داریال کا یہ درہ پہاڑوں کی دو چوٹیوں کے درمیان گھرا ہوا ہے اور تاریخی حقائق بھی اس کو تسلیم کرتے اور واضح کرتے ہیں۔ نیز واثق باللہ کے کمیشن نے اپنا یہ مشاہدہ بیان کیا ہے کہ یہ دیوار لوہے اور پگھلے ہوئے تانبے سے تیار کی گئی ہے بلاشبہ یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ یہی دیوار وہ "سد ذوالقرنین" ہے جس کا ذکر قرآن عزیز نے سورۂ کہف میں کیا ہے کیونکہ قرآن عزیز کے بتائے ہوئے دونوں وصف صرف اسی دیوار پر منطبق ہوتے ہیں اسی لیے وہب ابوحیان، ابن خرداد، علامہ انور شاہ اور مولانا آزاد جیسے محققین کی یہی رائے ہے کہ سد ذوالقرنین قفقاز کے اسی درہ کے سد کا نام ہے۔

ان تصریحات کے بعد اب ہم کو کہنے دیجئے کہ درہ داریال کی یہ سد سائرس (گورش یا کے خسرو) کی تعمیر کردہ ہے اور جیسا کہ ہم یاجوج و ماجوج کی بحث میں بیان کر چکے ہیں" یہ ان وحشی قبائل کے لیے اس نے بنائی تھی جو کاکیشیا کے انتہائی علاقوں سے آ کر اور اس درہ میں سے گزر کر قفقاز کے پہاڑوں کے اس طرف بسنے والوں پر لوٹ مار مچاتے تھے اور یہ وہی سیتھین قبائل تھے جو سائرس کے زمانہ میں حملہ آور ہو رہے تھے اور اس وقت کے یاجوج و ماجوج کا مصداق یہی قبائل تھے اور ان ہی کی روک تھام کی ضرورت سے سائرس نے ایک قوم کی شکایت پر یہ "سد" تیار کی اور ارمنی نوشتوں میں اس سد کا جو قدیم نام "بھاک کورائی" (کور کا درہ) لکھا چلا آتا ہے اس کور سے مراد غالباً گورش ہے جو سائرس ہی کا فارسی نام ہے۔

اور اس کے قریب دربند (بحر خزر) کی دیوار اس کے بعد اسی غرض سے کسی دوسرے بادشاہ نے بنوائی ہے اور نوشیرواں نے اپنے زمانہ میں اس کو دوبارہ صاف اور درست کرایا ہے جیسا کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے حوالہ سے ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔

اور ان تینوں دیواروں (سد) میں سے سکندر کی بنائی ہوئی کوئی ایک سد بھی نہیں ہے، اس لیے کہ سکندر کی فتوحات کی تاریخ جو کہ سامنے ہے اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سکندر کو اس غرض کے لیے کسی سد قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی ہو کیونکہ اس کی

---

❶ دربند نامہ کاظم بک ص ۲۱۔ یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ بعض معاصر بزرگ زیر بحث سد کے متعلق یہ شک ظاہر کرتے ہیں کہ یاقوت نے واثق باللہ کے تحقیقاتی وفد کی تفصیلات دیتے ہوئے یہ بیان کیا ہے کہ اس سفر کی آمد و رفت میں چھ ماہ صرف ہوئے پس اگر ذوالقرنین کی سد درہ داریال کی سد ہوتی تو بغداد سے کاکیشین (کوہ قاف) کی راہ ایسی طویل نہیں ہے کہ یہ وفد اتنی مدت میں واپس آتا۔

مگر یہ شک صرف ایک قیاسی مغالطہ ہے اس لیے کہ اول تو یاقوت حموی نے اس واقعہ کی تفصیلات کو خود ہی اہمیت نہیں دی اور ایک داستان کی طرح اس کا ذکر کر دیا ہے جیسا کہ سلام ترجمان سے منقول اس داستان کو نقل کرنے کے بعد کہتا ہے:

قد كتبت من خبر السد ما وجدته في الكتاب ولست اقطع لصحة ما اوردته لاختلاف الروايات فيه. والله اعلم بصحته.

"میں نے سد کے حالات میں ان واقعات کو لکھ دیا ہے جن کو میں نے کتابوں میں لکھا پایا اور میں نے یہ جو کچھ بھی نقل کیا ہے میں ہرگز اس پر یقین نہیں کرتا کیونکہ اس سلسلہ میں مختلف روایات ہیں جن کی صحت پر یقین نہیں کیا جا سکتا"۔ (معجم البلدان ج ۵)

دوسرے مدت سفر کی اس تصریح پر جب کچھ کہا جا سکتا تھا کہ اس کے ساتھ یہ تفصیلات بھی بیان کی جاتیں کہ ذرائع رسل و رسائل کیا تھے درمیانی مقامات میں آمد و رفت کے موقعوں پر کس قدر قیام رہا اور مقام مطلوب میں مدت قیام کیا رہی جب کہ عراق سے کاکیشین (جبل قوقایا) کی پہاڑیوں تک تقریباً آٹھ سو نو سو میل کی ایک طرفہ مسافت ہے۔

علاوہ ازیں اس واقعہ کا ذکر ابن خلدون، ابن خرداذبہ، ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ جیسے محقق مؤرخین و جغرافیہ داں بھی کرتے ہیں اور اس کے باوجود وہ یہ دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں کہ واثق باللہ کا یہ وفد اسی زیر بحث سد تک گیا ہے اور واپس ہو کر اسی کے حالات اس نے خلیفہ کو سنائے ہیں۔

Marfat.com

حکومت کے سارے دور میں یاجوج و ماجوج قبائل کا کوئی حملہ تاریخ میں موجود نہیں ہے اور نہ دربند (حصار) تک پہنچنے پر کسی قوم کا اس قسم کے وحشی قبائل سے دوچار ہونا اور سکندر سے اس کی شکایت کرنا تاریخی حقائق میں کہیں نظر آتا ہے۔

البتہ یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ آخر دربند (بحر قزوین یا بحر خزر) کی دیوار کے متعلق سد سکندری کیوں مشہور ہوا؟ سو اس مسئلہ کے تمام حقائق کو پیش نظر رکھنے کے بعد بآسانی اس کا یہ حل سمجھ میں آجاتا ہے کہ چونکہ اس مسئلہ کا تعلق یہود کی مذہبی روایات سے بہت زیادہ وابستہ ہے اور اسی لیے یہود کے سوال پر قرآن عزیز نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ تو اس بدعت اور غلط انتساب کی ابتداء بھی وہی سے ہوئی ہے اور سب سے پہلے جوزیفس نے اس کے متعلق یہ بلادلیل بیان کیا کہ یہ سد سد سکندری ہے اور وہیں سے یہ روایت چل گئی اور مؤرخین اسلام میں سے محمد بن اسحاق نے بھی چونکہ سکندر یونانی کو ذوالقرنین بتایا اس لیے مسلمانوں نے بھی اس سد کو سد سکندری کہنا شروع کر دیا اور آخر کار اس انتساب نے شہرت حاصل کر لی۔

مذکورہ بالا سد کے متعلق اگرچہ اکثر عرب مؤرخین یہی کہتے جاتے ہیں کہ وہ نوشیرواں کی بنائی ہوئی ہے مگر محققین کی رائے یہ ہے کہ اس کے بانی کا صحیح علم حاصل نہیں ہو سکا، البتہ تاریخی قیاسات سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید اس کی مرمت اور درستی نوشیرواں نے اپنے زمانہ میں کرائی ہو اور اسی وجہ سے وہ نوشیرواں کی جانب منسوب کر دی گئی ہو۔ بہرحال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس سد کو سد سکندری کہنا ایک افواہی انتساب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ نیز سکندر مقدونی جو انگریزی تاریخوں میں گریٹ الگزینڈر کہا جاتا ہے کسی طرح "ذوالقرنین" نہیں ہو سکتا اور نہ "سد ذوالقرنین" سے اس کا کوئی تعلق ہے۔

یاجوج و ماجوج کا خروج:

ذوالقرنین یاجوج و ماجوج اور سد کی بحث کے بعد سب سے زیادہ اہم مسئلہ یاجوج و ماجوج کے اس خروج کا ہے جس کا ذکر قرآن عزیز نے کیا ہے اور اس مسئلہ کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق علامات قیامت سے ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ خروج یاجوج و ماجوج کا مسئلہ کہ جس کی خبر قرآن عزیز نے بطور پیشین گوئی کے دی ہے ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ جس کو محض ظنی قیاسات سے حل کر لیا جائے اور جب کہ اس مسئلہ کا تعلق قرآن عزیز کے اخبار مغیبات سے ہے تو پھر اس کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق بھی قرآن عزیز ہی کو پہنچتا ہے نہ کہ ظن و تخمین کو۔ قرآن عزیز نے اس واقعہ کو سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء میں بیان کیا ہے اور اس مسئلہ سے متعلق جو کچھ بھی ہے وہ صرف ان دو سورتوں میں مذکور ہے۔ سورۂ کہف میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے:

﴿فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا ۝﴾ (الکہف: ۹۷، ۹۸)

"پس نہیں طاقت رکھتے وہ (یاجوج و ماجوج) اس سد پر چڑھنے کی اور نہ اس میں سوراخ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ (ذوالقرنین) نے کہا یہ میرے پروردگار کی رحمت ہے پھر جب میرے رب کا وعدہ آئے گا تو اس کو گرا کر ریزہ ریزہ کر دے گا اور میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے"۔

Marfat.com

اور سورۂ انبیاء میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ ۝ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ یٰوَیْلَنَا قَدْ كُنَّا فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِیْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۹۶، ۹۷)

"یہاں تک کہ جب کھول دیئے جائیں گے یاجوج و ماجوج اور وہ زمین کی بلندیوں سے دوڑتے ہوئے اتر آئیں گے اور خدا کا سچا وعدہ قریب آ جائے تو اس وقت اچانک ایسا ہوگا کہ جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی اور پکار اٹھیں گے ہائے کم بختی ہماری کہ ہم بے خبر رہے"۔

ان دونوں مقامات میں قرآن عزیز نے ایک تو یہ بتایا ہے کہ جس زمانہ میں ذوالقرنین نے یاجوج و ماجوج پر سد قائم کی تو اس کے استحکام کی یہ حالت تھی کہ یہ قومیں نہ اس کو پھاند کر اس جانب آ سکتی تھیں اور نہ اس میں سوراخ پیدا کر کے اس کو عبور کر سکتی تھیں اور سد کی اس مضبوطی اور پائیداری کو دیکھ کر ذوالقرنین نے خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور یہ کہا کہ یہ سب کچھ خدا کی رحمت کا کرشمہ ہے کہ اس نے مجھ سے یہ نیک خدمت کرا دی۔

اور دوسری بات یہ بیان کی ہے کہ جب قیامت کا زمانہ قریب ہوگا تو یاجوج و ماجوج بے شمار فوج در فوج نکل کر دنیا میں پھیل جائیں گے اور لوٹ مار اور تباہی و بربادی مچا دیں گے۔

ان دونوں باتوں سے عام طور پر مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ یاجوج و ماجوج سد ذوالقرنین میں اس طرح محصور ہو گئے ہیں کہ یہ سد قیامت تک اسی طرح صحیح و سالم کھڑی رہے گی اور جب یاجوج و ماجوج کے خروج کا وقت آئے گا اور وہ قیامت کے قریب اور علامات قیامت میں سے ہوگا تو اس وقت یکبارگی "سد" گر کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی اور اس لیے انہوں نے دونوں مقامات میں اسی کے مطابق آیات کی تفسیر کی ہے چنانچہ انہوں نے سورۂ انبیاء کی اس آیت ﴿حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ﴾ کا یہ ترجمہ کر کے "یہاں تک کہ جب یاجوج و ماجوج سد توڑ کر کھول دیئے جائیں گے" اس ارشادِ الٰہی کو ذوالقرنین کے اس مقولہ کے ساتھ جوڑ دیا جو کہف پ ۱۶ آیت ۹۸ میں مذکور ہے ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ﴾ "پھر میرے رب کا وعدہ آئے گا تو وہ اس کو ریزہ ریزہ کر دے گا"۔

مگر آیات کے سیاق و سباق اور ان کے مفہوم پر غائر نظر ڈالنے سے یہ تفسیر آیات قرآنی کا حق ادا نہیں کرتی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن عزیز نے سورۂ کہف میں تو صرف اسی قدر ذکر کیا ہے کہ یاجوج و ماجوج پر جب ذوالقرنین نے سد تعمیر کر دی تو اس کے استحکام کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ جب میرے خدا کا وعدہ آ جائے گا تو یہ سد ریزہ ریزہ ہو جائے گی اور خدا کا وعدہ برحق ہے اور اس کے خلاف ہونا محال و ممتنع۔

مگر اس جگہ یاجوج و ماجوج کے اس خروج کا کوئی ذکر نہیں ہے جو قیامت کے قریب وقوع میں آئے گا اور ہوتا بھی کیسے کیونکہ یہ تو ذوالقرنین کا اپنا مقولہ ہے جو سد کے مستحکم اور مضبوط ہونے کے سلسلہ میں کہا گیا ہے اور خروج یاجوج و ماجوج ان اخبار مغیبات میں سے ہے جو علامات ساعت کے طور پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے بیان کیا گیا ہے اور نبی اکرم ﷺ کے ذریعہ سے اقوام عالم کے

Marfat.com

لیے ایک تنبیہ ہے کہ خدا کی یہ زمین اپنے آخری لمحات میں ایک سخت اور ہولناک عالمگیر حادثہ سے دوچار ہونے والی ہے۔

اور سورۂ انبیاء میں صرف یہ مذکور ہے کہ قیامت کے قریب یاجوج و ماجوج کا خروج ہوگا اور وہ بہت سرعت کے ساتھ بلندیوں سے پستی کی جانب فساد بپا کرنے کے لیے اُمنڈ پڑیں گے اور اس جگہ سد کا اور سد کے ریزہ ریزہ ہو کر اس سے یاجوج و ماجوج کے نکلنے کا قطعاً کوئی تذکرہ نہیں ہے اور لفظ ﴿فُتِحَتْ﴾ سے ایسا سمجھنا محض قیاسی و تخمینی ہے جیسا کہ عنقریب واضح ہوگا۔

پس سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء دونوں میں اس واقعہ سے متعلق آیات کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہے کہ سورۂ کہف میں تو پہلے اس واقعہ کی تفصیلات سنائی گئی ہیں جن کے متعلق یہود نے نبی اکرم ﷺ سے براہِ راست خود یا مشرکین مکہ کے واسطہ سے سوال کیا تھا کہ ذوالقرنین کی شخصیت کے متعلق اگر کوئی علم رکھتے ہو تو اس کو ظاہر کرو۔ قرآن عزیز یعنی وحی الٰہی نے ان کو بتایا کہ ذوالقرنین ایک نیک اور صالح بادشاہ تھا اس نے تین مہمیں قابل ذکر سر کیں ایک مشرق اقصیٰ کی اور دوسری مغرب اقصیٰ کی اور تیسری شمال کی جانب اور اس تیسری مہم میں اس کو ایک ایسی قوم سے سابقہ ہوا جس نے یاجوج و ماجوج کی تباہ کاریوں کا شکوہ کرتے ہوئے اپنے اور ان کے درمیان سد قائم کر دینے کا مطالبہ کیا۔ ذوالقرنین نے ان کے مطالبہ کو اس طرح پورا کیا کہ اس جانب وہ جس درہ سے نکل کر حملہ آور ہوا کرتے تھے اس کو لوہے کی تختیوں اور پگھلے ہوئے تانبے سے بند کر دیا اور دو پہاڑوں کے درمیان درہ پر ایک بہترین سد قائم کر دی اور ساتھ ہی شکر خدا بجالاتے ہوئے اس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ یہ سد اس قدر مستحکم اور مضبوط ہے کہ اب یاجوج و ماجوج نہ اس میں سوراخ کر سکیں گے اور نہ اس پر چڑھ کر ادھر آ سکیں گے لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ سد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی طرح رہے گی بلکہ خدا کو جب تک منظور ہے یہ اسی طرح قائم ہے اور جب وہ چاہے گا کہ یہ روک باقی نہ رہے تو یہ ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور خدا کا وعدہ "یعنی ہر شے کی طرح سد کا بھی فنا ہو جانا" پورا ہو کر رہے گا۔

یہود نے چونکہ صرف ذوالقرنین کے متعلق سوال کیا تھا اس لیے سورۂ کہف میں اس کے متعلق تفصیل سے بتایا گیا اور یاجوج و ماجوج کا محض ضمنی تذکرہ آ گیا اور سورۂ انبیاء میں اللہ تعالیٰ مشرکین کا رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو بستیاں ہلاک کر دی گئیں اب ان کے باشندے دنیا میں زندہ نہیں واپس آئیں گے ہاں جب قیامت آ جائے گی "اور وہ جب آئے گی کہ اس سے پہلے یاجوج و ماجوج کا فتنہ پیش آئے گا" تب البتہ میدانِ حشر میں سب دوبارہ زندہ کر کے رب العالمین کے سامنے جواب دہ ہونے کے لیے جمع کیے جائیں گے۔

پھر چونکہ اس جگہ یاجوج و ماجوج کے خروج کو قیامت کی علامات بیان کر کے اہمیت دی گئی ہے اس لیے اس کے نکلنے کو سد کے ٹوٹنے اور ریزہ ریزہ ہونے کے ساتھ مقید نہیں کیا بلکہ سرے سے سد کا ذکر ہی نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ جب اس کے خروج موعود کا وقت آ جائے گا تو سرعت کے ساتھ بلندیوں سے پستی کی جانب امنڈ پڑیں گے اور تمام اقطاع و امصار میں پھیل جائیں گے۔

پس ان مجموعہ آیات سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ "سد ذوالقرنین" یاجوج و ماجوج کے خروج سے پہلے ضرور ٹوٹ پھوٹ چکی ہوگی دوسرے یہ کہ یاجوج و ماجوج کے موعود خروج کا وہ وقت ہوگا کہ قیامت کا وقت بالکل قریب ہو جائے اور اس کے بعد نفخ صور ہی کا مرحلہ باقی رہ جائے اس وقت یاجوج و ماجوج کے تمام قبائل بے پناہ سیلاب کی طرح امنڈ پڑیں گے اور تمام کائنات میں فساد عظیم برپا کریں گے۔

Marfat.com

بہر حال ذوالقرنین کے مقولہ ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ﴾ میں وعدے سے یاجوج و ماجوج کا خروج موعود مراد نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ بلاشبہ سد کا انداکاک ہو جائے گا اور وہ ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور سورہ انبیاء میں خدائے تعالیٰ کے ارشاد ﴿فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ﴾ میں فتح سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ سد توڑ کر نکل آئیں گے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اس کثرت سے فوج در فوج نکل پڑیں گے گویا کہیں بند تھے اور آج کھول دیئے گئے ہیں۔

چنانچہ اہل عرب لفظ "فتح" کو جب جاندار اشیاء کے لیے استعمال کرتے ہیں تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ یہ کسی گوشہ میں الگ تھلگ پڑی ہوئی تھی اور اب اچانک نکل پڑی، اس لیے جب کوئی شخص کہتا ہے "فتح الجراد" تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ٹڈیاں کسی جگہ بند تھیں اور اب ان کو کھول دیا گیا بلکہ یہ معنی مراد ہوتے ہیں کہ ٹڈی دل کسی پہاڑی گوشہ میں الگ پڑا تھا کہ اب اچانک فوج در فوج باہر نکل پڑا۔

پس یہاں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ یاجوج و ماجوج جیسے عظیم الشان قبائل جو عرصہ سے بایں کثرت وازدحام دنیا کے ایک الگ گوشہ میں پڑے ہوئے تھے اس دن اس طرح امنڈ آئیں گے کہ گویا بند تھے اور اب اچانک کھول دیئے گئے۔

سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء کی زیر بحث آیات کی تفسیر راس المحدثین حضرت استاد علامہ سید محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے بھی عقیدۃ الاسلام میں یہی فرمائی ہے اور بلاشبہ یہ تفسیر بغیر کسی تاویل کے صحیح اور درست ہے اور اس سلسلہ کے بہت سے خدشات کو دور کرنے کے لیے مفید۔

حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

وینبغی ان یعلم ان قول ذی القرنین ﴿هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا﴾ قول من جانبه لاقرايته على جعله منه من اشراط الساعة ولعله لاعلم له بذالك وانما اراد وعدا انه كائنه فان قوله تعالىٰ بعد ذٰلك ﴿وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ یَوْمَىٕذٍ یَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ﴾ لاستمرار التجددی نعم قوله تعالىٰ ﴿حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ﴾ هو من اشراط الساعة لكن ليس فيه للردم ذكر فاعلم الفرق. (ص ۲۰۱)

"اور یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ ذوالقرنین کا یہ قول ﴿هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ﴾ اس کا اپنا قول ہے اور کوئی قرینہ سیاق و سباق میں ایسا موجود نہیں ہے جس سے سد کے ریزہ ریزہ ہونے کے واقعہ کو علامات قیامت میں سے شمار کیا جائے اور شاید ذوالقرنین کو یہ علم بھی نہ ہو کہ اشراط ساعت میں سے خروج یاجوج و ماجوج بھی ہے اور اس نے ﴿وَعْدُ رَبِّیْ﴾ سے صرف اس کا کسی وقت میں ٹوٹ پھوٹ جانا مراد لیا ہو پس اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد "ہم نے کر چھوڑا ان کو اس دن سے اس حالت میں کہ بعض بعض پر امنڈ رہی ہیں" استمرار تجددی پر دلالت کرتا ہے یعنی برابر ایسا ہوتا رہے گا کہ ان میں سے بعض قبائل بعض پر حملہ آور ہوتے رہیں گے حتیٰ کہ خروج موعود کا وقت آ جائے ہاں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد جو سورۂ انبیاء میں ہے ﴿حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ﴾ تو البتہ یہ بلاشبہ علامات قیامت میں سے ہے لیکن اس میں سد کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ہے پس اس

Marfat.com

فرق کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے"۔

اور پھر اس کو تفصیل کے ساتھ بیان فرماتے ہوئے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں:

واعلم ان ما ذکرته لیس تاویلا فی القرآن بل زیادة شئ من التاریخ والتجربة بدون احواج لفظة من موضوعه. (۲۰۳)

"اور یہ یاد رہے کہ میں نے ان آیات کی تفسیر میں جو کچھ کہا وہ قرآن میں تاویل نہیں ہے بلکہ قرآن عزیز کے کسی لفظ کو اس کے اپنے موضوع سے نکالے بغیر تاریخ اور تجربہ کے پیش نظر مزید اظہار حال ہے"۔

عام مفسرین نے بیان کردہ تفسیر سے الگ سورۂ کہف اور انبیاء دونوں کی آیات متعلقہ کے واقعات کو اشراط ساعت میں شمار کرتے ہوئے جو تفسیر فرمائی ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے ترمذی اور مسند احمد کی ایک مرفوع حدیث ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور جس کا ترجمہ یہ ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یاجوج و ماجوج روزانہ ذوالقرنین کی سد کو کھودتے رہتے ہیں اور جب سورج نکلنے کا وقت قریب ہو جاتا ہے تو آپس میں کہتے ہیں کہ اب کام ختم کرو اب یہ اس قابل ہوگئی ہے کہ کل تم اس کو کھود کر گرا سکو گے مگر جب وہ اگلے روز پھر اس کام پر واپس آتے ہیں تو سد کو اصلی حالت سے بھی زیادہ مضبوط اور مستحکم پاتے ہیں۔ یہ اسی طرح ہوتا رہتا ہے مگر جب ان کی معین مدت کا وقت پورا ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوگا کہ اب وہ انسانی دنیا پر چھا جائیں تو اس روز بھی سابق کی طرح اس کو کھودیں گے اور جب سورج نکلنے کا وقت قریب ہوگا تو کام لینے والے کام کرنے والوں سے کہیں گے اب واپس جاؤ کل انشاء اللہ اس کو کھود کر برابر کریں گے اور آج چونکہ انشاء اللہ کہہ دیا اس لیے جب واپس آئیں گے تو اپنی محنت کو درست پائیں گے اور اس وقت وہ باقی محنت کر کے سد کو گرا دیں گے اور لوگوں پر نکل پڑیں گے اور تمام روئے زمین کا پانی پی جائیں گے اور لوگ ان کے خوف سے قلعوں اور پناہ گاہوں میں چھپ جائیں گے پھر وہ دنیا کو مغلوب سمجھ کر آسمان پر تیر پھینکیں گے کہ خدا اور عالم بالا سے جنگ کر کے اس کو بھی مغلوب کریں، اللہ تعالیٰ ان کے تیروں کو خون آلود کر کے واپس کرے گا تو وہ سمجھیں گے کہ ہم عالم بالا پر بھی غالب آ گئے پھر اللہ تعالیٰ ان کی گردن میں گلٹیاں پیدا کر دے گا جس سے وہ خود بخود مر جائیں گے"۔

مگر ترمذی نے اس حدیث کو بیان کر کے حدیث کی حیثیت پر یہ حکم لگایا ہے کہ

ھٰذا حدیث حسن غریب انما نعرف من ھٰذا الوجه مثل ھٰذا۔ (ترمذی سورۂ کہف)

"یہ حدیث حسن غریب ہے اور اسی طریقہ سند سے ایسی ہی عجیب باتیں ہم جانا کرتے ہیں"۔

یعنی ان کے نزدیک یہ روایت اپنے اعتبار سے منکر اور اچنبھی روایت ہے اور حافظ عماد الدین ابن کثیر اس روایت کو نقل کر کے اس پر یہ حکم لگاتے ہیں:

اس حدیث میں مضمون کے لحاظ سے نکارت (اچنبھا) ہے اور اس کو مرفوع کہنا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرنا غلط ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ٹھیک اسی قسم کی ایک اسرائیلی کہانی کعب احبار سے منقول ہے اور اس میں بھی یہ سب باتیں اسی طرح مذکور ہیں

Marfat.com

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے جو اکثر کعب احبار سے اسرائیلی قصے سنا کرتے تھے اس کو ایک اسرائیلی کہانی کے طور پر بیان کیا ہوگا جس کو نیچے کے راوی نے یہ سمجھا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، درحقیقت یہ راوی کا وہم ہے اور کچھ نہیں ہے۔

اس حدیث کے متعلق میں نے یہ جو کچھ کہا ہے میرا اپنا خیال ہی نہیں ہے بلکہ امام حدیث احمد بن حنبل رحمہ اللہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ ❶

ترمذی، ابن کثیر اور امام احمد رحمہم اللہ کی ان تصریحات کے بعد اس روایت کی حیثیت ایک اسرائیلی قصہ سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ لہٰذا مفسرین کا محض اس روایت کی بناء پر سورۂ کہف کی زیر بحث آیات کی یہ تفسیر کرنا کہ سد ذوالقرنین ٹھیک اس وقت ریزہ ریزہ ہوگی جب کہ اشراط ساعت میں سے موعود خروج یاجوج وماجوج پیش آئے گا، صحیح نہیں ہے۔

اور اگر ان کی تفسیر کا یہ حصہ صحیح مان لیا جائے تو پھر بھی وہ مذکورہ بالا روایت کے تسلیم کر لینے کے بعد قرآن عزیز کی آیت کے تعارض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ قرآن عزیز (کہف) میں سد کے متعلق ذوالقرنین کا یہ مقولہ نقل کیا گیا ہے:

﴿فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴾ (الکہف:۹۷)

اور اس کا مطلب تمام مفسرین نے بالاتفاق یہ بیان کیا ہے کہ یاجوج وماجوج اس سد میں کسی قسم کے ردوبدل پر قادر نہیں ہے، چنانچہ امام احمد اور ابن کثیر رحمہما اللہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

انهم لم یتمکنوا من نقبه ولا نقب شئ منه.

"بلاشبہ اب یعنی بناء سد کے وقت یاجوج وماجوج اس میں سوراخ کرنے یا کسی حصہ کو بھی کھودنے پر قادر نہیں رہے"۔

تو اب مفسرین اس روایت کے ان جملوں کے تعارض کو کس طرح دور فرمائیں گے جن میں یہ صراحت ہے کہ وہ اس کو کھود کر یا چاٹ کر گرنے کے قریب کر دیتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ صحیح حدیث کے تعارض کو کس طرح دور کر دیں گے جن کو امام بخاری رحمہ اللہ نے بسند صحیح روایت کیا ہے۔

ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خواب راحت سے بیدار ہوئے تو یہ حالت تھی کہ چہرۂ مبارک سرخ تھا اور یہ ارشاد فرما رہے تھے:

لا اله الا الله ویل للعرب من شر قد اقترب فتح الیوم من ردم یاجوج وماجوج مثل هذا وحلق قلت یا رسول الله صلی الله علیه وسلم انهلك وفینا الصالحون قال نعم اذا کثر الخبث.

"لا الہ الا اللہ، عرب کے لیے ہلاکت ہے اس شر سے جو قریب آ رہا ہے، آج یاجوج وماجوج پر قائم شدہ سد اس طرح کھول دی گئی ہے اور انگوٹھے پر انگلی رکھ کر اور گول حلقہ بنا کر دکھایا۔ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم ایسی حالت میں ہلاک ہو جائیں گے جب کہ ہم میں صالحین امت بھی موجود ہوں گے؟ ارشاد فرمایا: بے شک ایسا ہوگا اگر امت میں خبائث کی کثرت ہو جائے گی"۔ ❷ ❸

---

❶ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۱۰۵ ❷ البدایہ والنھایہ ج ۲ ص ۱۱۲۔ ❸ بخاری ومسلم عن الزہری۔ باب الفتن

Marfat.com

اس روایت میں یہ تصریح ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "سد" میں حلقہ انگشت کی مقدار سوراخ ہو گیا ہے اور مفسرین کی اس تفسیر کے مطابق قیامت کے موعود وقت سے قبل یہ ناممکن ہے۔

پس اگر یہ کہا جائے کہ اس صحیح بلکہ اصح روایت حدیثی میں "فتح" سے مراد شر اور فتنوں کا شیوع ہے اور اس کو استعارہ کے طور پر فتح روم کہہ دیا گیا تو سورۂ انبیاء کی آیت میں ﴿فُتِحَتْ﴾ کے معنی میں یہ اصرار کیوں ہے کہ اس سے سد ٹوٹ کر کھلنا مراد ہے؟ حالانکہ اس جگہ روم یا سد کا تذکرہ تک نہیں اور کیوں نہ اس سے بھی استعارہ مراد لیا جائے اور کیوں وہ تفسیر نہ کی جائے جو ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔

اور اگر حدیث میں حقیقی نقب کا ذکر ہے تو یہ سورۂ کہف کی اس تفسیر کے خلاف اور معارض ہے جو مفسرین نے عام طور پر بیان کی ہے کہ سد کا یہ استحکام قیامت کے موعود وقت تک یوں ہی رہے گا اور سد کا اس سے قبل ٹوٹنا پھوٹنا ناممکن ہے۔

لیکن عام تفسیر کے برعکس اگر حضرت شاہ صاحب کی تفسیر کے مطابق ان دونوں مقامات کی تفسیر کی جائے کہ جس کی فی الجملہ تائید امام احمد اور محدث ابن کثیر رحمہ اللہ کے اقوال سے بھی ہوتی ہے تو یہ سب مشکلات خود بخود دور ہو جاتی ہیں اور آیات کا مطلب اور حدیث کا مقصد بآسانی سمجھ میں آ جاتا ہے، چنانچہ ابن کثیر آیت ﴿وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ای فی ذالك الزمان لان هٰذه صيغة خبر ماض فلا ينفي وقوعة فيما يتقبل باذن الله لهم في ذالك قدرًا وتليطهم عليه بالتدريج قليلًا قليلًا حتى يتم الاجل وينقضي الامر المقدور فيخرجون كما قال الله تعالىٰ ﴿وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾ (الانبیاء: ۹۶)۔ [1]

"یعنی وہ (یاجوج و ماجوج) اس زمانہ میں سد کے متعلق ہر قسم کے ردوبدل سے بے بس ہو گئے ہیں اس لیے کہ استطاعوا کا صیغہ زمانہ ماضی کی اطلاع کے لیے وضع کیا گیا ہے پس اس آیت میں اس بات کی ہرگز نفی نہیں نکلتی کہ زمانہ مستقبل میں اللہ تعالیٰ ان کو اس پر قدرت دے دے کہ وہ آہستہ آہستہ اور تدریجی طور پر اس سد کو توڑ پھوڑ ڈالیں تا کہ وہ وقت موعود آ پہنچے جس کی خبر سورۂ انبیاء میں دی گئی ہے اور امر مقدور پورا ہو جائے اور تب وہ یک لخت یلغار کر کے اس طرح نکل پڑیں گے جس طرح سورۂ انبیاء کی اس آیت میں خبر دی گئی ہے ﴿وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾۔"

غرض اس عبارت کا مفہوم بھی وہی ہے جو حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے منقول ہو چکا ہے اور بغیر کسی تاویل کے آیت ﴿مَا اسْتَطَاعُوا.... الآیۃ﴾ کا صاف طور پر یہی مطلب متعین ہو جاتا ہے کہ یہ ذوالقرنین کے زمانہ کی کیفیت خود ان ہی کی زبانی ہو رہی ہے، یہ مطلب کسی طرح بھی نہیں ہے کہ ذوالقرنین کی سد یاجوج و ماجوج کے خروج موعود سے پہلے ٹوٹ ہی نہیں سکتی۔

اور یہ مطلب ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ یاجوج و ماجوج صرف ایک اس درہ سے ہی نکل کر غارت گری نہیں کرتے تھے بلکہ دنیا کے اس کونہ سے چین کے علاقہ منچوریا تک ان کے خروج کے بہت سے مقامات تھے پس اگر ان کے لیے سد ذوالقرنین نے درہ کی راہ ہمیشہ کے لیے مسدود کر دی تھی تو دوسرے مقامات سے ان کا خروج کیوں نہیں ہو سکتا تھا؟

---

[1] البدایہ والنھایہ ج ۲ ص ۱۱۲

Marfat.com

اسی لیے حضرت شاہ صاحب نے آیت ﴿وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ﴾ (الکہف:۹۹) کی تفسیر یہ کی ہے کہ ذوالقرنین کے اس واقعہ میں چونکہ یاجوج و ماجوج پر اس جانب سے روک قائم ہو جانے کا تذکرہ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کے مقولہ کے بعد اپنی جانب سے اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اے مخاطبین! تم جن یاجوج و ماجوج قبائل کے متعلق یہ باتیں سن رہے ہو یہ بھی سن لو کہ ہم نے ان قبائل کے لیے یہ مقدر کر دیا ہے کہ وہ آپس میں الجھتے رہیں گے اور موج در موج باہم دست بگریباں ہوتے رہیں گے حتیٰ کہ وہ وقت آ جائے جب کہ قیامت بپا ہونے میں "نفخ صور" کے علاوہ اور کوئی مرحلہ باقی نہ رہے اور سورۂ انبیاء میں یہ ارشاد فرمایا کہ "نفخ صور" سے پہلے قیامت کی اشراط و علامات میں سے ایک شرط یا علامت یہ پیش آئے گی کہ یاجوج و ماجوج کے تمام قبائل اپنے نکلنے کے ہر مقام سے ایک ساتھ امنڈ آئیں گے اور دنیا کی عام غارت گری کے لیے اپنی مقامی بلندیوں سے تیزی کے ساتھ اترتے ہوئے کائنات کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائیں گے، ﴿مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾ "الحدب" لغت میں اوپر سے نیچے جھکنے کو کہتے ہیں، اس لیے "حدب" کے معنی اونچے مقام سے نیچے اترنے کے ہوتے ہیں اور "نسلان" عربی لغت میں پھسلنے کو کہتے ہیں، اس لیے "ینسلون" کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اس سرعت کے ساتھ امنڈ آئیں گے کہ یہ معلوم ہوگا گویا وہ کسی ٹیلے سے پھسل رہے ہیں، چنانچہ مفردات امام راغب اور نہایہ ابن اثیر میں "حدب" اور "نسل و نسلان" کی بحث میں یہی لغوی تفصیل مذکور ہے۔

لہٰذا اس تفسیر سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن عزیز نے یاجوج و ماجوج کے خروج موعود کی جو کیفیت بیان فرمائی ہے وہ ان ہی قبائل پر منطبق ہوتی ہے جو بحر کاسپین سے لے کر منچوریا تک پھیلے ہوئے ہیں اور جو دنیا کی بہت بڑی آبادی کے محور ہیں اور جائے وقوع کے اعتبار سے عام سطح آبادی سے اس قدر بلند حصہ زمین پر مقیم ہیں کہ جب بھی نکل کر متمدن اقوام پر حملہ آور ہوتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا اُوپر سے نیچے کو پھسل رہے ہیں پس آئندہ بھی جب اشراط ساعت کی شکل میں ان کا آخری خروج ہوگا تو ان کے تمام قبائل کا سیلاب ایک ہی دفعہ اُمنڈ آئے گا اور ایسا معلوم ہوگا کہ انسانوں کے سمندر کا بند ٹوٹ گیا ہے اور وہ اپنے مقامات کی ہر بلندی سے نیچے کی جانب بہہ پڑا ہے۔

قرآن عزیز کی آیات زیر بحث کی یہ تفسیر الفاظ اور جملوں کو ان کے لغوی معنی سے ادھر ادھر ہٹائے اور ان میں تاویل کیے بغیر اس قدر لطیف ہے کہ جس سے وہ بہت سے شکوک و شبہات یک قلم دفع ہو جاتے ہیں جو اس سلسلہ میں مفسرین کو پیش آئے ہیں اور ان کو حل کرنے کے لیے غیر جانب تاویلات کرنی پڑی ہیں۔ نیز مدعیان نبوت کو ان تاویلات سے فائدہ اٹھا کر الحاد و زندقہ پھیلانے کا موقعہ میسر آ گیا ہے۔

سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء کی آیات کی اس تفسیر کے بعد اب حدیث بخاری کا مرحلہ باقی رہ جاتا ہے کہ اس کی کیا م ہے؟ تو حدیث ((ویل للعرب من شر قد اقترب)) اس بات پر تو صاف دلالت کرتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو رویا میں، جو نبی کے لیے وحی کی طرح صحیح اور حجت ہوتا ہے، یہ دکھایا گیا کہ سد یاجوج و ماجوج میں رخنہ پڑ جانے سے ایسا سخت حادثہ پیش آنے والا ہے عرب کے لیے ہولناک ثابت ہوگا لیکن یہ بات پوری طرح وضاحت کے ساتھ سامنے نہ آ سکی کہ ((فتح من ردم یاجوج و ماجوج میں لفظ فتح سے حقیقی معنی مراد ہیں کہ واقعی یاجوج و ماجوج کی سد میں سے انگوٹھے اور انگلی کے بنائے ہوئے حلقہ کی مقدار میں شگا ہو گیا ہے یا پیشین گوئیوں کی طرح اس پیشین گوئی میں بھی "فتح" اور حلق تسعین کا استعارہ کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ

Marfat.com

جملہ کا پہلے جملہ ((ویل للعرب)) سے کوئی ربط ہے یا یہ الگ الگ دو مستقل باتیں ہیں؟

ان دونوں سئلوں کے متعلق اہل تحقیق کی رائے مختلف ہے اور چونکہ اس رویا صادقہ کی تعبیر خود ذات اقدس ﷺ سے یا صحابہ رضی اللہ عنہم کے آثار سے بسند صحیح منقول نہیں ہے اس لیے محدثین اور ارباب سیر نے یہ کوشش فرمائی ہے کہ وہ اس حدیث کے مصداق کو تقریبی طور پر متعین فرمائیں۔

شیخ بدر الدین عینی فرماتے ہیں کہ ((ویل للعرب)) کے جملہ میں ان شرور وفتن کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جو آپ کی وفات کے بعد ہی امت میں رونما ہونے شروع ہو گئے اور جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت میں سب سے پہلے عرب (قریشی حکومت) کی طاقت کا خاتمہ ہو گیا اور جن کی ہلاکتوں کا پہلا شکار اہل عرب ہی ہوئے اور بعد میں ان کا اثر تمام امت مرحومہ پر پڑا۔

اور روم (سد) میں انگلی اور انگوٹھے کے بنائے ہوئے حلقہ کی مقدار رخنہ پیدا ہو جانے کا ذکر تقریبی ہے یعنی یہ مقصد نہیں ہے کہ واقعی اتنا چھوٹا سا رخنہ پڑ گیا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ سد ذوالقرنین کے استحکامات کی مدت ختم ہو گئی اور اب اس میں رخنہ پڑنے کی ابتداء ہو چلی ہے گویا اب وہ آہستہ آہستہ شکست و ریخت ہو جائے۔ [1]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ بھی قریب قریب یہی فرماتے ہیں، لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو رویا صادقہ کے بعد قتل عثمان رضی اللہ عنہ کی شکل میں ظاہر ہوا اور پھر متواتر فتن اور شرور کا سلسلہ جاری ہو گیا جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب (قریشی حکومت) تمام اقوام کے لیے ایسے ہو گئے جیسا کہ کھانے کے پیالہ پر کھانے والے جمع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں اس تشبیہ کا ذکر بھی موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> "وہ زمانہ قریب ہے کہ تم پر قومیں اس طرح ایک دوسرے کو دعوت دیں گی جس طرح کھانے کے بڑے پیالہ پر کھانے والے ایک دوسرے کو دعوت دیتے ہیں"۔ [2]

قرطبی کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد کے مخاطب عرب ہی ہیں اور رخنہ سد کے متعلق دونوں محدثین کا رجحان اسی جانب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حقیقی رخنہ مراد نہیں ہے بلکہ یہ ایک تشبیہ ہے۔

ان ہر دو محدثین کی تفصیلات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ((ویل للعرب)) والا جملہ جو شرور وفتن سے متعلق ہے اور "فتح روم" کے جملہ میں ایک ہی بات بیان کی گئی ہے۔ اور یہ دونوں جملے اس طرح آپس میں مربوط ہیں کہ دونوں کو ایک ہی حادثہ سے متعلق سمجھا جائے۔

اور حافظ عماد الدین بن کثیر اس بارے میں کوئی فیصلہ کن رائے نہیں رکھتے اور متردد ہیں کہ زیر بحث حدیث ((فتح من ردم یاجوج وماجوج)) میں فتح سے حقیقی فتح (کھل جانا) مراد ہے یا استعارہ ہے کسی آئندہ ایسے حادثہ سے جو یاجوج و ماجوج کے ہاتھوں پیش آنے والا ہے اور جس کا اثر براہ راست عرب (حکومت قریش) پر پڑے گا لیکن کرمانی شارح بخاری بعض علماء سے نقل کرتے ہیں کہ وہ اس پوری حدیث کو ایک ہی معاملہ سے متعلق سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس میں یاجوج و ماجوج کے ایسے حادثہ کا ذکر کیا گیا ہے جس کا ظہور قیامت کی علامت سے جدا درمیانی وقفہ میں پیش آنے والا ہے اور جو باعث ہوگا عرب کے زوال کا اور

---

[1] عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۲۳۵ [2] فتح الباری ج ۱۳ ص ۹۱

"فتح ردم" استعارہ ہے اس بات سے کہ جو حادثۂ آئندہ رونما ہونے والا ہے اس کی ابتداء ہوگئی ہے اور یہ وہ حادثہ تھا جو مستعصم باللہ خلیفہ عباسی کے زمانہ میں "فتنہ تاتار کے نام سے برپا ہوا اور جس نے عرب طاقت کا خاتمہ کر کے رکھ دیا"۔ [1]

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یاجوج وماجوج قبائل کی اس تاخت و تاراج کے بعد جس کا ذکر ذوالقرنین کے واقعہ کے ضمن میں آیا ہے تاریخ میں ان قبائل کا پھر کوئی یادگار حملہ مذکور نہیں ہے۔

البتہ ساتویں صدی عیسوی میں ان کے لیے ذوالقرنین کی یہ روک بیکار ہوگئی اور انہوں نے بحر خزر اور بحر اسود کے اس درہ کے علاوہ جوان پر بند کر دیا گیا تھا بحیرہ یورال اور بحر خزر کا درمیانی راستہ پالیا، نیز ادھر سد ذوالقرنین کے استحکامات میں بھی فرق آنا شروع ہوگیا تھا اور اس طرح ذوالقرنین کے بعد اب یاجوج و ماجوج کے ایک نئے فتنہ کا آغاز ہو چلا تھا اور صدیوں سے ان خاموش قبائل فتنہ جو میں پھر حرکت شروع ہوگئی تھی۔

لہٰذا نبی اکرم ﷺ کو رویاء صادقہ میں یہ دکھا دیا گیا کہ اگرچہ ابھی وہ وقت دور ہے جبکہ قیامت کے قریب تمام قبائل یاجوج و ماجوج عالم انسانیت پر چھا جائیں گے لیکن وہ وقت قریب ہے جب کہ ذوالقرنین کے بعد ان کا ایک اہم خروج پھر ہوگا اور وہ عرب کی طاقت اور فرماں روائی کی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا اور اسی خروج کو اس طرح حسی طور پر دکھایا گیا کہ گویا (سد) دیوار میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہوگیا ہے، اور آہستہ آہستہ وہ دیوار گر کر منہدم ہو جانے والی ہے۔

چنانچہ زمانہ نبوی میں یہ وہ وقت تھا کہ ان قبائل میں سے چند منگولین قبائل نے اپنے مرکز سے نکل کر قرب و جوار میں پھیلنا اور چھوٹے چھوٹے حملے کرنا شروع کر دیا تھا، اور آخر کار چھٹی صدی ہجری میں چنگیز خان ان کا قائد بن گیا اور اس نے منتشر قبائل کو ایک جگہ جمع کرنا شروع کیا اور پھر اس کے بیٹے اوکتائی خان نے ایک بے پناہ طاقت کے ساتھ اٹھ کر مغرب و جنوب پر حملہ کر دیا اور ۶۸۲ء میں آخر ہلاکو خان کے ہاتھوں بغداد کی عرب خلافت کا خاتمہ ہوگیا اور اس نے "خلافت عربیہ" کو تہ و بالا کر ڈالا۔

تو یوں سمجھئے کہ جس طرح نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس خود علامات قیامت میں سے سب سے بڑی علامت ہے یعنی آپ خاتم النبیین ہیں اور پھر بھی قیامت کے وقت میں اور ذات اقدس میں کافی غیر متعین فاصلہ ہے اسی طرح یہ فتنہ تاتار بھی علامت قیامت "خروج یاجوج ماجوج" کا ایک ابتدائی نشان ہے اور جس طرح خروج دجال و قتل دجال اور نزول عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی قریبی علامات ہیں اسی طرح سورۂ انبیاء میں ذکر کردہ خروج یاجوج و ماجوج بھی علامات قیامت میں سے قریبی اور آخری علامت یا آخری شرط ہے پس "فتح ردم" میں ان کی ابتدائی حرکت کی جانب اشارہ ہے جو رویائے صادقہ کے وقت شروع ہو چکی تھی اور ((ویل للعرب)) سے اس نتیجہ کا اظہار ہے جو عرب حکومت کے خاتمہ پر منتج ہوا ہے۔

لیکن شیخ بدرالدین عینی نے بخاری کی شرح عمدۃ القاری میں کرمانی کے بیان کردہ اس قول کی تردید کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ تاتاری فتنہ کا بانی چنگیز خان اور اس کا بیٹا ہلاکو خان تھا اور ان کو یاجوج و ماجوج میں سے سمجھنا صحیح نہیں ہے، لہٰذا اس حدیث کا مصداق اس فتنہ کو قرار دینا بھی غلط ہے بہرحال حدیث ((ویل للعرب)) کی ان مختلف توجیہات سے جب کہ یہ بات ظاہر ہوگئی کہ اس روایت کے مصداق کا تعین خود حدیث سے نہیں ہوتا بلکہ محدثین نے قرائن اور الفاظ حدیث کی نشست کو پیش نظر رکھ کر اپنی جانب سے

---

[1] عمدۃ القاری ج ۱۱

Marfat.com

مصداق متعین کرنے کی سعی فرمائی ہے اور پھر اس میں بھی اختلاف رائے رہا ہے تو اب ان ہی کے بتائے ہوئے اصول کو سامنے رکھ کر ہم بھی کچھ کہنے اور حدیث زیر بحث کے مقصد کو متعین کرنے کا حق رکھتے ہیں، اگرچہ دوسرے اقوال کی طرح وہ بھی غیر منصوص اور قابل ردّ و قبول ہوگا۔

حدیث زیر بحث میں مستقبل میں پیش آنے والے جس فتنہ اور شر کی خبر دی گئی ہے اس کے دو جملے بہت اہم ہیں ایک ((ویل للعرب من شر قد اقترب)) "عرب کے لیے ہلاکت ہے اس شر سے جو بلاشبہ قریب آ لگا ہے"۔ اور دوسرا ((فتح الیوم من ردم یاجوج و ماجوج وحلق تسعین)) "آج کے دن یاجوج و ماجوج کی سد سے انگوٹھے اور انگلی کے گول دائرہ کی مقدار میں کھول دیا گیا ہے"۔ اور ان ہر دو جملوں کے درمیان واوٴ عطف بھی نہیں ہے۔

لہٰذا الفاظ حدیث پر کافی غور و خوض کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں مسطورہ بالا ہر دو اقوال کی گنجائش ہے یعنی حدیث کا پہلا جملہ یہ پتہ دیتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک ایسے اہم شر کی اطلاع دے رہے ہیں جس کا اثر یہ ہوگا کہ عرب کے لیے سخت ہلاکت کا سامنا ہوگا اور "خلافت قریش" زوال پذیر ہو جائے گی۔

اور دوسرا جملہ یا پہلے جملہ کی تائید میں پیش کیا گیا ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس امت میں جو اہم فتنے برپا ہونے والے ہیں اور جن کا ابتدائی اثر عرب کی ہلاکت کی شکل میں ظاہر ہوگا ان فتنوں کے رونما ہونے کے لیے حسی علامت اس طرح سامنے آ گئی ہے کہ یاجوج و ماجوج پر بنائی ہوئی مستحکم سد ذوالقرنین میں رخنہ پڑنا شروع ہو گیا اور اس کی شکست و ریخت ہونے لگی۔ گویا یہ رخنہ آئندہ اسلامی طاقت یا عرب طاقت میں جلد رخنہ پڑ جانے کے لیے ایک علامت ہے۔ چنانچہ یہ فتنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے شروع ہو کر مختلف فتنوں کے بعد چند صدیوں میں قریشی حکومت کی ہلاکت و تباہی پر جا کر ٹھہرا اور اس طرح حدیث کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔

پس اس شکل میں "فتح ردم" آئندہ فتنوں اور شروں کے پیش آنے کی ایک علامت ہے جو امت اسلامیہ میں برپا ہو کر قرب قیامت میں موعود خروج یاجوج و ماجوج پر جا کر ختم ہو جائیں گے اور اس کے بعد دنیا کے درہم و برہم ہو جانے سے قیامت ہو جائے گی۔

یا یوں کہیے کہ دوسرا جملہ پہلے جملہ کی صرف تائید ہی نہیں ہے بلکہ اس کی تفسیر ہے اور پہلا جملہ درحقیقت نتیجہ اور ثمرہ ہے دوسرے جملہ کا اور مطلب یہ ہے کہ عرب (قریشی حکومت) کی ہلاکت کا وقت آ پہنچا۔ گویا یاجوج و ماجوج کا وہ بند جو ذوالقرنین نے بہت مستحکم باندھا تھا اس میں اب رخنہ پڑ گیا اور معنی اس میں شکست و ریخت شروع ہو گئی اور یہ تمہید ہے اس فتنہ کی جو اسی جانب سے اٹھے گا اور قریشی حکومت کا خاتمہ کر دے گا۔

پس اس تعبیر کے لحاظ سے تاتاری فتنہ کی وہ تاریخ سامنے لائی جائے گی جو گزشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہے اور جس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح حدیث کی بیان کردہ پیشین گوئی کے مطابق اس فتنہ کی ابتدا دور رسالت سے شروع ہو گئی تھی اور پھر کس طرح وہ خلیفہ عباسی مستعصم باللہ کے دور حکومت میں قریشی حکومت کے استیصال کا باعث ہوئی۔

پس اگر ان دونوں جملوں کے درمیان جو ربط اور تعلق ہے اس میں اس قدر وسعت تسلیم کر لی جائے کہ وہ محدثین کی بتائی ہوئی توجیہ یعنی اہم شرور و فتن کا شیوع اور کرمانی کا بیان کردہ ایک قول کے مطابق توجیہ یعنی فتنہ تاتار کا وجود، ان دونوں توجیہات کو حاوی ہو سکے تو ایسا تسلیم کر لینے میں نہ شرعی قباحت لازم آتی ہے اور نہ تاریخی اور زیر بحث حدیث کا مصداق بہت زیادہ فہم کے قریب

آ جاتا ہے۔

رہا شیخ بدر الدین نور اللہ مرقدہٗ کا یہ ارشاد کہ چنگیز خانی تاتاری یاجوج و ماجوج نہیں کہلائے جا سکتے تو یہ شیخ کا تسامح ہے اس لیے کہ یاجوج و ماجوج کے تعین کی بحث میں محققین محدثین اور مؤرخین نے جن قبائل اور ان کے مواطن کو محقق قرار دیا ہے اور خود شیخ موصوف نے بھی جن کو بڑی حد تک تسلیم فرمایا ہے ان ہی قبائل میں سے ایک شاخ ان تاتاریوں کی بھی ہے جو چنگیز خانی کہلائے اور یہ اپنے دور بربریت و وحشت میں ان ہی جگہوں میں آباد رہے ہیں اور وہیں سے ان کا خروج ہوا ہے جن پر سد ذوالقرنین قائم کی گئی تھی۔

بہر حال سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء کی زیر بحث آیات کی اس تفسیر کے درمیان جو ہم نے حضرت علامہ انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ اور حافظ حدیث عماد الدین بن کثیر کے حوالہ جات سے بیان کی ہے اور اس حدیث کی پیشین گوئی کے مصداق متعین کرنے والی مسطورہ بالا توجیہات کے درمیان کسی قسم کا بھی تعارض پیدا نہیں ہوتا اور زیر بحث آیات و روایات کے مصداق اپنی اپنی جگہ صاف اور واضح ہو جاتے ہیں اور ایسا کرنے میں نہ رکیک تاویلات کا سہارا لینے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو تفسیر بالرائے یا قابل اعتراض جدت کہا جا سکتا ہے بلکہ یہ جو کچھ بھی ہے سلف صالحین اور محدثین وارباب سیر کے مختلف اقوال میں ترجیح راجح کے اصول کو کار فرما بنا کر ایک ایسی معتدل راہ ہے جو نصوص قرآنی اور صحیح روایات حدیثی کے درمیان تطبیق کی راہ کہلائی جاتی اور سلفاً عن خلف مقبول و محمود رہی ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ حدیث مسطورہ بالا میں حلقہ کی مقدار رخنہ پڑ جانے کا جو تذکرہ ہے اس کے متعلق محدثین کی یہ رائے ہے کہ استعارہ وتشبیہ مراد ہو یا حسی رخنہ بہر دو صورت حلقہ کی مقدار رخنہ کا ذکر تقریبی ہے نہ کہ تحدیدی یعنی یہ مطلب ہے کہ سد میں رخنہ پڑنا شروع ہو گیا یہ مراد نہیں ہے کہ واقعی ایک حلقہ کی مقدار ہی رخنہ پڑا ہے چنانچہ گزشتہ صفحات میں ہم ابن کثیر سے اس سلسلہ میں نقول پیش کر چکے ہیں۔

اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں اور بعض دوسرے علماء نے کتب سیرت میں اس امر کی کوشش کی ہے کہ سورۂ انبیا کی ان آیات کا مصداق جن میں یاجوج و ماجوج کے موعود خروج کا ذکر کیا گیا ہے ((حتی اذا فتحت یاجوج و ماجوج وھم من کل حدب ینسلون)) فتنہ تاتار کو بنا کر یہیں قصہ کو ختم کر دیں اور اس کا امارت ساعت و علامت قیامت سے کوئی تعلق باقی نہ رہنے دیں۔

مگر ہمارے نزدیک قرآن عزیز کا سیاق و سباق ان کی اس تفسیر یا توجیہ کا قطعاً اباء و انکار کرتا ہے اور یہ اس لیے کہ سورۂ انبیاء میں اس واقعہ کو جس ترتیب سے بیان کیا ہے، وہ یہ ہے:

﴿وَ حَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَاۤ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۝ وَ اقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۹۵-۹۷)

Marfat.com

"اور مقرر ہو چکا ہے ہر ایک ایسی بستی پر کہ جس کو ہم نے ہلاک کر دیا ہے کہ اس کے بسنے والے واپس نہ ہوں گے یہاں تک کہ کھول دیئے جائیں یاجوج و ماجوج اور وہ ہر بلندی سے دوڑتے ہوئے امنڈ پڑیں اور قریب آ جائے سچا وعدہ پھر اس وقت حیرانی سے کھلی کی کھلی رہ جائیں آنکھیں منکروں کی اور کہیں ہائے ہماری بدبختی کہ ہم بے خبر رہے اس (قیامت) سے بلکہ ہم ظلم و شرارت میں سرشار رہے"۔

ان آیات میں آیت زیر بحث ﴿حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ﴾ الآیہ سے پہلی آیت میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ مرنے والوں کی موت کے بعد اب ان کے لیے اس دنیا میں دوبارہ زندگی نہیں ہے اور آیت زیر بحث میں یہ کہا گیا ہے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی کا وقت جن علامت و آیات کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے یا جن پر معلق کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج کے تمام قبائل اپنی پوری طاقت کے ساتھ بیک وقت اپنے مراکز سے نکل کر تیزی سے تمام دنیا پر چھا جائیں اور اس سے متصل آیت میں مزید یہ کہا گیا کہ پھر اس کے بعد قیامت بپا ہو جائے گی اور تمام شخص اپنی زندگی کے نیک و بد انجام دینے کے لیے میدان حشر میں جمع ہو جائیں گے اور ناکام اپنی ناکامی پر حسرت و یاس کرتے رہ جائیں گے۔

پس آیت زیر بحث کے سیاق و سباق نے یہ بات بخوبی واضح کر دی کہ اس مقام پر یاجوج و ماجوج کے ایک ایسے خروج کی اطلاع دی گئی ہے جس کے بعد شر و رفتن کا کوئی سلسلہ بلکہ دنیا کی ہستی کا کوئی سلسلہ باقی نہیں رہ جائے گا اور صرف قیامت بپا ہو جانے یعنی نفخ صور کی دیر باقی رہ جائے گی جو اس واقعہ کی تکمیل کے بعد عمل میں آ جائے گی۔

لہٰذا آیت کے سیاق و سباق سے قطع نظر کرتے ہوئے اور حدیث ((ویل للعرب من شر قد اقترب)) کا مصداق "فتنہ تاتار" کو متعین کرتے ہوئے سورۂ انبیاء کی اس آیت کو آخری علامت ساعت سے نکال کر فتنہ تاتار پر محمول کر لینا ہرگز ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا، نیز جمہور سلف صالحین کی مسلمہ توجیہ کے قطعاً خلاف ہے۔

ممکن ہے کہ اس میں توجیہ کے ناقلین و قائلین ہمارے اس اعتراض کو ہم پر ہی پلٹ دیں اور یہ فرمائیں کہ اسی طرح سورۂ کہف میں بھی آیت ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ﴾ میں "وعد" سے کیوں قیامت مراد لی جائے جب کہ اس کے بعد ہی آیت ﴿وَّ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ﴾ موجود ہے جو بلاشبہ قیامت کی آخری علامت ہے اور کیوں نہ کہا جائے کہ اس آیت سے یہ مراد ہے کہ یاجوج و ماجوج نفخ صور تک سد کے اندر محصور اور بند رہیں گے اور نفخ صور کے قریب یک بیک سد گر جائے گی اور وہ نکل پڑیں گے۔

تو اس کے متعلق ہماری یہ گزارش ہے کہ یہ اعتراض اپنی اس تقریر کے ساتھ ہرگز ہم پر وارد نہیں ہوتا اس لیے کہ سورۂ کہف کی ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے ہم پہلے ہی یہ واضح کر چکے ہیں کہ ان آیات میں سب سے پہلے ﴿وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ﴾ سے شروع کر کے ﴿وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا﴾ تک ذوالقرنین کا واقعہ بیان کیا گیا ہے یعنی آیت ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ﴾ میں ذوالقرنین کا مقولہ نقل کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد نہیں ہے اس لیے یہاں "وعد" سے وعدۂ قیامت مراد نہیں ہے بلکہ کسی تعمیر کی خرابی کا مقدور و معین وقت مراد ہے جس کی تعیین کو ذوالقرنین نے اپنی جانب سے تخمینی طور پر متعین کرنے کی بجائے مرد مؤمن اور صالح کی طرح خدا کی مرضی کے حوالہ کر دیا ہے۔

اور چونکہ ذوالقرنین کے واقعہ میں ضمنی طور سے یاجوج و ماجوج کا بھی ذکر آ گیا تھا اس لیے اس کے خاتمہ پر اگلی آیت میں

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے بھی یاجوج و ماجوج کا مختصر ذکر فرما دیا اور آیت ﴿وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ وَّ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ﴾ میں یہ بیان کیا کہ جن یاجوج و ماجوج کا ذکر تم نے ابھی ذوالقرنین کے واقعہ میں سنا ان کو ہم نے شر اور فتنہ کی اس زندگی میں اس طرح کر چھوڑا ہے کہ وہ برابر فساد اور چپقلش باہمی میں مصروف رہیں گے اور یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا کہ صور پھونک دیا جائے گا اس دن وہ سب جمع کیے جائیں گے اور اس دن جہنم کافروں پر پیش کی جائے گی۔

گویا سورۂ انبیاء میں تو یاجوج و ماجوج کا ذکر مستقل حیثیت رکھتا ہے اور وہاں بتانا ہی یہ منظور ہے کہ ان کا اجتماعی خروج قیامت کی آخری علامات میں سے ایک نمایاں علامت ہے اور سورۂ کہف میں ان کا تذکرہ صرف ضمنی ہے اور ان کے فساد اور شر انگیزی کے خصوصی واقعہ کی مناسبت سے انکی باہمی فساد انگیزیوں اور مختلف اوقات میں موج در موج چپقلشوں کی وارداتوں کا ذکر اس انداز میں کر دیا گیا کہ ان کے موعود خروج کی جانب بھی اشارہ ہو جائے۔

غرض سورۂ کہف کی زیر بحث آیات کا سیاق و سباق یعنی ان سے پہلی اور بعد کی آیات کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے کہ ذوالقرنین کے مقولہ ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ﴾ میں "وعد" سے مراد وعدۂ قیامت لیا جائے اور وہ معنی بیان کیے جائیں جو معترض نے ہماری بیان کردہ سورۂ انبیاء کی تفسیر کے مقابلہ میں پیش کی ہیں۔

الحاصل جن معاصر مفسرین نے سورۂ انبیاء کی زیر بحث آیات کا مصداق فتنۂ تاتار کو بتایا ہے اور اس کی تائید میں بخاری کی مشہور حدیث ((ویل للعرب من شر قد اقترب.... الخ)) کو پیش کیا ہے ان کی یہ تفسیر غلط ہے اور حدیث سے اس کی تائید قطعاً بے محل ہے بلکہ بخاری و مسلم کی دوسری صحیح احادیث جو کتاب الفتن میں مذکور ہیں اس تفسیر کے خلاف صاف صاف یہ بیان کرتی ہیں کہ علامات قیامت میں جب آخری علامات رونما ہوں گی تو پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول ہوگا اور دجال کا سخت فتنہ برپا ہوگا اور آخر کار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں وہ مارا جائے گا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد یاجوج و ماجوج کا موعود خروج ہوگا جو تمام دنیا پر شر و فساد کی صورت میں چھا جائے گا اور پھر کچھ وقفہ کے بعد نفخ صور ہوگا اور یہ کارخانۂ دنیا درہم برہم ہو جائے گا۔ ✿

یہ بھی واضح رہے کہ یہ اور اسی قسم کی دوسری صحیح اور اصح روایات سے ان متنبیوں (جھوٹے مدعیان نبوت) کے دعووں کا بھی ابطال ہو جاتا ہے اور ان کے کذب صریح کی رسوائی آشکارا ہو جاتی ہے جو اپنی نبوت کی صداقت کی تعمیر یہ کہہ کر تیار کرتے ہیں کہ انگریز اور روس یاجوج و ماجوج ہیں اور جب کہ ان کا خروج ہو چکا اور وہ عالم کے اکثر حصوں پر قابض ہو چکے تو اب "یسوع مسیح" کی آمد ضروری ہو گئی لہٰذا وہ موعود مسیح (عیسیٰ) ہم ہیں کیونکہ جب شرط موجود ہے تو مشروط کیوں موجود نہ ہو۔

کسی جھوٹے مدعی نبوت کی یہ دلیل اگرچہ خود تار عنکبوت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اور اس لیے درخور اعتناء بھی نہیں ہے تاہم عوام کو غلط فہمی سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس مدعی کے بیان کردہ یہ دونوں دعوے جو دلیل کے دو مقدموں کے طور پر بیان کیے گئے ہیں غلط اور ناقابل قبول ہیں اور اس لیے ان سے پیدا شدہ نتیجہ بھی بلاشبہ باطل اور مردود ہے۔

پہلا دعویٰ یا مقدمہ تو اس لیے غلط ہے کہ ہم نے یاجوج و ماجوج کی بحث میں تفصیل کے ساتھ حدیث و تاریخ سے یہ ثابت

✿ بخاری کتاب الفتن ج ۲

Marfat.com

کر دیا ہے کہ یاجوج و ماجوج کا اطلاق صرف ان ہی قبائل پر ہوتا رہا ہے جو اپنے اصل مرکز میں بہمہ طریق وحشت و بربریت مقیم ہیں اور ان میں سے جو افراد یا قبائل مرکز چھوڑ کر دنیا کے مختلف حصوں میں بس گئے اور آہستہ آہستہ متمدن بن گئے ہیں وہ تاریخ کی نظر میں یاجوج و ماجوج نہیں کہلاتے بلکہ اپنے بعض امتیازات خصوصی کے پیش نظر نئے نئے ناموں سے موسوم ہو گئے اور اپنے اصلی ۱، نسلی مرکز سے اس قدر اجنبی ہو گئے ہیں کہ وہ اور یہ دو مستقل جدا جدا قومیں بن گئیں اور ایک دوسرے کے دشمن ہوئے اسی طرح قرآن ا، حدیث کے مطالعہ سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ ان ہی قبائل کو یاجوج و ماجوج کہتا ہے جو اپنی بربریت اور وحشت کے ساتھ عام، سے الگ اپنے مرکز میں گوشہ گیر ہیں۔

اور اسی اصول پر دوسرا دعویٰ یا مقدمہ بھی باطل ہے کہ انگریز اور روس بلکہ یورپین حکومتوں کا تسلط او قبضہ یاجوج و ماجوج کا خروج ہے اور یہ اس لیے کہ ایک تو ابھی ذکر ہو چکا کہ متمدن اقوام کو یاجوج و ماجوج کہنا ہی غلط ہے دوسرے اس لیے کہ یاجوج و ماجوج کے اس فتنہ و فساد کے پیش نظر جس کا ذکر ذوالقرنین کے واقعہ میں سورۂ کہف میں مذکور ہے اور صحیح احادیث کی تصریحات کے مطابق ان کا وہ خروج بھی جس کا ذکر سورۂ انبیاء میں کیا گیا ہے اور جس کی علامت قیامت میں سے ٹھہرایا ہے ایسے ہی فساد و شر کے ساتھ ہوگا جس کا تعلق تمدن و حضارت سے دور کا بھی نہ ہو اور جو خالص وحشیانہ طرز و طریق پر برپا کیا جائے کہاں سائنس کے ایجادات و آلات کا طریقہ جنگ اور کہاں غیر متمدن وحشیانہ جنگ و پیکار؟ شتان بینهما۔

اور یہ بات اس لیے بھی واضح ہے کہ متمدن اقوام کی جنگ و پیکار کتنی ہی وحشیانہ طرز و طریق اختیار کیے ہوئے کیوں نہ ہوں بہرحال سائنس اور حرب و ضرب کے اصول کے مطابق ہوتی ہیں اور یہ سلسلہ اقوام و امم میں ہمیشہ سے جاری ہے اس لیے اگر اس قسم کے جابرانہ و قاہرانہ تسلط اور قبضہ کے متعلق قرآن عزیز کو پیشین گوئی کرنی تھی تو اس کی تعبیر کے لیے ہرگز یہ طریقہ اختیار نہ کیا جاتا جو یاجوج و ماجوج کے خروج موعود کے سلسلہ میں سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء میں اختیار کیا گیا ہے بلکہ ان کی ترقی نما بربریت کی جانب ضروری اشارات یا تصریحات کا ہونا لازم تھا۔ [1]

الحاصل احادیث صحیح اور آیات قرآنی کی مطابقت کے ساتھ ساتھ جب مسئلہ زیر بحث پر غور و فکر کیا جاتا ہے تو بصراحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس علامت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول از آسمان ضروری ہے نہ یہ کہ پہلے یاجوج و ماجوج کا خروج ہوگا اور مسیح علیہ السلام کی آمد کا انتظار کیا جائے، چنانچہ صحیح مسلم کی ایک طویل حدیث میں مذکور ہے:

فبینما ہو کذلك اذا بعث الله المسیح بن مریم فینزل عند المنارة البیضاء شرقی دمشق بین مهرودتین واضعًا کفیه علی اجنحة ملکین اذا طاطا رأسه قطر و اذا رفعه تحدر منه جمان کاللؤلؤ فلا یحل لکافر یجد ریح نفسه الا مات و نفسه ینتهی حیث ینتهی طرفه فیطلبه حتی یدرکه بباب لد فقتله ثم یاتی عیسی ابن مریم قوم قد عصمهم الله منه فیمسح عن وجوههم و یحدثهم بدرجاتهم فی الجنة فبینما هو کذلك اذا اوحی الله الی عیسی انی قد اخرجت عبادًا لی لا یدان لاحد بقتالهم فحرز عبادی الی الطور و یبعث الله یاجوج و

[1] یہ امر کہ آج جبکہ کا کیشیا کا تمام علاقہ متمدن ہو چکا اور یہاں کی بیشتر آبادی مسلمان ہے تو قریب بہ قیامت یاجوج و ماجوج کا خروج اس علاقہ سے کس طرح ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ گزشتہ صفحات میں یہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے کہ کاکیشیا کے اس حصہ سے چین و تبت تک کے تمام ساحلی اور پہاڑی علاقوں کا سلسلہ ان ہی وحشی قبائل کا مسکن رہا ہے اور آج بھی ہے، پس ان ہی علاقوں کے مختلف حصوں سے بے تعداد وحشی انسان وقت موعود پر نکل کر دنیا انسان کو تاراج کرنے کے لیے پھیل جائیں گے۔

ماجوج ﴿وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ﴾. [1]

"واقعات یہاں تک پہنچیں گے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مسیح بن مریم علیہ السلام کو بھیجے گا اور وہ (جامع) دمشق کے سپید شرقی منارہ کے نزدیک اس طرح اتریں گے کہ زعفرانی رنگ کی دو چادروں میں ملبوس اور فرشتوں کے بازوؤں پر ہاتھ کا سہارا دیئے ہوئے ہوں گے جب سر کو جھکائیں گے تو پانی ٹپکنے لگے گا اور جب سر اٹھائیں گے تو اس سے پانی کے قطرات اس طرح گرنے لگیں گے گویا ہار سے موتی ٹوٹ کر گر رہے ہیں یعنی آسمان پر غسل کر کے فوراً ہی نزول ہوگا جہاں تک ان کا سانس جائے گا کافر کی موت کا باعث ہوگا اور ان کا سانس ان کی حدنظر تک پہنچے گا، پھر اتر کر وہ دجال کا پیچھا کریں گے اور وہ اس کو بیت المقدس کے قریب بستی لد کے دروازہ پر پائیں گے اور قتل کر دیں گے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں کے پاس تشریف لائیں گے جن کو اللہ تعالیٰ دجال کے فتنہ سے محفوظ رکھے گا اور ان کے غبار آلودہ چہروں کو مس کرتے ہوئے ان کو جنت میں جو درجات ملیں گے اس کے متعلق باتیں کریں گے، حالات یہاں تک پہنچیں گے کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام پر وحی کرے گا کہ اب میں اپنے بندوں میں سے ایک ایسی قوم کو نکالتا ہوں جن سے جنگ کرنے کی دنیا میں کسی کے اندر طاقت نہیں ہے، لہٰذا تم میرے تمام بندوں کو طور پر لے جاؤ۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ یاجوج و ماجوج کو نکالے گا جو تیزی کے ساتھ دوڑتے ہوئے آئیں گے اور ہر بلند جگہ سے نکل پڑیں گے"۔

پس یاجوج و ماجوج کا خروج کسی حال میں بھی ان اقوام پر صادق نہیں آسکتا جو تمدن اور حضارت کی راہوں سے قاہرانہ اور جابرانہ جنگ و پیکار کے ذریعہ سے دنیا پر غالب و قابض ہوتی رہی ہیں اور کسی شخص کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ یاجوج و ماجوج قبائل کی تاریخی بحث سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اور جدید نبی بن کر اسلام کے اساسی اور بنیادی مسئلہ ختم نبوت کے خلاف تشکیل نبوت کی جدید طرح ڈالے اور اس طرح اسلام میں رخنہ انداز ہو کر دوست نما دشمن بنے۔

کیا ذوالقرنین نبی تھے؟:

ذوالقرنین کے تعین کے بعد یہ مسئلہ بھی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ ذوالقرنین نبی ہیں یا ایک نیک نہاد بادشاہ؟ سلف صالحین اور متاخرین کی اکثریت اسی جانب ہے کہ ذوالقرنین صالحین میں سے ہیں اور نیک نفس بادشاہ اور وہ نبی یا رسول نہیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں کہ جس میں ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے ان کا یہ قول مصرح موجود ہے:

لم یکن نبیًا ولا ملکًا. (الحدیث) [2]

"ذوالقرنین نہ نبی تھے اور نہ فرشتہ"۔

کان رجلًا احب اللہ فاحبه ..... الخ.

"وہ ایک انسان تھے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو محبوب رکھا، پس اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو محبوب رکھا"۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کو نقل کر کے اس کی توثیق کی ہے اور کہا ہے کہ میں نے اس روایت کو حافظ حدیث ضیاء الدین مقدسی کی کتاب مختارہ کی احادیث سے بسند صحیح سنا ہے اور پھر فرماتے ہیں کہ اس روایت میں ذوالقرنین کے متعلق یہ الفاظ بھی مذکور ہیں:

بعثه اللہ الٰی قومه. [3] "اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی قوم کی طرف بھیجا"۔

---

[1] مسلم کتاب الفتن [2] فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۵ [3] فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۸

Marfat.com

اس سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ لفظ "بعث" تو نبوت و رسالت کے لیے بولا جاتا ہے پھر نبوت کے انکار کے کیا معنی؟ اس کے بعد خود ہی یہ جواب دیا ہے کہ "بعث" یہاں اپنے عام معنی میں ہے جو نبی اور غیر نبی دونوں کے لیے بولا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

وقیل کان من الملوك وعلیه الاکثر. (فتح)

"اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا اور اکثر کی یہی رائے ہے"۔

حضرت علیؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی یہی مسلک ہے کہ ذوالقرنین نبی نہ تھے بلکہ ایک نیک اور صالح بادشاہ تھے:

عن ابن عباس قال کان ذوالقرنین ملکًا صالحًا رضی اللہ عمله و اثنٰی علیه فی کتابه و کان منصورًا. [1]

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین نیک اور صالح بادشاہ تھا اللہ تعالیٰ نے اس کے اعمال کو پسند فرمایا اور اپنی کتاب (قرآن) میں اس کی تعریف فرمائی اور وہ فاتح و کامیاب بادشاہ تھا"۔

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی ذوالقرنین کو صالحین میں سے مانتے تھے۔ [2]

البتہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی جانب یہ نسبت کی جاتی ہے کہ وہ ذوالقرنین کو نبی مانتے تھے:

عن مجاهد عن عبداللہ بن عمرو قال کان ذوالقرنین نبیًا. [3]

"عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین نبی تھے"۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ قرآن کا ظاہر یہی بتایا ہے، [4] مگر ان تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد فیصلہ کچھ نہیں دیتے لیکن حافظ عماد الدین ابن کثیر ان اقوال کو نقل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا فیصلہ یہ دیتے ہیں:

والصحیح انه کان ملکا من ملوك العادلین. [5]

"اور صحیح یہ ہے کہ ذوالقرنین عادل بادشاہوں میں سے تھا"۔

حضرت استاد علامہ محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی تحقیق بھی یہی ہے، چنانچہ عقیدۃ الاسلام میں تحریر فرماتے ہیں:

بل ملك اخر من الصالحین ینتهی نسبه الی العرب الساميين الاولین.

"کہ وہ ایک اور نیک بادشاہوں میں سے تھا اور اس کا نسب قدیم سامیوں پر پہنچتا ہے"۔

ان نقول کے پیش نظر مولانا آزاد کا یہ فرمانا:

"تو صحابہ و سلف سے جو تفسیر منقول ہے وہ یہی ہے کہ ذوالقرنین نبی تھے"۔ [6]

اپنے عموم کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے کیونکہ بیشتر سلف صالحین ذوالقرنین کی نسبت کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کو ایک بادشاہ حیثیت میں تسلیم کرتے ہیں، البتہ بعض سلف کی رائے میں وہ نبی تھے۔

اسی طرح متاخرین میں ابن کثیر کے متعلق یہ کہنا بھی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ وہ ذوالقرنین کے نبی ہونے کی تائید میں ہیں اس کہ سطور بالا میں ابن کثیر رحمہ اللہ سے جو کچھ منقول ہے وہ قطعاً اس کے خلاف ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں

---

[1] البدایہ والنھایہ ج ۲ ص ۱۳۲ [2] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۳ [3] فتح الباری ج ۶ ص ۲۶۵
[4] فتح الباری ج ۶ ص ۱۹۷ [5] فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۵ [6] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۲۰

Marfat.com

اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ذوالقرنین اور خضر کا جو ایک جگہ ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے اور اس میں خضر کی نبوت کی توثیق فرمائی ہے تو اس جگہ شاید ضمائر کے مرجع میں مولانا موصوف کو مغالطہ ہو گیا ہے چنانچہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

فان الاول کان عبدًا مؤمنًا صالحًا و ملکا عادلًا و کان وزیرہ الخضر، وقد کان نبیا علی ماقررناہ قبل ھٰذا۔ [1]

"اس لیے کہ اوّل (یعنی ذوالقرنین) ایک عبد مومن اور صالح تھا اور عادل بادشاہ اور اس کے وزیر خضر علیہ السلام تھے اور وہ (خضر) اس تحقیق کے مطابق جو ہم سابق میں بیان کر چکے ہیں بے شک نبی تھے"۔

بہر حال حضرت علی، ابن عباس، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم، امام رازی، ابن کثیر اور ان کے علاوہ سلف صالحین اور متاخرین کی اکثریت اسی کی قائل ہے کہ ذوالقرنین نبی نہیں تھے بلکہ عادل بادشاہ تھے پس جب کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین بلکہ متاخرین میں سے بھی اکثر اسی جانب ہیں کہ ذوالقرنین نبی نہ تھے تو جمہور کا یہ رجحان بلاشبہ اس امر کی دلیل ہے کہ آیت ﴿قُلۡنَا یٰذَا الۡقَرۡنَیۡنِ﴾ میں خدائے تعالیٰ کی مخاطبت ذوالقرنین کے ساتھ اسی قسم کی ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے قصہ میں ﴿اَوۡحَیۡنَاۤ﴾ کے اندر ہے۔

﴿وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی اَنۡ اَرۡضِعِیۡهِ ۚ﴾ (القصص: ۷)

"اور ہم نے موسیٰ کی والدہ پر وحی کی کہ تو اس (موسیٰ علیہ السلام) کو دودھ پلانا منظور کر لے"۔

اور یقیناً ان حضرات کا منطوق پر مفہوم کو ترجیح دینا بے وجہ نہیں ہے، خصوصاً جب کہ اس مخاطبت کو نہ ﴿اَوۡحَیۡنَاۤ﴾ سے تعبیر کیا گیا اور نہ ﴿اَنۡزَلۡنَا﴾ سے اور نہ ﴿قُلۡنَا﴾ کے علاوہ ذوالقرنین سے متعلق آیات میں کوئی ایسا مؤید موجود ہے جو ﴿قُلۡنَا﴾ کی خطابت کو خطابت وحی قرار دیتا ہے۔

لہٰذا راجح مذہب یہی ہے کہ ذوالقرنین نبی نہیں تھے بلکہ عادل اور صالح بادشاہ تھے۔

بصائر:

① مطالب قرآن کی بصیرت کے لیے جس طرح لغت عرب معانی بلاغت و بیان صرف و نحو احادیث اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم جیسے علوم کی معرفت ضروری ہے اسی طرح صحیح علم تاریخ کی معرفت ضروری ہے، چنانچہ گزشتہ اقوام و امم کے حالات و واقعات کا علم حاصل کر کے ان سے عبرت و بصیرت حاصل کرنے کی ترغیب خود قرآن عزیز نے پر زور اسلوب بیان کے ساتھ دی ہے، ارشاد ہے:

﴿قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ ثُمَّ انۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۱۱﴾﴾ (الانعام: ۱۱)

"کہہ دیجئے زمین کی سیاحت کرو پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوگا"۔

﴿قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ سُنَنٌ ۙ فَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۱۳۷﴾﴾
(ال عمران: ۱۳۷)

"بے شبہ تم سے پہلے (خدا کی مقرر کردہ) راہیں گزر چکی ہیں پس زمین کی سیر کرو پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا"۔

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۲

Marfat.com

② جہاں تک اسلام کے بنیادی مسائل کا تعلق ہے اس میں سلف صالحین کا مسلک ہی بغیر چون و چرا دلیل راہ ہے اور اس سے تجاوز زلیغ اور گمراہی ہے لیکن جہاں تک قرآن کے لطائف و نکات، معارف و علوم، اسرار و غوامض اور علمی و تاریخی مطالب کا تعلق ہے اس کے لیے کسی زمانہ میں بھی درِ تحقیق بند نہیں ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

((فلا تنقضی عجائبه)).

"قرآن کے لطائف و حکم کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں"۔

خصوصاً جب کہ تاریخی مطالب کے حصول کے لیے آج کے ذرائع معلومات قدیم علوم تاریخ کے ذرائع سے زیادہ وسیع ہو چکے ہیں تو سلف صالحین کے مسلک قدیم پر قائم رہتے ہوئے قرآنی حقائق اور اس کے تاریخی مباحث کی تفصیلات و جزئیات میں اقوال سلف کا پابند نہ رہتے ہوئے قرآن کی تائید کے لیے قدیم تحقیق اٹھانا سلف صالحین کی اقتداء ہے نہ کہ ان کے مسلک سے انحراف کیا کوئی اہل علم اور صاحب نظر اس حقیقت کا انکار کر سکتا ہے کہ ان مطالب تفسیری کے علاوہ جن کے متعلق دلائل سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ ارشادات نبوی ﷺ ہیں صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذاتی اقوال کے خلاف یا ان سے جدا تابعین اور تبع تابعین کے اقوال بہ کثرت کتب تفسیر میں مذکور ہیں اور متاخرین علماء تفسیر متقدمین کے اقوال پر نقد و جرح کرتے اور اختلاف رائے رکھتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے ہر شخص کی تحقیق قرآن عزیز کے مطالب کی خدمت ہی سمجھی جاتی ہے، البتہ اہلیت شرط ہے اور جو شخص بھی اس خدمت کے لیے اقدام کرے اس کا فرض ہے کہ فیما بینی و بین اللہ یہ غور و فکر کرے کہ وہ جس مسئلہ میں کوئی راہ اختیار کرتا ہے حقیقت میں اس کے تمام مالہ اور ماعلیہ سے واقف ہے یا نہیں اور یہ کہ اس کی اس تحقیق سے قرآن کی مزید تائید ہی ہوتی ہے اور سلف صالحین کے بنیادی مسلک قدیم سے قطعاً تجاوز لازم نہیں آتا۔

③ عدل و ظلم کی حکومت کے درمیان ہمیشہ سے یہ امتیازی فرق چلا آتا ہے کہ عادل حکومت کا نصب العین رعایا اور عوام (پبلک) کی خدمت ہوتا ہے اور اس لیے عادل بادشاہ کا شاہی خزانہ رفاہ عام اور پبلک خدمات اور ان کی خوشحالی کے لیے ہوتا ہے اور وہ اپنی ذات پر ضروری حاجات سے زیادہ اس میں سے صرف نہیں کرتا اور نہ عوام کو ٹیکسوں کی کثرت سے پریشان حال بناتا ہے اس کے برعکس جبر و ظلم کی حکومت کا منشاء بادشاہ اور حکومت کا اقتدار، ذاتی تعیش اور اس کا استحکام ہوتا ہے اس لیے وہ نہ رعایا کے دکھ درد کی پرواہ کرتا ہے اور نہ ان کی راحت و آرام کا خیال رکھتا ہے اور اس سلسلہ میں اگر کچھ ہو بھی جاتا ہے تو وہ حکومت کے مفاد و مصالح کے پیش نظر ضمنی ہوتا ہے نیز اس حکومت میں رعایا ہمیشہ ٹیکسوں کے بوجھ سے دبی رہتی اور اس ملک کی اکثریت افلاس و غربت ہی کا شکار رہتی ہے۔

ذوالقرنین چونکہ ایک صالح اور عادل بادشاہ تھا اس لیے اس نے شمالی سیاحت میں اس قوم سے ٹیکس لینے سے انکار کر دیا جو یاجوج و ماجوج پر سد بنانے کے سلسلہ میں دینا چاہتے تھے اور اس نے صاف کہا کہ خدا نے مجھ کو حکومت و ثروت اس لیے نہیں دی کہ میں اس کو ذاتی تعیش پر صرف کروں بلکہ صرف اس لیے عطا فرمائی ہے کہ اس کے ذریعہ سے مخلوق خدا کی خدمت انجام دوں۔ نیز اس نے جو ملک بھی فتح کیا اس کی رعایا پر عفو و کرم ہی کی بارش کی اور کبھی ان کو نہیں ستایا۔

Marfat.com

اصحاب الکہف والرقیم

(۱۰۰ء تخمیناً)

○ قرآن عزیز اور اصحاب الکہف والرقیم ○ کہف ورقیم؟ ○ واقعہ کی حیثیت ○ تفسیری حقائق ○ نتائج وعبر

قرآن عزیز اور اصحاب الکہف والرقیم:

ابن اسحاق بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ قریش مکہ میں یہ مشورہ ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ بہت سنگین ہوتا جارہا ہے اس لیے ایسا کوئی یقینی فیصلہ ہونا چاہئے کہ یہ صادق ہیں یا کاذب تاکہ ہم ان کے متعلق اپنی آخری رائے پر عمل کرسکیں۔ بہتر یہ ہے کہ اس مسئلہ کو یہود مدینہ سے حل کیا جائے کیونکہ وہ خود کو اہل کتاب کہتے اور اس قسم کے معاملات میں صاحب بصیرت ہیں۔ قریش نے اس غرض سے نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط پر مشتمل ایک وفد علماء یہود کے پاس بھیجا۔ علماء یہود نے ان سے کہا کہ تم ان سے تین باتیں دریافت کرو، اگر وہ صحیح صحیح جواب دیں تو بلاشبہ وہ خدا کے سچے رسول ہیں، تم کو ہرگز ان کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے، اور اگر وہ صحیح جواب نہ بتاسکیں تو تم کو اختیار ہے جو چاہو ان کے ساتھ کرو۔ وہ تین سوال یہ ہیں:

① ذوالقرنین کا واقعہ کیا ہے؟ ② اصحاب کہف کون تھے اور ان پر کیا گزرا؟ ③ روح کی حقیقت بیان کیجئے؟

وفد نے مکہ جا کر صنادید قریش سے صورتحال کہہ سنائی اور قریش نے اس بات کو بہت پسند کیا اور خدمت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تینوں سوالات کیے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا جواب وحی آنے پر دوں گا۔ چنانچہ جب وحی کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان واقعات کی حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے سورۂ کہف تلاوت کر کے واقعات کی حقیقت ان پر واضح کر دی:

﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ فَضَرَبْنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْۤا اَمَدًا ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ۝ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْ لَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى

عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴿١٥﴾ وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ
رَّحْمَتِهٖ وَ يُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿١٦﴾ وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ
الْيَمِيْنِ وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ
اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿١٧﴾ وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ ۖۗ وَّ
نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ ۖۗ وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ
لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿١٨﴾ وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ
مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ
بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَ لْيَتَلَطَّفْ وَ لَا
يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿١٩﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْۤا
اِذًا اَبَدًا ﴿٢٠﴾ وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ
يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤى
اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿٢١﴾ سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ
كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ
اِلَّا قَلِيْلٌ ۫ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّ لَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿٢٢﴾ وَ لَا تَقُوْلَنَّ
لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ٞ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَ قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّهْدِيَنِ
رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿٢٤﴾ وَ لَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿٢٥﴾ قُلِ اللّٰهُ
اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ٞ وَّ لَا
يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ﴿٢٦﴾ وَ اتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ۫ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ
دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿٢٧﴾ وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا
تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ
هَوٰىهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿٢٨﴾ وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّاۤ
اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ؕ
بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَ سَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٢٩﴾ (الكهف: ٩-٢٩)

Marfat.com

”کیا تم نے یہ گمان کرلیا ہے کہ اصحاب کہف ورقیم کا معاملہ ہماری نشانیوں میں سے کوئی عجیب (معاملہ) ہے جب کہ چند نوجوان پہاڑ کے غار میں پناہ گیر ہوگئے تھے اور یہ دعا مانگ رہے تھے اے ہمارے پروردگار! تو اپنے پاس سے ہم کو رحمت عطا کر اور ہمارے لیے رشد وہدایت مہیا کر پھر ہم نے غار میں چند سال تک کے لیے ان کو تھپک کر سلا دیا، پھر ان کو اٹھایا (بیدار کیا) تاکہ ہم جان لیں کہ دونوں (بستی والوں اور غار والوں) میں سے کس نے ان کی مدت کا صحیح اندازہ لگایا، ہم تجھ کو ان کا صحیح اور سچا واقعہ بتائے دیتے ہیں، بیشک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت کی روشنی اور زیادہ عطاء کردی تھی اور جب وہ (حاکم وقت کے سامنے) یہ اعلان کرنے پر کمربستہ ہوگئے کہ ہمارا پروردگار وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے اور ہم ہرگز اس کے علاوہ کسی کو خدا نہیں پکار سکتے اور اگر ایسا کریں تو خدا پر بہتان باندھیں گے، اس وقت ہم نے ان کے دل خوب مضبوط کردیے تھے وہ کہتے تھے کہ یہ ہماری قوم ہے جنہوں نے اللہ کے ماسوا بہت سے معبود بنالیے ہیں۔ یہ کیوں کھلی دلیل اپنے معبودانِ باطل (کی صداقت) کے لیے نہیں لاتے پس اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹی تہمت لگائے اور اے رفیقو! جب تم ان سے اور ان کی عبادت سے جو اللہ کے سوا وہ باطل معبودوں کی کرتے ہیں علیحدگی اختیار کرتے ہو تو پہاڑ کے غار میں چلے چلو تمہارا پروردگار اپنی رحمت نچھاور کرے گا اور تمہارے معاملہ میں سہولت کار پیدا کرے گا اور اے پیغمبر! تم سورج کو دیکھو گے کہ وہ نکلتے وقت ان کے غار سے داہنی جانب بچ کر نکل جائے گا اور ڈوبتے وقت غار سے کترا کر بائیں جانب کو ہوجاتا ہے اور وہ کشادہ غار میں ہیں یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے جس کو وہ ہدایت دے وہی راہ یاب ہے اور جس شخص کو اس کی مسلسل سرکشی کی بنا پر گمراہ کرے تو اس کے لیے کسی راہ دکھانے والے مددگار کو نہ پائے گا اور تو ان کو بیدار گمان کرے گا حالانکہ وہ سو رہے ہوں گے اور ہم ان کی کروٹیں بدلتے رہتے ہیں داہنے بھی اور بائیں بھی اور ان کا کتا اپنے اگلے ہاتھ پھیلائے غار کے منہ پر بیٹھا ہوا ہے اگر تو ان کو جھانک کر دیکھے تو ان کی اس شان اور حالت کو دیکھ کر مرعوب ہوجائے اور بھاگ پڑے اور اسی طرح ہم نے ان کو اٹھا دیا جگا دیا تاکہ آپس میں پوچھ گچھ کریں۔ ایک نے ان میں سے کہا تم غار میں کب سے ہو؟ دوسروں نے جواب دیا ایک دن یا دن کے کچھ حصہ سے۔ پھر انہوں نے کہا تمہارا پروردگار ہی خوب جانتا ہے کہ تم یہاں کتنی مدت سے ہو تو (اب یہ کرو کہ) اپنے میں سے کسی ایک کو شہر میں یہ سکہ دے کر بھیجو کہ وہ تمہارے لیے دیکھ بھال کر عمدہ قسم کا کھانا لائے اور اس کو چاہیے کہ بہت ہی رازدارانہ طریقہ پر جائے اور ہرگز کسی کو اطلاع نہ ہونے دے کہ ہم یہاں مقیم ہیں اس لیے کہ اگر ان پر تمہارا معاملہ منکشف ہوگیا تو وہ تم کو سنگسار کردیں گے یا تم کو زبردستی اپنے دین کی جانب لوٹانے پر مجبور کریں گے اور اس وقت تم ہرگز کامیاب نہ رہو گے (نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں) اور اسی طرح ہم نے شہر والوں پر ان کا معاملہ ظاہر کردیا تاکہ وہ یہ یقین کرلیں کہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے ہم نے ان کو اس وقت اس معاملہ کی اطلاع دی جب کہ وہ قیامت کے وجود وعدم پر آپس میں اختلاف کررہے تھے پھر وہ کہنے لگے کہ ان اصحاب کہف پر قبہ تعمیر کردو ان کا پروردگار ان کے حال کا خوب واقف کار ہے، یعنی ان سے کوئی تعرض نہ کرو، ان لوگوں نے جو برسر حکومت تھے کہا ہم تو ان کے غار پر ایک مسجد (ہیکل) تعمیر کریں گے اے پیغمبر کچھ لوگ

کہیں گے وہ تین آدمی ہیں چوتھا ان کا کتا ہے کچھ لوگ ایسا بھی کہتے ہیں نہیں پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا ہے یہ سب اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں بعض کہتے ہیں سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے۔ (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم!) کہہ دے ان کی اصل گنتی تو میرا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ ان کا حال بہت کم لوگوں کے علم میں آیا ہے اور تو لوگوں سے اس بارہ میں نزاع نہ کر مگر صرف اس حد تک کہ صاف صاف بات میں ہو (یعنی باریکیوں میں نہیں پڑنا چاہیے کہ کتنے آدمی تھے کتنے دنوں تک رہے تھے) اور نہ ان لوگوں میں سے کسی سے اس بارے میں کچھ دریافت کر اور ہرگز کسی چیز کے متعلق یہ نہ کہنا کہ میں کل کو یہ ضرور کرنے والا ہوں مگر (یہ کہہ کر) کہ ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا اور جب کبھی بھول جاؤ تو اپنے پروردگار کی یاد تازہ کر تو کہہ دو "امید ہے میرا پروردگار اس سے بھی زیادہ کامیابی کی راہ مجھ پر کھول دے گا"۔ اور کہتے ہیں وہ غار میں تین سو برس تک رہے اور لوگوں نے نو برس اور بڑھا دیئے ہیں۔ (اے پیغمبر!) تو کہہ دے اللہ ہی بہتر جانتا ہے وہ کتنی مدت تک رہے وہ آسمان و زمین کی ساری پوشیدہ باتیں جاننے والا ہے بڑا ہی دیکھنے والا بڑا سننے والا ہے کہ اس کے سواء لوگوں کا کوئی کارساز نہیں اور نہ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک کرتا ہے"۔

کہف و رقیم:

لغت میں کہف پہاڑ کے اندر وسیع غار کو کہتے ہیں مگر رقیم کے معنی میں مفسرین کو سخت تردد ہے اور ضحاک اور سدی جو ہر ایک تفسیری روایت کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی جانب ضرور منسوب کر دیا کرتے ہیں۔ اس مقام پر بھی حضرت عبداللہ بن عباس سے متعدد اقوال نقل کرتے ہیں:

یہ رقم سے مشتق ہے اور رقیم بمعنی مرقوم (مکتوب) ہے چونکہ بادشاہ وقت نے ان کی تلاش کے بعد ان کے نام پتھر کی ایک تختی پر کندہ کر دیئے تھے اس لیے ان کو اصحاب رقیم بھی کہا جاتا ہے، سعید ابن جبیر اس کی تائید میں ہیں اور مفسرین کے یہاں یہی قول مشہور ہے۔

یہ وادی کا نام ہے جہاں پہاڑ میں وہ غار تھا جس میں اصحاب کہف روپوش ہوئے تھے۔ قتادہ، عطیہ، عوفی اور مجاہد بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔

یہ اس پہاڑ کا نام ہے جس میں غار تھا۔

عکرمہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ کہتے سنا ((ما ادری ما الرقیم کتاب ام بنیان)) میں نہیں کہہ سکتا کہ رقیم سے کندہ تختی مراد ہے یا شہر مراد ہے۔

بروایت کعب احبار، وہب بن منبہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ ایلہ (عقبہ) کے قریب ایک شہر کا نام ہے، یہ بلاد روم میں واقع ہے۔

تاریخ اور اثری تحقیقات کے پیش نظر یہ آخری قول ہی صحیح اور قرآن عزیز کے بیان کے مطابق ہے اور باقی اقوال محض قیاسی ہیں۔

Marfat.com

اس اجمال کی تفصیل کے لیے تاریخ اور علم الآثار کے چند اوراق کا مطالعہ ضروری ہے، اصل یہ ہے کہ یہ واقعہ بعثت مسیح علیہ السلام سے کچھ زمانہ بعد کا ہے اور انباط کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے یہ انباط کون ہیں؟ اور ان کا مسکن وموطن کہاں ہے؟ یہی وہ گتھی ہے جس کے سلجھ جانے پر حقیقت روشن ہوسکتی ہے۔

مؤرخین عرب انباط کے متعلق عموماً یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ عجمی النسل ہیں اور اسی لیے وہ نبطی کو عربی کا مقابل قرار دیتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے اور عرب مؤرخین کے مختلف تاریخی مقولے اور توراۃ اور رومی و یونانی تاریخیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ نبطی خالص عربی اور اسماعیلی النسل ہیں مگر بدویانہ زندگی ترک کر دینے اور حجاز سے نکل کر دوسرے علاقوں میں بس جانے کی وجہ سے یہ عربوں کے لیے اجنبی ہوگئے حتیٰ کہ خود بھی یہ بھول گئے کہ عرب سے ان کو کیا نسبت ہے؟ اسی بناء پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مشہور مقولہ ہے:

تعلموا النسب ولا تکونوا کنبط السواد اذا سئل احدهم عن اصله قال من قریة کذا.

"اپنے نسب کو سیکھو عراق کے نبط کی طرح نہ بن جاؤ کہ جب ان میں سے کسی سے دریافت کیا جائے کہ تم کس خاندان سے ہو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم فلاں شہر کے ہیں"۔

لیکن "انباط" کی بحث کو چھوڑ کر جب مؤرخین عرب سے دریافت کیا جائے کہ نبط یا نابت کون ہے تو وہ بغیر کسی اختلاف کے فوراً یہ جواب دیں گے "ابن اسمٰعیل علیہ السلام" کیونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ لڑکوں میں سے بڑے کا نام نابت یا نبط ہے، چنانچہ ابن کثیر اپنی تاریخ میں نابت کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

ثم جمیع عرب الحجاز علی اختلاف قبائلهم یرجعون فی انسابهم الی ولدیه نابت و قیدار و کان الرئیس بعده والقائم بالامور الحاکم فی مکة والنظار فی امر البیت و زمزم نابت بن اسمٰعیل وهو ابن اخت الجرهمیین ثم تغلب جرهم علی البیت طمعًا فی بنی اختهم فحکموا بمکة وما والاها عوضا عن بنی اسمٰعیل مدة طویلة فکان اوّل من صار الیه امر البیت بعد نابت مضاض بن عمرو بن سعد بن الرقیب بن عبید بن نابت. ❶

"تمام حجازی عرب کے مختلف قبائل کا نسب حضرت اسمٰعیل کے دو صاحبزادوں نابت اور قیدار پر ختم ہوتا ہے اور اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد ان کا جانشین نابت ہوا وہی تمام امور کا والی مکہ کا حاکم، زمزم اور کعبہ کا متولی قرار پایا اور یہ بنی جرہم کا بھانجا تھا پس بنی جرہم اس تعلق کی وجہ سے اس کے بعد عرصہ تک مکہ پر حاکم و قابض رہے اور اطراف مکہ پر بھی انہی کی حکومت رہی مدت دراز کے بعد نابت کی پانچویں پشت میں سے ایک شخص مضاض نے دوبارہ مکہ کی حکومت اور بیت اللہ کی تولیت کو بنی جرہم کے قبضہ سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لی"۔

---

❶ البدایہ والنہایہ ج ۲

Marfat.com

مگر اس کے آگے عرب مؤرخین عام طور پر اس بارے میں خاموش ہیں کہ جب نابت بن اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل کثرت سے بڑھی تو کیا وہ صرف حجاز ہی کے اندر محدود رہی یا اطراف و جوانب میں پھیلی اور اگر ادھر ادھر گئی تو اس کا سلسلہ کہاں تک پھیلا۔ البتہ ابن خلدون نے اس سے متعلق معلومات میں کچھ اضافہ کیا ہے، وہ کہتا ہے:

"نابت بن اسمٰعیل بیت اللہ کا متولی ہوا اور مکہ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ مقیم رہا تا آنکہ اس کی نسل نے اس درجہ ترقی کی کہ وہ مکہ میں نہ سما سکے اور حجاز کے اطراف و جوانب تک میں پھیل گئے"۔ ❶

لیکن توراۃ نے اس سلسلہ میں مختلف مقامات پر جو کچھ کہا ہے وہ اصل گتھی کو سلجھانے میں بہت زیادہ مدد و معاون ثابت ہوتا ہے اس نے شروع میں تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی فہرست دی ہے اور اس کے بعد اس نے یہ بتایا ہے کہ خاندان نابت سائیر (کوہ سراط) یعنی حجاز سے شام کے علاقوں تک پھیلا ہوا ہے اور ایلہ (عقبہ) تک ان کا قبضہ ہے توراۃ میں نابت کا تلفظ بھی مختلف طریقوں سے مذکور ہے کہیں بنیت ہے تو کہیں نبیط اور کہیں نبایوط۔

توراۃ کے حوالہ جات یہ ہیں:

"یہ اسماعیل کے بیٹوں کے نام ہیں مطابق ان کے ناموں اور نسبتوں کی فہرست کے اسمٰعیل کا پہلوٹھا نبیت اور قیدار اور ادبئیل اور بیسام اور مسماع اور دومہ اور منشا اور حدر اور تیمہ اور اطور اور نفیس اور قدماہ"۔ ❷

یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں یروشلم کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

"اور قوموں کی دولت تیرے (یروشلم) کے پاس فراہم ہوگی اونٹوں کی قطاریں اور مدیان اور عنیفہ کی سانڈنیاں تیرے گرد آ کے جمع ہوں گی وہ سب جو سبا کے ہیں آئیں گے۔ قیدار کی ساری بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی۔ نبیت کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے"۔ ❸

اور حزقیل نبی کے صحیفہ میں ہے:

"بنایوط (نابت) کی بھیڑیں نذر لی جائیں گی"۔ ❹

اور سفر تکوین میں خاندان نابت کا علاقہ سکونت یہ بتاتے ہیں:

"اور وہ حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے جس سے آشور کو جاتے ہیں بستے تھے ان کا قطعہ زمین ان کے سب بھائیوں کے سامنے پڑا تھا"۔ ❺

ان حوالجات کی تفصیل و تشریح کے لیے اب اگر ان رومی مؤرخین کی شہادات بھی شامل کر لی جائیں جو نبطیوں (انباط) کے معاصر ہیں تو یہ بات بالکل ہی صاف ہو جاتی ہے کہ انباط اور بنو نابت بن اسمٰعیل علیہ السلام ایک ہی ہیں اور یہ کہ انہوں نے غیر متمدن زندگی کو چھوڑ کر متمدن زندگی اختیار کر لی تھی۔

یوسیفوس جو پہلی صدی عیسوی میں ہو گزرا ہے اور انباط کا معاصر بھی ہے لکھتا ہے:

---

❶ جلد ثانی ❷ تکوین باب ۲۵ آیات ۱۳-۱۴ ❸ باب ۲۱ آیت ۱۴
❹ باب ۲۵ آیت ۱۸ ❺ باب ۲۵ آیت ۱۸

Marfat.com

"ملک بحر احمر سے نہر فرات تک اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کے قبضہ میں ہے جن کے سبب سے ان کا نام بنو طینہ (Nabatena) پڑ گیا ہے اس کی سرحد (مغرب میں) مصر اور عرب سنگستان (Petana) مل گئی ہے، اور بہت سے بیابانوں اور بلند و فراز زمینوں کو شامل ہے جو مشرق کی طرف خلیج فارس تک منتہی ہوتی ہے عموماً اس ملک کے باشندوں کا نام بنایوط عرب (Nelayotn) ہے"۔ [1]

اور ڈائڈ روس ۸۰ ق م بیان کرتا ہے:

"انباط خلیج ایلہ (عقبہ) پر رہتے ہیں"۔ [2]

اور دوسری جگہ لکھتا ہے:

"اوپر گزرتے ہوئے تم خلیج عقبہ (ایلہ) میں داخل ہو گے جس کے حدود پر ان عربوں کی بہت سی آبادیاں ہیں جن کو لوگ نبط کہتے ہیں"۔ [3]

اور آثار اور کتبات میں نبط کا نام سب سے پہلے ۷۰۰ ق م میں نظر آتا ہے جب کہ آشور بنی پال شاہ اسیریا کے کتبہ میں وہ اپنے مفتوحین کی فہرست میں نا تان شاہ نبط کا تذکرہ کرتا ہے۔ [4]

ان تفاصیل کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت بالکل آشکارا ہو جاتی ہے کہ ایلہ (عقبہ) کی خلیج سے شام تک اور سواحل مصر سے خلیج فارس تک جو قوم مسطورہ بالا حوالجات میں برسر اقتدار نظر آتی ہے وہ نابت بن اسمٰعیل ہی کی نسل ہے جو نبط، انباط، بنایوط اور نبیت کے ناموں سے پکاری جاتی رہی ہے۔

البتہ ایک بات طبیعت میں ضرور کھٹکتی ہے اور وہ یہ کہ نابت بن اسمٰعیل علیہ السلام کی جس نسل سے توراۃ اور رومی مؤرخین اس تفصیل کے ساتھ واقف ہوں وہ عرصہ دراز کے بعد اپنے بھائیوں (اہل عرب) کی نگاہ میں کیوں اجنبی ہو گئی بلکہ خود نبطی یہ کیوں بھول گئے کہ وہ خالص عربی النسل اور اسمٰعیل (علیہ السلام) کی اولاد ہیں سو اس کے متعلق یاقوت حموی کے ایک جملہ سے بآسانی جواب دیا جا سکتا ہے۔ یاقوت (عربہ) کے عنوان میں بحث کرتے ہوئے یہ بیان کرتا ہے:

اما النبط فکل من لم یکن راعیًا او جندیا عند العرب من ساکن الارضین.

"اہل عرب دنیا کے ہر اس انسان کو نبطی کہہ دیتے ہیں جو چرواہا یا سپاہی نہ ہو"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاز سے نکل کر مدت مدید کے بعد چونکہ نبطیوں نے بدویانہ، سپاہیانہ زندگی چھوڑ کر متمدن شہریوں کی زندگی اختیار کر لی تھی اس لیے آہستہ آہستہ اہل عرب کی نگاہ میں بنی نابت اجنبی ہو گئے اور وہ ان کو بھی عجمی حکمرانوں کی طرح سمجھنے لگے لہٰذا ان کے طریق بود و ماند معاشرتی تمدن اور اختلاف احوال نے ان حجازیوں سے الگ کر کے ان ہی کے بھائیوں کی نگاہ پر ان کے حجابی پردے ڈال دیئے۔

---

[1] ماخوذ از گولڈ کائس آف رین ص ۲۲۵ انٹی ۱۲ (ارض القرآن ج ۲)

[2] ارض القرآن ج ۲ ص ۶۱، ماخوذ از گولڈ کائس آف مدن ص ۲۲۵ اینٹی (۱۲)

[3] ایضاً ج ۲ ص ۶۰ [4] ایضاً ج ۲ ص ۶۰

مؤرخین کے نزدیک انباط کا رقبہ حکومت تین مختلف العہد قوموں کے دائرۂ حکومت پر حاوی تھا یعنی ① ثمود کا ملک "وادی قریٰ" اس کا دارالحکومت مشہور شہر حجر تھا۔ ② ملک مدین اس کا دارالحکومت خود شہر مدین ہی تھا۔ ③ ملک ادوم اس کا دارالحکومت رقیم تھا۔ [1]

انباط کا زمانہ حکومت ۷۰۰ ق م سے شروع ہو کر ۱۰۶ تک ختم ہو جاتا ہے، اوائل صدی عیسوی میں رومیوں نے ان پر لشکر کشی کر کے اور شکست دے کر رقیم اور اس کے پورے علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا اور انباط کے پاس صرف حجر کا علاقہ باقی رہ گیا تھا جو ۱۰۶ء میں جب ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو انباط کی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا، رومیوں نے رقیم پر قبضہ کرنے کے بعد جب اس کو اپنی تمدنی، سیاسی اور معاشرتی ترقیوں کا مرکز بنایا تو اس کا پرانا نام بدل کر پیٹرا رکھا۔

یہی وہ رقیم ہے جس کا ذکر اصحاب کہف کے واقعہ میں قرآن عزیز نے کیا ہے: ﴿ اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ ﴾ اور یہی وہ شہر ہے جس کے کچھ سعادت مند انسان بت پرستی سے نفور ہو کر اور بت پرست حکمرانوں کے ظلم و جور سے محفوظ رہنے کی خاطر اس شہر کے پہاڑ کے ایک غار میں چھپ رہے تھے۔ پس حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ ارشاد کہ رقیم "ایلہ" کے قریب شہر تھا اور یہ کہ وہ روم کے علاقہ میں تھا بالکل صحیح اور قرآن اور تاریخ دونوں کے عین مطابق ہے۔ بلا شبہ وہ ایلہ (خلیج عقبہ) کے قریب واقع تھا اور چونکہ رومیوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا اس لیے اس کو روم کے علاقہ میں شمار کرنا قطعاً درست ہے۔

مگر حیرت ہے اس تاریخی انقلاب پر کہ جب رومیوں نے انباط کے اس مرکزی شہر کا نام پیٹرا رکھ دیا تو اس نام نے تھوڑے ہی دنوں میں اس درجہ شہرت حاصل کر لی کہ عرب اور عجم نے اس کے سیناؤں اور فنون لطیفہ کی نیرنگیوں سے متاثر ہو کر اس کا اصل نام بالکل فراموش کر دیا اور ان کے لیے چند صدیوں ہی میں رقیم ایک اجنبی اور غیر معلوم نام ہو گیا حتیٰ کہ اہل عرب نے بھی اس کو بطرا ہی کے نام سے یاد رکھا اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب قرآن نے اس کا اصل نام بیان کیا تو دوسروں کی طرح اہل عرب بھی حیران تھے کہ رقیم غار کا نام ہے یا لوہے کی تختی کا یا پہاڑ کا یا شہر کا لیکن جس نام کو انباط کے بھائیوں (حجازیوں) نے بھلا دیا تھا اس کو توراۃ نے اپنی سند میں محفوظ رکھا تاکہ جب نبی امی "وحی کے ذریعہ" اصل حقیقت کا اعلان کرے تو وہ اس کی تائید کے لیے خود کو پیش کر سکے۔ [2]

گزشتہ جنگ عظیم کے بعد آثار قدیمہ کی تحقیقات نے جہاں اور بعض جدید انکشافات کیے ہیں ان میں سب سے نمایاں اسی شہر رقیم (پیٹرا یا بطرا) کی دریافت ہے اور اس کے متعلق جس قدر اثری تحقیق کی جا رہی ہے اس سے قرآن عزیز کی حرف بہ حرف تصدیق ہوتی جاتی ہے۔

خلیج عقبہ (ایلہ) سے شمال کی جانب بڑھتے ہوئے پہاڑوں کے دو متوازی سلسلے ملتے ہیں ان ہی میں سے ایک پہاڑ کی بلندی پر انباط کا دارالحکومت رقیم آباد تھا۔

اس شہر کی موجودہ زمانہ میں جو اثری پیمائش کی جا رہی ہے اس میں نئے نئے انکشافات کے ساتھ اس کے پہاڑوں کے عجیب و غریب "غار" بھی قابل ذکر ہیں، یہ غار بہت وسیع اور دور دور تک چلے گئے ہیں اور اس طرح واقع ہیں کہ دن کی دھوپ اور تپش ان تک نہیں پہنچتی۔ ایک غار ایسا بھی دریافت ہوا ہے کہ جس کے دہانہ پر قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بہت سے

---

[1] ادوم کا علاقہ اوّل عیسو بن اسحاق (علیہ السلام) کے قبضہ میں تھا جیسا کہ ادملہ کے ذکر میں قصص القرآن جلد دوم میں ذکر ہو چکا ہے۔

[2] توراۃ سفر عدد اور صحیفہ یسعیاہ میں اس شہر کا نام راقیم بیان کیا گیا ہے۔ دائرۃ المعارف (عرب)

ستونوں کے کھنڈر باقی رہ گئے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کسی ہیکل کی عمارت ہے۔

اس صاف اور بے لاگ اثری اور تاریخی شہادتوں کے بعد یہ کہنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ قرآن عزیز نے جب اصحاب کہف کا واقعہ بیان کیا ہے وہ اسی شہر رقیم سے تعلق رکھتا ہے۔

واقعہ:

اسماعیلی عربوں کے مذہب سے متعلق تاریخ کے صفحات یہ شہادت دیتے ہیں کہ ان میں گو کچھ عرصہ باپ دادا کا دین حق "ملت ابراہیم" باقی رہا مگر آہستہ آہستہ مصر، شام اور عراق کے صنم پرستوں کے تعلقات نے عمرو بن لحی کے ذریعہ ان میں بت پرستی اور ستارہ پرستی کی داغ بیل ڈال دی اور کچھ عرصہ بعد ان عربوں کو شرک پرستی میں ایسا ید طولیٰ حاصل ہو گیا کہ وہ دوسروں کے لیے پیش رو بن گئے چنانچہ نابت کی اولاد بھی شرک کی گمراہی میں مبتلا تھی اور ان کے مشہور بت ذوالشریٰ لات، منات، ہبل، کسعہ، عمیانس اور حریش تھے۔ ❶ صدیوں تک نبطی بت پرستی کی اس گمراہی میں مبتلا رہے کہ مسیحی دور کے اوائل میں دارالحکومت رقیم کے اندر ایک عجیب معاملہ پیش آیا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مسیحی مذہب کا ابتدائی دور ہے نبطی حکومت کے اطراف یعنی شام وغیرہ میں عیسائیت کا زور ہے کہ رقیم کی چند نوجوان سعید روحیں شرک سے بیزار اور نفور ہو کر توحید کی جانب مائل ہو جاتی اور اور دین عیسوی کو قبول کر لیتی ہیں شدہ شدہ یہ بات بادشاہ وقت تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ نوجوان کو دربار میں بلاتا اور انکشاف حال چاہتا ہے، نوجوان کلمہ حق بلند کرنے میں بے باک اور جری ثابت ہوتے ہیں یہ بات بادشاہ کو ناگوار گزرتی ہے مگر وہ دوبارہ معاملہ پر غور کرنے کے لیے ان کو چند روز کی مہلت دیتا ہے یہ دربار سے واپس آ کر آپس میں مشورہ کرتے ہیں اور طے پاتا ہے کہ خاموشی کے ساتھ کسی پہاڑ کے غار میں پوشیدہ ہو جانا چاہیے تاکہ مشرکوں کے شر سے محفوظ رہ کر عبادت الٰہی میں مشغول رہ سکیں۔ یہ سوچ کر وہ ایک غار میں پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔ جب وہ غار میں داخل ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر نیند طاری کر دیتا ہے اور وہ خواب ہی کی حالت میں کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔ غار کی عجیب کیفیت ہے، اندر سے بہت وسیع ہے مگر قدرت نے اس کو ایسا موقع نصیب کیا ہے کہ زندگی کی بقاء کے قدرتی سامان وہاں سب موجود ہیں، ایک طرف دھانہ ہے تو دوسری جانب ہوا گزرنے کے منفذ اور سوراخ ہیں جن کی وجہ سے ہر وقت تازہ ہوا اندر آتی جاتی رہتی ہے۔ غار شمال وجنوب رویہ ہے اس لیے طلوع وغروب کے وقت آفتاب کی تپش اندر نہیں پہنچ پاتی مگر ہلکی ہلکی روشنی برابر پہنچتی رہتی ہے اور ایسی کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ نہ تاریکی ہی ہے کہ کچھ نظر نہ آئے اور نہ اتنی روشنی ہے کہ کھلے میدان کی طرح جگہ روشن ہو جائے۔ اس حالت میں چند انسان اس غار میں خواب آلود ہیں اور ان کا رفیق کتا اپنے اگلے ہاتھ پھیلائے غار کے دھانہ پر باہر کی جانب منہ کیے بیٹھا ہے۔

اس مجموعی صورت حال نے ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ پہاڑوں کے درمیان غار کے اندر جھانکنے والے انسان پر خوف و ہراس کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بھاگ کھڑے ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

برسوں تک یہ نوجوان اسی حالت میں آرام کے ساتھ محفوظ رہتے ہیں کہ شہر میں انقلاب ہو جاتا ہے رومی عیسائی نبطی حکومت

---

❶ کتاب الاصنام لابن الکلبی

Marfat.com

پر حملہ آور ہوتے ہیں اور دشمن کو شکست دے کر اس پر قابض ہو جاتے ہیں اور اس طرح رقیم (پیٹرا) عیسائیت کے آغوش میں آ جاتا ہے۔ اب خدا کی مشیت فیصلہ کرتی ہے کہ یہ نوجوان بیدار ہوں، وہ بیدار ہو جاتے ہیں اور آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے ایک دوسرے سے دریافت کرتے ہیں کہ ہم کتنی مدت سوتے رہے؟ ایک نے جواب دیا کہ ایک دن اور دوسرے نے کہا یا دن کا بھی کچھ حصہ۔ پھر کہنے لگے کہ ہم میں سے کوئی شہر جا کر کھانا لے آئے اور یہ سکہ لے جائے مگر جو بھی جائے اس طرح لین دین کرے کہ شہر والوں کو پتہ نہ لگ سکے کہ ہم کون ہیں اور کہاں ہیں؟ ورنہ مصیبت آ جائے گی۔ بادشاہ ظالم بھی ہے اور مشرک بھی، وہ یا تو شرک پر آمادہ اور بے دینی پر مجبور کرے گا اور یا ہم سب کو قتل کر ڈالے گا اور یہ باتیں ہمارے دین و دنیا کو برباد کر دینے والی ثابت ہوں گی۔

اب نوجوانوں میں سے ایک شخص سکہ لے کر شہر گیا، وہاں دیکھا تو حالات بالکل بدل چکے ہیں اور نئے آدمی اور نیا طور و طریقہ نظر آ رہا ہے، مگر پھر بھی وہ ڈرتے ڈرتے ایک باورچی کی دوکان پر پہنچا اور کھانے پینے کی چیزیں خریدیں، جب قیمت ادا کرنے لگا تو باورچی نے دیکھا کہ سکہ قدیم ہے اس طرح آخر بات کھل گئی لوگوں کو جب اصل حقیقت معلوم ہوئی تو انہوں نے اس شخص کا خیر مقدم کیا اور اس عجیب و غریب معاملہ سے بہت زیادہ دلچسپی لی کیونکہ عرصہ ہوا کہ یہاں مشرک بادشاہوں کا دور ختم ہو چکا تھا اور یہاں کے باشندوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔

اس شخص نے جب یہ حال دیکھا تو اگرچہ عیسائیت پھیل جانے سے اس کو بے حد خوشی ہوئی مگر اپنے اور اپنے رفیقوں کے لیے یہی پسند کیا کہ دنیا کے ہنگاموں سے علیحدہ رہ کر یاد خدا میں گزار دیں اس لیے کسی طرح مجمع سے جان بچا کر پہاڑ کی راہ لی اور اپنے رفقاء میں پہنچ کر سب حال کہہ سنایا۔ ادھر شہریوں میں ان کی جستجو کا شوق پیدا ہوا اور انہوں نے آخر ان کو ایک غار میں پا لیا۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ وہ شہر چلیں اور اپنی پاک زندگی سے اہل شہر کو فائدہ پہنچائیں مگر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے اور انہوں نے اپنی عمر کا باقی حصہ راہبانہ زندگی کے ساتھ اسی غار میں گزار دیا۔

جب ان مردانِ خدا راہبوں کا انتقال ہو گیا تو اب لوگوں میں چرچا ہوا کہ ان کی یادگار قائم ہونی چاہیے۔ چنانچہ ان میں جو حضرات ذی اثر اور با اقتدار تھے انہوں نے کہا کہ ہم تو ان کے غار پر ہیکل (مسجد) تعمیر کریں گے اور غار کے دہانہ پر ایک عظیم الشان ہیکل تعمیر کرا دیا۔ ①

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ جب اس جوان کے پیچھے بادشاہ وقت اور پبلک دونوں آئے تو غار کے قریب پہنچ کر وہ یہ نہ معلوم کر سکے کہ جوان کس جانب چلا گیا اور جب بہت جستجو کے بعد بھی اصحاب کہف کا پتہ نہ پا سکے تب مجبور ہو کر واپس گئے اور ان کی یاد میں پہاڑ پر ایک ہیکل (مسجد) تعمیر کر دیا۔

واقعہ کی تاریخی حیثیت:

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر بزرگوں کی نقول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے کچھ زمانہ بعد کا ہے یعنی ابتداء دور مسیحی کا واقعہ ہے مگر مجھ کو اس قول میں یہ تردد ہے کہ محمد بن اسحٰق کی اس روایت

---

① فتح الباری ج اول حدیث غار و تفسیر ابن کثیر ج ۳ سورۂ کہف البدایہ والنہایہ ج ۲

Marfat.com

سے جو اس واقعہ کے شانِ نزول سے متعلق ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب کہف کے بارے میں قریش مکہ کو یہود نے تعلیم کیا تھا کہ وہ دوسرے سوالوں کے ساتھ ایک سوال یہ بھی کریں اور یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اس واقعہ کے ساتھ یہود کو خاص دلچسپی تھی پس اگر یہ واقعہ عیسائیت کی ترقی سے متعلق تھا تو یہود کو اس کے ساتھ دلچسپی کے کیا معنی کیونکہ یہودیت اور عیسائیت تو نبرد آزما اور حریف جماعتیں ہیں اس سے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام سے بہت پہلے یہودی دور سے متعلق ہے۔ [1]

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ سوال اگرچہ اہمیت رکھتا ہے لیکن تاریخی سندات اس کی تائید نہیں کرتیں بلکہ خلاف فیصلہ کرتی ہیں اس لیے کہ یہ مسلم ہے کہ واقعہ زیر بحث شہر رقیم میں پیش آیا ہے اور یہ بھی طے شدہ حقیقت ہے کہ رقیم اپنی آبادی کے وقت سے کبھی یہودیت سے متاثر نہیں ہوا بلکہ نبطی دور میں بت پرستی کا گہوارہ رہا اور اس کے بعد رومیوں نے جب اس پر قبضہ کر لیا تو وہ عیسائیت کی آغوش میں آ گیا۔ چنانچہ رقیم کی تاریخ ان ہی دو عہدوں سے بنتی ہے تو پھر ایک خاص نکتہ کے پیش نظر محض ظن وتخمین سے کس طرح اس واقعہ کو یہودیت سے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مسیحی مذہب کے ابتدائی دور میں اس قسم کے چند واقعات اور بھی پیش آئے ہیں جن میں مشرک اور بت پرست بادشاہوں کے خوف سے عیسائیوں نے غاروں اور پہاڑوں میں جا کر راہبانہ زندگی اختیار کی ہے چنانچہ ایک واقعہ شہر افسس میں پیش آیا، ایک انطاکیہ میں اور ایک خود روم میں پیش آ چکا ہے۔ لہٰذا قرآن عزیز نے ایک ایسے ہی واقعہ کی خبر دی ہے جو شہر رقیم یا راقیم میں پیش آیا تھا۔

اس بنا پر ابن اسحٰق کی روایت کے متعلق دو باتوں میں سے ایک بات تسلیم کرنی چاہیے، اوّل یہ کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس روایت میں تین سوالات کا جو ذکر کیا ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو سوالات تو صرف یہودی علماء کے بنائے ہوئے تھے اور ان سے مشرکین مکہ قطعاً نا آشنا تھے مگر تیسرے سوال واصحاب کہف کا سوال، سے متعلق خود قریش مکہ کو بھی ایک حد تک علم تھا اس لیے کہ یہ واقعہ ان کے بہت قریب ہی پیش آیا تھا اور اگرچہ وہ رقیم کو بھول گئے تھے لیکن پیٹرا (بطرا) سے وہ بخوبی واقف تھے اور شام کی تجارت کی وجہ سے نبطیوں کے ساتھ ان کا ہر وقت کا واسطہ تھا اور واقعہ بھی کچھ زیادہ طویل عرصہ کا نہ تھا پس ہو سکتا ہے کہ وہ اس واقعہ کی کچھ معمولی باتیں جانتے ہوں اور چونکہ اس کا تعلق اہل کتاب سے تھا اس لیے قریشیوں نے آپ کی صداقت کے امتحان کے لیے بمشورۂ یہود اس کو بھی شامل کر لیا ہو اور چونکہ سوالات بہر حال مشرکین ہی کی جانب سے کیے گئے اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اختصار کے طور پر ان تینوں کو ایک ہی اسلوب سے نقل فرما دیا۔

یہ احتمال محض اندھیرے کا تیر نہیں ہے بلکہ قرآن عزیز کے اسلوب بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ زیر بحث تینوں سوالات میں سے پہلے اور دوسرے سوالوں کے متعلق قرآن کا اسلوب بیان یہ ہے ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ﴾ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ﴾ یعنی ان دونوں جگہ سوال کی حیثیت نمایاں کیا ہے مگر تیسرے مسئلہ میں پیرایہ بیان اس سے جدا یہ اختیار کیا گیا ہے ﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ ١ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا﴾ اس جگہ اگرچہ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ہے لیکن مقصود وہی لوگ ہیں جو سوال کر رہے ہیں اور اس واقعہ کی کچھ حقیقت جاننے کی وجہ سے اسے ایک عجیب وغریب واقعہ سمجھتے اور

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ سورۂ کہف البدایہ والنھایہ ج ۲

Marfat.com

نبی اکرم ﷺ سے مزید تفصیلات کے طالب ہیں۔ نیز اسی واقعہ میں قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ جب آپ ﷺ اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ ان کو بتائیں گے تو آپ ان کی تعداد کے بارے میں مختلف چرچے سنیں گے ﴿سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ﴾ ﴿يَقُولُونَ خَمْسَةٌ﴾ یہ بھی ثبوت ہے اس امر کا کہ قریش مکہ ضرور اس واقعہ سے قدرے آگاہ تھے اور اسی لیے "الرقیم" کہہ کر قرآن نے اس جانب ان کو توجہ دلائی کہ تم آج جس کا "بطرا" کہہ کر ذکر کرتے ہو وہ دراصل تمہارے ہی بھائیوں کی حکومت کا مرکزی شہر "رقیم" ہے جو تم سے فراموش ہو چکا ہے۔

دوسری بات یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے رومیوں کی فتوحات رقیم وحجر تک نبطیوں کے ہاتھوں یہودیوں کو ہر قسم کی تکالیف پیش آ چکی اور ان کے ساتھ سیاسی و مذہبی حریفانہ نبرد آزمائیاں بھی ہو چکی تھیں۔ [1] اس لیے اگرچہ اس واقعہ میں عیسائیت کی صداقت کا ایک پہلو ضرور نکلتا تھا تاہم نبطیوں کی مشرکانہ زندگی اور رومیوں کے ہاتھوں ان کی تذلیل وتحقیر کا پہلو بھی کچھ کم نمایاں نہیں ہوتا تھا جو بہر حال ان کی مسرت کا باعث تھا اور اس لیے غالباً یہود نے اس حیثیت کو نظر انداز کر دیا اور دو سوالوں کے ساتھ اس تیسرے سوال کو بھی خصوصیت کے ساتھ منتخب کیا۔

تفسیری حقائق:

① ﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ⑨﴾

"اے پیغمبر ﷺ! کیا تو خیال کرتا ہے کہ غار اور رقیم ہماری نشانیوں میں سے عجیب نشانی تھے؟"

یعنی جو لوگ اس واقعہ کو خدا کی نشانیوں میں سے بہت زیادہ نشانی سمجھ رہے ہیں تو ان پر یہ ظاہر کر دو کہ میرے خدا کے نشان یوں تو کائنات انسانی کے لیے بلاشبہ عجیب ہیں لیکن اس کی قدرت کاملہ کے پیش نظر اس کے دوسرے نشانات کے مقابلہ میں یہ کوئی عجیب وغریب نشان نہیں ہے اس لیے کہ زمین وآسمان کی صناعی سورج چاند اور ستاروں کی تخلیق اور ان کا حیرت انگیز نظام کشش نظام فلکی کی یہ بے نظیر ترتیب انسان پر وحی الٰہی کا نزول اور بظاہر اسباب حق کی کمزوری اور باطل کی قوت کے باوجود حق کی فتح اور باطل کی شکست ایسے امور ہیں جو اس واقعہ سے کہیں زیادہ تعجب خیز اور حیرت انگیز ہیں پس جن لوگوں کو یہ واقعہ بادیٔ النظر میں عجیب معلوم ہوتا ہے وہ اگر قدرت حق کی مسطورہ بالا کار فرمائیوں پر نگاہ حقیقت آگاہ سے غور کریں تو پھر ان کو بھی اقرار کرنا پڑے کہ بلاشبہ قدرت حق کے سامنے یہ واقعہ نہ عجیب ہے اور نہ حیرت انگیز البتہ عبرت زا اور بصیرت افزا ضرور ہے۔ ﴿لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ﴾

② امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اصحاب کہف پر بھی ایک باب معنون کیا ہے مگر مسطورہ بالا واقعہ سے متعلق مشہور حدیث ان کی شرائط کے مطابق ثابت نہیں ہوئی اس لیے انہوں نے سورۂ کہف کی آیات زیر بحث کی تفسیر اس روایت کے ذریعہ نہیں کی البتہ انہوں نے بنی اسرائیل کے ایک دوسرے واقعہ کے پیش نظر جو کہ "حدیث الغار" کے عنوان سے معنون ہے یہ سمجھا ہے کہ "اصحاب کہف" اور اصحاب رقیم دو الگ الگ شخصیتیں ہیں اور اصحاب رقیم وہ حضرات ہیں جن کا ذکر "حدیث الغار" میں کیا گیا ہے اسی بناء پر انہوں نے حدیث الغار کو "اصحاب رقیم" کی تفسیر میں نقل فرمایا ہے۔ حدیث غار کا واقعہ یہ ہے:

---

[1] سفر عدد باب ۲۰ آیات ۱۴-۲۱ و یسعیاہ

Marfat.com

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں سے پہلے بنی اسرائیل میں سے تین شخص سفر کر رہے تھے اثناء راہ میں بارش آ گئی، وہ تینوں ایک پہاڑ کی کھو (غار) میں پناہ لینے کے لیے داخل ہو گئے اتفاقاً پہاڑ کی اونچائی سے ایک بھاری پتھر لڑھک کر غار کے منہ پر آ گرا اور اس کو ڈھانپ لیا۔ یہ دیکھ کر تینوں نے ایک دوسرے سے کہا بھائی اب اس ویرانہ میں اس حادثہ سے نجات کی بظاہر اسباب تو کوئی صورت نظر نہیں آتی البتہ اگر ہم میں سے ہر ایک شخص اپنی زندگی کے کسی ایسے کام کا ذکر کر کے جو اس نے ریاء و نمود سے خالی صرف رضاء الٰہی کی خاطر کیا ہو رب العالمین کی درگاہ میں دعا مانگے تو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے نجات دے دے، تب ان میں سے ایک نے کہا خدایا تجھ کو خوب معلوم ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ایک مزدور سے چند سیر چاولوں پر مزدوری کرائی تھی مگر کام کے بعد مزدور چلا گیا اور اس کی اجرت میرے ذمہ باقی رہ گئی۔ فصل پر جب میں نے چاول کی کاشت کی تو اس کا حصہ بھی شامل کر لیا اور پیداوار پر اس کے حصہ کے چاولوں سے ایک عمدہ بیل خرید لیا۔ اس عرصہ میں مزدور آیا اور اس نے اپنی مزدوری کا مطالبہ کیا میں نے بیل کی رسی اس کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ یہ تیری مزدوری کا حاصل ہے اور اس کو واقعہ سنایا وہ بہت خوش ہوا اور بیل کو لے گیا۔ پس اے خدا اگر تیرے نزدیک میرا یہ عمل صرف تیری خوشنودی اور حقوق العباد کی حفاظت پر مبنی تھا تو اس کی برکت سے ہماری اس مصیبت کو دور کر دے چنانچہ اس کی دعا کا یہ اثر ہوا کہ بھاری چٹان نے حرکت کی اور غار کے منہ سے کچھ ہٹ گئی اور کشادگی پیدا ہو گئی۔ اب دوسرے نے کہا خدایا تو دانا و بینا ہے کہ میرے والدین بہت ضعیف اور ناتواں تھے اس لیے میرا یہ دستور تھا کہ اپنی بکریوں کا دودھ دوہ کر شام کو سب سے پہلے ان کو پلاتا اور بعد میں اپنے اہل وعیال کو شکم سیر کرتا ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مجھ کو جنگل میں دیر ہو گئی دودھ لے کر گھر آیا تو والدین انتظار کر کے سو چکے تھے اہل وعیال بھوک سے مضطرب اور بے تاب تھے اور دودھ کے خواہش مند مگر میں نے کہا کہ جب تک والدین اٹھ کر نہ پی لیں گے کسی کو دودھ نہیں ملے گا اور والدین کی نیند خراب نہ ہو اس لیے بیدار کرنا بھی نہیں چاہتا تھا اور تمام شب اسی طرح ان کے سرہانے دودھ لیے بیٹھا رہا کہ شاید درمیان میں بیدار ہوں اور بھوک ستائے مگر وہ صبح کو ہی بیدار ہوئے تب میں نے پہلے ان کو دودھ پلایا اور جب وہ سیراب ہو گئے تو بعد میں اہل وعیال کو دیا" پس اے خدا اگر میرا یہ عمل صرف تیری رضاء اور اطاعت والدین کے اداء حق کے لیے تھا تو ہماری اس مصیبت کو ٹال دے پتھر میں دوبارہ جنبش ہوئی اور چٹان اس درجہ ہٹ گئی کہ سامنے آسمان نظر آنے لگا اب تیسرے شخص کی نوبت تھی اس نے کہا! الٰہی تو علیم وخبیر ہے کہ میں اپنی چچا زاد بہن پر عاشق تھا اور اس کے وصل کے لیے بے تاب مگر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتی تھی بمشکل تمام میں نے اس کو سو درہم دے کر ورغلایا اور عمل بد پر آمادہ کر لیا جب میں اس کے قریب ہوا اور ہم دونوں کے درمیان کوئی حائل نہ رہا تو اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا بندۂ خدا، خدا کے خوف سے ڈر اور ناحق عصمت ریزی پر بے باک نہ بن" یہ سنتا تھا کہ مجھ پر تیرا خوف غالب آیا اور میں اس سے الگ ہو گیا اور سو درہم بھی اسی کو بخش دیے الٰہ العالمین اگر میرا یہ عمل خالص تیری رضا اور تیرے خوف کے پیش نظر تھا تو ہماری اس آفت کو دور کر اور ہم کو اس سے نجات دے اس کے بعد فوراً چٹان حرکت میں آئی اور غار کے دہانہ پر سے لڑھک کر نیچے جا رہی اور وہ تینوں اسرائیلی اس مصیبت سے نجات پا کر مسرت وشادمانی کے ساتھ اپنی منزل پر روانہ ہو گئے۔

اس روایت کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بزار اور طبرانی نے سند حسن کے ساتھ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ

سے یہی روایت نقل کی ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ نعمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رقیم کا ذکر کرتے ہوئے سنا آپ غار میں بند رہ جانے والے تین آدمیوں کا واقعہ سنا رہے تھے غالباً اسی بنا پر امام بخاری نے رقیم کی تفسیر میں "یہ حدیث غار" روایت کی ہے۔ ❶

لیکن اس تحقیق کے بعد جو گزشتہ سطور میں زیر بحث آ چکی جب کہ قرآن بعض آثار صحابہ اور تاریخ سے یہ پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ رقیم اس شہر کا نام ہے جس کے کسی پہاڑ کے غار میں اصحاب کہف جا چھپے تھے تو اب مسند بزار اور معجم طبرانی کی روایت کے مبہم الفاظ سے اصحاب رقیم کو اصحاب کہف سے جدا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ روایت نعمان رضی اللہ عنہ میں یہ احتمال موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب رقیم کا ذکر فرما رہے ہوں اور اس کے ساتھ اس واقعہ کا بھی ذکر فرمایا ہو اور بعد کو راوی نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث غار کا واقعہ دراصل اصحاب رقیم کی تفسیر میں ارشاد فرمایا ہے نیز جب کہ عربی زبان میں رقیم کے معنی "غار" کے کبھی نہیں آتے نہ حقیقتاً نہ مجازاً تو پھر یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے "رقیم" بمعنی غار کہہ کر حدیث غار کو اس کی تفسیر بتایا ہو یہ راوی کا وہم ہے اور غالباً اسی لیے بزار اور طبرانی کے علاوہ کسی نے بھی اس اضافہ کو بیان نہیں کیا حالانکہ کتب حدیث میں یہ واقعہ بہ کثرت منقول ہے اور خود صحیح بخاری بھی اس اضافہ سے خالی ہے نیز اگر صحیح روایت سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "الرقیم" کی تفسیر صاف اور واضح الفاظ میں خود ارشاد فرما دی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ جلیل القدر مفسرین اپنی اپنی تحقیق کے مطابق الرقیم کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل فرماتے؟ اور خود حافظ ابن حجر عسقلانی بھی یہ جرات نہ کرتے کہ اس روایت کے خلاف یہ فرمائیں کہ صحیح اور صواب یہ ہے کہ اصحاب کہف اور اصحاب رقیم دونوں ایک ہی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

و قال قوم اخبر الله عن قصة اصحٰب الكهف و لم يخبر عن قصة اصحاب الرقيم (قلت) و ليس كذٰلك بل السياق يقتضى ان اصحاب الكهف هم اصحاب الرقيم۔ ❁

"اور ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کا واقعہ تو ہم کو سنایا ہے مگر اصحاب رقیم کا واقعہ نہیں بیان کیا (میں کہتا ہوں) یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ قرآن کا سیاق یہ چاہتا ہے کہ اصحاب کہف اور اصحاب رقیم ایک ہی ہیں۔"

❷ ﴿فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا﴾ مولانا آزاد نے ﴿فَضَرَبْنَا عَلَى الْاٰذَانِ﴾ کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں "صاف معنی تو یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے یعنی دنیا کی صدا ان تک نہیں پہنچتی تھی۔ ❁ آیت کی تفسیر میں یہ قول ضعیف اور شاذ ہے ❁ اس کے برعکس مفسرین کے نزدیک مشہور تفسیر یہ ہے کہ ان پر نیند طاری ہو گئی تھی چونکہ نیند کی حالت میں آدمی کوئی آواز نہیں سنتا اس لیے اس حالت کو ﴿ضَرَبَ عَلَى الْاٰذَانِ﴾ سے تعبیر کیا گیا مگر اس تفسیر کے متعلق مولانا آزاد یہ فرماتے ہیں اس تفسیر میں اشکال یہ ہے کہ عربی میں نیند کی حالت کے لیے ﴿ضَرَبَ عَلَى الْاٰذَانِ﴾ کی تعبیر نہیں ملتی لیکن وہ (مفسرین) کہتے ہیں یہ ایک طرح کا استعارہ ہے گہری نیند کی حالت کو ﴿ضَرَبَ عَلَى الْاٰذَانِ﴾ کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ❺

❶ فتح الباری ج ٦ حدیث الغار ❁ فتح الباری ج ٦ ص ٢٩٣ ❁ ترجمان القرآن ج ٢
❁ فتح الباری ج ٦ ❺ ترجمان القرآن ج ٢

Marfat.com

ہمارے نزدیک مفسرین کی تفسیر ہی راجح ہے اور یہ استعارہ ہر زبان کے محاورات میں پایا جاتا ہے مثلاً جب ماں گود کے بچے کو لوریاں دے کر سلاتی ہے تو اس کے کان اور بازو پر ہاتھ رکھ کر تھپکتی جاتی ہے اس لیے اردو زبان میں بھی "کانوں کو تھپک دینا" نیند طاری کر دینے کے لیے بولا جاتا ہے چنانچہ شیخ الہند (نور اللہ مرقدہ) نے اس جملہ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔ ❶

"پھر تھپک دیے ہم نے ان کے کان اس کھوہ (غار) میں چند برس گنتی کے۔" (کہف)

علاوہ ازیں عربی زبان میں "ضرب علی اذنه" کے معنی "منعه ان یسمع" کے آتے ہیں یعنی اس کو سننے سے روک دیا" اب سننے سے روک دینے کی متعدد صورتیں ہیں ایک یہ کہ کوئی شخص بستی سے دور جنگل میں غار کی کھوہ میں جا بیٹھا اور اس لیے دنیا کی باتوں سے اس کے کان نا آشنا ہو گئے دوسری یہ کہ وہ بہرا ہو گیا اور سننے سے معذور کر دیا گیا۔ تیسری یہ کہ وہ سو گیا اور اس کے دیگر حواس ظاہرہ کی طرح کان بھی سننے سے معطل ہو گئے۔ لہٰذا "ضرب علی الاذان" کی تعبیر ان سب صورتوں کے لیے یکساں قابل استعمال ہے اور استعارہ وتشبیہ ہے تو تینوں معنی کے لیے ہے البتہ مولانا آزاد کی تفسیر میں یہ اشکال ضرور لازم آتا ہے کہ اگر "ضرب علی الاذان" کے معنی یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے۔ یعنی وہ بحالت بیداری عام زندگی کے مطابق بستی سے دو پہاڑ کے غار میں راہبانہ زندگی بسر کر رہے تھے تو پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے؟

﴿وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۭ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۭ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ﴾ (الکہف: ۱۹)

"اور ہم نے ان کو اٹھایا کہ وہ آپس میں سوال کریں ایک نے ان میں سے کہا تم یہاں کتنی مدت ٹھہرے رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔"

کیا یہ آیت اپنے صاف معنی میں یہ ظاہر نہیں کرتی کہ "ضرب علی الاذان" کی صاف تعبیر یہاں وہی ہے جو جمہور مفسرین کے نزدیک صحیح اور راجح ہے بلکہ ایسے موقع پر ﴿بَعَثْنٰهُمْ﴾ کی تعبیر کا تقاضا تو یہ ہے کہ مفسرین کی تفسیر کے علاوہ دوسرے معنی لینا قطعاً بے محل ہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن نے اصحاب کہف کی اس گفتگو کے بعد جو وہاں سوئے رہنے کی مدت سے متعلق ہے ان کی یہ گفتگو بھی نقل کی ہے کہ ان میں سے کوئی شہر جائے اور پوشیدہ طور پر جائے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے یہ بھی جمہور کی تفسیر کو قوت پہنچاتی ہے اس لیے کہ غار میں مدت قیام پر بات چیت اور پھر فوراً کھانے کی خواہش کا اظہار دونوں باتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑیے تو صاف معنی وہی بنتے ہیں جو مفسرین نے بیان کیے ہیں اور مولانا آزاد کی یہ تفسیر کہ عرصہ دراز کے بعد ان کو شہر کی حالت معلوم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس سلسلہ میں ان کے درمیان یہ گفتگو ہوئی" تکلف بارد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کو شروع سے آخر تک اس واقعہ کی تمام آیات میں تکلف بارد اختیار کرنا پڑا ہے مثلاً جب قرآن نے ان کی حالت بیان کرتے ہوئے یہ کہا ﴿وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ﴾ تو ان کو گمان کرے گا کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ خواب

---

❶ ترجمہ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہ

Marfat.com

میں ہیں" تو مولانا موصوف کو اپنی تفسیر کو صحیح بنانے کے لیے "یقظ" کے معنی زندہ اور "رقد" کے معنی "مردہ" کے اختیار کرنے پڑے ہیں حالانکہ ان کے حقیقی معنی "بیداری" اور "نیند" کے ہیں اور یہ معنی بلاتکلف یہاں صادق آتے ہیں پس مولانا پر بھی وہی بات صادق آتی ہے جو انہوں نے مفسرین کی مسلمہ تفسیر پر لازم کی ہے یعنی "فی الکلام تجوز بطریق الاستعارۃ" کلام میں استعارہ کی راہ سے مجاز اختیار کیا گیا ہے۔

بلکہ اگر غائر نظر سے دیکھیے تو "حقیقت کے صادق ہوتے ہوئے مجاز اختیار کرنا" مولانا آزاد" کی تفسیر پر تو صادق آتا ہے لیکن جمہور مفسرین کی تفسیر پر صادق نہیں آتا۔

مولانا آزاد نے آیات زیر بحث کی تفسیر میں اگرچہ مفسرین کے مختار قول کے خلاف ضعیف قول کو اپنا مختار بنایا ہے تاہم مفسرین کے اقوال کو احتمال کے درجہ میں تسلیم کرتے ہوئے ان کی تائید میں جو جملے ارشاد فرمائے ہیں وہ بلاشبہ ایسے حضرات کے لیے خصوصاً قابل مطالعہ ہیں جو اس قسم کے واقعات کو محض تعجب خیز سمجھ کر خلاف عقل کہہ دینے کے عادی ہیں فرماتے ہیں:

"بہر حال اگر یہاں "ضرب علی الاذان" سے مقصود نیند کی حالت ہو تو پھر مطلب یہ قرار پائے گا کہ وہ غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت میں پڑے رہے اور ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ﴾ کا مطلب یہ کرنا پڑے گا کہ اس کے بعد نیند سے بیدار ہو گئے۔"

یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت طاری رہے اور پھر بھی زندہ رہے طبی تجارب کے مسلمات میں سے ہے اور اس کی مثالیں ہمیشہ تجربہ میں آتی رہتی ہیں پس اگر اصحاب کہف پر قدرت الٰہی سے کوئی ایسی حالت طاری ہو گئی ہو جس نے غیر معمولی مدت تک انہیں سلائے رکھا تو یہ کوئی مستبعد بات نہیں۔" [1]

﴿ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝۱۲﴾ (الکہف: ۱۲)

"پھر ہم نے ان کو خواب سے اٹھایا تا کہ معلوم کریں کہ دو جماعتوں میں سے کس نے اس مدت کو محفوظ رکھا جس میں وہ (غار کے اندر) رہے۔"

یہاں دو جماعتوں میں سے ایک اصحاب کہف کی اور دوسری اہل شہر کی جماعت مراد ہے مطلب یہ ہے کہ یہ اس لیے کیا کہ مدت ظاہر ہو جائے اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ خدائے تعالیٰ نے ان کو برسوں تک بحالت خواب زندہ رکھا جب کہ وہ زندگی کی کے وسائل سے یکسر محروم تھے لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ بلاشبہ اسی طرح وہ مخلوق کو مرنے کے بعد بھی زندہ کرے گا اور بیشک قیامت اور بعث بعد الموت کا مسئلہ حق ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جب ان کو بیدار کیا اور ان میں سے ایک نوجوان شہر میں کھانا لینے گیا تو اس زمانہ میں بستی والوں کے درمیان "بعث بعد الموت" پر جھگڑا اور مناقشہ جاری تھا ایک جماعت کہتی تھی کہ فقط روح کا حشر ہو گا اور دوسری جماعت قائل تھی کہ روح اور جسم دونوں کو زندہ ہونا ہے یہ تو نصاریٰ کی جماعتیں تھیں اور جو نبطی مشرک آباد تھے وہ سرے سے بعث بعد الموت ہی کے منکر تھے ایسے نازک وقت میں اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو غار سے بیدار کر کے بھیجا اور اس طرح اصحاب کہف کا واقعہ سب پر ظاہر ہو گیا تو اس نے علی رؤس الاشہاد یہ نظیر قائم کر دی کہ جس طرح برسوں تک اسباب حیات سے

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲

Marfat.com

محروم رہنے کے باوجود روح کے ساتھ جسم بھی صحیح وسالم باقی رہا اسی طرح "بعث بعد الموت" روح اور جسم دونوں سے تعلق رکھتا ہے اور جس طرح سوتے رہنے کے بعد اصحاب کہف بیدار کر دیئے گئے اسی طرح قبر (عالم برزخ) میں سینکڑوں اور ہزاروں برس مردہ رہنے کے بعد قیامت میں زندہ کر دیئے جائیں گے۔

﴿وَ كَذٰلِكَ اَعۡثَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ لِيَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيۡبَ فِيۡهَا ۚ اِذۡ يَتَنَازَعُوۡنَ بَيۡنَهُمۡ اَمۡرَهُمۡ﴾ (الکہف: ۲۱)

"اور پھر (دیکھو) اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے لوگوں کو ان کے حال سے واقف کر دیا (ان کی بات) پوشیدہ نہ رہ سکی اور اس لیے واقف کر دیا کہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔"[1]

آیت کی یہ تفسیر عکرمہ کی روایت سے ماخوذ ہے اور اسی کو عام طور پر اختیار کیا گیا ہے لیکن مولانا آزاد نے ﴿لَا رَيۡبَ فِيۡهَا﴾ کو ﴿اِذۡ يَتَنَازَعُوۡنَ بَيۡنَهُمۡ اَمۡرَهُمۡ﴾ سے جدا کرتے ہوئے آیت کے معنی یہ کیے ہیں اسی وقت کی بات ہے کہ لوگ آپس میں بحث کرنے لگے ان لوگوں کے معاملہ میں کیا کیا جائے لوگوں نے کہا اس غار پر ایک عمارت بنا دو۔ حضرت شاہ ولی اللہ (نور اللہ مرقدہ) نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے۔

"درآں وقتیکہ نزاع می کردند مردماں درمیان خود در مقدمہ ایشاں پس گفتند عمارت کنید بر غار ایشاں"

یعنی یہ حضرات ﴿يَتَنَازَعُوۡنَ﴾ میں قیامت کے متعلق شہریوں کے باہم اختلاف کو مراد نہیں لیتے بلکہ اس گفتگو کو مراد لیتے ہیں جو اصحاب کہف کے مرقد پر ہیکل تعمیر کرنے کے بارے میں ہوئی۔

۵ ﴿فَاْوٗۤا اِلَى الۡكَهۡفِ﴾ ہم نے واقعہ کی جو تفصیلات بیان کی ہیں اور قرآن کی اندرونی اور تاریخ و روایات کی بیرونی شہادتوں سے جن امور کو ثابت کیا ہے ان سے جدا عام مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ یہود بنی اسرائیل کے قدیم زمانہ کا ہے جو شہر افس میں ایک مشرک .... بادشاہ دقیانوس کے زمانہ حکومت میں پیش آیا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ انہوں نے عیسائیت نہیں بلکہ یہودیت کو قبول کر لیا تھا اور بادشاہ وقت کے ظلم و جور سے بچ کر غار میں پناہ گزین ہو گئے تھے لیکن ہم ان پر گزشتہ سطور میں سیر حاصل بحث کر چکے اور ثابت کر چکے ہیں کہ اس واقعہ کا تعلق عیسائی دور سے ہے۔

۶ ﴿سَيَقُوۡلُوۡنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ خَمۡسَةٌ سَادِسُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ رَجۡمًۢا بِالۡغَيۡبِ ۚ﴾ (الکہف: ۲۲)

اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے متعلق ان حقائق کے اظہار کے بعد جو اس کے مقصد "تذکیر" کے لیے مفید تھے واقعہ کی ان جزئیات کے متعلق جو محض تاریخی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کے جان لینے سے کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ پیغمبر ﷺ کو یہ نصیحت فرمائی کہ وہ ان لاحاصل بحثوں سے پرہیز کریں اور ان پر سرسری طور سے گزر جائیں اور بیکار باتوں کے کھوج لگانے کی فکر نہ کریں۔ مثلاً یہ کہ ان نوجوانوں کی تعداد کیا تھی؟ ان کی عمروں کا تناسب کیا تھا وہ غار میں کتنی مدت مقیم رہے؟ مدت کی صحیح مقدار

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ عن عکرمہ۔

Marfat.com

کیا ہے؟ وغیرہ۔

﴿قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا﴾ (الکہف: ۲۲)

"(اے پیغمبر ﷺ) کہہ دیجئے ان کی اصل گنتی تو میرا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ ان کا حال بہت کم لوگوں کے علم میں آیا ہے اور جب صورت حال یہ ہے تو لوگوں سے اس بارہ میں بحث ونزاع نہ کر مگر صرف اس حد تک کہ صاف صاف بات میں ہو اور ورنہ ان لوگوں میں سے کسی سے اس بارے میں کچھ دریافت کر؟ (اس لیے کہ جو بات بھی ہوگی اٹکل سے ہوگی)"۔

تاہم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ فرماتے ہوئے کہ ان قلیل میں سے جن کو ان کی تعداد کا علم ہے ایک میں بھی ہوں ارشاد فرمایا کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تعداد کے متعلق پہلے دو مقولوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ فرمایا کہ یہ باتیں اٹکل کے تیر ہیں مگر تیسرا قول ذکر کرنے کے بعد ایسی کوئی بات نہیں کہی اس لیے یہ ہی صحیح تعداد ہے۔ [1]

﴿وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا﴾ (الکہف: ۲۵)

اس آیت کا ترجمہ عام طور پر مفسرین نے اس طرح کیا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے یہ اطلاع دے رہا ہے کہ وہ تین سو نو سال غار میں رہے مگر حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے بعض روایات میں جو معنی مذکور ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگوں کا مقولہ ہے اللہ تعالیٰ کا اپنا قول نہیں ہے یعنی وہ آیت ﴿وَلَبِثُوْا.... الاية﴾ کو اس سے قبل کے جملہ ﴿يَقُوْلُوْنَ﴾ کے تحت میں داخل سمجھتے اور یہ معنی کرتے ہیں کہ جس طرح لوگ (عیسائی) اصحاب کہف کی تعداد کے متعلق مختلف باتیں کہتے ہیں اور کہیں گے اسی طرح وہ یہ بھی کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ اصحاب کہف تین سو نو سال تک غار میں رہے۔

چنانچہ قاضی شوکانی اپنی تفسیر فتح القدیر میں نقل فرماتے ہیں:

اخرج ابن ابی حاتم و ابن مردویه عن ابن عباس قال ان الرجل ليفسر الاية ويرى انها كذلك فيهوى ابعد ما بين السماء والارض ثم تلا ﴿وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ﴾ ثم قال كم لبثت القوم قالوا ثلث مائة و تسع قالوا كانوا لبثوا كذلك لم يقل الله قل الله اَعْلَمُ بما لبثوا و لكنه حكى مقالة القوم فقال ﴿سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ﴾ الى قوله ﴿رَجْمًا بِالْغَيْبِ﴾ فاخبر انهم لا يعلمون ثم قال ﴿سَيَقُوْلُوْنَ وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا﴾. [2]

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں انہوں نے فرمایا آدمی آیت کی تفسیر کرتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس نے بالکل صحیح تفسیر کی ہے حالانکہ وہ اس میں فاش غلطی کرتا ہے گویا وہ اس آسمان وزمین سے بھی دور

[1] ابن کثیر ج ۳ [2] فتح القدیر سورۂ کہف

Marfat.com

جا گرا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ فرما کر بعد میں اس آیت کو تلاوت کیا ﴿وَ لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ﴾ اور فرمانے لگے لوگوں نے یہ سوال پیدا کیا کہ اصحاب کہف کتنے عرصہ غار میں رہے اور خود ہی یہ کہنے لگے کہ وہ تین سو نو سال غار میں رہے۔ پھر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا کہ اگر اصحاب کہف واقعی اتنے عرصہ ہی غار میں رہے ہوتے تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا ﴿قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا﴾ آپ کہہ دیجئے اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کتنے عرصہ مقیم رہے" دراصل یہ اللہ تعالیٰ کا مقولہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے قول کو حکایت کیا ہے اور ان کی گفتگو کو یہاں سے شروع کیا ہے ﴿سَیَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ ... اِلٰی قَوْلِهٖ ... رَجْمًا بِالْغَیْبِ﴾ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ وہ صحیح تعداد سے واقف نہیں ہیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے لوگوں کا دوسرا یہ مقولہ بیان کیا کہ وہ کہتے ہوئے پائے جائیں گے ﴿سَیَقُوْلُوْنَ وَ لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا ۝﴾۔

اور ابن کثیر نے تفسیر میں بروایت قتادہ، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے:

قال قتادة وفی قراءة عبدالله وقالوا ولبثوا یعنی انه قاله الناس وهكذا قال قتادة و مطرف. ❶

قتادہ کہتے ہیں اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرات میں یہ ہے (وقالوا ولبثوا) یعنی یہ مقولہ لوگوں کا ہے قتادہ اور مطرف کی رائے بھی یہی ہے۔"

ہمارے نزدیک بھی یہی معنی راجح ہیں کیونکہ قرآن کا سیاق اسی کو ظاہر کرتا ہے اس لیے کہ ان ہی آیات میں قرآن نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ اس قسم کی غیر مفید اور اٹکل کی باتوں کے پیچھے نہ پڑیں پس جب کہ ﴿وَ لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ﴾ کے بعد یہ کہا گیا ﴿قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ تو اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ غار میں قیام کی مدت کا مسئلہ بھی اندھیرے کا تیر ہے اور اس لیے صحیح طریق کار اس بارے میں بھی یہی ہے کہ اس کو علم الٰہی کے سپرد کر دیا جائے لہٰذا اس صورت میں یہ مقولہ اللہ تعالیٰ کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا ہے جو زمانہ نبوت میں اس واقعہ کی تفصیلات کے سلسلہ میں بے فائدہ اٹکل کے تیر چلاتے رہتے تھے۔

بایں ہمہ ابن کثیر رحمہ اللہ عام مفسرین کے معنی کو ہی راجح کہتے ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کو منقطع اور ان کی قراۃ کو شاذ ثابت کر کے اس کو ناقابل حجت قرار دیتے ہیں مگر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی صحیح روایت کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟ ابن کثیر یہ بھی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اول تین سو سال فرمایا اور یہ شمسی حساب کے مطابق ہے اور پھر ﴿وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا﴾ کہہ کر نو سال کا اور اضافہ اس لیے کیا تاکہ شمسی حساب قمری حساب کے ساتھ مطابق ہو جائے مگر اول نظر میں بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ آیت کی یہ تفسیر نہیں بلکہ تاویل ہے اس لیے کہ ایک طرف تو قرآن تذکیر و موعظت کے مقصد سے زائد تفصیلات کو دور از کار کہتا ہے اور دوسری جانب خود ہی ایسی باتوں کے درپے ہوتا ہے جس کا موعظت و بصیرت سے کوئی خاص تعلق نہیں بلکہ خالص علم ہیئت کا مسئلہ ہے۔ ❷ ابن کثیر کے نزدیک یہ مقولہ اس لیے بھی لوگوں کا نہیں ہو سکتا کہ نصاریٰ کے یہاں قیام کہف کی مدت تین سو سال مشہور

---

❶ ج ۳۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرات سے یہ مراد ہے کہ وہ اس مقام پر بطور تفسیر کے یہ پڑھ دیا کرتے تھے۔ (مؤلف)

❷ نیز از روئے حساب بھی نو کا اضافہ تطابق حساب کے لئے کافی نہیں۔

اور نوکا ان کے یہاں کوئی ذکر نہیں پایا جاتا مگر یہ بات بھی صحیح نہیں ہے اس لیے کہ دوسرے مفسرین نے ان کے دونوں قول نقل کیے ہیں۔شاید ابن کثیر کی نظر سے دوسرا مقولہ نہیں گزرا۔

⑧ ﴿وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ.....اِلٰى..... فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا﴾ (الکہف: ۱۷)

ان آیات میں قرآن عزیز نے اصحاب کہف کی اس حالت کا ذکر کیا ہے جب کہ وہ شروع میں غار کے اندر جا کر پوشیدہ ہوئے تھے اور یہ اس لیے کہ ان آیات کے متصل ہی جو آیات اس واقعہ پر روشنی ڈال رہی ہیں ان میں یہ باتیں مذکور ہیں وہ نیند سے بیدار ہوئے اور انہوں نے ایک رفیق کو کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا اس کی وجہ سے شہر والوں پر حقیقت حال ظاہر ہوگئی جملہ معترضہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر اس حقیقت حال کے منکشف کر دینے کی مصلحت بیان کی وہ دوبارہ غار میں عزلت گزیں ہو گئے اور اہل شہر نے اس غار کے دہانہ پر ہیکل تعمیر کر دیا ان واقعات کے بیان کرنے کے بعد ان آیات میں اس کیفیت کو بیان کیا جا رہا ہے جو اصحاب کہف پر نیند طاری ہونے کی حالت میں گزری یعنی اس غار کی اندر سے کیا حالت تھی دھوپ اور تازہ ہوا پہنچنے نہ پہنچنے کی کیا کیفیت تھی ایک طویل مدت تک خواب کی حالت میں رہنے کی کیا شکل تھی کیا ایک ہی کروٹ پر سوئے رہے یا زندہ انسانوں کی طرح کروٹیں بدلتے رہتے تھے ان کا کتا کس طرح وفاداری کا حق ادا کر رہا تھا۔اس مجموعی کیفیت کا اثر باہر سے جھانک کر دیکھنے والے انسان پر کیسا پڑتا تھا۔

جمہور مفسرین نے یہی تفسیر کی ہے اور آیات کے باہم نظام و ترتیب کے لحاظ سے یہ بہت صاف اور واضح تفسیر ہے مگر مولانا آزاد ان تمام آیات کو اصحاب کہف کے دوبارہ غار میں عزلت گزیں ہو جانے سے متعلق سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ قرآن یہ تفصیلات اس حالت کی بیان کر رہا ہے جب ان پر موت طاری ہو چکی تھی اور پھر انہوں نے "ایقاظ" میں یقظہ کے معنی زندگی اور رقود میں رقد یعنی موت کے اختیار کر کے کافی تکلف کیا ہے اور بعض مقدمات کے اضافہ کے ساتھ اپنی تفسیر کو دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ چونکہ مفسرین نے ان آیات کو اصحاب کہف کے پہلی مرتبہ غار میں پوشیدہ ہو جانے سے متعلق کہا ہے اس لیے ان آیات کی تفسیر میں حیرانی پیش آئی ہے مگر اس پوری تفصیل کے مطالعہ سے بآسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آیات زیر بحث کی تفسیر میں مفسرین قدیم کو تو کوئی حیرانی پیش نہیں آئی البتہ خود مولانائے موصوف کو اپنی اختیار کردہ تفسیر کی وضاحت میں ضرور تکلفات بارده اختیار کرنے پڑے ہیں اور سچ پوچھیے تو اس مقام پر ان کی تفسیر تاویل ہو کر رہ گئی ہے۔

﴿ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ "یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے"۔

یعنی پہاڑ کے اندر غار کی یہ مجموعی کیفیت کہ غار کا دہانہ اگرچہ تنگ ہے مگر اس کے اندر بہت کافی وسعت ہے اس کا جاء وقوع شمالاً وجنوباً ہے کہ جس کی وجہ سے طلوع و غروب دونوں حالتوں میں آفتاب غار کے سامنے سے داہنے اور بائیں کترا کر نکل جاتا ہے اور غار اس کی تپش سے محفوظ رہتا ہے اور دوسری جانب منفذ ہونے کی وجہ سے ہوا اور روشنی بقدر ضرورت پہنچتی رہتی ہے گویا انسانی بقاء کے لیے جو چیز مضر ہے یعنی تپش اس سے حفاظت اور جو بقاء حیات کے لیے ضروری شے ہے یعنی روشنی اور ہوا اس

کی موجودگی یہ ایسے امور ہیں جو خدائے تعالیٰ کی کھلی نشانیاں کہی جا سکتی ہیں کہ ان کی بدولت برسوں تک خدا کے نیک بندے دنیا کے علائق سے جدا ہو کر غار میں بحالت خواب بسر کر سکے اور ایسی حالت میں بسر کر سکے جب کہ سامان خورد و نوش اور بقاء حیات کے دیگر وسائل دنیوی سے قطعاً محروم تھے۔

(۱۰) عام طور پر مشہور ہے کہ اصحاب کہف ابھی تک غار میں سو رہے ہیں اور زندہ ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بصراحت یہ فرمایا ہے کہ ان کا انتقال ہو چکا۔

قال قتادة غزا ابن عباس مع حبيب بن مسلمه فمروا بكهف في بلاد الروم فرأوا فيه عظاما فقال قائل هذه عظام اهل الكهف فقال ابن عباس لقد بليت عظامهم من اكثر من ثلثمائة سنة. (رواہ ابن جریر) [1]

"قتادہ کہتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما ایک مرتبہ حبیب بن مسلمہ کے ساتھ ایک غزوہ میں تشریف لے گئے راہ میں بلاد روم میں اس مقام پر گزر ہوا جہاں پہاڑی غاروں کا سلسلہ ہے وہاں انہوں نے کسی غار کے اندر انسانوں کی ہڈیاں یا ڈھانچے دیکھے تو کسی کہنے والے نے کہا یہ اہل کہف کی ہڈیاں معلوم ہوتی ہیں اس پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ان کی ہڈیاں تو تین سو سال سے بھی زیادہ عرصہ ہوا کہ بوسیدہ ہو چکیں۔"

(۱۱) قرآن عزیز اور صحیح روایات سے یہ قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ اصحاب کہف کے نام کیا تھے بلکہ قرآن عزیز نے تو مشرکین مکہ یا نبطی اور رومی عیسائیوں کے یہاں اس سلسلہ میں جو اٹکل کی باتیں مشہور تھیں ان پر اعتماد رکھنے اور ان کی تحقیقات میں پڑنے سے روکا ہے البتہ اسرائیلی روایات میں ان کے نام یہ بتائے گئے ہیں: مکسلمینا، تملیخا، مرطونس، کسطونس، بیرونس، ونیوس، نطونس اور ان کے کتے کا نام قطمیر یا حمران ہے۔ [2]

(۱۲) ﴿وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ﴾ کتے نے وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا اور صلحاء کی صحبت پائی تو قرآن نے بھی اس کا ذکر خیر کر کے اس کو وہ عزت بخشی کہ انسانوں کے لیے قابل رشک بنا دیا شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے:

سگ اصحاب کہف روزے چند   پے نیکاں گرفت مردم شد
پسر نوح بابداں بہ نشست   خاندان نبوتش گم شد

(۱۳) ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (الکہف: ۲۳)

"اور کسی چیز کے لیے یہ نہ کہو کہ کل میں اس کو ضرور کروں گا مگر (یہ کہہ لیا کرو) یہ کہ خدا چاہے تو۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ تعلیم دی ہے کہ جب مستقبل میں کسی کام کا ارادہ ہو تو دعویٰ کے ساتھ یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں اس کو ضرور کروں گا اس لیے کہ کون جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا اور کہنے والا اس کائنات میں موجود بھی ہوگا یا نہیں لہٰذا اس معاملہ کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے "انشاء اللہ" ضرور کہنا چاہیے۔

---

[1] یہ روایت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ عیسائیت کے ابتدائی دور میں پیش آیا ہے۔

[2] یہ روایت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ عیسائیت کے ابتدائی دور میں پیش آیا ہے۔

⑭ ﴿وَقُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا﴾ (الکہف: ۲۴)

"تم کہو اُمید ہے میرا پروردگار اس سے بھی زیادہ کامیابی کی راہ مجھ پر کھول دے گا۔"

اس آیت میں اس جانب اشارہ ہے کہ عنقریب ایسا ہی معاملہ تم کو بھی پیش آنے والا ہے بلکہ وہ اس سے بھی عجیب وغریب ہوگا یعنی اپنا آبائی وطن چھوڑنا پڑے گا۔ راہ میں غار ثور کے اندر کئی دن تک پوشیدہ رہو گے۔ دشمن غار ثور کے منہ پر پہنچ جانے کے باوجود تم کو نہ پا سکیں گے تم بخیر وخوبی مدینہ پہنچ جاؤ گے اور وہاں تم پر فتح وکامرانی کی ایسی راہیں کھول دی جائیں گی جو اس معاملہ سے کہیں زیادہ عظیم وجلیل ہوں گی یہ سورت مکی عہد کی آخری سورتوں میں سے ہے اس لیے اس کے نزول کے بہت تھوڑے زمانہ بعد ہجرت کا وہ عظیم الشان واقعہ پیش آیا جس نے مسلمانوں کے دور حیات میں حیرت زا انقلاب پیدا کر دیا اور باطل نے حق کے سامنے سپر ڈال دی۔

⑮ ﴿لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا﴾ (الکہف: ۲۱)

"ہم ضرور ان کے مرقد پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔"

معلوم نہیں کہ اس کہنے سے ان لوگوں کا مقصد کیا تھا؟ یہ کہ واقعی ان کے مرقد پر ہیکل بنا کر اس کو سجدہ گاہ عام وخاص بنائیں گے کیونکہ یہ خدا کے مقبول بندے تھے تب تو ان عیسائیوں کا یہ عمل اسلام کی نگاہ میں قابل مذمت ونفرت ہے اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

((لعن الله اليهود والنصارى اتخذوا قبور انبيائهم مساجدا)).[1]

"اللہ تعالیٰ یہود ونصاریٰ پر لعنت بھیجے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد (سجدہ گاہ) بنا لیا تھا۔"

یعنی قبروں کو سجدہ کرتے تھے اور پھر ارشاد فرمایا:

((لا تتخذوا قبري عيدا))

"لوگو! تم میری قبر کو عید کی طرح تہوار نہ بنا لینا۔"

اور اگر ان کا مطلب یہ تھا کہ ان کی یادگار میں غار کے منہ پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے کہ جس میں صرف خدائے عزوجل ہی کی عبادت ہوا کرے گی تو ان کا یہ فیصلہ بے شبہ محمود اور قابل ستائش تھا۔

نتائج وعبر:

① اگر ہم کو کوئی بات اپنی عقل کے مطابق عجیب وغریب معلوم ہو تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے بھی واقعی کوئی عجیب بات ہے اور اگر وہ عجیب ہے بھی تو ہمارے لیے ہے نہ کہ خالق کائنات کے لیے جس نے کہ کائنات ہست وبود کو پیدا کیا اور پھر ایسے محکم نظام پر اس کو قائم کیا کہ عقل حیران ہے مگر آنکھ روزانہ اس کا مشاہدہ کرتی اور قلب ہر لمحہ اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ ﴿وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ﴾ خدائے تعالیٰ پر یہ بات کچھ بھاری نہیں۔

---

[1] رواہ الصحیحین

Marfat.com

④ جب شر و فساد اور ظلم و سرکشی اس درجہ بڑھ جائے کہ خدا کے نیک بندوں کے لیے کہیں پناہ نہ رہے تو اگرچہ عزیمت کا مرتبہ یہی ہے کہ کائنات کی رشد و ہدایت کی خاطر ہمہ قسم کی تکالیف برداشت کرے اور کلمہ حق پر کوہ استقامت بنا رہے اور مخلوق خدا سے منقطع ہو کر عزلت و کنج نشینی اختیار نہ کرے لیکن اگر حالات اس درجہ نزاکت اختیار کر لیں کہ مخلوق کے ساتھ تعلق رکھنے کی شکل میں یا جان دینی پڑے اور یا دین باطل قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑے اور حالت یہ ہو جائے:

﴿ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا۝ ﴾ (الکہف:۲۰)

"تو اس وقت رخصت ہے کہ جان کی حفاظت اور دین کی صیانت کے لیے دنیا کے علائق سے کٹ کر عزلت نشینی اختیار کر لے۔"

گویا یہ اضطراری حالت کا ایک ہنگامی اور وقتی علاج ہے جو صرف تحفظ دین و ایمان کے لیے کیا جا سکتا ہے لیکن اسلام کی نگاہ میں بذاتہ کوئی محبوب عمل نہیں ہے اور اختیاری طور پر اس جوگیانہ زندگی کو اختیار کرنا رہبانیت ہے ((ولا رھبانیة فی الاسلام)) اور اسلام رہبانیت کو ناپسند کرتا ہے۔

عیسائیوں کی مذہبی تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی عہد میں بعض سچے عیسائیوں کو اصحاب کہف کی طرح کے چند واقعات پیش آئے جن میں سے ایک روم میں ایک انطاکیہ میں اور ایک شہر افس میں پیش آنا بتایا جاتا ہے چنانچہ انہوں نے حالات سے مجبور ہو کر اضطراری طور پر اس جوگیانہ زندگی کو اختیار کیا تھا مگر بعد میں دوسری بدعات کی طرح یہ عمل بھی عیسائیت کا اہم جز اور محبوب عمل شمار ہونے لگا اور جس طرح ہندوستان کے قدیم دھرم کے مطابق دنیا سے کٹ کر ہندو جوگی پہاڑوں کی کھوہ اور ویرانوں میں یوگ کرنا مقدس عمل سمجھتے ہیں اسی طرح عیسائیوں نے بھی اختیاری رہبانیت کو مذہب کے مقدس اعمال میں شامل کر لیا۔

لیکن قرآن حکیم نے ان کے اس عمل کے متعلق صفائی کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بذاتہ یہ عمل کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے بلکہ اہل کتاب کی مذہبی بدعات میں سے ایک بدعت ہے۔

﴿ وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ﴾

(الحدید:۲۷)

"اور راہبانہ زندگی کو کہ جس کو ان (عیسائیوں) نے دین میں ایجاد کر لیا ہم نے ان پر فرض نہیں کیا تھا مگر انہوں نے اختیار کیا تھا اللہ کی رضا جوئی کے لیے پر اس کے حق کی رعایت نہ رکھ سکے۔"

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ طریق دین کے طریقوں میں سے نہیں مقرر کیا تھا بلکہ انہوں نے خود ہی اختیار کر لیا تھا اور اگرچہ ابتداء میں انہوں نے یہ خدائے تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اختیار کیا تھا مگر بعد میں اس کو نباہ نہ سکے اور رہبانیت کے پردہ میں دنیاداروں سے زیادہ دنیا طلبی اور ہوس ناکیوں میں مبتلا ہو گئے۔

حق یہ ہے کہ صاف اور سیدھی راہ اعتدال کی راہ ہے نہ اس میں پیچ و خم ہے اور نہ نشیب و فراز یہ راہ افراط اور تفریط دونوں سے جدا کر کے منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے اور چونکہ اسلام دین فطرت ہے اس لیے اس نے ہر معاملہ میں اعتدال ہی کو پسندیدہ عمل قرار دیا ہے اس کی نگاہ میں جس قدر دنیا میں انہماک برا ہے اسی قدر مخلوق خدا سے کٹ کر جوگیانہ رہبانیت بھی مذموم ہے۔ نبی اکرم

Marfat.com

ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس امت کے لیے رہبانیت "جہاد فی سبیل اللہ" ہے کیونکہ میدان جہاد کے لیے انسان جب ہی قدم اٹھاتا ہے کہ وہ اپنے نفس، اپنے اہل و عیال اور ہر قسم کے دنیوی علائق سے بے نیاز ہو کر صرف خدائے تعالیٰ کی مرضی کو پورا کرنا اپنا مقصد اور نصب العین بنا لے۔

③ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت

﴿وَلَا تَقُولَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (الکہف: ۲۳)

کے شان نزول کے متعلق یہ روایت کی جاتی ہے کہ جب مشرکین مکہ نے نبی اکرم ﷺ سے اصحاب کہف کے بارہ میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں کل وحی سے معلوم کر کے اس کا جواب دوں گا مگر آپ ﷺ کو "انشاء اللہ" کہنا یاد نہ رہا اس وجہ سے تقریباً پندرہ روز وحی کا نزول نہیں ہوا تب مشرکین نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں اور آپ ﷺ اس وجہ سے دل فگار ہونے لگے پندرہ روز کے بعد وحی کا نزول ہوا اور اس نے واقعہ کی ضروری تفصیلات کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ انسان جبکہ فردا سے ناواقف ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ جب کل کے لیے کسی بات کا وعدہ کرے تو خدا کی مشیت کا حوالہ ضرور دے دیا کرے تا کہ یہ بات کبھی فراموش نہ ہونے پائے کہ بندہ نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا میں زندہ بھی رہوں گا یا نہیں اور اگر زندہ بھی رہا تو وعدہ کے ایفا پر قادر ہو سکوں گا یا نہیں۔

④ دین اور ملت، خدائے تعالیٰ کی صاف اور سیدھی راہ کا نام ہے اس لیے وہ جبر و اکراہ سے قلب میں نہیں اترتی بلکہ اپنی صادق روشنی سے اندھے دلوں کو روشن اور منور کرتی ہے ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ﴾ "دین کے بارہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے" مگر اس کے برعکس باطل کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ خدا کی مخلوق پر زبردستی ظلم اور جبر سے اپنا اثر جمائے اور دلیل کی جگہ جبر سے کام لے لیکن خدا کی مشیت انجام کار صداقت (دین حق) کو غالب اور باطل کو مغلوب کر دیتی ہے اور انجام و نتیجہ حق ہی کے ہاتھ رہتا ہے مگر چونکہ خدا کی گرفت کا قانون اول کافی مہلت دیتا ہے اس لیے ظالم اقوام جہالت سے اس کو اپنی کامیابی سمجھ کر خدا کی بطش شدید سے غافل ہو جاتی ہیں اور اس لیے تاریخ بار بار اپنے سبق کو دہراتی رہتی ہے۔

⑤ تجربہ اس کا شاہد ہے کہ حق و صداقت کی تحریک اور نہ صرف یہ بلکہ ہر انقلابی تحریک جس درجہ قوم کے نوجوانوں پر اثر انداز ہوتی ہے عمر رسیدہ افراد قوم پر اس سرعت کے ساتھ اثر انداز نہیں ہوتی "علم النفس" (Psychology) کے ماہرین اس کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ معمر افراد کا دل و دماغ چونکہ عمر کے بڑے حصہ میں پرانی ریت و رسم کا عادی ہو جاتا ہے اور گزشتہ نظام سوسائٹی سے عرصہ تک مانوس رہ چکا ہوتا ہے اور اس کے رگ و ریشہ میں قدیم اثرات راسخ ہو چکے ہوتے ہیں اس لیے ہر وہ تحریک جو قدیم نظام یا فرسودہ رسوم کے خلاف ظاہر ہوتی ہے ان کا دل و دماغ اس کے جدید اثرات سے اذیت و تکلیف محسوس کرتا ہے اور جدید و قدیم محرکات کا تصادم ان کے لیے بار بن جاتا ہے اس لیے وہ جدید انقلاب سے مانوس ہونے کی بجائے اور زیادہ متوحش ہو جاتے ہیں البتہ ان میں سے جو دل و دماغ جذبات کے مقابلہ میں عقل کو اور تاثرات کے مقابلہ میں دلائل کو راہ نما بنا لیتے اور ہر معاملہ میں جدت و قدامت سے قطع نظر متانت و سنجیدگی کے ساتھ اس کی افادیت و مضرت پر غور کرنے کے

عادی ہوتے ہیں وہ اس عام اصول سے مستثنیٰ ہیں اور جب وہ انقلابی تحریک کے فوائد کو دلائل کی قوت سے محسوس کر لیتے ہیں تو اس تحریک کے لیے زبردست پشت پناہ ثابت ہوتے ہیں مگر جماعتوں اور قوموں میں عموماً ان کی تعداد کم ہوتی ہے۔

لیکن عمر رسیدہ افراد کے برعکس چونکہ نوجوانوں کے دل و دماغ بڑی حد تک غیر جانبدار ہوتے اور پرانے رسم و رواج کے لیے ابھی تک راسخ نہیں ہوتے اس لیے ان پر جدید نقوش بہت جلد منقش ہو جاتے ہیں اور وہ کسی تبدیلی اور کسی انقلاب کو محض اس لیے کہ وہ جدید محرکات کے داعی ہیں توحش کی نظروں سے نہیں دیکھتے بلکہ دلچسپی کے ساتھ اس کی طرف بڑھتے اور صاف دل و دماغ سے اس پر غور کرتے ہیں۔

اب یہ انقلابی تحریک کی ذمہ داری ہے کہ اگر اس میں صداقت اور حقانیت کارفرما ہے اور جماعتوں اور قوموں کو غلط روی سے نکال کر صراط مستقیم کی جانب داعی ہے تو اس کی جانب سرعت کے ساتھ جوق در جوق بڑھنے والوں اور پیروی کرنے والوں کی زندگی میں چار چاند لگ جاتے اور ان کا وجود کائنات ہست و بود کے لیے رحمت ثابت ہوتا ہے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو وہ ان تر و تازہ اور صاف دل و دماغ رکھنے والے نوجوانوں کو تباہی اور بربادی کی راہ پر لگا دیتی ہے اور ان کا وجود دنیائے انسانی کے لیے مصیبت اور عذاب بن جاتا ہے۔

قرآن عزیز نے اس واقعہ کے اظہار میں عبرت و موعظت کے جو پہلو نمایاں کیے ہیں ان میں سے ایک اہم پہلو اسی نفسیاتی مسئلہ کی جانب توجہ دلانا ہے۔

وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ قریش مکہ میں سے بوڑھوں اور سن رسیدہ لوگوں کی اکثریت کا اسلام کی مقدس تعلیم سے گریز اور انفرادی و اجتماعی حیات انسانی کے اس جدید انقلاب (اسلام) سے توحش اور ان کے نوجوانوں کی اکثریت کا اس کی جانب تیزی کے ساتھ متوجہ ہونا اور اس کی دعوت انقلاب کی کشش سے فوج در فوج اس کے لیے حلقہ بگوش ہو جانا دنیا کا انوکھا مظاہرہ نہیں ہے بلکہ جب کبھی بھی فرسودہ نظام اور باطل رسم و رواج کے خلاف خدا کے پیغمبروں نے حق و صداقت کا انقلاب برپا کیا ہے تو قبول حق کے لیے عمر رسیدہ انسانوں سے زیادہ نوجوانوں کے دل و دماغ پر ہی اس کا گہرا اثر پڑا ہے۔

سباء اور سیل عرم

(۲۰۰ء تخمیناً)

○ تمہید ○ سباء ○ نام یا لقب ○ زمانہ حکومت ○ سباء اور طبقات حکومت ○ مکائب سباء اور ملوک سباء ○ وسعت حکومت ○ طرز حکومت ○ سباء کی عمارات ○ سباء کا تمدن ○ سد مارب ○ جنتان عن یمین وشمال ○ سیل عرم ○ چند تاریخی مباحث ○ تفسیری مطالب نتائج و بصائر

تمہید:

سباء اور سیل عرم کا واقعہ بھی تاریخی واقعات میں بہت اہمیت رکھتا اور قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ میں صد ہزار سامان عبرت وموعظت مہیا کرتا ہے۔

قوموں کے عروج و زوال کا پس منظر بخت و اتفاق کا رہین منت نہیں ہوتا بلکہ قانون قدرت کے مقررہ اصول کے مطابق پیش آتا ہے البتہ کبھی اسباب عروج و زوال ایسے واضح اور صاف ہوتے ہیں کہ عام طریقہ سے یا مشاہدہ میں آ جاتے ہیں اور یا عقل کی سرسری توجہ سے پہچان لیے جاتے ہیں اور کبھی ان کا وجود ایسے اسباب پر مبنی ہوتا ہے جن کا تعلق عام اسباب و وسائل سے جدا۔ خدائے تعالیٰ کی فرماں برداری اور نافرمانی سے وابستہ ہوتا ہے یعنی باسباب ظاہر اگرچہ ایک قوم میں مثلاً وہ تمام حالات و اسباب پائے جاتے ہوں جن سے کسی قوم کو عروج حاصل ہوتا ہے تاہم وہ قوم اچانک ہلاکت و بربادی کی نذر ہو جاتی اور عالم انسانی کے لیے اس کی ہلاکت حیرت انگیز واقعہ بن جاتی ہے لیکن جب خدا کی جانب سے ان کی سرکشی بغاوت اور احکام الٰہی کی پیہم خلاف ورزی کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اور وحی الٰہی ان کے عمل اور پاداش عمل کی تفصیلات کو برسر عام لے آتی ہے تب اہل دانش یہ یقین کر لیتے ہیں کہ جس قوم کی اجتماعی زندگی کے خوب صورت خول میں ایسی مکروہ اور گھناؤنی شکل موجود تھی تو بلاشبہ اس کی ہلاکت و تباہی بخت و اتفاق کی وجہ سے نہیں بلکہ نوامیس الٰہی کے قانون پاداش عمل کے عین مطابق ہوئی ہے۔

سباء اور قوم سباء کا وہ عبرت ناک سانحہ اور ان کے عروج زوال کا وہ بصیرت افروز واقعہ جو سطور ذیل میں درج کیا جا رہا ہے قوموں کے عروج و زوال کے اس دوسرے قانون کے ہی زیر اثر عالم وجود میں آیا تھا اور تاریخ کے صفحات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ جو قوم خوش عیشی اور رفاہیت کے اونچے درجہ پر بے خوف و خطر زندگی بسر کر رہی تھی وہ یک لخت ہلاکت و بربادی کے قعر مذلت میں کس اتفاق وقت سے نہیں گر گئی تھی بلکہ اپنے دور رس اعمال بد کی پاداش میں اس کو یہ روز بد دیکھنا پڑا تھا۔

پس مناسب یہ ہے کہ قرآن عزیز نے ان حقائق کو جس انداز میں بیان کر کے سامان موعظت و بصیرت عطاء کیا ہے تاریخ

Marfat.com

کی بے لوث شہادت سے ان کی تفاصیل کو نقل کر دیا جائے تا کہ صداقت قرآن کا یہ پہلو بھی منکرین قرآن کے حق میں حجت کاملہ بن سکے۔

سباء:

سباء قحطانی قبائل کی مشہور شاخ ہے مؤرخین عرب اس کا نسب اس طرح بیان کرتے ہیں:

سباء بن یشجب بن یعرب بن قحطان۔

مگر تورات میں یہ کہا گیا ہے کہ سباء قحطان کا بیٹا ہے۔

اور یقطان (قحطان) سے الموداد، سلف، حصار، مادت، ارخ، ہدورام، اوزال، وقلاه عوبل، ابی مائل، سباء، حضتارموت، اوفیر، حویلہ، یارج (یعرب) اور یوباب پیدا ہوئے یہ سب بنی یقطان تھے اور ان کے مکان میسا سے سفار کی راہ میں اور پورب کے پہاڑ تک تھے۔ ✿

قحطان کو یقطان، یقطون، یقطین اور بقطین بھی کہا جاتا ہے۔ ✿

زبیر بن بکار کہتے ہیں کہ عربی میں قحطان اور عبرانی وسریانی میں یقطان اور یقطن کہتے ہیں مؤرخین جدید توراۃ کے بیان کو صحیح سمجھتے ہیں اس لیے کہ قحطان کی اولاد سے متعلق جو تفصیلات اس نے دی ہیں وہ تاریخی اقوال اور اثری وحضری کتبات سے مطابقت رکھتی ہیں، جدید مؤرخین کی اس تحقیق کے علاوہ یوں بھی ایسے معاملات میں توراۃ کا بیان دوسری روایات تاریخی کے مقابلہ میں زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے۔

غرض سباء بروایت توراۃ، قحطان کا بیٹا تھا اور بروایت عرب قحطان کا بیٹا۔

اہل نسب وتاریخ کا اس پر اتفاق ہے کہ قحطان امم سامیہ کی شاخ ہے لیکن اس میں اختلاف رکھتے ہیں کہ وہ عرب عاربہ میں سے ہے یا عرب مستعربہ میں یعنی وہ بنی اسماعیل میں سے ہے اور عدنانی وقحطانی ایک ہی سلسلہ ہے یا عدنانی تو بنی اسمٰعیل ہیں اور قحطانی اس سلسلہ سے الگ قدیم سلسلہ ہے۔

بعض مؤرخین عرب کا رجحان یہ ہے کہ قحطانی بھی بنو اسماعیل ہی ہیں اور تمام اقطاع عرب بنی اسماعیل کے علاوہ اور کسی نسل سے نہیں ہیں چنانچہ علماء انساب میں سے زبیر بن بکار اور محمد بن اسحاق کی یہی رائے ہے۔ ✿ اور امام بخاری بھی اسی جانب مائل ہیں اس لیے کہ انہوں نے بخاری میں ایک باب تحریر کیا ہے: باب نسبة اليمن الى اسماعيل عليه السلام۔

اور اس باب کے تحت ایک حدیث نقل کی ہے جس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بنی اسلم جو خزاعہ کی شاخ ہیں ان کو نبی اکرم ﷺ نے بنی اسمٰعیل فرمایا ہے اور خزاعہ بنی ازد کی شاخ ہیں اور بنی ازد باتفاق قحطانی ہیں لہٰذا قحطانی بھی بنی اسمٰعیل ہی میں سے ہوئے وہ حدیث یہ ہے:

✿ پیدائش باب ۱۱ آیات ۲۶-۳۰ ✿ الانباہ فی قبائل الرواہ لابن عبدالبر

✿ فتح الباری ج ۶ ص ۳۰۴ باب قول اللہ تعالیٰ ﴿ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴾

Marfat.com

خرج رسول الله ﷺ علی قوم من اسلم یتناضلون بالسوق فقال ارموا بنی اسمٰعیل فان ابا کم کان رامیا. ❶

"ایک مرتبہ بنی اسلم کی ایک جماعت پر نبی اکرم ﷺ کا گزر ہوا دیکھا تو وہ بازار میں تیراندازی کی مشق کر رہے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اے اولادِ اسمٰعیل خوب تیر اندازی کرو اس لیے کہ تمہارے باپ اسمٰعیل بھی تیر انداز تھے۔"

اور کتاب احادیث الانبیاء میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں حضرت ہاجرہ علیہا السلام کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

تلك امکم یا بنی ماء السماء. "اے عرب یہ (ہاجرہ) تمہاری ماں ہیں۔"

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسی جملہ کی شرح میں یہ کہا ہے: کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے "بنی ماء السماء" کہہ کر اہل عرب کو اس لیے خطاب فرمایا کہ وہ اپنی اور اپنے مویشیوں کی خاطر ایسے مقامات پر خیمے لگاتے پھرتے تھے جہاں بارش کا پانی جمع ہو گیا ہو یا ماء سماء سے زمزم مراد ہے اور ان ہر دو معنی کے لحاظ سے یہ جملہ ان لوگوں کے لیے دلیل بن سکتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ تمام عرب بنی اسمٰعیل ہیں۔

اور بعض اس جملہ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ اہل عرب کی شرافت نسب اور نجابت حسب کے لیے بطور تشبیہ کے بولا گیا ہے کہ جس طرح آسمان سے نازل پانی صاف اور بے عیب ہوتا ہے اسی طرح اہل عرب بھی حسب و نسب میں بے عیب ہیں پس اگر یہ معنی مراد ہیں تو اس صورت میں یہ جملہ ان حضرات کے لیے دلیل نہیں بن سکتا۔ اور آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

"عنقریب اس مسئلہ کی مزید تفاصیل انشاء اللہ تعالیٰ اوائل مناقب میں آئیں گی۔" ❷

اور اس مقام پر پہنچ کر پہلے قول کو تسلیم نہیں کرتے اور آخر قول ہی کو صحیح مانتے ہیں جیسا کہ عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

اور محققین کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام عرب کے انساب کا منبع دو ہیں۔ عدنان اور قحطان عدنان، بنی اسمٰعیل اور عرب مستعربہ ہیں اور قحطان عرب عاربہ، گویا ان کے نزدیک قحطانی بنی اسمٰعیل نہیں ہیں چنانچہ ہمدانی ابن عبدالبر، ابن کثیر، ابن حجر عسقلانی، ابن کلبی اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اسی کے قائل ہیں۔

قال هشام و من زعم ان قحطان ليس من ولد اسمٰعيل فانه يقول قحطان هو يقطون بن عابر بن شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوح قال ابوعمر هكذا قال ابن الكلبی فی العرب العاربة و رأيت بخط ابی جعفر العقيلی قال نا محمد بن اسمٰعيل قال نا سلام بن مسكين قال نا عون بن ربيعه عن يزيد الفارسی عن ابن عباس قال العرب العاربة قحطان بن الهميسع والامداد والسالفاتِ و حضرموت و هذا حديث حسن الاسناد و هو اعلی ما روی فی هذا الباب و اولی بالصواب. ❸

"ہشام کہتے ہیں اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قحطان بنی اسمٰعیل میں سے نہیں ہیں تو وہ اس کا نسب نامہ یہ بیان کرتے ہیں قحطان

---

❶ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۶ ❷ فتح الباری ج ۶ ص ۳۰۴ باب قول اللہ تعالیٰ ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا﴾
❸ الانباہ علی قبائل الرواہ ص ۵۷-۵۸

(یقطون) بن عابر بن شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوح۔ ابوعمر (ابن عبدالبر) کہتے ہیں کہ ابن کلبی نے بھی عرب عاربہ کی تفصیل کرتے ہوئے اسی طرح بیان کیا ہے اور میں نے ابوجعفر عقیلی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ روایت دیکھی ہے کہ انہوں نے محمد بن اسماعیل سے بسلسلہ سند یہ سنا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ قحطان بن الیمسع اور امداد اور سالفات اور حضر موت یہ سب عرب عاربہ ہیں اور اس حدیث کی سند حسن ہے اور اس مسئلہ میں یہ قول بلحاظ روایت بھی اعلیٰ درجہ کا ہے اور قرین صواب بھی ہے۔"

بلکہ ابن کثیر تو یہ کہتے ہیں کہ جمہور کی یہی رائے ہے:

لکن الجمهور علی ان العرب القحطانية من عرب اليمن و غيرهم ليسوا من سلالة اسمٰعيل و عندهم ان جميع العرب ينقسمون الى قسمين قحطانية و عدنانية۔ ❶

"لیکن جمہور کی تحقیق یہ ہے کہ قحطانی عرب خواہ وہ یمنی ہوں یا غیر یمنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے نہیں ہیں اور ان کے نزدیک تمام عرب دو اصل پر تقسیم ہیں قحطانی اور عدنانی۔"

اور جمہور کی جانب سے "بنی اسلم" سے متعلق حدیث کا حافظ ابن حجر نے یہ جواب دیا ہے کہ اس حدیث سے یہ استدلال صحیح نہیں ہے کہ جو قبائل بھی قحطان کی جانب منسوب ہیں وہ سب بنی اسماعیل ہیں اس لیے کہ بعض قحطانی قبائل وہ ہیں جن کے متعلق علماء انساب میں سخت اختلاف ہے کہ وہ قحطانی ہیں یا عدنانی مثلاً بنی خزاعہ کے بارہ میں یہی بحث ہے، تو یہ ممکن ہے کہ بنی اسلم کے متعلق بھی اسی قسم کا اختلاف موجود ہو (چنانچہ موجود ہے) اور ابن عبدالبر نے اسی حدیث کو بروایت صحیح نقل کیا ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ بنوخزاعہ اور بنواسلم دونوں تیراندازی کر رہے تھے تو یہ ہوسکتا ہے کہ خزاعہ کی اکثریت کی وجہ سے آپ نے تغلیباً ایسا فرما دیا ہو۔ ❷

لیکن ان جوابات کے علاوہ حافظ ابن حجر نے انساب عرب کے مشہور عالم ہمدانی سے یہ نقل کیا ہے کہ یمن کی حکومت کے زوال کے بعد جو قحطانی قبائل حجاز میں آ کر بس گئے تھے ان کے اور عدنانی قبائل کے درمیان ازدواجی رشتے بکثرت ہونے لگے تھے۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ سبیل توسع ایسا ارشاد فرمایا یعنی پدری سلسلہ کی بجائے مادری سلسلہ سے ان کو بنی اسماعیل فرمایا ہے۔

ہمدانی کا یہ جواب تاریخی نقطہ نظر سے بالکل صحیح ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یمن سے نکلنے کے بعد قحطانی اور عدنانی قبائل کے مابین ازدواجی رشتہ نے ہی یہ صورت پیدا کر دی ہے کہ بعض اہل نسب مشہور قحطانی قبائل کو عدنانی اِتحطانی کہتے نظر آتے ہیں مثلاً انصار (اوس خزرج) کے متعلق تمام محققین علم الانساب کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ قحطانی الاصل ہیں مگر اسی ازدواجی رشتہ سے کبھی بہ سبیل توسع ان کو عدنانی بھی کہہ دیا جاتا ہے اور اس نے بعض مؤرخین کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ وہ قحطانی نہیں بلکہ عدنانی ہیں۔ چنانچہ ابن عبدالبر کہتے ہیں:

فاول ذٰلك الازد وهي جرثومة من جراثيم قحطان و افترقت الازد و فيما ذكر ابن عبده وغيره من علماء الانساب على نحو سبع و عشرين قبيلة فمنهم الانصار۔ ❸

---

❶ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۶ ❷ فتح الباری ج ٦ ص ۴۲۰ ❸ الانباہ ص ۱۰۶

Marfat.com

قال ابن اسحاق امهما قيله ابنته كاهل بن عدرة من قضاعه كانت تحت حارثه بن ثعلبه.[1]

و روى عن عمر بن الخطاب و عبدالله بن عباس (رضي الله عنهم) ان قضاعة بن معد (بن عدنان).[2]

"قبائل یمن میں سے پہلا قبیلہ ازد ہے اور قحطانی سلسلہ کی شاخ ہے اور ابن عبدہ وغیرہ علماء انساب کے اقوال کے مطابق ازد کی تقریباً ستائیس شاخیں ہیں پس ان ہی میں سے انصار (اوس وخزرج) بھی ہیں ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اوس وخزرج کی والدہ قیلہ بنت کاہل بن عزرہ بنی قضاعہ میں سے تھی جو حارثہ بن ثعلبہ (قحطانی) کے نکاح میں آئی حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہم) سے منقول ہے کہ قضاعہ بن معد (بن عدنان) کی نسل سے ہیں۔

اسی طرح مصنف ارض القرآن کا وہ قول بھی درست ہے جو انہوں نے اس سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ بعض علماء انساب و حدیث خود قحطان کو اسماعیلی کیوں کہتے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

اس مبالغہ میں اصل حقیقت صرف یہ ہے کہ بعض قحطانی اسماعیلی ہیں اور یمن میں سکونت کے باعث یا کسی اور سبب سے ان کو قحطانی فرض کر لیا گیا ہے۔

ایک جانب بعض عدنانی قبائل کا یمن میں مقیم ہو جانا اور دوسری جانب سب کے انتشار سے بعض قحطانی قبائل کا حجاز، شام، عراق، نجد، بحرین میں جا کر وطن بنا لینا اور عدنانی قبائل کے ساتھ ازدواجی رشتے قائم کر لینا یہ وہ امور ہیں جن کی وجہ سے بعض قبائل کے متعلق قحطانی اور عدنانی ہونے میں اختلاف پیدا ہو گیا البتہ اہل عرب کو خود قحطان کے متعلق اسماعیلی ہونے کا خیال کیوں پیدا ہوا؟ اس کے جواب میں ہم مصنف ارض القرآن سے متفق نہیں ہیں کیونکہ جو اہل نسب اور علماء حدیث قحطان کو بنی اسماعیل میں سے سمجھتے ہیں وہ یہ بات اس الجھاؤ کی وجہ سے ہرگز نہیں کہتے کہ بعض عدنانی قبائل یمن میں بس جانے کی وجہ سے قحطانی کہلانے لگے جیسا کہ سید صاحب کا خیال ہے بلکہ یہ تو ایک مستقل نظریہ ہے جو بعض علماء نسب و حدیث کے درمیان اس لیے مقبول ہے کہ ان کے نزدیک تمام عرب صرف حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں اور ان کے نزدیک عرب مستعربہ کے علاوہ عرب بائدہ اور عرب عاربہ کی کوئی شاخ عرب میں باقی ہی نہیں رہی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا حجاز کعبۃ اللہ اور حرم کے ساتھ جو تعلق ہے اس کی عظمت اور اکثر قبائل عرب کے ابوالقبائل ہونے کا علاقہ ہے اس کی اہمیت یہ دو اہم باتیں ہیں کہ جن کی وجہ سے غالباً بعض قحطانی قبائل نے بھی خود کو عدنانی کہنا شروع کر دیا خصوصاً مقیم حجاز قبائل نے اس کو زیادہ نمایاں کیا نتیجہ یہ نکلا کہ جو قبائل خود کو اس پردہ میں نہیں چھپا سکتے تھے انہوں نے اس سے بڑھ کر ایک اور قدم اٹھایا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ خود قحطانی بھی اسماعیلی ہے تاکہ عدنانی اور قحطانی کا یہ فرق باقی ہی نہ رہے جو ایک کے اسماعیلی اور دوسرے کے غیر اسماعیلی ہونے سے باہمی امتیاز و شرف کا سبب بنتا تھا اور اسی بنا پر علماء انساب کے درمیان یہ مسئلہ اختلافی بن گیا اور علماء حدیث میں سے بعض محدثین نے غالباً اس لیے اس نظریہ کی تائید کی کہ ان کے سامنے چند ایسی صحیح روایات تھیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شاید کل عرب بنی اسماعیل ہی ہیں مثلاً حدیث کا یہ جملہ ((تلك امكم يا بنى ماء السماء)) میں ایک قسم کا عموم پایا جاتا ہے مثلاً بعض ایسے قبائل کے متعلق کہ جن کو قحطانی سمجھا جاتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے لیے "بنی اسمٰعیل" فرمانا مگر ان محدثین کا یہ خیال

---

[1] الانباہ ص ۶۳ [2] ایضاً ج ۱ ص ۲۷۷

Marfat.com

صحیح نہیں ہے جیسا کہ ہم حافظ ابن حجر، ابن عبدالبر، ابن کثیر بلکہ حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے مقالات سے ثابت کر چکے ہیں کہ وہ روایات کے ان الفاظ کا مطلب کیا سمجھتے ہیں بلکہ ابن عبدالبر نے اس مسئلہ کو صاف کرتے ہوئے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس دعوے کے ثبوت میں بعض مرفوع احادیث بھی پیش کی جاتی ہیں جن میں جرہم سلف اور ثقیف کو مستثنیٰ کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

((العرب کلها من ولد اسماعیل)). ❶

معلوم رہے کہ یہ اور اس قسم کی تمام روایات نا قابل اعتماد اور نا قابل حجت ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ان کی نسبت غلط ہے اور ابن عبدالبر کے اس قول سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔

قال ابو عمر اکثر الاختلاف المذکور فی کتابنا هذا و فی غیرہ من اهل النسب تولد من اختلافهم فی النسبة جمیع العرب الی اسمٰعیل بن ابراهیم (علیهما السلام) علی ما قد منا ذکرہ فی کتابنا هٰذا فی باب قحطان وغیرہ. ❷

"ابو عمر (ابن عبدالبر) کہتا ہے کہ ہماری اس کتاب میں اور اس کے علاوہ نسب کی دوسری کتابوں میں قبائل کے متعلق جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ اس نظریہ کی بدولت پیدا ہوا ہے کہ تمام عرب اسماعیل بن ابراہیم (علیہما السلام) کی اولاد ہیں جیسا کہ ہم اسی کتاب میں قحطان اور بعض دوسرے ناموں کے تحت ذکر کر آئے ہیں۔"

اور ابن کثیر کے اس قول سے بھی:

قیل ان جمیع العرب ینتسبون الی اسمٰعیل بن ابراهیم (علیهما السلام) والتحیة والاکرام والصحیح المشهور ان العرب العاربة قبل اسمٰعیل و قد قدمنا ان العرب العاربة منهم عاد و ثمود و طسم و جدیس و امیم و جرهم و العمالیق و امم اخرون لا یعلمهم الا الله کانوا قبل الخلیل علیه الصلوٰة والسلام و فی زمانه ایضًا. ❸

"کہا جاتا ہے کہ تمام عرب حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام کی نسل سے ہیں اور صحیح اور مشہور قول یہ ہے کہ عرب عاربہ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے پہلے عرب کے ساکن ہیں اور ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ عاد، ثمود، طسم، جدلیس، امیم، جرہم اور عمالیق اور ان کے علاوہ اور قبائل جن کا حال صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے سے تھے اور ان کے زمانہ میں عرب میں ان کی نسلیں پائی گئی ہیں۔"

پس حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کے متعلق جو انہوں نے اہل عرب کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے سلسلہ میں فرمایا یعنی "تلك امکم یا بنی ماء السماء" با آسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یا تو انہوں نے عدنانی قبائل کی اکثریت کے پیش نظر جو حجاز میں آباد تھی تغلیباً یہ فرما دیا اور یا اس لیے فرمایا کہ عرب کے قحطانی قبائل ہوں یا عدنانی پدری یا مادری کسی نہ کسی سلسلہ سے بنی ہاجرہ ضرور ہیں۔

---

❶ الانباہ ص ۹۲ ❷ وھی اثار کلھا ضعیفہ الاسناد ایضاً ص ۱۰۶ ❸ ابن اثیر ج ۲ ص ۱۵۶

Marfat.com

اس کے برعکس اگر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اس مقولہ کا مطلب یہ لیا جائے کہ تمام عرب پدری سلسلہ سے حقیقتاً بنی اسمٰعیل ہیں تو یہ واقعہ کے بھی خلاف ہو گا اور ان صحیح روایات کے بھی مخالف رہے گا جن سے یہ ثابت ہے کہ عرب کے قبائل کا سلسلہ نسب قحطانی اور عدنانی قبائل کے علاوہ بنی جرہم اور بعض دوسرے ان قبائل سے بھی تعلق رکھتا ہے جو عرب عاربہ کہلاتے تھے۔ اور توراۃ اور مؤرخین تو اس کے متعدد سلسلے بیان کرتے ہیں۔

نام یا لقب:

سباء نام ہے یا لقب؟ یہ بھی ایک سوال ہے جو اس جگہ زیر بحث آتا ہے توراۃ کہتی ہے کہ یہ نام ہے اور مؤرخین عرب کہتے ہیں کہ سباء لقب ہے اور نام عمرو یا عبد شمس ❶ ہے، عصر حاضر کے اہل تاریخ اسی کو صحیح سمجھتے ہیں پھر عرب کے اہل تاریخ سباء کا وجہ لقب یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ لفظ "سبا" بمعنی "قید" سے ماخوذ ہے چونکہ اس نے عرب میں سب سے پہلے جنگی قیدیوں کا طریقہ رائج کیا اور ان کو غلام بنایا اس لیے سباء لقب پایا اور جدید مؤرخین کہتے ہیں کہ یہ "س، ب، الف، مع ہمزہ سے مرکب" ایسے لفظ سے ماخوذ ہے جس کے مفہوم میں تجارت کے معنی داخل ہیں اور سباء اور قوم سباء چونکہ تاجر پیشہ قوم تھی اس لیے سباء کے نام سے مشہور ہوئی چنانچہ آج بھی عرب میں یہ لفظ شراب کی تجارت کے لیے بولا جاتا ہے "سبا الخمر شراها ليشربها وسبى سباء الخمر حملها من بلد الى بلد" ❷ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کا لقب "الرائش" بھی تھا لغت میں ریش یا ریاش کے معنی مال کے آتے ہیں یہ چونکہ بہت بڑا فیاض اور سخی تھا اور لوگوں کو کثرت سے مال و متاع دیتا رہتا تھا اس لیے اس لقب سے مشہور ہوا۔

زمانہ حکومت:

عام مؤرخین یہ کہتے ہیں کہ سباء نے چار سو چوبیس برس حکومت کی ❸ مگر جدید فلسفہ تاریخ کے لحاظ سے اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خاندان سباء کی مدت حکومت بیان کی گئی ہے لیکن یہ قاعدہ اس جگہ صحیح نظر نہیں آتا اس لیے کہ اگر قحطان کی تیسری پشت سے اس مدت کو شروع کیا جائے تو یہ تقریباً ۲۵۰۰ ق م ہو سکتی ہے۔ اس حساب سے سباء کی حکومت کو ۲۰۰۰ ق م ختم ہو جانا چاہیے حالانکہ ہم حضرت سلیمان علیہ السلام کے تذکرہ میں توراۃ سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ۹۵۰ ق م میں ملکہ سباء "بلقیس" نے حاضر خدمت ہو کر سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے اور بہت سے تحفے پیش کیے ہیں اور جیسا کہ سورۂ نمل میں ملکہ سباء کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے یہ زمانہ سباء کی حکومت کا زمانہ عروج ہے چنانچہ زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام کی یہ دعا مذکور ہے:

> "اے خدا بادشاہ کو اپنی عدالتیں عطاء کر اور بادشاہ کے بیٹے کو اپنی صداقت دے وہ تیرے لوگوں میں صداقت سے حکم کرے گا ترسیس اور جزیروں کے سلاطین نذریں گزاریں گے اور وہ جیتا رہے گا اور سباء کا سونا اسے دیا جائے گا اس کے حق میں سدا دعا ہو گی۔" ❹

حضرت داؤد علیہ السلام کی یہ دعا مقبول ہوئی اور ۹۵۰ ق م میں ان کے صاحبزادے حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں ملکہ نے حاضر ہو کر بہت سا سونا اور بیش قیمت جواہرات پیش کیے۔

---

❶ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۵۸ و تفسیر ابن کثیر ج ۳ ❷ اقرب الموارد ❸ البدایہ والنہایہ ج ۲ ❹ زبور ۷۲

Marfat.com

لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو سباء کی عمر کے متعلق مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور یا اس سے سباء کے پورے دور حکومت کی مدت نہیں بیان کی گئی بلکہ ان کی حکومت کے دوسرے دور یعنی ملوک سباء کی مدت حکومت مراد ہے جو کم وبیش چار سو چھتیس سال ہے۔ [1]

سباء اور طبقات حکومت:

مؤرخین کہتے ہیں کہ سباء کے دو بیٹے تھے ایک حمیر اور دوسرا کہلان اور تمام قحطانی قبائل ان ہی دو سلسلوں سے وابستہ ہیں اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عدنانی (اسماعیلی) قبائل جو نابت اور قیدار کی اولاد ہیں ان کا اصلی وطن شمالی عرب ہے اور قحطانی قبائل کا مسکن جنوبی عرب (یمن) ہے۔

اور عام اہل نسب جب حکومت سباء کا ذکر کرتے ہیں تو وہ حمیر کو براہ راست سباء کا جانشین کہہ دیتے ہیں اور تمام سلسلہ حکومت کو حمیری حکومت ہی سے یاد کرتے ہیں اور سباء کی حکومت کو مستقل حیثیت نہیں دیتے حالانکہ تاریخی حیثیت سے یہ نظریہ بالکل غلط ہے اس لیے کہ سباء یمن کے دور حکومت سے متعلق جو کتبات اثری اور حضری ذرائع سے برآمد ہو رہے ہیں نیز یونانی اور رومی معاصر سباء مؤرخین کی جو تاریخی شہادتیں ہیں ان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سباء کی حکومت دو طبقات میں منقسم رہی ہے اور پھر ہر دو طبقات کا زمانہ حکومت جدا جدا دو دوروں میں تقسیم ہے۔

طبقہ اولیٰ کا پہلا دور تقریباً ۱۱۰۰ ق م سے شروع ہو کر ۵۵۰ ق م پر ختم ہوتا ہے کیونکہ بلحاظ کتبات سب سے پہلے حکومت سباء کا ذکر زبور ۹۵۰ ق م میں ہوا ہے اور یہ ان کے عروج کا زمانہ قیاس کیا گیا ہے اس دور میں شاہان سباء کا لقب مکارب سباء نظر آتا ہے اور سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کی ملکہ سباء (بلقیس) اسی دور سے تعلق رکھتی ہے اور طبقہ اولیٰ کا دوسرا دور ۵۵۰ ق م سے شروع ہو کر ۱۱۵ ق م پر ختم ہوتا ہے جیسا کہ علم الآثار سے ثابت ہو چکا ہے اور "سیل عرم" اور "سباء کا انتشار" اسی دور سے متعلق ہے اس دور کے بادشاہ "ملوک سبا" کہلاتے ہیں۔

اور طبقہ ثانیہ کا پہلا دور ۱۱۵ ق م سے شروع ہو کر اواخر ۳۰۰ء پر ختم ہو جاتا ہے یہ بادشاہ ملک سباء و ریدان اور ملوک حمیر کہے جاتے ہیں اور ریدان ان کے مشہور قلعہ کا نام ہے اور سباء اور حمیر قومیت کو ظاہر کرتا ہے۔ حمیری سنہ اگرچہ غیر معروف رہا ہے لیکن ان کے ایک کتبہ میں حبشہ کے حملہ یمن اور ذونواس کی موت کا تذکرہ ہے چونکہ یہ واقعہ عرب اور رومی تاریخی روایات کے مطابق ۵۲۵ء میں پیش آیا اور کتبہ میں ۶۴۰ حمیری درج ہے لہٰذا اس کو پیش نظر رکھ کر سنہ حمیری کی ابتداء ۱۱۵ ق م سے مطابقت رکھتی ہے اس دور میں سباء کا یہ خاندان صرف یمن اور اطراف یمن کا حکمران رہا ہے۔

اور طبقہ ثانیہ کا دوسرا دور ۳۰۰ء کے اواخر سے شروع ہو کر ۵۲۵ء پر ختم ہوتا ہے اور یہ وہ زمانہ ہے کہ جب آخری مرتبہ اہل حبش یمن پر قابض ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ آفتاب اسلام کی ضیاء یمن تک پہنچتی ہے اور سارا یمن ایک ہی روز مشرف بہ اسلام ہو جاتا ہے اس دور میں حکومت کا تسلسل باقی نہیں رہا بلکہ ۳۴۰ء کے وسط میں پہلی مرتبہ اکسومی حبشی خاندان نے کچھ عرصہ کے لیے یمن پر فاتحانہ قبضہ کر لیا تھا مگر چند سال کے بعد حمیر پھر اس کو واپس لے لیتے ہیں اس دور میں شاہان سباء کا لقب مؤرخین عرب کے نزدیک تبع ہو جاتا ہے اور یہ "تبابعہ یمن" کہلاتے ہیں سامی زبان میں "تبع" کے معنی "سلطان اور قاہر بادشاہ" کے ہیں چونکہ اس دور میں شاہان حمیر

---

[1] ارض القرآن

یمن کے علاوہ حضر موت حبشہ، نجد اور تہامہ تک اپنی حدود مملکت کو وسیع کر لیا تھا اس لیے وہ اس لقب سے مشہور ہوئے چنانچہ ان کے دور کے کتبات میں "ملک سباء دریدان وحضر موت وغیرہ ملکوں کے نام اضافہ ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہی وہ "تبع ہیں جن کا ذکر قرآن کی سورۂ دخان اور سورۂ ق میں کیا گیا ہے دریدان کا قلعہ ان کا ابتدائی دار الحکومت رہا ہے اور یہ شہر ظفار کے قریب آباد تھا جو صنعا (موجودہ دار الحکومت یمن) کے متصل ہے اور جب سباء کے طبقہ اولیٰ کے انتشار سے اس کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو حمیر نے مارب تک اپنی حکومت کو وسیع کر لیا۔

سباء کے طبقات کی یہ تقسیم مشہور مؤرخ حمزہ اصفہانی کے بیان سے ہوتی ہے۔

و اول من ملك اولاد قحطان حمير بن سبا فبقى مليكا حتى مات هرمًا و توارث ولده الملك بعده فلم يعدهم الملك حتى مضت قرون وصار الملك الى الحارث و هو تبع الاول فمن ملك اليمن قبل الرائش ملكان ملك بسبا و ملك بحضر موت فكان لا يجمع اليمانيون كلهم عليهم الى ان ملك الرائش فاجتمعوا عليه و تبعوه فسمى تبعًا. ❶

"قحطان کی اولاد میں جو پہلا بادشاہ ہوا وہ حمیر بن سباء ہے یہ آخری وقت تک بادشاہ رہا یہاں تک کہ بوڑھا ہو کر مر گیا پھر حکومت اس کی اولاد میں وراثۃً جاری رہی اور چند صدیوں تک ان کے ہاتھ سے نہیں نکلی پھر حارث الرائش بادشاہ ہوا جو پہلا تبع ہے اس سے پہلے دو بادشاہ ہوتے تھے ایک سباء میں اور ایک حضر موت میں تمام یمنی ایک پر جمع نہیں ہوتے تھے لیکن جب الرائش بادشاہ ہوا تو اس کی بادشاہی پر سب مجتمع ہو گئے اور اس کی اطاعت قبول کر لی اس لیے اس کا لقب تبع ہوا۔"

اور مؤرخ محدث ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اپنی تاریخ میں یہی بیان کیا ہے:

و كانت العرب تسمى كل من ملك اليمن مع الشحر و حضر موت تبعا كما يسمون من ملك الشام مع الجزيرة قيصر و من ملك الفرس كسرىٰ و من ملك مصر فرعون و من ملك الحبشة النجاشي و من ملك الهند بطليموس. ❷

"اور عرب اس بادشاہ کو یمن کے ساتھ شحر اور حضر موت کا بھی بادشاہ ہو تبع کہتے ہیں جیسا کہ اس بادشاہ کو جو شام اور جزیرہ دونوں کا حکمران ہو قیصر کہتے ہیں اور جو فارس کا بادشاہ ہو اس کو کسریٰ اور ملک مصر کے بادشاہ کو فرعون اور حبشہ کے بادشاہ کو نجاشی اور ہندوستان کے بادشاہ کو بطلیموس کہتے ہیں۔"

غرض یہ خیال کہ سباء کی حکومت اور حمیری حکومت ایک ہی بات ہے نہ صرف تاریخ ہی کے خلاف ہے بلکہ خود قرآن عزیز کی تصریحات کے بھی خلاف ہے اس لیے کہ قرآن عزیز نے حکومت سباء سے متعلق سورۂ نمل اور سورۂ سبا میں جو دو واقعے بیان کیے ہیں ان کا تعلق سباء کے اس طبقہ سے ہے جو ملوک حمیر اور تبابعہ سے قبل گزرا ہے اور اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حمیر ہرگز سباء کا بلاواسطہ بیٹا نہیں ہے بلکہ اس کے اور حمیر کے درمیان بہت زیادہ واسطے ہیں اور حمیر اگرچہ سباء کا بیٹا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس

❶ ص ۱۰۸ مطبوعہ کلکتہ ❷ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۵۹

Marfat.com

کا اپنا زمانہ اور اس کی نسل میں قیام حکومت کا زمانہ ایک ہے بلکہ قیاس یہ چاہتا ہے کہ سباء کے بعد اس کی اولاد میں حکومت کا وہ سلسلہ جو طبقہ اولیٰ سے تعلق رکھتا ہے بجائے حمیر کی نسل کے کہلان کی کسی قدیم شاخ میں قائم رہا ہے کیونکہ مارب اور سباء کی نو آبادیوں کی تباہی کا اثر ہم بنی کہلان میں زیادہ پاتے ہیں اور مارب تک حمیری حکومت کی ابتداء سباء کی بربادی سے شروع ہوتی ہے چنانچہ عام مؤرخین کے خلاف ابن عبدالبر نے یہ تصریح کی ہے کہ سباء کی حکومت صرف حمیر کی نسل ہی میں نہیں رہی بلکہ کہلان کے خاندان میں بھی یہ سلسلہ رہا ہے وہ فرماتے ہیں:

و ولد سبا حمیر بن سبا و کھلان بن سبا فمن حمیر و کھلان کانت ملوك الیمن من التبابعة والاذواء.

"اور سباء کے دو بیٹے تھے حمیر اور کہلان اور حمیر و کہلان دونوں ہی کی نسل سے یمن کے بادشاہ تبع اور ذو ہوئے ہیں۔"

مکارب سباء وملوک سباء:

سباء (طبقہ اولیٰ) کے دور اول کے حکمران تاریخ میں "مکارب سبا" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں یہ لفظ "مکا" بمعنی مذہبی اور "رب" بمعنی مالک سے مرکب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سباء کا ابتدائی دور حکومت مذہبی پیشواؤں یعنی کاہن حکمرانوں سے شروع ہوتا ہے ان بادشاہوں کا دارالحکومت صرواح تھا اور یہ مارب اور صنعاء کے درمیان واقع تھا اور اس کے کھنڈرات بھی موجود ہیں اور ملوک سباء (شاہان سبا) کا دارالحکومت مارب تھا اور ان کا بادشاہ اس کے مشہور قلعہ "سلحین" میں رہتا تھا۔ ابن علقمہ جاہلی شاعر مسلمان مؤرخین سے قبل ان دونوں زمانہ ہائے حکومت کو الگ الگ ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

من یا من الحدثان بعد ملوک صرواح و مارب

صرواح اور مارب کے بادشاہوں کے بعد اب کون حوادث سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

اور یہی شاعر قلعہ سلحین کا بھی ذکر کرتا ہے۔

و قیصر سلحین قد عفاہ ریب الزمان الذی یریب

اور سلحین کا محل، جس کو زمانہ کے حوادث نے فنا کر دیا۔

وسعت حکومت:

حکومت سباء کی ابتداء جنوبی عرب "یمن" کے مشرقی حصہ سے ہوتی ہے اس کا دارالحکومت اول صرواح تھا اور پھر مارب ہوا آہستہ آہستہ اس حکومت نے ترقی کی اور ملکی فتوحات کے ساتھ ساتھ تجارتی ذرائع سے بھی بہت زیادہ کامیابی حاصل کی اس لیے اس کا رقبہ حکومت وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور شمالی عرب اور افریقہ تک اس کے حدود نظر آنے لگے چنانچہ حبشہ میں اذنیہ کا ضلع اسی کے مقبوضات میں تھا اور حکومت سباء کی جانب سے مغافر کے لقب سے ایک سبائی حکومت کرتا تھا یمن سے براہ حجاز شام تک جو قدیم تجارتی شاہراہ تھی اور جس کا ذکر قرآن عزیز نے سورۂ قریش میں "رحلة الشتاء والصیف" کہہ کر کیا ہے اور دوسری جگہ جس کو امام مبین فرمایا ہے وہ بھی ان ہی کے قبضہ میں آ گئی تھی اور شام فلسطین اور مدین کے نواح میں بھی ان کے مقبوضات موجود تھے اور ا

Marfat.com

طرح تقریباً آٹھویں صدی قبل مسیح میں اہل معین پر غلبہ پانے کے بعد سباء کی حکومت عرب کی عظیم الشان متمدن حکومت تھی۔ [1]

طرز حکومت:

سباء کے طرز حکومت کے متعلق اہل تاریخ یہ کہتے ہیں کہ اس زمانہ کے محدود سلسلہ رسل و رسائل کے پیش نظر یہ ضروری سمجھتا تھا کہ دار الحکومت سے فاصلہ پر آباد شہروں اور بستیوں پر آزاد گورنروں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں ہوں اور جو مرکزی حکومت کے تابع اور اس کے نائب کی حیثیت سے حکومت کیا کریں۔ پس اس اصول پر یمن کی حکومت قائم تھی اور اس کی ترتیب و تنظیم اس طرح پر تھی کہ آس پاس کے گاؤں اور قصبوں کے درمیان عموماً ایک قلعہ ہوتا تھا جس پر قلعہ دار رہتا تھا اور وہی ان آبادیوں کا حاکم اور ذو کہلاتا تھا اور اس مجموعہ آبادی کو "محفد" کہتے تھے۔ یمنی زبان میں ذو کے معنی "آقا" کے ہیں جو عربی میں بمعنی صاحب و مالک بولا جاتا ہے اور اس کی جمع اذواء آتی ہے اور قلعہ کا جو نام رکھا جاتا تھا اسی کے انتساب سے قلعہ دار کا لقب قرار پاتا تھا مثلاً ذو غمدان ذو ثعلبان۔

پھر چند محفد مل کر ایک "مخلاف" بنتا تھا اور اس مخلاف کے حاکم کو قیل (صوبہ دار) کہتے تھے قیل کی جمع "اقیال" ہے اور یہ سب اقیال "ملک" (بادشاہ) کے تابع فرمان ہوتے تھے ان ہی بادشاہوں کو یمن کی تاریخ میں مکارب سباء کہا جاتا تھا اور بادشاہ کا بھی ایک زبردست اور محکم قلعہ ہوتا تھا چنانچہ قلعہ "ریدان" اور "سلحین" ان ہی بادشاہوں کے قلعے تھے اور یہ بادشاہ ان ہی قلعوں اور دار الحکومت کے شہروں کے انتساب سے لقب پاتے تھے مثلاً ایک سباء وذو ریدان یا ملک سباء ذو سلحین" مارب کے آثار سے جو سکے حاصل کیے گئے ہیں ان پر یہ نقش کندہ ہے "ضرب بیت سلحین وحضر مارب" یعنی یہ قلعہ سلحین اور شہر مارب میں مسکوک کیا گیا۔

یمن کے اسلامی حکومت میں شامل ہونے کے بعد بھی "اذواء" اور "اقیال" کا یہ نظم حکومت باقی رکھا گیا اور یہی وہ اقیال یمن ہیں جن کو نبی اکرم ﷺ نے دعوت اسلام کے لیے نامہ ہائے مبارک تحریر فرمائے اور انہوں نے برضا و رغبت دعوت اسلام کو قبول کیا۔

سباء کی عمارات:

ہمدانی جو کہ قدیم مؤرخین کی طرح جدید یورپ کی نگاہ میں بھی بہت مستند اور سچا مؤرخ تسلیم کیا جاتا ہے اس نے اپنی مشہور کتاب اکلیل میں ایک باب سبا کی عظیم الشان اور عجیب و غریب عمارات کے لیے مرتب کیا ہے اور حکومت سبا کے سلسلہ میں جو کتبات پائے گئے ہیں ان میں بھی اکثر ان قلعوں اور بے نظیر عمارات ہی کے کتبے ہیں اور یورپین سیاح بھی ان کھنڈرات کے عجیب و غریب حالات سناتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ قصر غمدان [2] بے مثل صناعی کا نمونہ تھا یہ قصر بیس منزل رکھتا تھا اور ہر ایک منزل کا ارتفاع بقدر دس گز معماری اور سب سے اوپر کی منزل نہایت بیش قیمت آبگینوں سے بنائی گئی تھی اور اس قصر میں سو وسیع و عریض کمرے تھے اسی طرح بے نظیر عمارات کا سلسلہ تھا جو اس زمانہ کے رفیع تمدن اور سبا کی حیرت انگیز ترقی کا آئینہ دار تھا۔

---

[1] دائرۃ المعارف للبستانی (سبا) معجم البلدان (یمن)

[2] قال ابن غمدان قصر بالیمن بناہ یعرب بن قحطان وملکہ بعدہ واختلہ واثلہ بن یعرین سبا ویقال کان ارتفاعہ عشرین طبقہ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۷۹۔

سبا کا تمدن:

گزشتہ سطور میں کہا جا چکا ہے کہ اہل سبا ایک تاجر قوم تھی اور یہ وصف ان کا قومی مزاج بن گیا تھا اس لیے وہ حکومت کے وسائل ترقی کے لیے بھی اسی کو زیادہ اہم وسیلہ سمجھتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے حدود حکومت میں جو خزانے مدفون کر رکھے تھے وہ اور زیادہ ان کی اس فطرت کے لیے تائید غیبی بن گئے تھے کیونکہ عرب میں سونے اور جواہرات کی بہ کثرت کانیں موجود ہیں اور ان کا بیشتر حصہ ان ہی کے رقبہ حکومت میں موجود تھا۔ مدین میں سونے کے علاوہ دوسری قسم کی معدنیات بھی پائی جاتی ہیں حضر موت اور یمن کا علاقہ خوشبودار اشیاء کی پیداوار کے لیے مشہور تھا اور اب بھی ہے عمان اور بحرین میں موتیوں کے خزانے ہیں جن سے آج بھی تمام دنیا میں بیش قیمت موتی جاتا ہے۔ خود یمن کے ساحل ہندوستان اور حبش کی پیداوار کے لیے منڈی تھے اور شام، مصر اور یورپ اور ہندوستان حبش کے درمیان جو درآمد و برآمد ہوتی اور تجارتی کاروبار ہوتا تھا اس زمانہ میں سبا ہی اس کے واحد اجارہ دار اور براہ حجاز ان ملکوں تک سامان تجارت پہنچاتے تھے اسی بنا پر توراۃ میں سبا کی دولت وثروت اور اس کی وجہ سے ان کے تمدن کی عظمت کے بہ کثرت تذکرے پائے جاتے ہیں چنانچہ یسعیاہ نبی کی کتاب میں ہے۔

"مصر کے مزدور اور حبش اور سبا کے تجارتی مال اور تومند آدمی تیرے پاس آئیں گے اور وہ تیرے ہوں گے۔" ❶

اور اسی کتاب میں دوسری پیشین گوئی ہے:

"(اے یروشلم) اونٹوں کی قطاریں تجھ پر چھا جائیں گی مدین اور عیفا کی اونٹنیاں (بھی) یہ سب سبا سے آئیں گی اور سونا اور لوبان لے کر آئیں گی۔" ❷

اور یرمیاہ نبی کی کتاب میں ہے:

"(خداوند غصہ کرتے ہوئے فرماتا ہے) کس مقصد کے لیے میرے پاس سبا کا لوبان پیش کرتے ہو۔" ❸

اور حزقیل نبی کی کتاب میں ہے:

"اور عوام کے ساتھ سبا والے بیابان (عرب) سے لائے گئے جن کے ہاتھوں میں کنگن ہیں اور خوب صورت تاج ان کے سروں پر ہیں۔" ❹

اور دوسری جگہ ہے:

"اور سبا اور رعمہ کے سوداگر تیرے ساتھ سوداگری کرتے تھے وہ تیرے بازاروں میں ہر قسم کے نفیس اور خوشبودار مصالحے اور ہر طرح کے جواہرات اور سونا اور یمن کے شہروں حران قانہ اور عدن اور سوداگران سبا اور اشور اور کلما تیرے سوداگر ہیں یہ ہی تیرے تاجر تھے ہر قسم کی چیزوں کے جو کمخاب اور چوغے اور ارغوانی اور منقش پوشاکیں اور سب طرح کے بوٹے دار نفیس کپڑے گٹھوں سے کسے ہوئے اور مضبوط بندھے ہوئے تیری تجارت گاہ میں بیچنے کے لیے لاتے تھے۔" ❺

---

❶ (۱۴_۴۵) ❷ (۶_۶۰) ❸ (۲۰_۶) ❹ (۴۲_۲۳) ❺ (۲۲_۲۴_۲۷)

Marfat.com

سد مارب:

عرب میں مستقل دریا ناپید ہیں، اکثر بارش کے پانی پر گزر ہے اور کہیں کہیں پہاڑی چشمے بھی ہیں، بارش کا پانی ہو یا پہاڑی چشموں کا تمام پانی بہہ کر وادی کے ریگستان میں جذب ہو کر ضائع ہو جاتا ہے، قوم سبا نے اس پانی کو کام میں لانے اور باغات و زراعت کو سرسبز و شاداب بنانے کے لیے یمن کے اقطاع و امصار میں ایک سو سے زائد بند باندھے تھے اور ان کی وجہ سے تمام ملک سرسبز و بہارستان بنا ہوا تھا ان ہی بندوں میں سے سب سے بڑا اور عظیم الشان بند "سد مارب" تھا جو دار الحکومت مارب میں بنایا گیا تھا۔

اس "سد" کے متعلق قدیم جدید مؤرخوں اور سیاحوں نے جو حالات لکھے ہیں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ سبا کو فن انجینئری اور ہندسہ میں بہت بڑا کمال حاصل تھا۔

مارب کے جنوب میں داہنے بائیں دو پہاڑ ہیں جو کہ ابلق کے نام سے مشہور ہیں اور ان کے درمیان بہت طویل و عریض وادی ہے جس کو وادی اذنیہ کہتے ہیں جب پانی برستا یا پہاڑی چشموں سے بہہ نکلتا تو وادی دریا بن جاتی۔ سبا نے یہ دیکھ کر ۸۰۰ ق م میں ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بند باندھنا شروع کیا اور عرصہ تک اس کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہا۔

بعض مؤرخین عرب کہتے ہیں کہ یہ بن دو میل مربع تھا[1] اور صاحب ارض القرآن ایک یورپین سیاح ازماؤ کے مضمون کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ یہ ایک سو پچاس فٹ لمبی اور پچاس فٹ چوڑی دیوار ہے جس کا بہت بڑا حصہ منہدم ہو چکا ہے اور ایک تہائی اب بھی باقی ہے اور وہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ اس سیاح نے اس کا بہت عمدہ نقشہ تیار کر کے اپنے مضمون کے ساتھ شائع کیا ہے جو فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں چھپا ہے اور جس کو انہوں نے ارض القرآن میں بھی نقل کیا ہے۔

مؤرخین عرب یہ بھی کہتے ہیں کہ سبا نے اس کو اس طرح تعمیر کیا تھا کہ پانی کو روکنے کے بعد موسموں کے اختلاف کے پیش نظر آبیاری کے لیے پانی کے اوپر نیچے تین درجے قائم کر دیئے تھے اور ہر درجہ میں تیس تیس کھڑکیاں رکھی تھیں جن کے ذریعہ پانی کو کھولا اور بند کیا جاتا تھا اور پھر ان کے نیچے ایک بہت بڑا حوض بنایا تھا اس کے دائیں اور بائیں دو بڑے بڑے آہنی پھاٹک تھے جن کے ذریعہ حوض کا پانی تقسیم ہو کر مارب کے دونوں جانب نہروں، گولوں اور رجبھوں کے ذریعہ حسب ضرورت کام میں آتا تھا۔ اس عظیم الشان بند کی وجہ سے تقریباً تین سو مربع میل تک داہنے اور بائیں چھواروں کے نخلستان، میووں اور پھلوں کے حسین و جمیل باغ، خوشبوؤں کے کھیت اور مرغزار دار چینی، عود اور مختلف قسم کے خوشبودار درختوں کے گنجان باغات اس کثرت سے ہو گئے تھے کہ تمام علاقہ چمنستان اور فردوس بنا ہوا تھا۔[2]

ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ بروایت ابن منبہ یہاں تک مبالغہ کرتے ہیں کہ اگر ایک عورت کسی موسم میں بھی سر پر ٹوکری رکھ کر ان باغات کے اندر سے گزرتی تو ہاتھ لگائے بغیر ہی اس کی ٹوکری پختہ پھلوں کے ٹپکنے سے بھر جاتی۔[3]

یمن کی طبعی خصوصیت کے لحاظ سے خوشبوؤں، پھلوں اور پھولوں کے درختوں کی کثرت مارب کے بند کی وجہ سے اس میں

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۵۹ [2] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۵۸ [3] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۹

Marfat.com

عظیم الشان اضافہ اور ترقی تجارتی کاروبار اور معدنیات کی کثرت کی وجہ سے سونا، چاندی اور جواہرات کی بہتات نے قوم سبا میں اس درجہ خوش عیشی، رفاہیت، فارغ البالی اور اطمینان پیدا کر دیا تھا کہ وہ ہر وقت مسرت و شادمانی کے ساتھ خدا کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوتے اور شب و روز طمانیت و مرفعہ الحالی میں زندگی بسر کرتے تھے۔

اور ملک کے بہارستانوں اور چمنستانوں کی وجہ سے آب و ہوا میں اس درجہ اعتدال تھا کہ اہل سبا مچھروں، مکھیوں اور پسوؤں جیسے ایذا رساں کیڑوں سے پاک و محفوظ تھے چنانچہ سبا کے معاصر مؤرخ اہل سبا کی اس رشک پیدا کرنے والی زندگی کے حالات اس طرح بیان کرتے ہیں (راٹوتھینس Eratoothens) ۱۹۴ ق م لکھتا ہے۔

"عرب کے انتہائی حد پر سمندر (بحر ہند و عرب) کے پہلو میں سبا کے لوگ ہیں جن کا دارالحکومت مارب (Mariaba) ہے یہ قطعہ ملک مصر کے زیریں پڑا ہے، گرمیوں میں بارش ہوتی ہے اور دریا جاری ہوتے ہیں جو میدانوں اور تالابوں میں جا کر خشک ہو جاتے ہیں اسی سبب سے زمین اس قدر سرسبز و شاداب ہے کہ تخم ریزی وہاں سال میں دوبار ہوتی ہے حضر موت سے سبا کے ملک تک چالیس روز کا راستہ ہے اور معین سے سوداگر ستر دن میں ایلہ (عقبہ) پہنچتے ہیں، حضر موت، معین اور سبا کے ملک خوش و خرم ہیں اور ہیکلوں اور شاہی عمارتوں سے آراستہ ہیں۔

اور یونانی مؤرخ اگاتھرشیڈس (Agathershidos) ۱۴۵ ق م لکھتا ہے سبا عرب آبادان (Arafiafler) میں رہتے ہیں جہاں بہت اچھے اچھے بے شمار میوے ہوتے ہیں۔ زمین جو سمندر کے متصل ہے اس میں بلسان اور نہایت خوب صورت درخت ہوتے ہیں جو دیکھنے میں بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں اندرون ملک بخورات، دارچینی اور چھوہارے کے نہایت بلند درختوں کے گنجان جنگل ہیں اور ان درختوں سے نہایت شیریں بو پھیلا کرتی ہے درختوں کے اقسام کی کثرت و تنوع کے سبب سے ہر قسم کا نام و وصف مشکل ہے جو خوشبو اس میں سے اڑتی ہے وہ جنت کی خوشبو سے کم نہیں اور جس کی تعریف لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتی جو اشخاص زمین سے دور ساحل سے گزرتے ہیں وہ بھی جب ساحل کی طرف سے ہوا چلتی ہے تو اس خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں وہ گویا آب حیات کا لطف اٹھاتے ہیں اور یہ تشبیہ بھی اس کی قوت و لطافت کے مقابل میں ناقص ہے۔

اور یہی مؤرخ دوسری جگہ لکھتا ہے:

سبا میں تمام دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند لوگ ہیں۔ چاندی اور سونا بکثرت ہر طرف سے لایا جاتا ہے بعد کے سبب سے کسی نے ان کو فتح نہیں کیا ہے اسی لیے خصوصاً ان کے دارالحکومت میں سونے چاندی کے برتن ہیں تخت اور پیش گاہیں ہیں جن کے ستون زرنگار اور نقرئی و طلائی نقش و نگار سے آراستہ ہیں ایوان اور دروازے زر و جواہر سے منقش ہیں اس قسم کے زیب و زینت پر وہ نہایت ہنرمندی اور محنت صرف کرتے ہیں۔

اور مشہور مؤرخ آرٹی میڈ دروس (ARtimidors) ۱۰۰ ق م باشندہ شہر افسس لکھتا ہے:

سبا کا بادشاہ اور اس کا ایوان مارب میں ہے جو ایک پر اشجار پہاڑ پر زنانہ خوش حالی (عیش و عشرت) میں واقع ہے میوؤں کی کثرت کے سبب سے لوگ سست اور ناکارہ ہو گئے ہیں خوشبودار درختوں کی جڑوں میں لیٹے پڑے رہتے ہیں۔ جلانے کی لکڑی کے بدلے دارچینی اور خوشبودار لکڑی جلاتے ہیں کچھ لوگوں کا پیشہ زراعت ہے اور کچھ ملکی و غیر ملکی مسالوں کی تجارت کرتے ہیں یہ مسالے

Marfat.com

مقابل کے حبشی ساحل سے لائے جاتے ہیں جہاں سبا کے لوگ چمڑے کی کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کے پار چلے جاتے ہیں قرب و جوار کے قبائل سبا سے تجارتی اسباب خریدتے ہیں اور وہ اپنے ہمسایوں کو دیتے ہیں اور اسی طرح دست بدست وہ شام اور جزیرہ تک پہنچتے ہیں۔ ❶

جنتان عن یمین وشمال:

غرض یمن کی طبعی خصوصیات کے علاوہ جو اس ملک کی شادابی اور معتدل آب و ہوا کے لیے قدرتی وسائل کی شکل میں موجود تھیں ملک کے اندر اس "بند آب" نے ہمہ قسم کی راحت عیش وعشرت کی زندگی کے لیے سامان فراہم کر دیئے تھے اور ان سب چیزوں پر یہ متضاد تھا کہ یمن سے شام تک جس مشہور شاہراہ امام مبین پر اہل سبا کے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت تھی اس کے بھی دونوں جانب حسین وخوبصورت بلساں اور دار چینی کے خوشبودار درختوں کا سایہ تھا اور قریب قریب فاصلہ سے حکومت سبا نے ان کے سفر کو آرام دہ بنانے کے لیے کاروان سرائے بنا رکھی تھیں جو شام کے علاقہ تک ان کو اس آرام کے ساتھ پہنچاتی تھیں کہ خنک پانی اور میووں اور پھلوں کی افراط یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیتی تھی کہ وہ اپنے وطن میں ہیں یا دشوار گزار سفر میں حتیٰ کہ جب خوشگوار سایہ اور فرحت بخش ہوا میں ان کا کارواں ان کارواں سراؤں میں ٹھہرتا میوے اور تازہ پھل کھاتا اور سرد وشیریں پانی پیتا ہوا حجاز اور شام تک آمد و رفت رکھتا تو ہمسایہ قومیں رشک وحسد سے ان پر نگاہیں اٹھاتی اور حیرت وتعجب کے ساتھ ان کے اس عیش وعشرت پر انگشت بدنداں ہو جاتی تھیں جیسا کہ آپ ابھی ان کے معاصر مؤرخین کی زبان سے سن چکے ہیں کہ وہ کن الفاظ کے ساتھ ان کی اس خوش حالی کا تذکرہ کر رہے ہیں اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بے حد ارزاں کر دیا تھا۔

ان تاریخی تصریحات کے بعد اب ہم کو قرآن عزیز کی ان آیات کا مطالعہ کرنا چاہیے جو سبا کی اس خوش حالی کا ذکر کرتے ہوئے اس کو اہل سبا پر خدائے تعالیٰ کا عظیم الشان انعام واکرام اور احسان عظیم ظاہر کرتا ہے۔

﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِیْ مَسْكَنِهِمْ اٰیَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ یَّمِیْنٍ وَّ شِمَالٍ ۬ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَیِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ ۟﴾ (سبا: ۱۵)

"بلاشبہ اہل سبا کے لیے ان کے وطن میں قدرت الٰہی کی عجیب وغریب نشانی تھی دو باغوں کا (سلسلہ) داہنے بائیں اور (خدا نے ان کو یہ فرما دیا تھا) اے سبا والو اپنے پروردگار کی جانب سے بخشی ہوئی روزی کھاؤ اور اس کا شکر کرو شہر ہے پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشنے والا۔"

ایک مرتبہ گزشتہ تاریخی تفاصیل کو اور مطالعہ کیجئے اور صرف مسلمان مؤرخین کی روایات کی روشنی میں نہیں بلکہ ان غیر مسلم مؤرخین کی معاصرانہ شہادتوں کی روشنی میں پڑھئے جو اسلام دشمنی میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور پھر قرآن کی مسطورہ بالا آیات کا مطالعہ فرمایئے قرآن کہتا ہے کہ سبا کے اپنے گھر ہی میں خدائے تعالیٰ کی بے نظیر اور عجیب وغریب نشانی موجود تھی وہ یہ کہ سینکڑوں میل تک ان کے شہر کے داہنے بائیں میووں پھلوں اور خوشبودار چیزوں کے درختوں کا گنجان سلسلہ باغات کی شکل میں موجود تھا، یہ خدائے

❶ ارض القرآن ج ۲ ص ۲۵۲-۲۵۴

Marfat.com

تعالیٰ کا عطا کردہ رزق تھا جو آس پاس کی قوموں کے مقابلہ میں دو طرح سے ان کو بخشا گیا تھا۔ ایک ملک کے طبعی خواص کے ذریعہ جو اللہ کی "فطرۃ" کے ہاتھوں سے معتدل ہوا، سرد و خشک پانی، عمدہ پھلوں اور پھولوں کی خودرو پیداوار اور خوشبودار چیزوں کے درختوں کی طبعی نشوونما کی شکل میں ظاہر ہوا اور دوسرا آب رسانی کے بہتر طریقوں کی صورت میں جو درحقیقت خالق کائنات ہی کی عطا کردہ عقل و خرد اور فہم و ذکا کا نتیجہ تھا۔ پس اہل سبا کا فرض ہے کہ وہ اس خوش عیشی اور عافیت کوشی پر جو ان کو ان کے وطن ہی میں بے محنت حاصل ہے" اس کے شکر گزار بندے بنیں اگر وہ ان نعمتوں کا شکر ادا کریں گے اور خدا کے رشتہ کو مضبوط کرنے کے لیے اس کی مرضیات پر گامزن رہیں گے تو بلاشبہ انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ایک جانب ان کی دنیا کی زندگی کے لیے ان کو ایسا عمدہ اور ہر طرح سے پاک صاف وطن حاصل ہے اور دوسری جانب ان کی حیات ابدی اور نجات اخروی کے لیے ان کا پروردگار بہت بخشنے والا ہے۔

اہل سبا اور خدا کی نافرمانی:

اہل سبا ایک عرصہ تک تو اس جنت ارضی کو خدا کی عظیم الشان آیت و نعمت ہی سمجھتے اور حلقہ بگوش اسلام رہتے ہوئے احکام الٰہی کی تعمیل اپنا فرض یقین کرتے رہے لیکن تمول، خوش عیشی اور ہر قسم کے تنعم نے آہستہ آہستہ ان میں بھی وہی اخلاق ردیہ پیدا کر دیئے جو ان کی پیشرو گزشتہ متکبر اور مغرور قوموں میں موجود تھے اور یہ یہاں تک ترقی کرتے رہے کہ انہوں نے دین حق کو بھی خیر باد کہہ دیا اور کفر و شرک کی سابق زندگی کو دوبارہ اپنا لیا۔ تاہم "رب غفور" نے فوراً گرفت نہیں کی بلکہ اس کی وسعت رحمت نے قانون امہال (مہلت دینے کا قانون) سے کام لیا اور انبیاء (علیہم السلام) نے ان کو راہ حق کی تلقین فرمائی اور بتایا کہ ان نعمتوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم دولت، ثروت اور جاہ و حشمت کے نشہ میں چور ہو کر مست ہو جاؤ اور نہ یہ کہ اخلاق کریمانہ کو چھوڑ بیٹھو اور کفر و شرک اختیار کر کے خدا کے ساتھ بغاوت کا اعلان کر دو، سوچو اور غور کرو کہ یہ راہ بری ہے اور اس کا انجام برا انجام ہے۔

محمد ابن اسحاق بروایت ابن منبہ کہتے ہیں کہ اس درمیان میں ان کے پاس خدائے تعالیٰ کے تیرہ نبی حق رسالت ادا کرنے آئے مگر انہوں نے مطلق توجہ نہ کی اور اپنی موجودہ خوش عیشی کو دائمی وراثت سمجھ کر شرک و کفر کی بدمستیوں میں مبتلاء رہے۔ [1]

آخر تاریخ نے خود کو دہرایا اور ان کا انجام بھی وہی ہوا جو گزشتہ زمانہ میں خدائے برحق کی نافرمان قوموں کا ہو چکا ہے۔

سیل عرم:

چنانچہ خدائے تعالیٰ نے ان پر دو قسم کا عذاب مسلط کر دیا جس کی بدولت ان کے جنت مثال باغات برباد ہو گئے اور ان کی جگہ جنگلی بیریاں، خاردار درخت اور پیلو کے درخت اُگ کر یہ شہادت دینے اور عبرت کی کہانی سنانے لگے کہ خدا کی پیہم نافرمانی اور سرکشی کرنے والی اقوام کا یہ حشر ہوتا ہے۔

پہلی سزا:

ہوا یہ کہ وہ "بند" جس کی تعمیر پر ان کو بے حد ناز تھا اور جس کی بدولت ان کے دارالحکومت کے دونوں جانب تین سو مربع میل تک خوبصورت اور حسین باغات اور سرسبز و شاداب کھیتوں اور فصلوں سے یمن گلزار بنا ہوا تھا وہ خدا کے حکم سے ٹوٹ گیا اور اچانک

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲

Marfat.com

اس کا پانی زبردست سیلاب بنا ہوا وادی میں پھیل گیا اور مارب اور اس تمام حصہ زمین پر جن میں یہ فرحت بخش باغات تھے چھا گیا اور ان سب کو غرق آب کر کے برباد کر ڈالا اور جب پانی آہستہ آہستہ خشک ہو گیا تو اس پورے علاقہ میں باغوں کی جنت کی جگہ پہاڑوں کے دونوں کناروں سے وادی کے دونوں جانب جھاؤ کے درختوں کے جھنڈ جنگلی بیروں کے جھاندوں اور ان پیلو کے درختوں نے لے لی جن کا پھل بدذائقہ اور بکساپن لیے ہوتا ہے۔

اور خدا کے اس عذاب کو اہل مارب اور قوم سبا کی کوئی قوت وسطوت نہ روک سکی اور بند باندھنے میں انجینئری اور علم ہندسہ کی مہارت فن کا جو ثبوت انہوں نے دیا تھا وہ اس کی شکستگی کے وقت سب ناکارہ ہو کر رہ گیا اور اہل سبا کے لیے اس کے سواء کوئی چارہ کار باقی نہ رہا کہ اپنے وطن مالوف اور بلدہ طیبہ مارب اور نواح مارب کو چھوڑ کر منتشر ہو جائیں۔

قرآن عزیز نے اسی عبرتناک واقعہ کو بیان کر کے عبرت نگاہ اور بیدار قلب انسان کو نصیحت کا یہ سبق سنایا ہے:

﴿فَاَعۡرَضُوۡا فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡهِمۡ سَیۡلَ الۡعَرِمِ وَ بَدَّلۡنٰهُمۡ بِجَنَّتَیۡهِمۡ جَنَّتَیۡنِ ذَوَاتَیۡ اُکُلٍ خَمۡطٍ وَّ اَثۡلٍ وَّ شَیۡءٍ مِّنۡ سِدۡرٍ قَلِیۡلٍ ﴿۱۶﴾ ذٰلِکَ جَزَیۡنٰهُمۡ بِمَا کَفَرُوۡا ؕ وَ هَلۡ نُجٰزِیۡۤ اِلَّا الۡکَفُوۡرَ ﴿۱۷﴾﴾ (سبا: ۱۶-۱۷)

"پھر انہوں نے (قوم سبا نے) ان پیغمبروں کی نصیحتوں سے منہ پھیر لیا پس ہم نے ان پر بند توڑنے کا سیلاب بھیج دیا اور ان کے دو (عمدہ) باغوں کے بدلے دو ایسے باغ اُگا دیئے جو بدمزہ پھلوں، جھاؤ اور کچھ بیری کے درختوں کے جھنڈ تھے یہ ہم نے ان کی ناشکر گزاری کی سزا دی اور ہم ناشکر قوم ہی کو سزا دیا کرتے ہیں۔"

غور کیجئے کہ یہ سیلاب بہ اسباب ظاہر کس طرح آیا۔ کیا اس لیے کہ "مارب کا بند" کہنہ اور شکستہ ہو گیا تھا؟ نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو جس قسم کے مہندسین اور انجینئری کے ماہرین نے اس کو بنایا تھا۔ سبا میں ان کی اس وقت بھی کمی نہ تھی اور وہ اس کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں میں سینکڑوں بند تعمیر کراتے رہے تھے پھر کیا وہ اس کی کہنگی اور شکستگی کا اتنا انتظام بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اگر اس کو اپنی طبعی عمر پر ٹوٹنا ہی ہے تو پانی کے زور کو اس طرح کم کر دیا جائے یا اس کے لیے تعمیر میں ایسے اضافے کر دیئے جائیں کہ جس سے یہ اچانک شکست ہو کر اس مصیبت عظمیٰ کا باعث نہ بن سکتا پھر یہ سیلاب کیوں آیا کیا اس لیے کہ اس حقیقت کے جان لینے کے باوجود کہ یہ بند عنقریب شکستہ ہو کر اس واہیہ کبریٰ کا باعث بننے والا ہے انہوں نے کاہلی اور سستی سے اس کی پرواہ نہیں کی تو تاریخ کی روشنی میں یہ بھی غلط ہے اس لیے کہ حکومت سبا کے متعلق جو معاصرانہ تاریخی شہادتیں مہیا ہیں وہ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ اس بند کی مضبوطی استحکام اور ہر قسم کے حفاظتی امور کے بارے میں بہت مطمئن تھے اور برابر اس سے آبپاشی کا کام لے رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ قدیم وجدید تاریخیں اس ہولناک تاریخی واقعہ کے اسباب وعلل کے بارے میں قطعاً خاموش ہیں اور اس لیے خاموش ہیں کہ سبا پر یہ عذاب بلاشبہ غیر متوقع اور اچانک آیا جس سے وہ خود بھی حیران وسراسیمہ ہو کر رہ گئے اور وہ اس کے سواء اور کچھ سمجھ سکے کہ یہ جو کچھ ہوا اچانک غیبی ہاتھ سے ہوا کیونکہ "بند" کے استحکامات اور انتظامات میں بظاہر کوئی خرابی نہیں تھی پھر یک لخت اس کا ٹوٹ جانا اور پانی کا سیلاب عظیم کی شکل میں پھیل کر تمام جنت نشان علاقہ کو تباہ و برباد کر دینا بجز عذاب الٰہی کے اور کیا ہو سکتا ہے انہوں نے جب جائز اور پاک خوش عیشی کو عیاشی اور بداطواری میں بدل دیا۔ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے غرور و

Marfat.com

تکبر کے ساتھ کفرانِ نعمت کیا، نبیوں اور پیغمبروں کے بار بار رشد و ہدایت پہنچانے کے باوجود شرک و کفر پر اصرار کیا تو اچانک عذاب الٰہی آ کر ان کو تباہ و برباد نہ کرتا تو اور کیا ہوتا؟

﴿فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ ..... ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَ هَلْ نُجْزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ۝﴾ (سبا: ۱۶۔۱۷)

ابن جریر ابن کثیر اور دوسرے اصحاب سیر نے اس موقعہ پر ایک اسرائیلی حکایت بیان کی ہے جس کو محمد بن اسحاق نے وہب بن منبہ سے نقل کیا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جب "سد مارب" کو برباد کرنے کا ارادہ کر لیا تو "بند" کی بنیادوں میں بڑے بڑے گھونس پیدا کر دیئے اور انہوں نے آہستہ آہستہ اس کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا قوم سبا نے جب یہ دیکھا تو بند کی بنیادوں کے ہر ایک پایہ اور ستون سے بلیاں بندھوا دیں کہ اس خوف سے گھونس جڑوں کو کھوکھلا نہ کر سکیں گے۔

وہب بن منبہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں یہ پیشین گوئی درج تھی کہ اس سد کی بربادی گھونسوں کے ذریعہ ہوگی اس لیے جب انہوں نے سد میں گھونسوں کو دیکھا تو بلیاں باندھ دیں مگر جب خدائے تعالیٰ کی مشیت کے پورا ہونے کا وقت آیا تو گھونس اتنے منہ زور ہو گئے کہ وہ بلیوں سے گھبرانے کی بجائے ان پر حملہ آور ہونے لگے اور انہوں نے چند ہی روز میں بن آب کی جڑیں ہلا دیں اور نتیجہ یہ نکلا کہ بند پانی کا زور برداشت نہ کر سکا اور سیلاب کی صورت میں بہہ نکلا اس روایت کو بعض راویوں نے بغیر سند کے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی جانب بھی منسوب کیا ہے۔

یہ روایت، اسرائیلی حکایت اور اسرائیلی داستان سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی اور اصول روایت و درایت کے اعتبار سے ناقابل اعتماد ہے، روایت کے لحاظ سے اس لیے قابل اعتماد نہیں کہ اس کے بعض طریقے بے سند ہیں اور بعض منقطع اور درایت کے اعتبار سے اس لیے اعتماد کے قابل نہیں کہ اس روایت میں سیلاب سے متعلق جو واقعہ درج ہے یعنی گھونس اور بلیوں کا معاملہ وہ صرف وہب بن منبہ کی روایت میں مذکور ہے اور وہب اسرائیلی روایات کے مدار ہیں نیز اگر "سد مارب" کی تباہی میں گھونسوں اور بلیوں کا یہ معرکہ بھی کچھ تعلق رکھتا تو قرآن واقعہ کی اس اہم کڑی کو کبھی نظر انداز نہ کرتا یا کم از کم کسی صحیح حدیث میں اس تفصیل کا تذکرہ ہوتا۔

علاوہ ازیں جس ملک میں ایسے ماہر انجینئر موجود ہوں جنہوں نے مارب اور اس کے علاوہ یمن کے بہت سے حصوں میں بہترین "بند آب" اپنی فنی مہارت کی مدد سے بنائے ہوں ان کے متعلق عقل یہ کیسے باور کر سکتی ہے کہ جب ان کے علم میں یہ بات آئی ہو کہ اس "بند آب" کی بنیادیں گھونس کھوکھلا کر رہے ہیں تو بند کے استحکامات کی تمام ان حفاظتی تدابیر کو چھوڑ کر جو فن انجینئری اور استحکامات تعمیرات کے اصول پر ضروری تھیں صرف اس طفلانہ حرکت پر اکتفا کر لیا کہ بند کے ستونوں اور پایوں کے ساتھ بلیاں باندھ دیں پھر گھونس آزاد اور بلیاں مقید یہ عجیب حفاظتی تدبیر کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔

اس روایت کے برعکس قرآن عزیز کی صنیع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبا پر "سیل عرم" کا یہ عذاب اچانک آیا اور اس نے اس طرح مارب اور اطراف مارب کو تباہ کیا کہ اہل مارب کو سنبھلنے اور پیش آمدہ حالات کا صحیح اندازہ لگانے کا بھی موقع نہیں ملا۔ لہٰذا اگر چوہوں یا گھونسوں سے متعلق حکایت کو کسی درجہ میں تسلیم بھی کیا جائے تو واقعہ کی حقیقت صرف اسی قدر ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے

Marfat.com

موسم میں جب کہ یمن میں بارش بہ کثرت برستی ہے "بند آب" میں بڑے بڑے گھونسوں کی اتنی کثیر تعداد پیدا کر دی ہو جنہوں نے غیر معمولی طور پر چند ہی دنوں میں اس کو کھوکھلا کر ڈالا اور پانی کے زور نے یک لخت بند کو شکست کر کے سیلاب عظیم بپا کر دیا۔ اور قوم سبا اس حال سے ناواقف رہی اور اچانک حادثہ نے ان کو خانماں برباد کر کے اِدھر اُدھر منتشر کر دیا اگرچہ اس تفصیل کا ثبوت بھی کسی صحیح روایت سے نہیں ملتا۔

قرآن عزیز کا سیاق اور اس کا اسلوب بیان ان تمام روایات یا حکایات کا بھی انکار کرتا ہے جو محمد بن اسحاق وغیرہ اصحاب سیر نے اس سلسلہ میں نقل کی ہیں کہ انصار اور بعض دوسرے قبائل یمن کے بعض بزرگوں کو پرانی کتابوں یا کاہنوں کے ذریعہ سے "سیل عرم" کے متعلق تفصیلی حالات معلوم ہو گئے تھے اور اس لیے وہ اس حادثہ کبریٰ کے واقع ہونے سے قبل ہی مختلف حیلوں اور بہانوں سے یمن (مارب) چھوڑ کر یثرب، شام، عراق جیسے مقامات میں جا کر آباد ہو گئے تھے، ابن اسحاق وغیرہ کی روایات کا خلاصہ یہ ہے:

عمرو بن عامر لخمی اور بعض دوسرے ابو القبائل کو پرانی کتابوں اور کاہنوں کے ذریعہ سے یہ معلوم ہو گیا کہ شہر مارب پر سد کی شکست کی بدولت سخت بربادی آنے والی ہے اور اس سد کی شکست کا جب وقت آئے گا تو اول اس کی بنیادوں میں گھونس پیدا ہوں گے جو بنیادوں کو کھوکھلا کریں گے اور جب بند آب کمزور پڑ جائے گا تب برسات کے موسم میں ٹوٹ کر سینکڑوں میل تک سیلاب آ جائے گا اور مارب اور اس کے دونوں جانب میلوں تک حصہ ملک تباہ و برباد ہو جائے گا چنانچہ سب سے اول عمرو بن عامر نے یہ دیکھا کہ چوہے یا گھونس "بند آب" کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں تب اس نے سمجھا کہ اب مارب کی بربادی کا وقت آ پہنچا اس لیے اس نے طے کر لیا کہ اپنی قوم کو اصل حقیقت سے مطلع کیے بغیر کسی حیلہ سے ترک وطن کر کے کسی دوسری جگہ آباد ہو جانا چاہیے تا کہ آنے والی مصیبت سے محفوظ رہ سکیں اور بعض روایات میں ہے کہ عمرو کی بیوی بھی کاہنہ تھی اور اس واقعہ کی اطلاع اس نے پہلے سے ہی اپنے شوہر کو دے دی تھی۔ لہٰذا اس نے یہ طے کر لیا کہ یہاں سے ترک وطن کر دینا چاہیے مگر یہ ایسے طریقہ سے ہو کہ قوم کو کسی طرح علم نہ ہو ورنہ تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو تنہائی میں بلا کر یہ سمجھایا کہ میں ایک خاص ضرورت کے پیش نظر یہ چاہتا ہوں کہ کل جب میں مجلس میں تجھ سے کسی کام کے متعلق حکم کروں تو انکار کر دینا اس پر میں مصنوعی غصہ سے تیرے منہ پر طمانچہ ماروں گا تجھ کو بھی چاہیے کہ ادب واحترام کو بالائے طاق رکھ کر میرے منہ پر انتقامی طمانچہ لگائے اس کے بعد میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں کروں گا۔

لڑکے نے باپ کا یہ انوکھا مشورہ سنا تو بے حد پریشان ہوا اور اس نے ایسی گستاخی کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن باپ کے اصرار کے بعد اس کو منظور کرنا پڑا چنانچہ دوسرے روز بر سر مجلس وہی صورت پیش آئی جو باپ بیٹے کے درمیان مشورہ سے طے پائی تھی عمرو نے جب بیٹے کے ہاتھ سے طمانچہ کھایا تو بے حد مشتعل ہوا اور یہ ظاہر کیا کہ وہ اس کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑے گا اہل مجلس نے اس کے غصہ کو فرو کرنے کی بہت کوشش کی مگر اس نے نہ مانا آخر لڑکے کے ماموں دخل انداز ہوئے اور انہوں نے عمرو کو دھمکی دی کہ اگر تو اپنے بیٹے کو قتل کرے گا تو ہم تجھ کو قتل کر ڈالیں گے۔ عمرو نے یہ سن کر انتہائی غم و غصہ کے ساتھ اہل مجلس کو اپنا یہ فیصلہ سنایا کہ جس ملک میں ایک باپ کو اپنے بیٹے کی سخت گستاخی کی سزا دینا ناممکن ہو ایسے ملک میں رہنا عبث ہے۔ لہٰذا میں اپنی تمام جائیداد اور عمدہ

Marfat.com

باغات کو ارزاں فروخت کر دینا چاہتا ہوں تا کہ میں ایسی جگہ سے کہیں دور جا بسوں، یہ دیکھ کر لوگوں نے عمرو کی جائیداد کو سستے داموں خرید لیا اور وہ معہ اپنے اہل و عیال کے ترک وطن کر کے چلا گیا اور اسی طرح بعض دوسرے لوگ بھی حادثہ سے قبل ہی حادثہ کے خوف سے ترک وطن کر گئے۔

ان روایات کا اسلوب بیان خود بتا رہا ہے کہ یہ ایک فرضی داستان ہے جو داستان گوئی کے طرز پر بنائی گئی ہے نیز مستند تاریخی روایات سے بھی ان واقعات کی تائید نہیں ہوتی اور ان واقعات کے غیر مستند ہونے کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کا سیاق ان کے خلاف صاف طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ سبا کے قبائل اور خاندانوں کا تفرق و انتشار "سیل عرم" کے حادثہ کے بعد وقوع میں آیا ہے نہ کہ واقعہ سے قبل۔

پس تعجب ہے مولانا حبیب الرحمان صاحب (مرحوم و مغفور) جیسے دور رس عالم پر کہ انہوں نے "اشاعت اسلام" میں سبا اور سیل عرم پر مفصل و مدلل بحث کرتے ہوئے کس طرح ان داستانوں کو اہم روایات کی طرح بغیر کسی نقد و تبصرہ کے بیان فرما دیا۔

غرض یہ روایات صحیح ہوں یا غلط یہ بات واضح ہے کہ سبا اپنے غرور و تکبر عیاشانہ کاہلی و غفلت اور کفر و شرک پر اصرار و سرکشی کے سبب "سیل عرم" کے ذریعہ اس طرح تباہ و برباد ہوئے کہ فن تعمیر اور استحکامات عمارات کی تمام مہارت اکارت اور رائیگاں گئی اور وہ خود کو اس عذاب الٰہی سے نہ بچا سکے اور خدا کی مشیت پوری ہو کر رہی۔

دوسری سزا:

مارب کے "بند آب" ٹوٹ جانے پر جب شہر مارب اور اس کے دونوں جانب کے علاقے سرسبز کھیتوں، خوشبودار درختوں اور عمدہ میووں اور پھلوں کے شاداب باغوں سے محروم ہو گئے تو ان بستیوں کے اکثر باشندے منتشر ہو کر کچھ شام، عراق اور حجاز کی جانب چلے گئے اور کچھ یمن کے دوسرے علاقوں میں جا بسے مگر عذاب الٰہی کی تکمیل ہنوز باقی تھی اس لیے کہ سبا نے صرف غرور سرکشی اور کفر و شرک ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو نہیں ٹھکرایا تھا بلکہ ان کو یمن سے شام تک راحت رساں آبادیوں اور کارواں سراؤں کی وجہ سے وہ سفر بھی ناپسند تھا جس میں ان کو یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ سفر کی صعوبتیں کیا ہوتی ہیں اور پانی کی تکلیف اور خورد و نوش کی ایذاء کس شے کا نام ہے اور قدم قدم پر میلوں تک دو رویہ خوشبوؤں اور پھلوں کے باغات کی وجہ سے گرمی اور تپش کی زحمت سے بھی نا آشنا تھے۔

انہوں نے ان نعمتوں پر خدا کا شکر ادا کرنے کی بجائے بنی اسرائیل کی طرح ناک بھوؤں چڑھا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ انسان سفر کے ارادہ سے گھر سے نکلے تو یہ بھی نہ معلوم ہو کہ حالت سفر میں ہے یا اپنے گھر میں وہ بھی کیا خوش نصیب انسان ہیں جو ہمت مردانہ کے ساتھ سفر کی ہمہ قسم کی تکالیف اٹھاتے پانی اور خورد و نوش کے لیے آزار سہتے اور اسباب راحت آرام کے مہیا نہ ہونے کی وجہ سے لذت سفر کا ذائقہ چکھتے ہیں۔ اے کاش ہمارا سفر بھی ایسا ہو جائے کہ ہم یہ محسوس کرنے لگیں کہ وطن سے کسی دور دراز جگہ کا سفر کرنے نکلے ہیں اور ہم دوری منزل کی تکالیف سہتے ہوئے حضر اور سفر میں امتیاز کر سکیں۔

بدبخت اور ناسپاس گزار انسانوں کی یہ ناشکری تھی جس کی تمناؤں اور آرزوؤں میں مضطرب ہو کر خدا کے عذاب کو دعوت دے رہے تھے اور اس کے انجام بد سے غافل ہو چکے تھے۔

Marfat.com

سباء نے جب اس طرح کفرانِ نعمت کی تکمیل کر دی تو اب خدائے تعالیٰ نے بھی ان کو دوسری سزا یہ دی کہ یمن سے شام تک ان کی تمام ان آبادیوں کو ویران کر دیا جو نزدیک نزدیک مسلسل چھوٹے چھوٹے قصبوں، گاؤں، کارواں سراؤں اور تجارتی منڈیوں کی صورت میں آباد اور ان کے راحت و آرام کی کفیل تھیں اور سفر کی ہر قسم کی صعوبتوں سے ان کو محفوظ رکھتی تھیں" اور اس طرح اس پورے علاقہ میں خاک اُڑنے لگی اور یمن سے شام تک نو آبادیوں کا یہ سلسلہ ویرانہ میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ قرآن عزیز کی یہ آیات اسی حقیقت کا اعلان کرتی ہیں:

﴿وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّ قَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَ اَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ﴿١٨﴾ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿١٩﴾﴾ (سبا: ۱۸۔۱۹)

"ہم نے ان کے (ملک) اور برکت والی آبادیوں (شام) کے درمیان بہت سی کھلی آبادیاں قائم کر دی تھیں اور ان میں سفر کی منزلیں (کارواں سرائیں) مقرر کی تھیں (اور کہہ دیا تھا) چلو ان آبادیوں کے درمیان دن رات بے خوف و خطر مگر انہوں نے کہا اے ہمارے پروردگار ہمارے سفروں (منزلوں) کے درمیان دوری کر دے اور یہ (کہہ کر) انہوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا بس ہم نے ان کو کہانی بنا دیا اور ان کو پارہ پارہ کر دیا بلاشبہ اس (واقعہ) میں عبرت کی نشانیاں ہیں صابر اور شکر گزار بندوں کے لیے۔"

مؤرخین کہتے ہیں کہ سبا کے مقابلہ میں عرصہ دراز سے رومیوں کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح وہ بھی ہندوستان اور افریقہ کے ساتھ عربوں کی طرح براہ راست تجارت کر کے بیش بہا فائدہ حاصل کریں مگر عرب کسی طرح ان کو اس کا موقع نہیں دیتے تھے اور ان تجارتی سواحل پر قابض تھے لیکن پہلی صدی قبل مسیح میں رومیوں نے یکے بعد دیگرے مصر اور شام پر قبضہ کر لیا اور اب ان کو موقعہ ملا کہ اپنے منصوبہ کو پورا کریں لیکن تجارتی مراکز کے لیے جو شاہراہ امام مبین عربوں نے بنا رکھی تھی وہ خشکی کی راہ تھی اور گزرنے والوں کے لیے عربوں سے واسطہ پڑنا لازمی تھا اور رومی ان پہاڑی راہوں کو عبور کرنے میں ویسے بھی دقت محسوس کرتے تھے اس لیے انہوں نے عربوں کے خوف سے محفوظ رہنے کے لیے یہ کیا کہ ہندوستان اور افریقہ کی تجارت کے بری راستہ کو بحری راستہ میں تبدیل کر دیا اور بحر احمر میں کشتیوں کے ذریعہ تمام مال مصر اور شام کی بندرگاہ پر اُتارنے لگے نتیجہ یہ نکلا کہ اس جدید طریق تجارت نے یمن سے شام تک سبا کی تمام آبادیوں کو برباد کر دیا اور وہاں چند دنوں میں ہی خاک اڑنے لگی اور سبا کا یہ خاندان تتر بتر ہو گیا، کسی نے شام کی راہ لی کسی نے عمان کی اور کسی نے عراق کا رخ کیا تو کسی نے حجاز کا اور کوئی نجد پہنچا تو کسی نے بحرین کی راہ اختیار کی اور اہل سبا کی حکومت کا شیرازہ اس طرح بکھر گیا کہ وہ حقیقتاً ایک کہانی بن کر رہ گئے اور ﴿فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ﴾ اور ﴿مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ﴾ کا صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

اگر آپ تاریخ کا بغور مطالعہ کریں گے تو یہ بات حقیقت بن کر آپ کے سامنے آ جائے گی کہ سیل عرم کا واقعہ اور طریق سفر کی تبدیلی کی یہ صورت کہ جس کی وجہ سے یمن سے شام تک سبا کی نو آبادیاں برباد ہو کر رہ گئیں زمانہ کے اعتبار سے ایک دوسرے

سے زیادہ دور نہیں ہیں اور دونوں قسم کے عذاب کا رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ قائم ہے۔

قرآن عزیز نے جب اہل عرب کو سبا اور "سیل عرم" کا یہ واقعہ سنایا تو اس وقت یمن کا ہر متنفس اس حقیقت کا بہ چشم خود مشاہدہ کر رہا تھا اور وہ تمام خاندان بھی جو حجاز، شام، عمان، بحرین، نجد میں اس حادثہ کی بدولت پناہ گزین ہو گئے تھے اپنے آباؤ اجداد کے اس مرکز کی حالت زار کو دیکھ اور سن رہے تھے حتیٰ کہ ہمدانی جو کہ چوتھی صدی ہجری کا سیاح مورخ ہے اپنی کتاب اکلیل میں یمن کے اس حصہ کے متعلق اپنی عینی شہادت پیش کرتا ہے کہ قرآن نے ﴿جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ﴾ کہہ کر جن باغوں کا ذکر کیا ہے بلاشبہ آج ان کی جگہ اس قدر کثرت سے پیلو کے درخت موجود ہیں کہ اتنی کثرت کے ساتھ اور کہیں نہیں پائے جاتے اور ان ہی درختوں کے ساتھ جھاؤ اور کہیں کہیں جنگلی بیر کے درخت بھی نظر آتے ہیں اور دیدہ بینا اور گوش حق نیوش کو یہ کہہ کر سبا کی عبرت زا داستان سناتے رہتے ہیں۔

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہو

مولانا سید سلیمان نے ارض القرآن میں ابرہہ کے زمانہ کے کتبہ عرم کا ذکر کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا ہے:

"اس عصر تاریخی میں جب ہر غیر معاصرانہ روایت قابل شک و اشتباہ ہے خدائے قرآن نے اپنے کلام معجز کی صداقت کا نیا سامان پیدا کر دیا یعنی اس بند کے ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں واقعہ، سیلاب کے مشرح حالات کا کتبہ جو ایک عیسائی فاتح یمن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے مل گیا ہے یہ عیسائی فاتح وہی ہے جو اپنے ہاتھیوں کے بل پر کعبہ کو ڈھانے نکلا تھا لیکن آج اس دشمن کعبہ کا سنگی ہاتھ کعبہ مکرمہ کی کتاب مقدس کی تصدیق کے لیے بلند ہے۔" [1]

اس کتبہ میں ان حالات کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر ہے جو سبا کے دور میں سیل عرم کی وجہ سے "بند آب" کی شکستگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

الحاصل سبا کا یہ خاندان جو وسعت حکومت میں یمن (جنوبی عرب) اطراف شام وحجاز کی نو آبادیوں (شمالی عرب) اور حبشہ (افریقہ) پر حکمران تھا ۱۱۵ ق م کے پس و پیش حکومت سے بھی محروم ہو گیا اور اس کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا اور حبشہ پر اکسومی (سبا) خاندان نے اور شمالی عرب میں اسماعیلی عربوں نے اور خود یمن میں حمیری (سبا) خاندان نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ [2]

اس جگہ یہ بات قابل وضاحت ہے کہ "سیل عرم" کا سانحہ اور حادثہ سارے یمن پر پیش نہیں آیا تھا بلکہ یمن کے دارالحکومت مارب اور اس کے اطراف میں دونوں جانب سینکڑوں میل تک اس کا تباہی خیز اثر پڑا اور اس وقت صرف وہی قبائل ترک وطن پر مجبور ہوئے جو ان مقامات میں آباد تھے باقی ملک اور اس کے آباد باشندے یمن ہی میں مقیم رہے البتہ جب دوسرے عذاب نے رونما ہو کر پورے یمن کو اثر انداز کر لیا تب سبا کے باقی قبائل بھی منتشر ہونے پر مجبور ہوئے اور اس طرح ان کے اس مشہور خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ بات کہ "سیل عرم" کے حادثہ کا تمام قبائل یمن پر اثر نہیں پڑا تھا عرب اور غیر عرب مورخین دونوں کے یہاں مسلم ہے چنانچہ ابن کثیر رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] ارض القرآن ج ۱ ص ۲۵۷ ـ ۲۵۸ [2] تاریخ ابن کثیر ج ۲ وانسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (سبا)

"جب سیل عرم آیا تو تمام قبائل سبا یمن سے منتشر نہیں ہو گئے تھے بلکہ وہی قبائل منتشر ہوئے تھے جو مارب (دارالحکومت) میں مقیم تھے اور جن کے شہر میں مشہور "مارب کا بند" تھا اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے جو حدیث سابق میں ذکر ہو چکی ہے اس کا منشاء بھی یہی ہے کہ ان میں سے چار قبائل شام کے علاقوں میں جا بسے اور چھ قبائل یمن ہی میں مقیم رہے اور یمن میں مقیم قبائل، مذحج، کندہ، انمار، اشعر تھے اور انمار کی تین شاخیں تھیں خثعم، بجیلہ اور حمیر یہی وہ سبائی قبائل ہیں جن میں سے سبا کے نشست و انتشار کے بعد یمن کے حکمراں لوگ اور تبابعہ پیدا ہوئے تا آنکہ ان سے حبشہ کے بادشاہ نے یمن چھین لیا اور اس پر قابض ہو گیا اور پھر حمیری بادشاہ سیف بن ذی یزن نے دوبارہ شاہ حبشہ سے یمن کو واپس لیا اور یہ واقعہ ولادت باسعادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تھوڑے زمانہ قبل ہی پیش آیا جس کا تفصیلی ذکر ہم اپنے موقعہ پر کریں گے۔" ✿

اور سبا کے جو قبائل خاندان یمن سے نکل کر اِدھر اُدھر جا بسے تھے ان کی تفصیل دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"سبا کے قبائل میں سے غسانی قبائل کی ایک شاخ بصری (شام) چلی گئی اور ایک شاخ خزاعہ نے یثرب جاتے ہوئے بطن مر (تہامہ) کو شاداب دیکھ کر وہیں قیام کر دیا اور اوس و خزرج (انصار) یثرب (مدینہ) میں مقیم ہو گئے اور بنی ازد کا ایک حصہ عمان میں اور ایک وادی سراۃ میں جا بسا اور اسی طرح سبا کے یہ قبائل اقطاع و امصار عرب میں منتشر اور شذر و مذر پراگندہ ہو گئے۔" ✿

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"شعبی کہتے ہیں کہ غسان، شام و عراق میں منتشر ہو گئے اور انصار (اوس و خزرج) یثرب (مدینہ) میں جا بسے اور خزاعہ تہامہ (مکہ) میں اور ازد عمان میں جا بسے اور آس پاس منتشر ہو کر رہنے سہنے لگے۔" ✿

ابن کثیر رحمہ اللہ یہ بھی کہتے ہیں:

"عرب میں سبا کا یہ تفرق (انتشار) اس درجہ مشہور اور عبرت ناک سمجھا جاتا ہے کہ جب اہل عرب کسی قوم یا خاندان کے تفرق و انتشار کا ذکر کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں "تفرقوا ایدی سبا و تفرقوا شذر و مذر" ان کا حال سبا کا سا ہو گیا وہ پارہ پارہ ہو کر رہ گئے۔" ✿

تاریخی مباحث:

کتب سیر میں مذکور ہے کہ "مارب کا بند" سبا بن یعرب نے بنایا تھا مگر وہ اس کو پورا نہ کر سکا اور اس کے بعد اس کے بیٹے حمیر نے اس کو مکمل کیا ✿ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کو ملکہ سبا بلقیس نے تعمیر کرایا تھا لیکن یہ دونوں باتیں حقیقت سے بہت دور محض ظن و تخمین کی پیداوار تھیں" اس لیے کہ ماہرین علم الآثار نے "سد" کے کھنڈرات سے یہ پتہ چلایا ہے کہ اس بند آب کے بنانے والوں کے نام سنگی کتبوں پر کندہ اسی بند کی شکستہ دیواروں پر موجود ہیں اور ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس بند کو سب سے پہلے ۸۰۰ ق م میں سَمَہ علی ینوف (مکارب سبا) نے بنانا شروع کیا تھا مگر اس کے زمانہ میں تعمیر مکمل نہ ہو سکی اور اس

تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۹۱ ✿ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۵۳۸ ✿ تفسیر ابن کثیر ص ۵۳۹
تفسیر ابن کثیر ص ۵۳۴ ✿ تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۵۹

Marfat.com

کے بعد کے بادشاہوں نے اس کو پورا کیا شبع امر کے علاوہ جو نام ان کتبوں سے پڑھے گئے وہ یہ ہیں "سمہلی نیوف بن ذمرعلی (مکارب سبا) کرب اہل یین بن شبع امر (مکارب سبا) ذمرعلی ذرح (ملک سبا) یدع ایل وتار۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سد "مکارب سبا" کے زمانہ سے شروع ہو کر "ملوک سبا" کے ابتدائی دور تک طویل عرصہ میں تعمیر ہو سکی ہے۔ ❶

② ترمذی میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما ایک حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ ایک سائل نے نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ سبا کسی ملک کا نام ہے یا کسی عورت کا یا کسی مرد کا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک مرد کا نام ہے جس کی نسل سے دس قبائل ہیں ان میں سے چار شام میں سکونت رکھتے ہیں اور چھ یمن میں۔ یمنی قبائل مذحج، کنہ، ازد، اشعر، انمار اور حمیر ہیں اور شامی قبائل میں لخم، جذام، عاملہ، غسان ہیں ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب کہا ہے ❷ اور ابن کثیر رحمہ اللہ علیہ نے اس کے مختلف طرق روایت کو بیان کر کے بعض طریق روایت کو حسن قوی کہا ہے ❸ اور ابن عبدالبر نے انساب عرب پر بحث کرتے ہوئے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا ہے۔

هذا ادنٰی ما قیل به فی ذٰلك والله اعلم. ❹

"یہ روایت ان سب اقوال سے بہتر ہے جو اس سلسلہ میں کہتے جاتے ہیں۔"

اس روایت سے قبائل مسطورہ بالا کا قحطانی ہونا ثابت ہوتا ہے مگر یہ واضح رہے کہ ان میں سے متعدد قبائل کے متعلق علماء انساب میں سخت اختلاف ہے کہ یہ عدنانی ہیں یا قحطانی تاہم انصار (اوس خزرج) کے متعلق جو بلاشبہ بنی ازد ہیں تمام علماء انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ قحطانی الاصل ہیں اور بخاری کی وہ حدیث کہ جس سے مصنف ارض القرآن نے ان کو عدنانی ثابت کرنا چاہا ہے بقول علامہ ابن حجر عسقلانی ہرگز اس کے لیے دلیل نہیں بن سکتی جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں اور نہ ہم کو کسی عالم نسب انصاری کا یہ قول نظر آیا کہ اس نے خود کو قحطانی الاصل تسلیم نہ کیا ہو، البتہ یہ ممکن ہے کہ چونکہ نبی اکرم ﷺ عدنانی اسماعیلی ہیں اس لیے بعض انصار نے حصول شرف ومجد کے جذبہ میں مادری سلسلہ سے خود کو عدنانی (اسماعیلی) کہہ دیا ہو۔

یہ بیشک صحیح ہے کہ بعض عدنانی قبائل نے چونکہ یمن میں سکونت اختیار کر لی تھی اس لیے بعض قحطانی اور عدنانی قبائل کے درمیان علماء انساب میں اختلاف نظر آتا ہے اور قضاعہ کے عدنانی سے قحطانی بن جانے کا عجیب قصہ تو ابن عبدالبر اور خود شعراء عرب نے بیان کیا ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنے بھانجہ خالد بن یزید بن معاویہ کے اس مناقشہ میں جو اس کے اور بنو امیہ کے درمیان پیش آ گیا تھا۔ خالد کے کہنے سے اول خود کو یمنی قبائل کا حلیف بنایا اور پھر یمنی الاصل (قحطانی الاصل) ہونے کے مدعی بن گئے۔ ❺

③ قرآن حکیم نے سورہ سبا میں سبا کی مذہبی حالت پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبا کے طبقہ اولیٰ کی ہر دو شاخوں کا مذہب یا آفتاب پرستی (ستارہ پرستی) رہا ہے اور یا پھر یہودیت (دین موسوی) اور طبقہ ثانیہ کی ہر دو شاخوں میں یا صنم پرستی قومی مذہب رہا ہے اور یا عیسائی (یہودیت) بھی کبھی کبھی ان میں نظر آ جاتی ہے۔ قرآن نے اصحاب اخدود کا جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے اس لیے کہ ذونواس حمیری (یہودی) یمن ہی کا بادشاہ تھا۔

---

❶ ارض القرآن ماخوذ مضمون از ازماؤ فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی جرنل ۱۸۷۴ء ❷ تفسیر ج ۳
❸ الانباہ ص ۱۰۴ ❹ ایضاً ص ۱۰۶ ❺ الانباہ ص ۵۹۔۶۰

④ اہل عرب اس کے قائل ہیں کہ تمام قبائل عرب بلا استثنا صرف دو شخصوں کی نسل سے ہیں عدنان اور قحطان مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ توراۃ اور تاریخ ان دو سلسلوں کے علاوہ بعض دوسرے سلسلے بھی بیان کرتی ہے بلکہ بعض صحیح روایات میں بنی جرہم کا بھی ذکر موجود ہے جو ان دونوں (قحطانی) اور عدنانی سلسلوں سے الگ تیسرا سلسلہ ہے پھر علماء انساب کے پاس کون سی دلیل ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عرب میں ان دو سلسلوں کے سواء سب معدوم ہو گئے اور تمام قبائل عرب ان دو ہی سلسلوں میں منحصر ہو گئے ہیں؟

نبی اکرم ﷺ سے ایک ضعیف روایت سے اور حضرت عبداللہ بن مسعود، عبداللہ ابن عباس، عمرو بن میمون اور محمد بن کعب قرظی رضی اللہ عنہم سے بروایت قوی منقول ہے کہ جب وہ اس آیت کو تلاوت فرماتے:

﴿وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ ۚ﴾ (ابراھیم:۹)

"اور وہ لوگ جو ان (قوموں) کے بعد ہیں ان کو اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا"

تو ارشاد فرمایا کرتے تھے:

"کذب النسابون" "نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں"۔

یعنی انہوں نے بیچ میں بہت کچھ جھوٹ ملا دیا ہے۔

ابن عبدالبر معرفت علم انساب کو مفید علم ثابت کرتے ہوئے اس روایت کے متعلق فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے ان حضرات کا یہ جملہ قریش کے نسب کے لیے مخصوص ہو اور ان کا مطلب یہ ہو کہ اس سلسلہ میں عدنان سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے درمیان جو کڑیاں ہیں وہ تحقیقی نہیں ہیں اور اس میں نسابین کا جھوٹ شامل ہے مگر ہمارے نزدیک اس جملہ کا ٹھیک مطلب یہ ہے کہ اہل نسب کا یہ دعویٰ کہ وہ بنی آدم کے سلسلہ انساب کے ماہر اور محقق ہیں اور کوئی سلسلہ ہماری نگاہ تحقیق سے نہیں چھوٹا صحیح نہیں ہے اور وہ اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہیں ﴿لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ ۚ﴾ اللہ کے سواء کون اس کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ (انتہیٰ) [1]

ہم ابن عبدالبر کی اس توجیہ کی حرف بہ حرف تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عرب قبائل میں ایسے سلسلے موجود ہیں جو عدنانی اور قحطانی سے الگ ہیں اور اکثر علماء انساب ان میں تمیز کرنے سے قاصر رہے ہیں جیسا کہ ہم ابن کثیر کے حوالہ سے ثابت کر چکے ہیں۔

چند تفسیری مباحث:

① مفسرین کو "عرم" کے معنی میں بحث ہے اور وہ چند معنی بیان کرتے ہیں:

"گہرا پانی"، "وادی"، "سیلاب عظیم"، "بند آب" شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہ، نے "سیلاب عظیم" مراد لیا ہے فرماتے ہیں "پس بھیجی ہم نے ان پر رو زور کی" اور مصنف ارض القرآن فرماتے ہیں کہ "جس کو عرب حجاز "سد" کہتے ہیں اسی کو عرب یمن "عرم" کہتے ہیں ہمارے نزدیک زیادہ صحیح اور موقع کے مناسب یہی معنی ہیں اور جب کہ لغت عرب میں "عرمۃ" کے معنی "بند آب" کے آتے ہیں تو دوسرے معانی کی جانب توجہ غیر ضروری ہے "العرمتہ"، "سد یعترض بہ الوادی" [2] اس معنی کے دلچسپ اور مناسب

[1] القصد والامم لابن عبدالبر ص ۱۹ [2] الانباہ ص ۴۹

Marfat.com

حال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح قرآن عزیز میں "بند آب" کا ذکر ثابت ہو جاتا ہے اور دوسرے معانی اگر مراد لیے جائیں تو ان سے صرف یہ لازم آتا ہے کہ کوئی بند آب ہوگا جس کو سیلاب بہا کر لے گیا بند آب کا ذکر صراحتاً ثابت نہیں ہوتا۔

(۲) کسی خطہ زمین میں باغوں کا ہونا گو خوش عیشی کی دلیل ہے لیکن گزشتہ تفاصیل سے یمن کے طبعی خواص اور پھر بند آب کے عجیب و غریب طرز تعمیر نے سینکڑوں میل تک مارب کے داہنے بائیں مسلسل پھلوں، پھولوں اور میووں کے بے شمار باغات نے جو صورت حال پیدا کر دی تھی اس کے متعلق غیر مسلم مورخوں کی شہادتیں بھی یہ بتا رہی ہیں کہ مارب اور یمن کا یہ علاقہ دنیا میں فردوس نظیر بن گیا تھا اور ان کے ملک کی یہ صورت حال خدائے تعالیٰ کے خصوصی کرم کی رہین منت تھی اسی لیے قرآن عزیز نے اس کو خدا کی نشانی کہا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَنَّتَانِ عَن يَمِينٍ وَشِمَالٍ﴾ (سبا: ۱۵)

(۳) ان آیات میں ہے ﴿ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ ﴾ "شہر ہے پاک اور پروردگار ہے بخشنے والا" اور اس کے بعد ہے ﴿ فَأَعْرَضُوا ﴾ "پس انہوں نے خدا سے روگردانی کی" ان دونوں جملوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبا پہلے مسلمان تھے اور احکام الٰہی کے مطیع وفرماں بردار مگر آہستہ آہستہ انہوں نے نافرمانی اور کفر اختیار کر لیا جیسا کہ اس آیت سے بھی ظاہر ہوتا ہے ﴿ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِمَا كَفَرُوا ﴾ تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام اور کفر کے یہ دو زمانے ان پر کب طاری ہوئے تاکہ ان آیات کی تفسیر واقعات تاریخی کی روشنی میں کی جا سکے۔

اس سوال کا حل یہ ہے کہ سورۂ سبا سے قبل سورۂ نمل میں قرآن عزیز نے ملکہ سبا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات میں یہ بیان کیا ہے کہ ملکہ سبا اور اس کی قوم پہلے آفتاب پرست اور مشرک تھی مگر حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت و ارشاد پر اس نے اسلام قبول کر لیا اور تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ وہ اس کے بعد بھی اپنی زندگی میں سریر آرائے سلطنت رہی اور تمام قوم اس کی مطیع وفرماں بردار تھی پس جو اصحاب بصیرت اس زمانہ کی قوموں کے مذاہب کی تاریخ سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد ملکہ کا سلطنت پر قائم رہنا اس کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ ملکہ کے ساتھ اس کی قوم بھی ایمان لے آئی تھی۔

آپ نبی اکرم ﷺ کے ان نامہائے مبارک کے ان جملوں کو پڑھئے جو آپ ﷺ نے شاہان عالم کے نام دعوت اسلام کے سلسلہ میں بھیجے ہیں:

((فان توليت فعليك اثم اليريسين)) ، ((فان توليت فعليك اثم القبط)) ، ((فان توليت فعليك اثم المجوس)).

"اے شاہان روم و ایران و مصر اگر تم نے خدا کی دعوت حق کا انکار کر دیا تو تمہاری رعایا کی گمراہی کا وبال بھی تمہاری گردن پر رہے گا۔"

یہ آپ ﷺ نے کیوں ارشاد فرمایا صرف اس لیے کہ قدیم شخصی حکومتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان کی قومی حکومتوں میں جو مذہب بادشاہ کا ہوتا تھا وہی پوری قوم کا مذہب بن جاتا تھا اور بعض اقوام میں تو بادشاہ "خدا کا مظہر" سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا کسی بات کو اس کا قبو

کر لینا گویا رعایا کے لیے خدا کے حکم کے برابر تھا۔

بہر حال ۹۵۰ ق م میں سبا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا اور صدیوں تک انہوں نے اس امانت الٰہی کو سینہ سے لگائے رکھا لیکن گزشتہ قوموں کی طرح جب انہوں نے اس سے روگردانی شروع کی اور دوبارہ شرک اختیار کیا تب خدا کے پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانہ میں آ کر ان کو رشد و ہدایت کی جانب متوجہ کیا۔ غالباً یہ انبیاء بنی اسرائیل ہیں جو بذات خود یا اپنے نائبوں کے ذریعہ ان کو ہدایت کی جانب بلاتے رہے ہیں مگر انہوں نے عیش و عشرت، دولت و ثروت اور حکومت و شوکت کے نشہ میں کوئی پرواہ نہیں کی بلکہ بنی اسرائیل کی طرح خدا کی نعمتوں کو ٹھکرانے لگے تب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک صدی پہلے خدا کی جانب سے سیل عرم اور آبادیوں کی تباہی کا عذاب آیا اور اس نے سبا کے خاندان کو پارہ پارہ کر دیا۔

ایک یونانی مؤرخ تھیوفرتیسن جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً تین سو بارہ برس پہلے اور سبا کا معاصر تھا لکھتا ہے:

"یہ ملک سبا سے متعلق ہے جو بخورات کی بڑی حفاظت کرتے ہیں ان بخورات کا ڈھیر آفتاب کے ہیکل میں لایا جاتا ہے جو اس ملک میں نہایت مقدس سمجھا جاتا ہے۔" ✿

اور علمائے اسلام میں سے ماہرین علم الآثار نے دوسری یا تیسری صدی ہجری میں یمن کے ایک کتبہ میں پڑھا تھا۔

هذا ما بنٰى شمر يرعش سيدة الشمس. ✿

"یہ شمر یرعش نے سورج دیبی کے لیے بنایا ہے۔"

(۴) سورۂ سبا کی ان ہی آیات میں ہے: ﴿ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا ﴾ مفسرین نے ان برکت والی بستیوں کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کیے ہیں ان میں سے صحیح قول یہ ہے کہ اس سے شام کی بستیاں مراد ہیں اس لیے کہ قرآن نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ ان ہی بستیوں پر صادق آتا ہے جن کا تعلق یمن سے شام تک تجارتی شاہراہ سے تھا، مجاہد حسن قتادہ، سعید بن جبیر بن زید (رحمہم اللہ) وغیرہ یہی تفسیر کرتے ہیں:

يعنى قرى الشام يعنى انهم كانوا يسيرون من اليمن الى الشام فى قرى ظاهرة متواصلة. ✿

"یعنی برکت والی بستیوں سے شام کی بستیاں مراد ہیں یعنی وہ یمن سے شام تک امن و اطمینان کے ساتھ ان بستیوں میں ہو کر گزرتے ہیں جو اسی غرض سے قریب قریب بنائی گئی ہیں کہ ان کا سفر آسان اور خوش گوار رہے۔"

ابن کثیر رحمہ اللہ ﴿ قُرًى ظَاهِرَةً ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اى بينة واضحة يعرفها المسافرون ويقيلون فى واحدة ويبيتون فى اخرى. ✿

"یعنی ایسی بستیاں جو مسافروں تاجروں اور سیاحوں کے لیے ہی قریب قریب بنائی گئی تھیں اور جن کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے کہ ایک بستی میں دوپہر آرام سے گزاری تو شب باشی کے لیے دوسری بستی میں پہنچ گئے۔"

مفسرین (رحمہم اللہ) جب سبا کی ان آیات کی تفسیر کرتے ہیں تو "سیل عرم" اور "قرى ظاهرة" یعنی یمن سے شام تک پھیلی ہوئی سبا

ارض القرآن ج ۲ ص ۱۶۳ ماخوذ از ہیرن کی ہسٹاریکل ریسرچیز ج ۱ ص ۳۵

تاریخ حمزہ اصفہانی ۱۱۰ کلکتہ ✿ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۵۳۳ ✿ ارض القرآن ج ۱ ص ۲۷۴

Marfat.com

کی نو آبادیات کی بربادی دونوں ہی کا تذکرہ کرتے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ تاریخ کے اس پہلو پر نہیں ہے جو رومیوں کے تجارتی راہ بدل دینے سے سبا کو پیش آیا اور خود سبا کی اس مانگ پر ﴿رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا﴾ خدا نے ان کو اس حالت میں بدل دیا کہ وہ تلاش معاش کے لیے دیگر قبائل عرب کی طرح سفر کے مصائب جھیلتے پھریں اور ان کو عبرت کی کہانی بنا دیا اور پارہ پارہ کر دیا مگر ہم گزشتہ سطور میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ چونکہ بری تجارتی شاہراہ سے بحری راہ کی وہ تبدیلی کہ جس کے نتیجہ میں سبا کی نو آبادیاں بہت جلد برباد ہو گئیں اور سبا کا یہ خاندان حکومت پارہ پارہ ہو گیا تقریباً اس ہی زمانہ میں پیش آیا جو زمانہ "سیل عرم" کا تھا خواہ تبدیلی راہ کی داغ بیل اس سے بہت پہلے یونانیوں کے ہاتھوں پڑی ہو۔ پس مفسرین اگرچہ "قریٰ ظاہرۃ" کی بربادی میں تجارتی راہ کی تبدیلی کا تذکرہ نہیں کرتے مگر وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ "سیل عرم" اور یمن سے شام تک کی سبائی آبادیوں کی بربادی دو جدا جدا معاملے ہیں، یہ نہیں ہے کہ بند آب کے ٹوٹ جانے سے یہ تمام نو آبادیاں بھی برباد ہو گئی تھیں جیسا کہ ہم ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ سے سابق میں نقل کر چکے ہیں کہ سیل عرم کے بعد بھی مارب کے علاوہ یمن کے دوسرے حصوں میں قبائل یمن آباد تھے۔ لہٰذا قرآن کا فیصلہ مفسرین کے علی الرغم نہیں ہے جیسا کہ مصنف ارض القرآن نے سمجھا ہے۔

نتائج و عبر:

① اللہ تعالیٰ نے قرآن عزیز میں موعظت و نصیحت کے چار طریقے بیان فرمائے ہیں۔

(الف) "تذکیر بآلاء اللہ" یعنی خدائے تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جن نعمتوں کی ارزانی فرمائی ہے ان کو یاد کر کے خدا کے احکام کی پیروی کی جانب متوجہ کرنا سورۂ اعراف میں ارشاد ہے:

﴿فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۶۹)

"پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔"

﴿فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۷۴)

"پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے مت پھرو۔"

(ب) "تذکیر بایام اللہ" یعنی ان گزشتہ قوموں کے حالات بیان کر کے نصیحت و عبرت دلانا جنہوں نے یا تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و انقیاد کی وجہ سے کامرانی اور فلاح دارین حاصل کی اور یا سرکشی و طغیان کی انتہا پر پہنچ کر ہلاکت و تباہی مول لی اور عذاب الٰہی کی مستوجب قرار پائیں یا بالفاظ دیگر قوموں کی عروج و زوال کو پیش کر کے سامان عبرت مہیا کرنا سورۂ ابراہیم میں ہے۔

﴿وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ﴾ (ابراھیم: ۵)

"اور اے پیغمبر ان کو نصیحت کیجئے قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ یاد دلا کر۔"

(ج) "تذکیر بآیات اللہ" یعنی مظاہر قدرت کی جانب توجہ دلا کر خالق کائنات کی ہستی اور اس کی وحدت کا اعتراف کرانا اور تصدیق حق کے لیے اپنی نشانیوں (معجزات آیات قرآنی) کے ذریعہ چشم بصیرت وا کرنا۔ سورۂ یوسف میں ارشاد ہے:

Marfat.com

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝﴾(یوسف:۱۰۵)

"اور زمین اور آسمان میں خدا کے بہت سے نشانات ہیں کہ جن پر وہ بے توجہی کے ساتھ گزر جاتے ہیں اور پرواہ بھی نہیں کرتے۔"

(د) "تذکیر بما بعد الموت" یعنی برزخ اور قیامت کے حالات سنا کر عبرت دلانا سورۂ قٓ میں ہے۔

﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝﴾(ق:۴۵)

"پس قرآن کے ذریعہ نصیحت کرو اس شخص کو جو خدا کی وعید یعنی بعد الموت کے عذاب سے ڈرتا ہے۔"

پس قوم سبا کا یہ واقعہ "تذکیر بایام اللہ" سے تعلق رکھتا ہے اور ہم کو یہ عبرت دلاتا ہے کہ جب کوئی قوم عیش و راحت اور ثروت و طاقت کے گھمنڈ میں آ کر نافرمانی اور سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہے تو اول خدائے تعالیٰ اس کو مہلت دیتا اور اس کو راہ راست پر لانے کے لیے اپنی حجت کو آخری حد تک پورا کرتا ہے پس اگر وہ اس پر بھی قبول حق کی دشمن رہتی اور بغاوت و سرکشی کے اس اعلیٰ معیار پر پہنچ جاتی ہے کہ اس کو خدا کی نعمتیں اور عطا کردہ راحتیں بھی ناگوار گزرنے لگتی ہیں اور وہ ان کو ٹھکرانے لگتی ہے تو پھر قانون گرفت اپنا فولادی پنجہ آگے بڑھاتا اور ایسی بدبخت قوم کو پارہ پارہ کر دیتا اور ہلاکت و بربادی کے چرخ پر اتار دیتا ہے اور ان کا سارا کروفر دنیا کے سامنے صرف ایک کہانی بن کر رہ جاتا ہے۔

﴿قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝﴾(النمل:۶۹)

(اعاذنا اللہ من ذٰلك)

Marfat.com

اصحاب الاخدود (یا) قوم تُبع

(۵۲۵ء)

○ اخدود ○ اصحاب اخدود اور قرآن حکیم ○ واقعہ کی تفصیلات ○ تنقید و تبصرہ ○ تبع عرب کی دو حکایتیں
○ چند تفسیری نکات ○ بصائر و عبر

اخدود؟

"خد یا اخدود" کے معنی گڑھے، کھائی اور خندق کے ہیں یہ مفرد ہے اور اس کی جمع "اخادید" آتی ہے، چونکہ زیر بحث واقعہ میں کافر بادشاہ اور اس کے امراء و داعیان سلطنت نے خندقیں اور گڑھے کھدوا کر اور ان کے اندر آگ دہکا کر عیسائی مومنوں کو ان میں ڈال کر زندہ جلا دیا تھا اس نسبت سے ان کافروں کو "اصحاب اخدود" کہا جاتا ہے۔

اصحاب اخدود اور قرآن حکیم:

اصحاب اخدود کا تذکرہ قرآن حکیم میں سورہ بروج میں کیا گیا ہے اور اجمال و اختصار کے ساتھ صرف اسی قدر پر اکتفاء کیا گیا ہے جو رشد و ہدایت کے لیے باعث موعظت و بصیرت ہے۔

وہ کہتا ہے کہ محمد ﷺ کی بعثت سے قبل ایک مقام پر حق و باطل کا معرکہ پیش آیا۔ ایک جانب خدا کے مومن بندے تھے جن کے پاس اگرچہ مادی قوت و طاقت نہیں تھی اور وہ اس لحاظ سے ضعیف و کمزور تھے مگر ایمان اور حق و صداقت کی قوت اور خدا کے نام پر ایثار و فداکاری کی طاقت کے مالک تھے دوسری جانب میں ایمان باللہ اور قبول حق سے محرومی تھی مگر مادی شوکت و صولت اور قاہرانہ طاقت کی فراوانی تھی ان حالات میں کافر و مشرک طاقت نے مومنوں کی ایمانی قوت اور قبول حق کی طاقت کو دعوت مبارزت دی کہ یا وہ ایمان باللہ کو ترک کر کے شرک و کفر پر واپس آ جائیں ورنہ دنیا سے فنا ہو جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ مومنین صادقین نے اس دعوت مبارزت (چیلنج) کو ایمانی جرأت کے ساتھ قبول کیا اور ایمان باللہ کی روشنی سے نکل کر شرک و کفر کی تاریکی میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔

یہ دیکھ کر کافر جماعت کی جانب سے حاکمانہ طاقت اور قاہرانہ جبروت کے ساتھ شہر کے مختلف حصوں میں خندقیں کھودی جا رہی ہیں خندقوں کے اندر آگ دہک رہی ہے، شعلے بھڑک رہے ہیں اور زمین کا اکثر حصہ کرہ نار بنا ہوا ہے اب مومن جماعت کے غیور اور فداکار انسان کشاں کشاں لائے جا رہے ہیں، وہ جگہ جگہ خندقوں کے دہانوں پر کھڑے کر دیئے گئے ہیں اور کفر و شرک اپنی

Marfat.com

مادی قوت کے بل پر کہہ رہا ہے کہ یا مجھ کو قبول کرو ورنہ بھڑکتی ہوئی آگ اور دہکتے ہوئے گڑھوں کی نذر کر دیئے جاؤ گے یہ سن کر مومن جماعت کہتی ہے جہنم کی آگ کے مقابلہ میں تمہارا آگ کا یہ عذاب ایک کھیل ہے اس لیے ایمان باللہ جہنم کی آگ کے مقابلہ میں بخوشی اس کو قبول کرتا ہے مگر شرک و کفر کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا، کفر و شرک کی طاقت یہ سن کر لاجواب ہو جاتی مگر غیظ و غضب میں آ کر فدا کارانِ توحید کو زندہ نذر آتش کر دیتی ہے اور اس طرح حق کو فتح و کامرانی اور باطل کو شکست و ناکامی ہو جاتی ہے کیونکہ جو دنیا والوں کی نظر میں خندقوں کے اندر دہکتی آگ میں جلا دیئے گئے وہ جلے اور مرے نہیں بلکہ زندۂ جاوید بن کر ابدی جنت اور سرمدی بہشت سے نوازے گئے اور جو اپنی دنیوی طاقت کے گھمنڈ پر نیکوکار انسانوں پر بجھ جانے اور فنا ہو جانے والی آگ دہکا رہے تھے وہ ابدی اور دائمی آگ "جہنم" کے مستحق قرار پائے، انہوں نے دنیا میں آگ کی بھٹی روشن کی اور مومنین صادقین کو اس کا ایندھن بنایا خدائے تعالیٰ نے عالم آخرت میں ایک ہولناک بھٹی (جہنم) روشن کر رکھی ہے جس کا ایندھن کافر و مشرک ہوں گے، جابر و ظالم ہوں گے ان کی بھٹی کو بہ عجلت یا بہ دیر بجھ جانا ہے، فنا ہو جانا ہے۔ لیکن خدا کی دہکائی ہوئی بھٹی کو خلود اور ہمیشگی حاصل ہے وہ نہ بجھے گی اور نہ فنا ہو گی۔ کفر و شرک نے دنیا کی طاقت پر گھمنڈ کیا مگر اس کا نتیجہ "عذاب الحریق" اور "عذاب جہنم" ہے اور ایمان باللہ نے خدا کی طاقت پر بھروسہ کیا تو اس کا نتیجہ ﴿ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ﴾ اور ﴿جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ کی صورت میں ظاہر ہوا۔
غرض سورۂ بروج میں یہ واقعہ معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ اس طرح مذکور ہے:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝۱ وَ الْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝۲ وَ شَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ ۝۳ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝۴ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝۵ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝۶ وَّ هُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝۷ وَ مَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۸ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۹ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ لَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝۱۰ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ۝۱۱﴾ (البروج: ۱۔۱۱)

"شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ○ قسم ہے آسمان کی جس میں برج ہیں اور اس دن کی جس کا وعدہ ہے اور اس دن کی جو حاضر ہوتا ہے اور اس دن کی جس کے پاس حاضر ہوتے ہیں، مارے گئے کھائیاں کھودنے والے آگ ہے بہت ایندھن والی جب وہ اس پر بیٹھے اور جو کچھ وہ کرتے تھے مسلمانوں کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان سے بدلہ نہیں لیتے تھے مگر صرف اس بات کا کہ وہ یقین لائے اللہ پر جو زبردست ہے تعریفوں کا مستحق ہے جس کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور اللہ کے سامنے ہے ہر چیز بیشک جو ایمان سے بچلائے ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو پھر توبہ نہ کرے تو ان کے لیے عذاب ہے دوزخ کا اور ان کے لیے عذاب ہے آگ میں جلنے کا بیشک جو لوگ یقین لائے (اللہ پر) اور انہوں نے بھلائیاں کیں ان کے لیے جنتیں ہیں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں یہ ہے بہت بڑی کامرانی۔"

Marfat.com

واقعہ کی تفصیلات:

مفسرین نے ان آیات کی تفسیر میں متعدد واقعات نقل کئے ہیں مگر ان میں سے دو زیادہ مشہور ہیں ایک کا ذکر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے مسند میں امام مسلم نے صحیح میں اور نسائی و ترمذی نے سنن میں کیا ہے وہ یہ کہ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا گزشتہ زمانہ میں ایک بادشاہ تھا اس کے دربار میں ایک جادوگر تھا جب وہ بہت بوڑھا ہو گیا تو ایک روز اس نے بادشاہ سے کہا میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں اور موت کا وقت قریب ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ آپ ایک فہیم و زیرک لڑکا میرے حوالہ کر دیں تاکہ میں اس کو اپنا یہ فن (سحر) سکھا کر اپنی زندگی ہی میں کامل کر دوں۔ چنانچہ بادشاہ نے ایک لڑکے کو اس کے سپرد کر دیا اور اس نے ساحر سے سحر کی تعلیم شروع کر دی۔ بادشاہ کے محل اور ساحر کے مکان کے درمیان ایک راہب [1] کی کٹیا تھی ایک مرتبہ لڑکا اس راہب کے پاس چلا گیا اور اس کی باتوں اور اس کے طریقوں کو دیکھ کر بہت مسرور ہوا اور اس کے پاس آنے جانے لگا۔ یہاں دیر ہونے لگی تو ساحر اور بادشاہ مقررہ آمد و رفت میں تاخیر کرنے پر برافروختہ ہوئے لڑکے نے راہب سے اس کی شکایت کی۔ راہب نے کہا کہ اس معاملہ کے مخفی رکھنے کی صرف یہ صورت ہے کہ جب بادشاہ باز پرس کرے تو یہ عذر کر دینا کہ ساحر کے یہاں تاخیر ہو گئی اور جب ساحر ناراض ہو تو یہ کہہ دینا کہ بادشاہ کے پاس تاخیر ہو گئی۔

غرض یہ سلسلہ عرصہ تک یوں ہی جاری رہا کہ ایک مرتبہ لڑکے نے دیکھا کہ راہ میں بہت ہیبت ناک اور عظیم الجثہ درندہ لوگوں کی راہ روکے ہوئے ہے اور کسی کو یہ جرات نہیں ہوتی کہ وہ اس کے سامنے سے گزر جائے لڑکے نے سوچا کہ یہ بہترین وقت ہے اس بات کا کہ میں جانچ کروں آیا ساحر کا مذہب سچا ہے یا راہب کا (دین) یہ سوچ کر اس نے ایک پتھر اٹھایا اور کہنے لگا "خدایا اگر تیرے نزدیک ساحر کے مقابلہ میں راہب کا دین سچا ہے تو میرے اس پتھر سے تو اس جانور کو ہلاک کر دے" یہ کہہ کر اس نے جانور کو پتھر مارا پتھر کا لگنا تھا کہ وہ وہیں ہلاک ہو گیا لڑکا چل دیا اور راہب سے جا کر سارا ماجرا کہہ سنایا۔ راہب نے کہا صاحب زادے تم مجھ پر فضیلت لے گئے مجھے ڈر ہے کہ تم آزمائش میں ڈالے جاؤ گے دیکھو وہ وقت آئے تو میرا ذکر نہ کرنا۔ لوگوں نے لڑکے کی اس جرأت کو دیکھ کر چرچا کیا اور کہنے لگے کہ اس کو عجیب غریب علم آتا ہے، یہ سن کر اس کے پاس اندھے اور جذامی آنے لگے اور انہوں نے کہا کہ اپنے علم کے زور سے ہم کو اچھا کر اور وہ خدا کے فضل سے اچھا کر دیتا تھا۔ بادشاہ کا ایک درباری مصاحب نابینا ہو گیا تھا اس نے لڑکے کا چرچا سنا تو تحفے تحائف کا بہت بڑا سامان لے کر اس کے پاس آیا اور تحفے پیش کرتے ہوئے بینا کر دینے کی درخواست کی۔ لڑکے نے جواب دیا میں کچھ نہیں ہوں اور نہ مجھ میں یہ طاقت ہے بلکہ شافی مطلق تو خدائے واحد ہے پس اگر تو ایمان لے آئے اور اس واحد و یکتا کے سوا کسی کی پرستش نہ کرے تو میں ضرور تیری سفارش کے لیے دعا کروں گا۔ درباری یہ سن کر خدائے واحد پر ایمان لے آیا اور مسلمان ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو شفاء عطاء فرمائی اور وہ بینا ہو گیا۔ اگلے دن جب وہ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے نابینا کو بینا پایا، تب بادشاہ نے سوال کیا کہ اپنے بینا ہونے کی حقیقت بیان کر اس نے جواب دیا "میرے رب نے مجھ کو شفا بخش دی" بادشاہ نے کہا تیرا رب تو میں ہوں میں نے تجھ کو اچھا کر دیا؟ درباری نے جواب میں کہا نہیں تیرے اور میرے اور کل

---

[1] حق پرست عیسائی عابد

Marfat.com

جہان کے پروردگار نے اچھا کر دیا، بادشاہ نے (غصہ میں آکر) کہا "کیا میرے سوا بھی کوئی تیرا رب ہے" درباری نے کہا جی ہاں۔ "اللہ تیرا اور میرا دونوں کا رب ہے" تب بادشاہ نے اس کو طرح طرح کے عذاب میں مبتلاء کیا آخر اس نے لڑکے کا ماجرا کہہ سنایا۔ بادشاہ نے لڑکے کو بلایا اور اس سے کہا بیٹا مجھے معلوم ہوا ہے کہ "تو سحر کے ذریعہ سے اندھوں کو بینا اور مبروص اور جذامی کو شفاء دیتا ہے" لڑکے نے کہا "مجھ میں یہ طاقت کہاں؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کے شفاء دینے سے شفایاب ہوتے ہیں" بادشاہ نے کہا "کیا میرے علاوہ بھی تیرا اور کوئی رب ہے؟" لڑکے نے کہا "وہ خدا جو واحد و یکتا ہے تیرا اور میرا دونوں کا رب ہے" تب بادشاہ نے اس کو عذاب میں مبتلاء کرنا شروع کر دیا آخر اس نے راہب سے متعلق تمام واقعہ کہہ سنایا تب بادشاہ نے راہب کو بلایا اور اس کو مجبور کیا کہ وہ دین حق سے پھر جائے مگر راہب نے کسی طرح اس کو قبول نہیں کیا۔ تب بادشاہ نے اس کے سر پر آرا چلوا دیا اور اس طرح اس کو شہید کر ڈالا۔ اب لڑکے سے کہا کہ تو راہب کے دین سے پھر جا لڑکے نے بھی صاف انکار کر دیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر وہاں سے گرا دو کہ پاش پاش ہو جائے جب سرکاری آدمی لڑکے کو پہاڑ پر لے کر چڑھے تو لڑکے نے دعا کی "الٰہی تو ان لوگوں کے مقابلہ میں میرے لیے کافی ہو جا" چنانچہ اسی وقت پہاڑ زلزلہ میں آ گیا اور سرکاری آدمی گر کر ہلاک ہو گئے اور لڑکا صحیح و سالم بچ کر بادشاہ کے سامنے حاضر ہو گیا۔ بادشاہ نے یہ دیکھا تو کہا کہ تیرے ساتھ والے کہاں گئے لڑکے نے کہا خدا نے ان کے مقابلہ میں میری مدد کی تب بادشاہ نے غضب ناک ہو کر حکم دیا کہ اس کو لے جاؤ اور دریا میں لے جا کر غرق کر دو، سرکاری آدمی جب اس کو دریا کے بیچ میں لے کر پہنچے تو لڑکے نے پھر وہی دعا کی "خدایا ان سے مجھ کو نجات دے" فوراً ہی دریا میں جوش آیا اور وہ سب غرق ہو گئے اور لڑکا پھر بچ گیا اور صحیح و تندرست بادشاہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بادشاہ نے پھر وہی سوال کیا اور لڑکے نے وہی پھر جواب دیا اور اس مرتبہ وہ کہنے لگا۔ "بادشاہ اس طرح تو ہرگز مجھ پر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا البتہ جو ترکیب میں بتاؤں اگر اس کو اختیار کرے تو بیشک تو مجھ کو قتل کر سکتا ہے" بادشاہ نے لڑکے سے وہ ترکیب دریافت کی لڑکے نے کہا: "تو شہر کی تمام مخلوق کو بلند جگہ پر جمع کر جب سب جمع ہو جائیں تو اس وقت مجھ کو درخت پر سولی دینا اور میرے ترکش سے تیر لے کر اور یہ پڑھ کر میرے سینہ پر مارنا "بسم اللہ رب الغلام" "اللہ کے نام پر جو اس لڑکے کا پروردگار ہے" تب میں مر سکتا ہوں" بادشاہ نے لڑکے کے قول پر عمل کیا اور جب تمام شہر جمع ہو گیا تو لڑکے کو سولی پر لٹکا کر اور لڑکے کی بتائی ہوئی عبارت پڑھ کر اس کے تیر مارا اور لڑکا تیر کھا کر جاں بحق ہو گیا۔ مخلوق نے یہ دیکھا تو سب نے ایک دم باآواز بلند نعرہ لگایا "امنا برب الغلام، امنا برب الغلام" "ہم لڑکے کے پروردگار پر ایمان لائے" اور سب مسلمان ہو گئے درباری کہنے لگے "بادشاہ جس بات کا تجھ کو خوف تھا آخر وہی ہو کر رہی اور یہ تمام رعایا مسلمان ہو گئی بادشاہ یہ دیکھ کر جامہ سے باہر ہو گیا اور اس نے حکم دیا کہ شہر کے ہر ایک محلہ اور گلی کوچہ میں خندقیں کھودو اور ان میں خوب آگ دہکاؤ اور پھر ہر محلہ کے لوگوں کو جمع کرو اور ان سے کہو کہ وہ اس دین سے باز آ جائیں جو باز آ جائے اس کو چھوڑ دو اور جو انکار کرتا جائے اس کو دہکتی آگ میں ڈالتے جاؤ لوگ جوق در جوق جمع ہوتے تھے اور دین حق سے باز نہ رہنے کا اقرار کرتے اور دہکتی آگ میں بخوشی ڈالے جاتے تھے اور اس جاں گسل اور ہولناک نظارہ کو بادشاہ اور اس کے مصاحبین مسرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ ایک عورت لائی گئی جس کی گود میں شیر خوار بچہ تھا عورت بچہ کی محبت میں جھجکی فوراً بچہ نے کہا: "ماں صبر سے کام لے اور بے خوف خندق میں کود جا اس لیے کہ بلاشبہ تو حق پر ہے اور یہ ظالم باطل پر ہیں۔"[1]

[1] مسلم، نسائی، ترمذی، مسند احمد

Marfat.com

اور دوسرا واقعہ صاحب سیرۃ محمد بن اسحاق نے بہ سلسلہ سند محمد بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ شام اور حجاز کے درمیان جو بستی نجران کے نام سے مشہور ہے اس کے باشندے بت پرست اور مشرک تھے اور ان کے قریب کی آبادی میں ایک ساحر رہتا اور وہ نجران کے لڑکوں کو سحر کی تعلیم دیا کرتا تھا کچھ عرصہ بعد نجران اور ساحر کی بستی کے درمیان ایک راہب آکر خیمہ زن ہوا وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ اس کا نام فیمون تھا نجران کے جو لڑکے ساحر سے سحر کی تعلیم حاصل کرتے تھے ان میں ایک لڑکا عبداللہ بن تامر بھی تھا ایک روز عبداللہ راہب کے خیمہ میں چلا گیا۔ راہب نماز میں مشغول تھا عبداللہ کو راہب کی نماز اور طریق عبادت بہت پسند آیا اور اس کے پاس آنے جانے لگا اور اس سے اس کے دین کو سیکھنا شروع کر دیا اور ایمان لے آیا اور راہب سے سچی مسیحیت کی تعلیم حاصل کر کے آہستہ آہستہ عالم دین بن گیا۔ اب اس نے راہب سے یہ اصرار کیا کہ مجھ کو اسم اعظم کے متعلق کچھ بتائیے مگر راہب یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ برادر زادہ مجھے یہ خوف ہے کہ تو اس کو برداشت نہ کر سکے گا کیونکہ میں تجھ کو کمزور پاتا ہوں لڑکا خاموش ہو گیا یہاں تو یہ سلسلہ جاری تھا اور ادھر عبداللہ کا باپ تامر یہ سمجھتا رہا کہ میرا لڑکا ساحر سے سحر سیکھ رہا ہے کچھ دن خاموش رہ کر لڑکے سے صبر نہ ہو سکا اور اس نے یقین کر لیا کہ راہب بخل کر رہا ہے اور بتانا نہیں چاہتا یہ سوچ کر اس نے تیروں کا مٹھا لیا اور ہر ایک تیر پر خدا کا ایک ایک نام لکھا اور پھر آگ روشن کی اور ایک ایک تیر کو اس میں ڈالنا شروع کیا تیر آہستہ آہستہ آگ کی نذر ہوتے رہے اور جلتے رہے مگر ایک تیر جب آگ میں پہنچا تو فوراً اُچھل کر دور جا گرا لڑکا سمجھ گیا کہ اس تیر پر اسم ذات کندہ یہی اسم اعظم ہے اور اس کے بعد راہب کو سارا قصہ کہہ سنایا۔ راہب نے سنا تو عبداللہ کو نصیحت کی کہ اس کو حفاظت کے ساتھ اپنے پاس رکھنا۔

عبداللہ نے اس کو دین حق کی تبلیغ کا ذریعہ بنا لیا وہ جس کسی کو مریض پاتا تو اس سے یہ کہتا کہ اگر تو خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور مومن بن جائے تو میں تیرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کروں کہ وہ تجھ کو تندرست کر دے اور جب وہ شخص سچے دل سے ایمان لے آتا تو یہ دعا کرتا اور مریض چنگا ہو جاتا، شدہ شدہ یہ بات نجران کے بادشاہ تک پہنچی اس نے لڑکے کو بلایا اور کہا کہ تو نے میری مملکت میں فساد مچایا اور میرے اور میرے باپ دادا کے دین کی مخالفت شروع کر دی اس لیے اب تیری سزا یہ ہے کہ تجھ کو قتل کر دیا جائے۔

لڑکا کہنے لگا: "بادشاہ! میرا قتل تیری قدرت سے باہر ہے" بادشاہ نے غضب ناک ہو کر حکم دیا کہ اس کو پہاڑ کی چوٹی سے گرا دو، سرکاری آدمیوں نے اس کو پہاڑ کی چوٹی سے گرا دیا مگر قدرت الٰہی نے اس کو صحیح سالم رکھا اور وہ بادشاہ کے پاس واپس آ گیا اب بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو دریا میں لے جا کر غرق کر دو۔ لیکن وہ دریا میں پھینک دیئے جانے کے باوجود غرق نہ ہوا اور اس کو مطلق کوئی گزند نہیں پہنچا تب لڑکے نے بادشاہ سے کہا کہ اگر تو واقعی مجھ کو قتل کر دینا چاہتا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ تو خدائے واحد کا نام لے کر مجھ پر حملہ کر تو میں مارا جا سکتا ہوں، بادشاہ نے خدائے واحد کا نام لے کر لڑکے پر حملہ کیا تو لڑکا جاں بحق ہو گیا مگر ساتھ ہی عذاب الٰہی نے بادشاہ کو بھی اسی جگہ ہلاک کر دیا۔

اہل شہر نے جب لڑکے اور بادشاہ کے درمیان جنگ کا یہ نظارہ دیکھا تو وہ سب صدق دل سے خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور مشرف بہ اسلام ہو گئے اور انہوں نے سچائی کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کے احکام کی پیروی کو اپنا دین بنا لیا۔ چنانچہ نجران میں نصرانیت کے حقیقی اور سچے دین کی بنیاد اسی واقعہ سے پڑی۔

نجران میں عیسائیت کی ترویج اور لڑکے اور راہب کے واقعہ کا تذکرہ یہودی المذہب شاہ یمن ذونواس تک بھی پہنچا اس نے سنا تو سخت اشتعال میں آ گیا اور لشکر جرار لے کر نجران پہنچا اور تمام شہر میں منادی کرادی کہ کوئی شخص عیسائیت پر قائم نہیں رہ سکتا یا تو وہ یہودیت قبول کرلے ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جائے اہل نجران کے قلب میں عیسائیت اس درجہ گھر کر چکی تھی کہ ...ب نے مرجانا قبول کیا مگر عیسائیت سے منہ نہ موڑا۔ ذونواس نے یہ دیکھا تو غیظ و غضب میں آ گیا اور حکم دیا کہ شہر کی گلیوں اور شاہراہوں میں خندقیں اور کھائیاں کھودی جائیں اور ان میں آگ دہکائی جائے جب لشکریوں نے تعمیل کردی تو اس نے شہریوں کو جمع کر کے حکم دیا کہ جو شخص یہودیت قبول کرنے سے انکار کرتا جائے مرد ہو یا عورت یا بچہ اس کو زندہ آگ میں ڈال دو۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق بیس ہزار کے قریب مظلوم انسانوں کو جام شہادت پینا پڑا۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورہ بروج میں کیا ہے: ﴿قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۙ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۙ﴾

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد ابن اسحاق کہتا ہے کہ ذونواس یمن کا مشہور بادشاہ ہے اس کا اصل نام زرعہ تھا مگر سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد یوسف ذونواس کے نام سے شہرت پائی اس کے باپ کا نام تبان اسعد تھا اور ابوکرب کنیت رکھتا تھا۔ یمن کے ان بادشاہوں کا لقب "تبع" تھا اس لیے کتب تاریخ میں یہ خاندان تبابعہ یمن کہلاتا ہے۔ ابوکریب وہ پہلا "تبع" ہے جس نے بت پرستی چھوڑ کر یہودیت کو قبول کرلیا تھا، اس نے مدینہ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرلیا تھا مگر بنی قریظہ کے دو یہودی علماء کی تلقین پر سچے دین موسوی کو قبول کر کے مدینہ سے واپس چلا آیا اور پھر مکہ معظمہ پہنچ کر کعبہ پر غلاف چڑھایا اور دونوں یہودی علماء کو یمن ساتھ لے آیا انہوں نے یمن میں یہودیت کی تبلیغ کی اور آہستہ آہستہ اہل یمن نے یہودیت قبول کرلی۔

الحاصل ذونواس نے ایک دن میں نجران کے بیس ہزار حق پرست انسانوں کو شہید کر دیا مگر ان میں سے ایک شخص دوس ذوالغلبان کسی طرح جان بچا کر نکل بھاگا اور شام میں مقیم قیصر روم کے دربار میں پہنچ کر نجران کے حادثہ کی ہوشربا داستان کہہ سنائی اور احتجاج کیا۔ قیصر نے فوراً حبشہ کے بادشاہ "نجاشی" کو لکھا کہ وہ یمن پر حملہ کر کے ذونواس سے اس ظلم کا انتقام لے۔ نجاشی نے اس پر چڑھائی کردی اور تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کو شکست دے کر تمام یمن پر قبضہ کرلیا ذونواس نے دریا کے راستہ فرار ہونے کی کوشش کی مگر غرق ہو گیا اور اس طرح تقریباً ستر سال تک یمن نصاریٰ کے زیر حکومت رہا اس کے بعد حمیری خاندان کے ایک رئیس سیف بن ذی یزن نے کوشش کی کہ اپنے خاندان کے زیر نگین ملک پر دوبارہ قبضہ کرے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے کسریٰ فارس سے مدد طلب کی کسریٰ نے حکم دیا کہ مملکت میں جس قدر بھی قیدی ہیں ان کو رہا کر کے اور ان کی فوج بنا کر سیف بن ذی یزن کی مدد کی جائے اور سیف نے سات سو ایرانی اور باقی اپنی فوج کی مدد سے یمن پر حملہ کیا اور نصاریٰ کے ہاتھ سے یمن کو آزاد کرالیا۔ [1]

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نجران کا بادشاہ بت پرست تھا پس اگر عیسائی راہب کے ذریعہ نجران میں عیسائیت پھیل گئی تو ذونواس کو جو کہ یہودی المذہب تھا اس درجہ طیش کیوں آیا؟ اس کا جواب یورپین مورخین یہ دیتے ہیں کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اس وقت سیاسی اور تجارتی صورت حال ایسی بن گئی تھی کہ رومی (عیسائی) اور حبشی ایک فریق تھا اور حمیری (یہودی) اور ایرانی دوسرا فریق تھا اور دونوں میں زبردست رقابت قائم تھی اس لیے ذونواس نجران میں عیسائیت کو برداشت نہ کرسکا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۴-۴۹۵، البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۳۰-۱۳۱

Marfat.com

ہم اس میں اس قدر اور اضافہ کرتے ہیں کہ تاریخ اس بات کو بھی ثابت کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ صلیب کے اس نظریہ کی بناء پر جو یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کے یہاں مسلمہ ہے اس درجہ آپس میں عداوت اور بغض بڑھ گیا تھا کہ دونوں فریق بت پرستوں کی ترقی کو برداشت کر سکتے تھے لیکن ایک دوسرے کی مذہبی ترقی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی اور اس کا مظاہرہ اس درجہ نمایاں تھا کہ جب کبھی یہود کو موقعہ ملا ہے تو انہوں نے عیسائیوں پر محض مذہب کے نام پر سخت سے سخت مظالم روا رکھے ہیں اور حکومت کے دباؤ سے زبردستی ان کو یہودی بنانے کی کوشش کی ہے اور جب کبھی عیسائیوں کو موقعہ ہاتھ آیا ہے تو انہوں نے یہودیوں پر اسی طرح کے مظالم سے گریز نہیں کیا پس نجران کا واقعہ ایسے زمانہ میں پیش آیا جب کہ مسطورہ بالا سیاسی اور تجارتی رقابت کی موجودگی میں رومی تاجر سواحل یمن تک پہنچتے اور مال تجارت کے ساتھ ساتھ عیسائیت کی تبلیغ کو بھی جاری رکھتے تھے آہستہ آہستہ نتیجہ یہ نکلا کہ نجران جو ساحل یمن پر واقع تھا رومی تاجروں کا تجارتی اور تبلیغی مرکز بن گیا۔ حمیری بادشاہ یہ دیکھتے تھے اور سخت برہم ہوتے تھے مگر صاف طور سے ظلم کرنے کا بہانہ ہاتھ نہیں آتا تھا کہ حسب اتفاق راہب اور لڑکے کا یہ واقعہ پیش آ گیا اور ذونواس نے جب یہ دیکھا کہ بات ریاست وتجارت سے گزر کر مذہب تک پہنچ گئی تو یہودیت کے روایتی تعصب نے قابو سے باہر کر دیا اور پھر جو کچھ پیش آیا گزشتہ سطور میں آپ اس کا مطالعہ چکے ہیں۔

ان دو واقعات کے علاوہ مشہور محدث ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے صاحبزادہ ربیع فرماتے ہیں کہ اصحاب اخدود کے متعلق ہم نے سنا ہے کہ "فترۃ" کے زمانہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان زمانہ میں خدائے تعالیٰ کے نیک بندوں کی ایک جماعت نے جب یہ دیکھا کہ زمانہ بہت ہی خراب ہو چلا ہے اور فتنوں اور شرارتوں کا زور بڑھتا جا رہا ہے اور دین حق گروہ بندیوں کی نذر ہو کر ہر شخص کی ذاتی رائے کے تابع بن گیا ہے تو انہوں نے باہم مشورہ کر کے عام آبادیوں سے بہت دور ایک چھوٹی سی بستی آباد کر لی اور اس میں سچی عیسائیت کے مطابق عبادت وصداقت کی زندگی بسر کرنے لگے مگر ان کا یہ معاملہ پوشیدہ نہ رہ سکا۔ اور شدہ شدہ اس زمانہ کے بت پرست بادشاہ تک پہنچ گیا اس نے آ کر بستی کا محاصرہ کر لیا اور ان کو توحید الٰہی کے خلاف بت پرستی پر مجبور کرنے لگا لیکن ان حق پرستوں پر اس کی سختیوں کا مطلق اثر نہ ہوا اور انہوں نے شرک وبت پرستی سے صاف انکار کر دیا۔ تب بادشاہ نے غضبناک ہو کر خندقیں کھدوانے اور ان میں آگ دہکانے کا حکم دیا اور پھر جو شخص بت پرستی سے انکار کرتا جاتا تھا اس کو آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔ حق پرست گروہ کے بزرگ پروانہ وار آگ میں کود جاتے تھے اور اپنے بچوں اور نوجوانوں کو تسلی دیتے جاتے تھے کہ آج کا دن خوف کھانے کا دن نہیں ہے یہ آگ ہمارے لیے جہنم کی آگ سے محفوظ رہنے کا پیش خیمہ ہے۔ چنانچہ تمام حق پرستوں نے حق پر نثار ہو جانا قبول کیا مگر شرک وبت پرستی پر آمادگی ظاہر نہ کی، اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی ان پر اپنا یہ فضل فرمایا کہ جب وہ آگ میں ڈالے جاتے تو آگ تک پہنچنے اور اس کی تکلیف سہنے سے قبل ہی ان کی روح قبض کر لی جاتی تھی، مگر خندق اور کھائیوں کی آگ اس درجہ بھڑک رہی تھی کہ ان نیکوکار انسانوں کو کھا لینے کے بعد بھی نہ بجھی اور بے قابو ہو کر کچھ اس طرح پھیلتی گئی کہ بت پرست ظالم بادشاہ اور اس کے تمام لشکری سب کے سب اس کے اندر گر گئے اور جل کر وہیں خاک سیاہ ہو گئے۔ قرآن عزیز کی یہ آیات ﴿قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝﴾ اسی واقعہ کا تذکرہ کر رہی ہیں۔ [1]

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۳

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ یہ واقعہ فارس میں پیش آیا، جب فارس کے بادشاہ نے دین حق چھوڑ کر باطل پرستی اختیار کر لی اور اپنے محارم (ماں، بہن، بیٹی وغیرہ) سے نکاح کرنا جائز قرار دے لیا تو ان کے بعض علماء نے جو ابھی تک دین حق پر قائم تھے بادشاہ کو اس بات سے منع کیا بادشاہ نے حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی بجائے غضب ناک ہو کر یہ حکم کیا کہ کھائیاں کھدوائی جائیں اور جو شخص نکاح محارم کو باطل کہے اس کو کھائی میں جھونک کر زندہ جلا دیا جائے۔ چنانچہ اہل حق کی جماعت نذر آتش کر دی گئی اور پارسیوں میں آج تک نکاح محارم کو جائز سمجھا جا رہا ہے۔ [1]

انتقاد:

ان روایات کے مفہوم اور مقصد پر اگر نظر کی جائے اور تفصیلات و جزئیات کو نظر انداز کر دیا جائے تو سب کا حاصل ایک ہی نکلتا ہے اور وہ یہ کہ گزشتہ زمانہ میں مشرک یا یہودی بادشاہ نے ایک حق پرست اور توحید الٰہی سے سرشار جماعت کو بت پرستی یا باطل پرستی پر مجبور کیا اور جب انہوں نے اس کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا اور ایمان باللہ اور حق پرستی کو ترک کر دینے سے انکار کر دیا تو ظالم و جابر بادشاہ نے ان کو آگ میں جھونک کر زندہ جلا دیا مگر نتیجہ کے اعتبار سے حق پرست جماعت کے حصہ میں ابدی کامرانی اور سرمدی فوز و فلاح آئی اور ظالم و باطل کوش جماعت دنیا میں بھی خائب و خاسر ہوئی اور آخرت میں ابدی جہنم پائی۔

نیز اگر اس حقیقت پر غور کیا جائے کہ نزول آیات و سور میں اصل شے مفہوم و مراد ہے اور شان نزول کو ثانوی اور تاریخی حیثیت حاصل ہے جیسا کہ حکیم الامت شاہ ولی اللہ (نور اللہ مرقدہٗ) نے الفوز الکبیر میں تصریح فرمائی ہے تو پھر بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ باختلاف زمانہ اس چرخ نیلی فام کے نیچے ایسے واقعات متعدد پیش آ چکے ہیں جن کا ذکر مسطورہ بالا روایات میں کیا گیا ہے۔

چنانچہ یہ بھی ایک مستقل واقعہ ہے جس کو مسلم نے صحیح میں اور امام احمد نے مسند میں نقل کیا ہے اور وہ بھی جس کو محمد بن اسحاق نے سیرۃ میں بیان کیا اور وہ بھی جس کو ابن کثیر نے بروایت حضرت علی رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے بلکہ ابن کثیر نے بحیثیت ایک مؤرخ کے یہ ثابت کیا ہے کہ بلاشبہ اس نوعیت کے واقعات متعدد پیش آ چکے ہیں وہ تحریر فرماتے ہیں:

> و قد یحتمل ان ذٰلك قد وقع فی العالم کثیرًا کما قال ابن ابی حاتم کانت الاخدود فی الیمن زمان تبع و فی القسطنطنیة زمان قسطنطین و فی العراق فی ارض بابل بخت نصر الذی صنع الصنم و امر الناس ان یسجدوا له۔ [2]
>
> "اور یہ ممکن ہے کہ ایسے واقعات عالم میں بہت ہو گزرے ہوں مثلاً ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ اخدود کا معاملہ ایک تو یمن میں تبع کے زمانہ میں پیش آیا اور دوسرا قسطنطین کے زمانہ میں قسطنطنیہ میں اور تیسرا عراق (بابل) میں بخت نصر کے زمانہ میں پیش آیا جس نے ایک بت بنا رکھا تھا اور وہ لوگوں کو مجبور کرتا تھا کہ اس کو سجدہ کریں اور جو سجدہ نہ کرتا اس کو آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔"
>
> و عن مقاتل قال کانت الاخدود ثلاثه واحدة بنجران بالیمن والاخریٰ بالشام والاخریٰ بفارس احرقوا

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۳ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۴ سورۂ بروج

بالنار اما التی بالشام فھو انطنانوس الرومی و اما الذی بفارس فھو بخت نصر و اما التی بارض العرب (نجران) فھو یوسف ذونواس فاما التی بفارس والشام فلم ینزل اللہ تعالٰی فیھم قرانًا و انزل فی التی کانت بنجران. ❶

"اور مقاتل فرماتے ہیں کہ "اخدود" تین واقعے ہیں ایک یمن (عرب) کے شہر نجران میں پیش آیا۔ دوسرا شام میں اور تیسرا فارس میں ان واقعات میں مظلوموں کو دہکتی آگ میں ڈالا گیا تھا اور شام کا واقعہ انطنانوس رومی کے ہاتھوں پیش آیا اور فارس کا بخت نصر (بنوکدنذر) کے ہاتھوں اور نجران کا واقعہ یوسف ذونواس کے ہاتھوں پیش آیا لیکن فارس اور شام کے واقعات کا ذکر قرآن میں نہیں ہے البتہ نجران میں جو واقعہ پیش آیا اس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔" ❷

بہر حال اگرچہ مسطورہ بالا روایات بلکہ ان کے علاوہ اسی قسم کے اور واقعات اپنے مفہوم و مراد اور مقصد کے لحاظ سے سب ہی سورۂ بروج کی آیات زیر بحث کا مصداق بن سکتے ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ قرآن عزیز نے خصوصیت کے ساتھ کس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے تو مشہور تابعی مقاتل کی عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ نجران اور ذونواس سے تعلق رکھتا ہے اور یہی قول صحیح ہے اور یہ اس لیے کہ مسلم اور مسند کی روایت کے تو کسی ایک جملہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نبی اکرم ﷺ نے اس واقعہ کو سورۂ بروج کی آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں بیان فرمایا ہے، یہی وجہ ہے کہ امام مسلم نے اس روایت کو کتاب التفسیر میں نقل نہیں فرمایا، البتہ ترمذی نے ایک "حسن غریب روایت" میں ضرور اس واقعہ کو دوسرے واقعہ سے مربوط اس طرح بیان کیا ہے کہ گویا یہ سورۂ بروج کی زیر بحث آیات کی تفسیر ہے لیکن ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ترمذی کی حدیث سے تو یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ نبی اکرم ﷺ نے اس واقعہ کو بیان فرمایا ہے بلکہ یہ قوی احتمال ہے کہ یہ واقعہ راوی حدیث حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کا اپنی جانب سے بیان کردہ ہو کیونکہ وہ اہل کتاب کے قصص و واقعات کے بہت بڑے عالم تھے ترمذی کی حدیث کا ترجمہ یہ ہے۔

ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ عصر کی نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے لب مبارک کو اس طرح حرکت دی گویا کچھ بات فرمانا چاہتے ہیں مگر بیان نہ فرمائی تب کسی نے عرض کیا کہ آپ ﷺ کچھ ارشاد فرمانا چاہتے تھے مگر فرمایا نہیں، لبوں کو حرکت دے کر رہ گئے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انبیاء سابقین میں سے ایک نبی اپنی امت کا حال دیکھ کر از راہِ فخر کہنے لگے کہ ایسی امت کس

---

❶ تفسیر ابن کثیر ج ۴ سورۂ بروج

❷ شام و فارس کے واقعات میں شام کے واقعہ سے تو غالباً قسطنطین کا واقعہ مراد ہے وہ یہ کہ جب قسطنطین بانی قسطنطنیہ نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین حق کی بجائے مروجہ مسیحیت کو اپنا دین بنایا اور توحید کی جگہ تثلیث کو عقیدہ کی بنیاد قرار دیا اور صخرہ بیت المقدس سے منحرف کر کے مشرق کو قبلہ بنایا اور تمام قلمرو میں منادی کر دی کہ یا آباء و اجداد کا دین چھوڑ کر دین مسیحی اختیار کرو اور جو انکار کرے اس کو دہکتی آگ میں جھونک دو۔ اوائل چھٹی صدی عیسوی میں ہزاروں انسان دہکتی آگ میں جھونک دیئے گئے اور فارس کے واقعہ سے متعلق ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک اسرائیلی روایت جو کہ دانیال نبی کے صحیفے میں بھی مذکور ہے یہ بیان کی ہے کہ عراق (بابل) میں بخت نصر نے سونے کا ایک بت بنوایا تھا اور تمام رعایا سے اس کو سجدہ کراتا تھا سب نے سجدہ کیا لیکن دانیال علیہ السلام اور ان کے رفقاء نے سجدہ سے انکار کر دیا تب بخت نصر نے خندق میں آگ دہکا کر اس میں ان سب کو دھکیل دیا مگر وہ ان پر برد و سلام ہو گئی اور کوئی آنچ نہ آئی اور جن نو آدمیوں نے آگ کی بھٹی میں ان کو ڈالا تھا وہ جل کر خاک ہو گئے۔

Marfat.com

نبی کی ہوگی؟ کون اس کے مقابلہ میں اپنی امت پیش کر سکے گا اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ انداز پسند نہ آیا اور ان پر وحی نازل ہوئی کہ دو باتوں میں سے ایک بات قبول کر دیا امت پر مصیبت کا نزول ہو یا ان پر دشمن کا تسلط ہو، خدا کے نبی نے دشمن کے تسلط پر مصیبت کے نزول کو ترجیح دی۔ چنانچہ ستر ہزار کے قریب موت کی آغوش میں سلا دیئے گئے (اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں):

وکان اذا حدث بھذا الحدیث حدث بھذا الحدیث الاخر.

اور جب وہ اس واقعہ کو بیان کیا کرتے تھے تو اس کے ساتھ ایک اور واقعہ سنایا کرتے تھے (یہ دوسرا واقعہ وہی ہے جو مسلم میں مذکور ہے) اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وھذا السیاق لیس فیہ صراحۃ ان سیاق ھذہ القصۃ من کلام النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال شیخنا الحافظ ابوالحجاج المزی فیحتمل ان یکون من کلام صھیب الرومی فانہ کان عندہ من اخبار النصاری.

"اور روایت کا یہ طریق بیان ہرگز اس کی صراحت نہیں کرتا کہ اس دوسرے واقعہ کا تذکرہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کیا گیا ہمارے استاد ابوالحجاج مزی فرماتے ہیں اس بیان میں یہ احتمال ہے کہ یہ واقعہ صہیب رومی رضی اللہ عنہ کی جانب سے ہو اس لیے کہ وہ نصاریٰ کے قصص وواقعات کے عالم تھے۔"

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے "اصحاب اخدود" کے متعلق کتب تفسیر و سیر میں تین روایات مذکور ہیں ایک روایت اوپر بیان ہو چکی دوسری روایت میں ہے کہ یہ واقعہ یمن میں پیش آیا ہے اور تیسری روایت میں ہے کہ یہ حبشہ کا واقعہ ہے مگر ان تینوں روایات میں سے کسی ایک روایت کے متعلق بھی ان سے یہ بصراحت مذکور نہیں کہ وہ ان میں سے کسی واقعہ کو تاریخی حیثیت سے ان آیات کی تفسیر سمجھتے ہیں۔

پس جب کہ مسلم کی روایت اس مسئلہ میں خاموش ہے اور ترمذی کی روایت سے بھی اس کے متعلق کوئی بات صاف ثابت نہیں ہوتی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایات بطور توسع اور مفہوم ومقصد کے پیش نظر تو آیات کا مصداق بنتی ہیں لیکن تاریخی حیثیت سے شان نزول پر دلالت نہیں کرتیں تو اس صورت حالات میں مقاتل کی صراحت اپنے اندر قوت رجحان رکھتی ہے۔ چنانچہ اہل تحقیق کا رجحان اسی جانب ہے کہ قرآن میں مذکور واقعہ ذونواس سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وما ذکرہ ابن اسحاق یقتضی ان قصتھم کانت فی زمان الفترۃ التی بین عیسٰی و محمد علیھما من اللہ السلام وھو اشبہ.

"اور ابن اسحاق نے جو واقعہ نقل کیا ہے اس کا اقتضا یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان زمانہ (فترۃ) کا ہے اور یہی قرین قیاس ہے۔"

وقد تقدم فی قصۃ اصحاب الاخدود ان ذونواس وکان اخر ملوک حمیر وکان مشرکا وھو الذی قتل اصحاب الاخدود وکانوا نصاریٰ وکانوا قریبا من عشرین الفا.

تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۴ ✿ تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۵ ✿ ایضاً سورۃ الفیل

Marfat.com

اور اصحاب اخدود کے واقعہ میں گزر چکا ہے کہ ذونواس ہی وہ بادشاہ تھا جس نے تقریباً بیس ہزار سچے عیسائیوں کو خندقوں میں ڈال کر مار ڈالا تھا یہ بادشاہ مشرک تھا اور شاہان حمیر میں سے آخری بادشاہ تھا۔"

اور شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہٗ) کا رجحان بھی اسی جانب ہے لیکن یہ دونوں بزرگ ذونواس کو مشرک کہتے ہیں مگر تاریخی سند سے ثابت ہو چکا ہے کہ ذونواس اپنے باپ کے دین یہودیت ہی پر قائم تھا۔

علاوہ ازیں قیاس بھی یہ چاہتا ہے کہ قرآن میں مذکور واقعہ نجران اور ذونواس سے ہی تعلق رکھتا ہے اس لیے کہ اس سلسلہ میں بیان کردہ واقعات میں سے یہ واقعہ زمانہ کے لحاظ سے بھی زیادہ قریب ہے اور ملکی اعتبار سے بھی خود عرب کے اندر کا واقعہ ہے اس لیے نزول قرآن کے وقت اہل عرب اس واقعہ سے ضرور آگاہ ہوں گے۔ لہٰذا حق و باطل کے مختلف معرکوں میں سے موعظت و عبرت کے لیے قرآن نے اس واقعہ کو بیان کر دیا اور اس کے علاوہ دوسرے واقعات یا تو بہت ہی قدیم زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یا عرب کے باہر دوسرے ملکوں سے علاقہ رکھتے ہیں اس لیے وہ اس کے مقابلہ میں قابل ترجیح نہیں ہو سکتے۔ [1]

تبع:

"سیل عرم" کی بحث میں اگرچہ سبا کے ضمن میں "تبع اور تبابعہ" کا تفصیلی ذکر آ چکا ہے تاہم مختصر طور پر یہاں بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ یمن کے حمیری بادشاہوں میں سے ان کا لقب رہا ہے جنہوں نے تقریباً ڈھائی سو سال تک یمن کے مغربی حصہ کو دارالسلطنت قرار دے کر عرب شام، عراق اور افریقہ کے بعض حصوں پر بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی، جدید تحقیق کے اصول پر حمیر حمرۃ (سرخی) سے ماخوذ ہے اور اس کے مقابلہ میں سودانی۔ سواد (سیاہی) سے بنایا گیا ہے، چونکہ اہل عرب یعنی حمیری، حبشیہ کو سیاہ فام ہونے کی وجہ سے "سودانی" کہتے تھے اس لیے جواب میں حبشی ان کو احمر (سرخ) کہتے تھے۔ یہی لفظ آگے چل کر "حمیر" بن گیا اور لفظ "تبع" اصلاً حبشی لفظ ہے یا سامی الاصل ہے؟ اس کے متعلق عرب مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ یہ عربی (سامی) لفظ ہے اور تبع سے بمعنی متبوع (سردار) بنا لیا گیا ہے اور جدید اہل تحقیق یہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ حبشی الاصل ہے اور بمعنی قاہر و غالب آتا ہے

---

[1] محقق عصر حضرت استاذ علامہ انور شاہ (نور اللہ مرقدہ) ارشاد فرماتے تھے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آیت کا شان نزول تاریخی حیثیت سے متعین ہوتا ہے پھر بھی آیت کے مفہوم و مراد کے لحاظ سے اس میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ اس قسم کی دوسری جزئیات کو خود صاحب شریعت ﷺ آیت کا شان نزول فرما دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کی بہترین مثال سورۂ توبہ کی یہ آیت ﴿لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ﴾ (توبہ:۱۰۸) باتفاق جمہور "مسجد قبا" کے بارے میں نازل ہوئی لیکن ایک مرتبہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ذات اقدس ﷺ سے اس آیت کے شان نزول کے متعلق دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا "مسجدی ہذا" اس آیت کا مصداق میری یہ مسجد (مسجد نبوی) ہے چنانچہ تمام محدثین کے نزدیک آپ ﷺ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں جن اوصاف کا تذکرہ کیا گیا ہے چونکہ اس کا مصداق مسجد قبا سے بھی زیادہ مسجد نبوی بنتی ہے اس لیے یہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کو شان نزول بنایا جائے۔

لیکن آپ ﷺ کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تاریخی حیثیت سے آیت کا شان نزول مسجد قبا سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ مسجد نبوی سے رکھتا ہے پس اگر مسئلہ زیر بحث میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ترمذی کی روایات میں مذکورہ واقعہ کو نبی اکرم ﷺ ہی نے سورۂ بروج کی آیات کا شان نزول فرمایا ہے تو نقل و عقل سے پیدا شدہ قرائن و دلائل اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد مبارک مصداق کے توسع کے پیش نظر ہے نہ کہ اس حیثیت سے کہ تاریخی بنا پر ترمذی میں مذکور واقعہ ہی آیات کا شان نزول ہے۔

Marfat.com

یعنی عربی میں "سلطان اور حبشی زبان میں تبع مترادف ہے۔"

قرآن عزیز نے بھی تبع کا ذکر دو مقامات سورۂ قٓ اور سورۂ دخان میں کیا ہے، سورۂ دخان میں مختصر طور پر ان کی مادی قوت و طاقت کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ جب خدا کی نافرمانی کر کے وہ ہلاکت سے نہ بچے تو قریش جو ان کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں وہ سرکشی کر کے کیسے بچ سکتے ہیں اور سورۂ قٓ میں صرف مجرم قوموں کی فہرست میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

﴿اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ اَهْلَكْنٰهُمْ ۫ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝﴾ (الدخان: ۳۷)

"یہ (قریش) بہتر (قوی و طاقتور) ہیں یا تبع کی قوم اور جو ان سے پہلے گزر گئیں ہم نے ان کو اس لیے ہلاک کر دیا کہ وہ مجرم تھیں۔"

﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوْدُ ۝ وَ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ وَ اِخْوَانُ لُوْطٍ ۝ وَّ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَ قَوْمُ تُبَّعٍ ؕ﴾ (ق: ۱۲-۱۴)

"ان (مشرکین مکہ) سے پہلے نوح (علیہ السلام) کی قوم نے اصحاب الرس نے ثمود، عاد، فرعون، اخوان لوط اور اصحاب الایکہ اور قوم تبع نے (خدا کے پیغمبروں کو) جھٹلایا ہے۔"

عرب کی دو حکایتیں:

ابن کثیر رحمہ اللہ نے مشہور محدث ابوبکر بن ابی الدنیا رحمہ اللہ کے واسطہ سے بروایت محمد بن جعفر بن ابی طالب یہ حکایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بعض اہل علم سے سنا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے جب اصفہان فتح کر لیا اور شہر میں فاتحانہ داخل ہو گئے تو شہر پناہ کا ملاحظہ کیا دیکھا تو ایک جانب میں دیوار شکستہ ہے انہوں نے حکم دیا کہ دیوار کا یہ حصہ درست کر دیا جائے لیکن جب دیوار کو درست کر دیا گیا تو وہ ٹھہر نہ سکی اور یک لخت پھر گر گئی۔ چنانچہ دوبارہ مرمت کی گئی مگر وہ پھر منہدم ہو گئی تب بعض لوگوں کا یہ خیال ہوا کہ اس مقام پر کسی مرد صالح کی قبر معلوم ہوتی ہے یہ سوچ کر جب بنیاد کو کھدوایا گیا تو دیکھا کہ ایک شخص کھڑا مدفون ہے اور اس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور تلوار پر عبارت کندہ ہے جس کا حاصل یہ ہے "میں حارث بن مضاض ہوں جس نے اصحاب اخدود سے انتقام لیا" حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کو وہاں سے نکال کر قبرستان میں دفن کرا دیا اور دیوار کی تعمیر کرا دی جو صحیح سالم رہی۔"[1]

حارث بن مضاض عرب کے خاندان جرہم کا ایک بادشاہ تھا جس نے نابت بن اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے مکہ کی حکومت لے کر حکمرانی کی تھی اور یہ تقریباً حضرت اسماعیل علیہ السلام سے پانچ سو سال بعد کا زمانہ ہے، اس اعتبار سے اصحاب اخدود کا واقعہ بہت قدیم زمانہ سے متعلق ہو جاتا ہے مگر یہ روایت سیر کی روایات میں سے ہے اور اس کی سند منقطع ہے اس لیے اس کی حیثیت حکایت اور کہانی سے زیادہ نہیں ہے، علاوہ ازیں اگر یہ واقعہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ یہ ان مختلف واقعات میں سے ایک واقعہ ہو جن کا قرآن میں نہیں ہے مگر وہ آیات بروج کے مصداق میں داخل ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴

Marfat.com

اسی طرز کی ایک حکایت مشہور محدث محمد بن ابوبکر بن حزم نے بغیر سند کے بیان کی ہے، کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں نجران کا ایک شخص زمین کھود رہا تھا دیکھا تو اس جگہ ایک قبر ہے اندر جھانک کر دیکھا تو ایک نعش کو اس طرح بیٹھے ہوئے پایا کہ وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے ہے جب لوگوں نے اس کے ہاتھ کو سر سے ہٹایا تو اس سے خون بہنے لگا اور جب ہاتھ کو اسی طرح رکھ دیا تو خون بند ہو گیا۔ اس شخص کے ہاتھ میں ایک انگشتری تھی اور اس کے نگینہ پر یہ عبارت کندہ تھی "رَبِّیَ اللّٰہُ" اس واقعہ کی خبر فوراً حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دی گئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس شخص کو اس کی حالت پر رہنے دیا جائے اور اسی جگہ دفن کر دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس زمانہ میں لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ یہ نعش عبداللہ بن تامر کی ہے۔

نجران میں چونکہ راہب اور عبداللہ بن تامر کا واقعہ پیش آ چکا تھا اس لیے کوئی محل تعجب نہیں کہ اس قسم کی حکایات وہاں مشہور رہی ہوں اور عیسائیوں نے اپنی برتری کے لیے ان کو خوب آب و رنگ دیا ہو۔

چند تفسیری نکات:

① ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝۱ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝۲ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝۳﴾ (البروج: ۱۔۳)

قرآن عزیز کی ان آیات میں "واؤ" بمعنی قسم ہے اور ان آیات کے علاوہ قرآن کی متعدد سورتوں میں مختلف اشیاء کی قسم کا تذکرہ موجود ہے عام طور پر ان مقامات کی تفسیر میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس طرح ہم آپس میں قسمیں کھاتے ہیں یا ایسی چیز کی قسم کھاتے ہیں جو ہمارے لیے بہت زیادہ عزت و عظمت کے لائق ہے مثلاً باپ، استاد، پیر، پیغمبر اور خدا کی قسم اور یا ایسی شئے کی قسم کھائی جاتی ہے جو ہماری نگاہ میں بہت زیادہ محبوب ہو۔ مثلاً اولاد کی یا محبوب کی قسم اسی طرح خدائے تعالیٰ نے بھی قرآن میں قسمیں کھائی ہیں اور یہ سمجھ کر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو قسم کھانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیونکہ قسم تو صرف اس لیے کھائی جاتی ہے کہ مخاطب کو اگر ہماری بات پر کوئی شبہ ہو تو ہم جس چیز کی عزت کرتے یا اسے بہت زیادہ محبوب سمجھتے ہیں اس کی عزت و محبت کو واسطہ بنا کر اپنی صداقت کا یقین دلائیں پس جب کہ خدائے برتر کی ذات سے نہ کوئی برتر ہے اور نہ وہ اپنی صداقت کی تائید کے لیے کسی محبوب سے محبوب تر شے کا محتاج تو پھر ان اقسام القرآن کا کیا مطلب ہے؟۔

نیز جو شخص خدائے تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے وہ تو خود اس کا قائل ہے کہ اس ذات واحد سے زیادہ کوئی سچا نہیں ہے ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ اور العیاذ باللہ جو شخص خدا کو نہیں مانتا اس کے لیے یہ سب قسمیں بیکار ہیں۔ لہٰذا قرآن عزیز میں مذکور اقسام کے کیا معنی؟

حقیقت یہ ہے کہ قرآن عزیز کے ان مقامات میں "واؤ" قسم یا لفظ قسم سے متعارف قسم سمجھنا اور جن اشیاء کو واؤ قسم یا لفظ قسم کے بعد بیان کیا گیا ہے ان سے یہ مراد لینا کہ "جس طرح عام طور پر ہم باپ یا بیٹے کی یا اپنے سے معظم و محترم یا پیاری شے کی قسم کھاتے ہیں اسی طرح خدا نے بھی قسمیں کھائی ہیں" قطعاً غلط اور عربی زبان کے محاورات سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور یہ اس لیے کہ عرب محاورات میں ان مواقع پر بھی واؤ قسم کو استعمال کیا جاتا ہے جہاں کسی شے کو بطور تاکید کلام کے یا بطور شہادت و استشہاد کے پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی کلام میں ایسی بات کہی گئی ہے جس کے متعلق یہ خطرہ ہے کہ وہ بات جس کے لیے گفتگو شروع کی گئی ہے دل نشین

Marfat.com

ہوجائے اس صورت میں "الواو للقسم بمعنی الواو للتاکید" ہوجاتی ہے اسی طرح اگر متکلم کی جانب سے کوئی ایسی بات کہی گئی ہے جس کا سمجھنا مخاطب کے لیے اس وقت تک مشکل ہے جب تک اس بات سے متعلق ایسے شواہد نہ پیش کیے جائیں جو اس بات کو دلنشین بنا سکیں تو ایسے موقعہ پر واو قسم کے ساتھ ایسے امور کو بیان کیا جاتا ہے جو اس مضمون کو تہ قلب میں اتارنے کے لیے مدد دے سکیں جس کے لیے متکلم مخاطب سے کلام کر رہا ہے اور ایسے موقعہ استعمال میں "الواو للقسم" کے معنی "الواو للشهادة" کے ہو جاتے ہیں چنانچہ جن مقامات پر واو قسم کو "تاکید" یا "شہادت" کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور ان مقامات میں جن چیزوں کو واو یا لفظ قسم کے بعد بیان کیا گیا ہے ان کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ متکلم کے لیے بزرگ و محترم یا محبوب ہی ہوں بلکہ دنیا و مافیہا کی ہر شے بھی متکلم کے مقصد "تاکید مضمون" یا "شہادت و استشہاد" کے لیے مفید اور موقعہ کے مناسب حال ہو اس کا بیان کیا جانا ضروری ہے۔

پس قرآن عزیز میں جن جن مقامات پر "واو قسم یا "لفظ قسم" سے کلام کی ابتداء کی گئی ہے ان تمام مقامات میں قسم سے متعارف معنی (حلف) مراد لینا قطعاً غلط اور باطل ہیں بلکہ عربی محاورہ زبان کے مطابق ان میں سے اکثر مقامات میں واو بمعنی شہادت ہے اور بعض مقامات میں بمعنی تاکید ہے۔

مثلاً سورۂ والتین میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات ہست و بود میں انسان کو سب سے بہتر مخلوق بنایا ہے مگر ان انسانوں کے علاوہ جو ایمان باللہ اور عمل صالح کے ذریعہ اپنی انسانیت کے امتیاز کو باقی رکھتے ہیں جن انسانوں نے عقل و شعور کے خصوصی امتیازات کے باوجود اپنے خالق اور پروردگار سے سرکشی کی وہ ذلت و رسوائی کے اسفل سافلین میں پھینک دیئے گئے۔

لیکن یہ دونوں باتیں سطحی نظر میں دل لگتی نہیں تھیں اس لیے کہ کائنات عالم میں انسان سے زیادہ قوی و طاقت ور اور وسیع و عریض مخلوق موجود ہیں جیسے شمس و قمر، کواکب و سیارات اور ارض و سماوات نیز انسان عالم کی ہر شے کا کسی نہ کسی درجہ میں محتاج ہے اور ان کی کوئی شے اس کی محتاج نظر نہیں آتی لہٰذا یہ کس طرح باور کیا جائے کہ ایک ضعیف البنیان اور ہر شے کی محتاج مخلوق اپنی خلقت کے اعتبار سے کل کائنات سے بہتر ہو اور اگر یہ مان بھی لیا جائے تو پھر احسن تقویم کے اعزاز سے معزز ہونے کے بعد اسفل سافلین قرار دیئے جانے کے کیا معنی؟ اس ادق مضمون کو سمجھانے اور فہم و ادراک کے قریب لانے کے لیے قرآن نے اول تین واقعات کو شہادت کے پیش کیا اور پھر اصل مضمون کو واضح کیا اس نے کہا:

﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ﴾ (التین: ۱ تا ۳)

شے کے "احسن تقویم" پر ہونے کا معیار اس کی جسمانی طاقت یا عرض و طول کی فراوانی اور احتیاج سے استغنا نہیں ہے بلکہ عقل و ادراکات و جذبات کا وجود اس کے لیے صحیح معیار ہیں تاکہ وہ ان کے ذریعہ اپنے اندر ودیعت شدہ متضاد قوتوں کا توازن صحیح رکھ کر تمام کائنات سے ممتاز و معزز نظر آئے اور یہ وصف صرف انسان ہی کے اندر تخلیق کیا گیا ہے اور دوسری اشیاء عالم اس سے یکسر محروم اور ان ہی اوصاف کی بدولت وہ بدی اور گمراہی سے محفوظ رہتا اور نیکی اور ہدایت کی راہ پر گامزن ہو کر اپنے خالق کی معرفت کرتا اور ابدی و سرمدی نجات و فلاح پاتا ہے بلکہ عالم کی راہ نمائی اور کائنات الٰہی میں خدا کے پیغامات حق کی پیغمبری کا عظیم اعزاز بھی اسی کے لیے مخصوص ہے۔

Marfat.com

تم اگر تاریخ ماضی کے اوراق کا مطالعہ کرو گے تو تم پر بآسانی اس کی صداقت ظاہر ہو جائے گی مثلاً شام (بیت المقدس) کا وہ مقام جہاں بکثرت انجیر و زیتون کے درخت اور باغات پائے جاتے ہیں اس بات کے لیے شہادت دے رہا ہے کہ اس جگہ خدا کا وہ سچا ہادی پیدا ہوا جس کا نام عیسیٰ بن مریم ہے اور جس نے پاک بازی کے ساتھ دنیا کو ہدایت اور راستی کا سبق سکھایا اور اس سے قدیم تاریخ کا مطالعہ کرو تو طور سینا اس کا گواہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس پر خدا کے کلام کو کتنی بار سنا اور خدا کی پیغمبری کا شرف حاصل کر کے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلائی اور مساوات انسانی کا سبق سنایا اور دور کیوں جاتے ہو اس بلد امین (مکہ) سے پوچھو وہ شہادت دے گا کہ اس کی آغوش میں محمد ﷺ جیسی مقدس ہستی اور خدا کے بزرگ ترین پیغمبر نے جنم لیا اور عرب کے بے برگ و گیاہ ریگستان میں کھڑے ہو کر ساری کائنات کو حق و صداقت اور اخوت و مساوات کا سبق سنایا اور توحید الٰہی کی جانب صحیح راہ نمائی کی۔ کیا یہ تینوں مقدس ہستیاں انسان کے سوا کچھ اور تھیں اور عالم کی راہ نمائی کا جو کام انہوں نے انجام دیا کیا وہ شمس و قمر، آسمان و زمین بلکہ جن و ملک انجام دے سکتے تھے؟ نہیں ہرگز نہیں پس اگر تاریخ ماضی کی یہ سب شہادتیں صحیح اور حق ہیں تو اب اس اقرار میں پس و پیش کیوں ہو کہ بلاشبہ انسان کو خدا نے بہترین قوام سے مخلوق کیا ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝﴾ اور جب ایسا ہے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ جو انسان ان مقدس ہستیوں کے طریق کار پر کاربند نہیں ہے اور ان کی راہ ہدایت سے منحرف ہو کر بدی اور گمراہی کو اپنی زندگی بنائے ہوئے ہے وہ یقیناً انسانیت کے معیار سے گر گیا اور وہ اسی قابل ہے کہ انجام کار انتہائی قعر مذلت "اسفل سافلین" میں پھینک دیا جائے ﴿ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝﴾ (سورۃ التین: ۳ تا ۵)

ہاں جس نے ایمان باللہ اور عمل صالح کو اختیار کر کے یعنی "اسلام" کو راہ عمل بنا کر اپنی انسانیت کے شرف و امتیاز کو محفوظ رکھا اس کے لیے خدا کے پاس بے منت اجر و ثواب اور نتائج و ثمرات کی کامرانی ہے:

﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝﴾ (التین: ٦)

یہ ہے مطلب قرآن کی قسموں کا جو اس ایک مثال سے ظاہر ہے۔ لہٰذا باقی اقسام القرآن بھی اسی طرح اپنی اپنی سورت میں بیان کردہ مضمون کو دل نشیں بنانے کے لیے مناسب حال شواہد و نظائر کا کام دیتی اور بعض مقامات پر تاکید مضمون کا حق ادا کرتی ہیں۔

اس تفصیل کے بعد سورۂ بروج کی اقسام کی تفسیر بہت سہولت کے ساتھ ذہن و فکر میں آ سکتی ہے، اس سورہ میں چند چیزوں کو واو قسم کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: ① ﴿وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۝﴾ برجوں والا آسمان، ② ﴿وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ ۝﴾ قیامت کا دن، ③ ﴿شَاهِدٍ﴾ جمعہ کا دن یا ہر وہ شخص جو حاضر و موجود ہو، ④ ﴿مَشْهُودٍ﴾ عرفہ کا دن یا ہر وہ شخص جو اس واقعہ سے متعلق ہے اور ان کے بعد یہ کہا گیا: ﴿قُتِلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ ۝ إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ ۝﴾ .... الآیۃ﴾ یعنی جن باطل پرستوں نے خندقیں کھدوا کر اور ان میں آگ دہکا کر مومنوں کو خدا پرستی کی بنا پر ایسی حالت میں آگ کے اندر دھکیل کر زندہ جلا دیا کہ خود کنارو پر بیٹھے اپنی اس انسانیت سوز حرکت کا تماشہ دیکھ رہے تھے وہ اپنی اس کمینہ حرکت پر زیادہ دن نازاں نہ رہ سکے اور انجام کے لحاظ ہلاکت و بربادی ظالموں کے ہی حصہ میں آئی اور دائمی سرور و کامرانی مظلوموں نے پائی۔

اس واقعہ میں دو باتیں واضح کی گئی ہیں ایک یہ کہ دنیا کے کسی گوشہ میں ایسا الم ناک واقعہ پیش آیا۔ دوسری بات یہ کہ نتیجہ و ثمرہ کے پیش نظر ظالم خسارہ میں رہا اور مظلوموں کو فوز و فلاح نصیب ہوئی اور جب کہ پہلی بات گزشتہ تاریخ سے تعلق رکھتی تھی

Marfat.com

دوسری بات بھی یا تو تاریخ ماضی سے ہی متعلق تھی یا مستقبل سے اس کا تعلق تھا تو ضروری ہوا کہ مخاطب کو یہ دل نشین کرایا جائے کہ ایسا ضرور ہوا اور جب کبھی ایسا ہوا ہے تو اس کا انجام ظالم کے حق میں خسران ہی رہا ہے۔ چنانچہ اظہار مقصد سے قبل "واو قسم" کے ذریعہ اس طرح کلام کی ابتدا کی گئی کہ برجوں والا آسمان اس بات کا شاہد ہے کہ اسی چرخ نیلی فام کے نیچے ایک المناک واقعہ پیش آیا اور یوم قیامت بھی گواہ ہے جس میں ہر حق و باطل کا فیصلہ ٹھیک ٹھیک ہو جانے والا ہے کہ اس المیہ کا انجام ظالم کے حق میں برا رہا اور ہر وہ شخص اس کا گواہ ہے جو واقعہ کے وقت موجود تھا اور خود وہ ظالم اور مظلوم گواہ ہیں جن کا اس معاملہ سے تعلق رہا ہے کہ بلاشبہ خندق کھود کر آگ میں انسانوں کو جلانے والے ہی انجام کار ہلاک و برباد ہوئے یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ برجوں والا آسمان جو اپنی حیرت انگیز صنعت اور کواکب و نجوم کے ساتھ زینت پر خدائے واحد کی وحدانیت کا اقرار کر رہا ہے اور وہ قیامت کا دن جس دن میں خدائے واحد کے سواء کسی کی قوت و طاقت باقی نہ رہے گی اور جہاں ﴿ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ ﴾ کا اعلان ہوگا اور وہ جمعہ کا دن جس میں ہر ہفتہ کروڑوں انسان خدا کے سامنے سربسجود ہو کر اس کی وحدانیت کا اعلان کرتے ہیں اور وہ عرفہ کا دن جس میں سال بھر میں تمام خدا پرست دنیا خدائے واحد کی پرستش کا مظاہرہ کرتی ہے یہ سب اس بات کے لیے شاہد اور گواہ ہیں کہ "اصحاب اخدود" اپنے ظلم کے نتیجہ میں ناکام رہے اور ہلاک و برباد ہوئے اور نہ صرف وہ بلکہ ہر ظالم کا انجام "جہنم" اور ابدی ذلت و رسوائی ہے اور مظلوم کے لیے دنیا و دین دونوں میں فوز و فلاح اور کامرانی ہے اور پھر اس بات کو ثابت کرنے کے لیے چند تاریخی واقعات کو بھی دہرایا گیا اور بتایا گیا کہ تم ثمود اور فرعون کے واقعات پر غور کرو اور تاریخ ماضی میں محفوظ ان کی عبرت ناک داستانوں کا مطالعہ کرو تا کہ تم کو یقین ہو جائے کہ جن حقائق کی جانب سورۂ بروج میں توجہ دلائی گئی ہے ان کا ایک ایک حرف صحیح اور صادق ہے کیا "اصحاب الاخدود" میں طاقت و قوت ثمود اور فرعون سے زیادہ تھی اور کیا جب انہوں نے خدا کے مقابلہ میں سرکشی کر کے مظلوم ایمان داروں پر ہولناک مظالم کیے اور اس کی سزا میں خدائے تعالیٰ کی سخت گرفت نے ان کو بے یار و مددگار بنا کر ہلاک و برباد کر دیا تو دنیا کی کوئی طاقت و قوت یا خود ان کی قوت و سطوت ان کے کچھ بھی کام آئی اور ان کو تباہی سے بچا سکی؟

﴿ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۝۱۷ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ ۝۱۸ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۝۱۹ وَّ اللّٰهُ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ مُّحِيْطٌ ۝۲۰ ﴾ (البروج: ۱۷۔۲۰)

② ﴿ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ﴾ میں مفسرین نے برج کی تفسیر کرتے ہوئے تین معنی مراد لیے ہیں:

(الف) بڑے بڑے نجوم و کواکب مراد ہیں۔

(ب) بروج ہیئت مراد ہیں جن کی تعداد بارہ ہے اور بحساب ہیئت قدیم ہر ایک برج میں سورج پورے ایک ماہ میں دورہ کرتا اور چاند دو دن اور تہائی دن میں دورہ کرتا اور دو راتیں مستور رہتا ہے اور اس طرح یہ دونوں مہینے اور سال بناتے ہیں۔

(ج) بروج سے وہ قلعے مراد ہیں جو آسمان پر محافظ فرشتوں کے لیے بنے ہوئے ہیں۔

ہمارے نزدیک قرآن عزیز میں دوسرے معنی قطعاً مراد نہیں ہیں اس لیے کہ ہیئت کا یہ حساب ضروری نہیں کہ صحیح ہو بلکہ آج کی ترقی یافتہ ہیئت نے تو تجربہ اور مشاہدہ کی حد تک یونان کی ہیئت قدیم کو تقویم پارینہ بنا دیا ہے اور بطلیموس کا نظام فلکی فرسودہ داستان

Marfat.com

بن کر رہ گیا ہے اور پہلے اور تیسرے معانی میں پہلے معنی راجح معلوم ہوتے ہیں اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ بڑے کواکب و نجوم ہی محافظ ملائکۃ اللہ کا مستقر ہیں تو پہلے اور تیسرے معنی میں مطابقت ہو جائے گی۔

③ ﴿وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ﴾ کی تفسیر میں جلیل القدر صحابہ اور تابعین سے مختلف اقوال منقول ہیں:

(الف) شاہد سے مراد جمعہ محمد ﷺ انسان یا اللہ تعالیٰ مراد ہے۔

(ب) مشہود سے عرفہ قیامت یا جمعہ مراد ہے مگر اکثر کا رجحان یہ ہے کہ شاہد سے جمعہ اور مشہود سے عرفہ مراد ہے اس لیے کہ جمعہ کا دن ہر ہفتہ آتا ہے اور دنیا کے ہر گوشہ سے لوگ عرفات میں حاضر ہوتے ہیں۔

ابن جریر طبری نے نبی اکرم ﷺ سے بھی ایک روایت اسی طرح کی بیان کی ہے:

قال رسول اللہ ﷺ الیوم الموعود یوم القیامۃ و ان الشاھد یوم الجمعۃ و ان المشھود یوم عرفۃ. (الحدیث)

④ اصحاب الاخدود کو قیامت کے دن جو عذاب ہوگا اس کے متعلق قرآن عزیز نے عذاب جہنم کے ساتھ عذاب الحریق آگ لگنے کا عذاب کا بھی ذکر کیا ہے اس سے یا تو عذاب جہنم ہی مراد ہے اور "جزاء از جنس عمل" کے اصول پر اس کو عذاب حریق بھی کہہ دیا گیا ہے یا جہنم میں ہی جلنے کا کوئی خاص قسم کا عذاب مراد ہے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے اور شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہ نے یہ معنی مراد لیے ہیں کہ آخرت میں جہنم کا عذاب اور دنیا میں آگ کے اندر جلنے کا عذاب اور اس سے ان کا مقصد غالباً اس واقعہ کی جانب اشارہ کرنا ہے جس کو ہم ابن ابی حاتم کی روایت سے نقل کر آئے ہیں۔

بصائر و عبر:

① جب انسان انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خدا کے خوف سے بے پرواہ ہو جاتا ہے اور اس کو دولت و حکومت کا نشہ کبر و غرور کی اس بلندی پر پہنچا دیتا ہے جس پر چڑھ کر اس کی نگاہ میں تمام مخلوق ہیچ اور حقیر نظر آنے لگتی ہے تو اخلاق حسنہ اور جذبات عالیہ اس سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی ذات اور ذاتی اغراض کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھتا۔ تب یکا یک غیرت حق کو حرکت ہوتی ہے اور وہ اس کو اس طرح بلندی سے پٹخ دیتی ہے کہ پستی و ذلت کے تاریک غار کے علاوہ اس کے لیے اور کوئی جگہ باقی نہیں رہتی اور ﴿اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی﴾ کہنے والا رب حقیقی کی ایسی سخت گرفت میں آ جاتا ہے کہ پھر کائنات کی بھر پور طاقت اس کے کام آتی ہے نہ عالم ہست و بود کی دولت و حشمت اور اس کو سرنگوں ہو کر یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ﴾ ہے۔

② انسان "انسانیت کے امتیازات و خصائص" سے بنتا ہے ورنہ حیوان سے بھی بدتر ہے اور انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ جب انسان کو ہمہ قسم کی دولت و حشمت اور سامان میسر ہوں اور سطوت و طاقت بھی بے اندازہ نصیب ہو تو اس وقت بھی خدا اور خوف خدا سے ہرگز بیگانہ نہ ہو۔ ظفر مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

Marfat.com

﴿ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِى الْخَلْقِ بَصْطَةً ۚ .... فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴾ (الاعراف: ۶۹، ۷۴)

"اور اے قوم عاد وہ وقت یاد کرو جب تم کو قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا اور تم کو مخلوق میں ہر طرح کی فراخی عطاء کی ..... پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو۔"

﴿ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِى الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۗ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴾ (الاعراف: ۱۰)

"اور ہم نے بے شبہ تم کو زمین میں قدرت وسطوت عطاء کی اور تمہارے لیے ان میں زندگی کے سامان بخشے پھر تم میں بہت کم شکر گزار ہیں۔"

③ انسان جب خدائے تعالیٰ پر یقین محکم کر لیتا اور حلاوت ایمانی سے فیض یاب ہو جاتا ہے تو پھر کائنات کی بڑی سے بڑی طاقت اور عالم کا ہولناک سے ہولناک ظلم بھی اس کو حق وصداقت سے متزلزل نہیں کر سکتا اور وہ کوہ استقامت بن کر ایثار وقربانی کا پیکر ثابت ہوتا ہے چنانچہ "اصحاب اخدود" کا واقعہ اس کی زندہ شہادت ہے۔

④ "جزاء از جنس عمل" خدائے تعالیٰ کا قانون ناطق ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ظالم ومتکبر کو ظلم وکبر کے عالم وجود میں آتے ہی فوراً سزا مل جائے اس لیے کہ بہ تقاضائے صفت رحمت یہاں ساتھ ساتھ قانون امہال (مہلت دینے کا قانون) بھی کام کر رہا ہے۔ البتہ جب اچانک گرفت کر لی جاتی ہے تو پھر چھٹکارا نا ممکن ہے۔

Marfat.com

اصحاب الفیل

۵۷۱ء و سنہ ولادت باسعادت ﷺ عام الفیل

○ حبش ○ حکومت ○ نجاشی ○ مذہب و تمدن ○ یمن و حبش کی کشمکش ابرہہ الاشرم ○ القلیس
○ اصحاب الفیل ○ قرآن حکیم اور اصحاب الفیل ○ تفسیری مباحث ○ بصائر وغیرہ

حبش:

سبا کی بحث میں یہ ذکر آ چکا ہے کہ حکومت سبا کی حدود مملکت جنوبی عرب سے شروع ہو کر شمال عرب اور افریقہ تک وسیع ہو گئی تھیں۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ یمن اور افریقہ کے درمیان بحر احمر اور بحر عرب کے جو گوشے حائل ہیں ان کو بحر حبش کہا جاتا ہے اس لیے یمن کے مقابل بحر حبش عبور کر کے افریقہ کے سواحل پر جو آبادیاں ہیں اور جو دراصل سبا کی تجارتی نو آبادیاں تھیں اس قطعہ کو عرب جغرافیہ دان حبش کہتے ہیں اور یہ یورپین اقوام میں ابی سینیاء یونان میں ایتھوپیا اور خود اہل حبش میں جیز کہلاتا ہے۔ لغت عرب میں "حبش" کے معنی اختلاط و امتزاج کے آتے ہیں۔ ✿ چونکہ عرب مؤرخین کے نزدیک حمیر (سبا) اور حبشہ کے اصل باشندوں کے اختلاط سے یہ قوم عالم وجود میں آئی اس لیے انہوں نے ان کا یہ نام تجویز کیا ہے۔ ✿

اور علماء انساب کہتے ہیں کہ جب اہل حبش (اکسوم) نے یمن پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا تو سبا کے خاندانوں میں یہ کہہ کر سلسلہ ازدواج قائم کیا کہ اصلاً وہ طے بن ادد (بنی کہلان) کی اولاد ہیں۔ اور سبا ہی کی ایک شاخ ہیں۔ ✿

اور یورپین مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ اہل حبش (اکسوم) غیر مخلوط سامی الاصل نہیں ہیں بلکہ اصل باشندوں کے ساتھ مختلف اقطاع عرب کے مختلف قبائل مل گئے ہیں۔ ✿

بہرحال ان اقوال کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ افریقی قبائل (بنی حام) سبائی عرب قبائل (بنی سام) کے اختلاط سے قوم (حبش) وجود میں آئی ہے۔

حکومت:

اس مخلوط سبائی قوم کا دارالحکومت شہر اکسوم تھا جو ملک حبش کے صوبہ "تجریے" میں بجانب مشرق واقع تھا۔ اس شہر کے آثار

✿ حبش الشئی۔ جمعہ و لا تحابیش۔ جماعہ من الناس لیسوا من قبیلتہ واحدۃ۔
✿ دائرۃ المعارف للبستانی و وجدی و دائرۃ المعارف الاسلامیہ (حبش و سبا)
✿ القصر رو الامم ص ۲۶ لابن عبدالبر ✿ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (سبا)

Marfat.com

اب تک باقی ہیں اور اہل حبش اس کو مقدس شہر سمجھتے ہیں۔ [1]

کہتے ہیں کہ جس زمانہ میں حمیر نے ریدان کے قلعہ میں اپنی حکومت کا پرچم بلند کیا اسی زمانہ میں حبش نے اکسوم میں حکومت کی بنیاد ڈالی جو تقریباً ۱۱۵ ق م سے چھٹی صدی ہجری تک قائم رہی۔

نجاشی:

عرب، حبشہ کے بادشاہ کو نجاشی کا لقب دیتے ہیں دراصل یہ حبشی لفظ نجوس کا معرب ہے حبش کی زبان میں نجوس کے معنی "بادشاہ" کے ہیں اصحمہ بن ابجر مشہور نجاشی حبش ان خوش قسمت بادشاہوں میں سے ہیں جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا زمانہ پایا اور اسلام کی دولت سے مشرف ہوئے ان ہی کے زمانہ میں مسلمانوں نے پہلی ہجرت حبشہ کی جانب کی نجاشی نے ان کو باعزت پناہ دی اور قریش کے اس مطالبہ کو ٹھکرا دیا کہ مسلمانوں کو ان کے حوالہ کر دیا جائے اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اس تقریر سے متاثر ہو کر جو نجاشی کے دربار میں انہوں نے صداقت اسلام اور حقیقت اسلام پر کی تھی اس نے اسلام قبول کر لیا۔ یہی وہ نجاشی ہیں جن کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کا سلسلہ مراسلت رہا ہے اور یہی وہ نجاشی ہیں جن کے انتقال پر نبی اکرم ﷺ نے غائبانہ ان کی نماز جنازہ پڑھی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو بذریعہ وحی ان کے انتقال کی خبر دی۔

مذہب وتمدن:

حبش کا مذہب اور ان کا تمدن شروع سے ہی مصر (عرب) کے مذہب وتمدن سے متاثر رہا ہے اس لیے ان کا تمدن قریب قریب عرب ہی کا تمدن ہے اور مذہبی اعتبار سے یہ خاندان شروع میں مصری اور یمنی قبائل کی طرح بت پرست تھا لیکن جب رومی بادشاہوں کے اثر سے مصر نے عیسائیت کو قبول کر لیا تو اس کا اثر حبش پر بھی پڑا اور ۳۳۰ء میں سب سے پہلے اذنیہ نجاشی نے عیسائیت کو قبول کر لیا۔

حبش و یمن کی کشمکش:

گزشتہ صفحات میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ روم و ایران کی رقیبانہ وحریفانہ کشمکش نے یمن اور حبش کو بھی متاثر کیے بغیر نہ چھوڑا اور سیاسی اور تجارتی رقابت نے ان دونوں کے درمیان بھی کشمکش قائم کر دی جس کے نتیجہ میں من اور ایران ایک جانب نظر آتے ہیں اور حبش و روم دوسری جانب پھر عجیب اتفاق یہ ہوا کہ جس زمانہ میں حبش میں عیسائیت کا ظہور ہوا اسی کے قریب یمن میں یہودیت نے قدم جمائے، اگرچہ اس زمانہ میں عیسائیت کو کافی فروغ حاصل تھا مگر نہیں معلوم کن وجوہ کی بنا پر اہل عرب عیسائیت کے ساتھ مانوس نہیں تھے اس لیے یمن نے جب تبدیل مذہب کیا تو یہودیت کو قبول کیا اور عیسائیت کی جانب رجحان نہ کیا مگر چوتھی صدی عیسوی میں جب اذنیہ نجاشی حبشہ نے عیسائیت کو قبول کر لیا تو یمن اور حبش کے درمیان مذہبی منافرت کے جذبات نے سابق رقابت کو اور زیادہ مشتعل کر دیا اور اسی اشتعال کے نتائج میں "اصحاب اخدود" کا سانحہ پیش آیا اور ذونواس شاہ یمن کے اس ظلم کی دادرسی کے لیے نجران کے ایک سردار دوس بن ثعلبان نے نجاشی کے توسط سے قیصر روم تک فریاد پہنچائی اور قیصر روم نے نجاشی حبش کو حکم دیا کہ وہ یمن پر حملہ کر کے

[1] ایضاً ایڈیشن ۹ ج ۱ ص ۶۶-۶۷

حمیریوں سے انتقام لے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے۔

"اوائل چھٹی صدی میں حمیر (ذونواس) نے عیسائیوں کو سخت تکلیف پہنچائی جسٹینین اول نے شاہ حبش کالب الاصبح کو لکھا کہ ان کی امداد کرے چنانچہ اس نے حمیر کے ہاتھ سے یمن چھین لیا۔" ✿

اور ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ دوش نے قیصر روم کے پاس براہ راست فریاد کی اور قیصر نے ایک حکم نامہ دے کر اس کو نجاشی کے پاس بھیج دیا۔ دوش جب قیصر کا شاہی فرمان نجاشی کے پاس لے کر پہنچا تو وہ ستر ہزار فوج کے ساتھ یمن پر حملہ آور ہوا۔ ذونواس بھی فوج گراں لے کر مقابلہ پر آیا مگر شکست کھا گیا اور گھوڑے پر سوار دریا میں کود گیا کہ پار اتر کر فرار ہو جائے مگر پار نہ ہو سکا اور دریا میں غرق ہو گیا۔ ✿

عرب مؤرخین کہتے ہیں کہ یمن کے فاتح کا نام ارباط تھا اور ابرہۃ الاشرم اس کے ہمرکاب تھا مگر یونانی کہتے ہیں کہ اس کا نام اسمیفوس تھا اور اس زمانہ کے نجاشی کا نام الیباس (الاصبح) تھا۔

غرض مؤرخین عرب کی روایت کے مطابق ارباط یمن کا پہلا گورنر بنایا گیا حتیٰ کہ چند سال کے بعد ابرہہ نے اس پر بغاوت کر دی اور اس کو مار ڈالا اور بلاشرکت غیر یمن پر قابض ہو گیا جب نجاشی الاصبح کو یہ خبر پہنچی تو وہ سخت غضبناک ہوا اور اس نے قسم کھائی کہ ابرہہ کو قتل کر کے اس کے دارالحکومت کو پیروں تلے روند ڈالے گا۔

ابرہہ نے یہ سنا تو بہت گھبرایا اور اپنے جسم سے کچھ خون نکال کر ایک شیشی میں بند کیا اور ایک تھیلہ میں یمن کی خاک بھری اور دونوں چیزوں کو قاصد کے ہاتھ نجاشی کے پاس بھیجا اور اس کو لکھا کہ جس طرح ارباط آپ کا تابع فرمان تھا اسی طرح یہ غلام بھی ہمیشہ تابع اور مطیع رہے گا جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ حضور والا مجھ سے خفا ہیں اس وقت سے سخت پریشان ہوں اور میں آپ کی قسم کو پورا کرنے کے لیے اپنا خون اور یمن کی خاک بھیج رہا ہوں کہ آپ اس خون کو یمن کی خاک پر ڈال کر پیروں سے روند دیجئے اور اپنی قسم پوری کر لیجئے نجاشی نے ابرہہ کی معافی کو وقت کی مصلحت کے مناسب خیال کرتے ہوئے قبول کر لیا اور یمن پر ابرہہ کی گورنری کو منظور کر لیا اور اس طرح وہ یمن پر مطمئن حکومت کرنے لگا۔ ✿

ابرہۃ الاشرم:

ابرہہ کے متعلق مؤرخین کا یہ بیان ہے کہ یہ شاہی خاندان سے تھا اور چونکہ نکٹا تھا اس لیے اہل عرب اس کو ابرہۃ الاشرم کہتے ہیں۔ عربی میں "اشرم" نکٹے کو کہتے ہیں اس کی حکومت کا آغاز بعض کے نزدیک ۵۲۵ء اور بعض کے نزدیک ۵۴۳ء سے ہوتا ہے صاحب ارض القرآن دوسرے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔

ابرہہ، ابراہیم کا حبشی تلفظ ہے یہ عیسائیت میں بہت پرجوش تھا۔ اس نے تمام قلمرو میں عیسائی مبلغ مقرر کیے اور شہروں میں بڑے بڑے گرجا (کنیسا) تعمیر کرائے۔ ان تمام کلیساؤں میں سب سے بڑا اور مشہور کلیسا دارالحکومت صنعاء میں تیار کرایا جس کو اہل عرب "القلیس" کہتے ہیں جو یونانی لفظ "کلیسا" کا معرب ہے۔

✿ مضمون اسی سینا ✿ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۶۹ ✿ تاریخ ابن کثیر ج ۱

Marfat.com

القلیس:

ابن جریر اور ابن کثیر بروایت محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ یہ "کلیسا" بلحاظ فن تعمیر عدیم النظیر تھا اور جب یہ تعمیر ہو گیا تو ابرہہ نے نجاشی کو لکھا کہ میں نے آپ کے لیے صنعاء میں ایسا بے نظیر گرجا تعمیر کرایا کہ اس سے قبل تاریخ نے ایسا گرجا کبھی نہ دیکھا ہوگا اب میری تمنا یہ ہے کہ اقطاع و امصار کے عرب جو مکہ میں کعبہ کا حج کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں ان سب کا رخ اس "کلیسا" کی جانب پھیر دوں اور کل عرب کے لیے یہی مقام حج بن جائے اہل عرب نے یہ سنا تو ان میں سخت برہمی پیدا ہو گئی۔ ❶

(سہیلی کہتے ہیں کہ ابرہہ نے اس کی تعمیر میں یمن پر بہت سخت مظالم کیے، اہل یمن کو جبراً مزدور بنایا اور یمن کی بے اندازہ دولت اور بیش بہا زر و جواہر کو بے دریغ اس پر صرف کیا) یہ بیش قیمت پتھروں کی بہت خوب صورت اور بہت طویل و عریض عمارت تھی اور عجیب و غریب زرکار نقوش سے منقش اور جواہر ریزوں سے مزین تھی اور ہاتھی دانت اور آبنوس کے نہایت حسین و جمیل منقش منبروں اور سونے چاندی کی صلیبوں سے اس کو سجایا گیا تھا۔ ❷

اصحاب الفیل:

تاریخ عرب اس کی شاہد ہے کہ تمام اہل عرب خواہ وہ کسی بھی فرقہ اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں کعبہ کی بہت زیادہ عظمت کرنے اور اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق اس کا حج کرنا مقدس فرض سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ خاص کعبہ کے اندر عرب کے مختلف فرقوں کے بت تین سو ساٹھ کی تعداد میں نصب تھے۔ ❸

حتیٰ کہ حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل، حضرت عیسیٰ، حضرت مریم (علیہم السلام) کی تصاویر بھی موجود تھیں اور جب فتح مکہ میں نبی اکرم ﷺ فاتحانہ داخل ہوئے تو آپ ﷺ کے ارشاد پر جس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ نے ان بتوں کو کعبہ سے خارج کیا ہے تو اس وقت بھی یہ تصاویر کعبہ کے اندر موجود تھیں اور ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے جب یہ ذکر آیا کہ مشرکین عرب نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی تصویر اس طرح بنائی ہے کہ ان کے ہاتھ میں "پانسے" ہیں تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مشرکین جھوٹے ہیں اور اسمٰعیل علیہ السلام کا دامن اس بیہودہ عمل سے پاک ہے۔ ❹

بہرحال جب صنعاء میں مقیم کسی حجازی نے یہ سنا کہ ابرہہ نے "القلیس" کو اس نیت سے بنایا ہے تو اس کو غصہ آیا اور اس نے ایک شب میں موقعہ پا کر اس کلیسا کو نجس کر دیا۔ ابرہہ کو جب صبح کو یہ معلوم ہوا اور تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ یہ کام کسی حجازی کا ہے تو غصہ سے بے قابو ہو گیا اور گرجا کی بے حرمتی دیکھ کر غیظ و غضب میں پیچ و تاب کھانے لگا اور قسم کھائی کہ اب کعبہ ابراہیمی کو برباد کیے بغیر چین سے نہ بیٹھوں گا یہ ارادہ کر کے ابرہہ لشکر جرار اور ہاتھیوں کی ایک تعداد ساتھ لے کر مکہ کی جانب روانہ ہوا۔ یہ خبر تمام قبائل عرب میں ہوا پر سوار ہو کر پہنچ گئی اور تمام عرب میں اس سے ایک ہیجان پیدا ہو گیا سب سے پہلے یمن ہی کے ایک امیر ذونفر نے

---

❶ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۷

❷ اس کے آثار عباسی خلیفہ اول سفاح کے زمانہ تک موجود تھے روض الانف ج ۱ و تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۷۰

❸ بخاری و مسلم ❹ بخاری باب فتح

Marfat.com

یمن سے نکل کر عرب کے مختلف قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ میں ابرہہ کا مقابلہ کرنا چاہتا ہوں آپ کو چاہیے کہ اس نیک مقصد میں میرا ساتھ دیں۔ چنانچہ وہ آگے بڑھ کر ابرہہ کے مقابل آیا اور اس سے جنگ کی مگر شکست کھا گیا اور ذونفر گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد قبیلہ بنی خشعم کے سردار نفیل بن حبیب سے مقابلہ ہوا اور اس کو بھی شکست اٹھانی پڑی اور وہ بھی گرفتار ہو گیا جب ابرہہ طائف پہنچا تو بنی ثقیف کے سردار مسعود بن معتب نے آگے بڑھ کر ابرہہ کو یقین دلایا کہ مجھ کو اور میرے قبیلہ کو آپ سے کوئی پرخاش نہیں ہے اس لیے کہ ہم کو یہ یقین ہے کہ آپ "بیت اللات" کے انہدام کا ارادہ نہیں رکھتے جس میں ہمارا سب سے معظم اور محترم معبود لات نصب ہے۔ ابرہہ نے ان کو اطمینان دلایا اور خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ مسعود ثقفی نے راستہ بتانے کے لیے ایک شخص ابورغال کو راہنما بنا دیا مگر ابورغال وادی مغمس پہنچ کر مر گیا کہتے ہیں کہ عرب زمانہ جاہلیت میں اس کی قبر کو سنگسار کیا کرتے تھے کہ یہ کعبہ کے انہدام کے لیے راہنما بنا تھا۔

مغمس پہنچ کر ابرہہ نے ایک حبشی فوجی افسر کو جس کا نام اسود بن مقصود تھا حکم دیا کہ وہ مکہ جا کر چھاپہ مارے۔ اسود مکہ کے قریب پہنچا تو "قریش اور دوسرے قبائل کے اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو جو کثیر تعداد میں چر رہے تھے" پکڑ کر اپنے لشکر میں لے گیا۔ ان میں عبدالمطلب کے بھی دو سو اونٹ شامل تھے۔

اس زمانہ میں عبدالمطلب قریش کے سردار تھے۔ یہ حال دیکھ کر قریش، کنانہ، ہزیل اور دیگر قبائل نے آپس میں مشورہ کیا کہ ابرہہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے؟ مشورہ کے بعد یہ طے پایا کہ ہم میں طاقت مدافعت نہیں ہے اس لیے ہم کو مکہ چھوڑ کر قریب کی پہاڑی پر چلے جانا چاہیے ابھی یہ لوگ مکہ ہی میں تھے کہ ابرہہ کی جانب سے جناطہ الحمیری پہنچا اور دریافت کیا کہ مکہ کا سردار کون ہے؟ لوگوں نے عبدالمطلب بن ہاشم کی جانب اشارہ کیا۔ جناطہ نے کہا "میں ابرہہ کی جانب سے آیا ہوں ہمارے بادشاہ کا یہ حکم ہے کہ آپ تک یہ پیغام پہنچا دوں کہ ہمارا ارادہ آپ لوگوں کو نقصان پہنچانے کا نہیں ہے اور نہ ہم آپ سے جنگ کرنے کے لیے آئے ہیں ہم تو صرف اس گھر (بیت اللہ) کو ڈھانے کے لیے آئے ہیں پس اگر تمہارا ارادہ مقابلہ اور مدافعت کا ہو تو تم جانو اور اگر تم ہمارے اس ارادہ میں حائل نہ ہو تو ہمارا بادشاہ آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔" عبدالمطلب نے جواب دیا ہمارا قطعاً ارادہ نہیں کہ ہم تمہارے بادشاہ سے جنگ کریں اور نہ ہم میں یہ طاقت ہے یہ اللہ کا گھر ہے اور اس کے برگزیدہ نبی ابراہیم علیہ السلام کی یادگار، پس اگر اللہ اس کی حفاظت کرنا چاہے گا تو وہ کر سکتا ہے اور اگر اس کو اس کی حفاظت مقصود نہیں ہے تو ہم قوت مدافعت کے قابل قطعاً نہیں ہیں۔

(غرض اس گفتگو کے بعد عبدالمطلب ابرہہ کے لشکر میں پہنچے) اور ایک درباری کی جانب سے سفارش و تعارف پر اس کے سامنے پیش ہوئے۔ عبدالمطلب بہت شاندار اور وجیہ و شکیل انسان تھے، ابرہہ نے دیکھا تو ان کے ساتھ عزت سے پیش آیا اور اپنے برابر ان کو جگہ دی۔

گفتگو شروع ہوئی تو ان کی طلاقت لسانی اور خطابت سے ابرہہ بہت زیادہ متاثر ہوا، دوران گفتگو میں جب معاملہ پر بات چیت شروع ہوئی تو عبدالمطلب نے شکایت کی کہ آپ کے ایک سردار نے میرے اونٹ گرفتار کر لیے ہیں لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ ان کو میرے حوالہ کر دیجئے ابرہہ نے یہ سنا تو کہا: "عبدالمطلب میں تو تم کو بہت فہیم و عقیل سمجھتا تھا لیکن اس سوال پر سخت متعجب ہوں، تم کو معلوم ہے کہ میں کعبہ کو ڈھانے کے لیے آیا ہوں جو تمہاری نگاہ میں سب سے زیادہ باعظمت اور مقدس ہے لیکن تم نے اس

Marfat.com

کے متعلق ایک جملہ بھی نہیں کہا اور ایسی چھوٹی اور حقیر بات کا ذکر کر رہے ہو؟" عبدالمطلب نے جواب دیا "بادشاہ یہ اونٹ چونکہ میری ملکیت ہیں اس لیے میں نے ان کے متعلق درخواست پیش کی اور کعبہ میرا گھر نہیں خدا کا مقدس گھر ہے وہ آپ اس کا محافظ ہے میں کون ہوں جو اس کے لیے سفارش کروں؟" ابرہہ کہنے لگا اب اس کو میرے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ عبدالمطلب نے جواب دیا: "آپ جانیں اور رب البیت جانیں" یہاں پہنچ کر سلسلہ گفتگو ختم ہو گیا اور ابرہہ نے اپنے لشکریوں کو حکم دیا کہ عبدالمطلب کے اونٹ واپس کر دیئے جائیں۔"

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عبدالمطلب کے ہمراہ بنی بکر کا سردار یعمر بن نفاثہ اور بنی ہزیل کا سردار خویلد بن واثلہ بھی تھے، روانگی سے قبل انہوں نے ابرہہ کے سامنے یہ پیش کش کی کہ اگر کعبہ کے انہدام سے باز آ جائیں تو ہم تہامہ کا ایک تہائی مال آپ کی خدمت میں حاضر کر دیں گے مگر ابرہہ نے اپنی طاقت کے نشہ میں اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور اپنے ارادہ پر اڑا رہا تب یہ لوگ ناکام واپس آ گئے۔

عبدالمطلب نے واپس آ کر قریش اور دوسرے قبائل عرب کو جمع کیا اور ان کو تمام گفتگو سنا کر یہ مشورہ دیا کہ اب ہم سب کو قریب کی کسی پہاڑ پر پناہ گزیں ہو جانا چاہیے تاکہ اس منظر کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ سکیں جب اہل مکہ پہاڑی پر جانے لگے تو عبدالمطلب کی قیادت میں کعبۃ اللہ میں حاضر ہوئے اور اس کی زنجیر پکڑ کر درگاہ الٰہی میں یہ دعا کی:

"خدایا ہم اس بارے میں غمگین نہیں ہیں کہ جب ہم اپنی متاع کی حفاظت کر سکتے ہیں تو اپنی متاع (کعبہ) کی تجھ کو بھی ضرور حفاظت کرنی ہے اور تیری تدبیر پر نہ صلیب کی طاقت غالب آ سکتی ہے اور نہ اہل صلیب کی کوئی تدبیر، ہاں اگر تو ہی یہ چاہتا ہے کہ ان کو اپنے مقدس گھر کو خراب کرنے دے تو پھر ہم کون؟ جو تیرا جی چاہے سو کر۔"

مؤرخین نے عبدالمطلب کے ان اشعار کو بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنے خاص انداز خطابت کے ساتھ فی البدیہ درگاہ الٰہی میں پیش کیے اور جن کا ترجمہ ہم ابھی نقل کر چکے ہیں:

لا هم ان العبد یمنع رحاله فامنع رحالک

لا یغلبن صلیبهم و محالهم غدوا محالک

ان کنت تارکهم و قبلتنا فامر ما بدالک [1]

اس کے بعد عبدالمطلب اور تمام قریش مکہ کو خالی کر کے قریب کے پہاڑوں پر چلے گئے اور گھاٹیوں میں پناہ گزیں ہو کر حالات کا انتظار کرنے لگے۔

اگلے دن صبح کو ابرہہ نے اپنا لشکر مکہ کی جانب بڑھایا اگلی قطاروں میں ہاتھی تھے اور ان کے پیچھے لشکر جرار، ابھی یہ لشکر مکہ تک نہیں پہنچا تھا کہ راہ میں ہی اچانک پرندوں کے غول کے غول نمودار ہوئے اور لشکر کے سر پر فضا میں چھا گئے ان کی چونچ اور ان کے پنجوں میں سنگریزے تھے پرندوں نے ان سنگریزوں کو لشکر پر پھینکنا شروع کیا جس شخص کے سنگریزے لگتے تھے بدن پھوڑ کر باہر نکل آتے تھے اور فوراً ہی اعضاء گلنے سڑنے لگتے تھے نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑی دیر میں سارا لشکر زیروزبر ہو کر رہ گیا۔

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲

Marfat.com

محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ کچھ لوگ اسی حال میں لشکر سے فرار ہو کر یمن اور حبشہ پہنچے اور انہوں نے ابرہہ اور اس کے لشکر کی تباہی کا حال سنایا۔

اور مشہور محدث ابن ابی حاتم بروایت عبید بن عمیر نقل کرتے ہیں کہ جب ابرہہ کا لشکر مکہ کی جانب بڑھا تو تیز ہوا چلی اور سمندر کی جانب سے پرندوں کے غول اڑتے ہوئے لشکر پر چھا گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں پرندوں کا زبردست لشکر پرے کے پرے باندھے ہوئے ہے ان کے منہ اور ان کے دونوں پنجوں میں سنگریزے تھے انہوں نے اول تو آواز کی اور پھر لشکر پر سنگریزے مارنے لگے۔ ساتھ ہی تند و تیز ہوا چلنے لگی جس نے اس سنگ بازی کو لشکر کے لیے مصیبت عظمیٰ بنا دیا۔ چنانچہ جس شخص پر یہ سنگریزے گرے بدن پھوڑ کر باہر نکل آئے اور بدن گلنے اور سڑنے لگا اور اس طرح ان سنگ ریزوں نے سارے لشکر کو چھلنی کر ڈالا۔ [1]

محمد بن اسحاق نے بروایت عکرمہ رحمہ اللہ نقل کیا ہے کہ اسی سال عرب میں مرض چیچک کا ظہور ہوا۔

قرآن اور اصحاب فیل:

قرآن عزیز نے اس واقعہ کا سورہ الفیل میں اپنے معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ اس طرح ذکر کیا ہے گویا ذات اقدس ﷺ پر خدائے تعالیٰ کا بہت بڑا احسان اور اس کے اعزاز و اکرام کا عظیم الشان "نشان" ہے۔

﴿ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝ ﴾ (الفیل: ۱۔۵)

"(اے محمد ﷺ) کیا تو نے نہیں دیکھا تجھ کو معلوم نہیں کہ تیرے پروردگار نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا ان کے فریب کو ناکارہ نہیں بنا دیا اور بھیج دیے ان پر پرندوں کے جھنڈ وہ پھینک رہے تھے ان پر سنگریزے پس کر دیا ان کو کھائے بھوسہ کی طرح۔"

اصحاب الفیل کا یہ عجیب و غریب واقعہ ماہ محرم میں ولادت باسعادت محمد ﷺ سے چالیس یا پچاس روز قبل پیش آیا اہل عرب

---

[1] کہتے ہیں کہ ابرہہ نے فوج کو حکم دیا کہ وہ مکہ کی جانب بڑھے جب وہ مکہ کے قریب پہنچی ہے تو ہاتھیوں کی قطار میں سے سب سے پہلے اس ہاتھی نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا جس پر ابرہہ سوار تھا۔ فیلبان اگرچہ اس کے آنکس پر آنکس لگا رہا اور زبانی ڈپٹ رہا تھا مگر وہ کسی طرح آگے بڑھنے کا نام نہیں لیتا تھا لیکن جب اس کو یمن کی جانب چلاتے تھے تو وہ تیزی کے ساتھ چلنے لگتا تھا اس حالت میں اچانک پرندوں کے غول نے آ گھیرا۔

گویا قدرت کی جانب سے ابرہہ کے لیے یہ آخری تنبیہ تھی کہ وہ اب بھی سمجھ جائے کہ اس کا یہ ارادہ باطل اور ناپاک ہے اور یہ جرأت دراصل خدا کی طاقت کو چیلنج ہے اس لیے اس کو اس سے باز آ جانا چاہیے لیکن اس بدبخت نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور اپنے کردار کی پاداش کو پہنچ کر رہا۔

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ جب پرندوں کی سنگساری سے ابرہہ کا لشکر برباد ہو گیا تو اس میں سے بعض آدمی جو بدحالی کے ساتھ فرار ہو کر یمن پہنچے تھے ان میں سے خود ابرہہ بھی اس حالت میں پہنچا کہ اس کے تمام اعضاء گل سڑ کر گر چکے تھے اور وہ صرف ایک مضغہ گوشت نظر آتا تھا۔

یعنی قدرت نے جس طرح فرعون کو غرق کر دینے کے بعد اس کی نعش کو اس لیے کنارہ پر پھینک دیا تھا کہ وہ مصر کے قبطیوں اور بنی اسرائیل دونوں کے لیے سامان عبرت و بصیرت بنے اسی طرح یمن اور حبش کے باشندوں کی عبرت کے لیے ابرہہ کو اس حالت میں یمن پہنچایا کہ وہ یہ غور کریں کہ جس شخص نے اپنی مادی قوت کے گھمنڈ پر خدا کی طاقت کو چیلنج کیا تھا آج قدرت کے زبردست ہاتھ نے اس کا یہ حال کر دیا۔ ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾

Marfat.com

میں یہ واقعہ اس درجہ اہمیت وشہرت رکھتا تھا کہ انہوں نے اس سال کا نام "عام الفیل" (ہاتھیوں والا سال) رکھ دیا اور اس کے بعد تاریخی واقعات کو اسی سنہ کے حساب سے شمار کرنے لگے جو عیسوی سنہ کے حساب سے ۵۷۱ء اور رومی سنہ کے حساب سے ۸۸۶ سکندری کے مطابق ہوتا ہے۔

روایات عرب اور عرب مؤرخین میں یہ واقعہ اس درجہ مشہور و معروف تھا کہ جب نبی اکرم ﷺ مکہ کی زندگی مبارک میں سورۃ الفیل کا نزول ہوا تو مشرکین، یہود اور نصاریٰ کی اس عداوت کے باوجود جو آپ ﷺ کی ذات مبارک سے ان کو تھی کسی سمت سے بھی اس سورۃ میں بیان کردہ واقعہ کے خلاف کوئی صدا بلند نہیں ہوئی کہ یہ واقعہ غلط ہے یا اس کی اصل حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ دوسری ہے۔

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ چونکہ یہ واقعہ صرف ذات اقدس ﷺ ہی سے نہیں بلکہ تمام عرب خصوصاً قریش کی عظمت وعزت بڑھاتا تھا اس لیے کسی نے اس کے خلاف آواز بلند نہیں کی یہ بات اس لیے غلط ہے کہ جس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اس وقت عرب میں مذہبی فرقہ بندی کے اعتبار سے عرب کے مختلف حصوں میں عموماً اور نجران کے مشہور شہر میں خصوصاً عیسائیت مشرکین مکہ اور محمد ﷺ دونوں کی حریف ورقیب تھی اس لیے وہ عربی نژاد ہونے کو قطع نظر کر سکتے تھے مگر عیسائیت کی اس توہین کو جو ان کے زعم میں یا قریش مکہ کی عزت کو بڑھاتی تھی اور یا محمد ﷺ کی عظمت کو ایک لحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے بلکہ وہ اور یہود دونوں ایسے واقعہ کو سننا بھی گوارا نہ کرتے جو ان کے قبلہ صخرہ (بیت المقدس) کے علاوہ ایسے مقام "کعبہ" کی صد ہزار عظمت کا اظہار کرتا ہے جس کے قبلہ بننے کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور علی الاعلان اس کو جھٹلاتے تھے۔

بہر حال تاریخ کی صاف اور بے لوث شہادت یہ ثابت کر رہی ہے کہ ایک عیسائی معاصر نے بھی اس واقعہ کے خلاف لب کشائی کی جرات نہیں کی اور ہجرت کے بعد جب آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں نجران کا وفد (ڈیپوٹیشن) آیا ہے تو وہ اپنے خیال میں اسلام کے خلاف جس قسم کی نکتہ چینیاں کر سکتا تھا اور محمد ﷺ اور قرآن کی تکذیب میں جو دلائل دے سکتا تھا وہ سب اس نے پیش کے لیکن اس واقعہ کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا اور اگر ایسا ہوا ہوتا تو جس تاریخ نے ساڑھے تیرہ سو برس سے ان تمام اعتراضات کو اپنی آغوش میں محفوظ رکھا ہے جو معاندین کی جانب سے نبی اکرم ﷺ، قرآن اور اسلام پر کیے گئے ہیں وہ کیسے اس اعتراض کو فراموش کر سکتی تھی۔

لہٰذا تعصب سے پاک حقیقت میں نگاہ کو یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ یہ واقعہ اپنی تفصیلات کے ساتھ جس طرح عرب روایات ومؤرخین عرب کے یہاں محفوظ اور مشہور ہے وہ قطعاً صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی آخر کون سی وجہ ہے جب کہ سورۃ الفیل کے نزول کے وقت اس واقعہ کو گزرے صرف بیالیس تینتالیس سال ہی ہوئے اور اس لیے اس واقعہ کو آنکھوں سے دیکھنے والے ہزاروں اور اپنے یقین اور وطنی روایات سے سننے والے لاکھوں کی تعداد میں تمام اقطاع عرب میں موجود تھے۔

لیکن صدیوں کے بعد آج یورپین مؤرخین یہ کہتے ہیں "واقعہ صرف اتنا ہے کہ ابرہہ رومیوں کی مدد کو فوج لے کر نکلا راہ میں اس کی فوج چیچک کی وبا سے برباد ہوگئی" اور لطف یہ ہے کہ ان کے پاس اس دعویٰ کے لیے نہ کوئی تاریخی دلیل ہے اور نہ معاصرانہ شہادت بلکہ صرف عرب مؤرخین (محمد بن اسحاق وغیرہ) کے اس بیان سے کہ "اسی سال عرب میں چیچک کا ظہور ہوا" یہ فیصلہ کر لیتے ہیں۔

Marfat.com

معلوم نہیں کہ تاریخ اور فلسفہ تاریخ کا یہ کون سا نظریہ ہے کہ ایک روایت کے تمام واقعات کا تو اپنے مخالف سمجھ کر "بلا دلیل انکار کر دیا جائے اور اس واقعہ کے ایک ضمنی جملہ کے مفہوم کو بدل کر اور بغیر کسی سند کے اپنی جانب سے اس میں اضافہ کر کے ایک نیا مطلب پیدا کر لیا جائے۔"

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بقول ابن اسحاق اسی سال عرب میں چیچک کا ظہور ہوا اور غیر اسلامی روایت کے مطابق ہم یہ بھی قبول کیے لیتے ہیں کہ اسی سال یمن اور حبش میں بھی اس مرض نے سر نکالا تاہم اس سے یہ کیسے لازم آ جاتا ہے کہ:

① ابرہہ "کعبہ" کے ڈھانے کے لیے لشکر لے کر نہیں نکلا تھا جیسا کہ مستند تواریخ سے ثابت ہوتا ہے بلکہ رومیوں کی مدد کو نکلا تھا جیسا کہ یورپین مؤرخین بے دلیل محض انکل سے کہہ رہے ہیں۔

② اور یہ کہ ابرہہ کا لشکر رب کعبہ کے حکم سے چڑیوں کی سنگ باری سے تباہ نہیں ہوا جیسا کہ معاصر شہادتوں اور تواتر کے درجہ کی روایات ملکی تاریخی سے ثابت ہے بلکہ چیچک کی وبا سے برباد ہو گیا جس کے لیے تاریخ میں کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

یہ بات تو ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ ابرہہ "القلیس" کے انتقام میں کعبہ کو ڈھانے نکلا تھا پس اگر سمندر کی جانب سے آنے والی چڑیوں نے سنگریزوں کے ذریعہ سے بحکم رب کعبہ چیچک کے ایسے سخت جراثیم پیدا کر دیئے کہ انہوں نے حملہ آوروں کو سانس لینے کی بھی مہلت نہیں دی اور سنگریزوں کے لگنے کے فوراً بعد ہی بدن گلنے اور سڑنے لگا اور سارا لشکر زیروزبر ہو کر رہ گیا تو اس کو کیا کہنا چاہیے؟ اور یہ اگر قادر مطلق کی جانب سے ابرہہ اور اس کے لشکر پر عذاب نہیں تھا تو اور کیا تھا: ﴿فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾

حقیقت حال یہ ہے کہ یہ فطرت پرست "یورپین مؤرخین" یا تو اس واقعہ کو اس وجہ سے مسخ کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے کعبۃ اللہ کی عظمت اور وقت کی خود ساختہ عیسائیت کی اہانت کا پہلو بہت صاف اور نمایاں طور پر سامنے آتا ہے اور قدرت کے ہاتھوں حق و باطل کے معرکہ میں حق کے غلبہ اور باطل کی مغلوبیت کا اعلان ہو جاتا ہے یا محض فطرت پرستی اور مادہ پرستی کے جذبہ میں انہوں نے خدائے تعالیٰ کی غیر محدود طاقت کے مشاہدہ سے آنکھ بند کر لی ہے اور وہ ایسے واقعات کو ناممکن خیال کر لیتے ہیں حالانکہ اسی آسمان کے نیچے تاریخ اقوام وامم نے بارہا ایسے مشاہدے کیے ہیں اور تاریخ نے ان کو اپنی آغوش میں محفوظ رکھا ہے کہ جب بھی کوئی قوم ظلم و تکبر، طغیان و عصیان اور فساد و سرکشی میں حد سے گزر گئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اجرام ارضی و سماوی میں سے کبھی ہوا کو، کبھی برق کو کبھی بادو باراں کو کبھی ہولناک چیخ کو اور کبھی حیوانات کی یورش کو اس طرح ان پر مسلط کر دیا ہے کہ آنکھوں دیکھتے وہ اور ان کا زبردست تمدن سب کا سب خاک میں مل گیا، عاد و ثمود، نمرود، فرعون، اصحاب ایکہ، اصحاب اخدود جیسی قومیں اپنے اپنے زمانہ میں زبردست تمدن و حکومت کی مالک تھیں مگر جب انہوں نے خدا کی زمین میں فساد مچا دیا۔ زیردستوں پر ظالمانہ قابض ہو کر ان کو کچل ڈالا۔ شرک و کفر میں بے باک ہو کر خدا کے پیغمبروں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کیا اور انانیت میں آ کر بعض نے خدائی کا دعویٰ تک کر دیا تو ان ہی عناصر اور مخلوق ارضی و سماوی کے ذریعہ جن کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس طرح ہلاک و برباد کر دیا کہ تاریخ کے اوراق کے سوا دنیا میں ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

مگر انسان کی اس غفلت کو کیا کیجئے کہ وہ کوتاہی عقل سے گزشتہ واقعات کا انکار کرنے پر بہت جلد آمادہ ہو جاتا اور نئے کرشمہ غیبی کا طالب ہوتا ہے بلکہ بنی اسرائیل کی طرح بیجا جسارت کے ساتھ یہ کہہ اٹھتا ہے ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾

Marfat.com

اور جب وہ بھی اگلوں کی طرح عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاتا ہے تو حسرت وافسوس کرتا ہوا دوسروں کے لیے سامان عبرت وبصیرت بن جاتا ہے اور اس وقت کا اعتراف واقرار اور اس وقت کی حسرت وندامت اس کے کسی کام نہیں آتی۔

﴿فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِیْنَ۝۸۴ فَلَمْ یَكُ یَنْفَعُهُمْ اِیْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِهٖ ۚ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ۝۸۵﴾

(المؤمن: ۸۴-۸۵)

"پس جب دیکھا انہوں نے عذاب ہمارا تو انہوں نے کہا ہم ایمان لائے ایک خدا پر اور جس چیز کو خدا کا شریک ٹھہراتے تھے اس سے منکر ہوئے پس ان کے اس ایمان نے ان کو کوئی نفع نہیں دیا جب انہوں نے ہمارا عذاب آنکھوں سے دیکھ لیا اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہے جو ہمیشہ سے اس کے بندوں کے ساتھ جاری ہے اور کافروں نے اس موقعہ پر خسارہ ہی اٹھایا۔"

یہی حال آج یورپین مادہ پرستوں اور ان کے کور باطن مقلدوں کا ہے کاش کہ وہ حقیقت حال کو سمجھنے کی کوشش کریں اور حقائق سے انکار اور ان کا استہزاء نہ کریں۔ انہیں تاریخ کے دہرائے ہوئے اس سبق کو کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ لارڈ کچنر نے اسی زمانہ میں مصر پر جارحانہ مظالم کرتے ہوئے بڑے تکبر کے ساتھ سر بلند کرتے ہوئے یہ کہا تھا "آج میں مصر کا فرعون ہوں" پھر تم نے دیکھا کہ خدائے برتر کے قانون "پاداش عمل" نے اس کو وہی جواب دیا جو فرعون کو ملا تھا ﴿فَغَشِیَهُمْ مِّنَ الْیَمِّ مَا غَشِیَهُمْ﴾ اور اس کی غرقِ دریا نعش کو یورپ کی سائنس جدید کا کوئی کرشمہ بھی قعر دریا سے اوپر نہ لا سکا۔

یہ واقعہ صدیوں کا نہیں ہے، ہماری اور تمہاری زندگی کا واقعہ ہے پھر کیا منکرین خدا اور منکرین قدرت خدا نے اس واقعہ سے کوئی سبق حاصل کیا؟ نہیں بلکہ انہوں نے یہ کہہ کر ضمیر کی آواز کو دبا لیا کہ یہ تو بخت واتفاق کے واقعات میں سے ایک واقعہ ہے جو ہو گزرا، آخر انہوں نے ایسا کیوں سمجھ لیا قرآن کہتا ہے صرف اس لیے کہ:

﴿لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ۝۴۶﴾ (سورۃ الحج: ۴۶)

یعنی یہ بات نہیں ہے کہ وہ کور چشم ہیں وہ خوب دیکھتے ہیں لیکن ان کے سینوں کے اندر ان کے دل اندھے ہو گئے ہیں" اس لیے کچھ دیکھتے ہیں اس سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔ لہٰذا ایسی جماعت کے لیے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے: ﴿فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ۝﴾

سورہ فیل اور بعض دیگر تفسیریں:

سطور بالا میں سورۂ فیل کی تفسیر سلف صالحین رحمہم اللہ اور جمہور کے مسلک کے مطابق کی گئی ہے اس تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حرم کعبہ کی صیانت وحفاظت کے لیے ابرہۃ الاشرم اور اس کے عظیم الشان لشکر کو اپنے قانون "تعذیب امم" کے پیش نظر معجزانہ طور پر چھوٹی چھوٹی چڑیوں کے ذریعہ کنکریوں کی مار سے ہلاک وبرباد کر دیا کہ قریش بہ اسباب ظاہر اس لشکر جرار کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور رب کعبہ کو بہر حال کعبہ کی حفاظت مقصود تھی۔

Marfat.com

یہ تفسیر لغت عرب کی مطابقت، سلف صالحین سے منقول، روایات اور تاریخی تواتر کے پیش نظر بغیر کسی رد و انکار کے تیرہ سو سال سے قابل قبول رہی ہے۔

لیکن اس تفسیر کے مطابق چونکہ اس واقعہ کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اعجاز قدرت اور معجزانہ فعل کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے اس لیے گزشتہ پچاس ساٹھ سال کے اندر یورپ کے الحاد سے مرعوب ہو کر بعض حضرات نے سلف کے خلاف یہ سعی فرمائی ہے کہ خواہ حقیقت حال نظر انداز ہو جائے مگر کسی طرح اس واقعہ کا عجوبہ پن دور کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے تفسیر بالرائے سے کام لیا ہے۔ تفسیر بالرائے کے یہی معنی ہیں کہ اس پر نظر کیے بغیر کہ اس بارہ میں قرآن خود کیا کہتا ہے اور ایک خالی الذہن انسان اس سے کیا مطلب اخذ کرتا ہے اپنی جانب سے پہلے ایک خاص خیال قائم کر لیا جائے اور اس کے بعد آیات قرآنی کی تفسیر اپنے اس اختراعی خیال پر کر دی جائے۔

تفسیر بالرائے کے اصول پر سورۃ الفیل کی پہلی تفسیر سرسید کی جانب سے تہذیب الاخلاق میں کی گئی۔ سید صاحب چونکہ بذات خود عربیت (علوم لغت عرب) اور ان علوم سے جو قرآن عزیز کے حقائق سمجھنے کے لیے ازبس ضروری ہیں بیگانہ تھے اس لیے ان کی یہ تفسیر سرتا سر اغلاط اور لغو تاویلات پر مبنی ہے اور تفسیر احمدی کے ان دوسرے مقامات کی طرح جس میں انہوں نے خود قرآن عزیز کی دوسری آیات اور نبی معصوم ﷺ سے منقول صحیح روایت کے خلاف تفسیر بالرائے بلکہ تحریف معنوی پر غلط اقدام کیا ہے، اس مقام پر بھی قرآن کی زبان سے وہ کہلانا چاہتے ہیں جس کو قرآن کہنے کے لیے تیار نہیں، اس کے منہ میں وہ بات رکھ دینی چاہتے ہیں جسے خود اس کی زبان قبول نہیں کرتی۔

سرسید کی تفسیر سورۃ الفیل کی بنیاد اس امر پر قائم ہے کہ آیت ﴿وَ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝﴾ میں "طیر" سے "پرند" نہیں بلکہ "بدفالی" مراد ہے اور کنایۃً یہ لفظ "بلا و مصیبت" کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

مگر سید صاحب اس بات سے قطعاً ناآشنا ہیں کہ عربی لغت میں "طیر" کے معنی "بدفالی" کے ہرگز نہیں آتے اور وہ لفظ "طائر" ہے جس کے معنی بدفالی کے آتے ہیں اور جس سے کنایۃً مصیبت و بلاء کا مفہوم مراد ہو سکتا ہے۔ نیز وہ عربیت کے اس قاعدہ سے بھی قطعاً ناواقف معلوم ہوتے ہیں کہ اگر بفرض محال "طیر" کے معنی "بدفالی" کے تسلیم بھی کر لیے جائیں تب بھی اس مقام پر یہ معنی اس لیے نہیں بن سکتے کہ لغت عرب میں اس معنی کے ہوتے ہوئے اس کی جانب "ارسال" کی نسبت قطعاً غلط اور باطل ہے بلکہ اس کے لیے ﴿اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ﴾ کی جگہ "انزل علیہم" اور "القی علیہم" بولا جاتا ہے۔

حقائق قرآن سے بے بہرہ مگر یورپ کے الحاد و زندقہ سے مرعوب یہ حضرات قرآن کی تفسیر پر جرأت بے جا تو کرتے ہیں مگر اس بات کو یکسر فراموش فرما دیتے ہیں کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے: ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا﴾ اور تمام زبانوں کی طرح عربی الفاظ و تراکیب کے لیے بھی کچھ قواعد اور شروط ہیں۔ پس اگر کوئی شخص ان کے خلاف اس کے الفاظ اور اس کے جملوں کے معنی اور مفہوم بیان کرتا ہے تو درحقیقت تحریف معنوی کا مجرم بنتا ہے۔ بہرحال سید صاحب کی تفسیر اس قسم کی اغلاط کا مجموعہ ہے اس لیے علمی مباحث میں جگہ پانے کے لائق نہیں ہے۔

سلف صالحین کے خلاف سورۃ الفیل کی دوسری تفسیر مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ مصنف نظام القرآن کی ہے، یہ تفسیر سلف

اور جمہور کی تفسیر سے قطع نظر کر کے صرف عربیت اور اشعار عرب کے پیش نظر کی گئی ہے اور یہ اگر چہ مولانائے مرحوم کی علمی دیانت، تقویٰ وطہارت اور درک علوم قرآنی کے پیش نظر ان حضرات کی تفاسیر کی فہرست میں شامل نہیں ہے جنھوں نے محض معجزات کے انکار کی بنا پر تفسیر بالرائے کی مجرمانہ جسارت کی ہے تاہم واقعہ کے عجوبہ پن کو دور کرنے کے لیے مولانائے مرحوم کی یہ سعی معنوی استقام کی حامل ہے اور اس لیے ہم مولانائے مرحوم کی خدمت قرآن کا احترام کرتے ہوئے ان کے بعض دوسرے تفسیری مقامات کی طرح اس مقام سے بھی اختلاف کرنے پر مجبور ہیں۔

مولانائے مرحوم کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ "ترمی" کا فاعل "طیر" نہیں ہے بلکہ "انت" ہے جو "الم تر" کا بھی فاعل ہے اور آیت ﴿وَ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ۝﴾ اس حقیقت کا اظہار کرتی ہے جو عام طور پر عربوں کا خیال تھا کہ جب کوئی جرار فوج کسی جانب کا رخ کرتی ہے تو مردار خوار جانوروں کا غول پرے باندھے ساتھ ہوا میں اُڑتا چلتا ہے۔ مثلاً ابونواس کہتا ہے "ہمارے ممدوح کی فوج کے ہمراہ پرندے ہیں کیونکہ ان کو اس کے فاتح ہونے کا یقین ہے" یا بصرہ میں جنگ جمل سے جو صورت حال پیش آئی اس کا حال اسی روز اہل حجاز کو اس لیے معلوم ہو گیا تھا کہ مردار خوار جانور انسانوں کے کٹے ہوئے اعضا پنجوں میں لیے اُڑتے پھرتے تھے۔

اس تفسیر کے پیش نظر سورۃ الفیل کی آیات کے معنی یہ ہوں گے:

"تو نے دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اس نے ان کی تدبیر کو بیکار نہیں کر دیا؟ اس نے ان پر پرندوں کے پرے کے پرے بھیجے تو ان ہاتھی والوں کو پتھروں سے مارتا تھا پھر خدا نے ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔"

اس تفسیر پر حسب ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

① اگر "ترمی" کا فاعل "انت" ہے "طیر" نہیں ہے تو ﴿بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ ۝﴾ میں ﴿سِجِّیْلٍ﴾ کا اضافہ بے ضرورت بلکہ بے معنی ہو جاتا ہے۔

② اس صورت میں ﴿وَ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ۝﴾ کی غرض وغایت یا اس کے فائدہ اور مقصد سے خود قرآن خاموش ہے اور اس طرح سورۃ کی آیات کا باہم ربط باقی نہیں رہتا بلکہ نظم وانسجام میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔

③ شعراء عرب کے کلام میں فوج کے ساتھ پرندوں کے غول کا چلنا صرف ایک شاعرانہ تخیل ہے اس لیے قرآن کے بیان کردہ حقائق کی تفسیر کو اس خیال سے وابستہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

④ واقعہ کے معاصر یا کچھ عرصہ بعد کے عرب شعراء جب کہ خود اپنے اشعار میں اقرار کرتے ہیں کہ "ترمی" کا فاعل "طیر" ہے نہ کہ "الم تر کی ضمیر انت" (قریش) تو اس سے عدول کیوں اور کس لیے۔

⑤ ﴿فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝﴾ میں "فا" ثمرہ اور نتیجہ ہے "ترمی" کا اور "جعل" کا فاعل "رب" ہے تو معلوم ہوا کہ قریش کی سنگ باری سے ہاتھیوں والی فوج جرار کا کھائے ہوئے بھس کی طرح ہو جانا تب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اعجاز قدرت کا عمل بھی ہو ورنہ بلحاظ اسباب عادیہ یہ صورت قطعاً غیر معقول ہے اور اگر اس میں اعجاز کا دخل ہے تو جس عجیب بات سے بچنے کے لیے سلف کے خلاف تفسیر کو اختیار کیا گیا تھا اسی کو تسلیم کرنا لازم آ جاتا ہے۔

Marfat.com

⑥ عرب کی جنگوں میں محض بدویانہ سنگ اندازی کے طریقہ جنگ کے لیے تاریخی سند مطلوب ہے ورنہ خاص اس موقعہ کے لیے طریقہ جنگ کی یہ تفسیر بے سند رہ جاتی ہے اور نا قابل قبول ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بلاغت کا تقاضا ہے کہ جب کسی لفظ کے ساتھ متعلقات کا اضافہ ہو تو ضروری ہے کہ اس کا کوئی فائدہ ہونا چاہیے یعنی اس اضافہ کو کسی مقصد کے لیے لایا گیا ہو ورنہ وہ کلام بلاغت سے گر جائے گا اور اس کا اعجاز بلاغت تک پہنچنا تو معلوم؟ کیونکہ ایسی صورت میں یہ اضافہ بے معنی اور مہمل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اشعار کے تنگ میدان میں بھی بے ضرورت اس کو جائز نہیں سمجھا جاتا۔

دوسرا مقدمہ یہ قابل توجہ ہے کہ "سجیل" لغت عرب میں کنکری کو کہتے ہیں یعنی اگر مٹی کو آگ میں پکایا جائے تو پکنے کے بعد اس میں پتھر کی سی سختی پیدا ہو جاتی ہے اسی مٹی کی چھوٹی چھوٹی ٹھیکریوں کا نام عربی میں سجیل اور فارسی میں "سنگ گل" ہے بلکہ بعض علماء لغت نے تو یہ تصریح کی ہے کہ سجیل فارسی مرکب لفظ "سنگ گل" کی ہی تعریب ہے یعنی "مٹی سے بنا ہوا پتھر" اور یہ ظاہر بات ہے کہ مکہ کے پہاڑوں پر چھوٹے بڑے پتھر تو بہر حال کافی ملیں گے لیکن وہاں سجیل (کنکریوں) کی افراط کے کوئی معنی نہیں۔

پس اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آیت ﴿تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ﴾ میں قریش کی بدویانہ سنگ باری مراد ہے تو اس صورت میں ﴿بِحِجَارَةٍ﴾ کہنا کافی تھا بلکہ "حجارہ" کو سجیل کے ساتھ مخصوص کرنا حقیقت واقعہ کے خلاف ہو جاتا اور ایک غلط بات کا اظہار لازم آ جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ جواب میں یہ کہا جائے کہ اس مقام پر سجیل سے پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے یعنی "سنگ ریزے" مراد ہیں تو یہ اس لیے صحیح نہ ہوگا کہ لغت عرب میں پتھر کے چھوٹے ٹکڑے کو "الحصی" کہتے ہیں اور اس کی جمع "حصاۃ" آتی ہے۔ چنانچہ متداول کتب لغت میں بھی بصراحت یہ فرق مذکور ہے "الحصی صغار الحجارۃ الواحدۃ حصاۃ"۔ سجیل الحجارۃ من الطین الیابس" حتیٰ کہ علماء لغت اس فرق کو یہاں تک نمایاں کرتے ہیں کہ جو ٹھیکریاں مٹی کے برتن سے ٹوٹ کر وجود میں آتی ہیں اگر چہ و سجیل کہلائی جا سکتی ہیں تاہم دقیق امتیاز کے وقت لغت عرب میں ایسی ٹھیکری کے لیے لفظ "خذف" ❶ مخصوص ہے اور ہم کو یہ حقیقت بھی کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ محققین علماء لغت کا یہ دعویٰ ہے کہ لغت عرب میں ایک لفظ بھی دوسرے لفظ کا مترادف نہیں ہے او جو لفظ بھی فصحاء و بلغاء عرب کے کلام میں استعمال ہوتا ہے وہ اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے اور جن کو ہم مرادف الفاظ سمجھتے ہیں ان باہم جو نازک اور دقیق فرق ہے ان کی خصوصیات ضرور ملحوظ رہتی ہیں۔

غرض مصنف نظام القرآن کی تفسیر سورۃ الفیل کے مطابق اس مقام پر "سجیل" کا ذکر نہ صرف بے ضرورت بلکہ خلاف وا اور بے محل ہو جاتا ہے اور دوسرے اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ اگر "ترمی" کا فاعل "طیر" مان لیا جائے جیسا کہ جمہور نے اختیار کیا بغیر کسی خارجی مدد کے آیات سورۃ اپنا مطلب صاف صاف ادا کر دیتی ہیں اور سیاق و سباق کی مطابقت اور کلام کا انسجام اور اس ترتیب بحالہ باقی رہتی ہے۔

---

❶ مشہور اور متداول کتب لغت کا مطالعہ کیجئے۔

Marfat.com

لیکن تفسیر زیر بحث کے مطابق اگر "ترمی" کا فاعل "طیر" نہیں ہے بلکہ "انت" ہے تو اس صورت میں "ارسال طیر" کی غرض و غایت سے قرآن (سورۃ الفیل) قطعاً خاموش نظر آتا بلکہ ربط کلام میں خلل واقعہ ہو جاتا ہے اس لیے کہ آیت ﴿ اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَهُمْ ﴾ اور ﴿ تَرْمِیْهِمْ ﴾ کے درمیان ﴿ وَ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ ﴾ اپنے مقصد کے لیے قطعاً واضح نہیں ہے اور نہ سیاق و سباق میں اس کی جانب کوئی اشارہ موجود ہے بلکہ یہ کلام اجنبی ہے جو اپنی تصریح کے لیے آپ ہی ذمہ دار ہے اور بغیر تصریح کے باعث خلل کلام ہے اور اگر کلام کی اس اجنبیت کو باہر کی مدد سے حل اور آیت سے پیدا شدہ قدرتی سوال پر اس کی خاموشی کو خارجی تمہید سے دور کیا جاتا ہے تو بلحاظ بلاغت کلام ایسے ابہام و اجمال سے کہ جو خصوصی واقعہ کے سلسلہ میں اس طرح کلام میں موجود ہو کہ سیاق و سباق نہ اس کی وضاحت کرتے ہوں اور نہ اس پر دلالت کرتے ہوں" کلام میں نقص لازم آتا اور بے محل ابہام کا الزام وارد ہوتا ہے۔

تعجب ہے کہ "ارسال طیر" کی غرض و غایت یا حکمت کا اپنی جانب سے اختراع تو درست سمجھا جائے اور بغیر کسی سند کے یہ کہہ دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پرندوں کو صحن حرم میں افتادہ مردہ نعشوں سے پاک کرنے کے لیے بھیجا تھا اور بقاء ترتیب مضمون آیات اور حفاظت نقص کلام کی خوبیوں کے باوجود خود سورۃ میں ہی جو غایت اور حکمت بیان کی گئی ہے اور جو خارج سے مدد کی قطعاً محتاج نہیں ہے یعنی ﴿ تَرْمِیْهِمْ ﴾ تو اس کو رد کر کے غیر معقول قرار دیا جائے اور خصوصاً ایسی حالت میں کہ مردہ نعشوں سے صحن حرم کی پاکی کے متعلق صحیح تاریخی روایت میں یہ موجود ہے:

و ذکر النقاش فی تفسیرہ ان السیل احتمل جثتھم فالقاہ فی البحر. [1]

"اور نقاش نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ سیلاب آیا اور اس نے مردہ نعشوں کو بہا کر سمندر میں جا ڈالا۔"

اور تیسرے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ بالفرض اگر آیت ﴿ وَ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ۝ ﴾ کی تفسیر صاحب نظام القرآن کے اس استشہاد (کو صحیح تسلیم کر لیا جائے جو بطور تمہید انہوں نے اشعار عرب سے کیا ہے اور آیت کی خاموشی کو ختم کرنے کے لیے اصول بلاغت کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ابونواس یا نابغہ جیسے شعراء عرب کے کلام میں اگر یہ تخیل پایا بھی جاتا ہے کہ "جب کوئی فوج جنگ کے لیے سفر کرتی تھی تو مردار خوار جانور جھنڈ کے جھنڈ اس کے ساتھ چلتے تھے تو اس تخیل سے یہ کیسے لازم آیا کہ شعراء کا یہ خیال مبنی بر حقیقت ہے اور محض شاعرانہ تخیل نہیں ہے کہ قرآن کی تفسیر کے لیے استشہاد کا کام دے سکے؟ بلکہ جب ہم عرب کی لڑائیوں کے ان تفصیلی حالات کا مطالعہ کرتے ہیں جو اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان ہوئیں اور جن کے جزئی جزئی حالات اور معمولی معمولی واقعات تک کی تفصیلات کتب سیر و تاریخ میں محفوظ ہیں تو ان میں سے کسی ایک جنگ میں بھی اس حقیقت کا ذکر موجود نہیں ہے کہ مردار خوار پرندوں کے یہ جھنڈ کے جھنڈ مسلم یا مشرک لشکر کی ابتداء مسافت ہی سے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ چنانچہ غزوۂ بدر، اُحد، حنین، احزاب کے حالات اس قسم کے واقعہ سے قطعاً خاموش ہیں بلکہ اس کے خلاف غزوۂ بدر میں اس کا ثبوت تو موجود ہے کہ زعماء قریش کی نعشیں اٹھا کر ایک گڑھے میں ڈال دی گئیں اور یہ ذکر نہیں پایا جاتا کہ مسلمانوں کے یا مشرکین مکہ کے لشکر کے ساتھ مردار خوار پرند شروع ہی سے ہم سفر تھے اور انہوں نے ان مردہ نعشوں کو فوراً ہی ٹھکانے لگا دیا اسی طرح عرب کے علاوہ دنیا کی اور جنگوں میں بھی کہیں اس واقعہ کا ثبوت نہیں ملتا پس اس سے صاف معلوم

[1] البدایہ والنہایہ

Marfat.com

ہوتا ہے کہ شعراءِ عرب کا یہ کلام شاعرانہ مبالغہ آمیز تخیل سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا دراصل وہ اپنے ممدوح کو بہادری پر مبالغہ آمیزیاں کرتے ہوئے یہ مبالغہ بھی کرتے ہیں کہ انسان تو انسان مردار خوار جانور تک اس کی بہادری کا یقین رکھتے اور اس لیے اس کے لشکر کے ہمراہ چلتے ہیں حالانکہ حقیقت حال صرف اتنی ہوتی تھی کہ جب اس ممدوح نے دشمن کو شکست دے دی تو شکست خوردہ لشکر کی نعشوں پر گدھ چیل وغیرہ مردار خوار جانور نوچنے کھانے کو ٹوٹ گئے، اس عام بات کو شعراء نے شاعرانہ دقیقہ سنجی کے ساتھ ادا کر دیا ہے، کیا ابونواس کا یہی شعر جو مفسر صاحب نے بطور استشہاد پیش کیا ہے خود ہی یہ ظاہر نہیں کرتا کہ یہ محض شاعرانہ نکتہ سنجی ہے اس لیے کہ وہ کہتا ہے کہ میرے ممدوح کے لشکر کے ہمراہ پرند ہیں کیونکہ ان کو اس کے فاتح ہونے کا یقین ہے تو کیا یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ ان مردار خوار پرندوں کی فراست وکیاست انسانی فراست سے بھی بڑھی ہوئی ہوتی تھی کہ یہ معرکہ جنگ پیش آنے سے پہلے ہی یہ بھی سمجھ جاتے تھے کہ فلاں کو فتح اور فلاں کو شکست ہوگی اور اس لیے فاتح کی فوج کے ہمراہ چلتے تھے نہ کہ مفتوح کی فوج کے ساتھ۔

اور اگر اپنی خیالی تفسیر کی خاطر یہ سب عجیب باتیں تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے تو نہ معلوم سلف اور جمہور کی تفسیر ہی کو مان لینے میں کیوں اس قدر جھجک ہے۔

رہا بصرہ میں جنگ جمل کا ہونا اور حجاز میں پرندوں کے ذریعہ اس طرح اصل کیفیت کا حال معلوم ہو جانا کہ وہ انسانوں کے اعضاء کو پنجوں میں لیے اڑتے تھے تو اس سے یہ کیسے لازم آ گیا کہ یہ مردار خوار پرندے طرفین کے لشکر یا جو فاتح بننے والا تھا اس کے لشکر کے ساتھ ساتھ چل کر میدان معرکہ تک پہنچ کر درختوں اور جھاڑیوں میں خیمہ زن ہو گئے تھے کیا بصرہ میں نسر (گدھ) اور زاغ و زغن نہیں تھے اور کیا جو کچھ آج بھی ہوتا ہے وہی وہاں بھی نہیں ہوا ہوگا کہ جنگ کے نتیجہ میں جب میدان میں نعشیں پڑ گئیں تو فوراً ہی چہار جانب کی بعید مسافت سے مردار خوار پرند آ پہنچے اور کٹے ہوئے اعضاء کو پنجوں میں لے اڑے اور فضاء میں ان کے ذریعہ اہل حجاز کو بھی واقعہ کی اصل کیفیت کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ گدھ کے لیے تو ماہرین علم الحیوانات کا بیان یہ ہے کہ قدرت نے اس کی قوت شامہ کو اس قدر حساس بنایا ہے کہ وہ مردہ نعشوں کی پھیلی ہوئی بو یا فضاء میں پھیلی ہوئی گوشت کی بو کو بیسیوں میل کی مسافت سے محسوس کر لیتا اور سرعت رفتار کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا ہے۔

الحاصل تفسیر زیر بحث میں آیت ﴿ وَ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ۝ ﴾ کی تفسیر کے لیے خارج سے ان اشعار کی مدد لینا جو صرف شاعرانہ تخیل کی پیداوار ہیں اور صحیح تاریخی حقائق سے اعراض کرنا بلکہ خود قرآن کے سیاق وسباق سے ہی بغیر خارجی مدد کے واقعہ کی جو مکمل تصویر بنتی ہے اس سے گریز کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

اس تفسیر پر چوتھے اعتراض کی تفصیل یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ "ترمی" کا فاعل "قریش" ہیں تو آیت ﴿ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝ ﴾ میں الفاء للجزاء داخل ہو کر یہ ثابت کر رہی ہے کہ اس کا مدخول (یعنی جس جملہ پر وہ داخل ہے) آیت ﴿ تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ ۝ ﴾ کا ثمرہ اور نتیجہ ہے جس کا مطلب زیر بحث تفسیر کے مطابق یہ ہوا کہ جب قریش نے سنگ باری کے ذریعہ ان پر حملہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا یعنی سب وہیں کھیت رہے اور ہاتھیوں اور انسانوں سب کا کچومر نکل گیا۔

تو سوال یہ ہے کہ قریش کی بددیانہ سنگ باری سے کسی فوج گراں کا کہ جس میں دیو پیکر ہاتھیوں کی قطاریں بھی ہوں اس

Marfat.com

طرح بھرکس نکل جاتا کہ وہ اگر فرار ہو کر جان بچانا بھی چاہیں تو نہ بچ سکیں۔ اسباب عادیہ کے اعتبار سے کیا معقول سمجھا جا سکتا ہے اور کیا عقل یہ نہیں کہتی کہ جب ابرہہ نے یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ اور اس کی فوج گراں قریش کی سنگ باری کی تاب نہیں لا سکتے تو اس نے کیوں وہاں رہ کر ساری فوج کا بھرکس نکلوا لیا اور کیوں وہ ان ہی وادیوں میں سے ہو کر فرار نہیں ہو گیا جن وادیوں سے ہو کر آیا تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قریش کے پاس سنگ باری کے لیے مشینیں نہیں تھی کہ وہ ابرہہ کے لشکر پر ہزاروں من کی مہیب چٹانیں اس عجلت کے ساتھ لڑھکا دیتے کہ تمام لشکری اور ہاتھی گھوڑے اور اونٹ سب کے سب وہیں دب کر رہ جاتے اور کھائے ہوئے بھس کی طرح سب کا کچومر نکل جاتا۔

اور قریش پر خدائے تعالیٰ کا احسان تو اس صورت میں بھی پورا ہو جاتا تھا کہ اس نے ایسے عظیم الشان لشکر کو بدویانہ سنگ باری سے ہزیمت خوردہ بنا کر فرار پر آمادہ کر دیا۔

البتہ یہ بات اس وقت صحیح ہو سکتی اور باور کی جا سکتی ہے کہ اس کو اسباب عادیہ کے عام قانون سے مستثنیٰ قرار دے کر قدرت الٰہی کے معجزانہ عمل کے ساتھ وابستہ سمجھا جائے اور یہ کہا جائے کہ عام طریق جنگ کے خلاف یہ ایک معجزہ تھا مگر اس صورت میں تفسیر زیر بحث کا مقصد فوت ہوا جاتا ہے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ قرآن عزیز کی اس سورۃ کا اسلوب بیان از اول تا آخر یہ کہہ رہا ہے کہ یہاں جو صورت حال پیش آئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے خاص نوامیس قدرت کے زیر اثر ہوئی ہے اور اسی لیے جن لوگوں نے اس واقعہ کو آنکھوں سے دیکھا یا مشاہدہ کرنے والوں کی زبانی سنا ہے وہ اس سے آگاہ ہیں کہ یہ معاملہ کس درجہ عجیب اور کرشمہ قدرت کے زیر اثر کس درجہ حیرت انگیز ہو گزرا ہے اور یہ سبق ہے اور عبرت و بصیرت ہے قریش کے لیے جو اپنی طاقت کے گھمنڈ میں محمد ﷺ اور مسلمانوں کو پیس ڈالنا چاہتے ہیں وہ سمجھیں کہ جس نے کعبہ کی حفاظت کا یہ غیبی انتظام کر دیا وہی آج قبلہ ابراہیمی "کعبہ" کی صحیح عظمت کے داعی کی حفاظت و صیانت کا ضامن ہے۔

غرض غیر مسلح انسانوں کے ذریعہ چھوٹے چھوٹے پتھروں کی سنگ باری سے دیو پیکر ہاتھیوں اور آہن پوش لشکریوں کو فرار کا موقع نہ دے کر موقعہ ہی پر کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دینا اسی طرح عجیب ہے جیسا کہ پرندوں کی ماری ہوئی کنکریوں کا بندوق کی گولی کی طرح لگنا یا ایسے مہلک جراثیم کا حامل ہونا جن سے ایک فوج گراں کھائے ہوئے بھس کی طرح ہو کر رہ جائے مگر یہ کہ تسلیم کیا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک "معجزانہ نشان" تھا۔

اور اگر اس سے انکار نہیں ہے تو پھر کوئی وجہ وجیہ نظر نہیں آتی کہ سلف اور جمہور بلکہ بلاواسطہ خود آیات قرآنی سے حاصل شدہ تفسیر سے عدول کر کے ایسی تفسیر کیوں اختیار کی جائے جو لغت اور روایات دونوں لحاظ سے اسقام و نقائص کی حامل ہو۔

پانچویں اعتراض کا مقصد یہ ہے کہ زیر بحث تفسیر میں اگر شعراء عرب کے اشعار سے استشہاد کرنا حل مطلب کے لیے ضروری سمجھا گیا تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے لیے واقعہ سے متعلق مخصوص اشعار کو جن میں اس واقعہ کے معاصر عبدالمطلب کے اشعار بھی شامل ہیں نظر انداز کر دیا گیا بلکہ ان سے اعراض روا رکھا گیا اور شعراء عرب کے ایک ایسے تخیل کو بطور استشہاد تسلیم کیا گیا جس کا مبنی بر حقیقت ہونا خود محل نظر ہے اور جس کے لیے خود آیات قرآنی میں بھی کوئی قرینہ موجود نہیں ہے بلکہ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ

Marfat.com

اس مقام پر موجودگی طیر کا معاملہ تمام حالات کی بنا پر نہیں تھا بلکہ کرشمہ قدرت نے خاص صورت حال کے ساتھ ان کو بھیجا تھا تب ہی تو ﴿تَرْمِيْهِمْ﴾ سے قبل کی آیت میں "﴿اَرْسَلَ﴾ فرما کر اللہ تعالیٰ نے ان کی آمد کو خاص طور سے اپنی جانب منسوب کیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ کارخانہ عالم میں جو کچھ بھی حرکت وسکون ہے سب اسی کی قدرت کے ہاتھوں سے ہے۔

نیز ﴿تَرْمِيْ﴾ کے بعد ﴿فَجَعَلَهُمْ﴾ کہہ کر یہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ "رمی" کا یہ نتیجہ کہ وہ ﴿عَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ﴾ کی طرح ہو گئے ہمارا اپنا فعل تھا جس میں دوسرے کو کوئی دخل نہیں تھا ورنہ اگر پرندوں کا وجود عام حالات کی بناء پر ہوتا اور ﴿عَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ﴾ نتیجہ ہوتا قریش کے عمل سنگ باری کا تو اسلوب بیان یہ نہ ہوتا بلکہ یوں کہا جاتا "ان کے سروں پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ منڈلانے لگے جب کہ تو ان پر سنگ باری کر رہا تھا اور ہو گئے وہ اس سنگ باری سے کھائے ہوئے بھس کی طرح"

الحاصل جب کہ عرب قبل از اسلام اور بعد از اسلام دونوں زمانوں میں شعراء عرب کے وہ اشعار موجود ہیں جن میں صاف صاف اس کا اقرار ہے کہ واقعہ کی نوعیت وہی ہے جس کو روایات سلف ظاہر کرتی ہیں تو ان سے اعراض اور شعراء کے ایک عام تخیل سے استشہاد ہرگز درست نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ عبدالمطلب کے وہ اشعار جو اس سے قبل ذکر میں آچکے ہیں اس حقیقت کا صاف صاف اعلان کرتے ہیں کہ قریش نے ابرہہ کے لشکر کے مقابلہ میں طاقت مقاومت نہ دیکھتے ہوئے جنگ سے اعراض کیا اور وہ کعبہ کو رب کعبہ کے حوالہ کر کے پہاڑیوں پر پناہ گزیں ہو گئے اور حالات کا انتظار کرنے لگے عبدالمطلب کہتے ہیں:

لا هم ان العبد يمنع رحاله فامنع رحالك

"ہم اگرچہ عاجز ہونے کی وجہ سے شہر سے جا رہے ہیں لیکن یہ کوئی غم کی بات نہیں ہے ہر شخص اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے خدایا تو بھی اپنے گھر کی حفاظت کر۔"

اور آخر میں دشمن کے مقابلہ سے اپنے عجز اور درماندگی اور بظاہر اسباب کعبہ کی حفاظت سے مایوسی کے اثرات کا ان الفاظ میں اظہار کرتے ہیں:

ان كنت تاركهم و كعبتنا فامر ما بدالك

"اور اگر تیرا یہی منشاء ہے کہ وہ ہمارے کعبہ کے متعلق اپنا منشاء پورا کر لیں تو پھر جو تیرا جی چاہے وہ حکم فرما۔"

عبدالمطلب، واقعہ اصحاب فیل کے معاصر ہیں، سردار قریش ہیں اور ان کی جانب سے جنگ صلح کے ضامن ہیں وہ اقرار کر رہے ہیں کہ قریش دشمن کے مقابلہ سے عاجز ہو کر کعبہ اور ابرہہ کے معاملہ کو سپرد بخدا کر کے نتیجہ کے منتظر ہیں مگر اس کے برخلاف زیر بحث تفسیر اصرار کرتی ہے کہ قریش نے ضرور ابرہہ کے لشکر سے جنگ کی اور ان کو تباہ و ہلاک کر دیا۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

واقعہ سے متعلق یہ اشعار تمام کتب سیر میں بسند صحیح مذکور ہیں نیز عام روایات کی طرح اس واقعہ سے متعلق دو رائے تک موجود نہیں ہیں بلکہ صرف ایک ہی قول تاریخی تواتر سے منقول چلا آتا ہے مگر افسوس کہ پھر بھی وہ قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا۔

علاوہ ازیں اگر فرض کر لیجئے کہ یہ اشعار عبدالمطلب کی جانب غلط منسوب ہیں تب بھی ان اشعار سے یہ تو بہر حال ثابت ہوتا

Marfat.com

ہے کہ جن اہل عرب اور اہل حجاز کے سامنے قرآن، واقعہ فیل کو بیان کر رہا ہے ان کے یہاں قبل از اسلام اس واقعہ سے متعلق یہی روایت مسلم تھی جوان اشعار کے ذریعہ ظاہر کی گئی ہے اور اسی کو انہوں نے اپنے بزرگوں کی زبانی سنا یا واقعہ کا خود مشاہدہ کیا تھا اور اسی لیے عرب بعد الاسلام کے تمام شعراء بھی اپنے اشعار میں بلا خلاف اسی حقیقت کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔

عبداللہ بن ربعری سہمی اس واقعہ کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سائل امیر الحبش عنها مارانی
فلسوف بینی الجاهلین علیهما
ستون الفا لم ینوبوا ارضهم
بل لم یعش بعد الایاب سقیمها

"حبشہ کے سردار سے معلوم کرو کہ اس نے کیا کچھ دیکھا، عنقریب ناواقفوں کو اس واقعہ سے خبردار لوگ واقف کر دیں گے۔ ساٹھ ہزار لشکریوں میں سے کسی کو وطن لوٹنا نصیب نہیں ہوا اور اگر کوئی اِکا دُکا زخم خوردہ بھاگ نکلا تو وہ بھی خدائی مار کے زخموں سے نہ بچ سکا۔"

اور عبداللہ بن قیس کہتے ہیں:

کاده الاشرم الذی جاء بالفیل فولی وجیشه مهزوم
و أستهلت علیهم الطیر بالجندل حی کانه مرجوم

"ابرہۃ الاشرم نے یہ تدبیر چلی کہ کعبہ کے گرانے کو ہاتھیوں کو لے کر آیا پس وہ بھاگا اور اس کا لشکر بھی شکست خوردہ ہو گیا جب کہ پرندوں کے لشکر ان پر کنکریوں کی بارش کرتے ہوئے پرے کے پرے آ پہنچے اور سارا لشکر سنگسار ہو کر رہ گیا۔"

اور ابوقیس بن اسلت انصاری ابرہہ کے لشکر کی تباہی کے لیے خدائی مدد کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:

فلما أتاکم نصر ذی العرش ردهم
جنود الملیک بین ساف وحاصب
فولوا سرأعا هاربین و لم ینوب
الی أهله بحبش غیر عصانب

"پھر جب عرش والے کے پاس سے تمہارے لیے مدد آ پہنچی تو ابرہہ اور اس کے لشکر کا خدائی لشکر (پرندوں کے غول) نے منہ پھیر دیا جب کہ وہ ٹھیکریاں اور کنکریاں برسا رہا تھا پس سارا لشکر جلد ہی شکست کھا کر بھاگا اور ان میں سے چند معمولی ٹولیوں کے سواء کوئی بھی حبشہ تک نہ پہنچ سکا اور سب یہیں ہلاک و تباہ ہو کر رہ گئے۔"

چھٹے اعتراض کی تفصیل یہ ہے کہ قبل از اسلام اور بعد از اسلام عرب کی مشہور حروب کی تاریخی تفصیلات اشعار عرب، کتب سیرت اور مسلم و غیر مسلم تواریخ میں موجود ہیں جن میں مذہبی ملکی اور قومی ہر قسم کی جنگوں کے تذکرے پائے جاتے ہیں مگر ایک جنگ کے متعلق بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ اہل عرب یا قریش نے محض بدویانہ سنگ باری کی جنگ کی ہو بلکہ اس زمانہ کے متداول اسلحہ تلوار، تیر

Marfat.com

اور تبر وغیرہ سے ہی وہ جنگ کیا کرتے تھے جس میں منجنیق (گوپھن) کا بھی استعمال ہو جایا کرتا تھا اور اگر یہ تسلیم نہیں ہے تو اشعار عرب اور تاریخ عرب سے کوئی سند دکھائی جائے کہ محض سنگ باری کی جنگ کا کون سا مشہور یا غیر مشہور واقعہ تاریخ میں مذکور ہے کیونکہ تاریخ تو آج تک یہی کہتی چلی آتی ہے کہ اہل عرب تلوار کے دھنی اور بات بات پر ان کے درمیان تلوار کا نیام سے نکل آنا روزمرہ کا مشغلہ تھا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ بدویانہ سنگ باری کا یہ طریقہ اس خاص واقعہ میں پیش آیا اور اس کے ثبوت کے لیے یہی اول اور آخر مثال ہے تو پھر خود اس مخصوص واقعہ کے لیے تاریخی ثبوت چاہیے تاکہ یہ متعین ہو سکے کہ سلف اور جمہور سے منقول تفسیر غلط اور یہ جدید تفسیر ہی صحیح تفسیر ہے حالانکہ اس کے لیے کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔

پس اگر نہ خود عرب کے واقعات جنگ میں اس کی مثالیں موجود ہیں اور نہ خاص اس واقعہ کے لیے کوئی تاریخی شہادت پائی جاتی ہے بلکہ اس کے برعکس حجاز کی قوی روایات، تاریخی وقائع اور سلف صالحین کی نقول و روایات سے باتفاق یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابرہہ کے لشکر جرار کے مقابلہ میں قریش نے کوئی جنگ نہیں کی اور وہ تاب مقاومت سے عاجز ہونے کی وجہ سے کعبہ کو رب کعبہ کے بھروسہ پر چھوڑ کر پہاڑی پر پناہ گزیں ہو گئے تھے تو محض عربیت کے پیش نظر دو احتمالات میں سے ایسے احتمال کو اختیار کرنا جو بقاعدۂ عربیت بھی اسقام کا حامل ہے اور تاریخی شہادات اور سلف کی روایات کے بھی خلاف ہے نا قابل قبول ہے۔

اس مقام پر یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جانی چاہیے کہ کتب تفسیر و سیر میں چونکہ بکثرت ایسی روایات پائی جاتی ہیں جن کی نسبت سلف صالحین کی جانب بسند صحیح ثابت ہو جانے کے بعد بھی محققین علماء تفسیر یہ کہہ کر اس کے قبول و تسلیم کی قیمت گھٹا دیتے ہیں کہ یہ روایت اسرائیلیات میں سے ہے یعنی گو اس کی نسبت حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مسعود، ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کی جانب بلحاظ سند روایت صحیح ہے لیکن وہ ان روایات میں سے نہیں ہے کہ جو نبی معصوم ﷺ کے قول و عمل یا تقریر و تثبیت سے تعلق رکھتی اور اس بناء پر سلف کا مسلک قرار دی جا سکتی ہو بلکہ حضرت عبداللہ بن سلام، وہب بن منبہ اور کعب احبار جیسے بزرگوں کی ان حکایات و اقوال سے ماخوذ ہے جو یہ حضرات متبحر علماء یہود میں سے ہونے کی بنا پر اسلام لانے کے بعد مسلمانوں کی مجالس میں بیان کیا کرتے تھے اور نبی اکرم ﷺ کی اس اجازت کے پیش نظر کہ مسلمانوں کو توراۃ اور اسرائیلی روایات کی نقل اس حد تک جائز ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات کے خلاف نہ ہو" مسلمان روایات کو بطور حکایت نقل کر دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے اس لیے سورۃ الفیل کی تفسیر میں بھی کیا یہ امکان ہے کہ "ترمی" کا فاعل "طیر" کو مان کر سلف سے جو روایات منقول ہیں وہ بھی اسی قسم کی اسرائیلی حکایات ہوں کہ جن کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ آیات کی یہ تفسیر سلف اور جمہور کا متفقہ مسلک نہیں ہے تو اس کا جواب نفی میں ہوگا اور یہ اس لیے کہ جس زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا اور جس وقت سورۃ الفیل کا نزول ہوا دونوں زمانوں میں اس واقعہ سے کعبہ کی عظمت کے مقابلہ میں عیسائیت کی سخت توہین لازم آتی ہے اور اسی بنا پر جدید یورپین مؤرخین بھی اس توہین سے تلملا کر جو قدرت کے ہاتھوں عیسائیت کو کعبۃ اللہ کی عظمت کے مقابلہ میں پیش آئی تھی اس واقعہ کی بے سند اور دور از کار تاویلات کرتے نظر آتے ہیں اور جب کہ یہود اور علماء یہود بھی اپنی روایتی حاسدانہ خو کی وجہ سے اس مرکز توحید کی عظمت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جو بوڑھے پیغمبر ابراہیم علیہ السلام کی اسماعیلی شاخ کی اسرائیلی شاخ پر برتری کا باعث بنا ہے تو بے شبہ یہ کہنا مبنی برحقیقت ہوگا کہ جس واقعہ کی اشاعت

Marfat.com

یہود و نصاریٰ کو ایک لحہ کے لیے بھی برداشت نہیں ہو سکتی اس سے متعلق روایات کو اسرائیلیات اور اسرائیلی روایات کی طرح نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان روایات کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہی یہ ہے کہ جس وقت سورۃ الفیل کا نزول ہوا ہے واقعہ کو گزرے ابھی پچاس سال سے زیادہ نہیں ہوئے تھے مگر پھر بھی کسی مخالف جماعت یا فرد کو اس کی تکذیب کی جرات نہ ہو سکی اور کسی ایک شخص نے یہ تک نہ کہا کہ آیات الفیل کا دعویٰ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن قریش میں اس کے متعلق جس قسم کی باتیں مشہور ہیں وہ سرتا سر غلط ہیں اور اگر تکذیب کی گئی ہوتی تو تاریخ اس کو اپنے سینہ میں اسی طرح محفوظ رکھتی جس طرح اسلام کے مخالفوں کی ہر قسم کی ہرزہ سرائیوں اور معاندانہ واقعات واحوال کو آج محفوظ رکھا ہے۔

پس ایک منصف مزاج اور طالب حق انسان کا فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے کہ سورۃ الفیل سے متعلق واقعہ کی تفصیلات جس طرح عرب روایات اور شعراء عرب کے اشعار اور سلف سے منقول تفاسیر میں منقول ہیں وہی صحیح تفسیر ہے۔

سلف سے منقول سورۃ الفیل کی تفسیر اس لیے بھی قابل قبول ہے کہ اس کے مطابق وہ اسقام نہیں پیدا ہوتے جو جدید تفسیر کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ اس لیے کہ اگر ہم خارج کی شرح وتفصیل سے قطع نظر صرف قرآن کی آیات کے معانی ہی میں محدود رہ کر تفسیر کریں تو ربط آیات اور ترتیب مضمون اور انسجام سورہ یہ سب امور بغیر کسی وقت وتاویل کے قائم رہتے اور آیات کے معنی ہوتے ہیں۔

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا کیا۔ کیا ان کی شرآمیز تدبیر کو بیکار نہیں کر دیا اور اس نے ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے جو ان پر کنکریاں پھینک رہے تھے پس کر دیا پروردگار نے ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح۔

آیات کے اس صاف اور صحیح ترجمہ پر غور فرمایئے کہ کس طرح ایک آیت دوسری آیت کے ساتھ مربوط اور بغیر کسی اضافہ مضمون کے خود ہی پوری حقیقت کا اظہار کر رہی ہے البتہ قرآن میں مذکور معجزات کے سلسلہ الذہب میں ایک کڑی کا ضرور اضافہ کرتی ہے۔ اور قرآن سے باہر عرب روایات نثر ونظم اس صاف اور واضح حقیقت کے لیے بغیر کسی اضافہ کے صرف تفصیل واقعہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جمہور سلف کے خلاف سورۃ الفیل کی تفسیر ایک جدید مدعی تفسیر علوم قرآن نے بھی کی ہے جدید مفسر صاحب چونکہ نبی معصوم ﷺ سے منقول احادیث صحیحہ کو بھی ادلہ شرعیہ سے خارج سمجھتے اور انکار حدیث کو اپنا مسلک بنائے ہوئے ہیں اور خدمت مذہب کے نام سے اپنے مضامین میں اس الحاد کو خاص رنگ میں پیش کر کے انکار حدیث کی تبلیغ فرماتے رہتے ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ ان کی نگاہ میں سلف صالحین کے مسلک کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔

سورۃ الفیل کی یہ تفسیر اگرچہ مصنف نظام القرآن ہی کی تفسیر سے ماخوذ ہے مگر چونکہ جدید مفسر صاحب حقیقتاً علوم عربیت اور علوم قرآن دونوں سے ناواقف ہیں اور بایں ہمہ مختلف زبانوں میں قرآن کی تفاسیر بکثرت وجود میں آنے کے باعث ارزاں شہرت حاصل کرنے کے لیے مفسر بننا چاہتے ہیں اس لیے انہوں نے نظام القرآن میں مسطور تفسیر کے علمی پہلوؤں سے گریز کرتے ہوئے خطابیات کے طریقہ پر آیات کے مفہوم ومعانی سے جدا اپنی جانب سے چند ایسے اضافوں کے ساتھ اس کو پیش کیا ہے جن کو دیکھ

Marfat.com

کر صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ایسے کلام کی تفسیر کر رہے ہیں جو ان کے خیال میں خود اپنے اداء مقصد میں کوتاہ اور اپنے اسلوب بیان میں ناقص ہے اور محتاج ہے ایسے چند اضافوں کا جن کے ذریعہ اس کی تکمیل ہو سکے اور جو اس کے سقم اور نقص کو دور کر سکیں چنانچہ فرماتے ہیں:

جزئی تفاصیل میں جانے کے بغیر یوں سمجھو کہ اہل مکہ کی ایک مخالف قوت (ابرہہ) نے چاہا کہ قریش پر حملہ کیا جائے لیکن اس انداز سے کہ حملہ اچانک ہو اور قریش کو بے خبر جا پکڑا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے اس نے ایسا راستہ اختیار کیا کہ وہ وادیوں میں چھپتا چھپاتا مکہ تک آ پہنچے اور فوج کے مہیب ہاتھی انہیں کچل ڈالیں یہ تھی اس کی خفیہ تدبیر (کید) اس تدبیر کے مخفی رکھنے کے لیے اس نے پورا پورا اہتمام کر لیا لیکن مشیت کا منشاء اہل مکہ کا بچانا تھا اس لیے اس مہم میں ایک ایسی کڑی ساتھ جا لگی جس سے یہ تمام اسکیم ناکام ہو کر رہ گئی جس زمانہ میں بارود اور بم زمین کے ساتھ آسمان کو بھی آتش زار نہیں بنایا کرتے تھے بڑے لاش خور پرندے مثل گدھ چیل فوجوں کے ہمراہ ہو جاتے جوں ہی کوئی فوج نقل و حرکت کرتی یہ اپنی خدا داد فراست سے اندازہ کر لیتے کہ اب رزق کا سامان پیدا ہونے لگا ہے ہاتھیوں والی فوج نے اپنی نقل و حرکت کو اہل مکہ سے چھپائے رکھا لیکن ان پرندوں کے جھنڈ طیراً ابابیل کے معنی جھنڈ کے جھنڈ ہیں نہ کہ وہ ابابیلیں جو سر شام ہمارے ہاں اُڑتی پھرا کرتی ہیں اس فوج پر منڈلاتے ہوئے ساتھ ہوئے اور یوں زمین کی مخفی تدبیر کا راز آسمان کے پرندوں نے کھول دیا اہل مکہ جانتے تھے کہ اس قسم کے پرندوں کی پرواز کا کیا مطلب ہوتا ہے اور اس دھوئیں سے نیچے کی آگ کا پتہ پا گئے اور پہاڑوں پر چڑھ کر ایسا پتھراؤ کیا کہ فوج کا ہاتھیوں سمیت بھرکس نکل گیا۔ قرآن کریم نے اہل مکہ کو اس واقعہ کی یاد دلائی ہے۔ ❁

اس تفسیر پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کا تفصیلی ذکر تو مصنف نظام القرآن کی تفسیر سورۃ الفیل کے سلسلہ میں آ چکا اس لیے یہ برخود غلط مقلدانہ تفسیر قابل اعتناء نہیں ہے البتہ اس میں اپنی جانب سے نئے اضافات کر کے قرآن کو جو لقمے دیے گئے ہیں ان کی خرافت کا اظہار از بس ضروری ہے مفسر جدید نے ان اختراعی اضافات کو اس لیے بیان کیا ہے کہ ان کی گڑھی ہوئی تفسیر کے مطابق آیات کے مفہوم و معنی میں جو سقم پیدا ہو جاتا ہے اس کو دور اور ربط آیات میں جو خلا واقع ہو جاتا ہے اس کو پر کر دیا جائے۔

ایک جانب مصنف نظام القرآن کے تفسیری مطالب کا اپنی جانب انتساب اور دوسری جانب تقلیدی مضمون میں مجتہدانہ غیر علمی اضافات کی اپچ ان دونوں باتوں نے مل کر جدید مفسر صاحب کی تفسیر سورۃ الفیل کو طرفہ معجون بنا دیا ہے۔

آپ ایک مرتبہ پھر نشان زدہ عبارت کا مطالعہ فرمائیں اور ساتھ ہی سورۃ الفیل کی آیات کے سادہ معانی پر بھی توجہ دیتے جائیں تو آپ خود ہی حیرت و تعجب میں پڑ جائیں گے کہ اصحاب الفیل کے واقعہ سے متعلق یہ تمام کڑیاں جو جدید مفسر صاحب نے بیان فرمائی ہیں کہاں سے حاصل ہوئیں۔

سورۃ الفیل کی آیات میں تو ان باتوں کا پتہ تک نہیں ہے پھر نہیں معلوم کہ جدید مفسر صاحب نے ان کو کہاں سے اخذ کیا جب کہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ واقعہ سے متعلق روایات کو غلط اور تل کے اوٹ پہاڑ کی طرح سمجھتے ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں خود قرآن کے اندر سے کہہ رہے ہیں کیونکہ واقعہ سے متعلق روایات تو مفسر صاحب کے اضافوں کے برعکس یہ بیان کرتی ہیں:

❁ طلوع اسلام نمبر ۱۴۱ ص ۵۸

Marfat.com

① ابرہہ اپنی فوج گراں لے کر کہ جس میں بہت سے ہاتھی بھی شامل تھے علی الاعلان یمن سے مکہ کے لیے نکلا تھا اور اسی لیے راہ میں بعض قبائل عرب نے مزاحمت کی اور ناکام رہے۔

② ابرہہ کے اس خروج کی تمام اقطاع عرب میں شہرت ہوگئی تھی۔

③ اس لیے ابرہہ کی تدبیر جنگ خفیہ نہیں بلکہ علانیہ تھی۔

④ ابرہہ نے حجاز پہنچ کر عبدالمطلب سے صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے قریش سے کوئی سروکار نہیں میں تو کعبہ کے انہدام کے لیے آیا ہوں۔

⑤ عبدالمطلب اور قریش نے تاب مقاومت نہ رکھتے ہوئے مقابلہ نہیں کیا بلکہ پہاڑی پر چلے گئے۔

⑥ مشیت کا منشاء کعبہ کی حفاظت تھی نہ کہ قریش کا بچانا کیونکہ ابرہہ کعبہ ہی کو گرانے آیا تھا۔

اب جب کہ نہ قرآن ہی میں ان اضافوں کا ذکر ہے جن کو جدید مفسر صاحب نے بڑے شدومد سے بیان کیا ہے اور نہ ان کی بیان کردہ تفصیلات کے لیے کوئی تاریخی یا حدیثی سند موجود ہے تو ایسی تفصیلات پر مبنی تفسیر بلاشبہ تفسیر بالرائے اور قطعاً غلط اور مہمل ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ مفسر صاحب کے ان تمام اضافوں کی بنیاد صرف لفظ "کید" ہے جو سورۃ الفیل کی آیت ﴿ اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَهُمْ ﴾ میں مذکور ہے اور جس کے معنی انہوں نے "خفیہ تدبیر" کے کیے ہیں۔

لیکن یہ بات بھی لغو ہے اس لیے کہ اول تو فقط لفظ "کید" سے یہ داستان طویل کس طرح وجود میں آ سکتی ہے تاوقتیکہ اس کے لیے قرآن کے اندر یا باہر سے کوئی سند موجود نہ ہو دوسرے لغت عرب میں "کید" کے معنی "خفیہ تدبیر" کے لیے ہرگز مخصوص نہیں ہیں بلکہ کبھی وہ "شرآمیز تدبیر" کے مفہوم کو ادا کرتا ہے خواہ علانیہ ہو یا خفیہ اور کبھی "مطلق جنگ" کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

الکید، الحیلہ، المکر، الخبث، الحرب اور ان سب معانی میں "شرآمیز تدبیر" کا مفہوم مشترک ہے بلکہ خود قرآن نے لفظ کید کو مختلف مقامات پر "مطلق تدبیر" اور طریق کار کے معنی میں یا علانیہ تدبیر کے معنی میں استعمال کیا ہے سورۂ حج میں ہے:

﴿مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ⑮﴾ (الحج: ۱۵)

"جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا اور آخرت میں کوئی مددگار نہیں دے گا (یعنی خدا سے ناامید ہے) تو اس کو چاہیے کہ آسمان کی بلندی تک رسی کھینچ لے جائے اور جب اس کو پکڑے ہوئے معلق ہو تو چاہیے کہ اس کو کاٹ ڈالے پھر دیکھے کہ اس کی تدبیر اور اس کا یہ طریق کار کیا اس چیز کو کھو دے گا جو اس کو غصہ میں لاتی ہے (یعنی خدا سے ناامید ہونا ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی بلندی پر رسی باندھ کر چڑھے اور پھر بیچ میں پہنچ کر اس کو کاٹ ڈالے)۔"

اس مقام پر "کید" کے معنی فقط طریق کار" اور مطلق تدبیر کے ہیں اور خفیہ اور علانیہ دونوں شرطوں سے آزاد۔

اور سورۂ انبیاء میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں ہے:

﴿قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ⑱ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ ⑲ وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ⑳﴾ (الانبیاء: ۶۸-۷۰)

Marfat.com

"کافروں نے کہا تم اس (ابراہیم علیہ السلام) کو آگ میں جلا ڈالو اور اپنے معبودوں (بتوں) کی مدد کرو اگر تم کرنا چاہتے ہو ہم نے کہا (اللہ تعالیٰ نے کہا) اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی کی چیز بن جا اور انہوں نے (کافروں نے) ابراہیم کے ساتھ بری تدبیر کا ارادہ کیا پس ہم نے ان کو ہی خسارہ اٹھانے والوں میں کر دیا۔"

اور سورۃ الصافات میں ہے:

﴿قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ۝ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ۝﴾ (الصافات: ۹۷-۹۸)

"انہوں نے (مشرکوں نے) کہا بناؤ اس کے (ابراہیم علیہ السلام کے) لیے ایک عمارت (یعنی آگ کی بھٹی) پھر ڈال دو اس کو آگ کی بھٹی میں پس انہوں نے اس کے ساتھ بری تدبیر کا ارادہ کیا سو کر دیا ہم نے ان کو ذلیل و خوار۔"

ان ہر دو مقامات کا سیاق کلام یہ ہے کہ جب مشرکین ابراہیم علیہ السلام کے واضح اور روشن دلائل توحید کے مقابلہ میں لاجواب اور عاجز ہو گئے تو قبول حق کی بجائے غیظ و غضب میں آ کر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ شخص چونکہ ہمارے معبودوں (بتوں) کے حق میں گستاخ ہے اس لیے اس کو آگ کی بھٹی میں ڈال کر زندہ جلا دو، ابراہیم علیہ السلام اس فیصلہ کو سن رہے تھے مگر انہوں نے مطلق کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنے اعلان حق پر قائم رہے۔

قرآن نے مشرکین کے اس فیصلہ کو "کید" سے ہی تعبیر کیا ہے حالانکہ وہ خفیہ نہیں تھا بلکہ اعلانیہ تھا۔

غرض جب کہ "کید" خفیہ تدبیر کے لیے مخصوص نہیں ہے تو جب تک وضاحت کلام یا واضح قرینہ اس کا متقاضی نہ ہو کہ فلاں مقام پر "کید" کے معنی "خفیہ تدبیر" کے ہونے چاہئیں اس لفظ کو اس معنی کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔

اور ظاہر ہے کہ سورۃ الفیل میں اس تخصیص کے لیے نہ کوئی وضاحت موجود ہے اور نہ کوئی واضح قرینہ حتیٰ کہ خود جدید مفسر صاحب کے بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پاس اپنی بیان کردہ خفیہ تدبیر کی داستان کے لیے لفظ "کید" کے سوا نہ قرآن کے اندر سے کوئی ثبوت موجود ہے اور نہ باہر ہے اس لیے انہوں نے ابرہہ کی لشکر کشی سے متعلق داستان بیان کرتے ہوئے بے سند یہ کہنے پر اکتفا کیا ہے یہ بھی اس کی خفیہ تدبیر "کید" اور یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ "کید" کی یہ تفصیل انہوں نے کہاں سے حاصل کی ہے؟

یہ سوال اس لیے اور بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس مقام پر "کید" کے معنی خفیہ تدبیر" ہی کے ہیں تب بھی تو یہ ضروری نہیں ہے کہ خفیہ تدبیر کی تفصیلات وہی ہوں جو جدید تفسیر میں بیان کی گئی ہیں کیونکہ "خفیہ تدبیر" کو کسی خاص تفصیل کے اندر محدود کرنے کے لیے دلیل اور سند درکار ہے۔

نیز جب کہ سورۃ الفیل میں "اصحاب الفیل" کا ذکر ایک واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے تو اس سلسلہ میں محض احتمالات عقلی بے معنی ہیں بلکہ از بس ضروری ہے کہ واقعہ کے بنیادی اجزاء و تفاصیل خود قرآن میں موجود ہوں اور مفسرین کے ذہنی اختراع و ایجاد کے محتاج نہ ہوں اور پھر فروعی تفاصیل بھی اگر بیان کی جائیں تو ان کے لیے بھی داخلی یا خارجی سند صحیح کا ہونا ضروری ہے ورنہ تو واقعہ واقعہ نہیں رہے گا بلکہ ہر شخص کی دماغی اپج کا کھلونا بن کر رہ جائے گا۔

جدید تفسیر میں خفیہ تدبیر کی بیان کردہ تفصیلات کے متعلق ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ آیت ﴿وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ۝﴾ میں "ارسال طیر" اور "کید" دونوں مل کر اس تفصیل کو ظاہر کرتے ہیں تو یہ کہنا لغو اور بے سود ہے اس لیے کہ اس آیت میں تو

Marfat.com

صرف یہ کہا گیا ہے کہ "بھیج دیئے ہم نے ان پر پرند جھنڈ کے جھنڈ اور جدید مفسر صاحب یہ فرما چکے ہیں کہ آسمانی فضا میں بارود اور بموں کے استعمال سے قبل مردار خوار جانور لشکروں کے ساتھ ساتھ اس لیے منڈلاتے ہوئے چلتے تھے کہ ان کی فراست راہنمائی کرتی تھی کہ اب ان کی غذا کا سامان مہیا ہونے والا ہے اور شعراء عرب کے اشعار سے مصنف نظام القرآن بھی یہ استشہاد کر چکے ہیں کہ جب دو فریق میدان جنگ میں نبرد آزما ہونے کے لیے اپنی جگہ سے روانہ ہوتے تھے تو ان کے سروں پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اُڑتے ہوئے چلا کرتے تھے تاکہ مردہ نعشوں سے غذا حاصل کریں۔

تو تفسیر جدید کے مطابق ان دونوں باتوں کا حاصل زیادہ سے زیادہ یہ نکل سکتا ہے کہ آیت ﴿وَ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ﴾ یہ ظاہر کرتی ہے کہ عام حالات جنگ کی طرح اس جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے لشکر پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیے کہ وہ اس کی مردہ نعشوں سے غذا حاصل کریں لیکن "خفیہ تدبیر" کی یہ تفصیلات کہ:

① قریش پر اس انداز سے حملہ کیا جائے کہ حملہ اچانک ہو اور قریش کو بے خبر جا پکڑا جائے۔

② چنانچہ اس نے ایسا راستہ اختیار کیا کہ وادیوں میں چھپتا چھپاتا مکہ تک آ پہنچے۔

③ لیکن مشیت کا منشا چونکہ اہل مکہ کا بچانا تھا اس لیے اس میں ایک ایسی کڑی ساتھ جا لگی جس سے یہ تمام اسکیم ناکام ہو کر رہ گئی (وہ یہ کہ) پرندوں کے جھنڈ اس فوج پر منڈلاتے ہوئے ساتھ ہو گئے اور یوں زمین کی مخفی تدبیر کا راز آسمان کے پرندوں نے کھول دیا۔

④ اہل مکہ جانتے تھے کہ اس قسم کے پرندوں کی پرواز کا کیا مطلب ہوتا ہے وہ اس دھوئیں سے نیچے کی آگ کا پتہ پا گئے نہ آیت ﴿وَ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ﴾ سے ظاہر ہوتی ہیں اور نہ "کید" سے اور نہ دونوں کو باہم ملا کر مطلب حاصل کرنے سے ان تفصیلات کا ثبوت بہم پہنچتا ہے بلکہ یہ تک ظاہر نہیں ہوتا کہ اصحاب الفیل نے جو کید کیا تھا وہ "خفیہ تدبیر" کی ہی صورت میں تھا۔

یہی وجہ ہے کہ جدید تفسیر میں بایں ادعاء تردید مسلک سلف صالحین رحمہم اللہ خفیہ تدبیر کی ان تفصیلات کے لیے کوئی ثبوت بہم نہ پہنچایا جا سکا اور جو کچھ کہا گیا صرف دماغی اختراع سے کہا گیا ہے اور اگر جدید مفسر صاحب کے پاس ان کے لیے کوئی سند داخلی یا خارجی موجود ہے تو اس کے لیے صرف یہی کہا جا سکتا ہے: ﴿هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾

تفسیر زیر بحث میں واقعہ سے متعلق تفصیلات کو اپنی جانب سے گھڑ کر جو شکل و صورت دی گئی ہے اس میں جدید مفسر صاحب نے جگہ جگہ اس پر زور دیا ہے کہ اصحاب فیل کا مقصد قریش پر حملہ کرنا اور ان کو تباہ و برباد کرنا تھا اور مشیت کا منشا ان کو بچانا تھا اسی لیے سب کچھ ہوا جو سورۃ الفیل میں مذکور ہے لیکن ان تاریخی تفصیلات سے اگر قطع نظر بھی کر لی جائے جو واقعہ سے متعلق کتب سیر و تاریخ میں مذکور ہیں اور جو بے تکلف سورۃ الفیل کی آیات کی تفسیر یا تفصیل کرتی ہیں تب بھی بخاری و مسلم (صحیحین) کی احادیث، تفسیر جدید کے اس بنیادی مقدمہ کے قطعاً خلاف فیصلہ دیتی ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ "اصحاب فیل" کی یہ جنگ قریش کی تباہی کے لیے نہیں تھی "کعبۃ اللہ" کی بربادی کے لیے تھی اور اس لیے مشیت کا منشا کعبہ کی حفاظت تھا نہ کہ قریش کو بچانا۔

چنانچہ بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے حدیبیہ کے واقعہ سے متعلق جو طویل روایت نقل کی ہے اس میں ہے:

مسلمان اگرچہ جنگ کی نیت سے نہیں بلکہ زیارت بیت اللہ کے مقصد سے مکہ جا رہے تھے مگر مشرکین نے یہ سمجھا کہ جنگ کا ارادہ

Marfat.com

ہے اس لیے خالد بن ولید (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) مقدمۃ الجیش بن کر راہ روکنے کے لیے ایک چھوٹے دستہ کے ساتھ آگے بڑھے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا تو کہا بخدا ہمارا ارادہ کعبہ کی زیارت کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن اگر مشرکین مکہ ہمارے اس نیک مقصد میں حائل ہوئے تو ہم بے شبہ مقابلہ کریں گے تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ راہ بدل کر چلو تاکہ خالد کو پتہ نہ چلے کہ ہم کس طرف سے ہو کر آ رہے ہیں اور ایک لخت ان کے سر پر پہنچ جائیں۔ چنانچہ جب مسلمان ثنیہ المرار (پہاڑی ٹیلہ) پر پہنچے جہاں سے اچانک خالد کے دستہ پر حملہ کیا جا سکتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی (قصواء) بیٹھ گئی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ہر چند اس کو اٹھانا چاہا مگر وہ نہ اٹھی تب سب کہنے لگے قصواء بھڑک گئی اور بے قابو ہو گئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قصواء نہ بھڑکی ہے اور نہ بے قابو ہوئی اور نہ اس کی یہ عادت ہے بلکہ اس کو اسی خدا نے روک رکھا ہے جس نے ہاتھیوں والوں کو روک دیا تھا:

((فقال صلی اللہ علیہ وسلم ما خلأت و ما ذاك لها بخلق ولكن حبسها حابس الفيل))

اور پھر فرمایا اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے مشرکین مکہ شعائر اللہ کی عظمت کے سلسلہ میں جس بات کے بھی طالب ہوں گے میں اس کو پورا کروں گا اس ارشاد کے بعد اونٹنی کو ڈپٹا اور اونٹنی کھڑی ہو گئی اور حدیبیہ کے آخری کنارہ پر جا پہنچی۔ [1]

اس روایت میں ((حبسها حابس الفيل)) فرما کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ مشرکین مکہ اگر شعائر اللہ کی حرمت کے سلسلہ میں کسی بات کے بھی طالب ہوں گے تو میں اس کو پورا کروں گا تو یہ ارشاد مبارک صاف صاف یہ ظاہر کر رہا ہے کہ "حابس الفیل" نے جس طرح پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے یہ عہد لینے کے لیے قصواء کو چلتے چلتے روک دیا کہ اگر قریش سے جنگ پیش آئی تو وہ حرم اور کعبہ کی عظمت و حرمت کو مطلق کوئی آنچ نہ آنے دیں گے اسی طرح ماضی میں خدائے تعالیٰ نے اصحاب فیل کو اس لیے برباد کر دیا اور مکہ تک نہ پہنچنے دیا کہ وہ حرم اور کعبہ کو برباد کرنے اور اس کی توہین کرنے آئے تھے۔ چنانچہ خالد کے آمادۂ جنگ ہونے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ارادۂ مقاومت نے جب صورت حال کو جنگ کے قریب کر دیا تو حرم کے قریب پہنچ کر بحکم رب العالمین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ بیٹھ گئی تاکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں یہ اعلان کرایا جائے کہ مشرکین مکہ سے ارادۂ جنگ ہے لیکن سرزمین مکہ شعائر اللہ کا مرکز و محور ہے یہاں کعبۃ اللہ ہے۔ مقام ابراہیم ہے سعی ہے مسجد حرام ہے اور تمام سرزمین مکہ حرم ہے اس لیے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مشرکین مکہ (قریش) سے جنگ کے سلسلہ میں شعائر اللہ کی حرمت و عظمت میں کوئی فرق آنے پائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اس حقیقت حال کو فراست وحی سے سمجھ رہے تھے اس لیے اول آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناقہ (قصواء) کے بیٹھ جانے کی وجہ بیان فرمائی اور اس کے بعد یہ مسطورہ بالا اعلان فرمایا اور اب جبکہ کعبۃ اللہ اور شعائر اللہ کی عظمت و حرمت کا وعدہ منجانب اللہ لے لیا گیا تو اس کے فوراً بعد ہی خدا کے حکم سے قصواء خود بخود کھڑی ہو گئی اور منزل مقصود کی جانب گامزن ہوئی۔

اور بخاری و مسلم (صحیحین) کی ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے روز جو خطبہ دیا اس میں ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مکہ کو ہاتھیوں کی یورش سے بچا لیا تھا مگر اس نے اپنے رسول اور مسلمانوں کو اس پر قبضہ دے دیا تو یاد رہے کہ خدا کے اس حرم کی عظمت اب بھی اسی طرح ہے جس طرح اس سے پہلے تھی جو موجود ہیں ان کو چاہیے کہ غائب تک اس خبر کو پہنچائیں۔

[1] غزوۃ الحدیبیہ

Marfat.com

اس روایت میں بھی سرورِ عالم ﷺ نے صاف الفاظ میں یہ ظاہر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کو ہاتھیوں کی یورش سے قریش کی خاطر نہیں بلکہ کعبۃ اللہ اور حرم کی عظمت وحرمت کی خاطر بچایا تھا اور پھر مسلمانوں کو اس غلط فہمی سے بچانے کے لیے کہ کہیں وہ فتح مکہ کے زعم میں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ مکہ میں جنگ کی اجازت نے حرم کی عظمت آج کچھ کم کر دی ہے یہ خطبہ ارشاد فرما کر حقیقت حال کو واضح فرمایا اور تاکید فرمائی کہ جو لوگ اس وقت موجود نہیں موجود حضرات اس بات کو ان تک پہنچا دیں بلکہ اُمت مسلمہ کو ہمیشہ پہنچاتے رہیں۔

قریش کی بقا اور ان کی حفاظت اور حرم و کعبہ کی بقاء اور ان کی حفاظت یہ دو جدا جدا حقائق ہیں اور خدائے تعالیٰ نے دوسری حقیقت کی حفاظت کو اپنے ذمہ لیا ہے نہ کہ پہلی کو اس کے متعلق فتح مکہ کے وقت بعض صحابہ کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ اس خاص وقت میں اللہ تعالیٰ نے شاید نبی معصوم ﷺ کی کامیابی کی خاطر حرم کی عظمت وحرمت کو بھی نظر انداز کر دینے کی اجازت دے دی ہے۔ یہی غلط فہمی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو پیش آئی اور جب نبی اکرم ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے بہت سختی کے ساتھ ان کے اس خیال کی تردید فرمائی اور صرف یہی نہیں کیا بلکہ ان کو ان کے لشکر کی سرداری سے بھی معزول کر دیا۔ چنانچہ بخاری نے فتح مکہ سے متعلق حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کی طویل روایت میں اس طرح اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔

جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ پرچم لہراتے ابوسفیان کے پاس سے گزرے تو کہنے لگے ابوسفیان "الیوم یوم الملحمة الیوم تستحل الکعبة" (آج کا دن لڑائی کا دن ہے آج کعبہ کی حرمت کو بھی گزند پہنچ جائے گا) یہ سن ابوسفیان نے نبی اکرم ﷺ سے شکایت کی کہ سعد یہ کہہ رہے ہیں آپ ﷺ نے سن کر فوراً فرمایا: ((کذب سعد ولکن ھذا الیوم یعظم اللہ فیه الکعبة ویوم تکسی فیه الکعبة)) "سعد نے جو کہا جھوٹ کہا آج کا دن وہ ہے جس میں کعبہ کی عظمت کو اللہ تعالیٰ زیادہ بلند کرے گا آج کا دن وہ ہے کہ کعبہ کی حرمت کے لیے اس پر غلاف چڑھایا جائے گا اور بعض روایات میں اس کے ہم معنی یہ الفاظ ہیں ((الیوم یوم المرحمة الیوم تکسی الکعبة)).

اس روایت میں اگرچہ "اصحاب فیل" کا کوئی حوالہ نہیں ہے مگر فتح مکہ کے دوران میں اس واقعہ کے پیش نظر آ جانے سے یہ حقیقت بہرحال اور زیادہ روشن ہو گئی کہ جنگ و صلح ہر دو حالات میں اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ قریش کی حفاظت نہیں بلکہ کعبہ اور حرم کی حفاظت مقصود رہی ہے۔

فتح مکہ میں آخر قریش مکہ پر ہی ان کی بدعہدی کی وجہ سے چڑھائی ہوئی اور اگرچہ قریش کے فرار سے جنگ کی صورت پیدا نہیں ہوئی تاہم جن قریشیوں نے تھوڑی بہت مزاحمت کی وہ قتل بھی ہوئے مگر حابس الفیل نے ان کی کوئی مدد نہیں کی بلکہ مسلمانوں کو ہی کامیاب کر دیا کیوں؟ صرف اس لیے کہ مسلمانوں کا اعلان جنگ قریش کے لیے تھا اور وہ اس طرح کعبہ اور حرم کی حقیقی عظمت و حرمت کو واپس لانا چاہتے تھے اور اصحاب الفیل کو تباہی اور بربادی سے اس لیے واسطہ پڑا کہ اہل کتاب ہونے کے باوجود وہ مشرکین مکہ (قریش) کے خلاف نبرد آزما نہیں ہوئے تھے بلکہ مرکز توحید کعبۃ اللہ کو برباد کرنے کے ارادہ سے آئے تھے۔

ہم نے جدید مفسر صاحب کی مفروضہ داستان کے خلاف نبی معصوم ﷺ کی صحیح احادیث سے اگرچہ مسکت اور فیصلہ کن دلائل پیش کر دیے ہیں مگر ہم یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں اپنی من گھڑت داستان کے سامنے احادیث کی یہ شہادات اسی طرح قابل مضحکہ اور لائق تمسخر ہیں جس طرح وہ اپنے مزعومہ اسلامی رسالہ میں بخاری اور مسلم کی بعض دوسری احادیث کا مذاق اڑا

چکے اور ان کو نا قابل اعتماد قرار دے چکے ہیں۔ والی اللہ المشتکی

الحاصل جس طرح موثق دلائل وشواہد کی روشنی میں تفسیر جدید کا یہ بنیادی مقدمہ یا اختراعی تفاصیل کا یہ اہم حصہ بے بنیاد اور باطل ہے اسی طرح باقی حصص کو بھی بمصداق "قیاس کن زگلستان من بہار مرا" سمجھ لیجئے کہ ان کی حقیقت کیا ہے کہ ان کے لیے نہ قرآن کے اندر کوئی سند موجود ہے اور نہ باہر تاریخ واحادیث سے کوئی ان کو تائید حاصل ہے۔

مگر تفسیر بالرائے پر جدید مفسر صاحب کی یہ جسارت کس درجہ حیرت زا ہے کہ وہ اپنی خود ساختہ تفسیر کے مقابلہ میں سلف سے منقول تفسیر پر جو کہ احادیث صحیحہ عرب روایات اور تاریخی تواتر سے موید ہے تل کے اوٹ پہاڑ کی پھبتی کسنے سے بھی نہیں چوکتے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

اگر مفسر صاحب نے باقی تفسیر قرآن میں بھی یہی گل کاریاں کی ہیں اور اسلامی خدمت کے لیے اسی پیمانہ کو معیار بنایا ہے تو ہم اس خدمت دین کے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔

گر ہمیں مکتب است وہم ملا کار طفلاں تمام خواہد شد

چند تشریحی مطالب:

① آیت ﴿وَ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ۝﴾ میں ابابیل پرندوں کی جماعت کو کہتے ہیں اور اس کے مفہوم میں جماعت اور تتابع دونوں ایک ساتھ داخل ہیں یعنی وہ پرند مراد ہیں جو پرے کے پرے بن کر اڑتے اور اڑتے ہوئے ایک دوسرے میں گھسنے کی کوشش کرتے ہوں۔ چنانچہ لغت میں ہے "الابابیل" الفرق طیراً ابابیل متتابعہ مجتمعۃ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں "ابابیل ای تتبع بعضها بعضا" اور یہی مجاہد سے منقول ہے اور پرے کے پرے بن کر اس طرح اڑنا کہ ایک دوسرے کے پیچھے لگا ہوا ہے طبعاً اور فطرۃً بعض چھوٹے پرندوں کا خاصہ ہے بعض علماء لغت کہتے ہیں کہ یہ "ابالۃ" کی جمع ہے اور اکثر کا قول یہ ہے کہ یہ ایسی جمع ہے جس کے لیے کوئی واحد نہیں ہے "ابابیل" "جمع لا واحدلہ"۔

② ﴿بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ ۝﴾ میں حجارہ کو سجیل کے ساتھ مقید کیا ہے، یہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ اس سے وہ شے مراد ہے جس کو فارسی میں "سنگ گل" اور اردو میں "کھنگر" کہتے ہیں اور یہ کہ سنگ اور سنگریزوں کو "سجیل" نہیں کہا جاتا بلکہ ان کے لیے حجر پتھر اور حصی (سنگریزہ یا پارہ ہائے سنگ) بولا جاتا ہے۔

اہل لغت پتھر اور پتھر سے مشابہ اشیاء کے درمیان جو فرق بیان کرتے ہیں اس کا حاصل بھی یہی ہے یعنی الحجر پتھر، الحصی سنگریزہ یا پارۂ سنگ، سجیل کنکر یا سنگ گل الخذف مٹی کے برتنوں کے شکستہ ٹکڑے یا ٹھیکری۔ لہٰذا جس شخص نے ﴿حِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ ۝﴾ کے معنی سنگ یا پارۂ سنگ سمجھ کر ﴿تَرْمِیْهِمْ﴾ کا ترجمہ سنگ باری کر رہے تھے۔ کیا ہے غلط کیا ہے کیونکہ یہ لغت اور محاورات عرب دونوں کے خلاف ہے اور اس لیے اس معنی پر مبنی تفسیر بھی صحیح نہیں ہوسکتی اور اگر یہ کہا جائے کہ قرآن نے حصی کو مجازاً سجیل کہا ہے تو ثابت کرنا چاہیے کہ قرآن نے حقیقت کو چھوڑ کر کس لیے اس مقام پر مجازاً استعمال کیا ہے؟

اور اگر "سجیل" کے معنی حقیقی معنی مراد ہیں تو یہ بتانا چاہیے کہ مکہ کی اس پہاڑی پر "جہاں چڑھ کر قریش نے کنکر مارے" یہ کنکر کہاں سے آ گئے تھے جب کہ پہاڑیوں پر سنگریزے یا پارہ ہائے سنگ تو ہوتے ہیں مگر کنکر نہیں ہوتیں؟

Marfat.com

③ آیت ﴿فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ﴾ اس بات کے لیے نص ہے کہ ایسی فوج گراں کا جس میں ہزار ہا مسلح لشکریوں کے علاوہ دیو پیکر ہاتھی بھی تھے کنکروں کی مار سے کھائے ہوئے بھس کی طرح ہو جانا اور فرار ہو کر جان بچا لینے کی مہلت تک نہ ملنا قدرت کے اعجاز ہی کے ذریعہ وقوع پذیر ہوا اور اسباب عقلی و عادی کے ماتحت عمل میں نہیں آیا۔

بصائر و عبر:

مذاہب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون "تعذیب اقوام و امم" بہ تقاضائے حکمت دو میں منقسم رہا ہے۔

① جب تک پیروان دین حق اور متبعین پیغمبران خدا کی تعداد معاندین اور مخالفین کے مقابلہ میں اس قدر قلیل رہی ہے کہ عام حالات میں وہ دشمن کے مقابلہ سے معذور رہے ہیں تو اس پورے دور میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے زمین و آسمان یعنی اجرام ارضی و فلکی کے ذریعہ ان کی نصرت و حمایت کا سامان ہوتا رہا ہے اور تعلیم حق و صداقت سے سرکش اور متمرد قوموں پر قدرت بلاواسطہ مختلف قسم کے زمینی اور آسمانی عذاب نازل کرتی رہی ہے۔ چنانچہ قوم نوح (علیہ السلام) عاد، اصحاب ایکہ فرعون و قوم فرعون وغیرہ اقوام و امم سب اسی قسم کے عذاب سے ہلاک و برباد کی گئیں یہ دور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ختم ہو جاتا ہے۔

② جب جان نثارانِ حق و صداقت کی تعداد اس درجہ پر پہنچ گئی کہ وہ اگرچہ معاندین کے مقابلہ میں تھوڑے بھی رہے ہوں تب بھی اپنی تعداد کی اکثریت کے لحاظ سے دشمن کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونے کے قابل ہیں تو پھر "سنت اللہ" یہ رہی ہے کہ خود فدا کارانِ حق اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ میدان کارزار میں نکل کر دشمنانِ خدا کا مقابلہ کریں اور اپنی جان کی بازی لگا کر ملت بیضاء اور دین حق کی حمایت کے لیے سینہ سپر بنیں اور ساتھ ہی سچے رسولوں کے ذریعہ یہ وعدہ بھی دیا جاتا رہا کہ ثمرہ اور نتیجہ میں فتح و نصرت تمہارا ہی حصہ ہے ﴿وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○﴾ اور یہ نصرت و فتح کبھی ملائکۃ اللہ کی معیت جہاد سے پوری کی جاتی ہے اور کبھی اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔

غرض جن قوموں نے بھی حق و صداقت کے ظاہر ہو جانے اور خدائے برتر کے سچے پیغمبروں کی صداقت کو جان لینے کے بعد از راہ عداوت و غرور تعلیم حق سے نہ صرف منہ موڑا بلکہ اس کو مٹانے کی سعی ناکام کی تو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ان کو پاداش عمل کے چرخ پر کھینچ کر اور مختلف قسم کے عذاب چکھا کر صفحہ ہستی سے مٹا دیا اور اگرچہ ان کی تعذیب کا قانون عام طور سے ان ہی دو دوروں کے اندر منحصر رہا تاہم اللہ تعالیٰ کی حکمت کسی خاص طریق کار کے دائرہ میں محدود نہیں ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ ہماری اس تقسیم میں بعض مستثنیات بھی موجود ہوں البتہ تتبع اور استقراء کے پیش نظر تقسیم ضرور صحیح ہے۔

③ کعبۃ اللہ کے خلاف اصحاب فیل کی لشکر کشی اگرچہ قانون تعذیب امم کے دوسرے دور میں پیش آئی لیکن ایسے حالات اور ایسے زمانہ میں پیش آئی جو دورِ اوّل کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں یعنی "فترۃ وحی" (انقطاع وحی) کا زمانہ جس میں نہ کوئی رسول ہے اور نہ کوئی نبی اور نہ وقت کے سچے دین کے حامل ہی نظر آتے ہیں اور اگر ہیں بھی تو منتشر افراد ہیں نہ کہ باا ثر جماعت کہ وہ کعبۃ اللہ کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو۔ بلکہ ایک مدعی دین مسیحی ہی کعبہ ابراہیمی اور مرکز توحید کو برباد کرنے کے درپے نظر آتا ہے۔

اور مشرکین مکہ شرک و کفر کے باوجود اگرچہ "بیت اللہ" کی عظمت کے قائل ہیں مگر ایسی فوج گراں کے مقابلہ میں تاب و مقاومت نہیں رکھتے کہ جس کے ساتھ دیو پیکر ہاتھی بھی ہیں اور کعبہ کو رب کعبہ کے بھروسہ پر چھوڑ کر پہاڑ کی گھاٹیوں میں پناہ گزیں ہو

Marfat.com

جاتے ہیں تو ایسی حالت میں دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں ایک یہ کہ ابرہہ اور اس کا لشکر (اصحاب فیل) کامیاب ہو اور بیت اللہ برباد کر دیا جائے اور دوسری صورت یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ کا ایسا نشان (معجزہ) ظاہر کرے جو اسباب و وسائل سے بالاتر ہو کر اس مرکز دین اور قبلہ عالم "کعبہ" کی عظمت و حرمت کی حفاظت کا ضامن ہو اور ابرہہ اور اس کے لشکر (اصحاب فیل) کو قانون تعذیب امم کے پہلے دور کے مطابق ہلاک و برباد کر دے تاکہ یہ واقعہ کائنات انسانی کے لیے باعث عبرت و بصیرت ہو۔ چنانچہ حضرت حق کی جانب سے یہی دوسری صورت رونما ہوئی اور اس کے اعجاز قدرت نے "اصحاب فیل" پر جو عذاب سماوی نازل کیا تھا سورۃ الفیل میں اسی کو بیان کیا گیا ہے۔ "ذلك هو الحق" ...... "وما ذلك على الله بعزيز"

④ یہ واقعہ ولادت باسعادت محمد (ﷺ) سے چند * روز قبل پیش آیا یہ وہ وقت تھا جب کہ کائنات کا گوشہ گوشہ خدا پرستی اور توحید الٰہی کے نغموں سے محروم ہو چکا تھا، اور خدا کی بھیجی ہوئی سچی تعلیم کے مدعی ہر جگہ موجود تھے مگر سچی تعلیم معدوم ہو چکی تھی اور ادیان و ملل کے اصل خدوخال اور ان کی حقیقی شکل و صورت کو تحریف و تبدیل کے مرض نے مسخ کر دیا تھا۔ ہر جگہ شرک و کفر کا دور دورہ تھا، کہیں اصنام پرستی ہو رہی تھی تو کسی جگہ کواکب پرستی کا شور تھا کہیں آتش پرستی مقصد عبادت تھی تو کسی مقام پر عناصر پرستی دین کا نصب العین بن چکی تھی، کہیں تثلیث نے جگہ پا کر حضرت یسوع کو "مسیح بن اللہ" بنایا تھا تو کسی گروہ نے "عزیر بن اللہ" کہہ کر مذہب کے نام کا سہارا لیا تھا غرض ساری کائنات میں یا خدا کا انکار کار فرما تھا اور یا پھر اصنام پرستی، عناصر پرستی، کواکب پرستی حیوانات پرستی نے فلسفیانہ تخیل کی آڑ لے کر شرک و کفر کو نمایاں کیا تھا۔ اس لیے یہاں خدا پرستی کے علاوہ اور سب کچھ موجود تھا اگر مفقود تھی تو وہ فقط خدائے واحد کی پرستش ہی تھی۔

ان حالات کے پیش نظر غیرت حق کا فیصلہ ہوا کہ اب وہ نور ہدایت روشن اور وہ آفتاب رسالت جلوہ گر ہو جو کسی ایک خاص خطہ دنیا کو ہی نہیں بلکہ تمام عالم اور ساری کائنات کو "راہ مستقیم" دکھائے اور کائنات پرستی سے ہٹا کر خدا پرستی سکھائے۔ وہ گم کردہ راہ انسانوں کو راہ بتائے اور بھٹکے ہوئے غلاموں کو حقیقی مالک و آقا سے ملائے، ٹوٹے ہوؤں کا رشتہ جوڑے اور جاہلیت کی زنجیروں کو توڑے وہ دعائے خلیل علیہ السلام اور نوید مسیح کا حاصل ہو اور اس مرکز توحید "کعبہ" کی حقیقی عظمت و حرمت کا داعی جو خدا پرستی کے لیے سب سے پرانا اور مقدس گھر ہے اور جس کی تعمیر کا شرف ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام جیسے پیغمبروں کو بخشا گیا۔ آج اسرائیل کے خاندان سے "دعوت حق کی امانت واپس لے لی گئی کیونکہ انہوں نے خیانت کی اور اپنے بزرگوں کی وصیت کو فراموش کر دیا ﴿ نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ﴾ آج اسماعیل کا خاندان نوازا گیا اور خدا کی پاک امانت "سلالتہ اسماعیلی" کو عطا کر دی گئی۔ وقت آ رہا ہے کہ رسالت و نبوت کا یہ چاند عنقریب غار حرا سے کھیت کرے اور آفتاب حقیقت بن کر دنیا پر چمکے اس کی ملت، ملت ابراہیمی کہلائے اور دنیا میں خدا کا سب سے پہلا گھر (کعبہ) پھر قبلہ عالم اور مرکز کائنات ہے۔

ادھر حضرت حق کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے مگر دوسری جانب دنیا کی ایک حقیر ہستی یمن اور حبشہ کی فانی حکومت کے زعم میں یہ چاہتی ہے کہ مرکز توحید اور کعبہ ملت حق "بیت اللہ" کو برباد کر کے اور صفحہ ہستی سے مٹا کر مرکز تثلیث صنعاء کے "القلیس" کو کائنات انسانی کا قبلہ مقصود اور کعبہ محمود بنائے اور اس طرح توحید خالص کی جگہ تثلیث کی شرک پرستی کو فروغ دے وہ سمجھتا ہے کہ میری فوج گراں

* کتب سیر میں راجح قول یہ ہے کہ یہ واقعہ ولادت باسعادت سے پچاس روز قبل پیش آیا۔

Marfat.com

شوکت و ہیبت کے مقابلہ سے سارا عرب عاجز و درماندہ ہے اور وہ یقین رکھتا ہے کہ مہیب ہاتھیوں کا یہ لشکر جب "کعبۃ اللہ" کو منہدم کرنے کے لیے آگے بڑھے گا تو خدا کے اس گھر کو کوئی نہ بچا سکے گا اس لیے وہ کر وفر اور ہیبت و عظمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یمن سے چلتا ہے اور راہ میں جو قبائل مزاحمت کرتے ہیں ان کو پامال کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے سردار قریش عبدالمطلب جب اس کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو وہ اپنے غرور و نخوت کے ساتھ یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ ہمارا مقصد قریش سے نبرد آزما ہونا نہیں ہے بلکہ کعبہ کا انہدام و فنا مقصود ہے۔ عبدالمطلب اچھوتے اور عبرت آموز انداز میں اپنی بے چارگی اور تاب مقاومت سے معذوری کا اظہار کر کے کعبہ کو رب کعبہ کے سپرد کر کے قریش سمیت ابرہہ کی راہِ مزاحمت سے ہٹ جاتے ہیں۔

اب مقابلہ انسانوں کا انسانوں سے نہیں ہے بلکہ فرعون صفت اور ہامان نمط انسانی طاقت خدا کی طاقت سے ٹکرانا چاہتی ہے یہاں انسانی مقاصد دوسرے انسانوں کے مقاصد سے متصادم نہیں ہیں بلکہ حضرت حق کے مقصد پاک سے ایک ناپاک ہستی کا ارادہ ناپاک تصادم چاہتا ہے پھر نتیجہ کیا نکلا وہی جو ہونا چاہیے تھا کہ خدا کی معجزانہ قدرت کے سامنے انسانی قوت پاش پاش ہو کر رہ گئی اور اصحاب الفیل کا مقصد شر حضرت حق کے مقصد خیر کے مقابلہ میں ﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝﴾ کا مصداق بن کر رہ گیا۔

آج نہ اصحاب الفیل کا نام و نشان باقی ہے اور نہ اقلیس صنعاء کا اور نہ وہ قریش مکہ ہی باقی ہیں جن کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا تھا لیکن قبلہ توحید اور مرکز صداقت "کعبۃ اللہ" اسی طرح اپنی عظمت و جلالت کے ساتھ قائم و دائم ہے اور آج بھی قرآن عزیز اس کی رفعت شان کا ببانگ دہل یہ اعلان کر رہا ہے

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (آل عمران: ۹۶)

"بیشک سب سے قدیم وہ گھر جو انسان کی "خدا پرستی" کے لیے بنایا گیا۔ یقیناً وہ ہے جو مکہ میں ہے جو سراسر مبارک اور جہانوں کے لیے (مرکز) ہدایت ہے۔"

⑤ سورۂ الفیل کے مطالعہ سے دو باتیں صاف طور پر سمجھ آ جاتی ہیں۔

ایک یہ کہ اس سورۃ میں ایک متمرد اور سرکش جماعت کی ہلاکت کا عبرت آموز واقعہ مذکور ہے۔

دوسری یہ کہ اس واقعہ سے منجانب اللہ، کعبۃ اللہ کی حرمت و عظمت کی حفاظت کا بصیرت افروز نتیجہ نکلتا ہے۔

اب رہا یہ امر کہ اس واقعہ کے بیان کرنے سے جو غرض و غایت ہے وہ اپنے اندر کیا اسرار و حکم محفوظ رکھتی ہے تو اگرچہ خدا کی حکمتوں کا احاطہ انسانِ فانی کے حیلہ امکان سے باہر ہے تاہم بنظر استحسان دو حکمتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔

(الف) یہ واقعہ ولادت باسعادت (ﷺ) کے لیے ایک زبردست "نشان" کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کہ نظام قدرت کے ابھرے ہوئے نقوش ہم کو یہ خبر دیتے ہیں کہ اس کارگہ عالم میں جب بھی کوئی عظیم انقلاب بپا ہوتا ہے تو اس کے وجود سے قبل ضرور ایسے آثار اور ایسی علامات ظاہر ہوتی ہیں کہ جن کو دیکھ کر عبرت نگاہ اور حقیقت آگاہ انسان آنے والے انقلاب کا اندازہ کر لیتا ہے اور انسان ہی نہیں بلکہ حضرت حق نے حیوانات تک میں احساس جزئیات کا ایسا ملکہ ودیعت کیا ہے کہ طوفانِ باد و باراں اور بھونچال جیسے حوادث کا پتہ صرف علامات و آثار سے پا لیتے اور وقت سے قبل ہی اپنے اضطراب و کرب کے ذریعہ دور رس

Marfat.com

انسانوں کو ان حقائق کا علم کرا دیتے ہیں۔

دور نہ جایئے روزانہ ہونے والے انقلاب ہی کو دیکھئے اور اس سے اس حقیقت کی صداقت کو وزن کیجئے شب دیجور کی حیات چند ساعت کا جب پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور طلوع آفتاب عالمتاب کی وجہ سے اس کو پیام مرگ مل جاتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ رات کے آخری کنارہ پر پہنچ کر وہ کائنات کو اپنے رخ روشن کا جلوہ دکھا دیتا ہو بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اول اُفق مشرق میں سفیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ تاریکی کو روشنی سے بدلتا جاتا ہے اس وقت ہر ذی ہوش یہ سمجھ جاتا ہے کہ خورشید خاور کی تنویر کا وقت آ پہنچا گو نیند کے ماتے شب تاریک کی مرگ ناگہانی اور سفیدۂ صبح کی منادی طلوع آفتاب سے غافل ہوئے پڑے رہتے ہیں لیکن مرد باہوش اس علامت کو دیکھ کر روز روشن کی آمد کا پتہ لگا لیتے ہیں اور خواب غفلت سے بیدار ہو جاتے ہیں تا کہ آفتاب عالمتاب کی ضوء فشانی سے قبل ہی خود کو اس کے خیر مقدم کے لائق بنا سکیں۔

عالم مادی کے اس انقلاب کی طرح عالم روحانیات میں بھی "سنت اللہ" اسی طرح جاری و ساری ہے کیونکہ تمام عالمین کا "رب" ایک ہی وحدہ لاشریک لہ ہستی ہے اس لیے ہر عالم کے لیے اس کے نوامیس وقوانین میں بھی وحدت اور یکسانیت جلوہ گر ہے۔

کائنات روحانی میں عالم مادی کے وجود ہی سے یہ انقلاب تو ہوتا ہی رہا جو نہی توحید الٰہی کی روشنی پر کفر وشرک کی تاریکی نے غلبہ پایا ناموس الٰہی نے کسی روشن ستارہ یا قمر یا لیلۃ البدر کے ذریعہ اس ظلمت کو کافور کر دیا لیکن ابھی عالم ایسی روشنی کا طلبگار تھا کہ اس کے طلوع کے بعد روشنی اور تاریکی کا فرق اس طرح نمایاں ہو جائے کہ پھر کبھی ظلمت کفر نور توحید پر اس طرح نہ چھا سکے کہ سراب اور آب حیات کے درمیان امتیاز مشکل ہو جائے ہاں اگر روز روشن کی موجودگی میں بھی کسی شپر کو آفتاب کی روشنی نظر نہ آئے تو یہ ایک جدا بات ہے کہ قصور کس کا ہے، آفتاب کا یا شپرہ چشم کا؟

غرض جب وہ وقت قریب آ پہنچا کہ نبوت و رسالت کا آفتاب عالمتاب (محمد ﷺ) طلوع ہوا اور شرک و کفر کے پردہ ہائے ظلمت ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ چاک کر دیئے جائیں تو آسمان و زمین میں سفیدۂ صبح سعادت کے ایسے آثار و علائم نمودار ہونے لگے کہ چشم حق میں اور دلِ حق آگاہ نے یہ محسوس کر لیا کہ عنقریب عالم روحانیت میں عظیم الشان انقلاب بپا ہونے والا اور وہ وقت آنے والا ہے کہ داستان شب سرد پڑ جائے گی اور حقیقت کا آفتاب چمک اٹھے گا اور دل و زبان یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم　　　چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

عالم روحانیات کا یہ سراج منیر ✿ ظاہر ہے کہ سرزمین مکہ سے طلوع ہونے والا تھا اور اس کی دعوت عام کا محور و مرکز یہی مقدس مقام بننے والا تھا جہاں عبادت الٰہی کا سب سے پرانا گھر "کعبۃ اللہ" قبلہ عالم و عالمیان تھا پس ایسے عظیم الشان انقلاب کے وقت کفر وشرک کی ظلمت شب نے ایک آخری سہارا لیا اور نورِ آفتاب پر غالب آنے کی کوشش کی، یہی وہ منظر تھا جو ابرہہ اور اس کے لشکر اصحاب فیل کی بدولت دنیا کے اس پردۂ متحرک پر نظر آیا کہ کسی طرح مرکز توحید "کعبۃ اللہ" کو برباد کر کے تثلیث "القلیس" کو مرجع خلائق اور مرجع عبادت بنا دیا جائے تا کہ ظلمت شرک ایسا فروغ پائے کہ طلوع آفتاب کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔

مگر قدرت کے منشاء کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی اور خدا کے ارادہ پر کوئی ہستی غالب نہیں آ سکتی لہٰذا دنیا نے دیکھا کہ یہ منظر

✿ قرآن کے مادی آفتاب کو بھی سراج ہی کہا ہے ﴿وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا﴾ اس لئے روحانی آفتاب کو بھی سراج منیر کہا ہے۔

Marfat.com

بہت جلد ہی آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور تھوڑے سے عرصہ کے بعد ہی رسالت و نبوت کے آفتاب عالمتاب نے روشن ہو کر ساری کائنات الٰہی کو منور کر دیا۔

تو اب کہنا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت سے قبل جو "نشان" ظہور میں آئے اور صبح سعادت کے لیے آثار و علامات کہلائے ان ہی میں سے "اصحاب فیل" کا واقعہ بھی ایک زبردست "نشان اور عظیم المرتبت" علامت ہے۔

(ب) اس واقعہ کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے قریش کو اپنا بہت بڑا احسان یاد دلایا ہے کہ وہ یہ نہ بھول جائیں کہ جس وقت وہ "کعبہ" کی عظمت کے قائل ہونے کے باوجود ابرہہ (اصحاب فیل) کے اس مقابلہ سے عاجز رہے تھے جس میں اس نے "کعبہ" کی بربادی کا بیڑا اٹھایا تھا اس وقت ہم نے اپنی قدرت کاملہ کے "نشان اعجاز" سے وہ کر دکھایا کہ دشمن کی شر آمیز تدبیر اور اس کا ارادۂ بد دونوں خاک میں مل کر رہ گئے۔

کیا تم نے اس عبرت زا واقعہ سے یہ سبق حاصل نہیں کیا کہ یہ سب کچھ تمہاری خوشنودی کے لیے نہیں تھا جب کہ تم شرک کی تاریکیوں میں غرق اور کفر کی آلودگیوں میں ملوث تھے بلکہ "کعبہ" کی اس عظمت کی بقاء کے لیے تھا جس کی تعمیر بوڑھے پیغمبر ابراہیم علیہ السلام اور جواں پیغمبر اسماعیل علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی اور جس کے متعلق انہوں نے یہ فرمایا:

﴿رَبَّنَآ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ﴾ (ابراھیم: ۳۷)

"اے میرے پروردگار میں نے بسایا ہے اپنی بعض اولاد کو بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے باعزت و حرمت والے گھر کے پاس۔"

اور اس حرم مقدس کی خاطر جس کے لیے ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی:

﴿وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰہِیۡمُ رَبِّ اجۡعَلۡ ہٰذَا الۡبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجۡنُبۡنِیۡ وَ بَنِیَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ ۝۳۵﴾ (ابراھیم: ۳۵)

"(وہ وقت یاد کرو جب جب ابراہیم علیہ السلام نے) کہا اے میرے پروردگار تو اس شہر مکہ کو امن والا کر دے اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے بچا کہ ہم بت پرستی میں مبتلا ہوں۔"

آج پھر وہ وقت ہے کہ خدا کا پیغمبر محمد ﷺ کعبہ کی حقیقی عظمت قائم کرتا اور اس کو بتوں اور بت پرستی کی تلویث سے پاک کرنا چاہتا ہے مگر تم ان کو اور مسلمانوں کو ضعیف اور کمزور سمجھ کر اور اپنی قوت کے غرور اور گھمنڈ میں اکڑ کر آڑے آ رہے ہو تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس ذات نے "اصحاب فیل" کے کبر و غرور کو خاک میں ملا دیا تھا وہ تمہارے غرور کا بھی یہی حشر نہیں کر سکتا؟ سمجھو اور معاملہ کی حقیقت پر غور کرو اور پیغمبر خدا ﷺ کی مخالفت سے باز آ جاؤ۔

اس بات کی تائید سورۃ الفیل سے متصل سورۃ القریش سے بھی ہوتی ہے اس لیے کہ اس سورۃ میں قریش کو یہ توجہ دلائی گئی ہے یا ان پر اپنے اس احسان کو ظاہر کیا گیا ہے کہ عرب قبائل کے باہم بات بات پر جنگ و جدل اور معمولی معمولی معاملہ پر حرب و ضرب کے باوجود وہ حرم مکہ میں کس طرح مامون و محفوظ ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ اس کی خدمت کے انتساب کی وجہ سے حرم سے باہر بھی سردی اور گرمی دو موسموں میں اپنے محبوب تجارتی سفروں میں شام اور یمن تک بے خوف و خطر آتے جاتے ہیں اور کوئی آنکھ اٹھا کر بھی ان کی جانب دیکھنے نہیں پاتا۔

تو کیا وہ اس احسان کے شکر گزار نہیں ہوتے اور حرم اور کعبہ کی حقیقی عظمت کو سربلند کرنے کے لیے خدا کا آخری پیغمبر ﷺ تم کو جس صداقت کی جانب بلاتا ہے اس پر لبیک کہنے کو تیار نہیں ہوتے ان کے لیے یہ بات ہرگز زیبا نہیں دیتی۔

Marfat.com

﴿فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝﴾ (القریش: ۳-۴)

"پس ان کو چاہیے کہ وہ اس گھر کے پروردگار کی سچی پرستش کریں کہ جس نے ان کی بھوک کے لیے سامان رزق بہم پہنچایا اور ان کو خوف وخطر سے مامون ومحفوظ کر دیا۔"

(۶) ابرہہ مذہباً عیسائی تھا اور اس لیے وہ بیت اللہ "کعبہ" کی عظمت کو کسی طرح برداشت نہیں کرتا تھا اور اس کا وجود گویا ایک خار تھا جو کانٹے کی طرح اس کے دل میں کھٹک رہا تھا اس نے سوچا کہ "کعبہ" معمولی پتھروں کی ایک سادہ عمارت ہے اگر اس کے مقابلہ میں ایک ایسی خوبصورت اور بے نظیر عمارت بشکل کلیسا (گرجا) تیار کی جائے جو بیش قیمت پتھروں اور جواہرات سے مزین ہو تو اس طرح میں سارے عرب کی توجہ "کعبہ" سے ہٹا سکوں گا اور اس جدید "معبد" کو مرجع خلائق بنا سکوں گا یہ سوچ کر ایک طرف اس نے یمن کے دارالحکومت صنعاء میں ایک بے نظیر گرجا "القلیس" بنوایا اور دوسری جانب ایک معمولی واقعہ کو حیلہ بنا کر کعبہ کی بربادی کا تہیہ کیا نتیجہ جو کچھ ہوا مفصل مذکور ہو چکا لیکن اس واقعہ میں اس جانب اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ عیسائیوں کو ہی اس بیت اللہ "کعبہ" کے ساتھ عداوت رہے گی اور وہ اپنے غیر متمدن اور متمدن ہر زمانہ میں اس کے خلاف اپنی عداوت کا اظہار کرتے رہیں گے اور ہمیشہ اس مرکز توحید کے درپے رہیں گے، چنانچہ تاریخ ماضی اس کی شاہد ہے کہ جب کبھی نصاریٰ کو اس کا موقع میسر آیا انہوں نے عملاً اپنی عداوت کا اظہار کیے بغیر نہ چھوڑا اور اگرچہ خدائے تعالیٰ نے اس سلسلہ میں ہمیشہ ان کے ارادوں کو ناکام رکھا مگر وہ بہرحال اپنے قلبی بغض وحسد کا ثبوت دیے بغیر نہیں رہے۔

(۶) "کعبہ" بیت اللہ یعنی "خدا کا گھر" کہلاتا ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ "العیاذ باللہ" اللہ تعالیٰ کسی گھر میں ساکن ہے یا وہ گھر کا محتاج ہے بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ اس نے اپنی خالص عبادت کی غرض سے اقطاع وامصار کے مسلمانوں اور سچے عبادت گزاروں کے لیے کعبہ کو مرکز ومحور بنایا ہے اور یہ اس لیے کہ جب کہ خدائے تعالیٰ جہات سے وراء الوراء اور پاک ہے اور انسان اپنے ہر کام میں جہات میں سے کسی جہت کا محتاج تو از بس ضروری تھا کہ تمام کائنات کے پیروان توحید اور عبادت گزاران رب العالمین کی عبادت اور ان کی حیات ملی ودینی کے لیے ایک مرکز ہوتا کہ وہ انتشار اور تفرق وتشتت سے محفوظ رہیں اور وحدت اجتماعی کا سبق سیکھیں۔

لہٰذا اس کے لیے وہ مقدس عمارت "شعائر اللہ" قرار دی گئی جس کو مجدد انبیاء ورسل ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مقدس بیٹے اسماعیل علیہ السلام نے دنیا میں سب سے پہلے صرف خدائے واحد کی پرستش کے لیے تعمیر کیا تھا اور جو توحید کے اعلان کی سب سے پرانی یادگار تھی

﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝﴾

"جو لوگ اللہ کی نشانیوں کی عظمت کریں گے تو یہ ان کے دل کی پرہیزگاری کی دلیل ہے۔"

پس کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کعبہ کی اس لیے عظمت کرے کہ وہ "صنم" ہے یا خود قابل پرستش ہے اس لیے کہ جو ایسا سمجھے گا وہ مسلمان نہیں بلکہ مشرک کہلائے گا۔ بلکہ اس کی حرمت صرف اس لیے ہے کہ وہ "شعائر اللہ" ہے اور مرکز توحید، چنانچہ اسی حقیقت کو ایک عارف باللہ نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔ ؎ قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝﴾

Marfat.com

قصص القرآن

جلد چہارم

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے واقعات وحالات کا مُبصرانہ اور محققانہ بیان

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

تخریج و تصحیح

مولانا محمد عرفان فاضل جامعہ مدنیہ، لاہور

مکتبہ رحمانیہ

اقرا سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

فہرست مضامین (جلد چہارم)

پیش لفظ ... ۶

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

قرآن عزیز اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ... ۷
عمران وحنہ ... ۹
مریم علیہا السلام کی ولادت ... ۱۰
حنہ اور ایشاع ... ۱۲
مریم علیہا السلام کا زہد وتقویٰ ... ۱۳
کیا عورت نبی ہوسکتی ہے؟ ... ۱۴
نبوۃ النساء اور ابن حزم ... ۱۵
کیا حضرت مریم علیہا السلام نبی ہیں؟ ... ۲۰
آیت ﴿وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کا مطلب ... ۲۰
حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بشارات کتب سابقہ ... ۲۲
ولادت مبارک ... ۲۴
بشارات ولادت ... ۲۹
حلیہ مبارک ... ۲۹
بعثت ورسالت ... ۳۰
آیات بینات ... ۳۲
ق توجیہات اور حقیقت معجزات ... ۳۵
رت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی تعلیمات کا خلاصہ ... ۴۷
اری عیسیٰ علیہ السلام ... ۴۸
ی عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن وانجیل کا موازنہ ... ۴۹
نزول مائدہ ... ۵۱
"رفع الی السماء" یعنی زندہ آسمان پر اٹھالیا جانا ... ۵۵
قادیانی تلبیس اور اس کا جواب ... ۶۶
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع سماوی اور چند جذباتی باتیں ... ۷۵
وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کی تفسیر ... ۷۶
حیات عیسیٰ علیہ السلام ... ۷۸
لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ... ۷۸
حیاۃ ونزول عیسیٰ علیہ السلام اور احادیث صحیحہ ... ۸۲
حیات ونزول مسیح علیہ السلام کی حکمت ... ۸۸
واقعات نزول صحیح احادیث کی روشنی میں ... ۹۵
وفات مسیح علیہ السلام ... ۹۷
وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ... ۹۷
فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ... ۱۰۳
حضرت مسیح کی دعوت اصلاح اور بنی اسرائیل کے فرقے ... ۱۰۶
اناجیل اربعہ ... ۱۰۷
قرآن اور انجیل ... ۱۱۱
انجیل اور حواری عیسیٰ علیہ السلام ... ۱۱۴
حضرت مسیح علیہ السلام اور موجودہ مسیحیت ... ۱۱۶
تثلیث؟ ... ۱۱۶
ازمنہ مظلمہ اور اصلاح کنیسہ کی آواز ... ۱۲۰
قرآن اور عقیدہ تثلیث ... ۱۲۲
حضرت مسیح علیہ السلام خدا کے مقرب اور برگزیدہ رسول ہیں ... ۱۲۲

Marfat.com

حضرت مسیح علیہ السلام نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۲۳
لائق توجہ بات ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۲۷
کفارہ ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۲۷

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۲۹
بشارات النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۳۴
تورات اور بشارات ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۳۹
صبح سعادت ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۵۴
تاریخ ولادت کی تحقیق ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۵۶
نسب مبارک ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۵۸
یتیمی ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۶۱
بت پرستی سے نفرت، خلوت پسندی اور عبادت الٰہی کا ذوق ۔۔ ۱۶۴
حقیقت وحی ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۶۵
صاحب وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۷۵
بعثت ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۷۷
حدیث بخاری اور بعض مستشرقین کی کوتاہ اندیشی ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۷۹
بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۸۱
نبی اور مصلح ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۸۶
کیفیت وحی ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹۱
کیفیت وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹۳
نزول وحی کا پہلا دور ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹۴
نزول وحی کا دوسرا دور ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹۵
اعلانِ دعوت وارشاد کی پہلی منزل ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹۶
دعوت وارشاد کی دوسری منزل ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹۷
بعثت عامہ ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹۸
دعوت اسلام کا مجمل خاکہ اور حضرت جعفرؓ کی تقریر ۔۔۔۔ ۱۹۹
قرآن اور تجدید دعوت ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۰۰
توحید ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۰۲
رسالت ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۰۴
یوم آخرت ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۰۵
اسراء (معراج) ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۱۰
واقعہ کی وحدت ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۱۰
تحقیق تاریخ وسنہ ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۱۱
قرآن عزیز اور واقعہ معراج ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۱۱
احادیث اور واقعہ معراج کا ثبوت ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۱۲
واقعہ کی نوعیت ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۱۲
واقعہ معراج واسراء اور قرآن عزیز ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۱۲
سورۂ بنی اسرائیل اور واقعہ معراج ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۱۳
والنجم اور واقعہ معراج ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۱۹
واقعہ کی تفصیلات ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۲۲
معراج میں رویت باری ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۲۴
ہجرت ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۲۵
ہجرت حبش ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۲۵
ہجرت مدینہ کے اسباب ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۲۶
ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۲۷
دارالندوہ ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۲۷
قرآن عزیز اور ہجرت مدینہ ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۲۸
ہجرت؟ ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۲۹
ختم نبوت ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۳۱
غزوۂ بدر ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۴۵
غزوہ ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۴۵
بدر ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۴۵
واقعہ ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۴۵
دعائے نصرت ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵۱
غیبی نصرت وامداد ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵۱

نتیجہ جنگ ۲۵۲
جنگ بدر نے تاریخ عالم کا رخ بدل دیا ۲۵۳
قرآن عزیز کی روشنی میں غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر ۲۵۳
غزوۂ اُحد ۲۶۹
اُحد ۲۶۹
غزوۂ اُحد ۲۶۹
حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت ۲۷۱
قرآن عزیز اور غزوۂ اُحد ۲۷۱
غزوۂ احزاب (غزوۂ خندق) ۲۷۳
قرآن عزیز اور غزوۂ احزاب ۲۷۵
واقعہ حدیبیہ ۲۷۶
بیعت رضوان ۲۷۷
معاہدۂ صلح ۲۷۸
الفتح الاعظم ۲۸۰
حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ۲۸۱
بت شکنی ۲۸۴
رحمۃ اللعالمین کی شان ۲۸۴
خطبہ ۲۸۵
فتح مکہ اور قرآن عزیز ۲۸۶
غزوۂ حنین ۲۸۸
غزوۂ حنین اور قرآن حکیم ۲۸۹
غزوہ تبوک اور قبول توبہ کا عجیب واقعہ ۲۹۰
مالی استعانت ۲۹۰
عذر خواہی ۲۹۱
معاشرتی مقاطعہ ۲۹۱
ضبط و نظم کی عدیم النظیر مثال ۲۹۲
عشق رسول اور صداقت اسلام کا حیرت انگیز معیار ۲۹۲
قبول توبہ اور سورۂ توبہ ۲۹۴
قرآن عزیز اور غزوۂ تبوک ۲۹۴
اہم غزوات اور نتائج و بصائر ۲۹۵
بدر الکبریٰ ۲۹۵
غزوۂ اُحد ۲۹۵
غزوۂ احزاب ۲۹۷
صلح حدیبیہ ۲۹۸
فتح مکہ ۲۹۹
غزوۂ حنین ۲۹۹
غزوۂ تبوک ۳۰۰
تبنی ۳۰۱
حضرت زید رضی اللہ عنہ ۳۰۱
انسداد تبنی ۳۰۳
خرافی داستان ۳۰۴
حاصل کلام ۳۰۶
بصائر ۳۰۷
بنونضیر ۳۰۸
قرآن عزیز اور بنونضیر ۳۰۹
بصائر ۳۰۹
واقعہ افک ۳۱۰
موعظت ۳۱۲
نباء فاسق ۳۱۳
موعظت ۳۱۴
مسجد ضرار ۳۱۵
موعظت ۳۱۶
وفات یا وصل بالرفیق الاعلیٰ ۳۱۷
عبرت و موعظت ۳۱۹

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا.

وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مُحَمَّدِنِ الْمَبْعُوْثِ كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا.

امابعد! خدائے تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ آج قصص القرآن کی تالیف اپنی آخری منزل پر پہنچ کر کامیابی کے ساتھ مکمل ہو گئی، میں کیا اور میری لیاقت اور میرا قلم کیا؟ یہ جو کچھ بھی خدا کے فضل اور قرآن حکیم کی برکت کی بدولت ہوا۔ فالحمد للہ علی ذالك۔

یہ جلد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و دعوت اور حیات طیبہ اور دیگر مباحث متعلقہ پر مشتمل، اور پہلی تین جلدوں کی خصوصیات و امتیازات کی حامل ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقدس حالات میں خصوصیت کے ساتھ وہ مباحث لائق مراجعت ہیں جو قرآن حکیم کے حکیمانہ دلائل و براہین کی روشنی میں "حیات عیسیٰ علیہ السلام" سے متعلق ہیں یا عہد قدیم و عہد جدید (توراۃ و انجیل) کے مضامین الٰہیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "حیات طیبہ" تو وہ مخدوم شے ہے کہ از سلف تا خلف مسلسل ہر زندہ زبان اس خدمت پاک کو اپنا فرض یقین کرتی اور ادائے فرض سے سبکدوشی کا شرف حاصل کرتی رہی ہے۔ خصوصاً عربی زبان کے بعد اُردو زبان میں اس خدمت نے بہترین ذخیرہ پیش کر دیا ہے۔ اور مختصر، متوسط مطول ہر نوع کی تالیفات اس سلسلہ میں موجود ہیں اس لیے اس تالیف میں کوشش کی گئی ہے کہ صرف ان ہی واقعات کو سپرد قلم کیا جائے جن کا قرآن حکیم سے براہِ راست تعلق ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر شعبہ حیات قرآن حکیم کی جیتی جاگتی تصویر، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر اسوۂ حسنہ آیات قرآن کی تفسیر ہے۔

قصص القرآن کی تالیف اپنی افادیت اور مقصد تالیف کے لحاظ سے کیا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا فیصلہ ارباب ذوق کی نگاہ بصیرت کے سپرد ہے..... خدائے تعالیٰ سے دست بدعاء ہوں کہ وہ اس خدمت کو قبول فرمائے۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ وَهُوَ حَسْبِيْ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ○

خادم ملت

محمد حفظ الرحمٰن صدیقی کان اللہ لہ

۹ صفر المظفر ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۳ جنوری ۱۹۴۶ء

Marfat.com

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

○ قرآن اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ○ عمران وحنہ ○ مریم علیہا السلام کی ولادت ○ حنہ اور ایشاع الیشبع ○ مریم علیہا السلام کا زہد وتقویٰ ○ مقبولیت خداوندی ○ کیا عورت نبی ہوسکتی ہے؟ ○ نبوت النساء اور ابن حزم ○ آیت ﴿وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ○ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بشارات کتب سابقہ ○ ولادت مبارک ○ بشارات ولادت ○ حلیہ مبارک ○ بعثت ورسالت ○ آیات بینات لائق توجہ بات اور حقیقت معجزات ○ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا خلاصہ ○ حواری (عیسیٰ) علیہ السلام ○ حواری عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن وانجیل کا موازنہ ○ نزول مائدہ ○ رفع الی السماء یعنی زندہ آسمان پر اٹھالیا جانا ○ قادیانی تلبیس اور اس کا جواب ○ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع سماوی اور چند جذباتی باتیں ○ قادیانی کی ایک کذب بیانی ○ حیات عیسیٰ علیہ السلام ○ ﴿لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾ تفسیر بالرائے کی نمایاں مثال ○ ﴿وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ ..... مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ..... وَرَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ ○ حیات عیسیٰ علیہ السلام اور احادیث صحیحہ ○ احادیث حیات ونزول ○ حیات مسیح علیہ السلام اور اجماع امت ○ حیات ونزول مسیح علیہ السلام کی حکمت ○ واقعات نزول صحیح احادیث کی روشنی میں ○ وفات مسیح علیہ السلام ﴿وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ﴾ نبی صادق ومتنبی کاذب ○ حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت اصلاح ○ بنی اسرائیل کے فرقے ○ اناجیل اربعہ ○ قرآن اور انجیل ○ انجیل اور حواری عیسیٰ علیہ السلام ○ حضرت مسیح علیہ السلام اور موجودہ مسیحیت ○ تثلیث؟ باپ، بیٹا، روح القدس ازمنہ مظلمہ اور اصلاح کلیسہ کی آواز ○ حضرت مسیح علیہ السلام خدا کے مقرب رسول ہیں ○ حضرت مسیح نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے ○ لائق توجہ بات ○ کفارہ؟

قرآن عزیز اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں، اور جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ورسل ہیں اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام خاتم الانبیاء بنی اسرائیل ہیں، اور جمہور کا اس پر اجماع ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا، اور درمیان کا یہ زمانہ جس کی مدت تقریباً پانچ سو ستر سال ہے۔ فترۃ (انقطاع وحی) کا زمانہ رہا ہے۔

Marfat.com

عیسیٰ علیہ السلام کی جلالت قدر اور عظمت شان کا ایک امتیازی نشان یہ بھی ہے کہ اگر انبیاء بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت و رسالت کا مقام امامت حاصل ہے تو عیسیٰ علیہ السلام مجدد انبیاء بنی اسرائیل ہیں، اس لیے کہ قانون ربانی (تورات) کے بعد بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے انجیل (بائبل) سے زیادہ عظیم المرتبہ دوسری کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انجیل کا نزول قانون تورات کی تکمیل ہی کی شکل میں ہوا ہے یعنی نزول تورات کے بعد یہود نے جو قسم قسم کی گمراہیاں دین حق میں پیدا کر لی تھیں انجیل نے توراۃ کی شارح بن کر بنی اسرائیل کو ان گمراہیوں سے بچنے کی دعوت دی اور اس طرح تکمیل تورات کا فرض انجام دیا اور بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فراموش شدہ پیغام ہدایت عیسیٰ علیہ السلام ہی نے دوبارہ یاد دلایا اور تازہ بارانِ رحمت کے ذریعہ اس خشک کھیتی کو دوبارہ زندگی بخشی۔ مزید برآں یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام سرور کائنات محمد ﷺ کے سب سے بڑا مناد اور مبشر ہیں اور ہر دو مقدس پیغمبروں کے درمیان ماضی اور مستقبل دونوں زمانوں میں خاص رابطہ اور علاقہ پایا جاتا ہے۔ ❶

قرآن عزیز نے نبی اکرم ﷺ کی مماثلت کے سلسلہ میں جن پاک ہستیوں کے واقعات سے بہت زیادہ بحث کی ہے ان میں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) کی مقدس ہستیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت قرآن کے "تذکیر بایام اللہ" میں اس لیے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ جس دین قویم اور ملت بیضاء کا عروج و کمال محمد ﷺ کی تقدیس کے ساتھ وابستہ تھا اور جس ملت کی دعوت و تبلیغ کا محور و مرکز ذات اقدس ﷺ بننے والی تھی وہ ملت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے موسوم ہے ﴿مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ﴾ کیونکہ یہی وہ بوڑھے پیغمبر ہیں جنھوں نے شرک کے مقابلہ میں سب سے پہلے توحید الٰہی کو حنیفیت کا لقب دیا اور آئندہ ہمیشہ کے لیے خدا کی راہ مستقیم کے لیے "ملة حنیفیه" کا امتیاز قائم کر دیا، یعنی جو خدا کی پرستش کے لیے مظاہر کائنات کی پرستش کو وسیلہ بناتا ہے "وہ مشرک" ہے اور جو خالق کائنات کی یکتائی کا قائل ہو کر براہِ راست اسی کی پرستش کرتا ہے وہ "حنیف" ہے۔ پس اس مقدس پیغمبر نے خدا پرستی کے اس حقیقی تصور کو عملی حیثیت میں اس درجہ نمایاں کیا کہ مستقبل میں ادیان حق کے لیے اس کی پیروی حق و صداقت کا معیار بن گئی اور خدائے برتر کی جانب سے قبولیت کا یہ شرف عطاء ہوا کہ یہ مقدس پیغمبر کائنات رشد و ہدایت کا امام اکبر اور مجدد اعظم قرار دیا گیا:

﴿فَاتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا ؕ﴾ (آل عمران: ۹۵)

"پس پیروی کرو ابراہیم کی ملت کی، جو سب سے کٹ کر صرف خدا کی جانب جھکنے والا ہے۔"

﴿مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ هُوَ سَمّٰٮكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۙ مِنۡ قَبۡلُ وَفِىۡ هٰذَا﴾ (الحج: ۷۸)

"یہ ملت ہے تمہارے باپ ابراہیم کی، اس نے تمہارا نام "مسلم" رکھا نزول قرآن سے قبل اور اس قرآن میں بھی تمہارا نام "مسلم ہے"۔

اور موسیٰ علیہ السلام کی مقدس زندگی کا تذکرہ اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ ان کی دعوت و تبلیغ کے واقعات یعنی قوم کی جہالت و نافرمانی، دشمنانِ خدا سے نبرد آزمائی پیہم مصائب و آلام پر صبر و استقلال کا دوام و ثبات، اور اسی قسم کے دوسرے کوائف و حالات میں ان کے اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان بہت زیادہ مشابہت و مناسبت پائی جاتی ہے اور اس لیے وہ واقعات و حالات، قبول و انکار حق

❶ تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

Marfat.com

اوران سے پیدا شدہ نتائج کے سلسلہ میں بصیرت وعبرت کا سامان مہیا کرتے اور نظائر وشواہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کی حیات طیبہ کا مقدس ذکر مسطورہ بالا خصوصیات وامتیازات کی بناء پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔

غرض قرآن عزیز نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات وواقعات کو بسط وتفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان کی حیات طیبہ کے دیباچہ کے طور پر ان کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کے واقعات زندگی کو بھی روشن کیا ہے تاکہ قرآن کا مقصد "تذکیر بایام اللہ" پورا ہو۔

یہ ذکر پاک قرآن عزیز کی تیرہ سورتوں میں ہوا ہے، ان میں سے کسی جگہ نام مبارک عیسیٰ (یسوع) سے یاد کیا گیا ہے اور کسی جگہ "مسیح علیہ السلام" اور عبداللہ کے لقب سے اور کسی مقام پر کنیت "ابن مریم" کے اظہار کے ساتھ۔

نقشہ ذیل اس حقیقت کا کاشف اورارباب مطالعہ کی بصیرت کے لیے مدومعاون ہے:

شمار	سورہ	آیات	عیسیٰ	مسیح	عبداللہ	ابن مریم	تعداد آیات
۱	البقرہ	۲۵۳،۱۳۸،۱۳۷،۱۳۶،۸۷	۳	۰	۰	۲	۵
۲	آل عمران	۹۴،۶۴،۴۲	۵	۱	۰	۱	۲۴
۳	النساء	۱۷۲،۱۷۱،۱۵۹،۱۵۶	۳	۳	۰	۲	۶
۴	المائدہ	۱۲۰،۱۱۰،۷۸،۷۵،۷۲،۴۶،۱۷	۶	۵	۰	۱۰	۱۸
۵	الانعام	۸۵	۱	۰	۰	۰	۱
۶	التوبہ	۳۱،۲۰	۰	۱	۰	۱	۲
۷	مریم	۳۵،۱۶	۱	۱	۱	۱	۱۷
۸	المومنون	۵۰	۱	۰	۰	۱	۱
۹	الاحزاب	۸،۷	۱	۰	۰	۱	۲
۱۰	الشوریٰ	۱۳	۱	۰	۰	۰	۱
۱۱	الزخرف	۶۳،۵۷	۱	۰	۰	۱	۲
۱۲	الحدید	۲۷	۱	۰	۰	۱	۱
۱۳	الصف	۱۵،۶	۲	۰	۰	۲	۲

عمران وحنہ:

حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے حالات میں گزر چکا ہے کہ بنی اسرائیل میں عمران ایک عابد وزاہد شخص تھے اور اسی زہدوعبادت کی وجہ سے نماز کی امامت بھی ان ہی کے سپرد تھی اور ان کی بیوی حنہ بھی بہت پارساء اور عابدہ تھیں اور اپنی نیکی کی وجہ سے دونوں بنی اسرائیل میں بہت زیادہ محبوب ومقبول تھے۔ [1]

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ (آل عمران)

محمد بن اسحٰق "صاحب مغازی" نے عمران کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے:

عمران بن یاشم بن میشا بن جزقیا بن ابراہیم بن عزریا بن ناوش بن اجر بن یہودا بن ناز م بن مقاسط بن ایشا بن ایاز بن رخیعم (رحبعام) بن سلیمان بن داؤد (علیہما السلام) اور حافظ ابن عساکر نے ان ناموں کے علاوہ دوسرے نام بیان کیے ہیں اور ان دونوں بیانات میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے تاہم اس پر تمام علماء انساب کا اتفاق ہے کہ عمران حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور حنہ بنت فاقوذ بن قبیل بھی داؤد علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ ❶

عمران صاحب اولاد نہیں تھے اور ان کی بیوی حنہ بہت زیادہ متمنی تھیں کہ ان کے اولاد ہو، وہ اس کے لیے درگاہ الٰہی میں دست بدعاء اور قبولیت دعاء کے لیے ہر وقت منتظر رہتی تھیں۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حنہ صحن مکان میں چہل قدمی کر رہی تھیں، دیکھا کہ ایک پرندا اپنے بچہ کو بھرا رہا ہے، حنہ کے دل پر یہ دیکھ کر سخت چوٹ لگی اور اولاد کی تمنا نے بہت جوش مارا اور حالت اضطراب میں بارگاہِ الٰہی میں دعاء کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے اور عرض کیا "پروردگار اسی طرح مجھ کو بھی اولاد عطاء کر کہ وہ ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنے۔" دل سے نکلی ہوئی دعاء نے قبولیت کا جامہ پہنا اور حنہ نے چند روز بعد محسوس کیا کہ وہ حاملہ ہیں۔ حنہ کو اس احساس سے اس درجہ مسرت ہوئی کہ انہوں نے نذر مان لی کہ جو بچہ پیدا ہوگا اس کو ہیکل (مسجد اقصیٰ) کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گی۔ ❷

بہرحال اللہ تعالیٰ نے عمران کی بیوی حنہ کی دعاء کو شرف قبولیت بخشا اور وہ مسرت و شادمانی کے ساتھ امید بر آنے کی گھڑی کا انتظار کرنے لگیں۔

بشر بن اسحاق کہتے ہیں کہ حنہ ابھی حاملہ تھیں کہ ان کے شوہر عمران کا انتقال ہو گیا۔ ❸

مریم علیہا السلام کی ولادت:

جب مدت حمل پوری ہو گئی اور ولادت کا وقت آ پہنچا تو حنہ کو معلوم ہوا کہ ان کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی ہے، جہاں تک اولاد کا تعلق ہے حنہ کے لیے یہ لڑکی بھی لڑکے سے کم نہ تھی مگر ان کو یہ افسوس ضرور ہوا کہ میں نے جو نذر مانی تھی وہ پوری نہیں ہو سکے گی، اس لیے کہ لڑکی کس طرح مقدس ہیکل کی خدمت کر سکے گی؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے افسوس کو یہ کہہ کر بدل دیا کہ ہم نے تیری لڑکی کو ہی قبول کیا اور اس کی وجہ سے تمہارا خاندان بھی معزز اور مبارک قرار پایا، حنہ نے لڑکی کا نام مریم علیہا السلام رکھا، سریانی میں اس کے معنی ❹ "خادم" کے ہیں، چونکہ یہ ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کر دی گئیں اس لیے یہ نام موزوں سمجھا گیا۔

قرآن عزیز نے اس واقعہ کو معجزانہ اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ إِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ط

---

❶ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۵۶

❷ بنی اسرائیل کی مذہبی رسوم میں سے یہ رسم بہت مقدس سمجھی جاتی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کریں۔ البدایہ والنہایہ ج ۲۔

❸ فتح الباری ج ۲ ص ۳۶۴۔ ❹ فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۵۔

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۭ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْٓ اُعِيْذُھَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۭ

(آل عمران: ۳۳-۳۷)

"بیشک اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران ❁ کو (اپنے اپنے زمانہ میں جہاں) والوں پر بزرگی عطاء فرمائی (ان میں سے) بعض، بعض کی ذریت ہیں) اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے (وہ وقت یاد کرو جب عمران کی بیوی نے کہا: "خدایا! میں نے نذر مان لی ہے کہ میرے پیٹ میں جو (بچہ) ہے وہ تیری راہ میں آزاد ہے" پس تو اس کو میری جانب سے قبول فرما۔ بیشک تو سننے والا، جاننے والا ہے۔" پھر جب اس نے جنا تو کہنے لگی۔ "پروردگار! میرے لڑکی پیدا ہوئی ہے اور اللہ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا ہے اور لڑکا اور لڑکی یکساں نہیں ہیں (یعنی ہیکل کی خدمت لڑکی نہیں کر سکتی لڑکا کر سکتا ہے) اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے۔ اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان الرجیم کے فتنہ سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ پس مریم کو اس کے پروردگار نے بہت اچھی طرح قبول فرمایا اور اس کی نشوونماء اچھے طریق پر کی اور زکریا کو اس کا نگران کار بنا دیا۔"

حضرت مریم علیہا السلام جب سن شعور کو پہنچیں اور یہ سوال پیدا ہوا کہ مقدس ہیکل کی یہ امانت کس کے سپرد کی جائے تو کاہنوں ❁ میں سے ہر ایک نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس مقدس امانت کا کفیل مجھ کو بنایا جائے مگر اس امانت کی نگرانی کا اہل حضرت زکریا علیہ السلام سے زیادہ کوئی نہ تھا، اس لیے کہ وہ مریم علیہا السلام کی خالہ ایشاع (الیشبع) کے شوہر بھی تھے اور مقدس ہیکل کے معزز کاہن اور خدائے برتر کے نبی بھی تھے، اس لیے سب سے پہلے انہوں نے ہی اپنا نام پیش کیا مگر جب سب کاہنوں نے یہی خواہش ظاہر کی اور باہمی کشمکش کا اندیشہ ہونے لگا تو آپس میں طے پایا کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ اس کا فیصلہ کر لیا جائے۔ اور بقول روایات بنی اسرائیل تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی وہ دریا میں اپنے قلم (پورے) ڈالتے مگر قرعہ کی شرط کے مطابق ہر مرتبہ زکریا علیہ السلام ہی کا نام نکلتا، کاہنوں نے جب یہ دیکھا کہ اس معاملہ میں زکریا علیہ السلام کے ساتھ تائید غیبی ہے تو انہوں نے بخوشی اسی فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور اس طرح یہ "سعید امانت" حضرت زکریا علیہ السلام کے سپرد کر دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ مریم علیہا السلام کی کفالت کا یہ معاملہ اس لیے پیش آیا کہ وہ یتیم تھیں اور مردوں میں سے کوئی ان کا کفیل نہیں تھا بعض کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں قحط کا بہت زور تھا اس لیے کفالت کا سوال پیدا ❁ ہوا۔ لیکن یہ دونوں باتیں اگر نہ بھی ہوتیں تب بھی

❁ عمران حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام بھی ہے اور حضرت مریم علیہا السلام کے والد کا بھی یہاں والد مریم علیہا السلام مراد ہیں۔

❁ کاہنوں سے وہ مقدس ہستیاں مراد ہیں جو ہیکل میں مذہبی رسوم ادا کرتی اور خدمت ہیکل پر مامور تھیں۔

❁ تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۶۰۔

کفالت کا سوال اپنی جگہ پھر بھی باقی رہتا اس لیے کہ مریم علیہا السلام اپنی والدہ کی نذر کے مطابق "نذر ہیکل" ہو چکی تھیں اور چونکہ لڑکی تھیں اس لیے از بس ضروری تھا کہ وہ کسی مرد نیک کی کفالت میں اس خدمت کو انجام دیتیں۔

غرض زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کے صنفی احترامات کا لحاظ رکھتے ہوئے ہیکل کے قریب ایک حجرہ ان کے لیے مخصوص کر دیا تاکہ وہ دن میں وہاں رہ کر عبادت الٰہی سے بہرہ ور ہوں اور جب رات آتی تو ان کو اپنے مکان پر ان کی خالہ ایشاع کے پاس لے جاتے اور وہ وہیں شب بسر کرتیں۔ ①

حنہ اور ایشاع:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ ایشاع (الیشبع) مریم علیہا السلام کی ہمشیر تھیں اور حدیث معراج میں نبی اکرم ﷺ نے عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام کے متعلق یہ فرما کر ((وھما ابنا خالۃ)) جو رشتہ ظاہر فرمایا ہے اس سے بھی جمہور کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

لیکن جمہور کا یہ قول قرآن عزیز اور "تاریخ" دونوں کے خلاف ہے اس لیے کہ قرآن نے مریم علیہا السلام کی ولادت کے واقعہ کو جس اسلوب کے ساتھ بیان کیا ہے وہ صاف بتا رہا ہے کہ عمران اور حنہ، مریم علیہا السلام کی ولادت سے قبل اولاد سے قطعاً محروم تھیں یہی وجہ ہے کہ حنہ نے مریم علیہا السلام کی ولادت پر یہ نہیں کہا "خدایا! میرے تو پہلے بھی ایک لڑکی موجود تھی، اب تو نے دوبارہ بھی لڑکی ہی عطاء فرمائی" بلکہ درگاہِ الٰہی میں یہ عرض کیا کہ جس شکل میں میری دعا کو تو نے قبول فرمائی ہے اس کو حسب وعدہ تیری نذر کیسے کروں؟ نیز تورات اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے بھی کہیں یہ ثابت نہیں کہ عمران اور حنہ کے مریم علیہا السلام کے ماسواء کوئی اور اولاد بھی تھی بلکہ اس کے برعکس تاریخ یہود اور اسرائیلیات کا مشہور قول یہ ہے کہ ایشاع، مریم علیہا السلام کی خالہ تھیں۔

دراصل جمہور کی جانب یہ منسوب قول صرف حدیث معراج کے مسطورہ بالا جملہ کے پیش نظر ظہور میں آیا ہے حالانکہ نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ((وھما ابنا خالۃ)) وہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں، مجاز متعارف کی شکل میں ہے یعنی آپ ﷺ نے بہ طریق توسع والدہ کی خالہ کو عیسیٰ علیہ السلام کی خالہ فرمایا ہے اور اس قسم کا توسع عام بول چال میں شائع ذائع ہے۔

علاوہ ازیں ابن کثیر رحمہ اللہ کا اس کو قول جمہور کہنا بھی محل نظر ہے اس لیے کہ محمد بن اسحاق، اسحاق بن بشر، ابن عساکر، ابن جریر اور ابن حجر رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر اصحاب حدیث و سیر کا رجحان اس جانب ہے کہ ایشاع، حنہ کی ہمشیر اور مریم علیہا السلام کی خالہ ہیں، حنہ کی بیٹی نہیں ہیں۔

---

① روح المعانی سورۂ آل عمران.... مولانا آزاد ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں۔ قرآن میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ دو جگہ کیا گیا ہے، یہاں اور سورۂ آل عمران کی آیات (۳۵-۶۳) میں یہاں یہ ذکر حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بیان سے شروع ہوا ہے اور اناجیل اربعہ میں سے سینٹ لوقا کی انجیل ٹھیک اسی طرح یہ تذکرہ شروع کرتی ہے لیکن سورۂ آل عمران میں یہ تذکرہ اس سے پیشتر کے ایک واقعہ سے شروع ہوتا ہے یعنی حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش اور ہیکل میں پرورش پانے کے واقعہ سے اور اس بارہ میں چاروں انجیلیں خاموش ہیں لیکن انیسویں صدی میں متروک اناجیل کا جو نسخہ ویٹیکان کے کتب خانہ سے برآمد ہوا اس نے حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش کا یہ مفقود ٹکڑا مہیا کر دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک سرگزشت کا یہ ٹکڑا بھی اسی طرح الہامی یقین کیا جاتا تھا جس طرح بقیہ ٹکڑے یقین کئے جاتے ہیں۔ ج ۲ ص ۴۴۳۔

Marfat.com

مریم علیہا السلام کا زہد و تقویٰ:

زکریا علیہ السلام مریم علیہا السلام کی ضروری نگہداشت کے سلسلہ میں کبھی کبھی ان کے حجرہ میں تشریف لے جایا کرتے تھے لیکن ان کو یہ بات عجیب نظر آتی کہ جب وہ خلوت کدہ میں داخل ہوتے تو مریم علیہا السلام کے پاس اکثر بے موسم کے تازہ پھل موجود پاتے۔ [1] آخر زکریا علیہ السلام سے نہ رہا گیا اور انہوں نے دریافت کیا: مریم تیرے پاس یہ بے موسم پھل کہاں سے آتے ہیں؟ مریم علیہا السلام نے فرمایا: "یہ میرے پروردگار کا فضل و کرم ہے، وہ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق پہنچاتا ہے۔" حضرت زکریا علیہ السلام نے یہ سنا تو سمجھ گئے کہ خدائے برتر کے یہاں مریم علیہا السلام کا خاص مقام اور مرتبہ ہے اور ساتھ ہی بے موسم تازہ پھلوں کے واقعہ نے دل میں یہ تمنا پیدا کر دی کہ جس خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ پھل بے موسم پیدا کر دیے، کیا وہ میرے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود مجھ کو بے موسم پھل (بیٹا) عطاء نہ کرے گا؟ یہ سوچ کر انہوں نے خشوع و خضوع کے ساتھ بارگاہِ ربانی میں دعاء کی اور وہاں سے شرف قبولیت کا مژدہ عطاء ہوا۔

﴿وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾﴾ (آل عمران: ۳۷)

"اور اس (مریم) کی کفالت زکریا نے کی، جب اس (مریم) کے پاس زکریا داخل ہوتے تو اس کے پاس کھانے کی چیزیں رکھی پاتے۔ زکریا نے کہا: "اے مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آئیں؟" مریم (علیہا السلام) نے کہا "یہ اللہ کے پاس سے آئی ہیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق دیتا ہے۔"

مریم علیہا السلام اسی طرح ایک عرصہ تک اپنے مقدس مشاغل کے ساتھ پاک زندگی بسر کرتی رہیں اور مقدس ہیکل کا سب سے مقدس مجاور حضرت زکریا علیہ السلام بھی ان کے زہد و تقویٰ سے بے حد متاثر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عظمت اور جلالت قدر کو اور زیادہ بلند کیا اور فرشتوں کے ذریعہ ان کو برگزیدۂ بارگاہ الٰہی ہونے کی یہ بشارت سنائی۔

﴿وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِىْ وَ ارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾﴾ (آل عمران: ۴۲-۴۳)

"(اے پیغمبر وہ وقت یاد کیجئے) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو بزرگی دی اور پاک کیا اور دنیا کی عورتوں پر تجھ کو برگزیدہ کیا، اے مریم! اپنے پروردگار کے سامنے جھک جا اور سجدہ ریز ہو جا اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز ادا کر۔"

﴿وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ

[1] یہ تفصیل اگرچہ تفسیری روایات سے ماخوذ ہے اور آیت میں صرف لفظ رزق آیا ہے لیکن آیت سے بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ مریم علیہا السلام کا یہ رزق انسانی داد و دہش کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ بطور کرامت منجانب اللہ تھا۔ (مؤلف)

Marfat.com

یَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۴۴﴾ (آل عمران: ۴۴)

"اور تم اس وقت ان کاہنوں کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنے قلموں پوروں) کو قرعہ اندازی کے لیے) ڈال رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے اور تم اس وقت (بھی) موجود نہ تھے جب وہ اس کفالت کے بارے میں آپس میں جھگڑ رہے تھے۔"

حضرت مریم علیہا السلام جبکہ نہایت مرتاض، عابد و زاہد اور تقویٰ و طہارت میں ضرب المثل تھیں اور جبکہ عنقریب ان کو جلیل القدر پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہونے والا تھا تو من جانب اللہ ان کی تقدیس و تطہیر کا یہ اعلان بلاشبہ حق بہ حقدار رسید کا مصداق ہے، تاہم علمی اور تاریخی اعتبار سے بلکہ خود قرآن و احادیث کے مفہوم کے لحاظ سے یہ مسئلہ قابل توجہ ہے کہ آیت ﴿وَاصۡطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ کی مراد کیا ہے، اور کیا درحقیقت حضرت مریم علیہا السلام کو بغیر کسی استثناء کے کائنات کی تمام عورتوں پر برتری اور فضیلت حاصل ہے؟ اور یہی نہیں بلکہ اس آیت فضیلت نے مریم علیہا السلام کی ذات سے متعلق علماء سلف میں چند اہم مسائل کو زیر بحث بنا دیا ہے مثلاً: ① کیا عورت نبی ہوسکتی ہے؟ ② کیا حضرت مریم علیہا السلام نبی تھیں؟ ③ اگر نبی نہیں تھیں تو آیت کے جملہ ﴿وَاصۡطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ کا مطلب کیا ہے؟

کیا عورت نبی ہوسکتی ہے؟:

محمد بن اسحاق، شیخ ابوالحسن اشعری، قرطبی، ابن حزم (نور اللہ مرقدہم) اس جانب مائل ہیں کہ عورت نبی ہوسکتی ہے بلکہ ابن حزم تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت حوا، سارہ، ہاجرہ، اُم موسیٰ، آسیہ اور مریم علیہم السلام یہ سب نبی تھیں اور محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اکثر فقہاء اس کے قائل ہیں کہ عورت نبی ہوسکتی ہے اور قرطبی فرماتے ہیں کہ مریم علیہا السلام نبی تھیں۔

ان حضرات کے اقوال کے برعکس خواجہ حسن بصری، امام الحرمین شیخ عبدالعزیز اور قاضی عیاض (نور اللہ مرقدہم) کا رجحان اس جانب ہے کہ عورت نبی نہیں ہوسکتی اور اس لیے مریم علیہا السلام بھی نبی نہیں تھیں۔ قاضی اور ابن کثیر یہ بھی کہتے ہیں کہ جمہور کا مسلک یہی ہے اور امام الحرمین تو اجماع تک دعویٰ کرتے ہیں۔ جو علماء یہ فرماتے ہیں کہ عورت نبی نہیں ہوسکتی وہ اپنی دلیل میں اس آیت کو پیش کرتے ہیں:

﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِمۡ﴾ (النحل: ۴۳)

"اور تم سے پہلے ہم نے نہیں بھیجے مگر مرد کہ وحی بھیجتے تھے ہم ان کی طرف۔"

اور خصوصیت کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کے انکار پر یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن عزیز نے ان کو "صدیقہ" کہا ہے، سورۂ مائدہ میں ہے:

﴿مَا الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيۡقَةٌ ؕ﴾ (المائدہ: ۷۵)

"پس ابن مریم تو ایک پیغمبر ہیں جن سے پہلے اور بھی پیغمبر گزر چکے اور ان کی والدہ صدیقہ تھیں۔"

Marfat.com

اور سورۂ نساء میں قرآن عزیز نے منعم علیہم کی جو فہرست دی ہے وہ اس کے لیے نص قطعی ہے کہ "صدیقیت" کا درجہ "نبوت" سے کم اور نازل ہے۔ ❶

اور جو حضرات عورت کے نبی ہونے کے قائل ہیں وہ فرماتے ہیں کہ قرآن عزیز نے حضرت سارہ، ام موسیٰ اور حضرت مریم (علیہن السلام) کے متعلق جن واقعات کا اظہار کیا ہے ان میں بصراحت موجود ہے کہ ان پر خدا کے فرشتے وحی لے کر نازل ہوئے اور ان کو منجانب اللہ بشارات سے سرفراز فرمایا اور ان تک اپنی معرفت، عبادت کا حکم پہنچایا، چنانچہ حضرت سارہ کے لیے سورۂ ہود اور سورہ الذریات اور ام موسیٰ کے لیے سورۂ قصص میں اور مریم علیہا السلام کے لیے آل عمران اور سورۂ مریم میں بواسطہ ملائکہ اور بلاواسطہ خطاب الٰہی موجود ہے اور ظاہر ہے کہ ان مقامات پر وحی کے لغوی معنی (وجدانی ہدایت یا مخفی اشارہ) کے نہیں ہیں جیسا کہ آیت ﴿وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ﴾ میں شہد کی مکھی کے لیے وحی کا اطلاق کیا گیا ہے۔

اور خصوصیت کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کے نبی ہونے کی یہ واضح دلیل ہے کہ سورہ مریم میں ان کا ذکر اسی اسلوب کے ساتھ کیا گیا ہے جس طریقہ پر دیگر انبیاء ورسل کا تذکرہ ہے مثلاً:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰى.... وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ.... وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ.... وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ.... وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ﴾ یا مثلاً: ﴿وَ اَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا﴾

ہم نے مریم علیہا السلام کی جانب اپنے فرشتہ جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا۔ یا مثلاً ﴿قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ﴾ میں بلاشبہ تیرے پروردگار کی جانب سے پیغامبر ہوں" نیز آل عمران میں مریم علیہا السلام کو ملائکۃ اللہ نے جس طرح خدا کی جانب سے پیغامبر بن کر خطاب کیا ہے وہ بھی اس دعویٰ کی روشن دلیل ہے۔

اور مریم علیہا السلام کے صدیقہ ہونے سے متعلق جو سوال ہے اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر قرآن نے حضرت مریم علیہا السلام کو "صدیقہ" کہا ہے تو یہ لقب ان کی شان نبوت کے اسی طرح منافی نہیں ہے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے مسلم نبی ہونے کے باوجود آیت ﴿يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ﴾ ❺ میں ان کا صدیق ہونا ان کے نبی ہونے کو مانع نہیں ہے بلکہ ذکر پاک مقامی خصوصیت کی بناء پر مذکور ہوا ہے۔ کیونکہ جو "نبی" ہے وہ بہرحال "صدیق" ضرور ہے البتہ اس کا عکس ضروری نہیں ہے۔

ان علماء اسلام کی ترجمانی جس تفصیل کے ساتھ کتاب الفصل میں مشہور محدث ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے اس تفصیل وقوت کے ساتھ دوسری جگہ نظر سے نہیں گزری اس لیے سطور ذیل میں اس پورے مضمون کا ترجمہ لائق مطالعہ ہے۔

نبوۃ النساء اور ابن حزم:

یہ فصل ایسے مسئلہ کے متعلق ہے جس پر ہمارے زمانہ میں قرطبہ (اندلس) میں شدید اختلاف برپا ہوا، علماء کی ایک جماعت

---

❶ اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾

❷ سورۂ ہود آیت ۷۳-۷۱، والذریات آیت ۳-۲۹ ❸ قصص آیت ۷

❹ آل عمران ۴۲-۴۳-۴۵-۴۷ و سورۂ مریم ۱۶-۲۶ ❺ سورۂ یوسف

کہتی ہے کہ عورت نبی نہیں ہوسکتی اور جو ایسا کہتا ہے کہ عورت نبی ہوسکتی ہے وہ ایک نئی بدعت ایجاد کرتا ہے اور دوسری جماعت قائل ہے کہ عورت نبی ہوسکتی ہے اور نبی ہوئی ہیں، اور ان دونوں سے الگ تیسری جماعت کا مسلک توقف ہے اور وہ اثبات ونفی دونوں باتوں میں سکوت کو پسند کرتے ہیں مگر جو حضرات عورت سے متعلق منصب نبوت کا انکار کرتے ہیں ان کے پاس اس انکار کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی البتہ بعض حضرات نے اپنے اختلاف کی بنیاد اس آیت کو بنایا ہے ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ﴾۔

میں کہتا ہوں کہ اس بارہ میں کس کو اختلاف ہے اور کس نے دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عورت کو ہدایت خلق کے لیے رسول بنا کر بھیجتا ہے یا اس نے کسی عورت کو "رسول" بنایا ہے، بحث رسالت کے مسئلہ میں نہیں ہے بلکہ نبوت میں ہے، پس طلب حق کے لیے ضروری ہے کہ اول یہ غور کیا جائے کہ لغت عرب میں لفظ "نبوت" کے کیا معنی ہیں؟ تو ہم اس لفظ کو "انباء" سے ماخوذ پاتے ہیں جس کے معنی "اطلاع دینا" ہیں، پس نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کسی معاملہ کے ہونے سے قبل بذریعہ وحی اطلاع دے یا کسی بھی بات کے لیے اس کی جانب وحی نازل فرمائے وہ شخص مذہبی اصطلاح میں بلاشبہ "نبی" ہے۔

آپ اس مقام پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وحی کے معنی اس الہام کے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کی سرشت میں ودیعت کر دیا ہے جیسا کہ شہد کی مکھی کے متعلق خدائے برحق کا ارشاد ہے ﴿وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ﴾ اور نہ وحی کے معنی ظن اور وہم کے لے سکتے ہیں اس لیے کہ ان دونوں کو علم یقین سمجھنا (جو وحی کا قدرتی نتیجہ ہے) مجنوں کے سوا اور کسی کا کام نہیں ہے اور نہ یہاں وہ معنی مراد ہو سکتے ہیں جو باب کہانتہ سے تعلق رکھتے ہیں (یعنی یہ کہ شیاطین، آسمانی باتوں کو سننے اور چرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر شہاب ثاقب کے ذریعہ رجم کیا جاتا ہے اور جس کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے:

﴿شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ (الانعام: ۱۱۲)

کیونکہ یہ "باب کہانتہ" رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے وقت سے مسدود ہو گیا اور نہ اس جگہ وحی کے معنی نجوم کے تجربات علمیہ سے تعلق رکھتے ہیں جو خود انسانوں کے باہم سیکھنے اور سکھانے سے حاصل ہو جایا کرتے ہیں اور نہ اس کے معنی اس کے رویا (خواب) کے ہو سکتے ہیں جن کے سچ یا جھوٹ ہونے کا کوئی علم نہیں ہے بلکہ ان تمام معانی سے جدا "وحی بمعنی نبوۃ" یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے قصد اور ارادہ سے ایک شخص کو ایسے امور کی اطلاع دے جن کو وہ پہلے سے نہیں جانتا اور مسطورۂ بالا ذرائع علم سے الگ یہ امور حقیقت ثابتہ بن کر اس شخص پر اس طرح منکشف ہو جائیں گویا آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اس علم خاص کے ذریعہ اس شخص کو بغیر کسی محنت وکسب کے بداہۃً ایسا صحیح یقین عطاء کر دے کہ وہ ان امور کو اس طرح معلوم کر لے جس طرح وہ حواس اور بداہت عقل کے ذریعہ حاصل کر لیا کرتا ہے اور اس کو کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور خدا کی یہ وحی یا تو اس طرح ہوتی ہے کہ فرشتہ آ کر اس شخص کو خدا کا پیغام سناتا ہے اور یا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ براہ راست اس سے خطاب کرتا ہے۔

پس اگر ان حضرات کے نزدیک جو عورت کے نبی ہونے کا انکار کرتے ہیں نبوۃ کے معنی یہ نہیں ہیں تو وہ ہم کو سمجھائیں کہ آخر نبوت کے معنی ہیں کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کے ماسواء اور کوئی معنی بیان ہی نہیں کر سکتے۔

اور جبکہ نبوت کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے تو اب قرآن کے ان مقامات کا بغور مطالعہ کیجیے جہاں یہ مذکور ہے کہ اللہ

عزوجل نے عورتوں کے پاس فرشتوں کو بھیجا اور فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان عورتوں کو "وحی حق" سے مطلع کیا۔ چنانچہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ام اسحاق (سارہ علیہا السلام) کو اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی بشارت سنائی، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَ امْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ ۝ قَالَتْ یٰوَیْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ ۝ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ ؕ﴾ (سورۃ ہود: ۷۱-۷۳)

ان آیات میں فرشتوں نے ام اسحاق کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسحاق اور ان کے بعد یعقوب علیہما السلام کی بشارت سنائی ہے اور سارہ علیہا السلام کے تعجب پر یہ کہہ کر دوبارہ خطاب کیا ہے ﴿اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ والدۂ اسحاق (سارہ) علیہا السلام نبی تو نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ اس طرح ان سے خطاب کرے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جبرئیل علیہ السلام فرشتہ کو مریم (ام عیسیٰ علیہا السلام) کے پاس بھیجتا ہے اور ان کو مخاطب کر کے یہ کہتا ہے:

﴿قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِیًّا ۝﴾ (سورۃ مریم: ۱۹)

تو یہ "وحی حقیقی" کے ذریعہ نبوت نہیں تو اور کیا ہے اور کیا اس آیت میں صاف طور پر نہیں کہا گیا ہے کہ مریم علیہا السلام کے پاس جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغامبر بن کر آئے؟ نیز زکریا علیہ السلام جب مریم علیہا السلام کے حجرہ میں آتے تو ان کے پاس اللہ کا غیب سے دیا ہوا رزق پاتے تھے اور انہوں نے اسی رزق کو دیکھ کر بارگاہِ الٰہی میں صاحب فضیلت لڑکا پیدا ہونے کی دعا کی تھی، اسی طرح ہم موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے معاملہ میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل فرمائی کہ تم اپنے اس بچہ کو دریا میں ڈال دو اور ساتھ ہی ان کو اطلاع دی کہ میں اس کو تمہاری جانب واپس کروں گا اور اس کو "نبی مرسل" بناؤں گا، پس کون شک کرسکتا ہے کہ یہ "نبوت" کا معاملہ نہیں ہے، معمولی عقل وشعور رکھنے والا آدمی بھی بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے عطاء کردہ شرف نبوت سے وابستہ نہ ہوتا اور محض خواب کی بناء پر یا دل میں پیدا شدہ وسوسہ کی وجہ سے وہ ایسا کرتیں تو ان کا یہ عمل نہایت ہی مجنونانہ اور متہورانہ ہوتا اور اگر آج ہم میں سے کوئی ایسا کر بیٹھے تو ہمارا یہ عمل یا گناہ قرار پائے گا اور یا ہم کو مجنوں اور پاگل کہا جائے گا اور علاج کے لیے پاگل خانہ بھیج دیا جائے گا یہ ایک ایسی صاف اور واضح بات ہے جس میں شک وشبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تب یہ کہنا قطعاً درست ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈال دینا اسی طرح وحی الٰہی کی بناء پر تھا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رویا[1] (خواب) میں اپنے بیٹے (اسماعیل علیہ السلام) کا ذبح کرنا بذریعہ وحی معلوم کرلیا تھا اس لیے کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی نہ ہوتے اور ان کے ساتھ وحی الٰہی کا سلسلہ وابستہ نہ ہوتا اور پھر وہ یہ عمل محض ایک خواب یا نفس میں پیدا شدہ ظن کی وجہ سے کرگزرتے تو ہر شخص ان کے اس عمل کو یا گناہ سمجھتا یا انتہائی جنون یقین کرتا تو اب بغیر کسی تردد کے یہ کہا جاسکتا ہے

[1] نبیا کا خواب وحی ہوتا ہے نبی رم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک حدیث میں ایسا ہی فرمایا ہے۔

Marfat.com

کہ ام موسیٰ علیہا السلام نبی تھیں۔

علاوہ ازیں حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت پر ایک یہ دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ کہیعص میں ان کا ذکر انبیاء علیہم السلام کے زمرہ میں کیا ہے اور اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے:

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ﴾ (سورۃ مریم: ۵۸)

"یہی ہیں وہ انبیاء آدم کی نسل سے اور ان میں سے جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ کشتی میں سوار کیا (جن پر اللہ کا انعام واکرام ہوا)"۔

تو آیت کے اس عموم میں مریم علیہا السلام کی تخصیص کر کے ان کو انبیاء کی فہرست میں سے الگ کر لینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

رہی یہ بات کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مریم علیہا السلام کے لیے یہ کہا ہے ﴿ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ﴾ تو یہ لقب ان کی نبوت کے لیے اسی طرح مانع نہیں جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے نبی اور رسول ہونے کے لیے یہ آیت مانع نہیں ﴿ يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ ﴾ اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ (وباللہ التوفیق)

اب حضرت سارہ، حضرت مریم، حضرت ام موسیٰ (علیہن السلام) کے مسئلہ نبوت کے ساتھ فرعون کی بیوی (آسیہ) کو بھی شامل کر لیجیے۔ اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: [1]

((کمل من الرجال کثیر ولم یکمل من النساء الا مریم بنت عمران وآسیة بنت مزاحم امرأة فرعون)) (او کما قال علیه السلام).

"یعنی مردوں میں سے تو بہت سے آدمی کامل ہوئے ہیں مگر عورتوں میں سے صرف یہی دو کامل ہوئیں مریم بنت عمران اور آسیہ بنت مزاحم زوجہ فرعون۔"

اور واضح رہے کہ مردوں میں یہ درجہ کمال بعض رسولوں (علیہم السلام) کو حاصل ہوا ہے اور اگرچہ ان کے علاوہ انبیاء و رسل بھی درجہ نبوت و رسالت پر مامور ہیں لیکن ان مرسلین کاملین کے درجہ سے نازل ہیں، اس لیے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن عورتوں کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا ہے ان میں صرف ان دو عورتوں کو ہی درجہ کمال تک پہنچنے کی فضیلت حاصل ہے کیونکہ حدیث میں جس درجہ کمال کا ذکر ہو رہا ہے جو ہستی بھی اس درجہ سے نازل ہے وہ کامل نہیں ہے۔

بہر حال اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگرچہ بعض عورتیں بہ نص قرآن نبی ہیں لیکن ان میں سے ان دو عورتوں کو بھی درجہ کمال حاصل ہوا۔ درجات کے اس فرق کو خود قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے: ﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ حقیقت یہ ہے کہ کامل اس کو کہا جاتا ہے جس کی نوع میں سے کوئی دوسرا اس کا ہمسر نہ ہو پس مردوں میں سے ایسے کامل خدا کے چند ہی رسول ہوئے ہیں جن کی ہمسری دوسرے انبیاء و رسل کو عطا نہیں ہوئی اور بلاشبہ ان ہی کاملین میں سے ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور

[1] بخاری میں الفاظ حدیث یہ ہیں: ((قال رسول اللہ ﷺ کمل من الرجال کثیر ولم یکمل ن النساء الا آسیة امراۃ فرعون ومریم بنت عمران وان فضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام))

Marfat.com

ابراہیم علیہ السلام ہیں جن کے متعلق نصوص (قرآن و حدیث) نے ان فضائل کمال کا اظہار کیا ہے جو دوسرے انبیاء و رسل کو حاصل نہیں ہیں، اسی طرح عورتوں میں سے وہی درجہ کمال کو پہنچی ہیں جن کا ذکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں کیا ہے۔ [1]

ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے اس طویل مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر وحی کے ان معانی کو نظر انداز کر کے "جن کا اطلاق بلحاظ عموم لغت جبلت یا نفس میں ظن و وہم کے درجہ کا القاء والہام پر ہوتا ہے" وہ اصطلاحی معنی لیے ہیں جن کو قرآن نے انبیاء و رسل کے لیے مخصوص کیا ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک وہ (وحی) جس کا منشاء مخلوق خدا کی رشد و ہدایت اور تعلیم اوامر و نواہی سے ہوتا اور دوسری یہ کہ خدائے تعالیٰ کسی شخص سے براہِ راست یا فرشتہ کے واسطہ سے اس قسم کا خطاب کرے کہ جس سے بشارات دینا، یا کسی ہونے والے واقعہ کی ہونے سے قبل اطلاع دینا یا خاص اس کی ذات کے لیے کوئی امر و نہی فرمانا مقصود ہو، اب اگر پہلی صورت ہے تو یہ "نبوۃ مع الرسالۃ" [2] ہے اور بالاتفاق سب کے نزدیک یہ درجہ صرف مردوں کے ساتھ ہی مخصوص ہے جیسا کہ سورہ النحل کی آیت سے واضح ہے اور اس مسئلہ میں قطعاً دو رائے نہیں ہیں۔

اور اگر وحی الٰہی کی دوسری شکل ہے تو ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے مؤیدین علماء کی رائے میں یہ بھی نبوت ہی کی ایک قسم ہے کیونکہ قرآن عزیز نے سورۂ شوریٰ میں انبیاء علیہم السلام پر نزول وحی کے جو طریقے بیان کیے ہیں وہ اس وحی پر بھی صادق آتے ہیں۔ سورۂ شوریٰ میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝۵۱﴾ (الشوریٰ: ۵۱)

"اور کسی انسان کے لیے یہ صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے (بالمشافہ) گفتگو کرے مگر یا وحی کے ذریعہ یا پس پردہ کلام کے ذریعہ اور یا اس صورت سے کہ اللہ کسی فرشتہ کو پیغامبر بنا کر بھیجے اور وہ اس کی اجازت سے جس کو کہ وہ چاہے اس بشر کو وحی لا کر سنا دے بلاشبہ وہ بلند و بالا حکمت والا ہے۔"

اور جبکہ قرآن نے وحی کی اس دوسری قسم کا اطلاق بہ نص صریح حضرت مریم، حضرت سارہ، حضرت ام موسیٰ اور حضرت آسیہ علیہن السلام پر کیا ہے جیسا کہ سورۂ ہود، قصص اور مریم سے ظاہر ہوتا ہے تو ان مقدس عورتوں پر "نبی کا اطلاق" قطعاً صحیح ہے اور اس کو بدعت کہنا سرتاسر غلط ہے۔

ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے مؤید علماء نے اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے اس شبہ کا جواب بھی دیا ہے "کہ قرآن نے جس طرح صاف الفاظ میں مرد انبیاء کو نبی اور رسول کہا ہے اس طرح ان عورتوں میں سے کسی کو نہیں کہا" جواب کا حاصل یہ ہے کہ جبکہ "نبوۃ مع الرسالۃ" جو کہ مردوں کے لیے ہی مخصوص ہے کائنات انسانی کی رشد و ہدایت اور تعلیم و تبلیغ نوع انسانی سے متعلق ہوتی ہے تو اس کا

---

[1] الفصل فی الملل والاهواء والنحل مطبوعہ مصر ۱۳۴۸ھ ج ۵ ص ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴ یہ بحث فتح الباری ج ۶ ص ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۶۸ مطبوعہ مصر میں بھی قابل مراجعت ہے۔

[2] یہاں نبی اور رسول کے اس فرق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو علم کلام کی خاص اصطلاح ہے کیونکہ قرآن کثرت کے ساتھ نبی اور رسول کو مترادف معنی میں استعمال کرتا ہے۔

Marfat.com

تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو اس شرف سے ممتاز فرمایا ہے اس کے متعلق وہ صاف صاف اعلان کرے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا نبی اور رسول ہے، تا کہ امت پر اس کی دعوت وتبلیغ کا قبول کرنا لازم ہو جائے اور خدا کی حجت پوری ہو اور چونکہ نبوت کی وہ قسم جس کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوتا ہے خاص اسی ہستی سے وابستہ ہوتی ہے جس کو یہ شرف ملا ہے تو اس کے متعلق صرف یہی اظہار کر دینا کافی ہے کہ جو "وحی من اللہ" انبیاء ورسل کے لیے ہی مخصوص ہے اس سے ان چند عورتوں کو بھی مشرف کیا گیا ہے۔

عورتوں کی نبوت کے اثبات وانکار کے علاوہ تیسری رائے ان علماء کی ہے جو اس مسئلہ میں "سکوت اور توقف" کو ترجیح دیتے ہیں ان میں شیخ تقی الدین سبکی رحمہ اللہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، فتح الباری میں ان کا یہ قول مذکور ہے:

قال السبکی اختلف فی ھٰذہ المسئلة ولم یصح عندی فی ذٰلك شیء ..... الخ [1]

سبکی فرماتے ہیں: "اس مسئلہ میں علماء کی آراء مختلف ہیں اور میرے نزدیک اس بارہ میں اثباتاً یا نفیاً کوئی بات ثابت نہیں ہے۔"

کیا حضرت مریم علیہا السلام نبی ہیں؟:

اس تفصیل سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی نبوت کے انکار پر امام الحرمین کا دعوائے اجماع صحیح نہیں ہے۔ نیز یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فہرست انبیاء میں مسطورۂ بالا دوسری مقدس عورتوں کے مقابلہ میں حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کے متعلق قرآنی نصوص زیادہ واضح ہیں، یہی وجہ ہے کہ امام شعرانی، ابن حزم اور قرطبی رحمہم اللہ کے درمیان حضرت مریم علیہا السلام کے علاوہ نبیات کی فہرست کے بارہ میں خاصہ اختلاف نظر آتا ہے [2] اور حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کے متعلق تمام مثبتین نبوت کا اتفاق ہے۔

ہم کو ابن کثیر رحمہ اللہ کے اس دعویٰ سے بھی اختلاف ہے کہ جمہور، انکار کی جانب ہیں، البتہ اکثریت غالباً سکوت اور توقف کو پسند کرتی ہے۔

آیت ﴿وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کا مطلب:

جو علماء عورتوں میں نبوت کے قائل ہیں اور حضرت مریم علیہا السلام کو نبی تسلیم کرتے ہیں، ان کے مسلک کے مطابق تو آیت ﴿وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کا مطلب صاف اور واضح ہے وہ یہ کہ حضرت مریم علیہا السلام کو کائنات کی تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے، جو عورتیں نبی نہیں ہیں ان پر اس لیے کہ مریم علیہا السلام نبی ہیں اور جو عورتیں نبی ہیں ان پر اس لیے کہ وہ ان قرآنی نصوص کے پیش نظر جو ان کے فضائل وکمالات سے تعلق رکھتی ہیں باقی نبیات پر برتری رکھتی ہیں۔

لیکن جو علماء عورتوں کی نبوت کا انکار فرماتے ہیں اور حضرت مریم علیہا السلام کو "نبیہ" نہیں تسلیم کرتے وہ اس آیت کی مراد میں دو جدا جدا خیال رکھتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ آیت کا جملہ ﴿نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ عام ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کی تمام عورتوں کو شامل ہے۔ اس لیے بلاشبہ حضرت مریم علیہا السلام کو بغیر کسی استثناء کے کائنات انسانی کی تمام عورتوں پر فضیلت وبرتری حاصل ہے اور اکثر کا قول یہ ہے کہ آیت کے لفظ ﴿الْعٰلَمِیْنَ﴾ سے کائنات کی وہ تمام عورتیں مراد ہیں جو حضرت مریم علیہا السلام کی معاصر تھیں۔ یعنی قرآن عزیز حضرت مریم علیہا السلام کے زمانہ کا واقعہ نقل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ بشارت دی کہ وہ اپنے زمانہ کی تمام عورتوں

---

[1] فتح الباری ج ٦ کتاب الانبیاء [2] فتح الباری ج ٦ ص ٣٦٨

Marfat.com

میں برگزیدہ اور صاحب کمال ہیں اور ہم نے ان سب میں سے ان کو چن لیا ہے اور ﴿الْعٰلَمِیْنَ﴾ کا یہ اطلاق وہی حیثیت رکھتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت (بنی اسرائیل) کے لیے اس آیت میں اختیار کی گئی ہے۔

﴿وَ لَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴾ (الدخان: ۳۲)

"اور بلاشبہ ہم نے اپنے علم سے ان (بنی اسرائیل) کو جہان والوں کے مقابلہ میں پسند کر لیا ہے۔"

اور جبکہ باتفاق آراء بنی اسرائیل کی فضیلت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ﴿الْعٰلَمِیْنَ﴾ سے ان کی معاصر امم واقوام مراد ہیں کہ ان میں سے امت موسیٰ علیہ السلام کو فضیلت حاصل ہے تو حضرت مریم علیہا السلام کی فضیلت کے باب میں بھی یہی معنی مراد لینے چاہئیں۔

حضرت مریم علیہا السلام کا تقدس اور تقویٰ وطہارت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی والدہ ہونے کا شرف، مرد کے ہاتھ لگائے بغیر معجزہ کے طور پر ان کے مشکوئے معلیٰ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت بلاشبہ ایسے امور ہیں جن کی بدولت ان کو معاصر عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل تھی۔

پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ باب فضیلت ایک وسیع باب ہے اور جس طرح کسی شے کی حقیقت بیان کرنے میں بلیغ اور عمدہ طریق بیان یہ ہے کہ وہ جامع و مانع ہو یعنی اس کی حقیقت پر اس طرح حاوی ہو کہ تمام دوسری چیزوں سے ممتاز ہو جائے، نہ ایسی کوئی کمی رہ جائے کہ اصل حقیقت پوری طرح بیان نہ ہو سکے اور نہ ایسا اضافہ ہو کہ بعض دوسری حقائق بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اسی طرح اس کے برعکس بیان فضیلت کے لیے فصاحت و بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو بیان حقیقت کی طرح حدود و قیود میں نہ جکڑ دیا جائے کیونکہ اس مقام پر حقیقت شے نہیں بلکہ فضیلت شے کا اظہار ہو رہا ہے جو اگر اسی طرح کے دوسرے افراد پر بھی صادق آ جائے تو بیان حقیقت کی طرح اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا بلکہ اس موقع پر وسعت بیان ہی ازبس ضروری ہوتا ہے تاکہ مخاطب کے دل میں اظہار فضیلت سے جو نفسیاتی اثر پیدا کرنا ہے وہ دل نشین اور مؤثر ہو سکے۔

تو ایسی صورت میں ﴿عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ حضرت مریم علیہا السلام کے علاوہ دوسری کوئی مقدس عورت اس شرف کو نہیں پہنچ سکتی یا نہیں پہنچی بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ حضرت مریم علیہا السلام کو فضائل و کمالات میں بلند سے بلند مرتبہ حاصل ہے، باب فضائل کی یہی وہ حقیقت ہے جس کے فراموش کر دینے پر فضائل صحابہ وغیرہ میں اکثر ہم کو لغزش ہو جاتی اور چند مقدس اشخاص سے متعلق فضائل کے مابین تضاد و تناقض نظر آنے لگتا ہے، البتہ ان فضائل کی حدود سے گزر کر جب ہم صاحب فضائل افراد کے انفرادی و اجتماعی اعمال کا جائزہ لے کر فرق مراتب بیان کرتے ہیں تو وہ ضرور ایک دوسرے کے لیے حد فاصل ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرات صحابہ وصحابیات کے فضائل کے پیش نظر فرق مراتب کا صحیح فیصلہ جب ہی ممکن ہو سکتا ہے کہ ان کے ان فضائل کے ساتھ ساتھ جو زبان وحی ترجمان سے نکلے ہیں ان سے متعلق خصوصی ارشادات قرآنی وحدیثی، ان کی اسلامی خدمات، اسلام سے متعلق ان کی سرفروشیاں و جاں سپاریاں، نصرت حق میں مالی فداکاریاں، اسلام کے نازک ترین لمحات میں ان کے علم و تدبر کی عقدہ کشائیاں اور ان کی عملی جدوجہد کی رفیع سرگرمیاں ان سب کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے۔

Marfat.com

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بشارات کتب سابقہ:

ادیان وملل کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین حق اور ملت بیضاء کی تبلیغ ودعوت کا سلسلہ اگرچہ آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء محمد ﷺ تک برابر جاری رہا ہے لیکن اس سلسلہ کو مزید قوت پہنچانے اور سربلند کرنے کے لیے سنت اللہ یہ رہی ہے کہ صدیوں بعد ایک ایسے اولوالعزم اور جلیل القدر پیغمبر کو بھیجے جو امتداد زمانہ کی وجہ سے پیدا شدہ عام روحانی اضمحلال کو دور کر کے قبول حق کے افسردہ رجحانات میں تازگی بخشے اور ضعیف روحانی عواطف کو قوی سے قوی تر بنا دے، گویا مذہب کی خوابیدہ دنیا میں حق وصداقت کا صور پھونک کر ایک انقلاب عظیم بپا کر دے اور مردہ دلوں میں نئی روح ڈال دے اور اکثر ایسا ہوتا رہا ہے کہ جن اقوام وامم میں اس عظیم المرتبہ پیغمبر کی بعثت ہونے والی ہوتی ہے صدیوں پہلے ان کے ہادیان ملت اور داعیان حق (انبیاء علیہم السلام) اس مقدس رسول ﷺ کی آمد کی بشارات وحی الٰہی کے ذریعہ سناتے رہتے ہیں تاکہ اس کی دعوت حق کے لیے زمین ہموار رہے اور جب اس نور حق کے روشن ہونے کا وقت آ جائے تو ان اقوام وامم کے لیے اس کی آمد غیر متوقع حادثہ نہ بن جائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ان چند اولوالعزم، جلیل القدر اور مقدس رسولوں میں سے ایک ہیں اور اسی بناء پر انبیاء بنی اسرائیل میں سے متعدد انبیاء علیہم السلام ان کی آمد سے قبل ان کے حق میں منادی کرتے اور آمد کی بشارت سناتے نظر آتے ہیں اور ان ہی بشارات کی وجہ سے بنی اسرائیل مدت مدید سے منتظر تھے کہ مسیح موعود کا ظہور ہو تو ایک مرتبہ وہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کی طرح اقوام عالم میں معزز وممتاز ہوں گے اور رشد وہدایت کی خشک کھیتی میں روح تازہ پیدا ہوگی اور خدا کے جاہ وجلال سے ان کے قلوب ایک مرتبہ پھر چمک اٹھیں گے۔ بائبل (توراۃ وانجیل) اپنی لفظی ومعنوی تحریفات کے باوجود آج بھی ان چند بشارات کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتی ہیں جو حضرت مسیح (علیہ السلام) کی آمد سے تعلق رکھتی ہیں۔ توراۃ استثناء میں ہے:

"اور اس موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر (سائیر) سے ان پر طلوع ہوا، اور فاران کے پہاڑوں سے جلوہ گر ہوا۔" (ب ۳۳۔ آیت ۲۰)

اس بشارت میں "سینا سے خدا کی آمد" حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی جانب اشارہ ہے اور "سائیر سے طلوع ہونا" نبوت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہے، کیونکہ ان کی ولادت باسعادت اسی پہاڑ کے ایک مقام "بیت اللحم" میں ہوئی ہے اور یہی وہ مبارک جگہ ہے جہاں سے نور حق طلوع ہوا اور "فاران پر جلوہ گر ہونا" آفتاب رسالت کی بعثت کا اعلان ہے کیونکہ فاران، حجاز کے مشہور پہاڑی سلسلہ کا نام ہے۔ ❶

اور حضرت یسعیاہ نبی علیہ السلام کے صحیفہ میں ہے:

"دیکھ میں اپنا پیغمبر تیرے آگے بھیجتا ہوں جو تیری راہ تیار کرے گا، بیابان میں پکارنے والے کی آواز آتی ہے کہ خداوند کی راہ تیار کرو، اس کے راستے سیدھے بناؤ۔" ❷

اسی بشارت میں "پیغمبر" سے عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں اور بیابان میں پکارنے والے حضرت یحییٰ علیہ السلام ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مناد تھے اور ان کی بعثت سے قبل بنی اسرائیل میں ان کی بعثت رسالت کا مژدۂ جانفزا سناتے تھے۔

---

❶ تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔ ❷ باب ۴۰ آیات ۳۔۴

اور متی کی انجیل میں ہے:

"جب یسوع، ہیرودیس بادشاہ کے زمانہ میں یہودیہ کے بیت لحم میں پیدا ہوا تو دیکھو کئی مجوس پورب سے یروشلم میں یہ کہتے ہوئے آئے کہ یہودیوں کا بادشاہ جو پیدا ہوا ہے وہ کہاں ہے؟..... یہ سن کر ہیرودیس بادشاہ اور اس کے ساتھ یروشلم کے سب لوگ گھبرائے اور اس نے قوم کے سب سردار کاہنوں اور فقیہوں کو جمع کر کے ان سے پوچھا کہ مسیح کی پیدائش کہاں ہونی چاہیے؟ انہوں نے اس سے کہا کہ یہودیہ کے بیت لحم میں کیونکہ نبی (یسعیاہ علیہ السلام) کی معرفت یوں لکھا گیا ہے، اے بیت لحم یہوداہ کے علاقہ: تو یہوداہ کے حاکموں میں ہرگز سب سے چھوٹا نہیں کیونکہ تجھ میں سے ایک سردار نکلے گا جو میری امت اسرائیل کی گلہ بانی کرے گا۔" ❶

اور دوسری جگہ ہے:

"اور جب وہ یروشلم کے نزدیک پہنچے اور زیتون کے پہاڑ پر بیت فگے کے پاس آئے تو یسوع نے دو شاگردوں کو یہ کہہ کر بھیجا کہ اپنے سامنے کے گاؤں میں جاؤ وہاں پہنچتے ہی ایک گدھی بندھی ہوئی اور اس کے ساتھ بچہ تمہیں ملے گا، انہیں کھول کر میرے پاس لے آؤ اور اگر کوئی تم سے کچھ کہے تو کہنا کہ یہ خداوند کو درکار ہیں وہ فی الفور انہیں بھیج دے گا یہ اس لیے ہوا کہ جو نبی کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ "صیہون کی بیٹی سے کہو کہ دیکھ تیرا بادشاہ تیرے پاس آتا ہے وہ حلیم ہے اور گدھے پر سوار ہے بلکہ لادو بچہ پر۔" ❷

اور یوحنا کی انجیل میں ہے:

"اور یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کے لیے اس (یحییٰ علیہ السلام) کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں، انہوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں، پس انہوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟ تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا میں جیسا کہ یسعیاہ نبی نے کہا ہے بیابان میں پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو۔" ❸

اور مرقس اور لوقا کی انجیلوں میں ہے:

"وہ لوگ منتظر تھے اور سب اپنے اپنے دل میں یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی بابت سوچتے تھے کہ آیا وہ مسیح تھے یا نہیں تو یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) نے ان سب کے جواب میں کہا: میں تو تمہیں بپتسمہ دیتا ہوں مگر جو مجھ سے زور آور ہے وہ آنے والا ہے میں اس کی جوتی کا تسمہ کھولنے کے لائق نہیں، وہ تمہیں روح القدس سے بپتسمہ دے گا۔" ❹

ان ہر دو بشارات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود اپنی مذہبی روایات کی بناء پر جن اولوالعزم پیغمبروں کی بعثت کے منتظر تھے ان میں مسیح علیہ السلام بھی تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام ❺ نے ان کو بتایا کہ وہ نہ ایلیا ہیں نہ وہ نبی اور نہ مسیح علیہ السلام بلکہ مسیح علیہ السلام کی بعثت

❶ باب ۲ آیات ۱۔۶ ❷ باب ۲ آیات ۱۔۶ ❸ باب ۱ آیات ۱۹۔۲۳ ❹ لوقا باب ۱ آیات ۱۵۔۱۶

❺ عہد نامہ جدید (انجیل) میں یوحنا دو جدا جدا شخصیتیں ہیں ایک یحییٰ علیہ السلام اور دوسری عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور شاگرد۔

Marfat.com

کے مناد اور مبشر ہیں۔

قرآن عزیز نے بھی حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے واقعہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی تمہید قرار دیا ہے اور یحییٰ علیہ السلام کا مبشر اور منادی بتایا ہے۔ آل عمران میں ہے:

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (آل عمران: ۳۹)

"پس فرشتوں نے اس (زکریا) کو اس وقت پکارا جبکہ وہ حجرہ میں کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا تھا، بیشک اللہ تعالیٰ تجھ کو یحییٰ (فرزند) کی بشارت دیتا ہے، جو اللہ کے کلمہ (عیسیٰ علیہ السلام) کی تصدیق کرے گا۔"

ولادت مبارک:

عابد و زاہد اور عفت ماب مریم علیہا السلام اپنے خلوت کدہ میں مشغول عبادت رہتی اور ضروری حاجات کے علاوہ کبھی اس سے باہر نہیں نکلتی تھیں، ایک مرتبہ مسجد اقصیٰ (ہیکل) کے مشرقی جانب لوگوں کی نگاہوں سے دور کسی ضرورت سے ایک گوشہ میں تنہا بیٹھی تھیں کہ اچانک خدا کا فرشتہ (جبرئیل علیہ السلام) انسانی شکل میں ظاہر ہوا۔ حضرت مریم علیہا السلام نے ایک اجنبی شخص کو اس طرح بے حجاب سامنے دیکھا تو گھبرا گئیں اور فرمانے لگیں "اگر تجھ کو کچھ بھی خدا کا خوف ہے تو میں خدائے رحمان کا واسطہ دے کر تجھ سے پناہ چاہتی ہوں" فرشتے نے کہا: "مریم! خوف نہ کھا، میں انسان نہیں بلکہ خدا کا فرستادہ فرشتہ ہوں اور تجھ کو بیٹے کی بشارت دینے آیا ہوں" حضرت مریم علیہا السلام نے یہ سنا تو از راہ تعجب فرمانے لگیں: میرے لڑکا کیسے ہوسکتا ہے جبکہ مجھ کو آج تک کسی بھی شخص نے ہاتھ نہیں لگایا اس لیے کہ نہ تو میں نے نکاح کیا ہے اور نہ میں زانیہ ہوں" فرشتہ نے جواب دیا: میں تو تیرے پروردگار کا قاصد ہوں، اس نے مجھ سے اسی طرح کہا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ میں اس لیے کروں گا کہ تجھ کو اور تیرے لڑکے کو کائنات کے لیے اپنی قدرت کاملہ کے اعجاز کا "نشان" بنادوں اور لڑکا میری جانب سے "رحمت" ثابت ہوگا اور میرا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ مریم! اللہ تعالیٰ تجھ کو ایک ایسے لڑکے کی بشارت دیتا ہے جو اس کا "کلمہ" ❶ ہوگا، اس کا لقب "مسیح" ❷ اور اس کا نام عیسیٰ (علیہ السلام) (یسوع) ہوگا اور وہ دنیا اور آخرت دونوں میں باوجاہت اور صاحب عظمت رہے گا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقربین میں سے ہوگا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے نشان کے طور پر بحالت شیر خوارگی لوگوں سے باتیں کرے گا اور سن کہولت (بڑھاپے کا ابتدائی دور) بھی پائے گا تاکہ کائنات کی رشد و ہدایت کی خدمت کی تکمیل کرے اور یہ سب کچھ اس لیے ضرور ہو کر رہے گا کہ اللہ تعالیٰ کا قانون قدرت یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو وجود میں لانا چاہتا ہے تو اس کا محض یہ ارادہ اور حکم کہ "ہو جا" اس شے کو نیست سے ہست کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ یوں ہی ہو کر رہے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنی کتاب عطاء کرے گا، اس کو حکمت سکھائے گا اور اس کو بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے رسول اور اولوالعزم پیغمبر بنائے گا۔

قرآن عزیز نے ان واقعات کا معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ سورۂ آل عمران اور سورۂ مریم میں اس طرح ذکر کیا ہے:

---

❶ یعنی توالد و تناسل کے عام قانون سے جدا قانون اعجاز کے مطابق محض حکم الٰہی اور ارادۂ باری سے ہی رحم مریم میں وجود پذیر ہو جائے گا۔

❷ مسیح بمعنی مبارک یا سیاح جس کا کوئی گھر نہ ہو۔

Marfat.com

﴿اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٤٦﴾ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۖ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۖ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٤٧﴾ وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ﴿٤٨﴾ وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ﴾ (آل عمران: ۴۵۔۴۹)

"(وہ وقت قابل ذکر ہے) جب فرشتوں نے مریم (علیہا السلام) سے کہا: اے مریم! اللہ تعالیٰ تجھ کو اپنے کلمہ کی بشارت دیتا ہے اس کا نام مسیح، عیسیٰ ابن مریم ہوگا، وہ دنیا و آخرت میں صاحب وجاہت اور ہمارے مقربین میں سے ہوگا اور وہ (ماں کی) گود میں اور کہولت کے زمانہ میں لوگوں سے کلام کرے گا اور وہ نیکوکاروں میں سے ہوگا، مریم علیہا السلام نے کہا: "میرے لڑکا کیسے ہوسکتا ہے جبکہ مجھ کو کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا" فرشتہ نے کہا: "اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اسی طرح پیدا کردیتا ہے، وہ جب کسی شے کے لیے حکم کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے "ہوجا" اور وہ ہوجاتی ہے، اور اللہ اس کو کتاب و حکمت اور توراۃ و انجیل کا علم عطا کرے گا اور وہ بنی اسرائیل کی جانب اللہ کا رسول ہوگا۔"

﴿وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿١٦﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿١٨﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿١٩﴾ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿٢٠﴾ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَ لِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿٢١﴾﴾ (مریم: ۱۶۔۲۱)

"اور اے پیغمبر! کتاب میں مریم علیہا السلام کا واقعہ ذکر کرو اس وقت کا ذکر جب وہ ایک جگہ پورب کی طرف تھی اپنے گھر کے آدمیوں سے الگ ہوئی پھر اس نے ان لوگوں کی طرف سے پردہ کرلیا، پس ہم نے اس کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا اور وہ ایک بھلے چنگے آدمی کے روپ میں نمایاں ہوگیا مریم اسے دیکھ کر گھبرا گئی، وہ بولی اگر تو نیک آدمی ہے تو میں خدائے رحمان کے نام پر تجھ سے پناہ مانگتی ہوں" فرشتہ نے کہا: "میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں اور اس لیے نمودار ہوا ہوں کہ تجھے ایک پاک فرزند دے دوں" مریم بولی "یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو، حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں اور نہ میں بدچلن ہوں؟" فرشتہ نے کہا: "ہوگا ایسا ہی، تیرے پروردگار نے فرمایا کہ یہ میرے لیے کچھ مشکل نہیں وہ کہتا ہے یہ اس لیے ہوگا کہ اس (مسیح) کو لوگوں کے لیے ایک نشان بنادوں اور میری رحمت کا اس میں ظہور ہو اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے ہوچکا ہے۔"

جبرئیل امین علیہ السلام نے مریم علیہا السلام کو یہ بشارات سنا کر ان کے گریبان میں پھونک دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا کلمہ ان تک پہنچ گیا۔ مریم علیہا السلام نے کچھ عرصہ کے بعد خود کو حاملہ محسوس کیا تو بہ تقاضائے بشری ان پر ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی اور اس کیفیت نے اس وقت شدید صورت اختیار کر لی، جب انہوں نے دیکھا کہ مدت حمل ختم ہو کر ولادت کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے، انہوں نے سوچا کہ اگر یہ واقعہ قوم کے اندر رہ کر پیش آیا تو چونکہ وہ حقیقت حال سے واقف نہیں ہے اس لیے نہیں معلوم وہ کس کس طرح بدنام اور بہتان طرازیوں کے ذریعہ کس درجہ پریشان کرے اس لیے مناسب یہ ہے کہ لوگوں سے دور کسی جگہ چلے جانا چاہیے، یہ سوچ کر وہ یروشلم (بیت المقدس) سے تقریباً نو میل کوہ سراۃ (ساعیر) کے ایک ٹیلہ پر چلی گئیں جو اب "بیت اللحم" کے نام سے مشہور ہے، یہاں پہنچ کر چند روز بعد دردزہ شروع ہوا تو تکلیف و اضطراب کی حالت میں کھجور کے ایک درخت کے نیچے تنے کے سہارے بیٹھ گئیں اور پیش آنے والے نازک حالات کا اندازہ کر کے انتہائی قلق اور پریشانی کی حالت میں کہنے لگیں "کاش کہ میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور میری ہستی کو لوگ ایک قلم فراموش کر چکے ہوتے" تب نخلستان کے نشیب سے خدا کے فرشتہ نے پھر پکارا "مریم علیہا السلام! غمگین نہ ہو، تیرے پروردگار نے تیرے تلے نہر ❶ جاری کر دی ہے اور کھجور کا تنا پکڑ کر اپنی جانب ہلا تو پکے اور تازہ خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے پس تو کھا پی اور اپنے بچہ کے نظارہ سے آنکھیں ٹھنڈی کر اور رنج و غم کو بھول جا۔"

حضرت مریم علیہا السلام پر تنہائی، تکلیف اور نزاکت حال سے جو خوف طاری اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا فرشتہ کی تسلی آمیز پکار اور عیسیٰ علیہ السلام جیسے برگزیدہ بچہ کے نظارہ سے کافور ہو گیا اور وہ عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھ دیکھ کر شاد کام ہونے لگیں۔ تاہم یہ خیال پہلو میں ہر وقت کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا کہ اگرچہ خاندان اور قوم میری عصمت و پاک دامنی سے ناآشنا نہیں ہے پھر بھی ان کی اس حیرت کو کس طرح مٹایا جا سکے گا کہ بن باپ کے کس طرح ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہو سکتا ہے؟

مگر جس خدائے برتر نے ان کو یہ بزرگی اور برتری بخشی وہ کب ان کو اس کرب و بے چینی میں مبتلاء رہنے دیتا، اس لیے اس نے فرشتہ کے ذریعہ مریم علیہا السلام کے پاس پھر یہ پیغام بھیجا کہ جب تو اپنی قوم میں پہنچے اور وہ تجھ سے اس معاملہ کے متعلق سوالات کرے تو خود جواب نہ دینا بلکہ اشارہ سے ان کو بتانا کہ میں روزہ دار ہوں اور اس لیے آج کسی سے بات نہیں کر سکتی تم کو جو کچھ دریافت کرنا ہے اس بچہ سے دریافت کر لو، تب تیرا پروردگار اپنی قدرت کاملہ کا نشان ظاہر کر کے ان کی حیرت کو دور اور ان کے قلوب کو مطمئن کر دے گا۔ حضرت مریم علیہا السلام وحی الٰہی کے ان پیغامات پر مطمئن ہو کر بچہ کو گود میں لے کر بیت المقدس کو روانہ ہوئیں، جب شہر میں پہنچیں اور لوگوں نے اس حالت میں دیکھا تو چہار جانب سے ان کو گھیر لیا اور کہنے لگے "مریم علیہا السلام! یہ کیا؟" تو نے تو بہت ہی عجیب بات کر دکھائی اور بھاری تہمت کا کام کر لیا، اے ہارون نبی علیہ السلام کی بہن! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی بدچلن تھی پھر تو یہ کیا کر بیٹھی؟

مریم علیہا السلام نے خدا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لڑکے کی جانب اشارہ کر دیا کہ جو کچھ دریافت کرنا ہے اس سے معلوم کر لو میں تو آج روزہ ❷ سے ہوں۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر انتہائی تعجب کے ساتھ کہا: "ہم کس طرح ایسے شیر خوار بچہ سے باتیں کر سکتے ہیں جو

---

❶ سری لغت عرب میں نہر کو بھی کہتے ہیں اور بلند ہستی کو بھی، جمہور نے اس جگہ پہلے معنی مراد لیے ہیں۔۔۔۔ اور حسن بصری، ربیع بن انس اور ابن اسلم رحمہم اللہ سے دوسرے معنی منقول ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تیرے تلے ایک بلند ہستی پیدا کر دی ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲)

❷ بنی اسرائیل کے یہاں روزہ میں خاموشی بھی داخل عبادت تھی۔

Marfat.com

ابھی ماں کی گود میں بیٹھنے والا بچہ ہے" مگر بچہ فوراً بول اٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے (اپنے فیصلہ تقدیر میں) مجھ کو کتاب (انجیل) دی ہے اور نبی بنایا ہے اور اس نے مجھ کو مبارک بنایا خواہ میں کسی حال اور کسی جگہ بھی ہوں، اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں یہی میرا اشعار ہو اور اس نے مجھ کو اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا اور خودسر اور نافرمان نہیں بنایا اور اس کی جانب سے مجھ کو سلامتی کا پیغام ہے جس دن کہ میں پیدا ہوا اور جس دن کہ میں مروں گا اور جس دن کہ پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا"۔ اللہ تعالیٰ نے ان تفصیلات کو سورۂ انبیاء، تحریم اور سورۂ مریم میں ذکر فرمایا ہے:

﴿وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۹۱﴾ (الانبیاء: ۹۱)

"اور اس عورت (مریم علیہا السلام) کا معاملہ جس نے اپنی پاکدامنی کو قائم رکھا، پھر ہم نے اس میں اپنی "روح" کو پھونک دیا اور اس کو اور اس کے لڑکے کو جہان والوں کے لیے "نشان" ٹھہرایا ہے۔"

﴿وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا﴾ (التحریم: ۱۲)

"اور عمران کی بیٹی مریم علیہا السلام کہ جس نے اپنی عصمت کو برقرار رکھا پس ہم نے اس میں اپنی روح کو پھونک دیا۔"

﴿فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ۝۲۲ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ۝۲۳ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝۲۴ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۝۲۵ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ۝۲۶ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔـا فَرِيًّا ۝۲۷ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝۲۸ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۭ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝۲۹ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۣ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝۳۰ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝۳۱ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۝۳۲ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ۝۳۳﴾ (مریم: ۲۲۔۳۳)

"پھر اس ہونے والے فرزند کا حمل ٹھہر گیا وہ (اپنی حالت چھپانے کے لیے) لوگوں سے الگ ہو کر دور چلی گئی پھر اسے درد زہ (کا اضطراب) کھجور کے ایک درخت کے نیچے لے گیا (وہ اس کے تنا کے سہارے بیٹھ گئی) اس نے کہا کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی، میری ہستی کو لوگ ایک قلم بھول گئے ہوتے، اس وقت (ایک پکارنے والے فرشتے نے) اسے نیچے سے پکارا "غمگین نہ ہو تیرے پروردگار نے تیرے تلے نہر جاری کر دی ہے، اور کھجور کے درخت کا تنا پکڑ کر اپنی طرف ہلا، تازہ اور پکے ہوئے پھلوں کے خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے، کھا پی (اور اپنے بچہ کے نظارے سے) آنکھیں ٹھنڈی کر،

Marfat.com

پھر اگر کوئی آدمی نظر آئے (اور پوچھ گچھ کرنے لگے) تو (اشارہ سے) کہہ دے میں نے خدائے رحمان کے حضور روزہ کی منت مان رکھی ہے میں آج کسی آدمی سے بات چیت نہیں کرسکتی" پھر ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کو ساتھ لے کر اپنی قوم کے پاس آئی، لڑکا اس کی گود میں تھا، لوگ (دیکھتے ہی) بول اٹھے "مریم! تو نے عجیب ہی بات کر دکھائی" اور بڑی تہمت کا کام کر گزری، اے ہارون ✿ کی بہن! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا نہ تیری ماں بدچلن تھی" (تو یہ کیا کر بیٹھی) اس پر مریم علیہا السلام نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا (کہ یہ تمہیں بتلا دے گا کہ حقیقت کیا ہے" لوگوں نے کہا: بھلا اس سے ہم کیا بات کریں جو ابھی گود میں بیٹھنے والا شیر خوار بچہ ہے" مگر لڑکا بول اٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا، اس نے مجھے بابرکت کیا خواہ میں کسی جگہ ہوں، اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کہ جب تک زندہ رہوں یہی میرا شعار ہو۔ اس نے مجھے اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا، ایسا نہیں کیا کہ خودسر اور نافرمان ہوتا، مجھ پر اس کی طرف سے سلامتی کا پیغام ہے جس دن پیدا ہوا، جس دن مروں گا اور جس دن پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا"۔

قوم نے ایک شیر خوار بچہ کی زبان سے جب یہ حکیمانہ کلام سنا تو حیرت میں رہ گئی اور اس کو یقین ہو گیا کہ مریم علیہا السلام کا دامن بلاشبہ ہر قسم کی برائی اور تلویث سے پاک ہے اور اس بچہ کی پیدائش کا معاملہ یقیناً منجانب اللہ ایک "نشان" ہے۔

یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ پوشیدہ رہ جاتی، قریب اور بعید سب جگہ اس حیرت زا واقعہ اور عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ ولادت کے چرچے ہونے لگے اور طبائع انسانی نے اس مقدس ہستی کے متعلق شروع ہی سے مختلف کروٹیں بدلنی شروع کر دیں، اصحاب خیر نے اس کے وجود کو اگر یمن وسعادت کا ماہتاب سمجھا تو اصحاب شر نے اس کی ہستی کو اپنے لیے فال بد جانا اور بغض وحسد کے شعلوں نے اندر ہی اندر ان کی فطری استعداد کو کھانا شروع کر دیا۔

غرض اسی متضاد فضاء کے اندر اللہ تعالیٰ اپنی نگرانی میں اس مقدس بچہ کی تربیت اور حفاظت کرتا رہا تاکہ اس کے ہاتھوں بنی اسرائیل کے مردہ قلوب کو حیات تازہ بخشے اور ان کی روحانیت کے شجر خشک کو ایک مرتبہ پھر بارآور اور مثمر بنائے۔

﴿وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ ۝﴾ (المؤمنون: ۵۰) ✿

✿ کہتے ہیں کہ ہارون مریم علیہا السلام کے خاندان میں ایک عابد وزاہد انسان اور بہت نیک نفس مشہور تھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

✿ عن ابن عباس فی قولہ ﴿وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾ قال المعین الماء الجاری و ھو النھر الذی قال اللہ تعالی ﴿قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا﴾ و کذا قال الضحاک و قتادۃ الی ﴿إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾ ھو بیت المقدس و ھذا واللہ اعلم ھو الاظھر لانہ المذکور فی الایۃ الاخریٰ والقران یفسر بعضہ بعضا و ھذا اولی ما یفسر بہ ثم الاحادیث الاصحیحہ ثم الاثار. (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۴۶)

یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت ﴿وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾ کی تفسیر میں منقول ہے کہ "معین" سے نہر جاری مراد ہے اور یہ اسی نہر کا ذکر ہے جس کو آیت ﴿قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا﴾ میں بیان کیا گیا ہے اور ضحاک اور قتادہ رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے کہ ﴿إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾ سے بیت المقدس کی سرزمین مراد ہے اور یہی قول زیادہ ظاہر ہے اس لیے کہ دوسری آیت میں بیت المقدس (کی نہر) کا ہی ذکر ہے اور قرآن کا بعض حصہ خود ہی دوسرے حصہ کی تفسیر کر دیا کرتا ہے اور تفسیر آیات میں پہلی جگہ اسی طریق تفسیر کو حاصل ہے اس کے بعد صحیح احادیث کے ذریعہ تفسیر کا اور اس کے بعد آثار کے ذریعہ تفسیر کا درجہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

Marfat.com

"اور ہم نے عیسیٰ بن مریم اور اس کی ماں (مریم) کو (اپنی قدرت کا) نشان بنا دیا اور ان دونوں کا ایک بلند مقام (بیت اللحم) پر ٹھکانا بنایا جو سکونت کے قابل اور چشمہ والا ہے۔"

بشارات ولادت:

قرآن عزیز نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے حالات میں سے صرف اسی اہم واقعہ کا ذکر کیا ہے باقی بچپن کے دوسرے حالات کو جن کا ذکر قرآن کے مقصد تذکیر و موعظت سے خاص تعلق نہیں رکھتا تھا نظر انداز کر دیا ہے لیکن اسرائیلیات کے مشہور ناقل حضرت وہب بن منبہ سے جو واقعات منقول ہیں اور متی کی انجیل میں بھی جن کا ذکر موجود ہے ان میں سے یہ واقعہ بھی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو اسی شب میں فارس کے بادشاہ نے آسمان پر ایک نیا ستارہ روشن دیکھا، بادشاہ نے درباری نجومیوں سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ اس ستارہ کا طلوع کسی عظیم الشان ہستی کی پیدائش کی خبر دیتا ہے جو ملک شام میں پیدا ہوئی ہے۔ تب بادشاہ نے خوشبوؤں کے عمدہ تحفے دے کر ایک وفد کو ملک شام روانہ کیا کہ وہ اس بچہ کی ولادت سے متعلق حالات و واقعات معلوم کریں، وفد جب شام پہنچا تو اس نے تفتیش حال شروع کی اور یہودیوں سے کہا کہ ہم کو اس بچہ کی ولادت کا حال سناؤ جو مستقبل قریب میں روحانیت کا بادشاہ ثابت ہوگا۔ یہود نے اہل فارس کی زبان سے یہ کلمات سنے تو اپنے بادشاہ ہیرودیس کو خبر کی، بادشاہ نے وفد کو دربار میں بلا کر استصواب حال کیا اور ان کی زبانی واقعہ کو سن کر بہت گھبرایا اور پھر وفد کو اجازت دی کہ وہ اس بچہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کریں۔ پارسیوں کا یہ وفد بیت المقدس پہنچا اور جب حضرت یسوع علیہ السلام کو دیکھا تو اپنے رسم و رواج کے مطابق اول ان کو سجدۂ تعظیم کیا اور پھر مختلف قسم کی خوشبوئیں ان پر نثار کیں اور چند روز وہیں قیام کیا، دوران قیام میں وفد کے بعض آدمیوں نے خواب میں دیکھا کہ ہیرودیس اس بچہ کا دشمن ثابت ہوگا اس لیے تم اب اس کے پاس نہ جاؤ اور بیت اللحم سے سیدھے فارس کو چلے جاؤ۔ صبح کو وفد نے فارس کا ارادہ کرتے وقت حضرت مریم علیہا السلام کو اپنا خواب سناتے ہوئے کہا کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کی نیت خراب ہے اور وہ اس مقدس بچہ کا دشمن ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ تم اس کو ایسی جگہ لے جا کر رکھو جو اس کی دسترس سے باہر ہو، اس مشورہ کے بعد حضرت مریم علیہا السلام یسوع مسیح علیہ السلام کو اپنے بعض عزیزوں کے پاس مصر لے گئیں اور وہاں سے ناصرہ چلی گئیں اور جب عیسیٰ علیہ السلام کی عمر مبارک تیرہ سال کی ہوئی تو ان کو ساتھ لے کر دوبارہ بیت المقدس واپس آئیں۔ یہی روایات یہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے حالات زندگی بھی غیر معمولی تھے اور ان سے طرح طرح کے کرامات کا صدور ہوتا رہتا تھا۔[1] (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

حلیہ مبارک:

بخاری حدیث معراج میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، میری ملاقات حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہوئی تو میں نے ان کو میانہ قد سرخ سپید پایا۔ بدن ایسا صاف شفاف تھا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حمام سے نہا کر آئے ہیں، اور بعض روایات میں ہے کہ آپ کے کاکل کاندھوں تک لٹکے ہوئے تھے اور بعض احادیث میں ہے کہ رنگ کھلتا ہوا گندم گوں تھا۔ بخاری کی روایت اور اس

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۷۷ و انجیل متی باب ۲

Marfat.com

روایت میں اداء و تعبیر کا فرق ہے حسن میں اگر صباحت کے ساتھ ملاحت کی آمیزش بھی ہوتی ہے تو اس رنگ میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، کسی وقت اگر سرخی جھلک آئی تو صباحت نمایاں ہو جاتی ہے اور اگر کسی وقت ملاحت غالب آ گئی تو چہرہ پر حسن و لطافت کے ساتھ کھلتا ہوا گندم گوں رنگ چمکنے لگتا ہے۔

بعثت و رسالت:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل بنی اسرائیل ہر قسم کی برائیوں میں مبتلاء تھے اور انفرادی و اجتماعی عیوب و نقائص کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو ان سے بچ رہا ہو، وہ اعتقاد و اعمال دونوں ہی قسم کی گمراہیوں کا مرکز و محور بن گئے تھے حتیٰ کہ اپنی ہی قوم کے ہادیوں اور پیغمبروں کے قتل تک پر جری اور دلیر ہو گئے تھے، یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے متعلق معلوم کر چکے ہو کہ اس نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اپنی محبوبہ کے اشارہ پر کیسے عبرتناک طریقہ پر قتل کرا دیا تھا اور اس نے یہ سفاکانہ اقدام صرف اس لیے کیا کہ وہ حضرت علیہ السلام کی بڑھتی ہوئی روحانی مقبولیت کو برداشت نہ کر سکا اور اپنی محبوبہ سے ناجائز رشتہ پر ان کی نہی عن المنکر (برائی سے بچانے کی ترغیب) کی تاب نہ لا سکا اور یہ عبرتناک سانحہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی مبارک ہی میں ان کی بعثت سے قبل پیش آ چکا تھا۔

دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا للبستانی) میں یہود سے متعلق جو مقالہ ہے اس کے تاریخی مواد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے یہود کے عقائد و اعمال کا یہ حال تھا کہ وہ مشرکانہ رسوم و عقائد کو جزء مذہب بنا چکے تھے اور جھوٹ، فریب، بغض و حسد جیسی بداخلاقیوں کو تو عملاً اخلاق کریمانہ کی حیثیت دے رکھی تھی اور اسی بناء پر بجائے شرمسار ہونے کے وہ ان پر فخر کا اظہار کرتے تھے اور ان علماء و احبار نے تو دنیا کے لالچ اور حرص میں کتاب اللہ (توراۃ) تک کو تحریف کیے بغیر نہ چھوڑا اور درہم و دینار پر خدا کی آیات کو فروخت کر ڈالا یعنی عوام سے نذر اور بھینٹ حاصل کرنے کی خاطر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا اور اس طرح قانون الٰہی کو مسخ کر ڈالا۔

یہود کی اعتقادی اور عملی زندگی کا مختصر اور مکمل نقشہ ہم کو شعیا علیہ السلام کی زبانی خود توراۃ نے اس طرح دکھایا ہے:

"خداوند فرماتا ہے: یہ امت (بنی اسرائیل) زبان سے تو میری عزت کرتی ہے مگر ان کا دل مجھ سے دور ہے اور یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں کیونکہ میرے حکموں کو پیچھے ڈال کر آدمیوں کے حکموں کی تعلیم دیتے ہیں۔"

بہرحال ان ہی تاریک حالات میں جب حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کا واقعہ بھی ہو گزرا اور بنی اسرائیل نے خدا کے حکموں کے خلاف بغاوت و سرکشی کی حد کر دی تب وہ وقت سعید آ پہنچا کہ جس مبارک بچہ نے حضرت مریم علیہا السلام کی آغوش میں پیغام حق سنا کر بنی اسرائیل کو حیرت میں ڈال دیا تھا سن رشد کو پہنچ کر اس نے یہ اعلان کر کے "کہ وہ خدا کا رسول اور پیغمبر ہے اور رشد و ہدایت خلق اس کا فرض منصبی" قوم میں ہلچل پیدا کر دی، وہ شرف رسالت سے مشرف ہو کر اور حق کی آواز بن کر آیا اور اپنی صداقت و حقانیت کے نور سے تمام اسرائیلی دنیا پر چھا گیا، اس مقدس ہستی نے قوم کو للکارا اور احبار کی علمی مجلسوں، راہبوں کے خلوت کدوں بادشاہ اور امراء کے درباروں اور عوام و خواص کی محفلوں میں حتیٰ کہ کوچہ و برزن اور بازاروں میں شب و روز یہ پیغام حق سنایا۔

لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنا رسول اور پیغمبر بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہاری اصلاح کی خدمت میرے سپرد فرمائی

ہے، میں اس کی جانب سے پیغام ہدایت لے کر آیا ہوں اور تمہارے ہاتھ میں خدا کا جو قانون (توراۃ) ہے اور جس کو تم نے اپنی جہالت اور کج روی سے پس پشت ڈال دیا ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور اس کی مزید تکمیل کے لیے خدا کی کتاب (انجیل) لے کر آیا ہوں، یہ کتاب حق و باطل کا فیصلہ کرے گی اور آج جھوٹ اور سچ کے درمیان فیصلہ ہو کر رہے گا۔ سنو اور سمجھو اور اطاعت کے لیے خدا کے حضور جھک جاؤ کہ یہی دین و دنیا کی فلاح کی راہ ہے۔

اب ان حقائق اور ان کے عواقب و نتائج کو قرآن کی زبانی سنئے اور "احقاق حق و ابطال باطل" کے لطف سے بہرہ مند ہو کر عبرت و موعظت حاصل کیجئے، کیونکہ "تذکیر بایام اللہ" سے قرآن کا مقصد عظیم یہی بصیرت عبرت ہے:

﴿ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ؗ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ؗ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝ وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾

(البقرہ: ۸۷-۸۸)

"اور بیشک ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (توراۃ) عطاء کی اور اس کے بعد ہم (تم میں) پیغمبر بھیجتے رہے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کو واضح معجزے دے کر بھیجا اور ہم نے اس کو روح پاک (جبرئیل) کے ذریعہ قوت و تائید عطاء کی، کیا جب تمہارے پاس (خدا کا) پیغمبر ایسے احکام لے کر آیا جن پر عمل کرنے کو تمہارا دل نہیں چاہتا تو تم نے غرور کو شیوہ (نہیں) بنالیا؟ پس (پیغمبروں کی) ایک جماعت کو جھلاتے ہو تو ایک جماعت کو قتل کر دیتے ہو، اور کہتے ہو کہ ہمارے دل (قبول حق کے لیے) غلاف میں ہیں (یہ نہیں) بلکہ ان کے کفر کرنے پر خدا نے ان کو ملعون کر دیا ہے پس بہت تھوڑے سے ہیں جو ایمان لے آئے ہیں۔"

﴿ وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ ﴾ (المائدہ: ۱۱۰)

"اور (اے عیسیٰ) جب ہم نے بنی اسرائیل (کی گرفت و ارادۂ قتل) کو تجھ سے باز رکھا اس وقت جبکہ تو ان کے پاس کھلے معجزات لے کر آیا تو کہا بنی اسرائیل میں سے منکروں نے، یہ کچھ نہیں ہے مگر کھلا جادو ہے۔"

﴿ وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ ﴾

(آل عمران: ۵۰-۵۲)

"اور میں تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے ہے اور (اس لیے آیا ہوں) تاکہ تمہارے لیے بعض وہ

چیزیں حلال کردوں جو (تمہاری کج روی کی وجہ سے) تم پر حرام کردی گئی تھیں اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی نشانی لے کر آیا ہوں پس اللہ کا خوف کرو اور میری پیروی کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا اور تمہارا پروردگار ہے، پس اسی کی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے۔ پس جبکہ عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے کفر محسوس کیا تو فرمایا اللہ کے لیے کون میرا مددگار ہے تو شاگردوں نے جواب دیا ہم ہیں اللہ کے (دین کے) مددگار۔"

﴿ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ﴾ (الحدید: ۲۷)

"پھر ان کے بعد (نوح وابراہیم علیہما السلام کے بعد) ہم نے اپنے رسول بھیجے اور ان کے بعد عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کو رسول بنا کر بھیجا اور اس کو کتاب (انجیل) عطاء کی۔"

﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ﴾

(سورہ المائدہ: ۱۱۰)

"(وہ وقت یاد کے لائق ہے) جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا "اے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام! میری اس نعمت کو یاد کر جو میری جانب سے تجھ پر اور تیری والدہ پر نازل ہوئی جبکہ میں نے روح القدس (جبرئیل) کے ذریعہ تیری تائید کی کہ تو کلام کرتا تھا آغوش مادر میں اور بڑھاپے میں اور جبکہ میں نے تجھ کو سکھائی کتاب، حکمت، توراۃ اور انجیل۔"

﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ﴾ (الصف: ٦)

"اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) نے کہا: اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت سنانے والا ہوں ایک پیغمبر کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے۔" (صلی اللہ علیہ وسلم)

آیات بینات:

قصص القرآن جلد اول معجزات کی بحث میں گزر چکا ہے کہ حق وصداقت کے تسلیم وانقیاد میں انسانی فطرت ہمیشہ سے دو طریقوں سے مانوس رہی ہے ایک یہ کہ مدعی حق کی حقانیت وصداقت، دلائل کی قوت اور براہین کی روشنی کے ذریعہ ثابت اور واضح ہو جائے اور دوسرا طریقہ یہ کہ دلائل و براہین کے ساتھ ساتھ منجانب اللہ اس کی صداقت کی تائید میں عام قانون قدرت سے جدا بغیر اسباب ووسائل اور تحصیل علم وفن کے اس کے ہاتھ پر امور عجیبہ کا مظاہرہ اس طرح ہو کہ عوام وخواص اس کے مقابلہ سے عاجز ودرماندہ ہو جائیں اور ان کے لیے اسباب ووسائل کے بغیر ان امور کی ایجاد ناممکن ہو، پہلے طریق کے ساتھ یہ دوسرا طریق انسان کے عقل وفکر اور اس کی نفسیاتی کیفیات میں ایسا انقلاب پیدا کر دیتا ہے کہ ان کا وجدان یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ داعی حق (نبی وپیغمبر) کا

یہ عمل دراصل خود اس کا اپنا فعل نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ خدا کی قوت کام کر رہی ہے اور بلاشبہ یہ اس کے صادق ہونے کی مزید دلیل ہے۔ چنانچہ قرآن عزیز میں آیت ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ﴾ [1] میں اسی حقیقت کا اظہار مقصود ہے مگر ان ہر دو طریقوں میں سے ان اصحاب علم و دانش پر جو قوت فہم و ادراک میں بلند مقام رکھتے ہیں پہلا طریقہ زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے اور وہ دوسرے طریقہ کو پہلے طریقہ کی تائید و تقویت کی حیثیت سے قبول کرتے اور داعیٔ حق (نبی و پیغمبر) کے دعوائے نبوت و رسالت کی صداقت کا مزید عملی ثبوت یقین کر کے اس پر ایمان لے آتے ہیں اور ان حضرات ارباب عقل و فکر کے برعکس ارباب قوت و اقتدار اور ان کی ذہنیت سے متاثر عام انسانی قلوب دوسرے طریقہ تصدیق سے زیادہ متاثر ہوتے اور نبی و پیغمبر کے معجزانہ افعال کو کائنات کی طاقت و قوت کے دائرہ سے بالاتر ہستی کا ارادہ و قوت فعل یقین کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ان امور کو "خدائی نشان" باور کر کے دعوت حق و صداقت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔

قرآن عزیز نے اکثر و بیشتر مقامات پر پہلے طریق دلیل کو "حجۃ اللہ" "برہان" اور "حکمۃ" سے تعبیر کیا ہے۔ سورہ انعام میں خدا کی ہستی اس کی وحدانیت، معاد و آخرت اور دین کے بنیادی عقائد کو دلائل، نظائر اور شواہد کے ذریعہ سمجھانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

﴿قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ (الانعام: ۱۴۹)

"(اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے، اللہ کے لیے ہی ہے حجت کامل (یعنی مکمل اور روشن دلیل)"

اور اس سورۃ میں دوسری جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں ہے:

﴿وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ﴾ (الانعام: ۸۳)

"اور یہ ہماری "دلیل" ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطاء کی۔"

اور سورۂ نساء میں ہے:

﴿رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (النساء: ۱۶۵)

"(ہم نے بھیجے) پیغمبر خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تاکہ لوگوں کی جانب سے خدا پر پیغمبر بھیجنے کے بعد کوئی حجت (دلیل) باقی نہ رہے (کہ ہمارے پاس دلائل کے ذریعہ راہ مستقیم بتانے کوئی نہ آیا تھا اس لیے ہم دین حق کی معرفت سے محروم رہے)۔"

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ﴾ (النساء: ۱۷۴)

"اے لوگو! بیشک تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے برہان (قرآن) آ گیا۔"

[1] اور اے پیغمبر (بدر کے غزوہ میں) جب تو نے (دشمنوں پر) مٹھی بھر خاک پھینکی تھی تو تو نے وہ مشت خاک نہیں پھینکی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی مفصل بحث جلد اول میں گزر چکی ہے۔

Marfat.com

اور سورۂ یوسف میں ہے:

﴿لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ (یوسف: ٢٤)

"اگر نہ ہوتی یہ بات کہ دیکھ لی تھی اس (یوسف علیہ السلام) نے اپنے پروردگار کی دلیل۔"

اور سورۂ نحل میں ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (النحل: ١٢٥)

"اپنے پروردگار کے راستہ کی جانب دعوت و حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور تبادلہ خیالات کرو ان (مخالفین) کے ساتھ اچھے طریق گفتگو سے۔"

اور سورۂ نساء ہے:

﴿وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (النساء: ١١٣)

"اور اللہ تعالیٰ نے اتارا تجھ پر کتاب کو اور حکمت کو۔"

اسی طرح "حکمت" کا یہ ذکر سورہ بقرہ آل عمران، مائدہ، لقمان، صٓ، زخرف، احزاب اور قمر میں بہ کثرت موجود ہے اور دوسرے طریق دلیل کو اکثر "آیۃ اللہ" اور آیات اللہ" اور بعض مقامات پر "آیات بینات" اور "بینات" کہا گیا ہے۔

ناقہ صالح علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے:

﴿هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً﴾ (الاعراف: ٧٣)

"یہ اونٹنی تمہارے لیے (خدا کی جانب سے) ایک "نشان" ہے۔"

اور حضرت مسیح اور ان کی والدہ مریم علیہا السلام کے متعلق ارشاد ہے:

﴿وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ٩١)

"اور ہم نے کر دیا مریم اور اس کے لڑکے عیسیٰ علیہ السلام کو جہان والوں کے لیے "نشان" (معجزہ)"

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں ارشاد باری ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ﴾ (بنی اسرائیل: ١٠١)

"اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو نو نشان (معجزات) عطا کیے۔"

اور حضرت مسیح علیہ السلام کو جو معجزات دیے گئے تھے ان کے متعلق ارشاد ہے:

"اور دیے ہم نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو معجزات۔ اس وقت جبکہ تو ان کے پاس کھلے معجزات لے کر آیا تو کہا بنی اسرائیل میں سے منکروں نے یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔"

Marfat.com

ہم نے اس مقام پر اکثر و بیشتر کا لفظ قصداً اختیار کیا ہے کیونکہ قرآن عزیز کے اسلوب بیان سے واقف اس سے بے خبر نہیں ہے کہ اس نے ان الفاظ کے استعمال میں وسعتِ تعبیر سے کام لیا ہے یعنی جبکہ "معجزہ" بھی ایک خاص قسم کا "برہان" ہے اور قرآن اور آیات قرآن جس طرح سرتا سر "علم و برہان ہیں اسی طرح "معجزہ" بھی ہیں، اس لیے معجزہ پر برہان کا اطلاق اور کتاب اللہ کے جملوں پر آیت اور آیات اللہ کا اطلاق مجاز نہیں بلکہ حقیقت ہے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دو معجزوں عصاء اور ید بیضاء کے متعلق سورۂ قصص میں ہے:

﴿فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (القصص:۳۲)

"پس تیرے رب کی جانب سے یہ دو دلیلیں ہیں۔"

اور کتاب اللہ اور اس کے جملوں پر آیت اور آیات کے اطلاقات سے تو قرآن کی کوئی طویل سورہ ہی خالی ہوگی، تمام قرآن میں جگہ جگہ اس کثرت سے اس کا استعمال ہوا ہے کہ اس کی فہرست مستقل موضوع بن سکتا ہے۔

اسی طرح "آیات بینات" کا اگرچہ بکثرت اطلاق کتاب اللہ (قرآن، توراۃ، زبور، انجیل) اور ان کی آیات پر ہوا ہے مگر مسطورہ بالا مقامات کی طرح بعض بعض جگہ اس کو "معجزات" کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔

لائق توجہ بات اور حقیقت معجزات:

نبی اور رسول کی بعثت کا مقصد کائنات کی رشد و ہدایت اور دین و دنیا کی فلاح و خیر کی رہنمائی ہے اور وہ منجانب اللہ وحی کی روشنی میں اس فرض منصبی کو انجام دیتا اور علم و برہان اور حجتِ حق کے ذریعہ راہ صداقت دکھاتا ہے، وہ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ فطرت اور ماوراءِ فطرت امور میں تصرف و تغیر بھی اس کا کار منصبی ہے بلکہ وہ بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ میں خدا کی جانب سے بشیر و نذیر اور داعی الی اللہ بن کر آیا ہوں، میں انسان ہوں اور خدا کا ایلچی، اس سے زائد اور کچھ نہیں ہوں تو پھر اس کے دعوائے صداقت کے امتحان اور پرکھ کے لیے، اس کی تعلیم، اس کی تربیت اور اس کی شخصیت کا زیر بحث آنا یقیناً معقول لیکن اس سے ماوراءِ فطرت اور خارق عادت عجائبات و غرائب کا مطالبہ خلاف عقل اور بے جوڑ بات معلوم ہوتی ہے اور یوں نظر آتا ہے کہ کسی طبیب حاذق کے دعوائے حذاقت طب پر اس سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ طلسمی کھٹکے کی ایک عمدہ الماری یا لکڑی کا ایک عجیب قسم کا کھلونا بنا کر دکھائے، طبیب نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ ماہر لوہار یا بڑھئی ہے بلکہ اس کا دعویٰ تو امراض جسمانی کے علاج کا ہے، اسی طرح پیغمبر خدا کا یہ دعویٰ نہیں ہوتا کہ وہ خدا کی طرح کائنات پر ہمہ قسم کے تصرف و تغیر کا مالک و قادر ہے بلکہ اس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ تمام امراض روحانی کے لیے طبیب کامل اور حاذق و ماہر ہے۔

پس دعویٰ نبوت اور معجزات (خارق عادات امور) کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اور کیا اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ "معجزہ" لازم نبوت میں سے نہیں ہے؟

بلاشبہ یہ سوال بہت زیادہ قابل توجہ ہے اور اس لیے علم کلام میں اس مسئلہ کو کافی اہمیت دی گئی ہے لیکن ہم نے "آیات بینات" عنوان کے ماتحت ابتداء کلام میں دعوائے نبوت کی صداقت سے متعلق دلائل کی جو تقسیم انسانی طبائع اور ان کے فطری رجحانات

Marfat.com

کے پیش نظر کی ہے وہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور جوہر عقل کے تفاوت درجات نے بلاشبہ انسانوں کی قوت فکریہ کو جدا جدا دو طریقوں کی جانب مائل کر دیا ہے، ان حالات میں جب ایک نبی اور رسول یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خدا کی جانب سے ایک ایسے منصب پر مامور ہے جو ریاضات ومجاہدات اور نیک عملی کی قوت سے نہیں بلکہ محض خدا کی موہبت اور عطاء سے حاصل ہوتا ہے اور یہ "منصب نبوت ورسالت" ہے اور اس کا مقصد کائنات کی رشد وہدایت اور تعلیم حق وصداقت ہے تو بعض انسانی دماغ اور ان کا جوہر عقل اس جانب متوجہ ہو جاتا ہے کہ اگر اس ہستی کا یہ دعویٰ صحت پر مبنی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کو خدائے برتر کے ساتھ اس درجہ قربت حاصل ہے جو دوسرے انسانوں کے لیے ناممکن ہے پس جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی صدائے اصلاح اور اس کی تعلیم ہمارے قدیم رسم ورواج یا مذہب و دھرم کے ان عقائد واعمال کے خلاف ہے جس کو ہم حق سمجھتے آئے ہیں تو ان متضاد اور متخالف تعلیمات کی صداقت وبطالت کے امتحان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ یہ ہستی کوئی اور ماوراء فطرت یا خارق عادت امر کر دکھائے تو ہمارے لیے یہ سمجھنا بہت آسان ہو جائے گا کہ بغیر اسباب ووسائل کے اس ہستی کے ہاتھ ایسے امر کا صدور یقیناً اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کو خدائے برتر کے ساتھ خاص قرب حاصل ہے، تب ہی تو خدائے برحق نے یہ "نشان" دکھا کر اس کی صداقت پر مہر لگا دی، نیز وہ صاحب قوت واقتدار انسان جن کے غور وفکر کی قوت ایسے سانچہ میں ڈھل گئی ہے کہ ان پر کوئی امر حق اس وقت تک مؤثر ہی نہیں ہوتا جب تک کہ ان کی متکبرانہ طاقت کو غیبی ٹھوکر سے بیدار نہ کیا جائے، وہ بھی اس کے منتظر رہتے ہیں کہ مدعی نبوت ورسالت اپنی صداقت کو دلیل وبرہان کے ساتھ ساتھ ایک ایسے "کرشمہ" کے ذریعہ ناقابل انکار بنا دے کہ جس کا صدور دوسرے انسانوں سے یا تو ممکن ہی نہ ہو اور یا بغیر اسباب ووسائل کے استعمال کیے وجود پذیر نہ ہو سکتا ہو تا کہ یہ باور کیا جا سکے کہ بلاشبہ اس ہستی کی تعلیم وتبلیغ کو خدائے برتر کی تائید حاصل ہے۔ اسی لیے علماء کلام نے دعوائے نبوت اور معجزہ کے درمیان تعلق پر بحث کرتے ہوئے یہ مثال بیان کی ہے کہ ایک شخص جب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کو بادشاہ وقت نے اپنا نائب مقرر کر کے بھیجا ہے تو اس ملک یا صوبے کے باشندے خواستگار ہوتے ہیں کہ مدعی نیابت اپنے دعویٰ کی صداقت کے لیے کوئی سند اور علامت پیش کرے۔ چنانچہ مدعی نیابت ایک جانب اگر سند دکھاتا ہے تو دوسری جانب ایسی "نشانی" بھی پیش کرتا ہے جس کے متعلق یہ یقین کیا جا سکے کہ بادشاہ کی عطاء کردہ یہ نشانی اس کے عطیہ اور اس منصب کی تصدیق کے علاوہ اور کسی طرح بھی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً بادشاہ کی انگشتری (مہر حکومت) یا ایسا خاص عطیہ جو صرف اس منصب پر فائز ہستی کو عطاء کیا جاتا ہو۔

تو اگرچہ بظاہر دعویٰ نیابت اور انگشتری یا عطیہ خاص کے درمیان کوئی مطابقت نہیں ہے تاہم اس تعلق خاص نے جو شاہی تصدیق سے وابستہ ہے ان دونوں کے درمیان اہم ربط پیدا کر دیا ہے۔

لیکن جبکہ طریق تصدیق، معیار صداقت وحقانیت میں دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتا ہے اور حقیقتاً معیاری حیثیت صرف طریق اول (حجۃ وبرہان حق" کو ہی حاصل ہے، اس لیے معجزہ کے وقوع وصدور کا معاملہ پہلے طریق کے وجود وصدور سے قطعاً جدا ہے اور وہ یہ کہ ہر ایک مدعی نبوت ورسالت کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ اپنے دعویٰ حق وصداقت کو حجۃ وبرہان کی روشنی اور علم ویقین کی قوت کے ذریعہ ثابت کرے اور اپنی تعلیم وتربیت، اور شخصی حیات کے ہر پہلو میں دعویٰ اور دلیل وبرہان کی مطابقت کو واضح کرے اور انسانی جوہر عقل کے فکر وتدبر کی رہنمائی کا فرض اس طرح انجام دے کہ ہر قسم کے ظن ووہم اور فاسد وکاسد خیالات کے مقابلہ میں

Marfat.com

"یقین محکم" روز روشن کی طرح نمودار ہو جائے اور اس ادائے فرض کے لیے کسی کی جانب سے نہ مطالبہ شرط ہے اور نہ جستجو لازم بلکہ یہ نبی اور رسول کا براہ راست وہ فرض ہے جس کے لیے خدائے تعالیٰ نے اس کو منتخب اور مامور کیا ہے اور اگر ایک لمحہ کے لیے بھی وہ اس میں کوتاہی کرتا ہے تو گویا اپنے فرض کی پوری عمارت کو اپنے ہاتھ سے برباد کر دیتا ہے۔

﴿يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ﴾ (المائدہ: ٦٧)

"اے پیغمبر! جو تم پر نازل کیا گیا ہے تم اس کو پورا پورا پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو منصب رسالت کو ادا نہ کیا۔"

اس کے برعکس معجزہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ نبی اور رسول اس کو ضرور ہی دکھائے یا مخالفین کے ہر مطالبہ پر اس کی تعمیل کرے بلکہ "معجزہ" حجت و برہان کی وہ قسم ہے جو اکثر معاندین کے مطالبہ پر وقوع پذیر ہوتا ہے اور اس سے اس کا صدور صرف عالم الغیب کی اپنی "حکمت و مصلحت" پر ہی موقوف رہتا ہے اور وہی خوب جانتا ہے کہ معجزہ کے بارہ میں کسی کا سوال جو یائے حق کی حیثیت میں ہے اور کس کا تعنت اور انکار مزید کے لیے کن سعید روحوں پر اس کا یہ اثر پڑے گا کہ وہ کہہ اٹھیں گی ﴿آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَىٰ﴾ اور کن بدبختوں پر اس طرح اثر انداز ہوگا کہ یوں گویا ہوں گے: ﴿إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ۝﴾

پس قرآن عزیز نے اگر ایک جانب بہ نصوص قطعیہ یہ ظاہر کیا ہے کہ اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو حجت و برہان کے ساتھ مزید تائید و تقویت کے لیے معجزات عطا کیے ہیں تو دوسری جانب یہ بھی صاف صاف نبی کی زبانی کہلا دیا ہے کہ میں خدا کی جانب سے فقط "نذیر مبین" "بشیر و نذیر" اور "رسول و نبی" ہوں۔ میں نے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا کہ میں کائنات خداوندی کے تصرفات و تغیرات اور ماوراء فطرت امور پر قادر ہوں، ہاں خدائے برتر اگر چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے اور اس نے ایسا کیا بھی ہے مگر وہ جب ہی کرتا ہے کہ اس کی حکمت و مصلحت اس کی متقاضی ہو۔

چنانچہ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کو منطق الطیر اور تسخیر ہوا، طیور و جن کے نشان دیے گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو "تسع آیات بینات" "نو کھلے نشان" عطاء کیے گئے جن میں سے دو نشان اعصاء اور ید بیضاء کو قرآن نے "بڑے نشان" کہا ہے اور بحر قلزم میں غرق فرعون اور نجات قوم موسیٰ علیہ السلام کا عجیب و غریب واقعہ مستقل ایک "نشان عظیم" ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دہکتی آگ کے شعلوں کو "بردوسلام" بنا دیا۔ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے لیے "ناقہ صالح" کو نشان بنایا کہ جوں ہی اس کو کسی نے ستایا اسی وقت خدا کا عذاب قوم کو تباہ و برباد کر جائے گا۔ چنانچہ ٹھیک اسی طرح پیش آیا۔ حضرت ہود اور حضرت نوح علیہما السلام سے ان کی قوموں نے عذاب طلب کیا اور کافی سمجھانے کے بعد بھی جب ان کا اصرار قائم رہا تو ان پیغمبروں نے عذاب الٰہی کی جو وعیدیں سنائی تھیں وہ ٹھیک اپنے اپنے وقت پر پوری ہوئیں حالانکہ ان سب مواقع میں بظاہر اسباب نزول عذاب اور وقوع حوادث ہلاکت کے کوئی سامان نہیں تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو مختلف نشان (معجزات) دیئے گئے ان کو بھی قرآن نے صاف صاف بیان کر دیا ہے جو ابھی زیر بحث آئیں گے اور آخر میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو علمی معجزہ قرآن عطا کیا جس کی تحدی (مقابلہ کے چیلنج) کا کوئی جواب نہ دے سکا، نیز بدر کے معرکہ میں فرشتوں کا نزول اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کی نصرت و یاوری اور ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۚ﴾ کے اعلان سے اس مشہور معجزہ کا اظہار فرمایا جس نے بدر کے میدان میں مٹھی بھر خاک کو ایک ہزار دشمنوں کی آنکھوں کا آزار بنا دیا اور

"شق القمر" کا معجزہ عطا فرمایا۔ معاملہ زیر بحث کا یہ ایک پہلو یا ایک رخ ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب خاتم الانبیاء محمد کریم ﷺ کی دعوت ارشاد و تبلیغ حق کے روشن دلائل و براہین کا کوئی جواب مخالفین سے نہ بن پڑا تو از راہ تعنت و سرکشی عجائبات اور خارق عادات امور کا مطالبہ کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی پیغمبر ﷺ کو اطلاع دی کہ ان کا مقصد طلب حق اور جستجوئے صداقت نہیں ہے بلکہ یہ جو کہہ رہے ہیں سرکشی، ضد اور تعصب کی راہ سے کہتے ہیں اس لیے ان کا جواب یہ نہیں ہے کہ خدا کے نشانات کو بھان متی کا تماشا یا مداری کا کھیل بنا دیا جائے بلکہ اصل جواب یہ ہے کہ ان سے کہہ دو میں ان تصرفات کا مدعی نہیں ہوں میں تو نیک و بد امور میں تمیز پیدا کرنے، خدا کے بندوں کا خدا کے ساتھ رشتہ ملانے اور نیک و بد کاموں کے انجام کو واضح کرنے کے لیے "نذیر مبین" اور "نبی رسول" ہوں:

﴿وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ۝۹۰ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ۝۹۱ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِيْلًا ۙ۝۹۲ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝۹۳﴾ (بنی اسرائیل: ۹۰۔۹۳)

"اور انہوں نے (مشرکوں نے) کہا: ہم اس وقت تک ہرگز تیری بات نہیں مانیں گے کہ تو ہمارے لیے زمین سے چشمہ ابال دے یا تیرے واسطے کھجوروں کا اور انگوروں کا باغ ہو اور تو اس کے درمیان زمین پھاڑ کر نہریں بہا دے یا تو جیسا گمان کرتا ہے ہمارے اوپر آسمان گرا دے یا تو اللہ اور اس کے فرشتوں کو (ہمارے) مقابل لائے یا تیرے واسطے ایک سونے کا (طلائی) مکان ہو اور یا تو چڑھ جائے آسمان پر اور ہم تیرے چڑھ جانے کو بھی ہرگز اس وقت تک نہیں تسلیم کریں گے تاوقتیکہ تو ہمارے پاس (آسمان سے) کتاب لے کر نہ آئے کہ اس کو ہم پڑھیں (اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے پاکی ہے میرے پروردگار کے لیے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان ہوں، خدا کا پیغامبر ہوں۔"

﴿وَ لَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۙ۝۱۴ لَقَالُوْۤا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ۝۱۵﴾ (الحجر: ۱۴۔۱۵)

"اور اگر کھول دیں ہم ان پر آسمان کا ایک دروازہ اور یہ اس پر چڑھنے لگیں تب بھی ضرور یہی کہیں گے کہ اس کے سواء کچھ نہیں ہے کہ مست کر دی گئی ہیں ہماری آنکھیں بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔"

﴿وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ﴾ (الانعام: ۲۵)

"اور اگر یہ ہر قسم کے نشان بھی دیکھ لیں تب بھی (ضد اور تعصب کی بناء پر) ایمان لانے والے نہیں ہیں۔"

اب ان تفصیلات سے یہ بھی بخوبی روشن ہو گیا کہ علم کلام میں جن علماء کی رائے یہ ظاہر کی گئی ہے کہ "معجزہ دلیل نبوت نہیں

Marfat.com

ہے" ان کی مراد کیا ہے؟ وہ دراصل دعویٰ نبوت کی صداقت سے متعلق مسطورہ بالا ہر دو دلائل کے فرق کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جو ہستی نبوت و رسالت کا دعویٰ کرتی ہے اس پر لازم اور ضروری ہے کہ اپنے دعویٰ کی تصدیق کے لیے "حجۃ و برہان" پیش کرے اور دلائل کی روشنی میں اپنی حقانیت کو ثابت کرے اور وحی الٰہی کی جو تعلیم وہ کائنات کی ہدایت کے لیے پیش کرتی ہے برہان و حجت کے ذریعہ اس کی حقیقت کو واضح کرے تو گویا اس طرح نبوت و رسالت اور حجت و برہان صداقت میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے اس کے برعکس نبوت کے ساتھ معجزات اور آیات اللہ (نشانات خداوندی) کا تعلق اس طرح کا نہیں ہے بلکہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مخالفین کے مطالبہ پر یا بہ تقاضائے حکمت الٰہی نبی اور رسول از خود اپنی صداقت کی تائید میں کوئی نشان (معجزہ) دکھائے تو بلاشبہ وہ اس ہستی کے نبی و رسول ہونے کی ناقابل انکار "دلیل" ہے اور اس کا انکار درحقیقت اس رسول کی صداقت کا انکار ہے کیونکہ اس صورت میں یہ انکار حقیقت اور واقعہ کا انکار ہے اور حقیقت کا انکار "حق" نہیں بلکہ "باطل" ہوتا ہے جو نبوت و رسالت کے مقصد کے ساتھ کسی طرح بھی جمع نہیں ہوسکتا۔ البتہ اگر حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہو کہ تعلیم حق کی روشنی، وحی الٰہی پر دلائل و براہین کا یقین، اور اصول دین پر حجت و برہان کا قیام ہوتے ہوئے اب مخالفین کے بار بار طلب معجزات و عجائبات کی پرواہ نہ کی جائے اور نبی و رسول، وحی الٰہی کی روشنی میں حجت و برہان کے ذریعہ تعلیم حق جاری رکھے اور مخالفین کے جواب میں صاف صاف کہہ دے کہ میں نے ماوراء فطرت پر قدرت کا کبھی دعویٰ نہیں کیا تو اس صورت میں بندوں پر خدا کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور کسی امت اور قوم کو یہ حق نہیں رہتا کہ وہ تعلیم حق کے دلائل و براہین اور روشن حجت و بینہ سے اس لیے منہ پھیرے اور اس لیے اس کا انکار کردے کہ اس کی طلب پر اچنبھوں اور عجائبات کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا گیا۔

Marfat.com

پس قرآن عزیز نے جن انبیاء و رسل کے واقعات و حالات "تذکیر بایام اللہ" کے سلسلہ میں بیان کرتے ہوئے نصوص قطعیہ کے ذریعہ صراحت و وضاحت سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہم نے ان کی صداقت کے نشان کے طور پر نشانات (معجزات) ان کو عطا اور مخالفین کے سامنے ان کا مظاہرہ کیا تو ہمارا فرض ہے کہ ہم بے چون و چرا ان کو قبول اور ان کی تصدیق کریں اور عجائب پرستی کے الزام سے خائف ہو کر عالم غیب کی اس تصدیق سے گریز نہ کریں اور نہ رکیک و باطل تاویلات کے پردہ میں ان کے انکار پر آمادہ ہو جائیں کیونکہ ایسا کرنا اس آیت کا مصداق بن جانا ہے۔

﴿ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ ﴾ (النساء: ۱۵۰)

"اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کتاب الٰہی کے بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ایمان و کفر کے درمیان میں ایک راہ بنالیں۔"

اور ظاہر ہے کہ یہ مومن و مسلم کی نہیں بلکہ کافر و منکر کی راہ ہے، مومن و مسلم کی راہ تو سیدھی راہ یہ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ ﴾ (البقرہ: ۲۰۸)

"اے پیروان دعوت ایمانی! اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ (اور اعتقاد و عمل کی ساری باتوں میں مسلم بن جاؤ۔ مسلم

ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ زبان سے اسلام کا اقرار کرلو) اور دیکھو شیطانی وسوسوں کی پیروی نہ کرو، وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

بہر حال "سنت اللہ" یہ جاری رہی ہے کہ جب کسی قوم کی ہدایت یا تمام کائنات انسانی کی فوز وفلاح کے لیے نبی اور پیغمبر مبعوث ہوتا ہے تو اس کو منجانب اللہ محکم دلائل و براہین اور آیات اللہ (معجزات) دونوں سے نوازا جاتا ہے، وہ ایک جانب وحی الٰہی کے ذریعہ کائنات کے معاش معاد سے متعلق اوامر ونواہی اور بہترین دستور ونظام پیش کرتا ہے تو دوسری جانب حسب مصلحت خداوندی "خدائی نشانات" کا مظاہرہ کر کے اپنی صداقت اور منجانب اللہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے نیز ہر ایک پیغمبر کو اسی قسم کے معجزات ونشانات عطا کیے جاتے ہیں جو اس زمانہ کی علمی ترقیوں یا قومی وملکی خصوصیتوں کے مناسب حال ہونے کے باوجود معارضہ کرنے والوں کو عاجز ودرماندہ کردیں اور کوئی ان کے مقابلہ میں تاب مقاومت نہ لا سکے اور اگر تعصب اور ضد درمیان میں حائل نہ ہوں تو اپنی اکتسابی ترقیوں اور خصوصیتوں کے حقائق سے آگاہ ہونے کی وجہ سے اس اعتراف پر مجبور ہو جائیں کہ یہ جو کچھ سامنے ہے انسانوں کی قدرت سے بالاتر، ان کی دسترس سے باہر، اور صرف خدائے واحد ہی کی جانب سے ہے۔

مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں علم نجوم (Astronomy) اور علم کیمیا (Chemistry) کا بہت زور تھا اور ساتھ ہی ان کی قوم کواکب ونجوم کے اثرات کو ان کے ذاتی اثرات سمجھتی اور ان کو مؤثر حقیقی یقین کر کے خدائے واحد کی جگہ ان کی پرستش کرتی تھی اور ان کا سب سے بڑا دیوتا شمس (سورج) تھا کیونکہ وہ روشنی اور حرارت دونوں کا حامل تھا اور یہی دونوں چیزیں ان کی نگاہ میں کائنات کی بقاء وفلاح کے لیے اصل الاصول تھیں اور اسی بناء پر کرۂ ارضی میں "آگ" کو اس کا مظہر مان کر اس کی بھی پرستش کی جاتی تھی، علاوہ ازیں ان کو اشیاء کے خواص واثرات اور ان کے ردعمل پر بھی کافی عبور تھا گویا آج کی علمی تحقیقات کے لحاظ سے وہ کیمیاوی طریق ہائے عمل سے بھی بڑی حد تک واقف تھے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو ان کی قوم کی ہدایت اور خدا پرستی کی تعلیم وتلقین کے لیے ایک جانب ایسے روشن حجۃ وبرہان عطا فرمائے جن کے ذریعہ وہ قوم کے غلط عقائد کے ابطال اور احقاق حق کی خدمت انجام دیں اور مظاہر پرستی کی وجہ سے حقیقت کے چہرہ پر تاریکی کا جو پردہ پڑ گیا تھا اس کو چاک کر کے رخ روشن کو نمایاں کرسکیں۔

﴿وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝﴾
(الانعام: ۸۳)

اور دوسری جانب جب کواکب پرست اور بت پرست بادشاہ سے لے کر عام افراد قوم نے ان کے دلائل وبرہان سے لاجواب ہو کر اپنی مادی طاقت کے گھمنڈ پر دہکتی آگ میں جھونک دیا تو اسی خالق اکبر نے جس کی دعوت وارشاد کی خدمت حضرت ابراہیم علیہ السلام انجام دے رہے تھے ﴿يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا﴾ کہہ کر اپنی قدرت کا وہ عظیم الشان نشان (معجزہ) عطا کیا جس نے باطل کے پر ہیبت ایوان میں زلزلہ پیدا کردیا اور تمام قوم اس خدائی مظاہرہ سے عاجز، حیران وپریشان اور ذلیل وخاسر ہو کر رہ گئی:

﴿وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۷۰)

Marfat.com

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سحر (Magic) مصری علوم وفنون میں بہت زیادہ نمایاں اور امتیازی شان رکھتا تھا اور مصریوں کو فن سحر میں کمال حاصل تھا اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قانون ہدایت (توراۃ) کے ساتھ ساتھ "ید بیضاء" اور "عصاء" جیسے معجزات دیے گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ساحرین مصر کے مقابلہ میں جب ان کا مظاہرہ کیا تو سحر کے تمام ارباب کمال اس کو دیکھ کر یک زبان ہو کر پکار اٹھے کہ بلاشبہ یہ سحر نہیں یہ تو اس سے جدا اور انسانی طاقت سے بالاتر مظاہرہ ہے جو خدائے برحق نے اپنے سچے پیغمبروں کی تائید کے لیے ان کے ہاتھ پر کرایا ہے کیونکہ ہم سحر کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں اور یہ کہہ کر انہوں نے فرعون اور قوم فرعون کے سامنے بے خوفی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ وہ آج سے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے خدائے واحد ہی کے پرستار ہیں:

﴿وَ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۲۰-۲۲)

مگر فرعون اور امراء دربار اپنی بدبختی سے یہی کہتے رہے:

﴿قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ (الشعراء: ۳۴) ... ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝﴾ (قصص: ۳۶)

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں علم طب (Medical Science) اور علم الطبیعات (Physics) کا بہت چرچا تھا اور یونان کے اطباء وحکماء (فلاسفر) کی طب وحکمت گرد وپیش کے ممالک وامصار کے ارباب کمال پر بہت زیادہ اثر انداز تھی اور ملکوں میں صدیوں سے بڑے بڑے طبیب اور فلسفی اپنی حکمت ودانش اور کمالات طب کا مظاہرہ کر رہے تھے مگر خدائے واحد کی توحید اور دین حق کی تعلیم سے خواص وعوام یکسر محروم تھے اور خود بنی اسرائیل بھی جو کہ نبیوں کی نسل میں ہونے پر ہمیشہ فخر کرتے رہتے تھے جن گمراہیوں میں مبتلاء تھے سطور گزشتہ میں ان پر روشنی پڑ چکی ہے۔

پس ان حالات میں "سنت اللہ" نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رشد وہدایت کے لیے منتخب کیا تو ایک جانب ان کو حجت وبرہان (انجیل) اور حکمت سے نوازا تو دوسری جانب زمانہ کے مخصوص حالات کے مناسب چند ایسے نشان (معجزات) بھی عطاء فرمائے جو اس زمانہ کے ارباب کمال اور ان کے پیرووں پر اس طرح اثر انداز ہوں کہ جویائے حق کو اس اعتراف میں کوئی جھجک باقی نہ رہے کہ بلاشبہ یہ اعمال اکتسابی علوم سے جدا محض خدائے تعالیٰ کی جانب سے رسول برحق کی تائید میں رونما ہوئے ہیں اور متعصب اور متمرد کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ رہے کہ ان کو "صریح جادو" کہہ کر اپنے بغض وحسد کی آگ کو اور مشتعل کرے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان معجزات میں سے جن کا مظاہرہ انہوں نے قوم کے سامنے کیا قرآن عزیز نے "چار معجزات کا بصراحت ذکر کیا ہے:

① وہ خدا کے حکم سے مردہ کو زندہ۔ ② اور پیدائشی نابینا کو بینا اور جذامی کو چنگا کر دیا کرتے تھے۔
③ وہ مٹی سے پرند بنا کر اس میں پھونک دیتے تھے اور خدا کے حکم سے اس میں روح پڑ جاتی تھی۔
④ وہ یہ بھی بتا دیا کرتے تھے کہ کس نے کیا کھایا اور خرچ کیا اور کیا گھر میں ذخیرہ محفوظ رکھا ہے؟

قوموں میں ایسے مسیحا موجود تھے جن کے علاج ومعالجے اور اکتسابی تدابیر سے مایوس مریض شفاء پاتے تھے، ان میں ماہر طبیعات ایسے فلسفی بھی کم نہ تھے جو روح ومادہ کے حقائق اور ارضی وسماوی اشیاء کی ماہیات پر بے نظیر نظریات وتجربیات کے مالک

سمجھے جاتے تھے اور حقائق اشیاء میں ان کی باریک بینی اور مہارت ارباب کمال کے لیے باعث صد نازش تھی لیکن جب ان کے سامنے عیسیٰ علیہ السلام نے اسباب و وسائل اختیار کیے بغیر ان امور کا مظاہرہ کیا تو ان پر بھی ہدایت وضلالت کی قدرتی تقسیم کے مطابق یہی اثر پڑا کہ جس شخص کے قلب میں حق کی طلب موجزن تھی اس نے اقرار کیا کہ بلاشبہ اس قسم کا مظاہرہ انسانی دسترس سے باہر اور نبی برحق کی تائید و تصدیق کے لیے منجانب اللہ ہے اور جن دلوں میں رعونت، حسد اور بغض و عناد تھا ان کے تعصب نے وہی کہنے پر مجبور کیا جو ان کے پیشرو انبیاء ورسل سے کہتے آئے تھے۔ ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾

چوتھے معجزے کے بارے میں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کے مظاہرہ کی وجہ یہ پیش آئی کہ مخالفین جب ان کی دعوت رشد و ہدایت سے نفور ہو کر ان کو جھٹلاتے اور ان کے پیش کردہ آیات بینات (معجزات) کو سحر اور جادو کہتے تو ساتھ ہی ازراہ تمسخر یہ بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ اگر تم خدائے تعالیٰ کے ایسے مقبول بندے ہو تو بتاؤ آج ہم نے کیا کھایا ہے اور کیا بچا رکھا ہے تب عیسیٰ علیہ السلام ان کے تمسخر کو سنجیدگی سے بدل دیتے اور وحی الٰہی کی نصرت سے ان کے سوال کا جواب دے دیا کرتے تھے۔ [1]

مگر قرآن عزیز نے اس معجزہ کو جس انداز میں بیان کیا ہے اس کو غور کے ساتھ مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس "نشان" کے مظاہرہ کی وجہ مفسرین کی بیان کردہ توجیہ سے زیادہ دقیق اور وسیع معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام پیغام ہدایت وتبلیغ حق کی خدمت انجام دیتے ہوئے اکثر و بیشتر لوگوں کو دنیا میں انہماک، دولت و ثروت کے لالچ، اور عیش پسند زندگی کی رغبت سے باز رکھنے پر مختلف اسالیب بیان کے ذریعہ توجہ دلایا کرتے تھے تو جس طرح بعض سعید روحیں اس کلمہ حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتی تھیں اس کے برعکس شریر النفس انسان ان کے مواعظ حسنہ سے قلبی نفرت و اعراض کے باوجود امتثال امر کرنے والی ہستیوں سے زیادہ ان کو یہ باور کراتیں کہ ہم تو ہمہ وقت آپ کے اس ارشاد کی تعمیل میں سرگرم رہتے ہیں۔ لہٰذا قدرت حق نے یہ فیصلہ کیا کہ ان منافقین کی منافقت کی مضرت کو زائل کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایسا "نشان" عطا کیا جائے کہ اس ذریعہ سے حق و باطل منکشف ہو جائے اور حقوق اللہ اور حقوق انسانی کے اتلاف پر جو ذخیرہ اندوزی کا سامان کیا جا رہا ہے اس کا پردہ چاک کر دیا جائے۔

ان چہارگانہ خدائی نشان (معجزات) کے علاوہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے پیدائش بھی ایک عظیم الشان "خدائی نشان" تھا جس کے متعلق ابھی تفصیلات سن چکے ہو۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھ پر جن معجزات کا ظہور ہوا یا ان کی ولادت جس معجزانہ طریق پر ہوئی یہود نے ازراہ حسد ان کا انکار کیا تو کیا لیکن بعض فطرت پرست مدعی اسلام حضرات نے بھی ان کے انکار کے لیے راہ پیدا کرنے کی ناکام سعی فرمائی ہے ان میں سے بعض حضرات وہ ہیں جنہوں نے اس انکار کو ذاتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ فطرت پرست اور منکرین خدا یورپین علماء جدید سے مرعوبیت کی بناء پر یہ روش اختیار کی ہے تاکہ ان کی مذہبیت پر عجائب پرستی کا الزام عائد نہ ہو سکے، ان میں سرسید اور مولوی چراغ علی صاحب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور بعض وہ یہود صفت اشخاص ہیں جو اپنی ذاتی غرض اور ناپاک مقصد کی خاطر ازراہِ حسد و بغض حضرت مسیح علیہ السلام کے ان معجزات کا نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ تاویلات باطل کے پردہ میں ان کا مضحکہ اڑاتے ہیں ان میں سے متنبی کاذب مرزا قادیانی اور مسٹر محمد علی لاہوری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۸۲

قادیانی اور لاہوری نے تو یہ ظلم کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزہ ﴿اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡہِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ﴾ کے متعلق یہ کہہ دیا کہ مسیح کا یہ عمل ایک تالاب کی مٹی کا رہین منت تھا، معجزہ کچھ نہیں تھا اس تالاب کی مٹی کی یہ خاصیت تھی کہ جس کسی پرند کی شکل بنائی جاتی اور منہ سے دم تک سوراخ رکھ دیا جاتا تو ہوا بھر جانے سے اس میں آواز بھی پیدا ہو جاتی تھی اور حرکت بھی، گویا العیاذ باللہ! ان بدبختوں کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام کی جانب سے منکروں کے مقابلہ میں یہ معجزانہ صداقت نہیں تھی بلکہ مداری یا شعبدہ باز کا تماشہ تھا۔

اسی طرح احیاء موتیٰ (مردہ کو زندہ کر دینا) کے معجزہ کا بھی انکار کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن عزیز نے یہ فیصلہ سنا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ موت کے بعد کسی کو اس دنیا میں قبل از قیامت زندگی نہیں بخشے گا۔ لیکن لطف یہ ہے کہ اگر پورے قرآن کو از اول تا آخر پڑھ جایئے تو کسی ایک آیت میں بھی آپ کو یہ فیصلہ نہیں ملے گا بلکہ اس دعویٰ کے خلاف متعدد مقامات پر اس کا اثبات پائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں موت دینے کے بعد حیات تازہ بخشی ہے مثلاً سورہ بقرہ کی آیات ذبح بقرہ کے واقعہ میں ارشاد ہے:

﴿فَقُلۡنَا اضۡرِبُوۡہُ بِبَعۡضِہَا ؕ کَذٰلِکَ یُحۡیِ اللّٰہُ الۡمَوۡتٰی﴾ (البقرہ: ۷۳)

یا سورہ بقرہ ہی کی اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَاَمَاتَہُ اللّٰہُ مِائَۃَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَہٗ ؕ قَالَ کَمۡ لَبِثۡتَ ؕ قَالَ لَبِثۡتُ یَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ یَوۡمٍ ؕ قَالَ بَلۡ لَّبِثۡتَ مِائَۃَ عَامٍ﴾ (البقرہ: ۲۵۹)

یا اسی سورۃ میں تیسری جگہ مذکور ہے:

﴿وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰہٖمُ رَبِّ اَرِنِیۡ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ؕ قَالَ اَوَ لَمۡ تُؤۡمِنۡ ؕ قَالَ بَلٰی وَ لٰکِنۡ لِّیَطۡمَئِنَّ قَلۡبِیۡ ؕ قَالَ فَخُذۡ اَرۡبَعَۃً مِّنَ الطَّیۡرِ فَصُرۡہُنَّ اِلَیۡکَ ثُمَّ اجۡعَلۡ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنۡہُنَّ جُزۡءًا ثُمَّ ادۡعُہُنَّ یَاۡتِیۡنَکَ سَعۡیًا ؕ﴾ (البقرہ: ۲۶۰)

چنانچہ ان تمام واقعات میں "احیاء موتیٰ" کے صاف اور صریح معانی ثابت ہیں اور جن حضرات نے ان مقامات میں احیاء موتیٰ سے مجازی یا کنائی معنی لیے ہیں ان کو طرح طرح کی تاویلات کی پناہ لینی پڑی ہے مگر ان کی تاویلات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ احیاء موتیٰ کی یہ تاویل اس وجہ سے نہیں کر رہے ہیں کہ قرآن کے نزدیک اس کا دنیا میں وقوع ممنوع ہے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ آیات مسطورہ بالا کے سیاق وسباق کے پیش نظر یہی معنی مناسب حال ہیں۔

غرض یہ دعویٰ کہ قرآن ممنوع قرار دیتا ہے کہ دار دنیا میں "احیاء موتیٰ" وقوع پذیر ہو صرف مرزا قادیانی اور مسٹر لاہوری کے دماغ کی اپج ہے جو قطعاً باطل اور غیر ثابت ہے اور اس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں ہے، رہا یہ امر کہ خدا کے عام قانون فطرت کے ماتحت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں بحث گزر چکی ہے ملاحظہ ہو قصص القرآن ج ۲۔
ایضاً ٭ قصص القرآن جلد اول میں بحث گزر چکی ہے۔

Marfat.com

ایسا نہیں پیش آتا رہتا سو اگر ایسا ہوتا رہتا تو پھر یہ "معجزہ" ہرگز نہ کہلاتا اور خدائے برتر کا قانون خاص جو تصدیق انبیاء علیہم السلام کے مقصد سے کبھی کبھی مخالفین کے مقابلہ میں بطور تحدی (چیلنج) کے پیش آتا ہے کوئی خصوصیت نہ رکھتا۔

اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی بن باپ پیدائش کے مسئلہ کا بھی انکار کیا گیا ہے اور قادیانی اور لاہوری نے بھی اس کے خلاف بے دلیل ہرزہ سرائی کی ہے لیکن اس مسئلہ کی موافق و مخالف آراء سے قطع نظر ایک غیر جانبدار منصف جب حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے متعلق تمام آیات قرآنی کا مطالعہ کرے گا تو اس پر یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جائے گی کہ قرآن حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق یہود کی تفریط اور نصاریٰ کی افراط دونوں کے خلاف اپنا وہ فرض منصبی ادا کرنا چاہتا ہے جس کے لیے قرآن کی دعوت حق کا ظہور ہوا ہے یہود اور نصاریٰ اس بارہ میں دو قطعاً مخالف اور متضاد سمتوں میں چلے گئے ہیں یہود کہتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام مفتری اور کاذب اور شعبدہ باز تھے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ وہ خدا، خدا کے بیٹے یا ثالث ثلثہ تھے ان حالات میں قرآن نے ان اوہام وظنون کے خلاف علم ویقین کی راہ دکھاتے ہوئے دونوں کے خلاف یہ فیصلہ دیا کہ راہ حق افراط وتفریط کے درمیان ہے اور صراط مستقیم کی یہی سب سے بڑی شناخت ہے۔

وہ کہتا ہے واضح رہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام مفتری اور کاذب نہیں تھے بلکہ خدا کے سچے پیغمبر اور راہ حق کے داعی صادق تھے انہوں نے دعوت حق کی تصدیق کے لیے جو بعض عجیب باتیں کر دکھائیں وہ معجزات انبیاء کی فہرست میں شامل ہیں نہ کہ ساحروں اور شعبدہ بازوں کی اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی مگر اس سے یہ کیسے لازم آ سکتا ہے کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے ہو گئے کیا جو شخص پیدائش کا محتاج ہو اور پیدائش میں بھی ماں کے پیٹ کا محتاج اور جو شخص بشری لوازم کھانے پینے کا محتاج ہو وہ عبد اور بشر کے ماسواء خدا یا معبود ہو سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

یہاں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق الوہیت کا جو عقیدہ قائم کیا تھا اس کا بہت بڑا سہارا یہی واقعہ تھا جیسا کہ وفد نجران اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی باہمی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے۔

تو جبکہ قرآن نے یہود و نصاریٰ کے ان تمام باطل عقائد کی واضح الفاظ میں تردید کر کے جو انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق قائم کر لیے تھے اپنا فریضہ اصلاح انجام دیا یہ کیسے ممکن تھا کہ اگر بن باپ کے پیدائش کا واقعہ باطل اور غیر واقعی تھا اور جو سہارا بن رہا تھا الوہیت مسیح علیہ السلام کا، اس کے متعلق واضح طور سے قرآن تردید نہ کرتا بلکہ اس کے برعکس وہ جگہ جگہ اس واقعہ کو ٹھیک اس طرح بیان کرتا جاتا جیسا کہ متی کی انجیل میں بیان کیا گیا ہے اس کا فرض تھا کہ سب سے پہلے اسی پر ضرب کاری لگاتا اور صرف اس قدر کہہ کر کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا باپ فلاں شخص تھا اس ساری عمارت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا جس پر الوہیت مسیح علیہ السلام کی بنیاد رکھی گئی ہے مگر اس نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ یہ بات کسی طرح بھی مسیح علیہ السلام کی الوہیت کی دلیل نہیں بن سکتی، کیوں؟ اس لیے کہ

﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝٥٩﴾ (آل عمران: ۵۹)

پس اگر بن باپ کی پیدائش مسیح علیہ السلام کو درجہ الوہیت دے سکتی ہے تو آدم علیہ السلام کو اس سے زیادہ الوہیت کا حق حاصل ہے کہ وہ بن ماں باپ کے پیدا ہوئے ہے۔

بہرحال جن تاویل پرستوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی بن باپ پیدائش سے متعلق آیات کے جملوں کو جدا جدا کر کے احتمالات پیدا کیے ہیں وہ اس لیے باطل ہیں کہ جب اس واقعہ سے متعلق آیات کو یکجا کر کے مطالعہ کیا جائے تو ایک لمحہ کے لیے

Marfat.com

آیات کے معانی میں بن باپ پیدائش کے معنی کے ماسوا دوسرے کسی بھی احتمال کی گنجائش باقی نہیں رہتی مگر یہ کہ عربی زبان کے الفاظ کے معین مدلولات و اطلاقات میں تحریف معنوی پر بیجا جسارت کی جائے۔

نیز بقول مولانا ابوالکلام جن اصحاب نے بغیر باپ کے پیدائش سے متعلق آیات میں تاویل باطل کی ہے ان کی دلیل کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کا نکاح اگرچہ یوسف سے ہو چکا تھا مگر رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی ایسی صورت میں میاں بیوی کے درمیان مقاربت گو شریعت موسوی کے خلاف نہیں تھی تاہم وقت کے رسم و رواج کے قطعاً خلاف تھی اس لیے حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش لوگوں پر گراں گزری لیکن اول تو اس واقعہ کا ثبوت ہی موجود نہیں سب بے سند بات ہے دوسرے یہودیوں نے حضرت مریم علیہا السلام پر جو بہتان لگایا تھا "انسائیکلو پیڈیا آف بائبل" میں تصریح ہے کہ اس بہتان کی نسبت ایک شخص پینتھر اٹالی کی جانب کی تھی نہ کہ یوسف نجار کی جانب اس لیے تاویل کی یہ بنیاد ہی از سرتا پا غلط اور بے اصل ہے۔ [1]

علاوہ ازیں جہاں تک اس مسئلہ کا عقلی پہلو ہے سو عقل بھی اس کے امکان کو ممنوع اور محال قرار نہیں دیتی بلکہ اس کو ممکن الوقوع تسلیم کرتی ہے کیا سائنس کی موجودہ دنیا سے آشنا حضرات اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ آج جبکہ سائنس کی جدید تحقیق نے نظریوں سے آگے قدم بڑھا کر مشاہدہ اور تجربہ سے یہ ثابت کر دیا کہ دوسرے حیوانات کی طرح انسان کی خلقت و پیدائش بھی بیضہ سے ہوتی ہے اور اس کو اصطلاح میں خلیہ [2] تخم کہتے ہیں یہ خلیہ مرد اور عورت دونوں میں ہوتا ہے اور حمل قرار پا جانے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مرد کے خلیات تخم عورت کے بیضہ میں داخل ہو جاتے ہیں یہی خلیہ زندگی اور حیات کا تخم ہے اور قدرت حق نے اس کو بہت باریک جثہ عطا فرمایا [3] ہے تو اس تحقیق نے امریکہ اور انگلینڈ کے سائنسدانوں کو اس جانب متوجہ کر دیا ہے کہ کیوں وہ ایک ایسی کوشش نہ کریں کہ بغیر مرد کی مقاربت کے جنس رجال کے خلیات تخم کو آلات کے ذریعہ جنس اناث کے مبیض میں داخل کر کے "وجود انسانی" حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔ سائنس والوں کا یہ تخیل ابھی عملی حیثیت سے کتنا ہی دور ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ عقل یہ ممکن سمجھتی ہے کہ انسانی پیدائش آنکھوں دیکھے عام طریق ولادت کے علاوہ بعض دوسرے طریقوں سے بھی ہو سکتی ہے اور ان کو قانون قدرت کے خلاف اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ہم نے قدرت کے تمام قوانین کا احاطہ نہیں کر لیا ہے بلکہ انسان جس قدر علم و دانش کی جانب بڑھتا جاتا ہے اس کے سامنے قدرت حق کے قانون کے نئے نئے گوشے کھلتے جاتے ہیں۔

پس اگر یہ صحیح ہے کہ جو بات کل ناممکن نظر آتی تھی آج وہ ممکن کہی جا رہی ہے اور جلد یا بدیر اس کے وقوع پر یقین کیا جا رہا ہے تو نہیں معلوم پھر اس قانون قدرت سے انکار کر دینے کے کیا معنی ہیں جس کا علم اگرچہ ابھی تک ہم کو حاصل نہیں ہے مگر انبیاء و رسل جیسی قدسی صفات ہستیوں پر اس علم کی حقیقت آشکارا ہے تو کیا علمی دلیل کا یہ بھی کوئی پہلو ہے کہ جس بات کا ہم کو علم نہ ہو اور عقل اس کو ناممکن اور محال نہ ثابت کرتی ہو اس کا انکار صرف "عدم علم" کی وجہ سے کر دیا جائے خصوصاً جب یہ انکار ایک مدعی مسیحیت و نبوت کی جانب سے ہو تو اس کے لیے تو یہی کہا جا سکتا ہے۔

اب ان "آیات بینات" کو قرآن حکیم سے سنئے اور موعظت و عبرت کے حصول کا سروسامان کیجئے کہ ماضی کے ان واقعات کی تذکیر سے قرآن کا یہی عظیم مقصد ہے۔

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲ [2] خلیہ کو انگریزی میں (Catl) کہتے ہیں۔ [3] اس کا قطر انچ کا 1/500 ہوتا ہے۔

Marfat.com

﴿وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۝ وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝﴾ (آل عمران: ۴۸۔۵۱)

"اور خدا سکھاتا ہے اس (عیسیٰ) کو کتاب، حکمت، توراۃ اور انجیل، اور وہ رسول ہے بنی اسرائیل کی جانب (وہ کہتا ہے) کہ بیشک میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے "نشان" لے کر آیا ہوں، وہ یہ کہ میں تمہارے لیے مٹی سے پرند کی شکل بناتا پھر اس میں پھونک دیتا ہوں اور وہ خدا کے حکم سے زندہ پرند بن جاتا ہے اور پیدائشی اندھے کو سوانکھا کر دیتا اور سفید داغ کے جذام کو اچھا کر دیتا ہوں، اور خدا کے حکم سے مردہ کو زندہ کر دیتا ہوں اور تم کو بتا دیتا ہوں جو تم کھا کر آتے ہو اور جو تم گھر میں ذخیرہ رکھ آتے ہو سو اگر تم حقیقی ایمان رکھتے ہو تو بلاشبہ ان امور میں (میری صداقت اور منجانب اللہ ہونے کے لیے) "نشان" ہے اور میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے اور (اس لیے بھیجا گیا ہوں) تاکہ بعض ان چیزوں کو جو تم پر حرام ہو گئی ہیں تمہارے لیے حلال کر دوں تمہارے لیے پروردگار ہی کے پاس سے "نشان" لایا ہوں "پس تم اللہ سے ڈرو" اور (اس کے دیے ہوئے احکام میں) میری اطاعت کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے سو اس کی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے۔"

﴿وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَ تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ﴾ (المائدہ: ۱۱۰)

"اور (اے عیسیٰ ابن مریم! تو میری اس نعمت کو یاد کر) جبکہ تو میرے حکم سے گارے سے پرند کی شکل بنا دیتا اور پھر اس میں پھونک دیتا تھا اور وہ میرے حکم سے زندہ پرند بن جاتا تھا اور جبکہ تو میرے حکم سے پیدائشی اندھے کو سوانکھا اور سفید داغ کے کوڑھ کو اچھا کر دیتا تھا اور جبکہ تو میرے حکم سے مردہ کو زندہ کر کے قبر سے نکالتا تھا۔"

﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾ (الصف: ۶)

"پھر جب وہ (عیسیٰ علیہ السلام) ان کے پاس کھلے نشان لے کر آیا تو انہوں نے (بنی اسرائیل نے) کہا "یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔"

انبیاء علیہم السلام نے جب کبھی بھی قوموں کے سامنے آیات اللہ کا مظاہرہ کیا ہے تو منکروں نے ہمیشہ ان کے متعلق ایک بات ضرور کہی ہے "یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔" پس کیا ایک جویائے حق اور غیر متعصب انسان کے لیے یہ جواب اس جانب رہنمائی نہیں کرتا کہ

Marfat.com

انبیاء علیہم السلام کے اس قسم کے مظاہرے ضرور عام قوانین قدرت سے جدا ایسے علم کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے تھے جو صرف ان قدسی صفات ہستیوں کے لیے ہی مخصوص رہا ہے اور ان کے علاوہ انسانی دنیا اس کے فہم حقیقت سے بہرہ مند نہیں ہوئی تب ہی ان لوگوں کے پاس جواز راہ عناد وضد انکار پر تلے ہوئے تھے، اس کے انکار کے لیے اس سے بہتر دوسری تعبیر نہیں تھی کہ وہ ان امور کو "سحر و جادو" کہہ دیں۔ لہٰذا ان امور کو سحر و جادو کہنا بھی ان کے "معجزہ" اور "نشانِ خداوندی" ہونے کی زبردست دلیل ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی تعلیمات کا خلاصہ:

بہر حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو حجت و برہان اور آیات اللہ کے ذریعہ دین حق کی تعلیم دیتے رہتے اور ان کے بھولے ہوئے سبق کو یاد دلا کر مردہ قلوب میں حیات تازہ بخشتے رہتے تھے۔

خدا اور خدا کی توحید پر ایمان، انبیاء و رسل علیہم السلام کی تصدیق، آخرت (معاد) پر ایمان، ملائکۃ اللہ پر ایمان، قضاء وقدر پر ایمان، خدا کے رسولوں اور کتابوں پر ایمان، اخلاق حسنہ کے اختیار اعمال سیئہ سے پرہیز و اجتناب، عبادت الٰہی سے رغبت، دنیا میں انہماک سے نفرت اور خدا کے کنبہ (مخلوق خدا) سے محبت و مودت یہی وہ تعلیم و تلقین تھی جو ان کی زندگی کا مشغلہ اور فرض منصبی بنا ہوا تھا وہ بنی اسرائیل کو توراۃ، انجیل، اور حکیمانہ پند و نصائح کے ذریعہ ان امور کی جانب دعوت دیتے مگر بدبخت یہود اپنی فطرت کج، صدیوں کی مسلسل سرکشی اور تعلیم الٰہی سے بغاوت کی بدولت اس درجہ متشدد ہو گئے تھے اور انبیاء و رسل کے قتل نے ان کے قلوب کو حق وصداقت کے قبول میں اس درجہ سخت بنا دیا تھا کہ ایک مختصر سی جماعت کے علاوہ ان کی جماعت کی بڑی اکثریت نے ان کی مخالفت اور ان کے ساتھ حسد و بغض کو اپنا شعار اور اپنی جماعتی زندگی کا معیار بنا لیا اور اس لیے انبیاء کی سنت راشدہ کے مطابق رشد و ہدایت کے حلقہ بگوشوں میں دنیوی جاہ و جلال کے لحاظ سے کمزور و ناتواں اور زیردست پیشہ ور طبقہ کی اکثریت نظر آتی تھی، ضعفاء کا یہ طبقہ اگر اخلاص و دیانت کے ساتھ حق کی آواز پر لبیک کہتا تو بنی اسرائیل کا وہ سرکش و مغرور حلقہ ان پر اور خدا کے پیغمبر پر پھبتیاں کستا، توہین و تذلیل کا مظاہرہ کرتا اور اپنی عملی جد و جہد کا بڑا حصہ معاندت و مخالفت میں صرف کرتا رہتا تھا۔

﴿وَ لَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَ لِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۶۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۴﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۶۵﴾﴾ (الزخرف: ۶۳-۶۵)

"اور جب عیسیٰ علیہ السلام ظاہر دلائل لے کر آئے تو کہا: "بلاشبہ میں تمہارے پاس "حکمت" لے کر آیا ہوں اور اس لیے آیا ہوں تا کہ ان بعض باتوں کو واضح کر دوں جن کے متعلق تم آپس میں جھگڑ رہے ہو، پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، بیشک اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے سو اس کی پرستش کرو یہی سیدھی راہ ہے" پھر وہ آپس میں گروہ بندی کرنے لگے، سو ان لوگوں کے لیے دردناک عذاب کے ذریعہ ہلاکت اور خرابی ہے۔"

﴿وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ

Marfat.com

التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ ﴾ (الصف: ٦)

"اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا پیغمبر ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا نام اس کا احمد ہے، پس جب (عیسیٰ علیہ السلام) آیا ان کے پاس معجزات لے کر تو وہ (بنی اسرائیل) کہنے لگے، یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔"

﴿ فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَ اشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اَنْزَلْتَ وَ اتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ۝ ﴾ (آل عمران: ۵۲-۵۳)

"پھر جب عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان (بنی اسرائیل) سے کفر محسوس کیا تو کہا "اللہ کی جانب میرا کون مددگار ہے" حواریوں نے جواب دیا: "ہم ہیں اللہ کے (دین کے) مددگار۔ ہم اللہ پر ایمان لے آئے اور تم گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں، اے ہمارے پروردگار جو تو نے اتارا ہے ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم نے رسول کی پیروی اختیار کر لی پس تو ہم کو (دین حق کی) گواہی دینے والوں میں سے لکھ لے۔"

حواری عیسیٰ علیہ السلام :

مگر عیسیٰ علیہ السلام معاندین ومخالفین کی دراندازیوں اور ہرزہ سرائیوں کے باوجود اپنے فرض منصبی "دعوۃ الی الحق" میں سرگرم عمل رہتے اور شب و روز بنی اسرائیل کی آبادیوں اور بستیوں میں پیغام حق سناتے اور روشن دلائل اور واضح آیات اللہ کے ذریعہ لوگوں کو قبول حق وصداقت پر آمادہ کرتے رہتے تھے اور خدا اور حکم خدا سے سرکش اور باغی انسانوں کی اس بھیڑ میں ایسی سعید روحیں بھی نکل آتی تھیں جو عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت حق پر لبیک کہتی اور سچائی کے ساتھ دین حق کو قبول کر لیتی تھیں، ان ہی پاک بندوں میں وہ مقدس ہستیاں بھی تھیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شرف صحبت سے فیضیاب ہو کر نہ صرف۔ ایمان ہی لے آئی تھیں بلکہ دین حق کی سربلندی اور کامیابی کے لیے انہوں نے جان و مال کی بازی لگا کر خدمت دین کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا اور اکثر و بیشتر حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ رہ کر تبلیغ و دعوت کو سرانجام دیتی تھیں، اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ "حواری" (رفیق) اور "انصار اللہ" (اللہ کے دین کے مددگار) کے مقدس القاب سے معزز وممتاز کی گئیں۔ چنانچہ ان بزرگ ہستیوں نے پیغمبر خدا کی حیات پاک کو اپنا اسوہ بنایا اور سخت سے سخت اور نازک سے نازک حالات میں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہر طرح معاون و مددگار ثابت ہوئیں۔

﴿ وَ اِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَ بِرَسُوْلِیْ ۚ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَ اشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۝ ﴾ (المائدہ: ۱۱۱)

"اور (اے عیسیٰ وہ وقت یاد کرو) جبکہ میں نے حواریوں کی جانب (تیری معرفت) یہ وحی کی کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ تو انہوں نے جواب دیا "ہم ایمان لائے اور اے خدا! تو گواہ رہنا کہ ہم بلاشبہ مسلمان ہیں۔"

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآىِٕفَةٌ ۚ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ ﴿۱۴﴾﴾ (الصف: ۱۴)

"اے ایمان والو! تم اللہ کے (دین کے) مددگار ہو جاؤ جیسا کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے جب حواریوں سے کہا: "اللہ کے راستہ میں کون میرا مددگار ہے"...تو حواریوں نے جواب دیا "ہم ہیں اللہ (کی راہ) کے مددگار پس بنی اسرائیل کی ایک جماعت ایمان لائی اور ایک گروہ نے کفر اختیار کیا سو ہم نے مومنوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی پس وہ (مومن) غالب رہے۔"

گزشتہ سطور میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے یہ حواری بیشتر غریب اور مزدور طبقہ میں سے تھے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ کے ساتھ "سنت اللہ" یہی جاری رہی ہے کہ ان کی صدائے حق پر لبیک کہنے اور دین حق پر جان سپاری کا مظاہرہ کرنے کے لیے اول غریب اور کمزور طبقہ ہی آگے بڑھتا ہے اور زیردست ہی فداکاری کا ثبوت دیتے ہیں اور وقت کی صاحب اقتدار اور زبردست ہستیاں اپنے غرور اور گھمنڈ کے ساتھ مقابلہ اور معارضہ کے لیے سامنے آتی اور معاندانہ سرگرمیوں کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ کی راہ میں سنگ گراں بن جاتی ہیں لیکن جب خدائے تعالیٰ کا قانون پاداش عمل اپنا کام کرتا ہے تو نتیجہ میں فلاح و کامرانی ان کمزور فدایانِ حق ہی کا حصہ ہو جاتا ہے اور متکبر و مغرور ہستیاں یا ہلاکت کے قعر مذلت میں جا گرتی ہیں اور یا مقہور و مغلوب ہو کر سرنگوں ہو جانے کے ماسوا کوئی چارۂ کار نہیں دیکھتیں۔

حواری عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن و انجیل کا موازنہ:

قرآن عزیز نے عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی منقبت بیان کی ہے، سورۂ آل عمران کی آیات تمہارے سامنے ہیں، حضرت مسیح علیہ السلام جب دین حق کی نصرت و یاری کے لیے پکارتے ہیں تو سب سے پہلے جنہوں نے "نحن انصار اللہ" کا نعرہ بلند کیا وہ یہی پاک ہستیاں تھیں، سورۂ صف میں اللہ رب العالمین نے جب مسلمانوں کو مخاطب کر کے ﴿كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ کی ترغیب دی تو "تذکیر بایام اللہ" کے پیش نظر ان ہی مقدس ہستیوں کا ذکر کیا اور ان ہی کی مثال اور نظیر دے کر نصرت حق کے لیے برانگیختہ کیا اور سورۂ مائدہ میں ان کے قبول ایمان اور دعوت حق کے سامنے انقیاد و تسلیم کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بھی ان کے خلوص، حق طلبی اور حق کوشی کی زندہ جاوید تصویر ہے۔ یہ سب کچھ تو اس وقت کا حال ہے جب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے درمیان موجود ہیں لیکن آپ کے "رفع الی السماء" کے بعد بھی ان کی پر استقامت اور دین قویم کی فداکارانہ خدمت کے متعلق سورۂ صف کی آیت ۱۴ ﴿فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ ﴿۱۴﴾﴾ میں کافی اشارہ موجود ہے اور شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) نے اسی بناء پر آیت زیر بحث کی تفسیر کرتے ہوئے تاریخی شہادت کا اس طرح ذکر فرمایا ہے:

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے یاروں (حواریوں) نے بڑی محنتیں کی ہیں تب ان کا دین نشر ہوا، ہمارے حضرت کے پیچھے بھی حنفیوں نے اس سے زیادہ کیا۔"

Marfat.com

مگر اس کے برعکس بائبل (انجیل) بعض مقامات میں اگر ان کی منقبت اور مدح سرائی میں رطب اللسان ہے تو دوسری جانب ان کو بزدل اور منافق ثابت کرتی ہے۔ انجیل یوحنا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشہور و معتمد علیہ حواری یہودا کے متعلق اس وقت کا حال جب حضرت یسوع علیہ السلام کو یہودی گرفتار کرنا چاہتے ہیں، اس طرح مذکور ہے:

"یہ باتیں کہہ کر یسوع اپنے دل میں گھبرایا اور یہ گواہی دی کہ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک شخص مجھے پکڑا دے گا۔ شاگرد شبہ کر کے کہ وہ کس کی نسبت کہتا ہے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے..... ایک شخص جس سے یسوع محبت کرتا تھا..... اس نے یسوع کی چھاتی کا سہارا لے کر کہا اے خداوند وہ کون ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ جسے میں نوالہ ڈبو کر دے دوں گا وہی ہے، پھر اس نے نوالہ ڈبو دیا اور لے کر شمعون اسکریوتی کے بیٹے یہوداہ کو دے دیا اور اس نوالہ کے بعد شیطان اس میں سما گیا۔" ❶

اور انجیل متی میں اس شمعون پطرس حواری کے متعلق جو "بقول اناجیل ساری عمر حضرت یسوع کا پیارا اور معتمد علیہ رہا" یہ مسطور ہے:

"شمعون پطرس نے اس سے کہا، اے خداوند تو کہاں جاتا ہے، یسوع نے جواب دیا کہ جہاں میں جاتا ہوں اب تو میرے پیچھے نہیں آ سکتا مگر بعد میں میرے پیچھے آئے گا۔ پطرس نے اس سے کہا اے خداوند میں اب تیرے پیچھے کیوں نہیں آ سکتا، میں تو تیرے لیے اپنی جان دوں گا، یسوع نے جواب دیا، کیا تو میرے لیے اپنی جان دے گا؟ میں تجھ سے سچ سچ کہتا ہوں کہ مرغ بانگ نہ دے گا جب تک کہ تو تین بار میرا انکار نہ کرے گا۔" ❷

اور اسی متی کی انجیل میں تمام شاگردوں (حواریوں) کی بزدلی اور حضرت یسوع کو بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار ہو جانے کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

"اس پر سارے شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔" ❸

ان حوالجات سے تین ایسی باتیں ثابت ہوتی ہیں جن کو کسی طرح بھی عقل و نقل تسلیم کرنے کو تیار نہیں اوّل یہ کہ جو شاگرد اور حواری حضرت یسوع کے زیادہ قریب، ان کے معتمد علیہ اور ان کی نگاہوں میں محبوب تھے وہ نتیجہ میں نہ صرف بزدل بلکہ "منافق نکلے مگر عقل و نقل کا فیصلہ یہ ہے کہ اگرچہ ہر ایک پیغمبر اور مصلح کی جماعت میں ایک چھوٹا سا گروہ منافقین کا عموماً ہوتا ہے جو اپنی دنیوی اغراض کی خاطر بہ کراہت قلب ظاہرداری کے طور پر شریک جماعت ہونا مفید سمجھتا ہے مگر ایک مصلح اور پیغمبر کے درمیان ہمیشہ سے یہ فرق رہا ہے کہ مصلح خواہ اپنی جماعت کے منافقین سے پوری طرح آگاہ نہ ہو سکے لیکن نبی اور پیغمبر کو "وحی الٰہی" کے ذریعہ شروع ہی سے مخلص اور منافق کی اطلاع دے دی جاتی ہے تاکہ ایک منکر و کافر سے زیادہ جس گروہ سے جماعت حق اور اس کی دعوت و اصلاح کو ضرر پہنچ سکتا ہے، نبی اس کے حالات سے غافل نہ رہے۔ پس اسی پر کوئی منافق کسی وقت اور کسی حالت میں بھی نبی اور پیغمبر کا محبوب معتمد علیہ اور مقرب نہیں ہو سکتا، البتہ یہ ایک جدا امر ہے کہ نبی دین حق کی صالح کی وجہ سے اس کے ساتھ اعراض اور درگذر کا طریق عمل مناسب سمجھے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے ایک صحابی کے اس سوال پر کہ "جب آپ منافقین کے حالات منافقت سے آگاہ ہیں تو ان کا مقابلہ کر کے کیوں ان کو کیفر کردار تک نہیں پہنچا دیتے تاکہ جماعت مسلمین کو ان کی منافقت سے نجات ملے" یہ جواب دیا

❶ باب ۱۳ آیات ۲۱-۲۷ ❷ متی باب ۲۷ آیات ۴۶ ❸ باب ۲۶ آیات ۵۶

Marfat.com

"اس لیے کہ ان کے قبول ایمان کی ظاہر داری کے بعد ہمارے سخت گیر طریقہ کے متعلق غیر مسلموں کو یہ دھوکا نہ ہو کہ وہ کہہ اٹھیں "محمد ﷺ، اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرنے سے نہیں چوکتے۔"

دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ یہوداہ کے اندر شیطان نے اس وقت حلول کیا جب حضرت یسوع نے اپنے ہاتھ سے اس کو نوالہ ڈبو کر دیا، مگر یہ بات بھی اس لیے عقل ونقل کے خلاف ہے کہ بزرگوں اور مقدس انسانوں کے ہاتھوں سے جو کچھ ہوتا ہے اس کا اثر برکت، طہارت اور تقدیس تو ہوا کرتا ہے لیکن شیطان کا حلول اور بدی کا نفوذ نہیں ہوا کرتا، بیشک یہ درست ہے کہ جب حق کا ترازو قائم ہوتا ہے تو اس سے کھرا اور کھوٹا دونوں کی حقیقت کا انکشاف ہو جایا کرتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اس پیمانہ کے مس کرنے سے کسی کھرے میں کھوٹ پیدا ہو جائے اور انجیل کے اس بیان میں صورت حال پہلی نہیں بلکہ دوسری ہے۔

تیسری بات یہ کہ حضرت یسوع کے تمام ان حواریوں میں سے "جن کی مدح وستائش میں جگہ جگہ بائبل رطب اللسان ہے" ایک، دو، یا دس پانچ نہیں سب کے سب نہایت بزدلی اور غداری کے ساتھ اس وقت حضرت مسیح علیہ السلام سے کنارہ کش ہو گئے، جب دین حق کی حمایت ونصرت کے لیے سب سے زیادہ ان کی ضرورت تھی اور جب کہ پیغمبر خدا علیہ السلام دشمنوں کے نرغہ میں پھنسے ہوئے تھے۔

مگر انجیل کی اس شہادت کے خلاف سورۂ آل عمران میں قرآن عزیز نے یہ شہادت دی ہے کہ اس نازک وقت میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو دین حق کی نصرت ویاری کے لیے پکارا تو سب نے اولوالعزمی اور فداکارانہ جذبہ کے ساتھ یہ جواب دیا: "نحن انصار اللہ" اور پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے سامنے اپنی استقامت دین اور اپنے مخلصانہ ایمان کے متعلق شہادت دے کر نصرت کا پورا پورا یقین دلایا اور پھر سورۂ صف میں قرآن عزیز نے یہ بھی ظاہر کیا کہ ان حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جو کچھ کہا تھا ان کی موجودگی میں اور ان کے بعد سچی وفاداری کے ساتھ نباہا اور بلاشبہ مومنین صادقین ثابت ہوئے اور اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی مدد فرمائی اور ان کو دشمنانِ حق کے مقابلہ میں کامیاب کیا۔

انجیل اور قرآن کے اس موازنہ کو دیکھ کر ایک انصاف پسند یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس معاملہ میں "حق" قرآن کے ساتھ ہے اور علماء نصاریٰ نے انجیل میں تحریف کر کے اس قسم کے گھڑے ہوئے واقعات کا اضافہ اس لیے کیا ہے تاکہ صدیوں بعد کے خود ساختہ عقیدہ "عقیدۂ "صلیب مسیح" سے متعلق یہ داستان صحیح ترتیب پر قائم ہو سکے کہ جب مسیح علیہ السلام کو صلیب پر لٹکایا گیا تو انہوں نے یہ کہتے کہتے جان دے دی:

"ایلی ایلی لما سبقتنی۔" "اے خدا اے خدا! تو نے مجھے کیوں یکہ وتنہا چھوڑ دیا"

اور کسی ایک شخص نے بھی مسیح علیہ السلام کا ساتھ نہ دیا...... بہرحال حواریوں سے متعلق بائبل کی یہ تصریحات محرف اور خود ساختہ داستان سرائی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

نزول مائدہ :

مخلص اور فداکار حواریوں کی جماعت اگرچہ صادق الایمان اور راسخ الاعتقاد تھی مگر علمی ومجلسی تکلفات گفت وشنید کے لحاظ سے سادہ لوح اور ضروریات زندگی کے سروسامان کے اعتبار سے غرباء اور ضعفاء کی جماعت تھی اس لیے انہوں نے از راہ سادگی سادہ

Marfat.com

ولی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ درخواست کی کہ جس خدائے برتر میں یہ لامحدود طاقت ہے کہ اس کا ایک نمونہ آپ کی ذات اقدس اور وہ نشان (معجزات) ہیں خدائے تعالیٰ نے جن کو آپ کی تصدیق نبوت ورسالت کے لیے آپ کے ہاتھ پر ظاہر فرمایا اس خدا میں یہ طاقت بھی ضرور ہوگی کہ وہ ہمارے لیے غیب سے ایک دستر خوان نازل کر دیا کرے تا کہ ہم روزی کمانے کی فکر سے آزاد ہو کر باطمینان قلب یاد خدا اور دین حق کی دعوت و تبلیغ میں مصروف رہا کریں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ سن کر ان کو نصیحت فرمائی کہ اگر چہ خدا کی طاقت بے غایت اور بے نہایت ہے لیکن کسی سچے بندہ کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ اس طرح خدا کو آزمائے، پس خدا سے ڈرو اور ایسے خیالات سے بچو، یہ سن کر حواریوں نے جواب دیا "ہم اور خدا کو آزمائیں، حاشا ہمارا تو یہ مقصد نہیں، ہمارا تو یہ مطلب ہے کہ رزق کی جدوجہد سے دل کو مطمئن کر کے خدا کے اس عطیہ کو زندگی کا سہارا بنا لیں اور آپ کی تصدیق میں ہم کو حق الیقین کا اعتقاد راسخ حاصل ہو جائے اور ہم اس کی خدائی پر کائنات انسانی کے لیے شاہد عدل بن جائیں۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب ان کا بڑھتا ہوا اصرار دیکھا تو بارگاہِ الٰہی میں دعا کی "اے خدا! تو ان کے سوال کو پورا کر اور آسمان سے ایسا مائدہ (دستر خوان نعمت) نازل فرما کہ وہ ہمارے لیے تیرے غضب کا مظہر ثابت نہ ہو بلکہ ہمارے اوّل وآخر سب کے لیے خوشی کی یادگار (عید) بن جائے اور تیرا "نشان" کہلائے اور اس ذریعہ سے ہم کو اپنے غیبی رزق سے شاد کام کرے کیونکہ تو ہی بہتر رزق رساں ہے" اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی: عیسیٰ تمہاری دعاء قبول ہے، میں اس کو ضرور نازل کروں گا لیکن یہ واضح رہے کہ اس کھلی نشانی نازل ہونے کے بعد اگر ان میں سے کسی نے بھی خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی تو پھر ان کو عذاب بھی ایسا ہولناک دوں گا جو کائنات کے کسی انسان کو نہیں دیا جائے گا۔ قرآن عزیز نے نزول مائدہ کے واقعہ کا اس معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ ذکر کیا ہے:

﴿اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ تَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا وَ اٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَ ارْزُقْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

(المائدہ: ۱۱۲۔۱۱۵)

"اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ حواریوں نے کہا تھا "اے عیسیٰ بن مریم! کیا تمہارا پروردگار ایسا کر سکتا ہے کہ آسمان سے ہم پر ایک خوان اتار دے؟" (یعنی ہماری غذا کے لیے آسمان سے غیبی سامان کر دے) عیسیٰ علیہ السلام نے کہا خدا سے ڈرو (اور ایسی فرمائشیں نہ کرو) اگر تم ایمان رکھتے ہو، انہوں نے کہا (مقصود اس سے قدرت الٰہی کا امتحان نہیں ہے بلکہ) ہم چاہتے ہیں (ہمیں غذا میسر آئے تو) اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل آرام پائیں اور ہم جان لیں کہ تو نے ہمیں سچ بتایا تھا اور اس پر ہم گواہ ہو جائیں۔ اس پر عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے دعا کی "اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان

Marfat.com

سے ایک خوان بھیج دے کہ اس کا آنا ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے عید قرار پائے اور تیری طرف سے (فضل و کرم کی) ایک نشانی ہو۔ ہمیں روزی دے تو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے" اللہ نے فرمایا: "میں تمہارے لیے خوان بھیجوں گا، لیکن جو شخص اس کے بعد بھی (راہ حق سے) انکار کرے گا تو میں اسے (پاداش عمل میں) عذاب دوں گا، ایسا عذاب کہ تمام دنیا میں کسی آدمی کو بھی ویسا عذاب نہیں دیا جائے گا۔"

یہ مائدہ نازل ہوا یا نہیں؟ قرآن عزیز نے اس کے متعلق کوئی تفصیل نہیں بیان کی اور نہ کسی مرفوع حدیث میں اس کا کوئی تذکرہ پایا جاتا ہے، البتہ آثار صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم میں ضرور تفصیلات مذکور ہیں:

مجاہد اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مائدہ کا نزول نہیں ہوا، اس لیے کہ خدائے تعالیٰ نے اس کے نزول کو جس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا مطلب کرنے والوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ انسان ضعیف البنیان اور کمزوریوں کا مجسمہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی لغزش یا معمولی خلاف ورزی کی بدولت اس دردناک عذاب کے سزاوار ٹھہریں اپنے سوال کو واپس لے لیا، علاوہ ازیں اگر مائدہ کا نزول ہوا ہوتا تو وہ ایسا نشانِ الٰہی (معجزہ) تھا کہ نصاریٰ اس پر جس قدر بھی فخر کرتے وہ کم تھا اور ان کے یہاں اس کی جس قدر بھی شہرت ہوتی وہ بے جا نہ ہوتی تاہم ان کے یہاں اس نزول مائدہ کا اس طرح کوئی تذکرہ نہیں پایا جاتا۔ [1]

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ یہ واقعہ پیش آیا اور مائدہ کا نزول ہوا جمہور کا رجحان اسی جانب ہے البتہ اس کے نزول کی تفصیلات میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں مثلاً صرف ایک دن نازل ہوا یا چالیس روز تک نازل ہوتا رہا؟ اور پھر اترنا بند ہو گیا تو کیوں؟ اور صرف یہی ہوا کہ نازل نہ ہوا یا جن لوگوں کی خلاف ورزی کی وجہ سے بند ہوا ان پر سخت قسم کا عذاب بھی آ پہنچا؟ جو نقول یہ کہتی ہیں کہ مائدہ کا نزول صرف ایک دن نہیں بلکہ چالیس دن تک برابر جاری رہا وہ بند ہو جانے کا سبب یہ بیان کرتی ہیں کہ نزول مائدہ پر حکم یہ ہوا کہ اس کو فقیر مسکین اور مریض ہی کھائیں تونگر اور بھلے چنگے نہ کھائیں مگر چند روز تعمیل کے بعد لوگوں نے آہستہ آہستہ اس کی خلاف ورزی شروع کر دی یا یہ حکم ملا تھا کہ اس کو کھائیں سب مگر اگلے روز کے لیے ذخیرہ نہ کریں مگر کچھ عرصہ کے بعد اس کی خلاف ورزی ہونے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف مائدہ کا نزول ہی بند ہو گیا بلکہ خلاف ورزی کرنے والے خنزیر اور بندر کی شکل میں مسخ کر دیے گئے۔ [2]

بہرحال ان آثار میں جو قدر مشترک ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی تو مشیت باری کا یہ حکم ہوا کہ مائدہ طیار ہو چنانچہ لوگوں کی آنکھوں دیکھتے خدا کے فرشتہ فضاء آسمانی سے اس کو لے کر اترے ادھر فرشتے آہستہ آہستہ اس کو لیے ہوئے اتر رہے تھے اور ادھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ درگاہ الٰہی میں دست بدعا تھے کہ مائدہ آ پہنچا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اوّل دو رکعت نماز شکر ادا کی اور پھر مائدہ (خوان) کو کھولا تو اس میں تلی ہوئی مچھلیاں اور تر و تازہ پھل اور روٹیاں موجود پائیں اور خوان کھولتے ہی ایسی نفیس خوشبو نکلی کہ اس کی مہک نے سب کو مست کر دیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۱۶ مگر یوحنا کی انجیل باب ۶ میں تو یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ "عید فصح" کے موقع پر پیش آیا۔

[2] نزول مائدہ کا سوال اگرچہ کیا تھا حواریوں نے مگر کیا تھا سب کی جانب سے اس لئے یہ واضح رہے کہ جن نقول میں خلاف ورزی اور اس سے متعلق عذاب کا ذکر ہے اس کا اشارہ حواریوں میں سے کسی کی جانب مطلق نہیں ہے کیونکہ یہ بات نصوص قرآنی کے خلاف ہے۔

Marfat.com

نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ کھائیں مگر لوگوں نے اصرار کیا کہ ابتدا آپ کریں، آپ نے ارشاد فرمایا یہ میرے لیے نہیں ہے، تمہاری طلب پر نازل ہوا ہے، یہ سن کر سب گھبرائے کہ نہ معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو کہ خدا کا رسول تو نہ کھائے اور ہم کھائیں، آپ نے یہ دیکھ کر ارشاد فرمایا "اچھا فقراء، مساکین، معذورین اور مریضوں کو بلاؤ، یہ ان کا حق ہے تب ہزارہا بندگانِ خدا نے شکم سیر ہو کر کھایا مگر مائدہ کی مقدار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ❶

اس مسئلہ میں حضرت شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) مجاہد اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں اور نزول مائدہ سے متعلق ان دونوں جماعتوں سے الگ ایک اور لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں۔ موضح القرآن میں ہے:

﴿هَلْ يَسْتَطِيعُ﴾ "ہو سکے" یہ معنی کہ ہمارے واسطے تمہاری دعا سے اس قدر خرق عادت کرے یا نہ کرے فرمایا ﴿اتَّقُوا اللَّهَ﴾ "ڈرو اللہ سے" یعنی بندہ کو چاہیے کہ اللہ کو نہ آزمائے کہ میرا کہا مانتا ہے یا نہیں اگرچہ خداوند! (آقا و مالک) بہتیری مہربانی کرے ﴿وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ﴾ یعنی برکت کی امید پر مانگتے ہیں اور (تاکہ) معجزہ ہمیشہ مشہور رہے۔ آزمانے کو نہیں کہتے ہیں۔ وہ خوان اترا ایک شنبہ کو وہ نصاریٰ کی عید ہے جیسے ہم کو روز جمعہ۔ بعض کہتے ہیں وہ خوان اترا چالیس روز تک اور پھر بعض نے ناشکری کی یعنی حکم ہوا تھا کہ فقراء اور مریض کھائیں نہ محظوظ (تو انگر) اور چنگے پھر قریب اسی آدمی سوار اور بندر ہو گئے (مگر) یہ عذاب پہلے یہود میں ہوا تھا پیچھے کسی کو نہیں ہوا۔" ❷

اور بعضے کہتے ہیں (مائدہ) نہ اترا، تہدید سن کر مانگنے والے ڈر گئے نہ مانگا، لیکن پیغمبر کی دعا عبث نہیں اور اس کلام (قرآن) میں نقل کرنا بے حکمت نہیں، شاید اس دعا کا اثر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت (نصاریٰ) میں آسودگی مال سے ہمیشہ رہی اور جو کوئی ان میں ناشکری کرے تو شاید آخرت میں سب سے زیادہ عذاب پائے۔ اس میں مسلمان کو عبرت ہے کہ اپنا مدعا خرق عادت کی راہ سے نہ چاہے پھر اس کی شکر گزاری بہت مشکل ہے، اسباب ظاہری پر قناعت کرے تو بہتر ہے۔ اس قصہ میں بھی ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے آگے حمایت پیش نہیں جاتی۔ ❸

اس سلسلہ میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے موعظت و بصیرت سے متعلق بہت خوب بات ارشاد فرمائی ہے:

"عیسیٰ علیہ السلام سے ان کی قوم نے نزول مائدہ کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے جواب ملا "تمہاری درخواست اس شرط کے ساتھ منظور کی جاتی ہے کہ نہ اس میں خیانت کرنا نہ اس کو چھپائے رکھنا اور نہ اس کو ذخیرہ کرنا ورنہ یہ بند کر دیا جائے گا اور تم کو ایسا عبرت ناک عذاب دوں گا جو کسی کو نہ دیا جائے گا۔"

اے معشر عرب! تم اپنی حالت پر غور کرو کہ اونٹوں اور بکریوں کی دم پکڑ کر جنگلوں میں چراتے پھرتے تھے، پھر خدائے تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تمہارے درمیان ہی سے ایک برگزیدہ رسول مبعوث فرمایا جس کے حسب و نسب سے تم اچھی طرح واقف ہو، اس نے تم کو یہ خبر دی کہ عنقریب تم عجم پر غالب آ جاؤ گے اور اس پر چھا جاؤ گے۔ اور اس نے تم کو سختی

---

❶ یہ واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ تمام کتب تفسیر میں موجود ہیں۔
❷ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ واقعہ مسخ صحیح نہیں ہے۔
❸ موضح القرآن سورۂ مائدہ

Marfat.com

کے ساتھ منع فرمایا کہ مال و دولت کی فراوانی دیکھ کر ہرگز تم چاندی اور سونے کے خزانے جمع نہ کرنا مگر قسم بخدا کہ زیادہ لیل و نہار نہ گزریں گے کہ تم ضرور سونے چاندی کے خزانے جمع کرو گے اور اس طرح خدائے برتر کے دردناک عذاب کے مستحق بنو گے۔ ❶

"رفع الی السماء" یعنی زندہ آسمان پر اٹھالیا جانا:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نہ شادی کی اور نہ بود و ماند کے لیے گھر بنایا، وہ شہر شہر اور گاؤں گاؤں خدا کا پیغام سناتے اور دین حق کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیتے اور جہاں بھی رات آ پہنچتی وہیں کسی سروسامان راحت کے بغیر شب بسر کر دیتے تھے اور چونکہ ان کی ذات اقدس سے مخلوق خدا جسمانی و روحانی دونوں طرح کی شفا اور تسکین پاتی تھی اس لیے جس جانب بھی ان کا گزر ہو جاتا خلقت کا انبوہ حسن عقیدت کے ساتھ جمع ہو جاتا اور والہانہ محبت کے ساتھ ان پر نثار ہو جانے کو تیار رہتا تھا۔

یہود کو اس دعوت حق کے ساتھ جو بغض و عناد تھا اس نے اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کو انتہائی حسد اور سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھا اور جب ان کے مسخ شدہ قلوب کسی طرح اس کو برداشت نہ کر سکے تو ان کے سرداروں، فقیہوں، فریسیوں اور صدوقیوں نے ذات اقدس کے خلاف سازش شروع کی اور طے یہ پایا کہ اس ہستی کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کی بجز اس کے کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ بادشاہ وقت کو مشتعل کر کے اس کو دار پر چڑھا دیا جائے۔

گزشتہ چند صدیوں سے یہود کے ناگفتہ بہ حالات کی بدولت اس زمانہ میں یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کی حکومت اپنے باپ دادا کے علاقہ میں سے بمشکل ایک چوتھائی پر قائم تھی اور وہ بھی برائے نام اور اصل حکومت و اقتدار، وقت کے بت پرست شہنشاہ قیصر روم کو حاصل تھا اور اس کی نیابت میں پلاطیس یہودیہ کے اکثر علاقہ کا گورنر یا بادشاہ تھا۔

یہود اگرچہ اس بت پرست بادشاہ کے اقتدار کو اپنی بدبختی سمجھ کر اس سے متنفر تھے مگر حضرت مسیح علیہ السلام کے خلاف قلوب میں مشتعل حسد کی آگ نے اور صدیوں کی غلامی سے پیدا شدہ پست ذہنیت نے ایسا اندھا کر دیا کہ انجام اور نتیجہ کی فکر سے بے پرواہ ہو کر پلاطیس کے دربار میں جا پہنچے اور عرض کیا: "عالی جاہ! یہ شخص نہ صرف ہمارے لیے بلکہ حکومت کے لیے بھی خطرہ بنتا جا رہا ہے اگر فوراً ہی اس کا استیصال نہ کیا تو نہ ہمارا دین ہی صحیح حالت میں باقی رہ سکے گا اور اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کے ہاتھ سے حکومت کا اقتدار بھی نہ چلا جائے اس لیے کہ اس شخص نے عجیب و غریب شعبدے دکھا کر خلقت کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور ہر وقت اس گھات میں لگا ہے کہ عوام کی اس طاقت کے بل پر قیصر اور آپ کو شکست دے کر خود بنی اسرائیل کا بادشاہ بن جائے۔ اس شخص نے لوگوں کو صرف دنیوی راہ سے ہی گمراہ نہیں کیا بلکہ اس نے ہمارے دین تک کو بھی بدل ڈالا اور لوگوں کو بددین بنانے میں منہمک ہے۔ پس اس فتنہ کا انسداد از بس ضروری ہے تاکہ بڑھتا ہوا یہ فتنہ ابتدائی منزل ہی میں کچل ڈالا جائے۔"

غرض کافی گفت و شنید کے بعد پیلاطیس نے ان کو اجازت دے دی کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو گرفتار کر لیں اور شاہی دربار میں مجرم کی حیثیت سے پیش کریں، بنی اسرائیل کے سردار، فقیہ اور کاہن یہ فرمان حاصل کر کے بے حد مسرور ہوئے اور فخر و مباہات

---

❶ تفسیر ابن کثیر ج ۲ سورۂ مائدہ

کے ساتھ ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے کہ آخر ہماری سازش کارگر ہوئی اور ہماری تدبیر کا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگے کہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ خاص موقع کا منتظر رہا جائے اور کسی خلوت اور تنہائی کے موقع پر اس طرح اس کو گرفتار کیا جائے کہ عوام میں ہیجان نہ ہونے پائے۔ انجیل یوحنا میں اس واقعہ سے متعلق یہ کہا گیا ہے:

پس سردار کاہنوں اور فریسیوں نے صدر عدالت کے لوگوں کو جمع کر کے کہا ہم کرتے کیا ہیں؟ یہ آدمی تو بہت معجزے دکھاتا ہے، اگر ہم اسے یونہی چھوڑ دیں تو سب اس پر ایمان لے آئیں گے اور رومی آ کر ہماری جگہ اور قوم دونوں پر قبضہ کر لیں گے اور ان میں سے کائفا نامی ایک شخص نے جو اس سال سردار کاہن تھا ان سے کہا تم نہیں جانتے اور نہ سوچتے ہو کہ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ ایک آدمی امت کے واسطے مرے نہ کہ ساری قوم ہلاک ہو۔ [1]

یہ اس مشورہ کا تذکرہ ہے جو بادشاہ کے پاس جانے سے قبل آپس میں ہوا اور یہ خطرہ ظاہر کیا گیا کہ اگر اس ہستی کو یونہی چھوڑ دیا گیا تو بادشاہ وقت (قیصر) کہیں سلطنت کے لیے خطرہ سمجھ کر رہی سہی برائے نام حکومت یہود کا بھی خاتمہ نہ کر دے۔

اور مرقس کی انجیل میں ہے:

دو دن کے بعد فصح اور عید الفطر ہونے والی تھی اور سردار کاہن اور فقیہ موقع ڈھونڈ رہے تھے کہ اسے کیونکر فریب سے پکڑ کر قتل کریں کیونکہ کہتے تھے کہ عید کو کہیں ایسا نہ ہو کہ بلوہ ہو جائے۔ [2]

دوسری جانب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کے مکالمہ کو سورۂ آل عمران اور سورۂ صف کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب یہود کے کفر و انکار اور معاندانہ ریشہ دوانیوں کو محسوس کیا تو ایک جگہ اپنے حواریوں کو جمع کیا اور ان سے فرمایا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں اور کاہنوں کی معاندانہ سرگرمیاں تم سے پوشیدہ نہیں ہیں، اب وقت کی نزاکت اور کڑی آزمائش و امتحان کی گھڑی کی قربت تقاضا کرتی ہے کہ میں تم سے سوال کروں کہ تم میں کون وہ افراد ہیں جو اس کفر و انکار کے سیلاب کے سامنے سینہ سپر ہو کر خدا کے دین کے ناصر و مددگار بنیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد مبارک سن کر سب نے بڑے جوش و خروش اور صداقت ایمانی کے ساتھ جواب دیا "ہم ہیں اللہ کے مددگار خدائے واحد کے پرستار، آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلم وفا شعار ہیں، اور درگاہِ باری میں اپنی اس اطاعت کوشی پر استقامت کے لیے یوں دست بدعا ہیں اے پروردگار! ہم تیری اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لے آئے اور صدق دل کے ساتھ تیرے پیغمبر کے پیرو ہیں، خدایا! تو ہم کو صداقت و حقانیت کے فداکاروں کی فہرست میں لکھ لے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے فریضہ دعوت و تبلیغ کے خلاف یہود بنی اسرائیل کی مخالفانہ سرگرمیوں سے متعلق حالات کا یہ حصہ تو اکثر و بیشتر ایسا ہے کہ قرآن اور انجیل کے درمیان اصولاً اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اس کے مابعد کے پورے حصہ بیان میں دونوں کی قطعاً جدا جدا راہیں ہیں اور ان کے درمیان اس درجہ تضاد ہے کہ کسی طرح بھی ایک کو دوسری راہ کے قریب نہیں لایا جا سکتا۔ البتہ اس جگہ پہنچ کر یہود اور نصاریٰ دونوں کا باہمی اتحاد ہو جاتا ہے اور دونوں کے بیانات واقعہ سے متعلق ایک ہی عقیدہ پیش کرتے ہیں، فرق ہے تو یہ کہ یہود اس واقعہ کو اپنا کارنامہ اور اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں اور نصاریٰ اس کو یہود بنی اسرائیل کی ایک

[1] باب ۱۱ آیات ۴۷۔۵۱ [2] باب ۱۴ آیات ۱۔۲

Marfat.com

قابل لعنت جدوجہد یقین کرتے ہیں۔

یہود اور نصاریٰ دونوں کا مشترک بیان یہ ہے کہ یہود کے سرداروں اور کاہنوں کو یہ اطلاع ملی کہ اس وقت یسوع علیہ السلام لوگوں کی بھیڑ سے الگ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایک بند مکان میں موجود ہیں، یہ موقع بہترین ہے، اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے فوراً ہی یہ لوگ موقع پر پہنچ گئے اور چاروں طرف سے مکان کا محاصرہ کر کے یسوع علیہ السلام کو گرفتار کر لیا اور توہین و تذلیل کرتے ہوئے پیلاطیس کے دربار میں لے گئے تاکہ وہ ان کو سولی پر لٹکائے اور اگرچہ پیلاطیس نے عیسیٰ علیہ السلام کو بے قصور سمجھ کر چھوڑ دینا چاہا مگر بنی اسرائیل کے اشتعال پر مجبوراً سپاہیوں کے حوالہ کر دیا۔ سپاہیوں نے ان کو کانٹوں کا تاج پہنایا، منہ پر تھوکا، کوڑے لگائے اور ہر طرح کی توہین و تذلیل کرنے کے بعد مجرموں کی طرح سولی پر لٹکا دیا اور دونوں ہاتھوں میں میخیں ٹھونک دیں، سینہ کو برچھی کی انی سے چھید دیا اور اس کسمپرسی کی حالت میں انہوں نے یہ کہتے ہوئے جان دے دی "ایلی ایلی لما سبقتنی" انجیل متی میں اس واقعہ کی تفصیلات کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

"سردار کاہن نے اس سے کہا: میں تجھے زندہ خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر تو خدا کا بیٹا مسیح علیہ السلام ہے تو ہم سے کہہ دے۔ یسوع نے اس سے کہا: تو نے خود کہہ دیا بلکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابن آدم کو قادر مطلق کی داہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتا دیکھو گے اس پر سردار کاہن نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اس نے کفر بکا ہے، اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی، دیکھو تم نے ابھی یہ کفر سنا ہے تمہاری کیا رائے ہے، انہوں نے جواب میں کہا وہ قتل کے لائق ہے اس پر انہوں نے اس کے منہ پر تھوکا اور اس کے مکے مارے اور بعض نے طمانچے مار کے کہا "اے مسیح ہمیں نبوت سے بتا کہ کس نے تجھے مارا.... جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا کہ اسے مار ڈالیں اور اسے باندھ کر لے گئے اور پیلاطیس حاکم کے حوالہ کیا.... اور حاکم کا دستور تھا کہ عید پر لوگوں (بنی اسرائیل) کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے چھوڑ دیتا تھا اس وقت برابا نام ان کا ایک مشہور قیدی تھا پس جب وہ اکٹھے ہوئے تو پیلاطیس نے ان سے کہا تم کسے چاہتے ہو کہ میں تمہاری خاطر چھوڑ دوں؟ برابا کو یا یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے؟.... وہ بولے برابا کو، پیلاطیس نے ان سے کہا پھر یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے، کیا کروں، سب نے کہا اس کو صلیب دی جائے اس نے کہا کہ کیوں؟ اس نے کیا برائی کی ہے؟ مگر وہ اور بھی چلا چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دی جائے، جب پیلاطیس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا الٹا بلوہ ہوتا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا "میں اس راست باز کے خون سے بری ہوں تم جانو" سب لوگوں نے جواب دے کر کہا "کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر" اس پر اس نے برابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالے کیا تاکہ صلیب دی جائے۔ اس پر حاکم کے سپاہیوں نے یسوع کو قلعہ میں لے جا کر ساری پلٹن اس کے گرد جمع کی اور اس کے کپڑے اتار کر اسے قرمزی چوغہ پہنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے داہنے ہاتھ میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اسے ٹھٹھوں میں اڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ آداب اور اس پر تھوکا اور وہی سرکنڈا لے کر اس کے سر پر مارنے لگے اور جب اس کا ٹھٹھا کر چکے تو چوغے کو اس پر سے اتار کر پھر اس کے کپڑے اسے پہنائے اور صلیب دینے کو لے گئے۔ اس وقت

Marfat.com

اس کے ساتھ دوڈا کو صلیب پر چڑھائے گئے ایک داہنے اور ایک بائیں اور راہ چلنے والے سر ہلا ہلا کر اس کو لعن طعن کرتے اور کہتے تھے اے مقدس کے ڈھانے والے اور تین دن میں بنانے والے اپنے تئیں بچا اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو صلیب پر سے اتر آ، اسی طرح سردار کاہن بھی فقیہوں بزرگوں کے ساتھ مل کر ٹھٹھے کے ساتھ کہتے تھے اس نے اوروں کو بچایا اپنے تئیں نہیں بچا سکتا.... اور دوپہر سے لے کر تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھایا رہا اور تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا: "ایلی ایلی لما سبقتنی"۔ "اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھ کو کیوں چھوڑ دیا" جو وہاں کھڑے تھے ان میں سے بعض نے سن کر کہا، یہ ایلیا کو پکارتا ہے.... یسوع پھر بڑی آواز سے چلایا اور جان دے دی۔" ❶

تفصیلات میں کم و بیش فرق کے ساتھ یہی مفروضہ داستان باقی تینوں انجیلوں میں بھی مذکور ہے۔ چاروں انجیلوں کی اس متفقہ مگر مفروضہ داستان کو مطالعہ کرنے کے بعد طبیعت پر قدرتی اثر یہ پڑتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی موت انتہائی بیکسی اور بے بسی کی حالت میں دردناک طریقہ سے ہوئی اور اگرچہ خدا کے پاک اور مقدس بندوں کے لیے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی بلکہ مقربین بارگاہ صمدی کے لیے اس قسم کی کڑی آزمائشوں کا مظاہرہ اکثر ہوتا رہا ہے لیکن اس واقعہ کا یہ پہلو اس کے مفروضہ اور گھڑے ہوئے ہونے پر روز روشن کی طرح شاہد ہے کہ حضرت یسوع نے ایک اولوالعزم پیغمبر بلکہ مرد صالح کی طرح اس واقعہ کو صبر و رضاء الٰہی کے ساتھ انگیز نہیں کیا بلکہ ایک انتہائی مایوس انسان کی طرح خدا سے شکوہ کرتے کرتے جان دے دی" ایلی ایلی لما سبقتنی" کہتے ہوئے جان دے دینا مایوسی اور شکوہ کی وہ صورت حال ہے جو کسی طرح بھی حضرت مسیح علیہ السلام کے شایان شان نہیں کہی جاسکتی، پھر اس واقعہ کا یہ پہلو بھی کم حیرت زا نہیں ہے کہ بقول انجیل کے یسوع مسیح نے اس حادثہ سے قبل تین مرتبہ خدائے تعالیٰ سے یہ درخواست کی "اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ (موت کا) پیالہ مجھ سے ٹل جائے" اور جب یہ درخواست کسی طرح قبول نہ ہوئی تو مایوس ہو کر یہ کہنا پڑا "اگر یہ میرے پیئے بغیر نہیں ٹل سکتا تو تیری مرضی پوری ہو۔"

باعث حیرت یہ بات ہے کہ جبکہ عقیدۂ "کفارہ" کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ معاملہ خدا اور اس کے بیٹے (العیاذ باللہ) کے درمیان طے شدہ تھا تو پھر اس درخواست کے کیا معنی اور اگر لوازم بشریت کی بناء پر تھا تو خدا کی مرضی معلوم ہو جانے اور اس پر قناعت کر لینے کے بعد پھر یہ بے صبر اور مایوس انسانوں کی طرح جان دینے کا کیا سبب؟

یہود کی گھڑی ہوئی اس داستان کو چونکہ نصاریٰ نے قبول کر لیا تو یہود از راہ فخر و غرور اس پر بے حد مسرور ہیں اور کہتے ہیں کہ مسیح ناصری اگر "مسیح موعود" ہوتا تو خدائے تعالیٰ اس بے بسی اور بے کسی کے ساتھ اس کو ہمارے ساتھ میں نہ دیتا کہ وہ مرتے وقت تک خدا سے شکوہ کرتا رہا کہ اس کو بچائے مگر خدا نے اس کی کوئی مدد نہ کی حالانکہ ہمارے باپ دادا اس وقت بھی کافی اشتعال دیتے رہے کہ اگر تو حقیقتاً خدا کا بیٹا اور "مسیح موعود" ہے تو کیوں تجھ کو خدا نے ہمارے ہاتھوں اس ذلت سے نہ بچالیا۔

واقعہ یہ ہے کہ نصاریٰ کے پاس اس چبھتے ہوئے الزام کا کوئی جواب نہیں تھا اور واقعہ کی ان تفصیلات کو مان لینے کے بعد "عقیدۂ کفارہ" کی کوئی قیمت باقی نہیں رہ جاتی تھی تب انہوں نے واقعہ کی ان تفصیلات کے بعد ایک پارۂ بیان کا اور اضافہ کیا۔

---

❶ باب ۲۶ آیت ۵۷ تا ۷۵

Marfat.com

یوحنا کی انجیل میں ہے:

لیکن جب انہوں نے یسوع کے پاس آ کر دیکھا کہ وہ مر چکا ہے تو اس کی ٹانگیں نہ توڑ دیں مگر ان میں سے ایک سپاہی نے بھالے سے اس کی پسلی چھیدی اور فی الفور اس سے خون اور پانی بہ نکلا.... ان باتوں کے بعد ارملیتہ کے رہنے والے یوسف نے جو یسوع کا شاگرد تھا یہودیوں کے خوف سے خفیہ طور پر پیلاطیس سے اجازت چاہی کہ یسوع کی لاش لے جائے، پیلاطیس نے اجازت دے دی پس وہ آ کر اس کی لاش لے گیا اور نیکدیمس بھی آیا جو پہلے یسوع کے پاس رات کو گیا تھا اور پچاس سیر کے قریب مر اور عود ملا ہوا لایا۔ پس انہوں نے یسوع کی لاش لے کر اسے سوتی کپڑے میں خوشبودار چیزوں کے ساتھ کفنایا جس طرح کہ یہودیوں میں دفن کرنے کا دستور ہے اور جس جگہ اسے صلیب دی گئی وہاں ایک باغ تھا اور اس باغ میں ایک نئی قبر تھی جس میں کبھی کوئی نہ رکھا گیا تھا پس انہوں نے یہودیوں کی تیاری کے دن کے باعث یسوع کو وہیں رکھ دیا۔ ہفتہ کے پہلے دن مریم مگدلینی ایسے تڑکے کہ ابھی اندھیرا ہی تھا قبر پر آئی اور پتھر کو قبر سے ہٹا ہوا دیکھا پس وہ شمعون پطرس اور اس کے دوسرے شاگرد کے پاس جسے یسوع عزیز رکھتا تھا دوڑی ہوئی گئی اور ان سے کہا کہ خداوند کو قبر سے نکال لے گئے اور ہمیں معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھ دیا.... لیکن مریم باہر قبر کے پاس کھڑی روتی رہی اور جب روتے روتے قبر کی طرف جھک کے اندر نظر کی تو دو فرشتوں کو سپید پوشاک پہنے ہوئے ایک کو سرہانے اور دوسرے کو پائنتی بیٹھے دیکھا جہاں یسوع کی لاش پڑی تھی انہوں نے اس سے کہا اے عورت تو کیوں روتی ہے اس نے ان سے کہا اس لیے کہ میرے خداوند کو اٹھا لے گئے اور معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھا یہ کہہ کر وہ پیچھے پھری اور یسوع کو کھڑے دیکھا اور نہ پہچانا کہ یہ یسوع ہے۔ یسوع نے اس سے کہا مریم! وہ پھر کر اس سے عبرانی زبان میں بولی "ربونی" یعنی اے استاد! یسوع نے اس سے کہا مجھے نہ چھو، کیونکہ میں اب تک باپ کے پاس اوپر نہیں گیا لیکن میرے بھائیوں کے پاس جا کر ان سے کہو کہ میں اپنے باپ اور تمہارے باپ کے اور اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں، مریم مگدلینی نے آ کر شاگردوں کو خبر دی کہ میں نے خداوند کو دیکھا اور اس نے مجھ سے یہ باتیں کہیں۔ پھر اسی دن جو ہفتہ کا پہلا دن تھا شام کے وقت جب وہاں کے دروازے جہاں شاگرد تھے یہودیوں کے ڈر سے بند تھے یسوع آ کر بیچ میں کھڑا ہوا اور ان سے کہا کہ تمہاری سلامتی ہو اور یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ اور پسلی انہیں دکھائی، پس شاگرد خداوند کو دیکھ کر خوش ہوئے یسوع نے پھر ان سے کہا کہ تمہاری سلامتی ہو جس طرح باپ نے مجھے بھیجا ہے اسی طرح میں بھی تمہیں بھیجتا ہوں اور یہ کہہ کر ان کو پھونکا اور ان سے کہا "روح القدس" لو۔ [1]

ہر ایک شخص معمولی غور وفکر کے بعد بہ سہولت سمجھ سکتا ہے کہ یہ پارۂ بیان پہلے حصہ بیان کے ساتھ غیر مربوط اور قطعاً بے جوڑ بلکہ یہ اندازہ لگانا ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں تفصیلات ایک ہی شخصیت سے وابستہ ہیں کیونکہ پہلا پارۂ بیان ایک ایسی شخصیت کا مرقع ہے جو بے بس و بیکس مایوس اور خدا سے شاکی نظر آتی ہے اور دوسرا حصہ بیان ایسی ہستی کا رخ روشن پیش کرتی ہے جو خدائی صفات سے متصف ذات باری کی مقرب اور پیش آمدہ واقعات سے مطمئن و مسرور ہے بلکہ ان کے وقوع کی متمنی اور ان کو اپنے

---

[1] انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۳۔ ۳۴ و آیت ۳۸۔ ۴۲ و باب ۲۰ آیات ۱ تا ۲۲

ادائے فرض کا اہم جزو سمجھتی ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

بہر حال حقیقت چونکہ دوسری تھی اور ایک عرصہ دراز کے بعد "عقیدۂ کفارہ" کی بدعت نے نصاریٰ کو اس کے خلاف اس گھڑے ہوئے افسانہ کی تصنیف پر مجبور کر دیا اس لیے قرآن عزیز نے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق دوسرے گوشوں کی طرح اس گوشہ سے بھی جہالت و تاریکی کا پردہ ہٹا کر حقیقت حال کے رخ روشن کو جلوہ آرا کرنا ضروری سمجھا اور اس نے اپنا وہ فرض انجام دیا جس کو مذاہب عالم کی تاریخ میں قرآن کی دعوت تجدید و اصلاح کہا جاتا ہے۔

اس نے بتایا کہ جس زمانہ میں بنی اسرائیل، پیغمبر حق اور رسول خدا (عیسیٰ بن مریم علیہ السلام) کے خلاف خفیہ تدبیروں اور سازشوں میں مصروف اور ان پر نازاں تھے اسی زمانہ میں خدائے برتر کے قانون قضاء و قدر نے یہ فیصلہ نافذ کر دیا کہ کوئی طاقت اور مخالف قوت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام پر قابو نہیں پا سکتی اور ہماری محکم تدبیر اس کو دشمنوں کے ہر "مکر" سے محفوظ رکھے گی اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب بنی اسرائیل نے ان پر نرغہ کیا تو ان کو پیغمبر خدا پر کسی طرح دسترس حاصل نہ ہو سکی اور ان کو بحفاظت تمام اٹھا لیا گیا اور جب بنی اسرائیل مکان میں گھسے تو صورت حال ان پر مشتبہ ہو گئی اور وہ ذلت اور رسوائی کے ساتھ اپنے مقصد میں ناکام رہے اور اس طرح خدا نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا جو عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی حفاظت کے لیے کیا گیا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے یہ محسوس فرمایا کہ اب بنی اسرائیل کے کفر و انکار کی سرگرمیاں اس درجہ بڑھ گئی ہیں کہ وہ میری توہین و تذلیل بلکہ قتل کے لیے سرگرم سازش ہیں تو انہوں نے خاص طور سے ایک مکان میں اپنے حواریوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے صورت حال کا نقشہ پیش فرما کر ارشاد فرمایا: امتحان کی گھڑی سر پر ہے، کڑی آزمائش کا وقت ہے، حق کو مٹانے کی سازشیں پورے شباب پر ہیں، اب میں تمہارے درمیان زیادہ نہیں رہوں گا اس لیے میرے بعد دین حق پر استقامت، اس کی نشر و اشاعت اور یاری و نصرت کا معاملہ صرف تمہارے ساتھ وابستہ ہو جانے والا ہے، اس لیے مجھے بتاؤ کہ خدا کی راہ میں سچا مددگار کون کون ہے۔ حواریوں نے یہ کلام حق سن کر کہا: "ہم سب ہی خدا کے دین کے مددگار ہیں، ہم سچے دل سے خدا پر ایمان لائے ہیں اور اپنی صداقت ایمانی کا آپ ہی کو گواہ بناتے ہیں، اور یہ کہنے کے بعد انسانی کمزوریوں کے پیش نظر اپنے دعویٰ پر ہی بات ختم نہیں کر دی بلکہ درگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہو گئے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں تو اس پر ہم کو استقامت عطا فرما اور ہم کو اپنے دین کے مددگاروں کی فہرست میں لکھ لے۔

اس جانب سے مطمئن ہو کر اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے فریضہ دعوت و ارشاد کے ساتھ ساتھ منتظر رہے کہ دیکھیے معاندین کی سرگرمیاں کیا رخ اختیار کرتی ہیں اور خدائے برحق کا فیصلہ کیا صادر ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں قرآن عزیز کے ذریعہ یہود و نصاریٰ کے ظنون و اوہام فاسدہ کے خلاف "علم و یقین کی روشنی" بخشتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ جس وقت معاندین اپنی خفیہ تدبیروں میں سرگرم عمل تھے اسی وقت ہم نے بھی اپنی قدرت کاملہ کی مخفی تدبیر کے ذریعہ یہ فیصلہ کر لیا کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے متعلق معاندین حق کی تدبیر کا کوئی گوشہ بھی کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی پوشیدہ تدابیر کے مقابلہ میں کسی کی پیش نہیں جا سکے گی اس لیے کہ اس کی تدبیر سے بہتر کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی۔

Marfat.com

﴿وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴾ (آل عمران: ۵۴)

"اور انہوں نے (یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے (یہود کے مکر کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر کا مالک ہے۔"

لغت عرب میں "مکر" کے معنی خفیہ تدبیر (اور دھوکا کرنے) کے ہیں اور علم معانی کے قاعدہ "مشاکلہ" کے مطابق جب کوئی شخص کسی کے جواب یا دفاع (Defence) میں خفیہ تدبیر کرتا ہے تو وہ اخلاق اور مذہب کی نگاہ میں کتنی ہی عمدہ تدبیر کیوں نہ ہو اس کو بھی "مکر" ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ ہر ایک زبان کے محاورہ میں بولا جاتا ہے "برائی کا بدلہ برائی ہے" حالانکہ ہر شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ برائی کرنے والے کے جواب میں اسی قدر مقابلہ کا جواب دینا اخلاق اور مذہب دونوں کی نگاہ میں "برائی" نہیں ہے تاہم تعبیر میں دونوں کو ہم شکل ظاہر کر دیا جاتا ہے اور اسی کو "مشاکلہ" کہتے ہیں اور یہ فصاحت و بلاغت کا اہم جز سمجھا جاتا ہے۔

غرض خفیہ تدبیر دونوں جانب سے تھی، ایک جانب برے بندوں کی بری تدبیر اور دوسری جانب خدائے برتر کی بہترین تدبیر، نیز ایک جانب قادر مطلق کی تدبیر کامل تھی جس میں نقص و خامی کا امکان نہیں اور دوسری جانب دھوکے اور فریب کی خام کاریاں تھیں جو تار عنکبوت ہو کر رہ گئیں۔

آخر وہ وقت آ پہنچا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں، کاہنوں، اور فقیہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک بند مکان میں محاصرہ کر لیا، ذات اقدس اور حواری مکان کے اندر بند ہیں اور دشمن چاروں طرف سے محاصرہ کئے ہوئے ہیں، لہٰذا اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ کیا صورت ہو کہ جس سے دشمن ناکام رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کسی طرح کا بھی گزند نہ پہنچا سکے تاکہ خدائے قادر کا وعدۂ حفاظت اور دعویٰ تدبیر خیر پورا ہو تو اس کے متعلق قرآن نے بتایا کہ بیشک خدا کا وعدہ پورا ہوا اور اس کی تدبیر محکم نے عیسیٰ علیہ السلام کو دشمنوں کے ہاتھوں سے ہر طرح محفوظ رکھا اور صورت یہ پیش آئی کہ اس نازک گھڑی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وحی الٰہی نے بشارت سنائی: "عیسیٰ! خوف نہ کر تیری مدت پوری کی جائے گی (یعنی تم کو دشمن قتل نہیں کر سکیں گے اور نہ تم اس وقت موت سے دوچار ہو گے) اور ہوگا یہ کہ میں تجھ کو اپنی جانب (ملاء اعلیٰ کی جانب) اٹھا لوں گا اور ان کافروں سے ہر طرح تجھ کو پاک رکھوں گا (یعنی یہ تجھ پر کسی قسم کا قابو نہ پا سکیں گے) اور تیرے پیروؤں کو ان کافروں پر ہمیشہ غالب رکھوں گا (یعنی بنی اسرائیل کے مقابلہ میں قیامت تک عیسائی اور مسلمان غالب رہیں گے اور ان کو کبھی ان دونوں پر حاکمانہ اقتدار نصیب نہیں ہوگا، پھر انجام کار میری جانب (موت کے بعد) لوٹ آنا ہے پس میں ان باتوں پر فیصلہ حق دوں گا جن کے متعلق تم آپس میں اختلاف کر رہے ہو۔

﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَىَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴾ (آل عمران: ۵۵)

"(وہ وقت ذکر کے لائق ہے) جب اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ (علیہ السلام) سے کہا: "اے عیسیٰ! بے شبہ میں تیری مدت کو پوری کروں گا اور تجھ کو اپنی جانب اٹھا لینے والا ہوں اور تجھ کو کافروں (بنی اسرائیل) سے پاک رکھنے والا ہوں اور جو تیری پیروی کریں

Marfat.com

گے ان کو تیرے منکروں پر قیامت تک کے لیے غالب رکھنے والا ہوں، پھر میری جانب ہی لوٹنا ہے، پھر میں ان باتوں کا فیصلہ کروں گا جن کے بارے میں (آج) تم جھگڑ رہے ہو۔"

﴿ وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۱۰ ﴾ (المائدہ: ۱۱۰)

(قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو اپنے احسانات شمار کراتے ہوئے فرمائے گا) اور وہ وقت یاد کرو جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا (یعنی وہ کسی طرح تجھ پر قابو نہ پا سکے) جبکہ تو ان کے پاس معجزات لے کر آیا اور ان میں سے کافروں نے کہہ دیا: یہ تو جادو کے ماسوا اور کچھ نہیں ہے۔"

تو اب جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ اطمینان دلا دیا گیا کہ اس سخت محاصرہ کے باوجود دشمن تم کو قتل نہ کر سکیں گے اور تم کو غیبی ہاتھ ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لے گا اور اس طرح دشمنانِ دین کے ناپاک ہاتھوں سے آپ ہر طرح محفوظ کر دیے جائیں گے تو اس جگہ پہنچ کر ایک دوسرا سوال پیدا ہوا کہ یہ کس طرح ہوا اور واقعہ نے کیا صورت اختیار کر لی؟ کیونکہ یہود و نصاریٰ تو کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کو سولی پر بھی لٹکایا اور مار بھی ڈالا تب قرآن نے بتایا کہ مسیح بن مریم علیہما السلام کے قتل و صلیب کی پوری داستان سرتاسر غلط اور جھوٹ ہے بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ جب مسیح علیہ السلام کو بقید حیات ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا گیا اور اس کے بعد دشمن مکان کے اندر گھس پڑے تو ان پر صورت حال مشتبہ کر دی گئی اور وہ کسی طرح نہ جان سکے کہ آخر اس مکان میں سے مسیح علیہ السلام کہاں چلا گیا:۔

﴿ وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝۱۵۷ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۱۵۸ ﴾ (النساء: ۱۵۷-۱۵۸)

اور (یہود ملعون قرار دیے گئے) اپنے اس قول پر کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم پیغمبر خدا کو قتل کر دیا حالانکہ انہوں نے نہ اس کو قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا بلکہ (خدا کی خفیہ تدبیر کی بدولت) اصل معاملہ ان پر مشتبہ ہو کر رہ گیا اور جو لوگ اس کے قتل کے بارہ میں جھگڑ رہے ہیں بلاشبہ وہ اس (عیسیٰ علیہ السلام) کی جانب سے شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کے پاس حقیقت حال کے بارہ میں ظن (اٹکل) کی پیروی کے سوا علم کی روشنی نہیں ہے اور انہوں نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ نے اپنی جانب (ملاء اعلیٰ کی جانب) اٹھا لیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔"

قرآن عزیز کا یہ وہ بیان ہے جو یہود و نصاریٰ کے اختراعی فسانہ کے خلاف اس نے حضرت مسیح بن مریم علیہما السلام کے متعلق دیا ہے اب دونوں بیانات آپ کے سامنے ہیں، اور عدل و انصاف کا ترازو آپ کے ہاتھ میں۔ پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کی شخصیت اور ان کے دعوت و ارشاد کے مشن کو تاریخی حقائق کی روشنی میں معلوم کیجئے اور اس کے بعد ایک مرتبہ پھر ان تفصیلی واقعات پر نظر ڈالیے جو ایک اولوالعزم پیغمبر، مقرب بارگاہ الٰہی اور نصاریٰ کے عقیدۂ باطل کے مطابق خدا کے بیٹے کو خدا کے فیصلہ کے سامنے مایوس، مضطرب،

Marfat.com

بے یارومددگار اور خدا سے شاکی ظاہر کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس تضاد بیان پر بھی غور فرمائیے کہ ایک جانب عقیدۂ کفارہ کی بنیاد صرف اس پر قائم ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام خدا کا بیٹا بن کر آیا ہی اس غرض سے تھا کہ مصلوب ہو کر دنیا کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور دوسری جانب صلیب اور قتل مسیح علیہ السلام کی داستان اس اساس پر کھڑی کی گئی ہے کہ جب وہ وقت موعود آ پہنچتا ہے تو خدا کا یہ فرضی بیٹا اپنی حقیقت اور دنیا میں وجود پذیری کو یکسر فراموش کر کے "ایلی ایلی لما سبقتنی" کا حسرت ناک جملہ زبان سے کہتا اور مرضی الٰہی پر اپنی ناخوشی کا اظہار کرتا ہوا نظر آیا ہے، کیا کسی شخص کو یہ سوال کرنے کا حق نہیں ہے کہ اگر نصاریٰ کے بیان کردہ واقعات کے دونوں حصے صحیح اور درست ہیں تو ان دونوں کے باہم یہ تضاد کیسا اور اس عدم مطابقت کے کیا معنیٰ؟

پس اگر ایک حقیقت بیں اور دوررس نگاہ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اور واقعات و حالات کی ان تمام کڑیوں کو باہم جوڑ کر اس مسئلہ کا مطالعہ کرے تو وہ تصدیق حق کے پیش نظر بلا تامل یہ فیصلہ کرے گی کہ بائبل کی یہ داستان تضاد کی حامل اور گھڑی ہوئی داستان ہے اور قرآن نے اس سلسلہ میں جو فیصلہ دیا ہے وہی حق اور مبنی بر صداقت ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد سے سینٹ پال سے قبل تک نصاریٰ "یہود" کی اس خرافی داستان سے قطعاً بے تعلق تھے لیکن جب سینٹ پال (پولوس رسول) نے تثلیث اور کفارہ پر جدید عیسائیت کی بنیاد رکھی تو کفارہ کے عقیدہ کی استواری کے لیے یہود کی اس خرافی داستان کو بھی مذہب کا جز بنا لیا گیا۔

لیکن واقعہ سے متعلق حد درجہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جب کہ چودہ صدیوں سے قرآن حکیم نے عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و جلالت قدر کا اعلان کرتے ہوئے ان کے "رفع الی السماء" کی حقیقت کو یہود و نصاریٰ کی خرافی داستان کے خلاف علم و یقین کی روشنی میں نمایاں اور یہود و نصاریٰ کو دلائل و براہین کے ذریعہ لاجواب اور سرنگوں کر دیا تھا تو اس کے مقابلہ میں آج ایک مدعی اسلام، دعوئے نبوت و مسیحیت کے شوق یا ہندوستان پر مسلط عیسائی حکومت کی خودغرضانہ خوشامد میں یہود و نصاریٰ کے اسی عقیدہ کو دوبارہ زندہ کرنا اور اس پر اپنے "باطل عقیدۂ نبوت" کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے اور پنجاب (قادیان) کا یہ متنبی قرآن عزیز کی تصریحات سے بے نیاز ہو کر نہایت جسارت کے ساتھ ان تمام واقعات کی تصدیق کرتا ہے جو اس سلسلہ میں یہود و نصاریٰ نے اپنے اپنے باطل مزعومہ عقائد کی تکمیل کے لیے اختراع کیے ہیں، وہ کہتا ہے کہ بلاشبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہود نے اسیر کیا، ان کا ٹھٹھا اڑایا، ان کے منہ پر تھوکا، ان کے طمانچے بھی لگائے، ان کو کانٹوں کا تاج بھی پہنایا اور ان کے علاوہ ہر قسم کی توہین و تذلیل کا سلوک کرنے کے بعد ان کو صلیب پر بھی چڑھایا اور اپنے زعم میں ان کو قتل بھی کر ڈالا البتہ یہود و نصاریٰ کی حرف بحرف تصدیق کے بعد بغیر کسی قرآنی نص، حدیثی روایت اور تاریخی شہادت کے اپنی جانب سے یہ اضافہ کرتا ہے کہ جب شاگردوں کے مطالبہ پر نعش ان کے حوالہ کر دی گئی اور وہ تجہیز و تکفین کے لیے آمادہ ہوئے تو دیکھا کہ جسم میں جان باقی ہے تب انہوں نے خفیہ طور پر ایک خاص مرہم کے ذریعہ ان کے زخموں کا علاج کیا اور جب وہ چنگے ہو گئے تو پوشیدہ رہ کر کشمیر کو چلے گئے اور وہاں بھی حیات کے آخری لمحوں تک خود کو چھپائے رکھا اور گمنامی میں وہیں انتقال پا گئے، گویا یوں کہیے کہ یہود و نصاریٰ کی مفروضہ داستان میں حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق توہین و تذلیل کے جس قدر بھی پہلو تھے وہ سب تو متنبی کاذب نے قبول کر لیے باقی ان کی عظمت شان اور جلالت مرتبہ سے متعلق پہلو کو داستان سے خارج کر کے اس کے بجائے ایک ایسا فرضی حصہ جوڑ دیا جس سے ایک جانب نیچر پرستوں کو اپنی جانب مائل کرنے کا سامان مہیا ہو سکے اور دوسری جانب

Marfat.com

عیسیٰ علیہ السلام کی باقی زندگی مبارک کو گمنامی کے ساتھ وابستہ کر کے توہین و تذلیل کا ایک اور گوشہ جو تشنہ سامان رہ گیا تھا اس کی تکمیل ہو جائے۔ ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ﴾

متنبی پنجاب کو یہ سب کچھ کرنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ اس کی جانب ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے اور اس کی تفصیل کے لیے پروفیسر برنی کی کتاب "قادیانی مذہب" لائق مطالعہ ہے یا خود متنبی کاذب کی تصنیفی ہفوات اس حقیقت کو عریاں کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

ہمارے پیش نظر تو یہ مسئلہ ہے کہ متنبی پنجاب نے کس طرح قرآن حکیم کی نصوص قطعیہ کے خلاف یہود و نصاریٰ کے عقیدۂ "توہین" "تصلیب" اور قتل عیسیٰ علیہ السلام کی تائید پر بے جا جسارت کا اقدام کیا اور جس حد تک اختلاف کیا اس میں بھی دعویٰ قرآنی کے خلاف ان کی حیات طیبہ کو نامراد و ناکام اور گمنام ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی۔

آپ ابھی سن چکے ہیں کہ قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے مقابلہ میں خدائے تعالیٰ کی نجات سے دعویٰ حفاظت و برتری کو کس قوت بیان کے ساتھ نمایاں کیا ہے:

﴿وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ۞ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا﴾ (آل عمران: ۵۴-۵۵)

اور پھر کس زور کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دعوائے حفاظت کو اس شان کے ساتھ پورا کیا کہ دشمن کسی حیثیت سے بھی مسیح بن مریم علیہما السلام پر قابو نہ پا سکے اور ہاتھ تک نہ لگا سکے۔

تو اب قابل غور ہے یہ بات کہ ہم دنیا میں روز و شب یہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ اگر کسی صاحب قوت و اقتدار ہستی کے عزیز دوست یا مصاحب کے خلاف ان کا دشمن درپے آزار یا قتل کے درپے ہوتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ ہم صاحب اقتدار ہستی کی اعانت کے بغیر دشمن کے مقابلہ میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتے وہ صاحب اقتدار کی جانب رجوع کرتے ہیں اور یہ ہستی ان کو پوری طرح اطمینان دلاتی ہے کہ دشمن ان کو کسی طرح نقصان نہیں پہنچا سکتا بلکہ ان تک اس کی دسترس ہی نہیں ہونے دی جائے گی تو ہر ایک اہل عقل اس کا یہی مطلب لیتا ہے کہ اب کسی بھی حالت میں ان کو دشمن کا خطرہ باقی نہیں رہا مگر یہ کہ صاحب اقتدار ہستی یا اپنے وعدہ کا ایفاء نہ کرے اور جھوٹا ثابت ہو اور یا دشمن کی طاقت اتنی زیادہ ہو کہ وہ خود بھی اس حمایت و نصرت میں مغلوب و مقہور ہو کر رہ جائے۔

پس جب انسانی دنیا میں یہ اطلاع موصول ہو کہ صاحب اقتدار ہستی کے عزیز، دوست یا مصاحب کو اس کے دشمن نے گرفتار کر لیا، مارا پیٹا، منہ پر تھوکا اور ہر طرح ذلیل و رسوا کر کے اپنے گمان میں مار بھی ڈالا اور مردہ سمجھ کر نعش اس کے عزیزوں کے سپرد کر دی مگر حسب اتفاق نبض دیکھنے سے معلوم ہوا کہ کہیں جان اٹکی رہ گئی ہے لہٰذا علاج معالجہ کیا گیا اور وہ روبصحت ہو گیا تو دنیائے انسانی اس صاحب اقتدار ہستی کے متعلق کیا رائے قائم کرے گی جس نے اس مظلوم کی حمایت و نصرت کا وعدہ کیا تھا؟ یہ کہ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا یا نہیں کیا؟ ظاہر ہے کہ نہیں کیا خواہ قصداً نہیں کیا یا اس لیے کہ وہ مجبور رہا۔

پس اگر دنیائے انسانی کے معاملات میں صورت حال یہ ہے کہ معلوم نہیں کہ متنبی پنجاب کے عقل و دماغ نے قادر مطلق خدا

متعلق کس ذہنیت کے ماتحت یہ فیصلہ کیا کہ خدا نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو ہر قسم کی حفاظت و صیانت کے وعدہ کے باوجود دشمن کے ہاتھوں وہ سب کچھ ہونے دیا جس کو یہود و نصاریٰ کی اندھی تقلید میں متنبی پنجاب نے تسلیم کرلیا اور اشک شوئی کے لیے صرف اس قدر اضافہ کردیا کہ اگرچہ یہود نے صلیب وقتل کے بعد سمجھ لیا تھا کہ روح قفس عنصری سے نکل چکی ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ رمق جان ابھی غیر محسوس طور پر باقی تھی اس لیے اسی طرح ان کی جان بچ گئی جس طرح موجودہ زمانہ میں اب سے چند سال قبل جیلوں میں پھانسی دینے کا جو طریقہ رائج تھا اس کی وجہ سے کبھی پھانسی پانے کے رمق جان باقی رہ جاتی تھی اور نعش کی سپردگی کے بعد علاج معالجہ سے وہ اچھا ہو جاتا تھا۔

بہرحال ہم تو اس ذات واحد، قادر مطلق خدا پر ایمان رکھتے ہیں جس نے جب کبھی بھی اپنے خاص بندوں (نبیوں اور رسولوں) سے اس قسم کا وعدۂ حفاظت و صیانت کیا ہے تو پھر اس کو پورا بھی ایسی شان سے کیا ہے جو قادر مطلق ہستی کے لیے شایاں اور لائق ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم کے منکرین حق کا معاملہ سورۂ نمل میں جس معجزانہ شان کے ساتھ بیان ہوا ہے اس پر غور فرمائیے۔ ارشاد باری ہے:

﴿وَ كَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ۝ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ وَ مَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا مَكْرًا وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَ قَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝﴾ (النمل: ۴۸۔۵۳)

"اور شہر میں نو شخص تھے جو (بہت) مفسد تھے اور کوئی کام صلاح کاری کا نہیں کرتے تھے، انہوں نے آپس میں کہا "باہم قسمیں کھاؤ کہ ہم ضرور صالح (علیہ السلام) اور اس کے گھر والوں پر شب خون ماریں گے اور پھر اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے وقت موقع پر موجود ہی نہیں تھے اور قسم بخدا ہم ضرور سچے ہیں" اور انہوں نے (صالح علیہ السلام کے خلاف) خفیہ سازش کی اور ہم نے بھی (ان کی سازش کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور وہ ہماری مخفی تدبیر کو نہ سمجھتے تھے پس (اے محمد ﷺ!) دیکھو! کہ ان کی خفیہ سازشی تدبیر کا کیا حشر ہوا؟ یہ کہ ہم نے ان کو (مفسدوں کو) اور ان کی سرکش قوم کو سب کو ہلاک کردیا (نگاہ اٹھا کر) دیکھو یہ (قریب ہی) ہیں ان کے گھروں کے کھنڈر ویران ہیں ان کے ظلم کی وجہ سے، بیشک اس واقعہ میں نشانی ہے سمجھ والوں کے لیے اور ہم نے نجات دی ایمان والوں کو جو کہ پرہیز گار تھے۔"

اور پھر مطالعہ کیجئے اس عظیم الشان واقعہ کا جو ہجرت خاتم الانبیاء ﷺ سے تعلق رکھتا ہے اور سورۂ انفال میں دشمنان حق کی ناکامی کا ابدی اعلان ہے۔

ان دونوں واقعات میں حق و باطل کے معرکوں، دشمنوں کی خفیہ سازشوں اور انبیاء علیہم السلام کی حفاظت کے لیے وعدۂ الٰہی اور

Marfat.com

اس کے بے غل وغش پورا ہونے کا جو نقشہ قرآن عزیز نے پیش کیا ہے، تاریخی نگاہ سے ان پر غور فرمائیے اور فیصلہ کیجئے کہ جس خدا نے صالح علیہ السلام اور خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے وعدۂ حفاظت کو اس شان رفیع کے ساتھ پورا کیا ہو۔کیا متنبی پنجاب کے عقیدہ کے مطابق اسی شان معجزانہ کے ساتھ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں پورا ہوا؟ نہیں ہرگز نہیں، حالانکہ آیات قرآنی شاہد ہیں کہ ان دونوں واقعات کے مقابلہ میں عیسیٰ بن مریم علیہما السلام سے کیے گئے وعدے زیادہ واضح تفصیلات رکھتے ہیں اور ان میں صاف کہا گیا ہے کہ خدا کے بہترین مخفی فیصلہ کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کے دشمن ان کو ہاتھ تک نہ لگا سکیں گے، تب ہی تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنے جن احسانات وانعامات کو شمار کرائے گا ان میں سے ایک بڑا انعام واحسان یہ بھی ہوگا۔

﴿وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَنْكَ﴾ (المائدہ: ۱۱۰)

اور جبکہ ہم نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا تھا۔

متنبی پنجاب کو اگر اپنی نبوت اور مسیحیت کے افتراء اور ڈھونگ کو مضبوط کرنے کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کے خلاف اس درجہ ناگواری تھی جیسا کہ متنبی کاذب کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے تب بھی یہود ونصاریٰ کی اس اندھی تقلید کے لیے مقابلہ میں جو نصوص قرآنی کے خلاف "کفر بواح" تک پہنچاتی اور حضرت مسیح علیہ السلام کی شان رفیع کے حق میں باعث توہین وتذلیل وعدۂ الٰہی کی تکذیب کرتی ہے" کیا یہ کافی نہیں تھا۔کہ تاویل باطل [1] کے پردہ میں اتنا ہی کہہ دیا جاتا کہ وہ اگرچہ بقید حیات آسمان پر نہیں اٹھائے گئے مگر اللہ تعالیٰ نے بند مکان سے کسی طریق پر ان کو دشمنوں کے نرغے سے نکال کر محفوظ کر دیا اور دشمن کسی طرح ان کو نہ پا سکے، لیکن وائے برحال متنبی قادیان کہ خدا کے سچے پیغمبر حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے ساتھ بغض وعناد نے ﴿خَسِرَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ﴾ کا مصداق بنا کر ہی چھوڑا۔

قادیانی تلبیس اور اس کا جواب:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس معرکۃ الآراء مسئلہ میں "جو ان کی عظمت اور جلالت کا زبردست نشان ہے" سورۂ آل عمران کی آیات کا باہمی ربط اور ترتیب ذکری خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے کہ متنبی کاذب نے اس میں بھی "تلبیس الحق بالباطل" کا ثبوت دے کر ناواقف کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

قرآن عزیز، سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے دشمنوں کے نرغہ میں گھر جانے سے متعلق جس تسلی اور وعدہ کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطری شکل وصورت یہ پیش آئی کہ جب دشمنانِ دین نے حضرت مسیح علیہ السلام کا ایک بند مکان میں محاصرہ کر لیا تو ایک اولوالعزم پیغمبر اور خدائے برحق کے درمیان تقرب کا جو رشتہ قائم ہے اس کے پیش نظر قدرتی طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اب کیا پیش آنے والا ہے، راہ حق میں جاں سپاری یا قدرت الٰہی کا کوئی اور کرشمہ؟ اور اگر دشمنوں سے تحفظ کے لیے کوئی کرشمہ پیش آنے والا ہے تو اس کی کیا شکل ہوگی کیونکہ بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا؟ اور اگر تحفظ ہوا بھی تو کیا کچھ مصائب

[1] تاویل باطل اس لئے کہ حیات عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق دیگر نصوص قرآنی، حدیثی اور اجماع امت کے پیش نظر اس مقام پر یہ تاویل بلاشبہ "باطل" ہے مگر اس سے کم از کم حضرت مسیح علیہ السلام کی توہین اور وعدۂ الٰہی کی تکذیب کا پہلو نہیں نکلتا۔

وآلام اٹھانے کے بعد تحفظ جان ہوگا یا دشمن کسی بھی صورت میں قابو نہ پاسکیں گے؟ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قلب میں فطری طور پر پیدا ہونے والے سوالات کا ترتیب وار اس طرح جواب دیا: "عیسیٰ! میری یہ ذمہ داری ہے کہ میں تیری مقررہ مدت حیات پوری کروں گا یعنی مطمئن رہو کہ تجھ کو دشمن قتل نہ کر پائیں گے" ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ﴾ "اور صورت یہ ہوگی کہ اس وقت میں تجھ کو اپنی جانب یعنی ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھالوں گا" ﴿وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ﴾ اور یہ بھی اس طرح نہیں کہ پہلے سب کچھ مصائب ہو گزریں گے اور پھر ہم تجھ کو آخر میں علاج معالجہ کرا کر اٹھائیں گے، نہیں بلکہ یوں ہوگا کہ تو دشمن کے ناپاک ہاتھوں سے ہر طرح محفوظ رہے گا اور کوئی دشمن تجھ کو ہاتھ تک نہ لگا سکے گا ﴿وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ یہ تو تمہارے فطری سوالات کا جواب ہوا لیکن اس سے بھی زیادہ ہم یہ کریں گے کہ جو تیرے پیرو ہیں (خواہ غلط کار ہوں جیسا کہ نصاریٰ اور خواہ صحیح العقیدہ ہوں جیسا کہ مسلمان) ان کو قیامت تک یہود پر غالب رکھیں گے اور تا قیام قیامت کبھی ان کو حاکمانہ اقتدار نصیب نہیں ہوگا، باقی رہا تمام معاملات کا فیصلہ، سو اس کے لیے (قیامت کا) دن مقرر ہے اس روز سب اختلافات ختم ہو جائیں گے اور حق و باطل کا دوٹوک فیصلہ کر دیا جائے گا۔

زیر بحث آیات کی یہ تفسیر جس طرح سلف صالحین اور اجماع امت کے مطابق ہے اسی طرح اس میں آیات میں کیے گئے متعدد وعدوں کی ترتیب میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی مگر مرزائے قادیانی نے اپنی "مسند مسیحیت و نبوت" کو قائم کرنے کے لیے قرآن، احادیث صحیحہ اور اجماع امت کے خلاف جبکہ یہ دعویٰ کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت ہو چکی تو اس سلسلہ کی آیات میں تحریف معنوی کی ناکام سعی کو بھی ضروری سمجھا اور دعویٰ کیا کہ اگر مسیح علیہ السلام کی موت کے وقوع کو رفع الی السماء اور تطہیر اور تفوق المطیعین علی الکافرین سے قبل تسلیم نہ کیا جائے گا تو ترتیب ذکری میں فرق آ جائے گا اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم ماننا پڑے گا اور یہ قرآن عزیز کی شان بلاغت کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ ماننا چاہیے کہ ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ﴾ کے وعدہ کا وقوع ہو چکا اور عیسیٰ علیہ السلام پر موت آ چکی۔

مرزائے قادیانی کی یہ "تلبیس" اگرچہ ان حضرات سے تو پوشیدہ نہیں رہ سکتی جو عربیت اور قرآن کے اسلوب بیان کا ذوق رکھتے ہیں لیکن عوام کو مغالطہ میں ڈال سکتی ہے اس لیے اس عنوان کے شروع ہی میں آیات کی تفسیر کو اس طرح بیان کر دیا گیا کہ مرزا کی جانب سے جو تلبیس کی گئی ہے وہ خود بخود زائل ہو جائے تاہم مزید تشریح کے لیے یہ اور اضافہ ہے کہ ترتیب ذکری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلام میں اگر چند باتیں ترتیب وار ذکر کی گئی ہیں تو ان کا وقوع بھی اس طرح ہونا چاہیے کہ اس کلام میں ذکر کردہ ترتیب بگڑنے نہ پائے اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرنا نہ پڑے اور یہ جب ضروری ہے کہ کلام کی فصاحت و بلاغت کا تقاضا ہی یہ ہو کہ ترتیب ذکری میں فرق نہ آنے پائے ورنہ تو بعض مقامات پر تقدیم و تاخیر کو بھی فصاحت کی جان سمجھا جاتا ہے اور یہ علم معانی کا مشہور مسئلہ ہے۔

پس قرآن کی ان آیات میں جمہور اہل اسلام کی تفسیر کے مطابق ترتیب ذکری بحالہ قائم ہے اس لیے کہ خدا کی جانب سے وعدہ یہ ہے کہ میں تمہاری مقررہ مدت پوری کروں گا ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ﴾ یعنی تمہاری موت ان دشمنوں کے ہاتھ سے نہیں ہوگی بلکہ اپنی طبعی موت سے مرو گے مگر اس پہلے وعدہ کو پورا کرنے کے لیے متعدد صورتیں ہو سکتی تھیں، یہ کہ دشمنوں پر باہر سے اچانک حملہ ہو اور وہ فرار ہو جائیں یا سب وہیں کھیت رہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام ان کی زد سے بچ جائیں، یا یہ کہ قوم عاد و ثمود کی طرح زمین یا آسمان سے قدرتی عذاب آ کر ان سب کو ہلاک کر دے، یا یہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کسی ترکیب سے ان کے نرغہ میں سے محفوظ نکل

جائیں اوران کی دسترس سے باہر ہوجائیں، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے کرشمہ قدرت سے عیسیٰ علیہ السلام کو مکان بند رہتے ہوئے ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھالے وغیرہ وغیرہ۔تو قرآن نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خبر دی کہ پہلے وعدہ کا ایفاء مسطورہ بالا آخری شکل یعنی ﴿وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ﴾ کی شکل میں ہوگا اور ہوگا بھی ایسی قدرت کاملہ کے ہاتھوں کہ اس محاصرہ کے باوجود دشمن اپنے ناپاک ہاتھ تجھ کو نہیں لگا سکیں گے اور میں ان کافروں کے ہاتھ سے تجھ کو پاک رکھوں گا ﴿وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ اوران باتوں کے علاوہ یہ بھی ہوگا کہ میں تیرے پیروؤں کو تیرے منکروں پر قیامت تک غالب رکھوں گا، بہرحال بعد کے یہ تینوں وعدے بالترتیب جب ہی عمل میں آئیں گے کہ پہلے وعدۂ اول وقوع پذیر ہوجائے یعنی تیری موت ان کے ہاتھوں نہ ہو بلکہ اپنی مقررہ مدت پر پہنچ کر طبعی موت آئے۔ان آیات میں پہلے وعدہ کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ میں اول تجھ کو ماروں گا اور پھر بالترتیب یہ سب امور انجام دوں گا، کیونکہ یہ قول صرف جاہل ہی کہہ سکتا ہے لیکن جس کو گفتگو کا معمولی بھی سلیقہ ہے وہ ہرگز ایسا کہنے کی جرأت نہیں کرے گا کیونکہ ترتیب ذکری کے لیے یہ تو ہونا چاہیے کہ ان امور کے وقوع میں ایسی صورت نہ پیدا ہوجائے کہ ترتیب میں فرق لاکر تقدیم وتاخیر کا عمل جراحی کرنا پڑے لیکن اگر کوئی شے زمانہ کا امتداد اور طوالت چاہتی ہے اوراس کا آخری حصہ وقوع ان تمام امور کے بعد پیش آتا ہے جواس کے بعد مذکور تھے مگر ترتیب ذکری میں مطلق کوئی فرق نہیں آتا تو ایسی شکل میں اس وقوع کے متاخر ہوجانے سے کسی عالم کے نزدیک بھی کلام کی فصاحت و بلاغت میں نقص واقع نہیں ہوتا اور نہ اس قسم کے وقوع ترتیبی کا ترتیب ذکری کے ساتھ کوئی تعلق ہوتا ہے۔

پس مسئلہ زیر بحث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طبعی موت کا وقوع کبھی بھی ہو اس کا ترتیب ذکری سے مطلق کوئی علاقہ نہیں ہے یہاں تو ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ﴾ کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ دیے گئے متعدد وعدوں میں پہل اور اولیت اس وعدہ کو حاصل ہے کہ تمہاری موت کا سبب یہ یہود بنی اسرائیل نہیں ہوں گے بلکہ جب بھی یہ مقررہ مدت پوری ہوگی اس طریق پر ہوگی جو عام طور سے میری جانب منسوب کی جاتی ہے (یعنی طبعی موت) اور یہ وعدہ بہرحال باقی تین وعدوں سے پہلے ہی رہا تب ہی تو یہ تینوں وعدے وقوع میں آ سکے، اور اگر کہیں دشمن حضرت مسیح علیہ السلام کی موت کا سبب بن گئے ہوتے تو پھر ”رفع“ اور ”تطہیر“ کے لیے کوئی صورت ہی نہ رہ جاتی اور مرزا قادیانی کی طرح باطل اور رکیک تاویلات کی آڑ لینی پڑتی اور آیات زیر بحث کی ”روح“ فنا ہوکر رہ جاتی اور یہ اس لیے کہ اگر ”رفع“ سے رفع روحانی اور ”تطہیر“ سے روحانی پاکی مراد لیے جائیں تو یہ قطعاً بے محل اور بے موقع ہوگا کیونکہ قرآن کے ارشاد کے مطابق یہ وعدے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیے جارہے ہیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ بتانا کہ تمہارے متعلق یہود کا یہ اعتقاد ”کہ تم کاذب اور ملعون ہو“ غلط ہے اور تم مطمئن رہو کہ میں تمہارا رفع روحانی کرنے والا ہوں قطعاً عبث تھا کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیغمبر خدا ہیں اور جانتے ہیں کہ یہود کا افتراء کیا حقیقت رکھتا ہے، نیز یہود کو حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع روحانی کا پتہ نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ معاملہ عالم غیب سے متعلق ہے تو خدائے برتر کا یہ ارشاد نہ حضرت مسیح علیہ السلام کی برمحل تسلی کا باعث ہوسکتا تھا اور نہ یہود کے لیے سودمند اور یہی حال دوسرے وعدۂ تطہیر کا ہے بلکہ جب بقول قادیانی یہود کے ہاتھوں حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھا دیے گئے تو نعش پالینے کے بعد شاگردوں کا مرہم عیسیٰ لگا کر چنگا کر لینے اور پھر منجانب اللہ جن کی ہدایت وارشاد کے لیے مامور کیے گئے تھے ان سے جان بچا کر بھاگ جانے اور زندگی بھر گمنامی میں زندگی بسر کرتے رہنے کے بعد ﴿رَافِعُكَ اِلَیَّ﴾ اور ﴿وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ کہہ دینے سے نہ یہود کے عقیدۂ متعلق حضرت مسیح علیہ السلام کی ہی تردید ہوگی اور نہ ایک غیر جانبدار انسان ہی یہ سمجھ سکے گا کہ ایسے موقعہ پر

Marfat.com

جبکہ عیسیٰ علیہ السلام دشمنوں کے نرغے میں ہیں اور جبکہ ان کو یہ یقین ہے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور موت کے بعد رفع روحانی اور تطہیر لازم شے ہے، ان تسلیوں اور وعدوں کا کیا فائدہ ہے خصوصاً جبکہ ان کے ساتھ دشمن نے وہ سب کچھ کر لیا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔

البتہ جمہور اہل حق کی تفسیر کے مطابق آیات قرآنی کی روح اپنی معجزانہ بلاغت کے ساتھ پوری طرح ناطق ہے کہ یہ وعدے حضرت مسیح علیہ السلام سے جس طرح کیے گئے وہ برمحل اور فطری اضطراب کے لیے بلاشبہ باعث تسکین ہیں اور نبی اکرم ﷺ کی معرفت کا وقت کے یہود و نصاریٰ کے وراثتی عقائد باطلہ کی تردید کے لیے کافی اور مدلل۔

جمہور اہل حق کی یہ تفسیر "توفی" کے معنی "مقررہ مدت پوری کرنا" اختیار کر کے کی گئی ہے جس کا حاصل (توفی بمعنی موت) نکلتا ہے لیکن توفی کے یہ حقیقی معنی نہیں ہیں بلکہ بطور کنایہ کے مستعمل ہوئے ہیں کیونکہ لغت عرب میں اس کا مادہ (میٹر) وفی، یفی، وفاء ہے جس کے معنی "پورا کرنے" کے آتے ہیں اور اس کو جب باب تفعل میں لے جا کر "توفی" بناتے ہیں تو اس کے معنی "کسی شے کو پورا پورا لے لینا" یا "کسی شے کو سالم قبضہ میں کر لینا" آتے ہیں (توفی اخذہ وافیا تاماً یقال "توفیت من فلان مالی علیہ") اور چونکہ موت میں بھی، اسلامی عقیدہ کے مطابق روح کو پورا لے لیا جاتا ہے اس لیے کنایہ کے طور پر "کہ جس میں حقیقی معنی بحالہ محفوظ رہا کرتے ہیں" "توفی بمعنی موت مستعمل ہوتا ہے اور کہتے ہیں" "توفاہ اللہ ای اماتہ" لیکن اگر موقع پر دوسرے دلائل ایسے موجود ہوں جن کے پیش نظر توفی کے حقیقی معنی لیے جا سکتے ہوں یا حقیقی کے ماسوا دوسرے معنی بن ہی نہ سکتے ہوں تو اس مقام پر خواہ فاعل "اللہ تعالیٰ" اور مفعول "ذی روح انسان" ہی کیوں نہ ہو وہاں حقیقی معنی "پورا لے لینا" ہی مراد ہوں گے مثلاً آیت:

﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا﴾ (الزمر: ۴۲)

اللہ پورا لے لیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت اور ان جانوں کو جن کو ابھی موت نہیں آئی ہے پورا لے لیتا ہے نیند میں ﴿وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ﴾ کے لیے بھی لفظ "توفی" بولا گیا یعنی ایک جانب یہ صراحت کی جا رہی ہے کہ یہ وہ جانیں (نفوس) ہیں جن کو موت نہیں آئی اور دوسری جانب یہ بھی بصراحت کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیند کی حالت میں ان کے ساتھ "توفی" کا معاملہ کرتا ہے تو یہاں اللہ تعالیٰ فاعل ہے "متوفی" اور نفس انسانی مفعول ہے "متوفی" مگر پھر بھی کسی صورت سے "توفی بمعنی موت" صحیح نہیں ہیں ورنہ تو قرآن کا جملہ ﴿وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ﴾ العیاذ باللہ مہمل ہو کر رہ جائے گا، یا مثلاً:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ﴾ (الانعام: ۶۰)

(اور وہی (اللہ) ہے جو پورا لے لیتا یا قبضہ میں کر لیتا ہے تم کو رات میں اور جانتا ہے جو تم کماتے ہو دن میں) میں بھی کسی طرح توفی بمعنی موت نہیں بن سکتے حالانکہ توفی کا فاعل اللہ اور مفعول انسانی نفوس ہیں یا مثلاً آیت:

﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا﴾ (الانعام: ۶۱)

یہاں تک کہ جب آتی ہے تم میں سے ایک کسی کو موت قبض کر لیتے ہیں یا پورا لے لیتے ہیں اس کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) میں کہ موت ہی کا ہو رہا ہے لیکن پھر بھی ﴿تَوَفَّتْهُ﴾ میں توفی کے معنی موت کے نہیں بن سکتے ورنہ بے فائدہ تکرار لازم آئے گا، یعنی

Marfat.com

﴿ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ ﴾ میں جب لفظ "موت" کا ذکر آ چکا تو اب ﴿ تَوَفَّتْهُ ﴾ میں بھی اگر توفی کے معنی موت ہی کے لیے جائیں تو ترجمہ یہ ہوگا، یہاں تک کہ جب آتی ہے تم میں سے ایک کسی کو موت، موت لے آتے ہیں ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں دوبارہ لفظ موت کا ذکر بے فائدہ ہے اور کلام فصیح و بلیغ اور معجز تو کیا روزمرہ کے محاورہ اور عام بول چال کے لحاظ سے بھی پست اور لاطائل ہو جاتا ہے البتہ اگر "توفی" کے حقیقی معنی "کسی شے پر قبضہ کرنا یا اس کو پورا لے لینا" مراد لیے جائیں تو قرآن عزیز کا مقصد ٹھیک ادا ہوگا اور کلام بھی اپنے حد اعجاز پر قائم رہے گا۔

اب ہر ایک عاقل غور کر سکتا ہے کہ یہ دعویٰ کرنا کہ "توفی" کے حقیقی معنی موت کے ہیں۔ خصوصاً جبکہ فاعل خدا ہو اور مفعول ذی روح کہاں تک صحیح اور درست ہے۔

بہر حال اس موقع پر "موت" اور "توفی" دونوں کا ساتھ ساتھ بیان ہونا اور دونوں کا ایک ہی معمول ہونا اور پھر دونوں کے معنی میں فرق و تفاوت اس بات کے لیے واضح دلیل ہے کہ یہ دونوں مرادف الفاظ نہیں ہیں اور جس طرح لیث و اسد بمعنی شیر) ابل و جمل بمعنی اونٹ) نون و حوت بمعنی مچھلی) وغیرہ اسماء کا اور جمع، شمل، کسب بمعنی جمع ہونا) اور لبث مکث بمعنی ٹھہرنا) اور عطش، ظما پیاس) اور جوع، سغب بمعنی بھوک) مصادر کا حال ہے، موت اور توفی کے درمیان وہ معاملہ نہیں ہے بلکہ ان کے حقیقی معانی میں نمایاں فرق ہے۔ اور مثلاً آیت:

﴿ فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ ﴾ (النساء: ۱۵)

"پس روکے رکھو ان (عورتوں) کو گھروں میں یہاں تک کہ لے لے ان کو موت"

میں موت کو فعل توفی کا فاعل قرار دیا گیا ہے اور ہر ایک زبان کی نحو (گرامر) کا یہ مسئلہ ہے کہ فاعل اور فعل ایک نہیں ہوتے کیونکہ فعل، فاعل سے صادر ہوتا ہے، عین ذات فاعل نہیں ہوا کرتا تو اس سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ توفی کے حقیقی معنی "موت" کے ہرگز ہرگز نہیں ہیں، ورنہ اس کا اطلاق جائز نہیں ہو سکتا تھا۔ ان تین مقامات کے علاوہ سورہ بقرہ کی آیت:

﴿ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ﴾ (البقرہ: ۲۸۱)

پھر پورا دیا جائے گا ہر ایک نفس کو جو کچھ اس نے کمایا ہے۔"

اور سورہ نحل کی آیت:

﴿ وَ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ ﴾ (النحل: ۱۱۱)

"اور پورا دیا جائے گا ہر نفس کو جو کچھ اس نے کمایا۔"

میں بھی توفی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول نفس انسانی ہے تاہم یہاں توفی بمعنی موت نہیں بن سکتے اور بہت واضح اور صاف بات ہے۔

غرض ان آیات میں باوجود اس امر کے کہ "توفی" کا فاعل اللہ تعالیٰ اور اس کا مفعول "انسان یا نفس انسانی" ہے پھر بھی باجماع اہل لغت و تفسیر "موت کے معنی" نہیں ہو سکتے خواہ اس لیے کہ دلیل اور قرینہ اس معنی کے خلاف ہے اور یا اس لیے کہ اس مقام

پر توفی کے حقیقی معنی (پورا لے لینا یا قبض کر لینا) کے ماسواء "موت کے معنی" کسی طرح بن ہی نہیں سکتے۔

تو مرزائے قادیانی کا یہ دعویٰ کہ "توفی" اور "موت" مرادف الفاظ ہیں یا یہ کہ توفی کا فاعل اگر اللہ تعالیٰ اور مفعول، انسان یا نفس انسانی ہو تو اس جگہ صرف "موت" ہی کے معنی ہوں گے، دونوں دعوے باطل اور نصوص قرآنی کے قطعاً مخالف ہیں۔

﴿هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○﴾

توفی اور موت یقیناً مترادف الفاظ نہیں ہیں اور توفی کے حقیقی معنی "موت" نہیں بلکہ "پورا لے لینا یا قبض کر لینا" ہیں۔ قرآن عزیز سے اس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ پورے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی موت کا فاعل اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو قرار نہیں دیا گیا مگر اس کے برعکس توفی کا فاعل متعدد مقامات پر ملائکہ (فرشتوں) کو ٹھہرایا ہے مثلاً سورۂ نساء میں ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (النساء: ۹۷)

"بیشک وہ لوگ جن کو فرشتوں نے قبض کر لیا یا پورا پورا لے لیا۔"

اور سورۂ انعام میں ہے: ﴿تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا﴾ "قبض کر لیا یا پورا لے لیا" اس کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتوں) نے اور سورۂ سجدہ میں ہے ﴿قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ﴾ (اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے قبض کرے گا تم کو موت کا فرشتہ)" اور سورۂ انفال میں ہے: ﴿وَلَوْ تَرٰٓى إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (الانفال: ۵۰) "اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت کہ قبض کرتے ہیں فرشتے ان لوگوں (کی روحوں) کو جنھوں نے کفر کیا ہے۔

ان تمام مقامات پر اگرچہ توفی "کنایۃ" بمعنی موت استعمال ہوا ہے لیکن پھر بھی چونکہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی بجائے ملائکہ اور ملک الموت کی جانب ہو رہی تھی اس لیے لفظ "توفی" کا اطلاق کیا گیا اور لفظ "موت" استعمال نہیں کیا گیا اور یہ صرف اس لیے کہ موت تو اللہ کا فعل ہے اور موت کے وقت انسان کا یعنی روح انسانی کا قبض کرنا اور اس کا پورا پورا لے لینا یہ فرشتوں کا عمل ہے، تو جن مقامات میں یہ بتانا مقصود ہے کہ جب خدا کسی کی اجل پوری کر دیتا اور موت کا حکم صادر فرماتا ہے تو اس کی صورت عمل کیا پیش آتی ہے ان مقامات میں موت کا اطلاق ہرگز موزوں نہیں تھا بلکہ "توفی" کا لفظ ہی اس حقیقت کو ادا کر سکتا تھا۔

موت اور توفی کے درمیان قرآنی اطلاقات کے پیش نظر ایک بہت بڑا فرق یہ بھی ہے کہ قرآن عزیز نے جگہ جگہ "موت" اور "حیات" کو تو مقابل ٹھہرایا ہے لیکن "توفی" کو کسی ایک مقام پر بھی "حیات" کا مقابل قرار نہیں دیا۔ مثلاً سورہ ملک میں ہے:

﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ......﴾ (الملک: ۲)

"خدا ہی وہ ذات ہے جس نے پیدا کیا موت کو اور زندگی کو"۔ اور سورۂ فرقان میں ہے:

﴿وَلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً﴾ (الفرقان: ۳)

"اور وہ نہیں مالک ہیں موت کے اور نہ حیات کے۔"

اور اسی طرح ان دونوں کے مشتقات کو مقابل ٹھہرایا ہے مثلاً: ﴿كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى﴾ (البقرہ) ﴿يُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (روم)

﴿فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (البقرہ) ﴿وَ اُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (آل عمران) ﴿وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى﴾ (شوریٰ) (وغیر ذلک کثیراً) البتہ توفی کے حقیقی معنی میں چونکہ یہ وسعت موجود ہے کہ اسلام کے نقطہ نظر سے موت کی جو حقیقت ہے بطریق کنایہ اس پر بھی حسب موقعہ اس کا اطلاق ہوسکتا ہے تو یہ استعمال اور اطلاق بھی جائز ٹھہرا اور اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔

"توفی" کے معنی کی اس مفصل تشریح وتوضیح کا حاصل یہ ہوا کہ لغت عرب اور قرآنی اطلاقات دونوں اس کے شاہد ہیں کہ توفی اور موت دونوں کے حقیقی معنی میں بھی اور دونوں کے اطلاقات میں بھی واضح فرق ہے اور دونوں مرادف الفاظ نہیں ہیں خواہ توفی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول "انسان اور روح انسانی" ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اسلامی نقطہ نظر سے چونکہ موت ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جس پر بطریق "توسع" اور "کنایہ" توفی کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ پس جس مقام پر قرینہ اور محل استعمال کا تقاضا یہ ہوگا کہ وہاں توفی بول کر کنایۃً موت کے معنی لیے جانے چاہئیں تو اس جگہ "موت" کے معنی مراد ہوں گے لیکن اس کے برعکس اگر دلیل، قرینہ اور محل استعمال حقیقی معنی کا متقاضی ہے تو اس جگہ وہی معنی مراد ہوں گے اور ان ہی کو مقدم سمجھا جائے گا خواہ کنائی معنی وہاں قطعاً نہ بن سکتے ہوں اور خواہ بن سکتے ہوں مگر محل استعمال اور دوسرے دلائل اس کو مرجوح یا ممنوع قرار دیتے ہوں۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد لغت کے مشہور امام ابوالبقاء نے یہ تصریح کی ہے کہ عوام میں توفی کے معنی اگرچہ "موت" کے سمجھے جاتے ہیں مگر خواص کے نزدیک اس کے معنی "پورا لے لینا" اور "قبض کرنا" ہیں فرماتے ہیں:

التوفی الاماتة و قبض الروح وعليه استعمال العامة والاستيفاء و اخذ الحق وعليه استعمال البلغاء.

الحاصل، سورۂ مائدہ کی آیت ﴿اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ﴾ میں اگر حقیقی معنی مراد ہوں، جیسا کہ جلیل القدر علماء تفسیر ولغت نے اختیار کیے ہیں۔ تب بھی مرزائے قادیانی کے علی الرغم آیات زیر بحث کا یہ مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ تسلی دی گئی "اے عیسیٰ! میں تجھ کو پورا پورا لے لینے والا ہوں یا تجھ کو قبض کرنے والا ہوں اور صورت یہ ہوگی کہ میں تجھ کو اپنی جانب (ملاء اعلیٰ کی جانب) اٹھا لینے والا ہوں اور تجھ کو دشمنوں کے ناپاک ہاتھوں سے پاک رکھنے والا ہوں۔۔۔۔ الخ" یعنی جب شروع میں یہ بتایا کہ تجھ کو قبض کرلیا جائے گا یا پورا لے لیا جائے گا تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ قبض کرنے اور پورا لے لینے کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً ایک یہ کہ موت آجائے اور روح کو قبض کرلیا جائے اور پورا لے لیا جائے اور دوسری یہ کہ زندہ ملاء اعلیٰ کی جانب (اپنی جانب) اٹھا لیا جائے تو یہاں کون سی صورت پیش آئے گی۔ پس اس کو صاف اور واضح کرنے کے لیے کہا گیا کہ دوسری شکل اختیار کی جائے گی تاکہ دشمنوں کی سازشوں کے مقابلہ میں معجزانہ تدبیر کے ذریعہ وعدۂ الٰہی ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ پورا ہو اور ﴿وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَنْكَ﴾ کا عظیم الشان مظاہرہ ہو جائے اور "توفی" اور "رفع" ہو جانے پر نتیجہ یہ نکلے کہ ذات اقدس کافروں کے ہاتھ سے ہر طرح محفوظ ہو جائے اور اس طرح وعدۂ ربانی ﴿وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ بغیر کسی تاویل کے صحیح ہو جائے اور تاویل باطل کے ذریعہ شک اور تردد یا حقیقت حال سے انکار صرف ان ہی قلوب کا حصہ رہ جائے جو قرآن سے علم حاصل کرنے کی بجائے اول اپنے ذاتی اوہام وظنون کو راہنما بناتے اور پھر قرآن کے منطوق ومفہوم کے خلاف اس کے منہ میں اپنی زبان رکھ دینا چاہتے ہیں اور اس سے وہ کہلانا چاہتے ہیں جو وہ خود کہنا نہیں چاہتا مگر وہ قرآن عزیز کی اس صفت سے غافل رہتے ہیں:

Marfat.com

﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾ (السجدہ: ۴۲)

"اس قرآن کے آگے سے اور نہ اس کے پیچھے سے (کسی جانب سے بھی) باطل نہیں پھٹک سکتا، یہ اتارا ہوا ہے ایسی ہستی کی جانب سے جو حکمت والی، خوبیوں والی ہے۔"

متنبی پنجاب کو جب قرآن عزیز کی ان نصوص سے متعلق تحریف معنوی میں ناکامی ہوئی اور خسران کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تو مجبور ہو کر اور قرآن عزیز کے اطلاقات، احادیث صحیحہ کی اطلاعات اور اجماع امت کے فیصلہ کو پس پشت ڈال کر "فلسفہ" کی آغوش میں پناہ لینے کا ارادہ کیا اور اپنی تصانیف میں یہ ہرزہ سرائی کی کہ اگر حضرت مسیح علیہ السلام آسمان پر زندہ اٹھا لیے گئے تو یہ عقل کے خلاف ہے اس لیے کہ کوئی مادی جسم ملاء اعلیٰ تک پرواز نہیں کر سکتا اور کر بھی جاتا تو اتنی طویل مدت کیسے زندہ ہے اور وہاں کھانے، پینے اور رفع حاجت کرنے کی صورت کیسے عمل میں آ سکتی ہے؟

قدرت الٰہی کے معجزانہ افعال کو خلاف عقل کہہ کر بات اگر ختم ہو سکتی تو شاید قادیانی کی یہ فلسفیانہ موشگافی درخور اعتناء سمجھی جا سکتی۔ لیکن آج فلسفہ جدید بہ شکل سائنس ترقی کر کے جس حد تک پہنچ چکا ہے وہاں نظریات (Theores) نہیں بلکہ مشاہدات اور عملیات (Practicles) اس بات کو ثابت کر رہے ہیں کہ فضاء کے موانعات کو اگر آہستہ آہستہ ہٹا دیا جائے یا ان کو ضبط (Control) میں لے آیا جائے تو مادی جسم کے لیے غیر معلوم بلندی تک پہنچنا ممکن العمل ہو جائے گا اور اس کے لیے جوجدوجہد وہ کر رہے ہیں اس کو ممکن العمل سمجھ کر ہی کر رہے ہیں اور سائینٹیفک (Scientific) طریقہ پر کر رہے ہیں، پس اگر آج کا انسان میلوں اوپر ہوائی جہاز کے ذریعہ جا سکتا ہے اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ ہزاروں میل سے مادی انسان کے ساتھ باتیں کرتے وقت اس کے جسم کی تصویر لے سکتا ہے اور ہوا اور آفتاب کی لہروں اور شعاعوں پر کنٹرول کر کے ہزاروں میل تک اپنی آواز کو بذریعہ ریڈیو نشر کر سکتا ہے اور ہزاروں برس کے گزرے ہوئے واقعات کو فضاء میں نظم کر کے آج اس طرح سنا سکتا ہے گویا وہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے تو اس انسان کے خالق بلکہ خالق کائنات کے متعلق ازراہِ تفلسف یہ کہنا کہ وہ مادی جسم کو ملاء اعلیٰ تک کیسے لے جا سکتا ہے اپنی غباوت پر مہر کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔

اور اگر ادویات اور غذاؤں اور حفظان صحت کے مختلف طریقوں سے عمر طبعی کو دوگنا اور تین گنا کیا جا سکتا اور کیا جا رہا ہے نیز اگر مختلف غذاؤں کے اثرات ونتائج میں یہ فرق ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ کسی سے فضلہ زیادہ بنے اور کسی سے بہت کم بنے اور کسی سے قطعاً نہ بنے بلکہ وہ خالص خون کی شکل میں تحلیل ہو جائے اور اگر انسان اپنی ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعہ روحانی قوت کو بڑھا کر آج اس دنیا میں دنوں، ہفتوں بلکہ مہینوں بغیر خورد ونوش زندہ رہ سکتا ہے تو مجبور انسانوں کی ان کامیاب کوششوں کو صحیح سمجھنے کے باوجود خالق ارض وسماوات کی جانب حضرت مسیح علیہ السلام کی رفعت آسمانی پر مسطورۂ بالا شکوک پیش کرنا یا ان کے پیش نظر ان کی بجسد عنصری ملاء اعلیٰ تک پہنچنے اور وہاں زندہ رہنے کا انکار کرنا اگر جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص علمی حقائق سے ناآشنا اور علوم قرآن سے محروم ہے وہ "خلاف عقل" اور "ماوراء عقل" ان دونوں کے درمیان فرق کرنے سے عاجز ہے اور اس لیے ہمیشہ ماوراء عقل کو خلاف عقل کہہ کر پیش کرتا رہتا ہے۔

دراصل انسان کی فکری گمراہیوں کا سرچشمہ صرف دو ہی باتیں ہیں ایک یہ کہ انسان "عقل" سے اس درجہ بے بہرہ ہو جائے

Marfat.com

کہ ہر ایک بات بے سمجھے بوجھے مان لے اور اندھوں کی طرح ہر ایک راہ پر چلنے لگے، دوسری بات یہ کہ جو حقیقت بھی عقل سے بالاتر نظر آئے اس کو فوراً جھٹلا دے اور یہ یقین کر لے کہ جس شے کو اس کی سمجھ یا چند انسانوں کی سمجھ ادراک نہیں کر سکتی وہ شے حقیقتاً وجود نہیں رکھتی اور تکذیب کے لائق ہے حالانکہ بہت سی باتیں وہ ہیں جو ایک دور کے تمام عقلاء کے نزدیک ماوراء عقل سمجھی جاتی ہیں، اس لیے کہ ان کی عقلیں ان باتوں کا ادراک کرنے سے عاجز رہیں مگر وہی باتیں علمی ترقی کے دوسرے دور میں جا کر نہ صرف ممکن الوقوع قرار پاتی بلکہ مشاہدہ اور تجربہ میں آ جاتی ہیں پس اگر ہر ایک وہ شے جو کسی ایک انسان یا جماعت یا اس کے دور کے تمام اہل عقل کے نزدیک ماوراء عقل تھی "خلاف عقل" کہلانے کی مستحق تھی تو وہ دوسرے دور میں کیوں عقل کے لیے ممکن ہوئی بلکہ مشاہدہ میں آ گئی۔

قرآن عزیز نے گمراہی کی اس پہلی حالت کو (جہل، ظن، خرص، اٹکل) سے تعبیر کیا ہے اور دوسری حالت کو "الحاد" کہا ہے اور یہ دونوں حالتیں "علم و عرفان" سے محرومی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ خلاف عقل اور ماوراء عقل کے درمیان یہ فرق ہے کہ خلاف عقل بات وہ ہو سکتی ہے جس کے نہ ہو سکنے کے متعلق علم و یقین کی روشنی میں مثبت دلائل و براہین موجود ہوں اور عقل، دلیل و برہان اور علم یقین سے یہ ثابت کرتی ہو کہ ایسا ہونا ناممکن اور محال ذاتی ہے اور ماوراء عقل اس بات کو کہتے ہیں کہ بعض باتوں کے متعلق عقل ہی کا یہ فیصلہ ہے کہ چونکہ انسانی عقل کا ادراک ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتا اور حقیقت اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی، لہٰذا ہر وہ بات جو عقل کے احاطہ میں نہ آ سکتی ہو مگر اس کے انکار پر علم و یقین کے ذریعہ برہان و دلیل بھی دی جا سکتی ہو تو ایسی بات کو خلاف عقل نہیں بلکہ ماوراء عقل کہیں گے۔

خلاف عقل اور ماوراء عقل کے درمیان امتیاز ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ جن چیزوں کو کل کی دنیا میں عام طور پر خلاف عقل کہا جاتا رہا ان کو اہل دانش و بینش نے خلاف عقل نہ سمجھتے ہوئے موجودہ دور میں ممکن بلکہ موجود کر دکھایا اور کل یہی عقل کی ترقی آج کی بہت سی ماوراء عقل باتوں کو احاطہ عقل میں لا سکے گی اور نہ معلوم یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔

پس جو شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بجسد عنصری رفع الی السماء کا اس لیے منکر ہے کہ عقلی فلسفہ اس کا انکار کرتا ہے تو اس کا یہ دعویٰ "برہان و دلیل اور علم و یقین کی جگہ محض جہل، ظن، اٹکل کے ماتحت ہے" اور ایسے حضرات کے لیے پھر عالم غیب کی تمام ماوراء عقل باتوں، مثلاً وحی، فرشتہ، جنت، جہنم، حشر، معاد، معجزہ وغیرہ تمام باتوں کو خلاف عقل کہہ کر جھٹلا دینا چاہیے۔ قرآن عزیز نے ان ہی جیسے منکرین حق کے متعلق صاف صاف مکذبین کا لقب تجویز کر دیا ہے:

﴿بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ لَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ (یونس: ۳۹)

"نہیں یہ بات نہیں ہے (جیسا کفار کہتے ہیں) اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے۔ ٹھیک اسی طرح انہوں نے بھی جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں تو دیکھو ظلم کرنے والوں کا کیسا کچھ انجام ہو چکا ہے۔"

آیت ﴿كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ﴾ کہہ کر جس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے "یعنی انسان کی عقل جس بات کا ادراک

Marfat.com

کر سکے اس کو دلیل و برہان اور علم یقین کے بغیر ہی جھٹلا دینا اور صرف اس بناء پر انکار کر دینا کہ یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے" اس کی ایک نظیر مرزائے قادیانی کا وہ انکار ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے "رفع الی السماء" سے متعلق ہے اور اس کے خلیفہ مسٹر لاہوری کی فلسفیانہ موشگافیاں بھی اسی بے دلیل انکار وجحود کا شعبہ ہیں۔

اس حربہ کو بھی کمزور سمجھ کر متنبی پنجاب نے پھر رخ بدلا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس موقع کے علاوہ قرآن کے کسی مقام سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ "رفع" سے "رفع روحانی" کے ماسواء کوئی معنی لیے گئے ہیں یعنی مادی شے کی جانب رفع کی نسبت کی گئی ہو لہٰذا اس مقام پر بھی رفع روحانی کے علاوہ معنی لینا قرآن کے اطلاق استعمال کے خلاف ہے۔

مگر متنبی کاذب کا یہ دعویٰ اوّل تو بنیاداً ہی غلط ہے کیونکہ اگر کسی لفظ کے محل استعمال سے یا قرآن ہی کی دوسری نصوص سے ایک معنی متعین ہیں تب یہ سوال پیدا کرنا کہ "یہی استعمال دوسرے کسی مقام پر جب تک ثابت نہیں ہوگا قابل تسلیم نہیں" حد درجہ کی نادانی ہے تاوقتیکہ دلیل سے یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ لغت عرب میں اس لفظ کا اس معنی میں استعمال جائز ہی نہیں اور اگر اتمام حجت کے طور پر اس قسم کے لچر سوال یا دعوے کو قابل جواب، یا لائق رد سمجھا ہی جائے تو سورۂ والنازعات کی یہ آیت کافی ووافی ہے:

﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰىهَا ﴿٢٧﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿٢٨﴾﴾ (النازعات: ۲۷۔۲۸)

"(اے افراد نسل انسانی) خلقت اور پیدائش کے لحاظ سے کیا تم زیادہ بھاری اور بوجھل ہو یا آسمان، جس کو خدا نے بنایا اور اس کے بوجھل جسم کو بلند کیا۔"

اور ایک آسمان پر ہی کیا موقوف ہے یہ ہم سے لاکھوں اور کروڑوں میل دور فضاء میں سورج، چاند اور ستاروں کو خدائے برتر نے جو بلندی اور رفعت عطاء کی ہے کیا یہ سب کے سب مادی اجسام نہیں ہیں؟ اور اگر ہیں اور یقیناً ہیں تو جس خالق ارض وسماوات نے ان مادی اجسام کا رفع کیا ہے، وہ اگر ایک انسانی مخلوق کا رفع آسمانی کر دے تو اس کو قرآن کے اطلاق واستعمال کے خلاف کہنا غباوت اور جہالت نہیں تو اور کیا ہے، البتہ ثبوت درکار ہے تو اس کے لیے قرآن عزیز کی نصوص، صحیح احادیث اور اجماع امت سے زیادہ موثق ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع سماوی اور چند جذباتی باتیں:

مرزائے قادیانی نے اگرچہ اس مسئلہ میں جمہور کے خلاف یہود ونصاریٰ کی پیروی میں تحریف مطالب کی کافی سعی ناکام کی ہے اور مسٹر لاہوری نے بھی تفسیر قرآن میں تحریف معنوی کے ذریعہ اپنے مقتداء کی مدد کی، تاہم دل کا چور ان کو مطمئن نہیں کر سکا اور اس لیے انہوں نے دلائل وبراہین کی جگہ جذبات کو دلیل راہ بنایا اور کبھی تو یہ کہا کہ جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر زندہ تسلیم کرتے ہیں وہ ان کو خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر ہوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر، یہ تو سخت توہین کی بات ہے۔

لیکن علمی حلقوں میں اس لچر اور لوچ جذبہ کی کیا قدر وقیمت ہو سکتی ہے جبکہ ہر ایک مذہبی انسان اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے کہ اگرچہ فرشتے، ہمیشہ بقید حیات ملاء اعلیٰ میں موجود اور سکونت پذیر ہیں تاہم ان سب کے مقابلہ میں بلکہ ان کی جلیل القدر

Marfat.com

ہستیوں مثلاً جبرئیل و میکائیل کے مقابلہ میں بھی ایک مفضول سے مفضول نبی کا رتبہ بہت بلند اور عالی ہے، حالانکہ وہ نبی زمین پر مقیم رہا ہے اور جبرئیل کا قیام ملاء اعلیٰ کے بھی بلند تر مقام پر رہتا ہے چہ جائیکہ خاتم الانبیاء ﷺ کا مرتبہ جلیل کہ جس کی عظمت ...... "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" میں مضمر ہے، علاوہ ازیں نبی اکرم ﷺ نے شب معراج میں "قاب قوسین او ادنیٰ" کا جو تقرب پایا ہے وہ نہ کسی ملک اور فرشتہ کو حاصل ہوا اور نہ کسی نبی اور رسول کو، اس لیے حضرت مسیح علیہ السلام کا رفع آسمانی اس "رفعت" کو پہنچ ہی نہیں سکتا جو اسریٰ میں آپ کو حاصل ہوئی۔ بہرحال فاضل و مفضول کے درمیان فرق مراتب کے لیے تنہا ملاء اعلیٰ کا قیام معیار فضیلت نہیں ہے خصوصاً اس "افضل ہستی" کے مقابلہ میں جس کی فضیلت کا معیار خود اس کا وجود باجود ہو اور جس کی ذات قدسی صفات خود ہی منبع فضائل اور مرجع کمالات ہو ایسی ہستی سے تو "مقام" عزت و مرتبہ پاتا ہے نہ کہ وہ ذات گرامی۔

حسن یوسفؑ، دم عیسیٰؑ، ید بیضاء داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اور کبھی یہ کہا کہ جو شخص عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ تسلیم کرتا ہے وہ "العیاذ باللہ" نبی اکرم ﷺ کی اس لیے توہین کرتا ہے کہ وہ بقید حیات نہیں رہے اور اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھر ذات اقدس پر برتری حاصل ہوگئی۔

یہ مقولہ پہلے سے بھی زیادہ بے کیف اور بے معنی ہے بلکہ سرتاسر غلط بنیاد پر قائم، اس لیے کہ کون اہل عقل اور ذی ہوش کہہ سکتا ہے کہ "زندگی" بھی فاضل و مفضول کے درمیان معیار فضیلت ہے، اس لیے کہ زندگی کی قیمت ذاتی کمالات وفضائل سے ہے نہ اس لیے کہ وہ زندگی ہے، پھر "معیار فضیلت" کی اس بحث سے قطع نظر اس موقع پر نبی اکرم ﷺ کے مسئلہ فضیلت کو درمیان لانا اس لیے بھی قطعاً بے محل ہے کہ جبکہ قرآن عزیز کی نصوص نے تمام کائنات پر آپ ﷺ کی برتری کو ثابت کر دیا اور آپ کی سیرت نے زندہ شہادت بن کر ان نصوص کی تصدیق کر دی تو کسی بھی انسان کی "زندگی" یا "رفع آسمانی" یا اور کوئی "وجہ فضیلت" اس کے مقابلہ میں نہیں لائی جا سکتی، اور ہر ایک حالت و صورت میں "فضل کلی" اسی جامع کمالات ہستی کو حاصل رہے گا۔

وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کی تفسیر:

اس مسئلہ کو ختم کرنے سے پہلے اب ایک بات باقی رہ جاتی ہے کہ سورۂ نساء کی مسطورہ بالا آیت میں ﴿وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ کی کیا تفسیر ہے؟ یعنی وہ کیا اشتباہ تھا جو یہودیوں پر طاری کر دیا گیا تو قرآن عزیز اس کا جواب اس مقام پر بھی اور آل عمران میں بھی ایک ہی دیتا ہے اور وہ "رفع الی السماء" ہے، آل عمران میں اس کو وعدہ کی شکل میں ظاہر کیا ﴿وَرَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ اور نساء میں ایفاء وعدہ کی صورت میں یعنی ﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ﴾ جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ محاصرہ کے وقت جب منکرین حق گرفتاری کے لیے اندر گھسے تو وہاں عیسیٰ علیہ السلام کو نہ پایا، یہ دیکھا تو سخت حیران ہوئے اور کسی طرح اندازہ نہ لگا سکے کہ صورت حال کیا پیش آئی اور اس طرح ﴿وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ کا مصداق بن کر رہ گئے، اس کے بعد قرآن کہتا ہے:

﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝﴾ (النساء: ١٥٧)

اشتباہ کے بعد جو صورت حال پیش آئی اس کا نقشہ بیان کیا گیا ہے اور اس سے دو باتیں بصراحت ظاہر ہوتی ہیں: ایک

Marfat.com

کہ یہود اس سلسلہ میں اس طرح شک میں پڑ گئے تھے کہ گمان اور اٹکل کے ماسوا ان کے پاس علم ویقین کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی اور دوسری بات یہ کہ انہوں نے کسی کو قتل کر کے یہ مشہور کیا کہ انہوں نے "مسیح علیہ السلام" کو قتل کر دیا اور یا پھر آیت زمانہ نبوت محمدی کے یہود کا حال بیان کر رہی ہے۔

پس قرآن عزیز کے ان واضح اعلانات کے بعد جو حضرت مسیح علیہ السلام کی حفاظت وصیانت کے سلسلہ میں کیے گئے ہیں اور جن کو تفصیل کے ساتھ سطور بالا میں بیان کر دیا گیا ہے ان دو باتوں کی جزئی تفصیلات کا تعلق آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اور تاریخی روایات پر رہ جاتا ہے اور اس سلسلہ میں صرف ان ہی روایات وآثار کو قابل تسلیم سمجھا جائے گا جو اپنی صحت روایت کے ساتھ ساتھ ان بنیادی تصریحات سے نہ ٹکراتی ہوں جن کا ذکر متعدد مقامات پر قرآن عزیز نے بصراحت کر دیا ہے اور (القران یفسر بعضہ بعضا) قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی خود ہی تفسیر کر دیتا ہے" کے اصول پر جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دشمن ہاتھ تک نہ لگا سکے اور وہ محفوظ ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھا لیے گئے اور جیسا کہ حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام کی بحث میں ابھی نصوص قرآنی سے ثابت ہوگا کہ وہ وقوع قیامت کے لیے "نشان" ہیں۔ اور اس لیے دوبارہ کائنات ارضی میں واپس آ کر اور مفوضہ خدمت انجام دے کر پھر موت سے دوچار ہوں گے۔

شخص مقتول ومصلوب سے متعلق آثار وتاریخ کی جو ملی جلی روایات ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ "سبت کی شب" میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیت المقدس کے ایک بند مکان میں اپنے حواریوں کے ساتھ موجود تھے کہ بنی اسرائیل کی سازش سے دمشق کے بت پرست بادشاہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے لیے ایک دستہ بھیجا، اس نے آ کر محاصرہ کر لیا۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا۔ جب سپاہی اندر داخل ہوئے تو انہوں نے حواریوں میں ایک ہی شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہم شبیہ پایا۔ اور اس کو گرفتار کر کے لے گئے اور پھر اس کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جس کا ذکر گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔ ان ہی روایات میں بعض اس کا نام یودس بن کریا یوطا بیان کرتے ہیں اور بعض جرجس اور دوسرے داؤد بن لوزا کہتے ہیں۔

پھر ان روایات میں سے بعض میں ہے کہ یہ شخص مقتول اپنی خلقت ہی میں حضرت مسیح علیہ السلام کا مشابہ اور ان کا نقش ثانی تھا، اسرائیلیات انجیلی میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے یہودا اسخر لوطی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا شبیہ تھا اور بعض روایات میں ہے کہ جب یہ نازک گھڑی آ پہنچی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں کو دعوت وتبلیغ حق سے متعلق تلقین وہدایات کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھ کو مطلع کر دیا ہے کہ میں ایک مدت تک کے لیے ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا جاؤں گا اور یہ واقعہ مخالفین اور متبعین دونوں کے لیے سخت آزمائش وامتحان بن جانے والا ہے۔ لہٰذا تم میں سے جو شخص اس پر آمادہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو میرا شبیہ بنا دے اور وہ خدا کی راہ میں جام شہادت پائے اس کو جنت کی بشارت ہے تب ایک حواری نے پہل کی اور خود کو اس کے لیے پیش کیا اور منجانب اللہ وہ حضرت کا ہم شکل ہو گیا اور سپاہیوں نے اس کو گرفتار کر لیا۔ [1]

یہ تفصیلات نہ قرآن میں مذکور ہیں اور نہ احادیث مرفوعہ میں اس لیے وہ صحیح ہوں یا غلط نفس مسئلہ اپنی جگہ اٹل ہے اور قرآن کی آیات میں منصوص، اس لیے اصحاب ذوق کو اختیار ہے کہ وہ صرف قرآن کے اس اجمال پر ہی قناعت کریں کہ حضرت مسیح علیہ السلام

---

[1] واقعات کی یہ تفصیلات تاریخ ابن کثیر ج ۲ اور کتب تفسیر میں منقول ہیں۔

Marfat.com

کا رفع الی السماء اور ہر طرح دشمنوں سے تحفظ نیز یہود پر معاملہ کا مشتبہ ہو کر کسی دوسرے کو قتل کرنا یہود و نصاریٰ کے پاس اس سلسلہ میں علم و یقین سے محروم ہو کر ظن و تخمین اور شک و شبہ میں مبتلا ہو جانا اور قرآن کا حقیقت واقعہ کو علم و یقین کی روشنی میں ظاہر کر دینا یہ سب حقائق ثابتہ ہیں: ﴿وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ اور ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ....الایۃ﴾ کی تفسیر میں ان روایات کی تفصیلات کو بھی قبول کر لیں اور یہ سمجھ کر تسلیم کریں کہ زیر بحث آیات کی تفسیر ان تفصیلات پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ امر زائد ہے جو آیات کی تفسیر صحیح کے لیے موید ہے۔

حیات عیسیٰ علیہ السلام:

سورۂ آل عمران، مائدہ اور نساء کی زیر بحث آیات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق حکمت الٰہی کا یہ فیصلہ صادر ہوا کہ ان کو بقید حیات ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا جائے اور وہ دشمنوں اور کافروں سے محفوظ اٹھا لیے گئے۔ لیکن قرآن نے اس مسئلہ میں صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ حسب موقعہ ان کی حیات امروز پر نصوص قطعیہ کے ذریعہ متعدد جگہ روشنی ڈالی ہے اور ان مقامات میں اس جانب بھی اشارات کیے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات طویل اور رفع الی السماء میں کیا حکمت مستور تھی تاکہ اہل حق کے قلوب تازگی ایمان سے شگفتہ ہو جائیں اور باطل کوش اپنی کور باطنی پر شرمائیں۔

لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ:

﴿وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴾ (النساء: ۱۵۹)

"اور کوئی اہل کتاب میں سے باقی نہ رہے گا مگر یہ کہ وہ ضرور ایمان لائے گا عیسیٰ (علیہ السلام) پر اس (عیسیٰ علیہ السلام) کی موت سے پہلے اور وہ (عیسیٰ علیہ السلام) قیامت کے دن ان پر (اہل کتاب پر) گواہ بنے گا۔"

اس آیت سے قبل آیات میں وہی مسطورۂ بالا واقعہ مذکور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ صلیب پر چڑھایا گیا اور نہ قتل کیا گیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب اٹھا لیا، یہ یہود و نصاریٰ کے اس عقیدہ کی تردید ہے جو انہوں نے اپنے باطل زعم اور اٹکل سے قائم کر لیا تھا، ان سے کہا جا رہا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق صلیب پر چڑھائے جانے اور قتل کیے جانے کا دعویٰ قابل لعنت ہے کیونکہ بہتان اور لعنت توام ہیں، اس کے بعد اس آیت میں امر اول کی تصدیق میں اس جانب توجہ دلائی جا رہی ہے کہ آج اگر اس ملعون عقیدہ پر فخر کر رہے ہو تو وہ وقت بھی آنے والا ہے جب عیسیٰ بن مریم علیہما السلام خدائے برتر کی حکمت و مصلحت کو پورا کرنے کے لیے کائنات ارضی پر واپس تشریف لائیں گے اور اس عینی مشاہدہ کے وقت اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) میں سے ہر ایک موجود ہستی کو قرآن کے فیصلہ کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہے گا اور پھر جب وہ اپنی مدت حیات ختم کر کے موت کی آغوش سے دوچار ہو جائیں گے تو قیامت کے دن اپنی امت (اہل کتاب) پر اسی طرح گواہ ہوں گے جس طرح تمام انبیاء و مرسلین اپنی اپنی امتوں پر شاہد بنیں گے۔

یہ حقیقت کچھ مخفی نہیں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اگرچہ یہود و نصاریٰ دونوں واقعہ صلیب و قتل پر متفق ہیں لیکن اس سلسلہ

Marfat.com

میں دونوں کے عقائد کی بنیاد قطعاً متضاد اصول پر قائم ہے، یہود، حضرت مسیح علیہ السلام کو مفتری اور کاذب کہتے اور دجال [1] سمجھتے ہیں اور اس لیے فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے یسوع مسیح علیہ السلام کو صلیب پر بھی چڑھایا اور پھر اس حالت میں مار بھی ڈالا۔ اس کے برعکس نصاریٰ کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کا پہلا انسان آدم علیہ السلام گنہگار تھا اور ساری دنیا گنہگار تھی اس لیے خدا کی صفت "رحمت" نے ارادہ کیا کہ دنیا کو گناہوں سے نجات دلائے اس لیے اس کی صفت "رحمت" نے ابنیت (بیٹا ہونا) کی شکل اختیار کی اور اس کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ یہود کے ہاتھوں سولی پر چڑھے اور مارا جائے اور اس طرح ساری کائنات ماضی و مستقبل کے گناہوں کا "کفارہ" بن کر دنیا کی نجات کا باعث بنے۔

سورۂ نساء کی آیات میں قرآن عزیز نے صاف صاف کہہ دیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کے دعویٰ کی بنیاد کسی بھی عقیدہ پر بنی ہو لائق لعنت اور باعث ذلت و خسران ہے۔ خدا کے سچے پیغمبر کو مفتری سمجھ کر یہ عقیدہ رکھنا بھی لعنت کا موجب اور خدا کے بندے اور مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا انسان کو خدا کا بیٹا بنا کر اور "کفارہ" کا باطل عقیدہ تراش کر مسیح علیہ السلام کو مصلوب و مقتول تسلیم کرنا بھی گمراہی اور علم و حقیقت کے خلاف اٹکل کا تیر ہے اور اس سلسلہ میں صحیح اور مبنی برحقیقت فیصلہ وہی ہے جو قرآن نے کیا ہے اور جس کی بنیاد "علم و یقین اور وحی الٰہی" پر قائم ہے۔

پس آج جبکہ تمہارے سامنے اس اختلاف کے فیصلہ کے لیے جو شک و ظن کی شکستہ بنیادوں پر قائم تھا علم و یقین کی روشنی آ چکی ہے پھر بھی تم اپنے ظنون کاسدہ اور اوہام فاسدہ پر اصرار کر رہے ہو اور حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق باطل عقیدہ کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہو تو قرآن کا ایک دوسرا فیصلہ اور وحی الٰہی کا یہ اعلان بھی سن لو کہ تمہاری نسلوں پر وہ وقت بھی آنے والا ہے جب قرآن کے اس صحیح فیصلہ اور اعلانِ حق کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام ملاء اعلیٰ سے کائنات ارضی کو واپس ہوں گے اور ان کی یہ آمد ایسی مشاہد ہوگی کہ یہود و نصاریٰ میں سے ایک فرد بھی ایسا نہ رہے گا جو بادل خواستہ یا بادل ناخواستہ اس ذات گرامی پر یہ ایمان نہ لے آئے کہ بلاشبہ وہ خدا کے سچے رسول ہیں، خدا کے بیٹے نہیں برگزیدہ انسان ہیں، مصلوب و مقتول نہیں ہوئے تھے، بقید حیات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں:

﴿وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ سورۂ آل عمران اور سورۂ مائدہ کی طرح اس جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے لفظ "توفی" نہیں بولا گیا بلکہ بصراحت لفظ "موت" استعمال کیا گیا ہے، یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ ان دونوں مقامات پر جس حقیقت کا اظہار مقصود ہے اس کے لیے "توفی" ہی مناسب ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران سے متعلق آیات کی تشریح و تفسیر میں گزر چکا اور سورۂ مائدہ سے متعلق آیت کی تفسیر میں عنقریب بیان ہوگا اور اس جگہ چونکہ براہ راست "موت" ہی کا تذکرہ مطلوب ہے اور اس حالت کا ذکر ہے جس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام بھی ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ کا مصداق بننے والے ہیں اس لیے یہاں "موت" کو بصراحت لانا ہی از بس ضروری تھا اور یہ مزید برہان ہے اس دعویٰ کے لیے کہ آل عمران اور مائدہ میں لفظ "موت" کی جگہ "توفی" کا اطلاق بلاشبہ

[1] دجال دجل سے ماخوذ ہے جس کے معنی "فریب" ہیں۔

خاص مقصد رکھتا ہے ورنہ جس طرح ان دونوں مقامات پر "توفی" کا اطلاق کیا گیا تھا اسی طرح یہاں بھی کیا جاتا، یا جس طرح اس جگہ لفظ "موت" کا اطلاق کیا گیا ہے اسی طرح ان دونوں مقامات پر بھی لفظ موت ہی کا استعمال ہونا چاہیے تھا مگر قرآن عزیز کے ان دقیق اسالیب بیان کے فرق کا فہم طالبین حق کا ہی حصہ ہے نہ کہ مرزائے قادیانی اور مسٹر لاہوری جیسے اصحاب زیغ کا جو اپنی خاص اغراض ذاتی کے پیش نظر پہلے ایک نظریہ ایجاد کر لیتے ہیں اور بعد ازاں اس سلسلہ کی تمام آیات قرآنی کو اسی کے سانچہ میں ڈھال کر اس کا نام "تفسیر قرآن" رکھتے ہیں۔

بہر حال جمہور کے نزدیک آیت زیر عنوان کی تفسیر یہی ہے جو سپرد قلم کی جا چکی، مشہور محدث، جلیل القدر مفسر اور اسلامی مؤرخ عماد الدین بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس تفسیر کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بسند صحیح نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

قتادہ، عبدالرحمن اور بہت سے مفسروں کا یہی قول ہے اور یہی قول حق ہے جیسا کہ عنقریب ہم دلیل قاطع سے اس کو ثابت کریں گے۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) [1]

اور سرتاج محدثین ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اسی تفسیر پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یقین کیا ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس تفسیر کو ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے روایت سعید بن جبیر اور ابو رجاء نے بھی حسن رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ﴿قَبْلَ مَوْتِهِ﴾ یعنی قبل موت عیسیٰ علیہ السلام قسم بخدا بیشک وشبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بقید حیات ہیں اور جب وہ آسمان سے اتریں گے تو سب اہل کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی تفسیر کو اکثر اہل علم سے نقل کیا ہے اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔" [2]

مگر اس صحیح تفسیر کے علاوہ کتب تفسیر میں احتمال عقلی کے طور پر دو قول اور بھی منقول ہیں مگر وہ دونوں بلحاظ سند ضعیف اور ناقابل اعتماد اور بلحاظ سیاق وسباق (یعنی آیت زیر بحث سے قبل اور بعد کی آیات کے لحاظ سے) غلط اور ناقابل التفات ہیں یعنی ایسے احتمالات عقلی جو نقل اور آیات کے باہمی نظم وترتیب کے خلاف ہیں۔

ان ہر دو معنی میں سے ایک معنی یہ ہیں کہ "موتہ" میں جو ضمیر ہے اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بجائے اہل کتاب کی جانب لوٹایا جائے اور آیت کا ترجمہ یوں کیا جائے "اور اہل کتاب میں سے کوئی فرد ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لے آتا ہو" یعنی اگرچہ یہود ونصاریٰ اپنی زندگی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق قرآن کے بتائے ہوئے عقیدے پر ایمان نہیں لاتے اور اپنے اپنے عقیدہ پر قائم رہتے ہیں لیکن جب ان کو "موت" آ دباتی ہے تو وہ اس آخری حالت میں "جو نزع کا وقت کہلاتا ہے" صحیح عقیدہ کے مطابق ایمان لے آتے ہیں اور اہل کتاب کے ہر ایک فرد پر بلا استثناء یہی حالت گزرتی ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ "اہل کتاب کا ہر ایک فرد اپنی موت سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتا ہے" یعنی جب وہ عالم دنیا سے منقطع ہو کر عالم غیب سے وابستہ ہو رہا ہوتا ہے اس وقت اس پر اصل حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیشک خدا کے سچے پیغمبر تھے۔

---

[1] ابن کثیر ج ۱ [2] فتح الباری شرح بخاری ج ٦ ص ۳۰۴

Marfat.com

پس اس بات سے قطع نظر کہ یہ دونوں تفسیریں نقل روایت کے اعتبار سے نا قابل اعتماد اور غیر صحیح اور آیات کے سیاق و سباق کے خلاف ہیں عقلی نقطہ نظر سے بھی غلط ہیں اس لیے کہ اگر آیت کے معنی یہ ہیں جو سطور بالا میں نقل کیے گئے تب یہ آیت اپنے مقصد بیان کے خلاف بے معنی اور بے نتیجہ ہو جاتی ہے (العیاذ باللہ) کیونکہ قرآن عزیز دوسرے مقامات پر صاف کہہ چکا ہے کہ جب انسان عالم دنیا سے کٹ کر عالم غیب سے وابستہ ہو جاتا ہے اور نزع کی یہ کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے کہ جو معاملات اس ساعت سے قبل تک اس کے لیے غیب کے معاملات تھے وہ مشاہدہ میں آنے شروع ہو جاتے ہیں تو اس وقت اس کے اعمال و کردار کا صحیفہ لپیٹ دیا جاتا ہے اور اب تبدیلی اعتقاد کا کوئی نتیجہ اور ثمرہ نہیں ملتا یعنی اس وقت کا نہ اقرار و اعتراف معتبر اور نہ انکار مستند۔

﴿فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ فَرِحُوۡا بِمَا عِنۡدَهُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ وَ حَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝ فَلَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗ وَ كَفَرۡنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشۡرِكِيۡنَ ۝ فَلَمۡ يَكُ يَنۡفَعُهُمۡ اِيۡمَانُهُمۡ لَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ قَدۡ خَلَتۡ فِىۡ عِبَادِهٖ ۚ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الۡكٰفِرُوۡنَ ۝﴾ (الزمر: ۸۳-۸۵)

"پس جب آئے ان کے پاس پیغمبر واضح دلائل لے کر تو اس چیز سے خوش ہوئے جو ان کے پاس علم سے تھی اور گھیر لیا ان کو اس چیز نے جس کی وہ مذاق بناتے تھے پس جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو انہوں نے کہا ہم خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور جن چیزوں کو ہم اس کا شریک بناتے تھے اس سے منکر ہوئے، پس نہیں نافع ہوا ان کا (یہ) ایمان جب انہوں نے ہمارے عذاب کا مشاہدہ کر لیا یہ اللہ کی سنت ہے جو اس کے بندوں میں ہمیشہ جاری رہی اور اس موقع پر کافروں نے زیاں پایا۔"

﴿وَ لَيۡسَتِ التَّوۡبَةُ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّىۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ وَ لَا الَّذِيۡنَ يَمُوۡتُوۡنَ وَهُمۡ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓـئِكَ اَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ۝﴾ (النساء: ۱۸)

"لیکن ان لوگوں کی توبہ، توبہ نہیں ہے جو (ساری عمر تو) برائیاں کرتے رہے لیکن جب ان میں سے کسی کے آگے موت آ کھڑی ہوئی تو کہنے لگا اب میں توبہ کرتا ہوں، (ظاہر ہے کہ ایسی توبہ سچی توبہ نہیں ہوتی) اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی توبہ نہیں ہے جو دنیا سے کفر کی حالت میں جاتے ہیں ان تمام لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

تو ایسی صورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا معنی رکھتا ہے؟ انسان جب اس حالت پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے سامنے سے غیب کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور برزخ، ملائکۃ اللہ، عذاب یا راحت، جنت و جہنم، غرض دین حق کی تعلیم کردہ غیب کی ساری حقیقتیں اس پر منکشف ہو جاتی ہیں اور اس میں یہود و نصاریٰ کی ہی خصوصیت کیا ہے یہ حالت تو ہر ایک ابن آدم پر گزرنے والی ہے نیز جب اس قسم کا ایمان قابل قبول ہی نہیں ہے تو اس کا ذکر اسی اسلوب کے ساتھ ہونا چاہیے تھا جو غرق فرعون کے وقت فرعون کے ایمانی اعتراف و اقرار کے لیے اختیار کیا گیا اور جس میں اس وقت کی ایمانی پکار کی بے وقتی ظاہر کی گئی ہے نہ کہ

Marfat.com

ایسے اسلوب بیان کے ساتھ گویا مستقبل میں ہونے والے کسی ایسے عظیم الشان واقعہ کی خبر دی جا رہی ہے جو مخاطبین (یہود و نصاریٰ) کے عقائد و عزائم کے خلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق قرآن کی تصدیق اور اس کے اٹل فیصلہ کی زندہ شہادت بن کر پیش آنے والا ہے ورنہ تو ایک عیسائی اور یہودی پنجۂ موت میں آ جانے کے وقت جان عزیز سپرد کر دینے سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا تب کیا اور نہ لایا تب کیا، اس کی یہ تصدیق کائنات انسانی کے علم و ادراک سے باہر صرف اس کے اور خدا کے درمیان تعلق رکھتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی بات کا ایسے موقع پر تذکرہ کرنا قطعاً بے محل ہے جہاں ایک قوم کو اس کے ایک خاص عقیدہ پر ملزم و مجرم بنانے کے لیے فیصلہ حق کی تائید کے لیے ماضی اور مستقبل میں کائنات ارضی پر پیش آنے والے واقعات کو پیش کیا جا رہا ہے جیسا کہ آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہو رہا ہے علاوہ ازیں ان احتمالات کی یہاں اس لیے بھی گنجائش نہیں ہے کہ غرغرہ کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا محمد ﷺ پر اس قسم کا ایمان تو ہر اس اہل کتاب سے متعلق ہے جو اس آیت کے نزول سے کچھ دن قبل یا صدیوں قبل گزر چکے اور مر کھپ چکے ہیں۔ لہٰذا اگر آیت میں یہ مضمون بیان کرنا مقصود تھا تو اس کے لیے مؤکد مستقبل کی یہ تعبیر ﴿لَيُؤْمِنَنَّ﴾ فصاحت و بلاغت کلام کے بالکل خلاف ہے اس کے لیے تو ایسی تعبیر کی ضرورت تھی جو ماضی، حال اور استقبال تینوں زمانوں پر حاوی ہوتی تا کہ قرآن کا مفہوم اپنے توسع کے لحاظ سے پوری طرح ادا ہوتا۔

نیز دوسرے معنی تو اس لیے بھی قطعاً غلط اور بے محل ہیں کہ اس آیت سے قبل اور بعد کی آیات ہیں یعنی سیاق و سباق میں خاتم الانبیاء محمد ﷺ کا ذکر ہی نہیں ہے کیونکہ شروع آیات میں صرف حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے اور اس آیت کے آخر میں یہ ارشاد ہوا ہے: ﴿وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا﴾ اور واضح ہے یہ بات کہ اس جگہ شاہد سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں اور ﴿عَلَيْهِمْ﴾ کی ضمیر سے ان کی امت تو پھر نبی اکرم ﷺ کا ذکر کیے بغیر درمیان کی کسی ضمیر کا مرجع ذات اقدس کو قرار دینا نہ صرف یہ کہ فصاحت و بلاغت کے منافی ہے بلکہ قاعدۂ عربیت کے قطعاً خلاف اور انتشار ضمائر کا موجب ہے۔

غرض بے غل و غش صحیح معنی وہی ہیں جو جمہور نے اختیار کیے ہیں اور یہ دونوں خود ساختہ احتمالات آیت کی تفسیر تو کیا صحیح احتمال کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہیں۔ [1]

حیاۃ و نزول عیسیٰ علیہ السلام اور احادیث صحیحہ:

قرآن عزیز نے جس معجزانہ اختصار کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی، حیات امروز اور علامت قیامت بن کر نزول من السماء کے متعلق تصریحات کی ہیں صحیح ذخیرہ احادیث نبوی میں ان آیات ہی کی تفصیلات بیان کر کے ان حقائق کو روشن کیا گیا ہے۔ چنانچہ امام حدیث بخاری اور مسلم نے صحیحین (صحیح بخاری، صحیح مسلم) میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت متعدد طریقہ ہائے

[1] اس مقام کے علاوہ سورۂ زخرف کی آیت ﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ اور سورۂ آل عمران کی ابتداء سے بیاسی آیات تک جو وفد نجران سے تعلق رکھتی ہیں یہ سب مقامات و دلالۃ النص یا اشارۃ النص کی شکل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے لئے دلیل و برہان ہیں اور اگر چہ ان کی تفصیلات اور وجوہ استشہاد میرے پاس مدون و مرتب ہیں تاہم کتاب کی طوالت کے خوف سے اس جگہ ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے بقوت فرصت انشاء اللہ مستقل مضمون کی صورت میں ہدیہ ناظرین ہوگا، اور یا پھر حجۃ الاسلام علامہ محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہ کی کتاب "عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام" اس مقصد کے لئے قابل مراجعت ہے۔

Marfat.com

سند سے نقل کی ہے:

قال رسول اللہ ﷺ والذی نفسی بیدہ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکما عدلاً فیکسر الصلیب و یقتل الخنزیر و یضع الجزیۃ و یفیض المال حتی لا یقبلہ احد و حتی تکون السجدۃ الواحدۃ خیرا لہ من الدنیا و ما فیہا ثم قال ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ اقرؤا ان شئتم ﴿وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا﴾ ❶

"رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے ضرور وہ وقت آنے والا ہے کہ تم میں عیسیٰ بن مریم حاکم عادل بن کر اتریں گے، وہ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے (یعنی موجودہ عیسائیت کو مٹائیں گے) اور جزیہ اٹھا دیں گے (یعنی نشان الٰہی کے مشاہدہ کے بعد اسلام کے سوا کچھ بھی قبول نہیں ہوگا اور اسلامی احکام میں بارشاد رسول اللہ ﷺ جزیہ کا حکم اسی وقت تک کے لیے ہے) اور مال کی اس درجہ کثرت ہوگی کہ کوئی اس کو قبول کرنے والا نہیں ملے گا اور خدا کے سامنے ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمت رکھے گا (یعنی مالی کثرت کی وجہ سے خیرات و صدقات کے مقابلہ میں عبادت نافلہ کی اہمیت بڑھ جائے گی) پھر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تم (قرآن سے اس کا استشہاد) چاہو تو یہ آیت پڑھو ﴿وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ.....الایۃ﴾ اور کوئی اہل کتاب میں سے نہ ہوگا مگر (عیسیٰ علیہ السلام کی) موت سے پہلے اس پر (عیسیٰ پر) ضرور ایمان لے آئے گا اور وہ (عیسیٰ علیہ السلام) قیامت کے دن ان پر گواہ ہوگا۔"

❷ بخاری اور مسلم میں بسند نافع مولیٰ ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی منقول ہے:

قال رسول اللہ ﷺ کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم و امامکم منکم۔ ❷

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم میں ابن مریم اتریں گے اور اس حالت میں اتریں گے کہ تم ہی میں سے ایک شخص تمہاری امامت کر رہا ہوگا۔"

ان دونوں روایات کے علاوہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے متعدد طریقہ ہائے سند سے اور روایات بھی صحیحین: مسند احمد اور سنن ❸ میں درج ہیں جو یہی مفہوم و معنی ادا کرتی ہیں، ان میں سے ایک زیادہ مفصل ہے اور مسئلہ زیر بحث کے بعض دوسرے پہلوؤں کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ مسند احمد میں ہے:

❸ ان النبی ﷺ قال الانبیاء اخوۃ لعلات امھاتھم شتّی و دینھم واحد و انّی اولی النّاس بعیسی بن مریم لانہ لم یکن نبی بینی و بینہ و انہ نازل فاذا رائیتموہ فاعرفوہ رجلٌ مربوعُ الی الحمرۃ والبیاضِ علیہ ثوبان ممصّران کان رأسہ یقطر ان لم یصبہ بلل فیدق الصلیب و یقتل الخنزیر و یضع الجزیۃ و یدعوالناسَ الی الاسلام و یھلک اللہ فی زمانہ المسیح الدّجال ثم تقع الامانۃ علی الارض حتّی ترتع الاسود مع الابل والنمار مع البقر والذئاب مع الغنم و یلعب الصبیان بالحیات لا تضرھم فیمکث اربعین سنۃ ثم یتوفّی و یصلی علیہ المسلمون

---

❶ کتاب الانبیاء ❷ ایضاً ❸ ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ

Marfat.com

"نبی ﷺ نے فرمایا: "تمام انبیاء اصول دین میں علاتی بھائیوں کی طرح ہیں، دین سب کا ایک اور فروع دین مختلف اور میں دوسرے انبیاء کے مقابلہ میں عیسیٰ بن مریم علیہ السلام سے زیادہ قریب ہوں اس لیے کہ ان کے اور میرے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا اور بلاشبہ وہ کائنات ارضی پر اتریں گے، پس جب تم ان کو دیکھو تو اس حلیہ سے پہچان لینا: میانہ قد، سرخ و سفید رنگ ہوگا ان کے جسم پر دو سرخی مائل رنگ کی چادریں ہوں گی ایسا معلوم ہوگا گویا فی الحال غسل کر کے آ رہے ہیں اور سر سے پانی کے قطرے موتی کی طرح ٹپک پڑنے والے ہیں۔ وہ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے (موجودہ عیسائیت کا خاتمہ کر دیں گے) اور جزیہ اٹھا دیں گے اور لوگوں کو "اسلام" کی دعوت دیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے زمانہ میں تمام ادیان و ملل کو مٹا دے گا اور صرف ایک ہی دین "دین اسلام" باقی رہ جائے گا اور اللہ تعالیٰ ان ہی کے زمانہ میں مسیح دجال کو ہلاک کرے گا پھر کائنات میں "امانت" (امر خیر) جگہ کر لے گی حتیٰ کہ شیر اونٹوں کے ساتھ، چیتے گائے بیلوں کے ساتھ، بھیڑیے بکریوں کے ساتھ چرتے نظر آئیں گے اور بچے سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے، اور ان کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا، پس عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال اس زمین پر زندہ رہیں گے پھر وفات پا جائیں گے اور مسلمان ان کے جنازہ کی نماز ادا کریں گے۔"

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث روایت کی گئی اس میں خروج دجال کا ذکر کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد مبارک مذکور ہے:

④ فاذا جاؤا الشام خرج فبیناهم یعدّون القتال یسوّون الصفوف اذا قیمت الصلوٰة فینزل عیسٰی بن مریم... الخ

"پس جب مسلمان ملک شام پہنچیں گے تو دجال کا خروج ہوگا ابھی مسلمان اس کے مقابلہ میں جنگ کی تیاریاں کر رہے ہوں گے۔ صفیں درست کرتے ہوں گے کہ نماز کے لیے اقامت ہونے لگے گی۔ اس درمیان میں عیسیٰ علیہ السلام بن مریم کا نزول ہوگا اور وہ مسلمانوں کی امامت کا فرض انجام دیں گے۔"

اور صحیح مسلم میں حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت منقول ہے جس میں یہ مذکور ہے:

اذا بعث اللہ المسیح بن مریم (علیہ السلام) فینزل عند المنارة البیضاء شرقی دمشق بین مهرودتین واضعًا کفیه علی اجنحة ملکین اذا طأطأ رأسه قطر و اذا رفعه تحدّر منه جمانٌ کاللؤلؤ..... الخ

"ابھی دجال ایک مسلمان پر اپنے شیطانی کرشموں کی آزمائش کر ہی رہا ہوگا) کہ اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم علیہ السلام کو بھیج دے گا وہ جب کائنات ارضی پر اتریں گے تو مسجد دمشق کے مشرقی جانب کے سفید منارہ پر اتریں گے اور ان کے بدن پر (سرخی مائل) گہری زرد رنگ کی دو چادریں ہوں گی (یعنی ایک بدن کے اوپر کے حصہ پر اور دوسری زیریں حصہ بدن پر لپٹی ہوگی) اور دو فرشتوں کے بازوؤں پر سہارا لیے ہوں گے۔ جب سر جھکائیں گے تو سر سے پانی ٹپک پڑنے لگے گا اور جب سر اٹھائیں گے تو پانی کے قطرے موتیوں کی طرح ٹپکیں گے (یعنی غسل کیے آ رہے ہوں گے)۔"

اور مختلف طریقہ ہائے سند سے امام احمد نے مسند میں اور ترمذی رحمہ اللہ نے سنن میں حضرت مجمع بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح یہ روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

Marfat.com

یقتل ابن مریم الدّجال بباب لُدّ. ❶

"ابن مریم، دجال کو باب لد پر قتل کریں گے۔"

امام ترمذی اس روایت کو نقل کر کے فرماتے ہیں "ھذا حدیث صحیح" اور اس کے بعد ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی فہرست شمار کراتے ہیں جن سے نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اور ان کے ہاتھوں قتل دجال سے متعلق روایات کتب حدیث میں منقول ہیں فرماتے ہیں:

اور اس باب میں حضرت عمران بن حصین، نافع بن عیینہ، ابو برزہ اسلمی، حذیفہ بن اسید، ابو ہریرہ، کیسان، عثمان بن العاص، جابر بن عبداللہ، ابوامامہ باہلی، ابن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن العاص، سمرۃ بن جندب، نواس بن سمعان، عمرو بن عوف، حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہم سے بھی روایات منقول ہیں۔ ❷

امام احمد رحمہ اللہ نے مسند میں امام مسلم رحمہ اللہ نے صحیح میں اور اصحاب سنن نے سنن میں، بروایت حضرت حذیفہ بن الاسیدی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے:

قال اشرف علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من غرفة و نحن نتذکر الساعة فقال: لا تقوم الساعة حتی تروا عشر ایات، طلوع الشمس من مغربها والدخان والدابة، و خروج یاجوج و ماجوج و نزول عیسٰی بن مریم و الدجال و ثلثة خسوف خسف بالمشرق و خسف بالمغرب و خسف بجزیرة العرب و نار تخرج من قعر عدن تسوق و تحشر الناس تبیت معهم حیث باتوا و تقیل معهم حیث قالوا. ❸

"حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم (صحابہ) ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے قیامت کے متعلق بات چیت کر رہے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالا خانہ سے جھانکا اور ارشاد فرمایا: "قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تم دس نشان نہ دیکھ لو گے۔ آفتاب کا مغرب سے طلوع، دخان (دھواں) دابۃ الارض، خروج یاجوج و ماجوج، عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا نزول، دجال کا خروج، تین مقامات میں خسوف کا پیش آنا (زمین میں دھنس جانا) مشرق میں مغرب میں اور جزیرۃ العرب میں، آگ کا قعر عدن سے نکلنا جو لوگوں کو سمیٹ لے جائے گی اور جب رات کو لوگ آرام کریں گے تو وہ بھی ٹھہر جائے گی اور جب دوپہر کو قیلولہ کریں گے تب بھی وہ ٹھہری رہے گی۔"

اور محدث ابن ابی حاتم نے اور جلیل القدر محدث و مفسر ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے بروایت حسن بصری رحمہ اللہ بسند صحیح حیات و نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام سے متعلق ایک روایت نقل کی ہے اس میں ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الیهود ان عیسٰی لم یمت و انه راجعٌ الیکم قبل یوم القیٰمة.

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے فرمایا: "عیسیٰ علیہ السلام مرے نہیں اور بلاشبہ وہ قیامت سے پہلے تمہاری جانب لوٹ کر آئیں گے۔"

اسی طرح ابن ابی حاتم اور ابن جریر رحمہما اللہ نے سورۂ نساء کی آیات متعلقہ وفد نجران کی تفسیر کرتے ہوئے اصول حدیث کے

---

❶ لد دمشق کی شہر پناہ کا ایک دروازہ ہے۔ ❷ ترمذی باب نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام

❸ حدیث میں جن علامات کا ذکر ہے وہ سب تشریح طلب ہیں مگر یہاں ان کی تشریحات بے محل ہیں اس لئے نظر انداز کر دی گئیں، عام تشریحات کتب تفسیر و حدیث میں اور شاہ رفیع الدین دہلوی نور اللہ مرقدہ کے رسالہ علامات قیامت میں قابل مطالعہ ہیں۔

Marfat.com

نقطہ نظر سے بہ سند حسن ایک طویل روایت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے اس میں بھی بصراحت یہ مذکور ہے: ❶

فقال لهم النبی صلی اللہ علیہ وسلم الستم تعلمون ان ربنا حیٌّ لا یموت و ان عیسیٰ یأتی علیه الفناء.

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد سے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ بلاشبہ ہمارا پروردگار زندہ ہے جس کے لیے موت نہیں ہے اور بلاشبہ عیسیٰ علیہ السلام کو فنا (موت) سے دو چار ہونا ہوگا۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ لفظ "یأتی" فرمایا ہے جو مستقبل کے لیے بولا جاتا ہے لفظ "اتی" نہیں فرمایا جو ماضی کے لیے مخصوص ہے۔

اور بیہقی نے کتاب الاسماء والصافات میں اور محدث علی متقی گجراتی نے کنز العمال میں باسناد حسن و صحیح اس سلسلہ میں جو روایات نقل فرمائی ہیں ان میں نزول عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ "من السماء" کا لفظ صراحت سے موجود ہے۔ ❷

یہ اور اسی قسم کا کثیر ذخیرۂ حدیث ہے جو حیات و نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام پیغمبر بنی اسرائیل (علیہ السلام) سے متعلق کتب حدیث و تفسیر میں منقول ہے اور جو قوت سند کے لحاظ سے صحیح اور حسن سے کم رتبہ نہیں رکھتا اور باعتبار شہرت و تواتر روایات جن کا یہ حال ہے کہ حسب تصریح امام ترمذی، حافظ حدیث عماد الدین بن کثیر، حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی اور دیگر آئمہ حدیث سولہ جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کو روایت کیا ہے جن میں سے بعض صحابہ کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تصریحات سینکڑوں صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجمع میں خطبہ دے کر فرمائیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بغیر کسی انکار و اجنبیت کے ان روایات کو خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور خلافت میں علیٰ رؤس الاشہاد سناتے تھے۔ چنانچہ ان جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم سے جن ہزار ہا شاگردوں نے سنا ان میں سے یہ عظیم المرتبہ ہستیاں قابل ذکر ہیں جن میں ہر فرد روایت حدیث میں ضبط و حفظ، ثقاہت و علمی تبحر کے پیش نظر امامت و قیادت کا درجہ رکھتا ہے: مثلاً سعید بن المسیب، نافع مولیٰ ابو قتادہ، حنظلہ بن علی الاسلمی، عبدالرحمٰن بن آدم، ابو سلمہ، ابو عمرہ، عطاء بن بشار، ابو سہیل، موثر بن غفارہ، یحییٰ بن ابی عمرو، جبیر بن نفیر، عروہ بن مسعود ثقفی، عبداللہ بن زید انصاری، ابو زرعہ، یعقوب بن عامر، ابو نصرہ ابو الطفیل رحمہم اللہ۔

پھر ان علماء کبار اور محدثین اعلام سے جن بے شمار تلامذہ نے سنا ان میں سے راویان حدیث کے طبقہ میں جن کو حدیث اور علوم قرآن کا رتبہ بلند حاصل ہے اور جو اپنے اپنے وقت کے "امام الحدیث" اور "امیر المومنین فی الحدیث" تسلیم کیے گئے ہیں، بعض کے اسماء گرامی یہ ہیں: ابن شہاب زہری، سفیان بن عیینہ، لیث، ابن ابی ذئب، اوزاعی، قتادہ، عبدالرحمٰن بن ابی عمرہ، سہیل، جبلہ بن سہیم، علی بن زید، ابو رافع، عبدالرحمٰن بن جبیر، نعمان بن سالم، معمر، عبداللہ بن عبیداللہ رحمہم اللہ۔

غرض ان روایات و احادیث صحیحہ کا صحابہ، تابعین، تبع تابعین یعنی خیر القرون کے طبقات میں اس درجہ شیوع ہو چکا تھا اور وہ بغیر کسی انکار کے اس درجہ لائق قبول ہو چکی تھیں کہ آئمہ حدیث کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات و نزول سے متعلق ان احادیث کو مفہوم و معنی کے لحاظ سے درجۂ "تواتر" حاصل تھا اور اسی لیے وہ بے جھجک اس مسئلہ کو "احادیث متواترہ" سے ثابت اور مسلم کہتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ روایت حدیث کے تمام طبقات و درجات میں ان روایات کو "تلقی بالقبول" کا یہ درجہ حاصل رہا ہے کہ ہر دور میں اس کے رواۃ میں "ائمہ حدیث" اور روایت حدیث کے "مدار" نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان مرفوع و موقوف ب

❶ تفسیر ابن جریر ج ۵ ❷ کتاب الاسماء والصفات صفحہ ۳۰۱ و کنز العمال ج ۷ ص ۲۶۸

صحابہ رضی اللہ عنہم احادیث اور روایات کے ناقلین میں امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ جیسے اصحاب صحیح و سنن، ائمہ حدیث کے اسماء گرامی شامل ہیں اور وہ باتفاق ان روایات کی صحت وحسن کے قائل ہیں، چنانچہ یہ اور اسی قسم کی احادیث صحیحہ کا ذکر کرتے ہوئے مشہور محدث و مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں اول یہ عنوان قائم کرتے ہیں:

ذکر الاحادیث الواردة فی نزول عیسٰی بن مریم (علیهما الصلٰوة والسلام) الی الارض من السماء فی اخر الزمان قبل یوم القیٰمة.

"ان احادیث کا ذکر جو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے آسمان سے زمین پر اترنے کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ [1]

اور اس کے بعد سلسلہ کی احادیث کو نقل کرنے کے بعد آخر میں یہ تحریر فرماتے ہیں:

فهذه احادیث متواترة عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم من روایة ابی هریرة و ابن مسعود و عثمان بن العاص و ابی امامة والنواس بن سمعان و عبدالله بن عمرو بن العاص و مجمع بن حارثة و ابی شریحة و حذیفة بن اسید رضی الله عنهم و فیها دلالة علی صفة نزوله و مکانه .... الخ [2]

"پس یہ ہیں وہ احادیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے درجہ تک منقول ہوئی ہیں اور یہ نقل روایت (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ) ابوہریرہ، ابن مسعود، عثمان بن العاص، ابوامامہ، نواس بن سمعان، عبداللہ بن عمرو بن العاص، مجمع بن حارثہ، ابی شریحہ، حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے اور ان روایات میں عیسیٰ بن مریم کے طریقہ نزول اور مکان نزول سے متعلق بھی رہنمائی موجود ہے۔"

اور حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی (نور اللہ مرقدہٗ) علامہ ابوالحسین آبری رحمۃ اللہ علیہ سے نزول عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق احادیث کے تواتر کو فتح الباری میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کرتے ہیں:

"ابوالحسن خسعی ابری سے منقول ہے کہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس بارہ میں تواتر کو پہنچ چکی ہیں کہ مہدی اسی امت میں سے ہوں گے اور عیسیٰ علیہ السلام ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔"

اور تلخیص الجبیر کتاب الطلاق کے ضمن میں یہ تحریر فرماتے ہیں:

قال ابوالحسن الخسعی الابری بان المهدی من هذه الامة و ان عیسٰی یصلّی خلفه.... الخ

"لیکن رفع عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ تو تمام علماء حدیث و تفسیر کا اس پر اجماع ہے کہ وہ اپنے جسد عنصری کے ساتھ ہنوز زندہ ہیں (اور وہی قریب قیامت نازل ہوں گے)۔"

اور محدث عصر محقق وقت علامہ سید محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ "عقیدة الاسلام" میں اس "تواتر" کی تائید میں یہ تحریر فرماتے ہیں:

وللمحدث العلامة الشوکانی رسالة سماها التوضیح فی تواتر ماجاء فی المنتظر والدجال والمسیح ذکر

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ص ۵۷۸،۵۸۳

[2] حضرت استاذ کا یہ رسالہ اپنے موضوع میں بے نظیر تصنیف ہے، عربی زبان میں تحریر ہے اور علماء وطلبہ دونوں کے لئے لائق مطالعہ ہے۔ مصنف قصص القرآن اس سلسلہ کے اکثر مباحث میں اسی رسالہ کا خوشہ چین ہے۔

Marfat.com

فیها تسعة و عشرین حدیثاً فی نزوله علیه السّلام ما بین صحیح و حسن و صالح هذا و ازین منه مرفوع و اما الأثار فتفوت الاحصاء.... الخ

اور محدث علامہ شوکانی نے ایک رسالہ تصنیف کیا ہے جس کا نام یہ رکھا ہے "التوضیح فی التواتر ماجاء فی المنتظر والدجال والمسیح" اس رسالہ میں انہوں نے انتیس احادیث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے متعلق نقل کی ہیں جو اصول حدیث کے لحاظ سے صحیح، حسن، صالح تینوں درجات کو شامل ہیں اور مرفوع احادیث اس تعداد سے بھی زیادہ موجود ہیں اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم تو بیشمار ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی اور حیات و نزول من السماء پر امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ چنانچہ علم عقائد و کلام کی مشہور و مستند کتاب عقیدہ سفارینی میں امت کے اس اجماع کی تصریح موجود ہے۔

و منها ای من علامات السّاعة العظمی العلامة الثالثة ان ینزل من السّماء سید (المسیح) عیسٰی بن مریم (علیه السّلام) و نزوله ثابت بالکتاب و السنة و اجماع الامة و اما الاجماع فقد اجمعت الامة علی نزوله و لم یخالف فیه احد من اهل الشریعة و انما انکر ذٰلك الفلاسفة والملاحدة مما لا یعتد بخلافه۔ [1]

"اور علامات قیامت میں سے تیسری علامت یہ ہے کہ حضرت (مسیح علیہ السلام) عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) آسمان سے اتریں گے اور ان کا آسمان سے اترنا کتاب (قرآن) سنت (حدیث) اور اجماع امت سے قطعاً ثابت ہے (قرآن و حدیث سے نزول ثابت کرنے کے بعد فرماتے ہیں) جہاں تک اجماع امت کا تعلق ہے تو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے پر امت کا اجماع ہے اور اس بارہ میں پیروان شریعت اسلامی میں سے کسی ایک کا بھی خلاف موجود نہیں البتہ فلسفیوں اور ملحدوں نے نزول عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا ہے اور اسلام میں ان کا انکار قطعاً بے وقعت ہے۔"

حیات و نزول مسیح علیہ السلام کی حکمت:

گزشتہ سطور میں حیات نزول مسیح علیہ السلام کو دلائل و براہین کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے جو ایک منصف اور طالب حق کو علم یقین عطا کرتے ہیں، اب مزید طمانیت قلب کے لیے ان چند حکمتوں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جن کو علماء حق نے اس سلسلہ میں بیان فرمایا ہے لیکن اس کے مطالعہ سے قبل یہ حقیقت بہرحال پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور اس کی مشیت کی مصلحتوں کا احاطہ عقل انسانی کے لیے ناممکن ہے اور مخلوق، خالق کائنات کے اسرار و حکم پر عبور بھی کیسے کر سکتی ہے؟ تاہم علماء امت، فراست مومن اور علم حق کی راہ سے دین اور احکام دین کے اسرار و مصالح پر قلم فرسائی کرتے اور اپنی محدود دسترس کے مطابق اس موضوع پر علمی حقائق کا اظہار کرتے آئے ہیں۔

---

[1] صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے تین زمانوں کو "خیر القرون" کہا جاتا ہے چونکہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے ((خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونهم، ثم الذین یلونهم)) سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر ان لوگوں کا جو اس زمانہ سے قریب ہیں اور پھر ان کا جو اس دوسرے زمانہ سے متصل ہیں اور اس کے بعد فرمایا "پھر جھوٹ کی کثرت ہو جائے گی یعنی اس ہر سہ ادوار کے بعد اکثریت کے اندر دین انحطاط پیدا ہو جائے گا اور اسلامی خصوصیات اخلاق مٹ جائے گی۔

Marfat.com

اسلامی دور کی علمی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ دورِ اوّل میں علم الاسراء کی امامت کا شرف عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب اور صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہم کو حاصل تھا، اور اس کے بعد اگرچہ ہر ایک صدی میں دو چار علماء ربانی اس کے ماہر و محقق رہے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ خلیفہ اموی عمر بن عبدالعزیز، امام ابوحنیفہ، علامہ عزالدین بن عبدالسلام مصری، حافظ ابن تیمیہ، امام غزالی، رومی، سید مرتضیٰ زبیدی اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہم اللہ کو اس علم سے خاص مناسبت تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں ان کو فطری ملکہ عطا فرمایا تھا۔

بہرحال حکمت کی حیثیت لطائف و نکات کی ہوتی ہے اور اس کو دلیل و حجت کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا اس لیے زیر بحث مسئلہ میں بھی "حکمت و مصلحت" کا ذکر اسی نقطہ نظر سے سمجھنا چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب و لکل شیء عندہ فصل الخطاب۔

① یہود بنی اسرائیل اپنی مذہبی کتابوں کی پیشین گوئیوں اور بشارتوں میں یہ پڑھ چکے تھے کہ ان کو دو شخصیتوں "مسیح ہدایت" اور "مسیح ضلالت" سے سابقہ پڑے گا، اس لیے وہ منتظر تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد "مسیح ہدایت" کا ظہور کب ہوتا ہے لیکن شومیٔ قسمت کہ جب مسیح ہدایت کا ظہور ہوا تو انہوں نے بغض و حسد کی راہ سے اس کو "مسیح ضلالت" کہہ کر رد کر دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ آمادۂ قتل ہو گئے اور چونکہ قتل انبیاء ان کا دستور رہا تھا اس لیے وہ اس پر ہر وقت جری رہتے تھے، پس جبکہ وہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح ان کے قتل کے بھی قائل ہو گئے تو یہ تعجب خیز بات نہ ہوئی کہ جب مسیح ضلالت (دجال) کا خروج ہو تو یہود اس کو مسیح ہدایت کہہ کر قومی حیثیت سے اس کے پیرو ہو جائیں کیونکہ مذہبی تعلیم کے پیش نظر ان پر مسیح ہدایت کا اتباع ضروری تھا اور جب وہ مسیح ہدایت کو مسیح ضلالت کہہ کر قتل کر چکے تو اب مسیح ضلالت کو ہی اس کے دعوے کے مطابق مسیح ہدایت تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے مگر مشیت الٰہی فیصلہ کر چکی تھی کہ مسیح ضلالت کی گمراہی کا فتنہ چونکہ عظیم الشان ہو گا اور وہ اول خدائی کا دعویٰ کرے گا اور اس کے بعد مسیح ہدایت بنے گا اس لیے اس کا خروج قیامت کے قریب ہی ہونا چاہیے جو دورِ فتن یعنی فتنوں کی آماجگاہ ہو گا اس لیے حکمت الٰہی کا یہ بھی منشاء ہوا کہ "مسیح ہدایت" کو یہود کے فتنہ سے اس طرح بچا لیا جائے کہ وہ اس کو ہاتھ بھی نہ لگا سکیں اور جب وہ وقت آ پہنچے کہ مسیح ضلالت اپنی گمراہی کا علم بلند کرے تو مسیح ہدایت ملاء اعلیٰ سے کائنات ارضی پر اترے اور یہود بنی اسرائیل جو کہ بہ تعداد کثیر مسیح ضلالت کے پیرو ہو رہے ہوں گے، اپنی آنکھوں سے حق و باطل کا مشاہدہ کر لیں اور جب مسیح ہدایت کے مقدس ہاتھوں سے مسیح ضلالت کا خاتمہ ہو جائے تو ﴿ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝ ﴾ حق الیقین بن کر ان کی نگاہوں کے سامنے آ جائے اور اس طرح قبول حق کے ماسواء ان کے لیے دوسرا چارۂ کار باقی ہی نہ رہے اور یا پھر وہ بھی مسیح ضلالت کے ساتھ "فی النار" کر دیے جائیں۔

نیز یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ ادیان و ملل کی تاریخ میں صرف یہود ہی ایک ایسی جماعت ہے جس نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے خون ناحق سے ہاتھ رنگے تھے وہ صرف "نبی" ہی تھے جو ﴿علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل﴾ کے مصداق تھے مگر کوئی صاحب شریعت رسول ان کے اس قتل ناحق کا مظلوم نہیں بنا تھا اس لیے یہ پہلا موقعہ تھا کہ انہوں نے ایک جلیل القدر رسول (عیسیٰ بن مریم علیہما السلام) کو قتل کرنے کا نہ صرف ارادہ کیا بلکہ دنیوی اسباب کے لحاظ سے مکمل تیاری کر لی تھی تب مشیت حق نے یہ فیصلہ کیا کہ مسیح ہدایت کو اس طرح بچا لیا جائے کہ خود یہود کو بھی محسوس ہو جائے کہ وہ مسیح بن مریم علیہما السلام پر دسترس نہ پا سکے، لہٰذا فیصلہ مشیت بروئے کار آیا اور حضرت مسیح علیہ السلام کو ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا گیا اور تمام دنیوی اسباب ہیچ ہو کر رہ گئے لیکن اس احساس کے باوجود چونکہ حقیقت

Marfat.com

حال تک نہ پہنچ سکے اور ظن و گمان ہی کے قعر میں پڑے رہے گو اپنی بات رکھنے کے لیے مشہور یہی کرتے رہے کہ ہم نے مسیح بن مریم علیہما السلام کو قتل کر دیا۔ ادھر متبعین مسیح ہدایت (نصاریٰ) کی بدبختی دیکھئے کہ کچھ عرصہ کے بعد پولوس رسول نے ان میں عقیدہ تثلیث و کفارہ کی بدعت پیدا کر کے یہود کے گھڑے ہوئے افسانہ صلیب کو بھی داخل عقیدہ کر دیا اور اب یہود و نصاریٰ دونوں جماعتیں اس گمراہی میں مبتلاء ہو گئیں کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام صلیب پر چڑھا کر قتل کر دیے گئے۔ تب قرآن عزیز نے نازل ہو کر حق و باطل کے درمیان فیصلہ سنایا اور حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق دونوں جماعتوں نے جو دو الگ الگ رخ اختیار کیے تھے اور پھر ایک مسئلہ میں دونوں کا اتفاق بھی ہو گیا تھا ان سب کے متعلق علم یقین کے ذریعہ حقیقت حال کو واشگاف اور دونوں گمراہیوں کو واضح کر کے قبول حق کے لیے دعوت دی مگر جماعتی حیثیت سے دونوں نے انکار کر دیا اور حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق اپنے اپنے گمراہ کن عقیدہ پر قائم رہے مگر عالم الغیب والشہادۃ چونکہ ان حقائق کا ان کے وقوع سے قبل عالم و دانا تھا اس لیے اس کی حکمت کا یہ بھی تقاضا ہوا کہ مسیح ہدایت کو کائنات ارضی پر اس وقت دوبارہ بھیجا جائے جب مسیح ضلالت کا بھی خروج ہو چکے تا کہ یہود و نصاریٰ کے سامنے حقیقت حال مشاہدہ کے درجہ میں روشن ہو جائے یہود آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جس کے قتل کے مدعی تھے قدرت الٰہی کے کرشمے کی بدولت وہ بقید حیات موجود ہے اور نصاریٰ نادم ہوں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی سچی پیروی چھوڑ کر جو گمراہ کن عقیدہ اختیار کیا تھا وہ سرتاپا باطل اور ہیچ تھا اور اس طرح ہدایت و ضلالت کے معرکہ میں حق کی سربلندی اور باطل کی پستی کا دونوں مشاہدہ کر کے قرآن عزیز کی تصدیق پر مجبور ہو جائیں اور دونوں جماعتیں "ایمان حق" کو برضاء و رغبت اختیار کر لیں اور اپنے باطل عقائد پر شرمسار و سرنگوں ہو جائیں۔ اور چونکہ ان دونوں جماعتوں کے علاوہ ہدایت و ضلالت کا یہ مشاہدہ و مظاہرہ دوسرے اہل باطل بھی کریں گے اس لیے وہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے اور اس طرح احادیث صحیحہ کے مطابق اس زمانہ میں کائنات ارضی کا صرف ایک ہی مذہب ہوگا اور وہ "اسلام" ہوگا۔

۴ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۲۸﴾
(الفتح: ۲۸)

ادیان و ملل کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور معاندین حق کے درمیان "سنت اللہ" کے دو مستقل دور رہے ہیں۔ پہلا دور حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت لوط علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے اس دور میں سنت اللہ یہ رہی کہ جب قوموں نے اپنے پیغمبروں کی صدائے حق پر کان نہ دھرا بلکہ برابر اس کا تمسخر کرتی اور اس کے پیغام حق کے آڑے آتی رہیں، تب اللہ تعالیٰ کے عذاب نے ان کو ہلاک کر دیا اور دوسروں کے لیے ان کو باعث عبرت و بصیرت بنا دیا اور دوسرا دور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء محمد ﷺ تک پہنچا ہے اس دور میں سنت اللہ کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ جب اعداء حق اور دشمنان دین قویم نے کلمہ حق کی مخالفت پر اصرار کیا اپنے پیغمبروں کو ایذا دی اور ان کے ساتھ تمسخر کو اپنا نصب العین بنا لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کو ہلاک کرنے کی بجائے اپنے پیغمبروں کو یہ حکم دیا کہ وہ خدا کی راہ میں وطن چھوڑ دیں اور ہجرت کر جائیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے پیغمبر ہیں جنہوں نے قوم [1] کے سامنے یہ اعلان کیا:

---

[1] یہ حضرت ابراہیم کی اپنی قوم نہیں تھی اس لئے کہ یہ نبی سام (سامی) تھے اور نمارد عراق اور ان کی قوم بنی حام (حامی) تھے۔

Marfat.com

﴿ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ (عنکبوت: ۲۶)

اور عراق سے شام کی جانب ہجرت فرما گئے۔

پھر یہی صورت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیش آئی اور وہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے شام کو ہجرت کر گئے مگر فرعون اور اس کے لشکریوں نے چونکہ مزاحمت کی اور ہجرت کے بھی آڑے آئے اس لیے وہ بحر قلزم میں غرق کر دیئے گئے۔

اور یہی صورت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئی کہ جب قریش مکہ نے اذیت، تمسخر، دین حق کے ساتھ تصادم، اعمال دین کی مزاحمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تب مشیت الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ کو ہجرت کر جائیں، چنانچہ ہر قسم کی نگرانی اور مکان کے ہر طرف محاصرہ کے باوجود کرشمہ قدرت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ و مامون مدینہ ہجرت کر گئے۔

"سنت اللہ" کے اسی دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی اور ان کی قوم بنی اسرائیل نے ان کے ساتھ اور ان کی دعوت حق کے ساتھ بھی وہ سب کچھ کیا جو معاندین حق اور دشمنان دین اپنے پیغمبروں کے ساتھ کرتے رہے تھے اور ان میں ایک یہ خصوصیت زیادہ تھی کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل چند انبیاء کو قتل تک کر چکے تھے اور اب حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کے درپے تھے، اسی کے ساتھ یہ مسطورۂ بالا حقیقت بھی فراموش نہیں رہنی چاہیے کہ یہود مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت دو مسیح کے منتظر تھے اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو مسیح ضلالت قرار دے کر آج بھی مسیح ہدایت کے منتظر ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا یہ فیصلہ ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ہجرت، کائنات ارضی کی بجائے ملاء اعلیٰ کی جانب ہو تاکہ مقررہ وقت آنے پر وہ مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت کے درمیان مشاہدہ سے امتیاز کر سکیں اور ایک جانب اگر مسیح ہدایت کو مسیح ہدایت سمجھیں تو دوسری جانب قرآن کے فیصلہ حق کی صداقت وحقانیت کو دیکھ کر دین حق "اسلام" کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور ساتھ ہی نصاریٰ کو بھی اپنی جہالت اور یہود کی کورانہ تقلید پر ندامت ہو اور وہ بھی تعلیم قرآن کی صداقت پر یقین واعتقاد کے ساتھ شہادت دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

کچھ عجیب صورت حال ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اور خاتم الانبیاء محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان دعوت وتبلیغ حق، اور معاندین کی جانب سے حق کی معاندت ومخالفت، اور پھر اس کے نتائج وثمرات میں بہت ہی زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے دونوں کی اپنی قوم نے دونوں کو جھٹلایا دونوں کی قوموں نے سازش قتل کے بعد مکانوں کا محاصرہ کیا قدرت حق کے کرشمۂ اعجاز نے دونوں کو دشمنوں کی دسترس سے ہر طرح محفوظ رکھا، دونوں کے لیے ہجرت کا معاملہ پیش آیا، البتہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چونکہ بعثت عامہ تھی اور اس کی دعوت وتبلیغ کے لیے ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کرۂ ارضی پر قیام مسلسل ضروری تھا، اس لیے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کا حکم ہوا اور عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام چونکہ قوم کو دعوت حق پہنچا چکے تھے اور ایک خاص مقصد عظیم کے پیش نظر ان کا مدت مدید کے بعد کائنات ارضی پر موجود ہونا ضروری تھا اس لیے ان کو ہجرت ارضی کی بجائے ہجرت سماوی پیش آئی پھر جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے قائد ضلالت "امیہ بن خلف" کو اپنے حربہ سے قتل کیا، عیسیٰ بن مریم علیہما السلام بھی اپنی قوم کے مسیح ضلالت دجال کو قتل کریں گے اور جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وطن مکہ پر قدرت حق نے اقتدار عطا فرما دیا، عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا نزول بھی شام ہی کے اس مشہور شہر میں ہوگا جس سے اپنی قوم کی معاندانہ سازشوں کی بناء پر ملاء اعلیٰ کی جانب ہجرت پیش آئی تھی اور بیت المقدس، دمشق اور شام کے پورے ملک پر

Marfat.com

یہود کے علی الرغم ان کی حکومت ہوگی۔ ①

③ حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے قتل انبیاء علیہم السلام نے یہود کو اس درجہ گستاخ اور بے باک بنا دیا تھا کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ کسی ہستی کے متعلق یہ فیصلہ کہ وہ نبی صادق ہے یا متنبی کاذب ہمارے ہاتھ میں ہے اور جس کو ہم اور ہمارے فقیہ "کاذب" قرار دے دیں وہ واجب القتل ہے۔ چنانچہ اسی زعم باطل میں انہوں نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو مسیح ضلالت کہا اور ان کے فقیہوں نے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا۔ حالانکہ وہ جلیل القدر ہستی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں اس پایہ کا کوئی پیغمبر مبعوث ہی نہیں ہوا تھا اور اس نے جدید پیغام حق (انجیل) کے ذریعہ روحانیت کی مردہ کھیتی میں دوبارہ جان ڈال دی تھی، تب اللہ تعالیٰ کی مشیت کا فیصلہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیے بنی اسرائیل کے اس زعم باطل کو پاش پاش کر دیا جائے اور دکھا دیا جائے کہ رب العالمین، خالق کائنات جس کی حفاظت کا وعدہ کر لے کائنات کی کوئی ہستی یا مجموعہ کائنات بھی اس پر دسترس نہیں پا سکتی چنانچہ ید قدرت نے اس وقت اس مقدس ہستی کو جسد عنصری کے ساتھ ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا جبکہ مکان کے محاصرہ کے ساتھ دشمنوں نے اس کی حفاظت جان کے تمام وسائل دنیوی مسدود کر دیے تھے۔

پھر اس واقعہ نے ایک نئی صورت پیدا کر دی وہ یہ کہ مذاہب کی تاریخ میں صرف حضرت مسیح علیہ السلام ہی کی شخصیت ایسی ہے جن کے قتل و عدم قتل کے متعلق حق و باطل کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہوا اور یہود و نصاریٰ کے باہم واقعہ صلیب و قتل پر اتفاق کے باوجود دو باطل اور متضاد عقائد کی کشمکش نظر آنے لگی۔

یہود قتل و صلیب کی وجہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک وہ مسیح ضلالت تھے اور نصاریٰ وجہ صلیب یہ بتاتے ہیں کہ وہ خدا کے بیٹے تھے جو کائنات کے گناہوں کا کفارہ بننے کے لیے بھیجے گئے تھے تاکہ پاپی دنیا پاپ سے پاک ہو جائے اور صدیوں بعد جب قرآن نے "امر حق" کو واضح اور مسیح بن مریم علیہما السلام سے متعلق حقیقت حال کو روشن کیا تب بھی دونوں جماعتوں نے جماعتی حیثیت سے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا قدرت حق کا فیصلہ ہوا کہ خود مسیح بن مریم علیہما السلام ہی وقت موعود پر نازل ہو کر قرآن کے فیصلہ کی تصدیق کر دیں اور یہود و نصاریٰ کے باطل عقائد کا خود بخود اس طرح خاتمہ ہو جائے اور اس کے بعد مدعیان اہل کتاب کو شرک باطل کی پیروی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے اور خدا کی حجت ان پر تمام ہو جائے۔

نیز جبکہ اللہ تعالیٰ نے کائنات ہست و بود کے لیے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ خدا کی ہستی کے ماسوا ہر ایک وجود کو فنا اور موت ہے ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ .... ﴿كُلُّ شَىْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ اور یہ ظاہر ہے کہ ملاء اعلیٰ اور عالم قدس مقام موت نہیں ہے بلکہ مقام حیات ہے اس لیے از بس ضروری ہے کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام بھی موت کا ذائقہ چکھیں اور اس کے لیے کائنات ارضی اتریں تاکہ زمین کی امانت زمین ہی کے سپرد ہو اس لیے "حیات و رفع" کے بعد "نزول ارضی" مقدر ہوا۔ ②

علماء حق نے حیات و نزول عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق جو "اسرار و حکم" بیان فرمائے ہیں یہاں ان کا احاطہ مقصود نہیں ہے اس مختصر چند حکمتوں کا ذکر کر دیا گیا ورنہ محدث عصر علامہ سید محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے اس سلسلہ میں ایک طویل مقالہ عقیدۃ الاسلام میں سپرد قلم فرمایا ہے جو لائق مطالعہ ہے حضرت استاد نے نہایت لطیف مگر دقیق پیرایہ بیان میں کائنات عالم کو "انسان کبیر"

---

① خلاصہ از عقیدۃ الاسلام ② فتح الباری ج ۶

Marfat.com

انسان کو "عالم صغیر" قرار دے کر ان ہر دو عالم کی حیات و موت پر جو بحث فرمائی ہے اس سے حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع اور قرب قیامت میں کائنات ارضی کی جانب رجوع کی حکمت بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے لیکن یہ کتاب چونکہ اس دقیق بحث کی متحمل نہیں ہے اس لیے اپنی جگہ قابل مراجعت ہے۔

آخر میں اب اپنی جانب سے چند جملے اس سلسلہ میں اضافہ کر کے اس مبحث کو ختم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

④ قرآن عزیز میں "میثاق انبیاء" سے متعلق یہ ارشاد باری ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ۝﴾ (آل عمران: ۸۱)

"اور وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ اللہ نے نبیوں سے (یہ) عہد لیا کہ جب تمہارے پاس (خدا کی جانب سے) کتاب اور حکمت آئے پھر ایسا ہو کہ تمہاری موجودگی میں ایک رسول (محمد ﷺ) آئے جو تصدیق کرتا ہو ان کتابوں کی جو تمہارے پاس ہیں ضرور تم اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا، اللہ نے کہا: کیا تم نے اقرار کیا؟ انہوں نے جواب دیا ہاں ہم نے اقرار کیا، اللہ نے کہا: پس تم اپنے اس عہد پر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔"

آل عمران کی ان آیات میں حسب تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما [1] اس عہد و پیمان کا تذکرہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ازل میں خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے متعلق انبیاء و رسل علیہم السلام سے لیا، قرآن کے اسلوب بیان کے مطابق اگرچہ یہ خطاب انبیاء و رسل کی معرفت ان کی امتوں سے تھا کہ ان میں سے جو امتیں خاتم الانبیاء ﷺ کا زمانہ مبارک پائیں تو ان پر ایمان لائیں اور دعوت حق میں ان کی نصرت و یاری کریں۔ چنانچہ ہر ایک پیغمبر نے اپنے اپنے دور میں تعلیم حق کے ساتھ ساتھ خدا کے اس وعدہ کو بھی یاد دلایا اور ان میں سے اہل حق نے وعدہ دیا اور اقرار کیا کہ ضرور ان پر ایمان لائیں گے اور پیغام حق میں ان کی مدد کریں گے۔

تو یہ "میثاق النبیین" اگرچہ اس طرح پورا ہوتا رہا تاہم ازل میں چونکہ اس عہد و میثاق کے اول مخاطب حضرات انبیاء و رسل تھے اس لیے اس میثاق کی عملی حیثیت کا تقاضا تھا کہ خود انبیاء و رسل میں سے بھی کوئی نبی یا رسول اس عہد و میثاق کا عملی مظاہرہ کر کے دکھائے تاکہ یہ خطاب اولین براہ راست بھی مؤثر ثابت ہو مگر ﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾ میں بقاعدۂ عربیت خطاب تھا ان تمام انبیاء و رسل سے جو ذات اقدس ﷺ سے پہلے اس کائنات ارضی میں مبعوث ہونے والے تھے کیونکہ ازل ہی میں محمد ﷺ کے لیے یہ مقرر ہو چکا تھا ﴿وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ؕ﴾ پس محمد ﷺ کی صفت "خاتم النبیین" اور ازل سے مقدر "میثاق النبیین" کا

---

[1] عن علی و ابن عباس فی تفسیر آیه ما بعث اللّٰہ نبیا من الانبیاء الا اخذ علیه المیثاق لئن بعث اللّٰہ محمدا و هو حی لیؤمنن به ولینصرنه وامره ان یاخذ المیثاق علی امته لئن بعث محمد و هم احیاء لیؤمنن به ولینصرنه. (تفسیر ابن کثیر ج۱)
اللہ تعالیٰ نے انبیاء میں سے جس نبی کو بھی کسی قوم کی رشد و ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تو اس سے یہ عہد ضرور لیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اس وقت زندہ ہو جبکہ محمد ﷺ کی بعثت ہوگی تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا اور ان سے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی اپنی امتوں سے بھی یہی عہد و پیمان لیں کہ ان میں سے جو اس وقت موجود ہوں وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کی مدد کریں۔

Marfat.com

اجتماع صرف اسی ایک شکل میں ممکن تھا کہ انبیاء سابقین میں کوئی ایک پیغمبر بعثت محمد ﷺ کے بعد نزول فرمائیں اور وہ اور ان کی امت دنیاء انسانی کے سامنے خاتم الانبیاء ﷺ پر ایمان لائیں اور "دین حق" کی مدد و نصرت کا مظاہرہ کریں تا کہ ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ کا وعدہ حق پورا ہو۔

گزشتہ صفحات میں یہ حقیقت بخوبی عیاں ہو چکی ہے کہ اگرچہ تمام انبیاء و رسل اپنے اپنے زمانہ میں محمد ﷺ کی بشارات دیتے چلے آتے تھے لیکن یہ خصوصیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کے حصہ میں آئی کہ وہ ذات اقدس ﷺ کی بعثت کے لیے تمہید اور براہ راست منادی و مبشر بنے اور بنی اسرائیل کو تعلیم حق دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا:

﴿اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ﴾ (سورۃ الصف: ٦)

اور حقیقت یہ ہے کہ خاتم انبیاء بنی اسرائیل ہی کا یہ حق تھا کہ وہ خاتم الانبیاء والرسل کی بعثت کا "مناد" اور "مبشر" ہو اس لیے حکمت ربانی کا یہ فیصلہ ہوا کہ میثاق النبیین کے وقار کے لیے ان ہی کو منتخب کیا جائے اور اس معاملہ میں وہی تمام انبیاء و رسل کی نمائندگی کریں تا کہ امتوں کی جانب سے ہی نہیں بلکہ براہ راست انبیاء و رسل کی جانب سے وفاء عہد کا عملی مظاہرہ ہو سکے، اسی حقیقت کے پیش نظر نبی اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

((انا اولی الناس بعیسی ابن مریم والانبیاء اولاد علات لیس بینی و بینہ نبی)).

مگر قرآن چونکہ خدا کا آخری پیغام ہے اور ﴿اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ کے وعدۂ الٰہی نے رہتی دنیا تک اس کو تحریف سے محفوظ کر دیا ہے اس لیے قدرتی طور پر اس کی تعلیم کے ثمرات دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے مقابلہ میں مدت طویل تک اپنا کام کرتے رہیں گے اور اس کی روشنی سے قلوب کو گرمانے اور اطاعت ربانی کے لیے مشتعل کرنے کے لیے علماء امت انبیاء بنی اسرائیل کی طرح خدمت حق انجام دیتے رہیں گے۔ لیکن جب بعثت محمد ﷺ کو گزرے ہوئے بہت ہی طویل عرصہ ہو جائے گا اور امت مرحومہ کے عملی قومی اور اجتماعی اعضاء میں انتہائی اضمحلال پیدا ہو کر یہ کیفیت ہو جائے گی کہ ان کی بیداری اور تیز روی کے لیے صرف علماء حق کی روحانیت ہی کافی ثابت نہیں ہوگی وہ وقت اس کا متقاضی ہوگا کہ کوئی "قائم بالحجۃ" ان کو سنبھالے اور اس لیے مشیت الٰہی نے مقدر کیا کہ جو ہستی عیسیٰ بن مریم علیہ السلام انبیاء و رسل کے میثاق ازل کی نمائندگی کے لیے مامور ہے اس کا ایسے ہی وقت نزول ہو اور وہ امت محمد ﷺ کے درمیان رہ کر ذات اقدس ﷺ کی نیابت اور امت کی امامت کا فرض انجام دے اور ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ کا عملی مظاہرہ کر کے دکھائے۔

اب کرشمہ قدرت دیکھیے کہ ازل کے ان مقدرات نے جو کہ ملاء اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے کائنات ارضی میں کس طرح اپنی بساط بچھائی؟ بنی اسرائیل اپنے جلیل القدر پیغمبر کے قتل کے لیے سازش مکمل کر چکے ہیں شاہی دستہ چہار جانب سے مکان کو محصور کیے ہوئے ہے مگر قدرت حق اپنا کام اس طرح نہیں کرتی کہ معجزانہ کرشمہ کے ذریعہ ان کو محفوظ وہاں سے نکال کر خدا کی وسیع زمین کے دوسرے حصہ میں "ہجرت" کرا دیتی نہیں بلکہ ہوا یہ کہ ان کو ملاء اعلیٰ کی ہجرت کے لیے محفوظ و مامون زندہ اٹھا لیا اور سازش و محصور

Marfat.com

کرنے والوں کو ظن وریب کی دلدل میں پھنسا کر ان کے لیے خسر الدنیا والآخرۃ کا نشان عطاء کر دیا اور پھر ارضی انسان کے ارضی احکام کے لیے وہ وقت مقرر کر دیا جو "میثاق النبیین" کی نمائندگی کے لیے موزوں تھا، یہی ہے وہ حقیقت جس کو زبان وحی ترجمان نے اس طرح ظاہر فرمایا: "والذی نفسی بیدہ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکما عدلا" اور اسی کو نص قرآن نے یوں واضح کیا ہے: ﴿وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ﴾۔

پھر یہ ہستی میثاق انبیاء ورسل کی نمائندگی کا اس طرح حق ادا کرے گی کہ جب اس کا نزول ہوگا تو اس کرشمہ قدرت کو دیکھ کر مسلمانوں کے قلوب تصدیق قرآن اور تازگی ایمان سے روشن ہو جائیں گے اور وہ حق الیقین کے درجہ میں یقین کریں گے کہ بلاشبہ راہ مستقیم صرف اسلام ہی ہے اور مخبر صادق کی جس طرح یہ خبر صادق نکلی عالم غیب سے متعلق اس کی تمام خبریں اسی طرح حق اور بلاشبہ حق ہیں اور نصاریٰ بحیثیت قوم اپنے باطل عقیدۂ تثلیث وکفارہ پر نادم وشرمسار ہوں گے اور قرآن اور محمد ﷺ پر ایمان لانے کو اپنے لیے راہ نجات اور راہ سعادت یقین کریں گے اور یہود جب مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت کے معرکہ حق و باطل کا مشاہدہ کرلیں گے اور مسیح ہدایت کے نزول سے اپنے دعوائے قتل وصلیب کے ملعون عقیدہ کو باطل پالیں گے تو اب ان کو بھی "ایمان بالحق" کے سواء کوئی چارۂ کار نہیں رہے گا اور مسیح ضلالت کے رفقاء کے علاوہ وہ سب ہی "مسلم" بن جائیں گے یہی ہے قرآن کی وہ خبر صادق ﴿وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾ مسلمانوں میں ایمان کی تازگی و شگفتگی نصاریٰ اور یہود میں تبدیلی عقائد کا حیرت انگیز انقلاب دیکھ کر اب مشرک جماعتوں پر بھی قدرتی اثر پڑے گا اور ساتھ ہی خدا کے مقدس پیغمبر کے زبردست روحانی اثرات کارفرما ہوں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے اور اس طرح وحی ترجمان حامل قرآن محمد ﷺ کا یہ ارشاد اپنی صداقت کو نمایاں کرے گا۔ ویدعو الناس الی الاسلام ویھلك اللّٰہ فی زمانہ الملل کلھا الا السلام ویھلك اللّٰہ فی زمانہ الدجال.

اس تفصیل سے یہ بھی روشن ہوگیا کہ قرآن اور احادیث کی تصریحات ثابت کر رہی ہیں کہ اگر اس فرض کی انجام دہی کے لیے کوئی جدید نبی مبعوث ہوتا تو ایک جانب نبی اکرم ﷺ کا خصوصی شرف "خاتم النبین" باقی نہ رہتا اور دوسری جانب "میثاق النبیین" کے خطاب اوّلین کا عملی مظاہرہ عالم وجود میں نہ آتا کیونکہ وہ ہستی بہرحال محمد ﷺ کی امت ہی میں سے ہوتی۔ البتہ سابقہ نبی کی آمد نقلاً اور عقلاً دونوں حیثیت سے شرف خصوصی "خاتم النبین" کے لیے بھی قادح نہیں ہے اور "میثاق النبیین" کو بھی پورا کرتی ہے۔

واقعات نزول صحیح احادیث کی روشنی میں:

گزشتہ صفحات میں نزول عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق جو صحیح احادیث ذکر کی گئیں اور ان سے اور بعض دوسری صحیح احادیث سے جو تفصیلات ظاہر ہوتی ہیں ان کو ترتیب کے ساتھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

قیامت کا دن اگرچہ معین ہے مگر ذات باری کے ماسواء کسی کو اس کا علم نہیں ہے اور اس کا وقوع اچانک ہوگا ﴿عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ اور قیامت کا علم خدا ہی کو ہے ﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً﴾ حتی کہ ان پر اچانک قیامت کی گھڑی آ جائے گی ﴿لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً﴾ "قیامت ان پر نہیں آئے گی مگر اچانک" اور حدیث جبرئیل علیہ السلام میں ہے:

((ما المسئول عنھا باعلم من السائل))

"(جبرئیل علیہ السلام نے کہا) قیامت کے بارہ میں آپ سے زیادہ مجھے بھی علم نہیں جو اجمالی علم آپ کو ہے اسی قدر مجھ کو بھی ہے۔"

Marfat.com

اور ایک اور حدیث میں ہے:

((سمعت رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم یقول قبل ان یموت بشهر: تسألون عن الساعة وانما علمها عند الله)).

"تم مجھ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہو تو اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے"۔

البتہ قرآن عزیز اور احادیث صحیح نے چند ایسی علامات بیان کی ہیں جو قیامت کے قریب پیش آئیں گی اور ان سے صرف اس کے نزدیک ہو جانے کا پتہ چل سکتا ہے، ان "اشراط ساعت" میں سے ایک بڑی علامت حضرت مسیح علیہ السلام کا ملاء اعلیٰ سے نزول ہے جس کی تفصیلات یہ ہیں:

"مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان سخت معرکہ جنگ بپا ہو رہا ہوگا اور مسلمانوں کی قیادت و امامت سلالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہوگی جس کا لقب "مہدی" ہوگا اس معرکہ آرائی کے درمیان ہی میں مسیح ضلالت "دجال" کا خروج ہوگا یہ نسلاً یہودی اور یک چشم ہوگا کرشمہ قدرت نے اس کی پیشانی پر (ک، ا، ف، ر) کافر لکھ دیا ہوگا جس کو اہل ایمان فراست ایمانی سے پڑھ سکیں گے اور اس کے دجل و فریب سے جدا رہیں گے۔ یہ اوّل خدائی کا دعویٰ کرے گا اور شعبدہ بازوں کی طرح شعبدے دکھا کر لوگوں کو اپنی جانب توجہ دلائے گا مگر اس سلسلہ کو کامیاب نہ دیکھ کر کچھ عرصہ کے بعد مسیح ہدایت ہونے کا مدعی ہوگا یہ دیکھ کر یہود بکثرت بلکہ قومی حیثیت سے اس کے پیرو ہو جائیں گے اور یہ اس لیے ہوگا کہ یہود مسیح ہدایت کا انکار کر کے ان کے قتل کا ادعاء کر چکے ہیں اور مسیح ہدایت کی آمد کے آج تک منتظر ہیں اسی حالت میں ایک روز دمشق (شام) کی مسجد جامع میں مسلمان منہ اندھیرے نماز کے لیے جمع ہوں گے نماز کے لیے اقامت ہو رہی ہوگی اور مہدی موعود امامت کے لیے مصلے پر پہنچ چکے ہوں گے کہ اچانک ایک آواز سب کو اپنی جانب متوجہ کر لے گی مسلمان آنکھ اٹھا کر دیکھیں گے تو سپید بادل چھایا ہوا نظر آئے گا اور تھوڑے سے عرصہ میں یہ مشاہدہ ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام دو زرد حسین چادروں میں لپٹے ہوئے اور فرشتوں کے بازوؤں پر سہارا دیئے ہوئے ملاء اعلیٰ سے اتر رہے ہیں فرشتے ان کو مسجد کے منارہ شرقی پر اتار دیں گے اور واپس چلے جائیں گے اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تعلق کائنات ارضی کے ساتھ دوبارہ وابستہ ہو جائے گا اور وہ عام قانون فطرت کے مطابق صحن مسجد میں اترنے کے لیے سیڑھی کے طالب ہوں گے فوراً تعمیل ہوگی اور وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز کی صفوں میں آ کھڑے ہوں گے مسلمانوں کا امام (مہدی موعود) از راہ تعظیم پیچھے ہٹ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے امامت کی درخواست کرے گا۔ آپ فرمائیں گے کہ یہ اقامت تمہارے لیے کہی گئی ہے اس لیے تم ہی نماز پڑھاؤ۔ فراغت نماز کے بعد اب مسلمانوں کی امامت حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھوں میں آ جائے گی اور وہ حربہ لے کر مسیح ضلالت (دجال) کے قتل کے لیے روانہ ہو جائیں گے اور شہر پناہ کے باہر اس کو باب لد پر مقابل پائیں گے دجال سمجھ جائے گا کہ اس کے دجل اور زندگی کے خاتمہ کا وقت آ پہنچا اس لیے خوف کی وجہ سے رانگ کی طرح پگھلنے لگے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آگے بڑھ کر اس کو قتل کر دیں گے اور پھر جو یہود دجال کی رفاقت میں قتل سے بچ جائیں گے وہ اور عیسائی سب اسلام قبول کر لیں گے اور مسیح ہدایت کی پیروی کے لیے مسلمانوں کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آئیں گے اس کا اثر مشرک جماعتوں پر بھی پڑے گا اور اس طرح اس زمانہ میں اسلام کے ماسوا کوئی مذہب باقی نہیں رہے گا۔

ان واقعات کے کچھ عرصہ بعد یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کو اس

Marfat.com

سے محفوظ رکھیں گے، حضرت مسیح علیہ السلام کا دورِ حکومت چالیس [1] سال رہے گا اور اس درمیان میں وہ ازدواجی زندگی بسر کریں گے اور ان کے دورِ حکومت میں عدل و انصاف اور خیر و برکت کا یہ عالم ہوگا کہ بکری اور شیر ایک گھاٹ پر پانی پئیں گے اور بدی اور شرارت کے عناصر دب کر رہ جائیں گے۔ [2]

وفات مسیح علیہ السلام :

چالیس سالہ دورِ حکومت کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہو جائے گا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن ہوں گے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے:

((فیمکث اربعین سنة ثم یتوفی و یصلی علیه المسلمون و یدفنونه)). [3]

"پھر وہ کائنات ارضی پر اتر کر چالیس سال قیام کریں گے اور اس کے بعد وفات پا جائیں گے اور مسلمان ان کے جنازہ کی نماز پڑھیں گے اور ان کو دفن کر دیں گے۔"

اور ترمذی نے بسند حسن محمد بن یوسف بن عبداللہ بن سلام کے سلسلہ سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے:

((قال مکتوب فی التوراة صفة محمد و عیسی ابن مریم یدفن معه)). [4]

"عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا تورات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت (حلیہ و سیرت) مذکور ہے اور یہ بھی مسطور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ان کے ساتھ (پہلو میں) دفن ہوں گے۔"

وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا :

سورۂ مائدہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کے مختلف حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے پھر آخر سورہ بھی ان ہی کے تذکرہ پر ختم ہوتی ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اول قیامت کے اس واقعہ کا نقشہ کھینچا ہے جب انبیاء علیہم السلام سے ان کی امتوں کے متعلق سوال ہوگا اور وہ غایت ادب سے اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے اور عرض کریں گے خدایا! آج کا دن تو نے اس لیے مقرر فرمایا ہے کہ ہر معاملہ میں حقائق امور کے پیش نظر فیصلہ سنائے اور ہم چونکہ صرف ظواہر ہی پر کوئی حکم لگا سکتے ہیں اور قلوب اور حقائق کا دیکھنے والا تیرے سواء کوئی نہیں اس لیے آج ہم کیا شہادت دے سکتے ہیں، صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں تو علام الغیوب ہے اس لیے تو ہی سب کچھ جانتا ہے۔

﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝۱۰۹﴾ (المائدہ: ۱۰۹)

[1] اور مسلم میں ہے کہ دورِ حکومت سات سال رہے گی حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جب مسیح علیہ السلام کا رفع سماوی ہوا اس وقت ان کی عمر تینتیس سال تھی اور نزول کے بعد سال سال مزید بقید حیات رہیں گے، اس طرح کائنات ارضی میں کل مدت حیات چالیس سال ہو جائے گی۔

[2] ماخوذ از صحیح احادیث عن ابن عساکر فی تاریخہ

[3] اس سے قبل یہ حدیث مکمل نقل کی گئی ہے۔ اس کو ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، امام احمد نے مسند میں، ابوداؤد نے سنن میں، ابن جریر نے تفسیر میں اور ابن حبان نے صحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

[4] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۸۴

Marfat.com

"وہ دن (قابل ذکر ہے) جبکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو جمع کرے گا پھر کہے گا تم (اپنی اپنی امتوں کی جانب سے) کیا جواب دیئے گئے؟ وہ (پیغمبر) کہیں گے (تیرے علم کے سامنے) ہم کچھ نہیں جانتے بلاشبہ تو ہی غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے۔"

ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا ﴿لَا عِلْمَ لَنَا﴾ فرمانا علم حقیقی کی نفی پر ہی مبنی ہوگا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ وہ درحقیقت اپنی امتوں کے جواب سے لاعلم ہیں کہ کس نے ایمان کو قبول کیا اور کس نے انکار کیا کیونکہ جواب کا مقصد اگر یہ ہو تو یہ صریح جھوٹ اور کذب بیانی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی جانب اس عمل بد کی نسبت ناممکن ہے اس لیے انبیاء علیہم السلام کا یہ جواب مسطورۂ بالا حقیقت کے ہی پیش نظر ہوگا۔ ظاہر حالات کے علم سے انکار پر مبنی نہیں ہوگا اس کے لیے خود قرآن عزیز ہی شاہد عدل ہے کیونکہ وہ متعدد جگہ یہ کہتا ہے کہ قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں پر شہادت دیں گے کہ ہم نے ان تک خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا اور یہ کہ انہوں نے ہماری دعوت کو قبول کیا یا رد کر دیا۔ تو ان ہر دو مقامات پر نظر رکھنے کے بعد یوں کہا جائے گا کہ پاس ادب کے طریقہ پر اول انبیاء علیہم السلام کا یہی جواب ہوگا جو مائدہ میں مذکور ہے لیکن جب ان کو خدائے برتر کا یہ حکم ہوگا کہ وہ صرف اپنے علم کے مطابق شہادت دیں تب وہ شہادت دیں گے۔

﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾﴾ (النساء: ۴۱)

"پھر (اے پیغمبر!) کیا حال ہوگا اس دن (یعنی قیامت کے دن) جب ہم ہر ایک امت سے ایک گواہ طلب کریں گے (یعنی اس کے پیغمبر کو طلب کریں گے جو اپنی امت کے اعمال و احوال پر گواہ ہوگا) اور ہم تمہیں بھی ان لوگوں پر گواہی دینے کے لیے طلب کریں گے۔"

﴿وَجِيءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ﴾ (الزمر: ۶۹)

"اور لائے جائیں گے (قیامت کے دن) انبیاء اور شہداء اور فیصلہ کیا جائے گا ان لوگوں کے درمیان اچھائی اور برائی کا حق کے ساتھ۔"

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی ﴿لَا عِلْمَ لَنَا﴾ کی یہی تفسیر بیان فرمائی ہے: ❶

عن ابن عباس ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ ...الاية﴾ يقولوا الربّ عزوجل لا علم لنا الا علم انت اعلم به منا.

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ آیت ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ .... الاية﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: انبیاء علیہم السلام رب عزوجل سے عرض کریں گے، ہم کو کوئی علم نہیں ہے مگر ایسا علم کہ جس کے متعلق تو ہم سے بہتر جانتا ہے۔"

اور شیخ المحققین علامہ سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ آیت کے جملہ ﴿لَا عِلْمَ لَنَا﴾ کو "علم حقیقی کے انکار" پر محمول کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

---

❶ تفسیر ابن کثیر جلد ۱

"یہ بات مسلم ہے کہ ایک انسان کو.... خواہ وہ کسی درجہ اور رتبہ کا ہو.... دوسرے انسان کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہوتا ہے وہ علم حقیقی کے لحاظ سے "ظن" کے درجہ سے آگے "علم" تک نہیں پہنچتا، اس بناء پر نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((نحن نحكم بالظواهر والله متولى السرائر)).

"ہم ظاہر معاملات پر حکم لگاتے ہیں اور بھیدوں اور حقیقتوں پر تو صرف خدا کو ہی قابو حاصل ہے۔"

نیز ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ذات اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"تم میرے پاس اپنے جھگڑے لاتے ہو اور بعض تم میں سے زیادہ چرب زبان ہوتے ہیں اور مجھ کو علم غیب نہیں ہے کہ حقیقت سے آگاہ ہو جایا کروں اس لیے جو بھی فیصلہ دیتا ہوں ظاہر حالات پر ہی دیتا ہوں تو یاد رہے کہ جو شخص بھی اپنی چرب زبانی سے کسی بھائی کا ادنیٰ سا ٹکڑا بھی ناحق حاصل کرے گا تو بلا شبہ جہنم کا ٹکڑا حاصل کرے گا۔"[1]

بہر حال قرآن عزیز، احادیث رسول ﷺ، آثار صحابہ رضی اللہ عنہم، اور اقوال علماء سب یہی ظاہر کرتے ہیں کہ اس موقعہ پر انبیاء علیہم السلام کا جواب "عدم علم" کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ از راہ پاس ادب "حقیقی علم پر انکار" کو واضح کرتا ہے۔

غرض ذکر یہ تھا کہ اصل مقام پر اصل تذکرہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ کا ہو رہا ہے جو قیامت میں پیش آئے گا جبکہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنے انعامات شمار کرانے کے بعد ان سے ان کی امت کے متعلق سوال کرے گا اور حسب حال جوابات پیش کریں گے مگر سابق آیات میں چونکہ دوسرے مطالب ذکر ہوئے تھے اس لیے ان سے امتیاز پیدا کرنے کے لیے تمہیداً قیامت میں ہونے والے ان سوال و جواب کا ذکر ضروری ہوا جو عام طور پر انبیاء علیہم السلام سے ان کی امتوں کے متعلق کیے جائیں گے اور اس لیے بھی یہ تذکرہ ضروری تھا کہ اگلی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جواب کا ذکر کیا گیا ہے اس کا پیراۂ بیان بھی انبیاء علیہم السلام کے جواب کے ساتھ مطابق رکھتا ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؔؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَ لَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِيْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾﴾ (المائدہ: ۱۱۶۔۱۱۸)

"اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جب اللہ تعالیٰ عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام سے کہے گا "کیا تو نے لوگوں (بنی اسرائیل) سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو دونوں کو اللہ کے ماسواء خدا بنا لینا" عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے "پاکی تجھ کو ہی زیبا ہے میرے لیے کیسے ممکن

[1] عقیدۃ الاسلام ص ۱۶۵

Marfat.com

تھا کہ میں وہ بات کہتا جو کہنے کے لائق نہیں اگر میں نے یہ بات ان سے کہی ہوتی تو یقیناً تیرے علم میں ہوتی (اس لیے کہ) تو وہ سب کچھ جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں تیرا بھید نہیں پا سکتا بلاشبہ تو غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے، میں نے اس بات کے ماسواء جس کا تو نے مجھ کو حکم دیا ان سے اور کچھ نہیں کہا" وہ یہ کہ صرف اللہ ہی کی پوجا کرو جو میرا اور تمہارا سب کا رب ہے" اور میں ان پر اس وقت تک کا گواہ ہوں جب تک میں ان کے درمیان رہا پھر جب تو نے مجھ کو قبض کر لیا تب تو ہی ان پر نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے اگر تو ان سب کو عذاب چکھائے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کو بخش دے پس تو ہی بلاشبہ غالب حکمت والا ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب اپنا جواب دے چکیں گے تب اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرمائے گا:

﴿قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۱۹﴾ (المائدہ: ۱۱۹)

"اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ ایسا دن ہے کہ جس میں راستبازوں کی راستبازی ہی کام آ سکتی ہے، ان ہی کے لیے بہشت ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ خدا سے راضی اور خدا ان سے راضی (کا مقام اعلیٰ پائیں گے) یہ بہت ہی بڑی کامیابی ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب ایک جلیل القدر پیغمبر کی عظمت و شان کے عین مطابق ہے وہ پہلے بارگاہ رب العزت میں عذر خواہ ہوں گے کہ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ایسی نامناسب بات کہتا جو قطعاً حق کے خلاف ہے ﴿سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ﴾ پھر پاس ادب کے طور پر خدا کے علم حقیقی کے سامنے اپنے علم کو ہیچ اور بے علمی کے مترادف ظاہر کریں گے ﴿اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَ لَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ﴾ اور اس کے بعد اپنے فرض کی انجام دہی کا حال گزارش کریں گے ﴿مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِيْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ۚ﴾ اور پھر امت نے اس دعوت حق کا جواب کیا دیا؟ اس کے متعلق ظاہر امور کی شہادت کا بھی اس اسلوب کے ساتھ ذکر کریں گے جس میں ان کی شہادت خدا کی شہادت کے مقابلہ میں بے وقعت نظر آئے ﴿وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝﴾ اور اس کے بعد یہ جانتے ہوئے کہ امت میں مومنین قانتین بھی ہیں اور منکرین جاحدین بھی، وقوع عذاب اور طلب مغفرت کا اس انداز میں ذکر کریں گے جس سے ایک جانب خدا کے مقرر کردہ پاداش عمل کے قانون کی خلاف ورزی بھی مترشح نہ ہو اور دوسری جانب امت کے ساتھ رحمت و شفقت کے جذبہ کا جو تقاضا ہے وہ بھی پورا ہو جائے ﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرض داشت یا جواب کے مضمون کو ختم کر چکے تو رب العالمین نے اپنے قانون عدل کا یہ فیصلہ سنا دیا تا کہ مستحق رحمت و مغفرت کو مایوسی نہ پیدا ہو بلکہ مسرت و شادمانی سے ان کے قلوب روشن ہو جائیں اور مستحق عذاب غلط توقعات قائم نہ کر سکیں ﴿هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ ... الاية﴾

ان تمام تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ آیات زیر بحث کا سیاق و سباق صراحت کرتا ہے کہ یہ واقعہ قیامت کے روز پیش آئے

گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ملاء اعلیٰ پر اٹھا لیے جانے کے وقت پیش نہیں آیا۔ اس لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی ابتداء ﴿یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ .... الایۃ﴾ سے کرنا اور انتہاء واقعہ ﴿هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ ... الایۃ﴾ پر ہونا روز قیامت کے ماسواء اور کسی دن پر صادق نہیں آ سکتا اور اس ایک قطعی بات کے علاوہ دوسرے کسی احتمال کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔

نیز یہ تفصیلات واضح کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی امت کے قبول و انکار کے حالات سے آگاہی کے باوجود آیات مائدہ میں مذکور اسلوب بیان اس لیے اختیار فرمائیں گے کہ دوسرے انبیاء و رسل علیہم السلام بھی مقام کی نزاکت حال اور رب العزت کے دربار میں غایت پاس ادب کے لیے یہی اسلوب بیان اختیار فرمائیں گے۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور انبیاء علیہم السلام کے جوابات میں اسلوب بیان کی یکسانیت کے باوجود اجمال و تفصیل کا فرق صرف اس لیے ہے کہ زیر بحث آیات میں اصل مقصود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی امت کے قبول و انکار اور ان کے نتائج و ثمرات کا تذکرہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کا ذکر صرف واقعہ کی تمہید کے طور پر ہے۔

حقیقت حال کے اس انکشاف کے بعد اب جمہور امت مسلمہ کے خلاف خلیفہ قادیانی مسٹر محمد علی لاہوری کی تحریف معنوی بھی قابل مطالعہ ہے کہتے ہیں کہ سورۂ مائدہ میں مذکور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور پروردگار عالم کا یہ سوال و جواب اس وقت پیش آ چکا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نعش ملنے پر شاگردوں نے ان کا علاج کر کے چنگا کر لیا اور پھر وہ شام سے فرار ہو کر مصر اور مصر سے کشمیر پہنچے اور گمنامی کی حالت میں انتقال فرما گئے۔ مسٹر لاہوری نے اپنے دعوے میں دو دلائل پیش کیے ہیں: ایک یہ کہ عربیت کے قاعدے سے لفظ "اذ" ماضی کے لیے مستعمل ہے نہ کہ مستقبل کے لیے اور دوسری دلیل یہ کہ اگر جمہور کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کا انتقال نہیں ہوا اور وہ قیامت کے قریب نازل ہوں گے تو ضروری ہے کہ ان کو اپنی امت (نصاریٰ) کے عقیدہ الوہیت مسیح علیہ السلام اور تثلیث کا علم ہو چکا ہوگا کیونکہ نصاریٰ نے ان کے رفع کے زمانہ تک تثلیث کو نہیں اپنایا تھا اور اگر ایسا ہوتا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب ایسے اسلوب پر نہ ہوتا جس سے ان کی لاعلمی ظاہر ہوتی ہے۔

مسٹر لاہوری نے قرآن کی تحریف معنوی پر یہ اقدام یا تو اس لیے کیا کہ اپنے مرشد متنبی قادیان (علیہ ما علیہ) کے دعوائے مسیحیت کو قوت پہنچائیں اور مغالطہ اور سفسطہ سے کام لے کر "خسران مبین" کا سامان مہیا کریں اور یا پھر وہ قواعد عربیت سے اس درجہ ناواقف ہیں کہ نہ ان کو نحو کے معمولی استعمالات ہی کا علم ہے اور نہ وہ آیات قرآنی کے سیاق و سباق کا ہی کچھ درک رکھتے ہیں اور صرف جاہلانہ دعاوی پر دلیر نظر آتے ہیں۔

جن قوانین عربیت میں "اذ" اور "اذا" کے درمیان یہ فرق بیان کیا گیا ہے کہ "اذ" اگر فعل مستقبل پر بھی داخل ہو تب بھی "ماضی" کے معنی دیتا ہے اور "اذا" اگرچہ فعل ماضی پر بھی داخل ہو تب بھی مستقبل کے معنی دیا کرتا ہے ان ہی قوانین میں علماء معانی و بلاغت یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی گزرے ہوئے واقعہ کو اس طرح پیش کرنے کے لیے گویا وہ زمانہ حال میں پیش آ رہا ہے صیغہ مستقبل سے تعبیر کر لیا کرتے ہیں یعنی اس کے لیے "اذا" کا استعمال جائز رکھتے بلکہ مستحسن سمجھتے اور اس کو "استحضار" اور "حکایۃ الحال" کہتے ہیں اور اسی طرح مستقبل میں ہونے والے ایسے واقعہ کو جس کے وقوع سے متعلق یہ یقین دلانا ہو کہ وہ ضرور ہو کر رہے گا اور ناممکن ہے کہ اس کے خلاف ہو سکے اکثر ماضی کے صیغہ سے تعبیر کرنا مستحسن سمجھتے بلکہ بلاغت تعبیر کے لحاظ سے ضروری اور

مفید یقین کرتے ہیں کیونکہ اس طرح مخاطب اور سامع کے سامنے ہونے والے واقعہ کا نقشہ اس طرح آ جاتا ہے گویا وہ ہو گزرا ہے اور یہ بھی "استحضار" ہی کی ایک صورت سمجھی جاتی ہے دور کیوں جایئے لفظ "اذ" کا استعمال مستقبل کے لیے خود قرآن عزیز میں متعدد مقامات پر ثابت ہے:

﴿وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۝﴾(الانعام: ۲۷)

"اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت کہ وہ کھڑے کیے جائیں گے آگ (جہنم) کے اوپر پس کہیں گے اے کاش کہ ہم لوٹا دیئے جائیں دنیا میں اور نہ جھٹلائیں ہم اپنے رب کی نشانیوں کو اور ہو جائیں ہم ایمان والوں میں سے۔"

اسی طرح سورۂ انعام میں روز قیامت مجرموں کی حالت کا اس طرح ذکر کیا ہے:

﴿وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ۝﴾(الانعام: ۳۰)

"اور کاش کہ تو دیکھے، جب وہ اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے تو (پروردگار) کہے گا کیا یہ حق نہیں ہے؟ وہ کہیں گے قسم ہے پروردگار کی یہ (روز حشر) حق اور سچ ہے پس پروردگار کہے گا تو چکھو اس کے بدلہ میں عذاب جو تم کفر کیا کرتے تھے۔"

اور ان ہی مجرمین کی روز قیامت حالت کا نقشہ سورۂ سبا میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ۝ وَّ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖ﴾(سبا: ۵۱-۵۲)

"اور کاش کہ تو دیکھے جبکہ وہ (منکرین) گھبرائیں گے، پس نہیں بھاگ سکیں گے اور پکڑے جائیں گے قریب سے اور کہیں گے ہم (اب) اس پر ایمان لے آئے۔"

اور سورۂ سجدہ میں اس حقیقت کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے:

﴿وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ﴾(السجدہ: ۱۲)

"اور کاش کہ تو دیکھے جبکہ مجرم اپنا سر نیچے ڈالے ہوئے ہوں گے اپنے رب کے سامنے۔"

یہ اور اسی قسم کے متعدد مقامات ہیں جن میں مستقبل کے واقعات کو ماضی کے ساتھ تعبیر کیا گیا اور اس لیے لفظ "اذ" کا استعمال مفید سمجھا گیا پس جس طرح ان مقامات میں ﴿اذ وقفوا، قال، قالوا اذ فزعوا، واخذوا، اذ المجرمون ناکسوا﴾ تمام افعال لفظ "اذ" کے باوجود مستقبل کے معنی دے رہے ہیں اسی طرح ﴿اذ قال اللّٰہ یعیسی﴾ کے استعمال کو مستقبل کے لیے سمجھئے اور جس طرح ان تمام مقامات کے سیاق و سباق دلالت کر رہے ہیں کہ ان واقعات کا تعلق روز قیامت سے ہے ٹھیک آیات مائدہ کی زیر بحث آیات کا سیاق و سباق صراحت کر رہا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق قیامت کے دن سے ہے۔

Marfat.com

قاعدۂ عربیت کی اس حقیقت افروز تحقیق کے بعد مسٹر لاہوری کی دوسری دلیل پر نظر ڈالیے تو وہ اس سے بھی زیادہ لچر نظر آئے گی اس لیے کہ گذشتہ تحقیق سے یہ واضح ہو چکا کہ سورۂ مائدہ کی آیات زیر بحث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب ہرگز اس بات پر مبنی نہیں ہے کہ ان کو اپنی امت کی گمراہی کا علم نہیں ہوگا اور وہ اپنی لاعلمی ظاہر کریں گے، ایک مرتبہ ان آیات پر پھر غور کرو گے تو صاف نظر آئے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اصل جواب صرف یہ ہے:

﴿مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ﴾

اور اول آخر باقی آیات میں یا جواب کے مناسب حال تمہید ہے اور یا اللہ تعالیٰ کی جلالت و جبروت اور اپنی بیچارگی و درماندگی بلکہ عبودیت کا اظہار ہے جس میں ایک جلیل القدر پیغمبر کی شان کے مناسب حضرۃ القدس کے سامنے شہادت پیش کی گئی ہے علاوہ ازیں اگر مسٹر لاہوری کا یہ قول صحیح مان لیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی تک نصاریٰ نے چونکہ تثلیث کا عقیدہ نہیں اختیار کیا تھا اس لیے انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا یہ سوال کیا معنی رکھتا ہے:

﴿ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ﴾

کیا العیاذ باللہ اس کا یہ مطلب نہ ہوا کہ خدا نے عیسیٰ علیہ السلام کی امت پر جھوٹا الزام لگایا؟ پھر یہ کیا کم حیرت کی بات ہے کہ قادیانی اور لاہوری ایک جانب تو یہ کہہ رہے ہیں مگر اس کے قطعاً متضاد "آئینہ کمالات" میں قادیانی نے یہ کہا ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کی روح کو یہ معلوم ہوا اور اس کو بتایا گیا کہ اس کی امت کس طرح شرک میں مبتلاء ہوگئی تب عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی، خدایا! تو میرا مثیل نازل فرما تا کہ میری امت اس شرک سے نجات پائے اور تیری سچی پرستار بنے۔

ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا

حقیقت یہ ہے کہ قادیانی اور لاہوری کی تفسیر کا معیار یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کی آیات کے مطالب قرآن کی زبان سے سننا چاہتے ہیں بلکہ پہلے سے ایک باطل عقیدہ کو عقیدہ بناتے ہیں اور پھر اس کے سانچہ میں قرآن کو ڈھالنا چاہتے ہیں اور جب قرآن اس سانچہ میں ڈھلنے سے انکار کرتا ہے تو تحریف کے حربہ سے زبردستی اس پر مشق ستم کرنا چاہتے ہیں مگر وہ ایسا کرتے وقت میں اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ قرآن امت کی ہدایت کے لیے رہتی دنیا تک امام الہدیٰ ہے۔ اس لیے کوئی "ملحد و زندیق" خواہ کتنی ہی تحریف معنوی کی کوشش کرے ہمیشہ ناکام اور خاسر رہے گا اور خود قرآنی اطلاقات ہی اس کے عقیدہ وفکر کے بطلان کے لیے ناطق ہوں گے بلکہ بمصداق، دروغ گورا حافظہ نہ باشد، وہ اکثر اپنے ہی متضاد اقوال کی بھول بھلیاں میں پھنس کر اپنی کذب بیانی اور تفسیری افتراء پر مہر لگا لیتا ہے جس کی تازہ شہادت ابھی سطور بالا میں نقل ہو چکی ہے۔

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ:

حیات و رفع مسیح علیہ السلام سے متعلق گزشتہ مباحث میں "توفی" کی حقیقت پر کافی روشنی پڑ چکی ہے اور سورۂ مائدہ کی آیات مسطورہ بالا کی تفسیر کے بھی تمام پہلو واضح ہو چکے ہیں تاہم قرآن کے اعجاز بلاغت اور اسلوب بیان کی لطافت سے مستفید ہونے کے

Marfat.com

لیے چند سطور اس مسئلہ پر بھی سپرد قلم کر دینا مناسب ہے کہ اس مقام پر قرآن نے عیسیٰ علیہ السلام کے قیام ارضی کو ﴿مَا دُمْتُ فِيهِمْ﴾ سے اور کائنات ارضی سے انقطاع تعلقات کو ﴿تَوَفَّيْتَنِي﴾ سے کیوں تعبیر کیا۔

گزشتہ سطور میں لغت اور معانی کے حوالوں سے یہ تو ثابت ہو چکا کہ "توفی" کے حقیقی معنی "اخذ وتناول" (لے لینے اور قبضہ میں کر لینے) کے ہیں اور موت کے معنی میں بطور کنایہ اس کا استعمال ہوتا ہے اور یہ کہ کنایہ میں حقیقی معنی برابر ساتھ ساتھ رہتے ہیں مجاز کی طرح یہ نہیں ہوتا کہ حقیقی معنی سے جدا ہو کر لفظ غیر موضوع لہ میں استعمال ہونے لگے۔ پس اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن کا عقیدہ یہ ہوتا کہ ان کو موت آ چکی اور سوال و جواب کا یہ سلسلہ موت کے اسی وقت سے متعلق ہے نہ کہ قیامت کے دن سے تو پھر بلاغت و معانی کا تقاضا یہ تھا کہ اس موقع پر "حیات" اور "موت" ایک دوسرے کے متضاد الفاظ کو استعمال کیا جاتا تا کہ یہ حیثیت واضح ہو سکتی کہ سوال و جواب کا معاملہ "موت" کے ہم قرین ہے اور پھر لفظ "موت" کی صراحت اپنے مقابل لفظ "حیات" کی طالب ہوتی مگر قرآن نے ان دونوں الفاظ کی بجائے ﴿مَا دُمْتُ فِيهِمْ﴾ کو "حیات" کی اور "توفی" کو "موت" کی جگہ استعمال کیا ہے تو یہ کس لیے اور کس مقصد سے یا بغیر کسی حکمت و مصلحت کے یہ اسلوب اختیار کر لیا؟ جمہور امت تو اس کا ایک ہی جواب رکھتی ہے اور وہ یہ کہ قرآن نے دوسرے مقامات کی طرح اس مقام پر بھی اعجاز و ایجاز سے کام لیا ہے اور ان دو لفظوں میں وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی، رفع، نزول اور موت تمام مراحل کو سمو دینا چاہتا ہے وہ اگر یہ کہتا "ما حییت" "میں جب تک زندہ رہا" اور "فلما امتنی" "پس جب تو نے مجھ کو موت دے دی" تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی عام حالات کے مطابق دو ہی مراحل پیش آئے ہیں "زندگی" اور "موت" ان دونوں مرحلوں کے درمیان کوئی خاص صورت حال پیش نہیں آئی، لیکن جبکہ یہ خلاف واقعہ تھا اور ان کی زندگی اور موت کے درمیان دو اہم مراحل پیش آ چکے ہوں گے: ایک "ملاء اعلیٰ کی جانب بقید حیات رفع، اور دوسرے کائنات ارضی پر دوبارہ رجوع (نزول)" اس لیے از بس ضروری ہوا کہ حیات اور موت کی جگہ دو ایسے الفاظ اختیار کیے جائیں جو ان چاروں مراحل پر صادق آ سکیں اور جبکہ متعدد مقامات پر حسب حال ان مراحل کی تفصیل بیان ہو چکی ہے تو اعجاز بلاغت کا یہی تقاضا ہے کہ اب ان کو ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے۔

صورت حال کا یہی نقشہ تھا جس کے لیے قرآن عزیز نے "ما حییت" کی جگہ "ما دمت فیھم" استعمال کیا تا کہ یہ جملہ اختصار کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کے دونوں حصوں پر حاوی ہو جائے اس حصہ پر بھی جو ابتداء زندگی سے شروع ہو کر "رفع الی السماء" پر ختم ہوتا ہے اور اس حصہ پر بھی جو "نزول ارضی" سے شروع ہو کر "موت" پر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور اسی طرح قرآن نے "فلما امتنی" کا اسلوب بیان اختیار کیا تا کہ یہ جملہ بھی پہلے کی طرح باقی دونوں مرحلوں کو اپنے اندر سمو لے اس مرحلہ کو بھی جو "رفع الی السماء" کی صورت میں پیش آیا اور اس مرحلہ کو بھی جو نزول کے بعد "موت" کی صورت میں نمودار ہوا کیونکہ موت سے صرف ایک ہی حقیقت ظاہر ہو سکتی تھی مگر "توفی" میں بیک وقت دونوں حقیقتیں موجود تھیں، حقیقی معنی کے لحاظ سے صرف "اخذ وتناول" اور کنایہ کے اعتبار سے اخذ وتناول کے ساتھ ساتھ "موت" جیسا کہ سطور بالا میں "کنایہ" اور "مجاز" کے باہمی فرق سے معلوم ہو چکا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے خدایا! جو وقت میں نے ان کے درمیان گزارا اس کے لیے تو بیشک میں شاہد ہوں لیکن "توفی" کے اوقات میں ان پر فقط تو ہی نگہبان رہا باقی تیری شہادت تو ہر حالت میں ہر وقت ہر شے پر حاوی ہے۔

Marfat.com

مسئلہ متعلقہ کی یہ پوری بحث اس سے قطع نظر کہ نبی معصوم ﷺ نے آیات کی تفسیر میں کیا ارشاد فرمایا ہے لغت، معانی، بلاغت کے پیش نظر تھی ورنہ ان آیات کی تفسیر میں ایک مومن صادق کے لیے وہ صحیح مرفوع احادیث کافی ہیں جن کو محدثین نے بسند صحیح روایت کیا ہے مثلاً مشہور محدث حافظ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے جو حدیث نقل کی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

جب قیامت کا دن ہوگا تو تمام انبیاء علیہم السلام کو اور ان کی امتوں کو بلایا جائے گا اور عیسیٰ علیہ السلام بھی بلائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اول ان کے سامنے اپنی ان نعمتوں کو شمار کرائے گا جو دنیا میں ان پر نازل ہوتی رہیں اور عیسیٰ علیہ السلام ان سب کا اعتراف کریں گے اس کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا:

﴿ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ﴾

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام انکار فرمائیں گے پھر نصاریٰ بلائے جائیں گے اور ان سے سوال کیا جائے گا تو وہ دروغ بیانی کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہاں عیسیٰ علیہ السلام نے ہم کو یہی تعلیم دی تھی، یہ سن کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر سخت خوف طاری ہو جائے گا، بدن کے بال کھڑے ہو جائیں گے اور خشیت الٰہی سے ان کا رواں رواں بارگاہ صمدی میں سجدہ ریز ہو جائے گا اور یہ مدت ایک ہزار سال معلوم ہوگی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نصاریٰ کے خلاف حجت قائم کر دی جائے گی اور ان کی خود ساختہ صلیب پرستی کا راز فاش کر دیا جائے گا اور پھر ان کو جہنم میں جھونک دیئے جانے کا حکم ہو جائے گا۔ ❶

اور محدث ابن ابی حاتم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح یہ روایت نقل کی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "کہ اللہ تعالیٰ جب قیامت کے دن عیسیٰ علیہ السلام سے ان کی امت کے متعلق سوال کرے گا تو اپنی جانب سے عیسیٰ علیہ السلام پر جواب بھی القاء کر دے گا" اور اس القاء کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر القاء ہوگا کہ وہ یہ جواب دیں:

﴿سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ﴾ ❷

اور صحیحین (بخاری و مسلم) اور سنن میں جو حدیث شفاعت منقول و مشہور ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح قیامت میں تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں سے متعلق اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہوں گے اور معاملہ کے پیش آنے سے قبل خائف و ہراساں ہوں گے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ان میں سے ایک ہوں گے اور ان پر یہ خوف طاری ہو رہا ہوگا کہ جب ان سے امت کی مشرکانہ بدعت پر سوال ہوگا تو وہ درگاہ صمدی میں کس طرح اس سے عہدہ برآ ہو سکیں گے؟

الحاصل سورۂ مائدہ کی ان آیات کی تفسیر وہی صحیح ہے جو جمہور امت کی جانب سے منقول ہے اور قادیانی اور لاہوری کی تفسیر کرائے الحاد و زندقہ سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

---

❶ تفسیر ابن کثیر ج ۱ سورۂ مائدہ ❷ ایضاً

Marfat.com

حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت اصلاح اور بنی اسرائیل کے فرقے:

گزشتہ مباحث میں پڑھ چکے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل عطاء کی تھی اور یہ الہامی کتاب دراصل توراۃ کا تکملہ تھی یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمی اساس اگرچہ توراۃ ہی پر قائم تھی مگر یہود کی گمراہیوں مذہبی بغاوتوں اور سرکشیوں کی وجہ سے جن اصلاحات کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی معرفت انجیل کی شکل میں ان کے سامنے پیش کر دیا تھا، حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے یہود کی اعتقادی اور عملی گمراہیاں اگرچہ بے شمار حد تک پہنچ چکی تھیں اور حضرت مسیح علیہ السلام نے مبعوث ہو کر ان سب کی اصلاح کے لیے قدم اٹھایا، تاہم چند اہم بنیادی باتیں خصوصیت کے ساتھ قابل اصلاح تھیں جن کی اصلاح کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام بہت زیادہ سرگرم عمل رہے۔

① یہود کی ایک جماعت کہتی تھی کہ انسان کے اعمال نیک و بد کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے باقی قیامت، آخرت، آخرت میں جزا وسزا، حشر ونشر، یہ سب باتیں غلط ہیں یہ "صدوقی" تھے۔

② دوسری جماعت اگرچہ ان تمام چیزوں کو حق سمجھتی تھی مگر ساتھ ہی یہ یقین رکھتی تھی کہ وصول الی اللہ کے لیے ازبس ضروری ہے کہ لذات دنیا اور اہل دنیا سے کنارہ کش ہو کر "زہادت" کی زندگی اختیار کی جائے۔ چنانچہ وہ بستیوں سے الگ خانقاہوں اور جھونپڑیوں میں رہنا پسند کرتے تھے مگر یہ جماعت حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے کچھ پہلے اپنی یہ حیثیت بھی کھو چکی تھی اور اب ترک دنیا کے پردہ میں دنیا کی ہر قسم کی گندگی میں آلودہ نظر آتی تھی ظاہر رسم وطریق زاہدوں کا سا ہوتا مگر خلوت کدوں میں وہ سب کچھ نظر آتا جن سے رندان بادہ خوار بھی ایک مرتبہ حیا سے آنکھیں بند کر لیں، یہ "فریسی" کہلاتے تھے۔

③ تیسری جماعت مذہبی رسوم اور خدمت ہیکل سے متعلق تھی لیکن ان کا بھی یہ حال تھا کہ جن رسوم اور خدمات کو لوجہ اللہ کرنا چاہیے تھا اور جن اعمال کے نیک نتائج خلوص پر مبنی تھے ان کو تجارتی کاروبار بنا لیا تھا اور جب تک ہر ایک رسم اور خدمت ہیکل پر بھینٹ اور نذر نہ لے لیں قدم نہ اٹھائیں حتیٰ کہ اس مقدس کاروبار کے لیے انہوں نے توراۃ کے احکام تک میں تحریف کر دی تھی یہ "کاہن" تھے۔

④ چوتھی جماعت ان سب پر حاوی اور مذہب کی اجارہ دار تھی اس جماعت نے عوام میں آہستہ آہستہ یہ عقیدہ پیدا کر دیا تھا کہ مذہب اور دین کے اصول واعتقادات کچھ نہیں ہیں مگر "وہ" جن پر وہ صاد کر دیں، ان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیں، احکام دین میں اضافہ یا کمی کر دیں جس کو چاہیں جنت کا پروانہ لکھ دیں اور جس کو چاہیں جہنم کی سند تحریر کر دیں۔ خدا کے یہاں ان کا فیصلہ اٹل اور انمٹ ہے غرض بنی اسرائیل کے "اربابا من دون اللہ" بنے ہوئے تھے اور تورات کی لفظی اور معنوی ہر قسم کی تحریف میں اس درجہ جری تھے کہ اس کو دنیا طلبی کا مستقل سرمایہ بنا لیا تھا اور عوام وخواص کی خوشنودی کے لیے ٹھہرائی ہوئی قیمت پر احکام دین کو بدل ڈالنا ان کا مشغلہ دینی تھا یہ "احبار" یا "فقیہ" تھے۔

یہ تھیں وہ جماعتیں اور یہ تھے ان کے عقائد واعمال جن کے درمیان حضرت مسیح علیہ السلام مبعوث ہوئے اور جن کی اصلاح حال کے لیے ان کی بعثت ہوئی انہوں نے ہر ایک جماعت کے فاسد عقائد واعمال کا جائزہ لیا رحم وشفقت کے ساتھ ان کے عیوب ونقائص

پر نکتہ چینی کی ان کو اصلاح حال کے لیے ترغیب دی اور ان کے عقائد و افکار اور ان کے اعمال و کردار کی نجاستوں کو دور کر کے ان کا رشتہ خالق کائنات اور ذات واحد کے ساتھ دوبارہ قائم کرنے کی سعی کی۔ مگر ان بدبختوں نے اپنے اعمال سیاہ کی اصلاح سے یکسر انکار کر دیا اور نہ صرف یہ بلکہ ان کو "مسیح ضلالت" کہہ کر ان کی دعوت حق وارشاد کے دشمن اور ان کے خلاف سازشیں کر کے ان کی جان کے درپے ہو گئے۔

اناجیل اربعہ:

حضرت مسیح علیہ السلام پر جو انجیل نازل ہوئی تھی کیا موجودہ چاروں انجیلیں وہی ہیں یا یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد کی تصانیف ہیں؟ اس کے متعلق تمام اہل علم کا جن میں نصاریٰ بھی شامل ہیں اتفاق ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی انجیل نہیں ہے اور نہ اس کا ترجمہ ہے لیکن پھر ان موجودہ انجیلوں کے متعلق عیسائی کیا کہتے ہیں اور ناقدین کی رائے کیا ہے یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے۔

یہ بات بہرحال تسلیم شدہ ہے کہ موجودہ چاروں انجیلوں کے متعلق نصاریٰ کے پاس کوئی ایسی سند موجود نہیں جس کی بناء پر وہ یہ کہہ سکیں کہ ان کی روایات کا سلسلہ یا ان کی ترتیب و تالیف کا زمانہ حضرت مسیح علیہ السلام یا ان کے شاگردوں (حواریوں) تک پہنچتا ہے نہ اس کے لیے کوئی مذہبی سند ہے اور نہ تاریخی، بلکہ اس کے خلاف خود عیسائیت کی مذہبی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ پہلی صدی عیسوی سے چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک عیسائیوں میں اکیس سے زیادہ انجیلیں الہامی یقین کی جاتی اور رائج و معمول بہا تھیں لیکن ۳۲۵ء میں نالیسیا کی کونسل نے ان میں سے صرف چار کو منتخب کر کے باقی کو متروک قرار دے دیا اور سخت حیرت کا مقام ہے کہ کونسل کا یہ انتخاب کسی تاریخی اور علمی بنیاد پر نہیں ہوا بلکہ ایک طرح کی فال نکالی گئی اور اس کو الہامی اشارہ تسلیم کر لیا گیا، چنانچہ ان اکیس سے زائد انجیلوں میں سے بعض یورپ کے قدیم کتب خانوں میں پائی گئی ہیں مثلاً انیسویں صدی میں ویٹیکان کے مشہور کتب خانہ سے متروک اناجیل کا ایک نسخہ برآمد ہوا تھا جس میں موجودہ چاروں انجیلوں سے بہت کچھ زائد موجود ہے موجودہ نسخوں میں سے سینٹ لوقا کی انجیل میں خصوصیت کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ تفصیل سے درج ہے لیکن سورۂ مریم میں قرآن عزیز نے اس واقعہ کو جس طرح حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش اور ہیکل میں تربیت کے ذکر سے شروع کیا ہے نہ لوقا کی انجیل میں اس کا ذکر ہے اور نہ باقی تینوں انجیلوں میں۔ ویٹیکان کے اس نسخہ میں یہ واقعہ ٹھیک سورۂ مریم میں مذکور واقعہ کی طرح درج ہے۔ [1]

اسی طرح سولہویں صدی میں روما کے مشہور پوپ سکٹس (Skits) کے قدیم کتب خانہ میں ایک اور متروک انجیل کا نسخہ برآمد ہوا جس کا نام انجیل برنابا ہے، یہ نسخہ پوپ کے مقرب لاٹ پادری فرا مرینو نے پڑھا اور پوپ کی اجازت کے بغیر کتب خانہ سے چرا لایا چونکہ اس میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کثرت سے واضح اور صاف بشارتیں موجود تھیں حتیٰ کہ "احمد" نام تک مذکور تھا نیز الوہیت مسیح علیہ السلام کے خلاف عقیدہ کی تعلیم پائی جاتی تھی اس لیے وہ لاٹ پادری مسلمان ہو گیا حال ہی میں اس کا عربی ترجمہ مصر میں علامہ سید رشید رضا مرحوم نے المنار پریس سے شائع کیا ہے جو قابل مطالعہ ہے، ڈاکٹر سعادہ نے اس کے مقدمہ میں جو قابل قدر علمی تحقیق پیش کی ہے اس میں ہے کہ اس انجیل کا پتہ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس تاریخی منشور (حکم نامہ) سے چلتا ہے جو

---

[1] ترجمان القرآن جلد دوم

Marfat.com

خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے عیسائیوں کے پوپ گلیسیوس کی جانب سے کلیساؤں کے نام بھیجا گیا تھا اور جس میں ان کتابوں کے نام درج تھے جن کا پڑھنا پڑھانا عیسائیوں پر حرام کیا گیا تھا ان ہی میں انجیل برنابا کا نام بھی شامل تھا۔

علاوہ ازیں محققین یورپ بھی آج اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ابتدائی تین صدیوں میں ایک سو سے زائد انجیلیں پائی جاتی تھیں جو بعد میں چار کو چھوڑ کر باقی متروک کر دی گئیں اور کلیسہ کے فیصلہ کے مطابق ان کا پڑھنا حرام کر دیا گیا اس لیے آہستہ آہستہ وہ سب مفقود ہوتی چلی گئیں اور کہتے ہیں کہ ان مفقود نسخوں میں ایک مشہور انجیل، انجیل ایگنٹس (انجیل اغنطس) بھی تھی جو اب ناپید ہے۔

نیز یہ بات بھی خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے کہ سینٹ پال (پولوس رسول) کے جو خطوط ہیں اور جن پر موجودہ عیسائیت کی بنیادیں قائم ہیں ان کے مطالعہ سے جگہ جگہ یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگوں کو خبردار کرتا اور ڈراتا ہے کہ وہ ان انجیلوں کی جانب توجہ نہ دیں جو حضرت مسیح علیہ السلام کے نام کی بجائے دوسرے ناموں سے منسوب ہیں کیونکہ مجھ کو روح القدس نے اسی کے لیے مامور کیا ہے کہ میں انجیل مسیح علیہ السلام کی حمایت کروں، اسی کو اسوہ بناؤں اور اس کی تعلیم کو تمام عیسائی دنیا میں پھیلاؤں، چنانچہ حسب ذیل جملے اس کی صراحت کرتے ہیں کہ اس کے نزدیک مسیح علیہ السلام کی انجیل عیسائیوں میں متروک ہو چکی تھی اور بعد کی بے سند انجیلوں کا عام رواج ہو گیا تھا اور ان ہی میں سے یہ چار ہیں جو نالیسیا کی کونسل نے بغیر کسی سند کے فال کے ذریعہ صحیح تسلیم کر لیں۔

اب ان چار کا حال بھی سنئے۔ ان میں سے سب سے قدیم متی کی انجیل تسلیم کی جاتی ہے، بایں ہمہ اس کے متعلق نصاریٰ میں سے علماء متقدمین تو بالاتفاق اور علماء موجودہ میں سے اکثر اس کے قائل ہیں کہ موجودہ انجیل متی اصل نہیں ہے بلکہ اس کا ترجمہ ہے اس لیے کہ اصل کتاب عبرانی میں تھی جو اب ناپید ہے اور ضائع ہو گئی لیکن یہ اصل کا ترجمہ ہے یا اس میں بھی تحریف ہوئی ہے اس کے متعلق کوئی تاریخی سند موجود نہیں حتیٰ کہ مترجم کا نام تک معلوم نہیں اور نہ یہ پتہ کہ کس زمانہ میں یہ ترجمہ ہوا اور مشہور عیسائی عالم جرجیس زوبن الفتوحی اللبنانی نے اپنی کتاب میں تصریح کی ہے کہ متی نے اپنی انجیل بیت المقدس میں بیٹھ کر ۳۹ء میں عبرانی میں تصنیف کی تھی جیسا کہ مقدس ایرونیوس نے کہا ہے کہ اوسیبوس نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ متی کی انجیل کا یونانی ترجمہ اصل نہیں ہے اور جب بانیتوس نے یہ ارادہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان جا کر عیسائیت کی تبلیغ کرے تو اس نے متی کی انجیل کو عبرانی میں مکتوب اسکندریہ کے کتب خانہ قیصر میں محفوظ دیکھا تھا مگر وہ نسخہ مفقود ہو گیا اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس زمانہ میں کس شخص نے یونانی زبان میں موجودہ ترجمہ کو روشناس کرایا۔ [1]

دوسری انجیل مرقس کی ہے اس کے متعلق مشہور عیسائی عالم پطرس گوامگ اپنی کتاب مروج الاخبار فی تراجم الابرار میں مرقس کی سوانح حیات پر لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ نسل یہودی لاوی اور پطرس حواری عیسیٰ علیہ السلام کا شاگرد تھا۔ رومیوں نے جب عیسائیت اختیار کر لی تو ان کے مطالبہ پر یہ انجیل تصنیف کی، یہ الوہیت مسیح علیہ السلام کا منکر تھا اور اس نے اپنی انجیل میں اس حصہ کو بھی نہیں لیا جس میں حضرت مسیح علیہ السلام پطرس کی مدح کرتے ہیں یہ ۶۸ء میں اسکندریہ کے قید خانہ میں قتل ہوا بت پرستوں نے اس کو قتل کر دیا۔ [2]

---

[1] الفاروق بین المخلوق والخالق ج ۱ ص ۲۰ ماخوذ جرجیس زوبن البنانی مطبوعہ بیروت

[2] قصص الانبیاء للنجار۔

اور عیسائی دنیا کو اس بارے میں اختلاف ہے کہ مرقس کی انجیل کب تصنیف ہوئی۔ چنانچہ الفارق کے مصنف مرشد الطالبین ص ۱۷۰ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ علماء نصاریٰ کا خیال یہ ہے کہ یہ پطرس کی نگرانی میں ۶۱ء میں تصنیف ہوئی۔ [1]

تیسری انجیل سینٹ لوقا کی انجیل ہے جس قدر اختلاف علماء نصاریٰ میں متی کی انجیل سے متعلق ہے اس سے بھی زیادہ لوقا کی انجیل کی صحت و عدم صحت کے متعلق اختلاف ہے چنانچہ الفارق کے مصنف نے اس سلسلہ میں خود علماء نصاریٰ کے ہی اقوال نقل کیے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ الہامی کتاب نہیں ہے وہ فرماتے ہیں کہ مسٹر گڈل اپنے رسالہ "الہام" میں دعویٰ کرتا ہے کہ لوقا کی انجیل الہامی نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ لوقا نے خود اپنی انجیل کی ابتداء میں یہ لکھا ہے کہ یہ (انجیل) اس نے ثاوفیلس کے ساتھ خط و کتابت کی بناء پر لکھی ہے وہ اس کو مخاطب کر کے لکھتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کی باتیں جن لوگوں نے آنکھوں سے دیکھی تھیں انہوں نے ہم تک جس طرح پہنچائی ہیں ان کو بہت سے لوگ ہم سے نقل کر رہے ہیں اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کو خود ہی صحیح طریقہ پر جمع کر دوں تاکہ تم کو صحیح حقیقت معلوم ہو جائے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کا زمانہ نہیں پایا، اور محققین نصاریٰ یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ لوقا کی انجیل مرقس کی انجیل کے بعد وجود میں آئی ہے اور پطرس اور پولوس کے مرنے کے بعد تصنیف کی گئی ہے۔ [2]

اصل بات یہ ہے کہ لوقا انطاکیہ میں طبابت کرتا تھا اس نے مسیح علیہ السلام کو نہیں دیکھا اور مسیحیت کو سینٹ پال (پولوس) سے سیکھا ہے اور پولوس کے متعلق یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ وہ دراصل متعصب یہودی اور عیسائیت کا بدترین دشمن تھا اور نصاریٰ کے خلاف علی الاعلان اپنی جدوجہد جاری رکھتا تھا مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کی ہمہ قسم کی مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود مسیحیت کی ترقی ہوتی جا رہی ہے اور روکے نہیں رکتی تب اس نے یہودیانہ مکر و فریب سے کام لیا اور اعلان کیا کہ عجب معجزہ ہوا میں بحالت صحت تھا کہ ایک دم اس طرح زمین پر گرا جیسا کہ کوئی کشتی میں بچھاڑ دیتا ہے اور اس حالت میں حضرت مسیح علیہ السلام نے مجھ کو چھوا اور پھر سخت زجر و توبیخ کی کہ آئندہ تو ہرگز میرے پیروؤں کے خلاف کوئی اقدام نہ کرنا پس میں اسی وقت حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لے آیا اور پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے حکم سے میں مسیحی دنیا کی خدمت کے لیے مامور ہو گیا انہوں نے مجھ کو فرمایا کہ میں لوگوں کو مسیح علیہ السلام کی انجیل کی بشارت سنا دوں اور اس کے اتباع کی ترغیب دوں۔ چنانچہ اس نے آہستہ آہستہ "کلیسہ" پر ایسا قبضہ کیا کہ دین عیسوی کی اصل صداقتوں کو مٹا کر بدعتوں اور برائیوں کا مجموعہ بنا دیا، الوہیت مسیح علیہ السلام تثلیث و ابنیت اور کفارہ کی بدعت ایجاد کر کے مسیحیت کو وثنیت میں تبدیل کر دیا اور شراب، مردار اور خنزیر سب کو حلال بنا دیا۔ یہی وہ مسیحیت ہے پولوس کے صدقہ میں جس سے آج دنیا روشناس ہے اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ پولوس کے شاگرد لوقا کی انجیل الہامی انجیل ہے اور جیروم کہتا ہے کہ بعض قدیم علماء نصاریٰ اس کے قائل ہیں کہ لوقا کی انجیل کے ابتدائی دو باب الہامی نہیں الحاقی ہیں کیونکہ یہ اس نسخہ میں موجود نہیں ہیں جو مارسیوں فرقہ کے نسخوں میں ہے، اور مشہور نصرانی عالم اکہارن لکھتا ہے کہ لوقا کی انجیل کے باب ۲۲ آیات ۴۳۔۴۴ الحاقی ہیں، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ معجزات سے متعلق جو بیان ہے اس میں کذب بیانی اور شاعرانہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے جو غالباً کاتب کی جانب سے اضافہ ہیں لیکن صدق کا کذب سے امتیاز حد درجہ دشوار ہے اور کلی میش لکھتا ہے کہ متی اور مرقس کی انجیلیں بہت جگہ آپس میں مخالف اور متضاد

---

[1] الفارق ص ۳۱۹ [2] قصص الانبیاء للنجار ص ۴۷۷،۴۷۹

Marfat.com

واقعات کی حامل ہیں لیکن جس معاملہ میں دونوں کا اتفاق ہو اس کو لوقا کی انجیل کے بیان پر ترجیح حاصل ہے۔ (۱) اور یہ واضح رہے کہ لوقا کی انجیل میں بیس سے زیادہ مواقع پر متی کی انجیل سے اضافہ ہے اور مرقس کی انجیل سے تو اس سے بھی کہیں زیادہ۔ (۲) پس ان تمام دلائل سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ لوقا کی انجیل ہرگز الہامی نہیں ہے اور نہ کسی حواری کی تصنیف ہے۔

چوتھی انجیل یوحنا کی ہے اس کے متعلق نصاریٰ کا عام عقیدہ یہ ہے کہ یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے محبوب شاگرد یوحنا زبدی کی ہے زبدی صیاد، یوحنا کے والد کا نام تھا، جلیل کے بیت صیدا میں ولادت ہوئی اور حواری۔ عیسیٰ علیہ السلام کا شرف حاصل ہوا اور نصاریٰ میں مشہور بارہ حواریوں میں سے سب سے زیادہ ان ہی کو تقدیس حاصل ہے۔ جرجیس زوبیں اللبنانی لکھتا ہے کہ جس زمانہ میں شیرنیطوس اور بیسوں اور ان کی جماعت اپنے عقیدہ کی تشہیر کر رہی تھی کہ الوہیت مسیح علیہ السلام کا عقیدہ باطل ہے وہ بشر تھے اور حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا ہوئے اور حضرت مریم علیہا السلام سے قبل وہ عالم وجود میں نہیں تھے اس زمانہ میں ۹۶ء میں پادریوں، لاٹ پادریوں کی مجلس مشاورت ہوئی اور انہوں نے یوحنا کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست پیش کی کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی باتیں تحریر کریں اور جو باتیں دوسری انجیلوں میں پائی جاتی ہیں ان کے ماسواء جو کچھ معلوم ہو وہ لکھیں خصوصیت سے الوہیت مسیح کا مسئلہ ضرور لکھیں تاکہ شیرنیطوس وغیرہ کی جماعت کے خلاف ہمارے ہاتھ مضبوط ہوں تب یوحنا ان کی بات نہ ٹال سکے اور یہ انجیل لکھنے پر مجبور ہوئے (۳) مگر اس کے باوجود مسیحی علماء زمانہ تصنیف کی تعیین میں مختلف نظر آتے ہیں بعض کہتے ہیں ۶۵ء میں تالیف ہوئی اور بعض ۹۶ء اور بعض ۹۸ء میں تصنیف ہونا بیان کرتے ہیں۔

مگر ان کے مقابلہ میں ان مسیحی علماء کی تعداد کم نہیں ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یوحنا کی انجیل، حواری یوحنا کی تصنیف ہرگز نہیں ہے چنانچہ کیتھولک ہیرالڈ (۴) جلد نمبر ۷ میں پروفیسر لن سے منقول ہے کہ انجیل یوحنا از ابتداء تا انتہاء مدرسہ اسکندریہ کے ایک طالب علم کی تصنیف ہے اور برٹش نیدر لکھتا ہے کہ انجیل یوحنا اور رسائل یوحنا ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگرد یوحنا کی تصنیف نہیں ہے بلکہ کسی شخص نے دوسری صدی کے اوائل میں اس کو تصنیف کر کے اس لیے یوحنا کی جانب منسوب کر دیا تاکہ وہ لوگوں میں مقبول و مشہور بن جائے اور صاحب الفارق کہتے ہیں کہ مشہور مسیحی عالم کروتیس کا بیان ہے کہ یہ انجیل شروع میں بیس ابواب پر مشتمل تھی بعد میں افاس کے کنیسہ نے اس میں اکیسویں باب کا اضافہ کر دیا جبکہ یوحنا کا انتقال ہو چکا تھا (۵) ان حوالجات سے یہ بخوبی آشکارا ہوتا ہے کہ بلاشبہ یوحنا حواری کی انجیل نہیں ہے اور صرف اس مقصد سے تصنیف کر کے یوحنا کی جانب منسوب کی گئی کہ الوہیت مسیح علیہ السلام کے عقیدہ کنیسہ کو قوت پہنچائی جائے اور اصلاح عقیدہ کی جو آواز کبھی کبھی مسیحی دنیا میں اٹھتی تھی اس کو دبایا جائے۔

چہارگانہ اناجیل کے متعلق مسطورہ بالا مختصر تنقیدات کے علاوہ ان کے الہامی نہ ہونے کے دو واضح دلائل یہ بھی ہیں کہ ان چاروں انجیلوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کے وقائع درج ہیں حتیٰ کہ نصاریٰ کے زعم کے مطابق ان کی گرفتاری، صلیب، قتل، مر کر جی اٹھنے اور حواریوں پر ظاہر ہونے وغیرہ تک کے حالات بھی موجود ہیں۔ پس اگر یہ اناجیل انجیل مسیح علیہ السلام یا اس کا کوئی حصہ ہوتیں تو ان میں ان باتوں کا قطعاً تذکرہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ واقعات تو مسیح علیہ السلام کے بعد ان کے شاگرد جمع کرتے اور ان کو ایک تاریخی

---

(۱) قصص الانبیاء ص ۴۷۷ (۲) ایضاً ص ۴۷۷ (۳) قصص الانبیاء ص ۴۷۷
(۴) مطبوعہ ۱۸۴۴ء (۵) الفارق ص ۳۴۲-۳۴۱

Marfat.com

حیثیت حاصل ہوتی نہ کہ وہ کتاب اللہ کہلانے کے مستحق ہوتے اور یہ کہ جس طرح ان انجیلوں کے مصنفین کے بارہ میں اختلاف ہے اسی طرح ان تصنیفات کے باہم روایات واقعات میں بھی تناقص اور سخت اختلاف پایا جاتا ہے یعنی بعض معجزات وعجیب واقعات ایسے ہیں جو ایک انجیل میں پائے جاتے ہیں اور دوسری انجیل میں ان کا اشارہ تک نہیں ہے یا بعض میں ایک واقعہ جس طرح مذکور ہے دوسری میں کچھ زیادتی یا کمی کے ساتھ ایسے طریقہ پر بیان ہوا ہے کہ پہلی انجیل کے بیان میں اور اس میں صریح تضاد اور خلاف نظر آتا ہے مثلاً صلیب مسیح علیہ السلام کا واقعہ اناجیل میں تضاد بیان کے ساتھ منقول ہے۔

یہ بات بھی کم حیرت کے لائق نہیں ہے کہ یہ اناجیل اربعہ جن جن زبانوں میں منقول ہوئی ہیں ان کی عبارات وکلمات کے بقاء وتحفظ کی کبھی پرواہ نہیں کی گئی بلکہ ایک ہی زبان کے مختلف ایڈیشنوں اور اشاعتوں میں بہ کثرت الفاظ اور جملوں کی تبدیلی، کمی اور بیشی موجود ہے خصوصاً جن مقامات پر علماء نصاریٰ اور علماء اسلام کے درمیان بشارات کے سلسلہ میں یہ بحث آ گئی ہے کہ ان کا مصداق خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا حضرت مسیح علیہ السلام یا کوئی اور نبی، نیز جن مقامات پر الوہیت مسیح علیہ السلام کی صراحت میں فرق پڑتا نظر آتا ہوا ان کو کافی تختہ مشق بنایا جاتا رہا ہے...... اگر تحریفات لفظی ومعنوی اور تضاد بیان کی تفصیلات وتشریحات کو بہ نظر وسیع مطالعہ کرنا ہو تو اس کے لیے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی اظہار الحق وحافظ ابن قیم کی ہدایۃ الحیاری، باجہ جی زادہ کی الفارق بین المخلوق والخالق، اور مولانا آل نبی امروہی کی اظہار حق لائق دید کتابیں ہیں۔

غرض موجودہ چاروں انجیلیں الہامی انجیلیں نہیں ہیں نہ ان کے الہامی ہونے کی روایتی سند ہے اور نہ تاریخی، نہ ان کے مصنفین کے متعلق قطعی اور یقینی علم حاصل ہے اور نہ زمانہائے تصانیف ہی متعین ہیں بلکہ اس کے خلاف پولوس کے بیانات ان کتابوں کی تاریخی حیثیت مضامین ومطالب کا باہمی تضاد وتغیر اسی پر شاہد ہیں کہ یہ ہرگز انجیل مسیح علیہ السلام یا اس کا حصہ نہیں ہیں اور یہ کہ انجیل مسیح علیہ السلام نصاریٰ کے ہی ہاتھوں اول تحریف لفظی ومعنوی کا شکار ہوئی اور اس کے بعد مفقود ہو گئی بلکہ ان چہارگانہ انجیلوں میں سے کوئی بھی اصل نہیں ہے بلکہ یونانی اور اس سے منقول دوسری زبانوں کے تراجم ہیں جو تبدیلی وتغیر اور نقص وازدیاد کا برابر شکار ہوتے رہے ہیں اور صرف یہی نہیں کہ یہ اناجیل اربعہ انجیل مسیح علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ کسی علمی تاریخی اور مذہبی سند سے ان کا شاگردان مسیح علیہ السلام کی تصنیف ہونا بھی ثابت نہیں ہے بلکہ بعد کے مصنفین کی تصانیف ہیں البتہ ان تراجم میں مواعظ ونصائح اور مقامات حکمت کے سلسلہ میں ایک حصہ ایسا ضرور ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے ارشادات عالیہ سے ماخوذ ہے اس لیے نقل میں کہیں کہیں اصل کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔

قرآن اور انجیل:

قرآن عزیز کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ جس طرح خدا ایک ہے اسی طرح اس کی صداقت بھی ایک ہی ہے اور وہ کبھی کسی خاص قوم، خاص جماعت اور خاص گروہ کی وراثت نہیں رہی بلکہ ہر قوم اور ہر ملک میں خدا کی رشد وہدایت کا پیغام ایک ہی احساس وبنیاد پر قائم رہتے ہوئے اس کے سچے پیغمبروں یا ان کے نائبوں کے ذریعے ہمیشہ دنیا کے لیے راہ مستقیم کا داعی اور منادر رہا ہے اور اسی کا نام "صراط مستقیم" اور "اسلام" ہے اور قرآن اسی بھولے ہوئے سبق کو یاد دلانے آیا ہے اور یہی وہ آخری پیغام ہے جس نے تمام مذاہب کی صداقتوں کو اپنے اندر سمو کر کائنات ارضی کی ہدایت کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس لیے اب اس کا انکار گویا خدا کی تمام صداقتوں کا

Marfat.com

انکار ہے۔اسی بنیادی تعلیم کے پیش نظر اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی عظمت شان کو سراہا اور یہ اعتراف کیا کہ بلاشبہ انجیل الہامی کتاب اور خدا کی کتاب ہے لیکن ساتھ ہی جگہ جگہ یہ بھی بہ دلائل بتلایا کہ علماء اہل کتاب نے ان کی سچی تعلیم کو بدل ڈالا اور ہر قسم کی تحریف کر کے اس کی تعلیم کو شرک و کفر کی تعلیم بنا دیا۔مگر بعض بعض مقامات پر اہل کتاب کو توراۃ و انجیل کے خلاف عمل پر ملزم بناتی ہوئی موجودہ تورات و انجیل کے حوالے بھی دیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت اصل نسخے بھی اگرچہ محرف شکل میں ہی کیوں نہ ہوں پائے جاتے تھے۔بہرحال اس وقت بھی یہ دونوں کتابیں لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تحریفات سے اس درجہ مسخ ہو چکی تھیں کہ وہ تورات موسیٰ اور انجیل مسیح علیہما السلام کہلانے کی مستحق نہیں رہی تھیں۔چنانچہ قرآن نے اصل کتابوں کی عظمت اور اہل کتاب کے ہاتھوں ان کی تحریف اور ان کا مسخ دونوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے:

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ﴾ (آل عمران: ۳۔۴)

"(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) اللہ نے تجھ پر کتاب کو اتارا حق کے ساتھ جو تصدیق کرنے والی ہے ان کتابوں کی جو اس کے سامنے ہیں اور اتارا اس نے تورات اور انجیل کو (قرآن سے) پہلے جو ہدایت ہیں لوگوں کے لیے اور اتارا فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والا)۔"

﴿وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۝﴾ (آل عمران: ۴۸)

"اور سکھاتا ہے وہ کتاب کو، حکمت کو، توراۃ کو، انجیل کو۔"

﴿يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ مَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَ الْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ (آل عمران: ۶۵)

"اے اہل کتاب! تم کس لیے ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں جھگڑتے ہو اور حال یہ ہے کہ توراۃ اور انجیل کا نزول نہیں ہوا، مگر ابراہیم (علیہ السلام) کے بعد، پس کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔"

﴿وَ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۪ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ ۙ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَ لْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝﴾ (المائدہ: ۴۶۔۴۷)

"اور پیچھے بھیجا ہم نے عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کو جو تصدیق کرنے والا ہے اس کتاب کی جو سامنے ہے تورات اور دی ہم نے اس کو انجیل جس میں ہدایت اور نور ہے اور جو اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرتی ہے اور سرتاسر ہدایت اور نصیحت

ہے پرہیزگاروں کے لیے اور چاہیے کہ اہل انجیل اس کے مطابق فیصلہ دیں جو ہم نے انجیل میں اتار دیا ہے اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے موافق فیصلہ نہیں دیتا پس یہی لوگ فاسق ہیں۔"

﴿وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا یَعْمَلُوْنَ ۟﴾ (المائدہ: ٦٦)

"اور اگر وہ تورات اور انجیل کو قائم رکھتے (تحریف کر کے ان کو مسخ نہ کر ڈالتے) اور اس کو قائم رکھتے جو ان کی جانب ان کے پروردگار کی جانب سے نازل ہوا ہے تو البتہ وہ (فارغ البالی کے ساتھ) کھاتے اپنے اوپر سے اور اپنے نیچے سے بعض ان میں میانہ رو صلاح کار ہیں اور اکثر ان کے بدعمل ہیں۔"

﴿قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ﴾ (المائدہ: ٦٨)

"(اے محمد ﷺ!) کہہ دیجئے: اے اہل کتاب تمہارے لیے ٹکنے کی کوئی جگہ نہیں ہے جب تک تورات اور انجیل اور اس شے کو جس کو تمہارے پروردگار نے تم پر نازل کیا قائم نہ کرو (تا کہ اس کا نتیجہ قرآن کی تصدیق نکلے)۔"

﴿وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ ۚ﴾ (المائدہ: ١١٠)

"اور جب میں نے تجھ کو (اے عیسیٰ علیہ السلام) سکھائی کتاب حکمت تورات اور انجیل۔"

﴿اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ ؗ﴾ (الاعراف: ١٥٧)

"(نیکوکار) وہ شخص ہیں جو پیروی کرتے ہیں الرسول کی جو نبی اُمی ہے اور جس کا ذکر اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔"

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ﴾ (التوبہ: ١١١)

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے خرید لیا ہے مومنوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات پر کہ ان کے لیے جنت ہے وہ اللہ کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں پس قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں ان کے لیے اللہ کا وعدہ سچا ہے جو تورات اور انجیل میں کیا گیا ہے۔"

غرض یہ مدح و منقبت ہے اس تورات اور انجیل کی جو تورات موسیٰ اور انجیل عیسیٰ کہلانے کی مستحق اور درحقیقت کتاب اللہ لیکن یہود و نصاریٰ نے ان الہامی کتابوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ اس کا حال بھی قرآن ہی کی زبان سے سنئے:

﴿ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ (البقرہ: ۷۵)

"کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے حالانکہ ان میں ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ کا کلام سنتا تھا پھر اس کو بدل ڈالتا تھا باوجود اس بات کے کہ وہ اس کے مطالب کو سمجھتا تھا اور دیدہ و دانستہ تحریف کرتے تھے۔"

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴾ (البقرہ: ۷۹)

"پس افسوس ان (مدعیان علم) پر جن کا شیوہ یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں تا کہ اس کے معاوضہ میں ایک حقیر سی قیمت دنیوی فائدہ کی حاصل کریں پس افسوس اس پر جو کچھ وہ لکھتے ہیں اور افسوس اس پر جو کچھ وہ اس ذریعہ سے کماتے ہیں۔"

﴿ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ﴾ (النساء: ٤٦)

"وہ اہل کتاب، کتاب اللہ (تورات و انجیل) کے کلمات کو ان کے محل و مقام سے بدل ڈالتے ہیں یعنی تحریف لفظی اور معنوی دونوں کرتے ہیں۔"

ان کے علاوہ ثمن قلیل (معمولی پونجی) کے عوض آیات اللہ کی فروخت کرنے کے متعلق تو بقرہ، آل عمران، نساء، توبہ میں متعدد آیات موجود ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ، تورات و انجیل کی بیع دونوں طرح کیا کرتے تھے، تحریف لفظی کے ذریعہ بھی اور تحریف معنوی کے سلسلہ سے بھی۔ گویا سیم و زر کے لالچ سے عوام و خواص کی خواہشات کے مطابق کتاب اللہ کی آیات میں لفظی و معنوی تحریف ان کے فروخت کرنے کی حیثیت رکھتی ہے جس سے بڑھ کر شقاوت بدبختی کا دوسرا کوئی عمل نہیں اور جو ہر حالت میں موجب لعنت ہے۔

انجیل اور حواری عیسیٰ علیہ السلام :

مفسرین عام طور پر حواری کو "حور" سے ماخوذ کہتے ہیں جس کے معنی کپڑے کی سپیدی کے ہیں جب کپڑا دھل جانے کے بعد سپید ہو جاتا ہے تو اہل عرب کہا کرتے ہیں "حار الثوب" اس لیے دھوبی کو "حواری" کہتے ہیں اور "حواریون" اس کی جمع آتی ہے۔ اس معنی کے پیش نظر حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں کو یا اس لیے حواری کہتے ہیں کہ ان میں سے اکثر دھوبی اور مچھیرے کا پیشہ کرتے تھے اور یا اس لیے کہ جس طرح دھوبی کپڑا صاف کر دیتا ہے یہ بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے لوگوں کے قلوب کو روشن کر دیا کرتے تھے حواری کے معنی ناصر و مددگار اور ناصح کے بھی آتے ہیں اور عبدالوہاب نجار فرماتے ہیں کہ نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں "شاگرد" کہتے ہیں یہ تعبیر بے اصل نہیں ہے بلکہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ اصل کے اعتبار سے "حبور" عبرانی لفظ ہے جس کے معنی "شاگرد" کے ہیں اور اس کی جمع "حبوریم" آتی ہے یہی حبوریم ہے جو عربی میں جا کر حواری اور حوارین کہلایا۔

Marfat.com

حوارییِن عیسیٰ علیہ السلام کا گذشتہ صفحات میں تفصیل سے ذکر آچکا ہے لیکن قرآن عزیز نے صرف "حواریون" کہہ کر مجمل تذکرہ کیا ہے، کسی کا نام مذکور نہیں ہے، انجیل نے البتہ ان کے نام بھی بتلائے ہیں اور تعداد بھی۔ چنانچہ متی کی انجیل کے باب ۱ میں بارہ نام شمار کیے ہیں اور چار انجیلوں سے خارج برنابا کی متروک انجیل کے باب ۱۴ میں بھی یہی تعداد مسطور ہے البتہ چند ناموں میں اختلاف پایا جاتا ہے، نقشہ حسب ذیل ہے:

انجیل متی

نمبر شمار	نام
۱	پطرس (سمعان)
۲	اندراوس پطرس کا بھائی
۳	یعقوب بن زبدی
۴	یوحنا (یعقوب کا بھائی)
۵	فیلپس
۶	برثولماوس
۷	توما
۸	متی العشار
۹	یعقوب بن حلفی
۱۰	لبادس (ملقب بہ تداوس)
۱۱	مسعان القانوی
۱۲	یہودا اسخریوطی

انجیل برنابا

نمبر شمار	نام
۱	پطرس الصیاد (سمعان)
۲	اندراوس
۳	برنابا
۴	یعقوب بن زبدی
۵	یوحنا بن زبدی
۶	فیلپس
۷	برثولماوس
۸	تداوس
۹	یعقوب بن حلفی
۱۰	یہودا
۱۱	متی العشار
۱۲	یہدا اسخطریوطی [1]

دونوں انجیلوں کے درمیان صرف دو ناموں میں اختلاف ہے، متی میں توما اور سمعان قانوی ہیں اور برنابا میں ان کی جگہ خود برنابا اور تداوس ہیں ان میں کون صحیح کہتا ہے؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے لیکن دلیل کی روشنی میں یہ کہنا بہت آسان ہے کہ کلیسہ کی کونسل نے بے دلیل اور بے سند صرف اس بنا پر برنابا اور اس کے رفیق تداوس کے نام منظور کر دیئے کہ ان دونوں کی روایات الوہیت مسیح علیہ السلام اور کفارہ کے خلاف سچی عیسائیت پر مبنی تھیں اور یہ کلیسہ کے اس عقیدہ کے قطعاً خلاف تھیں جو سینٹ پال کی محرف عیسائیت کا مقبول عقیدہ تھا اور ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ برنابا کا نام موجودہ عیسائیت میں حواریوں سے خارج سمجھا جاتا ہے تاہم ان رسولوں کی فہرست میں آج بھی موجود ہے جنھوں نے ملکوں میں خدائی بادشاہت کا اعلان کیا اور مسیحی دین کی دعوت وتبلیغ کا فرض انجام دیا۔

[1] قصص الانبیاء للنجار ص ۴۸۲۔

Marfat.com

حضرت مسیح علیہ السلام اور موجودہ مسیحیت:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم حق کا خلاصہ گذشتہ بیانات میں سپرد قلم ہو چکا ہے وہ خدا کے سچے پیغمبر حق و صداقت کے داعی دین مبین کے ہادی و مبلغ تھے اور خدا کے تمام سچے پیغمبروں کی طرح ان کی تعلیم بھی پہلی صداقتوں کی موید اور وقت کی انفرادی واجتماعی ضروریات کے انقلابات و حوادث کے مناسب حال انجیل کی شکل میں اصلاح و انقلاب کے لیے منادتھی، توحید خالص، معرفت کردگار کے لیے کردگار سے ہی بلا وسیلہ تقرب، محبت و شفقت، رحمت وعفو کی اخلاقی برتری ان کی پاک تعلیم کا نچوڑ تھا، لیکن انسانی انقلابات کی ذہنی تاریخ میں اس سے زیادہ حیرت اور تعجب کی غالباً کوئی بات نہ ہو کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی مقدس تعلیم ہی کے نام پر موجودہ مسیحیت، توحید کی جگہ تثلیث، معرفت حق کے لیے ابنیت کا عقیدہ، نجات کے لیے علم وعمل کی درستکاری کی جگہ کفارہ پر ایمان جیسی مشرکانہ اور جاہلانہ بدعات کی تبلیغ اور نشر واشاعت میں سرگرم عمل ہے۔

تثلیث؟:

بستانی نے دائرۃ المعارف (Encyclopaedia) میں اس مسئلہ پر مسیحی نقطہ نظر سے سیر حاصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عیسائی مذہب نے سب سے پہلے تثلیث کا نام "رسولوں کے عہد" میں سنا، اس سے قبل مسیحیت اس عقیدہ سے قطعاً ناآشنا تھی اور رسولوں کا عہد سینٹ پال (پولوس رسول) سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہی حضرت ہیں جن کی بدولت دین مسیحی نے نیا جنم لیا اور جن کی یہودیت نے از راہ تعصب مسیحی صداقت و توحید کے عقیدہ کو وثنیت اور شرک سے آلودہ کر کے کامیابی کا سانس لیا، یہ عقیدہ دراصل وثنی (بت پرستانہ) فلسفہ کی موشگافیوں کی پیداوار اور صنم پرستانہ عقیدہ "اوتار" کی صدائے بازگشت ہے اور اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ذات یا صفات خداوندی بشکل انسانی کائنات ارضی میں وجود پذیر ہو سکتی ہے گویا یہ عقیدہ فلاسفہ ہیلانیسن اور غنوسطینین کے عقائد فلسفیانہ کا ایک معجون مرکب ہے۔ چنانچہ تاریخ قدیم سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی عیسوی میں انطاکیہ کے بشپ (Bushap) تھیوفیلوس نے سب سے پہلے اس سلسلہ میں ایک یونانی کلمہ "ٹریاس" کا استعمال کیا اس کے بعد ایک دوسرے بشپ ترتلیانوس نے اس کے قریب قریب ایک لفظ تیرنیتاس ایجاد کیا، یہی وہ یونانی لفظ ہے جو موجودہ مسیحی عقیدہ "ثالوث" (تثلیث) مرادف اور ہم معنی ہے۔ اگر اس مسئلہ کی حقیقت کو ذرا اور گہری نظر سے دیکھنے کی کوشش کی جائے تو تاریخی حقائق سے یہ بات نمایاں نظر آئے گی کہ ثالوث کا عقیدہ دراصل مسیحیت اور وثنیت کی اس آمیزش کا نتیجہ ہے جو مسیحیت کے غلبہ اور وثنیت (بت پرستی) کی مغلوبیت کی وجہ سے پیش آیا خصوصاً جب مصری بت پرستوں نے اس مذہب کو قبول کیا تو انہوں نے اس عقیدہ کو بہت ترقی دی اور فلسفیانہ دقیقہ سنجیوں کے ساتھ اس کو علمی بحث بنا دیا۔ مسیحیت قبول کر لینے کے بعد بت پرستوں پر جو رد عمل ہوا اس کے نتیجہ میں سے ایک اہم بات یہ تھی کہ ان کی خواہش ہمیشہ یہ رہی کہ وہ کس طرح گذشتہ وثنیت کی موجودہ مسیحیت کے ساتھ مطابقت پیدا کریں؟ تا کہ اس طرح قدیم وجدید دونوں ادیان کے ساتھ ربط قائم رہ سکے، چنانچہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد "اسکندریہ کے فلسفہ آمیز اصنامی تخیل سیراپیز (Serapis) سے تثلیثی وحدت کی اصل لی گئی اور ایزیز (Isis) کی جگہ حضرت مریم علیہا السلام کو اور ہورس (Hors) کی حضرت مسیح علیہ السلام کو دی گئی" اور اس یونانی اور مصری فلسفیانہ وثنیت کی بدولت موجودہ مسیحیت میں الوہیت مسیح علیہ السلام اور تثلیث "کلیسہ" کا مقبول عقیدہ بن گیا۔

Marfat.com

یہ عقیدۂ تثلیث ابھی سن طفولیت ہی میں تھا کہ علماء نصاریٰ میں اس کے رد و قبول پر معرکۃ الآراء بحثیں شروع ہوگئیں "نیقاد" کی کونسل میں مشرقی گرجاؤں میں اور خصوصی اور عمومی مجالس میں جب بحث نے طول کھینچا تو کلیسہ نے فیصلہ دیا کہ مسئلہ ثالوث (تثلیث) حق اور اس کے خلاف "الحاد" ہے ان ملحد جماعتوں اور فرقوں میں نمایاں فرقہ "ابیونیین" ہے جو کہتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام انسان محض تھے۔ دوسرا "سابلیین" ہے جس کا خیال ہے کہ خدا ذات واحد ہے اور اب ابن، روح القدس، یہ مختلف صورتیں ہیں جن کا اطلاق مختلف حیثیتوں سے ذات واحد ہی پر ہوتا ہے۔ تیسرا فرقہ "آریوسیین" ہے اس کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اگرچہ "ابن اللہ" ہیں مگر "اب" کی طرح ازلی نہیں ہیں بلکہ کائنات بلند و پست سے قبل "اب" کی تخلیق سے مخلوق ہوا ہے اور اس لیے وہ "اب" سے نیچے اور اس کی قدرت کے سامنے مغلوب و خاضع ہے اور چوتھا فرقہ "مقدونیین" ہے ان کا کہنا ہے کہ "اب" اور "ابن" دو ہی اقنوم ہیں "روح القدس" اقنوم نہیں ہے بلکہ مخلوق ہے۔

کلیسہ نے ان کو اور اسی قسم کے دوسرے فرقوں کو "ملحد" قرار دے کر نیقادی کی کونسل منعقدہ ۳۲۵ء اور قسطنطنیہ کی کونسل منعقدہ ۳۸۱ء کے مطابق ثالوث (تثلیث) کو مسیحی عقیدہ کی بنیاد تسلیم کیا اور فیصلہ دیا کہ "اب" اور "ابن" اور "روح القدس" تینوں جدا جدا مستقل اقنوم (اصل ہیں) اور عالم لاہوت میں تینوں کی وحدت ہی خدا ہے گویا اس طرح ریاضی اور علم ہندسہ کے اٹل اور ناقابل انکار بدیہی مسئلہ کے خلاف یا یوں کہیے کہ بداہۃً عقل کے خلاف یہ تسلیم کر لیا کہ "ایک" تین ہے اور "تین" ایک اور یہ بھی کہا کہ "ابن" ازل ہی میں "اب" سے پیدا ہوا اور "روح القدس" کا صدور بھی ازل ہی میں "اب" سے ہوا ہے اور پھر ۵۸۹ء میں طلیطلہ کونسل نے یہ ترمیم منظور کر لی کہ "روح القدس" کا صدور "اب" سے ہی نہیں بلکہ "اب" اور "ابن" دونوں سے ہوا ہے۔ اس ترمیم کو "لاطینی کلیسہ" نے تو بغیر چون و چرا تسلیم کر لیا اور اس کو کلیسہ کا عقیدہ بنا لیا لیکن "یونانی کلیسہ" اول تو خاموش رہا مگر اس کے کچھ عرصہ کے بعد اس ترمیم کو بدعت قرار دے کر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس باہمی اختلاف نے اس قدر شدید صورت اختیار کر لی کہ "یونانی کلیسہ" اور "کیتھولک لاطینی کلیسہ" کے درمیان کبھی اتفاق و اتحاد پیدا نہ ہوسکا۔

ثالوث یا تثلیث کا یہ عقیدہ دین مسیحی کے رگ و پے میں خون کی طرح ایسا سرایت کر گیا کہ مسیحی کے بڑے فرقوں رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کے درمیان سخت بنیادی اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر اس میں اتفاق ہی رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل حیرت ہے یہ بات کہ لوتھر کی جماعت اور اصلاح پسند کلیساؤں نے بھی ایک عرصہ دراز تک اس کیتھولک عقیدہ کو ہی بغیر کسی اصلاح و ترمیم کے عقیدہ تسلیم کر لیا البتہ تیرھویں صدی عیسوی میں فرقہ لاہوتی کی اکثریت نے اور جدید فرقوں سوسینیائی، جرمانی، موحدین اور عمومیین وغیرہم نے اس عقیدہ کو نقل و عقل کے خلاف کہہ کر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ [1]

یہ ہے مسیحیت میں عقیدۂ تثلیث کی وہ مختصر تاریخ جس سے یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جاتی ہے کہ دین مسیحی کی حقیقی صداقت کی تباہی کا راز اسی الحاد اور مشرکانہ بدعت کے اندر پوشیدہ ہے جو صنم پرستانہ تخیل کا رہین منت ہے۔

عقیدۂ ثالوث کیا شے ہے اور "اب" "ابن" "روح القدس" کی تعبیرات کی حقیقت کیا ہے یہ مسئلہ بھی مسیحیت کے ان مباحث میں سے ہے جن کا فیصلہ کن جواب کبھی نہ مل سکا اور جس قدر اس کو صاف اور واضح کرنے کی کوشش کی گئی اس میں الجھاؤ اور

[1] دائرہ المعارف للبستانی ج ۶ ص ۳۰۵ کلمہ (ثالوث)

پیچیدگی کا اضافہ ہی ہوتا گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ جس عقیدہ کو مسیحیت میں اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل تھی وہی "معمہ" بن کر رہ گیا اور قدیم وجدید علماء نصاریٰ کو یہ کہنا پڑا کہ تثلیث میں توحید ہے اور توحید میں تثلیث، یہ مذہب کا ایسا مسئلہ ہے جو دنیا میں حل نہیں ہو سکتا اور دوسرے عالم میں پہنچ کر ہی یہ عقیدہ حل ہوگا۔ اس لیے یہاں اس کو عقل سے سمجھنے کی کوشش کرنا فضول ہے بلکہ خوش عقیدگی کے ساتھ قبول کر لینا ہی نجات کی راہ ہے۔ چنانچہ اواخر انیسویں صدی کے مشہور عیسائی عالم پادری فنڈر نے "میزان الحق" میں یہی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاہم اس صنم پرستانہ فلسفہ کی جو تشریحات کی گئی ہیں ان کو مختصر طور پر یوں سمجھنا چاہیے کہ اس کائنات ہست و بود کو جس میں ہم بس رہے ہیں "عالم ناسوت" کہا جاتا ہے اور ملاء اعلیٰ کہ جس کا تعلق عالم غیب سے ہے وہ اور اس سے ماوراء جہاں نہ زمین و زماں کا گزر اور نہ مکین و مکان کا جہاں سب کچھ ہے لیکن مادیت سے بالاتر اور وراء الوراء ہے اس کا نام "عالم لاہوت" ہے تو جب زیر و بالا اور بلند و پست کچھ بھی نہ تھا اور ازل کی غیر محدود وسعت میں "وقت" ایک بے معنی لفظ تھا اس وقت تین اقنوم [1] تھے "باپ" "بیٹا" "روح القدس" اور ان ہی تین اقانیم کی مجموعی حقیقت کا نام "خدا" ہے۔ رومن کیتھولک، پراٹسٹنٹ اور ان دونوں سے جدا کلیسۂ شرقی تینوں ہی اس پر متفق ہیں اور اسی کو دین مسیحیت کی روح یقین کرتے ہیں اور بڑی جسارت کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ کتاب مقدس کی تصریحات اسی کا اعلان کرتی ہیں۔

اس عجوبہ روزگار عقیدہ نے اس حد پر پہنچ کر جو نئے نئے مباحث و افکار پیدا کیے ان کا مطالعہ کرنے سے دیدۂ حیرت اور چشم عبرت کے لیے بہت کچھ سامان مہیا ہو جاتا ہے، بڑی بڑی مذہبی کونسلوں، بڑے بڑے کلیساؤں کے بشپوں اور پاپاؤں نے اس عقیدہ کی تشریح میں یہ عجیب و غریب مباحث پیدا کیے کہ "اقنوم اول" باپ سے کس طرح اقنوم ثانی بیٹے کی ولادت ہوئی اور پھر باپ سے یا باپ اور بیٹے دونوں سے کس طرح اقنوم ثالث "روح القدس" پھوٹ کر نکلی یا کس طرح اس کا صدور ہوا اور یہ کہ ان کے باہم نسبت کیا ہے اور ان کے جدا جدا کیا القاب و صفات ہیں جو ایک دوسرے کو آپس میں متمائز کرتے ہیں اور پھر جب یہ تثلیث توحید بن جاتی ہے تو اس کی صفات و القاب کی کیا صورت ہو جاتی ہے، نیز یہ کہ جس کو ہم خدا کہتے ہیں اس میں تینوں اقانیم برابر کے شریک ہیں یا کوئی ایک پورا اور دوسرے دو جزوی حصہ دار ہیں اور جزوی شرکت ہے تو کس نسبت اور تعلق سے ہے؟ غرض خدائے برتر کی مقدس اور پاک ہستی کو معاذ اللہ کمہار کے چاک پر رکھا ہوا برتن فرض کر کے جس طرح اس کو بنایا اور تیار کیا ہے اور توحید خالص کو تباہ و برباد کر کے جس طرح شرک و ترکیب کا نیا سانچہ ڈھالا ہے دنیائے مذاہب و ادیان کی تاریخ میں ایسا مذہبی تغیر و انقلاب چشم فلک نے نہ کبھی دیکھا نہ سنا ان هذا الشیء عجاب۔ بہرحال "باپ" "بیٹا" "روح القدس" کی جدا جدا تفصیلات و تشریحات اور پھر وحدت سے ترکیب اور ترکیب سے وحدت کی عجوبہ زا تعبیرات کی ایک بھول بھلیاں ہے جس کا کہیں اور چھور نظر ہی نہیں آتا اور جب کہنے والا ہی لفظی تعبیرات کے علاوہ "حقیقت" سمجھنے سے عاری ہے تو سننے والا کیا خاک سمجھ سکتا ہے۔

باپ: اقانیم ثلاثہ میں "اب" پہلا اقنوم ہے۔ اسی سے اقنوم ثانی کی ولادت ہوئی اور "عالم لاہوت" میں یہ کبھی بھی دوسرے اور تیسرے اقانیم سے جدا نہیں ہوتا، مگر مسیحی فرقوں میں کنیسہ کی عام تعلیم کے مطابق اکثر فرقے یہ کہتے ہیں کہ وحدت لاہوت میں تینوں

[1] اقنوم کے معنی "اصل"

Marfat.com

کا درجہ مساوی ہے اور کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں ہے اور آریوسی کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ دوسرا اقنوم "بیٹا" اقنوم اول کی طرح ازلی نہیں ہے البتہ عالم بالا و پست سے غیر معلوم مدت پہلے اقنوم اول سے پیدا ہوا ہے اس لیے اس کا درجہ "باپ" کے بعد اور اس سے کم ہے اور مقدونی فرقہ کہتا ہے کہ صرف دو ہی اقنوم ہیں "باپ" اور "بیٹا" اور "روح القدس" مخلوق ہے اور فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جس کا پایہ تمام ملائکۃ اللہ سے بلند ہے اور طلیطلہ کی کونسل کا فیصلہ یہ ہے کہ روح القدس "باپ" اور "بیٹا" دونوں سے پھوٹ کر نکلی ہے یا دونوں سے ہی اس کا صدور ہوا ہے مگر قسطنطنیہ کی کونسل روح القدس کو صرف باپ ہی سے صادر ہونا بتلاتی ہے اور قدیم و جدید فرقوں میں سے ایک بڑی جماعت اقنوم ثالث مریم علیہا السلام کی تسلیم کرتی اور روح القدس کے اقنوم ہونے کا انکار کرتی ہے۔

بیٹا: عربی میں "ابن" فرنچ میں "فی"..... اور انگریزی میں (Son) اور اُردو میں "بیٹا" کہتے ہیں، یہ اس شکل انسانی پر بولا جاتا ہے جو عام قانون قدرت کے مطابق مرد و عورت کے جنسی تعلقات کا نتیجہ ہوتا ہے مگر عقیدۂ ثالوث کے مطابق وہ عالم لاہوت میں "باپ" سے جدا بھی نہیں ہے اور پیدا بھی ہے اور پھر بعض کے نزدیک اس کی پیدائش ازلی ہے اور بعض کے نزدیک غیر ازلی، آگے چل کر کہتے ہیں کہ جب "باپ" کی مشیت کا فیصلہ ہوا تو اقنوم ثانی "بیٹا" عالم ناسوت (کائنات ہست و بود) میں مریم کے بطن سے پیدا ہو کر "مسیح" کہلایا اور بعض کا تو یہ دعویٰ ہے کہ خود باپ ہی عالم ناسوت میں بیٹا بن کر مریم کے بطن سے تولد ہوا اور مسیح علیہ السلام کی شکل میں روشناس ہوا اور طرفہ تماشا یہ کہ بعض کے نزدیک تو اقنوم ثانی "ابن" کو اقنوم اول "اب" پر برتری اور تفوق حاصل ہے۔

روح القدس: اسی طرح "روح القدس" کے متعلق بھی سخت اختلاف ہے: کوئی کہتا ہے کہ وہ اقنوم ہی نہیں ہے اس لیے عالم لاہوت میں اس کو الوہیت حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ مکدونی اور آریوسی کہتے ہیں کہ وہ ملائکۃ اللہ میں سے ہے اور ان میں سب سے برتر و بلند ہے اور ماراتونیوس کہتا ہے کہ "روح القدس" کی تعبیر مجاز ہے اور اللہ تعالیٰ کے افعال پر مجازاً اس کا اطلاق کیا جاتا ہے ورنہ الگ سے کوئی حقیقت نہیں ہے اس بناء پر اس قول کے قائلین کو "مجازئین" کہا جاتا ہے اور علماء جدید میں کلارک کہتا ہے کہ الہامی کتابوں عہد نامہ قدیم و جدید میں کسی ایک جگہ بھی "الوہیت" کا درجہ نہیں دیا گیا، فرقہ مکدونی نے الوہیت روح القدس کا انکار کرتے ہوئے شدومد سے یہ کہا ہے کہ اگر جوہر الوہیت میں روح القدس کو بھی دخل ہوتا تو یا وہ مولود ہوتی یا غیر مولود، اگر مولود ہے تو اس کے اور "ابن" کے درمیان کیا فرق رہا اور اگر غیر مولود ہے تو اس کے اور "اب" کے درمیان کیا امتیاز ہے۔

ان کے مقابلہ میں دوسری جماعتیں کہتی ہیں کہ "روح القدس" کو بھی الوہیت حاصل ہے یوسیو رومانی کہتا ہے کہ "روح القدس" کا صدور "اب" اور "ابن" دونوں سے ہوا اور وہ ان کے جوہر نفس سے ہے اور دونوں کے ساتھ وحدت لاہوت میں "الٰہ" ہے اور اثناسیوس کہتا ہے کہ روح القدس کی الوہیت ناقابل انکار ہے اور کتب سماویہ میں روح پر "الٰہ" کا اور اللہ پر "روح" کا اطلاق ثابت و مسلم ہے اور اس کی جانب ان ہی امور کی نسبت کی گئی ہے جن کا تعلق ذات خدا کے ماسوا اور کسی سے نہیں ہے مثلاً تقدیس ذات، معرفت جمیع حقائق وغیرہ اور یہ عقیدہ قدیم سے چلا آتا ہے جیسا کہ نظم وسولجیا سے ثابت ہے جس کی قدامت تالیف سب کے نزدیک مسلم ہے اس میں الوہیت "روح القدس" کا اعتراف موجود ہے اور مولٹ لفیلو پیٹرس نے انکار الوہیت روح پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ نصاریٰ کے نزدیک خدائے حقیقی کی توحید کا تثلیث میں مضمر ہونا ایک مسلم حقیقت ہے پھر روح کو الوہیت سے خارج کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور مکدونیوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مار اثناسیوس کہتا ہے کہ کتب سماوی میں روح کو ابن نہیں کہا گیا بلکہ روح

Marfat.com

الاب اور روح الابن کے اطلاقات پائے جاتے ہیں لہٰذا اس کو "ابن" یا "اب" کہنا صحیح نہیں اور نہ اس کو الوہیت سے نکال کر مخلوق کہنا درست ہوسکتا ہے اور ادراک بشری عاجز ہے کہ ان فلسفیانہ بحثوں سے "روح القدس" کی حقیقت تک پہنچ سکے البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فقط تولید (پیدا ہونا) ہی تنہا ایسا واسطہ نہیں ہے جو "اب" کے ساتھ قائم ہو بلکہ انبثاق (صدور یا پھوٹ نکلنا) بھی ایک شکل ہوسکتی ہے مگر ہم اس دنیا میں تولید و انبثاق کے درمیان فرق ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہیں البتہ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ تولید و انبثاق دونوں کا "اب" کے ساتھ ازلی و ابدی اور تلازم کا تعلق ہے۔ پس ہمارے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ فلاسفہ قدیم (فلاسفہ یونان) کی طرح "روح القدس" اور "اب" کے درمیان فلسفیانہ موشگافیوں کے ذریعہ وہ اعتقادات قبول کرلیں جو انہوں نے خدا سے صدور ارواح کے متعلق پیدا کرلیے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ وہ اختلافات بھی پیش نظر رہنے چاہئیں جو گزشتہ سطور میں بیان ہوچکے ہیں کہ بعض کلیسہ "روح القدس" کا فقط اقنوم اول (باپ) سے صادر ہونا مانتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ "باپ" اور "بیٹا" دونوں سے اس کا صدور ہوا ہے، یہ اختلاف بھی عیسائی فرقوں کے درمیان سخت کشاکش کا سبب رہا ہے کیونکہ ۳۸۱ء میں منعقدہ کونسل قسطنطنیہ نے "منشور ایمانی" میں یہ واضح کردیا تھا کہ روح القدس کا صدور "باپ" ہی سے ہوا ہے اور عرصہ تک یہی عقیدہ مسیحی دنیا میں نافذ رہا لیکن ۴۴۷ء میں اول ہسپانیہ کے کلیسہ نے پھر فرانس کے کلیسہ نے اور اس کے بعد تمام لاطینی رومن کلیساؤں نے اس ترمیم کو جزء عقیدہ بنایا کہ "روح القدس" کا صدور اقنوم اول (باپ) اور اقنوم ثانی (بیٹا) دونوں سے ہوا ہے، عیسائی علماء کہتے ہیں کہ دراصل یہ بحث ۸۶۶ء میں سب سے پہلے شرق کے بطرق فوتیوس نے اس لیے پیدا کی کہ اس کی اور اس کی جماعت کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح شرق (یونان) کے کلیسہ کو غرب (روم) کے کلیسہ سے جدا کردیا جائے اور مشرق و مغرب کے کلیساؤں کا اتحاد باقی نہ رہنے دیا جائے، اسی خیال کی تائید و تقویت کے لیے ۱۰۴۳ء میں بطریق میخائیل کرولاریوس نے اس عقیدہ کو بہت جلد شائع کیا اور آخر کار صدیوں تک ان اختلافات نے کلیسہ ہائے مشرق و مغرب کے درمیان مخالفانہ کشمکش کو قائم رکھا اور دونوں کلیسہ ایک دوسرے پر یہ الزام قائم کرتے رہے کہ مخالف کلیسہ نے مسیحیت میں الحاد و بدعت کی آمیزش کرکے حقیقی مذہب کو مٹا ڈالا ہے اور رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کی بالعموم اور کلیساؤں کے مختلف فرقوں کی بالخصوص کشمکش کا یہ سلسلہ اس وقت تو انتہائی شدت اختیار کرچکا تھا اور باہم ہولناک خونریزیوں اور بہیمانہ مظالم کا جہنم بن چکا تھا جبکہ اسلام اعتقادات کی سادگی، اعمال صالحہ کی پاکیزگی اور اپنی علمی و عملی روحانیت کی شگفتگی کی بدولت "امن عام" اور "رحمت" کا نیر درخشاں بنا ہوا تھا۔

ازمنہ مظلمہ اور اصلاح کنیسہ کی آواز:

یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائیوں کے مذہبی کلیسہ معمولی معمولی اختلافات کی بناء پر پوپ کی حکومت اور پیروان پوپ کی حکومتوں کے ذریعہ ایک دوسری جماعت کو گردن زدنی اور کشتنی قرار دیتی اور ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کو وحشت ناک عذابوں میں مبتلاء کر کے قتل کردیا کرتی تھیں اسی بناء پر مؤرخین تاریخ کے اس دور کی ازمنہ مظلمہ (زمانہ ہائے تاریک) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

قرآن نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق جس حقیقت اور صداقت کا اظہار کیا تھا پوپ اور کلیسا سے مرعوبیت نے اگرچہ ایک مدت مدید تک عیسائیوں کو اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیا مگر پھر بھی یہ صدائے حق اثر کیے بغیر نہ رہ سکی اس کی تفاصیل اگرچہ خاتم

الانبیاء محمد ﷺ کی حیات طیبہ میں مذکور ہوں گی لیکن یہاں صرف اس قدر اشارہ کرنا مقصود ہے کہ رومن کیتھولک، پراٹسٹنٹ اور دوسرے فرقوں نے بغیر کسی جھجک کے سینٹ پال کی تحریف (تثلیث) مسیحیت کا بنیادی عقیدہ تسلیم کر لیا تھا اور اگرچہ بعض چھوٹی جماعتوں یا افراد نے کبھی کبھی اس کے خلاف آواز اٹھائی مگر وہ آواز دب کر رہ گئی اور نقار خانہ میں طوطی کی صدا سے زیادہ اس کی حیثیت نہ بن سکی مثلاً ۳۲۵ء اور ۳۸۱ء میں جب نیقادی کونسل اور قسطنطنیہ کونسل نے تثلیث کو دین مسیحی کی بنیاد قرار دیا اس وقت ابوئیین نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام صرف انسان ہیں اور الوہیت کا ان سے کوئی علاقہ نہیں اور سابلیین کہتے تھے کہ اقانیم ثلاثہ، تین مختلف جوہر نہیں ہیں بلکہ وحدت لاہوتی کی مختلف صورتیں اور تعبیریں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ صرف اپنی ذات واحد کے لیے اطلاق کرتا ہے تاہم اس وقت تک چونکہ پوپ اور کلیسہ کے فیصلے خدائی فیصلے سمجھے جاتے تھے اور بشپ اور پاپا "اربابا من دون اللہ" یقین کیے جاتے تھے اس لیے ان اصلاحی آوازوں کو "الحاد" کہہ کر دبا دیا گیا مگر جب صلیبی جنگوں نے عیسائیوں کو مسلمانوں کے اتنے قریب کر دیا کہ انہوں نے اسلام کے اعتقادی اور عملی نظام کا بہت کچھ نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اسلام سے متعلق بطارقہ (Batariqa) بساقفہ (Bishaqifa) کی غلط بیانی اور بہتان ان پر ظاہر ہونے لگی تب ان میں بھی آزادی فکر نے کروٹ لی اور کورانہ تقلید کو شکست و ریخت کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ چنانچہ لوتھر کی آواز پہلی صدائے حق تھی جس نے جرأت کے ساتھ "اربابا من دون اللہ" کے بتوں کو ماننے سے انکار کر دیا اور پوپ کے مقابلہ میں کتاب مقدس کی پیروی کی دعوت دی مگر آپ کو تعجب ہوگا یہ سن کر کہ پوپ کی جانب سے لوتھر کے خلاف جو الحاد اور بد دینی کے الزامات لگائے گئے تھے ان میں سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ یہ درپردہ "مسلمان" ہو گیا ہے اور پاپا کے خلاف اس کی صدا قرآن کی صدائے بازگشت ہے۔

بہرحال یہی وہ صدائے اصلاح تھی جو بلاشبہ اسلام کی دعوت تفکر و تعقل سے متاثر ہو کر آہستہ آہستہ "اصلاح کنیسہ" کے نام سے مسیحی دنیا میں گونج اٹھی اور آگ کی طرح ہر طرف اس کے شعلے نظر آنے لگے ان ہی اصلاحات میں سے ایک اہم اصلاحی تخیل یہ بھی تھا کہ عقیدۂ ثالوث کتاب مقدس (عہد نامہ جدید) کے قطعاً خلاف ہے۔ چنانچہ تیرھویں صدی عیسوی میں قدیم لاہوتی فرقہ کے جمہور نے نسطوری فرقہ کے جماعتی فیصلہ نے اور جدید جماعتوں میں سے سوسینیانیین .... جرمانیین .... موحدین..... اور عمومیین اور دوسری جماعتوں نے تعلیم کلیسا کے خلاف مذہبی بغاوت کرتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ تثلیث کا عقیدہ نقل و عقل دونوں کے خلاف اور ناقابل تسلیم ہے اور اگرچہ قومی و مذہبی عصبیت نے ان کو اسلامی عقیدہ کا پیرو ہونے سے باز رکھا تاہم انہوں نے عقیدۂ تثلیث کی مختلف شکلوں کے ساتھ ایسی تعبیرات کرنی شروع کر دیں جس سے عقیدۂ ثالوث باطل ہو کر توحید الٰہی کے پاک اور مقدس جراثیم پیدا ہونے لگے مثلاً سوئڈنبرگ نے کہا: "اقانیم ثلاثہ" "باپ" "بیٹا" "روح القدس" کا تعلق حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات کے ماسوا ذات احدیت سے نہیں ہے یعنی مسیح علیہ السلام کی ذات اپنی طبع لاہوتی کے پیش نظر "باپ" ہے اور عالم ناسوت میں انسانی شکل کی تقید کی وجہ سے "بیٹا" اور اقنوم ثانی" ہے اور اس حیثیت سے کہ روح القدس کا صدور اس سے ہوا ہے وہ اقنوم ثالث "روح" ہے غرض "ثالوث" کا تعلق صرف حضرت مسیح علیہ السلام سے ہے اور کانٹ (Cant) کہتا ہے کہ عقیدۂ ثالوث کے یہ معنی نہیں ہیں کہ "باپ" "بیٹا" "روح القدس" بلکہ یہ عالم لاہوت میں خدائے برتر کی تین بنیادی صفات کی جانب اشارہ ہے جو باقی تمام صفات کے لیے مصدر اور منبع کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ "قدرت" (اب) حکمت (ابن) اور "محبت" (روح) ہیں یا اللہ کے ان تین افعال کی جانب اشارہ ہے جو "خلق" "حفظ" اور "ضبط" کے

Marfat.com

نام سے بھی تعبیر کیے جاتے ہیں اور ہیگن اور شیلنگ نے اس خیال کی کافی اشاعت کی کہ عقیدۂ ثالوث حقائق کی طرح کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ایک تخیلی نظریہ ہے ان کی مراد یہ ہے کہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے خدائے برتر کی ذات وحدہ لاشریک لہٗ ہے اور مسیح علیہ السلام مخلوق خدا، لیکن عام خیال و تصور میں جب ہم لاہوتی عالم کی جانب پرواز کرتے ہیں تو ہمارا خیال اس عالم میں خدا، مسیح علیہ السلام اور روح القدس کو "اب" "ابن" اور "روح" کی تعبیرات دیتا اور ان کے باہم تعلق کو اقانیم ثلاثہ کی حیثیت میں دیکھتا ہے۔

"عقلیین" "لوتھرین" اور "موحدین" اور "جرمانیین" کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں جو سابلیین کے عقیدہ کو اختیار کر کے ایک بڑی جماعت کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یورپ کی نشاۃ جدید میں بھی عام طور پر تمام کلیساؤں کا ثالوث (تثلیث) پر ہی عقیدہ ہے اور ان کے نزدیک اس کلمہ کی تعبیر وہی ہے جو چوتھی صدی عیسوی میں متعدد مذہبی کونسلوں نے کی اور جو بلاشبہ شرک جلی اور توحید کے یکسر منافی ہے۔

قرآن اور عقیدۂ تثلیث:

نزول قرآن کے وقت جمہور مسیحی جن بڑے فرقوں میں تقسیم تھے ثالوث کے متعلق ان کا عقیدہ تین جدا جدا اصولوں پر مبنی تھا ایک فرقہ کہتا تھا کہ مسیح علیہ السلام عین خدا ہے اور خدا ہی بشکل مسیح علیہ السلام دنیا میں اتر آیا ہے اور دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ مسیح ابن اللہ (خدا کا بیٹا) ہے۔ اور تیسرا کہتا تھا کہ وحدت کا راز تین میں پوشیدہ ہے۔ باپ، بیٹا، مریم اور اس جماعت میں بھی دو گروہ تھے اور دوسرا گروہ حضرت مریم علیہا السلام کی جگہ "روح القدس" کو اقنوم ثالث کہتا تھا، غرض وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو ثالث ثلاثہ (تین میں کا تیسرا) تسلیم کرتے تھے اس لیے قرآن کی صدائے حق نے تینوں جماعتوں کو جدا جدا بھی مخاطب کیا ہے اور یکجا بھی اور دلائل و براہین کی روشنی میں مسیحی دنیا پر یہ واضح کیا ہے کہ اس بارہ میں راہ حق ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ مسیح علیہ السلام مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا شدہ انسان اور خدا کا سچا پیغمبر اور رسول ہے باقی جو کچھ بھی کہا جاتا ہے وہ باطل محض ہے...... خواہ اس میں تفریط ہو جیسا کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ العیاذ باللہ وہ شعبدہ باز اور مفتری تھے یا افراط ہو جیسا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ وہ خدا ہیں اور خدا کے بیٹے ہیں یا تین میں کے تیسرے ہیں۔

قرآن عزیز نے صرف یہی نہیں کیا کہ نصاریٰ کے تردیدی پہلو کو ہی اس سلسلہ میں واضح کیا ہو بلکہ اس کے علاوہ حضرت مسیح علیہ السلام کی شان رفیع کی اصل حقیقت کیا ہے اور عند اللہ ان کو کیا قربت حاصل ہے، اس پر بھی نمایاں روشنی ڈالی ہے تاکہ اس طرح یہود کے عقیدہ کی بھی تردید ہو جائے اور افراط و تفریط سے جدا راہ حق آشکارا نظر آنے لگے۔

حضرت مسیح علیہ السلام خدا کے مقرب اور برگزیدہ رسول ہیں:

﴿قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۟ۙ وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۪۟ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ ؗ وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ۝ وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ۝﴾ (مریم: ۳۰-۳۳)

"(مسیح علیہ السلام نے کہا) بیشک میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس نے مجھ کو نبی بنایا ہے اور مجھ کو مبارک ٹھہرایا جہاں بھی میں رہوں اور اس نے مجھ کو نماز کی اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی جب تک بھی زندہ رہوں اور اس نے مجھ کو میری والدہ کے لیے نیکوکار بنایا اور مجھ کو سخت گیر اور بدبخت نہیں بنایا مجھ پر سلامتی ہو جب میں پیدا ہوا جب میں مرجاؤں اور جب حشر کے لیے زندہ اٹھایا جاؤں۔"

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ وَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ۝ وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ اتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝﴾ (الزخرف: ۵۹-۶۱)

"وہ (مسیح علیہ السلام) نہیں ہے مگر ایسا بندہ جس پر ہم نے انعام کیا اور میں نے اس کو مثال بنایا ہے بنی اسرائیل کے لیے اور اگر ہم چاہتے تو کر دیتے ہم تم میں سے فرشتے زمین میں چلنے پھرنے والے اور بلاشبہ وہ (مسیح علیہ السلام) نشان ہے قیامت کے لیے۔ پس اس بات پر تم شک نہ کرو اور میری پیروی کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔"

﴿وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ﴾ (الصف: ۶)

"اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے کہا اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا رسول ہوں تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے تورات اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے۔"

حضرت مسیح علیہ السلام نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ (المائدہ: ۱۷)

"بلاشبہ ان لوگوں نے کفر اختیار کر لیا جنھوں نے یہ کہا "بیشک اللہ وہی مسیح بن مریم" ہے" کہہ دیجیے کہ اگر اللہ یہ ارادہ کر لے کہ مسیح بن مریم (علیہما السلام)، مریم اور کائنات زمینی پر جو کچھ بھی ہے سب کو ہلاک کر ڈالے تو کون شخص ہے جو اللہ سے (اس کے خلاف) کسی شے کے مالک ہونے کا دعویٰ کر سکے اور اللہ کی بادشاہت ہے آسمانوں کی اور زمین کی وہ جو چاہتا ہے اس کو پیدا کر سکتا ہے اور اللہ ہر شئے پر قدرت رکھنے والا ہے۔"

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ

أَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾ (المائدہ: ۷۲)

"بلاشبہ ان لوگوں نے کفر اختیار کیا جنھوں نے کہا بلاشبہ اللہ وہی مسیح بن مریم (علیہ السلام) ہے۔ حالانکہ مسیح (علیہ السلام) نے یہ کہا: اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے بیشک جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے پس یقیناً اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مددنہیں ہے۔"

﴿وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾﴾ (البقرہ: ۱۱۶)

"اور انہوں نے کہا: اللہ نے "بیٹا" بنالیا ہے وہ ذات تو ان باتوں سے پاک ہے بلکہ (اس کے خلاف) اللہ کے لیے ہی ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے ہر شے اللہ کے لیے تابع دار ہے۔"

﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾﴾ (آل عمران: ۵۹)

"بلاشبہ عیسیٰ (علیہ السلام) کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے کہ اس کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اس کو کہا ہو جا تو وہ ہو گیا۔"

﴿يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ۫ وَ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾﴾ (النساء: ۱۷۱)

"اے اہل کتاب اپنے دینی معاملہ میں حد سے نہ گزرو اور اللہ کے بارے میں حق کے ماسوا کچھ نہ کہو بلاشبہ مسیح ابن مریم (علیہ السلام) اللہ کے رسول ہیں اور اس کا کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم پر ڈالا (یعنی بغیر باپ کے اس کے حکم سے مریم کے بطن میں وجود پذیر ہوئے) اور اس کی روح ہیں۔ پس اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تین (اقانیم) نہ کہو اس سے باز آ جاؤ تمہارے لیے بہتر ہوگا بلاشبہ اللہ خدائے واحد ہے پاک ہے اس سے کہ اس کا بیٹا ہو، اسی کے لیے ہے (بلاشرکت غیرے) جو کچھ بھی ہے آسمانوں اور زمین میں اور کافی ہے اللہ "وکیل" ہو کر۔"

﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾﴾ (الانعام: ۱۰۱)

"وہ (خدا) موجد ہے آسمانوں اور زمین کا اس کے لیے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے اور نہ اس کی بیوی ہے اور اس نے کائنات کی ہر شے کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔"

﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ﴾ (المائدہ: ۷۵)

Marfat.com

"مسیح بن مریم (علیہ السلام) نہیں ہیں مگر خدا کے رسول بلاشبہ ان سے پہلے رسول گزر چکے ہیں اور ان کی والدہ صدیقہ ہیں، یہ دونوں کھانے کھاتے تھے، (یعنی دوسرے انسانوں کی طرح کھانے پینے وغیرہ امور میں وہ بھی محتاج تھے)۔"

﴿لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَ مَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝﴾ (النساء: ۱۷۲)

"ہرگز مسیح (علیہ السلام) اس سے ناگواری نہیں اختیار کرے گا کہ وہ اللہ کا بندہ کہلائے اور نہ مقرب فرشتے حتیٰ کہ روح القدس "جبرئیل" ناک بھویں چڑھائیں گے اور جو عبادت سے ناگواری کا اظہار کرے اور غرور اختیار کرے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی جانب اکٹھا کرے گا یعنی جزا و سزا کے دن سب حقیقت حال کھل جائے گی۔"

﴿وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِۨابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝﴾ (التوبہ: ۳۰)

"اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور نصاریٰ کہتا ہے مسیح (علیہ السلام) خدا کا بیٹا ہے یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں ریس کرنے لگے اگلے کافروں کی بات کی اللہ ان کو ہلاک کرے کہاں سے پھرے جاتے ہیں۔"

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۝ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝﴾ (الاخلاص: ۱۔۴)

"اے (محمدؐ) کہہ دیجئے اللہ یکتا ہے، اللہ بے نیاز ہستی ہے، نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور کائنات میں کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔"

قرآن نے اس سلسلہ میں اپنی صداقت اور اصلاح عقائد و اعمال کا جو مدلل اور واضح اعلان کیا اس کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ موجودہ کتاب مقدس کے محرف اور مسخ کر دیے جانے کے باوجود جس شکل و صورت میں آج موجود ہے وہ کسی ایک مقام پر بھی "ثالوث" کے اس عقیدہ کا پتہ نہیں دیتی جس کی تفصیلات و تشریحات ابھی سطور بالا میں علماء نصاریٰ، مذہبی کونسلوں اور کلیساؤں سے نقل ہو چکی ہیں اور بجز تعبیر کے جگہ جگہ حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے خدا کو "باپ" اور خود کو "بیٹا" ظاہر کیا گیا ہے اس کے لیے اور کوئی ثبوت واضح اور مصرح طور پر مہیا نہیں ہے۔ پس اگر ہم اس سے قطع نظر بھی کر لیں کہ یہ تعبیرات "تحریفی" اور صنم پرستی کے تخیل کی رہین منت ہیں اور اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیں کہ خدائے برتر کی جانب سے سچی الہامی انجیل میں بھی یہ تعبیرات موجود تھیں تب بھی ان سے نصاریٰ کا عقیدۂ "تثلیث" کسی طرح صحیح ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ "ابن" کا لفظ اگرچہ حقیقی معنی کے لحاظ سے اس انسان پر بولا جاتا ہے جو کسی کی صلب یا کسی کے بطن سے مادہ منویہ کے ذریعہ پیدا ہوا ہو، تاہم محاورات زبان اور اہل زبان کے استعمالات و اطلاقات شاہد ہیں کہ یہ لفظ کبھی مجاز کے طور پر اور کبھی تشبیہ یا کنایہ کے طریق سے اور بھی مختلف معانی پر بولا جاتا ہے مثلاً ایک بڑی عمر کا شخص اپنے سے چھوٹے کو مجازاً "ابن" (بیٹا) کہہ دیا کرتا ہے یا بادشاہ اپنی رعایا کو "اولاد" کہہ کر خطاب کرتا ہے یا استاد اپنے شاگردوں کو "بیٹا" کہہ کر پکارتا ہے یا جو شخص کسی علم و ہنر کا ماہر یا اس کی خدمت میں سرشار ہوتا ہے تو اس کو کنایۃً اس علم و ہنر کا بیٹا کہہ کر یاد کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں "ابن القانون" "ابن الفلسفہ" "ابن الفلاحۃ" "ابن الحدادہ" یا دنیا طلبی کی حرص و آرزو میں اگر حد

سے گزر چکا ہے تو اس کو "ابن الدراہم" "ابن الدنانیر" کہہ دیا کرتے ہیں، اسی طرح مسافر کو "ابن السبیل" مشہور شخصیت کو "ابن جلا" بڑے ذمہ دار انسان کو "ابن لیلہا" آنے والے دن سے بے پرواہ شخص کو "ابن یومیہ" دنیا ساز ہستی کو "ابن الوقت" کہتے ہیں یا جس کے اندر کوئی وصف نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے تو اس وصف کی جانب لفظ ابن کو منسوب کر کے ذات موصوف کو یاد کرتے ہیں مثلاً صبح کو "ابن ذکاء" کہتے ہیں اور ان تمام مثالوں سے زیادہ یہ کہ انبیاء بنی اسرائیل اپنی امتوں کو ابناء اور اولاد کے ساتھ ہی خطاب کرتے اور نصائح و مواعظ میں یہ ظاہر فرماتے ہیں کہ امم واقوام انبیاء علیہم السلام کی روحانی اولاد ہوتی ہیں۔

اور یہی حال "اب" اور "باپ" کے اطلاقات واستعمالات کا ہے، ایک چھوٹا اپنے بڑے کو، ایک ضرورت مند اپنے مربی کو، ایک شاگرد اپنے استاد کو، ایک امتی اپنے نبی رسول کو "اب" اور "باپ" کہنا فخر سمجھتا ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تمام اطلاقات مجاز، کنایہ اور تشبیہ کے طور پر کیے جاتے ہیں اسی طرح بے نظیر مقرر اور خطیب کو "ابوالکلام" بہترین انشاء پرداز کو "ابوالقلم" ماہر نقاد کو "ابوالنظر" ڈراونی اور ہیبت ناک شے کو "ابوالہول" سخی کو "ابوالنجاد" فن کاشتکاری کے ماہر کو "ابوالفلاحۃ" صنعت وحرفت کے حاذق کو "ابوالصنع" شب وروز بولتے رہتے ہیں۔

تو ان اطلاقات کے پیش نظر بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتاب مقدس میں ذات احدیت پر اب (باپ) کا اطلاق رب حقیقی کی حیثیت میں اور حضرت مسیح علیہ السلام پر ابن (بیٹا) کا اطلاق محبوب ومقبول الٰہی کی حیثیت میں ہوا ہے یعنی جس طرح باپ اور بیٹے کے درمیان محبت وشفقت کا رشتہ مضبوط و مستحکم ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ محبت وشفقت کا وہ رشتہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اور اس کے مقدس پیغمبر مسیح علیہ السلام کے درمیان قائم ہے، ایک صحیح حدیث میں بھی نبی اکرم ﷺ نے اس استعارہ اور تشبیہ کو استعمال فرماتے ہوئے کہا ہے:

الخلق عیال اللہ "تمام مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔"

پس روزمرہ کے محاورات واطلاقات کو نظر انداز کر کے کتاب مقدس کے لفظ "اب" اور "ابن" کے ایسے معانی ومطالب مراد لینا جو صریح شرک کے مترادف ہوں بلکہ اس سے بھی زیادہ قباحت وشناعت کے ساتھ خدا کی ہستی کو تین اقانیم سے مرکب ظاہر کرتے اور خدا کے حصے بخرے بناتے ہوں، کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا اور صریح ظلم اور اقدام شرک ہے (تعالی اللہ علوا کبیرا) بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ ان ہی اناجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ ارشاد مذکور ہے۔ ❁

"میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ تم آسمان کو کھلا ہوا اور خدا کے فرشتوں کو اوپر جاتے ہوئے اور ابن آدم (مسیح علیہ السلام) پر اترتے دیکھو گے۔"

اور باب ۱۳ میں بصراحت خود کو "رسول" کہا ہے:

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ نوکر اپنے مالک سے بڑا نہیں ہوتا اور نہ "رسول" اپنے بھیجنے والے سے۔"

اور باب ۴ میں ہے:

"کیونکہ یسوع نے خود گواہی دی کہ "نبی" اپنے وطن میں عزت نہیں پاتا۔"

اور باب ۳ میں ہے:

❁ باب ۱ آیت ۵۱

Marfat.com

"اور آسمان پر کوئی نہیں چڑھا سوائے اس کے جو آسمان سے اترا یعنی ابن آدم جو آسمان میں ہے۔"

اور باب ٦ میں ہے:

"پس جو معجزہ اس نے دکھایا وہ لوگ اسے دیکھ کر کہنے لگے جو نبی دنیا میں آنے والا تھا وہ فی الحقیقت یہی ہے۔"

اور انجیل متی میں ہے: ❶

"لیکن اس لیے کہ تم جان لو کہ ابن آدم (مسیح علیہ السلام) کو زمین پر گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار ہے۔"

علاوہ ازیں اگر عہد نامہ جدید میں حضرت مسیح علیہ السلام کے لیے "ابن" کا اطلاق موجود ہے تو نیکوکار انسانوں پر بھی "ابناء اللہ" اور بدکاروں کے لیے "ابناء ابلیس" کا اطلاق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انجیل متی میں ہے۔ ❷

"مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔"

اور انجیل یوحنا میں ہے: ❸

"یسوع نے ان سے کہا: اگر تم ابراہیم کے فرزند ہوتے تو ابراہیم کے سے کام کرتے ...... انہوں نے اس سے کہا ہم حرام سے پیدا نہیں ہوئے ہمارا ایک باپ ہے یعنی خدا۔"

لہٰذا عقیدۂ تثلیث میں نصاریٰ کے لیے موجودہ کتاب مقدس سے بھی کوئی حجت و دلیل نہیں ملتی اور اس لیے بغیر کسی شک و ریب کے یہ کہنا حق ہے کہ یہ عقیدۂ تثلیث صنم پرستانہ عقائد کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔

لائق توجہ بات:

یہ بات کبھی فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ ادیان ملل سابقہ کے مسخ و تحریف میں تحریف کرنے والوں کو اس سے بہت زیادہ مدد ملی کہ بنیادی عقائد میں صراحت اور وضاحت کی جگہ وقت کے معبروں، مفسروں اور ترجمانوں نے کنایات، استعارات اور تشبیہات سے بہت زیادہ کام لیا، ان تعبیرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ان مذاہب حق کا صنم پرستوں اور فلسفیوں سے واسطہ پڑا اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح اس دین حق کو قبول کر لیا تو اپنے فلسفیانہ اور مشرکانہ افکار و خیالات کے لیے ان ہی استعارات اور تشبیہات کو پشت پناہ بنایا اور آہستہ آہستہ ملت حقیقی کی شکل و صورت بدل کر اس کو معجون مرکب بنا ڈالا، اسی حقیقت کے پیش نظر قرآن عزیز نے وجود باری، توحید، رسالت، الہامی کتب، ملائکۃ اللہ، غرض بنیادی عقائد میں ذومعنی الفاظ، پر پیچ تشبیہات اور توحید میں خلل انداز استعارات و کنایات کی بجائے واضح صریح اور غیر مبہم اطلاقات کو اختیار کیا ہے تا کہ کسی ملحد، زندیق اور مشرک فلسفی کو توحید خالص میں شرک اور اوہام وظنون کی نکتہ آفرینیوں کا موقع ہاتھ نہ آنے پائے اور اگر کوئی شخص اس کے باوجود بھی بے جا جسارت کرے تو خود قرآن عزیز کی نصوص صریحہ ہی اس کے الحاد کو پاش پاش کر دیں۔

کفارہ:

موجودہ مسیحیت کا دوسرا عقیدہ جس نے دین مسیحیت کی حقیقت کو برباد کر ڈالا "کفارہ" کا عقیدہ ہے اس کی بنیاد اس تخیل پر

❶ باب ۹ آیت ٦ ❷ باب ۵ آیت ۹ ❸ باب ۸ آیت ۴۰-۴۱

قائم ہے کہ تمام کائنات "جس میں نیکوکار اور انبیاء و رسل سب ہی شامل ہیں" ابتداء آفرینش سے ہی گنہگار ہے، آخر رحمت الٰہی کو جوش آیا اور اس کی مشیت نے ارادہ کیا کہ بیٹے کو کائنات ارضی میں بھیجے اور وہ مصلوب ہو کر اول و آخر تمام کائنات کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور اس طرح دنیا کو نجات اور مکتی حاصل ہو سکے لیکن اس عقیدے کے قوام بنانے کے لیے چند ضروری اجزاء کی ضرورت تھی جن کے بغیر یہ عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی تھی اس لیے "عہد رسول" میں سب سے پہلے میسحیت نے یہودیت کے اس عقیدے کو تسلیم کر لیا کہ ان کو صلیب پر بھی چڑھایا گیا اور مار بھی ڈالا گیا اور اس کو شرف قبولیت دینے کے بعد دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ "الوہیت" کے باوجود مسیح علیہ السلام کا صلیب پانا اور قتل ہونا اپنے لیے نہیں بلکہ کائنات کی نجات کے لیے تھا چنانچہ جب اس پر یہ حادثہ گزر لیا تو اس نے پھر الوہیت کی چادر اوڑھ لی اور عالم لاہوت میں باپ اور بیٹے کے درمیان دوبارہ لاہوتی رشتہ قائم ہو گیا۔

پس جب مذہب میں خدائے برتر کے ساتھ صحت عقیدہ اور نیک عملی مفقود ہو کر نجات کا دار و مدار عمل کردار کی بجائے "کفارہ" پر قائم ہو جائے اس کا حشر معلوم؟

قرآن نے اسی لیے جگہ جگہ یہ واضح کیا ہے کہ نجات کے لیے عقیدہ کی صحت یعنی صحیح خدا پرستی اور نیک عملی کے ماسوا کوئی دوسری راہ نہیں ہے اور جو شخص بھی اس "راہ مستقیم" کو ترک کر کے خوش عقیدگی اور اوہام و ظنون کو اسوہ بنائے گا اور نیک عملی اور صحیح خدا پرستی پر گامزن نہ ہو گا بلاشبہ گمراہ ہے اور راہ مستقیم سے یکسر محروم۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۪ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝۶۲﴾ (البقرہ: ۶۲)

"جو لوگ اپنے کو مومن کہتے ہیں اور جو یہودی ہیں اور جو نصاریٰ ہیں اور جو صابی ہیں ان میں سے جو بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آیا اور اس نے نیک عمل کیے تو یہی وہ شخص ہیں جن کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے، نہ ان پر خوف طاری ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

یعنی قرآن کی دعوت اصلاح ادیان و ملل کا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہودی، نصرانی صابی گروہوں کی طرح ایک نیا گروہ مومنوں کے نام سے اس طرح اضافہ کر دے کہ گویا وہ بھی ایک قومی، نسلی یا ملکی گروہ بندی ہے کہ خواہ اس کی خدا پرستانہ زندگی اور عملی زندگی کتنی ہی غلط اور برباد ہو یا سرے سے مفقود ہو مگر اس گروہ بندی کا فرد ہونے کی وجہ سے ضرور کامیاب اور خدا کی جنت و رضا کا مستحق ہے۔

قرآن کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے بلکہ وہ یہ اعلان کرنے آیا ہے کہ اس کی دعوت حق سے پہلے کوئی شخص کسی بھی گروہ اور مذہبی جماعت سے تعلق رکھتا ہو اگر اس نے (قرآن کی تعلیم حق) کے مطابق خدا پرستی اور نیک عملی کو اختیار کر لیا ہے تو بلاشبہ وہ نجات یافتہ اور کامیاب ہے ورنہ تو وہ اگر مسلمان گھر میں پیدا ہوا پلا اور بڑھا اور اسی سوسائٹی میں زندگی گزار کر مر گیا مگر قرآن کی دعوت حق کے مطابق خدا پرستی اور نیک عملی دونوں سے محروم رہا یا مخالف تو اس کے لیے نہ کامیابی ہے اور نہ فوز و فلاح۔ باقی رہا مسیحیت کے کفارہ کا خصوصی مسئلہ تو قرآن نے اس کے ابطال اور تردید کے لیے یہ راہ اختیار کی کہ جن بنیادوں پر اس کو قائم کیا گیا تھا ان کی ہی جڑ کاٹ دی، چنانچہ گذشتہ سطور میں صلیب اور قتل مسیح علیہ السلام کے انکار، رفع الی السماء کے اثبات کے مبحث میں اس پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔

حضرت محمد ﷺ

○ محمد ﷺ اور قرآن ○ بشارات النبی ﷺ ○ صبح سعادت ○ تاریخ ولادت کی تحقیق ○ نسب مبارک یتیمی
○ بت پرستی سے نفرت ○ خلوت پسندی اور عبادت الٰہی کا ذوق ○ حقیقت وحی ○ صاحب وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل ○ بعثت ○ حدیث بخاری ○ بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق ○ نبی اور مصلح ○ کیفیت وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی ○ نزول وحی کا پہلا دور ○ نزول وحی کا دوسرا دور ○ دعوت وارشاد کی پہلی منزل
○ دعوت وارشاد کی دوسری منزل ○ دعوت وارشاد کی تیسری منزل ○ (بعثت عامہ) دعوت اسلام کا مجمل خاکہ
○ قرآن اور تجدید دعوت ○ توحید ورسالت ○ یوم آخرت ○ اسرائی (معراج) ○ ہجرت ○ غزوات
○ غزوۂ بدر ○ غزوۂ اُحد ○ غزوۂ خندق یا احزاب ○ واقعہ حدیبیہ ○ معاہدہ صلح ○ فتح مکہ (الفتح الاعظم)
○ حاطب بن بلتعہ کا واقعہ ○ بت شکنی ○ خطبۂ غزوۂ حنین ○ غزوۂ تبوک اور قبول توبہ کا عجیب واقعہ
○ غزوات اور نتائج وبصائر ○ تبنی ○ خرافی داستان ○ بصائر ○ بنونضیر ○ بصیرت ○ واقعہ افک
○ موعظت بناء فاسق ○ موعظت ○ مسجد ضرار ○ وفات یا وصل بالرفیق الاعلیٰ ○ عبرت وموعظت

محمد ﷺ اور قرآن :

قرآن کلام الٰہی ہے اور خاتم الانبیاء محمد ﷺ اس کے مہبط ہیں وہ ان پر نازل ہوا ہے، قرآن علم ویقین کی روشنی ہے اور ذات اقدس ﷺ اس کا عملی نمونہ اسوہ اور نقشہ ہیں ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ قرآن رشد وہدایت ہے اور محمد ﷺ راشد وہادی، قرآنی حق وصداقت کے لیے دعوت وپیغام ہے اور نبی اکرم ﷺ اس کے داعی اور پیغامبر، اس لیے قرآن کا ہر ایک جملہ اور اس کی ہر ایک آیت کسی نہ کسی حیثیت میں ذات قدسی صفات سے تعلق رکھتی ہے تو اب کس طرح یہ کہا جائے کہ قرآن میں اتنی جگہ اس مقدس ہستی کا ذکر ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہ ؓ سے چند صحابہ ؓ نے عرض کیا کہ آپ نبی اکرم ﷺ کے کچھ حالات زندگی ہم کو سنائیں، صدیقہ عائشہ ؓ نے نگاہ تعجب سے دریافت کیا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے جو مجھ سے خلق نبی کے متعلق سوال کرتے ہو۔ (فان خلقه كان القران) آپ ﷺ کی تمام اخلاقی زندگی قرآن کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھی، قرآن جو کچھ کہتا ہے محمد ﷺ نے اسی کو کر دکھایا۔

Marfat.com

پس قرآن کے کسی حصہ کو سامنے لانا گویا حیات طیبہ کا پیش نظر لے آنا ہے۔

البتہ قرآن عزیز نے جن آیات میں آپ ﷺ کے اسمائے گرامی یا اوصاف عالی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ﴿یا اَیُّھَا النَّبِیُّ﴾ اور ﴿یا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ﴾ کہہ کر مخاطب کیا، اس کی تفصیل مسطورۂ ذیل نقشہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس نقشہ میں نبی، اور رسول، کے علاوہ جن اسماء اور اوصاف کی تفصیل مسطور ہے وہ یہ ہیں:

(۱) محمد	(۲) احمد	(۳) عبداللہ	(۴) شاہد	(۵) بشیر	(۶) نذیر
(۷) مبشر	(۸) مذکر	(۹) عزیز	(۱۰) رؤف	(۱۱) رحیم	(۱۲) امین
(۱۳) مزمل	(۱۴) مدثر	(۱۵) منذر	(۱۶) ہادی	(۱۷) یٰسین	(۱۸) رحمۃ
(۱۹) نعمت	(۲۰) طٰہٰ	(۲۱) نور	(۲۲) حق	(۲۳) سراج منیر	(۲۴) شہید
(۲۵) داعی الی اللہ	(۲۶) خاتم النبیین	(۲۷) نبی	(۲۸) رسول	(۲۹) عبدہ	

نقشہ

نام یا صفت	نام سورۃ	آیات
(۱) محمد	آل عمران	۱۴۴
	احزاب	۴۰
	محمد	۱
	الفتح	۲۹
(۴) شاھد	احزاب	۴۶
	مزمل	۱۵
(۶) بشیر	اعراف	۱۸۸
	ھود	۲
	سبا	۲۸
	فاطر	۲۴
(۸) مذکر	الغاشیہ	۲۱
(۹) سراج منیر	فاطر	۴۶
(۱۰) داعی الی اللہ	فاطر	۴۶
(۱۱) حق	یونس	۱۰۸

نام یا صفت	نام سورۃ	آیات
(۲) احمد	صف	۶
	حدید	۹
(۳) عبداللہ	جن	۱۹
	کہف	۱
	الفتح	۹
(۵) مبشر	احزاب	۴۶
	الفتح	۹
	فرقان	۵۶
	نساء	۱۹
(۷) نذیر	بقرہ	۱۱۹
	عنکبوت	۵۰
	نساء	۱۹
	اعراف	۱۸۸
	ھود	۲

Marfat.com

(۱۲) عزیز	توبہ	۱۲۸
(۱۳) رؤف	توبہ	۱۲۸
(۱۴) رحیم	توبہ	۱۲۸
(۱۵) امین	دخان	۱۹
(۱۶) نور	مائدہ	۱۵
(۱۷) نعمة	بقرہ	۲۳۱
	نمل	۸۱
(۱۸) هادی	روم	۵۳
(۱۹) رحمة	انبیاء	۱۱۷
(۲۰) طٰہٰ	طٰہٰ	۱
(۲۲) مزمل	مزمل	۱
(۲۴) منذر	نمل	۹۲
(۲۶) نبی	آل عمران	۱۶۱
	اعراف	۱۵۷،۱۵۶
	مائدہ	۸۱
	انفال	۶۴،۶۵،۶۷،۷۰
	براۃ	۶۱،۷۳،۱۱۳
	حجرات	۲
	احزاب	۱،۲۸،۳۲،۳۸،۴۶
	فاطر	۵۰،۵۲
	تحریم	۱،۳،۸،۹
	طلاق	۱
	ممتحنہ	۱۲
	حجر	۸۹
	فاطر	۲۳،۲۴،۲۷،۴۲،۴۶
	الفتح	۹
	الذاریات	۵۰_۵۱
	ملک	۸،۹،۱۷،۲۶
	فرقان	۵۶
	البقرہ	۱۱۹
	سبا	۲۸،۴۶
	صٓ	۷
	احقاف	۵
(۲۱) یٰسٓ	یٰسین	۱
(۲۳) مدثر	مدثر	۱
(۲۵) خاتم النبیین	احزاب	۴۰
(۲۷) رسول	بقرہ	۱۴۶،۲۵۰
	آل عمران	۲۳،۸۱،۸۲،۱۰۱،۱۳۲
		۱۵۳،۱۷۲،۱۷۹،۱۸۳
	نساء	۱۴،۵۲،۶۱،۶۴،۶۹،۷۹
		۸۰،۱۰۰،۱۱۵،۱۶۲،۱۷۰
	مائدہ	۱۵،۳۲،۴۱،۵۵،۵۶،۶۷
		۸۲،۹۲،۹۹،۱۴۰
	اعراف	۱۵۷،۱۵۸
	انفال	۱،۱۲،۲۴
	توبہ	۱،۲،۷،۱۶،۲۴،۲۶،۲۹
		۳۳،۵۴،۵۹،۶۳،۶۵،۸۰
		۸۱،۸۴،۸۶،۸۸،۹۱،۹۴

(۲۷) رسول	نحل	۱۱۳
	اسراء	۹۳
	حج	۷۸
	مومن	۷۸
	زخرف	۲۹
	جمعہ	۲
	صف	۹،۱۱،۶۶
	حشر	۴،۶،۷،۸
	ممتحنہ	۱
	جن	۲۲،۲۸
	الحاقہ	۴۲
	نور	۴۷،۴۸،۵۱،۵۲،
		۵۴،۵۶،۶۲،۶۳
(۲۸) شہید	بقرہ	۱۴۳
	نساء	۴۱
	نحل	۸۹
	حج	۷۸
	فرقان	۷،۲۷،۳۰،۴۱
	طلاق	۱۱

		۹۷،۹۹،۱۰۵،۱۰۷،۱۲۸
(۲۷) رسول	عنکبوت	۱۸
	حجرات	۱،۳،۸،۱۴،۱۵
	الفتح	۹،۱۲،۱۳،۱۷،۲۶،۲۷
		۲۸،۹۶
	احزاب	۶،۲۱،۲۹،۳۱،۳۳،۳۶،۴۰
	فاطر	۵۲،۵۷،۷۱
	دخان	۱۴،۱۹
	حدید	۷،۸،۲۹
	مجادلہ	۵،۸،۹،۱۲،۱۳،۲۰،۲۲
	محمد	۳۲،۳۳
	منفقون	۱،۷،۸
	تغابن	۸،۱۲

(۲۹) عبدہ	الفرقان	۱
	اسراء	۱

قرآن عزیز اور صحیح احادیث میں نبی اکرم ﷺ کے جن اسماء وصفات کا ذکر ہے علماء اسلام نے اس پر مستقل تصانیف کی ہیں اور ابن دحیہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اس پر قلم اٹھایا۔ ان کے علاوہ ابن کثیر، بیہقی، ابن عساکر (رحمہم اللہ) جیسے محدثین نے ان تمام احادیث وآثار کو یکجا جمع کر دیا ہے جن میں آپ ﷺ کے اسمائے صفات اور القاب مذکور ہیں، مشہور محدث ابوبکر بن عربی نے شرح ترمذی میں ان کی شمار چونسٹھ کرائی ہے بعض نے ننانوے بعض نے تین سو اور بعض اہل علم نے ان کو ایک ہزار تک پہنچایا[1] ہے۔ مگر یہ کثرت تعداد اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس شمار میں ان تمام انتسابات کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جو کسی مناسبت حال سے آپ ﷺ

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۴۳۵

Marfat.com

کی جانب منسوب ہیں اگرچہ بحیثیت اسماء صفات یا القاب کے ان کا اطلاق ذات اقدس پر صحیح نہیں ہو سکتا مثلاً آپ ﷺ نے انبیاء علیہم السلام اور اپنے درمیان صفت نبوت کے تعلق کو ظاہر اور ختم نبوت کو واضح کرنے کے لیے خود کو قصر نبوت کی آخری لبنہ (اینٹ) فرمایا ہے تو جن بزرگوں کو آپ ﷺ کے اسماء و صفات کی کثرت سے شغف تھا انہوں نے صفات النبی میں "اللبنہ" کو بھی شمار کر لیا۔ [1]

بخاری کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میرے پانچ نام ہیں: محمد ہوں، احمد ہوں، ماحی ہوں یعنی کفر و شرک کو مٹانے والا ہوں، حاشر ہوں۔ اس لیے کہ قیامت کے دن تمام کائنات سے پہلے میں حضرت حق کی بارگاہ میں حاضر ہوں گا۔ اور عاقب ہوں (بقول زہری آخری پیغمبر ہوں) حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: پانچ کا یہ عدد حصر کے لیے نہیں ہے بلکہ اس جگہ ان اسماء و صفات کا ذکر ہے جو کتب سابقہ اور امم و اقوام ماضیہ میں آپ ﷺ سے متعلق مشہور و معروف اور بشارات و پیشین گوئیوں میں مسطور تھے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ باتفاق علماء اسلام قرآن میں آپ ﷺ کے جو اسماء و صفات مذکور ہیں وہ یہ ہیں:

الشاهد، البشير، النذير، المبين، الداعي الى الله، السراج المنير، المذكر، الرحمة، النعمة، الهادي، الشهيد، الامين، المزمل، المدثر۔ لیکن ہماری فہرست کے مقابلہ میں یہ فہرست ناقص ہے جن اسماء و صفات کا ذکر نقشہ میں ہے وہ بھی جمہور کے نزدیک مسلم، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ احادیث میں مذکور اسماء و صفات میں سے حسب ذیل صفات بہت مشہور و معروف ہیں: المتوکل، المختار، المصطفى، الشفيع المشفع، الصادق المصدوق۔

بہر حال محمد اور احمد ﷺ دو اسماء اعلام (نام ہیں) اور باقی اسماء صفات و القاب ہیں اور قرآن میں آپ ﷺ کے نام پاک کے انتساب سے ایک سورت کا نام سورۂ محمد ہے جس کے شروع میں ہی آپ ﷺ کا اسم گرامی مذکور ہے:

﴿وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ (محمد:۲)

اور صرف ایک جگہ سورۂ صف میں احمد منقول ہے یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کی اس بشارت کے تذکرہ میں یہ نام آیا ہے جو آپ ﷺ کی آمد سے متعلق انہوں نے بنی اسرائیل کو سنائی تھی:

﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ﴾

یہ حقیقت بھی قابل فراموش نہیں ہے کہ آپ ﷺ کے اسماء و صفات محض رسمی نہیں ہیں کہ والدین نے جو چاہا نام رکھ دیا اور احباب و اصحاب نے جس صفت و لقب سے جی چاہا پکار لیا بلکہ ان اسماء صفات کا آپ ﷺ کی زندگی اور آپ ﷺ کے اخلاق و اعمال کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے جیسا کہ ابھی ماحی، حاشر اور عاقب کے متعلق خود زبان وحی ترجمان سے سن چکے ہو یا مثلاً محمد اس ہستی کو کہتے ہیں جس کے تذکرے ہمیشہ خوبی اور نیک گوئی کے ساتھ ہوتے ہوں، یہ انبیاء سابقین علیہم السلام کی بشارات اور مستقبل میں تذکرہائے حیات کی جانب اشارہ ہے اور احمد اس ذات پر اطلاق ہوتا ہے جو سب سے زیادہ حمد الٰہی کے لیے نغمہ سنج ہو یہ ذات اقدس کی عبدیت کاملہ اور انسان کامل ہونے کو ظاہر کرتا ہے بلاشبہ آپ ﷺ خدا پرست انسانوں کے لیے مبشر و بشیر اور فتنہ جو مفسدوں، کافروں اور مشرکوں کے لیے منذر و نذیر ہیں، روز قیامت، صادق و کاذب دونوں پر شاہد و شہید ہیں، چشم حق بین اور گوش حق نیوش کے

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۴۳۶

لیے مذکر (ناصح) ہیں، راہ حق سے بھٹکے ہوؤں کے لیے ہادی اور خدا سے بھاگے ہوؤں کے لیے داعی ہیں ان کا وجود رحمۃ ہے کائنات عالم کے لیے اور ان کی ہستی نظام کائنات کے لیے نعمت ہے، جہل و شرک کے لیے نور ہیں اور پیغام الٰہی کے لیے نبی و رسول، مصائب و آلام میں عزیز ہیں اور نوع انسانی کے ہر ایک گوشۂ حیات کے لیے رؤف و رحیم، ان کی صدا، صدائے حق ہے اور ان کی ذات الصادق الامین، قرآن خدا کا آخری پیغام ہے اس لیے وہ خاتم النبیین ہیں، ان کی بعثت عالمگیر ہے اس لیے طٰہٰ و یٰسین ہیں اور آسمان نبوت کے سراج منیر ہیں اور کائنات و رسالت کے بشیر و نذیر، عالم ادیان و ملل کی سلطانی کے باوجود گدائے کملی پوش ہیں اس لیے مزمل ہیں اور مدثر، پھر باایں ہمہ حسن و کمال ﴿اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ﴾ اور ﴿لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ﴾ کے مصداق ہیں اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَ سَلِّمْ وَ بَارِكْ عَلَيْهِ۔ خدا پر توکل اس کا شعار ہے اس لیے متوکل اس کا وصف عالی وقار ہے اور وہ خدائے برحق کا برگزیدہ و مختار ہے بارگاہ الٰہی میں ابرار و مقربین سے بھی زیادہ مصطفیٰ، مجتبیٰ نیکوکار و صالحین کے لیے الشفیع المشفع اور ہر ایک شعبہ ہائے حیات میں الصادق المصدوق ہے۔ (ﷺ)

ہم جانتے ہیں کہ اظہار مقصد کے لیے یہ اشارات کافی نہیں ہیں بلکہ اپنے معنوی مناسبات کے لحاظ سے ہر ایک وصف و نام قرآن سے شہادت کا طالب ہے اور قرآن کی شہادت بلاشبہ ہر ایک گوشہ کی تفصیل کے لیے شاہد عدل لیکن افسوس کہ کتاب کا موجودہ ترتیبی نقشہ اس کا متحمل نہیں ہے اس لیے صرف آیات کے حوالجات اور ارشادات پر ہی اکتفا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بشارات النبی ﷺ:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۸۱﴾ (آل عمران: ۸۱)

"اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد کیا کہ میں تم کو جو کچھ کتاب اور حکمت عطاء کروں اور پھر تمہارے پاس وہ پیغمبر آئے جو ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہیں تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا (پھر) اللہ نے فرمایا کیا تم اس عہد کا اقرار کرتے ہو اور اس کو میرا اہم عہد سمجھ کر قبول کرتے ہو تو انہوں نے کہا بیشک ہم اقرار کرتے ہیں اللہ نے فرمایا اب تم اس عہد پر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ بنتا ہوں۔"

حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس آیت "میثاق" میں اس عہد و میثاق کا تذکرہ ہے جو ازل میں تمام انبیاء و رسل علیہم السلام سے خاتم الانبیاء ﷺ کے متعلق لیا گیا، خطاب اگرچہ براہ راست انبیاء علیہم السلام سے ہے مگر مقصود و مراد میں ان کی امتیں بھی شامل ہیں کیونکہ عمومی طور پر ان ہی کے ذریعہ وفاء عہد کا مظاہرہ ہونے والا تھا۔

اس عہد میثاق کو اس درجہ اہمیت کیوں حاصل ہے؟ یہ بات کچھ تمہید کی محتاج ہے مادیات و روحانیت پر فاعل مختار ایک ہی ہستی ہے اور وہ خدا ہے مگر مادیات میں خدائے برتر کے جاری قانون فطرت کا ہم شب و روز مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اور وہ ہم کو محسوس نظر آتا ہے اس کے برعکس عالم روحانیات حواس خمسہ سے بلند احساسات تعقل و تفکر کا محتاج ہے یہاں وجدان و شعور جب عقل و فکر کو رہنما بناتے اور دونوں راہنما ریب و شک اور اوہام و ظنون سے محفوظ "سلیم" بن کر رہنمائی کا حق ادا کرتے ہیں تو انسان کے سامنے روز

روشن کی طرح یہ حقیقت چمک اٹھتی ہے کہ خدائے واحد کی احدیت و یکتائی عالم مادیات اور روحانیت میں ایک ہی قسم کے قانون فطرت کو نافذ رکھتی ہے۔

اب ذرا دیدۂ عبرت کو وا کیجئے اور کائنات ہست و بود پر نظر ڈالیے تو یہ حقیقت ہر جگہ ابھری ہوئی ملے گی کہ ذات واحد کے ماسواء یہاں کائنات کی ہر ایک شے کے لیے دو ہی سرحدیں مقرر ہیں آغاز و انجام اور درمیان کی تمام کڑیاں نشوو ارتقاء کے لیے وقف ہیں ہر ایک چیز شروع ہوتی اور درمیانی دور میں ترقی پذیر رہتی اور پھر حد کمال کو پہنچ کر اپنی ضرورت کو پورا کر دیتی ہے اس کو انجام اور شروع کو آغاز کہتے ہیں۔

روحانیات میں بھی یہی سلسلہ جاری ہے نسل انسانی کا جب آدم علیہ السلام سے آغاز ہوا تو مادی وجود کے ساتھ خدا کی معرفت یعنی خدا پرستی کی امانت کو بھی ساتھ لایا وہ اگر ایک جانب نسل انسانی کے مادی باپ تھے تو دوسری جانب خدا کی بخشی ہوئی ہدایت وصداقت کے لیے "نبی" اور "ایلچی" بھی تھے اور جب کہ خدا کی ہستی ایک اور اس کی بنیادی صداقت و ہدایت کا پیغام بھی ایک ہے تو ضروری ہوا کہ نوع انسانی کی رشد و ہدایت اور خدا پرستی کی بنیادی تعلیم کا سلسلہ بھی ایک ہی لڑی میں پرو یا جائے اور آغاز سے انجام تک اس سلسلہ کی تمام کڑیاں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہوں کہ ان میں سے کسی ایک کی بھی تکذیب گویا پورے سلسلۂ روحانیت کی تکذیب کے مرادف ہو۔ چنانچہ اس حقیقت کو قرآن نے اس طرح ظاہر کیا ہے:

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ﴾ (البقرہ: ۲۸۵)

"ہم ایمان وتصدیق میں خدا کے کسی ایک پیغمبر کے درمیان بھی تفریق جائز نہیں رکھتے۔"

اور اسی کو زبان وحی ترجمان نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

((نحن بنو علات ديننا واحد)).

"ہم تمام انبیاء ورسل کی تعلیمات اصل و بنیاد میں اسی طرح ایک ہیں جیسا کہ علاتی بھائی کہ ان سب کا باپ ایک ہی ہے۔"

پھر اس سلسلۂ روحانیت کی اگرچہ تمام کڑیاں ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہیں۔ مگر آغاز اور نشوونما اور دور کمال وانجام کے پیش نظر اسی طرح باہم فرق مراتب رکھتی ہیں جس کا مظاہرہ ہم کو عالم مادیات کے مختلف سلسلوں میں نظر آتا ہے اور جس کو ہم فطری (Natural) کہتے ہیں اور ان درجات و مراتب میں بھی درجہ کمال کو جس سے کہ انجام کی سرحد ملتی ہے سب سے زیادہ رفعت و بلندی حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہی اس سلسلہ کا محور و مرکز (Center) اور قطب رحی (چکی کی کیلی) ہوتا اور وابستہ و پیوستہ کی منزل مقصود سمجھا جاتا ہے۔

چنانچہ کائنات کی ہر شے کی طرح خود عالم انسانی نے بھی اس ربع مسکوں پر عہد طفولیت گزارا ہے، اس وقت دنیائے انسانی ایک چھوٹے سے کنبے کی طرح آباد تھی اور نسل انسانی کا باپ ہی روحانی طبیب بھی تھا لیکن جب سلسلۂ بود و ماند آہستہ آہستہ خاندانوں، برادریوں قبیلوں سے آگے بڑھ کر قوموں اور جغرافیائی نسلوں میں تقسیم ہونے لگا اور وحدت نے کثرت کی ہی شکل نہیں اختیار کر لی بلکہ کثرت میں بھی تنوع پیدا ہونے لگا تو ان مادی نشوونما اور ترقیوں کے ساتھ ساتھ روحانی رشد و ہدایت نے بھی نقطۂ

Marfat.com

وحدت پر قائم رہتے ہوئے تنوع اور کثرت کی شکل اختیار کر لی یعنی ہر ایک قوم و ملک میں جدا جدا ہادی و رہنما اور پیغمبر مبعوث ہونے لگے بلکہ بعض حالات میں ایک قوم میں بیک وقت متعدد نبیوں نے دعوت حق میں ایک دوسرے کی اعانت کا فرض انجام دیا۔ اگرچہ ان کی دعوتوں کی بنیاد سرتاسر ایک ہی "اصل و بنیاد" پر قائم تھی۔

﴿ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۗ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۠ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۲۱۳ ﴾ (البقرہ : ۲۱۳)

"ابتداء میں ایسا تھا کہ لوگ الگ الگ گروہوں میں بٹے ہوئے نہیں تھے ایک ہی قوم و جماعت تھے (پھر ایسا ہوا کہ باہم دگر مختلف ہو گئے اور الگ الگ ٹولیاں بن گئیں) پس اللہ نے (یکے بعد دیگر) نبیوں کو مبعوث کیا وہ (ایمان و عمل کی برکتوں کی) بشارت دیتے اور (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈراتے تھے۔ نیز ان کے ساتھ کتاب الٰہی نازل کی گئی تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے ان میں وہ فیصلہ کر دینے والی ہو (اور تمام لوگوں کو راہ حق پر متحد کر دے) جو لوگ باہم دگر مختلف ہوئے تو اس لیے نہیں ہوئے کہ ہدایت سے محروم اور حقیقت سے بے خبر تھے، نہیں وحی الٰہی کے واضح احکام ان کے سامنے تھے مگر پھر بھی محض آپس کی ضد اور مخالفت سے اختلاف کرنے لگے تھے بالآخر اللہ نے ایمان والوں کو (دین کی) وہ حقیقت دکھا دی جس میں لوگ مختلف ہو رہے تھے۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے دین کی سیدھی راہ دکھلا دیتا ہے۔"

﴿ وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۱۹ ﴾ (یونس : ۱۹)

"اور (ابتداء میں) انسانوں کی ایک ہی امت تھی پھر الگ الگ ہو گئے اور اگر تمہارے پروردگار کی جانب سے پہلے سے ایک بات نہ ٹھہرا دی گئی ہوتی تو جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں ان کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا۔"

لیکن خدائے واحد کی جانب سے رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ اگرچہ وقتی تقاضا کے پیش نظر ہزاروں برس تک قوموں اور ملکوں میں تنوع اختیار کیے رہا۔ تاہم وہ اپنے مقصد وحدت کو فراموش نہ کر سکا اور بنیادی وحدت کے ساتھ اس عارضی کثرت کو بھی ایک ہی نقطۂ وحدت پر لانے کے لیے اس وقت تک برابر حرکت کرتا رہا جب تک کہ اپنے مرکز وحدت اور مقصد کمال کو نہ پا سکا۔

یعنی خدا کی صداقت کا پیغام اگرچہ جدا جدا قوموں اور ملکوں میں نبیوں اور پیغمبروں کی زبانی پہنچایا جاتا رہا اور گو ان تمام پیغامات میں فروعی اور وقتی تنوع سے قطع نظر اساسی اور بنیادی وحدت قائم رہی مگر خدا کی وحدانیت اور اس کے پیغام کی اساسی وحدت کا تقاضہ یہی تھا کہ یہ مختلف دعوتیں اور پیغامات سمٹ کر ایک ایسے نقطہ اور مرکز پر آ جائیں کہ وہ تمام کائنات کے لیے بیک وقت اور رہتی دنیا تک ایک ہی پیغام بن کر اپنی نمود دکھلائے اور ایک ایسا پیغمبر مبعوث ہو جس کی بعثت، بعثت عام ہو اور جس کی دعوت، عالمگیر

دعوت ہوتا کہ پھر اس تنوع اور کثرت کی ضرورت باقی نہ رہے۔

عالم روحانیات کی اپنی "مثل اعلیٰ" یا اپنے محور و مرکز کی جانب یہ حرکت جب کہ عالم مادیات کے نشوو ارتقاء کے متناسب حالات سے وابستہ تھی اور خالق کائنات کا قانون فطرت جب کہ دونوں سمتوں میں ایک ہی اصل پر کارفرما ہے تو یہ بھی از بس ضروری ہوا کہ روحانیت کے کمال و ارتقاء کا یہ دور مادی عالم کے ایسے دور کے ساتھ رونما ہو کہ کائنات انسانی کے ارتقاء دماغی و عقل کی استعدادات اپنے رشد و کمال کے ایسے نقطہ پر پہنچ جائیں کہ حجاب مستقبل میں مستور تمام ترقیاں اسی ارتقاء کا نتیجہ کہلائیں اور گو اس سلسلہ میں ایک مدت کیوں نہ ہو جائے مگر کائنات ارضی کا یہ پورا مادی کارخانہ اسباب مادی کی بناء پر ایک کنبہ اور ایک خاندان بن کر رہ جائے اور ملکوں اور قوموں کی بہتات و کثرت کے باوجود کسی ایک گوشہ کے حرکت و سکون کے اثر سے تمام کائنات متاثر ہونے پر مجبور ہو جائے تا کہ اس وقت عالم روحانیات کا آخری نقطۂ ارتقاء کائنات انسانی کے عقل و دماغ کو اپنی دعوت کی یکتائی و وحدت سے متاثر کر سکے اور دنیا دانستہ یا نادانستہ اسی کے بتلائے ہوئے سوسائٹی کے نظام کو آہستہ آہستہ اپنا کر عملاً خدا کا ایک کنبہ بن جائے اور مساوات عالم اور اخوت ہمہ گیر کا مظاہرہ کر دکھائے اور نتیجہ یہ نکلے کہ دین حق صرف تعلیم قرآن ہی میں منحصر ہو کر رہ جائے۔

تاریخ اقوام و ملل شاہد ہے کہ قرآن کی دعوت و اصلاح کی صدائے حق نے جب چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کو پکارا ہے اس وقت دنیا کے تمام مذاہب و ادیان خود اصحاب مذاہب کے تاریخی اقوال کے مطابق اپنی حقیقی روشنی کو یکسر فراموش کر چکے تھے ❁ اور دنیا کے ہر گوشے اور ہر سمت میں مذہب و دھرم اور نظام سوسائٹی تنگی و تاریکی اختیار کر چکا تھا اس وقت قرآن کی آواز پہلی آواز تھی جس نے دنیا کے مذاہب اور ان کی سوسائٹی کے ابتر نظام میں نیا انقلاب پیدا کر دیا اور اقوام و امم نے بہ عجلت یا بہ دیر، اعتراف و اقرار کے ساتھ یا حاسدانہ انکار کے ساتھ مذہب اور سوسائٹی دونوں میں اسی کی اصطلاحات کو اپنایا اور قبول اصلاحات کے بغیر آنے والی دنیا میں اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

توحید کامل اور خالص خدا پرستی، نسل و خاندان یا کفارہ کی جگہ خدا پرستی اور نیک عملی پر مدار نجات، نسلی غرور و تفاخر کا انہدام، کاسٹ سسٹم کا خاتمہ، حقوق انسانیت میں تمام افراد انسانی کی مساوات، اخوت عام کی داغ بیل، رواجی غلامی کے خلاف اصلاح و انقلاب کی تشکیل، عورتوں کے لیے حقوق انسانیت میں مساوات کا اعلان اور حقوق صنفی میں امتیازی احکامات، انقلاب و اصلاح، وراثت، ازدواجی زندگی میں ظالمانہ رواج کا خاتمہ اور جدید مفید اصلاحات (خلع وطلاق وغیرہ) زکوٰۃ کے وجوب، سود و قمار کی حرمت اور دوسری اصلاحات کے ذریعہ اقتصادی نظام میں بنیادی انقلاب، انفرادی اور اجتماعی ملکیت کی تسلیم اور دونوں کے مابین تجدیدی اعتدال کا اعلان سیاسی اور ملکی نظام میں بادشاہت شخصی اور پارٹی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ شوروی نظام کی تشکیل ایسے اہم امور ہیں کہ آج کی دنیا میں ہر ایک انصاف پسند عاقل کے نزدیک ان کی صداقت و افادیت تسلیم ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو بلاشبہ یورپ و ایشیا میں افریقہ و امریکہ میں سوسائٹی کے نظام اور مذہب و دھرم کی اصلاح کے نام سے جو صدائیں بھی اس تعلیم اور اعلان حق کے بعد اٹھیں اگر بغیر کسی تعصب کے تاریخی انقلابات پر غور کیجئے گا تو ان میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی صدا کی بازگشت پائیں گے جو چھٹی صدی عیسوی میں فاران کی چوٹی سے بلند ہوئی اور جس نے ﴿ وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ کو تاریخ عالم میں سچ کر دکھایا۔

❁ اس سلسلہ کے حوالجات آئندہ تعلیم الاسلام اور مسئلہ خاتم النبیین کے مبحث میں ذکر ہوں گے۔

تاریخی حقائق کی اس روشنی میں اب پھر ہم کو گذشتہ مضمون کی جانب واپس جانا چاہیے کہ جبکہ مادی استعدادات نشوونما پا رہے تھے اور چند صدیوں بعد جو قوموں کے انقلابات و اصلاحات کے لیے چند برسوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، مادی اسباب کی بدولت یہ سارا کارخانہ عالم ایک کنبہ بن جانے والا تھا۔ اس وقت از بس ضروری ہوا کہ "وحدت مذہب" کی روحانی صدا بلند ہو اور اس کی صدائے حق کسی خاص قوم اور ملک کی بجائے کائنات کے ہر گوشہ کے لیے یکساں حیثیت رکھے۔

پس منشائے تقدیر الٰہی یہ ہوا کہ ایسے پیغام اور پیغامبر کی نصرت وحمایت کے لیے ازل ہی میں انبیاء ورسل سے عہد ومیثاق لیا جائے اور ان کو مطلع کیا جائے کہ جب وہ پیغام کامل اور "آخری صدائے حق" بلند ہو جس کا تعلق رہتی دنیا تک تمام کائنات ارضی کے ساتھ یکساں طور پر وابستہ ہے تو وہ اور ان کی امتیں اس کو قبول کریں اور اس کی مدد فرض سمجھیں کیونکہ کائنات روحانی کا یہی مرکز وحدت اور نقطۂ مثل اعلیٰ ہے۔ چنانچہ یہی وہ عہد میثاق ہے جس کو تمام امتوں نے اپنے اپنے دور میں اپنے پیغمبروں اور نبیوں کی معرفت "بشارات" کی شکل میں سنا اور آج بھی دنیا کے تمام مذاہب و ادیان میں خواہ وہ امتداد زمانہ کی بناء پر شرک کی آلودگیوں سے قطعاً منحرف ہو چکے ہوں یا ان میں تحریف وصداقت کا امتزاج قریبی دور سے وابستہ ہو۔ اوتار یا نبی مرسل کی معرفت کے ساتھ ایک "منتظر ہستی" کا مشترک عقیدہ پایا جاتا ہے۔ "یہود مسیح" کے علاوہ بھی "ایلیا" یا وہ نبی کہہ کر اس کی آمد کے منتظر ہیں، نصاریٰ بھی ہر قسم کی تحریف کے باوجود مسیح کے بعد فارقلیط (پیراکلیوطاس) بمعنی (احمد) یا "روح حق" یا "ناصر" وغیرہ صفات کے تعارف سے اسی کے انتظار میں ہیں۔ مجوس آج تک ایک "نجات دہندہ" کا انتظار کر رہے ہیں اور ویدک دھرم (سناتن دھرم) ہندوؤں میں بھی ایک "اوتار" کا انتظار ہو رہا ہے اور آج عقلیت کے نام پر اس "ہستی منتظر" کے عقیدہ کو کتنا ہی مضحکہ خیز سمجھا جائے اور خود مذہبی افراد اپنے اپنے مذہب کے اس عقیدہ کو کیسا ہی غیر معقول کیوں نہ ٹھہرائیں لیکن ان کے پاس اس کا جواب کچھ نہیں ہے کہ مذاہب و ادیان کے موجودہ اختلافات کے باوجود چھوٹے سے ناستک گروہ کو چھوڑ کر ہزارہا برس کائنات انسانی میں اس عقیدہ کا کسی نہ کسی شکل میں مشترک عقیدہ بنا رہنا اس کے "حقیقت" ہونے کی ناقابل انکار دلیل ہے۔ البتہ یہ بات جدا ہے کہ جس طرح یہود نے از راہِ حسد "مسیح ہدایت" کے انتظار کے باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قبول نہ کیا اسی طرح مذاہب عالم کی اقلیت کو چھوڑ کر جو کہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئی ان کی اکثریت نے محمد ﷺ کو قومی وملکی عصبیت اور گروہ بندی کی بندشوں کی وجہ سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا یا ان کی دعوت حق کو عرب کے لیے محدود قرار دے کر خود کو اس سے علیحدہ کر لیا۔

بہرحال ہندوستان کا قدیم مذہب چونکہ حقیقت مذہب کو فراموش کر چکا اور اس کی موجودہ شکل نے کسی طرح قدیم شکل و صورت کو بدل کر نیا رخ اختیار کر لیا اور اس کی تاریخ خود اس کے اپنے پاس بھی نہیں ہے اور اب اس کی تمام بنیاد صرف آبائی رسوم پر یا چند مخصوص فلسفیانہ عقائد پر قائم ہے اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ "منتظر ہستی" کے متعلق جو روایات رکھتے ہیں ان کی اصل حقیقت کیا تھی اور یہی حال بدھسٹ کا بھی ہے اس لیے ہم ابوریحان بیرونی اور بعض دیگر مفسروں اور مؤرخوں کے ان بیانات سے قطع نظر کرتے ہیں جو انہوں نے ہندوؤں کے عقیدہ "کلنکی اوتار" کے "شنبل" میں نزول کو محمد ﷺ پر منطبق کرنے کی سعی کی ہے۔

اور یہاں صرف یہود ونصاریٰ پر نازل کتب سماویہ تورات، زبور اور انجیل سے ہی ان بشارات کو پیش کر دینا مناسب سمجھتے ہیں جن میں تحریف کے باوجود اب بھی اصل کتاب کی چمک باقی ہے اور علمائے یہود ونصاریٰ کے پاس انطباق کے انکار کی موجہ دلیل

Marfat.com

موجود نہیں ہے، چنانچہ حضرت مولانا رحمت اللہ (نور اللہ مرقدہ) کی میزان الحق اور حافظ ابن قیم کی ہدایہ الحیاری اور باجہ جی زادہ کی الفارق وغیرہ کتب سے اور ان مناظرات مطبوعہ سے ظاہر ہوتا ہے جو علماء نصاریٰ اور علماء اسلام کے درمیان ان بشارات سے متعلق پیش آئے ہیں اور جن کے متعلق بعض علماء نصاریٰ کو اقرار و اعتراف کے ماسوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔

تورات اور بشارات:

تورات کتاب استثناء میں ہے:

خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی طرف کان دھریو، اس سب کی مانند جو تو نے خداوند اپنے خدا سے حوب میں مجمع کے دن مانگا اور کہا کہ ایسا نہ ہو کہ میں خداوند اپنے خدا کی پھر سنوں اور ایسی شدت کی آگ پھر دیکھوں تا کہ میں مر نہ جاؤں اور خداوند نے مجھے کہا کہ انہوں نے (بنی اسرائیل نے) جو کچھ کہا سو اچھا کیا۔ "میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔" اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو کہ جنھیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا لیکن وہ بھی اگر ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔ [1]

نشان زدہ جملوں کو غور سے پڑھیے اور پھر ہر ایک جملہ کی حقیقت کو تاریخی روشنی میں دیکھیے تو تاریخ کا بے لاگ فیصلہ ایک اور صرف ایک ہی ہوگا اور وہ یہ کہ اس بشارت کا مصداق ذات اقدس محمد ﷺ کے ماسوا دوسری کوئی ہستی نہیں ہے۔

بشارت کا پہلا جملہ یہ ہے: "میں ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔" تاریخ کہتی ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں بنی اسمٰعیل کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں جو اس کا مصداق بن سکے اور بنی اسمٰعیل میں محمد ﷺ کے ماسوا کوئی نبی ہی نہیں ہوا جو موسیٰ علیہ السلام کی مانند کہلایا جا سکے اور دوسرا جملہ ہے: "میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اس سے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔" اس جملہ کو ایک بار پھر غور سے پڑھیے اور اس کے بعد قرآن کی ان آیات کا مطالعہ کیجیے جن میں بعینہٖ یہی صفات نبی اکرم ﷺ کے لیے مذکور ہیں:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ (النجم: ۳۔۴)

"وہ (محمد ﷺ) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں خدا کی وحی سے کہتے ہیں جو ان پر وحی کی جاتی ہے۔"

﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۝﴾ (مریم: ۹۷)

"پس بے شبہ ہم نے اس (قرآن) کو تیری زبان پر آسان کر دیا تا کہ تو اس کے ذریعہ متقیوں کو بشارت دے اور کج راہوں کو (عذاب الٰہی سے) ڈرائے۔"

---

[1] باب ۱۸ آیت ۱۵۔۲۱

Marfat.com

﴿ وَ اِنَّهٗ لَتَنۡزِیۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰی قَلۡبِكَ لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِیۡنَ ﴿۱۹۴﴾
بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۹۵﴾ وَ اِنَّهٗ لَفِیۡ زُبُرِ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۹۶﴾ ﴾ (الشعراء: ۱۹۲-۱۹۵)

"اور یقیناً یہ جہانوں کے پروردگار کا اتارا ہوا ہے اس کو روح الامین (جبرئیل) نے تیرے قلب پر اتارا تا کہ تو گمراہوں کو (اعمال بد کے نتائج سے) ڈرانے والوں میں سے ہو یہ ہے صاف عربی زبان میں اور اس کا ذکر پہلی کتابوں میں موجود ہے۔"

بشارات کے جملوں اور قرآن کی ان آیات کے اسلوب بیان کا مطالعہ کرنے کے بعد کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ دونوں کسی ایک ہی ہستی کی صفات کا ذکر ہے اب تیسرے جملہ کو پڑھئے: "جو کوئی میری باتوں کو جنھیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔" اور ساتھ ہی ان آیات قرآنی کا مطالعہ کیجئے:

﴿ فَكَیۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِیۡدٍ وَّ جِئۡنَا بِكَ عَلٰی هٰۤؤُلَآءِ شَهِیۡدًا ﴿۴۱﴾ یَوۡمَئِذٍ یَّوَدُّ الَّذِیۡنَ
كَفَرُوۡا وَ عَصَوُا الرَّسُوۡلَ لَوۡ تُسَوّٰی بِهِمُ الۡاَرۡضُ ؕ وَ لَا یَكۡتُمُوۡنَ اللّٰهَ حَدِیۡثًا ﴿۴۲﴾ ﴾ (النساء: ۴۱-۴۲)

"اور پھر (اے پیغمبر!) کیا حال ہوگا اس دن (قیامت کے دن) جب کہ ہم ہر ایک امت میں سے ان پر ایک گواہ طلب کریں گے، اور ہم تم کو ان سب پر گواہ بنائیں گے سو جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور الرسول (محمد ﷺ) کی نافرمانی کی وہ اس دن یہ پسند کریں گے کاش کہ (وہ دھنس جائیں اور) زمین ان کے اوپر برابر ہو جائے اور اُس دن یہ اللہ سے کوئی بات بھی پوشیدہ نہ رکھ سکیں گے۔"

غور کیجئے کہ دونوں عبارتوں میں کس درجہ مطابقت ہے اور سب کے بعد اس فقرے کو بامعان نظر دیکھئے لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔" اور پھر قرآن کی اس آیت کو بھی پڑھئے اور فرمائیے کہ کیا یہ دونوں مضامین ایک ہی حقیقت کے دو نقش نہیں ہیں؟

﴿ وَ لَوۡ تَقَوَّلَ عَلَیۡنَا بَعۡضَ الۡاَقَاوِیۡلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذۡنَا مِنۡهُ بِالۡیَمِیۡنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡهُ
الۡوَتِیۡنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنۡكُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ عَنۡهُ حٰجِزِیۡنَ ﴿۴۷﴾ وَ اِنَّهٗ لَتَذۡكِرَةٌ لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۴۸﴾ ﴾ (الحاقہ: ۴۴-۴۸)

"اور یہ پیغمبر بعض باتوں کو اپنی جانب سے گھڑ کر ہماری جانب منسوب کر دے تو بے شبہ ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیں اور پھر اس کی گردن کی رگ کاٹ ڈالیں (قتل کر دیں) اور اس وقت تم میں سے کوئی بھی اس کو ہماری گرفت سے باز نہیں رکھ سکتا۔"

تورات کی پیش گوئی اور آیات قرآنی کے مسطورۂ بالا تطابق کے بعد تحدی (چیلنج) کے ساتھ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ بشارات میں ذکر کردہ مجموعۂ صفات کا مصداق ذات اقدس ﷺ کے ماسوا کوئی دوسری ہستی تاریخی دنیا میں نہیں پائی جاتی یہ مجموعۂ صفات نہ حضرت مسیح علیہ السلام پر صادق آتے ہیں نہ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام پر اور نہ حضرت زکریا و یحییٰ علیہما السلام پر اور نہ دوسرے انبیاء بنی اسرائیل پر صادق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب علماء یہود سے اس کے متعلق دریافت کیا جاتا ہے تو وہ ایک "منتظر ہستی" کے مزید انتظار کے ماسوا

Marfat.com

دوسرا کوئی جواب نہیں رکھتے اور خاتم الانبیاء ﷺ کو اس کا مصداق نہ سمجھنے میں بے دلیل انکار اور خموشی کے علاوہ ان کے پاس اور کچھ نہیں ہے اسی طرح نصاریٰ بھی حضرت مسیح علیہ السلام کو اس بشارت کا مصداق ثابت کرنے میں مجموعہ صفات کے پیش نظر عاجز و درماندہ نظر آتے اور صاف اور واضح باتوں کو دوراز کار تاویلات کا جامہ پہنا کر اعتراف حقیقت سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔

اور تورات استثناء ہی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک نغمہ باب ۳۱ میں مذکور ہے جو انہوں نے موت سے چند لمحات قبل بحکم الٰہی بنی اسرائیل کو سنایا۔ اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ میدان تیہ میں اپنی قوم کو جمع کرو اور خدا کا یہ پیغام سناؤ کہ جب بنی اسرائیل خدا کے وعدے کے مطابق شہروں میں جا بسیں گے تو حکومت، تمول اور رفاہیت میں بدمست ہو کر خدا کی نافرمانیوں میں مبتلا ہو جائیں گے حتیٰ کہ بت پرستی سے بھی باز نہیں رہیں گے۔ پس جب ان کی حالت اس درجہ ابتر ہو جائے گی تو میں ان سے خفا ہو جاؤں گا اور ان سے اپنا منہ چھپا لوں گا اور اس کے بعد میری غیرت حق حرکت میں آئے گی اور میں بھی ان (بنی اسرائیل) کو ایک ایسی قوم کے ذریعہ خفا کروں گا اور ان سے اپنی نعمت (نبوت) چھین کر اس قوم کو بخش دوں گا جو ان پڑھ [1] اور تمدن سے دور، بے عقل، خانہ بدوش ہو گی جس کو تم اور دنیا کی قومیں "متمدن جماعت" نہ سمجھیں گی۔ اس کے بعد باب ۳۲ میں اس نغمہ کی تکمیل ان الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے:

تم اس بشارت یا پیغمبرانہ پیشین گوئی کے لیے تاریخ ماضی پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ بنی اسرائیل کی متمردانہ سرگرمیاں، باغیانہ اور سرکشانہ شرانگیزیاں جب حد سے زیادہ متجاوز ہو گئیں اور انہوں نے مسیح علیہ السلام ہدایت جیسی جلیل القدر ہستی کو بھی رد کر دیا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسے مقدس پیغمبر کو قتل کر ڈالا تو ان کی جگہ خدا نے کس قوم کو پسند کیا کس کو شرف رسالت سے نوازا اور کس نے ساری کائنات میں حیرت زا انقلاب بپا کر کے سچی خدا پرستی اور نیک عملی کا غلغلہ بلند کر دیا اور بنی اسرائیل نے کس کے عظمت و جلال کو دیکھ کر حاسدانہ اس کے روکنے کی سعی کی۔ کیا یہ عرب قوم نہیں تھی اور کیا یہ محمد ﷺ کی مقدس ہستی اور ان کی قوم نہ تھی جس پیغمبر نے دنیوی وسائل و اسباب کی نظر میں اُمی "ان پڑھ" ہونے کے باوجود متمدن قوموں کے ظالمانہ و جابرانہ تمدن کو فنا کے گھاٹ اتار کر اس عظیم الشان عادلانہ تمدن کی بنیاد ڈالی کہ ہر قسم کے اسباب و وسائل کے فقدان اور موانع کے باوجود جس کی عظمت و سرعت رفتار نے ماہرین فلسفہ تاریخ کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ اسلام کی دعوت و اصلاح اور انقلاب، دنیائے تاریخ کی مستثنیات میں سے ہے۔ یہی وہ اُمی اور گلہ بان قوم تھی جو ایک "اُمی" کی خدا پرستانہ تعلیمات سے تربیت پا کر چند ہی برسوں میں دنیا کی قوموں کی تربیت و اصلاح کے لیے "بہترین معلم" ثابت ہوئی اور اونٹوں اور بکریوں کے چرانے والے دیکھتے ہی دیکھتے انسانوں کے چرواہے بن گئے اور بنی اسرائیل کی ہمہ قسم کی حاسدانہ اور معاندانہ جدوجہد اس کی راہ ترقی میں پرکاہ کی برابر بھی سنگ راہ نہ بن سکی تو کیا تاریخ کے ان ابھرے ہوئے نقوش کے بعد بھی اس انکار کے لیے کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ تورات کی اس پیشین گوئی کا مصداق محمد ﷺ اور بنی اسمٰعیل علیہ السلام کے

---

[1] کتاب مقدس کے قدیم نسخوں میں "ان پڑھ" کا لفظ تمام زبانوں میں موجود ہے مگر بعد کے ایڈیشنوں میں اس کی جگہ کہیں "بے عقل" اور کہیں اسی کے مترادف الفاظ پائے جاتے ہیں حاصل اگرچہ پھر بھی وہی رہتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ قرآن میں محمد ﷺ کی صفت اُمی اور آپ کی قوم کی "امیین" مذکور ہے جس کا لفظی ترجمہ "ان پڑھ قوم" ہوتا ہے اس لیے محض اس لئے کہ پیشین گوئی کا یہ صاف تطابق باقی نہ رہے قدیم لفظ کو بدل کر اس قسم کے الفاظ رکھ گئے۔ مختلف ایڈیشنوں کی اس قسم کی لفظی تحریفات کے لیے میزان الحق کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

Marfat.com

ماسواء کوئی اور ہستی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہی وہ اوصاف اور واضح حقیقت ہے جس کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

﴿ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ٘ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ١ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ١ۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۠ ۱۵۷ قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا ا۟لَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ١ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ١۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۱۵۸ ﴾

(الاعراف: ۱۵۷۔۱۵۸)

"پس میں ان کے لیے رحمت لکھ دوں گا) جو الرسول (محمد ﷺ) کی پیروی کریں گے کہ وہ نبی اُمی [1] ہوگا (یعنی دنیا کے سلسلہ تعلیم وتعلم کے لحاظ سے ان پڑھ ہوگا اور) اس کے ظہور کی خبر وہ اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے وہ انہیں نیکی کا حکم دے گا اور برائی سے روکے گا اور پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا اور گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا اور اس بوجھ سے نجات دے گا جس کے تلے وہ دبے ہوں گے اور ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے تو جو لوگ ان پر ایمان لائے اس کے مخالفوں کے لیے روک ہوئے (راہ حق میں) اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے ہوئے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے (یعنی قرآن) سو وہی ہیں جو کامیابی پانے والے ہیں (اے پیغمبر!) تم لوگوں سے کہو: اے افراد نسل انسانی! میں تم سب کی طرف بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ خدا کی آسمانوں کی اور زمینوں کی بادشاہت اسی کے لیے ہے، کوئی معبود نہیں مگر وہی ایک ذات، وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول اور نبی اُمی پر کہ اللہ اور اس کے کلمات (یعنی اس کی تمام کتابوں) پر ایمان رکھتا ہے اس کی پیروی کروتا کہ کامیابی کی راہ تم پر کھل جائے۔"

اور تورات استثناء میں ہے:۔

"اور یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) مرد خدا نے اپنے مرنے سے آگے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔"

موسیٰ علیہ السلام نے یہ بشارت بھی بنی اسرائیل کو اپنی موت سے قبل ایسی حالت میں سنائی تھی کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی وداعی حالت کو

---

[1] اُمی لفظ اُم کی جانب منسوب ہے جس کے معنی ماں کے ہیں، اہل عرب یہ لفظ اس شخص کے لئے بولتے ہیں جس نے پڑھا لکھا نہ ہو گویا وہ ماں کے پیٹ سے آج ہی پیدا ہوا ہے، اہل عرب چونکہ عام طور سے ان پڑھ تھے اس لئے اُمیین کہلائے اور پیغمبر اسلام نے بھی چونکہ "وحی الٰہی" کے ذریعہ تعلیم وتربیت کے ماسوا دنیا کے اسباب تعلیم وتعلم کے لحاظ سے کسی کے سامنے زانوائے ادب تہہ نہیں کیا اس لئے ان کی صفت بھی اُمی رہی، آپ ﷺ نے خود بھی یہ ارشاد فرمایا: ((نحن امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب))

Marfat.com

دیکھ کر دل تنگ اور دل گیر ہو رہے تھے اور یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب خداوند خدا موسیٰ علیہ السلام جیسا کوئی پیغمبر مبعوث نہ کرے گا۔

سینا جو طور۔ کے نام سے مشہور اور وادی سینا میں واقع ہے اور زبان حال سے شہادت دے رہا ہے کہ آگ کی جستجو کے بہانے موسیٰ علیہ السلام کو یہیں خدا سے ہم کلام کا شرف حاصل ہوا تھا اور ﴿ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴾ کا مظاہرہ میرے ہی سینہ پر ہوتا رہا ہے اور شعیر (ساعیر یا سراۃ) اس پہاڑی سلسلہ کا نام ہے جو عرب میں سب سے زیادہ طویل اور شام سے یمن تک شمالاً وجنوباً پھیلا ہوا ہے اور القدس (یروشلم) کے سامنے ہو کر گزرتا ہے، یہیں وہ جگہ ہے جو بیت اللحم کے نام سے آج بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت مبارک کی گواہ اور بعثت مسیح علیہ السلام کا مناد ہے اور فاران عبرانی (جرو) میں عرب کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو حجاز کے نام سے مشہور ہے یہی مقام اس وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی سرزمین) کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے جس کو مکہ کہتے ہیں اور جو بہت مشہور و معروف ہے اور مقام ولادت و بعثت ہے خاتم الانبیاء محمد ﷺ کا۔

اس تفصیل کے بعد پیشین گوئی کا مطلب واضح ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا خدائے برتر کی صداقت و ہدایت کا پیغام نور ہدایت بن کر سینا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شکل میں نمودار ہوا اور سراۃ (شعیر) پر حضرت مسیح علیہ السلام کی صورت میں طلعت افروز ہوا اور فاران پر محمد ﷺ کا رخ انور بن کر جلوہ گر ہوا۔

فراعنہ کی طویل و مدید غلامی سے اس خانوادۂ نبوت (بنی اسرائیل) کے قلوب میں یاس و حرمان نے ایسی جگہ کر لی تھی کہ اب ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس بنجر زمین پر خدا کی رحمت کی بارش ہوگی اور حجابہائے تاریک سے "نور ہدایت" اپنی نمود دکھلائے گا۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صدائے حق گویا نور ہدایت کی وہ نمود تھی جس نے صدیوں بعد پھر ان کے گھرانے پر رونمائی کی اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد اگرچہ بہت انبیاء علیہم السلام احیائے حق کے لیے مبعوث ہوئے مگر حضرت مسیح علیہ السلام کے وجود گرامی نے جس شان و عظمت کے ساتھ اس درمیان کی پیدا شدہ اندھیاریوں کا پردہ چاک کر کے ہدایت و رشد کی روشنی چمکائی گویا وہ طلوع تھا اس نور ہدایت کا جو موسیٰ علیہ السلام کی حیات طیبہ میں اپنی نمود دکھا چکا تھا اور جس کے ذریعہ آسمان ہدایت کے اُفق میں صبح سعادت نے شب ظلمت سے جھانکنا شروع کر دیا تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ یہی نور ہدایت بنی اسرائیل سے منتقل ہو کر جب بنی اسمٰعیل تک پہنچا تو خاتم الانبیاء محمد ﷺ میں اس طرح جلوہ گر ہوا کہ فاران کی چوٹیوں سے جب اس کی کرنیں کائنات کے چہار جانب پھیلیں تو تمام عالم انسانی کو روشن و منور بنا دیا اور ظلمت شرک و کفر کو مٹا کر نور توحید سے ہر گوشۂ عالم کو تاباں و درخشاں کر دیا۔ چنانچہ تورات میں مذکور اس حقیقت کو قرآن عزیز نے اس سے زیادہ بہتر اور معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ ادا کیا ہے:

﴿ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ ﴾ (التین: ۱-۶)

"شاہد ہے (وہ مقام جو مرکز ہے) انجیر و زیتون کے باغوں (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام ولادت "بیت اللحم") اور شاہد ہے طور سینا اور شاہد ہیں یہ بلد امین "مکہ" یقیناً ہم نے انسان کو بہترین مخلوق بنایا پھر اس کو انتہائی پستی میں پھینک دیا ماسواء

ان انسانوں کے جو ایمان لائے اور کام کیے نیک پس ان کے لیے اجر ہے بے منت (یعنی خدا کا فضل اور رضا اور جنت)۔"

الواو للشھادۃ ، واوٗ کا استعمال شہادت کے لیے بھی ہوتا ہے عربیت کا مشہور قاعدہ ہے اور اس قسم کی شہادت اکثر ایسے مواقع کے لیے مخصوص ہے کہ متکلم جس حقیقت کو ظاہر کرنا چاہتا ہے مختلف وجوہ کی بنا پر مخاطب کو اس کے سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے تب بعض بدیہی اور محسوس مثالیں دے کر مخاطب کے لیے اس حقیقت کا سمجھنا آسان بنا دیتا ہے۔ سورۂ والتین کی آیات میں بھی صورت حال ایسی ہی ہے اس لیے کہ بتلانا یہ مقصود ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کو بہترین مخلوق بنایا ہے اس کے باوجود اگر سچا خدا پرست اور نیک کردار نہیں ہے تو انجام کار وہ انتہائی پستی میں پھینک دیا جائے گا اور اس کی حقیقت چوپاؤں سے بھی بدتر ہو جائے گی ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ﴾ مگر یہ کہ سچا خدا پرست اور نیک اعمال ثابت ہو تو پھر انسانیت کے بلند سے بلند درجہ کا مستحق اور بے حساب و بے منت خدا کی نعمتوں کا مستوجب ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات کافی تفکر و تدبر کی محتاج ہے۔ ایک ہستی تمام مخلوقات سے اپنی تخلیق و تکوین میں "احسن" بھی ہو اور پھر قعر مذلت کی گہرائیوں میں بھی پھینک دی جائے اس لیے بطور شہادت نہایت لطیف پیرایہ میں تین مشہور اور نمایاں دور ہدایت کا ذکر کر کے اس جانب توجہ دلائی کہ اگر تاریخ کا مقصد یہ ہے کہ ماضی کے آئینہ میں مستقبل کی تصویر دیکھی جا سکے تو ان ہر سہ ادوار تاریخ کا مطالعہ کرو اور دیکھو کہ خدائے برتر نے کائنات کی رشد و ہدایت کا شرف "انسان" ہی کو بخشا اور پھر غور کرو کہ وہ بھی انسان ہی تھے جنھوں نے خدا کے پیغمبروں کی پیروی میں سچی خدا پرستی اور نیک عملی اختیار اور نتیجہ یہ نکلا کہ روز قیامت کے فیصلہ سے قبل بھی اسی دنیا میں انہوں نے عزت، شرافت، حکومت سب کچھ پایا اور آخرت کا اجر تو بے منت و بے حساب الگ رہا اور وہ بھی انسان ہی تھے جو سرکشی، بغاوت اور پیغمبرانہ تعلیم کے خلاف فساد انگیزی کی بدولت آخرت سے پہلے ہی ذلت و رسوائی اور ہلاکت و بربادی کے قعرہائے مذلت سے دوچار ہوئے اور جہنم کے اسفل سافلین سے جو واسطہ آئندہ پڑنے والا ہے وہ جدا ہے۔ پس اگر ان حقائق کو پیش نظر رکھو گے اور تاریخ ماضی کے ان اوراق کو دیدۂ عبرت سے دیکھو گے تو پھر تمہاری یہ حیرت، اعتراف حقیقت سے بدل جائے گی اور آئینہ عقل و فکر میں یہ سب کچھ روشن ہو جائے گا۔ تورات کی بشارت کے یہ الفاظ بھی خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں:

"وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔"

قابل توجہ اس لیے ہے کہ جب ہم تاریخ کے اس واقعہ کا مطالعہ کرتے ہیں کہ رمضان ۸ ہجری مطابق جنوری ۶۳۰ء میں فتح مکہ کی غرض سے جب محمد ﷺ روانہ ہوئے ہیں تو دس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم جلو میں تھے اور آتشی شریعت یعنی "جہاد بالسیف کا حکم الٰہی.... ان کے ہاتھ میں تھی" تو قدرت الٰہی کے اس اعجاز کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ جس ذات برتر نے موسیٰ علیہ السلام کی لسان حق سے ان جملوں کو ادا کرایا۔ اسی نے محمد ﷺ کے حق میں اس کو کر دکھایا ﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ تو کیا کسی حق پرست حق آگاہ کو ذرا سا بھی تامل ہو سکتا ہے کہ بلاشبہ موسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا مصداق خاتم الانبیاء محمد ﷺ ہی کی ذات گرامی ہے۔

تورات کی یہ اور اسی قسم کی دوسری بشارات ہیں جن کے پیش نظر بعثت محمد ﷺ سے صدیوں پہلے یہود کو نبی آخر الزماں کا انتظار تھا اور وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ اب وہ وقت دور نہیں ہے کہ نور ہدایت "آفتاب عالمتاب" بن کر جلوہ گر ہونے والا ہے، اسی لیے جب کبھی ان کے اور مشرکین کے درمیان جنگ پیش آ جاتی تو کہا کرتے تھے کہ وہ وقت قریب آ رہا ہے کہ نبی آخر الزماں مبعوث ہوں

Marfat.com

گے اور ہم ان پر ایمان لا کر ان کی قیادت میں تم سے حق و باطل کی جنگ کریں گے اور کامیاب ہوں گے۔ چنانچہ جب قومی اور نسلی تعصب اور بغض وحسد کی بناء پر انہوں نے آفتاب ہدایت کی روشنی سے منہ پھیر لیا اور آنکھیں بند کر لیں تو قرآن عزیز نے ان کو (یاد ایام) کے ساتھ ملزم و مجرم بناتے ہوئے یہ کہا:

﴿وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾﴾ (البقرہ: ۸۹)

"چنانچہ جب ایسا ہوا کہ اللہ کی طرف سے ان کی ہدایت کے لیے ایک کتاب نازل ہوئی اور وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی تھی جو پہلے سے ان کے پاس موجود ہے تو باوجودیکہ وہ (تورات کی پیشینگوئیوں کی بناء پر اس ظہور کے منتظر تھے، اور) کافروں کے مقابلہ میں اس کا نام لے کر فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے تھے لیکن جب وہی جانی بوجھی ہوئی بات سامنے آ گئی تو صاف انکار کر گئے اور مخالفت پر کمر باندھ لی پس ان لوگوں کے لیے جو دیدہ و دانستہ کفر کی راہ اختیار کریں اللہ کی لعنت ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے ایک دفعہ قبیلہ غطفان اور یہود کے درمیان جنگ ہوئی تو خیبر کے یہود ان کے مقابلہ میں فتح و نصرت کے لیے یہ دعا مانگتے تھے۔ [1]

اللھم انا نسئلك بحق محمد النبی الأمی الذی وعدتنا ان تخرجه فی اٰخر الزمان ان نصرتنا علیھم.

"خدایا! ہم تجھ سے اس نبی اُمی کا واسطہ دے کر دعا مانگتے ہیں جس کے متعلق تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ آخر الزماں ہوں گے۔"

اور علی ازدی سے منقول ہے کہ "یثرب" (مدینہ) کے یہود ہمارے مقابلہ کے وقت اکثر یہ دعا کرتے تھے:

اللھم ابعث ھٰذا النبی یحکم بیننا و بین الناس.

"خدایا! اس نبی موعود کو مبعوث فرما جو ہمارے اور لوگوں (مشرکوں) کے درمیان حق کا فیصلہ کر دے۔" [2]

اور عقبہ ثانیہ میں جب مدینہ کے ستر اشخاص آپ ﷺ سے دعوت اسلام کی حقیقت معلوم کرنے آئے اور آپ ﷺ نے ان پر حقیقت حال ظاہر فرمائی تو انہوں نے اسی وقت ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، بلاشبہ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کی بعثت سے متعلق ہم اکثر یہودی علماء سے سنا کرتے ہیں [3] اور کیا اس تاریخی پہلو سے ان اقوال کی صداقت پر روشنی نہیں پڑتی کہ جب رومیوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل کی آخری اور فیصلہ کن تباہی عمل میں آئی تو آخر شام، فلسطین، شرق اُردن یمن جیسے شاداب و زرخیز علاقوں کو چھوڑ کر وہ کون سی اہم وجہ تھی جس نے یہود کے نمایاں اور مشہور قبائل بنو قریظہ اور بنو نضیر (وغیرہ) کو یثرب اور نواح یثرب میں آباد ہونے کی ترغیب دی یقیناً صرف ایک ہی وجہ تھی اور وہ یہ کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد اپنے انبیاء کی بشارات میں یہ بھی سنا تھا کہ اس "منتظر ہستی" کا ظہور یثرب اور نواح یثرب میں ہوگا۔ مگر وائے بدبختی کہ قبول حق کا سب سے بڑا مانع ان کو یہ پیش آیا کہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ عن البیہقی [2] بدائع الفوائد ج ۲ از مسند بزار [3] تفسیر ابن کثیر ج ۱

Marfat.com

قومی، جماعتی اور نسلی حسد نے ان کو اس کی اطاعت سے باز رکھا۔ حتیٰ کہ جب انصار رضی اللہ عنہم میں سے بعض حضرات علماء یہود کے سامنے یہ کہہ گزرتے کہ ہم نے تو اس نبی امی پر ایمان لانے کی بات سب سے پہلے تمہاری ہی زبانی سنی تھی اور اس کے ظہور سے قبل تم ہی اس کے تذکرے کیا کرتے اور ان کتابوں سے متعلق بشارات سنایا کرتے تھے پھر اب کیا ہوا کہ جب اس کا ظہور ہوا تو تم انکار کر بیٹھے تو وہ علانیہ جھوٹ بول دیتے اور کہتے کہ ہم کو یاد نہیں کہ کب ہم نے تم سے ایسی باتیں کہی تھیں۔ [1]

تورات کی طرح عہدنامہ جدید (اناجیل) میں بھی تحریف لفظی معنوی کے باوجود نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے متعلق یہ بشارات ملتی ہیں۔ متی کی انجیل میں ہے:

لیکن بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول ○ کیونکہ آسمان کی بادشاہت اس گھر کے مالک کی مانند ہے جو سویرے نکلا تا کہ اپنے انگوری باغ میں مزدور لگائے اور اس نے مزدوروں سے ایک دینار روز ٹھہرا کر انہیں اپنے باغ میں بھیج دیا○ پھر پہر دن چڑھے کے قریب نکل کر اس نے اوروں کو بازار میں بیکار کھڑے دیکھا ○ اور ان سے کہا تم بھی باغ میں چلے جاؤ جو واجب ہے تمہیں دوں گا پس وہ چلے گئے پھر اس نے دو پہر اور سہ پہر کے قریب نکل کر ویسا ہی کیا اور کوئی ایک گھنٹہ دن رہے پھر نکل کر اوروں کو کھڑا پایا اور ان سے کہا تم کیوں یہاں تمام دن بیکار کھڑے رہے ○ انہوں نے اس سے کہا اس لیے کہ کسی نے ہم کو مزدوری پر نہیں لگایا۔ اس نے ان سے کہا۔ تم بھی باغ میں چلے جاؤ۔ جب شام ہوئی تو باغ کے مالک نے اپنے کارندے سے کہا کہ مزدوروں کو بلاؤ اور پچھلوں سے لے کر پہلوں تک انہیں مزدوری دے دو○ جب وہ آئے جو گھنٹہ بھر دن رہے لگائے گئے تھے تو انہیں ایک ایک دینار ملا جب پہلے مزدور آئے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ ہمیں زیادہ ملے گا اور ان کو بھی ایک ہی دینار ملا تو گھر کے مالک سے یہ شکایت کرنے لگے کہ ان پچھلوں نے ایک ہی گھنٹہ کام کیا ہے اور تو نے انہیں ہمارے برابر کر دیا جنھوں نے (ہم نے) دن بھر کا بوجھ اٹھایا اور سخت دھوپ سہی ○ اس نے جواب دے کر ان میں سے ایک سے کہا: "میاں میں تیرے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا، کیا تیرا مجھ سے ایک دینار نہیں ٹھہرا تھا جو تیرا ہے اٹھا لے اور چلا جا، میری مرضی یہ ہے کہ جتنا تجھے دیتا ہوں اس پچھلے کو بھی اتنا ہی دوں ○ کیا مجھے روا نہیں کہ اپنے مال کو جو چاہوں سو کروں؟ یا تو اس لیے کہ میں نیک ہوں بری نظر سے دیکھتا ہے ○ اس طرح آخر، اول ہو جائیں گے اور اول آخر○

اس بشارت میں حضرت مسیح علیہ السلام نے مثالی رنگ میں اقوام وامم عالم کی عملی زندگی اور خدا کی جانب سے ان پر اجر وثواب کا مرقع پیش فرمایا ہے پہلے مزدور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل کی دنیا کے لوگ ہیں اور دوسری جماعت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت بنی اسرائیل مراد ہیں۔ تیسرا گروہ نصاریٰ ہیں اور چوتھی جماعت خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی امت ہے، کائنات ارضی کی عمر کے لحاظ سے پہلی دوسری اور تیسری جماعت کے مقابلہ میں محمد ﷺ کی امت کا زمانہ حیات یوں سمجھئے گویا دن کا آخری حصہ ہے اور اجر وثواب میں اس آخری امت کو پہلی امتوں کے مقابلہ میں برابر کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے یہاں ان کو دوسری تمام امتوں پر برتری حاصل ہے اس لیے کہ اگرچہ ان کا وجود حیات امتوں کے آخر میں ہوا ہے لیکن چونکہ یہ خدا کے آخری پیغام "قرآن" کی حامل اور "سرخیل انبیاء

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱

Marfat.com

رسل ؑ کی امت ہیں اور تمام امتوں سے ان کے رسول ﷺ پر ایمان لانے کا وعدہ و میثاق لیا گیا ہے۔ لہٰذا حیات دنیا کے لحاظ سے گو ان کا زمانہ آخر ہے مگر مرتبہ اور عظمت کے اعتبار سے وہ سب سے اول ہیں۔ یہی ہے مراد بشارت کے پہلے اور آخری جملہ کی یعنی "بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول اور اس طرح آخر اول ہو جائیں گے اور اول آخر۔"

نبی آخر الزماں ﷺ نے بھی ٹھیک اسی طرح ایک مثال بیان فرمائی ہے جو بخاری میں منقول ہے: "دوسری امتوں کے مقابلہ میں دنیا کے اندر تمہاری مثال ایسی ہے جیسا کہ دن کے طویل عرصہ میں عصر (شام) سے غروب آفتاب کے وقت کی، اہل تورات (یہود) کو تورات عطا کی گئی اور انہوں نے اس پر عمل کیا حتیٰ کہ وہ دوپہر ڈھلے عاجز رہ گئے (یعنی خدا کی تعلیم حق کو فراموش کر بیٹھے) تب ان کو مالک نے ایک قیراط مزدوری دے دی اور پھر اہل انجیل (نصاریٰ) کو کام پر لگایا اور انہوں نے دوپہر ڈھلے سے عصر (شام) تک کام کیا اور پھر وہ بھی عاجز رہ گئے تب ان کو بھی مالک نے ایک ایک قیراط مزدوری دے دی، آخر میں ہم کو قرآن ملا اور ہم نے دنیا کی زندگی کے دن غروب ہونے تک کام کیا۔ تب مالک نے ہم کو دو دو قیراط عطا کیے اس پر پہلوں نے شکایت کی کہ ہم نے زیادہ محنت کی مگر تو نے ان کو اور ہم کو برابر کر دیا۔ مالک نے کہا میں نے تمہاری مزدوری میں سے تو کم نہیں کیا۔ تب مالک نے فرمایا: تو پھر میری یہ مرضی ہے کہ میں اپنے پاس سے جس کو چاہوں (مزدوری کی کیفیت و نوعیت کے فرق اور کام کی صلاحیت و استعداد کے پیش نظر) زیادہ دوں۔ فھو فضل اوتیہ من اشاء

اور امم ماضیہ و اقوام سابقہ کے مقابلہ میں امت محمدیہ کی یہی فضیلت ہے جس کو قرآن نے بصراحت اس معجزانہ اسلوب میں بیان کیا ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

"تم (تمام امم و اقوام میں) بہترین امت ہو جو کائنات انسانی (کی خدمت) کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔ تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے باز رکھتے ہو۔"

بہرحال آخری جماعت کا اول ہو جانا اگر اس کا مصداق امت محمد ﷺ نہیں تو اور کون ہے جس کا ذکر تورات کی ان بشارات میں ہو رہا ہے اور جن کی تصدیق "نبی امی" اور قرآن دونوں کر رہے ہیں، عقلاً بھی یہ فرق مراتب واضح ہے اس لیے کہ جبکہ محمد ﷺ تمام انبیاء و رسل کے بعد مبعوث ہوئے اور آپ ﷺ کے قبول کرنے والوں میں آپ ﷺ کی قوم سے بھی زیادہ دنیا کی دوسری اقوام و امم کے افراد شامل ہیں تو یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی فرد یا جماعت پہلے سے کسی مذہبی جماعت میں شامل ہے تو اس کے لیے جدید دعوت حق کو قبول کرنے میں قومی، جماعتی اور نسلی عصبیت و غرور سب سے بڑی رکاوٹ بن کر سامنے آ جاتا ہے۔ پس جو شخص اس رکاوٹ کو پاؤں تلے روند کر دعوت حق پر "لبیک" کہتا ہے وہ بلاشبہ اس کا مستحق ہے کہ اپنے اپنے زمانہ میں پہلی صداقتوں پر ایمان لانے والوں کے مقابلہ میں اس کو دو چند بلکہ چند در چند اجر و ثواب عطا ہو۔

اور انجیل یوحنا میں ایک بشارت اس طرح مسطور ہے:

"اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے "کاہن" اور "لیوی" یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے تو

Marfat.com

اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں انہوں نے اس سے پوچھا کہ پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے اس نے جواب دیا نہیں پس انہوں نے اس سے کہا پھر تو کون ہے تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے؟" ❶

اس پیشین گوئی کا تاریخی زمانہ وہ ہے جب حضرت یحییٰ (یوحنا علیہ السلام ❷) اپنی صدائے حق سے بنی اسرائیل کو مسحور کر رہے تھے اور حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کی بشارت دیتے تھے اس وقت یہود کے مقدسین کی ایک جماعت ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے یہ سوالات کیے۔

سوالات میں تین پیغمبروں کے متعلق ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ ان میں سے کون ہیں مگر انہوں نے انکار کیا وہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں ہیں تو یہ سوالات ظاہر کرتے ہیں کہ یہود تین یا دو پیغمبروں کے ظہور کے منتظر تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے، حضرت ایلیا ❸ کے اور ایک ایسے پیغمبر کے جس کا ذکر ان کے درمیان اس درجہ مشہور تھا کہ انہوں نے سوالات کے وقت دو ناموں کی طرح نام لینا ضروری نہیں سمجھا اور صرف "وہ نبی" کہنا ہی کافی خیال کیا۔

یہ بشارت اس درجہ واضح اور صاف ہے کہ نصاریٰ بجز بے دلیل انکار کے تاریخ کے اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں کہ اگر محمد ﷺ "وہ نبی" کا مصداق نہیں ہیں تو پھر کون ہے۔ کیا معاملہ کی صورت یہ نہیں ہے کہ جس طرح یہود ظہور مسیح علیہ السلام کے منتظر تھے مگر ان کی آمد پر از راہ حسد ان کو رَدّ کر دیا، اسی طرح یہود و نصاریٰ دونوں "وہ نبی" کی شہرت عام کے پیش نظر اس کے ظہور کے سخت منتظر ہونے کے باوجود اس کی بعثت وظہور کے نسلی وقومی عصبیت کی بدولت منکر ہو گئے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے اس طرح بیان کیا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٤٦﴾ ﴾ (البقرہ: ۱۴۶)

"وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ تم کو اس طرح "پیغمبر حق" پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بلاشبہ ان میں سے ایک فریق حق کو چھپاتا ہے اور وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ حق کو چھپا رہے ہیں۔"

یوحنا کی انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کی وصیت بھی محمد ﷺ کی بشارت کے لیے شاہد عدل ہے، فرماتے ہیں:

"تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا کہ تو کہاں جاتا ہے؟ بلکہ اس لیے کہ میں نے یہ باتیں تم سے کہیں تمہارا دل غم سے بھر گیا ○ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے

---

❶ باب ۱۶ آیات ۱۹۔۲۲

❷ یوحنا عبرانی میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا نام ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری کا نام بھی ہے جن کی جانب یوحنا منسوب ہے۔

❸ کہا جاتا ہے کہ کتب قدیمہ میں ایلیا بھی محمد ﷺ کی صفت منقول تھی اور اس لیے خواص علماء یہود ایلیا اور فارقلیط کو ایک ہی تسلیم کرتے تھے مگر بعد کی تحریفات کی بدولت ایک اور "منتظر ہستی" کا اضافہ ہو گیا اور وہ الیاس علیہ السلام ہیں۔ یہود نے اب یہ گھڑ لیا کہ حضرت الیاس علیہ السلام کا دوبارہ ظہور ہوگا اور اس کے لیے اناجیل میں بھی دو کی جگہ تین کے ظہور کا ذکر نظر آتا ہے۔

پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آ کر دنیا کو گناہ اور راست بازی سے اور عدالت کے بارہ میں قصوروار ٹھہرائے گا۔"❶

یہ بشارت حضرت مسیح علیہ السلام کی وصیت ہے اور تمثیلی استعاروں اور تشبیہوں کی بجائے واضح الفاظ میں ایک "موعود پیغمبر" کی خبر دیتی ہے اور موعود ہستی کی جن صفات کا اس میں ذکر ہے وہ حرف بحرف خاتم الانبیاء محمد ﷺ پر صادق آتی ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام حواریوں اور شاگردوں کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ ان کی جدائی سے کس درجہ متاثر ہیں دل غم سے بھرے ہوئے ہیں آنکھیں پرنم ہیں، حسرت و یاس چہرے سے ٹپک رہی ہے کیوں؟ کیا اس لیے کہ ایک انسان ان سے جدا ہو رہا ہے نہیں، نہیں بلکہ خدا کا ایک ہادی، نبی و رسول، پیغمبر صداقت کی وداعی گھڑیاں قریب ہیں اور اب نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا ایسی مقدس ہستیوں سے بہرہ ور ہوگی یا نہیں کیونکہ منکروں اور باطل پرستوں نے خدا کی اس نعمت کی کوئی قدر نہ کی اور اس کو رَد کر دیا۔ اس غم آگیں منظر میں حضرت مسیح علیہ السلام ان کو تسلی و تشفی دیتے اور یقین دلاتے ہیں کہ "میرا جانا تمہارے لیے "فائدہ مند" ہے" اور پھر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اگر میں نہ جاؤں تو وہ "مددگار" تمہارے پاس نہ آئے گا" یعنی میرا کائنات ارضی پر یہ قیام اس "مددگار" کی آمد کے لیے تاخیر کا باعث ہو رہا ہے جس کا آنا تمہارے لیے اس درجہ مفید ہے کہ بایں محبت و خلوص میرا جانا ہی تمہارے لیے فائدہ مند ہے" پھر اس کی معرفت کے لیے مزید باتیں بیان فرمائیں کہ وہ دنیا کو گناہوں (برائیوں) سے باز رکھے گا راست بازی کا حکم کرے گا اور افراط و تفریط کی ان روشوں کے خلاف جو انسانی دنیا کے ہر معاملہ میں رگ و ریشہ کی طرح پھیلی ہوں گی "عدل" سے گریز پر مجرم اور قصوروار ٹھہرائے گا۔

قدرتی طور پر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ ہستی کون ہے جو ان مجموعہ صفات کا مصداق بن سکے۔ علماء نصاریٰ کہتے ہیں کہ اس سے مراد "روح القدس" ہے اور وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے قبر میں جی اٹھنے اور آسمان پر باپ کے پاس چلے جانے کے بعد شاگردوں پر نمودار ہوئی لیکن جب اس باطل تاویل پر ان سے یہ کہا گیا کہ ماضی یا مستقبل میں کون سا زمانہ آچکا ہے یا آئے گا جس پر بشارت کا یہ جملہ صادق آسکے جو دراصل پوری وصیت کی روح ہے "وہ آ کر دنیا کو گناہ سے اور راست بازی سے اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا" اور کس طرح یہ عبارت صرف اس نور پر صادق آسکتی ہے جو شاگردوں پر (روح القدس) ایک کبوتر کی شکل میں نازل ہو کر دکھلائی گئی۔

یہ وصیت تو اس تاویل کے برعکس صاف یہ ظاہر کر رہی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام ایک ایسے عظیم المرتبہ، جلیل القدر پیغمبر کے ظہور کی بشارت سنا رہے ہیں جس کی آمد کائنات انسانی کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کی موجودگی سے بھی زیادہ سودمند ثابت ہوگی اور جو ایک مرتبہ پھر کائنات کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلائے گی اور اس کی تعلیم حق کا معیار سر تا سر "عدل" پر مبنی ہوگا کہ یہی تمام اخلاق کریمانہ اور شعبہ حیات کے لیے اساس اور بنیاد کار ہے اور اس حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے جب ہم تاریخی مذاہب سے دریافت کرتے ہیں کہ اس کا مصداق کون ہے تو اس کے ماسواء اور کوئی جواب نہیں ملتا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد وصیت میں مذکور اوصاف کی مصداق ہستی محمد ﷺ کے ماسواء کوئی ظہور میں نہیں آئی۔ یہی مقدس ہستی ہے جس نے ایسے زمانہ میں جبکہ دنیا کی قوموں اور ان کی سوسائٹیوں میں

❶ باب ۱۶

Marfat.com

"عدل" ایک بے معنی شے رہ گئی تھی اور جب کہ سچی نیک عملی اور خدا پرستی، قومی اور اجتماعی زندگی سے خارج ہو چکی تھی دنیاء انسانی کو یہ پیغام سنایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝﴾ (النحل: ۹۰)

"بیشک اللہ حکم دیتا ہے "عدل" کا "احسان" کا قرابت داروں کے ساتھ سلوک کا اور یقیناً منع کرتا ہے فحش کاموں اور باتوں سے۔ اور بغاوت وسرکشی سے وہ تم کو نصیحت کرتا ہے تا کہ تم نصیحت قبول کرو۔"

اور یہی وہ مقدس ہستی ہے جس کے ظہور کی بدولت اس کی امت کا مقصد حیات یہ ظاہر کیا گیا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

"(اے امت محمد ﷺ) تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی خدمت) کے لیے عالم وجود میں لائی گئی ہے تم لوگوں کو بھلائی اور نیکیوں کا حکم کرتے اور ان کو برائیوں سے باز رکھنے کی تلقین کرتے ہو۔"

مضمون وصیت کے اس نمایاں پہلو کے ماسواء ایک اور روشن اور واضح بات اس وصیت یا بشارت میں وہ جملہ ہے جس میں موعود ہستی کو ایک خاص وصف کے ساتھ یاد کیا گیا ہے یہ وصف اگرچہ جدید ایڈیشنوں میں "مددگار"۔ "وکیل"۔ "معزی" اور "شفیع" ہے، لیکن قدیم یونان، فرنچ، لیٹن اور انگریزی تراجم میں "پیراکلیوتاس" اور عبرانی (جبرو) اور عربی تراجم میں "فارقلیط" پایا جاتا ہے جو عربی لفظ احمد کے ہم معنی اور مرادف ہے۔

یہ بات تو علماء نصاریٰ اور ہر ایک تاریخ دان کے نزدیک متفق علیہ اور مسلم ہے کہ موجودہ اناجیل میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل انجیل نہیں ہے بلکہ جن ناموں سے یہ منسوب ہیں ان کے بھی اصل نسخے نہیں بلکہ تراجم ہیں اور یہ کہ مسیح علیہ السلام کی انجیل کا اور یجنل (اصل) نسخہ قدیم جبرو (عبرانی) زبان میں تھا اس لیے یہ دعویٰ بسہولت کیا جا سکتا ہے کہ اور یجنل نسخہ میں یہ لفظ بلاشبہ احمد ہی ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ صف میں قرآن عزیز نے حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا ہے:

﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ أَحْمَدُ﴾ (الصف: ٦)

اور دلیل یہ ہے کہ موجودہ انجیل کے تراجم میں فارقلیط اسی لفظ احمد کا ہم معنی اور مرادف لفظ اختیار کیا گیا مگر جب علماء نصاریٰ نے یہ دیکھا کہ صداقت خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے لیے کتاب مقدس سے بصراحت تام بہت بڑی دلیل ہاتھ آ گئی اور علماء اسلام کی جانب سے ہم پر قوی حجت قائم ہوئی جاتی ہے تو بعد کے ایڈیشنوں میں لفظ فارقلیط یا پیراکلیوتاس نکال دیا گیا اور اب اس کی جگہ کبھی ناصر (مددگار) کبھی وکیل، کبھی شفیع اور کبھی معزی (تسلی دینے والا) لکھا جانے لگا تاکہ واضح نام کی بجائے ایک ایسی صفت آ جائے جس کا اطلاق بغیر کسی تعیین کے ہر ایک ذات حق پر ہو سکے۔ اناجیل کے قدیم وجدید نسخوں اور پھر قدیم وجدید کے مختلف ایڈیشنوں میں لفظ فارقلیط اور اسی قسم کی دوسری گوناگوں تحریفات کا مطالعہ کرنا ہو تو اس کے لیے میزان الحق اور الفارق کا مطالعہ از بس مفید ہے یہاں

Marfat.com

اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کہ اناجیل کے عربی تراجم میں مسطورہ بالا الفاظ کی بجائے فارقلیط تھا صرف یہ ایک ثبوت کافی ہے کہ ایک صدی قبل کے عربی نسخہ میں جو لندن سے ۱۸۴۴ء میں شائع ہوا تھا یہ لفظ یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۶ میں موجود تھا "والهلب من الاب فيعطيكم فارقليطا اخر۔

تاہم علماء نصاریٰ کی اس واضح تحریف کے بعد بھی ان کا مقصد حل نہیں ہو سکتا اور ایک مرتبہ ان سے پھر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس بشارت میں لفظ فارقلیط (احمد) کی جگہ مسطورہ بالا الفاظ میں سے ہی کوئی لفظ سہی مگر جبکہ اس بشارت کا مصداق روح القدس کا کبوتر کی شکل میں شاگردوں پر نمودار ہو جانا" کسی طرح نہیں بنتا تو پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد تاریخ ادیان میں وہ کون سی ہستی ہے جس کو اس کا مصداق سمجھا جائے۔ کیا علماء نصاریٰ اس بے دلیل انکار کے ساتھ کہ اس کا مصداق ذات اقدس محمد ﷺ نہیں ہیں جرأت کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں ہستی اس مجموعہ صفات کا مصداق تھی یا آج ہے یا آئندہ آئے گی۔ نہیں وہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ان کے پاس اس انکار کے لیے صرف یہی ایک مثبت دلیل ہے کہ روح القدس اس کا مصداق ہے کاش کہ وہ قدرت بھی رکھتے کہ روح القدس کو انسانی شکل میں کائنات کی ہدایت کے لیے لا سکتے کہ وہ پیغمبرانہ صداقت کے ساتھ لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتی برائیوں سے روکتی اور عدل ترک کر کے افراط و تفریط کی راہ بد اختیار کرنے پر لوگوں کو قصوروار ٹھہراتی تب شاید ان کا یہ قول الفاظ بشارت کی مطابقت کر سکتا ورنہ تو یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس بشارت کو ذات اقدس ﷺ کے حق میں تسلیم نہ کرنا صرف نسلی، قومی اور جماعتی گروہ بندی سے پیدا شدہ عصبیت و حسد کا نتیجہ ہے۔

اس سے قطع نظر ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی انجیل میں احمد (فارقلیط) کی بجائے مسطورہ بالا الفاظ ہی میں سے کوئی لفظ تھا تب بھی اس کا مصداق خاتم الانبیاء ﷺ کے ماسوا کوئی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ قرآن عزیز نے مختلف مقامات پر نبی اکرم ﷺ کے جو اوصاف حمیدہ بیان کیے ہیں وہ ان ہی مسطورہ بالا الفاظ کے ہم معنی ہیں مثلاً سورۂ توبہ میں آپ ﷺ کو عزیز، رؤف، رحیم کہا گیا ہے:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲۸ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝۱۲۹﴾ (التوبہ: ۱۲۸۔۱۲۹)

"(ایمان والو!) تمہارے پاس (اللہ کا) ایک رسول آ گیا ہے جو تم ہی میں سے ہے تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہش مند ہے وہ ایمان والوں کے لیے شفقت رکھنے والا، رحمت والا ہے (اے پیغمبر!) اگر اس پر بھی یہ لوگ سرتابی کریں تو ان سے کہہ دو میرے لیے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف اس کی ذات، میں نے اس پر بھروسہ کیا وہ تمام عالم ہستی کی جہانداری کے عرش عظیم کا خداوند ہے۔"

اور سورۂ انبیاء میں ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۷﴾ (الانبیاء: ۱۰۷)

Marfat.com

"اور ہم نے تجھ کو نہیں بھیجا مگر جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر۔"

اور اگر صحیح احادیث کی تصریحات کو بھی ان آیات کی تفسیر کے طور پر شامل کر لیا جائے تب تو اناجیل کے تراجم میں مذکورہ اوصاف بعینہٖ آپ کو مل جائیں گے مثلاً الشافع المشفع الشفیع، الناصر (مددگار) وغیرہ۔

پھر اسی باب کی آیت ۱۳ کو اس مضمون کے ساتھ اگر ملایئے تو معاملہ اور زیادہ واضح اور صاف ہو جائے گا حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لیکن جب وہ سچائی کی روح آئے گا تو تم کو سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔"

غور فرمائیے کیا یہ مضمون "روح القدس" پر صادق آ سکتا ہے جس نے چند شاگردوں پر ظاہر ہو کر اپنی نمود دکھلائی یا ایسی ہستی پر جو لوازم بشریت سے متصف ہونے کے باوجود کائنات انسانی میں رہ کر سچائی کی راہ دکھلائے اور امور غیب سے متعلق خدا نے جو کچھ بتلایا ہے (علامات قیامت، جنت و جہنم، حشر و نشر وغیرہ کی تفصیلات) اس کو مخلوق خدا تک پہنچانے اور پھر معلوم کر و تاریخ ماضی سے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد محمد ﷺ کے علاوہ کون آیا جس نے خدا سے بھٹکے ہوئے انسانوں کا رشتہ دوبارہ خدا سے ملایا اور ادیان و ملل کی گم شدہ صداقتوں کو قرآن کے ذریعہ روشن و نمایاں کیا، کیا موافق و مخالف دونوں شہادتیں اس پر متفق نہیں ہیں کہ اس کی قوم دوست و دشمن سب ہی اس کو "الصادق الامین" کہہ کر پکارتے تھے اور کیا انجیل کا یہ فقرہ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا اور قرآن کی یہ آیت ﴿ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ ﴾ وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا، جو کچھ کہتا ہے اس وحی سے کہتا ہے جو خدا کی جانب سے اتاری جاتی ہے، ایک ہی مقدس ہستی کی تقدیس حیات اور صداقت قول و عمل کے دو عکس نہیں ہیں پس سچائی کی روح میں لفظ "روح" سے فائدہ اٹھا کر اور بقیہ تمام مضمون بشارت سے آنکھ بند کر کے اس کو "روح القدس" کہہ دینا علمی دیانت ہے؟ ہرگز نہیں۔

غرض وصیت یا بشارت حضرت مسیح علیہ السلام کی جانب سے واضح اور صاف اعلان ہے۔ ظہور قدسی صفات ﷺ کا اور اس کا انکار بداہت کا انکار اور تعصب بیجا کی دلیل [1] بشارات النبی ﷺ کا یہ باب بہت وسیع ہے اور چھٹی صدی ہجرت میں ایک مسیحی عالم سعید بن حسن اسکندرانی نے جب کتاب مقدس میں ان بشارات کو دیکھ کر اسلام قبول کیا تو محیط النظر ایک مستقل کتاب اسی موضوع پر تصنیف کی اور ہمیشہ سے علماء اسلام بھی اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ لکھتے رہے ہیں حتیٰ کہ بعض علماء نے ہندوؤں کی قدیم کتابوں اور مجوس کے قدیم نوشتوں میں بھی "منتظر ہستی" سے متعلق جو کچھ مذکور ہے اس کو بشارات النبی ﷺ میں شامل کیا ہے مگر ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہوئے قرآن عزیز کی ان آیات پر اس مضمون کو ختم کر دینا چاہتے ہیں جو نزول قرآن کے وقت سے یہود و نصاریٰ کے سامنے برابر اعلان کرتی رہی ہیں کہ قدیم سماوی کتابوں میں اس مقدس پیغمبر کا تذکرہ برابر رہا ہے اور چونکہ خدا کی تقدیر یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس کا آخری اور کامل و مکمل قانون اسی ذات اقدس ﷺ کے ہاتھوں کائنات ہست و بود تک پہنچے گا۔ اس لیے از بس ضروری

---

[1] اس پیشینگوئی میں فارقلیط سے مفصل محققانہ بحث کے لیے میزان الحق از مولانا رحمت اللہ (نور اللہ مرقدہ) الفارق، ہدایۃ الحیاری اور رسالہ تہذیب الاخلاق مضمون فارقلیط قابل مراجعت ہیں۔

تھا کہ اس کا ذکر پہلے نوشتوں میں ہوتا کہ جب اس کے ظہور کا وقت آ پہنچے تو تمام صادق ادیان وملل سے متعلق امتیں میثاق الٰہی کے مطابق اس پر ایمان لائیں اور اس کی پیش کردہ صداقت اور قانون ہدایت "قرآن" کو اپنے لیے راہ عمل بنائیں۔ چنانچہ سورۂ الفتح میں ارشاد ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ٻوَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ﴾ (الفتح: ۲۹)

"محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ (صحابہ رضی اللہ عنہم) ان کے ساتھ ہیں وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم خو ہیں۔ (اے مخاطب!) تو ان کو دیکھے گا (خدا کے سامنے) جھکنے والے سجدہ کرنے والے اور اس طریقہ سے خدا کے فضل اور اس کی رضاء کے خواہش مند ہیں ان کی نشانی یہ ہے کہ ان کے چہروں (پیشانیوں) پر سجدے کے نشانات ہیں، تورات اور انجیل میں ان کا ذکر اسی طرح ہے۔"

یہ ذکر انجیل برنابا میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور آپ ﷺ کی صفات بہت نمایاں الفاظ میں مذکور ہیں لیکن وہ نصاریٰ کے نزدیک متروک ہے مگر جیسا کہ سابق میں کہا جا چکا ہے اس کا ترک کسی دلیل پر قائم نہیں ہے بلکہ وہ اور بعض دوسری اناجیل کا ترک محض ایک فال کی بناء پر ہوا جو اسی غرض سے نکالی گئی تھی۔ اور سورۂ شعراء میں ہے:

﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ١٩٢؀ۭ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ١٩٣؀ۙ عَلٰي قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ١٩٤؀ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ١٩٥؀ۭ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ١٩٦؁﴾ (الشعراء: ۱۹۲-۱۹۶)

"اور یقیناً یہ (قرآن) جہانوں کے پروردگار کا اتارا ہوا ہے، اس کو روح الامین (جبرئیل علیہ السلام) نے (خدا کی جانب سے) تیرے قلب پر نازل کیا تاکہ تو (خدا کے نافرمانوں کو) ڈرانے والوں میں سے ہو یہ صاف عربی زبان میں ہے اور اس کا ذکر پہلوں (گذشتہ پیغمبروں) کی کتابوں میں ہے۔"

اور ایک مرتبہ خود نبی اکرم ﷺ نے انہی بشارات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

((دعوة ابی ابراهیم و بشرٰی عیسٰی)).

"(یعنی) میں اپنے باپ ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا ہوں اور عیسیٰ مسیح (علیہ السلام) کی بشارت ہوں (یعنی) دعاء خلیل اور نوید مسیحا۔"

قرآن عزیز نے دعا ابراہیم علیہ السلام کا ذکر اس طرح کیا ہے:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ١٢٩؀ۧ﴾ (البقرہ: ۱۲۹)

"اے ہمارے پروردگار! ان (اہل عرب) ہی میں سے ایک رسول بھیج، جو ان پر تیری آیات پڑھے اور ان کو کتاب اور

Marfat.com

حکمت سکھائے اور ان کو (ہر قسم کی برائیوں سے) پاک کرے بے شبہ تو غالب اور حکمت والا ہے۔"

اور بشارت مسیح علیہ السلام کا ذکر سورۂ صف میں اس طرح منقول ہے:

﴿ وَ اِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ فَلَمَّا جَاۗءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ ﴾ (الصف:٦)

"اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) نے کہا: "اے بنی اسرائیل! میں تمہاری جانب اللہ کا رسول (ایلچی) ہوں تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد (فارقلیط) ہوگا پس جب ان کے پاس وہ (خدا کا پیغمبر) دلائل لے کر آیا تو یہ کہنے لگے یہ تو کھلا جادو ہے۔"

صبح سعادت:

تاریخ ادیان وملل شاہد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور پر تقریباً چھ صدیاں گزر چکی ہیں اور معمورۂ عالم خدا کے پیغمبروں کی معرفت حاصل کی ہوئی صداقت حق کو فراموش کر چکا ہے تمام کائنات انسانی خدا پرستی کی بجائے مظاہر پرستی میں مبتلاء ہے اور ہر ملک میں نوع انسانی سے لے کر نوع جمادات تک کی پرستش سرمایہ نازش بنی ہوئی ہے۔ کوئی انسان کو اوتار (خدا) کہہ رہا ہے تو کوئی خدا کا بیٹا۔ ایک اگر مادہ پرست ہے تو دوسرا خود اپنی آتما (روح) کو ہی خدا سمجھ رہا ہے۔ سورج کی پوجا ہے، چاند اور تاروں کی پرستش ہے، حیوانوں، درختوں اور پتھروں کی عبادت ہے، آگ، پانی، ہوا، مٹی کے سامنے ناصیہ فرسائی ہے غرض کائنات کی ہر شے پرستش اور پوجا کے لائق ہے اور نہیں ہے تو صرف ذات واحد قابل پرستش نہیں ہے نہ اس کی احدیت کا تصور خالص ہے اور نہ صمدیت کا۔ اس کو اگر مانا بھی جاتا ہے تو دوسروں کی پرستش اور عبادت کے ذریعہ وہ اگر خالق موجودات ہے تو دوسروں کے واسطہ اور احتیاج کے ساتھ مادہ، روح اور ترکیب سب ہی باتوں کا محتاج ہے وہ اگر مالک موجودات ہے بھی تو انسان، حیوان، درخت، پتھر کے بل بوتہ پر، غرض ساری دنیا میں اصل کارفرمائی مظاہر کی تھی اور "ذات حق" صرف نام کے لیے، حقیقت سے چشم پوشی تھی مگر مجاز کے ساتھ ذوق عشق، ذات حق سے بعد تھا مگر، مظاہر سے قربت سرمایہ، سعادت، خالق سے بیگانگی تھی مگر مخلوقات کی عبادت گزاری شعار عام تھا اور ہر طرف

﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ ﴾

"ہم ان کو نہیں پوجتے مگر اس لیے تاکہ وہ خدا کی جانب ہماری قربت کا ذریعہ بن جائیں۔" کا مظاہرہ نظر آتا تھا۔

یہی وہ تاریک دور تھا جس میں "سنت اللہ" یعنی خدا کے قانون ہدایت وضلالت نے ماضی کی تاریخ کو پھر دہرایا اور غیرت حق نے فطرت کے قانون ردعمل (Reaction) کو حرکت دی یعنی آفتاب ہدایت برج سعادت سے نمودار ہوا اور چہار جانب چھائی ہوئی شرک وجہالت اور رسم ورواج کی تاریکیوں کو فنا کر کے عالم ہست وبود کو علم ویقین کی روشنی سے منور کر دیا۔

Marfat.com

۹ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کی صبح، وہ صبح سعادت تھی جب مدنیت و حضارت سے محروم، بن کھیتی کی سرزمین مکہ کے ایک معزز قبیلہ قریش (بنی ہاشم) میں عبداللہ بن عبدالمطلب کے یہاں آمنہ بنت وہب کے مشکوے معلّی سے آفتاب رسالت محمد ﷺ نے ظہور کیا۔

خدایا! صبح کیسی سعادت افروز تھی جس نے کائنات ارضی کو رشد و ہدایت کے طلوع کا مژدۂ جانفزا سنایا اور وہ ساعت کیسی مبارک و محمود تھی جو معمورۂ عالم کے لیے پیغام بشارت بنی، عالم کا ذرہ ذرہ زبان حال سے نغمے گا رہا تھا کہ وقت آ پہنچا کہ اب دنیاء ہست و بود کی شقاوت دور اور سعادت مجسم سے عالم معمور ہو، ظلمت شرک و کفر کا پردہ چاک ہو اور آفتاب ہدایت روشن ہو تابناک ہو۔ مظاہر پرستی باطل ٹھہرے اور خدائے واحد کی توحید مقصد حیات قرار پائے۔

دنیا تو کیا ملک، قبیلہ اور خاندان کو بھی یہ علم نہ تھا کہ مذاہب عالم جس آفتاب رسالت کے طلوع ہونے کے منتظر ہیں وہ اس غیر متمدن سرزمین اور عبدالمطلب کے گھرانے سے جلوہ گر ہوگا کہ اس کی ولادت باسعادت کو خاص اہمیت دیتے اور تاریخ ولادت کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتے مگر جس خالق کائنات کے نوشتہ تقدیر نے اس کو مقدس ہستی بنانے کا فیصلہ کیا۔ اسی کے ید قدرت نے ولادت باسعادت کے لیے ایک معجزانہ تاریخی نشان بھی ظاہر کر دیا اور وہ اصحاب الفیل کا واقعہ تھا۔

معتبر اور مستند روایات شاہد ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی ولادت اس واقعہ سے چند ماہ بعد ہوئی۔ [1]

یہ واقعہ جن خصوصیات کا حامل ہے ان کے پیش نظر یہ عرب کے لیے عموماً اور اہل حجاز کے لیے خصوصاً نہایت عجیب اور حیرت زا تھا۔ اور اس لیے وہ کبھی اس کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اس کا نام ہی عام الفیل (یعنی ہاتھیوں والا سال) رکھ دیا۔ مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ دراصل یہ واقعہ ایک (نشان) ہے اس جلیل القدر ہستی کے ظہور کا جو ایک روز تمام معمورۂ انسانی کو مرکز توحید اور قبلہ ابراہیمی پر جمع کر دے گی اور اس کو غیر اللہ (بتوں) کی آلودگیوں سے پاک کر کے توحید الٰہی کے نغموں کے لیے مخصوص کرائے گی۔ کیونکہ یہی وہ پہلا مقام ہے جو صرف خدائے واحد کی پرستش کے لیے بنایا گیا۔ یہ مندر نہیں تھا کہ مورتی کی پوجا کی جائے، یہ گرجا اور کلیسا بھی نہ تھا کہ یسوع مسیح علیہ السلام اور کنواری مریم علیہا السلام کے مجسموں کے سامنے سر جھکایا جائے نہ یہ آتش کدہ تھا آگ کو نور کا مظہور قرار دے کر اس کی پرستش کی جائے اور نہ یہ صلوات یہود تھا کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا کر اس کی تقدیس کے نغمے گائے جائیں بلکہ یہ تو خدا اور صرف ایک خدا کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا:

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ۚ۹۶﴾﴾ (آل عمران: ۹۶)

غرض بعثت کے بعد جب قدرت کے اعجاز نما ہاتھوں نے عام الفیل میں آپ ﷺ کی ولادت کا راز سربستہ آشکارا کر دیا تب دنیا نے یہ سمجھا کہ ابرہۃ الاشرام اور اس کے لشکر سے کعبۃ اللہ کی یہ حفاظت اس لیے تھی کہ وہ وقت قریب آ پہنچا جب دوبارہ یہ مقدس مقام خدائے واحد کی عبادت اور توحید خالص کی مرکزیت کا شرف حاصل کرنے والا ہے پس جو طاقت بھی اس مقصد عظیم سے تصادم ہوگی خود ہی پاش پاش ہو کر رہ جائے گی۔

[1] واقعہ کی تفصیلات قصص القرآن ج ۳ میں گزر چکیں۔

Marfat.com

ابرہہ عیسائی تھا اور اہل عرب (قریش) مشرک، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ ابرہہ اور اس کے لشکر کی بربادی قریش کی نصرت و حمایت کے لیے تھی، نہیں! بلکہ اس لیے سب کچھ ہوا کہ مشیت الٰہی کے خلاف ابرہہ کی خواہش تھی کہ یمن (صنعاء) میں جو خوبصورت گرجا (القلیس) باپ، بیٹا، روح القدس (تثلیث) کے فروغ دینے کو بنایا گیا تھا مرکز توحید "کعبۃ اللہ" کی جگہ وہ مرجع خلائق بنے اور اس مقصد کی خاطر اس نے انہدام کعبہ کے لیے لشکر کشی کی ادھر قریش یعنی سارا عرب اس کی مقاومت سے عاجز و درماندہ تھا، ابرہہ وقت کے تمام جنگی اسلحہ اور سروسامان کا مالک اور قریش ان سب سے یکسر محروم، تب غیرت حق حرکت میں آئی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ دنیوی طاقت کے گھمنڈ پر مشیت الٰہی سے ٹکرانے والا خود ہی فنا کے گھاٹ اتر گیا اور محور توحید "کعبہ" خدائی حفاظت کے سایہ میں اس طرح قائم رہا۔

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی ؀﴾ (النازعات: ٢٦)

"بلاشبہ اس بات میں بڑی ہی عبرت ہے اس شخص کے لیے جو خوف خدا رکھتا ہے۔"

قرآن عزیز نے سورۃ الفیل میں اسی حقیقت کو معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ نقل کیا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ كَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ ؀ اَلَمْ یَجْعَلْ كَیْدَهُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ ؀ وَّ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ؀ تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ ؀ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ؀﴾

(الفیل: ۱۔۵)

"(اے پیغمبر!) کیا تجھے نہیں معلوم کہ تیرے پروردگار نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا ان کے فریب کو ناکام نہیں بنا دیا؟ اور ان پر فوج در فوج پرند بھیج دیے، وہ پرند ان پر کنکریاں پھینکتے تھے پھر (خدا نے) ان ہاتھیوں والوں کو کھائے ہوئے بھس کے مانند کر دیا۔"

بہرحال عام الفیل، نبی اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت کا سال ہے اور یہ واقعہ آپ ﷺ کے ظہور قدسی کا سب سے بڑا قریبی نشان ہے اور یہ حقیقت اس شخص پر بخوبی عیاں ہے ﴿لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِیْدٌ﴾ جس کے پاس قبول حق کے لیے دل ہے یا وہ حاضر دماغی کے ساتھ امر حق کی جانب کان لگائے ہوئے ہے۔"

تاریخ ولادت کی تحقیق:

تمام ارباب تاریخ و سیر کا تین باتوں پر کلی اتفاق ہے ایک یہ کہ ولادت کا سال "عام الفیل" تھا چنانچہ سیرت و مغازی کے مشہور امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ اور جلیل القدر محدث و مورخ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ جمہور کی یہی رائے نقل کرتے ہیں:

و کان مولدہ علیہ الصلوٰۃ والسلام عام الفیل و ھذا ھو المشھور عن الجمھور و قال ابراھیم بن منذر الخرامی و ھو الذی لا یشك فیه احد عنمائنا انه علیه الصلوٰۃ والسلام وُلِدَ عام الفیل۔ [1]

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۶۱

"جمہور کے نزدیک یہی قول مشہور ہے کہ نبی ﷺ کی ولادت عام الفیل میں ہوئی اور ابراہیم بن منذر کہتے ہیں کہ اس بات میں کسی عالم کو بھی شک وشبہ نہیں کہ نبی علیہ السلام عام الفیل میں پیدا ہوئے۔"

والمجتمع علیہ انہ علیہ السلام ولد عام الفیل۔ ❁

"اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ محمد ﷺ عام الفیل میں پیدا ہوئے۔"

اور دوسری اور تیسری بات یہ کہ آپ ﷺ کی ولادت ربیع الاول کے مہینے میں دوشنبہ (پیر) کے دن صبح صادق کے وقت ہوئی:

وھذا مالا خلاف فیہ انہ ولد ﷺ یوم الاثنین ثم الجمھور علی ان ذلک کان فی شھر ربیع الاول۔ ❁

"اور اس پر کلی اتفاق ہے کہ آپ ﷺ دوشنبہ (پیر) کے دن پیدا ہوئے، پھر جمہور کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ ربیع الاول کا مہینہ تھا۔"

قال ابوقتادہ رضی اللہ عنہ ان اعرابیا قال یا رسول اللہ ما تقول فی صوم یوم الاثنین فقال ذلک یوم ولدت فیہ و انزل علیّ فیہ۔ ❁

"ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: گاؤں کے ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ پیر کے دن کے متعلق کیا فرماتے ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ وہ دن ہے، جس میں میری ولادت ہوئی اور جس میں مجھ پر سب سے پہلی وحی نازل ہوئی۔"

لیکن اہل سیر و تاریخ اس بات میں مختلف الرائے ہیں کہ ربیع الاول کی کون سی تاریخ تھی عوام میں تو مشہور قول ہے کہ ۱۲ ربیع الاول تھی اور بعض کمزور روایات اس کی پشت پر ہیں اور اکثر علماء ۸ ربیع الاول کہتے ہیں لیکن صحیح اور مستند قول یہ ہے کہ ۹ ربیع الاول تاریخ ولادت ہے اور مشاہیر علماء تاریخ و حدیث اور جلیل المرتبہ ائمہ دین اسی تاریخ کو "صحیح" اور "اثبت" کہتے ہیں، چنانچہ حمیدی، عقیل، یونس بن یزید، ابن عبداللہ، ابن حزم، محمد بن موسیٰ، خوارزمی، ابوالخطاب ابن دحیہ، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن حجر عسقلانی، شیخ بدرالدین عینی جیسے مقتدر علماء کی یہی رائے ہے۔

محمود پاشا فلکی نے (جو قسطنطنیہ کا مشہور ہیئت داں اور منجم گزرا ہے) ہیئت کے مطابق جو زائچہ اس غرض سے مرتب کیا تھا کہ محمد ﷺ کے زمانہ سے اپنے زمانہ تک کے کسوف و خسوف (سورج گرہن و چاند گرہن) کا صحیح حساب معلوم کرے، پوری تحقیق کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ سن ولادت باسعادت میں کسی حساب سے بھی دوشنبہ (پیر) کا دن ۱۲ ربیع الاول کو نہیں آتا۔ بلکہ ۹ ربیع الاول ہی کو آتا ہے اس لیے بلحاظ قوت و صحت روایات اور باعتبار حساب ہیئت و نجوم ولادت مبارک کی مستند تاریخ ۹ ربیع الاول ہے۔ ❁

اصحاب فیل کے واقعہ سے کس قدر عرصہ بعد ولادت ہوئی؟ متعدد اقوال میں سے مشہور قول یہ ہے کہ پچاس دن بعد ظہور قدسی ہوا ہے:

وقیل بخمسین یوما و ھو اشھر۔ ❁

❁ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۶۱ ❁ ایضاً ج ۲ ص ۲۶۱ ❁ مسلم

❁ ۸ اور ۹ کا اختلاف حقیقی نہیں ہے بلکہ مہینے کے ۲۹ اور ۳۰ کے حساب پر مبنی ہے اور جبکہ حساب سے ثابت ہو گیا کہ صحیح تاریخ ۲۱ اپریل تھی تو ۸ کے متعلق تمام اقوال دراصل ۹ کی تائید میں پیش ہو سکتے ہیں۔

❁ فتح الباری ج ۶ و تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۶۰

Marfat.com

"ایک قول یہ ہے کہ اصحاب فیل کے واقعہ سے پچاس دن بعد ولادت باسعادت ہوئی اور یہی قول زیادہ مشہور ہے۔"

نسب مبارک:

نبی اکرم ﷺ عربی النسل ہیں اور عرب کے معزز قبیلہ قریش کی سب سے زیادہ مقتدر شاخ بنی ہاشم سے ہیں، قرآن عزیز نے اہل عرب کو خطاب کرتے ہوئے متعدد مقامات پر آپ ﷺ کے عربی نژاد ہونے کا ذکر کیا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ﴾ (الجمعه: ۲)

"(خدا) وہ ذات ہے جس نے امیین (ان پڑھ لوگوں) میں سے ہی ایک رسول بھیج دیا جو ان پر اس کی آیات پڑھتا اور ان کا تزکیہ کرتا اور ان کو الکتاب (قرآن) اور حکمت سکھاتا ہے۔"

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾ (التوبه: ۱۲۸)

"بلاشبہ تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول (محمد ﷺ) آیا۔"

﴿اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ (آل عمران: ۱۶۴)

"جب کہ بھیج دیا اللہ نے ان میں ایک رسول جو بلحاظ نسب ان ہی میں سے ہے۔"

﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَ مَنْ حَوْلَهَا﴾ (الشورٰی: ۷)

"اسی طرح ہم نے آپ ﷺ پر قرآن کو بزبان عربی اتارا ہے تاکہ (اے محمد ﷺ) تم مکہ والوں اور ان کے گردوپیش کے بسنے والوں کو (برائیوں سے) ڈراؤ۔"

﴿اَعْجَمِیٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ ۝﴾ (النحل: ۱۰۳)

"کیا (اس قرآن کو سکھا دیتا ہے کوئی عجمی) اور حالت یہ ہے کہ یہ واضح عربی زبان میں ہے۔"

ماہرین انساب عرب کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ ﷺ حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام کی نسل سے ہیں اس لیے کہ قریش بغیر کسی اختلاف رائے کے عدنانی، ہیں اور عدنان کے اسماعیلی ہونے میں دو رائے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

عرب کے علم الانساب کے مشہور عالم محدث ابن عبدالبر تحریر فرماتے ہیں:

و أجمعوا ان محمداً رسول الله ﷺ من ولد عدنان و ان عدنان من ولد اسمعيل و ان ربيعة و مضر من ولد اسمعيل. ❶

"اور علماء انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ عدنان کی نسل سے ہیں اور عدنان اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے ہے

❶ القصد والامم ص ۲۲ والانباہ علی قبائل الرواہ ص ۴۶

Marfat.com

اور ربیعہ اور مضر بھی اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔"

علماء انساب نے نسب نامہ کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

اور والدہ کی جانب سے آپ ﷺ کا نسب نامہ کلاب پر جا کر پدری سلسلۂ نسب کے ساتھ مل جاتا ہے یعنی آمنہ بنت وہب بن عبدمناف بن زہرہ بن کلاب، کلاب کو حکیم بھی کہتے ہیں۔

البتہ عدنان اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے درمیان سلسلہ کے ناموں سے متعلق ماہرین انساب کی آرا مختلف [1] ہیں اس لیے نبی اکرم ﷺ نے اس کے متعلق ارشاد فرما کر "کذب النسابون" (نسب بیان کرنے والوں نے غلط بیانی کی ہے) کسی رائے کی توثیق نہیں فرمائی اور اپنے سلسلہ نسب کے متعلق صرف اس قدر ارشاد فرمایا ہے:

ان اللہ اصطفی کنانۃ من ولد اسمٰعیل واصطفی قریشا من کنانۃ واصطفی من قریش بنی ھاشم واصطفانی من بنی ھاشم. [2]

"اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں سے کنانہ کو ممتاز بنایا اور کنانہ میں سے قریش کو عزت و عظمت بخشی اور قریش میں سے بنی ہاشم کو امتیاز عطا فرمایا اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو منتخب فرمایا۔"

گویا اس طرح سلسلہ نسب کے صرف ان حصوں کی تصدیق فرمائی جو ماہرین انساب کے درمیان بلا خلاف مسلم تھے۔

اسلام نے نسبی تفاخر اور اس پر مبنی سماجی رسم و رواج کو بہت بڑا گناہ اور جرم قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے خدا کے یہاں فضیلت کا معیار "ایمان اور عمل صالح" ہے اور وہاں حسب و نسب کی کوئی پرسش نہیں ہے، نیز نسبی تفاخر اسلام کے بنیادی قانون "اخوت اسلامی" کے قطعاً منافی ہے اس لیے اسلام کے اجتماعی دستور میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، تاہم واقعاتی طور پر تاریخ یہ پتہ دیتی ہے کہ ہمیشہ انبیاء و رسل علیہم السلام اپنی قوم اور اپنے ملک کے معزز خاندان میں سے ہوتے رہے ہیں، حکمت خداوندی کا یہ فیصلہ غالباً اس لیے ہوا کہ قوموں اور ملکوں کے رسم و رواج اور نسبی تفاخر کے خلاف ان کی دعوت حق اور ان کا پیغام صداقت کہیں ذاتی مفاد کے لیے نہ سمجھ لیا جائے اور اس طرح اس کا اخلاقی پہلو کمزور نہ ہو جائے مثلاً کسی سماجی زندگی میں ذات پات کی تقسیم اور کاسٹ سسٹم اس طرح موجود ہے کہ اس کی وجہ سے بعض انسان بعض کو حقیر و ذلیل سمجھنے لگے ہیں تو اگر اس قوم یا ملک میں کوئی پیغمبر اس خاندان سے تعلق رکھتا ہو جس کو قومی اور ملکی رواج نے نیچ اور پست اقوام کا لقب دے رکھا ہے ایسی حالت میں اس ظلم صریح باطل کوشی کے خلاف اس پیغمبر کی صدائے حق اتنی سرعت کے ساتھ کامیاب نہ ہوتی جس قدر اس حالت میں ہو سکتی ہے جس کو وہ خود اس قوم ملک کے اونچے خاندان سے تعلق رکھتا ہو اور صرف ایک اسی خاص مسئلہ میں نہیں بلکہ اس کے پیغام حق کی تمام اصلاحات میں یہ فرق ضرور نظر آئے گا۔

بہر حال یہ حکمت ہر مقام اور ہر موقع پر مفید ہو یا نہ ہو عرب کے حالات و واقعات کے لیے از بس مناسب اور مفید ثابت ہوئی چنانچہ صدائے اسلام نے جب اپنی انقلابی اور اصلاحی گرج سے روحانیت کی خفتہ کائنات میں تہلکہ ڈال دیا تو ایک جانب نبی اکرم ﷺ

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ [2] مسلم

نے اہل عرب کو یہ سنایا کہ جہاں تک خاندانی امتیاز کا تعلق ہے تو میں قریشی بھی ہوں اور ہاشمی بھی، اور یہ امتیاز تمہارے نقطہ نظر سے بہت بلند ہے مگر میری نگاہ میں اس کی حیثیت صرف یہ ہے: "ولا فخر، یہ کوئی فخر کرنے کی چیز نہیں ہے۔" اور دوسری جانب نسبی تفاخر کی بنیادوں کے انہدام اور مساوات انسانی کی دعوت عام کے لیے اس خدائی فرمان کا اعلان کر کے کائنات انسانی کی تمام تاریک ذہنیت کے خلاف انقلاب عظیم برپا کر دیا:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ﴾ (الحجرات: ۱۳)

"لوگو! میں نے تم سب کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے (یعنی تخلیق انسانی کی ابتدا آدم اور اس کی بیوی حوا (علیہما السلام) سے ہوئی ہے) اور تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں صرف اس لیے بانٹ دیا ہے کہ آپس میں (صلہ رحمی کے لیے) پہچان اور معرفت کا طریقہ قائم کر لو (اور اصل یہ ہے کہ) بلاشبہ اللہ کے نزدیک وہی عزت والا ہے جو تم میں سے پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے والا ہے۔"

اور حجۃ الوداع کے موقع پر جب آپ ہزار ہا صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں وداعی پیغام سنا رہے ہے اور اسلام کے بنیادی اصول کے استحکام کے لیے اہم وصایا پیش فرما رہے تھے اس حکم خداوندی کی تائید میں یہ انقلاب آفریں پیغام بھی ارشاد فرمایا:

ان اللہ یقول ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ﴾ فلیس لعربی علی عجمی فضلٌ و لا لعجمی علی عربی فضلٌ و لا لاسود علی ابیض فضل و لا لابیض علی اسود فضل الا بالتقوٰی یا معشر القریش لا تجیئوا بالدنیا تحملونها علی رقابکم و یجئ الناس بالاٰخرۃ فانی لا اغنی عنکم من اللہ شیئًا.... الخ [1]

"اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: "اے افراد نسل انسانی! بلاشبہ ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تمہارے درمیان خاندان اور قبائل بنا دیے ہیں تا کہ (صلہ رحمی کے لیے) تعارف پیدا کرو بلاشبہ تم میں اللہ کے نزدیک وہی برگزیدہ ہے جو زیادہ متقی (نیک کردار ہے) پس (خوب یاد رکھو کہ) نہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ عجمی کو عربی پر کوئی برتری حاصل ہے نہ کالے کو گورے پر کوئی فضیلت ہے اور نہ گورے کو کالے پر کوئی بزرگی۔ بلکہ ان سب کے لیے فضیلت کا معیار صرف تقوٰی (نیک عملی) ہے۔ اے گروہ قریش! ایسا نہ ہو کہ تم (خاندانی فخر کے زعم باطل کی وجہ سے قیامت میں) دنیا کو کاندھے پر لاد کر لاؤ اور دوسرے لوگ (نیک عملی کی بدولت) آخرت کا سامان لے کر آئیں، واضح رہے کہ (تمہارے محض قریشی ہونے کی وجہ سے) میں تم کو خدا کے فیصلے سے قطعاً بے پرواہ نہیں بنا سکتا (خدا کے یہاں تو صرف عمل ہی کام آئے گا)۔"

اور ایک مرتبہ نسبی فخر کے خلاف تبلیغ حق کرتے ہوئے اس کو "جاہلی تعصب" فرمایا اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کے لیے سخت

---

[1] مجمع الفوائد جلد ۱ از معجم طبرانی کبیر

Marfat.com

تاکید فرمائی۔ ارشاد فرمایا:

((ان اللہ تعالیٰ قد اذھب عنکم عبیۃ الجاھلیتہ و فخرھا بالاباء و انما ھو مؤمن تقی او فاجر شقی الناس کلھم بنو ادم و ادم خلق من تراب)). ❶

"اللہ تعالیٰ نے (دعوت اسلام کے ذریعہ) تمہارے درمیان سے جاہلیت کے تعصب اور نسبی فخر کو مٹا دیا ہے اور اب انسان یا نیکوکار مومن ہے اور یا بدکار پاپی، سب انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے، (پھر فخر کرنے کا کیا موقع ہے)؟"

اسی مقدس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اسلام کے دور اولین میں نہ ذات پات کا کوئی سوال باقی رہ گیا تھا اور نہ خاندانی تفاخر کی کوئی حیثیت سمجھی جاتی تھی اور اس صدائے حق نے غلاموں تک کو سروری بخش دی تھی، چنانچہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی سالاری لشکر اور امامت جہاد، بلال حبشی رضی اللہ عنہ کے لیے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ارشاد "سید ھذہ الامۃ" "اس امت کا سردار" قریش اور ہاشمی صحابہ کے درمیان ایک عجمی انسان ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی جلالت و عظمت، صہیب رومی رضی اللہ عنہ اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی رفعت و بلندی مرتبت اور اسی قسم کے ہزاروں واقعات تھے جو چشم فلک نے آنکھوں سے دیکھے اور تاریخ نے آغوش صفحات میں محفوظ رکھے ہیں مگر وائے بدبختی کہ بیرونی اثرات اور عرب سے باہر عجمی ماحول نے ایک عرصہ کے بعد مسلمانوں کو پھر اسی لعنت سے دوچار کر دیا۔ جس کا مرثیہ اقبال مرحوم کو اس طرح کرنا پڑا۔ ع

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

سرور دو عالم ﷺ نے یہ فرما کر ((انما ھو مومن تقی او فاجر شقی)) اس مسئلہ کو اس درجہ صاف کر دیا تھا کہ مسلمان کی زندگی میں کبھی اس کے برعکس زندگی کا کوئی اثر پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا، ذات پات تو صرف اس لیے تھیں کہ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں باہمی تعارف، صلہ رحمی اور حسن سلوک کا معاملہ ایک دوسرے کے ساتھ بآسانی ہو سکے، ورنہ کیسی ذات، کہاں کا خاندان؟ کون برادری؟ یہاں تو صرف دو ہی فطری اور نیچرل تقسیمیں ہیں یا "نیکوکار" یا "بدکار" کسی قوم، کسی خاندان اور کسی ملک کا انسان ہو اگر "سچی خدا پرستی" اور نیکوکاری رکھتا ہے تو وہ سب ایک برادری اور ایک قوم ہیں اور اگر مشرک و کافر اور بدکار پاپی تو یہ سب ایک گروہ اور ایک ٹولی ہیں۔

یتیمی:

خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے والد ماجد کا نام عبداللہ اور والدہ ماجدہ کا نام آمنہ تھا۔ ابھی آفتاب ہدایت نے کائنات ہست و بود میں طلوع نہیں کیا تھا اور حضرت آمنہ کی مشکوئے معلیٰ اس ودیعت کی امین ہی تھی کہ والد ماجد کا انتقال ہو گیا اور ارباب سیرت کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ایک قافلہ تجارت کے ساتھ شام تشریف لے گئے تھے، واپسی میں جب قافلہ مدینہ (یثرب) پہنچا تو وہ بیمار ہو گئے اور

---

❶ ابوداؤد ۔ ترمذی

اس لیے اپنے ننھیال بنی نجار میں قیام پذیر رہے قافلہ جب مکہ پہنچا تو عبدالمطلب نے بیٹے کے متعلق دریافت کیا قافلہ نے ان کی بیماری اور مدینہ میں قیام کا واقعہ کہہ سنایا۔ تب عبدالمطلب نے اپنے بڑے بیٹے حارث کو دریافت حال کے لیے مدینہ بھیجا، حارث جب مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ نے ایک ماہ چند روز بیمار رہ کر داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ واپس آ کر جب حارث نے باپ کو حادثہ کی اطلاع دی تو عبدالمطلب اور تمام خاندان کو اس صدمہ جانکاہ نے بے حال کر دیا۔ کیونکہ عبداللہ اپنے باپ اور بھائیوں کے بہت چہیتے تھے۔

غرض جب ولادت باسعادت ہوئی تو اس سے قبل ہی آپ ﷺ کو یتیمی کا شرف حاصل ہو چکا تھا، چنانچہ قرآن نے آپ ﷺ کی یتیمی و دنیوی وسائل سے محرومی کے باوجود آغوش رحمت کردگار میں نشوونما پا کر ہادی عالم بننے کا معجزانہ اختصار کے ساتھ سورہ والضحیٰ میں تذکرہ کیا ہے:

﴿ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۞ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۞ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۞ ﴾ (الضحی: ۶۔۸)

"(اے پیغمبر!) کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہیں پایا پھر اپنی آغوش (رحمت) میں جگہ دی اور کیا تجھ کو ناواقف نہیں پایا، پھر تجھ کو (کائنات کی ہدایت کے لیے) ہدایت ماب بنایا اور کیا تجھ کو (ہر قسم کے وسائل سے محروم ومحتاج نہیں پایا) پھر تجھ کو (ہر قسم کی سروری دے کر) غنی بنا دیا۔"

بقول حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ ان آیات میں عجیب وغریب اعجاز اور اسلوب بیان کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے تمام ارتقائی مدارج کا تذکرہ ہے تم سمجھتے ہو، کہ ﴿ فَاٰوٰى ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ پروردگار عالم نے آپ ﷺ کو رہنے سہنے کی صورت پیدا کر دی یا آپ ﷺ کو بے یار ومددگار نہیں رہنے دیا، یہ بھی صحیح ہے مگر اس کلام ربانی کی اصل روح یہ ہے کہ اس نے ذات اقدس ﷺ کو ہر قسم کے مادی اسباب ووسائل سے بے پرواہ رکھ کر اپنی آغوش رحمت میں لے لیا اور آپ ﷺ کے نشوونما وارتقاء کو خالص اپنی تربیت میں کامل ومکمل کیا۔ [1] اور ﴿ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ﴾ کی تفسیر کو خود قرآن ہی نے دوسری جگہ روشن کر دیا ہے مثلاً سورہ شوریٰ میں ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ ﴾ (الشوریٰ: ۵۲)

"اور اسی طرح ہم نے تیری جانب اپنے "امر" کی روح کا القاء کیا (حالانکہ اس سے پہلے) نہ تو کتاب (قرآن سے واقف تھا اور نہ ایمان (کی حقیقت) سے، لیکن ہم نے اس کو "نور" (روشنی) بنا دیا ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں (اس کی صلاحیت واستعداد کے پیش نظر) اس کے ذریعہ ہدایت دیتے ہیں۔"

اور آیت ﴿ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ﴾ میں دنیوی احتیاج وغناء کا ذکر روح کلام نہیں ہے بلکہ اس جانب اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

---

[1] تفسیر ابن کثیر

Marfat.com

آپ ﷺ کو قربت و کمال کا وہ مرتبہ عظمیٰ عطا فرمایا ہے کہ مادی اور روحانی ہر قسم کی احتیاج سے بالاتر بنا کر صفات حمیدہ اور اخلاق کریمانہ کی مثل اعلیٰ "غنا" سے بہرہ ور بنا دیا، یہی وہ غنی ہے جس کا خود ذات اقدس ﷺ نے اس طرح ذکر فرمایا ہے:

((لیس الغنٰی عن کثرۃ العرض ولکن لغنٰی عن النفس)).

"غنا مالداری کی بہتات کا نام نہیں ہے حقیقی غنی "نفس کا ماسوی اللہ سے مستغنی ہو جانا" ہے۔"

عمر مبارک ابھی چھ سال ہی کی تھی کہ آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ آمنہ کا بھی انتقال ہو گیا بی بی آمنہ آپ ﷺ کو آپ کے ننھیال (مدینہ) میں لے کر گئی تھیں، واپسی میں مقام ابوا میں بیمار ہو گئیں اور چند روز علیل رہ کر وہیں انتقال فرمایا اور سن مبارک ابھی آٹھ منزلیں ہی طے کر پایا تھا کہ دادا عبدالمطلب نے بھی دنیا سے منہ موڑ لیا اور اس طرح عہد طفلی ہی میں وسائل تربیت اور دنیوی اسباب کفالت سے محرومی نے گویا مشیت الٰہی کی جانب سے یہ اعلان کر دیا کہ جس ذات قدسی صفات کو خدائے واحد نے خالص اپنی تربیت کے لیے منتخب کر لیا ہے کیسے ممکن ہے کہ اس کو دنیوی اسباب و وسائل تربیت کا محتاج بنائے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک یتیم و یسیر اور مادی وسائل سے محروم ہستی کو اپنے لیے چن کر کس طرح اپنی ربوبیت کاملہ کا مظہر بنایا۔ سورہ انشراح میں اس حقیقت کو اچھوتے انداز میں بیان فرمایا:

﴿اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ ۙ﴿۱﴾ وَ وَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَهۡرَكَ ۙ﴿۳﴾ وَ رَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ ؕ﴿۴﴾﴾ (الانشراح:۱-٤).

"کیا ہم نے (قبول حق و صداقت کے لیے) تیرا سینہ نہیں کھول دیا اور (معرفت الٰہی کی حقیقی طلب اور قوم اور کائنات انسانی کی بے راہ روی پر ان کی ہدایت کی تڑپ کا) وہ بوجھ ہم نے تجھ سے دور کر دیا جس نے تیری کمر توڑ رکھی تھی اور ہم نے تیرے ذکر کو کائنات ہست و بود میں بلند کر دیا۔"

"شرح صدر" یہ کہ اب وسائل تعلیم و تعلم کے ذریعہ حاصل ہونے والے تمام علوم و معارف اس عطاء الٰہی اور وہبی معرفت و علم کے سامنے ہیچ ہو کر رہ گئے ہیں جس کی سمائی کے لئے ہم نے تیرے سینہ کو کھول دیا ہے، اب علوم و معارف کے بحر ناپیدا کنار بھی ہوں تو تیرے سینہ کا دامن وسیع ان کے لیے کافی و وافی ہے اور اسی "شرح صدر" نے معرفت الٰہی کے تمام پوشیدہ گنجینے تجھ پر وا کر دیے اور وہ سارا بوجھ تیرے سینہ پر سے ہٹ گیا جس نے تیری کمر کو اس لیے شکستہ کر رکھا تھا کہ قلبی جستجو اور دلی تڑپ کے باوجود تو اس سے قبل نہیں جانتا تھا کہ معرفت الٰہی کی راہ مستقیم کون سی ہے اور گم کردہ راہوں کی راہنمائی کی سبیل کیا ہے؟ مگر اب یہ سب کچھ روشن ہو جانے کے بعد ہم نے عالم بالا و پست میں تیرے ذکر کو وہ بلندی اور رفعت عطا فرمائی کہ تیرا مقام ؏

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

قرار پایا، چنانچہ نام احمد و محمد ﷺ ہے اور مقام، مقام محمود، سورۃ الحمد وظیفہ حیات ہے اور لواء حمد قیامت میں طغرائے امتیاز ؏

حسن یوسفؑ، دم عیسیٰؑ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

Marfat.com

یہی نہیں بلکہ "قرآن کی تجدید دعوت" کے ذریعہ تیری صدائے حق نے اعتقاد وعمل اور ایمان وکردار کی راہ سے تمام دنیا کے نظام ہائے اجتماعی وسماجی میں جو عظیم الشان انقلاب بپا کر دیا اور سوسائٹی کے ہر شعبہ کی پرانی اور فرسودہ بساط کو اُلٹ کر جو نئی بساط بچھا دی اس نے تیرے ذکر کو وہ رفعت و برتری عطا کی کہ کوئی قوم، کوئی مذہب اور کوئی جماعت کسی نہ کسی شکل میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

بت پرستی سے نفرت، خلوت پسندی اور عبادت الٰہی کا ذوق :

عہد طفولیت سے ازدواجی زندگی کے ابتدائی مراحل تک کے حالات و واقعات تفصیل کے ساتھ کتب سیرت وحدیث میں منقول ہیں۔ اس لیے وہیں لائق مراجعت ہیں۔ مختصر یہ کہ دادا عبدالمطلب کے انتقال کے بعد آپ ﷺ کے چچا ابوطالب آپ ﷺ کے ساتھ بہت انس رکھتے تھے اور زندگی بھر آپ ﷺ کی رفاقت کا حق ادا کرتے رہے۔ انبیاء ورسل کی سنت کے مطابق آپ ﷺ نے اپنی روزی کا بار کسی پر نہیں ڈالا اور دنیوی مشاغل میں آپ ﷺ نے بکریاں بھی چرائیں اور تجارت بھی کی، شام کے مشہور تجارتی شہر بصریٰ میں بھی اس غرض سے تشریف لے گئے اور پچیس سال کی عمر میں یہی سفر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے عقد کا باعث ہوا، آپ ﷺ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال تجارت مضاربت پر بصریٰ کی منڈی میں لے گئے، خدیجہ رضی اللہ عنہا کا غلام میسرہ بھی رفیق سفر تھا، اس درمیان میں آپ ﷺ کی صداقت وامانت، ایک یہودی راہب کی بشارت اور بیش بہا منافع تجارت کا جو تجربہ اور مشاہدہ کیا تھا میسرہ نے وہ سب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہہ سنایا چنانچہ یہی تاثر ازدواجی رشتہ کا باعث بن گیا۔

اب زندگی میں ایک اور انقلاب ہوا کہ آپ ﷺ کو خلوت گزینی کی طرف رغبت ہوئی اور غار حرا میں روز وشب بسر ہونے لگے، بت پرستی سے شروع ہی سے نفرت تھی اس لیے کبھی نہ کسی صنم کے آگے سر جھکایا اور نہ کسی ایسی مجلس میں شرکت فرمائی جو صنم پرستی کے میلے کہلاتے تھے، اب خلوت میں فطرت سلیم جس طرح راہنمائی کرتی خدائے واحد کی عبادت کرتے مگر ایک خلش سینہ میں ایسی تھی جو اس حالت میں بھی بے چین ہی رکھتی، اکثر یہ سوچ کر تڑپ جاتے تھے کہ میری قوم خصوصاً اور دنیاء انسانی عموماً کس طرح خدائے واحد کو چھوڑ کر صنم پرستی اور مظاہر پرستی میں مبتلا ہے اور یہ کہ اخلاق کی دنیا کس طرح اُلٹ گئی ہے آخر وہ کونسا نسخہ کیمیاء ہے جو اس حالت میں انقلاب پیدا کر دے اور سچی خدا پرستی اور نیک عملی پھر ایک مرتبہ اپنی نمود دکھلائے۔

یہی جذبات وتاثرات تھے جو قلب مضطرب میں موجزن تھے اور خلوت کدۂ حرا میں انہی کیفیات کے ساتھ ذات اقدس ﷺ مصروف یاد الٰہی رہتی اور جب کئی کئی دن اس طرح گزر جاتے تو کبھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حاضر ہو کر آذوقہ حیات دے جاتیں اور کبھی خود بنفس نفیس جا کر چند روز کا سامان خورد ونوش لے آتے اور حراء میں پھر مشغول عبادت ہو جاتے، چنانچہ چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی آج حرا زبان سے اس کیف آگیں منظر کا شاہد ہے جس کا لطف اس نے برسوں اٹھایا ہے، مشہور محدث ومؤرخ حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس واقعہ ان مختصر الفاظ میں حسن وخوبی کے ساتھ بیان کیا ہے:

وانما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یحب الخلا والانفراد علی قومه لما یراهم علیه من الضلال المبین من عبادة الاوثان والسجود للاصنام وقویت محبة للخلوة عند مقاربة ایحاء اللہ الیه صلوات اللہ وسلامه علیه۔ ❶

❶ البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۵

Marfat.com

"اور رسول اللہ ﷺ (دور شباب میں) خلوت پسند ہو گئے تھے اور قوم سے الگ تنہائی میں وقت گزارتے تھے کیونکہ وہ قوم کی اس کھلی گمراہی کو دیکھ کر" کہ وہ بت پرستی میں مبتلا اور بتوں کے سامنے سجدہ گزار ہے" کڑھتے تھے اور جوں جوں آپ ﷺ پر وحی الٰہی کے نزول کا زمانہ قریب ہوتا جاتا تھا (مشیت الٰہی سے) اسی قدر آپ ﷺ کی خلوت پسندی میں اضافہ ہوتا جاتا، صلوات اللہ وسلامہ علیہ "اس ذات اقدس ﷺ پر خدا کی رحمتیں اور سلامتی نازل ہو۔"

بہرحال یہی وہ خلوت کدۂ عبادت تھا جہاں ذات اقدس ﷺ پر سب سے پہلے "وحی الٰہی" کا نزول ہوا اور بالترتیب سورۂ اقراء اور سورۂ مدثر کی چند آیات سنانے کے لیے بشیر ونذیر بنا دیا۔

حقیقت وحی:

یہ "وحی" و "تنزیل" کیا ہے جس کو "نبوت ورسالت" کے خصائص میں سے کہا جاتا ہے اور یہ "منصب نبوت ورسالت" کیا شے ہے جس کا "وحی وتنزیل" کے ساتھ اتنا گہرا اور قریبی تعلق ہے کہ منطقی اصطلاح میں "لازم وملزوم" کہا جا سکتا ہے اور اس اصطلاحی گفتگو سے قطع نظر سادہ الفاظ میں اس سوال کو کیوں نہ اس طرح پیش کر دیا جائے کہ کائنات انسانی کے ہر معاملہ میں جبکہ حسن وقبح کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لیے فطرت نے ہم کو "جوہر عقل" عطا کر دیا ہے اور انسان کے اندر کی یہ سرچ لائٹ (Search Light) ہر ایک مادی شعبۂ حیات میں رہنمائی کرتی ہے تو پھر "رسول ونبی کے ذریعہ پیغام الٰہی" کی حاجت کیا ہے؟ اور عالم روحانیات کے مسائل اور معرفت الٰہی کے حصول میں تنہا "عقل" ہی کیوں کافی نہیں سمجھی جاتی؟ یہی وہ سوال ہے جس کے حل ہو جانے پر "وحی" اور "نبوت" دونوں کی حقیقت بھی خود بخود واضح ہو جا سکتی ہے۔

اس سوال کو حل کرنے کے لیے پہلے ایک تمہید قابل توجہ ہے اور دراصل وہی اس مسئلہ کی کلید ہے۔

تم جب کائنات کے وجود وخلق کو عمیق فکر ونظر سے مشاہدہ کرتے ہو تو یہ حقیقت ہر جگہ ابھری ہوئی نظر آتی ہے کہ خالق کائنات نے اپنی ربوبیت کاملہ کے فیض وعطا سے ہر شے کو جس طرح وجود بخشا اور خلق کیا اس کو "ہدایت" (راہنمائی) سے بھی سرفراز کیا ہے اور اگر یہ نہ ہوتی تو کائنات کا وجود وخلق مہمل اور بیکار ہو جاتا، کیونکہ یہی "ہدایت" ہر ایک جاندار پر زندگی اور معیشت کی راہ کھولتی، ان کی حیات کو مفید بناتی اور ضروریات حیات کی طلب وحصول میں راہنمائی کرتی ہے اور یہی ناموس فطرت کا وہ فیض عام ہے جس کے بغیر کوئی مخلوق بھی سامان حیات اور وسائل تربیت سے استفادہ نہیں کر سکتی ورنہ وجود وحیات کی یہ گرمجوشیاں ہی ظہور پذیر ہو سکتیں۔

"مچھلی کے جائے کن تیرائے" اسی حقیقت کی جانب اشارہ ہے، وہ جب اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں تو خود بخود پانی میں تیرنے لگتے اور اپنی غذا کی جستجو میں مصروف ہو جاتے ہیں، پرندوں کے بچے انڈے سے باہر آتے ہی ہوا میں اُڑنے کی کیوں کوشش کرتے نظر آتے ہیں، حیوان اور انسان کا بچہ جب اس کارگاہ ہستی میں قدم رکھتا ہے تو بھوک وپیاس دور کرنے کے لیے ماں باپ سے تعلیم حاصل نہیں کرتا بلکہ خود بخود ماں کے سینہ پر منہ رکھ کر غذا کے خزانہ سے دودھ کیوں چوسنے لگتا ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ تم کہتے ہو کہ یہ فطرت کا قانون ہے جو ان سب کو "فیض ہدایت سے فیض یاب کر کے مخلوق کی نشوونما کا سامان مہیا کرتا ہے، یہ "ہدایت" ہے جو ہر حرکت حیات میں اپنا کام کر رہی ہے اور یہ "فیض ہدایت" ہے جو خالق کائنات کی جانب سے مخلوقات کی نشوونماء کے لیے "فیض عام" ہوا ہے۔

Marfat.com

لیکن ابھی وسعت نظر کو آگے بڑھنے دیجئے اور قدرت حق کے مشاہدہ کے لیے تیز گام ہو جیے تو کارگہ قدرت اور نوامیس فطرت کی کرم فرمائیاں اور زیادہ جلوہ آرا نظر آئیں گی۔ اور تم دیکھو گے کہ یہ "ہدایت" بھی دوسری موجودات کی طرح ارتقائی درجات رکھتی ہے اور ہر ایک درجہ اپنی افادیت کی نمود جدا رکھتا ہے۔ چنانچہ اس راہ میں سب سے پہلے "وجدان کی ہدایت" سامنے آتی ہے اور یہ طبیعت حیوانی کے "فطری اور باطنی الہام" کا نام ہے، یہی وہ ابتدائی درجہ ہے جو بچہ کو قید ہستی میں آنے کے فوراً بعد ہی کسی خارجی تعلیم وتربیت کے بغیر اس کی غذا کا پتہ دیتا اور اسباب حیات کے لیے معلم بنتا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو انسان کی ارتقائی منزل پر پہنچ کر اور "ضمیر کی آواز" "اندر کی صدا" بن کر حقائق کی معرفت کے لیے خارجی دلائل و براہین سے زیادہ قوی حجت ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد "ہدایت حواس" کا درجہ ہے یہ پہلے درجہ سے بلند ہے اور اس کی عطاء وبخشش سے ہر ایک ذی روح دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے، چھونے کی قوتیں حاصل کرتا ہے اور ان کے ذریعہ کائنات عالم میں اپنی افادیت اور استفادہ دونوں کو ترقی دیتا ہے۔

قدرت حق کی جانب سے یہ دونوں درجے انسان اور حیوان دونوں کو عطاء ہوئے ہیں اور دونوں کی یکساں طور پر راہنمائی کرتے ہیں، مگر ان دونوں سے بلند ایک درجہ اور ہے جو "ہدایت عقل" کہلاتا ہے اور صرف "انسان" ہی کے لیے مخصوص ہے اور یہ بھی پہلے دو درجوں کی طرح بدیہی اور فطرت کے قوانین ونوامیس میں نمایاں جگہ رکھتا ہے۔ یہی وہ "ہدایت" ہے جو انسان کو بقیہ تمام حیوانات سے امتیاز بخشتی، اس کے سامنے فکر ونظر اور ترقیوں کی راہیں کھولتی ہے اور اسی کی بدولت وہ "اشرف المخلوقات" کہلانے کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔

عطیہ الٰہی "ہدایت" کے یہ تینوں درجے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں حضرت انسان کی راہنمائی کا حق ادا کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ "وجدان" اس میں سعی پیہم کا جوش وولولہ پیدا کرتا ہے "حواس" اس کے لیے معلومات فراہم کرتے ہیں اور "عقل" اس کو جزئیات و کلیات کا علم بخشتی اور ان سے متعلق احکام ونتائج ترتیب دیتی ہے۔

غرض یہی وہ "ہدایت" ہے، قرآن عزیز نے جس کا ذکر انسانی تخلیق وتربیت کے سلسلہ میں کیا ہے، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے باہمی مکالمہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدائے برحق کی ربوبیت کاملہ کا جس طرح اظہار فرمایا ہے اس کا ذکر یوں کیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے:۔

﴿ رَبُّنَا الَّذِيٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝ ﴾ (طٰه: ۵۰)

"ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی پھر اس پر راہ عمل کھول دی۔"

اور سورۂ اعلیٰ میں ہے:

﴿ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝ ﴾ (الاعلیٰ: ۲۔۳)

"وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی پھر اس کو درست کیا پھر ہر وجود کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا، پھر اس پر راہ عمل کھول دی۔"

اور سورۂ بلد میں ہے:

﴿ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ۝۸ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ ۙ۝۹ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۚ۝۱۰ ﴾ (البلد: ۸۔۱۰) ❶

"کیا ہم نے اس کو (دیکھنے کے لیے) دو آنکھیں نہیں دیں اور کیا (بولنے کے لیے) زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے، اور ہم نے اس کو اچھی اور بری دونوں راہیں دکھا دیں۔"

اور سورۂ دہر میں ہے:

﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ۝۳ ﴾ (الدھر: ۲۔۳)

"ہم نے انسان کو (مرد وعورت کے) ملے جلے نطفہ سے پیدا کیا جس کو (ہم) مختلف حالتوں میں پلٹتے ہیں پھر اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنا دیا، ہم نے اس پر راہ عمل کھول دی، اب یہ اس کا کام ہے کہ شکر گزار بنے یا ناشکر گزار۔"

مگر یہ بات بھی بہت صاف ہے کہ ہدایت کے ان ہر سہ مراتب "وجدان" "حواس" "عقل" کی راہ عمل اپنے اپنے دائرۂ عمل ہی تک محدود ہے یعنی "وجدان" ایک جاندار کے اندر زندگی کے لیے جوش عمل اور سعی مسلسل ولولہ تو پیدا کر سکتی ہے مگر حیوان یا انسان سے باہر محسوسات خارجیہ کا ادراک اور علم اس کے دائرۂ عمل سے خارج ہے، اسی طرح "ہدایت حواس" محسوسات کا ادراک ضرور پیدا کر دیتی ہے لیکن یہ اس کے احاطۂ عمل سے باہر ہے کہ وہ محسوسات کے نتائج واحکام اور جزئیات سے کلیات کا اور کلیات سے جزئیات کا استنباط کر سکے کیونکہ یہ کارفرمائی "ہدایت عقل" سے متعلق ہے جو عام حیوانات کے لیے نہیں بلکہ صرف انسان کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔

تو "ہدایت عقل" اگرچہ پہلی دونوں ہدایات کے مقابلہ میں بلند مرتبہ رکھتی اور کائنات کی بلند ترین ہستی (حضرت انسان) کی راہنمائی کرتی ہے تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ "عقل" کا دائرہ وسیع تر ہونے کے باوجود پھر محدود ہے کیونکہ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ عقل جو کچھ اور جس قدر بھی نتائج واحکام کا استنباط واستخراج کرتی ہے اس کا دائرہ محسوسات ہی تک محدود رہتا ہے اور حواس خمسہ (قوت باصرہ، سامعہ، لامسہ، شامہ، ذائقہ) نے اپنی اپنی خدمات انجام دے کر جو کچھ ہمارے لیے فراہم کیا ہے "عقل اسی پر اپنا تصرف کرتی اور کر سکتی ہے لیکن یہ بات کہ محسوسات کی سرحد سے پرے کیا کچھ ہے اور اس پردے کے پیچھے کیا ہے؟ اس مقام پر پہنچ کر "عقل" بھی عاجز و درماندہ ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ "درجہ ہدایت" بھی اس سلسلہ میں ہم کو کسی قسم کی روشنی پہنچانے سے معذور نظر آتا ہے۔

علاوہ ازیں اگر وجدان کی تکمیل کے لیے حواس اور حواس کی تکمیل کے لیے عقل کی ہدایت موجود نہ ہوتی تو انسان ہرگز ان مدارج ارتقاء اور مراتب رفیع پر نہ پہنچ پاتا جن تک آج پہنچا ہوا ہے اور آئندہ جن تک پہنچنے کے لیے میدان عمل میں گامزن ہے، اگر انسان

---

❶ اس آیت میں وجود کائنات کے چار مراتب بیان کر کے قرآن نے ایک عظیم الشان "حقائق علمیہ" کا ایک باب کھول دیا ہے یہ چار مراتب بالترتیب "خلق، تسویہ، تقدیر، ہدایت" ہیں اور یہی چار مراتب خلاصہ حقائق ہیں خلق یہ کہ وجود بخشا، تسویہ یہ کہ اس کی استعداد کے مطابق اس کی درست کاری کی، تقدیر یہ کہ ہر شے سے متعلق اس کے بدء خلق سے اس کے نتیجہ حیات تک کے لیے پہلے سے ایک مقررہ اندازہ طے کر دیا اور ہدایت یہ کہ اس پر ہر قسم کی راہ عمل کھول دی۔ تفصیلات کتب تفاسیر میں مطالعہ فرمائیں۔

Marfat.com

میں وجدان کی قوت نہ ہوتی تو کس طرح حواس کی دنیا تک اپنی حیات کو پہنچا سکتا اور اگر محسوسات کے ادراک کے لیے حواس کی قوتیں نہ ہوتیں تو انسان کس طرح اپنی ذات سے خارج اشیاء کا ادراک کر سکتا اور ترقی کے لیے کوئی قدم اٹھا سکتا اور جبکہ حواس کے وسائل ادراک محدود ہیں، اور نہ صرف محدود بلکہ بسا اوقات گمراہی اور غلطی میں مبتلا کر دیتے ہیں مثلاً ہم کو طویل فاصلہ کی بڑی سے بڑی چیز چھوٹی نظر آتی ہے یا خلط صفراء کے بڑھ جانے سے شیریں سے شیریں چیز ذائقہ میں تلخ معلوم ہوتی ہے یا فاصلہ ہونے کی وجہ سے ہم رنگوں کے امتیاز میں اکثر غلطی کر جاتے ہیں تو ان تمام حالتوں میں، عقل کی ہدایت، کام آتی اور صحیح راہنمائی کرتی ہے اور اصل حقیقت کو پیش نظر لاتی ہے، وہ کہتی ہے کہ اگر طویل فاصلہ کی بناء پر تم کو "جہاز" ایک چھوٹی سی چیز نظر آتا ہے تو یہ نگاہ اور قوت باصرہ کا قصور ہے ورنہ جہاز ایک لمبی چوڑی اور بڑی شے کا نام ہے، اسی طرح شیریں اور تلخ کا فیصلہ کرتی ہے اور کہتی ہے کہ حقائق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی شیریں ہر حالت میں شیریں ہے، اس لیے ذائقہ کی یہ تلخی مرض کی وجہ سے ہے غرض حواس کی غلطیوں سے محفوظ رکھ کر اصل حقیقت کو واضح کرنا "عقل کی ہدایت" کا فریضہ ہے اس لیے ہم ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس سے قطع نظر...... کہ عقل محسوسات کی حدود سے آگے کچھ نہیں جانتی...... انسان کی عملی زندگی کے تمام حالات میں عقل کی ہدایت بھی کافی اور مؤثر ثابت نہیں ہوتی اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ نفس انسانی، جذبات، رجحانات اور قسم قسم کی خواہشات سے متاثر و مغلوب ہے بلکہ اکثر یہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ جب "عقل" اور "جذبات" کے درمیان کشمکش ہوتی ہے تو فتح "جذبات" ہی کی ہوتی ہے اور "عقل" درماندہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

تو ان حالات میں "عقل" ہی تقاضا کرتی ہے کہ یہاں "عقل سے بھی بلند" اور کوئی درجہ ہونا چاہیے جو عقل سے زیادہ مؤثر رہنما اور ہر قسم کی کوتاہیوں سے پاک اور بے لوث ثابت ہو۔

اس تمہید کا حاصل یہ نکلا کہ انسان محسوسات کے دائرہ میں محدود رہ کر بھی اور ماوراء محسوسات کے ادراک کے لیے بھی "ہدایت عقل" سے بلند (ایک چوتھے) درجہ ہدایت کا محتاج ہے تو اب لائق غور و فکر ہے یہ بات کہ جس "رب العالمین" نے اپنی ربوبیت کاملہ سے انسان کے ارتقائی کمالات کی حاجات و ضروریات کے پیش نظر ہدایت وجدان سے بلند ہدایت حواس اور ہدایت حواس سے رفیع ہدایت عقل عطا فرمائی تو جبکہ عقل کی ہدایت بھی خاص حدود سے آگے نہیں جا سکتی اور حصول کمالات اور اعمال کے صحیح ضبط و نظم کے لیے ہی کافی نہیں ہے۔ نیز ماوراء محسوسات کے عدم علم کے باوجود اس کے انکار پر کوئی مثبت علمی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وجدانی جذبات و احساسات اور شعور نفس اس کے "حقیقت" ہونے کا پتہ دیتے ہیں تو کیا اس خدائے برحق کی ربوبیت اور فیض رحمت کے لیے یہ منافی نہ تھا کہ وہ انسان کو "ہدایت عقل" سے بلند کوئی "مرتبہ ہدایت" عطا نہ کرے؟ ضرور منافی تھا اور اس لیے ایسا نہیں ہوا بلکہ اس نے اس کو ایک اور بلند تر مرتبہ "ہدایت وحی" بخشا، یہ مرتبہ ہدایت اپنی راہنمائی میں ہر قسم کی کوتاہیوں اور خطاء و قصور سے مامون و محفوظ ہے کیونکہ یہ خدا کی جانب سے ہر شے کی حقیقت کا علم و یقین عطا کرتا ہے اور ہدایت وحی کے افاضہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی مقدس ہستی کو جو ہر قسم کے گناہوں اور عیوب سے "معصوم" ہوتی ہے اس مقصد کے لیے چن لیتا ہے کہ وہ اس کی جانب سے کائنات انسانی تک "ہدایت وحی" کو پہنچا دے، اس لیے یہ مقدس ہستی ایک جانب لوازم بشریت کے ساتھ مقیدرہ کر دوسرے انسانوں کی طرح "انسان" اور "بشر" کہلاتی ہے اور دوسری جانب عیوب و ماثم سے "معصوم" رہ کر خدا کے ساتھ وہ تعلق رکھتی

ہے جو دوسرے مقدس سے مقدس انسانوں کو بھی حاصل نہیں ہوتا اور اس طرح خدا اور اس کے بندوں کے درمیان افاضۂ "ہدایت وحی" کے لیے ایلچی اور واسطہ بنتی ہے، ایسی حقیقت کا نام مذہب کی اصطلاح میں "نبوت و رسالت" ہے۔

قرآن حکیم نے ہدایت کے اس مرتبہ عالی کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ حسب ذیل چند شواہد ملاحظہ ہوں:

﴿وَ اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى﴾ (حم السجدہ: ۱۷)

"لیکن قوم ثمود تو اسے بھی ہم نے راہ حق و ہدایت دکھلائی تھی لیکن اس نے اندھے پن کو پسند کیا اور "ہدایت" کی راہ نہ چلی۔"

﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۗ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (الانعام: ۷۱)

"(اے پیغمبر!) کہہ دیجیے، یقیناً اللہ کی ہدایت ہی "حقیقی ہدایت" ہے اور ہم سب کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ تمام کائنات عالم کے پروردگار کے آگے سر عبودیت جھکا دیں۔"

﴿وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۗ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ (الروم: ۶۹)

"اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں سعی و جانفشانی کی تو ضرور ہے کہ ہم بھی ان پر اپنی راہیں کھول دیں اور بلاشبہ اللہ ان لوگوں کا ساتھی اور مددگار ہے جو نیک کردار ہیں۔"

﴿اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝ وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَ الْاُوْلٰى ۝﴾ (اللیل: ۱۲-۱۳)

"بلاشبہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم رہنمائی کریں (ہدایت وحی عطاء کریں) اور یقیناً آخرت اور دنیا دونوں ہمارے ہی لیے ہیں۔"

ارتقائی نقطۂ نظر سے "ہدایت وحی" اور مسئلہ نبوت و رسالت کی وضاحت کے لیے اشہب فکر کو یوں بھی مہمیز کیا جا سکتا ہے کہ جب کہ یہ عقلی اور عملی نظریہ مسلمات میں سے ہے کہ "بقاء انفع" یا "بقاء اصلح" کے فطری قانون کے مطابق کائنات کی گوناگوں موجودات میں ہر ایک شے اپنے موجود رہنے کے لیے کوئی "حکمت و مصلحت" ضرور رکھتی ہے اور حکیم مطلق کا قانون فطرت کسی شے کو اسی وقت تک باقی رکھتا ہے جب تک اس کا وجود "نافع" اور "مفید" ہونے کی صلاحیت رکھتا اور جس غرض و غایت کے لیے اس کو پیدا کیا گیا ہے اس کو پورا کرتا ہے اور اسی قانون "بقاء انفع و اصلح" سے یہ بات بھی بہت واضح اور نمایاں طور پر ثابت ہوتی ہے کہ "نفع اور افادیت" کا سب سے اہم جزو یہ ہے کہ ہر شے اپنے سے بلند مخلوق اور سلسلۂ مخلوقات میں سے ہر نوع اپنے سے بلند نوع کی بقاء کے لیے مفید و معاون ثابت ہو، پس جبکہ حضرت انسان کو عقل بھی موجودات عالم کی سب سے بلند مخلوق اور مدارج ارتقاء کی بلند ترین کڑی تسلیم کرتی ہے اور اسی قانون کی رو سے موجودات عالم کی ہر شے اس کی خدمت، اس کے نفع اور اس کی افادیت میں مصروف عمل نظر آتی ہے تو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اشرف المخلوقات (انسان) کا وجدان، اس کے جذبات عالیہ اور اس کے افکار و خیالات کی پرواز جبکہ عالم مادیات سے کہیں زیادہ بلند اور رفیع ہیں اور اس کی عقل یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ماوراء مادہ سے ناواقف ہے پھر بھی اس پردہ کے پیچھے کچھ ہونے کا احساس رکھتی اور اس کی معرفت کے لیے چسک محسوس کرتی ہے۔ فطرت الٰہی کا فیضان اور بقاء انفع کا ناموس اس کو عالم مادیات و محسوسات ہی کے اندر محصور رکھتا، اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ فطرت "بخیل" ٹھہرتی بلکہ یہ فطرت کا بہت بڑا ظلم ہوتا اور یہ ظاہر ہے کہ

Marfat.com

تنہا عقل اس کو اس منزل تک پہنچانے کے لیے قاصر و نا کام ہے لہٰذا از بس ضروری تھا کہ "فطرت الٰہی" اس کی رہنمائی کے لیے مزید کوئی سامان مہیا کرتی اور انسان کی ذہنی و فکری ترقیوں کو درجۂ تکمیل تک پہنچاتی۔ پس ماوراء مادہ علوم و معارف اور کائنات انسانی کی فلاح و نجات کے مقصد عظیم کے لیے عقل کی رہنمائی کا یہی وہ فیضان الٰہی ہے جس کو قرآن کی اصطلاح اور مذہبی بول چال میں "وحی نبوت" کہا جاتا ہے اور آیات ذیل اسی حقیقت کا اعلان کرتی ہیں:

﴿ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ﴾ (الانعام: ۱۹)

"اس نے (خدانے) مجھ پر اس قرآن کی وحی کی تاکہ اس کے ذریعہ تمہیں (اہل عرب کو) اور انہیں جن تک اس کی تعلیم پہنچ جائے (ربع مسکون کو) "انکار اور بدعملی کے نتیجہ سے" ڈراؤں۔"

﴿ اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ كَمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی نُوْحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِیْسٰی وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَیْمٰنَ ۚ وَ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ﴿۱۶۳﴾ وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَیْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَیْكَ ؕ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَكْلِیْمًا ۚ﴿۱۶۴﴾ رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ﴿۱۶۵﴾ ﴾ (النساء: ۱۶۳-۱۶۵)

"(اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری جانب اسی طرح "وحی" بھیجی جس طرح نوح علیہ السلام پر اور ان نبیوں پر جو نوح علیہ السلام کے بعد ہوئے بھیجی تھی، اور جس طرح ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب، عیسیٰ ایوب، یونس، ہارون، سلیمان (علیہم السلام) پر بھیجی اور داؤد کو زبور عطاء فرمائی، نیز خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم (قرآن میں) پہلے سنا چکے ہیں اور جن کا حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا، اور (اسی طرح) اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام کرنا ہوتا ہے، یہ تمام رسول (خدا پرستی اور نیک عملی پر) خوش خبری دینے والے اور (انکار حق پر) ڈرانے والے تھے (اور اس لیے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے (اور نیک و بد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور پیش کر سکیں (یعنی یہ عذر کر سکیں کہ ہمیں راہ حق کی طرف کسی نے دعوت نہیں دی تھی) اور خدا (اپنے کاموں میں) سب پر غالب ہے اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت والا ہے۔"

﴿ وَ لَمَّا جَآءَ عِیْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَ لِاُبَیِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۶۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۶۴﴾ ﴾ (الزخرف: ۶۳-۶۴)

"اور جب عیسیٰ علیہ السلام خدا کی) نشانیاں لے کر آیا، کہا "میں تمہارے پاس حکمت و دانائی لے کر آیا ہوں اور اس لیے آیا

Marfat.com

ہوں کہ بعض ان باتوں کو جن کے متعلق تمہارے درمیان اختلاف ہے صاف صاف بیان کر دوں، پس اللہ کے متقی بندے بن جاؤ اور میری پیروی کرو (اس بات میں کہ) بیشک اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس اسی کی عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔"

﴿يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ وَّ يَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾﴾ (النساء: ۱۷۴۔۱۷۵)

"(اے افراد نسل انسانی!) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے برہان (دلیل وحجت) آ گئی اور ہم نے تمہاری طرف واضح اور آشکارا روشنی بھیج دی پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انہوں نے اس کا سہارا مضبوط پکڑ لیا تو وہ انہیں عنقریب اپنی رحمت کے سایہ میں داخل کر دے گا اور ان پر اپنا فضل کرے گا اور انہیں اپنے تک پہنچنے کی راہ دکھائے گا۔ ایسی راہ جو بالکل سیدھی راہ ہے۔"

قرآن نے ان آیات میں "ہدایت وحی" کو "حکمت" "برہان" (حجت و دلیل اور نور مبین) (آشکار روشنی) کہا ہے تاکہ یہ بخوبی واضح ہو جائے کہ جس طرح محسوسات و مادیات کے لیے "عقل" کو "روشنی" اور "دلیل راہ" کہا جاتا ہے اسی طرح عقل کے دائرہ حدود سے آگے کے لیے "ہدایت وحی" یہی حیثیت رکھتی اور یہی خدمات انجام دیتی ہے۔

"ہدایت وحی" کی ضرورت پر اب تک جو کچھ کہا گیا اگر اس کے علاوہ مزید اضافہ مطلوب ہو تو مبدأ فیاض کے اس لطیف و حسین فیضان کے متعلق اس روشن پہلو سے بھی نظر کی جا سکتی ہے کہ جب ہم حواس کی قوتوں کا فکر عمیق سے مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت صاف نمایاں نظر آتی ہے کہ ناموس فطرت نے یہاں ایک قوت کے عملی نظام کو اس طرح سانچہ میں ڈھالا ہے کہ انسان کے اندر ودیعت کی ہوئی قوت حواس اس وقت تک اپنا صحیح عمل نہیں کر پاتی جب تک خارج سے اس کی مدد نہ کی جائے۔ مثلاً قوت باصرہ دیکھنے کی قوت کا نام ہے اور تم اس سے اپنی زندگی میں برابر کام لیتے رہتے ہو اور اس بحث سے قطع نظر "کہ جو شے باہر موجود ہے وہ آنکھ کے باریک پردوں پر اپنا عکس ڈال رہی ہے یا آنکھ کے پردوں میں جو روشنی ہے وہ اندر سے بشکل شعاع نکل کر موجود خارجی کو متاثر کر رہی ہے، اور اس کو ہم "دیکھنا" کہتے ہیں۔ "تم" نے کبھی اس پر ضرور غور کیا ہوگا کہ جب تم کسی قسم کی بھی روشنی میں ہوتے ہو تو اپنی قوت باصرہ کی استعداد کے مطابق جس شے کو دیکھنا چاہتے ہو دیکھتے ہو لیکن جوں ہی تاریکی کا شکار ہو جاتے ہو اور شب دیجور کے ساتھ ابر سیاہ کے پردے روشنی پر چھا جاتے ہیں اس وقت حلقۂ چشم میں قوت باصرہ کی موجودگی کے باوجود تم یہ کہا کرتے ہو کہ "ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا" تو آخر بینا ہوتے ہوئے ایسا کیوں کہتے ہو؟ تمہارا جواب اس وقت یہ ہوتا ہے کہ قانون قدرت نے یہی مقرر کر دیا ہے کہ باطنی قوائے عمل اس وقت تک اپنا صحیح کام نہیں کرتے جب تک خارج سے اس سلسلہ کی مدد نہ پہنچے۔ اس لیے قوت باصرہ کی باطنی قوت بھی محتاج ہے کہ دیئے (چراغ) کی روشنی سے لے کر ماہتاب و آفتاب تک جس حیثیت کی بھی روشنی ہو اپنا عملی مظاہرہ کر سکے گی اور یہی حال دوسرے حواس کا بھی ہے۔

Marfat.com

پس اگر یہ صحیح ہے اور بلاشبہ صحیح ہے کہ خدائے واحد کا قانونِ قدرت اور ناموس فطرت اپنی وحدت کی جلوہ نمائی کا مظاہرہ کائنات مادی اور عالم روحانی میں یکساں طور پر کرتا رہتا ہے تو بے تامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ "عقل" حضرت انسان کے اندر کی وہ روشنی ہے جس کو ید قدرت نے انسانیت کے ارتقائی منازل پر گامزن ہوکر انسانیت کی "مثل اعلیٰ" اور "مقصد عظیم" کو پانے کے لیے ودیعت کیا ہے، مگر مسطورۂ بالا قانون یہاں بھی اسی طرح کارفرما ہے جیسا کہ قوائے حواس میں کارفرما نظر آتا ہے یعنی اگر "عقل" عالم محسوسات و مادیات کے دائرے میں اپنا عملی مظاہرہ کرنا چاہتی ہے تو وہ محسوسات خارجی کی مدد کی ضرور محتاج رہتی ہے، مثلاً اس کا یہ فریضہ ہے کہ جزئیات کے ذریعہ "کلی" کا استخراج کرے، لیکن وہ ایسا جب ہی کر سکے گی کہ خارج میں اس سلسلہ کی جزئیات کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے حقائق اصلیہ کو اس کے سامنے پیش کرے۔ پس اگر عقل کی روشنی اور ان حقائق کے درمیان وہم، خیال اور ظن کے تاریک پردے حائل ہو جائیں تو عقل کی روشنی ہرگز اپنا صحیح کام نہیں کرسکتی۔ اسی طرح جب وہ ماوراء محسوسات (روحانیات) کی جانب اپنی روشنی کو متوجہ کرتی ہے تو یہی اوہام، ظنون، خیالات اور جذبات فاسدہ کے تاریک پردے، اس کے اور عالم روحانیات کے درمیان عموماً حائل ہو جاتے ہیں، اور وہ اکثر و بیشتر ان سے مغلوب ہو کر گم کردہ راہ ہو جاتی اور معرفت حق اور معرفت باطل کے درمیان فرق و امتیاز سے عاجز نظر آتی ہے۔ ایسی حالت میں خالق کائنات کی رحمت کاملہ اور ربوبیت تامہ اس کو خاسر و ناکام نہیں چھوڑتی اور خارج سے اس کی پوری مدد کرتی ہے اور یہی وہ خارج کی روشنی ہے جو نبی اور پیغمبر کے ذریعہ کائنات انسانی تک پہنچی، اور دین و مذہب کی زبان میں "وحی روشنی" کہی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن عزیز نے اسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے جگہ جگہ وحی کو "نور" (روشنی) سے تعبیر کیا ہے:

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا۝﴾ (النساء: ۱۷۴)

"(اے افراد نسل انسانی!) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے برہان (دلیل وحجت) آ گئی اور ہم نے تمہاری جانب واضح اور آشکارا "روشنی" (وحی الٰہی بشکل قرآن) بھیج دی۔"

﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ۝﴾ (المائدہ: ۱۵)

"اللہ کی جانب سے تمہارے پاس (حق کی) "روشنی" آ چکی اور ایسی کتاب آ گئی جو (اپنی ہدایتوں میں نہایت) روشن کتاب ہے۔"

﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝﴾ (التوبہ: ۳۲)

"یہ لوگ (مشرکین، یہود، نصاریٰ) چاہتے ہیں "اللہ کی روشنی" کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں حالانکہ اللہ یہ "روشنی" پوری کیے بغیر رہنے والا نہیں اگرچہ کافروں کو پسند نہ آئے۔"

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (ابراھیم: ۵)

Marfat.com

"اور (دیکھو واقعہ یہ ہے کہ) ہم نے اپنی نشانیوں کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکالے اور "روشنی" میں لائے۔"

﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۙ﴾

(الشوریٰ:۵۲)

"اور اسی طرح ہم نے تیری جانب اپنے "امر" میں سے "روح امر" کی وحی بھیجی حالانکہ اس سے قبل تو نہیں جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب؟ اور نہیں جانتا تھا کہ کیا ہے ایمان؟ لیکن ہم نے اس کو (قرآن کو) نور (روشنی) بنایا، ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ان کو اس کے ذریعہ راہ دکھاتے ہیں، اور اے پیغمبر! بلاشبہ تو (لوگوں) کو سیدھی راہ کی جانب راہنمائی کرتا ہے۔"

پھر اس مسئلہ کی اہمیت پر ایک دوسرے پہلو سے بھی فکر ونظر کی ضرورت ہے وہ یہ کہ ہم اس عالم ہست و بود میں روز وشب کے مشاہدات وتجربات سے یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوتے ہیں کہ یہاں ہر شے کی کیفیت وکمیت یا اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ایک "ترازو" یا "پیمانہ" ضرور ہے اور یہ کہ ہر ایک "پیمانہ" اور ہر ایک "ترازو" اپنے اندر ایک خاص صلاحیت رکھتا اور اپنی صلاحیت کے مطابق ہی اشیاء کے ناپ تول میں کام دے سکتا ہے مثلاً موتی اور جواہرات کے تولنے کے لیے ایک خاص ترازو (کانٹا) ہے، اب اگر ہم یہ چاہیں کہ اس میں شکر، روئی، غلہ جیسی چیزوں کو تولیں تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے یہ نہیں، بلکہ دوسری قسم کا ترازو کام دے گا، یا مثلاً کپڑا، زمین وغیرہ جیسی اشیاء کی پیمائش کے لیے ہم ایک خاص قسم کا پیمانہ (گز) استعمال کرتے ہیں۔ پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس سے حرارت و برودت کی بھی پیمائش کرلیں تو اس کے لیے یہ نہیں بلکہ دوسرا پیمانہ تھرمامیٹر ❶ کام میں لانا ہوگا، اور اسی طرح ہوا کے دباؤ اور سطح کی اونچائی معلوم کرنے کے لیے بیرومیٹر ❷ اور زلزلوں اور بھونچالوں کی حالت دریافت کرنے کے لیے سیسومیٹر ❸ اور آواز کی مقدار وقوت کی پیمائش کے لیے فونومیٹر ❹ جدا جدا قسم کے پیمانے استعمال کرنے ہوں گے کیونکہ ان کی اپنی صلاحیت و استعداد کار کا یہی فطری تقاضا ہے کہ اگر اس کے خلاف ان کا استعمال کیا جائے گا تو یا تو قطعاً بیکار ثابت ہوں گے اور یا صحیح حقیقت نہ بتلا سکیں گے حالانکہ ان سب کا ایک ہی کام ہے یعنی "ماپ تول" اور ایک ہی نام ہے "ترازو اور پیمانہ" مگر ہر شے کی حقیقت اور اس کی کیفیت وکمیت کے پیش نظر چونکہ ان سب کی صلاحیت کار کی حدود متعین ہیں لہٰذا ان میں سے کوئی ایک بھی اپنی حدود سے متجاوز ہو کر کارآمد ثابت نہیں۔

قانون قدرت کی کارفرمائی کو رہنما بنا کر اگر ہم اسی نقطۂ نظر سے آگے قدم بڑھائیں اور خالص مادیات سے گزر کر معنویات کی حدود پر جا پہنچیں تو یہاں بھی وہی کرشمہ قدرت نظر آتا ہے یعنی انسان کی انفرادی واجتماعی حیات کے لیے رحمت کردگار نے جو پیمانے مقرر کیے ہیں، اور جن کو وجدان، حواس اور عقل کہا جاتا ہے ان میں بھی جدا جدا صلاحیتوں کے اعتبار سے حدود منقسم ہیں، مثلاً پیمانہ "وجدان" انسان کی صرف اسی کیفیت وحالت سے متعلق ہے جو قدرت کے ہاتھوں نے اس کے وجود کے ساتھ ساتھ اس میں ودیعت

❶ ThermaMeter ❷ BeroMeter ❸ SesisoMeter ❹ PhoneMeter

Marfat.com

کر دی ہے اور حواس کا پیمانہ ان ہی اشیاء سے تعلق رکھتا ہے جو دیکھنے، سننے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے میں آ سکتی ہیں اور پیمانہ "عقل" ان دونوں سے آگے عالم مشاہدات و محسوسات کے حقائق اور ان کی کیفیات کے جانچنے ان کے درمیان امتیاز پیدا کرنے، ان سے نتائج اخذ کرنے اور ان پر احکام صادر کرنے کی خدمت انجام دیتا ہے۔

پس اگر ہم چاہیں کہ "وجدان" سے "حواس" اور "حواس" سے "عقل" کا کام لیں تو خود عقل ہی کے نزدیک ایسا کرنا غلط ہوگا، کیونکہ یہ قانون فطرت کی مقررہ حدود کی خلاف ورزی کے مرادف ہے جس کے اقدام پر ناکامی کے ماسوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

لیکن عقل انسانی اس کے آگے نہ جاننے کے باوجود پھر جاننے کی جستجو رکھتی اور اپنی ترقی کو اس کے اندر محدود نہیں سمجھتی، نیز تمام خارجی دلائل سے بڑھ کر انسان کے اندر کی قوی تر حجت و برہان "وجدان" ان ہر دو عالم سے بھی بلند تر عالم کے وجود کا جو پتہ دیتی ہے اس کے پیش نظر ہم وسعت نظر کا قدم اور آگے بڑھاتے اور مسطورۂ بالا عالم معنویات سے لطیف تر معنوی عالم کا کھوج لگانا چاہتے اور اس کائنات سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں، جہاں حسن، صداقت اور محبت [1] (ذات حق کی صفات ربوبیت، عدالت اور رحمت) اپنی جلوہ آرائیوں سے اس کائنات کو بھی منور کر رہی ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں پہنچ کر پیمانہ عقل بھی کوتاہ ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی رفعت پرواز وہاں تک رسائی نہیں کر پاتی، خصوصاً ایسی حالت میں کہ انسانوں کے درمیان "عقل" کا اس درجہ تفاوت موجود ہے کہ ایک شخص کی عقل اس کو نہ صرف ممکن الوقوع سمجھتی ہے بلکہ اس کو وجود پذیر کر دکھاتی ہے بلکہ تفاوت عقلی کی بوالعجبیوں کا تو یہ حال ہے کہ ایک ہی شخص کی عقل ایک وقت جس بات پر ناممکن کا فتویٰ صادر کر دیتی ہے دوسرے وقت میں اسی بات کو ممکن سمجھنے لگتی ہے تو جب پیمانہ عقل کا عالم محسوسات میں یہ حال ہے تو عالم غیب تک اس کی رسائی معلوم؟ اور پھر جس پیمانہ کے توازن کو غیر متوازن بنانے کے لیے وہم و خیال اور جذبات کا سیل رواں موجیں مارتا رہتا ہو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ خارج سے مدد و یاری کے بغیر "عقل" معرفت الٰہی اور علوم غیب تک رسائی حاصل کر سکتی ہے؟

پس انسان کی بیچارگی و درماندگی کے اس مقام پر بھی رحمت کردگار اپنے فیضان سے اس کو محروم نہیں رکھتی اور معنوی اور روحانی حقائق کی معرفت کے لیے ایک مقدس ہستی (پیغمبر) کے ذریعہ اس کو عقل سے بھی رفیع و لطیف پیمانہ "ہدایت وحی" عطا کر دیتی ہے۔ تاکہ انسان "سعادت و شقاوت" میں امتیاز کرنے کے بعد حیات سرمدی اور "نجات ابدی" کو پا سکے۔

قرآن عزیز نے "وحی الٰہی" کو یہی حیثیت دیتے ہوئے سورۂ شوریٰ میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَ الْمِیْزَانَ ؕ ﴾ (الشوریٰ: ۱۷)

"اللہ وہ ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب (قرآن) کو نازل کیا اور اتارا "میزان" (ترازو) کو یعنی دین حق کو جو حق و باطل کے لیے ترازو اور پیمانہ ہے۔"

---

[1] آج کل علمائے جدید میں یہ بحث جاری ہے کہ سائنس نے اپنی حدود کو اس طرح محدود رکھا کہ اس کے دائرہ میں حسن، صداقت اور محبت کی کوئی قدر و قیمت نظر نہیں آتی اور اس لیے وہ خدا کی ہستی کی معرفت ضروری نہیں سمجھتی مگر یہ سائنس کا کمال نہیں ہے بلکہ نقص ہے جو آج نہیں تو کل ضرور پورا ہو کر رہے گا۔

Marfat.com

چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب (نوراللہ مرقدہ) موضح القرآن میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"ترازو فرمایا دین حق کو جس میں بات پوری ہے نہ کم نہ زیادہ۔"

صاحب وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل:

"ہدایت وحی" یا "نبوت و رسالت" کی حقیقت و اہمیت پر گزشتہ سطور میں کوتاہ قلمی کے باوجود جو کچھ سپرد قرطاس کیا گیا اس کی تکمیل کے لیے اس سوال کو بھی حل کرنا از بس ضروری ہے کہ جب کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ "حامل وحی" ہے اور "خدا کا پیغمبر اور ایلچی" تو اس کے دعوائے صدق و کذب کی معرفت کا کون سا طریقہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ "علم الکلام" کے ماہرین (متکلمین) نے اس معرفت کے لیے بہت سے دلائل و براہین پیش کیے ہیں اور اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر اس پر معرکۃ الآراء بحثیں کی ہیں تاہم وہ اپنے طرز استدلال میں اصطلاحی فلسفیانہ اسلوب رکھتی ہیں جس کو ہم "مذہبیات" و "روحانیات" میں خاص اہمیت دینے کو آمادہ نہیں ہیں کیونکہ اس راہ میں وہی اسلوب بیان مفید، دل نشین اور جاذب قلوب ہوسکتا ہے جس کی بنیاد و نہ وجدانی طرز استدلال پر رکھی گئی ہو اور عقلیت کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اصطلاحی فلسفہ و منطق کی قیود میں اس کو پابہ زنجیر نہ کر دیا گیا ہو اور یہ اس لیے کہ معرفت الٰہی اور معرفت علوم غیبیہ کے لیے دلیل "وجدان" سے زیادہ دوسری کوئی دلیل و برہان موثر نہیں ہے، اسی حکمت بالغہ کے پیش نظر قرآن عزیز کے تمام عقلی استدلالات..... جن پر غور کرنے کے لیے "قرآن" عقل و فکر اور تدبر کو مخاطب بناتا ہے..... کی بنیاد بھی "وجدان" پر قائم کی گئی ہے البتہ یہ قرآن حکیم کا اعجاز بلاغت ہے کہ ان وجدانی دلائل کو اگر کوئی فلسفی دقیق فلسفیانہ طریق استدلال کے سانچہ میں ڈھال کر زیر بحث لانا چاہے تو یہ وجدان پر مبنی استدلالات اسی اہمیت و قوت کے ساتھ اپنی صداقت اور ثمرہ و نتیجہ کو اس رنگ میں بھی تسلیم کرا لیتے ہیں۔

غرض "وجدان" اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ تم مدعی نبوت کی زندگی کو "صداقت کی کسوٹی" پر خوب کسو اور اگر آج وہ ہستی تمہارے سامنے نہیں ہے تو تعصب اور نسلی و جماعتی حسد سے پاک اور بے لوث ہو کر بے لاگ تاریخی حقائق سے دریافت کرو، پس اگر تم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ اس کی قبل از دعوائے نبوت زندگی کا ہر شعبہ حیات صداقت و حقانیت کا مظہر ہے اور ہر ایک شعبۂ زندگی بے داغ صداقت کا پیکر اور نہ صرف اسی قدر بلکہ اس کا وجود ہر قسم کی بداخلاقیوں، گناہوں اور آلودگیوں سے پاک اور "معصوم" ہے اور اخلاقی بلندیوں کا مخزن اور ان ہی کیفیات و حالات کے ساتھ اس نے جانے بوجھے لوگوں میں زندگی کا بڑا حصہ گزارا ہے تو پھر اس کے دعوائے صداقت میں شک و شبہ کرنا عقل سلیم کے خلاف ہوگا کیونکہ عقل بآسانی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جس ہستی نے اپنی مدت حیات کے طویل عرصہ میں نازک سے نازک موقعوں پر بھی کبھی ایک لمحہ کے لیے انسانی دنیا پر جھوٹ نہ بولا ہو، آخر دماغی و قلبی انقلابات کی وہ کونسی تاریخ ہے جس کی بنا پر ایسی باہوش و حواس ہستی کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ خالق کائنات "خدائے برحق" پر کذب بیانی اور افترا پردازی کے لیے یک بیک آمادہ ہو جائے، چنانچہ قرآن عزیز نے اسی حقیقت کو سورۂ یونس میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۗ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۞ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۗ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ

Marfat.com

الْمُجْرِمُوْنَ ۞ ﴾(یونس: ۱۶-۱۷)

"اور تم کہو" اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن تمہیں سناتا ہی نہیں اور تمہیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا (مگر اس کا چاہنا یہی ہوا کہ تم میں اس کا کلام نازل ہو اور تمہیں اقوام عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنائے) پھر دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملہ سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟ پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو باندھے اللہ پر بہتان یا جھٹلائے اس کی آیتوں کو، بیشک بھلا نہیں ہوتا گنہگاروں کا۔"

"صاحب وحی" کی صداقت کی یہ ایسی بہترین کسوٹی اور دلیل ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے ۶ ھ میں پادشاہان دنیا کے نام اسلام کی دعوت و پیغام کے سلسلہ میں والا نامے بھیجے تو وقت کی سب سے بڑی طاقت (رومن امپائر) کے بادشاہ ہرکلیوس (ہرقل) کے پاس حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نامہ مبارک لے کر پہنچے تب اس نے بھی جب آپ ﷺ کی صداقت کو پرکھنا چاہا تو سب سے پہلے اسی وجدانی دلیل کو "معیار صداقت" ٹھہرایا اور صورت حال یہ پیش آئی کہ اس نے سرکاری حکام سے دریافت کیا، یہاں کوئی حجازی قافلہ موجود ہے جس سے اس ہستی کے متعلق معلومات حاصل ہو سکیں؟ اتفاق سے ابوسفیان (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) کی سرکردگی میں ایک تجارتی قافلہ مقیم تھا۔ چنانچہ ان لوگوں کو شاہی دربار میں طلب کیا گیا اور ہرکلیوس نے رئیس التجارۃ (ابوسفیان رضی اللہ عنہ) سے نبی اکرم ﷺ کے متعلق چند سوالات کیے جن میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ "وہ تمہارے اندر ہی پلا بڑھا ہے تو کیا تم نے اس کی زندگی کے اس طویل دور میں کبھی جھوٹ کا شائبہ پایا ہے؟" ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "کبھی نہیں بلکہ اس کے برعکس وہ اپنی قوم میں "الصادق الامین" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے" یہ سن کر ہرکلیوس نے یہ کہا:

و سألتك هل كنتم تتهمونه بالكذب قبل ان يقول ما قال فذكرت ان لا فقد اعرف انه لم يكن ليذر الكذب على الناس ويكذب على الله. (بخاری ج ۱)

"میں نے تجھ سے یہ بھی دریافت کیا: کیا کبھی اس کے اس دعویٰ سے قبل تم نے اس کو جھوٹا پایا ہے؟" تو نے کہا: "کبھی نہیں" تب میں نے یقین کر لیا کہ جو ہستی انسانوں پر جھوٹ کہنے کو آمادہ نہ ہو وہ کبھی خدا پر جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

"جو ہستی انسانوں پر جھوٹ کہنے کو آمادہ نہ ہو وہ کبھی خدا پر جھوٹ نہیں بول سکتی۔" دیکھئے یہ جملہ اس سلسلہ میں وجدان انسانی کا کس درجہ صحیح ترجمان ہے کہ ہرکلیوس نے بھی تمام عقلی و نقلی دلائل سے الگ ہو کر وجدان کے تقاضے سے پہلی دلیل جو پیش کی وہ وہی تھی جس کو وجدان کے خالق (خدائے برتر) نے اپنے پیغمبر سے (صداقت دعویٰ کے لیے) پیش کرائی۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ان آیات کی تفسیر اسی حقیقت کی روشنی میں اس طرح کی ہے:

"پھر آیت (۱۶) میں صداقت نبوت کی ایک سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے..... فرمایا، ساری باتیں چھوڑ دو، صرف اس بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں ہوں جس کے خصائل و حالات کی تمہیں خبر نہ ہو، تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کر چکا ہوں، یعنی چالیس برس تک کی عمر کہ عمر انسانی کی پختگی کی کامل مدت ہے اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی بتلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی ایک بات بھی تم نے سچائی اور امانت کے خلاف مجھ میں دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان

Marfat.com

باندھنے کے لیے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں، مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم نہیں پا سکتے؟

تمام علماء اخلاق ونفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس برس کا زمانہ اس کے اخلاق وخصائل کے اُبھرنے اور بننے کا اصل زمانہ ہوتا ہے جو سانچہ اس عرصہ میں بن گیا پھر بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا پس اگر ایک شخص چالیس برس کی عمر تک "صادق وامین" رہا ہے، تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب ومفتری بن جائے کہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ ﴿فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ﴾ "آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے خدا" پر افترا کرنے لگے؟

چنانچہ اس کے بعد فرمایا: دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے جو شخص اللہ پر افتراء کرے اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں اور جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر انسان ہے اور شریر ومفتری انسان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اب صورت حال نے یہاں دونوں فریق پیدا کر دیے۔ اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام ونامراد ہونا پڑے گا، اگر تم سچائی کے مکذب ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہے، فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا یہ فیصلہ صادر ہو گیا، جو مکذب تھے ان کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا، جو صادق تھا اس کا کلمہ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہے گا۔ [1]

بہر حال "صاحب وحی" کے دعوائے صداقت کی یہ وجدانی دلیل عقل سلیم اور فکر مستقیم کی نگاہ میں "علم الیقین" پیدا کرنے کے لیے کافی ووافی ہے، تاہم بقیہ شرائط یعنی صداقت تعلیم نزول وحی کا ادعاء اور مخالفین کے مقابلہ میں تحدی (چیلنج) اور تحدی کا ایفاء "مدعی نبوت ورسالت" کے لیے یہ تمام امور بھی ازبس ضروری ہیں اور اپنی جگہ تفصیل طلب اور قابل لحاظ ہیں اس لیے کہ ان شرائط کے پیش نظر ہی نبی اور مصلح کے درمیان امتیاز، نبی اور ساحر وشعبدہ باز کے مابین فرق بین اور نبی اور متنبی میں تضاد قائم کیا جا سکتا ہے۔ [2]

بعثت :

غرض خاتم الانبیاء ﷺ کی حیات طیبہ کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں کا یہ حال تھا کہ ایک جانب خلوتہائے راز میں معرفت الٰہی کے لیے استغراق، صراط مستقیم کی جستجو، نوع انسانی کے اصلاح حال کی تڑپ اور طلب تھی اور دوسری جانب افراد قوم و ملک کے ساتھ راست گفتاری، صداقت شعاری، حسن معاملت اور اصابت فکر جیسے اخلاق کریمانہ وصفات حمیدہ سے متصف معاشرتی زندگی کا مظاہرہ تھا اور ان امتیازات کی وجہ سے ہر فرد کی نگاہ میں آپ ﷺ کی وہ قدر ومنزلت تھی کہ باتفاق رائے "الصادق الامین" کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے اور کل جو دشمنی ان کو محمد رسول اللہ ﷺ سے دعوائے نبوت کی بناء پر ہوئی وہ آج محمد ﷺ بن عبداللہ کے ساتھ قطعاً نہیں تھی اور سب ہی ان کی تقدیس وتطہیر کے قائل تھے۔

یہی حالات وواقعات تھے جبکہ عمر مبارک چالیس منزلیں طے کر چکی تھی، رمضان کا مہینہ تھا اور آپ ﷺ غار حرا میں مشغول عبادت تھے کہ اچانک آپ ﷺ کے سامنے جبرئیل علیہ السلام فرشتہ نمودار ہوا اور اس نے بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۱۵۰

[2] یہ مباحث علم کلام میں قابل مراجعت ہیں لیکن قصص القرآن کی تمام جلدوں کے مطالعہ سے یہ کل بحث تسلی بخش تفصیلات کے ساتھ مل جائیں گے۔

Marfat.com

کو ثقلین کی رشد و ہدایت کے لیے چن لیا اور رسالت و پیغمبری کے منصب کبریٰ پر فائز کیا۔

یہ واقعہ چونکہ نوع انسانی کی تاریخ میں حیرت زا انقلاب کا باعث ثابت ہوا اور اس نے ذات اقدس ﷺ کو معراج رفعت کی اس حد پر پہنچا دیا جہاں عالم ادیان و ملل کے تمام اصلاحات و انقلابات اس ہستی کا فیض رحمت نظر آتے ہیں اس لیے تاریخ و حدیث کے روشن صفحات نے اس واقعہ کی تمام تفصیلات کو بسند صحیح اپنے سینہ میں محفوظ رکھا ہے، چنانچہ فن حدیث و تاریخ اسلام کے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی مشہور و مقبول کتاب الجامع الصحیح میں صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے اس واقعہ کو جن الفاظ میں نقل کیا ہے اس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

نبی اکرم ﷺ پر شروع میں سچے خوابوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کوئی خواب آپ ﷺ نہیں دیکھتے تھے مگر وہ اپنی تعبیر میں اس درجہ روشن اور صحیح ثابت ہوتا تھا جیسا کہ طلوع صبح کے لیے سفیدۂ صبح کا ظہور ہوتا ہے پھر آپ ﷺ کو خلوت محبوب ہوگئی اور حراء میں مشغول عبادت رہنے لگے۔ گاہے گاہے آپ ﷺ اہل و عیال کے پاس بھی تشریف لے آتے تھے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے لیے کچھ توشہ تیار کرتیں اور آپ ﷺ اس کو لے کر پھر غار میں واپس تشریف لے جاتے، اسی طرح حرا میں مشغول استغراق و عبادت تھے کہ اچانک ایک روز آپ ﷺ پر خدا کا فرشتہ نمودار ہوا اور کہنے لگا: "اِقْرَاْء پڑھیے۔" نبی اُمی نے کہا: "ما انا بقاری، میں پڑھنا نہیں جانتا" پیغمبر ﷺ ارشاد فرماتے تھے "کہ جب میں نے فرشتہ سے یہ کہا تو اس نے مجھ کو گرفت میں لے لیا جس کی شدت سے مجھ کو تکلیف محسوس ہونے لگی اور پھر چھوڑ کر مجھ سے دوبارہ کہا "پڑھیے" اور میں نے وہی جواب پھر دیا "میں پڑھنا نہیں جانتا" تب اس نے پھر وہی عمل کیا، اور گرفت چھوڑ کر تیسری مرتبہ پھر پہلا جملہ دہرایا اور میں نے بھی وہی سابق جواب دیا غرض تین مرتبہ یہی گفتگو اور یہی عمل ہوتے رہنے کے بعد چوتھی مرتبہ فرشتہ نے (سورۂ اقراء کی) یہ چند آیتیں تلاوت کیں:

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝۵ ﴾ (العلق: ۱-۵)

"اپنے اس پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا۔ اس نے انسان کو خون بستہ سے پیدا کیا، پڑھ اور تیرا پروردگار بہت کرم کرنے والا ہے جس نے قلم (تحریر) کے ذریعہ (انسان کو) علم سکھایا، انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جس سے وہ ناواقف تھا۔" [1]

غرض نبی اکرم ﷺ نے ان آیات کو دہرایا اور یہ آپ ﷺ کے ذہن نشین ہوگئیں، اس کے بعد جب حراء سے فارغ ہوئے تو یہ حالت کہ قلب (شدت وحی سے) کانپ رہا تھا، آپ ﷺ نے مکان میں داخل ہوتے ہی فرمایا: "مجھ کو کپڑا اڑھاؤ" (حضرت) خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فوراً کپڑا اوڑھا دیا، جب آپ ﷺ کو سکون ہوا تو خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تمام واقعہ کہہ سنایا اور پھر فرمایا: خشیت

---

[1] حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں بہت ہی لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں، موضح القرآن میں لکھتے ہیں: اول جبرئیل علیہ السلام وحی لائے تو یہ پانچ آیتیں، حضرت (محمد ﷺ) نے کبھی لکھا پڑھا نہ تھا اس لیے (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ قلم سے بھی علم وہی دیتا ہے یوں بھی (یعنی بغیر وسائل بھی وہبی طور پر) وہی دے گا۔

علی نفسی۔" مجھے جان کا خوف ہے۔" (1) (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے یہ سن کر عرض کیا: "قسم بخدا! خدا آپ ﷺ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا کیونکہ آپ ﷺ صلہ رحمی کرتے ہیں، مہمانوں کی مہمانداری، بیچاروں کی چارہ گری فرماتے اور مفلس کے لیے ذریعہ معاش مہیا کرتے ہیں اور حق رسی کی کڑی سے کڑی مصیبت میں مددگار بنتے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نبی اکرم ﷺ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، ورقہ زمانہ جاہلیت کے ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے سچی عیسائیت کو قبول کر لیا تھا، عبرانی زبان سے واقف اور انجیل کی کتابت کیا کرتے تھے اور بہت ضعیف العمر اور نابینا تھے (حضرت) خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ورقہ سے کہا: برادرِ من آپ اپنے بھتیجے کا واقعہ تو سنئے۔" ورقہ نے دریافت حال کیا، تب نبی اکرم ﷺ نے گزرا ہوا واقعہ سنایا، ورقہ نے سنا تو کہا: ھٰذا الناموس الذی کان ینزل علی موسٰی۔ یہ وہ فرشتہ (جبرئیل علیہ السلام) ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی الٰہی لے کر آیا کرتا تھا۔ کاش کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں جب تیری قوم تجھ کو تیرے وطن (مکہ) سے نکالے گی۔" آپ ﷺ نے دریافت کیا: "کیا میری قوم مجھ کو وطن سے بے وطن کرے گی" ورقہ نے کہا: "بیشک ایسا ہوگا اور جس پیغام کے لیے خدا نے آپ ﷺ کو پیغمبر بنایا ہے اس خدمت پر جو بھی مامور ہوا اس کے ساتھ یہی صورت پیش آئی ہے، پس اگر وہ وقت میری زندگی میں آیا تو میں پوری قوت کے ساتھ تیری حمایت کروں گا" مگر ورقہ کو یہ وقت نہیں آیا اس سے قبل ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ (2)

حدیث بخاری اور بعض مستشرقین کی کوتاہ اندیشی:

صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں نزول وحی کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ پر فوری تاثر ہوا اس کو خود زبان مبارک سے اس طرح ظاہر کیا گیا ہے ((انی خشیت علی نفسی)) اور پھر اس کے متصل ہی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے تسکین دہ الفاظ منقول ہیں تو یہ واقعہ کا ایسا پہلو ہے جس کی فطری صداقت اور غیر مصنوعی سادگی خود بخود دل میں اتر جاتی ہے اور واقعہ کا نقشہ اس طرح سامنے آ جاتا ہے کہ ایک صادق و امین ہستی اپنی پاک اور بے لوث زندگی کے ساتھ ایک غار میں محو استغراق ہے، اس کے قلب میں خدائے برتر کے لیے عشق سے سرشار جذبہ عبودیت موجزن ہے، وہ شرک اور گناہوں کی آلودگیوں سے نفور و بیزار گوشہ تنہائی کو پسند کر کے پہاڑ کے ایک غار میں سرگرم عبادت ہے، یہ سلسلہ اگرچہ عرصہ سے جاری ہے مگر اچانک ایک روز خدا کا فرشتہ (جبرئیل علیہ السلام) جو ہمیشہ سے خدا کے پیغمبروں کے پاس وحی لے کر آتا رہا ہے، اس پر ظاہر ہوتا ہے اور وحی الٰہی کی پیغام رسانی کرتے ہوئے اس کو نبوت و رسالت کی بشارت دیتا ہے۔ یہ ہستی چونکہ اس سے قبل اس منصب جلیل کی حقیقت سے ناآشنا تھی اس لیے اس حیرت زا خبر اور وحی الٰہی کی عظیم ترین روحانی قوت کے زبردست اثر نے جو فوری انقلاب ذات اقدس ﷺ میں پیدا کیا اس کی وجہ سے تشویش اور گھبراہٹ کا رونما ہونا ایک فطری بات تھی "خشیت علی نفسی" کی مراد یہ نہیں تھی کہ جان کا خوف آپ ﷺ کو پریشان کیے ہوئے تھا، ایک عربی نژاد، قریشی الاصل اور شخصی شجاعت کے مالک سے اس قسم کی توقع کیسے ہو سکتی ہے؟ بلکہ مطلب یہ تھا کہ وہ اس بار عظیم کو برداشت بھی کر سکے گا یا نہیں، چنانچہ اس اعلیٰ تاثر کو اس مقدس انسان کی رفیقہ حیات خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے محسوس کرتے ہوئے اس کے اخلاق کریمانہ اور اوصاف حمیدہ کا ذکر کیا اور کہا کہ ایسی ہستی ناکام زندگی کے لیے نہیں ہوتی اور خدا کبھی آپ ﷺ کو رسوا نہیں کرے گا، اور

---

(1) یعنی مجھے یہ خوف ہے کہ شاید میں وحی کے بار کو برداشت نہ کر سکوں۔
(2) بخاری باب کیف بدء الوحی علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

Marfat.com

پھر اس مقدس پیغمبر کو ورقہ کے پاس لے گئیں تا کہ ایک ایسے شخص سے جو عرصہ سے خدا کی وحی اور خدا کی کتاب کا ذکر کرتا رہتا ہے اس اجمال کی تفصیل معلوم کریں۔

اس صاف اور سادہ بات کو دیکھیے اور پھر بعض مستشرقین یورپ کی اس مضحکہ خیز نکتہ چینی پر نظر ڈالیے جو تعصب اور کوتاہ نظری کی عینک لگا کر کی گئی ہے۔

اگر پیغمبر اسلام پر حراء میں وحی الٰہی کا نزول اور فرشتہ کا ظہور ہوا ہوتا تو پھر آپ ﷺ وحی الٰہی سے فیضیاب ہو کر اور منصب رسالت کی بشارت سن کر یہ کیوں فرماتے "انی خشیت علی نفسی" اور خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تسکین دینے کی ضرورت پیش نہ آتی کیا آپ ﷺ کو خدا پر بھروسہ نہیں تھا۔

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا، حقیقت حال کیا تھی اور اس کو رنگ و روغن دے کر کیا بنا دیا؟ یہاں نہ خدا پر عدم اعتماد کی کوئی جھلک ہے اور نہ فرشتہ کے ظہور اور وحی کے نزول پر ریب و شک کا معاملہ ہے بلکہ اس حقیقت کے اعتراف ہی کی وجہ سے جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی اس کا ایک فطری تاثر ہے جو آپ ﷺ کی صداقت کا مزید ثبوت فراہم کرتا ہے، کیونکہ اگر اس کے برعکس کہیں آپ اس واقعہ کو اس طمطراق کے ساتھ پیش فرماتے کہ گویا ذات اقدس ﷺ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ جانی بوجھی بات ہے تب البتہ اس کی گنجائش ہو سکتی تھی کہ اس شخص نے (دعوائے نبوت کے لیے) پہلے سے ایک منصوبہ قائم کر رکھا تھا، اور حراء کی خلوتیں بھی اسی مقصد کے لیے تھیں۔ چنانچہ اب موقع دیکھ کر اس نے یہ اعلان کر دیا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور مجھ پر وحی آتی ہے۔

بہر حال اس مسئلہ پر ہم نے مختصر طور پر جو کچھ لکھا ہے علماء اسلام نے مختلف اسالیب بیان کے ساتھ اسی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے مثلاً: مشہور محدث و مفسر حافظ عماد الدین بن کثیر (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں: ❶

ثم قال: ((لقد خشیت علی نفسی)) و ذلک لانہ شاھد امرًا لم یعھدہ قبل ذٰلک ولا کان فی خلدہ.

"آپ ﷺ نے فرمایا: ((لقد خشیت علی نفسی)) یہ اس لیے فرمایا کہ آپ ﷺ نے ایک ایسی حقیقت کا آج مشاہدہ کیا کہ اس سے قبل اس سے واقف نہیں تھے اور نہ کبھی آپ ﷺ کے دل میں یہ خیال گزرا تھا کہ ایسا کچھ پیش آئے گا۔"

اور حکیم الامہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی لطیف توجیہ کا حاصل یہ ہے:

"پھر آپ ﷺ پر غار حراء میں حق (وحی) کا نزول ہوا جب فرشتہ اور آپ ﷺ کے درمیان سلسلہ کلام ختم ہو گیا تو آپ ﷺ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی جس کو ہم اپنی زبان میں "تشویش و اضطراب" سے تعبیر کرتے ہیں اور حقیقت میں یہ ایک نفسیاتی کیفیت تھی جس کا پیش آنا فطری تھا اس لیے کہ جب نزول وحی کی وجہ سے آپؐ کے بشری قویٰ پر ملکوتی صفات نے اثر کیا تو دو متضاد قوتوں کے درمیان تصادم اور پھر ملکوتی قوت کے غلبہ کی وجہ سے آپ ﷺ کے اندر تشویش پیدا ہو جانا یقینی تھا، یہی وجہ ہے کہ ابتداء نزول وحی کے بعد کچھ مدت تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا کیونکہ انسان بشریت اور ملکیت دو جہات کے درمیان محصور ہے، پس جس ہستی کی بشریت پر ملکوتی صفات غالب آ کر اس کو ظلمتوں سے نور کی جانب لے جاتی ہیں تو جس قوت کے ساتھ یہ غلبہ اپنا اثر کرتا ہے انسان اپنے اندر اسی شدت کے ساتھ بشریت و ملکیت کے

❶ تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۷

Marfat.com

کے درمیان تصادم اور تزاحم محسوس کرتا ہے اور شدت تصادم کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی ملکوتی قوت و استعداد کو اس درجہ کامل و مکمل کر دے جو منصب نبوت و رسالت کے لیے ضروری ہے حتیٰ کہ اس کی قوت بشری (قوت بہیمی و حیوانی) قوت ملکوتی کے ہاتھ میں پوری طرح تابع و اور منقاد ہو جاتی ہے، اور اب وہ ہستی جس کو فیضان نبوت سے سرفراز کیا گیا ہے مطمئن اور تصادم کی کشمکش سے بالاتر ہو کر اس منصب جلیل (نبوت و رسالت) کی خدمت کے قابل ہو جاتی ہے۔" ❶

بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق:

"نبوت" اور "بشریت" کے درمیان اس درجہ نازک رشتہ ہے کہ قرآن حکیم کی "تعلیم" سے قبل پیروان مذاہب و ادیان نے اس راہ میں بھی اعتدال کو ترک کر کے افراط اور تفریط کو اسوہ بنالیا تھا اور اس بارہ میں ان کو سخت ٹھوکر لگی تھی، چنانچہ بعض پیروان مذہب نے یہ دیکھ کر کہ نبی اور رسول باوجود اس امر کے کہ وہ انسان اور بشر کی شکل وصورت رکھتا ہے لیکن ساتھ ہی افراد انسانی سے جدا ایسی خصوصیات کا حامل نظر آتا ہے جو مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ سے بھی دوسروں کو حاصل نہیں ہوتیں، اس لیے دراصل وہ بشر نہیں بلکہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے جس نے انسانوں کی نجات کے لیے جامہ بشریت اختیار کر لیا ہے۔ ❷ اس کے برعکس دوسری جماعت نے یہ کہا کہ نبوت و رسالت کوئی منصب نہیں ہے کہ خدا کی جانب سے "عطیہ مناصب" کی طرح دیا جاتا ہو بلکہ اخلاق کریمانہ اور صفات حمیدہ کا وہ اعلیٰ درجہ ہے جو ہر ایک انسان اپنی روحانی جدوجہد سے حاصل کر لے سکتا ہے اور کہتے ہیں کہ اگرچہ عطا و بخشش ہر شے کے لیے اسی کی جانب (خدا کی جانب) سے ہے لیکن کسی شے کا بطور "منصب" عطا ہونے کی حدود میں محدود رہنا اور روحانی جدوجہد سے ہر شخص کے حاصل کر لینے کے لیے اس کا دروازہ کھلا رہنا ان دونوں باتوں کے درمیان جو فرق ہے ہمارا خیال یہ ہے کہ "نبوت" بھی اور درجات روحانیت کی ہی طرح ہے اور عطاء منصب کی شکل میں خاص امتیاز نہیں رکھتی۔

قرآن حکیم نے اس افراط و تفریط کو ختم کرنے کے لیے "نبوت و رسالت کی حقیقت کو" بہت عمدہ طریقوں سے آشکارا کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کی راہنمائی کے لیے جو مختلف درجات ہدایت کا سلسلہ قائم کیا ہے اس کا اعلیٰ درجہ "ہدایت وحی" کا ہے اور یہ انسان کی روحانیت اور مقصد حیات کی کامرانی کا کفیل و ضامن ہے اور جبکہ ہدایت کا یہ سلسلہ "انسانی راہنمائی کے لیے" ہے تو عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ درجہ "انسان" ہی کو بخشا جائے لیکن کیا ہر شخص کو جدا جدا بخش دیا جائے۔ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ یہاں درجات عقل مختلف ہیں اور درجات استعداد میں بھی تنوع موجود ہے اس لیے از بس ضروری ہے کہ کسی خاص ہستی کو اس کے لیے چن لیا جائے تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس انتخاب کی نوعیت کیا ہونی چاہیے یہ کہ جو عمدہ صلاحیتوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مجاہدات اور ریاضیات کے ذریعہ نفس پر قابو پائے یا یہ کہ خدائے تعالیٰ جس کو یہ درجہ عطا فرمائے اس کی صلاحیتوں اور اس کی استعدادات کی تخلیق ہی اس طرح کر دے کہ صدق و امانت اس کا مایہ خمیر بنا ہوا ہو اور خارجی مجاہدہ اور ریاضت کا محتاج نہ ہو۔ یہ جدا امر ہے کہ خدائے برتر کے سامنے اظہار عبودیت اور تقرب الی اللہ کے لامتناہی فیض سے فیض یاب ہونے کے لیے

---

❶ حجۃ اللہ البالغہ ج ص ص ۱۵۳ ❷ اوتار اور ابن اللہ کا عقیدہ دراصل ایک سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔

Marfat.com

اس سلسلہ کو بھی کلیۃً ترک نہ کرے۔ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عقل و بصیرت اس فیصلہ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ یہاں دوسری شکل عمل میں آنی چاہیے اس لیے کہ جس طرح خدائے برتر کے مقررہ قانون قدرت نے "ہدایت وحی" سے پہلے کے مختلف درجات ہدایت کو انسان کے مجاہدہ و ریاضت پر موقوف نہیں رکھا اور اس بخشش و فیض کو حسب حال "عطیہ الٰہی" کی حیثیت میں رکھا ہے یعنی "وجدان" "حواس" اور "عقل" ان سب درجات ہدایات کا جب یہی حال ہے کہ وہ جدوجہد سے نہیں بلکہ "عطیۂ الٰہی" سے ملتے ہیں تو "ہدایت وحی" بھی جس کو بخشا جائے وہ بطور "منصب و عطیہ" کے ہی عطاء ہو، البتہ یہ ازبس ضروری ہے کہ جس کو بھی بخشا جائے اس کی روحانی صلاحیتیں اور استعدادات ہر طرح اس منصب کی اہل ہوں اور ایسی ہستی کو عطاء نہ ہو کہ اس کی صلاحیت و استعداد عطاء کرنے والے کی بے سلیقگی پر چشمک زن ہو۔

غرض نبی اور "رسول" اس ہستی کو کہتے ہیں جو لوازم بشریت کے ساتھ اپنے تقدس و طہارت اور اخلاق حسنہ و اوصاف حمیدہ کے اس بلند مقام پر فائز ہو اور اس کے صفات صدق و امانت اس درجہ مسلم ہوں کہ اس کو "بشر معصوم" کہہ سکیں، وہ نہ خدا ہوتا ہے اور نہ ابن خدا بلکہ خدا کی جانب سے "ہدایت وحی کا حامل" مخلوق خدا کے لیے "خدا کا ایلچی" اور ان کی ہر قسم کی "رشد و ہدایت کا کفیل" ہو، چونکہ وہ بشر ہے اس لیے افراد نسل انسانی سے تعلق رکھتا ہے، اور چونکہ ہر قسم کی آلودگیوں اور گناہوں سے پاک اور "معصوم" ہے اس لیے اس کو اللہ سبحانہ، کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل ہے۔ پس نبوت و رسالت کا بشریت کے ساتھ یہی وہ تعلق ہے جو ہر قسم کی افراط و تفریط سے بری اور حقیقت حال کے لیے آئینہ دار ہے اور اسی حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے خود زبان وحی ترجمان سے ظاہر فرمایا ہے: ((انما انا قاسم واللہ یعطی)) خدا دینے والا ہے اور میں تقسیم کرنے والا ہوں۔ یعنی ایک جانب خدا سے "وحی ہدایت" حاصل کرتا ہوں اور دوسری جانب خدا کے بندوں تک اس کو پہنچا دیتا ہوں یہی میرا فریضہ رسالت و نبوت ہے اور اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے مختلف اسالیب بیان کے ساتھ اس سلسلہ کے غلط کار لوگوں کی ہدایت کے لیے اس طرح بیان کیا ہے:

﴿ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴾ (بنی اسرائیل: ۹۳)

"کہہ دیجیے، پاکی ہے میرے پروردگار کے لیے، میں نہیں ہوں مگر انسان، اور خدا کا ایلچی (رسول)۔"

﴿قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۛۚ وَ مَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۛؕ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ﴾ (الاعراف: ۱۸۸)

"وہی ہو کر رہتا ہے جو خدا چاہتا ہے اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو ضرور ایسا کرتا کہ بہت سی منفعت بٹور لیتا اور (زندگی میں) کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا، میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ماننے والوں کے لیے (گناہوں کی پاداش عمل سے) خبردار کرنے والا اور (نیک عمل پر) بشارت دینے والا ہوں۔"

﴿قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۙ وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ﴾ (مریم: ۳۰-۳۱)

"(عیسیٰ علیہ السلام نے) کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھ کو (ہدایت انسانی کے لیے) کتاب دی اور مجھ کو "نبی" بنایا اور اس

نے مجھ کو بابرکت کیا، خواہ میں کسی جگہ ہوں۔"

﴿فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۖ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ ۖ وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ ۝﴾ (طہ: ۴۷)

"(موسیٰ وہارون) اس (فرعون) کے پاس جاؤ اور کہو ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ پس بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ رخصت کردے اور ان پر سختی نہ کر۔ ہم تیرے پروردگار کی نشانی لے کر تیرے سامنے آگئے ان پر سلامتی ہو جو سیدھی راہ اختیار کرے۔"

﴿رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝﴾ (النساء: ۱۶۵)

"یہ تمام رسول (خدا پرستی ونیک عملی کے نتائج کی) خوشخبری دینے والے اور (انکار حق کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے (اور اس لیے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے (اور نیک وبد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور پیش کرسکیں اور (خدا اپنے کاموں میں) سب پر غالب ہے اور (تمام کاموں میں) حکمت والا ہے۔"

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝﴾ (الاحزاب: ۴۵۔۴۶)

"اے نبی! بلاشبہ ہم نے تجھ کو بھیجا ہے (حق پر) گواہی دینے والا اور (نیکی کے انجام پر) بشارت دینے والا اور (بدی کے انجام سے) ڈرانے والا اور بلانے والا اللہ کی راہ کی طرف اس کے حکم سے اور بھیجا روشن چراغ بنا کرے۔"

﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۝ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا ۝ لِّيَعْلَمَ أَن قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ﴾ (الجن: ۲۶۔۲۸)

"وہ (خدا) غیب کی تمام باتوں کا جاننے والا ہے پس وہ اپنے غیب (کے معاملات) پر کسی کو خبردار نہیں کرتا مگر جس کو پیغمبر بنا کر چن لے، پس بلاشبہ وہ (خدا) اس رسول کے آگے اور پیچھے نگہبان چلاتا ہے (یعنی اس کو اس بات سے محفوظ رکھتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی خبر میں شیطان یا اس کا نفس کوئی ملاوٹ کرسکے اور اس کو شبہ پڑ جائے کہ یہ خدا کی وحی ہے یا کچھ اور) تاکہ خدا یہ ظاہر کردے کہ انہوں نے (رسولوں نے) بلاشبہ اپنے پروردگار کے پیغام (ٹھیک ٹھیک) پہنچا دیئے۔"

ان آیات کی تفسیر میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب (نوراللہ مرقدہ) یہ تحریر فرماتے ہیں:

"یعنی رسول کو خبر دیتا ہے غیب کی، پھر چوکیدار (فرشتے) رکھتا ہے اس کے ساتھ کہ اس میں شیطان دخل نہ کرنے پاوے اور اپنا (رسول کا) نفس غلط نہ سمجھے یہی معنی ہیں اس بات کے کہ پیغمبروں کو عصمت ہے اوروں کو نہیں اور ان کا معلوم" بے شک"

Marfat.com

ہے اوروں کے معلوم میں شبہ ہے۔"

"نبی" اور "رسول" سے متعلق مسطورۂ بالا افراط و تفریط کے ساتھ ساتھ مشرکین عرب ایک نئی گمراہی میں مبتلاء تھے وہ کہتے تھے کہ اول تو "پیغمبر" کا وجود ہی ہمارے لیے اچنبھے کی بات ہے، اور اگر یہ اچنبھا ہونا ہی تھا تو اس کے لیے ہماری طرح کا ایک انسان ہی کیوں چنا گیا کیوں ایک "فرشتہ" نہ بھیجا گیا اور اگر انسان ہی بھیجنا تھا تو یا تو مکہ اور طائف کی کسی متمول سرمایہ دار ہستی کو پیغمبر بنایا جاتا ورنہ اس کو ہی غیب سے خزانے اور بے نظیر باغات عطاء کیے جاتے تب ہم سمجھتے کہ بیشک یہ خدا کا فرستادہ ہے:

﴿وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ﴾ (الفرقان: ۷-۸)

"اور وہ (مشرکین) کہتے ہیں یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے ساتھ آسمان سے فرشتہ اترتا اور وہ خدا کے پیغام سے خبردار کرتا یا ایسا کیوں نہ ہوا کہ (ہماری آنکھوں دیکھتے) اس پر آسمان سے خزانہ اتر آتا یا قدرتی باغ ہوتا کہ وہ (ہر وقت مرضی کے مطابق) اس سے (پھل) کھاتا۔"

﴿وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّاۤ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ يَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَ جَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَ كَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ۠﴾ (الفرقان: ۲۰)

"اور ہم نے تجھ سے پہلے بھی ایسے ہی پیغمبر بھیجے تھے جو کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے (یعنی پیغمبری کے لیے بشریت منافی نہیں ہے بلکہ انسانوں کے لیے انسان ہی کو پیغمبر ہونا چاہیے) اور ہم نے (انسانوں میں سے انسان ہی کو پیغمبر بنا کر) ایک دوسرے کی آزمائش کا سامان کر دیا کہ آیا تم صبر و استقامت کا ثبوت دیتے ہو یا نہیں اور تیرا پروردگار بلاشبہ (انسانوں کے کردار کا) دیکھنے والا ہے۔"

﴿وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَ لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝﴾ (الانعام: ۸-۹)

"اور وہ کہتے ہیں اس پر (محمد ﷺ) پر کیوں فرشتہ نہیں اتارا گیا اور اگر ہم فرشتہ اتارتے تو البتہ (نتائج اعمال کا) فیصلہ کر دیا جاتا اور پھر وہ مہلت نہ دیے جاتے اور اگر ہم اس کو فرشتہ کر دیتے تو بھی (انسانوں کی ہدایت کے لیے) اس کو بصورت انسان ہی ظاہر کرتے اور (اس طرح) ہم پھر ان لوگوں کو اس شبہ میں مبتلاء کر دیتے جس میں اب مبتلا ہیں۔"

اس جگہ ان کی گمراہی کو دو دلائل سے واضح کیا ہے ایک یہ کہ ایمان و اعتقاد کی زندگی سرتاسر "غیب" سے متعلق ہے پس اگر انسان کو اسی عالم میں عالم غیب کے معاملات کا مشاہدہ کرا دیا جائے اور پھر بھی وہ انکار پر جما رہے تو خدا کا قانون "امہال" (مہلت کا قانون) نافذ نہیں ہوگا بلکہ نتائج اعمال کا فوراً ہی ظہور ہو کر رہے گا اور ان کے لیے بھی مضر ہے اور خدا کی حکمت رحمت و ربوبیت کے بھی خلاف ہے دوسری دلیل یہ کہ انسانی دنیا میں اگر فرشتہ کے ذریعہ "ہدایت وحی" کو بھیجا جائے تو انسان کس طرح اس سے مانوس ہو سکتے

Marfat.com

ہیں، پھر اگر اسے بھی انسان ہی کی شکل میں بھیجیں تو شبہ کرنے والوں کا شبہ اسی طرح قائم رہے گا۔ اس لیے عقل ونقل دونوں فیصلہ یہی ہے کہ ہدایت کے لیے "انسان" ہی کو مبعوث ہونا چاہیے۔

﴿وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓىِٕكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَىِٕنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝﴾

(بنی اسرائیل: ۹۴۔۹۵)

"اور لوگوں کے پاس جب ہدایت آ پہنچی تو ان کو ایمان لانے سے کسی بات نے نہیں روکا مگر اس نے کہ وہ کہتے ہیں "کیا خدا کسی بشر کو پیغمبر بنا کر بھیجے گا" اے پیغمبر! کہہ دیجئے اگر زمین پر انسانوں کی جگہ فرشتوں کی آبادی ہوتی اور وہ اس پر چلتے پھرتے تو ہم ضرور ان کے لیے آسمان سے فرشتہ کو ہی رسول بنا کر بھیجتے۔"

﴿وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ مَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝﴾(الانبیاء: ۷۔۸)

"اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے بھی جن پر وحی نازل کی ہے وہ انسانوں کے سوا اور کچھ نہیں تھے پس (اے معترضین!) اگر تم نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے دریافت کرلو اور نہ ہم نے ان کو بے جان (دھڑ) بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ (خدا کی طرح) ہمیشہ رہنے والے تھے۔"

بہرحال ان آیات میں قرآن عزیز نے علمی اور تاریخی دونوں قسم کے دلائل سے یہ صاف کر دیا کہ کائنات انسانی کی ہدایت کے لیے "انسان" کا نبی اور ہادی ہونا فطری بات ہے اور اس لیے اقوام ماضیہ میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔

پھر اس مسئلہ کی جانب بھی توجہ کی ہے کہ نبوت و رسالت کا تعلق سرداری، سرمایہ داری اور جتھ بندی سے کچھ نہیں ہے اور اس کے لیے جن فطری اعلیٰ ملکات واستعدادات کی ضرورت ہے ان کے پیش نظر اللہ تعالیٰ ہی خوب واقف ہے کہ کون اس "منصب" کا اہل ہے:

﴿وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝﴾(الزخرف: ۳۱۔۳۲)

"اور وہ کہتے ہیں یہ قرآن کیوں ان دو بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی سردار پر نازل نہیں ہوا، (تو) کیا تیرے پروردگار کی رحمت کو یہ تقسیم کرنے والے ہیں، نہیں، بلکہ ہم نے ہی ان کے درمیان ان کی دنیوی معیشت کو تقسیم کیا ہے اور ہم نے ہی بعض انسانوں کو بعض پر بلندی درجات عطاء کی ہے تاکہ بعض بعض کے مسخر رہیں (یعنی بعض مقتدی ہوں اور بعض مقتدیٰ، بعض پیغمبر ہوں اور بعض اُمتی) اور تیرے پروردگار کی رحمت (نبوت) اس (دولت وثروت) سے (کہیں زیادہ) بہتر ہے

Marfat.com

جو وہ خزانہ کیے ہوئے ہیں۔"

﴿ وَ اِذَا جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ حَتّٰى نُؤۡتٰى مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ ؕۘ اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَـتَهٗ ؕ ﴾ (الانعام: ۱۲۴)

"اور جب ان کے پاس خدا کی جانب سے کوئی آیت آتی ہے تو یہ (مشرکین) کہتے ہیں "ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم کو بھی وہی چیز (وحی) نہ دی جائے جو خدا کے رسولوں کو دی گئی (لیکن ایسا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ) اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنے منصب رسالت کو کس کے سپرد کرے۔"

اور یہ بات تو بہت واضح اور صاف ہے کہ جس شخص کو کوئی منصب عطاء کیا جائے تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر طرح اس کے لیے جوہر قابل اور اہل ہونا چاہیے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک جوہر قابل کو وہ "منصب" ملے کیونکہ معطی کی مصلحت ہی خوب فیصلہ کر سکتی ہے کہ کس کو ملے اور کس کو نہ ملے چہ جائیکہ جوہر قابل بھی نہ ہو۔ اس لیے ضروری ہوا کہ جو نبی اور رسول ہو وہ ہر حیثیت سے "انسان کامل" اور گناہوں سے "معصوم" ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو شخص بھی اخلاق حمیدہ اور روحانی مجاہدات کے ذریعہ "تقدیس" کا درجہ حاصل کر سکا ہو وہ منصب نبوت پر بھی ضرور فائز ہو۔

بہر حال نبوت "منصب" ہے۔ "ڈگری" نہیں ہے، اور اس لیے جن کو دیا بھی جاتا ہے ان کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ تم پر فضل خداوندی ہے ورنہ اگر وہ تم سے اس کو سلب کر لینا چاہے تو تمہاری طاقت بلکہ کائنات کی طاقت سے باہر ہے کہ پھر یہ تم کو مل سکے۔

﴿ وَ لَئِنۡ شِئۡنَا لَنَذۡهَبَنَّ بِالَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيۡنَا وَكِيۡلًا ۙ﴿۸۶﴾ اِلَّا رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضۡلَهٗ كَانَ عَلَيۡكَ كَبِيۡرًا ﴿۸۷﴾ ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۶-۸۷)

"اور (اے پیغمبر!) اگر ہم چاہیں تو جو تجھ پر ہم نے وحی کی ہے اس کو چھین لیں اور پھر تجھ کو کوئی بھی ایسا کارساز نہ ملے جو ہم پر زور ڈال سکے، لیکن (یہ جو سلسلہ وحی جاری ہے تو) اس کے سواء کچھ نہیں ہے کہ تیرے پروردگار کی رحمت سے ہے اور یقین کر کہ تجھ پر تیرے پروردگار کا بڑا ہی فضل ہے۔"

نبی اور مصلح:

مسطورۂ بالا تفصیلات سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ چونکہ "نبی" اور "رسول" کو براہ راست خدائے برتر سے شرف مکالمت حاصل ہوتا ہے یا خدا کا معصوم فرشتہ خدا کی وحی لا کر سناتا ہے اس لیے اس کا ذریعہ علم "علم یقین" کا درجہ رکھتا ہے جس میں شک وشبہ کی مطلق گنجائش نہیں رہتی اور اس کے علاوہ تمام ذرائع علم یقین کے اس درجہ سے نیچے ہیں بلکہ ان کی افادیت "ظن" سے آگے نہیں بڑھتی اس لیے اگر ایک مرد صالح اپنی قوم یا نوع انسانی کی اصلاح حال کے لیے کوئی قدم اٹھائے تو مقدس سے مقدس تر ہونے کے باوجود اس کے اپنے طریقہ اصلاح میں غلطی کا وقوع اور امکان دونوں موجود رہتے ہیں بلکہ بعض اوقات وہ ایسی فاش غلطی کر گزرتا ہے کہ اس سے فائدہ پہنچنے کی بجائے قوم کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اس لیے ایک "نیکوکار مصلح" یہ کبھی دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ اصلاح حال کے لیے جو

Marfat.com

کچھ اپنی جانب سے کہتا ہے غلطی سے پاک ہے مگر ایک "نبی" اور "رسول" کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ یہ بھی اعلان کرے کہ میں خدا کی جانب سے اصلاح حال کے لیے خدا کا پیغام رساں ہوں اور یہ بھی دعویٰ کرے کہ وہ جو "تعلیم اصلاح" پیش کر رہا ہے، خدا کا فرمودہ ہے اور اس لیے ہر قسم کی غلطی اور لغزش سے پاک اور محفوظ ہے وہ یہ نہیں کہے گا کہ یہ میرے دل کی آواز ہے یا اندر سے جو آواز آتی ہے اس کا نتیجہ اور ثمرہ ہے بلکہ صاف صاف یہ کہے گا کہ اس میں میرا اپنا کچھ نہیں میں تو صرف ایلچی اور پیغامبر ہوں یہ جو کچھ بھی ہے خدا کا فرمان اور اس کی "وحی" ہے۔

چنانچہ قرآن عزیز نے جگہ جگہ ان دونوں باتوں کو واضح کیا ہے وہ کہتا ہے کہ ہر ایک پیغمبر کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اعلان کر دیں کہ خدا نے ان کو اپنی "ہدایت وحی" کے لیے چن لیا ہے اور وہ خدا کے پیغمبر ہیں اور یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ ان پر وحی کیا جاتا ہے اس کو حرف بہ حرف امت تک پہنچائیں۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ٦١-٦٢)

"(نوح علیہ السلام) نے کہا اے میری قوم! مجھ کو گمراہی سے کوئی واسطہ نہیں ہے بلکہ میں تو تمام کائنات کے پروردگار کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں تم تک اپنے پروردگار کی جانب سے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور میں اللہ کی باتوں میں سے وہ باتیں جانتا ہوں جن سے تم بے خبر ہو۔"

اور حضرت ہود علیہ السلام اور قوم کے درمیان مکالمہ میں حضرت ہود علیہ السلام نے یہ اعلان فرمایا:

﴿قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۝﴾ (الاعراف: ٦٧-٦٨)

"(ہود علیہ السلام نے) کہا: اے میری قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں لیکن میں جہانوں کے پروردگار کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں میں اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور (پیغام الٰہی اور خیر خواہی میں) صاحب امانت ہوں۔"

اور حضرت صالح علیہ السلام نے یہ فرمایا:

﴿قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۝﴾

(الاعراف: ٧٩)

"(صالح علیہ السلام نے) کہا: اے قوم! بلاشبہ میں نے تم کو اپنے پروردگار کا پیغام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کی مگر تم خیر خواہی کرنے والوں کو ناپسند کرتے ہو۔"

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے یہ ارشاد فرمایا:

Marfat.com

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝﴾ (مریم: ۴۱۔۴۳)

"اور یاد کرو کتاب (قرآن) میں ابراہیم کا حال، بلاشبہ تھا وہ بہت ہی صادق اور نبی جب اس نے اپنے باپ سے کہا: "اے باپ! ایسی چیز کی پوجا کیوں کرتا ہے جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے اور نہ تجھ کو کسی (نقصان) سے بے پرواہ کرتی ہے (یعنی بت پرستی کیوں کرتا ہے؟) اے باپ! بلاشبہ مجھ کو علم (وحی) سے وہ حصہ ملا ہے جو تجھ کو حاصل نہیں ہے پس میری پیروی کر میں تجھ کو سیدھی راہ دکھلاؤں گا۔"

اور لوط علیہ السلام نے اپنی قوم سے مکالمہ کرتے ہوئے یہ فرمایا:

﴿اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝﴾ (الشعراء: ۱۶۱۔۱۶۴)

"جب کہا ان سے ان کے بھائی (لوط) نے کیا تم پرہیزگاری اختیار نہیں کرتے بلاشبہ میں تمہارے لیے خدا کا بھیجا ہوا ہوں (اور اس پیغامبری میں) صاحب امانت ہوں پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔"

اور حضرت یعقوب و یوسف علیہما السلام کے ایک طویل حیرت زا واقعہ کے ضمن میں یعقوب علیہ السلام کا وہ مقولہ بھی منقول ہے جس میں انہوں نے اپنے بیٹے یوسف علیہ السلام کو وحی الٰہی کے ذریعہ یہ بشارت دی ہے کہ جس طرح خدا نے تیرے باپ دادا، ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کو پیغمبری عطا فرمائی اسی طرح تجھ کو بھی اس منصب جلیل سے سرفراز کرے گا۔

﴿وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ (یوسف: ۶)

"اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو چن لے گا اور تجھ کو تعبیر رؤیا کا علم بخشے گا اور تجھ پر اپنی نعمت (نبوت) کی تکمیل کرے گا اور اولاد یعقوب پر (جو اس کے اہل ہوں گے) جیسا اس نے اس سے پہلے تیرے باپ دادا ابراہیم، اسحاق پر اس (نبوت) کو پورا کیا بیشک تیرا پروردگار جاننے والا ہے حکمت والا ہے۔"

اور پھر یوسف علیہ السلام کی تبلیغ و دعوت کا اس طرح قرآن میں مذکور ہے:

﴿يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَاۗءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۳۹۔۴۰)

"اے میرے قید کے رفیقو! کیا بہت سے آقا اور خداوند بہتر ہیں یا یکتا خدا کی ذات جو ہر شے پر غالب ہے تم اس کے سوا جس کو پوجتے ہو ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے گھڑ لیے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے کوئی دلیل نہیں اتاری اور حکم تو خدا کے سوا کسی کا نافذ نہیں، اس نے یہی حکم دیا ہے کہ اس کے سواء کسی کی عبادت نہ کرو، دین کی سیدھی راہ یہی ہے۔ لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔"

اور حضرت شعیب علیہ السلام نے اصحاب ایکہ کے سامنے یہ اعلان کیا:

﴿كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْــَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝﴾ (الشعراء: ۱۷۶۔۱۷۹)

"اصحاب ایکہ نے پیغمبروں کو جھٹلایا، جب ان سے شعیب (علیہ السلام) نے کہا: کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، بلاشبہ میں تمہارے لیے (خدا کی جانب سے) صاحب امانت پیغامبر ہوں پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔"

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دربار میں بے دھڑک یہ اعلان فرمایا:

﴿وَ قَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ حَقِيْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۰۴۔۱۰۵)

"اور موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: اے فرعون! بلاشبہ میں جہانوں کے پروردگار کا پیغمبر ہوں میرے لیے یہی لائق ہے کہ میں خدا کے بارے میں حق کے سواء کچھ نہ کہوں، میں تمہارے پروردگار کی طرف سے "دلیل" لے کر آیا ہوں، پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو (آزاد کر کے) بھیج دے (جن کو صدیوں سے غلام بنا رکھا تھا)۔"

اور حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے واقعہ میں سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو دعوت اسلام کے لیے جو نامہ مبارک تحریر فرمایا تھا اس کا اسلوب بیان یہ ہے:

﴿اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَ اْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝﴾
(النمل: ۳۰۔۳۱)

"یہ سلیمان (علیہ السلام) کی جانب سے ہے اور یہ شروع ہے اللہ کے نام سے جو رحمٰن ہے رحیم ہے بات یہ ہے کہ مجھ پر اپنی بلندی و برتری کا اظہار نہ کر (کیونکہ میں بادشاہ نہیں بلکہ پیغمبر ہوں) اور میرے پاس خدا کی فرمانبردار بندی بن کر حاضر ہو۔"

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل ایک علاقہ میں خدا کے چند نبی دعوت و تبلیغ اسلام کے لیے مامور کیے گئے تھے انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا:

﴿قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّاۤ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ۝ وَ مَا عَلَيْنَاۤ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝﴾ (یٰس: ۱۶۔۱۷)

"انہوں نے کہا ہمارا پروردگار (خوب) جانتا ہے کہ بلاشبہ ہم تمہاری جانب اس کے بھیجے ہوئے ہیں اور ہمارے اوپر اس

Marfat.com

سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں کہ امرِ حق کا صاف اور کھلا پیغام پہنچا دیں۔"

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بار بار بنی اسرائیل کے سامنے یہ اعلان فرمایا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور میری بتلائی ہوئی راہ کے سوا کوئی راہ مستقیم نہیں کیونکہ میں جو کچھ بھی پیش کر رہا ہوں خدا کا فرمودہ ہے:

﴿قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۙ﴾ (مریم: ۳۰)

"(عیسیٰ علیہ السلام نے) کہا بلاشبہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھ کو "کتاب" عطا کی ہے اور اس نے مجھ کو "نبی" بنایا ہے۔"

﴿وَ اِذْ قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ﴾ (الصف: ۶)

"جب کہا عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) نے اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب خدا کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں (رسول ہوں)۔"

اور خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی دعوت و تبلیغ میں تو جگہ جگہ یہ حقیقت بہت نمایاں نظر آتی ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۙ وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا﴾ (الاحزاب: ۴۵-۴۶)

"اے نبی! بلاشبہ ہم نے تجھ کو (حق کے لیے) گواہ اور (نیک عملی کے لیے) بشارت دینے والا اور (بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والا اور خدا کے حکم سے اس کی جانب بلانے والا اور (ہدایت و صراط مستقیم کے لیے) روشن چراغ بنایا ہے۔"

﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا ِ۟الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (الاعراف: ۱۵۸)

"(اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے "اے لوگو! بیشک میں تم سب کی جانب اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، اسی کے لیے ہے بادشاہت آسمانوں کی اور زمین کی کوئی خدا نہیں ہے مگر صرف وہی یکتا ذات، (وہی) زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول "نبی اُمی" پر جو خود اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان لاتا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہ پاؤ۔"

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران: ۱۹)

"بلاشبہ اللہ کے نزدیک (ہمیشہ سے) دین (حق) اسلام ہی ہے۔"

﴿وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ﴾ (آل عمران: ۸۵)

"جو شخص اسلام کے ماسواء کو دین بنانا چاہے تو خدا کے یہاں وہ مقبول نہیں ہے۔"

Marfat.com

غرض پیغمبر اور نبی کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ اپنی دعوت اصلاح اور تعلیم حق پر خود بھی ایمان لائے اور کائنات کے سامنے بھی یہ اعلان کرے کہ یہ "پیغام ہدایت" اور یہ "تعلیم حق" میری جانب سے نہیں بلکہ خدا کی جانب سے ہے اور اسی نے مجھ کو اپنا ایلچی بنا کر اس کی دعوت کے لیے بھیجا ہے یہ جو کچھ ہے سب خدا کا اپنا ہے میں تو صرف اس کی جانب پکارنے والا ہوں اور اس میں شک و شبہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے اور یہ ہر قسم کی لغزش و خطاء سے پاک "علم یقین" اور "وحی الٰہی" ہے جس کے متعلق خدا کا یہ فیصلہ ہے:

﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾ (حٰمٓ السجدہ: ۴۲)

اور

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ (النجم: ۳۔۴)

لیکن "مصلح غیر نبی" کو یہ مجاز حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی دعوت اصلاح کے بارہ میں یہ دعویٰ کرے، کیونکہ اس کی یہ دعوت اصلاح یا کسی پیغمبر اور نبی کی "ہدایت وحی" کی پیروی میں ہوگی، تب تو اس کی حیثیت ایک یاددہانی کرنے والے کی ہے اور یا ہدایت وحی کے اتباع کے ساتھ اس کے اپنے اجتہاد اور ضمیر کی آواز کا بھی دخل ہوگا تو اس کے اس حصہ اصلاح کا لغزش، خطاء بلکہ بعض اوقات غلط روی سے بھی محفوظ رہنا لازمی اور ضروری نہیں ہے۔

کیفیت وحی:

وحی سے متعلق جو حقائق سپرد قلم ہو چکے ہیں ان میں ایک یہ اضافہ بھی قابل توجہ ہے: عربی میں وحی کے معنی "مخفی اشارہ" کے ہیں، گویا یہ فطرت الٰہی کی وہ سرگوشی ہے جو ہر ایک مخلوق پر اس کی راہ عمل کھولتی ہے، چنانچہ قرآن نے شہد کی مکھی کے نظام بیت کے متعلق فطری ہدایت کو لفظ "وحی" سے ہی تعبیر کیا ہے:

﴿وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ﴾

(النحل: ۶۸)

"اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اسی غرض سے بلند کی جاتی ہیں اپنے لیے چھتے بنائے۔"

اور مذہب و دین کی اصطلاح میں اس الہام کو کہتے ہیں جو خدائے برتر کی جانب سے نبی اور پیغمبر پر اس طرح القاء یا فرشتہ کے ذریعہ نازل کیا جاتا ہے کہ اس مقدس ہستی کو اس کے منجانب اللہ ہونے کا روز روشن سے بھی زیادہ یقین حاصل ہو جاتا ہے اور کسی قسم کے بھی شک و شبہ اور تردد کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اسی لیے وہ تحدی کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ "خدا کی وحی" اور اس کا بخشا ہوا "علم یقین" ہے نزول وحی کی یہ صورت کس طرح پیش آتی ہے اور کون سے وہ طریقے ہیں جن کے ذریعہ نبی معصوم کو خدا کی وحی کا علم ہوتا ہے؟ قرآن عزیز اس کے متعلق یہ کہتا ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَائِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ

Marfat.com

بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَكِیْمٌ ﴿۵۱﴾ (الشوریٰ:۵۱)

"اور کسی انسان کے لیے یہ صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے (اس دنیا میں بالمواجہہ) گفتگو کرے مگر یا وحی (کے القاء) کے ذریعہ یا پس پردہ یا بھیج دے فرشتہ کو پس وہ اس کی (خدا کی) اجازت سے اس پر وحی لا اُتارے جو اس کی (خدا کی) مرضی ہو بلاشبہ وہ (خدا) بلند و بالا حکمت والا ہے۔"

غرض "وحی" ایک خاص ذریعہ علم کا نام ہے جو خدا کی جانب سے اس کے نبیوں اور رسولوں کے لیے مخصوص ہے اور اس کا تعلق براہ راست عالم قدس اور عالم غیب سے ہے اسی بنا پر اگرچہ انبیاء و رسل کو اس کی معرفت اور اس کے منجانب اللہ ہونے کا یقین کامل آفتاب عالمتاب سے زیادہ بدیہی ہوتا ہے لیکن وہ اس کو حقیقی کیفیت کو دوسروں پر تشبیہ و تمثیل ہی کے ذریعہ واضح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جب بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت اقدس ﷺ سے نزول وحی کی کیفیت کے متعلق سوالات کیے تو آپ ﷺ نے یہ جوابات ارشاد فرمائے:

((احیانا یاتینی کصلصلة الجرس)) "کبھی یوں معلوم ہوتا ہے گویا گھنٹہ کی مسلسل گونج ہے۔"

((دوی کدوی النحل)) "(کبھی) جس طرح شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے گونج پیدا ہوتی ہے اس طرح کی گونج محسوس کرتا ہوں۔"

((واحیانا یتمثل لی الملك رجلا فاعی ما یقول)) "اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ انسان کی شکل میں ظاہر ہو کر مجھ کو خدا کی وحی سناتا ہے اور میں اس کو محفوظ کر لیتا ہوں۔"

ان جوابات میں کیفیت وحی کو اگرچہ قریب الفہم بنانے کی کافی کوشش کی گئی ہے پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حقیقی کیفیت کو خدا اور خدا کے پیغمبر کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں پا سکتا اور پیغمبر اس حقیقت کا اذعان اور اس کے منجانب اللہ ہونے پر غیر متبدل یقین تو رکھتا ہے لیکن غیر نبی پر حقیقی کیفیت کو واضح کرنے سے معذور ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لیے کہ یہ صورت حال تو دنیا کی بن دیکھی اشیاء کے بارہ میں صبح سے شام تک ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً جس شخص نے سیب کو نہیں دیکھا اور نہیں چکھا اس کے سامنے دیکھنے اور چکھ لینے والا اگرچہ سیب کی حقیقت کا بہتر سے بہتر نقشہ بھی پیش کر دے اور اس کے رنگ، مزہ، خوشبو، لطافت وغیرہ کی تعبیر بحد کمال بھی پہنچا دے تب بھی وہ شخص سیب کو آنکھ ۔۔ دیکھنے اور زبان سے چکھ لینے والے کے مقابلہ میں کسی طرح اس کی حقیقی کیفیت سے آگاہ نہیں ہو سکتا وہ بلاشبہ سیب کے متعلق صحیح علم تو حاصل کر سکتا ہے لیکن حقیقی ذوق کو ہرگز نہیں پا سکتا اسی طرح نبی کی تعلیم و تلقین سے ہم "وحی" کے متعلق ایک اجمالی علم ضرور حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس کی حقیقی کیفیت کو نہیں پا سکتے۔

نبی اکرم ﷺ نے قرآن میں مسطور ہر سہ اقسام وحی میں سے پہلی قسم ((الا وحیا)) کے متعلق یہ بھی ارشاد فرمایا ہے: ((وھو اشدہ علی فیفصم عنی وقد وعیت ما قال)) اور وحی کی یہ صورت مجھ پر بہت سخت گزرتی ہے پھر جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو وحی الٰہی نے جو کچھ کہا ہوتا ہے وہ سب مجھے محفوظ ہوتا ہے" یعنی جب فرشتہ بشکل انسان تمثل اختیار کر کے وحی الٰہی لاتا ہے یا ((من وراء حجاب)) براہ راست خدائے برتر سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے تو یہ دونوں صورتیں آپ ﷺ پر آسان ہوتی ہیں مگر "القاء وحی" کی پہلی شکل سخت گزرتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کے متعلق علماء حق یہ ارشاد فرماتے ہیں:

خالق کائنات نے انسان کو لوازم بشریت کی قیود و شروط کے ساتھ اس درجہ پابند بنا دیا ہے کہ انبیاء و رسل جیسی مقدس اور

Marfat.com

معصوم ہستیوں کو بھی اپنی تطہیر و تقدیس کے باوجود ان اثرات سے متاثر ہوئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے اس لیے جب ان پر ندا کی وحی کا نزول ہوتا اور ایسی حالت میں ان پر عالم قدس کے تمام اثرات چھا جاتے اور انوار و تجلیات کی آغوش میں وہ حضرت حق سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے ہیں تو اس حالت میں ان پر دو قسم کی کیفیتوں میں سے ایک کیفیت ضرور طاری ہوتی ہے ایک یہ کہ اس کے بشری خواص کو مغلوب کر کے اس کی روحانی کیفیات کو عالم قدس کی جانب اس درجہ بلند اور رفیع کیا جائے کہ وہ حضرت حق کی وحی کے اثرات قبول کرنے اور محفوظ رکھنے کے قابل ہو سکے اور چونکہ جذب و انجذاب کی اس خاص حالت اور عالم آب و گل سے عالم قدس کی جانب اس مخصوص رفعت میں بشری خصوصیات اور روحانی مؤثرات کے درمیان سخت قسم کا تصادم پیدا ہو جاتا ہے اس لیے اس تصادم اور تزاحم سے نبی پر ابتداءً ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ جب یہ تصادم ختم ہو کر یہ عالم قدس کے تمام پاک اور لطیف اثرات اس ہستی پر چھا جاتے ہیں اور وہ ان میں محو اور مستغرق ہو کر لذت وحی کو پا جاتی ہے تو پھر یہ اذیت و تکلیف یک لخت جاتی رہتی ہے اور اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور یہ سب کچھ چند دقیقوں میں ہو گزرتا ہے۔

یہی وہ صورت وحی ہے جس کی کیفیات کو ذات اقدس ﷺ نے ((صلصلة الجرس)) اور ((دوی النحل)) کی تمثیلات میں سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے تمثیلات میں اس پہلو کے اختیار کرنے کی وجہ بھی مسطورۂ بالا حقیقت ہے اس لیے کہ اس صورت خاص میں جب بشری حواس وادراکات پر عالم قدس کے روحانی اثرات کا غلبہ ہوتا ہے تو اول حواس وادراکات میں اضطراب و بے چینی پیدا ہو جاتی ہے اور حاسہ سمع کہ جس کا تعلق سماعت وحی سے ہے وہ شروع میں ایک خاص قسم کی گونج محسوس کرتا ہے جو اس عالم پست سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتی اور اس کے بعد وہ "وحی الٰہی" کی اصل کیفیت سے لذت اندوز ہوتا اور اس کو "علم یقین" اور "اذعان حق" کے ساتھ پالیتا ہے کیونکہ عالم قدس کے قوی مؤثرات اس پر غالب آکر "وحی الٰہی" کے حصول کا ہر طرح اہل بنا دیتے ہیں مگر دوسروں پر اس حقیقت کے تمام و کمال سمجھانے میں ان علامات و اثرات کے اظہار سے آگے نہیں جاتا جن کو ابھی ((صلصلة الجرس)) اور ((دوی النحل)) کی تعبیرات میں سن چکے ہو۔ وحی الٰہی کی اس نوع کے علاوہ دوسری ہر دو انواع "یعنی وراء حجاب کلام الٰہی کی سماعت یا فرشتہ کے ذریعہ وحی کے نزول" میں صورت حال برعکس ہوتی ہے اور اس وقت نبی کے بشری خواص کو عالم قدس کی جانب رفعت دینے اور عالم خاک و گل سے عالم نور کی جانب جذب و انجذاب سے متاثر کرنے کی تکلیف نہیں دی جاتی بلکہ عالم قدس کی تمام کیفیات خود، ہبوط و نزول کرتی اور نبی کی روحانیت کو متاثر بناتی ہیں اور یا فرشتہ بحکم حضرت حق اپنے ملکوتی جسد کو جامہ انسانیت کے ساتھ متمثل کر لیتا اور عالم قدس کے اثرات اور بشری خواص میں امتزاج پیدا کر کے نبی کے حضور حاضر ہوتا اور وحی الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور اس لیے ان دونوں صورتوں میں نبی اور رسول کو پہلی قسم کے تصادم سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔

کیفیت وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی:

چونکہ یورپ کے دور علمی کی بنیاد خالص مادیات پر قائم ہے اور روحانی علوم اور ماوراء مادیات کے ناقابل انکار حقائق کے لیے وہ کوئی جگہ دینے کو آمادہ نہیں ہے، اس لیے بعض مستشرقین نے جب وحی الٰہی کی پہلی قسم کے متعلق نبی اکرم ﷺ کے وہ اقوال سنے جن کا ذکر ابھی ہو چکا ہے اور وہ حالات پڑھے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نزول وحی کی اس خاص صورت میں آپ ﷺ کرب اور

Marfat.com

اضطراب محسوس فرماتے اور سردی کے ایام میں آپ ﷺ کی پیشانی پر پسینہ آ جاتا اور آپ ﷺ پر بے خودی کے سے آثار نظر آنے لگتے تو انہوں نے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی کہ یہ نزول وحی کی کیفیت نہیں ہوتی تھی بلکہ (العیاذ باللہ) آپ ﷺ کو ہسٹریا کا دورہ ہو جاتا تھا۔

مستشرقین پر زور الفاظ میں آپ ﷺ کی صداقت و امانت کو تسلیم کرتے ہیں، آپ کی تعلیمات حق کو سراہتے اور کائنات انسانی کے لیے آپ کی تعلیمات کو "تعلیم کامل" مانتے ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کے دعویٰ "الہام و وحی الٰہی" کا انکار کرتے اور کیفیت وحی کو مرض سے تعبیر کرتے ہیں۔ ﴿ سُبۡحٰنَكَ هٰذَا بُهۡتَانٌ عَظِيۡمٌ ۝ ﴾

درحقیقت یہ حضرات یا تو از راہ تعصب ناقابل انکار تعلیم حق کے تسلیم کے ساتھ ساتھ ایک ایسی بات کہنا چاہتے ہیں جس سے تعلیم حق (اسلام) پر کاری ضرب لگ سکے اور تعصب کے الزام سے بھی بچ جائیں اور یا پھر اس علمی حقیقت سے بے بہرہ ہیں جس کو تفصیل کے ساتھ ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں کہ نزول وحی کی یہ کیفیت "مرض" نہیں تھا بلکہ اپنے اثرات اور محرکات کی بناء پر ایک فطری صورت حال تھی جس کا پیش آنا از بس ضروری تھا اور دراصل یہ کیفیت دماغ، حواس اور اعضائے انسانی کو مفلوج نہیں بناتی تھی جیسا کہ ہسٹریا وغیرہ میں ہوتا ہے بلکہ اس کے برعکس تمام مادی قویٰ میں روحانی کوائف کی ایسی برقی رو دوڑا دیتی ہے جس سے چند لمحات کے بعد ان کے اندر ایسی زبردست اور مافوق المادہ قوت پیدا ہو جاتی تھی جس کے ذریعہ اس ہستی (نبی) میں عالم قدس سے پوری طرح وابستہ ہو کر خدا کی وحی اور اس کے کلام کو سننے اور قلب و دماغ میں بخوبی محفوظ رکھنے کی صلاحیت رونما ہو جائے۔ چنانچہ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے اس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا:

((فیفصم عنی و قد وعیت ما قال)).

"شدت و کرب کی یہ کیفیت جلد ہی مجھ سے زائل ہو جاتی ہے اور میں وحی الٰہی کو تمام و کمال محفوظ کر لیتا ہوں۔"

کیا ہسٹریا کے دوروں کا کوئی مریض ایسا پیش کیا جا سکتا ہے جس پر ایک جانب مرض کا مسلسل حملہ ہو رہا ہو اور دوسری جانب وہ علمی و عملی صلاحیتوں معاشی و معادی حکمتوں، اور دینی و دنیوی رفعتوں کے لیے ایسا کامل و مکمل دستور و آئین اور اعمال و افکار پیش کر رہا ہو، کائنات جس کا جواب نہ رکھتی ہو اور دوست و دشمن دونوں اس کی رفعت و بلندی کا اعتراف کرتے ہوں؟ کیا دماغی فتور جو کہ ہسٹریا کا ثمرہ اور نتیجہ ہے اور دماغی رفعت و بلندی جس کے ثمرات حیرت زا اور عملی دنیا میں وقیع سے وقیع تر ہوں دونوں یکجا جمع ہو سکتے ہیں؟ اور اگر نہیں ہو سکتے اور بلاشبہ نہیں ہو سکتے تو حقیقت حال کو نظر انداز کرتے ہوئے "وحی الٰہی سے متعلق" مستشرقین کا یہ دعویٰ کس درجہ حقیر اور بے وقعت ہو جاتا ہے صاحب عقل و بصیرت اس کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں؟

نزول وحی کا پہلا دور:

نبی اکرم ﷺ پر سب سے پہلے سورۂ علق کی یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿ اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ‌ۚ ۝ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ‌ۚ ۝ اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُۙ ۝ الَّذِىۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِۙ ۝ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ يَعۡلَمۡؕ ۝ ﴾ (العلق: ۱۔۵)

Marfat.com

"پڑھو! اپنے پروردگار کے نام سے، جس نے پیدا کیا، پیدا کیا انسان کو خون بستہ سے، پڑھو! اور تیرا پروردگار جو سب سے زیادہ برگزیدہ ہے وہ ہستی ہے جس نے سکھایا لکھنا، سکھایا انسان کو وہ سب کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا۔"

ان آیات میں یہ بتلایا گیا ہے کہ حضرت انسان جو خدا کی سب سے بہتر اور سلسلہ کائنات کی سب سے ترقی یافتہ مخلوق ہے اور اسی وجہ سے وہ کائنات ہست و بود میں "خلیفۃ اللہ" کے منصب پر سرفراز کیا گیا ہے اس کی خلقی کمزوریوں کا یہ حال ہے کہ اس کی نمود کی ابتداء آب نجس اور خون بستہ سے ہوئی ہے لیکن قدرت حق نے جب اس کو مقام رفیع بخشنے کا ارادہ کیا اور "اسفل سافلین" کے لائق مخلوق کو "درجات علیا" پر فائز کرنا چاہا تو اس کو وہ صفت اعلیٰ عطا فرمائی جو صفات الٰہی میں مبداء الصفات ہے یعنی اس کو "صفت علم کا مظہر"، بنایا اس کو "قلم کے ذریعہ" لکھنا سکھایا اور علوم و عرفان کا مہبط و محور ٹھہرایا پھر اس جانب بھی اشارہ کیا کہ یہ سلسلۂ اسباب و مسببات حصول علم کے تین ہی طریقے ہیں "ذہنی، لسانی، رسمی" اور علم ذہنی الفاظ اور رسوم و نقوش کا محتاج نہیں ہوتا اور علم لسانی علم ذہنی کا محتاج ہے مگر رسوم و نقوش کتابت سے بے نیاز اور علم رسمی، رسم الخط اور نقوش کا بھی محتاج ہے پس اگر "علم رسمی" کا کسی جگہ مذکور ہو تو لسانی اور ذہنی علوم کا ذکر خود بخود ہو جاتا ہے کیونکہ یہ اپنے سے بلند ہر دو علوم کے لیے بہترین معبر ہے اور ظاہر ہے کہ علم رسمی "قلم" کا محتاج ہے لہٰذا قرآن عزیز نے ﴿عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ کہہ کر لطیف پیرایہ بیان میں اس پوری حقیقت کو واضح کر دیا اس کی مزید تشریح ﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ سے کر دی اور اس معجزانہ اسلوب کی غرض و غایت یہ ہے کہ ایک جانب "علم" اور "نبوت" کے درمیان کیا علاقہ ہے اس کا اظہار ہو جائے اور دوسری جانب انسان کو اپنے مقصد حیات کا صحیح علم ہو جائے۔

نزول وحی کا دوسرا دور :

غار حراء میں منصب نبوت سے سرفرازی کے وقت سورۂ علق کی یہ چند آیات نازل ہو کر وحی الٰہی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ حراء میں فرشتہ کے ظہور اور وحی کے نزول سے فوری طور پر نبوت و رسالت کے جو خصائص و اثرات ذات اقدس ﷺ پر وارد ہوئے ہیں وہ اچھی طرح راسخ ہو جائیں اور صلاحیت و استعداد نبوت و رسالت کی تکمیل ہو جائے تا کہ آئندہ سلسلۂ وحی کے قوی مؤثرات و محرکات پیغمبر ﷺ کے بشری خواص کے اجنبی نہ رہیں اس لیے کچھ عرصہ کے لیے نزول وحی کا سلسلہ بند رہا۔ اسی کو مذہب کی اصطلاح میں "فترت وحی" کہتے ہیں۔

لیکن ذات اقدس ﷺ کو حراء میں پیش آمدہ کیفیت و صورت حال سے جو فطری تشویش پیدا ہوتی تھی جب اس نے سکون و طمانیت کی شکل اختیار کر لی تو نزول وحی کی روحانی کیفیات نے اس درجہ لطف اندوز کیا کہ آپ ﷺ اس "فترت" کو برداشت نہ کر سکے اور لطیف و عمیق جذبات نے اس حد تک اضطراب و بے چینی کی شکل اختیار کر لی کہ گاہ گاہ ناموس اکبر (جبرئیل امین علیہ السلام) ظاہر ہو کر آپ ﷺ کو صبر و تسکین کی دعوت دیتے اور یقین دلاتے تھے کہ اپنی تمام لطافتوں اور حسن و کمال کے ساتھ نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے اور "فترت" کا یہ دور محض عارضی ہے اس لیے آپ اندوہگیں نہ ہوں تب آپ تسکین پاتے اور وقت موعود کے منتظر رہتے کہ کچھ عرصہ بعد نزول وحی کا دوسرا دور شروع ہوا اور سب سے اول سورۂ مدثر کی یہ آیات نازل ہوئیں۔ ❶

❶ فترۃ کا زمانہ کس قدر رہا ہے اس سلسلہ میں چھ ماہ سے ڈھائی سال تک کے متعلق روایات پائی جاتی ہیں اور محدثین کا رجحان چھ ماہ کی طرف زیادہ ہے۔

﴿ یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَ ثِیَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝ ﴾ (المدثر: ۱۔۷)

"اے کملی پوش اٹھ (اور لوگوں کو گمراہی کے انجام سے) ڈرا اور اپنے پروردگار کی عظمت وجلال کو بیان کر اور لباس کو پاک کر اور بتوں سے جدا رہ اور زیادہ حاصل کرنے کی نیت سے حسن سلوک نہ کر اور اپنے پروردگار کے معاملہ میں (اذیت و مصیبت پر) صبر اختیار کر۔"

ان آیات نے گویا انسانی مقصد حیات کی تکمیل کر دی کیونکہ سورۂ علق میں کہا گیا تھا کہ انسانیت کبریٰ کے لیے "صحیح علم" شرط ہے، یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ علم صحیح کی رفعت و بلندی کے اعتراف کے باوجود انسانیت کی تکمیل اس وقت تک ناممکن ہے کہ علم صحیح کے ساتھ "عمل صحیح" بھی موجود ہو اس لیے کہ اگر علم صحیح ہے اور عمل صحیح مفقود تو اس کی افادیت معطل اور بیکار ہے اور اگر عمل ہے اور علم صحیح ندارد تو وہ عمل موجب زیان و نقصان ہے، رشد و ہدایت اور صراط مستقیم کے لیے دونوں ہی کا وجود ضروری ہے اور تب ہی "انسان" "انسانیت کبریٰ" حاصل کر سکتا ہے۔

غرض جس طرح سورۂ علق کی آیات نے "علم نافع" کی جانب اشارات کیے اسی طرح سورۂ مدثر نے "عمل نافع" کی اساسی تفاصیل ظاہر کی ہیں خدا کی ہستی اور اس کی ربوبیت کاملہ کا عملی اعتراف، باطنی طہارت و پاکیزگی کا کمال ظاہری طہارت و پاکی کا لزوم، بے غرض اور بے لوث اخلاق حمیدہ کی اساس "احسان" پر استقامت اور قبول حق اور نیک عملی کے نتائج پر "صبر" ان آیات کا حاصل ہیں اور یہی وہ بنیادی امور ہیں جن میں علم حق اور عمل صحیح کی تمام کائنات سمو دی گئی ہے۔

نیز ذات اقدس ﷺ کے لیے سورۂ علق اور سورۂ مدثر کا یہ خطاب اور پیغام حق، اشارہ ہے اس جانب کہ یہ نظام عمل منصب رسالت کے لیے "تکمیل نفس" اور دعوت رشد و ہدایت کے لیے "مرتبہ اولین" کی حیثیت رکھتا ہے اور یہی مستقبل قریب میں "بعثت عامہ" کا باعث ثابت ہوگا۔

اعلانِ دعوت وارشاد کی پہلی منزل:

کلام الٰہی کے اس حکم کے بعد جو کہ تبلیغ و دعوت حق کا پہلا پیغام تھا دعوت وارشاد نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اب ذات حق نے سورۂ شعراء کی آیات نازل فرما کر نبی اکرم ﷺ کو یہ فیصلہ سنایا کہ سب سے پہلے اہل قرابت اور رشتہ داروں کو دعوت حق دیجئے کہ دوسروں پر بھی اس کا اثر پڑے اور یوں بھی قریش اور بنی ہاشم کے قبول حق کا اثر تمام عرب قبائل پر پڑنا لازمی ہے اس لیے کہ وہ سب قبائل کے سرخیل اور سرگردہ ہیں اور ساکنان حرم ہونے کی وجہ سے تمام عرب پر ان کا دینی اور دنیوی اثر ہے۔ سورۂ شعراء میں ہے:

﴿ وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ ۝ وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَ تَوَكَّلْ عَلَی الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ ۝ الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ

تَقُوۡمُ ﴿۲۱۸﴾ وَ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيۡنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۲۲۰﴾ ﴾ (الشعراء: ۲۱۴-۲۲۰)

"اور (اے پیغمبر!) اپنے قریبی ناتے والوں کو (گمراہی سے) ڈرا اور جو مسلمان تیرے پیرو ہیں ان کے لیے اپنے بازوؤں کو پست رکھ (یعنی نرمی اور تواضع سے پیش آ) اگر وہ نافرمانی کریں تب تو ان سے کہہ دے میں تمہارے ان اعمال (بد) سے بری ہوں اور غالب رحم کرنے والی ذات پر بھروسہ کر جو تجھ کو اس وقت بھی دیکھتی ہے جب تو اس کی بارگاہ میں کھڑا ہوتا ہے اور اس وقت بھی جبکہ تو سجدہ کرنے والوں میں مل کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے بلاشبہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔"

گویا یہ "تکمیل علم وعمل" اور "منصب رشد و ہدایت کے فیضان" کے بعد دوسرا درجہ تھا، جس میں اعلانِ حق اور دعوت اسلام کی عملی صورت اختیار کرنے کے لیے تحریک کی گئی، چنانچہ صحیح روایات شاہد ہیں کہ آپ ﷺ نے صفا کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اس زمانہ کے طریق اعلان کے مطابق "یا صباحا" "یا صباحا" کہہ کر خانوادۂ قریش کو پکارا اور جب سب جمع ہو گئے تو ایک مثال دے کر سمجھایا کہ بلاشبہ میں خدا کا پیغمبر اور رسول اور صراط مستقیم کے لیے ہادی برحق ہوں ارشاد فرمایا:

"لوگو! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک لشکر جرار جمع ہے اور تم پر حملہ کے لیے آمادہ، تو کیا تم مجھ کو صادق سمجھو گے۔ ((او مصدق؟)) لوگوں نے کہا ہم نے تجھ کو "الصادق الامین" پایا ہے تو جو کچھ کہے گا حق اور صداقت پر مبنی ہوگا تب آپ ﷺ نے فرمایا: تو لوگو! میں تم کو خدائے واحد کی جانب بلاتا ہوں اور اصنام پرستی کی نجاست سے بچانا چاہتا ہوں، تم اس دن سے ڈرو، جب خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال و کردار کا حساب دینا ہے۔" [1]

یہ صدائے حق جب قریش کے کانوں میں پہنچی تو وہ حیران رہ گئے اور باپ دادا کے دین "بت پرستی" کے خلاف آواز سن کر برافروختہ ہونے لگے گویا سب میں ایک آگ سی دوڑ گئی اور سب سے زیادہ آپ ﷺ کے حقیقی چچا ابولہب کو طیش آیا اور غضبناک ہو کر کہنے لگا:

تبالك سائر اليوم اما دعوتنا الا بهذا.

"تو ہمیشہ ہلاکت ورسوائی کا منہ دیکھے کیا تو نے اس غرض سے ہم کو بلایا تھا۔" [2]

عجب منظر ہے کہ چند گھڑیاں پہلے جس محمد بن عبداللہ کی صداقت و امانت اور خصائل حمیدہ سے ساری قوم متاثر رہ کر اس کی عظمت وعزت کرتی اور اس کے ساتھ والہانہ محبت کا اظہار کرتی تھی وہی آج اس اعلان پر "کہ میں محمد رسول اللہ ہوں" یکلخت بیگانہ و نفور اور خون کی پیاسی بن گئی۔

دعوت وارشاد کی دوسری منزل:

سیرت کی کتابوں میں پڑھ آئے ہو کہ نبی اکرم ﷺ نے خاندان اور برادری کے لوگوں کو راہ حق دکھانے اور ان کی ایمانی اور اخلاقی حالت درست کرنے کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا مگر قریش کے چند اصحاب کے سوائے کسی نے آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک نہ کہا

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۳۸

[2] سورۂ لہب کا نزول ابولہب کی اسی گستاخانہ جرأت کے انجام بد کا اظہار کرتا ہے۔

Marfat.com

اور عداوت و بغض کو اپنا شعار بنائے رکھا تب دعوت وارشاد نے ترقی کے تیسرے زینہ پر قدم رکھا اور ذات حق کی جانب سے حکم ہوا: اے داعی حق! خاندان اور برادری کے انکار و جحود سے متاثر و غمگین نہ ہو اور اپنی مفوضہ خدمت پر استقامت کے ساتھ قائم رہو کیونکہ سعادت وشقاوت تمہارے قبضہ میں نہیں ہے تمہارا کام تو صرف ابلاغ (پہنچانا) ہے۔ البتہ اب خاندان کے دائرہ سے آگے بڑھ کر مکہ اور اطراف مکہ کے قبائل و اقوام کو بھی یہ پیغام حق سناؤ اور دعوت وارشاد کا یہ تحفہ ان کے سامنے بھی رکھو تاکہ جو سعید روحیں "پیغام حق" کے لیے مضطرب اور بے چین ہیں وہ اس پر لبیک کہہ کر تسکین پائیں اور روح تشنہ کو آب حیات سے سیراب کریں۔

﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا﴾

(الانعام: ۹۲)

"اور (دیکھو) یہ کتاب (قرآن) ہے جسے ہم نے (توراۃ کی طرح) نازل کیا، برکت والی اور جو کتاب اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس لیے نازل کی تاکہ تم اُم القریٰ (یعنی شہر مکہ) کے باشندوں کو اور ان کو جو اس کے چاروں طرف ہیں (گمراہیوں کے نتائج سے) ڈراؤ۔"

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى﴾ (الشوریٰ: ۷)

"اور اسی طرح ہم نے تم پر قرآن نازل کیا زبان عربی میں تاکہ (گمراہیوں کے نتائج سے) ڈراؤ شہر مکہ کے باشندوں کو اور ان کو جو اس کے آس پاس ہیں۔"

چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے تبلیغ حق کو مکہ کی تحدید سے آزاد کر کے اطراف مکہ کے لیے عام کر دیا اور طائف، حنین اور یثرب (مدینہ) تک اپنی صدائے حق کو پہنچایا بلکہ مہاجرین کے ذریعہ حبشہ کے عیسائی بادشاہ اصحمہ تک کلمہ حق سنایا۔

بعثت عامہ:

اس کے بعد دعوت وارشاد کی وہ تیسری منزل پیش آئی جو "بعثت محمدی" کا نصب العین اور مقصد وحید، اور تمام انبیاء ورسل علیہم السلام کے مقابلہ میں ذات اقدس محمد ﷺ کی بعثت کے لیے طغرائے امتیاز تھی، یعنی خدائے برتر نے آپ کی بعثت کو "بعثت عام" قرار دیا اور حکم ہوا کہ آپ ﷺ نہ صرف قریش کے لیے، نہ صرف اُم القریٰ (مکہ) اور اطراف مکہ کے لیے نہ صرف عرب کے لیے نبی و رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں بلکہ آپ ﷺ کی بعثت تمام کائنات انسانی کے لیے ہوئی ہے اور آپ ﷺ عرب و عجم اور اسود و احمر سب کے لیے پیغامبر اور خدا کے ایلچی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٨﴾﴾ (سبا: ۲۸)

"اور ہم نے آپ کو کائنات انسانی کے لیے پیغام دے کر بھیجا ہے (اعمال نیک پر) خوش خبری سنانے اور (اعمال بد پر) لوگوں کو ڈرانے کے لیے اور اکثر (جاہل) لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔"

﴿تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ﴿١﴾﴾ (الفرقان: ۱)

Marfat.com

"پاک اور برتر ہے وہ ذات جس نے حق و باطل کے درمیان تمیز دینے والی کتاب نازل فرمائی اپنے بندے محمد ﷺ پر تاکہ وہ تمام جہان والوں کو (انجام بد سے) ڈرائے۔"

دعوت اسلام کا مجمل خاکہ اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر :

نبی اکرم ﷺ سرزمین عرب میں مبعوث ہوئے اس لیے فطری طریق کار کے پیش نظر سب سے اول قوم عرب ہی ان کی دعوت وارشاد کا مخاطب قرار پائی تاکہ جو قوم کل چوپایوں کی گلہ بان تھی نور نبوت سے مستنیر ہو کر کائنات انسانی کی گلہ بان بن جائے اور خدائے برتر کے سب سے بزرگ تر پیغمبر و رسول کے سایہ رحمت میں تربیت پا کر کائنات ہدایت کے لیے "خیر امۃ" کا لقب پائے۔تو اب دیکھنا یہ ہے کہ عرب جیسی سرکش، جاہل، تمدن و حضارۃ سے یکسر محروم اور اخلاقی وملی جذبات واحساسات سے قطعاً منحرف قوم پر "اسلام کی دعوت" نے فوری طور پر کیا اثر کیا تاکہ ہم بآسانی یہ اندازہ کر سکیں کہ جس مذہب کے بنیادی اصول وعقائد اور افکار و اعمال نے ایسی قوم کے تمام شعبہ ہائے حیات میں حیرت زا اور عظیم الشان انقلاب پیدا کر کے اس کو روحانی دنیا کا انسان بنا دیا اس مذہب کی صداقت کے لیے تنہا یہ ایک کارنامہ ہی روشن دلیل بن سکتا ہے۔

مشرکین مکہ کی پیہم مخالفت ایذاء رسانی اور ہولناک طریقہ ہائے عذاب نے جب مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت کو افریقہ کے مشہور ملک حبشہ کی جانب ہجرت پر مجبور کر دیا اور وہ عیسائی حکمراں اصحمہ کی حکومت میں پناہ گزین ہو گئے تو سرداران قریش اس کو بھی برداشت نہ کر سکے اور اصحمہ کے دربار میں مشاہیر کا ایک وفد بھیج کر یہ مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو اس لیے ان کے حوالہ کر دے کہ یہ بددین ہو کر اور باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر قوم میں تفرقہ پیدا کرنے کا باعث بنے اور یہاں رہ کر بھی حکمران کے دین کے مخالف ہیں۔

اصحمہ نے وفد کا مطالبہ سن کر مسلمانوں کو جواب دہی کے لیے دربار میں طلب اور اسلام کے متعلق دریافت حال کیا، تب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اسلام سے متعلق تقریر فرمائی اور اس کی مقدس تعلیم کا مختصر اور جامع نقشہ کھینچ کر اصحمہ کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔یہی وہ تقریر ہے جو دراصل عرب کے دور جاہلیت اور قبول اسلام کے دور کی انقلابی کیفیت کا مجمل مگر بہترین خاکہ ہے۔حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بادشاہ اور درباریوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

"بادشاہ! ہم پر ایک طویل تاریک زمانہ گزرا ہے اس وقت ہماری جہالت کا یہ عالم تھا کہ ایک خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے تھے اور خود ساختہ پتھروں کی پوجا ہمارا شعار تھا مردار خوری، زناکاری، لوٹ مار، قطع رحمی صبح وشام کا ہمارا مشغلہ، ہمسایوں کے حقوق سے بیگانہ، رحم وانصاف سے ہم ناآشنا اور حق وباطل کے امتیاز سے ہم ناواقف، غرض ہماری زندگی سرتا سر درندوں کی طرح تھی کہ قوی ضعیف کو کچلنے اور توانا، ناتواں کو ہضم کر لینے کو اپنے لیے فخر اور طغرائے امتیاز سمجھتا تھا۔

رحمت خدا کا کرشمہ دیکھیے کہ اس نے ہمارے اندر ایک بزرگ پیغمبر مبعوث کیا جس کے نسب سے ہم واقف جس کی صداقت، امانت وعصمت پر دوست ودشمن دونوں گواہ، جس کی قوم نے اس کو "محمد الامین" کا لقب دیا، وہ آیا، اور اس نے ہم کو خدا کی توحید کا سبق دیا خدائے واحد کی جانب بلایا اس نے بتلایا کہ خدا کا کوئی سہیم وشریک نہیں وہ شرک سے پاک ہے بت پرستی جہالت کا شیوہ ہے اس لیے قابل ترک ہے اور صرف خدائے واحد ہی کی عبادت حق عبدیت ہے اس نے ہم کو حق گوئی اور صداقت شعاری کی تلقین کی اور صلہ رحمی کا حکم فرمایا، ہمسایوں اور کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک سکھایا، قتل و

Marfat.com

غارت کی رسم بد کو مٹایا، زنا کاری کو حرام اور فحش کہہ کر اس ننگ انسانیت عمل سے ہم کو نجات دلائی، نکاح میں محارم اور غیر محارم کا فرق بتایا، جھوٹ بولنے، ناحق مال یتیم کھانے کو حرام فرمایا، نماز اور خیرات وصدقات کی تعلیم دی اور ہر حیثیت سے ہم کو حیوانیت کے قعر مذلت سے نکال کر انسانیت کبریٰ کے مرتبہ پر پہنچایا۔

بادشاہ! ہم نے اس مقدس تعلیم کو قبول کیا اور اس پر صدق دل سے ایمان لائے یہ ہے ہمارا وہ قصور جس کی بدولت یہ مشرکین کا وفد تجھ سے مطالبہ کرتا ہے کہ تو ہم کو ان کے حوالے کر دے۔" [1]

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اسلام کے صاف اور سادہ مگر روشن اصول کو جب اصحمہ کے سامنے جرأت حق کے ساتھ پیش کیا تو حبشہ کے حکمران نے مسلمانوں کو اپنی پناہ سے نکال کر وفد کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا اور پھر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے خوش الحانی کے ساتھ سورۂ مریم کی چند آیات تلاوت کیں تو نجاشی حبشہ بے حد متاثر ہوا اور آبدیدہ ہو کر اسلام کی صداقت پر ایمان لے آیا اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے دست حق پرست پر مشرف باسلام ہو گیا۔

یہ ہے دعوت اسلام کا مختصر خاکہ جس نے دنیا کے شب رنگ اور تاریک ترین خطہ انسانی کو ایک بہت ہی قلیل عرصہ میں مثل آفتاب تابناک اور روشن ترین بنا دیا۔ اس خاکہ میں اعتقادات، اخلاق اور اعمال حسنہ کا وہ تمام عطر موجود ہے جس کو قرآن عزیز نے مختلف سورتوں میں حسب حال اور مناسب مقام پر بکثرت بیان کیا ہے بلکہ پورا قرآن انہی روشن حقائق کا ہادی اور مرشد ہے۔

قرآن اور تجدید دعوت:

نبی اکرم ﷺ کی بعثت جبکہ بعثت عام ہے تو از بس ضروری ہوا کہ کائنات انسانی کی رشد وہدایت کے لیے خدا کا جو پیغام آپ ﷺ کے ذریعہ آئے وہ آخری پیغام ہو اور کامل ومکمل پیغام ہو اور فطرت کے ایسے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو کہ عقل سلیم اور فطرت مستقیم تمام کائنات انسانی کے لیے اس کو ابدی اور سرمدی پیغام یقین کرے اسی پیغام الٰہی کا نام "القرآن" یا "الکتاب" ہے۔

قرآن کی تعلیم اور اس کی دعوت واصلاح کی حقیقت معلوم کرنے سے قبل چند لمحات کے لیے مذاہب عالم کی تاریخ پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

قرآن کے نزول سے قبل کائنات انسانی پر چار مذہبی تصور حاوی اور فکر ونظر ذہنی پر اثر انداز تھے: ہندومت۔ مجوسی۔ یہودی اور مسیحی۔

ہندومت تصور الٰہی کے متعلق خواص اور عوام کے لیے دو جدا جدا تخیلات رکھتا تھا خواص کے لیے وحدۃ الوجود [2] اور عوام کے لیے اصنام پرستی، وحدۃ الوجود کا تصور اس درجہ فلسفیانہ تھا کہ خدا کا صحیح تصور کسی طرح اس راہ سے ممکن نہ تھا اس لیے کہ اگر ایک جانب وہ ہر وجود کو خدا یا خدا کا جزء مانتا ہے تو دوسری جانب خدا کے لیے کوئی محدود ومتعین تخیل بتانے سے عاجز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندومت کے تمام اسکولوں (مذاہب) میں اصنام پرستی ہی کو مذہبی امتیاز رہا اور وہ توحید خالص کو مقبول خواص وعوام نہ بنا سکا۔ چنانچہ ویدک دھرم، بدھ مت، جین مت وغیرہ بلکہ جدید اصلاحی اسکول (مذہب) آریہ سماج سب کے سب توحید خالص کے تصور سے خالی ہیں۔

[1] سیرت ابن ہشام جلد اول وتاریخ ابن کثیر ج ۳

[2] یہاں وہ وحدت الوجود مراد ہے جو یوگیانہ تصور کا نچوڑ ہے۔

Marfat.com

مجوسی مذہب کا اعتقادی تصور تو صاف صاف "ثنویت" کی بنیادوں پر قائم ہے یعنی وہ خدا کے تصور و تخیل کو خیر و شر کی جدا جدا دو متقابل قوتوں میں تقسیم کر دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ نور اور خیر کا خدا "یزداں" اور ظلمت و شر کا "اہرمن" ہے اور اس طرح خدائے خیر اور خدائے شر دو خدا کائنات ہست و بود پر متصرف اور باہم متقابل ہیں۔

یہودی مذہب اگرچہ خدا کے تصور میں مدعی توحید رہا ہے لیکن موجودہ تورات کے اوراق شاہد ہیں کہ اس کی نگاہ میں خدا کی ہستی تجسم سے پاک نہیں ہے اسی لیے تورات کا تخیلی خدا کہیں حضرت یعقوب علیہ السلام سے کشتی لڑتا نظر آتا ہے اور یعقوب علیہ السلام اس کو پچھاڑ دیتا ہے، اور کہیں اس کی انتڑیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے چیختا نظر آتا ہے، کبھی وہ بنی اسرائیل کو اپنی چہیتی بیوی بنالیتا ہے تو کبھی مصر سے خروج کے وقت بادل اور آگ کا ستون بن کر بنی اسرائیل کی راہنمائی کرتا نظر آتا ہے اور کبھی اس کی آنکھیں دُکھنے آجاتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور اس تصور کا آخری مظاہرہ حضرت عزیر (عزرا) علیہ السلام کو خدا کا بیٹا تسلیم کرنے پر منتج ہو جاتا ہے۔

اسی طرح مسیحی تصور بھی تجسم و تشبہ کے چکر میں آ کر حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مان لیتا اور اس طرح مشرکانہ عقیدہ "اوتار" کا تخیل اپنا لیتا ہے اور اقانیم ثلثہ (تثلیث) اور مریم پرستی میں حقیقی خدا پرستی کو گم کر بیٹھتا ہے خدا کی ہستی سے متعلق یہ وہ تصورات تھے جن میں دنیا کے بڑے بنیادی مذاہب نزول قرآن کے وقت مبتلا نظر آتے ہیں۔

ان سب مذاہب میں توحید حقیقی سے غفلت نے رسالت یعنی دعوت حق کے داعی کی شخصیت کے متعلق بھی غلط تصورات پیدا کر دیے تھے چنانچہ ہندوستان کے مذہبی تصور میں تو رسالت و نبوت اپنے صحیح معنی میں نظر ہی نہیں آتی اور وہ نبی و رسول کے مفہوم سے ہی یکسر نا آشنا نظر آتا ہے اور مجوسی، یہودی اور مسیحی مذاہب کے معتقدات میں اگر یہ تصور پایا بھی جاتا ہے تو افراط و تفریط کی شکل میں کبھی "ابن اللہ" ہو کر اور کبھی "بداخلاق و بداعمال انسان" کا پیکر بن کر جیسا کہ تورات میں حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی بیٹیوں کا ان کے ساتھ اختلاط کا واقعہ مذکور ہے (العیاذ باللہ من ھذہ الخرافات والافتراءات)

گویا ان کے نزدیک یا تو "رسول" اور داعی حق کی شخصیت کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی اور یا پھر خدا، خدا کا اوتار اور خدا کا بیٹا بن کر سامنے آتی ہے اور اس لیے جس طرح وہ حقیقی توحید سے بیگانہ نظر آتے ہیں اسی طرح رسالت و نبوت کے صحیح تصور سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔

اسی طرح عالم آخرت کے متعلق بھی ان مذاہب کے تصور کی دنیا افراط و تفریط سے خالی نہیں تھی بعض مذاہب میں تو کائنات انسانی مختلف چولوں کے چکر میں گرفتار نظر آتی اور آواگون (تناسخ) کے ناقص فلسفیانہ نقطہ نگاہ کا رہین منت بنی ہوئی ہے اور ایک حد پر پہنچ کر "برہم" یعنی خدا میں جذب ہو جانا نجات کا آخری نقطہ متعین کیا جاتا ہے۔ نیز خیر و شر کی جزا و سزا کے بارہ میں ایک قادر مطلق خدا نہیں بلکہ ایک جبری قانون میں جکڑی ہوئی مجبور ہستی کا تصور پیش کرتا ہے اور بعض اگرچہ تناسخ کے غلط عقیدہ سے جدا یوم معاد اور یوم حساب کے تصور سے آشنا بھی ہیں لیکن ان کے نزدیک بھی عالم آخرت کا معاملہ اعمال صالحہ و سیئہ یا افعال و کردار کے حق و باطل کی جزا و سزا سے وابستہ نہیں ہے بلکہ نسلی امتیازات اور جماعتی فرقہ بندی اور یا پھر کفارہ کے ساتھ مربوط ہے۔

ان چار بنیادی مذاہب عالم کے علاوہ مشرکین اور فلاسفہ کی بعض ایسی جماعتیں بھی تھیں جو نہ خدا کی ہستی کی قائل ہیں اور نہ عالم آخرت کی اور خدا کی ہستی پر اگر ایمان بھی رکھتی تھیں تو سینکڑوں ہزاروں بلکہ بے تعداد بتوں کی باطل پرستی کے ساتھ ملوث و مجروح۔

غرض یہ تھے مذاہب عالم کے وہ ذہنی تصورات اور فکری معتقدات جن پر کائنات انسانی کی روحانی اور سرمدی سعادت کا مدار سمجھا جاتا تھا اور جو بلاشبہ اپنے نتائج وثمرات کے لحاظ سے کائنات انسانی کو مشعل ہدایت دکھا کر "انسانیت کبریٰ" کے درجہ تک پہنچانے اور انسانوں کا خدا کے ساتھ حقیقی معبود وعبد ہونے کا رشتہ قائم کر کے دین ودنیا کی خیر وفلاح تک پہنچانے میں قطعی تہی دامن تھے۔

ان ہی حالات میں "اسلام" کی دعوت وتبلیغ یا "تعلیم حق" نے رونمائی کی اور کائنات انسانی کے ہر شعبہ حیات میں گوناگوں انقلاب پیدا کر کے نیا عالم پیدا کر دیا اور آفتاب ہدایت کی روشنی سے منور بنا کر اس کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔

توحید:

نبی اکرم ﷺ نے خدا کے کلام (قرآن) کے ذریعہ سب سے پہلے اسی عقیدۂ توحید پر روشنی ڈالی اور توحید خالص کی حقیقت واضح کر کے تمام کائنات انسانی کو اس کی جانب دعوت دی۔

قرآن عزیز کی دعوت توحید کا حاصل یہ ہے کہ اللہ ایک ایسی ہستی کا نام ہے جو اپنی ذات وصفات میں ہر قسم کے شرک سے پاک اور وراء الوراء ہے، نہ اس کا کوئی سہیم وشریک ہے اور نہ اس کا ہمتا وہمسر، اس لیے "ابنیت" کا عقیدہ ہو یا "اوتار" کا، صنم پرستی ہو یا ثنیت وتثلیث، یہ سب باطل ہیں وہ یکتا وبے ہمتا ہے، باپ، بیٹا اور اس قسم کی نسبتوں سے پاک ہے، پرستش کے قابل وہ خود ہے نہ کہ اس کے مظاہر اور اس کی مخلوقات، وہ جس طرح تجسم وتشبہ سے بالاتر ہے اسی طرح اس کا نہ کوئی مقابل ہے اور نہ کوئی حریفانہ سہیم۔

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ﴾ (البقرہ: ۲۵۵)

"اللہ" اس ہستی کا نام ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود اور خدا نہیں ہے، اللہ وہ ہے کہ اس کے سوا کوئی نہ خدا ہے نہ معبود، وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے اور زندگی کا بخشنے والا۔"

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْـًٔا﴾ (النساء: ۳۶)

"پس تم اللہ ہی کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔"

﴿لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ۝۱۳﴾ (لقمان: ۱۳)

"اللہ کا کسی کو شریک نہ بنا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔"

﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ﴾ (البقرہ: ۱۶۳)

"اور خدا تمہارا ایک ہی ہے۔"

یہ اور اسی مضمون کی بے شمار آیات ہیں جو قرآن عزیز میں توحید خالص کی داعی اور منادی ہیں لیکن سورۂ اخلاص یا سورۂ توحید میں جس معجزانہ اختصار کے ساتھ توحید سے متعلق موجودہ مذاہب کے ناقص اور غلط تصورات کو باطل کرتے ہوئے توحید خالص کی تعلیم دی گئی ہے۔ وہ خود اپنی نظیر ہے:

Marfat.com

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۙ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ﴾

(الاخلاص: ۱۔۴)

"(اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے اللہ یکتا ذات ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور نہ اس کا کوئی ہمسر اور سہیم وشریک ہے۔"

ایک مرتبہ توحید سے متعلق مذاہب عالم کی تعلیم پر اور نظر کیجئے اور پھر ان چند مختصر آیات کو غور وفکر کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے تو آپ اندازہ کر سکیں گے کہ پہلی دو آیات میں توحید خالص کا صحیح اور حق تصور پیش کر دیا گیا ہے، قرآن کہتا ہے کہ اللہ ایسی ہستی کا نام ہے جو یکتا و بے ہمتا ہے، ساری کائنات اس کی محتاج ہے اور وہ ہر قسم کی احتیاج سے پاک اور بے نیاز ہے وہ صمد ہے یعنی مجموعہ کمالات صرف صمدیت کا حصہ ہے اور بس۔

اس کے بعد وہ نصاریٰ اور یہود سے مخاطب ہو کر شمع ہدایت دکھاتا ہے کہ اللہ اس ہستی کو کہتے ہیں جو باپ اور بیٹے جیسی فانی نسبتوں سے بالاتر ہے وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا، تعالی اللہ علوا کبیرا اور اسی طرح ہندو دھرم سے کہتا ہے کہ ایسی لازوال ہستی کی مقدس شان اس سے بلند و بالا ہے کہ وہ کسی انسان یا حیوان کے جسم میں محدود ہو کر "اوتار" کہلائے یا اس معبود مطلق کے ساتھ چھوٹے معبودوں کا سلسلہ قائم کر کے کسی مخلوق کو اس کا سہیم وشریک ٹھہرایا جائے۔ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ اور وہ مجوس اور ویدک دھرم کے ان پجاریوں کو مخاطب کرتا ہے جو اس کو یزداں کہہ کر اہرمن کو اس کا مقابل حریف تسلیم کرتے ہیں یا روح (جیو) اور مادہ (پرکرتی) کو خدا کے ساتھ ازلی وابدی (قدیم وغیر مخلوق) کہہ کر ان چیزوں کو خدا کا کفو اور ہمسر بتلاتے ہیں اور کہتا ہے ﴿وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ﴾ خدا اس ہستی کا نام ہے جس کا نہ کوئی ہمسر اور حریف ہے اور نہ اس کی طرح انادی (قدیم) اور غیر مخلوق ہے۔

غرض قرآن عزیز نے خدا کی ذات واحد سے متعلق ان تمام نسبتوں کا قطعی انکار کر کے جو توحید خالص کے کسی طرح بھی معارض ہوتی تھیں اس کو یکتا اور بے ہمتا ظاہر کیا ہے اور اس طرح شرک فی الذات اور شرک فی الصفات کا قلع قمع کر دیا ہے اور شرک فی الالوهية اور شرک فی الربوبية کے خلاف توحید اور صرف توحید کو ہی اسلام کا بنیادی تصور قرار دیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ جس طرح قرآن نے توحید کے تمام اطراف و جوانب کو نقص و خام کاری سے پاک کر کے حقیقی توحید کے تصور کی جانب راہنمائی کی اور ہر قسم کے تجسم سے وراء الوراء بتلا کر توحید کامل کی جانب دعوت دی اسی طرح اس نے توحید کے اس فلسفیانہ عقیدہ کو بھی باطل ثابت کیا جو اس باب میں تفریط کی حد تک بڑھ کر صفات الٰہی کا بھی منکر ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ قادر ہے بغیر قدرت کے، خالق ہے بغیر خلق کے، بصیر ہے بغیر رویت کے، سمیع ہے بغیر سمع کے وغیرہ وغیرہ۔ اس عقیدہ کا حاصل یہ ہے کہ خدا ایسی ہستی کا نام ہے جس کے لیے "تعطل" لازم ہے جیسا کہ پہلی تعلیمات کا حاصل یہ تھا کہ کسی نہ کسی رنگ میں خدا کے لیے تجسم ضروری ہے۔

قرآن نے کہا کہ پہلی کیفیت اگر افراط پر مبنی تھی تو یہ تفریط پر قائم ہے اس لیے کہ ایک ذات کے لیے متعدد صفات کمال کا ہونا ذات کی وحدت پر اثر انداز نہیں ہے اس لیے بلاشبہ وہ سمیع و بصیر ہے، سنتا ہے اور دیکھتا ہے، لاریب وہ قدرت کاملہ کے ساتھ قادر ہے اور صفت رحم و کرم کے ساتھ رحیم و کریم ہے البتہ اس کی صفت سمع و بصر، صفت رحم و کرم وغیرہ صفات کا انسانی صفات سمع و بصر

Marfat.com

سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور جس طرح وہ اپنی ذات میں بے ہمتا اور یکتا ہے اسی طرح صفات میں بھی ہے:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۖ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

"اس (خدا) کی کوئی مثال نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ وہ سنتا ہے، دیکھتا ہے۔"

غور فرمائیے کہ کس معجزانہ تعبیر کے ساتھ ایک ہی آیت اور ایک ہی جملہ میں اس کی صفات کمالیہ کا اعتراف بھی مذکور ہے اور یہ بھی وضاحت موجود ہے کہ خدا کی ان صفات کو انسانی صفات کی طرح نہ سمجھو بلکہ اس کی ذات کی طرح اس کی صفات بھی ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ﴾ کے عنوان سے معنون اور انسانی صفات کی حقائق کے مقابلہ میں بے مثال و بے نظیر ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدائے برتر کی توحید جب ہی حقیقی توحید کہلا سکتی ہے کہ اس میں نہ تجسم کا عقیدہ شامل حال ہو اور نہ تعطل کا کہ یہ دونوں افراط و تفریط کی راہیں ہیں بلکہ عقیدہ یہ ہو کہ اللہ اپنی ذات میں بھی بے ہمتا و یکتا ہے اور اپنی صفات میں بھی اور وہ ہر طرح کے شرک و کفو سے پاک اور برتر ہے۔

رسالت:

توحید حقیقی کے ثبوت کے بعد قرآن نے "رسالت" کے بنیادی عقیدہ کی اصلاح بھی ضروری سمجھی اور اس نے بتلایا کہ کسی تعلیم کے حسن و قبح میں معلم کی شخصیت کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اچھی تعلیم کا معلم بدعمل انسان ہو یا بری تعلیم کا معلم نیکوکار، اور جبکہ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ خدا ہر ایک انسان کے ساتھ براہِ راست ہم کلام نہیں ہوتا تو از بس ضروری تھا کہ کائنات انسانی کی ہدایت کے لیے ایک انسان ہی کو معلم بنایا جائے اور وہی خدا کی جانب سے رسالت اور پیغامبری کا فرض انجام دے۔

پس بشری اوصاف سے متصف یہ انسان نہ خدا ہوگا اور نہ خدا کا بیٹا یا خدا کا اوتار بلکہ بشر اور انسان ہی رہے گا نیز خدا کے پیغامبر ہونے کی وجہ سے پاکی اور تقدس کا جو رشتہ اس کو خدا کی درگاہ سے وابستہ کیے ہوئے ہے اس کے پیش نظر اس کی ہستی کا نہ انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کو دوسرے انسانوں کے مساوی کہا جا سکتا ہے اس لیے قرآن نے جگہ جگہ مسیح ابن مریم اور عزیر (علیہما السلام) کے متعلق اس حقیقت کو واضح کیا کہ وہ خدا کے مقدس رسول ہیں۔ خدا یا خدا کے بیٹے نہیں ہیں۔ نیز یہ بھی بتلایا کہ اگر ایک انسان تمہاری طرح کھاتا بھی ہے اور پیتا بھی اور بازاروں میں چلتا پھرتا۔ خرید و فروخت کرتا اور گھر میں اہل و عیال کے ساتھ معاشرتی زندگی بسر کرتا ہے تو اس سے یہ کیسے لازم آ گیا کہ وہ خدا کا فرستادہ "رسول" نہیں ہے اور کس طرح یہ جائز ہے کہ ایک صادق و امین ہستی کے اس دعویٰ کو تم محض قیاس کی بناء پر جھٹلا دو کہ وہ خدا کا رسول نہیں ہے۔

قرآن نے ان حقائق کو جن صاف اور واضح تعبیرات کے ساتھ بیان کیا ہے گذشتہ صفحات میں آپ ان کا مطالعہ فرما چکے ہیں۔ پس جس کتاب میں نبوت و رسالت سے متعلق صحیح تصور موجود نہ ہو وہ کبھی اپنی مذہبی تعلیمات کی صداقت کی مکمل تصویر نہیں پیش کر سکتی، یہی وہ عقیدہ ہے جس کی حقیقت میں "ایمان بالرسل" "ایمان بالکتب" "ایمان بالملائکہ" سب بنیادی عقائد سمٹ کر جذب ہو جاتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ جبکہ ہدایت انسانی کے لیے خدائے تعالیٰ اپنی پیغامبری کے لیے ایک انسان اور بشر کو ہی چن لیتا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان نے جب سے اس کائنات میں قدم رکھا ہے اسی وقت سے رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ قائم ہے:

﴿ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴾(فاطر: ۲۴)

"کوئی گروہ یا جماعت ایسی نہیں ہے کہ جس میں ہماری جانب سے نذیر (پیغامبر) نہ گزرا ہو۔"

﴿ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾(الرعد: ۷)

"اور ہر قوم کے لیے ہادی آئے ہیں۔"

﴿ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ﴾(المؤمن: ۷۸)

"ان میں سے بعض کے واقعات کا ہم نے قرآن میں تذکرہ کر دیا ہے اور بعض ایسے ہیں جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں کیا۔"

اور یہ یقین لانا بھی ضروری ہے کہ جبکہ خدا ایک ہے اور اس کی تعلیم ایک تو بلاشبہ تمام پیغمبرانِ خدا کی بنیادی تعلیم بھی ایک ہی رہی ہے اور اس لیے اگر خدا کے کسی ایک برحق نبی و رسول کا بھی انکار کر دیا گیا تو گویا اس نے پوری دعوت قرآنی کا انکار کر دیا پس یہ ایمان ضروری ہوا:

﴿ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ﴾(البقرہ: ۲۸۵)

"ہم خدا کے پیغمبروں میں پیغمبر ہونے کے لحاظ سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے (کہ ایک کو مان لیں اور دوسرے کا انکار کر دیں)۔"

لہٰذا جب تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا از بس ضروری ہوا تو ان پر نازل شدہ تمام کتب سماویہ پر بھی ایمان لانا جزء ایمان ہو گا ورنہ تو ایک جانب سے ایمان لا کر دوسری جانب سے اس پیغمبر کی صداقت کا انکار لازم آئے گا اور جب رسالت اور رسالت کے ساتھ کتب سماویہ پر ایمان حقیقت ثابتہ بن جائے تو ملائکۃ اللہ پر اس لیے ایمان لانا ضروری ہو گا کہ خدا کے ان پیغمبروں نے یہ صاف صاف اعلان کیا ہے کہ خدا کی جانب سے ان پر یہ وحی خدا کا فرشتہ لے کر آتا ہے تو اب یا ہم اس پیغمبر کی صداقت کا انکار کر دیں اور یا پھر بن دیکھے فرشتہ پر اس لیے ایمان لے آئیں کہ بتلانے والی ہستی اپنے کردار و اعمال میں ہر طرح صادق و امین اور امراض دماغی و قلبی "جنون وسحر" سے ہر طرح پاک ہے اور ضروری نہیں ہے کہ جس شے کو آنکھوں نے نہ دیکھا ہو اور کانوں نے نہ سنا ہو وہ حقیقت میں بھی غیر موجود ہو کیونکہ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کسی شے کے عدم علم سے اس شے کا عدم لازم نہیں آتا یعنی یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو ہم نہیں جانتے وہ واقعہ میں بھی موجود نہ ہو۔

یوم آخرت:

نبی اکرم ﷺ نے خدا کے آخری اور مکمل پیغام قرآن کے ذریعہ تیسری بنیادی اصلاح "یوم آخرت" سے متعلق فرمائی۔

Marfat.com

مذاہب عالم اس سلسلہ میں بھی راہ مستقیم سے روگرداں اور افراط و تفریط کے بحر ظلمات میں پھنسے ہوئے تھے یا تو آواگون ❶ (تناسخ) کے چکر میں یوم آخرت کے اس تصور سے قطعاً بیگانہ ہو چکے تھے اور قیامت (پرلے) کا تعلق انسانی اعمال کی جزاء وسزا اور یوم الحساب سے غیر متعلق سمجھ چکے تھے اور یا پھر اس دن نجات کا مدار اور جزاء وسزا کا معیار اعمال وکردار کی جگہ نسل و خاندان اور سوسائٹی کی معاشرتی گروہ بندی پر سمجھ بیٹھے تھے اور "کفارہ" کو عقیدہ بنا کر حساب ومحاسبۂ اعمال سے مطمئن ہو چکے تھے۔ اور مشرکین اور بعض فلاسفہ نے تو یوم آخرت کے وجود ہی کا انکار کر دیا تھا اور ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ آج کا مردہ انسان کل کس طرح زندگی اختیار کر لے گا اور سینکڑوں اور ہزاروں برس کی بوسیدہ ہڈیاں یوم حساب میں کس طرح جسم بن کر اپنی روح کے لیے لباس بن سکیں گی۔

قرآن نے نازل ہو کر دنیاء انسانی کو بتایا کہ اس صاف اور واضح بات کے سمجھنے میں آخر تم پر کیوں وحشت طاری ہوتی ہے اور کیوں تمہاری عقل اس کو نہیں تسلیم کرتی کہ جس خالق کائنات اور بدیع السماوات والارض نے نمونہ اور نقشہ کے بغیر یہ عجیب و غریب عالم آفرینش کر دیا وہ بلاشبہ اس پر قادر ہے کہ ماضی میں مخلوق اور حال میں مردہ بوسیدہ ہستی کو مستقبل میں دوبارہ وجود عطا فرما دے اور اس کے منتشر اجزاء کو جمع کر کے دوبارہ وہی ہیئت جسمانی عطا اور سابق روح کو اس میں واپس کر دے۔

---

❶ اس موقع پر اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں سے متعلق اگرچہ بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے تاہم اس قدر سمجھ لینا ضروری ہے کہ تناسخ (آواگون) کا عقیدہ اس اساس پر قائم ہے کہ ہر ایک انسان کی موجودہ زندگی سابق میں کیے ہوئے اعمال کا ثمرہ اور نتیجہ ہے ورنہ کائنات میں یہ تنوع ہرگز نہ ہوتا کہ کوئی انسان ہے تو کوئی حیوان اور کوئی نباتات و جمادات نیز انسانوں میں کوئی غلام ہے تو کوئی جاہل اور کوئی صحت یاب ہے تو کوئی مریض اور کوئی امیر کبیر ہے تو کوئی مفلس ومحتاج وغیرہ وغیرہ۔

اس عقیدہ کا مقصد یہ ہوا کہ بغیر عمل وکردار کے اگر عالم میں یہ تغیرات موجود ہیں تو یہ خدا کی صفت عدل کے منافی ہے لیکن عقیدہ کی خام کاری اور بطلان کی مختلف وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اگر روح اپنے اعمال کی وجہ سے مختلف جون بدل کر ان تغیرات عالم کا باعث ہے جو مجموعہ کائنات کے حسن کا باعث ہیں اور جس کی بدولت یہ پورا کارخانہ مکمل نظام کے ساتھ وابستہ نظر آتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان کے لئے فطری اور نیچرل طور پر گنہگار، بدکار اور بداعمال ہونا ازبس ضروری ہے تاکہ مجموعہ کائنات کا یہ حسن نہ صرف یہ کہ پیدا ہو بلکہ قائم رہے جس کا تغیرات اور تنوعات پر مبنی ہونا ازبس ضروری ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیجئے کہ جون بدل کر آواگون کی زندگی اگر اعمال کی جزا وسزا سے متعلق ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت انسان کے لئے نیکوکار بننے کی جگہ زیادہ سے زیادہ بدکار رہنا چاہیے تاکہ آئندہ نظام عمل میں یہ تنوع باقی رہے جس کا باقی رہنا عقل وفطرت کے مطابق ہے ورنہ تو حیوانات، نباتات، جمادات کے فقدان سے انسانی دنیا کا یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔

تناسخ کے ناقص فلسفیانہ عقیدہ پر یقین رکھنے والوں نے اس حقیقت کو یکسر فراموش کر دیا ہے کہ ایک چیز اپنی انفرادیت کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی قبیح اور بری معلوم ہو لیکن مجموعہ کائنات کے پیش نظر اس کا وجود بھی اپنے اندر ضرور حسن رکھتا ہے مثلاً تل (خال) اپنے رنگ وروپ میں کیسا ہی سیاہ فام کیوں نہ ہو لیکن محبوب کے رخسار پر نہ خود حسین بن جاتا ہے بلکہ حسن محبوب کو دوبالا کر دیتا ہے اور حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ جیسے صوفی کو "خال محبوب پر سمرقند و بخارا" بخش دینے پر آمادہ کر دیتا ہے۔

اسی طرح عالم وکائنات میں انفرادی طور پر کسی کا مریض ہونا، اپاہج ومعذور ہونا، ناقص الخلقت ہونا وغیرہ گو قبیح اور قابل افسوس نظریات ہوں مگر مجموعہ کائنات کے حسن کے لئے فطری (نیچرل) ہیں اور اس تنوع پر ہی دنیا کے نظام کا بقاء ہے اور خالق کائنات کے کمالات آفرینش کا آئینہ دار۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

Marfat.com

یا تو صاف کہو کہ اس کائنات کو کسی بلند و بالا ہستی نے پیدا نہیں کیا جس کو خدا (اللہ) کہتے ہیں اور اگر یہ مانتے ہو تو یہ قطعاً عقل کے خلاف ہے کہ جو ابتدائی آفرینش کر سکے وہ اس آفرینش کو دوہرا نہ سکے:

﴿وَ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَیًّا ۝ اَوَ لَا یَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ یَكُ شَیْـًٔا ۝﴾ (مریم: ٦٦-٦٧)

"اور انسان کہتا ہے کہ بھلا جب میں مرگیا تو کیا میں (قبر سے) زندہ نکالا جاؤں گا۔ کیا انسان یہ یاد نہیں کرتا کہ ہم نے پہلے اسے پیدا کیا حالانکہ وہ کوئی چیز نہیں تھا۔"

﴿وَ ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّ نَسِیَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَ هِیَ رَمِیْمٌ ۝ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَ هُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمُ ۝﴾ (یٰسین: ٧٨-٧٩)

"اور ہماری نسبت باتیں بنانے لگا اور اپنی پیدائش کی حقیقت کو بھول گیا، کہتا ہے کہ ہڈیاں جب گل کر خاک ہوگئی ہوں تو کون ہے جو ان کو زندہ کر کے کھڑا کردے (اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے کہ جس نے ان ہڈیوں کو اول بار پیدا کیا تھا وہی ان کو زندہ کرے گا اور وہ سب کا پیدا کرنا، جانتا ہے۔"

یہ مشرکین مکہ تھے جو خدا اور خالقیت خدا کے تو قائل تھے مگر دوسری زندگی کے منکر و کافر اور جاحد تھے۔ پھر اس نے ان کو بھی مخاطب کیا جو کہتے تھے کہ آخرت کا تصور اس لیے فضول ہے کہ یہ کائنات کسی کی مخلوق ہی نہیں مادہ اور اس کی حرکت یونہی ازل سے ابد تک کائنات کا روپ و رنگ اختیار کیے ہوئے ہے اور حرکت و کشش دو قوتیں اس نظام عالم کے ہر قسم کے تنوعات کے کفیل ہیں۔ قرآن نے کہا، یہ گمراہ کن تصور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے وہ یہ کہ عقل اور سائنس کے خلاف یہ سمجھ لیا گیا کہ ذرات مادہ (اجزاء اثیریہ) میں شعور اور ارادہ نہ ہونے کے باوجود حرکت، قوت استعداد اور کشش کے ذریعہ خود بخود ایسی اشیاء وجود پذیر ہوسکتی ہیں جن کا مواد (میٹریل) ان ذرات میں موجود نہیں یعنی مادہ میں بالقوہ بھی نہ شعور ہے اور نہ ارادہ، نہ جذبات ہیں نہ احساسات، نہ ادراکات ہیں اور نہ عقل و تمیز، ورنہ تو جسم کو بالقوہ ان صفات کا حامل کہنا بجا ہوتا، لیکن یہ مسلمات میں سے ہے کہ جسم کو نہ شعوری کہہ سکتے ہیں نہ جذباتی، نہ ذی ادراک کہا جاسکتا ہے اور نہ ذی عقل و صاحب تمیز پس دلیل "وجدان" جو فطری دلائل میں سب سے مضبوط اور نیچر دلیل ہے، وہ اس حقیقت کو تسلیم کراتی ہے کہ جبکہ تمام موجودات عالم میں "انسان" موجودات عالم کی ارتقائی ہستی اور اشرف الموجودات ہے اور اس میں جذبات، حسیات، ادراکات، شعور اور عقل جیسے لطیف اوصاف موجود نظر آتے ہیں حالانکہ بلاشبہ مادہ کی قوت و استعداد میں یہ معدوم تھے، تو اس میں قطعاً شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ انسان سے بلند ضرور ایک ایسی ہستی موجود ہے جو قدرت و ارادہ کی علی الاطلاق مالک اور تمام موجودات کی خالق ہے اور اس میں بھی کوئی ریب و شک نہیں کہ انسان ایسی ذی عقل و ذی شعور اور صاحب ارادہ ہستی کی تخلیق محض بے فائدہ نہیں ہے اور اس کی زندگی کے اعمال اور کردار بے وجہ اور مہمل نہیں ہیں اور جبکہ ہم اس دنیا میں انسانوں کے اعمال و کردار کی جزاء و سزا کا مظاہرہ نہیں دیکھتے تو وجدان ہی ہمارے لیے رہنمائی کرتا ہے کہ ایک ایسا دن ضرور مقرر ہے

Marfat.com

جب کائنات انسانی اپنے اعمال و کردار کی جزاء و سزا کا نتیجہ و ثمرہ پائے گی اور اسی کو یوم القیامہ، یوم الآخرہ اور یوم الحساب کہتے ہیں، چونکہ یہ دن اپنی پائیداری اور قیام کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے اس لیے یوم القیامہ کہلاتا ہے اور چونکہ دنیائے موجودہ کے بعد ہے اس لیے یوم الآخرہ ہے اور چونکہ جزاء و سزا اور اعمال کے محاسبہ پر مشتمر ہوگا اس لیے یوم الحساب ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ﴾ (سبا: ۳)

"اور منکرین کہتے ہیں کہ قیامت ہم کو تو کبھی نہیں آئے گی۔ اے محمد! ﷺ کہہ دیجئے، ہاں ہاں مجھ کو اپنے پروردگار کی قسم جو عالم الغیب ہے قیامت تو تم کو ضرور پیش آ کر رہے گی۔"

﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝۳۶ ... الی ... اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يُّـحْيِۦ الْمَوْتٰى ۝۴۰ۧ﴾ (القیامۃ: ۳۶، ۴۰)

"کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ مہمل اور بیکار چھوڑ دیا جائے گا کیا خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے؟"

﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝۱ۙ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝۲ۙ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝۳ۙ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴ۡ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝۵ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۶ۭ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝۷ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝۸ۧ﴾ (التین: ۱-۸)

"گواہ ہے انجیر و زیتون (کے باغات سے سرسبز و شاداب وہ مقام بیت اللحم جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی) اور گواہ ہے طور سیناء (جہاں موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفرازی نصیب ہوئی) اور گواہ ہے یہ بلد امین (مکہ جہاں محمد ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی) کہ بلاشبہ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر قوام سے بنایا پھر اس کو نشیبوں کے سب سے نیچے مقام پر دھکیل دیا مگر وہ انسان جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کے لیے بے منت و احسان اجر و ثواب ہے تو اب وہ کیا بات ہے جو تجھ کو دین (قیامت) کے جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے کیا اللہ حاکموں میں سے بہتر حاکم نہیں ہے۔"

اور سچ تو یہ ہے کہ قرآن عزیز کہتا ہے کہ آخرت کے انکار پر منطقی دلائل قائم کرنے اور سفسطہ اور غلط روش کو اختیار کر کے اِدھر اُدھر بھٹکنے کی آخر ضرورت کیا ہے جبکہ انسان کی سب سے قریب اور سب سے زیادہ مضبوط دلیل "وجدان" خود بخود اس جانب راہنمائی کرتی ہے کہ یہ نظام عالم جس طرح حیرت زا اور محیر العقول نظام فطرت سے منظم اور قوانین فطرت کے ہاتھوں میں مسخر ہے، ہو نہیں سکتا کہ یہ خود رو نظام ہو اور جبکہ اس کا کوئی خالق ضرور ہے تو اس نے خیر و شر کے ثمرات و نتائج کے لیے بھی ضرور کوئی وقت مقرر کیا ہے ورنہ یہ کامل و مکمل نظام ثمرہ اور نتیجہ کے پیش نظر ایک مہمل شے ماننی پڑے گی۔ پس نتیجہ اور ثمرہ کا وہ دن ہی "یوم آخرت" کے نام سے موسوم ہے جو نہ تناسخ کے چکر سے وابستہ ہے اور نہ ازلیت و ابدیت عالم کا حامل بلکہ جس طرح عالم کی ہر شے کا ایک آغاز ہے اور ایک انجام، اسی طرح خود اس پورے عالم کا بھی ایک آغاز اور انجام ازبس ضروری ہے۔

پس مومن اور مسلم وہی ہے جو توحید خالص، رسالت کے صحیح تصور اور یوم آخرت پر یقین کامل، کے سررشتہ کے ساتھ پیوستہ

Marfat.com

ہو اور یہی وہ تین بنیادی عقائد ہیں جو دین کے حقیقی تصور یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسل، ایمان بالکتب، ایمان بالملائکہ، ایمان بالقدر اور ایمان بالآخرہ سب ہی پر حاوی ہیں اور یہی وہ دین کامل ہے جس کی تشریح قرآن عزیز نے سورۂ بقرہ کے آخری رکوع میں اس طرح کی ہے:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ۝ ﴾ (البقرہ: ۲۸۵)

"رسول محمد (ﷺ) ایمان رکھتے ہیں اس شے پر جو اس پر ان کے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے (یعنی قرآن) اور ہر ایک (ایماندار) ایمان رکھتا ہے خدا پر، فرشتوں پر، سماوی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، (وہ کہتے ہیں خدایا) ہم تیرے پیغمبروں کے درمیان کسی ایک کو بھی پیغمبر تسلیم کرنے کے سلسلہ میں فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں ہم نے تیرا حکم سنا اور اس کی پیروی کی، اے پروردگار ہم تجھ سے مغفرت کے خواہاں ہیں اور ہم کو آخر کار تیری ہی جانب لوٹنا ہے۔"

مابعد الطبیعاتی عقائد و افکار سے متعلق قرآن حکیم کی یہی وہ اصلاحی اور انقلابی تعلیمات تھیں جن کو نبی اکرم ﷺ نے اول عرب کے سامنے روشناس کیا اور پھر تمام کائنات انسانی تک پہنچا کر مذاہب کی دنیا ہی بدل ڈالی اور اسلام کی اس دعوت توحید نے مذاہب عالم میں ہلچل پیدا کر دی اور کسی نہ کسی رنگ میں ان کو توحید حقیقی کے اس ارتقائی نقطہ کی جانب جھکنا پڑا اور اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان رشتہ معبودیت و عبودیت ہی کو صحیح نقطۂ نظر پر استوار اور عقائد اور مابعد الطبیعاتی افکار کے رخ روشن کو آشکارا کر دیا، بلکہ اس نے "ایمان اور عمل صالح" کو دین کی بنیاد بنا کر اخلاق، معاشرت، معاش، غرض مذہب اور اجتماعی سیاست سب ہی کو اصلاح و انقلاب کے سانچے میں ڈھال کر دنیا کی صحیح راہنمائی کا حق ادا کر دیا۔

یہ بحث چونکہ طویل الذیل ہے اور آیت ﴿ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ ﴾ کی تفسیر کے ضمن میں شرح و بسط کی محتاج، اس لیے یہ مقام اس کی وسعت کو برداشت نہیں کر سکتا۔